

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی
کارنامہ جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو
دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید
کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو
پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ
طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/-

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے
اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار
کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/-

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہد قدیم کی
سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات
کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے
پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/-

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی
تجربوں اور رویوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ
ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔

مزاحیہ مضامین کا ...
بار بار پڑھنے کی چیز ہے

...ی الغور

کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔
مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔

مولانا آزاد کی کہانی

مولانا ابوالکلام آ...
ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ ...
اسٹنٹ کالج کے ڈائرکٹ...
بڑی محنت سے لکھی ہے۔ ...
تاریخی دستاویز۔

دیگر ادارے ...

مضامین سید...

ادبی مضامین کا اہم مجموعہ

توفیق الحکیم

... ناول نگار ...

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

جنوری ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۱

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/-

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 691019

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلیٰ آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

نظمیں/غزلیں

مانگے کا اجالا

طنز و مزاح

کہانی

افسانے

مدیب
اد ملزوم کی
مجموعوں اور
کے اعتراف اور
جرائد (ان میں
قلم کار کے
لکھے ایڈٹ
حمن میں
بی رسائل
(جس
قلمی

نئی مطبوعات

قلم اور قدم (مضامین) سید حامد ۷۵/-
مفکرینِ تعلیم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۴۰/-
گاہے گاہے (شعری مجموعہ) رولینڈ لارنس ۳۰/-
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں محوی صدیقی ۹/-
بچوں کے الطاف حسین حالی (سوانح) ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید ۶/-
بچوں کی آپا جان 〃 پروفیسر صغرا مہدی ۶/-
بچوں کے نظیر اکبر آبادی 〃 شفیقہ فرحت ۶/-
رسالہ دینیات (حصہ ششم) ادارہ ۶/-
〃 (حصہ ہفتم) 〃 ۶/-
〃 (حصہ ہشتم) 〃 ۶/-
حیاتِ عمران (سوانح) مسعود الرحمٰن خاں ۱۵/-
میثاق النبیینؐ (تحقیق) مولانا عبدالحق ودیارتھی ۱۲/-
معروضات (مضامین کا مجموعہ) ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی ۱۰/-
سمتِ سفر (قوزان کے اداریوں کا انتخاب) سلمان ماہی ۷۰/-
ڈھانچہ (افسانوں کا مجموعہ) محمود شاہد ۶۰/-
یونانِ قدیم کا لازوال المیہ اردو نظم میں (ڈرامے) مترجم محمد سمیع الحق ۴/-
[illegible] بلیس ارض کو لونو میں
(انتخاب کلام خادم آروی) صابر آروی ۷۰/-
[illegible] شعری مجموعہ) ڈاکٹر گوپال کرشن شفق ۱۲۰/-
[illegible] (مذہب) مولانا حبیب ریحان خان ندوی ۵۰/-
[illegible] ب) عزیز احمد ۵۰/-
سما[illegible] مولانا عبدالحق ودیارتھی ۱۲۵/-
[illegible] مجموعہ) اسلم عمادی ۶۰/-
[illegible] ادبی رسالہ) مدیر: عاصم شہنواز شبلی ۴۰/-
[illegible] مدیر: اسرار عالم فی شمارہ ۱۰/-
[illegible] مولانا سید محمد اطہر کی جیل ڈائری) مرتبہ: سید خلود نقیب ۱۰/-
[illegible] مدہ (برائے تعلیم بالغاں) ایم عزیز الحسن بھیروی ۴/-

[illegible] رق عطا عابدی

دہلی کی تاریخی مساجد جلد اوّل (تاریخ) عطاء الرحمٰن قاسمی ۲۰/-
فلسطین کے چار ممتاز شعرا (ادب) عبدالحق حقانی ۶/-
بیان (ناول) مشرف عالم ذوقی ۱۰۰/-
روتا ہوا آدمی (افسانے) رئیس نجمی ۸۰/-
آج (رسالہ) مدیر: اجمل کمال ۸۰/-
ارتکاز 〃 〃 راغب شکیب ۱۰۰/-
غالب کے چند نقاد (تذکرہ) سلیمان اطہر جاوید ۶۰/-
توضیحی اشاریۂ غالب نامہ (اشاریہ) فاروق انصاری ۶۰/-
غالب نامہ جلد نمبر ۱۶ شمارہ ۲ ۵۰/-
رشیدیات مہر الٰہی ۵۰/-
اشاریہ تنقید عتیق احمد ۵۰/-
علم شرح تعبیر پروفیسر نعیم احمد ۱۲۵/-
اردو تنقید پروفیسر منظر عباس نقوی ۱۰۰/-
سلیمان ندوی ڈاکٹر ہاشم ۱۵۰/-

تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں محوی صدیقی

حصہ اول و دوم

محوی صدیقی صاحب نے اس کتاب میں بچوں کو بزرگوں کے اخلاقی کارناموں سے واقف کرا کر ان میں شریفانہ جذبات و پاکیزہ اخلاق پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ قیمت ۹/- روپے

نماز پڑھیے

حدیث میں آیا ہے کہ نماز ہر مسلمان بالغ مرد و عورت پر فرض ہے اس مختصر سی کتاب میں نماز کے بارے میں سارے احکامات اور فضائل نہایت سلیس اور آسان زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۴/۵۰

حدیث کیا ہے احمد خاں خلیل

حدیث کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ ہم تک کیسے پہنچی۔ اس کے عالم کون ہیں۔ اس کی قسمیں کتنی ہیں اور اس کے مشہور مجموعے کتنے ہیں یہ سب اس چھوٹی سی کتاب میں بتایا گیا ہے۔

قیمت ۴/- روپے

مہمان مدیر
عطا عابدی
ای-۱۵۳/۲۲ ذاکر نگر
نئی دہلی ۲۵

چند باتیں
قلم کار اور مدیر کے حوالے سے

قلم کار پہلے یا مدیر؟ اس سوال کا جواب اگرچہ "انڈا پہلے یا مرغی؟" کی طرح مشکل یا الجھانے والا نہیں ہے لیکن دونوں کی معنویت کا بہت کچھ انحصار ایک دوسرے کے وجود پر ضرور ہے۔ قلم کار اور مدیر کے درمیان تعلقات کی کئی نوعیتیں ہیں۔ قلم سے قلم کار (شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں وغیرہ) کا ہی نہیں بلکہ مدیر کا بھی ناگزیر رشتہ ہوتا ہے۔ مدیر خود ایک قلم کار بھی ہوتا ہے، البتہ قلم کے استعمال کی جہتیں الگ ہوتی ہیں۔ مدیر کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسے تمام قلمکاروں (شاعر، افسانہ نگار، مقالہ نگار، ناول و ڈراما نگار، طنزومزاح نگار اور مکتوب نگار وغیرہ) کا اعتماد و تعاون اسے حاصل رہے۔

مدیرانہ فرائض کا احساس کرتے ہوئے مدیر اور اپنے مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے قلم کار، دونوں آپس میں خوشگوار رویوں کو پروان چڑھاتے ہیں اور اس سے ایک صحت مند تہذیب کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ قلم کار اور مدیر دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مدیر کے بغیر قلم کار صرف مشاعروں، جلسوں، نشستوں، مجموعوں اور کتابوں تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قلم کار کے تعارف، ان کی خدمات کے اعتراف اور ان کی نگارشات کی ترویج و ترسیل کا سب سے بڑا وسیلہ آج بھی رسائل و جرائد (ان میں روزنامہ اور ہفتہ وار اخبارات کے ادبی گوشے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں) ہیں۔ قلم کار کے بغیر اگر مدیر کا تصور کیا جاسکتا ہے تو وہ اس طرح کہ مدیر خود ہی مختلف مضامین لکھے، ایڈٹ کرے، ترتیب دے اور شائع کرے۔ غیر ادبی رسالوں میں ایسا ممکن ہے لیکن اس ضمن میں بھی بطور مثال صرف ایک رسالہ "الرسالہ" کا نام ذہن میں آرہا ہے۔ یعنی غیر ادبی رسائل بھی مختلف قلم کاروں کے قلمی تعاون کے محتاج ہیں۔ ایسی صورت میں کسی ادبی رسالہ (جس میں مختلف اصنافِ ادب کی شمولیت ضروری ہوتی ہے) کے بارے میں صرف مدیر کی قلمی

نگارشات پر مشتمل ہونے کی بابت سوچنا بھی دشوار ہے۔ بالفرض اگر کسی مدیر نے ایسا کیا بھی تو کب تک کرے گا؟ مختلف قلم کاروں کا تعاون رسالہ کی زندگی و صحت کے لیے ناگزیر ہے۔ مدیر اور قلم کار کے وجود کی معنویت و افادیت ایک دوسرے کے ربط و تعاون سے ہے اور رہے گی۔ اس ربط و تعاون کے استحکام اور پائیداری کے لیے ضروری ہے کہ ان کے درمیان خوشگوار اور مخلصانہ تعلقات ہوں۔ لیکن ان دنوں قلم کار اور مدیر کے رشتے میں کئی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں یا بدگمانیوں کے سبب عدم اعتماد کی دیوار کھڑی ہونے لگی ہے۔ قلم کار مدیر کی شکایتیں کرتے نظر آتے ہیں تو مدیر قلم کار کے بعض تکلیف دہ رجحانات سے پریشان رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات ہر مدیر یا ہر قلم کار کے حوالے سے نہیں کہی جاسکتی' لیکن عمومی صورتِ حال بیزار کُن ہے۔ یہ مسائل معمولی نظر آتے ہیں لیکن ان سے چشم پوشی کرنے کا سلسلہ یونہی جاری رہا تو یہ بڑے بڑے مسائل پیدا کرنے کا موجب بن سکتے ہیں۔ معمولی کمزوریوں یا کوتاہیوں کو معمولی سمجھ کر اصلاح کی صورت پیدا کرنے کے بجائے اسے نظر انداز کرتے رہنا ایک غیر معمولی غلطی کے مترادف ہے۔

اب آیئے' ان "چھوٹے مسائل" کی طرف۔

گذشتہ سال ایک چھوٹے سے شہر کے ایک چائے خانہ میں ایک نوجوان شاعر سے ملاقات ہوئی۔ رسمی بات چیت کے بعد وہ یوں گویا ہوئے۔۔۔ "میرا بس چلے تو تمام مدیران کو گولی ماردوں۔" یہ سُن کر میں سنّاٹے میں آگیا۔ ایک شاعر کی لطافت یوں جارحانہ رُخ اختیار کرے گی' میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اپنے کسی ردِّ عمل کا اظہار میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا۔۔۔ "تمام مدیران جھوٹے اور وعدہ فراموش ہوتے ہیں۔" میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔ "آخر ہوا کیا؟ کچھ وجہ بھی بتائیں گے یا یونہی اپنی بھڑاس نکالتے رہیں گے؟" ان کا جواب تھا۔۔۔ "میری غزل فلاں مدیر نے اپنے رسالہ کے لیے "نمبر میں ہے" کہہ کر رکھ لی تھی۔ میں ڈیڑھ سالوں سے اپنے نمبر کا انتظار کررہا ہوں۔ بار بار خط لکھا لیکن اب تک میرا نمبر نہیں آیا جب کہ اس دوران فلاں فلاں شاعر کی غزلیں کئی بار چھپ چکیں۔ ان شعرا کے نمبر اتنی جلدی جلدی کیسے آجاتے ہیں؟ اب آپ ہی بتایئے' نمبر پر شائع کرنے کی بات جھوٹ اور فریب ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔۔۔۔ "ممکن ہے' بعد میں غزل میں کوئی کمزوری نظر آگئی ہو۔" یہ سُن کر وہ طیش میں آگئے اور بولے۔۔ "تو وہ واپس کرسکتے تھے۔ جوابی لفافہ ساتھ میں تھا۔" میں نے کچھ کہنا چاہا تو انھوں نے یہ کہہ کر خاموش رہنے پر مجبور کردیا کہ میں مدیران کے حلقے سے تعلق رکھتا

ہوں' اس لیے ان کی طرفداری کروں گا ---- یہ ایک مثال ہے' ورنہ اکثر نئے یا رسالوں کے شہروں سے دور رہنے والے قلم کار مدیران کی شکایتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک دوسرے نوجوان قلم کار نے اپنی کتاب کی دو دو کاپیاں تبصرے کے لیے مختلف رسالوں کو بھیجیں۔ دو ایک مقامی رسالہ و اخبار (وہ بھی ایک سال بعد) کے علاوہ اور کہیں اس پر تبصرہ شائع نہ ہوسکا۔ بعد میں جب وہ دہلی آئے تو ایک دوست سے تبصرہ لکھوا کر انھوں نے ایک رسالہ کے مدیر کے حوالہ کردیا اور جلد شائع کرنے کی تاکید یا درخواست کی۔ تبصرہ اگلے ہی مہینے شائع ہوگیا۔ تبصرہ کی اشاعت پر اس صاحبِ کتاب قلم کار نے اپنے ردِ عمل کا اظہار اس طرح کیا ---- "دیکھا آپ نے! اگر میں دہلی نہ آتا تو تبصرہ شائع ہوپاتا؟" مدیر کے اس عمل کو منہ دیکھی عمل کہہ سکتے ہیں لیکن مدیر کو اس عمل پر آخر مجبور کس نے کیا؟ قلم کار نے اور صرف ایک قلمکار نے۔ بہت سے قلمکار مدیر پر اقربانوازی کا الزام لگاتے ہیں۔ اقربانوازی سے بہتوں کی حق تلفی ہوتی ہے لیکن مدیر کے اقربا قلم کار ہی تو ہوتے ہیں جو اپنا حق تو لیتے ہی ہیں' دوسرے قلم کاروں کا حق بھی سمیٹ لینے کی غرض سے مدیروں کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔ اگر مدیر نے جرات سے کام لیا اور بڑے یا قریبی ناموں کے باوجود ان کی چیز واپس کردی تو پھر مدیر کی "خیر" نہیں۔ کچھ بڑے نام اپنی ہر چیز کو پتھر کی لکیر اور ہر حال میں قابلِ اشاعت سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی چیز کی واپسی شاید ان کی شان کی خلاف ورزی ہے۔ نتیجتاً مدیر کے خلاف ان کی سرگرمیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مدیران اکثر بڑے ناموں کی چیزوں کو دیکھتے ہی چھاپنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کسی بھی ادبی یا نیم ادبی رسالہ کی ورق گردانی کرکے دیکھ لیجیے' بڑے یا مخصوص نام ہر دو چار مہینے بعد کہیں نہ کہیں موجود پائیں گے۔ ان اونچی یا مخصوص "دکانوں" کی پکوان پھیکی ہے یا میٹھی' اس پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ نئے ناموں یا دور افتادہ مقامات کے قلم کاروں کے ساتھ مدیر عموماً انصاف نہیں کرپاتے کہ وہ ان کی چیزوں کو جلد پڑھنے کی فرصت نہیں نکال پاتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جوابی لفافہ ہونے کے باوجود مکمل جواب دینے کی زحمت بہت کم کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی وعدۂ اشاعت کے باوجود وعدہ وعدہ ہی رہتا ہے۔ اس وعدہ کی تکمیل اگر ہوئی بھی تو تقاضے اور یاد دہانیوں کے بعد۔ اور جب تخلیق شائع ہوئی تو متعلقہ شمارہ ارسال کرنے کے لیے بھی قلم کار کو خط لکھنا پڑتا ہے۔

ادبی رسالوں کے اکثر مدیران متعلقہ رسالہ کے مالک بھی ہوتے ہیں' لہٰذا قلم کاروں اور قارئین کے سامنے وسائل کی کمی کا اظہار (ہم اسے بہانا نہیں کہتے) ہوتا رہتا

۔ وسائل کی کمی کے باوجود رسالے چھپتے رہتے ہیں اور کاتب سے لے کر بائنڈر اور ٹھیلے ہونے والے تک کو محنتانہ ادا کرتے ہیں مگر ان کے پاس قلم کار کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات متعلقہ شمارہ اور جوابی کارڈ تک خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اس تعلق سے ایک قلم کار کا کہنا ہے : ۔"جب بغیر خرچ کے ہر ماہ تخلیقات کا انبار لگا رہتا ہے تو وہ خرچ کیوں کریں؟ وہ تو تخلیق کی اشاعت کو بھی قلم کار پر احسان سمجھتے ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ ممتاز و مشہور قلم کاروں کی تخلیقات عموماً معیاری اور بہت حد تک نقائص سے پاک ہوتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ تو ہے نہیں، اور نہ ہی اس کا اطلاق تمام تخلیقات یا قلم کار پر ہو سکتا ہے۔ ایک نئے قلم کار، جس کی پہنچ مدیر تک نہیں ہے، کی کتاب مفید و معیاری ہونے پر بھی اس پر تبصرہ کی اشاعت بمشکل ہو پاتی ہے لیکن قریبی قلم کاروں کی کتابوں پر تبصرہ بلا تاخیر شائع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کے بعض رسالے کے یکے بعد دیگرے کئی شمارے پر تبصرے شائع ہوتے رہتے ہیں۔

کسی رسالہ کے دفتر میں آپ جائیے اور مدیر سے قلم کاروں کے رویہ پر گفتگو کیجیے تو غزلوں کی کثرت کا ذکر ضرور ہوگا۔ آپ کو ہر روز موصول ہونے والی غزلوں کی تعداد بتاتے ہوئے مدیر کا سوال ہوگا۔۔۔ "آپ ہی کہیے، میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر ان کو چھاپنا بھی چاہوں تو کس طرح؟ ایک شمارہ میں تقریباً ایک درجن غزلیں شائع ہوتی ہیں، جو کافی ہوتی ہیں۔ لیکن ہر دو چار دنوں بعد ہمارے پاس درجن بھر غزلیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے میں شعرا کی بیشتر تعداد کو مایوسی یا طویل انتظار کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ اگر صرف ان تمام غزلوں کو پڑھنے، فیصلہ کرنے اور جواب دینے کا کام کیا جائے تو دوسرے اور کام نہیں ہو سکتے۔ غزلوں کے علاوہ اچھی خاصی تعداد میں افسانے اور مضامین بھی موصول ہوتے ہیں۔ اب آپ بتائیے، ان سبھوں کے پڑھنے اور انتخاب کرنے میں غیر معمولی وقت لگے گا یا نہیں؟" مدیر کا دردِ سر یہیں تک محدود نہیں ہے۔ بعض شعرا کی ایک بار غزل چھپی تو شکریہ کے ساتھ ہی دوسری غزل بھیج دی جاتی ہے اور پھر تقاضا کہ غزل کب شائع ہو رہی ہے۔ بعض قلم کار اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ ترتیب میں ان کے مقام کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بعض قلم کار کسی ایک مدیر یا کسی بڑے ادبی نام سے اپنے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے خط لکھتے ہیں کہ ان کے حکم یا ان کی خواہش کے احترام میں آپ کو تخلیق بھیج رہا ہوں۔ بعض اساتذہ اپنے اثر و رسوخ سے اپنے شاگردوں کی تخلیقات کی اشاعت کا کام

[redacted]

انجام دیتے ہیں۔

بسا اوقات مدیر قلم کاروں کی مرسلہ تخلیقات کے سلسلے میں اپنے فیصلے سے مہینوں (سالوں بھی) تک آگاہ نہیں کرتے۔ لہٰذا قلم کار وہاں سے مایوس ہو کر وہ تخلیق دوسرے رسالے کو بھیج دیتے ہیں اور اتفاق ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مہینوں کے فاصلے سے دونوں رسالوں میں وہ تخلیق شائع ہو جاتی ہے۔ جس رسالہ میں وہ تخلیق بعد میں شائع ہوتی ہے' اس کے مدیر کو قارئین لکھتے ہیں کہ فلاں تخلیق فلاں رسالہ میں شائع ہو چکی ہے۔ مدیر بھی اسے "غیر ذمے دارانہ حرکت" قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا قلم کار کی غیر ذمے دارانہ حرکت کے سبب نہیں بلکہ خود مدیر کے جواب دینے میں غیر معمولی تاخیر کے سبب ہوا۔ کسی کسی مدیر خصوصاً نئے' عوامی یا تفریحی نوعیت کے رسالوں کے مدیران کے نزدیک تخلیق کی قبولیت کا پیمانہ رسالہ کی خریداری بھی ہے۔ لیکن یہ پیمانہ شاید ہی کبھی بڑے ناموں کے ساتھ استعمال کرنے کی جرات کی جاتی ہو گی بلکہ ان کو تو رسالہ کا ہر شمارہ اعزازی طور پر ملتا ہے اور وہ بھی اسے اپنا حق سمجھتے ہیں۔

کسی بھی باحیات ادبی شخصیت پر نمبر یا گوشہ شائع ہوتے وقت مدیر پوری طرح (مندرجات کی حد تک) اس شخص کی مرضی کے تابع نظر آتا ہے جس پر نمبر یا گوشہ نکلنا ہوتا ہے۔ اس نمبر یا گوشہ کے لیے مضامین کس سے لکھوائے جائیں' اسے بہتر سے بہتر بنا کر کس طرح پیش کیا جائے' ان تمام سوچوں سے مدیر تقریباً بری الذمّہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب صاحبِ نمبر یا گوشہ خود (یا ان کے قریبی رفیق) ہی مرتب کی ذمے داری سنبھالیں گے تو مضامین کی نوعیت یک رُخی یا قصیدہ خوانی کے سوا اور کیا ہو گی؟ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ نمبر یا گوشہ ترتیب دینے کے لیے مدیر خود یا اپنے معاون کے ذریعہ مختلف مکتبۂ فکر سے مضامین لکھواتے تاکہ متعلقہ فنکار کے مختلف گوشے سامنے آتے۔ ایسی صورت میں مضمون لکھنے والے بھی کسی مصلحت یا مروت کا بہت کم شکار ہوتے' لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسالوں کے شخصی نمبر یا گوشے تعریفی و توصیفی الفاظ کا گورکھ دھندہ نظر آتے ہیں۔ اس روش پر قلم کار شاید اس لیے آواز نہیں اٹھاتے یا احتجاج نہیں کرتے کہ کل وہ بھی اپنی شخصیت' خدمات اور فن پر نمبر یا گوشہ نکالنے (نکلوانے) والوں کی صف میں کھڑے ہوتے ہیں یا خود ان پر نمبر یا گوشہ نکل چکا ہوتا ہے لہٰذا اب وہ کس طرح اس روش کو غلط کہیں۔

بعض قلم کار اپنی کتاب تبصرہ کے لیے بھیجتے یا پیش کرتے وقت مبصر یا مدیر سے کہتے ہیں۔ "اپنی قیمتی رائے سے ضرور نوازیں۔" لیکن قیمتی رائے کا مفہوم اُن کی نظر میں

تعریف و توصیف ہوتا ہے۔ ان کی توقع کے برعکس اگر کتاب کے حسن و قبح یعنی دونوں پہلوؤں پر تبصرہ شائع ہوتا ہے تو صاحبِ کتاب مدیر و مبصر سے الجھنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ اگر مبصر صرف تعریف و توصیف کے کلمات کا ہی اظہار کرتا ہے تو صاحب کتاب کو چھوڑ کر دوسرے اہل نظر بجا طور پر اسے قصیدہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کمزوریوں کی نشاندہی کرنے یا نقائص کی طرف اشارہ کرنے پر صاحبِ کتاب اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے اور آیندہ محتاط رہنے کے بجائے مبصر کو گالی دینے، زک پہنچانے یا لعنت ملامت کرنے تک کا حربہ اختیار کرلیتے ہیں۔ اکثر صاحبِ کتاب حسب مرضی تبصرہ نہ ہونے کے سبب مبصر کی علمی صلاحیت ہی کو چیلنج کرنے لگتے ہیں۔ بعضوں کے جذبۂ انتقام کا انداز یوں ہوتا ہے---"اپنی کتاب چھپواؤ تو ہم بھی بتاتے ہیں۔" اس قسم کی زد میں مبصر ہی نہیں، مدیر بھی ہوتے ہیں۔ مدیر کے پاس خط آتا ہے یا زبانی اظہار ہوتا ہے کہ "آپ کو یہ کتاب کس نے تبصرے کے لیے دی تھی؟" ایسے جاہلانہ تبصرے چھاپ کر آپ نے اپنا بھی وقار کم کرلیا" آپ نے ایسا تبصرہ شائع کیسے کردیا" لیکن اگر تبصرہ صرف تعریف و توصیف پر مشتمل ہو تو تہہ دل سے مبصر اور مدیر دونوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس وقت صاحب کتاب یہ نہیں پوچھتے کہ "آپ کو تبصرے کے لئے کتاب کس نے دی" "تبصرہ قصیدہ خوانی ہو کر رہ گیا۔" وغیرہ

مصنف کی کتاب نعوذ باللہ نہ تو "کتاب اللہ" ہے کہ کمزوریاں یا نقائص نہیں ہونگی اور نہ مبصر آدمی سے علاحدہ کوئی ایسی مخلوق ہے کہ غلطیاں سرزد نہیں ہوں گی۔ مبصر نے اگر نا انصافی کی ہے تو خود تبصرے کے سبب مبصر کا وقار اور اعتبار کم ہوگا۔ مبصر کو مصنف یا اس کے رفقاء کے ردِّ عمل سے متاثر ہوئے بغیر دیانتدارانہ روش پر قائم رہنا چاہیئے اور اگر تبصرے میں کوئی سہو یا غلطی ہوگئی ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے۔

مصنف کے منفی یا انتہا پسندانہ ردِّ عمل کے شکوے کا مطلب یہ نہیں کہ مبصر بالکل عدل کے پتلے ہوتے ہیں۔ مبصر کبھی کسی تبصرے میں کسی خاص وجہ سے کسی کو زمین سے آسمان ثابت کرتے ہیں تو کسی مصنف کو دانستہ مجروح بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ایسا ہے تو یہ اپنی جگہ خود کم اہم نہیں ہے۔ اگر مبصر نے موضوع کو سمجھنے میں غلطی کی ہے تو معقول دلائل اور مناسب طریقہ سے مبصر کے "فیصلے" کو رد کیا جاسکتا ہے۔ مبصر نے اگر کتاب کے ساتھ واقعی زیادتی کی ہے تو مصنف کے جائز اعتراض یا احتجاج میں دیگر قلم کاروں کی آواز بہت کم شامل ہوپاتی ہے۔ غالباً وہ یہ سوچتے ہیں کہ بیٹھے بٹھائے مبصر یا مدیر سے مخالفت کیوں مول لیں؟ مبصر نے اگر دیانتدارانہ تبصرہ کیا ہے اور اس پر

متعلقہ مصنف برا نگیختہ ہے تو دیگر قلم کار اس مصنف کے ردعمل پر اپنے تاثر کا اظہار شاید ہی کر پاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں قلم کاروں کی خاموشی خود ان کے نزدیک مصلحانہ ہو سکتی ہے لیکن اسے عادلانہ نہیں کہا جا سکتا۔

قلم کار اور مدیر کے رشتوں کے تحت کس کس سے کہاں اور کس قسم کی کوتاہیاں سرزد ہو رہی ہیں، اس کی نشاندہی کی یہ کوشش کس حد تک UNBIASED اور IMPERSONAL ہے، اس کا فیصلہ آپ قارئین پر ہے۔ راقم الحروف کو اعتراف ہے کہ قلم کار و مدیر کے حوالہ سے تمام اصلاح طلب گوشے سامنے نہ آ سکے اور جو گوشے سامنے آئے بھی تو ان پر خاطر خواہ روشنی نہ ڈالی جا سکی۔ اس کے باوجود یہ مضمون کئی حل طلب مسائل اور جواب طلب سوالات کی جانب اشارے کر کے قارئین (بشمول قلم کار و مدیر) کو غور و فکر کی دعوت ضرور دیتا ہے اور یہی اس تحریر کا مقصد بھی ہے۔ ●●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی طرف سے
ایک خواب نامہ ایک کتاب

مستقبل کی طرف

مرتبین
خواجہ محمد شاہد خالد کمال فاروقی

مولانا محمود حسن کے خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے لے کر آج تک کے ایسے تمام خطبات کا مجموعہ، ایک اہم تاریخی دستاویز:

قیمت: ۱۵۰/-

پلاٹینم جوبلی تقریبات کے دوران یہ کتاب رعایتی قیمت پر پیش کی جائے گی)

قلم اور قدم

سیّد حامد

ہمارے تہذیبی، تعلیمی، لسانی، معاشرتی مسائل کا بے لاگ اور ہمدردانہ تجزیہ۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز دانشور اور سماجی مبصرؔ کے قلم سے۔ ان مضامین کا اہم ترین پہلو جیتی جاگتی زندگی کے مسائل اور معاملات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

قیمت ۷۵/- روپے

سیاہ فام ادب

مرتبین: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ایک نئی، زندہ اور متحرک حسیت کا منظر نامہ۔ سیاہ فام جمالیات اور سیاہ فام ادب پر اردو میں اوّلین کاوش۔ آج کے ادبی مزاج کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے

قیمت ۴۰/-

سرسید اور ان کے عہد کا مطالعہ ہمارے اجتماعی حال اور مستقبل کا مطالعہ ہے۔
اس سلسلے کی ایک اہم کتاب

سرسیّد سے اکبر تک

مرتبین
شمیم حنفی سہیل احمد فاروقی
قیمت ۹۰/- روپے

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین:- پروفیسر شہر یار / پروفیسر ابوالکلام قاسمی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں پروفیسر نارنگ کی علمی، ادبی سرگرمیوں کے نمایندہ پہلوؤں سے متعلق مضامین، تاثرات، تنقیدی آرا اور ادبی مسائل پر مکالمہ، سے ان کی دلچسپیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۶۰/- روپے

آگے سمندر ہے

انتظار حسین

انتظار حسین کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے "آگے سمندر ہے" آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔ قیمت: ۱۵۰/- روپے

خامہ بگوش کے قلم سے

۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۰ء کے طنزیہ مزاحیہ کالموں کا انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: مظفر علی سیّد

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالموں کا مجموعہ جن کا اردو والوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔

صفحات لگ بھگ ۳۵۰۔ قیمت مجلد 150/- عام ایڈیشن 80/-

رضا نقوی واہی
۱۰/۵ گردنی باغ
پٹنہ۔۱

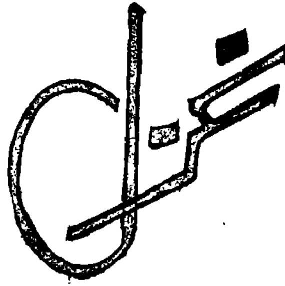
گٹھری واہیات کی

سرکار کی عنایت و بخشش سے جب بنی
روزِ ازل سے قسمتِ شاعر جو بند تھی
استاد، و مبتدی و عطائی و تک فروش
چالاک اُن میں جو تھے، رقم ہضم کر گئے
پٹنہ سے لکھنؤ تلک آنے لگے نظر
ہر صاحبِ کتاب نے آکر ترنگ میں
اجراء کے جشن تک تو رہی خوب دھوم دھام
اجراء کے بعد آیا نکاسی کا مرحلہ
لکھے گئے عزیز و اقارب کو بھی خطوط
سعیِ بلیغ پر بھی نہ بر آئی آرزو!
بنیوں نے کی بچاروں کی تھوڑی مدد ضرور
ٹھونگا بنانے والے بھی کچھ لے گئے کلام
گھر والیوں نے پھاڑ کے اوراق گاہ گاہ
ولاد شاعروں کی تھی اردو سے نابلد
گلدستۂ سخن سے بنائی گئی پتنگ
ہوتا رہا یہ حشر نگاہوں کے سامنے
جیسے دہی فروش لیے سر پہ ٹوکرا
اب یوں ہی اپنے دوش پہ لادے ہوئے کتاب

یو پی میں اور بہار میں اردو اکیڈمی
اک زور دار جھٹکے سے فی الفور کھل گئی
اکثر کو بہرِ طبع و اشاعت رقم ملی
اوروں نے جیسے تیسے کتاب اپنی چھاپ لی
اک اک گلی میں صاحبِ دیواں کئی کئی
مقدور بھر ضیافت احبابِ خاص کی
مجموعہ جس کو مفت ملا، اس نے داد دی
ہر اک کتب فروش کی چھانی گئی گلی
اخبار میں نکالا گیا اشتہار بھی
دو ایک جلد بھی نہ کتابوں کی بک سکی
ردّی کے بھاؤ لے لیں کتابیں کبھی کبھی
شاعر کے خونِ دل کی کھپت یوں بھی کچھ ہوئی
چولھے جلائے، گرم کی سالن کی دیگچی!
قدر اُن کے دل میں ہوتی بھلا کیا کلام کی
چھوڑی گئی ڈرین میں کاغذ کی ناؤ بھی
ہمت نہ ہاری اہلِ سخن نے مگر کبھی
بازار میں پکارتا پھرتا ہے "لے دہی"
پھرتے ہیں صبح و شام سخنور گلی گلی

واہی بھی باوجودِ ضعیفی ہے اُن کے ساتھ
گٹھری

شمیم جے پوری
محلہ نبی سرائے میرٹھ
(اتر پردیش)



یہ کس کے قتل کی یاروں میں گفتگو آئی
کہ حرف حرف سے میرے لہو کی بُو آئی

خدا کرے کہ ترے گلستاں کو راس آئے
یہی بہار جو پی کر مرا لہو آئی

خود اپنے آپ سے نظریں بچا کے دیکھا ہے
جو تیری جیسی کوئی شکل روبرو آئی

یہاں ترستے ہیں ہم تیری خاکِ پا کے لیے
نسیمِ صبح ترے گیسوؤں کو چھو آئی

بس ایک بار ترے پاس ہو کے گزرا تھا
تمام عمر ترے پیرہن کی بُو آئی

نہ کوئی لفظ نہ آواز، صرف سناٹا
نہ جانے آج کہاں لے کے آرزو آئی

دعائیں مانگ کے پچھتا رہا ہوں اب دل میں
بہار آئی تو کیسی لہو لہو آئی !

تلاش کرتا ہوں اب اپنی خلوتوں میں اسے
بہت دنوں میں یہ تہذیبِ جستجو آئی

شمیم کو تو زمانہ مٹا چکا کب کا
صبا پیامِ کرم لے کے آج تو آئی

رفعت صدیقی
۱۲-۲-۸۰۰/۱۹۶ دلشاد نگر کالونی
ریتی باؤلی - حیدر آباد - ۲۸

تمام شد

(میرے نوخیز لڑکے شفاعت کی رحلت پر)

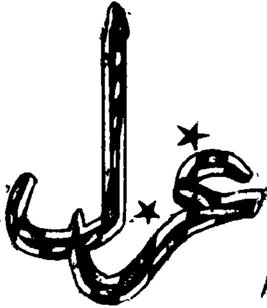
ساری مصروفیت تمام ہوئی
ہسپتالوں کے ان گنت پھیرے
مشورے، ڈاکٹر، حکیموں سے
ان گنت ڈکس ٹروز[1] کے باٹل
بوتلیں خون کی۔ وہ انجکشن
جن سے چھلنی تھا اس کا سارا جسم
آکسیجن کے ٹیوب ختم ہوئے
ساری مصروفیت تمام ہوئی
اب نہ امید صحت یابی کی
نہ دعائیں ہیں زندگانی کی
اور کچھ بھی نہیں رہا لیکن
ڈھیر ساری رپورٹس[2] باقی ہیں
اور وہ جس کے لیے تھا یہ سب کچھ
چھوڑ کر سب کو جا چکا ہے کہیں
اب فقط ایک گہرا سناٹا
میرے سارے وجود میں گم ہے

---

[1] DEXTROSE.
[2] REPORTS.

• ادارہ کتاب نما دعا گو ہے کہ اللہ رب العزت مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

منظور ہاشمی
۱-اے نظیر احمد روڈ
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
علی گڑھ



کچھ تو تعمیر بھی پرانی ہے
کچھ ہوا کی بھی مہربانی ہے

کس قیامت کی سخت جانی ہے
موت بھی وجہ زندگانی ہے

خود بھی حیران رہ نہ جاؤں کہیں
جانے کیا اب کے جی میں ٹھانی ہے

اب تو یہ اعتبار بھی نہ رہا
جسم میں خون ہے کہ پانی ہے

کیسے ممکن ہوا کہ اس کے بغیر
آج کی شام بھی سہانی ہے

بات پوری ہو کس طرح اپنی
کچھ بتانا ہے، کچھ چھپانی ہے

غزلیں

عبدالمجید
شعبۂ اردو
گورنمنٹ رضا پی جی کالج
رام پور۔ یوپی

پاؤں رکتے ہی نہیں ذہن ٹھہرتا ہی نہیں
کوئی نشہ ہے تھکن کا کہ اُترتا ہی نہیں

دن گزرتے ہیں گزرتے ہی چلے جاتے ہیں
ایک لمحہ جو کسی طرح گزرتا ہی نہیں

بھاری دروازۂ آہن کہ نہیں کھل پاتا
میرے سینے میں یہ سناٹا اُترتا ہی نہیں

دستِ جاں سے میں اٹھا لوں اسے پی لوں لیکن
دل وہ زہرابِ پیالہ ہے کہ بھرتا ہی نہیں

کیا لیے پھرتا ہوں میں آب و سراب آنکھوں میں
ڈوبتا ہی نہیں کوئی کہ اُبھرتا ہی نہیں

یہ پگھلتی ہی نہیں شمع کہ جلتی ہی نہیں
یہ بکھرتا ہی نہیں دشت کہ مرتا ہی نہیں

کچھ نہ کہیے تو بھلا یوں ہی سمجھتے رہیے
پوچھ لیجیے تو وہ عیبوں سے مُکرتا ہی نہیں

شہپر رسول
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی ۲۵

کہاں کوئی جو زباں بھی، جگر بھی رکھتا ہو
پھر اپنے ہاتھ بھی، گردن بھی، سر بھی رکھتا ہو

خموش ہونٹ بھی، عرضِ ہُنر بھی رکھتا ہو
تغیّرات پہ گہری نظر بھی رکھتا ہو

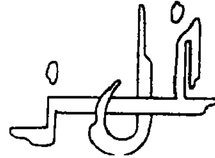
کئی امیدیں بجھاتا ہو ایک جنبش میں
کئی چراغ سرِ رہگذر بھی رکھتا ہو

کبھی تو ہجر کے محور میں قید ہو جائے
کبھی وصال کا لمبا سفر بھی رکھتا ہو

لہو میں پلتی ہوں آزادیاں بھی اس کے مگر
قفس میں خوش بھی ہو اور بال و پر بھی رکھتا ہو

سفر کا شوق رکھتا ہو اپنے سینے میں
عذابِ ہمسفری سے مفر بھی رکھتا ہو

نصر قریشی
۱۴۷، ٹھٹیا بہادر گنج، الہ آباد (یوپی)



خانہ در خانہ بٹی ہے زندگی
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے زندگی

چہرہ ہنستا اور دل روتا ہوا
ہم نے اکثر یوں بھی کی ہے زندگی

گھر کی چھت کے بعد سر پر آسماں
جیسے صحرا میں کھڑی ہے زندگی

آج اپنی بے بسی کو دیکھ کر
سر پٹک کر رو رہی ہے زندگی

مسکراہٹ بانٹتے پھرتے ہیں لوگ
بھیک میں مانگی ہوئی ہے زندگی

اے خدا! تیرا کرم، تیری عطا
شکر ہے کہ زندگی ہے زندگی

اپنی تحریروں میں زندہ ہو گئے
مر کے بھی ہم کو ملی ہے زندگی

دوستوں نے زخم کچھ ایسے دیے
نصر زخمی ہو گئی ہے زندگی

راجیش ریڈی
۱۷، اے۔ فلیٹ نمبر ۴۰۴
کلیک اسٹیٹ، اٹوپ ہل، بمبئی ۳۷

غزل

ہم اپنی راہ سے یوں بے خبر نہیں ہوتے
ہمارے ساتھ اگر راہ بر نہیں ہوتے

عجب کمال ہے اکثر صحیح ٹھہرتے ہیں
وہ فیصلے جو کبھی سوچ کر نہیں ہوتے

دیا ہے کس نے انھیں شوق یوں بھٹکنے کا
یہ جو ہوائیں ہیں کیوں ان کے گھر نہیں ہوتے

جنم ہمارا بھی ہوتا جو اک صدی پہلے
ہمارے حصے میں بھی اتنے ڈر نہیں ہوتے

یہ کس عجیب سی دنیا میں آ گئے ہیں ہم
جہاں پرندے تو ہوتے ہیں پر نہیں ہوتے

جو پھل بھی دیتے تھے چھایا بھی اور دعائیں بھی
اب اس زمین پہ ایسے شجر نہیں ہوتے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پتھر کی دیوار
سردار جعفری

"پتھر کی دیوار" سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ اس فصل بہار کا ثمر ہے جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی۔ (پاکٹ اڈیشن) قیمت ۱۵/- روپے

وسط ایشیا۔ نئی آزادی، نئے چیلنج
آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی، بی۔ بی۔ سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔

قیمت ۵۱/- روپے

معیار اردو
مرتبہ: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالر محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت ۲۱/- روپے

مغیث الدین فریدی: شخصیت اور ادبی خدمات
مرتبہ: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے اس میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

تذکیر و تانیث
نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک فتاویٰ مدون کیا ہے۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت =/75

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ
ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کے محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تا حال کارفرما رہے ہیں۔ پیش کیے گئے ہیں۔

قیمت ۴۵/- روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات)
ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سید ظہور قاسم کی تحقیق کا میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی علمی مہم کے پہلے میر کارواں ہیں ان خطبات میں اس پُراسرار ارضی خطے کی دلچسپ داستاں بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بتدریج ترقیوں کا تجزیہ بھی۔ قیمت ۱۰/- روپے

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم
اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر "معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر" کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش کیا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت ۱۰/- روپے

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات
ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندوستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت ۱۵/- روپے

دیویندر اسّر
بی ۱۵۳/۲ جنک پوری
نئی دہلی ۵۸

قرۃ العین حیدر

زندگی، فلسفہ اور تحلیل نفسی

قرۃ العین حیدر کی تخلیقات پر لکھنا انتہائی دشوار کام ہے کیونکہ ان پر پرکھ کے ابھی تک کے رائج پیمانے عائد نہیں ہوتے۔ یہ تحریریں ایسی ہیں کہ یہ نہ صرف تنقید کی نئی فکر اور تازہ کاری بلکہ اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہیں کہ ان کی تنقید کا نظریہ ــــ اگر اسے نظریہ کا نام دیا جاسکے تو ــــ ان کے اندر سے ہی نمو پائے گا۔ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ ان کی فکشن اپنی تنقید خود ہی لیے ہوئے وجود میں آتی ہے۔ وہ ایک طرح سے ہمارے ادب میں کیرتی فکشن کا ایسا نمونہ ہے جس کی کوئی مثال اردو ادب اور شاید ہندستان کی دوسری زبانوں کے ادب میں بھی موجود نہیں۔

قرۃ العین حیدر نے "کارِ جہاں دراز ہے" کے بارے جو لکھا ہے وہ ان کی دوسری تخلیقات کے بارے میں بھی صحیح ہے۔

> "ایک مشہور ناقد نے مجھ سے اعتراضاً کہا تھا کہ "آخر شب کے ہم سفر" پورا ناول نہیں ہے "آگ کا دریا" کو ٹوٹل ناول نہیں کہا گیا کیونکہ یہ اصلاح اس وقت یہاں غالباً پہنچی نہیں تھی۔ "کارِ جہاں دراز ہے" بھی مغربی تنقید کے بہت سے نظریوں کی کسوٹی پر کسا گیا۔ پورا نہ اُترا کہیں فٹ نہ بیٹھا۔ اس وقت تک نان فکشن ناول بھی شاید کسی نے نہیں سُنا تھا۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا اسے ROOTS نے انسپائر کیا ہے۔ حالانکہ وہ ROOTS کی اشاعت سے پہلے لکھا گیا تھا..... ارے بھائی ایک سوانح عمری انتہائی غیر دلچسپ انداز میں لکھی جاسکتی ہے اور ناول کے پیرایے میں بھی۔ اس میں کون سی ناقابلِ فہم یا قابلِ اعتراض یا بحث طلب بات تھی.....؟"
>
> قرۃ العین حیدر ــ ایوانِ اردو اکتوبر ۱۹۹۱ء

لہٰذا کسی ایسے عنوان کے تحت جیسا کہ قرۃ العین حیدر ــ حیات اور فلسفہ تحلیل نفسی ہے لکھنا ممکن نہیں۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو یہ نہ صرف گمراہ کُن ہوگا بلکہ فکشن کی تنقید کے تقاضوں کے بھی منافی ہوگا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ ان کی تحریروں میں سوانحی عناصر کی تلاش کریں۔ یہ کام ادبی جاسوسوں کے لیے چھوڑ دیا جائے تو بہتر ہے۔ دوسرے تحلیل نفسی نہ صرف فکر اور طریقۂ کار کی رو سے پُرانی پڑ چکی ہے بلکہ خود نفسیات کے شعبے میں بھی یہ مشکوک ہو چکی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی سوانح تو ان کی فکشن کے بیسیوں کرداروں میں بکھری پڑی ہے آپ کس کس کی تحلیل نفسی کریں گے۔ جب کوئی مصنف ذات اور کائنات کے بیچ پھیلی ہوئی سوچ

بیکراں اسپیس میں داخل ہوتا ہے تو ہم ایسی سچائیوں سے آشنا ہوتے ہیں جسے محض ذات کے حوالے یا تاریخی حالات کی رو سے ادراک کے دائرے میں لانا ممکن نہیں۔ لہٰذا جن دو باتوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔۔۔ لازمۂ خیال/تحلیل نفسی/شعور کی رو اور تاریخ نویسی۔ وہ دونوں ہی PROBLEMATIC ہیں۔ ان کی فکشن میں جو ذہنی اسپیس ہے وہ ہر جگہ موجود ہے اور کہیں بھی موجود نہیں۔ کیونکہ وہ اگر ایک طرف جسمانی/طبیعاتی سطح پر حرکت پذیر ہے تو دوسری طرف اسی لمحے اس سے پرے غیر مرئی حقیقتوں کے اسرار کے بند دروازے پر بھی دستک دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادیب مکمل طور پر اپنی ذات اور تجربات سے ماورا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اسے رد بھی کرتا ہے تو وہ اپنے تجربے کے حوالے سے رد کرتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا اظہار ذات ہے یعنی INVERTED SELF EXPRESSION لیکن جب قرۃ العین حیدر نے اپنے تجربات کو اپنی ذات اور زندگی کے حوالے سے جو بھی مواد فکشن میں استعمال کیا تو انھوں نے ان کی حد بندیوں کی زمان و مکان میں محصور ہونے کے باوجود اس طرح توڑ دیا کہ وہ ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہو کر ہماری ہی داستان بن جاتی ہے اس طرح ان کی فکشن گم شدہ ذات کے ساتھ ساتھ گم گشتہ آوازوں کی بازیافت بھی ہے۔

شیشے کا گھر یا پت جھڑ کی آواز یا روشنی کی رفتار کے افسانے ہوں۔ میرے بھی صنم خانے ہو یا گردش رنگ چمن۔ ان کی تحریروں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور معنیٰ کی نئی دنیاؤں کے در کھلنے لگتے ہیں انھوں نے جب جب بھی سوانحی حالات کا استعمال کیا ہے یا اپنی زندگی سے فکشن کا مواد اخذ کیا ہے وہ انکشاف ذات کے اسی وسیع اور ہمہ جہت معنیٰ میں ہوا ہے۔ ان کی تحریروں کی یہ SELF-REFLEXIVTY داخلی معنویت اور تہذیبی بازیافت اور تعمیر نو کی صورت میں رونما ہوتی ہے "کار جہاں دراز ہے"، یعنی سوانحی حوالوں اور تہذیبی تذکروں کے باوجود اسی عمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے ابن سعید کے کھلے شخصی مطالعے کے فٹ نوٹ میں کہا ہے۔

> قصہ یہ ہے کہ مجھے اپنا احوال رقم کرنے سے پہلے اپنے سارے گھرانے کا احوال رقم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ میں ان سب سے علاحدہ کوئی انوکھی ہستی نہیں ہوں۔

اس پر فتح محمد ملک نے COMMENT کرتے ہوئے کہا ہے کہ اور جب سارے گھرانے کا احوال رقم کرنے بیٹھیں تو صاحب التواریخ کی خوابناک فضاؤں میں جا نکلیں۔ کائنات اور وقت کے باطن میں قرۃ العین حیدر کا سفر ہنوز جاری ہے۔ دیکھیے اگلی منزل کہاں ہے؟ اس پس منظر میں قرۃ العین حیدر کا یہ قول کافی اہم اور معنیٰ خیز ہے کہ لکھنا ان کے لیے مابعدالطبیعاتی فعل ہے۔

اس تناظر میں ان کی فکشن حقیقت بھی ہے اور ماورائے حقیقت بھی لیکن یہ حقیقت پر مبنی نہیں جیسا کہ اس سے مراد لی جاتی ہے ایسی سرحد پر کھڑے ہو کر دونوں اطراف کو دیکھتے ہوئے انسانی PREDICAMENT کی داستان رقم کرنا ہر ادیب کے لیے چیلنج ثابت ہوا ہے۔ بالخصوص ان ادیبوں کے لیے جنھوں نے تاریخ اور وقت کے خطی تسلسل کو رد کر دیا ہے۔ وقت کے تسلسل اور تاریخ کے تسلسل میں فرق ہے۔ تاریخ کے نام نہاد تسلسل میں BREAK ہے JUMPS میں RUPTURS ہیں۔ وقت کے آگے پیچھے وقت ہی ہے۔ وقت میں وہ سب کچھ موجود ہے جو بیت چکا ہے۔ اور وہ بھی ہے جو ان گنت ہے۔ ابھی سامنے نہیں آیا۔ قرۃ العین حیدر اپنی

فکشن میں ہمہ وقت کئی زمانوں میں سفر کرتی ہیں۔ اسے آپ PRESENCE OF THE PAST کہیں BACK TO THE FUTURE یا کوئی اور نام دیں وہ ہمہ وقت کئی زمانوں میں سفر کرتی ہیں "آگ کا د
ایک اقتباس:

"وقت کے پیٹرن میں طلعت جہاں بیٹھی تھی، وہی طلعت اسی پیٹرن میں ایک جگہ اور موجود تھی اور دونوں نقطوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ تھا اور اس فاصلہ پر انسان آگے کی طرف چل سکتا تھا۔ آگے اور آگے۔ پیچھے جانا ناممکن تھا۔ گو ہزاروں طلعتیں اَن گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود تھیں۔ جیسے آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں ایک ہی چہرے کے مختلف عکس آتے ہیں۔"

آئینے کے یہ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے، تاریخ کے تسلسل میں یہ JUMPS BREAKS اور RUPTURES یہ ان گنت ٹکڑوں میں منتشر ان گنت جگہوں پر موجود طلعتیں حسب ذاتی کرب ا اجتماعی المیے کا استعارہ بن گئی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی فکشن اس سے جنم لیتی ہے، اس میں نمو پاتی اور اسے مستقبل کے روبرو کھڑا کر دیتی ہے کہ سنو مستقبل کی آہٹ سنو۔ اور پہچانو کہ یہ کس کی آواز ہے بلا رہی ہے۔ ایک اقتباس۔

"یہ جو میں ہوں۔ خاموشیوں کی دیوی نے آہٹ سے کہا۔ تم جس راستے پر چلوگے بالآخر مجھ تک پہنچو گے۔ جس راگ کو سنو گے اس میں میری آواز ہوگی۔ جس خوشبو کو محسوس کروگے اس میں میری مہک پاؤ گے۔ پھولوں کے جو رنگ دیکھوگے ان میں میری جھلک موجود ہوگی۔ کہیں بستی ہوں، کہیں لیشو دھرا ہوں لیکن تمہارے وجود کا سایہ ہوں۔ سایہ جو کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جو ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے لیکن مل نہیں سکتا اور مستقبل کی صدیوں کے اندھیرے میں کھو جاتا ہے۔

یہ ہے "گیکٹس لینڈ" جس میں انسان کی ویژن رنگا رنگ پھولوں کی بارش کر سکتی ہے۔ اگر اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ آنے والی نسلیں اگر ہمارے عہد کو پہچاننا چاہیں گی تو وہ تاریخ نویسوں کی کتابوں سے نہیں قرۃ العین حیدر کی تحریروں سے روشنی کی بشارت حاصل کریں گی۔ جو تاریخ نہ ہو۔ ہو۔ بھی تاریخ سے زیادہ مستند ہیں۔

یہ وقت ہی ہے جس سے ان کے کردار ہم کنار ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی شناخت بنتی ۔ ان کے رشتے بدلتے ہیں۔ فکر اور اظہار کے پیرایے بدلتے ہیں۔ احساس کی جہتیں بدلتی ہیں۔ آگ کا د ہو یا "کارِ جہاں دراز ہے"، گردش رنگ چمن، ہو یا "چاندنی بیگم" ان کے کردار سمے کے اس بہاؤ میں تیرتے ڈوبتے اور ابھرتے ہیں۔ حالات ان کی ٹریجک حیثیت کے اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ قصہ گو قرۃ ا داستان در داستان تاریخ اور تہذیب کی تہہ در تہہ پرتیں کھولتی جاتی ہے اور ان کی فکشن کے پاردرشی آ میں سمے عکس بن کر جھلکنے لگتا ہے۔ اس کے لیے جس ویژن اور ریسرچ جو دونوں اطراف ماضی اور مستقبل جانب بیک وقت دیکھ سکنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف ایسا ادیب ہی کر سکتا ہے جس کے ذہن میں علم تمام وسیلوں اور اظہار کے تمام نمو ۔ ایک مسلسل سلسلہ بڑھ رہا ہو گر بشہ رکے ز نگتے ہوں۔ ان سلسلہ

قرۃ العین کا قول ہے۔

"جس قسم کے ناول میں لکھتی ہوں ان کے لیے تو ریسرچ ظاہر ہے کہ بے حد ضروری ہے، علاوہ ازیں مصوری، آرٹ، ہسٹری، آرکیالوجی اور موسیقی سے میری گہری دلچسپی اس چھان پھٹک میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ کون سی انوکھی بات ہے"۔ ایوان اردو۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

یہ واقعی انوکھی بات ہے۔ ذرا ہم عصر فکشن کا مطالعہ کر کے دیکھیے تو یہ حقیقت آپ پر آشکارا ہو جائے گی کہ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ جس شعور و آگہی، ذہنی اور فکری گہرائی، احساس، جذبے اور تجربے کی وسعت یادوں، خوابوں اور تمثیل، تاریخ، معاشرے اور تہذیب کے کچھ مستقل اور سیکڑوں تغیر پذیر VARIABLES کو انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں جس تانے بانے میں بُنا ہے جو تیکنیک دیے ہیں وہ تلاش ذات کے اس سفر اور ذات کے اظہار سے شروع ہوتا ہے جو بالآخر معاشرے کے انتشار، تہذیب کی تخریب اور کائناتی CHAOS کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

"چاندنی بیگم"، کے بارے میں وہ لکھتی ہیں۔

زمین اور اس کی ملکیت اس پہلو دار ناول کا بنیادی استعارہ ہے جو پہلے باب کے تعارفی پیراگراف سے لے کر آخری صفحے تک موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی ارتقا کا عمل، پیہم تغیر، تبدیلی، تخریب و تجدید و تعمیر اور فطرت سے انسان کے اٹوٹ سمبندھ کی اشاریت کافی واضح ہے"۔ ایوان اردو۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء

سوال یہ نہیں کہ یہ تلاش آپ کو کس منزل پر لے جاتی ہے۔ یا کہاں سے کیسے شروع ہوتی ہے بلکہ یہ ہے کہ تلاش کے اس سفر سے آپ کیسے گزرتے ہیں؟ ان کے لیے تلاش کا یہ سفر محض انکشاف ذات تک محدود نہیں جو ذاتی یا اجتماعی لاشعور کی پروردہ ہے اور جسے شعور کی رَو کے ذریعے پیش کیا گیا۔ کہا جاتا ہے جس ا ذکر ان کی تحریروں کے تجزیے میں عام طور پر کیا جاتا ہے بلکہ وقت کے بہاؤ میں انھوں نے ان ANCH- OR POIN- کی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن کے سہارے لوگ زندگی کرتے ہوئے ایسے MYTHS استعارے کی تخلیق کرتے ہیں جو ان کے وجود کا جواز ہی نہیں اسناد بھی بن جاتے ہیں۔ مادیت، وجودیت، رسریت کے اس تناظر میں قرۃ العین کا یہ بیان کافی معنی خیز ہے۔

"لکھنا ایک مابعد الطبیعاتی فعل ہے۔ اس طرح لکھنا جیسے صفحے پر بارش ہو رہی ہو، ادراک، اکتساب، تجزیہ، تشریح، ترجمانی، اطلاع، خبر رسانی سب ایک عمل میں شامل ہیں۔ کوئی ایک معمولی سا واقعہ اور آپ ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ تین چار سال ہوئے (یاد رہے یہ اقتباس دسمبر ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا)۔ آپا نے مشین پر سلائی کرتے ہوئے یوں ہی باتوں باتوں میں کہا، اپنے قصبے میں جاڑے آتے ہی ہم ہار سنگھار سے دوپٹے رنگتے تھے اور جب بسنت آتی تھی"۔

ان کی بچی نے جو چار سال کی عمر سے کراچی میں رہ رہی ہے۔ ایلوس پریسلے کی سوانح حیات سے سر اٹھا کر پوچھا "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"، اس ایک جملے کو سننے کے بعد میں نے آٹھ سو صفحات کا ناول لکھ مارا "اماں بسنت کیا ہوتی ہے؟"،

ساری دنیا، ساری کائنات کا تجزیہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ مگر تلاش کسی ایک نقطے سے تو شروع کی جا سکتی ہے۔" نقوش، دسمبر ۱۹۵۹ء

قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسا سانحہ رونما ہوتا ہے کہ ان کی تہذیب کے بنیادی محرکات اور پُ رانی اقدار میں شدید بحران کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کے انفرادی اور اجتماعی کردار میں حیرت انگیز تغیر رونما ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی سانحہ ہندوستان کی تحریک میں تقسیم وطن کی صورت میں رونما ہوا۔ جب ہم قرۃ العین حیدر کی تحریریں پڑھتے ہیں تو ہمیں اس امر کا شدید احساس ہوتا ہے کہ تقسیم اور آزادی کے مشترک تاریخی عمل نے اس بحرانی کیفیت کو کتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ اس کے رد عمل اور نتائج کی بازگشت آج تک سنائی دے رہی ہے۔ سیاست اس دور کے اہم محرکات میں ایک اہم عنصر رہی ہے گو کہ ان کی تحریروں میں اس کی براہ راست عکاسی کم ہی نظر آتی ہے لیکن پوری روداد اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ کس طرح اس نے مذہب، سماج اور تہذیب پر حاوی ہو کر ایسی پُر انتشار کیفیت کو جنم دیا ہے جس کے باعث نئی نسل کی ذہنی فضا یکسر بدل گئی ہے۔ اس ذہنی فضا کے پردہ میں کتنے ہی کردار ہیں مختلف، انفرادی الگ الگ اور ایک دوسرے سے منسلک بھی۔ جو ان کے افسانوں اور ناولوں میں زندگی کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ایسے کتنے ہی منفرد کرداروں سے اپنے قارئین کو روشناس کرایا ہے جو تاریخ کے حادثات کا شکار ہو گئے ہیں اور کچھ ایسے بھی کردار ہیں جو تاریخ کے دھارے کی سمت بدلنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ایک ہی افسانوی مجموعہ "پت جھڑ کی آواز" کو سامنے رکھیے تو سائمن، فقیرا، ڈائنا روز، کارمن، کنول کماری، کشوری، تنویر فاطمہ، آفتاب رائے، اقبال بخت سکینہ، مس سلمیٰ مرزا، جمشید، ثریا جبیں، سلمان بھائی سے آپ کی ملاقات ہو گی۔ اپنے ارد گرد کے ماحول سے ٹوٹ کر گر جانا، اپنی آرزوؤں کو پامال ہوتے دیکھنا اور اپنے تصورات اور خوابوں اور آدرشوں کی دنیا سے الگ ہو جانا، اپنے وطن سے جلاوطن ہو جانا جس تنہائی، جس اجنبی پن، جس خود علاحدگی ALIENATION اور دہشت کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات میں اس کی المناک روداد ملتی ہے۔ ان کے ایک افسانے "جلاوطن" میں کنول کماری تنہائی کے آخری نقطے پر پہنچ کر کہتی ہے۔

"باہر اندھیرا تھا اور سردی اور بے کراں خاموشی، میں زندہ ہوں لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی و ابدی پچھتاوے کا ویرانہ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی زندگی ہو سکتی ہے اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ اب میں اپنے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی۔"

ایسے کردار انسانی روح کی پہنائیوں، دل کے تاریک نہاں خانوں اور ذہن کی تہوں میں ڈوب کر اور انھیں اپنے حرکت پذیر ماحول اور اپنی ذہنیت سے ہم آہنگ کیے بغیر تخلیق نہیں ہو سکتے لیکن ان کی تخلیقات میں تنہائی اور دہشت اور جلاوطنی کی اس وادی میں سب سے سرخرو ہو کر گزر جانے کی امید ختم نہیں ہوتی۔

ایک اقتباس:

ہے۔ انھوں نے سوچا لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں اور ہمارے چاروں طرف لاکھوں، کروڑوں انسانوں کا ہجوم۔ یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں لیکن دیکھو یہ راستے پر جھیلیں۔ یہ باغات ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو بیکلخت ہمارے سامنے آگئی لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد ہے۔ اسے محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔"

ایک اور اقتباس:

پرانے عہدہ سے منسوخ ہوئے، کشوری نے آہستہ سے دہرایا ہم اس طرح سے زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو مرنے نہیں دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہوگی۔ آج کی صبح ہے مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی تخلیق ہے لیکن کنول کماری تم اب بھی رو رہی ہو ــــ

خوش آیند مستقبل کے تمام تر خوابوں کے باوجود جب تک ہم اپنے دماغوں میں محصور رہ جانے پر مجبور رہیں گے۔ کنول کماری ابد تک روتی رہے گی۔ ہم سب اپنے ماحول، اپنے ماضی، اپنے تہذیبی ورثے اور یادوں اور قومی شعور کے پالے ہوئے ہیں۔ ہمارا کردار اور ہماری شخصیت ایک منجمد جامد ٹھہرا ہوا نقطہ یا لمحہ نہیں بلکہ مسلسل بہتی ہوئی دھارا ہے۔ اس لیے ہم ازلی اور ابدی ہیں۔ ڈستی ہوئی یادو ناآسودہ حسرتوں، ناکام تمناؤں، شکستہ آرزوؤں پامال امیدوں کے مرگھٹ، شعور اور لاشعور کے راستے، ذاتی محرومیوں اور اجتماعی شکست و ریخت کے مرقد۔ آگ کا دریا سے گزرتے ہوئے، آنسوؤں کی وادی میں اترتے ہوئے۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات سے گزرتے ہوئے ہم ایسی ہی فکر کے روبرو ہوتے ہیں۔ یہ تخلیقات ہندستانی کلچر کی نمو پاتی ہوئی اس قوت کو پیش کرتی ہیں جس میں مختلف نسلوں، مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کی روح جذب ہوتی چلی گئی ہے۔ نسلی اور اجتماعی لاشعور، مشترک تہذیب اور کردار کے تہہ در تہہ عناصر میں انتشار کی کیفیت کی ترجمانی کرنے کے باعث ان کی تحریریں ہمارے عہد کی اہم دستاویز بن گئی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ان مسائل پر ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے جس نے تاریخی شعور کے تحت سماجی محرکات اور عمل کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور یہی فکر و آگہی وہ اپنے قارئین تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے تلاش کا جو سفر شروع کیا ہے وہ ہزار شکستوں، رکاوٹوں اور المیوں کے باوجود زندگی کی جانب مڑتا ہے اور زندگی کے اس طویل سفر میں جس سفر کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتی ہیں وہ ہے ویژن ــ میں یہ مضمون ان کے اس تصور پر ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ یہی ان کا فلسفہ ہے۔ وہ کہتی ہیں،

"آخر کار وہ خوبصورت ویژن دکھلائی پڑتا ہے۔ ارے تم کدھر نکل آئے۔ زندگی کی طرف واپس جاؤ۔ انقلاب اور موت کی تند رو آندھیوں کے سامنے زرد کمزور پتوں کی طرح بھاگتے ہوئے انسان۔ ہماری طرف واپس لوٹو۔ اس ویژن کی طرف۔"

اختر وامق
۶-۱ ار بی، عیدگاہ ہلز، بھوپال



بچھڑ کے شاخ سے وہ گل جہاں کہیں ہوگا
مجھے یقیں ہے بہاروں کا ہم نشیں ہوگا

اُسے گئے تو زمانہ گزر گیا لیکن
ابھی بھی لگتا ہے جیسے یہیں کہیں ہوگا

نہ تیرا عکس نہ سایہ نہ ہی شبیہہ تیری
یہ دل کسی بھی بہانے سے خوش نہیں ہوگا

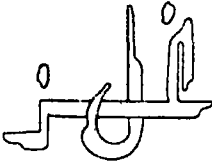
جو میرے ذہن کو چھولے میرا بدن پڑھ لے
وہی تو روح میں اترے گا دل نشیں ہوگا

وہ بے ضمیر منافق ہے خود غرض ہے اُسے
کسی بھی درد کے رشتے پہ کیا یقیں ہوگا

جو ہو سکے تو خود اپنا محاسبہ کر لو
میرے کہے پہ بھلا تم کو کیا یقیں ہوگا

محبتوں کا تناور درخت بھی وامق
گرے گا سوکھ کے اک دن تہِ زمیں ہوگا

احمد کمال حشمی
ایچ ۲۸ بی۔ ایل نمبر ۲، نیا بازار، کانکی نارا، ویسٹ بنگال



میں سنگ ہوں کہ گہر ہوں چلے پتا مجھ کو
اُٹھا کے رکھ لے یا رستے سے دے ہٹا مجھ کو

یہ ساری دنیا تو کہتی ہے بے وفا مجھ کو
بتا سمجھتا ہے ایسا ہی تو بھی کیا مجھ کو

سکون و چین سے رہنے کہیں نہیں دیتی
تمھاری یادوں کی یہ تیز تر ہوا مجھ کو

اُجالے چاند بھی دیتا تو ہے مگر پھر بھی
بہت عزیز ہے ننھا سا اک دیا مجھ کو

کسی کے واسطے یہ زندگی غزل ہوگی
مری حیات تو لگتی ہے مرثیہ مجھ کو

قسم خدا کی میں اس کا غلام ہو جاتا
خلوص سے وہ اگر مجھ سے مانگتا مجھ کو

حیات اپنی غزل کی طرح حسیں ہوگی
ردیف بن کے بنا لینا قافیہ مجھ کو

عمران ابن عرشی
۱۶ جولا پاڑہ مسجد لین، ہوڑہ ۷۱۱۱۰۱

غزل

میرے خوابوں میں کون آیا ہے
دل کا ہر تار تھرتھرایا ہے

کیا میرے ذہن میں سمایا ہے
اک نیا انقلاب آیا ہے

کاش بوندیں زمین تک اُتریں
آسماں پہ تو اَبر چھایا ہے

سوچ کا میں وہی مسافر ہوں
جس نے خود راستہ بنایا ہے

ریگ زارِ حیات میں ہر سو
تیرے غم کا لطیف سایہ ہے

سارا گلشن سُلگ اُٹھا عمرانؔ
کس نے وحشت کو ورغلایا ہے

قاصر مجیبی
عنایت کالونی، کٹھوکر تالاب، گیا ۸۲۳۰۰۱

غزل

شوخیوں کے ساتھ ہے ہر جلوہ سامانی کا رُخ
پھیرنا لازم ہے اب تصویرِ حیرانی کا رُخ

چھوٹ جاتی ہے دُرِ یکتا کی سیپی ہاتھ سے
عین ساحل کی طرف ہوتا ہے طغیانی کا رُخ

شُعلۂ جاں دامنِ ہستی سے اُوپر آگیا
سوچنا ہے کس طرح بدلیں ہوا پانی کا رُخ

چاہتوں کو پھر توانائی ملے تو کس طرح
ہر نئے انداز میں ہے دشمنِ جانی کا رُخ

شہر کے اونچے درختوں سے لپٹنا چھوڑ کر
ہے یہی بہتر کریں اب کوئے ویرانی کا رُخ

ڈاکٹر اسلام عشرت
صدر شعبۂ اردو، بی۔ ایس۔ کالج، دانا پور

اقبال کی شاعری میں منظریہ جہات

سر علامہ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت اور ان کا فن بھی مرزا غالب کی طرح بے حد وسیع و ہمہ گیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے مختلف النوع پہلو ہیں۔ مثلاً کسی نے ان کی غزل گوئی پر تفصیلی بحث کی ہے کسی نے ان کی شاعری میں فکر و خیال کی بلندیوں کو تسلیم کیا ہے۔ کسی نے ان کی شاعری میں جذبہ حب الوطنی کو تلاش کیا ہے اور کسی نے انھیں دنیا کا ایک عظیم مفکر اور اسلامی شاعر قرار دیا۔ گویا ان کی شخصیت و شاعری کے بہت سے گوشے ابھی تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ پھر بھی علامہ اقبال ایک ایسے عظیم فنکار ہیں جن پر مختلف جہتوں سے کام کرنے کی گنجائش باقی ہے۔ لہٰذا اسی نسبت سے ہم نے ان کی شاعری کے منظری پہلو کا انتخاب کیا ہے کیوں کہ ان کی شاعری کا یہ ایک ایسا اہم عنصر ہے جس پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہاں پر میں یہ بات واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کا مقصد یہ ہے کہ ناقدین حضرات اس جانب متوجہ ہوں۔ گویا میں اہل فکر و نظر اور نقادانِ فن کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہوں۔

یوں تو اردو شاعری میں منظر نگاری کی ابتدا باضابطہ طور پر دور جدید میں ہوئی لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ قدیم ادوار میں منظر نگاری کی طرف توجہ ہی نہیں دی گئی۔ البتہ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ عہد گذشتہ میں مناظر فطرت کو محض ذاتی طور پر پیش کرنے کا رواج تھا یعنی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور شعوری طور پر ایسی کوششیں گذشتہ ادوار میں نظر نہیں آتی ہیں۔ اسی لیے اس قسم کے نمونے صرف قدیم مثنویوں میں ملتے ہیں۔

بہر کیف، دور جدید میں نظموں میں مناظر فطرت و قدرت کی عکاسی ایک شعوری کاوش کا نتیجہ ہے اور اس کے آغاز کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔ چناں چہ اس عہد کے اردو شعرا نے بھی انگریز منظر نگار شعرا کے طرز پر بعض نظمیں لکھیں اور اس لحاظ سے ہم اقبال کو دور جدید کے اہم و ممتاز منظر نگار شعرا کی صف میں شمار کر سکتے ہیں۔ منظر نگاری ایک اہم ترین صنف سخن و فن ہے جس میں تشبیہوں و استعاروں کی جادوگری ہوتی ہے۔ یعنی تمام باتیں اشارے و کنائے میں کہی جاتی ہیں اور اس میں شاعر کوئی خاص پیغام دینے کی بجائے عموماً اپنی وسعتِ نظر کا کمال

علامہ اقبال نے محض قومی وملّی شاعری ہی نہیں کی بلکہ انھوں نے منظر کشی، جذبات نگاری و معنی آفرینی کے اعتبار سے بھی اپنی شاعری میں چار چاند لگائے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے فکر کو شعریت بخشی اور خیال کو تصور قرار دیا۔ اقبال کی منظری نظموں کو ہم گنگا جمنی کہہ سکتے ہیں، کیوں اقبال اتنی دلکش اور پیاری زبان استعمال کرتے ہیں، جس کی شیرینیت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اقبال اپنے آرٹ وفن کے ذریعہ فطرت سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں اور اپنے گرم نفس سے زندگی کی تیز و تند لہر اس میں دوڑا دیتے ہیں۔ اقبال اتنے بڑے فنکار ہیں کہ وہ فطرت کی سرگوشیاں بھی سن لیتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیجیے کہ اقبال اپنے جذبات کو فطرت پر طاری کر دیتے ہیں۔ فطرت کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ فطرت اس وقت تک حسن سے بے بہرہ رہتی ہے جب تک کہ انسانی نگاہ اور دل اس میں جمال آفرینی نہ کرے۔ اقبال کے متعلق اگر ہم یہ کہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز ہی منظر نگاری سے کیا ہے تو یہ بیجا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان کی سب سے پہلی نظم "ہمالہ" ہے اور اس نظم میں انھوں نے منظر نگاری کا جو اعلا کمال دکھایا ہے، اس سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ دراصل اقبال کو منظر نگاری میں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ ہمالہ کو موضوع بنا کر اقبال نے ہندستان کے مناظر سے اپنے دلی لگاؤ کا اظہار انتہائی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ وہ الفاظ کے زیر و بم سے فطرت کی ایسی ہو بہو تصویر کھینچ دیتا ہے جسے دیکھ کر اقبال کی منظر کشی پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ اردو کے مشہور و ممتاز ناقد ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی "ہمالہ" کو منظر کشی کے لحاظ سے ایک عمدہ و کامیاب نظم بتلایا ہے، یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل ہے اور مسدس کی شکل میں ہے۔ یہ نظم فطرت کی سچی تصویر کشی کرتی ہے۔ مثلاً:

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

علامہ اقبال کی ایک نظم "ابرِ کوہسار" ہے۔ یہ نظم ان کی شاعری کے پہلے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نظم میں چار بند ہیں۔ یہ نظم مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔ اس میں منظری شاعری کا پورا پورا لطف ملتا ہے۔ گویا منظر نگاری کے لحاظ سے یہ نظم ایک عمدہ کامیاب اور لائق مطالعہ ہے۔ یوں تو اس نظم میں منظر نگاری اور فطرت کشی کے بے نظیر نمونے تقریباً تمام بند میں ملتے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ بند ملاحظہ ہو:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا ابرِ کوہسار ہوں، گل پاش ہے دامن میرا

کبھی صحرا، کبھی گلزار ہے مسکن میرا شہر و ویرانہ مرا، بحر مرا، بن میرا
کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

اس نظم میں پہاڑی بادلوں کو آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ اس نظم میں ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ زورِ بیان کے ساتھ ساتھ لطفِ زبان بھی یہاں موجود ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے شاعر نباضِ فطرت اور عکاسِ حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار مصورانہ کیفیت کے عمدہ نمونے ہیں۔

بن کے گیسو رخِ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں بالیاں نہر کو گرداب کی پہناتا ہوں
سبزۂ مزرعِ نوخیز کی امید ہوں میں زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

اقبال کی ایک مختصر سی نظم "ماہِ نو" ہے۔ یہ مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہوئی بے حد حسین و دلکش نظم ہے۔ یہ مختصر ہوتے ہوئے بھی منظری نظموں میں ایک اہم و بے مثال نظم ہے۔ اس میں فطرت اور انسان دونوں کی نقاب کشائی مؤثر انداز میں کی گئی ہے۔ اردو کے ممتاز و منفرد نقاد ڈاکٹر اختر اورینوی نے اس نظم پر اپنی رائے یوں دی ہے۔ "ماہِ نو" ایک آئینہ ہے جس میں شاعر اپنا چہرہ دیکھتا ہے۔ جتنی تشبیہیں ہیں، نادر ہیں اور اندازِ بیان نہایت شاعرانہ ہیں۔" چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

اقبال کی ایک نظم "جگنو" ہے، بظاہر یہ نظم بہت معمولی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے کیوں کہ اس نظم کی شروعات ہی منظر کشی سے ہوتی ہے اور اس اعتبار سے ہم اس کو منظر نگاری کا ایک ارفع و اعلا تحفہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اچھوتی تشبیہیں اور نادر استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا! ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں؛
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں!

"بانگ درا" میں ایک نظم "گورستانِ شاہی" کے عنوان سے ملتی ہے۔ یہ نظم بھی مصوری، منظر کشی، نغمگی، شعریت اور رسنگیت کے لحاظ سے ایک کامیاب، عمدہ اور انفرادیت کی حامل ہے۔

یہ نظم قارئینِ کرام پر بڑا گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج ہیں:

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

علامہ اقبال کے یہاں ایک خاص خوبی یہ پائی جاتی ہے کہ بعض دفعہ وہ ایسا دلکش و حسین منظر پیش کرتے ہیں کہ ہماری آنکھوں کے سامنے فضا میں سماں بندھ جاتا ہے اور وہی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے جس کی وہ فضا حامل ہوتی ہے۔ چناں چہ مثال کے لیے محض اقبال کی ایک ہی نظم "ایک شام" کو لے لیجیے۔ اس نظم میں سکون و سکوت کی کتنی جاندار اور کیسی پُر اثر تصویر کھینچی ہے۔ ملاحظہ ہو:

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں سب کے سو گئی ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا

اقبال کی ایک نظم "بزم انجم" ہے۔ اس نظم کے متعلق اردو کے مشہور و ممتاز ناقد ڈاکٹر اختر اورینوی ایک مقام پر بالکل درست کہتے ہیں کہ "اس نظم کے ابتدائی تین اشعار میں پُر اثر منظر کشی کی گئی ہے، نادر اور تازہ کار ــــــ اس کی تصویریت اور متحرک مصوری ملاحظہ کیجیے۔ الفاظ سے صناعانہ قلم بندی کی گئی ہے۔"

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو — طشتِ اُفق سے لے کر لالے کے پھول مارے
حُسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں — جس طرح عکسِ گُل ہو شبنم کی آرسی میں
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور — قدرت نے اپنے گہنے سونے کے سب اُتارے

اقبال نے فطرت کی تصویر کشی اور منظر نگاری کے میدان میں جہاں جہاں افتادِ طبع کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔ وہ ان میں ہر مقام پر کامیاب ہوئے ہیں اور اس میدانِ خاص میں اقبال اردو کے تقریباً تمام شعرا پر سبقت لے گئے ہیں۔ آئیے ہم اقبال کی نظروں سے کشمیر کا نظارہ کریں اور حظ اٹھائیں:

رخت بہ کاشمیر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

بادِ بہار موج موج مرغِ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج برسرِ نارون نگر

اقبال نے اپنی ایک نظم "ایک آرزو" میں فطرت کی معصوم رعنائیوں اور سکون بخش ...

کا نقشا انتہائی سادگی وسلاست سے بڑے ہی شاعرانہ انداز میں یوں کھینچا ہے:

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

اس نظم کی زبان نہایت نفیس، لطیف، فطری اور عمدہ ہے۔ یہ نظم سادگی و روانی کے اعتبار بے حد خوبصورت و دلکش ہے۔ اس کی مثال ملاحظہ ہو:

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

ذیل کے اشعار بھی لائق مطالعہ قابل قدر و قابل تعریف ہیں۔ دیکھیے ان شعروں میں کتنی صاف ستھری اور حقیقی تصویرکشی کی گئی ہے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

اقبال نے "انسان اور بزم قدرت" کے عنوان سے بھی ایک پُر اثر و معنی خیز نظم لکھی ہے۔ میں انھوں نے فطرت کی مصوری و نقاشی بے حد حسین و موثر انداز میں کی ہے، مثلاً:

سرخ پوشاک ہے پھولوں کی درختوں کی ہری
تیری محفل میں کوئی سبز کوئی لال پری

ہے ترے خیمۂ گردوں کی طلائی جھالر
بدلیاں لال سی آتی ہیں افق پر جو نظر

کیا بھلی لگتی ہے آنکھوں کو شفق کی لالی
مئے گلرنگ خم شام میں تو نے ڈالی

شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ اپنی گراں قدر تصنیف "اقبال، اس کی شاعری اور پیغام" میں اقبال نظر نگاری پر بحث کرتے ہوتے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہمارا دعویٰ ہے کہ قدرت کے اینٹ اور گارے سے جو شاندار قصر اقبال نے تعمیر کیے ہیں وہ تاریخ ادب میں صناعی کے نمونے ہیں۔ جنھیں زمانے کی بے مہری کھنڈرات میں تبدیل نہیں کر سکتی اور جو مرقع اس نے سجائے ہیں، ان پر مانی و بہزاد بھی جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ گویا اقبال نے مصوری کے وہ نمونے پیش کیے ہیں۔ جو صفحۂ روزگار سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔"

درج ذیل مثالوں سے مذکورہ بالا عبارت کی وضاحت مکمل طور پر ہو جائے گی۔

مطلع خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوت گاہ مینا میں شراب خوشگوار

(نمود صبح)

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہسار
(ساقی نامہ)

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
(کنارِ راوی)

گل و نرگس و سوسن و نسترن شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
(ساقی نامہ)

علامہ اقبال کی ایک بہت ہی مشہور فارسی نظم ہے، جس کا عنوان ہے "فصلِ بہار" اردو کے مشہور و ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین نے ایک مقام پر اس نظم کے متعلق جو رائے دی ہے، وہ قابلِ ذکر و قابلِ اتفاق ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ "اقبال نے اپنی نظم "فصلِ بہار" میں جادوگری سے ایسا سماں باندھا ہے کہ حقیقت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرچہ یہ نظم مختصر اور معمولی معلوم ہوتی ہے لیکن منظر نگاری اور تصویر کشی کے لحاظ سے یہ بہت ہی جاندار ہے۔" چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنم ہزار
طوطی و دراج و سار
بر طرفِ جوئبار
کشتِ گل و لالہ زار
چشمِ تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

اقبال کی ایک نظم "ہلالِ عید" ہے۔ اس نظم میں بھی منظر نگاری اور مصوری کے خالص اور بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ "ذوقِ نظارۂ جمال" اور "دیدۂ بینا" پیدا کرے کوئی۔ ذیل میں مثال کے طور پر چند اشعار درج ہیں:

شام تیری کیا ہے صبحِ عیش کی تمہید ہے تیری پیشانی پہ تحریر پیامِ عید ہے
اے مہِ نو! ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے سرگذشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے

علامہ اقبال کے کلام کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں فطرت کی تصویر کشی اپنے اصل روپ میں ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ وہ جس قسم کا سماں باندھنا چاہتے ہیں بڑی آسانی سے باندھ دیتے ہیں اور اس میں اصلیت کا پورا پورا دخل ہوتا ہے۔ یعنی منظر نگاری، مصوری اور فطرت کشی پر اقبال کو قدرت کاملہ حاصل ہے۔ مثلاً ان کی بے حد طویل اور مشہور انقلابی نظم "خضرِ راہ" ہے۔ اس نظم میں اقبال اپنی قوم کو ایک پیغام دینا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس پیغام کو قوم کے سامنے پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم کو اسے سننے کے لیے مکمل طور پر آمادہ کر لیا جائے۔ چناں چہ شاعر چاہتا ہے کہ ہر طرف ایک سکوت

عالم طاری ہو جائے تاکہ قوم اس پیغام کو بہ غور سن سکیں۔ اور اس پر عمل پیرا ہونے کی حتی الامکان کوشش کریں۔ دیکھیے ایسا ماحول اور اس قسم کی فضا پیدا کرنے کے لیے اقبال فطرت کے مناظر کی کتنی دل فریب و حسین عکاسی کرتے ہیں:

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر — گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا ہوا آسودہ دریا نرم سیر — تھی نظر حیران کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار — موج مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر — انجم کم ضو گرفتارِ طلسم ماہتاب

اسی طرح "جوابِ خضر" کے جواب کے ابتدائی حصے پر غور کیجیے تو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس میں بھی حقیقی، حسین، دلکش اور موثر نگاری و فطرت کشی کی گئی ہے:

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگام صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبریل

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل

یوں تو علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے تینوں ادوار میں فطرت کشی و منظر نگاری کے ارفع و اعلا اور بے نظیر نمونے پیش کیے ہیں۔ لیکن پہلے دور میں متحرک مصوری اور منظر کشی کی بہتات ملتی ہے۔ اقبال اپنے عہد کے تمام اردو شعرا سے فطرت کشی و منظر نگاری کے لحاظ سے بلند و بالا مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ گویا منظر کشی میں کوئی بھی ان کا ہم پلہ نہیں۔ البتہ یہ علاحدہ بات ہے کہ ان کے بعد کے شعرا نے منظر نگاری کی جانب خصوصی توجہ دی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بہرکیف گزشتہ صفحات کے دلائل و حوالوں کے پیش نظر اگر ہم اقبال کو انگریزی زبان کے مشہور و ممتاز شاعر ورڈس ورتھ (Wordsworth) کا ہم پلہ قرار دیں تو کسی کو چراغ پا ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اقبال بھی ورڈس ورتھ (Wordsworth) کی طرح فطرت کے حسین و دلکش سایے میں پناہ لیتا ہوا نظر آتا ہے اور اس اعتبار سے ہم علامہ اقبال کو "مصورِ فطرت" بھی کہہ سکتے ہیں۔

مانگے کا اُجالا

زورِ قلم یا ضعفِ قلم



خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے

پچھلے ہفتے ہم کالم نہیں لکھ سکے۔ ہم کراچی کے جس علاقے میں رہتے ہیں وہاں کئی دن تک گولیوں کی بارش ہوتی رہی۔ عام بارش ہوتی تو ہم ایک چھوڑ دو دو کالم لکھ سکتے تھے مگر گولیوں کی بارش میں وصیت تو لکھی جاسکتی ہے، کالم نہیں لکھا جاسکتا۔ اس ہفتے بھی قلم ہمارا ساتھ نہیں دے رہا کیوں کہ ہم ایک اہم مسئلے پر سوچ بچار کر رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کراچی کے حالات کی درستی کے لیے اربابِ اقتدار متعلقہ لوگوں سے تو مذاکرات نہیں کرتے مگر ادھر ادھر سے کچھ لوگوں کو بیگار میں پکڑ کر لے آتے ہیں، اور ان سے کراچی کے حالات پر گفتگو کرتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے سندھ کے نئے گورنر نے مشاعرے کے کچھ شاعروں کو گورنر ہاؤس میں طلب کیا اور ان سے کراچی کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ کیا۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ جو شاعر اپنی شاعری کے معیار کو بہتر بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ کراچی کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے کیا مشورہ دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایسا اہم مسئلہ زیرِ غور ہو تو کالم کیسے لکھا جاسکتا ہے۔ مسلسل غیر حاضری بھی اچھی نہیں لگتی، اس لیے ہم اپنا ایک غیر مطبوعہ دیباچہ شائع کر رہے ہیں جو مشہور ہندوستانی ادیب نارنگ ساقی کی کتاب "ادیبوں کے لطیفے" کے دوسرے اڈیشن کے لیے لکھا گیا ہے۔

ہم نے پاکستان کا کوئی شاعر یا نثر نگار ایسا نہیں دیکھا جو پینے پلانے اور دہلی جانے کا شوق رکھتا ہو اور نارنگ ساقی کی تعریف نہ کرتا ہو۔ بلکہ بعض شاعر تو دہلی جاتے ہی اس لیے ہیں کہ نارنگ ساقی کی میزبانی سے لطف اندوز ہوسکیں۔ اسی لیے تو کنور مہندر سنگھ بیدی کہا کرتے تھے کہ نارنگ ساقی نام ہی کے نہیں، کام کے بھی ساقی ہیں۔ اس کے برعکس ایک ہمارے ساقی فاروقی ہیں کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق صرف تخلص کے گناہ گار ہیں، ساقی گری کرتے بھی ہیں تو صرف اپنی۔ دوسروں کی تواضع شاعری سے کرتے ہیں جس سے مہمان نوازی کے آداب ہی کی نہیں، روزمرہ اخلاق کی بھی نفی ہوتی ہے۔ لیکن نارنگ ساقی کی اخلاقی حالت نسبتاً بہتر ہے جس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے ہاں پاکستانی شاعروں کی دعوت تھی، ایک شاعرِ خوش خصال حد سے زیادہ چڑھا جانے کے باوجود اس قدر ہوش میں رہے کہ چپکے سے میز سے ایک بوتل اٹھا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔ بوتل ڈھکنے کے بغیر تھی، اس لیے دخترِ رز

موصوف کے کوٹ سے باہر جھانکنے لگی، نارنگ ساقی سے اپنے معزز مہمان کے کپڑے آلودہ ہوتے نہ دیکھے گئے، انھوں نے نظر کائے محفل سے بچا کر موصوف کی خدمت میں بوتل کا ڈھکنا پیش کیا اور چپکے سے ان کے کان میں کہا: "اسے بھی میری طرف سے قبول فرمایئے۔" یہ واقعہ ہم تک ایک ضعیف راوی کے ذریعے پہنچا ہے، اگر درست نہ بھی ہو تو اسے درست ماننے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ نارنگ ساقی میز پر رکھی ہوئی بوتل کو ڈھکنے کے ساتھ اور کوٹ کی جیب میں دھانسی ہوئی بوتل کو ڈھکنے کے بغیر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

نارنگ ساقی کا نام ایسا ہے کہ خیال خود بخود ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ کسی غیر علمی اور غیر ساختیاتی تحریر کے لکھنے یا پڑھنے کے دوران ڈاکٹر صاحب کا خیال آنا سوءِ ادب ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے اگلی سطور میں ہم اپنے ممدوح کو صرف ساقی لکھیں گے۔ اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ اگر ممدوح کو ہماری کوئی بات پسند نہ آئے تو وہ اسے ساقی فاروقی کی طرف منتقل کر سکتے ہیں۔

ساقی کاروباری آدمی ہیں۔ ایسا آدمی ان اشغال سے اجتناب کرتا ہے جن سے کاروباری ساکھ خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ لیکن موصوف اپنے ادبی ذوق کے ہاتھوں مجبور ہونے کی وجہ سے اندیشہ ہائے دور دراز سے خاصے بے نیاز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاعروں کی بہت بڑی تعداد سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں۔ ظاہر ہے کہ بری صحبت کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے لیکن ساقی بڑی حد تک بُرے نتیجے سے محفوظ ہیں کیوں کہ وہ سورج غروب ہونے کے بعد ہی شاعروں سے ملتے ہیں۔ کاروباری اوقات میں وہ اپنی سخن فہمی اور سخن پروری کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد شعرائے کرام دوسروں کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت سے اس لیے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ اس وقت وہاں ہوتے ہیں جہاں سے انھیں اپنی خبر بھی نہیں آتی۔

بُرے نتیجے سے کسی حد تک محفوظ ہونے کی بات ہم نے اس لیے کہی ہے کہ اگر ساقی "کلیتاً" محفوظ رہتے تو وہ زیر نظر کتاب کے مرتب یا مولف نہ بنتے اور ہم بھی دیباچہ لکھنے کی شقت سے محفوظ رہتے۔ "مشقت" کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ کسی کتاب پر دیباچہ لکھنا، اس کتاب کے لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہمارے اس جملے کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ کتاب لکھنا بھی مشکل کام ہے۔ اگر یہ کام مشکل ہوتا تو ڈاکٹر عبادت بریلوی ۸۵ کتابوں کے اور ڈاکٹر محمد حسن ۴۲ کتابوں کے مصنف نہ ہوتے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۹۲ء کے آخر تک کے ہیں۔ پچھلے ڈھائی برسوں میں ان دونوں بزرگوں کی تصانیف میں جو اضافہ ہوا ہے، اس سے ہم لاعلم ہیں۔ ایسی ہی باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ لاعلمی بھی ایک نعمت ہے۔

کسی کتاب پر دیباچہ لکھنا کیوں مشکل ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا بھی بہت مشکل ہے۔ چونکہ اس وقت ہم ایک کتاب پر دیباچہ لکھ رہے ہیں اس لیے یہ اچھا نہیں لگتا کہ کتاب اور صاحب کتاب کی مدح کی بجائے غیر متعلق مباحث پر زورِ قلم صرف کیا جائے اور اس کے بعد جو کچھ لکھا جائے وہ ضعف قلم کا آئینہ دار ہے۔

ضعفِ قلم کا ذکر آیا ہے تو ایک جملۂ معترضہ عرض کیے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ ڈاکٹر خلیق انجم ہمارے دیرینہ کرم فرما ہیں اور ساقی سے بھی ان کے گہرے مراسم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہی نے ہمیں زیر نظر کتاب پر دیباچہ لکھنے کا حکم دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خط لکھ کر ہماری عزت افزائی تو کی ہے، لیکن خط میں جو کچھ لکھا

ہے اس سے جو تھوڑی بہت عزت رہ گئی ہے، اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ لاحق ہوگیا ہے۔ انھوں نے فرمایا، اگر آپ نے دیباچہ نہ لکھا تو میں خود لکھ کر آپ کے نام سے کتاب میں شامل کر دوں گا۔ یہ دھمکی ایسی نہیں تھی کہ ہم پریشان نہ ہوتے۔ ہم نے سوچا اگر ڈاکٹر صاحب نے ہمارے نام سے بھی ویسی ہی کوئی تحریر لکھ دی جیسی تحریریں وہ عموماً اپنے نام سے چھپواتے رہتے ہیں تو پھر ہم کسی کو منہ دکھانے کے تو کیا، آئینہ دیکھنے کے بھی لائق نہ رہیں گے۔ لہٰذا ہم دیباچہ لکھنے پر فوراً آمادہ ہوگئے۔ (بہرحال ضعفِ قلم سے متعلق جملۂ معترضہ ختم ہوتا ہے۔)

ادیبوں کے درمیان رہ کر ساقی نے جو مضحکہ خیز صورت حال دیکھی، اس سے انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ ادیبوں کے لطیفے یک جا کر دیے جائیں۔ پہلے تو انھوں نے وہ لطیفے جمع کیے جو ان کے "چشم دید" اور "گوش شنید" تھے اور پھر کتابوں کی ورق گردانی کر کے بہت سے لطیفوں کا سراغ لگایا۔ اگر ساقی کا کتابوں کی ورق گردانی کرنا بجائے خود ایک لطیفہ نہیں ہے تو ہم بلا خوفِ تردید عرض کریں گے کہ اردو میں پہلی مرتبہ اتنے بہت سے لطیفے کسی کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ گو اردو کی بیشتر کتابیں لطائف ہی کے مجموعے ہوتی ہیں لیکن ان غیر شعوری کوششوں کے مقابلے میں ساقی کی شعوری کوشش اس لیے امتیازی حیثیت رکھتی ہے کہ اسے پڑھنے کے دوران قاری ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ کچھ دیر کے لیے زندگی کے غموں سے نجات حاصل کرلیتا ہے۔ جبکہ اردو کی عام کتابوں کو پڑھنے کے دوران خود زندگی ہی سے نجات حاصل کرنے کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل اسی فیصد لطیفے ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ کچھ ہنسی لطیفوں پر آتی ہے اور کچھ ان کے کرداروں پر جن کے جملے بازیوں سے یہ لطیفے وجود میں آئے ہیں۔ باقی بیس فیصد لطیفے ایسے ہیں ان پر ہنسنے کے لیے تنخواہ دار مصاحب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ آدمی بلاوجہ نہیں ہنس سکتا۔ اگر کام کا معاوضہ ملے گا تو وہ ضرور محنت کرے گا یعنی ہنسے گا۔ ساقی کے وسائل ایسے ہیں کہ وہ تنخواہ دار مصاحب رکھ سکتے ہیں۔ ہما شما کے لیے یہ ممکن نہیں۔

ہما شما کی مشکلات کا احساس کرتے ہوئے ساقی نے کتاب کے دوسرے اڈیشن سے یہ بیس فی صد لطیفے خارج کر دیے اور ان کی جگہ نئے لطیفے شامل کیے ہیں۔ گویا نیا اڈیشن طباعت کے اعتبار ہی سے نہیں لطیفوں کے اعتبار سے بھی نیا ہے۔ اگر کتاب کے آیندہ اڈیشنوں میں بھی اسی طرح کمی وبیشی ہوتی رہی تو پانچویں اڈیشن میں کوئی ایسا لطیفہ شامل نہیں ہوگا۔ جو پہلے چار اڈیشنوں میں آچکا ہو۔ کاش جناب مرتب دوسرے اڈیشن کی بجائے پانچواں اڈیشن پہلے شائع کردیتے تاکہ ایک بالکل نئی کتاب پڑھنے کو مل جاتی۔

ساقی نے یہ کتاب مرتب کر کے نہایت مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔ بظاہر یہ لطیفوں کی کتاب ہے لیکن فی الحقیقت یہ ایک کتابِ حوالہ ہے جس سے ہمارے ادبی مورخین ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساقی نے ہماری ادبی تاریخ کے مستند اور مستقل ماخذ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے کیوں کہ اس کتاب میں زمانۂ حال کے جن ادیبوں کا ذکر ہے، ان میں سے بیشتر ادبی کاوشوں کی وجہ سے نہیں، اپنے لطیفوں کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔ محمد حسین آزاد اس راز سے واقف تھے، انھیں جن ادیبوں کو زندہ رکھنا مقصود تھا، ان کے حالات لطیفوں کی ہی صورت میں "آبِ حیات" میں بیان کیے ہیں۔ اس کے

برعکس ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب میں لطیفہ گوئی سے اجتناب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی تاریخ میں وہ خود تو زندہ رہ جائیں گے لیکن ان لوگوں کے زندہ رہ جانے میں شک ہے جن کا تذکرہ انھوں نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ باتصویر ہے۔ کتاب کے ۳۸ باب ہیں۔ ہر باب کسی نہ کسی ادیب سے منسوب ہے جس کی تصویر عنوان کے ساتھ آویزاں کی گئی ہے۔ بعض تصویریں اتنی پرکشش ہیں کہ انھیں دیکھ کر ان سے متعلق ابواب کے لطیفوں کی تعداد میں خود بخود ایک کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر ہماری بات مبہم نظر آئے تو اس کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ سن لیجیے۔ اردو کے بلند مرتبہ نقاد اور افسانہ نگار محمد حسن عسکری کو فوٹو گرافی سے بھی دلچسپی تھی۔ سلیم احمد مرحوم اور انتظار حسین کی تصویریں شائع ہوتی رہتی ہیں، ان میں سے بہترین عسکری صاحب ہی کی کھینچی ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ استاد اختر انصاری اکبرآبادی مرحوم نے عسکری صاحب سے فرمایش کی کہ وہ ان کی تصویر کھینچ دیں۔ عسکری صاحب ٹالنے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے کیوں کہ مرحوم کسی کی تصویر کھینچنے یا کسی پر تنقیدی مضمون لکھنے کے لیے ایک خاص معیار پیش نظر رکھتے تھے۔ استاد نے اصرار کیا تو عسکری صاحب راضی ہو گئے۔ استاد نے کیمرے کے سامنے بیٹھتے ہی مسکرانا بلکہ ہنسنا شروع کر دیا تاکہ ان کی تصویر خندۂ دنداں نما کی حامل ہو۔ عسکری صاحب نے کہا: "حضرت! آپ ناحق ہنس رہے ہیں۔ ہنسنا ان کا حق ہے جو آپ کی تصویر دیکھیں گے....."

تصویروں ہی کے ضمن میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کتاب کے شروع میں تقریباً تین درجن تصویروں کا البم بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ تصویریں خود مرتب کتاب کی ہیں جو انھوں نے مختلف ادیبوں کے ساتھ کھینچوائی ہیں۔ ادیب تو جیسے ہیں ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں لیکن ساقی ہر تصویر میں ایک نئے انداز سے نظر آتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لطیفے جمع کرنے کے لیے انھیں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں!

ساقی نے "اپنی بات" کے عنوان سے کتاب کا جو دیباچہ لکھا ہے وہ خاصا سنجیدہ بلکہ یوں کہیے کہ عالمانہ ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ بتایا کہ لطیفہ کیا ہوتا ہے اور کس طرح وجود میں آتا ہے، بلکہ یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ عربی، فارسی اور اردو میں ادبی لطیفے جمع کرنے کا کام کس کس نے کیا اور کون کون سی کتابیں وجود میں آئیں۔ عربی فارسی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر تبصرہ کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کرنے کی گنجایش موجود ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو کتابوں کی حد تک ساقی نے انھیں شاعروں سے رہنمائی حاصل کی ہے جن سے ان کے مراسم ہیں۔ غالب نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جن سے خستگی کی داد طلب کی تھی، وہ غالب سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم تھے۔

افسوس کہ استاد لاغر مراد آبادی کراچی میں ہیں اور ساقی دہلی میں۔ اگر ساقی استاد سے رابطہ کرتے تو وہ انھیں بتاتے کہ اردو میں ادبی لطیفوں کی پہلی کتاب "بزم خیال" ہے جو صفدر مرزاپوری نے لکھی تھی۔ یہ موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ دوسری اور بہترین کتاب "انتخاب نادرہ" ہے جو منشی دیبی پرشاد بشاش کی تصنیف ہے۔ یہ دوسری دہائی میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے چھپی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں مفتی ولی اللہ ایبٹ آبادی کی کتاب "نمکدانِ فصاحت" لاہور سے اور مفتی انتظام اللہ شہابی کی "لطائف الشعراء" تقسیم ہند سے کچھ پہلے دہلی سے چھپی تھی۔ ساقی جب اپنی کتاب کا تیسرا اڈیشن شائع کریں تو ان چاروں کتابوں کو بھی دیکھ لیں۔ ان میں انھیں بہت سے اچھے لطیفے مل جائیں گے۔ لطیفے نہ بھی ملیں، اس بہانے کچھ کتابیں تو ان کی نظر سے گزر جائیں گی!

نامی انصاری
۲۹۵/۹ نالہ روڈ، چمن گنج، کانپور

شاعری کی ناقدری

۱۔ پروفیسر گیان چند جین کا اعلان "مجھے شعری مجموعوں سے بچاؤ"
" اکیڈمیوں کی مالی امداد کے طفیل 'اردو میں وہ کتابیں بھی اشاعت کا منہ دیکھ لیتی ہیں جنہیں امداد کے بغیر پردۂ غیب میں ہی رہنا ہوتا۔
اشاعت کے بعد کتابوں کی نکاسی کی اوگھٹ گھاٹی سامنے آتی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی کتابیں تو درسگاہوں کی لائبریریاں اور شاذ طلبہ خرید لیتے ہیں لیکن شعری مجموعوں کا کیا ہو! یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں شعراء کی تعداد نثر نگاروں سے زیادہ ہے اور اردو کی جملہ ادبی کتابوں میں شعری مجموعوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ شاعر، سامع یا قاری کے لیے ترستا ہے خریدار نہیں ملتا تو اپنی عمر بھر کی کمائی تحفتاً ہی اہل الرائے کو تفویض کر دیتا ہے۔ اور اس کی بہا میں نثری داد کا طالب ہوتا ہے۔
میں کسی طرح معاصر ادب کا نقاد نہیں ہوں لیکن میرے پاس شعری مجموعے جس کثیر تعداد میں آتے ہیں۔ ان سے میں سراسیمہ ہو گیا ہوں۔ اگر مجھ بے بصیرت کا یہ حال ہے تو جو حضرات اردو کے نامور مبصر اور دیدہ ور نقاد ہیں، ان کے یہاں تو شعری مجموعوں کی ایسی باڑھ آتی ہوگی کہ گھر میں ان کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ ہی نہ بچتی ہوگی۔"
(ہماری زبان دہلی، بابتہ ۱۵ فروری ۱۹۸۷ء۔ صفحہ ۴)

۲۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کہیں لکھا تھا کہ خراب کتابوں سے ان کے یہاں دو تین الماریاں بھری ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان کا کیا کریں۔ فی الوقت مجھے ان کی تحریر دستیاب نہیں اس لیے حوالہ دینے سے قاصر ہوں۔

۳۔ مدیر ماہنامہ آج کل۔ دہلی کے اعلانات۔
ا۔ " براہ مہربانی شعری تخلیقات تا اطلاع ثانی بالکل نہ بھیجیں۔ اس اعلان کے بعد ملنے والی شعری تخلیقات کے سلسلے میں دفتر سے کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔" (ماہنامہ آج کل دہلی۔ بابتہ فروری ۱۹۹۵ء۔ صفحہ ۲۱)
ب۔ " ہمارے پاس شعری تخلیقات کا انبار جمع ہے۔ براہ مہربانی تا اعلان ثانی اپنی تخلیقات نہ روانہ کریں۔" (ماہنامہ آج کل دہلی۔ بابتہ مارچ ۱۹۹۵ء۔ صفحہ ۲۱)

۴۔ "یہ بھی ہے کہ ۹۹ فیصد کتابیں شائع ہونے والی کتابیں عام طور سے شاعری سے متعلق ہوتی ہیں۔ اس دفتر میں سال میں تبصرے کے لیے اوسطاً بارہ سو کتابیں موصول ہوتی ہیں۔ اس میں سے گیارہ سو سے زیادہ کتابیں شعری مجموعے ہوتے ہیں جنہیں اصرار کرنے پر بھی نہ کوئی پڑھنے کے لیے تیار ہوتا ہے، نہ کوئی تحفتاً لینے کو۔ کہاں رکھی جائیں

یہ کتابیں اور کیسے ان پر تبصرہ ہو، یہ آج کے ہر اردو رسالے کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔"

(اداریہ۔ ماہنامہ آج کل اردو۔ فروری ۱۹۹۵ء صفحہ ۲)

ماہنامہ کتاب نما دہلی کے ہر شمارے کے دوسرے صفحہ پر گزشتہ ماہ شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست چھپتی ہے۔ جنوری، فروری اور مارچ میں شائع شدہ فہرست کے مطابق، اس دوران اردو کی ۷۷ کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں شعری مجموعوں کی تعداد ۱۲ ہے۔ اس طرح شعری مجموعوں کی اشاعت کل کتابوں کی صرف ۱۶ فیصد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ فہرستیں مکمل نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اردو کی کتابیں شائع ہوئی ہوں گی لیکن مکمل اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں کتاب نما کے فراہم کردہ اعداد و شمار کو بنیاد مان کر یہ کہنا ممکن ہے کہ اردو میں شائع ہونے والی کتابوں کا ۹۰ فیصد حصہ شعری مجموعوں پر مشتمل نہیں ہوتا جیسا کہ مدیر آج کل کا اندازہ ہے۔ تاہم اس بات سے مجھے بھی انکار نہیں کہ شعری مجموعوں کی کثرتِ اشاعت ہی کی بنا پر، ان کی قدر و قیمت اتنی گھٹ گئی ہے کہ مدیران اخبارات و رسائل، کتب فروش اور لائبریریاں سب ان کو لینے خریدنے اور رکھنے سے انکار کر دیتے ہیں اور شاعر اپنا مجموعہ کلام چھپوا کر صاحب کتاب تو بن جاتا ہے مگر یہ کتابیں اس کے گھر میں یا تو دیمک کی نذر ہو جاتی ہیں یا گھر والے شاعر سے چھپا کر ردی میں بیچ دیتے ہیں۔ راقم الحروف نے بچشم خود اپنے شہر کے ایک سربرآوردہ شاعر کا مجموعہ کلام کباڑی مارکیٹ میں زمین پر دیگر کباڑ کی چیزوں کے ساتھ پڑے ہوئے دیکھا ہے اور عبرت حاصل کی ہے۔

شاعری کی اس ناقدری کی خاص وجہ شاعری کی کتابوں کی کثرت ہے جو عموماً اردو اکادمیوں اور نیم سرکاری اداروں کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوتی ہیں۔ ان اداروں کا طریقۂ کار ایسا ہے کہ کوئی معمولی درجے کا شاعر بھی ذرا سی کوشش سے مالی امداد حاصل کر سکتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے مبتدی شاعر بھی اب اپنا مجموعۂ کلام چھپوانے لگے ہیں جن کی شاعری کی عمر پانچ سات برس سے زیادہ نہیں اور جو ابھی استادوں کے سایۂ عاطفت سے آزاد بھی نہیں ہو سکے ہیں۔

موجودہ صارف سماج میں طلب اور رسد کا اصول جس طرح کام کر رہا ہے اس کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کی کتابوں کی رسد ضرورت سے بہت زیادہ ہے اور طلب معمول سے بہت کم، جس کا راست نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کی کتابوں کی ناقدری اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ کتب فروش مجموعۂ کلام دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں اور شاعر بے چارہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ شاعری یوں بھی پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز ہے۔ سننے کا یہ مطالبہ مشاعروں، ریڈیو اور ٹی وی کی شعری نشستوں، راگ رنگ کی محفلوں اور فلموں سے بخوبی پورا ہو جاتا ہے پھر کوئی شعری مجموعہ کیوں پڑھے! پڑھنا بھی ہوگا تو وہ فیض، فراق، مجروح، قتیل شفائی، احمد فراز اور پروین شاکر کو پڑھے گا، محمد مشتاق اور نور بیگم کو کیوں پڑھے گا۔

کلیم الدین احمد کی طرح یہ کہنا تو مناسب نہیں ہوگا کہ غزل گوئی پر دس سال کے لیے پابندی عائد کر دی جائے، اس لیے کہ یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ قابل عمل۔ ادب میں مارشل لا کا خیال تفنن طبع کی حد تک تو خوشگوار معلوم ہوتا ہے مگر عملاً ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ شاعری بہر حال ایک تخلیقی عمل ہے اور اس کو جاری رکھنے کی وکالت رشید حسن خاں جیسے کڑے تیور کے محقق بھی کر چکے ہیں۔ ایک انٹرویو میں رشید حسن خاں نے شاعری کی روایت کے تسلسل پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

جہاں کہیں بھی روایت کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے وہ روایت مر جاتی ہے اور روایت کا تسلسل ادب کی

سطح پر نہیں قائم ہوتا یا نیچے کی سطح پر قائم ہوتا ہے، تو لازم ہے کہ شاعری کی روایت کا تسلسل جو نچلی سطح پر اس وقت قائم ہے وہ قائم رہے، کارفرما رہے، رواں دواں رہے۔ ہاں جب تنقید، قدر وقیمت کے تعین پر گفتگو کرتی ہے تو مسئلہ دوسرا ہوتا ہے۔" (ضمیمہ قومی آواز۔ لکھنو مورخہ ۸ نومبر ۱۹۹۲ء)

رشید حسن خاں کی بات سے مجھے بھی پورا اتفاق ہے مگر شاعری کے تسلسل کا یہ کام مختلف سطحوں پر بخوبی انجام پا رہا ہے۔ اردو کے معیاری درجنوں ادبی رسائل وجرائد ہیں جن میں ہر قسم کے ادنا واعلا شعرار کا کلام شائع ہوتا ہے۔ دہلی سے نکلنے والے درجنوں ڈائجسٹ ہیں جو ہر طرح کے شعرار کا کلام شائع کرتے ہیں۔ شاعری بہرحال اردو کے ادبی منظر میں برابر موجود رہتی ہے اور وہ تسلسل بھی برقرار رہتا ہے جس کی حمایت رشید حسن خان نے کی ہے لیکن شاعری کے مجموعوں کی کثرتِ اشاعت کا مسئلہ دوسرا ہے اور اس پر کسی نہ کسی قسم کا قدغن ضرور لگنا چاہیے۔

میرے خیال سے کتابی صورت میں صرف وہی کلام شائع ہونا چاہیے جو مستند اور معتبر ہو اور جسے اعلا درجے کی شاعری میں امتیاز کے ساتھ شامل کیا جا سکے۔ نوآموز اور متوسط درجے کے شاعروں کی روایتی، رسوماتی، اور غیر تخلیقی شاعری کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے اردو ادب کو تو کوئی فائدہ پہنچتا نہیں ہے۔ البتہ شاعری کی ناقدری کا جواز ضرور مہیا ہو جاتا ہے۔ کسی شاعر کو اپنا مجموعہ کلام چھپوانے کے بارے میں صرف اسی وقت سوچنا چاہیے جب وہ کم از کم ۲۵ برسوں تک مشق سخن کر چکا ہو اور اردو کے ادبی حلقوں میں اسے اعتبار حاصل ہو چکا ہو۔ بعض لوگ ـــــ ساری عمر شاعری کرتے رہتے ہیں مگر ان کا ہر روز ہنوز روز اول ہی رہتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک قابل عمل تجویز یہ ہے کہ فخرالدین علی احمد کمیٹی لکھنو (جس کی جزوی مالی امداد کی بدولت اردو شاعری کی پچاس فیصد سے زیادہ کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں) اور ملک کی دیگر اردو اکادمیاں ہر سال علمی کتابوں کی اشاعت کے لیے جزوی مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ ان کا صرف دس فیصد حصہ ہی شعری مجموعوں پر خرچ کیا جائے۔ مثلاً فخرالدین علی احمد کمیٹی اگر پچاس کتابوں پر مالی امداد منظور کرتی ہے تو اس میں شاعری کے مجموعوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ مالی امداد کے لیے جتنے شعری مجموعے کمیٹی کو موصول ہوں ان کی پہلے ایک سہ رکنی سب کمیٹی اپنے طور پر جانچ کرے اور غیر معیاری و رسومیاتی شاعری کے مجموعوں کو براہ راست مسترد کر دے۔ ایکسپرٹ کے پاس وہی شعری مجموعے بھیجے جائیں جو بادی النظر میں اعلا صفات کے حامل ہوں۔ اس کے بعد بھی جب فائنل فہرست تیار ہو تو کل کتابوں کے دس فیصد حصے ہی پر آرڈر آف میرٹ کے لحاظ سے مالی امداد فراہم کی جائے۔ یہی طریقہ اردو اکادمیوں کو بھی اپنانا چاہیے اور اس پر سختی سے عمل کرنا چاہیے کیونکہ ایسے ناقابل التفات شعری مجموعوں کی اشاعت، وقت اور روپیہ دونوں کا زیاں ہے، جن کا مقدر محض دیمکوں کے پیٹ کی غذا فراہم کرنی ہو۔

جہاں تک ہمارے گلی کوچوں سے اگنے والے شعرار کرام کا تعلق ہے تو وہ نصیحت اور ملامت دونوں سے ماورار ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے زیاں کا احساس ہوتا ہے نہ ملک وقوم کے زیاں کا لیکن جن لوگوں کو سرکار نے اردو کی ترقی وترویج کی ذمے داری سونپی ہے ان کو تو اپنے فرائض کا احساس ہونا ہی چاہیے۔ سرکار کی فراہم کردہ رقوم کا استعمال اردو زبان کی قرار واقعی ترقی وترویج کے لیے کرنا چاہیے نہ کہ بے مصرف کتابوں کی تھوک پیداوار کے لیے جن کا ایک بڑا حصہ محض شعری مجموعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شعری کتابوں کے جو مسودے مالی امداد دینے

والے اداروں کو موصول ہوتے ہیں، ان کا بھی ایک قابلِ لحاظ حصہ بیکار اور بے مصرف مسودوں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن بہت سے معاملات میں مبصر چشم پوشی کر جاتے ہیں اور اشاعت کے لیے سفارش کر دیتے ہیں۔

اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے جس کی طرف پروفیسر گیان چند جین نے اشارے کیے ہیں۔ اکثر مبتدی اور کم عیار شعرا جب اکادمیوں کی مالی امداد سے اپنا مجموعہ چھپوا لیتے ہیں تو نقادوں کو گھیر گھار کے یا سعی و سفارش سے اپنے مجموعوں پر "کچھ" لکھوانا بھی چاہتے ہیں۔ "کچھ" کا مطلب نقاد کی دیانت دارانہ رائے نہیں ہوتی بلکہ شاعر کے کلام کی تحسین محض ہوتی ہے۔ اگر کوئی نقاد اس قسم کے شعری مجموعوں پر اپنی اصل رائے کا اظہار کر دے تو وہ ہمیشہ کے لیے معتوب ہو جائے گا اور متعلقہ شاعر تمام عمر اس کو معاف نہیں کرے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب سربرآوردہ نقاد، ہم عصر شاعروں کے کلام پر اظہار خیال کرنے کے بجائے میر و غالب اور اقبال و فیض کے کلاموں کی تعبیر و تشریح پر اپنی ناقدانہ صلاحیتیں صرف کرتے ہیں۔ شاعروں کی برادری اس بات پر خفا ہوتی ہے کہ نقاد ہم عصر شاعری کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نقادوں کا مسئلہ یہ ہے کہ جب وہ اردو کی ۹۹ فیصد شاعری کو خاص کر غزلیہ شاعری کو کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی محور پر آنکھ موند کے گردش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ کس کی شاعری پر کیا لکھا جائے۔ اور کیسے لکھا جائے۔

قدر و قیمت کے تعین کا مسئلہ تو ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ گذشتہ ادوار کے کتنے ہی نامور شعرا آج زمانے کی گرد میں اس طرح روپوش ہو گئے ہیں کہ اکبر حیدری کشمیری اور ڈاکٹر کاظم علی خاں جیسے محققین کے علاوہ کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ اسی طرح دورِ حاضرہ کے شعرا کی ایک بڑی تعداد بھی اب سے پچاس سال بعد گردِ کارواں کے پیچھے گم ہو جائے گی۔ اس وقت نقادوں کی سفارش ہی کام آئے گی نہ شعری مجموعوں کی چکنی ہوئی اشاعت۔ اس لیے شعری مجموعوں کی باڑھ کو روکنے میں اگر ہمارے محترم شعرا کرام بھی اپنا قیمتی تعاون دے سکیں تو یہ اردو شاعری کی ناموس بچانے کے لیے ایک مبارک قدم ہوگا۔

لگ بھگ پچھلے چار مہینے سے ڈاک والوں کی ہڑتال کی وجہ سے ڈاک نہ صرف تاخیر سے مل رہی ہے بلکہ غائب ہو رہی ہے

مجتبیٰ حسین
۳۰۰-انکورا اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج - نئی دہلی

نام میں کیا رکھا ہے

ان دنوں ہمارے حافظہ کا حال کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ہم اکثر اپنے دوستوں کے نام بھول جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ جہاں ایک طرف ہماری یادداشت کمزور ہوتی جا رہی ہے وہیں دوسری طرف ہمارے دوستوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کس کس کو کہاں تک یاد رکھیں، پچھلے دنوں ہمارے بے تکلف دوست بھاسکر راؤ، جو بمبئی میں رہتے ہیں اور جو ہمارے زمانہ طالب علمی کے دوستوں میں سے ہیں، ایک محفل میں مل گئے تو ہم نے انھیں بھاسکر راؤ کے بجائے "سدھاکر راؤ" کہہ کر مخاطب کیا۔ بڑی حیرت کے ساتھ ہمیں دیکھتے ہوئے بولے "یار! تم میرے چالیس برس پرانے دوست ہو اور تم مجھے بھاسکر راؤ کے بجائے "سدھاکر راؤ" کہہ کر مخاطب کر رہے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے بھی بھولتے جا رہے ہو"۔ ہمیں اچانک اپنی اس غلطی کا احساس ہوا لیکن یہ ہماری عادت ہے کہ ہم اپنی غلطی کو ماننے کے بجائے اس کی کوئی نہ کوئی خوبصورت تاویل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے کہا "اچھا تو تم اب بھی بھاسکر راؤ ہی ہو۔ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ بمبئی کی نئی سرکار نے تمھارا نام بدل کر بھاسکر راؤ سے سدھاکر راؤ کر دیا ہے۔ بمبئی کا نام تو ممبئی ہو گیا۔ عثمان آباد کا نام "دھاراشیو" اور اورنگ آباد کا نام "سامبھاجی نگر" ہو گیا۔ میں نے یہ سمجھا کہ تمھارا نام بھی، بھاسکر راؤ سے سدھاکر راؤ ہو گیا ہے۔

بھاسکر نے نہایت غصہ سے کہا "میں کوئی سڑک ہوں، کوئی مقام ہوں یا کوئی شہر ہوں کہ میرا نام بدل دیا جائے۔ میں تو ایک فرد ہوں"۔ ہم نے کہا "یار! کیا کریں نام بدلنے کی وبا اب کچھ اتنی عام ہوتی جا رہی ہے کہ کل کے دن مقامات، سڑکوں اور شہروں کے ناموں کے علاوہ افراد کے نام بھی بدلے جا سکتے ہیں۔ جب خرد کا نام جنوں پڑ سکتا ہے اور جنوں کا نام خرد، تو کچھ بھی ہو سکتا ہے"۔ بھاسکر نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا "تمھاری ایسی ہی دلچسپ باتوں کی وجہ سے تو تمھارا گرویدہ ہوں۔ اب مجھے یقین آیا کہ تم میرا نام نہیں بھولے تھے بلکہ صرف مذاق کر رہے تھے"۔ اب ہم اسے کیسے سمجھاتے کہ ہم سچ مچ اس کا نام بھول گئے تھے۔ جس دن بھاسکر راؤ سے ہماری یہ بات چیت ہوئی اتفاق سے اس کے دوسرے ہی دن یہ خبر آئی کہ مرکزی حکومت نے دہلی کے مشہور زمانہ کناٹ پلیس کا نام بدل کر "راجیو چوک" اور کناٹ سرکس کا نام بدل کر "اندرا چوک" کر دیا ہے اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ ہم نے اسی دن ایک ٹیکسی ڈرائیور سے جب "اندرا چوک"

چلنے کو کہا تو اس نے پوچھا "یہ چوک کہاں ہے جی؟" ہم نے کہا "راجیو چوک کے پاس ہے" بولا "کیا یہ دونوں چوک دہلی میں ہیں؟" ہم نے کہا "تم نے آج کا اخبار نہیں پڑھا۔ آج سے کناٹ پلیس اور کناٹ سرکس کے ناموں کو بدل کر انھیں راجیو چوک اور اندرا چوک کر دیا گیا ہے" بولا "آپ نے سیدھے سیدھے کیوں نہیں بتا دیا کہ کناٹ پلیس چلنا ہے۔ یوں بھی میں ٹیکسی چلاتا ہوں، مجھے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ نے میرا جو وقت برباد کیا ہے اس کے پانچ روپے ایکسٹرا لوں گا۔ وہ بھی آپ سے رعایت کے ساتھ لے رہا ہوں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو دس روپے چارج کرتا" بہر حال کناٹ پلیس اور کناٹ سرکس کے ناموں کی تبدیلی پر ان دنوں بڑا شور مچایا جا رہا ہے ہم نے تو یہ دیکھا کہ نام وہی چلتے ہیں جو عوام کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں۔ کچھ برس پہلے دہلی کی ماتا سندری لین کا نام بدل کر "ایوان غالب مارگ" کر دیا گیا تھا بلکہ اس گلی کے نام کی تختی پر اردو رسم خط میں بھی یہ نام لکھا گیا تھا اور اردو کی عظیم الشان روایت کے مطابق اس میں بھی کتابت کی ایک دلچسپ غلطی سرزد ہو گئی تھی کیونکہ "ایوان غالب مارگ" کا نام اردو میں "ایوان گالیب مارغ" لکھا گیا تھا۔ مگر کتابت کی یہ غلطی ہمارے لیے اس لیے گوارا ہو گئی تھی کہ غالب کے نام کے ساتھ جس "غ" کو استعمال ہونا تھا اس "غ" کو مارگ کے املا میں شامل کر لیا گیا تھا۔ کتابت کی غلطی میں عموماً حروف تہجی کی تعداد کو کم یا زیادہ کر دیا جاتا ہے لیکن یہاں حروف تہجی کی تعداد میں ذرا سی بھی بے ایمانی نہیں کی گئی تھی۔ بس ذرا حروف تہجی کی ترتیب کے اُلٹ پھیر کی وجہ سے تلفظ میں تھوڑی سی بے ایمانی ضرور ہو گئی تھی خیر جو کچھ بھی ہو غالب کے شعر تو سماج میں بدستور چلتے رہے لیکن ان کے نام کی سڑک نہیں چلی۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کو "ایوان غالب مارگ" چلنے کو کہا اور اس نے ہمیں غالب کے مزار پر پہنچا دیا جو بستی حضرت نظام الدین میں واقع ہے۔ سچ پوچھیے تو جب تک عوام کسی نام کو شرف قبولیت نہ بخشیں تب تک یہ نہیں چلتے اور اس میں بھی عوام اپنے مخصوص تلفظ کو رائج کر دیتے ہیں۔ اکثر نام کثرت استعمال سے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حیدرآباد میں ایک علاقہ "بودلے شاہ کی کھڑکی" کے نام سے مشہور ہے۔ ہم نے ایک عرصہ تک اپنا سر کھپایا کہ یہ بودلے شاہ کون تھے، کیا کرتے تھے۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ بزرگ موصوف کا اصلی نام "بو دعلی شاہ صاحب" تھا مگر عوام نے اپنی سہولت کی خاطر انھیں "بودلے شاہ صاحب" بنا دیا۔ اسی طرح حیدرآباد میں ایک فرانسیسی باشندہ موسیو ریمون نے ایک باغ لگایا تھا۔ اب اس باغ کا نام کثرت استعمال کے باعث "باغ موسیو ریمون" سے "باغ موسیٰ رام" بن گیا ہے۔ یہی نہیں افراد کے ناموں کے ساتھ بھی کبھی کبھی یہی صورت حال پیش آ جاتی ہے۔ کالج کے زمانہ میں ہمارے ایک دوست تھے جن کا نام تھا غضنفر لودھی۔ ایک عرصہ تک تو لوگ انھیں ان کے پورے نام کے ساتھ پکارتے رہے پھر بعد میں سہولت کی خاطر صرف "لودھی صاحب" کہنے لگے لیکن تاریخ میں چونکہ ابراہیم لودھی بہت مشہور بادشاہ گزرا ہے جس نے بابر سے شکست کھائی تھی اس لیے بعد میں لوگوں نے ان کے نام میں سے "لودھی" کو نکال دیا اور وہ صرف "ابراہیم صاحب" پکارے جانے لگے۔ کہاں تو غضنفر لودھی تھے۔ صرف "ابراہیم" بن کر رہ گئے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ان سے مشہور ہونے والے

نام کا ان کے اصلی نام سے کیا کوئی تعلق نہیں تھا مگر بیچارے عوام کی مرضی کے آگے مجبور تھے۔
اب جو یہ مرکزی حکومت نے کناٹ پلیس اور کناٹ سرکس کے ناموں کو بدل کر انھیں "راجیو چوک" اور "اندرا چوک" کر دیا ہے تو بھلا ہم کون ہوتے ہیں اس معاملہ میں رائے دینے والے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی شخصی طور پر ایک عرصہ سے یہ سوچ ہی رہے تھے کہ کناٹ پلیس کا نام کوئی بدلے یا نہ بدلے ہم ہی آگے بڑھ کر اسے بدل دیں کیونکہ ایک زمانہ میں کناٹ پلیس ہمارا بے حد پسندیدہ علاقہ رہا ہے یہ بات ہم اس کناٹ پلیس کی کر رہے ہیں جو آج سے پچیس برس پہلے تھا۔ ہماری اکثر شامیں بلکہ راتیں تک اس علاقہ میں گزرتی تھیں اس کا وہ درمیانی پارک جو اگرچہ لندن کے ہائیڈ پارک کی طرح بڑا نہیں تھا لیکن پھر بھی بہت بڑا تھا سمٹ سمٹ کر فوارہ میں تبدیل ہو گیا ہے اس میں جہاں زیر زمین پالیکا بازار بن گیا ہے اس کے اوپر ایک کافی ہاؤس تھا جسے چند انقلابی دانشوروں اور ادیبوں نے شامیانے لگا کر قائم کیا تھا۔ اس کافی ہاؤس میں دہلی کی کیسی کیسی ہستیاں جمع ہوتی تھیں۔ اردو کے ادیبوں کو ہی لے لیجیے۔ دیویندر ستیارتھی، ساغر نظامی، سلام مچھلی شہری، عمیق حنفی، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، اور بیسیوں ادیب یہاں جمع ہوتے تھے۔ کافی پینے کی شرط نہیں تھی بلکہ یہاں بیٹھنے کی شرط تھی۔ کتنے ہی ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں سے ہماری یہیں ملاقات ہوئی۔ پھر بھی جب پالیکا بازار بننے لگا تو اس کافی ہاؤس کا بوریا بستر بھی گول کر دیا گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کناٹ سرکس کے برابر فلک بوس عمارتیں کھڑی ہوتی چلی گئیں۔ کناٹ پلیس جہاں جا کر مکمل سکون اور فرحت کا احساس ہوتا تھا وہاں اب دھڑا دھڑ تجارتی اداروں کے دفتر قائم ہونے لگے۔ اب تو یہاں سے گزرتے ہوئے بھی ہمیں وحشت اور سراسیمگی کا احساس ہوتا ہے، عرصہ ہوا کہ ہم نے کناٹ پلیس جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے لیے تو وہ کناٹ پلیس کب کا ختم ہو چکا جہاں کی شامیں اب بھی ہمارے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ جس کناٹ پلیس اور کناٹ سرکس کا نام بدل دیا گیا ہے اس سے ہمارا تو کوئی بھی تعلق نہیں رہا۔ اب اگر اس کا نام بدل دیا جاتا ہے تو ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے بس اتنی سی گزارش ہے کہ جن ہستیوں کے ناموں پر اس علاقہ کا نام رکھا گیا ہے ان کے مزاج اور ذوق کی جھلک بھی اس علاقہ میں نظر آنی چاہیے۔ ہم لوگ صرف نام بدل دیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ حیدر آباد کے میونسپل کارپوریشن نے ہومیو پیتھی طریقہ علاج کے لیے ممتاز ماہر ڈاکٹر بھومنّا کی بے لوث خدمات سے متاثر ہو کر اس سڑک کا نام "ڈاکٹر بھومنّا روڈ" رکھ دیا تھا جہاں ان کا مطب واقع تھا۔ میونسپل کارپوریشن نے اس سڑک کا صرف نام رکھ دیا تھا اور کبھی اس کی صفائی اور مرمت کی طرف توجہ نہیں کی تھی راویوں کا بیان ہے کہ ڈاکٹر بھومنّا محض اپنے نام کی لاج رکھنے کے لیے اپنے صرفہ سے اس سڑک کی صفائی کا بندوبست فرمایا کرتے تھے مانا کہ شیکسپیر نے کہا تھا کہ "نام میں کیا رکھا ہے" لیکن اب ہم اس بیان سے متفق نہیں ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
صدر شعبۂ اردو بی۔ این۔ کالج پٹنہ

اُردو ہے جس کا نام

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب میں ایک اقلیتی کالج میں نیا نیا اردو کا استاد ہوا تھا۔ تنخواہ کے نام پر "کافی رقم" ملتی تھی مگر وہ روزانہ کالج جانے کے لیے ناکافی تھی۔ اس لیے میں ہفتے میں صرف دو دن کالج جاتا اور باقی دنوں میں مسکراہٹ کا بلٹ پروف چہرے پر چڑھائے بیگم کی فائرنگ نما فرمائشوں سے بچنے کی پریکٹس کرتا رہتا۔ جب کبھی بیگم میر کی طرح تنگ دستی کی شکایت کرتیں میں انھیں غالب کی طرح گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج ہونے کا مشورہ دیتا کہ آخر اپنے ملک میں اسّی بچاسی فی صد لوگ اسی طرح پُرمسرت زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر وہ نغمہ سنج ہونے کے بجائے زود رنج ہونے لگتیں تو میں انھیں داغ کا یہ شعر سناتا ہے

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اور پھر اس کی یہ تشریح کرتا کہ جب ایک بار ہمارا رشتہ اردو سے قائم ہو گیا ہے تو دیر یا سویر ساری دنیا میں ہماری بھی دھوم ہوگی۔ شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے کہ اچانک ایک دن انھوں نے آنسو گیس سے کام لینے کے ساتھ ساتھ ایک دھماکہ بھی کر دیا:

"میں صاف طور پر کہے دیتی ہوں کہ اگر آپ نے پندرہ دنوں کے اندر دارجلنگ کا پروگرام نہ بنایا تو میں میکے چلی جاؤں گی!"

اس طرح کے دھماکے کا اثر مجھ پر دو منٹ سے زیادہ نہیں رہتا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں انھیں خود ہی مائکے پہنچا آتا اور خود چند دن ہنسی خوشی گزار لیتا مگر فی الحال معاملہ نازک تھا۔ اگلے ہی ماہ ہماری سسرال میں جائداد تقسیم ہونے والی تھی اور میں کسی بھی حال میں اس کے فوائد سے محروم ہونے کو تیار نہ تھا۔ اس لیے ہلکی سردیوں کے باوجود مجھے تیز پسینہ چھوٹنے لگا۔ میں نے پسینہ پونچھنے سے قبل دانش مندوں کی طرح بیوی کے آنسو پونچھنا ضروری سمجھا اور آواز میں انتہائی مٹھاس پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"جانِ من! دارجلنگ کیا چیز ہے، تم کہو تو میں....."

مگر بیگم نے مجھے بات پوری کرنے کا موقع دیے بغیر گولہ باری کا دوسرا مرحلہ شروع کر دیا:

"میں آپ کی چالیں خوب سمجھتی ہوں۔ اگر آپ نے آج ہی ٹکٹ نہ بنوالیے تو بچوں کے اسکول سے واپس آتے ہی میں انھیں لے کر ممی کے گھر چلی جاؤں گی۔"

اب میرے پاس دفاع کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے ڈوبنے سے پہلے ایک تنکے کا سہارا

"ٹھیک ہے میں ٹکٹ بنوالیتا ہوں مگر سردی کا موسم ہے کچھ تیاری بھی تو کرنی ہوگی اور پھر ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو کہاں رکھیں گے؟"

وہ جیسے تمام حملوں کے لیے پہلے تیار بیٹھی تھیں۔ فوراً جواب دیا:

"چار نئے کمبل میں نے کل ہی نیشنل بلڈنگ اسٹور سے منگا لیے ہیں۔ آخر وہ آپ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ پیسا آج نہ کل ادا ہو جائے گا۔ رہا بچوں کا سوال تو انھیں ماموں کے گھر پہنچا دیں گے۔"

میں نے آخری دشواری بیان کی:

"مگر کچھ پیسے بھی تو چاہییں۔ دور کا سفر ہے۔"

انھوں نے فوراً اس دشواری کا حل پیش کر دیا:

"یہ بی۔ اے۔ آنرز کی دو سو کاپیوں کا بنڈل ہے۔ آپ کے دوست شرما جی کنٹرولر آف اگزامز ہو گئے ہیں۔ انھوں نے خبر دی ہے کہ کاپیاں جانچ کر دیں۔ ادائیگی فوراً ہو جائے گی اور نقد۔"

میں نے علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا، پر عمل کرتے ہوئے اپنے کئی بزرگ استادوں کی خوشنودی کے لیے کاپیاں جانچنے کا کام پہلے بھی کیا تھا اور کئی دنوں تک بخار میں مبتلا رہا تھا مگر اب مرتا کیا نہ کرتا، والا معاملہ تھا۔ چپراسی کو دارجلنگ کے ٹکٹ لانے اسٹیشن روانہ کر دیا اور خود سفر کے انتظامات میں لگ گیا۔

دو تین دن کس طرح گزر گئے پتا ہی نہیں چلا۔ چوتھے دن کاپیوں کا بنڈل نکالا اور کام شروع کیا۔ اردو کی کاپیاں جانچنے کے پچھلے تجربوں نے مجھے اس قدر محتاط بنا دیا تھا کہ اب میں کاپیاں پڑھے بغیر بھی غلط جوابات پر بالکل درست نمبر دینے پر کامیاب ہو رہا تھا۔ شاید یہ کام چند گھنٹوں میں ختم بھی ہو جاتا کہ بیگم صاحبہ پھر نازل ہو گئیں۔ انھوں نے مجھے احساس دلایا کہ میں لڑکوں پر بہت ظلم کر رہا ہوں۔ میں نے بے حسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ! اگر میں پڑھ کر نمبر دوں گا تو زیادہ ظلم ہوگا۔"

مگر وہ بیگم ہی کیا جو مان جائیں۔ ناچار میں نے گورنمنٹ کالج کی کاپیوں کا بنڈل اٹھایا اور پہلی کاپی پڑھنی شروع کی۔ طالب علم نے مختلف اشعار کی تشریح کی تھی۔ پہلا شعر تھا:

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لڑکے نے تشریح کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یہ شعر انیس کی غزل گوئی سے ماخوذ ہے۔ اس شعر میں انھوں نے خبردار کیا ہے کہ میرے خرمن کے خوشہ چین میں ہیں۔ اس طرح انیس نے چین کے ملکوں کی نشاندہی کی ہے اور اس میں چین کے حالات زندگی کو بڑے حسین پیرایے میں بیان کیا ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔"

میں نے آگے بڑھا۔ میر کے شعر "دل پُر خوں کی اک گلابی سے ... عمر بھر ہم رہے شرابی سے" کی تشریح اس طرح کی گئی تھی:

"میر کی تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مزاجی کی طرف ہے۔ ذیل کی غزلوں میں میر صاحب نے کہا ہے کہ ہم اپنی محبوبہ کی گلابی خون کو شراب سمجھ کر عمر بھر پیتے رہے۔ اس طرح اپنی محبوبہ کی دل کی خون کو اپنا بنا لیا تو محبوبہ بھی میری ہو گئی۔"

اس سے اگلے صفحے پر میر کے ایک اور شعر کی تشریح اس طرح کی گئی تھی:

"یہ اشعار میر کا ہے۔ کہتے ہیں کہ غریب لوگوں کے یہاں کچھ نہیں رہتا ہے اور ان کے گھر کا چراغ شام ہی سے بجھا رہتا ہے۔ میر بھی غریب ہیں اس لیے ان کے دل میں کچھ نہیں رہتا ہے۔ وہ صاف رہتا ہے۔ ان کو دن بھر کھانے کو بھی نہیں ملتا ہے۔ وہ دن بھر کھائے پیے بغیر ہی رہتا ہے مگر شام ہی سے دل بجھا رہتا ہے کہ کہاں سے خوراک آئے گا کہ ہم لوگ رات کو کھائیں گے۔"

میں نے دوسری کاپی اُٹھائی۔ اس شعر کی تشریح اس طرح درج تھی:

"میر نے یہ شعر اپنے فطری انداز میں لکھے ہیں۔ کہتے ہیں کہ غریب کے یہاں کراسین تیل بھی نہیں رہتا ہے کہ وہ شام کو اپنا چراغ جلا کر پڑھے اور پیٹ میں اناج رہے گا تب ہی تو پڑھائی آئے گی۔ اگر پیٹ میں اناج نہیں رہے گا پڑھائی بھی نہیں ہوگی اور دل مفلس کا چراغ بیمار رہے گا۔"

میں نے ایک اور کاپی اُٹھائی۔ انیس کے شعر کی تشریح میں بس اتنا لکھا تھا۔

"شاعر صاحب کہتے ہیں کہ وہ روز ایک نیا مضمون اپنے محبوب کی شان میں تیار کرتے ہیں مگر اس کو چاہنے والی محبوبہ کو خبر ہی نہیں ہوتی۔"

میر کے شعر کو اس طرح تختہ مشق بنایا گیا تھا:

"شاعر کی معشوقہ اس سے ملنا چاہتی ہے مگر نہیں مل پاتی چوں کہ شام کو اکثر و بیشتر لوڈ شیڈنگ بھی ہوتی ہے اور مفلسی کے سبب چراغ بھی بجھا رہتا ہے اور دن میں وہ نہیں ملتی کہ لوگ دیکھ لیں گے۔"

ایک اور صاحب نے اس طرح گل افشانی کی تھی:

"میری گھر والی مجھ کو کبھی نہیں چھوڑتی ہیں۔ وہ مجھے ہر وقت گھر میں رہنے کو کہتی ہیں میں اس سے عاجز آگیا ہوں۔ اس لیے میں شام ہی سے گھر کو چھوڑ دیتا ہوں اور وہ چراغ بجھا کر سو جاتی ہیں۔"

میں نے چند سکنڈوں کے لیے آنکھ بند کرکے صفحات پلٹے۔ جو صفحہ سامنے آیا اس پر ایک شعر کی تشریح کچھ اس طرح لکھی تھی:

"یہ شعر اقتباس میں لکھی گئی ہے۔ اس کے شاعر درّد نے شعر میں غضب کی روانی تاری کی ہے اور اس میں ایک محبوبہ کے نہ ملنے سے اپنی بے ثباتی کا ذکر اور بے چینی کو درد انگیز الفاظوں میں بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر میری محبوبہ دنیا کے اندر نہ ملے تو میں اس کو حشر کے روز ڈھونڈوں گا۔ یا شاید وہ عالم برزخ میں ضرور ملے گی۔"

ایک اور کاپی پڑھی تو اندازہ ہوا کہ اردو میں تحقیق کی نئی روایتیں قائم ہو سکتی ہیں۔ صاحبزادے نے لکھا تھا:

"یہ شعر موّمن کا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم خدا سے بچھڑ کر اپنی زندگی بسر کروگے تو گھر کا چراغ بجھا رہے گا۔ موّمن بھی ایک ایسی عورت ہے جو کافرہ تھی مگر جس کو خدا کے احکاموں اور خدا سے لگاؤ ہو گیا اور وہ موّمن کہلانے لگی۔"

میں نے اس تحقیق کی داد دینے کے بعد چند منٹ آرام کیا۔ پھر ایک ڈیفنس کالج کی کاپیوں کا بنڈل اٹھایا تاکہ خزاں میں کچھ بہار کی صورت نظر آئے۔ پہلی ہی کاپی کے پہلے صفحے پر ایک خط تھا:

"چچا جان السّلام علیکم!

امید ہے خانہ اہل بخیر ہوں گے۔ اپنی بیٹی جان کر مہربانی کیجیے گا۔ ویسے میں دکنی تو بڑھی نہیں ہوں مگر رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ اس وقت اوپر والا اور آپ کی رحمت کی ضرورت ہے۔ آپ اگر اسّی نمبر دینے کا فرض ادا کر سکے تو دل سے دعائے خیر نکلتی رہے گی۔"

میں نے لاحول پڑھ کر دوسری کاپی پلٹی۔ پھر ایک خط ملا:

"چچا جان! میں ایک یتیم لڑکی ہوں اور میری شادی عید کے مہینے ہونے والی ہے...."

مجھے خوشی ہوئی کہ میرے معاشرے میں اب بھی ایک یتیم لڑکی سے شادی کرنے والا کوئی نوجوان موجود ہے۔ میں اس بھتیجی کے سر پر معاف کیجیے گا اس کی کاپی پہ شفقت کا ہاتھ نہ رکھتا تو کیا کرتا؟ مگر میرا جذبۂ شفقت جلد ہی سرد پڑ گیا۔ چوں کہ دوسری لڑکی نے بھی یتیم ہونے کا دعوا کیا تھا اور شادی کی خبر نہیں دی تھی۔ تیسری نے محض یتیم ہونے کی دہائی دینا ناکافی سمجھتے ہوئے بات کچھ اور آگے بڑھائی تھی:

"محترم اکزامنر صاحب! میں ایک یتیم کی لڑکی ہوں۔ آپ مجھ پر ضرور رحم کریں گے۔ اللہ آپ کی مغفرت کرے گا۔"

میں نے سوچا، تم یتیم تو نہیں ہو مگر عقل کی یتیم ضرور ہو۔ بہر حال، کاپی آگے بڑھی تو محمد حسین آزاد کے مضمون کا خلاصہ کچھ اس طرح لکھا تھا:

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

شبیہہ عباس جارچوی
ایچ۔۲۸۔اے/۸ مین ایکسٹینشن کالونی
کراچی ۳۷۔پاکستان

یہ بھی خراب کہانی ہے

ویٹنگ روم ایک ہی تھا چھوٹا سا جیسا چھوٹے ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتا ہے اول تو زیادہ تر بھائیں بھائیں ہی کرتا۔ کبھی کبھار اِکّا دکّا یا دو چار مسافر آجاتے تو اس میں رونق ہوجاتی اسٹیشن کا ماشکی فاروق اسٹیشن کے چھوٹے موٹے متفرق کام کرتا اور اسٹیشن ماسٹر کے گھریلو کام بھی کرتا۔ ویٹنگ روم میں کبھی کبھی معزز مسافروں کے آنے کی صورت میں ویٹنگ روم کی فوری طور پر اور پھرتی کے ساتھ صفائی اور خاص طور سے جھاڑ پونچھ کردیتا اور مسافروں کو ان کے سامان کی حفاظت کے لیے چوکس رہنے کو بھی کہتا کہ بعض دفعہ سوئے ہوئے مسافروں کا سامان چوری ہونے کا واقعہ ہوتا رہتا تھا۔ فاروق کو مسافروں کی خدمت کے عوض بعض مرتبہ بخشش مل جاتی، یوں اس کی سوکھی تنخواہ کے علاوہ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہوجاتی۔ فاروق اس وقت ویٹنگ روم کے پاس منڈلا رہا تھا کہ کوئی خدمت انجام دینے کے عوض اسے کچھ پیسے مل جائیں۔

ان دنوں برسات کا موسم تھا اس پورے علاقے میں بارشوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا تھا۔ کچھ دیر کو بارش رک جاتی۔ آسمان بھی صاف ہوجاتا لیکن پھر تھوڑی ہی دیر میں نہ جانے کہاں سے بادل آجاتے، آسمان پر اندھیرا چھا جاتا اور بوندیں شروع ہوجاتیں۔ روم اس وقت ایک لیمپ جل رہا تھا جس میں رنگین مٹی کا تیل ڈلا ہوا تھا محکمۂ ریلوے رنگین تیل اس لیے ڈالتا تھا تاکہ نجی استعمال کے لیے چوری ہونے کی صورت میں شناخت ہوسکے کہ یہ تیل سرکاری ہے اور چوری کیا گیا ہے۔ رات دو بجے کا وقت تھا محمد رحیم اپنی بیوی گلزار فاطمہ اور تین سالہ بچی رقیہ کے ساتھ اس ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ واپسی کی گاڑی صبح ساڑھے چھے بجے آنی تھی اور وہ ایک اتفاق سے اس اسٹیشن پر آگیا تھا اور اب اپنی غلطی پر پچھتا رہا تھا۔ اس اسٹیشن سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا نہ آنے کا نہ جانے کا لیکن وہ یہاں موجود تھا۔ ہوا یوں کہ وہ ایک چھوٹے اسٹیشن کے لیے ایک جگہ سے ریل میں سوار ہوا اور گارڈ سے بات کرکے آگے آنے والے اپنے متعلقہ اسٹیشن پر گاڑی روکنے کے لیے کہا جہاں ویسے گاڑی نہیں رکتی تھی۔ گارڈ نے کچھ پیسے بطور رشوت لے کر اس چھوٹے اسٹیشن پر گاڑی روکنے کا وعدہ کرلیا تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے وہ اس اسٹیشن پر گاڑی نہ روک سکا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آگے آنے

والے ایک اسٹیشن سے ایک اہم شخصیت ریل میں سوار ہوئی، اس لیے گارڈ اپنے وعدے سے پھر گیا اور یہ گاڑی اس اسٹیشن پر کبھی نہیں رکتی تھی لیکن یہاں سگنل ڈاؤن نہیں تھا اس لیے چند منٹوں کے لیے رک گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ محمد رحیم اپنی بیوی اور بچّی کے ساتھ یہیں اتر گیا ورنہ ریل اسے اپنی منزل سے اور دور لے جاتی۔ اس نے گارڈ سے اپنے پیسے جاکر واپس لیے اور یہیں ویٹنگ روم میں ٹک گیا۔ یہاں پہلے سے ایک ضعیف خاتون اپنی ملازمہ کے ساتھ موجود تھیں۔ محمد رحیم تو ایک معمولی شخص تھا وہ اپنے شہر میں ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر تھا اور اس کے گھر میں اس کی بیوی اور بچّی کے علاوہ اس کی ماں اور ایک کنواری بہن بھی ساتھ رہتی تھی۔ ویٹنگ روم میں جو خاتون موجود تھیں اس کے حلیے اور سامان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بزرگ خاتون خاصی صحت مند اور جاذب نظر تھیں اور ان کی ملازمہ جوان سے مقابلے میں کم عمر تھی وہ بھی گٹھے ہوئے اور مضبوط جسم کی مالک تھی۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں اور ٹپ ٹپ کی آواز لگاتار آ رہی تھی۔ ننھی رقیہ کچھ بے چین تھی، کبھی وہ ٹھُن ٹھُن کرتی اور کچھ دیر بعد رونے لگتی۔ بزرگ خاتون نے وقت گزاری کے لیے اس جوڑے سے خود کو متعارف کراتے ہوئے اپنا نام رابعہ اور اپنی ملازمہ کا نام تہمینہ بتایا۔ محمد رحیم اب جس پسنجر ٹرین کا انتظار تھا اس میں بیٹھ کر اُسے واپس اسی طرف جانا تھا جہاں سے وہ آگے آچکا تھا جبکہ رابعہ اور ان کی نوکرانی کو مخالف سمت میں جانا تھا۔ رابعہ اس اسٹیشن کے قریب ایک گاؤں میں اپنے عزیزوں میں ایک فوتگی کے چہلم میں آئی تھی اور اب واپس جا رہی تھیں جبکہ رحیم اپنے گاؤں سے بڑے شہر میں اپنے ہیڈ ماسٹر کے پوتے کی سالگرہ میں شرکت کے لیے گیا تھا کہ شومئی قسمت سے یہاں آکر پھنس گیا تھوڑی دیر میں ایک ٹرین آنے والی تھی اس کی دور سے آنے والی سیٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی اسٹیشن ماسٹر ہری جھنڈی لے کر پلیٹ فارم پر آگیا۔ تھوڑی دیر میں ریل آئی اور شور کرتی، سیٹی بجاتی اور زناٹے بھرتی ہوئی گزر گئی۔ تھوڑی دیر میں رقیہ نے پھر فیل مچانا شروع کیا۔ جتنا اس کی ماں اسے چُپ کرانے کی جتنی کوشش کرتی اُتنی ہی وہ اور مچلنے لگتی۔ جب اسی طرح کچھ دیر ہوگئی تو رابعہ نے بچّی کی ماں سے پوچھا کہ بچّی کیوں رو رہی ہے تو اس نے کہا کہ یوں ہی ضد کر رہی ہے۔ پھر کچھ دیر کے لیے ویٹنگ روم میں خاموشی چھاگئی۔ تھوڑی دیر چین سے بیٹھنے کے بعد ننھی بچّی نے پھر رونا شروع کیا۔ اب پھر رابعہ نے گلزار فاطمہ سے پوچھا "ارے بیٹی بچّی کو چُپ کراؤ نا، کیا وجہ ہے یہ چُپ کیوں نہیں ہو رہی ہے؟" اب گلزار فاطمہ نے رابعہ کو بتایا کہ "ہماری بچّی کو خراب عادت پڑ گئی ہے کہ یہ دادی سے روزانہ رات کو کہانی سُنتی ہے اور کہانی سننے کے بعد ہی سوتی ہے میں اگر سُناتی ہوں تو مجھ سے نہیں سُنتی، کہتی ہے کہ امی آپ خراب کہانی سُناتی ہیں۔" اس جواب کے بعد ویٹنگ روم کا ماحول پھر وہی ہوگیا جو کچھ دیر پہلے تک تھا یعنی کچھ دیر بچّی کی خاموشی اور پھر کچھ دیر تک اس کا رونا اور مچلنا۔

رابعہ نے اشارے سے بچّی کو اپنے پاس بلایا اور اسے ایک بسکٹ اور تھرماس میں سے چائے نکال کر دی اور پوچھا کہ اس کی دادی کیسی کہانیاں سُناتی ہیں تو بچّی نے جواب دیا کہ "پریوں

اور شہزادیوں کی۔ دادی اچھی کہانی سناتی ہیں اور امّی خراب کہانی سناتی ہیں۔" رابعہ نے کچھ دیر کے بعد بچّی سے کہا کہ اچھا میں تمھیں ایک کہانی سناتی ہوں ایک شہزادی کی۔ وہ کہانی تمھیں دادی کی کہانی کی طرح اچھی لگے گی، امّی کی کہانی کی طرح خراب نہیں لگے گی" رقیہ خوش ہو گئی۔" دیکھو بیٹا ایک لڑکی تھی اس کا نام تو شہزادی تھا مگر وہ سچ مچ کی شہزادی نہیں تھی بس یہی کہ وہ ذرا امیر گھر کی بیٹی تھی گھر والوں نے اس کا نام تو کچھ اور رکھا تھا مگر پیار سے شہزادی کہتے تھے ہاں وہ تھی بھی تو سچ مچ کی شہزادی جیسی خوبصورت۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اکلوتی اولاد کا مطلب تو سمجھتی ہو نا۔ یہی کہ اس لڑکی کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ شہزادی کے ابّا ایک سرکاری اسپتال میں سرجن تھے۔ شہزادی نے بھی کالج میں ڈاکٹری پڑھی اور وہ جلسوں میں تقریریں بھی کرتی تھی۔ جیسے تم نے ٹی وی میں جلسوں میں تقریریں کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ رقیہ نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ شہزادی جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں ایک لڑکا صابر نام بھی پڑھتا تھا۔ وہ ڈاکٹری میں اس سے ایک کلاس آگے تھا وہ بھی تقریریں کرتا تھا اور بہت قابل تھا۔ شہزادی اور صابر دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے وہ اپنے کالج کی طرف سے تقریروں کے مقابلے کے لیے دوسرے کالجوں میں اپنے شہر اور دوسرے شہروں تک بھی جاتے اور کالج کے لیے انعام جیت کر لاتے۔ کچھ دیر کے بعد ریلوے اسٹیشن کا ماشکی اِن مسافروں سے پوچھنے کے لیے آیا کہ انھیں کسی چیز یا مدد کی ضرورت تو نہیں، اور پوچھ کر واپس اسٹیشن کے کمرے میں چلا گیا۔ ننھی رقیہ خاموش بیٹھی کہانی سنتی رہی۔ جب شہزادی اور صابر دونوں نے ڈاکٹری پاس کر لی تو صابر نے رشتے کے لیے اپنے گھر والوں کو شہزادی کے یہاں بھیجا لیکن شہزادی کے والد نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان کی بیٹی صابر کو چاہتی ہے اِس رشتے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ ان کے مقابلے میں غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور شہزادی کے انکار کے باوجود زبردستی اس کی شادی اپنے واقف کار ایک جاگیردار گھرانے میں کر دی۔ ننھی تم یوں سمجھو کہ جاگیردار اس کو کہتے ہیں جس کے پاس بہت سارے پیسے ہوتے ہیں یعنی امیر آدمی۔ بھئی رقیہ تم ہنکارا تو بھرو، تم کہانی سمجھ تو رہی ہو، نا۔ ہاں ہاں، رقیہ بولی، امیر آدمی اسے کہتے ہیں جیسے ہمارے گاؤں میں اکبر کے ابّا ہیں۔ اکبر کا گھر بہت بڑا ہے اور ان کے گھر میں دو کاریں ہیں اور کئی نوکر بھی ہیں۔ اکبر ہمیشہ اچھے کپڑے پہنتا ہے اور گھڑی بھی پہنتا ہے۔ اکبر اسکول نوکرانی کے ساتھ آتا ہے اور اسے واپس لے جانے کے لیے بھی نوکرانی آتی ہے رقیہ نے اپنی معلومات سے رابعہ کو مطلع کیا۔ رابعہ نے چٹاچٹ رقیہ کی بلائیں لے لیں اور پیار کیا۔ "ہاں تو کہانی میں آگے کیا ہوا؟" رقیہ نے سوال کر کے ثابت کیا کہ وہ آج کوئی پہلی مرتبہ کہانی نہیں سن رہی بلکہ یہ اس کا معمول ہے۔ صبح کاذب کا وقت ہو رہا تھا۔ اسٹیشن سے ملحق ریلوے ملازم کے کسی کوارٹر سے مرغ کی بانگ آ رہی تھی۔ ہاں تو کہانی میں آگے یہ ہوا کہ جاگیردار گھرانے والے شہزادی کو بیاہ کر اپنے گاؤں لے گئے۔ یہ لوگ تھے تو پڑھے لکھے لیکن بہت غصّے والے، شکّی مزاج اور پرانے خیال والے تھے اور عورتوں کو اپنے پیر کی جوتی بنا کر رکھنے کے قائل تھے۔ شہزادی کے شوہر نے چند ماہ ہی شہزادی پر ظلم کرنا اور اسے صابر کے نام کا طعنہ دینا شروع کر دیا۔ یہی نہیں جب اس کے

شوہر نے دیکھا کہ وہ بیوی کو اپنی منشاء کے مطابق دبا اور جھکا کر نہیں رکھ سکتا تو اس نے ایک سال بعد دوسری شادی کر لی اور شہزادی کو حویلی میں ایک کمرہ دے کر محبوس کر قید کر دیا۔ شہزادی جو اپنی جوانی میں تتلی کی طرح اُڑتی پھرتی تھی وہ شادی کے بعد ایک چھوٹے سے گانو کے زمینداروں کی حویلی میں بند ہو کر رہ گئی اور اس نے اپنی آیندہ زندگی کے جو خواب دیکھے تھے وہ اپنے مزاج کے مخالف لوگوں میں جانے کی وجہ سے سب چکنا چور ہو گئے۔ اب بھی شہزادی زمیندار کی بیوی ہے کیونکہ اس نے اسے طلاق نہیں دی لیکن وہ اسے ایک نوکرانی سے زیادہ نہیں سمجھتا بس اتنا ضرور ہے کہ شہزادی گانو میں ڈاکٹرنی ہے وہ مریضوں کا علاج کرتی ہے اور صرف دوا کے پیسے ان سے لیتی ہے۔ شہزادی کے ماں باپ مر چکے ہیں وہ صابر کو کبھی نہیں بھلا سکی اور اب بھی اسے یاد کر کے روتی ہے جو اُسے زندگی میں پھر کبھی نہیں ملا لیکن جس کے متعلق اسے لوگوں سے کبھی کبھار یہ پتا چلتا رہا کہ اس نے اپنا قول نبھایا اور شہزادی کے نہ ملنے کے بعد اس نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ شہزادی نے اپنے ماں باپ کی پسند کا لحاظ کرتے ہوئے زندگی یوں ہی کاٹ دی۔" کہانی میں آگے پھر کیا ہوا؟" ننھی رقیہ نے پھر پوچھا۔ "بس یہ کہانی اتنی ہی ہے"، بچپن میں گھر میں پیار سے پکاری جانے والی رابعہ نے کہانی ختم کرتے ہوئے ننھی رقیہ سے پوچھا کہ "یہ کہانی دادی کی کہانی کی طرح اچھی ہے یا امی کی کہانی کی طرح خراب ہے؟" "یہ بھی خراب کہانی ہے؟" ننھی رقیہ نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا اور تھوڑی دیر کے بعد بچی آرام سے سو گئی۔

بقیہ صفحہ ۴۶

"مولانا آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ سر سید کے ساتھیوں میں تھے اور جنگ آزادی میں بھی آپ نے حصہ لیا ہے۔ "گلشن اُمید کی بہار" سے مطلب ہے کہ وہ امید کو ایک فرحت بخش بہار سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ میں امتحان دے رہی ہوں اور اس اُمید پر دے رہی ہوں کہ میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔ اسے اپنی زبان میں یعنی ہندستانی زبان میں آس کہتے ہیں۔ غالب نے لکھا ہے کہ آس کا پنچھی ہاتھ سے چھوٹا جائے رے"

میرا پھر وہی حال ہوا جو اس سے قبل کئی بار امتحان کی کاپیاں پڑھنے کے سبب ہو چکا تھا۔ سر کے تیز درد سے نجات پانے کے لیے کئی گولیاں کھائیں۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اسی دن امتحان کی کاپیوں کا بنڈل یونی ورسٹی میں واپس کر دیا اور اس کے فوراً بعد دار جلنگ کے ٹکٹ واپس کرنے کے لیے اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن، مجھے داغ کے شعر کا دوسرا مصرع اکثر یاد ہی نہیں آتا۔ بس ایک آہِ سرد کے ساتھ دہراتا ہوں ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ

ڈاکٹر عارفہ سلطانہ
متصل مسجد - محلہ راجپان، ٹونک (راجستھان)

ہندستان کی عہد ساز خواتین

اس واسطے چھیڑا ہے پروانوں کا افسانہ
شاید تیرے کانوں میں پیغام عمل جائے

ہندستان کی تاریخ ان عہد ساز خواتین کو نہیں بھلا سکتی، جنھوں نے دار و رسن کی آزمائش سے گزر کر ہندستان کی تاریخ کو نیا موڑ دیا ہے۔ کبھی یہ میدان جنگ میں تلوار چلاتی نظر آئیں، کبھی بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں شاہی فرمان جاری کرتی نظر آئیں، کبھی انھوں نے ایک کے سر سے دوسرے کے سر پر تاجِ شاہی پہنچادیا۔ کبھی وہ تاج خود ان کے سروں کی زینت بنا۔ انھوں نے صرف عیش و عشرت میں ہی زندگیاں نہیں گذاریں بلکہ وطن کی خاطر اپنی جانوں کی قربانیاں بھی دیں۔

آزاد ہندستان کی تاریخ بھی عہد ساز خواتین سے خالی نہیں، آج زندگی کے ہر شعبہ میں خواتین اعلا عہدوں پر فائز نظر آتی ہیں۔ یہ موضوع دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پُر کشش اور تجسس سے بھرا ہوا ہے لیکن بخوف طوالت میں یہاں چند نامور خواتین کا ہی ذکر کروں گی۔

رضیہ سلطان ہندستان کی پہلی ملکہ تھی۔ التمش کی یہ بہادر بیٹی جب ہندستان کی ملکہ بنی تو غیور پٹھانوں کو ایک عورت کی ان پر حکمرانی منظور نہ ہوئی۔ غیرت سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے اور انھوں نے متحد ہو کر اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا لیکن رضیہ سلطان نے سرکش اور باغی سرداروں کو شکست دے دی اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف محبت کے پھولوں سے ہی لطف اندوز ہونا نہیں جانتی، بلکہ جنگ کے میدان میں بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر سکتی ہے۔

رضیہ سلطان کے بعد ہمیں گلبدن بیگم ہمایوں نامہ لکھتی نظر آتی ہیں۔ سلیمہ سلطانہ شاعری کرتی نظر آتی ہیں۔ دکن کی خشک پہاڑیوں پر ایک چاند سا چہرہ رکھنے والی حسینہ گھوڑے پر دوڑتی

نظر آتی ہے جو اس قدر خوبصورت ہے کہ چاند بھی اس کے آگے ماند پڑجائے اسی لیے لوگ اسے چاند بی بی کہتے تھے۔ جو اتنی نڈر تھی کہ اس نے اپنے جیتے جی اکبر اعظم کی عظیم فوجوں کو قلعہ احمد نگر فتح نہیں کرنے دیا وہ اکبر اعظم جیسے جلیل القدر بادشاہ کی فوجوں سے ٹکر لینے میں ذرا بھی نہیں گھبرائی تھی۔ اسی لیے اس آہنی نسوانی چٹان کو لوگ جون آف آرک بھی کہتے ہیں۔

چاند بی بی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہمیں نور جہاں نظر آتی ہے جس نے ایک غریب باپ کے گھر جنم لیا لیکن کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں تاج شاہی لکھ دیا تھا۔ اس لیے وہ بادشاہ جہانگیر کی چہیتی بیگم بنی۔ تاریخ شاہد ہے کہ پہلی بار کسی بادشاہ کے ساتھ اس کی بیگم کا نام بھی سکّوں پر لکھا جانے لگا۔ وہ ایک باوقار اور عظیم حکمراں تھی۔ نفاست پسندی، علمیت، ذکاوت میں اس کا مرتبہ بہت بلند تھا، نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کا اسے بہت شوق تھا۔ پولو کی بہترین کھلاڑی اور بے پناہ حسن کی مالک کو بادشاہ نے اپنی مُہر تک اس کے حسن کی نذر کردی۔

نور جہاں کے بعد ممتاز محل شاہجہاں کے دل پر حکومت کرتی نظر آتی ہے جس کی یاد میں شاہجہاں نے تاج محل جیسی خوبصورت لافانی یادگار تعمیر کروائی —— شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا بھی ایک باہمت، باحوصلہ شہزادی تھی جس نے اپنے باپ کے آخری دنوں میں اس کا ساتھ دیا اور خاندانی روایات اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے اپنی محبت کو قربان کردیا۔

اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت انتشار کا شکار ہوگئی انگریز دن بدن تجارت کے ساتھ ساتھ ہندستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔ حتیٰ کہ 1857 کے تاریخ ساز انقلاب کے ساتھ ہی مغل سلطنت نے اپنی آخری سانس لی۔ ہندستان کی عظیم خواتین اس افراتفری اور انتشار کے دور میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتی نظر آتی ہیں۔ زینت محل نے زندگی کے آخری ایام میں بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دیا۔ لکھنؤ کی بیگم حضرت محل جیتے جی فرنگی طاقت کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں ہوئی۔ زینت محل نے جلاوطنی کی موت کو غلامی کی زندگی پر ترجیح دی۔

جنگ آزادی کی لڑائی میں ایک جاں باز رانی سر سے کفن باندھے فرنگیوں سے ٹکر لیتی نظر آتی ہے جس کے دل میں آزادی کی جوت اس طرح جل رہی تھی کہ اس نے اپنا کل اثاثہ یہاں تک کہ آزادی پر اپنی جان تک نچھاور کردی۔ یہ تھی جھانسی کی رانی لکشمی بائی، اس نے جس دلیری اور ہمت کا ثبوت دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ملک پر کبھی کٹھن وقت آپڑے تو عورت میدان جنگ میں بھی کود سکتی ہے۔ لکشمی بائی نے بھی بڑے بڑے سورماؤں کے دانت کھٹّے کردیے اور آخری وقت تک آزادی کے لیے لڑتی رہی اور شہید ہوگئی۔

آزادی کی تحریک میں جہاں شمالی ہند میں جھانسی کی رانی، حضرت محل اور زینت محل وغیرہ

[redacted]

کارہائے نمایاں انجام دیتی نظر آتی ہیں وہاں آزادی کی لڑائی میں بہار کی خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ جیل گئیں، انھوں نے شعلہ فشاں تقریریں کیں۔ ستیہ گرہ میں گاندھی جی کا ساتھ دیا۔ ان نامور خواتین میں شریمتی سرسوتی دیوی، مسز حسن امام، ساوھنا دیوی، شریمتی ارملا دیوی، شریمتی پربھاوتی کے نام بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے گاندھی جی کے کہنے پر گھر گھر جاکر شراب بندی کی تحریک چلائی اور آزادی کی اس لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ہندستان کی عہد ساز خواتین میں ایک اور نام بلندی پر چمکتا ہوا نظر آتا ہے وہ نام مسز سروجنی نائیڈو کا ہے۔ جنھوں نے سیاست اور ادب کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ سماجی خدمت کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی۔ انھوں نے گیارہ برس کی عمر سے انقلابی شاعری شروع کی تھی۔ 1919 میں جب جلیان والا باغ میں قتل عام ہوا تو ان کی روح تک لرز اٹھی۔ انھوں نے انگلینڈ اور امریکہ میں اس سانحہ پر بھرپور روشنی ڈالی۔ جس سے انگلینڈ کے حکمراں اور اخبارات چونک اٹھے۔ ہندستان آکر انھوں نے جنگ آزادی میں حصّہ لیا۔ 1925 میں کانپور کی کانگریس کمیٹی کی صدر منتخب ہوئیں۔ 1931 میں انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ مل کر نمک بنایا اور جیل گئیں۔ آزادی کے بعد وہ اترپردیش کی گورنر مقرر ہوئیں۔ ان کی انگریزی نظموں کے تین مجموعے بھی شائع ہوئے۔ وہ ایک بہترین مقرر تھیں اور ایک اچھی شاعرہ اور ملک و قوم کی رہنما بھی اِس ناتے انھیں بلبل ہند (بھارت کوکیلا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے)

بیگم حسرت موہانی اور بیگم زلیخا آزاد نے اگرچہ عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن حسرت موہانی اور ابوالکلام آزاد نے ان خواتین سے مستقل مزاجی اور ایثار نفس کا ایسا سبق حاصل کیا جس نے ان دونوں صاحبان کو سیاست، صحافت اور شاعری کے میدان میں کہیں سے کہیں پہنچادیا۔ جب ابوالکلام آزاد جیل میں ہوتے تھے تو ان کے تمام سیاسی کام بیگم آزاد ہی بہت خوش اسلوبی سے کرتی تھیں۔ اسی طرح حسرت نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گذارا۔ اس عرصے میں بیگم حسرت ہی ان کے تمام کاموں کو سنبھالتی تھیں۔ مشاہدات زنداں اور اردوئے معلّٰی میں ان مشکلات مصائب اور سختیوں کا ذکر ہے جن کا سامنا بیگم حسرت نے کیا —— جس کو پڑھ کر انگریزوں کی آمریت اور بربریت کا پتا چلتا ہے ——

سروپ رانی نہرو (کملا نہرو) نے عملی طور پر سیاست میں تو حصہ نہیں لیا لیکن موتی لال نہرو اور جواہرلال نہرو کو جنگ آزادی میں حصہ لینے کو کبھی منع نہیں کیا۔ جنگ آزادی میں انھوں نے گھر کے اندر کی لڑائی لڑی یعنی گھر کی تمام ذمے داریوں کو خوش اسلوبی سے پورا کیا۔

1857 سے 1947 تک بے شمار خواتین گمنامی میں رہ کر بھی وطن کی آزادی کے متوالوں

کی شریک کار رہیں۔ لیکن ان میں ایک نام سرفہرست ہے جو ہندستان کے بچے بچے کے دل میں بستا ہے۔ اس نام کو لوگ عقیدت و محبت سے لیتے ہیں۔ ہم انھیں پریہ درشنی یعنی اندرا گاندھی کے نام سے جانتے ہیں۔ آپ 19ر نومبر 1917 کو الہ آباد کے آنند بھون میں پیدا ہوئیں۔ آپ دادا کی اصول پسندی، باپ کی نڈرتا، ماں کے ضبط و تحمل کی طاقت لے کر اس دنیا میں آئیں۔ دہلی کے کینڈر گارٹن سے آپ کی تعلیم شروع ہوئی۔ والد جواہر لال نہرو اور دادا موتی لال نہرو کے بار بار جیل جانے کی وجہ سے آپ کی تعلیم میں رکاوٹیں آتی رہیں لیکن نہرو جی کی جیل میں بھی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ خطوط کے ذریعے ہی اندرا جی کی بہترین تربیت کر سکیں۔ اکیس سال کی عمر میں آپ کانگریس کی ممبر بنیں 26ر مارچ 1942 کو ان کی شادی فیروز گاندھی سے ہوئی۔ اس دور میں زیادہ تر فیروز گاندھی بھی جیل میں رہے۔ آپ نے اپنی ازدواجی زندگی میں دو انمول رتن راجیو گاندھی اور سنجے گاندھی پیدا کیے ۔1947ء میں جب ملک آزاد ہوا۔ تو آپ نے نہرو جی کی پرائیویٹ سکریٹری کے فرائض انجام دیے۔ 1959 میں آپ کانگریس پارٹی کی صدر کے معزز عہدے پر فائز ہوئیں۔ 1964 میں آپ نے وزیر اطلاعات و نشریات کا عہدہ سنبھالا۔ شاستری جی کے انتقال کے بعد اندرا گاندھی ملک کی پہلی وزیر اعظم بنی۔ اس زمانے میں آپ نے بینکوں کا نیشنلائزیشن کیا۔ پریوی پرس پر روک لگائی اور بیرونی حملوں کا مقابلہ کیا اور اپنے ملک کا وقار قائم رکھا۔ انھوں نے ہندستان کو عظیم اور ممتاز بنانے کے لیے بے شمار کام کیے مہاتما گاندھی سے انھوں نے صداقت، محبت اور عدم تشدد کا جو سبق سیکھا تھا انھوں نے ان تعلیمات پر عمل کر کے ہندستان کو مضبوط بنایا۔

غریبی کے خاتمہ کی حتی الامکان کوشش کی، سماج واد اور خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کی نویں ایشیاڈ کھیل ہندستان میں منعقد کروائے ناوابستہ ملکوں کی کانفرنس ہندستان میں کروائی جس میں 101 ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی۔ اندرا جی کے ان کارناموں کی وجہ سے ان کو بھارت رتن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

ہماری قدیم روایات رواداری، دانشمندی اور سیکولرازم کو انھوں نے آزادی کے مجاہدوں کی میراث سمجھ کر محفوظ اور برقرار رکھا۔ انھوں نے عوام میں نئی قدروں کا شعور پیدا کیا۔ ملک نے ان کی رہنمائی میں سائنس و ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک مذہبی کٹرپن، فرقہ پرستی اور طبقاتی فرق کو مٹانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ انھوں نے عوام کی بہتری کے لیے اپنے خون کی آخری بوند بھی قربان کردی۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ 31ر اکتوبر 1984 کو ملک کی اس عظیم رہنما اور عہد

ساز خاتون کو ان ہی کے محافظوں نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا لیکن ہندستان میں ان کی تعلیمات ان کی فکر و فلسفہ اور ان کے دانشمندانہ اقدامات ہمیشہ ہندستانی عوام کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

اے مورخ اٹھا قلم اپنا داستان لکھ لہو سے اب اس کی

زندگی عہد ساز تھی جس کی

اہل گیتی کو ناز تھا جس پر

ہندستان کی عہد ساز خواتین کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں علی برادران (مولانا محمد علی، شوکت علی) کی والدہ "بی اماں"، بھوپال کی حکمراں بیگمات شاہجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم کے نام نامی بھی قابل ذکر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وجے لکشمی پنڈت، مدر ٹریسا، اندومتی گوئنکا، ارونا آصف علی کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔

ہمارے ترنگے جھنڈے کا خواب ایک انقلابی خاتون بھکائی رستم کاما نے دیکھا۔ آج کا ترنگا ان ہی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

سیاست کے ساتھ ساتھ ادب کی دنیا میں بھی خواتین کے بہت بلند رتبے نظر آتے ہیں۔ جیسے مہادیوی ورما' نذر سجاد حیدر' عصمت چغتائی' امرتا پریتم' جیلانی بانو' قرۃ العین حیدر وغیرہ وغیرہ۔

ادب اور سیاست سے ہٹ کر اور بہت سے معزز عہدوں پر ہمیں خواتین سرفہرست نظر آتی ہیں۔ آزادی سے پہلے پولس کی نوکری غلامی اور ناانصافی کو ظاہر کرنے والی تھی لیکن آزادی کے بعد اس میں بہت سی تبدیلیاں آئیں اس میں سب سے بڑی تبدیلی تھی کہ خواتین نے بھی اس پرخار میدان میں قدم رکھنا شروع کیا۔ 1949 میں ہمیں پولس کے اعلا عہدوں پر' پرعزم و باہمت عورتیں نظر آتی ہیں۔ ان میں سکنتلا جی کا نام سب سے پہلا ہے۔ ان کے علاوہ بھی 1949 کے بعد سے پولس کے اعلا عہدوں پر خواتین فائز نظر آتی ہیں۔ 1980 میں منجری جاروہار بہار کی پہلی خاتون آئی پی ایس بنی۔ کرن بیدی ایس پی بنی اور ان کے علاوہ بہت سی خواتین ہمیں شعبۂ پولس میں نظر آتی ہیں۔ کانتا تلوار انگلینڈ میں ایشیا کی سب سے پہلی مجسٹریٹ بنی۔

وقت کوتاہ اور قصہ طولانی کے سبب یہاں زندگی کے ہر شعبے کی معزز عہد ساز خواتین کا ذکر تو ممکن نہیں ہے مگر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ چاہے وہ نغمہ کی دنیا ہو' کھیلوں کا میدان ہو' یا تعلیم اور سائنس کی دنیا ہو' خواتین ہر جگہ اپنے کارناموں کی وجہ سے شہرت حاصل کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔

...ظہر مسعود
...بستان، دین دیال روڈ
...ھنؤ ۲۲۶۰۰۳

خادمِ ادب

جہازی سوٹ کیسوں کے ساتھ اپنی سانسوں کو بھی درست کرنے میں انھیں کچھ نہیں تو بیس منٹ ضرور لگ گئے ہوں گے۔ ریشمی کُرتے پاجامے میں ان کا مجرّب اور بے ڈول بدن ایسے بھرا ہوا تھا جیسے بڑھل کے اندر گودا۔ جسمانی اعتبار سے ہم دونوں میں وہی تناسب تھا جو کٹھل اور کروندے میں ہوتا ہے۔ سانس لیتے وقت وہ لہار کی دھونکنی کی طرح پھول پچک رہے تھے اور ان کے نفس کی آمد و شد براہ راست ہماری عافیت پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

اس عذاب سے بچنے کا ہم نے یہ طریقہ نکالا کہ جب وہ سانس اندر کھینچ کر پھولتے تو ہم باہر نکال کر پچک جاتے اور جب وہ سانس باہر نکالتے تو ان کے تصرف سے جو تھوڑی بہت آکسیجن بچ جاتی اسے ہم اپنے پھیپھڑوں میں بھر کر حتی المقدور پھولنے کی کوشش کرتے۔

مختصر یہ کہ ہم دونوں صنعتِ تضاد کی تصویر بنے منٹوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر رہے تھے اور ان کے لامحدود جسم کی بدولت ہم باریک کانچ کی شیشی کے مانند ایک کونے میں فٹ، ہلنے جلنے سے بھی محروم تھے حتیٰ کہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ دو چار گھڑی زندگی اسی شکل سے اور رگڑ گئی تو ہم بیاد رکھنے کے قابل بھی نہیں رہ جائیں گے کہ خدا رکھتے تھے اور حیاتِ مستعار کا قرض کسی بھی لمحے ہمارے سر سے اُتر جائے گا۔

لہٰذا ہم نے سوچا کہ جان جہاں آفریں کے سپرد کرنے سے پہلے کم از کم آخری خواہش کا اظہار تو کر ہی دیا جائے۔ مگر ہم کچھ اس طرح Packed تھے کہ باصرہ اور سامعہ کو چھوڑ کر باقی حواسِ خمسہ پر سے ہماری قدرت ختم ہو چکی تھی۔

ایک مرتبہ وہ کسی حاجت سے مخالف سمت کو جھکے، مگر، اس سے پہلے کہ ہم موقع کو غنیمت جان سکتے، وہ واپس آنا شروع ہو گئے اور واپسی کے اس عمل میں ہم کمپارٹمنٹ کی دیوار اور ان کے پہاڑ جیسے تخیتے کے بیچ مجسم "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے،، بن گئے اور اس غیر معمولی دباؤ سے ہماری آخری خواہش چیل جھپٹے میں پھنسے چوہے کی "چیں،، بن کر نکل گئی۔

"جی کچھ فرمایا آپ نے ؟،،

انھوں نے ہماری طرف گھومنے کی کوشش میں ہمیں گرم آگ کمپارٹمنٹ کے تنور میں نانِ تنکی کی طرح چپکاتے ہوئے دریافت کیا۔

"حضور کا اسم گرامی ؟،،

ہم نے بہ مشکل کہا اور ساتھ ہی انگشت شہادت سے انھیں پرے ڈھیلنے کی کوشش کی۔ ہماری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا جب ہم نے دیکھا کہ انگشت شہادت نے وہ کام کیا جو بقول سودا رستم سے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید اسی موقع پر، وہ بھی ہماری انگشت شہادت کی صحت کو دیکھ کر، کہتے ہیں، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا،

"خاکسار کو زرتار بھسمنڈوی کہتے ہیں"

موصوف نے دونوں ہاتھ جوڑ کر خاکساری کا مظاہرہ کچھ اس شدت سے کیا کہ ان کے مرکزِ ثقل میں خاصا خلل واقع ہوگیا اور وہ سیٹ پر سے فرش پر تشریف لے آئے۔ کودا کوئی یوں چھت پہ ترکی دھم سے نہ ہوگا۔ اس تفصیل کا محل نہیں ہے کہ انھیں دوبارہ اپنی جگہ پر کیونکر نصب کیا گیا۔

"زرتار بھسمنڈوی —— یعنی کہ —— واہ بھئی، یہ بھی کوئی نام ہوا!" بھسمنڈوی کا کانٹا ہمارے حلق میں اٹک گیا تھا۔

"آپ نے منقار کسمنڈوی سنا ہے؟ یقیناً سنا ہوگا"، انھوں نے ہماری بات کاٹ کر بٹوے میں سے پاؤ بھر پان مسالہ نکال کر اپنے منہ میں جھونکتے ہوئے کہا "جب آپ اسے ہضم کر سکتے ہیں تو زرتار بھسمنڈوی میں آپ کو کیا قباحت نظر آتی ہے؟"

موصوف کی دلیل بھی چونکہ انھیں کی طرح وزنی تھی اس لیے بات کا رخ بدلنے میں ہی عافیت نظر آئی اور ہم نے دریافت کیا:

"جناب کا شغل؟"

"خدمت ادب"

"یہ سب کچھ خدمتِ ادب کی بدولت؟"

ہم نے ان کی شان و شوکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں جناب۔ اس سب کی بدولت خدمتِ ادب"

"خدمت ادب کے علاوہ آپ اور کیا کرتے ہیں؟"

"بھوسے کی آڑھت"

"ادب اور بھوسے کا تعلق کچھ سمجھ میں نہیں آیا"، پھر ان کی ناراضگی کے خیال سے فوراً بات برابر کی۔

"ویسے خود ادب اور ادیب کے تعلقات بھی آج کل خاصے کشیدہ نظر آتے ہیں"

"تعلق ہے صاحب، برابر ہے۔ آپ جانتے ہیں دنیا میں ادب کی خدمت کو پیشہ بنانے والے بہت ہیں"

"جی۔ جانتے ہیں"

"اور بھی بہت سے کھلاڑی اس میدان میں ہیں جن میں پیشہ ورانہ چشمکیں بھی چلا کرتی ہیں —— یہی بھوسا، جو بظاہر صرف گائے بھینسوں کے کھانے کی چیز ہے، بوقت ضرورت رقیبانِ روسیاہ کے بھر بھی دیا جاتا ہے"

"اس وقت آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟"

"اس وقت ہم جارہے ہیں حاکمِ اعلا سے ملنے ۔ ہمارے شہر میں ایک عالمی سمینار منعقد ہونے والا ہے ـــــ اس کی صدارت کے لیے تاریخ لینا ہے۔"

"سمینار کس موضوع پر ہے ؟"

"آپ جانتے ہیں کہ ادب کی دنیا میں فیشن کی طرح ہر وقت نئی چیز کی مانگ رہتی ہے اور نئی چیز یں پیش کرتے ہیں انجمن بھوسا فروشانِ ادب کا جواب نہیں ۔ ناچیز اس کا بانی صدر ہے ۔ یہ انجمن کثیر تعداد میں اچھوتے موضوعات پر کامیاب تقریبیں منعقد کر چکی ہے۔"

"مثلاً ؟"

"مثلاً ادب میں بھوسے کا مقام، ہماری شعری روایت میں بھوسے کی اہمیت، اردو میں بھوسا نگاری کی تحریک، آغاز، ارتقا، اور معلوم ہو تو انجام بھی، بھوسے کے بغیر ہمارے شعری سرمائے کا کیف وکم وغیرہ ۔"

"موضوع تو بڑے جان دار ہیں !"

"جی، سمینار اس سے بھی زیادہ جان دار ہوتے ہیں" انھوں نے ہمارے گھٹنے کو اپنے خیال میں تھپ تھپاتے اور ہمارے خیال میں اس کا کچومر نکالتے ہوئے کہا "ہم آپ کو بھی سمینار میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔"

"کہیے، آپ سامع کی حیثیت سے شریک ہونا پسند کریں گے یا مقالہ نگار کی حیثیت سے ؟"

"مقالہ نگاری تو دور رہی، ہم تو ڈھنگ کے سامع بھی نہیں ہیں"

"کیا مطلب ؟ سامع نہ سہی آپ مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی شرکت نہیں کر سکتے ؟"

"جی ـــ مقالہ نگاری کوئی آسان کام ہے ؟"

"آپ بھی کمال کے آدمی ہیں ـــــ کیا آپ کو پانچ ستارہ ہوٹلوں میں عیش کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ؟ کار پر بیٹھ کر سیر، تفریح اور شاپنگ کرنے میں دشواری ہوتی ؟ خاص کر جب زر بھی نہ خرچنا ہو ـــ سکنڈ کلاس سے برآمد کیے جانے کے باوجود ہوائی جہاز کا کرایہ وصول کرنے میں آپ کو زحمت ہوتی ہو ؟ ؟ ؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہے، مگر مقالے کے نام سے جو چیز ہمارے تصور میں آتی ہے، آپ کے سارے فسانے میں اسی کا ذکر نہیں !"

"مقالہ نگاری کا ایسا ہی شوق ہے تو کچھ لکھتے لائیے گا۔"

"کچھ ـــ یعنی کہ کچھ بھی"

"بالکل صاحب بالکل"

"اور وہ جو مائک پر آکر پڑھنا ہوتا ہے ؟"

"وہ اس میدان کے نوآموز کھلاڑیوں کا کام ہے"

"مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ جس طرح فیشن شو میں شوخ و شنگ حسینائیں آنچل لہراتی ہوئی نکل جاتی ہیں اسی ط

ماہر فن مقالہ نگار بھی مائک پر کاغذ لہرا کر چلے جاتے ہیں۔"
"یہ تو سامعین کے ساتھ بے انصافی ہوئی!"
"لگتا ہے آپ نے کسی عالمی سمینار میں شرکت نہیں کی۔ اسی قبیل کے مقالہ نگار سامعین میں شرفِ قبول حاصل کرتے ہیں۔ جن کی توجہ سمینار کے شروع ہوتے سے پیشتر ہی اس کے اختتام پر مرکوز ہو جاتی ہے۔"
"ایسا کیوں؟"
"ایسا اس لیے کہ تقریب کا خاتمہ پُرتکلف ضیافت کا نقیب ہوتا ہے۔"
"آپ اسی کو ادب کی خدمت کہتے ہیں؟"
"آپ کو شک ہے؟ معلوم ہوتا ہے آپ ادب کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑنے کے مخالف ہیں"
"اجی توبہ کیجیے ـــ ہمارے دل میں تو ادب کا رشتہ روزی روٹی سے جوڑنے کے ارمان کب سے مچل رہے ہیں۔ کہیے، کب، کہاں، کتنے بجے مقالہ لے کر حاضر ہو جاؤں؟"

شپا بھاردی
ترجمہ: قاسم ندیم
وِلس کالونی ۵۰۵/۹
گوونڈی۔ بمبئی ۴۳

رضائی

ہندی ادب سے ایک کہانی

کلپنا نے بڑا صندوق کھولا۔ ایک عجیب سی بو کے ساتھ فنیل کی مہک اس کی ناک میں داخل ہوگئی۔ پرانی ساڑیوں میں لپٹے کپڑے اس نے باہر کیے۔ برآمدے میں چارپائی بچھائی۔ اس پر چادر ڈال کر شال، سوئٹر، مفلر سب کو پھیلا دیا۔ دھوپ دکھانے کے لیے چارپائی پر پھیلے رنگین اونی کپڑے کلپنا کو بہت اچھے لگ رہے تھے۔ کاش! زندگی بھی رنگ برنگی اونی دھاگوں کی طرح ہوتی۔ سوئٹروں کو دھوپ میں پھیلاتے ہوئے کلپنا غور سے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس میں کون سے سوئٹروں کی اون جم رہی ہے، کون سے چھوٹے ہو رہے ہیں۔ کون سے پرانے پڑ گئے ہیں...... کس کی اون گھس گئی ہے.... کس کا رنگ اڑ گیا ہے۔

دھوپ میں شدت آ رہی تھی۔ تبھی اندر سے سلیل کی تیز آواز کلپنا کو سنائی دی: "صندوق کیوں کھلا پڑا ہے؟ بند کرو.... بدبو آ رہی ہے۔" بات ختم ہوتے ہی کلپنا نے باہر ہی سے کہا، "گرم کپڑوں کو دھوپ دکھانی ہے.... کل رات بچوں کو سردی لگ رہی تھی۔ دو چار دن بعد کمبل سے کام نہیں چلے گا۔"

کلپنا صندوق کے پاس آ گئی۔ رضائی نکالی۔ آخری رضائی نکالنے کے ساتھ بہت تیز بدبو آئی۔ دیکھا تو چوہا مرا ہوا تھا۔ موٹا چوہا ایک دم چپٹا ہو کر صندوق سے چپک گیا تھا۔ کلپنا نے دیکھا اس کا چمڑے سے چمڑا چپک گیا تھا۔ گوشت کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کلپنا نے اس کو پھینکا۔ صندوق بند کیا۔ رضائی کو کمرے سے باہر لائی۔ اس کو دیکھتے ہی سلیل نے کہا، "کیا گھر میں بدبو پھیلا رہی ہو۔ ان سب کو اوپر پھیلانا۔ نہیں تو سارا گھر بدبو سے بھر جائے گا۔"

کلپنا نے اپنے سر پر رکھی رضائی کو برآمدے کی زمین پر رکھ دیا۔ آنچل کو پیچ دے کر کمر میں ٹھونستے ہوئے رضائی کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے قدموں کے پیچھے وہ جملے چھوڑتی گئی۔ "ابھی آپ کے لیے ناشتہ بنا دوں، جب آپ آفس چلے جائیں گے تب اوپر ڈال دیں گے۔ رضائی تین منزلیں چڑھانا پڑے گی۔ پھر ابھی سب کے آفس جانے کا وقت ہے۔ مجھے چڑھنے میں دقت ہوگی۔ رضائی سے بھی بدبو آ رہی ہے۔ لوگوں کو پریشانی ہوگی۔" قدموں کی آہٹ کے ساتھ بات ختم ہو گئی۔ کلپنا نے اسٹو جلانے کے لیے ماچس کی تیلی نکالی۔

"جلدی سے جاؤ یہاں سے، میں آفس دیر سے چلا جاؤں گا۔" کلپنا کی اتنی سفارش کے

بعد بھی سلیل راضی نہیں ہوا اور ناک بند کیے ہوئے اپنا ڈھکا آئی جی آرڈر دے ڈالا۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ رضائی کو اوپر دھوپ میں لے گئی۔ پھیلاتے ہی دیکھا۔ رضائی بیچ بیچ میں سے کئی جگہ سے ایسی صاف تھی جیسے توپ کا گولہ نکل کر گیا ہو۔ اس نے سوچا، کٹا پھٹا تو رفو کیا جا سکتا ہے۔ اب اس رضائی کے لیے کیا کرتا ہوگا؟ ہانپ تو رہی تھی، سانس اور تیز چلنے لگی کہ اب یہ رضائی کیسے ٹھیک ہوگی؟ اس میں پیوند کیسے لگے گا مگر لگانا تو پڑے گا ہی۔ ایک تو سردی، اس پر رضائی کی یہ حالت......،،

یہی سوچتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ چھت کی دھوپ کی وجہ سے اس کی آنکھیں چوندھیا گئی تھیں۔ رضائی کے سبب اس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ کمرے میں آئی۔ اخبار سے نظر ہٹاتے ہوئے سلیل نے کہا ،، بڑی دیر لگادی، اوپر والی سے بات کرنے لگی تھی کیا؟ یہی عادت تمھاری خراب ہے، جہاں جاتی ہو بیٹھ جاتی ہو، خیر میں تیار ہوں۔ مجھے آفس کے لیے اب بہت دیر ہوگئی ہے میں جارہا ہوں۔،،

کلپنا نے شیریں اور پیار بھرے انداز میں کہا ،، بس ذرا دیر ٹھہریے ،،

کلپنا کچن میں گئی۔ ناشتا تیار کرکے لائی۔ کلپنا کو پریشان دیکھ کر سلیل نے پوچھا، اتنے ٹینشن میں کیوں ہو؟ کیا کسی نے کچھ کہا؟ بات ختم کرتے ہوئے سلیل ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ بے حد دبی آواز میں پسینا صاف کرتے ہوئے کلپنا نے جواب دیا ،، چوہوں نے رضائی کتر لی ہے۔،،

سلیل نے چونکتے ہوئے کہا ،، چاروں ،،

کلپنا نے تسلی بندھاتے ہوئے کہا نہیں..... ایک۔

غصّے میں سلیل نے کہا، ان چوہوں سے میں پریشان ہوگیا ہوں۔ سالوں کو مارنے کی دوائی دو تو کھاتے نہیں ہیں۔ اگر کھا بھی لیتے ہیں تو مرتے نہیں۔ بڑی آفت ہے۔ دوائی میں ملاوٹ۔ زہر میں ملاوٹ۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ کہتے کہتے سلیل اُگلے ہوئے نوالے کی طرح باہر چلا گیا۔ قدم ابھی برآمدہ بھی نہ چھوڑ پائے تھے کہ وہ کلپنا کہتا ہوا پھر کمرے میں داخل ہوگیا ،، سنو.... اسے سن رہی ہو... پتا چلا ہے کہ راشن کی دکان میں مٹی کا تیل آگیا ہے، لیتی آنا دوپہر میں۔ گیس آج کل بہت پریشانی سے ملتی ہے۔ مہینے بھر بعد نمبر بک کروانے پر بھی سالوں کی منت سماجت کرنی پڑتی ہے جو کرتے نہیں بنتی۔ گیس رہتے ہوئے بھی رشوت خوردینے آنا کانی کرتے ہیں۔ ہر دو مہینے میں شارٹیج ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں سالے کیا گھپلا کرتے ہیں؟ ،،

سلیل کا غصّے سے بھرا بیان سن کر کلپنا آہستہ سے بولی ،، مجھے آج گیہوں دھونا ہے۔ کل کے بعد آٹا ختم ہو جائے گا۔ باہر سے آٹا لیتے ہیں تو سب کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔

سلیل نے طریقہ بتاتے ہوئے کہا ،، ایسے ہی بنا لو صاف کرکے۔،،

کلپنا نے اسی لہجے میں جواب دیا ،، رائی، بھوسہ اور مٹی بہت ہے۔ دھوئے بغیر گیہوں صاف نہیں ہوگا۔،،

سلیل نے دوبارہ چلاتے ہوئے کہا۔ تو مٹی کا تیل کیسے آئے گا؟ جو کریں سو ہم کریں۔ گھر پر رہ کر، ذرا دور جاکر اتنا سا کام نہیں کرسکتی ہو.....؟

تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر وقت ملا تو آج نہیں تو کل لے آؤں گی۔"
اگر ختم ہو گیا، اور کوئی مہمان آ گئے تب ؟" سلیل نے میز پر ہاتھ پٹکنے کی سی آواز میں کہا۔
"آپ جائیے آفس۔ دیر ہو رہی ہے، میں دیکھ لوں گی۔" کلپنا ذمے داری کے لیے تیار ہوتے ہوئے بولی۔

سلیل صبح کے ایک پہر کی طرح چلا گیا۔ دھوپ کھسک رہی تھی اور چارپائی پر سایہ آ گیا تھا۔ کلپنا نے چارپائی گھسیٹ کر دھوپ کی طرف بڑھا دی تھی۔ اسی چارپائی پر اسے ابھی گیہوں سکھانے تھے۔ یہاں اتنی جگہ کہاں کہ دو چارپائیاں پھیلا سکے۔ .... اگر پھیلا دی تو اوپر والے لوگ آئیں گے کہاں سے۔ ایک اور جھنجھٹ پھر اپنے پاس دوسری چارپائی کہاں ہے؟ دو تخت اور ایک صوفہ ہے بس کسی طرح کام چلتا ہے۔ چارپائی کی کمی کی وجہ سے سردیوں میں پریشانی ذرا بڑھ جاتی ہے۔ زمین پر سونا ذرا مشکل ہوتا ہے۔

باتھ روم میں نل کھول کر کلپنا نے بالٹی لگا دی۔ پانی میں گیہوں ڈال کر اور ہاتھ گھماتے ہوئے کلپنا سوچتی رہی۔" سلیل اگر باہر کا نل بند نہ کرواتے تو یہ پریشانی نہیں ہوتی۔ صبح باری باری سے سب لوگ باتھ روم میں نہا لیتے اور میں گیہوں باہر دھو لیتی۔ لیکن سلیل کو شور پسند نہیں۔ دوسری جگہوں پر پانی نہ آنے کی وجہ سے آس پاس اور اوپر نیچے کے لوگ پانی بھرنے کے لیے آ جاتے تھے۔ نل کے پاس ایک طرف بالٹیوں کا جھنڈ لگا تھا۔ دوسری طرف پڑوسیوں کا۔ ایک طرف بالٹیوں کا شور تو دوسری طرف پڑوسیوں کا شور۔ اب تو وہ جھنجھٹ نہیں رہتا لیکن یہ سب جو دوسری پریشانیاں بڑھ گئی ہیں پندرہ روز سے الگ۔ کلپنا اپنے بال بھی دھو نہیں پا رہی ہے۔ کبھی پانی نہیں رہتا ہے۔ کبھی کچھ ہو جاتا ہے اور جب رہتا ہے تب گھر کے بچے ہی نہانے میں لگے رہتے ہیں۔ پھر سلیل کو نہانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے پتا نہیں کیا کرتے رہتے ہیں۔ اتنی دیر باتھ روم میں.....

گیہوں دھو دھو کر کلپنا ٹوکری میں نکالتی گئی۔ گیہوں دُھل گئے۔ کلپنا کا بوجھ کم ہوتا گیا۔ گرم کپڑے سمیٹ کر اندر تخت پر رکھ دیے۔ گیہوں باہر پھیلا دیے۔ گھڑی میں دیکھا بارہ بجے تھے۔ وہ باورچی خانہ میں گھس گئی۔ کیوں کہ سلیل کے کھانا کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔

اسٹو میں پن مارا، ہوا بھری۔ دیا سلائی جل گئی اور اسٹو بھبک اٹھا۔ دہکتی آنچ اور بھرائی آواز پر پریشر کو کر رکھ کر کلپنا سوچنے لگی کہ اسٹو جلانے میں تو اتنی محنت لگتی ہے۔ کسی کو جلانے میں تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔ راکھ بھی ہوا اڑا لے جاتی ہے کہ اسی کے بہانے کسی کو کچھ پتا چل جائے۔

کلپنا روٹی سینک ہی رہی تھی کہ سلیل آ گیا۔ ڈائننگ ٹیبل سے لگی کرسی کو کھینچ کر بیٹھ گیا جیسے کسی ہوٹل میں آیا ہو۔ اس نے بیرے کی طرح کھانا پروس دیا۔ کھانا کھانے کے بعد جاتے جاتے سلیل کلپنا سے کہہ گیا، رضائی اوپر سے اٹھانے کی یاد رکھنا۔ چوہا رضائی کتر گیا ہے۔ جب بھی یاد آ جاتی ہے تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اس سال ویسے بھی ایک رضائی بنوائی تھی۔

نکھل کو لمبے عرصے تک کے لیے ٹور پر رہنا پڑتا ہے۔ ریسرچ کے کام میں۔ زکام بھی ایسے آئے دن شہر میں ہوتے دنگوں کی طرح ہو جاتا ہے۔ دو گدے نے تو بنوائے تھے تکیے بھی سب ا

...ی ہو گئے ہیں کہ ایک غلاف میں دو تکیے رکھنے پڑتے ہیں۔ اوپر سے یہ چار پانچ جگہ سے ایک رضائی ...جو ہے کاٹ گئے ہیں۔ سلیل اپنی یہ باتیں ایسے کہہ رہا تھا جیسے اندر کا غبار اگل اگل کر اندر کھانا نکلنے کے لیے جگہ بنا رہا ہو۔ کلپنا نے محسوس کیا کہ سلیل کھانا کھا رہے تھے اور سلیل کو فکریں ...کھا رہی تھیں۔ پریشان.... پریشان ہو کر خرچ کرتے وقت ایسے لگتا ہے جیسے لگے مہینے میں اب کوئی خرچہ ...ی نہیں ہو۔ مگر مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی لسٹ بنا کر تیار ہو جاتی ہے۔

کلپنا سوچ ہی رہی تھی کہ سلیل نے آگے جوڑتے ہوئے کہا: "گھر تو اب ایک دم پنکچر سواری ...ہو گیا ہے۔ ہوا بھرو، تھوڑی دور بیٹھ کر چلاؤ کہ ہوا نکل جاتی ہے۔" یہ سن کر کلپنا نے دلاسا دیتے ...ہوئے کہا: "کس کا گھر آج کل پٹرول کی سواریوں کی طرح چلتا ہے۔ صرف انھیں کا نا جن کے پاس چار پہیوں ...والی گاڑیاں ہیں۔ ایک بہت بڑا طبقہ ٹھیلوں کی طرح کھینچ کر اپنی گرہستی چلا رہا ہے۔ خون پسینہ بہا کر ...کبھی کبھی ایسی چڑھائی یا ڈھلان آتی ہے کہ کھینچنے والوں کی جان پر بن آتی ہے۔ ذرا ان کے بارے میں ...بھی سوچ لیا کرو۔"

"کیوں؟" سلیل نے کہا۔

تسلی ملتی ہے۔ سانس لیتے ہوئے کلپنا نے جواب دیا۔ سلیل کھانا کھا کر فائل دباتے ہوئے گھر سے باہر ہو لیا۔ کلپنا ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے گرم کپڑوں کی تہہ بنانے لگی۔ نہا کر برآمدے میں پھیلے گیہوں پر ہاتھ پھرانے آئی۔ دیکھا کہ چارپائی پر سوکھنے کے لیے پھیلے گیہوں کے اوپر کچھ کھلونے پڑے تھے۔ گیلے کپڑوں پر ہاتھ گھمایا۔ ایک جگہ گیہوں کا ڈھیر گیلا لگا۔ کلپنا سمجھی اوپر والے کرایے دار کے گملوں نے پانی گرایا ہے۔ پر پتا نہیں کیسا پانی تھا۔ کہیں جھوٹا یا گندہ تو نہیں۔ وہ فکریں ڈوب گئی۔

بے مطلب کی بے وجہ فکریں اسے کاٹنے لگیں۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ سے الجھی رہتی ہے۔ بے حد بے چین اور پریشان۔ نہ جانے کتنی طرح کی فکریں زہریلے سانپوں کی طرح اس کے ذہن میں لوٹا کرتی ہیں دیکھنے والے اس کی حالت دیکھ کر کہتے ہیں۔ آپ کی صحت اچھی ہے۔ کلپنا کو یہ سنتے ہی لگتا ہے کہ جسم کا موٹا ہونا ہی کیا صحت اچھی ہونا ہے۔ انھیں کیا پتا اس جسم کو فکروں اور پریشانیوں نے کس قدر کھوکھلا کر دیا ہے۔

بی۔ اے میں پڑھتی کلپنا کی لڑکی آ گئی۔ آتے ہی اس نے بیگ رکھنے سے پہلے ہی اپنی تیز آنکھوں کے اتار چڑھاؤ میں کہا۔ "کل پریکٹیکل کے لیے اپرن سلنا ہے اس کے لیے جین کا کپڑا چاہیے۔ پریکٹیکل لکھنے کے لیے سادے اور نوٹ سائز رولڈ پیپر چاہیے۔"

پلس ٹو میں پڑھتی لڑکی نے آکر فرمائش کی "بازار میں دہلی بورڈ کی کتابیں آ گئی ہیں۔ پاپا سے کہنا آج یا کل لے آئیں، ورنہ وہ بک جائیں گی۔"

پانچویں جماعت میں پڑھتے ہوئے راہل نے اسکول سے آتے ہی کہا: "مجھے اسکیچ پین آج ہی چاہیے۔ کل ڈرائنگ کمپٹیشن ہے۔"

کلپنا سب کی بات سن کر سوچنے لگی۔ ہر چیز کی کتنی راشننگ ہے۔ ہر جگہ لائن ہے

ہر ایک کو جلدی ہے۔ جس کے سامنے جو ضرورت ہوتی ہے، وہ اس کی سب سے بڑی ضرورت....
مجبوری اور پریشانی ہوتی ہے۔ لسٹ دیکھتے ہی دیکھتے بڑھ گئی تھی۔

سلیل نے آفس سے آتے ہی کہا "آج ساتھ میں کچھ دوست تھے۔ انھیں چائے پلانی پڑی اس لیے دیر ہوگئی۔ سامان نہیں لا پایا ہوں۔ اگر بہت ضروری ہو تو جھولا دو لے آؤں" کلپنا سلیل کی تھکان کو دیکھ کر کہنا چاہتی تھی "آج رہنے دو.... کل لے آنا" مگر ضرورت اور بچوں کی ضرورت دیکھ کر بولی۔ "چائے پی لیجیے پھر لے آئیے گا" مگر سلیل کو کلپنا کی اتنی ہمدردی بھی اچھی نہیں لگی کیوں کہ اس میں سامان لانے کا اشارہ تھا۔ جھنجھلا کر کہا "پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ چائے پی کر آیا ہوں۔ لاؤ جھولا دو....

طیش بھرے اس حکم پر کلپنا نے جھولا دیتے ہوئے ڈرتے ڈرتے بچوں کی لسٹ سنا دی۔ سلیل کو لگا جیسے چوہے نے اس کی جیب ہی کتر دی ہو۔ وہ اسکوٹر کی چابی لے کر اسکوٹر کی طرف بڑھا۔ راہل نے اپنی مانگ خود جا کر کہی اور ساتھ چلنے کی ضد کی۔ سلیل نے سمجھاتے ہوئے کہا "راہل بیٹا.... اسکوٹر خراب ہے۔ کہیں بھی کھڑا ہو سکتا ہے بریک لگتا نہیں ہے"
راہل نے سلیل کی بات کو جھوٹ قرار دیتے ہوئے کہا "ہم ساتھ چلیں گے، نہیں تو آپ لائیں گے نہیں"

سلیل کو یہ بات سن کر ایسے لگا جیسے بیٹے نے باپ کو تھپڑ رسید کیا ہو۔ پھر بھی سلیل نے کہا "آپ تو اسکول میں رہتے ہیں، آپ کا سب سامان اب تک تو میں ہی لاتا رہا ہوں۔ پھر آپ نے ایسے کیوں کہا؟" بات سلیل نے کچھ ایسے کہی جیسے میں نے کوئی غلطی نہیں کی، پھر بھی آپ نے کیوں مارا؟

راہل مان گیا۔ سلیل اسکوٹر اسٹارٹ کرنے لگا لیکن کئی کک مارنے پر بھی اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اسٹینڈ سے اترا۔ پیدل لے جا کر دوڑایا، شروع نہیں ہوا۔ سلیل ہانپنے لگا۔ آتی جاتی سانس کی طرح رک رک کر کہا۔ کلپنا، ذرا ٹول بکس دینا۔ سالا گڑبڑ کر رہا ہے۔ اب یہ بھی پرانا ہو گیا ہے۔ ٹھیک سے چلنے کے لیے اس کی بھی کچھ ضرورت بن رہی ہے۔

ٹول بکس لے کر سلیل اسکوٹر سدھارنے لگا۔ تبھی ایک آدمی اٹیچی لیے ہوئے آگیا۔ پوچھا "سلیل شکلا کا گھر یہی ہے"

سلیل نے ان پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے کہا "ہاں....... کہیے"، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

آنے والے نے اپنا تعارف دیتے ہوئے سلیل کے والد کی چٹھی دکھائی۔ تب تک کلپنا بھی آگئی۔ تعارف کرواتے ہوئے سلیل نے کہا "آپ رام چندر مشرا ہیں۔ یہاں کے ایک ٹریننگ پروگرام میں آئے ہیں۔ ایک ہفتہ یہی رہیں گے۔ ذرا خیال رکھنا۔ انھیں کوئی پریشانی نہ ہو۔"

مہمان کو دیکھ کر کلپنا کو لگا جیسے رضائی میں چوہے کا کاٹا ہوا سوراخ اور بھی بڑھ گیا ہو۔ خالی جھولوں کے گٹھے میں ایک اور خالی جھولا آگیا ہو۔

(ہندی ماہنامہ "کہانی کار"، شمارہ ۹۲-۹۴، ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔)

محمود حامد
۱۷/۱۱سی، اے جی کالونی، یوسف گوڑہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۴۵

تلاش گمشدہ

نیند سے جاگ کر میں نے سوچا کہ کاش میں سوتا ہی رہتا، یا پھر رات کے وہ لمحات لامتناہی ہو جاتے جو میں نے نیند کے انتظار میں گزارے تھے۔ مجھے رات سے خوف لگتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا۔

"یہ کیا پاگل پن ہے ـــ؟" اُس نے ڈانٹ کر کہا۔

"اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟ دیکھو نا! چاروں طرف کس قدر خوفناک اندھیرا چھایا ہوا ہے ـــ!"

"تو کیا ہوا۔ تمھارا کمرہ تو منور ہے۔"

"میں اپنے کمرے کی بات نہیں کر رہا، بلکہ کھڑکی سے باہر دیکھنے کی بات کر رہا ہوں۔"

تمھیں باہر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے! رات کا وقت ہے۔ اپنے کمرے میں سو رہو۔ دیکھو تو یہاں کی ہر چیز کتنی خوبصورت لگتی ہے ـــ! یہ رنگ برنگی بتیاں، یہ خوبصورت فانوس! ارے دن میں ان کا کیا خاک مزہ آئے گا ـــ! ساری دنیا رات کو رنگین کہتی ہے ـــ اور ایک تم ہو کہ رات کو سیاہ مان کر وحشت زدہ ہو رہے ہو۔"

"کیوں نہ ہوں۔ بند کمروں میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں کھلی فضاؤں میں رہنے کا عادی ہوں۔"

"تو پھر جاؤ ـــ کہیں جا کر صبح کا انتظار کرو، یا پھر کسی کونے میں دبک کے سو رہو۔"

..... اور اس طرح میں نے کئی گھنٹے نیند کے انتظار میں گزارے۔ پھر جب نیند کا غلبہ محسوس ہوا، تو خوبصورت اور منور صبح کا تصور لیے سو گیا۔

ہر روز کی طرح صبح کے تصور میں جیسے ہی آنکھیں کھولیں کمرے میں رات جیسی ہی روشنی دیکھ کر تعجب سا ہوا۔ پھر سوچا کہ شاید کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہوں۔ آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھولی۔ روشنی کی ایک بھی کرن کمرے میں داخل نہ ہوئی۔ ہاں ہوا کا ایک سرد جھونکا اس شدت سے اندر آیا کہ میں اپنا توازن کھوتے کھوتے بچ گیا۔ پھر میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا، تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ کیوں کہ دن ہونے کے باوجود چاروں طرف سیاہی ہی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر میں نے اپنی گھڑی دیکھی جو آٹھ بجا رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ میں تقریباً رات کے دو بجے سویا تھا، اور اب آٹھ بج رہے ہیں۔ یہ یقیناً دن ہی کے آٹھ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر کے ایک فرد سے پوچھا کہ وقت کیا ہوگا۔ اس نے پہلے تو مجھے کچھ دیر تک غور سے دیکھا پھر اپنے مونڈھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

"آٹھ بجے ہیں۔"

"کیا صبح کے آٹھ بجے ہیں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"جی ہاں۔ صبح کے آٹھ۔" وہ جھلا کر بولا۔

"پھر اب تک اندھیرا کیوں ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"اندھیرا کیسا — ہر طرف روشنی ہے۔" اس نے مزید جھلا کر کہا۔

"نہیں — میں باہر کی بات کر رہا ہوں۔"

"باہر روشنی کے لیے پیسے کون دے گا!" اس نے اسی تند لہجے میں جواب دیا۔

"روشنی — اور پیسے —!!" میں کچھ سمجھا نہیں۔

"اب اس میں نہ سمجھنے والی بات کیا ہے —! جب گھر کے لیے روشنی خریدنی ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ باہر کے لیے بھی خریدنی ہوگی۔"

"کیا — روشنی — اور خریدی جائے —!!"

"تو کیا مفت میں ملتی ہے روشنی —؟"

"نہیں تو اور کیا۔ یہ آسمان پہ چاند، تارے، سب ہی تو مفت میں دیکھنے کو ملتے ہیں اور ہر صبح جو سورج نکلتا ہے، وہ کیا پیسے لے کر گھر گھر روشنی کرتا ہے —!"

میری باتوں سے وہ تعجب میں پڑ گیا، اور میری طرف سے لاپروائی برتتے ہوئے کہنے لگا۔ تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اب تو بس اس بات پر یقین کر لو کہ یہاں روشنی خریدنی پڑتی ہے۔ گھر کے لیے بھی — اور باہر کے لیے بھی۔

"ارے واہ! باہر کے لیے کیسے —؟"

"چلو تمھیں دکھاتا ہوں کہ باہر کیسے چلا جاتا ہے — اور یہ بھی جان لو کہ تم اس وقت میری خریدی ہوئی روشنی میں چل رہے ہو۔" اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے جاتے ہوئے کہا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میرے سر پر بھی روشنی کی چند کرنیں مرکوز ہیں جیسے کسی نے ایک بڑی سی ٹارچ ہمارے سروں پر رکھ دی ہو۔ میں پریشان ہو گیا۔

"آخر ایک ہی رات میں یہ سب کیسے بدل گیا —!"

بدحواسی کے عالم میں جب یہ بات میری زبان سے بے اختیار نکل گئی تو اس نے چند لمحوں کے لیے میرا چہرہ دیکھا اور پھر نہایت ہی ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "تم سوئے ضرور مگر شاید بہت دیر تک — صرف ایک ہی رات سوتے تو شاید اُسی صبح کو دیکھتے جو تمھیں مفت میں روشنی دے سکتی تھی۔ مگر تمھاری طویل نیند نے تمھیں ان ساری حقیقتوں سے غافل رکھا۔ اب تو

ہر چیز بکتی ہے۔ کھانا پانی کے ساتھ روشنی بھی۔ اب یہ نہ پوچھو یہ سب کب سے اور کیوں ہوا۔ یہ سب وقت کی باتیں ہیں۔ اور اب وقت اتنا آگے نکل گیا ہے کہ تمھارے وقتوں کی بات اب کوئی نہیں جانتا۔ اگر یہاں جینا ہے تو اور چیزوں کے ساتھ روشنی بھی خریدو۔"

پھر میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا کہیں ایٹمی جنگ تو نہیں ہوئی کہ جس کے بعد کہتے ہیں کہ کرۂ ارض کے اطراف کافی موٹا کالے دھویں کا غلاف چڑھ جائے گا۔ اور کم از کم تین سال تک سورج نظر نہیں آئے گا۔ پھر دماغ نے خود ہی اس بات کی تردید کردی کہ ایسا نہیں ہوسکتا کیوں کہ سب ہی لوگ خوش ہیں اور اپنے اپنے کام میں مشغول۔ اپنے سروں پر خریدی ہوئی روشنی لیے کتنی شان سے پھر رہے ہیں۔!

مگر ۔۔۔ ان کا کیا ہوگا جن کے ہاں روشنی خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوں گے۔!

" وہ اندھیرے میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔" ایک انجانی آواز کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو کسی سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔

" بھائی جان! غریب آدمی ہوں۔ بنا روشنی کے چل رہا ہوں۔ اس ٹکراؤ کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اگر تھوڑی سے روشنی مل جاتی تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

میں پریشان سا ہوگیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے روشنی کے بازار میں پہنچا تو ایک ہجوم دکھائی دیا۔ یہ دکان گاہکوں سے بھری تھی، جو روشنی مُنہ مانگے داموں پر خرید رہے تھے۔

" کیا انھیں اس قدر روشنی کی ابھی ضرورت ہوگی ۔۔۔!" میں نے سوچا۔ میری مشکل یہی ہے کہ میں بے خیالی میں بے ساختہ بلند آواز کہہ جاتا ہوں۔

" بھائی صاحب! سنا ہے دام بڑھنے والے ہیں۔ اس لیے لوگ آج ہی خریدنا چاہتے ہیں۔"

کسی نے جواب دیا۔

" مگر کیوں ۔۔۔ دام کیوں بڑھ رہے ہیں؟" میں پھر بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

" سنا ہے کل بجٹ پیش ہوگا اور اس بار تو روشنی کا دام دوگنا ۔۔۔ یا پھر تین گنا ہو جائے گا۔ ویسے ملک کی مالی حالت تو پہلے ہی خراب ہے۔ دوسرے اسے باہر کے ملکوں کو برآمد کیا جانے والا ہے۔" اُسی اجنبی آواز نے جواب دیا۔

" کیا کہا ۔۔۔! ہمارے ملک کی روشنی دوسرے ممالک کو برآمد کی جائے گی۔ پھر یہاں کی تاریکی کا کیا ہوگا ۔۔۔!"

ارے بھائی! یہاں روشنی کی اتنی مانگ نہیں۔ یہاں تو روشنی وہی چاہتے ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ بھوکے لاچاروں نے تو اندھیرے ہی میں اپنا پیٹ بھرنا غنیمت سمجھا ہے۔ پچھلے برس جب روشنی پر راشننگ ہوگئی تھی تو جیسے غریبوں کی عید ہوگئی۔ انھوں نے اپنے راشن کارڈ پر خریدی ہوئی روشنی کو اونچے دام پر امیروں کے ہاتھ بیچ دیا۔ ہاں اب تو یہ کھلے بازار میں بک رہی ہے۔

ویسے روشنی کے بغیر بھی یہ غریب بہت خوش ہیں۔ اب انھیں پیٹ بھرنے کے لیے ہر چیز قریب ہی مل جاتی ہے۔ شکار کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ تیر چلاؤ — چھرا چلاؤ — چاقو چلاؤ — کیا مجال جو ایک بھی وار خالی جائے۔ چند ہی لمحوں میں کوئی نہ کوئی زمین پر تڑپتا مل ہی جاتا ہے۔

ویسے آج کل روشنی والوں سے اندھیرے والے کچھ کم ہی ڈرتے ہیں۔ خاص کر جب سے یہ دو نمبر کی روشنی بازار میں آگئی ہے۔

"دو نمبر کی روشنی — ! وہ کیا ہے —؟" میں کوئی نئی بات خاموشی سے سن کر چپ نہیں رہ سکتا۔

ارے یار ! دنیا کے سارے ساز و سامان کی طرح دو نمبر کی روشنی بھی بازار میں آگئی ہے۔ لیکن جب دکان سے خریدو تو اچھی خاصی — مگر چار قدم چلو کہ غائب۔ پھر جیسے ہی روشنی غائب ہوئی کہ اندھیرے والوں نے اس پر حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بوٹیاں نوچ لیں۔

تو یہ ! یہ کیسا زمانہ ہے —!!
اور آنے والا زمانہ شاید اس سے بھی برا ہو۔
تو کیا کیا جائے —!!
سیدھے اپنے کمرے میں جاؤ — اور سو جاؤ۔
ہاں۔ یہی ٹھیک رہے گا۔ اس طرح جاگنے سے بہتر تو یہی ہے کہ چپ چاپ سو جائیں۔
چاہے اس وقت تک بھی جب نیند سے اٹھا کر حساب کتاب پوچھا جائے گا۔

بی پی سری واستو رند
R-16 سکیٹر 11' نوئیڈا

وقت کی گرد میں اٹاہوا آئینہ

ماجد رمن

عمر کے اس حصے میں جبکہ سر کے وہ بال چاندی ہو چکے ہیں جو کبھی گہرے سیاہ و گھنیرے تھے اور علم و ادب سے جن کا رشتہ کافی گہرا تھا تو ماضی کی بے شمار یادیں ہی تسکین کا سہارا ہیں۔

جب بھی یادوں کے دریچے کھولتا ہوں تو مختلف واقعات' ادبی تخلیقات' شخصیات اور بھولی بسری کہانیاں ذہن کے گوشوں میں رینگنے لگتے ہیں۔ پہروں ان کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں اور محو حیرت ہو جاتا ہوں کہ آخر ان میں کون سی مقناطیسیت ہے کہ جن کی نقوش نہ تو گردش زمانہ مٹا سکی ہے نہ وقت کی تند و تیز آندھی دھندلے کر سکی ہے اور نہ غم دوراں و غم روزگار ہی جنھیں فراموش کرا سکے ہیں۔

مجھے یاد ہے وہ زمانہ جب میں ادبی رسائل اور ناولوں کے مطالعہ کے شوق میں جنون کی حد تک مبتلا تھا۔ ہند و پاک کے ادبی رسائل جہاں اور جس طرح بھی دستیاب ہوتے حاصل کرتا اور چاٹ جاتا اس وقت برصغیر ہند و پاک میں شائع ہونے والا شاید ہی کوئی اچھا افسانہ یا ناول ایسا ہو گا جو میری نظر سے نہ گذرا ہو۔

ان ہی دنوں پاکستان کے شہر کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامہ "انجم" میں "ایک اور تاج محل" عنوان کا ایک افسانہ میری نظر سے گذرا۔ اچھوتے موضوع کا یہ افسانہ زبان' بیان' تکنیک' برتاؤ اور انداز تحریر کے اعتبار پر اس قدر کامیاب تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ افسانہ کے خالق کا نام دیکھا تو ماجد رمن۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ صاحب ماجد ہیں کہ رمن کیونکہ ہندو مسلم ناموں کا یہ سنگم مجھے

بھ عجیب سالگا۔ میں یہ جاننے کے لئے مضطرب ہوگیا کہ آخر یہ صاحب ہیں کون ---؟ اس کے د ماجد رمن کے کئی اور افسانے ہندوپاک کے رسائل میں پڑھنے کو ملے مگر میرا اشتیاق اپنی جگہ پر ائم رہا۔ ماہنامہ "مشرق" کراچی کے 1962 کے سالنامہ میں ایک فکاہیہ "کھوٹے سکے" کے ساتھ مصنف کا تعارف پڑھا تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ماجد رمن نام کے جس 22 سالہ ادیب سے میں متاثر ہوں اس کا اصل نام ماجد علی زیدی ہے وہ اترپردیش کے ضلع بریلی کے قصبہ آنولہ کے سید خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

16 سال کی عمر سے افسانہ نگاری کی ابتداء اس بات کا ثبوت ہے کہ ماجد رمن کا ذہن بچپن ہی سے شعروادب اور افسانہ نگاری کے لئے مناسبت رکھتا تھا۔ ان ہی خداداد صلاحیتوں کی بدولت آج ماجد رمن وہ مقام حاصل کرچکے ہیں کہ اردو دنیا میں ان کا نام و شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے لیکن اس ترقی میں ان کی انتھک جدوجہد، کاوشوں اور کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

میں نے یہ چاہا ضرور تھا کہ ماجد رمن سے ملاقات ہو مگر یہ گمان میں بھی نہیں تھا کہ ملاقات اس قدر ڈرامائی انداز میں ہوگی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ زندگی کے سفر میں ایک موڑ پر وہ ماجد رمن مجھے مل گیا جس کے متعلق میں 1960 سے بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔

قریب سے دیکھا، نزدیک سے جانا، آج جبکہ وہ مجھ سے بہت نزدیک ہیں تو میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ماجد رمن نے شعروادب ہی میں نہیں اردو صحافت میں بھی وہ اعلیٰ مقام حاصل کرلیا ہے جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

صحافت میں بھی شاعری اور افسانہ نگاری ان کے مزاج پر پوری طرح حاوی ہے۔ اخباری تحریروں میں بھی جہاں ان کا منفرد انداز جھلکتا ہے وہیں افسانے بھی منفرد موضوعات سے آراستہ ہوتے ہیں اور شاعری میں بھی ایسے پہلو نکلتے ہیں جن میں داخلی اور خارجی کیفیات کا ذکر اچھوتے انداز میں ہوتا ہے۔

میں ذاتی طور پر ان کی افسانہ نگاری، شاعری اور صحافت کا بے حد مداح ہوں۔ خاص طور پر اس لیے کہ صحافت میں بھی وہ نہایت احترام کے ساتھ ادب کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں عجیب قسم کی چاشنی پیدا ہوجاتی ہے اور اس چاشنی کا ذائقہ جس منہ کو لگ جائے وہ لذت محسوس کرتا رہتا ہے۔

ماجد رمن کے چہرے پر موجود زمانے کے گہرے نقوش اور آڑی ترچھی لکیریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انھوں نے نہ صرف زندگی کے تھپیڑوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے بلکہ اس جدوجہد میں بہت کچھ کھویا اور پایا ہے مگر اپنی خودداری اور انا پر کبھی آنچ نہیں آنے دی ہے۔

ماجد رمن کا قلمی سفر بہت طویل ہے کم عمری ہی میں اسکول کے لئے چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھنا، خاص موقعوں کے لئے غزلیں اور نظمیں کہنا خداداد ادبی صلاحیتوں کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ 1956میں سرزمین رامپور پر انھیں ہونہار ادیب کی حیثیت سے اس وقت تسلیم کیا گیا جب ان کے افسانہ "پتھر" نے افسانوی مقابلہ میں پہلا انعام حاصل کیا۔

1962میں انھوں نے اترپردیش کی سابق ریاست رامپور سے شائع ہونے والے ادبی ماہنامہ "دریچے" کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھال کر میدان صحافت میں پہلا قدم رکھا اور "دریچے" کی اشاعت کے فروغ میں اس وقت کے مشہور و معروف نوجوان افسانہ نگار اپنے استاد ایم پاشا کے شانے سے شانہ ملا کر چلنے لگے۔

افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ آتش شکم کی خاطر انھوں نے 1967میں رامپور سے شائع ہونے والے روزنامہ اخبار "قومی جنگ" سے وابستہ ہو کر صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور ساتھ ہی شہر وبیرون شہر کے کئی ہفت روزہ اخبارات ورسائل کو قلمی تعاون دیتے رہے۔

1976میں جیب میں قلم رکھ کر اور چند سکے ڈال کر اپنے ایک عزیز دوست ایم سلیم کے ہمراہ دہلی آئے اور روزی کی تلاش شروع کردی۔ اسی جستجو میں ان کی ملاقات مشہور ادیب وشاعر آنجہانی پرکاش پنڈت سے ہوگئی جو ہند پاکٹ بکس کے روح رواں تھے۔ پرکاش پنڈت جیسا ادب نواز، مردم شناس اور انسان دوست شخص پہلی ہی ملاقات میں ماجد رمن کے اندر کی صلاحیتوں کو بھانپ گیا۔ پرکاش پنڈت نے نہ صرف اپنے دوست شفقت سے انھیں نوازا بلکہ تادم مرگ ہمت افزائی، رہنمائی اور سرپرستی بھی کرتے رہے جس نے ماجد رمن کے جذبہ جہد مسلسل کو استواری اور ادبی زندگی کو جلا بخشی۔ ماجد رمن نے اپنے لڑکھڑاتے قدم استوار کئے اور نئے عزم وارادے کے ساتھ صحافت کے نئے سفر پر نکل پڑے۔

خوش قسمتی سے اس وقت کے سب سے معیاری ادبی رسالہ "بیسویں صدی" میں رحمٰن نیر کی ادارت میں کام کرنے کا انھیں موقع مل گیا اور تب سے اب تک ان کا یہ سفر جاری ہے۔

روزنامہ وہفت روزہ "الجمیتہ" روزنامہ "فیصل جدید" روزنامہ "مشرقی آواز" ہفت روزہ "بنیاد" ہفت روزہ "اخلاص" ماہنامہ "نصرت" ماہنامہ "گلفام" ماہنامہ "درخشاں" ماہنامہ "قلمی ستارے" ماہنامہ "نیلو" اور نہ جانے کتنے دوسرے اداروں کو وہ قلمی تعاون دیتے رہے ہیں۔ خو اپنا ادبی ماہنامہ "اکیسویں صدی" بھی نکالا جو دو سال تک جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔

1977میں ان کی کتاب "اندرا کی واپسی" اور 1989میں انتہائی دلچسپ ناول "سونے کفن" شائع ہوئے۔ پوربی پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول اس لئے بیحد مقبول ہوا کہ وہ دلوں پر گہر۔

نقوش چھوڑتا ہے۔ اس ناول کی زبان سلیس، سادہ اور صاف ستھری، لب ولہجہ مہذب، دھیما اور نرم ہے کرداروں کے احساسات و جذبات کئی رنگوں میں نماں نظر آتے ہیں۔ ان کا ہموار اسلوب ایک خاص قسم کی لطافت پیدا کرتا ہے جو قارئین کو متاثر کرتا ہے۔

غم کی شدت جب حد سے تجاوز کر جائے اور مایوسی کا احساس دل و دماغ پر پوری طرح قابو پالے تو یہ قدرتی بات ہے کہ زندگی کی مثبت قدروں سے انسان کا ایمان اٹھ جاتا ہے مگر ماجد رمن کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا ادیب شاعر اور صحافی بھی عام انسانوں کی طرح حساس ہوتا ہے مگر وہ حالات کی تلخیوں کو جس شدت سے محسوس کرتا ہے عام انسانوں کو میسر نہیں ہوتا جن قلم کاروں نے اپنی سعی مسلسل اور جہد مستقل سے اردو ادب کے خزانہ کو مالا مال کیا ہے ان میں ایک نام ماجد رمن کا بھی ہے۔ ماجد رمن کے مخصوص و منفرد انداز نگارش نے انہیں اپنے زمانہ کے قلم کاروں میں ممتاز بنایا ہے ان کے اخلاق، کردار، انداز، افکار میں وہی گرمی خلوص اور وابستگی موجود ہے جو ایک اچھے قلم کار میں ہونی چاہئے۔ یہی خوبیاں ان کی کامیابی و ہردلعزیزی کی علامت ہیں۔

اچھے فنکار کے لئے اچھا انسان ہونا شرط اول ہے کیونکہ اعلیٰ فن کی شراب لطیف کسی کثیف پیانہ میں ہو تو نہ تو جاذب نظر ہو سکتی ہے اور نہ پر اثر۔ ماجد رمن کے سینے میں ایک اچھے انسان کا دل دھڑکتا ہے وہ اچھے انسان ہونے کے ساتھ ہی اچھے دوست بھی ہیں اور پر خلوص ساتھی بھی، ان کی متلون مزاجی، دور اندیشی، ذہانت، کم گوئی اور خودداری نے ان کے کردار کو سونے سے کندن بنادیا ہے۔ وہ ہمیشہ خود نمائی سے گریز کرتے ہیں، ذاتی مفادات کے لئے انہوں نے حالات سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ماجد رمن نے انتہائی ادب، احترام اور خلوص کے ساتھ اردو کی خدمت کی ہے۔ انہوں نے صحافت کے پیشے کو بھی صرف روزی روٹی کا ذریعہ نہیں بنایا۔ صحافت ان کے لئے راہ تو بنی منزل نہیں۔ بطور صحافی بھی وہ اتنے ہی کامیاب ہیں جتنے بحیثیت شاعر و افسانہ نگار۔

تقریباً چار ہزار مضامین اور افسانے لکھنے کے بعد ماجد رمن گذشتہ چار برسوں سے "راشٹریہ سہارا" کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اور ان دنوں ہفت روزہ "راشٹریہ سہارا" میں بحیثیت چیف سب ایڈیٹر کام کر رہے ہیں، اللہ ان کی عمر دراز کرے کیونکہ اردو ادب و صحافت کو ان کی ذات سے بے شمار توقعات ہیں۔

ماجد رمن کے سلسلے میں اتنا لکھا ہے تو یہ اور لکھتا چلوں کہ سنتے آئے تھے کہ ہر کامیاب شخص کی ترقی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن ماجد رمن کی ہموار و ناہموار زندگی میں ایک

نہیں دو عورتوں کا دخل رہا ہے۔ ایک ان کی محبوبہ جس نے ان کے قلم کو جلا بخش کر کامیاب ادیب و شاعر بنایا، ان کے خیالات کو تازگی بخشی اور —— دوسری میری اپنی شانو بھابی یعنی ماجد رمن کی شریک حیات جنہوں نے ان کے شانہ بہ شانہ رہ کر نہ صرف اپنی بلند کرداری و بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا بلکہ ماجد رمن کو سربلند رہ کر زندگی گذارنے کا حوصلہ بھی عطا کیا۔ خوش اخلاق، سلیقہ مند، دور اندیش اور دلیر شانو زیدی واقعی ماجد رمن کی شریک حیات ہیں ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے

[redacted]

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

جائزے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سیاہ فام ادب

مرتبین : شمیم حنفی / سہیل احمد فاروقی
مبصر : شکوہ محسن مرزا
قیمت : چالیس روپے
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سیاہ فام ادب کا آغاز حقیقتاً انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوا، مگر یہ ادب ۱۹۶۰ء کے بعد روان چڑھا۔ اس طرح تقریباً سو سال سے یہ ادب ایک متوازی تحریک کی حیثیت سے پنپتا رہا۔ حالانکہ ۱۹۲۹ء اس ادب کی ترقی اور نشوو نما کے لیے اہم ہے، مگر ۱۹۷۰ء ایک ایسا سنگ میل ہے جس کے بعد سیاہ فام ادب نے اپنی مخصوص شناخت بنالی اور یہ سیاہ فام عوام کی زندگی اور خوابوں کا ترجمان بن گیا۔ ۱۹۶۷ء میں منعقد ہونے والی فسک یونی ورسٹی رائٹرز کانفرنس FISK UNIVERSITY WRITERS CONFRE خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، کیونکہ اس کے بعد سیاہ فام ادب غیر معمولی تنوع اور معنویت کے ساتھ اُبھرا۔ اس کانفرنس کے بعد کئی ایسی تصانیف منظرِ عام پر آئیں، جنھوں نے اس ادبی تحریک کے نظریات اور مقاصد واضح طور پر متعین کیے۔ لاروئے جونز اور پری کا نیل کی مرتب کردہ BLACK FIRE (1968) کلیرنس میجر کا شعری انتخاب "دی نیو بلیک پوئٹری" (۱۹۶۹ء) اور ایڈیسن گیل کی کتاب "دی بلیک ایستھیٹک" (۱۹۷۱ء) اس ادب کے لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل تصانیف ہیں۔ اس سلسلے میں لینگسٹن ہیوز کا مضمون THE NEGRO ARTIST AND THE MOUNTAIN جو گیل کے انتخاب میں شامل ہے، ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہیوز نئے طرح کے ادب کا حامی ہے، جس میں ایسے اشعار لکھے جائیں جو "سیاہ چہروں کی خوبصورتی" کا ذکر کرے اور موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے نسلی ہو۔ ہیوز سیاہ فام ادب کو اپنے روایتی سرمایے، اپنی نسل اور اپنے مخصوص تجربات پر فخر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ہوئٹ فلر TOWARDS A BLACK AESTHETIC میں زور دیتا ہے کہ ایک ایسا نیا ادب تخلیق ہونا چاہیے جس میں سیاہ فام نسل کے تجربوں اور زندگی کا حقیقی عکس ملے۔ اس کے خیال میں سیاہ فام نسل کے تجربات اتنی ہی اہمیت اور صداقت کے

امل ہیں جتنے کہ سفید فام نسل کے تجربات۔

سیاہ فام ادب کے لیے اماموامیری بارا کا نام غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ بارا کا
ملی نام لاروئے جونز تھا لیکن اسلام کے زیر اثر اس نے اپنا نام تبدیل کر کے اِساموامیری بارا
ختیار کیا۔ بارا کا اپنے مضمون A BLACK VALUE SYSTEM (۱۹۶۹ء) میں ایک نیا نظام اقد
تجویز کرتا ہے، جس کا مقصد سیاہ فام نسل کو یورپی اور امریکی اقتدار سے نجات دلانا ہے۔ بارا ک
نے سات اصول وضع کیے جن کے لیے اس نے کاویدہ (KAWAIDA) کی اصطلاح استعمال ک
اس کے تشکیلی عناصر مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) اُموجا یا اتحاد (UNITY) (۲) کوجی چاگولیہ یا خود اختیاریت (SELF-DETERMINATION
(۳) اجیما (COLLECTIVE WORK AND RESPONSIBILITY) (۴) اُجاما (COLLECTIVE ECONOMICS)
(۵) نیا یا مقصد (PERPOSE) (۶) کومیا یا تخلیقیت (CREATIVITY) (۷) نمانی یا یقین (FAITH) بارا ک
کے خیال میں کاویدہ ایسے انقلاب کی بنیاد رکھتا ہے جو کہ سفید فام نسل کے عائد کردہ نظام سے
نجات دلا سکتا ہے۔ اس طرح بارا کا نے بہت ہی واضح اور جامع نظامِ اقدار کی نشاندہی کی جس
میں سیاہ فام نسل کے تصورات، آرزوئیں، رجحانات، حسیت، شعور اور زندگی کا عکس ملتا ہے
اسی وجہ سے بیسویں صدی میں سیاہ فام ادب اہم ترین تحریک بن کر اُبھرا اور ۱۹۹۳ء میں ایک نمای
ناول نگار ٹونی مارلین کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

اردو قاری کے لیے یہ ایک خوش آیند بات ہے کہ پروفیسر شمیم حنفی اور سہیل احمد فاروقی
نے سیاہ فام ادب کے عنوان سے ایک ایسا انتخاب مرتب کیا ہے جو اس متنوع ادب سے ہمیں
متعارف کراتا ہے۔ اس میں مرتبین کے مضامین، مکالمے، مباحث، کہانیاں اور نظمیں یکجا کر دی ہیں
پروفیسر شمیم حنفی نے ایک تعارفی مضمون سپردِ قلم کیا ہے، جس میں سیاہ فام ادب، اس کے سیا
اور معاشرتی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس ابتدائیہ میں خاص طور پر سیاہ فام ادب کا
ہندستانی سیاق و سباق میں جائزہ لیا گیا ہے، جس سے اس ادب کی آفاقیت سمجھنے میں مدد ملتی ہے
حالانکہ احتجاجی ادب میں عام طور پر نعرہ بازی نمایاں ہوتی ہے لیکن مرتبین کی کوشش رہی ہے کہ
اس ادب کے انسان دوست عناصر کو اُجاگر کیا جائے۔ ابتدائیہ میں پروفیسر شمیم حنفی لکھتے ہیں "اجتما
زندگی کی حقیقتوں کا شعور، ایک گہری انسانی دردمندی، ایک برہمی اور اُداسی، ایک ضدی امید اور
ایک ہولناک نشاط پرستی، سیاہ فام ادب کے اساس عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

چونکہ مرتبین اس ادب کو صرف مدافعتی ادب نہیں سمجھتے، اس لیے انھوں نے شدت پسند
رویوں کو یکسر مسترد کرتے ہوئے ایسی تحریروں کو یکجا کیا ہے جن میں گہرا سیاسی اور معاشرتی شعور
ادبی وقار اور فنی خوبیاں ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے کتاب کا ابتدائیہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ عبارت
ملاحظہ کریں۔ "یہ ایک سیدھا سچا مکالمہ ہے۔ ظالم اور مظلوم کے مابین اور اس مکالمے کا بنیادی
ایک تو اپنی صورتِ حال کا اظہار ہے دوسرے اپنے شعور پر نوآبادیت کی گرفت کو کمزور کرنا ہے
کیونکہ عمومی طور پر تیسری دنیا کے ادب اور علی الخصوص سیاہ فام اور مشرقی وسطی کے مدافعتی ادب

ِ جہد ایک شعور اور ایک نئے ایقان کی جد و جہد ہے۔
تاب میں ایبا پینکر کا مقالہ "سیاہ فام جمالیات" دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں
اس ادب کے رجحانات، میلانات اور نظریات پر جامع گفتگو کی ہے بلکہ سیاہ فام ادب
ب پر ایک ساتھ اس طرح بحث کی ہے کہ سیاہ فام ادب ایک استعارہ بن جاتا ہے۔
ن نارنگ کا مقالہ "سیاست بطور فکشن" ادب اور سیاست کے باہمی تعلق کے تناظر میں
ب کے اہم ادیبوں کا تعارف پیش کرتا ہے۔ یہ مقالہ اردو قارئین کے لیے اس لیے بھی اہم
ں میں سیاہ فام ادب کے شہرۂ آفاق تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان کے
اشرتی اور نظریاتی عناصر کو اجاگر کیا گیا ہے جس سے اس ادب کے امکانات کا صحیح اندازہ

۱۹۰ء میں نوبل انعام یافتہ ادیب ٹونی موریسن کا ٹامس لی کلیر کے ساتھ مکالمہ خاص طور
جہ کا مستحق ہے۔ موریسن اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان کی تخلیقات نہ صرف اعلا اور شاندار
م ادب کی مثال ہیں بلکہ (MAINSTREAM) انگریزی ادب کا گراں قدر سرمایۂ افتخار بھی ہیں
ے استعمال، اس کے سماجی، سیاسی اور نسلی ابعاد، ظالم اور مظلوم کے بیچ کشاکش
عات پر اپنے تصورات پیش کرتی ہیں۔ اپنے ناول TAR BOBY کے تعلق سے ان کا اظہار
ادب کے لیے امکانات روشن کرتا ہے اور ہمیں غیر معمولی تخلیق کار سے روشناس کراتا

تاب میں شامل نظموں اور کہانیوں کا انتخاب مرتبین کی ادب شناسی کا پتا دیتا ہے۔ یہ
سیاہ فام ادب کی نمایندگی کرتی ہیں۔ ان میں ظلم، نسلی امتیاز اور تعصبات، جذبات و
، فکر اور تصوّرات غرضیکہ انسانی وجود کے تمام نرگونگوں کی عکاسی ملتی ہے۔ ترجموں میں خاص
ت ہی اعلا معیار برقرار رکھا گیا ہے۔
سیاہ فام ادب، جیسی کتاب کا مقصد نہ صرف اس تحریک کو اردو قاری سے متعارف کرانا
اس ادب کے لیے ایسے تناظر تشکیل کرنا ہے جو اس کی تفہیم اور ادراک میں معاون ہوسکیں۔
مقصد میں مرتبین پوری طرح سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ مرتبین پروفیسر شمیم حنفی اور سہیل
تی نہ صرف ہماری مبارک باد بلکہ شکریے کے بھی مستحق ہیں۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے سیاہ فام ادب
کے ساتھ شائع کیا ہے یہ کتاب اردو کی معیاری کتابوں میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

تصنیف کردہ۔ ادا جعفری

...رہی سو بے خبری رہی
(خود نوشت)

تبصرہ نگار ۔ عبداللہ ولی بخش قادری
قیمت ۔ دوسو روپے
ناشر۔ مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ۔ کراچی

" وہ جو بے چین اور بے خبر ہجوم میں تنہا لڑکی تھی، یہ اس کی اور میری کہانی ہے۔ میرے
ں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا صبح و شام کے بیچ آتا ہے۔ میرا اور اس کا وہی رشتہ ہے

جو سوچ کا آواز سے ہوتا ہے۔ سوچ کی سرحدیں نہیں ہوتیں۔ آواز حدود میں گرفتار رہتی ہے۔ آواز، سوچ کے ساتھ چلے، کبھی ایسا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی وہ میرے پاس ہوتی ہے کبھی صدیوں کے فاصلے پر۔"

مندرجہ بالا اقتباس اس خودنوشت کے 'حرفِ آغاز' کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے دُہری 'اداکاری' کی غمازی بھی ہوتی ہے جو کہ 'انا' اور 'انا۔ مثالیہ' کی تگ و دو سے عبارت ہے۔ احوالِ زندگی کی یہ کہانی جستہ جستہ انتیس عنوانات کے تحت بیان ہوئی ہے جن میں چار پہلے یہ ہیں: بڑی حویلی، گوشۂ عافیت، بدایوں کے شام و سحر، جہاں میں تھی۔ یہ سارا ماجرا مجموعی طور پر، تنہا لڑکی کی زندگی کے اوّلین ۲۳، ۲۴ سال کے دوران کارزارِ حیات میں جہدِ مسلسل کے نقوش پر مبنی ہے۔ اس لڑکی کا نام عزیز جہاں رکھا گیا۔ اس نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں اور ذوقِ سخن کی بیداری کا آغاز ہوا تو ادا بدایونی کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی اور جنوری ۱۹۴۷ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ادا جعفری کی صورت میں اگلے سال ہی مارچ ۱۹۴۸ء میں تارکِ وطن ہو کر کراچی چلی گئیں۔ خودنوشت میں اگرچہ اس لڑکی کا نام اور تاریخ پیدائش دونوں پردۂ خفا میں ہیں تاہم اس دور کے نقوش بڑے واضح اور گہرے ہیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ "یہ ایک ایسی کہانی ہے جو کہانی بھی نہیں ہے۔ ہاں ایک خاص زمانے کے رنگ، تہذیب، طرزِ فکر اور طریقِ معاشرت سے دوبارہ ملاقات یا تعارف کی کچھ نہ کچھ حیثیت ضرور رکھتی ہے۔ وہ دکھ سکھ جو گئے زمانوں میں برتے ان کی حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے...... میری یادوں کے اس مرقع میں جو محبتیں اور شفقتیں ہیں وہیں مجبوریاں اور محرومیاں ہیں۔ وضع داریاں بھی ہیں اور کم نگاہیاں بھی۔ حویلی میں اذانوں کے اُجالے تھے، دعاؤں کے سویرے تھے۔ مگر طاقوں میں شرافت، انا اور روایت کے بُت بھی سجے ہوئے تھے۔" (بڑی حویلی ۷، ۸، ۹)۔ ان کی پرورش بڑی حویلی ہی ہوئی جو اُن کی ننھیال اور اس وقت کے نہایت ممتاز رئیس کی رہائش گاہ تھی۔ انھوں اس کے آدابِ زندگی کو بڑی دل آویزی سے بیان کیا ہے۔ (جہاں میں تھی۔ ۴۵) ان کے والد جواں عمری میں وفات پائی جبکہ وہ تین چار سال کی بچی تھیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ والد اور خاندان ذکر برائے نام ملتا ہے مگر اس حادثے کے شدید اثرات اُن پر پڑے تھے اور اس محرومی کا احساس ہر حال میں رہا ہے۔

پانچویں عنوان 'آئینہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے' کے تحت ادا جعفری نے بتایا کہ کیوں کر ان کی شادی انجام پذیر ہوئی اور اس دور کی بعض نظموں کا پس منظر یا محرک کیا رہا ہے۔ نیز انھوں نے چند اُبھرتی ہوئی شاعرات کا ذکر کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات یہ کہی ہے کہ "یہاں اہمیت صرف ناموں کی نہیں ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ بند لبوں نے جرأتِ سخن کی۔ شدید حبس میں سانس لینے کی کاوش، بسیط خلا میں سوچنے کی صلاحیت۔ بیشک یہ صدائے احتجاج نہیں تھی لیکن اہم بات یہی ہے کہ ان تمام خواتین کا تعلق روایتی گھر آنگن سے تھا۔" اگلا عنوان 'روشنی کی لکیر' ہے یہاں انھوں نے اپنی والدہ کی خدمت میں صمیم قلب سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ساتویں عنوان "سفر ہے شرط" کے تحت اپنی شاعری کے پہلے دو مجموعوں کا ذکر کیا ہے اور
کے بعد دس بارہ سال شاعری سے دور رہنے کی وجہ بتائی ہے کہ "ہوا یہ تھا کہ اس لڑکی نے
عورت کا روپ دھارا تو اپنے آپ سے بچھڑ گئی۔ گہنے لیے، ہار سنگھار، اور گود میں چاند سورج۔
تیرہ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا لیکن وہ لڑکی مری نہیں تھی، بس ہجوم میں کھو گئی تھی۔ بات
ہے کہ عورت موت کا استقبال تو صرف ایک ہی بار کرتی ہے لیکن جنم بار بار لیتی ہے" (مسافتوں
درمیاں۔ ۹۴)۔ پھر انھوں نے غلامی کی شام کا ذکر کیا ہے کہ "موت ارزاں تھی اور کسی مذہب
پہچانتی نہیں تھی۔ اس کے بعد..... اب زندگی کے نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ کراچی کی رہائش ہے
گھر بسانے کے لیے مسائل۔ جن کے بیان میں لطافت اور صداقت دونوں کی آمیزش نظر آتی ہے اور
سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے شریکِ زندگی پر نازاں اور شاداں ملتی ہیں جس سے نشاطِ حیات کی
ضمانت ہوتی ہے۔ (ورنہ سفرِ حیات کا بے حد طویل تھا۔ ۱۲۰، ۱۲۱)۔ "شہرِ غزالاں" کے عنوان سے
راولپنڈی کا ذکر کیا ہے کہ "۴۸ء کا راولپنڈی بڑا بے تکلف اور زود آشنا شہر تھا۔ (موجِ ہوا کے ساتھ
ساتھ) "مہربان لمحے" کے عنوان سے انھوں نے اپنے احباب کا بڑی خوش دلی اور پذیرائی کے ساتھ ذکر
کیا ہے اور ہر ایک کے لیے بڑی حد تک مخصوص و منتخب الفاظ و انداز کا اہتمام کیا ہے جو ان کے حسنِ
خیال اور قدرتِ بیان پر دلالت کرتا ہے۔

ادا جعفری کی خود نوشت میں ایسے جملوں اور فقروں کی کوئی کمی نہیں ہے جو شعری لطافت سے
بھرپور نہ ہوں۔ ان کے بیشتر عنوانات بھی اس کیفیت کے مظہر ہیں۔ ان کا بیان تعلّی اور تصنع سے علاقہ
نہیں رکھتا اور شستہ و شائستہ لہجے کا حامل ہے۔ اس میں صدق دلی اور نیک نفسی کا جوہر پایا جاتا ہے
انھوں نے اسے واقعات کی کھتونی یا اعداد و شمار کی جدول بننے نہیں دیا ہے بلکہ نمائندہ اور اہم
واقعات و معاملات کے تال میل اور باز رسانی سے ایک کہانی پیش کی ہے۔ ان کی پوری آپ بیتی خود
ہی آگاہی کا پرچم اٹھائے ہوئے ہے لیکن انھوں نے نام رکھا ہے "جو رہی سو بے خبری رہی"۔ اس
بارے میں باشعور قاری کو خود نوشت پڑھ کر خود ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔

تاریخِ خاندیش کے بکھرے اوراق

مصنف : ڈاکٹر اکبر رحمانی
تبصرہ نگار : پروفیسر عظیم الشان صدیقی
قیمت : ۵۰/ روپے کل صفحات ـــــ ۱۳۲
ملنے کا پتا: ایجوکیشنل اکادمی، اسلام پورہ۔ جلگاؤں ۴۲۵۰۰۱

ہندستان کی تاریخ میں سرزمینِ خاندیش کو نمایاں حیثیت حاصل ہے جس کی وجہ سے اسے نہ صرف
جنوبی ہند کی کلید کہا گیا ہے بلکہ یہ سرسبز و شاداب علاقہ اپنی زرخیزی کی وجہ سے لوگوں کے لیے کشش کا
سبب بھی بنا رہا ہے۔ یہاں حجری دور کے آثار بھی ملتے ہیں جس سے اس کی تہذیبی و تمدنی زندگی اور
قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن خاندیش کی اس اہمیت اور قدامت کے باوجود اس علاقے
کی اب تک کوئی مربوط و مبسوط تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ البتہ بعض حضرات نے اس کے مختلف پہلوؤں
کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور عہدِ فاروقی پر چند کتابیں بھی موجود ہیں لیکن یہ تصانیف

خاندیش کی مجموعی تصویر کو سامنے نہیں لاتی ہیں۔ چنانچہ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے ڈاکٹر اکبر رحمانی نے چھے جلدوں میں خاندیش کی تاریخ لکھنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کے لیے وہ گذشتہ بیس سال سے نہایت محنت، جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ مواد اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ یہ کتاب مضامین کی شکل میں اسی منصوبہ کا ایک حصّہ یا تعارف ہے جس کے مطالعے سے مجموعی طور پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے دیانت داری، خلوص اور ذمّے داری کے ساتھ اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی ہے اور مقصد کے لیے انھوں نے نہ صرف عربی، فارسی، اردو، مراٹھی اور انگریزی کے ایسے مآخذوں سے استفادہ کیا ہے جس میں سے بعض کمیاب اور نادر ہیں اور جن تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انھیں نہ صرف مختلف شہروں کا سفر کرنا پڑا ہے بلکہ خاصی زحمت بھی اٹھانی پڑی ہے اور مکمل تصنیف نہ ہونے کے باوجود انھوں نے نہ سرزمین خاندیش سے متعلق ضروری، اہم اور بنیادی معلومات کو مستند و معتبر حوالوں کی مدد سے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے اور جہاں تضاد یا اختلاف نظر آیا ہے اس کی نہ صرف نشاندہی کر دی ہے بلکہ حسب ضرورت وضاحت سے بھی کام لیا ہے اس کتاب کے ابتدائی دو باب "خاندیش — ایک پُرانی بستی" اور "خاندیش کے حکمراں" اسی محنت ژرف نگاری، تحقیق و تاریخی شعور کا نتیجہ ہیں جن سے نہ صرف موضوع کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے بلکہ یہ ابواب تاریخ اور خاندیش سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مزید کام کرنے کی تحریک بھی فراہم کرتے ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی "خاندیش میں حجری دور کے آثار" سے متعلق باب ہے جسے اگرچہ ابتدا میں ہونا چاہیے تھا لیکن کتابت کی غلطی سے اس کی ترتیب بدل گئی ہے۔

حجری دور کے آثار میں جہاں انھوں نے جدید تحقیق اور کھدائی کے نتیجہ میں سامنے آنے والے پتھر اور بعد میں لوہے کے اوزار، غاروں اور قبروں نیز ایسے انسانی ڈھانچوں کا ذکر کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں رہتا کہ دس ہزار سال قبل یہاں انسانی زندگی کے آثار موجود تھے اور جن کی اپنی کوئی تہذیب بھی تھی۔

اس کتاب کا دوسرا اہم پہلو اختصار اور دیانت داری ہے انھیں اپنے موضوع سے متعلق جو مواد حاصل ہوا ہے اس کو انھوں نے کم سے کم الفاظ میں پیش کر دیا ہے اور غیر ضروری وضاحت حاشیہ آرائی اور قیاسات سے احتراز کیا ہے جس کی وجہ سے تاریخی صداقت برقرار رہتی ہے ہندستان کے بارے میں قبل مسیح کیا گیارھویں صدی تک تاریخی مواد کم ہی ملتا ہے اور جو کچھ ہے وہ چند پوتھیوں، کتبوں اور آثار تک ہی محدود ہے جن سے بعض اوقات صرف نام تک ہی معلوم ہوسکتے ہیں۔ ڈاکٹر اکبر رحمانی کو بھی اس کتاب کی ترتیب و تصنیف میں یہی دشواری پیش آئی ہوگی اس لیے ان کا دوسرا باب "خاندیش کے حکمراں" بھی صرف راجاؤں کے ناموں تک ہی محدود ہے۔

تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق میں ڈاکٹر اکبر رحمانی نے عہد مغلیہ کے بارے میں عام دلچسپی کے پیش نظر صرف تین موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ اس میں پہلا موضوع ہے خاندیش سے مغلوں کی دلچسپی، ابوالفضل فیضی کی سفارت اور اکبر نامہ، آئین اکبری وغیرہ میں خاندیش کا ذکر مختلف شہروں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حالت وغیرہ جس سے مغلوں کی سیاسی حکمت ع

کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کسی علاقہ پر یوں ہی اچانک حملہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی کامیابی میں سیاسی تدبر، منصوبہ بندی اور معلومات و روابط کو بھی دخل ہوتا تھا۔

دوسرا موضوع مغلوں کی مذہبی روا داری ہے جس میں اورنگ زیب کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے حالانکہ بعض متعصب اور تنگ نظر مورخین نے اسے کٹر مذہب پرست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر رحمانی نے اسی الزام کی تردید کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ہندو مورخین نیز ہندو پجاریوں کے نام فرامین وغیرہ کے حوالوں سے ان الزامات کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے جس میں بعض فرامین ایسے بھی ہیں جن کو خود انھوں نے دیکھا ہے۔

مغلوں کے بارے میں تیسرا موضوع اورنگ زیب کی داستان معاشقہ ہے جس کا محرک نا۔ س۔ انعامدار کا وہ ناول ہے جو مراٹھی میں "شہنشاہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کہنے کو تو وہ تاریخی ناول ہے لیکن متعصب ناول نگار نے ایک مراٹھی کنیز ہیرا بائی کی طرف شہزادگی کے زمانے میں اورنگ زیب کے ربط خاص کے ایک معمولی واقعہ کو توڑ مروڑ کر افسانہ طرازی کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ اورنگ زیب کا کردار مشکوک ہو جائے۔ ڈاکٹر رحمانی نے پہلے تو اسی ناول کو موضوع بنایا ہے اور اس کے متضاد بیانات، کمزوریوں اور غلط بیانیوں کے حوالے سے اس سازش کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ان تاریخوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ جس میں اس واقعہ کو حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مغلوں کے بارے میں یوں تو متعدد تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن صرف تین کتابیں احکام عالمگیری مصنفہ حمید الدین خاں، ماثر الامراء مصنفہ، شاہ نواز خاں اور اطالوی سیاح نکولائی منوچی کا سفرنامہ ایسی ہیں جن میں اس واقعہ کو مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا۔ اس میں آخر الذکر ماخذ اس لیے کمزور نظر آتا ہے کیوں کہ اس میں روایات کے علاوہ اول الذکر تصانیف کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ باقی دو ماخذ کے بیانات کی ڈاکٹر اکبر رحمانی نے منطقی استدلال اور شواہد کے ذریعہ اس طرح کی تردید کی ہے کہ ان کے بیانات مشکوک ہو جاتے ہیں اور اورنگ زیب کو بدنام کرنے کی سازش بے نقاب ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر اکبر رحمانی نے ہیرا بائی عرف زین آبادی کے مقبرے کے بارے میں ڈاکٹر شیخ رمضان کے بیانات کی بھی مدلل انداز میں تردید کی ہے جس میں کھنڈرات کو اورنگ زیب کی محبوبہ کا مزار ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کا آخری موضوع خاندیش پر نظام کی حکومت کے مختصر جائزہ پر مشتمل ہے جس سے مسلمانوں کے عہد میں خاندیش کے نظام حکومت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں محمد حنیف ملی صاحب اور محمد حسن فاروقی صاحب کا عالمانہ پیش لفظ اور دیباچہ بھی شامل ہے جس نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ کتاب کی زبان و اسلوب سادہ و سلیس، خیال واضح، انداز بیان معروضی اور استدلالی ہے اگرچہ کہیں کہیں جذبات بھی غالب آجاتے ہیں جو بیانات کو خشک اور بے مزہ نہیں ہونے دیتے امید ہے کہ ڈاکٹر اکبر رحمانی کی اس تازہ تصنیف کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا

کھُلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما سے متعلق آپ کی دو ٹوک، بے لاگ اور فوری رائے کی ہمیں انتہائی ضرورت ہے مگر کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مختصر بھی ہو۔ (ادارہ)

● خان ایف، ایم مرزا، بمبئی ا

بہت عرصہ ہوا۔ بمبئی کے کسی اردو اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ جنوب کے ایک مسلمان عالم نے چاروں ویدوں کا مطالعہ کیا ہے اور اسے رگ وید یا یجر وید میں حضورؐ کی آمد کا اشارہ ملا ہے اس کے بعد اس کا کوئی مزید چرچا نہیں ہوا۔

برہمنوں میں جس نے صرف ایک وید پڑھا ہو۔ اس کو ویدی کہتے ہیں۔ سکھ مذہب اختیار کرنے کے بعد یہ بیدی بن گیا۔ علاقائی زبان کے زیر اثر جس نے دو وید پڑھے ہوں۔ اس کو ندلے Dwivedi کہتے ہیں اور تین وید والے کو ندلے Trivedi اور چاروں والے کو چترویدی۔

کتاب نما کے ماہ ستمبر کے شمارے میں صفحہ ۹ پر ایک خبر ویشالی میں مولانا حالی سے متعلق ایک سمینار کے انعقاد کی ہے جس کی صدارت کسی مولانا امین احمد خاں "چترویدی" صاحب نے فرمائی۔ میری گذارش ہے کہ آپ ان سے رابطہ قائم کرکے اس بات کی تحقیق فرمادیں۔ کہ اگر انھوں نے چاروں ویدوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے اور انھیں اس پر عبور ہے تو کیا ان کی نظر یا علم میں ایسی کوئی بات حضورؐ سے متعلق آئی یا نہیں۔

اور اگر آپ عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہ زحمت گوارا نہ کرسکیں۔ تو مجھے ان کے ایڈریس سے مطلع فرمادیں تاکہ میں ان سے رابطہ قائم کرسکوں جواب کے لیے لفافہ ارسال خدمت ہے۔

● ڈاکٹر منصور عمر، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ

اکتوبر ۹۵ء کے کتاب نما میں میری کتاب "اختر انصاری دہلوی حیات اور ادبی خدمات"، کے سلسلے میں عبداللہ ولی بخش قادری صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ موصوف کو اس بات پر اعتراض ہے کہ میں نے اختر انصاری کے نام کے ساتھ "دہلوی" کا اضافہ کیوں کیا؟ جبکہ وہ بدایوں کے رہنے والے تھے چنانچہ موصوف نے اختر انصاری کی تین کتابوں (دہان زخم، ایک قدم اور سہی، اور وقت کی باتوں میں) حوالے کے طور پر پیش کیا ہے کہ ان کتابوں میں صرف اختر انصاری لکھا ہوا ہے۔ جبکہ یہ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ اختر صاحب کا وہ معروف قطعہ بھی جو انھوں نے بدایوں کے سلسلے میں کہا ہے، پیش کیا ہے اس ضمن میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے اختر انصاری مرحوم کے نام کے ساتھ اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی جانتا تھا کہ ایک اختر انصاری دہلوی ہیں جو علی گڑھ میں رہتے ہیں اور ایک اختر انصاری اکبر آبادی ہیں جو پاکستان میں رہتے ہیں۔ میری واقفیت سنی سنائی باتوں پر نہ تھی بلکہ اختر انصاری دہلوی کے مقالات کا مجموعہ "مطالعہ و تنقید"، پر، جو میرے پاس اُن دنوں بھی تھا اور آج بھی موجود ہے، مصنف کا نام "اختر انصاری دہلوی" لکھا ہوا ہے اور اندر کے صفحہ کی تحریر اس طرح ہے:-

مطالعہ وتنقید اختر انصاری (دہلوی)/ شعبۂ تعلیمات، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ / ناشر، فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ / پہلی اشاعت ۱۹۶۵ء / مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی۔"

ظاہر ہے کہ جب میں نے اپنی Synopsis بنائی تو اس میں اختر انصاری دہلوی لکھا۔ اور میرے نگراں استاذی پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ اور پھر جب اس کی نقل اختر صاحب کو بھیجی تو انھوں نے اپنی دلی مسرت کا اظہار میرے نگراں کے نام اپنے مکتوب میں کیا۔ جس کا حوالہ میں نے اپنی کتاب میں دیا ہے اور جب علی گڑھ جاکر میں نے اختر صاحب سے ملاقات کی اور ان سے انٹرویو لیا تو معلوم ہوا کہ ان کی جائے پیدائش بدایوں ہے۔ چنانچہ میں نے ان سے سوال کیا کہ جب آپ کی جائے پیدائش بدایوں ہے تو پھر آپ خود کو دہلوی کیوں لکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ چونکہ میری پرورش و پرداخت دہلی میں ہوئی ہے اس لیے میں خود کو دہلوی لکھتا ہوں اور دہلوی کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ رہی بات بدایوں کی تو وہاں میں صرف ڈیڑھ سال کی عمر تک رہا۔ لہٰذا خود کو بدایونی کہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دہلوی لکھنے کی دوسری وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ چونکہ اختر انصاری اکبرآبادی بھی پیدا ہوگئے ہیں اس لیے بھی میں نے اپنے نام کے ساتھ دہلوی لکھنا شروع کیا۔

بہرکیف! یہ وہ حقائق ہیں جن کی وضاحت اختر انصاری مرحوم نے خود کردی تھی اور ثبوت کے طور پر اپنی کتاب "مطالعہ وتنقید" بھی چھوڑی (جو غالباً قادری صاحب کی نظروں سے نہیں گزری ہے)، اگر یہ حقائق اور ثبوت نہ ہوتے، جب یہ ثابت کرنا آسان تھا کہ اختر انصاری دہلوی تھے۔ مثلاً سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ، بہار کے رہنے والے تھے۔ یگانہ چنگیزی لکھنوی، عظیم آبادی تھے، اور غالب کی پیدائش آگرہ کی تھی لیکن وہ دہلوی کہلائے۔

مذکورہ حقائق کی روشنی میں عبداللہ ولی بخش قادری صاحب پر یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اختر انصاری مرحوم کے نام کے ساتھ "دہلوی" کا الزام میرا عاید کردہ نہیں ہے۔

● رام پرکاش کپور، ۱۸، ایم۔ آئی۔ جی، پدم نابھ پور درگ، مدھیہ پردیش۔

کتاب نما کے اداریے نہایت دلچسپ اور دعوتِ فکر دینے والے ہوتے ہیں۔ آپ کا یہ مدیران سے اشاریہ لکھوانے والا تجربہ ایک انوکھا، لاثانی اور نہایت کامیاب بھی رہا ہے۔ مضامین بھی عام طور پر نہایت معلوماتی اور جامع ہوتے ہیں لیکن مضامین کا کوٹا کچھ زیادہ ہی رہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ نہایت اہم موضوعات پر مضامین شائع کرتے ہیں لیکن کسی بھی چیز کا "بہت زیادہ" ہوجانا اچھا نہیں لگتا۔ کسی چیز کی بھی ضرورت سے زیادہ مقدار طبیعت پر گراں گزرنے لگتی ہے اور آدمی بور ہونے لگتا ہے۔ اور کبھی کبھی مضامین نہایت دقیق Abstract پیچیدہ اور مشکل موضوعات پر ہوتے ہیں جن میں عام قاری کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں مجھے آنجہانی جناب شمس کنول صاحب (خدا ان کو جنت نصیب کرے) کے ایک مکتوب (کتاب نما جنوری ۱۹۹۴ء) کے الفاظ یاد آرہے ہیں: "طاہر بھائی! آپ سے ایک بات اور کہنا ہے (قدرت کرے میری یہ بات آپ کی کاروباری پالیسی کو متاثر نہ کرے) کہ قافیے کی ماہیت اور ساختیاتی فکر جیسے موٹر پارٹس چھاپ

چھاپ کر اپنے قارئین کے صبر و ضبط کا امتحان کب تک لیتے رہیں گے۔ یہ شہ پارے کسی داؤ تصنیف کی تخلیق نہیں کسی فیکٹری کا پروڈکشن معلوم ہوتے ہیں۔ براہِ کرم اس بڑھاپے میں لوہے کے چنے مت چبوائیے۔ ساتھ میں اپنی کمزوری کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ کچھ مضامین تو اپنے سر کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ کچھ پلے نہیں پڑتا۔ شاید میری کم علمی اور مطالعہ کی کمی کی وجہ سے ہے لیکن ہے یہ حقیقت۔

خیر آپ سے استدعا ہے کہ بڑے بڑے عالموں فاضلوں اور بڑے دانش وروں کے علاوہ عام معمولی اوسط قاری کی پسند کی طرف بھی دھیان دیجیے۔ اور اچھے افسانے بھی شائع کیجیے۔ ہر شمارے میں اوسطاً پانچ چھے سنجیدہ مضامین اور ایک یا دو طنز و مزاح کے مضامین اور صرف ایک افسانہ ہوتا ہے۔ ایک دو شماروں میں تو سات آٹھ تک مضامین شائع ہوئے ہیں (۱۹۹۵ء کے شماروں کا اوسط لیا ہوں) اور کسی کسی شمارے میں تو افسانہ بالکل ہی غائب رہتا ہے۔ خامہ بگوش کا کا کالم مضامین کی یکسانیت Monotony دور کرنے میں کچھ معاون ثابت ہوتا ہے لیکن افسانوں کی کمی ہمیشہ کھٹکتی ہے۔ اچھے افسانے ادب کا اتنا ہی اہم حصّہ ہیں جتنا کہ سنجیدہ مضامین اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ افسانوں کا کوٹا کچھ بڑھائیے۔ ہم آپ کے احسان مند رہیں گے۔

جناب شمس کنول کے انتقال کے بارے میں پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ مجھے ان سے خاص عقیدت تھی۔ کچھ ہی روز پہلے میں نے ان کو لکھا تھا "...... خدارا اس جریدے کو بند مت ہونے دیجیے۔ "الف تا افق" جیسے بے لاگ بے خوف اور انسان دوست جریدے ملک میں کتنے ہیں؟ اسے کسی بھی طرح جاری رکھیے..." بعد میں پتا چلا کہ جس وقت میں یہ خط لکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ وفات پا چکے تھے۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے۔

ادبی تہذیبی خبریں

گوپی چند نارنگ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دہلی ۱۵ر دسمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کتاب ' ساختیات ' پس ساختیات اور مشرقی شعریات ' سمیت مختلف ہندستانی زبانوں کی ۲۰ کتابوں کو اس سال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اکادمی کے سکریٹری اندرناتھ چودھری نے ایک پریس نوٹ میں یہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ان کتابوں کا انتخاب ہر زبان سے متعلق جیوری کی سفارشات کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ اس سال انگریزی زبان کی کسی کتاب کو ایوارڈ نہیں دیا جاسکا اور ڈوگری کے ایوارڈ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ پروفیسر نارنگ کی تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل اس مبسوط کتاب میں نہ صرف نئی ادبی تھیوری کی پیش رفت کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے ' بلکہ مشرقی شعریات یعنی سنسکرت ' عربی اور فارسی شعریات کی نئی تبدیلیوں کی روشنی میں بازیافت کی گئی ہے نیز مابعد جدیدیت اور نئے فلسفے کی جملہ شاخوں پر بھی خیال افروز بحث کی گئی ہے۔ مبصرین نے اس کتاب کو ایک غیر معمولی علمی کارنامہ قرار دیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک تہنیتی تختی اور ۲۵ ہزار روپے نقد پر مشتمل ہوتا ہے۔

ادارہ کتاب نما ' مکتبہ جامعہ ' پروفیسر گوپی چند نارنگ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

رفعت سروش کو ساہتیہ اکیڈمی کا ترجمے پر ایوارڈ

دہلی : ساہتیہ اکیڈمی نے جن سولہ کتابوں پر ترجمے کے لیے مترجم حضرات کو ایوارڈ دیا ہے اس میں اردو کے جانے مانے ادیب ' شاعر جناب رفعت سروش کو درندا ون لال ورما کے ہندی تاریخی ناول "لکشمی بائی" کے ترجمے پر بھی ایوارڈ دیا گیا ہے ' اس ایوارڈ پر ایک سند نامہ اور دس ہزار روپے نقد دیے جائیں گے۔ ادارہ کتاب نما ' رفعت سروش صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

جوہر اکادمی کے تقسیم انعامات کی تقریب

جوہر اکادمی کے انعام یافتگان کا تعارف کراتے ہوئے

اکادمی کے چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے اپنے روایتی پُراثر انداز میں اکادمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا یہ تنظیم وطن پرستی کے جذبے کو جگانے اور مولانا جوہر کی وطن عزیز کے لیے خدمات سے موجودہ اور آنے والی نسلوں کو واقف کرانے کے لیے ۱۹۸۹ء میں قائم کی گئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا جوہر نے مذہبی تنگ نظری کے خلاف آخری دم تک جدوجہد کی۔ وہ ایک روشن دماغ اور وسیع القلب شخص تھے۔ پروفیسر واسع نے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر میں بلا کا جوش اور ولولہ تھا وہ ہمہ پہلو شخصیت تھے ' شاعر تھے۔ بہترین نثر نگار تھے اور انگریزی دانی میں ان کا جواب نہیں تھا۔ جناب ابرار کرتپوری نے نعت پیش کی۔ پاکستانی شاعر اور "شعلے" کے اڈیٹر شاہد الوری نے غالب کے انداز میں اپنی شاعری سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ سید علی ظاہر شاہ نے مولانا جوہر کا نعتیہ کلام پیش کیا۔ جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین نے اپنے دست مبارک سے جناب شوق اثری (رام پوری) ' جناب الیس فضیلت (رام پوری) ' ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کے جناب اسد یار خاں ' سریع الحرکت فورس کے آئی جی جناب عبدالاحد صدیقی ' محترمہ نلنی سنگھ اور عارف محمد خاں کو انعامات پیش کیے۔ جناب سیتارام کیسری کانگریس آئی کے رکن مسٹر رجت شرما انعام لینے کے لیے موجود نہیں تھے۔ گیانی ذیل سنگھ کو یہ انعام بعد از مرگ دیا گیا۔

سیفی پریمی نہیں رہے

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور و معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر سیفی پریمی کا ۲۹ر نومبر ۱۹۹۵ء کو صبح ساڑھے دس بجے نئی دلی کے شجان مہندرا اسپتال میں انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر سیفی پریمی ۳ر جنوری ۱۹۱۳ء کو ضلع بدایوں کے مردم خیز قصبے گنور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم مولانا حبیب الرحمٰن ایک دین دار ' متواضع اور منکسر المزاج شخص تھے۔ سیفی پریمی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد مشن اسلامیہ ہائی اسکول بدایوں سے دسویں پاس کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آخر میں مولانا اسماعیل میرٹھی پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ ۱۹۵۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں تقرر ہو گیا اور یہیں سے ۱۹۷۶ء میں سبکدوش ہوئے۔

مرحوم کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شعروادب اور سیاست سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اردو کے مشہور شاعر اور ماہر عروض مولانا ابرار حسنی گنوری سے اصلاح سخن لینی شروع کی اور سیفی گنوری کے نام سے غزلیں، نظمیں، افسانے اور تنقیدی مضامین وغیرہ لکھنے شروع کیے۔ ان کی پہلی غزل اور پہلا افسانہ مولانا افق کاظمی امروہوی کے ماہنامہ "قائد" میں چھپا اور پہلا تنقیدی مضمون میر تقی میر پر ماہنامہ "عالمگیر" لاہور میں شایع ہوا۔ اس کے بعد برصغیر ہندوپاک کے مختلف رسالوں میں ان کے مضامین اور افسانے وغیرہ شائع ہوتے رہے۔ ڈاکٹر سیفی پریمی کی سب سے پہلی کتاب شاعری کا مجموعہ "خلش" کے نام سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں مالک رام کے ساتھ مل کر "جگر بریلوی : شخصیت اور فن" کتاب ترتیب دی۔ ۱۹۷۶ء میں "حیات اسماعیل میرٹھی" ۱۹۷۹ء میں "کہاوت اور کہانی" ۱۹۷۸ء میں "آدھی گھڑی" (ناول) اور "منزلیں پیار کی" (ناول) ان کی کتابیں شائع ہوئیں۔

ڈاکٹر سیفی پریمی نہایت صاف گو، بیباک اور خود دار انسان تھے۔ جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم اور امن عالم میں ان کا یقین تھا۔ ان کی موت سے اردو دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹی شمن ہیں۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(محمد عارف خاں)

جامعہ کے شعبہ اردو کی خبریں

ممتاز مفتی کی یاد میں جلسہ

۷/ نومبر ۱۹۹۵ء کو جامعہ کے اردو ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام فیکلٹی ہال میں مشہور و معروف افسانہ نگار، ناول نگار "ممتاز مفتی کی یاد میں" ایک جلسے کا انعقاد ہوا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ مہمان خصوصی اردو کے مشہور افسانہ نگار جوگیندر پال تھے۔ نظامت کے فرائض اسلم جمشید پوری نے ادا کیے۔

پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر محمد ذاکر اور پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ کوثر مظہری نے تعارفی کلمات ادا کرتے وقت ممتاز مفتی اور مہمان مقرروں کا تعارف پیش کیا۔ جبین انجم نے ممتاز مفتی کی کہانی "مہندی والا ہاتھ" پڑھی۔ اور اس کہانی پر نجمہ خاں نے ایک جائزہ پیش کیا۔ آخر میں اسلم جمشید پوری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

احمد رضی کی رحلت

ڈاکٹر شہپر رسول کے بڑے بھائی، کہنہ مشق شاعر احمد رضی کا گزشتہ دنوں بچھراؤں میں انتقال ہوگیا۔ موصوف اردو کے مشہور شاعر تھے اور پروفیسر عنوان چشتی کے اہم شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

پلاٹینم جبلی تقریبات

شعبۂ اردو کے زیر اہتمام یک روزہ سمینار

۵/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو شعبہ اردو کے زیر اہتمام ایک روزہ سمینار کا انعقاد کانفرنس ہال میں ہوا۔ سمینار کا موضوع "اردو زبان و ادب کے فروغ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصہ" تھا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کے سابق لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے ادا کیے۔ پروفیسر صغرا مہدی نے اس موقع پر ابتدائی کلمات میں سمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ مہمان خصوصی جناب پروفیسر سلامت اللہ نے جامعہ کے ماضی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ شہاب الدین انصاری نے کہا کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا ادارہ ہوگا جس نے اردو کے فروغ میں جامعہ سے زیادہ حصہ لیا ہو۔

پہلے اجلاس کی صدارت اردو کی مشہور و معروف افسانہ نگار، ناول نگار قرۃالعین حیدر نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد محمود نے ادا کیے۔ اس اجلاس میں معین الدین صاحب، عبداللہ ولی بخش قادری، سید غلام حیدر علی نقوی اور پروفیسر مجیب رضوی نے مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر سید جمال الدین، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، شعیب رضا وارثی، یوسف عامر، کوثر مظہری اور اسلم جمشید پوری نے بحث و مباحثے میں حصہ لیا۔ آخر میں ڈاکٹر شہپر رسول نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر عنوان چشتی (صدر شعبہ اردو) نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے ادا کیے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے "جامعہ اور اردو دانشوری" عنوان پر اور پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے "ڈاکٹر سید عابد حسین کی ادبی ڈرامہ نگاری" پر مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر صادقہ ذکی کا موضوع "جامعہ میں ڈرامہ

نگاری اور پروفیسر مجیب" تھا۔ ڈاکٹر شہناز انجم کے مقالے کا عنوان "ادبی نثر اور جامعہ کے اہم نثر نگار" تھا۔ عبداللطیف اعظمی نے "اردو صحافت کے فروغ میں جامعہ کا حصہ" پیش کیا۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اجلاس میں پڑھے گئے تمام مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اندرون جامعہ ہونے والی کارروائیوں میں اردو زبان کے استعمال کو بحال کرنے پر زور دیا۔

پروفیسر حنیف کیفی اور پروفیسر محمد ذاکر نے بھی اپنے تاثرات بیان کیے۔ آخر میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(اسلم جمشید پوری)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سابق سینئر استاد اور معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پریمی کا ۲۹ر نومبر ۱۹۹۵ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین اسی روز بعد نماز عصر جامعہ کے قبرستان میں ہوئی۔ سیفی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے مورخہ ۶ر دسمبر ۱۹۹۵ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تاریخ و ثقافت کے طلبہ کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر مجیب اشرف، سید جمال الدین اور سہیل احمد فاروقی نے مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا اور ان کے انسانی اوصاف پر روشنی ڈالی۔ جلسے کے اختتام پر مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پیش کی گئی:

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک سابق سینئر استاد اور معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن سیفی پریمی ۲۹ر نومبر ۱۹۹۵ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)

سیفی پریمی صاحب ۱۳ر جنوری ۱۹۳۳ء کو ضلع بدایوں کے قصبہ گنور میں پیدا ہوئے۔ علمی اور دینی ماحول میں ابتدائی تعلیم مکمل کر کے انھوں نے ثانوی اور اعلا تعلیم کے مراحل بدایوں اور علی گڑھ میں طے کیے۔

سیفی صاحب نے ایک مشفق استاد اور خلیق و ملنسار رفیق کار کی حیثیت سے جامعہ کے طلباء اور اسٹاف دونوں کے دلوں میں خاص جگہ بنالی تھی۔ انھوں نے خلوص و محبت اور رواداری کو ہمیشہ اپنا شعار بنائے رکھا اور یہی وہ دولت ہے جو انسان کو لافانی بناتی ہے۔

یہ جلسہ ڈاکٹر سیفی پریمی کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ہم سیفی صاحب کے اہل خانہ اور ان کے برادر عم زاد پروفیسر مجیب اشرف صدر شعبہ تاریخ و ثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔"

سکریٹری ہسٹری ایسوسی ایشن، شعبہ تاریخ و ثقافت،
جامعہ ملیہ اسلامیہ

غالب اکادمی میں مشاعرہ

۳ر دسمبر شام محترم رفعت سروش کی صدارت میں انجمن شاخ ادب کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس مشاعرہ کی خصوصیت یہ تھی کہ دہلی کے ممتاز شاعر وصی احمد وصی نے اپنے استاد جناب ساحل سحری صاحب کو دستار باندھ کر اس قدیمی روایت کو تازہ کیا اس موضوع پر جناب گلزار دہلوی نے پُراثر تقریر کی اور عنوان چشتی نے اس رشتے کو اپنی تقریر سے وقار بخشا۔

اس مشاعرہ میں جن معتبر شعراء نے شرکت کی ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

جناب ابرار کرتپوری، واجد سحری، افضل کرتپوری، نظمی سکندر آبادی، سیماب سلطانپوری، طالب رام پوری، ساحل سحری، ملک زادہ جاوید، دلکش آفریدی، اعجاز انصاری، انداز دہلوی، شکیل سحرابیوی، وصی احمد وصی، محبوب امین، محسن بدر، شمس رمزی، دلشاد شاہجہاں پوری، کوثر متین، شاہد نگینوی، نشتر بچھرایونی، محترمہ ترنم نشاط، زینت عالمی، اور دیگر شعراء نے سامعین کو رات دیر گئے تک اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ ظہیر دہلوی کی کنوینرشپ میں نوجوان شاعر فاخر ادیب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انجمن کے صدر الحاج محمد سلیم نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

غالب اکیڈمی کی سلور جوبلی کے موقع پر
پروفیسر نارنگ کا خطبہ

نئی دہلی ۱۴ر دسمبر (نمائندہ عوام) غالب اکیڈمی کی سلور جوبلی کے موقع پر ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر حکیم عبدالحمید صاحب کی سرپرستی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے موضوع پر توسیعی خطبہ دیا۔ انھوں نے سابقہ عالمی اور قومی تخلیقات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے جدید تر ادبی تخلیق

جلسے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر بشیر الدین احمد نے فرمائی۔ استقبالیہ تقریر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اور تعارفی تقریر پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ تقریب کی مناسبت سے متین امروہوی نے قطعہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عقیل احمد نے انجام دیے۔

دہلی یونیورسٹی، شعبہ اردو کی خبریں

نئی دہلی، ۵؍ دسمبر کو پروفیسر محمد حسن نے "اودھ میں اردو ادب کا تہذیبی و فکری پس منظر" کے عنوان سے نظام خطبہ دیا۔ جلسہ کا افتتاح وزیر امور خارجہ پرنب مکھرجی نے کیا۔ پروفیسر قمر رئیس نے تعارف پیش کیا اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے شکریہ ادا کیا۔

۳۰؍ نومبر ۱۹۹۵ء ڈاکٹر صادق کو دہلی اردو اکیڈمی کے نئے سکریٹری منتخب ہونے پر اعزازیہ دیا گیا۔ صدر شعبہ اردو نے اپنے افتتاحی کلمات میں ڈاکٹر صادق کی علمی، ادبی خدمات کو سراہا۔ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر شمیم نکہت اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ڈاکٹر صادق کو مبارکباد پیش کی۔

۲۹؍ نومبر، اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کی جانب سے "اردو بیرون ممالک میں" پر ایک سمینار کا انعقاد کیا۔ پروفیسر عبدالحق نے جلسہ کا افتتاح کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے مندرجہ بالا عنوان پر ایک نہایت پُر مغز تقریر کی۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر سید صادق سکریٹری اردو اکیڈمی نے کی۔ اساتذہ کرام میں پروفیسر شمیم نکہت، ڈاکٹر قدسیہ زیدی، ڈاکٹر نکہت ریحانہ خاں، ڈاکٹر محمد رضا، ڈاکٹر ارتضی کریم، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر توقیر احمد، ڈاکٹر محمود فیاض اور اسکالرز و طلبہ نے شرکت کی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے شرکاء سمینار کا شکریہ ادا کیا۔

۱۸؍ دسمبر۔ اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کی جانب سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملنے پر ڈاکٹر ایس۔ ایس۔ رانا ڈین فیکلٹی آف کالجز کی صدارت میں اعزازیہ دیا گیا۔ جلسہ کا آغاز صدر شعبہ اردو پروفیسر عبدالحق کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ گوپی چند نارنگ "مرحلہ شوق کے مسافر ہیں"۔ پروفیسر نارنگ کی علمی، ادبی خدمات کا شعبے کے اساتذہ ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر شریف احمد، پروفیسر امیر عارفی اور ڈاکٹر رانا نے کھلے دل سے اعتراف کیا اور مبارکباد پیش کی۔

(ادارہ کتاب نما و مکتبہ جامعہ، پروفیسر نارنگ اور ڈاکٹر صادق کے ساتھ ساتھ شعبہ اردو کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کو بھی مبارک باد دیتا ہے کہ ۱۹۹۵ء نے جاتے جاتے انھیں دو قابل فخر خوشیاں پیش کیں۔)

شجاع خاور پر فالج کا حملہ

نئی دہلی، ۱۴؍ دسمبر۔ اردو کے منفرد ممتاز شاعر شجاع خاور فالج کے حملہ کے بعد رام منوہر لوہیا اسپتال کی شدید دیکھ بھال کی یونٹ میں زیر علاج ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کے دائیں جانب فالج گرا ہے۔ اب وہ ہوش میں آگئے ہیں۔ اور تازہ ترین خبروں کے مطابق اب ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی ہے۔

عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
ٹونک کے نئے ڈائریکٹر

ٹونک، (راجستھان) ۱۹؍ دسمبر۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ مولانا ابوالکلام آزاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک کے نئے ڈائریکٹر جناب صاحبزادہ عبدالمعید خاں نے اپنے عہدے پر کام شروع کردیا ہے۔ ۲۴؍ جولائی ۱۹۹۵ء کو راجستھان پبلک سروس کمیشن کے ایک مقابلہ میں جناب صاحبزادہ عبدالمعید خاں کا سلیکشن ہوا اور حکومت راجستھان نے اپنے ۹؍ نومبر ۱۹۹۵ء کے ایک آرڈر کے تحت انھیں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز کردیا۔ جناب عبدالمعید خاں، ٹونک ریاست کے تیسرے فرماں روا نواب محمد علی خاں بہادر کے (جوکہ اس ادارے کے بانی ہیں) پڑپوتے ہیں، وہ پانچ مضامین میں ایم۔ اے۔ ہیں۔ اس کے تقرر کا راجستھان کے ادیبوں اور دانشوروں نے خیر مقدم کیا ہے اور صوبائی سرکار کو مبارکباد دی ہے۔

اردو ہے جس کا نام

مراد آباد۔ ۵؍ دسمبر۔ میونسپل کارپوریشن کے میئر ہمایوں قدیر انصاری اور ۴۴؍ اراکین نے اردو میں حلف لیا۔ ۳۱ نے ہندی میں حلف لیا۔ بی جے پی کے رکن ہنس راج تاؤ نے بھی اردو میں حلف لیا۔

ڈاکٹر قیصر شمیم کا نیا پتا :
38/۱۷۔ این سی ای آر ٹی کیمپس نئی دہلی ۱۶

علی جواد زیدی کا نیا پتا :

۱۸۹ / ۳-سوشواس کھنڈ گومتی نگر لکھنؤ-۲۲۶۰۱۰

ڈاکٹر رشید موسوی کا نیا پتا :

۳۰۳-روزا پارٹمنٹ گارڈن ٹاور،
مسب ٹینک، حیدر آباد-۵۰۰۰۲۸ (آندھرا پردیش)

نور برہانپوری کا انتقال پر ملال

شہر سورت کے نامور بزرگ شاعر جناب نور برہانپوری کا انتقال گذشتہ دنوں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ آپ ۷۵ برس کے تھے اور ایک عرصہ سے مرض دمہ میں مبتلا تھے۔

نور برہانپوری نے آبائی وطن برہانپور کو خیرباد کہہ کر گذشتہ ۵۵ سال سے شہر سورت میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اندور کے بزرگ استاد و شاعر جناب رمضان خاں ذاکر اندوری سے شرف تلمذ حاصل کر کے اردو شاعری میں اپنا منفرد مقام حاصل کر لیا تھا۔ (شہادت خاں صادق بینا نگری)

استاد سخن حضرت نظیر علی عدیل کا سانحہ ارتحال

دکن کے نامور استاد سخن جانشین صفی اورنگ آبادی حضرت سید نظیر علی عدیل ۲۰ نومبر ۸۵ء کو پانچ بجے شام اپنے خدائے حقیقی سے جا ملے۔ حضرت عدیل کا شمار صف اول کے نعت گو اور غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ ہر صنف سخن نیز عروض پر عبور کامل رکھتے تھے۔ تقریباً تین چار ضخیم دیوان زیر طبع ہیں۔ ان کے شاگرد ملک و بیرون ملک کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ م-ق- سلیم، حیدر آباد

دیگر اداروں کی اہم مطبوعات

اوصاف حمیدہ	عبدالغنی فاروق	۴۰/-
اسلامی معاشرت کے آداب	ڈاکٹر ظہور الحسن شارب	۲۲/-
اسلامی ریاست	مرتب: خورشید احمد	۹۹/-
المرأة فی الاسلام	مالک رام (عربی زبان)	۹۰/-
اللہ کے سپاہی	مسکین حجازی	۱۲/-
الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری	۱۲۰/-
اسلام اور موسیقی	مولانا مفتی محمد شفیع	۴۰/-
امام اعظم ابوحنیفہ رح	مفتی عزیز الرحمٰن	۱۰۰/-
امام اعظم حضرت ابوحنیفہ کے حیرت انگیز کارنامے	مولانا عبدالقیوم حقانی	۴۰/-
اسلامی فقہ (مکمل)	مولانا منہاج الدین مینائی	۱۵۰/-
احادیث قدسیہ (عربی اردو)	ابومسعود ندوی	۵۰/-
الفاروق (مکمل)	مولانا شبلی نعمانی	۴۵/-
انفاس العارفین	حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۴۰/-
اختلافات، اسباب، آداب	جمال سلطان	۲۵/-
اسلامی ثقافت کی حفاظت	جمال سلطان	۳۰/-
اصول اسلام	مولانا ادریس کاندھلوی	۲۰/-
اسباب زوال امت	علامہ شکیب ارسلان	۱۵/-
اسلام میں دعوت و تبلیغ کے اصول	قاری محمد طیب	۱۸/-
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، اوّل تا سوم (مکمل)	محمد یامین قریشی فی حصہ ۵۵ روپے	۱۶۵/-
اسلام اور ارتقاء زندگی	ڈاکٹر جمیل احمد	۱۵/-
اسلام ابدی خطوط اور نئے زاویے	شمیم اختر	۸۰/-
آئینہ عملیات	صوفی محمد عزیز الرحمٰن صاحب	۴۰/-
اشارے منزل کی طرف	شاہ محمد عثمانی	۴۰/-
الاسماء الحسنیٰ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	۵۰/-
آئینہ نماز	مولانا محمد عاشق الٰہی	۱۲/-
اسلام کا قانون محبت	ریاض حسین	۱۴/-
امام غزالی	اعجاز الحق قدوسی	۷/-
اسلام مسلمان اور غیر مسلم	علامہ یوسف صاحب	۳۵/-
اسلامی قانون فقہ اور جدید مسائل نکاح	شاہد حسن قاسمی	۱۰۵/-
امت مسلمہ کا انحطاط اور اس کی تعمیر نو	غلام محمد	۵۰/-
الوعظ الاعظم	وقار علی	۵۶/-
اسلامی قانون، نکاح، طلاق، وراثت	مولانا مفتی فضیل الرحمٰن	۵۰/-
اکسیر ہدایت (اردو)	مولانا محمد سعید نقشبندی	۲۰۰/-
اسلامی نام	خلیل الرحمٰن نعمانی	۱۲/-
الصلوٰۃ فی القرآن	سید افتخار حیدر	۲۰۰/-
ایمان باللہ اور اس کے عملی تقاضے	روشن علی	۸/-
ایک مثالی استاد	پروفیسر محمد اکرم طاہر	۵/-
آسان ترکیب نماز	قاری محمد مشتاق	۱۵/-

ب

بچوں کے لیے قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	۱۲/۵۰
بچوں کے لیے حدیث	//	۱۲/۵۰
بہار شریعت (مکمل)	احمد رضا خاں صاحب	۵۰۰/-
بہشتی زیور کلاں مکمل	مولانا اشرف علی صاحب	۱۵۰/-
بہشتی زیور خورد	//	۶۰/-
بارہ تقریریں	محمد شریف نوری	۲۵/-
بابا نانک شاہ	مولانا احتشام الحسن صاحب	۸/-
بنیادی معلومات، قرآن مجید	مولانا ظفر علی	۱۸/-
بارہ مہینوں کے فضائل واحکام	مفتی سید عبدالکریم صاحب	۳۵/-
بیس تقریریں	مولانا ابومنور محمد بشیر	۴۵/-
بائبل، قرآن اور سائنس	ثناء الحق صدیقی	۵۰/-
پنج سورہ	پلاسٹک کور	۱۴/-
پیارے رسول کی پیاری باتیں	زبیر احمد	۸/-

ت

تحریک دعوت و تبلیغ	عبدالمجید خطیب	۱۰/-
تعبیر نامہ خواب (عربی، اردو)	امام محمد بن سیرین	۲۸/-
تاریخ مدینہ منورہ	محمد عبدالمعبود	۴۵/-
تاریخ تہذیب اسلامی	پروفیسر محمد یٰسین صدیقی	۴۵/-

تذکرہ وکلام حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی — طالب ہاشمی — ۳۰/-
تعلیم الاسلام اردو (مکمل) — مفتی محمد کفایت اللہ — ۱۸/-
تعلیم الاسلام انگلش (مکمل) — مفتی محمد کفایت اللہ — ۳۰/-
تاریخ اسلام — سید امیر علی — ۳۰/-
تاریخ فرشتہ اوّل ودوم مکمل: عبدالحیٔ خواجہ (کامل سیٹ) — ۴۰۰/-
تذکرۃ الاولیا (اردو) — شیخ فریدالدین عطار — ۷۵/-
تذکرۂ جلیل — حاکم پیرزادہ — ۲۵/-
تصوف کی باتیں — ڈاکٹر ظہورالحسن شارب — ۱۸/-
تقویت الایمان — مولانا شاہ اسمٰعیل شہید — ۲۰/-
تصوّف کے دو نامور کردار — ڈاکٹر ریاض احمد — ۱۵/-
تجلی — شاہ بلیغ الدین — ۸۵/-
تجوید کی کتاب — شاہ محمد عثمانی — ۱۰/-
تاریخ دارالعلوم دیوبند اوّل دوم — سید محبوب رضوی (کامل سیٹ) — ۳۰۰/-
جدید فکری بحران — ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی — ۲۰/-
جلاالقلوب — کاش اکبری — ۱۵/-
جدید مسائل کے شرعی احکام — مولانا خورشید حسن قاسمی — ۳۲/-
حضرت ابوبکر صدیق رضہ — محمد حسین ہیکل — ۷۵/-
حصن حصین — مولانا محمد ادریس — ۳۵/-
حیات ولی — حافظ عبدالحمید قادری — ۵۰/-
حج مسنون کا طریقہ — مومن محی الدین — ۳۵/-
حفظ الایمان — مولانا اشرف علی تھانوی — ۶/-
حدیثی اصول — وجیہ الدین احمد خاں — ۱۵/-
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی — مظہر انصاری دہلوی — ۸/-
حی علی الصلوٰۃ — محمد یعقوب علی خاں — ۸/-
حضرت عائشہ — شرافت حسین — ۱۰/-
حیات رسولؐ — علی اصغر چودھری — ۲۵/-
حضرت لوط علیہ السلام — حافظ افروغ حسن — ۶/-
حضرت عثمان بن عفانؓ — محمد حسین ہیکل — ۳۰/-
حضرت قادر رقیس الاعظم حیات وکرامات
مولانا سید اخلاق حسین دہلوی — ۳۵/-
حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ
مولانا سعود عالم قاسمی — ۶۰/-

حدائق بخشش (کامل) — ۶/-
خالد ابن ولیدؓ — جنرل محمد اکبر خاں — ۱۵/-
خدا موجود ہے — عبدالحمید صدیقی — ۱۸/-
خطبات ہاشمی — سید محمد ہاشمی — ۱۵/-
خوب ترنگ — ڈاکٹر عالی جعفری — ۸۵/۵۰
دینی مسائل — مولانا اشرف علی تھانوی — ۳۵/-
دعوت وتبلیغ میں مسجد کا کردار: مولانا امیرالدین مہر — ۱۲/-
رہبر عالم — آفتاب احمد بدایونی — ۲۰/-
روح کی بیماریاں اور ان کا علاج: مولانا محمد اختر صاحب — ۸۰/-
رحمت عالم — سید سلیمان ندوی — ۱۴/-
رسول خدا کی غریبوں سے محبت: مولانا امداد صابری — ۵/-
روح، عذاب قبر اور سماع موتی — عبدالرحمٰن گیلانی — ۲/-
روح تصوّف — مفتی محمد شفیع — ۲۵/-
رسول حکمت — مسعود احمد شاہ — ۳۵/-
سیرت خاتم النبیین — ڈاکٹر ماجد علی خاں — ۱۰۰/-
سائنس اور اسلام — مولانا قاری محمد طیب — ۱۵/-
سو صحابۂ کرام وصحابیات — اسلامک بک فاؤنڈیشن — ۲۰/-
سفر نامۂ حج — عبدالسلام الداعی — ۲/-

سیر حضرت یوسف علیہ السلام قرآن وحدیث کے آئینے میں
مولانا خورشید حسن قاسمی — ۳۰/-
مناجات مقبول — مترجم اوّل درمیانی — ۱۶/-
سفر آخرت — ام سلمہ — ۵۵/-
سیرت نبوی اور مستشرقین — ڈاکٹر عبدالعلیم — ۶۰/-
سنت اللہ کی روشنی میں حفظ امن: مولانا عبداللہ طارق — ۱/-
سائنس میں مسلمانوں کی خدمات — عطش درانی — ۸/-
شریعت وتصوّف — مولانا شاہ مسیح اللہ خاں — ۲/-
شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب: صفی الرحمٰن اعظمی — ۴/-
شریعت میں مصلحت وضروریات کا لحاظ: علامہ ابن قیم — ۳/-
شاہان بے تاج — وحیدہ نسیم — ۴/-
شہید اعظم سیدنا حضرت امام حسینؓ: مولانا ابوالکلام آزاد — ۱۰/-
شمائل رسولؐ — محمد میاں صدیقی — ۲۹/-

شفاء العلیل	شاہ ولی اللہ دہلوی	۲/-
شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی فرید الوحیدی		۲۵/-
ضیائے عرفان	نادم بلخی	۵/-
طلبہ کے لیے ضابطۂ اخلاق	علی اصغر چشتی	۸/-
علاء الدین خلجی	مظہر انصاری دہلوی	۸/-
عقائد اسلام	عبدالحلیم محمود	۳۰/-
فتنۂ جہیز	عبدالرحمن کوندو	۵۰/-
فتوح الغیب	شیخ عبدالقادر جیلانی	۴/-
فوائد الفواد کا علمی مقام	مولانا اخلاق حسین	۱۲/-
فلاح دین و دنیا	مفتی شوکت علی فہمی	۵/-
فکر اسلامی کی اصلاح	ڈاکٹر طٰہٰ جابر علوانی	۳۰/-
فقہ عمرؓ	شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۵/-
فقہ حضرت ابوبکرؓ	ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی	۶۵/-
قرآنی معارف	مولانا محمد نظر علی خاں	۱۲/-
قرآن اور کائنات	حاجی غلام حسن	۳۰/-
کتابت حدیث	مفتی رفیع عثمانی	۲۴/-
کربلا کے بعد قاتلان حسینؓ کا عبرت ناک انجام	پروانہ ردولوی	۲۵/-
کربلا کی بہادر خواتین	پروانہ ردولوی	۲۵/-
گلدستۂ نماز	مولانا غلام محمد	۸/-
مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاسؒ	مولانا سید ابوالحسن ندوی	۳۰/-
مرنے کے بعد کیا ہوگا	مفتی محمد عاشق الٰہی	
محمد ابن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح	مولانا مسعود عالم ندوی	۳۵/-
معرکۂ دین و سیاست	نعیم صدیقی	۲۵/-
مسلمان عورت	ابوالکلام آزاد	۳۰/-
مسلمان قاضیوں کا بے لاگ عدل	سید عبدالصبور طارق	۴۵/-
نو بچوں کے پیارے نام	الیاس عادل	۴/-
حافظ	پروفیسر بدر الدین الحافظ	۴۵/-
ساہرات	مولانا شمس الدین	۴/-
[illegible]	[illegible]	۱۱/-

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ	ڈاکٹر احسان حقی	۵/-
معراج رسول	محمد گل احمد عتیق	۷/-
میلاد گوہر	منشی گوہر علی خاں	۱۵/-
اصل میلاد اکبر وارثی	خواجہ محمد اکبر وارثی	۱۵/-
مقدمۃ القرآن	وحید الدین احمد خاں	۴/-
مسئلہ سود	مولانا مفتی شفیع صاحب	۲۵/-
محدثین عظام	ڈاکٹر تقی الدین ندوی	۱۰۰/-
مکتوبات حضرت علی	حکیم نبی احمد خاں	۶۵/-
مضامین قرآن	العلا پبلیکیشنز	۱۰۰/-
مسلم اوقاف کے اصول نظم و نسق	اصطفےٰ حسین	۵۰/-
رمضان کے روزے (فضائل و مسائل)		۱۲/-
معمار انسانیت (سیرت)		۸۰/-
مفتاح کنوز السنۃ		۲۰۰/-
نماز	العلا پبلیکیشنز	۸/-
نصیحت المسلمین	مولانا خرم علی صاحب	۸/-
نور الشیوخ	حضرت پیر محمد شاہ	۲۵/-
نماز مسنون کلاں	مولانا عبدالحمید سواتی	۱۴/-
وظائف و عملیات	محمد اشفاق حسن خاں	۲۵/-
یادوجیہ کے اقوال و افکار اور آثار	ڈاکٹر شعائر اللہ خاں	
قرآن کریم حوالہ نمبر ۱۰	جلی قلم	۹/-
کنز الایمان قرآن کریم حوالہ نمبر ۶۲۳	جلی قلم	۱۲۵/-
قرآن کریم لفظی ترجمہ بامحاورہ ترجمہ		
عربی کا تلفظ حوالہ نمبر ۵۰	مجلد	۱۰۰/-
پاکستانی مجموعہ اوراد و وظائف		۳۵/-
رکن الدین		۱۵/-
حصن حصین کلاں	۲۳×۳۶/۱۶	۳۰/-
معرکۂ کربلا اردو	۲۰×۳۰/۱۶	۳۰/-
دعائے حزب البحر		۳/-
یسرنا القرآن درمیانی	۲۲×۲۶/۱۶	۲/۵۰
دعائے ختم القرآن		۳/-

القرآن کریم نمبر۶۴، ۱۶سطری، ۵۵۲صفحات		۳۵/-	تجرید بخاری شریف		۵۰/-
القرآن کریم نمبر۳۰، ۱۶سطری، ۵۵۲صفحات		۳۰/-	آفتاب عالم	مجلد	۴۵/-
القرآن کریم نمبر۱۲ حافظی، ۱۵سطری، ۶۱۶صفحات		۳۸/-	تذکرۃ الاولیاء	مجلد	۵۰/-
القرآن کریم نمبر۲۳ حافظی، جلی قلم		۳۸/-	بہار شریعت حصہ اوّل	۱۰ حصے	۱۱/-
القرآن کریم نمبر۳۹ حافظی پریس		۳۰/-	بہار شریعت حصہ دوم	۱۰ حصے	۱۱/-
مدنی بہشتی زیور مکمل	۲۰×۲۶/۸	۵۵/-	قاعدہ ۴ ورقی کلاں	PL	۲/۷۵
اشرفی بہشتی زیور مکمل	۲۰×۳۰/۸	۴۵/-	قاعدہ ۴ ورقی خورد	PL	۲/-
اشرفی بہشتی زیور مکمل	۲۰×۳۰/۸	۵۵/-	قاعدہ ایک ورقی کلاں	PL	۱/۵۰
مدنی بہشتی زیور مکمل	۲۰×۲۶/۸	۵۰/-	قاعدہ ایک ورقی خورد	PL	۱/۲۵
غنیۃ الطالبین مجلد	ارمغان سرمدی	۶۵/-	طب نبوی		۱۲/-
غنیۃ الطالبین مجلد	شمس بریلوی	۷۲/-	فیروز اللغات	درمیانی	۵۰/-
سنی بہشتی زیور مجلد		۴۰/-	فیروز اللغات	کلاں	۱۷۵/-
قصص الانبیاء مجلد مکمل		۵۰/-	فوائد الفوائد	مجلد	۴۰/-
الفاروق مجلد مکمل		۲۰/-	عربی بول چال		۶/-
فضائل اعمال	جلد اوّل	۵۰/-	عربی ٹیچر		۱۲/-
فضائل اعمال	جلد دوم	۵۰/-	ہندی عربی ٹیچر		۱۰/-
شمس المعارف	مجلد	۷۸/-	میدانِ حشر		۸/-
عوارف المعارف	مجلد	۷۲/-	خدا کی جنت		۸/-
اُسوۂ رسول اکرمؐ	مجلد	۶۰/-	طبّ روحانی		۱۴/-
فضائل حج	مجلد	۲۵/-	روشن چراغ		۳۲/-
فضائل صدقات	مجلد	۲۴/-	پارہ جات	متفرق	۱/۵۰
شمع شبستانِ رضا	مجلد	۴۰/-	کشف المحجوب		۴۵/-
نقش سلیمانی اردو	مکمل	۳۲/-	ستاروں کی روشنی میں بچوں کے نام		۱۵/-
شفاء العلیل القول الجمیل	مجلد	۲۱/-	تاریخ اسلام تین جلدیں مکمل سیٹ		۱۷۵/-
عملیات و تعویذات	مجلد	۲۱/-	جاء الحق	مکمل مجلد	۴۵/-
دلائل الخیرات مترجم اوّل	درمیانی	۱۶/-	قانونِ شریعت		۵۴/-
مرنے کے بعد کیا ہوگا		۲۴/-	جنتی زیور	مجلد	۴۵/-
اصلی میلاد اکبر	اوّل	۱۰/-	موت کی یاد	اردو	۸/-
اسلام کیا ہے؟	مجلد	۱۴/-	اعمال قرآنی		۱۲/-
دلائل الخیرات مترجم اوّل	کلاں	۲۴/-	مسلمان خاوند	اردو	۸/-
سستی غذاؤں سے علاج اوّل دوم		۱۴/-	اصلاح الرسوم		/-

نماز باتصویر	۲/-	قرآن کریم نمبر ۹ مترجم اشرفی امبوز	۲۲/-
شرح اسماء الحسنیٰ	۱۴/-	قرآن کریم نمبر ۴۲۲ مترجم رضوی امبوز	۲۵/-
رحمت عالم	۱۱/-	قرآن کریم نمبر ۱ معری (سفید) امبوز	۱۰/-
مکاشفۃ القلوب	۴۵/-	قرآن کریم نمبر ۷ معری (سفید) امبوز	۷۵/-
وظائف رحمانی	۱۶/-	قرآن کریم نمبر ۱۰۰۱، معری (سفید) امبوز	۶۵/-
میلاد اکبر ہندی	۱۵/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) ریگزین	۷۰/-
مسلمان خاوند ہندی	۸/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) پاپلین	۸۵/-
موت کی یاد ہندی	۸/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) فوم/قینچی	۱۵/-
قصص الانبیاء ہندی مجلد	۳۰/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) ساٹن	۱۰۰/-
بخاری شریف ہندی مجلد	۳۶/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سبز) امبوز	۱۰۰/-
تاریخ اسلام ہندی مجلد	۳۶/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری بارڈر امبوز	۱۰۰/-
آفتاب عالم ہندی مجلد	۳۶/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری گراؤنڈ بارڈر امبوز	۱۰۵/-
اسلام کیا ہے؟ ہندی مجلد	۱۵/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری گراؤنڈ بارڈر پریس	۱۴۰/-
حضرت محمد ہندی مجلد	۳۰/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) امبوز	۹۰/-
معرکۂ کربلا ہندی مجلد	۳۶/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) مقیم	۶۰/-
بہشتی زیور ہندی مجلد	۴۸/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری (سفید) آصف	۶۵/-
مرنے کے بعد کیا ہوگا ہندی	۳۰/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری آرٹ (سفید) ساٹن	۷۵/-
فضائل اعمال اول ہندی	۷۲/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری آرٹ (سفید) پریس	۲۷۰/-
فضائل اعمال دوم ہندی	۷۸/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری آرٹ دوکلر ساٹن	۲۹۰/-
آئینہ نماز ہندی	۱۰/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری آرٹ دوکلر پریس	۳۱۰/-
میری نماز ہندی	۱۰/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری آرٹ تین کلر ساٹن	۳۲۰/-
نقش سلیمانی ہندی مجلد	۲۶/-	قرآن کریم نمبر ۳ معری آرٹ تین کلر پریس	۳۴۰/-
شمع شبستان رضا ہندی	۵۰/-	قرآن کریم نمبر ۳۲۲، معری حافظی ریگزین	۵۵/-
مسنون مقبول دعائیں ہندی	۷/-	قرآن کریم نمبر ۳۲۲، معری حافظی آصف	۴۵/-
ترکیب نماز ہندی پاکٹ	۵/-	قرآن کریم نمبر ۱۳۶ معری حافظی ریگزین	۵۵
چھ باتیں ہندی پاکٹ	۵/-	قرآن کریم نمبر ۱۳۶ معری حافظی آصف	۴۵/-
سنی بہشتی زیور ہندی	۵۰/-	قرآن کریم نمبر ۵۳ معری (سفید) ریگزین	۴۵/-
قرآن کریم نمبر ۳۲۵ معری (سبز) امبوز	۲۳/-	قرآن کریم نمبر ۵۳ معری (سفید) آصف	۳۸/-
〃 نمبر ۳۲۳ معری (سفید) امبوز	۱۷/-	قرآن کریم نمبر ۱۰۱ مترجم ہندی اول	۸۵/-
〃 معری (سفید) امبوز	۱۴/-	قرآن کریم نمبر ۱۰۱ مترجم ہندی آصف	۷۰/-
〃 حافظی امبوز	۱۵/-	قرآن کریم نمبر ۲۲ مترجم رضوی قینچی	۱۱۰/-

۲۲ مترجم رضوی ریگزین	۱۰۰/-	قرآن کریم نمبر۲۳ معرّی پلاسٹک	۴۲/-
۲۲ A مترجم رضوی جلی قلم	۱۱۰/-	قرآن نمبر۲۳ معرّی ریگزین گولڈن	۸۵/-
۲۲ مترجم رضوی پرس	۱۴۰/-	قرآن نمبر۲۳ معرّی ڈائی پرس	۸۰/-
۲۲۲ مترجم رضوی امبوز	۹۰/-	قرآن نمبر۱۲۳ معرّی ریگزین	۳۸/-
بر۲۲۲ مترجم رضوی ریگزین	۸۰/-	قرآن نمبر۱۲۳ معرّی پلاسٹک	۳۹/-
نمبر۱۲۲ مترجم رضوی ریگزین	۹۰/-	قرآن کریم نمبر۱۲۳ معرّی گولڈن پرس	۶۸/-
نمبر۶۴ مترجم اشرفی امبوز	۷۵/-	قرآن کریم نمبر۱۲۳ معرّی پرس ڈائی	۵۸/-
بر۸۱ مترجم اشرفی ریگزین	۸۵/-	قرآن کریم نمبر۱۲۳ معرّی (سفید) پرس	۵۳/-
بر۸۱ مترجم اشرفی پاپلیس	۹۵/-	قرآن کریم نمبر۵۶ معرّی ریگزین	۵۲/-
نمبر۸۱ مترجم اشرفی فینسی	۹۵/-	قرآن کریم نمبر۵۶ معرّی (سفید) پرس	۴۴/-
نمبر۸۱ مترجم اشرفی اوّل	۱۰۰/-	قرآن کریم نمبر۵۶ معرّی (سفید) پلاسٹک	۳۳/-
نمبر۸۱ مترجم اوّل ساٹن	۱۲۰/-	قرآن کریم نمبر۵۶ معرّی گولڈن پرس	۵۵/-
نمبر۸۱ مترجم اوّل پرس	۱۴۰/-	قرآن کریم نمبر۵۶ معرّی (سفید) ڈائی پرس	۵۰/-
نمبر۸۱ مترجم دوکلر ساٹن	۲۹۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹A معرّی (سبز) پرس	۶۰/-
نمبر۸۱ مترجم دوکلر پرس	۳۱۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹A (سبز) پرس گولڈن	۷۰/-
نمبر۸۱ مترجم تین کلر ساٹن	۳۲۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹A (سبز) پلاسٹک	۵۵/-
نمبر۸۱ مترجم تین کلر تین پرس	۳۴۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹A (سبز) ڈائی پرس	۶۵/-
نمبر۴۴ ترجمہ شاہ رفیع الدین	۱۱۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹ معرّی گولڈن پرس	۵۸/-
نمبر۶۶ ترجمہ شاہ عبدالقادر	۱۲۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹ معرّی سادہ پرس	۵۰/-
نمبر۳۲۵ ترجمہ فتح محمد خاں صاحب	۱۱۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹ معرّی ڈائی پرس	۵۳/-
نمبر۵ ترجمہ شیخ الہند	۱۳۰/-	قرآن کریم نمبر۱۱۹ معرّی پلاسٹک	۵۳/-
نمبر۵ ترجمہ شیخ الہند	۱۲۵/-	قرآن کریم نمبر۱۹ معرّی گولڈن پرس	۵۲/-
کریم انگریزی رومن	۷۵/-	قرآن کریم نمبر۱۹ معرّی سادہ پرس	۴۷/-
نمبر۲۲۰ مترجم رضوی ریگزین	۶۰/-	قرآن کریم نمبر۱۹ معرّی ڈائی پرس	۵۰/-
نمبر۲۲۰ مترجم رضوی PL	۶۵/-	قرآن کریم نمبر۱۹ معرّی پلاسٹک	۴۰/-
نمبر۲۲۰ مترجم رضوی پرس	۹۵/-	قرآن کریم نمبر۱۳۹ معرّی گولڈن پرس	۴۸/-
نمبر۲ مترجم اشرفی ریگزین	۵۵/-	قرآن کریم نمبر۱۳۹ معرّی سادہ پرس	۴۰/-
نمبر۲ مترجم اشرفی PL	۶۰/-	قرآن کریم نمبر۱۳۹ معرّی ڈائی پرس	۴۳/-
نمبر۲ مترجم اشرفی پرس	۹۵/-	قرآن کریم نمبر۱۳۹ معرّی پلاسٹک	۳۴/-
نمبر۳۲۳ معرّی ریگزین	۵۰/-	قرآن کریم نمبر۲۴۷ معرّی گولڈن پرس	۴۸/-
نمبر۲۳ معرّی ریگزین	۴۰/-	قرآن کریم نمبر۲۴۲ معرّی سادہ پرس	۴۰/-

قرآن کریم نمبر ۴۴/۳ معرّی	ڈائی پرس	۴۳/-
قرآن کریم نمبر ۴۴/۳ معرّی	پلاسٹک	۳۴/-
قرآن کریم نمبر ۱۴۴/۱ معرّی	گولڈن پرس	۴۴/-
قرآن کریم نمبر ۱۴۴/۱ معرّی	سادہ پرس	۳۴/-
قرآن کریم نمبر ۱۴۴/۱ معرّی	ڈائی پرس	۳۷/-
قرآن کریم نمبر ۱۴۴/۱ معرّی	پلاسٹک	۲۷/-
قرآن کریم نمبر ۴/۴ معرّی	گولڈن پرس	۴۴/-
قرآن کریم نمبر ۴/۴ معرّی	سادہ پرس	۳۶/-
قرآن کریم نمبر ۴/۴ معرّی	ڈائی پرس	۳۹
قرآن کریم نمبر ۴/۴ معرّی	پلاسٹک	۳۰/-
قرآن کریم نمبر ۲/۴۴ معرّی	گولڈن پرس	۳۵/-
قرآن کریم نمبر ۲/۴۴ معرّی	سادہ پرس	۲۴/-
قرآن کریم نمبر ۲/۴۴ معرّی	ڈائی پرس	۳۰/-
قرآن کریم نمبر ۲/۴۴ معرّی	پلاسٹک	۲۲/-
قرآن کریم نمبر ۸/۴۴ مترجم	گولڈن پرس	۵۸/-
قرآن کریم نمبر ۸/۴۴ مترجم	سادہ پرس	۵۰/-
قرآن کریم نمبر ۸/۴۴ مترجم	ڈائی پرس	۵۲/-
قرآن کریم نمبر ۸/۴۴ مترجم	اشرفی پلاسٹک	۴۳/-
قرآن کریم نمبر ۲۰ مترجم	گولڈن رضوی	۶۳/-
قرآن کریم نمبر ۲۰ مترجم	سادہ رضوی	۵۵/-
قرآن کریم نمبر ۲۰ مترجم	ڈائی رضوی	۵۸/-
قرآن کریم نمبر ۲۰ مترجم	پلاسٹک رضوی	۴۸/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۳ لیمینیشن		۱۸۵/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۳ (سفید) سادہ		۱۴۰/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۳ (سبز) سادہ		۱۷۰/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۱ (سفید) سادہ		۱۵۰/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۲۲۲ (سفید) سادہ		۱۳۰/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۱۲۶ (سفید) سادہ		۱۳۰/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۵۲ (سفید) سادہ		۱۱۰/-
ایک تا تیس پاروں کا سیٹ نمبر ۳ چھ جلدوں میں		۹۵/-
سولہ سورہ مترجم کلاں	PL	۲۰/-

سولہ سورہ مترجم درمیانی PL	۱۴/-
سولہ سورہ مترجم رضوی کلاں	۲۵/-
سولہ سورہ مترجم رضوی درمیانی	۱۶/-
سولہ سورہ مترجم اشرفی کلاں	۲۴/-
سولہ سورہ مترجم اشرفی درمیانی	۱۶/-
پنج پارہ نمبر ۳ اوّل سادہ	۲۲/-
پنج پارہ نمبر ۳ دوم سادہ	۱۸/-
پنج پارہ نمبر ۳۲۲ اوّل سادہ	۱۹/-
یازدہ سورہ درمیانی	۸/-
الحزب الاعظم مترجم کلاں	۲۴/-
الحزب الاعظم مترجم درمیانی	۱۶/-
منزل مترجم کلاں	۳/-
منزل مترجم درمیانی	۲/-
منزل مترجم خورد	۱/۵۰
نماز مترجم (سبز) کلاں	۳/-
نماز مترجم (سبز) درمیانی	۲/-
نماز مترجم (سبز) خورد	/۵۰
سورۂ یٰسین شریف مترجم (سبز) کلاں	/۵۰
سورۂ یٰسین شریف مترجم (سبز) درمیانی	/۵۰
سورۂ یٰسین شریف مترجم (سبز) خورد	۱/-
دعائے گنج العرش مترجم (سبز) کلاں	۲/۵۰
دعائے گنج العرش مترجم (سبز) درمیانی	۱/۵۰
دعائے گنج العرش مترجم (سبز) خورد	۱/-
مسنون مقبول دعائیں	۶/-
چھ باتیں اردو	۵/-
آئینہ نماز اردو	۱۰/-
میری نماز اردو	۹/-
یسرنا القرآن ۴۰ صفحات	۲/-
یسرنا القرآن ۴۸ صفحات	۱/۷۵
یسرنا القرآن کلاں مجلد ۲۰x۳۰	۶/-
مناجات مقبول مترجم اوّل کلاں	۴/-

آج سے ۴۷ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۴۷ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعلِ راہ بھی بنایا۔ اردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ علمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں۔ اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے

جنوری ۱۹۹۶ء

یادداشت

- براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمایئے۔
- ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔
- اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوایئے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔
- اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔
- مصارف ڈاک وریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔
- کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجیے۔
- کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اس وقت مقرر ہوگی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے دفاتر

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

ٹیلی فون 6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

ٹیلی فون 3260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

ٹیلی فون 3763857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔

علی گڑھ 202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نزدیک ڈاک خانہ جامعہ نگر

نئی دہلی 110025

مطبع

لبرٹی آرٹ پریس، ۱۵۲۸ پٹودی ہاؤس

دریا گنج نئی دہلی 110002

ٹیلی فون نمبر 3276018

لبرٹی آرٹ پریس دریو پرنٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دریا گنج نئی دہلی 110002 میں چھپوا کر شائع کیا

جیبی کتابیں

کم سے کم قیمت پر اردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پیش کرتی ہیں

کتاب نما کے تمام خریداروں کو پاکٹ بکس پر ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا اور پچاس روپے سے زیادہ کی منگانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

جیبی کتابیں جو نہ آپ کے ذہن پر بار ڈالیں گی اور نہ آپ کی جیب پر

پتھر کی دیوار علی سردار جعفری
سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ 15/-

لہو پکارتا ہے علی سردار جعفری
سردار جعفری کی انقلابی نظموں کا تازہ ترین مجموعہ 15/-

بیاضِ مریم سکندر علی وجد
وجد کی تحریروں اور حسین کی تصویروں سے "بیاضِ مریم" ایک نادر نشاط انگیز گلدستہ بن گیا۔ 15/-

ایک خواب اور علی سردار جعفری
سردار جعفری کے مقبول شعری مجموعے کا چھٹا اڈیشن 10/-

آتش گل (شعری مجموعہ) جگر مرادآبادی
جگر مرادآبادی کا دیوان ' پرکیف غزلوں کا مجموعہ 10/-

ساتواں آنگن (ناول) صالحہ عابد حسین
صالحہ عابد حسین کے جادو نگار قلم کا نیا شاہکار ایک دلچسپ انوکھی اور سبق آموز کہانی 8/-

دھوپ (ناول) رابعہ تبسم
ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس نے ایک عمر سایوں کی جستجو میں گزار دی اور جب منزل پر پہنچی تو وہاں بھی دھوپ پھیلی ہوئی تھی 5/-

گھر (ناول) ماریہ رحمٰن
ایک مغربی لڑکی جس نے ہندستان میں گھر بنایا گھر جو سماجی زندگی کی سب سے چھوٹی، سب سے مضبوط اکائی ہے ایک ایسے گھر کی کہانی جو پلکوں میں چھپے ہوئے آنسوؤں کی زبانی بیان ہوئی 8/-

واپسی کا سفر (ناول) عبداللہ حسین
سفر زندگی کا دوسرا نام ہے مگر واپسی کا سفر؟ عبداللہ حسین نے واپسی سفر کی کہانی بیان کی ہے۔ 5/-

راگ بھوپالی (ناول) صغرا مہدی
اردو کی بیباک ادیبہ کا نیا ناول صغرا مہدی کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کہانی ہر ناول انسانی رشتوں کا ایک نیا آئینہ خانہ ہوتا ہے 7/-

نشیب (ناول) عبداللہ حسین
عبداللہ حسین کا قلم نئی وادیوں میں سرگرم سفر ہے "نشیب" اس سفر کا ایک سنگ میل ہے۔ 5/-

موت کا بازار (ناول) آفتاب جلالی
آدرشوں کا قتل، خوابوں کا قتل، امیدوں کا قتل۔ ہمارا معاشرہ ایک قتل گاہ ہے۔ اس کے مجرم؟ "موت کا بازار" ایسے ہر سوال کا جواب ہے۔ 8/-

رومانی غزلیں مرتبہ، ثمینہ حجاب
غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل ہمارے جذبات کی دستاویز ہے رومانی غزلوں کا بہترین انتخاب 10/-

انتخاب اکبر الہ آبادی صدیق الرحمٰن قدوائی
اکبر الہ آبادی کی شاعری سامان ظرافت بھی ہے اور تازیانہ عبرت بھی۔ 12/-

پچھلے پہر (شعری مجموعہ) جاں نثار اختر
اردو کے البیلے رومانی شاعر کے کلام کا جامع انتخاب 7/50

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دھلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

خامہ بگوش کے قلم سے

(۱۹۸۱ تا ۱۹۹۰ کے طنزیہ مزاحیہ کالموں کا انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: مظفر علی سیّد

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالموں کا مجموعہ جس کا اردو والوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ صفحات لگ بھگ ۳۵۰۔ قیمت مجلد ۱۵۰/- عام اڈیشن ۸۰/-

انوار قرآن

(یعنی اسلامی تصوف کے حوالے سے قرآن فہمی کے چند پہلو)

پروفیسر نثار احمد فاروقی

یہ مضامین اگرچہ مختصر ہیں اس کے باوجود ان کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ ہمارے بزرگ صوفیا کو قرآن کریم سے کتنا گہرا شغف تھا اور اس کے لطیف نکات کو کیسے سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

قیمت ۱۵/- روپے

رنگ، خوشبو، روشنی — قتیل شفائی

قتیل شفائی کی آواز شاعری کی اسی جادو اثری کی آواز ہے جس نے اندھیرے میں بھی ایک جوت جلا رکھی ہے قتیل شفائی کے چودہ شعری مجموعوں کا انتخاب۔ قیمت ۸۰/-

اشارات قلب — پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم

اشارات قلب میں ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے سادہ و سلیس زبان میں دل کی صحت، تکالیف، اسباب متعلقہ مسائل نہایت اختصار کے ساتھ مع ضروری ہدایات کے پیش کیے ہیں۔ قیمت ۶/-

مولانا ابوالکلام آزاد — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

(فکر و نظر کی چند جہتیں)

اس کتاب میں مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کے قومی و ملی محرکات کو نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، یقیناً ان مضامین میں قارئین کو مولانا سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ملیں گی۔ قیمت ۶۰/- روپے

صحرا میں لفظ — فضیل جعفری

فضیل جعفری کا شمار آج کے عہد کے سنجیدہ اور ذمہ دار نقادوں میں ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کے شاعروں پر لکھے ہوئے موصوف کے نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔

قیمت ۹۰/- روپے

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات

ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں ۲۲ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۷۴ء سے ۱۹۹۴ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظرنامے میں جن تحریکات و تعبیرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے اُن کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت ۵۱/- روپے

طرز دوام — اختر سعید خاں

غزل کا فن نرم آنچ سے چلایا جاتا ہے بھڑکتے شعلوں

سے نہیں۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا کبھی اس کے تبسم میں اشک کی نمی ہوتی ہے تو کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔ یہ ساری خوبیاں اس شعری مجموعے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ قیمت ۵۱/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالرز میں ہوتا ہے موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ قیمت ۴۵/-

سیر کر دنیا کی غافل .....

(سفرنامے) ڈاکٹر صغرا مہدی

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اردو دنیا میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب آپ کے پانچ سفرناموں کا مجموعہ ہے اس کتاب میں ڈاکٹر خالد محمود کا ان سفرناموں پر تبصرہ اور یوسف ناظم کا ایک دلچسپ خاکہ بھی شامل ہے۔ قیمت ۵۱/-

ٹیلی ویژن نشریات

(تاریخ، تحریر، تکنیک) انجم عثمانی

اردو میں ٹیلی ویژن نشریات پر پہلی کتاب جو ایسے حضرات کے لیے نہایت اہم کتاب ہے جو ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا یا کوئی اہم کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔

قیمت ۹۰/- روپے

کاسۂ خیال

(شعری مجموعہ)

عبدالمعروف خاں چودھری

معروف صاحب حقیقی شاعر ہیں جو خیال کو جذبے میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں ان کے یہاں فکر اپنی تجریدی شکل میں نہیں ملتی۔ ان کا تشبیہی تخیل علامتوں استعاروں اور حسی پیکروں میں اپنی کارفرمائی دکھاتا ہے جس کا آپ بخوبی اندازہ اس شعری مجموعے کے مطالعے سے لگا سکتے ہیں۔ قیمت ۵۱/-

انشائے غالب

مرتبہ: رشید حسن خاں

غالبیات کے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ

مرزا غالب نے ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر اپنی نثر و نظم کا انتخاب تیار کیا تھا۔ اس کا اصل خطی نسخہ جس کے بعض صفحات پر مرزا غالب کے قلم کی تصحیحات ہیں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) کے پاس محفوظ تھی انھوں نے اس کے حواشی لکھ لیے تھے لیکن مقدمہ نہیں لکھ پائے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مالک رام صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا اور مزید حواشی لکھے۔ اب رشید حسن خاں نے اپنے مختصر پیش لفظ کے ساتھ اس انتخاب کو سارے متعلقات کے ساتھ مرتب کیا۔ آخر میں اصل خطی نسخے کا عکس بھی شامل ہے۔ قیمت ۶۰/-

حضرت محمدؐ اور قرآن

ڈاکٹر رفیق زکریا

مترجم: ڈاکٹر مظہر محی الدین

ڈاکٹر رفیق زکریا کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ اس کتاب میں سلمان رشدی کے ناول "شیطانی آیات" کا مدلل اور اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔ ۴۳۲ صفحات

قیمت دو سو روپے

پتھر کی دیوار

سردار جعفری

"پتھر کی دیوار" سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ اس فصل بہار کا ثمر ہے جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی۔ (پاکٹ اڈیشن)

قیمت ۱۵/- روپے

وسط ایشیا ۔ نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ قیمت /۱۵ روپے

معیارِ اردو

مرتبہ: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالر محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت /۲۱ روپے

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ

ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کے محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تاحال کارفرما رہے ہیں۔ پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت /۴۵ روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات)

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سید ظہور قاسم کی تحقیق کا میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی علمی مہم کے پہلے میر کارواں ہیں ان خطبات میں اس پُراسرار ارضی حصے کی دلچسپ داستان بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بہ تدریج ترقیوں کا تجزیہ بھی۔

قیمت /۱۰

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش

کیا تھا۔ اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قیمت /۱۰ روپے

تاریخ نگاری ۔ قدیم و جدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت /۵۱ روپے

محاوراتِ ہند

سبحان بخش

بہ تصحیح و ترتیب: محبوب الرحمٰن فاروقی

محاورات کے اس مجموعے کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا اس میں دہلی کے گرد و نواح کے محاورے اکٹھا کر کے بہ حروف تہجی جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت /۱۵

تذکیر و تانیث

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک فتاوٰی مدون کیا ہے اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت /۵، روپے

عبارت کیسے لکھیں

رشید حسن خاں

یہ کتاب اس لیے مرتب کروائی گئی ہے کہ ہمارے طالب علموں کو املا کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو سکے اور اُن کی تحریر اُن خرابیوں سے محفوظ رہ سکے جس سے عبارت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

قیمت /۱۵ روپے

لہو پکارتا ہے

سردار جعفری

سردار جعفری کی انقلابی نظموں اور نغموں کا تازہ ترین

مجموعہ جن سے وطن اور انسانیت سے محبت کے ساتھ ساتھ برائیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی ملتا ہے
(پاکٹ اڈیشن) قیمت ۱۵/- روپے

آگے سمندر ہے (ناول)

انتظار حسین

انتظار حسین کا شمار اردو کے صف اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے "آگے سمندر ہے" آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔

قیمت ۱۵۰/- روپے

تفہیم

رشید حسن خاں

اردو کے بلند پایہ محقق، دانشور اور زبان کے پارکھ جناب رشید حسن خاں کے اہم ترین مضامین کا نیا مجموعہ قیمت ۱۵/-

چہرہ در چہرہ

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے بلاشبہ شخصی خاکہ نگاری کو ایک نیا اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ اردو کی اہم شخصیتوں کے باغ و بہار خاکے۔ قیمت ۱۵/- روپے

فی البدیہہ

یوسف ناظم

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کے ۱۶ دلچسپ اور قہقہوں سے بھرپور مضامین کا نیا مجموعہ۔ قیمت ۵/-م

تعلیم و تعلم

ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے "تعلیم" کے موضوع پر موصوف کی کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب آپ کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔

قیمت ۱۵/- روپے

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

عبدالقوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر، حالی، چکبست

سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، فراق، ساحر، جاں نثار اختر، فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۱۵/- روپے

آپ خوبصورت اردو کیسے لکھ سکتے ہیں؟

انشا اور تلفظ

رشید حسن خاں — طلبہ کے لیے

آپ کی رہنمائی کر سکتی ہے یہ کتاب آپ کے لیے، اردو کے ممتاز محقق اور زبان کے پارکھ جناب رشید حسن خاں نے لکھی ہے اس کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ جملہ یا عبارت کس طرح لکھی جائے اور اس کی خوبیاں اور خرابیاں کیا ہیں۔ قیمت ۹/- روپے

شعریات سے سیاسیات تک

غلام ربانی تاباں - مترجم: اجمل اجملی

فرقہ واریت کے خلاف تاباں صاحب کے انگریزی مضامین کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۱۵/- روپے

دوسرا اور پانچواں سرسید یادگاری خطبہ

سرسیّد اور روایت کی تجدید

پروفیسر مونس رضا

سرسیّد اور اردو یونیورسٹی

پروفیسر مسعود حسین خاں

مرتبہ: خواجہ محمد شاہد

سرسیّد یادگاری خطبات کا سلسلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شروع کیا تھا اب تک چار ممتاز دانشوروں کے خطبات شائع کیے جا چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

قیمت ۱۰/- روپے

آدم خور چیتا

ریاض احمد خاں

اس کتاب میں شکار کی جتنی کہانیاں ہیں سب سچی اور آنکھوں دیکھی ہیں۔ حیرت انگیز اور دل دہلا دینے والی کہانیاں۔ قیمت ۱۴/- روپے

ھینی جھینی بینی چدریا
عبدالبسم اللہ
مترجم۔ وسیم حیدر ہاشمی

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انسی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔ قیمت: /۵۰ روپے

اندازِ گفتگو کیا ہے
شمس الرحمٰن فاروقی

اس کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے ہیں اور اس بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے مسائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین میں شاعروں اور شاعری کو ہی معرضِ بحث میں لایا گیا ہے۔
ایک نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت: /۵۰ روپے

دستک اس دروازے پر
وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ ہے اور اس سلسلے میں مغرب کے فلسفے، تصوّف، اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ تجربے اور تخلیقی تجربے کا یہ فرق ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ قیمت: /۵۰ روپے

مٹّی کا بلاوا (ڈرامے)
شمیم حنفی

سب سے بڑا ڈراما خود انسانی زندگی ہے۔ شمیم حنفی کے یہ ڈرامے زندگی کے ڈرامے کا ایک منظریہ ترتیب دیتے ہیں۔ ایک نئے تہذیبی اور سماجی زاویۂ نظر کا عکس، ان میں بیشتر ڈرامے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کے ذریعے مقبول ہو چکے ہیں۔
(دوسرا اڈیشن) قیمت: /۴۵ روپے

شناس و شناخت
انور صدیقی

پروفیسر انور صدیقی کے بارہ اہم تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ قیمت: /۶۰ روپے

کچھ مشرق سے، کچھ مغرب سے
ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری

انگریزی عشقیہ شاعری کے فروغ میں اندلسی اور عرب تہذیب و ادب کے بعض مصادر کی نشاندہی اور فراق اور شہریار کی شعری حسیات میں مغربی رجحانات کے بارے میں علمی مضامین، گلستان سعدیؒ کے منظوم اردو تراجم، دانشوری اور تصور مذہب، میر، سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے اور بعض اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرے۔ قیمت: /۱۵ روپے

صحرانورد کے خطوط
میرزا ادیب

صحرانورد کے خطوط، آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی صحرانورد کے خطوط کو۔ قیمت: /۵۰ روپے

اسرارِ خودی
(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب: شائستہ خاں

علامہ اقبال کی "اسرارِ خودی" کے پہلے اڈیشن میں چند اشعار بطریق انتساب درج تھے جو دوسرے اڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ دوسرے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیش کش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ کون سے اشعار حذف کیے اور وہ کہاں گئے؟ اور وہ اشعار کون سے تھے؟ یہ آپ کو اس کتاب کے عکسی اڈیشن سے معلوم ہوگا۔ قیمت: /۵۰ روپے

مسلمانوں کا تعلیمی نظام
ضیاء الحسن فاروقی

اس کتاب میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام سے متعلق چار اہم مضامین ہیں جن میں قیام مدارس کی تحریک، بغداد کا

مدرسہ نظامیہ اور مسلمانوں کا نظام تعلیم (عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں) خاصی معلومات فراہم کرتے ہیں قیمت ۵۰/۔

جام جہاں نما — گربچن چندن

اردو صحافت کی ابتدا

ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے شعبے مستشرق میں مستور تھے۔ مصنف نے اوریجنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسلّمہ نظریات کا بیباک جائزہ لیا ہے اور اردو کے اس اولین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف، کردار اور مرتبے کی صراحت کی ہے۔ مزید اس حصّے کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹ ویں صدی میں ہندستان اردو صحافت کی پیش رفت میں جام جہاں نما نے ڈالا۔ قیمت ۵۰/۔ روپے

حمورابی اور بابلی تہذیب وتمدّن — مالک رام

دنیا کے علم وفن، آئین وقوانین، حکومت کے نظم ونسق، مذہب، معاشرت، غرض زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل وترقی اور ترویج میں بابل کا جو مقام رہا ہے اس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اہم ترین دستاویز۔ قیمت ۵۰/۔ روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل۔ چوپڑا۔ ایف۔ آر۔ سی۔ پی

ترجمہ: نذیرالدین مینائی

خدا نہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل چوپڑا نے دل کا فعل۔ دل کا دورہ۔ قلبی انجوگرافی۔ بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب باتصویر۔ ضرور مطالعہ کیجیے۔ قیمت ۲۵/۔ روپے

تذکرۂ ماہ وسال — مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے قیمت: ۱۲۵/۔

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف:۔ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہؒ کا تعارف بھی ہے۔ قیمت ۴۵/۔ روپے

افکار اقبال — محمد عبدالسلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشاندہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔ قیمت ۱۲۵/۔ روپے

تحقیق نامہ — مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں قیمت ۱۲۵/۔

مرضیات — حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت

الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث، طلبہ کے علاوہ اطبّا کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ قیمت: ۱۵/

تاثر نہ کہ تنقید
صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقّاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ قیمت ۱۵/ روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہد حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود — قیمت: ۶۶/ روپے

گوشے میں قفس کے
دلیپ سنگھ

(طنزیہ و مزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "گوشے میں قفس کے"، آپ کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ دلچسپ انسان کے نہایت دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۴۵/ روپے

سحر کے پہلے اور بعد
میرزا سعید الظفر چغتائی

یہ ایک قصبے کی سماجی اور سیاسی تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں مصنف کے بچپن کی گلیاں سعدیؒ کے گلستاں کی طرح حسین و نوجوان نظر آ رہی ہیں۔ دلچسپ جگ بیتی۔ قیمت ۱۸/ روپے

تحریریں
اسلم پرویز

اردو کے جانے مانے ادیب اور نقاد ڈاکٹر اسلم پرویز کے اہم مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت ۱۸/ روپے

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول)
کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر بنا ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے، استوار ہونے اور ٹوٹنے کی درد انگیز داستان، جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ قیمت ۴۰/ روپے

سفر (ناول)
رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ یہ انتہائی رنگین ہے اور سنگین بھی۔ قیمت ۲۷/ روپے

خواب اور خلش (شعری مجموعہ)
آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت ۳۶/ روپے

غبار منزل (شعری مجموعہ)
غلام ربّانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں نظموں اور قطعات کا تازہ ترین مجموعہ جس میں "ساز لرزاں"، "ذوق سفر"، اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت ۴۵/ روپے

فریدؒ و فردِ فریدؒ
ڈاکٹر اسلم فرخی

شیخ کبیر فرید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی کے روحانی سفر کی روداد۔ قیمت ۲۷/

کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

کتاب نما کے مندرجہ ذیل خصوصی شماروں پر
کتاب نما کے خریداروں کو ۲۵٪ کمیشن دیا جائے گا
ڈاک خرچ بذمہ خریدار (ادارہ)

شمس الرحمٰن فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— احمد محفوظ

اردو کے معتبر ادیب، نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی کی اعلا ادبی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ قیمت ۸۰/- روپے

اردو افسانہ بمبئی میں ۱۹۷۰ء کے بعد

مرتبہ ——— الیاس شوقی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں نئی نسل کے ۹ نمائندہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شائع کیا گیا ہے مرتب نے اپنے پیش لفظ کے آخر میں افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے "۱۹۷۰ء کے بعد بمبئی کا افسانہ زندگی کی سچائیوں کی عمدہ مثال ہے" قیمت ۱۵/-

مغیث الدین فریدی

شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ ——— ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے اس میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

خواجہ حسن نظامی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین پروفیسر نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی

اردو کے صاحب طرز ادیب، صحافی، خاکہ نگار، مترجم و مفسر قرآن خواجہ حسن نظامی کے فن اور شخصیت پر اردو کے ممتاز ترین ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔

قیمت ۵۱/- روپے

مولانا عبدالوحید صدیقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— پروانہ ردولوی

اردو کے بیباک اور حق شناس صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ملک کے بزرگ صحافیوں اور اہل علم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت ۱۵/- روپے

غلام ربانی تاباں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین۔ اجمل اجملی، ڈاکٹر صغرا مہدی، عذرا رضوی

اردو کے ممتاز غزل گو شاعر غلام ربانی تاباں مرحوم کی شاعری اور فن پر اردو کے ممتاز اہل قلم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت ۷۵/- روپے

پروفیسر نثار احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین ——— خلیق انجم - ایم حبیب خاں

عربی، فارسی کے اسکالر اور اردو کے معتبر ترین ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ملک و بیرون ملک کے بلند پایہ مصنفین کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۵۱/- روپے

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— ڈاکٹر سید حامد حسین

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام سیکھا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی سیکھی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔ قیمت ۵۱/- روپے

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ——— ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک مشفق اور مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض بھی۔ قیمت ۴۵/- روپے

خواجہ احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، انتظامی امور کے ماہر، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی (جن کے عہد میں شعبۂ اردو، اپنے کارہائے نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا) کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— مجتبیٰ حسین

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے میں ملک کے ممتا ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خ پر روشنی ڈالی ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین ——— ڈاکٹر علی احمد فاطمی / عذرا رضوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا م جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ قیمت ۴۵/- روپے

پروفیسر مسعود حسین خاں

(علمی، لسانی اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— ایم حبیب خاں

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں اردو کے مما ادیب، ماہر لسانیات اور محقق جناب مسعود حسین خا کی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ۱۲ ممتاز ادیبو کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت ۴۵/- روپے

علی سردار جعفری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

ترتیب ——— ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابد

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہو نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی، ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری؛ ان کی مکم شخصیت کا بھرپور جائزہ۔ قیمت ۴۵/- روپ

مطبوعات
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و نظر کی چند جہتیں۔
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۶۰/-
جدید ادبی تحریکات ڈاکٹر سید حامد حسین ۶۰/-
صحرا میں لفظ فضیل جعفری ۹۰/-
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر مومن محی الدین ۵۱/۴
ٹیلی ویژن نشریات۔ تاریخ۔ تحریر۔ تکنیک۔ انجم عثمانی ۹۰/-
انشائے غالب مرتبہ: رشید حسن خاں ۴۰/-
اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ ابراہیم یوسف ۵/۴
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات ڈاکٹر سید جمال الدین ۵۱/-
انداز گفتگو کیا ہے شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/-
دستک اس دروازے پر ڈاکٹر وزیر آغا ۶۵/-
سر سید یادگاری خطبات۔ مونس رضا، مسعود حسین خاں ۱/-
تفہیم رشید حسن خاں ۷۵/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں عبدالقوی دسنوی ۷۵/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے نقی حسین جعفری ۵۱/-
شناس و شناخت انور صدیقی ۶۰/-
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/-
سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم۔ اختر الواسع ۱۰/-
آزمائش کی گھڑی سید حامد (زیر طبع)

حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن مالک رام ۷۵/-
جام جہاں نما گر بچن چندن ۷۵/-
اردو ناول میں عورت کا تصور فہمیدہ کبیر ۴۱/-
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ کبیر ۷۵/-
تاثر نہ کہ تنقید صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۱/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے طاہر مسعود ۶۶/-
تحریریں ڈاکٹر اسلم پرویز ۵۱/-
انشائیہ کے خدوخال وزیر آغا ۳۵/-
افکار اقبال عبدالسلام خاں ۱۲۵/-
تذکرہ ماہ و سال مالک رام ۱۲۵/-
تحقیق نامہ مشفق خواجہ ۱۲۵/-
سحر کے پہلے اور بعد سعید الظفر چغتائی ۵۱/-
پہچان اور پرکھ پروفیسر آل احمد سرور ۵۱/-
اقبال کا نظریہ خودی عبدالمغنی ۱۵۰/-
قلندر بخش جرأت جمیل جالبی ۱۰/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل وارث علوی ۳۶/-
تاریخ اودھ قاسم علی نیشاپوری ۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر ظ انصاری ۳۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید ڈاکٹر وزیر آغا ۶۰/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں مالک رام ۵۱/۰۰
لسان الصدق مولانا ابوالکلام آزاد ۷۵/۰۰
اردو میں کلاسیکی تنقید پروفیسر عنوان چشتی ۴۸/-
تفہیم و تنقید پروفیسر حامدی کاشمیری ۴۸/-
نذر مختار مرتبہ: مالک رام ۱۰۱/-
تحقیقی مضامین مالک رام ۶۰/-
خسرو نامہ مجیب رضوی ۲۱/-
تحفۃ السرور مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/-
جائزے مرتبہ: مظفر حنفی ۴۵/-
نقد بجنوری صدیقہ بیگم ۲۵/-
ادبی سماجیات ڈاکٹر محمد حسن ۱۵/-
الفاظ کا مزاج غلام ربانی ۲۳/-

تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	زیر طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۶/۵۰
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۴/-
〃 سوم	〃	۲۲/-
〃 چہارم	〃	۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۵/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۶/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۷/۵۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۹/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۲۴/-
تنقید کیا ہے	〃	۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی	داؤد رہبر	۳۹/-
اردو اسیز	مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی	۳۶/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	۴/۵۰
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۵/-
دبستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	۱۶/-

تعلیم

مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۱۲/۵۰
قلم اور قدم	سید حامد	۷/۵۰
تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۶/۵۰
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/-
ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴/۵۰
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	۲۱/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۵۱/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	۵۴/-
ہم کیسے پڑھائیں۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۳/-
تعلیمی خطبات۔	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔	اختر الواسع	۲۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	۱۲/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۷/-
بنیادی استاد کے لیے۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۲/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۲/-
بچوں کا آرٹ	عبید الحق	۲۴/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

مستقبل کی طرف (خطبات جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ: خواجہ محمد شاہد / خالد کمال فاروقی ۱۵۰/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو کشمیری لال ذاکر ۳۰/-
دلّی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی ۵۱/-
چند تصویر بتاں مولانا عبدالسلام قدوائی ۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب پروفیسر آل احمد سرور ۸/-
صاحب جی، سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-
ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں ڈاکٹر عابد حسین ۷۵/-
شہید جستجو۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷۵/-
مولانا آزاد کی کہانی۔ ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۸/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۵/-
حیات جامیؒ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
نقش ذاکر۔ مرتبہ عبدالحق خاں ۵۱/-
مالک رام ایک مطالعہ۔ مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ مرتبہ خلیق انجم ۳۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات وخدمات۔ مرتبہ انور صدیقی ۱۸/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹۰/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) صالحہ عابد حسین ۶۵/-
وحید شاعر اور شخص۔ مرتبہ یوسف ناظم ۲۵/-
غبار کارواں۔ بیگم انیس قدوائی ۲۷/-
فراق شخص وشاعر۔ مرتبہ: شمیم حنفی (زیر طبع)
حیات حافظ۔ اسلم جیراجپوری ۱۵/-
افکار رومی۔ مولانا عبدالسلام خاں ۴۰/-
بزم رفتگاں صباح الدین عبدالرحمٰن (زیر طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ پروفیسر ممتاز حسین (زیر طبع)

مکالمات افلاطون۔ مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین ۳۶/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری۔ شفیق النسا بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند۔ ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیات اسماعیل، حیات وخدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیس۔ سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰
حسرت کی شاعری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷/۵۰
گنجہائے گرانمایہ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۴۲/-
کیا خوب آدمی تھا۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/-
قدسیہ زیدی۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انشار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
روسی ادب اوّل، دوم پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

طنزیات، مزاحیات

خامہ بگوش کے قلم سے مرتبہ: مظفر علی سید مجلد ۱۵۰/- غیر مجلد ۸۰/-
فی البدیہہ یوسف ناظم ۴۵/-
چہرہ در چہرہ مجتبیٰ حسین ۵۱/-
طنزیات ومضحکات۔ رشید احمد صدیقی ۴۰/-
گوشے میں قفس کے دلیپ سنگھ ۴۵/-
فی الحقیقت یوسف ناظم ۸۰/-

الفور۔ — یوسف ناظم — -/۳۰
ں مال۔ — شفیقہ فرحت — -/۱۸
لحال۔ — یوسف ناظم — -/۱۸
نگ نمبر۔ — شفیقہ فرحت — -/۱۶
کلیات۔ — یوسف ناظم — -/۱۸
ت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی — -/۱۵
رخیر۔ — یوسف ناظم — -/۲۱
پڑکی۔ — حضرت آوارہ — -/۱۰
نداں۔ — رشید احمد صدیقی — -/۲۶
لوفہ زار۔ — خواجہ عبد الغفور — -/۱۶
وار قہقہہ۔ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا — -/۱۵
شگفتہ بیانی میری۔ — رشید احمد صدیقی — -/۱۵

طب۔ ایلوپیتھی

شارات قلب — پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم — ۶/:
رضیات — حکیم نعیم الدین زبیری — -/۵۱
پنے دل کی حفاظت کیجیے۔ ترجمہ۔ نذیر الدین مینائی — -/۲۵
یابیطس۔ ڈاکٹر محمد شعیب اختر — (زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

یر کر دنیا کی غافل — صغرا مہدی — ۵۱/:
سط ایشیا — آصف جیلانی — ۵۱/:
دلبس کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد — -/۴۵
پشکن کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد — -/۲۵
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز۔ بیگم صالحہ عابد حسین — -/۱۸
اتیں لاہور کی۔ — سوم آنند — -/۱۶
رہ نورد شوق۔ — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۱۲/۵۰
یادوں کے سائے — عتیق صدیقی — -/۱۲

شعری مجموعے

گا ہے گا ہے — رولینڈ لارنس — ۳۰/:
رنگ، خوشبو، روشنی — قتیل شفائی — ۸۰/:
طرازِ دوام — اختر سعید خاں — ۵۱/:
کاسۂ خیال — عبد المعروف خاں — ۵۱/:
میں سمندر رہوں — فرحان سالم — ۲۰/:
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں — -/۷۵
بانگِ درا — اقبال — -/۱۲
بالِ جبریل — اقبال — -/۸
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز — 〃 — -/۸
خواب اور خلش — آل احمد سرور — -/۴۶
غبارِ منزل — غلام ربانی تاباں — -/۲۵
انیس — ۳۳ غیر مطبوعہ مرثیے — -/۹۰
پرانی بات ہے۔ — زبیر رضوی — -/۳۰
سازِ سخن۔ — ادا جعفری — -/۴۵
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری — -/۷۵
دائروں میں پھیلی لکیر۔ کشور ناہید — -/۲۰
آنکھ میں سمندر۔ — زاہد ڈار — -/۲۰
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ ندا فاضلی — -/۳۰
رات کے مسافر۔ — مرتبہ انور سجاد — -/۲۸
گدازِ شب۔ — معین احسن جذبی — -/۴۰
ایک خواب اور۔ — علی سردار جعفری — -/۴۰
حرف حرف روشنی۔ — حمایت علی شاعر — -/۲۵
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت — -/۲۰
دوہے۔ — جمیل الدین عالی — -/۱۲
کلیات عرش ملسیانی — مرتبہ مالک رام — -/۷۵
راہ دار۔ — ساقی فاروقی — -/۲۲
پتھر کی زبان۔ — فہمیدہ ریاض — -/۱۵

شام کا پہلا تارا ۔ زہرا نگاہ ۲۱/-

مثنوی نُہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۲۸/-

لہو پکارتا ہے ۔ علی سردار جعفری ۱۵/-

شام شہریاراں ۔ فیض احمد فیض مجلد ۱۷/ ۶/-

جستہ جستہ ۔ خورشید الاسلام ۱۸/-

گل افشانی گفتار ۔ نشور واحدی ۵/-

کرب آگہی ۔ آنند نرائن مُلا ۱۰/۵۰

نوائے آوارہ ۔ غلام ربانی تاباں ۸/۵۰

اردو گیت ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیر طبع)

پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۱۵/-

انتخاب حالی (دنیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۱۵/-

شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۔ ۸/۵۰

ذوق سفر ۔ غلام ربانی تاباں ۵/-

کو بہ کو ۔ سلمان جاں نثار اختر ۷/-

آتش گل جگر مرادآبادی ۲۵/-

دیوار قہقہہ ۔ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

انوار قرآن پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۵/-

حضرت محمدؐ اور قرآن ڈاکٹر رفیق زکریا ۲۰۰/-

مسلمانوں کا تعلیمی نظام ضیاء الحسن فاروقی ۵/۷۵

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ۔ محمود احمد برکاتی ۔ ۲۵/-

فرید و فرد فریدؒ اسلم فرخی ۲۷/-

اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ ضیاء الحسن فاروقی ۸/-

اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا مرتبہ سید مقبول احمد ۸/-

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل ۔ مولانا مجیب اللہ ندوی ۔ ۱۶/-

نقد ملفوظات نثار احمد فاروقی ۶۵/-

خطبات عیدین مولانا تقی امینی ۲۱/-

تاریخ اودھ قاسم علی نیشاپوری ۲۷/-

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت ۔ ڈاکٹر مجیب اشرف ۔ ۱۲/-

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۸/-

ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-

ترجمۂ قرآن ۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش پروفیسر مشیر الحق ۸/-

مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات ۔ پروفیسر ریاض الرحمن شیروانی ۸/-

دنیا کے بڑے مذہب ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۸۵/-

ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ۔ شمس الرحمن محسنی ۵۰/-

رسول اکرمؐ اور یہود حجاز ۔ سید برکات احمد ۴۰/-

محبوب الارشاد ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-

ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

اسلام دور حاضر میں ۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۳۶/-

اسلامیات ۔ مالک رام ۲۷/-

عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-

حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵/-

روح القرآن ۔ مولانا عبد السلام قدوائی ۳۰/-

عشق اور بھگتی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴/-

عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳۰/-

مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ عبد السلام قدوائی ۸/-

عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء ۔ محمود الحسن ۱۵/-

سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبید الرحمٰن ۲/-

مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)

ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۶/-

دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ۱۲/-

کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰

خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-

مسلمان اور سیکولر ہندوستان ۔ پروفیسر مشیر الحق ۷/-

اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۶/۵۰

اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-

تاریخ الامت سیرت رسولؐ حصہ اوّل مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
" خلافت راشدہ " دوم " ۲۱/-
" خلافت بنی امیہ " سوم " ۱۵/-
" عباسیہ " چہارم " ۱۵/-
" عباسیہ بغداد " پنجم " ۲۷/-
" عباسیہ مصر " ششم " ۲۷/-
" آل عثمانؓ " ہفتم " ۱۸/-
" ہشتم " ۳۶/-
فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز)۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-
" " کلاں سائز " ۴/-
بکھرے ورق سینتی کمار چیٹرجی ۴/-
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-

ناول

نئے سمندر رہے انتظار حسین ۱۵/-
جھینی جھینی بینی چدریا عبدالبسم اللہ ۶۵/-
صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۶۵/-
نوٹوں کی تلاش ایاز سیوہاروی ۶۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-
سفر رابعہ تبسم ۲۷/-
سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-
ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل۔ کشمیری لال ذاکر ۳۲/-
فرار۔ ظفر پیامی ۴۰/-
ڈوبتے سورج کی کتھا۔ کشمیری لال ذاکر ۳۹/-
لمحوں میں بکھری زندگی۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-

مہکتی بہاریں۔ کوثر چاندپوری ۱۸/-
راگ بھوپالی۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات۔ کشمیری لال ذاکر (زیرطبع)
میں واپس آؤں گا۔ ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس ۲۵/-
پُروائی۔ صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیرطبع)
انگوٹھے کا نشان۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-
ایک ہم دو دل۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-
اشک خوں۔ حبیبہ بانو ۱۰/-
اپنی اپنی صلیب۔ صالحہ عابد حسین ۹/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ۔ جتندر بلّو ۱۲/-
ایک مٹھی ہندوستان۔ سید شمیم اشرف۔ ۹/-
ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
آلپس کے گیت۔ مترجم قرۃ العین حیدر ۳/-
پیار کا موسم۔ مہندر ناتھ ۴/۵۰
چنار کا پتا۔ سلطان آصف فیضی ۳/-
پابہ جولاں۔ صغریٰ مہدی (زیرطبع)
زندگی کی لہر (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق ۴/-
کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق (زیرطبع)
بیوہ۔ منشی پریم چند ۲۴/-
گئودان (نیا اڈیشن) " ۶۵/-
میدانِ عمل۔ (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۶۵/-
یو دو کیہ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/-
شکستِ ناتمام۔ زہرہ سیدین ۲/-
ابھی دور۔ صالحہ عابد حسین زیرطبع
پُراسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/۵۰

افسانے

صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۶۵/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر — ۷۵/-
آوازوں کا میوزیم — ساگر سرحدی — ۴۵/-
سدا بہار چاندنی۔ — رام لعل — ۳۰/-
دل دریا۔ — شرون کمار — ۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں۔ — صالحہ عابد حسین — ۱۸/-
درد دل — ستارہ جعفری — ۱۸/-
مکتی بودھ — راجندر سنگھ بیدی — ۲۵/۵۰
نیلی ساری — خواجہ احمد عباس — ۱۲/-
گرہن۔ — راجندر سنگھ بیدی — ۳۰/-
کوکھ جلی۔ — " — ۱۸/-
کھڑکی۔ — پرکاش پنڈت — ۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ۔ — ہرچرن چاولہ — ۱۲/۷۵
تیوری۔ — امر سنگھ — ۱۴/۷۵
قلی نمبر ۳۹۹۔ — وجاہت علی سندیلوی — ۱۴/۷۵
دانہ و دام۔ — راجندر سنگھ بیدی — ۲۷/-
اپنے پرائے۔ — اوم پرکاش بجاج — ۹/-
نئی دھرتی نئے انسان — خواجہ احمد عباس — ۱۲/-
درد و درماں — صالحہ عابد حسین — زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے — راجندر سنگھ بیدی — ۳۶/-
واردات۔ — پریم چند — ۲۱/-
اردو افسانے مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی — ۳۶/-
دس افسانے۔ — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — ۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں۔ — انور خاں — ۹/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں۔ — صغریٰ مہدی — ۱۰/-
اپنے دکھ مجھے دیدو۔ — راجندر سنگھ بیدی — ۲۱/-

ڈرامے

زوال کا عروج۔ — مترجم: انور عظیم — ۳۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے۔ — پروفیسر شمیم حنفی — ۲۱/-
انٹی گونی۔ — سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی — ۹/-
خانہ جنگی — پروفیسر محمد مجیب — ۶/-
حبہ خاتون۔ — پروفیسر محمد مجیب — ۶/-
تاریخ کے آنچل میں۔ — رفعت سروش — ۱۸/-
اداس موڑ۔ — ابراہیم یوسف — ۱۲/-
اینٹنی اور کلیوپٹرا — ولیم شیکسپیر — ۱۶/۵۰
مٹی کا بلاوا۔ — شمیم حنفی — ۴/۵۰
سات کھیل۔ — راجندر سنگھ بیدی — ۱۶/۵۰
غالب کون۔ — سید محمد مہدی — ۸/۵۰
خیال کی دستک۔ — ساگر سرحدی — ۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا۔ — کرتار سنگھ دگل — ۶/-
پہلے آپ۔ (مزاحیہ ڈراما) — افتخار عالم — ۲/۵۰
آذر کا خواب۔ — قدسیہ زیدی — ۸/۵۰
آزمایش۔ — پروفیسر محمد مجیب — ۶/-
انجام۔ — پروفیسر محمد مجیب — ۶/-
کھیتی — " — ۴/۵۰
ہیروئن کی تلاش۔ — " — ۵/۵۰
پردۂ غفلت۔ — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۱/-
دروازے کھول دو — کرشن چندر — ۶/۵۰
آئینۂ ایام۔ جے بی پریسٹلے — مترجم خلیق احمد — ۶/۵۰
نقشِ آخر۔ — اشتیاق حسین قریشی — ۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن — ڈاکٹر اخلاق اثر
ریڈیو ڈرامے کی اصناف — "
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو — " — ۱/-
فاؤسٹ (گوئٹے) مترجم: — ڈاکٹر عابد حسین — ۵/۵۰

اقبالیات

الجہادے — ابراہیم یوسف — ۵۱/-
زندگی کی طرف۔ — پروفیسر شمیم حنفی — ۳۶/-
افکار اقبال۔ — محمد عبد السلام خاں — ۵/-

...کا نظریۂ خودی	عبدالمغنی	۱۵۰/-
...جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	۱۴/-
...ات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	۳۵/-
...اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سیّد وحید الدین	۳۶/-
...اور دہلی	عبدالقوی دسنوی	۹/۵۰
...اقبال ۔	میکش اکبرآبادی	۲۵/۵۰
...اقبال ۔	اسلوب احمد انصاری	۲/-

غالبیات

...کرِ غالب	مالک رام	(زیرِ طبع)
...نثارِ غالب ۔	مالک رام	۴۸/-
...البِ اور صفیر بلگرامی ۔	مشفق خواجہ	۳۶/-
...لامذۂ غالب ۔	مالک رام	۷۵/-
...فسانۂ غالب ۔	مالک رام	۱۶/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ ۔	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر ۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۴/-
نیرنگِ خیال ۔	مالک رام	۱۵/-
یادگارِ غالب اردو ۔	"	۳۰/-
" فارسی ۔	"	۹/-
انتخابِ مضامینِ سرسید	انور صدیقی	۱۶/-
حیاتِ سعدی ۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۳۶/-
فسانۂ آزاد (تلخیص)	" ڈاکٹر قمر رئیس	۷۵/-
فردوسِ بریں ۔	" عبدالحلیم شرر	۱۶/-

انتخاب مضامینِ شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	۷۵/-
انتخابِ ناسخ	مرتبہ " "	۱۵/-
مثنوی بحرالمحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	۵/-
شریف زادہ ۔	" ڈاکٹر قمر رئیس	۲۰/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۲۸/-
فسانۂ مبتلا ۔	" صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۵/-
توبۃ النصوح ۔	" مالک رام	۳۶/-
باغ و بہار ۔	" رشید حسن خاں	۲۷/-
ابن الوقت ۔	" ڈاکٹر خلیق انجم	۴۵/-
مجالس النساء ۔	" صالحہ عابد حسین	۲۴/-
گذشتہ لکھنؤ	" رشید حسن خاں	۷۵/-
قصۂ حاتم طائی ۔	" اطہر پرویز	۱۵/-
انتخابِ ولی	مرتبہ سیّد ظہیر الدین مدنی	۲۰/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
" مراثی انیس و دبیر ۔	رشید حسن خاں	۳۶/-
" نظیر اکبرآبادی ۔	" "	۳۰/-
" اکبر الٰہ آبادی ۔	صدیق الرحمٰن قدوائی	۲۱/-
" کلامِ میر ۔	ڈاکٹر محمد حسن	(زیرِ طبع)
دیوانِ درد	رشید حسن خاں	۲۴/-
انتخابِ سودا	"	۱۵/-
" قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۷/-
" ذوق ۔	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۲۴/-
مثنوی سحرالبیان ۔	رشید حسن خاں	۲۱/-
مثنوی گلزارِ نسیم ۔	"	۱۶/-
افاداتِ سلیم ۔	ڈاکٹر خلیق انجم	۳۰/-
مقدمۂ شعر و شاعری ۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۷/-

جیبی کتابیں

بیاضِ مریم	سکندر علی وجد	۱۵/-
لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	۱۵/-

مرکی دیوار	رر	۱۵/:
ب خواب اور ۔	علی سردار جعفری	۱۰/-
آتش گل ۔	جگر مرادآبادی	۱۰/:
پچھلے پہر ۔	جاں نثار اختر	۷/۵۰
رومانی غزلیں ۔	ثمینہ حجاب	۱۰/:
انتخاب اکبر الہ آبادی ۔	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۲/:
ساتواں آنگن ۔	صالحہ عابد حسین	۸/-
دھوپ ۔	رابعہ تبسم	۵/-
ثمر ۔	ماریہ رحمٰن	۸/-
واپسی کا سفر ۔	عبداللہ حسین	۵/-
راگ بھوپالی ۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۷/-
نشیب ۔	عبداللہ حسین	۵/-
موت کا بازار ۔	آفتاب ہلالی	۸/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	مرتبہ: احمد محفوظ	۸۰۰
اردو افسانہ بمبئی میں	" الیاس شوقی	۵۱/:
مغیث الدین فریدی نمبر	" ظہیر احمد صدیقی	۴۵/:
خواجہ حسن نظامی نمبر	" نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی	۷۵/:
عبدالوحید صدیقی نمبر	" پروانہ ردولوی	۵۱/:
غلام ربانی تاباں نمبر	" اجمل اجملی	۷۵/:
اختر سعید خاں نمبر	" ڈاکٹر سید حامد حسین	۵۱/:
نثار احمد فاروقی نمبر	" ڈاکٹر خلیق انجم	۵۱/:
پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر	مرتبہ شہریار/ابوالکلام قاسمی	۶۰/:
ڈاکٹر خلیق انجم نمبر	مرتبہ: ایم حبیب خاں	۹۰/:

خواجہ احمد فاروقی	مرتبہ: خلیق انجم	۴۵/-
عابد علی خاں	" مجتبیٰ حسین	۴۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں	" ایم حبیب خاں	۴۵/-
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ علی احمد فاطمی/عذرا مجیب	۴۵/-
فرمان فتح پوری نمبر	مرتبہ خلیق انجم	۲۵/-
سردار جعفری نمبر	مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی	۴۵/-
صالحہ عابد حسین نمبر	مرتبہ: عزیز قریشی	۴۵/-
نئی نظم کا سفر	مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی	۴۵/-
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق ۔	حامد حسین	۳/-
پریم چند نمبر ۔	عبدالقوی دسنوی	۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر ۔	کرنل بشیر حسین زیدی	۱۶/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر ۔	ادارہ	۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر ۔	مرتبہ عبدالقوی دسنوی	۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر	ساحر ہوشیارپوری	۵/۵۰
جگن ناتھ آزاد نمبر	مرتبہ: ایم حبیب خاں	۵۱/-
خواتین افسانہ نگار نمبر ۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر ۔	مالک رام	۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر ۔	یوسف ناظم	۲۵/-
قدسیہ زیدی نمبر ۔	کرنل بشیر حسین زیدی	۲۵/-
فراق نمبر ۔	شمیم حنفی	زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر ۔	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر ۔	ادارہ	۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر ۔	مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	۲۰/-
جائزے ۔	مرتبہ مظفر حنفی	۴۵/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکیر و تانیث (۷ ہزار الفاظ)	فصاحت بہادر جنگ	۷۵/:
معیار اردو	رر	۳۱/:
محاورات ہند ۔	تصحیح و ترتیب: محبوب الرحمٰن فاروقی	۵۱/:

عبارت کیسے لکھیں		۱۵/:
انشا اور تلفظ		۱۲/:
پیامی قواعد اردو	طلبہ اڈیشن	۳/:
// //	کلاں	۶/:
پیامی اردو انگریزی ڈکشنری		۱۶/:
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری		۱۲/:
ہمارے محاورے	سیفی پریمی	۱۲/۵۰
کہاوت اور کہانی	//	۸/:
مختصر اردو لغت		۶۵/:
فرہنگ عامرہ		۶۰/:
فیروز اللغات	درمیانی	۱۵/:

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب	(ادارہ)	۲۱/:
نیا اردو نصاب اوّل	قیصر زیدی/محمد ذاکر	۱۰/:
آئینہ ادب	ڈاکٹر محی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ	۲۱/:
انوار ادب	پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی	۸/۵۰

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن		/:
حیات اللہ انصاری		/:
چیچک	مشتاق احمد	/:
آستین کا سانپ	محمد حسین حسّان	/:
چاند	//	/:
دیمک	//	/:
کتنی زمین	//	/:

ہندی کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل	۱/:
پرم پرا	۱/:
اپنا گھر	۱/:
امریکہ	۱/:
دہلی	۱/:
منور بخش اور رکام	۱/:
چاندی کا چمچہ	۱/:

بچوں کے لیے

مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں ۹/:
نماز پڑھیے ۴/۵۰
السلام علیکم ۷/۵۰
حضرت یوسف علیہ السلام ۴/۵۰
حدیث کیا ہے ۴/:
حضرت عمر فاروق رضہ ۶/:
نقوش سیرتؐ اوّل ۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ دوم ۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ سوم ۵/:
نقوش سیرتؐ حصہ چہارم ۵/:
نقوش سیرت حصہ پنجم ۵/:
رسالہ دینیات اوّل ۳/:
〃 دوم ۴/:
〃 سوم ۵/:
〃 چہارم ۵/:
〃 پنجم ۶/:
〃 ششم ۶/=
〃 ہفتم ۶/=
〃 ہشتم ۶/=
حضرت آدم علیہ السلام ۴/:
حضرت یحییٰ علیہ السلام ۳/:
بزرگانِ دین ۴/:
امت کی مائیں ۴/۵۰
اچھی باتیں ۴/۵۰
خوب سیرتؐ اول ۶/:
خوب سیرتؐ دوم ۶/:
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں ۴/۵۰
سلطان جی رح ۴/۵۰

سیرت پاک مختصر مختصر ۳/:
کمسن صحابی ۶/:
رحمان کا مہمان ۶/:
اسلام کے جاں نثار ۵/:
نور کے پھول ۹/:
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیق رضہ ۶/:
حضرت عبداللہ بن عمر رضہ ۳/:
حضرت طلحہ رضہ ۳/:
حضرت ابو ذر غفاری رضہ ۳/:
حضرت سلمان فارسی رضہ ۳/۵۰
حضرت عبداللہ بن عباس رضہ ۳/:
حضرت محبوب الٰہی رح ۳/:
حضرت معین الدین چشتی رح ۳/:
حضرت فرید گنج شکر رح ۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح ۳/:
نیک بیٹیاں ۳/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء رح ۳/:
حضرت حمزہ رضہ ۳/:
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضہ ۳/:
حضرت ابوہریرہ رضہ ۴/:
اللہ کے صفی ۲/۵۰
اللہ کا گھر ۴/۵۰
اللہ کے خلیل ۳/۵۰
رسول پاکؐ کے اخلاق ۴/:
قرآن پاک کیا ہے؟ ۵/:
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل ۶/:
〃 دوم ۶/:
اسلام کے مشہور امیر البحر ۹/:
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل ۷/۵۰

〃 حصہ دوم ۶/:
اسلام کیسے شروع ہوا ۷/۵۰
رسول پاکؐ ۶/:
دس جنتی ۷/۵۰
سرکار کا دربار ۶/۵۰
چار یار ۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو) ۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی) /۴۰
ہمارا دین حصہ اوّل ۸/۵۰
ہمارا دین حصہ دوم ۸/۵۰
ہمارا دین حصہ سوم ۸/۵۰
تحسین القرآن (زیر طبع)
منہاج القرآن ۴/۵۰
ائمہ اربعہ (زیر طبع)
ارکان اسلام ۴/:
عقائد اسلام ۴/۵۰
خلفائے اربعہ ۱۰/۵۰
نبیوں کے قصے ۷/۵۰
ہمارے رسولؐ ۶/:
مسلمان بیبیاں ۶/:
ہمارے نبیؐ (اردو) ۴/:
ہمارے نبیؐ (ہندی) زیر طبع
سرکار دو عالمؐ ۹/:
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) ۲/:
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں) ۴/۵۰

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی ۶/:
بچوں کے نظیر اکبر آبادی ۶/:
بچوں کے "قا" انصاری ۶/:
بچوں کی آپا جان (گیرڈ انفیلس) ۶/:

بچوں کی شفیقہ فرحت ۴/۵۰
بچوں کے عابد علی خاں ۴/-
بچوں کے علی سردار جعفری ۴/-
بچوں کے یوسف ناظم ۴/-
چارلی چیپلن اور کینتھ اینڈرسن ۹/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی ۴/-
بچوں کے میر امّن دلی والے ۴/۵۰
بچوں کے محمد حسین آزاد ۴/-
بچوں کے مرزا غالب ۴/-
بچوں کے رنگا رنگ خسروؒ ۴/-
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد ۴/-
بچوں کے سلطان جی رح ۴/۵۰
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی ۴/۵۰
بچوں کی صالحہ عابد حسین ۴/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین ۴/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق ۴/۵۰
بچوں کے میرزا ادیب ۴/۵۰
بچوں کے غلام السیدین ۵/-
بچوں کے مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲۱/-
بچوں کے ذاکر صاحب ۷/-
دادا نہرو ۶/-
اندرا گاندھی کی کہانی ۶/-
محمد شفیع الدین نیّر ۷/۵۰
ہمارے عظیم سائنس داں ۹/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں ۶/-
مولانا آزاد کی کہانی ۱۸/-
جوہر قابل ۴/۵۰
بچوں کے چار بزرگ دوست ۳/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی ۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں ۲/-
میر انیس ۲/-

امیر خسروؒ ۳/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات ۱۰/-
کہانی بھی، معلومات بھی ۶/-
چیزوں کی کہانی ۷/۵۰
یہ کیسا بخار ہے ۶/-
آپ کا جسم ۶/-
گندا پانی ۴/-
کیوں اور کیسے؟ ۶/-
سائنس کی دنیا ۸/-
کمپیوٹر کیا ہے ۸/-
عجائب گھر ۶/-
ذرّے کی کہانی ۲۱/-
علاج میرا دشمن ۶/-
پرواز کی کہانی ۴/۵۰
غذا کی کہانی ۳/۵۰
رنگوں کی بستی ۵/-
غذائیں دوائیں ۸/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں ۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے ۳/-
صحت کی الف بے ۵/-
سنہرے اصول ۵/-
پرندوں سے جانوروں تک ۴/۵۰
دہلی ۲/-
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) ۱/۵۰
سماجی زندگی حصہ سوم ۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم) ۷/۷۵
ان تھک جان (زیر طبع)
بھن بھن بانو //
جاں باز سپاہی //

ہمت کے پھل //
موم کا محل //
بڑے دادا کی کہانی //
چٹانوں کی کہانیاں //

نظمیں

پھلجھڑیاں ۶/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲۱/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) ۷/۵۰
چہکتی کلیاں (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے ۶/۵۰
سہانے ترانے ۴/۵۰
بچوں کے افسر ۲/-
بچوں کے اقبال ۶/۵۰

ننھے منّے بچوں کے لیے

بتاشے (باتصویر) ۷/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) ۱/-
شیر اور بکری // ۱/۵۰
چاند کی بیٹی // ۱/-
بھیڑیے کا گانا // -/۵۰
جادو کی ہنڈیا // ۱/-
چالاک بلّی // -/۵۰
دم کٹی لومڑی // -/۵۰
کوّے کا خواب // -/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری -/۵۰

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

خطرناک سگنل پہلا حصہ ۱/-
لاش چل پڑی دوسرا حصہ ۱/-
کالا جنگل نیلی موت تیسرا حصہ ۱/-

خلائی سرنگ چوتھا حصہ	۱۰/:	سمندر کا بادشاہ ہار گیا	۴/۵۰	جادو کی سارنگی	۳/:
وہ خلا میں بھٹک گئے۔ پانچواں حصہ	۱۰/:	چوں چوں بیگم	۴/:	بدر شہزادی	۶/:
خلائی مخلوق بمبئی میں چھٹا حصہ	۱۰/:	ماسٹر شامت	۶/:	سمندری طوفان اور تین لڑکے	۶/:
موت کی شعاعیں ساتواں حصہ	۱۰/:	ٹھوڑی تارا ماتھے چاند	۴/:	ننھا سیاح	۷/:
خطرناک فارمولا آٹھواں حصہ	۱۰/:	پکڑے گئے	۷/۵۰	زیور	۶/:
تابوت سمندر میں نواں حصہ	۱۰/:	درویش کا تحفہ	۶/:	شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	۶/:
خلائی مخلوق کا حملہ دسواں حصہ	۱۰/:	مورا سے فرار	۷/۵۰	سام پر کیا گزری	۳/۵۰
عمران کی زندہ لاش گیارھواں حصہ	۱۰/:	بکرے کی تعریف	۶/:	جنگو کی بلّی	۳/:
شہر پتھر بن گیا بارھواں حصہ	۱۰/:	جھیل کا راز	۶/:	چالاک خرگوش کے کارنامے	۹/:
روشنی ہی روشنی	۱۰/:	قصر صحرا اوّل	۷/:	چور پکڑو	۳/۵۰
ایلس کی دنیا	۱۰/۵۰	قصر صحرا دوم	۱۰/:	بہادر علی	۷/۵۰
پتھر کا خرگوش	۱۰/:	قصر صحرا سوم	۸/:	خالی ہاتھ	۹/:
سرخ موت	۴/۵۰	عمّوں کی تباہی	۷/۵۰	کھلونا نگر	۸/۵۰
دنیا کی عجیب وغریب کہانیاں	۷/۵۰	پیار کا پنچھی	۴/:	حاجی بباکی ڈائری	۷/۵۰
انمول کہانیاں	۴/۵۰	ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	۷/۵۰	قصّہ اژدھا پکڑنے کا	۶/:
پتھر کی گڑیا	۷/۵۰	پادری کی روح	۴/:	ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
ریل کے پہیے	۴/:	ٹھگ سے ٹھگا ٹھگ کو	۴/۵۰	ابو علی کا جوتا	۶/:
افریشیا کی کہانیاں	۷/۵۰	گدھا کہانی	۹/:	ننھا سراغ رساں	۵/:
۸۰ دن میں دنیا کا چکّر	۳/:	خفیہ سرنگ	۶/:	پُراسرار غار	۶/:
ہزاروں خواہشیں	۹/:	بڑھیا کی بھینس	۴/۵۰	ظالم ڈاکو	۶/:
مونٹی کرسٹو کا نواب	۹/:	تیس مار خاں	۴/۵۰	عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۷/۵۰
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر	۶/:	چالاک خرگوش کی واپسی	۱۵/:	دلّی کی شادی	۴/:
جادوئی چقماق کی ڈبیہ	۴/۵۰	غریب لکڑہارے کی کہانی	۶/:	رحمت شہزادہ	۴/۵۰
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	۴/:	نردولی کا آدم خور	۶/:	اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
دادی اماں کی کہانیاں	۶/:	ہمت کے کرشمے	۶/:	پانچ جاسوس	۱۰/:
سفر کے قصے	۵/:	خلائی مسافر	۶/:	جنگل کی ایک رات	۷/۵۰
پہاڑی مہم	۴/۵۰	ابو خاں کی بکری	۱۵/:	اچھی کہانیاں	۳/:
تین بندوقچی	۱۰/:	ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/:	ہرن کا دل	۲/:
ہم بنے کمانڈو	۵/:	نرالے گویے	۴/۵۰	دریا کی رانی	۳/:
ایک تھا مرغا ککڑوکوں	۶/:	باتونی کچھوا	۴/۵۰	گوہر شہزادی	۴/:
پریوں کی کہانیاں	۶/:	جادو کا چھلّا	۳/:	شریر شیرا	۳/۵۰

پری رانی	۳/-	جادو کا گھر	۳/۵۰	تین اناڑی	۶/-
خطرناک سفر	۳/۵۰	بی مینڈکی اور کوا	۳/۵۰	خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا	(زیر طبع)
ننھا جبرو	۳/۵۰	تاک دنا دن تا کے سے	۳/۵۰	چمپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۴/۵۰	روٹی کس نے پکائی	۳/۵۰	ننھا ٹٹو	۳/-
بابا ناصح	۲/-	پھر میں جگنوں کیا خاک	۳/۵۰	چنبیلی	۱/۲۰
سلامہ و صمصامہ	۴/۵۰	پانچ بونے	۳/۵۰	شہزادہ اور ٹھگ	(زیر طبع)
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/-	چیونٹی رانی	۳/۵۰	**ہماری درسی کتابیں**	
شرارت	۶/-	بچوں کی کہانیاں	۳/۵۰	اردو قاعدہ	۵/-
ننھا فرشتہ	۶/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	۳/۵۰	اردو کی پہلی کتاب	۷/۵۰
ایک کھلا راز	۳/۵۰	پکڑ دم کے ٹکو	۳/۵۰	اردو کی دوسری کتاب	۱۰/۵۰
مچھیرا اور اس کی بیوی	۲/۵۰	بدو رانا پردیس چلے	۳/۵۰	اردو کی تیسری کتاب	۱۲/-
بھوتوں کا جہاز	۷/۵۰	ہتو متو	۳/۵۰	اردو کی چوتھی کتاب	۱۲/-
یار کی تلاش	۶/-	سرخ جوتے	۴/۵۰	اردو کی پانچویں کتاب	۱۴/-
خرگوش کی چال	۴/-	ریڈیو فیچر	(زیر طبع)	اردو کی چھٹی کتاب	۱۶/-
آؤ ڈراما کریں	۴/-	پلک نہ مارو	۶/-	اردو کی ساتویں کتاب	۱۷/-
خرگوش کا سپنا	۹/-	ایک دیس ایک خون	۳/۵۰	اردو کی آٹھویں کتاب	۱۸/-
نیلا ہیرا	۶/۵۰	جادو کے کھیل	(زیر طبع)	اردو خوش خطی حصہ اول	۳/۵۰
ایک کوری تیلی میں	(زیر طبع)	انعامی مقابلہ	۳/۲۵	اردو خوش خطی حصہ دوم	۳/۵۰
شیر خاں	۴/-	دعوت ملاجی	(زیر طبع)	〃 حصہ سوم	۳/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۲/-	جیت کس کی؟	۴/-	〃 حصہ چہارم	۳/۵۰
لومڑی کے بچے	۲/-	چینی کی گڑیا	(زیر طبع)	ہمارا ملک بھارت	۱۷/-
میاں ڈھینچو کے بچے	۴/-	بہادر سیاح	۴/-	بھارت اور سنسار	۱۴/-
بہادر	۴/۵۰	چچا غالب	(زیر طبع)		
ہرن کے بچے	۳/-	تانبیل خاں	۳/-		
اس نے کیا کرنا جانا	۳/۵۰	جن حسن عبدالرحمن	۵/-		
کٹا ہوا ہاتھ	۷/۵۰	چوری کی عادت	۳/۵۰		
میگھ نگر کا راجا	(زیر طبع)	غیر ذمہ دار لڑکا	(زیر طبع)		
جی دار اور ننھا فرشتہ	〃	جب اور اب	〃		
سرکس	۱/۵۰	سندر چنار	۱/۵۰		
بندر اور نائی	۴/۵۰	گلاو چوہیا اور غبارے	۱/۵۰		
لومڑی کا گھر	۲/۵۰	لال مرغی	۴/-		

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

مائندو قطعاتِ تاریخ — مرتبہ: ڈاکٹر علی احمد خلیلی — ۲۰/-
ر غالب — " قاضی عبدالودود — ۵۰/-
ولانا آزاد اور رفاقت قرآنی / مولانا آزاد سیمینار کے مقالے — ۵۰/-
ردو غزل (۱۹۴۰ء کے شعرا کے تناظر میں) — ۴۰/-
اد عظیم آبادی — قیس رضوی عظیم آبادی — ۴۰/-
ہار میں اردو رسائل اور اخبارات
مرتبین: شکیل احمد شمسی / محمد ذاکر حسین — ۵۰/-
شہر میں کرفیو (ناول) — وبھوتی نارائن رائے — ۲۵/-
قاضی سید رضا حسین — مولوی سید عبدالمغنی — ۵۰/-
اردو زبان (مسائل اور حل) — خطبہ سید ہاشم علی — ۵/-
محمود ایاز کے سوغات کا اشاریہ — ڈاکٹر سلمان عابد — ۲۰/-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو رسائل کا اشاریہ
مرتبہ: ڈاکٹر عطا خورشید — ۵/-
شاہ کمال علی کمال اور ان کی تصانیف — قاضی عبدالودود — ۲۰/-
روہیل کھنڈ اور لغت — رئیس رام پوری — ۲۰/-
اردو جرائد - خدا بخش میں (ایک صدی کا ذخیرہ) — ۵۰/-
دیوان ابوالکلام آزاد — ڈاکٹر عبدالغفار شکیل — ۲۵/-
عقائد ہنداں (دبستان مذاہب، متعلقہ ابواب) ذوالفقار موید — ۵/-
"نگار" وضاحتی اشاریہ — مرتبہ: عطا خورشید — ۲۰/-
آثار آزاد (مولانا آزاد کے اوائل عمر کی خود نوشت تحریریں)
سید قدرت اللہ فاطمی — ۲۰/-
رسالہ "جامعہ" عہد اوّل (۱۹۲۳ء - ۱۹۴۷ء) کا اشاریہ — ۵۰/-
جہان غالب — قاضی عبدالودود — ۱۰۰/-
تذکرہ کاملانِ بہار — ۱۰۰/-
اردو رسائل کا ذخیرہ (خدا بخش لائبریری میں) — ۱۰۰/-
عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ۔
پروفیسر سید حسن عسکری — ۷۵/-
عبدالحق بحیثیت محقق — قاضی عبدالودود — ۱۲۵/-
قواعد اردو — پروفیسر فدا علی خاں — ۱۰۰/-

کلام شاد (انتخاب) — قاضی عبدالودود — ۱۲۵/-
کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اوّل) قاضی عبدالودود
" حصہ دوم "
اردو رسائل ۱۹۹۳ء (نصف اوّل) نمبر ۲ — ۲۰۰/-
" " (جولائی تا دسمبر) — ۲۰۰/-
بہار اردو لغت — احمد یوسف — ۱۰۰/-
مرآۃ الاحوال جہاں نما (سفرنامہ ہند) احمد بہبہانی — ۲۰۰/-
مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ امیری (احوال و افکار)
سید منیر الدین احمد — ۷۵/-
قرآن مجید کی تفسیریں (چودہ برس میں) — ۲۰/-
چار بیت (تعارف و انتخاب) شبیر علی خاں شکیب — ۱۲۵/-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو مخطوطات۔ ترتیب ڈاکٹر عطا خورشید — ۳۰۰/-
تفسیر القرآن اوّل — سرسید احمد خاں
تفسیر القرآن دوم — "
تحریر فی اصول التفسیر — "
(مکمل سیٹ — ۲۵۰/-)
سکوں پر اشعار — ۱۷۵/-
جدید غزل گو — (ادارہ) — ۷۵
دیوان نوازش — نوازش لکھنوی — ۵۰/-
دیوان راسخ عظیم آبادی — غلام علی راسخ عظیم آبادی — ۱۰۰/-
ہندومت حصہ اوّل (۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب — ۵۰/-
ہندومت حصہ دوم (۲) " " " — ۶۰/-
ہندومت حصہ سوم (۳) " " " — ۸۰/-
بدھ / جین / سکھ اور رادھا سوامی (۴) " " — ۴۰/-
ہندو مسلم مسئلہ (۵) " " — ۴۰/-
اسلامیانِ ہند (۶) " " — ۴۰/-
تاریخ ہند (۷) " " — ۶۰/-
پریم چند افسانے (۸) " " — ۵۰/-
پریم چند: مزید افسانے (۹) " " — ۶۰/-
پریم چند: ادبیات (۱۰) " " — ۴۰/-
پریم چند متفرقات (۱۱) " — ۴۰/-
مشاہیر ادب اردو حصہ اوّل (۱۲) " — ۱۵۰/-

" " " دوم		(۱۳)	۱۵۰/-
" " " سوم		(۱۴)	۲۰۰/-
" " " چہارم		(۱۵)	۱۲۵/-
نیا ہندستان مشاہیر کے آئینے میں حصہ اول		(۱۶)	۱۶۰/-
" " حصہ دوم		(۱۷)	۵/-
سیاست ہند حصہ اوّل		(۱۸)	۱۰/-
سیاست ہند حصہ دوم		(۱۹)	۱۵/-
ممالک اسلامیہ جاپان اور دوسرے ممالک		(۲۰)	۱۰/-
ادبیات ہندی		(۲۱)	۵۰/-
چند اہم اخبارات و رسائل	قاضی عبدالودود		۳۰/-
جین دھرم کے مقدس مقامات	بابو نیمی داس		۴۰/-
تہذیب، زبان، ادبیات (خطبات جلد دوم)			۷۵/-
ہندو مذہب۔	پنڈت منوہر لال زتشی		۱۰/-
شری کرشن، گوتم بدھ اور دوسرے رہنما۔	نارائن پرشاد		۵۰/-
پیر علی (ناول)	شاد عظیم آبادی		۲۵/-
کچھ ہندومت کے بارے میں	(ادارہ)		۴۰/-
کبیر صاحب	پنڈت منوہر لال زتشی		۲۵/-
اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں	(ادارہ)		۱۰۰/-
ہندوؤں کے تیوہار	لالہ بالکشن بترا ابر		۴۰/-
ہندوؤں کے اوتار	"		۲۰/-
کرنل محبوب احمد			۲۵/-
پٹنہ کے کتبے	فصیح الدین بلخی		۵۰/-
جامع الشواہد	مولانا ابوالکلام آزاد		۶۰/-
اردو ادب	رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱-۱۹۴۸ سے انتخاب		۵۰/-
اردو لغت	" "		۴۰/-
چند ادبی مشاہیر کی تحریریں	" "		۷۰/-
اردو ہندی ہندستانی	" "		۴۰/-
ہندی ادبیات	" "		۴۰/-
تاریخ	" "		۶۰/-
سائنس	" "		۶۰/-
یادگار روزگار	سید بدرالحسن		۲۰۰/-

گیتا اور قرآن	پنڈت سندر لال	۲۵/-
جواہر لال نہرو کا سفر روس	جواہر لال نہرو	۲۰/-
شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا	جنید احمد	۴۵/-
تحفۃ السعداء	خواجہ کمال	۲۰/-
خطبۂ صدارت موتی لال نہرو		۱۰/-
شریمد بھگوت گیتا	مہاتما گاندھی	۲۰/-
محبوب الالباب	خدا بخش خاں	۲۰۰/-
قطعات دلدار	مرتبہ: قاضی عبدالودود	۲۰/-
میرا مذہب	محمد علی ردولوی	۳۰/-
لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری	قاضی عبدالغفار	۴۰/-
صراط مستقیم	مرتبہ: قمر آستاں خاں	۴۰/-
حکایت لقمان	ایس فیلس	۴۵/-
ہندو دھرم اکبر کے عہد میں	ابوالفضل	۱۰۰/-
مجمع النفائس	سراج الدین علی خاں	۱۵۰/-
تصوف برصغیر میں	خدا بخش سمینار	۱۵۰/-
اعمال نامہ	سر رضا علی	۱۰۰/-
گاندھی جی اور ہندو مسلم ایکتا	نقش علی	۱۵/-
اِثْ معانی مؤلفہ نقش علی	تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار	۱۵/-
بھگوت گیتا یا نغمۂ خدا : ندی	محمد اجمل خاں	۲۰/-
جوگ بسشٹ منہاج السالکین	دارا شکوہ	۴۰/-
ہندو دھرم ہزار برس پہلے	البیرونی	۱۰۰/-
گفتنی ناگفتنی	وامق جونپوری	۷۵/-
جرنل ۷۵-۶۲		۱۵۰/-
خدا بخش جرنل ۶۳-۶۸		۱۵۰/-
خدا بخش جرنل ۶۹-۷۴		۱۵۰/-
جنید احمد کی آٹوگراف بک	جنید احمد	۲۰/-
ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ	ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین	۱۰۰/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت۔	منشی رام پرشاد ماتھر	۳۰/-
داستان میری	ڈاکٹر اقبال حسین	۳۰/-
دیوان مصحفی	مرتبہ: امیر لکھنوی / امیر مینائی	۵۰/-

نظریاتی تنازعوں کے درمیان ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

فروری ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۲

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/-

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرے کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

مانگے کا اجالا

طنز و مزاح

کہانی

جائزے

کچھ خطوط اور ادبی تہذیبی خبریں

نئی مطبوعات

عصمت چغتائی شخصیت اور فن (سوانح) جگدیش چندر ودھاون ۵۰/-
صحت نامہ ڈاکٹر ریحان انصاری ۴/-
فکری گدگدی (مزاحیہ) جمیل ناگپوری ۲۵/-
خواب و خیال (شاعری) جگدیش لور ۲۰۰/-
چمن در چمن // منظور عثمانی ۶۰/-
ٹھمری سنگیت کار (موسیقی) بی۔آر دیودھر ۴/۵۰
میر تقی میر شخصیت اور فن (ادب) خوشحال زیدی ۱۲۵/-
دوسرا ابھور خاں (افسانے) نور پرکار ۷۵/-
میری درسگاہ (مراٹھی نظمیں) مترجم رفیعہ شبنم عابدی ۵۰/-
شفق کا ایک اور رنگ (نثری نظمیں) نور پرکار ۵۰/-
سپنے میرے اپنے (ناول) میناناز ۶۰/-
رانی (ناول) رضیہ بٹ ۱۰/-
دل ایک گلاب سا (ناول) ایم سلطانہ فخر ۸/-
پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل کی عکاسی۔ ڈاکٹر سیما فاروقی ۱۰۰/-
دلت مراٹھی ادب شناسی (ادب) انیس چشتی ۴/-
دیوان یقین دہلوی (دیوان) ڈاکٹر فرحت فاطمہ ۱۱/-
شہکار عروض و بلاغت (عروض) انور مینائی ۴/-
حیات ازدواج (طبی جنسیات) حکیم حبیب الرحمن ۷۵/-
ارمغان فلاح شاہ مفتی علی ۵۱/-
اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر (ادب) حامد اللہ ندوی ۲۰۰/-
افکار اقبال (اقبالیات) صابر ابوہری ۷۵/-
نرم رو (شعری) سلیم زاہد ۷۵/-
احتساب (افسانے) ڈاکٹر وجیہہ الرحمن ۷۵/-
ساحر ہوشیار پوری کا ایک مطالعہ (شخصیت) ڈاکٹر خورشید عالم ۱۰۰/-
باپوئے قوم (مہاتما گاندھی) ترتیب: گوپال متل ۱۰۰/-
گاندھی جی کے افکار // // ۱۰۰/-
باپو کے چرنوں میں // // ۱۰۰/-

سرورق پروفیسر عبیدالرحمن ہاشمی

مہاتما گاندھی اپنا پیامبر (مہاتما گاندھی) ترتیب پریم گوپال متل ۱۰۰/-
اردو نقاد کی حیثیت سے فراق کا جائزہ (تنقید) ڈاکٹر مہتاب عالم ۱۰۰/-
عالمی اردو ادب نمبر ۱۹۹۵ء (مجلہ) نند کشور وکرم ۱۵۰/-
دائرے کا سفر (شاعری) بشیر منظر ۵۰/-
سیاسیات (پالیٹیکل سائنس) مشتاق احمد ۷۵/-
دہلی میں اردو افسانہ (افسانوی ادب) ڈاکٹر ظل ہما ۲۰۰/-
خلیل الرحمن اعظمی کی تنقید نگاری (شخصیت) ڈاکٹر عفت آرا شمسی ۲۰۰/-
بونسائی (افسانوی مجموعہ) تسنیم کوثر ۱۰/-
ہند و مسلم یونیورسٹیاں/کتب خانے ۲۷ (تاریخ) ادارہ ۷۵/-
مذہب ۲۹ (مذہب) // ۵۰/-
کچھ شاد عظیم آبادی کے بارے میں (شخصیت) قاضی عبدالودود ۸/-
اخبارات و رسائل ۲۶ (مجلہ) ادارہ ۷۵/-
ادبیات فارسی ۲۳ // ۵۰/-
تعاقب (ناول) سیدہ نسیم چشتی ۳۰۰/-

مہمان مدیر
پروفیسر قاضی عبید الرحمن ہاشمی
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

آشاریہ

مشترکہ تہذیبی ورثہ اور اقبال

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہزاروں سال کی تہذیبی تاریخ اور بعد کی مجموعی سماجی زندگی (کم از کم امیر خسرو سے لے کر اکبر تک) بلکہ اس کے بعد کے ادوار تک چند استثنا کے ماسوا بالعموم گو ناگوں کثرت میں وحدت، مذہبی و روحانی احساسات میں گہری ہم آہنگی و مناسبت، ضبط (TOLERANCE) صلح جوئی، خیر سگالی، دردمندی اور پُر امن جہدِ للبقا کی ایک دل نشیں مثال رہی ہے، حد یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط تک تقریباً دو سو سال کے عرصہ میں تمام ہندستانیوں کا مقدر سیاسی اور معاشی محکومی کی ایک ہی زنجیر میں جکڑا رہا ہے اور مشترک تاریخ کا عنصر ایک وحدت آفریں قوت کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے۔ البتہ اس عظیم تہذیبی سفر اور آہستہ خرام دریا کے متوازی مذہبی اور نسلی امتیازات کی جو ہلکی سی لکیر ساتھ ساتھ چل رہی تھی اس کا دائرہ بتدریج بڑھتا اور پھیلتا رہا ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کی ابتدا میں مغربی تہذیبی تسلط کی روز افزونی سے سراسیمہ ہندو اور مسلمان ہندستان کے گزشتہ ہزاروں برس قدیم سرمایہ علم و دانش سے فیض حاصل کرنے کے بجائے احیائے ماضی اور
کی دھن میں ایک دوسرے کے تہذیبی نقوش کو کالعدم کر دینے کی ابتدا کر دیتے ہیں، اس کشاکش کے عالم میں تہذیبی کارواں جب بیسویں صدی میں داخل ہوتا ہے تو مدّوجزر کا ایسا بھیانک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ قومی و ملکی تحفظ اچانک بے پناہ خطرات کی زد میں آجاتے ہیں۔ ایک زمانے سے چلے آرہے متحدہ قومی نظریے اور قوم پرور تصوّرات کے بالمقابل فرقہ پروری پر مبنی دو قومی اصول و نظریات کے فروغ سے تشدد بربریت اور فسطائیت کا جنون تمام مشترکہ انسانی اقدار اور شرافتوں کو تہ و بالا کرنے لگتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہماری تہذیبی زندگی کے ایوان میں گزشتہ ہزار ہا برسوں سے فروزاں چراغِ عرفان و ہدایت اور حکمت و معرفت کی جھلملاتی ہوئی لو وقت کی ان تیز آندھیوں میں ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ تاہم وقت اور تاریخ کے اس نازک موڑ پر جن مدبّروں اور دردمندوں نے آگے بڑھ کر اس گھپ اندھیرے اور غم ناک فضا میں اپنی دانش نورانی سے کچھ اُجالا کرنے کی کوشش کی ان میں علامہ اقبال کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

اقبال اپنی دیگر حیثیتوں کے علاوہ بنیادی طور پر ایک شاعر تھے۔ ان کے لیے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جب انسانیت سسک کر دم توڑ رہی تھی، قوم کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا تو وہ محض ایک تماشائی کی نظر سے سب کچھ دیکھتے رہتے، وہ جس اخلاقی اور انسانی منصب پر گامزن

تھے اس کا تقاضا تھا کہ وہ وقت کی اس نازک گھڑی میں کسی گروہ کا فریق بن کر ابھرنے اور اس کی حمایت کرنے کے بجائے قدرے معروضی فکر کے ساتھ اندھیرے اور اُجالے اور خیر و شر کے مسائل پر غور کرتے۔ البتہ اقبال میں بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "فکر کی گہرائی اور جدّت کے ساتھ ساتھ شدّت اور تخیل کے بے قید بلند پروازی بھی جو ایشیا کے رومانی شاعروں کی خصوصیت ہے موجود تھی اس لیے انھوں نے ان قدروں کی تعریف میں جو وہ مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے اس قدر مبالغے سے کام لیا کہ بہت سے سادہ لوح جذباتی مسلمانوں کی نظر میں ان کے نصب العین کی ایک مسخ شدہ تصویر سما گئی"۔ اقبال کے شاعرانہ تخیل نے تصوّرِ خودی سے لامتناہی قوّت کو منسوب کر کے اور عشق کے مقابلے میں عقل (جو حقیقت کے ذہنی ادراک کا وسیلہ ہے) کی نفی کر کے جس شاعرانہ انتہاپسندی کا مظاہرہ کیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں بالعینہٖ حبّ وطن اور قوم پروری کی مخالفت میں بھی وہ تمام حدود و قیود سے تجاوز کر گئے۔ غالباً اسی بے اعتدالیٔ فکر کا نتیجہ ہو گا کہ اقبال انتہائی خلوصِ نیّت اور اپنے شاعرانہ تخیل کی تمام تر خلّاقانہ رفعتوں کے باوجود "نئے انسان اور نئے انسانی معاشرہ کا کوئی واضح خاکہ بنانے سے قاصر رہے۔ انھوں نے قوم کو ایک شاعرانہ پیام دے کر آمادۂ سفر تو کر دیا لیکن منزلِ مراد کی نشاندہی نہ کر سکے۔ یہاں آ کر یہ بات صاف طور پر محسوس ہوتی ہے کہ شاعری اور زندگی کے اصولوں میں کس قدر بعد ہوتا ہے اور یہیں پر خود شاعرانہ فکر کے حدود کا بھی اندازہ ہونے لگتا ہے۔

اقبال جو یورپ جانے سے قبل مشترکہ ہندستانی تہذیب کے ہر مظہر کے دلدادہ تھے اور اخوت کی دیرینہ بنیادوں اور اقدار پر ایمان رکھتے تھے اچانک ذہنی تبدیلی سے آشنا ہوتے ہیں، ان کی سیاسی بصیرت امّتِ مسلمہ کی اجتماعی شیرازہ بندی (ساحلِ نیل سے خاکِ کاشغر تک) کا جو خواب منتج ہے اپنے حدود میں ایک ہی تہذیبی پرچم کو بلند ہوتا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ اِس مقصد کے لیے وہ کبھی وسطِ ایشیا کے ترکمانوں کی جانب دیکھتے ہیں۔ کبھی عثمانی ترکوں اور افغانوں سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ البتہ جب مستقبل قریب میں کسی عالمگیر مسلم تحریک کے قدموں کی آہٹ نہیں سنتے تو قدرے دیگر ہو کر مسلم قوموں کو اپنی گہری شخصیت میں ڈوب جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

اقبال کی سیاسی فکر کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالیے تو یہاں ایک خواب ناک اور مثالی اسلامی ریاست کے خدوخال ابھرتے نظر آتے ہیں جو اپنے واقعی وجود کے لیے ہندستان کے حدود سے باہر کسی سرزمین کی متلاشی ہے۔ (اسی تصوّر کے ماتحت آگے چل کر جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی ریاست کی فلسفیانہ بنیادیں استوار کیں) چنانچہ ۱۹۳۰ء کے قریب جب اقبال کچھ عرصہ کے لیے ہندستان کی عملی سیاست میں داخل ہوتے ہیں تو گروہی عصبیت اور فرقہ وارایت کے تنگ دائروں سے نکل کر اور مشترکہ تہذیبی میراث کی پاسبانی کرنے کے بجائے اپنے فکری منصوبے کے تحت مسلمانوں کے اکثریتی علاقے شمالی مغربی ہند میں ایک آئیڈیل اسلامی ریاست کی تعمیر کے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ الہٰ آباد میں مسلم لیگ کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے .... ایک متحدہ مغربی شمالی ریاست

کی تعمیر بـ مجھے کم سے کم شمالی مغربی ہندستان کے مسلمانوں کی آخری منزل نظر آتی ہے۔"
ی تقسیم کا یہ وہ خاکہ ہے جو اقبال نے واقعی تقسیم ملک سے تقریباً ۱۵ برس قبل پیش کیا تھا۔ البتہ جو چیز اقبال
بالغ نظر اور صاحبِ بصیرت انسان نے دیدہ و دانستہ نظر انداز کردی یا جسے دیکھنے اور دکھانے کی ضرورت
س نہ کی وہ اس کثیر ملک میں سیکڑوں برس سے رہنے بسنے والے دوسرے علاقوں کے لاکھوں کروڑوں
مان تھے جو اپنے اجداد کی سرزمین کو عقیدت و محبت کے سبب چھوڑ کر نئے "جہانِ مسلم" میں جلاوطنی کے
ماده نہ ہوسکے، نئی، پاک اور محفوظ سرزمین میں سکونت اختیار کرنے والے مسلمانوں نے "اغیار" کی
ین پر چھوٹ جانے والے اپنے ان دینی بھائیوں کے بارے میں بھی کچھ سوچا تھا۔ ۔ ۔ ۔ شاید نہیں!
کی وجہ صاف ہے کہ اس پوری سیاسی کشمکش میں انسانیت کی مجموعی بقا اور سلامتی محض ایک ثانوی
ی، اصلی اور بنیادی چیز تو وہ سیاسی اور مادّی مفادات تھے جو معصوم انسانوں کے مذہبی جذبات
انگیختہ کرکے حاصل کیے گئے البتہ اس کے عواقب کس قدر دور رس تھے، اس کے مضمرات کس
اندوہناک تھے اور اس ظالمانہ کاروائی کے نتیجے میں پورے برصغیر میں انسانیت کس کس طرح
ا غلطاں ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اگر ہمارے شاعرِ مشرق کو خواب میں بھی اس کا خیال آگیا ہوتا
صرف سیدھی سیدھی شاعری کرتے۔ اپنے عہد کی مذموم سیاست میں گرفتار ہونے، مذہبی فرقہ
ری اور علاحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی حمایت کے سبب زندگی کا جو نقشا بنا شاید وہ آج
ے مختلف ہوتا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی طرف سے
ایک خواب نامہ ایک کتاب

مستقبل کی طرف

مرتبین
خواجہ محمد شاہد خالد کمال فاروقی

مولانا محمود حسن کے خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے لے کر آج تک کے ایسے تمام خطبات کا مجموعہ، ایک اہم تاریخی دستاویز:

قیمت: ۱۵۰/-

پلاٹینم جوبلی تقریبات کے دوران یہ کتاب رعایتی قیمت پر پیش کی جائے گی)

قلم اور قدم سید حامد

ہمارے تہذیبی، تعلیمی، لسانی، معاشرتی مسائل کا بے لاگ اور ہمدردانہ تجزیہ۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز دانشور اور سماجی مبصرؔ کے قلم سے۔ ان مضامین کا اہم ترین پہلو جیتی جاگتی زندگی کے مسائل اور معاملات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔

قیمت ۷۵/- روپے

سیاہ فام ادب

مرتبین: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی
ایک نئی، زندہ اور متحرک حسیت کا منظر نامہ۔
سیاہ فام جمالیات اور سیاہ فام ادب پر اردو میں اولین کاوش۔ آج کے ادبی مزاج کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے قیمت ۴۰/-

سرسید اور ان کے عہد کا مطالعہ ہمارے اجتماعی حال اور مستقبل کا مطالعہ ہے۔
اس سلسلے کی ایک اہم کتاب

سرسید سے اکبر تک

مرتبین
شمیم حنفی سہیل احمد فاروقی
قیمت ۹۰/- روپے

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین:- پروفیسر شہریار / پروفیسر ابوالکلام قاسمی
کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں پروفیسر نارنگ کی علمی، ادبی سرگرمیوں کے نمایندہ پہلوؤں سے متعلق مضامین، تاثرات، تنقیدی آرا اور ادبی مسائل پر مکالمہ، سے ان کی دلچسپیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۶۰/- روپے

آگے سمندر ہے انتظار حسین

انتظار حسین کا شمار اردو کے صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے "آگے سمندر ہے" آپ کا تازہ ترین ناول ہے۔ قیمت: ۱۵۰/- روپے

خامہ بگوش کے قلم سے

۱۹۸۲ء تا ۱۹۹۰ء کے طنزیہ مزاحیہ کالموں کا انتخاب (جلد اوّل)

مرتبہ: مظفر علی سید

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالموں کا مجموعہ جس کا اردو والوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔
صفحات لگ بھگ ۳۵۰۔ قیمت مجلد 150/- عام ایڈیشن 80/-

ڈاکٹر گیان چند
اندرا نگر، لکھنؤ 226016

مآثر غالب مولفہ قاضی عبدالودود کی نئی تدوین از حنیف نقوی

ڈھاکے کے ایک علم دوست حکیم حبیب الرحمٰن کے پاس ایک قلمی بیاض تھی جس میں
ب کے 32 غیر مطبوعہ فارسی خطوط درج تھے۔ قاضی عبدالودود نے خود اس کی نقل کی۔ ان خطوط
ساتھ غالب کی دوسری کمیاب اردو اور فارسی تحریروں کو ملا کر ایک مجموعہ "آثار غالب" کے نام
مرتب کیا اور اسے علی گڑھ میگزین غالب نمبر 49-1948 میں شائع کر دیا۔ میگزین کے شذرات
1ر ستمبر 1949 کی تاریخ پڑی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شمارہ 50-1949 کے تعلیمی سال
شائع ہوا ہوگا۔ مختار الدین احمد نے قاضی صاحب کو اطلاع دی کہ شیخ محمد اکرام کی ایک کتاب آثار
ب کے نام سے آگئی ہے۔ اس پر قاضی صاحب نے اپنے مجموعے کا نام بدل کر "مآثر غالب" رکھ
۔ میگزین میں متن میں اس کا نام آثار غالب دیا ہے اور فہرست میں مآثر غالب۔ ضمیمے کے سو دو سو
نخ فاضل چھپوا لیے تھے۔ ان پر دوسرا سرورق "مآثر غالب" کے نام سے لگا دیا گیا اور یہ مجموعہ انجمن
تی اردو بہار کی طرف سے ستمبر 1949 میں شائع ہوا۔

ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے قاضی صاحب کی تمام کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تو اسے بھی
وسری بار شائع کیا۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد سے درخواست کی گئی کہ وہ اس کی تصحیح و ترتیب نو کر دیں۔ وہ
س کے لیے رضامند نہیں ہوئے۔ اس کے بعد یہ کام ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے مکمل کیا۔ ان کی
اضلانہ ترتیب کے ساتھ یہ کتابچہ 1995 میں شائع ہوا۔ مرتب نے مجھے اس کی کاپی 14ر نومبر 1995
کو دستخط کر کے بھیجی ہے۔ اس سے میرا خیال ہے کہ کتاب نومبر 1995 میں شائع ہوئی۔

متن کتاب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں اردو نثر، اردو نظم، فارسی نثر اور فارسی
نظم ہیں۔ دوسرے حصے میں غالب کے 32 فارسی خطوط ہیں۔ بقول حنیف نقوی ان میں سے چار خط

متفرقاتِ غالب مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی میں بھی شامل ہیں' باقی 28 خطوط پہلی بار سامنے آرہے ہیں۔(پس گفتار ص 102) متن کتاب کے بعد قاضی صاحب کے عالمانہ حواشی ہیں۔ مختار الدین احمد لکھتے ہیں۔

"غالب کی تحریرات نظم ونثر کے ہر حصے کے متعلق ایسے بیش قیمت معلومات انھوں نے پیش کیے ہیں کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ان پر اضافہ مشکل نظر آتا ہے۔" (صفحہ 113)

قاضی صاحب کے حواشی کے بعد ڈاکٹر حنیف احمد نقوی نے اول الذکر پر اس تفصیل سے حواشی لکھے ہیں کہ اضافے تو اضافے تصحیحات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ وہ واحد آدمی ہیں جس نے قاضی صاحب کی تحریر میں اتنی زیادہ تصحیحات و توضیحات کی ہیں۔ اس کے بعد دو پس گفتار ہیں: پس گفتار 1 از ڈاکٹر حنیف احمد نقوی' پس گفتار۔2 از ڈاکٹر مختار الدین احمد۔ دراصل ان دونوں کو پس گفتار کی جگہ پیش گفتار یعنی پیش لفظ کے طور پر ابتدائے کتاب میں دینا چاہیے تھا۔ مختار صاحب نے مجموعے کی شانِ نزول اور کچھ مشاہدات درج کیے ہیں۔ تحشیہ نہیں کیا جب کہ حنیف نقوی نے اتنا مفصل اور دقیق تحشیہ کیا ہے جو قاضی صاحب کے حواشی سے کم اہم نہیں۔

چونکہ دونوں پس گفتار دراصل پیش لفظ ہیں اس لیے میں ان پر سب سے پہلے لکھتا ہوں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کی پس گفتار 2 اس اڈیشن سے پہلے کئی رسالوں میں مضمون کی شکل میں آچکی ہے۔ مختار صاحب مآثر غالب کی ترتیب اول کے وقت سے قاضی صاحب کے شریک یا مشیر تھے۔ چونکہ وہ عینی شاہد تھے اس لیے انھوں نے شانِ نزول کی جو تفصیلات دی ہیں وہ باوثوق ہیں' اس تحریر کو کتاب میں پیش لفظ کے طور پر آنا چاہیے تھا۔

ڈاکٹر حنیف احمد نقوی اپنی پیش گفتار میں مجموعے کے مشمولات اور شانِ نزول کا بیان کرتے ہیں۔ نیز خطوط کے مطالب کی اہمیت پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔ پس گفتار کے دوسرے حصے میں وہ 11 شقوں میں اپنی تدوین کی جزئیات بیان کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ اہم یہ ہیں۔

(1) طبع اول میں فارسی خطوط بیاض حبیب الرحمٰن کی ترتیب کے مطابق منقول تھے۔ مرتب دوم نے انھیں مکتوب الیہم کی مناسبت سے تقسیم کیا۔ پھر ہر مکتوب الیہ کے خطوط کو تاریخی ترتیب سے درج کیا۔

(2) تین نئے مکتوب الیہم کا پتا لگایا اور ان سے انتساب کی وجوہ مناسب مقام پر دیں۔ واضح ہو کہ مطبوعہ پس گفتار میں انھوں نے ایک نئے مکتوب الیہ کا ذکر کیا ہے' میرے پاس بھیجے ہوئے نسخے میں ترمیم کرکے تین نئے مکتوب الیہم نواب علی اکبر خاں' سراج الدین احمد اور خواجہ فیض الدین حیدر کے نام لکھے ہیں۔

(3) ہر خط کے آخر میں قوسین میں اس کے زمانہ تحریر کی نشان دہی کا التزام کیا۔ تاریخ کے
ن کے شواہد حواشی میں دیے۔
(4) طبع اول کے متن کی تصحیحات کیں۔
جو یہ فرائض سرانجام دے وہ صحیح معنی میں مرتب ہے لیکن حنیف نقوی نے تو عالمانہ حواشی
لکھے ہیں۔ افسوس ناشر ادارہ تحقیقات اردو نے سرورق پر کتاب کے لیے "مرتبہ قاضی
الودود" لکھنے پر اکتفا کی ہے لیکن حنیف نقوی نے جو اتنی سر مغزی کی ہے اس کا کوئی اعتراف
ں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنے مختصر پیش لفظ "حرفے چند" میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر نقوی نے اس
کی ذمے داری سنبھال لی تو یہ کام ہو گیا" لیکن پورا نام نہیں لکھا کہ یہ کون سے نقوی ہیں۔ میں اردو
کم از کم دو اور ڈاکٹر نقوی (نقویوں؟) کو جانتا ہوں' الہ آباد کے ڈاکٹر ناصر حسین نقوی اور علی گڑھ
ڈاکٹر منظر عباس نقوی۔ شاید ڈاکٹر بیدار نے حنیف نقوی کے حواشی کا بہ نظر غائر مطالعہ نہیں کیا۔
میں پیش کردہ معلومات کسی طرح قاضی صاحب کے حواشی سے کم نہیں۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ
رق پر لکھا جاتا

مرتبہ: قاضی عبدالودود و ڈاکٹر حنیف احمد نقوی

یا مرتبین قاضی عبدالودود و ڈاکٹر حنیف احمد نقوی

مالک رام نے مہیش پرشاد کے مرتبہ "خطوط غالب" کی ترتیب ثانی کی تو انجمن نے سرورق پر
ب اول کا نام حذف کر کے' صرف مرتب ثانی مالک رام کا نام درج کیا۔ اس پر بجا اعتراض کیا گیا۔
ں مرتب اول کا نام ہے۔ مرتب ثانی کا نہیں' یہ بھی اسی قسم کی فرد گذاشت ہے۔ ہے یہ عجیب
یب قسم کی تدوین جس میں مرتب ثانی نے مرتب اول کے حواشی پر حواشی لکھے ہیں۔
کتاب کے شروع میں قاضی عبدالودود کا لکھا التماس ہے جو مآثر غالب کے انجمن ترقی اردو
ر کے اڈیشن کے شروع میں شامل کیا گیا تھا۔ اس میں اہم ترین اطلاع یہ ہے کہ کتاب کا نام آثار
ب سے بدل کر مآثر غالب کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد پانچ اور اندراجات ہیں جن کے شروع میں صفحہ
ر نمبر دیا ہے اور قوسین میں ایک اور (موجودہ صفحہ و سطر نمبر) ہے لیکن صفحات کے یہ دونوں نمبر طبع
ں کے مطابق نہیں۔ ناشر کو چاہیے تھا کہ قوسین والے موجودہ صفحہ نمبر کو زیر مطالعہ طبع دوم کے
ات کے مطابق کر دیا جاتا۔

متن کتاب میں اردو فارسی کی 16 چیزیں یا زمرے ہیں جن میں سے بقول حنیف نقوی کے
ں غیر مطبوعہ ہیں۔ باقی سب پہلے کہیں نہ کہیں چھپ چکی تھیں گو کم یاب ہیں (ص 101) حصہ دوم
، 32 فارسی خطوط میں 28 غیر مطبوعہ ہیں۔ متن کے بعد تحقیقات کے ساتھ قاضی صاحب کے

حواشی ہیں جن میں بعض مخففات شت، ق، ک، ک م، م، ن، ن ا، ہیں جن کے مشار الیہ کو یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ حواشی کا حصہ (3) قاضی صاحب کی مخصوص الجبرائی زبان میں ہے جو دیکھنے کے لیے ہے۔ سمجھنے کے لیے نہیں۔ بہرحال ان حواشی سے جس جید علم کا پتا چلتا ہے، جو بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان کا اندازہ انھیں بالاستیعاب پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اولیت کا فخر قاضی صاحب کو ہے کہ انھوں نے تشخیص وادراک کی راہیں کھولیں جن پر حنیف نقوی نے زیادہ دقت نظر سے چل کر مزید تشخیصات و تصحیحات کیں۔

قاضی صاحب کے حواشی صفحہ 30 سے 62 تک ہیں۔ اس کے آگے حنیف نقوی کے حواشی، استدراکات اور پس گفتار ہیں جو ص 71 سے 107 تک ہیں۔ ناشر نے ضعیفوں پر یہ ستم کیا ہے کہ حنیف کے حواشی اس قدر خفی کتابت میں ہیں جو کسی دوسری اردو کتاب میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان کا مسطر 31 سطری ہے جب کہ قاضی صاحب کے حواشی کا 23 سطری۔ متن کا اس سے بھی زیادہ جلی معلوم ہوتا ہے۔ حنیف احمد کے حواشی کے ایک صفحے میں قاضی صاحب کے حواشی کے ڈیڑھ صفحے کا مواد ہے۔ اس ناشر نے جزرسی میں مجھے بھی مات کر دیا۔

قاضی صاحب کی تقلید میں حنیف احمد نے بھی کم از کم تین مخففات حروفی استعمال کیے ہیں: ص، ط، مت، حرف کے بجائے ایک لفظ لکھا جائے تو قاری کو تفہیم کی سہولت رہتی ہے مثلاً متفرقات غالب کے لیے مت کے بجائے متفرقات، قاطع القاطع کے لیے فن کے بجائے القاطع، حنیف نقوی کے مخففات متن سے متعلق بہت کم ہیں۔ ان کا اعلا کارنامہ قاضی صاحب کے حواشی پر تبصرہ ہے جو ص 74 سے 99 تک ہے۔ ناشر و طابع کی لاپروائی سے چار خلفشار دکھائی دیے۔

(1) قاضی صاحب نے حواشی کے متن میں بعض اوقات ایک ستارہ بنا کر اس کا حاشیہ فٹ نوٹ میں لکھا ہے گویا یہ حاشیہ در حاشیہ ہو۔ ان پاورقی حاشیوں کو حنیف نقوی کے حواشی میں بھی ستارہ بنا کر مکرر درج کر دیا گیا ہے حالانکہ ان کے آخر میں ہر جگہ حاشیہ نگار کے نام کے حروف (ق ع و) لکھ دیے گئے ہیں۔ جب یہ اندازہ ہے کہ یہ قاضی صاحب کا تبصرہ ہے تو اسے حنیف احمد کی تحریر کے بیچ میں کیوں لکھا گیا۔

(2) چار خطوط متفرقات غالب سے مشترک ہیں لیکن ان میں کہیں کہیں اختلاف متن ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے حواشی میں کہیں کہیں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حنیف اپنے حواشی میں لکھتے ہیں۔

"قاضی صاحب کے درج کردہ اختلافات متن نہ تو پوری طرح مطابق اصل ہیں اور نہ کلی طور پر جامع و مانع۔ ہم نے اس مجموعے اور متفرقات میں مشترک تمام خطوط کے اختلافات پاورق میں

ج کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ متذکرہ فرق کا اندازہ کرنے کے لیے ان حواشی کی طرف رجوع کیا جا سکتا
۔" (ص 93)

لیکن متن کے پاورق (فٹ نوٹ) میں یہ اختلافات کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ غالباً حنیف کے
ئی کے متن ہی میں سمو دیے گئے ہیں یا پھر چھپنے سے رہ گئے ہوں گے۔

(3) کاتب صاحب نے صفحوں پر نمبر شمار ڈالنے میں غلطی کی ہے۔ صفحہ 96 کے بعد کے صفحے پر
98، 997 ڈالا گیا ہے اور اس کے آگے کے صفحے پر 100-99

(4) مندرجہ بالا صفحہ 100-99 پر حنیف نقوی کے استدراکات کا (5) درج ہے جس میں
جہ محمد مستقیم کی شناخت کی گئی ہے۔ نہ معلوم کس بے توجہی سے یہ پوری عبارت قاضی صاحب
حواشی کے آخر میں صفحہ 62 پر بھی چھاپ دی گئی ہے۔ ستم یہ ہے کہ اس سے پہلے صفحہ نمبر
1-99 بھی درج کر دیا ہے۔

حنیف نقوی کے حواشی کے مطالب یہ ہیں۔

(1) متن کتاب صفحہ 1 سے 29 تک ہے۔ حنیف نے ان صفحات کے حواشی میں مآثر طبع اول
طبع دوم کے اختلافات نسخ دیے ہیں۔ طبع دوم کا متن ان کا درست کردہ ہے۔

(2) اپنے حواشی میں انھوں نے فارسی کے کئی اشعار اور مصرعوں کی تخریج کی ہے یعنی ان
مصنف کا پتا دے کر ان کا صحیح متن پیش کیا ہے۔

(3) انھوں نے قاضی صاحب کے حواشی کی کم از کم 52 تصحیحات کی ہیں۔ ان کے علاوہ 18
افے اور 18 صراحتیں میں نے بادی النظر میں شمار کیں۔ یقین ہے اضافوں کی تعداد اس سے کہیں
دہ ہوگی۔

(4) بڑے پیمانے پر خطوط کی تاریخوں کا تعین کیا ہے۔ یہ بالخصوص صفحہ 90 تا 92 پر ملاحظہ
یئے۔ خطوں کے علاوہ دوسرے متعدد واقعات کی تاریخیں بھی طے کی ہیں۔ جن لوگوں کے نام خطوط
آئے ہیں یا مکتوب الیہ ہیں ان کی سوانح کی اہم تاریخیں بھی دی ہیں۔

ذیل میں مثالاً چند تصحیحات درج کی جاتی ہیں' ان میں قاضی صاحب کے حاشیے اور صفحے کا نمبر
ج کیا جائے گا۔

(1) حاشیہ 1 قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ سیر سیاح میاں داد خاں سیاح کی کتاب ہے (صفحہ
3) حنیف نے تصحیح کی کہ سیر سیاح لکھنؤ اور کانپور کے دو مشاعروں کا گلدستہ ہے جسے منشی انوار حسین
لیم سہسوانی اور احمد حسن خاں جوش نے مرتب کیا۔ گلدستے کے مقدمے میں میاں سیاح کے شمالی
ر کے سفرات کی تفصیل ہے۔ (صفحہ 74)

(2)حاشیہ 1 قاضی صاحب کوڈھاکے کے آغا احمد علی مصنف موید برہان کا سنہ ولادت معلوم نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب تذکرہ نساخ کے مطابق اس کا انتقال عین شباب میں 1290ھ میں ہوا تو اس کا قتیل کی حمایت میں 1243ھ میں کلکتے میں ہنگامہ آرائی کرنا ناممکن ہے جیسا کہ غلام رسول مہر نے غالب میں لکھا ہے۔ (صفحہ 34) حنیف نے احمد علی کی صحیح تاریخ ولادت 10رشوال 1255ھ اور صحیح تاریخ وفات لکھی جس سے ثابت ہوا کہ احمد علی معرکہ کلکتہ کے بعد پیدا ہوا ہے (صفحہ 75) دراصل قاضی صاحب ڈھاکے کے احمد علی اور احمد علی گوپاموی میں التباس کر رہے ہیں۔ قتیل کی حمایت میں کلکتے میں ہنگامہ موخرالذ کرنے کیا تھا۔1

(3)حاشیہ 3 یہ تصحیح قاضی صاحب کی نہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ہے۔ غالب نے تیغ تیز کے آخر میں ایک استفتا دیا ہے جس میں تقریباً تمام سوالوں کے آخر میں مصا لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے مولانا عرشی کو لکھا کہ یہ مصنف کا مخفف ہے۔ (صفحہ 34) ڈاکٹر حنیف کے مطابق یہ "مصیب" کا مخفف ہے جس کے معنی حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھنے والا ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ غالب نے آغا احمد علی کی موید برہان کے حاشیوں پر جو 120 یادداشتیں لکھی تھیں ان میں سے 62 کے آخر میں یہ نشان موجود تھا۔ دوسرے کی غلطیاں نکالنے والا مصنف نہیں ہو سکتا حقیقت کو تلاش کرنے والا ہی ہو گا۔ (صفحہ 77)

(4)حاشیہ 1 قاضی صاحب لکھتے ہیں درفش کاویانی میں غالب نے لکھا ہے کہ سات فضلائے کلکتہ، جو برہان کے محشی (حاشیہ نگار) ہیں، میرے ہم نوا ہیں۔ غالب کو اس کی خبر نہیں کہ یہ حواشی رویک کے لکھے ہوئے ہیں اور مصححین مطبع طبی، جن میں حکیم عبدالمجید کے سوا کسی کے عالم ہونے کا ثبوت موجود نہیں، ان سے کچھ سروکار نہیں رکھتے (صفحہ 38) حنیف نے تصحیح کی کہ قاطع برہان لکھتے وقت غالب نے برہان کے نسخۂ افضل المطابع کلکتہ کو سامنے رکھا تھا جس کے سرورق کے مطابق 11 علماء و فضلاء نے اس کی تصحیح کی۔ دوسرے اڈیشن درفش کاویانی کو لکھتے وقت انھوں نے مطبع طبی کے نسخے کو سامنے رکھا۔ غالب کا دعوا افضل المطابع کے اڈیشن کے بارے میں درست ہے۔ (صفحہ 78)

(5)حاشیہ 2 قاضی صاحب: محمد نجف جن کے نام سے ایک خط پنج میں ہے۔ اور ان کے بھائی محمد حمیدالدین یقین ہے کہ غلام نجف کے اقربا سے ہوں (صفحہ 43) حنیف تصحیح کرتے ہیں کہ غلام نجف اور محمد نجف ایک ہی شخص ہیں (صفحہ 80)

(6)حاشیہ 2 قاضی صاحب نے الٰہی بخش معروف کے انتقال کی تاریخ 1243ھ لکھی (صفحہ 43) حنیف نے شیفتہ کے حوالے سے 1242ھ لکھی اور یہی صحیح ہے۔ (صفحہ 80)

(7)حاشیہ I قاضی صاحب: حکیم حبیب الرحمٰن نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ارمغان نساخ

---

1 شانتی رنجن بھٹاچاریہ: بنگال میں اردو زبان و ادب۔ لکھنؤ ۱۹۷۶ء ص ۶۰۔ ۶۵۔

کے چوتھے دیوان میں ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ ہے (صفحہ46) حنیف: نساخ کے چوتھے دیوان کا تاریخی نام "ارمغانی" ہے۔ کہنا چاہیے تھا۔ "نساخ کے چوتھے دیوانِ ارمغانی میں" (صفحہ82)

(8) حاشیہ 3 قاضی صاحب نے خط 26 کی بنا پر طے کیا کہ تپاں نے غالب کو کلکتے میں اپنے ساتھ ٹھہرانا چاہا تھا لیکن غالب تیار نہ ہوئے (صفحہ50) حنیف: یہ خط دراصل سراج الدین احمد کے نام ہے اور انھیں نے غالب کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ (صفحہ83)

(9) حاشیہ 4 قاضی صاحب "مرزا حاجی" کا ذکر کرتے ہیں (صفحہ 50) حنیف: ان کا نام "خواجہ حاجی" تھا مرزا حاجی نہیں۔ تپاں نے غالب کے نام ایک خط میں ان کا نام "خواجہ حاجی خاں" لکھ دیا۔ اس پر غالب نے خندہ کیا کہ "خواجہ حاجی" کو "خواجہ حاجی خاں" بنادیا۔ (صفحہ83)

(10) حاشیہ 3 قاضی صاحب: شائق کے والد کا نام علیم اللہ نہیں 'خلیل اللہ ہے۔ دہلی جانا غالباً صحیح نہیں (صفحہ51) حنیف: مولف سراپا سخن نے ان کا نام خواجہ خلیل الدین 'باشندۂ ڈھاکہ' وارد دہلی لکھا ہے۔ (صفحہ84)

(11) حاشیہ 5 قاضی صاحب: شائق کا انتقال تیرھویں صدی کے آٹھویں عشرے میں ہوا (صفحہ51) حنیف نے کئی مآخذ کی بنا پر ان کا سنہ وفات 1268ھ طے کیا۔ (صفحہ84)

(12) حاشیہ 5 قاضی صاحب: سراج الدین احمد کانپور کے باشندے ہو سکتے ہیں گو بعض خطوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ مسکن تھا۔ (صفحہ52) حنیف نے کئی خطوط سے یہ شافی طور پر ثابت کیا کہ سراج الدین احمد کا وطن لکھنؤ تھا۔ (صفحہ84)

(13) حاشیہ 9 قاضی صاحب: پنج آہنگ اور متفرقات غالب میں سراج الدین احمد کے نام 11 خط مشترک ہیں۔ (صفحہ52) حنیف: 14 خط مشترک ہیں۔ (صفحہ85)

(14) متعلق حاشیہ 10 قاضی صاحب: ایک خط میں جو رمضان 1278ھ (مارچ 1862ء) کے کچھ بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ان (سراج الدین احمد) کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ لکھا ہوا ہے (صفحہ 52) حنیف نے بہ دلائل طے کیا کہ یہ خط بالیقین اگست 1864 کا ہے۔ (صفحہ85)

(15) حاشیہ 4 قاضی صاحب: غالب جب تک کلکتے میں رہے ظاہراً مرزا افضل بیگ سے کوئی شکایت نہ ہوئی (صفحہ53) حنیف نے غالب کے ایک خط سے دکھایا کہ غالب کو کلکتے ہی میں ان سے سخت شکایت تھی (صفحہ85)

(16) حاشیہ 8 قاضی صاحب: قیام کلکتہ میں تین بار ہوگلی جانے کا پتا غالب کے خطوں سے ملتا ہے۔ (صفحہ53) حنیف: تین بار کی حد بندی مناسب نہیں۔ مختلف خطوں میں کم از کم مزید دوبار اور جانے کا ذکر موجود ہے۔ (صفحہ86)

(17)حاشیہ 6 قاضی صاحب: یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غالب اواخر ربیع الثانی یا اوائل جمادی الاولیٰ میں کلکتے سے رخصت ہوئے ہوں گے۔ (صفحہ56) حنیف: نے متفرقات غالب اور نامہ ہائے فارسی کی سند سے ثابت کیا کہ واپسی کا سفر صفر1245ھ کے تیسرے ہفتے (اگست 1829) میں شروع ہوا تھا۔ (صفحہ89)

(18) متعلق حاشیہ 1 قاضی صاحب: تپاں کے نام خط 12 میں مذکور محفل آرائی کا تعلق خط 1 و خط 2 کی دعوت شادی بسم اللہ سے ہے (صفحہ 57) حنیف: نہیں، اس خط کی بزم سے وہ محفل مراد ہے جو تپاں کے زیر اہتمام ہر چہار شنبے کو منعقد ہوتی تھی (صفحہ89)

(19) حاشیہ 3 قاضی صاحب: ڈھاکے کی بیاض میں " پیچتاب " لکھا ہے۔ غالب نے "پیچ و تاب" لکھا ہوگا (صفحہ 58) حنیف نے غالب کے دو فارسی خطوں کی نشان دہی کی جن میں پیچتاب ہی لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا املا یہی تھا (صفحہ91)

(20) حاشیہ 6 قاضی صاحب: غالب نے ایک خط میں معترض بطور اسم مفعول استعمال کیا ہے۔ اس کی جگہ معترض الیہ ہونا چاہیے۔ (صفحہ 58) حنیف: غالب کا عربی کا علم بہت محدود تھا۔ قاضی صاحب کی اصلاح میں بھی دخل کاتب معلوم ہوتا ہے۔ صحیح معترض علیہ ہے (صفحہ92)

(21) حاشیہ 1 قاضی صاحب: غالب نے خط میں استشعار بمعنی استفسار استعمال کیا ہے۔ یہ کاتب یا غالب کی غلطی ہے۔ (صفحہ 60-59) حنیف: غالب نے ایک اور خط میں استشعار اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے کاتب کی غلطی نہیں۔ (صفحہ93)

(22) حاشیہ 4 غالب کے خط 28 میں ایک مرکب "اجلّہ بدیہات" چھپا ہے۔ صاحب موید برہان نے اعتراض کیا کہ "اجلۂ بدیہیات" کی جگہ "اجلائے بدیہیات" چاہیے۔ قاضی صاحب نے ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا "اجل بدیہیات ہونا چاہیے۔ اجلّہ اور بدیہات دونوں غلط ہیں"۔ (صفحہ61) حنیف: موید برہان کے بیان سے ظاہر ہے کہ غالب نے "بدیہیات" لکھا تھا "بدیہات" سہو کاتب ہوگا۔ حیرت ہے کہ محمد زبیر صدیقی اور قاضی صاحب اجل کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ "اجل" "جلیل" کا اسم تفضیل ہے اور "اجلا" "جلی" کا۔ یہاں محل جلی (ضدِ خفی) کا ہے نہ کہ جلیل کا۔ اس لیے "اجلائے بدیہیات" ہی درست ہے۔ (صفحہ94)

(23) حاشیہ 6 قاضی صاحب: خط 30 سے پتا نہیں چلتا کہ دیوان اردو یا دیوانِ فارسی کا ذکر ہے؟ اگر فارسی ہے اور یہ خط اس زمانے کا ہے جب خط 31 لکھا گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دیوان 1248ھ میں مرتب تھا۔ (صفحہ61) حنیف: یقیناً دیوان اردو کا ذکر ہے کیونکہ دیباچہ دیوانِ اردو 1248ھ کے مطابق اس وقت تک دیوانِ فارسی کی ترتیب کا کام شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ (صفحہ94)

قاضی صاحب کے ایک بیان میں میں بھی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ صفحہ 12 پر معمے کا ایک شعر ہے

نیم شب یخ بستہ دیدم برگذر گاہ خرام
برسر آبے کہ بودش درمیان کاف ولام

قاضی صاحب صفحہ 48 پر لکھتے ہیں۔

"حل شیخ کمال ہے۔ نیم شب یخ بستہ: شیخ گزر گاہ خرام یعنی م اور سر آب یعنی الف م اور ل کے درمیان آیا شیخ کمال ہو گیا۔"

میرا خیال ہے کہ سر آب سے مراد الف نہیں ہے۔ ما بہ معنی آب مراد ہے جو ک اور ل کے بیچ آکر ک ' ما ' ل یعنی کمال ہو گیا۔ تصحیحات مبہت زیادہ ہو گئیں۔ اضافے اور وضاحتیں بھی بسا اوقات تصحیحات میں گڈمڈ ہیں۔ میں ان کی چند مثالوں پر قناعت کروں گا۔ اول اضافے:

(1) حاشیہ 3 قاضی صاحب: رائے چھج مل کے بارے میں غالب اپریل 1853ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ یہ آفتاب سرکوہ ہیں۔ تعجب نہیں کہ اس کے کچھ بعد ان کی وفات ہوئی ہو۔ (صفحہ 47) حنیف غالب کا کہا ہوا چھج مل کی وفات کا قطعہ درج کرتے ہیں جس کے مطابق 1277ھ (1860-61) میں وفات ہوئی۔ (صفحہ 83)

(2) حاشیہ 4 قاضی صاحب "مے خانۂ آرزو سرانجام" کے لیے لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ 1254ھ سے قبل کا لکھا ہوا ہے اور ظاہرا معدوم ہے (صفحہ 47) حنیف نے غالب کا کہا ہوا قطعہ تاریخ تکمیل درج کیا جس سے 1250ھ برآمد ہوتا ہے (صفحہ 82)

(3) حاشیہ 5 قاضی صاحب: مرزا افضل بیگ کی وفات جس سنہ ہجری میں ہو صفر کے آخری چہار شنبے سے پہلے تھی (صفحہ 53) حنیف نے متفرقات غالب سے دریافت کیا کہ چہار شنبہ 23 صفر 1247ھ سے کچھ پہلے وفات ہوئی۔ (صفحہ 85)

(4) حاشیہ 4 و 5 قاضی صاحب نے تپاں کے نام کے خط 14 کی تاریخ رمضان 1243ھ یا رمضان 1244ھ قیاس کی اگلے جملے میں انھوں نے 1243ھ کو ترجیح دی (صفحہ 57) حنیف نے بہت سے خطوط کی بنا پر حساب لگا کر طے کیا کہ یہ خط رمضان 1244ھ کا ہے اور غالباً 26 رمضان کا۔ (صفحہ 89)

(5) حاشیہ 7 صفحہ 12۔ فارسی نظم فاطمہ منظوم بنام جوہر کے بارے میں حنیف احمد نے اضافہ کیا کہ آخر سے اوپر تیسرے شعر کے بعد باغ دو در میں دو شعر زائد ہیں۔ وہ اشعار درج کیے۔ (صفحہ 72)

(6) حاشیہ 7 صفحہ 12۔ خط 23 کے بارے میں حنیف نے اضافہ کیا کہ متفرقات غالب میں

تپاں کے نام کا یہ خط "خواہید دید" والے پیراگراف پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کی دو سطریں مولوی سراج الدین احمد کے نام کے مکتوب کا حصہ ہیں۔ (صفحہ 73)

اب محض تین وضاحتیں جو ایک طرح سے اضافہ بھی کی جا سکتی ہیں۔

(1) حاشیہ 1 قاضی صاحب: طغرا نے بہ قول غالب دریچہ (بہ یائے معروف) کو دریچہ بہ یائے مفتوح باندھا ہے (صفحہ 36) حنیف: طغرا کا زیر بحث شعر یہ ہے۔

روز وشب دریچہٴ مشرق ومغرب باز است
ورنہ از تنگیِ ایں خانہ نفس می گیرد

(صفحہ 77)

(2) حاشیہ 2 قاضی صاحب: فردوسی شاہنامہ میں سو جگہ "گرفت" کو "خفت" و "گفت" کا قافیہ اور ہزار جگہ "شگفت" کا قافیہ لایا ہے (صفحہ 36) حنیف: فردوسی کا وہ شعر جس میں "رفت" اور "شگفت" بطور قافیہ آئے ہیں 'یہ ہے

سرو دل پُر از کینہ کردو برفت
تو گوئی کہ عہدِ فریدوں گرفت

(صفحہ 77)

میرا خیال ہے کہ نثری جملے کی صراحت کے بموجب دوسرے مصرع میں قافیہ "گرفت" کے بجائے "شگفت" رہا ہو گا۔

(3) حاشیہ 6 میر ولایت علی کے نام جو غالب کا نودریافت اردو خط ہے اس سے صفیر بلگرامی نے نتیجہ نکالا کہ ٹکٹ مونث بھی ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے میں اس خط سے ٹکٹ کی تانیث نہیں ثابت ہوتی۔ (صفحہ 41) حنیف نے توجیہ کی کہ غالب نے اپنے زمانے کی روش کے مطابق لکھا ہو گا۔

"ٹکٹ لپیٹنی بھول گیا" "آج جو بکس کھولا ٹکٹ بکس میں پائی"

صحیح "لپیٹے" اور "پائے" ہے کیونکہ دو روپے کے دو ٹکٹ تھے۔ (صفحہ 79)

قاضی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ اس خط کا پتا نہ چلا جو اس سے پہلے میر ولایت علی نے لکھا تھا۔ حنیف نقوی نے صراحت کی کہ یہ پہلا خط انشائے سید گل مرتبہ محمد ہاشم مطبوعہ آرہ میں شامل ہے نیز مشفق خواجہ نے اپنی کتاب "غالب اور صفیر بلگرامی" میں صفحہ 119 پر نقل کیا ہے۔

تخریج یعنی مصنف کی نشان دہی اور متن کی درستی کی صرف دو مثالیں درج کرتا ہوں۔

(1) حاشیہ 1 قاضی صاحب: "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" شاید سعدی کے یہاں ملتا ہے

لیکن لباب الالباب عرفی جلد 1 صفحہ 287 پر یہ قطعہ موجود ہے۔ نام کی جگہ پر نقطے ہیں۔" (صفحہ 34)
اس کے بعد قاضی صاحب نے دو شعروں کا ایک قطعہ لکھا ہے جس کا آخری مصرع مندرجہ بالا ہے۔
حنیف نے مع سند خبردی کہ یہ قطعہ ابنِ یمن کا ہے (صفحہ 77)

(2) حاشیہ 2 صفحہ 24 پر مصرع ہے ع آوازِ سگاں کم نہ کند رزق گدارا' قاضی صاحب لکھتے ہیں "سنا ہوا مصرع ہے مگر یاد نہیں آتا کہ کس کا ہے" (صفحہ 61) حنیف لکھتے ہیں کہ یہ عرفی سے منسوب ایک مقطع کا مصرع ثانی ہے لیکن یہ مقطع یا اس زمین میں کوئی غزل عرفی کے دیوان میں موجود نہیں۔ پورا شعر یہ ہے

عرفی تو میندیش ز غوغائے رقیباں
آواز سگاں کم نہ کند رزقِ گدا را

(صفحہ 94-93)

حواشی کے بعد استدراکات ہیں جن میں انھوں نے خط 25 کے بارے میں خیال ظاہر کیا کہ یہ تپاں کے نام نہیں' نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی کے نام ہے۔ استدراکات کی دوسری شق نہایت اہم ہے۔ لطائف غیبی جو سیاح کے نام سے شائع ہوئی ہے' قاضی صاحب کے نزدیک اس کا لفظ لفظ غالب کے قلم سے نکلا ہے۔ حنیف اس سے متفق نہیں۔ ان کے موقف کے دو حصے ہیں۔

(1) اس رسالے میں منشی سعادت علی کی گھریلو زندگی سے جس واقفیت کا پتا چلتا ہے وہ سیاح کے لیے ممکن نہ تھی۔ اس لیے یہ رسالہ سیاح کی تصنیف نہیں ہو سکتا۔

(2) مصنف نے اسف اور افسوس کے مشتقات پر عالمانہ بحث کی ہے۔ حنیف سمجھتے ہیں۔
"نہ تو سیاح کا مبلغ علم اتنا وسیع تھا کہ وہ اس قسم کے مسائل پر گفتگو کر سکیں اور نہ غالب ہی فقہ و کلام جیسے علوم میں اتنا درک اور دخل رکھتے تھے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب نہ تو سیاح کی تصنیف ہے اور نہ غالب کی بلکہ کسی تیسرے شخص کی لکھی ہوئی ہے۔" (صفحہ 96)

استدراکات کی تیسری شق میں وہ قاطع برہان کے رد کی چار کتابوں کی تاریخ اشاعت سے ہٹ کر ان کی تاریخِ تکمیل معلوم کرتے ہیں اور پھر ان کی نئی زمانی ترتیب قائم کرتے ہیں۔ اس کے آگے ان کی اور ڈاکٹر مختار الدین کی پس گفتار ہے جن کے بارے میں میں رائے دے چکا ہوں کہ انھیں کتاب کے شروع میں پیش لفظ کے طور پر آنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر حنیف نے اپنی پس گفتار کے بعد اپنے مآخذ کی فہرست یعنی کتابیات درج کی ہے جس میں فارسی اور اردو کی کئی نادر کتابیں شامل ہیں مثلاً تواریخ ڈھاکا' سیر سیاح' نگارستان سخن' ہفت آسمان وغیرہ۔

مجھے اپنے شاگرد حنیف نقوی کی مشقت دیکھ کر دل سوزی ہوتی ہے۔ مآثر غالب غالبیات کی

ایسی کتاب پارینہ ہے جس پر بہت کم قارئین توجہ دیں گے۔ غالب کی فارسی تحریروں میں کس کو دلچسپی ہے؟ حنیف نے ایسے رسالے پر اتنی غیر معمولی دیدہ ریزی کی، اتنی کاوش سے تو وہ غالب پر ایک مستقل کتاب لکھ سکتے تھے۔ میں اس کتاب کے ایک صفحے کے بھی حواشی لکھنے کا اہل نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ حنیف کو غالب سے متعلق افراد، غالب کی فارسی تحریروں اور فارسی ادبیات کا اتنا گہرا عرفان ہے۔ وہ کالی داس گپتا رضا کے ساتھ چوٹی کے محققِ غالبیات ہیں لیکن افسوس ان کی کارگزاری پر کون توجہ کرے گا۔ کون مدد دے گا۔ ایسے کاموں کو پڑھنے اور ان کی قدر شناسی کرنے والے افراد دس بیس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ جب ناشر ہی نے ان کے نام کو نظرانداز کردیا، انھیں مرتب کی حیثیت بھی نہیں دی تو دوسروں سے کیا امید۔ اگر ناشر سکوت سخن شناس کو توڑیں تو کتاب کی بقیہ کاپیوں پر ان کا نام مرتبِ ثانی کی حیثیت سے ٹانک دیں تاکہ تلافیِ مافات ہو۔

مظہر امام
۶۰، لبنی پاکٹ نمبر ا ، میور وہار
فیس ا - دہلی ۹۱

منظر شہاب : پیراہن جاں اور تیز ہوا

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی مشہور تصنیف "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" میں جس کی تکمیل 1957 میں ہوئی، اس تحریک سے متاثر ہونے والے نوجوان شعرا میں ابن انشاء، رفعت سروش، باقر مہدی، حسن نعیم، بلراج کومل، قاضی سلیم، وحید اختر، عمیق حنفی، شاذ تمکنت وغیرہ کے ساتھ منظر شہاب کا بھی نام لیتے ہوئے لکھا تھا:

"یہ وہ شاعر ہیں جن کی اٹھان 1947 کے بعد کی ہے، اس لیے ان میں سے بعض نے انتہا پسند گروہ کا بہت کم ساتھ دیا ہے ——— بعض ایسے بھی ہیں جو خاصی حد تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔"

یہ تو صحیح ہے کہ منظر شہاب ترقی پسند ادبی تحریک کی پیداوار ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے انتہا پسند گروہ کا کبھی ساتھ نہیں دیا اور ناموں کی بھیڑ میں اپنی الگ پہچان باقی رکھی۔

پانچویں دہائی کے اوائل میں ان کا کلام اس وقت کے معتبر رسائل کے ذریعہ عموماً اور "شاہراہ" کے توسط سے خصوصاً اپنے قاری کا ایک بڑا حلقہ بنانے میں کامیاب رہا۔ ان کی بعض غزلوں اور "ساقی نامہ" "ایک رات" اور "چاندنی رات" جیسی نظموں نے انھیں نوجوان شاعروں میں جلد ہی ایک قابلِ لحاظ مقام عطا کیا۔ ان نظموں نے جمیل مظہری، آل احمد سرور، احتشام حسین اور اختر اورینوی جیسے صاحبان نظر سے بھی داد حاصل کی تھی۔ چھٹی دہائی کے وسط سے اپنی منصبی مصروفیات کے باعث منظر شہاب شعر گوئی کی طرف اس تندہی سے توجہ نہ دے سکے جس کا تقاضا ان کی تخلیقی صلاحیتیں کر رہی تھیں۔ شعر گوئی کی رفتار سست ضرور ہو گئی لیکن جب بھی کوئی زبردست محرک سامنے آیا ان کی تخلیقی جولانیاں پھر کرشمہ دکھانے لگیں۔

1947 سے 1988 تک کے کلام پر مشتمل "پیراہن جاں" منظر شہاب کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب ان کی عمر 62 سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ گویا ان کا شعری سرمایہ 41 سال کے طویل عرصے کو محیط ہے۔ اس میں 23 نظمیں، 42 غزلیں، چھ رباعیات، تین

آزاد قطعات اور دو گیت شامل ہیں۔

منظر شہاب نے جس زمانے میں شاعری شروع کی' وہ اردو ادب میں گھن گرج کا' خطابت کا' بلند آہنگی کا دور تھا اور اس وقت کے بیشتر شعرا اونچی آواز میں "عوام" سے خطاب کر رہے تھے۔ عوامی شاعری کے تصور نے ایک مخصوص فارمولا وضع کر رکھا تھا۔ اور ہر شاعر اسی سُر میں سُر ملا رہا تھا۔ منظر شہاب نے ابتدا سے ہی اپنی شاعری کو اس شور و شغب سے بچائے رکھا۔ ان کی پہلی نظم "سنہرے لمحے" (1948) جس کا موضوع انقلاب ہے، کا آغاز اس نرم و نازک لہجے سے ہوتا ہے۔

سنہرے لمحے
نئی سحر کے سنہرے لمحے
رخ جہاں سے ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں
ردائے ظلمت ہٹا رہے ہیں' فضا کو زریں بنا رہے ہیں
اور یہ لہجہ آخر تک برقرار رہتا ہے!

اس زمانے کے مقبول موضوعات سے منظر شہاب نے اجتناب نہیں برتا۔ ان کے یہاں بھی امن عالم کی ضرورت کا احساس ہے، وہ بھی چین کی آزادی کا استقبال کرتے ہیں۔ لیکن ان کا لہجہ کہیں درشت اور تیز نہیں ہوتا۔ اگر تھوڑی بہت بلند آہنگی ان کی کسی نظم میں ملتی ہے تو وہ "ساقی نامہ" ہے۔

گلستانِ چین آج گلنار ہے — بہار اپنی قسمت پہ سرشار ہے
وہ چینی جو مجبور و محکوم تھے — وہ چینی جو مفلوج و مظلوم تھے
وہ چینی جو فاقوں میں پلتے رہے — وہ چینی ' لہو جو اگلتے رہے
بالآخر وہ تیور بدلنے لگے — بغاوت کے شعلے مچلنے لگے
بالآخر علم کے اٹھ گئے — بالآخر قدم کے قدم اٹھ گئے

اگر اسے بلند آہنگی سے تعبیر کیا جائے تو اس کی نوعیت وہی ہے جو اقبال کی اسی عنوان کی نظم میں ہے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ دونوں نظموں کی بلند آہنگی بڑی خوش آہنگ ہے۔ ان دونوں

مثنویوں کا عنوان "ساقی نامہ" ہے اور دونوں کی بحر ایک ہی ہے۔ منظر شہاب نے بلاشبہ اقبال سے تحریک حاصل کی ہے۔ لیکن ان کی فکر اقبال کے بعد کے اس عالمی منظر نامے کو پیش کرتی ہے جو بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے اوائل میں اپنا اثبات کر رہا تھا۔

منظر شہاب کی شاعری عام طور سے بالواسطہ اظہار کی شاعری ہے۔ ہر چند انھوں نے وقتی مسائل کے تعلق سے بھی نظمیں اور اشعار کہے، مگر چوں کہ ان کا مزاج بنیادی طور پر رومانی رہا، اس لیے انھوں نے ایسے موضوعات و مسائل کے برتاؤ میں بھی نرمی، نفاست، تزئین اور آرائش کو ترجیح دی اور تحریک کے سیاسی نظریے سے اتفاق رکھتے ہوئے بھی شاعری کو شاعری کی طرح برتا۔ انھوں نے رمزیت اور ایمائیت سے بھی حسب ضرورت خلاقانہ کام لیا اور استعارہ سازی اور پیکر تراشی سے بھی اپنی تخلیقات کو تہہ داری عطا کی۔ ان کی شاعری صرف غم دوراں کی شاعری نہیں ہے۔ اس میں غم جاناں بھی ہے اور غم ذات بھی۔ انھوں نے انفرادی احساس اور تجربے سے اپنی شاعری کا نگار خانہ سجایا ہے۔ ان کے کلام کو ان کے دلآویز ڈکشن کے حوالے سے بھی دیکھنا چاہیے۔ "پیراہنِ جاں" کا مطالعہ کرتے ہوئے خوش رنگ آوازوں اور دل نشیں رنگوں سے قدم قدم پر معانقہ ہوتا ہے!

مجھے منظر شہاب کی نظموں میں "ایک رات" سب سے زیادہ پسند آئی۔ یہ نظم امن عالم کی خواہش پر منتج ہوتی ہے۔ امن ایک زمانے میں ترقی پسندوں کا خاص موضوع تھا لیکن اس موضوع پر عموماً اتنی سپاٹ، بے اثر اور بے رنگ شاعری کی گئی کہ اس سے ایک طرح کی کراہت محسوس ہونے لگی تھی، لیکن منظر شہاب نے اس نظم میں پُر کشش طرز اظہار اختیار کیا ہے۔ اسے ایک ایسی نجی، مانوسیت عطا کی ہے اور اس میں اپنی شخصیت کا ایسا گداز بھر دیا ہے کہ یہ نظم معیاری اور مثالی شاعری کا نمونہ بن گئی ہے۔ پوری نظم اس لائق ہے کہ اسے نقل کیا جائے لیکن اس کا یہ موقع نہیں۔ فی الحال اِدھر اُدھر سے کچھ ٹکڑے:

سجی سجی سی دکانیں، نہ قمقموں کے نجوم
نہ گل رخوں کے گلستاں، نہ قامتوں کے ہجوم
نہ قہقہے، نہ اشارے، نہ شوخیاں، نہ حجاب
نہ زرنگار تکلف، نہ ریشمی آداب

نہ ریڈیو پہ تھرکتے طرب فزا نغمے
نہ ناچ گھر میں چھنا کے ' نہ میکدے آباد

یہ آسماں پہ دبے پاؤں گوپیوں کا سفر
زمیں پہ پھیلتا گنگا کی بانسری کا یہ راگ
مُراد پور کی گلیاں' یہ اونگھتا رومان
یہ اسپتال' یہ میداں' یہ کالجوں کی قطار
یہ اونچے اونچے کتب خانے فکر میں سرشار

یہ ہوسٹل' یہ جواں سال قہقہوں کا دیار
یہ چٹکلے' یہ لطیفے' یہ گالیوں کی مٹھاس
یہ بات بات میں جمنا کی موج کا عالم

یہ میرے ذہن میں یادوں کے مسکراتے کنول
کسی کی نرگسی آنکھوں کی مشتعل تنویر
کسی کی مخملیں زلفوں کا رینگتا ہوا لمس
کسی کے جسم کی قربت کی گرمیِ احساس

میں سوچتا ہوں' یہ آدم کی عظمتوں کے نشاں
یہ ارتقا' یہ تمدن کی ضوفشاں قندیل
دل ونظر کے یہ دلچسپ چند افسانے
چھڑی جو جنگ تو ان کا مآل کیا ہوگا
جنوں کے دور میں طرز خیال کیا ہوگا

منظر شہاب نے "ساقی نامہ" میں چینی انقلاب کی ہمنوائی کی' لیکن 1962 میں جب چینی فوجیں ہماری سرزمین کی سرحد پر حملہ آور ہوئیں تو انھوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار نظم "دو ملک دو کہانی" میں کرتے ہوئے اشتراکی فکر پر بھی سوالیہ نشان قائم کیا:

چین جس کی پُر خلل نیّت ہوئی کم نگاہی شاملِ طینت ہوئی
اٹھ گیا بازار سے نقدِ وفا بے وفائی شوق کی قیمت ہوئی
دشمنِ جاں بن گئی ہے دوستی کیا مصیبت یار کی صحبت ہوئی

دم بخود ہے اشتراکی فکر گاہ۔ منتشر مسلک کی جمعیت ہوئی
جس کی اک اک بوند کو امرت کہیں۔ مشتبہ اس جام کی صحت ہوئی

اشتراکی تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود جب منظر شہاب نے محسوس کیا کہ اس کے رہنماؤں نے مصلحت کوشی اور زر پرستی کی بنا پر انقلابی جدوجہد سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے تو انھوں نے کہا:

ہم ہوگئے اسیر طلسماتِ زرگری
جوشِ جنوں کو، عزم بغاوت کو کیا ہوا؟
سر سے کفن تو باندھ کے نکلے تھے سرفروش
دار و رسن کو، شوقِ شہادت کو کیا ہوا؟

اشتراکیت ایک زمانے میں اور ایک عرصے تک انسانی امید کی آخری پناہ گاہ تھی لیکن آہستہ آہستہ اس کا طلسم بھی ٹوٹنے لگا۔ کوئی اور پناہ گاہ؟ کوئی اور منبع امید؟ یہ مقطع دیکھیے:

زرد پتوں کی مانند بکھرا کیے، سرخ پھولوں کی چاہت میں منظر شہاب
اب تو بہتر ہے سپنوں کی انگنائی میں ایک ننھا سا تلسی کا پودا لگائیں

ترقی پسند شاعری میں رجائیت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ منظر شہاب کی شاعری میں بھی امید و رجا کے نقوش جابجا ملتے ہیں۔ اور یہ اوپر سے اوڑھی ہوئی مصنوعی رجائیت نہیں ہے بلکہ ان کے بطون سے اور ان کے طرزِ احساس سے پھوٹی ہے، لیکن چوں کہ وہ ایک درد مند اور حساس دل رکھتے ہیں اس لیے زندگی کے تاریک پہلو انھیں مایوس اور ناامید بھی کرتے ہیں۔ ان کے اندر غم و غصہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ ایسے بہت سے اشعار ہیں اور ایک غزل تو اول تا آخر یاسیت آمیز ہے:

مری آنکھ روئے لہو نہ کیوں، مجھے دل نہیں کہ جگر نہیں

آج کی شاعری کا ایک اچھا خاصا حصہ فرقہ وارانہ منافرت اور فسادات اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات، قتل و خون، غارت گری، تباہی اور ان کے مضمرات کو کسی نہ کسی عنوان سے پیش کر رہا ہے۔ لیکن اب سے بہت پہلے 1964 میں جب منظر شہاب جمشید پوری خود اس مرحلہ خاک و خوں سے گزرے تو انھوں نے کہا۔

وہ صبحِ غم، وہ شام، سوگواراں ہم نہ بھولیں گے
لہو کی آگ میں جلتا گلستاں ہم نہ بھولیں گے
ستم کے گھاٹ پر روشن چتائیں مہ جبینوں کی
ہوس کی سیج پر بے خواب خوباں ہم نہ بھولیں گے
نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں، نہ جانے کس کو تکتی تھیں
وہ پتھرائی ہوئی چشمِ غزالاں ہم نہ بھولیں گے

شہیدوں کے لہو سے تر بہ تر راہیں اہنسا کی
اہنسا کی قسم، خون شہیداں ہم نہ بھولیں گے

انھیں اس سے بھی زیادہ اذیت ناک تجربے سے 1979 میں دوچار ہونا پڑا۔ جب مشہور افسانہ نگار زکی انور بھی درندوں کی وحشت کا شکار ہوئے۔ اس موقع پر منظر شہاب نے ایک نظم بھی کہی "ماتم زکی انور کا" اور ایک غزل بھی، جو اپنے تاثر کے اعتبار سے ایک بلند درجہ رکھتی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

بارشیں خون کی تیز ہیں، تیز ہیں خون کی آندھیاں
چاک در چاک اڑنے لگیں خون میں زیست کی چھتریاں
رات پٹرول کی آگ سے شہر میں یوں چراغاں ہوا
کانپ کر بجھ گئیں دل کے روشن جھروکوں کی سب بتّیاں
بے اماں خلق، کرفیو زدہ، روز شب کے اندھیرے میں گم
اپنی گردن میں ڈالے ہوئے اپنے کتبات کی تختیاں
دونوں ہی لکھ رہی تھیں لہو سے مرے سانحہ قتل کا
اک طرف حملہ در آستیں، اک طرف پاسباں وردیاں

اور اسی تعلق سے یہ بلیغ اشارہ بھی ایک جہانِ معنی رکھتا ہے:

سراغ قتل، شہادت، ثبوت، سب گونگے
لہو خموش تھا، خنجر بھی بے زباں نکلا

محبوب، عاشق اور رقیب کا تصور منظر شہاب کے یہاں روایتی نہیں، بلکہ موجودہ سماجی پس منظر میں ہے اور آج کی فضا سے ہم آہنگ ہے۔ وہ رقیب میں آداب دل دہی دیکھتے ہیں اور اسے "باوضع خوش جفا" قرار دیتے ہیں۔ یہاں فیض کی مشہور نظم "رقیب سے" بے اختیار یاد آتی ہے۔ "خوش جفا" کی تازہ کار ترکیب بھی قابل لحاظ ہے:

بہ وقت رشک بھی آداب دل دہی کا لحاظ
مجھے رقیب سا باوضع خوش جفا نہ ملا

اس غزل کے ایک دوسرے شعر میں عاشق کی انا کا اظہار حقیقی پیرایے میں ہوا ہے۔ وہ انا جو اسے آج کے زمانے میں مجنوں اور فرہاد جیسا "عاشق صادق" بننے نہیں دیتی ــــ اس شعر میں "خود ادا" کی ترکیب بھی توجہ طلب ہے:

میں خود ادا ہی سہی، زعم حسن تو ٹوٹا   بلا سے عاشق صادق کا مرتبہ نہ ملا

اردو غزل میں محبوبہ کے لیے بھی تذکیر ہی کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اور ذہن اس سے کچھ اس طرح مانوس ہو چکا ہے کہ اگر اتفاقاً کہیں تانیث کا صیغہ استعمال ہو تو اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ لیکن منظر شہاب نے اپنے ایک شعر میں اسے اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے:

یہ رنگ و بوئے دل آرا، یہ پیکرِ شاداب
بھرے شباب میں لگتی ہو گلستاں کی طرح

اسی غزل کا یہ لطیف شعر بھی دیکھیے:

فریب کار سہی، دل کا غمگسار تو تھا
وہ اک خیال جو برسوں رہا گماں کی طرح

عشق و طلب کے متعلقات منظر شہاب کے تجربے کا حصہ بن گئے ہیں:

وہ بے زبان تکلم، وہ بے صدا ترسیل
خموش رہ کے بھی سب کچھ کہا کہا سا ہے

یہ التفات کہ خود ہی وہ آ گئے اکثر
یہ بے رُخی کہ مہینوں اتا پتا نہ ملا

محبت صرف نفاست روح ہی نہیں 'لطافتِ بدن بھی ہے۔ عشق کی جلوہ سامانیاں کئی روپ اختیار کرتی ہیں۔ منظر شہاب کے اشعار میں یہ زندہ صداقتیں دیکھیے:

عظیم تر ہے محبت میں روح کا رشتہ — مگر بدن کا تعلق بھی درمیاں نکلا

واقعہ یوں بھی گزرتا ہے سرِ کوچۂ عشق — ایک چاہت کئی محبوب میں بٹ جاتی ہے

کہیں پڑوس کا کوئی لہو پکار نہ لے — توقعات نے کیا کیا نہ اشتعال دیا

منظر شہاب کے یہاں موضوعات کا بھی تنوع ہے اور اسلوب و اظہار کا بھی 'ہندی رس سے استفادے کا ثبوت ان کے گیت ہی نہیں۔ ان کی نظم "لہو ترنگ" بھی ہے۔ انھوں نے بعض ایسے انگریزی الفاظ بھی نہایت دلکشی کے ساتھ اپنی غزلوں میں استعمال کیے ہیں جو ہماری روز مرہ کی بول چال کا حصہ ہیں۔ مثلاً بس 'کلب 'ہلو۔ یہ اشعار دیکھیے:

تمام بس کے مسافر میں اضطراب سا تھا کہ اک نظر بھی اسے دیکھنا تو خواب سا تھا

گھر کا آنگن ہو کہ دفتر کہ کلب یا خلوت کائنات آپ کے پیکر میں سمٹ جاتی ہے

'ہلو' پہ میرے 'تبسم کا پردہ ڈال دیا بڑھایا ہاتھ تو آداب کہہ کے ٹال دیا

منظر شہاب کو ہیتی تجربوں سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک ایسی غزل بھی ملتی ہے جو اس کی متعین ہیئت کے مطابق نہیں ہے۔ یعنی اس کا آخری شعر مطلعے کی صورت میں ہے اور اس کی ردیف اور قوافی غزل کے دیگر اشعار سے مختلف ہیں۔ اس طرح کی ہیئت میں صرف اقبال کے یہاں دو غزلیں ملتی ہیں۔ ایک "بال جبریل" میں اور ایک "زبور عجم" (فارسی) میں۔ منظر شہاب کی اس غزل میں تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ آخری مطلع ان کا اپنا نہیں ہے بلکہ انھوں نے حافظ کے مطلعے کی تضمین کی ہے۔

منظر شہاب نے اس سے آگے بڑھ کر "آزاد قطعہ" کا تجربہ کیا ہے۔ آزاد نظم کے بعد آزاد غزل اور آزاد رباعی کے تجربے ہوئے ہیں۔ مگر آزاد قطعہ کا تجربہ پہلی بار انھوں نے ہی کیا ہے۔ وہ اس کے بانی بھی ہیں اور خاتم بھی۔ نمونے کے طور پر ایک آزاد قطعہ دیکھیے:

تیرے پیکر کے چھلکتے ہوئے ساغر میں مرا حصہ ہے اتنا' مجھے معلوم نہ تھا۔
میں ہوں پیاسا مگر اس درجہ ہوں پیاسا' مجھے معلوم نہ تھا
یہ کڑی دھوپ' یہ مسموم ہوائیں' یہ ترے پیار کی خلوت گاہیں
میرے ہر درد کا تو ہی ہے مداوا' مجھے معلوم نہ تھا

مجموعے کی ترتیب کے وقت منظر شہاب نے ایک دو نمایاں تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ جو نظم "پہاڑی لیلیٰ" کے نام سے شریک مجموعہ ہے "ادیباسی حسینہ" کے نام سے چھپی تھی۔ مجھے یہی عنوان زیادہ پسند ہے۔ اس نظم کا آخری مصرع جو اب یہ ہے: ع۔ اک قیامت پہاڑی لیلیٰ ہے' پہلے اس طرح تھا: ع

ادیباسی حسینہ فتنہ ہے

اسی طرح ایک غزل جس کی ردیف "ڈر لگتا ہے" تھی۔ اب بدل کر "جی ڈرتا ہے" ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں "ڈر لگنا" خلاف محاورہ نہیں ہے۔

منظر شہاب خوش کلام شاعر ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے۔ انھوں نے اپنے

۔ مقطع میں یہی بات بہ عنوان دیگر کہی ہے:

فسانہ تلخ ہے اور مذکرہ لطف سے کہیے
مگر شہاب بہ ایں درجہ خوش کلام نہیں

ان کے دو مقطع اور دیکھیے۔ یہ تعلّی نہیں، بیان واقعہ ہے:

تیرے اشعار میں اعجاز تاثر ہے شہاب!
رگِ افکار لو خونِ جگر دیتا ہے

لوگ جس کو شہاب کہتے ہیں   سخت کافر ہے، شعر کہتا ہے

منظر شہاب تہذیب فن کے شاعر ہیں۔ یہ بات زور دے کر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آج کی
ری میں خوش کلامی کا عنصر عنقا ہو چکا ہے اور زبان وبیان کے حسن کو روایتی ذہن کی علامت
، کر بہ نظر تحقیر دیکھا جا رہا ہے۔ منظر شہاب زندگی کی تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لیے بھی شیریں
ں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ایسے حساس فنکار ہیں جس کا آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلتا رہا
۔ اپنے کلام میں اثر پیدا کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں۔ ع معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے
د۔ خون جگر ہی ہر فن کو اثبات دیتا ہے۔ اسی خون جگر نے منظر شہاب کے کلام میں بھی لطف
ر پیدا کیا ہے۔ یہ خوش کلامی، یہ اثر آفرینی، تیز ہوا میں پیراہنِ جاں چاک رکھنے کی ادا منظر
اب کی شاعری کو درجہ اعتبار بخشتی ہے۔ ایسے دور میں جب بہت سے سود بخش کام کیے جاسکتے
ں۔ شاعری سے رشتہ استوار رکھنا واقعی بڑی جرأت چاہتا ہے۔ آج کے زمانے میں شعر کہنا سچے
ر کھنا، کفر اور کافری سے کم نہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام کی ابتدا میں ہی اس شعر سے ملاقات ہوتی
، جس کے حوالے سے اس کتاب کا نام رکھا گیا ہے:

پیراہنِ جاں چاک رہے تیز ہوا میں
طوفان میں جینے کی ادا چاہیے یارو!

یہی کج کلاہی، یہی بانکپن منظر شہاب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی
صدر شعبۂ اردو،
بمبئی یونیورسٹی، بمبئی

پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم

مہاراشٹر میں عموماً اور بمبئی میں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں اسمٰعیل یوسف کالج کو بڑی اہمیت رہی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی زندگی کے پیش نظر جب ۱۹۳۰ء میں اسمٰعیل کالج کی بنیاد پڑی اسی وقت اس کے کارپردازوں کی نظر تعلیمی دھارے کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ملک کے مختلف علاقوں پر اپنے مضامین میں ماہر اساتذہ اور عالموں پر پڑتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے لیے علم وادب کا جو کارواں بنا اس کے میر کارواں ڈاکٹر بذل الرحمن مرحوم تھے جو آن دنوں کیمبرج کے نئے نئے فارغ التحصیل تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی وعربی میں ریڈر تھے۔ ڈاکٹر رحمٰن کے ساتھ کالج کی علمی زندگی میں جو علم وادب کا آفتاب طلوع ہوا اس کی گرمی اور روشنی کالج کی روایت بن گئی۔ کالج کی فضا میں اس کی ایک نہ ایک کرن آج بھی پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ بقول اقبال ؎

اس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب۔

اسمٰعیل کالج ڈاکٹر بذل الرحمٰن کی قیادت میں ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنتا گیا۔ اس ادارے کو مثالی بنانے میں جن علم ودانش کے متوالوں نے حصّہ لیا اور اسے پُرنور کر کے جلا بخشی ان میں ڈاکٹر داؤد پوتا، پروفیسر مولوی، پروفیسر مختار، پروفیسر کوریلو الفانسو، پروفیسر محمد ابراہیم ڈار، جواں سال ڈاکٹر باقر علی ترمذی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر سراج الحسن نقوی اور ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے ہندستان گیر شہرت پائی۔ اسمٰعیل کالج کے سلسلے میں سر مولوی رفیع الدین کا نام لینا بھی ضروری ہے۔ جو اس زمانہ میں صوبۂ بمبئی کی ریاستی حکومت میں وزیر تعلیم تھے اور جن کی اعانت کالج کے بنانے میں شامل حال رہی ہے۔ ڈاکٹر داؤد پوتا عربی کے عالم اور ماہر تعلیم تھے۔ آپ تقسیم ہند کے بعد سندھ کے ناظم تعلیمات بنے اور انتقال کیا۔ پروفیسر مولوی پاکستان چلے گئے تھے اور وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار مرحوم نے اپنی عمر کے کیاون دیں میں کالج کی ملازمت کے دوران ہی میں ۱۹۵۲ء میں انتقال فرمایا اور ان سب میں نوعمر ڈاکٹر باقر علی ترمذی نے قاہرہ میں وفات پائی جہاں پر وہ حکومت ہند کے وظیفہ پر عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ڈاکٹر مختار جو تاریخ اور معاشیات کے پروفیسر تھے انھوں نے بھی تقسیم کے بعد پاکستان ہی میں سکونت اختیار کی۔ وہ پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کے صدر اور حکومتِ پاکستان کے ECONOMIC ADVISER رہے۔ اور پروفیسر سراج الحسن نقوی جو ۱۹۳۰ء سے اسمٰعیل کالج میں سائنس کے پروفیسر اور وائس پرنسپل رہے، کالج کی ملاز

۱۹۵۵ء میں سبکدوش ہوئے۔ نقوی صاحب مولانا آزاد کالج آف آرٹس اینڈ سائنس اورنگ آباد کے
پرنسپل تھے۔ اسمٰعیل یوسف کالج کی اس علمی و ثقافتی روایت میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب کو ایک
زی مقام حاصل تھا۔

ندوی صاحب دیسنہ کی اس مشہور فیملی کے فرد تھے جس کا تعلق علامہ سید سلیمان ندوی سے تھا۔
کے والد سید نبین بھی بڑے عالم شخص تھے۔ ندوی صاحب یکم نومبر ۱۹۰۰ء میں مہاراشٹر میں چاندہ میں
ہوئے۔ یہیں پر ان کی ابتدائی تعلیم مراٹھی ذریعہ سے شروع ہوئی۔ وہ اپنی مہاراشٹری پیدائش اور مراٹھی
علیم کا ذکر بہت فخریہ انداز سے کرتے تھے۔ وہ شبلی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اس کا ذکر بھی انھوں نے
فخریہ انداز سے کیا ہے۔ اپنے انتقال سے قبل دو تین سالوں میں کئی مرتبہ انھوں نے شبلی سے اس تعلق کو
را ہے۔ شبلی کے زندہ شاگردوں میں غالباً وہ آخری تھے۔ شبلی سے بلاواسطہ شاگردوں کا یہ سلسلہ ندوی
حب پر ختم ہو گیا۔

۱۹۵۴ء میں جب میں ایس۔ ایس سی میں طالب علم تھا احمد سیلر ہائی اسکول میں میرے شفیق استاد پرنسپل
ار علی مرحوم نے مجھے مشورہ دیا کہ ایس۔ ایس سی پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے میں اسمٰعیل کالج میں
ادلوں اور عربی وار دو پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے پڑھوں۔ ان کا خیال تھا کہ
د اور عربی میں اعلیٰ قابلیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان دو بزرگوں کے تحت ادبی و علمی تربیت کے علاوہ
شخصی تربیت بھی ہوگی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اسمٰعیل کالج متوسط طبقے کے مسلمانوں میں
ت مقبول تھا۔ اور اس کی تعلیمی روایت کے پیش نظر طلبہ اور والدین اس کالج میں تعلیم حاصل کرنا اپنے
باعث اعزاز سمجھتے تھے۔ یوں سمجھیے اس زمانہ میں ریاست بمبئی میں اسمٰعیل کالج کی حیثیت دہی تھی جو
رستان میں علی گڑھ یونیورسٹی کی تھی —— ہاں! تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ انصار علی مرحوم کے مشورے کے مطابق
رع ہی سے ذہن اسمٰعیل کالج کے لیے تیار تھا۔ لہٰذا ایس۔ ایس سی کے نتائج کے بعد ہم چند دوستوں
ہمراہ جو کالج کے طالب علم تھے اسمٰعیل کالج پہنچے۔ اور اس طرح اپنے خاندانی اسکول احمد سیلر ہائی اسکول
بعد ہم نے خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۵۴ء میں اسمٰعیل کالج میں داخلہ لیا۔ اسی دوران
ر صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا نظریں جس شخص کو تلاش کر رہی تھیں وہ ذات ندوی صاحب کی تھی۔

ندوی صاحب کی شخصیت میں بلا کا جادو تھا۔ علم کا دفینہ تو تھے ہی اس پر ان کی باوقار شخصیت اور
کے سفید نرم و ملائم بالوں سے ان کی شخصیت اور بھی نکھرتی تھی۔ اور مجھے تو اکثر یہ خیال گزرا اور خواہش ہوتی
میری شخصیت بھی ایسی ہی دودھ سے سفید اور نرم و ملائم بالوں والی ہو۔ بلا مبالغہ ندوی صاحب کی شخصیت
لج کے پروفیسروں میں سب سے زیادہ دلکش اور دل موہ لینے والی شخصیت تھی۔ اور پرنسپل سے لے کر
لج کے سینئر اسٹاف ممبر بھی ان کے آگے بونے معلوم ہوتے تھے سوائے پروفیسر سراج الحسن نقوی کے جن کی سنجیدگی
ر رعب کی وجہ سے روح اس قدر کانپتی تھی کہ ان کے قریب جانا مشکل تھا۔ نقوی صاحب کے مقابلے
وی صاحب کی شخصیت کا جادو اس لیے بھی زیادہ چلتا تھا کہ وہ بہت زیادہ سوشل تھے۔ اور فرسٹ ایر
سے لے کر پی۔ ایچ ڈی کے طالب علم یہاں تک کہ چپراسیوں سے خیر و عافیت دریافت کرتے اور ہنستے بولتے
کل جاتے تھے۔ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بمبئی یونیورسٹی میں جہاں کے وہ فیلو بھی تھے،

ندوی صاحب کا وہی حال تھا جو کالج میں تھا۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ریکٹر، رجسٹرار، تقریباً ہر فیکلٹی ممبر اور ہر مضمون کے پروفیسر سے آپ کے تعلقات کے علاوہ چپراسی اور باغیچہ کا ہر مالی ندوی صاحب کا سلام ڈ'ول کرتا تھا۔ ندوی صاحب اپنے بمبئی کے قیام کی وجہ سے تھوڑی مراٹھی اور گجراتی زبانیں بھی جاننے لگے تھے۔ اور بلا تکلف بولنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ چپراسیوں اور مالیوں سے خاص طور پر وہ انھیں کی زبانوں میں گفتگو کرتے تھے ـــــ ندوی صاحب اندھیری میں رہتے تھے۔ ندوی صاحب کا پرانا مکان جس میں وہ تقریباً ۳۰ سال رہے اور پھر جسے بمبئی فائر بریگیڈ سے لیا تھا۔ بمبئی سے اندھیری جانے والی بس کا اسٹاپ بھی یہیں تھا۔ اور" ندوی اسٹاپ" کے نام سے مشہور تھا فرسٹ ایر کے دوران عید کے موقع پر ندوی صاحب نے ساری کلاس کو اپنے یہاں عید ملنے کی غرض سے بلایا تھا۔ چونکہ میں ان کے مکان سے ناواقف تھا میں نے ندوی صاحب سے پتا پوچھا تو ندوی صاحب نے کہا آپ اندھیری کی بس میں بیٹھ جایئے اور کنڈکٹر سے پوچھیے وہ ٹھیک سے پہنچا دے گا۔ ہم تو اسے مذاق سمجھے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی محبت پسند طبیعت کی وجہ سے وہ بس کنڈکٹروں میں بھی مقبول اور مشہور تھے اور ہوا بھی یہی کنڈکٹر ہی کی مدد سے ہم ندوی صاحب کے مکان پہنچے۔ ندوی صاحب عید مل کر بہت خوش ہوئے اور بے شمار دعاؤں سے نوازا۔ ندوی صاحب سے عقیدت کی وجہ سے ہم بھی اس کارنیک پر بہت خوش تھے، اسی موقع پر راقم کو پنڈت سندر لال سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ جو ان دنوں ندوی صاحب کے مہمان تھے۔ وہ جب بھی اپنے مکان، واقع اندھیری پر بلاتے تو کہتے کہ" آپ ہماری اندھیری میں آیئے تاکہ وہاں اُجالا ہو"۔ میرے دوست اختر کشمیری جب ان سے ملے تو کہا" آپ ہمارے یہاں اندھیری آیئے تو ہمیں آپ سے روشنی ملے گی"۔ وہ اندھیری کی مناسبت سے ہمیشہ "پن" (Pun) کیا کرتے تھے۔ انھیں پن میں خاص درک حاصل تھا۔ کنڈکٹر بھی ان کے نام، کام اور مزاج میں شوخی کی وجہ سے انھیں بہت پسند کرتے تھے۔ اور انھیں اکثر بس میں فوراً جگہ مل جایا کرتی تھی۔ عید پر جب بھی لوگ ان سے ملنے جاتے "شیر خرما" کے علاوہ ندوی صاحب عطر سے بھی مدارات کرتے تھے۔

میں انٹر میں تھا تو دوسری ٹرم ہی میں ندوی صاحب اپنی کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تھے ... لیکن جب کبھی وہ کالج آتے تو ان سے ملاقات ہوتی اور بہت ہی محبت سے پیٹھ پر ہاتھ رکھتے کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اسی سال جب کالج کی بزم مجمع الادب کی طرف سے آپ کو "تابانی ٹرافی" کی صدارت کے لیے بلایا گیا تھا۔ میں بھی ندوی صاحب سے ملا اور ان سے "آٹوگراف" کی گزارش کی تو انھوں نے آٹوگراف" میں لکھا "پڑھو اور بڑھو" ہم تو اس وقت یہ چاہتے تھے کہ ندوی صاحب کوئی اقبال کا شعر لکھتے یا کوئی رنگین عبارت "پڑھو اور بڑھو" خاطر خواہ "آٹوگراف" لینے کا اطمینان نہ ہوا تھا۔ لیکن آج یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے کتنی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ وہ آٹوگراف دیا ہوگا ـــــ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ" صرف دو ہستیاں یہ چاہتی ہیں کہ بچے ترقی کریں اور آگے نکل جائیں۔ ایک شفیق والدین اور دوسرے استاد"۔

بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں ندوی صاحب کا ثانی نہیں مل سکتا۔ وہ ایک بہت اچھے [illegible] تھے اور ان کی بات بات میں ایک بات ہوتی۔ گفتگو کرنے کا یہ رنگ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ الفا

ے کھیلن ان کی عادت تھی لیکن معلومات کے لحاظ سے بھی وہ بحرِ ذخار تھے تاریخ ، ادب اور زبان کے ہر موضوع پر بے تکان دلچسپ اور معلوماتی گفتگو کرتے۔ وہ اکثر مجھے کہتے اور شاید سب سے کہتے کہ "بیٹے آیا کرو جو کچھ مجھے معلوم ہے وہ تم بھی جان لو، میں تو زیادہ جینے کا نہیں مر جاؤں گا تو سر مٹی بن جائے گا۔ ابھی موقع ہے"۔ اب جب کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے ایسے لگتا ہے جیسے وہ اپنی زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر ایسی باتیں نہ سنیے گا
باتیں ہماری سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

فرسٹ ایر میں اردو کا نصاب دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ نثر اور نظم۔ حصۂ نظم ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی صاحب کے ذمہ تھا اور نثر ندوی صاحب پڑھایا کرتے تھے۔ عام طور سے وہ نثر پڑھتے اور مشکل الفاظ کے معنی بتاتے اور تدریس کو انگریزی کے لفظ کلیئر (clear) پر ختم کرتے۔ چونکہ اسکول میں بہت ہی لائق اور فائق اور تدریس کے ماہر اساتذہ سے اردو پڑھی تھی۔ کالج میں ندوی صاحب کے اس انداز تدریس سے مایوسی ہوتی کہ وہ کسی جملے کی صراحت ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اور اگر ان سے صراحت کی توقع کی جاتی تو یہ کہہ کر خاموش کر دیتے تھے کہ "آپ کالج میں کس لیے آئے ہیں۔ آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم، اگر آپ کو معلوم نہ ہو اور مطالعہ کا یہ حال ہے تو بہتر ہے کہ آپ کالج ہی نہ آتے" ندوی صاحب کی تدریس کا معمول یہی تھا، تاہم سال میں دو تین لیکچر ہی ہوتے کہ طبیعت خوش ہو جاتی۔ طلبہ پر ندوی صاحب کی علمیت کی دھاک یہی دو تین لیکچرس ہوتے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ فرسٹ ایر کے دوران شرر کا مضمون "لکھنؤ کے رکاب دار" پڑھا رہے تھے۔ اس مضمون میں انواع و اقسام کے کھانوں کا ذکر ہے۔ ان ہی میں "نرگسی کباب" کا ذکر بھی ہوا ہے۔ "نرگسی کباب" پر فوراً ندوی صاحب پوچھ بیٹھے کہ بتایئے نرگسی کباب" کسے کہتے ہیں۔ چوں کہ اس سوال کا جواب امورِ خانہ داری سے تھا، ندوی صاحب پہلے ہی اعلان کر چکے کہ "لڑکوں کے لیے اس سوال کا جواب دینا قطعاً ضروری نہیں ہے"۔ ہماری ہم جماعت لڑکیوں میں متعدد لڑکیاں تھیں جو خصوصاً پہلی بنچ پر بیٹھتی تھیں۔ انھوں نے تقریباً ہر لڑکی سے "نرگسی کباب" کے بارے میں دریافت کیا لیکن جب کسی سے بھی جواب نہ بن سکا تو ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انھوں نے لڑکوں کی طرف دیکھ کے سر کو ہاتھ لگا کر کہا "آپ سب کا مستقبل بہت تاریک دکھائی دے رہا ہے۔ اگر ایسی بیویاں ملیں تو کیا کروگے۔ کھانے کی ساری لذتوں سے محروم ہو جاؤ گے۔ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور بات میں بات پیدا کرنے کا اندازہ آپ کو مندرجہ ذیل چند واقعات سے بخوبی ہوگا۔

میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ جون کا مہینہ، بمبئی کی موسلا دھار بارش اور اسمٰعیل کالج کی پہاڑی پر ہیل اور باغ سے ڈھکی ہوئی فضا تھی، ان دنوں تمام نوجوانوں میں ایک فیشن چل رہا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ وہ اپنی قمیص کے بٹن شاذ ہی لگاتے تھے۔ ندوی صاحب کو کھلے بٹن رہنا سخت ناگوار تھا لیکن بجائے اس کے کہ وہ نوجوان طالب علموں کو ڈانٹیں، اپنے پاس بٹن خرید کر جیب میں رکھتے اور جوں ہی کوئی طالب علم بٹن کھلا دکھائی دیتا آپ سلام کرتے ہوئے اس طالب علم تک پہنچتے اور اس کے بٹن لگا دیتے اور بٹن کی غیر موجودگی میں خود اپنی جیب سے بٹن نکال کر اس کے لگاتے، اس کا طلبہ پر عام اثر یہ تھا کہ وہ ندوی صاحب کو دیکھتے ہی محتاط ہو جاتے اور اپنے بٹن لگا لیتے۔

مرحوم سوشل اور بلا کے رنگین مزاج تھے۔ وہ مولوی تھے اور پکے مسلمان بھی۔ وہ خوش عقیدہ تھے، خوش پوش بھی تھے۔ اور خوش فکر بھی تھے۔ وہ عیدین کی نماز بہت باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ گو وہ ندوہ کے بھی فارغ التحصیل تھے اور ندوی کے قیام سے مولانا یا مولوی کا لفظ ان کے نام کا جز بن گیا تھا لیکن اخیر عمر میں وہ ان القاب سے بہت جز بز ہوتے تھے۔ انھیں یہ قطعاً پسند نہیں تھا کہ لوگ انھیں مولانا یا مولوی لکھیں۔ ایک مرتبہ میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی پرانی جگہ ان کے دفتر میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا، اتنے میں ان کے نام ایک خط آیا۔ مکتوب نگار نے لفافہ پر "مولانا نجیب اشرف ندوی" لکھا تھا۔ مرحوم یہ دیکھ کر بہت خفا ہوئے۔

اُن کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ کبھی نہیں بھولتا۔ یہ زمانہ بھی میری فرسٹ ایر ہی کا تھا۔ بارش کا موسم گزر چکا تھا۔ اور دھوپ سے بچنے کے لیے ندوی صاحب نے ہیٹ لینا شروع کر دی تھی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے کے معاملے میں پہل کرتے تھے اور اپنے مخصوص انداز سے ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے تھے۔ ان کے سلام کا انداز کچھ ایسا تھا کہ نہ وہ صحیح طور سے "آداب" ہی تھا نہ ہی انگریزی "سیلوٹ"۔ بہرحال جس واقعہ کا میں ذکر کرنے جا رہا ہوں وہ یوں ہے کہ ان کا ہیٹ ان کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ کالج کا ریڈور سے گزر رہے تھے اُسی وقت ہمارے چند دوستوں کا گروپ بھی گزرا۔ ندوی صاحب نے ہمیں دیکھتے ہی فوراً، اپنے معمول اور عادت کے مطابق سلام کے لیے ہاتھ اُٹھایا جو بجائے سیدھے ہاتھ کے اُلٹا ہاتھ تھا۔ ہمارے ایک ساتھی جو ذرا ضرورت سے زیادہ تیز تھے انھوں نے فوراً ندوی صاحب سے کہہ دیا کہ ہمیں آپ کا سلام قبول نہیں ہے۔ ندوی صاحب نے پوچھا، بیٹے کیوں؟ جواب دیا آپ نے سلام اُلٹے ہاتھ سے کیا ہے۔ ندوی صاحب نے ان کی پیٹھ پر بڑی محبت اور شفقت سے ہاتھ رکھا اور پوچھا "بیٹے دل کس طرف ہوتا ہے؟" ہمارے وہ ساتھی اتنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ وہ منٹوں میں نہیں بلکہ سیکنڈوں میں خاموش یا قایل کرتے تھے۔ اپنا خیال اور اپنی بات دوسروں تک بہت خوبصورتی سے پیش کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۵۲ء کی بات ہے، کالج میں مشہور "فقیہہ انٹر کالجیٹ اردو ڈراما" کا مقابلہ تھا، ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ مقابلہ کے دن شام کے تقریباً ۸ بجے سارے مہمان اور جج صاحبان بھی تشریف لا چکے تھے۔ لیکن جج صاحبان میں سے ایک صاحب (جن کا مجھے اس وقت نام یاد نہیں) کسی مجبوری کی وجہ سے کالج تشریف نہ لا سکے اور مقابلہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے فون پر اطلاع دی اور معذرت چاہی۔ ایسے حالات منتظمین کے لیے لمحۂ فکر یہ ہوتے ہیں، ان کی پریشانی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس قسم کے پروگرام کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اس وقت کالج کی ادبی مجلس "مجمع الادب" کے صدر ندوی صاحب ہی تھے۔ ندوی صاحب بھی پریشان تھے کہ آخر وقت پر کسے جج بنایا جائے۔ اتفاق سے دو جج جو اس وقت حاضر تھے ان میں سے ایک مشہور فلم ڈائرکٹر "ڈائرکٹر ودی" تھے۔ ندوی صاحب نے ڈائرکٹر ودی سے اپنی پریشانی اور حالات کی نزاکت کا ذکر کیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ اپنے رسوخ سے کوئی جج حاصل کریں۔ ڈائرکٹر ودی نے انھیں اطمینان دلایا اور فون پر اپنی بیگم ممتاز شانتی کو فوراً بلایا کہ وہ آئیں اور جج کے فرائض انجام دیں۔ بہرحال ممتاز شانتی تشریف لائیں اور مقابلہ شروع ہوا۔ مقابلہ کے بعد جب انعامات تقسیم ہونے سے پہلے ندوی صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور مہمانوں

سا تعارف، شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوئے تو اس جج کو حاصل کرنے کے واقعہ کو جس خوب صورت انداز سے پیش کیا وہ کبھی نہیں بھولتا ـــــ انھوں نے کہا کہ "آج مقابلہ شروع ہونے سے قبل ہمیں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے ایک جج کسی مجبوری کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے، جس کی وجہ سے عین موقع پر ہم بہت پریشان تھے، لیکن ہمارے درمیان ونّی تھے، ہم نے اپنی مشکل آسان کرنے کے لیے ان سے گزارش کی تو انھوں نے شانتی کو بلایا اور وہ بھی کیسی؟ ممتاز!"

ندوی صاحب نے تقریباً اڑسٹھ سال کی عمر پائی۔ تعلیمی زندگی کے بعد چالیس سال تک انھیں علمی و ادبی خدمات کا موقع ملا، ابتدا میں انھوں نے "نیرنگ خیال"، "ہمایوں"، "تعارف"، "الناظر" وغیرہ رسالوں میں ادبی و علمی مضامین لکھے۔ عام طور سے ان کے مضامین "سنان" کے نام سے شائع ہوتے تھے جو سید نجیب اشرف ندوی "کا مخفف تھا۔ استاد محترم ڈاکٹر عالی جعفری نے بتایا کہ وہ ابتدا میں افسانے بھی لکھا کرتے تھے۔ اور ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "پھلاپیاں" کے نام سے ہلطان بک ڈپو بمبئی نے ڈاکٹر نعیم الحق کے نام سے شائع کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ بالصواب لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ ندوی صاحب اچھے افسانہ نگار یا شاعر ہوں گے یا ہو سکتے تھے۔ اپنے اس مفروضہ کی بنیاد ندوی صاحب کے وہ مضامین ہیں جن میں وہ شاعرانہ تخیل سے کام لے کر اپنی بات کہتے ہیں۔ وہ زبان جو درت افسانہ نگار کی ہو سکتی ہے یا شاعر کی! ایسے ہی چند مضامین اور تبصرے " رقعاتِ عالمگیری" اور " لغات گجری" ہیں۔ اور چند مضامین میں ان کا مضمون "شبلی اور بمبئی" ہے جو اسمٰعیل یوسف کالج کے میگزین "پامز" میں شائع ہوا تھا۔ ندوی صاحب کی علمی و ادبی فتوحات میں تقریبہ چالیس مضامین اور تبصرے ہیں۔ انھیں کام کرنے کے جو مواقع نصیب ہوئے اور انھوں نے جو عمر پائی اس لحاظ سے علمی دنیا ان سے اس سے زیادہ کی امید کرتی تھی۔ لیکن گوناگوں نجی پریشانیوں کی وجہ سے جن کا ندوی صاحب سے قدیمی تعلق تھا، وہ علمی دنیا کی وہ توقعات پوری نہ کر سکے۔ لیکن وہ خود اپنے تئیں اپنے ان کارناموں سے بڑی حد تک مطمئن تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بڑی تعداد میں کیڑے مکوڑوں کو جنم دینے کی بجائے ایک شیر کو جنم دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور میرا خیال ہے۔ " رقعاتِ عالمگیری" کی ادبی و علمی حیثیت وہی ہے جو ایک شیر کے بچے کی ہوتی ہے " رقعاتِ عالمگیری" کے بعد ان کا سب سے زیادہ وقیع کارنامہ "لغات گجری" کی تدوین ہے۔ جن کی وجہ سے ندوی صاحب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ اپنے طالب علموں سے بھی یہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی ایک پائیدار اور ٹھوس کام کریں۔ انتقال سے تقریباً دو سال قبل خود مجھے انھوں نے کہا "بیٹے زود نویسی اچھی بات نہیں ہے کوئی ایک عمدہ کتاب لکھ کے پھینک دو، یہی بڑی ادبی خدمت ہو" اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن انکار نہیں کیا جا سکتا ـــــ ابھی میں نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس دن ہم دونوں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ساتھ نکلے ندوی صاحب کو اندھیری جانا تھا مجھے بائیکلہ، کہنے لگے ساتھ چلو گے نا! میں نے اثبات میں جواب دیا، اور جب ہم دونوں انسٹی ٹیوٹ سے نکلے تو انھیں مجھ سے مراٹھی میں بات کرنے کا شوق ہوا۔ گو تلفظ اور جملے کی ساخت کے اعتبار سے ان کی مراٹھی صحیح نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنی مراٹھی دانی پر فخر کرتے تھے۔ اسی وقت انھوں نے فخریہ بتایا کہ وہ پیدائشی اعتبار سے مہاراشٹری ہیں اور ان کی ابتدائی تعلیم مراٹھی زبان سے ہوئی۔ جب وہ چاندہ میں ضلع المورہ میں ...

بس میں ہمیشہ وہ ڈبل ڈیکر میں اوپر بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اسی دن جب ہم بس میں بیٹھے تو اس خیال سے ندوی صاحب کو اوپر چڑھنے میں تکلیف ہوگی میں نیچے لپکا۔ لیکن ندوی صاحب نے مجھے فوراً منع کر دیا۔ اور کہا "نہیں بیٹے اوپر چلیں گے" اس وقت کی ندوی صاحب کی یہ وصیت مجھے کبھی نہیں بھولتی کہ "بیٹا! ہمیشہ اوپر رہنا!" کس قدر معنی خیز جملہ تھا وہ ندوی صاحب کا "بیٹا! ہمیشہ اوپر رہنا"

ندوی صاحب ایک شاعرانہ دل اور عاشقانہ مزاج رکھتے تھے۔ وہ رندوں میں رند اور صوفیوں میں صوفی تھے۔ ان کی رندی اور سرمستی اور عاشقانہ رنگین مزاجی ان کے شاگردوں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں شبلی کے جانشین تھے۔ ان کی ذات میں شبلی کی علمی، ادبی، تاریخی، شعری اور عشقیہ روایتیں پوشیدہ تھیں۔ اگر مستقبل میں کبھی ان سے متعلق یہ بات سامنے آئے کہ شبلی کی طرح انھوں نے بھی کسی عطیہ اور زہرہ سے دل لگایا تھا تو اسے پر تعجب نہ ہونا چاہیے، وہ ایک باکمال اور مکمل انسان تھے، وہ جو تھے ویسے ہی تھے۔ انھوں نے کبھی اپنی زندگی کا کوئی پہلو دانستہ چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اپنے آپ کو مختلف پردوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اپنے آپ پر کسی قسم کا ملمع نہیں چڑھایا۔ یہ ندوی صاحب کی بڑی خوبی تھی۔ وہ بہت دور اندیش تھے اور اس لیے تنگ نظر بھی وہ اپنے اس مزاج کی وجہ سے... شخص کو فوراً پہچان لیتے۔

مقصد حیات پورا ہوتے ہی اللہ بلا لیتا ہے۔ وہ جان و مال کا مالک ہے۔ ہم افسوس کرتے ہیں، میں آج ان کی اچھی باتوں کو یاد کرتا ہوں، ان کی موت پر تاسف کرتا ہوں، میرے استاد تھے، استاد کی حیثیت سے مجھ پر ان کے احسانات ہیں۔ ان کی محبت اور ملامت دونوں سے میں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے اور ان کی ادبی خدمات ہمیشہ یاد رہیں۔ بقول میر ؎

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں ہے کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

رضا نقوی واہی
۵/۱۶ گردنی باغ۔ پٹنہ
بہار۔

مہمانِ خصوصی

(بقول مجتبیٰ حسین "مہمانِ خصوصی" کا "اہل" بننے کے لیے اعلا درجے کی "نااہلیت" کا ہونا ضروری ہے)

ایک دن حضرت حافظ نے یہ دیکھا منظر
"طوقِ زرّیں" سے مزیّن ہے ہمہ "گردنِ خر"

اور چھکڑے میں جُتا رینگ رہا ہے تازی　　　زخم ہی زخم ہے کوڑے کا زِ سر تا بہ کمر
تھے جو مرحوم بڑے سادہ دل و نیک مزاج　　　"ایں چہ شور لیست" کہا اور گرے چکرا کر
وہ تو اس غم کو لیے خلدِ بریں میں پہنچے　　　کئی صدیوں کا زمانے نے لگایا چکر
آج ہم پر بھی مگر جبرِ نظارہ ہے وہی　　　وہی نیرنگِ تماشہ، وہی نیرنگِ نظـ
وہ چراگاہِ سیاست ہو کہ میدانِ ادب　　　طوقِ زرّیں ہے وہی اور وہی گردنِ خر
اختیارات کی کرسی پہ "خرانِ فربہ"　　　متمکن نظر آتے ہیں بہ صد کرّ و فر
ایک کرسی پہ کسی طرح اُچک کر پہنچے　　　اور پھر دھڑ سے کھلے کشف و کرامات کے د
پھر تو بقراط و ارسطوئے زمانہ ہیں وہ　　　علم و حکمت میں نہیں پھر کوئی ان کا ہمـ
پھر تو صحرائے جہالت بھی ہے دریائے علوم　　　پھر تو ہر بے ہنری میں بھی ہیں سو سو جوہر
خواہ دو حرف بھی تعلیم نہ حاصل کی ہو　　　طوقِ زرّیں کے کرشمے سے بنے دانشـ

کوئی جلسہ ہو وہ "مہمانِ خصوصی" ہوں گے
کوئی موقع ہو دھڑلے سے وہ دیں گے لکچر

وہ زمیں کے ہوں مسائل کہ خلا کی باتیں　　　مثلِ مقراض زباں چلتی رہے گی فر
عالم و فاضل و دانش ور و اہلِ حکمت　　　سب نظر آئیں گے قدموں پہ جھکائے ہوئے

طوقِ زرّیں کا جو اس کو نہ کرشمہ کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

شجاع خاور
۱۔ پارک لین، تال کٹورا پارک
نئی دہلی ۔ ۱

غزل

کب کس نے جان دی ہے کہاں کچھ نہیں پتہ
یاں اتنا اہتمام ہے واں کچھ نہیں پتہ

ٹوٹے گا کب یہ رشتۂ جاں کچھ نہیں پتہ
یہ سب وہاں سے پوچھو یہاں کچھ نہیں پتہ

زورِ قلم میں اتنا اضافہ ہوا ہے کیوں
جب سے ہوئی ہے بند زباں کچھ نہیں پتہ

خیر آج تو ہمارے لبوں پر ہیں مرثیے
کل کون ہوگا مرثیہ خواں کچھ نہیں پتہ

سب لکھ رہے ہیں مدح اسی کی مگر حضور
کس پر گرے گی برقِ تپاں کچھ نہیں پتہ

دن رات بحث کرتے ہیں ہم آرزو کے ساتھ
کہنے کو ہم کو سود و زیاں کچھ نہیں پتہ

ہم تو جناب نکلے تھے خالی بیان کو
آیا کہاں سے زورِ بیاں کچھ نہیں پتہ

ہم جاہلوں کی بات تو ہے جاہلوں کی بات
ان عالموں کو بھی تو میاں کچھ نہیں پتہ

دو چار خواہشیں ہیں اور اک زندگی ہے بس
ہم کو ترے زمان و مکاں کچھ نہیں پتہ

ظفر گورکھپوری
A-۳۰۲ فلوریڈا شاستری نگر
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۳

دوہے

کون بسنتی دھو گئی، ندی میں اپنے گال
تٹ خوشبو سے بھر گیا سارا پانی لال

ہوا اکھاڑے پیڑ کو، کرے پھول کو خاک
ماٹی کو بھی چاہیے ہر دن کچھ خوراک

بھور سکھی پھیکی لگے، شام کی لالی مند
اُن آنکھوں میں کیا نہیں جن میں ساجن بند

برگد ستّر سال کا، تنہ جڑیں کمزور
دیکھے کیسا ڈوب کر ہریالی کی اور

کیا کرنا ہے، کیا کیا؟ آگے کیا ہے موڑ
کبھی کبھی ایکانت میں بیتی عمر نچوڑ

بھیس بدلنے سے کہیں چھُپتے ہیں کرتوت
چاہے مکھوٹا اوڑھ لو، چاہے تلو بھبھوت

گزرا گھر کے پاس سے، کون سجل، سُکمار
بن ہولی کے دور تک رنگوں کی بوچھار

بھوکی بھیڑ کے جسم میں، بس سیپی بھر خون
چرواہے کو دودھ دے یا تاجر کو اون

میں اک گونگی بانسری، وِیاکُل، بے آرام
جاگ اٹھیں سب سُر مرے تم جو چھو لو شام

کس ڈولی میں عُمر نے مجھ کو کیا سوار
سکھی میں راہ میں لُٹ گئی ڈاکو ہوئے کہار

خُوشبو کانٹوں میں بھی ہے، کیا کلیاں کیا پھُول
بات شردھّا کی ہے سب چھُو کر دیکھ ببول

بیٹھیں، دم لیں چار پَل، سَمے کہاں ججمان
جیون بھاری قرض ہے سانس سانس بھگتان

غزلیں

ڈاکٹر رقیعہ شبنم عابدی
سہراب - ۳۰۷ سی
سات بنگلہ اندھیری (ویسٹ)
بمبئی ۵۸

مری ہی بیخ کنی، ناسپاس کرتے رہے
یہ کام وہ، جو تھے موقع شناس کرتے رہے

جسے بُھلا کے نئے منظروں میں ڈوبی ہَوا
ہم عمر بھر اُسی بادل کا پاس کرتے رہے

انھیں کو رنگِ چمن سے شکایتیں بھی رہیں
کہ جو لہو سے مِرے، اقتباس کرتے رہے

نئے جزیرے ہمارے بھی سامنے تھے مگر
ہم اک سراب کو ساحل قیاس کرتے رہے

وہ لوگ جن کے بدن دھوپ نے جلائے تھے
گھٹا میں بیٹھ کے سورج کی آس کرتے رہے

قبائے سبز اُڑھاتی رہی بہار جنھیں
انھیں درختوں کو تم بے لباس کرتے رہے

یہ شہرِ دل تھا کہ کوئی سرائے تھی شبنمؔ
جہاں تھکے ہوئے سپنے نواس کرتے رہے

رؤف صادق
۹/۷۸ - گیٹ نمبر ۵ - اولڈ کلکٹر کمپاؤنڈ
مال وانی، ملاڈ - بمبئی ۹۵

خوابوں میں کبھی خوابوں کی تعبیر میں ہے قید
ہر شخص نظریات کی زنجیر میں ہے قید

جو جذبۂ دل میں مرے طوفان اٹھادے
آنسو کا وہ قطرہ تری تحریر میں ہے قید

راس آئیں گی تدبیر کی کیا تازہ ہوائیں
اس دور کا انسان ابھی تقدیر میں ہے قید

یونہی تو کسی دل کی عمارت نہیں گرتی
اک سنگِ خلش پیار کی تعمیر میں ہے قید

وہ کرب حقیقت میں بیاں ہو نہیں سکتا
جو مصحفِ احساس کی تفسیر میں ہے قید

اس دور کی تقدیر کا سہما ہوا پیکر
بکھرے ہوئے حالات کی تصویر میں ہے قید

اس عہد کا ہر فرد ہے حسّاس جزیرہ
جو حلقۂ گرداب کی تحریر میں ہے قید

...حبوب علی خاں اخگر
...نیب منشن ۲/۱۷/۲۶۲-۳-۱۹
...جہاں نما۔ حیدرآباد

غزلیں

جس کو شوقِ دید نے اندھا کیا
ہائے تم نے اس سے بھی پردا کیا

کیا نہ ہوتا اور کچھ کہتا اگر!
جس نے لفظِ کُن سے سب پیدا کیا

غم میں ہنسنے پر مرے وہ خوش نہیں
میں نے تو معیارِ غم اونچا کیا

جب سمجھ میں آئے معنٰی صبر کے
ہر نئے غم پر نیا سجدا کیا

رونے والے نے فراقِ دوست میں
آنسوؤں کا مصرفِ بے جا کیا

دے دیا دل اک جھلک ہی دیکھ کر
ہم نے یہ سودا بہت منہگا کیا

جس نے دی تھی جان، دے ڈالی اسے
عمر بھر میں کام اک اچھا کیا

کر لیا میں نے یقیں ہنس دیکھ کر
اس نے اخگر جب کوئی وعدا کیا

رونق رضا ایڈوکیٹ
گاندھی نگر۔ سلطان پور
یو۔پی

سلسلہ ابر کا تو جاری ہے
کس لیے پھر یہ آہ و زاری ہے

ان کے چہرے پہ شرم طاری ہے
ہو نہ ہو کوئی بات ہاری ہے

بزم میں ان کے شوق سے ہم نے
پوری شب چین سے گزاری ہے

عشق غیروں سے وہ نہیں کرتے
جن کو تصویر تیری پیاری ہے

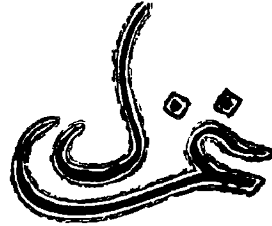
گوری رنگت، سیاہ زلفوں میں
دیکھیے کس کی یہ سواری ہے

جلوۂ طور جس نے دیکھا ہو
کیا اسی کی یہ بے قراری ہے

مرا دیوان تیرے ہاتھوں میں
تو بھی کیا میرا ہی پجاری ہے

قلب رونق رضا منوّر ہے
جامِ کوثر کی یہ خماری ہے

وقار صدیقی
فیملی ہاسپٹل، دتیا
ایم پی



زمیں میں بیج جو بوئے گئے ہیں نفرت کے
تو پھول کیسے کھلیں گے بھلا محبت کے

اندھیرے چھائے ہوئے ہیں جہاں جہالت کے
وہاں چراغ تھے روشن کبھی ذہانت کے

یہ میرے ملک کی تہذیب ہے روایت ہے
کہ بن کے رشتے نہیں ٹوٹتے محبت کے

وہ ایک نام جو کل تک تھا حاشیے پہ کہیں
سرورق ہے وہی اب کتابِ شہرت کے

بھڑک اٹھیں گے اگر چل پڑی ہوا پھر سے
سلگ رہے ہیں جو جذبے یہاں بغاوت کے

حدیثِ دل ہے یہ اس کو بھی آپ پڑھ لیجیے
پڑھے ہیں آپ نے قصے بہت محبت کے

صابر دت

میر اور کبیر کا وارث

میرا اور کبیر کا وارث
اپنے باپ کی قبر میں لیٹا
ایک جدید شاعر ہے
اس کا حلیہ
ہاتھ میں سونے کی چوڑی ہے
سونے کی زنجیر گلے میں
کرتے پہ سونے کے بٹن ہیں
آنکھوں پر سونے کا چشمہ
جیب میں ایک سونے کا قلم ہے
اور کلائی پر اسکی، سونے کی گھڑی ہے
مری دعا ہے
خدا بچائے اس کو
نظر بد سے
چوروں سے
کہ اکثر
سونے سے یہ لدا پھندا
ہندی اردو کا شاعر
شہروں شہروں
دوہے گنگنانے
ریل کے ڈبوں میں
تنہا مارا مارا پھرتا ہے

غزلیں

قمر گونڈوی
کوچۂ جگر۔ گونڈہ

خام ذہنوں میں اک قیاس ہوں میں
چشمِ بینا میں روشناس ہوں میں

موجزن مجھ میں اک سمندر ہے
پھر بھی صحرا کی جیسے پیاس ہوں میں

بھول جانا مجھے نہیں آتا
دُور رہ کے بھی تیرے پاس ہوں میں

لے مری جاں گلے لگا لے مجھے
آج کی شب بہت اداس ہوں میں

پُرزے پرزے ہیں جیب و داماں کے
دیکھیے کتنا خوش لباس ہوں میں

عہد نو کا فقط نقیب نہیں
یادِ ماضی کی بھی اساس ہوں میں

مجھ کو پڑھیے بہت سمجھ کے قمر
تابِ ذریں کا اقتباس ہوں میں

سید سعید احمد
داستانِ ادب
الہ آباد

نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری تحریر کا مطلب
لکھوں تفسیر تو پوچھیں گے وہ تفسیر کا مطلب

اسے مسمار کردے کوئی موج مضطرب آکر
لب ساحل یہی ہے ریت کی تعمیر کا مطلب

لبِ گفتار پر بندش کہیں رفتار پر پہرے
یہی ہے اصطلاحِ فن میں دار و گیر کا مطلب

وطن کو بھی محبت ہے وطن میں رہنے والوں سے
یہی دراصل ہے اس خاکِ دامن گیر کا مطلب

اسیری میں کبھی دیوانگی کم ہو نہیں سکتی
نہ کچھ زنداں کا مقصد ہے نہ کچھ زنجیر کا مطلب

زباں پر امن عالم، دل میں منصوبہ تباہی کا
بجز تخریب کیا ہے وعدۂ تعمیر کا مطلب

کسی صورت صلیب و دار کا یہ سلسلہ ٹوٹے
سعید اب نہ پوچھے کوئی حلقۂ زنجیر کا مطلب

مختار شمیم
ایف ۲- گورنمنٹ گرلز کالج کیمپس
موتی طویلہ - اندور
ایم - پی

ایک نظم

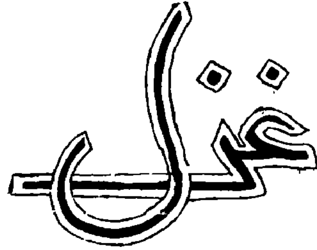
برسوں بعد ملے تو جیسے ہم میں نہ تھی کوئی پہچان
جیسے ہم خود سے انجان!
جانے کتنے موسم گزرے
کتنی بہاریں آئیں، آکر پلٹ گئی ہیں
کتنے پت جھڑ بیتے
جانے ہم کس رُت میں بچھڑے
کتنی شامیں، کتنی صبحیں
یوں ہی رہیں سُنسان
لیکن
ڈار سے بچھڑے پنچھی
برف کے تیر/ ہوا کے نیزے/ سورج کے شعلوں کی لپک میں
زخموں کی سوغاتیں لے کر
خون میں نہائے
جب اک دن تھک ہار کے لوٹے تو
امیدوں کا چاند گگن میں سسک رہا تھا
یادوں پر کچھ اوس پڑی تھی
مرجھائے غنچوں سے جیسے روٹھ گئی مسکان
برسوں بعد ملے تو ہم میں نہ تھی کوئی پہچان
جیسے ہم خود سے انجان!

جعفر ساہنی
ہندستان میڈیکوز، ڈی/ ۸۵
توپسیا روڈ، کلکتہ ۳۹

انتظار

وہ نوکر ہے۔
ہمیشہ اپنے مالک سے
ذرا سی چوک پر ڈھیروں
خباثت سے بھرے کلمے
تنفّر میں بسی گالی
کھڑا خاموش سُنتا ہے
گنہگاری پہ روتا ہے
جواباً کچھ نہیں کہتا
کہ کچھ کہنے کے لائق وہ
ابھی تک بن نہیں پایا
سکت پیدا نہ کر پایا
ابھی تو زہر پینا ہے
اسے پیتے ہی جانا ہے
جواباً عرض کرنے کا
ابھی موسم نہیں آیا
مناسب دن نہیں آیا
توقع ہے مگر روشن!

فصیح اللہ نقیب
اصغر حسین جونیر کالج
آکولہ۔ مہاراشٹر



چہرہ کہ پیش لفظ ہے دل کی کتاب کا
مضمون کہہ گئی ہے نظر انتساب کا

اپنے الم، تمھاری خوشی، کس کا ہو رہوں
کیسا یہ کام آن پڑا، انتخاب کا

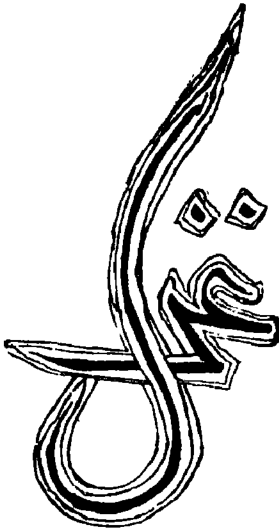
میرا وجود میں ہوں، نہ تیرا وجود تو
احساس درمیاں ہے فقط انجذاب کا

خوشبو، حجاب، رنگ، تبسم، حیا، صفت
کیسے کریں لبوں سے تقابل گلاب کا

افسانے بن گئی ہیں سراسر حقیقتیں
قصے جنوں کے ہو گئے، حقہ نعاب کا

دیتی رہی نقیب تجھے درس زندگی
اب یہ معاملہ ہے ترے اکتساب کا

غنی اعجاز
آکولہ۔ مہاراشٹر



جھوٹی تسلیوں پہ رضامند ہوگئے
ہم اپنی خواہشات کے پابند ہوگئے

سوئے جو ہم تو آنکھ کا کاجل چُرا لیا
کس درجہ پہرے دار ہنرمند ہوگئے

چہرے پہ تھے کچھ اور بھی چہرے چڑھے ہوئے
ہونے کو بے نقاب تو ہر چند ہوگئے

کوہِ گراں بھی لا نہ سکے، زلزلوں کی تاب
جھپکی پلک، زمین کا پیوند ہو گئے

ڈستا رہے گا خوف کا جنگل تمام رات
یعنی فصیلِ شہر کے در بند ہوگئے

یعقوب یاور
شعبۂ اردو
وسنت کالج برائے خواتین
قلعہ راجگھاٹ ۔ وارانسی

پرکاش تیواری
۱۹۹ سیکٹر ۱۲، آر، کے پورم
نئی دہلی ۲۲

غزلیں

غریقِ بادہ بھی آخر شریکِ جادہ ہوا
تو گردِ راہ سے آلودہ جو لبادہ ہوا ؟

بعینہٖ یہ فلک کا مزاج سادہ ہوا
کسی پہ کم تو کسی پر کرم زیادہ ہوا

خود اپنی شرم نے گنوا دیا سواروں میں
وگرنہ جو بھی سفر تھا وہ پا پیادہ ہوا

غرور کج کلہی کی نگاہِ برق خرام
فلک نشیں بھی لمحوں میں خاک زادہ ہوا

نہ حوصلہ ہے، نہ نیت ہے، کام کرنا ہے
اور آج تک جو ہوا وہ بھی بے ارادہ ہوا

میں اپنی خواہشِ بے نام کے بھنور کا اسیر
اور اُس پہ بابِ اجابت بھی ناکشادہ ہوا

کسی کی فکر پہ شبہاتِ بے سبب یاور
کسی کے شعر میں سرقہ بھی استفادہ ہوا

عذابِ روح کی تفسیر کیا لکھوں
مری ہر سوچ ہے زنجیر کیا لکھوں

صدا سنتے ہی پھر دیوانگی جاگی
ابھی کیوں پاؤں کی زنجیر کیا لکھوں

جلے ہیں جن کے گھر وہ کون ہیں یارو
ہوئی ہے ان سے کیا تقصیر کیا لکھوں

تو کیوں اتنا ہر اک دل میں سماتا ہے
تجھے حسنِ گلِ کشمیر کیا لکھوں

وہ کہتے ہیں کہ لکھو حالِ دل اپنا
سبھی شعروں میں ہے تحریر کیا لکھوں

بہت کچھ لکھنے کو پرکاش ہے لیکن
چبھی ہے سینے میں شمشیر کیا لکھوں

مانگے کا اجالا

ادبی خرکار



خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے — خامہ بگوش

وہ دن گئے جب اردو ادب پر برصغیر کے چند بڑے شہروں کی اجارہ داری تھی۔ اب تو یہ زبان اور اس کے ادیب دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں اور بعض مقامات پر تو لاہور، کراچی، دہلی اور لکھنؤ جیسی ادبی چہل پہل نظر آتی ہے۔ اردو کے بین الاقوامی مشاعرے تو منعقد ہوتے ہی تھے اب بین الاقوامی رسالے بھی شائع ہونے لگے ہیں جن میں برصغیر سے باہر کے ادیبوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ تارکین وطن معاشی دباؤ کے تحت رزق کی تلاش میں غیر ملکوں میں جاتے ہیں۔ تو ادب کے ذریعے ان کا تعلق اپنے وطن سے قائم رہتا ہے۔ ادبی رسالے بھی معاشی دباؤ کے تحت اس تعلق کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کس طرح؟ اس کا اندازہ ذیل کی خط و کتابت سے ہوگا جو ایک کرم فرما کی عنایت سے ہمیں پڑھنے کے لیے ملی تھی۔ جی نہ چاہا کہ ایسی بصیرت افروز خط و کتابت سے ہم اکیلے محظوظ ہوں۔ لہٰذا ہم اس کا کچھ حصّہ اپنے قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے شائع کر رہے ہیں۔

(۱)

کراچی ۲ر فروری ۱۹۹۳ء

مکرمی خلیل بےخود صاحب۔ آداب۔ آپ نے ماہنامہ "خرکار" کا سالانہ زرتعاون عنایت کر کے ادب نوازی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کی وجہ سے تاریخ ادب میں آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ اگر آپ اس تاریخ میں اپنا نام آبِ زر سے لکھوانا چاہتے ہیں تو رسالے کی تاحیات سرپرستی قبول فرمائیے۔ اس کے نرخ منسلکہ ریٹ کارڈ پر درج ہیں۔ آپ نے سالانہ زرتعاون کے ڈرافٹ کے ساتھ جو خط بھیجا ہے، اس کی خوبصورت نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شاعر ہیں، نیز آپ کے شاعرانہ نام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ازرہ کرم اپنا کلام مع تصویر عنایت فرمائیے تاکہ دنیائے ادب کے سامنے مستقبل کے ایک بڑے شاعر کو فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ ہمارے ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سعودی عرب، خلیج کی ریاستوں، یورپ اور امریکا میں آباد برصغیر کے بے شمار باشندوں کے اندر چھپے ہوئے شاعروں کو برآمد کیا ہے۔ یہ تمام شاعر

آج اردو دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ آپ کے اندر کے خوبصورت شاعر کو بھی باہر آنا ہوگا۔
خرکار نوازی کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ ہی جیسے صاحبان عزم و ہمت کی وجہ سے اردو عالمی سطح پر مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کے جواب کا بے تابی سے انتظار کروں گا۔ آپ کا خیر اندیش
مینا لکھنوی

(۲)

دوبئی ـ ۱۵ فروری ۱۹۹۳ء
محترمی۔ تسلیمات۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مگر جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں شاعر نہیں ہوں۔ میرا نام آپ کو شاعرانہ اس لیے نظر آیا کہ میں حضرت بیخود گڑھ مکیشتری کا فرزند ہوں میرا اصل نام خلیل اللہ خاں ہے اسے میں نے مختصر کر کے والد مرحوم کے تخلص سے جوڑ دیا ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینیر ہوں۔ افسوس کہ ایک شاعر کا بیٹا ہونے کے باوجود شعر کہنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ البتہ اردو زبان سے بے پناہ محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے ایک دوست نے آپ کے رسالے کا سالانہ چندہ بھیجنے کے لیے کہا تو میں نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔ آپ مجھے رسالے کا سرپرست بنانا چاہتے ہیں تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس کا ہدیہ بھی پیش کر رہا ہوں۔ غزل میں نے کبھی نہیں لکھی، اس لیے بھیجنے سے معذور ہوں۔ البتہ آپ کی خواہش کے احترام میں اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔ فی الحال اپنے رسالے میں اسی کی اشاعت پر اکتفا کیجیے ـــ مخلص خلیل بیخود۔

(۳)

کراچی ۸ مارچ ۱۹۹۳ء
عزیزی خلیل بیخود صاحب ـ سلام و رحمت ـ سرپرستی کی رقم کا ڈرافٹ ملا اور تصویر بھی۔ دونوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہوئی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت بیخود گڑھ مکیشتری کا فرزند ارجمند شاعر نہ ہو۔ میں نے آپ کی تصویر کو بغور دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے اندر ایک طرح دار شاعر موجود ہے۔ آپ اس شاعر کو باہر نکالیے۔ اگر کسی وجہ سے اس کے باہر نکلنے میں کچھ دیر ہے تو میں آپ کے لیے غزلوں کا انتظام کر رہا ہوں، بلکہ کر لیا ہے۔ میرے عزیز دوست فرصت بریلوی میرے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔ ان سے آپ کے لیے چند غزلیں لکھوائی ہیں جو بھیج رہا ہوں ایک ایک کر کے انھیں خرکار، میں شائع کرتا رہوں گا۔ آپ اس دوران میں مقامی مشاعروں اور شعری نشستوں میں شرکت شروع کر دیجیے انشاء اللہ بہت جلد آپ بطور شاعر مشہور ہو جائیں گے۔ فرصت بریلوی صاحب کو غزلوں کا کچھ معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ ان کے لیے آپ جو رقم بھیجیں اس کا ڈرافٹ میرے نام ہونا چاہیے میں ایک دم ساری رقم ان کے حوالے نہیں کروں گا کیونکہ آیندہ بھی غزلیں لکھوانی ہوں گی۔
یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی آپ حضرت بیخود مکیشتری کے فرزند دلبند ہیں۔ میں نے

پاکستان سے چند ماہ پہلے انھیں سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں دیکھا تھا۔ سبحان اللہ کیا کلام تھا اور پڑھنے کا انداز بھی کیسا دل نشیں تھا۔ ان کا نورانی چہرہ اور خوبصورت آواز اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے وہ میرے حال پر بہت مہربان تھے۔ اسی رشتے سے میں نے آپ کو "محترمی" کی بجائے "عزیزی" لکھا ہے۔ انشاءاللہ آپ ہمیشہ عزیز ہی رہیں گے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ اس وقت زیادہ نہیں لکھا جا رہا کیونکہ میرا قلم خاصا پرانا ہو گیا ہے اور لکھنے میں دقت ہوتی ہے۔ دعاگو۔ مینا لکھنوی

(۴)

دوبئی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۹۳ء

بزرگوار محترم۔ سلام مسنون۔ آپ کا محبت نامہ ملا اور غزلیں بھی۔ والد مرحوم سے تعلق خاطر کا آپ نے خوب خیال رکھا۔ نہایت عمدہ غزلیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فرحت بریلوی نے میرے ہی خیالات و جذبات کو منظوم کر دیا ہے۔ یہ غزلیں پڑھ کر میرے اندر چھپا ہوا شاعر باہر آ گیا ہے۔ اس کی طرف سے بھی سلام قبول کیجیے۔ حضرت فرحت بریلوی کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔ امید ہے وہ آیندہ بھی میرے حال پر کرم فرماتے رہیں گے۔ مجھ سے جو خدمت ہو سکے گی اس سے دریغ نہیں کروں گا۔ منسلکہ ڈرافٹ انھیں کے حساب میں بھیج رہا ہوں۔ میرے ایک دوست کے دوست یہاں مشاعروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہر سال کسی شاعر کا جشن مناتے ہیں اور پاک و ہند کے بہت سے شاعروں کو بلا کر مشاعرہ بازی کرتے ہیں۔ عنقریب یہ مشاعرہ ہونے والا ہے۔ کوشش کروں گا کہ اس میں غزلیں سنانے کا موقع مل جائے۔

"خبر کار" کے جس شمارے میں میری غزل شائع ہو، اس کی دس کاپیاں قیمتاً بھجوا دیا کیجیے۔ اپنا پرانا قلم پھینک دیجیے۔ میرے ایک دوست کراچی جانے والے ہیں ان کے ہاتھ نیا قلم بھجواؤں گا۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔ نیازمند۔ خلیق بیخود۔

(۵)

کراچی ۳ نومبر ۱۹۹۳ء۔

عزیز گرامی قدر۔ خوش رہیے۔ گذشتہ چند مہینوں میں آپ نے اردو دنیا میں جو نام پیدا کیا ہے اس پر میں جتنا فخر کروں کم ہے۔ آپ کی غزلوں کی تعریف میں "خبر کار" کے دفتر میں روزانہ آٹھ دس خط موصول ہوتے ہیں۔ فرحت بریلوی نہایت توجہ سے آپ کے لیے فکر سخن کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہفتے میں دو دن صرف آپ ہی کا کام کرتے ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ وہاں کے مشاعروں اور شعری نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اور بطور شاعر آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ آپ کے اس خیال سے مجھے صدفی صد اتفاق ہے کہ آپ کا مجموعہ کلام اب شائع ہو جانا چاہیے۔ ڈاکٹر منیف ذوقی کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ فرماتے ہیں جب تک آپ کا مجموعہ شائع نہیں ہوگا اس وقت تک اہل ادب کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کس درجے کے شاعر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ فیض کے بعد آپ ہی وہ شاعر ہیں جس کے ہاں عصری حسیت عروج پر نظر آتی ہے۔ آپ کا دیوان میں مکتبہ خبر کار سے

چھاپوں گا۔ اگر کچھ رقم پیشگی مل جائے تو فوراً کتابت شروع کرادی جائے گی۔ انشاء اللہ دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی۔
آپ نے رسالے کے خریدار بنانے میں خرکارنوازی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کا شکریہ ادا کرکے میں آپ کے خلوص کو آلودۂ رسمیات نہیں کرنا چاہتا۔ میری دعا ہے کہ خدا آپ کو ایسی نیکیوں کی مزید توفیق دے۔ آمین۔ دعاگو۔ میناؔ لکھنوی۔

(۶)

دوبئی ۲۲ ردسمبر ۱۹۹۳ء
بزرگوار محترم۔ آپ کا ہر خط سیروں خون بڑھا دیتا ہے۔ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے دیوان کی اشاعت کی ذمے داری قبول فرما لی ہے۔ اخراجات کی آپ بالکل پروا نہ کریں۔ بس اس کا خیال رکھیں کہ گیٹ اپ ایسا ہو کہ جو بھی دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔
یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر منیف ذوق میری شاعری کے بارے میں اتنی عمدہ رائے رکھتے ہیں۔ مجھے فیض کے برابر جگہ دینا، ان کے صاحب علم و نظر ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے کیا ہی اچھا ہو اگر ڈاکٹر صاحب میرے دیوان کا دیباچہ لکھ دیں۔ اس سلسلے میں جو خدمت میرے لائق ہو تحریر فرمایئے۔ فلیپ آپ کس سے لکھوائیں گے؟ میری حقیر رائے یہ ہے کہ دائیں طرف کا فلیپ آپ خود لکھیں اور بائیں طرف کا فلیپ حضرت فرصت بریلوی سے لکھوائیں۔ آپ دونوں بزرگ میرے دائیں بائیں ہوں گے تو میرے ادبی قد و قامت میں اضافہ ہوگا۔ عقبی سرورق پر میری تصویر ہونی چاہیے اور تصویر کے نیچے میرے حسب حال میرا ہی کوئی شعر ہو۔ شعر کا انتخاب حضرت فرصت بریلوی پر چھوڑتا ہوں کہ وہ میرے شعری مزاج کو خوب سمجھتے ہیں۔
دیوان کے مصارف طباعت کا تخمینہ معلوم ہوجائے تو پوری رقم یک مشت ارسال کردوں گا۔ فی الحال کام شروع کرنے کے لیے کچھ رقم بھیج رہا ہوں اور ہاں دیوان کی رونمائی کس انداز سے ہوگی؟ اس کی کچھ تفصیل لکھیے تاکہ میں اس جہت میں کوئی عملی قدم اٹھا سکوں
آپ کا خادم۔ خلیل بیخود۔

(۷)

کراچی ۱۵ ر جنوری ۱۹۹۴ء
عزیز مکرم۔ دعائیں۔ خط کا جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں دراصل میں اس دوران میں آپ ہی کے کام میں مصروف رہا۔ دس بارہ کاتبوں سے کتابت کے نمونے حاصل کیے اور ماہرین کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کیے۔ کوئی نمونہ پسند نہ آیا تو طے پایا کہ دیوان نوری نستعلیق میں کمپوز کرایا جائے۔ کام شروع ہوگیا ہے۔ انشاء اللہ اگلے ایک ماہ میں کمپوزنگ کا کام مکمل ہوجائے گا۔ توقع ہے کہ مارچ کے آخر تک کتاب چھپ جائے گی۔ اخراجات کا تخمینہ الگ کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ اسے آپ ملاحظہ کرلیجیے۔
ڈاکٹر منیف نے دیباچہ لکھ لیا ہے اور اب وہ اس پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ انھوں

نہایت خوش اسلوبی سے آپ کی شاعری میں ترقی پسند عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اتنی اہم کتاب میں ایک دیباچہ کم پڑے گا۔ کم از کم ایک دیباچہ اور ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس کا انتظام ہوگیا ہے۔ اسلام آباد سے نظیر صدیقی نے محبوب خزاں کی شاعری پر ایک مضمون "خرکار" میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے جو خزاں کی شاعری سے زیادہ آپ کی شاعری کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون میں جہاں جہاں خزاں کا نام آیا ہے وہاں ہر جگہ میں نے آپ کا نام لکھ دیا ہے خزاں کے جو اشعار نمونتہً پیش کیے گئے تھے ان کی جگہ آپ کے اشعار درج کر دیے ہیں۔ نظیر صدیقی سے میرے مراسم بہت گہرے ہیں، اس لیے انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ جب میں انھیں اس دیباچے کا معاوضہ بھیجوں گا تو وہ بہت خوش ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ یہ پیش کش کریں کہ انھوں نے فیض پر جو مضمون لکھا تھا اسے بھی مناسب قطع و برید کے بعد آپ کے حسب حال بنالیا جائے۔

دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلے جلسہ ہوگا اور پھر عشائیہ۔ آج کل لوگ ایسی تقریبات میں عشائیے ہی کی وجہ سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کا تخمینہ بھیج رہا ہوں۔

اگلے سال "خرکار" کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کی گولڈن جوبلی منانے کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ کے دیوان کی رونمائی کے موقع پر ایک بردشیر شائع کیا جائے گا جس میں صنعتی و تجارتی اداروں اور بنکوں کے اشتہارات ہوں گے۔ اشتہارات کی ساری آمدنی آپ کی طرف سے گولڈن جوبلی فنڈ میں بطور عطیہ دے دی جائے گی۔ اس سے ملک کے ادبی حلقوں میں آپ کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوگا۔ یہاں کے اداروں کے اشتہار تو میں حاصل کرلوں گا۔ البتہ خلیج کی ریاستوں سے اشتہارات آپ ہی کو حاصل کرنے ہوں گے وہاں کے کئی ادارے یہاں کے اخباروں میں اشتہارات شائع کراتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے آٹھ دس اداروں کے اشتہار بھی مل جائیں تو گولڈن جوبلی شاندار پیمانے پر منائی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دیوان کی رونمائی میں آپ کی شرکت لازمی ہوگی۔ آپ یہاں تشریف لائیں گے تو آپ کے اعزاز میں دعوتیں بھی ہوں گی۔ ان دعوتوں کے اخراجات تخمینے میں شامل نہیں کیے گئے یہ بات اس لیے آپ کے کان میں ڈال دی ہے کہ اخراجات کی یہ مد بھی آپ کے پیشِ نظر رہے۔

دعا گو۔ مینا لکھنوی

تحریر: خشونت سنگھ
ترجمہ: سید عاصم محمود

پنجابی کہانی

دادی امّاں

میری دادی اماں بھی آپ سب کی دادی اماں کی طرح ضعیف اور کمزور تھیں۔ ان کا ضعیف اور جھریوں بھرا چہرہ اس وقت میرے سامنے موجود ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں میری دادی اماں نہایت حسین وجمیل اور ایک عدد خاوند کی مالک تھیں۔ لیکن مجھے پتہ نہیں کیوں اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ اگرچہ ان کے شوہر یعنی میرے دادا ابا کی ایک بڑی سی تصویر آج بھی ہمارے ڈرائنگ روم میں نصب ہے جس میں وہ ایک بڑی سی کلف دار پگڑی پہنے، ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس کھڑے ہیں۔ ان کے سینے پر پھیلی ہوئی بڑی سی سیاہ داڑھی دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی سو سال پرانے انسان کو دیکھ رہے ہوں۔ انہیں دیکھ کر یہ یقین نہیں آتا کہ وہ صرف بیوی بچوں والے ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کے پوتوں اور پڑپوتوں کی فوج جو موجود ہے۔ اس لیے جب میں اپنے ذہن میں دادی اماں کی جوانی اور حسین سراپے کا تصور کرتا ہوں اور پھر اس کا مقابلہ دادا ابا سے کرتا ہوں تو مجھے دادا ابا کا تصور اور مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو دادی اماں اکثر ہم سے ان کھیلوں کا تذکرہ کرتی تھیں جو انہوں نے اپنے بچپن کے زمانے میں کھیلے تھے۔ لیکن جب ہم ان کے بوسیدہ سراپے پر نظر ڈالتے تھے تو ہمیں ان کی باتیں بے سر پا اور فضول لگتی تھیں۔ اس لیے جب وہ ہمیں سوتے وقت پیغمبروں کی حکایتیں سناتی تھیں تو ہم انہیں ایک کان سے سنکر دوسرے کان سے اڑا دیا کرتے تھے۔

مجھے لگتا تھا کہ میری دادی اماں ہمیشہ سے جسامت میں فربہ اور قد میں پستہ چلی آ رہی ہیں۔ ان کی کمر بھی شاید ہمیشہ سے خمیدہ چلی آ رہی ہے۔ ان کا چہرہ سیکڑوں ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا آماجگاہ بن چکا تھا جو پورے چہرے پر سمندر کی لہروں کی طرح ادھر سے ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے انہیں اسی حالت میں پایا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ بوڑھی اور بورڑھی اتنی بوڑھی ہو چکی ہیں کہ ان میں مزید بوڑھی ہونے کی صلاحیت اختتام پذیر ہو چکی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی برسوں سے وہ ایک ہی مقام پر قیام پذیر ہیں۔ میرے لیے وہ کبھی بھی خوبصورت نہیں رہیں لیکن وہ ہمیشہ مجھے نہایت پیاری لگیں۔ وہ مکان کے ایک گوشے میں بنی مٹی کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر چبوترے پر بیٹھ جاتیں اور تسبیح کے دانے گھماتی رہتیں۔ ان کے چاندی کے تار جیسے سفید براق بالوں کی لٹیں ان

کے چہرے پر بکھری رہتیں اور وہ مسلسل منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔ ہاں وہ واقعی نہایت حسین تھیں۔ وہ اس کہر کی مانند تھیں جو پہاڑوں پر مستقل اپنا بسیرا کیے رکھتی ہے۔ ہاں میری دادی اماں کہر کی مانند تو تھیں۔ سفید، بے داغ، آہستہ آہستہ پُرسکون انداز میں سانس لیتی ہوئیں اور اپنے اندر معصومیت اور شفقت کا احساس سموتی ہوتیں۔ میں اور دادی اماں ہم دونوں آپس میں گہرے دوست تھے کیونکہ میرے ماں باپ جب شہر جانے لگے تو مجھے انہی کے حوالے کر گئے تھے۔ میں مستقلاً ان کے ساتھ رہنے لگا وہ صبح سویرے مجھے گہری نیند سے بیدار کرتیں اور اسکول لے جانے کے لیے تیاری کرنا شروع کر دیتی تھیں جب وہ مجھے نہلا دھلا رہی ہوتیں تو بلند آواز کے ساتھ مذہبی آیات بھی پڑھتی جاتی تھیں تاکہ میں بھی انہیں سن کر یاد کرتا جاؤں اور یاد کرنے سے زیادہ انہیں اپنے دل میں بٹھاؤں۔ لیکن میں انہیں صرف اس لیے سنتا تھا کیونکہ مجھے دادی اماں کی گنگناتی ہوئی آواز بہت پیاری لگتی تھی۔ ان کے بول میں نے کبھی اپنے دل میں نہیں بٹھائے۔ مجھے نہلانے دھلانے کے بعد وہ دیوار کے نیچے رات ہی کو دھل دھلا کر رکھی ہوئی سلیٹ، رنگین اور سفید چاکوں کا ڈبہ، چھوٹی سی مٹی کی دوات اور لمبا سا بانس کا قلم جمع کرتیں اور آیتیں ایک کپڑے میں باندھ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا کرتی تھیں۔ میرا اور ان کا ناشتہ عموماً ایک موٹی سی چپاتی ہوتی جس کے اوپر تھوڑی سی بالائی اور تھوڑی سی شکر چھڑی ہوئی تھی۔ ہم ناشتہ کرنے کے بعد اسکول کی طرف چل پڑتے دادی اماں کے ہاتھ میں اکثر رات کی بچی ہوئی باسی روٹیاں بھی ہوتی تھیں جو گاؤں کے کتے اور بلیوں کے پیٹ بھرنے میں کام آتی تھیں۔

دادی اماں ہمیشہ میرے ساتھ ہی اسکول کا رخ کرتی تھیں۔ کیونکہ اسکول کے ساتھ ہی مندر منسلک تھا۔ اسکول میں پنڈت ہم سب بچوں کو صبح ہی مذہبی رسومات ادا کراتے اور اس کے بعد ہم سب چبوترول پر بیٹھ کر اونچی آوازوں میں سبق پڑھنے لگتے۔ دادی اماں مجھے اسکول چھوڑ کر برآمدے کے پار بنے ہوئے کمروں میں چلی جاتیں اور وہاں بیٹھ کر مذہبی کتب کا مطالعہ کرنے لگتیں۔ جب ہم دونوں اپنی اپنی پڑھائی ختم کر لیتے تو ہمارا گھر واپسی کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔ گھر واپسی پر راستے میں گاؤں کے سیکڑوں کتے دم ہلاتے ہوئے ہمارا استقبال کرتے اور ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چپاتیوں کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ ہمارے گھر کے دروازے تک جاری رہتا۔

جب میرے والدین شہر میں اپنا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے ہم دونوں کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ لیکن شہر پہنچتے ہی پہلے دن سے ہی میری اور دادی اماں کی دوستی میں تبدیلی آنے لگی۔ شہر میں اگرچہ ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے لیکن اب دادی اماں میرے ساتھ اسکول نہیں جاتی تھیں۔ اب مجھے اسکول لے جانے کے لیے ایک انگریزی لاری آتی تھی۔ شہر کی گلیوں، سڑکوں میں بھی کتے برائے نام پائے جاتے تھے اس لیے دادی اماں نے گھر کے آنگن میں ننھی منی چڑیوں کو دانہ دنکا کھلانے کا کام سنبھال لیا۔

وقت تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ اب ہم دونوں کم کم ملتے تھے۔ وہ شروع شروع تو کچھ عرصے تک مجھے اسکول جانے کے لیے صبح سویرے اٹھاتی۔ تیار کرواتی اور جب میں اسکول سے واپس آتا تو پوچھتی کہ آج پنڈت جی نے کیا پڑھایا ہے؟ لیکن بعد میں انہوں نے یہ سب کرنا بند کر دیا۔ میں جب انہیں انگریزی کے الفاظ انگریزی سائنس کی چھوٹی چھوٹی باتیں، ارشمیدس کا قانون، اور دنیا کی

ترقی کے بارے میں بتاتا تو نہ معلوم کیوں وہ غمگین ہو جایا کرتی تھیں ۔ شاید اس لیے کہ اب وہ مجھے پڑھانے میں کوئی مدد نہیں کر سکتی تھیں ۔ انہیں گوروں کے اسکولوں میں پڑھائے جانے والے لفظوں پر قطعاً اعتبار نہ تھا ۔ میں نے جب انہیں یہ بتایا کہ ان ولایتی اسکولوں میں بھگوان اور اس کی کتابوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا جاتا تو ان کا دل ٹوٹ گیا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں ۔

ایک دن جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ میرے اسکول میں مجھے ناچ گانے کی تربیت دی جا رہی ہیں ۔ تو وہ اس خیال سے شدید پریشان اور آزردہ ہو گئیں کہ اب ان کا پوتا عیاشیوں اور اوباشوں کی صحبت اختیار کر لے گا ۔ کیونکہ ان کے نزدیک ناچ گانا صرف عیاشیوں اور بیسواؤں کو زیب دیتا تھا ۔ وہ کہتی تھیں کہ شریف اور مذہبی گھرانوں کو ان چیزوں سے دور رہنا چاہیے ۔ اس دن سے پتہ نہیں کیوں وہ مجھ سے بہت کم مخاطب ہونے لگیں ۔

جب میں بڑا ہو گیا اور کالج جانے لگا تو مجھے ایک الگ کمرہ دیدیا گیا ۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے ہم دونوں کی پرانی دوستی کا رشتہ جیسے مکمل طور پر ٹوٹ گیا ہے ۔ دادی اماں نے اس بات کا بدلہ یوں لیا کہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ۔ اب وہ دن چڑھنے سے لے کر دن ڈھلنے تک اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر منہ ہی منہ میں کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتیں اور ان کی انگلیاں تسبیح کے دانے گھماتی رہتیں ۔ لیکن دوپہر ہوتے ہی وہ چڑیوں کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے کھلانے کے لیے آنگن میں چلی آتیں اور آنگن میں بیٹھ کر ڈبل روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چوں چوں کرتی چڑیوں کے سامنے ڈالتی جاتیں ۔ سیکڑوں کی تعداد میں چڑیاں ان کے اردگرد پھدکتی پھرتیں اور ادھر ادھر شور مچاتی رہتیں ۔ چڑیاں ان کی ٹانگوں اور کندھوں پر بیٹھ جاتیں اور بعض شرارتی چڑیاں ان کے سر کو بھی چھتری بنانے سے نہیں چوکتیں تھیں ۔ ان کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک نرم و ملائم مسکراہٹ بکھری رہتی تھی ۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے لیے آدھے گھنٹے کے مختصر سے لمحات پورے دن میں سب سے زیادہ مسرت کا پیغام لاتے تھے ۔

جب میں نے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جانے کا پروگرام بنایا تو مجھے یقین تھا کہ دادی اماں میرے اس فیصلے سے بہت برہم ہوں گی ۔ مجھے پانچ سال کا طویل عرصہ گھر سے باہر گزارنا تھا اور ان کی عمر اور صحت دیکھتے ہوئے کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کس لمحے کیا سے کیا ہو جائے ۔ لیکن میری دادی اماں کو سب کچھ معلوم تھا ۔ وہ دوسروں کی طرح جذباتی نہیں تھیں ۔ اس دن دادی سب کے ساتھ مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے آئیں ۔ ان کے چہرے سے ، ان کی گفتگو سے اور ان کی حرکات سے کسی قسم کے جذبات ظاہر نہیں ہو رہے تھے ان کے شکستہ لب اور جہاں دیدہ ذہن دونوں مذہبی آیات پڑھنے میں مصروف تھے ۔ ان کی انگلیاں تسبیح کے دانوں پر معمول سے تیز پھر رہی تھیں ۔ انہوں خاموشی سے میرے ماتھے پہ بوسہ دیا اور جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو میری آنکھوں میں نمی تیر گئی ۔ ان کے اور میرے درمیان روحانی رشتہ تو ٹوٹ چکا تھا اب جسمانی رشتہ بھی ٹوٹ رہا تھا ۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب میں دادی اماں کو دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا ۔

لیکن ایسا نہیں ہوا میں جب پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد واپس آیا تو ایئرپورٹ پہ وہ بھی دوسروں کے ساتھ شانہ بشانہ موجود تھیں ۔ اب بھی ان کے پاس کچھ کہنے کے لیے الفاظ موجود نہیں تھے ۔

لیکن جب انہوں نے مجھے اپنے پتلے پتلے بازوؤں میں لپیٹا تو میں نے آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے لبوں سے آیات کی دھیمی آواز صاف سن لی۔ میری آمد کے بعد بھی ان کے لیے خوشیوں سے بھرے لمحات وہی تھے جب وہ سیکڑوں چڑیوں کے درمیان کبھی پچکارتی تو کبھی ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہوتیں انہیں روٹی کے ٹکڑے کھلانے میں مصروف رہتیں تھیں۔

ایک شام اچانک اُن میں تبدیلی آگئی۔ اس رات خلاف معمول انہوں نے عبادت بھی نہیں کی۔ انہوں نے دوسرے دن صبح سویرے پڑوس کی عمر رسیدہ عورتوں کو جمع کیا اور کہیں سے پرانا سا ڈھول تلاش کر کے ان سے مذہبی آیات زور زور سے سننے لگیں۔ وہ ڈھول کئی گھنٹوں تک خمیدہ اور لاغر ہاتھوں میں تھپکتا رہا۔ اور عورتیں مختلف مذہبی آیات گاتی رہیں۔ آخر کار ہمیں ہی ان کی شدید تھکن کا احساس دلا کر انہیں سب کچھ ختم کر دینے پر قائل کرنا پڑا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس دن دادی اماں نے عبادت نہیں کی تھی۔ اس سے اگلے روز ہمیں پتہ چلا کہ دادی اماں بیمار ہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق یہ ہلکا پھلکا میعادی بخار تھا جو چند روز میں خود بخود غائب ہو جائے گا۔ لیکن دادی اماں کے خیالات بالکل مختلف تھے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اب ان کے جانے کا وقت نزدیک آن پہنچا ہے اب وہ صرف چند گھنٹوں ہی کی مہمان ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی زندگی کا آخری باب ہمارے ساتھ گفتگو میں نہیں بلکہ مذہبی کتب پڑھنے میں گزارنا چاہتی تھیں۔

ہم نے اس بات پر بہت خفگی کا اظہار کیا لیکن دادی اماں نے ہماری ناراضگی کو نظر انداز کر دیا۔ وہ پُرسکون انداز میں اپنے بستر پر نیم دراز عبادت میں مصروف رہیں اور آیات پڑھتی رہیں۔ اچانک اس سے پہلے کہ ہمیں احساس ہوتا ان کے لبوں نے ہلنا بند کر دیا اور ان کی تسبیح بے جان انگلیوں سے چھوٹ کر سینے پر گر گئی۔ ان کے چہرے پر ایک نور چھایا ہوا تھا۔ ہمیں احساس ہو گیا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔

ہم نے انہیں بستر سے اٹھا کر فرش پر لٹا دیا اور رسم کے مطابق لال کفن سے اُن کا جسم ڈھانک دیا۔ ہم نے انہیں چند گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیا تاکہ ہم دفنانے کا انتظام کر سکیں۔ شام کے وقت ہم دوبارہ ایک اسٹریچر لیے ان کے کمرے میں داخل ہوئے تاکہ اس پر انہیں لٹا کر بحفاظت آخری آرام گاہ تک لے جا سکے۔ اس وقت ڈوبتے سورج کی سنہری چمکتی کرنیں ان کے پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جب ہم انہیں لٹا کر باہر آئے تو یک لخت ٹھٹھک کر رک گئے کیونکہ پورا آنگن ننھی منی ہزاروں چڑیوں سے بھرا ہوا تھا لیکن وہ سب کی سب خلاف معمول خاموش تھیں .... انتہائی خاموش۔ ایک کونے سے بھی چوں چوں کی آواز نہیں اٹھ رہی تھی۔ ہمیں چڑیوں کی یہ حالت دیکھ کر بہت رحم آیا۔ میری امی ان کے لیے ڈبل روٹی کے ٹکڑے لائیں اور دادی اماں کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے انہیں ڈالنے لگیں۔ ایک بھی چڑیا نے ان ٹکڑوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ جب دادی اماں کا اسٹریچر لے جانے لگے تو وہ ایک دم پھڑپھڑا کر خاموشی سے اڑ گئیں۔

دوسرے دن صبح سویرے ہمارے ملازم نے وہ سارے ڈبل روٹی کے ٹکڑے آنگن سے سمیٹ کر کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیے۔ ●

مجتبیٰ حسین
۲۰۰ انکور اپارٹمنٹس پٹ پڑ گنج
نئی دہلی

پھر وہی مسقط کے رات دن

صاحبو، ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء تک ہم نے ملکوں ملکوں کی خوب خاک چھانی۔ جاپان، یورپ، امریکا، کناڈا، روس، سعودی عرب، اور پاکستان نہ جانے کہاں کہاں گئے۔ لوگوں کو حسبِ توفیق گمراہ کرنے کے لیے ہم نے حسبِ عادت سفرنامے بھی لکھے جو خلافِ توقع مقبول بھی ہوئے۔ اس کے بعد ہم نے ملک سے باہر قدم نہیں نکالا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم میں اچانک "حب الوطنی" کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جو عمر کے تقاضے کی وجہ سے آدمی میں عموماً پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ملکوں ملکوں گھومنے کے بعد ہمیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انسان چاہے کسی بھی برّاعظم میں رہے، کم و بیش وہی حرکتیں کرتا ہے۔ تیسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ اردو کے ادیب ہونے کے ناتے ہم اس وقت تک رختِ سفر نہیں باندھتے جب تک کہ ہمارے اخراجاتِ سفر کوئی دوسرا برداشت نہ کرے۔ بیرونِ ملک کی بات تو چھوڑیے ہم اندرونِ ملک بھی (حیدرآباد کو چھوڑ کر) کسی اور شہر میں اپنے پلّے سے کرایہ ادا کر کے نہیں گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس عرصہ میں بیرونی ملکوں سے ہمارے لیے بلاوے نہیں آئے تھے۔ آئے تھے ضرور لیکن ہم نہیں گئے۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے ہی ملک کو "بیرونی ملک" بنانے کی کوشش کی جائے، یعنی اُسے بھی ترقی یافتہ بنا دیں مگر یہ کام بھی ہم سے نہ ہو سکا۔ ہم اکیلے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ مرزا غالب بھی عمر کے آخری حصّہ میں فرصت کے رات دن کے متلاشی رہتے تھے۔ تمھیں بھلے ہی فرصت نہ ملے مگر مسقط تو موجود ہے۔ وہیں چلے جاؤ۔ یوں بھی اب ہم آئے دن کے مسئلوں سے بیزار ہو چکے ہیں۔ آخر کہاں تک ان مسئلوں کا حل ڈھونڈتے پھریں۔ ہمارے وزیراعظم مسٹر نرسمہا راؤ ہی کو دیکھیے کہ جب بھی ملک کے مسئلوں سے تنگ آ جاتے ہیں تو کسی بیرونی سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ ان کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں کتنے مسئلے پیدا ہوئے اور انھوں نے کتنے بیرونی دورے کیے۔ تاہم وزیراعظم کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ مسئلے حل نہ کریں تو تب بھی بیرونی سفر پر جا سکتے ہیں۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جب تک بال بچوں کی ضروریات پوری نہ کریں، بجلی اور ٹیلی فون وغیرہ کا بل نہ ادا کریں، تب تک ملک سے تو کجا گھر سے باہر بھی قدم نہیں نکال سکتے۔

تاہم ادھر جب سے مسقط میں تیل دریافت ہوا ہے اور جب سے ہمارے دوست ہمایوں ظفر زیدی مسقط میں جا کر پھر سے آباد ہوئے ہیں تب سے ہمیں شبہہ سا ہونے لگا تھا کہ بڑے ہو کر ایک نہ ایک دن ہم مسقط ضرور جائیں گے۔ ہمایوں ظفر زیدی سے لگ بھگ بیس برس پہلے علی گڑھ میں ہماری

ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ علی گڑھ یونی ورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے انگریزی کے استادوں کی روایت کے مطابق انگریزی کے مقابلہ میں اردو کے معاملات سے زیادہ سروکار رکھتے تھے۔ یہ تو پتا نہیں کہ انگریزی میں شعر کہتے ہیں یا نہیں مگر ان کے اردو کے شعر تو خود ہم نے اپنے کانوں سے سنے اور آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اردو کے بہت اچھے شاعروں میں سے ہیں اس لیے کہ ہر کسی کو اپنے شعر نہیں سناتے۔ ہمارے پاس اچھا شاعر ہونے کی یہی کسوٹی ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں رہنے کے سوسو جتن کرتے ہیں۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ایلزبتھ ٹیلر نے جتنے شوہر بدلے ہیں ان سے کہیں زیادہ نوکریاں انھوں نے بدلی ہیں۔ کبھی ایک نوکری پر قانع نہیں رہے۔ ہمیں تو اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ پچھلے بیس برسوں میں کیا کیا کرتے رہے۔ البتہ پچھلے سات آٹھ برسوں میں وہ کئی بیرونی ملکوں میں رہے اور ماشاء اللہ پچھلے تین چار برسوں سے مسقط میں مقیم ہیں۔ ایک جگہ پر ٹک کر رہنے کا ان کا یہ سب سے لمبا ریکارڈ ہے۔ اس میں بھی خوبی ان کی نہیں مسقط کی نظر آتی ہے۔ اس عرصہ میں وہ جب بھی ہندستان آئے ہم سے خواہش کی کہ ہم مسقط ضرور آئیں۔ ادبی محفلیں سجانے کا انھیں بے حد شوق ہے چنانچہ مسقط میں بھی ایک ادبی انجمن قائم کر رکھی ہے۔ ہمیں عرصہ سے مسقط بلا رہے ہیں۔ ایک بار بلایا تو ہم نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ ہماری بجائے خوشونت سنگھ کو بلائیے۔ چنانچہ خوشونت سنگھ کو بلالیا۔ دوسری بار بلایا تو ہم نے ایک اور شخصیت کا نام تجویز کر دیا۔ انھیں بھی انھوں نے بلالیا۔ تیسری بار بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار بلایا تو کہنے لگے "اب شرعی اعتبار سے کوئی عذر قابل مسموع نہ ہوگا۔ اس بار آپ کسی کو قربانی کا بکرا نہیں بنائیں بلکہ خود قربان ہو جائیں گے"۔ سو اب ہم "قربان ہونے" کے لیے مسقط جا رہے ہیں۔ جہاں انھوں نے اردو مزاح نگاروں کی ایک محفل کا اہتمام کیا ہے جس میں ہندستان اور پاکستان کے چند منتخب مزاح نگاروں کو مدعو کر رکھا ہے"۔

پچھلے تین دہوں میں جب سے خلیجی ممالک میں تیل دریافت ہوا ہے تب سے ان ممالک کا جو فائدہ ہوا سو ہوا ہی ہے لیکن اردو کے ادیبوں اور بالخصوص شاعروں کا بھی خاصا فائدہ ہوا ہے۔ اب یہ مشاعرے پڑھنے کے لیے "پیلی بھیت"، اٹاوہ اور رام پور نہیں جاتے بلکہ سیدھے دوبئی، قطر، دمام، ابوظہبی، اور جدّہ وغیرہ جانے لگے ہیں۔ ماشاء اللہ اب تو اردو کے شاعر، مشاعروں کی تاریخوں اور ان سے ملنے والے معاوضوں کا حساب کتاب کمپیوٹر کی مدد سے رکھنے لگے ہیں۔ ہم نے اردو کے کئی شاعروں کے گلوں میں سونے کی زنجیریں بھی دیکھی ہیں جبکہ آزادی سے پہلے کے اردو شاعروں کے پاؤں میں لوہے کی زنجیریں ہوا کرتی تھیں۔ کپڑے بھی اب وہ ماشاء اللہ اچھے پہننے لگے ہیں اور ان کپڑوں پر اچھے اچھے سینٹوں کا چھڑکاؤ بھی کرنے لگے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں اردو شاعری نے بھلے ہی ترقی نہ کی ہو لیکن اردو کے شاعروں نے ضرور ترقی کی ہے۔ گویا اب ان کی پرسنالٹی نکل آئی ہے۔ ہم اردو کے ایک "خلیج یافتہ" شاعر سے واقف ہیں جو ہفتہ کے ساتوں دنوں میں وقت دیکھنے کے لیے سات مختلف گھڑیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پہلے بیڑی پیتے تھے (اور وہ بھی مانگ کر) لیکن اب ڈن ہل سے کمتر درجہ کا سگریٹ پینے پر راضی نہیں ہوتے۔ یہ سب خلیجی ممالک کی دین ہے۔ آج سے تیس برس پہلے تک خلیجی ممالک کے صحراؤں میں گمنام اور آوارہ ہواؤں کے جھکڑوں کی آوازوں کے علاوہ اللہ اکبر

اور اذانوں کی گونج تو سنائی دیتی تھی لیکن اب ماشاء اللہ مکرر ارشاد ہو، عطا ہو، توجہ چاہتا ہوں، ذرہ نوازی اور بندہ پروری کا شکریہ وغیرہ جیسے کلمات کی گونج بھی سنائی دینے لگی ہے۔ خلیجی ممالک میں جب سے اردو کی نئی بستیاں آباد ہوئی ہیں تب سے ہم ملک میں خلیجی ممالک سے تیل کو درآمد کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور شاعر حضرات اپنی شاعری کو "برآمد" کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم نے خلیجی ممالک کے بعض شاعروں کے ویڈیو کیسٹ دیکھے ہیں۔ ہماری ہی طرح کے مشاعرے ہوتے ہیں۔ صرف ایک کمی نظر آتی ہے اور وہ ہے "ہوٹنگ" کی۔ ان کیسٹوں میں خلیجی ممالک کے سامعین ایسے صابر و شاکر نظر آئے کہ بڑے سے بڑے شعر کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ پیسا ہو تو آدمی میں صدمہ کو جھیلنے کی سکت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ خلیجی ممالک کے سامعین اپنی جیب سے پیسا خرچ کر کے شعرا کو مدعو کرتے ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ "ہوٹنگ" کریں گے تو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی جو اردو کلچر انھیں میسر آیا ہے اور جس کے لیے وہ ترستے رہتے ہیں اس سے وہ محروم ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے بھی خلیجی ممالک کے مشاعرے، برے شاعروں کے لیے ایک نعمتِ مترقبہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

اب تو ماشاء اللہ خلیجی ممالک میں اردو شاعروں کے جشن بھی منائے جانے لگے ہیں۔ وطن عزیز میں تو اب اردو شاعروں کے جشن منانے کی روایت ختم سی ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ خلیجی ممالک میں جس اہتمام سے اردو شاعروں کے جشن منائے جانے لگے ہیں وہ اہتمام وطن میں کہاں سے میسر آئے گا۔ اب بڑی مشکل سے دو چار ہی ایسے نامور اور خوش قسمت شاعر باقی رہ گئے ہیں جن کے جشن خلیجی ممالک میں نہیں منائے گئے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ دو ایک برسوں میں یہ باقی ماندہ شاعر بھی خلیجی ممالک سے "جشن یافتہ" ہو کر نکلیں گے۔ اس کے بعد تیل تو ہوگا مگر جشن کے چراغوں میں روشنی نہ ہوگی۔

تاہم یہ غنیمت ہے کہ اردو کا بجھتا ہوا چراغ خلیجی ممالک کے تیل کی مدد سے پھر سے بھڑک اٹھا ہے۔ اب ہم مسقط جا رہے ہیں تو ہمیں احساس ہے کہ ہم اردو کی ایک نئی بستی کی طرف جا رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خلیجی ممالک میں اردو کی یہ نئی بستیاں اس وقت تک تو ضرور پھلیں پھولیں جب تک کہ ہم جیسوں کے بھی "جشن" کی باری نہ آجائے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جشن سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ، کل ہماری باری ہے

پرویز یداللہ مہدی
P.O.Box No. 633
UMM-AL-QUWAIN
(U.A.E)

نیا سال، نئی کار، نئی بیوی

طنز و مزاح

کسی زمانے میں پہیلیاں بوجھنا اور بوجھوانا وقت گزاری اور تفریح کا بہترین مشغلہ ہوا کرتا تھا چنانچہ بے ضرر اور بچکانہ پہیلیوں کے ساتھ ذومعنی اور سیکسی قسم کی پہیلیاں بھی لوگ بانگ دھڑ سے بوجھتے اور بوجھوایا کرتے، آخر الذکر پہیلیوں کو موضوع بنا کر بعد ازاں جنوبی ہند کے بیشتر فلم سازوں نے لاتعداد سیکسی فلمیں اور دادا کونڈکے اینڈ برادری نے ذومعنی مکالموں سے مزین فلموں کی لائن لگا کر سماج میں اپنی پوزیشن اور معاشرے میں آبروریزی، عصمت دری اور بلات کار جیسے جرائم کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ کیا، اس وقت ہمارا موضوع چونکہ فلم نہیں پہیلیاں ہیں اس لیے پہیلیوں کے بارے میں اتنا اور عرض کر دیں کہ پہیلیاں بوجھنے اور بوجھوانے کے لیے فرصت کے رات دن درکار ہوتے ہیں جبکہ دور حاضر میں رات اور دن تو وافر مقدار میں ہیں لیکن فرصت عنقا ہے بالخصوص بمبئی میں تو فرصت نے جیسے دائمی رخصت لے رکھی ہے، ایسے عالم میں پہیلیاں بوجھنے کے بجائے آدمی خود "بجھ" کے رہ جاتا ہے یعنی پہیلی بن جاتا ہے تاہم اہالیان بمبئی کے حوصلے، ہمت اور پامردی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کہ حالات کی حوصلہ شکن چکی میں مسلسل پسنے، مہنگائی کے پے بہ پے جھٹکوں سے جھوجھنے کے باوجود پہیلیاں بوجھنے بلکہ نت نئی پہیلیاں گھڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

ابھی پچھلے ہفتے کی بات ہے ہمارے نزدیک ترین پڑوسی شریمان قاسم بھائی حاتم بھائی رسی والا جو موقع محل کی مناسبت سے رسّی کو سانپ اور سانپ کو رسّی ثابت کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، حسب معمول سر راہ ہم سے ٹکرا گئے اور بڑے اصرار کے ساتھ بلکہ بہ زور دست و بازو ہمیں ہنکا کر قریبی ہوٹل میں چائے نوشی کی غرض سے لے گئے، موصوف کی جبریہ دعوت کی پیش کش پر ہی ہم سمجھ گئے کہ قاسم بھائی رسّی والا نے یقیناً کسی نئی پہیلی پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور اب اپنی طبع آزمائی کے نتیجے سے ہمیں از راہ کرم مستفیض فرمانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہوٹل میں قدم رنجہ فرماتے ہی موصوف نے پہلی سانس میں بیرے کو ایک عدد لمبا پانی چائے لانے کا آرڈر دیا، اور دوسری سانس میں موضوع سخن پر آ گئے۔ فرمایا "بات چاہے سیاست کی ہو یا سیکس کی معمے کی ہو یا پہیلی کی، آج جس کو دیکھو اس کو چبائے ہوئے نوالے چبانے کی لت پڑی ہوئی ہے کوئی بھی نئی بات، نئی پہیلی سوچنے کو تیار نہیں لیکن میں ہمیشہ پبلک سے ہٹ کے سوچتا ہوں ہٹ کے بات بولتا ہوں اس واسطے پول کے ہر وقت نئے نئے آئیڈیا نئی نئی پہیلیاں ڈھونڈ کے لاتا ہوں۔"

موصوف کی تمہید ختم ہوئی تھی کی چائے آگئی چنانچہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اصل موضوع پر اظہار خیال فرمایا "آپ تو بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اس واسطے بول کے بہت پہیلیاں بوجھے ہوں گے لیکن جو نئی پہیلی میں بنایا ہوں اس کو میرا کھلا چیلنج ہے کوئی بھی نہیں بوجھ سکتا، کاٹ کو بولے تو یہ کوئی ایسی ویسی آلتو فالتو پہیلی نہیں ہے، ایک جناور ایسا تھا جس کی دم پر پیسہ تھا یا ہری تھی من بھری تھی راجا جی کے باغ میں دوشالہ اوڑھے کھڑی تھی کے ماقسک ۔ یہ بہت دھانسو پہیلی ہے ایک دم گپت، ذرا دھیان سے سننے کا ۔ موصوف کی لفاظی نے ہمیں تجسس و تحیّر کی ایورسٹ پر پہنچا دیا تھا چنانچہ ہاتھ جوڑتے ہوئے انھیں فوراً پہیلی سنانے کا اشارہ کیا۔ بولے آپ بھی کیا یاد کریں گے، سنیے میری لیٹسٹ Latest پہیلی ۔ ایک مہمان ایسا نہ تو جس کی دُم پر پیسا، نہ آنگ کے اوپر دُشالہ، سال میں فقط ایک ہی وقت آتا اور پھر پورے ایک سال تک واپس نہیں جاتا، اب بولو کون ہے یہ مہمان ۔ ؟"

ہم نے حیرت سے کہا ۔ بڑا عجیب و غریب بلکہ ڈھیٹ مہمان ہے یہ، سال میں صرف ایک بار آتا ہے اور پورے ایک سال تک سر پہ سوار رہتا ہے، پھر بھی آپ اسے مہمان کہہ رہے ہیں، جناب مہمان ایک دن کا ہوتا ہے یا دو دن کا، تیسرے دن ہر مہمان شیطان ہو جاتا ہے پہلے آپ یہ وضاحت کیجیے کہ یہ مہمان ہے یا شیطان؟ مسکرا کر بولے ۔ مہمان بولو یا شیطان! مہنگائی میں دونوں برابر ہیں مگر میں جس مہمان کی بات کر رہا ہوں وہ مہمان نہیں کچھ اور ہے، اب اصلیت میں یہ کیا چیز ہے آپ کو بوجھنا ہے ۔

ہم نے جھنجھلا کر کہا ۔ ٹھیک ہے مگر پہلے آپ کچھ اتا پتا تو بتایئے کہ اس کا تعلق کس سے ہے کھانے کی چیز ہے پینے کی چیز ہے، اوڑھنے پہننے سے ہے ۔ "

فوراً ہماری بات کاٹ کر بولے ۔ یہ کھانے پینے اوڑھنے پہننے کی چیز نہیں بلکہ بھگتنے کی چیز ہے اس کو امیر غریب، چھوٹا بڑا، کالا گورا ہر کوئی بھگتتا ہے اور پورے ایک سال تک بھگتتا ہے بڑی ظالم چیز ہے یہ ۔

ہم نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "یہ آتا کب ہے؟ اس کے آنے کا کوئی خاص وقت مقرر ہے یا جب جی چاہے منہ اٹھائے چلا آتا ہے"۔

بولے ۔ اس کے آنے کا وقت بھی مقرر ہے اور جانے کا بھی! یہ دن کے وقت کبھی نہیں آتا، ہمیشہ رات کے وقت آتا ہے چوروں کی طرح، پھر بھی امیر لوگ بڑے بڑے ہوٹل، بڑے بڑے کلب میں جا کر اس کا سواگت کرتے ہیں اور جو غریب اور مڈل کلاس لوگ ہوٹلوں اور کلبوں میں جا کر اس کا سواگت نہیں کر سکتے وہ دور درشن کے اوپر اس کا دیدار کر کے خوش ہو لیتے ہیں، اب بولیے یہ کون ہے ۔؟

عرض کیا ۔ یہ وہ مہمان ہے جس کے آنے پر لوگ باگ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں یہ کہہ کر، نیا سال مبارک " Happy New Year "

نیا سال منانے کا چونچلا سب سے پہلے کہاں اور کب شروع ہوا! اس کا سہرا کس قوم کے

سر بند ھتا ہے اس پر صرف وہی اصحاب باکمال بلکہ آزاد خیال ہی کھل کر روشنی ڈال سکتے ہیں جو کپڑوں کی طرح بیویاں اور بیویوں کی طرح کپڑے بدلنے میں مہارت رکھتے ہیں، کیونکہ دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے چندہ نمایندوں کا متفقہ خیال ہے کہ نئے سال کا صحیح لطف اسی وقت آتا ہے جب سال کے سال کم سے کم دو نئی چیزیں آدمی کی دسترس میں ہوں ایک کار، دوسرے بیوی، جبکہ اس سلسلے میں ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ سوسائٹی نے ان عالی مرتبت نمایندوں کو حالات حاضرہ کے پیش نظر اپنے اس خیال میں تھوڑی سی ترمیم کر لینا چاہیے کہ فی زمانہ جہاں تک کاروں کا تعلق ہے نت نئے ماڈل اور نت نئی ڈیزائن کی ہزارہا کاریں نیشنل اور انٹرنیشنل ہر مارکیٹ میں ہمہ وقت دستیاب ہیں نتیجتاً صاحب زر حضرات جب چاہیں —— پھینک کر کسی بھی برانڈ نیو Brand New کار کے بلا شرکت غیرے مالک بن سکتے ہیں لیکن جہاں تک نت نئی بیویوں کا سوال ہے اتفاق سے اعلا سوسائٹی میں برسوں سے "چھوڑ پکڑ" کی لعنت چونکہ عام ہے اس لیے شادی کی منڈی میں نت نئی بیویوں کی شدید قلت ہے چنانچہ بیویوں کے باب میں او نچے طبقے کے ماڈرن مردوں کے سامنے سوائے سمجھوتے اور مصالحت کے کوئی چارہ نہیں تاہم نئے سال کی خوشی میں سکنڈ ہینڈ بیوی کا ہاتھ پکڑتے وقت محض اس تصور کے سہارے دل کو بہلایا جا سکتا ہے کہ سیکنڈ ہینڈ بیوی صرف اپنے سابق شوہر کے حق میں پرانی ہوتی ہے دیگر حاضرین ناظرین بلکہ غائبین کے حق میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو ہوتی ہے غالباً یہ اسی بہلاوے کا نتیجہ ہے جو اونچی سوسائٹی کے اعلا طبقے میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا ہے کہ نئے سال، نئی کار، اور نئی بیوی کا مثلث سال نو کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے حالانکہ نتیجہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی تین مختلف اشیاء کی تثلیث لطف و انبساط کو دوبالا نہیں سہ بالا کر دیتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ جو لوگ پرانی کار، پرانی موٹر سائکل، پرانی سائکل اور پرانی بیوی کے ساتھ نئے سال میں قدم رکھتے ہیں سال نو کی خوشیوں پر ان کا کوئی حق نہیں ہوتا، ہوتا ہے لیکن ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور بڑے بڑے غم آپس میں اس قدر مدغم ہوتے ہیں کہ موقع چاہے خوشی کا ہو یا غم کا، ان کی آنکھیں چھلک اٹھتی ہیں اور یہ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہ آنسو خوشی کے ہیں یا غم کے، چنانچہ سال نو کے موقع پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نچلے اور متوسط طبقے کی آنکھیں نئے سال کے ساتھ نئی آس نئی اُمید، نئے حالات کے خوش آیند تصور سے بھر آتی ہیں یا بعد خرابیٔ بسیار گذشتہ سال کی رخصتی کے خیال سے چھلک پڑتی ہیں کہ دیکو کسی طرح سال کٹا، بہت بڑا پاپ کٹا۔ ویسے بھی مہمان چاہے جاندار ہو یا بے جان یا بلائے جان، اس کی آمد پر اُسے خوش آمدید کہنا ہے۔

رسم دنیا بھی ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے

چنانچہ ترقی یافتہ قومیں شور شرابے، ڈھول تماشے، باجے گاجے، دھوم دھڑلکے کے ساتھ سال نو کا استقبال کرتی ہیں اور ترقی پذیر قومیں بادل ناخواستہ ہی سہی آگے بڑھ کر نئے سال کی پیشوائی کرتی ہیں کہ تیسری دنیا کے باشندوں میں آنے والے کے قدم لینے اور جانے والے کو دعا دینے کی رسم عام ہے لہذا صرف سال نو کے موقع پر تمام اقوام عالم ایک ہی پلیٹ فارم پر پہنچ جاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ اس موقع پر بھی ان کے نظریات، احساسات اور جذبات ایک

دوسرے سے قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ ان معنیٰ میں کہ کچھ قومیں جہاں نئے سال کی آؤ بھگت کرتی ہیں وہیں کچھ اقوام جانے والے سال کو جاؤ بھگت کہنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیتی ہیں، غالباً یہ اسی نظریاتی تضاد کا نتیجہ ہے کہ عین نئے سال کی آمد اور پرانے سال کی وداعی کے وقت تمام روشنیاں چند لمحوں کے لیے گل کر دی جاتی ہیں اور جب روشنیاں دوبارہ جگمگاتی ہیں تب نہ صرف یہ کہ سال بدل جاتا ہے بلکہ فلور پر رقص کرتے ہوئے بہتیرے جوڑوں کے پارٹنر بھی بدل جاتے ہیں یعنی اس کی ٹوپی اس کے سر، اور اس کی بیوی اس کے بازوؤں میں پہنچ جاتی ہے بہر حال جوڑوں کی یہ ادلا بدلی نئے سال اور پرانے سال کی یہ آؤ بھگت اور جاؤ بھگت کے مظاہرے صرف سال نو کے موقع پر دیکھنے کو ملتے ہیں غالباً ایسے ہی کسی موقعے کے لیے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

اوصاف احمد
پوسٹ بکس نمبر ۹۲۰۱
جدّہ ۲۱۴۱۳، سعودی عربیہ

جمیل مہدی

کچھ باتیں کچھ یادیں

مقام : لکھنؤ
زمانہ : ۱۹۶۷ء کا کوئی مہینہ
منظر : لکھنؤ سے شائع ہونے والے ایک اردو اخبار کا دفتر۔ دروازے سے اندر داخل ہوں تو سامنے ایک لمبی سی میز بچھی ہوئی نظر آتی ہے جس پر کاغذات اور پرانے رسالوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ دروازے کے رُخ پر میز کے سامنے ایک ادھیڑ عمر آدمی، سفید قمیص پاجامے میں ملبوس، کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہوا کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ پاس ہی ایک دبلا پتلا نوجوان، بیس اکیس سال کی عمر، قمیص اور پتلون پہنے ہوئے انگریزی سے اردو میں خبروں کا ترجمہ کر رہا ہے۔

ایک ریش دراز بزرگ داخل ہوتے ہیں "السلام علیکم"، کی آواز گونجتی ہے۔
"قبلہ اڈیٹر صاحب تشریف رکھتے ہیں ؟"
"جی ہاں" ادھیڑ عمر شخص بغیر نظریں اٹھائے ہوئے جواب دیتا ہے۔ لکھنے کا عمل بدستور جاری ہے۔
"کہاں ہیں ۔؟"
"یہ کیا بیٹھے ہوئے ہیں" اس شخص نے قریب بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔
"جی ؟" بزرگ متعجبانہ لہجہ میں بولے۔
"جی!" ان کا جواب مختصر تھا۔
"آپ کی تعریف" اب بزرگ نے براہ راست حملہ کیا۔
"جی۔ میں ان کا اسسٹنٹ لگا ہوا ہوں" ادھیڑ عمر شخص نے نوجوان کی جانب پھر اشارہ کیا۔ زیر لب مسکرائے اور دفتر قہقہوں سے گونج اٹھا۔ باریش بزرگ جو مراسلہ چھپوانے کے لیے آئے تھے۔ شرمندہ ہو کر رہ گئے۔

ناظرین باتمکین :
آپ کچھ سمجھے بھی کہ یہ ادھیڑ عمر اور نوجوان شخص کون ہیں۔ ادھیڑ عمر شخص جو کرسی پر اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے، اردو کے مشہور صحافی جمیل مہدی تھے اور نوجوان شخص آپ کا یہ ہی مضمون نگار جو آج خود ادھیڑ عمر کو پہنچ کر، اپنی یادوں کے چراغ روشن کرنے بیٹھا ہے اور آپ کو ایک بھولی بسری کہانی سنانا چاہتا

ہے۔ جمیل مہدی کون تھے۔ کیا تھے۔ میں نے انھیں کس حال میں دیکھا اور کیا پایا۔ ان سوالوں کے جواب کے لیے بات ذرا دور سے شروع کرنا پڑے گی۔

ابھی آپ میں شاید ایسے اصحاب موجود ہوں جنھیں یاد ہو کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں ہندستان میں فسادات کی ایک بھیانک لہر اٹھ کھڑی ہوئی تھی جن میں جبل پور اور کلکتہ کے فسادات خاص طور پر شدید اور خوں ریز تھے۔ اس وقت تک مسلم قیادت اتنی بانجھ نہ ہوئی تھی جتنی کہ اب ہے۔ ڈاکٹر سید محمود اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی حیات تھے، مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ فسادات کے زہر سے معمور اس فضا کو بدلنے کے لیے ڈاکٹر سید محمود، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا ابواللیث ندوی، مولانا محمد اسمٰعیل، سلیمان سیٹھ وغیرہ نے مختلف مسلم جماعتوں کے زعماء اور اکابر کے ساتھ مل کر مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی جس نے مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا کر دیا تھا۔ آزادی کے بعد مسلم جماعتیں پہلی بار منظم ہو رہی تھیں اور اس بار ان کا نقطۂ نظر زیادہ تعمیری تھا۔

اسی درمیان ۱۹۶۷ء کے انتخابات آگئے۔ اتر پردیش جو عرف عام میں یوپی کہلاتا ہے ہندستانی مسلمانوں کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں نہ صرف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے بلکہ اس علاقے نے ہندستانی مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی زندگی میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلم مجلس مشاورت کے قیام کے بعد یوپی میں اس کی ذمے داری ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کو سونپی گئی جو اس وقت کی مسلم سیاست میں تیزی سے نمایاں ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر فریدی ایک خوبصورت، دلکش، اور دلنواز شخصیت کے حامل تھے، علم طب میں ان کا مقام تھا اور وہ یوپی کے چند نامور اطبا میں سے ایک تھے لیکن ان کا تعلق طبقۂ اشرافیہ سے تھا اور ان کے قدم سیاست کے خارزاروں میں بھٹکنے کے لیے نہ بنے تھے۔ بامقصد سیاست کے لیے جس منصوبہ سازی، ہوش مندی، مستقل مزاجی اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے مزاج کا جز نہ تھی وہ شعلۂ مستعجل کی طرح بھڑک اٹھتے تھے اور یہ آگ بسا اوقات اسی تیزی سے ٹھنڈی ہو جاتی تھی جس تیزی سے بھڑکی تھی۔ حضرت گنج میں ان کا مطب ایک وسیع عمارت میں تھا جو غالباً ان کی ہی ملکیت میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی پریکٹس خاصی تھی۔ وہ صبح سے دوپہر اور پھر شام کو مریضوں کو دیکھتے۔ ان کی سیاست اس خالی وقت کا مشغلہ تھی جو مطب کے اوقات سے بچ جاتا۔ مریضوں کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے رٹائرنگ روم میں تشریف لاتے تو چائے اور مصاحبین دونوں تیار ہوتے۔ اسی خالی وقت میں ملت کے درد کا درماں تلاش کیا جاتا، نئی انجمنیں تشکیل پاتیں، یوپی کی سیاست پر بحث ہوتی، سی بی گپتا اور تریوکی سنگھ کی چالوں پر غور ہوتا اور چائے کے ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنی کار میں تشریف لے جاتے اور اللہ اللہ خیر صلا۔

جب یوپی مسلم مجلس مشاورت کی باگ ڈور ڈاکٹر فریدی کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے یکے بعد دیگرے مختلف سیاسی پینترے بازیوں کے ذریعے مشاورت کا ملحقہ حذف کر دیا اور باقی ماندہ مسلم مجلس کو ایک نیم سیاسی پارٹی کی شکل دے دی۔ مجلس مشاورت جو برادران وطن کے درمیان ہندو مسلم مفاہمت کا کام کرنے اٹھی تھی اور جس نے اسلام کے عالم گیر انسانی پیغام کو، امن، سلامتی اور رواداری کی روشنی کو دوسروں تک پہنچانے کا عزم کیا تھا، اپنے مقصد اور طریق عمل میں ناکامی ہوئی تو اس میں مسلم مجلس، اس کی سیاسی طاقت آزمائیوں اور محاذ آرائیوں کے شوق کا بھی بڑی حد تک دخل تھا۔

۱۹۶۶ء کے جاڑوں کی شروعات تھی۔ اب تو یاد نہیں کہ کس نے بتایا تھا لیکن ہم نے کسی سے سُن لیا کہ مجلس مشاورت کی جانب سے لکھنؤ میں ایک اردو روزنامہ نکالے جانے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ کچھ اور تفتیش پر پتا چلا کہ حاجی شفیق الرحمٰن ایڈوکیٹ کی کوٹھی واقع گوئن روڈ پر اخبار میں ملازمت کے لیے درخواستیں لی جا رہی ہیں۔ ہم اس زمانے میں لکھنؤ یونی ورسٹی میں بی اے۔ سال اوّل کے طالب علم تھے اور مرورِ زمانہ سے مجبور ہو کر گھر گھر ٹیوشن پڑھاتے پھرتے تھے۔ چنانچہ ہم نے بھی ایک سادے کاغذ پر عرضی تحریر کی اور حاجی صاحب کی کوٹھی پر دے آئے۔ جیسے پندرہ دن بعد یونی ورسٹی میں منظر سلیم مل گئے جو ان دنوں اردو میں ایم۔ اے کر رہے تھے۔

"ارے بھائی۔ ارے بھائی تم یہاں کہاں گھوم رہے ہو۔ تمہارا تقرر تو قائد اخبار میں ہو گیا ہے۔"

تب ہمیں معلوم ہوا کہ مجوزہ اخبار کا نام قائد رکھا گیا ہے۔ کسی کا ذہن اس طرف نہیں گیا کہ اس کی نسبت "قائداعظم" کی طرف جا سکتی ہے لیکن بعد میں (آں جہانی) جن سنگھ کے نکتہ دانوں نے یہی نکتہ پیدا کیا۔ خیر منظر سلیم صاحب نے جو خود قومی آواز میں ملازم تھے ہمیں آگاہ کیا کہ اگر ملازمت چاہیے تو شام کو راج پارک ویو ہوٹل (واقع امین آباد) میں پہنچ جاؤں جہاں قائد کا عارضی دفتر قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم پہنچ گئے لیکن یا منظر العجائب۔ وہاں اخبار تو کیا اخبار کا ٹکڑا بھی نظر نہیں آیا۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔ وہ سناٹا ہے کہ آواز نہیں آتی۔

کئی گھنٹے کی تگ و دو کے بعد معلوم ہوا کہ عارضی دفتر حاجی اکرام احمد صاحب کی کوٹھی واقع راجا کی بازار میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ خیر صاحب۔ یہ بندۂ ناچیز، افتاں و خیزاں منزلیں مارتا امین آباد سے راجہ کی بازار پہنچا اور سیدھے دفتر میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں کئی شکلیں جانی پہچانی نظر آئیں۔ احمد ابراہیم علوی، وقار رومانی شوکت عمر، محمود فیضی، اور ناچیز راقم الحروف، ادارتی اسٹاف میں تھے۔ بھوپال سے روزنامہ "انکار" کے مدیر اشتیاق عارف چیف اڈیٹر بنا کر بلائے گئے تھے۔ غرض کہ ان تیاریوں کے بعد دوسرے روز صبح روزنامہ "قائد" کا پہلا شمارہ عالم وجود میں آیا۔

اردو صحافت اور ہندستانی مسلم تہذیب میں اخبار اور اس کے متعلقات کو ایک رومانوی حیثیت حاصل رہی ہے۔ صحافت کو ایک طرح سے عبادت سمجھا جاتا رہا ہے۔ صحافت کا یہ تصور عام کرنے میں الہلال، البلاغ اور ہمدرد جیسے اخبارات اس طرح پیش پیش رہے ہیں کہ اخبارات کا تجارتی اور معاشی پہلو پس پشت پڑ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری صنعتوں کی طرح اخبار بھی ایک صنعت ہے جس طرح دوسرے کاروباروں کو نفع بخش بنانے کے لیے کاروباری ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اخبار کو منفعت بخش بنانے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے بھی کاروباری ہنرمندی درکار ہے۔ اتفاق سے روزنامہ قائد کا کاروباری پہلو بہت کمزور تھا اس کا مقابلہ ایک طرف تو قومی آواز سے تھا جس کی پشت پر کانگریس پارٹی کے بے پناہ وسائل اور نیشنل ہیرالڈ کی بنیادی سہولتیں موجود تھیں۔ تو دوسری طرف سیاست جدید (کانپور) غیر کانگریسی مسلمانوں کی جذباتی فضا سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ قائد اخبار، ان دونوں اخبارو کے درمیان اپنی جگہ نہیں بنا سکا۔ ایک بزنس منیجر مقرر کیے گئے۔ وہ جلد ہی ہٹا دیے گئے۔ انھیں دنوں ایک صاحب مسمّی مجتبیٰ صدیقی آئی۔ اے۔ ایس (اب مرحوم) جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ جس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں نواب علی یاور جنگ کے خلاف ہنگامہ ہوا مجتبیٰ صدیقی صاحب رجسٹرار تھے اور

اسی سلسلے میں معتوب ہو کر داخلِ زنداں ہوئے۔ اب رہائی کے بعد وہ ڈاکٹر فریدی اور حاجی شفیق الرحمٰن کے ساتھیوں میں شامل ہو گئے جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی بازیابی کی تحریک میں سرگرم تھے۔ بزنس منیجر مذکور کی برطرفی کے بعد مجتبیٰ صدیقی صاحب اخبار کے ایڈمنسٹریٹر مقرر کیے گئے۔ انھوں نے اخبار کے دفتر کو بھی ڈپٹی کلکٹر کا دفتر یا رجسٹرار آفس سمجھ کر اپنا انتظام و انصرام شروع کیا۔ ادارتی پالیسیوں سے لے کر خبروں کے ترجمے تک، اور ایجنٹوں کی تقرری سے لے کر اخبار کی فروخت تک ہر معاملے میں وہ دخیل تھے اور یہ دخل ٹکنوکریٹ کا نہیں بیوروکریٹ کا تھا۔ چنانچہ اشتیاق عارف صاحب اس فضا کو بہت دن جھیل نہیں پائے اور بھوپال واپس چلے گئے۔

اشتیاق عارف کی روانگی کے بعد مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ اداریہ کون لکھے۔ ہم سب نوجوان صحافی تو نوسکھیے تھے اور کسی اخبار میں کام کرنے کا پہلا تجربہ تھا اس لیے ہم میں سے کسی پر یہ ذمے داری نہیں ڈالی جا سکتی تھی اس لیے قرعۂ فال نکلا حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی کے نام حکیم صاحب مشہور اردو ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کے بھتیجے اور داماد تھے جن کے بارے میں ایک بار جمیل مہدی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مولانا ماجد دریابادی نے ادب و صحافت کو چھوڑ کر رشد و ہدایت کا منصب سنبھال لیا ہے حکیم عبدالقوی صاحب اس وقت روزنامہ "سیاست جدید،، (کانپور) کے لیے ہبے نامی اداریے،، لکھا کرتے تھے چنانچہ اب اس میں ایک اور اداریے کا اضافہ ہو گیا دو روزناموں کے لیے اداریے لکھنے کے ساتھ ساتھ حکیم صاحب مطب بھی کرتے اور اپنے چچا مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفتہ واری اخبار "صدق جدید،، کی انتظامی ذمے داریاں بھی سنبھالتے۔ چنانچہ ان کے پاس قائد کے دیگر امور کی نگرانی کے لیے ذرا کم ہی وقت بچتا۔ وہ دن میں گیارہ بجے کے آس پاس دفتر تشریف لاتے اور ایک دو گھنٹہ گزار کر چلے جاتے۔ اس درمیان قائد کا دفتر اکرام صاحب کی کوٹھی سے ڈاکٹر فریدی کے مطب کی بالائی منزل میں منتقل ہو چکا تھا۔ شوکت عمر، احمد ابراہیم علوی اور وقار رومانی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ ادارتی اسٹاف میں کل ملا کر دو آدمی بچے۔ دن کی شفٹ میں محمد محمود فیضی جو اب ماشاء اللہ ڈاکٹر محمود فیضی ہیں اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ سیاسیات میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہیں۔ رات کی شفٹ میں یہ سطور نویس۔ اخبار کسی نہ کسی طرح لشتم پشتم چل رہا تھا۔ یہ فضا تھی جب جمیل مہدی دیوبند سے لکھنؤ تشریف لائے اور پھر بہ تدریج انھوں نے قائد کی ادارتی ذمے داریاں سنبھالیں، خود جمیل مہدی کے الفاظ میں:

"۶۲ء سے ۶۶ء تک کا زمانہ مکمل تعطل اور بے دلی کی حالت میں بسر ہوا لکھنے پڑھنے سے ایک طرح کی وحشت ہونے لگی تھی لیکن پھر حسب معمول، مرضی اور خواہش کے خلاف ایک ناگہانی واقعہ نے ساری بے کیفی اور بد دلی کو ختم کر کے نئے سرے سے سرگرم عمل ہونے پر مجبور کیا۔۔۔۔ کیا ڈاکٹر فریدی مرحوم کے پیہم اصرار اور مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم کی مسلسل مساعی کے بدولت اپنی مرضی اور خواہش کے برخلاف ۶۷ء میں لکھنؤ آنا پڑا اور ایک سال یا اس سے کچھ زائد مدت تک روزنامہ "قائد" کی ادارت کی ذمے داریاں سنبھالنا پڑیں۔ لکھنؤ ایسی جگہ تھی جہاں قیام کا تصور تک

کبھی زندگی میں نہ آیا تھا۔ نہ ہی طبیعت کو اس شہر سے کوئی مناسبت تھی۔اس پر قائد
اخبار کے حالات مستزاد جو یوپی مسلم مجلس مشاورت کا آرگن ہونے کے باوجود
مجھ سے پہلے ایک بے سمت اخبار کی طرح شائع ہو رہا تھا۔"

جمیل مہدی دیوبند کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مفتی مہدی حسن، دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے متعلق تھے۔ مہدی حسن صاحب کو ہم نے دیکھا ہے۔ ایک بار اس زمانے میں ہی لکھنؤ تشریف لائے تھے جب جمیل صاحب قائد اخبار سے متعلق تھے۔ دفتر کے باہری کمرے میں ایک چارپائی پر بستر لگوادیا گیا تھا جس پر مفتی صاحب دراز تھے۔ خاصا لانبا قد، دُبلے پتلے، سفید براق داڑھی، جمیل صاحب چارپائی پر پائتانے بیٹھے پیر دبا رہے تھے۔ میں دفتر میں داخل ہونے لگا تو آواز دے کر پکارا، اپنے والد سے ملاقات کرائی۔ اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا۔ انھوں نے دعا دی۔ اللہ دونوں باپ بیٹوں کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ اب نہ اس طرح کے باپ پیدا ہوتے ہیں نہ بیٹے۔ خود ہماری آنکھوں کے سامنے زمانہ کیا سے کیا ہوگیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

جمیل مہدی کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ گہرا تھا۔ ان کی نظر تیز اور یادداشت غیر معمولی تھی۔ ۳۰ء اور ۴۰ء کی دہائیاں جب ان کے ذہن کی تشکیل ہو رہی تھی، ہندستان کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ علم کی اس شاخ کے پروردہ تھے جس کی نمایندگی دارالعلوم دیوبند کرتا ہے جس کے مطابق علم کتابی نہیں سماعی ہوتا ہے اور جس میں نصاب سے زیادہ فیضان کی کرامت ظاہر ہوتی ہے۔ جمیل مہدی نے گوکہ رسمی طور پر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن دارالعلوم کے تمام اہم استادوں سے کسب فیض کے مواقع انھیں حاصل رہے۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا انورشاہ کشمیری، مولانا محمد طیب قاسمی، علامہ ابراہیم بلیاوی، علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ شامل تھے مولانا سندھی سے اپنے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مجھے مولانا سندھی نے حجۃ البالغہ سبقاً سبقاً اس وقت پڑھانی شروع کی جب میں عربی کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا اور جو کچھ وہ کہتے تھے اسے سمجھنے کی استعداد میرے اندر نہ تھی لیکن آگے چل کر کان میں پڑے ہوئے وہ تمام الفاظ نہ صرف روشن ہوئے بلکہ آگے کی راہ کے لیے مشعل ہدایت بھی ہوئے۔۔۔۔۔"

ان لوگوں کے بارے میں ہزاروں باتیں ان کی نوک زبان پر رہتی تھیں۔ علامہ ابراہیم بلیاوی دارالعلوم میں فلسفہ، منطق اور فقہ کے استاد تھے۔ ان کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ جمیل مہدی نے سنایا تھا۔ ایک بار جمیل صاحب کوئی مسئلہ دریافت کرنے علامہ ابراہیم بلیاوی کے پاس گئے۔ علامہ نے سرسری سا جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی۔ جمیل صاحب نے کہا "دیکھیے مولانا، بتانا ہے تو مسئلہ ٹھیک سے سمجھا دیجیے ورنہ کہہ دیجیے کہ نہیں بتائیں گے۔" علامہ بولے "میاں، تمھیں زیادہ ضرورت ہوا کرے تو زیادہ پوچھا کرو۔ ہم کم بولتے ہیں بوجہ کاہلی کے۔"

انھیں ذاتی تعلقات کے باعث، اسلام اور اسلامی تاریخ کے بارے میں ان کا علم کتابی کم اور عملی زیادہ تھا ورنہ ان کی زندگی کی ابتدا شعر و ادب سے ہوئی تھی۔ بیس برس کی عمر تک حالی، شبلی

نذیر احمد، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، مرزا رسوا، شرر، پریم چند، اور پنڈت سدرشن کی تمام "مکمل اور معتبر" تحریریں پڑھ چکے تھے۔ ابتدا افسانہ نگاری سے کی، پہلا افسانہ "شاعر" میں شائع ہوا۔ جو اس زمانے میں آگرہ سے شائع ہوتا تھا۔

"شاعر" سے جمیل مہدی کے ادبی تعلقات ایسے استوار ہوئے کہ سیماب اکبر آبادی کی پاکستان ہجرت کے بعد جب ۵۱ء میں "شاعر" آگرہ سے بمبئی منتقل ہوا تو جمیل مہدی، اعجاز صدیقی کے ساتھ "شاعر" کے شریک مدیر کی حیثیت سے بمبئی چلے گئے۔ اس زمانے میں ان کے تعلقات بمبئی میں مقیم ادبی، اور فلمی شخصیتوں کے ساتھ رہے ان میں گیت کار شکیل بدایونی، موسیقار نوشاد، اور فلم ڈائرکٹر محبوب خاں کا تذکرہ تحسین و توصیف کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ شکیل بدایونی کی وفات پر انھوں نے پُر اثر مضمون بھی لکھا تھا۔ اس زمانے میں ہم فلمیں نہیں دیکھا کرتے تھے بوجہ تنگ دستی، جمیل مہدی نے اصرار کرکے مجھے "مدر انڈیا" اور "طوفان اور دیا" نامی فلمیں دکھائیں اور بہ حیثیت ایک آرٹ کے، فلم شناسی کے فن سے روشناس کرایا۔

اپنے بمبئی کے قیام کے بارے میں جمیل مہدی خود لکھتے ہیں:

"بمبئی کا قیام اس لحاظ سے یادگار اور فیصلہ کن ثابت ہوا کہ اسی دوران مشغولیتوں، اور مصروفیتوں کا میدان بالکل دوسرا ہوگیا۔ اور ادبی، شعری، اور مذہبی موضوعات کے بجائے ساری توجہ سیاسی موضوعات کی طرف ہوگئی۔ اس تبدیلی کا سبب روزنامہ "جمہوریت"، کے ادارے میں شمولیت تھی۔ اور وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ اخبار کے مدیر مولانا حامد الانصاری غازی۔ اچانک بیمار ہوگئے اور انھوں نے اپنے اصرار کے ذریعہ مجبور کر دیا کہ میں ان کی جگہ ادارتی تحریر کے کام کو سنبھال لوں۔ مولانا حامد الانصاری مشہور انقلابی اور تحریک ریشمی رومال کے ہیرو مولانا منصور انصاری کے صاحبزادے اور مولانا قاری محمد طیب قاسمی کے داماد تھے۔ اس لیے ان کے اصرار کی مزاحمت میرے لیے ممکن ہی نہ تھی۔"

بمبئی میں ان کا قیام ۷۵ء تک رہا۔ اس کے بعد دیوبند واپس آگئے اور اس وقت تک وہاں مقیم رہے کہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، انھیں قائد کا مدیر بنا کر لکھنؤ لے آئے۔

جمیل مہدی بہت سادہ لباس پہنتے تھے۔ ۱۹۶۷ء سے لے کر ان کے انتقال کے وقت میں نے انھیں قمیص اور پاجامے کے سوا کسی دوسرے لباس میں نہیں دیکھا۔ یہ سادگی ان کے طرز زندگی میں بھی تھی اور برتاؤ میں بھی، ان کی شخصیت کا جادو آہستہ آہستہ کھلتا تھا۔ وہ خود پہلی ملاقات میں کسی سے نہ کھلتے تھے بلکہ ملاقات کو رواروی میں نبٹا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ جس کا اندازہ اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں بیان کردہ واقعہ سے ہوا ہوگا۔

جب جمیل مہدی روزنامہ قائد کی ذمہ داریاں سنبھالنے لکھنؤ تشریف لائے تو ابتدائی زمانے میں ہی میں نے ان سے پوچھا کہ وہ دیوبند میں کیا کیا کرتے تھے بولے "کچھ نہیں"، میں نے کہا آخر کچھ تو کرتے

رہے ہوں گے۔ بڑی سنجیدگی سے بولے "کبوتر اُڑایا کرتا تھا۔" میں سمجھا کہ حضرت مجھے اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن بعد میں پتا چلا کہ ان کا یہ بیان حقیقت بیانی پر مشتمل تھا اور اس کا سبب بے دلی، بے حسی، اور تعطل کی وہ کیفیت تھی کہ لکھنے پڑھنے سے انھیں وحشت ہونے لگی تھی۔ روزنامہ قائد میں آنے کے بعد بھی کئی ہفتہ تک انھوں نے اپنا طرز عمل بہت پیچھے پُردوں میں رکھا۔ بس خبریں بناتے رہتے اور حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے۔ حکیم عبدالقوی دریابادی اپنی گنجلک اردو میں بدستور اداریہ لکھتے رہے۔ پھر ایک دن مجتبیٰ صدیقی (مرحوم) آئی۔ اے۔ ایس سابق رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایڈمنسٹریٹر اخبار قائد نے کسی خبر یا شذرے کے بارے میں انھیں ایک نوٹ بھیجا۔ یہ نوٹ چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر لکھے ہوتے تھے۔ جمیل صاحب کو جب یہ نوٹ دیا گیا تو انھوں نے اسے ایک نظر دیکھا اور لانے والے کے سامنے ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ چپراسی پر تو بجلی گر پڑی۔ اور سارے دفتر میں سناٹا چھا گیا۔ "صدیقی صاحب کا نوٹ پھاڑ دیا؟" چپراسی بولا۔ "تو کیا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالوں؟" جمیل صاحب کا جواب تھا۔ ان کے اس عمل نے اسٹاف کی نگاہ میں ان کی شخصیت کو درجۂ اعتبار دے دیا۔ اور اس کے بعد کے مرحلے آسان ہو گئے۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اداریہ لکھنے کا کام حکیم عبدالقوی سے لے کر جمیل مہدی کو دے دیا گیا جس دن جمیل مہدی نے روزنامہ "قائد" کا پہلا اداریہ لکھا اس دن سارے شہر لکھنؤ میں ہلچل مچ گئی۔ پہلی بار یہ ہوا کہ شہر کے بازاروں میں لوگ قائد اخبار کی کاپیاں ڈھونڈ رہے تھے اور اخبار نہیں مل رہا تھا۔ اس کا بھی ایک سبب تھا۔ لکھنؤ میں اردو کا ایک ہی اخبار تھا۔ قومی آواز۔ اس کے اڈیٹر تھے جناب حیات اللہ انصاری، جو خود تو اردو کے ایک صاحب طرز ادیب اور افسانہ نگار تھے لیکن اپنی کانگریس نوازی اور حکومت پرستی میں بہت آگے بڑھے ہوئے تھے۔ تاہم انھوں نے اخبار نویسی کا ایک اعلا معیار قائم کر رکھا تھا۔ منظر سلیم، مسیح الحسن رضوی، مجیب سہالوی، عشرت علی صدیقی، احمد جمال پاشا جیسے معروف ادیب اور صحافی اس زمانے میں قومی آواز کے ادارتی عملہ میں شامل تھے اس لیے یہ اخبار اپنے انداز بیان اور زبان و ادب کے اچھے اسلوب کی بنا پر پڑھے لکھے طبقے میں خاصا مقبول تھا۔ دوسرا اخبار "سیاست جدید" کانپور سے خان غفران زاہدی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا گو کہ یہ اخبار حکومت نواز نہ تھا اس لیے مسلم عوام میں خاصا مقبول تھا لیکن اس کی زبان و بیان کا معیار بلند نہ تھا۔ اشتیاق عارف یا حکیم عبدالقوی کی ادارت میں قائد اپنے لیے کوئی جگہ نہ بنا سکا گو کہ ایک اچھے اور معیاری غیر کانگریسی اخبار کی گنجایش موجود تھی۔ جمیل مہدی نے ایک اچھے صحافی کی طرح، اس کو چند دنوں میں ہی بھانپ لیا اور ادارتی ذمے داریاں سنبھالتے ہی انھوں نے سیدھا حملہ "قومی آواز" اور اس کے اڈیٹروں پر ہی کیا۔ چنانچہ اس دن کے اداریہ کا عنوان تھا "حیات اللہ انصاری کی سیاست اور صحافت" اس اداریہ کا سلسلہ کوئی ایک ہفتہ چلا اور اس ایک ہفتہ میں جمیل مہدی کے قلم نے حریفوں سے بھی داد لے لی۔

بہت سے اردو صحافیوں کی طرح جمیل مہدی بھی قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ لکھنے کے لیے وہ سفارت خانوں سے جاری ہونے والے پریس نوٹ استعمال کرتے تھے۔ ان کاغذوں کی لمبائی

ں دو ٹکڑے کر لیتے اور اس سلپ کو پشت کے رُخ پر رائٹنگ پیڈ پر کلپ سے لگا دیتے۔ ہمیشہ
پنے ذاتی فونٹین پین سے لکھتے۔ ان کی لکھاوٹ، خوبصورت، صاف، واضح اور پختہ ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ
ورح کر لکھتے تھے اس لیے لکھنے کے بعد کاٹنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ مضامین اور اداریے
لکھنے کی صورت یہ تھی کہ دوست احباب آ رہے ہیں، چائے پی جا رہی ہے، گفتگو ہو رہی ہے اور اس
درمیان اداریہ بھی لکھا جا رہا ہے، کبھی ایک دو جملے لکھ لیے، کبھی ایک دو جملے بول دیے۔ کبھی صرف
لکھنے پر توجہ ہے کہ محفل سے غیر حاضر ہو گئے اور اگر محفل میں دلچسپی کا سامان ذرا زیادہ ہوا تو لکھنے
کا سامان کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر رکھ دیا۔

جمیل مہدی نے روزنامہ "قائد" میں اتنی جان ڈال دی کہ ایک جسد بے روح، قومی آواز جیسے توانا
خبار کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا لیکن اس اخبار کو جو بیماریاں لاحق تھیں ان کا علاج صرف ایک مضبوط
لم سے نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب اخبار کی پالیسیوں کا سوال مسلم سیاست، اور مسلم سیاست دانوں
کے عام رُخ کے سوال سے جُڑ کر کھڑا ہو گیا تو جمیل مہدی نے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ہی مقابل کھڑا پایا
وان کو بعد اصرار دیوبند کے کنج تنہائی سے نکال کر لائے تھے۔

روزنامہ قائد سے مستعفی ہونے کے بعد جمیل مہدی ہفتہ وار "ندائے ملت" سے متعلق ہو گئے۔ ندائے ملت
کے مدیر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور ڈاکٹر آصف قدوائی سے ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔ قائد سے
خصت ہونے کے بعد انھیں احساس تھا کہ راقم الحروف وہاں شدید ذہنی دباؤ کی حالت میں کام کر رہا ہے
اس لیے انھوں نے ندائے ملت کے مدیر انتظامی حفیظ نعمانی سے کہا کہ اوصاف کو بھی ندائے ملت
ں لے آئیے۔ اس اثنا میں ہم نے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد لکھنؤ یونی ورسٹی میں ایم۔ اے
معاشیات) میں داخلہ لے لیا تھا اور اب دو گھوڑوں پر سواری بہ تدریج ناممکن ہوتی جا رہی تھی۔ اس
لیے کچھ ہی ہفتہ بعد ہم بھی "ندائے ملت" کے دفتر میں موجود تھے۔ ہماری موجودگی میں ہی ایک دن
جمیل مہدی نے ڈاکٹر آصف قدوائی کو ٹیلی فون پر مجلس مشاورت کے بارے میں ایک "لائن" دی۔ ڈاکٹر
صاحب نے اس فرمایش کے بعد مسلم مجلس کی طابع آزمائی پر وہ مشہور ایڈیٹوریل لکھا جو بالآخر
ندائے ملت کے ٹرسٹیوں اور عملۂ ادارت کے درمیان کشمکش کا سبب بنا۔ نتیجہ کے طور پر ٹرسٹیوں
نے ادارتی عملہ کو ندائے ملت سے بے دخل کر دیا۔ اس مرحلہ پر جمیل مہدی نے چند ساتھیوں کے
ساتھ مل کر ہفتہ وار "عزائم" کی طرح ڈالی۔ عزائم کا شمار جلد ہی اردو کے مشہور ہفتہ واروں میں ہونے لگا
لکھنؤ میں یہ جمیل مہدی کے قیام کے سب سے خوبصورت دن تھے۔ ان کے ذہن پر سے وہ دباؤ ہٹ
چکے تھے جن کا وہ قائد اور ندائے ملت کے دنوں میں شکار تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم اور وہ لال باغ
سے گزر رہے تھے جہاں سے کچھ ہی دور پر مرحوم اخبار قائد کا دفتر تھا۔ لال باغ کی مسجد کے پاس
پہنچے تو جمیل مہدی نے کہا "اوصاف، یہ مسجد بڑی مستجاب الدعوات ہے"۔ سبب پوچھنے پر بتایا کہ یہاں
میں نے یہ دعا مانگی تھی کہ یا تو خدا قائد اخبار کے منتظمین کو عقل دے یا پھر مجھے ان سے نجات دے۔
خدا نے مجھے نجات دے دی۔"

عزائم ہندستانی مسلمانوں کی سیاست میں ایک احتجاجی تحریک کا بانی تھا۔ جمیل مہدی، ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ سیاست سے سخت غیر مطمئن تھے۔ ان کے خیال میں ہندستانی مسلمانوں کے لیڈروں کو خصوصاً اور عوام کو عموماً ان تاریخی تبدیلیوں کا احساس نہ تھا جن سے وہ آزادی کے بعد ہندستان میں دوچار تھے اور نہ ہی ان حالات کے مقابلہ کے لیے وہ اچھی طرح تیار تھے اس لیے "عزائم" کے ذریعہ وہ ہندستانی مسلمانوں کی ذہنیت اور طرزِ فکر کو بدلنا چاہتے تھے۔ اس راہ کی دشواریوں سے بھی وہ بخوبی آگاہ تھے ایک مضمون میں لکھتے ہیں :

"دماغوں، دلوں، روحوں اور ذہنوں کے بدلنے سے زیادہ محنت طلب اور مشکل کام دوسرا نہیں۔ ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر چٹانوں میں سوراخ کرنے کا یہ کام جتنا مشکل، جتنے استقلال، جتنی لگن، جتنی جدوجہد اور جتنے انتظار کا طالب ہے دنیا کا کوئی دوسرا کام نہیں" (افکار و عزائم۔ ص ۱۴۷)

اس قسم کا موڈ طاری ہوتا اور یاس، آس پر غلبہ حاصل کرنے لگتی تو غالب کا یہ شعر پڑھتے جو ان کی صورتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے

دل شکستن سے بھی ہے نومید یارب کب تلک
آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

دوسرے مصرعے کو کئی بار دہراتے "آبگینہ کوہ عرضِ گراں جانی کرے"، پھر کہتے "ظالم نے کیا بات کہی ہے۔ آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے"۔

اس سلسلے میں کبھی کبھار ان کے قلم سے مسلم رہنماؤں اور مسلم تنظیموں کے بارے میں درشت جملے بھی نکل جاتے جن پر بعض حلقوں کی جانب سے یہ شکایت کی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد میں رخنہ اندازی کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک مرحلہ پر انھیں کہنا پڑا تھا :

"میں اس بدنصیب ملت کا ایک بدنصیب فرد ہوں جسے ہندستان کی ہزار سالہ تاریخ کے سب سے زیادہ ہولناک مرحلے کا سامنا ہے۔ اس ملت کی موت و زیست اور مستقبل کے ساتھ خود میری زندگی، موت اور مستقبل کا سوال وابستہ ہے اس لیے یقیناً مجھے اس بات کا حق حاصل ہے کہ ان ساری سرگرمیوں، اس ساری قومی جدوجہد اور اس جدوجہد کے لیے موجودہ جواز کا پوری احتیاط، اور اپنی بساط بھر قابلیت اور علم کی حد تک جائزہ لوں، اس کی کوتاہیوں، خامیوں، کمزوریوں اور غلطیوں کا نہ صرف پتا لگاؤں بلکہ ان کے اظہار میں کسی قسم کی مصلحت اور خوف کا شکار اپنے آپ کو نہ ہونے دوں" (افکار و عزائم۔ ص ۲۶۵)

چنانچہ حق گوئی و بےباکی کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو :

"خدا جانے یہ کس قسم کا اتحاد اور کس قسم کے اختلاف کا نعم البدل ہے کہ اس کی موجودگی میں مسلمانوں کو ہزیمتوں اور شکستوں کے سوا کوئی دوسری شے نصیب نہیں ہوتی۔ اردو زبان کو لوحِ تاریخ سے کھرچ کر پھینک دیا گیا، احمد آباد جیسی عظیم

تباہی کا سامنا ہوا، پرسنل لا میں ترمیم کی مصیبت دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اختلاف کا نام لینا گناہ ہے۔ اتحاد کی موجودگی سے انکار کفر کے برابر ہے قوم بدستور متحد ہے اور قومی وجود ہلاکت کے کنارے جا لگا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ساری دنیا میں قیادت کے بحران کا مسلمانوں کو سامنا ہے مگر ہندستان میں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان رہنماؤں نے مشیت کی مرضی پوری کرانے کی ساری ذمے داری اپنے کندھوں پر لے لی ہے ۔ ۔ ۔ ۔" (افکار و عزائم۔ ص ۱۴۷)

مسلم مجلس مشاورت کے بارے میں انھوں نے لکھا:

"مجلس مشاورت آج ماضی کی سرگزشت بن کر رہ گئی ہے۔ اپنے اصل پروگرام اور اصل نصب العین سے ہٹ کر نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہے لیکن وقت کی ضرورت آج بھی زندہ ہے، پہلے سے زیادہ توجہ طلب بن گئی ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں جاکر کام کرنا چاہیے۔ اکثریت کا دل جیتنا چاہیے۔ شرافت اور انسانیت پر اعتماد کو برقرار رکھنا چاہیے۔ باعزت زندگی گزارنا ہے تو اس کے لیے آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہ ضرورت کون پوری کرے گا۔ اسی کے جواب پر مستقبل کے امن کا انحصار ہے۔" (افکار و عزائم ص ۱۸۷)

اسی آہنگ اور آن بان سے عزائم دس سال تک لکھنؤ سے ہفتہ وار کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ لکھنؤ کی سرزمین ادبی رسالوں کے لیے یوں بھی سازگار نہیں ہے اس لیے دس سال تک عزائم کا متواتر شائع ہوتے رہنا عزائم کی سخت جانی، اور جمیل مہدی کی جاں فشانی کا مظہر تھا۔ اس درمیان ہم لکھنؤ چھوڑ کر علی گڑھ پہنچے اور وہاں بھی مختصر قیام کے بعد دلّی آن براجے۔ اردو صحافت کے ساتھ ہمارا مختصر سا معاشقہ ایم۔ اے پاس کرنے کے ساتھ ہی ختم ہو چکا تھا۔ قادر مطلق نے ہمارا رزق، اب معاشیات کے درس اور تدریس سے منسلک کر دیا تھا اس لیے اردو کچھ لکھنے کی مہلت کم ہی ملتی تھی۔ اس کے باوجود عزائم جب تک ہفتہ وار کی صورت میں زندہ رہا علی گڑھ اور دہلی میں میرے نام برابر آتا رہا۔ اس کو جمیل مہدی کے کریمانہ اخلاق، اور پرانی روایتوں کی پاسداری کے سوا کس چیز سے تعبیر کروں؟

علی گڑھ اور دہلی سے اکثر لکھنؤ جانا ہوتا تھا۔ جمیل مہدی ان دنوں دارالشفا میں رہنے لگے تھے جو یوپی ممبران مجالس قانون ساز کا ہوسٹل ہے۔ جتنے دن قیام رہتا، خوب گپ شپ رہتی۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں کئی گھنٹے سے ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک اور صاحب بھی آکر بیٹھ گئے۔ ان کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اچانک بولے۔

"بھئی ہمیں جانا ہے۔ ریڈیو پر ایک مذاکرہ ہے۔ اس کی ریکارڈنگ ہے۔"

ہم نے مذاکرے کا موضوع پوچھا۔ بتایا "اردو ادب میں طنز و مزاح"

ہم نے پوچھا مذاکرے میں کون کون شرکت کر رہا ہے۔

بولے "شمس الرحمٰن فاروقی، احمد جمال پاشا، ذکی کاکوروی، اور میں"

ہم نے کہا "فاروقی صاحب تو خیر معروف نقاد ہیں اور جمال پاشا خود مزاح نگار ہیں۔ رہے آپ۔ تو آپ کس

میدان میں بند ہیں لیکن یہ ذکی کاکوروی کیا چیز ہیں اور وہاں کیا کریں گے ؟"
اس موقع پر جہاں تک ہمیں یاد آتا ہے کہ ہم نے ریڈیو اسٹیشن کے منتظمین کی شان میں کچھ ایسے لفظ بھی ضرور استعمال کیے تھے جو شرفا صرف بے تکلف صحبت میں استعمال کرتے ہیں۔ مسکرائے۔ پھر اچانک ہی ان تیسرے صاحب کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا۔

"دیکھو ان صاحب سے بھی آپ کی واقفیت ہے۔"

ہم نے نفی میں سر ہلایا تو رسان سے بولے "آپ ذکی کاکوروی ہیں"

خدا کا کرنا دیکھیے کہ انھیں ذکی کاکوروی کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی کہ عزائم کے اداریوں کا انتخاب کریں اور "افکار و عزائم" کے عنوان سے شائع کریں۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے جمیل مہدی کے ان مضامین کو ان آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا جن کے لیے یہ مضامین لکھے گئے تھے۔ ورنہ روزناموں، اور ہفتہ واروں میں شائع ہونے والے مضامین کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے۔

مقام : جدّہ
زمانہ : ۱۹۸۷ء کا کوئی مہینہ
منظر : ایک دفتر کا منظر، وہی نوجوان جس سے پہلے منظر میں ملاقات ہو چکی ہے۔ نوجوان اب ادھیڑ عمر کے دروازے پر ہے۔ بیس برس گزر چکے ہیں۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی ہے۔ میز پر سر جھکائے کچھ لکھ رہا ہے۔

چپراسی ڈاک میز پر لا کر رکھتا ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے:

"گذشتہ ہفتے عزائم کے مدیر جمیل مہدی کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا"

ایک ٹھنڈی سانس!

کہاں جاؤں کس کو بتاؤں کہ کیا سانحہ ہو گیا ہے۔

اناللہ و انا الیہ راجعون۔

بقیہ صفحہ ۷۶ کا

• اطہر صاحب! کیا سندو آیا تھا۔ وہ کل شام تک آنے کا پکا وعدہ کر گیا تھا کہ آ کر محنتانہ دے جائے گا۔ میں نے محض آپ کی وجہ سے صرف ۱۰۰ روپے مانگے تھے لیکن اس نے صرف ۲۵ روپے دیے۔ اپنی غربت کا رونا روتا رہا میں خوب جانتا ہوں ان لوگوں کو لیکن آپ کی وجہ سے ..... بیٹا رہزن، جعلی نوٹوں کا دھندہ کرنے والا .... اور اور باپ اتنا محتاج؟ میں نے بس آپ کی وجہ سے اعتبار کر لیا تھا کہ آپ کسی نادہند کی سفارش تو کریں گے نہیں۔ پھر آپ نے ضمانت .... ذرا آپ اس کو بلوائیے"

وکیل صاحب تو چلے گئے لیکن ان کی گفتگو اطہر کے ذہن پر ہتھوڑا چلاتی رہی جس کی دھمک کے باعث ان کے قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ ان کے انفاس نوک جھونک کرنے لگے۔ نفس لوامہ ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن امّارہ تمسخر پہ اتر آیا تھا، منہ چڑا رہا تھا۔ ہاں نفس مطمئنہ ضرور منہ لٹکائے خاموش تھا اور اطہر خود؟ وہ اپنے مستقبل کو اجنبی دوراہے پر کھڑا محسوس کر رہا تھا۔

زیڈ ایم۔ خاں
۱/۷۵ ہاتھی خانہ، فتح گڑھ

دوراہا

ریٹائر ہو جانے کے بعد اطہر کو اپنے خاندان کے اخراجات پورے کرنے کی فکر دامن گیر ہو گئی لیکن اس خیال سے طمانیت بھی کہ اب اس کو دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کی فکر سے چھٹکارہ مل جائے گا لیکن یہ گمان زیادہ مطمئن کرتا نظر نہیں آیا کیونکہ فطرتاً ان کا دل اپنے ہر گوشہ میں انسانی ہمدردی کا جذبہ ہمکتا محسوس کرتا تھا۔

وہ صبح صبح اپنے کمرہ میں چارپائی پر دراز چھت کو ایسے تک رہے تھے گویا کسی حسین منظر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں یا کوئی ایسی تحریر پڑھ رہے ہوں جو ان کی کتاب زندگی کا روشن باب ہو، ان کی باشعور زندگی کا۔ یا جیسے وہ اپنے بیوی بچوں، اعزا و اقربا نیز دوسرے پریشان حال لوگوں کے ساتھ کیے گئے اپنے سلوک کے کھاتے کے اوراق الٹ پلٹ رہے ہوں اور اسی روشنی میں اپنے مستقبل کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن رہ رہ کر ان کی ریٹائرڈ پوزیشن ٹھوکر بن کر ان کو مایوس کرتی نظر آ رہی تھی اس لیے وہ اپنی جادۂ منزل متعین کر نہیں پا رہے تھے۔ کل تک اپنے ارادوں کو توانا محسوس کرنے والا اطہر آج تذبذب میں مبتلا تھا کیوں کہ معاشی ضروریات ویسی ہی توانا تھیں بلکہ بڑھتی ہوئی گرانی کے باعث تواتر۔ جوں ہی اس کے احساسات نے اس کی کشادہ پیشانی اور دوربین نگاہ کو سکیڑنا شروع کیا ان کی بیگم کی کڑک دار آواز کانوں سے ٹکرائی۔

"ارے سنتے ہو۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ پنشن ہو گئی ہے۔ فرصت سے ہم کنار رہنے کا موقع فراہم ہو گیا ہے لیکن گھر کی ذمے داریاں؟ کیا ان کو بھی ریٹائر کر دیا ہے۔ بچے تو اسکول جا رہے ہیں۔ چڑھتی جوانی میں شادی کر لی ہوتی تو آج لڑکے برابر کے ہوتے، کمائی کرنے والے۔ اس وقت تو بھائی بہنوں، اعزا و اقربا کو کو لھے سے لگائے رہے۔ یار دوستوں کے دکھ درد بٹاتے رہے۔ عمر بھر یہی کیا۔ اب تو بچوں کی فکر کرو۔ ان کا مستقبل بنانے کی فکر۔ اب اٹھ بیٹھو میرے سرکار۔ جا کر سبزی ترکاری لاؤ۔ جانتے ہو دروازہ پر سبزی کتنی مہنگی دیتا ہے۔"

بیگم کی طنزیہ تقریر سن کر اطہر قدرے جھنجھلا اٹھا اور ہم کلامی میں مبتلا ہو گیا۔ میں سوچتا تھا کہ چند دن بعد آرام ملے گا لیکن ..... بہرحال ..... اٹھو اطہر۔ یہ کام تو اب کرنا ہی پڑے گا۔ سچ ہی کہتی ہے درخشاں۔ اب تو ہمیشہ کفایت شعاری سے کام لینا ہوگا، پیسہ دانت سے پکڑنا ہوگا۔ ضرورت مندوں سے بھی

چا چھڑانا ہوگا ..... ہاں ..... نہیں تو بچو ..... اب اٹھو بیٹھو اطہر .....“

اطہر بددل ہو کر اٹھا۔ سبزی کی ٹوکری مانگی۔ درخشاں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا

”آج بابو جی کو ٹوکری یاد آ گئی۔ اجی جناب والا کئی مہینے ہوئے آپ کی اس چہیتی کی ہڈی پسلیاں چرمرا کر بکھر گئیں۔ اس کو چولھے میں دفن کر دیا گیا۔ تم کو تو دفتر، دوستوں اور ضرورت مندوں سے فرصت ہی نہ ملتی تھی جو اس کی مرہم پٹی کر دیتے یا بازار سے دوسری لے آتے۔ اب ٹوکری مانگ رہے ہو؟ وہ جھولا سامنے کھونٹی پر لٹک رہا ہے اس کو ہی بغل میں داب لو۔ بس۔“

آج اطہر کو اپنی لاپروائی کا بھی احساس ہوا۔ انھوں نے بیگم کو تیکھی نہیں بلکہ سنجیدہ نظروں سے دیکھا اور جھولا لینے کے لیے آگے بڑھے لیکن اسی وقت کال بیل نے مترنم آواز میں اپنی طرف مخاطب کیا اور وہ ہاتھ بجائے جھولے کی طرف بڑھانے کے دروازہ کی طرف بڑھا کر گیلری میں مڑ گئے۔ بیگم کے چہرہ پر ہلکی سی سنجیدگی پھیل گئی انھوں نے آہستہ سے کہا۔

”لو! اب آ چکی ترکاری۔“

اطہر نے جوں ہی دروازہ کھولا کسی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”سلام اوّا۔“

”سلام۔ کیا ہے ننددو۔ تو اس وقت۔ صبح صبح، خیریت تو ہے۔ گانو میں کوئی .....؟“

ان کی بات پوری ہونے دینے سے پہلے ہی اس نے گھگھیاتے ہوئے اطہر کے پیر پکڑ لیے اور بولا۔

”اوّا! پولس والے رات کو ہمرے للاّ کو پکڑ کر لے گئے۔ دیا کرو اوّا ہمرے اوپر چھڑوائے دیو ہمرے بیٹوا بالکل بے کسور ہے۔ نام ماتر کسور نا ہی۔ دشمنی سے پکڑ لے گئے۔“

”اچھا اچھا میرے پیر تو چھوڑو اور سنو۔ میں ..... اب ریٹائر ہو گیا ہوں۔ اور اب .....“

ابھی وہ اپنی بات پوری کر بھی نہیں پائے تھے کہ ننددو اسی انداز میں کہنے لگا۔

”تب تو اچھا ہوا بھیّا۔ اب آپ کو پوری پھرست ہے۔ آپ تو ہمرے مائی باپ ہیں۔ جلدی کرو اوّا۔ وہ ..... بے سارے مار مار کر للاّ کی ہڈیاں چور چور کر رہے ہیں۔“

اپنی فطرت سے مجبور اطہر کو اس پر ترس آ گیا اور بیگم سے بغیر کچھ کہے وہ اسی حالت میں چل دیے۔ جھولا اور بیگم دونوں گھر کی رونق بنے رہے۔

بس آنے میں جتنی دیر ہو رہی تھی ننددو کا چہرہ اتنا ہی اداس تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کیفیت نے اطہر کو جو درد دل رکھتا تھا اور بے چین کر دیا۔ اس نے مزید انتظار بہتر نہ سمجھا اور تھری وہیلر سے سفر کرنے کا ارادہ کیا۔

پولس اسٹیشن سے خالی ہاتھ واپس ہوتے ہوئے وہ بہت افسردگی محسوس کر رہا تھا۔ ننددو بھی اس کے ساتھ ہی واپس آیا۔ کرایہ دینے کے لیے جب اطہر نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب نے کفالت کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس میں صرف دو روپے ہی پڑے تھے جب کہ دس روپے دینا تھے۔ اس نے ننددو کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ اس کی جیب پر نظر ڈالی تو اس کے بوسیدہ لباس کی طرح جیب بھی پھٹی نظر آئی اور اس کی گورٹ ٹوٹ لینا اطہر نے اپنی غیرت کے منافی سمجھا۔ فوراً ہی اس کے دل نے مشورہ دیا۔

"وہ غریب انسان ہے۔ ہے تو تمہارے ہی گاؤں کا۔ ایسے لوگ تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں۔ نام اور عزت بڑی چیز ہے پیسہ نہیں۔ ہے تو کسی جان پہچان والے دوکاندار سے۔ صرف آٹھ روپے کی بات ہی تو ہے"

آج اطہر کو قرض لیتے ہوئے بہت شرمندگی محسوس ہوئی لیکن دل نے ڈھارس بندھائی اور کہا

"ایک نادان اور پریشان حال انسان کی مدد فخر کی بات ہے شرم کی نہیں"

آج پہلی بار اس نے خود کو کھویا کھویا محسوس کیا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا مگر اس کو خیال آیا کہ تھانے میں اس کا اٹھ کا تو بہت ٹھاٹ باٹ سے تھا اور یہ ننند و..... ابھی اس کی فکر کسی نتیجہ پر پہنچ نہ سکی تھی کہ سامنے سے آنے والے موٹر کے ہارن نے اس کے تخیل کو درہم برہم کر دیا۔

وہ ننند و کو جب اپنے کمرہ میں بٹھا کر گھر کے اندر گیا تو اس کی نظر بیگم کی نظر سے ٹکرائی۔ بیگم نے فوراً منہ بسور کر نظر پھیری اور اپنے کام میں منہمک ہو گئی۔ اطہر نے بیگم کے پاس جا کر خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"درخشاں پتا نہیں ننند و کب سے کھڑا ہوگا۔ ارے اپنے گاؤں والا ننند و جو تمہیں بہت ادب سے جھک کر "سلام بیگم صاحب" کہتا ہے۔ وہی ننند و۔ کیا پکایا ہے میرا مطلب ہے سبزی وبزی۔ کچھ ٹھیک ٹھاک کھانا ہے نا۔ تم تو جانتی ہو کہ ایسے وقت عزت کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر..... وہ جا کر کیا کہے گا۔ ہاں بس ذرا جلدی۔ کچہری بھی جانا ہے"

بیگم نے بڑی بے رُخی کے ساتھ جواب دیا۔

"سبزی تو بونے جا رہی ہوں، انتظار کرنا ہوگا۔ دال موجود ہے۔ کہو تو وہی پہنچا دوں....."

اس جواب پر اطہر اُداس ہو گیا۔ ساتھ ہی اس کے ذہن پر غصہ کی ایک لہر اٹھی لیکن فوراً ہی وہ وقت کی نزاکت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ اور وہ سر جھکائے گلاس اور پانی کا جگ لے کر کمرہ میں واپس آ گئے ان کے واپس آتے ہی ننند و نے پھر گڑگڑا کر کہنا شروع کیا۔

"آقا! کب چلیو بکیل کے پاس۔ ۱۲ بج رہے ہیں۔ آج ہی کام کروائے دیو۔ بس جمانت جرور ہوئی جا"

"مرے کو ماریں شاہ مدار" والی مصداق نے اطہر کی پیشانی پر بل ڈال دیے لیکن وہ اپنے احساس کا اظہار اپنی حرمت اخلاق کے باعث زبان سے نہ کر سکے۔ صرف اتنا کہا۔

"ارے! کھانا تو کھالو"

"آقا ایک کور (نوالہ) بھی حرام ہے جب تک للّا چھٹ نہ جائے"

اور ننند و کی اس بے چینی نے اطہر کے دل میں آسن جما دیا۔ یوں تو وہ کبھی اپنی مزاجی کیفیت کی بنا پر کام ترک کر سکتا تھا لیکن کچہری کے اخراجات کے تخیل سے وہ گھبرا سا گیا۔ اس کی زبان سے بلا ارادہ نکلا۔

"بھئی وکیل کی فیس اور دوسرے اخراجات۔ کیا تم انتظام کے ساتھ آئے ہو؟"

اس سوال نے ننند و پر تازیانہ کا کام کیا۔ اس نے فوراً جھک کر اطہر کے پیر پکڑ لیے اور کہا۔

"آقا۔ ہم گھبراہٹ میں بھاگ کھڑے بھئے"

اور اس نے اپنی جیب الٹ کر کہا۔

"آقا۔ ادھر سے لوٹ کر جانے کے لیے کرایہ بھی..... کچھ پیدل چلے جئی اید۔ ہم ایک ایک پا

چلا دی ایسا میرے مالک۔"

آج پہلی بار، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اظہر نے تامل کیا۔ اس کے ذہن پر ایک منفی لہر اٹھی، مستقبل کی راہوں کو تلاش کرنے والی نگاہوں کے گوشے سکڑے لیکن بروقت اس کے دردمند دل نے کہا۔

" اظہر! خیر..... آخری بار..... اس کے بعد ہمیشہ کے لیے سلام۔"

اور وہ اٹھ کر برآمدہ میں آیا۔ بیگم کھانے کی ٹرے لے کر آرہی تھیں۔ پہلے تو اس نے کھانے سے بے اعتنائی برتنا چاہی لیکن بھوک کے غلبے سے مجبور ہو کر وہیں چارپائی پر بیٹھ کر بہ عجلت چاول پر دال ڈال کر بھوک کا منہ بند کر دیا۔

تیسرے دن وہ بعد عشا کھانا کھا کر ٹہلنے جا رہے تھے کہ ایک صاحب لپک کر ان کے پاس آئے اور اظہر پیش کار کا پتا دریافت کیا۔ اظہر نے ٹمٹماتی ہوئی اسٹریٹ لائٹ میں ان کے چہرہ کو بغور دیکھا جس پر بے چینی جھلک رہی تھی۔ انھوں نے سوال کیا۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں..... کیا کام ہے۔؟"

"میں اس وقت بڑی مصیبت میں مبتلا ہوں۔ آپ ان کا پتا بتادیں۔ بہت ضروری کام ہے۔ میرا بچہ مر رہا ہے۔ یہ پرچہ ان کو دینا ہے۔ کہاں رہتے ہیں وہ؟"

وہ نووارد سب کچھ ایک سانس میں کہہ گیا۔ بچہ کی حالت نازک سن کر اظہر کا جذبۂ ہمدردی عود کر آیا۔ انھوں نے بہ نظر ترحم نووارد کو دیکھا اور کہا۔

"میں ہی ہوں اظہر....."

نووارد نے فوراً پرچہ ان کو دیا اور کہا۔

"شریف بھیا نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ذرا جلدی کیجیے۔ لوگ بچہ کو لے کر اسپتال پہنچتے ہوں گے۔"

اظہر نے تحریر پر نظر ڈالی۔ شریف ان کا بچپن کا لنگوٹیا اور کلاس فیلو تھا۔ شمس آباد میں رہتا تھا۔ اس اہمیت کے احساس نے اس کو ٹھونکا دیا۔"

"گھبراتے کیوں ہو۔ شریف نے بھرپور اعتماد کے ساتھ پرچہ پر لکھا ہے۔ تامل نہ کرو...."

اور وہ نووارد کے ساتھ اسپتال پہنچ گیا۔

سرکاری اسپتالوں کی حالت سے کون واقف نہیں۔ قدم قدم پر اشارے پیسا پیسا مانگتے نظر آتے ہیں۔ وہاں کے ملازم اسپتال میں جگہ حاصل کرتے ہی انسانیت نام کی روح کو اپنے پیروں سے کچل دیتے ہیں لہٰذا مریض ان کے لیے ایک بوجھ معلوم ہوتا ہے۔ وارڈ سرونٹ بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ ڈاکٹر ضرور کھوکھلی ہمدردی جتاتا ہے وہ بھی دلربایانہ لاپروائی کے انداز میں۔ وہاں بے وزن التجائیں اور خوشامد بے اثر رہتی ہے۔ مریض جتنی نازک حالت میں ہوتا ہے اتنا ہی وہ منہ موڑ کر بات کرتے ہیں۔

جذبات کی رو نے اظہر کو اسپتال پہنچا تو دیا لیکن وہاں پہنچتے ہی ان کو اسپتال کے پہلے اور ضروری احتیاج و مطالبہ کا احساس ہوا۔ نووارد سے کچھ کہنے کی اخلاقی ہمت خود میں نہ پاکر انھوں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ کل صبح بچوں کی فیس دینے کے لیے ان کی جیب میں چالیس روپے پڑے تھے۔ دل نے کہا "چلو کام شروع کرانے کے لیے پیسے کافی ہیں بھگوان سے ....." دراصل وہ شریف کی نگاہوں سے گرنا نہیں چاہتا تھا اور شریف ان کو ایک بارسوخ شخصیت سمجھتا تھا۔ انھوں نے آہستہ سے انگریزی میں ڈاکٹر سے کہا۔ ڈاکٹر نے فوراً اطمینان

کا معائنہ کیا۔ کالرا بتایا۔ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اطہر کو نسخہ پکڑایا اور جلد دوائیں لانے کو کہا۔ اطہر نے بلا تامل، رقم طلب نظروں سے نووارد کو دیکھا۔ کئی بار دیکھا لیکن اس کی غمگین نظریں صرف مریض کو دیکھنے میں منہمک رہیں۔ ڈاکٹر نے اطہر کو بت بنا ہوا دیکھ کر مزید تاکید کی اور کہا۔

"ارے ابھی آپ تو یہیں کھڑے ہیں۔ مریض کی حالت نازک ہے۔ تاخیر خطرہ ثابت ہوگی۔ دوا فوراً لائیے۔"

لیکن اطہر ڈاکٹر کی تہدید سننے سے زیادہ نووارد کو دیکھنے میں مشغول تھا۔ ڈاکٹر کی وارننگ پر نووارد مریض پر اور نظریں گاڑ کر رونے لگا۔ اطہر نے بڑی کسمساہٹ محسوس کی اور چلنے کے لیے قدم اٹھایا لیکن فوراً ہی دوا کی قیمت کے سوال نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ آخر مجبور ہو کر اس نے نووارد سے کہا۔

"پیسے لائے ہو؟ ..... میرے پاس تو....."

نووارد نے ۱۰۰ روپیہ کا نوٹ نکال کر دیا اور کہا۔

"آپ دے آتے۔ کیا ہم بعد میں دے نہیں دیتے۔ ذرا بھاگ کر جائیے۔ کہیں دکان بند....."

دوا فروش نے دو سو گیارہ روپے مانگے جس پر اطہر گھبرا اٹھا اس نے ہکلاتے ہوئے کہا "مے نے۔ میرے پاس تو..... صرف ....."

یہ کہتے ہوئے سو روپے کا نوٹ دکھایا۔ دوا فروش نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بابو جی! آپ دیہاتی معلوم تو نہیں ہو رہے ہیں۔ پڑھے لکھے بزرگ ہیں۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایسے نازک مریض کی دوا..... کم سے کم نسخہ ہی پڑھ لیتے۔ آپ کو اندازہ ہو جاتا۔ آپ کو انتظام کر کے آنا چاہیے تھا....."

اس تقریر کی بوچھار نے اطہر کو شرابور کر دیا۔ پانی پانی۔ وہ گومگو حالت میں دوا فروش کا منہ تکنے لگے۔ ان کی زبان گنگ ہو گئی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ اتفاق سے اسی وقت ایک اور صاحب دوا لینے آ گئے جو اطہر کو خوب جانتے تھے اور ان کی دوا فروش سے بھی کافی شناسائی تھی۔ وہ ضامن بن گئے۔

اطہر نے دوا کا بل نووارد کو دیا تو اس نے بہت سادہ سا جواب دیا۔

"ارے بابو جی! میں انگریزی پڑھا نہیں ہوں۔ اس کو آپ ہی رکھیں۔ آپ بے ایمانی تھوڑی کریں گے ہمارا بیٹا ٹھیک ہو جائے بس۔ ہمیں سو روپے کی فکر نہیں ہے اپنے بچہ کی۔"

اطہر اس کے اسلوب گفتگو پر حیران نظر آنے لگے۔

دوسرے دن شام کو جب اسپتال پہنچے تو نووارد مع مریض اسپتال سے جا چکا تھا۔ آج پہلی بار کسی مریض کے صحت یاب ہونے پر ان کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمودار نہیں ہوئے بلکہ وہ خود کو سولی پر جھولتا محسوس کرنے لگے۔

جب وہ گھر واپس آ رہے تھے تو ان کی ملاقات ان وکیل صاحب سے ہو گئی جنھوں نے اطہر کی سفارش پر نندو کے لڑکے کی ضمانت کافی دوڑ بھاگ کر کے اسی دن کرا دی تھی۔ وکیل صاحب نے بڑے پُرتپاک انداز میں اطہر کو نمستے کہا۔ اطہر نے ایک سو گیارہ روپے کی چوٹ کی کسک کو دباتے ہوئے بغیر مسکرائے سرد سا جواب دیا۔ وکیل صاحب نے بلا تاخیر کہا۔ (باقی صفحہ ۱۷ پر)

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

جائزے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

قلم اور قدم

مصنف: سیّد حامد
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۷۵/- روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

علامہ اقبال نے کہا تھا:

"حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا ان کے افراد کی تعداد، ان کے زورِ بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی بلکہ اس کی زندگی کا دار و مدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔"

"قلم اور قدم" سیّد حامد صاحب کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں ان کے ۳۵ مضامین شامل ہیں۔ کتاب کو مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) تہذیب و معاشرت، اخلاق، مذہب۔ (۲) لسانی مسائل / مسلمانوں کے مسائل (۳) خطبات، خاکے اور تاثرات۔ (۴) انشائیے۔ "قلم اور قدم" کے مجموعی تاثر میں علامہ اقبال کا مذکورہ بیان غالب نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا نام مسلم معاشرہ کے چار اہم مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ پر تجویز ہوا ہے جس میں کوئی خاص راز پوشیدہ ہے۔ یہی عنوان کتاب کے دیباچے کی سرخی بھی ہے۔ یہ بات تو اکثر مشہور ہے کہ اردو کی کلاسیکی نثر کا نمونہ پڑھنا ہو تو سیّد حامد صاحب کی نثر دیکھو۔ سچ بھی یہی ہے کہ فی زمانہ جتنی خوبصورت اور مسجع مگر فصیح اور پُرمعنی نثر سیّد حامد صاحب لکھتے ہیں اس کی مثال مفقود ہے، اور یہ شاید موصوف کی زبانِ فارسی اور زبانِ انگریزی پر یکساں دسترس کا نتیجہ ہے۔

عنوان سے یہ بات کچھ سمجھ میں نہ آئی کہ آخر کتاب کا یہ نام کیوں طے پایا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہندستان کے دل برداشتہ مسلمانوں اور خصوصًا اردو زبان کی سرپرستی جس درد اور تڑپ کے ساتھ سیّد صاحب

فرمارہے ہیں وہ عدیم المثال ہے۔ سرسید احمد خاں کی مانند مسلمانوں کی درماندگی اور ناخواندگی کی مدافعت کا ڈنکا جس طرح انھوں نے تعلیمی کاروں کے ذریعے پورے ملک میں بجایا ہے وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہی نہیں ایک نئی صبح کا آغاز بھی ہے۔ قلم اور قدم کے عنوان سے جو مجموعۂ مضامین منظرِ عام پر آیا ہے شاید اس کے عنوان میں بھی یہی اشارہ پوشیدہ ہے کہ ہم ہاتھ میں قلم لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور پوری طاقت کے ساتھ اپنے تعلیمی مشن کا اعلان کر دیں۔ ملک میں مسلمانوں کی پست حالی کا جو احساس سید حامد صاحب کو ہوا ہے اس سے مسلمانانِ ہند کو یہ خوشی بھی ہے کہ کوئی بالغ نظر انسان ان کا سرپرست بھی ہے جس کی حیثیت نباضِ ملت اور مصلح ملت کی ہے "قلم اور قدم" نزع میں گرفتار ملت کے لیے حیات آفریں اور زندگی بخش پیغام کی حامل ہے۔ سرسید، حالی، اکبر اور اقبال نے جو خودشناسی، خود اعتمادی اور علم و عمل کا درس دیا تھا سید حامد صاحب نے ازسرِ نو اس کی تجدید کی ہے اور کسمپرسی کے عالم میں جی رہی اس قوم کو بتایا ہے کہ تم اپنی گم شدہ لیاقت اور صلاحیت کو دوبارہ پیدا کر لو تو دنیا آج بھی تمھاری محتاج ہے اور تم اس کے سرتاج ہو، لیکن اس کے لیے تمھیں سب سے پہلے تہذیب و اخلاق کو درست کرنا ہوگا یعنی تعلیمی میدان میں سب سے آگے جانا ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے اس کے تقاضے بھی بدل گئے ہیں، علوم جدیدہ کی لپٹ نے معاشرہ کو گرفت میں لے لیا ہے جس کی پہلی منزل یہی ہے کہ اس کے فروغ اور ترقی کو لے کر سید حامد صاحب نے قوم کی ترقی کا خواب دیکھا ہے اور خود بھی اسی کے لیے گھر گھر دستک دے رہے ہیں اور جہاں تہاں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ خیال غالباً ان کا صحیح ہے کہ جب تک تحریر کو زبان اور سفر کے ذریعہ پھیلایا نہ جائے گا اور اس کو جگہ جگہ پہنچایا نہ جائے گا اس کی تکمیل نہ ہوسکے گی چنانچہ امر یہی ہے کہ ازمنہ قدیم کے نبیوں اور مصلحوں سے لے کر آج کے پارٹی ورکروں تک یہ عمل جاری ہے۔ سید صاحب تعلیم کو انسانیت کا اوّلین مرکز قرار دیتے ہیں جس کے ساتھ سلیقہ اور تربیت نہایت ضروری ہے۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اصلاح گھر سے پھیلتی ہے چنانچہ سب سے پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ مثل مشہور ہے کہ علم پالنے سے قبر تک جاری رہتا ہے "پالنا"، یا "ماں کی گود"، یا پھر بقول سید صاحب "گھر" ہی اوّلین درس گاہ ہے اور یہیں سے زندگی کی بنیاد بنتی یا بگڑتی ہے۔ صدیوں اور قرنوں سے بزرگوں کے تجربات میں گزرا ہوا نقشا سید صاحب نے نئے سانچے میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے۔ اس میں کبھی کبھی شیخ عطارؒ، مولانا رومؒ اور شیخ سعدیؒ کے بلیغ ناصحانہ انداز کا بھی احساس ہوتا ہے۔ کتاب کا اوّلین حصہ سب سے زیادہ غور طلب ہے اس میں دو مضمون چائلڈ سائیکولوجی کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں اور بچوں میں تعلیم و تربیت کے جدید سائنسی اور نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں پرورش کرنے کی تلقین دی گئی ہے تاکہ بچوں کا مکمل ذہنی اور جسمانی نشو و نما ہو۔ تعلیم کا صحیح حاصل بھی یہی ہے کہ نہ بچوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے اور نہ بات بات پر ان کو قدغن لگا دیا جائے بلکہ میانہ روی کے ساتھ انھیں سیدھی ڈگر پر ڈال کر صالح بنانے کی کوششیں کی جائیں کیوں کہ انھیں بچوں کے اجتماع سے آگے چل کر معاشرہ کی تعمیر ہوگی۔

اس طرح یہ کتاب واضح طور پر سوشل رفارم کا لائحہ عمل ہے۔ سچ پوچھو تو ایک نسخۂ کیمیا ہے جس میں مسلمانوں کے موجودہ غم کا مداوا ہے۔ سید صاحب کا خیال ہے کہ جو شخص پیدا ہوتا ہے وہ باقی لوگوں کا قرض دار ہوتا ہے۔ خلقِ خدا کی خدمت کرنے اور ان کی حالت کو بہتر بنانے کا۔ پستی سے نکالنے اور تر

کی راہ پر ڈالنے کا "دوآتشہ" "حاصل زندگی" "تراویح" "یاد اللہ" اور "کیپنلی" وغیرہ وہ پُر مغز و پُر معانی مضامین ہیں جن میں حیات بعد ممات کا حکیمانہ اور منطقی نظر سے تیقن ۔ انکسار، عاجزی، احترام آدمیت اور تعمیری فکر کا درس دیا گیا ہے۔ اگر ان خیال افزا قواعد پر ہمارا معاشرہ عمل پیرا ہوجائے تو دین فطرت کا زندہ نمونہ دیکھنے کو مل جائے۔ کتاب کے اس حصّہ میں "غیبت" "بدگمانی" "بداندیشی" "حسد" اور "اختلاف" کے نقصانات اور امکانات کو بڑے سادہ، پُر لطف مگر دل نشیں انداز سے سمجھایا گیا ہے ۔ سب سے اہم بات جو اس ضمن میں کی گئی ہے وہ وقت کی قدر دانی کی ہے۔ جو معاشرہ وقت کی ناقدری کرتا ہے کبھی خوشحال نہیں رہتا۔ سیّد حامد صاحب نے ہر شخص کو دل آزاری سے باز رہنے کا مشورہ دیا ہے اور یہ وہ نسخۂ بے بدل ہے جس پر ساری دنیا کی اصلاح کا ذمّہ لیا جاسکتا ہے ۔

"قلم اور قدم" کا دوسرا حصّہ یا دوسرا باب لسانی مسائل کا ہے اس میں اردو اور اردو والوں کا جتنا درد سیّد حامد صاحب کے قلم سے ٹپکتا ہے اس کا بیان اِس قلم سے مشکل ہے۔ نہ صرف ہندستان میں اردو کے مستقبل کی تابناک بشارت دی ہے بلکہ پوری دنیا میں اردو بولی کے چلن کا راز بھی فاش کیا ہے لیکن انھوں نے خود اردو رسم خط سے بے اعتنائی کی شکایت بھی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ابھی دیکھ لیجیے کہ اردو شاہکاروں کو سمجھنے والے اب کتنے باقی رہ گئے ہیں عوام و خواص میں جب اعلا تخلیقات کو سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے کی صلاحیت نہیں رہے گی تو تخلیقات کا معیار گرتا چلا جائے گا" ص۳۳

اس مکروہ مرض اور زبوں حالی کا درماں بھی سیّد حامد صاحب نے اسی مضمون کے آخر میں واضح کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگرچہ اردو کو مٹانے میں حکومت اور اردو والوں نے بے مثال عملی تعاون دیا ہے لیکن اب بھی اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور صرف اس صورت میں کہ

"ہمیں چاہیے کہ بچوں کو خود پڑھائیں اور اس انداز سے پڑھائیں گویا ہمارا دینی فریضہ ہے ہماری دینی غیرت کا تقاضا ہے" ص۳۵

مسلمانوں کے مسائل پر سب سے اہم اور قابل ذکر مضمون سیّد حامد صاحب کا "وقت کی سب سے اہم ضرورت" ہے جس میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ ابلاغ اور میڈیا کے دور میں "ان کے پاس انگریزی کا ایک بھی روزنامہ نہیں ہے" جس کے ذریعے وہ اپنی بات حکومت، ریاست اور دوسرے فرقے کے لوگوں تک پہنچا سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے مسائل، تکلیفوں، مجبوریوں اور محرومیوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بات سو فی صد درست ہے مگر جتنی درست ہے اس کا عمل میں آنا اتنا ہی مشکل بھی ہے لیکن مل جل کر ہمت کریں تو کوئی مشکل بھی نہیں ـــــ کتاب کے اسی حصّہ میں "دینی تعلیم مدارس اور سائنسی تعلیم" اور "سائنس کی عوامی تحریک" وغیرہ اقتضائے حال کے موافق مضامین بھی شامل ہیں ۔

تیسرے حصّہ میں خطبات، خاکے اور انشائیے ہیں اور وہ بھی وقت کی پکار اور ملت اسلامیہ کی زبوں حالی کی خوں چکاں داستانیں ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے غیرت و حمیت کے علاوہ بیداری اور خود شناسی کا احساس جوش مارتا ہے "نہ جیتے بنتی ہے نہ مرتے" ایک عجیب مگر صداقت انگیز مضمون ہے جس میں مسلمانوں کے ویران قبرستانوں کا دکھڑا رویا گیا ہے اور عہد جدید کے تقاضوں کے ساتھ مٹتے

ہوئے قبرستانوں کے تحفظ اور توسیع کے لیے مفید حل اور کارآمد مشورے بھی پیش کیے گئے ہیں جن پر بغیر کسی تساہل فی الفور عمل کیا جانا چاہیے۔

"قلم اور قدم" میں عام کتابوں کی طرح بعض جگہ سہو بھی ہوا ہے مثلاً ص۱۰ اور ص۲۱ پر ایک ہی شعر دو بار نقل ہوا ہے مگر دونوں جگہ اس کا متن بدلا ہوا ہے "مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن" اسی طرح راقم الحروف نے "پن چکی" کا لفظ سنا تھا جو پانی سے چلنے والی چکی ہوتی ہے جیسے پنہاری، پن گھٹ، پن ڈبی یا پن کپڑہ وغیرہ میں پانی کا مخفف "پن" بنالیا گیا، اسی طرح پن چکی میں بھی۔ مگر قلم اور قدم میں یہ لفظ "پون چکی" استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ شاید ہوا سے چلنے والی چکی یعنی پَوَن چکی کا بگڑ کر بھی پن چکی ہو گیا ہوگا۔
اسی طرح کتاب کے چوتھے حصّے میں ایک انشائیہ کا عنوان ہے "گفتند یافت می نشود" اس انشائیے میں تلاش و جستجو، جہد و عمل کی ترغیب دی گئی ہے اور آج کے زمانے میں اس سے بڑھ کر اور کیا پیغام ہوگا۔ یہ عنوان مولانا روم کے ایک شعر سے لیا گیا ہے جو اس طرح نقل ہوا ہے۔

گفتند یافت می نشود جستہ ایم ما   گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس شعر میں فی الحقیقت ان تھک کوشش اور گردشِ پیہم یعنی شوقِ ناتمام کی تعلیم پنہاں ہے۔ علّامہ اقبال نے بھی "اسرارِ خودی" کے صفحۂ اوّل پر یہ شعر مزید دو اشعار کے ساتھ نقل کیا ہے اس شعر کا متن سیّد حامد صاحب کے نقل کردہ شعر سے مختلف ہے مصرعۂ اولیٰ اس طرح ہے۔

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما

اسرارِ خودی کا پیغام بھی عملِ پیہم ہے اور سیّد صاحب کے انشائیے کا سبق بھی تلاشِ مسلسل ہے۔ ایک طرف اقبالؒ دوسری طرف سیّد حامد اور دونوں اپنے وقت کے اکابر، مگر یہ متنی تفاوت کیوں ؟۔
بحیثیت مجموعی یہ کتاب ایک انسانی ضابطۂ حیات اور اسلامی دستور العمل ہے۔ یہ کہنے میں کچھ عار نہیں ہے کہ آج متاعِ کارواں لُٹ رہا ہے اور برابر لوٹا جا رہا ہے۔ احساس باقی نہ رہے تو ناکامی کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے لیکن شکر ہے کہ ابھی احساسِ زیاں باقی ہے اور اس عرصۂ قحط الرّجال میں سیّد حامد صاحب جیسا ذکی الحس احساس دلانے والا موجود ہے۔ یہ کتاب لکھ کر سیّد صاحب نے مجددِ عصر کا کام انجام دیا ہے۔ اگر ان تجاویز پر عمل کیا گیا تو ممکن ہے آج کا معتوب مسلمان قعرِ مذلت سے نکل کر عظمتِ رفتہ کو پھر سے حاصل کر لے اور اس کا گمشدہ وقار لوٹ آئے۔

کیا کہوں "قلم اور قدم" کا ایک ایک لفظ ہندستان کے ایک ایک مسلمان کے سینے میں اُتار نے بلکہ جڑ دینے کے قابل ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کتاب کو پڑھوں اور بار بار پڑھوں، سر دھنوں اور اوروں کو بھی سناؤں کیوں کہ یہ وہ نابغۂ روزگار تصنیف ہے جو پوری سوسائٹی کے عالمِ علم و عمل میں ایک اضافہ ہی نہیں نیک فال بھی ہے۔ موقع صرف عش عش کرنے کا نہیں بلکہ کلیجہ تھام لینے کا ہے یہ نسخہ جس میں سیّد صاحب کے خونِ جگر کی آمیزش نے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے جس پر احساسِ ذمّے داری میں ٹھنڈی سانسیں لینا، راتوں کی نیند حرام کرنا اور قومی تڑپ میں بے قرار ہو اٹھنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ہر شخص پڑھے اور سمجھے کہ انسان کسے کہتے ہیں اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔

تبصروں میں طباعت و اشاعت کی تعریف کرتے وقت اکثر روایتی طور پر دیدہ زیب لکھ دیا

جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ "قلم اور قدم" کا ٹائٹل جس قدر خوش نما اور جاذب نظر ہے جس میں نیلگوں زمین پر زرّیں قلم سے عنوان لکھا ہے اور اس پر سیاہ و سفید کی مزید دلکش آمیزش نے جو حسن پیدا کیا ہے اس کا بیان قلم کی زبان سے باہر ہے۔ اس کی حُسن و زیبائش کے جاذب نظر نظارہ نے اگر کتاب کو اٹھا لینے اور آنکھوں کو مرکوز کر دینے پر مجبور نہ کیا تو یہ سطریں لایعنی۔ سفید چمک دار کاغذ۔ نفیس نستعلیق کتابت، بے داغ طباعت اور مضبوط جلد بندی نے اس کے حسن کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے، اس کے باوجود قیمت نہایت مناسب بلکہ کم ہے۔

گاہے گاہے

مصنف : رولینڈ لارنس
تبصرہ نگار : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۳۰/ روپے
ناشر : نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

رولینڈ لارنس صاحب کے شعری مجموعے "گاہے گاہے" کی اشاعت کے بعد ان لوگوں کو اپنی رائے پر نظر ثانی کر لینی چاہیے جو کہتے ہیں کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے"۔ رولینڈ لارنس صاحب ریاضی کے استاد ہیں جنھیں اردو زبان سے کوئی لالچ نہیں ہے اور وہ صرف اردو کو از راہِ تفنن استعمال کرتے ہیں جو ان کے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ جب کبھی جذبۂ دل یا ذوقِ لطیف نے زور مارا نظمیں یا غزلیں کہ لیں جن پر مشہور زمانہ ادبی ہستی امتیاز علی خاں عرشی سے اصلاح لیتے رہے ہیں۔ مصنف کی شاعری کا رنگ و آہنگ، مشرق و مغرب کا خوبصورت امتزاج ہے۔ زبان پر مشرقی انداز و اثر حاوی ہے باوجود اس کے کہ اس مجموعہ میں کوپر کی دو انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے جو شاید اصل نظموں سے زیادہ خوبصورت اور ترجمہ کے بجائے اصل تخلیق معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نظمیں ہیں "تجدید وفا" اور "خلش"۔ شاعر کی نظر پرواز تخیل سے قطع نظر حقیقی زندگی پر زیادہ ہے۔ جھیل، مچھلی، مٹی، برتن، جنگل عورتیں بچھڑے کھیت، مناظر قدرت معدنیات، اندھیرا اُجالا وغیرہ زندگی کے لوازمات ان کی شاعری کا جز ہیں۔ ایک نظم تو مسلسل مگر نا تمام ہے جو "سچی کہانی صدیوں پرانی" کے عنوان سے شامل ہے انسانی ارتقا کی داستان ہے آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

کام کچھ اس طرح سے تقسیم قبیلوں میں ہوا ہر قبیلہ کسی فن کے لیے مشہور ہوا

کتاب کی ابتدا میں عابد رضا بیدار صاحب کا مقدمہ ہے جس میں ان کے مختصر علمی سفر کا بیان ہے مگر سوانحی تعارف کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

رولینڈ لارنس صاحب کے چند شعر نقل کیے بنا رہا نہیں جاتا۔

کچھ لوگ لے تو آئے ہیں اس بزم میں ہمیں ساقی پہ اعتماد مگر اب نہیں رہا
نہ میں حریف نہ حاسد عجیب الجھن ہے تمہارے شہر میں ہر شخص مجھ سے بدظن ہے

اس مجموعے کے پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ مصنف فنِ شعر سے بخوبی واقف ہے۔ شعر کہنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ کتابت، طباعت نہایت نفیس ہے کاغذ سفید اور چمک دار اور دبیز ہے۔ سرورق سہ رنگا اور دیدہ زیب ہے۔ اشاعت کے تمام اعلا معیار کے باوجود قیمت صرف تیس روپے ہے جو لاگت سے بھی کم معلوم ہوتی ہے۔

شعلۂ گل
(شعری مجموعہ)

شاعر:- سردار الہام
مبصر:- پروفیسر عنوان چشتی
قیمت: چالیس روپے

اس دور میں شعری مجموعے کافی تعداد میں آرہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شعری مجموعہ اچھا ہو تو جی خوش ہو جاتا ہے۔ "شعلۂ گل" ایسا ہی شعری مجموعہ ہے جس کو پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سردار الہام نے اگرچہ نمود و نمائش سے دور رہ کر لیلائے سخن کی مشاطگی کی مگر موصوف اپنے اندازِ سخن سے پہچانے جاتے ہیں اس لیے اردو کے اکثر فن کاران کے نام اور کام سے واقف ہیں۔

سردار الہام کے شعری مجموعہ "شعلۂ گل" کی اساس، روشن مستقبل، حریت فکر، حوصلہ، امید، حرکت اور مساوات کے تصورات پر ہے۔ انھیں انسانیت بہت عزیز ہے۔ انھوں نے نسلی امتیازات نیز بدحالی کے خلاف مالی اور معاشی بنیادوں پر عالم گیر بھائی چارے کے تصور کو فروغ دیا۔ ان کے رومانی، تصورات اور حسن و عشق کے معاملات بھی خالص مجازی اور ارضی ہیں۔ انھوں نے اپنے رنگ افشاں جذبات اور مجروح خوابوں کو نظموں کے قالب میں ڈھالا ہے جن کی ارضی اور زمینی بنیادیں محسوس ہوتی ہیں۔

سردار الہام کی نظمیں اپنی ساخت اور تکنیک کے اعتبار سے حفیظ جالندھری، احسان دانش اور ساغر نظامی کی یاد دلاتی ہیں۔ موصوف نے اپنی نظموں میں ہیئت اور تکنیک کے خوبصورت تجربے کیے ہیں۔ بندوں کو نئے انداز میں برتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو مہذب شعری زبان میں پیش کیا ہے جس پر ایک طرف روایت کی گہری چھاپ ہے اور دوسری طرف تجربہ اور تازگی کا اثر بھی ہے۔ میں "شعلۂ گل" کا خیر مقدم کرتا ہوں اور یہ بھی امید کرتا ہوں کہ اچھی شاعری کے رسیا بھی سردار الہام کے اس شعری مجموعے کا خیر مقدم کریں گے۔

معیاری طباعت اور کتابت اور عمدہ گٹ اپ کے ساتھ مجموعہ "شعلۂ گل" نہایت مناسب قیمت چالیس روپے میں مکتبہ جامعہ کے حسب ذیل بک ڈپوز سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار۔ دہلی ۶ ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

طلوعِ وجدان
(شاعری)

شاعر: ظفر حمیدی
ناشر: ظفر حمیدی، آم گولا روڈ، مظفر پور ۲ بہار
مبصر: عبید الرحمٰن
قیمت: ۵/ روپے

طلوعِ وجدان، ظفر حمیدی کا چھٹا مجموعۂ کلام ہے۔ اس سے قبل رقصِ خیال، نوائے تیشہ، ریزہ ریزہ موجِ غبار، اور آہنگ آفاق، منظر عام پر آچکے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ میں نعت پاک، غزلیں، نظمیں اور قطعات شامل کیے گئے ہیں۔ ظفر حمیدی کوئی پانچ دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں مگر جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ شاعری کی سطح پر اپنی تخلیقات کی نمائش کرنے میں وہ زیادہ کامیاب نہیں رہے ہیں۔ اس کی وجہ

غالباً یہ ہے کہ وہ صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے اور اپنے جمالیاتی ذوق کی تشفی کی خاطر شعر کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مشاعروں میں ان کی شرکت بہت کم ہوا کرتی ہے۔ رسائل میں بھی کم ہی چھپتے ہیں۔ بہرحال ان کا ایک اور مجموعۂ کلام نظروں کے سامنے ہے۔ اور اس کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ظفر حمیدی چوں کہ ایک کامیاب معالج ہیں اور مریض کے مرض کو گہرائی میں اتر کر دیکھنے اور اس کے علاج کی خاطر تدابیر ڈھونڈنے کے عادی ہیں لہٰذا اپنے ماحول پر بھی حکیمانہ نظر ڈالتے ہیں۔ عصری مسائل کی جانب دردمند دل کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔ اپنی فکر اور اپنے احساسات کو شعر میں بیان فرماتے ہیں ؎

دیکھ کر شہر میں ہر موڑ پہ اک تازہ صلیب
کتنے ٹکڑوں میں ظفر میں نے لٹکنا چاہا

آپ کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز کی طویل کہانی موجود ہے جس کی اک اک کیفیت آپ کی یادداشت میں محفوظ ہے۔ وہم و گمان کی تاریکی سے نکل کر کس طرح یقین کی روشنی اپنائی اس کے واضح اشارے بھی ملتے ہیں۔ اب آپ اس مقام پر ہیں جہاں نہ کوئی تشکیک باقی ہے اور نہ کوئی تزلزل اور یہی طلوعِ وجدان ہے ؎

شکستگیٔ خرد کا عالم، شعور کی بے خودی کی منزل
یہیں سے آغاز انتہا ہے، طلوعِ وجدان ہو رہا ہے

نہایت سادگی اور خوش اسلوبی سے اپنا پیغام قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں بھی بعید از فہم الفاظ نہیں ملتے۔ مانوس اور سلیس الفاظ سے آراستہ یہ مجموعہ قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور یہی شاعر کی کامیابی ہے۔

ظفر حمیدی کے پاس واضح نظریہ موجود ہے جس کی بنا پر وہ نامساعد حالات میں بھی پُرامید نظر آتے ہیں۔ زندگی کے تئیں ان کا یہ مثبت رویّہ قاری کو متاثر کیے بنا نہیں رہتا ؎

بھٹکتا پھر رہا ہوں گمرہی کے رہگزاروں میں
ظفر ان رہگزاروں سے میں اک رستہ نچوڑوں گا

سرورق، کتابت و طباعت عمدہ ہیں۔ یقین ہے کہ پچھلے مجموعوں کی طرح ان کے اس مجموعہ کی بھی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

تشنہ تشنہ
(شعری مجموعہ)

شاعر : محمد خطیب اللہ حمیدی
ناشر : محمد خطیب اللہ حمیدی، آم گولا روڈ، مظفرپور بہار
مبصر : عبید الرحمٰن
قیمت : سو روپے۔

یہ خطیب اللہ حمیدی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو خاصا ضخیم ہے۔ قریب ایک سو پچاس نظمیں اور سو سے زیادہ غزلیں شامل ہیں۔ محمد خطیب اللہ حمیدی بزرگ کہنہ مشق شاعر جناب ظفر حمیدی کے صاحبزادے ہیں اور اپنے والد ہی کی طرح شاعری داد و دہش کے لیے نہیں بلکہ اپنی انا کی تسکین کی خاطر کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشاعروں یا شعری نشستوں میں شریک نہیں ہوتے۔ درحقیقت ان کا یہ مجموعہ ہی ادبی دنیا

میں انھیں متعارف کرائے گا۔

خطیب سائنس کے لیکچرار ہیں۔ اردو سے محبت اور شاعری سے دلچسپی انھیں ورثہ میں ملی ہے۔ ان کے دادا مرحوم ڈاکٹر حمیدالدین عاصی اپنے زمانے کے بلند پایہ شاعر تھے۔ والد ماجد بھی دورِ جدید کے شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اب خطیب بھی اپنے افکار و خیالات کو شاعری میں منتقل کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ مجموعہ اسی سلسلے کی پہلی کاوش ہے۔

ایک اچھا شاعر وہ ہے جو اپنے دور کی صعوبتوں، ناہمواریوں اور اس کے مسائل سے باخبر ہو، اور انھیں حل کرنے کی بھی جستجو کرے۔ خطیب اسی زمرے کے شاعر ہیں۔ وہ آج کے مشینی دور میں اخلاقی قدروں کی پستی، انسانوں کے دکھ سکھ اور زندگی کی بے کیفیتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں ؎

اس مشینی دور نے کیسا دیا ہے ہم کو موسم
کتنی آلودہ فضا ہے، کلی کلی مرجھائی ہے

خطیب کی شاعری میں شاعر کا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ اشعار میں ذاتی تجربات اور احساسات غالب ہیں اور انھیں سے شاعر کی صحیح شناخت ممکن ہوتی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی یہی رنگ موجزن ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی نظموں میں شاعر کی بصیرت نمایاں ہے۔

اس مجموعہ میں کئی غزلیں ایسی بھی ہیں جو خطیب کے تجرباتی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ مصرعۂ اولیٰ بدلتا جاتا ہے مگر مصرعۂ ثانی وہی رہتا ہے۔ یہ ایک اچھی کاوش کہی جاسکتی ہے۔

تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود خطیب قنوطیت کے شکار نہیں بلکہ ایسے حالات میں بھی قاری کو جہدِ مسلسل کا پیغام دیتے ہیں۔ درحقیقت وقت کی اہم ضرورت ہے جس کی طرف شاعر نے نشاندہی فرمائی ہے ؎

اپنی ہستی کو جلا کر پہلے سورج تو بنا　　آگہی کی دھوپ میں کھلتا خودی کا پیڑ ہے

کتاب کا سرورق نہایت عمدہ ہے۔ کتابت و طباعت بھی دیدہ زیب ہیں۔ توقع ہے اہلِ ذوق کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

فائر ایریا

ناول نگار : الیاس احمد گدّی
مبصر : نارنگ ساقی
قیمت : ۱۵۰/- روپے
ملنے کا پتا : معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی

ناول کے بارے میں کچھ کہہ دینا نسبتاً آسان ہے۔ کیونکہ ناول کو بغیر پڑھے بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ "اس میں گاؤں کی عکاسی کی گئی ہے۔ زبان وہی ہے جو عام طور پر دیہات میں بولی جاتی ہے اور کردار زندہ و جاندار ہیں وغیرہ وغیرہ" یہ تمام باتیں ناول کو سرسری انداز سے دیکھنے کے بعد کہی جاسکتی ہیں۔ ناقد کو معلوم ہوتا ہے کہ اوّل تو اس نے کچھ ایسا کہا نہیں جس کی وجہ سے گرفت میں آسکے اور اگر کچھ ایسا کہا بھی ہے تو اسے گرفت میں وہی قاری لاسکیں گے جو نہ صرف مکمل ناول پڑھیں گے بلکہ پوری دلچسپی سے پڑھیں گے۔

ادب پارے کی پہلی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ وہ پڑھا جا سکے تاکہ ادیب اپنی بات قاری تک پہنچا سکے اور ناول پڑھا جا سکے اس کے لیے ضروری ہے کہ ناول نگار جو کہانی سنا رہا ہے وہ اتنی دلچسپ ہونی چاہیے کہ قاری کو یہ جاننے کی "خواہش رہے کہ اس کے بعد کیا ہوا؟" کہانی کے کردار کھردرے ہوں یا نرم دل لیکن ہوں ایسے کہ مل کر احساس ہو کہ کمال کا آدمی تھا یا عورت تھی۔ کہانی کا پس منظر بھی بہت اہم ہے، کسی کردار اور واقعے کو کہانی کے پس منظر میں دیکھے بغیر اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں جا سکتا۔

الیاس احمد گدی بڑی رواں دواں نثر لکھتے ہیں، ان کو قاری کو ساتھ لے کر چلنا مشکل نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن زیر تبصرہ ناول "فائر ایریا" میں وہ پوری طرح ایسا نہیں کر پائے۔ دراصل ان کے ذہن کے نہاں خانے میں کہانی یا کردار نگاری سے زیادہ یہ بات تھی کہ وہ کولیری کے بارے میں ناول لکھ رہے ہیں اور اس سے پہلے کسی نے کولیری کے پس منظر میں ناول نہیں لکھا۔

پس منظر ناول کا ایک ضروری حصہ ہے لیکن جب وہ کہانی پر حاوی ہونے لگے تو قاری کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کسی خاص موضوع پر کتابچہ پڑھ رہا ہے۔ یہی صورت حال قاری "فائر ایریا" پڑھتے ہوئے محسوس کرنے لگتا ہے جو کولیری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر اسے کولیری کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی ہیں تو ناول کی بجائے کتابچہ پڑھنا بہتر ہوگا جو خصوصی طور پر اس مطلب کے لیے لکھا گیا ہے۔ گدی صاحب نے کہانی کہنے سے پہلے ایک ابتدائیہ محض اس لیے لکھا ہے کہ قاری کو کولیری کے بارے میں معلومات بہم پہنچا سکیں لیکن انھوں نے ابتدائیہ پر ہی اکتفا نہیں کیا ناول میں کئی ایسے مقام آتے ہیں جہاں وہ کولیری کا لینڈ سکیپ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً ناول کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں۔

> "باوری دھوڑا پرلی طرف کافی دور ہے اگر کوئی مصور کولیری کا لینڈ سکیپ بنانا چاہے تو یوں بنے گا۔ سب سے پہلے چار پانچ کمروں کی ایک عمارت جو کولیری آفس ہے۔ اس سے لگے چند دو کمروں کے کوارٹر جو بابو کوارٹر کہلاتے ہیں وہاں سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر کوئلے کی کان، جس کے ایک سرے پر گاڑیاں کھڑی ہیں یعنی کول ٹب، اسی کے ساتھ ایک شیڈ میں ہالج کا رسہ کھینچنے والے چکے (موٹر بھی ہیں)۔ ایک طرف کوئلے کے ڈھیر ہیں جو لوڈنگ سائٹ کہلاتا ہے اس کے بعد زمین کا ایک بڑا ٹکڑا جو نیچے دھنس کر زمین کی عام سطح سے نیچا ہو گیا ہے۔ یہ بیٹھی ہوئی زمین بن تلسی کی جھاڑیوں سے بھری رہتی ہے اور مختلف سمتوں سے جس میں پگڈنڈیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس بیکار اور بھرتی زمین کے اعتراف میں دھوڑے ہیں۔ ڈھوئیاں دھوڑا۔ پرنگر پا دھوڑا، گیوامی دھوڑا اور ان سے قدرے الگ باوری دھوڑا۔

اس طرح کے پیراگراف کہانی کو سمجھنے میں مددگار ہونے کی بجائے کہانی کی روانی کو روکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری ایسے پیراگراف سے بچ کر نکلنا پسند کرتا ہے۔ اگر ۳۴۷ صفحوں کے

ناول کے آدھے صفحات سے قاری بچ کر نکلنے کی کوشش کرے تو ظاہر ہے وہ گدی صاحب کے ساتھ چلنے کی بجائے یہ کہتا ہوا چلتا ہے کہ گدی صاحب آپ چلیے اگلی سڑک پر پھر ملیں گے۔

فائر ایریا کی کہانی بہت سادہ سی ہے گدی صاحب نے ناول کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار سہدیو جو پہلے حصے میں ایک آدرشی وادی نوجوان ہے، جو برداشت نہیں کر سکتا کہ مزدوروں کو کوئی ایکسپلائٹ کرے۔ دوسرے حصے میں سہدیو سمجھ جاتا ہے کہ مزدوروں کو ایکسپلائٹ کرنے والے صرف مالک اور اس کے گرگے ہی نہیں بلکہ یونین لیڈر بھی اس میں شامل ہیں۔ تیسرے حصے میں وہ یونین کے ساتھ ہو لیتا ہے اور اپنی زندگی میں رنگ بھر لیتا ہے اور آخر میں اس کی آنکھیں کھلتی ہیں جب وہ اپنے محسن اور یونین کے انتہائی وفادار ورکر جمدار کو قتل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

یہ کہانی اتنی سادہ ہے کہ قاری دوسرے باب میں ہی سمجھ لیتا ہے کہ ناول نگار اسے اور سہدیو کو کہاں لے کر جائے گا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ناول میں "جمدار اور پرتی بالا جیسے زندہ اور جاندار کردار ہیں۔ گو کرداروں سے جو زبان بلوائی گئی ہے وہ ان کی روزمرّہ کی زبان ہے پھر بھی ادب میں فحش الفاظ کا استعمال "ارے بولو نہ منہ میں کیا ماں کا ــــ گیا ہے" گراں گزرتا ہے۔ اگر مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ فحش الفاظ ان کی روزمرّہ کی زبان کا حصہ ہیں تو مصنف کو مختلف جگہ پر ــــ کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ روزمرّہ کی زبان کا استعمال کرتے ہوئے بھی کہیں کہیں گدی صاحب چوک گئے ہیں مثلاً صفحہ ۷ پر جمدار الگ زبان بولنے لگتا ہے:

> "غریب، چھوٹا اور بڑا انھیں بھگوان نے نہیں بنایا۔ ان کو نیچے گرایا گیا ہے، ان کا استحصال کیا گیا ہے۔ ان کو بھوکا اور ننگا رکھ کر، سود میں جکڑ کر، بیگار لے کر، مار پیٹ کر، اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ کیڑے بھرے آم کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ سارا سماجی شعور، سارا معاشرتی اور تہذیبی تصوّر ان کے یہاں مفقود ہو گیا۔ صرف ایک بات وہ جانتے ہیں کہ زندہ رہنا ہے، وہی بات جو ایک جانور جانتا ہے۔ یہ سب ایک دو سال یا دس بیس سال میں نہیں ہوا، بلکہ ہزاروں سال سے چلتا رہا ہے، یہ سب کچھ پہلے ڈلا نظام ......

جمدار کی اچانک یہ زبان کھٹکنے لگتی ہے اور وہ یو پی کا باشندہ معلوم ہونے لگتا ہے گدی صاحب کے پاس بہت اچھے کردار تھے، کہانی بہت سیدھی سادھی تھی لیکن افسوس کی بات ہے کہ ناول کی خوبی پر کولیری کی کالک چھا گئی اور مجموعی طور پر ناول ایک معمولی ناول کی سطح سے اوپر نہ اٹھ سکا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات	(تنقید)	ڈاکٹر سید حامد حسین	۵۱/:
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ	(تاریخ)	ڈاکٹر مومن محی الدین	۴۵/:
سیر کر دنیا کی غافل	(سفرنامے)	ڈاکٹر صغرا مہدی	۵۱/:
طرازِ دوام	(شعری مجموعہ)	اختر سعید خاں	۵۱/:
کاسۂ خیال	//	عبدالمعروف خاں چودھری	۵۱/:
مسرت سے بصیرت تک (نیا اڈیشن)	(تنقید)	آل احمد سرور	۹۰/:
بیوہ //	(ناول)	پریم چند	۲۴/:
انشائے غالب	(انتخاب رقعات غالب)	مرتبہ رشید حسن خاں	۶۰/:
تذکیر و تانیث		جانشین امیر مینائی جلیل حسن جلیل	۷۵/:
اردو ڈراما نگاری کا تنقیدی جائزہ		ابراہیم یوسف	۴۵/:
پتھر کی دیوار	(شعری مجموعہ)	سردار جعفری	۱۵/:
وسط ایشیا	(سفرنامہ)	آصف جیلانی	۵۱/:
معیارِ اردو	(محاورے)	جلیل حسن جلیل	۲۱/:
سیرت طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم		اختر الواسع	۱۰/:
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج		ڈاکٹر سید ظہور قاسم	۱۰/:
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات		سید جمال الدین	۵۱/:
محاوراتِ ہند۔ سبحان بخش		مرتبہ محبوب الرحمٰن فاروقی	۵۱/:
حضرت محمدؐ اور قرآن	(مذہب)	ڈاکٹر رفیق زکریا	۲۰۰/:
تفہیم	(مضامین)	رشید حسن خاں	۷۵/:
شناس و شناخت	(تنقید)	پروفیسر انور صدیقی	۶۰/:
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے	(مضامین)	ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری	۵۱/:
چہرہ در چہرہ	(طنز و مزاح)	مجتبیٰ حسین	۵۱/:
فی البدیہہ	//	یوسف ناظم	۴۵/:
تعلیم و تعلّم	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۷۵/:
سرسید اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر مونس رضا سرسید اور اردو یونیورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسن خاں	خطبہ	مرتبہ خواجہ محمد شاہد	۱۰/:
شعریات سے سیاسیات تک		غلام ربانی تاباں	۵۱/:
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں	(تنقید)	عبدالقوی دسنوی	۷۵/:

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما سے متعلق آپ کی دو ٹوک، بے لاگ اور فوری رائے کی ہمیں انتہائی ضرورت ہے مگر کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مختصر بھی ہو۔ (ادارہ)

● م۔ق۔ سلیم، سائبان، ۹۴-۲-۱۹، بیرون فتح دروازہ حیدرآباد۔ اے پی۔

کتاب نما جنوری ۱۹۶ء "چند باتیں، قلم کار اور مدیر کے حوالے سے" مہمان مدیر عطا عابدی نے حقیقت کے ان گوشوں کو وا کیا ہے جس کو چھیڑتے ہوئے دوسرے مدیر کتراتے ہیں۔ قلم کار پہلے یا مدیر؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کو جتنا سلجھائیے الجھتا ہی جائے گا آج کل باغی قلم کار مدیر بننے کی سعی لاحاصل کرتے نظر آتے ہیں۔ دکن جو کہ کسی زمانہ میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتا تھا آج ادبی کھنڈر بن گیا ہے دو ایک رسالوں "سب رس" وغیرہ کو چھوڑ کر کوئی ادبی رسالہ یا جریدہ نہیں نکلتا جبکہ ۲۰۰ سے زائد ہفتہ وار اور ۱۵ سے زائد روزنامے نکلتے ہیں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ بقول عطا عابدی کے "وہ کسی بھی ادبی یا نیم ادبی رسالہ کی ورق گردانی کر کے دیکھ لیجیے بڑے یا مخصوص نام ہر دو چار صفحے بعد کہیں نہ کہیں موجود پائیں گے۔ ان ادبی یا مخصوص "دکانوں" کی پکوان پھیکی ہے یا میٹھی اس پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے"۔

یقیناً عطا عابدی نے آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بھی لکھی ہے وہ بھی ایک رسالہ کے مدیر ہیں اور ان کے افکار اور رملت کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے صرف چند گوشوں پر ہی خامہ فرسائی کی ہے۔ مکمل طور پر وہ مدیر اور قلم کار کا جائزہ لیتے تو نہ مدیر شائع کر سکتا اور نہ قلم کار پڑھ سکتا۔ بہر حال چند باتیں لکھ کر مدیر اور قلم کار کے زخموں پر نمک بھی چھڑکا ہے اور پھاہا بھی رکھا ہے۔

ڈاکٹر عارفہ سلطانہ کا مضمون "ہندستان کی عہد ساز خواتین" ایک تاریخ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس بار ادب زیادہ ہے اسی لیے کتاب نما قطب نما کا کام دے رہا ہے اور قطب مینار کی طرح بلند بھی۔

● فہیم ڈھابوی، شاستری پارک، نئی دہلی

کتاب نما جنوری ۱۹۶ء میں مہمان اداریہ بہت توازن اور بے لاگ انداز میں لکھا گیا ہے جس کی داد دینی چاہیے لیکن یہ سب باتیں عطا عابدی نے بطور صحافی کے لکھی ہیں بطور ادیب کے نہیں، اور شاید بطور ادیب کے ادبی مسئلے پر ہی سہی، کھری، سچی اور جرأت سے وہ بھی نہیں لکھ سکتے کہ آج کا ادیب کل سے کہیں زیادہ مصلحت پسند واقع ہوا ہے۔

● مجاز نوری، مدیر "رفتار نو" ادب کدہ، نور الحسن لین در بھنگہ، بہار۔

کتاب نما (جنوری ۹۵ء) میں عطا عابدی کا مہمان اداریہ اور نامی انصاری کا مضمون بطور خاص پسند آیا۔ قلم کار اور مدیر کے حوالہ سے جن امور پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم قلم کار و مدیر اپنی اپنی سطح پر اپنا جائزہ لیں تاکہ ایک صحت مند ادبی تہذیب کی تشکیل عمل میں آئے۔ عطا عابدی نے جن "چھوٹے مسائل" کی طرف توجہ دلائی ہے وہ اب چھوٹے نہیں رہے۔ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ اشاعت کے لیے قلم کار کی جانب سے مدیر کو مقدمہ کی دھمکی اور رایوان میں آواز

اٹھانے تک کی بات کی جانے لگی ہے۔

دوسری طرف مدیر کو بھی "زمانے" کی ہوا لگی ہوئی ہے۔ ناجی انصاری کی باتیں بھی دعوت فکر دیتی ہیں۔ آپ نے ان دونوں تحریروں کو ایک ہی شمارہ میں جگہ دے کر قارئین کے غور و فکر اور ردِ عمل کے لیے وافر سامان مہیا کر دیا ہے۔

"کھلے خطوط" کالم میں آپ کا یہ نوٹ درست ہے کہ رائے مختصر ہو مگر کیا ہی اچھا ہو کہ کھلے خطوط کے صفحات کم از کم چھے ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین کی آراء شامل اشاعت ہو سکیں۔

● روشن لال روشن بنارسی۔ سی ۲/۱۰ سرائے گوردھن چیت گنج، وارانسی۔ یو۔پی

کتاب نما اردو کا اپنے ڈھنگ کا ایک رسالہ ہے جہاں مدیر کا سلسلہ بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے اس سے ہر شمارہ ایک ندرت اور زاویۂ نظر کا غماز ہو جاتا ہے۔ پھر تقریباً سبھی شماروں میں جامعہ کی کتب فہرست بھی ہوتی ہے۔ ادبی خبرنامہ بھی ایک گراں قدر حصہ ہوتا ہے۔ نومبر کے شمارے میں "اردو مراٹھی لسانیاتی رشتہ" ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ اور جناب م م راجندر کا مضمون پریم ناتھ در اور جدید افسانہ نگاری بھی بہت ہی اہمیت کے حامل مضامین ہیں یہ مضمون پڑھ کر پریم ناتھ در صاحب کی ایک لازوال کہانی "تولڑن بس" بے ساختہ یاد آگئی۔

● تارا چرن رستوگی، اقبال اسٹڈیز سینٹر گوہاٹی

کتاب نما نومبر ۹۵ء کے جملہ مشمولات پڑھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اس رسالے کو مدیر محترم نے ایک اکادمی بنا دیا ہے۔

جناب رگھوناتھ گھمئی کو بھی خاں صاحب نے تلاش کر لیا۔ گھمئی صاحب کی نظم بہ عنوان "آج کی شاعری" بہت اچھی ہے کاش مزید گھمئی صاحب کے اردو خدمت گزاری کے کوائف بغایت امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے گھر پر ہر ماہ مشاعرہ کراتے ہیں جو ایک پُرتکلف ضیافت پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ میزبانی کا دوسرا نام رگھوناتھ گھمئی ہے۔ ان جیسا خاموش اردو کا دوسرا خدمت گزار ملنا مشکل ہے، کاش اردو کی ایسی بے لوث خدمت کرنے والے مل جائیں۔ اردو، فارسی، سنسکرت، ہندی اور انگریزی زبانوں میں موصوف کی مہارت قابل رشک ہے۔

اردو ادبیاتی صحافت میں کتاب نما کو وقیع مقام پر پہنچا دیا ہے۔

● احمد وصی، بمبئی

کتاب نما (نومبر ۹۵ء) کے شمارے میں اپنی غزل پر آپ کے کاتب صاحب کی اصلاح کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ میرے جن شعروں پر انھوں نے "خامہ فرسائی" کی ہے وہ اس طرح ہیں۔

میں اپنے گھر سلامت لوٹ آیا
یہی تو آج کی تازہ خبر ہے

●

لیے پھرتی ہے اپنے ساتھ مجھ کو
بتا اے زندگی جانا کدھر ہے

ادبی تہذیبی خبریں

کل ہند اردو اڈیٹرس کانفرنس

نئی دہلی۔ "اردو اخبارات نے نہ صرف فرقہ پرستی اور علاحدہ پسندگی کے خلاف آواز بلند کی ہے بلکہ اردو کو زندہ بھی رکھا ہے۔ اس زبان نے اور اس زبان کے صحافیوں نے جنگ آزادی میں سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں اس لیے سرکاری اشتہارات دینا چاپلوسی نہیں یہ اردو اخبارات کا حق ہے اور حکومت کا فرض بھی ہے۔"

ان خیالات کا اظہار مرکزی محکمہ سیاحت کے وزیر جناب غلام نبی آزاد نے کل ہند اردو اڈیٹرس کانفرنس کی سلور جوبلی تقریب میں کیا جو ۱۰ جنوری کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ انیکسی میں منعقد ہوئی تھی۔ اپنے خطبہ صدارت میں غلام نبی آزاد نے مزید کہا کہ میرے محکمہ کی جانب سے اردو اخبارات کو صرف ایک فیصد اشتہارات دیے جاتے تھے مگر اب ۱۶ فیصد اشتہارات دیے جا رہے ہیں۔

اس دو روزہ کانفرنس کا افتتاح مرکزی وزیر اطلاعات جناب پی اے سنگما نے کیا جبکہ کرناٹک کے وزیر اعلا ایچ ڈی دیوی گوڑا، مرکزی نائب وزیر داخلہ پی ایم سعید، سابق وزیر داخلہ مفتی محمد سعید، نیو ایج کے مدیر ایم جے اکبر اور اردو اڈیٹرس کانفرنس کے صدر جناب محمد افضل (ایم پی) مدیر اخبار نو دہلی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تنظیم کے سکریٹری رضوان احمد صاحب نے کانفرنس کی ۲۵ سالہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کی، نظامت کے فرائض جناب شریف الحسن نقوی نے انجام دیے۔ یہ دو روزہ تقریب ۱۰ اور ۱۱ جنوری کو نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی جس میں ملک بھر کے تقریباً ۲۰۰ مدیران اخبارات نے شرکت کی۔

اپنے افتتاحی خطبہ میں مرکزی وزیر اطلاعات کے پی سنگما نے کہا کہ حیدرآباد اور بمبئی کا دورہ کرنے میں نے اردو اخبارات کے مسائل سے آگاہی حاصل کی یہ حقیقت ہے کہ اردو اخبارات نے عوامی بیداری کا کام کیا ہے اور اپنے پڑھنے والوں کو یعنی اقلیتی فرقہ کو خود اعتمادی دی ہے ان کے اندر جو عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو رہا تھا اسے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وزیر اعلا کرناٹک نے کہا کہ ان کی ریاست یو این آئی کی اردو سروس کو پچاس فیصد سب سڈی دیتی ہے اور یہ پہلی ریاست ہے جس نے مسلمانوں کو ریزرویشن دیا ہے۔

انگریزی کے صحافی ایم جے اکبر نے اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ رعایت اور سبسڈی طلب کرنا کمزوری کی علامت ہے۔ ۶ دسمبر ۹۲ء کے سانحہ کے بعد آپسی اعتماد ختم ہو گیا اس روز صرف مسجد نہیں ٹوٹی بلکہ بھروسا بھی ٹوٹ گیا، اس حادثہ کے بعد مسلمانوں نے دوسروں پر بھروسا کرنا چھوڑ دیا ہے اب وہ اپنی تعمیر و ترقی اور آگے بڑھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ یہ ایک صحت مند علامت ہے۔

سابق وزیر داخلہ مفتی محمد سعید نے کہا کہ ہمارے ملک کی مستحکم روایتوں اور ثقافتی قدروں کو کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ بی جے پی بھی اسے تبدیل نہیں کر سکتی کیوں کہ ملک کے سیکولر اور جمہوری مزاج کو بڑھاوا دینے میں اردو اخبارات اہم رول ادا کر رہے ہیں اس لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔

مفتی سعید کے ہاتھوں "بے باک صحافی، م افضل" نامی کتاب کی رونمائی ہوئی جسے اڈیٹر روزنامہ "ساز دکن" حیدرآباد دکن محترم محمد باقر حسین شاذ نے مرتب کیا تھا۔ کانفرنس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے شکریہ کے بعد پہلی افتتاحیہ نشست ختم ہوئی۔

...لنچ کے بعد اسی جگہ دوسری نشست ...روع ہوئی جس میں مندوبین نے اپنے ...لات کا اظہار کیا۔

دفتر ندوۃ المصنفین میں آگ

...ئی دہلی۔ ۱۶ جنوری ۹۶ء آج دوپہر کو دفتر ندوۃ المصنفین ...سالہ برہان واقع اردو بازار دہلی میں اچانک ...ں آگ لگ گئی جس سے ادارہ کا بیش قیمت علمی اثاثہ ...ر نایاب کتابیں، پچاس سالہ ریکارڈ، فائلیں ...ں کھاتے وغیرہ سب جل کر خاکستر ہو گئے۔ ...انہ جامع مسجد میں بجلی اکثر غائب رہتی ہے جس کی ...بہ سے موم بتی اور لالٹین کی روشنی میں کام کاج ...یا جاتا ہے۔ دفتر برہان میں موم بتی جل رہی تھی ...لنچ ٹائم میں ملازم لنچ پر چلے گئے، موم بتی بجھانا ...ھول گئے جس کی وجہ سے موم بتی سے کسی کاغذ ...نے آگ پکڑی اور پھر وہ تمام دفتر کو اپنی لپیٹ ...ں لے گئی۔ نقصان کا اندازہ لاکھوں کا ہے اور ...ں ہوئی علمی کتابوں کے نقصان کا کوئی اندازہ ہی ...ہیں کیا جا سکتا ہے۔

کتاب صحرا کی رسم اجرا

...ئی دہلی، ۱۸ جنوری ۹۶ء ڈاکٹر حنیف ترین کے شعری مجموعے ...ناب صحرا" کی رسم اجرا دہلی اردو اکادمی میں "بزم غالب" کے زیر اہتمام پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہاتھوں عمل ...ں آئی۔ پروفیسر نارنگ نے اس موقع پر کہا، حنیف ترین ...ارے ابھرتے ہوئے سنجیدہ شعرا میں شمار کیے ...اتے ہیں جو اپنی شاعری، اپنے فن اور اپنے مشن کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ مسند صدارت سے بولتے ...وئے م۔ افضل (ممبر پارلیمنٹ) نے کہا کہ ہمیں اس ...ت سے کوئی سروکار نہیں کہ نظم طویل ہے یا مختصر، ہمارے لیے تو وہی نظم طویل ہے جو ہمیں بور کر دے۔ اور ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری بور نہیں کرتی۔ پروگرام کی نظامت مخمور سعیدی نے کی۔ اس موقع پر پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر صادق، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر عتیق اللہ قاسمی، بلراج کومل اور حنیف ترین نے بھی جلسہ کو خطاب کیا۔

خواجہ احمد فاروقی کا انتقال

نئی دہلی، ۳۱ دسمبر ۹۵ء اردو کے ایک بزرگ صاحب طرز ادیب، ممتاز محقق و استاد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا آج شام سوا سات بجے تیرتھ رام اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم طویل عرصہ سے علیل تھے اور صاحب فراش تھے۔ ان کی عمر ۸۰ سال کے قریب تھی۔ تدفین کا عمل علی گڑھ میں آیا۔

پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک ڈاکٹر فرحت فاطمہ دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

پروفیسر فاروقی ایک ممتاز دانشور تھے اور ملکی و بین اقوامی سطح پر اردو کی تعلیم و فروغ میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں، ان کی سربراہی میں متعدد یادگار علمی سمینار بھی منعقد ہوئے۔

مرحوم کی متعدد کتابیں علمی و ادبی حلقوں میں مقبول و معروف ہوئیں جن میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ذوق و جستجو"، میر تقی میر، حیات و شاعری، فارسی سے انگریزی ترجمہ دستنبو، چراغ رہ گزر، یاد یار مہرباں، تذکرہ سرور وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر کا انتقال

نئی دہلی، ۲ جنوری ۹۶ء اعظم گڑھ کے شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد طاہر کا بنارس ہندو یونی ورسٹی میں انتقال ہو گیا۔ وہ

شوگر کے مریض تھے اور ان کے گردے خراب ہو گئے تھے۔ ڈالیس کے لیے انھیں بنارس پہنچایا گیا تھا۔

سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ

انور جمال قدوائی کا انتقال

نئی دہلی۔ گذشتہ جمعرات یعنی ۴ جنوری ۱۹۹۶ کی صبح ہونے سے پہلے ہی اودھ کی تہذیب کے نمایندے، سیکولر اقدار کے نقیب، صحافت اور رابطہ عامہ کے میدانوں کے سرخیل، سفارت کار، حکومت کے کارپرداز، تعلیمی منتظم و مدبر اور ادارہ ساز شخصیت انور جمال قدوائی کا آفتاب حیات غروب ہوگیا۔ قدوائی صاحب مسولی ضلع بارہ بنکی کے ایک مشہور تعلقہ دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ رفیع احمد قدوائی ان کے سگے عم زاد تھے۔ ان کے والد ولایت علی قدوائی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے عزیز ترین دوست تھے اور انگریز سامراجیت کے مخالف تھے ساتھ ہی مغربیت کی اندھی اور بھونڈی تقلید کے سخت ناقد تھے اور اس کا ثبوت ان کے وہ کالم تھے جو وہ مولانا محمد علی کے اخبار "کامریڈ" میں "بمبوق" کے قلمی نام سے لکھتے تھے اپنے چچا کی طرح ہی رفیع احمد قدوائی نے بھی انگریز مخالف کے روپ میں عملی جدوجہد کا میدان اپنے لیے چنا۔

یہی وہ ماحول تھا جس میں انور جمال قدوائی مرحوم نے آنکھیں کھولیں اور ان کے شعور کا ارتقا ہوا۔ حب الوطنی، متحدہ قومیت اور سامراج مخالف جذبات ایک طرح کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں ۱۹۲۴ء میں انھوں نے بی اے (آنرز) میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۸ء میں انگریزی زبان و ادب میں ایم اے کرنے کے بـ وہ انگریزی صحافت کے میدان میں آ گئے۔ کیونکہ وہ برطانوی حکومت کی استعماری مشینری کا کل پرز بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تین سال سے زیاد پنڈت جواہر لال نہرو کے قائم کردہ اخبار نیشنل ہ سے وابستہ رہے اور پھر تقریباً اتنے ہی عرصے وہ "ہندستان ٹائمز" کے خصوصی نمایندے ر اسی حیثیت سے دوسری جنگ عظیم کی رپورٹنگ کے لیے انھوں نے خاصا عرصہ جنوب مشرقی ایشـ میں بھی گزارا۔ جہاں انھوں نے اتحادیوں کے ہاتھ جاپانیوں کی شکست، برما، ویتنام اور انڈونیشـ میں نئی قوم پرور قوتوں کے عروج کو بڑے قریب سے دیکھا اور بحیثیت رہنماؤں کی شخصیتوں اور سرگرمیوں سے ہندستانی قارئین کو متعارف کرایا۔ اس باعث انڈونیشیا کی تحریک آزادی کے سالار اور بعد ازاں صدر سوئیکارنو ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

۱۹۴۶ء کے اواخر میں بحیثیت صحافی قدوائی صاحب نے پنجاب اور صوبہ سرحد میں سیاسی حا کا قریبی مشاہدہ کرتے ہوئے رپورٹنگ کی۔ یہ ا کے لیے بڑا تکلیف دہ زمانہ تھا کیونکہ فرقہ وارانہ فـ کی گھٹن اور تقسیم کی طرف ملک کی پیش رفت ایک قوم پرور ذہن کے لیے بڑی کرب ناک تھی۔ مگر آ کون ٹال سکتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں آزاد ہندستان کو جب اپنے لیے خدمت گزاروں کی ضرورت پیش آئی تو جوان العمر انو قدوائی نے ملک کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کردیا اور پھر وہ روم، انقرہ اور لندن میں ہندستا سفارت خانوں میں پریس اتاشی کے فرائض انجا دیتے رہے۔ وزارت خارجہ اور تجارت میں ڈپـ سکریٹری رہے۔ سوئزرلینڈ میں ہندستانی سفارت میں فرسٹ سکریٹری، لندن میں ہندستانی ہائی کمیشن م

ں وسائنسی مشیر بھی رہے۔ اس کے علاوہ ٹی چلنے ے کے ڈپٹی چیرمین، سی ایس آئی آر کے سکریٹری س اور ٹیکنالوجی کی وزارت میں ایڈیشنل سکریٹری بعد ازاں سکریٹری بنے۔

۱۹۷۳ء میں قدوائی صاحب وزارت اطلاعات ریات کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔ یہ زمانہ وہ جب اندر کمار گجرال صاحب اس وزارت کے سربراہ ، لیکن ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ب آزاد صحافت کی مشکیں کسنے کے لیے سنسر قوانین ذ کرنے کی پالیسی کا معاملہ آیا تو انور جمال قدوائی ں کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر پائے اور اسی بنا پر ی خواہش پر انھیں جموں و کشمیر پبلک سروس کمیشن چیرمین بنا کر کشمیر بھیج دیا گیا۔ جہاں سے وہ ۱۹۷۸ء جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بن کر دہلی گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بحیثیت وائس چانسلر ر جمال قدوائی صاحب نے تعمیر و ترقی، توسیع ر جدید کاری کی ایک روشن روایت کی داغ ں ڈالی۔ نئے ہاسٹلوں کی تعمیر، کالج سسٹم کی ، فیکلٹیوں کا قیام اور تنظیم نو، نئے نئے پیشہ ورانہ یت کے کورسیز شروع کیے جن میں شہری ہوا ی کے میدان میں ترقی یافتہ نوجوانوں کی فراہمی کے ، ایرکرافٹ مینٹیننس کا کورس خصوصی اہمیت کا حامل ا تو کہ ان کے بعد افسوس کہ جاری نہ رہ سکا۔ نظامی اور تعلیمی مجالس میں جمہوری طریقوں سے ایندگی کا آغاز، جامعہ کے ماسٹر پلان میں شامل ام الاضیوں کو غاصبانہ قبضوں سے محفوظ رکھنا، تھ ہی مقامی آبادی سے خوشگوار اور خیرسگالی ہمی تعلقات کی استواری ان کے دور کی نمایاں صوصیات ہیں۔

مرحوم قدوائی نے اپنی انتھک جدوجہد، محنت، اور حوصلے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالی اور ترقی دی جس نے کہ نئے ہندستان میں جامعہ کو ایک بار پھر ملک گیر شہرت کا حامل ادارہ بنا دیا۔ وہ ادارہ ماس کمیونی کیشن ریسرچ سنٹر ہے جس کے وہ بانی چیرمین اور بعد ازاں اعزازی ڈائرکٹر رہے۔ اس ادارے کے ذریعے انھوں نے الیکٹرانک میڈیا کے غیر معمولی انقلاب کے آنے سے پہلے ہی جدید ذرائع ابلاغ کے لیے نئی نسل کے وہ تکنیکی اور فنی ماہرین تیار کردیے جن میں سے آج ہر ایک اپنی الگ اہمیت رکھتا ہے قدوائی صاحب نے ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۵ء تک ہر ہر پل اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اس ادارے کو ترقی دینے میں گزارا اور انھیں اس سے ایسی غیر معمولی محبت تھی کہ وہ معیار اور مقدار میں سے کسی پر بھی کوئی ایسا سمجھوتہ کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوئے جس سے اس کے استناد یا بلند پروازی پر کوئی حرف آئے۔

مرحوم انور جمال قدوائی صاحب اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے بائیں بازو کے نظریات کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے اس لیے وہ ایسی تمام عوامی تحریکات اور تنگ نظری، رجعت پسندی، فسطائیت اور فرقہ پرستی کے خلاف ہمارے سماج میں منظر عام پر آتی رہیں۔ ان کی جرأت فکر و عمل ان سے وابستہ نئی نسل کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہی۔ قدوائی صاحب کی ایک خوبی اور بھی تھی کہ انھیں دیکھ کر ہی یہ پتا چلتا تھا کہ ”کام ہی عبادت ہے“ کے کیا معنی ہیں۔ نیم بکھرے بال، سوچتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، ہاتھ یا منہ میں سلیقے سے پائپ دبائے، ۸۰ سال سے زیادہ عمر کے باوجود ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف انور جمال قدوائی صاحب کو ۴ جنوری کو بعد نماز عصر جامعہ کے خصوصی قبرستان میں محمد مجیب کے برابر

سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہ بھی کیسا اتفاق تھا کہ پروفیسر محمد مجیب جو جامعہ کے ذاکر صاحب کے بعد ۲۵ سال تک وائس چانسلر رہے قدوائی صاحب کی طرح اودھ کی تہذیب کا مرقع نمونہ تھے اور دونوں ہی جامعہ سے وابستہ ہونے کے بعد تاحیات جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کہیں اور نہ گئے اور بالآخر یہیں قیامت تک کے لیے آسودہ خاک ہیں۔ شاید اسی کو غالب نے "روا داری بشرط استواری اصل ایماں" کہا تھا۔

قومی مورچہ کے اڈیٹر

شفیع الرحمٰن انصاری کا انتقال

وارانسی، ۲۹ دسمبر ۹۵ء، اترپردیش کے سابق وزیر اور اردو روزنامہ "قومی مورچہ" کے مدیر اعلا شفیع الرحمٰن انصاری آج یہاں دل کا دورہ پڑنے کے بعد انتقال کر گئے۔ وہ ۵۲ برس کے تھے۔ مسٹر انصاری وارانسی شہر کے شمالی اسمبلی حلقے سے تین مرتبہ ریاستی اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ مسٹر انصاری شہر کے متعدد سماجی اور تعلیمی اداروں سے بھی وابستہ رہے۔

معروف طنزیہ و مزاحیہ شاعر نظر برنی کو صدمہ

نئی دہلی۔ ۱۵ جنوری، مشہور شاعر اور ادیب حضرت علامہ خضر برنی مرحوم کی اہلیہ اور معروف شاعر نظر برنی کی والدہ کا کل مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اور آج ۱۶ جنوری ۹۶ء کو بعد نماز ظہر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ادارہ کتاب نما مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے اور سوگوار خاندان کو اپنی دلی تعزیت پیش کرتا ہے۔

اردو ادیب اوپندر ناتھ اشک فوت

الہ آباد۔ ۱۹ جنوری، اردو اور ہندی کے معروف ادیب اوپندر ناتھ اشک کا طویل علالت کے بعد آج یہاں سوروپ رانی نہرو اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۵ برس کے تھے۔

اشک کو سانس لینے میں تکلیف کی شکایت کی وجہ سے گذشتہ ۳ جنوری کو اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ کل رات ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور انھیں مصنوعی طریقے سے سانس دی جا رہی تھی۔ اردو اور ہندی میں متعدد ناولوں، افسانوں اور یادگاری کتابوں کے مصنف اشک کو کئی ادبی اعزازات سے نوازا گیا تھا۔ ابھی حال میں مدھیہ پردیش حکومت نے ہندی اور اردو ادب میں گرانقدر خدمات انجام دینے کے لیے انھیں "اقبال سمان" دینے کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعزاز انھیں ۱۳ فروری کو بھوپال میں بھارت بھون میں ایک تقریب میں دیا جانا تھا۔

آرٹس فیکلٹی کے ڈین

پروفیسر نعیم احمد کا انتقال

علی گڑھ۔ ۲۲ جنوری، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیرمین اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر نعیم احمد کے انتقال کی خبر سن کر آرٹس فیکلٹی میں تمام کلاسوں کو معطل کر دیا گیا اور شعبۂ اردو و آرٹس فیکلٹی کے تعزیتی جلسوں میں ان کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ پروفیسر نعیم احمد ۱۸ جنوری کی دوپہر کو اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے اچانک ان کے دماغ کی رگ پھٹ جانے کے نتیجے میں ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور فوراً ہی اسپتال میں داخل کرایا گیا اور ۱۹ جنوری کی شب میں دہلی کے آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں منتقل کر دیا گیا اور ۲۲ جنوری کی صبح کو تین بجے ان کا انتقال ہوگیا۔ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن نے پروفیسر نعیم احمد کے اچانک انتقال پر گہرے

رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ پروفیسر نعیم احمد دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ میرٹھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے۔ ۱۴ جولائی ۳ ۱۹ء کو مسلم یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو مقرر کیے گئے اور یکم جنوری ۱۹۹۴ء کو آرٹس فیکلٹی کے ڈین کا منصب سنبھالا اور اپنی ڈین شپ کے زمانے میں فیکلٹی کے تمام شعبوں کی توسیع و ترقی کی فکر کرتے رہے وہ ایگزیکیٹو کونسل کے رکن بھی تھے اور ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے اڈیٹر تھے۔ ابھی حال ہی میں انھیں یونی ورسٹی کی پلاٹینم جوبلی تقریبات کا کوآرڈی نیٹر مقرر کیا گیا تھا۔

شعبۂ اردو کے تعزیتی جلسہ میں پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر انصار اللہ نے مرحوم کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر روشنی ڈالی۔

احمد سہیل کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

امریکا میں مقیم اردو کے ادیب اور شاعر احمد سہیل کو عالمی تقابلی ادب کے شعبے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ احمد سہیل نے اپنا تحقیقی کام "عالمی ادب، مغرب اور مشرق کے تناظر میں"، ممتاز ادیب اور یو ڈی سی، واشنگٹن ڈی سی میں انگریزی اور تقابلی ادب کے استاد ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ احمد سہیل برصغیر سے تعلق رکھنے والے پہلے اسکالر ہیں، جن کو اس شعبے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ موصوف کے مقالے میں اردو تھیٹر کا خاطر خواہ حصہ بھی شامل ہے۔

بدر الدین طیب جی کا انتقال

نئی دہلی، ۲۰ دسمبر ۹۵ء، ممتاز سفارت کار اور دانشور بدر الدین طیب جی آج سویرے یہاں انتقال کر گئے ان کی عمر ۸۸ سال تھی۔ مسٹر طیب جی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے شیخ الجامعہ ہونے سے قبل انڈونیشیا، بلجیم، بون (جرمنی) اور تہران میں ہندستان کے سفیر رہے بعد میں وہ جاپان میں ہندستان کے سفیر رہے مسٹر طیب جی ۱۹۳۲ء میں آئی سی ایس میں اور ۱۹۵۷ء میں آئی ایف ایس میں شامل ہوئے۔ انڈین فارن سروس ایسوسی ایشن نے ان کی موت پر جلسہ تعزیت منعقد کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا، ایسوسی ایشن نے کہا ہے کہ ہندستانی خارجہ پالیسی اور خارجہ سروس کے تئیں مسٹر طیب جی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

نائب صدر جمہوریہ ہند کے آر نارائنن نے طیب جی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ایک پیغام میں انھوں نے کہا کہ ہمارے انتظامیہ، ڈپلومیسی اور تعلیم کے لیے ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ طیب جی کے انتقال سے انھوں نے اپنا ایک قریبی دوست کھو دیا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نائب صدر مسٹر راحت محمود چودھری اور مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے ممبر پروفیسر اختر الواسع نے ایک مشترکہ بیان میں بدر الدین طیب جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عہد ساز شخصیت تھے ملک کی خارجہ پالیسی وضع کرنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا اور مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر بھی انھوں نے ملک و قوم کی شاندار خدمت انجام دی۔

بدر الدین فیض الحسن طیب جی کے جسد خاکی کو آج (۲۹ دسمبر) یہاں بعد نماز جمعہ سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرانے قبرستان

میں بیوی کی قبر کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی بیوی ثریا کا انتقال ۱۹۷۰ء میں ہوا تھا۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔ تدفین میں خارجہ سکریٹری مسٹر سلمان حیدر، راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے نائب چیرمین مسٹر عابد حسین، جرمنی میں ہندستان کے سابق سفیر کرنل رحمٰن، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر بشیر الدین احمد، جامعہ ہمدرد کے چانسلر حکیم عبدالحمید، مسلم یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید حامد، جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین، جامعہ ملیہ کے رجسٹرار محمد میاں، اساتذہ ایسوسی ایشن کے نمائندے پروفیسر فیضان سمیت یونی ورسٹی کے تمام شعبوں کے لوگ شامل تھے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کے پتے میں تبدیلی

ڈاکٹر ستیہ پال آنند کا نیا پتا یہ ہے۔

606, Adams Street
Herndon VA 22070
U.S.A

مکتبہ جامعہ کی علی گڑھ شاخ کے انچارج کو صدمہ

علی گڑھ۔ ۲۰ جنوری ۹۶ء مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی علی گڑھ برانچ کے انچارج مرتضیٰ حسین بلگرامی کی حقیقی چچی صاحبہ کا ۹ جنوری کو ان کے وطن میں انتقال ہو گیا۔ اکتوبر میں موصوف کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۸ دسمبر ۹۵ء کو چھوٹے بھائی اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اللہ ربّ العزّت سے دعا کرتا ہے کہ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور بلگرامی صاحب اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل دے۔

مکتبہ جامعہ کے سابق کارکن کو صدمہ

نئی دہلی ۱۷ جنوری ۹۶ء مکتبہ جامعہ کے سابق کارکن جناب مجیب احمد خاں کی اہلیہ فیروزہ بیگم مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ ۱۵ جنوری کی شب میں اچانک بلڈ پریشر بڑھ جانے کی وجہ سے مرحومہ کے دماغ کی نس پھٹ گئی تھی۔ تدفین جامعہ کے قبرستان میں ہوئی۔ مرحومہ جامعہ برادری میں اپنی نیک طینت اور خوش مزاجی کی وجہ سے بہت مقبول تھیں۔ اس لیے پرسہ دینے والے مردوں اور عورتوں کا دن بھر تانتا بندھا رہا۔ مکتبہ جامعہ کے تمام کارکنوں سے ان کے گھریلو تعلقات تھے، اس لیے مکتبہ جامعہ کا ہر فرد غم میں ڈوبا ہوا ہے اور ان کی مغفرت کے لیے دُعا کر رہا ہے۔

جامعہ برادری کو صدمہ

نئی دہلی۔ ۱۸ جنوری ۹۶ء جناب نورالدین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرانے کارکن تھے۔ ڈرائیور تھے۔ جامعہ کی "بس" چلاتے تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ ۱۷-۱۸ جنوری کی شب میں مجیب احمد خاں کی اہلیہ کے تدفین میں شریک رہے پھر مجیب احمد خاں کے گھر پر پرسے کے لیے گئے۔ اسی رات ۱۲ بجے کے لگ بھگ سانس کی تکلیف محسوس کی۔ اپنے صاحبزادے کی ضد پر اسپتال چلے گئے لیکن کوئی دوا کارگر نہیں ہوئی اور صبح تین بجے انتقال ہو گیا۔ تدفین جامعہ کے قبرستان میں ہوئی۔ مرحوم کی خوش مزاجی اور خلوص کا یہ حال تھا کہ ان کے دور کے طلبہ اور اساتذہ انھیں اپنا عزیز سمجھتے تھے۔ مرحوم کے اس اچانک انتقال پر جامعہ کی فضا انتہائی سوگوار ہو گئی۔ مکتبہ جامعہ مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو صبر کی تلقین عطا فرمائے۔ آمین۔



نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

مارچ ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۳

فی پرچہ 6/50

سالانہ 60/=

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 80/=

غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=

(بذریعہ ہوائی ڈاک) 350/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، انتقاد و تبصرے کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

سورۂ رحمٰن (ترجمہ و تشریح) حکیم محمد سعید	۶/-
بے نام شجر (شعری مجموعہ) نورجہاں ثروت	۱۶۰/-
غالب پر چند تحقیقی مقالے پروفیسر نذیر احمد	۶۰/-
غالب نامہ (سلور جوبلی نمبر) ″	۵۰/-
جدید اردو غزل - ۱۹۸۰ء کے بعد	۱۰۰/-
ڈاکٹر صاحب کے خط	۲۵۰/-
اردو میں دانشوری (مقالات)	۲۵۰/-
تاریخ کے ساتھ کھلواڑ (مقالات)	۵۰/-
اردو مسئلہ (مباحث و مقالات)	۴۰/-
زیور اخلاق (غزلیات) نقی احمد ارشاد	۳۰/-
نور فاراں (نعتیہ کلام) عاقل مراد آبادی	۳۰/-
جدید اردو افسانے کا موضوعاتی ارتقاء محمد کمال الدین	۶۰/-
شیشوں کے درمیاں (مجموعہ کلام) شفق تنویر	۵۰/-
فلمی معلومات - مرتبہ ڈاکٹر الف انصاری	۲۵/-
ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد (سالنامہ) اڈیٹر مصطفیٰ کمال	۱۵/-
متاع ہنر (شعری مجموعہ) محمود سروش	۱۲۰/-
شہر آشوب ایک تجزیہ - ڈاکٹر امیر عارفی	۱۲۵/-
شیر دریا (ادب) رضا علی عابدی	۱۵۰/-



سرورق ـــــ ڈاکٹر شہیر رسول

مکتبہ جامعہ کی اہم کتاب

تصوف
خواجہ حسن ثانی نظامی

رسم اور حقیقت

تصوف کی تاریخ، صوفیہ کے نظامِ حیات، تعلیمات، ہندستانی سماج پر صوفیہ کے اثرات۔ اور ان جیسے بہت سے دوسرے سوالات پر روشنی ڈالنے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جس میں برِّصغیر ہند و پاک میں رائج جملہ صوفی سلسلوں کے مکمل شجرے بھی دیے گئے ہیں۔ ایک ایسی کتاب جو صوفیہ کی زندگیوں اور ان کی جہد و سعی کا حقیقی رخ سمجھنے میں کلید کا کام دے گی۔ صوفی لٹریچر میں ایک قابلِ قدر اضافہ۔ قیمت ۹۰/-

متاعِ ہنر
محمود سروش

محمود سروش الفاظ کے مزاج داں ہیں، صداقت، جذبات اور خلوصِ اظہار ان کی ندرتِ کلام کے ضامن ہیں ان کی شاعری میں ایک لطیف جمالیاتی کیف ہے

قیمت ۱۲۰/-

بے نام شجر
نورجہاں ثروت

نورجہاں ثروت کی غزلوں میں ان کا اپنا لب و لہجہ ہے جذبات اور کیفیتوں کے بیان میں ایسی تاثیر ہے جس کا اثر تا دیر رہتا ہے۔ قیمت ۱۶۰/-

ضربِ آگہی
محمد آفاق

یہ مجموعۂ کلام ایک ہی نشست میں پڑھنے کی چیز نہیں۔ اگر قسطوں میں پڑھیں گے تو یہ آپ کو زندگی کی صداقتوں کی طرف متوجہ کرلے گا۔

قیمت ۶۰/-

مہمان مدیر
ڈاکٹر شہپر رسول
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اشاریہ

پیکر تراشی کے حوالے سے

مشاہدہ اور تجربہ انسانی ذہن کا فطری عمل ہے۔ یہ عمل تخیل و تصوّر کا احاطہ کرتا ہے اور مادّی و غیر مادّی ارضی و غیر ارضی نیز فطری اور غیر فطری اشیا، اور اوصاف پر اپنی کمند ڈالتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذہنِ انسانی دیکھی ان دیکھی اور محسوس و غیر محسوس اشیا و تصورات کی پرچھائیوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ حواسِ خمسہ مادی دنیا سے جس قدر تجربات کشید کرتے ہیں، ان کے نقوش انسانی ذہن کے نہاں خانوں میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور جب ہمارے سامنے ایسے کسی تجربے، شے یا صفت کا ذکر ہوتا ہے تو اس کا عکس پردۂ ذہن پر اُبھر آتا ہے۔ اس عکس کو "ذہنی شبیہہ" یا "ذہنی پیکر" کہتے ہیں اور جب یہی عکس "لفظی تصویر" کی شکل اختیار کرتا ہے تو "لسانی پیکر" کہلاتا ہے۔ فنی سطح پر "ذہنی پیکر" کو "لسانی پیکر" میں تبدیل کرنے کا عمل ہی پیکر تراشی کا کمال ہے۔ ہر تخلیقی زبان اور ذہن میں تصویر کاری کی قوت اور صلاحیت پنہاں ہوتی ہے اور یہی صلاحیت فن پارے میں پیکر تراشی کے رنگ بھرتی ہے۔

تخلیق کار بسا اوقات اپنی باطنی کیفیات کا اظہار براہ راست نہیں کرتا بلکہ کائنات کی بعض اشیاء اور احوال سے ان کی مماثلت و مناسبت پیدا کر کے نفسِ مضمون کو روشن کرتا ہے اور معنوی جہات میں اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح اس کے مافی الضمیر کی بالواسطہ ترسیل ہوتی ہے۔ اس عمل کو تخلیق کار کی مخصوص پیکر تراشی کہا جاتا ہے۔

تخلیق کا عمل تنقید اور مطالعے کے عمل کے برعکس ہوتا ہے۔ اس طرح یہ بھی درست ہے کہ تنقید کا عمل تخلیق کے عمل کے برخلاف ہوتا ہے۔ تخلیق کا عمل باطن یا اندر سے باہر کی طرف یا مجرد سے ٹھوس کی طرف ہوتا ہے۔ تنقید یا مطالعے کا عمل باہر سے اندر کی طرف یعنی ٹھوس سے تجرید یا ماورائیت کی طرف ہوتا ہے۔ قاری یا ناقد کی حیثیت سے جب ہم کسی تخلیق یا فن پارے کو مطالعہ و تنقید کا نقطۂ آغاز بناتے ہیں تو اس کا ایک لازمی ردِ عمل ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ اس کے متعلقہ عناصر ہمارے حواس کو متاثر کرتے ہیں۔ اس عمل میں اولاً ہم تخلیق یا فن پارے کو ایک "لسانی پیکر" کی حیثیت سے سامنے رکھتے ہیں اور پھر اس کے مفہوم تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ اس کے نقاد یا قاری کی حیثیت سے تخلیق کی دیگر خوبیوں، نزاکتوں اور جہات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس عمل میں اس امر کا بطورِ خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ تخلیق یا فن پارے کی بنیادی ساخت کیا ہے؟ اس کی مجازی، تخلیقی اور جمالیاتی زبان کی نوعیت کیا ہے؟ اس میں استعاروں اور پیکروں کا استعمال اور ان کی شناخت کیا ہے؟ دراصل پیکر تراشی انسانی ذہن

کا بنیادی وصف ہے۔ اس لیے ہر تخلیق میں پیکروں کا ہونا ایک فطری سی بات ہے۔ چونکہ ہر لفظ، ترکیب تشبیہ، استعارہ اور علامت میں "پیکر" بننے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لیے تخلیق یا فن پارے کی ساخت پر غور کرکے پیکر تراشی کے عمل اور پیکروں کی نوعیت کی شناخت کی جا سکتی ہے مگر اس کا انحصار تخلیقی زبان کے مخصوص استعمال پر ہوتا ہے۔ چند مثالیں اشعار کے حوالے سے ملاحظہ کیجیے ؎

یہ برف سی ترے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی !
مری نگاہ میں خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا
(شکیب جلالی)

نہیں ہے آنکھ کے صحرا میں ایک بوند سراب
مگر یہ رنگ بدلتا ہوا سا کچھ تو ہے
(بانی)

اس کی آواز میں تھے سارے خد و خال اس کے
وہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پر و بال اس کے
(وزیر آغا)

زمیں پہ کس لیے زنجیر ہو گئے سایے
مجھے پتا ہے مگر میں نہیں بتانے کا
(شہریار)

ان اشعار میں آنکھ کے صحرا میں ایک بوند سراب کا نہ ہونا، چہرے پر برف کا پگھلنا، نگاہ میں خواہش کا شائبہ بھی نہ ہونا، آواز میں خد و خال کا دکھائی دینا، پر و بال کا ہنسنا اور زمین پر سایوں کا زنجیر ہو جانا وغیرہ مخصوص انداز کا ایسا تصویری اظہار ہے جس کی مدد سے زندگی کے گوناگوں تجربات پیکروں کی شکل میں قاری کے ذہن پر اپنے تاثرات کو منکشف کرتے ہیں۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پیکر تراشی کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا۔ اس ضمن میں اصل دشواری یہ ہے کہ پیکر تراشی کی حدیں صرف کسی منظر نامے کی تشکیل تک ہی محدود نہیں بلکہ زبان کا تخلیقی اور مجازی استعمال بھی اس کے دائرے میں آتا ہے۔ مجازی استعمال سے مراد زبان کا غیر لغوی استعمال ہے جو فن کار سے ایک مخصوص ذہانت کا تقاضا کرتا ہے مثلاً چند اشعار زبان کے تخلیقی استعمال کے ضمن میں پیش کروں۔

ہم سفر سیل ہوا کے تھے ٹھہرتے بھی کہاں
یوں تو راہوں میں کئی ٹھور ٹھکانے آئے
(نشتر خانقاہی)

ملا تو منزلِ جاں میں اتارنے نہ دیا
وہ کھو گیا تو کسی نے پکارنے نہ دیا
(ظفر اقبال)

مرا وجود ہے یا گونجتا ہے سناٹا
ہے شور ایسا کہ کچھ بھی مجھے سنائی نہ دے
(عنوان چشتی)

گزارتا ہوں جو شب عشق بے معاش کے ساتھ
تو صبح اشک مرے ناشتے پہ گرتے ہیں
(صابر ظفر)

آسمانوں سے پرندے لوٹنے کا وقت ہے
اس سمے پیڑوں سے یہ طائر کدھر رخصت ہوئے
(اسعد بدایونی)

راستہ دیر تک سوچتا رہ گیا
جانے والے کا کیوں نقشِ پا رہ گیا
(ہلال فرید)

ان اشعار کے خالقوں نے اپنے شعری اظہار کو پُر اثر بنانے اور اس میں جامعیت اور ہمہ گیری پیدا کرنے کے لیے تشبیہی، استعاراتی اور علامتی انداز اختیار کیا ہے۔ ٹھوکر کھانے، وجود کا گونجنا، منزلِ جاں، عشق بے معاش، پرند اور راستہ وغیرہ ایسے الفاظ و تراکیب ہیں جن کے استعمال میں تشبیہ، استعارہ اور علامت کا رنگ ہے۔ بنیادی طور پر تخلیقی یا مجازی زبان کے یہ اجزاء پیکر تراشی کے کلیدی عناصر ہیں۔ پیکر تراشی چھوٹے پیمانے پر وہی کام انجام دیتی ہے جو کام بڑے پیمانے پر شاعری کرتی ہے۔ شاعری کی تفہیم کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ شاعر دنیا کی بے ترتیبی سے دو چار ہو کر اپنی شاعری کے تناظر میں ایک بالترتیب ردّعمل پیش کرتا ہے۔ گویا شاعرانہ پیکر تراشی یا تو بے ترتیبی کے احساس میں اضافہ کرتی ہے یا ترتیب کے احساس کو گہرا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر سڈنی (SIDNEY) کی نظم کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

"WITH HOW SAD STEPS,
O MOON, THOU, CLIMB'ST THE SKIES!
HOW SILENTLY, AND WITH HOW
WAN A FACE!"

("اے چاند تم کس قدر زرد (بے رونق) چہرہ لیے کس درجہ خاموشی سے کتنے طول قدموں کے ساتھ آسمان کی بلندی (مسافت) طے کر رہے ہو")

اس نظم کی روح تک رسائی پیکر تراشی کی مدد ہی سے ممکن ہے۔ ان سطروں میں چاند کو بوجھل قدموں کے ساتھ مسافت طے کرتے ہوئے کسی افسردہ، زرد اور بے رونق چہرے والے انسان کے مماثل ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ اندازِ سخن کئی سطحیں رکھتا ہے۔ چاند کا مجسم ہونا اور انسانی غموں میں مبتلا ہونا ایک واضح خیال پیش کرتا ہے۔ اس کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ شاعر نے افسردگی کے اظہار کے لیے ایک بالواسطہ اور ذہانت سے بھرپور شعری طریقہ کار استعمال کیا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے افسردگی اور بے رونقی سے ملتی جلتی چیزوں کو یکجا کر کے افسردگی کے احساس کو نہایت اثر انگیز اور مضبوط بنا دیا ہے

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیکر تراشی خیال کو پیچیدہ اور معنی خیز بناکر اس کے تاثر میں زیادہ قوت پیدا کردیتی ہے۔ ادب بالخصوص شاعری میں پیکر تراشی کی بڑی اہمیت ہے۔ شاعری کے ضمن میں اظہار خیال کرتے ہوئے ٹی۔ ڈبلو۔ ڈٹن T.W.DUTTON نے تصویری ترسیل پر بہت زور دیا ہے۔ اس کے مطابق خالص شاعری انسانی ذہن کا وہ جذباتی اور پُرآہنگ لسانی اظہار ہے جس کو مادّی اور فنکارانہ مگر تصویری اظہار بھی کہا جاسکتا ہے۔ مغرب و مشرق کے بیشتر نقاد اس بات سے متفق نظر آتے ہیں کہ تخیل کا سب سے پہلا اور سب سے نمایاں وصف تصویر سازی کی صلاحیت ہے۔ اس صلاحیت کے ذریعے ذہن ایسے پیکروں کو بھی جنم دیتا ہے جو آنکھ کے سامنے نہ ہوں یا حقیقتاً ان کا وجود ہی نہ ہو۔ یعنی شعری تصویر کاری کی صلاحیت کے ذریعے شاعر اپنے فنی اظہار میں بعض انجانی اور ان دیکھی اشیا کو بھی ایک نام اور ایک شکل عطا کردیتا ہے۔ شیکسپیر کا خیال ہے۔

> "شاعر کی آنکھ اپنی بے چین گردش (یا جنونی کیفیت) میں زمین سے آسمان تک یا آسمان سے زمین تک کا نظارہ کرتی ہے اور جیسے جیسے تخیل کا سانچہ ڈھلتا ہے شاعر کا قلم غیر متعارف چیزوں کو ایک شکل دینے لگتا ہے اور لاوجود کو نام دے کر اسی سرزمین پر اپنے ماحول میں بسا لیتا ہے۔"
>
> (A MID SUMMER NIGHTS DREMY)

شاعر کے ذہن کی یہ صلاحیت اس کی ذہانت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ قاری و سامع کو یہی چیز اس قدر متاثر کرتی ہے کہ وہ شاعر کے خیالات کی راہ پر چل کر اس کے باطن کی گہرائیوں تک دسترس حاصل کرلیتا ہے۔

یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ شاعری اور پیکر تراشی دونوں چیزیں انسانی ذہن کے بنیادی اعمال و اوصاف میں شامل ہیں۔ واقعہ ہے کہ انسان موجودات تک پہنچنے سے قبل تصورات IMAGINATION کی تشکیل کرتا ہے۔ کھلے ذہن سے سوچنے سے پہلے گھبراہٹ اور الجھن کے ساتھ اپنی صلاحیتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ درست طور پر بول پانے سے قبل گیت گاتا ہے۔ نثر میں گفتگو کرنے سے بیشتر نظم کی زبان بولتا ہے اور تکنیکی اصطلاحات کے استعمال سے پہلے استعارے کا استعمال کرتا ہے اور یہ استعاراتی زبان اس کے لیے قطعی فطری ہوتی ہے۔ پس انسانی ذہن کا یہی وصف شاعرانہ پیکر تراشی کے لیے اساس مہیا کرتا ہے۔ انجانی اور ان دیکھی چیزوں اور کیفیات کو ایک شکل اور ایک نام دے دینا، بے جان اور بے حرکت اشیا میں حرکت یا ارتعاشات کو جنم دے کر تصویری ترسیل کی کیفیت پیدا کرنا شعری پیکر تراشی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسی لیے پیکر تراشی کو شاعری میں روح پھونکنے کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ سی۔ ڈے لیوس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پیکر تراشی شاعری میں قلب کی حیثیت رکھتی ہے اور ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ شعر خود ایک ایسا پیکر ہو جس کی تشکیل مختلف پیکروں کے ذریعے ہوئی ہو۔ اس بات سے پیکر کے وسیع تر میدانِ عمل اور اس کے تخلیقی پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

پیکر تراشی کے حوالے سے یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر کو اعلا درجے کی مصوّری بھی کہا جاسکتا ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر اس شے، خیال یا حالت کو بڑی چابکدستی، حسن اور فنکاری کے ساتھ شعری زبان میں مرتسم کردیتا ہے جس کو ایک مصور اپنی تمام تر صنّاعانہ قوت اور بعض خارجی

اشیا کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر نقش کرنے میں بسا اوقات اس قدر کامیاب نہیں ہو پاتا۔ دراصل پیکر تراشی تجربے کی ایک سے زیادہ سطحوں کو ادرش کرتی ہے اور شعر میں تصویریت اور معنویت کا اختلاط نیز تصویر در تصویر کی کیفیت زندگی کی نت نئی پیچیدگیوں کو بھی شاعرانہ خوبصورتی کے ساتھ آئینہ کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل
وزیٹنگ پروفیسر
ٹوکیو یونی ورسٹی آف فارن اسٹڈیز، جاپان

اردو مثنوی ــ اور تحریک مجاہدین کا ایک غیر معروف شاعر

قائم خاں قائم

کپتان قائم خاں قائم کے حالات اور اس کے ذکر سے متعلقہ ماخذ بالعموم خالی ہیں۔ جبکہ یہ ایک پرگو شاعر تھا اور اس نے بالخصوص غزل اور مثنوی کے ساتھ ساتھ متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ ٹونک سے اس کا تعلق تھا لیکن ٹونک کی ادبی یا علمی و تہذیبی تاریخ سے متعلق جو ماخذ دستیاب ہیں اور وہاں کے شاعروں کے جو تذکرے منظر عام پر آئے ہیں، ان میں اس کا ذکر موجود نہیں۔ راقم کے ذخیرۂ کتب میں اس کا ایک ضخیم دیوان "دیوانِ قائم"، اور ایک ضخیم مثنوی "گوہر نگار" محفوظ ہیں۔ دیوان ۳۹۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع جعفری اکبرآباد سے حافظ جعفر بخش کے اہتمام سے ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوا ہے مثنوی بھی یہیں سے شائع ہوئی ہے لیکن راقم کے نسخہ میں اس کا آخری ورق نہ ہونے کے باعث اس کے سنہ اشاعت کا علم نہیں ہوتا۔ یہ صفحہ ۲۱۶ پر خاتمہ مثنوی کے عنوان کے تحت ، اشعار کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ امکان ہے کہ اس کا آخری ورق ہی ضائع ہوا ہے۔ اس کی داخلی شہادت سے یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ قائم نے اسے دیوان کی تکمیل کے بعد لکھنا شروع کیا۔

ع　　کیا جب کہ دیوان میں نے ختم . . . . .
مثنوی: ۱۲

دیوان اور مثنوی دونوں کی کتابت و طباعت اور کاغذ کے معیار کی یکسانیت سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں تقریباً ساتھ ہی ساتھ شائع ہوئی ہیں۔

دیوان اور مثنوی میں ایسی داخلی شہادتیں بھی موجود نہیں، جن سے شاعر کے حالات کے بارے میں علم ہو سکے۔ یہ نواب وزیر محمد خاں وزیرالدولہ کے عہد (۱۸۳۴ء ــ ۱۸۶۴ء) سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے دیوان اور مثنوی دونوں میں ان کی شان میں مدحیہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ اگرچہ اس کے نام کے ساتھ "کپتان"، کا لاحقہ بھی یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ ریاست کی فوج میں اس عہدے پر فائز رہا ہے یا اپنے اجداد سے، کہ وہ ریاست میں کبھی اس عہدے پر فائز رہے ہوں گے، ور ا شتاً جیسا کہ وہاں یہ رواج قائم ہو گئی تھی، اس نے بھی اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا ہوگا۔ مگر اس نے وزیرالدولہ کی نسبت اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے خود کو بحیثیت کپتان ان کا نوکر بتایا ہے جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ ریاست میں سرکاری ملازمت اور اپنے اسی مذکورہ عہدے کے ساتھ وابستہ تھا:

ملازم ہیں ان کا ہی کپتان ہوں دل و جاں سے حاضر میں ہر آن ہوں

دیوان : ۳۹۰

میں نوکر ہوں جس کا اے یار کریم اسے بھی تو رکھ خوش بہر دوسرا

دیوان - ۹

میں نوکر اس کا ہوں آقا ہے میرا حاتم ثانی اسے زیبا ہے ہر طرح سے ہر رتبہ بھلائی کا

مثنوی - ۹

پھر دیوان کے خاتمہ میں بھی اس موضوع پر یہ اشعار ملتے ہیں، جن سے اس کے مصطفیٰ آباد (ٹونک) میں متمکن اور وزیرالدّولہ کی ملازمت میں رہنے کی واضح شہادت ملتی ہے :

دل آباد ہے اور جی شاد ہے کہ میرا وطن مصطفیٰ باد ہے
جو ہے والیٔ ٹونک ابن امیر وہ ہے میرا آقا محمّد وزیر

قائم نے یہاں ٹونک کو "مصطفیٰ آباد" سے موسوم کیا ہے جبکہ یہ "محمد آباد" کے نام سے معروف ہوا ممکن ہے اوّلاً ٹونک کے لیے محمّد آباد ہی نام تجویز ہوا ہو، مگر چونکہ ہندستان میں اور بھی محمد آباد موجود رہے ہیں، اس لیے شاید اسے مصطفیٰ آباد سے موسوم کر دیا گیا ہو لیکن بعد میں یہ کسی وجہ سے "محمد آباد" کے نام ہی سے معروف ہوا، جو متاخر ماخذ سے ثابت ہوتا ہے[1]۔ پھر بھی قائم کی اس عصری شہادت کے بعد اس کا نام ایک وقت میں "مصطفیٰ آباد" ضرور رکھا گیا تھا۔ کیوں کہ یہ امکان کم ہے کہ وہ کسی اور مصطفیٰ آباد میں مقیم ہو جیسے "جوناگڑھ" کا یہ نام رکھا گیا تھا[2]، یا مین پوری (یوپی) کی ایک تحصیل کا بھی یہ نام تھا[3] اور ضلع انبالہ میں بھی ایک تحصیل اس نام کی تھی[4]۔ لیکن قائم کا ان میں سے کسی ایک میں رہ کر وزیرالدولہ کی ملازمت میں رہنا بعید از حقیقت ہے

ریاست کے افغان نسل حکمرانوں کی طرح قائم یا اس کے اجداد کا تعلق بھی افغانستان سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اردو کے علاوہ ہندی، فارسی اور پشتو سے بھی خوب واقف تھا۔ اس کے دیوان میں "افغانی غزلیں" اور پشتو کی ایک مقبول صنف "ٹپہ" کو اردو میں اختیار کرنے کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

قائم نے وزیرالدولہ کی نسبت جو عقیدت مندانہ اور دعائیہ جذبات بیان کیے ہیں ان کا نمونہ یہ ہے

جواں مرد ہے وہ خجستہ سیر خدا سی بزرگی اسے ہے عطا
وہ ہے معدن جود دار باب علم نہیں جس (کا) ثانی کوئی دوسرا
وہ ہے ہند میں ایک سلطان دیں ثنا خواں ہے (ہر) یک بصد مرحبا
شجاعت کے عالم میں ہے لا مثال سخاوت میں رکھتا ہے دل کو بھرا

---

[1] مثلاً سید اصغر علی آبرو "حدیقہ راجستان"، مطبع ستارۂ ہند، آگرہ ۱۳۱۸ھ، مقدمہ ص ۷؛ سید علی اصغر پیشکار "نجم الثاقب"، مطبوعہ، بجنور، ۱۹۰۴ء، ص ۵

[2] بحوالہ "ENCYCLOPEDIA OF ISLAM"، نئی اشاعت، جلد دوم، لائیڈن، ۱۹۶۵ء، ص ۵۹۷، ۱۱۲۷

[3] بحوالہ "IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA"، جلد ۱۸، آکسفورڈ، ۱۹۰۸ء، ص ۶۲

[4] بحوالہ: اے گھوش "AN ENCYCLOPEDIA OF INDIAN ARCHAEOLOGY" جلد دوم، لائیڈن، ۱۹۹۰ء، ص ۹۶

عبادت کے دریا کا ہے ایک در ‏ ‏ جبیں پر ہے قدرت کی اس کے ضیا
مروت فتوت کا جامہ ہے یہ ‏ ‏ سبھی لوگ جس پر کریں جاں فدا
وہ عادل ہے عالم ہے عامل غرض ‏ ‏ شب و روز کرتا ہے کار خدا
خدایا اسے رکھ بجاہ و جلال ‏ ‏ کہ رونق ہے اس کے ہی دم سے سوا
کرم رحم سے اس کا دل شاد رکھ ‏ ‏ نہ لا پاس کچھ اس کے جور وجفا
تو دنیا میں قائم رکھ اس کو رحیم ‏ ‏ وہاں تک کہ خورشید کا ہے ضیا

دیوان: ۹-۱۲

وزیر الممالک محمد وزیر ‏ ‏ جوان و جواں بخت روشن ضمیر
عدالت گری اور سخاوت کا طور ‏ ‏ ہے جیسا ہے اس میں نہ ہو کوئی اور
جہاں میں ہوئے ہیں سلاطیں تمام ‏ ‏ نہ ایسا کسی نے کیا جگ میں نام
کہ نواب نے جو کیا ہے ضرور ‏ ‏ اسے جانتے سب ہیں نزدیک و دور
کہ فعل شنیعہ جو تھے لا کلام ‏ ‏ کیے ملک سے دور اپنے تمام
جھکایا سبھوں کو رہِ دین پر ‏ ‏ بد آئین بھی آئے آئین پر
ہے رونق عجب شہر اسلام میں ‏ ‏ ہے نیکی کا ہر کار ہر کام میں
اسے علم کا شوق ہے اس قدر ‏ ‏ کہ جو ذکر ہے اس کا شام وسحر
ادب حفظ معقول ومنقول ہے ‏ ‏ خدا کا وہ ہر طرح مقبول ہے
ہے جب تک جہاں میں یہ ماہِ منیر ‏ ‏ الٰہی رہے شاد دل یہ وزیر
اسے خرم و شاد رکھ تو مدام ‏ ‏ طفیلِ محمد علیہ السلام

مثنوی: ۸ — ۱۱

یہاں انہی اشعار کے درمیان قائم نے وزیر الدولہ کے والد نواب امیر الدولہ (۱۷۶۸ء-۱۸۳۴ء) کی شان میں بھی اس طرح کے اشعار لکھے ہیں:

جہاں میں تھا زور اس کی شمشیر کا ‏ ‏ ہر اک اس سے ڈرتا تھا چھوٹا بڑا
ولایت سے تھا نامور وہ امیر ‏ ‏ نہ رکھتا تھا دنیا میں (اپنی) نظیر
کیا اس نے آباد سنبل کے تئیں ‏ ‏ وہ کرتا تھا گلزار جنگل کے تئیں
ہوا ٹونک میں جب کہ رونق فزا ‏ ‏ تو گردن کشوں نے دبا سر جھکا
گیا جس ولایت میں وہ نامور ‏ ‏ کیا پل میں تسخیر اسے سربسر

مثنوی: ۱۰-۱۱

قائم کو سید احمد شہید سے بے پناہ عقیدت ونسبت تھی اور چونکہ نوابین ٹونک بھی سید احمد شہید کی تحریک سے ربط وعقیدت رکھتے تھے، اس لیے قائم کے خیال میں وزیر الدولہ کی نیک طبعی اسی تحریک کے زیر اثر تھی:

خلیفہ ہے یہ سید احمد کا ایک "تو ہوتا ہے اس سے ہر اک کار نیک
مثنوی: ۱۰

وزیر الدّولہ عالی ہے خادم دل سے جو ان کا تو ان کے فیض سے ان کو ملا درجہ بڑائی کا
قائم کا طبعاً مذہب کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ اس سے قطع نظر کہ اس وقت کی روایت کے مطابق اس کے دیوان اور اس کی مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے، اس کے دیوان کی متعدد غزلوں میں بھی نعتیہ اشعار شامل ہیں اور ساتھ ہی دیوان میں نعت و مناجات کا ایک علاحدہ گوشہ موجود ہے۔ اور اس کی مثنوی میں منقبتیں بھی شامل ہیں بلکہ اس کی مثنوی کا تو مرکزی خیال اور بنیادی مقصد ہی تمام تر اخلاقی اور ناصحانہ و اصلاحی ہے۔ ان دونوں تصانیف میں اس نے سید احمد شہید سے اپنی عقیدت و ارادت کے اظہار میں جو اشعار تحریر کیے ہیں، وہ ان کی ذات اور تحریک سے اس کی نسبت و وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں ان کے اشعار کو مکمل نقل کیا جاتا ہے۔

قصیدہ در شان جناب پیر دستگیر قدس سرہ العزیز جناب سیّد احمد صاحب

کہاں تک شکر ہو بندے سے ذات کبریائی کا — کہ وہ معبود حق سلطان ہے ہر دو سرائی کا
اٹھائیں سر کو کیوں کر جو کہ حامل ہیں گناہوں کے — ولے امید رحمت سے ہے دعویٰ بس عطائی کا
کیا محبوب پیدا اس نے اپنا اپنی رحمت سے — عنایت سے لقب بخشا اسے ہے مصطفائی کا
گناہگارانِ امت کے جو ہیں بس واسطے سب کے — کریں گے معاملہ عقبیٰ میں وہ مشکل کشائی کا
گناہوں کے پھنسے ہے دام میں قائم کہے کیا اب — توقع ہے انھیں کی ذات سے یار و رہائی کا
کیا آل نبی سے ملک روشن حق تعالیٰ نے — سمجھتا بھید ہے وہ آپ ہی اپنی خدائی کا
اطاعت جس نے کی آل نبی کی جان اور دل سے — تو اس کو پا گیا رستہ مجوّ پھر صفائی کا
غلام احمد کا ہوں میں اور جناب سیّد احمد کا — مجھے ہے داعیہ بس جان و دل سے خاکپائی کا
مریدوں میں نہیں کہتا میں خود گو پر یہ کہتا ہوں — انھیں رتبہ ہے شاہی کا مجھے رتبہ گدائی کا
سیادت منہ پہ روشن اور انھوں کو تھی بزرگی خوب — جنھوں نے یہاں نکالا طور دیں کی رہنمائی کا
خدا کی راہ پر چلتے تھے وہ دن رات اے ہم دم — اسی باعث ملا رتبہ ہے ان کو دو سرائی کا
اگر میں آگیا نظروں میں ان کی تو ہوا اکثر — تھا جلوہ آنکھ میں ان کے عزیز و کیمیائی کا
ولایت میں ہوا روشن وہ جوں خورشید تابندہ — جبیں پر تھا چمکتا ان کے تو نور خدائی کا
ہزاروں کو ہوا ہے فیض ان کی ذات سے یارو — کہ ہر چاروں طرف ہے نام روشن بس بھلائی کا
کرامت جو ہوئی ظاہر انھوں کی ملک و عالم میں — فلک تک اُڑ گیا آوازہ ان کی پارسائی کا
امیر المومنین اس دور میں حق نے کیا ان کو — نبی کے دین میں پایا ہے درجہ کیا بڑائی کا
نہایت عجز تھا ان میں بہادر دین کے تھے وہ — نہ لائے پاس اپنے نام کا ہے وہ ریائی کا
مروت میں یگانہ خلق میں از بسکہ لاثانی — ختم ہے اس سے کار متقی و پارسائی کا
ہوا بیمار ایک پل میں انھوں کے لب سے بہ ذالخود — نہ حاجت مند وہ ہرگز ہوا نسخہ دوائی کا

فدا ہر شخص تھا ان پر ملائک دل سے تھے قرباں
کہ تھا نام خدا وہ مظہرِ نورِ خدائی کا

تھا خورشید سعادت ماہتابِ احمدی تھا وہ
چمک سے جس کی ہے عالم میں جلوہ روشنائی کا

جو لے حاجت گیا ان پاس وہ شاداں ہوا (ایک دم)
کہ نزدیک ان کے تھا مطلق نہ نام خود نمائی کا

وہ تھے مقبولِ حق کے ہر طرح اور برگزیدہ تھے
انھیں زیبا ہے درجہ ہر صفت کا اور ثنائی کا

پیغمبر کے نواسے تھے عزیز از جان جو حسنین
دیا حق نے انھیں درجہ شہادت کی ضیائی کا

جنابِ سیدِ دوراں کو بھی اس حق تعالیٰ نے
عطا یہ درجہ اعلا کیا ہے خوش نمائی کا

جہاں میں جو کرامت تھیں وہ سب ان میں ہویدا تھیں
قلم کو تاب کیا ہے جو لکھے حرف بڑائی کا

ہوا جو خادم ان کا گرچہ مجرم ہے وہ عالم کا
وہیں حق سے ہوا بس وہ سزاوار عطائی کا

حقیقت ہوں میں ذرہ اور (وہ) خورشید عالم ہے
اسی پرتو سے میں پایا اثر اپنی صفائی کا

وہ رنگ قدرتی تھا اور سراپا نور سے پر تھا
ہوا روشن میرا ان سے یہ رنگ حنائی کا

غلام اپنی بزرگی جو رکھے تحقیق (ہے) یہ بات
میاں کا ہے وہ سب صدقہ اور اس کی پارسائی کا

مکرم اور اشرف تھے بزرگ دہر تھے واللہ
تھے ساکن گر زمیں پر حال تھا ظاہر سمائی کا

جہاں ان کا قدم پہنچا ہوئے جا ایک وہ گلشن
ملا تحقیق تھا درجہ انھوں کی اولیائی کا

میں تھا تاریک دل ازبسکہ خوبی ہے یہ قسمت کی
یہ ان کے فیض سے مطلب ہوا ہے دل کشائی کا

حقیقت میں نہیں تھا بات کرنے کا مجھے کچھ ڈھنگ
ملا درجہ انھیں سے ہے سخن کی آشنائی کا

ہو مجھ سے کب صفت ان کی کہ ہوں قطرہ کے میں مانند
وہ ہے دریائے رحمت فضل جود کبریائی کا

عجب ہے چرخ کی گردش کہ باعث اس کی گردش کی
پڑا جو سامنے یک بار کے پردہ جدائی کا

رہے محروم ہم دیدار سے اس جا پہ صد افسوس
قدم سے ان کے جنت میں لیا رتبہ ضیائی کا

الٰہی مجھ کو قدموں میں ان کے دیجیو تو جا
تری درگاہ میں ہر دم ہے یہ دست دعائی کا

بھرا ہوں میں گناہوں میں تو اپنے فضل سے وہ کر
کہ محفل میں ہو ان کی وہاں میرا دخل رسائی کا

وزیر الدولہ عالی ہے خادم دل سے جو ان کا
تو ان کے فیض سے ان کو ملا درجہ بڑائی کا

یہاں تک خوبیاں اس کی ہیں کر تو اے دلا یہ غور
کہ پہونچا آسماں تک شہرہ (ہے) حشمت نمائی کا

نہ ہو اس کی صفت قائم سے یک ذرہ کسی ڈھب سے
دکھاتا ہے دلے یہ خیال طبع آزمائی کا

دیوان: ٦-٩

صفت پیر دستگیر جناب حضرت سید احمد صاحب رضی اللہ عنہ

مجھے ارغوانی پلا دے شراب
کہ ہے ساقیا تو بساں آفتاب

مجھے مثل آئینہ روشن کرے
وہ پژمردہ دل میرا گلشن کرے

کرے جو صفت پیر کی میرا دل
انھوں کی محبت میں ہو جائے کھل

وہ ہے شاہ ایسا جہاں میں نمود
قلم جو لکھے اس سے گا فزود

شہان عرب اور عجم کے تمام
فتادہ ہیں در پردہ انھوں کے مدام

قائم نے غزل اور مثنوی کے علاوہ دیگر متعدد اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے دیوان میں غزلیں صفحہ ۱۲ سے ۲۵۶ تک محیط ہیں۔ ان کے بعد مخمس، مسدس، قطعات، رباعیات، واسوخت اور مثنیٔ شامل ہیں۔ طبیعت میں موزونی اور پُرگوئی تو ہے لیکن شعری پختگی، گہرائی، ندرتِ خیال، بلندیٔ فکر اور محاسن ورموز سے اس کے کلام بالعموم آراستہ نہیں۔ یہ آمد کے علاوہ آورد اور ساتھ ہی تک بندی و لفظی آراستگی کی کوششوں تک محدود نظر آتا ہے بلکہ اس باب میں کم سوادی اس حد تک بھی نظر آتی ہے کہ عروض ہی کی نہیں، قواعد کی اغلاط کے ساتھ ساتھ، کئی جو متعدد مقامات پہ نمایاں ہیں، لغوی کوہیاں۔ مثلاً مونث کو مذکر، جیسے انتہا، راہ، توقع آواز، ضیا نظیر کو مذکر استعمال کرنا اور املا کی اغلاط بھی ملتی ہیں۔ تلاش کو تالاش اور خرم کو خورم جیسی کوتاہیوں سے قطع نظر مثنوی کو ہر جگہ مسنوی لکھنا تعجب خیز ہے۔ ان سب کے باوجود شاعر اپنے اسلوب کو (مثنوی میں) پُر بہار قرار دیا ہے:

عجب اس کا اسلوب ہے پُر بہار　　　عجائب یہ قصہ ہے گوہر نگار
مثنوی : ۱۳

لیکن اسے اپنی کمزوری اور کم مائیگی کا احساس ضرور ہے، چنانچہ وہ دعا گو ہے:

سخن کا مرے دل میں خانہ بنا　　　مجھے شاعروں میں یگانہ بنا
صفت شعر کی میرے شاعر کریں　　　خوشی سے سروں پر اسے وہ دھریں
اگر اس میں خامی وہ دیکھیں ذرا　　　تو اصلاح فرماویں اس میں بیا
مرا خامہ کردے تو گوہر فشاں　　　کہ قائم رہے اس سے نام و نشاں
مثنوی : ۱۳

یہ نہیں کہ قائم کا سارا کلام ہی خامیوں اور کمزوریوں کا حامل ہے، متعدد مقامات پر نگا ٹھہر بھی جاتی ہے بلکہ کہیں جم بھی جاتی ہے۔ مثلاً غزلوں میں جا بجا اس طرح کے اشعار بھی مل جاتے ہیں:

آنکھوں سے پس از مرگ بھی جاری رہا دریا　　　بہتا ہے ہر اک سمت میری گور میں پا
ہے موجزن آنکھوں میں مری اشک کا طوفاں　　　ابلا تھا کبھی جیسے کہ تنور میں پا
دامن کو تو رکھ لیتے ہیں ہاں دیدۂ تر پر　　　پر داغ جگر پر کبھی چھایا نہیں ر
کس طرح ہمیں تیری نظر آوے تجلی　　　موسیٰ کی طرح دیدۂ بینا نہیں ر
جب اس نے بکھرے زلف گرہ گیر میں موتی　　　ہم نے بھی جڑے اشک کی زنجیر میں مو
اس تشنۂ فرقت کو تصور ہے یہ ہر دم　　　پلوادے تو الفت سے مجھے آب بقا
دائم رہوں ہوں ہجر میں جانانِ من بیا　　　ہوں مرغ نارسیدہ گلستانِ من ب
ہر ایک دشت میں پھرتا ہوں میں بےرنگ ہوا　　　سراغ حیف ملے ہے نہ شہسوار
شکر خدا کہ مرگئے وعدے سے پیشتر　　　مشہور خلق میں نہ صنم بے وفا
امکاں سے خارج ہے کہ نکلے ہوس دل　　　وہ شوخ تصور میں بھی تنہا نہیں

کیا مدق دل سے انھیں جس نے یاد　　بفضل خدا وہ ہوا زود شاد
میں قربان ہوں اے خدا تجھ اوپر　　کہ امت نبی میں ہیں ایسے بشر
مثال مسیح معجزہ ان سے ہو　　تلطف سے کردیوے تو اپنے دو
پڑا ان کا جس جا پہ جاکر قدم　　ہے کیا دخل اس جا پہ پھر ہو ستم
جہاں سے کیا کفر یک بار دور!　　وہ تھے برگزیدہ خدا کے ضرور
کرامات ادنا یہ سن ان کی یار　　گئے جو وہ پنجاب میں ایک بار
وہاں پر شقی تھے بہت سرنگوں　　کیا ایک دم ہیچ ان کو زبوں
ہوئے خود بخود آکے فرماں پذیر　　نشانہ پہ بیٹھے ہے جس طرح تیر
جو فرمان سے ان کے باہر ہوا　　تو ایک دم میں دوزخ سے جاکر ملا
ہوئے وہ شہادت سے پھر کامیاب　　نبی کے ہوئے دین میں آفتاب
ہوس تھی یہی ان کے دل میں مقیم　　سو بر لایا رحمت سے اپنے کریم
دلا کر تصور تو اس جا بہم　　بزرگی رکھے کوئی ایسی اتم
تو پھر کیوں نہ قربان انساں ہوں　　جہاں میں وہی ایک سلطان ہوں
جواں مرد تھے بس وہ ہر کام میں　　ہیں جانتے سبھی شہر اسلام میں
سخاوت میں یکتا مروت میں فرد　　تھے وہ دین کی رہ میں مردانہ مرد
شجاعت کے پیشہ کا تھا شیر نر　　ہے ان کی شجاعت کی حق کو خبر
عبادت میں رہتے تھے حق کی تمام　　بجز یاد حق کے نہ تھا اور کام
شرافت وہ رکھتے تھے ہر بات میں　　بھرا علم ہر ایک تھا ذات میں
کروں نام کا ان کے تم سے بیان　　کہ ہے اسم یہ ان کا اے مردمان
خدا (کا)، وہ عاشق جو واحد ہوا　　تو مشہور بس سید احمد ہوا
میرے پیر ہیں وہ میں ان کا مرید　　رکھوں ہوں میں الفت انھوں کی مزید
عجب شان ان کی ہے اے مردماں　　خدا نے کیا فضل اپنا عیاں
بھلا جس کی امت میں یہ ہوں بشر　　پیغمبر کی مانند کب ہو دگر
نبی کی جو ادنیٰ سی اک بات ہے　　وہ سب مرسلوں کی کرامات ہے
خدا سے کرو تم دعا میرے پیر　　مرے دل کا بر لاوے مانی الضمیر
ولایت کے تم ماہ تابندہ ہو　　بزرگی کے خورشید رخشندہ ہو
سر اپنا تمھارے قدم پہ رکھوں　　میں جاروب روضہ کی آکر کروں
خدا دیوے گر مجھ کو طاقت بہم　　تو روضہ کا حضرت کے دیکھوں حشم
رہوں اس پہ پروانہ آسا نثار　　کہ ہے زیب افزا وہ باغ و بہار
یہ قائم ہے فدوی تمھارا ضرور　　کمر بستہ خدمت میں ہے بے قصور

مثنوی ۱ ۶-۸

استخواں کو بھی قائم کے نہ کھایا پسِ مرگ
ناتوانی سے سبک دوش ہوا ہوں قائم
لکھا تھا وصف جو قائم نے گیسوئے جاناں
اب چبھے ہے دل پہ میرے بے طرح خارِ فراق
آنکھوں کو میں نے کس کے کفِ پا سے ملا تھا
قیس نے مجھ سے عشق سیکھا تھا!
جھڑی فرقت کی آنکھ سے ہے رواں
آپ نے ابرو چڑھائیں غیظ میں
گر دیدۂ پُر آب سمندر سے کم نہیں
پھرتے ہیں غیر صورت یاجوج غم زدہ
تیری خوش چشمی کی تعریف سنی ہے جب سے
نخلِ خزاں رسیدہ ہوں میں باغِ دہر میں
خانہ بدوش پھرتے ہیں ہم شکلِ آسماں
ڈبویا ہم نے اب دیدے کے رخصت دیدۂ تر کو
ترے بن چور کر ڈالوں نہ کیوں کر سنگِ حسرت سے
نہ ملا ساغرِ مے مجھ کو تو کس حسرت سے
موت سمجھی ہے بہانہ شبِ تنہائی کو
کنجِ تنہائی میں سوجھے مجھے لاکھوں مضموں

مجھ کو بھی ہم نے سنگِ کوچۂ جاناں دیکھا
لاش جاتی ہے چلی جیسے کفن میں تنکا
تو بن گیا پرِ طاؤس اس کتاب میں سانپ
اور نشتر زن جگر میں ہو رہا ہے خارِ تپ
آتی حنا کی اشک سے تھی بو تمام رات
اس سبب سے تھا عشق اس کا پاک
غم کے آتے ہیں دم بہ دم بادل!
خم پڑا ہے آگے کیا تلوار میں
لختِ دل و جگر بھی شناور سے کم نہیں
دیوارِ یار سدِّ سکندر سے کم نہیں
حسرتِ دید میں باہر نکل آئیں آنکھیں
ملتا ہے اب صبا کوئی رشکِ چمن کہاں
اس ہر وش کی یاد میں حبِّ وطن کہاں
شجر کو کوہ کو فرشِ زمیں کو چرخِ اخضر کو
صراحی کو سبو کو جام کو مینا کو ساغر کو
پی گیا ساقیا میں آنکھ میں بھر کر آنسو
کاش ایسے میں وہ آجائیں مسیحائی کو
عین وحدت میں نظر آتی ہے کثرت مجھ کو

قائم نے بالعموم اپنی علامتوں اور استعارات کو محدود رکھا ہے۔ روایتی موضوعات اگرچہ اس کے کلام میں بکثرت موجود ہیں لیکن محاکات اور معاملہ بندی جیسے عناصر خاصے کم نظر آتے ہیں۔ عشقیہ جذبات کی اس کے کلام میں بہتات ہے اور اس نے ان کا اظہار متنوع صورتوں میں کیا ہے۔ ذاتی یاس و محرومی اور نارسائی اس کے ہاں بکثرت ملتی ہے۔ دیوان میں اگرچہ نعت و مناجات مستقل عنوان کے تحت بھی موجود ہیں لیکن متعدد غزلوں میں بھی نعتیہ جذبات پر مبنی اشعار خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں لیکن متعدد غزلوں کے علاوہ جو دیگر اصناف اس کے دیوان میں شامل ہیں، ان میں ناصحانہ اور واعظانہ خیالات حاوی ہیں۔ اس کی مثنوی (گوہر نگار) تو بنیادی طور پر اخلاقی موضوع ہی پر مبنی ہے اور اصلاحی و ناصحانہ مقصد کی حامل ہے۔ اس کا آغاز حمد و نعت اور صفت اہل کبار صفتِ اہل بیت اور صفت سید احمد شہید سے ہوتا ہے۔ اس مثنوی کی تخلیق کے محرک قائم کے احباب: منشی ظہور علی اور شہامت خاں تھے۔ مثنوی کے سبب تصنیف کے تحت قائم نے لکھا ہے:

سبب اس کے کہنے کا ہے اک دگر　　سناتا ہوں میں تجھ کو لے خوش سیر
کیا جب کہ دیوان میں نے ختم　　مرے دوست ہیں ایک عالی ہمم

بڑے مہرباں ہر طرح ہیں شفیق
محبت کے دریا میں ہیں وہ غریق

مروت میں یکتا شرافت کی کان
سبھی جانتے ہیں انھیں بے گمان

خرد ان کے دم پر سے قربان ہے
ملائک صفت بس وہ انسان ہے

ہے دلشاد حق کی اطاعت میں وہ
رکھے ہے بھرا دل عبادت میں وہ

تواضع میں رہتے ہیں قائم مقیم
سبھوں سے وہ جھکتے ہیں بے خوف و بیم

غریبوں سے الفت ہے ان کو زیاد
ملا ان سے جو ہو گیا شاد شاد

ہے نام ان کا منشی ظہور علی[1]
بزرگی رکھے ہیں خفی و جلی

وہ فرمانے مجھ سے لگے اس طرح
میں لکھتا ہوں اس کو یہاں جس طرح

کہ قائم ہے تو دوست میرا تمام
تو اس واسطے یہ کروں ہوں کلام

تو اس مثنوی کو بھی تیار کر
رکھے خوش خدا تجھ کو شام و سحر

شہامت خاں ہیں میرے مہرباں
انھوں نے بھی دی اس میں ترغیب ہاں

ہے منشی کی خاطر مجھے بس عزیز
کہ وہ صاحب ہوش ہے اور تمیز

جو ارشاد ایسا انھوں نے کیا
تو فوراً میں اس مثنوی کو لکھا

مثنوی: ۱۲-۱۳

مثنوی کے قصّہ کا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جس کا نام خطا ہے اور جس پر ایک نیک دل اور رعایا پرور بادشاہ عبدالرحیم حکمراں ہے۔ یہ ایسا خوش خصال ہے کہ ملک میں سب ہی اس سے خوش اور مطمئن ہیں۔ اس کے دربار میں کئی وزیر ہیں لیکن دو اس کے زیادہ قریب ہیں، ایک ماہ رخ اور دوسرا زمیری۔ یہ علی الترتیب خیر اور شر کی علامتیں ہیں۔ دونوں بادشاہ کا زیادہ سے زیادہ قرب اور اعتماد چاہتے ہیں اور اسی لیے ان میں ایک کشمکش رہتی ہے۔

ایک دن بادشاہ زمیری سے خواہش ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک ایسی عورت کا طلب گار ہے، جس میں یہ تین صفات ہوں: وہ حسین ہو، نیک و پرہیز گار ہو اور پھر خوش آواز بھی ہو۔ زمیری بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسی عورت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی عورت تو اسے کوئی نہیں ملتی لیکن وہ خود ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر در بدر پھرتا اور ناکام و نامراد واپس آجاتا ہے۔ اس کے ناکام آنے کے باوجود بادشاہ اس خدمت پر اس کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ جب زمیری نے یہ دیکھا کہ بادشاہ نے اس کی ناکامی کے باوجود اسے انعام و اکرام سے نوازا ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ وہ بادشاہ کے لیے ہر حال میں پسندیدہ ہے تو وہ مغرور اور خود پسند ہو جاتا

---

[1] گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ مدبر الملک منشی سید ظہور علی خاں صاحب اٹاوی اہل کار یا میر منشی دفتر کونسل عالیہ" عہد نواب ابراہیم علی خاں (۱۸۶۷ء - ۱۹۳۰ء) تھے۔ بحوالہ اعجاز احمد خاں "تاریخ ٹونک"، (ٹونک، ۱۹۸۳ء) ص ۹۵؛ ڈاکٹر مہدی حسن (برادر ڈاکٹر ہادی حسن، علی گڑھ) کے مطابق یہ ان کے والد کے پھوپھا تھے اور ان کا اصلاً تعلق اکبر آباد سے تھا۔ مکتوب، حکیم محمود احمد برکاتی بنام راقم، مورخہ ندارد، موصولہ ٹوکیو، ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء؛ غالباً ان ہی کا توسط تھا کہ قائم کی تصانیف اکبر آباد سے شائع ہوئیں۔

ہے۔ پھر اس میں اور ماہ رخ میں کشمکش اور رقابت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

بادشاہ کی خواہش دیکھ کر ایک دن ماہ رخ نے بادشاہ سے اپنی بیوی انجم فزا کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو بادشاہ کو مطلوب ہیں۔ اور کہا کہ چونکہ ہم آپ کی اولاد کے برابر ہیں اس لیے آپ اسے اپنی کنیز کے طور پر قبول کر لیجیے۔ وہ بخوشی آپ کی خدمت بجا لائے گی۔ چنانچہ بادشاہ نے ماہ رخ کی مرضی دیکھ کر اسے بطور دختر اپنانا منظور کر لیا۔ زمیری یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے حسد میں بادشاہ سے کہا کہ ماہ رخ نے جو کچھ صفات اس عورت کی بتائی ہیں وہ جھوٹے ہیں۔ یقیناً وہ عورت حسین اور خوش آواز ہے لیکن دراصل آوارہ ہے۔ اور اگر بادشاہ کو اس کی بات پر شک ہو تو اسے موقع دیا جائے تاکہ وہ اس عورت کی آوارگی کو ثابت کر سکے۔ وہ خود بادشاہ کے سامنے یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ کسی طرح ماہ رخ کو کچھ عرصہ کے لیے گھر سے دور بھیج دیا جائے اور زمیری کو اجازت دی جائے کہ وہ ماہ رخ کے گھر جاکر اس عورت کو ورغلا کر لے آئے۔

زمیری نے جو کچھ کہا تھا، حسد میں کہا تھا اور غلط تھا۔ وہ عورت انجم فزا حسن اور خوش الحانی کے ساتھ ساتھ نہایت پرہیزگار اور عبادت گزار تھی۔ بادشاہ کی اجازت سے زمیری موضع قصر روانہ ہوتا ہے، جہاں ماہ رخ کا گھر تھا اور وہاں انجم فزا رہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ کٹنیوں سے مدد لیتا ہے اور مدعا بیان کرتا ہے۔ سب ہی کٹنیاں انجم فزا کی پرہیزگاری کے باعث اس کام سے ہاتھ کھینچ لیتی ہیں لیکن بالآخر ایک کٹنی راضی ہو جاتی ہے اور فریب و مکر سے انجم فزا سے ملنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کرتی ہے مگر ناکام رہتی ہے کیوں کہ انجم فزا پردے کی اس قدر پابند ہوتی ہے کہ انجان عورتوں سے بھی ملنے سے گریز کرتی ہے۔ کٹنی ناکام ہو کر آخر انجم فزا کے والدین سے رجوع کرتی ہے ان کے پاس جاکر ان کی ہمدردی حاصل کرتی ہے۔ اور پھر حالات سے واقف ہو کر واپس آتی ہے اور ایک جعلی خط انجم فزا کے نام اس کی ماں کی طرف سے لکھتی ہے اور اسے اس کے باپ کی فرضی بیماری کا حال لکھ کر اپنے پاس بلاتی ہے لیکن انجم فزا اس بنیاد پر کہ اس کا شوہر وہاں نہیں تھا اور اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے نہیں نکل سکتی تھی، وہ ماں کو جواباً معذرت کا خط لکھ کر آنے سے انکار کر دیتی ہے۔ تب کٹنی ایک دوسرا خط اس کی ماں کی طرف سے انجم فزا کو لکھتی ہے کہ اس کا باپ فوت ہو گیا ہے اس لیے اب وہ خود اس کے پاس آنا چاہتی ہے۔ انجم فزا کو اپنے باپ کے مرنے کا بہت دکھ ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنی ماں کو اپنے پاس بلا لیتی ہے۔ وہ خط پاکر خود وہ کٹنی انجم فزا کے پاس اس کی ماں بن کر پہنچ جاتی ہے۔ کم عمری میں بیاہے جانے کے باعث انجم فزا کٹنی اور اپنی ماں میں تمیز نہیں کر پاتی۔ وہ کٹنی اس کے ساتھ رہنے لگتی ہے اور انجم فزا اس کو ماں سمجھ کر اس کی خدمت گزاری میں لگ جاتی ہے۔ وہ ایک خط اپنے شوہر کو بھی لکھ کر اپنے باپ کے مرنے کی اطلاع دیتی ہے۔

یہ خط جو فراق کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، طویل ہے اور بارہ ماسہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مثنوی نگار نے ایک اور قصہ کہانی میں شامل کیا ہے جو ایک عورت کی بے وفائی کے واقعہ پر مبنی ہے اور اس کا مقصد عورت کی فطرت کا مقابلہ کرنا ہے تاکہ انجم فزا کی وفاشعاری اور پاسداری زیادہ اُجاگر ہو سکے۔

ماہ رخ وہ خط پڑھ کر بے چین ہوجاتا ہے اور بادشاہ سے اپنی بیوی کے پاس جانے کی اجازت طلب کرتا ہے لیکن عین اس وقت پڑوسی ملک ختن سے جنگ کا خطرہ بڑھ جانے کے باعث بادشاہ اسے گھر جانے سے روک دیتا ہے، کیوں کہ وہ اسے اپنا سب سے معتبر وزیر سمجھتا ہے۔ چنانچہ ماہ رخ رک جاتا ہے۔ اس مقام پر مثنوی میں اوّلاً شاہ خطا اور شاہ ختن کے درمیان مراسلت ہوتی ہے لیکن پھر جنگ چھڑ جاتی ہے۔ شاہ خطا کو فتح نصیب ہوتی ہے اور وہ ماہ رخ کو ملک ختن کے بندوبست کی ذمے داری سونپ کر اسے وہاں بھیج دیتا ہے۔ ماہ رخ اس فوری فرض کی ذمہ داری کی وجہ سے انجم فزا کے پاس نہیں جاسکا لیکن وہ ایک خط لکھ اپنے جذبات فراق والم بیان کرتا ہے۔ اس عرصہ میں وہ کٹنی انجم فزا کی ایک دلکش تصویر بناکر زمیری کے پاس لے جاتی ہے۔ زمیری اس تصویر کو بادشاہ کے پاس لے جاتا ہے اور انجم فزا سے اپنے وصل کی جھوٹی کہانی سناتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ماہ رخ بادشاہ کی نظروں سے گر جاتا ہے اور وہ غصّہ میں ماہ رخ کو ملک ختن سے واپس بلواکر اس کا منصب و عہدہ زمیری کو دے دیتا ہے۔

ماہ رخ کو اصل حالات کا علم نہیں ہوتا۔ جب وہ واپس آتا ہے تو بادشاہ کا رویہ بھی بدلا ہوا پاتا ہے۔ بادشاہ اسے سبب بتادیتا ہے اور ساتھ ہی ثبوت میں انجم فزا کی تصویر بھی دکھا دیتا ہے۔ ماہ رخ کو یہ تصویر دیکھ کر بے حد رنج ہوتا ہے۔ اس پر ستم یہ ہوتا ہے کہ زمیری اس کے سارے مال واسباب پر بھی قبضہ کرلیتا ہے اور اسے اپنا ماتحت بنالیتا ہے۔ ماہ رخ ایک دن یکہ سوچ کر زمیری سے بہانہ کرتا ہے کہ اس کا بہت سا مال واسباب ختن میں رہ گیا ہے جسے وہ وہاں سے لانا چاہتا ہے۔ زمیری اس کی لالچ میں اسے ختن جانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ ماہ رخ ختن کے لیے روانہ ہوتا ہے لیکن راستہ میں اپنے گھر پہنچتا ہے اور بیوی کو دیکھ کر اس کے منہ پر کالک مل دیتا ہے اور پھر بغیر کچھ کہے سنے واپس ہوجاتا ہے۔ انجم فزا کچھ سمجھ نہیں پاتی اور بے حد ملول ہوجاتی ہے۔ پھر بھی وہ اپنے مقدر پر شاکر رہتی ہے لیکن اصلیت کا کھوج بھی لگاتی ہے۔ اور جب وہ اپنی ماں کو خط لکھتی ہے تو اس پر ساری حقیقت وا ہوجاتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ جب اس کی دنیا ہی بگڑ چکی تو وہ خود کیوں نہ اپنے آپ کو بدل کر کوئی تدبیر کرلے۔ چنانچہ وہ اپنا رنگ وروپ بدل کر اور ایک مطربہ کے بھیس میں بادشاہ کی توجّہ حاصل کرلیتی ہے۔ بادشاہ اسے پسند کرنے لگتا ہے اور یوں اس کی رسائی دربار تک ہوجاتی ہے۔ وہاں اس کو زمیری کی ساری سازش کا بھی پتا چل جاتا ہے۔

بادشاہ اس کے لیے بے تاب رہنے لگتا ہے اور ایک دن اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا ہے مگر انجم افزا اس کی آتش شوق کو بھڑکانے کے لیے اس کے پاس جانے سے گریز ظاہر کرتی ہے اور بہانہ کرتی ہے کہ ایک امیر نے اسے ایک ہفتہ کے لیے اپنے پاس ملازم رکھ لیا ہے اور ابھی چار دن باقی ہیں، اس کے بعد ہی وہ بادشاہ کے پاس آسکے گی۔ بادشاہ بے چین ہوجاتا ہے اور ان چار دنوں کے گزرنے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ انجم افزا چار دن گزرنے کے باوجود بادشاہ کے پاس نہیں جاتی، پانچویں دن جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے گلہ کرتا ہے تو وہ اس سے کہتی ہے کہ جس شخص نے اسے ملازم رکھا تھا، اس نے تین لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب وہ مکر گیا ہے اور کہتا ہے کہ اسے کسی کا ڈر نہیں، وہ بادشاہ سے بھی نہیں ڈرتا۔ بادشاہ یہ سن کر غضب ناک ہوجاتا ہے اور اس شخص کا نام،

پوچھتا ہے۔ انجم فزا زمیری کا نام بتادیتی ہے۔ بادشاہ زمیری کو طلب کرتا ہے۔ زمیری حاضر ہوتا ہے مگر بادشاہ کو غصہ میں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس عورت کو نہیں جانتا اور اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ انجم فزا کہتی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے اور اگر سچا ہے تو اس سے کہیں کہ جو کچھ یہ کہتا ہے اس کا چھلکہ لکھ دے۔ بادشاہ اس تجویز کو پسند کرتا ہے اور زمیری بھی بخوشی چھلکہ لکھ دیتا ہے۔ یہ ساری باتیں ماہ رخ کو معلوم ہو جاتی ہیں اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انجم فزا اسی مقصد سے یہاں آئی ہے۔ بادشاہ بھی حقیقت جان کر بہت خوش ہوتا ہے اور اسے اپنی بیٹی بنا لیتا ہے اور زمیری کو دیوار میں چنوا دیتا ہے۔ پھر بطور انعام ماہ رخ کو ختن کی حکمرانی بخش دیتا ہے۔

قائم نے اپنی اس مثنوی کو خود عجیب و مختلف داستان و قصہ سے تعبیر کیا ہے:

عجب ہے فسانہ عجب داستاں　　عجب نکتہ ہے دل کشا میری جاں

اور جس نکتہ کی طرف اس کا اشارہ ہے غالباً وہ اس کا اخلاقی و اصلاحی مقصد و موضوع ہے جو اس مثنوی کی بنیاد ہے۔ اس مثنوی میں جا بجا اس قسم کے اشعار ملتے ہیں:

سخن راستی مرد کا ہے شعار　　بجز راستی کے وہ ہے خوار و زار
سخن راستی منہ کو روشن کرے　　دل غنچہ کو مثل گلشن کرے
ہے جب تک کہ زندہ تو لے خوش صفات　　سوا راستی کے نہ کہہ اور بات
ز کذب آدمی می شود بے وقار　　بسا می شود خوار در روزگار
کن ہر لحظہ تو از دروغ اجتناب　　کہ گردد تر نہار کار خراب

مثنوی: ۲۹

اس مثنوی کے اخلاقی پہلو کا محور عورت کی عصمت و عفت اور نیکی و پرہیزگاری اور خاص طور پر اطاعت و فرماں برداری ہے۔ انتہائی درد و الم میں کہ باپ کے انتقال پر بھی انجم افزا کا شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہ نکالنا اور ماں کے پاس نہ پہنچنا اس کی حد درجہ اطاعت کا مظہر ہے قائم نے اس وصف کو یوں بیان کیا ہے:

سخن سچ ہے یہ مادر مہرباں　　کہ شوہر مجازی خدا ہے یہاں
پیمبر کی ہے اس طرح سے حدیث　　اسے جو نہ مانے وہ ہے گی خبیث
کہ خاوند کا حکم لاوے بجا　　رکھے حکم پر اس کے گردن جھکا
نہیں تو ہے دوزخ میں اس کا مقام　　وہ جلتی رہے رات و دن لا کلام
بھلا جب نبی کا یہ فرمان ہو　　نہ کیوں کر ہمارا وہ ایمان ہو

مثنوی کا قصہ، اس کے کردار، اس کی کہانی میں موجود خیر و شر کی کشمکش اور اس مناسبت سے اس کے کرداروں کی تخلیق اور پھر شر کے مقابلہ میں خیر کی فتح جیسے لوازمات اسے ایک روایتی مثنوی کی صف میں شامل رکھتے ہیں لیکن اس کا موضوع اور اس کا اخلاقی و مقصدی پہلو اسے اردو مثنویوں کے ذخیرے میں ایک قدرے مختلف اور منفرد مقام تک لے جاتا ہے۔ اس کا موضوع اور کہانی کا تانا بانا مثنوی کی روایتی اور اس وقت کی عدم مروجہ ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ نہ اس میں فوق الفطرت عنا

وکردار موجود ہیں نہ یہ محیر العقول واقعات پر مبنی ہے۔ ماحول اور کہانی کا تعلق بہر حال اسی دنیا اور اسی زندگی سے ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تصور و تخیل میں تشکیل پائی ہے۔ سید احمد شہید کو اپنا 'پیرو دستگیر' قرار دینے والے شاعر سے ایسی ہی توقع بھی کی جاسکتی تھی۔

تحریک مجاہدین کے تحت یا اس کے زیر اثر جو ادب تخلیق ہوا ہے، نثر سے قطع نظر، نظم میں یہ بالعموم مثنوی ہی کی صنف میں تخلیق ہوا ہے لیکن ایسی مثنویاں زیادہ تر تجزیہ ہیں یا راست تحریکی نظریے ومقصد کے ابلاغ کا نمونہ پیش کرتی ہیں جن میں کہانی اور تمثیل کا عنصر قریب قریب ناپید ہے۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی تحریک مجاہدین کے ادب اور اردو مثنویوں کی عام تاریخ میں ایک مختلف حیثیت رکھتی ہے۔ مثنوی نگاری کے فن اور شعری محاسن و خوبیوں سے قطع نظر، کہ اس پہلو سے یہ مثنوی شاید کسی امتیازی وصف کی حامل نہ سمجھی جائے مگر اپنے مقصد اور مخلصانہ تخلیقی صفات کے باعث اسے اس حیثیت میں ضرور قابل ذکر شمار کیا جانا چاہیے۔

۱۰

گوپی چند نارنگ

اشفاق حسین کا چاہت گھر اور سوچ نگر

اشفاق حسین ہمارے اُن شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے بہت کم مدّت میں اپنے لیے دلوں میں جگہ محفوظ کرلی ہے، اپنے شعری اسلوب اور طرزِ گفتار سے، اپنی شخصیت کی موہنی سے اور شب و روز کی ادبی سرگرمیوں سے۔ ان کا نام شمالی امریکہ یا کینیڈا سے اس طرح وابستہ ہوگیا ہے گویا وہ اُدھر ہی کے شاعر ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ شعر و ادب کی دنیا میں وہ امریکہ و کینیڈا پہنچنے سے بہت پہلے داخل ہوچکے تھے اور ان کی کچھ کتابیں بھی منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "اعتبار" کراچی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا جب وہ پاکستان آرٹس کونسل سے وابستہ تھے۔ کینیڈا وہ دو برس کے بعد آئے، اول شعری مجموعے سے بھی دو برس پہلے یعنی ۱۹۷۷ء میں وہ فیض کی شاعری پر اپنی کتاب 'فیض ایک جائزہ' بھی لکھ چکے تھے جس کو فیض کی شاعری پر پہلی تنقیدی کتاب ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ترکِ وطن کے دو برس کے اندر انھوں نے ٹورنٹو سے اردو ماہنامہ "اردو انٹرنیشنل" جاری کیا۔ اس میں ان کے ساتھ شہلا برنی، لزلی لاوین، بیدار بخت، محمد علی صدیقی، فاروق حسن، خالد سہیل اور دیگر احباب بھی شریک تھے۔ ۱۹۸۵ء میں اشفاق حسین کی نظموں کا انگریزی ترجمہ THAT DAY WILL DAWN ٹورنٹو ہی سے شائع ہوا اور ۱۹۸۷ء میں چنڈی گڑھ سے پنجابی تراجم پر مشتمل کتاب "نیندر نال رشتہ" منظرِ عام پر آئی۔ علاوہ ازیں اس سارے زمانے میں اشفاق حسین نے جو کام فیض احمد فیض کے

حوالے سے کیا، اس کی بھی بہت اہمیت ہے۔ فیض پر ان کی دوسری کتاب صبیب عنبر دست لاہور سے ۱۹۹۲ء میں آئی، اور تیسری کتاب جو نہایت جامع اور ضخیم ہے، پاکستان سے "فیض کے مغربی حوالے" کے نام سے اور ہندوستان سے "فیض امریکہ و کینیڈا میں" اور "فیض یورپ میں" بھی منظرِ عام پر آچکی ہے۔ موخرالذکر کتاب کی حیثیت بلا شبہ ایک ایک کتابِ حوالہ کی ہے۔

اشفاق حسین کی شخصیت کی اُن جہات سے سب واقف ہیں اور یہ کہ ٹورنٹو کو اردو کے ادبی نقشے پر نمایاں کرنے میں جن دانشوروں، شاعروں، مترجموں، صحافیوں، افسانہ نگاروں ناول نگاروں اور نئے پرانے ادیبوں کی کوششوں کو دخل رہا ہے، ان میں اشفاق حسین ایک ذات تو ہیں انجمن بھی ہیں۔ شاعر کا اصل تعارف اس کی شاعری ہی ہوتی ہے اور اشفاق حسین کی شاعری کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو کہا ہی جاتا رہا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اشفاق حسین فقط دربدری اور بے گھری کے ناسٹلجیا کے شاعر نہیں۔ اسی طرح اشفاق حسین کی پہچان فقط ان کی سماجی سیاسی معنویت سے بھی نہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ سماجی سیاسی آگہی ان کے نظریۂ حیات کا واضح حصہ ہے۔ لیکن متن کچھ اور بھی کہتا ہے۔ اسی طرح بے گھری اور ہجرت کا احساس بھی ان کے یہاں عام لہجے سے ہٹ کر کسی دوسرے قالب میں ملتا ہے۔ پہلے سامنے کی توقعات کی بات ہو جائے۔ اس کے بعد میں متن کے قلب کی بات اٹھاؤں گا۔

اشفاق حسین کو اس کا احساس ہے کہ "دربدری اور بے گھری کا یہ ناسٹلجیا میرے قبیلے اور میری نسل کا مقدر ہے، اور عذاب کے اس راستے سے صرف میں ہی تنہا نہیں گزر رہا ہوں، زخم خوردہ لوگوں کا ایک پورا کارواں میرے ساتھ ہے۔" انھوں نے ایک جگہ خود ہی یہ سوال اٹھایا ہے کہ "نہ ہی میں جلاوطن کیا گیا ہوں اور نہ ہی میں نے کسی سیاسی جبر کے نتیجے میں نقلِ مکانی کی ہے، تو پھر میرے یہاں ہجرتوں کا دکھ، وطن بدری کا کرب، غریب الوطنی کی کیفیتیں اور نقلِ مکانی کی اذیتیں، یہ سب کیوں ہے؟" اس کا جواب اشفاق حسین کی وضاحت میں نہیں، ان کی شاعری میں دیکھنا چاہیے جہاں بعض باطنی

کیفیات اور جذباتی تجربے، روش عام سے ہٹ کر ہیں۔ ایسا نہ ہو تو پھر تخلیق کا جواز ہی نہیں۔ اشفاق کا تجربہ یا اس تجربے کو جھیلنے کا ان کا ذہنی انداز دوسروں سے الگ ہے، اس لیے اس سے جو شکلیں بنتی ہیں وہ بھی مختلف ہیں۔ پہلے خارج کا منظر نامہ اور بچوں کے حوالے سے تہذیبی تصادم کی یہ شکلیں دیکھیے:

شہر کی ساری عمارات ہیں کن لوگوں کی
قرض پر سب نے جو لے رکھے ہیں گھر کس کے ہیں

چمکے گا نسل و رنگ کے داغوں کا سلسلہ
دروازے پر بھی نام نہ لکھا کرے کوئی

اگرچہ ذہن ہیں چھوٹے پہ ہیں خیال بڑے
ہمارے بچے ہیں ہم سے ہزاروں سال بڑے
کھلی ہوا جو ملی ہے تو کم سنی میں بھی
ابھر کے آنے لگے ذہن میں سوال بڑے

سکوں ملتا ہے بے آنگن گھروں میں میرے بچوں کو
کھلے دالان کی خواہش تو میری نسل ہی تک ہے
نہ جانے کون سی وحشت بسی ہے آ کے شہروں میں
کہ سب چاروں طرف ہیں پھر بھی تنہائی سبھی تک ہے
یہ ٹوٹے لوگ بکھرے لوگ میرے لوگ ہیں جن کا
گئی تہذیب سے رشتہ غزل کی شاعری تک ہے

لیکن اصل وحشت تو باطن کی ہے۔ ان اشعار میں تجربے بھی ہیں حیرت بھی اور حل نہ ہو سکنے والے سوال بھی :

ہجرت کا ثمر بھی تو مقدر نہیں اپنا
بے گھر ہوئے ایسے کہ کوئی گھر نہیں اپنا
تھے اس کے حوالے سے سبھی رنگ ہمارے
اب ہم پہ کھلا کوئی بھی منظر نہیں اپنا

ویسے بھی کب زمیں نے کیا تھا ہمیں قبول
ہم کیوں اداس ہو گئے ہجرت کے باب میں

کیوں میری جڑیں جا کے زمیں سے نہیں ملتیں
گملوں کی طرح صحن میں رکھا ہوا کیوں ہوں

کوئی چہرہ اب کسی کھڑکی میں یاد آتا نہیں
ساحلوں پر دھوپ کھاتی لڑکیاں ہیں اور ہم

پہن کر ہم لباس اجنبیت کس طرف جائیں
کہ ہم اپنا بدن لائے ہیں چہرہ چھوڑ آئے ہیں

بعض نظمیں بھی اسی طرح کی کیفیتوں کی غمازی کرتی ہیں۔ " اونچی عمارتوں کے محلے میں" اس تضاد کو ابھارتی ہے جو فلک بوس عمارتوں کے پس منظر میں غربت اور بے بسی کے مناظر کو دیکھ کر ابھرتا ہے۔ نظم اپنے کلائمکس پر آکر سوال اٹھاتی ہے کہ مغرب کے ان

رول کے گندے سب و سے میں گٹار بجا کر دو چار سکّے بخشش میں پانے والا فنکار
ں دنیا سے ہے، پہلی دنیا سے یا تیسری دنیا سے ؟ لیکن غزلوں میں یہ احساسات
بھی تیکھے پن کے ساتھ ابھرے ہیں :

گلی کوچوں میں اک آسیب سا ہے
شجر پتھر کے، سایہ دھوپ کا ہے

کمالِ ضبط کی حد پر ہوں میں بھی
مگر دریا تو رستہ مانگتا ہے

آنکھوں میں ادھورے سہی کچھ خواب بھی ہوں گے
بے وجہ بچھڑ جانے کے اسباب بھی ہوں گے

نکلے تھے جو گھر سے تو یہ معلوم تھا ہم کو
مٹی کے گھروندے ہیں تو سیلاب بھی ہوں گے

جو لوگ نمایاں ہیں سو وہ اپنی جگہ پر
لیکن ابھی کچھ لوگ تہِ آب بھی ہوں گے

برسیں گے کبھی لوٹ کے امید کے بادل
تپتے ہوئے صحرا کبھی شاداب بھی ہوں گے

ممکن ہے نہ ہوں، ہم مگر اس شہرِ زیاں میں
کچھ لوگ تو ہوں گے کہ جو نایاب بھی ہوں گے

اشفاق حسین کی پوری شاعری میں ان کی سماجی دردمندی موج تہ نشین کی حیثیت رکھتی ہے، ان کی سیاسی ترجیحات جگہ جگہ چھلک جاتی ہیں۔ اس بارے میں مجھے ان کی جو نظمیں زیادہ پسند ہیں، وہ "آدھی گواہی پورا جسم" اور "جنت کی کنجی ہاتھ میں رکھنے والے" ہیں۔ موخرالذکر نظم کا پیرایہ طنزیہ ہے کہ اسے فرعونِ بے سامان ہر چند کہ تو سمجھتا ہے کہ جنت کی کنجی تیرے ہاتھ میں ہے، لیکن تو نے ذہن و دل پر تالے ڈال دیے ہیں حتیٰ کہ:

تیرے شہر سے
دوزخ کی سب کالیں
لوکل کالیں ہیں!

"آدھی گواہی پورا جسم" جس شدید صورتِ حال کے بارے میں ہے، اتنا معلوم ہے کہ آدھی آبادی اس کی زد پر ہے۔ ان مصرعوں میں انسانیت کی کراہ ہے جو دل کی ٹیس بن کر ابھرتی ہے، لیکن مسئلہ کا کوئی سادہ حل سامنے نہیں:

عورت، ہل اور بیل کو اب بھی ایک سمجھنے والے
کیسے جانیں ایک دھڑکتے دل کے احساسات
ہو تو رہا ہے "آدھی گواہی پورے جسم" کا کھیل
اب دیکھیں گے ہوتی ہے اس کھیل میں کس کو مات

ہم نے شروع میں اشارہ کیا تھا کہ اشفاق حسین فقط ہجرت کے شاعر نہیں۔ یہ ان کا وجودی مسئلہ تو ہے، لیکن باطن کے تحت الشعوری مسائل کچھ اور بھی ہیں۔ میری رائے ہے کہ اشفاق حسین کا مرکزی اظہار یہ محبت کی آواز کا ہے، دردِ محبت اور وفورِ محبت کی آواز کا جس کی آگ سے خود شاعر کا وجود اور شاعری کا متن روشن ہے۔ حاشیہ بے شک اختیاری ہوتا ہے لیکن متن کی کیفیات اضطراری ہیں جن پر کسی کا بس نہیں۔ اس جذبے کے زیادہ جوہر نظموں میں کھلے ہیں۔ پہلے چند اشعار غزلوں سے:

یہ جانتا تو کبھی بھول کر نہ ملتا میں
کہ وہ ملے گا تو اتنا بدل چکا ہوگا

آساں تو نہیں ہے کہ اس کو بھلا سکوں
لیکن اتر بھی جاتے ہیں دریا چڑھے ہوئے

خواب کے بے درد گنبد میں جانے سے پہلے
اپنے لیے واپس آنے کا رستہ رکھنا

اچھا نہیں وہ شخص مگر اس کے باوجود
کچھ گفتگو اسی سے چلو بے سبب کریں

نقش" شروع کے دور کی ایک موثر نظم ہے :

ڈوبتی شام کا زخمی منظر
سامنے گہرا سبز سمندر
ایسے میں کشتی سے اتر کر
ساحل کی گیلی مٹی پر
تیرا نام مٹایا لکھ کر
نقش مگر باقی ہے دل پر

ں کے مقابلے میں "یاد" زیادہ رچاؤ لیے ہوئے ہے :

شب کسی مہرباں کی یاد آئی
صبح تک جاگتی تھی تنہائی
روشنی تھی چراغ چہروں کی
تیرگی کھو چکی تھی بینائی
نیند ناراحتی کے گجرے میں
رتجگوں کے کنول پرو لائی

آنسوؤں کی پھوار کے نیچے
خامشی لے رہی تھی انگڑائی
منتظر رقصِ نوحہ گر کی تھی
درد کی بے قرار انگنائی
مضمحل اجنبی اندھیروں میں
کھوگئی تھی شبِ شناسائی
دل کو اشفاق یوں جو دُکھنا تھا
کیوں پھر اس مہرباں کی یاد آئی

یہ نظم فیض کی یاد دلاتی ہے، چراغ چہرے، نیند ناراحتی کے گجرے، رتجگوں کے کنول، آنسوؤں کی پھوار کے نیچے خامشی کا انگڑائی لینا، درد کی بے قرار انگنائی، شب شناسائی یہ سب پیکر اشفاق حسین کے ہیں۔ جو شخص ایک چھوٹی سی نظم میں ایسے جمالیاتی پیکر خلق کرسکتا ہو، اس کی شعریت میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔ ایک اور مختصر نظم "بے صدا آواز" کے آغاز میں بھی یہی کیفیت جاری و ساری ہے، اور پوری شدتِ احساس کے ساتھ:

ہوا دریدہ بدن راستے شکستہ لباس
گزرتے لمحوں کا آہنگ، بیتی شام کی چاپ
نظر اٹھا کے جو دیکھوں تو دور دور تلک
بلند ہوتی ہی جائے فصیلِ تنہائی
نہ یادِ یار کی قندیل ہے نہ ہجر کا چاند
بس ایک دل کے دھڑکنے کی بے صدا آواز
میں ایسے لمحوں کی دہلیز پر کھڑا ہو کر
یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی شمعِ جسم کے ساتھ
مرے خیال کے آنگن میں آ کے رقص کرو
مجھے نہ ہونے کا احساس کھائے جاتا ہے

مرے وجود کو احساس زندگی دے دو
تم اپنے قربِ تخیل کی چاندنی دے دو

۱رائے میں اشفاق حسین کے یہاں ہجری ادب کا اصلی روپ ان کی محبت کی نظموں
ملتا ہے۔ مٹی سے دوری یا جڑوں سے جدا ہونے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، اشفاق حسین
یہاں محبت کا احساس اتنی شدت سے اس خلا کو بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ 'دریدہ بدن'
راستے شکستہ لباس، روح کی تنہائی کے پیکر ہیں۔ گزرتے لمحوں اور بیتی شاموں کی
نے جو گھاؤ لگائے ہیں، ان کے اندمال کی صورت فقط یادِ یار کی قندیل ہے،
اتنا گہرا ہے کہ بس دل کے دھڑکنے کی بے صدا آواز آئے جاتی ہے۔ غزلوں میں بھی
ت کی تقلیب کا یہ عمل بعض جگہ دکھائی دیتا ہے۔ بعد کی ایک غزل سے یہ چند شعر دیکھیے۔
شعر میں 'چلے جائیں گے' سے مراد فقط دیارِ محبوب سے رخصت ہی نہیں، بے زمینی
ہے جس کی توثیق سفر سے ہو جاتی ہے۔ اگلے شعر میں دستک فقط در دل پر نہیں درِ
پر بھی ہے، اور آخری شعر میں بدلتے موسموں کا پیکر واضح طور پر مغرب میں بے گھری
تجربے سے آیا ہے۔ شاخِ آرزو پر ثمر آتے رہنے کے سلسلے میں اشفاق کے نظریۂ
ت کی رجائیت برحق، لیکن اس کی توثیق پیڑوں پودوں کے بے لباس ہونے اور پھر
ے موسموں کے ساتھ ہری بھری کونپلوں کے لد جانے سے ہوئی ہے۔ حلقۂ زماں کی
ں کی طرح نمو کا یہ دوران بھی دائمی ہے جو شاخِ آرزو کو محبت کے برگ و بار کے تصور
ر سبز رکھتا ہے:

محبت اور محبت کا شجر باقی رہے گا
چلے جائیں گے ہم لیکن سفر باقی رہے گا
کسی دستک کی کانوں میں صدا آتی رہے گی
کوئی نقشِ قدم دہلیز پر باقی رہے گا
بدلتے موسموں کی بے زبانی کہہ رہی ہے
کہ شاخِ آرزو کا ہر ثمر باقی رہے گا

اس سلسلے میں میری پسندیدہ دو غزلوں سے کچھ اشعار اور ملاحظہ ہوں جن سے اوپر کی گفتگو کی مزید توثیق ہوگی کہ اشفاق حسین کے یہاں مٹی سے دوری دردِ محبت میں ڈھل جاتی ہے یا 'لوپوئمز' میں یہ جذبات تطہیر کے عمل سے گزر کر نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہیں جو شعریت اور لطف و اثر کا امکان رکھتی ہیں :

اس دہلیز پہ جب کوئی گلدستہ رکھنا
میرے نام کا بھی اک سوکھا پتّا رکھنا
خواب کے بے در گنبد میں جانے سے پہلے
اپنے لیے، واپس آنے کا رستہ رکھنا
دیکھتے رہنا آوازوں کے رنگ سنہرے
جب وہ آنکھیں بولیں تب، لب بستہ رکھنا

سرد ہوا کے تیر سے سارا بدن چھدا ہوا
ایسے میں تیری یاد کا زخم بہت ہرا ہوا
تازہ ہوا کی منجمد انگلیاں اس کو لے گئیں
برف کی اک سلیٹ پر نام جو تھا لکھا ہوا
ضبط کی ساری سرحدیں آنکھ تک آ کے ختم تھیں
آج میں کھل کے رو لیا، آج تو معجزہ ہوا

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دوسری غزل کی امیجری کے سارے نقوش یخ بستہ فضاؤں سے متعلق ہیں : ٹھنڈی ہوا کا ہڈیوں میں پیوست ہونا، ہوا کی منجمد انگلیاں یا برف کی سلیٹ معنویت کے جن رشتوں کو ابھارتی ہے، ان کا تعلق نئے تجربوں سے ہے۔ اشفاق حسین نے ایک جگہ بے وجہ نہیں کہا :

برف کے شہر میں کچھ دھوپ بچا کر رکھیں
یخ زدہ موجِ ہوا بارِ دگر آئے گی

اس سلسلے کی کچھ اچھی نظموں کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان میں شعری اظہار کے اعتبار سے "بیگانہ رہو" اور "ایسے میں" کا اضافہ ضروری ہے۔ "بیگانہ رہو" کا مرکزی مسئلہ اجنبیت ہے۔ پیار و محبت کی شدت بیگانگی اور اجنبیت سے ہے، محبت چونکہ تنہائی اور مسلسل بے گھری کا واحد مداوا ہے، اور تکمیلِ آرزو اس مداوا کی نفی ہے، اس لیے بار بار جی یہ چاہتا ہے کہ آنکھوں کے کنول اسی طرح روشن رہیں، ان کی کشش، ان کا جادو، برابر دامنِ دل کو کھینچتا رہے، کیونکہ خدا نہ کرے کہ یہ بھی دوسروں کی طرح دوست بن کر اپنی پہچان کھو بیٹھیں اور دل کا آباد گلستان پھر سے ویرانہ بن جائے:

دل کا آباد گلستان نہ ہو ویرانہ کہیں
تم بھی اوروں کی طرح دوست نہ بن جانا کہیں

"ایسے میں" بھی مختصر سی نظم ہے۔ انسان کی ذہنی آوارگی اس کو "انجان جزیروں" کی طرف لے جاتی ہے، لیکن ذہن آسودگی کو ہمیشہ 'میپل لیف' کے سایے میں ڈھونڈھتا ہے۔ اشفاق حسین کی شعری گرامر میں ایسی سبک اور شیریں مختصر نظموں کی خاص اہمیت ہے:

جب تم ساتھ ہو ایسے میں
کھو جائیں ہم رستے میں
جسم کی خوشبو ساتھ رہے
دل کی باتیں کرنے میں
اپنے عکس کو دیکھیں ہم
آنکھوں کے آئینے میں
صدیاں پاؤں سے لپٹی ہوں
زندہ ہوں اک لمحے میں
چلتے چلتے آ نکلیں

آپس میں ہم بات کریں
اک دوجے کے لہجے میں
تھک جائیں تو بیٹھ رہیں
میپل لیف کے سائے میں

لیکن ان نظموں سے یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اشفاق حسین محبت کے ہلکے پھلکے جذبات کے شاعر ہیں۔ ان نظموں کو شاعری کے پورے سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ جذبات ہجرت کے عذابوں ثوابوں کے زیرِ اثر دردِ دل کی خلش اور اضطراب کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ انسانی رشتوں کی نوعیت، ٹوٹتے بنتے تعلقات اور وجود کے اسرار کے بارے میں سوال اٹھاتے ہیں، مثلاً :

اب اس سے ملنے نہ ملنے کا ایک عالم ہے
کہ اس سے ہجر کے رشتے بھی کچھ وصال میں ہیں

اس نوع کے اشعار میں سوچ کا جو عنصر ہے وہ 'لو پوئٹری' کی غیر متوقع جہات کو سامنے لاتا ہے۔ ایسے اشعار میں محبت کی کیفیتوں کا رنگ کچھ گہرا کچھ دھندلا ہو جاتا ہے۔ ایسے اشعار بے سوزِ دروں ممکن نہیں :

ہم سوچ کے نگر میں کہاں تک نکل گئے
گم گشتۂ خیال تو پہلے کبھی نہ تھے

اسی سے بھیک اجالوں کی مانگتے ہو کہ جو
خود اک چراغ کی مانند آندھیوں میں ہے
کھلیں گے کیسے یہاں تیری چاہتوں کے گلاب
کہ نفرتوں کی گھنی دھوپ آنگنوں میں ہے

جو شوق بھی ہو اس سے گریزاں نہیں رہنا
لیکن مری مانو تو نمایاں نہیں رہنا

لوٹ کر اب دُکھ نگر میں جائیں کیا
وہ سمجھتا ہی نہیں سمجھائیں کیا

ان اشعار میں مسائل پر غور و خوض کی جو صورت اور جو معنوی تہ داری ہے لطف اثر کی اپنی کیفیت رکھتی ہے۔ اشفاق حسین چونکہ غزل اور نظم دونوں کے شاعر ہیں، س تحریر کو میں نظم کے ذکر پر ختم کرنا چاہوں گا۔ ایک چھوٹی سی نکری نظم " اپنے ہونے کا گمان" ہے جس میں ارتکاز و تکمیل کے تمام مراحل چند مصرعوں میں طے ہوئے ہیں۔ ہر چند کہ تمام پرندے اچھے لگتے ہیں، مگر شاخوں پر سر نیہوڑائے بھیگی شام سے ڈرتے ہوئے پرندے اچھے نہیں لگتے، اس لیے ان کو دیکھ کر آج کے انسان کی بے بسی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے:

بس سر نیہوڑائے
شاخ زندگی پر
اپنے ہونے کا گمان اوڑھے ہوئے ہوں
یقین کے خوف سے سہما ہوا ہوں

ایک اور مزے کی نظم " مکمل رائے " ہے جو یہ سوال اٹھاتی ہے کہ جب انسان کی ساری باتیں، سب رویے اور سارے فیصلے فقط مفروضوں پر قائم ہیں، اور جب ہر نیا خیال ایک نیا موڑ ہے اور انسان ہر وقت نامکمل ہے

تو پھر ہم نامکمل لوگ
اس دنیا کے ہر اک مسئلے پر
کس لیے اپنی مکمل رائے دیتے ہیں!

اشفاق حسین نے ایک خوبصورت نظم میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ "کیوں لکھوں؟ حرف وصوت میں معنی زندگی کے تجربے کے خون سے آتے ہیں۔ وہ تحریر جو تجربے سے نہیں ابھرتی، اس سے زندگی کا حسن نہیں جھلکتا، اور اگر زندگی کا حسن یا زندگی معنویت کی کوئی نہ کوئی سطح شاعری کے جمالیاتی اثر سے قائم نہیں ہوتی تو شاعری بے مصرف ہے۔ سچی شاعری کا اصلی منصب ہی زندگی کے تجربے کے لطف و اثر کو قائم کرنا ہے

کیوں لکھوں؟

میں اب وہ حرف کیا لکھوں
کہ جو کاغذ پہ آکے
زندگی کا حسن کھو بیٹھے
میں اب وہ لفظ کیا لکھوں
جو پڑھنے والی آنکھوں کو
منور ہی نہ کرتا ہو

میں اب وہ شعر کیا لکھوں
جو میرے تجربوں کو
چھو نہ پایا ہو

میں اب وہ نظم کیا لکھوں
جو میرے دل کے آنگن میں
کوئی مہتاب ہی لائے
نہ کوئی آس کا جگنو
نہ کوئی درد کی خوشبو
نہ کوئی ریشمی آنچل

نہ کوئی سرمئی گیسو
نہ کوئی ہجر کا ماتم
نہ کوئی وصل کا پہلو

میں ایسی نظم کیوں لکھوں
میں ایسا شعر کیوں لکھوں
کہ جس کے آیئنے میں
اپنا چہرہ خود نہ پہچانوں

میں ایسا لفظ کیوں لکھوں ؟
میں ایسا حرف کیوں لکھوں ؟

خوشی کی بات ہے کہ اشفاق حسین کی شاعری دل کے آنگن میں درد کا 'مہتاب' بھی رکھتی ہے، آس کا 'جگنو' بھی اور دکھ کی 'ٹیس' بھی۔ اس میں سوز و ساز اور جستجو و آرزو کی حساب فہمی کا حوصلہ ہے۔ اور جو کسوٹی اشفاق حسین نے شاعری کے لیے وضع کی ہے، خود ان کا کلام اس پر پورا اترنے کی بشارت کا امکان رکھتا ہے۔

رضا نقوی واہی
۵/۱۴ گردنی باغ
پٹنہ ۱، بہار

یہ غزل گوئی بھی.....

آج میں ایک رسالے کے جو دفتر میں گیا
پوسٹ مین آ گیا اتنے میں وہاں ڈاک لیے
لگ گیا میز پر اس طرح خطوں کا انبار
لی اڈیٹر نے انھیں دیکھ کے اک انگڑائی
کر کے پھر ڈاک کا تودہ تہہ و بالا جھٹ سے
ان میں جو کام کا تھا بڑھ کے الگ چھانٹ لیا
کارڈ کے بعد لفافوں کی جو باری آئی
میں نے گھبرا کے کیا حضرت والا سے سوال
وہ یہ بولے کہ میں کیا حالِ دلِ زار کہوں
یہ لفافوں کا جو انبار نظر آتا ہے
یہ لفافے مرے اعصاب پہ چھا جاتے ہیں
ان میں کچھ اور نہیں، صرف غزل ہوتی ہے
دن میں دو بار اسی طرح سے ڈاک آتی ہے
نہ تو خاکہ، نہ ڈراما، نہ کوئی افسانہ
ان لفافوں میں نہ جب کوئی مقالہ نکلے
جس طرح سے کسی منڈی میں ہو جاپانی مال
چھاپنا چاہوں جو میں صرف غزل کے اشعار
ہر گلی کوچے میں دس بیس سخنور ہیں ضرور
جن کا آغاز غزل، جن کا ہے انجام غزل
ذہن مفلس ہے مگر مشقِ سخن جاری ہے

محو ترتیب مضامین تھے مدیر اعلا
پوسٹ کارڈ اور لفافوں کی کئی تھاک لیے
جس طرح شہر کی گلیوں میں ہو کوڑے کی قطار
کبھی رخسار پہ زردی کبھی لالی آئی
کارڈ جتنے تھے انھیں چن کے نکالا جھٹ سے
اور باقی جو بچے پھاڑ کے نیچے پھینکا
اک عجب طرح کی چہرے پہ اداسی چھائی
بات کیا ہے جو طبیعت ہوئی اس درجہ نڈھال
بسکہ حالات کے چنگل میں ہوں اک صیدِ زبوں
اف اسے دیکھتے ہی منہ کو جگر آتا ہے
میرے ایوانِ خیالات کو ڈھا جاتا ہے
دیکھ کر جس کو طبیعت مری شل ہوتی ہے
اور ہر بار غزل تھاک کی تھاک آتی ہے
بس جو آیا تو فقط "حالِ دلِ دیوانہ"
کیوں نہ اردوئے معلّیٰ کا دوالہ نکلے
یونہی بازار صحافت میں ہے غزلوں کا حال
آج بن جائے رسالہ مرا "ڈیلی اخبار"
جن کے افلاس کا ہوتا ہے تغزّل میں ظہور
دن غزل، رات غزل، صبح غزل، شام غزل
"یہ غزل گوئی بھی اعصاب کی بیماری ہے"

اب تو گھبرا کے یہ کہتا ہوں کہ مر جاؤں گا
قبر میں بھی جو یہ پہنچے تو کدھر جاؤں گا

ہمارے واہی صاحب ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ کو ۸۲ برس کے ہو گئے۔ ادارہ کتاب نما ان کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہے۔

مانگے کا اُجالا

خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے



انتظار حسین کی متروک اردو

اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ انیس ناگی پاکستان کے اہم ترین ادیبوں میں سے ہیں۔ دو سے زیادہ رائیں ہوں تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ کوئی ادیب اس وقت تک اہمیت اختیار نہیں کرسکتا، جب تک وہ کثرتِ آرا کی بھٹی میں تپ کر کندن نہ بن جائے۔ کثرتِ تعبیر سے خواب تو پریشان ہوسکتے ہیں۔ کثرتِ آرا سے انیس ناگی پریشان نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا ادبی مقام ان کے بارے میں رائے دینے والوں کی ذہنی سطح سے بہت بلند ہے۔ انیس ناگی ادب کے جس مقام پر فائز ہیں، وہاں وہ تنہا ہیں، ان کا کوئی حریف نہیں۔ حریف تو کیا قاری بھی کوئی نہیں کیونکہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کے قاری کے پاس کتاب خریدنے کے لیے تو پیسے ہوتے نہیں، علم حاصل کرنے کے لیے وسائل کہاں ہوسکتے ہیں۔

انیس ناگی بلاشبہ صاحبِ علم و فضل ہیں۔ ان کا عالمی ادب کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ خصوصاً مغربی ادب تو انھوں نے گھول کر پی رکھا ہے، مشرقی ادب ابھی صرف گھولا ہے، پیا نہیں۔ شیشیوں میں بند ان کے پاس موجود ہے، جب مغربی ادب سے جی بھر جائے گا تو اس کی طرف بھی توجہ کریں گے۔

انیس ناگی کے حریفوں کو ان کے صاحبِ علم ہونے میں شبہ ہے ان کا کہنا ہے، چونکہ وہ ایک سرکاری افسر ہیں، اس لیے انھوں نے علم کو اپنے دروازے پر بطور دربان بٹھا رکھا ہے۔ اس کی حیثیت صرف آرائشی ہے اسے کسی معاملے میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ کاش حریفوں کو یہ معلوم ہوتا کہ کسی شخصیت کی عظمت کا صحیح اندازہ اس کے دربان ہی سے کیا جاسکتا ہے یقین نہ آئے تو دیوانِ غالب دیکھ لیا جائے، جتنے شعر محبوب کی تعریف میں ہیں اس سے زیادہ محبوب کے دربان کی تعریف میں مل جائیں گے۔

انیس ناگی کی ادبی شخصیت ہشت پہلو ہیرے کی سی ہے، جس طرف سے دیکھیے ایک نیا عالم نظر آتا ہے، ادب کی کوئی صنف، کرخت ہو یا نازک، ان کی دسترس سے باہر نہیں ہے، اس کی کوئی دوسری مثال اردو ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اردو ادب کی کوئی ایسی معقول تاریخ بھی بازار میں نہیں ملتی جس میں انیس ناگی کا ذکر ہو۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ دستیاب ہے لیکن وہ اٹھارھویں صدی تک کے ادیبوں کا احاطہ کرتی ہے اس لیے اس میں بوجہ بُعدِ زمانی انیس ناگی کا ذکر نہیں ہے، جالبی صاحب چاہتے تو اپنی تاریخ

ادب میں انیس ناگی کے لیے گنجائش نکال سکتے تھے لیکن جب مورخ کے دل میں گنجائش نہ ہو تو اس کی تاریخ ادب میں گنجائش کیسے نکل سکتی ہے۔ جالبی صاحب ہم سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ بعض شاعر زمان ومکان کی حدوں سے ماورا ہوتے ہیں، غالب کو اگر اکیسویں صدی کا شاعر کہا جا سکتا ہے تو انیس ناگی کا ذکر اٹھارویں صدی کے شاعروں کے ساتھ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

انیس ناگی ایک نہایت عمدہ ادبی رسالے "دانشور" سے بھی وابستہ ہیں۔ یہ رسالہ گذشتہ کئی برسوں سے شائع ہو رہا ہے، اس کی پیشانی پر ایک لیبل چسپاں ہوتا ہے جس پر یہ الفاظ درج ہیں "نئے ادب کا ترجمان" لیکن جو ادب اس میں چھپتا ہے وہ نئے پن سے آگے کی چیز ہے، مثلاً اس کے تازہ شمارے میں ظفر اقبال کی "نئی" غزلیں شامل ہیں، ایک غزل کے یہ دو شعر ہم نے بطور نمونہ استاد لاغر مراد آبادی کو سنائے۔

جو آن کے ہمسائے ہمارے میں رہیں گا   تحقیق کہ وہ خود ہی خسارے میں رہیں گا
اس گھر کی بناوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ شوخ   اک بار رہیں گا تو دو بارے میں رہیں گا

استاد گرامی نے یہ شعر سن کر فی البدیہہ فرمایا۔

ناگی نے جو چھاپیں ظفر اقبال کی غزلاں   جو ان کو پڑھیں گا وہ خسارے میں رہیں گا

مگر ہم خسارے میں نہیں رہے کیونکہ ہم ظفر اقبال کے سارے مجموعے پڑھ چکے ہیں، اب ہمیں کسی قسم کی شاعری یہاں تک کہ انیس ناگی کی شاعری بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

"دانشور" کے تازہ شمارے کا سب سے خطرناک حصہ ان تبصروں پر مشتمل ہے جو امجد اسلام امجد، انتظار حسین اور کشور ناہید کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ تبصرے کسی غازی علم دین نے لکھے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ یہ فرضی نام ہے اور تبصرے خود انیس ناگی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ مگر انتظار حسین کی تحقیق یہ ہے کہ نام فرضی نہیں ہے غلط چھپا ہے "غازی" اور "علم" کے درمیان ایک لفظ "بے" بھی تھا جو چھپنے سے رہ گیا ہے۔

یہ تبصرے کتنی سخت زبان میں ہیں، اس کا اندازہ اس اقتباس سے کیجیے جو امجد اسلام امجد جیسے شاعر نغز گو کے بارے میں ہے "صبح ہو یا شام، طوفان ہو یا آندھی، جنگ ہو یا امن، امجد اسلام امجد بیک وقت تمام ادبی اور ثقافتی محاذوں پر موجود ہوتے ہیں۔ اخبار کھولیں تو ان کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے، ریڈیو کھولیں تو وہ زراعت کے پروگرام میں تقریر کر رہے ہوتے ہیں، ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کریں تو ان کا ڈراما نشر ہو رہا ہوتا ہے یا وہ خاندانی منصوبہ بندی کے اشتہار میں موجود ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ سدا بہار ہیں، ہر حکومت میں ان کا ستارہ عروج پر ہوتا ہے۔ ان کے حاسد کہتے ہیں کہ یہ سب میڈیا کا کمال ہے کہ ایک اوسط درجے کے شاعر کو کس طرح پورے معاشرے پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ میڈیا کہتا ہے کہ ان کا مقام پابلو نرودا سے کچھ ہی پیچھے ہے جبکہ ادبی نقاد اور دانشور ان کی ادبی اور ثقافتی مہمات پر مسکراتے ہیں اور ڈرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے کہ ان کا تعلق ایک طاقتور گروہ سے ہے۔"

اس تبصرے پر امجد اسلام امجد کا ردعمل بھی ہم تک پہنچا ہے، انھوں نے کہا "تبصرہ نگار ریڈیو، اخبار اور ٹی وی کو کھولتے ہی کیوں ہیں، انھیں اپنی کتابیں کھول کر دیکھنی چاہئیں کہ جنھیں جلد ساز کے بعد کبھی کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا۔"

انتظار حسین کے تازہ ناول "آگے سمندر ہے" کے بارے میں تبصرہ نگار کی گوہر افشانیاں بھی دیکھ کے

بل ہیں۔ پہلے تو انھوں نے ناول کے چند بے ضرر قسم کے جملوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے یہ ثابت
نا چاہا کہ "انتظار حسین کے تمام کردار پاکستان کے قیام اور یہاں اپنے قیام کو ایک مصیبت تصور کرتے ہیں"۔
ر پھر یہ سوال کیا ہے "اگر یہ سرزمین اتنی بے رحم ہے تو یہ کردار واپس کیوں نہیں چلے جاتے ؟"
سرزمین تو بے رحم نہیں ہے، تبصرہ نگار جیسے فرزندانِ زمین ضرور بے رحم ہیں جو جیتے جاگتے انسانوں
ے تو نالاں تھے ہی، اب افسانوی کرداروں کے وجود کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ان
۔داروں کے ساتھ ان کی زبان کو بھی وہیں بھجوا دینا چاہیے جہاں سے یہ آئی ہے۔ جو کردار ہمیں پسند نہیں ہیں
، کی زبان میں شاعری کر کے اور ناول لکھ کر اپنا وقت اور ان کی زبان کو خراب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔
تبصرہ نگار نے انتظار حسین پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ وہ متروک اردو میں لکھتے ہیں اور محاوروں کی
تاب سامنے رکھ کر ایسے نادر الفاظ استعمال کرتے ہیں جو کم از کم پاکستان میں بولے اور لکھے نہیں جاتے۔
ہم انتظار حسین کو مشورہ دیں گے کہ وہ آیندہ اسی زبان میں لکھا کریں جو پاکستان میں لکھی اور بولی
اتی ہے، یعنی متروک اردو کی بجائے غلط اردو میں لکھا کریں، رہی محاوروں کی کتاب سامنے رکھ کر لکھنے کی
ت تو تبصرہ نگار کی خدمت میں عرض ہے کہ انتظار حسین ان ادیبوں میں سے ہیں جو لغت سامنے رکھ کر نہیں لکھتے
ہ لغت نگار ان کی کتابیں سامنے رکھ کر لغات مرتب کرتے ہیں۔ انتظار حسین سے زیادہ "متروک" الفاظ
ہمیں میر و غالب کے ہاں ملتے ہیں، تو کیا ہم انھیں بھی پڑھنا چھوڑ دیں؟ اور علّامہ اقبال کے بارے میں کیا
ے ہے، ان کے کلام کا تو بڑا حصّہ فارسی میں ہے جو پاکستان کی حد تک ایک "متروک" زبان ہے۔
تبصرہ نگار کی خدمت میں عرض ہے کہ جس لفظ کے معنیٰ ہمیں معلوم نہ ہوں وہ متروک نہیں ہوتا مشکل
فظ ہوتا ہے، انتظار حسین کا قصور یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ بھی استعمال کر جاتا ہے جو بعض لوگوں کے لیے
شکل ہوتے ہیں اس لیے ہم تبصرہ نگار کو مشورہ دیں گے کہ وہ انتظار حسین کے ناول کو کسی معیاری لغت کی مدد
سے دوبارہ پڑھ لیں۔ اس سے انھیں دو فائدے ہوں گے، ایک تو یہ کہ بہت سے مشکل لفظوں کے معنیٰ معلوم
ہو جائیں گے، دوسرے اس کا بھی علم ہو جائے گا کہ انتظار حسین نے ناول میں لکھا کیا ہے۔
تبصرہ نگار نے کشور ناہید کے ساتھ بھی کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ان کی کتاب "بُری عورت کی کتھا"
ر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس کتاب میں کشور ناہید نے اپنے بچپن کے حالات غیر مسلسل طریقے سے
یان کیے ہیں لیکن اپنی جوانی کی ادبی مہمات اور دوسرے واقعات کو ہوا تک نہیں لگنے دی۔ کشور ناہید سب کو
مجرد دے گئی ہے اور تو اور جاوید شاہین بھی منہ دیکھتے رہ گئے، اس نے کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ اصل
یں کشور ناہید نے اس کتاب میں انتقام لیا ہے اپنے مرحوم شوہر یوسف کامران اور اپنے سسرال سے
س طرح اس نے اپنی اصل زندگی کو مخفی رکھا ہے، خود نوشت کے لیے حوصلے اور دیانت داری کی شرط ہوتی
ہے اور یہ دونوں باتیں کشور ناہید کی سرگزشت میں مفقود ہیں۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ انھوں نے مقابلے کا
امتحان دیے بغیر اور کسی اعلا علمی ادبی اور ثقافتی ہنر کے بغیر عاجزی اور بے بسی کی دنیا میں رہتے ہوئے
دسویں گریڈ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا اور اب اللہ کے فضل سے بائیسویں گریڈ کی اسامی پر تعینات
ہیں۔ بُری عورت کی کتھا، جھوٹ کا ایک پلندہ ہے جس میں معاصر حقائق اور لوگوں کے بارے میں غلط بیانی
سے کام لیا گیا ہے۔"

ایک ایسے معاشرے میں جہاں سچ کی کوئی ایسی تعریف نہ کی جاسکتی ہو جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور جہاں ایک کا جھوٹ دوسرے کا سچ ہو وہاں کشور ناہید پر جھوٹ بولنے کا الزام لگانا بڑی زیادتی ہے اور پھر کشور ناہید نے کب یہ دعوا کیا ہے کہ وہ اپنی کتاب میں صرف سچ لکھے گی، کیا پاکستان کے ہزاروں ادیبوں میں سچ بولنا صرف کشور ہی کا فرض ہے؟ کشور کا جو سچ تھا وہ اس نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا، اب ان لوگوں کو بھی اپنا اپنا سچ بیان کر دینا چاہیے جن کا ذکر کشور کی کتاب میں نہیں ہے لیکن ان کی خواہش ہے کہ ہوتا۔ ویسے جن لوگوں کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے، انھیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ ناصر کاظمی، شاکر علی اور مختار صدیقی کی طرح مرنے کے بعد نہیں، جیتے جی رسوا ہو جاتے اور کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔

مژدہ کہ کشور ناہید کی کتاب کا پاکستانی اڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے۔ اسے اگر "پاکیزہ" اڈیشن کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ یہ ہندستانی اڈیشن کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں کم از کم ایک درجن مقامات ایسے ہیں جہاں سے عبارتیں حذف کی گئی ہیں یا ان میں تبدیلی کی گئی ہے۔ یہ مقامات مذہبی یا اخلاقی نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہو سکتے تھے۔ حیرت ہے کہ کشور ناہید جو اپنی بات پر اڑ جانے میں ضرب المثل ہیں، اپنی کتاب میں تحریف پر کیوں کر آمادہ ہو گئیں۔

"مقامات آہ و فغاں" کو حذف کرنے میں بڑی بے دردی سے کام لیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض ایسی بے ضرر عبارتیں بھی حذف کر دی گئی ہیں جن میں پھلوں، سبزیوں اور گٹھلیوں وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ مگر سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ ہندستانی اڈیشن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا جو دیباچہ تھا، اسے بھی پاکیزہ اڈیشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس میں کوئی غیر اخلاقی بات نہیں تھی، سوائے اس کے کہ کشور ناہید کی تعریف میں مبالغے سے کام لیا گیا تھا۔ دیباچے کو حذف کرنے کی تلافی یوں کی گئی ہے کہ کشور نے ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ اپنی ایک تصویر شامل کتاب کر دی ہے۔ یہ تصویر فوٹو گرافی کے فن کا شاہکار ہے کیونکہ صاحبان تصویر میں سے ایک نقشِ حیرت نظر آتا ہے اور دوسرا نقشِ عبرت۔

پاکیزہ اڈیشن باتصویر ہے۔ خیال تھا کہ کتاب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، تصویروں میں انھیں کی عکاسی ہوگی لیکن کشور نے صرف مشاہیر کے ساتھ تصویریں چھپوانے پر اکتفا کی ہے۔ ان مشاہیر میں کتاب کا ناشر بھی شامل ہے۔ ایک تصویر اشفاق احمد کے ساتھ بھی ہے جس میں وہ اور کشور سیخ کباب بنا رہے ہیں لیکن تصویر کے ساتھ یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ شغل شوقیہ ہے یا پیشہ ورانہ۔

پاکیزہ اڈیشن میں کچھ دستاویزات کے عکس بھی شامل ہیں جن میں سرفہرست کشور ناہید اور یوسف کامران کا نکاح نامہ ہے۔ معلوم نہیں اس کی اشاعت کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال اس کی اشاعت سے یہ فائدہ ہوا کہ کشور عظیم شاعروں کے اس مختصر سے گروہ میں شامل ہو گئیں جن کے نکاح نامے چھپ چکے ہیں۔ پہلا نکاح نامہ جو شائع ہوا تھا وہ علامہ اقبال کا تھا اور اقبال اکیڈمی کے رسالے میں چھپا تھا۔ دوسرا نکاح نامہ فیض احمد فیض کا ہے جو مرزا ظفر الحسن مرحوم کی کتاب "خون دل کی کشید" میں شامل ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کشور ناہید نکاح نامے کی اشاعت کی حد تک علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کی صف کی شاعرہ ہیں۔ امید ہے یہ امتیاز کشور کے شاعرانہ مرتبے کے تعین میں بھی معاون ہوگا۔

ایک اور دلچسپ دستاویز ڈاکٹر انور سدید کا وہ خط ہے جو انھوں نے ۱۹۷۳ء میں رائٹرز گلڈ کے

سکریٹری قتیل شفائی کے نام لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب احمد فراز اور کشور ناہید کو سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ اس خط میں ڈاکٹر انور سدید نے ان دونوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی ہے "کشور ناہید اور احمد فراز کو مالی مشکلات سے بچانے کے لیے اپاہج اور معذور ادیبوں کے فنڈ سے کم از کم پچاس روپے ماہوار کا وظیفہ عطا کرنے پر غور فرمایا جائے" قتیل شفائی نے یہ خط اس نوٹ کے ساتھ کشور ناہید کو بھجوا دیا تھا: "از رہِ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیے تاکہ سدید صاحب کے حکم کی تعمیل کر سکوں"۔

افسوس کہ اس سلسلے کی باقی دستاویزات کتاب میں شامل نہیں کی گئیں۔ اس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر انور سدید کی تجویز پر عمل کیا گیا یا نہیں۔ بہر حال یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آج سے بیس پچیس سال پہلے ہمارے ادیب ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔

رفعت سروش
۱۷۔۔۳ سیکٹر ۲۷ نوئیڈا (یوپی)

لفظوں کے گھروندے

چند لفظوں کے گھروندے،
اور کچھ بوسیدہ کاغذ
عمر بھر کی ہے کمائی
زندگی! بس اتنی مہلت
ان گھروندوں کو بہا دوں
وقت کی چنچل ندی میں
کیا خبر یہ بہتے بہتے
جا لگیں اک ایسے ساحل پر،
جہاں بے لفظ بے معنی ہو دنیا
اور پھر بے آسرا مخلوق
ان میں دو گھڑی آرام کرے
زندگی کے نفسِ مطلب کو سمجھ لے
آنسوؤں اور درد کی تحریر پڑھ لے

مشتاق شاہجہاں پوری
تلہر، شاہجہاں پور (یوپی)

غزل

کام کوئی کبھی بنا ہی نہیں
اپنے پیروں سے میں چلا ہی نہیں
ایک کردار رہ گیا ہے فقط
اس لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں
کیا کہوں کیوں میں سرخرو نہ ہوا
تیر دل پر کوئی چلا ہی نہیں
آپ کو کون بھول سکتا ہے
آپ کا نام "سبا" میں تھا ہی نہیں
اُٹھ گئے ہیں جہاں سے دیدہ ور
یا صحیفوں میں کچھ لکھا ہی نہیں
کوئی غالب ہے کوئی میر تقی
شاعر معتدل رہا ہی نہیں
موسلا دھار جم کے برسا بھی
بھورا بادل فقط اُٹھا ہی نہیں
پھونکا جاتا ہے پُتلا راون کا
اصل میں وہ کبھی مرا ہی نہیں
جس نے مشتاق خود کو پہچانا
وہ مسافر کبھی تھکا ہی نہیں

پروفیسر حفیظ بنارسی
مکی محلہ آرا
بہار

مشاعرہ

پُرکیف و پُر بہار ہے بزمِ مشاعرہ
سجتی ہے ہر جگہ یہ بڑی آن بان سے
کتنوں کی اس کے دَم سے جوانی ہے دوستو
اس کی ادا ادا پہ زمانہ نثار ہے
مستی جو واہ واہ میں ہے جام میں کہاں
موسم ہو کوئی شعر وسخن کی بہار ہے
لیڈر قضا کرے گا تو ہوگا مشاعرہ
مسرور کوئی ہو کہ کوئی خستہ حال ہو
پٹنہ ہو لکھنؤ ہو کوئی بھی مقام ہو
غالب کی آنکھ نم ہو کہ غمگین ہو روح شاد
اک نیم وحشی، صنف غزل جس کا نام ہے
اس کے لیے سجے گی بہاروں کی انجمن
ہر شہر ہر دیار میں ہوگا مشاعرہ
کچھ ہند و پاک ہی میں نہیں اس کا زور ہے
لاہور اور کراچی کے گلشن میں بیٹھ کر
کیا چیز ریل گاڑی ہے پوچھو مجاز سے
جانِ سخن ہے روحِ ادب ہے مشاعرہ
ہر اک مرض کا اب یہی سستا علاج ہے
اس کے قصیدہ خوانوں میں شاہ وفقیر ہیں
ہر حال میں جوان رہے گا مشاعرہ

ہر قلب کا قرار ہے بزمِ مشاعرہ
چلتا ہے کام کتنوں کا اس کی دکان سے
جو خوش گلو ہے اس کی تو چاندی ہے دوستو
ہر شخص اس کے عشق میں سینہ فگار ہے
جو لطف اس میں ہے وہ کسی کام میں کہاں
قائم اسی سے دشت ودمن کی بہار ہے
شاعر کوئی مرے گا تو ہوگا مشاعرہ
ہو جنم دن کسی کا کہ روزِ وصال ہو
ہو صبحِ عید یا کہ محرّم کی شام ہو
ہوگا مشاعرے کا بہرحال انعقاد
سو جاں سے اس پہ صدقے دلِ خاص وعام ہے
اس پر نثار ہوگی ستاروں کی انجمن
گلشن میں ریگزار میں ہوگا مشاعرہ
امریکہ و عرب میں بھی اب اس کا شور ہے
دہلی کا لطف لیتے ہیں لندن میں بیٹھ کر
اڑتے ہیں شاعر اب تو ہوائی جہاز سے
تفریح کا حسین سبب ہے مشاعرہ
بچوں کا اور بوڑھوں کا سب کا علاج ہے
جب آپ بھی حفیظ اس کے اسیر ہیں
اردو مٹے مگر نہ مٹے گا مشاعرہ

سطوت رسول
ذاکر حسین لائبریری
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

دستک

رات خوبصورت ہے[1]
میم خواب دروازے
اجنبی صداؤں سے
کھڑ کھڑانے لگتے ہیں
لڑکھڑانے لگتے ہیں
تیز گرم سانسوں کے
تیر آنے لگتے ہیں
اپنی بند آنکھوں میں
خواب سرسراتے ہیں
بوند بوند خاموشی
پتھروں سے رستی ہے
ریگِ جاں میں تنہائی
دشتِ پُرخطر میں ہے
جانکنی کے عالم میں
رات جاگ کر کاٹو
اپنے اپنے دکھوں کو
اس طرح سے تم، بانٹو
رات خوبصورت ہے

---

[1] سردار جعفری کے خوبصورت مصرعے سے معذرت

اقتدار جاوید
بادشاہ پور ضلع منڈی بہاءالدین
(پاکستان)

الماری میں

اس شیشے کی الماری میں
اس بند پڑی الماری میں
اس خستہ سی الماری میں
کئی بوسے ہیں، کئی عمریں ہیں
اس شام کو قتل و غارت میں
کچھ قید ہوئے کچھ خاک ہوئے
کچھ آنسو تھے اس عورت کے
جو ران کے اوپر گرتے تھے
کچھ قطرے تھے.....
کچھ نسلیں تھیں بے نامی میں ناموں کو مار گئیں
کچھ نسلیں تھیں جو تے کی شکل میں جیون ہار گئیں
اب باقی بوسے لرزیں گے اک نیند بھری بے زاری میں
اب باقی عمریں کاٹیں گے ہم باہم گریہ زاری میں
الماری میں

غزلیں

رحمت امروہوی
مرزاپور، احمدآباد، گجرات

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

کبھی ملکہ، تو کبھی شہ کا قصیدہ لکھا
مصلحت دیکھ کے غالب نے بھی کیا کیا لکھا

کبھی صاحب کے کفِ دست کو دل کہہ لیا فرض
اور کبھی چکنی سپاری کو سویدا لکھا

کھیل اورنگِ سلیماں رہا اس کے نزدیک
اور بازیچۂ اطفال کو دنیا لکھا

موجزن اس میں بھی تھا اس کی انا کا جوہر
اس نے شہزادے کی شادی کا جو سہرا لکھا

ذکر رمضان کے روزوں کا جب آیا رحمت
اس نے خس خانہ و برف آب کا شکوہ لکھا

یوں تو غالب کی طرح تم بھی ہو مجرم رحمتؔ
تم نے شہ کا نہیں غالب کا قصیدہ لکھا

بسمل عارفی
بشن پور حکیم آباد، سمستی پور

کوئی تو راہ نکالو کہ فاصلہ ٹوٹے
حریف وقت کی آنکھوں کا آئینہ ٹوٹے

خلا میں کون سی منزل تلاش کرتے ہو
قدم زمین پر رکھو تو حاشیہ ٹوٹے

بہت دنوں سے لبوں پر جمود طاری ہے
کبھی خیال میں آؤ کہ سلسلہ ٹوٹے

سرے سے میں ہی غلط تھا تو صاف کہہ دیتے
یہ کیا کہ میری سیاست سے قافلہ ٹوٹے

بہت کٹھن ہے زمانے میں سرخرو ہونا
لحاف سر سے ہٹاؤ تو دائرہ ٹوٹے

رکھو سنبھال کے بسملؔ سکون کے لمحے
نہ جانے کون سی ساعت میں حوصلہ ٹوٹے

یوسف ناظم

یوں کمیشن میں اب دھرا کیا ہے: اور درویش کی صدا کیا ہے

(بحوالۂ غالب)

گو کہ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کوئی تحقیقاتی کمیشن نہیں ہے لیکن ہے تو کمیشن۔ بہت اچھا ہوا کہ یہ کمیشن دلی میں مقیم ہے اتفاق سے کہیں بمبئی میں ہوتا اور کسی اہلِ نظر کی نظر اس پر پڑ گئی ہوتی تو صرف اس بنا پر کہ اس کا تخلص کمیشن ہے آج لوگ اس پر فاتحہ پڑھتے نظر آتے اور اگر اکبر الہ آبادی جیسے کسی صاحب دل کو اس کمیشن کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ملتی تو وہ فاتحہ پڑھنے والوں کے لیے پلاؤ کا بھی اہتمام فرما دیتے۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی یاد ہمیں یوں آئی کہ ایک نہایت ہی معتبر شخص نے ہمیں بتایا کہ جب سے ،حوالہ کیس، منظر عام پر آیا ہے (یعنی لایا گیا ہے) اس وقت سے یونی ورسٹیوں کے پروفیسر صاحبان نے جو اتفاق سے گائیڈ بھی ہوتے ہیں، ام فل، اور پی ایچ ڈی کے لیے مقالے لکھنے والے طالب علموں کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ وہ اپنے مقالوں میں بھولے سے بھی کوئی "حوالہ" نہ دیں۔ ان میں سے ایک پروفیسر صاحب نے تو یہ تک کہ دیا کہ گو کہ وہ برسوں سے یہ مقالے پڑھتے نہیں ہیں لیکن اب دل پر جبر کر کے ضرور پڑھیں گے صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں ان میں حوالے تو نہیں دیے گئے ہیں۔ جن صاحب نے ہم تک یہ خبر پہنچائی انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جب ایک طالب علم نے اپنے گائیڈ سے یہ پوچھا کہ اگر مقالوں میں حوالوں پر پابندی لگا دی گئی تو یہ مقالے لکھے کس بنیاد پر جائیں گے تو اسے جواب ملا کہ مجھے اس سے سروکار نہیں ہے مقالے کی بنیاد کیا ہو گی کیوں کہ یہ مسئلہ میرا نہیں تمھارا ہے۔ مجھے بہر حال اس لفظ سے ڈر لگنے لگا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس لفظ حوالے نے کسی کے دل پر اثر تو کیا (ورنہ کلام نرم و نازک، کا بے اثر ہونا مشہور ہے)

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس لفظ سے ہی شکایت ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی واقعات ہیں جو ہماری طرز زندگی کا اشاریہ ہیں مثلاً بھوپال گیس المیہ کہہ دیجیے تلمیح سمجھ میں آجاتی ہے۔ شکر اسکینڈل عنوان دیجیے آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ شکر کی فروخت کا معاملہ ہو گا اور اس کا تعلق کسی شکر رنجی یا شکر کی بیماری سے نہیں ہو سکتا۔ سمنٹ اسکینڈل کی بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے بلکہ اس سے زیادہ ڈھکی چھپی باتیں عام آدمی تک سمجھ لیتا ہے مثال کے طور پر آپ بریف کیس کا نام لیں، سننے والا خوش ہو جاتا ہے کہ وہ آپ نے کیا غزل چھیڑ دی۔ اتنا خوش ہو جاتا ہے کہ ایک ساز کی فرمائش کر دیتا اور عمر رفتہ کو بھی آنے کی دعوت بھیج دیتا ہے۔ بوفورس کا نام لیجیے فوراً ایک ایسی سواد ذہن میں آتا ہے اور ذہن ال اطالیہ کی مدد کے بغیر پرواز کر کے اٹلی پہنچ جاتا ہے کیونکہ آدمی کا ذہن بھی پر

طاقت پرواز مگر رکھتا ہے تندور کیس بھی سمجھ میں آتا ہے اور مودی کا مرڈر کیس بھی، لیکن نہیں سمجھ میں آتا تو صرف یہ حوالہ کیس ہے جس کی شرح لکھنی پڑتی ہے گویا اسکینڈل نہ ہو میر تقی میر کا شعر ہو۔ اکثر کمزور دل کے لوگ تو جن کا احتیاطاً کارڈیوگرام، نکالا جاچکا ہے، 'اللہ کے حوالے' کے الفاظ بھی سُن کر کانپ اٹھنے لگے ہیں حالانکہ یہ دعائیہ نہیں دعائیہ الفاظ ہوتے ہیں۔ ویسے ہم نے اس حوالہ کیس کی ماہیت پر غور کیا تو یہ ہمیں ایک چھتیسے شعر کی طرح کی چیز نظر آیا۔ ۶۵ کروڑ کے کیس میں بھلا کیا جان ہو سکتی ہے۔ یہ شعر گوئی کیسے ہوئی صرف تک بندی ہوئی۔ آج کل کے حساب سے دیکھا جائے تو یہ رقم قطرۂ شبنم بلکہ اشکِ بلبل سے بھی کم حیثیت کی چیز معلوم ہوتی ہے اور اگر ہمارے ملک کے رقبے کے حسا سے جانچا جائے تو اس میں شہرت کا بھی، رسوائی اور سُبکی کا پہلو نکلتا ہے۔ ہم غریب ضرور ہیں لیکن اتنے بھی کہ ۶۵ کروڑ روپوں کے لیے واویلا مچانے لگیں (آہ و فغاں کے لیے ہمارے یہاں کئی موضوعات موجود ہیں) اور پچھلے پندرہ بیس برسوں کی محنت شاقہ کے بعد تو ہماری غریبی بہت دور ہو چکی ہے اور صرف ان لوگوں کو دکھائی دیتی ہے جن کی بینائی میں کوئی نقص ہے۔ یہ غریبی اب داغ داغ اندھیرے کی طرح ہے (ہم نے داغ داغ اندھیرے کی ترکیب بفیض احمد فیض کے حوالے سے استعمال کی ہے اور اس لیے کی ہے کہ اندھیرے کے ذکر میں اگر کوئی حوالہ ضبط تحریر میں آجائے تو اسے لائق تعزیر نہیں سمجھا جانا چاہیے)

اس حوالہ کیس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ کوئی پانچ سال پُرانا کیس ہے۔ آہ۔ کس موقع پر غالب یاد آئے جنھوں نے فرمایا تھا زخم بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا۔ یہ کیس ہمیں اس لیے بھی پسند آیا کیونکہ ہم لوگ پانچ سالہ منصوبوں کے عادی ہو چکے ہیں اور یہ عادت اتنی جڑ پکڑ چکی ہے کہ اگر راشن کارڈ کے لیے ہماری درخواست بھی پانچ سال کی مدت گزرنے سے پہلے منظور ہو جاتی ہے تو ہماری بھوک مر جاتی ہے۔ یوں بھی راشن کارڈ پر ملتا ہی کیا ہے۔ لوگ راشن کارڈ تو اس لیے بنوا ہیں کہ اس کے بغیر اس کے بغیر ٹیلی فون نہیں مل سکتا، پاسپورٹ نہیں بن سکتا، بلکہ اگر پولیس تھانے پر کا شکایت لکھوانی ہو تو پہلے راشن کارڈ دکھانا پڑتا ہے اور شاید کارونر بھی راشن کارڈ دیکھے بغیر متو مریض کا پوسٹ مارٹم نہیں کرتا۔ (راشن کارڈ نہ ہونا آدمی کی ولدیت ہو گئی) ہمارے یہاں ہر تاخیر کی پشت پر باعثِ تاخیر نام کی ایک داستان بہر حال موجود رہتی ہے۔

اس حوالہ اسکینڈل کے مصنف سلمان رشدی یا محترمہ تحسین کی طرح کے کوئی بہت مشہور آدمی نہیں ہیں لیکن ہیں بہت دیانت دار تذکرہ نویس۔ ورنہ عام طور پر تذکرہ نویس حضرات غلط اندراج کرنے کے شوقین ہوتے ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہے کہ ان کی توجہ اندراجات کی صحت سے زیادہ اپنی انشا پردازی اور املا پر ہوتی ہے (اعراب پر بھی)۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے تو ایسے تذکرے لکھے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گل بکاؤلی کی داستان لکھ رہے ہیں یا میر حسن کی کوئی مثنوی جیسی تصنیف کا ہم ذکر کر رہے ہیں اسے تصنیف بھی کہنا مشکل ہے کیوں کہ اس کی نوعیت صرف ڈائری کی ہے۔ اہمیت اندراجات کی ہے جو تاریخ وار لکھے گئے ہیں۔ یہ ڈائری کراؤن سائز کی ہے یا ڈیما سائز کی۔ مجلد ہے یا غیر مجلد۔ ایسی فروعی باتیں صرف ادبی کتابوں کے سلسلے میں استعمال کی باتیں ہیں اور قا کی دلچسپی کا مرکز بھی یہی فروعات ہوتی ہیں۔ ان کتابوں سے انتشار پھیلتا ہے اس ڈائری نے کہا جا

ہے ڈائری پھیلایا ہے (لیکن محدود) اس لیے آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ واہ کیا ڈائری ہے (ایکٹنگ کی ضرورت نہیں صرف زبانی کہہ دینا کافی ہے)۔ یہ تصنیف اصل میں ایک لیجر (Ledger) ہے اور اس کا چربہ کسی نیشنلائزڈ بینک سے حاصل کیا گیا ہے۔ درجِ فہرست بینک کی ہم نے اس لیے صراحت کر دی کہ اس نوعیت کے بینکوں کا درجہ ذرا بلند ہوتا ہے ورنہ ان کا لیجر بھی وہی ہوتا ہے جو سارے اچھے بُرے بینکوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیجر لکھنا افسانہ اور ناول لکھنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ہے اور نازک بھی۔ اس میں باریک بینی سے کام لینا پڑتا ہے اور دماغ کو حاضر رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی پروف ریڈنگ نہیں ہوتی ہے اور اسی لیے اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ جس ڈائری کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں سارے کرداروں کے نام صرف حروف تہجی میں لکھے گئے ہیں۔ ان حروف تہجی سے اصل افراد کا نام معلوم کر لینا مشکل نہیں تھا اور معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی صحیح نتیجہ اخذ کر سکتا تھا۔ صرف حروف تہجی کی بجائے اگر مصنف مخصوص کوڈ یا مخفی اشارے استعمال کرتا تو افراد کے ناموں کا انکشاف مشکل ہو جاتا اور ہمیں اس کام کے لیے ذہین لوگوں کی ضرورت پیش آتی۔ مصنف اس لحاظ سے ہماری داد کا مستحق ہے کہ اس نے ڈائری کو ڈائری ہی کی حد تک رکھا اسے معمّا نہیں بنایا ورنہ بانیان مقدمہ ڈائری ہاتھ میں لیے دربدر مارے مارے پھرتے اور ان کی زبان پر یہی ہوتا کہ اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا (ان کی تنخواہ بہرحال جاری رہتی)

ڈائریاں، روزنامچے اور مخطوطات پڑھنا صرف انسانوں کے بس میں ہے۔ اس کام میں کوئی دوسری مخلوق اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ سراغرسانی، باربرداری، غذائی مسائل حل کرنے اور سواری وغیرہ کے کاموں میں تو دنیا کی دوسری مخلوقات کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہیں لیکن خواندگی صرف انسانوں اور انسانوں میں سے بھی صرف چند افراد یہ کام کر سکتے ہیں ورنہ دنیا کی نصف آبادی (جس میں ہمارا بڑا حصہ ہے) ناخواندہ ہے۔ غنیمت ہے کہ جن صاحب نے حوالے کے لین دین کے سلسلے میں جو اندراجات کیے وہ زیادہ پیچیدہ نہیں تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان میں سے چند تو کیلی گرافی کے عمدہ نمونے تھے انگریزی کے حروف تہجی میں یوں بھی دو حرف ایک ڈیزائن کے نہیں ہوتے جیسے کہ اردو میں دال اور واؤ۔ (بعض لوگ تو خود اردو کو رَد میں ارُدد بروزن ورود پڑھ جاتے ہیں) اردو میں دو حرفوں کو جوڑ کر لکھنے کا معیوب طریقہ رائج ہے اس کی وجہ سے بعض وقت اچھے اچھوں کو مصیبت میں مبتلا ہوتے دیکھا گیا ہے مثلاً ہمیں یاد ہے کہ فارسی کے ایک استاد نے شعر پڑھتے وقت پڑھ دیا "گلزخاں" اور پھر خود ہی حیران ہو کر بولے یہ شعر میں گلزخاں کہاں سے آ گئے۔ ایک طالب علم نے انھیں بتایا کہ جناب وہ گلزخاں نہیں ہیں بلکہ گل رخاں ہے۔ اس ڈائری کے مطالعے میں ہمارے احباب کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی یوں بھی سرکاری دفاتر میں پڑھے لکھے لوگوں کا بھی تقرر کیا جاتا ہے۔ موجودہ صورت حال کیا ہے ہمیں معلوم نہیں۔ ایک واقعہ البتہ ہمیں معلوم ہے کہ سرکاری دفتروں کے آداب میں یہ اصول رائج ہے کہ جب صفحہ ختم ہو جائے لیکن تحریر کا کچھ حصہ جس میں لکھنے والے کی قابلیت کا نچوڑ ہوتا ہے، باقی رہ جائے تو صفحے کے آخر میں صفحہ اُلٹیے، ضرور لکھا جائے۔ انگریزی میں پی ٹی او کے حروف لکھے جاتے ہیں یعنی پلیز ٹرن اوور۔ ایک ڈسٹرکٹ ٹریژری آفیسر نے عجلت میں کہ انھیں گھر جانا تھا، پی ٹی او

پر یعنی ڈی ٹی او کے دستخط ثبت فرما دے اور اس طرح صفحے کی پشت پر جو تجویز لکھی گئی تھی یونہی گمنام رہ گئی (بعد میں معلوم نہیں کس کے حوالے ہوئی)

بات کمیشن کے ذکر سے شروع ہوئی تھی اس سلسلے میں رائے عامہ معلوم کرنے والے اداروں کی تحقیق یہ ہے کہ اب عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سارے کمیشن ختم ہو جائیں گے اور صرف ایک کمیشن باقی رہے گا جو لین دین کے سلسلے میں لیا اور دیا جاتا رہا ہے اور یہ کہ اب صرف کمیشن ایجنٹ باقی رہیں گے ورنہ ایک زمانہ تھا جب کمیشنوں کے سربراہ کی تلاش میں سرکار سرگرداں رہتی تھی اور بڑی مشکل سے انھیں کوئی ایسا جج ملتا تھا جو خالی ہوتا تھا۔

ایک کمیشن ایجنٹ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ سودے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد وہ فریقین کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ دونوں برسوں مقدمہ بازی میں مصروف رہتے ہیں اس لیے کہ بیچنے والے فریق کے پاس ملکیت کے پورے کاغذات ہی نہیں تھے اور جو کاغذات خریدار کو دکھائے گئے تھے وہ بی۔اے اور ایم اے کے ان اسناد کی طرح کے تھے جو بازار میں فروخت ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جعلی اسناد رکھنے والے لوگ قابلیت میں ان لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں جنھوں اصلی اسناد حاصل کی تھیں ۔ ہم خود اوّل الذکر قسم کے فارغ التحصیل لوگوں سے بہت مرعوب ہیں۔

مجتبیٰ حسین

بابائے مسقط، گلبرگہ کے رہنے والے ہیں

صاحبو! ہم ملک سے باہر جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اردو زبان کے حوالہ سے ہی جاتے ہیں۔ اسی مظلوم اور بے کس زبان کے حوالہ سے بیرونی ملکوں میں گلچھرّے اُڑاتے ہیں اسی نادار اور مفلس زبان کے وسیلہ سے ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں اور موج مناتے ہیں۔ اسی بے بس اور دکھیا زبان کی آڑ میں فائیو اسٹار ہوٹلوں میں رہتے ہیں اور قیمتی تحفے تحائف قبول کرتے ہیں۔ گویا ہمارا شمار اس غریب زبان کے امیر ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اپنے ملک میں یہ زبان جتنی مظلوم اور بے کس نظر آتی ہے وہ بیرونی ملکوں میں نظر نہیں آتی۔ اس کے جلسوں میں پاکستان، بنگلہ دیش، ہندستان اور نہ جانے کن کن ملکوں کے لوگ چلے آتے ہیں۔ اندرون ملک بھلے ہی کچھ لوگوں کو اس زبان سے بیر ہو لیکن بیرونی ملکوں میں یہ زبان جس طرح کے انواع واقسام کے شائقین ادب کو اکٹھا کر دیتی ہے اس سے لگتا ہے کہ یہ برصغیر ابھی تک تقسیم نہیں ہوا۔ ہمارا تو خیال ہے کہ لگ بھگ نصف صدی گزر جانے کے باوجود اس زبان نے تہذیبی اور جذباتی سطح پر اس برصغیر کو تقسیم ہونے نہیں دیا۔ ہم یہ جو پچھلے دنوں مسقط گئے تھے تو اس زبان کے حوالہ سے گئے تھے۔ مسقط میں آئے دن مشاعرے اور موسیقی وغیرہ کے پروگرام تو ہوتے رہتے ہیں لیکن طنز ومزاح کی کوئی باضابطہ محفل یہاں کبھی آراستہ نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے دوست ہمایوں ظفر زیدی کا عرصہ سے اصرار تھا کہ ہم مسقط ضرور آئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مسقط کے ادب دوست حضرات اب شعروں پر داد دیتے دیتے تھک چکے ہیں۔ اب وہ ذرا ہنسنا بھی چاہتے ہیں۔ اس بات پر کہ آخر اتنے دنوں تک وہ بلاوجہ ہی شعروں پر داد کیوں دیتے رہے۔ دیارِ غیر میں آرام وآرائش کی ساری سہولتیں تو میسّر آجاتی ہیں لیکن ڈھنگ سے ہنسنے کے مواقع ذرا کم ہی میسّر آتے ہیں۔ ہمایوں کوئی انجمن وغیرہ تو نہیں چلاتے البتہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن ضرور ہیں۔ تاہم طنز ومزاح کی یہ محفل انڈیا ایسوسی ایشن آف عمان کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی جس میں ہندستان سے یوسف ناظم اور دلیپ سنگھ کے علاوہ ہم نے اور پاکستان سے انشائیہ نگار اور شاعر منظر علی خاں نے شرکت کی۔ اس اعتبار سے مزاح نگاروں کا یہ ایک ہندوپاک اجتماع تھا جس میں مسقط میں مقیم ہندستان اور پاکستان کے شائقین ادب نے بھاری تعداد میں شرکت کی لیکن اس محفل کے انعقاد سے پہلے ہمیں ایک اور محفل شعروسخن میں شرکت کرنے کا موقع ملا جس کا اہتمام حبیب بینک کی مسقط شاخ کے منیجر نذیر حسین بھٹو نے اپنی قیام گاہ پر کیا تھا۔ مسقط کے مقامی شاعروں سے ہماری یہ ...

بینک ہے۔ چنانچہ اس محفل میں زیادہ تر حبیب بینک کے ملازمین اور کھاتہ داروں نے شرکت کی۔ پھر دلچسپ بات یہ تھی کہ اس محفل میں حبیب بینک کی مسقط شاخ کے جنرل منیجر واعظ الرحمٰن کے علاوہ پاکستان سے آئے ہوئے مزاح نگار منظر علی خاں بھی شریک تھے جو خود بھی حبیب بینک کے بہت بڑے افسر یعنی اس بینک کے سینیر وائس پریسیڈنٹ ہیں بلکہ وہی اس محفل کے صدر بھی تھے۔ نتیجہ میں بینک کے ملازمین نے اس دن شعروں پر "تھرو پراپر چینل" داد دی اور خوب داد دی۔ پہلے بینک کے وائس پریسیڈنٹ منظر علی خاں داد دیتے تھے۔ بعد میں بینک کے جنرل منیجر واعظ الرحمٰن کی داد سنائی دیتی تھی۔ تب کہیں یہ داد بینک کے منیجر نذیر حسین بھٹو سے ہوتی ہوئی بینک کے درجہ بدرجہ نچلے ملازمین کے منہ سے سنائی دیتی تھی۔ ایسی باقاعدہ اور باضابطہ داد ہم نے کم ہی سنی ہے۔ منظر علی خاں تو خیر ہمارے پرانے دوست ہیں۔ ان سے کراچی میں ہماری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ واعظ الرحمٰن سے البتہ ہم مسقط میں پہلی بار ملے۔ ہندستان سے پاکستان کو ہجرت کرنے سے پہلے ان دونوں حضرات کا تعلق صوبہ بہار سے رہ چکا ہے اور ان دونوں بہاریوں کا شخصی کارنامہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی ان سے ملتا ہے بہاریوں کے بارے میں اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے (رائے بُری ہو تو اچھی کر لیتا ہے) واعظ الرحمٰن مسقط کی اردو محفلوں کی جان ہیں۔ بے حد ملنسار، خوش اخلاق اور مخلص آدمی ہیں۔ مسقط کی محفل طنز و مزاح کے انعقاد میں بھی وہ اپنے بینک اور بینک بیلنس دونوں کے ساتھ شریک تھے۔ چونکہ ہمارا تعلق حبیب بینک سے نہیں تھا اسی لیے ہم اس محفل میں "تھرو پراپر چینل" داد دینے کے پابند نہیں تھے اس لیے ایسے شعروں پر بھی بے ساختہ داد دیتے رہے جو بحر سے خارج تھے۔ ہمایوں نے دو ایک بار ٹوکا بھی کہ حضرت آپ بے وزن شعروں پر داد دے رہے ہیں۔ ہم نے کہا "اردو ماحول سے ہزاروں میل دور لق و دق صحرا میں کہے جانے والے شعروں پر وزن اور بحر کی پابندی اچھی نہیں لگتی" اس محفل میں محترمہ صدف بھٹو صدف ملک، عابد فاروقی، مقبول احمد شیخ، سید سعید واحد، فرزانہ اعجاز، عارف انوار الحق شکیل کاظمی یوسف شکیل، جاوید اقبال، جاوید اقبال رشید، بابائے مسقط کیفی حسینی، ہمایوں ظفر زیدی، یوسف ناظم اور صدر مشاعرہ منظر علی خاں نے کلام سنایا۔ اس محفل میں جب کنوینر مشاعرہ نے کیفی حسینی کو دعوت سخن دیتے ہوئے کہا کہ "اب آپ کو بابائے مسقط کلام سنائیں گے" تو ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ اردو والے جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنا ایک "بابائے اردو" یا "ملک الشعراء" یا "شمس العلماء" ضرور ایجاد کر لیتے ہیں اور متعلقہ حضرات بھی ان القاب کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک کردار کے بارے میں کہیں لکھا ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ بربنائے انکسار و خطا کاری "عاصی ظہور الدین" لکھا کرتے تھے۔ ان کے لکھے پر لوگوں نے بھی انھیں "عاصی ظہور الدین" پکارنا شروع کر دیا۔ کیفی حسینی غزل سرا ہوئے تو ہمیں ان کے ترنم میں سے دکن کی بو آنے لگی۔ یوں لگا جیسے ہم مخدوم محی الدین اور سعید شہیدی کا کلام ترنم سے سن رہے ہوں۔ جب بابائے مسقط کلام سنا چکے تو ہم نے پوچھا "قبلہ آپ کا تعلق کس علاقہ سے ہے؟" بولے "ویسے تو پچھلے چالیس برسوں سے پاکستان میں مقیم ہوں لیکن میرا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے" ہم نے پوچھا "حیدرآباد دکن کے کون سے علاقے سے ہے؟" بولے "گلبرگہ شریف سے" ہم نے جب گلبرگہ شریف سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تو بہت خوش ہوئے۔ پوچھا "گلبرگہ میں کہاں رہتے تھے؟" بولے

،، محلہ جگت میں رہتا تھا،، ہم نے کہا، ہم بھی محلہ جگت میں رہتے تھے ،، پھر اس کے بعد ہم نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ محلہ جگت کے کس مکان میں رہتے تھے کیونکہ ہمیں اندیشہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ ہمارے سوال کے جواب میں یہ نہ کہہ دیں کہ وہ بھی اسی مکان میں رہتے تھے۔ ہم نے کہا، بابائے مسقط ہمیں یہ تو پتا تھا کہ دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن یہ اتنی بھی چھوٹی ہو سکتی ہے اس کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔ کیفی حسینی (اصلی نام سید مصطفیٰ حسینی) بیجاپور کے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیجاپور اور گلبرگہ کی کئی ہستیوں کا ذکر کیا۔ حسینی شاہد اور زینت ساجدہ سے بھی اپنی رشتہ داری بتائی۔ پولیس ایکشن کے وقت یہ حیدرآباد کے مغل پورہ میں مقیم تھے۔ بابائے مسقط اب بھی ان گلیوں کو یاد کرتے ہیں جن میں چلنے کا انھیں کم کم ہی موقع ملا تھا۔ اس مشاعرہ میں ہمایوں ظفر زیدی نے ایک خوبصورت شعر سنایا۔ آپ بھی سن لیجیے۔

مرے خدا مجھے پردیس میں سکون دے دے
کہ اب تو لوٹ کے جانے کا حوصلہ بھی نہیں

دوسرے دن طنز و مزاح کی یادگار محفل جس میں شرکت کے لیے ہم گئے تھے انڈین ایسوسی ایشن کے ہال میں منعقد ہوئی۔ یہ ایک مخلوط محفل تھی جس میں ہندستانی، پاکستانی، گجراتی، پنجابی، حیدرآبادی اور سندھی باشندے شریک تھے۔ ہندستان اور پاکستان دونوں کے سفارت خانوں کے اعلا عہدہ دار بھی شریک تھے۔ طنز و مزاح کی یہ ایک یادگار محفل تھی ـــ ابتدا میں ہمایوں ظفر زیدی نے طنز و مزاح کے بارے میں انگریزی میں ایک مدلل تقریر کی۔ اس کے بعد منظر علی خان، یوسف ناظم، دلیپ سنگھ اور ہم نے مضامین سنائے۔ لوگوں کا اشتیاق کچھ اتنا زیادہ تھا کہ ہمیں اور دلیپ سنگھ کو تین تین مضامین سنانے پڑے۔ یہ پہلا موقع تھا جب مسقط میں نثری مضامین نے اتنی داد حاصل کی۔ ہال کے باہر تک سامعین کا ہجوم تھا۔

تیسرے دن ہمارے ایک اور میزبان واعظ الرحمٰن، جنرل منیجر حبیب بینک نے اپنے گھر پر ایک خوبصورت محفل آراستہ کی جس میں مسقط میں متعینہ پاکستانی سفیر جناب خالد محمود نے بطور خاص شرکت کی۔ مسقط کے سب سے خوبصورت علاقہ قرم میں واعظ الرحمٰن کی کوٹھی شائقین ادب سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مزاح نگاروں سے پھر مضامین سنے گئے اور مسقط کے سارے شعرا نے جی کھول کر کلام سنایا۔ واعظ الرحمٰن نے مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مہمانوں کو تحفے تحائف سے بھی نوازا گیا۔ واعظ الرحمٰن نہ تو شعر کہتے ہیں نہ مزاح لکھتے ہیں لیکن ہمیں بتایا گیا کہ اردو کے حوالہ سے کوئی بھی محفل آراستہ ہو تو وہ نہ صرف اپنے گھر کے دروازے بلکہ اپنے بینک کے دروازے بھی کھول دیتے ہیں۔ ہم تو اپنے مضامین سنا کر اردو کی خدمت کرتے ہیں لیکن واعظ الرحمٰن کچھ سنائے بغیر ہی اردو کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ صحیح معنوں میں اردو کے خاموش خدمت گزار ہیں۔ واعظ الرحمٰن نے کہا کہ طنز و مزاح کی یہ محفل بہت ڈرتے ڈرتے رکھی گئی تھی لیکن جس طرح یہ محفل کامیاب رہی اس کے چرچے مسقط میں جگہ جگہ ہو رہے ہیں۔ اب انشاء اللہ ایسی محفلیں ہر سال ہوا کریں گی۔ ہم نے بھی انھیں مستقبل میں بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے کیوں کہ اردو کی خدمت کے لیے ہم ہر دم ہوائی جہاز میں بیٹھنے، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرنے اور قیمتی تحفے قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ کوئی ہمیں آزما کے تو دیکھ لے۔

قمر گونڈوی
کوچہ جگر
گونڈہ، یو، پی

مجروح سلطانپوری

فن اور شخصیت

گزرے ہوئے بچپن کے لمحات جب یاد آتے ہیں تو جیسے دل دھڑکنے لگتا ہے ہزاروں خیالات ذہن میں اک ساتھ ابھرتے ہیں۔ میں گڑبڑا جاتا ہوں، کسے اپناؤں کسے چھوڑ دوں، یادوں کا یہ طویل سفر اس کی منزل ہے کہاں ہے زبان گنگ ہو جاتی ہے جذبات کی ترجمانی کے لیے لفظوں کے انتخاب مزید پریشانیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں مگر یہ دل ہے کہ ماہی بے آب ہے۔ سب کچھ کہنے کے لیے جو اس نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اللہ اللہ کتنے دلکش وحسین زمانے تھے۔ کیا ماحول تھا، کیا محبت تھی انسانیت تھی۔ ان دنوں میری عمر لگ بھگ چودہ پندرہ کی رہی ہوگی، اسکول جانا، خالی وقتوں میں گلی ڈنڈا ہاکی، فٹ بال کھیلنا۔ یہ میرا گھر ہے اس کے سامنے میونسپل آفس کا سبز وشاداب میدان ہے اسی کے سامنے حضرت جگر مرادآبادی کا گھر ہے (پہلے یہی گھر مرحوم اصغر گونڈوی کا تھا) باہری کمرے میں ہر گھڑی آمد و رفت لگی رہتی ہے رنگ برنگ کی شیروانیاں زیب تن کیے دیدہ زیب دروں کی ریل پیل، مجھے یہ لوگ کسی دوسری دنیا کے مخلوق لگتے تھے۔ میں انھیں تعجب اور للچائی للچائی نظروں سے دیکھا کرتا تھا کیونکہ یہ لوگ مجھے بہت اچھے لگتے تھے اسی میں ایک صاحب تھے جن کے ایک پیر میں لنگ تھا لیکن تھے بہت دیدہ زیب اور بہت خوبصورت لمبے چوڑے، گوراچٹا چہرہ بڑے بڑے پیشانی پر لٹکتے بال اور جھجک جھجک کر چلنا۔ شہروں کے محلوں نے انھیں بائیرن کا خطاب دے رکھا تھا اور ہم انھیں راہی معصوم رضا کے نام سے جانتے تھے جو آگے چل کر ڈاکٹر راہی معصوم رضا کہلائے۔ انھوں نے گونڈہ ہی سے اپنی پہلی بیوی کو طلاق نامہ بھیجا تھا جب غازی پور والے گونڈہ آئے تب یہ راز کھلا جگر مرادآبادی اس پر ناراض ہوئے اور بائیرن صاحب کا اپنے یہاں آنا جانا بند کرا دیا۔ حضرت وامق جونپوری جو ان دنوں گونڈہ میں ڈسٹرکٹ سپلائی افسر تھے وہ راہی معصوم رضا پر بہت برہم ہوئے۔ شمسی مینائی مرحوم نے بائیرن صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا مگر یہ اپنی اک چپ میں سب ٹال گئے۔

جگر صاحب کے یہاں آنے جانے والوں میں ایک اور بہت پُر وقار، پُرکشش شخصیت تھی مناسب قد، مردانہ وجاہت، دیدہ زیب چہرہ، چوڑی چمکیلی پیشانی، کچھ بھوری کچھ کالی آنکھیں، اس پر موٹے فریم کا کالا چشمہ، بکھرے بکھرے سنہرے بال، بہت کم گو بہت کم سخن میں انھیں مغرور آدمی سمجھتا تھا جبکہ جگر صاحب کی محفل میں لوگ ایک دوسرے سے باتوں میں لگے رہتے تھے اور یہ چُپ چُپ نہ جانے کس خیال میں گم صُم مگر اللہ جانے اس میں کون سی کشش تھی جو اندر ہی اندر مجھے کھینچتی رہتی تھی۔ آج میں اپنی عمر

کے آخری حصے کو گزارنے میں لگا ہوں اور آج بھی اسی سے بے حد متاثر ہوں یعنی حضرت مجروح سلطانپوری مجروح صاحب جس طرح اپنے خطوط میں مجھے مخاطب کرتے ہیں میں کیا عرض کروں جیسے مجھے ساری کائنات کی خوشیاں مل گئیں۔ آپ کو ایک عمر جس کی تمنا رہی ہو وہ آپ کو مل جائے تو سوچیے کتنی خوشی ہوگی۔ آج مجروح صاحب کا میں اہم رازداں ہوں، ان کی گھریلو زندگی کے اہم واقعات میرے سامنے ہیں جو ایک گھر کے فرد کے علاوہ دوسرا جان ہی نہیں سکتا۔ میں اس بات پر نازاں ہوں کہ جگر مرادآبادی کے روحانی فرزند مجروح سلطانپوری کا میں ادنا عقیدت مند کفش بردار مثال کے طور پر مجروح صاحب کے ۶ ستمبر ۹۵ء کے تحریر کردہ خط سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں:

عزیزم قمر۔

میں علالت کے باعث کچھ لکھنے کی مشقت سے جس قدر بچنا چاہتا ہوں اسی قدر آپ کا مخلصانہ سوال مجھے کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ان دنوں میرا ہاتھ قابو میں نہیں ہے 〃 〃 〃 〃 〃 〃

〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 آپ وہ شعر پھر سے بھیج دیجیے، میرے ذہن میں اس وقت نہیں ہے۔ خط میرے سرہانے سے کاغذات کا انبار ہٹاتے وقت کسی نے ادھر ادھر کر دیا۔ افسوس ہوا، پتا کسی نہ کسی اور ہی سے لکھوانا پڑتا ہے۔ اس روز میری ایک منہ بولی بہن کی لڑکی یہاں تھی اسی نے لکھا تھا۔ بمبئی میں عام طور سے ق کو ک بولتے ہیں، مثلاً قاضی کو ہمیشہ کاضی۔ بس اب تھک گیا۔

دستخط مجروح

میں اس وقت آپ سے مجروح صاحب کے بارے میں محو گفتگو ہوں۔ اس پرآشوب اور تیز رو زمانے کے ساتھ بھولی بسری یادوں سے بھی ناتا جوڑے رکھنا ہے کیونکہ یہی ہے میری متاع حیات میں ایک قابل قدر بہ اعتبار دوست بزرگوں کی فہرست میں ایک نام اور جوڑتے ہیں وہ ہیں جگر صاحب کے دوست پروفیسر آل احمد سرور صاحب، جگر ہیں اور آپ میں کیا یارانہ تھا اگر میں اس کو بیان کرنے لگوں تو یہ مضمون دھرا رہ جائے گا لہٰذا چند اہم باتوں کے بعد میں جلد اصل موضوع پر آجاؤں گا۔

علی گڑھ سرسید نگر میں جب میں دوسری بار پروفیسر آل احمد سرور صاحب سے ان کی کوٹھی پر ملنے گیا تو وہ اکتوبر کی پندرہ تاریخ ۹۵ء تھی صبح ۹ بجے ہوں گے۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا چند لمحوں بعد قدموں کی آہٹ سے لگا کوئی آرہا ہے۔ دروازہ کھلا آل احمد سرور صاحب۔ میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور انھوں نے ہاتھ کے ہلکے اشارے سے مجھے کمرے میں کھینچ لیا۔ میں ادب سے سلام کر کے سامنے والے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ سکوت توڑتے ہوئے عرض کیا حسب حکم میں نے (جگر گوشے) مضمون والا اخبار بھیج دیا تھا تو انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ہاں مل گیا ہے مگر ابھی پڑھنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ تم بتاؤ کیسے آ گئے۔ میں نے عرض کیا، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی ۶ اکتوبر کو ایک دن میں آرٹ فیکلٹی لاونج میں سرسید ڈے کی تقریبات منا رہی ہے پروفیسر نعیم صاحب نے AMU پر ایک

م سُنانے کی دعوت دی ہے وہی پیش کروں گا لہذا آپ کو بھی سلام کرنے چلا آیا۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے
وئے میں کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ انھوں نے پوچھ لیا تم ٹھہرے کہاں ہو۔ فی الحال پروفیسر زبیر خاں
احب کے یہاں ہوں وہ پھر بولے وہ تو شاید تمھارے ہی شہر کے ہیں۔ جی ہاں صحیح فرمایا آپ نے۔ پھر باتیں ہونے
یں میں نے از خود بات کو طول دینے کی خاطر عرض کیا۔ میں بخوبی جانتا ہوں آج ایک زمانہ گزر جانے کے
د بھی آپ کو جگر صاحب سے وہی لگاؤ ہے جو ان کی زندگی میں تھا مثلاً آپ نے ابھی ۔ نیا دور لکھنؤ میں
پنے ایک طویل مضمون میں تحریر کیا ہے۔ ترقی پسندوں کے مشاعرے لکھنؤ میں جب علی سردار جعفری نئی دنیا
و سلام نظم سنا رہے تھے تو قدامت پرستوں نے ہوٹنگ شروع کر دی لہذا ان کو نظم روکنی پڑی لیکن جگر مرادآبادی
ے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلا جس کا اعتراف بعد مشاعرہ سجاد ظہیر نے بھی کیا وغیرہ وغیرہ۔ میری یہ بات
سُن پروفیسر کے سرخ سفید چہرے پر خون کی گردش کی سرخی مزید نظر آنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کسی گہری
سوچ میں ڈوب گئے ہیں پھر سکوت ٹوٹا اور یوں گویا ہوئے۔ تمھیں نہیں معلوم میرا گونڈہ سے قریبی رشتہ
ہے۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں میں گونڈہ میں رہتا تھا، ان دنوں میرے والد مولوی کرم احمد صاحب گونڈہ ہیڈ پوسٹ
آفس میں پوسٹ ماسٹر تھے میں سول لائن گونڈہ میں رضی الدین بیرسٹر کی کوٹھی سے ملحق والے مکان
یں رہتا تھا اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر رام پرشاد صاحب تھے
جو اردو کے عالم تھے۔ انھوں نے سر ڈاکٹر محمد اقبال کی نگرانی میں تاریخ ہند نام کی ایک کتاب لکھی تھی۔ جگر
صاحب کی پرخلوص دوستی نے اس رشتہ میں اضافہ کیا تب سے میرا گونڈہ آنا جانا برابر لگا رہے میں جگر صاحب
کے انتقال سے دو ماہ قبل گورکھپور سے واپسی میں غالباً یہ ماہ جون جولائی ۶۰ء کی بات ہے جگر صاحب
سے گونڈہ میں ملا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک سوال کیا۔ سر جب جگر صاحب کے یہاں گئے تو جگر صاحب
کا وہی دسترخوان تھا یا اس میں کچھ تبدیلی پائی۔ تھوڑا توقف کے بعد بولے، نہیں اس وقت دسترخوان
کے لیے اہتمام کیا گیا تھا اس جواب میں ایک ایسا درد پوشیدہ تھا جو آل احمد سرور کی آنکھوں سے ٹپکا
پڑ رہا تھا میں آج بھی اپنے اس سوال پر شرمندہ ہوں پھر سرور صاحب نے بتایا میں ۵۸ء سے ۶۲ء تک
ساہتیہ اکادمی دہلی کا کنوینر تھا اور اس کے صدر تھے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب مرحوم ساہتیہ اکادمی
دہلی کے ذریعے اردو کے دانشوروں اور شاعروں کے انعامات کی میں نے سفارش کی ان میں چند نام
یوں ہیں۔ فراق گورکھپوری، راجندر سنگھ بیدی۔ اختر الایمان۔ قرۃ العین حیدر اور جگر مرادآبادی۔ جگر صاحب
کے بارے میں اعتراض تھا کہ ان کا کلام پرانا ہے مگر میں نے زیر بحث معاملہ میں اس غلط دعوے کی ٹھوس
دلیلیں پیش کیں اور جگر صاحب کو انعام دلایا۔ میرا دوسرا سوال جس کے لیے آج میں پھر ان کی کوٹھی پر آیا تھا
کیا۔ سر آپ بخوبی واقف کہ جگر صاحب اور مجروح صاحب میں گہری چھنتی تھی بتانے کی زحمت کریں۔ اس دوستی
کی وجہ تو معلوم نہیں۔ پہلے دونوں رند مشرب تھے لیکن یہ ضرور یاد ہے ۱۹۴۲ء میں جگر صاحب کے ہمراہ
پہلی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں آئے تھے تب میں نے انھیں دیکھا اس دور میں یہ نظمیں کہا کرتے
تھے جو اچھی ہوتی تھی کچھ دنوں بعد جگر صاحب چلے گئے مگر مجروح صاحب ہمارے درمیان بیس پچیس دن رہے
میں تو یہ معلوم ہے ان دنوں یہ جگر کے دوست کم پروردہ زیادہ تھے بات کی باتوں کا مجھے صحیح علم نہیں
اس بات کا اعتراف حضرت مجروح اپنے خط بتاریخ ۱۴ نومبر ۹۵ء میں یوں کرتے ہیں۔

قمر سلمۂ دعائیں۔

کسی عبارت کے ذریعے تم نے غالباً جگر کا دوست لکھا ہے جبکہ ہمیں ہمیشہ انھوں نے اپنا فرزند جانا صفحہ۵ میں سرور صاحب کا بھی دوست نہیں ان کا خورد ہوں انھوں نے درست فرمایا میں جگر کا پروردہ ہوں " " " " " "

" " " " " " " " " "

چراغ نمبر والوں نے خود ہی اپنی کوششوں سے مضامین حاصل کیے مجھ سے صرف معصوم راہی کے بارے میں کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان سے کہوں میں نے ان کو کہلوا بھیجا کہ اگر ان کا قلم ایمان دار ہے تو بھلا یا بُرا جیسا بھی ہوں وہ خود لکھیں میرے کہنے کی ضرورت پیش کیوں آرہی ہے چنانچہ انھوں نے نہیں لکھا میں نے بھی کہا خوش رہیے۔ میں وائرس کا شکار رہوں اس قدر دُبلا ہو گیا ہوں اپنی شیروانی پہننا آج کل ترک کر چکا ہوں کہ مانگے کی لگتی ہیں ڈھیلی بے ڈول۔ والسّلام

(دستخط) مجروح

۱۴ر نومبر ۱۹۷۵ء بمبئی

یہ قدآور شخصیتیں بڑا گہرا سمندر جیسی ہوتی ہیں۔ ان میں جوار بھاٹا کی صورت پیدا کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں شرط ہے ان ذمہ دار لوگوں کو اپنے اعتماد میں لینے کی پھر وہ وہ انکشافات ہوتے جس سے ہمارے دور، ہمارے تمدن کی نشان دہی ہوتی ہے اور یہی دور تاریخ کی بنیادیں۔ اس وقت ہمارا موضوع ہیں حضرت سلطانپوری ہندو پاک کے نامور غزل گو شاعر بسلسلۂ جگر مرادآبادی اور ترقی پسندوں کی کانفرنس کا تاریخی واقعہ ہے یہ کانفرنس ۴۹ء میں بھیمڑی میں ہوئی غزل کے بارے میں کیا تجویز پاس ہوئی مظہر ہے مجروح صاحب کا یہ خط۔

عزیزم قمر۔ سب سے پہلے خط کا جواب بڑی تفصیل سے دیا تھا محترمی و مخدومی جگر صاحب کو میں نے دو ماہ سے اوپر بمبئی میں اپنے ساتھ رکھ کر صدر ہند کے اور ہندستان کے سب سے بڑے امراض قلب کے ماہر ڈاکٹر جال پٹیل کا علاج کرواکر صحت مند حالت میں یہاں سے روانہ کیا اور جب گونڈہ میں ان کی حالت پھر بگڑی تو میں نے یہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز ڈاکٹر کے معاون خاص ڈاکٹر ورلائی کو بھیجا۔ ہوائی اڈہ سے گونڈہ اور جگر علیہ الرحمہ کو دیکھ کر پھر لکھنؤ واپسی کے لیے میں نے سیّد صدیق حسن (ع ۱ ۱) مکرم سے ان کی کار مانگی مگر علاج کسی قیسی الفاروقی کی جہالت کے باعث نہ ہوسکا اور پھر جب تسکین صاحب کی جگر صاحب کے متعلق خفیہ فرمائش پر کہ جگر کو علی گڑھ یونی ورسٹی نے ڈاکٹری کی ڈگری دی ہے مگر ان کے پاس کچھ نہیں ہے (یعنی میں) کچھ کر سکتا تو اچھا ہو۔ میں نے فوراً پانچ سو کا منی آرڈر بھیجا بقول ضمیر صدیقی جگر صاحب کی غیرت نے گوارا نہیں کیا اور ہفتوں پوسٹ مین کو کل آنا کہہ کر بار بار لوٹاتے رہے آخر چھٹے یا ساتویں دن گھر ہی کے کسی فرد نے وصول کر لیا جگر مرحوم اتنے کمزور تھے

کہ سفر نہیں کر سکتے تھے غرض کہ اس مضمون کا مفصل خط میں نے تمھیں لکھا مگر رسید نہ آنے پر ایک کارڈ تم گونڈوی جگر، بوڈ گونڈہ کے پتا پر مزید لکھا اور خط کی رسید چاہی مگر تمھاری طرف سے مکمل خاموشی رہی، اس بار رجسٹری بھیج رہا ہوں شاید اس طرح مل جائے۔

میرے جیل جانے یا میرے احباب کے انتقال کر جانے والے ہم عمر گیت کاروں کے پسماندگان کے ساتھ کیا کیا سلوک کیے یا خود ترقی پسندوں کی آبیاری کس طرح کی جب جگر صاحب اور رشید احمد صدیقی صاحب کے ساتھ کے ارادت مندوں نے مجھے کس طرح مردود قرار دیا تھا اور جب ترقی پسندوں میں پہنچا تو ڈاکٹر علیم نے (جو بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے) ڈاکٹر ملک آنند کو ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی آل انڈیا کانفرنس بھیمڑی میں کس طرح لائے سارے ہندستان سے آئے ہوئے نمائندوں کے درمیان غزل کے خلاف یہ تجویز بہ اتفاق رائے پاس کروائی کہ غزل ہمارا ساتھ نہیں دے سکتی ہمارے شاعر اس میں وقت ضائع نہ کریں اس وقت تم میری تنہائی کا اندازہ کر سکتے ہو مگر اس اکیلے پن کے باوجود میں نے یہ اشعار فیض احمد فیض سے برسوں پہلے دیے پھر پگڑی برسوں بعد کی غزلوں پر فیض کے سر بندھی اور میرے ان اشعار کا اعتراف بہت دنوں تک نہیں کیا گیا۔ شعر یوں ہیں۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پانو کی زنجیر نہ دیکھ

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

دستِ صنم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سرِ بازار سہی

غزل کی ہزار سالہ روایت کو توڑتے ہوئے کہ درِ محبوب عاشق کی منزل ہے میں نے غزل کو زندگی کہا اور محبوب کو رفیق سفر، یہ اشعار محاوروں کی طرح لوگوں کی زبان پر فیض سے بہت پہلے جاری تھے مگر جگر صاحب کے تعلق سے یا کوئی اور بات دو تین سالوں سے جھٹک مار کر مجھے فیض پر اولیت دی جا رہی ہے مگر جگر صاحب کے تعلق سے یا کوئی اور بات ہو یا خود میرے معاملات میں نے کبھی اپنی پبلسٹی

نہیں کی مگر جادو کب تک سر چڑھ کر نہ بولتا۔ ہاتھ میں رعشہ نے پریشان کر رکھا ہے بس۔

دستخط مجروح

۳۰/۴/۹۴ بمبئی

مجروح صاحب کا مندرجہ بالا خط آپ نے ملاحظہ کیا جگر صاحب سے محبت عقیدت کے گہرے نقوش ملتے ہیں اچھا ہوا کہ انھوں نے یہ خط لکھ کر میرے دل میں پیدا ہونے والے شک و شبہہ کو رفع کر دیا جبکہ میرا ایک مضمون اسی سلسلے کا جو ۲۷ جنوری ۹۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اس میں میں نے جگر صاحب سے بے توجہی کا گلہ کیا تھا لیکن اس خط سے بہت سی معلومات فراہم ہوئیں اور مدتوں کے پڑے پردے درمیان سے اٹھ گئے۔ جگر صاحب کو ایام بیماری میں اپنے پاس بلا کر اپنے گھر میں علاج کرایا تسکین قریشی صاحب کی خفیہ فرمایش پر پانچ سو کا منی آرڈر بھیجا اس خط کے بعد جب میں نے جگر صاحب کے منہ بولے بھتیجے نیاز احمد سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ جگر صاحب کی بیماری کے دنوں میں گھر کی دیکھ ریکھ یہی کرتے تھے پھر یہ روپیا کس نے وصول کر لیا ممکن ہے محسن صاحب نے رکھ لیا ہو جس پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ مجھے اس کا بخوبی علم ہے جگر صاحب روپیا پانی کی طرح بہاتے تھے لیکن ایام بیماری میں وہ نوٹوں کو تکیہ میں چھپا کر رکھنے لگے تھے اور نیفہ میں بھی اپنے ہی گھر میں موصوف ایک نہیں دو دو بیماریوں کے شکار رہتے تھے محترمہ نسیم وکلن نے بھی گھر کا ماحول بہت بدل دیا تھا کیونکہ جگر صاحب کے چھوٹے بھائی (مرحوم) علی مظفر صاحب جن کی کئی اولادیں تھیں گونڈہ میں آکر جگر منزل میں جم گئے تھے جائداد اور رائلٹی کے سلسلے میں سرد جنگ تھی اور بعد رحلت جگر مرادآبادی علی مظفر صاحب کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ محترمہ نسیم کلن نے ساری جائداد اپنے بھتیجے نیاز احمد کے نام کرا لی تھی۔ یہ واقعہ جب یاد آتا ہے تو میرے دل میں احترام جگر متزلزل ہونے لگتا ہے

یوں ایام بیماری میں جگر صاحب کو چاہنے والوں نے ان کا خیال رکھا مسلسل منی آرڈر، تحفے تحائف آیا کرتے تھے۔ کرشن چندر حیرت گونڈوی حکیم عبدالباری تو باقاعدہ صبح و شام خیریت دریافت کرنے آتے تھے میں برابر حاضری دیا کرتا اور انجکشن لگایا کرتا، جگر صاحب عوض میں پانچ روپیا دیا کرتے تھے۔

مجروح صاحب خود کو جگر صاحب کا فرزند (روحانی) کہتے ہیں حالانکہ وہ طبعاً خوددار ہیں جلدی کسی رنگ یا محفل میں ڈھلنے والے نہیں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں جگر صاحب سے انھیں والہانہ محبت رہی بلکہ میں تو انھیں عاشق جگر کہا کرتا ہوں وہ میری اس بات پر مسکرا دیتے ہیں مگر جب PWA والوں کا ذکر چھڑتا ہے تو کچھ پریشان و رنجیدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک زمانہ میں اس تحریک نے غزل کے شاعروں کو گھسی پٹی مشین کا فالتو پرزہ سمجھ رکھا تھا یہ وبا جو مہلک بیماری کی طرح جتنی تیزی سے پھیلی اتنی ہی تیزی سے جاں بحق بھی ہو گئی، غزل سے محبت کرنے والے شاعروں پر نہ جب اس کا اثر تھا نہ آیندہ ہوگا۔

زلفِ لیلائے شب دراز رہے
آبروئے غزل نہ جائے کہیں

مجھے یہ بھی کہنے میں تامل نہیں کہ PWA والوں نے غزل کے شاعروں کو متاثر کیا تھا خود مجروح صاحب

کیونسٹ بنے پھرتے تھے مثال میں میں ان کا ایک مشہور شعر پیش کرتا ہوں ملاحظہ کریں۔

کس نے کہا پھر امن کا جھنڈا دھرتی پر لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر ہے چیلا مارے ساتھی جانے نہ پائے

ٹھیک کہا تھا مجاز ردولوی نے آدمی کو خراب ہوتے دیر نہیں لگتی لیکن اس کے بعد مجروح صاحب کا اندر والا آدمی جاگا اور انھیں محسوس کرایا کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے کیونکہ جو شخص تفسیر جلالین تفسیر بیضاوی کا مطالعہ کر چکا ہو ہزار گھٹ جائے پھر بھی کچھ نہ کچھ اس میں ایمان کی رمق تو باقی رہے گی لہٰذا وہ سنبھل گئے اور یوں کہا۔

زندگی کی قدر سیکھی شکریہ تیغ ستم
ہاں ہمیں تھے کل تلک جینے سے اکتائے ہوئے

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم سے وضع خرام
گری کلاہ تو ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

سیل رنگ رہے گا مگر اے کشت چمن
ضرب موسم تو پڑی بند بہارا تو کھلا

دیار شام نہیں منزل سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

آئیے میں آپ کو مجروح صاحب سے ایک انٹرویو کے ذریعے ملاتا ہوں۔ مجروح صاحب کے بارے میں جگر صاحب اور تسکین قریشی صاحب باتیں کیا کرتے تھے کہ انھیں دین سے بڑا شغف ہے آج موقع ملا تو میں نے پہلا یہی سوال کیا۔ وہ میرے اس سوال پر حیرت زدہ رہ گئے اور بولے ہاں یہ تو درست ہے مجھے تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی پڑھنے کا شوق تھا مگر اب وہ سب بہت پرانی باتیں ہوگئیں، سب بھول بھال گئے پہلے جیسی یاد داشت بھی نہیں رہی۔ خیر جانے دیں مگر یہ بتائیے آپ کا اور جگر صاحب کا یارانہ کیسے پروان چڑھا۔ تو مسکرائے اور ایک واقعہ بیان کیا۔ ایک لمبی داڑھی والے بزرگ اپنی غزل بغرض اصلاح جگر صاحب کو دکھانے لگے، جگر صاحب نے اپنے پمپ شوز اتارے ہاتھ میں لیے اور زوردار نعرہ مارا بھاگو رے اور سرپٹ بھاگ لیے۔ یہ سن کر ہم سب ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میں نے پھر پوچھا اپنی غزلوں پر اصلاح کس سے لی۔ تو بولے پہلے دو تین غزلیں مولانا آسی کو دکھائیں مگر ان سے کوئی خاص استفادہ علم شعر سے متعلق نہیں ہوا۔ علم شعر میں نے جگر صاحب سے یوں حاصل کیا وہ میری غزلوں کی مجھ ہی سے اصلاح کراتے تھے بس ٹوک دیا کرتے تھے اور میں درست کرلیتا تھا۔ ازراہ کرم فرمائیں آپ نے پہلا مشاعرہ کہاں پڑھا تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ میں نے شاعری ۱۹۴۰ء میں سلطانپور کے طرحی مشاعرے سے کی، پہلی غزل میں اہل شہر نے مجھے شاعر تسلیم کرلیا۔ مصرع تھا۔

ایسی نظروں سے نہ مجھ کو آپ دیکھا کیجیے

اس مصرع کی طرحی غزل پر مجھ سے یہ شعر سرزد ہوا۔

ہم ہیں کعبہ ہم ہیں بت خانہ ہمیں ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجیے

دوسرے قافیوں کی تحریری شکل کے باعث قافیہ "الف" سے لکھا اس سے قبل دوسرے شعرا کا کلام دوستوں میں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔

برخوردار میاں عندلیب شعر کہتے ہیں اور ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ شعر و شاعری سے دور ہیں۔ فلم ڈائرکشن سیکھی ہے۔ عنقریب ہی ان کی فلم شروع ہونے والی ہے۔ آپ فلموں میں گانے دے رہے ہیں؟ میں فلموں کی نغمہ نویسی ترک کر دوں تو یہ چنے کہاں سے کماؤں اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ کہاں سے بھروں؟ اپنے شعری انتخاب "غزل" کے بارے میں کچھ بتائیں اور تاریخ پیدائش؟

نوٹ کیجیے تاریخ پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء علاوہ اس کے غزل کے سلسلے میں نوٹ کریں۔ دوبئی والوں نے چند اضافوں کے ساتھ اس کا نام "مشعل جاں" رکھا ہے۔ مہاراشٹر کی پانچ یونیورسٹیوں نے لیا مہاراشٹر کالج کے کورس میں پڑھائی جاتی ہے۔ اسم گرامی بتانے کی زحمت کریں۔ اسرار الحسن خاں چوہان۔ آپ کا شجرۂ نسب پرتھوی راج چوہان سے ملتا ہے؟ جی ہاں والد بزرگوار کا نام۔ محمد حسین خاں چوہان، پولیس محکمہ میں ملازم تھے۔ میں ایک سوال اور کرنا چاہتا تھا مگر اس لیے ٹال گیا کہ اس بارے میں موصوف مجھے تفصیل سے خط تحریر کر چکے وہ خط آپ ضرور پڑھیں۔

بمبئی ۴ ستمبر ۱۹۵ء برخوردار میاں قمر دعائیں

ایک سال پہلے بڑا بیٹا (ارم) جسے میں نے ہر سیاہ سفید کا مالک بنا دیا تھا اس لیے کہ آمد و خرچ کا حساب

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مگر نادانستگی میں اور اس نے اپنی سادگی میں بمبئی اور دہلی کے عیاروں کے ہاتھ پڑ کر میرا سب کچھ کھو کر ایک بیوہ بہو ایک ۱۲ سال کا لڑکا ایک تین سال کی بیٹی چھوڑ کر اسی غم میں شرمندگی میں ایسا پڑا کہ ہمیشہ کے لیے منہ چھپا کر حیرت و حسرت میں ڈال گیا۔ پندرہ سولہ لاکھ روپیا نقد۔ ایک فلیٹ کوڑیوں کے مول، دو گاڑیاں ایک تو کسی دوست کے دینے کے بہلانے دوسری گیرج میں ہے اور اس طرح بیوی کے سارے زیورات سبھی کچھ ایک سیریل حکومت سے پاس کرانے کے چکر میں لوگوں کے سبز باغ دیکھتا رہا اور لٹتا رہا اور شکست پر شکست کی ندامت میں مجھ سے کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یہ مناظر مجھ پر اس کے انتقال کے بعد کھلے میری بیوی (بیگم فردوس صاحبہ) تعلیم یافتہ نہ ہونے کے سبب حماقت کی حد تک سادہ لوح ہیں انھوں نے بھی علم کے باوجود مجھ سے سب کچھ چھپایا سوائے اس معصوم کی موت کے۔

〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

والسّلام مجروح

ہی کیا تمام قارئین کرام پر بھی اس غم واندوہ میں ڈوبی تحریر کا اثر ہوگا۔ بحمد اللہ سب ہی آل اولاد والے ہیں۔ اللہ دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے اس حادثہ میں ہم مجروح صاحب کے برابر کے شریک ہیں۔

میں نے مجروح صاحب سے ایک سوال اور کیا جو فلم انڈسٹری کے بارے میں تھا تو انھوں نے ناراض ہو کر کہا اس سوال کے بارے میں تمھیں بذریعہ ڈاک اطلاع بھیج دی گئی ہے۔ لہٰذا انفرویو ختم۔ حالانکہ میرا یہ پروجیکٹ بہت لمبا چوڑا ہے اس وقت ان باتوں کا محل نہیں خوف طوالت تحریر بھی مدنظر ہے۔ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے مجروح صاحب کا ایک قیامت خیز مطلع پیش ہے پھر آگے۔

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جاناں نہ کہیں

اسی کے ساتھ ایک واقعہ یاد آیا جو شعر سے متعلق ہے اور وہ شعر یوں ہے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں جو ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

اس شعر کے بارے میں پروفیسر وارث کرمانی صاحب آج کل نئی دہلی بتاریخ یکم اپریل ۹۲ میں فرماتے ہیں۔

یہ شعر فنّی لحاظ سے کمزور ہے پہلا مصرع بعد میں کہے جانے سے بھرتی کا لگتا ہے مگر شاعر کے تخیل حسن نے مصرع کو ڈھانپ لیا ہے اور پڑھنے والے یا سننے والے کو اتنی مہلت نہیں دیتا کہ وہ موشگافی کرے اور اس نازک فرق کو محسوس کرے۔

دوسری جگہ حسین پیرایے میں قلم گھما کر چوٹ کرتے ہیں۔

مجروح کا سرمایۂ سخن مختصر ہے ورنہ ان کا کلام رشید احمد صدیقی کے باشاہان تغزل پر ایک اور اضافہ ہوتا اور وہ اردو کے عظیم غزل نگاروں میں تسلیم کیے جاتے۔

پروفیسر وارث کرمانی صاحب نے جس شعر کو کمزور اور فنّی لحاظ سے غلط بتانے کی کوشش کی ہے اسے موصوف روایتی پس منظر میں دیکھتے ہیں جبکہ یہاں ایسا ہے نہیں۔ محبوب یاد محبوب عاشق کی منزل ہوتا ہے۔ دوسرے مصرع میں جس راہ میں چراغ چراغ محبوب کے ہاتھ اور اس کی رفاقت نے جلائے ہیں وہ محبوب کے کوچے کی نہیں زندگی کی ہے اس طرح دیکھا جائے تو فنّی اعتبار سے برمحل نہیں لازمی ہے۔ میں نے اس بارے میں جب مجروح سے بات کی تو انھوں نے کہا تمھارا خیال درست ہے جہاں تک سرمایۂ سخن مختصر کی بات ہے تو عرض کروں اس سلسلے میں اصغر گونڈوی تو بہت ہی مختصر ہیں مگر ان کا قد اتنا اونچا ہے کہ اس دور کے ادب میں ان کے حوالے نہ دیے جائیں تو ہمارا ادب غیر معتبر مانا جائے گا لہٰذا مختصر کلام کی بحث لاحاصل ہے دیکھنا یہ ہے کہ مجروح کہہ کیا رہے ہیں۔ میں یہاں مثال کے طور پر عرض کروں کہ

پاکستان میں مجروح سلطانپوری کے مجموعۂ کلام کی اشاعت اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ جب تک نئی نسل کے سامنے مجروح کی مساعی پیش نظر نہ ہو ان کی قاعدانہ صلاحیتوں سے پوری طرح باخبر نہ ہو سکے گی۔ فیض احمد فیض کے خیال میں مجروح جدید اردو غزل کے

کے میر تقی میر ہیں۔

محمد علی صدیقی (کراچی)

رشید احمد صدیقی کے بادشاہان تغزل میں افسانے کی بات فرماتے ہیں وارث کرمانی صاحب اور دوسرا اردو انھیں میر تقی میر کا درجہ دینے کو تیار بیٹھی ہے لہٰذا مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ مجروح صاحب عظیم غزل نگار تھے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ مثال کے طور پر یہاں چند اشعار پیش کروں گا یہ ۵۴ کا شعر ہے۔

بچا لیا ہمیں طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

یہ شعر مشعل جاں کے ہیں۔

جو ٹھہرتی تو ذرا چلتے صبا کے ہمراہ
یوں بھی ہم روز کہاں سوئے چمن جاتے ہیں

دل سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی!
نگاہ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

زباں ہماری نہ سمجھا کوئی یہاں مجروح
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

قتیل شفائی صاحب نے ساری عمر غزل کی زلفیں سنوارنے میں صرف کر دی، غزل کا پرچم لہراتے رہے برخلاف اس کے فیض دھکا دے کر آگے نکل جانے کا مزاج رکھتے تھے مگر دھاگ کے وہی دو پات ان کے ادب کو P.W.A کے ذریعے فائدہ کیا ملا بلکہ دامن پر دھبے آ گئے اور بیچاری کمیونزم بھی جا رہی وہ بے دین بھی مرے اسی وجہ سے ایک عمر مارے مارے پھرے اب وہ اگر زندہ رہیں گے اپنی غزلوں کے بل بوتے پر یہاں ایک بیان ملاحظہ کریں جو برادر خورد سردار جعفری جناب علی رضا صاحب کا ہے

سردار بھائی کو (سردار جعفری صاحب) جتنا اور جیسا علم فیض کے کلام کے محاسن و معائب کا ہے اتنا اور ویسے کسی کو نہیں فیض کے اشعار کے ساتھ ان کو سیکڑوں شعرائے قدیم کے اردو فارسی، عربی غزل کے وہ اشعار بھی یاد ہیں جو ماخذ ہیں فیض کے اشعار کا اور جن کا تتبع انھوں نے کیا ہے ہر ہر معیب نظروں میں ہونے کے بعد بھی محاسنِ کلام کی وجہ سے وہ فیض کے معترف ہیں محبت بھی اتنی کہ پاس

خاطر دل کی بات کبھی زبان پر نہیں لائے کہ ان کا مقام بلند ہے۔

روح اصغر گونڈوی اور جگر کا مزاج رکھتے ہیں یہاں خارجیت میں بھی داخلیت کے عنصر نمایاں طور پر ہیں گے وہ اوروں کی طرح تصنع تکلف، بناوٹ کے عادی نہیں، صاف ستھری پُرخلوص اور ایماندارانہ باتیں کرتے ہیں نہ حریص نہ لالچی نہ ابن الوقت لہٰذا ان خصوصیات کو سمجھنے کے سبب زیادہ تر لوگ مخالف گروپ کے ملیں گے۔ یوں تو اختر سعید خاں بھوپال، پروفیسر وارث کرمانی اور قابل قدر تبصرہ نگار ناقدین اپنے در پر یہ ثابت کرنے کے درپے ہیں کہ مجروح سلطانپوری ترقی پسند گروپ کی ایک چیز ہیں یا شاعر ہیں یہ بات درست مگر اس طرح نہیں کچھ گوشے ہیں انھیں حل کیے بغیر معاملات میں الجھن پیدا کرنا ہے یوں تو جگر صاحب بھی ترقی پسندوں میں آجائیں گے کیونکہ مرحوم کا یہ شعر زبانہ زد ہے۔

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

جبکہ مجروح خود فرماتے ہیں ترقی پسندوں کی کانفرنس ۴۹ء میں تنہا غزل کا شاعر تھا یہی وجہ رہی ہوگی کہ بقول خود ان کے انھیں مردود قرار دیا گیا چٹائی سے الگ کر دیا گیا پھر بھی وہی ترقی پسندی کی ضد ان کے حوالے سے کم از کم یہ بات میرے پلے نہیں پڑتی۔ سچّی بات تو یوں ہے وہ ہمارے دور کے وہ قلم کار ہیں جو اٹھارھویں صدی کا بھی دل سے احترام کرتے ہیں ان کے یہاں نئے پیمانے میں کہنہ شراب کا بھرپور نشہ ہے۔ اپنے گرد و پیش انھیں جو کچھ نظر آیا، اپنے نئے ایجاد کردہ پیمانے میں ڈھال کر پیش کر دیا ان کی یہی انفرادیت انھیں دوسرے قلم کاروں کے مقابلہ میں نمایاں کیے ہے۔ جب ہم اس نکتہ کو نہیں پرکھ پائے تو ترقی پسندی یعنی وہی کیونسٹوں والا لیبل لگا دیتے ہیں اور بات بڑھی تو تجریدیت پر اتر آئیں گے۔

خود بت گر ہیں خود بت خانہ اس فکر اور اس نہج کے شاعر آج بھی میری نظروں میں ہیں یہ اور بات کہ انجانے میں انھوں نے خود کو خانوں میں بانٹ رکھا ہے مگر یہ اپنی جگہ طے ہے نہ وہ روایت پسند ہیں نہ ترقی پسند بلکہ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے رہے سہے اس کی عکاسی خوبصورت اور اپنی سوچ کے مطابق کی۔ جیسے خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر شہریار، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، منظر سلیم، شجاع خاور، ڈاکٹر اختر بستوی، حیرت گونڈوی، ظفر گورکھپوری، محمود کمال کنجوی اور اسی طرح کے متعدد قلم کار جن کا نام لیں تو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اسی صف کے امام ہیں بزرگ و قابل احترام شاعر مجروح سلطانپوری صاحب جن کا روز اوّل سے باغ اردو میں غزل گو کے حوالے سے بلند مقام ہے اور جب تک اردو ہے ان کی جملہ خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور میں رسوا سر بازار سہی

(بائکلہ کلہ جیل ۱۹۵۱ء بمبئی)

وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

جنت پہ نگہ تسنیم بہ لب انداز اس کے اے شیخ نہ پوچھو
میں جس سے محبت کرتا ہوں انساں ہے خیالی حور نہیں

اپنی بیگم صاحبہ کے لیے فرماتے ہیں کیونکہ مشعل جاں انھیں کے نام ہے۔

نوائے بہار گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں مہک تیرے پیرہن میں رہے

میں اس مضمون کو یہیں ختم کرتا ہوں مگر پروجیکٹ بہت لمبا ہے کیونکہ مجروح صاحب نے مجھے مالدار بنادیا ہے بہت اہم اہم خطوط ہیں اگر انھیں میں عیاں کردوں تو بہت سے چہرے بے نقاب ہوجائیں مگر مجھے وقت کا انتظار ہے۔ تجربہ درکار ہے انشاء اللہ کتاب میں سب آئے گا اس شعر کے ساتھ خدا حافظ۔

جو نکلنا ہو مری قسمت کا
تو ستارا کوئی روشن نکلے

فارم حسب قاعدہ

بابت "کتاب نما"، نئی دہلی ۲۵

۱۔ مقام اشاعت : جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام : سید وسیم کوثر ہندستانی، پتا: جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۴۔ پبلشر کا نام : 〃　〃　〃

۵۔ اڈیٹر کا نام : شاہد علی خاں　〃

مالکان کا نام اور پتے : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

چیرمین کا نام : ڈاکٹر سید ظہور قاسم اے۔ ۱۵۔ ڈیفنس کالونی نئی دہلی ۲۴

۱۔ ڈائرکٹر : نواب اقبال محمد خاں۔ کف پریڈ کولابہ۔ بمبئی ۵

۲ 〃 : سید مجتبیٰ حسین زیدی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۳ 〃 : ضیاء الحسن فاروقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۴ 〃 : بشیر الدین احمد، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

۵ 〃 : خواجہ محمد شاہد ڈی ۲/۳ قدوائی نگر (ویسٹ) نئی دہلی

۶ 〃 : صدیق الرحمٰن قدوائی۔ باغ شفیق جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایے کے ایک فیصد سے زیادہ کے حصے دار جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔ اسلامی یتیم خانہ کینڈی سی فیس بمبئی ۷

میں سید وسیم کوثر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۲ر مارچ ۱۹۹۶ء　　　دستخط
سید وسیم کوثر

ڈاکٹر ذکاءالدین شایاں
نزد اولڈ سٹی پوسٹ آفس
پکاریا۔ پیلی بھیت۔ یو، پی
۲۶۲۰۰۱

اسعد بدایونی کی شاعری

تقریبًا اٹھارہ انیس سال سے میرے ادبی اور قلمی تعلقات اسعد بدایونی سے قائم ہیں۔ وہ مجھ سے پندرہ سال عمر میں چھوٹے ہوں گے۔ جب بدایوں سے انھوں نے اپنے چند ادیب ساتھیوں کے ساتھ "روشن" کا "نئی غزل نمبر" شائع کیا، تو میرے مضمون کی اشاعت سے وہ میرے مزید قریب آئے۔ ان کی شخصیت میں ابتدا ہی سے مجھے دو عناصر نے خصوصی طور پر متاثر کیا۔ ایک تو مشتعل اور برہم نوجوانوں جیسا ذہن جو سماجی بدانصافیوں کے مصنوعی ڈھانچے کو تخریبی انداز ہی سے سہی، مگر تبدیل کرنے کا شدید خواہش مند ہے چنانچہ اسی ذہن کے تحت میرے اور ان کے درمیان کچھ اختلافات بھی رہے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے ادبی نام کے ساتھ "بدایونی" کی نسبت سے گریز کریں لیکن ماضی کے اقداری ورثے کی حرمت کے زیرِ اثر شاید انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو جمالیات اور محبت کی لطافتوں سے اس درجہ مزین ہے کہ اسعد کی خود پر طاری کی ہوئی جلالی کیفیات بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہ زاویہ اُن کے فن کو آفاقیت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

۱۹۷۷ء میں ان کا پہلا مجموعہ "دھوپ کی سرحد" شائع ہوا۔ تو اس کے مطالعے سے مجھے نوجوان اسعد بدایونی کی ذہنیت کے ابتدائی ادبی نقوش سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ اس وقت یہ شاعر ان مشتعل کم عمر نوجوانوں کی بھیڑ میں نظر آیا جو "بس میں جگہ نہ ملنے پر شیشے کی کھڑکیوں کو توڑ دینا چاہتا ہے" جو "شوکیس پر پتھر مارتا ہے"، جو "اندھیرا ہو جانے پر بجلی کے بلب کو چکنا چور کر دیتا ہے"۔ جو اپنے کمرے کی تمام کرسیوں کو باہر پھینک کر ننگے فرش پر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی شاعر کو معصوم بچے کا غلیل سے چڑیوں کو مار ڈالنا بھی گوارا نہیں۔ میرے خیال سے یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسعد بدایونی اپنے برہم ذہن کی تمام کرختگی سے دامن کش ہونے لگتے ہیں اور اپنے جسم اور اپنی روح کے ان جمالیاتی اور جذباتی رشتوں کو پکڑ لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو بعد میں ان کی غزل کی نرم تہہ داری کا سبب بنتے ہیں اور انھیں بہت جلد اینٹی غزل کے فیشن والے اسلوب سے ہٹا کر غزل کی متوازن راہ دکھانے لگتے ہیں۔ جمالیات اور جنس کے نہایت باریک موڑ پر اسعد نے بھی بہت سچائی کے ساتھ جوان جسمانی تقاضوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے اور احترام بھی۔ وہ سڑک سے گزرتے ہوئے "کنوارے بدن" کو نظر انداز نہیں کرتے اور "بدن" کے اشاروں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ اسی ماحولیاتی مظاہر کی ذہنی کشمکش کو اسعد بدایونی نے اپنی انانیت، حق و باطل کے معرکے، لہجے کی سنگینی، ماضی کی اقدار سے محبت، وطنی نسبت، قبیلوں کے

جماحے اور انجام کار جمالیاتی احساسات کی ہفت رنگی سے وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے، جو ان کی غزل میں نمایاں ہے۔ "زنجیر" کی آواز اور اس کی آہنی فضا کی علامت میں اسعد بدایونی خواہ کتنا ہی اپنی غزلیہ روش کو "آہن پوش" بنائیں لیکن اسی کے ساتھ کسی ریشمیں پاؤں کی "پازیب" کی جھنکار بھی ان کے جمالیاتی اور جنسی اور بدنی محسوسات کو برابر واضح کرتی رہتی ہے چنانچہ مجموعی حیثیت سے اسعد بدایونی کی غزل میں اپنی مرکبات کے ساتھ تنہائی کا احساس۔ شدید انانیت، نوجوانی کا جوش اور تغزل کی نیرنگیاں بھی پوری طرح شامل ہیں۔ اس سے ماورا خدائی ذات کا احساس اور کائنات کی دگرگوں اور لمحہ لمحہ بکھرتی سنورتی صورتیں بھی اسعد کی غزل کا نمایاں زاویہ بنی رہتی ہیں۔

اسعد بدایونی کا دوسرا شعری مجموعہ "خیمۂ خواب" ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ چھے سال کے بعد اسعد کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اردو غزل کا نیا رنگ و لہجہ نہ براہ راست اشتعال برداشت کرسکتا ہے اور نہ سیدھے سادے کھلے کھلے عمومی جذبات ــــ ان سے الگ غزل اپنے استعاراتی، اشاراتی اور علامتی ابعاد کی پروردہ ہے۔ چنانچہ "خیمۂ خواب" کی غزلیں اسعد بدایونی کے متوازن غزلیہ ذہن کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں زبان و بیان، مواد و موضوعات، ڈکشن اور ردیف و قوافی کی تازہ تراش خراش اور تشکیلی لہجوں کی تازہ کاری قدم قدم پر متوجہ کرتی ہے۔

تقسیم ہند سے پہلے اور اس کے بعد اور پھر آج تک تین نسلوں نے انسانیت کی قتل و غارت گری کے جو مناظر دیکھے اور سہے ہیں ان کے تمام پہلو ترقی پسند ادب، جدیدیت اور اب موجودہ جدید تر نسل کی غزلوں میں برابر فنی حیثیت سے ابھرے ہیں اور یقین و اوہام، حق و باطل، سماجی ناہمواریوں کی شدت، نفرت، تعصب، شہری جبر، دیہی معصومیت ــــ یہ سب کشمکش آج کی نئی غزلوں میں زیریں لہر کی شکل میں جاری ہے۔ اسعد بدایونی نے بھی "خیمۂ خواب" کی غزلوں میں جمالیاتی اور اکثر جگہ رمزیہ اور طنزیہ انداز سے ان کی جانب اشارے کیے ہیں ــ کربلائی فضا ان کی غزلوں میں شعوری یا لاشعوری طور پر در آئی ہے۔ خیمے، قبیلے، دشمن، فوج، ہول، خوف، رن، جنگ، بربریت، سپاہ مکر و ریا، تشنگی غریق دجلہ خوں، نیزوں پر نقد جاں، تیر کمان، شکار سحر کی رجز خوانی۔ یہ تمام منظرنامہ اسعد بدایونی کی غزل میں بہت نمایاں ہے۔ اسی کے دوش بدوش اسعد بدایونی کا غزلیہ ذہن ماضی کے اقدار کی اہمیت کو نشان زد کرتے ہوئے حال کے اعمال اور افراد کو پریشان اور بے وقعت بھی ثابت کرتا ہے۔ ان کے خیال میں ماضی کے لوگ "کوہ وقار" تھے اور آج کے مشینی عہد کے پروردہ پریشان اور بدحال ہیں۔ آج صحیفے دھواں دھواں ہیں اور عبارت کے لفظ و معنی کھوتے جا رہے ہیں۔ آج صداقت خمیدہ سر ہے بدی کا راج ہے اور شرافت اور نیکی پامال وغیرہ۔

اسعد بدایونی کی غزلوں میں جسم و جاں اور ہجر و وصل کا مرحلہ یا معرکہ بھی بہت اہم ہے جو ان کے ذہن کو عصر حاضر کی سنگینی سے الگ کر کے ان کیفیات کو سنبھال کرتا ہے جو شاعر کا جمالیاتی دائرہ ہے اس حصار میں اسعد بدایونی اپنی غزل کی لفظیات سے بھرپور کام لیتے ہیں۔ چشمۂ وصل۔ لمس گمشدہ کی لذت۔ گلاب صبر وغیرہ۔

اساطیری فضا، فطرت کی نیرنگیاں، ہجرت کے غم، بے گھر ہونا، بستی میں ہو کا عالم، انجانا خوف،

برکتوں والی لوح سے قلبی سکون حاصل کرنا۔ عشرتِ گذشتہ کی یادوں میں کھو جانا۔ فنا ہونے کا غم ہونیا کے تمام ہنگاموں کی رونقوں کا انسان سے جدا ہونا۔ تنہا چراغ کا آندھیوں سے لڑنا، اپنی انانیت اور اپنی شاعری کی انفرادیت کا احساس، وغیرہ اسعد کی غزلوں کا امتیازی نشان ہے۔ اسعد بدایونی نے فارسی تراکیب اور مرکبات کی انوکھی اور تازہ معنویت کی اشاراتی فضا سے بھی بہت کام لیا ہے۔ ان کی تمام شاعری ان کے جمالیاتی انعکاسات کے ساتھ کچھ ماضی کے جواں مردوں سے دور طلسماتی کرداروں کی روشنی میں اپنا ایسا سفر طے کرتی معلوم ہوتی ہے جو اسعد بدایونی کے غزلیہ فن کا مخصوص حصہ ہیں۔ اس غزل کے منظر نامے میں انسان، کائنات، فطرت، آفاقی محبت، زمانے کے دکھ، ہجر و وصل کے مناظر، خوف اور خوشی کے احساسات، سب کی دھوپ چھاؤں اسعد بدایونی کی غزل پر نکھری ہوئی ہے۔

اسعد بدایونی کے تیسرے شعری مجموعے "جنوں کنارا" کا مطالعہ ان کی گذشتہ غزلوں کی معنویت کو ما قبل خطوط پر مزید مستحکم کرتا ہے۔ ان میں کئی پہلو توجہ طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ اسلامیات کے تاریخی پس منظر کے ساتھ "رجزیہ" گھن گرج کا ماحول شاعر کے باطنی، دنیاوی خرافات سے کنارا کشی اور شکست خوردہ احساس کے باوجود انانیت کا مکمل عکاس معلوم ہوتا ہے۔

مولا۔ نماز شوق، رکوع و سجود و قیام، ہارا ہوا سپاہی، انا، شہری تصنع سے بیزاری، ہجوم سے خوف وغیرہ الفاظ میں یہ کیفیات جاری و ساری ہیں۔ اسعد بدایونی کا "میں"، اس مجموعے میں کچھ زیادہ ہی دیو پیکر ہو گیا ہے جیسے ساری کائنات اسی کے زیر نگیں آ گئی ہے۔

کمہار، چاک کی مٹی، تودہ، قبیلہ، جنگ، دشمنی، انسان کی مجادلانہ ذہنیت، شور و غل سے بیزاری، حق و کذب کی معرکہ آرائی، نادیدہ خوف، قلعہ، فصیل وغیرہ لفظیات میں اسعد کی غزل اپنا چہرہ سنوارتی ہے ان غزلوں کی موضوعی سنگینی کی پیٹھ میں اسعد کے جمالیاتی احساسات (جو ہجر و وصل سے منسلک رہنے پر ہمیشہ مجبور رہتے ہیں) کے وہ مناظر بہت وسیع ہیں جہاں شاعر نے غزل کی تشبیہی اور پیکری زبان میں اپنے خیالات کو مرتب کیا ہے۔ غزال، تجدِ خواب، جسم و جاں کے ذائقے اور لمساتی فضا، وصال کی ناؤ، بدن کے بحر کے بھنور، وصل کے چھینٹے، ہجر کا رہوار، دریائے انتظار کا پل۔ دوڑتی بھاگتی پُر فریب دنیا میں فطرت کے حسن کی طرف للچائی نظر سے دیکھنا۔ آج کے عہد میں انسان پر پیغمبرانہ وقت کا پڑنا۔ وصل و ہجر کے لمحاتِ مختصر کا شدید احساس۔ انسان کی فنا آمادہ زندگی۔ مولا اور ربِّ کریم سے خطاب۔

—— یہ سب شعری لفظیات اسعد کی غزل کے خصوصی زاویے ہیں جو قاری کو غزل کے تازہ ابعاد کی میناکاری سے متعارف کراتے ہیں۔

اسعد بدایونی کی غزلوں میں جذباتی روانی اور شعری زبان و آہنگ کی برجستگی نہ معلوم کیوں مجھے فانی بدایونی کی غزل سے قریب تر محسوس ہوتی رہی ہے۔ فانی کی یاسیت اور رنگینی کے ساتھ فانی کی غزلیہ زبان نے جیسے اسعد کے یہاں کوئی نئی انگڑائی لی ہے۔ ہو سکتا ہے میرا یہ خیال صحیح نہ ہو لیکن مجھے لگتا ایسا ہی ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کا نظمیہ لہجہ اور اقبال کے مجازی علائم کے نقوش بھی بار بار ابھرتے ہیں۔

"جنوں کنارا" میں اسعد بدایونی نے جو چند نظمیں شامل کی ہیں، وہ ان کے غزلیہ احساسات

کا بکھ مزید بکھرا بکھرا اور واضح روپ ہے، جو ہماری توجہ کو کچھ سروسامان مہیا کرتا ہے۔ اسعد کی ان غزلوں اور نظموں کے مطالعے کے بعد ان کے شاعری کے جو زاویے سامنے آتے ہیں ان میں آج کے عہد کے انسان کی وجودی مجبوریوں کی تمام شادمانیاں اور غمگینیاں سما گئی ہیں جس سے لمحاتی سطح پر فرد بیک وقت خوش و خرّم بھی ہے اور غمزدہ بھی ہے۔ زندگی کو گلے لگانے کے لیے بے قراری بھی ہے اور اس کی ناپائیداری سے ہراساں بھی۔

ڈاکٹر اعظم شاہ خاں
لیکچرار ان زولوجی
گورنمنٹ کالج ٹونک
راجستھان

خوابوں کی حقیقت

ہر آدمی کے ذہن میں اکثر اس طرح کے سوالات اٹھتے ہیں کہ انسان کو خواب کیوں دکھائی دیتے ہیں ان کے دیکھنے کی وجوہات کیا ہیں؟ اور کیا یہ کسی حقیقت سے جڑے ہوتے ہیں؟ وقتاً فوقتاً ان سوالات کے جوابات بھی دیے جاتے رہے ہیں اور ان پر تحقیقات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

خواب کی حقیقت جاننے سے پہلے نیند کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انسان پوری رات میں دو طرح کی نیند سوتا ہے "گہری نیند" جسے انگریزی میں "نون ریپڈ آئی مومینٹ سلیپ" (NREM SLEEP) کہتے ہیں اور دوسری ادھوری یا "ہلکی نیند" جسے "پیراڈوکسیکل سلیپ" Paradoxical Sleep کہتے ہیں اور میڈیکل اصطلاح میں "ریپڈ آئی مومینٹ سلیپ" (REM Sleep) کہا جاتا ہے۔ آدمی رات کے بیشتر حصے میں گہری نیند یا NREM SLEEP سوتا ہے۔ جس کے دوران آنکھوں میں کسی طرح کی حرکات نہیں ہوتیں۔ اس طرح کی نیند میں آدمی کو بہت آرام ملتا ہے۔ جب کہ دوسری طرح کی نیند یعنی "ریم سلیپ" (REM SLEEP) یا ہلکی نیند کے دوران آنکھوں میں تیز حرکات ہوتی رہتی ہیں اور سوتے وقت اسی نیند کے دوران آدمی اپنی پوزیشن بدل کر کروٹ وغیرہ لیتا ہے۔ شروع نیند کا ۸۰ سے ۱۰۰ منٹ کا وقفہ گہری نیند کا ہوتا ہے اس کے بعد گہری نیند کے بیچ بیچ میں پانچ سے تیس منٹ کے لیے ریم نیند یا ہلکی نیند کا دور آتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ پوری رات باری باری سے چار سے پانچ بار دہرایا جاتا ہے۔

خواب ان دونوں قسم کی نیندوں کے دوران دکھائی دیتے ہیں لیکن گہری نیند کے دوران دکھائی دینے والے خواب چونکہ یاد نہیں رہتے اس لیے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ گہری نیند کے دوران خواب دکھائی نہیں دیتے جب کہ "ریم سلیپ" یا "ہلکی نیند" کے دوران دکھائی دینے والے خواب اکثر یاد رہ جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس دوران انسان کے دماغ کی حالت بیداری کی حالت جیسی ہوتی ہے۔

خوابوں کی حقیقت کے بارے میں سب سے پہلے فرائیڈ FREVD نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق انسان کو جو خواب دکھائی دیتے ہیں وہ بے معنی یا بے ضرورت نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔ اس نے خوابوں کو خواہشات کی تکمیل کا ایک ذریعہ بتایا۔ فرائیڈ کے نظریے کے مطابق خواب نیند کی حالت میں ذہن کا لاشعوری عمل ہے جس کے ذریعے

دبی ہوئی یا دبائی ہوئی لاشعوری خواہشات کا اظہار ہوتا ہے۔ جو مخفی صورتوں میں خواب بن کر دکھائی دیتی ہیں۔ فرائیڈ کے مطابق بیداری کی حالت میں لاشعور اور شعور کے درمیان اخلاقی احساسات و جذبات و احتساب کا کام کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے غیر تہذیب، غیر سماجی اور برے خیالات و خواہشات ہمارے ذہن کے شعوری سطح پر نہیں آپاتے اور ذہن کے کسی حصے میں دبے رہ جاتے ہیں لیکن یہ دبے ہوئے خیالات لاشعوری سطح پر زیادہ مضبوط شکل اختیار کرکے شعوری سطح پر آنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ اپنی شکل بدل کر خواب کی شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یعنی خوابوں کے ذریعہ انسان کی اپنی ہی ادھوری خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اکثر یہ خواہشات خواب میں اپنی حقیقی شکل کے بجائے کوئی بدلی ہوئی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان خواب دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ اس کی خواہشات تھیں یا محض ایک خواب۔

چوں کہ ہر خواب کے پیچھے کوئی نہ کوئی خواہش چھپی رہتی ہے۔ اس لیے اگر خواب صحیح طرح یاد رہے اور اس کا ٹھیک طریقے سے تجزیہ کیا جائے تو انسان کے خیالات یا دبی ہوئی خواہشات کا صحیح طور پر پتا لگایا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر فرائیڈ نے خواب کے دو پہلو بتلائے۔ "مواد آشکار" Manifest Content اور "مواد مخفی" (Latent Content)

خواب میں جو کچھ دکھائی دیتا ہے اس کو فرائیڈ نے "مواد آشکار" Manifest Content کا نام دیا۔ خواب دیکھنے والا خود یا خواب کی تعبیر بتانے والا "مواد آشکار" کی صحیح تشریح سے ہی لاشعوری خواہشات کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس تشریح سے خواب کی جو تعبیر سامنے آتی ہے اس کو "مواد مخفی" Latent Content کہتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ وہ شہر کی ایک سڑک پر کھڑا ہے جہاں جنگ ہو رہی ہے۔ اس جنگ کے دوران گولیوں کی بوچھار سے عورتیں اڑ اڑ کر آسمان کی طرف جا رہی ہیں اس طرح خواب میں جو کچھ اس نے دیکھا اسے فرائیڈ نے "مواد آشکارا" کا نام دیا۔ اس خواب کی تشریح کرنے پر پتا چلا کہ اس آدمی کے تعلقات اپنی بیوی سے اچھے نہیں تھے اور وہ اس سے نفرت کرتا تھا لیکن وہ سرعام اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں اس آدمی کی اپنی بیوی کے لیے دبی ہوئی نفرت اس خواب کا باعث بنی۔ اس نفرت یا خواب کی وجہ کو فرائیڈ نے "مواد مخفی" کا نام دیا۔

فرائیڈ کے مطابق انسان کے لاشعور میں دبی خواہشات یا احساسات مخفی شکل اختیار کرکے پانچ طریقوں سے خواب کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ پہلے طریقے میں "مواد مخفی" کے مختلف اجزا، "مواد آشکار" کے ایک ہی سانچے کے ذریعے واضح ہو جاتے ہیں یعنی ایک ہی خواب میں مختلف قسم کے عوامل ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں جسے فرائیڈ نے "تکثیف کا طریقہ" Condensation بتایا۔ مثلاً ایک عورت نے خواب میں ایک لمبی چوڑی جسامت والے آدمی کو دیکھا جس کی شباہت اس کے والد سے ملتی تھی۔ جس نے اسے بچپن سے جوانی تک سخت پابندیوں میں رکھا تھا۔ اس آدمی کا چہرہ اس سپاہی سے ملتا جلتا تھا جس سے وہ عورت بچپن سے ڈرتی تھی اور اس کی آنکھیں اس کی ساس کی آنکھوں سے ملتی جلتی تھیں۔ جس سے وہ نفرت کرتی تھی۔ اس طرح کے خواب

جن میں بہت سے احساسات ایک جگہ مل جائیں اس طریقے کو فرائیڈ نے تکثیف Condensation کا طریقہ بتایا؟

دوسرا طریقہ "بے محلی" - (Displacement) کا ہے جس میں آدمی کی لاشعوری خواہشات کسی متعلقہ انسان سے یا حادثے سے منسوب نہ ہو کر کسی دوسری شکل میں خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے ایک عورت نے خواب میں دیکھا کہ ایک لال گھوڑا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ خواب کی تشریح سے پتا چلا کہ وہ عورت جرمن تھی اور اس سے جو آدمی محبت کرتا تھا اس کا نام "فریڈ" تھا۔ جس کے لال داڑھی تھی۔ جرمن میں گھوڑے کو "فریڈ" کہتے ہیں۔ اس لیے اس کو خواب میں یہ دکھائی دیا کہ ایک لال گھوڑا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

تیسرا طریقہ علامت کاری Symbolization کا ہے۔ جس کے ذریعے لاشعوری خواہشات مختلف قسم کی علامات کی شکل اختیار کر کے خواب میں دکھائی دیتی ہیں۔ چوتھے طریقے میں انسان کے لاشعور میں چھپی خواہشات خواب میں اصل شکل میں نہ آکر تمثیلی شکل میں دکھائی دیتی ہیں اور جس طرح ڈرامے کے منظر یکے بعد دیگرے سلسلے وار بدلتے رہتے ہیں اسی طرح خواب میں دکھائی دینے والا مواد بھی سلسلے وار بدلتا دکھائی دیتا ہے۔ خوابوں کے اس طرح دکھائی دینے کے طریقے کو ڈرامائی انداز Dramatization کہتے ہیں۔ خواب کی پانچویں قسم کو "ثانوی تفصیل" Secondary Elaboration کہتے ہیں۔ خواب میں دکھائی دینے والے مناظر یا باتیں ویسے تو بے معنی لگتی ہیں۔ لیکن انسان اپنے جاگنے پر خواب کو بامعنی بنا کر پیش کرتا ہے۔

آج کی جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بھی خوابوں کے بارے میں فرائیڈ کے نظریات صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ جدید سائنسی نظریہ کے مطابق جاگتی حالت میں ہم جو کچھ سوچتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں یا جن حالات میں ہم رہتے ہیں ان کی چھاپ ہمارے دماغ پر پڑتی ہے اور وہ باتیں ہمارے ذہن کے لاشعور میں جا کر جمع ہو جاتی ہیں۔ نیند کی حالت میں وہ باتیں یا واقعات اکثر اپنا انداز بدل کر ہمیں خواب کی شکل میں دکھائی دیتی ہیں۔ خواب کے دوران جس حالت یا ماحول میں ہم سو رہے ہیں یا جیسا ہم محسوس کر رہے ہیں وہ بھی ہمارے خواب کا حصہ بن جاتا ہے۔

دراصل خواب انسان کی دبی ہوئی خواہشات اور احساسات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے مختلف جنس اور عمر کے لوگوں کے خواب بھی مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ عورتوں کے دیکھنے والے خواب مردوں کے خوابوں سے بالکل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ملٹن کریمر Dr. Milton Kramer کے مطابق اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے جسمانی نظام، ان کی جسمانی بناوٹ اور اس کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے خیالات کا مختلف ہونا اور سماج میں ان کی الگ الگ حیثیت ہونا بھی اس کے اسباب ہیں۔ مردوں کے خوابوں میں اس طرح کے واقعات اکثر زیادہ ہوتے ہیں جن میں وہ خصوصی طور پر اجنبی لوگوں کے ساتھ اجنبی جگہوں پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ عورتوں کے خوابوں میں ان کو اکثر اپنے گھر یا آس پاس یا جانی پہچانی جگہیں دکھائی دیتی ہیں جن میں گھر کے افراد، ملنے والے یا رشتے دار دکھائی دیتے ہیں۔ ان

کے خواب اکثر حساس معاملات سے جڑے ہوتے ہیں۔ گھر گرہستی سے متعلقہ عورتوں کو اکثر اپنے بچوں سے متعلق اور ملازم پیشہ عورتوں کو اپنے افسر یا ساتھیوں سے متعلق خواب دکھائی دیتے ہیں۔ حاملہ عورتوں کو اپنے ہونے والے بچے سے متعلق خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اسی دوران حاملہ عورت کے خاوند کو اس طرح کے خواب دکھائی دیتے ہیں جیسے اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرنے لگی ہو۔ وہ اپنی بیوی میں بیگانگی اور اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے اکثر خواب میں وہ اپنی بیوی پر ناراض ہوتا یا غصّہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جن کو اپنے عزائم پر اعتماد نہیں ہوتا یا جو لوگ پست ہمّت ہوتے ہیں وہ اکثر خوابوں میں بھی اپنے آپ کو مختلف قسم کے مقابلوں میں پچھڑا ہوا پاتے ہیں۔ اس کے برعکس باہمت اور پُرعزم لوگوں کے خواب اس طرح کے ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے فتح کے لطف سے شرابور پاتے ہیں۔

عمر کے مطابق بھی خوابوں کی اقسام تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کیوں کہ ہر عمر کے لوگوں کی خواہشات، دماغی کیفیات اور عمر سے جڑے تقاضے الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً چھوٹے بچے جن کو اکثر ہر چیز سے ڈرایا جاتا ہے اور جن کے دماغ پر پٹائی ہونے کا ڈر لگا رہتا ہے ان کے خواب اکثر ڈراؤنے قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کو عجیب عجیب ہیئت کے ڈراؤنے جانور دکھائی دیتے ہیں جو اکثر ان پر حملہ کرتے ہوئے یا ان کا پیچھا کرتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح سنِ بلوغ سے لے کر بھرپور جوانی کی عمر میں دکھائی دینے والے خواب اکثر جنسیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ خوابوں سے متعلق ماہر ڈاکٹر ملٹن کریمر (Dr. Milton Kramer) کے مطابق ۲۱ سے ۴۴ سال کے درمیان کی عمر والوں کو خوابوں میں وہ اکثر غلط اور صحیح کا چناؤ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں کہ اس عمر میں وہ حقیقی طور پر بھی اپنی زندگی کی راہوں کو متعین کرنے اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کی جدوجہد میں لگے ہوتے ہیں خواہ وہ پیشے کا معاملہ ہو، سماجی حیثیت کا یا ازدواجی زندگی کا۔ اسی طرح ۴۵ سے ۴۹ سال کی عمر کے لوگوں کو جو خواب دکھائی دیتے ہیں ان میں کسی سے مقابلے کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہے کہ اس عمر تک اکثر وہ اپنی خواہشات یا عزائم کو یا تو پا چکے ہوتے ہیں یا اب تک وہ حالات سے سمجھوتہ کر چکے ہوتے ہیں۔ اس عمر میں حقیقی زندگی میں بھی مقابلہ آرائی کا جذبہ بہت کم پایا جاتا ہے ۶۵ سال کی عمر کے بعد چونکہ جسم ناتواں ہو چکا ہوتا ہے، ذرائع محدود ہو جاتے ہیں، سماج میں انسان کی زیادہ پوچھ نہیں رہتی، جس کا اس عمر کے لوگوں کو خاصا احساس ہوتا ہے اس لیے ۶۵ سال کی عمر کے بعد دکھائی دینے والے خواب اس طرح کے ہوتے ہیں جن میں وہ لوگ اپنے آپ کو کسی نہ کسی وجہ سے مجبور پاتے ہیں۔ اکثر ان کے خوابوں میں کچھ کھو دینے کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔

جنس اور عمر کے علاوہ روزمرّہ کی زندگی میں انسان کا رویہ اور طریقۂ کار بھی خوابوں پر حاوی ہوتا ہے۔ پنسلوانیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایرن بیک کے مطابق اکثر غصیلے مزاج کے افراد

خواب میں بھی اپنے آپ کو کسی پر غصّہ کرتے ہوئے یا ظلم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جبکہ رحم دل لوگ کسی زخمی جانور یا مجبور انسان کی مدد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ افسردہ Depressed قسم کے لوگ خوابوں میں بھی اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کے ذریعے الگ تھلگ پاتے ہیں۔ جن کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ کمزور لوگ یا خطرناک امراض میں مبتلا لوگ اکثر ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں۔ اسی طرح دباؤں یا حادثات کا شکار لوگ اکثر ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو کسی مصیبت یا آفت سے گھرا ہوا پاتے ہیں۔ اسی طرح تخلیقی مزاج کے افراد اکثر خوابوں کے ذریعے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مصنف، فن کار یا سائنس داں سونے سے پہلے اپنے تحت الشعور (Sub-Conscious) سے کہہ کر سوتا ہے کہ وہ اس کی الجھی ہوئی گتھی سلجھانے میں مدد کرے۔

لاکھوں لوگوں میں سے کچھ افراد کو کبھی کبھی اس طرح کے خواب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے ذریعے ان کو مستقبل میں رونما ہونے والی باتوں کا مشاہدہ (Premonitions) ہو جاتا ہے امریکا کے پہلے صدر ابراہیم لنکن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کو اپنے انتقال کے پہلے ایک خواب دکھائی دیا تھا کہ پریسیڈنٹ ہاؤس میں لوگ رو رہے ہیں اور آہ وزاری کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر جب وہ سیڑھیاں اتر کر ایک کمرے میں پہنچے تو وہاں ان کو تابوت میں رکھی ایک لاش دکھائی دی۔ جس کو دیکھ کر انھوں نے پوچھا یہ کون مرگیا ہے؟ تو پاس میں کھڑے فوجی افسر نے جواب دیا کہ صدر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔ اس بات کو محض اتفاق کہیں یا خواب کی تعبیر کہ اس خواب کے ایک ہفتے بعد ابراہیم لنکن کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

آج کے سائنسی دور میں خواب کی حقیقت پر جس قدر ریسرچ کی گئی اس سے تو یہی پتا چلتا ہے کہ انسانی ذہن کے لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشات یا اس کے احساسات کسی نہ کسی صورت میں نیند کی حالت میں اس کے سامنے آتے ہیں۔ جب وہ گہری نیند میں نظر آتے ہیں تو یاد نہیں رہتے۔ لیکن جب ادھوری یا ہلکی نیند میں دکھائی دیتے ہیں تو انسان کے ذہن پر خواب کے واقعات اس کے جاگنے کی صورت میں بھی چھائے رہتے ہیں لیکن ہم پر سائنسی تحقیقات سے پہلے کے نظریات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ دنیا کی ہر ترقی یافتہ کلاسیکی زبان کے ادب میں خواب کے موضوع پر مستقل کتابیں ملتی ہیں۔ سنسکرت میں "سوپن سجری" نام سے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی گئی ہے جس کا ترجمہ "جواہر تعبیر" کے نام سے اردو زبان میں منشی دیوی پرشاد بشاش نے کیا تھا جو رضوی پریس دہلی میں ۱۸۸۲ء میں چھپا تھا۔ اسی طرح عربی زبان میں "علم رویا" پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں اور فارسی میں بھی ایسی کتابیں موجود ہیں۔ اردو میں خوابوں کی تعبیر پر تعبیر نامے لکھے گئے ہیں۔ مگر ان میں خوابوں کے بارے میں قیاسی نظریات دکھائی دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں مذہبی عقائد بھی نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید سے بھی تعبیر لی جاتی ہے۔ حافظ شیرازی کے دیوان سے بھی خواب کی تعبیر نکالی جاتی ہے اور اکثر وہ تعبیریں صحیح بھی ثابت ہوتی ہیں۔ ہمیں ان عقائد اور نظریات سے اختلاف نہیں لیکن علم خواب سے متعلق اردو کی کتابوں میں عام طور پر سائنٹفک نظریات کا فقدان نظر آتا ہے۔ اسی خیال سے خواب کی حقیقت کے بارے میں مذکورہ بالا سائنٹفک نظریات پیش کیے گئے ہیں۔

آصف فرخی

ایک شادی شہر میں

"کریں تو کیا کریں؟ ہماری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

ایک بے تاب آواز میرے کمرے کے باہر گونج رہی تھی۔ میں اندر رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ بڑی مشکل میں ہیں اچھے خالو بیچارے، میں نے لیٹے لیٹے اندازہ لگا لیا تھا کہ باہر کون بول رہا ہے اور اس کا مسئلہ کیا ہے۔

ہوگی وہی شادی کی بات، مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں بھلا اس میں کیا کرسکتا ہوں، میں اپنے طور فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

"کوئی ان کو دیکھے۔ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔ سر پر قیامت آکر گزر جائے، انھیں خبر نہ ہوگی ..... دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے، ان کا دس دس بجے تک سونا نہیں چھوٹتا۔" اچھے خالو کی آواز میں مشکل کے بجائے شکایت بھری ہوئی تھی۔

"اے ہے، چین سے سونا کہاں ملتا ہے غریب کو۔" اماں جان کی آواز دالان سے میرے دفاع میں آئی۔ "وہ تو کہو آج کل کالج میں چھٹی ہوگئی ہے۔ ہنگاموں کی وجہ سے تو یہ گھر میں دکھائی دے بھی رہے ہیں....."

لے دے کر پھر تان اسی پر ٹوٹی کہ میں کیا کرتا ہوں اور کیا نہیں، میں نے کوفت کے ساتھ سوچا۔ "میں سو نہیں رہا۔" میں نے اندر سے آواز لگا کر انھیں مطلع کیا۔ "سب خبر ہے مجھے۔ آپ لوگ میرے بارے میں یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ سویا مرا برابر۔"

"اے ہے۔ خدا سے ڈرو۔ شہر میں مارا ماری ہو رہی ہے اور تم صبح صبح ایسی بدفالیں منہ سے نکال رہے ہو....." اماں جان کا رُخ میری جانب ہوگیا۔ "کچھ یہی خیال کرلو کہ شادی کا گھر ہے۔"

ان کی اتنی شہ پاکر اچھے خالو چل نکلے۔ "میاں سو نہیں رہے تو پلنگ پر اینڈ تو رہے ہو۔ ہمارے لیے فرق کیا پڑا؟ اب اٹھ بھی جاؤ۔ کام دھام میں ہاتھ بٹانے کے تو تم روادار ہوتے نہیں۔ ہاتھ پیروں سے مدد نہیں کرتے تو زبان ہلا کر ہمیں مشورہ ہی دے دو۔ کچھ تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کریں۔"

مدد کی درخواست سے اب میں روگردانی نہیں کرسکتا تھا۔ "آتا ہوں۔" میں نے پکار کر کہا، اور ہاتھ منہ دھوکر اچھے خالو کے پاس جا بیٹھا۔ صبح کا اخبار چائے کی پیالی سے دبا ہوا تھا۔

پیالی خالی تھی۔ اخبار بھرا ہوا تھا۔

"بیٹا، آدھی آستین کا سوئٹر ہی پہن لو۔ کل رات سے خاصی سردی ہو رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہوتی، سال بھی ختم ہونے کو ہے۔ اور تم ایسے ہی بند کمرے اور رضائی میں سے اٹھ آئے۔۔۔۔"

اماں جان نے شاید غیر اختیاری طور پر وہی انداز اختیار کر لیا جواب سے تھوڑی دیر پہلے اچھے خالو کا تھا۔

"ادھر دھوپ کے رُخ پر کرسی کر لو۔۔۔" اچھے خالو نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا جس کے آدھے حصّے پر دھوپ آرہی تھی۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، یہی کرنا ہوگا۔ میں نے اپنے ننداسے اور آلکسی مارے بدن کو کرسی پر گرادیا اور اچھے خالو کی طرف دیکھنے لگا کہ اب یہ شادی کا مسئلہ پھر اٹھائیں گے۔

شادی۔۔۔۔ شادی صبح ہوتے ہی گھر میں گھنٹی سی بجنے لگتی تھی۔

"یہیں تو ہول اٹھنے لگا ہے۔ دن تاریخ سر پر چلے آرہے ہیں اور گھر میں شادی کا کوئی ہنگامہ نہیں۔ ہو بھی کیسے، حالات میں اس قدر بے یقینی چلی آرہی ہے۔۔۔۔" اچھے خالو نے پھر شروع سے قصّہ چھیڑنے کی نیت باندھی۔

ان کو یہیں ٹوک دینا ضروری ہے، میں نے دل میں سوچا۔

"وہ تو چچا غالب بھی فرما گئے ہیں کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس بس، دوسرا مصرعہ نہ پڑھ دینا۔ پھر وہی بدشگونی کی باتیں؟ میاں کس سے لڑ کر بیٹھے ہو؟" اچھے خالو کی توجہ پھر بٹ گئی۔

دھوپ کرسی پر سرکتی رہی۔ ہم خاموش بیٹھے رہے۔

"اب تو کارڈ بھی چھپ گئے اور ادھر شہر کا یہ حال ہے" اچھے خالو کو پھر یاد آیا۔ "سوچ سوچ کر ہمارا تو دماغ ماؤف ہوا جا رہا ہے۔ تقریب کریں تو کس دل سے کریں اور ملتوی کر دیں تو پھر سارے انتظامات کا کیا ہوگا۔ ملتوی کرتے ہیں تو اتنا سارا روپیہ جو ایڈوانس دیا ہے، ڈوب جائے گا۔ اور طے شدہ پروگرام پر چلتے ہیں تو اس کی کیا گارنٹی ہے کہ بارات اور دولھا، شادی گھر پہنچ پاتے ہیں کہ نہیں؟"

بارات کے لفظ پر اس دولھا کی اخباری تصویر میری نگاہوں میں پھر گئی جو فائرنگ کی زد میں آکر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس تصویر کو ذہن سے جھٹکنا ہوگا، میں نے اپنے آپ کو باور کرایا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ ہم آپ یہ طے کر لیں کہ تقریب کب اور کہاں ہوگی، کھانے اور کپڑے کی تفصیلات اس وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں جب چھوٹی خالہ بھی یہاں ہوں" میں نے تیزی سے کہا، جیسے اپنے ہی ذہن میں ہونے والی بوچھار سے بچ رہا ہوں۔

"چلو تم نے سیدھے سبھاؤ کی بات تو کی" اچھے خالو میری اس اچانک توجہ پر اچنبھے میں آگئے "یہ تمھیں خیال تو آیا کہ لڑکی والے ہو، بہن بیاہنی ہے" انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا چہرہ سرخ ہوتے ہوئے محسوس کیا، جیسے انھوں نے بہن کی گالی دی ہو جس کا میں جواب نہیں دے سکتا۔

"جگہ تو پکی ہے ناں؟" میں نے اپنے آپ کو نارمل اور پُرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اب کسی بھی بات کو پکی کہاں کہہ سکتے ہیں؟ ایڈوانس دے کر ہم نے بکنگ تو اسی وقت کروادی تھی...." وہ کہنے لگے۔

"آپ نے آخری فیصلہ کون سے میرج گارڈن کا کیا تھا، سبزہ زار کہ سدابہار؟" میں چاہتا تھا کہ ایک ایک تفصیل ٹھیک ہو۔

"اے میاں، کس زمانے کی بات کر رہے ہو، کچھ بسنت کی خبر بھی ہے؟" اچھے خالو مجھ پر برس پڑنے کو تھے "اب تو کارڈ بھی چھپ گئے اور تم اسی سوال پر اٹکے ہوئے ہو۔ یہ فیصلہ تو اسی وقت ہوگیا تھا کہ ان کے لان میں گنجایش تو بہت ہے مگر بلدیہ والوں نے تالے بندی کر دی تھی، اس کے بعد سے ان کا بھروسا نہیں رہا۔ دولھا والوں نے کہلوادیا تھا کہ یہ ادھر ادھر شادی ہال جو بن گئے ہیں وہ ان کے اسٹیٹس کے نہیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل اتنی جلدی کوئی مل نہیں سکتا۔ اس لیے اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے،" انھوں نے یاد دلایا تو مجھے یاد آگیا۔ "دیکھیے، اصل چیز تو نکاح ہے۔ باقی سب رسمیں فروعی ہیں۔ ایسا کریں کہ صبح کے وقت چند بزرگوں کی موجودگی میں گھر پر نکاح رکھ لیں۔ بعد میں رسپشن ہوتا رہے گا۔"

اس کا ردِعمل کس طور ہوگا، مجھے اس کا اندازہ لگالینا چاہیے تھا۔ بہتر تو یہی تھا کہ میں چُپ ہی رہتا۔

"بس تمھیں تو ساری تقریبات ہی فضول لگتی ہیں۔" اس سے پہلے کہ اچھے خالو کچھ کہتے، اماں جان بول پڑیں۔ "دنیا تمھارے قاعدے پر تو چلتی نہیں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے! اور پھر ہم اپنے ارمان کیسے نکالیں گے؟ خدا نہ کرے، کوئی بیوہ کی شادی تو ہے نہیں۔"

"تو بس پھر آپ کیے جائیے دنیا بھر کے لَلّے تلّے....." مجھے غصہ آنے لگا۔ "آپ کو حالات کی سنگینی کا ذرا سا بھی اندازہ ہے؟ آج کا جو تقاضا ہے اس کے حساب سے چلیے....!"

"ایلو، صاحبزادے اماں کو پڑھانے چلے ہیں۔ اب شادی بیاہ پر بھی رسمیں نہ ہوں تو ایسی سونی شادی کس کام کی؟" اماں جان میری بات سے بالکل متفق نہیں تھیں۔

ان کے جواب پر میں بھی جھلا گیا۔ "آپ بھی تو شادی بیاہ کو ٹی وی کا قسط وار ڈراما سمجھنے لگی ہیں۔ آپ نے اخبار میں پڑھا تھا کہ مہمانوں سے بھرا شادی ہال لوٹ لیا گیا؟ کوئی ایک دفعہ کی بات تو ہے نہیں۔ آئے دن یہی خبریں سننے میں آتی ہیں۔ اور پھر بارات تو دونوں ہی کے لیے ٹارگٹ ہے ڈاکو بھی اور دہشت گرد بھی۔"

شاید میرا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا تھا۔ اماں جان کچھ نہ بولیں لیکن اچھے خالو نے مجھے اطمینان

دلانا چاہا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ بُری گھڑی بتا کر نہیں آتی۔ ان دنوں تو پھر بھی ذرا اطمینان ہے۔ حکومت کے اور ادھر والوں کے مذاکرات چل رہے ہیں۔ خدا کرے یہ بیل منڈھے چڑھ جائے اور ان دونوں میں آپس میں بات بن جائے۔ ہم تو اس آسرے میں بیٹھے ہیں۔ پھر بھی میں نے سیکورٹی کا بندوبست کیا ہے۔ دوگن مین شادی ہال کے دروازے پر رہیں گے اور دوگن مین دلھن کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلیں گے۔ تمھاری خالہ کہہ رہی تھیں کہ جس گاڑی میں دلھن کی رخصتی ہو، وہ بھی نہ سجواؤ....."

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس طرح کی سجاوٹ اور یہ سب ٹیم ٹماق نہ کریں...." ان کی بات سے جیسے میری دلیل کو وزن مل گیا۔

اماں جان نے ماننے سے انکار کر دیا۔" اب سجاوٹ بھی نہ ہو اور گھر پر رونق بھی نہ ہو تو کیا نگوڑ ماری چوروں کی بارات ہے؟"

"آپ کو دھوم دھڑکے کے علاوہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں ہے۔" میرے لہجے میں بھی ناگواری آگئی۔" اصل میں آپ لوگ بس روزانہ اخبار پڑھ کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں کہ آج شہر میں یہ واقعات ہوئے۔ ہونہہ، کراچی کے واقعات....." اچھے خالو نے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے پانی کی طرف دیکھا اور چپ ہو گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر بولنے لگا۔" اُفوہ، یہ بھی روز کی بحث بن گئی ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ لوگوں کو ٹیلی فون پر اطلاع دے دیں اور چھ بجے کا وقت کر دیں...."

اماں جان تنک کر بولیں" اے یہ شادی ہے یا نگوڑ ماری ٹی پارٹی؟"

اچھے خالو نے دھیمے سے کہا" چائے کا ذرا معقول انتظام کر لیں تو کیسا رہے؟"

اماں جان نے فوراً جواب دیا" رہنے دو وہ پھر بھی چلئے۔ اعظم میاں کی شادی کا بھول گئے؟ ایوب خاں والا مارشل لا لگا تھا اور منادی تھی کہ شادی میں کھانا نہ کیا جائے۔ ابا جی نے بادام پستے گھسوا کر نہایت عمدہ حریرے کا شربت دیا لیکن کہنے والوں نے یہی کہا کہ شدو بھائی نے شربت کے پیالے پر بیٹی کا نکاح پڑھوا دیا..."

"خیر، مارنے والوں کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے لیکن کہنے والوں کی زبان تو کوئی پکڑ نہیں سکتا..." اچھے خالو ایک بار پھر بول اٹھے۔

"اے بس رہنے بھی دو۔ ہوتے ہوتے کام میں تم لوگ اس قدر مین میخ نکال رہے ہو کہ توبہ بھلی۔ یوں نہیں ہو سکتا اور ووں نہیں ہو سکتا۔ شادی کے معاملے میں نیاں پڑ گئی۔ تقریب کی تیاری کا یہ حال ہے تو پھر اللہ ہی ہے جو آگے بیڑا پار کرائے گا..." اماں جان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"اس سے تو بہتر ہے کہ ملتوی کر دیں۔" اچھے خالو نے لقمہ دیا۔

"ایسی بات منہ سے بھی نہ نکالنا۔ دشمن کے کان بہرے۔ ملتوی ہونے سے کیسی بدشگونی

ہو گی۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ ضرور لڑکی میں کوئی عیب ہے۔" انھوں نے اچھے خالو کو تاڑتے تاڑتے چھوڑ دیا۔

اچھے خالو ہکلاتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کرنے لگے " میں تو چند دن ٹھہرنے کو کہہ رہا ہوں۔ ذرا امی جی تو ہو لے۔۔۔۔"

"اس کا انتظار کب تک کریں، قیامت تک؟ پہلے آپا رضیہ کی اب تب لگی ہوئی تھی۔ ان کی طرف سے ذرا اطمینان ہوا تو پھر یہ گڑبڑ۔۔۔۔ اب تو کئی برس ہو گئے، یہی رنگ محفل دیکھ رہے ہیں۔ ایک ذرا کے ذرا شہر نے سنبھالا لیا، تھوڑے دن بعد پھر وہی فائرنگ، ہلاکت، دہشت گرد خفیہ ہاتھ۔۔۔۔" اماں جان جوش میں آکر بولے چلی جا رہی تھیں "لیکن لوگوں نے شادی بیاہ کرنے بند تو نہیں کر دیے۔"

"بلکہ اس کے برخلاف۔" میں نے زیر لب کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" اچھے خالو نے میری طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں، یونہی۔۔۔" میں نے چاہا کہ بات ٹال دوں۔

"یوں ہی کیا؟" اماں جان نے بات پکڑ لی " کوئی تو رائے دو۔ گھر کے فرد ہو، اس معاملے میں تو بولو۔ تم نے یہ طریقہ بنا لیا ہے کہ سامنے تو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہو، پھر پیٹھ پیچھے بھن بھن کرتے ہو۔۔۔"

اب تو کچھ نہ کچھ بولنا ہی پڑے گا، میں نے اندازہ لگا لیا۔ "دسمبر کا مہینا یہی سوچ کر رکھا تھا کہ فاروق بھی چھٹی لے کر آ سکے گا۔ ورنہ بعد میں اسے چھٹی نہیں ملے گی، اس کی ریذیڈنسی کا پہلا سال ہے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر تو امریکا گیا ہے، اب روز روز تو آنے سے رہا۔۔۔"

"لیکن دسمبر تو یوں ہی نکلا جا رہا ہے۔۔۔" اچھے خالو بیچ میں بول اٹھے۔

ممکن ہے اپنی بات جاری رکھی ہوتی میں نے، یا ان کی بات کا جواب دیا ہوتا اگر دروازے پر آہٹ نہ ہوتی ہوتی۔

"آ گئے بیٹا؟ بڑی عمر ہے تمھاری۔ ابھی تمھارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔" اماں جان فاروق کو دیکھ کر کھل اٹھیں۔ پھر فرزانہ کی طرف رُخ کر کے پوچھنے لگیں " بازار کا کام ہوا؟"

"لیجیے، آپ یہاں آئے بیٹھے ہیں اور ہم چھوٹی خالہ کو گھر ڈراپ کر کے آ رہے ہیں۔" فاروق نے آگے بڑھ کر اچھے خالو سے ہاتھ ملایا۔

"ہاں، میں نے سوچا صبح صبح ہی ادھر سے ہوتا جاؤں۔ شادی کے گھر میں بہتیرے کام ہوتے ہیں۔" اچھے خالو کچھ جھینپ سے گئے کہ انھیں یہاں بیٹھے ہوئے دیکھ لیا گیا ہے، جہاں وہ نہ بھی ہوتے تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔

"زیور کی طرف تو میں گئی ہی نہیں۔ ابھی اس کی دی ہوئی مدت پوری کہاں ہوئی ہے؟ باقی کے کچھ کام ہوئے اور کچھ نہیں ہوئے۔ یہ کام والے بازار کے پھیرے پر پھیرے کروائے جا رہے ہیں اور کام ہے کہ پورا ہی نہیں ہو رہا،" فرزانہ نے پلاسٹک کی تھیلیوں میں لپٹے ہوئے

کپڑے اماں جان کے سامنے ڈھیر کر دیے۔

اماں جان نے تھیلیاں اپنے سامنے گھسیٹ لیں، اور ایک ایک کر کے ٹٹولنے کھول کر دیکھنے اور پوچھنے لگیں۔ فرزانہ ان کے بالکل سامنے جاکر بیٹھ گئی اور ایک ایک کرکے جوڑے کا حساب دینے لگی۔

"وہ جو شیفون کی ساڑھی تھی، کامدانی والی۔ اس کی کنی پر کام بن گیا، پلے پر نہیں بنا۔ تنچوئی کا جوڑا ابھی تیار نہیں ہوا۔ اور وہ جو کام والا جوڑا تھا، اس کا ناس مار دیا۔ دبکا کہا تھا، اس کی جگہ نرا سلمیٰ لگا دیا اور وہ بھی گھا ہوا نہیں بنایا، سارے میں پھیلا دیا۔ بھاری جوڑے کی جگہ ہلکا ہوگیا۔ نہ کوئی کام وقت پر کرکے دے رہے ہیں نہ مرضی کا ..... اور یہ دیکھیے اس کا کیا حال کیا ہے۔ کپڑا ابھی مسک گیا اور چپل کے سے پنچے بناکر رکھ دیے ....ترپے گنوا دو... ہاں ہاں، میں نے اسے دکھایا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کے پیسے میں نہیں دوں گی۔ ہر بات کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہے کہ کاریگر نہیں ہیں۔ دکان والا کہہ رہا تھا کہ آپ لوگ پرانے گاہک ہیں ورنہ اوروں کے تو پورے پورے آرڈر واپس کر رہا ہوں۔ زردوزی کے کاریگر رہتے ہی سارے ایسے علاقے میں ہیں۔ ہنگاموں کی وجہ سے آ نہیں رہے.... ۔"

"ایک تو تم لوگوں کو کام بنوانے کا خبط ہوگیا ہے۔ اطلس کا جوڑا بھی ہوگا تو اس پر دبکا لگنے کو دے دوں گی،" اماں جان نے بیزاری سے ہاتھ چلایا۔

"اب جہیز میں بھی کام کے جوڑے نہیں ہوں گے تو بعد میں کہاں بنیں گے۔ میں نے تو آپ سے کہا تھا کہ بعد میں یہ کام والے جوڑے روزمرہ کے استعمال میں نہیں آتے، اور گنڈی کا سوٹ دے دیں، تو آپ ہی راضی نہیں ہوئیں کہ جہیز میں سوتی جوڑا کیسے دے دوں ..." فرزانہ نے ایک بار ریشمی کے بجائے سوتی جوڑوں کی بحث چھیڑ دی جس پر وہ بہت دن سے دلیلیں دے رہی تھی۔

اماں جان اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ "تم بازار گئی تھیں، وہیں سے دلھن ممانی کے ہاں ہو آتیں۔ چوتھی کا غرارہ وہ تیار کر رہی ہیں، ان سے پوچھ لینا تھا کہ کپڑا کم تو نہیں پڑ گیا۔ کہیں وہ ایسے ہی نہ کاٹ لیں .... یہ بھی تمہاری ضد تھی کہ فرشی غرارہ ہو اور چٹا پٹی کا بنے۔ میں تو پریشان ہو کر رہ گئی شہر کے ان مسئلوں سے ...." اماں جان اپنے آپ کو پیٹے ڈال رہی تھیں۔

"ہاں میاں، درزی نے تمہارے سوٹ کا کیا کہا؟ ٹرائل کب کا ہوچکا ہے۔ اب تو ڈلیوری دینی ہے...." اچھے خالو نے فاروق سے پوچھا۔

"ٹیلر کے ہاں جانے کے لیے تو گاڑی پارک کر رہا تھا...." فاروق نے کہتے کہتے لہجہ دھیما کر لیا۔ "دکان کے سامنے بڑا رش تھا۔ پیلی ٹیکسی بیچ میں رکی ہوئی تھی اور ٹیکسی والا چیخ رہا تھا، لوٹ لو، لوٹ لو مجھے، کراچی والا ہوں ناں میں..... ایک بار گلا ہی کاٹ ڈالو..." میں نے چاہا کہ رک کر پتا کروں کیا ہوا ہے؟ پولیس والوں نے چیکنگ کے نام پر کچھ کیا تو نہیں ہے لیکن فرزانہ نے کھینچ لیا کہ یہاں نہ رکیے، گڑبڑ بڑھ نہ جائے.... ہم فوراً نکل آئے ...."

میں کرسی پر آگے کو ہو کر غور سے سن رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں میں اس کی بات نہ کرنے لگوں، اچھے خالو بول پڑے۔ یوں ہی سوال پوچھنے کی خاطر "شادی کا سونٹہ نہ ہو جائے ....۔ اور میاں فاروق، تیاری تو چل رہی ہے؟"

فاروق نے چبھتی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبانے لگا "جی ہاں، اچھے خالو۔ پوری تیاری ہے۔ لڑکی بھی تیار ہے اور لڑکا بھی راضی ہے....."

فرزانہ نے کامدانی والا پلو اماں جان کے سامنے پھیلاتے پھیلاتے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو فلمی ہیرو کی نقل کرتے ہوئے فاروق نے وہیں سے گنگنا کر تان ماری "بول رادھا بول۔ سنگم ہوگا کہ نہیں۔ ارے بول رادھا بول......"

میں نے کرسی کے دونوں ہتھے مضبوطی سے پکڑ لیے اور سوچ میں پڑ گیا۔ اب رادھا کیا بولے گی؟

نثار راہی
پی/۴۴، ٹیلہ جمال پورہ
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

چڑھی جوانی بڈھوں کو

وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ جب ہر جگہ آبادی کم ہوتی تھی مگر سماج میں بزرگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور ایک زمانہ یہ ہے کہ آبادی ہر جگہ زیادہ ہے مگر بزرگ بہت تھوڑے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت بزرگ تو ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ دکھائی اس لیے نہیں دیتے کہ بزرگی میں تبدیل ہونے والی عمر آئی نہیں کہ بھائی لوگ سر کے (اور اگر مونچھیں وجود میں ہیں تو مونچھوں کے بھی) بال رنگنا شروع کر دیتے ہیں یعنی بالوں کو خضاب سے نوازنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب جوان لوگوں کے بال تیس بتیس سال کی عمر سے سفید ہونا شروع ہوتے تھے تو وہ انھیں رنگنے کے بجائے انکل کہلانا زیادہ پسند کرتے تھے اور پچاس سال کی عمر کے بعد تو مرد لوگ بزرگ سمجھے جانے لگتے تھے۔ آج تو پچاس سال کی عمر میں وہ ہیرو بنے رہتے ہیں اور بزرگ کہلانے سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ گزرے زمانے میں چالیس پچاس برس کا آدمی اپنے سفید بالوں کے باعث کبھی بیوی سے مار نہیں کھاتا تھا بلکہ ہمیشہ بیوی سے عزت ہی پاتا تھا۔

اُن دنوں سماج میں بزرگ زیادہ تھے تو اخلاق بھی زیادہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنے سے چھوٹوں کو اخلاقیات کے سبق پڑھایا کرتے تھے لیکن آج بزرگ نہیں تو اخلاق بھی پڑھائے کون۔ آج کے سماج میں کئی جوان سب کے بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں۔ مگر خضاب یعنی ڈائی کا جادو کبھی انھیں بوڑھا نہیں ہونے دیتا اور وہ ہمیشہ جوان ہی نظر آتے رہتے ہیں لیکن کئی کئی بچّوں کے باپ ہونے کے باوجود وہ ایسا کیوں کرتے ہیں یہ ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آیا — وہ بڑھاپے سے ڈرتے ہیں یا اپنا بڑھاپا بھگانے کی کوشش کرتے ہیں یا بیوی کے سامنے جوان بنے رہ کر رعب گانٹھتے ہیں یا لڑکیوں کے سامنے ہیرو بنے رہنا پسند کرتے ہیں۔ جو بھی ہے، سماج میں بوڑھے تو کم ہوئے اور سماج کا نقصان تو ہوا۔ اور سچ پوچھیے کے نوجوانوں کا حق تو کٹا۔

لیکن ٹھہریے۔ ہم ابھی بات کر رہے تھے بوڑھے مردوں کی لیکن اب ہمیں یاد آیا کہ آج کل تو نانیاں اور دادیاں بھی خضاب لگا کر اپنا بڑھاپا چھپانے لگی ہیں۔ ہماری رشتے کی ایک خالہ ہیں۔ سفید بالوں میں ان کی بزرگی بہت پُرکشش لگا کرتی تھی۔ تب ان کی باتوں میں اور ان کے

ہر انداز میں وقار تھا اور وہ سنجیدگی میں ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھیں لیکن ایک دن وہ بھی چپکے چپکے کسی بیوٹی پارلر سے اپنے بال رنگا لائیں اور پھر ان کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ وہ ہر وقت بات بات پر ہنسنے اور مسکرانے لگیں۔ ہمیں ایسا لگا کہ جیسے بال کالے ہونے کے ساتھ ہی ان کا دل بھی جوان ہوگیا خضاب کا جادو دیکھیے کہ ان میں جوان لڑکیوں جیسی چنچلتا آگئی اور سنجیدگی ایک دم سے رخصت ہوگئی جوان نظر آنے سے ان کی صحت کو کچھ فائدہ ہوا تو ہوا ہو، لیکن ان کی بزرگی چلی جانے سے فیملی میں جو ایک عدد خاتون بزرگ تھیں وہ بھی نہ رہیں۔

بات زیادہ دنوں کی نہیں ہے۔ اکیس بائیس برس کا ہمارے محلے کا ایک لڑکا ایک خوبصورت لڑکی کو بازار میں دیکھ کر اس پر فدا ہوگیا۔ پھر اس سے شادی بھی پکّی ہوگئی لیکن جب کسی نے یہ راز کھولا کہ لڑکی بال رنگنے سے اور بیوٹی پارلر کے چمتکار سے خوبصورت اور کم عمر نظر آتی ہے ورنہ وہ اٹھائیس تیس برس کی عمر سے کسی طرح کم نہیں، تو ان صاحبزادے نے فوراً عشق کا بھوت اپنے دماغ سے نکال پھینکا اور آیندہ کے لیے توبہ کرلی کہ بازار میں کسی لڑکی کو دیکھ کر اب کبھی فدا نہ ہوگا ــــ ٹیکنیکلی Technically دیکھیں تو وہ لڑکی ابھی بڑھاپے کے کھنڈر دہلیز پر نہیں آئی تھی۔ بلکہ ابھی وہ جوانی کے گلشن میں کچھ دن اور ٹہلنے کی حقدار تھی لیکن کانوں بھری زبان والے کچھ بھائی لوگوں نے تو یہی کہا کہ وہ بچارا لڑکا اس بُڈھی سے پھنستے پھنستے بچا۔

اب ذرا ہمارے پڑوس پر نظر ڈالیں۔ پڑوس میں ایک ہی اکلوتے بزرگ تھے، دھنی رام جی۔ "تھے" اس لیے کہا کہ کچھ دن پہلے تک تو وہ بزرگ تھے لیکن اب پھر سے جوان ہوگئے ہیں۔ پہلے محلے کی سبھی لڑکیاں ان کی عزّت کرتی تھیں اور انھیں انکل انکل کہتی تھیں لیکن ایک دن پتا نہیں کس کے مشورے پر کہیں سے بال رنگوا کر آگئے۔ پینٹ بوشرٹ چھوڑ کر سفاری سوٹ پہن لیا اور پڑوس کی لڑکیوں سے کہنے لگے کہ وہ انھیں انکل نہیں دھنی رام کہہ کر پکاریں۔ اس دن سے پڑوس میں کوئی کہنے لگا کہ بُڈھا سنک گیا ہے، تو کوئی کہتا کہ بڈھا بدمعاش ہوگیا ہے۔ اب ہم جوان نظر آنے والے ان بڑے میاں کو کیسے سمجھاتے کہ جوانوں کا روپ لے کر انھوں نے اپنی عزّت اور وقار دونوں کھو دیے ہیں۔

لیکن ہم بھی کیا کریں۔ ہمیں سوسائٹی اور خاندان میں بزرگ دیکھے بنا اچھا بھی تو نہیں لگتا کیونکہ بزرگ تو بزرگ ہی ہوتا ہے۔ اس کی شان (اور کہیں کہیں عظمت) کا مقابلہ دس بیس جوان بھی نہیں کرسکتے، لیکن پرابلم یہ ہے کہ بزرگ نہ کسی فیکٹری میں بنائے جاسکتے ہیں نہ کہیں سے پکڑ کر لائے جاسکتے ہیں۔ انھیں تو قدرت وقت کے عمل سے بناتی ہے لیکن بزرگی کی دہلیز پر پہنچنے والے بیشتر لوگ قدرت کے اصولوں سے ہی مسخری کرنے لگے ہیں اور لوگ جب قدرت کے اصولوں سے مسخری کرنے لگیں تو پھر ہم بچارے کیا کرسکتے ہیں۔ سوائے دعا کرنے کے کہ اے خدا، غیر قدرتی طریقے سے جوان بنے بڈھوں کو عقل دے تاکہ وہ زیادہ دیر ہونے سے پہلے پھر سے بزرگ بن جائیں۔ کہ آج کے سماج کو بزرگوں کی بہت ضرورت ہے اور آج کے بچوں کو سفید سفید نظر آنے والے نانا نانی اور دادا، دادی کی۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

عروس القرآن
سورہ رحمٰن

ترجمہ و تشریح: حکیم محمد سعید
ناشر: مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
ہدیہ: چھے روپے
تبصرہ نگار: پروفیسر اختر الواسع

قرآن حکیم — بلا شبہہ اللہ رب العزت کی پرہیز گاروں کے لیے آخری، ابدی اور کھلی ہوئی کتاب ہدایت ہے۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس لیے بندوں پر لازم ہے کہ وہ اس عطاء ربانی پر اپنے رب کا جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت میں یوں تو متاثر کرنے کا ایک عمومی جذبہ ہے لیکن اس کی سورۂ رحمٰن کی تلاوت میں ایک خاص جاذبیت اور حلاوت ہے۔ مترجم و شارح کے الفاظ میں "اس سورۃ میں اللہ جل شانہ نے انسانوں پر اپنے احسانات و انعامات اور اپنی قدرت کے کمالات پر ہمیں متوجہ کیا ہے اور بار بار سوال کیا ہے کہ اے جن و انس تم اللہ کے کس کس احسان کا، کن کن نعمتوں کا اور اس کی قدرت کے کیسے کیسے مظاہر اور نشانیوں کا انکار کروگے؟"

اس سورہ کے الفاظ کا دروبست، اس کا آہنگ اور استفہامیہ انداز پھر معانی و مفہوم کے جہان سب نے مل کر اس سورہ کو عروس القرآن کا درجہ دلا دیا ہے۔

حکیم محمد سعید صاحب نے (جو ہمدرد پاکستان کے سربراہ اور ہندستان میں مقیم اپنے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ ہی کی طرح پاکستان میں بھی مومنانہ فراست سے صحت، تعلیم، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور مذہب کے میدانوں میں نہ جانے کتنے جہانِ تازہ آباد کر رہے ہیں) سورۂ رحمٰن کے اسی حسن اور اس سورۂ مبارکہ کے الفاظ و مفہوم کی اسی جاذبیت کے پیشِ نظر پہلے تو یہ لازم کر دیا کہ ہمدرد پبلک اسکول (پاکستان) کے ہر طالبِ علم کو یہ سورۃ ضرور یاد ہو اور اب انھوں نے اس کے ترجمہ و تشریح کو عامۃ المسلمین کے استفادے کے لیے شائع کر دیا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب کی یہ خواہش ہے اور اس کا احترام ہم سب کے لیے سعادت کی بات ہوگی کہ "ہر مدرسے اور ہر اسکول میں جہاں دینیات پڑھائی جاتی ہے سورۂ رحمٰن کو پوری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جائے۔"

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ سورۂ رحمٰن کو حکیم محمد سعید صاحب کے اس ترجمہ و تشریح کے ساتھ مکتبہ پیام تعلیم نے (جو اردو میں غیر سے بچوں کا اب شاید واحد سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ادارہ رہ گیا ہے) بڑے اہتمام اور مصوّر ڈھنگ سے اس کو شائع کیا ہے۔ رنگین طباعت اور نفیس کتابت کو دیکھتے ہوئے ہدیہ مناسب ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ قرآن سے محبت اور اس کے مطالعے کا شغف رکھنے والے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اس اشاعت کے بعد مکتبہ جامعہ سے یہ امید بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ آگر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کو بھی اسی اہتمام سے شائع کرے اور اس سلسلے کو اسی طرح آگے بڑھائے تو یہ بڑی سعادت ہوگی ۔

شعریاتِ بالِ جبریل

مصنف : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
تبصرہ نگار : محمد نفیس
صفحات : ۲۰۰ قیمت : /۲۰ روپے
رابطہ : ۳۳۸، شبلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کلام اقبال کی حسن طرازی و سحر کاری اور تازگی کا ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ یہ محض فکر و پیام کی صدائے مسیحا نفسی ہی نہیں بلکہ فن کی معراج اور شاہکار بھی ہے۔ فن کی پختہ کاری جو جگر کاوی اور شعلہ نفسی کا پیش خیمہ ہے سرتاسر سوز و ساز سے لبریز ہے کلام اقبال کے فنی تلازموں میں امیجری (پیکر تراشی) کی خصوصی اہمیت ہے جو برائے حسن کاری و صناعی نہیں بلکہ فکر و پیام کی ترسیل کا ایک نادر وسیلہ بھی ہے۔ اقبال کی امیجری ترجمانِ فطر بھی ہے اور ترجمان حیات بھی، یہ محض شاعر کے من کی موج نہیں بلکہ دُرِ تہِ آب ہے۔ اقبال کے کلام میں پیکر نت نئی شکلوں اور وسیع تر مفاہیم و مطالب کے ساتھ ابھرتے ہیں اقبال کی امیجری ہماری ادبی و تہذیبی تاریخ کا ایسا بحر ذخار ہے جس کے ایک ایک لفظ میں تلاطم ہے۔ لفظی پیکروں کا یہ تلاطم ہمیں حال کے ارتعاشات سے صرف ماضی کی تجلّیات کی طرف ہی نہیں لے جاتا بلکہ مستقبل کے ممکنات اور رجائیت کا آئینہ دکھاتا ہے۔

کلام اقبال کے فنی مطالعہ میں بالِ جبریل کی خصوصی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر توقیر احمد خاں صاحب نے شعریاتِ بالِ جبریل کے عنوان سے اپنی اس تصنیف میں امیجری کی تعریف و تفہیم و تقسیم اور کلام اقبال میں اس کی جلوہ نمائی کو اپنا موضوعِ خاص بنایا ہے۔ اسی نقطۂ نگاہ سے دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو دو طویل ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کے ۹۴ صفحات امیجری کی تعریف، اقسام، اہمیتِ پیکر تراشی امیجری کے مترادفات و متعلقات، امیجنیشن، آئیڈیا (خیال)، رمزِ بلیغ، آرکی ٹائپ، ادبی تنقید میں امیجری، امیجری کی اردو اصطلاح، اردو میں امیجری، اقبال اور شعریاتِ اقبال میں امیجری وغیرہ اہم موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ فن امیجری کے انگریزی مآخذ سے خصوصیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اردو ادب میں امیجری کے سرچشمے کو مشرقی شعریات سے جوڑ کر اس کی تقدیم و اولیت کو پیش کیا ہے۔ امیجری کے نقطۂ نگاہ سے کلامِ اقبال کا مطالعہ کرانے والے بعض اہم اساتذہ کا ذکر بھی کیا ہے۔ تاریخی تسلسل کے ساتھ احمد دین، کلیم الدین احمد اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر محمد حسن، حاتم رام پوری اور حامد کاشمیری کا ذکر اس ضمن میں کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں جو بالِ جبریل کا تعارف، عنوان سے تحریر کیا گیا ہے اس میں بالِ جبریل کے عنوانٰ

زبان، اسلوب، ترتیب، غزلیات، رباعیات، محاسن شعری، فکر و فلسفہ، تصوف، حریت پسندی، ملک اور سیاست، جہد و عمل، مغرب شکنی، انسانی بے بسی، انسان دوستی، رنگ تغزل، راہ نجات اور صحیفۂ کائنات وغیرہ عنوانات کے ذیل میں اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

علی نقدان کے اس دور میں اقبال اور بالخصوص بالِ جبریل کے مطالعہ میں یہ کتاب واقعی ایک خوشگوار اضافہ ہے اور کالج و یونی ورسٹی کے طلبہ وطالبات کے لیے نصاب اور اقبال فہمی کے لیے ایک مفید ذریعہ بھی۔ امید ہے کہ مصنف کی اس مخلصانہ کوشش و کاوش کو بہ نظرِ استحسان دیکھا جائے گا۔ اس کتاب کے لیے توقیر صاحب دلی مبارکباد و تحسین کے مستحق ہیں۔

جلد مضبوط، کتابت خوشخط نستعلیق اور کاغذ سفید، چمک دار ہے۔ ٹائٹل بھی شایانِ شان سادہ اور دلکش ہے۔

کوہِ نور

شاعر: ضیا جبل پوری
مبصر: مجیب احمد خاں، نئی دہلی
قیمت: ۲۵/- روپے
ناشر: گونج پبلی کیشنز، نظام آباد

کوہِ نور، ضیا جبل پوری کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ وہ نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی، جیسی شوخی رنگینی اور شگفتگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا یہ کلاسیکی لب ولہجہ جدیدیت سے ہم آہنگ ہوکر ایک نئی معنویت اور تازگی پیدا کرتا ہے۔ ان کی اپنی شاعری میں زندگی کے تمام مسائل کا حسن و خوبی جائزہ ہے۔ اس لیے ان کی شاعری سے نشاط و کرب، گھٹن اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ تاہم شاعر امیدوں سے وابستہ ہے اس لیے مایوسی کا احساس نہیں ہوتا ہے

اپنی پلکوں پہ کوئی خواب سجائے رکھیے — اپنے خاکوں میں کوئی تاج بنائے رکھیے
عین ممکن ہے بہاروں کا گزر ہو جائے — خانۂ دل کے در و بام سجائے رکھیے

موجودہ دور میں انسانی قدروں کو جس طرح پامال کیا جا رہا ہے اور ان کے جذبات و احساسات کو مجروح کیا جا رہا ہے۔ ضیا نے اس صورت حال پر خوب طنز کیا ہے۔ اس لیے ان کے کلام میں تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر دلکشی برقرار ہے۔ مثلاً

امن اور انسانیت کے نام سے ڈرتے ہیں لوگ — یہ تاثر جو کبھی الفاظ نے پایا نہ تھا
آپ نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نام پر — بادشاہوں نے کبھی ایسا ستم ڈھایا نہ تھا

شامل ہے ہمارا بھی لہو رنگ چمن میں — کلیوں کو تبسم کی ادا ہم نے ہی دی ہے
حاکمِ وقت نے مجمع میں سزائیں دی ہیں — ہم نے ہر حال میں خلقت کو دعائیں دی ہیں

ضیا جبل پوری کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی خوب خوب نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں خیال کی بلندی، سنجیدگی، شگفتگی اور اثر آفرینی جلوہ افروز ہے۔ ان کا کلام ان تمام ادبی و فنی خوبیوں کے باعث نہایت دلکش ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں ایسے سدابہار پھول کھلائے ہیں جن پر کبھی خزاں نہ آئے گی۔ اس شعری مجموعہ کا کاغذ اچھا ہے اور کتابت بھی خوبصورت ہے۔

سپاہی بہادر

(۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں بھوپال کا حصّہ)

مصنف: اسد اللہ خاں
تبصرہ نگار: حامد جعفری
زرِ تعاون: ۵۰ روپے
ناشر: اشرف ندیم
ملنے کا پتا: بھوپال بک ہاؤس۔ بدھوارہ۔ بھوپال

اسد اللہ خاں، بھوپال میونسپل کارپوریشن میں ایک اعلا عہدہ پر فائز رہے تھے اور اردو زبان و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کا تعلق بھوپال کے ایک معزز علمی خاندان سے تھا۔ ان کے ادبی مضامین اکثر مقامی اخباروں کی زینت بنتے رہتے تھے لیکن لوگوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ انھیں تاریخ سے اور خصوصاً بھوپال کی تاریخ سے اتنی دلچسپی تھی اور وہ اس کے اہم دور پر کتاب بھی ترتیب دے رہے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ کتاب مسودے کی صورت ہی میں رہ جاتی اگر ان کی بیگم زرِ کثیر صرف کر کے کتابی شکل میں یہ تحفہ اردو داں حضرات کو پیش نہیں کرتیں۔ اس طرح انھوں نے اسد اللہ خاں (مرحوم) کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام انگریزوں نے تجارت کے مقصد سے کیا تھا مگر بعد میں اس کمپنی نے ہندستان کے سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت قائم کر لی اور اس حکومت کو "کمپنی بہادر" کا نام دیا۔ لہٰذا اس کے جواب میں جب اس کمپنی کے خلاف ہندستان گیر عوامی نفرت ایک تحریک بن کر پروان چڑھی اور ریاست بھوپال کے سپاہیوں نے بھی اس جنگ آزادی میں حصّہ لینے کے لیے کمپنی کے خلاف تلوار اٹھائی اور ایک متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کیا تو اسے "سپاہی بہادر" کا نام دیا اور یہی نام اسد صاحب نے اپنی کتاب کا رکھا۔

کسی بھی ملک و قوم کے لیے اپنی تاریخ کا جاننا اور یاد رکھنا اشد ضروری ہوتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت پر مصنف کی نظر تھی اور اسی لیے بھوپال کی تاریخ کے ایک گم شدہ مگر اہم باب کی بازیافت کی کوشش میں یہ کتاب عالمِ وجود میں آئی۔ اس میں بھوپال کی جنگِ آزادی میں شرکت کو تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ اسد صاحب نے کتاب کی ابتدا میں ایک وسیع فہرست ان مآخذ کی دی ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔

کتاب میں نواب سکندر جہاں بیگم کے زمانے کے حالات، ان کی انگریزوں سے وفاداری (جو کہ دراصل اپنی چھوٹی سی ریاست کو انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی) کمپنی کے خلاف بغاوت، اس کے محرکات، اس میں شامل جیالوں کے کارنامے اور پھر اس تحریک کی ناکامی کو مع اسباب کے نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کو پڑھنے سے بھوپال کی تاریخ کے وہ اہم گوشے بھی روشن ہوتے ہیں جو تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے

اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کا علم اٹھانے والوں میں انگریزی فوج کے رسالدار، ولی شاہ ان کے لیڈر تھے جن کی معاونت حوالدار مہاویر کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے سیہور چھاؤنی میں ایک کونسل کی تشکیل کر کے، نشان محمدی اور مہاویری

جھنڈا انگریزوں کے خلاف بلند کیا اور اس طرح بھوپال کی جنگ آزادی میں شرکت کو عملی شکل دی۔ ہندو، مسلمان دونوں ہی مل کر اس جنگ میں شریک ہوئے تھے اور اس طرح یہ تحریک قومی ایکتا کی جانب ایک مثبت قدم بھی تھی۔

جب کہ ہمارے علم میں ہے انگریزوں اور ریاست بھوپال کے ایک معاہدے کے تحت ایک انگریز ریذیڈنٹ سیہور میں متعین تھا اور ریاست بھوپال کی حفاظت کے لیے ہندستانی اور انگریز فوجیوں کی کافی تعداد، انگریز افسر کی کمان میں وہاں فروکش تھی۔ اس کمپنی کے دو جیالے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ کچھ اور اہم نام جنھوں نے اس جنگ میں حصّہ لیا اور اپنی جانیں قربان کیں ان میں وارث محمد خاں (اندور) فاضل محمد خاں، عادل محمد خاں، کامدار محمد خاں، سردار سنگھ گوتد، کمال شاہ اور محمد شاہ ہیں۔ اس بغاوت کے چار مراکز تھے جو کہ بھوپال کی چاروں طرف سے گھیرابندی کرنے کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ ان میں بیرسیہ، گڑھی آنبہ پانی، راحت گڑھ اور چھیپانیر تھے۔ آخرالذکر مقام پر ٹھاکر دولت سنگھ باغیوں کے سربراہ تھے۔

کتاب میں تفصیل سے اسبابِ بغاوت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بھوپال کے علما کرام بھی اس تحریک میں شامل تھے اور مسجد متکا شاہ کے ایک تاریخی جلسے میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوا جاری کرکے اس بغاوت کو مذہبی رنگ بھی دے دیا تھا جیساکہ ہمیں معلوم ہے کہ انگریزوں کے خلاف یہ جنگ پورے ہندستان میں ناکام ہوئی اور ہزاروں لوگوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ بھوپال کے سپاہیوں اور ان کے مددگاروں کو جنرل روز کے مقابلے میں شکست کا سامنا ہوا اور بڑی بہیمانہ سزائیں ان کا مقدر ہوئیں۔ جنرل روز کے حکم سے ۱۴ر جنوری ۱۸۵۸ء کو سیہور میں ۳۵۶ لوگوں کو بے رحمی کے ساتھ گولیوں کی باڑھ سے بھون دیا گیا اس قتل عام کے بعد بھوپال میں اس تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔

اسد صاحب کی کاوشوں سے اب یہ بات تاریخی ثبوتوں کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ریاست بھوپال کے عوام الگ تھلگ نہیں رہے تھے۔ اگرچہ بیگم بھوپال انگریزوں کی حلیف تھیں لیکن عوامی جوش اور غصّہ غیرملکی حکمرانوں کے خلاف یہاں بھی بغاوت کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا تھا اور سیکڑوں جانوں کی قربانی دے کر بھوپالیوں نے ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں اپنی ریاست کا نام سنہرے حروف میں درج کرایا تھا۔

حالانکہ اسد اللہ خاں باقاعدہ تاریخ نویس نہیں تھے پھر بھی انھوں نے کمال حسن و خوبی کے ساتھ معروضی نکتہ نظر سے واقعات کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ نہ صرف واقعات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ ایک اچھے تاریخ نگار کی طرح اس بغاوت کے محرکات، اس کی ناکامی کے اسباب اور پھر اس سے حاصل شدہ نتائج پر بھی بحث کرتے ہیں۔

اس کتاب کو مصنّف کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ برجیس انجم اور مصنف کے برادر اشرف ندیم نے شائع کیا ہے۔

کتاب کا انتساب بیگم برجیس انجم نے بجا طور پر جنگ آزادی کے ان جیالوں کے نام کیا

ہے جنھوں نے اپنی جانیں آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں غیر ملکی طاقت کے خلاف جنگ میں قربان کردیں۔

کیڑے قدرت کا شاہکار

مصنف: ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی
مبصر: پروفیسر خلیل احمد جعفری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
قیمت: ۵/۸۰ روپے
ناشر: شمس الاسلام فاروقی، ب/۹۰، احاطہ طالب، نورنگر جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ماضی میں ماہر حیوانات نے اپنی تصانیف میں مختلف جانوروں کے ساتھ بعض حشرات جیسے چیونٹیوں دیمک یا ٹڈیوں وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن صرف کیڑوں سے متعلق شاید یہ پہلی کتاب ہے جو اردو زبان میں منظر عام پر آئی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عام انسانوں کی نظر میں کیڑے ایک حقیر اور لایعنی مخلوق ہیں جن سے گندگی کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن فائدہ بعید از قیاس ہے۔ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی جنھیں حشریات کے میدان میں تقریباً چونتیس سال کا تجربہ حاصل ہے اور جو ایک معروف زراعتی ادارے انڈین ایگلری کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے شعبۂ حشریات سے وابستہ ہیں انھوں نے زیر نظر کتاب میں کیڑوں کا ایک واضح تصور پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے آپ کو پتا چلے گا کہ کیڑے درحقیقت کیا ہیں، ان کے آباو اجداد کون ہیں اور وہ کتنے پرانے ہیں۔ ساتھ ہی آپ ان خصوصیات سے بھی متعارف ہوں گے جن کی بنا پر کیڑے ہر دور میں ایک بالادست مخلوق کی حیثیت سے رہے ہیں۔

مصنف نے کیڑوں اور انسانی زندگی کے تعلق پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور اس امر کی وضاحت کی ہے کہ تمام کیڑے ہمارے دشمن نہیں ہوتے بلکہ بہت سی اقسام نہ صرف ہمارے نقصان کی تلافی کرتی ہیں بلکہ کئی کے ساتھ تو ہمارے صنعتی مفادات بھی وابستہ ہیں، کیڑوں اور پودوں کے رشتے بہت دلچسپ انداز سے بیان کیے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے ہر مخلوق کو اس زمین پر زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کی مکمل صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کا خوب خوب استعمال کیڑے اور پودے دونوں ہی کرتے ہیں۔

کتاب کے چند مضامین جیسے کیڑوں کے پر اور قوت پرواز، کیڑوں کی آوازیں اور کیڑوں کی چمک بے حد دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ ان کا مطالعہ بلاشبہہ ایسے حقائق سے پردہ اٹھاتا ہے کہ آپ بے ساختہ خدا کی صناعی اور ربوبیت کے معترف ہو جاتے ہیں اور کیڑوں کا اولین تصور دھندلا پڑنے لگتا ہے۔ یہ مصنف کا کمال ہے کہ آپ خود بھی ان ننھے منے کمزور اور بظاہر غلیظ کیڑوں کو قدرت کا شاہکار کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے اور قیمت بھی مناسب ہے۔ تصاویر نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب سائنسی موضوعات میں ایک اہم اضافہ ہے جو عوام اور طلبہ دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ثابت ہوگی۔

ھے خطوط

لہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

ب نما سے متعلق آپ کی دوٹوک، بے لاگ اور فوری رائے
ہیں انتہائی ضرورت ہے مگر کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مختصر
ی ہو۔ (ادارہ)

م پرکاش کپور، ۱۸/۷، ایم، آئی، جی۔ پدم نابھ پور
ل ۱۰۰۱ ۴۹۱ (مدھیہ پردیش)

جنوری کے شمارے میں جناب عطا عابدی کا
ریہ نہایت دلچسپ اور دعوتِ فکر دینے والا ہے
ون کافی جامع ہے اور انھوں نے کافی مسائل پر
ث کی ہے۔ ایک دو مسائل کے بارے میں میں کچھ
فہ کرنا چاہتا ہوں۔

کسی باحیات ادبی شخصیت پر گوشہ نکالنے کے
ے میں انھوں نے لکھا ہے "ہونا تو یہ چاہیے کہ
ریا گوشہ ترتیب دینے کے لیے مدیر خود یا اپنے
اون کے ذریعے مختلف مکتبۂ فکر سے مضامین لکھواتے
متعلقہ فن کار کے مختلف گوشے سامنے آتے...
ہ۔" لیکن بدقسمتی سے ایسا ہوتا نہیں ہے جیسا کہ
وں نے بھی لکھا ہے۔ ماہنامہ انشا، کلکتہ میں ان
ں جناب گوپی چند نارنگ کے بارے میں چھپے
م مینائی صاحب کے مضمون پر جو بحث چل رہی
ہے۔ اس سلسلے میں دسمبر ۱۹۹۵ء کے انشا، جناب
رحامد علی خاں صاحب کا ایک مکتوب چھپا ہے۔ میں
ں تنازعے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں اس
وب میں لکھی ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا
ں۔ وہ لکھتے ہیں "... اِس خط میں ڈاکٹر نارنگ تو
با قمر رئیس نے آل احمد سرور اور ڈاکٹر محمد حسن کو بھی نہیں
بخشا۔ رام لال کو لکھا ہے کہ "اگر آپ ان لوگوں سے
گوشہ کے لیے مضمون لکھوا رہے ہیں تو پھر میں شریک
نہیں ہوں...."

اب اس تحریر سے دو باتیں سامنے آتی ہیں
ایک یہ کہ جناب رام لال جیسے جانے مانے اور مستند
عظیم ادیب نے بھی اپنے پر "گوشہ" کے سلسلے میں
اپنی مرضی کے ادیبوں کو لکھا۔ اڈیٹر کی مرضی پر بات
نہیں رہنے دی (یا اڈیٹر نے خود ہی اپنی مرضی استعمال
کرنے سے گریز کیا) دوسرے یہ کہ جناب قمر رئیس
جیسے بڑے ادیب نے بھی یہاں تک تعصب ظاہر کیا۔
کہ لکھ دیا کہ "اگر آپ ان لوگوں سے مضمون لکھوا رہے
ہیں تو میں شریک نہیں ہوں" یہاں یہ بھی غور طلب
ہے کہ سرور صاحب اور ڈاکٹر محمد حسن جناب قمر رئیس
کے اساتذہ میں شامل ہیں۔ اگر اتنے بڑے بڑے
جانے مانے ادیبوں کا یہ حال لکھا ہے تو عام تخلیق کار
کس گنتی میں ہے۔

دوسری بات جو میں لکھنا چاہتا ہوں وہ تبصرہ
کے بارے میں ہے انھوں نے لکھا ہے "اگر تبصرے
میں سہواً کوئی غلطی ہوگئی ہو تو اس کے اعتراف میں کوئی
قباحت نہیں ہونی چاہیے...... مبصر کبھی کبھی کسی
کو زمین سے آسمان ثابت کرتے ہیں اور کسی مصنف
کو دانستہ مجروح کرتے ہیں..... اگر مبصر نے موضوع
کو سمجھنے میں غلطی کی ہے تو معقول دلائل اور مناسب
طریقے سے مبصر کے "فیصلے" کو رد کیا جا سکتا ہے...
مبصر نے اگر کتاب کے ساتھ واقعی زیادتی کی ہے
تو مصنف کے جائز اعتراض یا احتجاج میں دیگر قلم کاروں
کی آواز بہت کم شامل ہو پاتی ہے......" مبصر نے
اگر دیانت دارانہ تبصرہ کیا ہے۔ اور اس پر متعلقہ مصنف
برانگیختہ ہے تو دیگر قلم کار اس مصنف کے ردِ عمل
پر اپنے تاثر کا اظہار شاید ہی کر پاتے ہیں" آخر میں
انھوں نے لکھا ہے "دونوں صورتوں میں قلم کاروں

کی خاموشی خود ان کے نزدیک ایک مصلحتانہ ہو سکتی ہے لیکن اسے عادلانہ نہیں کہا جا سکتا۔۔۔۔"

لیکن انھوں نے تبصرے کے سلسلے میں ایک اور پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے فرض کیجیے (مبصر نے موضوع کو سمجھنے میں غلطی کی ہے) لیکن مدیر نے وہ شمارہ مصنف کو بھیجا ہی نہیں۔ اس لیے مصنف کا ردِ عمل تو معلوم نہیں ہو سکتا۔ یا اگر مصنف کسی مصلحت کی بنا پر خاموش رہتا ہے لیکن کوئی دوسرا قلم کار یا قاری مدیر کی توجہ اس "ناانصافی" کی طرف دلاتا ہے لیکن مدیر مبصر سے اپنی دوستی کی وجہ سے یا کسی اور مصلحت کی بنا پر وہ "احتجاج یا ردِ عمل" شائع نہیں کرتا۔ تو اس کا کیا علاج ہے یا اگر کوئی مدیر اپنے رسالے میں چھپی کسی تخلیق (ناول بھی رسالوں میں چھپتے ہیں) پر بھیجا ہوا دیانت دارانہ تبصرہ کسی مصلحت کی بنا پر شائع نہیں کرتا تو وہ قلم کار۔ قاری یا مبصر کیا کر سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ "قہرِ درویش برجانِ درویش" کے مصداق کے مطابق خاموشی اختیار کرے جیسا کہ مجھے اکثر کرنا پڑتا ہے۔ (نام نہیں گنوانا چاہتا)

ایک اور بات۔ جیسا کہ عطا عابدی صاحب نے بھی لکھا ہے "مدیر کبھی کبھی اپنے آپ کو بہت مشکل میں گھرا پاتا ہے۔ اگر وہ کسی چیز کو شائع نہیں کرتا تو قلم کار ناراض ہو جاتا ہے اور ناراضگی کبھی کبھی حد سے تجاوز کر جاتی ہے" مثلاً "آج کل" کے مدیر کو کسی شاعر نے لکھا تھا "آپ میری تخلیقات اس لیے شائع نہیں کرتے کہ میں غیر مسلم ہوں۔ یہ رسالہ آپ کی ذاتی ملکیت نہیں ہے گورنمنٹ پبلیکشن ہے۔ میں آپ کے خلاف اپنے ایم۔ پی کو کہہ کر پارلیمنٹ میں سوال اٹھاؤں گا۔۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔ اور ساتھ میں عدالت لے جانے کی بھی دھمکی دی تھی۔ "آج کل" کے اسی شمارے میں ایک اور قلم کار کا مکتوب بھی شائع ہوا تھا جس میں لکھا تھا "۔۔۔ آپ نے میری غزلوں کو واپس کر دیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی۔ حیرت آپ کے تنقیدی شعور کی کمی پر ہوئی۔ اور صدمہ اس لیے ہوا کہ آپ نے میری تخلیقات لوٹا کر ان کی تذلیل کی۔۔۔۔۔ آپ کو مجھ سے معافی مانگنی چاہیے"

اس کے برعکس اگر مدیر بلا امتیاز سب کچھ شائع کرے (تصویر کا دوسرا رخ) تو بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ ماہنامہ "آج کل" میں ہی جناب اوپندر ناتھ اشک نے اپنے مضمون میں عصمت چغتائی کی پرائیوٹ گفتگو کے کچھ فقرے لکھے تھے (جنوری ۱۹۹۲) جس پر کسی قاری نے اس قدر شدت سے ردِ عمل دکھایا کہ اس کا خط (مارچ ۱۹۹۲) شائع ہونے پر پارلیمنٹ میں ہنگامہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدیر کو اپنی کرسی خالی کرنی پڑی۔ وہ جون ۱۹۹۲ سے جولائی ۱۹۹۳ تک رسالہ سے علاحدہ رہے۔ شکر ہے حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اگست ۱۹۹۳ میں وہ دوبارہ مدیر کی پوسٹ پر بحال کر دیے گئے۔

رشید حسن خاں کا نیا پتا

MR. RASHEED HASAN KHAN
167. BAROOZAI – II
SHAH JAHANPUR (U.P.)
Pin 242001

مارچ ۹۶ء

نما

بی تہذیبی خبریں

آندھراپردیش کے آٹھ اضلاع میں

دو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ

حیدرآباد ۔ ۱۷ فروری ۔ آندھراپردیش حکومت
آٹھ اضلاع میں جہاں اقلیتی فرقوں کی آبادی ۱۰فیصد
، زیادہ ہے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ
ینے کا فیصلہ کیا ہے ۔ اس سلسلے میں آج یہاں
ں کابینی میٹنگ میں ایک فیصلہ کیا گیا ۔ نامہ نگاروں
ے بات چیت کرتے ہوئے ریاست کے وزیر خزانہ
وک گج پتی راجو نے کہا کہ اردو حیدرآباد، کڈاپا، نظام آباد
ت پور، رنگا ریڈی، کرنول، میدک اور گنٹور کے
لاع کی دوسری سرکاری زبان ہوگی ۔ انھوں نے
ید کہا کہ سرکاری زبان سے متعلق ایکٹ میں اسمبلی کے
ندہ اجلاس میں مناسب ترمیم کی جائے گی ۔ یہ
لاس مارچ کے پہلے ہفتہ میں شروع ہو رہا ہے
ابینہ نے تیلگو یونی ورسٹی کا نام پوٹی سری راملو کے نام
ر رکھنے کا بھی فیصلہ کیا ۔

دو دانی، زبان دانی کے امتحانات میں

۱۲ ہزار ۵۱۷ امیدوار کامیاب

حیدرآباد ۔ ۱۶ جنوری ، معتمد عمومی ادارہ ادبیات
ردو پروفیسر مغنی تبسم نے اطلاع دی ہے کہ عابد علی خان
یجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۷ جنوری ۱۹۹۶ء کو
ردو دانی، اردو زبان دانی اور اردو انشاء کے امتحانات
نعقد کیے گئے تھے ۔ دونوں شہروں حیدرآباد و سکندرآباد
کے ۸۴ مراکز اور اضلاع کے ۹۰ مراکز کے ۱۶۵۰۰
میدواروں نے امتحان میں شرکت کے فارمس داخل کیے
تھے لیکن شب برات کی وجہ سے صرف ۱۳۳۹۰
امیدوار شریک امتحان رہے ۔ ان میں سے ۱۲۵۱۷
نے کامیابی حاصل کی ۔ عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ
کے تحت اردو تعلیم کے ان مراکز کا قیام ۱۹۹۴ء میں عمل
میں آیا تھا ۔ جون ۱۹۹۴ء میں صرف اردو دانی کا امتحان
ہوا تھا جس میں ۳۹۸۲ طلبہ و طالبات شریک امتحان
رہے ۔ جنوری ۱۹۹۵ء میں اردو دانی کے ساتھ ساتھ
اردو زبان دانی کے امتحانات منعقد ہوئے تھے جس
میں ۷۰۸۲ طلبہ و طالبات شریک امتحان رہے اور ۶۳۶۸
امیدوار کامیاب قرار پائے تھے ۔ جون ۱۹۹۵ء میں
اضلاع و شہر کے ۱۴۶ مراکز پر ۵۴۸۵ امیدواروں نے
امتحان دیا اور ۱۱۲۷ نے کامیابی حاصل کی تھی ۔ عابد
علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تحت اردو تعلیم کے تین
مدارج ہیں اس دفعہ یعنی ۱۹۹۶ء میں اردو دانی اور
زبان دانی کے بعد اردو انشاء کا اضافہ عمل میں آیا ہے
عوام میں اردو تعلیم کا یہ سلسلہ مقبولیت حاصل کر کے
روز بروز ترقی کر رہا ہے ۔

پاکستان میں رضا الجبار کے فن و فکر پر سمینار

پاکستان سے آئی ہوئی اطلاع کے مطابق رائٹرز
فورم چشتیاں کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز اور صاحب
طرز افسانہ نگار رضا الجبار کے فکر و فن پر ایک سمینار
۱۹۹۵ء کے اواخر میں منعقد کیا گیا ۔ وزیر اعظم پاکستان
کے کوارڈی نیٹر اور پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے
ڈپٹی سکریٹری جنرل عبدالقادر شاہین نے کہا کہ یورپ
اور امریکا کی مصروف ترین زندگی میں سے قیمتی وقت
نکال کر اردو شاعروں اور ادیبوں کا اردو زبان کے
قارئین کے لیے معیاری ادب تخلیق کرنا ایک عظیم کارنامہ
ہے ۔ انھوں نے کہا ہے کہ موجودہ حکومت بیرون
ملک مقیم اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کو قدر کی
نگاہ سے دیکھتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ سال

ادیبوں اور دانشوروں کی قومی کانفرنس میں بیرون ملک مقیم ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ گو مصنف رضاءالجبار بھارت سے کنیڈا گئے ہیں لیکن انھوں نے اردو ادب کے افسانوں میں برصغیر پاک و ہند اور مغرب کی تہذیبوں کی درست عکاسی کی ہے۔ مجلس مذاکرہ کے صدر صحافی مجید تسلیم نے کہا کہ رضاءالجبار کے افسانوں میں تہذیبوں کا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ رضاءالجبار کا ایک علاحدہ قوم اور تہذیب میں رہ کر اردو ادب کے لیے کام کرنا دراصل اردو ادب اور افسانے کو زندہ رکھنے کی بے مثال کوشش ہے۔ مرزا لیاقت بیگ نے کہا کہ رضاءالجبار کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب ظاہری طور پر رنگین نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں بے رنگ اور کھوکھلی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رضاءالجبار نے مغرب کی طرف سفر کرنے والوں کو قبل از وقت حقیقت سے آگاہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ برصغیر کے لوگوں کے معاشی اور سماجی مسائل کو بھی کھل کر بیان کیا ہے۔ نصیر احمد قریشی نے کہا کہ رضاءالجبار نے اپنے افسانوں میں مشرق خاص طور پر برصغیر کے مشترکہ خاندانی نظام کی اہمیت کو مغرب میں خوب اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ رضاءالجبار کا فن اردو افسانے میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ہے۔ پروفیسر رانا محمد افضل نے کہا کہ رضاءالجبار کے افسانے کی ابتدائی سطریں پڑھنے کے بعد تجسس میں پورا افسانہ پڑھنا چاہتا ہے۔ پروفیسر افضل نے کہا کہ معذوری کے باوجود رضاءالجبار کا ادبی زندگی میں مقام پیدا کرنا ہمت کی بات ہے۔ قبل ازیں رائٹرز فورم کے جنرل سکریٹری مرزا نصرت علی بیگ نے رضاءالجبار کے افسانوں کے مجموعے "چاند کی کشتی کا اکیلا مسافر" سے افسانے پڑھ کر سنائے جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔

عروج زیدی کی نویں برسی پر خراج عقیدت

رام پور۔ ممتاز شاعر حضرت عروج زیدی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی نویں برسی پر عروج منزل، حضرت عروج زیدی روڈ پر ۲ فروری کو شروع ہوئی۔ فجر کی نماز کے بعد ختم کلام پاک اور مزار عروج زیدی پر چادر چڑھا کر دعائے مغفرت کی گئی۔ عروج منزل کے سبزہ زار پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ تقریب کی صدارت شاہجہانپور سے تشریف لائے سردار ہرجیت سنگھ دانش نے کی۔ اور نظامت کے فرائض نعیم اختر سیتاپوری نے انجام دیے۔

مقررین نے مرحوم کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت عروج زیدی دیانت و صداقت کے اعلا رتبوں پر فائز تھے انھوں نے دین کو دنیا پر کبھی قربان نہیں کیا۔ وہ ایک عظیم محب وطن اور سچے انسان تھے وہ ایک بلند پایہ شخصیت۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ایک کہنہ مشق شاعر، ممتاز ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔

نامور ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی کو "بھارتیہ بھاشا پرسکار" کا اعزاز

تمام ادبی دنیا خصوصاً اردو زبان و ادب کے تمام دانشوروں اور شیدائیوں کے لیے یہ خبر باعث مسرت ہوگی کہ نامور ناقد اور بہار یونی ورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر پروفیسر وہاب اشرفی کو اس سال "بھارتیہ بھاشا پرسکار" سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس انعام سے اردو زبان و ادب کے ایک دانشور کو نوازا گیا ہے۔ تحقیق و تنقید نیز دیگر موضوعات و اصناف پر بھی ڈاکٹر وہاب اشرفی نے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے مثنوی کا بھی نئے سیاق و سباق میں جائزہ پیش کیا ہے۔

اسی سلسلے میں "کاروانِ ادب، جمشید پور" کی جانب سے جناب ظفر ہاشمی کے کاشانے پر ایک

سوص نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں احباب کے
ادہ بہار شریف سے آئے ہوئے معروف
سانہ نگار جناب شہاب دائروی، جناب انور امام،
ناب سلطان احمد ساحل، جناب منظر کلیم اور جناب
مید فردوسی بھی شریک تھے۔

اکٹر محمد رضوان علوی کاکوروی کا حادثۂ ارتحال

شعبۂ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی کے سابق صدر شعبہ پروفیسر
اکٹر محمد رضوان علوی کاکوروی کا سنیچر ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء کو
ت ۹ بجے انتقال ہوگیا۔ دوسرے روز بعد نماز ظہر ان
کے آبائی وطن قصبہ کاکوری میں سیکڑوں احباب و اعزا کی
وجودگی میں مرحوم کی تدفین ہوئی۔

مرحوم محمد رضوان علوی صاحب پر ۱۷ جنوری
و بعد نماز مغرب شدید قلبی دورہ پڑا تھا اور وہ
اری کارڈیالوجی میڈیکل کالج میں داخل کیے گئے۔ دوسرے
روز طبیعت کافی سدھر گئی تھی مگر تیسرے دن رات میں
پھر شدید دورہ پڑا اور علوی صاحب چشم زدن میں
پنے مالک حقیقی سے جاملے۔

ڈاکٹر علوی صاحب ایک بہت ہی مشفق اور
کامیاب استاد تھے اور طلبہ میں علمی لگن پیدا کرنے
ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی صحیح رہنمائی
کرنے میں یکتا تھے۔ اپنی علمی خدمات کے لیے
انھیں صدر جمہوریہ ہند سے توصیفی سند بھی عطا ہوئی
تھی۔ فخر الدین علی احمد کمیٹی حکومت اتر پردیش کے
قیام اور اسے ترقی دینے میں ان کا بہت بڑا حصہ رہا ہے
اسلامیہ انٹر کالج لکھنؤ کو ڈگری کالج بنوانے میں ڈاکٹر رضوان
صاحب تن تنہا دامے درمے سخنے ہر طرح سے
سرگرداں رہے اور آخر کامیابی نے ان کے قدم چومے
اور اسلامیہ کالج۔ ڈگری کالج ہوگیا اور اس میں
سائنس اور کامرس کی بھی فیکلٹیاں قائم ہوگئیں۔
لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ عربی کو ترقی اور
وسعت دے کر جس طرح انھوں نے اسے ایک
مثالی شعبہ بنا دیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ڈاکٹر صاحب
کو اردو عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر یکساں عبور
حاصل تھا اور وہ تینوں زبانوں میں لکھتے پڑھتے
رہتے تھے۔ ان کی تحریروں میں دو کتابیں "علوم و
فنون عہد عباسی میں" اور "دمشق اسلامی تہذیب کا
گہوارہ" قابل قدر ہیں اور داد تحسین حاصل کر چکی
ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے شاگردوں کی تعداد سیکڑوں میں
ہے عربی ادب اور عرب تہذیب و تمدن میں بلا مبالغہ
درجنوں طلبہ نے ان کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری
حاصل کیں۔ وہ عربی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری
کا بھی بہت عمدہ مذاق رکھتے تھے یہ خوبی ان کو میراث
میں ملی تھی اس لیے کہ ان کے اجداد میں محسن کاکوروی
اور نور الحسن نیر جیسے شاعر و ادیب گزرے ہیں۔ ڈاکٹر
صاحب کے والد مولانا مصطفیٰ حسن علوی مرحوم بھی
خود ایک فاضل دیوبند اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔

ڈاکٹر علوی صاحب حافظ قرآن ہونے کے ساتھ
ساتھ علمی اور انتظامی خصوصیات کے حامل اور خوش
لباسی و خوش مذاقی، حسن و اخلاق، شرافت و مروت
وضع داری و ملنساری کا ایک ممتاز نمونہ تھے۔ وہ بہت
ہی منکسر اور وسیع القلب تھے۔ نمائش اور تکبر سے مبرا
اور خدمت خلق کے جذبہ سے مرصع ان کی شخصیت
ان کی ہر دل عزیزی کا سبب تھی۔

انھیں سب خوبیوں کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب
لکھنؤ یونی ورسٹی میں اور شہر لکھنؤ میں یکساں طور پر
ہر دل عزیز تھے ان کے انتقال پر ملال سے لکھنؤ ایک
بہت اچھے استاد اور ایک ہر دل عزیز شخصیت
سے محروم ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں سے درگذر کرے اور ان
کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اعزہ کو صبر جمیل دے۔

(ڈاکٹر شاہ عبد السلام لکھنؤ)

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیرجانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما نئی دہلی

اپریل ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۴

فی پرچہ 6/50

سالانہ 60/-

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 80/-

غیرممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/-

(بذریعہ ہوائی ڈاک) 350/-

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ٹیلی فون:۔ ۶۹۱۰۱۹۱

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

پرنٹر پبلیشر سیّد وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

ایران کا اسلامی انقلاب اور اس کا عالمی ردّعمل
(رپورٹ) شہید صفی پوری ۲۲۵/
نقاب اٹھنے تک (افسانے) چاندکرن ۱۰۰/
گریباں جھوٹ بولتا ہے 〃 ۱۵/
تعبیر و تحلیل (تنقیدی مضامین) پروفیسر قمر رئیس ۱۵۰/
احتشام حسین ایک دبستان۔ مرتبہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ۳۵۰/
علامہ شاہ عبدالحیٰ احقر حیات اور کارنامے (تذکرہ)
سید قدرت اللہ الحسینی ۲۵۰/
حرف بارپاب (شعری مجموعہ) افتخار عارف ۹۵/
سخن گسترانہ (تنقیدی مضامین) ڈاکٹر منصور عمر ۱۰۰/
اسلوب اور اسلوبیات (ادب) طارق سعید ۲۵۰/
داستان تاریخ اردو (نیا اڈیشن) تاریخ ادب اردو
مولفہ حامد حسن قادری ۳۶۰/
گلدستہ نعتیہ کلام طارق سعید ۶۰/
عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار (سوانح)
ڈاکٹر فرزانہ اسلم ۲۰۰/
اردو اسٹیج، ڈراما تاریخ و تنقید (ڈراما کی تاریخ)
ڈاکٹر بیجے دیو سنگھ ۱۵۰/
اودھ کے تاریخ نگار (تاریخ) انور حسین اکبرپوری ۱۲۰/
وزیر آغا کی امتزاجی نظریہ سازی (تنقید)
ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ۱۰۰/
دھوپ کی چادر (افسانے) سید احمد قادری ۷۵/
اردو انشائیہ کے ارتقا میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا حصہ
(تحقیق) ڈاکٹر ریاض احمد انصاری ۶۰/
رفعت و گذشت (افسانے) ڈاکٹر سعید گورکھپوری ۱۰/
عقد سعید مداحوں کی نظر میں (سہرے) ۱۸/
خواب کنارے (کہانیاں) سلیم سرفراز ۷۵/

سرورق ـــــ مسعود احمد برکاتی
مصوّر ـــــ شکیل اعجاز

افکار [illegible] خاں ۱۶/
بہار میں اردو افسانہ نگاری (ابتدا تا حال) تنقید و تحقیق
ڈاکٹر قیام نیر ۳۰/
تعین زمانہ قاضی عبدالودود ۲۰/
تاریخ کے ساتھ کھلواڑ (درسی کتابوں میں زہریلا مواد)
(ادارہ) ۵/
رشید احمد صدیقی کے کچھ خطوط، کچھ رقعات بنام پروفیسر
مسعود حسین خاں (ادارہ) ۱۰۰/
میر قاضی عبدالودود ۱۵۰/
معارف کا اشاریہ شائستہ خان ۵۰۰/
گاندھی جی کا پیغام پروفیسر مکٹ بہاری لال ۱۰/
رام پور کا جشن بہار (ادارہ) ۵/
تقریظ قندیل حرم مرتبہ: مسرت حسین آزاد / عابد رضا بیدار ۲۰/
ایک نوجوان ہندوستانی مسلمان کی ڈائری جو ۱۹۷۱ء میں چل بسا
مرتبہ: عابد رضا بیدار ۵۰/
رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز ایک تعارف
(ادارہ) ۱/
باقیات زمانہ نمبر ۳ (رسالہ زمانہ کا پنور سے انتخاب) ۲۵۰/
دیانرائن نگم اور رسالہ زمانہ و اخبار آزاد نمبر ۳۲ ۱۵۰/
زمانہ ۱۹۰۳ء تا ۱۹۴۲ء کے مشتملات کی فہرست نمبر ۳۳ ۱۵۰/
شعرا کے تذکرے قاضی عبدالودود ۲۰۰/
ذاکر صاحب کے خط (عکسی اڈیشن) ۲۵۰/
اردو میں دانشوری (خدا بخش دانشوری سیمینار ۱۹۸۶ء
کے مقالات) ۲۵۰/

مہمان مدیر
مسعود احمد برکاتی
ہمدرد فاؤنڈیشن
کراچی

اشاریہ

تشویش معلومات

ہر دور اپنے مسائل ساتھ لاتا ہے۔ اس گزرتے ہوئے دور کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ اس دور میں زندہ رہنے کے لیے آپ کو ہر لمحہ بڑھتی ہوئی معلومات و اطلاعات کو اپنے میں جذب کرنا پڑتا ہے۔ یہ معلومات اتنی وسیع، متنوع، متفرق بلکہ منتشر ہیں کہ اُن سے نبرد آزما ہونا، اُن میں سے انتخاب کرنا، اُن کا ترک و اختیار خود اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ بعض وقت ذہنی یا جذباتی قسم کا مسئلہ بن جاتا ہے جو انسان کو اعصابیت میں مبتلا کرنے والے مسائل میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہم اس دور کی کن کن باتوں، کن ضرورتوں اور کن کن انکشافات و ایجادات کو سمجھتے ہیں اور کن کن کو نہیں سمجھتے۔ سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان ہر لمحہ بڑھتا ہوا فاصلہ بھی ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ذہنی الجھن یا پریشانی کا باعث ہو جاتا ہے۔ جتنا کچھ اُسے معلوم ہے اور جتنا کچھ اُسے معلوم ہونا چاہیے، اس کا درمیانی فاصلہ اپنی جگہ ایک مستقل فکرمندی کا ذریعہ ہے۔ آج کا باشعور اور حساس انسان اس فاصلے کو کم سے کم کرنا چاہتا ہے۔ یہ خواہش اس کی فکرمندی اور احساسِ بے بسی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔

اکثر تعلیم یافتہ افراد سوچتے ہیں کہ اُن کو جو کچھ معلوم ہے وہ بہت کم ہے اور اُن کو بہت کچھ جاننا چاہیے۔ یہ احساس مستقل روگ بن جاتا ہے۔ علم کی زیادتی علم کی کمی کا احساس دلاتی ہے اور یہ تو بڑی پُرانی بات ہے کہ جو جتنا وسیع علم رکھتا ہے اُتنا ہی اس کو معلوم ہے کہ وہ علم کی اس سے کہیں وسیع دنیا سے ناواقف ہے۔ کم جاننے والا اتنا غیر مطمئن نہیں ہوتا جتنا غیر مطمئن زیادہ جاننے والا، زیادہ باخبر، زیادہ علم والا ہوتا ہے۔

لیکن اس دور کے حوالے سے بات ذرا مختلف ہو گئی ہے۔ چھپے ہوئے حروف کی بے انتہا کثرت، ذرائع ابلاغ کی وسعت اور ایجادات (ایجادات سے زیادہ تجارتی اختراعات، میکانکی ذرائع، برقی و برقیاتی آلات) کے اعلانات و اشتہارات نے انسانی حواس کو گھنا دیا ہے۔ طباعت و اشاعت کی سہولتوں نے اطلاعات کو سہل الحصول بنا کر عام دسترس میں پہنچا دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اس صورتِ حال کے ردِعمل دو قسم کے ہوئے ہیں۔ ایک تو حد سے زیادہ مرعوبیت بلکہ مایوسی کے نتیجے میں علم سے بالکل بے تعلقی اور دوری کا رویہ، دوسرے زیادہ سے زیادہ معلومات و اطلاعات حاصل کرنے کا شوق بلکہ جنون۔

دوسرے رویے والا آدمی کسی بات پر یہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں نہیں جانتا۔ بات کوئی ہو، مسئلہ

کوئی ہو، شعبہ کوئی ہو، اس کو اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے احساسِ محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی ذہنی رویے کے نتیجے میں ہر وقت اپنی بے خبری کا احساس، اخبار کی ہر خبر پڑھنے کی کوشش، اور ہر دوسرے آدمی کو اپنے سے زیادہ باخبر یا باعلم سمجھنے کی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ذہن جب زیادہ توانائی پکڑتا ہے تو ہر اخبار، ہر کتاب بلکہ ہر پمفلٹ ہر ہینڈ بل بلکہ ہر سطر پڑھ ڈالنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ چھپے ہوئے حروف کی بے پناہی اس خواہش میں کامیاب نہیں ہونے دیتی۔ اب تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان ہر چیز پڑھ لے، اور پڑھ لے تو سمجھ بھی لے اور نگل لے۔ ایسے آدمی کی طبیعت پر ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ ہر دوسرے آدمی کو اپنے سے زیادہ باخبر اور پڑھا لکھا (well read) سمجھنے لگتا ہے۔

اس صورتِ حال کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ علم اور معلومات میں فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے بظاہر یہ امتیاز عجیب سا ہے لیکن معلومات محض واقعات، خبروں، ناموں، تاریخوں کے ٹکڑوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور علم کے ساتھ بصیرت، شعور اور تہذیبِ نفس جڑے ہوئے ہیں۔ ہر چیز جاننا ممکن نہیں ہے لیکن کوئی چیز کس درجہ، کس مقام، کس معیار کی ہے، اس کا اندازہ و احساس اور تعین علم کا ثمر ہے۔ جبکہ معلومات رکھنے والا آدمی بہت سی چیزوں کے بارے میں جانتا ہے ان کے نام یا کام سے بھی واقف ہو سکتا ہے لیکن اگر اس میں وہ بصیرت نہیں ہے جو کسی شخص، چیز، واقعے یا کتاب کا صحیح مقام سمجھ سکے تو اس شخص کو صاحبِ معلومات تو کہا جا سکتا ہے، صاحبِ علم ہونے کے زمرے میں وہ نہیں آتا۔

ڈاکٹر جانسن نے علم (Knowledge) کی یہ تعریف کی ہے۔

" Knowledge is to know and to know from where to know "

"علم کا مطلب جاننا ہے اور یہ جاننا بھی علم ہے کہ کہاں سے معلوم کیا جائے"۔ گویا علم ہمیں وہ صلاحیت اور سمجھ بھی عطا کرتا ہے کہ جو چیز ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں سے معلوم کی جائے۔ کس شخص سے پوچھا جائے، کس کتاب میں دیکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ کوئی آدمی ساری زندگی پڑھتا رہے، کوئی اور کام نہ کرے تب بھی علم کے ناپیدا کنار سمندر کے کنارے پر ہی رہے گا اس لیے یہ جذبہ کہ ہر خبر پڑھی جائے، ہر اطلاع سنی جائے، ہر کتاب دیکھی جائے، خبط ہی کے ضمن میں آئے گا۔

یہ کوشش یا عادت فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ آپ ہر آدمی سے ملنا شروع کر دیں تو آپ کے پاس اچھے آدمیوں سے ملنے کا وقت کہاں بچے گا۔ اسی طرح آپ رطب و یابس پڑھ کر اچھی اور بنیادی، خصوصاً پرانی کتابوں کے مطالعے کا وقت غصب کر لیں گے۔

جدید کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے اور اپنے دور کو سمجھنے اور برتنے کے لیے یہ لازمی ہے لیکن اتنا ہی ضروری قدیم کتابوں کا مطالعہ ہے۔ محض نیا پن ہی سب کچھ نہیں۔ نئی معلومات کے پیچھے بہت سے لوگ اس لیے بھاگتے ہیں کہ جاہل نہ سمجھے جائیں بلکہ اپنے پڑھے لکھے ہونے کا سکہ جمائیں۔ اگر ایک ماہرِ قلب درد دل کی کسی ایک نئی دوا سے واقف نہیں ہے تو یہ ایسی بات نہیں ہے جو اس کو مہارت کے مرتبے سے گرا دے۔ وہ قلب کی تشریح (اناٹمی) اس کے افعال، مضر اغذیہ و عوامل کو سمجھتا ہے اور سب سے

بڑھ کر اصولِ علاج سے واقف ہے تو وہ وجع القلب کا علاج ایک دوا سے نہیں دوسری دوا سے کرسکے گا وہ تدابیر بتا سکے گا جن کو اختیار کرکے دورے یا دردِ دل سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک باذوق نقاد یا قاری کو ضروری نہیں کہ غالب کا ہر شعر یاد ہو لیکن کسی شعر کے متعلق اس کا تربیت یافتہ ذہن یہ شبہہ ضرور ظاہر کرسکتا ہے کہ یہ غالب کا شعر نہیں ہوسکتا۔ غالب کے مزاج اور لفظیات سے اس کی واقفیت اور اس کی غالب شناسی اس کو کسی دوسرے کے شعر کو غالب کے سر تھوپنے کی اجازت نہیں دے سکتی اور یہ اس کی غالب شناسی کا ثبوت ہے چاہے وہ حافظِ غالب نہ ہو۔

بلاشبہہ آج کے ادیب کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ ادب کے قاری کو (تنقید، شاعری اور افسانوی ادب کی وسیع تر دنیا سے واسطہ پڑتا ہے۔ رسائل وجرائد کی بھی کثرت ہے۔ ان کے مطالعے میں بھی انتخاب ضروری ہے لیکن انتخاب کے لیے بھی ان سب پر ایک نظر ڈالے بغیر چارہ نہیں ہے۔ رسائل وکتب کے انبار میں سے اپنے مطالعے کے لیے آپ جن کو اوّلیت دیں گے اور ان کا مطالعہ ضروری سمجھیں گے وہ بھی غیر اہم اور کم اہم رسائل وکتب پر سرسری نگاہ ڈال کر ہی ممکن ہوگا۔ تنقید نگار کے لیے تو اور بھی مشکل ہے۔ ادب کی رفتار اور معیار کے تعین کے لیے کم معیار ادب پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہوتی ہے۔ پھر ادب کے علاوہ زندگی کے دوسرے تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی بہت سی چیزیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ فائلوں کی ورق گردانی، رپورٹوں کا جائزہ اور متعلقہ جرنلوں پر نظر ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ توجہ، وقت اور توانائی ان میں بھی صرف ہوتی ہے۔ ان کو دیکھے بغیر آپ نہ کسی سے بات کرسکتے ہیں نہ قلم چلا سکتے ہیں۔

مدیروں کے لیے تو ایک اور مسئلہ بھی ہے ۔ بے شمار مسودات ان کو تقدیر کے لکھے کی طرح پڑھنے پڑتے ہیں۔ مسودات پڑھے بغیر اشاعت کے لیے انتخاب ممکن نہیں ہے اور مثلاً دس اچھے مسودات چننے کے لیے سو برے مسودات بھی پڑھنے ضروری ہیں۔ بری تحریر پڑھنے سے بڑی سزا شاید ہی کسی پڑھے لکھے آدمی کو دی جاسکے۔ وسیع دسترخوان پر لذیذ کھانوں کے ساتھ ایک آدھ بدمزہ کھانا تو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن ایک خوش ذائقہ "ڈش" کے لیے دس بے لذت ڈشیں تو حلق سے نہیں اتر سکتیں۔

خیر یہ تو ضروری بلکہ جبری مطالعہ ہوتا ہے اور منصبی تقاضے کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ علم کی وسعت کے لیے مطالعے میں اب بہت احتیاط اور سخت انتخاب کی ضرورت ہے ورنہ جس کیفیت کو آج کل تشویشِ معلومات (Information Anxiety) کہا جاتا ہے وہ نہ صرف اعصاب شکن ثابت ہوگی بلکہ علمی نقصان کا باعث بھی ہوگی۔ وسیع مطالعے کے باوجود علم کی برکتوں سے محروم رہنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

خصوصی مہارت یا کسی علم کا عمیق مطالعہ پوری یکسوئی، ہمہ وقت غور وفکر اور ریاضت پیہم مطالعے کی قربانی چاہتا ہے۔ اخبارات نے ہماری زندگی میں غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ہے لیکن ان کو کسی قیمت پر بنیادی کتابوں کا وقت نہیں دینا چاہیے۔ میں ایک روز ڈاکٹر لیری ڈوسے کی کتاب Space Time and Medicine پڑھ رہا تھا۔ عنوان کتنا ہی خشک ہو لیکن مجھے یہ کتاب غیر معمولی دلچسپ

اور جاذب طلب لگ رہی تھی۔ شام کا اخبار آیا تو اس کی سنسنی خیز سرخیوں نے ذہن کو جھٹکا یا اور یکسوئی میں فرق ڈالا، کتاب کا کچھ وقت چھین ہی لیا۔ بنیادی کتاب مطالعے میں تسلسل چاہتی ہے۔ میں تھوڑی دیر تشویش معلومات کا شکار رہا لیکن پھر اس کشاکش سے نکل آیا۔

اخبار، ٹی وی اور دوسرے ذرائع ابلاغ کی "معلومات افروزی" کو قابو رکھ کر ہی ہم معلومات کی مرعوبیت سے نکل سکتے ہیں اور وسیع کتابوں کے لیے وقت اور توانائی بچا سکتے ہیں۔ بلاشبہ انسان کی کاہلی اس کو ذہنی ریاض اور مشقت سے گریز پر مائل کرتی ہے لیکن اگر معاشرے کے چند دماغ بھی اس کٹھنائی سے نہ گزریں تو عام انسان تو جاہل ہی رہنا پسند کریں گے۔

اختر سعید خاں
اندرون اطوارہ
بھوپال

غزل

جہاں تک نظر کیجیے گردِ سفر ہے
گزرگاہِ دل بھی عجب رہگزر ہے
یہاں تو بسیرا ہے پرچھائیوں کا
جسے ڈھونڈتا ہوں وہ دنیا کدھر ہے؟

میں خوش ہوں بہت اپنی تنہا روی سے
یہاں کون کس کا ہے مجھ کو خبر ہے
کہاں ساتھ دینے کی مہلت ہے تم کو
ستارو بہت دور میری سحر ہے

کبھی تم کبھی گرمِ رو تھا زمانہ
زمیں دل کی روندی ہوئی کس قدر ہے
ترے عہد کا کیا ہو دستور دیکھیں
ابھی تک تو یہ زندگی دردِ سر ہے

یہ کچھ نقش سے ہیں جو دیوار و در پر
انھی سے یہ گھر آج بھی اپنا گھر ہے
خریدار ہوں یا نہ ہوں آنسوؤں کے
متاعِ ہنر تو یہی چشمِ تر ہے

نہ وہ اجنبی ہے نہ میں اجنبی ہوں
جو کچھ بھی ہے اختر حجابِ نظر ہے

طاہر حسن صدیقی
1808 J STREET
SACRAMENTO
CA 95814--30

علامہ اقبال کی نظم

مسجد قرطبہ

کا

ایک مختصر جائزہ

مسجد قرطبہ علامہ اقبال کی ایک طویل اردو نظم ہے۔ اس میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند میں آٹھ شعر، اس طرح کل اشعار کی تعداد ۶۴ ہے۔ سب سے طویل اردو نظم جواب شکوہ ہے جو مسدس کی طرز پر لکھی گئی ہے، اس میں ۱۰۸ شعر ہیں، اور شکوہ بھی مسدس ہی کے طرز پر ہے اس میں ۹۲ شعر ہیں۔ ہسپانیہ، اندلس اور قرطبہ ایک ہی موضوع کے مختلف رخ ہیں، ان پر کچھ مختصر نظمیں اور بھی ہیں، جن کا تذکرہ نہ کرنا اس موضوع کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ یہ سب نظمیں بال جبریل میں شامل ہیں اور ہسپانیہ، اندلس یا مسجد قرطبہ میں لکھی گئی ہیں۔ بال جبریل کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ قطعات یا نظموں کے دو مجموعہ شروع میں ہیں پہلے میں سولہ (۱۶) نظمیں ہیں اور دوسرے میں ۶۱ نظمیں ہیں۔ ان نظموں کو عنوان کوئی نہیں دیا گیا، بلکہ حوالہ کے لئے ان کو نمبر دیئے گئے ہیں۔ دوسرے مجموعہ کے نمبر ۱۲ پر جو نظم ہے اس کے اشعار قرطبہ میں لکھے گئے ہیں، اس لیے میں نے اس نظم کو بھی اس مطالعہ میں شامل کر لیا ہے۔ اور ترتیب کے لحاظ سے اس کو پہلا نمبر دیا ہے۔ نظم کے ان دونوں مجموعوں کے بعد رباعیات کا مجموعہ ہے

اور پھر قرطبہ سے متعلق چھ نظمیں ایک ساتھ ہیں۔ اس طرح کل سات نظمیں اس موضوع سے متعلق ہیں۔ ترتیب اس طرح ہے ۔(۲) دعا۔(۳) مسجد قرطبہ ۔(۴) قید خانہ میں معتمد کی فریاد ۔(۵) عبدالرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت ۔(۶) ہسپانیہ اور آخر میں (۷) طارق کی دعا ۔ ان تمام نظموں کے مختصر جائزہ سے امید ہے کہ مسجد قرطبہ اور ان نظموں کا مجموعی تاثر پیدا کرنے میں مدد ملے گی ۔

(۱) سات شعروں کی اس نظم میں جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، اقبال کے احساسات جو قرطبہ کی سرزمین سے وابستہ ہیں، ملاحظہ ہوں ---

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
ہوائے قرطبہ، شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شباب

(۲) نظم "دعا" میں گیارہ شعر ہیں اور یہ "مسجد قرطبہ" سے متصل اور اس سے پہلے ہے، اس کا انداز ملاحظہ فرمائیے

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
میرا نشیمن نہیں، درگہ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو، شاخ نشیمن بھی تو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو

سرزمین اندلس اور قرطبہ کے ذکر اور قربت کے تصور سے روح زمین کا کانپنا منبر و

[redacted]

ضراب کا تو بنا، نواؤں میں سوز و سرور اور جگر کا لہو، زندگی میں سوزِ تب، درد و داغ، نور و حضور، لالہ کا لب آبجو سرخوش و پرسوز ہونا، یہ ہیں وہ خیالات جو بار بار شاعر کے دماغ میں آتے ہیں، اور اگر قربت نہ ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ـــــ

پاس اگر تو نہیں، شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

اس لئے شاعر یہ دعا کرتا ہے کہ ـــ

چشمِ کرم ساقیا، دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو، خلوتیوں کے سبو

(۳) دعا" کے بعد نظم "مسجد قرطبہ" ہے، جو اس مضمون کا موضوع ہے، لیکن پہلے میں باقی چار نظموں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں

(۴) مسجد قرطبہ کے بعد "قید خانہ میں معتمد کی فریاد ہے ۔ "معتمد اشبیلیہ بادشاہ اور عربی شاعر تھا جس کو شکست دے کر ہسپانیہ کے ایک حکمران نے قید میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں، انگریزی زبان میں ترجمہ ہو کر وزڈم آف دی ایسٹ سیریز میں شائع ہو چکی ہیں" ۔ چونکہ اس بادشاہ کا تعلق سرزمین اندلس سے ہے، غالباً اسی لئے اس نظم کو مسجد قرطبہ کے متصل رکھا گیا ہے ۔ یہ مختصر سی چار اشعار کی نظم ہے، جس میں نہایت متانت اور پراثر انداز سے شاعر نے اپنے درد کی کسک بیان کی ہے ۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں

خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل تھی اسی فولاد سے شاید مری تلوار بھی
جو مری تیغ دو دم تھی اب مری زنجیر ہے شوخ و بے پروا ہے کتنا خالق تقدیر بھی

(۵) اس کے بعد جو نظم ہے، وہ آزاد ترجمہ ہے ان اشعار کا" جو عبدالرحمٰن اول کی تصنیف سے ہیں اور تاریخ المقری میں درج ہیں"۔ نظم کا عنوان ہے۔" عبدالرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت"۔ یہ درخت مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا۔ یہ اشعار اس زمانہ کی یاد دلاتے ہیں جب اندلس پر اسلامی پرچم پوری شان و شوکت سے لہرا رہا تھا۔ چھوٹی بحر میں نہایت شگفتہ انداز سے یہ ترجمہ پانچ پانچ اشعار کے دو بندوں میں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کس محبت اور فخر و عقیدت سے شاعر (جو ایک حکمراں بھی ہے) اس چھوٹے سے کھجور کے پودے کا ذکر کرتا ہے جس سے اس کا اپنی ثقافت سے گہرا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ آخری شعر میں طارق کے قول۔ "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کی صدائے بازگشت بھی ہے۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں — میرے لئے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حور ہے تو

صبح غربت میں آ کے چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے — مومن کا مقام ہر کہیں ہے

(۶) اس کے بعد نظم "ہسپانیہ" ہے، جس میں سات شعر ہیں۔ یہ نظم شروع ہوتی ہے شاعر کے اس مشاہدہ کے ساتھ کہ۔۔

ہسپانیہ تو خون مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پھر اس کی خاک میں سجدوں کے نشانوں اور باد سحر میں خاموش اذانوں، ستاروں کی طرح روشن سنانوں اور کوہ و کمر میں استادہ خیموں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے ----

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خون جگر میں

اس کے بعد خس و خاشاک میں دبے ہوئے مسلمان کا ذکر اور غرناطہ کی گذشتہ عظمت دیکھ کر اپنی حسرت اور تشنگی کے احساس کا یہ اظہار کہ --

دیکھا بھی، دکھایا بھی، سنایا بھی، سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

(۷) آخر میں مشہور نظم "طارق کی دعا" ہے۔ اس نظم میں کل دس اشعار ہیں، پہلے چار شعروں میں شاعر نے طارق کی زبان سے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا ذکر کیا ہے کہ یہ مسلمان تیرے وہ پر اسرار بندے ہیں جن کو تو نے ایسا ذوق بخشا ہے کہ وہ صرف تیری رضا کے طالب ہیں۔ ان کو نہ تو حب مال ہے اور نہ ہوس ملک گیری۔ تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی رکاوٹ بھی ان کا راستہ نہیں روک سکتی۔ پانچویں شعر میں طارق کی ایک خواہش ہے

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے قبا چاہیئے اس کو خون عرب سے

خون عرب کی ضرورت علامہ اقبال نے ایک دوسری جگہ یہ بتائی ہے کہ

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلماں کو وہ ننگ ہے پادشاہی

اس کے بعد تین شعروں میں پھر ان انعامات اور احسانات کا ذکر ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے طارق اور اس کے ساتھیوں کو نوازا تھا۔ اور آخری دو شعروں میں طارق کی زبان سے مسلمانوں کو پھر انہی انعامات سے نوازنے کی دعا ہے۔ ---

دل مردِ مومن کو پھر زندہ کر دے وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

طارق کی دعا کو اس ترتیب میں یہاں رکھنے کا مقصد قاری کے ذہن کے پردے پر وہ پُر عظمت عالی شان اور روح پرور منظر کھینچنا ہے جو طارق کے کارناموں سے وابستہ ہے۔ وہ بطلِ جلیل جس کے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور یقین کا یہ عالم تھا کہ وہ واپسی کے تمام راستے مسدود اور اللہ تعالیٰ کی نصرت پر بھروسا کر کے، فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوتا چلا گیا۔ اور اس کا یہ عمل آج تک ضرب المثل ہے۔ عبدالرحمن اول کی تصنیف سے اقتباس اور طارق کی اس دعا سے وہ نقشہ بھی نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے جو علامہ نے اپنے ترانۂ ملی کے اس شعر میں کھینچا تھا

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

چھ نظموں کا مختصر ذکر کرنے کے بعد میں نفسِ مضمون کی طرف آتا ہوں۔ "مسجد قرطبہ" بہ طرز قصیدہ آٹھ بندوں کی نظم ہے۔ پہلا بند تشبیب، دوسرا گریز اور اس کے بعد پانچ بند مدح کے اور آٹھواں بند اختتامیہ ہے۔ تشبیب میں بہ ظاہر شب و روز اور اس کے عوامل کی کارفرمائیوں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن یہ دستبردِ زمانہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ ایک

[redacted]

فلسفیانہ تصور ہے، جس کی رو سے زندگی ایک حرکت مسلسل کا نام ہے ۔اس میں وقت کی الہیاتی صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور زندگی کو کائنات زمانی میں حرکت مسلسل ہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے ۔اقبال کا یہ تصور حیات خضر راہ میں بھی ہے، جہاں وہ بتلاتے ہوئے دمادم کو زندگی کی دلیل بتاتے ہیں اور زندگی کو، جاوداں، پیہم دواں اور ہردم جواں سے تعبیر کرتے ہیں ۔ساقی نامہ میں بھی تقریباً یہی تصور اجاگر کیا گیا ہے۔

دمادم رواں ہے یم زندگی　　ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
فریب نظر ہے سکون و ثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرہء کائنات

پوری تشبیب میں سلسلہ روز و شب ہی کا ذکر ہے ۔ اس میں تشبیہوں کی ندرت کے ساتھ بھرپور معنویت ہے اور موضوع سے ان کی لطیف مناسبت بھی ۔ یہ سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات بھی ہے اور اصل حیات و ممات بھی، یہ تار حریر دو رنگ بھی ہے، جس سے ذات الہی اپنی قبائے صفات کا تانا بانا بناتی ہے اور ساز ازل کی فغاں بھی جس سے ذات واجب زیر و بم ممکنات (دنیا کے اونچ نیچ) دکھاتی ہے ۔ہمارے شب و روز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ یہ زمانہ کی حرکت مسلسل ہے جس میں یہ دن رات نہیں ہیں بلکہ یہ ایک موج اور اتار چڑھاؤ کی کیفیت ہے جو ایک مسلسل زیر و بم کی حرکت (Rythmic motion) کے ذریعہ دن رات کا تصور پیش کرتی ہے ۔انسانی کار گذاریوں اور ہنر مندیوں کو کوئی ثبات نہیں ۔ تشبیب کا آخری شعر ہے ----

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا　　نقش کہن ہو کہ نو، منزل آخر فنا

تشبیب پڑھنے کے بعد قاری کو خیال ہوتا ہے کہ اس کے بعد شاید شاعر مرثیہ کا آغاز کرے گا، لیکن اقبال گریز میں قاری کو ایک دوسری نوید سناتے ہیں کہ ہمیشگی اور

پائندگی اسی ذات بے ہمتا کو ہے' اور وہ کارنامے جو مردِ خدا انجام دیتا ہے اور جو عشق الٰہی کے ثمرہ میں وجود میں آتے ہیں وہ دوامی ہیں۔ گریز کا پہلا شعر ملاحظہ ہو۔۔۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات دوام　　جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

گریز میں وہ مردِ خدا کے عمل کو عشقِ الٰہی کے ثمر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ مردِ خدا کا عمل عشقِ الٰہی سے پیدا ہوتا ہے' اسی سے تقویت پاتا ہے اور اسی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ عشق اصل حیات ہے' موت اس پر حرام ہے۔ زمانہ کی رفتار خواہ کتنی ہی طوفانی ہو' عشق اس کو روک سکتا ہے' کیونکہ وہ خود ایک طوفان ہے۔ عشقِ الٰہی کے ذکر میں ان کے قلم سے جو خیالات گہرباری کرتے ہیں' وہ ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا ایسے منسلک ہیں کہ موتیوں کے ہار میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا شعر ایسے جذبے اور جوش سے آتا ہے جیسے دریا کی روانی۔ مختصراً تشبیہیں ملاحظہ فرمائیے۔۔۔ عشق دمِ جبرئیل۔ عشق دلِ مصطفیٰ' عشق خدا کا رسول' عشق خدا کا کلام' عشق فقیہِ حرم' عشق امیرِ جنود' عشق ہے ابن السبیل' اس کے ہزاروں مقام۔ ایک تموج' ایک رو' ایک لہر ہے کہ ایک کے بعد دوسری' اور دوسری کے بعد تیسری چڑھی چلی آتی ہے' اور ٹھہرتی ہے یہاں آکر کہ۔۔۔۔

عشق کی مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق ہے نورِ حیات' عشق ہے نارِ حیات

الفاظ پر شکوہ' خیالات عالی شان' اثر آفاقی' موسیقی حروف کی غنائیت اور مفہوم کی معنویت سے بھرپور وجد میں لانے والی۔ یہ ہے وہ تاثر جو اس بند کو پڑھ کر ہوتا ہے اور نظم کے آخر تک قائم رہتا ہے۔

تیسرے بند میں مدح کی ابتداء ہے۔ یہاں بھی اسی عشق کا ذکر ہے جس کی ابتداء گریز میں کی گئی تھی۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ تشبیب سے گریز اور گریز سے مدح اس طرح ایک

کے بعد دوسری آتی ہیں کہ گریز تشبیب[15] کا اور مدح گریز کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ گریز میں نظریاتی طور پر عشق کی صفات کا ذکر تھا، مدح میں ان صفات کی ٹھوس مثال حرم قرطبہ بتائی گئی ہے ----

اے حرم قرطبہ عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود

لیکن عشق کا یہ ثمر حاصل کرنے کے لئے خون جگر کی ضرورت ہوتی ہے، مشقت پسندی، عرق ریزی اور اپنے مقصد سے لگن چاہیئے، تب کہیں جا کر گوہر مقصود حاصل ہو تا ہے۔ جس کو عشق ہو تا ہے وہ دیوار کے سائے کے تلے آرام نہیں ڈھونڈتا، اس کو تو رات دن ایک ہی لگن رہتی ہے، خوب سے خوب تر کی تلاش میں درد دل، درد جگر، صرف کرتا ہے، مشقت پسندی اختیار کرتا ہے، عرق ریزی کرتا ہے۔ اسی لیے وہ کہ اٹھتا ہے --

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد دل جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

اقبال نے جس جذبہ عشق اور خون جگر کا ذکر کیا ہے، وہ شاعری کا خالق نہیں بلکہ وہ ایسی تعمیر کا خالق ہے جس کا نام حرم قرطبہ ہے۔ تعمیر مسجد کا محرک اور خالق تو ہوتا ہی عشق الٰہی ہے، معمار مسجد کا جذبہ اسی عشق اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب ایک شاعر کو اپنے دیوان کے لیے اتنے درد دل جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو معمار کو رضائے الٰہی کی خاطر جس خون جگر کی ضرورت ہو گی، اس کا کیا ٹھکانا۔

غالب نے کہا تھا ----

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رلائے کیوں

لیکن اقبال کا پیام دوسرا ہے، اور اس لیے اس کا طرز کلام بھی مختلف ہے -----

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

قطرۂ خونِ جگر، سل کو بناتا ہے دل

خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

غالب کا دل رونے کے جذبہ سے اس لیے سرشار ہوتا ہے کہ وہ دل ہے، سنگ و خشت نہیں، لیکن اقبال کا رونے کا جذبہ مختلف ہے۔ وہ پتھر ہی کو اپنے خونِ جگر سے زندگی عطا کر کے دل بنا دیتے ہیں۔ وہ دل جو خود دھڑکتا ہے، دوسروں کے دلوں کو دھڑکاتا ہے۔ اس کی آواز صدا بصحرا نہیں رہتی، بلکہ قاری کے دل کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے، اس کے جذبات کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ اور بے اختیار اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ اس میں قاری کے شاندار ماضی کا ذکر ہے، بلکہ اس لیے کہ شاعر کے دل سے جو شرارے نکلے ہیں، وہ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس شاعر کا دل اپنے آباؤ اجداد کے فنون کے خزانے اور علم کے موتی دیارِ فرنگ اور قبضۂ اغیار میں دیکھ کر سی پارہ ہو جاتا ہو، تو کیا اس کے اشعار کو پڑھ کر قاری کا دل دو نیم بھی نہ ہو گا۔

معجزۂ فن بھی اسی خونِ جگر کے قطرہ سے وجود میں آتا ہے، اور پتھر کو زبان عطا کرتا ہے، یہی وہ معجزہ ہے جو حرمِ قرطبہ کے در و دیوار سے ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر کی نوا ہو، مغنی کا نفس، نقاش کی کاوش یا مصنف کی تصنیف، بغیر خونِ جگر کے فن پارے نہیں بنتے۔ وہ خونِ جگر ہی ہے جو مسجدِ قرطبہ کا بنیادی معمار ہے، اسی نے اس کی فضا کو دل فروز بنایا، اور وہی شاعر کی نوا کو سینہ سوز بنانے کا ذمے دار ہے۔ دلوں کا حضور اور کشود بھی اسی کی بدولت ہے۔ یہی سینۂ آدم کی عرشِ معلیٰ تک رسائی کرتا ہے اور اسی سے سجدوں میں گداز ہوتا ہے۔ اور جب شاعر اس بند میں حرمِ قرطبہ کی دل فروز فضا اور اپنی سینہ سوز نوا اور انسان کے سوز و گداز بود کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ذات تک پہنچتا ہے تو کس عاجزانہ انداز سے اپنے نسب کا ذکر اور کس اعلیٰ ظرفی سے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ قاری بے اختیار اسی محبت

سے شاعر کی فراخ دلی اور جذبہ خلوص سے متاثر ہوتا ہے، اور اسی شوق سے نغمۂ اللہ ہو اس کی رگ و پے میں بھی سما جاتا ہے ۔۔۔۔

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق
لب پہ صلوۃ و درود، دل میں صلوۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

تیسرے بند میں تخلیق حرم قرطبہ کا باعث جذبہ، خون جگر کو بتایا گیا تھا، چوتھے بند میں شاعر اسی تخلیق یعنی حرم قرطبہ کا ذکر کرتا ہے جو اس جذبہ سے معرض وجود میں آئی ہے، جس کا جلال و جمال مرد خدا کے جلیل و جمیل اعمال کا نتیجہ ہیں۔ جس کی بنا پائیدار، اور ستون بے شمار ہیں، جیسے شام کے صحرا میں قطار اندر قطار کھجور کے درخت، جس کے در و بام پر وادئ ایمن کا نور ہے، اور جس کے منار بلند جلوہ گاہ جبرئیل ہیں۔ یہ سب تشبیہات قاری کے ذہن کے کینوس پر وہ سارے مناظر پیش کرتی ہیں جس سے حرم قرطبہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اسکے ساتھ وہ عقیدت بھی جو شاعر کو اس تعمیر سے ہے۔ اور پھر جب وہ معماران حرم قرطبہ کا ذکر اسی عقیدت اور خلوص سے کرتا ہے تو تاریخ اپنے اوراق الٹ کر ان پاکباز نفوس کے کردار بھی سامنے لاتی ہے جنھوں نے اس لاجواب تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ وہ مرد مسلمان جس کی اذانوں سے سر کلیم و خلیل فاش ہوا، اس کی زمین بے حدود تھی اور افق لا انتہا۔ دجلہ، دنیوب اور نیل اس کے سمندر کی موج تھے، اس کے زمانے عجیب تھے اور فسانے عجیب تر، جنھوں نے زمانے کو الٹ کر وہ نیا زمانہ لایا، وہ ارباب ذوق کا ساقی اور میدان شوق کا شہسوار تھا، جس کے دل و دماغ میں محبت الٰہی کا گہرا نشہ اور ہاتھ میں ظلمتوں کو مٹانے والی تلوار تھی، اور ۔۔

مرد سپاہی ہے وہ جس کی زرہ لا الہ ۳ سایہء شمشیر میں اس کی پنہ لا الہ

پانچویں بند میں اس راز کا ذکر ہے جو حرم قرطبہ کی تعمیر سے ظاہر ہوا کہ بندہء مومن کے کتنے دنوں کی تپش اور کتنے دلوں اور شبوں کی گدازی اس کی تعمیر میں صرف ہوئی ---

تجھ سے ہوا آشکار ، بندہء مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

اور پھر بندہء مومن کے مقام بلند، خیال عظیم، سرور و شوق اور نیاز و ناز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں --

ہاتھ ہے اللہ کا بندہء مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں ، کار کشا، کارساز

بندہء مومن خاکی ہوتے ہوئے بھی نوری نہاد ہے، وہ بندہء مولاصفات ہے اور اس کا دل بے نیاز دونوں جہاں سے غنی ہے اور وہ صرف اللہ کی رضا کا طالب ہے۔ اس کی امیدیں قلیل ہیں اور مقاصد جلیل ، اس کے اطوار اتنے معصوم ہیں کہ وہ جس پر نظر ڈالتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ بات کرتا ہے تو دھیمے لہجے میں، اور جب کام میں مشغول ہوتا ہے تو مستعد۔ کیا روانی ہے اشعار میں اور کیا محبت ہے ذکر مرد مومن کے کردار میں، ملاحظہ فرمائیے ---

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
عشق کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ حلقہء آفاق میں گرمیء محفل ہے وہ

مرد مومن علامہ اقبال کا مرکزی کردار ہے، جب اور جہاں بھی وہ اس کا ذکر کرتے ہیں، ہمیشہ اسی عقیدت، اسی محبت اور اسی شان سے کرتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ وہ گفتار اور کردار میں اللہ کی برہان ہے، وہ ہمسایہء جبریل امین ہے ، اس کا وطن نہ بخارا ہے نہ بدخشاں اور ---

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورہء رحماں

ایک اور جگہ مرد مومن کے بارے میں۔

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

چھٹے بند میں قرطبہ کے فن اور اس کے فنکاروں کا ذکر ہے۔ مسجد قرطبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو دین مبین کی شان و شوکت ہے اور ارباب فن کے لیے کعبہ کی طرح محترم، اتنی محترم کہ تیری بدولت سرزمین اندلسیہ ہی حرم مرتبت بن گئی، تیرے حسن کی نظیر کہیں نہیں ہے، اگر ہو سکتی ہے تو صرف مسلمان کے دل میں۔ آہ، تیرے معمار کون تھے، وہ مردان حق تھے، حامل خلق عظیم اور صاحب صدق و یقین تھے، جنھوں نے دنیا کو تعلیم دی اور یورپ کو جہالت کے اندھیروں سے روشنی کی طرف راستہ دکھایا اور آج بھی جن کے طفیل اس ملک کے باشندے خوش دل، گرم جوش، سادہ دل اور خوش اخلاق ہیں۔ اور جہاں آج بھی چشم غزال عام ہے اور جس کی ہواؤں اور موسیقی میں آج تک رنگ حجاز پایا جاتا ہے ---

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

ساتویں بند کی ابتداء مایوسی اور حسرت کے جذبے سے ہوتی ہے۔ وہ قرطبہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں تیرے ماضی کے زمین و آسمان تو ستاروں کی نگاہوں میں پوشیدہ ہیں، لیکن آہ

تیری فضا کیوں صدیوں سے بے اذاں ہے اور پھر شاعر اسی زمانے کی تلاش میں سرگرداں یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سخت جان لوگ کہاں چلے گئے جنھوں نے اپنے خون سے اس چمن کی آبیاری کی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عشق بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں؟ — کون سی منزل میں ہے کون سی محفل ہے ؟

اور زمانہ اور حالات زمانہ کا تجزیہ کرتے ہوئے، شاعر اس سوال کے جواب کے لیے پرامید نظروں سے دیکھتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گنبد نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟ — دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا؟

آٹھواں بند، جو اختتامیہ ہے، وہ غالباً اس امید کا جواب ہے جو ساتویں بند کے اخیر میں نظر آتی ہے ۔ گنبد نیلوفری رنگ بدل چکا ہے، پہاڑوں کی وادی میں بادل شفق میں ڈوب گئے ہیں، سطوت اسلام کا آفتاب غروب ہو کر جاتے ہوئے، اپنا خزانہ خون شہدا کی لالی میں ڈبو کر بدخشاں کے لالوں کے ڈھیر کی صورت میں چھوڑ گیا ہے، اور شاعر آب رواں کبیر کے کنارے اسی عظمت اسلام کے خواب دیکھنے میں محو ہے ۔ عالم نو تو ابھی پردۂ تقدیر میں ہے لیکن اس کا کچھ تھوڑا سا حال شاعر کو بھی نظر آ رہا ہے، اور وہ تصویر کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر شاعر اس سے پردہ اٹھا دے تو اہل فرنگ چیخ اٹھیں گے ۔ ان کے ظلم و ستم کی کہانیاں اور چیرہ دستیوں کی منصوبہ بندیاں جو انھوں نے کی ہیں اور جو وہ کرنے جا رہے ہیں، وہ سب منصۂ شہود پر آجائیں گی جس کی وہ تاب نہ لا سکیں گے ۔

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب — پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے

آخر میں شاعر جس نتیجہ پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے

(۱) انقلاب زندگی ہے اور یہی قوموں کی زندگی کی روح بھی ہے ۔

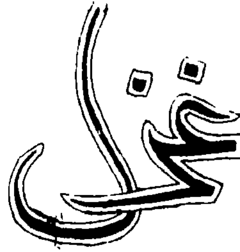
(۲) ہر قوم کو اپنا احتساب کرنا چاہیئے ۔ جو قوم اپنے ہر عمل کا احتساب کرتی رہتی ہے وہی زمانے کے ہر حملے کا منہ توڑ جواب دے سکتی ہے

(۲) خون جگر اور عرق ریزی کے بغیر، تن آسانی سے جو کام بھی کیا جائے گا وہ نقش ناتمام اور سودائے خام کی طرح ہے ۔ خود شاعر کے الفاظ میں -----

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب
صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

راقم السطور کے نزدیک نظم "مسجد قرطبہ" کے یہ آخری تین شعر اس نظم کا نچوڑ ہیں اور یہ ہمارے لیے عمل کی راہ بھی متعین کرتے ہیں۔

زبیر فاروقی
شعبۂ عربی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵



وہ میری زندگی کو معتبر ہونے نہیں دیتا
میں صاحب دل تو ہوں صاحب نظر ہونے نہیں دیتا

جگا دیتا ہے ہر موسم میں کچھ ارماں نئے دل میں
وہ شاخ گل کو بے برگ و ثمر ہونے نہیں دیتا

نمو سے میری اندیشے ہیں کیا کیا صحن گلشن میں
میں وہ پودا جسے گلچیں شجر ہونے نہیں دیتا

غلط فہمی کی دیواریں یقیناً ختم ہو جاتیں
مگر یہ کام اپنا نامہ بر ہونے نہیں دیتا

میں جام جم تو کیا جام سفالیں بھی نہ بن پایا
کوئی بھی شکل دست کوزہ گر ہونے نہیں دیتا

دیا دست دعا مجھ کو تو، توفیق دعا بھی دی
دعاؤں میں مری لیکن اثر ہونے نہیں دیتا

احمد صغیر صدیقی
بی۔ ۸۔ کرسٹل بنگلو
موڈل کالونی۔ کراچی

حاشیہ

خزاں گزرنے کے بعد
جب
موسم بہاراں کی پہلی چاپوں پہ
کوئی ننھی کلی
کسی سبز و سرخ روزن پہ آنکھ رکھ کر
بدن اٹھاتی خلاؤں۔۔
رنگوں میں سرسراتی ہوئی ہواؤں۔۔
فضاؤں کی اپسراؤں کی اور جھانکے
تو اپنی آنکھوں میں تم یہ منظر آتار لینا

کہ اس کی مانند
ہم بھی اک روز اپنا لہو سجا کر
وجود کے سب علم اٹھا کر
بہار کی پہلی روشنی کو سلام کرنے
روش روش پر کھڑے ہوئے تھے
سسکتے لمحوں کی تختیوں پر
مہکتی رو پہلی رُت کی اس قرمزی، کاسنی کہانی کو جب بھی لکھنا
تو حاشیے کے ادھر۔۔۔
بکھرتے، اُڑتے اُڑتے زرد خاک گوں پیکروں کی صورت
کہیں ہمیں بھی ابھار دینا

حبیب تنویر

ہیرے کی انگوٹھی

ایک معجزہ اکبر پور میں ہم نے بھی کل دیکھا تھا
دن بھی تھا اور دور دور تک فضائیں رات بھی چھائی تھی

اک پل چڑیاں نکلی ہی تھیں دوسرے پل واپس آئیں
صبح کے پاکیزہ چہرے سے شام بھی لپٹی آئی تھی

جھوم کے سورج کود آیا تھا چاند کی کھڑکی سے اندر
اور دہلیز پہ تین ستاروں کی اک صف نکل آئی تھی

ہر عالمتاب کا نور اور چاند کی باہوں میں ہو بند
جوشِ فراواں میں سورج نے گود اپنی پھیلائی تھی

بل کھاتے سایے لپکے تھے زلف پریشاں کی مانند
صبح بھی تھی کچھ بہکی بہکی، شام بھی کچھ بورائی تھی

آسمان پر کھلے عشق کے سب آثار نمایاں تھے
شوق کا عالم محشر خیز، قیامت کی رسوائی تھی

چاند نے سورج کے مکھڑے پر نیلا آنچل پھینکا تھ
سورج نے بڑھ کے انگوٹھی ہیرے کی پہنائی تھی

ایک معجزہ اکبر پور میں ہم نے بھی کل دیکھا تھا

علی احمد جلیلی
جلیل منزل، مکان نمبر ۲۲/۱/۳/۴۳/۱
سلطان پورہ، حیدرآباد

اقبال متین
کہانی، کتاب نگر
نظام آباد۔ اے۔ پی

غزلیں

جلن بہار کا کچھ اب کے سال ایسا تھا
لہو تھے پھول، سماں ڈال ڈال ایسا تھا

قریب ہو کے بھی وہ جیسے دور تھا ہم سے
ہمارے بیچ خط انفصال ایسا تھا

جو دیکھا چھو کے اُسے ہاتھ ہو گئے زخمی
وہ پھول سے بھی ہے نازک خیال ایسا تھا

وہ رو کے نکلا تھا گھر سے ذرا گماں نہ ہوا
خراب حال کا چہرہ بحال ایسا تھا

ہر اک قدم پہ جلانے پڑے جنوں کے چراغ
رہِ خرد میں اجالوں کا کال ایسا تھا

گھٹائیں آگئیں گھر کر، یہی گمان ہوا
کوئی سمیٹے ہوئے بال بال ایسا تھا

لبوں کو دے گئی زحمت نہ بولنے کی علی
سوال بن گئے ہم خود، سوال ایسا تھا

ایک کچی کلی چٹکی میں مسل کر آئے
وہ بغیچے میں مرے ہاتھوں کو مل کر آئے

ساری محفل میں سبھی تیرے ہیں لیکن جاناں
بات جب ہے کہ تو، گھر تک مرے چل کر آئے

دم دلاسہ تو سبھی دیتے ہیں دینے والے
کوئی سچ ہے تو کسی دل سے نکل کر آئے

میں تو مٹی کی طرح جھڑتا ہوں اپنے گھر میں
جو بھی آئے در و دیوار میں ڈھل کر آئے

قتل ہو کر بھی تو رسوائے زمانہ ہیں ہم
سُرخ رو ہو کے جو آئے وہ سنبھل کر آئے

خون کے دھبے ہیں دُھل جائیں گے دُھلتے دُھلتے
اس سے کہہ دو کہ وہ پوشاک بدل کر آئے

ہم بھی رو رو کے ابھی سوئے تھے اقبال متین
وہ بھی کمرے سے دبے پاؤں نکل کر آئے

ایلی جینڈر پیذرنک
مترجم
احمد سہیل
321 Old Elkart Road
37
Palestine, Tx 75801
(U.S.A)

نقاب اور نظم

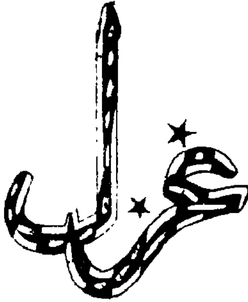
بچپن کی زیارت گاہ کا شاندار محل
غروب آفتاب اور رسیوں میں جکڑا گہوارہ
زنداں میں رکھا جائے گا
وہ کھنڈرات سے خانقاہ لے چکی ہے
وہ تنہا واپس آئے گی

پستی

میں وحشی دنوں کو چھپا چکی ہوں
ہوا اور بارش مجھے مٹا رہے ہیں
ایک آگ نظم کی طرح
ایک دیوار پر لکھا ہے

ایلی جینڈر پیذرنک
ارجنٹائن کی شاعرہ ہیں ۱۹۳۹ بیونس آئرس میں پیدا ہوئیں
انھوں نے شاعری کے علاوہ ڈرامے، ناول اور ادبی تنقید بھی
لکھی جو ترجمہ ہو کر امریکا اور یورپ میں شائع ہو چکے ہیں۔ پیذرنک
نے ۱۹۷۲ء میں خودکشی کی۔

شفیق اعظمی
سرائے میر، اعظم گڑھ
یو، پی



پھول، سبزہ، رنگ، خوشبو، رس، ہوا لیتے چلیں
جس طرف جائیں اُدھر ہم اک فضا لیتے چلیں

شوق منزل آشنا کو ہم سفر کر لیجیے
اجنبی ہیں ہم تو کوئی رہنما لیتے چلیں

کیا ضروری ہے کہ وہ ہر بار وعدہ توڑ دے
آیئے آج اور اک عہدِ وفا لیتے چلیں

داغ دل، زخم جگر، خون تمنا ہی سہی
کچھ تو ہم اپنی وفاؤں کا صلہ لیتے چلیں

عہد فرعونی میں اتنی بے حسی اچھی نہیں
ہم کلیم وقت ہیں تو معجزا لیتے چلیں

جس کی قسمت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے شفیقؔ
آیئے اس کے لیے بھی اک دیا لیتے چلیں

شجاع خاور
۱-پارک لین، تال کٹورا پارک
نئی دہلی ۱



کیا ستم ہے۔ وفا کرے کوئی
اور دل میں رہا کرے کوئی

کام باقی ہے بس فرشتوں کا
صور پھونکے خدا کرے کوئی

آگ کا کام تو جلانا ہے
کیوں مرا سامنا کرے کوئی

میں ملاؤں کسی کو سب سے مگر
مجھ کو سب سے جُدا کرے کوئی

آسماں کا بھی امتحاں ہو جائے
میرے حق میں دعا کرے کوئی

جسم جو کہیے مان جاتا ہے
آرزوؤں کا کیا کرے کوئی

ہم کسی کا بُرا نہیں کرتے
کیوں ہمارا بُرا کرے کوئی

ایک بیعت سے کام سو نکلیں
کربلا کیوں بپا کرے کوئی

وصل میں کون سے ملے تھے وہ
رنج کیا ہجر کا کرے کوئی

میں ہی کیا ساری کائنات ہے گم
کیا کسی کا پتا کرے کوئی

لطفِ منزل لیا کرے کوئی
اور طے راستہ کرے کوئی

روح بیمار پڑ گئی ہے شجاعؔ
جسم کی کیا دوا کرے کوئی

حیدر قریشی
AUF DER ROOS 7
65795 HATTERSHEIM1
GERMANY

شاکر رام پوری
اے ۱۰/۷/۱ پارک سائٹ
وکرولی۔ بمبئی ۷۹

غزلیں

عشق کی دنیا کے ان دیکھے نگر رہتے ہیں
عمر تھوڑی سی ہے اور اتنے سفر رہتے ہیں

ابھی کچھ اور چکانے ہیں زمانے کے حساب
اس کے کچھ قرض ابھی تک مرے سر رہتے ہیں

کبھی سوچا ہی نہیں آپ نے یہ کون ہیں جو
اپنا گھر ہوتے ہوئے آپ کے گھر رہتے ہیں

شہر اک اور وہاں آپ ہی بس جاتا ہے
جس جگہ جا کے ترے شہر بدر رہتے ہیں

متلاطم ہے ابھی تک مرے دل کا دریا!
اور دریا میں بہت سارے بھنور رہتے ہیں

جسم کا سحر، طلسم آنکھ کا، لب کا منتر
اس میں بھی کتنے فسوں ساز ہنر رہتے ہیں

چور سا آن چھپا ہے مرے من میں حیدر
اس کے سینے میں بھی سو طرح کے ڈر رہتے ہیں

وقت ہے وقت یہ اب اس کی ہوا کچھ بھی نہیں
جو بندھی دیکھی کبھی اب وہ ہوا کچھ بھی نہیں

لذتیں لوٹی تھیں کل چل کے انہی راہوں پر
عیش ساماں ہے فضا پھر بھی مزا کچھ بھی نہیں

اللہ اللہ وہی کہتے نظر آتے ہیں یہاں
کل جو تن تن کے سناتے تھے خدا کچھ بھی نہیں

یہ بھی اس شوخ کا انداز دل آرا دیکھو
خط مجھے بھیج دیا اور لکھا کچھ بھی نہیں

بے حسی کھینچ کے لے آئی کہاں جانے مجھے
رنگ و بو کچھ بھی نہیں شیریں نوا کچھ بھی نہیں

لوگ کہتے ہیں عجب لکھی غزل شاکر نے
خود فریبی کا چلن جس میں گلہ کچھ بھی نہیں

رتن چند اثر
ایچ-۱۲۴ بلاک، سری گنگانگر

وقت

تو سمجھتا ہے کہ تو نے وقت کو
کر لیا ہے قید
لمحوں۔ ساعتوں۔ ہفتوں۔ مہینوں
کے خیالی جال میں
اور یہ، کہ اُس خیالی جال کی
ریشمی ڈوری ہے تیرے ہاتھ میں
جس کو مرضی کے مطابق
کھینچ کر۔ یا دیکے ڈھیل
ناچ تگنی کا نچا سکتا ہے تو
وقت کو اُلّو بنا سکتا ہے تو
لیکن اے نادان شخص
وقت اِک اُلّو نہیں
یا کوئی توتا، کوئی مینا نہیں
جس کو تفریح تفنن کے لیے
رکھ سکے پنجروں میں اپنے پال کر
وقت ہے گنجا عقاب
خود سر و خود احتساب
جب بھی اس کے من میں اُٹھّے گی ترنگ
اور وہ اُڑنا چاہے گا مثلِ پتنگ
ایک ہی جھٹکے سے اپنے پنجۂ بے رحم کے
توڑ کر یہ تیری ڈوری
نوچ کر حلقۂ دام
پھُر سے اُڑ جائے گا
اور تو
ہاتھ ملتا دیکھتا رہ جائے گا۔

سعید گورکھپوری
سی/۱۸۴/۱۰، ترکمان پور
گورکھپور یو، پی



اپنا دشمن جہان ہے اس وقت
دل کو ناحق گمان ہے اس وقت

ہے مناسب یہی کہ آجاؤ
خالی غم کا مکان ہے اس وقت

کہتے رہیے کہ سُن رہا ہوں میں
کتنی شیریں زبان ہے اس وقت

پوری دنیا پہ چھا گئی یارو
اردو ایسی زبان ہے اس وقت

جانے کب تک ستم یہ ڈھائے گا
سر پہ جو آسمان ہے اس وقت

کون آیا نہیں ہے اپنا عزیز
کس میں اٹکی یہ جان ہے اس وقت

ہے جو باہم یہ اتحاد سعید
عظمتوں کا نشان ہے اس وقت

اختر وامق
۱۰۶، بی، عید گاہ
نیر بستان کوٹھی، بھوپال



وہ شخص جو قریب تھا سایہ تھا خواب تھا
اک جھوٹ سچ کے پردے میں کیا کامیاب تھا

کیسا عجیب دوست وہ خانہ خراب تھا
آنکھیں چراغ، تلخ زباں، دل گلاب تھا

اک روز بھی پڑھا نہ پلٹ کر کوئی ورق
اس کے تئیں میں ایک پرانی کتاب تھا

اچھے تھے دن جو بے خبری میں گزر گئے
ہر لمحہ آگہی کا مجھے اک عذاب تھا

وہ جسم صرف جسم نہیں تھا کہ بھول جائیں
سر تا قدم وفا کا مکمل نصاب تھا

اس کی کتابِ دل میں کوئی ذکر ہو نہ ہو
ہاں، سرورق پہ میرے لیے انتساب تھا

وامق ہیں اس کے طنز پہ چپ ہوں کہ میرے پاس
بیہودگی کا اس کے سوا کیا جواب تھا

پروین صدیقی
۹۳، اقبال باغ۔ گرلس کالج روڈ
علی گڑھ ۲



(غالب کی زمین میں)

جو ساتھ رہ کے بھی سمجھے نہ ان کی خو کیا ہے
تو کیسے جانیں گے دنیا کا رنگ و بو کیا ہے

لگائے چہرے پہ یوں اس نے انگنت چہرے
کہ ہم نہ جان سکے دوست کیا عدو کیا ہے

لہو کا رنگ تو اک جیسا سب کا ہے لیکن
شریف خون کی بھی جانئے کہ تُو کیا ہے

جہاں میں اور بھی لاکھوں ہیں ایک ہم ہی نہیں
نظر میں جن کی زمانے کی آبرو کیا ہے

وہیں پہ جانیے معراجِ عشق ہے یارو
جہاں نہ ہوش رہے چاک کیا رفو کیا ہے

اسی امید پہ ہم نے گزار دی پروینؔ
کبھی تو پوچھیں گے وہ تیری آرزو کیا ہے

بزمی مجاہدی
بزمی لاج ۳/۱۰۰ اقبال باغ
گرلس کالج روڈ۔ علی گڑھ۔ یوپی

"جاں گسل المیہ"

ہائے سیفی یہ کیا کیا تم نے
دل کو چپ چاپ میرے توڑ گئے
کیا کہوں اس ستم ظریفی کو
مجھ کو روتا ہوا ہی چھوڑ گئے

ساٹھ سالہ رفاقتوں کی ڈور
جس میں کل تک بندھے ہوئے تھے ہم
دستِ فطرت نے اس کو توڑ دیا
جس لڑی میں گندھے ہوئے تھے ہم

میں علی گڑھ سے دلّی کیسے جاؤں
تین سال اس دکھن میں بیت گئے
ہائے مجبوریاں کہ آخر وقت
میں تمھیں تم مجھے نہ دیکھ سکے

وقتِ رخصت مجھے خبر بھی نہ کی
اس قدر بے مروتی اے دوست
لیکن اس کا گلہ ہے تم سے فضول
تم کو خود بھی خبر نہ تھی اے دوست

حرفِ ماضی تھی محفلِ گنگنو
"میری دلّی" کی دلکشی بھی گئی
بھولی بسری کہانیوں کا ذکر
[illegible]

"قطعہ تاریخ وفات"

مرگِ سیفی کا الم ہے بے پناہ
اب دلِ غمگیں ہے اپنا حشرگاہ
کہہ دے بزمی مصرعِ سالِ وفات
"شاعرِ رومان اٹھا دنیا سے آہ"

۱۴۱۶ھ

رمز آفاقی
۵/۴/۱۷ اے کیلا نگر
علی گڑھ۔ یوپی

اہم تاریخ مرگ جناب سیفی پریمی
۱۹۹۵ء

قطعہ تعزیت آں مرحوم
۱۴۱۶ھ

بات یہ دل میں رہے کیوں باقی
رمز کہہ دوں میں خدا لگتی بھی
عیسوی سن میں یہ تاریخ ہے خوب
"داخلِ خلدِ بریں شد سیفی"
۱۹۹۵ء

مانگے کا اُجالا



امہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے

ادبی منشیات

خدا کے فضل و کرم سے اردو کے عام ادیبوں کی طرح ہم بھی مدح و تعریف کے معاملے میں خود کفیل ہیں یعنی اپنی تعریف کرنے اور سننے میں اتنا انہماک رہتا ہے کہ کسی دوسرے کی تعریف کرنے یا سننے کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا لیکن جب کبھی ظفر اقبال کی کوئی غزل یا کالم نظر آجاتا ہے تو ہم اپنے طرزِ عمل اور طرزِ فکر میں تبدیلی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جو کام مجبوری سے کیا جائے وہ خوشی سے نہیں کیا جاتا۔ تاہم یہ سوچ کر ہم اپنے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ جب اہلِ ثروت اپنے مال پر زکوٰۃ دیتے ہیں تو ہمیں بھی اپنے سرمایۂ مدح و تعریف کی زکوٰۃ نکالنی چاہیے۔ اگر اس بہانے کسی دوسرے کے کمالات کے اعتراف کا موقع مل جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لہٰذا ہم کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ ظفر اقبال ہمارے پسندیدہ شاعر اور کالم نگار ہیں۔

ہم اب تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ظفر اقبال اچھے شاعر ہیں یا کالم نگار۔ ہم یہ تو نہیں کہیں گے کہ اُن کی غزل پڑھیں تو ایسا لگتا ہے کہ اُن کا کالم پڑھ رہے ہیں اور کالم پڑھیں تو اس میں غزل کا مزہ آتا ہے اس لیے کہ غزل کی خوبیاں غزل ہی میں نکھر کر سامنے آتی ہیں اور کالم کے اوصاف کالم ہی کو نکھارتے ہیں ظفر اقبال کی غزل کے بارے میں اپنے کسی سابقہ کالم میں ہم محمد حسین آزاد کے حوالے سے عرض کر چکے ہیں کہ موصوف بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے، کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

ظفر اقبال کی کالم نگاری کے بارے میں بھی اگر محمد حسین آزاد کے حوالے سے بات کی جائے تو "آبِ حیات" میں بیان کردہ یہ واقعہ سنایا جا سکتا ہے۔ کسی محفل میں میرزا سودا نے ایک خان صاحب کی ہجو اُن کی موجودگی میں سنائی۔ خان صاحب نے ہجو پوری توجہ سے سنی اور پھر خنجر نکال کر میرزا سودا سے کہا، میں نے تمہاری نظم سنی، اب تم میری نثر سنو۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے خان صاحب کا غصہ ٹھنڈا کیا، ورنہ بھری محفل میں نظم اور نثر کے امتزاج سے نثری نظم کا قضیہ پیدا ہو جاتا اور ادبی تاریخوں میں خان صاحب کا نام نثری نظم کے بانی کی حیثیت سے درج کرنا پڑتا۔

خان صاحب نے جو نثر کا لفظ جس چیز کے لیے استعمال کیا تھا وہی چیز ظفر اقبال کے پاس بھی [illegible] کالم لکھتے ہیں۔ ہم خامہ بگوش ہیں تو وہ خنجر بگوش۔ فرق یہ ہے کہ خامہ

... ہے اور کان بھی اپنا۔ ظفر اقبال کا ... دو مصرعوں کا استعمال میں لاتے ہیں۔ مزید فرق یہ ہے کہ ... ضرورت نادر شاہی تلوار بن جاتا ہے۔ نادر شاہ دوست دشمن میں تمیز نہیں کرتا تھا۔ ظفر اقبال کرتے ہیں دشمن کو غصے سے اور دوست کو محبت سے ایک ہی گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

کچھ عرصے سے ظفر اقبال کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ موصوف نقاد بھی بہت اعلا درجے کے ہیں۔ مزاحمتی ادب کے بارے میں ان کے ایک مقالے پر کچھ عرصہ قبل ہم اظہار خیال کر چکے ہیں۔ اس وقت ان کا جو مقالہ ہمارے سامنے ہے، اس کا عنوان ہے "جدید اردو غزل اور نئی شعریات کی ضرورت"۔ پہلا مقالہ فکر انگیز تھا مگر یہ خاصا تشویش انگیز ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ موجودہ شاعری ناقابل برداشت حد تک یکسانیت کا شکار ہو چکی ہے۔ اُسے مسترد کر کے اس کی شکل و صورت کے ساتھ اس کے معیارات کو بھی تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

شاعری کی موجودہ صورت حال کی تصویر کشی انھوں نے ان الفاظ میں کی ہے "کتابیں دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں اور روایتی سانچے میں ڈھلے ہوئے اشعار ٹنوں کے حساب سے برآمد ہو رہے ہیں۔ حالانکہ روایتی انداز و اسلوب میں اب مشکل ہی سے اتنی گنجائش رہ گئی ہے کہ بہت زور لگا کر بھی عمدہ شعر نکالا جا سکے ..... ہماری زیادہ تر شاعری چونکہ صنف غزل میں ہو رہی ہے، اس لیے بات غزل ہی کے حوالے سے آگے چلے گی۔ اسے ایک نیم وحشی صنف سخن کہا گیا ہے جبکہ میں خود غزل گو ہونے کے باوجود اسے ایک بیہودہ صنفِ سخن بھی قرار دیتا ہوں، اور وہ اس لیے کہ جو غزل آج لکھی جا رہی ہے وہ اساتذہ کی رنگا رنگ جگالی کے سوا اور کچھ نہیں"۔

ان سب باتوں سے ہمیں اتفاق ہے مگر استاد لاغر مراد آبادی نے اپنا حق اختلاف محفوظ رکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں، ہماری بہترین شاعری غزل ہی میں ملتی ہے، اگر یہ صنف سخن بیہودہ ہوتی تو ظفر اقبال ہرگز اس کو اظہار خیال کا ذریعہ نہ بناتے۔ ہاں ان کی طبع آزمائی کے بعد غزل کی قلب ماہیت ہو گئی ہو تو دوسری بات ہے لیکن اس کا بھی امکان نہیں کیونکہ ظفر اقبال نے اردو غزل کو ایک نئے اور تازہ لہجے سے آشنا کیا ہے۔

استاد گرامی نے مزید یہ فرمایا، ظفر اقبال چونکہ الفاظ کو ماورائے لغت معانی بھی عطا کرتے ہیں، اس لیے ممکن ہے انھوں نے لفظ "بیہودہ" کو اس کے برعکس معنی میں استعمال کیا ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو آیندہ ہر بیہودہ گو کو نغز گو سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

اردو غزل میں انقلابی تبدیلیاں لانے کے لیے ظفر اقبال یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ موجودہ شاعری کا سارا سرمایہ ضائع کر دیا جائے تاکہ شاعری کی عمارت نئی بنیادوں پر تعمیر کی جا سکے۔ فرماتے ہیں: "جہاں تک میری عاجزانہ کاوشوں کا تعلق ہے تو میں ہر وقت اپنی جملہ شاعری کو مسترد کرنے کے لیے تیار رہتا ہوں لیکن اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے اور کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی دوسرا بھی میرا ساتھ دینے کو تیار ہو تو ایک مہم ایک تحریک چلائی جا سکتی ہے اور برآمد شدہ منشیات کی طرح شاعری کو نذر آتش کر کے کوئی نئی طرح ڈالی جا سکتی ہے کیونکہ جب تک سابقہ جملہ شاعری تلف نہیں کی جائے گی، اس وقت تک مکمل طور پر اس سے قطع تعلق کیے بغیر شاعری میں کوئی نیا بیج بویا ہی نہیں جا سکتا"۔

اردو شاعری کی پوری تاریخ میں ایثار کی ایسی کوئی دوسری مثال نہیں مل سکتی کہ کوئی شاعر خود اپنی شاعری کو نذرِ آتش کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اپنی شاعری کی حد تک تو ظفر اقبال اپنی تجویز پر عمل کر سکتے ہیں لیکن انھیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ دوسرے شاعر بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ بفرضِ محال اگر بعض شعرا مروتاً راضی ہو بھی گئے تو ان کی شاعری کا وہی حال ہوگا جو آتش زدنی منشیات کا ہوتا ہے۔ اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں کہ اتنے ٹن منشیات کو نذرِ آتش کر دیا گیا لیکن نذرِ آتش ردی اخبار ہوتے ہیں، منشیات کو دوبارہ بازار میں فروخت کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

ہم ظفر اقبال کے ایثار کی قدر کرتے ہوئے انھیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ دوسروں کی شاعری کو بلا تکلف نذرِ آتش کر دیں لیکن اپنی شاعری کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں کیونکہ جیسی اعلا درجے کی شاعری انھوں نے اب تک کی ہے، ویسی کوئی دوسرا تو کیا، وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔ غالب کی بہترین شاعری وہ ہے جو انھوں نے پچاس برس کی عمر تک کی تھی۔ اس کے بعد تو وہ زیادہ تر نثر ہی لکھتے رہے۔ نثر انھوں نے اس لیے لکھی کہ ویسی شاعری وہ نہیں کر سکتے تھے جیسی وہ کرتے رہے تھے۔ شاعری کو نذرِ آتش کرنے یا ضائع کرنے سے ہمیں یوں بھی اتفاق نہیں ہے کہ جو کام آنے والے زمانے کو انجام دینا ہے، اسے ہم کیوں انجام دیں۔ ہر کام اپنے وقت پر اور مناسب ہاتھوں سے انجام پانا چاہیے۔

ظفر اقبال نے نئی شعریات کی تشکیل کے لیے متعدد نکات پیش کیے ہیں جن میں سرِ فہرست یہ ہے کہ شاعر زبان سے مغلوب نہ ہو بلکہ اس پر غالب آکر شعر کہے۔ گرامر کی پابندیوں کو توڑ دے کیونکہ اس طرح شعر زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ شعر میں کسی فعل، اسم یا مصدر کی کمی شعر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ لفظ کے استعمال میں بقدرِ ضرورت من مانی کو روا رکھا جائے کیونکہ شعر میں ایک ہی لفظ کا غیر معمولی، غیر متوقع یا غیر حقیقی استعمال معنوی لحاظ سے اس کی کایا پلٹ کر سکتا ہے۔

ان باتوں کو سن کر ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر گرامر کی پابندیوں کو توڑنے سے شاعری بامعنی ہوتی تو انیس ناگی موجودہ دور کا سب سے بڑا شاعر ہوتا۔ شعر اگر فعل، اسم اور مصدر کے بغیر مکمل ہو سکتے تو پھر بہترین شاعری بغیر لکھے وجود میں آ جاتی۔ لفظ کے استعمال میں من مانی روا رکھنے کی اجازت کے نتیجے میں جو شاعری لکھی جائے گی اسے من مانی ہی کہا جائے گا نہ کہ شاعری۔

"بعض لوگوں" کی ان باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ظفر اقبال نے جو نکات پیش کیے ہیں ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گرامر کی پابندیاں زبان اور شاعری کے ارتقا میں حائل ہوتی ہیں۔ ظفر اقبال نے تو صرف فعل، اسم اور مصدر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تجویز کی ہے، ہمارا بس چلے تو ہم مذکر و مونث اور جمع و واحد کے قاعدوں کو بھی دریا برد کر دیں۔ جن چیزوں کی اصلیت ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتی ہے، ان کے لیے اصول اور قاعدے بنانے کی کیا ضرورت ہے۔

جدید غزل کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں ظفر اقبال نے ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ فرماتے ہیں: "یہ جو دنیا بھر کی شاعری کے تراجم دنیا بھر میں دھڑا دھڑ ہو رہے ہیں، تو غزل وہ صنفِ سخن ہے جس کا کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس کے مخصوص اشارے اور اصطلاحات ترجمہ کی ہی نہیں جا سکتیں۔ چنانچہ میری ذاتی ناقص رائے میں جدید غزل کی نئی عمارت تعمیر کرتے وقت اسے

بات کا خصوصی خیال رکھا جانا ضروری ہوگا کہ اس میں ایسی تبدیلی لانے کی بھی کوشش کی جائے کہ دوسری بین الاقوامی زبانوں میں اس کا ترجمہ بے حد مشکل یا ناممکن نہ رہے۔ جدید غزل میں تسلسل خیال کی روایت پہلے ہی سے موجود ہے جو اس طرح بھی شکل پذیر ہو سکتی ہے کہ کسی بھی غیر ملکی شائق ادب کو اس کا ترجمہ پڑھتے وقت کسی جھنجھلاہٹ کا احساس نہ ہو۔"

آج کل ہمارے ادیبوں میں اپنی تحریروں کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کرانے کا جو شوق ہوا ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کسی تحریر کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے ترجمے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اسی لیے تو آج کل کی نوّے فیصد طبع زاد تحریروں پر ترجمے کا گمان گزرتا ہے۔ شاعروں کی اسی خواہشِ ترجمہ کا لحاظ کرتے ہوئے ظفر اقبال نے مذکورہ بالا تجویز پیش کی ہے۔ ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ آپ کی تجویز کردہ شعریات کے مطابق جو غزل وجود میں آئے گی اسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ غزل جتنی کسی اردو جاننے والے کی سمجھ میں آئے گی، اتنی ہی کسی اردو نہ جاننے والے کی سمجھ میں بھی آ جائے گی۔

مجتبیٰ حسین
۲ انکور اپارٹمنٹس
ٹ پڑگنج۔ نئی دہلی

رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے

اردو کے مایہ ناز محقق، ناقد اور دانشور رشید حسن خاں اپنی زندگی کے پورے ۲۷ برس دہلی میں گزارنے کے بعد ۳ر فروری کو اپنے آبائی قصبہ شاہ جہاں پور کو واپس چلے گئے اور لوگوں کو یہ سوچتا ہوا چھوڑ گئے کہ اس فیصلہ میں غلطی اُن کی ہے یا دہلی شہر کی۔ دہلی شہر میں لوگوں کے آکر بس جانے کے بارے میں کسی منچلے نے کہا تھا کہ دہلی میں اکثر لوگ باہر سے آتے ہیں اور یہاں اس لیے بس جاتے ہیں کہ ان کے پاس واپسی کا کرایہ نہیں ہوتا۔ رشید حسن خاں کے سامنے یہ مسئلہ بھی نہیں تھا کیونکہ وہ سال میں دو چار مرتبہ شاہ جہاں پور ضرور جایا کرتے تھے یعنی وہ ان کے پاس شاہ جہاں پور واپس جانے کا کرایہ تھا، پھر یہ اپنی زندگی کے ۲۷ بھرپور برس دہلی شہر کو دینے کے بعد واپس کیوں چلے گئے۔ بہت عرصہ پہلے استاد شاہ شیخ ابراہیم ذوق نے دکن میں شعرا کی سرپرستی کا حال جاننے کے باوجود کہا تھا

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

سچ تو یہ ہے کہ ان کے اس مصرع پر ہم اب بھی حیرت کرتے ہیں کہ ذوق نے دہلی کی جن گلیوں کو چھوڑ کر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا وہ آخر دہلی میں کہاں واقع ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں نئی دہلی کا شہر تو تھا نہیں۔ جو کچھ بھی شہر تھا وہ جامع مسجد کے اطراف کی گلیوں میں ہی آباد تھا۔ ان گلیوں میں ہمیں بھی کبھی کبھار جانے کا اتفاق ہوتا ہے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم جب بھی ان گلیوں میں گئے وہاں سے واپس آنے میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس لیے نہیں کہ یہ گلیاں ہمیں بہت پسند ہیں اور ہم یہاں سے جلدی نکلنا نہیں چاہتے بلکہ اس لیے کہ آدمی یہاں چیونٹی کی رفتار سے چلتا ہے۔ چلتا کیا ہے دھینگا مشتی کرتے ہوئے اپنا راستہ بناتا ہے، وہاں سے واپس آکر تو ہمیں اپنا وزن بھی کم محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ذوق کے زمانہ میں یہ گلیاں اس قابل رہی ہوں گی کہ انھیں چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ مگر اب تو یہ گلیاں نہ صرف کاٹنے کو دوڑتی ہیں بلکہ اکثر اوقات تو کاٹ بھی لیتی ہیں۔

چاہے کچھ بھی ہو رشید حسن خاں نے جب دہلی کو چھوڑ کر شاہ جہاں پور واپس جانے کا فیصلہ کیا ان کے دوستوں (جن کی تعداد بہت کم ہے) اور دشمنوں دونوں کو تشویش ہوئی لیکن اس کے باوجود کسی نے انھیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بس اتنا کیا کہ ۲ رفروری کو انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک وداعی جلسہ رکھا گیا جس میں ادب دوستوں سے خواہش کی گئی کہ وہ آئیں اور رشید حسن خاں کو وداع کریں۔ اردو گھر میں منعقدہ اس جلسہ میں ہم نے پہلی بار اتنا بڑا اجتماع دیکھا، کیا شاعر کیا ادیب

کیا صحافی، کیا دانشور، کیا طالب علم، کیا دوست کیا دشمن، سب کے سب وہاں موجود تھے۔ وہ بھی تھے جن سے رشید حسن خاں کے زبردست معرکے چلے۔ اس جلسہ میں ایسی زبردست حاضری اس بات کا ثبوت تھی کہ اب جب کہ ادب اور بالخصوص اردو ادب میں "تجارت" کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے اور لوگ ادب کو بھی ایک کاروبار کے طور پر چلا رہے ہیں۔ اب بھی لوگ موقع آنے پر سچے اور خالص علم کی قدر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی، شاہد علی خاں، اسلم پرویز، خلیق انجم، شارب ردولوی، شریف الحسن نقوی، محمود سعیدی، رفعت سروش، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور نہ جانے کتنوں نے رشید حسن خاں کے بارے میں اظہار خیال کیا اور یوں اظہار خیال کیا کہ لگتا تھا کہ واقعی سچ بول رہے ہیں۔

رشید حسن خاں سے اگرچہ ہماری شخصی ملاقات بائیس تئیس برس پہلے دہلی میں ہوئی تھی لیکن ہم عرصے سے ان کے نیازمندوں میں رہے ہیں۔ ہم نے انھیں جب بھی دیکھا ایک قلندر صفت عالم کے روپ میں ہی پایا۔ ہمیشہ مطالعہ میں غرق یا کسی سوچ میں غلطاں یا کسی نکتہ پر کسی سے بحث میں مصروف۔ قلندری، ثابت قدمی، اور علم سے ان کے گہرے شغف کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج سے ۲۷ برس پہلے وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر وابستہ ہوئے تھے اور آخر وقت تک وہ اسی عہدے پر ڈٹے رہے۔ نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ سیکڑوں طالب علموں نے ان کی رہنمائی میں ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے اور بعد کو پروفیسر بھی بنے۔ سچ تو یہ ہے کہ رشید حسن خاں کی علمیت خود ایک ایسا عہدہ ہے جس کے آگے بڑے بڑے بھی پانی بھرتے ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ خاں صاحب نے خود کہاں تک رسمی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ کبھی بڑی بڑی ڈگریاں نہیں دیکھیں۔ انھوں نے محض اپنے بل بوتے پر عربی، فارسی اور اردو کا اتنا علم حاصل کر لیا ہے کہ اب خود ایک "دانش گاہ" بن گئے ہیں۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کے میدان میں برصغیر کی کئی نامور ہستیوں سے ٹکر لی اور بیشتر اوقات کامیاب و کامران ہی رہے۔ شاہ جہاں پور کے خالص پٹھان ہونے کے ناتے علمی معاملات میں وہ موقع آنے پر لوٹ جانے کو ترجیح دیتے ہیں بہ نسبت لچک جانے کے۔ انھوں نے جب بھی ٹکر لی اپنے سے بڑے آدمی سے ہی ٹکر لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ہمارے شخصی مراسم ہمیشہ خوشگوار ہی رہے ہم سے ٹکر لیتے بھی تو کس بات پر۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ میر امّن کی "باغ و بہار"، رجب علی بیگ سرور کے "فسانۂ عجائب" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" کو ہم نے پہلے بھی پڑھا ہے (صرف پڑھا ہے سمجھا کم ہے) لیکن جب رشید حسن خاں نے ان کلاسیکی کتابوں کے متنوں کو مرتب کیا اور ان کے تنقیدی اڈیشن شائع کیے تو تبھی یہ ہماری سمجھ میں آ سکے۔ اردو کے کلاسیکی ادب کو ہم جیسے طالب علموں اور عام آدمی تک پہنچانے کا جو کام رشید حسن خاں نے انجام دیا ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک ایک نکتہ اور ایک ایک پہلو پر انھوں نے برسوں چھان پھٹک اور تحقیق کی ہے۔

اردو قواعد پر بھی ان کے عبور اور بالغ نظری کو برصغیر کے ہر دانشور اور عالم نے سراہا ہے۔ رشید حسن خاں نے اردو املا کو آسان بنانے کے لئے کچھ اصول

نئی اشاعتی اداروں نے اپنالیا ہے۔ ہم جب نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ میں اردو کے سربراہ تھے تو ہم نے بھی ایک دن غفلت میں ان اصولوں کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ نتیجہ میں آج ہم بہت سے لفظوں کے املا بھول چکے ہیں۔ گاؤں اور پاؤں جیسے لفظوں کو وہ گانو اور پانو لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ کبھی ہم گانو تو صحیح لکھ لیتے تھے لیکن پانو لکھتے وقت نہ جانے کیوں ہمارے پاؤں لڑکھڑا جاتے تھے۔ خیر یہ موقع نہیں ہے کہ ان کے املا کے اصولوں پر بحث کی جائے۔ "تماشہ" کو وہ "تماشا" لکھنے کے قائل ہیں لیکن ہم نے جب بھی ان کے کہنے کے مطابق "تماشا" لکھنے کی کوشش کی تو خود "تماشہ" بن گئے۔ ان کی تو یہ بھی سفارش ہے کہ "گنگنانا" کو "گن گنانا" لکھنا چاہیے۔ ہم سے تو خیر لکھا نہیں گیا لیکن باتھ روم میں گنگنانے کا جو شوق ہمیں برسوں سے تھا وہ یکسر موقوف ہو گیا۔ "گنگنانے" میں جو موسیقی ہے وہ "گن گنانے" میں کہاں۔ ایک بار ہم نے انھیں خط لکھا۔ خط میں کسی لفظ کے املا پر انھوں نے ہمیں ٹوکا تو ہم نے انھیں یہ کہہ کر چپ کروا دیا کہ "قبلہ! جہاں تک ہمارے املا کا سوال ہے اس کے سمجھنے والے تو مرزا غالب، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور مولانا شبلی وغیرہ ہیں۔ ہمارا سلسلہ تو ان لوگوں سے ہے آپ جیسے پڑھے لکھوں سے نہیں"

بہرحال اردو گھر کے وداعی جلسہ میں لوگوں نے ان کے بارے میں بڑی خوبصورت باتیں کہیں اور سچے دل سے کہیں۔ اس کے جواب میں رشید حسن خاں نے اپنی جوابی تقریر میں صرف دو جملے کہے کہ "علم اور تحقیق کے معاملے میں میں نے نہ تو کبھی مصلحت پسندی کو روا رکھا اور نہ ہی آئندہ رکھوں گا" جلسہ کے دوسرے دن وہ شاہ جہاں پور جانے والے تھے۔ ہم نے کچھ احباب سے کہا بھی کہ وہ صرف اس جلسہ میں انھیں وداع کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ دوسرے دن اسٹیشن پر جا کر بھی انھیں وداع کر آئیں۔ نادر شاہ بھی جب دہلی سے ایران واپس جا رہا تھا تو بادشاہ وقت محمد شاہ انھیں وداع کرنے کے لیے شہر کی فصیل سے باہر تک گیا تھا کہ موصوف کہیں واپس نہ آ جائیں۔ ہم تو خیر انھیں وداع کرنے کے لیے اسٹیشن نہیں گئے لیکن بعد میں پتا چلا کہ کچھ اصحاب حفظ ما تقدم کے طور پر انھیں وداع کرنے کے لیے سچ مچ اسٹیشن گئے تھے۔

رشید حسن خاں کے دہلی سے چلے جانے پر لوگ اب دکھی ہیں لیکن جب وہ یہاں تھے تو تب بھی دکھی ہی تھے (وجوہات دوسری تھیں) مانا کہ وہ دہلی میں ۳۷ برس رہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان برسوں میں وہ دہلی کے معمولات کا حصّہ کہاں بنے۔ نہ کبھی کسی سازش میں شریک ہوئے نہ کسی جوڑ توڑ میں حصّہ لیا۔ وہ تو سدا اپنی گوشہ نشینی میں مگن رہے۔ ہمیشہ لائبریریوں اور کتابوں کی خاک چھانتے رہے۔ دہلی کی ادبی محفلوں میں بھی وہ کم ہی آتے رہے اور اپنا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے میں گزارا۔ ایسے لوگ دہلی میں رہیں یا شاہ جہاں پور میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ شاہ جہاں پور جا کر بھی کتابوں میں کمر کمر ڈوبے رہیں گے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کر دیں کہ جلسہ کے بعد ہم جانے لگے تو ایک صاحب نے ہمارا راستہ روک کر کہا "قبلہ! آپ کو بھی تو حیدر آباد سے دہلی آئے ہوئے لگ بھگ پچیس برس بیت گئے۔ کیا آپ بھی ۳۷ برس سے پہلے دہلی کی جان نہیں چھوڑیں گے؟" اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ ہمیں بھی وداع کرنے کے لیے کتنا [illegible]

ممتاز مفتی

ممتاز مفتی بھی ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو ۹۰ سال کی عمر میں چل بسے۔ وہ اردو کے ایک منفرد اور بے مثال افسانہ نگار تھے۔ جن کی اردو افسانے میں بہت پہلے جگہ متعین ہو چکی تھی اور جن کی اہمیت اور عظمت سے انکار ممکن نہ تھا۔ انھوں نے افسانہ نگاری اس دور میں شروع کی، جسے اردو افسانے کا "دورِ زریں" کہا جاتا ہے۔ جب بیک وقت بہت سارے اچھے اور قد آور افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ جن میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، اور بہت سارے افسانہ نگار شامل تھے۔ ان افسانہ نگاروں میں ممتاز مفتی قطعی منفرد نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا موضوع اور اسلوب ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے ان کا شمار حقیقت نگاروں میں ہوتا ہے لیکن ان کی حقیقت نگاری، سماجی حقیقت نگاری نہ تھی، البتہ جسے نفسیاتی حقیقت نگاری کہا جا سکتا ہے ممتاز مفتی وہ افسانہ نگار تھے جن سے اردو افسانے میں نفسیاتی افسانہ نگاری شروع ہوتی ہے۔ ان سے قبل اردو میں یا تو پریم چند اسکول کی خارجی حقیقت نگاری تھی یا پھر یلدرم اسکول کی رومانویت۔ اس کے بعد ترقی پسند افسانے کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں زیادہ زور سماجی حقیقت نگاری پر دیا گیا اور معاشرے کی برائیوں اور کمزوریوں کو افسانے کا موضوع بنایا گیا۔ اسی دور میں کرشن چندر جیسے سحر نگار افسانہ نویس کا ظہور ہوا۔ جس نے دنیائے ادب میں قدم رکھتے ہی کامیابی اور مقبولیت کا جھنڈا گاڑ دیا۔ اسی دور میں بیدی اور غلام عباس کا بھی ورود ہوا اور انھوں نے سنجیدہ اور متین اندازِ نگارش کی وجہ سے قارئین کی توجہ مبذول کر لی۔ اسی دور میں ممتاز مفتی کا پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" "ادبی دنیا" (لاہور) کے سالنامہ میں شائع ہوا۔ جس پر "ادبی دنیا" کے پہلے مدیر منصور احمد نے مصنف کے بارے میں ایک طویل تعارفی نوٹ لکھا اور افسانے کی کھل کر تعریف کی۔ جس سے اگر ایک جانب قارئین سے مصنف کا تعارف ہوا تو دوسری جانب مصنف کی بڑی حوصلہ افزائی بھی ہوئی، اور نئے افسانہ نگار کی حیثیت سے ان میں لکھنے کا بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا لیکن ان کی امیدوں پر اس وقت اوس پڑ گئی جب "ادبی دنیا" کے نئے مدیر عاشق حسین بٹالوی نے (جنھوں نے منصور احمد کی وفات کے بعد "ادبی دنیا" کی ادارت سنبھال لی تھی) ان کا افسانہ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ آپ طبع زاد افسانہ بھیجیے، حالانکہ ان کا افسانہ طبع زاد ہی تھا۔ ان کا افسانہ اتنا اچھا تھا کہ انھیں یقین ہی نہیں آیا کہ ممتاز مفتی جیسا نو آموز افسانہ نگار اتنا اچھا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ اسی لیے انھیں اس پر ترجمہ ہونے کا گمان ہوا۔ عاشق حسین بٹالوی سے اُن کی پہلے سے روشناسی تھی۔ وہ شاید ممتاز مفتی

کتاب کی ادبی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے یا زیادہ قائل نہ تھے۔ اس واقعہ سے ممتاز مفتی کی حوصلہ شکنی تو ہوئی لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور انھوں نے یہی افسانہ دلّی سے نیا نیا شائع ہونے والا رسالہ ”ساقی“ کو بھیج دیا۔ جسے شاہد احمد دہلوی نے فوراً شائع کر دیا۔ اس طرح ممتاز مفتی نے اردو ادب میں رفتہ رفتہ اپنی جگہ بنانی شروع کر دی۔

جیسا کہ اردو ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے۔ ۱۹۴۰ء کے عشرے میں اردو افسانے پر جن مغربی مفکروں کے اثرات مرتب ہوئے۔ ان میں مارکس اور فرائیڈ نمایاں ہیں۔ ان دونوں کے اثرات نے اردو افسانے میں دو واضح رجحانات کو جنم دیا۔ ایک ترقی پسندی کا رجحان اور دوسرا افسانے میں تحلیل نفسی کا میلان۔ یہ دلچسپ اتفاق ہے کہ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا سال ایک ہے یعنی ۱۹۳۶ء۔ اس سال سے اردو افسانے میں جس ترقی پسند رجحان کا آغاز ہوا اس کے تحت افسانے میں مزدوروں اور متوسط طبقہ کی زندگی اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا گیا لیکن ممتاز مفتی نے ابتدا سے ہی اپنے لیے مختلف راہ منتخب کی اور فرد کے کچلے ہوئے احساسات اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ابتدا سے ہی علم النفسیات سے دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے اسی دور میں فرائیڈ، یونگ، ایڈلر اور دیگر ماہرین نفسیات کا مطالعہ کیا۔ انھیں فرائیڈ کی جس تصنیف نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سائیکالوجی آف ایوری ڈے لائف ”ہے۔ نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان ماہرین نفسیات کی کیس ہسٹری پر افسانے لکھنے لگے۔ نفسیاتی مریضوں کی روددادوں میں بڑے افسانوی عناصر ہوتے ہیں۔ جن پر کوئی بھی مصنف اپنے افسانے کی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔ ابتدا میں اردو میں اس نوع کے افسانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اس لیے کہ اردو میں یہ بالکل نئی شے تھی لیکن جب اردو میں نفسیات کا مطالعہ عام ہو گیا تو ممتاز مفتی کے ان افسانوں میں کوئی ندرت باقی نہ رہی اور سب سے پہلے ممتاز شیریں نے ان کے اس نوع کے افسانوں پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ممتاز مفتی خود اعتراف کرتے ہیں کہ ”ان تمام علما کی تصانیف میں کیس ہسٹریز میرے لیے مشعلِ راہ ہو گئیں اور ان کیس ہسٹری کی جستجو میں میں جنسیات پڑھنے پر مائل ہو گیا (بحوالہ ”میرے بہترین افسانے“ مرتبہ: محمد حسن عسکری، مطبوعہ ۱۹۴۳ء) وہ اینتھالوجی میں اپنے افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں ”میرا مصنف ہونے کا جواز صرف یہ ہے کہ میں نفس غیر شاعر کے رجحانات پر لکھتا ہوں۔ اگرچہ آج تک زیادہ تر میری وہ کہانیاں پسند کی گئی ہیں جو میرے موضوع سے ہٹ کر ہیں۔ میری کہانیاں زیادہ تر گرد و پیش کے کسی واقعہ پر مبنی ہوتی ہیں اور میری سب سے بڑی مشکل کسی غیر شعوری رجوع کو احاطۂ شعور میں لانا ہوتا ہے۔ جو لازمی طور پر کہانی کا کلائمکس ہوتا ہے۔“

ابتدا میں کیس ہسٹری پر افسانے لکھنے کے باعث ممتاز مفتی بہت حد تک فارمولے کے شکار ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ اس میں ان کے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا دخل نہ تھا اور وہ نفسیاتی مریضوں کی داستانوں کو بڑی آسانی سے افسانوی روپ دے دیتے تھے لیکن وہ بہت جلد اس سحر سے نکل آئے اور بقول خود ان کے۔ وہ گرد و پیش کے واقعات پر افسانے لکھنے لگے۔ اس طرح ان کے افسانوں میں گہرائی پیدا ہو گئی لیکن ان کا پسندیدہ موضوع انسانی نفسیات ہی رہا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ (بقول ان کے) انھوں نے برٹرنڈ رسل، ہنری جیمز بالڈن، سنتایانا اور نطشے کا مطالعہ بھی کیا۔ وہ ان سے متاثر بھی ہوئے لیکن ان کے افسانوں پر ان فلاسفہ اور مفکرین کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ علا

یہ ہے کہ اناطولی فرانس کی "تائیس" سے لے کر دوستوفسکی کی "ایڈیٹ" اور ابسن کا "گڑیا گھر" سے لے کر ڈی۔ ایچ لارنس۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کافکا، پیئر لوئی اور پروست تک کا مطالعہ کیا لیکن ان تمام مصنفوں میں سے کسی سے بھی فکری طور پر متاثر نہیں ہوئے۔ ان مصنفین سے انھوں نے افسانے کا کرافٹ تو سیکھا لیکن ان کے طرزِ نگارش یا افکار کو قبول نہیں کیا۔ دراصل انسان کے تشکیلی دور میں طبیعت جس طرف مائل ہو جاتی ہے انسان اس پر عمر بھر قائم رہتا ہے یہ بنیادی طور پر افتادِ طبع کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ممتاز مفتی کے افسانوں میں نفسیاتی رمز شناسی تو ملتی ہے لیکن سماجی مسائل نہیں ملتے۔ اسی لیے ثقہ ترقی پسند حلقوں میں ممتاز مفتی کبھی زیادہ پسند نہیں کیے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے افسانہ ترقی پسندوں کے لیے "کارآمد" نہ تھے اور ان کے انقلابی مشن کو آگے نہیں بڑھاتے تھے لیکن ان کا فن اتنا پختہ اور جاندار تھا کہ ترقی پسندوں کی جانب سے ان کی زیادہ پذیرائی نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اردو افسانے میں اپنے لیے مقام بنا لیا۔

مجنوں گورکھپوری (جنھوں نے ۱۹۳۵ء تک افسانہ نگاری ترک کر دی تھی) کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "سمن پوش" میں چند افسانے تحت الشعور کے بارے میں لکھے ہیں۔ مجنوں ابتدا میں رومانوی اور اپنی افسانہ نگاری کے آخری دور میں ٹامس ہارڈی کے زیر اثر غم پسند افسانہ نگار تھے۔ نفسیاتی افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کی شناخت نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو میں نفسیاتی افسانے کی ابتدا ممتاز مفتی سے ہی ہوتی ہے جو محمد حسن عسکری اور آغا شمس سے ہوتی ہوئی شبیر محمد اختر اور سلیم اختر تک پہنچتی ہے میں نے اس فہرست میں منٹو اور عصمت کو عمداً شامل نہیں کیا۔ ان دونوں افسانہ نگاروں کا موضوع بہ ہر کے عشرے میں ہی بطور نفسیاتی افسانہ نگار اپنی شناخت منوالی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس دور میں انھیں افسانہ نگاروں کی دوسری صف میں شمار کیا جاتا تھا یعنی کرشن چندر، منٹو، عصمت اور بیدی کے بعد والی صف میں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ممتاز مفتی زندگی بھر بہترین نفسیاتی افسانے لکھنے کے باوجود دوسری صف میں ہی رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس دوسری صف کے افسانہ نگاروں میں ان کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

میرے خیال میں اس کی وجہ موضوع بھی ہے اور کرافٹ مین شپ بھی۔ بڑا افسانہ نگار اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی بڑا کہلاتا ہے اور اپنی فن کاری کی وجہ سے بھی۔ جہاں تک موضوع کا تعلق ہے۔ زندگی میں جنس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ جنس زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے لیکن کلی اور واحد حقیقت نہیں۔ جنس اگر زندگی کی سب سے بڑی، کلی اور واحد حقیقت ہوتی تو انسان جبلی تقاضوں کا غلام بن کر رہ جاتا۔ حیوان کی سطح سے بلند نہ ہوتا اور نہ تہذیب کے اتنے مراحل طے کرتا۔ زندگی میں بنیادی اہمیت انسان اور اس کے معاشرے کو حاصل ہے یا پھر زندگی کی معنویت کو۔ اس لیے جو ادیب و شاعر اپنی تخلیق کے لیے صرف جنس کو موضوع بنا لیتے ہیں وہ بڑے اور عظیم ادیب نہیں بن پاتے۔ ہمارے سامنے ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور میراجی کی مثالیں موجود ہیں۔ عالمی تناظر میں کیا لارنس کی اہمیت سارتر یا کامو سے زیادہ ہے؟ (حالانکہ فنی اعتبار سے لارنس، سارتر اور کامو سے کہیں آگے ہے) اس طرح کیا میراجی کا ادبی مقام راشد اور فیض سے بلند ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کسی ادیب کے بڑے اور اوسط

دیے کا ہونے میں موضوع کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد یعنی پچاس سو برس کے بعد اردو ادب کا مورخ اور ناقد جب میراجی، راشد اور فیض کی درجہ بندی کرے گا تو میراجی کو ہرگز وہ مقام حاصل نہ ہوگا جو راشد اور فیض کو حاصل ہوگا اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ میراجی کے وژن کا دائرہ کتنا چھوٹا اور راشد اور فیض کے وژن کا دائرہ کتنا بڑا اور وسیع ہے۔ کسی ادیب کے بڑے ہونے کا فیصلہ اس کی کرافٹ مین شپ سے بھی ہوتا ہے لیکن صرف کرافٹ مین شپ سے نہیں۔ اس کی عظمت کے لیے دوسرے عنصر کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ دوسرا عنصر زندگی کا وژن ہے۔ موضوع کی بحث کو نظر انداز کر دیا جائے اور صرف کرافٹ مین شپ کو لیا جائے اور فنی نقطۂ نظر سے ممتاز مفتی کا اردو کے چار بڑے افسانہ نگاروں یعنی کرشن، بیدی، عصمت اور منٹو سے موازنہ کیا جائے تو بھی مفتی جی اس مقام تک نہیں پہنچتے جہاں یہ چاروں (کم از کم عصمت، منٹو اور بیدی) متمکن نظر آتے ہیں۔ اس لیے ممتاز مفتی کو اردو افسانہ نگاروں کی دوسری صف کا سب سے اہم افسانہ نگار کہا جائے تو غلط نہیں ہے۔

آج جبکہ وہ ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کیجیے تو قارئین کو تعجب ہوگا کہ وہ اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں سے کتنے منفرد تھے۔ ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ مشہور افسانہ "آپا" ہے۔ جو ان کی شناخت بن چکا ہے اور جس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن وہ اسے اپنا شاہکار یا نمایندہ افسانہ تصور نہیں کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح غلام عباس "آنندی" کو اپنا شاہکار تسلیم نہیں کرتے تھے۔ دراصل بعض تخلیقات کے بارے میں مصنف اور ناقدین کے درمیان اختلاف رائے رہا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے "آپا" ان کے ابتدائی دور کا افسانہ ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "آپا" ہی ممتاز مفتی کا شاہکار افسانہ ہے اور انھوں نے اس کے بعد کوئی شاہکار افسانہ نہیں لکھا تو اس کا مطلب ان کے فن کے ارتقا سے انکار کرنا ہے یعنی انھوں نے اپنی نصف صدی کی افسانہ نگاری میں کوئی ترقی نہیں کی اور ان کا فن "آپا" کے بعد ایک جگہ رک گیا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ انھوں نے "آپا" کے علاوہ بھی بہت سے عمدہ اور اچھے افسانے لکھے ہیں جن میں ان کا افسانہ "ماتھے کا تِل" شامل ہے۔ ۱۹۴۳ء میں محمد حسن عسکری نے جب "میرا بہترین افسانہ" کے عنوان سے ایک انتخاب مرتب کیا اور ہر افسانہ نگار سے اس کا پسندیدہ افسانہ طلب کیا تو ممتاز مفتی نے اپنا افسانہ "ماتھے کا تِل" پیش کیا۔ اس افسانے میں انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوع "لاشعور" کو پیش کیا جس کے لیے انھوں نے "نفسِ غیر شاعر" کی اصطلاح وضع کی تھی جو رائج نہ ہو سکی۔ اس افسانے کے ہیرو سعید کو حقیقی طور پر اپنی بھابی تبسّم سے عشق ہو جاتا ہے۔ جسے وہ ظاہر نہیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ معاشرہ اور اخلاق اس کی اجازت نہیں دیتا، چنانچہ وہ اپنے جذبات کو احترام کے پردے میں چھپا کر رکھتا ہے کہ کہیں خود اس پر یہ راز ظاہر نہ ہو جائے اور وہ بھابی تبسّم کی بہن تسلیم کے پردے میں تبسّم کی آرزو رکھتا ہے اور پھر سعید کا دو ایک بار تسلیم کو تبسّم سمجھ لینا۔ اس کی غلط فہمی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی مستور آرزو ہوتی ہے۔ بقول مصنف آخری سکور میں سعید کا ماتھے پر بنا ہوا سیاہ نقطہ مٹانے کے بجائے تبسّم کا تِل کھرچ اس کا فوٹو سرہانے رکھ دینا واضح اشارہ ہے جس سے دفعتاً تبسّم پر حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ اگرچہ سعید کو شعوری طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ غیر شعوری طور

پر اپنی بھابی کی آرزو میں گھل رہا ہے۔ اسی موضوع پر آغا شمس کا افسانہ "شکست" بھی ہے جس میں ہیرو غیر شعوری طور پر اپنی بھابی سے عشق کرتا ہے اور وہ اس جذبے کو دبانے کی اس قدر کوشش کرتا ہے کہ بالآخر شدید بیمار پڑ جاتا ہے۔ دونوں افسانے کا موضوع ایک ہونے اور ٹریٹمنٹ مختلف ہونے کے باوجود میرے خیال میں آغا شمس کا افسانہ مفتی کے زیر بحث افسانے سے کہیں زیادہ بہتر اور پرمغز ہے۔ جن قارئین کو نفسیاتی افسانے سے دلچسپی ہے انھیں ان دونوں افسانوں کا ضرور تقابلی مطالعہ کرنا چاہیے۔ افسانے میں خصوصاً حقیقت پسند افسانے میں رمز و کنایے کا استعمال بہت بڑا فن ہے۔ ممتاز مفتی اس فن کے ماہر تھے۔ ان کا مشہور افسانہ "آپا" میں بھی یہ فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ خصوصاً افسانے کے آخری پیراگراف میں مصنف اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا ہے۔ ہیروئن کی آنکھ سے جلتے ہوئے انگارے پر آنسو کا گرنے والا قطرہ سب کچھ بیان کر دیتا ہے اور قاری افسانے کے اختتام پر مبہوت رہ جاتا ہے۔

ممتاز مفتی نے خود اپنے فن کے بارے میں جو کچھ کہا ہے۔ اس کی اہمیت کم نہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اظہار میں غلو، بناوٹ یا رسمی بیان نہ آئے۔
بات میں سادگی ہو، روانی ہو، میرے سچ میں کتابی رنگ نہ پیدا ہو۔ کہانی لکھی نہ جائے۔
کہی جائے، سنائی جائے۔"

انھوں نے اپنے فن کے بارے میں جو کچھ کہا اسے کرکے دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان کے افسانوں میں سادگی اور بے ساختگی پائیں گے۔ آپ کو بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ملے گا۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو لکھتے ہیں جو جانتے سب ہی ہیں لیکن جنھیں لکھنے کی ہر ایک میں نہ جرأت ہوتی ہے اور نہ صلاحیت۔ مثلاً انسان کے بہت سے جذبات ایسے ہوتے ہیں جن کا اظہار نہیں ہو پاتا ہے اور انسان اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ وہ سماجی اور اخلاقی پابندیاں (ٹیبوز) ہیں جو ان جذبات کے اظہار میں مانع ہیں اور انسان اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے نت نئے طریقے اختیار کرتا ہے اور بقول مفتی "نہ جانے ہم سب کس کس اوٹ میں کس کس کی آرزو نہیں کرتے" ممتاز مفتی نے اعتراف کیا ہے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی دین ہو یا نہ ہو۔ ایک دین ضرور ہے اور وہ یہ کہ "میں نے وہ باتیں کہہ دینے کی کوشش کی جو جانتے سبھی ہیں مگر کہتا کوئی نہیں ہے یہ باتیں بڑی حقیقتوں کے بارے میں نہیں ہوتیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی سچائیاں ہوتی ہیں۔" ممتاز مفتی جیسے ماسٹر کرافٹ مین کے گزر جانے کے بعد اردو کے کلاسیکی افسانے میں جو خلا پیدا ہو گیا وہ شاید کبھی پُر نہ ہو گا۔ میں یہ بات محض رسمی طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس لیے کہ منٹو، کرشن، بیدی، عصمت، غلام عباس، ابوالفضل صدیقی اور سید انور کے گزر جانے کے بعد ممتاز مفتی ہی سب سے معمر و سینیئر افسانہ نگار تھے۔ اب ان جیسا افسانہ لکھنے والا کون پیدا ہو گا؟

شمیم احمد
ای 4/239 اریرا کالونی، بھوپال

وی پنگ انڈسٹری

انگریزی زبان میں کچھ تو بات ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کے پیچھے لٹھ لیے لیے پھرتے ہیں مسٹر فاعلن تک اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ اور فقروں کو جا بے جا اور انگڑ بے جوڑ استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔ آج کل وہ نوحہ گری کے معاملات پر سر کھپا رہے ہیں اور اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتے پھر رہے ہیں کہ نوحہ گری یا رونے رُلانے کا عمل محض ایک جذباتی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ ایک باقاعدہ فن ہے، اور اس فن کے ماہرین کی روٹی روزی کے حصول کا اس سے باقاعدہ تعلق ہے۔ ابتداً یہ فن محض ایک پیشہ مزدوری تھا، ترقی کرتے کرتے باقاعدہ کاروبار بنا اور اب ترقی کی انتہائی اونچائیوں پر پہنچ کر اسے ایک بہت ہی اہم اور طاقت ور صنعت کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس صنعت کے جملہ نشیب و فراز، خصائص اور طور طریقوں کا کامل اظہار اردو کی اصطلاح صنعت نوحہ گری سے نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنے پرچار میں اسے وی پنگ انڈسٹری کہہ کر سننے والوں کو مرعوب کرتے ہیں۔

نوحہ گری کو جذباتی مسئلہ نہ ماننے اور اسے پیشہ ورانہ فن قرار دینے کے معاملے میں مسٹر فاعلن سند کے طور پر بزرگوں کا یہ قول کہ رونے کو مزدور نہیں ملتے پیش کرکے اپنی بات اور دلیل کو وزن دار بنا لیتے ہیں۔ سند اضعاف کے طور پر وہ مرزا غالب

غالب صاحب سے اس کی تو تعلی بھی کر لیتے ہیں بچا بھی کیا ہے چھوڑ گئے شعر

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو، ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

غالب صاحب کا یہ فرمان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ نوحہ گری واقعتاً ایک پیشہ ورانہ فن ہے۔ یہ ایک اقتصادی مسئلہ ہے کہ اس زمانے میں غالب صاحب کی اتنی حیثیت نہ تھی کہ وہ ایک عدد نوحہ گر کو لیز پر انگیج کر پاتے۔ مگر اس سے یہ تو ثابت ہے کہ ان کے زمانے میں بھی یہ پیشہ پھل پھول رہا تھا۔ اور اس کے ذریعہ لوگ اپنے خاندان کی کفالت کیا کرتے تھے۔

دنیا آج ترقی کے اس مقام پر جا پہنچی ہے، جہاں سے اب اسے ترقی معکوس ہی کی راہ پر چلنا ہے۔ اس لیے آج ہر فن، ہر علم، ہر پیشے، ہر کاروبار اور ہر انڈسٹری نے اسپیشلائزیشن کی ہزارہا شاخیں برگد کے درخت کی جڑوں کی طرح دور دور تک پھیلادی ہیں۔ کسی زمانے میں لے دے کے منشی مقفہٰ صنعت کے حکیم ہوا کرتے تھے جو قارورہ دیکھ کر مرض کی تشخیص کر لیا کرتے تھے اور قدح بھر بھر کر پینے کے لیے دوائیں تجویز کر دیا کرتے تھے۔ یا ہمالیائی سلسلوں سے آئے ہوئے جٹا دھاری وید ہوا کرتے تھے جو آدمی کی ناڑی دیکھ کر نہ صرف اس کی ذات، اوقات بلکہ اس کے اجداد اور خاندان کی ہسٹری تک بتا دیا کرتے تھے۔ اور آج! آج ڈاکٹر ہوتا ہے۔ امراض کی ہر فیلڈ کا ایکسپرٹ فیلڈ مارشل۔ دانتوں کا ڈاکٹر الگ، آنکھوں کا الگ، کان ناک اور حلق کا الگ، ہڈیوں کا الگ، بچوں کا الگ، عورتوں کا الگ، مرد اور عورتوں کے امراض پوشیدہ و خبیثہ کا الگ، دوا دینے

الا الگ، چیر پھاڑ کرنے والا الگ، مردے کا پوسٹ مارٹم کرنے والا الگ۔ وغیرہ وغیرہ۔

انجینئروں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ سول انجینئر، الیکٹریکل انجینئر، مکینکل انجینئر، الیکٹرانک انجینئر۔ سب الگ ہوتے ہیں اور اپنی فیلڈ کے مانے ہوئے اسپیشلسٹ اور اول درجے کے ایکسپرٹ۔ حد تو یہ ہے کہ ٹی وی، ریڈیو سدھارنے والے میکنک بھی انجینئر کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ موٹر کاریں اور اسکوٹر ریپیر کرنے والے حضرات بھی انجینئر ہوتے ہیں۔ مسٹر فاعلن نے تو اس معاملے میں ایک عجیب و غریب نظارہ دیکھا۔ جہاں انجینئر اور ڈاکٹر کا گنگا جمنی سنگم تھا۔ دکان تھی سائکل سدھارنے، ٹائر ٹیوب کے پنکچر بنانے اور دستی پمپ سے ہوا بھرنے کی۔ اس کے بورڈ پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ "سائکل اسپتال" دکان پر نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مستیا بیگ۔ یہ تھا وہ مقام جہاں مسٹر فاعلن نے بہ آواز بلند ہانک لگائی تھی۔

حیراں ہوں، روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

—————— اور لوگوں سے پوچھا تھا کہ بھائی آس پاس کوئی رونے والا مزدور رہتا ہو تو اس کا اتا پتا بتاؤ تا کہ اسے کرایے پر حاصل کر کے رونے کا انتظام کر سکوں۔

"کیوں میاں جی رونے کا کیا کام آپڑا۔" کسی نے پوچھا تھا۔

"بھئی دیکھ نہیں رہے، سائکل ورک شاپ اسپتال بن گیا۔ اس سے زیادہ رونے کا اور کیا مقام ہو سکتا ہے۔ یہاں کسی رونے والے کا پتا بتاؤ۔" مسٹر فاعلن نے کہا۔

"میاں یہ شریفوں کا محلہ ہے، رونے والا یہاں کہاں ملے گا۔ ہر چیز اپنے ٹھیے پر ملتی ہے۔

ملی ماروں کو ڈھونڈتا ہے، تو دلی کے بلی ماران جانا پڑے گا۔۔ آپ کو رونے والا چاہیے.
رونے والوں کے سپر بازار جائیے۔ وہاں ہر قسم کے رونے والوں کی الگ الگ دکانیں او
اسٹال ہیں۔ وہاں کا مال بکتا نہیں کرایے پر چلتا ہے۔" بتانے والے نے بتایا۔ مسٹر فاعلن ا
بڑی حیرت ہوئی کہ رونے والے ایکسپرٹوں کا علاحدہ سے سپر بازار کھلا ہوا ہے، اور انھیں
جو کہ زمین کا گز بنے پھرتے ہیں، پتا ہی نہیں۔ شعلۂ اشتیاق بھڑکا اور مسٹر فاعلن نے
بتانے والے صاحب سے نوحہ گروں کے سپر بازار کا اتا پتا لیا۔ اور بن گئے راجستھانی
اونٹ۔ بے نکیل سیدھے پہنچے نوحہ گروں کے سپر بازار میں۔

واہ کیا نظارہ تھا۔ بیسیوں دکانیں ایک سے ایک اپنی اپنی فیلڈ کے اکسپرٹ رونے
والوں سے سجی ہوئی تھیں۔ ہر رونے والے کے سینے پر SIS مارک کی تختی لگی ہوئی تھی
جس کا صاف مطلب تھا کہ ہر نوحہ گر اپنی فیلڈ کا اصلی اور خالص مال ہے جس میں ملاوٹ
اس کے ڈپلی کیٹ ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہر دکان پر Fixed rate to rate کی تختی
ٹنگی ہوئی تھی۔ مال کے خالص ہونے کی وجہ سے گویا بارگیننگ کی قطعی گنجایش نہ تھی
ہر نوحہ گر کے سینے پر کوالٹی کے لحاظ سے فی گھنٹہ نوحہ گری کا Rate درج تھا۔ ایک دکان
مسٹر فاعلن نے کہا۔

"بھئی مجھے ایک ایسا نوحہ گر چاہیے جو میرے ساتھ فلاں محلے میں چل
سائکلوں کے اس ورکشاپ کے سامنے کھڑا ہو کر زار و قطار روئے جس پر سائکل اسپتال
لکھا ہوا ہے اور اس کے میکینک کی نیم پلیٹ پر انجینئر مسیتا بیگ کے بجائے ڈاکٹر مسیتا بیگ
لکھا گیا ہے۔ یہ مسئلہ بیگ صاحب کی عقل پر ماتم کرنے کا ہے۔"

دکان دار نے مسٹر فاعلن کو سر سے پیر تک دیکھا۔ مسکرایا اور بولا۔" میاں

صاحب! یہ نوحہ گروں کا کباڑ خانہ نہیں ہے۔ رونے والوں کا اسکریپ آپ کو بازار کے دائیں جانب والی آخری دکان پر ملے گا یہ جواب سن کر مسٹر فاعلن بڑے حیران ہوئے۔ اسی عالم حیرانگی میں پوچھا۔

"بھئی یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر آپ کی یہ دکان۔۔۔۔۔۔۔۔"

دکان نہیں اسٹور۔۔۔۔" دکان دار نے ناگواری سے بات کاٹی۔

"ٹھیک ہے بھائی اسٹور ہی سہی۔ آپ کا یہ اسٹور کس قسم کے نوحہ گروں کا ہے۔" مسٹر فاعلن نے پوچھا۔

"جس شخص کی جوان، خوبصورت، اور دل و جان چھڑک کر اصلی محبت کرنے والی بیوی مرگئی ہو، اسے رونے کے لیے یہاں دھاڑیں مار مار کر، پُر سوز و دل فگار انداز میں رونے والا اے پلس کوالٹی کا نوحہ گر مل سکتا ہے۔ فکسڈ ریٹ 351 روپے 95 پیسے فی گھنٹہ۔"

دکان دار نے وضاحت کی۔

"اور میاں جس کی کالی کلوٹی، ڈھلی عمر کی، بٹوے پر جان چھڑکنے والی جورو اللہ کو پیاری ہو اس کے نوحہ گر کا کیا ریٹ ہے" مسٹر فاعلن نے دریافت کیا۔

"بازو والی دکان پر پوچھیے۔ وہ ان کی فیلڈ ہے۔" دکان دار نے روکھے پن سے جواب دیا۔

بازو والی دکان پر ایک مہاشے جن کی کالی کلوٹی، موٹی بھدی، چیچک رو، فضول خرچ اور چرب زبان بیوی کا سورگ باس ہوا تھا، اور جس کے مرنے پر وہ بے حد مطمئن اور خوش نظر آرہے تھے، ایک ایسے نوحہ گر کا ٹرائل لے رہے تھے جو مگرمچھ کے آنسو بہانے اور متوفیہ کے اوصاف خمیدہ کا رقت انگیز انداز میں بین کر کر کے رونے کا

اسپیشلسٹ تھا۔ دکان کا ہیلپر اس کے سامنے بیٹھا دو کلو پیاز کاٹ رہا تھا جس سے کہ نوحہ گر کی آنکھوں میں آنسو اگائے جا رہے تھے۔ اس نوحہ گر کا ریٹ 51 روپے 95 پیسے فی گھنٹہ تھا ۔لیز ٹیکس دس روپے بہ قدرے پیاز کی قیمت اکسٹرا تھا۔ نوحہ گر ٹرائل میں کامیاب ہوا اور تین گھنٹے کے لیز کانٹریکٹ پر مہاشے جی کے ساتھ چلا گیا۔

مسٹر فاعلن ٹھہرے ایک فالتو قسم کے انسان۔ وہاں بھی انکوائری کر رہے ہیں۔

" بھئی میری جوان جہان سالی مر گئی۔ دو نوحہ گر چاہیں۔ ایک میرے لیے اور ایک میری بیوی کے لیے۔ بڑھیا قسم کے۔"

" یہاں صرف کالی اور نانجار بیویوں کی دعائیہ اموات پر مگر مچھی آنسو بہانے والے ایکسپرٹ نوحہ گر دستیاب ہیں۔ سالیوں پر رونے والے ،وہ سامنے والی دکان پر ملیں گے۔" جواب ملا۔

"اور بہن کی موت پر میری بیوی کے لیے نوحہ گرنی کہاں ملے گی ۔" مسٹر فاعلن نے پوچھا۔۔"اس کی بازو والی دکان پر۔" پھر جواب ملا۔

مسٹر فاعلن کی دلچسپی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھی ۔اس لیے موصوف نے پورے سپر بازار کا چکر لگایا۔ ایک ایک دکان کا جائزہ لیا۔ بہ اطمینان خاطر کھڑے ہو کر ان کے بورڈ پڑھے۔ بورڈ بڑے دلچسپ اور لاجواب تھے۔ مثلاً ویپر س پیر لڈائز۔ وی پر س۔ این۔ وی پر س۔ رونے والا اسٹور۔ دل فگار۔ جگر خراش۔ آنسو بھنڈار۔ اشک پیلس۔ سیلاب بلا۔ اس بورڈ پر غالب کی تصویر بنی ہوئی تھی، جس کے نیچے یہ مصرع لکھا تھا۔

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

ہر بورڈ پر نوحہ گروں کی اقسام، خصوصیات اور فیلٹ آف اسپے شلائزیشن کا تذکرہ بھی تھا۔

لا بڈھے باپ کی موت پر خوش ہونے والے اور پوری جائداد کا اکلوتا وارث بن جانے
لے بیٹے کے لیے اول درجے کا مکار نوحہ گر یہاں دستیاب ہے۔ شرابی، کبابی، چھٹے۔
باش شوہر کی موت پر شکر منا کر اپنے یار کے ساتھ بھاگ جانے والی بیوی کے لیے
ہتھڑ مار مار اور پچھاڑ کھا کھا کر رونے والی نوحہ گرنیوں کے ملنے کا واحد مرکز۔ بیٹے کی
وت پر دل کے آنسو نچوڑنے والے باپ کے لیے بنا گلیسرین اور پیاز کے اشکوں کے
وتی لٹانے والا نوحہ گر صرف ہمارے یہاں دستیاب ہے۔ والدہ مرحومہ کی یاد میں سینہ
وٹ کوٹ کر رونے والے نوحہ گروں اور گرنیوں کے لیے یہاں تشریف لائیے۔

انسانی زندگی کا کوئی رشتہ ایسا نہ تھا جس پر نوحہ گری کرنے والے اس مارکیٹ میں دستیاب نہ ہوں۔ باپ دادا، اماں دادی، چچا چچی، ماموں ممانی، خالہ خالو، پھوپا پھوپی، بیٹے بیٹیوں، بھتیجا بھتیجیوں، بھانجہ بھانجیوں، ساس سسر اور دامادوں غرض ہر قریبی اور دور دراز کے رشتے داروں پر رونے والے بہ افراط مناسب ریٹ پر دستیاب تھے۔ ہر دکان پر زبردست بھیڑ تھی ٹرائل لیے جانے کی وجہ سے وہ آہ و بکار اور دل خراش و دل نگار شور و شغف تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بمبئی کلکتہ کے اسٹاک ایکسچنج بہ یک وقت اس بازار میں موجود تھے۔ پیاز۔ سے لدے پھندے ٹرک یہاں آ آ کر ان لوڈ ہو رہے تھے۔ دلی میں ایک بار پیاز تیس چالیس روپے فی کلوگرام بک گئی تھی جب کہ سیب آٹھ روپے کلو مل رہا تھا۔ مسٹر فاعلن کی سمجھ میں یہ بات اب آئی کہ ضرور اس سال دلی میں نوحہ گروں کی ڈیمانڈ اچانک بڑھ گئی ہو گی۔ جس نے پیاز مارکیٹ کو ایک دم آسمان چھوا دیا ہو گا۔

پورے مارکیٹ کا شرح و بسط کے ساتھ سروے کرنے کے بعد مسٹر فاعلن کو یہ

ت معلوم ہوئی۔ نوحہ گری کے تین خاص سیزن بھی ہوتے ہیں۔ ایک شادیوں کا۔
ب امتحانوں کا۔ ایک الیکشن کا۔ مسٹر فاعلن نے بڑی حیرت سے اس بات پر غور کیا کہ
حہ گری کا شادیوں سے کیا تعلق۔ چنانچہ ایک دکان پر جاکر پوچھا۔
کیوں بھئی شادیوں میں جاکر نوحہ گری کرنے کی کیا تک ہوئی۔"
میاں جی جب لونڈیا اپنے بابل کے گھر سے وداع ہوتی ہے، تو اسے رونے کی ضرورت
وتی ہے کہ نہیں۔"
کان دار نے الٹا مسٹر فاعلن سے سوال کیا۔
جی ہاں ہوتی ہے۔" مسٹر فاعلن نے جواب دیا۔
'لونڈیا کی ماں بہنوں، اور ان کی دیکھا دیکھی بھاوجوں، دوسرے سگے سمبندھیوں اور
ڑوس پڑوس کی میلاؤں کو رونے کی ضرورت ہوتی ہے کہ نہیں۔" پھر سوال ہوا۔
"جی ہاں بالکل ہوتی ہے۔" مسٹر فاعلن بولے۔
'اس موقع کے لیے ہم نے بطور خاص امپورٹیڈ نوحہ گرنیوں کا انتظام کیا ہے۔ ان کے
بغیر کسی شادی میں رونے کا ماحول پیدا نہیں ہو سکتا۔ ماں بہنیں بچاری کتنوں کی طرف
سے اور کتنا روئیں گی۔ لونڈیا کا بھی کچھ خیال رکھنا ہے کہ نہیں، خود اتنا روئے گی تو سہاگ
کے وقت رات بھر بے ہوش پڑی رہے گی۔ دولھے راجہ کاٹھ کا الو بنے رہیں گے۔ میاں
ہر سماج کے کچھ تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ ہم تو میاں بزنس نہیں سماج سیوا کرتے ہیں۔"
دکان دار نے وضاحت کی۔
"آپ کے ریٹ۔" مسٹر فاعلن نے پوچھا۔
"خود لونڈیا کے لیے۔ ایک سو ایک روپے 95 پیسے فی گھنٹہ۔ اس کی بہنوں کے لیے دو سو

ایک روپے 95 پیسے فی گھنٹے۔" جواب ملا۔

"اور ماں باپ کے لیے۔" مسٹر فاعلن نے پھر سوال کیا۔

"ماں خود روتی ہے۔ باپ سبک سبک کر رومال سے آنسو پونچھ لیتا ہے۔ اس لیے انھیں کسی رونے والی اور رونے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ماں سوتیلی ہے تو اس کے لیے لاجواب امریکن نوحہ گری کا ہمارے یہاں معقول انتظام ہے۔ پر اس کا ریٹ بہت ہائی ہے۔" دکاندار نے بتایا۔

"کیا ریٹ ہے۔" مسٹر فاعلن نے پوچھا۔

"ایک ہزار ایک روپے 95 پیسے فی گھنٹہ۔ میاں اس کے لیے ایک کوئنٹل تو پیاز ہی لگ جاتی ہے۔" دکان دار نے جواب دیا۔

امتحانوں میں فیل ہونے والے طالب علموں اور طالبات کے لیے ان کے مضامین، فیکلٹیوں اور، درجات اور مارکس کے پرسنٹیج کے حساب سے رونے والے اور والیوں کی علاحدہ علاحدہ دکانیں تھیں۔ نوعیت اور ترجیح کے لحاظ سے ریٹ بھی مختلف تھے۔ مسٹر فاعلن نے سوچا کہ شادیوں اور امتحانوں کا سیزن تو ہر سال آتا ہے۔ آتا کیا ہے، سال بھر رہتا ہے۔ آدمیوں کو اور کام ہی کیا ہے۔ پیدا ہونا شادی کرنا۔ بچوں کی ٹیم تیار کرنا اور مر جانا۔ بچوں کا کام ہے، امتحان دے کر فیل ہو جانا۔ یونیورسٹیوں اور بورڈوں کا کام ہے سال میں دو دو تین تین بار امتحان لینا۔ اس لیے نوحہ گروں کو سال بھر عمدہ کام مل جاتا ہے، مگر الیکشن تو پانچ سال میں ایک بار آتا ہے۔ پھر بھی خاص اس کے لیے نوحہ گروں کی علاحدہ سے دکانیں ہیں۔ بظاہر تو یہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، چڑیا کا بچہ ادھر نہیں جھک رہا ہے۔ پھر ان کے پیٹ کیوں کر پلتے ہوں گے۔ یہ گورکھ دھندہ

ہے بھئی۔

یہ جستجو انھیں ایک الیکشنی نوحہ گروں کے اسٹال پر لے گئی۔ دکان دار سے آپ نے دریافت کیا۔

"بھائی ایک بات تو بتاؤ الیکشن تو آتا ہے پانچ سال میں ایک بار۔ پھر آپ کا کام کیسے چلتا ہے؟" دکان دار نے بتانا شروع کیا۔

"یوں تو ہمارا ایک بزنس سیکریٹ ہے۔ مگر آپ چونکہ چہرے مہرے سے ایک شریف آدمی دکھائی پڑتے ہیں اس لیے چلیے بتائے دیتے ہیں۔ دیکھیے صاحب الیکشن آتا ہے، تو بوتھ کیپچرنگ بھی ہوتی ہے۔ سر پھٹول بھی جم کے ہوتی ہے۔ لوگ خوب مرتے ہیں۔ مرنے والوں کے قریبی اور دور کے سیکڑوں رشتے دار ہوتے ہیں۔ انھیں رونے والوں کی اچانک ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ ایک تو رہی یہ بات! دوسرے ہر سیٹ پر پچاس پچاس، کہیں تو سوسو، سواسو، امیدوار پہلوانی کرتے ہیں۔ الیکشن کا ایک خاص نکتہ یہ ہوتا ہے کہ ہر سیٹ پر جیتنے والا تو ایک ہی امیدوار ہوتا ہے۔ باقی سب کو تو ہارنا ہی پڑتا ہے۔ ہارنے والوں کی دو کیٹگریز ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کی ضمانت بچ جاتی ہے، دوسرے وہ جن کی ضمانت ضبط ہو جاتی ہے۔ ان سارے ہارے ہوئے امیدواروں کو اور ان کے پورے خاندانوں، جھنڈا برداروں اور نعرے لگانے والوں کو تھوک کے بھاؤ نوحہ گروں کی لاکھوں کی تعداد میں ضرورت پڑتی ہے۔ اس موقع پر پورا پورا اسٹاک اس چھوٹی سی دکان میں تو سما نہیں سکتا اس لیے ہمیں نوحہ گروں کی ہاٹ بازار کے کسی بڑے میدان میں لگانی پڑتی ہے۔ اس دکان میں تو آپ کو ایک بھی نوحہ گر نہیں ملے گا یہ تو ہمارا ٹھیا ہے یعنی دفتر! گاہک ہم سے یہاں رابطہ قائم کرتا ہے۔ ایک الیکشن ختم ہونے کے بعد آنے

والے چناؤ میں نوحہ گروں کی ایڈوانس بکنگ اسٹارٹ ہو جاتی ہے۔ آخر ہمیں اتنی بڑی تعداد میں رونے والوں کا اسٹاک بھی تو جٹانا پڑتا ہے۔"

"آپ کے ریٹ کیا ہیں۔" مسٹر فاعلن نے پھر پوچھا۔

"یہ کیٹگری ٹو کیٹیگری طے کیے جاتے ہیں۔ جس پہلوان کا لنگوٹ سلامت رہ گیا یعنی اس کی ضمانت بچ گئی، اس کے لیے دس ہزار ایک روپیہ 95 پیسے۔ دو دن کے لیے۔ اس کے خاندان اور ورکروں کے لیے دو ہزار ایک روپیہ 95 پیسے ایک دن کے لیے ۔ جس پہلوان کا لنگوٹ اتر گیا، یعنی ضمانت ضبط ہو گئی خود اس کے لیے ایک ہزار ایک روپیہ 95 پیسے دو دن کے لیے اس کے خاندان اور نعرہ برداروں کے لیے پانچ سو ایک روپیہ 95 پیسے۔ ایک دن کے لیے۔ اس میں ایک اسپیشل کیٹگری بھی ہے وہ امیدوار جسے اپنی جیت کا ایک سو ایک فیصدی بھروسا ہو اور وہ غیر متوقع طور پر الیکشن ہار جائے اور اس کی ضمانت بھی ضبط ہو جائے اس کے لیے پندرہ ہزار ایک روپیہ 95 پیسے ہر دو دن کے حساب سے ۔ اس کے خاندان اور ورکروں کے لیے ساڑھے سات ہزار ایک روپیہ 95 پیسے صرف تین دن کے لیے۔" دکان دار نے تفصیل پیش۔

"اس حساب سے تو آپ ایک سیزن میں کروڑوں روپے کما لیتے ہوں گے۔" مسٹر فاعلن نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں خدا کا شکر ہے ۔ ایک سیزن میں اتنی کمائی ہو جاتی ہے کہ دو سیزن کام نہ بھی کریں تو عیش سے موج مستی منائیں۔ دس سال کا کوٹہ ایک ہی سیزن میں پورا ہو جاتا ہے میاں! پر ایک بات ہے میاں! مزے ہیں، الیکشن جیتنے والے پہلوان ہی کے۔" دکان دار نے کہا۔

ہا وہ کیسے۔ ؟ مسٹر فاعلن نے حیرت سے دیدے پھاڑ دیے۔

ں وہ الیکشن جیت کر پانچ سال میں جتنا کما لیتا ہے۔ اتنا ہم چار سیزن یعنی بیس سال میں نہیں کما پاتے۔" دکان دار نے بہ حسرت و یاس جواب دیا۔ کچھ توقف کے بعد پھر

۔ میاں یہ الیکشن ہے خوب چیز۔ جس نے ایجاد کی ہو گی، بڑا قابل اور اقتصادیات کا طُر ں رہا ہو گا۔"

کیسے بھئی۔" مسٹر فاعلن محو حیرت ہو چکے تھے۔

اں یہ الیکشن ہی ہے جس نے ہمارے اس نوحہ گری کے کاروبار کو باقاعدہ انڈسٹری کا بہ دیا۔ وی پنگ انڈسٹری کا۔" دکان دار نے فخریہ لہجے میں کہا۔

حضرت مسٹر فاعلن کی ریسرچ ختم ہوئی۔ اب آپ انھیں کوس سکتے ہیں۔

قیوم راہی
اے-۲۰۰/۱ بلاک ڈی
نارتھ ناظم آباد-کراچی
پاکستان

خاموشی

رنگ اس کا گورا ضرور تھا لیکن سفیدی مائل۔ سرخ و سفید والی بات نہیں تھی۔ چہرے کے نقوش ایسے جنھیں بس گوارا کہا جا سکتا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے اس اکہرے بدن اور سنجیدہ چہرے والی لڑکی میں کوئی جاذبیت نظر نہیں آئی۔

اس دن غضب کی ٹھنڈ تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون منجمد ہو گیا ہو۔ میں نے حسبِ معمول اسکوٹر اسکول کے صحن میں کھڑا کیا۔ میرا آٹھ سالہ بیٹا نعیم کتابوں کا بیگ اٹھائے احتیاط سے نیچے اترا اور اپنے کلاس روم کی طرف چلنے لگا۔ تب میں نے برآمدے میں اس جگہ جو استانیوں کے بیٹھنے کے لیے مخصوص تھی، اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کا جیکٹ اور کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھوں کو اوورکوٹ کی جیبوں میں پناہ دے رکھی تھی۔ برابر بیٹھی استانیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ مگر وہ خاموش تھی۔ سب سے بے نیاز، تنہا تنہا سمٹی سمٹائی سی۔ لگتا تھا اسے یہاں زبردستی بٹھایا گیا ہے اور ذرا موقع ملتے ہی وہ یہاں سے بھاگ جائے گی۔

اس اسٹاف ٹیبل سے تھوڑے ہی فاصلے پر کلرک براجمان تھا۔ کام تو مجھے کوئی نہ تھا پھر بھی نہ جانے کیوں کلرک کی میز کی جانب کھنچا چلا گیا۔ اس کے ارد گرد کئی بچے اور ان کے سرپرست کھڑے تھے۔ کچھ لوگ فیس ادا کر رہے تھے اور کئی کچھ معلومات حاصل کر رہے تھے۔ میں اب اس لڑکی کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سراپا کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا چہرہ شاید غیر معمولی سردی کے زیرِ اثر سفید ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی گم صم تھی۔ کئی بار اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ یہ شکنیں اس کی اندرونی گھٹن اور بیزاری کی غمازی کر رہی تھیں۔ یوں تو میں بڑی احتیاط کے ساتھ چور نظروں سے اس کام میں مشغول تھا پھر بھی ایک دو بار میری اور اس کی نظریں چار ہوئیں۔ اور تب میں نے اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھیں۔ ایک انجانا سا تذبذب۔ ایک انجانی سی گھبراہٹ جیسے وہ اپنے اندر کے نیم تاریک گھنے جنگل میں بھٹکتی پھر رہی ہو۔ پھر اچانک میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سوجی ہوئی سی تھیں، گویا وہ رات بھر جاگتی رہی ہو اور روتی رہی ہو۔

میں تو اس مطالعے کے سلسلے کو منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چند منٹ بعد جب کلرک کی میز کا گھیراؤ ٹوٹ گیا تو مجھے مجبوراً اپنے اسکوٹر کا رُخ کرنا پڑا۔

یہ تو خیر پہلے دن کے تاثرات تھے جو کئی دن تک قائم رہے۔ البتہ تجسس روز بروز بڑھتا گیا

رہا۔ اس کے چہرے کو پڑھنا میرا معمول بن گیا۔ چہرے پڑھنا کچھ اتنا آسان کام بھی نہیں۔ یہ بھی ایک فن ہے۔ اور اس فن پر پورا اترنے کے لیے تجربات کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے پھر بھی یہ دعوا نہیں کیا جا سکتا کہ جو کچھ پڑھا گیا ہے، سمجھا گیا ہے وہ سو فیصد صحیح ہے۔

میں شاید بھٹک گیا ہوں۔ بات اس لڑکی کی ہو رہی تھی اور میں چہرے پڑھنے کے فن پر تبصرہ کرنے لگا۔ مگر یہ بھی تو اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بہت دنوں تک اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ وہ روز اول کی طرح افسردہ افسردہ، آزردہ آزردہ سی تھی۔ وہی شست شست تھکی تھکی سی چال، وہی ظاہری رکھ رکھاؤ، وہی اکلوتا گلابی رنگ کا چیک اور رکوٹ۔ وہی سیاہ جوتے۔ مجھے ابھی اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہونے کا انتظار تھا کہ جس کے بغیر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے اسکول پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ اسکوٹر سے اتر کر نعیم نے چند قدم بڑھائے اور گھبرا کر مجھے دیکھا۔ میں استفسار کیا تو ڈرتے ڈرتے کہنے لگا میں اس کو کلاس روم تک چھوڑ آؤں کیونکہ نئی میڈم بہت سخت ہیں۔ بات بات پر ڈانٹتی ہیں، سزائیں دیتی ہیں، زیادہ غصہ آجائے تو چھڑی سے مارنے لگتی ہیں — کلاس روم پہنچا تو ایک کرخت نسوانی آواز میرے کانوں کے پردے سے ٹکرائی۔ ساتھ ہی میز پر زور سے چھڑی پٹخی گئی۔ میں دروازے کے نزدیک پہنچا تو نئی میڈم کی صورت میں اسی لڑکی کو دیکھا۔ مجھے ایک جھٹکا سا محسوس ہوا۔ اس کا یہ نیا روپ میرے لیے خاصا حیران کن تھا وہ اس وقت بری طرح جھنجھلائی ہوئی تھی، بے قابو سی۔ ایک بار پھر اس نے چھڑی زور سے میز پر دے ماری "خبردار جو کسی نے شور مچایا" اس کی آواز میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی۔ وہ بچاری دبلی پتلی یتیم سی لڑکی معصوم بچوں کے لیے اس قدر سنگ دل اور ظالم بھی ہو سکتی ہے۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے برآمدے میں چپ چپ اداس اداس سا دیکھا تھا اور جس کے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھرتے رہتے تھے جب وہ مڑی تو اس نے مجھے دیکھا۔ میں نے فوراً نعیم کو آگے بڑھا دیا "آج ذرا دیر ہو گئی، اسے کچھ کہیے گا نہیں"

"جی"، وہ ایک قدم آگے بڑھی جیسے میری بات سن نہ سکی ہو۔

"میرا مطلب ہے دیر میری وجہ سے ہوئی ہے اسے کچھ کہیے گا نہیں"

"کوئی بات نہیں۔ آیندہ خیال رکھیے"

وہ بلیک بورڈ کے پاس پہنچ گئی۔ اور میں اس کی سخت گیر طبیعت کے بارے میں سوچتا ہوا صحن میں آ گیا۔ عجیب نامعقول سی لڑکی ہے پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو۔

اس کے لیے ہمدردی کے جو جذبات میرے دل میں تھے سرد پڑنے لگے۔ ہر وقت منہ سجائے رکھنا کہاں کی انسانیت ہے۔ بچوں کے ساتھ تو اسے پیار اور مہربانی سے پیش آنا چاہیے نہ کہ ان سے ظالمانہ سلوک روا رکھا جائے۔ اگر کبھی نعیم کو اس نے پیٹا تو میں بڑی میڈم سے شکایت کر کے دماغ درست کروا دوں گا محترمہ کا۔ خود بھی ایسی خبر لوں گا کہ یاد کرے گی۔ سارا نشہ اتر جائے گا مس صاحبہ کا۔ غرض کہ اس کی خود سری اور جارحانہ انداز نے مجھے اس سے متنفر کر دیا تھا۔

اب میرا یہ معمول بن گیا تھا کہ روز نعیم سے اس کے بارے میں رپورٹ لیتا۔ اس بچارے کے پاس ایک ہی جواب ہوتا اور وہ یہ کہ مس بخاری بہت غصے والی ہیں۔ اور یہ جو اس پر ابھی تک ڈانٹ یا مار نہیں پڑی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کا بتایا ہوا ہر کام پابندی اور محنت سے کرتا تھا۔ کبھی اس نے مس بخاری کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ ویسے بھی وہ کلاس کے ہونہار اور قابل طلبہ میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں تو مجھے مس بخاری سے باز پرس کرنے کا کبھی موقع نہ مل سکا۔ البتہ کئی اور بہانوں سے میں اس سے بات کرنے لگا تھا۔ چاہتا تھا ذرا بے تکلفی ہو جائے تو اسے سمجھاؤں کہ معصوم بچے پھول کی طرح نازک ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور پیار کے ساتھ پیش آنا چاہیے لیکن وہ میرے ساتھ خاصی محتاط رہی۔ اور یوں میرے تعلقات کبھی اس حد تک استوار نہیں ہو سکے کہ کھل کر بات کر سکتا۔

"کلاس میں کیسا چل رہا ہے نعیم"؟ ایک دن میں نے گفتگو کا آغاز اسی بات سے کیا۔

"بہت اچھا"، وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"گھر پر ٹیوشن تو میں نے رکھی نہیں ہے البتہ خود ہی کچھ وقت دے دیتا ہوں"

"ٹھیک ہے۔ بچہ ہوشیار ہے۔ بات کو جلد سمجھ لیتا ہے"

"کوئی شرارت وغیرہ"

"نہیں"

"میں نے اُسے ہدایت کر دی ہے کہ شریر بچوں کو اپنا دوست ہرگز نہ بنائے"

چند بچوں کے زور زور سے بولنے کی آواز کا شور مچا تو اس نے فوراً قمچی میز پر پٹخی "کون شور کر رہا ہے" وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ چہرے پر جلال کی سرخی دوڑ گئی۔

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ سارے بچے سہم کر رہ گئے۔ سانس روکے ہوئے سے وہ یوں بیٹھے تھے جیسے کسی خونخوار کی زد میں آ گئے ہوں۔ واپس ہوتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اس کی گرجتی ہوئی آواز سنی "خبردار جو اب کسی نے بھی شور مچایا۔ کھال ادھیڑ دوں گی"

چند دن بعد میرا اُس سے پھر مکالمہ ہوا۔

"دیکھیے میڈم نعیم کہہ رہا تھا آپ نے پکنک کا چندہ مانگا ہے"

"ہاں" مس بخاری نے انتہائی مختصر جواب دیا۔

"پروگرام کہاں کا ہے"

"فی الحال تو دو تجویزیں زیر غور ہیں"

"کون کون سی"

"ایک نندی پور کے لیے۔ دوسری جہانگیر کے مقبرے کے لیے"

"نندی پور تو دور ہے، شام ہو جائے گی"

"فی الحال کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ بڑی میڈم طے کریں گی لیکن میرا خیال جہانگیر کے مقبرے کے لیے ہے"

"جی ہاں۔ یہی مناسب ہے"
اس نے کتاب کھول لی اور پڑھانے میں مصروف ہوگئی۔ میں نے روپے آگے بڑھائے۔

"یہ لیجیے"
وہ تنک کر قریب آئی "لائیے"
اس نے مجھے گھورا۔ جیسے کہ رہی ہو جب چندہ دینا ہی تھا تو اتنی باتیں سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے روپے لے لیے۔ کاپی پر نعیم کا نام درج کیا اور پھر بچوں کی طرف رجوع ہوگئی۔

صحن تک پہنچتے پہنچتے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ انتہائی مغرور، بد دماغ اور کسی حد تک غیر مہذب لڑکی ہے، اس لیے کسی ہمدردی کی مستحق نہیں۔ میں عنقریب سارے تکلفات کو نظر انداز کر کے واضح الفاظ میں اس کو خبردار کروں گا کہ اگر بچوں کے ساتھ اس کا سلوک نہ بدلا تو کسی موثر کارروائی کے اقدام کے لیے خود کو قابو میں نہ رکھ سکوں گا۔ میں اس کا یہ رنگ ڈھنگ برداشت نہیں کرسکتا۔

کچھ عرصے تک میں بے حد مصروف رہا۔ اسے دیکھنے اور اس کے بارے میں سوچنے کا بھی وقت میسر نہ آسکا۔ ویسے سوچنے کے لیے اب رہ بھی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو آنکھوں نے دیکھ لیا تھا مگر اس کے باوجود کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دل کو ابھی تک ایک کُرید سی لگی ہوئی ہو۔ نہ جانے کیوں۔

کئی ماہ بعد ایک جھڑ کی ایک اُداس دوپہر کو باتوں باتوں میں جب مجھے کلرک کی زبانی پتا چلا کہ مس بخاری ایم۔ اے ہے اور اسے اتنی کم تنخواہ ملتی ہے جو کسی کو بتائی نہیں جاسکتی، اس کی تعلیمی قابلیت سے بہت کم۔ تو مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں ضروری نہیں کہ اشیاء کی نوعیت وہی ہو۔ حقیقت کو پانے کے لیے عجلت کی نہیں، صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لیے گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ اچانک ایک پردہ سا میری نظروں کے سامنے سے سرکا۔ اور تب میں نے ایک چھوٹا سا معمولی سا مکان دیکھا۔ تھکے تھکے قدموں سے مس بخاری اس میں داخل ہو رہی تھی۔ گھر میں افراد کم نہیں تھے۔ مگر رونق نہیں تھی۔ زندگی کی وہ ہماہمی، شادابی اور بشاشت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سب چہرے زرد زرد تھے۔ سب لوگ سوچوں کے حصار میں محبوس تھے۔ یوں خاموش تھے جیسے ایک دوسرے سے ناراض ہوں یا پھر کسی کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ماحول پر سکوت طاری تھا۔ سکوت جب گہرا ہو جاتا ہے تو صدا بن کر گونجنے لگتا ہے۔ میں خود اس صدا کو سن چکا ہوں۔ میں ان کمہلائے ہوئے چہروں، بجھتے چراغوں کی مانند ٹمٹماتی ہوئی آنکھوں اور بند ہونٹوں سے اچھی طرح آشنا ہوں۔ میں خود ایک طویل عرصے تک اس سکوت کا گھائل رہ چکا ہوں۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے تھے مجھے۔ اتنی مسلسل محنت مشقت اور تگ و دو کرنی پڑی تھی کہ ہانپ ہانپ گیا تھا۔ لہولہان سا ہوگیا تھا۔

یہ تم اپنی محرومیوں اور گھٹن کا بدلہ ان معصوم بچوں سے کیوں لے رہی ہو آخر — ایک بار پھر میرے دل میں اس خواہش نے انگڑائی لی کہ مس بخاری سے بات کروں۔ اسے سمجھاؤں کہ وہ غلط راہ پر چل رہی ہے۔ اسے اپنی سوچوں کے انداز بدل دینے چاہیں۔ مگر باوجود کوشش کے میں ایسا نہیں

کر سکا۔ میرے اور اس کے درمیان جو ایک فاصلہ قائم ہو چکا تھا کبھی طے نہ ہو سکا۔ بعض فاصلے مختصر ہوتے ہوئے بھی اس قدر طویل بن جاتے ہیں کہ انسان ساری زندگی عبور نہیں کر پاتا۔ غالباً فاصلہ بھی اسی نوعیت کا تھا۔ چنانچہ میں نے مس بخاری کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔ خواہ مخواہ کسی (وہ بھی ایک اجنبی لڑکی) کے گھریلو اور خالص ذاتی معاملات میں دخل اندازی غلط فہمی کا موجب بھی تو بن سکتی تھی۔ پھر وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھی (جس کا سو فیصد امکان تھا) کہ جناب کیوں میرے غم میں دُبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ میں جیسی بھی ہوں، جو کچھ کر رہی ہوں خود ذمّے دار ہوں۔ آپ اپنی راہ لیں۔ اپنے مسائل حل کریں۔

اب مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ چنانچہ نعیم کو صحن میں چھوڑ کر میں فوراً ہی دفتر کا راستہ لیتا۔ برآمدے میں جاتا تو درکنار اسکوٹر بھی ایسی جگہ کھڑی کرنے لگا تھا جہاں سے اسٹاف ٹیبل نظر سے اوجھل ہوتی۔

کئی ہفتے یونہی سکون سے گزر گئے۔

اس دن میں واپسی پر اسکول وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ آخری پیریڈ ختم ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے لیکن میں دو تین منٹ بعد ہی اکتانے لگا۔ جلدی یوں تھی کہ نعیم کو گھر پہنچانے کے بعد مجھے دفتر کا ایک اشد ضروری کام نمٹانا تھا۔ میں نے نعیم کے کلاس روم کا رخ کیا کہ میڈم سے اجازت لے لوں گا، چند منٹ کی تو بات ہے۔ دروازے سے تھوڑی ہی دور پہنچا تھا کہ ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا۔ مس بخاری ایک خاص اپنائیت کے انداز میں بچوں سے مخاطب تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی بھی نہیں تھی جس کے بغیر اس کی شخصیت ادھوری ادھوری سی لگ رہی تھی۔ اس کا یہ انداز میرے لیے بڑا غیر متوقع، حیران کن اور چونکا دینے والا تھا۔ اچانک جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پاؤں اسی جگہ جمے رہے۔ ذرا بھی تو جنبش نہ کر سکا۔ چند ساعتوں کے بعد جیسے غنودگی کے عالم میں آگے بڑھا۔ اور جب دروازے کے قریب پہنچا تو ایک بچے نے مس بخاری کو میرے بارے میں بتایا۔ مس بخاری نے میری طرف دیکھا۔ اس کے گورے گورے چہرے پر ایک خاص فتح اور اطمینان کا سایہ تھا۔ ایک ایسا سکون نمایاں تھا جو اس سے قبل میں نے اس کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر میں نے ایک کومل سی آواز سنی "نعیم بیٹے جاؤ چھٹی کر لو تمھارے ڈیڈی لینے آئے ہیں"
اور میں نے دیکھا اور محسوس کیا، اس ایک لمحے میں مس بخاری نے کتنے ہی طویل برسوں کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔

کوثر مظہری
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دلی۔ ۲۵

اسماعیل میرٹھی کی نظم
''آثار سلف''

اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے ذہن اور نفسیات کو سامنے رکھ کر تمثیلی، اخلاقی اور مشاہداتی نظمیں لکھیں۔ اردو کی پہلی کتاب سے پانچویں کتاب اور ''اردو زبان کا قاعدہ سے ''سفینۂ اردو اور ''سواد اردو'' تک مولانا اسماعیل نے ایک اہم کام کیا ہے۔ اسکول کے نصاب میں ان کی کتابیں پڑھائی جانے لگیں ۔ ہر جگہ اور ہر زبان پر اسماعیلی اردو کا چرچا ہونے لگا۔ اس سے انھیں کافی نقصان ہوا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اردو شعر وادب کو نقصان پہنچا۔ یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ مولانا اسماعیل صرف بچوں کے شاعر و ادیب ہیں اور یہ کہ وہ صرف ہماری گائے، عجیب چڑیا، اونٹ اور اسلم کی بلی ۔ جیسی نظموں کے شاعر ہیں۔ مکالمہ سیف و قلم، باد مراد، مناقشہ ہوا و آفتاب ''اور آثار سلف'' جیسی نظموں کو پس پشت ڈال دیا گیا یا قابل اعتنا ہی نہ سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ نظمیں اپنے اندر شدت احساس کی گرمی اور اثر آفرینی رکھتی ہیں۔ یہاں ان کی شاہکار طویل نظم ''آثار سلف'' کا ایک جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا اسماعیل میرٹھی چونکہ ۱۸۸۸ سے لے کر ۱۸۹۹ تک آگرہ کے سینٹرل نارمل اسکول میں فارسی کے استاد رہے تھے اس لئے انھیں قلعہ اکبر آباد کے درودیوار کو قریب سے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کے افکار کو پر پرواز لگا اور ان کے آئینہ احساس میں دور مغلیہ کے عروج وزوال کی سچی تصویر ابھر آئی۔ انھوں نے جو محسوس کیا اور ان کے اندر جس قدر Power of Perception تھا اس نظم مشعر کیفیت قلعہ اکبر

آباد موسوم ہے۔ [illegible] کی تحقیق میں لکھا ہے۔ یہ نظم کلیات اسماعیل میں ۱۱ صفحات پر بکھری ہوئی ہے اور اس میں کل ستر (۷۰) بند ہیں۔

اس نظم میں قلعہ اکبر آباد اور اس سے منسلک بادشاہوں ، بزرگان دین ، شاعروں ، ادیبوں اور ان کی سرگرمیوں کو جزیات کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ نظم کے بین السطور میں دور مغل شاہی کی تہذیبی و ثقافتی کرنیں زر پاشی کر رہی ہیں۔

ملاحظہ کریں کہ اسماعیل میرٹھی نے اپنے مشاہدات اور لطیف خیالات کو تشبیہوں اور ترکیبوں سے کس طرح حسن تعمیر بخشا ہے۔

یارب یہ کسی مشعل کشتہ کا دھواں ہے	یا گلشن برباد کی یہ فصل خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے	یا قافلہ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
یا دور گذشتہ کی مہابت کا نشاں ہے	بانئ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچم جم جاہئ اکبر
بجتا تھا یہاں کوس شہنشاہئ اکبر

یہ قلعہ اکبر آباد جیسے الوند کی طرح آب جمنا کے کنارے بہ تزک و احتشام کھڑا ہے، جیسے ایک مضبوط تنومند فوجی ہو، جیسے ہندستان کا راجپوت ہو یا سمرقند کا ترک۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہاتھیوں کو سجا کر اور زریں ہودج سے لیس کر کے باہر نکالا جاتا تھا۔ اس قلعہ سے اکبر اعظم کا نام منسوب ہے۔ جو مخزن تدابیر تھا اور یہیں پر جہانگیر کا مطلع تھا، شاہجہاں کی توقیر و عظمت اسی قلعہ سے جڑی ہے۔ اس کے علاوہ اس عہد کے

دوسرے مشاہیر واکابر کے نام بھی اس قلعہ سے منسوب ہیں۔ اسی سبب سرزمین ہند پر قلعہ اکبر آباد خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کا اقبال و اجلال اعلا و برتر تھا اور آج اس کے درودیوار سے نحوست ٹپک رہی ہے۔ شاعر نے اظہار تاسف کیا ہے جو اپنے اندر پرخلوص درد لیے ہوئے ہے۔ بند کچھ اس طرح ہے۔ ؎

وہ چتر و دیہیم وہ سامان کہاں ہیں	وہ شاہ وہ نوئین وہ خاقان کہاں ہیں
وہ بخشی و دستور وہ دیوان کہاں ہیں	خدام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں
وہ دولت مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں	فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس

ہوتے تھے جہاں خان و خواتین زمیں بوس ۱؎

اسماعیل میرٹھی نے شعروں میں دوراز کار تشبیہیں استعمال نہیں کی ہیں بلکہ اخلاص اور سچائی کے ساتھ دربار شاہی سے منسلک اور منسوب اشیا اور عناصر کے استعمال سے حقیقت کی برجستہ اور فنکارانہ ترجمانی کی ہے۔ حالی نے بھی عہد رفتہ اور عظمت ماضی کو پرخلوص جذبے کے ساتھ اپنے ''مسدس'' میں پیش کیا ہے۔ مگر اسماعیل میرٹھی کا جذبہ ان کے عینی اور ذاتی مشاہدے کا پابند ہے۔ کہیں بھی جذبہ کی لگام ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ اس لیے جب وہ یہ ذکر کرتے ہیں کہ اس رنگ محل میں مطرب خوش آواز کی ترنگیں تھیں مگر اب کچھ بھی نہیں، اب تو فوارے بھی شکستہ ہیں، نہ وہ چلمن زرتار ہے اور نہ وہ بستر کمخواب، جام بلوریں بھی نہیں۔ یہاں دادودہش کا چلن عام تھا اور یہیں سے عدل جہانگیری کی زنجیر قائم ہوئی تھی، تو کچھ بھی مبالغہ معلوم نہیں ہوتا اور نہ تصنع کا گزر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جن عناصر خوارج یا مجردات کا ذکر انھوں نے کیا ہے، ان کا

۱؎ کلیات اسماعیل ۱۹۷۶ء، ص ۱۹۴

دربار شاہی سے گہرا تعلق ہے۔

چونکہ محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، اور شبلی وغیرہم نے لفظوں میں منظر نگاری اور فطرت نگاری کی مثالیں قائم کی ہیں۔ لہٰذا اسماعیل میرٹھی نے بھی منظر کشی میں اپنے مشاہدے کو پیش کیا ہے اس ضمن میں ایک بند پیش کیا جاتا ہے۔

وہ نہر، وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ	اب دیکھیے وہ مسجد و حمام زنانہ
ہے طرز عمارت سے عیاں شان شہانہ	صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ
ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوہ ترانہ	کیا ہو گئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ

چغتائیہ گلزار کی یہ فصل خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

بعد کے بندوں میں شاعر نے اس دور کے سماجی رسم و رواج اور درباری رکھ رکھاؤ کا بھی ذکر کیا ہے۔ زنجیر عدل، نور جہاں اور ممتاز محل کے حسن اور ذکاوت، درشن جھروکہ، تلادان جودھابائی کی جاہ و حشمت وغیرہ کا ذکر ہوا ہے۔ وزیروں اور امیروں، صلحا اور علماء، کو بھی شعروں میں جگہ دی گئی ہے۔ اسلامی اور ہندستانی تہذیب و ثقافت کے مشترکہ نقوش کو اس نظم میں مولانا اسماعیل میرٹھی نے خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اچھوتی اور برمحل تشبیہوں اور علامتوں سے اپنی نظم کو انھوں نے اور بھی پراثر بنادیا ہے۔

قلعہ اکبر آباد میں ایک خوبصورت مسجد تھی جس کے در و دیوار سے مسلمانوں کے برے دن کے نقوش پھوٹ رہے ہیں۔ حسن تعمیر اور جذبہ اسلامی کا پرتو آج بھی اس مسجد پر دیکھا جاسکتا ہے۔ مسجد پر شاعر نے پورے چار بند لکھے ہیں مگر یہاں صرف دو

بندوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہاتھوں نے ہنر مند کے اک سحر کیا ہے | سانچے میں عمارت کے مگر ڈھال دیا ہے
یا تار نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے | مر مر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
گو شمع نہ فانوس نہ بتی نہ دیا ہے | ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے

چلیے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارے کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا | مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا | ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھہرا تھا یہاں عز و علا کا | جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا

ہیں اب تو نمازی مرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکین ؎۱

اس بند کا آخری شعر معنوی اور شعری دونوں حیثیتوں سے توجہ چاہتا ہے مسجد فریاد کر رہی ہے کہ اب تو کوئی نمازی بھی نہیں البتہ اس صحن میں دھوپ آتی ہے، رات کو چاندنی ہوتی ہے اور کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسکیں ادھر آجاتا ہے۔ بلکہ اب تو محض مسکینوں کے سایے ہیں۔ آخری مصرعے میں دھوپ، چاندنی اور سایہ مسکیں تینوں مجردات کو نمازی قرار دے کر ان کی تجسیم کی ہے۔ مولانا نذیر احمد نے اس شعر کو کافی پسند کیا تھا اور خصوصاً سایہ مسکیں کے استعمال کو موزوں و بر محل قرار دیا تھا۔

۱۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔ حامدی کاشمیری ۱۹۶۸ء ص ۱۲۷

ڈاکٹر سیفی پریمی صاحب نے اس نظم کے ان بندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مسجد قرطبہ کا ذکر چھیڑا ہے اور کہا ہے کہ اقبال کے یہاں بجز اسلوب بیان کے کوئی ندرت یا اضافہ نہیں ملتا[1] میں ڈاکٹر سیفی پریمی کے اس نظریہ سے بہت کم ہی اتفاق کرتا ہوں۔ دونوں نظموں کا پس منظر بہت مختلف ہے اور پھر یہ کہ مولانا اسماعیل میرٹھی یہ نظم اکبر آباد (آگرہ) میں بیٹھ کر لکھ رہے ہیں جبکہ علامہ اقبال مسجد قرطبہ میں ہسپانیہ کی سرزمین میں لکھ رہے ہیں۔ دونوں شاعروں میں فکری اور زمانی بعد ہے۔ اقبال کے یہاں متکلم اور حاضر کا پیرایۂ بیان ہے جب کہ اسماعیل میرٹھی کے یہاں غائب کا۔ اقبال کے یہاں خون جگر اور عشق کی لو تیز تر ہے جو ملائک، عقل کل یعنی جبریلؑ، حبیب خدا اور خود ذات باری تعالیٰ کو محیط ہے۔ جہاں اسماعیل میرٹھی کہتے ہیں ؎

ہاتھوں نے ہنر مند کے اک سحر کیا ہے | سانچے میں عمارت کے مگر ڈھال دیا ہے

وہاں اقبال کو سنیے ؎

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کار جہاں بے ثبات! کار جہاں بے ثبات

فرق ظاہر ہے اور بھی کئی نکات ہیں جن پر بحث کی یہاں گنجایش نہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ضرور ہے کہ علامہ اقبال کے سامنے "آثار سلف" اور ایسی دوسری شاہکار نظمیں رہی ہوں گی۔ ان نظموں سے ان کے جذبے کو تقویت بھی ملی ہو گی "مگر مسجد قرطبہ" پر "آثار سلف" کے اشعار کو فوقیت دینا شاید مناسب نہ ہو گا۔ اسی طرح اسماعیل

۱۔ حیات اسماعیل ۱۹۷۶ء، ص ۱۹۳

میرٹھی کے اس شعر پر۔

ہمت میں تھے شاہین تو جرأت میں تھے شہباز
عزت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

جناب سیفی پریمی نے یہ کہا ہے کہ اس میں شاہین اور شہباز، اسماعیل کا اپنا اختراع ہے اور ممکن ہے کہ اقبال نے شعوری یا غیر شعوری طور پر شاہین کو "مستعار لیا ہو اور بعد میں اپنا لیا ہو۔ اگر سیفی پریمی کے مذکورہ بالا نظریات کو صحیح مان لیا جائے تو یہ کہنے میں کیا عار ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال کی نہ "مسجد قرطبہ" اپنی تخلیق ہے اور نہ "شاہیں" ان کی شاعری میں اپنی تخلیق کردہ علامت۔ اگر کوئی ثبوت پیش کیا گیا ہوتا تو کوئی بات نہیں۔ مگر یہاں تو صرف قیاس آرائیاں خرچ کی گئیں ہیں اور اس سے بات نہیں بنتی۔

"آثار سلف" ایک طویل بیانیہ نظم ہے۔ موضوع میں اتنی وسعت اور تنوع ہے کہ اس میں ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کے کوائف سمٹ آئے ہیں۔ اس موضوع میں کیا اتنی وسعت ہے کہ اس میں عمومی صداقت کی تلاش کی جا سکے؟ سوال تو اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ وسعت کا یہاں معنی یہ ہے کہ اس میں ہندستان اور ایران کی قدیم تاریخ بھی ہے، عہد اکبری کا تذکرہ بھی ہے، اسی طرح علوم وفنون کے باب میں فیضی اور ابوالفضل کے ساتھ ساتھ بو علی سینا اور افلاطون کا ذکر بھی آیا ہے۔ راجا بکرم، بھوج اور راجا ارجن کے ساتھ جمشید اور سکندر کو بھی شعری پیکر عطا کیا گیا ہے۔ اس نہج پر تو اس نظم کی معنوی اور تہذیبی اہمیت آفاقی کہی جا سکتی ہے۔ لہٰذا عمومی صداقت کی جستجو بھی سعی رائگاں نہیں ہوگی۔ تہذیب و تمدن کے ٹوٹے پھوٹے رشتوں کو اسماعیل میرٹھی نے ہنرمندی اور فنی خوبیوں کے ساتھ اس نظم میں پرو دیا ہے۔ پروفیسر حامدی

کاشمیری نے اس موضوع کے سلسلہ میں یہ لکھا ہے کہ۔ "نظم کا موضوع ایک خارجی نوعیت رکھنے کے باوجود شاعر کی خلاقانہ صلاحیتوں کی بدولت داخلی جذبے کی گہرائی سے ہمکنار ہے[1]"

قلعہ کی شکستگی کا حال بیان کرنے کے بعد نوجوانوں کے سامنے اسلاف کی عظمت و برتری کو پیش کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کے سرفراز اور کامیاب ہونے کی وجہ کیا تھی۔ بند ملاحظہ کریں۔

عزت کی ملی تھی انھیں جاگیر دوامی	دولت کے طرف دار تھے اور دین کے حامی
خصلت میں خوشامد تھی نہ عادت میں غلامی	رسموں میں خرابی تھی نہ اطوار میں خامی
گر فہم و فراست کی مجالس میں تھے نامی	تدبیر ممالک میں تھے وہ صدر گرامی

گر فتح و ظفر میں تھے سکندر سے زیادہ
تھے دانش و حکمت میں ارسطو کے بھی دادہ

اسلاف نے حصول علم کے لیے بھی محنت و مشقت کی۔ فیضی جیسے علامہ نے تاریخ نگاری اور ادب نگاری میں گل و بوٹے کھلائے۔ وہ لوگ عیش پسندی کی جگہ جفاکشی کو اپنی زندگی کا شعار سمجھتے تھے۔ آج بھی کچھ لوگ "پدرم سلطان بود" پر ہی زندگی کی گاڑی کو لیے جارہے ہیں۔ مگر اس جھوٹی شان پر نازاں ہونے اور پھولنے سے شاعر آگاہ کرتے ہیں۔

دل اپنی ستایش سے نہ بہلایئے حضرت	اس راہ میں دھوکا نہ کہیں کھایئے حضرت
شیخی کو بہت کام نہ فرمایئے حضرت	شعلہ کو تعلّی کے نہ بھڑکایئے حضرت
آبا کی بزرگی پہ نہ اترایئے حضرت	یہ گو ہے یہ میدان ادھر آیئے حضرت

ا۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات۔ حامدی کاشمیری ۱۹۶۸ء ص ۱۲۷

پھر اچانک اسماعیل میرٹھی کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بادشاہوں اور امرا کی زندگی میں بے راہ روی اور خوشامدانہ مزاج آگیا۔ ان کے مشیر کار اور مصاحب نے اور بھی انھیں تنزل کی راہ میں ڈال دیا۔ شاعر کے ذہن میں عہد رونق واجلال اور دور تاریکی و ابتذال دونوں موجود ہیں۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں ؎

کیا حال تھا حضرات ملوک اور امرا کا | انبوہ تھا بیہودہ مشاغل کی بلا کا
یا فوج کنیزوں کی تھی اک قہر خدا کا | یا بولتا طوطی تھا کسی خواجہ سرا کا
یا شور خوشامد کا تھا یا مدح و ثنا کا | تھا غول گویوں کا تو جمگھٹا تھا شعرا کا

سفلے تھے مشیر اور مصاحب تھے چھچھورے
وہ عقل کے دشمن تو حضور ان سے بھی کورے

جس تاریخی پس منظر کو اسماعیل میرٹھی نے یہاں پیش کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بادشاہوں کو بے ہودہ مشاغل نغموں کی، موسیقی کی چاہت اور رقاصاؤں کی عشوہ طرازیوں نے بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ خواجہ سراؤں کو برتری حاصل تھی۔ اور درباری ایسے تھے جنھوں نے اپنے تملقانہ رویوں سے بادشاہوں اور امیروں کو حقیقی زندگی سے بہت دور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمام حکومت دوسری قوم کے ہاتھوں چلی گئی۔ اسماعیل میرٹھی کی ذہنی بالیدگی اور شعور کی پختگی نے انھیں تاریخی اور سماجی پہلوؤں کو سمیٹ لینے میں کامیاب بنایا ہے۔ عیاشی اور عیش کوشی اور کھوکھلی شان و شوکت نے مسلمانوں کو قعر مذلت میں دھکیل دیا۔ اس نظم میں اسماعیل میرٹھی نے ہند اسلامی کلچر، تہذیب و تمدن، رکھ رکھاؤ، فنون لطیفہ اور دوسرے عوامل زندگی اور عناصر

کائنات سمویا ہوا ہے۔ قومی و ملی افکار کی کرنیں اس نظم کو اور بھی تابناک کرتی ہیں۔

جس طرح حالی نے "مدو جذر اسلام" میں ضمیمہ کے ذریعہ قوم کے حوصلے کو بلند کیا اور انہیں عظمت رفتہ پر ماتم کرنے کی بجائے لگن اور امید کا مشعل دیا جس کی روشنی میں چل کر اپنی منزل تک رسائی ہو سکے۔ شاعر کا یہ فرض ہے کہ قوم کو ڈرائے مگر پھر اسے راستہ بھی دکھائے ورنہ قوم کے غارت ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی ہے۔ اخیر میں مولانا اسماعیل میرٹھی نے نوجوانانِ قوم کے حوصلے بلند کیے ہیں۔ اخلاقیات اور مختلف علوم و فنون کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ صاف دل اور کینہ سے پاک ہو کر معرکۂ علم و عمل میں نکلنے اور فتح یاب ہونے کا درس دیا ہے۔ خوبصورت اور معنی خیز تراکیب اور استعارات سے شعروں کو حسن بخشا ہے۔ اس بند پر اپنی بات ختم کرتا ہوں ؎

ہے قوم اگر باغ تو تم اس کے شجر ہو | ہے قوم اگر نخل تو تم اس کے ثمر ہو
ہے قوم اگر آنکھ تو تم نور بصر ہو | ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گہر ہو | نظارگی ہے قوم تو تم مدّ نظر ہو

موسیٰ بنو اور قوم کو ذلت سے بچاؤ
گوسالۂ غفلت کی پرستش سے چھڑاؤ

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما سے متعلق آپ کی دوٹوک، بے لاگ اور فوری رائے کی ہمیں انتہائی ضرورت ہے مگر کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مختصر بھی ہو۔ (ادارہ)

● اقبال متین۔ کہانی۔ کتاب گھر۔ نظام آباد۔ اے۔ پی

جنوری کے رسالے میں "گٹھری واہیات کی" (رضا نقوی واہی) آپ نے جس اہتمام سے چھاپی ہے یہ طنزیہ نظم اسی اہتمام کی مستحق تھی۔ کتنی سچی اور کھری باتیں واہی صاحب کر گئے ہیں اور ان کے انکسار نے خود کو بھی کشکول برداروں کے غول میں شامل کر لیا ہے یہ ان کی بڑائی ہے۔ رفعت صدیقی کی نظم (تمام شد) بہت متاثر کرتی ہے اس پر ادارے کی جانب سے لگایا ہوا آپ کا نوٹ آپ کے درد مند دل کی جگہ اپنے دل میں بھی بنا لیتا ہے۔ رفعت صدیقی میرے چہیتے ہیں شاید اسی لیے بھی میں آپ کی غمگساری پر آنسو زدہ ہو گیا۔ خامہ بگوش کا میں مداحوں میں سے ہوں۔ "زور قلم یا ضعف قلم" میں وہ سب کچھ ہے جو زخموں کے لیے مرہم اور مرہم کے لیے شفا کا کام دیتا ہے۔ مجھ سے انجانے میں ایک بے ادبی سرزد ہو گئی تھی۔ میرے ایک قلمی دوست تھے انور خواجہ۔ اللہ کرے حیات ہوں۔ میں نے مشفق خواجہ صاحب کو اسی بے تکلفی سے خط لکھ دیا تھا جیسے انور خواجہ کو لکھ سکتا تھا۔ وہ خاموش ہی رہے۔ درگزر کیا یہ ان کی شرافت نفس کی دلیل ہے آج تک خاموش ہیں کہ بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے یادوں کے ضمن میں "باتیں بیماریاں" کا ایک سلسلہ ماہنامہ "سب رس" میں شروع کر رکھا ہے کبھی تفصیل سے اس غلط فہمی کا ذکر کروں گا۔

اتفاق سے نامی انصاری کا مضمون "شاعری کی ناقدری" انھیں شاعران کرام کی خوش فہمیوں کا احاطہ کرتا ہے جن کا ذکر واہی نے اپنی نظم میں کیا ہے۔ نامی انصاری نے "فخرالدین میموریل سوسائٹی" اور دوسری اکاڈمیوں کو شاعری کے مجموعوں کی اشاعت کے بارے میں بڑی صائب رائے دی ہے۔ ان کے احتسابی لائحہ عمل سے میں متفق ہوں کہ یہ گرد و غبار چھٹے بھی۔ مجتبیٰ حسین اور محمود حامد کی تخلیقات پڑھ لی ہیں اچھی لگیں۔

● عبدالقوی دسنوی

کتاب نما (فروری ۹۶ء) کا اداریہ پڑھ کر بہت بے مزہ ہوا اقبال زندہ ہوتے تو کہتے:

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے

میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں:

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

● جمیل صدیقی بدایونی، سوتھا، بلڈانہ

فروری ۹۶ء کا شمارہ آیا۔ مہمان مدیر قاضی عبدالرحمن ہاشمی کا اداریہ یکطرفہ ہے۔ کوئی بھی نظریہ کسی ایک شخص کے ذہن میں خود بخود پیدا نہیں ہو جاتا۔ اس کے پس منظر میں تاریخی، معاشرتی اور اقتصادی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اس کے منظر عام پر آنے سے بہت پہلے اس کی داغ بیل پڑ چکی ہوتی ہے اور قدرتی غیر محسوس طریقے سے انسانی عقائد و عمل کو اسی انداز میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک فرد واحد پر تقسیم کی ذمہ داری ڈالنا بے محل ہے۔ خامہ بگوش حسب سابق اپنی شمشیر طنز کی آب برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔

● مشتاق احمد نوری، سکریٹری بہار اردو اکادمی،
اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔

مارچ کا کتاب نما سامنے ہے۔ شہپر رسول نے "پیکر تراشی کے حوالے سے" بہت کار آمد باتیں کہی ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں اس سے بہتر ڈھنگ سے پیکر تراشی کے تعلق سے باتیں نہیں کی جاسکتیں۔

محترم رضا نقوی واہی ۸۲ سال گزار کر بھی ویسے ہی چاق و چوبند ہیں ان کی شاعری کی دھار آج بھی اتنی ہی تیز ہے اور اس سے زیادہ دھار ان کی نثر میں ہے۔

اس بار خامہ بگوش نے بھی اپنے قلم کی نوک بہت تیز رکھی ہے۔ انتظار حسین کے سلسلہ میں ان کا یہ جملہ ہزاروں جملے پر بھاری ہے۔ "انتظار حسین ان ادیبوں میں سے ہیں جو لغت سامنے رکھ کر نہیں لکھتے بلکہ لغت نگار ان کی کتابیں سامنے رکھ کر لغات مرتب کرتے ہیں۔" اسے کہتے ہیں سو سنار کی ایک لہار کی!!

مجروح سلطان پوری صاحب پر مضمون طویل تو ہے لیکن تشنہ ہے قمر صاحب کو پورے تسلسل کے ساتھ ان کے فن اور شخصیت پر لکھنا چاہیے تھا۔ انھوں نے بس اپنے ذاتی تعلق کے حد میں ہی مضمون کو محدود کر دیا ہے جبکہ مجروح صاحب کی شخصیت کسی بھی حد سے باہر ہے۔

سچ ہے ایسی شخصیتیں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ آپ خاص نمبر نکالنے کی ایک مہارت رکھتے ہیں شخصیتوں پر کتاب نما کے کئی نمبر آچکے ہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ مجروح صاحب پر بھی ایک شمارہ نکالتے۔[1]

[1] مجروح صاحب کی اجازت سے ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کتاب نما کا نمبر ترتیب دے رہی ہیں (ادارہ)

● ڈاکٹر محمد نعمان، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، احمد آباد، بھوپال۔

کتاب نما، فروری ۱۹۹۰ء کا اشاریہ مشترکہ تہذیبی ورثہ اور اقبال" پڑھا۔

مذکورہ بالا اشاریہ میں حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جنھیں مخالفین اقبال برسوں سے لکھتے چلے آرہے ہیں اور جنھیں ہمارے مورخین و محققین قطعی غلط ثابت کر چکے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ علامہ اقبال نے بعض مخصوص حالات کے سبب مسلم اکثریت کی حامل ایک متحدہ ریاست کی تشکیل کی تجویز پیش کی تھی لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے ہندستان کے حدود سے باہر کسی سرزمین کے متلاشی تھے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال نے غیر منقسم ہندستان میں شامل رہ کر مذکورہ ریاست کا خواب دیکھا تھا۔ میری حقیر رائے میں اُن کا یہ خواب اگر شرمندۂ تعبیر ہو جاتا تو ہم تقسیم کے المیہ سے نہ صرف محفوظ رہتے بلکہ ہر اعتبار سے صورت حال آج سے بدرجہا بہتر ہوتی۔ علامہ اقبال کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہو گیا تھا اور ان کی اس تجویز کا ۱۹۴۷ء کی تقسیم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

علامہ اقبال کی تمام عمر حب الوطنی کے نغمے گانے اور تعصب و تنگ نظری کے خلاف آواز بلند کرنے میں بسر ہوئی۔ انھوں نے نظریۂ سیاسی وطنیت کی مخالفت ضرور کی لیکن حب الوطنی کے وہ کبھی مخالف نہیں رہے۔ اردو اور فارسی دونوں کلام، ان کے جذبۂ حب الوطنی کے شاہد ہیں۔ اقبال کی حب الوطنی پر شک کرنا روشن آفتاب کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔

اقبال کے یہاں مثالی اسلامی ریاست کا تصور نہیں ہے بلکہ مثالی انسانی معاشرہ کا تصور ہے یہ علاحدہ بات ہے کہ اس مثالی معاشرہ کے قیام کے لیے انھوں نے اسلامی اقدار کو اس لیے بنیاد

گیا تھا کیونکہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور عالمِ انسانیت کی بقا اور ترقی کے لیے وہ اسلام کے اصولوں کو مفید سمجھتے تھے۔ ان کی فکر مذہب پسندی کی فکر تھی، مذہب بیزاری کی نہیں! اس مذہب پسندی کے سلسلہ میں انھوں نے تمام مذاہب کے بہترین اصولوں کو اخذ کر کے ایک مثالی انسانی معاشرہ کا خاکہ مرتب کیا تھا۔ ان کا مثالی انسان، تنگ نظر یا کٹھ ملا نہیں بلکہ ایک وسیع النظر، وسیع المشرب، وسیع الاخلاق، حریت پسند، ہمدرد اور حساس انسان ہے۔

جو باتیں تحقیق و تاریخ کے آئینے میں غلط ثابت ہو چکی ہیں، انھیں دہرانا غیر مناسب عمل ہے۔ ایسے مضامین جن سے ہمارے بزرگوں عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی فکر تکذیب ہوتی ہو یا ان کے کردار مسخ ہوتے ہوں، کم از کم "کتاب نما" کے صفحات پر شائع نہ ہوں تو بہتر ہوگا۔ ہماری دل آزاری کے لیے دوسروں کے قلم ہی کیا کم ہیں کہ ہم خود اپنے قلم سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ صاف دل اور صاف ذہن برادرانِ وطن کے لیے بھی تکلیف رسانی کا باعث بن جائیں۔

● کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

فروری ۹۶ء کا "کتاب نما" بغور پڑھا۔ پروفیسر قاضی عبدالرحمن ہاشمی کا مہمان اداریہ یقیناً کئی لوگوں کو کئی طرح سے سوچنے پر مجبور کرے گا بلکہ یوں کہیں کہ دعوتِ فکر دے گا۔ اس کے علاوہ گیان چند جین کا مضمون تحقیق کے باب میں اضافی صورت کا ہے۔ جناب مظہر امام نے منظر شہاب کی شاعری پر بھرپور مضمون قلم بند کیا ہے "فائر ایریا" پر نارنگ ساقی نے تبصرہ لکھا ہے۔ اچھا ہی لکھا ہے مگر انھیں ناول اور کہانی کا فرق کون سمجھائے؟ پورے ناول میں فن پارہ ہونے کے عناصر موجود ہیں۔ کہانی پن بھی ہے، کردار نگاری کا پختہ شعور بھی ہے اور جسے نارنگ ساقی کولیری کا لینڈ سکیپ بنانے کی بات کرتے ہیں دراصل وہ ناول کا ناگزیر حصہ ہے اور اسے جزئیات نگاری بھی کہہ سکتے ہیں اور اگر قاری اس طرح کے صفحات سے بچ کر آگے نکلنا چاہتا ہے تو اس سے گدی صاحب کا کیا جاتا ہے قاری اگر ناول کے فن سے ذرا بھی واقف ہوگا تو اسے آگے نہیں بڑھ کر گدی صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ جوڑ کر چلنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

● توصیف احمد خاں، ملت ویلفیر سوسائٹی، جھریا۔

کتاب نما (فروری ۹۶ء) نظر نواز ہوا۔ میں بطور خاص مہمان اداریہ، خامہ بگوش کا کالم اور تبصرے پڑھتا ہوں۔ اس کے تبصرے عموماً بڑے معتدل اور جامع ہوتے ہیں مگر اس بار تبصروں کے کالم میں الیاس احمد گدی کے ناول "فائر ایریا" پر نارنگ ساقی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔

ادب میں سب سے زیادہ میں صنفِ ناول کو پسند کرتا ہوں۔ اب تک اردو، ہندی اور انگریزی کے تقریباً ساڑھے تین سو ناولوں کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اردو میں ناول نگاری کا آغاز انگریزی ناولوں کے زیر اثر ہوا مگر آج بھی اردو ناول انگریزی ناول سے بہت پیچھے ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو میں ناولوں کی کثرت تو ہے مگر زیادہ تر موضوعات وہی گھسے پٹے ہیں۔ الیاس احمد گدی کا ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے ایک بالکل نئے موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کی۔ اسی خیال کا برملا اظہار جناب شمس الرحمن فاروقی شب خون میں شائع اپنے تبصرے میں کر چکے ہیں

اردو میں بڑے ناول انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ یہ کارنامہ ہے کہ الیاس صاحب نے ایک انگشت کا اضافہ کیا ہے۔ ورنہ کئی برسوں سے اس میدان میں دھول اڑتی نظر آرہی تھی۔

● صوبیدار ایم اے خان، ۱۵ راجپوت

جنوری کا کتاب نما ملا۔ اس میں شامل مضامین میں نامی انصاری صاحب کا مضمون "شاعری کی ناقدری"، پڑھ کر واقعی شاعروں کی ناقدری کا احساس شدت سے ہوا۔ غزلوں میں جناب شمیم جے پوری کی غزل کا یہ شعر بے حد پسند آیا ؎

بس ایک بار ترے پاس ہو کے گزرا تھا
تمام عمر ترے پیرہن کی بُو آئی

طنز و مزاح کے متعلق سارے مضامین پسند آئے افسانوں میں ہندی افسانہ "رضائی"، بھی خوب ہے خدا کرے کہ کتاب نما کا معیار اور بلند ہو۔

● ضیاء جبل پوری، کاماریڈی

مارچ کا شمارہ ملا۔ آصف فرخی کی کہانی اچھی لگی۔ مضامین میں گوپی چند نارنگ اور معین الدین عقیل کے مضامین پسند آئے۔ رام پرکاش کپور کا خط خوب ہے۔ نظموں میں "دستک"، "الماری میں" اور "لفظوں کے گھروندے" دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ غزلیں تمام اچھی ہیں۔ تبصرے حسبِ معمول معیاری ہیں۔ "پیکر تراشی کے حوالے سے"، کئی بار پڑھ چکا ہوں۔

● سید احتشام الدین، رسول منزل، محلہ ملا حلیم خاں دربھنگہ، بہار۔

کتاب نما دسمبر ۸۹ء کا شمارہ پڑھا۔ "متعلقات تہذیب اور ادب"، بڑا جامع اور بھرپور مضمون ہے۔ عتیق اللہ صاحب کی نظر تہذیب و تمدن کے سلسلے میں بہت گہری اور واضح ہے۔ اردو اور [illegible]

ذہن کام کر رہا ہے جس کی تعریف "ورود مسعود" میں مسعود صاحب کر چکے ہیں۔ "فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں"، پر کاظم علی اور نیر مسعود کی گفتگو بہت معلوماتی ہے۔ شعری حصہ پسند آیا۔ باکک بانی "بھوپال گیس" اور "نہ اک پتے کو روبابا"، نظموں نے متاثر کیا۔ محسن احسان کا "نذر غالب" کا یہ شعر ؎

اتر گیا رگ و پے میں تعصبات کا زہر
محبتوں کا اثر بے اثر ہے کیا کیجیے

پسند آیا۔ عادل حیات نے اپنے خط میں "گھٹن کم ہو دریچے کھول لینا"، پر اعتراض کیا ہے۔ موصوف کو سمجھنا چاہیے غزل کا مزاج عجیب ہے۔ یہاں عجیب و غریب باتیں اپنا الگ رنگ رکھتی ہیں ؎ ہمارے گھر کے اُجالوں پہ مہرباں ہے کوئی
ہوا چلی تو چراغ اور مسکرانے لگے

اب ہم کہیں کہ ہوا چلنے پر چراغ بجھ جاتے ہیں تو محترم ایسا نہیں ہوتا۔ سیکڑوں مثالیں ہیں اور یہ بڑا بحث طلب موضوع ہے۔

● رام پرکاش کپور، ۱۸/۷ ایم۔ آئی۔ جی۔ پدم نابھ پور درگ ۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

عوام پر تو غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈے کا اثر ہو ہی جاتا ہے لیکن نہایت دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ اب تک اردو کے کئی ادیب و دانشور بھی علامہ اقبال کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ علامہ اقبال کے بارے میں المیہ یہ ہے۔ ہر ایک نے اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق ان کی شاعری اور شخصیت کو interpret کرنے اور اپنے عقیدے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ کسی نے اُن کو "شاعرِ اشتراکیت"، بنا دیا۔ تو کسی نے "شاعرِ ملتِ اسلام"، کسی نے "شاعرِ مشرق"، تو کسی [illegible]

کا بانی بنا دیا۔ ان کو صرف "علامہ اقبال۔ شاعر اور فلاسفر" نہیں رہنے دیا۔ میں نے اس مضمون میں غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

مضمون کچھ طویل ہو گیا ہے لیکن مجھے پوری امید ہے۔ آپ اسے شائع کر کے مجھے شکریے کا موقع دیں گے۔

[مضمون] آئندہ شمارے میں شائع ہوگا۔

● پروفیسر رونق شہری، آر، ایس، پی، کالج جھریا، بہار

کتاب نما فروری کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر گیان چند اور مظہر امام کے مضامین شمارے کا سرمایہ ہیں۔ شجاع خاور کی غزل اور ظفر گورکھپوری کے دوہے منظوم حصے میں نئے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔ مانگے کا اجالا میں "ادبی خبر کار" آپ ہی کا حصہ ہے۔ کیسے کیسے مواد آپ جمع کر کے رکھتے ہیں۔ "فائر ایریا" پر نارنگ ساقی کا تبصرہ یکطرفہ اور Damaging ہے۔ مبصر کا یہ جملہ بھی لطیفہ ہی کہلائے گا کہ ناول کے بارے میں کچھ کہہ دینا بھی نسبتاً آسان ہے کیونکہ ناول کو پڑھے بغیر بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ زبان اور بولی کا تذکرہ کر کے انھوں نے فائر ایریا کے مطالعے کی غرض و غایت پر ہی سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ نارنگ ساقی نے اس ناول کو غیر دلچسپ ثابت کرنے کے لیے تحیر کا فقدان نہ کہہ کر عجیب و غریب تاویلات پیش کی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فائر ایریا کے دلچسپ ہونے کے بنا پر ہی اسے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مصنف کے ذہن پر اچھوتے موضوع برتنے کا احساس کا غلبہ اس لیے نہیں رہا ہے کہ اسی موضوع پر ہندی کے قد آور ادیب سمجونے "ساودھان نیچے آگ ہے" چند برس پہلے لکھا تھا مجلدار جیسے مرکزی کردار کی نیت اس کے

مافی الضمیر کی آواز ہے جو اس کے تفکر کی آئینہ دار ہے۔

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

جائزے

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گلزارِ نسیم

(پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی)

مرتب : رشید حسن خاں
تبصرہ نگار: عبداللہ ولی بخش قادری
صفحات: ۲۷۴ قیمت: ۱۱۰/ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

رشید حسن خاں صاحب کی مرتبہ مثنوی گلزارِ نسیم کی پیش کش، ان کے سابقہ کارناموں، باغ و بہار، اور فسانۂ عجائب،، کے سلسلے کی ہی ایک تازہ ہم پلّہ ادبی کاوش کی حیثیت رکھتی ہے جس سے ان کی دیدہ ولائی و دیدہ ریزی دونوں کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے نہ صرف ان تینوں کتب کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے بلکہ وہ ہمارے واحد محقق و مرتب ہیں جن کے بارے میں انجمن کی ادبی کمیٹی طے کرچکی ہے کہ ان کی اس قبیل کی ہر سعی کو بلا تامل منظرِ عام پر لایا جائے گا۔

مکتبہ جامعہ دہلی نے اردو کی معیاری کتابوں کے سستے اڈیشن پیش کرنے کے لیے ۱۹۶۴ء میں ایک مجلس ادارت ترتیب دی جس میں رشید حسن خاں صاحب کا نام آغاز سے آج تک بدستور برقرار ہے اور کوئی دوسرا رکن ان سے زائد فعال نہیں رہا ہے۔ ان کی مرتبہ مثنوی گلزارِ نسیم، بار اوّل اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی جس کا پیش لفظ' دو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن ستمبر ۱۹۹۷ء میں چھپا جس میں 'تعارف' نے دس صفحے حاصل کرلیے ہیں۔ اس کے اختتام پر انھوں نے لکھا ہے:

"نسخہ مکتبہ جامعہ کی یہ دوسری اشاعت ہے۔ اشاعت اول میں بعض اغلاط باقی رہ گئی تھیں۔ اس بار احتیاط کے ساتھ ان کی تصحیح کردی گئی ہے۔ ایک تصحیح کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں: ص ۹۰ پر ایک مصرع ہے: داتا تھی وہ جہل خانے آئی۔ پہلے 'جہل' کو غلط الکاتب سمجھ کر 'جیل خانے' رکھا تھا۔ سامنے کا لفظ تھا۔ اشاعت اوّل (نسخہ مطبع میر حسن رضوی) میں 'جیلخانہ' نہیں بلکہ 'جہلخانہ' ہے۔ نسخۂ نظامی پریس میں بھی جہل خانہ ہی ہے۔ مخدومی امتیاز علی عرشی (زاد مجدہ) نے میرے

خط کے جواب میں اس شعر کی تصحیح کے ذیل میں التزام فرمایا [illegible]
جہل خانہ ہی درست ہے۔ جہل نے جیل کی شکل بعد میں اختیار کی ہے یہ بیچ کے
بعد کے مطبوعہ نسخوں میں 'جیل خانہ' ملتا ہے۔ اب غور کرنے پر خیال آیا کہ 'دانا
تھی' کی رعایت بھی جہل خانے کی مقتضی ہے اور یہ نسیم کا خاص انداز ہے۔ ورنہ یوں
یہ لفظ یہاں محض بیکار ہے۔ اب اس لفظ کو 'جہل خانہ' بنا دیا گیا ہے۔ یہ ہے؛
جمای استادخاںیت، متعدد اشعار کی تصحیح کے ذیل میں عرشی صاحب قبلہ نے
زحمت گوارا فرمائی۔ شکریہ کیا ادا کروں، مولانا میرے بزرگ ہیں۔ نیاز مندی کا تقاضا
ہے کہ خاموشی کے ساتھ ان کے احترام میں سر جھکا دوں ؎

اور اب زیر تبصرہ اشاعت میں پیش لفظ کے تحت ڈاکٹر خلیق انجم (سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند) نے دو صفحے تحریر فرمائے ہیں جس کے اختتامی جملے حسب ذیل ہیں: پوری ذمے داری کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ رشید حسن خاں صاحب نے متن کو تیار کرنے میں متنی تنقید کے تمام جدید سائنٹفک اصولوں سے کام لیا ہے اور اس طرح یہ ایک مثالی اڈیشن بن گیا ہے لیکن اس کے بعد 'مقدمۂ مرتب' کی وسعت ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے ذیلی عنوانات ۲۸ ہیں جو 'تمہید' سے شروع ہو کر 'خاتمہ' تک پہنچتے ہیں۔ درمیان میں 'گلزار نسیم' کی ادبی اور نصابی اہمیت' سے لے کر قصّے کا محل وقوع، نسیم کے حالات زندگی، گلزار نسیم کی مختلف اشاعتوں کا تعارف، فارسی متن سے متعلق مباحث کے علاوہ 'معرکہ چکبست و شرر' پر ان کا محاکمہ بھی موجود ہے جسے ادبی عدالت عالیہ کا 'قول فیصل' قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ سارا حصہ ۱۴۴ صفحات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے بعد گلزار نسیم کا متن آتا ہے جو ۷۶ صفحات پر مبنی ہے جسے مرتب نے بہر طور معتبر و مستند بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ پھر ضمیمہ تشریحات ۲۸۳ صفحات پر پھیلا ہوا ہے جو بذات خود ایک تصنیف کہلانے کا مستحق ہے۔ پھر دوسرا ضمیمہ ۳۰ صفحات پر مشتمل سامنے آتا ہے جو 'تلفظ و املا' سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ضمیمہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مرتب کا طرۂ امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے صحت متن کے ساتھ ساتھ صحت تلفظ و املا پر خاطر خواہ توجہ کی ہے جو فی زمانہ ہمارے ادیبوں کا شعار نہیں رہا ہے۔ جس کے بعد ۹۴ صفحات پر فرہنگ کا اندراج ملتا ہے۔ اس ضمن میں بھی انہماک سے کام لیا گیا ہے۔ الفاظ کے لغوی معنی اور عام مفہوم کے علاوہ مثنوی کے سیاق و سباق میں اس کی معنویت کو بخوبی اجاگر کر دیا گیا ہے اختتام پہ فارسی متن (مصنف: عزت اللہ بنگالی) پیش کیا گیا ہے جس کی ضخامت ۱۲۱ صفحات ہے۔

"نسخۂ مکتبہ جامعہ کی دوسری اشاعت میں رشید حسن خاں صاحب کے 'پیش لفظ' کا مندرجہ بالا اقتباس اس بات کا ثبوت تو فراہم کرتا ہی ہے کہ وہ کس طرح خوب سے خوب تر کی جستجو کرتے ہیں اور ان کی زیر تبصرہ تازہ سعی بلیغ ایک دو دن کا قصہ نہیں بلکہ ان کے ۲۵ سال کی سرگرم ادبی زندگی کا ایک مظہر ہے لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی آشکار ہو جاتا ہے کہ وہ بزرگان ادب کا کس قدر احترام کرتے ہیں البتہ ان کا قلم ادیبوں کی تن آسانی اور دیانت داری کا روادار نہیں رہا ہے جنھوں نے ادبی دیانت کو اپنا شعار گردانا ہے اور شخصی مروت و مصلحت [illegible]

کرتے رہے ہیں۔ اس میں ان کے انہماک اور لگن کو دیکھتے ہوئے انھیں 'درویش ادب' کہنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے، جس نے اپنے وطن شاہجہاں پور سے اٹھ کر دہلی میں پڑاؤ ڈالا اور تیس سال سے زائد مدت یہاں گوشہ نشین رہا۔ اب انھوں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا ہے اور اپنے وطن کے تکیہ پر لوٹ گئے ہیں۔ ان کی یہ تازہ، نوازش، دہلی کے قیام کی الوداعی یادگار کہلائے گی۔ خدا کرے وہ اپنے وطن میں اپنے اہل و عیال اور احباب کے درمیان پرسکون اور خوشگوار ماحول میں اپنے شب و روز گزاریں اور صحت مند رہیں۔ اور ہاں، ان کا قلم بھی رواں دواں رہے۔ ان کی اس ادبی کاوش کو 'سبیر حاصل' کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ ادبی ذوق رکھنے والوں اور ادب کے طالب علموں کے لیے اس کا مطالعہ مثنوی گلزار نسیم کی فہم اور لطف اندوزی میں اضافے کا موجب ہوگا۔ زیر تبصرہ اشاعت کی طباعت اچھی ہے اور ضخامت کے مدنظر قیمت کم۔ اس کی کتابت میں صحت املا اور عبارت کے اندر الفاظ کے وصل و فصل کے معاملے میں مرتب کی وضع احتیاط کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ کاش ہمارے اشاعتی ادارے اس روش پر کاربند ہوجائیں۔ اس اشاعت کے لیے انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم دلی مبارک باد کے مستحق ہیں ــ

۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں
اسلامی تحریکیں

مصنف : ڈاکٹر اقتدار محمد خاں
مبصر: محمد اسحاق، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ
ناشر: مصنف قیمت : ؍۲۵۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تبلیغی جماعت، جمعیت علماء ہند، جماعت اسلامی ہند، دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ نے ہندستان میں اسلام کے فروغ اور اس کی اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد رونما ہونے والے ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات، ہندو مسلم منافرت اور قتل و خونریزی کے بیچ ٹھوس سنجیدہ اور پرامن فکری اور علمی تحریکات اور اداروں کا قیام اور ان کا امن و سلامتی کے اسلامی پیغام کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تربیت کا کام تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ انتخاب تھا تخریب کو چھوڑ کر تعمیر کا، جنگ چھوڑ کر امن کا اور دیوانگی، جنون اور جہالت کو چھوڑ کر سنجیدگی، وقار اور علم کا۔ تاریخی حیثیت کے حامل ان اداروں اور تحریکوں پر علمی بحث پر مشتمل زیر نظر کتاب کئی پہلوؤں سے ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہے ایک تو یہ کہ مذکورہ وسیع موضوع کو نہایت اجمال کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں وہ تاریخی پس منظر بھی پیش کیا گیا ہے جس سے موضوع کی معنویت اور افادیت میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔ تیسرا نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ مختلف اسلامی تحریکوں اور اداروں پر اس بحث میں مصنف کا رویہ نہایت مثبت رہا ہے۔ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ بظاہر الگ الگ یہ اسلامی تحریکیں اور جدا جدا یہ اسلامی ادارے ایک ہی مشن اور ایک ہی مقصد کی مختلف شکلیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ دعوت، تعلیم، تحریک اور مشن ہے قرآن و سنت کو عام کرنے کا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں بھی اسی نکتہ کی وضاحت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے:

" ہندستان کی ان تمام اسلامی تحریکوں میں ایک معنوی ربط اور نظم ہے۔ تحریک

دارالعلوم دیوبند سے لے کر جماعت اسلامی ہند تک، ان کے درمیان جو بظاہر فرق نظر آتا ہے وہ بعض تحریکی قائدین اور ارکان میں تحریکی شعور نہ ہونے کے سبب پیدا ہوا ہے اور مصنوعی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی ساری اسلامی تحریکیں ایک ہی روح اور ایک ہی جذبہ کی حامل ہیں کہ اس ملک میں اسلام اور مسلمان نہ صرف زندہ رہیں بلکہ غالب ہو کر رہیں۔"

زیر نظر کتاب اپنے طویل مقدمہ کے علاوہ مندرجہ ذیل عنوانات پر محیط ہے:

۱۔ جماعت اسلامی
۲۔ تبلیغی جماعت
۳۔ جمعیت العلماء
۴۔ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کی تحریکات میں ۱۹۴۷ء کے بعد مزید ترقی۔
۵۔ مندرجہ بالا اصلاحی و تعلیمی تحریکات کا ہندستانی مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی پر اثر۔

عہد رسالت کے بعد خلفائے راشدین کے عہد سے مسلسل ہر دور میں مسلمانوں میں ایسے علماء مجتہدین اور مصلحین ابھرتے رہے ہیں جو مسلمانوں کو کتاب وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کی دعوت دیتے رہے ہے۔ فقہ اسلامی کے تدوینی مراحل میں کتاب وسنت کے علاوہ اجماع، قیاس، استحسان، استصلاح، عرف وعادت کی بنیادوں پر اسلامی قانون کی جو مختلف صورتیں مدوّن ہوئیں، انھوں نے ملّت اسلامی کو ایک وحدت کی شکل عطا کی، جس نے ہر دور میں ابھرنے والے چیلنجوں کا سامنا کیا۔
ہندستان کی آزادی اور ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کو یہاں نئے حالات سے دوچار ہونا پڑا اور قریب قریب انھیں از سر نو مذہبی اعتبار سے وہ تاریخ دُہرانی پڑی جو عہد وسطی کی ابتدا میں ہندستان میں مسلمانوں نے مرتب کی تھی۔ انھیں دوبارہ ایک ایسی بھاری اکثریت کے چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا جس کا اپنا ایک فلسفۂ حیات معاشرتی نظام، عقائد اور عبادت وریاضت کا مجموعہ تھا جس نے جارحیت کا روپ بھی اختیار کرلیا تھا، اس ماحول میں ہندستان میں مذکورہ اسلامی تحریکوں نے مسلمانوں میں اسلامی راسخ الاعتقادی اور مذہبی تشخص کی سمت میں جو کردار ادا کیا وہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

ہندستان کے اس نئے دور میں ہندستانی مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی تاریخ کے مطالعہ کا یہ پہلو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اگر ایک طرف نہایت اہمیت کا حامل ہے تو دوسری طرف اس کا معروضی مطالعہ نہایت دشوار، صبر آزما، انہماک اور ریاضت کا محتاج تھا لیکن مصنّف نے جس احساس فرض شناسی اور لگن کے ساتھ اس کام کو انجام دیا وہ اس کے لیے بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مختلف اسلامی تحریکوں اور اداروں کے متعلق ان کی معلومات کا انحصار اصل مآخذ رہے ہیں انھوں نے ثانوی مآخذ کو یا تو اہمیت ہی نہیں دی یا دی تو محض اصل مآخذ کی مزید تائید کی خاطر مطالعہ کے اس نہج نے ان تحریکات اور اداروں سے وابستہ افراد کے لیے بالخصوص ایسے رہنما نقوش چھوڑے جن سے ان کی آپسی دوری بہت کم ہو۔ اور وہ خود بھی ایک دوسرے کے سلسلہ میں اپنی عینک سے دیکھنے کے بجائے دوسروں کے احساسات اور تعبیروں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں مطالعہ

کے اس مثبت رخ نے اس کتاب کو کسی مخصوص مسلک کا ترجمان اور نمایندہ نہ رہنے دیا۔ ممکن ہے اگر انھوں نے یہ معروضی رویہ نہ اپنایا ہوتا اور یہ کتاب محض کسی مخصوص فکر کی نمایندہ ہوتی تو اس مخصوص فکر کے حاملین کی نظریں ان کی زیادہ پذیرائی اور مقبولیت ہوتی مگر اس سے کئی قدم آگے بڑھ کر مصنف نے اس کتاب کو ہر مسلک ترجمان اور نمایندہ بنا دیا کیوں کہ انھوں نے ہر مسلک کا مطالعہ اس کے ذاتی لٹریچر اور اصل مآخذ کی روشنی میں کیا ہے۔

اس کارآمد کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومت اترپردیش لکھنؤ) کا مالی تعاون حاصل رہا ہے وہ اس سلسلہ میں شکریہ کی مستحق ہے۔ امید ہے کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ کتاب ضرور مقبول ہوگی۔

اقبالیات کے تین سال

۱۹۸۷ — ۱۹۸۹ء

مصنف : ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مبصر : پروفیسر جعفر بلوچ

صفحات : ۱۸۴

قیمت : ۵۴ روپے

ناشر : حراپبلی کیشنز۔ فضل الٰہی مارکیٹ اردو بازار، لاہور

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سالہا سال سے اقبالیات کو لازمۂ حیات بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی تصانیف وتالیف کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۷۴ء سے اقبالیات پر ان کی کتابیں مسلسل شائع ہو رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ اخبارات ورسائل وجرائد میں تو وہ اس سے بھی پہلے لکھ رہے ہوں گے۔ گویا اقبالیات سے ان کا شغف عمر بھر کا شغف ہے اور یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

اقبالیات میں تصنیف وتالیف کے دیگر شعبوں کے علاوہ وہ ۱۹۸۴ء سے اقبالیاتی ادب کا جائزہ بھی مرتب کر رہے ہیں جو ایک بیش بہا ادبی خدمت ہے۔ ۱۹۹۲ء میں آپ نے ۱۹۸۷ء تا ۱۹۸۹ء کے اقبالیاتی ادب کے جائزوں پر مشتمل اپنی کتاب اقبالیات کے تین سال، اربابِ نظر کی خدمت میں پیش فرمائی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ذیل کے پندرہ ابواب میں اس سہ سالہ اقبالیاتی ادب کا جائزہ لیا ہے۔

متن، تراجم، کتب حوالہ، سوانحی ذخیرہ، جامعاتی تحقیق، موضوعاتی مطالعہ بعض اہم مباحث، مضامین کے مجموعے، شرح کلام، منظوم کتابیں، متفرق کتابیں، اخبارات وجرائد کے اقبال نمبر، اہم مضامین ومقالات، اقبالیاتِ متفرق اور ضمیمہ۔

جناب ہاشمی کا یہ جائزہ اقبالیات محض کتاب شماری تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے تمام تصنیفی اور تالیفی کاموں کی قدر وقیمت اور اہمیت متعین کرنے کی بھی سعی بلیغ فرمائی ہے اور بعض مفترت رسال کتابوں اور تحریروں پر گرفت بھی کی ہے۔ مثلاً اقبال کے نام سے فائدہ اٹھانے کے لیے بعض حضرات اپنی کتابوں کے نام اس طرح رکھتے ہیں کہ وہ کتابیں اقبالیات سے متعلق معلوم ہوتی ہیں حالاں کہ ان میں اقبالیات کا حصہ سرے سے نہیں ہوتا یا محض جزوًا اور برائے نام ہوتا ہے۔ جناب پروفیسر ہاشمی نے اس رجحان کی حوصلہ شکنی کی ہے اور اس سلسلے میں متعدد مشاہیر مثلاً جیلانی کامران، ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، ڈاکٹر

سہیل بخاری، ڈاکٹر وحید عشرت، پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ اور سید عبدالصبور طارق وغیرہ کے کاموں کا جائزہ لیا ہے۔ اقبالیات میں یہ التباس آفرینی واقعی افسوس ناک ہے۔ ہاشمی صاحب، جناب مظفر حسین برنی کی مرتب کردہ "کلیات مکاتیب اقبال" جلد اوّل سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے چناں چہ انھوں نے اس کتاب کی متعدد کوتاہیاں گنوانے کے بعد لکھا ہے۔

"زیر نظر کلیات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس نوعیت کے کام کے لیے محض وسائل کافی نہیں بلکہ اس کے لیے وہ تحقیقی ذوق اور نظر بھی مطلوب ہے جو ایک طویل مشق اور موضوع پر کچھ وقت کام کرنے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ چناں چہ زیر نظر کلیات کو دیکھ کر قدرے مایوسی ہونا قدرتی بات ہے۔"

اسی طرح ہاشمی صاحب نے 'عرفات' کے اقبال نمبر شائع شدہ جنوری فروری، ۱۹۸۰ء پر رائے دیتے ہوئے مقدمہ نگار محمد دین کلیم مرحوم کے بارے میں لکھا۔

"اس مقدمہ میں آگے چل کر انھوں نے بتایا ہے کہ علامہ کو ایک دفعہ "خارزار کفر" سے گزرنا پڑا اور علمائے لاہور نے آپ کو کفر کے فتویٰ سے نوازا۔" یہاں انھوں (محمد خاں کلیم مرحوم) نے فتویٰ جاری کرنے والے عالم (مولوی دیدار علی) کا نام لینے کے بجائے اس حرکت کو "علمائے لاہور" کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر مظفر عباس نے حضرت علامہ کے مشہور خطبۂ علی گڑھ بعنوان "دی مسلم کمیونٹی" کو مولانا ظفر علی خاں کے اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کرایا اور خطبہ کے انگریزی متن کو اپنی "دریافت" کے طور پر پیش کیا حالاں کہ پرویز ہاشمی یہ متن ۱۹۸۰ء میں اپنی کتاب "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" میں پیش کر چکے تھے اور یہ متن اسی سال مجلہ "تحقیق" میں بھی شائع ہوا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے پر پرویز ہاشمی کی آزردہ خاطری بجا ہے بلکہ پورا اقبالیاتی ادب ان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

ایک صاحب شاہد اقبال کامران نے حضرت علامہ کے متذکرہ بالا خطبے کے ایک اور ترجمہ کی ضرورت محسوس فرمائی ہے حالاں کہ اس سے قبل مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے نام سے موجود ہے جسے خود حضرت علامہ اقبال کی تائید و تحسین حاصل ہے۔ مولانا کے ترجمہ کی موجودگی کے باوجود اگر فکرِ اقبال کی تسہیل و تفہیم کے لیے کامران صاحب نے ایک اور ترجمہ فرمایا ہے تو چشمِ ما روشن دلِ ناشاد، کامران صاحب کے پیش لفظ کے جو اقتباسات ہاشمی صاحب نے اپنے جائزہ میں پیش کیے ان سے بھی مولانا ظفر علی خاں کے ترجمہ کی تحکیم و تجلیل ہی ظاہر ہوتی ہے لیکن ہاشمی صاحب نے اپنے جائزہ میں بعض ایسے فقرے لکھ دیے ہیں جن سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ شاہد اقبال کامران مولانا کے مقابلے میں حریفانہ میدانِ ترجمہ میں اُترے ہیں اور مولانا کے ترجمہ کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہوئے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ہاشمی صاحب کی اپنی سرعتِ احساس ہے۔ کامران صاحب کے الفاظ سے یہ ادعائیت ظاہر نہیں ہوتی۔ مجموعی طور پر "اقبالیات کے تین سال"، ایک نہایت مفید اور بصیرت افروز کام ہے اور اقبالیاتی ادب میں تشکر طلب افادیت و اہمیت کا حامل ہے۔

معلوماتِ سخن

شاعر: علامہ سریر کابری کامینائی (مرحوم)
مرتب: سید محمد داؤد اختر کابری
مبصر: سید احمد قادری
صفحات: ۱۶۰ قیمت ۳۵/- روپے
رابطہ: سریر منزل، کریم گنج۔ گیا بہار

"معلوماتِ سخن،، اس مشہور و مقبول شاعر کا مجموعہ کلام ہے جنھیں بلبل بہار علامہ سریر کابری مینائی کے نام سے جانا جاتا ہے اور جن کے بارے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا:

"بہار میں آج بھی باکمال ہستیوں کی کمی نہیں، میں ناقد ہوں شاعر نہیں، ایسے ترشے ہوئے الفاظ داد کے لیے کہاں سے لاؤں۔ جو سریر کابری کی شاعری کے لیے واقعی موجب تحسین ہوں"

ایسے عظیم اور قادرالکلام شاعر کے اس اہم مجموعہ کلام میں شامل غزلیں (ردیف وار) رباعیاں قطعات، اور تاریخی قطعات ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ جس میں عہد ماضی سے عہد حاضر تک کی بے حد خوبصورت تصویر کشی ملتی ہے۔ مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی و گیرائی اور فکری و فنی بصیرتیں پورے مجموعے کے اشعار میں بڑے فنکارانہ اور شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ موجود ہیں۔

اپنی شاعری میں سریر کابری نے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اصلاحی افکار کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی چنگاریوں کو بھی بڑے پُر وقار اور ایک خاص معیار کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

علامہ سریر کابری کو صنف شاعری کے تمام اصناف پر یکساں طور پر قدرت حاصل تھی اور ان کی دوربیں اور دور اندیش نگاہوں نے اپنے عہد کے ساتھ ساتھ آنے والے عہد کو بھی دیکھا اور بڑی شدت سے محسوس کیا تھا بلکہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اس مشہور قول سے بھی دو چار قدم آگے نظر آتے ہیں کہ ایک عظیم شاعر اپنے فن پارے میں اپنے عہد کی تصویر کشی کرتا ہے۔

علامہ سریر کابری کی شاعری کا نہیں بلکہ اردو شاعری کا المیہ ہے کہ ایسے بلند مقام شاعر کی شاعری کو وہ مقام نہیں بخشا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ "معلوماتِ سخن،، ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جو ہماری اردو شاعری کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہارِ نعت

ترتیب ـ حفیظ تائب
ضخامت ـ ۲۰۷ صفحات
ملنے کا پتہ ـ گلڈ ہاؤس منٹگمری روڈ۔ لاہور
تبصرہ نگار ـ صادقہ ذکی

پیش نظر انتخاب "بہارِ نعت،، سرکار دو عالم کے ذکر سے روحانی تسکین پانے والوں کے لیے ایک

عمدہ تحفہ ہے۔ اس کاروانِ بہار کو رواں دواں ہوئے یوں تو تقریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ لیکن اچھی کتاب کی زندگی قیدِ مقام و وقت سے آزاد ہوتی ہے۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد اس کی نکہت وجود تازہ کا پیام بن جاتی ہے۔ پھر ذکرِ نبیؐ یعنی موضوعِ کتاب بھی ایسا ہے کہ جس پر گردِ وقت کی کوئی تہہ اپنا کام نہیں کر سکتی۔

یوں تو نعتیہ کلام کی روایت دورِ نبویؐ سے ثابت ہوتی ہے لیکن اردو زبان و ادب میں یہ موضوع زبان کے ابتدائی مراحل سے ملتا ہے۔ اگر اس طرح نظر کی جائے تو حفیظ تائب کی یہ کتاب اردو نعت گوئی کے تسلسل میں کئی لحاظ سے اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے مثلاً چند سالوں میں اہلِ فن نے نعت گوئی کی جانب جو توجہ کی ہے اس کی وجہ سے اس صنف کے دائرہ کار میں کسی قدر وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس انتخاب میں نعتیہ غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نعتیہ غزل اپنی مخصوص موسیقیت کی وجہ سے بآسانی ترنم کی لہروں میں تحلیل ہو جاتی ہے اور اس طرح گہری تاثیر کا سبب ہوتی ہے۔ مثلاً اس کتاب کی غزلیں اپنے قارئین کو دیارِ محبوبؐ اور آستانۂ محبوب کی تمناؤں سے سرشار کر دیتی ہیں۔ اس ترتیب سے قطعِ نظر یہ موضوع انتہائی گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک تقاضا تھا کہ نظم کا پیرایہ اظہار بھی اس کا متحمل ہو۔ مسرت ہے کہ اس انتخاب میں رسولِ کریمؐ کی حیات کے بعض پہلوؤں کو نئے طرزِ اظہار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں میں پروین شاکر، انور سدید، جیلانی کامران، ذوالفقار احمد تابش، ریاض احمد، سید قمر ہاشمی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ طباعت، کتابت اور جلد کے لحاظ سے بھی یہ کتاب محنت اور شوق کا ثمر معلوم ہوتی ہے۔ امید ہے کہ دینی اور ادبی حلقوں میں یہ کتاب یکساں طور پر مقبول رہے گی۔ اور نئی آب و تاب کے ساتھ اس کے دوسرے ایڈیشنز آتے رہیں گے۔

نامِ مصنف: ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

تبصرہ نگار: یوسف ناظم

اردو کی لسانی تشکیل

قیمت: پچیس روپے

وسط دسمبر ۱۹۸۶ء میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے زیرِ اہتمام بمبئی میں اردو املا اور رسم الخط کے موضوع پر جو سیمنار ہوا اس کے کئی فوائد ہوئے۔ اس کے فوری فوائد میں سب سے اہم اور غیر متنازعہ فیہ فائدہ یہ تھا کہ غیر ماہرین کو ماہرین سے ملنے کا موقع ملا۔ باہر سے آنے والے مہمانوں میں اس مرتبہ اتفاق سے میری ملاقات ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ سے ہو گئی اور کافی تفصیلی ملاقات ہوئی جس کا سلسلہ چار روز تک جاری و ساری رہا۔ مرزا صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں استاد ہیں۔ اس کے باوجود ان کے چہرے پر نرمی ہے (جو آج کل بہت کم لوگوں کے چہروں پر پائی جاتی ہے اور خاص طور پر محققین کے چہرے تو اس سے یعنی نرمی سے مبرّا ہوتے ہیں)۔ خلیق بھی ہیں۔ نشست و برخاست اور (چار دن کی) عادات و اطوار کی روشنی میں بے حد مہذب پائے گئے اور انھیں دیکھ کر کوئی شخص یہ شبہ نہیں کر سکتا کہ یہ لسانیات جیسے خاردار موضوع کے گلچین ہوں گے۔ لسانیات، صوتیات، عروض اور اس قسم کے دوسرے موضوعات بے آب و گیاہ ریگستان کے مانند ہوتے ہیں اور جو بھی اس ریگستان سے گزرتا ہے وہ (تقریباً) جی جان سے گزرتا ہے۔ کھلانا تو اس کا بہرحال برحق ہے۔ مرزا خلیل بیگ نے یہ سفر کیا اور اب بھی یاترا ہی پر ہیں لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح محفوظ اور

تروتازہ رکھا ہے جیسے ریگستان سے نہیں کسی نخلستان یا شبستان سے چلے آرہے ہوں۔ ان کی تصنیف "اردو کی لسانی تشکیل"، مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں کی مکمل تفسیر ہے اور مجھ جیسے ہلکی پھلکی بلکہ رومانی اور جاسوسی کتابیں پڑھنے والے شخص کا اس موضوع پر کوئی کتاب پڑھنا (اور اس کا سمجھنا) ایسا ہی ہے جیسے صندل کو پتھر پر گھسنا لیکن میرے اس عمل کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ کتابوں کے بڑے بڑے ناموں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ کتاب واقعی صندل ثابت ہوئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں دردِ سر میں مبتلا تھا اور رفعِ دردِ سر کے لیے میں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ تو ایک تلازمہ ہے۔ کتاب پڑھنے میں مجھے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا اسی سے میں نے اندازہ لگایا کہ خود مصنف کو کتاب لکھنے میں کتنی پریشانی اور عرق ریزی سے کام نہیں لینا پڑا ہوگا۔

زیرِ نظر کتاب آٹھ مضامین پر مشتمل ہے اور جیسا کہ مصنف نے 'کتاب نامے' (پیش لفظ) میں لکھا ہے یہ تمام مضامین اردو زبان کی ولادت، اس کے بچپن، عنفوانِ شباب اور پکی عمر تک پہنچنے کے مراحل و منازل اور اس کے ارتقا سے متعلق ہیں۔ مصنف نے اپنے لیے خاصا بڑا وسیع موضوع چنا اور ظاہر ہے اس موضوع پر ۱۷۶ اسٹیشنری کی اسٹیشنری قطعی ناکافی ہے۔ مصنف نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ موضوع سے متعلق ان کے اور کئی مضامین اس کتاب میں شامل نہیں کیے جا سکے۔ مصنف کا اعتراف اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ مصنف نے اس سفر میں کافی وقت گزارا ہے اور گرد و پیش کا جائزہ بنظرِ غائر کیا ہے (تحقیقی و علمی مسائل میں اگر نظر غائر نہ ہو تو پھر فائدہ ہی کیا ہے)۔ اس کتاب کے پہلے مضمون "اردو کے آغاز و ارتقا کے نظریے" (ایک تنقیدی جائزہ) کو میں "بیت الغزل" سمجھتا ہوں (راہی اپنی اپنی سمجھ ہے) مرزا خلیل بیگ نے ایک ٹھوس، اور جامد مضمون کو آب معطر بنا کر پیش کر دیا۔ اس مضمون میں اردو زبان کے سبھی محققین اور ماہرین کے نظریے شامل ہیں جن پر مصنف نے بڑی احتیاط اور احساس ذمہ داری کے ساتھ بحث کی ہے اور کوشش کی ہے کہ موضوع تشنہ نہ رہے ـــــ جو لوگ اس مضمون کو تشنہ سمجھیں شاید ان کو پیاس ضرورت سے زیادہ ہی لگتی ہے۔ یہ مضمون دلچسپ بھی بہت ہے اس لیے کہ اگر تمام مخلوق کی رائیں پڑھی جائیں تو ان سے صرف یہی ثابت ہوگا ہے کہ اردو کسی ایک علاقے میں یا کسی ایک مقام پر نہیں پیدا ہوئی، بلکہ جگہ جگہ پیدا ہوئی، پنجاب میں، سندھ میں، دکن میں۔ بہر حال یہ کیا کم ہے کہ سارے محققین اس بات پر متفق ہیں کہ اردو ہندستان میں پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر تارا چند کے حوالے سے اس مضمون کا ماحصل (یا حشر) ان الفاظ میں ملتا ہے (صفحہ ۱۴)

"ظاہر ہے اس وقت ہندوؤں کی زبان کیا تھی۔ یہی اردو جس کا پرانا نام ہندوی اور ہندی تھا اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو کے آغاز و ارتقا کا سہرا صحیح معنوں میں ہندوؤں ہی کے سر ہے اور وہی اس کے پیدائش کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔ مسلمانوں کو اردو کی پیدائش کا ذمہ دار قرار دینا یا اردو کو ہندستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ منسوب کرنا تاریخی اور لسانی حقائق کو جھٹلانا ہے۔ ہاں اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں نے اردو کو نکھارنے اور چمکانے، سجانے اور سنوارنے نیز اسے ترقی یافتہ بنانے اور ادبی مرتبے تک پہنچانے میں ایک نمایاں اور مہتم بالشان کردار ادا کیا ہے" اس اقتباس میں مجھے صرف ایک لفظ "ذمہ دار" کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ اس لفظ سے زم کا پہلو نکلتا ہے ـــــ (آپ اسے دوبارہ پڑھیں گے تو یہ پہلو ضرور نکلے گا) ـــــ اس لیے کہیں ایسا نہیں ہے کہ جن حلقوں سے اردو کی مخالفت ہو رہی ہے انھوں نے اس جملے کے معنی وہی سمجھے جن کی طرف یہ خاکسار اشارہ کر رہا ہے۔

"قدیم اردو مراثی"۔ یہ مضمون تالیف کی تعریف میں آتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس مضمون میں پورے تین سو سال پہلے کے لکھے ہوئے مرثیے نقل کیے گئے ہیں" ایک ادبی ورثہ ہے جو مسعود حسین رضوی ادیب کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔

"اردو کا ادبی و لسانی ارتقا"، بھی اہم مضمون ہے۔ لیکن میں اسے پڑھتے پڑھتے درمیان میں رک گیا کیوں کہ اس کے باب دوم میں مجھے ایک لفظ "سرراہ" کی طرح کا محسوس ہوا اور وہ لفظ ہے "پیشں اردو" مصنف نے اصل میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ زبان کے باقاعدہ آغاز سے پہلے اس کی شکل کیا تھی۔ اس مضمون میں مقولوں اور مضمونوں کی بھی تفصیل رہ گئی ہے اور مضمون کتنے ہی مقامات سخت ہیں۔ گو آگے چل کر مضمون آسان ہو گیا ہے۔ اگر اول الذکر مضمون مطلع تھا تو یہ حسن مطلع ہے

مصنف نے اپنی تحقیق کی روشنی میں اردو کے اٹھارویں صدی کے دور کو اپنی مخصوص لسانی خصوصیات کی بنا پر شعوری دور بتایا ہے اور جدید دور کی ابتدا انیسویں صدی کے آغاز سے بتائی ہے۔ وہ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف کو جدید اردو کا اولیں نقش تسلیم کرتے ہیں۔ خاکسار کا خیال ہے کہ مصنف کا تجزیہ صحیح ہونا چاہئے۔

کتاب میں شامل دوسرے مضامین اردو کی معکوسی آوازیں اور ان کا ارتقا، سترھویں صدی کی اردو، قدیم اردو اور قدیم اردو کا سرمایۂ الفاظ، اس کی رسم خط اور املا، خالص ٹیکنکل مضامین ہے۔ لیکن اتنے بھی مفصل نہیں کہ پڑھے ہی نہ جائیں۔ کتاب میں لسانی اصطلاحات بھی دے دی گئی ہیں۔ جو درحقیقت درکار تھیں۔

آخر میں اشاریہ بھی موجود ہے، صرف یہی پڑھ لیا جائے تو مصنف کی کاوش اور مشقت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ تحقیق میں اتنا پڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں نے جو تحقیقی مقالے پڑھے تھے ان میں بہت کچھ تھا لیکن تحقیق نہیں تھی۔

مصنف کو اس خوبصورت اور وقیع کتاب کی تخلیق، ترتیب اور اشاعت پر مبارک باد دینا فضول ہے۔ یہ تو سخن ناشناس کی داد سمجھی جائے گی۔

ہمارے کنور صاحب

مرتب : کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی
مبصر : ڈاکٹر سیفی پریمی مرحوم
ناشر : جشن کنور مہندر سنگھ بیدی کمیٹی ایل ۴۰۔ کناٹ سرکس۔ نئی دہلی
قیمت : اسّی روپے اشاعت : ۱۹۸۶ء
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ۲۵

"ہمارے کنور صاحب" میں اردو ادب کے تقریباً چالیس (۴۰) مشہور و معروف اہل قلم نے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی بے لوث ادبی اور سماجی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا ذہنی رفعت اور اعلا کرداری اوصاف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ تمام مضامین پر گفتگو کرنے کا یہ محل ہے نہ تبصرے میں گنجائش۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ سب نے خلوص اور اپنی ادبی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ یہاں صرف تین مضامین کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جن میں ایک

عہد اور اردو کلچر کی تاریخ نیز بہتر اقدار کو سمویا گیا ہے۔
۱۔ 'توقیت'، ماہر غالبیات مالک رام
۲۔ دہلی کی ادبی محفلیں اور کنور صاحب۔خواجہ محمد شفیع
۳۔ ستیم، شوم، سندرم ۔۔ ساحر ہوشیار پوری
ان میں پہلا مضمون تذکرہ کی نوعیت کا ہے۔ دوسرے میں اردو کلچر کا ارتقا اور تیسرے میں وہ واقعات مندرج ہیں جن پر قلم اٹھانے سے خود کنور صاحب نے بوجوہ گریز کیا ہے۔

وقت اور صفحات کی کفایت کے پیش نظر یہاں صرف اردو کلچر کا مختصر احاطہ کیا جاتا ہے۔ خواجہ محمد شفیع نے دوسری جنگ عظیم کے دور سے آزاد ہندستان میں اپنے قیام تک کے بتیس مشاعروں اور نشستوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے اس تناظر میں کنور صاحب کی شخصیت کا جلوہ دیکھیے:
ص ۶۰ ۔ "دن عید اور رات شب برات تھی اور کنور بھائی عید کا چاند اور شب برات کا انار تھے۔ ان کی کیفیت یک انار و صد بیمار کی تھی۔ اللہ کا بندہ انکار کرنا جانتا ہی نہ تھا۔

ص ۶۱ ۔ "کنور بھائی ہر بزم ادب میں گل سر سبز تھے اور دُرِ شہوار۔ شعر میں جتنی خوبیاں ہو سکتی ہیں کنور بھائی کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ایسا قادر الکلام متواضع، ہم درد ہر دکھ درد میں شریک شعرا اور ادبا کی ہر طرح میری مراد۔ دامے، درمے، قدمے۔ سب ہے۔ پھر بھی وہ محفل کا سنگار نہ ہوگا تو کیا کوئی مجھ جیسا نا اہل ہوگا۔"
ص ۶۱ ۔ آخری پیرا۔ "آخر میں عرض ہے کہ شاہکار مقالات آئیں گے اور مجموعہ کو زینت بخشیں گے۔ اس نا اہل کی تحریر کم خواب میں ٹاٹ کا پیوند ہوگی۔ اس کے حسن کو خراب نہ کریں۔ راقم کے تاثرات کنور بھائی کے قدموں میں رکھ دیں اور بس!

حاصل عمر نثار رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

خدا حافظ و ناصر۔ اللہ پھر خیر سے ملائے۔

مشاعرے اور نشستیں:

۱۔ نیشنل وار فرنٹ (کنور صاحب) ۲۔ محبوب الٰہی اور امیر خسرو کے مزارات پر (خواجہ حسن نظامی) ۳۔ کوٹن ملز دہلی کا سالانہ مشاعرہ ۴۔ پنڈت امرناتھ ساحر احباب کو جمع کرتے تھے۔ ۵۔ یوم برق کا مشاعرہ (طالب دہلوی) ۶۔ کالجوں کے مشاعرے ۷۔ بیخود دہلوی کے دولت کدہ پر نشست ۸۔ ہارڈنگ پبلک لائبریری میں مشاعرہ ۹۔ نواب سراج الدین سائل کے شاگردوں کی محافل ۱۰۔ دلی کے پنجابی سوداگران کے مشاعرے جن میں اہتمام طعام (دنبہ کا قورما، چھینٹے اور بغیر چھینٹے کی باقرخانی ۱۱۔ ہندو کالج کے مشاعرے میں گلزار زتشی اپنے پورے جوبن پر ہوتے تھے۔ ۱۲۔ قابل عطار کے کوچہ میں جناح کیپ ہاؤس والے محفل کا اہتمام کرتے تھے۔

۱۳۔ سر شنکر لال کی کوٹھی پر نشست اور دعوت (چاندی کی تھالی اور کٹوریوں میں بھوجن پروسا جاتا تھا۔)

۱۴۔ سبزی منڈی میں زریں خورمی کا مشاعرہ اور دعوت (میووں کی بھرمار)

۱۵۔ سبزی منڈی کے ملکہ باغوں میں دعوت کرتے تھے۔ بھٹیکری کی روٹی، بیگن کا بھرتہ، قیمہ، ہری مرچیں، سیخ کباب، ہزاروں قسم کی چٹنیاں اور اچار۔ پھر مشاعرہ۔

۱۶۔ برسات میں جھرنے پر نشستیں ہوتیں۔ روے میدے کے گرم گرم پراٹھے اور ربڑی، آموں کا پوچھنا ہی کیا۔ نانذیں بھر کر ہوتے۔ کنور بھائی خوش خوراک تھے لیکن بسیار خور نہیں۔ فیض جھنجھانوی، ماہر دہلوی اور بخشب جارچوی بلا نوش تھے۔

۱۷۔ سب سے بڑا مشاعرہ "گاندھی جینتی" کا کمپنی باغ میں ہوتا۔ اس کا اہتمام لالہ دیش بندھو گپتا اور منشی گوپی ناتھ امن کرتے تھے۔ یہ مشاعرہ رات کے آٹھ نو بجے سے صبح کی اذانوں تک چلتا۔

۱۸۔ "یوم داغ" منایا گیا۔ داغ نمبر چھپا۔ یہ کہنے کو یوم تھا لیکن تین شب و روز چلا۔

۱۹۔ لالہ مرلی دھر دلی کے تھے۔ لائل پور کوٹن ملز کے مالک۔ لائل پور میں ایک عام نشست ہوئی اور دوسری لالہ مرلی دھر کی کوٹھی پر۔

۲۰۔ پنڈت زار زتشی، اندر پرستھ کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ کالج کی لڑکیاں محترم کو مولوی صاحب کہتی تھیں۔ سال میں ایک بار یہ سبھا بھی جمتی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک عظیم شخصیت کو عظیم خراج تحسین ہے۔ صوری حسن بھی نمایاں شان!

ادبی تہذیبی خبریں

علی سردار جعفری کے اعزاز میں خصوصی جلسہ

مصنفین جامعہ کی کتابوں کی رسم اجراء

نئی دہلی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے تعلیمی سفر میں مغربی علوم کو مشرقی اور اسلامی علوم سے ہم آہنگ کرنے کی اس روایت کو ہمیشہ عزیز رکھا ہے جو اس ادارے کے بانیوں اور اس کے فروغ کے مقصد سے وابستہ اہم شخصیتوں نے قائم کی تھی۔ اس خیال کا اظہار شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر بشیرالدین احمد صاحب نے یونیورسٹی اکیڈمک اسٹاف کالج اور انجمن تعمیر ادب جامعہ نگر کے زیر اہتمام ۲۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو جامعہ کے کانفرنس ہال میں برصغیر ہندو پاک کے معروف شاعر و دانشور جناب سردار جعفری کے اعزاز میں منعقد خصوصی جلسے اور ان کے ہاتھوں مصنفین جامعہ کی تازہ مطبوعات کی رسم اجرا کے موقع پر کیا۔ جامعہ کے مختلف شعبوں سے وابستہ مصنفین کو مبارک باد دیتے ہوئے شیخ الجامعہ صاحب نے کہا کہ جامعہ نے ماضی میں تصنیفی خدمات کی اعلا مثال پیش کی ہے جس کا جیتا جاگتا ثبوت ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کا جاری کردہ علمی و تحقیقی مجلہ اسلام اور عصر جدید ہے جس کے ذخیرے کی بنیاد پر بڑے بڑے تحقیقی پروجیکٹ مکمل کیے جا سکتے ہیں۔

مہمان خصوصی علی سردار جعفری صاحب نے اردو شعر و ادب پر عربی روایات و تصورات کے اثرات پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ خصوصاً اردو شاعری پر یہ اثر اتنا گہرا ہے کہ کسی نظم پارے کا کسی ہندستانی عربی داں کے قلم سے کیا ہوا ترجمہ باذوق عرب قاری کو شاید سمجھنے میں مشکل ہو لیکن اصل اردو میں پڑھ کر یا سن کر مرکزی مفہوم تک اس کی رسائی ہو جائے گی۔ کیونکہ امیجری اور پیکر تراشی میں آج بھی اردو غزل عرب لینڈ اسکیپ سے بڑی حد تک کسب نشاط کر رہی ہے۔ اس ضمن میں جعفری صاحب نے اردو شاعری میں قرآنی تعلیمات کے استعمال کی طرف بھی اشارہ کیا۔ بعض فلسطینی اور عراقی شعرا مثلاً محمود درویش اور معین بسیسو سے ذاتی ملاقات اور گفتگو کا بھی مہمان خصوصی نے ذکر کیا۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو اور عربی کی انقلابی شاعری کے درمیان فکری اور ذہنی مماثلتوں کی نشاندہی بڑی آسانی سے کی جا سکتی ہے اور اسی مماثلت نے انھیں جدید عربی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے معین بسیسو کی چند پر زور نظموں کے عربی ترجمے پڑھ کر سنائے اور پھر سامعین کے اصرار پر اپنی دو نظمیں "کربلا" اور "میرا سفر" اور کچھ غزلیں بھی سنائیں۔

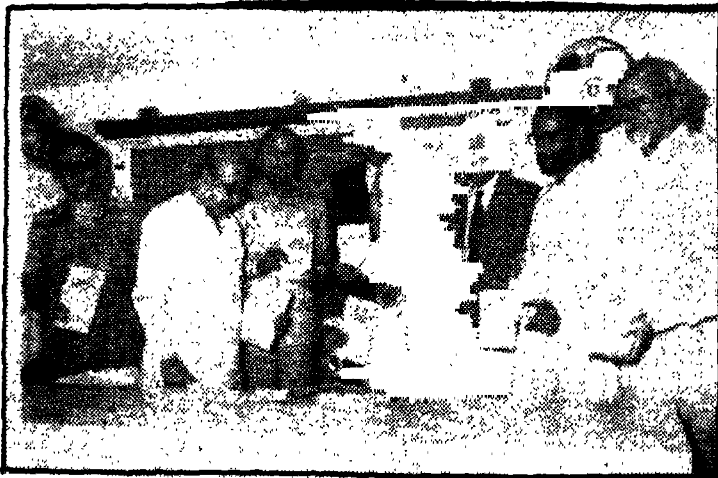
اکیڈمک اسٹاف کالج کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر ظفر احمد نظامی نے مہمان خصوصی کا جامعہ میں استقبال کرتے ہوئے ان کا ایک قلمی چہرہ پیش کیا جس پر نظامی صاحب کو خوب داد و تحسین ملی۔

اس جلسے میں کتابوں کے اجرا کی رسم انجام پائی۔ ان کا مختصر تعارف کراتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی، ڈین فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز نے کہا کہ یہ کتابیں تعلیم، مسائل تعلیم، تربیت اساتذہ، مذہب اور تصوف، ادب اور تاریخ اور سیاست اور معاشرت جیسے وسیع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں علم کی صحیح روح تک رسائی حاصل کرنے کے جذبے کے ساتھ ساتھ ایک طرف ماضی کی بازیافت

کی خواہش نظر آتی ہے تو دوسری طرف مستقبل کی راہیں استوار کرنے کی آرزو بھی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ وہی طرزِ فکر ہے جس کا ثبوت بانیان اور بہی خواہانِ جامعہ نے اپنے قول و عمل سے ہمیں دیا ہے۔ اس تقریب میں مندرجہ ذیل کتابوں کی رونمائی ہوئی جن کے مصنفین / مرتبین کے نام قوسین میں دیے گئے ہیں۔

ا۔ مستقبل کی طرف (مجموعۂ خطبات جلسہ ہائے تقسیم اسناد)
مرتبین: جناب خواجہ محمد شاہد / جناب خالد کمال فاروقی)
۲۔ آپا جان گرڈا فلپس بورن (پروفیسر صغرا مہدی)
۳۔ مفکرینِ تعلیم (ڈاکٹر محمد اکرام خاں)
۴۔ تصوف، رسم اور حقیقت (خواجہ حسن ثانی نظامی)
۵۔ سرسید سے اکبر تک
(پروفیسر شمیم حنفی / ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی
۶۔ سیاہ فام ادب (پروفیسر شمیم حنفی / ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی)
۷۔ استادوں کی تعلیم اور تربیت (جناب مسعود الحق)
۸۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ
(ڈاکٹر خالد محمود)
۹۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں اسلامی تحریکیں
(ڈاکٹر اقتدار محمد خاں)

صدر جلسہ اور مہمانِ خصوصی نے اردو کتابوں کی اشاعت میں مکتبہ جامعہ کی خدمات اور اس کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کی انتھک کوششوں کو سراہا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر صغرا مہدی صاحبہ نے کی۔ اور ڈاکٹر خالد محمود صاحب نے مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کے بعد اکیڈمک اسٹاف کالج میں ایک فوٹو گرافی سیشن میں مذکورہ کالج میں جاری عربی ریفریشر کورس میں شریک



تصویر: حضرت محمود سروش کے مجموعہ کلام "متاعِ ہنر" کے رسم اجراء کی تقریب میں۔ بائیں سے دائیں ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب، جناب باقر مہدی، جناب اختر حسن رضوی، جناب شمیم کاظم، جناب ٹی اے خان جناب عثمان غنی عادل، جناب سید بشارت شکوہ اور درمیان میں تشریف فرما ہیں حضرت محمود سروش۔
مورخہ ۴ مارچ کو رضوی کالج، باندرہ میں یہ تقریب منعقد ہوئی تھی۔

اسمٰعیل یوسف کالج، جوگیشوری ممبئی میں عربی کے استاد جناب محمد علیم مختارے نے علی سردار جعفری کی خدمت میں عربی زبان میں منظوم سپاس نامہ پیش کیا۔

تعطیل کا دن ہونے کے باوجود اس جلسے میں باہر کے مہمانوں کے علاوہ جامعہ کے ایک بڑے علمی و ادبی حلقے اور عربی ریفریشر کورس میں شریک ملک کے مختلف صوبوں سے آئے ہوئے اساتذہ نے بھی شرکت کی۔

اردو امتحانات میں ۱۶ ہزار سے زائد امیدواروں کی شرکت

حیدرآباد۔ جنوری، دونوں شہروں میں اردو پڑھنے اور لکھنے کا ذوق، آج اس وقت دیکھا گیا جبکہ شہر کے کوئی ۱۴۰ مقامات پر ۱۶ ہزار سے زائد افراد نے جن میں زیادہ تر بچے شامل تھے اردو دانی، زبان دانی اور انشا کے امتحانات میں شرکت کی۔ جس کا عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ اور ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ اضلاع کرنول تروپتی، میدک اور نظام آباد میں بھی یہ امتحانات منعقد کیے گئے۔ اس سال امتحانات کی خصوصیت یہ تھی کہ پہلی بار مشیرآباد جیل میں ۵۰ زیر دریافت قیدیوں نے بھی جن میں سے بعض کی مادری زبان تلگو ہندی ہے ان امتحانات میں شرکت کی۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے بالکل نئی نسل میں اردو خواندگی کو عام کرنے کے مقصد سے اردو گرمائی کلاسس اور امتحانات کا آغاز کیا ہے لیکن معمر افراد کو بھی امتحانات میں شرکت کرتے دیکھا گیا۔ ایک مرکز پر جو آصف نگر کے علاقہ میں تھا ایک ۶۰ سالہ ضعیف خاتون کو بھی اردو دانی کا امتحان دیتے دیکھا گیا۔ اردو سیکھنے سے نوجوانوں میں دلچسپی کا اس بات سے پتا چلتا ہے کہ ایک مرکز پر انجینیرنگ کی ایک طالبہ مس فرح اور میڈیسن کی طالبہ مس آفرین نے اردو انشاء کے امتحان میں شرکت کی جبکہ اسلامی سنٹر نامپلی کے مرکز پر ۹ غیرمسلم لڑکیوں نے اردو دانی کا امتحان دیا۔ ایک عیسائی بچے الفریڈ نے جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے فلورا سینٹ اسکول معین باغ میں اردو امتحان دیا۔ الہدیٰ اسکول، مولانا آزاد نگر میں تلگو مادری زبان کی وجے لکشمی نے بھی امتحان میں شرکت کی۔ شہر اور اضلاع میں واقع جملہ ۲۳۰ مراکز کے لیے عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی طرف سے امتحانات کی نگرانی کے لیے پروفیسرس، ڈاکٹرس، وکلاء، انجینیرس، ادیبوں اور شاعروں کی خدمات سے بھی استفادہ کیا گیا۔ ۸ ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔ ان ٹیموں نے مسٹر زاہد علی خاں اڈیٹر سیاست، مسٹر ظہیر الدین علی خاں سکریٹری ٹرسٹ، پروفیسر مغنی تبسم معتمد ادارہ ادبیات اردو، راۓ منوہر راج سکسینہ صدر انجمن ترقی اردو اور صدر شعبہ اردو سنٹرل یونی ورسٹی حیدرآباد ڈاکٹر انور الدین، پروفیسر اکبر علی بیگ، پروفیسر انور معظم، پروفیسر اشرف رفیع انجمن ترقی پسند مصنفین کے معتمد عمومی جناب نصرت محی الدین، مسٹر پرتاب سروی (عثمانیہ یونی ورسٹی) کی رہنمائی میں تمام امتحانی مراکز کا معائنہ کیا۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ بانی روزنامہ "سیاست"، جناب عابد علی خاں کی یاد میں قائم کیا گیا ہے جو زندگی بھر اردو کاز کے نقیب رہے اور جنھیں تعلیمی مقاصد سے گہرا تعلق خاطر تھا۔ آج شہر کی مختلف بستیوں میں اردو امتحانات کے پیش نظر ایک اردو جشن کی فضا تھی۔ شہر کے تمام سرکردہ اردو کارکن اور سربراہ اردو امتحانات کے منظم انداز میں تکمیل کے لیے مصروف تھے تاکہ اردو والوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت و افادیت سے متعلق بیداری پیدا کی جائے۔ مشیرآباد جیل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر جانسن میمونیل نے دورہ

کرنے والے صحیفہ نگاروں کو بتایا کہ جیل کے جملہ ۱۰۱۰ زیر دریافت قیدیوں میں سے ۰۰ اردو جاننے والے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امتحانات میں شرکت خواہشمند قیدیوں کے لیے تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ مسٹر زاہد علی خاں اڈیٹر روزنامہ سیاست جنھوں نے جیل کے مرکز کا معائنہ کیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کی مساعی کی ستائش کی۔ انھوں نے کہا کہ غیر اردو داں افراد میں پایا جانے والا غیر معمولی جوش و جذبہ قابل ستائش ہے مسٹر زاہد علی خاں نے کہا کہ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے امتحانات منعقد کیے جارہے ہیں اور مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں کا ردعمل توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ عوام بالخصوص نوجوانوں میں اردو زبان کو عام کرنے اور اس کی ترویج کے لیے یہ امتحانات منعقد کیے جارہے ہیں۔

اختر الایمان اور نسیم حجازی کی یاد میں تعزیتی نشست

اختر الایمان اور نسیم حجازی کی یاد میں "حلقۂ فکر و فن" جامعہ نگر دہلی کی ایک تعزیتی نشست جناب عطا عابدی کی صدارت میں ہوئی۔ نظامت کے فرائض اسلم جمشید پوری نے ادا کیے۔ اس موقع پر کوثر مظہری نے اختر الایمان اور نسیم حجازی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اختر الایمان اردو نظم کے ایک اہم ستون تھے انھوں نے اردو نظم کو نئی سمت اور رفتار عطا کی۔ نسیم حجازی نے بیسویں صدی میں تاریخی ناول نگاری کو عروج بخشا۔ انجینیر فیروز مظفر نے اختر الایمان کی رحلت کو اردو دنیا کا ایک ناقابل تلافی نقصان کہا۔ انھوں نے نسیم حجازی کو منفرد اسلوب والا اہم ناول نگار بتایا۔ عطا عابدی نے اس موقع پر کہا کہ اختر الایمان کی موت نے اردو نظم میں جو خلا پیدا کیا ہے اس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔ اختر الایمان نے اردو نظم کو اس مقام پر پہنچایا جہاں وہ غزل سے آنکھیں ملا سکتی تھی۔ عطا عابدی نے نسیم حجازی کے کئی اہم ناولوں کا بھی تذکرہ کیا۔

اسلم جمشید پوری نے نشست کے اختتام پر نسیم حجازی پر عنقریب ایک سیمینار کرائے جانے کا اعلان کیا۔

علی جواد زیدی اسّی سال کے ہو گئے

اردو کے ممتاز ادیب و شاعر پدم شری سید علی جواد زیدی نے ۱۰ مارچ ۱۹۹۶ء کو اسّی سال پورے کر لیے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس خوشی کے موقع پر لکھنؤ کے دوست احباب خصوصاً ممتاز افسانہ نگار رام لعل صاحب وغیرہ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں خصوصی شمارہ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علی جواد زیدی صاحب کا موجودہ پتا حسب ذیل ہے:

۳/۱۸۹۔ وشواس کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ یوپی ۲۲۶۰۱۰

بلونت سنگھ پر تحقیقی مقالہ

ادبی حلقوں میں اس خبر کا خیر مقدم کیا جائے گا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شاہدہ پروین کو بلونت سنگھ پر تحقیقی کام کے سلسلے میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ یہ مقالہ پروفیسر شمیم حنفی کی نگرانی میں تیار کیا گیا ہے اردو کے اس بے مثل افسانہ نگار کے ناولوں اور افسانوں کا یہ پہلا مبسوط مطالعہ ہے۔

جگر مرادآبادی سیمینار اور انجمن کا سالانہ جلسہ ملتوی

نئی دہلی۔ ۱۲ مارچ۔ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے گذشتہ دنوں ایک سڑک حادثے میں زخمی ہو جانے کے سبب ۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ کا مجوزہ جگر مرادآباد کا سیمینار اور انجمن

کا سالانہ جلسہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ نئی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی حالت ابھی نہیں ہے کہ وہ دفتر آسکیں یا اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

شارب ردولوی کے پتے میں تبدیلی

نئی دہلی۔ پروفیسر شارب ردولوی اور پروفیسر شمیم نکہت شالیمار باغ سے دہلی یونی ورسٹی کے مکان اے II / ۷، موریس نگر دہلی ۷ میں منتقل ہو گئے ہیں اور ان کا تبدیل شدہ فون نمبر ۲۵۰۶۵۷۴، ہے۔

برصغیر ہند و پاک میں منشی فیاض علی کے حیات اور کارناموں پر پہلی کتاب کی رسم اجرا

لکھنؤ۔ گذشتہ شام جہاں آرا سلیم کی کتاب "منشی فیاض علی حیات اور ادبی خدمات" کا رسم اجرا کرتے ہوئے جسٹس حیدر عباس رضا نے کہا کہ اردو کے افسانوی ادب کا شاید ہی کوئی ایسا قاری ہو جس نے دلچسپی کے ساتھ فیاض علی کے ناولوں شمیم اور انور کا مطالعہ نہ کیا ہو مگر عوامی مقبولیت کے باوجود فنی نقطۂ نگاہ سے انھیں وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکا جو ایک بلند پایہ ناول کو ہونا چاہیے۔ جسٹس حیدر عباس نے جہاں آرا سلیم کو ان کی تصنیف پر مبارکباد دی اور کہا کہ برصغیر ہند و پاک میں فیاض علی کے فن اور شخصیت پر یہ پہلا تحقیقی مقالہ منظر عام پر آیا ہے۔

اختر الایمان کی رحلت پر تعزیتی نشست

شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے عظیم شاعر اختر الایمان کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد ہوا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر قاضی عبدالرحمن ہاشمی نے کی۔ انھوں نے اختر الایمان کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کی نظموں خصوصاً "ایک لڑکا" کے حوالے سے فرمایا کہ وہ بیسویں صدی کی چند طویل نظموں میں اپنی فنی و تخلیقی معجزہ کاری کے سبب اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ پروفیسر محمد ذاکر نے ایک مختصر مضمون پیش کیا۔ انھوں نے اختر الایمان کی شاعری پر بڑے خوبصورت انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے انھیں اردو کا ممتاز نظم نگار شاعر قرار دیا۔ ان کی شاعری، احساس کی شاعری ہے۔ ان کی نظمیں پڑھتے وقت ایسا احساس ہوتا ہے جیسے کسی کی دنیا لٹ رہی ہو۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے اختر الایمان کی حیات اور فن سے متعلق گفتگو کی۔ انھوں نے اختر الایمان کے بچپن کے حالات اور پھر بمبئی تک کے سفر کا مختصر جائزہ پیش کیا۔ ان کے فن سے متعلق انھوں نے کہا کہ اختر الایمان نے خارجی تجربے کو داخلی تجربہ بنا دیا۔ اجتماعی اظہار کو داخلی بنا کر پیش کیا۔ اور نظم کو شخصی اظہار کا طریقہ بنایا۔

جناب عبداللطیف اعظمی نے اس موقع پر اختر الایمان سے اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کیا۔ انھوں نے آل انڈیا تقریری مقابلوں کا ذکر بھی کیا جب وہ اور اختر الایمان نمایاں کامیابی حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے اختر الایمان کو بہترین مقرر قرار دیا۔

پروفیسر ظفر احمد نظامی (ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج) نے اس موقع پر اختر الایمان کو خراج عقیدت پیش کیا اور شعبۂ اردو کو اختر الایمان پر ایک سمینار کرانے کا مشورہ دیا۔

پروفیسر نقی حسین جعفری (شعبۂ انگریزی) نے اس موقع پر کہا کہ اختر الایمان اس دور کے سب سے بڑے نظم گو شاعر تھے۔ وہ اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور مقلد بھی۔

ڈاکٹر صادقہ ذکی نے کہا کہ اختر الایمان کہیں

بھی ایک نظم کو ایک نشست میں پورا نہیں کرتے تھے وہ کبھی ایک مہینے اور کبھی سالوں کے فاصلے سموئے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صادق ذکی نے اختر الایمان کی رحلت کو عالمی اردو برادری کے لیے نقصانِ عظیم بتایا۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ اختر الایمان کا شمار ان نظم گو شعرا میں ہے جنھوں نے شاعری کو وہ رویہ دیا جس نے ہندستان اور برِّصغیر کو ایک محدود دائرے سے نکلنے پر آمادہ کیا۔ اور وہ آفاقی تصوّر جو نظم کو درکار تھا، عطا کیا۔ اختر صاحب تا حیات اپنے اس رویے پر قائم رہے۔ اختر الایمان اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے اس موقع پر شعبۂ اردو کی جانب سے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی۔ جلسے میں پروفیسر صغرا مہدی، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر شہناز انجم، ڈاکٹر اسد الدین (شعبۂ انگریزی) ڈاکٹر (مسز) لاٹھے (شعبۂ ہندی) ڈاکٹر سہیل فاروقی (نائب مدیر رسالہ جامعہ) کے علاوہ ریسرچ اسکالرز ایم فل۔ ایم۔ اے۔ اور بی۔ اے کے طالب علموں نے خاصی تعداد میں شرکت کی۔

رپورٹ: اسلم جمشید پوری

اخلاق اثر کا نیا پتا

ڈاکٹر اخلاق اثر، این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی فیلڈ ایڈوائزر برائے پنجاب، ہریانہ اور مرکزی خطہ چنڈی گڑھ، فیلڈ ایڈوائزر کا دفتر، کوٹھی نمبر ۲۷، سیکٹر نمبر ۱۹۔ اے
چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۹ ٹیلی فون ۲۸۱۲۸

نذیر بنارسی کا انتقال

وارانسی۔ ۲۴ مارچ، گنگا جمنی تہذیب کے بے نظیر شاعر نذیر بنارسی کے انتقال سے دنیائے ادب کے ساتھ قومی یکجہتی کے کاز کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ برسوں بستر علالت پر رہنے کے بعد کل رات یہاں ۸۷ برس کی عمر میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار نذیر بنارسی ۲۵ نومبر ۱۹۰۹ء کو بنارس میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد حکیم نور محمد سے انھوں نے حکمت کا علم حاصل کیا تھا۔ زندگی کے آخری لمحے تک وہ فرقہ پرستی کی بیماری کے علاج کے طریقے ڈھونڈنے میں مصروف رہے۔

راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ نذیر ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور اقدار سے وابستہ رہے۔

نذیر اعزازات اور انعامات سے دور رہنے والے شاعر تھے۔ گنگ و جمن، جواہر سے لعل تک، غلامی سے آزادی تک، چیتنا کے سور (ضمیر کی آواز) کتاب غزل اور راشٹر (قوم) کی امانت راشٹر (قوم) کے حوالے ان کی اہم تخلیقات ہیں۔ صبح بنارس ان کی مشہور نظم ہے جسے ہر مشاعرے میں لوگ سننا پسند کرتے تھے۔ انھیں کیندریہ ہندی سنستھان کی طرف سے سبرامنیم بھارتی ایوارڈ دیا تھا اور انھوں نے پدم شری واپس کر دیا تھا۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

مئی ۱۹۹۶ جلد ۳۶ شمارہ ۵

فی پرچہ 6/50

سالانہ =/60

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے =/80

غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) =/170

(بذریعہ ہوائی ڈاک) =/350

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
ٹیلی فون:- ۶۹۱۰۱۹۱

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برنی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پہلا صفحہ
مشتاق احمد نوری
۶۰/۷/۳ آفیسر فلیٹ
بیلی روڈ پٹنہ ۸۰۰۰۰۱

اشاریہ

بہار میں اردو۔ مسائل اور امکانات

اردو کبھی محلوں کی زبان نہیں رہی اور کبھی اسے سیاسی پشت پناہی بھی نصیب نہیں ہوئی۔ پھر بھی وہ آج تک زندہ ہے اور اس کے بدخواہ لاکھ چاہ کر بھی اسے حاشیے پر پہنچانے میں ناکام رہے ہیں۔ دیگر زبانوں کی ترقی کی راہ میں تو دوسری زبانوں کے حامی روڑے اٹکاتے رہے ہیں، لیکن اردو زبان واحد زبان ہے جسے اس کے اپنے بولنے اور لکھنے والے کند چھری سے ہمہ وقت ذبح کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اردو کی سیڑھی کے سہارے جو لوگ بام عروج پر پہنچے خود انھوں نے ہی وہاں سے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے رسم خط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کی ہوا زوروں پر چلی لیکن کسی نے بنگلہ، اڑیا، آسامیا یا دیگر صوبے کی ترقی یافتہ علاقائی زبان کے سلسلے میں ایسا شوشہ کبھی نہیں چھوڑا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس کے چاہنے والے صحیح معنوں میں اس سے محبت کرتے تھے، لیکن ہماری زبان اردو کا یہ حال ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہے۔

وہ اور ہوں گے جنھیں دشمنوں سے شکوہ ہے
ہمیں تو دوست ہمارے فریب دیتے ہیں

سچ پوچھیے تو اردو کی بقا اور اس کی ترویج و فروغ کے لیے از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اردو کو صرف دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اس قانون پر کس حد تک عمل ہو رہا ہے اور کیا کبھی اس کے لیے باضابطہ سروے کی ضرورت محسوس کی گئی؟ صرف یہ کہہ دینا کہ قوم کی جہالت دور کی جائے اور زبان کی پڑھائی کے لیے کوشش کی جائے، کافی نہیں ہوگا بلکہ عملی طور پر اس زبان کو اپنانے کے لیے کون سے اقدام اٹھائے جا رہے ہیں اس پر غور کیا جانا ضروری ہے۔ ہم اطمینان سے اس سلسلے کی ساری ذمے داریاں سرکار کے سر تھوپ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ کہ اب ہمارے کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا جب کہ سچ تو یہ ہے کہ سب ہمیں ہی کرنا ہے قول و فعل کے درمیانی پل صراط کو جب تک ہم پار نہیں کر لیتے تب

تک مسائل کا حل نکل پانا مشکل ہے۔

ہمارے سامنے یہ سوالات آتے ہیں کہ کیا کبھی موجودہ سماجی پس منظر میں اس کا عمرانی تجزیہ کیا گیا؟ میرے علم میں اب تک ایسی کوئی بات نہیں آئی ہے۔ اس لیے جب بحث اور گفتگو کے ایسے دروازے کھلیں گے تب ہی یقیناً ان مسئلوں پر غور و فکر کیا جائے گا اور یہ مسائل بھی زیرِ بحث آئیں گے جنھیں از خود طے شدہ سمجھ کر ہم نے اب تک چھوڑ رکھا ہے۔ ہم اس سچ سے منہ نہیں موڑ سکتے کہ ناسازگار حالات کے باوجود اردو نے اپنی تخلیقی توانائی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ یہ دعوتِ احتساب ہے کہ اردو کے سلسلے میں ہمارے یہاں شعور کی وہ وحدت دریافت کر لی گئی ہے جو مسلسل غور و خوض کے بعد ایمانداری کے وسیع تناظر کی دین ہوتی ہے۔ کیا ہم نے ایسی کوئی شعوری کوشش کی ہے کہ اردو نئی تہذیبی، معاشرتی، تاریخی اور تخلیقی کاوشوں کی ترجمان، دوسری بڑی زبان کے درمیان قرار دی جاسکے، کیا اس سلسلے میں ہمارے یہاں فکری اعتماد کا اثاثہ ہے؟

یہاں ایک بات اور کہتا چلوں کہ شاید اردو کا معاملہ ہمارے یہاں لسانی حقیقت سے زیادہ نفسیاتی جہت کا ہو گیا ہے۔ اسپین کے اس سپاہی کی طرح جو اپنی گردن اس وقت تک جھکائے رہا جب تک کہ اسے قلم کرنے کے لیے تلوار نہیں لائی گئی۔ کمزوریوں کی نشاندہی اور بیماری کا تجزیہ زندہ رہنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ہمارے یہاں کا سب سے باشعور طبقہ، یعنی دانشور اور ہمارے راہ رَو مصلحتوں کی سولی پر لٹک رہے ہیں۔ کبھی اُن کی شناخت سچائی ہوا کرتی تھی اور اب خود سچائی بے شناخت ہو گئی ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر اردو زبان و ادب کو از سرِ نو مربوط کر کے ایک نیا لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو نہ صرف ایک زبان ہے بلکہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی آبرو بھی ہے۔ زبان صرف ادب ہی نہیں ہوتی بلکہ ثقافتی مظہر بھی ہوتی ہے کیا کبھی ہم نے اس طرح اردو کا مطالعہ کرنے کی کوئی سعی کی ہے؟

ہمیں ان سارے گوشوں پر غور کرنا ہی ہوگا تاکہ اردو کو بھی وہ ہمہ گیری اور اہمیت حاصل ہو سکے جس کی وہ اپنے عظیم سرمایے کی وجہ سے مستحق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بہار کے وزیرِ اعلا اردو کے مسائل سمجھنا چاہتے ہیں اور انھیں حتی الامکان حل کرنے میں بھی مخلص ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ یہ مسائل کیا کیا ہیں؟ شاید اس سلسلے میں کوئی جامع فہرست نہیں بنائی گئی اور نہ ہی ہمارے قائدین نے اہلِ الرائے حضرات کو جمع کر کے اتفاقِ رائے سے ایسے نکتے تیار کرائے جن سے حال اور مستقبل میں اردو کا

بھلا ہو سکے۔

مختلف اداروں کی جو قراردادیں اور تجاویز کا ہے بگاہے اخبارات میں نظر آتی ہیں ان میں اردو کے مسائل سے زیادہ خود ان اداروں اور انجمنوں کے مسائل ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر تجویزوں کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ فلاں کی جگہ فلاں کا تقرر کیا جائے۔ اس کمیٹی میں ان افراد کو شامل کیا جائے اور ان کو ہٹادیا جائے بالعموم تجویزوں اور فیصلوں کی نوعیت یہی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مسائل نظروں سے اوجھل رہتے ہیں اور بات وہیں کی وہیں رہ جاتی ہے۔ یہ بات کتنی تشویش ناک ہے کہ اردو خواندگی کا تناسب روز بروز گھٹتا جارہا ہے۔ اردو میڈیم سے چلنے والے اسکولوں کی معنویت ختم ہوتی جارہی ہے۔ اگر کسی اسکول میں زبان کے علاوہ کسی دوسرے علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ دی جانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو طلبہ کے لیے وہ ان معنوں میں بے کار ہو جاتی ہے کہ اب سیکنڈری بورڈ کے امتحانات میں اردو میں سوالات نہیں آتے۔ ایسی صورت میں اردو ذریعۂ تعلیم کے کیا معنی ہیں؟

اس سلسلے میں غور کرنا ہوگا۔ یہ درست ہے کہ اب BPSC کے امتحانات میں اردو میں لکھنے کی آسانی ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو پڑھنے والوں اور جاننے والوں کی تعداد بڑھے۔ لیکن نتیجہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اگر سروے کیا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ مسلمانوں کا Elite طبقہ شعوری اور لاشعوری طور پر اردو سے نابلد ہوتا جارہا ہے۔ اس کے لیے اس طبقے میں نہ تو شرمندگی کا احساس ہے اور نہ ہی اسے اپنے لیے نقصان دہ تصور کرتا ہے۔

آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ذہنیت میں تبدیلی لائی جائے۔ ورنہ وہ دن دور نہیں جب اردو مسلمانوں کے صرف ایک خاص طبقے کی زبان بن کر رہ جائے گی۔ پہلے تو بار بار کہا جاتا تھا کہ جو زبان روزی روٹی سے نہیں جڑی ہو اس کے حصول سے کیا فائدہ؟ لیکن اب موجودہ دور میں ایسا نہیں ہے۔ اردو کے نام پر ہزاروں بحالیاں ہوئی ہیں۔ ہو رہی ہیں اور آیند بھی ہونے کے امکانات ہیں۔ لیکن کیا صرف اردو کے نام پر بحالیاں کر دینے سے اردو کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے شاید نہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اس زبان کی جڑیں زمین کے اندر اتاری جائیں۔ گھر گھر میں اس کا چلن عام کیا جائے۔ اور اس کے اصل مسائل سامنے لائے جائیں تاکہ اس کے حل کے لیے سرکار سے مطالبہ کیا جاسکے۔

اردو خواندگی کو بڑھاوا دینے کے لیے حکومت کی طرف سے Urdu Proficiancy Courses چلانے کی ضرورت ہے حال ہی میں بہار کے ایک سینئر آئی۔ اے۔ ایس آفیسر نے وزیر اعلا کے سامنے کہا بھی تھا کہ جس طرح دیگر صوبے میں آئی۔ اے۔ ایس کے آفیسر

وہاں کی صوبائی زبان سیکھتے ہیں اس طرح یہاں کے آفیسرز کے لیے اردو کا جاننا بھی لازمی قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں بھی سرکار سے قدم اٹھانے کی گزارش کی جاسکتی ہے۔

پبلک اسکولوں، خاص کر انگریزی اسکولوں سے قطعی طور پر اردو کو نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ حکومت چاہے تو ان کے ارباب و حل و عقد کو تاکیدی تحریر کے ذریعہ اردو کی تعلیم پر اصرار کر سکتی ہے۔

غرض حکومت سے اردو کے لیے جو کچھ مانگنا چاہیے وہ ہم مانگتے ہی کہاں ہیں۔ ہم افراد یا اوارے کو دیکھتے ہیں۔ ان کے لیے یا ان کے خلاف لڑتے ہیں حالانکہ ہمیں زبان کی بقا اور اس کی ترقی کے بارے میں من حیثیت مجموعی سوچنا اور غور کرنا چاہیے اس کے لیے جدو جہد کرنی چاہیے۔ جب ہم میں اجتماعی افادیت کا یہ تعمیری جذبہ پیدا نہیں ہوگا ہم اپنی زبان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور بس یونہی آپس میں ایک دوسرے سے سر ٹکراتے رہیں گے۔

اردو کے بے شمار مسائل میں ایک اہم ترین مسئلہ اردو کی ابتدائی تعلیم کا ہے۔ کہنے کو آج بھی اردو مدرسوں میں، اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہیں۔ لڑکے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں، اور دانش گاہوں میں مقالے کی فہرست میں تیزی سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری رسالے بھی نکل رہے ہیں جن میں کچھ تو تجارتی مقصد سے نکالے جارہے ہیں اور کچھ معیاری رسالے چند جیالے ادب دوستوں کی کوشش سے نکل رہے ہیں۔ شاعری اور فکشن کے میدان میں بھی کام ہو رہا ہے اور تنقید نگار و تحقیق نگار بھی سرگرم عمل ہیں۔

سب سہی، لیکن کیا فی الواقع اردو لکھنے پڑھنے والوں کی نئی نسل آرہی ہے؟ کیا بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب سے ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے؟ عالم یہ ہے کہ بچے چار سال کے ہوئے اور انھیں کانونٹ میں داخل کرنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ ان اداروں میں سخت قسم کا مقابلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جو بچے ان امتحانوں میں کامیاب نہیں ہوتے، یا جن کے والدین کانونٹ کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے وہی بچے ایسے اسکولوں کی زینت بنتے ہیں جو دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن بچے نہ تو انگریزی ہی سیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی اردو۔

عجیب سی سچویشن ہے۔

خرابی کچھ نہ کچھ ہمارے تعلیمی نظام میں بھی ہے۔

آزادی سے پہلے ہر گھر میں مولوی و ماسٹر کا چلن رہا تھا۔ مولوی بچوں کو کلام پاک کے ساتھ ساتھ اردو بھی پڑھاتے تھے۔ ماسٹر انگریزی حساب اور دوسرے مضامین پڑھایا کرتے تھے

ض گھروں میں ہندی اور حساب کے لیے پنڈت آیا کرتے تھے۔ جو ہندی کے ساتھ سوا، پڑھ، پون اور ڈھائی کے پہاڑے بھی یاد کراتے تھے۔
گھر کی اس تعلیم گاہ میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کا مرحلہ بحسن وخوبی انجام پا جاتا اور جب ڈھائی سال بعد بچے اسکول بھیجے جاتے تو وہ وہاں کسی قسم کی اجنبیت نہیں محسوس کرتے تھے۔ بہت ہی چھوٹی عمر میں اردو تعلیم کا سلسلہ شروع کر دینے سے یہ ہوتا ہے کہ بچے جب اسکول میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں اردو کی اتنی استعداد ہوتی ہے کہ وہ مزے میں بڑے بڑے جملے پڑھ لیتے ہیں اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ اردو تعلیم کو روزی روٹی کے مسئلے سے ہم رشتہ کرنے سے اردو تعلیم کا رواج عام ہو جائے گا۔ کسی بھی گوشے سے اردو کو رزق سے منسلک کرنے کا مطالبہ نہیں اٹھایا جاتا تھا۔ اردو پڑھنے کا عام رواج تھا۔ سن شعور تک پہنچتے پہنچتے لوگوں کے پاس اردو الفاظ و محاورات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو جاتا تھا جو ساری زندگی ان کے کام آتا۔ اور یہ اس ابتدائی تعلیم کی دین ہوتی تھی جس کی طرف ہر گھر میں خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کی تمیز اردو پڑھنے کے سلسلے میں اس زمانے میں نہیں تھی اور اب یہ حال ہے کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی ہر طرف کوشش ہو رہی ہے۔ اردو ٹیچر، اردو ٹائپسٹ، اور اردو مترجم بحال کیے جا رہے ہیں۔ اور اس بات کی سعی کی جا رہی ہے کہ اردو پڑھنے والوں کے لیے نئی سے نئی آسامیاں پیدا کی جائیں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔
یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ اگر ہم نے ٹوٹی ہوئی اردو سیکھ بھی لی، اور اردو کی تھوڑی بہت استعداد حاصل بھی کر لی تو کیا ہم اس لائق ہو جائیں گے کہ ڈھائی تین سو سال کے دینی لٹریچر کو جس میں، تفسیر، سیرت، حدیث، فقہ اور تاریخ بھی شامل ہے، نیز اپنے کلاسیکی ادب کو اپنی گرفت میں لے سکیں فی الحال تو ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے بچے قرآن تک نہیں پڑھ پاتے۔
اردو سے اگر ہمارا رشتہ منقطع ہوا یا اگر ہم نے محض ایک کمزور سا رشتہ اردو سے باقی رکھا، تو شاید ہم اس تہذیبی اور دینی سرمایے سے استفادہ کرنے میں ناکام رہیں گے جن سے ہمارا تشخص قائم ہے۔
ایک بہت ہی اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم اپنی شناخت کے بغیر زندہ رہنے کی تیاری کرنے لگے ہیں؟ اگر نہیں تو ہمیں یہ احساس جگانا ہے کہ تہذیب وتمدن کی بیش بہا قدروں کی محافظت کے لیے اردو لکھنا، پڑھنا اور اس کی اعلا صلاحیت پیدا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری ہے ہماری زندگی کے لیے سانس کا جاری رہنا۔

اردو کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں فی الوقت اردو والوں کے پاس کوئی واضح نقشہ نہیں ہے۔ یقینی طور پر یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو عام آدمی کی فہم سے بالاتر ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے درمیان جو لوگ صاحب الرائے کہے جاتے ہیں، جو اہلِ علم و فن ہیں ان سے درخواست کی جائے کہ وہ سر جوڑ کر اس مسئلے پر غور و فکر کریں اور اس کے لیے کوئی مناسب لائحہ عمل مرتب کرلیں، اس کے بعد ہی امید کی جاسکتی ہے کہ بے حد دشوار گزار منزلیں طے کرنے کے بعد گوہر مقصود انھیں مل جائے گا۔ آج عالم یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں میں اردو ٹیچر بحال کیے جارہے ہیں، لیکن انھیں شکایت ہے کہ بیشتر اسکولوں میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ کچھ اسکولوں میں جب اردو خواں طلبہ اور طالبات نہیں ملتے ہیں تو مجبوراً ایسے اردو ٹیچرس اپنے اسکولوں میں دوسرے مضامین پڑھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔

حکومت بہار نے دفتروں میں اردو مترجموں کی آسامیاں قائم کیں اور ان پر اردو جاننے والے مترجم فائز ہوئے۔ لیکن خبر ہے کہ ان کے پاس شاذ و نادر ہی کبھی اردو میں درخواست آتی ہے مجبوراً انھیں بھی عام دفتری کام، جو بیشتر ہندی میں ہی ہوتے ہیں سر انجام دینے پڑتے ہیں۔ اور یہی حال اردو ٹائپسٹوں کا بھی ہے کہ دفتر میں اردو ٹائپ کا کام نہیں ہونے کے سبب انھیں دوسرے کاموں میں لگادیا گیا ہے۔

اردو کو Job Oriented بنانے کے سلسلے میں حالیہ زمانے میں حکومت نے بہت کچھ کیا ہے۔ لیکن جو حقائق سامنے آرہے ہیں وہ حد درجہ مایوس کن ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حکومت بہت کچھ کرنے کے باوجود اردو آبادی کے دلوں میں اردو کے چراغ تو روشن نہیں کرسکتی۔ یہ کام حکومت کا ہے بھی نہیں یہ کام تو خود اردو والوں کا ہے۔ کیا ہم واقعی اپنی اس ذمے داری کو سنجیدگی سے سمجھ رہے ہیں اور اگر سمجھ رہے ہیں تو پھر اس سلسلے میں کیا کیا عملی اقدام اٹھائے گئے ہیں اس کا محاسبہ ضروری نہیں ہے کیا؟

جب حالات اس درجہ ناگفتہ بہ ہوں تو بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم خود اٹھ کھڑے ہوں کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ کرنا ہے خود ہمیں ہی کرنا ہے سرکاری مراعات کے بھروسے ہی سب کچھ چھوڑ دینا کسی بھی طرح دانش مندی نہیں کہی جاسکتی۔ اردو کی ابتدا کو ہم ایک بڑا کاز تصور کرکے اپنے اندر ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کریں اور ان علاقوں میں جائیں جہاں اردو تعلیم کا سلسلہ تیزی سے ختم ہوتا جارہا ہے۔ ان گھروں میں جائیں جہاں کچھ عرصے پہلے اردو پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ قائم تھا۔ گھر کے بزرگوں سے ملیں اور انھیں اردو کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت سمجھائیں اور اردو کو اپنے نظام تعلیم سے خارج کردینے کے خطرناک

نتائج پر ان سے گفتگو کریں اور انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ آج اردو ہمارے تشخص کی سب سے بڑی علامت بن گئی ہے۔ اردو نہیں تو ہم نہیں۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم اردو کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں کچھ ٹھوس اسکیمیں بنائیں۔ پہلے دارالخلافہ میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا مرکز قائم کیا جائے جو اردو کا ایک آسان سا نصاب تیار کرے اور پھر اضلاع، سب ڈویژنوں، بلاکوں میں اردو تعلیم کے مراکز قائم کیے جائیں اور اس نئے نصاب کو سامنے رکھ کر اردو کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

جن علاقوں میں ہم مراکز قائم نہ کر سکیں وہاں سال میں پندرہ پندرہ دنوں کے لیے دو چار کیمپ لگائے جائیں، اور ان مراکز اور کیمپ کی جانچ کے لیے وفد بھیجے جائیں جو ان تعلیمی اداروں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مفید مشورے بھی دیں۔ ان کاموں کے لیے ہمیں ایک بڑے سرمایے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے اردو کی جو مختلف تنظیمیں ہیں انھیں سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔ ان کے پاس جو وسائل ہیں ان کا استعمال پہلے کیا جائے۔ یہ ادارے اور انجمنیں رقم کا انتظام کریں، عوامی چندوں کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہیں کریں اور اس سلسلے میں حکومت سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ جتنے بھی ادارے اردو کے لیے کام کر رہے ہیں چاہے وہ سرکاری گرانٹ سے چلتے ہوں یا عوامی چندہ سے ان سب کو مل بیٹھ کر الگ ڈفلی الگ راگ کو تیاگ کر، اس نیک مقصد کے لیے اتحاد قائم کرتے ہوئے پروگرام مرتب کرنا ہوگا' پھر بہتر حکمت عملی اپناتے ہوئے اس کام کو انجام تک پہنچانا ہوگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے ان خطوط پر کام کیا جائے اور ہم اسے ایک بڑا اور اہم فریضہ سمجھ کر تندہی سے اس میں لگ جائیں تو انشاءاللہ ہماری کوششیں بار آور ہوں گی اور پانچ دس سال میں حالات یکسر بدل جائیں گے۔ لیکن جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے ہم پہلے ہی بہت وقت برباد کر چکے ہیں۔ اگر اب بھی نہ چونکے تو پھر ہمارے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔

اردو کی ابتدائی تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں ہم نے کچھ تجویزیں پیش کی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اہلِ دانش و بینش یکجا ہو کر اس مسئلے پر غور خوض کریں تو اس کے بہترین نتائج نکلیں گے۔ ساتھ ہی وہ کچھ اور بھی بہتر تجویز پیش کر سکیں گے۔

لیکن یہ تو طے ہے کہ یہ مسئلہ ہر حال میں ہمارا ہی ہے اور تجویز کوئی بھی ہو اس پر عمل کرنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ہمیں اردو والوں کو یہ باور کرانا ہے کہ اردو ان کی تہذیب اور ان کے

تہذیبی سرمایے کو ثابت و سالم رکھنے کا واحد ذریعہ ہے یہی نہیں بلکہ ان کے دینی سرمایے کو بھی محفوظ رکھے گی۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہم حدیث، فقہ، تاریخ، سیرت، اولیائے کرام کے حالات اور ان کے ملفوظات کو آخر کس زبان میں پڑھیں گے؟ ہمیں عربی آتی نہیں فارسی آتی نہیں تو پھر سوائے اردو کے چارہ بھی کیا ہے جس میں دین کا سارا سرمایہ محفوظ ہے اور یہ تو ایک مکمل حقیقت ہے کہ ان کو پڑھے بغیر دین کا صحیح ادراک نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم نے ایک طے شدہ ڈگر پر چل کر کامیابی حاصل کر لی اور اس طرح اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی ایک نئی کھیپ ہمارے سامنے آگئی تو یقین جانیں ویرانے میں ایک بار پھر بہار آجائے گی۔

دراصل اردو زبان و ادب کی ترقی و توسیع کے۔ لیے ہمارے ذہن میں ایک بڑا نقشا ہے۔ ہم اردو کو دنیا کی عظیم زبانوں اور حد درجہ ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر اردو والوں کی ایک تازہ دم نسل ہمارے درمیان آجاتی ہے تو ہم کچھ بڑے منصوبوں کے لیے اس کا عملی تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) اول تو یہ کہ ہم اردو زبان و ادب کی ایسی مستند تاریخ مرتب کریں جس میں اردو کے سبھی علاقوں میں زبان کی نشو و نما اور ادبی ارتقا کی پوری داستان مل جاتی ہو۔ (۲) مختلف علاقوں میں زبان کس طرح ترقی کی منزلیں طے کر کے اس مقام پر پہنچی کس حد تک وہ اپنی بنیاد سے دور ہوئی اور اس نے قواعد، صرف و نحو میں کون کون سی تبدیلیاں کیں۔

(۳) مختلف علاقوں کے شعر ادب کے سفر میں کون کون سی منزلیں آئیں۔ موضوع اور ہیئت کی سطح پر کتنے تجربے ہوئے ڈکشن کے معاملے میں وہ ایک دوسرے سے کس حد تک مختلف ہیں۔

(۴) اس طرح ایک تاریخ ادبی رجحانات اور تحریکات کی بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔ اردو شعر و نثر کا ایک معتدبہ حصہ مخطوطوں کی شکل میں ہماری لائبریریوں میں بند ہے، ہم ان کی اشاعت کا منصوبہ بھی تیار کر سکتے ہیں۔

(۵) اردو فکشن کی عمر اردو شاعری کی عمر سے خاصی کم ہونے کے باوجود اس نے ایسی ترقی کی ہے کہ ہمیں اسے مغرب کے فکشن کے ہم پلہ قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کی بھی ایک تاریخ مقرر کی جائے۔

(۶) ہمیں ایک معیاری دارالترجمہ کی بھی ضرورت ہے۔ ترجمہ کا فن خاصا مشکل فن ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس کے لیے ایک تربیتی کورس تیار کریں اور ایسے لوگوں کو معقول وظیفے پر ترجمہ کورس کے لیے تربیت دیں جن کی اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی کی بھی اچھی استعداد ہو۔

ترجمے کے ذریعہ مختلف علوم کی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے سے ہم اردو کے دامن کو دوسری زبانوں کے زروجواہر سے بھر سکتے ہیں۔

(۷) اعلا پیمانے پر اردو کے تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں۔ تحقیق و تنقید زبان و ادب کے قافلے کو آگے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

ہمیں ایک طرف تو اپنے کلاسیکی سرمایے کو اچھی طرح سنبھال کر رکھنا ہے اور دوسری طرف ادب کو نئی روشنی کے لیے ہمہ وقت اپنے روزن و در کو وا رکھنا ہے۔

تعلیم کو Job Oriented بنانے سے اور Visual Media کے فروغ سے یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ہم سہل پسند ہوتے جارہے ہیں۔ کتابوں سے ہمارا رشتہ کم ہوتا جارہا ہے اور ہم Mediocrity کی راہ پر تیزی سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ امر حد درجہ تشویش ناک ہے۔

اگر ہماری آنکھیں کھلی رہیں اور ہم تہذیب کی ان "نئی برکتوں" کے شکار نہ ہوئے تو یقیناً مستقبل ہمارا ہوگا۔ اور ہم پھر ایک بار اپنی صفوں میں قد آور شخصیتوں کی آمد کا مژدہ سن سکیں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہم عملی طور پر کیا کررہے ہیں؟ اور کیا کرنا چاہیے اس کے لیے سب سے پہلے اپنی اس مادری زبان کی محبت اپنے دل میں بسانی ہوگی۔ اور دل سے اس کی ترقی کے لیے عملی طور پر تعاون کرنا ہوگا۔

برسوں سے یہ سوال رسالوں اور اداروں کے ذریعہ اٹھایا جاتا رہا ہے کہ خطوط کے پتے اردو میں لکھے جائیں۔ لیکن سوال اٹھانے والے کسی رسالے یا ادارے نے آج تک ایک بھی خط اردو میں نہیں لکھا۔ اگر لکھا بھی تو صرف فیشن کی حد تک دو چار خطوط لکھے گئے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی اور کہیں جاری نہیں رہا۔ اس کا کیا سبب ہے اس کو کہتے ہیں قول و فعل کا تضاد۔ ہمیں کم از کم اپنے احباب کو ایک پوسٹ کارڈ ہی سہی، اردو میں پتا لکھ کر ان سے بس یہی گزارش کرنی چاہیے کہ اگر انھیں خط ملے تو وہ اردو میں پتا لکھ کر اس کی اطلاع انھیں دیں۔ اس طرح ایک شخص اگر دس کارڈ اپنے احباب کو لکھے تو اسے اپنی جیب سے ایک پان کی رقم ہی صرف کرنی ہوگی اگر خط نہ بھی پہنچے تو افسوس نہیں ہوگا کہ ضروری بات نہیں پہنچ سکی۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اس محکمے میں بھی اردو ملازمین رکھے جائیں گے تاکہ اردو پتے کے ساتھ انصاف ہو سکے۔

پٹنہ کے پاسپورٹ آفس میں ۹۰% سے زائد پاسپورٹ مسلمانوں کے بنتے ہیں اسے سامنے رکھ کر سرکار نے اردو میں بھی پاسپورٹ فارم مہیا کرلیا تاکہ اردو داں حضرات کو دشواری نہ ہو۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ اردو کا ایک بھی فارم نہیں بکا۔ نتیجہ سارے فارم

بے کار گئے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ سرکار صرف فارم مہیا کرا سکتی ہے لیکن اردو داں جب خود اس سے فائدہ نہ اٹھانا چاہیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

اردو داں جتنے بھی بزنس مین ہیں وہ اردو میں اپنا سارا حساب کتاب لکھیں اور وہ بھلے ہی انگریزی کے لکھیں اس طرح اس زبان کا چلن نجی زندگی میں بھی ضروری ہے۔

ہم شادی بیاہ کے دعوتی کارڈ بھی انگریزی میں شائع کراتے ہیں۔ فنکشن کے دعوت نامے انگریزی اور ہندی میں ہوتے ہیں۔ اس طرح کیا ہم درپردہ اپنی زبان سے نفرت کا اظہار نہیں کررہے ہیں؟

ہر بلاک ہیڈ کوارٹر میں اردو ٹرانسلیٹر ہیں، ہم اردو میں درخواست نہیں دیتے وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ اس پر فوری کارروائی نہیں ہوگی پہلے اس کا ہندی ترجمہ ہوگا پھر کارروائی ہو گی۔ سوال یہ ہے کہ ہندی میں دیے گئے درخواست پر ہی کب فوری کارروائی ہو جاتی ہے؟ اپنی زبان کی بقا کے لیے اگر قدرے تاخیر بھی ہو تو اسے برداشت کرنا چاہیے۔

اردو داں کو یہ بھی چاہیے کہ وہ اپنے بینک کھاتے اور دیگر جگہ بھی اپنے دستخط اردو میں کریں تاکہ اردو سے ان کا قلبی اور عملی سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

بزنس کے معاملے میں اردو داں طبقہ کمزور نہیں ہے۔ لیکن اپنی دکانوں کا سائن بورڈ اردو میں نہ لکھوا کر ہندی یا انگریزی میں لکھوانا پسند کرتے ہیں جبکہ ہندی جاننے والے حضرات اپنی دکانوں کا بورڈ اردو میں بھی لکھواتے ہیں تاکہ اس طبقے کی ہمدردی انھیں حاصل رہے۔

ہم اردو رسائل اور اخبار خریدنا احساس کمتری کی بات سمجھتے ہیں۔ سفر میں خاص طور سے ایسے رسائل بھی ہندی اور انگریزی کے خرید لیے جاتے ہیں جو عام دنوں میں لوگ نہیں خریدتے صرف اس لیے کہ ان کی شناخت اردو داں کے طور پر نہ ہو۔ آخر کیوں؟
ہم کب تک اس طرح اپنی شناخت چھپاتے رہیں گے۔"

اس طرح ہم دانستہ اور نادانستہ بہت سے ایسے اقدام کررہے ہیں جو ہمیں اردو دشمنوں کی صف میں کھڑا کرتے ہیں، ہمیں اس زبان کو اس طرح قبول کرنا ہوگا جس طرح جسم لباس کو قبول کرتا ہے۔ ہمیں اس بات کو بھی ذہن نشیں کرنا ہوگا کہ اردو کو صرف محبوبہ کا درجہ دینا کافی نہیں بلکہ اس سے نکاح کرنا بھی ضروری ہے۔

بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اردو کے سلسلے میں ۹۰ء سے لے کر اب تک پروفیسر جابر حسین نے بے شمار کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جسے گنوانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ سرکار نے ہر گام پر اپنے خلوص کا اظہار کیا ہے لیکن سرکار کے کرچکنے

کے بعد سارا کام اردو داں طبقے کو ہی کرنا ہوتا ہے جو ہم نہیں کر رہے ہیں۔

اب جب کہ اس زبان کو سرکاری درجہ حاصل ہے اور اردو ڈائریکٹوریٹ کا قیام بھی عمل میں آچکا ہے تو سرکار کو اس زبان کی بنیادی تعلیم کے لیے کچھ اور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اردو میڈیم اسکولوں کی کمی ہے یا پھر ٹیچر کم پڑ رہے ہیں، دراصل سماج کا وہ طبقہ جو کریمی لیئر سے تعلق رکھتا ہے اور جن کے بچے بہتر مستقبل اور تعلیم کے لیے انگریزی میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں اس کے لیے بھی انھیں اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم سرکار کو اپنے طور پر کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں سرکار کو کچھ خرچ کرنا نہیں ہوگا۔ وہ پہلے ایک نوٹی فکیشن جاری کر کے انگریزی میڈیم اسکولوں کے لیے یہ ہدایات جاری کر سکتی ہے کہ ہر اسکول میں جب سنسکرت زبان کی تعلیم کا نظم ہے تو پھر بچوں کو اتنی آزادی ملنی چاہیے کہ وہ سنسکرت یا اس کے متوازی کوئی دوسری زبان نہ پڑھنا چاہیں تو اردو بھی آپٹ کر سکتے ہیں اس طرح جو نتیجہ سامنے آئے گا وہ بہت حیران کن ہوگا اور تب اردو داں کے ساتھ بہت سے غیر اردو داں لڑکے بھی سنسکرت یا دوسری زبان کی بجائے اردو ہی پڑھنا پسند کریں گے۔ سنسکرت ایک ایسی زبان ہے جو کم از کم بہار کے کسی بھی علاقے میں نہ تو بولی جاتی ہے اور نہ ہی لکھی جاتی ہے یہ صرف نصابی طور پر زندہ ہے۔ اور اگر ریڈیو والے اس زبان میں خبریں نشر کرنا بند کر دیں تو عوام یہ بھاشا سننے کو ترس جائے گی۔ اردو زبان اس کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ سنسکرت زبان کے ادبی سرمایے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس طرح اگر سرکاری طور پر اچھے اسکولوں میں اس زبان کو تعلیم کے سلسلے میں پشت پناہی حاصل ہو جائے تو اس کے زندہ رہنے کے امکانات مزید روشن ہو جائیں گے۔

رضا نقوی واہی
۱۶/۵ گردنی باغ
پٹنہ-۱ بہار

ٹی۔ وی۔ فوبیا

مجتبیٰ صاحب سے جب پوچھا گیا جاپان میں
کون سی بیماریاں مہلک ہیں ہندستان میں

بولے نکسل واد، فرقہ واریت، آتنک واد
ہو رہا ہے ریزہ ریزہ جن سے قومی اتحاد

جھوٹ کی اک اور بیماری ہے مثلِ کالرا
جس کو عرفِ عام میں کہتے ہیں "ٹی وی فوبیا"

یہ مرض چھایا ہوا ہے قوم کے اعصاب پر
ایک اک گھر ہے "محمد شاہ رنگیلے" کا گھر

آج کل اِس وائرس کی زد میں ہے پورا سماج
کر دیا ہے اس نے ٹھپ معمول کا ہر کام کاج

عشق نے جس طرح غالب کو نکما کر دیا
بے اثر انداز سب پر یوں ہی ٹی وی فوبیا

سگ گزیدہ ہو، کہ ٹی وی کا مریضِ لا علاج
اتفاقی امر ہے، لیکن ہیں دونوں ہم مزاج

بھونکتا ہے سگ گزیدہ جیسے پانی دیکھ کر
ٹی وی کمرے کی فضا ویسی ہی آتی ہے نظر

کوئی ملنے کے لیے آئے تو ہوتا ہے غضب
تیوریاں اپنی چڑھا لیتے ہیں گھر کے لوگ سب

اس قدر ہوتی ہے آمدِ مہماں کی ناگوار
دفعتاً ہوتا ہے سارا گھر الرجی کا شکار

مول لینے کے لیے یاروں سے پکّی دشمنی
گھر میں ٹی وی سٹ بنا زینت ڈرائنگ روم کی

چشم بد دور، اب تو ہے اسٹار ٹی وی کا چلن
یعنی گھر میں آگئیں چھوٹی بڑی دونوں بہن

دور درشن جب رُکا اسٹار ٹی وی چل پڑا
اس طرح دن رات کا وارا نیارا ہو گیا

ساتھ دادا جان کے بیٹھے سبھی اہلِ دھیال
دیکھتے رہتے ہیں چلتے پھرتے سایوں کا کمال

پردۂ سیمیں پہ گاڑے مستقل اپنی نظر
ہیں مگن دنیا و مافیہا سے ہو کر بے خبر

قوم کی تحویل میں بنیادی قدریں جو بھی تھیں
وہ سب کی سب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

مسجد و مندر کی اب تکرار بے مفہوم ہے
اب تو ہر گھر کی عبادت گاہ ٹی وی روم ہے

تبسم خضر
خلاصی ٹولہ، پٹنہ،

نغمہ

"جو گرا آنسو کا قطرہ گوہرِ یک دانہ تھا"
(میر تقی میر)

ظلمتیں تھیں ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ تھا
آسماں بھی چادرِ مہتاب سے بیگانہ تھا
چشمِ پُرنم کی جھلک نورِ جبینِ کہکشاں
"جو گرا آنسو کا قطرہ گوہرِ یک دانہ تھا"
جھٹپٹے میں بھیروی گاتی ہوئی موجِ صبا
شبنمی لب پر طلوعِ صبح کا افسانہ تھا
وہ مدھر لَے، وہ سُروں کی تان میں آہستگی
وہ سلوکِ فن کا اندازِ ہنرمندانہ تھا
بانسری کی دُھن پہ جیسے ناچتی ہوں ناگنیں
اپسرا کے رقص میں بھی بانکپن ویسا نہ تھا
دھڑکنیں دل کی، لبوں پر ارتعاشِ تشنگی
ماتمی شب تھی، غضب کا ماتمِ غم خانہ تھا
جب ملا مجھ سے ملا وہ دوستی کے روپ میں
اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی لگتا نہ تھا
وہ قفس نا آشنا تھا تلملا کر رہ گیا
اس سے پہلے اس پہ ایسا حادثہ گزرا نہ تھا
ہر قدم پر آفتوں کے سو جھیلے، رونما
وقت کا تیور کبھی بگڑا ہوا اتنا نہ تھا
اب الجھتے ہیں مرے دامن سے کانٹے ہمدمو
غنچۂ گُل سے خضرؔ کا بھی کبھی یارانہ تھا

مکتبہ پیام تعلیم کی اہم کتابیں

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی ۶/-
بچوں کے نظیر اکبرآبادی ۶/-
بچوں کے آقا انصاری ۶/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس) ۶/-
بچوں کی شفیقہ فرحت ۴/۵۰
بچوں کے عابد علی خاں ۴/-
بچوں کے علی سردار جعفری ۴/-
بچوں کے یوسف ناظم ۴/-
چارلی چیپلن اور کینتھ اینڈرسن ۹/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی ۴/-
بچوں کے میر امن دلی والے ۴/۵۰
بچوں کے محمد حسین آزاد ۴/-
بچوں کے مرزا غالب ۴/-
بچوں کے رنگارنگ خسروؒ ۴/-
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد ۴/-
بچوں کے سلطان جی رحمہ ۴/۵۰
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی ۴/۵۰
بچوں کی صالحہ عابد حسین ۴/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین ۴/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق ۴/۵۰
بچوں کے میرزا ادیب ۴/۵۰
بچوں کے غلام السیدین ۵/-
بچوں کے مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲۱/-
بچوں کے ذاکر صاحب ۷/-
دادا نہرو ۶/-
اندرا گاندھی کی کہانی ۶/-
محمد شفیع الدین نیّر ۷/۵۰
ہمارے عظیم سائنس داں ۹/-

چند مشہور طبیب اور سائنس داں ۶/-
مولانا آزاد کی کہانی ۸/-
جوہر قابل ۴/۵۰
بچوں کے چار بزرگ دوست ۳/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی ۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں ۲/-
میر انیس ۲/-
امیر خسروؒ ۲/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات ۱۰/-
کہانی بھی، معلومات بھی ۶/-
چیزوں کی کہانی ۷/۵۰
یہ کیسا بخار ہے ۶/-
آپ کا جسم ۶/-
گندا پانی ۴/-
کیوں اور کیسے؟ ۶/-
سائنس کی دنیا ۸/-
کمپیوٹر کیا ہے ۸/-
عجائب گھر ۶/-
ذرّے کی کہانی ۲۱/-
علاج میرا دشمن ۶/-
پرواز کی کہانی ۴/۵۰
غذا کی کہانی ۳/۵۰
رنگوں کی بستی ۵/-
غذائیں دوائیں ۸/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں ۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے ۳/-
صحت کی الف بے ۵/-
سنہرے اصول ۵/-
پرندوں سے جانوروں تک ۴/۵۰
دہلی ۲/-

انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) ۱/۵۰
سماجی زندگی حصہ سوم ۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم) ۱/۵
ان تھک جان (زیر طبع)
بھن بھن بانو //
جاں باز سپاہی //
ہمت کے پھل //
موم کا محل //
پیامی قواعد اردو طلبہ کے لیے ۳/-
// // (بڑا سائز) ۱/-

نظمیں

پھلجھڑیاں ۶/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) ۱/۵۰
چٹکتی کلیاں (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے ۱/۵۰
سہانے ترانے ۱/۵۰
بچوں کے افسر ۱/-
بچوں کے اقبال ۱/۵۰

ننھے منّے بچّوں کے لیے

بتاشے (باتصویر) ۱/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) ۱/-
شیر اور بکری // ۱/۵۰
چاند کی بیٹی // ۱/-
بھیڑیے کا گانا // ۱/۵۰
جادو کی ہنڈیا // ۱/-
چالاک بلی // ۱/۵۰
دُم کٹی لومڑی // ۱/۵۰
کوّے کا خواب // ۱/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری ۱/۵۰

شمس الرحمٰن فاروقی
۱۰۔ ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد (یوپی)

تقطیع اس کی اب میاں صبح سے تا یہ شام ہو

ساقی فاروقی کی ایک غزل ہے جس کے تمام مصرعے مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن پر بخوبی تقطیع ہوتے ہیں۔ ساقی کی تمام غزلوں طرح یہ غزل بھی رواں اور شگفتہ ہے لیکن چونکہ اس کا وزن نامانوس ہے لہٰذا یہ سوال اٹھا کہ اس کی بحر اور وزن کیا متعین ہوں؟ جناب احمد ندیم قاسمی نے گمان کیا کہ غزل کو درحقیقت بحر رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن دوبار) میں ہونا تھا اور شاید سہواً شاعر نے ایسا وزن اختیار کر لیا ہے جس سے مصرعوں کے خارج از وزن ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے جناب مشفق خواجہ سے رجوع کیا تو جناب مشفق خواجہ نے بھی تصدیق کی کہ متداول وزن تو مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ہی ہے لیکن اس میں مفتعلن کی جگہ مفعولن تو آسکتا ہے مستفعلن نہیں آسکتا۔ شاعر سے استفسار کیا گیا تو اس نے مختلف موقعوں پر مختلف باتیں کہیں۔ ساقی کی باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ میری غزل کے تمام مصرعوں کا وزن مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن بالکل بے عیب ہے اور اس وزن کو رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن دوبار) سے خلط ملط کر سکتے ہیں۔ ساقی نے اقبال اور غالب کے بعض مصرعوں کی تقطیع مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن کے وزن پر کی اور کہا کہ اگرچہ جن غزلوں/نظموں سے یہ مصرعے لیے گئے ہیں ان کا عام وزن مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن ہی ہے لیکن یہاں مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن کے وزن والے مصرعے ہیں۔ ساقی نے دوسری بات یہ کہی بحر بسیط مثمن سالم کا وزن مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن ہے۔ میں نے دونوں جگہ (یعنی حشو اول اور عروض/ضرب) کے فاعلن پر م کا اضافہ کر کے مفاعلن بنا لیا۔ اس طرح وزن مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن حاصل ہوا۔ لہٰذا میری غزل خارج از بحر نہیں بلکہ بحر میں ہے۔

ساقی کے پہلے استدلال کے جواب میں کہا گیا کہ غالب اور اقبال کے جو مصرعے آپ نے مستفعلن مفاعلن کے وزن پر تقطیع کیے ہیں وہ دراصل اس وزن میں آتے ہی نہیں اور بحر بسیط میں فاعلن پر میم لگا کر مفاعلن حاصل کرنا از روئے عروض درست نہیں۔ یہ بحث بہت طول کھنچی اور ان صاحبان کے درمیان جو مکاتبت اس موضوع پر ہوئی وہ "معاصر" لاہور میں شائع ہوئی۔ بحث کا لب لباب یہی رہا کہ ساقی فاروقی اپنے موقف پر اڑے رہے اور اپنی غزل کے تمام مصرعوں کو اپنے سامعہ اور ذوق کی بنا پر اور عروض کی بنا پر بھی درست بتلاتے رہے۔ مشفق خواجہ اپنے مسلک

اڑنے رہے کہ نہ بحر بسیط یہاں کام آئے گی اور نہ مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن کا خلط مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن کے ساتھ غالب اور اقبال کی ان غزلوں / نظموں میں ثابت ہو سکتا ہے جن کا حوالہ ساقی نے دیا ہے۔

اس پوری بحث میں ساقی صاحب نے خوب ڈینگیں ہانکی ہیں، فقرے بازیاں کی ہیں، پینترے دکھلائے ہیں اور رائج ہر قسم کی چیز کا بھی مظاہرہ کیا ہے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کی غزل صاف، شگفتہ اور رواں ہے اور اس کے سارے مصرعے بخوبی اور بہ آسانی مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن پر تقطیع ہو سکتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس وزن کی بحر کو رجز مثمن مخبون کا نام دیا جا سکتا ہے۔ لہذا سوال یہ نہیں کہ ساقی کی غزل میں موزونیت ہے کہ نہیں۔ اور نہ ہی یہ سوال ہے کہ اس غزل کے وزن کو عروض کی زبان میں بیان کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ غزل بے شک پوری کی پوری موزوں ہے اور اس کے وزن کو عروض کی زبان میں بے شک بیان کر سکتے ہیں۔ للہٰذا اصل سوالات حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ ساقی کی غزل کے تمام مصرعے مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن کے وزن پر ہیں۔ کیا یہ وزن عروض کی کتابوں میں مذکور ہے ؟

۲۔ کیا اس وزن میں پرانے اساتذہ نے کوئی شعر کہا ہے ؟

۳۔ کیا اس وزن کو عروضی اصطلاح میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں (یعنی اس کی بحر اس طرح متعین کر سکتے ہیں) کہ اسے از روئے عروض درست قرار دیا جا سکے ؟

۴۔ کیا اس وزن (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن) کو مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن کے ساتھ خلط کر سکتے ہیں ؟

۵۔ غالب اور اقبال کے بعض مصرعوں کا وزن ساقی صاحب نے مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن بیان کیا ہے۔ کیا ساقی کی تقطیع کو صحیح قرار دے سکتے ہیں ؟

اب ان سوالوں کے جواب ملاحظہ ہوں ۔

سوال ۱۔ کیا وزن مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن عروض کی کتابوں میں مذکور ہے ؟

جی نہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہوں کہ عروض کی تمام قدیم و جدید مستند کتابیں اس وقت میرے پیش نظر ہیں لیکن جتنی بھی پیش نظر ہیں (مثلاً "معیار الاشعار" اور اس کا ترجمہ، زد کامل عیار "عروض سیفی" "حدائق البلاغت"، "دریائے لطافت"، "غیاث اللغات" "مقیاس الاشعار"، "بحر الفصاحت"، "آئینہ بلاغت"، اور جدید لوگوں میں زار علامی، کندن ارادلی، گیان چند اور کمال احمد صدیقی کی کتابیں وغیرہ)۔ ان میں سے کسی میں بھی مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن دوبار یعنی رجز مثمن مخبون کا ذکر نہیں۔ رجز کی فرع مفاعلن (مخبون) ہر کتاب میں ہے اور رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن دوبار) بھی ہر کتاب میں ہے لیکن مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن مذکور نہیں۔

سوال ۲۔ کیا اس وزن (رجز مثمن مخبون) میں اساتذہ نے کوئی شعر کہا ہے ؟

جی نہیں، میرے علم واطلاع کے بموجب یہ وزن فارسی اردو اساتذہ کے یہاں نہیں ملتا۔ اقبال نے البتہ اس وزن میں شعر کہے تھے لیکن وہ انھوں نے بعد کو خارج کر دیے (تفصیل آگے آتی ہے)

سوال ۳۔ کیا اس وزن کو عروضی اصطلاح میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ اسے ازروئے عروض درست قرار دیا جا سکے؟

جی ہاں ۔ یہ وزن (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن) قباحت سے بالکل پاک ہے۔ عروضی اصولوں کی رو سے اس میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر اسے غلط قرار دیا جائے۔ بحر رجز میں رکن سالم (مستفعلن) ہر جگہ آسکتا ہے۔ میں نے جناب کندن ارلولی اور کمال احمد صدیقی (جنھیں میں اس زمانے کے بہترین عروضیوں میں شمار کرتا ہوں) سے دریافت کیا کہ رجز مثمن مخبون میں کیا قباحت ہے؟ دونوں کا یہی جواب تھا کہ یہ وزن کتابوں میں مذکور نہیں لیکن اصولی طور پر اس میں کوئی قباحت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ جناب کمال احمد صدیقی نے یہ بھی تصدیق کی کہ مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن پر مبنی کلام اردو فارسی اساتذہ کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ جناب گیان چند بھی ہمارے زمانے کے ماہر عروضی ہیں۔ انھوں نے اقبال کے یہاں اس وزن (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن) کے حدوث پر ایک مضمون بہ عنوان "اقبال کی مہارت عروض" لکھا ہے جو ان کی کتاب "کھوج" میں شامل ہے۔ گیان چند نے اس معاملے کا تصفیہ نہیں کیا ہے کہ وزن مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن پر شعر کہنا درست ہے کہ نہیں۔ انھوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ اقبال نے اپنی تین اردو نظموں میں وزن بحر رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن) کے ساتھ خلط کیا گویا عروض کی دی ہوئی آزادی استعمال کی لیکن بعد میں اقبال نے اس وزن کو نا مطبوع سمجھتے ہوئے ترک کر دیا اور اس وزن میں کہے ہوئے اشعار متعلقہ نظموں سے حذف کر دیے، یا متداول وزن (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن) کا لحاظ رکھتے ہوئے ان میں اصلاح کر لی۔ بحیثیت مجموعی گیان چند اس وزن (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن) کے خلاف ہیں لیکن کسی عروضی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس بنا پر کہ یہ نامطبوع ہے۔

گیان چند نے یہ بھی کہا ہے کہ اقبال نے دو فارسی غزلوں میں بھی مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن استعمال کیا ہے۔ یعنی فارسی میں اس وزن کو اقبال غالباً قابل اعتراض نہ سمجھتے تھے۔ گیان چند نے حوالہ نہیں دیا ہے کہ یہ اشعار کن مجموعوں میں ہیں۔ سرسری تلاش میں مجھے وہ اشعار کلیات اقبال فارسی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ میں نہ ملے۔ یقین ہے کہ اشعار اقبال ہی کے ہوں لیکن اصل متن کی غیر موجودگی میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ گیان چند صاحب کی کتاب میں اشعار کا متن کچھ غلط بھی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ان کے بیان پر تکیہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے فارسی میں کچھ شعر مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میں کہے ہیں اور اس وزن کا خلط مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن کے ساتھ کیا ہے۔

بنیادی بات بہر حال یہی ہے کہ رجز مثمن مخبون (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن دوبلہ)

عروضی اعتبار سے بالکل درست ہے۔ عروضیوں نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر غالباً اس لیے نہیں کیا کہ یہ عربی فارسی میں نہیں ملتی۔ مفاعلن کو مستفعلن سے بطریق خبن مستخرج کرتے ہیں اور اس زحاف کے لیے ایسی کوئی قید نہیں کہ وہ حشو یا عروض و ضرب میں سالم رکن کے بعد نہ آئے۔ اور کسی بھی کتاب میں ایسی پابندی بھی نظر نہ آئی کہ رجز میں سالم اور مخبون ارکان ایک ہی مصرعے میں نہیں آسکتے۔ لہذا رجز مثمن مخبون (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن دو بار) میں کوئی عیب نہیں۔

اب اگر سوال یہ اٹھے کہ جب اس بحر و وزن میں کوئی عیب نہیں تو اسے پرانے اساتذہ نے استعمال کیوں نہیں کیا؟ (ساقی فاروقی غالب اور اقبال کی سند پر کہتے ہیں کہ کم از کم ان دو بڑے شعرا نے اسے ضرور برتا ہے لیکن یہ دعوا محل نظر ہے۔) اس سوال کا اصل جواب یہ ہے کہ اساتذہ بطور عام انھیں بحروں کو برتتے ہیں جو عروض کی کتابوں میں مذکور ہوں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس بحر کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں، کیونکہ رجز مثمن مطوی مخبون (مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن دو بار) سے کام چل جاتا ہے۔ شاذ ہی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کو مفتعلن کی جگہ مستفعلن ناگزیر معلوم ہو۔ پھر مفتعلن کی جگہ مفعولن آہی سکتا ہے، یہ بڑی آسانی ہے۔ لیکن مفتعلن کی جگہ مفعولن بھی اردو کے شعرا (کیا قدیم کیا جدید) نے بہت ہی کم برتا ہے۔ اس کی وجہ سامعہ کی ناآشنائی ہے۔ ظاہر ہے یہ کہ یہ صورت دوری (۲۰ مارد معقف) ہے لیکن معاملہ ہے یہی۔ اگر شعرا ان اوزان کو ان بحروں میں استعمال کرتے تو سامعہ ان سے آشنا ہوتا۔ اور شعرا نے ان اوزان کو ان بحور میں استعمال اس لیے نہیں کیا کہ سامعہ ان سے ناآشنا ہے۔

سوال ۴۔ کیا اس وزن (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن) کو مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن کے ساتھ خلط کر سکتے ہیں؟

چونکہ کتب عروض میں رجز مثمن مخبون (مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن دو بار) مذکور ہی نہیں، اس لیے ان دو اوزان (رجز مثمن مخبون اور رجز مثمن مطوی مخبون) کو خلط کرنے نہ کرنے کے بارے میں کوئی کتابی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اب معاملہ صرف ذوق اور ذاتی رجحان طبع کا رہ جاتا ہے۔ بظاہر تو دونوں میں اتنی مماثلت ہے کہ ان کا خلط نامناسب نہیں معلوم ہوتا لیکن عروضی اصول کے لیے محض مماثلت سند نہیں، ورنہ کئی اوزان ایسے تھے کہ جن کا خلط مناسب بلکہ اچھا معلوم ہو سکتا ہے۔ عروضی اصول اوزان کے خلط کی اجازت اسی وقت دیتے ہیں جب ان کی مماثلت پر (منجملہ اور باتوں کے) یہ دلیل بھی آسکے کہ اس خلط سے کوئی ایسا فرق کسی اور جگہ نہ واقع ہوگا جو کسی اصول پر ضرب پہنچائے۔ مثلاً بحر رمل مثمن کا مشہور وزن ہے: فعلات فاعلاتن فعلات فاعلن (یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا۔) یہاں تسکین اوسط کا عمل کرتے ہوئے مفعول فاعلاتن مفعول فاعلاتن حاصل کرتے ہیں لیکن ان دونوں کا خلط از روے عروض درست نہیں، کیونکہ بحر بدل جاتی ہے۔ اس کے برخلاف مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن اور مفعول فاعلاتن مفعول فاعلن کا خلط جائز ہے۔ لہذا صرف مماثلت اس بات کے لیے کافی نہیں کہ دو اوزان کا خلط جائز ٹھہرے۔ یہاں صورت حال یہ ہے کہ رجز مثمن سالم (مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن دو با

ہیں پہلے ہم نے حشو اول اور عروض و ضرب کو مخبون کیا تو مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن ہاتھ آیا۔ اب اس سے رجز مثمن مطوی مخبون بنانے کے لیے ہمیں واپس جاکر صدر و ابتدا اور حشو دوم کو مفتعلن کرنا پڑے گا۔ یعنی الٹی گنگا بہانی پڑے گی۔ عروض کا عام قاعدہ ہے کہ جب زحافات کا عمل کرتے ہیں تو شروع سے شروع کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کرتے کہ بعد والے رکن پر زحاف پہلے لگائیں اور پہلے والے رکن پر اس کے بعد۔ مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن میں مستفعلن کو مفتعلن میں بدلنے کے لیے ہمیں یہی الٹا عمل کرنا ہوگا، جو مناسب نہیں۔ لہٰذا ہزار مماثلت کے باوجود ان دو اوزان (رجز مخبون اور رجز مطوی مخبون) کا خلط مناسب نہ ہوگا۔

ساقی فاروقی نے غالب اور اقبال کے مصرعوں سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن بھی صحیح Valid وزن ہے۔ اور اس طرح یہ بھی ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس وزن کا خلط رجز مثمن مطوی مخبون سے جائز ہے۔ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ غالب اور اقبال کو عروض میں چنداں درک نہ تھا۔ ان کا ہر عمل عروضی اعتبار سے مستند نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اقبال نے "بانگ درا" کی تین نظموں کے کئی مصرعوں میں اولاً رجز مثمن مخبون اور رجز مثمن مخبون اور رجز مثمن مطوی مخبون کو خلط کیا تھا بعد میں ان تمام مصرعوں کو انھوں نے یا تو بدل کر مطوی مخبون کے مطابق کر لیا یا سرے سے خارج ہی کر دیا۔ تفصیل کے لیے گیان چند کا محولہ بالا مضمون اور اکبر حیدری کا مضمون "کلام اقبال کے اصل ماخذ اور اقبال کا نادر و نایاب کلام"، مطبوعہ "ہماری زبان"، نئی دلی بابت ۲۲ مارچ ۱۹۹۵ ملاحظہ ہوں۔

سوال ۵ ـ غالب اور اقبال کے بعض مصرعوں کی تقطیع ساقی نے مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن بیان کی ہے۔ کیا ان کی تقطیع درست ہے؟

اس سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ساقی نے اپنی تقطیع کی بنیاد غلط قرأت یا غلط اصول پر رکھی ہے۔ مثلاً غالب کا مصرع ہے ؎

موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

ساقی نے "موج" اور "محیط" کے درمیان کسرۂ اضافت فرض کیا ہے اور اضافت کا اشباع کر کے "موج" کو "موجے" پڑھا ہے۔ یعنی "موجے مُحی" مستفعلن "طِ آب میں" مفاعلن۔ اوّل تو "موج" اور "محیط" کے مابین یہاں اضافت ہے نہیں کیونکہ اس طرح معنی کا خون ہو جاتا ہے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اگر اضافت کو کھینچ کر ہی پڑھنا ہے یا حرف علت کو کھینچ کر ہی پڑھنا ہے تو پھر اسی مصرعے کی کیا شرط ہے؟ غالب کی اسی غزل میں اکثر مصرعے (حتیٰ کہ زیر بحث مصرعے میں "مارے ہے دست و پا کہ یوں" بھی) اضافت یا حرف علت کو کھینچ کر پڑھے جا سکتے ہیں ملاحظہ ہو:

۱ـ بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

دونوں جگہ "سے" کو کھینچ کر پڑھیں اور تقطیع مفتعلن کے بجائے مستفعلن کریں۔

۲ ـ میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی

"سُن کے ستم ظریف نے" کو کھینچ کر پڑھیں اور تقطیع مستفعلن کریں۔

۳ ـ سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا کہ دیا کہ یوں

"سن کے" اور "کو" کو کھینچ کر پڑھیں اور تقطیع مستفعلن کریں۔

۴۔ قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں

رجز مطوی مخبون میں غالب کی دوسری مشہور اردو غزل کے اس مصرعے میں بھی "قید حیات" کو طویل اضافت کے ساتھ پڑھیں اور "قید ے حیات" کر دیں تو مستفعلن بن جائے گا۔

اسی طرح اقبال کی غزل (نظم ؟) مشمولہ "بال جبریل" کا مصرع ہے۔

مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

یہاں ساقی نے "پارس" کو بروزن "سارس" پڑھ کر تقطیع مستفعلن مفاعلن کی ہے۔ ظاہر ہے کہ "پارہ" بروزن "ساخت"، یا انگریزی Parse ہے۔ "پارس" بروزن "سارس"، بمعنی پتھر ہے اور "پارس" بروزن Faree ایران کا ایک نام ہے۔ یہاں "پارس و شام سے گزر" کو بروزن مستفعلن مفاعلن پڑھ ہی نہیں سکتے۔ ہاں اسی مصرعے کے جزو اوّل (مصر و حجاز سے گزر) کو بآسانی مستفعلن مفاعلن پڑھ سکتے ہیں اگر واؤ معطوفہ کو کھینچ کر پڑھیں۔ یعنی اس وقت تو واؤ کو محض ضمہ کی طرح پڑھتے ہیں، اگر اسے پورا واؤ پڑھیں تو " مصرو حجا "، بروزن مستفعلن ہو جائے گا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح تو اس بحر میں بہت سارے مصرعے بے تکلف مطوی مخبون کی جگہ صرف مخبون فرض کیے جا سکتے ہیں۔ سوال فرض کرنے کا نہیں بلکہ حتمی طور پر مفتعلن کی جگہ مستفعلن پڑھنے کا ہے۔ موجودہ شکل میں اقبال یا غالب کے یہاں یہ ممکن نہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگر "پارس"، بمعنی "ایران" کو بروزن "سارس" ہی پڑھنے پر اصرار کیا جائے تو بھی "پارس و شام سے گزر"، پڑھ کر مفتعلن مفاعلن پر تقطیع کر سکتے ہیں۔ لہٰذا "پارس" بروزن "سارس"، بھی ہو تب بھی حتمی طور پر یہاں مستفعلن مفاعلن نہیں بنتا۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ اقبال نے تین نظموں میں مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن اور مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن کو یک جا استعمال کیا تھا۔ "بانگ درا" میں شامل ان تینوں نظموں کے نام بالترتیب یہ ہیں: "پیام"، "طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام" اور "کوشش ناتمام"۔ موجودہ صورت میں ان میں کوئی مصرع مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن کے وزن پر نہیں لیکن ساقی فاروقی نے اقبال کے "پارس و شام سے گزر" والے مصرعے سے استدلال کیا ہے جو "بال جبریل" میں ہے۔ یعنی اس کے بارے میں یہ شک بھی نہیں ہو سکتا کہ اقبال نے یہاں مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن استعمال کیا ہوگا۔ "بال جبریل" کا زمانہ آتے آتے اقبال نے عروضی تجربے ترک کر دیے تھے۔

سودا کے بارے میں ان کے معاصروں کا خیال تھا کہ علم و شعر و ادب میں وہ میر سے کم تر ہیں۔ قاضی عبدالودود نے اس بات کو اپنے طور پر یوں کہا کہ کسی ادبی معاملے میں سودا کی رائے معتبر نہیں، وہ مرد جاہل تھا۔ بہرحال، مجھے صرف سودا کے یہاں ایک مثال مفتعلن مفاعلن اور مستفعلن مفاعلن ملانے کی نظر آئی۔ ممکن ہے اوروں کے یہاں بھی ہو لیکن فی الحال میرے علم میں نہیں۔ سودا کا ایک ہجویہ مخمس (در ہجو مولوی ندرت کشمیری) رجز مثمن مطوی مخبون میں ہے لیکن اس کا دوسرا بند حسب ذیل ہے ؎

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جو التزام ہو
بحر میں جس کی ہر طرح شبہۂ خاص و عام ہو

تقطیع اس کی جس کنے صبح سے تابہ شام ہو
اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو
گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو

یہ ظاہر ہے کہ تیسرے مصرعے کا اوّل رکن (جس کے الفاظ کو میں نے جلی لکھ دیا ہے تاکہ کوئی شک نہ رہ جائے) مستفعلن کے وزن پر ہے۔ میں نے یہ بند کلیات سودا مرتبہ آسی مطبوعہ نول کشور پریس ۱۹۳۲ سے نقل کیا ہے لیکن میرے پاس کلیات سودا کے جتنے نسخے ہیں سب میں یوں ہی لکھا ہے۔ رشید حسن خاں اور خورشید الاسلام کے انتخابات سودا میں بھی یوں ہی ہے۔ لہٰذا اس میں بہت کم شک رہ جاتا ہے کہ سودا نے اس ہجو میں ایک بار مفتعلن کی جگہ مستفعلن رکھا ہے۔ بعض لوگوں کے لیے اتنی سند کافی ہو سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ساقی فاروقی کی غزل بحر رجز مثمن مخبون میں بہ آسانی اور بخوبی تقطیع ہو سکتی ہے۔ اس کو خارج از بحر کہنا یا ناموزوں ٹھہرانا بالکل غلط ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ساقی نے کوئی نئی بحر ایجاد کی ہے۔ کیونکہ چند مصرعے ہی سہی لیکن سودا اور اقبال کے یہاں یہ وزن ملتا ہے۔ کتابی اعتبار سے اس بحر میں کوئی عیب نہیں۔ بسیط مثمن سالم (مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن دوبار) میں فاعلن کے سر پہ میم لگا کر مفاعلن بنانے کی ضرورت نہیں، اور نہ از روئے قاعدہ یہ ممکن ہی ہے۔ ساقی کی غزل رجز مثمن مخبون میں ہے اور بہت خوب ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ، یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت ۳۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمینار میں پیش کیا۔
قیمت ۱۰/-

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں سابقہ مجموعوں "ساز لرزاں"، "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت ۴۵/-

گول مال — شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/-

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" آپ کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت ۴۵/-

الکٹرانی یلغار اور کتابوں کا مستقبل

"وسیلہ علم کے طور پر کتابیں جلد ہی فرسودہ ہو جائیں گی ۔ درس گاہوں میں نصابی کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی اور طلبہ کو متحرک تصویروں والی اسکرین کے ذریعہ اسباق پڑھائے جائیں گے۔ انسانی علم کے ہر شعبہ کا احاطہ بصری آلات کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔"

یہ پیش گوئی 1993 میں تھامس ایڈیشن نے بڑے طمطراق سے کی تھی جب الیکٹرانی ذرائع ابلاغ اور متحرک تصویروں والے وسائل آج کی طرح عام نہیں تھے۔ لیکن کتابوں سے لکل خالی دنیا کا تصور پیش کرنے والے ایڈیشن واحد شخص نہیں تھے ۔ بلکہ الیکٹرانی دور کی ابتدا سے اب تک متعدد مرتبہ اس طرح کی پیش گوئیاں سامنے آچکی ہیں اور اسی کے ساتھ کتابیں اپنے تنوعات کے ساتھ نہ صرف موجود ہیں بلکہ بیشتر زبانوں کے اندر ان کی تعداد و اشاعت میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ موجودہ دور میں تدریس و اشاعت علم کی غرض سے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اب کمپیوٹر کے روز افزوں استعمال کے باوجود یہ سوال اب بھی قائم ہے کہ کیا وہ وقت کبھی آئے گا جس کی پیش گوئی ایڈیشن اور ان کے ہم نوا کرتے رہے ہیں؟

یہ سوال کہ کیا کتابوں کا کوئی مستقبل ہے، خاص طور پر ان عوامی جائزوں کا نتیجہ ہے جن سے ہر عمر کے افراد میں اخبارات کے مطالعہ کے رجحان میں کمی کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن خبروں کے معاملے میں اخبارات کے مقابلے میں الیکٹرانی ذرائع ابلاغ کی مقبولیت کی بنیاد پر کتابوں کی افادیت کے بارے میں نتائج اخذ کرنا جہاں ایک غیر منطقی استدلال ہے، وہیں کتابوں کے خاتمہ سے متعلق باتوں میں بڑی حد تک مبالغہ آمیزی نظر آتی ہے۔

نیو یارک یونی ورسٹی میں جرنلزم کے پروفیسر میتھل اسٹیفنس متحرک تصویروں اور الکٹرانی وسائل کے پھیلاؤ کو چوتھا مواصلاتی انقلاب قرار دیتے ہیں جب کہ تین دیگر انقلابات لاکھوں سال پہلے زبانوں کی ترقی تقریباً پانچ ہزار سال قبل حروف تہجی کی تشکیل اور پندرھویں صدی میں چھاپہ خانوں کی ایجاد پر مشتمل تھے اس چوتھے انقلاب کے بارے میں مسٹر اسٹیفنس کا

کہنا ہے کہ اس سے کتابوں پر انحصار کم ہو جائے گا بلکہ حصولِ علم کا زیادہ بہتر ذریعہ اور نیا انداز فکر حاصل ہوگا۔ بالٹی مور یونی ورسٹی کے اسکول آف کمیونیکیشن ڈیزائن کے ایڈون گولڈ کے خیال میں بھی ایڈیشن کی پیش گوئی غلط نہیں تھی البتہ قبل از وقت تھی ٹیلی ویژن کے پھیلاؤ اور ان کے چینلوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ لازمی طور پر چھپے ہوئے، مواد کو پڑھنے پر صرف ہونے والے وقت اور مطالعہ کے رجحان میں کمی کا باعث بنے گا۔ اس خیال کی بازگشت تھیرس میگیو کے یہاں بھی سنائی دیتی ہے جو اسکولوں میں الیکٹرانی ٹکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال پر مضامین شائع کرنے والے رسالہ "الکٹرانک لرننگ" کی مدیرہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماضی میں امریکی اسکولوں میں معلومات بہم پہنچانے کا، اس وقت کی ٹکنالوجی کے اعتبار سے، سب سے موثر ذریعہ کتابیں تھیں۔ لیکن آج دوسرے زیادہ موثر وسائل دستیاب ہیں جن کے اسکولوں میں استعمال کی ہم حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ان میں، کمپیوٹر، ویڈیو، آڈیو کیسٹ، موڈیم، مصنوعی سیاروں کی مدد سے طویل مسافتی تدریس اور دوسرے ذرائع شامل ہیں جن کی بدولت آگے چل کر امریکی زندگی کے خدوخال بالکل بدل جائیں گے۔

الکٹرانی کلچر کے طرف دار ان تینوں افراد اسٹیفنس، گولڈ اور میگیو کے بیانات میں دو باتیں مشترک ہیں: پہلی یہ کہ تینوں امریکیوں کے رہنے جینے اور معلومات حاصل کرنے کے طریقوں میں زبردست تبدیلی کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ وہ مستقبل کی حقیقی تصویر تو پیش نہیں کر سکتے، لیکن انھیں انقلابی تبدیلیوں کی آمد کا یقین ہے۔ دوسری بات یہ کہ نئے انداز فکر اور نئے انداز خواندگی سے متعلق غیر معمولی توقعات کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ الکٹرانی کلچر کتابوں یا تحریری مواد کا مکمل صفایا نہیں کر سکتا، ہاں ان کے استعمال میں کمی لا سکتا ہے۔ یہ اعتراف لیوس جے، پیرلمین جیسے انتہا پسندوں کو بھی کرنا پڑا ہے، جنھوں نے اپنی ایک کتاب میں مطبوعہ ادب کو فرسودہ ٹکنالوجی اور حروف تہجی کو نیم فرسودہ شے قرار دیتے ہوئے امریکی اسکولوں کو ختم کرنے کی حمایت کی تھی کیونکہ نصابی کتابوں پر انحصار کرنے والے یہ اسکول گذشتہ صدی کی یادگار ہیں۔ لیکن انھیں بادل ناخواستہ یہ بھی کہنا پڑا کہ کتابیں ناپید نہیں ہوں گی۔ ان میں کچھ اہم خوبیاں ہیں اور بعض مقاصد کے لیے بہت مفید ہیں۔

محض الکٹرانی ٹکنالوجی کی ترقی اور اس کے وسیع پھیلاؤ کی بنیاد پر جو لوگ کتابوں اور تحریری روایات کے خاتمہ کی پیش گوئی کرتے ہیں ان کے لیے ایڈون گولڈ کی یہ یاد دہانی بر محل ہے کہ ایک زمانہ میں کمپیوٹروں کے فروغ کے نتیجے میں کاغذ کے استعمال سے ازادو فاتر کا تصور بھی کیا گیا تھا لیکن عملاً ہوا کیا؟ کمپیوٹروں سے جڑے پرنٹروں اور زیروکس مشینوں کے طفیل

کاغذ کا استعمال ختم ہو جانے کے بجائے کچھ اور بڑھ ہی گیا۔ مسٹر گولڈن کے اس بیان سے، جو خود کتابی کلچر کے زوال کی امید رکھتے ہیں، یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ کسی ٹکنالوجی کے پھیلاؤ کے حقیقی نتائج کا پیشگی طور پر کوئی قطعی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مطبوعہ کتابوں کی بصری و سمعی شکلوں میں منتقلی بھی مختلف پہلوؤں سے کار آمد ثابت ہوئی ہے۔ یہی معاملہ نصابی تعلیم کے لیے تیار کیے گئے کمپیوٹر سوفٹ ویر کا ہے، جن کے ذریعہ معلومات حاصل کرنے میں خاص طور پر بچوں کو دلچسپی بھی ہوتی ہے اور آسانی بھی۔ لیکن نئے وسائل کی تمام افادیت کے باوجود تحریری مواد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ایسا نہیں کہ الکٹرانی یلغار کے مقابلے میں کتابوں کو بے یار و مدد گار چھوڑ دیا گیا ہو۔ بلکہ مطالعہ کے رجحان میں کمی اور خاص طور پر نوجوانوں میں اس رجحان کے بڑھتے ہوئے اظہار سے فکر مند افراد نے علم کے بیش قیمت اور پائدار ذخیرہ کی حیثیت سے کتابوں کی اہمیت کو بر قرار رکھنے کی مختلف کوششیں کی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ۱۹۷۷ میں امریکا کی مشہور لائبریری آف کانگریس کے اس وقت کے سربراہ ڈینیل بورسٹین کے ذریعہ ایک ''کتاب مرکز'' کا قیام تھا۔ جو خاص طور پر کسی مطالعے سے دلچسپی کو فروغ دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ ایک ادارے کی حیثیت سے یہ مرکز کافی کامیاب رہا اور آج مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ۱۳۰ سے زیادہ تنظیمیں اس مرکز کے ساتھ اشتراک کرتے ہوئے تحریری مقابلوں، کتابی میلوں اور دوسرے طریقوں سے کتابوں اور قلم کے استعمال کو بڑھاوا دینے کا کام کر رہی ہیں۔ اس کام میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے بچوں اور نوجوانوں پر خاص توجہ مرکوز کی ہے جن کے لیے گرما کی تعطیل میں ریڈنگ پروگرام کے انعقاد، بچوں کے لکھنے والوں میں، تقسیم انعامات اور ان کو مختلف مضامین پڑھ کر سنانے کے لیے والدین کی حوصلہ افزائی جیسی سرگرمیاں انجام دی ہے۔

مذکورہ بالا کتاب مرکز کے ایک صلاح کار مائکل تھامسن کا کہنا ہے کہ اس مرکز کا قیام ایسے وقت میں ہوا تھا جب کمپیوٹر کی پیش رفت کو دیکھتے ہوئے عام طور پر کتابوں کا مستقبل تاریک بتایا جا رہا تھا۔ لیکن یہ رائے بڑی حد تک مبالغہ آمیزی پر مبنی تھی اور الکٹرانی وسائل کی تمام کامیابیوں کے باوجود کتابوں میں عام اندازوں سے کہیں زیادہ ثابت قدمی کی صلاحیت ہے۔ مسٹر تھامسن کے اس بیان کی تائید کتابوں سے متعلق اعداد و شمار سے بھی ہوتی ہے۔

امریکا میں جہاں الکٹرانی وسائل کا استعمال اپنے عروج پر ہے، وہیں کتابوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۹۴ میں ۱۲ لاکھ کتابیں شائع ہوئی تھیں، جن میں ۱۹۹۳

کے مقابلے میں ایک لاکھ ۴۲ ہزار سے تائیٹل تھے طباعت واشاعت کی دنیا سے متعلق حلقوں کے مطابق صرف ۱۹۹۴ میں ہی نہیں بلکہ گذشتہ ایک دہائی سے کتابوں کی اشاعت میں اضافہ کا رجحان ہے۔ اسی طرح شکاگو کی پبلک لائبریری ایسوسی ایشن کے مطابق امریکا کی نو ہزار پبلک لائبریریوں میں ۱۹۸۰ سے ۱۹۹۲ کے درمیان کتابوں کی دست گردانی میں ۸۴ فیصد اضافہ ہو۔

دوسری طرف میری لینڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر جان پی رابنسن کے جائزہ کے مطابق گذشتہ دو دہائیوں میں امریکا میں مطالعہ پر صرف کیے جانے والے مجموعی وقت میں تقریباً ۲۵ فیصد کمی آئی ہے اور ایک اوسط بالغ امریکی روزانہ نصف گھنٹے سے بھی کم وقت مطالعہ پر صرف کرتا ہے۔ تاہم اس جائزہ کی رو سے کتابوں اور رسائل کے مطالعہ کی شرح میں اضافہ ہوا ہے یہ اور بات ہے کہ یہ اضافہ اس رفتار سے نہیں ہوا ہے جس رفتار سے اخبارات کے مطالعہ میں کمی آئی ہے۔ اس طرح ایک متضاد صورت حال سامنے آتی ہے۔ جس میں ایک طرف مطالعہ کے رجحان میں کمی کے اشاریہ موجود ہیں تو دوسری طرف کتابوں کی تعداد اشاعت، فروخت اور لائبریریوں کے ذریعہ ان کی تقسیم میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ اس تناقض سے آپ کیا نتیجہ اخذ کریں گے، اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ نصف گلاس پانی کو کس طرح دیکھتے ہیں۔ آدھے بھرے ہوئے گلاس کی صورت میں یا آدھے خالی گلاس کی صورت میں۔ بہ شکریہ

(یونائیٹڈ انفارمیشن سروس)

نوبیل پرائز سیلف سروس

سیانوں سے سنا ہے کہ جس طرح کوئی شخص کسی نیک کام کی ابتدا کرے تو اس کا ثواب جاریہ اس کے کھاتے میں جاتا ہے اسی طرح بُرے کام کی ابتدا کرنے والے کے حساب میں اس بُرے کام کا "عذابِ جاریہ" بھی جاتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی دانست میں "ثوابِ جاریہ" کا اہتمام کرتا ہے مگر لوگ اسے "عذابِ جاریہ" میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ نیوٹن کی ایٹم تھیوری Atom Theory اس کی مثال ہے کہ ایٹم سے انسانی فلاح کی بجائے انسان کو نیست و نابود کرنے کا کام لیا جارہا ہے۔

راقم الحروف بھی عذاب جاریہ کی زد سے باہر نہیں کہ اس نے شاعروں ادیبوں کی تلاش اور ان کی پذیرائی کے سلسلے میں بعض چھوٹے ظروف کو اپنی محبت اور خلوص سے اتنا لبریز کر دیا کہ وہ چھلکنے لگے اور آج دنیا والے اسکے حساب میں جمع ہونے والا "عذاب جاریہ" دیکھ رہے ہیں۔

صاحبو! علماء کرام سے لفظ "بدعت" بار بار سنا۔ بدعت کی تشریحات میں اگرچہ بہت سے "چونکہ، چنانچہ اور اگر، مگر" ہیں لیکن ہماری کم علمی کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ ہر وہ کام جو حضور رسول مقبول صلعم کے زمانے میں نہیں ہوتا تھا اور بعد میں، علماء کرام کی اجازت کے بغیر، شروع ہوا "بدعت" کے فریم میں فٹ کیا جاسکتا ہے ماسوائے تراویح اور دیگر "مخصوص اعمال" کے جنہیں علماء نے جائز قرار دیدیا ہے جیسے فوٹو گرافی جو ٹیلیویژن کی لحاظ سے پہلے تک حرام تھی مگر اب علماء کرام نے اسے تبلیغ کا ذریعہ قرار دیدیا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق اعمال کا انحصار نیتوں پر ہوتا ہے اور نیت کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے ان علماء کرام کو بھی نیتوں کا علم ہوتا ہو جو دینداری یا الحاد کے فتوے جاری کر سکتے ہیں۔

یورپ میں ایک بزرگ ایسے بھی گذرے ہیں جن کی نیت سے تو ہم واقف نہیں البتہ ان کی جاری کردہ ایک "بدعت" سے ضرور واقف ہیں جسے "نوبیل پرائز" کہا جاتا ہے۔ یہ موسیو الفرڈ برنہارڈ نوبیل تھے جن کی پیدائش اکتوبر ۱۸۲۳ء میں سٹاک ہوم (سویڈن) میں ہوئی اور اٹلی کے قصبہ سان ریمو (San Rwmo) میں ۱۸۹۶ء میں انتقال ہوا۔ موصوف جاتے جاتے اپنی بے پناہ دولت اور ایک عدد وصیت چھوڑ گئے جس کی رو سے نوبیل انعامات کا سلسلہ ۱۹۰۱ء سے شروع ہوا۔

یہ انعامات طبیعات (Physics)، کیمیا (Chemistry)، علم الابدان،

(Phsiology) ادب (Literature) ، اور امن کے شعبے کام کرنے والوں کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔ معاشیات (Economics) کا انعام سویڈن کے قومی بنک کی طرف سے ۱۹۶۸ء میں شروع کیا گیا۔ معاشیات، طبیعات اور کیمیا (Chemistry) کے انعامات رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنس کے زیر اہتمام دیے جاتے ہیں۔ جب کہ فزیالوجی اور میڈیسن کے انعام کا فیصلہ کیرولائن میڈیکو چیرر جیکل انسٹی ٹیوٹ۔ Caroline Medico Chirurgical Institute کرتی ہے۔ ادب کے انعام کی ذمے داری سویڈش اکیڈمی پر ہے اور امن کے انعام کی چودھراہٹ ناروے کی پارلیمنٹ Norwegian Storting کے پاس ہے۔ انعام کی رقم گیارہ ہزار سے تیس ہزار پونڈ تک ہے۔ مختصر یہ کہ یہ انعامات مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں کرنے پر دیے جاتے ہیں جن کا فیصلہ "بڑوں" کی مذکورہ بالا "پنچایتوں" میں کیا جاتا ہے۔ سنا ہے یہ "بڑے" ان سے بھی "بڑوں" کے زیر اثر ہوتے ہیں۔

حضرت گربہ چوف کو بھی نوبیل پرائز دیا گیا غالباً اس لیے کہ نہ صرف آج کی دنیا ان کے کارناموں کی معترف ہے بلکہ آنیوالی نسلیں بھی، اگر کبھی آزادی کے خواب دیکھنے کے قابل ہوئیں تو، ان کے کارہائے نمایاں کو فراموش نہ کر سکیں گی کہ موصوف نے اہل مغرب کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ایسی گراں قدر چیز، جس کے حصول کے لیے صدیوں کی قربانیاں درکار ہوتی ہیں، طشتری (بلکہ اڑن طشتری) میں سجا کر ان کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ شاید ان کی یہی سعادت مندی، جرأت رندانہ، یا فراخدلی تھی جس کے سبب انہیں اس انعام سے نوازا گیا۔

صاحبو! سب یہی کہتے ہیں کہ جمہوریت میں فیصلے کا اختیار کثرت کو ہوتا ہے قلت کو نہیں، یہ بھی سنا تھا کہ جمہوریت میں طاقت ہوتی ہے لیکن دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ جمہوریت طاقت کے اشاروں پر رقص کرتی ہے۔ تبھی تو بوسنیا کے معاملے میں خلیج کے سارے مغربی جمہوریت کے سائے میں پلنے والے بے حس "حکمران" مغربی جمہور کے فیصلوں کو تسلیم کر رہے ہیں اس لیے کہ طاقت کی کنجی سربوں کے پاس ہے۔ طاقت اگر جمہوریت کا لباس پہن لے تو اسے خدائی اختیار مل جاتا ہے پھر طاقت چاہے تو اقوام عالم سے بھی اپنی مرضی کے فیصلے کرا سکتی ہے۔

اعلیٰ حضرت گربہ چوف جمہوریت پسند اور آزاد منش بادشاہ رہے ہیں۔ آنجہانی شخصی یا اجتماعی پابندیوں کے خلاف اور کھلے پن کے علمبردار تھے۔ مروّت اور اخلاق ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جمہوریت نوازی، امن و آزادی، کشادہ دلی، سمجھوتہ پسندی اور طاقت سے افہام و تفہیم کا اس سے زیادہ سبق آموز یا عبرت انگیز ثبوت اور کیا ہوگا کہ آنجہانی نے اپنے گھر کے دروازے اہل مغرب کے لیے کھول دئے یہاں تک کہ خود بھی فٹ پاتھ پر آگئے اور قوم کے ہاتھ میں بھی کشکول دے گئے۔ اس سعادت مندی اور صلح پسند حکمت عملی پر انہیں نوبیل پرائز نہ ملتا

ہیں ... انہیں ... ہے تو ہیں سوال کرنے والوں سے پوچھوں کہ ... کو کہتے ہیں؟

برنہارڈ نوبیل کا گھرانا ۱۸۴۲ء میں سٹاک ہوم چھوڑ کر سینٹ پیٹر برگ (روس) میں آ ... ہو گیا تھا۔ موسیو برنہارڈ امریکہ اور پیرس میں تعلیم حاصل کر کے انگریزی، فرانسیسی، جرمن سویڈش اور روسی زبانوں کا ماہر ہونے کے علاوہ ایک انجنیئر اور کیمیا ساز بن گیا تو اس نے روس ... واپس آکر اپنے والد ایمانوئیل نوبیل کے کارخانے میں کام شروع کر دیا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہ کارخانہ دیوالیہ ہو گیا اور وہ سویڈن چلا آیا۔ سویڈن میں اس نے رقیق مادے Nitro Glycerin پر تحقیقات شروع کر دی مگر جب اس کی تیاری کی منزل آئی تو پوری فیکٹری دھماکے سے اُڑ گئی جس میں برنہارڈ کا بھائی بھی مارا گیا۔

سویڈن کی حکومت نے اس حادثے سے کوئی "فائدہ" نہیں اٹھایا یعنی نہ تو ہمسایہ ممالک پر تخریب کاری کا الزام لگایا اور نہ ملک میں حزب اختلاف کے سیاستدانوں کو گرفتار کیا بلکہ صرف اتنا کیا کہ برنہاڈ کی تجربہ گاہ کو شہر سے باہر منتقل کر دیا۔ برنارڈ نوبیل پاگل سائنسدان کے طور پر مشہور ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد تجربات کے دوران برنہارڈ نوبیل پر انکشاف ہوا کہ رقیق آتش گیر مادے کو سفوف میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس طرح اس کو ڈائنامائیٹ بنانے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ ۱۸۶۷ء میں اس اہم دریافت کو انگلستان میں تسلیم کر لیا گیا، ۱۸۶۸ء میں امریکہ نے سند قبولیت دیدی اور آخر کار ۱۸۷۶ء میں اسے سب سے زیادہ طاقتور ڈائینامائٹ بنانے کا Patent (اختیار کلّی) مل گیا۔ نوبیل کے کارخانے پوری دنیا میں قائم ہوگئے جس سے اس نے بے انتہا دولت کمائی۔ اس کا خیال تھا اس ایجاد سے انسانیت کو فائدہ پہنچے گا اور پہاڑوں اور چٹانوں کو توڑ کر نہریں اور راستے نکالے جا سکیں گے۔

برنہارڈ نوبیل کو بچپن سے ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ اس نے بچپن میں کچھ نظمیں بھی لکھی تھیں۔ اس کی موت کے بعد اس کے کاغذات سے ایک ادھورے ناول کا مسودہ بھی ملا تھا۔ وہ فلاحی اداروں میں دل کھول کر چندہ دیتا تھا اور مرتے وقت اس نے اپنی ساری دولت سائنس ادب اور امن کی ترقی کے لیے وقف کر دی اور نوبیل انعامات کا سلسلہ شروع ہوا۔

انعامات کی تقسیم کے لیے الفرڈ برنہارڈ نوبیل نے واضح ہدایات چھوڑی تھیں لیکن ... ... منتقل ہونے والے بارود کو انسانیت کی فلاح سے زیادہ تخریب کے ... ... تقسیم کے ... میں ... اختلافات ...

ہیں۔ بسا اوقات تیسرے درجے کے ادیبوں کو یہ انعامات دیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مغرب کے چودھری ان انعامات پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ثبوت کے طور پر سالزے نت زن Alexander Solzay -Nitzin کا نام بھی لیا جاتا ہے جس نے روسی سماج کے خلاف تیسرے درجے کی تحریریں لکھ کر مغرب کے بڑوں کی نظر میں مقام اور انعام حاصل کیا۔ دوسرا نام ریڈیارڈ کپلنگ کا ہے۔ مزید براں جب سارتر نے یہ انعام قبول کرنے سے انکار کیا تو ان افواہوں کو اور تقویت ملی۔

اب تو یہ بات کم و بیش کلیہ بن گئی ہے کہ مشرق کی روشنی کا دیا، کسی دل میں روشن نہ سہی، اگر ٹمٹما بھی رہا ہو تو مغرب کے اجالوں کا فیض حاصل نہیں ہو سکتا۔ کئی سال سے ہندوستانی لابی کوشاں ہے کہ کسی ہندی ادیب کو یہ انعام مل جائے تاکہ ہندی بھی عالمی زبانوں میں مقام حاصل کر سکے۔ میں ذاتی طور بھی اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بھی ایسی کوششوں کے خلاف نہیں ہوں۔ ترقی پسند تحریک نے تو ہر زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ہر زبان کو اس کا حق دلانا چاہا ہے یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ہندی ادیب اگر تحریک کو فراموش کر کے صرف ہندی کے لیے کوشش کرتے ہیں تو ہمیں یہ شکایت نہیں ہوتی کہ وہ ہندی کی ترویج کیوں چاہتے ہیں بلکہ موقف کو نظر انداز کرنے کا گلہ ہوتا ہے۔

میں دوسرے لاکھوں انسانوں کی طرح ٹیگور کا مداح ہوں مگر میرے ممدوح کی کم نصیبی تھی کہ اس دور میں اعلیٰ حضرت " گربہ چوف " روشنی کا مینار نہیں تھے جو Short Cut راستہ بتا دیتے لیکن آج کے ہندی ادیبوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ان سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ ۔یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بندہ اگر زمیندار کی چوکھٹ پر بیٹھ کر چلم پیتا رہے تو شام کو سیر دو سیر چاول تو مل ہی جاتے ہیں۔ آخر امریکیوں کی چوپال سے ہی اعلیٰ حضرت " گربہ چوف " نے استفادہ کیا کہ نہیں؟

صاحبو! کسی کی کارگزاریوں پر یا تحقیقات و تصنیفات پر انعام (Award) دینا یقیناً مستحسن اقدام ہے مگر نوبیل نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ ادب پر صرف ایک انعام رکھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ساری دنیا کے ادیبوں میں سے صرف ایک کو انعام دیا جائے اور ساری زبانیں اور اسکے لکھنے والوں کو نظر انداز کر کے " کثرت " کے مقابلے میں " قلت " کو نوازا جائے۔ اب اردو کو ہی لے لیجیے۔ ملک ملک، شہر شہر، قریہ قریہ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ جنگل جنگل، صحرا صحرا شاعروں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔ نثر نگار ان کے علاوہ ہیں۔ اب اگر ان شعراء میں سے کسی ایک کو ایوارڈ دیدیا جائے تو کیا اس سے " کثرت " کی حق تلفی نہیں ہوگی؟

رسم جمہوریت کے منافی نہیں ہے؟ وہ بھی اس دور میں جہاں اگر ایک طاقتور کسی کمزور ملک کو نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کرلے تو بھی وہ اپنے ساتھ دوسرے ملکوں کو حتیٰ کہ اقوام متحدہ کو شامل کرلیتا ہے اور یہ بربادی جمہور کے نام پر کی جاتی ہے۔

نوبیل پرائز والوں کی جمہور دشمنی سے تنگ آکر برصغیر کی کچھ اکادمیوں اور اداروں نے ایک مثبت قدم اٹھایا ہے اور اپنی طرف سے کچھ ایوارڈ دینے شروع کیے ہیں لیکن انہوں نے بھی نوبیل پرائز کی نقل میں ادیبوں اور دانشوروں پر مشتمل کمیٹیاں بنائیں جو انعام کے حقدار کا انتخاب کرتی ہیں۔ ہرچند کہ ان کمیٹیوں کے اراکین کے نام نوبیل پرائز والوں کی طرح خفیہ نہیں رکھے جاتے اور نہ ہی ایسی کمیٹیوں کے اراکین چاند پر سے بلائے جاتے ہیں بلکہ وہ اپنے ہی ملک کے اکابرین ہوتے ہیں جنہیں مختلف محفلوں میں، ان کے گھروں پر ملا بھی جا سکتا ہے، انہیں محفلوں میں مہمان خصوصی بھی بنایا جا سکتا ہے، ان کے ساتھ شامیں بھی منائی جا سکتی ہیں اور راتیں بھی گزاری جا سکتی ہیں۔ یہ لوگ بامروّت ہوتے ہیں۔ انہیں سلام بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کی آنکھوں میں اتنا لحاظ بھی ہوتا ہے کہ وہ کثرت سے سلام کرنے والوں کو فراموش بھی نہ کریں مگر ہمارا جمہوری اعتراض یہ ہے کہ اردو کے تین لاکھ پچپن ہزار شاعروں کی قسمت کا فیصلہ مٹھی بھر صاحب نظر لوگوں کی کمیٹی کیوں کرے؟ ہونا تو یہ چاہئیے کہ اخبارات میں اعلان کردیا جائے کہ فلاں اکادمی یا ادارے پر بُرا وقت آیا ہے اور وہ ایوارڈ دینا چاہتا ہے جس کا فیصلہ جمہوریت کی بنیادوں پر ہوگا۔ اب جس شاعر کے حق میں زیادہ ووٹ آئیں اسے ایوارڈ دیدیا جائے۔

انصاف سے کام لیجیے ایک طرف تو علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی جیسے شعرا ہیں جو سال بھر میں مشکل سے پانچ سات مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں اور دوسری طرف طمنچہ بیگم، خنجر بانو، چھپن چھری، اور آنسہ قیامت صغرا جیسی بے مثال شاعرات جو حصول کلام سے لیکر موسیقی کی سپتک اور سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی، کی شب و روز ریہرسل کا کشٹ اٹھانے کے بعد ایک سال میں ۳۶۵ مشاعروں میں شرکت کی زحمت اٹھاتی ہیں اور "عوام" سے داد اور منتظمین سے مال وصول کرتی ہیں۔ جمہوریت کی رو سے ایوارڈ دئے جائیں تو مجروح سلطانپوری کیفی اعظمی اور سردار جعفری کی ضمانت ضبط ہو جائے۔

ایوارڈ کی لیے جمہوریت کا طریق کار اپنانے سے جہاں جمہوریت کو فروغ ہوگا وہاں شاعر اور ادیب بھی جمود سے باہر نکلیں گے۔ اور یہ جو سرپھرے ترقی پسند کہتے ہیں کہ زیادہ تر شعرا مشاہدہ نہیں کرتے، نئی جہتیں تلاش نہیں کرتے، بلکہ گھر بیٹھے ایک صدی قبل کی شاعری کی جگالی کرتے ہیں ان کا بھی منہ توڑ جواب بھی ہی ہوگا، اس لیے کہ ایوارڈ جمہوری انداز میں ملنے لگیں تو

شاعر حضرات اپنی P.R بنانے کے چکر میں، ووٹ حاصل کرنے کی خاطر، گلی، گلی، قریہ، قریہ رائے عامہ استوار کرتے نظر آئیں گے۔ ایسا کرنے سے انہیں ووٹ ملیں نہ ملیں وہ عوام سے تو ملیں گے۔ ہو سکتا ہے عوام کے دکھوں پر ان کی نظر پڑ جائے۔ عوام کے دکھوں سے ان کے رشتے استوار ہوں نہ ہوں، ووٹ حاصل کرنے کے لیئے ہی سہی، وہ عوام کی بات کرنے لگیں۔ آخر ہمارے سیاستدان بھی تو یہی کرتے ہیں، ان کا بھی تو عوام کے دکھوں سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ شاعری کے میدان میں تو پھر بھی ان شاعروں کو بھی جنہوں نے اپنی زندگی ترقی پسند تحریک کی مخالفت میں گذاری، ترقی پسند تحریک کی ادب پر گرفت اور مقبولیت سے مجبور ہو کر، فیشن کے طور پر ہی سہی بہرحال مطلق العنانی اور آمریت وغیرہ کے خلاف کچھ شعر کہنے پڑتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ شعراء اگر جمہوریت کا علم لے کر نکل پڑیں تو خود بخود ان کی شاعری میں آمریت اور مطلق العنانی کے خلاف اشعار ڈھل کر آئیں گے خواہ وہ انعامات دینے والی اکادمیوں کے خلاف ہوں۔ ایسے "بیدار" شاعروں کی توجہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس ارشاد کی طرف مبذول کرانی بھی بے جانہ ہوگی۔ اقبال کہتے ہیں؛

"بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے"

اور جب حکیم الامت کہہ رہے ہیں کہ بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے تو یہ چند اہل نظر کون ہوتے ہیں لاکھوں شعرا کو تولنے والے؟

ہمارے خیال میں وقت آگیا ہے کہ اردو کے سارے شاعر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور صاحب الرائے، مفکرین اور دانشوروں کی آراء کے محتاج ہونے کی بجائے جمہوریت کا علم بلند کردیں اور اپنے حق کی خاطر جان کی بازی لگادیں۔ پھر بھی یہ اکادمیاں نہ سدھریں تو ہر شاعر کو چاہئیے کہ حسب استطاعت دوسرے شعرا کو، امداد باہمی کے اصولوں کے تحت، اپنی طرف سے ایوارڈ دینے شروع کردے اور جواباً ہر اس شاعر سے ایوارڈ وصول کرنے شروع کردے جسے ایوارڈ دیا جائے۔ مثلاً ایک شاعر اگر بیس دوسرے شعرا کو ایوارڈ دے تو جواباً اسے بیس ایوارڈ ملیں گے۔ یوں بھی آج کے دور میں ایوارڈ دینے پر کوئی خاص رقم خرچ نہیں ہوتی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طرفین کا خرچ ایوارڈ لینے والا برداشت کرے۔ ایسا ممکن نہ ہو تو کاغذ پر لکھی ہوئی ایک سند سے بھی کام چل سکتا ہے۔ رہا سوال لفافے میں بند ایوارڈ کی رقم کا، تو یہ بات تو ایوارڈ لینے اور دینے والے کے مابین "پرائیویٹ" ہوتی ہے۔ کوئی اس لفافے کو کھول کر نہیں دیکھتا۔

حقیر، فقیر، پرتقصیر، رنجور و مہجور، عاشور کا یہ مشورہ بے بنیاد یا "غیر آزمودہ" نہیں ہے بلکہ یہ مشورہ "آزمودہ" اور یہ نسخہ "تیر بہدف" ثابت ہو چکا ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ؟

مغرب میں آباد ہمارے کچھ دوستوں نے، جو شعر تو ہماری طرح کے ہی کہتے ہیں لیکن ذہانت میں "بے جواب دار" ہیں، سکہ بند اور مستند دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو ایوارڈ دینے کے "تابڑ توڑ" دو تین اعلانات کیے تو نہ صرف یہ سارے کے سارے دانشور (یکے بد دیگرے) خوشی خوشی ایوارڈ لینے پہنچ گئے بلکہ انہیں ایوارڈ دینے والوں میں میر و یگانہ بننے کی صلاحیتیں بھی نظر آگئیں اور وطن واپس آکر جو مضامین لکھے ان میں ایسے سارے "امکانات" کا بھرپور تذکرہ کیا۔ قسم لے لیجیے جو کسی دانشور نے یہ سوچا ہو کہ یہ ایوارڈ یا انعامات کسی فرد واحد کی طرف سے ہیں یا کسی تنظیم کی طرف سے اور اس تنظیم میں کوئی فرد واحد ہی "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" ہے یا برائے نام ہی سہی، کوئی کمیٹی وغیرہ بھی ہے یا نہیں جس نے یہ صدقہ، جاریہ جاری کیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس صورت حال سے ہماری ایک غلط فہمی بھی دور ہو گئی اور ہم نے یہ سیکھا کہ انعام، بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کو دیا جائے، یہ ایک فرسودہ روایت ہے۔ اب چھوٹے بھی اپنے بڑوں کو، بشرطِ سعادت مندی، انعام سے نواز سکتے ہیں۔

صاحبو! ابھی تک اردو والوں میں کم از کم یہ تہذیب باقی ہے کہ وہ اپنے بڑوں، اپنے Seniors کا احترام کرتے ہیں لہٰذا اس سے پہلے کہ ہمارے بزرگ دانشور کسی ایوارڈ کو قبول کرنے سے پہلے ایوارڈ کی حیثیت کی چھان بین شروع کر دیں اور فرد واحد یا کمزور افراد کی طرف سے اعلان کیے گئے ایوارڈز (انعامات) کو قبول کرنے سے انکار کر کے اس سلسلے کو بند کرا دیں، ہر شاعر کو چاہیے کہ زیادہ نہیں تو کم از کم اردو کے پچاس مستند دانشوروں کے لیے ایوارڈ کا اعلان کر دے ہمارے بزرگ بہر حال اپنی رواداری کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ لوگ احسان ناشناس بھی نہیں ہیں لہٰذا اگر ان اکابرین نے ایوارڈ دینے والوں کو "جوابی ایوارڈ" نہ بھی دلوائے تو ان پر توصیفی مضامین تو ضرور لکھیں گے اور اس طرح ہر ایوارڈ دینے والے شاعر کو اگر اکابرین کے پچاس مضامین حاصل ہو گئے تو وہ خود پر لکھے گئے پچاس مضامین و قصائد پر مشتمل ایک انمول کتاب چھپوا کر مشہور بلکہ مستند شاعروں کی فہرست میں نمایاں جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ برصغیر کے شعراء اس نسخہ پر عمل کر کے شفایاب ہوں گے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی اور اہم کتابیں

تنقید اور جدید اردو تنقید — ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید میں ایک مکتب کہلاتے ہیں۔ ان کا منفرد انداز فکر و نظر اور موقف زیر نظر مجموعہ میں بھی جھلکتا ہے۔ اردو تنقید پر کام کرنے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ -/60

مشقی تدریس۔ کیوں اور کیسے؟
ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے استادوں کی ٹریننگ کے عملی پہلو کی اہمیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کے پیش نظر "مشقی تدریس" پیش کی۔ یہ کتاب آپ کے طویل تجربے، عمیق مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ -/45

دلی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی

میر امن سے شاہد احمد دہلوی تک دلی کے قلم کاروں کا جو طویل سلسلہ ہے۔ اشرف صبوحی اس کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ ان کی دلی کا مرکز لال قلعہ نہیں، شاہجہاں آباد کے عوام ہیں۔ اس میں کبابی بھی ہیں، بھٹیارے بھی، بوڑھے تکیہ دار بھی ہیں اور رنگ ریز بھی۔ دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھے ہوئے یہ دلچسپ خاکے اعلا اور جاندار نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

-/51

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں — مالک رام

مالک رام صاحب نے گذشتہ تیس برسوں میں مولانا آزاد کے بارے میں مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ -/51

جدید افسانہ اور اس کے مسائل
وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔

قیمت -/36 روپے

اپنی ہواؤں کی خوشبو — کشمیری لال ذاکر
(خاکے)

اس کتاب میں اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور اردو دوستوں کے ہلکے ہلکے نقوش ہیں۔ مکمل تصویریں نہیں۔ مگر ان خاکوں میں آپ کو نرم نرم ہواؤں کی خوشبو ملے گی۔ وہ خوشبو جس کی تمنا آپ کو برسوں سے ہوگی۔ -/36

صاحب جی سلطان جی
ڈاکٹر اسلم فرخی

اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اور سلاطین دہلی کے تعلقات کا جائزہ تاریخی بنیاد اور مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت -/20

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب
ایک تنقیدی جائزہ

پروفیسر آل احمد سرور

اس خطبے میں پروفیسر آل احمد سرور نے مجیب صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب THE INDIAN MUSLIMS کو موضوع بحث بنایا ہے۔ خطبے کے آخر میں پروفیسر موصوف نے موجودہ دور میں ہندستانی مسلمانوں کو لاحق مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور ایک لائحہ عمل کا تعین کیا ہے۔ قیمت -/8

مانگے کا اُجالا

خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے



رونمائی یا رسوائی

حالات کی ستم ظریفی سے کراچی کی ادبی و تہذیبی زندگی تقریباً ختم ہو گئی ہے، وہ تو خدا بھلا کرے سحر انصاری کا جو تھوڑی بہت ادبی چہل پہل نظر آتی ہے، انھیں کے دم سے ہے۔ وہ کتابوں اور ادیبوں کی رونمائیوں میں شرکت نہ کریں تو دنیائے ادب خانہ، بے چراغ ہو جائے۔ کراچی کی کسی تقریب کا سحر انصاری کے بغیر تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود سحر انصاری کا تصور کسی ادبی تقریب کے بغیر کیا جائے۔ خدا نے انھیں علم کے ساتھ توانائی بھی بہت دی ہے۔ کہ وہ ایک ایک دن میں کئی کئی تقریریں بھگتا دیتے ہیں۔ کچھ ہی دن ہوئے کہ انھوں نے ایک ہی دن میں ایک ہی وقت میں، تین تقریبوں میں مقرر، مہمانِ خصوصی اور صدر کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہ اس طرح کی پہلی تقریب میں سب سے پہلے تقریر کر کے دوسری تقریب میں چلے گئے اور وہاں کچھ دیر مہمانِ خصوصی بن کر بیٹھے۔ پھر یہاں سے اٹھ کر تیسری تقریب میں کرسیِ صدارت کو رونق بخشی۔ آخری تقریب میں آٹھ بجے رات تک بیٹھے رہے۔ اس سے زیادہ اس لیے نہ بیٹھ سکے کہ انھیں ٹیلی ویژن کے ایک مذاکرے میں شرکت کرنا تھی۔ اس کے بعد ریڈیو کے ایک مشاعرے میں انھوں نے اپنا کلام سنایا دوسرے روز اخبار سے معلوم ہوا کہ یہ سب مصروفیات سہ پہر کے بعد کی تھیں۔ دن میں دس بجے انھوں نے ایک اخبار کے دفتر میں ایک مذاکرے میں شرکت کی تھی اور بارہ بجے ایک مقامی کالج کے مباحثے میں منصف کے فرائض انجام دیے تھے۔

حق یہ ہے کہ سحر انصاری جیسا کوئی دوسرا مستعد، فعال اور مصروف ادیب ہم نے نہیں دیکھا، خود سحر انصاری نے بھی نہ دیکھا ہو گا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے ان کی ذات ادبی پاور ہاؤس کا درجہ رکھتی ہے کہ ان سے اہلِ ادب توانائی کا درجہ حاصل کرتے ہیں۔

سحر انصاری کو خدا نے جو مقبولیت بخشی ہے، وہ کم ادیبوں کے حصے میں آتی ہے۔

نوجوانوں ہی میں نہیں، بزرگوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ استاد
مراد آبادی نے وصیت کر رکھی ہے کہ ان کی نماز جنازہ سحر انصاری سے پڑھوائی جائے۔ ہم نے
اس کا سبب پوچھا تو استاد نے فرمایا "میں اپنی کسی کتاب کی رونمائی کا یا اپنے ساتھ شام منانے کا
قائل نہیں ہوں۔ شام غریباں کو تو آنا ہی آنا ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ شام، سحر
انصاری کی امامت میں منائی جائے" ہم نے عرض کیا۔ "انصاری صاحب صرف زندہ ادیبوں کی
تقریبات میں شرکت کرتے ہیں" فرمایا "پھر تو انھیں میری تقریب میں ضرور آنا چاہیے
کیونکہ مرنے کے بعد میرا شمار زندہ جاوید ادیبوں میں ہوگا۔"
اس کے جواب میں ہم نے استاد کو انھیں کا ایک شعر سنایا:

اس غلط فہمی پہ زندہ ہیں جناب لاغر
بعد مرنے کے انھیں یاد کرے گی دنیا

اور عرض کیا، ایک طرف تو آپ اپنے آپ کو زندہ جاوید ادیب کہتے ہیں، اور دوسری طرف
آپ کو اس میں شبہ ہے کہ مرنے کے بعد آپ کو دنیا یاد رکھے گی۔ کیا یہ دونوں باتیں ایک
دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟
فرمایا: "ہر چیز اپنی ضد سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کل مجھے کوئی یاد نہیں کرے گا'
لہذا میں اس غم کو غلط کرنے کے لیے اپنا شمار زندہ جاوید ادیبوں میں کرتا ہوں۔ اسی طرح میں
کتابوں اور ادیبوں کی رونمائیوں کے خلاف ہوں لیکن ان تقریبوں کے گل سر سبد سحر انصاری کا
دل سے قدر دان ہوں اور انھیں ادب کے حق میں ایک نعمت سمجھتا ہوں۔"

ہم نے اس کا سبب پوچھا تو استاد نے فرمایا۔ "سحر انصاری نئے لکھنے والوں کی حوصلہ
افزائی کرتے ہیں اور پرانے پاپیوں کی دلجوئی نہایت عمدگی سے کرتے ہیں۔ جس ادیب کی
تقریب میں جاتے ہیں، اس کے عظیم ہونے میں کوئی کسر رہ جاتی ہے تو اسے اپنی تقریر یا
مقالے سے پورا کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کے بارے میں کوئی سخن گسترانہ بات خود کہتے ہیں نہ کسی
دوسرے مقرر کو کہنے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ جس تقریب میں شریک نہ ہوں، وہ
تقریب تقریب رسوائی بن جاتی ہے۔ یقین نہ آئے تو قمر علی عباسی کے نئے سفر نامے "نیل
کے ساحل" کی جو تقریب ہوئی تھی، اس کی روداد پڑھ لیجیے۔"

یہ کہہ کر استاد نے ایک اخباروں کے پلندے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا، یہ اخبارات
لے جایئے اور قمر علی عباسی کے صبر و تحمل کی داد دیجیے کہ وہ کیا سننے کی توقع رکھتے تھے اور انھیں
کیا کچھ سننا پڑا۔

ہم نے جلسے کی روداد پڑھی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ہمیں یقین نہ آیا کہ کوئی شخص فائیو اسٹار ہوٹل کے بھاری اخراجات برداشت کر کے وہ کچھ سن سکتا ہے جسے سننے کے لیے گرہ سے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تقریب کے ہر مقرر نے قمر علی عباسی کے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کہی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تمام مقرر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق صاحب تقریب کی فن کتاب سازی سے دلچسپی کو تاراج کرنے کے لیے آئے ہیں لو تو اور ڈاکٹر اسلم فرخی جیسے مرنجاں مرنج عالم نے بھی فرمایا کہ عباسی کے سفرنامے پڑھنے والا جہاندیدہ بن جاتا ہے۔ اس جملے کا مطلب سمجھنے کے لیے چونکہ ایک خاص حد سے زیادہ پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اس لیے تقریب رونمائی کے پورے مجمع میں، بشمول جناب صدر کوئی بھی ڈاکٹر اسلم فرخی کی ژرف نگاہی کی داد نہ دے سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے گلستان سعدی کی ایک حکایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ حکایت اس زمانے کی ہے جب دربار شاہی میں سیدوں حاجیوں اور شاعروں کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ ایک شخص نے جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا اپنے آپ کو بیک وقت، حاجی اور شاعر کی حیثیت سے مشہور کر کے دربار شاہی تک رسائی حاصل کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص سیاح تو ہے لیکن سیّد، حاجی اور شاعر نہیں ہے۔ دربار میں اس نے جو قصیدہ پڑھا تھا، وہ بھی کسی اور شاعر کے دیوان سے اڑایا تھا۔ بادشاہ نے سزا دینے کے لیے اس سیاح روسیا کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اس سے کہا اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو۔ اس نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

اگر راست می خواہی از من شنو
جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر سچی بات سننا چاہتے ہو تو مجھ سے سنو، جس نے دنیا دیکھی ہوئی ہے وہ جھوٹ زیادہ بولتا ہے۔ بادشاہ یہ سن کر ہنسا اور کہا، چونکہ اس شخص نے زندگی میں پہلی بار سچ بولا ہے، اس لیے میں اسے معاف کرتا ہوں۔

اس حکایت کو ذہن میں رکھا جائے تو ڈاکٹر اسلم فرخی کے جملے کی معنویت واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی انھوں نے یہ فرمایا، سفرنامہ نگار تو جہاں دیدہ تھا ہی، اس کے سفرنامے پڑھنے والے بھی جہاں دیدہ بن جاتے ہیں۔

محمود شام نے عجیب بات کہی کہ قمر علی عباسی ہر سال دوبار مختلف ممالک کا سفر کرتے ہیں اور ہر چھے ماہ بعد ایک سفرنامے کی تقریب رونمائی منعقد کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ اپنا اصل کام چھوڑ کر یہ کام کیسے کرتے ہیں اور سال میں دو مرتبہ عالمی سفر کی اجازت انھیں کیسے ملـ

جاتی ہے۔

محمود شام کا اشارہ اس طرف ہے کہ عباسی ایک ذمے دار سرکاری افسر ہیں' جب وہ سال میں چھے مہینے سفر کریں گے اور باقی چھے مہینے سفر نامہ لکھیں گے تو سرکاری فرائض کس طرح انجام دیں گے؟ محمود شام کا یہ اعتراض ان جیسے تجربہ کار اور باخبر صحافی کے شایانِ شان نہیں ہے۔ قمر علی عباسی بہر حال ان سرکاری عمال سے بدرجہا بہتر ہیں جو اپنا اصل کام بھی نہیں کرتے اور کسی بے اصل کام میں مصروف بھی نہیں رہتے۔ عباسی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ کم از کم سفر کرنے اور سفر نامے لکھنے میں تو اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں۔

محمود شام نے اس پر بھی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ عباسی کو سال میں دو مرتبہ عالمی سفر کرنے کی اجازت کیسے مل جاتی ہے ہمیں اس پر تعجب نہیں' البتہ ،اس پر تعجب ہے کہ سفر نامہ لکھنے کی اجازت کون دیتا ہے۔ باز پرس اسی شخص سے ہونی چاہیے۔ عباسی بے قصور ہیں کیونکہ وہ عادت سے مجبور ہو کر سفر نامے لکھتے ہیں۔

پی آئی اے کے سربراہ ایئر وائس مارشل فاروق عمر نے اپنی تقریر میں کہا' عباسی کا سفر نامہ چونکہ مصر کے بارے میں ہے' اس لیے اگر وہ اس کی تقریب رونمائی اہرام مصر کے قریب منعقد کروانا چاہیں تو انھیں اور ان کی اہلیہ کو پی آئی اے کی طرف سے سہولت مہیا کی جا سکتی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ پی آئی اے مصنف اور ان کی اہلیہ کو سفری سہولت مہیا کرے گا مگر یہ دونوں وہاں اکیلے جا کر ایک دوسرے کی رونمائی تو کر سکتے ہیں' کتاب کی رونمائی کیسے کریں گے۔ اس کارِ خیر کے لیے کچھ مقررین اور سامعین کی بھی ضرورت ہو گی۔ پی آئی اے کو چاہیے کہ اس مقصد کے لیے پورا ایک جہاز مہیا کرے تاکہ عباسی کے ساتھ ان کے ہم جیسے قدردان بھی اہرام مصر دیکھ سکیں۔ اگر پی آئی اے نے یہ تجویز منظور کر لی تو پھر ہم مصنف سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے ساتوں سفر ناموں کے تمام اڈیشن بھی ساتھ لے چلیں تاکہ تقریب رونمائی کی یادگار کے طور پر پتھر کے اہرام کے بالمقابل سفر ناموں کا اہرام بھی تعمیر کیا جا سکے۔ آیندہ زمانوں کے سیاح یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ بیسویں صدی کے آخر میں کتابوں سے وہی کام لیا جاتا تھا جو دو ہزار نو سو سال قبل مسیح میں پتھروں سے لیا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ قابلِ اعتراض تقریر' صدر تقریب حسین حقانی کی تھی۔ انھوں نے چھوٹتے ہی فرمایا' اس تقریب میں ہر شخص کو کسی نہ کسی مقصد کے پیش نظر مدعو کیا گیا ہے۔ پی آئی اے کے سربراہ کو اس لیے بلایا گیا ہے کہ صاحب تقریب کو اگلے سفر کے لیے مفت ٹکٹ مل جائے۔ مجھے اس لیے بلایا ہے کہ میں اطلاعات و نشریات کا وفاقی سیکریٹری ہوں۔۔ میری وجہ

سے ٹی وی پر تقریب رونمائی کی کوریج بہترین ہوگی۔
ٹی وی تو ہم نہیں دیکھتے البتہ اخبارات کی حد تک ہم گواہی دیں گے کہ آج تک کسی کتاب کی تقریب رونمائی کی خبریں اور تصویریں اس اہتمام سے شائع نہیں ہوئیں۔ مسلسل تین روز تک یہ خبریں اور تصویریں یوں چھپتی رہی ہیں جیسے جرائم کی تصویریں اور خبریں چھپتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جنگ جیسا اخبار جو اپنے بانی کی برسی کی خبر کو سوئم اور چہلم کی عام خبروں سے زیادہ جگہ نہیں دیتا، اس نے بھی اطلاعات ونشریات کے وفاقی سیکریٹری کو خوش کرنے کے لیے اس تقریب کی دو کالمی روداد ۴۶ سینٹی میٹر جگہ میں چھاپی ہے۔
حسین حقانی نے اپنے فرائض منصبی کے برعکس اپنی تقریر میں سچ بولنے کی جرات مندانہ کوشش کی ہے۔ لیکن سچ اتنا ہی اچھا لگتا ہے جتنا آٹے میں نمک۔ حقانی صاحب کی تقریر میں نمک ہی نمک نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں "ایک زمانہ تھا کہ کتابیں پڑھنے کے لیے لکھی جاتی تھیں، لیکن اب تقاریب کی رونمائی کے لیے لکھی جاتی ہیں۔" حقانی صاحب کا اشارہ شاید اس کتاب کی طرف ہے جو صدر ضیاالحق کے خلاف لکھی گئی تھی اور پچھلے دنوں جس کی تقریب رونمائی کی صدارت وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کی تھی۔ قمر علی عباسی بہرحال پڑھنے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ حقانی صاحب نے اپنی تقریر میں اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے عباسی کے ساتوں سفرنامے پڑھے ہیں۔ اس سے ضمنی طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ حقانی صاحب خاصے وسیع المطالعہ ہیں اور ایسی کتابیں بھی پڑھ لیتے ہیں جنھیں چھپنے کے بعد خود مصنف بھی نہیں پڑھتا کیوں کے بعض مصنفوں کا لکھنے کا نہ سہی پڑھنے کا معیار خاصا بلند ہے۔
حقانی صاحب نے یہ بھی کہا "ہر سفرنامے میں عباسی کا فوکس ایک یا کئی حسینائیں ہوتی ہیں جو ان کو خوش آمدید یا خدا حافظ کہتی ہیں۔ اور وہ ان کے اصرار کے باوجود ہوٹل میں اپنے کمرے کا نمبر نہیں بتاتے۔ پتا نہیں وہ اپنے اس مشن میں کیسے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اٹھارہ سال کی عمر سے اب تک حالت سفر میں ہوں لیکن کبھی کسی حسینہ سے واسطہ نہیں پڑا۔"
حقانی صاحب نے صرف سفر کیے ہیں اس لیے حسیناؤں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی انھیں چاہیے کہ وہ بھی سفرنامہ لکھیں۔ سفرنامہ لکھنے کے دوران یہ مخلوق قدم قدم پر دامن گیر ہوگی کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔۔ اگر یہ حسینائیں ہوٹل کے کمرے کا نمبر پوچھیں تو حقانی صاحب انکار نہ کریں۔ اگر ہر پاکستانی عباسی کی طرح انھیں مایوس کرتا رہا تو یہ حسینائیں پاکستان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کریں گی۔ اس لیے گزارش ہے کہ اپنے کمرے کا نہ سہی، عباسی کے کمرے کا نمبر بتا کر ان بے چاریوں کو نامرادانہ زیست کرنے سے بچا لیا جائے۔

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل
سندیلہ، یو۔پی

غزل

چال چلنا ہے تو پھر بہتر چلو
پھینکنا خنجر ہے وہ تم مر چلو

شامِ غربت مجھ سے کہتی روز ہے
یاد کرتا ہے تمھیں اب گھر چلو

بنکیاں قدرت کو دیکھو بے نقاب
شیخ جی حجرے سے اب باہر چلو

ذہنِ خوابیدہ کو تازہ فکر دو
پھینک کر اس جھیل میں پتھر چلو

میکدہ بھی ہے فرازِ دار بھی
جس طرف جانا ہو تم بڑھ کر چلو

ہے حرم کہ دور منزل دوستو
کیوں نہ لے کر بادہ و ساغر چلو

گھر یہ شیشے کے فریبِ آرزو
ان کی جانب لے کے تم پتھر چلو

مختلف اوروں سے ہے منزل تری
راہ اپنی سب سے کترا کر چلو

تا بہ کے یہ بے حسی اور یہ جمود
اب اٹھو اور لے کے اک محشر چلو

احسن رضوی جونپوری
بھادی، شاہ گنج
جونپور۔ یو۔پی

غزل

کچھ اس طرح سے ہم اس زندگی کے ساتھ چلے
کہ جس طرح سے کوئی اجنبی کے ساتھ چلے

پہنچ سکا نہ مگر کوئی میرے ہونٹوں تک
سمندر اتنے مری تشنگی کے ساتھ چلے

وہ جن کو شکوہ تھا ہر اک سے بے وفائی کا
رہِ وفا میں وہ شرمندگی کے ساتھ چلے

نہ جانے آج یہ کیا تھا کہ ہم ترے ہمراہ!
زباں ہوتے ہوئے خامشی کے ساتھ چلے

ہر اک نظر سے بچا کر ہم اپنے سینے میں
متاعِ درد لیے خامشی کے ساتھ چلے

تجھے بھی راہ میں مل جائے ہم سفر کوئی
یہی دعا ہے کہ تو بھی کسی کے ساتھ چلے

غزلیں

مختار شمیم
ایف ۲، گرلز کالج کیمپس
موتی طویلہ، اندور

دشت و صحرا میں بھی اذاں دی ہے
تجھ کو آواز بے گماں دی ہے

سوچتے ہیں تجھی کو جانِ من!
اس سخن پر تو ہم نے جاں دی ہے

پتھروں میں گلاب کھلتے ہیں
یوں بھی احساس کو زباں دی ہے

پہلے خود کو نشانہ پر رکھا
پھر اسے تیغ اور سناں دی ہے

جب ملیں گے تو ٹوٹ جائیں گے
یہ قسم اس نے درمیاں دی ہے

آشا پربھات
سیتامڑھی، بہار

بھولے سے بھی دان نہ لے
انساں کا احسان نہ لے

راز مرا تو جان نہ لے
مجھ سے میری پہچان نہ لے

مومن سودا تک ہے ٹھیک
غالب کا دیوان نہ لے

دیپ جلا ہر رستے پر
اور کوئی طوفان نہ لے

آشا تیری ہر اک بات
وہ چپکے سے مان نہ لے

غزلیں

قیصر الجعفری
۴۴ب/بی۔ تنور باغ۔ کوسہ
ضلع تھانہ۔ مہاراشٹر

تیشہ تو چلاتے ہیں مگر بے ہنری سے
شکوہ ہے مجھے یاروں کی اس کم نظری سے

آنکھوں کا دھواں پونچھ کے دیکھو مرا چہرا
تصویر کو رسوا نہ کرو بے بصری سے

نادیدہ ہواؤں سے چراغوں کو بچاؤ
شب خون نہ پڑ جائے کہیں بے خبری سے

پرچھائیں مری آگ کو کیا برف نظر لوگ
جل جاتا ہے کاغذ مری شعلہ اثری سے

الہام کا ٹکڑا ہے مرا حرفِ حقیقت
رشتہ ہے مرے نطق کا پیغام بری سے

میں خاک اڑاؤں کہ عزیزوں کو دعا دوں
اک شہر پریشاں ہے مری در بدری سے

کانٹوں کی قبا پر یہ لہو کون چھڑکتا؟
تازہ ہے بیاباں مری آشفتہ سری سے

آہنگِ یقیں اور ہے شوغائے گماں اور
چھت تو ہے گر جائیگی کیا نوحہ گری سے؟

قیصر! مری آواز ہے فردا کا اجالا
پھوٹے ہے بشارت چراغِ سحری سے

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی
۷۰ ام ،اردو بازار
دہلی ۶

دل کی شکستگی کا سماں کچھ نہ پوچھیے
ان کی عنایتوں کا بیاں کچھ نہ پوچھیے

کب سے یہ جل رہا تھا مکاں کچھ نہ پوچھیے
اب کیوں اٹھا ہے دل سے دھواں کچھ نہ پوچھیے

باہم عداوتوں نے سبک کر دیا ہمیں
کیسے تھے ہم بھی کوہِ گراں کچھ نہ پوچھیے

ارزاں ہے کتنا خونِ بشر آج کل یہاں
جنسِ وفا ہے کتنی گراں کچھ نہ پوچھیے

دیکھا کسی نے ہنس کے سرِ بزم جب ہمیں
کیا کیا ہوئے نہ اُن کو گماں کچھ نہ پوچھیے

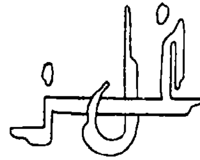
آئے گی اب بہار چمن میں تو ہم کو کیا
گزرا ہے کیسے دورِ خزاں کچھ نہ پوچھیے

جو دل کہ بے نیازِ غمِ دہر تھا کبھی
کیا ہو گیا وہ دارِ اماں کچھ نہ پوچھیے

وہ رحمتِ تمام ہے اس کا تو ہے یقیں
گزری ہے کیسے زیست یہاں کچھ نہ پوچھیے

اپنوں کے زخم کھا کے بھی قاسم ہنسا کیا
یارو! یہی ہے رنگِ جہاں کچھ نہ پوچھیے

نسیم سامانی
خونی پور، گورکھپور
یو۔پی



جشنِ شب تو ہو چکا رنگِ سحر دیکھے گا کون
وقت کے سیلاب کا زیر و زبر دیکھے گا کون

اپنے ہی گلشن میں سب محوِ خرامِ ناز ہیں
لالۂ صحرا ترا زخمِ جگر دیکھے گا کون

میں ہوں جو ہر شب جلاتا ہوں امیدوں کے چراغ
جانے والے راہ تیری عمر بھر دیکھے گا کون

کوئی دروازہ کوئی در ہو تو پڑ جائے نظر
راکھ کا اک ڈھیر ہو جو اب وہ گھر دیکھے گا کون

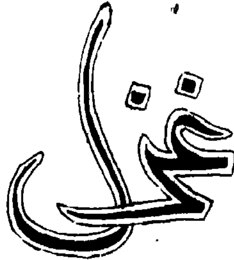
سچ تو یہ بھی ہے کہ جلتے ہیں چراغوں سے چراغ
دوستو لیکن چراغوں کا سفر دیکھے گا کون

سب کی ہو گی ان کی دستارِ فضیلت پر نظر
شہر یاروں کا بھلا دامانِ تر دیکھے گا کون

جشن میں ساری یزیدی سلطنت کھو جائے گی
وقت کے نیزے پہ دیوانے کا سر دیکھے گا کون

اے نسیم اب خونِ دل کی قدر ہوتی ہی نہیں
سب یہاں فنکار ہیں تیرا ہنر دیکھے گا کون

راز اعظمی
اڈیٹر "نئے زاویے"، ویکلی
سبز پوش ہاؤس، جعفرا بازار، گورکھپور، یو۔پی



بے رخی اچھی لگی، اور برہمی اچھی لگی
آپ جب دشمن ہوئے تو دشمنی اچھی لگی

دوسروں کے غم میں جس نے کاٹ دی کُل زندگی
مجھ کو دنیا میں اسی کی زندگی اچھی لگی

التفاتِ ناز میں شامل تغافل کا ہے رنگ
میرے دل کو یہ ادا بھی آپ کی اچھی لگی

کارواں تو آپ ہی کی رہبری میں لٹ گیا
آپ کی اس رہبری سے رہزنی اچھی لگی

خود جبینِ شوق اس کے آستاں پہ جھک گئی
تھی خلوصِ دل سے جو وہ بندگی اچھی لگی

میں تو ہوں درویش اس کا جو ہے رب العلمین
اس فقیری میں مجھے شاہنشہی اچھی لگی

رنج و غم، دکھ درد سے آراستہ اسلوب ہیں
راز صاحب آپ کی یہ شاعری اچھی لگی

نازقادری
مہدی حسن روڈ
مظفرپور۔ بہار

پروفیسر کلیم ضیاء
پلاٹ نمبر ۲۲/ ۵ ۹
شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی

غزلیں

سچ تو یہ ہے میرے ہی اوپر چلے
اس طرف سے جتنے بھی پتھر چلے
ریزہ ریزہ ہو گیا ہر ایک شخص
اتنے پتھر شہر کے اندر چلے
ہو رہی ہیں پتھروں کی بارشیں
تم کہاں یہ آئینہ لے کر چلے
لالہ و گل کے پیالے میں لہو
زرد موسم میں یہی ساغر چلے
جب ترا رستہ ہوا مجھ سے جدا
ساتھ میرے پاس کے لشکر چلے
دوستوں کے ساتھ مل کر ہنس لیے
اور اداسی دل میں لے کر گھر چلے
ہائے رے یہ سانحہ کیسا ہوا
کارواں سے لٹ کے اک رہبر چلے
ہو رہی ہے یوں بسر اب زندگی
خواب میں جیسے کوئی پیکر چلے
لمحۂ رفتہ کی یاد آئی جو نازؔ
کیا کہوں دل پر کئی نشتر چلے

حادثے گشت میں رہتے ہیں قضا کی صورت
کتنی محدود ہے دنیا میں بقا کی صورت
قصۂ صبر و رضا اس کو سناؤ جاکر
جس نے دیکھی نہ ہو ارباب وفا کی صورت
زخم بھر جائیں گے پل بھر میں یقیں ہے مجھ کو
وہ جو آ جائیں ذرا دیر دوا کی صورت
آ کے بیٹھے بھی نہیں ٹھیک سے اور چل دیے
جب بھی آتے ہو تو آتے ہو ہوا کی صورت
زندگی کیوں نہ تجھے غرقِ سمندر کر دوں
میں نے کاٹا ہے بہت تجھ کو سزا کی صورت
فاصلے اور بھی بڑھ جائیں محبت میں اگر
صاف آئے گی نظر پھر تو قضا کی صورت
تو جو بولے تو اتر جائے مجسم دل میں
کسی تاثیر سے بھرپور دعا کی صورت
حادثہ پھر تو نہیں کوئی فلک ساز ہوا
اتری اتری سی ہے کیوں آج ضیا کی صورت

غزلیں

اخلاق سہسوانی
سہسوان۔ ضلع بدایوں

ہم نے اے مصلحتِ وقت یہ لغزش کی ہے
یعنی دانستہ لٹیروں کی ستایش کی ہے

موت کے منہ سے بچا لایا ہوں اکثر جس کو
سنتا ہوں اس نے مرے قتل کی سازش کی ہے

تیری خوشیوں میں سما جائے کسی طرح الم
تیرے ہمسائے نے اس بات کی کوشش کی ہے

تھے یہاں لوگ سبھی امن و اخوت کے امیں
شہر میں کس نے یہ پھر خون کی بارش کی ہے

شک ہے لوگوں کو وفاؤں پہ ہماری پھر بھی
اے وطن جبکہ تری ہم نے پرستش کی ہے

لب کشائی کی اجازت تو ملی ہے مجھ کو
یہ الگ بات کہ حق گوئی پہ بندش کی ہے

کچھ نہ صیاد کرے اور نہ بجلی اخلاق
بات تو ساری گل و خار کی رنجش کی ہے

ضیاء جبل پوری
کاماریڈی

زندگی کے باغی کو پھر امان دے دی ہے
مصلحت کی چوکھٹ پر دل نے جان دے دی ہے

ہم سیاہ خاموں کو بے زبان کشتوں کو
دور کے مصائب نے خود زباں دے دی ہے

ذکر قامت و قد کا ان کے روبرو کر کے
اہلِ علم و دانش کو ہم نے شان دے دی ہے

جوہرِ شرافت نے اور حیلے کے زیور نے
اک دکن کی بیٹی کو آن بان دے دی ہے

اڑتے اڑتے ہولے سے تیر دل پہ پھینکے گا
اس شریر بچے کو کیوں کمان دے دی ہے

وقت کے پروں اُڑ کر چاند پر ضیاء پہنچے
دشتِ نارسائی میں جا اذاں دے دی ہے

غزلیں

رؤف خیر
بیت الخیر
رسالہ بازار، گولکنڈہ

شعر کہنا اگر آجائے تو مصرع کرنا
آتے آتے تمہیں آجائے گا مطلع کہنا

بے ریاضت کوئی پہچان کہیں بنتی ہے
شعر کہنا ہی اگر ہے تو مرصّع کہنا

بس یہی سوچ کے ہر خط سے بڑا خط کھینچو
نامناسب ہے مثلث کو مربع کہنا

کیا پٹاری سے نکلتا ہے تماشا آخر
کیوں مداری نے لگا رکھا ہے مجمع کہنا

بے محل ہو تو بھلی بات بُری لگتی ہے
وہ تو سُنتا ہے مگر دیکھ کے موقع کہنا

اس کے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے
اور کیا اس سے زیادہ ہو منافع کہنا

کوئی بازی ہو لگا دینا ہے جاں کی بازی
کوئی موقع ہو اسے آخری موقع کہنا

اب کوئی راز ہو سربستہ نہیں رہ سکتا
کیمرہ بن کے خلاؤں میں ہے مطلع کہنا

علمیت اوڑھ کے پھرتی ہے جہالت کیا کیا
خیر اُترے گا نہ کب تک یہ ملمع کہنا

قیوم کنول
مقیم کی چال، گومتی پور
احمد آباد

وفا کے راستے میں جو دغا نہیں دیتا
مرا ضمیر اُسے بد دعا نہیں دیتا

وہیں پہ جاتا ہے جس گھر سے آس ہوتی ہے
ہر ایک در پہ بھکاری صدا نہیں دیتا

نہ جانے کون سا ہے راز جو چھپاتا ہے
وہ اپنے گھر کا کسی کو پتا نہیں دیتا

چلو خلوص سے ہم اُس کے لب ہلا آئیں
بہت دنوں سے وہ ہم کو دعا نہیں دیتا

جو بے گناہوں پہ کرتا ہے بے شمار ستم
مرے خدا۔ تو اسے کیوں سزا نہیں دیتا

میں آب ہوں اگر ہوتیں نہ طاقتیں مجھ میں
کبھی پہاڑ مجھے راستہ نہیں دیتا

جو بھوک پیاس کی انگنائیوں میں رہتا ہے
اُسے بہار کا موسم مزا نہیں دیتا

وہ آسمان پہ رہتا ہے پر زمیں کی طرح
کنول یہ وصف ہر اک کو خدا نہیں دیتا

ضمیر ساجد
مومن پورہ۔ اکولہ



تم نے تو اپنا قول بھی پورا نہیں کیا
یہ اور بات ہم نے تقاضا نہیں کیا

تم اس کے جھوٹ کو بھی سمجھنے لگے ہو سچ
افسوس میرے سچ پہ بھروسا نہیں کیا

اس نے بھی جنگ بندی کا اعلان کر دیا
اپنی طرف سے ہم نے بھی حملہ نہیں کیا

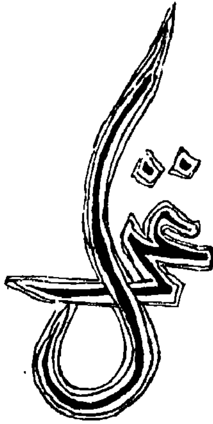
احساسِ کمتری نہ پڑوسی کو ہو کہیں
یہ سوچ کر مکان کو اونچا نہیں کیا

کرفیو میں گزار چکا جب وہ چار دن
پھر اس نے قید کوئی پرندہ نہیں کیا

تھی جس میں دوستوں کے ہر اک فعل پر بحث
ہم نے اسی کتاب کا اجرا نہیں کیا

پھر اس کے دشمنوں کی بھی تعداد بڑھ گئی
ساجدؔ نے جب ضمیر کا سودا نہیں کیا

فیاض افسوس
پارسی ٹاکلی، اکولہ



تھی حُسن کی ڈھیر سی جو دولت تو کچھ ہمارا خیال کرتے
لٹا رہے تھے جو تم محبّت تو کچھ ہمارا خیال کرتے

تمھیں خبر تھی کہ روز و شب ہم تمھارے در پہ پڑے ہوئے ہیں
ذرا بھی ہوتی اگر شرافت تو کچھ ہمارا خیال کرتے

کیا دھرا ہے ہمارا خود ہی، تو کرتے بیگم سے کیا شکایت
جو ملتی بچوں سے ان کو فرصت تو کچھ ہمارا خیال کرتے

ہمارے استادِ محترم کچھ کلام ہم کو بھی دے کے جاتے
تھی اتنی جلدی برائے رحلت تو کچھ ہمارا خیال کرتے

تمام عاشق اَڑے ہوئے تھے اور آپ چھت پر کھڑے ہوئے تھے
جو دے رہے تھے سبھی کو دعوت تو کچھ ہمارا خیال کرتے

ہم آئے اپنے کرایے سے بھی، گئے ہم افسوس چائے سے بھی
سخن میں درکار تھی حرارت، تو کچھ ہمارا خیال کرتے

رام پرکاش کپور
۸۱۷۔ایم۔آئی جی پدم نابھ پور
درگ ۴۹۱۰۰۱(مدھیہ پردیش)

مطالعۂ اقبال

فروری 1996 کے "کتاب نما" میں، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب کا اشاریہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ بلکہ ذہنی کوفت ہوئی آج کل علامہ اقبال کے خلاف لکھنے اور ان پر تقسیم ملک اور اس کے نتائج کی ذمے داری ڈالنے کے ساتھ ساتھ اُن پر مسلم بنیاد پرستی کو ہوا دینے اور اپنے عہد کے مذموم سیاست میں گرفتار ہونے، مذہبی فرقہ پروری اور علاحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی حمایت کا الزام لگانے کا چلن کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں مولانا وحیدالدین صاحب نے بھی اردو بلٹز میں "مطالعۂ اقبال۔ غلطی کہاں ہے؟" کے عنوان سے ایک بحث کا آغاز کرتے ہوئے اپنے مضمون میں علامہ اقبال پر یہی الزام لگائے ہیں۔ اور اب پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن صاحب نے بھی یہی کیا ہے۔

ایک طرف تو پروفیسر صاحب ہندستان کی گذشتہ ہزاروں سال کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب اور "سرمایہ علم ودانش" کے لیے بیسویں صدی کے کچھ رجحانات سے خطرہ کے بارے میں لکھتے ہوئے اقبال کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں :۔

"۔۔۔اس مقام پر پہنچ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہماری تہذیب زندگی کے ایوان میں گذشتہ ہزارہا برسوں میں فروزاں چراغ عرفان وہدایت اور حکمت ومعرفت کی جھلملاتی ہوئی لَو وقت کی ان تیز آندھیوں میں ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی تاہم وقت اور تاریخ کے اس موڑ پر مدبّروں اور دردمندوں نے آگے بڑھ کر اس گھپ اندھیرے اور غم ناک فضا میں اپنی دانش نورانی سے کچھ اجالا کرنے کی کوشش کی ان میں علامہ اقبال کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

لیکن دوسری طرف مضمون کے آخر میں اقبال کے 1930ء کے مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس میں خطبۂ صدارت کا out of context حوالہ دیتے ہوئے اپنے انہی جذبات کی نفی کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں :۔

"ملک کی تقسیم کا یہ وہ خاکہ ہے جو اقبال نے واقعی تقسیم ملک سے پہلے تقریباً 15 سال

ا پیش کیا تھا۔ البتہ جو اقبال جیسے بالغِ نظر اور صاحبِ بصیرت انسان نے دیدہ دانستہ نظر انداز
ی تھی یا جسے دیکھنے دکھانے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی وہ اس کثیر ملک میں سیکڑوں برس
ے رہنے بسنے والے دوسرے علاقوں کے لاکھوں کروڑوں مسلمان تھے جو اپنے اجداد کی
زمین کو عقیدت و محبت کے سبب چھوڑ کر نئے "جہانِ مسلم" میں جلاوطنی کے لیے آمادہ نہ
ے۔ اور نئی پاک اور محفوظ سرزمین میں سکونت اختیار کرنے والے مسلمانوں نے "اغیار" کی سر
ن پر چھوٹ جانے والے اپنے ان دینی بھائیوں کے بارے میں کچھ سوچا تھا۔ شاید نہیں۔ اس
وجہ صاف ہے کہ اس پوری سیاسی کشمکش میں انسانیت کی مجموعی بقا اور سلامتی محض ایک ثانوی
ز تھی۔ اصلی اور بنیادی چیز تو وہ سیاسی اور مادّی مفادات تھے جو معصوم انسانوں کے مذہبی
ذبات کو برانگیختہ کر کے حاصل کیے گئے البتہ اس کے عواقب کس قدر دوررَس تھے، اس کے
ضمرات کس قدر اندوہناک تھے اور اس ظالمانہ کارروائی کے نتیجے میں پورے برصغیر میں
سانیت کس طرح لہو میں غلطاں ہوئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اگر ہمارے شاعرِ مشرق کو خواب
بں بھی اس کا خیال آگیا ہوتا تو صرف سیدھی سیدھی شاعری کرتے۔ اپنے عہد کی مغموم
یاست میں گرفتار ہونے، مذہبی فرقہ پروری اور علاحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی
مایت کے سبب زندگی کا جو نقشا بنا شاید وہ آج قدرے مختلف ہوتا۔"

علامہ اقبال پر یہ الزامات اور خاص طور پر "مذہبی فرقہ پروری اور علاحدگی پسندی کی حامل مجنونانہ قوتوں کی حمایت" کا الزام سراسر بےبنیاد، گمراہ کُن اور بہتان ہے۔ مولانا وحید الدین نے بھی اپنے مضمون میں لکھا ہے :۔

"پاکستان کے نام پر برصغیر میں جو دھواں دھار تحریک اٹھی وہ براہِ راست اقبال کی دین تھی۔ یہ اقبال ہی کے افکار تھے جنھوں نے مسلمانانِ ہند کے اندر پاکستان کے حق میں جوش و خروش پیدا کیا۔۔۔۔"

"اقبال کے تمام پرستار خاص طور پر پاکستان کے تمام علما و دانشور فخر کے ساتھ دعوا کرتے ہیں کہ اقبال پاکستان کے حقیقی بانی ہیں۔" "اقبال کے تمام معتقدین کا متفقہ طور پر یہ دعوا ہے۔ کہ پاکستان کی تحریک میں جان ڈالنے والی شخصیت صرف علامہ اقبال کی تھی۔" مولانا نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اس کے علاوہ بے شمار لوگ ہیں جو اقبال کے پُرجوش کلام کو پڑھ کر "مجاہد" بن گئے۔ مثلاً کشمیر کے مسلمان 1989ء سے بزعمِ خود جس خونی جہاد میں شامل ہیں اس کی تحریک انھیں اقبال ہی کے کلام سے ملی ہے۔"

پاکستان کا حکمران طبقہ اور میڈیا تو تقسیم کے وقت سے ہی اپنے سیاسی مُفاد کی خاطر یا کسی

اور مصلحت کی بنا پر اقبال کو پاکستان کے ابتدائی تصور کے موجد، حصول پاکستان کی تحریک کے مجاہد اور قیام پاکستان کے ذمے دار کے طور پر خراج تحسین و عقیدت پیش کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہندستان میں ماہرین اقبالیات اور ادیب و دانشور اس نقطہ نظر کے خلاف رہے ہیں۔ لیکن حال ہی میں کچھ ادیبوں اور دانش وروں کے اس نقطہ نظر کی تائید میں مضامین پڑھنے کو ملے ہیں۔ موجودہ ماحول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کبھی کبھی تو یہ خیال بھی آتا ہے کہ یہ سب غیر شعوری طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ جان بوجھ کر کسی اسکیم کے تحت علامہ اقبال کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ لیکن کسی کی نیت پر شک کرنا یا کسی کے Bona fides پر شک کرنا میری فطرت اور میرے اصول کے خلاف ہے۔ اس لیے میں یہ مان کر چلتا ہوں کہ یہ سب مضامین غلط فہمی کا نتیجہ ہیں اور میں اس مضمون میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس سلسلے میں جناب پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن صاحب اور دوسرے دانشوروں کو جناب مظفر حسین برنی سابق گورنر ہریانہ اور چیئرمین اقلیتی کمیشن کی کتاب "محب وطن اقبال" پڑھنے کا مشورہ دوں گا۔ انھوں نے اقبال کے متعلق شعوری اور لاشعوری طور پر پھیلائی گئی تمام غلط فہمیوں کو تفصیل کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور صحیح صورتِ حال کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف قیام پاکستان کے بارے میں علامہ کے متعلق پھیلائی گئی غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ بلکہ اقبال کی سیاست اور متاع شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے کردار کے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:-

"ان کے دوستوں اور مداحوں کے بیان کیے ہوئے بہت سے قصے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ایک کشادہ ذہن انسان تھے اور انسان دوستی نیز ہمدردی کا بھی جذبہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں دو واقعات درج کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا واقعہ عبدالرشید طارق بیان کرتے ہیں۔ علامہ کی قیام گاہ کے نزدیک ہی ایک سینما تھا۔ ایک بار انھوں نے سینما کے شور و غل کی طرف علامہ کی توجہ دلاتے ہوئے دریافت کیا آپ جیسے فلسفی اور شاعر کے آرام میں اس سے خلل نہیں پڑتا۔ علامہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے تو عادت سی پڑ گئی ہے انھوں نے جب ان کو کوٹھی بدلنے کی صلاح دی تو علامہ نے بتایا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس کوٹھی کے وارث دو یتیم ہندو بچے ہیں۔ جنھیں میں 130 روپے کرایہ دیتا ہوں۔ میں نے اگر یہ کوٹھی چھوڑ دی تو اس کا اتنا کرایہ شاید ان یتیموں کو نہ مل سکے۔

دوسرے واقعے کے راوی جلال الدین اکبر ہیں۔ یہ اسٹیٹ اسکالرشپ کا معاملہ تھا جس

کے تحت ایم اے فارسی میں اول آنے والا طالب علم اعلا تعلیم کے لیے برطانیہ جانے کا مستحق قرار پاتا تھا۔ 1929 میں اقبال ایم اے فارسی کے صدر ممتحن اور پیپر سیٹر (Paper Setter) تھے اکبر صاحب نے ایم اے کے امتحان میں شرکت کی لیکن ان کے پرچے حسب توقع اچھے نہ ہوئے۔ چنانچہ ان کی سفارش کے لیے حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ اگر اکبر فیل ہو گئے تو اسٹیٹ اسکالر شپ کوئی ہندو لے جائے گا۔۔ اقبال نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں امیدوار کو فارسی بہت اچھی آتی ہے وہ ایک اچھا شاعر بھی ہے۔ اور ہونہار طالب علم بھی۔ لیکن جو مستحق ہے اسے ہی اسکالر شپ ملنا چاہیئے۔ چنانچہ اُس سال یہ اسکالر شپ صرف دو نمبروں کے فرق سے ایک ہندو طالب علم کو مل گیا اور وہ طالب علم فارسی کے مشہور اسکالر شپ اور ادیب ڈاکٹر ہیرا لال چوپڑہ تھے جو بعد میں کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر تھے۔ انھوں نے خود سے اس واقعہ کی تصدیق کی تھی۔۔

غلط فہمی کا منبع علامہ اقبال کا 1930ء کے مسلم لیگ کے الہ آباد اجلاس میں دیا گیا خطبۂ صدارت ہے۔ لیکن اس خطبہ میں علامہ اقبال نے آزاد پاکستان کی نہیں بلکہ انڈین فیڈریشن کے اندر ایک مسلم اکثریت کے صوبہ کی وکالت کی تھی جسے توڑ موڑ کر لوگوں نے آزاد پاکستان کے تصور کے طور پر پیش کر دیا۔ آزاد پاکستان کا تصور علامہ اقبال کے دماغ کی اُپج نہیں تھی بلکہ انگریز کی ایک چال تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر یہ ڈر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ جمہوریت میں ووٹ تو ہر بالغ ڈال سکتا ہے۔ لیکن حکومت اکثریت کی ہوتی ہے۔ مگر ہندستان کے مسلمانوں نے اور مسلم لیگ نے اس وقت یہ نظریہ قبول نہیں کیا تھا صرف چوہدری رحمت علی اور ان کے کچھ ساتھیوں نے ہی انگریز کی اس چال پر ڈالا ہوا دانہ چُگا تھا میں یہاں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کہ کس طرح مسلم لیگ میں پاکستان کی مخالفت کرتے کرتے کس طرح 1937 کے الیکشن کے بعد یوپی میں کانگرس لیگ اتحاد ٹوٹ جانے کے بعد پاکستان کے حق میں سوچ وچار شروع ہوئی (وجہ کوئی بھی ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی کتاب India wins freedom کے بعد میں شائع شدہ تیس صفحات میں اس کے بارے میں لکھا ہے) اور آخر کار 1940 میں لاہور کے اجلاس میں مسلم لیگ نے آزاد پاکستان کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے۔ کہ علامہ اقبال اس اجلاس سے دو سال قبل یعنی 1938 میں ہی وفات پا گئے تھے

یہ کہنا کہ "اقبال کے تمام معتقدین کا یہ دعوٰی ہے کہ پاکستان کی تحریک میں جان ڈالنے والی شخصیت صرف علامہ اقبال کی تھی" صحیح نہیں ہے اور حقیقت سے کوسوں دور ہے برصغیر

۔ پاکستان کے مشہور اور جانے مانے اردو کے ادیب شاعر و دانشور اور انجمن ترقی اردو (ہند)
، صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد جو اردو حلقوں میں چوٹی کے ماہرین اقبالیات مانے جاتے ہیں وہ
ی اقبال کو پاکستان کا بانی ماننے والی تھیوری کو نہیں مانتے۔ اور انھوں نے اپنی مختلف تصنیفات
تحریروں میں اس بات کا اظہار کیا ہے (پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی یکتا پوزیشن کا ثبوت یہ ہے
پاکستان میں اقبال صدی کے جشن کے موقع پر جلسہ گاہ سے اقبال کے مزار پر فاتحہ پڑھنے
نے والے جلوس کی قیادت کے لیے ہندستان اور پاکستان کے وہاں موجود ادیبوں، شاعروں
نشوروں اور معتقدین اقبال نے اتفاق رائے سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو چنا تھا) علامہ اقبال
ے ایک اور معتقد آنجہانی جناب ہیرالال چوپڑہ کے ماہنامہ انشا کلکتہ میں چھپے مضمون "علامہ
ال اور ہندستان" سے کچھ اقتباسات لکھ رہا ہوں :۔

"مرحوم علامہ اقبال کے متعلق یہ غلط فہمی عام طور پر پھیلائی جا رہی ہے کہ وہ پاکستان
ے بانیوں میں سے تھے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ 1930 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ
سوں میں بطور صدر کے انھوں نے یہ تقاضا ضرور کیا تھا کہ شمال جنوب میں ایک ایسا صوبہ بنایا
ئے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو سیاست دانوں نے اس سے یہ مطلب اخذ کر لیا کہ وہ
ہندوستان سے الگ کسی نئے ملک کے بنانے کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ بعد میں جب انگلستان
ں چوہدری رحمت علی وغیرہ نے ایک الگ پاکستان کے لیے پروپیگنڈہ شروع کیا، تو ایڈورڈ
ٹامسن نے اقبال کے مشہور خطبات "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے
ہیں پاکستان کا حامی قرار دیا تو انھوں نے اسے خط لکھ کر واضح کر دیا تھا کہ "پاکستان میرا منصوبہ
ہیں ہے۔ میری تجویز ایک مسلم صوبے کی تشکیل ہے جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور وہ
ہندوستانی وفاق (فیڈریشن) کا ایک حصہ ہو جبکہ نظریۂ پاکستان میں ایک جداگانہ وفاق کی تجویز
کھی گئی ہے جو براہ راست انگلستان سے مربوط ایک علیحدہ ریاست ہو۔ میرا عقیدہ ہے کہ
ہندستان سے الگ پاکستان نہ ہندوؤں اور نہ مسلمانوں اور نہ برطانوی راج کے لئے مفید ہوگا" یہ
حقیقت ہے کہ علامہ اقبال اپنے ہندوستانی ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہے اور کھلے عام اس کا اعادہ
کرتے ہیں۔

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا میرے لاتی و مناتی
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے راز ہائے دل میں

یا پھر فرماتے ہیں

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ و رمز آشنائے روم و تبریز است

(مجھے دیکھو کہ ہندوستان میں کوئی دوسرا ایسا نہیں ہے جو برہمن زادہ ہوتے ہوئے بھی روم و تبریز کا محرم اسرار ہو)

ویسے بھی سارے ہندستان کو اس کا علم ہے کہ 1904 میں انھوں نے ترانہ "ہندوستان ہمارا" لکھا تھا۔ جو مقبول خاص و عام ہوا۔ اور 1947 سے پہلے وہی قومی ترانہ مانا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ انگلستان کے وزیر اعظم رمر بے میکڈ انلڈ نے 1910 میں ہندستان کے دورے کے بعد "ہندستان کی بیداری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تو اس میں واضح طور پر لکھا کہ سارے ہندستان میں اقبال کے ترانہ "ہندستان ہمارا" کو ترانہ ملی کی حیثیت حاصل ہے "اس قومی ترانے کی شان نزول میں کئی مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ کہ کس طرح وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے مقابلے میں مشہور انقلابی لالہ ہردیال کی قائم کردہ ینگ مین انڈین ایسوسی ایشن کے پہلے سالانہ جلسے میں علامہ نے صدارت کرتے ہوئے لکھا تھا۔ یہی نہیں علامہ اقبال کو ہندستانی تہذیب سے گہرا انس تھا۔ اسی لیے انھوں نے گرونانک۔ رام گایتری۔ اور سوامی رام تیرتھ نظمیں لکھیں اور ہمیشہ اپنے ہندستانی ہونے پر بجا طور پر فخر کرتے رہے۔ ہندستان کے فلسفہ تہذیب اور ثقافت کی تعریف کی ہے۔

یہ تو سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ لاہور آ کر علامہ نے سب سے پہلے اپنی نظم "نالہ یتیم" پڑھی تھی لیکن انھوں نے اپنا پہلا اردو کا مجموعۂ کلام "بانگ درا" 1924 میں ترتیب دے کر شائع کیا تو اس میں سب سے پہلی نظم "ہمالہ" کے عنوان سے رکھی اس میں وطنیت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے بعد ہندستانی بچوں کا گیت "میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے" لکھا جس میں چشتی نانک حجازیوں تاتاریوں یونانیوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح وہ سب میرے ملک کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ الغرض علامہ شروع سے آخر تک ہندستان اور ہندستانیت کی پرستش کرتے رہے۔ اور لوگوں نے انھیں خواہ مخواہ پاکستانی بنا کر بدنام کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

ڈاکٹر چوپڑہ نے ایڈورڈ تھامسن کو لکھے خط کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں علامہ اقبال کے ایک اور مکتوب کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا جو انھوں نے مارچ 1934 کو کلکتہ کے جناب راغب حسن کو ایڈورڈ تھامسن والے مضمون کے بارے میں ہی لکھا تھا۔ "برلو کرم دھیان دیجیے کہ

میری اسکیم کو نظریۂ پاکستان سے (ایڈورڈ تھامسن) مخلوط کر رہا ہے میں تو انڈین فیڈریشن میں ہی ایک مسلم صوبے کی تشکیل کا حامی ہوں، جب کہ نظریۂ پاکستان میں شمال مغربی ہند کے صوبوں کی ایک الگ فیڈریشن کی بات کہی گئی ہے۔ جو براہ راست انگلستان سے مربوط ہو گا۔" جناب کے۔ کے عزیز نے بھی اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ "یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال آزاد مسلم مملکت کے قیام پر استدلال نہیں کیا ہے بلکہ ہندستانی وفاق میں ہی ایک مسلم مملکتِ قیام کا نظریہ پیش کیا ہے۔ مزید بر آں بنگال اور آسام (پہلے مشرقی پاکستان اور اب بنگلہ دیش) ان کے زیر بحث نہ تھا۔" ان کو تصور پاکستان کا بانی کہنا یہ کہنا کہ وہ شاعر تھے جنھوں نے تقسیم وطن کا خواب دیکھا تھا۔ یکسر گمراہ کن ہوگا۔ انھوں نے کبھی بھی تقسیم کا ذکر نہیں کیا ان کا نصب العین یہ تھا کہ شمال مغرب میں مسلم صوبوں کو متحد کر دیا جائے تاکہ مجوزہ ہندو مرکز سے زیادہ مراعات حاصل ہو سکیں۔ قیام پاکستان کو اقبال پر تھوپنا پاکستانی قومیت کا ایک مفروضہ ہے۔ The making of Pakistan By k.k. AZIZ, CHATTO AND WINDUS, LONDON

اقبال کے بارے میں غلط فہمی تو جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ 1930 سے ہی پھیلائی جا رہی تھی۔ لیکن آزادی سے پہلے اسے کوئی زیادہ اہمیت نہیں ملی اس غلط فہمی کو تقویت اس وقت ملی جب پاکستان کے حکمراں طبقے اور میڈیا نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر اقبال کو پاکستان کے بانی کے طور پر خراج تحسین و عقیدت پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح شاعر مشرق کو مشرق کی وسعتوں سے نکال کر اپنے عقائد و تصورات کے قید خانے میں ڈال دیا۔ اور شاعر مشرق سے اسے شاعر پاکستان بنا کر محدود کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ چند سال پہلے جب اقبال کی صد سالہ برسی کے موقع پر گورنمنٹ آف انڈیا کے پوسٹل ڈیپارٹمنٹ نے ڈاک جاری کیے تو اخباروں میں اس کے خلاف احتجاج کے کئی مکتوبات شائع ہوئے۔ جن میں علامہ اقبال کو ملک کی تقسیم کا ذمے دار ٹھہرایا گیا تھا۔ اور کئی مکتوبات میں تو نہایت مضحکہ خیز، لاعلمی اور ناسمجھی کا مظاہرہ کیا گیا تھا ایک صاحب نے یوں لکھا تھا "اقبال ساری عمر حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد کرتا رہا اور تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلا گیا۔" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال 1938 میں مسلم لیگ کے 1940 کے لاہور اجلاس (جس میں آزاد پاکستان کا ریزولیوشن پہلی بار پاس ہوا تھا) سے بھی دو سال پہلے وفات پا گئے تھے۔ اگر زندہ بھی ہوتے تو بھی ان کا پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کیونکہ وہ سیال کوٹ کے رہنے والے تھے اور بعد میں انھوں نے لاہور میں رہائش اختیار کر لی تھی اور یہ دونوں شہر پاکستان میں ہیں۔

مجھے ایسے مکتوبات پڑھ کر ذہنی کوفت ہوتی تھی۔ چنانچہ میں نے ان مکتوبات کے جواب

یں ایک خط لکھا تھا۔ جو ان دنوں ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی میں چھپا تھا (اس کی کٹنگ اب بھی میرے پاس ہے)۔ میں نے لکھا تھا:۔

"اقبال کے متعلق تنازعے کے بارے میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تنازعے (con-troversy) غیر ضروری اور لاحاصل اور نہایت ہی افسوس ناک ہے ڈاکٹر اقبال اگر فرقہ پرست ہوتے یا نظریۂ پاکستان کو بڑھاوا دینے والے ہوتے تو پنڈت نہرو لاہور ان کے گھر ان سے ملنے کبھی نہ گئے ہوتے اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پنڈت نہرو نے شدید اصرار اور دباؤ کے باوجود مسولینی سے اس کے سیاسی نظریہ (آمریت) کی وجہ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب وہ یورپ سے واپسی پر اٹلی کے دارالخلافہ روم میں ٹھہرے تھے۔ (پنڈت نہرو نے ان دونوں واقعات کا ذکر اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں کیا ہے۔) اقبال انڈین فیڈریشن میں ہی ایک مسلم اکثریت والے صوبے کی حمایت کرتے تھے۔ لیکن اقبال ہندو سکھ اقلیت سے خالی ریاست کی کبھی حمایت نہ کرتے۔ ہم ہندستان کے مشترکہ تہذیب و ثقافت میں اقبال کے بیش بہا اضافہ (contribution) کو نظر انداز نہیں کر سکتے "سارے جہاں سے اچھا" "ہمالہ" "میرا وطن وہی ہے" "شوالہ" اور دوسری نظمیں ان کی ہندستانی تہذیب و تمدن سے محبت کی سند اور ثبوت ہیں۔ ان کی نظم شوالہ کا آخری شعر ہے:۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے واسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال کے ذہن میں جس مملکت کا تصور تھا وہ خود ان کے الفاظ میں جو انھوں نے مسلم لیگ کے لکھنؤ اجلاس میں کہے تھے۔ ہندستان میں ایک مسلم مملکت کا خواب نہ کہ ایسی مملکت کا خواب جو ہندستان سے تمام رشتے ناطے توڑے" بدقسمتی سے آج پاکستان، ہندستان سے سارے رشتے ناطے توڑنے والی مملکت بن گئی ہے"

اقبال کو صرف اسلام اور مسلمانوں سے وابستہ کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ اقبال نے نہ صرف "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" لکھا بلکہ یہ شعر بھی لکھا۔

بستۂ رنگ و خصوصیت نہ ہو میری زباں
نوعِ انساں قوم ہو میری وطن سارا جہاں

ملک کے آج کے ماحول کو دیکھ کر مجھے اقبال کی ہی یہ وارننگ اور چیتاونی یاد آ رہی ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

جھینی جھینی بینی چدریا
عبدالبسم اللہ
مترجم۔ ویم حیدر ہاشمی

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر آنسی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔ قیمت ۱۵۰/-

اندازِ گفتگو کیا ہے
شمس الرحمٰن فاروقی

اس کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے ہیں اور اس بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے مسائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین میں شاعروں اور شاعری کو ہی معرضِ بحث میں لایا گیا ہے۔
ایک نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۱۵۰/- روپے

دستک اس دروازے پر
وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ ہے اور اس سلسلے میں مغرب کے فلسفے، تصوف، اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ تجربے اور تخلیقی تجربے کا یہ فرق ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ قیمت ۵۱/- روپے

مٹی کا بلاوا (ڈرامے)
شمیم حنفی

سب سے بڑا ڈراما خود انسانی زندگی ہے۔ شمیم حنفی کے یہ ڈرامے زندگی کے ڈرامے کا ایک منظر پہ ترتیب دیتے ہیں۔ ایک نئے تہذیبی اور سماجی زاویۂ نظر کا عکس ان میں بیشتر ڈرامے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کے ذریعے مقبول ہو چکے ہیں۔
(دوسرا اڈیشن) قیمت ۴۵/- روپے

کچھ مشرق سے، کچھ مغرب سے
ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری

انگریزی عشقیہ شاعری کے فروغ میں اندلسی اور عرب تہذیب و ادب کے بعض مصادر کی نشاندہی اور فراق اور شہریار کی شعری حسیات میں مغربی رجحانات کے بارے میں علمی مضامین، گلستان سعدیؔ کے منظوم اردو تراجم، دانشوری اور تصورِ مذہب، میر، سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے اور بعض اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرے۔ قیمت ۱۵/- روپے

صحرانورد کے خطوط
میرزا ادیب

صحرانورد کے خطوط، آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی صحرانورد کے خطوط کو۔ قیمت ۱۵/- روپے

اسرارِ خودی
(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب: شائستہ خاں

علامہ اقبال کی "اسرارِ خودی" کے پہلے اڈیشن میں چند اشعار بطریق انتساب درج تھے جو دوسرے اڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ دوسرے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیش کش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ کون سے اشعار حذف کیے اور وہ کہاں گئے؟ اور وہ اشعار کون سے تھے؟ یہ آپ کو اس کتاب کے عکسی اڈیشن سے معلوم ہوگا۔ قیمت ۱۵/- روپے

پیامی قواعدِ اردو
طلبہ اڈیشن، ۱۲/-

قواعد جیسے خشک مضمون کو سمجھنے، سمجھانے اور برتنے کے لیے نہایت آسان زبان میں ترتیب دی ہوئی یہ قواعد اساتذہ اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ہے۔ قیمت: ۱۲/-

مسز عارفہ سلطان
صدر شعبہ اردو، نزد مسجد
محلہ رجبن، ٹونک

"پارسی تھیٹر میں ادبی معیار سماجی اصلاح کی نظر سے"

اردو ڈرامے کی ابتدا آغا حسن امانت سے ہوئی۔ زمانہ تھا واجد علی شاہ کا۔ اور علاقہ تھا اودھ کا۔ اس کی مقبولیت کے بعد سے تو سبھاؤں کا زمانہ شروع ہو گیا اس سے قبل واجد علی شاہ کے چھوٹے سے ناٹک رادھا کنہیا سے اس کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔ پرستان کی کہانیاں اس دور میں بڑی مشہور تھیں جس سے ڈرامے کا چلن عام ہونے لگا۔

پرتگیزوں نے سترھویں صدی عیسوی میں اور انگریزوں نے اٹھارویں صدی عیسوی میں ممبئ میں تھیٹر ہال قائم کیے اور ان میں مسیحی تبلیغ کے لیے ادنا درجے کے انگریزی اور ہندستانی کھیل اسٹیج کیے جانے لگے۔ لیکن ان میں زبان و بیان کا کوئی ایسا انداز نظر نہیں آتا تھا جس کی نسبت یہ کہا جاسکے کہ یہ اردو ڈرامے کا آغاز تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں مرہٹوں اور پارسیوں نے "ڈرےمیٹک کور" بنائے جن میں مرہٹی اور گجراتی ڈرامے کھیلے جاتے تھے انھیں میں ایک ہندو ڈرےمیٹک کور بھی تھا جس میں پارسی رئیسوں کی اکثریت حصے دار تھی انھوں نے اس اسٹیج پر اردو ڈراما کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی ترتیب میں زیادہ تر مغربی اثر نمایاں تھا۔ یہ ڈراما گوپی چند اور جلندھر" کے نام سے ایک پارسی رئیس نے گجراتی میں لکھ کر اردو میں ترجمہ کرایا اور 1853 میں اسٹیج ہوا۔ اس ڈرامے کی کامیابی نے پارسیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا پارسیوں کی اردو اچھی تھی وہ اردو فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے اور مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گجراتی ڈراموں کے ساتھ ان میں اردو ڈراموں کا شوق بھی پیدا ہوا۔

1854 میں پارسی رئیسوں نے اپنی ایک جماعت "پارسی ڈرےمیٹک کور" کے نام سے قائم کی اور اس کے زیر اہتمام اردو کھیل "پیدائش سیاوش" کھیلا گیا۔۔ یہ ڈراما پارسی مذہب کی تاریخی داستان سے تعلق رکھتا تھا۔

اس سے قبل 1845 میں انگریز حکام نے پارسی رئیسوں کے اشتراک سے گرانٹ روڈ پر

بمبئی تھیٹر کے نام سے ایک ہال تعمیر کیا۔ جہاں صرف انگریزی ڈرامے کھیلے جاتے تھے لیکن حقیقت میں یہ تھیٹر اردو اسٹیج کا سنگ بنیاد ثابت ہوا۔ اور پارسی ڈرہمیٹک کور کو اس اسٹیج پر اردو ڈرامے کی ترویج و ترقی میں بڑی مدد ملی ۔ یہاں پر گجراتی سے اردو میں ترجمہ کرواکر پارسی ڈرہمیٹک کور نے کئی ڈرامے کھیلے جو بہت زیادہ کامیاب ہوئے۔

1861 میں اٹھارہ، انیس چھوٹی بڑی کمپنیاں ممبئی میں وجود میں آئیں جو اردو ڈرامے کھیلتی تھیں ۔ لیکن جس تیز رفتاری کے ساتھ کمپنیوں میں اضافہ ہوا۔ اس رفتار سے تھیٹر تعمیر نہ ہو سکے۔ اس لیے نئے شائقین کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

انیسویں صدی کے وسط میں پارسیوں کی معاشرتی حالت بہت خراب تھی عوام و خواص جادو ٹونا اور جنتر منتر پر یقین رکھتے تھے۔ تعلیم سے ناواقف تھے عورتوں کو سخت پردے میں رکھا جاتا تھا۔ پارسی رقص و سرور کی محفلوں میں بھی حصہ نہیں لے سکتے تھے اور اگر لیتے تھے تو آوارہ لوباش کہلاتے تھے۔ ان حالات میں بھی پارسیوں نے گجراتی تھیٹر کی ابتدا کی۔ کیونکہ ان کا شوق ڈراما آہستہ آہستہ دیوانگی کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن انھوں نے ہر مخالفت کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے وطن کی عزت و عظمت اور جاہ و حشمت کو اس کے اصلی رنگ لباس اور زبان میں پیش کرنے کے لیے شاہنامہ سے رستم و سہراب وغیرہ کا انتخاب کیا۔ اور اس کو ڈرامائی صورت میں پیش کیا جو انتہائی کامیاب رہا۔

1858 سے 1870 تک کتنے اردو ڈرامے لکھے گئے، کس نے لکھے اور وہ کب اسٹیج ہوئے اس کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔ دادا بھائی پٹیل نے اسی دوران اپنی پوری توجہ اردو ڈراموں کی طرف مبذول کر دی۔ اور ان کو اعلا پیمانے پر دکھلانے کے انتظامات کیے۔۔ حالانکہ ان کی بڑی مخالفت کی گئی لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہے پٹیل نے ایک ڈراما ایدل جی کھور جی سے گجراتی میں لکھوایا۔ اور سیٹھ بہرام جی فریدوں جی سے اردو میں" خورشید" کے نام پر ترجمہ کرلیا۔ اور اس کو نئی سینریوں کے ساتھ نئی پوشاکوں کے ساتھ اسٹیج کیا۔ 1871 میں جب یہ ڈراما اسٹیج پر دکھایا گیا تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ یہ پورا اڈراما نثر میں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے" نور جہاں" دکھایا یہ بھی بڑا کامیاب رہا۔ دادا بھائی پٹیل کو اردو ڈراما کو ترقی دینے کا اس قدر شوق تھا کہ انھوں نے بغیر سوچے سمجھے اعلان کر دیا کہ وہ بھی اسٹیج پر کام کریں گے ۔ اس بات کی بہت مخالفت کی گئی۔ لیکن انھوں نے ڈراما حاتم طائی میں حاتم طائی بننے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ وکٹوریہ تھیٹر ہال میں اس کو پیش کیا گیا۔ اور حقیقت میں ناظرین نے ان کے کام کو اور اس ڈرامے کی جس کو آرام نے لکھا تھا اور جس کو مثنویوں کے ذریعہ سینریاں پیش کر کے دکھایا گیا تھا دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔

اس کے علاوہ بھی الفریڈ ناٹک منڈلی نے بے شمار بہترین ڈرامے جدید انداز سے پیش کیے اور کامیابی حاصل کی۔ پارسی اسٹیج پر اردو ڈرامے نے خاصی ترقی کی لیکن چونکہ پارسی سیٹھوں کا مطمح نظر ذاتی تفریح اور شہرت کے ساتھ دولت بھی کمانا تھا۔ اس لیے ان ڈراموں میں فکر و فن اور معاشرتی زندگی کی عکاسی نظر نہیں آتی البتہ تمثیل کاری اسلوب میں کافی ترقی ہوئی۔

اگرچہ ڈراموں میں ہندستانی زندگی اور سماجی کشمکش سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ صرف نئے تجارتی مرکزوں کی تفریح کا سامان تھے۔ کسی اردو کے بڑے ادیب نے بھی اس وقت تک اس میں ذاتی دلچسپی نہیں لی تھی۔ پارسی تھیٹر کمپنیوں کی خدمات اس لحاظ سے قابل قدر تھیں کہ انھوں نے اردو ڈرامے کی ارتقائی منازل میں خاص توجہ اور تندہی سے اہم حصہ لیا۔

پارسیوں نے اردو تھیٹر کے فروغ میں سعی و کوشش کی، بے دریغ روپے صرف کیے اور فنی لحاظ سے کئی تجربے کیے۔ چوں کہ عوام کا مذاق بعض سیاسی، سماجی اور تعلیمی بنا پر پست تھا اس لیے اس دور کے ڈراموں اور ان کے پیش کش کے اہتمام میں خصوصیت سے اس بات کا کو ملحوظ رکھا گیا کہ ذوق عامہ کی تسکین ہو سکے۔ ڈراموں کی قومی یا تہذیبی اہمیت نہیں تھی بلکہ یہ صرف تجارتی مرکزوں کی تفریح کا سامان تھا۔ پارسی دور کے ڈراموں میں زیادہ تر مغربی رنگ نمایاں ہے یا قدیم مثنویوں کی بنیاد پر مافوق الفطرت قصوں یا ہندو دیومالائی کہانیوں کو ڈراموں میں پیش کیا جاتا رہا۔

پارسی اسٹیج کے پہلے غیر پارسی ڈرامانگار منشی محمود میاں بنارسی تھے ان کے بعض ڈرامے زبان و بیان اور تدبیر کاری کے لحاظ سے اس دور کے دوسرے تمام ڈراموں سے بہتر پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی اچھے ڈرامے لکھے۔ لیکن ان میں زیادہ تر کا پلاٹ قدیم مثنویوں، قصوں کہانیوں طلسماتی اور مافوق الفطرت واقعات پر مبنی ہے۔ انھوں نے تقریباً ۲۳ ڈرامے لکھے۔ ظریف اور حباب رام پوری نے بھی اس دور میں خاصی شہرت حاصل کی۔

پارسی اسٹیج کے ابتدائی دور میں طالب بنارسی نے نمایاں نام کمایا۔ ان کی زبان صاف فصیح اور شستہ ہے۔ اگرچہ ڈرامے عام روش پر ہی لکھے گئے ہیں کسی سماجی پہلو کو مد نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے ہیں۔ مکالموں میں زبان و بیان کی سلاست اور برجستگی پائی جاتی ہے طالب کے گانوں کے بول مترنم ہیں، ان کے گیت عام فہم ہندی آمیز اردو، اور غزلیں جذبات و بندش اور تراکیب کے لحاظ سے دلکش ہیں۔ انھوں نے اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ فصیح استعمال کی ہے انھی خصوصیات کی بنا پر ان کو اس عہد کا بہترین ڈرامانگار قرار دیا گیا ہے۔

اسی دور میں چند اور ڈرامانگار کافی مشہور ہوئے اگرچہ ان کی اکثر تصانیف اب ناپید ہیں

ڈرامانگاروں و تھوڑا کربالا اپنے معاصرین کے مقابلے میں کمتر نہیں تھے۔
ظہیر محمد، سجاد حسین، جوہر بنارسی، نظیر حسین سجاد دہلوی، بزرگ لاہوری، احمد حسین
...ی، امراؤ علی مراد بریلوی، دیوانہ امر تسری، افسوں مراد آبادی، عبداللہ عبدالوحید قیس
...نے بڑی تعداد میں ڈرامے لکھے ان میں سے مراد بریلوی اور دیوانہ امر تسری کے بعض
...ے تو اس قدر مقبول ہوئے کہ دو دو سال تک ان کو اسٹیج پر دکھایا جاتا رہا ان ڈرامانگاروں میں
زیادہ تر کی زبان سلیس و فصیح رہی مکالمے چاہے منظوم ہوں یا نثر میں لیکن دلچسپی سے خالی
ہوتے تھے۔

ان ڈرامانگاروں نے اچھے ڈرامے جو سماجی اصلاح اور ادبی معیار کو آگے بڑھائے ہوئے
لکھنے کی کوشش کی۔ لیکن عوام کا معیار کیونکہ پست تھا اور پارسی تھیٹریکل کمپنیاں زیادہ تر مالی
...خاطر ہی ڈراما اسٹیج کرتی تھیں اس لیے وہ ڈرامانگاروں کو نقالی پر مجبور کرتی تھیں۔
اور ڈراموں میں تھوڑی بہت ترمیم اور اضافہ کے بعد انھیں پیش کر دیا جاتا تھا۔ مالکان
روز ایک نیا ڈراما دکھانا چاہتے تھے اس لیے بہت کم مدت میں ڈراما لکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے
اور سینہ زوری عام بات تھی۔ ان پابندیوں کے ساتھ کوئی بھی بہتر ادیب یا فن کار کسی
اور فنی تخلیق کا بلند پایا نمونہ نہیں پیش کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے کوئی بڑا ادیب اس طرف
نہیں ہوتا تھا۔

مالکان کمپنی میں دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی، آردیشر بھائی، خورشید جی، پسٹن
...جی، چند ذہین اور لائق ڈرامانگار ایسے بھی تھے جو تجارتی صنعت کے ساتھ ڈرامے کو فنی
بھی بخشنا چاہتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ڈراموں میں فنی اقدار کی بلندی سے اسٹیج کی ترقی ہوگی
...سے تجارت کو بھی فائدہ پہنچنے کی امید ہے۔ لیکن اکثریت ایسے سیٹھوں کی تھی جو صرف
...کو ہی فروغ دینا چاہتے تھے۔

پارسی تھیٹریکل کمپنیاں جب ممبئی میں زور شور سے چلنے لگیں تو 1857 کے بعد مختلف
...کا دورہ بھی کرنے لگیں جہاں وہ اپنے مشہور کھیل دکھاتی تھیں اس میں شہر کے معززین
...ر شعرا بھی آتے تھے۔ اور ڈراموں پر تنقید کرتے تھے پارسی سیٹھ رتن جی ٹھونٹھی اور
...جی وغیرہ کو معقول اصحاب سے مل کر اپنے ڈراموں کی پستی کا احساس ہوتا تھا اس لیے
...خیال ہوا کہ ملک کے مستند ادیبوں سے بھی ڈراما لکھوانا چاہیے۔ اب عوام کے...
...لازمی ہے سماجی تبدیلیاں بھی ہو رہی ہیں۔ اس لیے اب ڈراما...

سب سے پہلے دلوابھائی رتن جی نے اپنی کمپنی میں ڈرامے لکھنے کے لیے اس دور کے یک مستند ادیب وشاعر سید مہد حسن احسن لکھنوی کو تیار کر لیا۔ جب الفریڈ کمپنی برائے ان کو ستقل ڈراما نگاری کی حیثیت سے اپنی کمپنی میں ملازم رکھا تو اسٹیج پر قدامت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اگر وہ ادبی وقار کو قائم رکھتے تو عوامی ذوق کی تسکین نہیں ہو سکتی تھی اس لیے احسن کو بھی روش عام اختیار کرنا پڑی۔ اگرچہ انھوں نے زبان و بیان میں روانی سلاست اور شگفتگی پیدا کی۔ اپنے دلکش اسلوب کی وجہ سے قدیم طرز پر غیر فنی دائرہ میں محدود رہ کر اپنے ڈراموں میں نثر اور نظم دونوں کو بڑی حد تک سنوانے کی کوشش کی 1897 میں احسن الفریڈ کمپنی کے ساتھ جڑ گئے اور اپنا پہلا ڈراما چندراولی اسٹیج کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت سے 1922 تک احسن کی طوطی ڈرامے کی دنیا میں بولتی رہی انھوں نے بہت کوشش کی کہ ڈرامے کو ادبی رنگ پر لے آئیں۔ لیکن پارسی سیٹھوں نے عام طرز سے ہٹ کر نئے تجربے کرنے سے انکار کر دیا۔ احسن کو ہندستان کے اسٹیج پر ڈراموں کا انداز بدلنے کا فخر حاصل ہے۔ انھوں نے صرف شیکسپئر کے پلاٹ ہی لیے اور اپنا ایک الگ اسٹائل رکھا۔ جس میں دنیا کی بے ثباتی، عشق و محبت، وصل و ہجر واقعات عالم، جذبات صادقہ، واردات قلبیہ، شجاعت اور دلیری کے واقعات کو زمانے کے تقاضے کو مد نظر رکھ کر پیش کیا اس دور میں احسن لکھنوی سے مقابلہ کرنے کی کسی دوسرے ادیب کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

احسن کی ڈراما نگاری سے متاثر ہو کر ان کے ہم عصر ڈراما نگاروں نے ڈراما نگاری کے مروجہ اصولوں کو مد نظر رکھ کر ترقی پذیر شکل میں ڈرامے لکھے اور یہ بھی کوشش کی کہ ڈرامے کو اس لائق بنایا جا سکے کہ سماج میں جو پرانے توہمات ہیں، قدیم رسم ورواج ہیں ان کو ا تحریروں کے ذریعے بدلا جا سکے۔ پارسی الفریڈ تھیٹریکل کمپنی اور نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی دونو کے لیے احسن نے ڈرامے لکھے۔ پارسی ہدایت کاروں کی توجہ سے ڈرامے کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ محدود دائرے میں رہ کر ہی لوگوں نے نئے تجربات کیے احسن کے معاصرین میں سے سے زیادہ شہرت آغا حشر کاشمیری کو حاصل ہوئی۔ طالب بنارسی کا دور احسن کی شہرت ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ آغا حشر اس دور کی ترقی و عروج کے اصل بانی اور خاتم ہیں جس کا اعترا احسن اور ان کے دوسرے معاصرین نے بھی کیا ہے۔

جب حشر نے ڈراما نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو ان کے سامنے بھی کمپنی تجارت پیشہ سیٹھوں کے تقاضے تھے۔ سب سے پہلے تو روایتی اسلوب عوام کا پسند اور اس ساتھ ہی طویل وقت جو تقریباً سات گھنٹے ہوتا تھا اور اس میں تماشائی کو اپنی طرف متوجہ

تھا جس میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوں۔ آغا حشر کے پر زور قلم کا یہ کرشمہ تھا کہ انھوں نے ان تمام پابندیوں کے باوجود اپنی تصانیف میں حسن بیان طرز ادا کوفنی لوازم اور دل کشی سے مالا ل کیا اس میں عام معاشرتی اور سماجی مسائل، زندگی کے حقائق سے بھر کر ایک نئے دور کا آغاز یا۔ انھوں نے عام انسانی زندگی کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا۔

ابتدا میں ان کے ڈراموں میں بھی انسانی فطرت کو ہنگامی ضروریات کے تحت پیش کیا یا ان کے طنز میں نشتریت نہیں ہوتی۔ وہ سماج کی برائیوں پر براہ راست تبصرہ نہیں کرتے لیکن دھیرے دھیرے جب ان کا خطیبانہ رنگ جمتا گیا تو انھوں نے عوامی مذاق کی تہذیب رنے ٹھانی۔ عوام پر ان کا رنگ اس طرح جم چکا تھا کہ غیر ارادی طور پر آغا حشر کے خیالات کا ساتھ دیتے تھے۔ وہ پھکڑ زبان جو اس زمانے کے ڈراموں میں رائج تھی، وہ مبتذل خیالات جو ڈرامے کے روح رواں تھے اور اداکاری کا پست معیار آغا حشر نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعے ان سب کو تبدیل کر دیا۔ وہ خاموشی سے دھیرے دھیرے ڈرامے کی دنیا میں انقلاب لائے۔ انھوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کے آزاد ترجمے کیے اور ان کو ہندستانی قالب میں ڈھال دیا۔ انھوں نے موقع محل کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے ڈراموں میں ترنم اور جوش و خروش پیدا کیا۔ وہ بڑے عالم انسان تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بے تکان بول سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے تجارتی اسٹیج پر بھی رفتہ رفتہ ایسی تبدیلیاں کیں جن کی وجہ سے تماشائیوں اور پارسی مالکان میں عامیانہ انداز میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ آغا حشر نے تقریباً ۳۲ سال ڈرامے لکھے اور اپنے ہر دور میں انھوں نے یہی کوشش کی کہ عوام کے مذاق کی تہذیب کر سکیں۔ اگر وہ ایک دم یہ تبدیلی اسٹیج کے ڈرامے پر کرتے تو شاید ناکام رہتے لیکن وہ عوام کے مزاج شناس تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے فن میں تدریجی ارتقا کے امکانات تلاش کیے ان کے آخری دور کے ڈراموں میں سماجی، معاشی مسائل قومی زندگی، سماج کی برائیوں کے خلاف جنگ وغیرہ نے ہی جگہ پائی۔

آغا حشر جیسی شہرت اردو کے کسی اور ڈراما نگار کو حاصل نہیں ہو سکی بہت سے لوگوں نے تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے ڈرامے لکھے اور خاص نام بھی کمایا جیسے بیتاب جنھوں نے تھیٹر کی دنیا میں خاصا نام کمایا۔ اپنے ڈراموں میں سماجی مسائل کو بھی جگہ دی اس دور کے ڈراما نگاروں نے مذہبی مسائل، ستی کی رسم، آزادی کے لیے لڑائی، اتحاد، حب وطن پرستی، عورتوں کی سماج میں عزت، مساوی حقوق وغیرہ پر ڈرامے لکھے۔ اور خاصی شہرت حاصل کی۔

ملکوتی یا شاہی دور کی کہانیاں اب قصہ پارینہ بن چکی تھیں اس دور کے ڈراما نگاروں نے

خیالی داستانوں سے اپنا دامن چھڑایا اور نئے دور کے نئے مسائل کو ڈراموں میں جگہ دی مذہبی عقائد اور نظریات میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں میلانات اور رجحانات جو تبدیل ہو رہے تھے ان تمام چیزوں کو انھوں نے اپنے ڈراموں میں جگہ دے کر نئے دور کا آغاز کیا۔

پارسی تھیٹر کمپنیاں اگرچہ تجارتی مقصد کے تحت قائم ہوئی تھیں اور وہ تمام ملک میں گھوم گھوم کر اپنے ڈرامے دکھاتی تھیں۔ عوامی مذاق ہی ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ لیکن کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے لکھنے والوں نے دھیرے دھیرے عوامی معیار اونچا اٹھانے کی کوشش کی اور پارسی تھیٹر کے آخری دور نے تو کھل کر عوام کی ذہنیت کو جھنجھوڑا اور اس بات کی بھرپور کوشش کی گئی کہ عوام کے سماجی مسائل اور ان کے حل بھی ڈراموں میں پیش کیے جائیں۔

مقصود الٰہی شیخ

RAVI NEWS WEEKLY
RAVI HOUSE, UNIT E1
Legrams Lane, Bradford BD7 1NH
Telephone & Fax (01274) 721227

آخری ایکٹ

تم نے کبھی ہارتے ہوئے جواری کو دیکھا ہے؟ داؤ پر داؤ لگاتا چلا جاتا ہے لیکن گراوٹ کی روک اور بندش کا خیال تک اسے نہیں آتا۔ اس کی سوچ اس سے چھن چکی ہوتی ہے۔

یہ ہماری تنہائیاں، اکیلاپن کون سا روپ بھرنے لگا ہے؟

محبت بے وفائی کا نام نہیں۔ محبت چوری چکاری سے ملنے کی بات نہیں۔ زمانے بھر سے ڈر، چھپ کر گود میں انگارے بھرنے کو نہیں کہتے۔ یہ بیمار محبت، یہ ناصبوری، یہ جھنوری یہ سب کیا ہے جو ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔

میں تم سے دور ہو جاتا ہوں۔

تم مجھ سے نہ ملا کرو۔

میں نے پا لیا ہے تمہارا وصل راحت نہیں، کرب کا ان چاہا تحفہ ہے۔ ایک کوڑھ ہے۔ ہجر کی لذت اور انتظار کا لطف جاتا رہا۔

ایک تم ہو۔ ایک میں ہوں اور فریب کی دنیا ہے۔ وقت کا دھوکہ ہے۔ ہم کب تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہیں گے؟ اخلاق باختگی کا نئے سے نیا معیار توڑتے چلے جائیں گے؟ جس روز ہم پکڑے گئے ہمارا پردہ فاش ہو گیا تو ہم منہ چھپانے کہاں جائیں گے۔

سوچتا ہوں۔

جذبوں کی پاکیزگی کی کوئی دھجی بھی ہوگی جو ہماری ستر پوشی میں ہماری ساتھی بن سکے گی!

کبھی کبھی میرے تصور میں دو تصویریں ابھرتی ہیں۔ ایک دولہا کی دوسری کوٹی دلھن ہوتی ہے۔ ان کے چہرے اپنے چہرے نہیں ہیں۔ یہ تمہارا اور میرا چہرہ ہے پھر یہ چہرے میرے تمہارے نہیں رہتے۔ ان کے نقوش بدل جاتے ہیں۔ دو متحرک پتلے، دو بے قرار روحیں ایک بھیڑ میں نظروں کے پیاموں کا تبادلہ کرتے ہیں پھر سب سے نظریں چرا کر کچھ وعدے، کچھ پیمان کرتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے ملن اور جدائی کے منظروں سے میری پیاس کچھ اور بڑھ جاتی ہے پھر مجھے احساس کی پہچان ملتی ہے۔ یہ دو چہرے اتنے غمگین نہیں۔ میرے کانوں سے دور کی آواز ٹکراتی ہے۔ یہ میرے دو بین جل سے نکلی مچھلی کی آنکھیں بن جاتے ہیں جن میں رتی بھر نمی نہیں۔ خشک پھٹی پھٹی آنکھوں سے میں دیکھ رہا ہوں۔

ائیرپورٹ ہے۔ وہ تمہارا منگیتر ہے۔ یہ میری منگیتر ہے۔

میں اور تم

ان کا استقبال کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نجیب اختر
سنٹر آف انڈین لینگویجز
جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی
نئی دہلی

معیاری اردو نثر

دنیا میں پائے جانے والے ہر ادب کی ابتدا شاعری سے ہوئی، ہر ملک اور ہر زبان میں نثر کا وجود نظم کے بعد عمل میں آیا۔ اس کے اسباب بادی النظر میں خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فنّی مواد کا کچھ حصّہ ایسا بھی ہوتا ہے جو شاعری کے سانچے میں احساسِ تکمیل کے ساتھ ادا نہیں کیا جاسکتا۔ "احساسِ تکمیل کی ادائیگی" نے دنیا کے ہر ادب میں نثر کی بنا ڈالی۔

دنیا کا ہر ادب اپنی نثر کے عروج کا ایک خاص دور رکھتا ہے اور ہر ادب اپنے اس ارتقائی دور کو بڑے ہی مبارک لمحات میں شمار کرتا ہے۔ انگریزی ادب کا درخشاں دور اٹھارھویں صدی عیسوی میں شروع ہوتا ہے جو دراصل سوئفٹ اور ایڈیسن کا دور ہے۔ نثری ارتقا کا یہ دور اپنے اندر ایک بڑی لمبی مدت رکھتا ہے۔ دو صدیوں کی تراش خراش اور تجربوں کے بعد بہترین نمونہ برنارڈ شا اور ایلیٹ کی تحریروں میں ملتا ہے۔

اردو چونکہ نسبتاً نو وارد زبان ہے اس لیے اس میں نثر کے اعلا نمونے ماضی قریب سے تعلق رکھتے ہیں گرچہ اردو نثر کو تجربات کے لیے وہ طویل لمحات میسّر نہیں ہو سکے لیکن اتنے کم عرصے میں اردو نثر میں جو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں صرف اور صرف اردو ادب ہی کا خاصّہ ہے۔

زبان کوئی سائنٹفک چیز نہیں جو خود بخود بنتی اور بگڑتی رہے بلکہ اہل زبان جن خیالات میں محو رہتے ہیں ویسے ہی زبان تیار ہو جاتی ہے۔ ابتدائی نثری سرمایے کا مذہبی امور پر مشتمل ہونا اسی بات کی وضاحت کرتا ہے۔ ابتدائی عمل ہو یا ارتقائی عمل ہر دور نے اسے زندگی کی حقیقتوں سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر ایک مختصر سی مدت میں نئے نئے تجربوں سے آشنا ہوئی اور اس طرح زبان کی اہم خصوصیتوں کو اپنے اندر سمیٹتی گئی۔ اردو نثر کے معیاری ادب پاروں کو سامنے رکھ کر یہ بات بڑے ہی وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو نثر خیال کو پیش کرنے، ذہنی اتفاق اور ہمراہی کو حاصل کرنے اور اعصاب پر چھا جانے کے بجائے ترغیب دلانے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہے۔ اس نے ہمیشہ ایک منطقی سانچے کی ضرورت محسوس کی ہے جس میں اس کے مقدمات کامل ہم آہنگی کے ساتھ جگہ پاتے رہے ہیں۔ وہ سوچنے کے انداز میں وضاحت کرتی رہتی ہے اور بیان کے حدود کو واضح اور روشن طور پر سامنے لاتی ہے اور اس لیے اس میں خصوصاً زائد

اور غیر ضروری تفصیلات سے احتراز پایا جاتا ہے جو ایک معیاری اور اچھی نثر کی خصوصیت ہے۔

وضاحت اور قطعیت پر جو زور اردو نثر میں ملتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ نثر کی زبان اکتاہٹ پیدا کرے اور سپاٹ ہو۔ وضاحت ایک اہم شرط ہے اور اس راستے میں جو چیز بھی حائل ہو وہ عیب ہے، بیان میں ابہام یا اشکال خیال سے کم اور الفاظ سے زیادہ پیدا ہوتا ہے اگر خیال واضح نہیں ہے تو کبھی کبھار اسے آرٹ سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ واضح خیال اپنے ساتھ خود واضح بیان لاتا ہے مڈلٹن مرے نے خلوص پر، اقبال نے خون جگر پر زور دیا ہے لیکن حقیقت تو یہ کہ خلوص کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ذہن کی روشنی بھی۔ گو بات اس طرح کہی جائے گویا اس پر نازل ہوئی ہو اور یہی چیزیں معیاری اور اچھی نثر کی تخلیق میں معاون ہوتی ہیں۔ اردو نثر کے ترنم میں اسرار کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اس میں وضاحت کے ساتھ ہی ایک سہولت بیان، سبک روی اور لوچ پایا جاتا ہے جو زبان کی پختگی الفاظ کے تناسب اور ان کے صوتی مطالبات کا لحاظ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اردو نثر کی یہ خصوصیت برسوں کے معیاری ارتقاء کا فیضان ہے۔

معیاری اردو نثر اس دھوپ کی طرح ہے جو ہر چیز کو آئینہ کر دیتی ہے۔ یہ وہ تلوار ہے جو حق و باطل کا فیصلہ کر سکتی ہے اور یہ وہ اینٹ ہے جو بقول آل احمد سرور "اگر دوسری اینٹ کے ساتھ مل جائے تو تاج محل بھی بنا سکتی ہے۔ معیاری نثر جذبے کے نخل شاداب سے اگتی ہے۔ یہ ہمارے جذبات کا پرتو، ان کا فطری عمل یا ردعمل ہوتی ہے اس کا ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے۔ آہنگ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایک آہنگ سے مراد ایک خاص قسم کی موسیقی اور نغمگی ہے۔ شاعری میں یہ موسیقیت الفاظ کی تکرار اور ٹکراؤ سے حاصل ہوتی ہے۔ نثر میں تکرار ناگوار ہوتی ہے۔ یہاں پیرائے بدل بدل کر اسے حاصل کیا جاتا ہے کبھی الفاظ بدل دیے جاتے ہیں کبھی ان کا استعمال بدل جاتا ہے۔ الفاظ اپنا وجود رکھتے ہیں اور ہر وجود کا ایک عمق ہوتا ہے۔ لمبائی چوڑائی موٹائی اور گہرائی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہشت پہل ہیرے کی طرح ہوتا ہے جب کوئی ہنرمند صناع ان سے کام لیتا ہے تو اپنی صلاحیت اور ہنرمندی کے مطابق اسے اتنی ہی خوبصورت شکل دے دیتا ہے۔ نثر میں الفاظ کو برتنے والا شخص ان پہلوؤں سے بھی واقف ہوتا ہے جو شاعری میں اب تک لوگوں کی نگاہ سے چھپی رہ گئی تھیں یہاں پوشیدہ پہلوؤں میں سے بھی وہ ان ہی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جن میں ایک مخصوص کھنک باقی ہے اور یہ کھنک ہی وہ آہنگ بن جاتی ہے جو دیدہ و دل کو شاد کام کرتی ہے۔ یہ انتخاب نظر جوہری کی جوہر شناسی اور مطالعہ کی وسعت چاہتا ہے اور ہر وسیع مطالعہ کا حامل جوہری بڑا صاحب نظر اور معیاری نثر نگار ہوتا ہے۔

زبان کی خصوصیت اور جامعیت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھائے۔ زندگی کو ظاہر کرے نہ کہ چھپائے اور یہ کام نثر سے بہتر کوئی صنف انجام نہیں دے سکتی۔ نثر کی کامیابی کا راز بھی اس میں مضمر ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔

معیاری نثر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نثر کے طویل اور پرپیچ آہنگ میں متوازن

کی بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ صفت بہ صفت کا اضافہ چونکہ تاثر کو مجروح کر دیتا ہے اس لیے نثر نگار کم لفظوں میں آہنگ کی تلاش کرتا ہے۔

احساس و ادراک کسی معیاری اور اچھی نثر کی تخلیق کے لیے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل نثر میں احساس و ادراک کو جو حیثیت حاصل ہے اس کی رو سے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ کس واقعے نے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ جذبات کے اس ابال نے ناول، افسانے، انشائیے اور مضمون و مقالے کی شکل کس طرح اختیار کیا۔

شبلی نے دل پر اثر کرنے والی ایک طویل فہرست دی ہے۔ سامعہ، باصرہ، شامہ، لامسہ اور ذائقہ وغیرہ معیاری نثر ان سب پر بیک وقت اپنے اثر مرتب کرتی ہے۔ غرض یہ کہ معیاری نثر جذبات، تخیل، احساس و ادراک، منظر کشی و محاکات، آہنگ، استعارہ، تشبیہ، لفظوں کی پیکر تراشی، اصنام کی صورت گری، موسیقی کے جادو، نغمے کی گت اور سنگ تراشی کا کمال کے مجموعہ کا نام ہے۔

معیاری نثر کی ایک اور اہم خصوصیت وسیع دامنی ہے۔ وسیع دامنی سے مراد الفاظ کی بے جا بھیڑ نہیں بلکہ اسالیب بیان میں اظہار بیان پر قدرت ہے۔ مسائل حیات کے ہر گوشے کے حال کا اظہار نثر میں ہونا اس کی کامیابی دلالت کرتا ہے۔ تاریخ ہو یا فلسفہ، معاشیات ہو یا سماجیات ہر موضوع پر اظہار بیان کے بہترین طریقے ہی میں نثر کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ ایلیٹ نے شاعری کو مقامی اور نثر کو عوامی یا عالم گیری کردار سے متصف قرار دیا ہے جس سے مراد خیالات اور تعلیمات میں وسعت ہے۔ اچھی نثر اسی لیے اپنا ایک بین اقوامی کردار رکھتی ہے۔ کسی زبان کی شاعری کسی غیر ملکی زبان میں منتقل نہیں کی جا سکتی لیکن نثر بہت حد تک الفاظ کے متعین مفہوم کے ذریعے ترجمے کا لبادہ پہن سکتی ہے۔ نثر میں یہ خوبی الفاظ کے متعین مفہوم، بیان کے مدلل ہونے، متانت اور منطقی استدلال کو مدنظر رکھنے اور خیالات کا سنجیدگی کے ساتھ اظہار کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

معیاری نثر کی تخلیق میں ایک اور اہم بات پیش نظر رکھنی ہوتی ہے وہ یہ کہ نثری اسلوب میں شخصیت سیدھے سادے طریقے سے جلوہ گر نہ ہو۔ یہاں نثر نگار کی شخصیت الفاظ کی چھلنی میں چھن کر آتی ہے اور یہ الفاظ بھی ایک خاص سانچہ رکھتے ہیں جو الفاظ ایک شخص استعمال کرتا ہے وہ ایک دور یا روایت یا مزاج کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں یعنی وہ اجتماعیت کے ساتھ انفرادی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ معیاری نثری اسلوب وہ نہیں جس میں کسی شخص کے من کی موج نمایاں ہو بلکہ وہ ہے جس میں اس کے دور کی روح اور اس کے امکانات کی زیادہ پذیرائی ہوئی ہو۔ سر سید کا اسلوب ان کے ہم عصروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ معیاری نثر کی جو تعریف بھی کی جائے اس کے دامن میں سنجیدہ نثر کے تمام پہلوؤں کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش ہونی چاہیے۔ اس کے معنی کتابی نثر کے نہیں۔ کیونکہ لفظ کتابی میں بول چال کی بے ساختگی سے دوری اور اصطلاحات کی خامی بدرجہ کا پہلو آگیا ہے۔ نثر کا اچھا اسلوب بڑی حد تک قطعی ہوتا ہے اور ایک لفظ ہٹا دینے سے مفہوم کے بدلنے کا خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے۔

معیاری نثر کا اسلوب ایک ایسی تلوار کی طرح ہوتا ہے جو ننگا ہونے سے او جھل رہ کر اپنا کام کر جا

اور غیر ضروری تفصیلات سے احتراز پایا جاتا ہے جو ایک معیاری اور اچھی نثر کی خصوصیت ہے۔

وضاحت اور قطعیت پر جو زور اردو نثر میں ملتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ نثر کی زبان اکتاہٹ پیدا کرے اور سپاٹ ہو۔ وضاحت ایک اہم شرط ہے اور اس راستے میں جو چیز بھی حائل ہو وہ عیب ہے، بیان میں ابہام یا اشکال خیال سے کم اور الفاظ سے زیادہ پیدا ہوتا ہے اگر خیال واضح نہیں ہے تو کبھی کبھار اسے آرٹ سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ واضح خیال اپنے ساتھ خود واضح بیان لاتا ہے مڈلٹن مرے نے خلوص پر، اقبال نے خون جگر پر زور دیا ہے لیکن حقیقت تو یہ کہ خلوص کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ذہن کی روشنی بھی۔ گو بات اس طرح کہی جائے گویا اس پر نازل ہوئی ہو اور یہی چیزیں معیاری اور اچھی نثر کی تخلیق میں معاون ہوتی ہیں۔ اردو نثر کے ترنم میں اسرار کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اس میں وضاحت کے ساتھ ہی ایک سہولت بیان، سبک روی اور لوچ پایا جاتا ہے جو زبان کی پختگی الفاظ کے تناسب اور ان کے صوتی مطالبات کا لحاظ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اردو نثر کی یہ خصوصیت برسوں کے معیاری ارتقاء کا فیضان ہے۔

معیاری اردو نثر اس دھوپ کی طرح ہے جو ہر چیز کو آئینہ کر دیتی ہے۔ یہ وہ تلوار ہے جو حق و باطل کا فیصلہ کر سکتی ہے اور یہ وہ اینٹ ہے جو بقول آل احمد سرور "اگر دوسری اینٹ کے ساتھ مل جائے تو تاج محل بھی بنا سکتی ہے۔ معیاری نثر جذبے کے تحمل شاداب سے اگتی ہے۔ یہ ہمارے جذبات کا پرتو، ان کا فطری عمل یا رد عمل ہوتی ہے اس کا ایک مخصوص آہنگ ہوتا ہے۔ آہنگ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایک آہنگ سے مراد ایک خاص قسم کی موسیقی اور نغمگی ہے۔ شاعری میں یہ موسیقیت الفاظ کی تکرار اور ٹکراؤ سے حاصل ہوتی ہے۔ نثر میں تکرار ناگوار ہوتی ہے۔ یہاں پیرائے بدل بدل کر اسے حاصل کیا جاتا ہے کبھی الفاظ بدل دیے جاتے ہیں کبھی ان کا استعمال بدل جاتا ہے۔ الفاظ اپنا وجود رکھتے ہیں اور ہر وجود کا ایک عمق ہوتا ہے۔ لمبائی چوڑائی موٹائی اور گہرائی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہشت پہل ہیرے کی طرح ہوتا ہے جب کوئی ہنرمند صنّاع ان سے کام لیتا ہے تو اپنی صلاحیت اور ہنرمندی کے مطابق اسے اتنی ہی خوبصورت شکل دے دیتا ہے۔ نثر میں الفاظ کو برتنے والا شخص ان پہلوؤں سے بھی واقف ہوتا ہے جو شاعری میں اب تک لوگوں کی نگاہ سے چھپی رہ گئی تھیں یہاں پوشیدہ پہلوؤں میں سے بھی وہ ان ہی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جن میں ایک مخصوص کھنک باقی ہے اور یہ کھنک ہی وہ آہنگ بن جاتی ہے جو دیدہ و دل کو شاد کام کرتی ہے۔ یہ انتخاب نظر جوہری کی جوہر شناسی اور مطالعہ کی وسعت چاہتا ہے اور ہر وسیع مطالعہ کا حامل جوہری بڑا صاحب طرز اور معیاری نثر نگار ہوتا ہے۔

زبان کی خصوصیت اور جامعیت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھائے۔ زندگی کو ظاہر کرے نہ کہ چھپائے اور یہ کام نثر سے بہتر کوئی صنف انجام نہیں دے سکتی۔ نثر کی کامیابی کا راز بھی اس میں مضمر ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔

معیاری نثر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نثر کے طویل اور پُرپیچ آہنگ میں مترادفات

کتاب نما

کی بھیڑ ممکن نہیں ہوتی۔ صفت پر صفت کا اضافہ چونکہ تاثر کو مجروح کر دیتا ہے اس لیے نثر نگار کم لفظوں میں آہنگ کی تلاش کرتا ہے۔

احساس وادراک کسی معیاری اور اچھی نثر کی تخلیق کے لیے اہم حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل نثر میں احساس وادراک کو جو حیثیت حاصل ہے اس کی رو سے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ کس واقعے نے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ جذبات کے اس ابال نے ناول، افسانے، انشائیے اور مضمون ومقالے کی شکل کس طرح اختیار کیا۔

شبلی نے دل پر اثر کرنے والی ایک طویل فہرست دی ہے۔ سامعہ، باصرہ، شامہ، لامسہ اور ذائقہ وغیرہ معیاری نثر ان سب پر بیک وقت اپنے اثر مرتب کرتی ہے۔ غرض یہ کہ معیاری نثر جذبات، تخیل، احساس وادراک، منظر کشی و محاکات، آہنگ، استعارہ، تشبیہہ، لفظوں کی پیکر تراشی، اصنام کی صورت گری، موسیقی کے جادو، نغمے کی گت اور سنگ تراشی کا کمال کے مجموعہ کا نام ہے۔

معیاری نثر کی ایک اور اہم خصوصیت وسیع دامنی ہے۔ وسیع دامنی سے مراد الفاظ کی بے جا بھیڑ نہیں بلکہ اسالیب بیان میں اظہار بیان پر قدرت ہے۔ مسائل حیات کے ہر گوشے کے حال کا اظہار نثر میں ہونا اس کی کامیابی دلالت کرتا ہے۔ تاریخ ہو یا فلسفہ، معاشیات ہو یا سماجیات ہر موضوع پر اظہار بیان کے بہترین طریقے ہی میں نثر کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ ایلیٹ نے شاعری کو مقامی اور نثر کو عوامی یا عالم گیری کردار سے متصف قرار دیا ہے جس سے مراد خیالات اور تعلیمات میں وسعت ہے۔ اچھی نثر اسی لیے اپنا ایک بین اقوامی کردار رکھتی ہے۔ کسی زبان کی شاعری کسی غیر ملکی زبان میں منتقل نہیں کی جا سکتی لیکن نثر بہت حد تک الفاظ کے متعین مفہوم کے ذریعے ترجمے کا لبادہ پہن سکتی ہے۔ نثر میں یہ خوبی الفاظ کے متعین مفہوم، بیان کے مدلل ہونے، متانت اور منطقی استدلال کو مد نظر رکھنے اور خیالات کا سنجیدگی کے ساتھ اظہار کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

معیاری نثر کی تخلیق میں ایک اور اہم بات پیش نظر رکھنی ہوتی ہے وہ یہ کہ نثری اسلوب میں شخصیت سیدھے سادے طریقے سے جلوہ گر نہ ہو۔ یہاں نثر نگار کی شخصیت الفاظ کی چھلنی میں چھن کر آتی ہے اور یہ الفاظ بھی ایک خاص سانچہ رکھتے ہیں جو الفاظ ایک شخص استعمال کرتا ہے وہ ایک دور یا روایت یا مزاج کے بھی آئینہ دار ہوتے ہیں یعنی وہ اجتماعیت کے ساتھ انفرادی خصوصیت بھی رکھتے ہیں۔ معیاری نثری اسلوب وہ نہیں جس میں کسی شخص کے من کی موج نمایاں ہو بلکہ وہ ہے جس میں اس کے دور کی روح اور اس کے امکانات کی زیادہ پذیرائی ہوئی ہو۔ سرسید کا اسلوب ان کے ہم عصروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ معیاری نثر کی جو تعریف بھی کی جائے اس کے دامن میں سنجیدہ نثر کے تمام پہلوؤں کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش ہونی چاہیے۔ اس کے معنی کتابی زبان کے نہیں۔ کیونکہ لفظ کتابی میں بول چال کی بے ساختگی سے دوری اور اصطلاحات کی خاصی بدپرہیزی کا پہلو آگیا ہے۔ نثر کا اچھا اسلوب بڑی حد تک قطعی ہوتا ہے اور ایک لفظ ہٹا دینے سے مفہوم کے بدلنے کا خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے۔

معیاری نثر کا اسلوب ایک ایسی تلوار کی طرح ہوتا ہے جو نگاہوں سے اوجھل رہ کر اپنا کام کر جائے

جس طرح اس بھرپور وار میں پھرتی اور چابکدستی ہوتی ہے، اسی طرح اچھی نثر میں ایک سریع النفوذ اور برق اثر کیفیت ہوتی ہے کہ جس میں طاقت، مہارت اور تیزی مل کر قیامت بن جاتی ہے۔ مڈلٹن مرے نے اسی کو پُرجوش ادعا Effectiveness of Assertion کہا ہے۔ معیاری نثر گویا کہ ندا کی وہ آواز ہے جس پر سوائے لبیک کہنے کے کوئی چارہ نہیں۔ یہاں عظمتِ حُسن ہے اور عظمتِ حسن بقول پروفیسر آل احمد سرور "یہ الفاظ کی فوج پر انسان کی فتح ہے اور اسی لیے لازوال اور لافانی ہے۔

اچھی نثر بے ساختہ معلوم ہوتی ہے اور اس کے پیچھے صدیوں کے ذہن کا عطر اور ایک شخصیت کی بصیرت اور گرمی ہوتی ہے۔ یہاں الفاظ اپنی مخصوص نشست میں نظر آتے ہیں۔ نیز خیال اور الفاظ کے درمیان ایک ایسا ربط ہوتا ہے جس سے معنیٰ و مطالب بھی اپنی پوری کیفیت کے ساتھ ادا ہوتے ہیں۔ ان کی مجموعی ترکیب ایسی ہوتی ہے کہ فنی ہیئت اور اسلوب بھی حسن و خوبی کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ یہاں خیالات کو موثر بنانے کے لیے جذبات سے نہیں کھیلا جاتا بلکہ خیالات کی صحت، رفعت اور ان کے تسلسل سے کام لیا جاتا ہے۔ جس سے جملے ہی نہیں فقرے بھی بڑی چستی کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا جوڑ بھی نظر نہیں آتا۔

معیاری اور اچھی نثر کا آہنگ خامی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے جس طرح اچھا شعر کہنا مشکل ہے اسی طرح اچھی نثر بھی لکھنا آسان نہیں۔ اس میں لکھنے والے کو اپنی شخصیت کھونی پڑتی ہے اور زندگی کا خون دے کر اس کی آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ مولانا آزاد نے غبارِ خاطر میں ایک جگہ چڑیا کی شکل و صورت کا نقشا اتنی خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے کہ نظروں کے سامنے نہ صرف منظر بلکہ اس کی ساری کیفیت پھر جاتی ہے۔

"چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دم اور گول گول آنکھیں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولاپن، ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی تھیں۔ گویا پوچھ رہی تھی درد تو نہیں ہو رہا۔۔۔"

آزاد کی نثر میں معیاری نثر کے بعض اعلا نمونے ملتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کا تجزیۂ احساس ہے۔ ابوالکلام کا ادراک اور احساس نہایت وسیع اور پیچیدہ ہے۔ وہ کسی شے کی حقیقت کے کسی ایک نقطے کا بھی ادراک کر لیتے ہیں تو ان کے سامنے احساسات کی ایک دنیا آجاتی ہے اور ان کی نازک اور باریک حس پر اس دنیا کے تمام طبقات روشن ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اسی کیفیت کو بیان کرنے لگتے ہیں تو اس کو مبہم اور مہمل نہیں چھوڑتے۔ اس کی ہر ہر ادا کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جذبے کی گرمی ہے جو انھیں نبض کی دھڑکن عطا کرتی ہے۔ ایک بات لطف یہ کہ تحریریں فرداً فرداً اپنا مجموعی پیکر بھی بناتی ہیں جو بولتا ہوا ہوتا ہے اور یہ ساری چیزیں ان کے باصرہ اور سامعہ کی تیزی اور کار آفرینی کے ساتھ مل کر ایک معیاری اور کامیاب نثر پیش کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"آنکھیں کھلیں تو عہدِ شباب کی صبح ہو چکی تھی اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف

دیکھا تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دل پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ صبح فریب نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ سارا شہرستان امید اور نگارخانۂ نظر فریب سے صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں کے لیے بنا ہے اور گویا گوشہ گوشہ ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم براہ ہے جس طرف کان لگایا یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنے ہی گنبد غفلت اور ہنگامہ ہوس کی گونج تھی یا نوگرفتار طلسم شباب کی ہوشربائیوں کے لیے خود ساز ہستی کا نوائے فریب ہی ایسا ہی ہے!!

آزاد کی نثر معیاری اس لیے بھی کہی جا سکتی ہے کہ اس میں ایک بڑے انسان کی حیات دھڑک رہی ہے۔ ان سطور کا سحر مواد میں نہیں بلکہ اس نادر اسلوب میں ہے جو ایک شخص کے خیال کو زندہ و رواں شکل دے سکتا ہے اور یہی ہے ایک کامیاب نثر کا خاصہ۔

اردو نثر کا پہلا بہتر اور معتبر نمونہ سرسید کے یہاں ملتا ہے۔ سرسید نے قبل کی نثری روایتوں سے جہاں فائدہ اٹھایا وہیں انھوں نے ان اسالیب بیان سے یکسر بغاوت بھی کی۔ ان تحریروں میں خیالات میں وزن اور اظہار و بیان میں زور پایا جاتا ہے جو ایک معیاری نثر کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ سرسید نے نثر کو بحث و مباحثے اور استدلال کے سائنٹفک بنیادوں پر استعمال کیا اور اسے تشبیہ و استعارے کی بوجھل آرایش سے منزہ کیا جس سے نثر میں صلاحیت پیدا ہو گئی کہ علمی موضوعات پر اظہار خیال کا ذریعہ بنائی جا سکے۔ سرسید کی تحریر کا ایک نمونہ دیکھیے۔

"پس سویلزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلے میں لانا، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریقہ تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچایا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت۔"

کامیاب اور معیاری اردو نثر میں آزادانہ سوچنے اور سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان ہونا ضروری ہے۔ کامیاب نثر کا انداز نہ خالص رومانی ہونا چاہیے اور نہ خالص کلاسیکی۔ اس میں رومانیت کی اگر کوئی ادا ہو تو صرف یہی کہ فکر و ادب میں پرانی روایات اور قدیم اسالیب کی پیروی کو ضروری خیال نہیں کیا جانا چاہیے۔ نثر نگار کا مزاج بظاہر کلاسیکی معلوم ہونا چاہیے مگر اس کی کلاسیکیت میں رومانیت کی جھلکیاں بھی ملنی چاہییں۔ معیاری نثر میں حقیقت زیادہ اور افسانویت Fiction یعنی جو اعلا ادب خصوصاً رومانی ادب میں موجود ہوتی ہے کم ہونی چاہیے اور یہ ساری چیزیں سرسید کے یہاں جمع ہو گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"ناصحان شفیق نے ہم کو کبھی کچھ کہا اور کبھی کچھ آخر کار کافر و ملحد ٹھہرا ہی دیا۔ دور و نزدیک کے مولوی صاحبوں سے کفر کے فتووں پر مہریں چھپوا کر منگوائیں اور ہمارے

اوپر تا مع حقیقت جناب مولوی حاجی سید امداد علی صاحب نے ایک رسالہ چھاپ ہی دیا اور وہ امداد الآفاق، اس کا نام رکھا بھلا اور کچھ ہو یا نہ ہو بچارے غریب چھاپہ والے کو فائدہ ہو گیا۔ اسی سال میں ہماری تحریرات کی تردید میں مولانا علی بخش خاں صاحب بہادر نے (جو امید ہے کہ اب تک حاجی بھی ہو گئے ہوں گے اور انشاء اللہ تعالیٰ آیندہ سے ان کو بھی حاجی لکھا کریں گے) دو رسالے تحریر فرمائے جن میں سے ایک کا نام شہاب ثاقب اور دوسرے کا نام تائید الاسلام۔ اخباروں میں نور الانوار اپنا نور عالم میں برساتا ہی تھا۔ مگر اس سے ایک اور اوپر پرچہ ان کے گھر کا اُجالا مسمّیٰ بنور الآفاق لامع ظلمۃ النفاق پیدا ہوا ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہے اور ہمارے اس پرچہ تہذیب الاخلاق کے جواب میں نکلا، اس کے مضامین ظاہراً تو جناب حاجی مولوی سید امداد علی صاحب بہادر کے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ مگر بعض لوگ ان مضامین کو لے پالک بتاتے ہیں۔ بہرحال ہم کو اس سے کیا کہ وہ میاں نظیر کے ہیں یا میاں بشیر کے ہیں۔ کسی کے ہوں مگر دلچسپ ہیں خدا ان کی عمر دراز کرے۔"

معیاری نثر کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ دقیع حقائق و جذبات کے ہمراہ اس میں حسن و جمال کے رنگ بھی موجود ہوں تحریر سادہ بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ دلکش اور لطیف بھی۔ نیز ان نثری ادب پاروں کی حیثیت کسی کاروباری چیز کی نہیں بلکہ اظہار و خیال کے وسیلے سے ہونی چاہیے۔ نثر کی کامیابی کا ایک بڑا سبب نثر نگار کا خلوص ہوتا ہے۔ یہ تجربات کی صداقت سے پیدا ہوتا ہے۔ خلوص سے مراد یہ کہ فن کار کو اس بات کا احساس ہو کہ وہ جو کچھ کہہ سکے دل کی آواز ہو۔ اور اسی احساس کی وجہ سے فنکار کو اپنے تجربات کی سچائی کا یقین ہوتا ہے۔ بعض حالات میں بول چال کا بے تکلف انداز نثر کو مزید خوبیوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ جو دراصل اس امر کا ثبوت ہوتا ہے کہ کوئی مصنف یا نثر نگار اپنے عصر اور ماحول سے بیگانہ نہیں۔ جب ادیب اپنے عصر کی زندگی سے بے خبر ہوتا ہے یا بے خبر رہنا چاہتا ہے تو کتابی زبان اور بول چال کی زبان میں فاصلہ ناقابل عبور ہو جاتا ہے۔ نثر نگار کو نثری تقاضوں کا پورا پورا احساس ہونا چاہیے۔ نیز ادبی شگفتگی پیدا کرنے کے لیے ہر موقع پر جداجدا مقتضیات کا خیال رکھنا چاہیے۔ مرزا غالب کی نثر جس کا سرمایہ خطوط پر مشتمل ہے ان ساری خصوصیات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ رام پور کے ایک جشن کی کیفیت اپنے ایک خط میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) "آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔ دن اور شام کا کھانا یہیں کھائیں گے روشنی اور آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی، طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع، اس مجلس کو کوالف الملک کہنا چاہیے۔"

(۲) "کون کہتا ہے کہ میں قید سے رہا ہوا ہوں پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں"

(واضح رہے کہ یہاں کالے سے مراد کالے خاں کا مکان ہے)

(۳) "۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا تیرہ برس حوالات

میں رہا۔ ۷، رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی میرے
پاؤں میں ڈال دی، دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر
کو مشقت ٹھہرایا۔" "غلہ گراں ہے موت ارزاں ہے، میوے کے مول اناج بکتا ہے
ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر۔۔۔۔"

غالب نے اردو نثر کو شخصیت سے روشناس کرتے ہوئے اس میں متانت کے ساتھ سلاست اور سادگی پیدا کی۔ اردو میں سنجیدہ طنز و ظرافت کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا بھی غالب کے سر ہے۔

معیاری نثر کا ذکر نامکمل رہے گا اگر اس ضمن میں حالی سے متعلق گفتگو نہ کی جائے — اردو نثر کو صاف ستھری اور معیاری بنانے میں سرسید نے جو خدمات انجام دیں اور غالب نے اردو نثر کی قدیم روایتوں سے جس طرح یکسر بغاوت کی یہ اس بات کا متقاضی تھا کہ کوئی شخص اردو نثر نگاری کی ان دونوں روایتوں کے بہترین اجزا ایک جگہ جمع کر دے اور بلاشبہ حالی نے یہی کیا۔ حالی کی نثر اس لیے بھی سرسید کی نثر سے زیادہ خوبیوں کی حامل ہے کہ اس میں دونوں خصوصیات جمع ہو گئی ہیں — حالی کی تحریروں کی سادگی، لطافت اور سہولت سے پُر ہے۔ حالی کی منطقیت شاعرانہ منطق کی نرم و نفیس کیفیت میں ڈوبی ہوتی ہے۔ قیاس تمثیل سے کام لے کر حالی شاعروں کی طرح بعض قضیوں کو حسن تعلیل کی صورت دیتے ہیں۔ حالی کی قطعیت میں شاعرانہ تیقن کا اندازہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حالی کی سادہ نگاری کی خصوصیات میں ایک اہم چیز ان کا فطری انداز ہے۔ انھیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ عبارتوں میں خواہ مخواہ عالمانہ شان پیدا کرنا نثر کی کامیابی کے لیے بہتر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ترکیبوں میں عربی فارسی انداز سے بڑی حد تک بچتے تھے اور شاید یہی اُن کی کامیابی کا راز ہے۔

حالی کی نثر کا نمونہ۔

"سب سے مقدم اور ضروری چیز جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دے دیتی ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے۔ جس کو انگریزی میں امیجنیشن کہتے ہیں۔ یہ قوت جس شاعر میں اعلا درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلا درجہ کی ہوگی۔ یہ وہ ملکہ ہے جس کو شاعر اپنے ساتھ ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے اور جو اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر کی ذات میں یہ ملکہ موجود ہے اور باقی شرطوں میں جو کہ کمال شاعری کے لیے ضروری ہیں کچھ کمی ہے تو اس کی کمی کا تدارک اس ملکے سے کر سکتا ہے لیکن اگر یہ ملکہ فطرتی کسی میں موجود نہیں تو اور ضروری شرطوں کا کتنا ہی بڑا مجموعہ اس کے قبضے میں ہو وہ ہرگز شاعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ وہ طاقت ہے جو شاعر کو وقت اور زمانے کی قید سے آزاد کرتی ہے۔ ماضی و استقبال کو اس کے لیے زمانۂ حال میں کھینچ لاتی ہے۔"

(مقدمہ شعر و شاعری)

ایک کامیاب نثر نگار کو جوشِ بیان سے متصف ہونا چاہیے لیکن جوشِ بیان بھی نثر کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ احساسِ کمال اور احساسِ عظمت کی پیداوار نہ ہو۔ نثر میں کہیں

کہیں خطیبانہ فلسفیانہ انداز اختیار کرنا چاہیے لیکن اسی وقت جب نثر نگار اس کی ضرورت محسوس کرے نثر نگار کی خود اعتمادیت نثر میں اعلادرجے کی جمعیت اور صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبارتوں کی داخلی معنوی تنظیم کی طرح اس کا ظاہری منطقی نظام بھی نہایت چست اور مکمل ہو جاتا ہے اور یہ چست فقرے، فکری نظم و ضبط کے لحاظ سے نثر کا شاہکار نمونہ بن جاتے ہیں۔ ان خوبیوں کو برتنے کے علاوہ اگر ایجاز و اختصار کی طرف نثر نگار کا میلان ہو تو پھر کیا کہنا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خوبیوں کو برتنے والا نثر نگار کون ہے؟ اس کا جواب بہت ہی آسان ہے اور بہت ہی حقیقت پسندانہ۔ مثال کے طور پر ہم شبلی کا نام پیش کر سکتے ہیں۔

یہ شبلی ہی ہیں جنھوں نے سرسید سے متعلق رہنے کے باوجود ان سے بغاوت کی۔ بغاوت کا ہلکا سا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑا ہے۔ ان کا ذہن زندگی کے نرم اور معتدل کیفیتوں کا شائق نہیں جو ایک ادیب کے شایانِ شان ہے۔ شبلی کی تحریروں میں تپش کم ہیں اور جو بھی ہیں وہ خاص موقعوں پر شبلی کی نثر کا خاص امتیاز ان کی شعریت ہے اور اس میں بھی وہ عناصر زیادہ ہیں جو غزل سے مخصوص ہیں۔

شبلی ایک کامیاب نثر نگار کی طرح حسن کاری کی ایک خاص شان پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ان کے شاعرانہ بیان کے ساتھ ان کی نثر کو صوتی اور ظاہری اعتبار سے بھی اثر، حسن اور لطف کا نادر مجموعہ بنا دیتا ہے۔ ولولہ انگیز اور پرجوش خیالات کے اظہار کے وقت شبلی کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی موسیقی پیدا ہو جاتی ہے جو ساری عبارت کے مدوجزر میں، خوشگوار لے کو ابھارتی ہے۔

معیاری نثر کے اعلا نمونے عبدالحق کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں لیکن یہاں مصنف کی شخصیت اور انفرادیت اس قدر نمایاں ہے کہ اس چیز نے اس کی کامیابی کو مجروح کر دیا ہے اگر یہاں نثر نگار کی شخصیت نمایاں نہ ہوتی تو شاید معیاری نثر کا بہترین نمونہ ہوتا۔

شاعری کی مذکورہ بالا مثال سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ معیاری نثر کا اعلا نمونہ اس وقت تخلیق ہوتا ہے جب کوئی زبان تجربات کی منزلوں سے کافی آگے نکل چکی ہوتی ہے۔ نثر نگار کے ہاتھ میں الفاظ کا ایک ایسا ہتھیار ہو جن کے ذریعے وہ گہرے گہرے مفہوم کو قابل فہم مستحکم اور منضبط انداز میں ادا کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہو۔

معیاری نثر جس کی خصوصیات کی نشاندہی حسطور بالا میں کی گئی ہے زبان کے ارتقا میں پختگی کو ظاہر کرتی ہے یوں تو اس کم عمر زبان کے سرمایے میں بھی ادبی اسالیب کا ایک نیا بازار نظر آتا ہے اور انفرادی رنگ اپنی اپنی جگہ دیدہ زیب اور سامعہ نواز ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم خطابت اور شاعری کے سحر سے آزاد ہو کر نثر کے حدود کو اب تک نہیں پہچان سکے ہیں اور جب تک ایسا نہیں ہوتا ہے سرسید حالی اور عبدالحق کے کارنامے کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

عبدالمعروف خاں
ذاکر باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

کنفیوژن

یہ نکہت و نور کی دنیا۔ پروقار و عظیم دنیا۔ اوروں کے لیے دلکش اور حسین دنیا مگر میرے لیے ۔ افسوس بے معنی دنیا۔ جہاں بھی جاؤں جدھر بھی دیکھوں خود کو اجنبی پاتا ہوں۔ دنیا کی دلکشی و رنگینی صرف میری اجنبیت کو بڑھاوا دیتی ہے۔ ساری دنیا میرے لیے وہ دکان ہے جس میں قدم نہیں رکھ سکتا کیونکہ جو سکہ وہاں چلتا ہے میری گانٹھ میں نہ کبھی تھا نہ آج ہے۔

اس قدر بے معنی اور بے مصرف ہونے پر بھی میں یہاں کیوں ہوں اور کیا کر رہا ہوں یہاں سے چلے جانے کا خیال اکثر آیا اور اب بھی آتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ جاؤں کہاں کہ یہ دنیا میرے خیال سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ہر خطے اور ہر قریے اور ہر ملک میں ایک سی ہے۔ جگہ بدل لینے سے صرف کچھ کر لینے کا احساس ضرور ہوگا مگر اجنبیت پیچھا نہ چھوڑے گی تھوڑے سے وقت کے بعد ہر احساس اور ہر امنگ مضمحل ہو جائے گا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ اس مخصوص احساس کا مارا دنیا میں میں اکیلا ہوں۔ یہ ممکن نہیں۔ کوئی نہ کوئی تو مجھ جیسا ہوگا ہی۔ کیوں نہ اسے تلاش کروں۔ مل گیا تو تنہائی کی دبیز چادر ہٹے نہ ہٹے ہلکی ضرور ہو جائے گی۔ منزل مبہم اور مقصد موہوم ہے پھر بھی نکلوں دیکھا جائے گا۔

ایک اونچے مکان کے سایے تلے کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ملتے ہیں۔ میں اُن کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ بظاہر کھلے کھلے سے لوگ، بے نقاب باتیں کرنے والے مجھے بھانے لگتے ہیں اور میں ان کے نغل میں بچھ جاتا ہوں۔ آسودگی کی چادر سایہ کر لیتی ہے اور جانے کتنے عرصے کے بعد نیند کا گمان ہونے والا ہی تھا کہ ایک بات دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے وہ ہے ان لوگوں کی آنکھوں کی کیفیت۔ ذرا غور سے جھانکنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ دنیا کو بڑی حسرت و امید کے ساتھ تک ساتھ رہے ہیں۔ تھوڑا کھلنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں دنیا نے "ناٹ باہر" کر دیا ہے۔ اور اب یہ صرف اس امید پر جی رہے ہیں کہ شاید ترس کھا کر دوبارہ انھیں برادری میں شامل کر لیا جائے ——— یہ وہ لوگ تو نہیں جنھیں اپنا یا اپنے جیسا کہا جا سکے یہ احساس ہتھوڑے کی طرح دماغ پر گرتا ہے اور اس کی چولیں ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ آسودگی کی موہوم سی چادر دھیرے دھیرے تحلیل ہونے لگتی ہے اور میں بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔

پتا نہیں کب تک بھاگتا رہتا ہوں۔ سانس اکھڑ جاتی ہے اور بے سدھ ہو کر گرنے لگتا ہوں۔

گرنے سے پہلے یہ دیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں کہ آگے قریب ہی ایک وادی ہے جس کی جھلمل روشنی جانے کیوں امید افزا محسوس ہوتی ہے۔ بیہوش ہونے سے پہلے قدرے اطمینان ہو جاتا ہے۔

ہوش آنے پر محتاط قدموں سے ڈرتے جھجکتے وادی کی طرف قدم بڑھاتا ہوں۔ بہت دیر تک تنہا اپنی دھن میں مگن چلتا رہتا ہوں ــــ اچانک محسوس ہوتا ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ اور میری سمت میں چلنے والے سائے انسان ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی سے بات نہیں کرتا اور اپنے کام میں مگن ہے۔ ہر چہرہ منجمد ہے جس پر خاموشی اپنا آسن جمائے بیٹھی ہے۔ لگتا ہے مسکراہٹ دھوپ ان چہروں پر کبھی پڑی ہی نہیں۔ اچھا ہی ہوا اگر پڑتی تو جم جاتی۔

بہت صاف صاف سا ماحول ہے جس کو کام سونپا گیا ہے قرینے سے ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے بے حد خوبصورت اور حسین سڑکیں ہیں مگر سوئی ہوئی۔ سربلند اور پروقار عمارتیں مگر بیزار اور اکتائی ہوئی۔ لوگ چلتے پھرتے نظر آرہے ہیں مگر یہ بھی بالکل صاف صاف نظر آتا ہے کہ زندگی ایک مقام پر تھم گئی ہے جم گئی ہے۔

پورے ماحول کو جذب بھی نہیں کر پاتا کہ پکڑا جاتا ہوں

کئی انسان نما سپاہی مجھے گھیرے میں لے لیتے ہیں جانے کس کے ہونٹ ہلتے ہیں مگر آواز جیسے ہر طرف سے آرہی ہو۔ آپ ہمارے رہنما کے مہمان ہیں۔ آپ کے لیے مکان اور کار کا انتظام کر دیا گیا ہے آپ اس کالی مرسڈیز میں بیٹھ جائیے۔ میں نیند کی سی کیفیت میں گاڑی میں بیٹھ جاتا ہوں۔ ایک بے حد تنا ہوا جذبات سے عاری چہرہ بغل میں نظر آتا ہے۔ پوچھنا ہی پڑتا ہے کہ وہ کون ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ وہ مترجم ہیں اور آج سے میرے ساتھ ہی رہیں گے۔ اس کی منجمد شخصیت میرے اندر سردی کی لہریں بھر دیتی ہے مگر اب تک میں اس قدر خائف اور اتنا سہم چکا ہوں کہ انکار تو درکنار اس شخص کی رفاقت ممنونانہ انداز میں قبول کرتا ہوں اور چل پڑتا ہوں۔

گاڑی حرکت میں آتی ہے اور سناٹے کی چیخ کی طرح سڑکوں پر بے تکان تیرتی ہوئی منزلیں طے کرنے لگتی ہے۔ سڑکوں پر چلنے والے بے حد منظم طریقے سے تیز تیز چلے جا رہے ہیں۔ کسی بھی قسم کی کوئی آواز نہیں۔ ہنسنا بولنا تو شاید یہاں کا دستور ہی نہیں۔ میں آخر کار ایک عمدہ نظر آنے والے مکان میں ٹھیل دیا جاتا ہوں۔ عمارت کی عظمت، فرنیچر کی نفاست جنھیں میں اپنی سوچوں کی دنیا میں بھی نہ دیکھ سکا تھا میرے استعمال کے لیے حاضر تھے ــــ مگر یہ کیا۔ خوشی کے بجائے ایک عجیب سا احساس گھیر لیتا ہے۔ سنٹرل ہیٹنگ سسٹم کے باوجود سردی کی لہر ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ پورا مکان خوش آمدید کہنے کے بجائے کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ ایک منجمد سا انسان کھانے کے وقت کا اعلان کرتا ہے ــــ کھانا دیکھنے میں اچھا مگر بولتا ہوا کہ میں صرف خوردنی ہوں مجھ میں کسی قسم کے خلوص کی حرارت مت تلاش کرو۔ بھوکا تھا ہی جو ملا پیٹ میں اتار لیا اور واپس آکر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو لگا کہ سویرا ایسا کہ شب دیجور بھی شرمائے۔ سناٹا ایسا کہ کلیجہ منہ کو آئے۔ اتر کام پر قریب قریب روتے روتے درخواست کرتا ہوں کہ خدارا کسی انسان کو بھیج دیجیے۔ تنہائی مجھے ڈس رہی ہے اور عجب نہیں کہ نگل ہی جائے۔

جواب میں آواز آتی ہے کہ انسان تو یہاں ہزاروں سال پہلے رہتا تھا اب تو میوزیم میں بھی کوئی باقی نہیں رہا۔ روبوٹ ہیں جس قدر کہے بھیج دیے جائیں۔

"مگر میں روبوٹ نہیں انسان ہوں مجھے انسانوں کی رفاقت چاہیے"

"یقیناً آپ کچھ دیر تک انسان ہی ہیں مگر آپ کو روبوٹ بنانے کا کام شروع ہو چکا ہے آپ کی الجھنیں اور پریشانیاں بس ختم ہی ہوا چاہتی ہیں"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ آپ کا سربراہ انسان ہے پھر میں کیسے مان لوں کہ یہاں سرے سے انسان ہوتے ہی نہیں"

"سربراہ کا نام احترام سے لو۔ وہ عظیم ہے۔ روبوٹ بنا کر اس نے ہم پر احسان کیا ہے۔ دیکھو ہم کتنے آرام سے ہیں"

"آرام سے تو ہیں مگر کیا خوش بھی ہیں"

"خوش ہونا کیا ہوتا جو ہمیں چاہیے ملتا رہتا ہے"

"مگر سکون؟"

"جو ہمیں میسر ہے اسی کا نام آپ کی دنیا میں شاید سکون ہے"

دونوں دو مختلف ویو لینگتھ پر بات کر رہے ہیں۔ تکرار بیکار ہیں بھاگ لو شاید روح بچ جائے۔ بھاگنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی اور بھاگتے بھاگتے ایسے علاقے میں پہنچتا ہوں جہاں ہر طرف روح کی عظمت کے گان گائے جا رہے ہیں۔ اطمینان ہوا کہ شاید آخرکار صحیح جگہ پر پہنچ ہی گیا۔ طبیعت خواہ مخواہ مطمئن کیا ہوئی کہ شاید نیند آگئی۔

"اٹھو بھائی۔ سونے کی کوشش بیکار ہے۔ یہاں کوئی سو کیسے سکتا ہے۔ کیا پردیسی ہو؟"

"معلوم نہیں مگر اجنبی ضرور ہوں۔ فرمائیے کیا میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں"

"اپنا ضمیر بیچو گے"

"کیا ملے گا"

"روٹی"

"مگر روٹی کے لیے ضمیر کا سودا کرنا کیا مناسب ہوگا؟ روٹی تو مل ہی جائے گی"

"واقعی اجنبی ہو۔ بھلا روٹی کے سامنے ضمیر کی کیا حیثیت؟ روٹی حاصل کرنا ہمارا فرض ہے، ہمارا دھرم ہے"

"مگر ضمیر کو بچانا بھی تو ہمارا ہی فرض ہے"

"کیسے بچائے گا ضمیر کو اگر انسان بھوکا ہوگا"

"کیا بھوک ضمیر سے بڑی ہے"

"تمہیں بھوک کی عظمت کا اندازہ نہیں۔ بھوک ایک بہت وسیع لفظ ہے پتا نہیں کتنی بھوکیں ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی بھوک کی خاطر انسان صرف ضمیر ہی کیا عزت نفس، خودداری، غیرت اور نہ جانے کیا کیا بیچتا ہی رہتا ہے۔

"میں نہیں مانتا"

"ہٹ دھرمی ہے۔ خیر جب مان جاؤ تو ہم سے ملنا۔ سودا ہو جائے گا"

کچھ ہی دنوں میں لگا کہ وہ ضمیر کے سوداگر شاید ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ ضمیر ایک غیر ضروری بوجھ ہے جسے جتنی جلدی اتار پھینکا جائے بہتر ہوگا۔ کچھ دن اور خود سے اور حالات سے الجھتا رہتا ہوں آخر ہار جاتا ہوں اور قریب کے ڈسٹ بن میں ضمیر کو پھینک کر روبوٹ بننے کے لیے چل پڑتا ہوں۔ یہ پتا نہیں کہ ڈسٹ بن سے منہ موڑتے ہی روبوٹ بن چکا ہوتا ہوں بے حسی اطمینان اور سکون کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ●●

ادھو کونڈولکر
مراٹھی سے ترجمہ
وقار قادری

اندھیرا
(مراٹھی زبان کے دلت ادب سے)

بال کافی بڑھ گئے تھے۔ سوچا کٹوائے جائیں۔ صبح اٹھ کر نائی کے گھر چلا گیا دینیا نائی اپنی جھونپڑی کے سامنے ایک کرسی ڈال کر بال کاٹنے میں مصروف تھا قریب رکھی ایک بینچ پر کچھ لوگ اپنی باری کے منتظر تھے۔ میں ابھی جا کر ان لوگوں میں شامل ہونے ہی والا تھا کہ دینیا نائی بول پڑا "ماسٹر شام میں آنا ابھی نہیں"

"کیوں ابھی اور کتنے لوگ باقی ہیں یہ دو تین ہی تو ہیں انتظار کر لوں گا" بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے کہا"

"نہیں ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں جو آنے کا کہہ کر گئے ہیں "کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کی مالش کرتے ہوئے دینیا نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں شام پانچ بجے آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

شام کو جب میں دینیا کے گھر دوبارہ گیا تب وہ قینچی اور استرا اپنے بکسے میں رکھ رہا تھا۔

"آپ تو بہت جلدی آ گئے" مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔

"ہاں سوچا شام ہو گئی تو تمھیں ٹھیک سے دکھائی نہیں دے گا۔"

"اچھا تو آپ باہر ہی بیٹھیے۔

"یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا اور کرسی اٹھا کر باہر لے آیا اس کا پاجامہ اترا ہوا تھا اور صرف لنگوٹ میں میرے سامنے کھڑا تھا ایک کپڑا نکال کر اس نے میری گردن کے اطراف میں لپیٹ دیا جو نہایت ہی گندہ اور بالوں سے اٹا ہوا تھا۔ شاید کسی زمانے میں سفید رہا ہو گا مگر اب اس کے رنگ کی شناخت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے جس سے مجھے متلی محسوس ہو رہی تھی مگر اس کے آنگن میں تھوکنے کی ہمت بھی مجھ سے نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے تھوک کو نگل لیا۔

سامنے آئینہ بھی نہ تھا جو میں ایسا کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھ پاتا۔

"پانی گرم ہو گیا ہے نا۔" بال کاٹتے ہوئے دینیا نے اپنی بیوی سے چلا کر پوچھا۔

تھارا کام ہو گیا ہے کیا۔ اندر سے اس کی بیوی نے اس سے بھی زور دار آواز میں اس سے سوال کیا۔
ابھی ہو جائے گا۔
تو جب ہو جائے گا تب آنا پانی گرم مل جائے گا۔
اب میں سمجھ گیا تھا کہ میرے بال کاٹنے پر یہ نہائے گا کیوں کہ میں اچھوت ہوں۔ صبح کا اس کا رویہ اب میری سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا۔ وہاں سے لوٹنے پر میں نے ساری بات پانڈو کو بتا دی۔ ''
''تمھارے بال کس نے کاٹے ؟'' پانڈو نے پوچھا
دینیا نائی نے ''
مھاروں اور چماروں کے بال وہ کبھی نہیں کاٹتا تم ماسٹر ہو نا اس لیے کاٹا ہوگا۔ ''
''تو پھر آپ لوگ بال کہاں کٹواتے ہو ؟''
''ہم لوگ تو جیتا پور یا ناٹا چلے جاتے ہیں تمھیں معلوم نہیں تھا کیا۔ ؟''
''نہیں۔ یہاں آنے کے بعد ایک بار راجا پور گیا تھا تو وہیں کٹوا لیے تھے۔'' میں نے کہا۔
''تمھارے گانو میں نائی چماروں کے بال کاٹتا ہے کیا ؟''
''سونا نائی کا لڑکا آج کل چھپ چھپ کر کاٹتا ہے۔''
''ماسٹر جی ہم لوگ پولیس میں ایک شکایت درج کریں گے کہ یہ نائی ہمارے بال نہیں کاٹتا۔''
ٹھیک ہے میں نے پانڈو کو دلاسہ دیا۔
میری بیوی اوشا کے پیٹ کا درد بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ نئے مہمان کی آمد کے ہم منتظر ہیں۔ مگر یہ انتظار تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے اونچی ذات والوں کو ملنے والی یہ سہولتیں ہماری خاطر نہ تھیں۔ دیہاتوں میں دائی کا کام کرنے والی عورتیں ہمارے گھروں کو نہ آتی تھیں قریبی گانو سے ڈاکٹر کو بلانے کے ارادے سے میں نے کاشی رام کو ساتھ لیا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔

''کیا اتنی رات گئے ڈاکٹر ہمارے ساتھ آئے گا ؟'' کاشی رام نے اندیشہ ظاہر کیا''
''کوشش کریں گے ویسے اسے آنا تو چاہیے وہ ایک سرکاری نوکر ہے اور یہ اس کی ڈیوٹی بھی ہے'

ہم دونوں پیدل چل پڑے کاشی رام کی گپ میں راستہ کٹ رہا تھا۔ مگر میرا دھیان اس کی باتوں میں نہ تھا۔ اس نے اب ایک واقعہ سنانا شروع کیا تھا۔

"گنگو کے وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ گانو کی ایک بھی عورت آنے کو راضی نہیں ہوئی۔ آخر کار ایک عورت آئی اور دور ہی سے بتاتی رہی۔ ایسا کرو۔۔۔ ویسا کرو۔۔۔ جب یہ خبر عباس کی ماں کو ملی تو وہ دوڑی چلی آئی۔ مسلمان تھی بہت اچھی عورت تھی۔ کہنے لگی برے وقت کا تماشا دیکھنا اچھی بات نہیں ہے۔ ہماری کئی عورتوں کی ایسے وقت میں اس نے مدد کی تھی۔ آج وہ ہوتی تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ خالی خبر ملنے پر وہ دوڑی چلی آتی اس کے ہاتھ میں بھی زبردست گن تھا بہت پار کھی عورت تھی۔ گر بھ وتی کو دیکھتی اور بتاتی کہ وہ بچہ کیا جنے گی۔ تم اس بارنی گو ساوی کو جانتے ہو؟ اس کے پیٹ میں دو دن تک درد تھا۔ گانو کی ساری عورتیں ناکام ہوئی تھیں۔ آخر میں عباس کی ماں آئی اور اس کا چھٹکارہ ہو گیا۔ ورنہ آتی تو بارنی مر جاتی۔"

یہ سن کر میں اور پریشان ہو گیا۔ جی چاہا کہ کاشی رام کو ایسی واقعات سنانے سے منع کر دوں۔ مگر میں خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔

ہم اس گانو میں آ گئے جہاں ڈاکٹر رہتا تھا۔ سارا گاؤں نیند کی آغوش میں کھو چکا تھا ہمارے قدموں کی آہٹ دور تک پھیل رہی تھی۔ ڈاکٹر کے گھر پہنچنے پر میں نے دھیرے سے آواز لگائی۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں؟

"ڈاکٹر صاحب وہاں بغیچے میں ہیں" اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ میں پاس کے گارڈن کی جانب بڑھا۔

"ہوا کتنی اچھی ہے۔ جی کرتا ہے یوں ہی زندگی بھر کے لیے تمھاری بانہوں میں پڑا رہوں"

ہمارے قدموں کی آہٹ سے اچانک یہ آواز بند ہو گئی۔

"کون ہے ادھر۔۔۔۔ ایک کرخت آواز سنائی دی۔

"ڈاکٹر صاحب ہیں کیا؟ میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا

"کیا کام ہے اتنی رات گئے" اور ادھر بغیچے میں آنے کے لیے تمھیں کس نے کہا۔۔۔۔

"نہیں کسی نے نہیں کہا میں خود ہی چلا آیا تھا۔"

"کیوں۔۔؟ کیوں چلے آئے ہو یہاں کیا کام ہے؟

"میری پتنی۔۔۔۔۔۔ درد کے مارے وہ۔۔۔۔۔۔

"کس گانو کے ہو

"دیو گوٹھن"

"یہ گانو میری حد میں نہیں آتا۔ اور پھر اتنی رات گئے میں وہاں کیسے جاؤں گا؟ تم اپنی پتنی کو یہاں لے آو۔ تم لوگوں کو عقل تو ہوتی نہیں۔ بس اٹھے کہ ڈاکٹر کے یہاں چلے۔ رات کا وقت سمجھتا

ہے کہ نہیں۔۔۔؟ نانسن

کسی انجانے کتے پر بھونکنے والے کتے کی مانند ڈاکٹر مجھ پر بھونک رہا تھا۔ میں بہت نراش ہو گیا بہت ذلیل کیا تھا اس نے۔

مگر بیوی کی نازک حالت کا تصور کرتے ہوئے میں نے انکساری سے گھگھیاتے ہوئے پھر سے گزارش کی۔ ڈاکٹر صاحب میں اسے یہاں نہیں لا سکتا۔

"کیوں گانو میں ڈولی نہیں ہے کیا؟ ڈاکٹر چلایا۔

"صاحب ڈولی اٹھانے کے لیے گانو میں کوئی نہیں ملتا۔

"کیوں کیا تمھارے گانو کے مزدور مر گئے؟

"صاحب ہم اچھوت ہیں ہمارے پاس کوئی نہیں آتا۔ آپ کے پاس اس لیے آیا کہ آپ کی گاڑی ہے" میں نے پھر منت ساجت کی۔

"ایک بار کہہ دیا نا۔ اب چلتے بنو۔" ہمیں جانے کے لیے کہہ کر اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ چلو ہم گھر چلتے ہیں۔ ورنہ تھوڑی دیر میں پھر کوئی یہاں آئے گا۔

ہم ناامید ہو کر وہاں سے لوٹ آئے۔ اب کیا کریں گے کاشی رام نے سوال کیا"

"تم ہی بتاؤ اب کیا کریں۔۔۔؟

"کتنے بجے ہیں؟"

"گیارہ۔۔۔"

ارے باپ رے کافی رات ہو گئی۔ چاروں جانب بھیانک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں تیز قدموں سے واپس لوٹ رہے تھے گھر پہنچ کر دیکھا لوشا اسی حالت میں تھی۔ ماں اس کے قریب بیٹھی تھی۔

ڈاکٹر کو لے آئے۔۔۔ ماں نے پوچھا"

نہیں

تو اب کیا کریں گے صبح سے اس کا پیٹ درد کر رہا ہے اتی رات ہوئی اب تک چھٹکارا نہیں ہوا۔ میں بھگوان کا نام لیتے لیتے تھک گئی۔ کچھ نہ ہوا ماں نے پریشان ہو کر کہا۔

جا تو ہمت مت ہار۔ ہاتھ پانو دھو کر اندر جا بھگوان کے سامنے ناریل رکھ کر پرارتھنا کر" ماں کا دل رکھنے کے لیے میں نے اندر جا کر ناریل رکھا اور چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ لوشا کی طبیعت اب بھی ناساز تھی۔ اڑوس پڑوس کی کافی عورتیں اب جمع ہو چکی تھیں اور میں اوندھے منہ مایوس اور ناامید پڑا اپنی تقدیر کو کوس رہا تھا۔

اقبال نامے

مرتب : ڈاکٹر اخلاق اثر
مبصر : ڈاکٹر سید حامد حسین
قیمت : ۸۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی

بیسویں صدی کی دانشوری کی تاریخ میں برصغیر ہندو پاک میں ڈاکٹر اقبال کے نام نے ایک غیر معمولی اعتبار حاصل کیا ہے۔ اقبال کے اس سرمایۂ ادب کی تو قدر و قیمت بہت پہلے ہی متعین ہو چکی تھی جس میں انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر اور اپنی رموز آشنا فکر کو اظہار بخشا تھا۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد سے محققین نے ان کے قلم کی جنبش سے پیدا ہونے والی ہر کشش اور ہر نقطے کی تلاش و تفتیش کو اپنے شوق و شغف کا مرکز بنایا ہے۔ چنانچہ اقبال کے مکاتیب کی بازیافت پر بھی خصوصی توجہ دی گئی اور ان کی تدوین اور ان کے تجزیے میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا گیا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی ڈاکٹر اخلاق اثر کی تصنیف "اقبال نامے" بھی ہے۔ اب اس کا دوسرا اضافوں کے ساتھ اور ترمیم شدہ اڈیشن بھی سامنے آچکا ہے۔ اس میں بھوپال اور اندور سے متعلق اقبال کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ مکاتیب کو یکجا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے خصوصی طور پر ان مکاتیب کی صحتِ متن پر توجہ دی ہے اور اس کے لیے ان میں سے بیشتر خطوط کے عکس بھی "اقبال نامے" میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس اڈیشن میں اقبال کے آٹھ غیر مطبوعہ خط شامل ہیں جن میں سے ایک شعیب قریشی کے نام اور باقی سات راس مسعود کے نام ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۳۰ اور ۱۹۳۷ کے درمیان تحریر کیے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ مثنوی پس چہ باید کرد ——— کے ایک نسخے پر اقبال کی تحریر کا عکس اور راس مسعود کی تحریر میں بھوپال کے نواب حمید اللہ خاں کے ان احکامات کے نوٹس کا عکس جو اقبال کے وظیفے سے تعلق رکھتا ہے اس اڈیشن میں شامل کیے گئے۔

بعض دوسرے مکاتیب جو دیگر مجموعہ ہائے خطوط میں نامکمل یا حذف و ترمیم کے ساتھ شروع ہوئے تھے ان سے بھی ڈاکٹر اخلاق اثر نے خصوصی بحث کی ہے اور ان کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ "اقبال نامے" میں شامل یہ بحث خصوصی توجہ کے لائق ہے کیونکہ اس سے اقبال کے بعض اہم مکاتیب کے سلسلے میں کچھ ضروری گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

نئے اڈیشن میں نہ صرف بھوپال اور اندور سے متعلق دوسرے ذرائع سے سامنے آنے والے مزید خطوط کا اضافہ کیا گیا ہے بلکہ ان کے عکس بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر عبد الرحمن بجنوری کا بھوپال کے قیام کے دوران انتقال ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اقبال کے بجنوری کے والد کے نام خط اور دیگر تفصیلات کو "اقبال نامے" میں جگہ دی گئی ہے۔

"اقبال نامے" میں شامل مواد کو دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ۷۶ مکاتیب ہیں اور دوسرے حصے میں ۳۶ مکاتیب کے عکس اور انگریزی متن شامل کیے گئے ہیں۔ یہ مکاتیب ۱۹۳۸ کے عرصے پر محیط ہیں۔ انھیں مکتوبین کے تحت تاریخی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ یہ خطوط ۱۸ لوگوں کے نام ہیں جن میں سر راس مسعود، امۃ المسعود، ممنون حسن خاں، سید نذیر نیازی، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سید عبد الباسط، جسٹس عبد الرشید، شعیب قریشی وغیرہ شامل ہیں۔

"اقبال نامے" میں شامل خطوط سے متعلق شخصیات کے بارے میں سوانحی تفصیلات "اقبال نامے" کی افادیت میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اخلاق اثر نے بڑی محنت اور کد و کاوش کے ساتھ معلومات حاصل کر کے انھیں بڑی جامعیت

کے ساتھ اپنے مقدمے کا حصہ بنایا ہے۔ کتاب کے آخر میں مکاتیب سے متعلق اہم شخصیات کے نایاب فوٹو بھی شامل ہیں۔

"اقبال نامے" مکاتیب اقبال کے سلسلے میں ہو رہی تحقیق و تدوین کی ایک اہم اور قابل قدر کوشش ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے معروضی اور حقائق پر مبنی تحقیق کے تقاضوں کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ وہ اپنے موضوع سے کتنی گہری وابستگی رکھتے ہیں اس کا اندازہ اقبال نامے کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے مقابلے سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں نہ صرف ان کی لگاتار کھوج کے نئے نتائج سامنے آئے ہیں بلکہ انھوں نے اس میدان میں جو دوسری تحقیق ہو رہی ہے اس پر بھی ان کی گہری نظر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کو بھوپال سے جو گہری وابستگی رہی اس کے لیے ڈاکٹر اخلاق اثر نے "اقبال نامے" "اقبال اور شیش محل" "اور اقبال اور ممنون" جیسی تصانیف کے ذریعے اس عظیم شاعر و مفکر کو شایان شان خراج تحسین اور سپاس گذاری کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ وہ اسی طرح اقبالیات کے دائرے میں مزید توسیع کے کام میں ہمہ تن مصروف رہیں گے۔

حکیم محمد سعید کے طبی مشورے

مصنف : جناب حکیم محمد سعید
مرتب : جناب مسعود احمد برکاتی
قیمت : ایک سو روپے
ناشر : بیت الحکمۃ، مدینۃ الحکمت کراچی
پتا : ہمدرد فاؤنڈیشن ناظم آباد کراچی

نونہالان پاکستان کا مقبول رسالہ ماہنامہ "ہمدرد نونہال" کا ایک مقبول کالم طبی مشورے بھی ہے۔ نونہال سوال کرتے ہیں اور جناب محترم حکیم سعید جواب دیتے ہیں۔ اگست ۱۹۸۸ سے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ ان سوالات کی نوعیت حفظان صحت ہوتی ہے۔ نونہال پوچھتے ہیں کہ صحت مند کیسے رہا جائے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ نونہال اور خواتین اور بزرگ اپنی تکلیف بتاتے ہیں اور حکیم صاحب اس کا علاج بتاتے ہیں۔ اب جب ان سوالات و جوابات کو مسعود احمد برکاتی نے بڑی محنت اور سلیقے سے جمع اور مرتب کیا تو ۲۲۲ صفحات میں یہ سارا مواد سمایا۔ اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ جملہ ۸۱ امراض کا علاج بتایا گیا ہے۔ زیادہ غور کیا تو اس کتاب میں حفظ صحت کے نکات در نکات آئے ہیں۔ مجموعی طور پر نہ صرف نونہالان وطن کے لیے بلکہ نوجوانوں اور بزرگوں کے لیے بھی اس کتاب میں رہنمائی اور صحت کے اصول موجود ہیں اور حکیموں اور ڈاکٹروں کے لیے اس میں نہایت اہم نکات طب و صحت سما گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اب ہر شخص کے لیے جو صحت مند رہنا چاہتا ہے اور علاج جاننا اور کرانا چاہتا ہے مفید اور ضروری ہے۔ دنیائے طب میں اپنی نوعیت کی یہ واحد کتاب ہے۔ اطبا کے لیے تو طبی رموز و نکات جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

"میری درس گاہ"

شاعر : نارائن سروے
مترجم : ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
مبصر : محمد حسین پرکار
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

میری درس گاہ نارائن سروے کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا اور جب ۱۹۹۷ء میں محترمہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ نے اردو کے قالب میں ڈھال کر شائع کیا۔ یہ مجموعہ جوں ہی میرے ہاتھوں میں آیا میں نے ایک ہی نشست میں اسے پڑھ ڈالا۔ اور بلا تامل میں نے اس منظوم ترجمے پر اپنے تاثرات لکھنے کے لیے قلم اٹھایا اس کی بھی تین وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ نارائن سروے صاحب کو میں تعلیمی سال ۱۹۴۶-۱۹۴۰ سے جانتا ہوں جب میں کالج میں بی اے آرٹس کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں ہم چار جناب نارائن سروے، پروفیسر کیشو میشرام میرے چھوٹے بھائی اور پرکار اور میں نگر ماسک پر بیٹھ کر مراٹھی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کی پہلی پہلی کوششیں کیا کرتے تھے۔ اس وقت تک نارائن سروے اور پروفیسر کیشو میشرام باقاعدہ اپنی

ذاتی تخلیقات سے مراٹھی ادب میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ جبکہ میں اور بھائی نور پرکار ابھی ابھی کالج جوائن ہیپر اور کالج میگزین سے باہر قدم رکھ کر اردو رسالوں میں اپنے مضامین اور تراجم بھیجنے لگے تھے اور ان کی اشاعت کے بعد ہمت افزائی ہوئی تب کہیں قلم سنبھالنے کا باقاعدہ ہوش آیا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ "میری درس گاہ" کی مترجم ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ بہانی کالج میں میری ساتھی تھیں اور ہم ایک ہی مضمون پڑھایا کرتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مراٹھی ادب کو اردو قاری تک پہنچانے والے ترجمہ نگاروں میں ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا جو اب تک بدیع الزماں خاور، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، نور پرکار، یونس اگاسکر، سلام بن رزاق، خلد اگاسکر اور راقم الحروف تک محدود تھا۔ یہ حلقہ جتنا وسیع ہو گا وہ ادب کے حق میں نیک فال ثابت ہو گا۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک نارائن سروے نے ایک طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے اور ان کے مزید چار شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور مراٹھی ساہتیہ سمیلن کے وہ صدر بھی رہ چکے ہیں۔

نارائن سروے کا کلام ایک تلخ سچ ہے اور جو سچ ہوتا ہے اس میں فریب داستان کی خاطر اضافے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ ایسے کلام میں شیرینی اور غنائیت کا عنصر بہت کم ملتا ہے بلکہ یوں کہوں تو بجا نہ ہو گا کہ ایسا کلام بزمیہ شاعری اور رزمیہ شاعری دونوں سے ہی مختلف ہوتا ہے اور اس کی اپنی ایک الگ پہچان ہوتی ہے۔ نارائن سروے کی شعروں کی یہی پہچان ہے لفظ در لفظ در لفظ اور شعر در شعر تلخ تر سچ۔ ایسا سچ جیسی دھواں اگلنے والی ملیں۔ تانابانا بننے والی مشینیں بوجھ ڈھونے والے مزدور جیسے روز نکلنے اور ڈوبنے والا سورج اور لہو کے چراغ سے اندھیرے کا منہ چڑانے والی غربت زدہ بستیاں۔ میں ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کی جسارت کی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایسا مشکل مجموعۂ کلام ترجمے کے لیے منتخب کیا اور اسے اتنی ہی خوبصورتی سے اردو نظموں کی شکل دے کر پیش کیا۔ میں انھیں ان کی اس بیش بہا 'ادبی خدمت' کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ مراٹھی ادب کا علم انھیں ان کے والد سے ورثے میں ملا ہے لہٰذا نارائن سروے کے کلام کو اردو میں منتقل کرنا ان کے ذوق ادب کے عین مطابق تھا اس کے باوجود جہاں کہیں بھی انھیں ذرا سا بھی شائبہ ہوا انھوں نے براہ راست نارائن سروے سے رابطہ قائم کر کے اس بات کی تسلی کر لی کہ وہ اپنی یہ ادبی ذمّے داری نبھانے میں کوتاہی تو نہیں کر رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں "میری درس گاہ" سے ملنے والا یہ سب سے قیمتی درس ہے۔

گو نارائن سروے کو انقلابی تحریکوں نے متاثر ضرور کیا لیکن ان کی شاعری کا جھکاؤ کسی خاص رجحان کی طرف نہیں ملتا بلکہ ان کی ساری کاوشیں انسان کو پہچاننے اور اپنی ذات کو پہچاننے پر مرکوز ہیں۔ وہ زندگی سے فرار کے قائل نہیں۔

جینا ہی ہو گا
مقابلہ کرنا ہی ہو گا۔
کبھی رو دے کر
کبھی رو لے کر!!

ہاں ایک اور بات جو نارائن سروے کو انقلابی شاعروں میں منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ نارائن سروے ان سارے درد و کرب سے گزرے ہیں جو انقلابی شاعری کا موضوع رہے ہیں اور ان مظلوموں میں سے ایک ہیں جن کے درد کو دوسروں نے دیکھ کر محسوس کیا ہے اسے سہا نہیں ہے۔ وہ زندگی کی درس گاہ اس دنیا کی تجربہ گاہ میں ان سارے مراحل سے گزرے ہیں جو اوروں کو درس دیتے ہیں اور نتیجہ اخذ کرنے میں مدد دیتے ہیں بالفاظ دیگر نارائن سروے کی شاعری آپ بیتی ہے جبکہ بیشتر دوسرے انقلابی شاعروں کا کلام جگ بیتی ہے۔ یہی واضح فرق نارائن سروے کی شاعری میں اور عام انقلابی شاعری میں ہے۔ بطور مجموعی انقلابی شاعری میں موضوع کی عکاسی میں نغمگی کا پہلو برقرار رہتا ہے جبکہ نارائن سروے کے یہاں صرف یہ تھکے ہوئے دکھی دل کی آواز ہے۔ ہزاروں لاکھوں مزدوروں کا نعرہ ہے اور جینے کا اپنا ایک انوکھا انداز ہے۔ یہی ان کی شاعری کی جان ہے اور ان کی پہچان بھی۔

آخری بات۔ اگر نارائن سروے کو دنیا کی درس گاہ میں اور شعری تخلیق کے طویل سفر میں انہی مراحل سے گزرنا پڑا تھا

جس میں سے گزر کر قلو بنیساں گوہوتا ہے ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی کو بھی ترجمے کے مراحل سے گزرتے ہوئے انھی احساسات سے گزرنا پڑا ہوگا جیسے صدائے تیشہ سرودیں پوشیدہ نغمے کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں گزرنا پڑتا ہے۔ میں دونوں کے حق میں بھی دعا کروں گا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

تحقیق کا فن

مصنف : ڈاکٹر گیان چند
مبصر : ڈاکٹر جمیل جالبی
صفحات : [illegible]
قیمت : [illegible] روپے
ناشر : مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد

پروفیسر ڈاکٹر گیان چند اردو زبان و ادب کے بڑے محقق، بلند پایہ استاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ انھوں نے اردو زبان میں متعدد کتابیں لکھی ہیں جو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ ساری دنیا میں، جہاں اردو زبان و ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے، حوالے کی کتابوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر گیان چند اپنے وسیع علم اور گہری نظر کی وجہ سے ساری اردو دنیا میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے ایسے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن پر ان سے پہلے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ تحقیق غالب اور تحقیق اقبال ان کی تنقید و تحقیق کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے ایک طرف غالب کے منسوخ کلام کی شرح "تفسیر غالب" کے نام سے لکھی اور دوسری طرف علامہ اقبال کے ابتدائی کلام کو ریزہ ریزہ جمع کر کے "ابتدائی کلام اقبال" بہ ترتیب مہ و سال ۱۹۰۸ء تک کے نام سے شائع کیا۔ "اردو کی نثری داستانیں" اور "اردو مثنوی شمالی ہند میں" وہ کتابیں ہیں جو جدید تحقیق میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔

"تحقیق کا فن" ڈاکٹر گیان چند کی وہ قابل قدر تصنیف ہے جس میں فن تحقیق کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں خود مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں تحقیق کا فن کو اپنی بہترین کتاب سمجھتا ہوں"۔ اس کتاب میں نہ صرف ان کی زندگی کے علمی و تحقیقی تجربوں اور وسیع گہرے مطالعے کا نچوڑ آ گیا ہے بلکہ ترتیب کے ساتھ فن تحقیق کے وہ سارے پہلو بھی سامنے آ گئے ہیں جو تحقیق کرنے والے ہر طالب علم، ہر استاد اور محققوں کے لیے نہایت مفید ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے تحقیق کرنے والوں کی ایسی تعلیم و تربیت ہو جاتی ہے جن کی مدد سے وہ تحقیق کو سائنٹیفک بنیادوں پر قائم کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایک طرف ایم فل، پی ایچ ڈی کے مقالوں کا معیار بلند ہوگا۔ ترتیب و تدوین کی بہتر صورت وجود میں آئے گی اور ساتھ ہی تحقیق کرنے والوں میں ایک گہرا شعور بھی پیدا ہوگا۔ میری نظر سے اس موضوع پر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جس میں تحقیق کے سارے پہلوؤں اور طلبہ و اساتذہ کی ساری ضرورتوں کو سامنے رکھ کر کتاب لکھی گئی ہو۔ یہ کتاب تحقیق کے سلسلے میں اسی لیے ایک بنیادی حوالے کی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کی تصنیف و تالیف پر میں ڈاکٹر گیان چند کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے ہماری جامعات اور کالجوں کے طلبا و اساتذہ یکساں طور پر مستفید ہوں گے اور ان امور کی روشنی میں جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں آیا ہے ان کی علمی تحریروں اور تحقیقی مقالات کا معیار بلند ہوگا۔

معروضات

مصنف : ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خان
قیمت : [illegible] روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

"معروضات" ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ضبط تحریر میں آتے رہے۔ اب انھیں

یکجا کر کے کتاب کی شکل میں پیش کروایا گیا ہے جس پر دیباچہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے اور پیش لفظ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ یہ مضامین مصنف کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ ہیں جس میں ان کے نقطۂ نظر کا عکس صاف نظر آتا ہے اور ضیاء الرحمٰن صدیقی مشرقی انداز کے ہمہ رنگ نقاد کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں کل تیرہ مضامین ہیں جن کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دو مضمون نثری تنقید (یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کا صحافتی کردار اور فیض کی نثر) دو مضمون ناول (یعنی مرزا ہادی رسوا کے ناولوں میں کردار نگاری اور تحریک آزادی اور پریم چند) دو مضمون ڈاکٹر خلیق انجم پر دو مضمون طنز و مزاح (شہباز امروہوی ایک قابل توجہ طنز نگار اور ہندستان کی تحریک آزادی میں اردو طنز و مزاح کا کردار) دو مضمون فن شاعری پر (یعنی جوش کا فن اور رؤف امروہوی بحیثیت نعت گو) اور دو مضمون (قاضی عبد الغفار اور غلام السیدین سرزمین ہریانہ کے ماہر تعلیم) کچھ سوانحی نوعیت کے ہیں۔

کیونکہ پی ایچ ڈی کے مطالعہ کے دوران ان کا زیادہ دھیان تحریک آزادی کی طرف رہا ہے اس لیے ان تحریروں میں بھی ضیاء الرحمٰن صدیقی کے اس مطالعہ کا اثر نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب دلچسپ اور ہمدردانہ ہے۔ جس میں بعض تحقیقی نکتے ابھارنے کی سعی کی گئی ہے۔ نعت گوئی کے فن کی جانب مصنف نے پہلی بار توجہ کی ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ موضوع ابھی تک عدم توجہ کا شکار ہے جس پر ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے پہل کی کوشش کی ہے۔ فیض کی نثر شہباز امروہوی اور رؤف امروہوی بڑے اچھوتے اور فکر انگیز موضوعات ہیں اور اس کتاب میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈیمائی سائز کی کتاب میں عمدہ طباعت نستعلیق کتابت اور کاغذ سفید استعمال ہوا ہے۔ پشت پر صاحب کتاب کی تصویر اور تعارف چھپا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے امید ظاہر کی ہے" اردو دنیا کو ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی سے مزید توقعات وابستہ ہیں اور امید ہے یہ کتاب پذیرائی حاصل کرے گی۔"

کینسر

مصنفہ : نورالعین علی
تبصرہ نگار : ابراہیم یوسف
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتا : ۲۴۔ الہلال، ریکلیمیشن، باندرہ مغربی، ممبئی

مصنفہ نے صدہا سال پرانے سماجی مسئلہ کو آج کے حالات میں بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ نصرت کا کردار بہت متاثر کن ہے۔ اس کے احتجاجی رویہ نے اسے خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ دادی ماں کے خیالات آج کے معاشرے میں کچھ عجیب ضرور لگتے ہیں مگر وہ بڑا پیارا کردار ہے کہ وہ مٹتی ہوئی تہذیب اور ختم ہوتی ہوئی پیڑھی کی نمائندہ ہے۔ وہ بدلتے حالات سے لاعلم اپنی پرانی تہذیب کو سینہ سے لگائے ہوئے ہے۔ اس سے ہمدردی اور پیار پیدا ہوتا ہے۔ ماں کی کم سخنی میں ہزاروں سخن پوشیدہ ہیں۔ وہ شکایت نہیں کرتی مگر اس کی کم سخنی قدرت کی ستم ظریفی کے خلاف خاموش احتجاج ہے جو ظاہر تو نہیں ہوتا مگر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ غرض رنگا رنگ کرداروں اور ان کی پیش کش "کینسر" نہ صرف ایک معیاری تخلیق ہے بلکہ اردو کے احتجاجی ڈراموں میں ایک اضافہ ہے۔

چوں چوں کا مربہ

مدیر : ڈاکٹر اسحاق طبیب
اشاعت : دسمبر ۱۹۹۴ صفحات : دو سو
مبصر : عبداللہ ولی بخش قادری
ملنے کا پتا : لعلی چوک، بدایوں

" اماموں یا سیاست کی سرزمین سے ہنستوں کا نقیب چوں چوں کا مربہ ایوی نمبر دو آتشہ کہلانے کا

مستحق ہے۔ کیونکہ اس بار ذکر اس پرورش کا ہے۔ اپنی اشاعت کے ڈھائی سال کے قلیل عرصے میں اس نے اپنی شناخت پیدا کرلی ہے۔ نئے عنوانات اور طنز و مزاح کی چاشنی سے بھرا ہوا یہ رسالہ تفنن طبع اور لطف سخن دونوں کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا یہ بیوی نمبر ا بہ زبانِ خود" معجونِ مرکب (بوڑھے مضامین) چٹنی (منظومات بوسیدہ) اور باسی کڑاھی" جیسے عنوانات کے تحت اپنے دامن میں بہت کچھ مال مسالہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ "علامہ جھک جھک کی جہاں پھٹک اور جابجا چکل پھٹکل" اس سب پر مستزاد ہے۔

اردو ادب میں بیوی کا ذکر خیر بعض انشاپردازوں کی کمزوری یا مجبوری رہا ہے اور بعض کے لیے وہ ایک تحفظاتی میکانیہ کی حیثیت رکھتا ہے بالخصوص ظریف شعرائے کرام کی کاوش ہائے جا اور بے جا میں۔ بیوی نمبر ا اس بات کا ہمہ تن شاہد ہے۔ تاہم اس موقع پر چودھری محمد علی کی 'اتالیق بیوی' کا بھی خیال آیا۔

رسالہ ہذا کے مدیر اسحاق صاحب اپنے آپ کو ڈاکٹر اور طبیب کے درمیان محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ وہ ایک جوان سال اور جواں ہمت اردو پرستار کی حیثیت رکھتے ہیں اور رسالے کو معنوی خوبی کے ساتھ ساتھ حسن ظاہر سے بھی آراستہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اُن کے اعلان کے مطابق اس کا تفریحی ٹیکس پچیس روپے اور رونمائی دو ہزار پیسے ہے۔ اس ادبی سوغات کی سج دھج دیکھتے ہوئے بلا تکلف کہا جاسکتا ہے کہ "آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے۔

دلّی کی تاریخی مساجد (حصہ اول)

مصنف : عطاء الرحمٰن قاسمی
تبصرہ نگار : مولانا غیاث الدین قاسمی
قیمت : ۲۰۰ روپیے
ملنے کا پتا : مولانا آزاد اکیڈمی ۴۳ ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

"دلی کی تاریخی مساجد حصہ اول" دلی کی تاریخ پر سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید اور مولوی بشیرالدین احمد خاں کی واقعات دار الحکومت دلی کے بعد ایک بے نظیر کتاب ہے اس کتاب میں دہلی کے واقع تغلق، خلجی، لودھی اور مغل ادوار کی ان ستر تاریخی و یادگار مسجدوں کا محققانہ و مورخانہ تذکرہ ہے۔ جن سے ہماری صدیوں کی تاریخ وابستہ ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ان مسجدوں کی تاریخ قدیم عربی و فارسی کتابوں اور سیاحوں کے سفرناموں کے حوالے سے مرتب کی گئی ہے اور امتداد زمانہ کی بنا پر جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا بھی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی تصویریں بھی شائع کی گئی ہیں، اور ان مسجدوں پر لگے ہوئے تاریخی کتبوں اور الواح کا بھی مرکز ہے۔ جو بہت ہی بیش قیمت ہیں۔

عطاء الرحمٰن قاسمی نے کتاب کی ترتیب میں بڑی بالغ نظری اور ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے انھوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات و جزئیات سے بڑے اہم اور تاریخی نتائج اخذ کیے ہیں اور قارئین کی ضیافت طبع کا بھرپور سامان فراہم کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب میں بعض ایسی مسجدوں کا بھی تذکرہ ہے۔ جن کا ذکر نہ مصنف آثار الصنادید نے کیا ہے اور نہ مصنف واقعات نے کیا ہے۔ قاسمی صاحب نے بڑی تحقیق و جستجو کے ساتھ ان تاریخی مسجدوں کا سراغ لگایا ہے۔ جو تغلق، خلجی، لودھی اور مغل فن تعمیر

ے شاہکار اور دلفریب نمونے ہیں اور آج بھی شکستہ و نیم شکستہ حالت میں قوموں کے عروج و زوال
ی داستان سنا رہی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ جب کبھی کوئی مورخ دلی کی تاریخ اور فن تعمیر پر تحقیقی کام کرے گا تو اس اہم
دستاویزی کتاب کو نظر انداز کرنے کی جرات نہیں کرسکے گا اور اس کتاب کو بطور حوالہ پیش کرنے پر
مجبور ہوگا۔

عطاء الرحمٰن قاسمی کی زبان سادہ و شگفتہ ہے۔ انھوں نے بڑی اچھی زبان میں کتاب لکھی ہے۔
جو ادبی حیثیت سے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

محکمہ آثار قدیمہ، ڈی ڈی اے، وقف بورڈ اور عوامی تنظیموں کے کردار اور طرز عمل کا بھی بڑا درد
ناک ذکر ہے۔ قاسمی صاحب نے کتاب کی تصنیف میں بڑی جانفشانی کی ہے۔ مصنف کتاب کی محنت و کاوش کی
داد نہ دینا بڑا ظلم ہے۔ امید کہ کتاب علمی و ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اردو بک ریویو

مدیر اعزازی: اسرار عالم
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۲۰ روپے
سالانہ : ۱۰۰ روپے
پتا : ۲/۳۹، ۱ (بیسمینٹ) نیوکوہ نور ہوٹل پٹودی ہاؤس
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

"اردو بک ریویو" اسرار عالم اور عارف اقبال کی ادارت میں نکلنے والا نیا جریدہ ہے جس کا
پہلا شمارہ نومبر ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا اب تک دو شمارے شائع ہوئے ہیں۔ ۲ء ۳ ایک ساتھ چھپے
ہیں اس ماہنامے کے پرنٹر پبلشر جاوید اختر ہیں مشاورتی بورڈ میں ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عبدالمغنی
اور محمود عالم کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ رسالے کا مزاج مہذب، علمی، ادبی اور معلوماتی ہے، سطحی،
فحش اور گھٹیا مواد سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اردو دنیا کی ادبی خبروں کے علاوہ دنیا کی دوسری اہم
عمرانی اور معاشرتی خبریں بھی فراہم کرتا ہے۔ مضامین نئے اور معلوماتی ہیں اور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی منتظمہ کا عملہ
اردو کی جہتوں سے واقف ہے۔ اردو کے کلاسیکی ادب اور قدیم مخطوطات کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ پیش نظر
شمارے کے سرورق پر پہلی صدی عیسوی کے چینی فن خطاطی کے ایک طغرے کا عکس شائع ہوا ہے جو کانسے
کی پلیٹ پر بنایا گیا تھا۔

دلی سے پہلی بار چھپنے والا یہ جریدہ کاغذ کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی نہایت عمدہ ہے جس کا
ٹائیٹل اور پشت چارٹ نما دبیز اور مضبوط کاغذ پر تیار کیے گئے ہیں۔ پھر بھی قیمت اس کی ضخامت اور معیار
سے کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ رسالے کے نام سے ظاہر ہے جو نہایت دلکش اور چونکا دینے والا ہے۔ امید کی جاتی ہے ادبی
حلقوں میں تیزی سے پذیرائی حاصل کرے گا اور اردو کی سچی خدمت انجام دے گا۔

تعلیم ایک تحریک

مصنف : محمد اسحاق
مبصر : ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
قیمت : ۱۵/ روپے
ملنے کا پتا : جاوید منزل، بازار، گورڈا، حیدرآباد

اسحاق صاحب کے تعلیمی مسائل پر مضامین مختلف اخبارات اور رسائل کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اہم جریدے تہذیب الاخلاق میں بھی شائع ہوئے اور ان کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے ملک کے کئی رسالوں نے انھیں دوبارہ شائع کیا۔ پھر احباب کے اصرار پر ان کی پہلی کتاب "تعلیمی مسائل اور ہماری ذمے داریاں" منظرِ عام پر آئی۔ اس کے پانچ سال بعد اس کتاب میں شامل مضامین کے علاوہ کچھ اور مضامین شامل کر کے "تعلیمی مسائل" کے عنوان سے دوسری کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اسحاق صاحب کے مضامین کا سلسلہ جاری رہا اور پچھلے دو تین برس میں شائع ہونے والے مضامین پر مشتمل زیر نظر کتاب "تعلیم ایک تحریک" کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں جناب محمود بن محمد سابق سفیر برائے سعودی عرب اور پروفیسر جعفر نظام سابق وائس چانسلر کاکتیہ یونیورسٹی کے تاثرات کے علاوہ جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تحریر کردہ وہ پیش لفظ بھی شامل ہے جو انھوں نے اسحاق صاحب کی پہلی کتاب کے لیے سپردِ قلم کیا تھا۔

اس کتاب کا پہلا مضمون "بچہ اسکول سے کیوں بھاگتا ہے" نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے دقیق علمی اصطلاحات اور بڑے بڑے اصول دہرانے کی بجائے نہایت سلیس اور سادہ زبان میں بچوں، والدین اور اساتذہ کے رویوں کا تجزیہ کیا ہے اور اس ضمن میں کچھ مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ جن پر عمل کیا جائے تو ان کے خیال میں بچہ اسکول سے بھاگنے کی بجائے اسکول کی طرف بھاگے گا۔ ایک اور مضمون میں مصنف نے جہاں ایک طرف مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا ہے، وہیں دوسری طرف ان کا خیال ہے کہ اگر انگریزی میں مناسب استعداد حاصل کی جائے تو ہندوستانی تعلیمی نظام کے پس منظر میں ملت کے طلبہ کے لیے اعلا معیار تک پہنچنا ممکن ہو سکتا ہے۔ جس کے لیے ان کا مشورہ ہے کہ اسکول کے زمانے سے ہی طلبہ کی انگریزی کو بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے اور جدید سائنٹفک طریقے اختیار کرنے چاہییں تاکہ اعلا تعلیمی سطح پر انھیں زبان کی دشواری نہ ہو۔ اردو میڈیم مدارس کے ضمن میں ایک مضمون میں مصنف نے جو مشورے دیے ہیں وہ بے حد اہم اور ان کے برسہا برس کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ ان مشوروں پر اگر سنجیدگی سے عمل کیا جائے تو اردو مدارس کی صورتِ حال میں نمایاں تبدیلی ہو سکتی ہے اور قوم کے غربت کی وجہ سے جو ناخواندگی پھیلی ہوئی ہے اس کا بھی سدِباب ممکن ہے۔ مدینہ ایجوکیشنل سنٹر کے زیرِ اہتمام سوپر اسکول کی اسکیم پر بھی ایک مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کے دردمند اصحاب اس طرح کے مزید سوپر اسکول قائم کرنے کی طرف توجہ دیں تاکہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ ملک اور قوم کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہو سکیں۔ مدارس کے انتظامیہ کے لیے ایک بہت اہم مسئلہ اچھے اساتذہ کا حصول ہے جس کی کئی وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک اہم وجہ بے حد کم تنخواہ بھی ہیں۔ اسحاق صاحب نے

اپنے تجربات کی روشنی میں اچھے اساتذہ کے حصول کے لیے کچھ اہم مشورے دیے ہیں کیوں کہ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک اچھا استاد پوری نسل کا معمار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں جملہ اٹھارہ مضامین ہیں اور ہر مضمون اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ من حیث الکل اسحاق صاحب کی تازہ ترین تصنیف "تعلیم ایک تحریک" والدین کے لیے، تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے لیے، سماجی اصلاح اور تعلیمی تحریکوں سے وابستہ اصحاب کے لیے اور خود اساتذہ کے لیے ایک لاقیمت تحفہ ہے۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی کتب

مراٹھی آموز	ڈاکٹر عصمت جاوید	۲۵/-	تھورسنگیت کار	پی آر بودھر	
ایک ہی پیالہ (ڈراما)	رام گنیش گڈکری، مراٹھی سے ترجمہ: خلیل مظفر	۲۰/-		مراٹھی سے ترجمہ: غلام دستگیر شہاب	۲۵/-
			"امکان" — مراٹھی عصری ادب کا انتخاب حصہ ۱		۴۰/-
ناگپور میں اردو	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	۵۰/-	" " — " " " " حصہ ۲		۲۵/-
علم الامراض	ڈاکٹر کرتی محمد غفران	۹/-	امکان — یک بابی ڈراما (خصوصی شمارہ)		۱۰/-
چاند ستارے (بچوں کا ادب)	اسحٰق خضر	۱۵/-	امکان — سراج اورنگ آبادی (خصوصی شمارہ)		۲۰/-
کمپیوٹر اور اس کی بیسک زبان	عبدالباری مومن	۲۰/-			

—: ملنے کے پتے :—

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، اولڈ کسٹم ہاؤس، ڈی ڈی بلڈنگ، شہید بھگت سنگھ روڈ۔ بمبئی ۴۰۰۰۲۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہاسپٹل، بمبئی ۳

غذائیں دوائیں

صحت بخش سبزیوں، پھلوں اور عام جڑی بوٹیوں
کے خواص اور فائدے

ہم میں سے اکثر یہ نہیں جانتے کہ پیاز ایک اعلا درجے کی جراثیم کش دوا ہے۔ لہسن سے بلڈ پریشر (خون کا دباؤ) کم ہوتا ہے۔ مولی یرقان کا ایک علاج ہے، شہتوت گلے کی تکلیف بھی دور کرتے ہیں، نیم بہترین اینٹی سیپٹک اور مصفی خون ہے۔ آملہ وٹامن سی سے بھرپور ہے۔ اڑوسا پھیپھڑوں کا ٹانک ہے وغیرہ۔ ہم جتنی سبزیاں، دالیں اور پھل استعمال کرتے ہیں اور اپنے اردگرد جو پودے اور درخت دیکھتے ہیں، قدرت نے ان میں ایسی دوائی اور شفائی اثرات رکھے ہیں کہ اگر ہم ان کا بروقت مناسب استعمال کریں تو بے شمار پریشانیوں اور اخراجات سے بچ سکتے ہیں۔

اس کتاب میں تقریباً پچاس سبزیوں، پھلوں اور عام جڑی بوٹیوں کے خواص، فائدے اور استعمال دیے گئے ہیں۔

قیمت ۸/- روپے

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

> کتاب نما سے متعلق آپ کی دوٹوک، بے لاگ اور فوری رائے کی ہمیں انتہائی ضرورت ہے مگر کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مختصر بھی ہو۔ (ادارہ)

● رضوان اللہ، ۱۔ ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

کتاب نما کے شمارہ برائے ماہ فروری میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کے اداریے کے حوالے سے چند معروضات۔

شاعر مشرق ایک مفکر تھے، ایسے مفکر جن پر فکر اسلامی کا غلبہ تھا اور وہ اس قبیل کے سیاست داں یا سیاست کار نہیں تھے جو اسی صدی میں اقوام کی قسمتوں کے فیصلے کرتے رہے چنانچہ برصغیر کے کسی گوشے میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کے عواقب کا ادراک ان کے احاطۂ فکر سے باہر کی چیز تھی حالانکہ وہ مخصوص فکری بنیادوں پر یا مذہبی یا نسلی اساس پر قائم مملکتوں میں ہلاکت خیزیوں اور قہرسامانیوں کا مشاہدہ و مطالعہ کر چکے تھے۔ ممکن ہے کسی اسلامی مملکت کی تشکیل کی صورت میں کچھ لوگوں کے نقل مکانی کا امکان موصوف کی نظر میں رہا ہو لیکن اپنی فکری نہج کی بنا پر انھوں نے اس ممکنہ عمل کو اسی طرح کی ہجرت تصور کیا ہو جس کے بارے میں پڑھتے اور سنتے آئے ہیں نہ کہ ایک با اثر اور دانشور طبقے کی ہجرت جو اسلاف کی ساری مقدس اور قابل فخر میراث کے تحفظ کا بار منتشر، بے یار و مددگار اور مفلوک الحال پسماندگان کے کاندھوں پر چھوڑ گیا ہو۔ چنانچہ مجوزہ اور ممکنہ مملکت کے حدود میں جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداری نظام کے حاملوں کے جبر و استبداد موصوف کی بصیرت سے محو ہو گئے۔ یہی وہ عناصر تھے جو آزادی کے بعد زمین داری اور جاگیرداری کو ختم کرنے کے کانگریس پارٹی کے اعلانیہ عزم سے لرزہ براندام تھے اور اپنے تحفظ کے لیے ایک مضبوط حصار قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کام کے لیے انھوں نے ایک ماہر قانون داں مسٹر محمد علی جناح اور ان کے معاونین کی خدمات حاصل کرلیں جو خود بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان لوگوں نے اپنے موکلوں کے مقدمے کی خوب اچھی طرح پیروی کی اور ان کے مفادات کو آنے والے وقتوں کے لیے محفوظ کر دیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، جمال الدین افغانی، سید احمد شہید، مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہ کے خواب کی اس بھیانک تعبیر کو دیکھ کر ان کے اخلاف دم بخود رہ گئے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تلبیک: مری بود ہم نفس عدم" کی تفسیر کب سامنے آتی ہے۔ جب نام نہاد مملکت اسلامی کی سرزمین بے شمار مظلوموں اور معصوموں کا خون ناحق جذب کر چکی ہو اور جب "دین خریدۂ کافری" ہو چکا ہو تو فراست انسانی کو اس کا متبادل تلاش کرنے کے لیے آخر کتنی مدت درکار ہوگی؟ "اجابت از در حق بہر استقبال" کب آئے گی؟ مظلوموں کی داد رسی میں قدرت کاملہ کو تامل کب تک! یوں بھی جب کوئی قوم اپنے منشور سے منحرف ہو جاتی ہے تو من حیثیت القوم اس کے وجود کا جواز باقی نہیں رہتا۔

● رئیس الدین رئیس ۱۴۲۵/۱۰ اچلی گیٹ، علی گڑھ۔

کتاب نما کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس

شمارہ میں ڈاکٹر شبیر رسول صاحب کا اشاریہ "پیکر تراشی کے حوالے سے" ایک بلیغ و بصیرت افروز اشاریہ ہے ہر چند کہ مضمون مختصر ہے مگر جامع ہے اور پیکر تراشی کی ہر پہلو سے وضاحت ہوتی ہے آپ سے درخواست ہے کہ پیکر تراشی کے ہی حوالے سے ڈاکٹر صاحب سے طویل مضمون بھی لکھوائیے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون "اشفاق حسین کی چاہت کا گھر" نارنگ صاحب کی چاہت کا گھر زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، ذکاء الدین شایاں، رضا نقوی واہی کی تخلیقات متاثر کن ہیں۔

● عبدالصمد فکری، ناگ پور (ایم ایس)

کتاب نما (مارچ ۹۶ء) پڑھنے کا موقع ملا۔ تقریباً تمام مضامین نثر و نظم اچھے لگے۔ کھلے خطوط میں رام پرکاش کپور کی باتیں بہت اہم ہیں اور اس پر اردو دنیا کو غور و فکر کرنا چاہیے۔ قلم اور مدیر کے حوالہ سے جو باتیں سامنے آئی ہیں۔ وہ سرسری طور پر دیکھنے کی نہیں بلکہ سنجیدگی سے اس پر مسلسل فکر و عمل کی ضرورت ہے ورنہ آپ بھی اس حمام میں ننگے ہونے کے الزام سے بچ نہیں سکیں گے۔

● جاوید اختر کاشف، ۱۳۸، ایم جی مارگ، سول لائنز، الٰہ آباد۔ یو پی۔

رسالے کے نام، تیور اور مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ بات کھٹکتی ہے کہ کتاب نما کے تبصرے اکثر کچھ زیادہ ہی مختصر ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ رسالہ اسم با مسمیٰ تبھی ہو پائے گا جب کتابوں پر بھرپور اور جامع تبصرے کثرت سے شائع ہوں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ "جائزے"، کے صفحات بڑھائے جائیں۔ ہر تبصرے میں صفحات، قیمت، سنِ اشاعت اور ناشر کے پتے کا ذکر لازمی قرار دیا جائے۔ ساتھ ہی زیر نظر کتاب سے نمایندہ اقتباسات ضرور دیے جائیں تاکہ کتاب کے کردار اور معیار کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔

● خلیل تنویر، اُدے پور، راجستھان

کتاب نما شمارہ مارچ ۹۶ء میں قمر گونڈوی کا مضمون مجروح سلطان پوری فن اور شخصیت شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مجروح صاحب کے ایک خط کا حوالہ دیا گیا ہے جس میں مجروح نے تحریر کیا ہے کہ...... "میں نے یہ اشعار فیض احمد فیض سے برسوں پہلے دیے پھر پگڑی برسوں بعد کی غزلوں پر فیض کے سر بندھی"۔

فیض احمد فیض کا پہلا شعری مجموعہ نقش فریادی ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور مجروح صاحب نے شاعری کی شروعات ۱۹۴۰ء میں سلطان پور کے ایک طرحی مشاعرے سے کی۔ فیض کے پہلے شعری مجموعہ میں نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی موجود ہیں جس میں محبت پر ایسا حقیقت پسندانہ شعر بھی موجود ہے۔

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ مجھ کو تو تجھ سے پیار نہیں

مجروح صاحب کا یہ دعوا کہ ترقی پسند شعرا میں صرف انھوں نے غزل کو گلے لگایا حقیقت سے بہت دور ہے۔ مجروح صاحب کے علاوہ معین احسن جذبی، مجاز اور فیض نے بھی غزلیں کہی ہیں اور ان غزلوں کا معیار کسی طرح مجروح صاحب کی غزلوں سے کم نہیں ہے۔

وارث کرمانی صاحب کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ مجروح صاحب کا سرمایۂ سخن مختصر ہے مجروح صاحب کے شعری مجموعے میں صرف سولہ، سترہ اشعار ایسے ہیں جو ان کے منفرد لب و لہجہ کی عکاسی کرتے ہیں باقی اشعار پر جگر مرحوم کے بڑے گہرے اثرات ہیں۔

قمر گونڈوی صاحب کا فیض کے بارے میں یہ کہنا کہ "وہ بے دین مرے" ان کی کم علمی کو ظاہر کرتا ہے، فیض نے اسلام کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ مرنے سے پہلے ان کا طویل انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں ایک جگہ انھوں نے نماز کی امامت کرنے کی بات قبول کی تھی ایسے شخص کے لیے یہ کہنا کہ وہ بے دین مرے، کذب و افترا ہے۔

● ڈاکٹر محمود شیخ، ۵۹۲، مرزا غالب مارگ، نیا محلہ جبل پور

مہمان مدیر، پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب کا اشاریہ 'کتاب نما' فروری ۹۶ء دیکھ کر حیرت ہوئی اور افسوس بھی۔ قاضی صاحب کے خیالات پر گرفت کی جا سکتی ہے لیکن طوالت کے خوف سے ہم اقبال کی تقریر کے اس اقتباس پر غور کرتے ہیں جسے بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ ... ایک متحدہ مغربی ریاست کی تعمیر مجھے کم سے کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی آخری منزل نظر آتی ہے۔"

کیا واقعی اقبال کی ایک تقریر نے ملک کا نقشہ بدل دیا؟ سوچ کے دھارے بدل دیے؟ مشرقی اور مغربی بنگال کی تفریق، مذہبی بنیاد پر ووٹوں کی تقسیم اور منٹو مارلے اصلاحات کو کس خانے میں فٹ کیا جائے گا؟ کیا یہ سب بھی اقبال کے اشارے پر ہو رہا تھا؟ اس اقتباس یا پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کا ذکر ہے پھر یہ بنگال کی تقسیم کیوں کر ہوئی؟ ریاست بنانے کا مفہوم ملک کی تقسیم کہاں سے اخذ کر لیا گیا؟ قاضی صاحب کو ۱۸۵۷ء کے بعد اکثریتی طبقہ کی فسطائی قوتوں کا عمل بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ انگریزی نظام حکومت جمہوری نہیں تھا۔ آج وہ اقبال کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں کیونکہ ملک میں جمہوریت ہے بھلے ہی اس کا سر فسطائی قوتوں کے جبڑے میں ہے ایسی جمہوریت فسطائیت سے بدتر ہے جس میں قوموں کو معاشی اور سماجی استحکام حاصل نہ ہو۔ حقائق کو محض جذباتی باتوں سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ پھر یہ شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں، کا عتاب آخر ہم پر ہی کیوں؟ ہم جو انھیں جانتے بھی نہیں؟ کیا یہ سیاسی بلیک میلنگ نہیں کہ خاموش رہو ورنہ ہم تمھارے گلے میں تقسیم کا پٹہ لٹکا دیں گے؟ تمھارے دانشوروں کو ذلیل کیا جائے گا؟ تمھاری حقیقت فراموش کر دی جائے گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ لکھیے اور لکھائیے مگر ہمت اور استقلال کے ساتھ، سوچیے غور کیجیے مگر انصاف کے ساتھ! کیونکہ ....

عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارا، نہ ملّا، نہ زاہد، نہ حکیم

فیض احمد فیض تمام عمر سیاست سے وابستہ رہے ان کے بارے میں ہاشمی صاحب کیا سوچتے ہیں؟

● جگدیش چندر بترہ اڈیٹر سرائیکی انٹرنیشنل ۳۴ پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب نے فروری ۱۹۹۶ء کے کتاب نما میں جو اشاریہ "مشترکہ تہذیبی ورثہ اور اقبال" پر لکھا ہے اس میں حقیقت پسندی کا اظہار ہے۔ علامہ اقبال "جو یورپ جانے سے قبل مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے ہر مظہر کے دلدادہ تھے اور اخوت کی دیرینہ بنیادوں اور اقدار پر ایمان رکھتے تھے۔ اچانک ذہنی تبدیلی سے آشنا ہوتے ہیں اور ان کی سیاسی بصیرت امت مسلمہ کی اجتماعی شیرازہ بندی کا جو خواب بنتی ہے اس سے نہ صرف مشترکہ ہندوستانی تہذیب بلکہ اسلام پر بھی غلط اثر ہوا ہے۔ دو قومی نظریہ کے یکجہتی وحدت، خیر سگالی اور دردمندی کو برصغیر سے

در بدر کر دیا ہے۔ آج نہ تو پاکستان میں اور نہ ہی ہندستان میں رہنے والے مسلمان خوش ہیں جن لوگوں نے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی وہ آج تک پاکستان میں مہاجر ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ مذہب سے کہیں زیادہ علم۔ ادب ثقافت انسانیت کو جوڑتا ہے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی صاحب سے توقع تھی کہ وہ ان وجوہات کو بھی تفصیل سے بیان کرتے جن کی وجہ سے اقبال جیسی شخصیت کیونکر سیاست کا شکار ہوگئی؟

● اختر سعید خاں، بھوپال

اپریل کے کتاب نما میں غزل کی اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔ مقطع میں سہو کتابت سے ایک غلطی راہ پاگئی ہے، اگر تصحیح فرمادی جائے تو شکر گزار ہوں گا۔ صحیح یوں ہے ؂

نہ وہ اجنبی ہے نہ میں اجنبی ہوں
جو کچھ ہے سو اختر حجابِ نظر ہے

● انور قمر، ۱۳ اے گل اپارٹمنٹس، باندرہ، ممبئی ۵۰

مجتبیٰ حسین کا مضمون "رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے" (کتاب نما، اپریل ۱۹۹۶ء) پڑھنے کے بعد مجھے مقدس انجیل کی ایک عبارت یاد آگئی کہ ایک دن حضرت عیسیٰ نے اپنے تمام حواریوں کو اپنے پاس بلایا اور انھیں بیماروں کو بیماری سے اور آسیب زدوں کو آسیب سے نجات دلانے کی فضیلت بخشی اور فرمایا کہ اب وہ اللہ کے دین کو چاروں سمت پھیلانے کے لیے چل کھڑے ہوں جس بستی میں جائیں اس بستی کے بیماروں کو اچھا کر دیں، مُردوں کو جِلا دیں، کوڑھیوں کو پاک کر دیں اور آسیب زدوں کے جسموں سے آسیب نکال دیں لیکن سونا اپنی کمر میں نہ رکھیں اور نہ رکھیں چاندی اور رقم۔ راستے کے لیے نہ جھولی لیں، نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں نہ لاٹھی۔ جس گھر میں پہنچیں وہیں قیام کریں اور مذہب کی تبلیغ کے بعد آگے بڑھ جائیں۔ مگر جس بستی کے لوگ انھیں قیام نہ کرنے دیں، تو اس صورت میں وہاں ہرگز نہ رکیں۔ بلکہ بستی چھوڑنے سے پہلے وہ اپنے پیروں سے لگی ہوئی گرد کو بھی سبھوں کے سامنے اس طرح سے جھاڑ دیں کہ دیکھنے والے کو بخوبی احساس ہو جائے کہ جانے والا تو اس بستی کی خاک بھی اپنے ساتھ لے جانے کا روادار نہ ہوا۔

میرا خیال ہے کہ اس عبارت اور مذکورہ مضمون میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ ہے انسان کا طرزِ عمل! جو صداقت متعین کرنے میں ایک رہنما کی حیثیت سے کام آسکتا ہے۔

● شاکر رام پوری، وکرولی، ممبئی ۹۳

آپ کے پرچہ میں اپریل کے شمارہ میں میری غزل شائع ہوئی ہے جس کے مطلع کے مصرع اوّل میں غلط کتابت ہوگئی ہے آپ نے مصرع اس طرح لکھا ہے۔

"وقت ہے وقت یہ اب اس کی ہوا کچھ بھی نہیں"

جبکہ صحیح مصرع یوں ہے۔

وقت ہے وقت یہ اس کی وفا کچھ بھی نہیں

ادبی و تہذیبی خبریں

اخترالایمان کے سانحہ ارتحال پر مختلف شہروں میں تعزیتی جلسے

دہلی یونی ورسٹی دہلی یونی ورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر عبدالحق نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے فرمایا کہ اخترالایمان اقبال کے بعد اردو نظم میں سب سے نمایاں نام ہے جنھوں نے اپنے منفرد انداز و اسلوب سے اردو نظم کو معیار و وقار عطا کیا انھوں نے کہا کہ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی وہ پہلا شعبہ ہے جس نے اخترالایمان پر ان کی حیات میں ایک سمینار منعقد کیا۔ پروفیسر شمیم نکہت نے اخترالایمان کو ایک عہد ساز شخصیت قرار دیا جبکہ پروفیسر امیر عارفی نے فرمایا کہ اخترالایمان نے اپنی نظموں میں ندرت خیال اور جدت اسلوب کو جنم دیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے مرحوم کی رحلت کو اردو کے لیے ناقابل تلافی بتایا۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے کہا کہ اخترالایمان کی شاعری کلاسکی اقدار اور عصری حسیت کے متوازن عناصر سے مزین ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مرحوم جدید اردو شاعری کے ایمان تھے۔ ڈاکٹر ابن کنول نے کہا کہ ان کے ناگہانی موت سے اردو ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ شعبہ کے ریسرچ ایسوسی ایٹس خواجہ اکرام الدین، قمر نفیس حسن، رضی الرحمٰن، سراج اجملی، نجمہ رحمانی، شاہد تسلیم اور دیگر طلبا نے بھی اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

انجمن ترقی اردو کراچی

انجمن کے معتمد اعزازی جمیل الدین عالی نے کہا کہ اخترالایمان میرے زمانہ طالب علمی کے دوست تھے ان کی رحلت سے مجھے ذاتی طور پر دکھ ہوا ہے۔ معروف شاعر احمد ندیم قاسمی نے کہا کہ ان کا اسلوب قطعی منفرد تھا۔ افتخار عارف نے کہا کہ اہل ادب ایک ذہین شاعر سے محروم ہو گئے۔ اجلاس میں ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر اسلم فرخی، افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر فہیم اعظمی، محسن بھوپالی، حسن عابدی، مشفق خواجہ، شکیل عادل زادہ، جمیل اختر خان، سلیم چودھری، سرشار صدیقی، سحر انصاری، ہلال نقوی، کاظم حسن، رخسانہ صبیم (دہلی)، صفیہ صدیقی (لندن)، ممتاز احمد خاں نے شرکت کی۔

حلقہ ادب بہار پروفیسر عبدالمنان صاحب کی صدارت میں حلقہ ادب بہار نے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبدالمغنی، جناب ہارون رشید، ڈاکٹر عبدالصمد، جناب شان الرحمٰن، جناب فخرالدین عارفی، جناب خورشید اکبر اور جناب اثر فریدی نے اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

ونو بھا یونی ورسٹی ہزاری باغ :- صدر شعبۂ اردو پروفیسر ابوذر عثمانی نے کہا کہ اخترالایمان نے اردو نظم کو ایک نئے طرز اور ایک نئے لہجے سے آشنا کیا اور علامتی نظموں کے بالخصوص معتدل، معتبر اور کامیاب نمونے پیش کیے۔ ریڈر شعبۂ اردو ڈاکٹر خورشید جہاں نے ان کی نظم نگاری کو اردو شاعری میں ایک منفرد اور اچھوتے تجربے سے تعبیر کیا۔ طالبہ نسیمہ خاتون نے مرحوم کی نظم "ذکر مغفور" پڑھ کر سنائی اور بتایا کہ اخترالایمان آخری ایام میں جس کرب اور اذیت میں مبتلا تھے یہ نظم اس کی واضح عکاسی کرتی ہے اس کے علاوہ شعبے کے طلباء و طالبات نے بھی اپنے اپنے تاثرات پیش کیے۔

اردو فاؤنڈیشن نوئیڈا :- اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شاعر مظہر امام کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس موقع پر رفعت سروش نے کہا کہ اخترالایمان نے جدید اردو نظم کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا۔ وہ ایک تاریخ ساز شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ شیخ سلیم احمد نے کہا کہ ان میں غضب کی خود اعتمادی تھی۔ حامد محمود نے کہا کہ اخترالایمان بڑی زندہ دل شخصیت تھے۔ ذکی طارق نے ان کی نظموں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری آپ بیتی کے پردے میں جگ بیتی ہے جبکہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے کہا کہ بیشک "ایک لڑکا" ایک نمایندہ نظم ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ان کی شاعری کی بہت سی جہتیں ہیں صدر جلسہ مظہر امام نے اخترالایمان کے فکر و فن کے سفر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ وہ ابتدائی دنوں میں افسانہ نگاری سے اور بعد میں فلمی مکالمہ نگار اور منظر نگار کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ افسانہ نگار قمر جمالی اور پی جی رند سرپو استوا نے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔

نوری اردو اکادمی برہولیا دربھنگہ :- ڈاکٹر مطلوب انور کی صدارت میں نوری اردو اکادمی کے زیر اہتمام اخترالایمان کی

رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں سکریٹری اکاڈمی اظہر نیر نے اخترالایمان کی نظموں کے آہنگ اور تکنیک پر ایک منفرد تقریر کی جبکہ صدر جلسہ نے اخترالایمان کی اردو خدمات کا اعتراف کیا۔

ممبئی میں تعزیتی نشست

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی، انجمن ترقی اردو، ادارہ ہم سب اور قلم رائٹر ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام بروز سنیچر مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۹۶ء کی شام ساڑھے چار بجے خلافت ہاؤس ممبئی میں معروف شاعر اخترالایمان کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست کا اہتمام ہوا۔

نشست کا آغاز ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے کلمات سے ہوا۔ یعقوب راہی نے اخترالایمان کے فن پر مضمون پیش کیا۔ مشہور صحافی حسن کمال نے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ بہ حیثیت مکالمہ نگار مرحوم انتہائی کامیاب رہے۔ پروفیسر انور ظہیر نے انھیں منفرد لب و لہجہ کے شاعر قرار دیا۔ ہارون رشید (علیگ) نے کہا کہ اخترالایمان نے فلموں کے ذریعہ اردو زبان کو غیر اردو دانوں میں مقبول و عام کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ مدھو سدن اخترالایمان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اخترالایمان یتیم خانہ سے اپنی زندگی کا آغاز کیا اور مصیبتوں، پریشانیوں کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے وہ زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ جبکہ یوسف ناظم نے "اختر بھائی کا پتا بدل گیا" کے عنوان سے اپنا مضمون پیش کیا۔

باقر مہدی نے کہا اختر بھائی اور میں نے ایک ساتھ ممبئی میں کام شروع کیا بعد میں وہ فلموں سے اور میں ادبی دنیا سے وابستہ ہو گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے تعزیتی قرارداد پیش کی۔ وزیر اعظم ہند کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا اور دو منٹ کھڑے ہو کر تعزیت پیش کی۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے نظامت کے فرائض انجام دیے سید وقار قادری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

خلیل جبران اور ٹیگور کے ادب پر تحقیق

عالمی تقابلی ادب کے شعبے سے مراقش کی

شاعرہ عائشہ الجدید کو ڈاکٹریٹ

امریکا میں اقامت پذیر عربی زبان کی شاعرہ عائشہ الجدید کو عالمی تقابلی ادب کے شعبے سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ عائشہ الجدید نے اپنا تحقیقی مقالہ لبنان نژاد خلیل جبران اور رابندر ناتھ ٹیگور کے شعری ادب میں انسانی اقدار سے عبارت ضابطۂ حیات، احترام آدمیت اور دونوں ممتاز شعرا کی تخلیقات خصوصاً گیتانجلی اور The Prophet میں تمدنی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی مماثلث اور مساوات پر لکھا۔ انھوں نے یہ کام واشنگٹن ڈی سی میں مقیم اور یو ڈی سی میں انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر اردو کے ممتاز شاعر اور ادیب ڈاکٹر ستیہ پال آنند کی زیر نگرانی برسوں میں مکمل کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک گرانٹ کے تحت ان کے انگریزی تھیسس کو عربی زبان کے علاوہ برصغیر کی تین بڑی زبانوں، بنگالی ہندی اور اردو میں ترجمہ کیے جانے کی تجویز ہے۔ عائشہ الجدید کا آبائی وطن مراقش ہے اور وہ عرب براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے منسلک ہیں۔ عربی میں ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

جشن غنی اعجاز

اکولہ ۶ر دسمبر کی شب اکولہ میں اچھی شاعری سننے کے شوقین طلبا، اساتذہ، ڈاکٹرس، وکلاء وغیرہ کا رُخ ہاشم سیٹھ لائبریری کی طرف تھا جہاں جشن غنی اعجاز کا اہتمام کیا گیا۔ ان کے دوسرے شعری مجموعہ "گرد سفر" کی رسم اجراء جناب خان محمد اظہر حسین (ایم ایل سی) کے ہاتھوں انجام پائی۔ بعد ازاں ایڈوکیٹ مروان علی خان نشاط کی صدارت میں ایک تاریخی مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ مہمانان خصوصی میں قاضی محمد علی، سید ظفر علی، محسن شہیدی، ابراہیم بسمل، سخاء اللہ خاں، ڈاکٹر عمران، ڈاکٹر شعیب اور ڈاکٹر اعزاز پرویز صاحبان نے شرکت کی۔ پر لطف جملوں اور صاحبِ جشن غنی اعجاز کے سیکڑوں خوبصورت اشعار سے آراستہ نظامت مقبول شاعر فصیح اللہ خان نقیب نے انجام دے کر حاضرین کا دل موہ لیا۔ مشاعرہ کے کامیاب شعراء میں مروان علی خان نشاط، ابراہیم بسمل، غنی اعجاز، انوار نشتر، فیاض افسوس، قاضی رؤف انجم، مصطفیٰ جمیل، فصیح اللہ خان نقیب، ضمیر ساجد، شوکت انصاری، اقبال خلش، حسین واصف، مظفر وکی، امین الدین امین، التمش شمس، شیخ امید، حسین جھنجھٹ، عظیم وقار، ڈاکٹر عمران اور حنیف ـــــ شامل ہیں۔

مجموعہ کلام متاعِ ہنر کے رسم اجراء کی ممبئی میں ایک باوقار تقریب

ممبئی: "آج ہماری تہذیب کے نشانات مٹتے جا رہے ہیں اور بزرگوں کے احترام کا فقدان ہوتا جا رہا ہے اور ہماری اعلا قدریں ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ ایسے ماحول میں فاران پبلی کیشنز اور اردو قبیلہ نے جناب محمود سروش کی کتاب کی اشاعت اور پھر اس کے اجراء کا اہتمام کر کے اور اپنا فریضہ سمجھ کر جو یہ کام انجام دیا ہے ان لوگوں کو میں اس کی مبارکباد دیتی ہوں۔" مشہور شاعرہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے محترم محمود سروش کے شعری مجموعہ متاعِ ہنر کی تقریب اجراء کی نظامت کرتے ہوئے ابتداء میں یہ باتیں کہیں۔

اس موقعہ پر دبستان آرزو کے روح رواں، شاعر وادیب جناب نوا لکھنوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ محترم محمود سروش آرزو اسکول کے آخری چراغ ہیں ان کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل بن کے رہیں گے۔ یہ اشعار حضرت محمود سروش کو تب تک زندہ رکھیں گے جب تک اردو زبان وادب باقی رہیں گے۔ نئی نسل کے نمایندہ شاعر عبدالاحد ساز نے جناب محمود سروش کی شاعری پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ میں شاعر ہوں نہ ادیب، نہ صحافی ہوں نہ پڑھا لکھا آدمی ـــــ لیکن ان تمام علمی افلاس کے مقابلے میں میرا ایک فخر اتنا عظیم ہے کہ جو مجھے سرتاج بناتا ہے وہ یہ کہ محمود سروش میرے دوست ہیں ـــــ ان خیالات کا اظہار جناب بشارت شکوہ نے کیا۔

محترم محمود سروش کے برادر خورد جناب اختر حسن رضوی نے اپنی تقریر میں محمود سروش صاحب کی خودداری، شرافت اور اپنی ذات وصفات سے استغنا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب کی ان خوبیوں کا ہمارے خاندان پر بڑا اثر ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑی بات ہے کہ ہمارا کردار، ہمارے گھر کا کلچر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مشہور مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے ایک دلچسپ خاکہ "محمود سروش میری کمزور آنکھوں میں" پیش کیا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی کے چیئرمین اور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے کہا کہ اگر چہ انھیں کوئی سرکاری اعزاز یا منصب نہیں ملا لیکن جو اعزاز اور منصب مجھے ملا ہے اس میں محمود (سروش) بھائی کا بڑا حصہ ہے کیا یہ بھی ایک اعزاز نہیں کہ انھوں نے بے شمار لوگوں کو صاحب اعزاز بنایا ہے۔ ڈاکٹر دلوی نے زور دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ رضوی کالج ہے یہاں ایک باقاعدہ شعبہ اردو قائم ہونا چاہیے اور محمود سروش صاحب کا جو قیمتی کتب خانہ ہے وہ یہاں کا ایک ریسرچ ونگ بن جائے۔

دوران جلسہ فاران پبلی کیشنز کی جانب سے صاحب کتاب محمود سروش کی خدمت میں نسل نو کے نمایندہ شاعر عبدالاحد ساز نے گلدستہ پیش کیا اور اردو قبیلہ کی جانب سے جناب جمیل مرصع پوری نے متاعِ ہنر کے خالق سروش صاحب کو شال اور گلہائے تحسین پیش کیے نیز فاران پبلی کیشنز کے روح رواں عثمان غنی عادل کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے انھیں پھولوں کا ہار پیش کیا۔

نوجوان شاعر اور جناب سروش کے داماد شمیم عباس نے اپنی جذباتی تقریر میں کہا کہ میں اہل خانہ کی طرف سے اور اردو کے قاری کی حیثیت سے یہ کہوں گا کہ محمود سروش صاحب نے جو کارنامہ انجام دیا ہے عثمان غنی عادل صاحب کا کارنامہ جو متاعِ ہنر کی صورت میں طبع ہو کر ہم تک پہنچا ہے کسی معنی میں کم نہیں ہے۔ جناب عادل نے کم از کم مجھ پر ذاتی طور پر احسان کیا ہے۔

صدر جلسہ جناب باقر مہدی نے متاعِ ہنر کا اجراء کیا۔ بعد میں متاعِ ہنر کے خالق جناب سروش سے کچھ اظہار خیال کی گزارش کی گئی۔ وہ شدید علالت اور نقاہت کے باوجود جلسہ گاہ میں اخیر تک موجود رہے اور انھوں نے شدید رندھی ہوئی آواز میں شکر ربی کے ساتھ یہ کہا کہ "میں نے تو زندگی کو جس طرح پایا اسی طرح نظم کر دیا۔ میں نے ذرا بھی ردو بدل نہیں کیا۔" جناب باقر مہدی نے اپنی تقریر میں محمود سروش صاحب کے علمی پہلوؤں کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ جب میں ممبئی میں پہلی بار آیا تھا تو حضرت سروش میرا سائبان بنے۔ ان کی ایک خاص بات مجھے آج یاد آتی ہے کہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھو مقرر تو بہت ہوئے ہیں۔ شاعر تو بہت ہوئے ہیں، ادیب تو بہت ہوئے ہیں لیکن قاری بننا بہت ضروری ہے۔ جناب باقر مہدی نے یہ بھی کہا کہ "ہم لوگ" اس دور کے نہیں ہیں۔

گزشتہ ۳؍مارچ کی شام باندرہ (ممبئی) کے رضوی کالج میں منعقد ہونے والی اس تقریب میں شعر وادب کے شائقین اور محمود سروش کے معتقدین کی خاصی تعداد موجود تھی جس میں انور خان، انور قمر، انور ظہیر خان، الیاس شوقی،

[illegible]
رضوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جواں سال غزل سنگر راشد علی نے کلام محمود سروش اور علامہ آرزو لکھنوی کی غزل گا کر جلسے میں ساز و آواز کی ایک ترنگ پیدا کی جبکہ اختتام جلسہ پر جناب عثمان غنی عادل نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ کا خیر مقدم

بھوپال ۱۶؍مارچ ۱۹۹۶ء سیفیہ کالج کے شعبہ اردو میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اساتذہ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر خالد محمود اور جناب تحسین برنی کے اعزاز میں ایک شاندار جلسہ ہوا جس میں شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ کالج کے پرنسپل جناب حسن مسعود صاحب اور سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکریٹری جناب زین الدین شاہ صاحب نے شرکت فرمائی۔ جلسے کا آغاز جناب زین الدین شاہ صاحب کے استقبالیہ کلمات سے ہوا۔ موصوف نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور سیفیہ کالج کسی پروجیکٹ پر مل کر کام کریں تاکہ دونوں تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور طلبہ کو ایک دوسرے کے نزدیک آنے کے مواقع حاصل ہوں۔ جناب زین الدین شاہ صاحب کی استقبالیہ تقریر کے بعد ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عثمانی نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا برصغیر میں لوگ ادب کو اخبار کی طرح پڑھنے کے عادی ہو گئے ہیں جبکہ ادب بار بار مطالعہ کا متقاضی ہے کہ اس کے بغیر مکمل ابلاغ ممکن نہیں۔ انھوں نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی خدمات کو سراہتے ہوئے شعبۂ اردو کا اعزازی طالب علم بننے کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ بھوپال شہر غزل اور شہر اقبال ہی نہیں شہر خلوص بھی ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی (نائب مدیر رسالہ جامعہ) اور جناب تحسین برنی نے بھی اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار فرمایا۔ ڈاکٹر سہیل فاروقی نے پرسوز آواز میں اپنی خوبصورت غزلیں سنا کر سامعین سے داد حاصل کی اس سے قبل ڈاکٹر محمد نعمان نے بانی سیفیہ ملا سجاد حسین پاسبان سیفیہ ملا فخر الدین مرحوم اور سیفیہ کالج کا تعارف کرایا مہمانوں کا تعارف ڈاکٹر خالد محمود نے کرایا جو سیفیہ کالج کے قدیم طالب علم ہیں اور عرصہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو سے منسلک ہیں۔ پروفیسر حسن مسعود صاحب پرنسپل سیفیہ کالج نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں جناب عشرت قادری کی زیر صدارت ایک شعری نشست منعقد ہوئی جس میں مہمان شاعر ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی کے علاوہ پروفیسر زکی الرحمٰن، ڈاکٹر خالد محمود، ظفر صہبائی، نسیم انصاری، اقبال مسعود، اختر واصق، اقبال بیدار اور بدر واسطی نے اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے سانحہ ارتحال پر تعزیتی جلسہ

۱۴؍جنوری ۱۹۹۲ء اردو ریسرچ ایسوسی ایشن کی جانب سے شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ پروفیسر عبدالحق صدر شعبہ اردو نے خواجہ احمد فاروقی کے کارہائے نمایاں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ خواجہ صاحب کی شخصیت ہمہ جہت تھی اور انھوں نے تاحیات اردو کے فروغ اور بہتری کے لیے کام کیا۔ خواہ شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کا قیام ہو یا اردو یونی ورسٹی قائم کرنے کا خیال یہ خواجہ صاحب کی دین ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی صد سالہ جشن منانے کا پہلا خیال اور کوشش فاروقی صاحب نے ہی کی تھی۔ نظام توسیعی خطبات کی شروعات اور انجمن اساتذہ کا قیام دراصل انہی کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔ ایم لٹ کورس کی شروعات سب سے پہلے شعبہ اردو میں فاروقی صاحب نے ہی کی تھی بعد ازاں یو جی سی کی طرف سے مرکزی یونی ورسٹیوں میں ایم فل کا کورس شروع ہوا۔ شعبہ اردو میں تدوین متن کا کورس بھی فاروقی صاحب کی سوچ کا نتیجہ تھا اور اس کے بعد دیگر شعبہ نے اسے اپنے نصاب میں شامل کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے خواجہ صاحب کی شخصیت اور ادبی و انتظامی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ایک لمحہ کا حساب رکھتے تھے اور ان کا ہر لمحہ اردو کے معیار و وقار کو بلند کرنے میں صرف ہوتا تھا اور پروفیسر قمر رئیس نے فرمایا کہ ان کی شخصیت بلند قامت تھی اور ایک چھتنار درخت کی طرح اردو ادب و زبان پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ شعبہ عربی کے استاد پروفیسر سلیمان اشرف نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ جب تک اردو زندہ ہے فاروقی

ب کا نام بھی زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ جو خواجہ
ب کی دختر نیک اختر اور شعبہ کے اساتذہ میں ہیں اس
قع پر شرکائے جلسہ کے اظہار تعزیت اور دلجوئی کا شکریہ ادا
یا۔ اس تعزیتی جلسہ میں ڈاکٹر عظمت اللہ خان، ڈاکٹر ارتضیٰ
کریم، ڈاکٹر امین کنول، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر
ت ریحانہ خاں، ڈاکٹر توقیر احمد خاں، ڈاکٹر اکرام الدین، ڈاکٹر
ائشہ سلطانہ، ڈاکٹر نجمہ رحمانی، نفیس احمد، سراج اجملی، ظفر
دین، محمد رضی الرحمن اور دیگر ریسرچ اسکالرز اور طلبا
طالبات نے شرکت کی۔

بہار قانون ساز کاؤنسل

بہار قانون ساز کاؤنسل نے اپنے دستور العمل اور
صول و ضوابط میں ترمیم کرتے ہوئے ہندی، دیوناگری خط کے
ساتھ ساتھ اردو زبان خط کو قانون ساز کاؤنسل کی آئینی زبان
خط کی شکل میں منظوری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج کاؤنسل کے
کارگزار چیئرمین پروفیسر جابر حسین کی صدارت میں منعقد
کاؤنسل کی دستور العمل کمیٹی کی نشست میں یہ تاریخی فیصلہ کیا
گیا۔

دستور العمل میں اس ترمیم کے مطابق کاؤنسل کے
دستور العمل اور اصول و ضوابط کی دفعہ 41 میں دستوری زبان
کی شکل میں ہندی، دیوناگری خط کے ساتھ ساتھ اردو زبان خط
کے استعمال کا نظم کیا جائے گا۔

کاؤنسل کے اس فیصلے کی روشنی میں ایوان کی مکمل
کارروائی فہرست امور روزانہ تفصیلات کمیٹی کی رپورٹیں
وغیرہ ہندی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی تیار کرکے معزز
اراکین کو فراہم کی جائیں گی۔ ساتھ ہی معزز اراکین کو اپنی
توجہ دلاؤ نوٹس اور وقفہ صفر سے متعلق اطلاعات بھی ہندی کے
ساتھ ساتھ اردو میں دینے کی سہولت ہوگی۔ یاد رہے کہ
کاؤنسل کے کارگزار چیئرمین پروفیسر جابر حسین نے اپنا عہدہ
سنبھالتے ہی کاؤنسل میں اردو شعبہ کی تشکیل کا فیصلہ کیا اور
اس کے لیے مختلف سطحوں پر انتظامی پوسٹیں بھی تشکیل کی
گئیں۔ اس درمیان کاؤنسل کی مختلف کمیٹی رپورٹوں اور
بعض اہم کارروائی رپورٹ کے حصے اردو زبان خط میں معزز
اراکین کے بیچ تقسیم کیے گئے۔ دستور العمل کمیٹی کی نشست
میں پروفیسر حسین کے علاوہ جناب مشری سدا لیڈر حزب مخالف
پروفیسر ارون کمار ڈپٹی لیڈر، ڈاکٹر رام چندر پوربے، رگھوناتھ
گپتا شیو نندن پرساد سنگھ، رام پیارے لال، مسعود رائے، کما
شنکر شکل، مدھو سنہا اور شکیل احمد خاں نے حصہ لیا۔ کاؤنسل

کے کارگزار چیئرمین پروفیسر جابر حسین نے دستور العمل کمیٹی
کے اس فیصلے کو دوسری سرکاری زبان کی شکل میں اردو کو اس کا
آئینی حق دلانے کی سمت ایک اہم تعمیری قدم بتایا۔ ادارہ کتاب نما
پروفیسر جابر حسین کو اس نیک اور اہم کام کے مبارکباد پیش
کرتا ہے۔

نعیم زبیری کا انتقال

اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب نعیم زبیری
کا ۷ مارچ ۱۹۹۶ء کو نظام انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل
سائنس حیدر آباد میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی عمر تقریباً
۸۰ برس تھی۔ وہ نہایت خوش مزاج اور مرنجان مرنج
شخصیت کے حامل تھے۔

مسرور حسین سرور کو صدمہ

فتح گڈھ: ۱۱ مارچ ۱۹۹۶ء کو اردو کے مشہور
شاعر مسرور حسین سرور کی والدہ کا طویل علالت کے
بعد انتقال ہوگیا۔ موصوفہ گلے کے کینسر میں مبتلا تھیں۔
ادارہ کتاب نما مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے
اور پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

صغریٰ عالم کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

محترمہ صغریٰ عالم کو بی آر امبیڈکر بہار یونیورسٹی
مظفر پور نے ان کے تحقیقی مقالہ "پروفیسر عنوان چشتی،
حیات اور کارنامے" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری
تفویض کی۔ انھوں نے اپنا یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر
عبدالواسع پروفیسر آف اردو بی آر اے بہار
یونیورسٹی مظفر پور شعبۂ اردو کی نگرانی میں مکمل
کیا۔ ان کے ممتحن ڈاکٹر افصح ظفر پروفیسر آف اردو
مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا اور پروفیسر مظفر حنفی کلکتہ
یونیورسٹی تھے۔

پروانہ ردولوی کو بابائے اردو صحافتی ایوارڈ

نئی دہلی ۱۲/اپریل (عوام بیورو) بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سوسائٹی رجسٹرڈ کے صدر حاجی امین انصاری اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر عقیل اختر ملک کے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۶ء کا بابائے اردو ایوارڈ برائے صحافت بزرگ صحافی جناب پروانہ ردولوی کو دیا جائے گا۔ بزرگ شاعر جناب حفیظ میرٹھی کو شاعری کے لیے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے اسسٹنٹ سکریٹری جناب ایم حبیب خاں کو تحقیق کے لیے جناب گلزار دہلوی کو قومی یکجہتی کے لیے اور جامعہ اردو علی گڑھ کو تعلیم کے لیے بابائے اردو کل ہند ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ۲۱/اپریل کو بابائے اردو کے وطن ہاپوڑ میں منعقد ہونے والے ایک جلسہ میں یہ ایوارڈ دیے جائیں گے۔ اس موقع پر قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کے کردار پر ایک سمینار بھی ہوگا۔

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ کے نئے صدر

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نئے صدر کے طور پر اپنا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی (سابق صدر) کے عہدہ سے مستعفی ہوجانے کے باعث پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کو شعبۂ اردو کی صدارت سونپی گئی ہے۔

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ہوئی۔ موصوف نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ مشہور نقاد پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔ "شعریات اقبال" اور "نقد شعر" ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

دہلی یونی ورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر شمیم نکہت کو صدمہ

دہلی ۱۵/اپریل۔ دہلی یونی ورسٹی میں اردو کی پروفیسر اور افسانہ نگار ڈاکٹر شمیم نکہت کی والدہ کا طویل علالت کے بعد ۸۵ سال کی عمر میں آج علی الصباح یہاں انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں ایک بیٹا اور چھ بیٹیاں ہیں۔ ان کے بیٹے محمد ابراہیم صدیقی اسلام آباد میں ہیں۔ ممتاز ناقد پروفیسر شارب ردولوی، مشہور افسانہ نگار و صحافی عابد سہیل اور مشہور مصور مصلح احمد ان کے داماد ہیں۔ بعد نماز جمعہ دہلی گیٹ قبرستان میں تدفین ہوئی جس میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر ٹی این بال، پروفیسر سہگل اور دیگر اساتذہ و طلبا کی بڑی تعداد موجود تھی۔

دلیپ بادل نہیں رہے

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور شاعر، ادیب اور تبصرہ نگار جناب دلیپ بادل کا مختصر علالت کے بعد ۱۳/مارچ ۱۹۹۶ء کو آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں ساڑھے گیارہ بجے شب اچانک انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۶۳ سال تھی۔

دلیپ بادل صاحب بہت ہنس مکھ، ملنسار اور منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔ ان کا اردو گھر سے بہت گہرا رشتہ تھا۔ وہ "ہماری زبان" کے لیے مختلف اصناف کی کتابوں پر مستقل تبصرے لکھتے رہے۔ وہ ایک بہت اچھے شاعر اور نثر نگار بھی تھے۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جون ۱۹۹۶ جلد ۳۶ شمارہ ۶

فی پرچہ 6/50
سالانہ 60/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 80/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 350/=

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
ٹیلی فون:- ۶۹۱۰۱۹۱
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید دسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

مکتبہ جامعہ بک کلب

کا ممبر بن کر اردو کی ادبی اور معیاری کتابیں رعایتی قیمت پر حاصل کیجیے

ہمیں یقین ہے کہ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس نئی اسکیم سے استفادہ کریں گے اور ہمیں موقع دیں گے کہ ہم کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ اچھی کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کرسکیں۔

قواعد وضوابط

1 بک کلب کی فیس رکنیت دس روپے /10 Rs ہوگی۔ ممبر بننے کے لیے کسی فارم کی ضرورت نہیں۔ فیس رکنیت بھیج دینا کافی ہے۔

2 بک کلب کے ہر ممبر سے ماہنامہ "کتاب نما" کا (جس کا سالانہ چندہ /60 روپے ہے) صرف /55 روپے سالانہ چندہ لیا جائے گا۔

3 ہر ممبر کو مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (غیر درسی پر) 25٪ اور ہندستان میں چھپی ہوئی تمام اردو کی کتابوں کی خریداری پر 10٪ کمیشن دیا جائے گا۔ (ہر فرمائش پر بک کلب کی ممبری کا حوالہ دینا ضروری ہوگا)

4 بک کلب کا ممبر صرف انفرادی طور سے بنا جا سکتا ہے۔ کوئی لائبریری بک کلب کی ممبر نہیں بن سکتی۔

5 ممبری کے دوران ممبر حضرات جتنی بار چاہیں کتابیں خرید سکتے ہیں۔

6 کتابیں بذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی اور اخراجات روانگی کتب ممبر کے ذمے ہوں گے۔

7 گیارہ مہینے گزرنے کے بعد ہر ممبر کے لیے لازمی ہوگا کہ وہ فیس رکنیت کی کتابیں خرید کر پچھلا حساب صاف کرے اور آئندہ کے لیے پھر سے رکنیت کی فیس بذریعہ منی آرڈر روانہ کرے۔

8 بک کلب کی رکنیت کی مدت پوری ہو جانے کے باوجود اگر کسی نے اپنی طرف سے کتابوں کا آرڈر نہیں بھیجا تو ہم مجبوراً اپنی پسند کی کتاب بھیج کر حساب صاف کردیں گے۔

ممبر حضرات اپنی پسند کی کتابیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یا اس کی کسی بھی شاخ سے حاصل کرسکتے ہیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ 202002

مہمان مدیر
ڈاکٹر ناشر نقوی
شعبۂ اردو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ (پنجاب)

اشاریہ
کچھ اردو اور پنجاب کے تعلق سے

ہندستان کے نقشے پر بہ ظاہر پنجاب ایک چھوٹے سے صوبے کی صورت میں نظر آتا ہے لیکن قومی تاریخ کے پس منظر میں جب اس صوبے کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہی پنجاب ہندستان کا دل بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خطہ ہندستان کا سرحدی صوبہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بھارت میں عہد بہ عہد جتنے بھی حملہ آور آئے ان کا پہلا پڑاو پنجاب ہی رہا۔ ان حملہ آوروں کے آنے اور آکر یہاں بس جانے کا سلسلہ ایک دو بار نہیں بلکہ صدیوں سے رہا ہے۔ ان حملہ آوروں سے پنجاب کے عوام نے جہاں حکومتوں کی جنگیں لڑی ہیں وہاں لسانی محاذ پر بھی اپنی دلیری کے ثبوت دیئے ہیں۔ پنجاب میں ارتباط، اختلاط، انحطاط اور احتیاط کا یہ عمل اور رد عمل صدیوں پر محیط ہے ۱۰۰۴ء میں محمود غزنوی نے پنجاب پر اپنی حکومت قائم کی اور لاہور کو اپنی راجدھانی بنایا، اس کی فوج میں ترک، خلج، افغان اور ہندی شامل تھے۔ غزنویوں نے مفتوحہ پنجاب کو جالندھر، ملتان، جہلم سندھ اور لاہور اضلاع میں منقسم کیا، یہاں ان کی حکومت تقریباً ایک سو ستر برس قائم رہی۔ ظاہر ہے کہ اس مدت میں ہندو مسلم اتحاد و اتفاق میں استحکام بھی ہوا اور اسی رشتے کے سبب پنجاب میں ایک نئی زبان کی کونپلیں پھوٹنا شروع ہوئیں۔ پنجاب کے بڑے علاقے پر حکومت چلانے کے لیے غزنیوں کو پنجابی سے اور پنجاب کے عوام کو رابطے کے لیے ترکی، فارسی اور عربی سے سمجھوتا کرنا فطری بات تھی۔ غزنی مسلمان چونکہ پنجاب میں تازہ ولایت تھے اس لیے انھوں نے اس نئی رابطے کی زبان کا نام ہندی رکھا اور اس ہندی کی ترقی میں نمایاں کام بھی کیے۔ غزنیوں میں البیرونی نے ہندی اور سنسکرت میں مہارت حاصل کی اس نے عربی سے سنسکرت اور سنسکرت سے عربی میں متعدد کتابوں کے ترجمے کیے جن میں "تاریخ الہند" اس کی قابل ذکر تالیف ہے۔

کسی زبان کی تشکیل میں جو عوامل کار فرما ہوتے ہیں ان کی بنیاد تہذیبی اکائیوں پر

ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں پنجاب کے سیاسی اور تہذیبی تغیرات کے ساتھ ساتھ جب ہم اردو کی ابتدائی اور ارتقائی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ مسلم فاتحین کی زبانوں نے پنجاب کی قدیم اور علاقائی بولیوں یعنی بانگڑو اور ہریانی کے ساتھ ملکر جس زبان کی تشکیل کی وہ پنجابی تھی۔ فاتحین اور پنجاب کے عوام وسیلۂ اظہار سے ایک نیا ہند آریائی تمدن بھی قائم ہوا جس کے زیر اثر پہلے پنجاب میں اور پھر رفتہ رفتہ پورے مغربی ہندستان میں جدید بھاشاوں نے جنم لیا۔ یہ زبانیں، برج بھاشا، پنجابی پھر ہندی اور ہندوی کے نام سے مشہور ہوئیں یہی رابطے کی زبان پھر اردو کہلائی۔ نظر شیر علی سرخوش نے اردو تاریخ کے سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ اردو زبان کی نہایت ابتدائی اور شکل و صورت پنجابی ہی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صدیوں کے تہذیبی ٹکراو کی آمیزش کے باوجود پنجاب کی اپنی تہذیب کی جڑیں بیرونی کلچر کی آندھیوں سے متاثر تو ضرور ہوئیں لیکن اکھڑ نہیں سکیں وہ مسلمان جو پنجاب میں باہر سے آئے یہیں کے ہو رہے۔ وہ صوفیائے کرام جو اسلام کی ترقی پسند تہذیب کے امین تھے انہوں نے پنجابی بن کر پنجاب کے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا۔ بابا فرید، حمید الدین ناگوری، بو علی شاہ قلندر، وراثت شاہ، شیخ اسماعیل، بلہے شاہ اور داتا گنج بخش جیسے اولیا اللہ کی ادبی اور روحانی خدمت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان سب کو اپنے پنجابی ہونے پر فخر تھا۔

پنجاب کے اولیا اللہ نے بھی اردو کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ۱۱۲۰ء میں مسعود سلمان ایک عظیم شاعر ہوا جسکا دیوان ہندی، اردو کی پہلی کتاب کے روپ میں شائع ہوا لیکن اب یہ دیوان مفقود ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس کے لیے معترف ہیں کہ اگر یہ دستیاب ہو جاتا تو لسانی مسائل کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں در حقیقت پنجاب کا اردو سے وہی تعلق ہے جو ایک ماں کا اپنی بیٹی سے ہوتا ہے۔ یہی وہ دھرتی ہے جہاں اردو پیدا ہوئی۔ پروفیسر محمود شیرانی اس موضوع پر "پنجاب میں اردو" عنوان کے تحت اپنی معرکتہ الارا کتاب تصنیف فرما چکے ہیں۔ ہندستان کی قدیم اور جدید تاریخ میں پنجاب کی ایک الگ شناخت ہے۔ پہلے اس صوبے کا دائرہ سندھ ملتان، کشمیر، راجستھان، ہماچل پردیش، ہریانہ، دہلی اور چنڈی گڑھ تک پھیلا ہوا تھا جو اب سمٹ کر ضلع پٹیالہ سے امر تسر تک رہ گیا ہے تقسیم در تقسیم کے عمل مسلسل نے پنجابی تہذیب و ادب پر بار ہا حملے کیے ہیں لیکن راجندر سنگھ بیدی کے بقول، وہی تو ایک دھرتی ہے جس سے آٹھوں پہر لوبان

کی خوشبو اٹھتی ہے اس کے دریا تو ایک طرف پوکھر بھی انور اگ سے واقف ہیں، جہاں بھی کہیں لوگ ایک بلند آواز سے قہقہہ لگاتے ہوئے سنائی دیں وہاں ضرور کوئی پنجابی ہو گا۔

روحانی اور ادبی سلسلے سے جہاں بابا گرو نانک، گورو ارجن دیو، گورو گو بند سنگھ اور ان کے بعد داغ اسکول سے وابستہ اردو کا پہلا صاحب دیوان سکھ شاعر گنڈا سنگھ مشرقی، امر سنگھ منصور اور غالب کے ہم عصر بدھ سنگھ کی اردو شاعری کا ذکر نہ کرنا گریز ہے وہاں پنجاب کے فرزندوں میں اردو کے پہلے تنقید نگار مولانا حالی پانی پتی، علامہ اقبال، مولانا وحیدالدین سلیم، موہن سنگھ دیوانہ، سعادت حسن منٹو، تلوک چند محروم، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، قتیل شفائی، جوگندر پال، کنور مہندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، ساحر لدھیانوی، برج موہن دتاتریہ کیفی اور صالح عابد حسین جیسے کتنے ہی نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو زبان و ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

پنجاب کی سرزمین کو گیان اور دھیان کی دھرتی کہا جاتا ہے اردو کے حوالے سے یہاں دو شاعروں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کا اردو ادب کی تاریخ میں کہیں ذکر نہیں آیا جبکہ ان کی تاریخ ساز شخصیت اور ادبی منزلت خود اردو کے لیے وجہ افتخار ہے۔

بابا گرو نانک کو ہم سکھ مذہب کے بانی کی حیثیت سے ہی قابل تعظیم سمجھتے آئے ہیں جبکہ ان کی عظمت یہ بھی ہے کہ اردو کی ابتدائی تاریخ میں کبیر کی طرح ان کا بھی نمایاں رول رہا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں ان کا جو کلام شامل ہے اس میں اس وقت کی مروجہ اردو کے نمونے جگہ جگہ نظر آئیں گے علاوہ ازیں ان کی دو نظمیں، سہ حرفی، اور حاضر نامہ، خود اپنے عنوانات سے ہی اردو نظم ہونے کی دلیل پیش کرتی ہیں۔ بابا نانک کا یہ شعر جو سکھ مذہب کا نعرہ حق ہے، اردو ہی میں ہے ؂

اول اللہ نور اُپایا قدرت دے سب بندے ایک نور سے سب جگ اپجیا کون بھلے کون مندے

پندرویں صدی عیسوی کی شاعری میں اس قدر واضح اردو تو کسی کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔ دو شعر اور ملاحظہ کیجیے ؂

کیا ہنس کیا بگلہ جاں کسوں نذر کرے جو تس بھاوے نانکا گوں ہنس کرے

نانک دنیا کیسی ہوئی سالک مت رہیو کوئی بھائی بھندی سب ہیت چکلیڈ نیا کارن دین گنوایا

حیرت کی بات ہے کہ نانک کا تذکرہ اردو کی تاریخ میں شامل نہیں ہوا حالانکہ اردو کی داغ

بنل کے سلسلے میں ان کے کلام کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ سکھ مذہب کے دوسرے گورو صاحبان میں گرو وار جن دیو، گورو تیغ بہادر اور گرو گوبند سنگھ کے یہاں بھی بہت سے اردو اشعار ہمیں ملتے ہیں۔ اسی مذہب سے متعلق انیسویں صدی کے صاحب دیوان اردو شاعر گنڈا سنگھ مشرقی ہیں۔ جو داغ کے شاگرد تھے لیکن ان کا بھی کہیں ذکر نہیں ملتا۔ میرے پاس ان کا مطبوعہ دیوان اور مذہبی شاعری کے مجموعے موجود ہیں۔ یہاں ان کے پانچ شعر پیش کر رہا ہوں۔

عہد شباب چشم زدن میں ہوا تمام جھونکا تھا ایک نسیم کا آکر نکل گیا
دار فنا میں کون ہے جس کو قیام ہے کوئی یہاں سے آج گیا کوئی کل گیا
کیا جہاں سے رسم یاری اٹھ گئی دوستوں سے دوست داری اٹھ گئی
کچھ اٹھائی دل نے اور کچھ جان نے سب مصیبت باری باری اٹھ گئی
کہتے ہیں ابرو اٹھا کر ناز سے ہم سے یہ تلوار بھاری اٹھ گئی

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نئے مورخین ادب اور ریسرچ اسکالر اردو کے دامن کو نئی معلومات کے گہرے آب دار سے مالا مال کریں یہ بات قابل فخر ہے کہ پنجاب کی تینوں یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس اردو اور پنجاب کے اٹوٹ رشتے کو نئے تحقیقی گوشوں سے واضح کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

باوجود اس کے کہ موجودہ ہندستانی پنجاب میں سیاست کی آندھیاں بہت کچھ اڑا دینے کے درپے ہیں پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اردو کے تئیں پنجابیوں کے دلوں میں ایک جوت جل رہی ہے۔ غیر مسلم طلبہ دور دراز دیہاتوں سے سفر اور موسموں کی صعوتیں سہتے ہوئے اردو پڑھنے آتے ہیں ان اردو پڑھنے والوں کا شوق بے ضرر ہے، یہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ پنجاب کی دھرتی سے اردو کا جو اٹوٹ رشتہ ہے وہ قائم رہ سکے اور نئی نسل اپنی دیسی زبان سے دیسی سنسکرتی کو سمجھ سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جو کسی بھی طور پر اردو سے جڑے ہوئے ہیں سچے جذبے اور نیک ارادے کے ساتھ اندھیروں میں چراغ جلاتے رہیں تاکہ روشنی کا سلسلہ قائم رہ سکے۔ اُن ادبی رسالوں کو خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں جو بنام سرکار نہیں بنام کردار اور معیار چھپ رہے ہیں اپنی بات کو انشااللہ خاں انشا کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں کہ :

سنا یارات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا   تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا۔

شمس الرحمٰن فاروقی
۲۹۔ سی ہیسٹنگز روڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۱

بنارس میں فارسی زبان وادب کے دو قیمتی آثار

آل خطاب میں جن کی اولاد سب سے زیادہ ہندوستان میں پھیلی وہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب قاضی ابراہیم نامی عہد اکبری میں مرزاپور کے مشہور قصبے بندھیاچل میں آکر آباد ہوئے۔ قاضی ابراہیم کی آٹھویں پشت میں قاضی عبداللہ ۱۷۲۰ میں پیدا ہوئے۔ ملا محمد عمر المتخلص بہ سابق کے نام سے قاضی عبداللہ کی شہرت بلاد ہند میں خوب پھیلی۔ ملا محمد عمر ۱۷۵۵ کے آس پاس بنارس آئے اور محلہ کتواپورا میں مقیم ہوئے۔ ان کی اولاد آج تک اسی جگہ اور کم وبیش انہیں مکانات میں آباد ہے جو ملا محمد عمر سابق نے بسائے تھے۔ ملا سابق اور شیخ علی حزیں میں بڑی دوستی تھی، اس میں معاصرانہ چشمک کا بھی کچھ دخل رہا ہوگا، لیکن دونوں ایک دوسرے کے معترف تھے اور آپس میں کسی قسم کی رقابت نہ تھی۔

ملا سابق کا انتقال نوے برس کی عمر میں ۱۸۱۰ میں ہوا۔ اس وقت ان کے بیٹے مفتی محمد ابراہیم کی علمیت اور ثقاہت کا سارا اودھ قائل تھا۔ مفتی ابراہیم کے علم وفضل کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اودھ کے مفتی اعظم تھے اور تفضل حسین خاں علامہ جیسی ہستیوں کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ مفتی ابراہیم کا انتقال ۱۸۳۸ میں ہوا تھا۔ غالب ۱۸۲۷/۱۸۲۸ میں جب بنارس سے گذرے تو اغلب ہے کہ ان کی ملاقات مفتی ابراہیم سے ہوئی ہو۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ غالب نے اس مختصر مدت قیام میں بھی ملا سابق کا نام اور کلام سنا ہوگا۔

غالب کی مثنوی "چراغ دیر" بنارس کے ادبی ورثے کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس کے چند اشعار جو بہت مشہور ہیں، حسب ذیل ہیں ؂

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور

بنارس را کسے گفتا کہ چین است
ہنوز از گنگ چینش بر جبیں است

بہ خوش پرکاری طرز و جودش
ز دہلی می رسد ہر دم درودش
بنارس را مگر دیدست در خواب
کہ می گردد ز نہرش در دہن آب

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار خصوصاً دوسرا اور چوتھا شعر، سبک ہندی کے بہترین نمونے ہیں اور تعلیل و تشبیہ کی جدت کے لحاظ سے نظامی کو بھی ان پر ناز ہوتا۔ لیکن اب ملا سابق کی مثنوی "تاثیر عشق" کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں :-

چہ شہرے آں کہ از حسن سر انجام
ز لطف حق بنارس یافتہ نام
چہ شہرے انتخاب ہفت کشور
ز روم و مصر بردہ رونق و فر
ہوایش قوت روح و مایۂ جاں
خریدارش بجاں ہرانسی و جاں
چو از آب لطیفش آگہی یافت
خضر از آب حیواں روے بر تافت
بہر سویش چو جنت باغ دلکش
کہ داد از خرمی غم دیدہ را بخش
اگرچہ مائل روے زمین است
بمعنی بہ ز فردوس برین است
بہ وصف قصر ہاے سربلندش
سخن را نارسا گردو کمندش

صاف ظاہر ہے کہ غالب نے ملا سابق کا جواب لکھا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ہند فارسی شعریات میں کسی معاصر یا بزرگ کو خراج عقیدت کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ اس کا جواب لکھا جائے۔ چنانچہ صائب وغیرہ نے اس کے لئے اصطلاح ہی "استقبال" وضع کی، کہ مقصود صاف ظاہر ہو جائے۔ غالب نے ملا سابق کے مندرجہ بالا اشعار کے مضامین کی بازگشت کو اپنے اشعار

میں بے تکلف در آنے دیا ہے۔ اور اگر اس میں کسی قسم کا شبہ ہو تو "چراغ دیر" کے تقریباً آخیر کے حصے میں غالب ایک شخص (جسے وہ "روشن بیانی" کہتے ہیں) سے پوچھتے ہیں کہ آخر قیامت آکیوں نہیں جاتی؟ یہ سوال و جواب سننے کے لائق ہے۔

به نفخ صور تعویق از پے چیست
قیامت را عناں گیر جنوں کیست
سوے کاشی باندازِ اشارت
تبسم کرد و گفتا ایں عمارت
که حقا نیست صانع را گوارا
که از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

یہاں اب کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ غالب نے بنارس اور ملا سابق دونوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اگر "چراغ دیر" بنارس کے ادبی ورثے میں شامل ہے اور بے شک ہے، تو ملا سابق کی "تاثیر عشق" کو بنارس کے ادبی ورثے کا گُل سر سبد کہنا چاہیے۔

افسوس کہ جس طرح ملا سابق کے کارنامے ازمنۂ بعد کی نگاہوں سے کم و بیش او جھل رہے۔ اسی طرح اکثر لوگ اس بات سے بھی بے خبر رہے کہ بنارس کے ادبی ورثے کی ایک اور مہتم بالشان یادگار یعنی "فرہنگ آنند راج" (۱۸۸۷) کا وجود بھی ایک حد تک خانوادۂ ملا سابق کا مرہون منت ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ فرہنگ آنند راج کا کوئی تعلق بنارس سے بھی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ فارسی کے اس غیر معمولی مبسوط اور مستند لغت کا مولف و مرتب محمد پادشاہ المتخلص بہ شاد علاقۂ مدراس کا رہنے والا اور مہاراج کمار وزیانگرم کا میر منشی تھا۔ وزیانگرم کی کثیر املاک بنارس میں بھی تھی اور اس کا معتد بہ حصہ اب بھی باقی ہے۔ اس تعلق سے مہاراج کمار وزیانگرم کا قیام بنارس میں تا دیر رہا کرتا تھا اور یہیں اس وقت کے مہاراج کمار المعروف بہ آنند راج کے میر منشی نے کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ لغت مرتب کیا اور اسے "فرہنگ آنند راج" کے نام موسوم کیا۔ میر منشی محمد پادشاہ کے استاد مولوی مفتی شاہ رضا علی (۱۸۳۰ تا ۱۸۹۵) جو "قطب بنارس" کے نام سے بھی موسوم ہیں، مفتی اعظم علامہ محمد ابراہیم کے پوتے یعنی ملا سابق کے پرپوتے تھے۔

قطب بنارس حضرت مفتی شاہ رضا علی اپنے وقت کے جید عالم، فقیہ، صوفی، اور با فیض بزرگ تھے۔ وہ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں صاحب دیوان تھے اور ان کے فتاویٰ کا

مجموعہ "فیوض الرضا" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ سراج الیقین بلگرامی نے اپنی کتاب "شمس العارفین" میں شاہ رضا علی کے بارے میں "بہت بڑے عالم فاضل، حافظ و قاری، درویش کامل، صاحب نسبت اہل دل" جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں اور لکھا ہے "آپ کی قرأت اور خوش الحانی کا یہ عالم تھا کہ سننے والے بے خود اور محو ہو جاتے تھے۔" مفتی شاہ رضا علی نے علم قرأت اور تجوید پر بھی ایک کتاب فارسی میں لکھی تھی "آنندراج" کی تکمیل پر مفتی شاہ رضا علی نے اس کی تاریخ تینوں زبانوں (عربی اور فارسی، اور اردو) میں کہی تھی اور تینوں قطعات تاریخ کتاب کی آخری جلد میں شامل ہیں۔

"فرہنگ آنندراج" کم سے کم دو بار ہندوستان میں چھپی اور ایک بار جدید اصولوں اور حواشی دیباچے کے ساتھ چھ جلدوں میں ایران سے شائع ہوئی۔ ہندستانی اشاعتوں میں سے ایک تو تین جلدوں میں نولکشور سے (۱۸۸۹ء / ۱۸۹۴ء) میں منظر عام پر آئی اور ایک بار غالباً بنارس ہی سے چھپی۔ اس دوسری اشاعت کے بارے میں میری معلومات ناقص ہیں۔ جناب رشید حسن خاں نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ فرہنگ آنندراج کچھ نہیں ہے صرف "برہان قاطع" اور "بہار عجم" کا مجموعہ ہے اور مرتب نے اپنی طرف سے کچھ کیا نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ رائے عجلت میں قائم کی گئی ہے اور فرہنگ آنندراج کے قیمتی، معتبر اور کار آمد لغت ہونے کا یہی ثبوت کافی ہے کہ اسے نہایت اہتمام اور علمی معیار و مراتب کے تحفظ کے ساتھ ایران سے زمانہ حال میں شائع کیا گیا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس لغت کے بہت سے امتیازات ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ اس میں عربی کے وہ الفاظ کثرت سے درج کیے گئے ہیں جو فارسی میں مستعمل ہیں اور جو عام لغات میں نہیں ملتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے لغات میں عبد الرشید الحسینی کی "منتخب اللغات" (۱۶۲۵/ ۱۶۲۶) اور جدید تر لغات میں غیاث اللغات (۱۸۲۶) اور آنندراج (۱۸۸۹/ ۱۸۹۴) نہ ہوتیں تو ہم بہت سے عربی الفاظ کے بارے میں نہ جان پاتے کہ یہ فارسی میں مستعمل ہیں کہ نہیں۔ "منتخب" تو اس باب میں خصوصیت لائق لحاظ ہے کہ اس میں صرف عربی الفاظ ہیں اور ان کے معنی بھی اکثر وہی درج ہیں جو اصل عربی میں مستعمل ہیں۔ آنندراج اور غیاث دونوں نے اس باب میں منتخب سے بہت فیض اٹھایا ہے، لیکن "آنندراج" نے جگہ جگہ چھوٹے بڑے اضافے بھی کیے ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے آنندراج جلد اول یوں ہی بے ارادہ کھولی تو اس میں لفظ نظر پڑا:۔

آنندراج: جائر بکسر ہمزہ کصاحب۔ع۔ آں کہ از راہ حق میل کند بر اہ باطل وجور کنندہ و ستم گار۔ جورۃ و جارۃ و جائرون جمع۔

"آنندراج" نے یہ لفظ "منتخب" سے لیا ہے، لیکن وہاں اندراج صرف اس قدر ہے :۔
منتخب : جائر ستم کنندہ و آں کہ از راہ حق میل کنند۔
"غیاث" نے بھی یہ لفظ "منتخب" سے لیا ہے اور اس کی تعریف یوں کی ہے :۔
غیاث : آں کہ از راہ حق میل کنند براہ باطل وجور کنندہ و ستم گار۔
ظاہر ہوا کہ "آنندراج" نے "منتخب" اور "غیاث" دونوں سے استفادہ کیا ہے، لیکن اپنی طرف سے اس لفظ کی متعدد جمعیں اضافہ کی ہیں اور بتایا ہے کہ یہ لفظ عربی ہے۔ یہ لفظ "برہان قاطع" اور "بہار عجم" اور "شمس اللغات" میں نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہ "موید الفضلا" (۱۵۱۹) مرتبہ محمد لاد میں بھی نہیں، جب کہ محمد لاد نے ہر حرف کی تین فصول الگ الگ قائم کر کے الفاظ درج کیے ہیں، یعنی فصل فی العربی، فصل فی الفارسی اور فصل فی الترکی۔ یہ لفظ اسٹائنگاس (۱۸۶۵) میں بھی نہیں جب کہ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ "زیادہ ہو تو بہتر" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے کثرت سے ایسے الفاظ بھی درج کرتا ہے جو مشکوک یا مصحف ہیں۔
"شمس اللغات" کو جدید ہندوستان کا آخری بڑا فارسی لغت کہہ سکتے ہیں۔ اس معنی میں کہ اگرچہ اس کی ترتیب ۱۸۰۴ سے ۱۸۰۵ میں ہوئی لیکن اس کی اشاعت بمبئی سے ۱۸۹۱ میں پہلی بار ہوئی۔ اس کے مرتبین نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ صرف اس کے مصحح سید بشیر حسن امروہوی کا نام معلوم ہے اور انہوں نے اس لغت کو "من تصنیف لطیف و تالیف شریف چند علمائے متبحرین ہند" لکھا ہے۔ الطباع کے پہلے اس کی شہرت بہت پھیل چکی تھی، چنانچہ "برہان قاطع" اور "قاطع برہان" کے قضیے میں اس کے حوالے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نامانوس لغات اور قدیم کمیاب اشعار کے حوالوں اور ضخامت نے اسے بڑا اہم لغت بنادیا ہے۔ لیکن اس میں تمباکو جیسا اہم لفظ نہیں، نہ ت م کے ساتھ نہ ت ن کے ساتھ "آنندراج" میں تنباکو کا اندراج "بہار عجم" سے لیا گیا ہے، لیکن اس میں محمد پادشاہ نے اہم اضافہ کیا ہے "کہ بہ لفظ نوشیدن محض خطاست۔ "برہان قاطع" میں یہ لفظ نہیں ہے۔ حالانکہ بقول "بہار عجم" بحوالہ "ماثر رحیمی" یہ لفظ عہد اکبری میں ہندوستان میں آچکا تھا اور "برہان" کا زمانۂ تصنیف ۱۶۳۲ یعنی عہد شاہ جہانی ہے۔
تضعیف بیوت شطرنج کے تحت غیاث نے ایک طویل دلچسپ نوشہ لکھا ہے جسے "آنندراج" نے "غیاث" کا حوالہ دے کر ہو بہو نقل کر دیا ہے۔ یہ اصطلاح یا فقرہ 'بہار عجم' اور "شمس اللغات" میں نہیں ہے۔ "بہار" اور "برہان" میں تو لفظ تضعیف بھی نہیں ہے، جب کہ "شمس" نے تضعیف کے معنی "دو بالا کردن و در چند گردانیدن و ضعیف کردن و

خواندن" لکھے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ "منتخب" میں تضعیف کچھ اس طرح لکھا ہے کہ تصنیف بروزن فعولن پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا "شمس اللغات" نے تضعیف بروزن فعولن کا اندراج الگ سے کرکے وہی معنی لکھے ہیں جو "منتخب" میں ہیں لیکن تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ:

شمس: تضعیف دوچند کردن وافزوں کردن وناتواں کردن ومنسوب بہ نادانی کردن

منتخب: تضعیف=دوچنداں کردن وافزوں کردن ومنسوب بہ ناتوانی کردن

"آنندراج" میں "منتخب" کے حوالے سے "منتخب" کا اندراج نقل کردیا ہے لیکن ذرا سے اضافے کے ساتھ:

آنندراج: تضعیف=بروزن تفعیل۔ ع۔ دوچند کردن وافزوں کردوں وناتواں کردن ومنسوب بہ ناتوانی کردن

صاف معلوم ہوتا ہے کہ "شمس اللغات" میں "منسوب بہ نادانی کردن" یا تو غلطی سے درج ہوگیا ہے، یا پھر یہ دور کے استعاراتی معنی ہیں اور یہاں ان کا اندراج مخدوش ہے۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی عرض کردوں کہ عربی کے جو دو لغات میرے پاس ہیں یعنی علامہ عبدالحفیظ بلیاوی کی مصباح اللغات اور Hans Wehr کا عربی۔ انگریزی لغت، دونوں میں وہ معنی نہ مل سکے جو "شمس اللغات" نے اوپر مذکور کیے ہیں یعنی "منسوب بہ نادانی کردن"۔ "آنندراج" میں دیے ہوئے معنی زیادہ معتبر معلوم ہوتے ہیں۔

اب بعض فارسی الفاظ کے اندراجات کو دیکھتے چلیں۔ "آنندراج" اول کو ایک جگہ بے ارادہ کھولا تو لفظ "حرف" نظر آیا۔ اس کے جو معنی "بہار عجم" میں درج ہیں اور جو صفات اس کے لکھے گئے ہیں وہ سب "آنندراج" میں بھی ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ "آنندراج" میں اس لفظ پر بہت طویل نوشتہ ہے جو مختلف لغات پر مبنی ہے اور جس کا کچھ حصہ جس کا تعلق عربی نحویوں کی اصطلاح "حرف" سے ہے، مولف لغت کی اپنی معلومات و تحقیق کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ "حرف" سے جو محاورے اور روزمرے فارسی میں بنتے ہیں ان کی کثیر تعداد "بہار عجم" اور "آنندراج" میں ہے اور تقریباً ہر اندراج، "آنندراج" نے "بہار عجم" سے نقل کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ "آنندراج" میں ترتیب مختلف ہے، گویا مولف نے مکھی پر مکھی نہیں ماری ہے بلکہ اپنے نظم و اصول کے اعتبار سے لغات لکھے ہیں۔ "حرف آشنا" ایک روزمرہ / محاورہ "بہار" میں نہیں ہے لیکن "آنندراج" میں ہے۔ "برہان" میں "حرف" کے معنی جن لفظوں میں لکھے ہیں وہ "بہار" اور "آنندراج" سے بالکل مختلف ہیں، کیوں کہ وہاں حرف بالفتح

کی جگہ حرف بالضم ایک الگ ہی لفظ لکھا گیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ "بعضے گفتہ اند عربی است"۔ "آنند راج" میں حرف بالضم درج ہے اور معنی تقریباً وہی ہیں جو "برہان" میں ہیں لیکن وہ مولف کی اپنی تحقیق پر مبنی معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ انھوں نے حرف کی ہندی "ہالون" بتائی ہے اور اور یہ اطلاع "برہان" میں نہیں ہے۔ "برہان" میں حرف بالفتح سے متعلق محاورے اور روزمرہ بہت کم ہیں۔ "حرف گلوگیر" تینوں لغات میں مشترک ہے، لیکن "برہان" میں اس کے معنی لکھے گئے ہیں: "کنایہ از دنیا و روزگار است و غرور و تکبر نیز گویند"۔ صاحبانِ "بہار" و "آنند راج" نے ان معنی کو لائق اعتنا نہیں سمجھا ہے اور حرف گلوگیر کو حرف خاطر رنج کا مرادف بتا کر معنی لکھے ہیں "حرفے کہ طبع از استماع آں متاذی گردد۔"

حاصل کلام یہ کہ "فرہنگ آنند راج" میں "برہان قاطع" اور "بہار عجم" کی اندھی پیروی نہیں کی گئی ہے۔ مولف نے کئی اور فرہنگوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی تحقیق سے بھی کام لیا ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ ٹیک چند بہار نے خان آرزو پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ لیکن جہاں بہار خود اپنی تحقیق یا قیاس سے کام لیتے ہیں ٹھوکر کھاتے ہیں سیالکوٹی مل وارستہ جس کی "مصطلحات شعرا" کو بہار نے تقریباً تمام و کمال اپنی "بہار عجم" میں داخل کر لیا ہے، اس کے بارے میں بھی غالب کی رائے اچھی نہ تھی۔ اغلب ہے کہ وہ صاحب "فرہنگ آنند راج" کے زمانے میں ہوتے تو اور بھی گالیاں دیتے۔ لیکن یہ بات خیال میں رکھنے کی ہے کہ خود غالب ہزار فارسی شناس اور اعلیٰ درجے کے فارسی گو سہی، لیکن لغت نگاری سے انھیں مس نہ تھا۔ زبان کے ساتھ مناسبت لغت نگاری کی اہم ترین ضرورت ہوتی ہے اور غالب کو وہ چیز حاصل تھی۔ لیکن مناسبت بہ لسان کو لغت نویس کی واحد ضرورت نہیں کہا جا سکتا۔ معاصر اور گذشتہ لغات اور فرہنگوں سے واقفیت بھی لغت نویس کی بہت اہم ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ دوسری لغات اور فرہنگوں پر آنکھ بند کر کے تکیہ کرنے کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے، بلکہ ہوتا ہے کہ ان لغات کی غلطیاں اور زیادتیاں ان کے تتبع کے یہاں بھی در آتی ہیں۔ لہٰذا لغت نگار کو علم، قیاس، سماع، مشق، مناسبت، ان سب کی ضرورت اشد درجے میں ہوتی ہے۔ مولف "آنند راج" نے اتباع و تقلید کے ساتھ ساتھ تحقیق و تخمین سے بھی کام لیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اسے لغت نگاری کا غیر معمولی کارنامہ اور بنارس کی ادبی تاریخ کا ایک درخشاں ورق کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی
پروفیسر کوارٹرس سائنس کالج کمپاؤنڈ، پٹنہ۔

مطالعۂ اقبال

"کتاب نما" (نئی دہلی) بابت مئی 1996میں جناب رام پرکاش کپور نے "مطالعۂ اقبال" کے موضوع پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان حقائق پر مبنی ہیں جن سے انکار کوئی معقول اور باخبر شخص شاید ہی کر سکے۔ اقبال بلاشبہ وطن دوست تھے اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک ہندستان سے اپنی محبت کا اظہار کرتے رہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دستاویز اُن کی حیات میں شائع ہونے والے ان کے آخری مجموعۂ کلام "ضرب کلیم" کی مشہور نظم "شعاع امید" ہے۔ اس نظم کا پس منظر اور پیش منظر دونوں آفاقی ہیں، مگر شاعر مشرق ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر انسانیت ہونے کی حیثیت سے اقبال ہندستان ہی کو اپنی کوششوں کا مرکز اور اپنی توقعات کا محور قرار دیتے ہیں۔ "شعاع امید" ایک عالمی تاریکی میں گویا اقبال کی صورت میں، اس شان سے ابھرتی ہے:

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

اس طرح اپنے سب سے بڑے فنّی و فکری کارنامے "جاوید نامہ" میں اقبال نے جس احترام کے ساتھ ہندو مفکروں اور رہنماؤں کو دنیا کے عظیم ترین اشخاص کے درمیان جگہ دی ہے اور انسانیت کی بقا و فلاح میں ان کے کردار کا تذکرہ و تجزیہ کیا ہے وہ یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اقبال کسی قسم کی فرقہ پرستی کے کبھی شکار نہ ہوئے اور ان کا تخیل ہمیشہ کائناتی سطح پر کام کرتا رہا۔

بہرحال، اقبال کا مطالعہ قوم پرستی کی حدود میں نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ ان کے شایان شان ہے۔ گاندھی اور نہرو جیسے قوم پرست سیاست داں بھی اپنے آپ کو دنیا کا شہری کہتے تھے، جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا مطمح نظر بھی یہی تھا۔ اقبال اول تو محض سیاست داں نہیں تھے، ایک عالمی مفکر تھے۔ دوسرے وہ ہر معقول دانشور کی طرح وطن دوستی اور وطن پرستی کے درمیان فرق کرتے تھے۔ ان کی مشہور نظم "وطنیت" (بانگ درا) کے شروع ہی میں یہ وضاحت موجود ہے کہ وہ وطنیت کے سیاسی تصور پر تنقید کررہے ہیں، یعنی وطنیت کے فطری و انسانی تصور کی اہمیت و ضرورت سے ان کو انکار نہیں۔ اس نظم میں انھوں نے اس نیشنلزم کی مذمت کی ہے جس کے سامراجی و فسطائی مظاہر ایشیا و افریقہ میں اہل مغرب کی نوآبادیت اور یورپ میں جنگ عظیم اول کی صورت میں سامنے آچکے تھے۔ پھر خدا پرستی کے ساتھ کوئی دوسری پرستش جمع نہیں ہوسکتی۔ ایک مسلمان وطن دوست ہوسکتا ہے، ہوتا ہے اور اس کو لازماً ہونا چاہیے، اس لیے کہ ایک حدیث رسول صلعم کے مطابق حبِ وطن ایمان کا ایک جزو ہے۔ لیکن وطن پرستی اور قوم پرستی ایک دوسری چیز ہے جس کی گنجائش اسلامی توحید کے آفاقی و انسانی تصور مساوات اور نظریۂ اخوت میں موجود نہیں، پھر قوم پرستی اپنی حد سے بڑھ کر اس بین الاقوامی تخیل میں بھی حائل ہوجاتی ہے جس کے بغیر انسانیت کی شیرازہ بندی نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک تقسیم ہند اور قیام پاکستان کا تعلق ہے، یہ کارنامہ برطانوی وائسرائے ہند ماؤنٹ بیٹن نے زبردستی انجام دیا اور اس کے محضر پر نہرو اور پٹیل کے دستخط بھی محمد علی جناح کے ساتھ ساتھ ہی ہیں۔ اس کے لیے کسی کو الزام دینا اب اپنے منہ پر آپ تھپڑ مارنا اور اپنے ملک کے بزرگوں ہی کو گالی دینا ہے، جس کا کوئی حاصل اور جواز نہیں۔ ایک تاریخ بن چکی اور اس کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرلینا ہی عقلمندی اور مردانگی ہے۔ اقبال کا رول اس سلسلے میں صرف یہ ہے کہ وہ آزاد ہندستان میں مسلمانوں کا استقلال چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے

1930ء میں انھوں نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں خطبہ دیا' جو صرف فیڈریشن کی تجویز پر اسی طرح مشتمل ہے جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا وہ منصوبہ و نقشا جسے شروع میں کینٹ مشن پلان کے نام سے کانگریس اور لیگ دونوں ہی نے منظور کرلیا تھا۔ بعد میں یہ کس طرح رد کیا گیا اس کی مصدقہ روداد مولانا آزاد کی "انڈیا ونس فریڈم" اور ایچ' ایم سیراوائی کی "پارٹیشن آف انڈیا" میں پڑھی جاسکتی ہے۔ اقبال تو تقسیم سے تقریباً دس سال قبل ہی وفات پاگئے لیکن یہ ضرور ہے کہ اپنی وفات سے چند ماہ قبل 37 میں انھوں نے مسٹر جناح کو خطوط لکھ کر صوبائی حکومتوں کے تلخ تجربوں کی روشنی میں آئندہ مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کا شدید اندیشہ ظاہر کیا اور فرقہ وارانہ مسئلے کا حل' ملک کو غلامی سے نکالنے اور انتشار سے بچانے کے لیے' تقسیم ہند کو قرار دیا' تاکہ ہندستانی' آزادی اور اطمینان کے ساتھ برصغیر کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرسکیں اور پورے مشرق کی نجات کا سامان کریں۔ یہ فرقہ وارانہ حل پوری نیک نیتی کے ساتھ ' ایک تعمیری جذبے سے پیش کیا گیا' اور بالآخر ایک واقعہ بن کر سامنے آیا' گرچہ افسوس یہ ہے کہ ایک ہولناک قتل عام کے ساتھ رونما ہوا اور آج تک صرف سیاسی رہنماؤں کی بدنیتی اور بیوقوفی کے سبب برصغیر میں ایک انتشار کا باعث بنا ہوا ہے' گرچہ یہ انتشار ہر حال میں پیدا ہوتا' جیسا برصغیر کے تینوں منقسم حصّوں کے احمقانہ انداز سیاست سے آج بھی ظاہر ہے۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اگر اقبال تصورِ پاکستان کے بانی ہوں بھی تو کیا؟ وہ دنیا کے ایک عظیم ترین شاعر تھے' ایک عظیم ترین مفکر تھے اور وہ دنیائے ادب کے سب سے بڑے مفکر شاعر تھے۔ اس بات پر ہندستان اور مشرق کو فخر کرنا چاہیے کہ اتنا بڑا مفکر شاعر اس خطے میں پیدا ہوا' خواہ اس کے سیاسی خیالات جو بھی ہوں۔ لیکن شاید مشکل یہ ہے کہ اقبال غلام ہندستان اور غلام مشرق میں پیدا بھی ہوئے اور وفات بھی پاگئے' حالاں کہ دونوں کی آزادی کے لیے سب سے بڑھ کو فکر انگیز' ولولہ خیز اور بصیرت افروز نغمہ سرائی انھوں ہی نے کی' جس نے مغرب کے ذہنی و عملی غلبے کا سارا طلسم توڑ کر رکھ دیا' ترانۂ ہندی ہو کہ ترانۂ ملّی' دوسرا کوئی شاعر آج تک نہیں لکھ سکا۔ مگر اس دیس کے بندے اقبال ہی کے بقول' نصف صدی کی آزادی کے بعد' اب بھی غلامی ہی پہ رضامند ہیں جس دیس میں خدا نے اقبال کو پیدا کیا۔ چناں چہ اپنے عظیم شاعر و مفکر کے تمام کارناموں کو چھوڑ کر چند بے خبر اور بے ذوق افراد آزادیٔ ہند کے بجائے تقسیم ہند میں اقبال کے اس رول کو نشانۂ تنقید بنائے ہوئے ہیں جو ان کی محدود اور کمزور نگاہ میں غلط طور پر سامنے آیا۔ ورنہ وہ اگر ایک وسیع نظر دنیائے مغرب ہی پر ڈالتے تو ان کو

معلوم ہوتا کہ انگریزوں نے کبھی ولیم بٹلویٹس کی شاعرانہ عظمت پر لعن طعن اس لیے نہیں کیا کہ وہ انگلستان کو تقسیم کرکے آئرلینڈ کی آزادی کی تحریک کا علم بردار تھا۔ جب کہ اس تحریک کے ہنگامہ خیز اثرات وواقعات آج بھی جاری ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مطالعۂ اقبال کی وہ جہت ہی سرے سے غلط ہے جس میں کبھی ان کے فن پر صرف فن کے لیے بحث کی جاتی ہے اور کبھی فکر پر صرف فکر کے لیے' اس لیے کہ اقبال کا کارنامہ فکر اور فن کا ایک ایسا مرکب ہے جس کی اجزاء میں تحلیل و تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ ان کے افکار وخیالات ایک سحر آفریں شاعری میں روبہ اظہار آئے ہیں اور اس شاعری کا کوئی تصور ان افکار وخیالات کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کا نظام فکر ان کے نظام فن میں ظاہر ہوا ہے اور ان کا نظام فن ایک نظام فکر پر مبنی ہے۔ وہ ایک منظم مفکر بھی تھے اور منظم شاعر بھی۔ لہٰذا ان کا مطالعہ ایک تنظیم کے ساتھ ہی مفید اور معقول ہو سکتا ہے۔ یہی تنظیم اقبال کے فکر وفن اور مطالعۂ اقبال دونوں میں توازن کی ضامن ہے' ورنہ وہی نامعقول انتشار پیدا ہوگا جو بعض لوگوں کے مطالعۂ اقبال میں نمایاں ہے۔ ایسے لوگوں میں سرفہرست کلیم الدین احمد ہیں جن کی کتاب "اقبال —— ایک مطالعہ" صرف کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئی ہے اور اقبال ناشناسوں کے لیے ایک نمونۂ عبرت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے فکر وفن پر تنقید بے جا کرنے والے کم علمی اور کم نظری دونوں کے شکار ہیں۔ وہ ایک قسم کی نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہیں۔ اقبال کے کلام میں جس رفعت وشوکت' قوت وطاقت اور عزم وحوصلہ یا ہمت وجرات کا پیغام ہے وہ مریضانہ ذہنیتوں کے حامل لوگوں کو پسند نہیں' جب کہ کچھ لوگ ابن الوقتی اور زمانہ سازی کے سبب بھی اقبال پر تنقید کرتے ہیں۔ یہ لوگ اقتدار وقت کے ساتھ مفاہمت ومصالحت کے قائل ہیں' اس لیے کہ ایک مرعوب ذہن اور کمزور کردار کے مالک ہیں' جب کہ اقبال ظلم وزیادتی اور جبر وستم کے ساتھ پنجہ آزمائی کرکے ایک حق پسندانہ انقلاب کے داعی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نغمات وملفوظات بصیرت ومسرت کے ساتھ ساتھ دل ودماغ میں ایک ولولۂ عمل اور حوصلۂ کار پیدا کرتے ہیں۔ کلامِ اقبال کی یہ تب وتاب بعض مزاجوں کو راس نہیں آتی اور چند افراد کے غلط ارادوں میں حائل نظر آتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنی عقل وعلم کے بقدر اور اپنے منصوبہ ونقشا کے مطابق اقبال کے فکر وفن پر تنقید ضروری سمجھتے ہیں لیکن اول تو ذوق وشعور سے خالی ہونے کے سبب ان کی تنقید بے وزن وبے اثر ہوتی ہے' دوسرے اقبال کی عام مقبولیت ہر حلقے میں اتنی زیادہ ہے کہ تنقید کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔

بہرحال، تمام مقبولیت کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی قدر شناسی کا حق ابھی ادا نہیں ہوا۔ وہ شاعر مشرق ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر انسانیت بھی تھے اور اگرچہ ان کی شاعری ان کے فلسفے پر حاوی ہو گئی مگر وہ عصر حاضر کے ایک اہم فلسفی بھی تھے۔ اگر صرف ان کی شاعری کا موازنہ مثال کے طور پر مغرب کے تین عظیم ترین شعرا، دانتے، گیٹے اور شیکسپیر کے کلام سے آزاد ذہن و فکر کے ساتھ کیا جائے تو اقبال کا سرمایۂ شعری ان میں کسی سے بھی ایک درجہ کم نہیں ثابت ہوگا۔ اگر اقبال کی صرف ایک کتاب "جاوید نامہ" کا تفصیلی وتقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسا کوئی کارنامہ مغرب یا مشرق کے کسی شاعر کا نہیں۔ پھر "بانگ درا" سے "ارمغان حجاز" تک کلام اقبال کے تنوع، وفور اور حجم یا کیف و کم پر غور کیا جائے تو اقبال کی شاعری میں ہمواری واستواری کے ساتھ ساتھ جو رنگا رنگی اور تعمگی ہے اس کی کوئی نظیر دنیائے ادب میں موجود نہیں۔ فن کے اس کمال کے علاوہ اقبال کی وسیع و عمیق اجتہادی فکر کا اندازہ ان کے انگریزی خطبات مدارس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جس میں انھوں نے تمام قدیم وجدید اور مشرقی و مغربی مفکرین پر ہر علم وفن کے دائرے میں تنقید کرکے مدلل طریقے پر اپنا ایک الگ نظام فکر پیش کیا ہے۔ اس نظام کو اگر اصلًا اسلامی یا قرآنی کہا جائے تو کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اقبال نے دیگر مفکرین پر تنقید قران وسنت ہی کے دیئے ہوئے اپنے محورِ فکر اور معیارِ نظر سے کی ہے۔

جنوبی ایشیا کے علاوہ مرکزی و مغربی ایشیا میں اقبال کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور یورپ کے بھی بعض حلقوں میں ان کی اہمیت و عظمت کا احساس عالمی ادب میں اقبال کے اس بلند مقام کی طرف ایک اشارہ ہے جس پر میں اپنی متعدد کتابوں اور مضامین میں پچھلے چالیس سال سے زور دیتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جیسے جیسے مغرب کی ذہنی غلامی کا طلسم ٹوٹتا جائے گا اور فکر و نظر کی آزادی ووسعت حقیقت پسندی اور حق پسندی کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ کرے گی مطالعہ اقبال کی جہت بہتر سے بہتر ہوتی جائے گی اور مفکر شاعر کی قدر شناسی عالم گیر پیمانے پر بڑھتی چلی جائے گی۔ اس اثنا میں اردو اور فارسی شاعری کا ذوق رکھنے والوں کو ابتدا سے انتہا تک اقبال کے ذہنی وفنی ارتقا کا محیط و مرکب مطالعہ مرتب و منظم طریقے پر بار بار اور بہ کثرت کرنا چاہیے۔

معذرت

گرمی کی شدت اور بجلی کی دل شکن اداؤں نے نہ تو ہمارے کمپیوٹر کو کام کرنے دیا اور نہ خوش نویس حضرات کو بہت سے صفحات کمپیوٹر صاحب نے ہی ہضم کر ڈالے۔ مجبوراً پرچے کے صفحات کم کرنے پڑے۔ اس کی تلافی آئندہ کر دی جائے گی۔ (ادارہ)

مکتبہ پیام تعلیم کی اہم کتابیں

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی	۶/-
بچوں کے نظیر اکبرآبادی	۶/-
بچوں کے "ظ" انصاری	۶/-
بچوں کی آپا جان (ڈگیرڈافلیس)	۶/-
بچوں کی شفیقہ فرحت	۴/۵۰
بچوں کے عابد علی خاں	۴/-
بچوں کے علی سردار جعفری	۴/-
بچوں کے یوسف ناظم	۴/-
چارلی چیپلن اور کینتھ اینڈرسن	۹/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی	۴/-
بچوں کے میر امن دلی والے	۴/۵۰
بچوں کے محمد حسین آزاد	۴/-
بچوں کے مرزا غالب	۴/-
بچوں کے رنگارنگ خسروؒ	۴/-
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد	۴/-
بچوں کے سلطان جی رح	۴/۵۰
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی	۴/۵۰
بچوں کی صالحہ عابد حسین	۴/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین	۴/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق	۴/۵۰
بچوں کے میرزا ادیب	۴/۵۰
بچوں کے غلام السیدین	۵/-
بچوں کے مولانا اسمٰعیل میرٹھی	۲۱/-
بچوں کے ذاکر صاحب	۷/-
دادا نہرو	۶/-
اندرا گاندھی کی کہانی	۶/-
محمد شفیع الدین نیر	۷/۵۰
ہمارے عظیم سائنس داں	۹/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۶/-
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/-
جوہر قابل	۴/۵۰
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی	۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں	۲/-
میر انیس	۲/-
امیر خسروؒ	۲/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات	۱۰/-
کہانی بھی، معلومات بھی	۶/-
چیزوں کی کہانی	۷/۵۰
یہ کیسا بخار ہے	۶/-
آپ کا جسم	۶/-
گندا پانی	۴/-
کیوں اور کیسے ؟	۹/-
سائنس کی دنیا	۸/-
کمپیوٹر کیا ہے	۸/-
عجائب گھر	۶/-
ذرّے کی کہانی	۲۱/-
علاج میرا دشمن	۶/-
پرواز کی کہانی	۴/۵۰
غذا کی کہانی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۵/-
غذائیں دوائیں	۸/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں	۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے	۳/-
صحت کی الف بے	۵/-
سنہرے اصول	۵/-
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
دہلی	۲/-
الو کا عجائب خانہ (۳ حصے)	۱/۵۰
سماجی زندگی حصہ سوم	۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم)	۷/۷۵
ان تھک جان	(زیر طبع)
بھن بھن بانو	"
جاں باز سپاہی	"
ہمت کے پھل	"
موم کا محل	"
پیامی قواعد اردو طلبہ کے لیے	۳/-
" " " (بڑا سائز)	۶/-

نظمیں

پھلجھڑیاں	۶/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی	۲۱/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر)	۷/۵۰
چہکتی کلیاں	(زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے	۶/۵۰
سہانے ترانے	۴/۵۰
بچوں کے افسر	۶/-
بچوں کے اقبال	۶/۵۰

ننھے منّے بچوں کے لیے

بتاشے	(باتصویر)	۷/۵۰
جاں نثار دوست	(باتصویر کہانیاں)	۶/-
شیر اور بکری	"	۷/۵۰
چاند کی بیٹی	"	۶/-
بھیڑیے کا گانا	"	۷/۵۰
جادو کی ہنڈیا	"	۶/-
چالاک بلّی	"	۷/۵۰
دم کٹی لومڑی	"	۷/۵۰
کوّے کا خواب	"	۷/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری		۷/۵۰

کتاب نما
قتیل شفائی
Qateel Shifai Street, 19-Ghalib Colony,
Samanabad, LAHORE - 54500, (Pakistan)
Tel. (042) 7575230 - 7573234



عشق ہے میرا دلنشیں، درد ہے دلرُبا مرا
ہے کوئی اہلِ دل جسے، چاہیے مشورہ مرا

میں نے کسی بھی شخص سے، پہل نہ کی جُدائی میں
مانے نہ مانے میرا دوست، جانتا ہے خدا مرا

میری بھی زندگی میں وہ، پہلا نہیں ہے چارہ گر
میں کہوں کس زباں سے، یار ہے بے وفا مرا

دیر نشیں تو غیر تھے، اہلِ حرم کو کیا کہوں
دونوں کا وہ ہوا کرم، باقی نہ کچھ بچا مرا

اے مرے محتسب مجھے، کیسے کرے گا تو پسند؟
میں ہوں صداقتوں کا جام، تلخ ہے ذائقہ مرا

سب نے کہا مجھے تیری، مہنگی پڑے گی دوستی
دوست تجھے بنالیا، دیکھ یہ حوصلہ مرا

عشق کے زہر سے قتیلؔ، کب تھی یہ آگہی مجھے
مجھ کو امر بنا گیا، چھوٹا سا تجربہ مرا

کرامت بخاری
۲۷۰۔اے۔فیصل ٹاؤن
جی او آر ۳۔لاہور

اگر تم بیچنا چاہو

اگر تم بیچنا چاہو
ادائیں بھی، وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی

یہ دنیا ہے۔
یہاں آواز بکتی ہے
یہاں تصویر بکتی ہے
یہاں پہ حرف کی حرمت یہاں تحریر بکتی ہے
یہ بازار جہاں اک بیکراں گہرا سمندر ہے
یہاں پر کشتیاں ساحل پہ آکر ڈوب جاتی ہیں
مسافر مر بھی جاتے ہیں
مگر رونق نہیں جاتی
یہ انسانوں کا جنگل ہے
اور اسی جنگل میں منگل کا سماں ہر وقت رہتا ہے۔
اگر تم بیچنا چاہو
ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ردائیں بھی
مرے دل میں بھی اک بازار سجتا ہے
جہاں پر شام ہوتے ہی غموں کی بھیڑ رہتی ہے۔
ہجوم یاس ہوتا ہے
کہ اس بازار میں اکثر وفا نیلام ہوتی ہے
کئی یوسف سر بازار بکتے ہیں
اگر تم بیچنا چاہو۔

شرون کمار ورما
۱۲۵۲۔گلی اونٹھاں والی
چوک پراگ داس۔امرتسر

صدی کے موڑ پر

میں جاگتا ہوں تو ساتھ میرے
عجیب احساس جاگتا ہے۔
میں وہ نہیں ہوں
جو رات سویا تھا آئینے کی گواہی لے کر
بدل گیا ہوں
میں اپنے لوگوں میں اجنبی ہوں
میں سوچتا ہوں
یہ کیا ہوا ہے، یہ کیوں ہوا ہے
اُداس چہروں پہ خالی آنکھیں
نہ دیکھتی ہیں، نہ بولتی ہیں
بجھتے دریچوں کے خشک ہونٹوں پہ چیخ پتھرا کے رہ گئی ہے۔
دلوں پہ دہشت سی چھا گئی ہے
سڑک پہ سایے کے پیچھے سایہ سا بھاگتا ہے۔
میں جاگتا ہوں تو ساتھ میرے
عجیب احساس جاگتا ہے۔

محسن بھوپالی
Mohsin Manzil
IV-F 5/3 Nazimabad
Karachi - 74600

ہائیکو

گلشن ہے شاداب
سچ ہے، میں نے دیکھے ہیں
خون آلود گلاب

★

تجھ کو ترسیں گی
اب کے ساون سے پہلے
بوندیں برسیں گی

★

منظر میں گم ہو
پگڈنڈی پر تنہا شخص
لگتا ہے تم ہو

★

بچپن کا ہم راز
انجانے بن جاؤ تم
جب بھی دے آواز

★

رستہ تکتے ہیں
جن کے جذبے سچے ہوں
وہ کب تھکتے ہیں

★

کوئل گاتی ہے
لمبے دن کا سناٹا
اس کا ساتھی ہے

★

مچھر دانی میں
مچھر کے بھن بھن سے میں
ہوتا ہوں محفوظ

احمد وصی

ٹوٹا پن

ہاتھوں کی ریکھائیں پڑھنا
پڑھ کر پھر اُن کو جھٹلانا
خود کو سچا ثابت کرنا
اوروں کو جھوٹا ٹھہرانا
مسجد، مجلس، جلسہ، محفل
اِن سب سے اپنے کو بچانا
تنہا جینا تنہا مرنا
چھوڑ دیا ہے سارا زمانا
جیسے، جو کہنا، کرنا تھا
تم سے اب تک ہو نہیں پایا
خود کو دوش نہ دے کر تم نے
دنیا پر الزام لگایا
لیکن کون تمھیں سمجھائے
ٹوٹا شیشہ جڑ تو جائے
پھر بھی جوڑ نہ چھپنے پائے

اختر ضیائی
13D HOE STREET
WALTHAMSTOW
LONDON E17 4SD



وہ کم نصیب جو عہدِ جفا میں رہتے ہیں
عجیب معرضِ کرب و بلا میں رہتے ہیں

نمودِ ذوق و بلوغِ ہنر کا ذکر ہی کیا
یہاں پہ لوگ تو سعیِ بقا میں رہتے ہیں

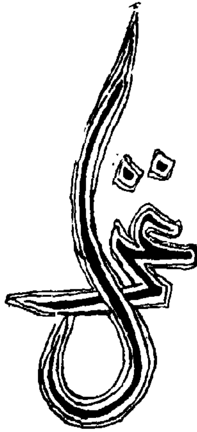
وہ صبح و شام مری رُوح میں ہیں جلوہ نما
دلِ فگار و الم آشنا میں رہتے ہیں

حصارِ ذات میں محبوس ہو کے اہلِ ہوس
فریبِ حاصلِ بے مدّعا میں رہتے ہیں

بُھلا چکے ہیں زمین و زماں کے سب قصّے
سخن طراز ہیں لیکن خلا میں رہتے ہیں

امیرِ شہر کی صحبت کے فیض سے اختر
جنابِ شیخ اب اونچی ہوا میں رہتے ہیں

انیس النور
فلیٹ نمبر ۲۰۲ - گل مہر اپارٹمنٹ
نزد دارالفلاح مسجد
ممبرا (ضلع تھانہ)



ظلمتِ شب سے ڈر گیا سورج
میرے دل میں اُتر گیا سورج

کالی راتوں سے جو نہ کام ہوا
دن دہاڑے وہ کر گیا سورج

کیا اندھیروں کی حکمرانی ہے
منہ چھپائے گزر گیا سورج

شب گزیدہ ہے ہر کرن کیسے
کیا سمجھوتہ کر گیا سورج

جذب کرنے لہو شہیدوں کا
تختۂ دار پر گیا سورج

صدف جعفری
۲۶ زکریا اسٹریٹ
کلکتہ ۷۳

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس ۲۰۷۵۴
بحرین (عربین گلف)

غزلیں

دیکھ کر حیرت کو بھی حیرت زدہ
شہرِ دل ہے کس قدر وحشت زدہ

درد آنگن میں سفر کا کھو گیا
گرچہ چہرہ گھر کا تھا عُسرت زدہ

کون سمجھے گا عبادت عشق کی
دل تو ہر سینے میں ہے نفرت زدہ

ہنس پڑی سُن کر زمانے کی ہوا
قصّہ اک معصوم کا رِقّت زدہ

تھا محافظ پھول کا ہر پَل مگر
خار پھر بھی رہ گیا تہمت زدہ

حُسنِ سیرت اجنبی سا تھا وہاں
جس جگہ ہر چشم تھی صورت زدہ

مسکراہٹ ڈھونڈنے میں زندگی
ہائے کیسی ہوگئی ہجرت زدہ

خواب کیسا اس نے دیکھا تھا صدف
مسکرائی ماں سدا شفقت زدہ

سامنے آئیں گے نہیں، ضد پہ ہیں وہ اَڑے ہوئے
پردے سے دیکھے جائیں گے در پہ ہیں پڑے ہوئے

قطرے جو انفعال کے رُخ پہ ہیں کچھ رُکے ہوئے
لوحِ سپید و سُرخ پہ موتی سے ہیں جڑے ہوئے

مژگاں پہ نوک و خم ہزار، نگہ وہ، ہو جو دل کے پار
تیر و کماں سنبھال کر، سامنے ہیں کھڑے ہوئے

ہائے وہ قربتِ شباب، وائے نگاہ اجتناب
اپنوں سے غیر ہو گئے، غیر سے جب بڑے ہوئے

افشاں برنگِ کہکشاں، مہر جبیں، چہرہ نشاں
تیری نظر کے امتحاں، شاہد بہت کڑے ہوئے

غزلیں

خورشید اکبر

لہو نگاہ سے دل سے دھواں گزرتا ہے
یہ شہر میر ہے یوں بھی یہاں گزرتا ہے

قدم کی چاپ نہ دستک نہ دھڑکنوں کی صدا
تری گلی سے کوئی بے زباں گزرتا ہے

یقین کس پہ کروں، کس کو بھول جاؤں میں
ہر اک لباس پہ تیرا گماں ہوتا ہے

مری زمین کی پستی پہ طنز مت کرنا
طواف کر کے مرا آسماں گزرتا ہے

مری طرح سے کوئی بے نشان ہو تو کہوں
غبارِ راہ سرِ لامکاں گزرتا ہے

قلم نہ صفحۂ قرطاس معتبر اب کے
نواحِ جاں میں عجب امتحاں گزرتا ہے

وہ ایک شخص مرے سرد و گرم کا ساتھی
اسے بھی لہجۂ اکبر گراں گزرتا ہے

وسیم مینائی

تارین جلال نگر، شاہجہاں پور
یو پی

انا فلک پہ چڑھا کر گرا بھی دیتی ہے
قد اوروں کو یہ بونا بنا بھی دیتی ہے

تمہاری یاد فقط رہزنِ سکوں ہی نہیں
تمہاری یاد مجھے حوصلہ بھی دیتی ہے

ہوائے غم کا بھروسا نہیں محبت میں
چراغِ دل کو یہ اکثر بجھا بھی دیتی ہے

نوازتی ہے کبھی تاجِ زر سے یہ شہرت
کبھی یہ خاک میں عزت ملا بھی دیتی ہے

چمن میں کس کو ہے ادراک اس حقیقت کا
کلی چٹک کے پیامِ فنا بھی دیتی ہے

ڈبو بھی دیتی ہے دریا کی موج اٹھ کے وسیم
یہ ڈوبتوں کو کنارے لگا بھی دیتی ہے

غزلیں

مقصود احمد مقصود
شعبۂ عربی، بڑودہ یونی ورسٹی
بڑودہ

میری سوئی ہوئی قسمت کا ستارا جاگا
یا شبِ غم تری یادوں کا اُجالا جاگا
اوڑھ کر سو گئے ہم ہجر کی لمبی چادر
جب نہ امکان ترے شامِ ملن کا جاگا
نیند کی گود میں سر جیسے ہی رکھا میں نے
بے قراری کا مری آنکھ میں صحرا جاگا
من کی جاگی ہوئی خواہش کو سُلایا جس نے
اس کے نروان کا ایک ایک دریچا جاگا
حشر میں میرے گنہ کیا ہوئے واماندہ قدم
دستِ رحمت کا مرے سر پہ سہارا جاگا
کام مشکل سے بھی مشکل ہوا آسان بہت
جس گھڑی پیکرِ خاکی میں ارادا جاگا
درِ معمول پہ سیلاب نے دستک کیا دی
آنکھ ملتے ہوئے دریا کا کنارا جاگا
گاؤں میں جب کبھی انگڑائی لی زرخیزی نے
عارضِ شہر پہ اک سبز سا غازا جاگا
شب نے آرام کا بستر ہی لگایا تھا ابھی
یک بہ یک نیند سے مقصود سویرا جاگا

مقبول حسن لاری
بلاتی پور، گورکھپور
یو، پی

خونِ دل پیش کرو، خونِ جگر پیش کرو
حوصلہ ہے تو وطن کے لیے سر پیش کرو
ہو پرستارِ اُجالے کے تو ہر اک کو یہاں
ظلمتِ شب کے عوض نورِ سحر پیش کرو
اپنی خود ساختہ جنّت سے نکل کر باہر
کوئی فردوس پئے نوعِ بشر پیش کرو
کسمپرسیِ گلستاں پہ تاسّف کیسا
ایک اِک گل کے لیے خونِ جگر پیش کرو
مہر و الفت کے بکھر جائیں اُجالے ہر سو
گلشنِ دہر میں وہ فکر و نظر پیش کرو
راکھ کا ڈھیر دکھاتا ہوں تو ہنس کر مجھ سے
لوگ کہتے ہیں کہ جلتا ہوا گھر پیش کرو
تم کو رہبر نے دیے راہ میں دھوکے کیا کیا
اپنی آنکھوں سے وہ رودادِ سفر پیش کرو
زورِ باطل سے ہراساں نہیں ہونا مقبولؔ
حق کا پیغام ہے بے خوف و خطر پیش کرو

مانگے کا اُجالا



خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے

ادب کے سلامت علی، نزاکت علی

دنیائے موسیقی میں تو سلامت علی، نزاکت علی اور نصرت علی، فتح علی جیسی کئی جوڑیاں ہر دور میں موجود رہی ہیں لیکن دنیائے ادب میں صرف عطاالحق قاسمی اور امجد اسلام امجد ہی کی جوڑی نظر آتی ہے۔ خدا اس جوڑی کو نظر بد سے بچائے کہ بازار ادب میں انھیں دونوں کا سکّہ چلتا ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سکہ کھوٹا نہیں ہے، ورنہ آج کل ادب کے بازار میں زیادہ تر کھوٹے سکّوں کا ہی چلن ہے۔ پڑھنے والوں کو بھی کھوٹے، کھرے کی پہچان نہیں رہی، کھوٹے کی پہچان نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، کھرے کی پہچان نہ ہونا بہت بڑا المیہ ہے، یہی وجہ ہے کہ نظیر صدیقی جیسے کھرے ادیبوں کو شکایت رہتی ہے کہ زمانہ ان کی قدر نہیں کرتا۔ کاش صدیقی کو معلوم ہوتا کہ زمانہ تو روایتی اندھے کی طرح اپنوں ہی میں یعنی ابنائے زمانہ میں ریوڑیاں بانٹتا ہے نظیر صدیقی اگر ان ریوڑیوں سے اپنے کام و دہن کی تلخی دور کرنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑیں اور اپنے ترچ پر اپنے ساتھ شامیں منانا شروع کردیں۔

ہاں تو ذکر تھا عطا اور امجد کی جوڑی کا، اس جوڑی سے پہلے بھی ایک جوڑی دنیائے ادب میں سرگرم عمل رہی ہے، ادیبوں کی نئی نسل محمد عمر نور الٰہی کے نام سے کاہے کو واقف ہوگی کہ وہ سوائے اپنے نام کے کسی اور کا نام سننا پسند نہیں کرتی۔ وہ لوگ جو قیام پاکستان سے پہلے کی کتابیں اور رسالے پڑھتے رہے ہیں، محمد عمر نور الٰہی سے خوب اچھی طرف واقف ہیں۔ رسالوں میں بے شمار مضامین اس نام سے چھپتے رہے ہیں۔ ایک درجن کے قریب مغربی ڈراموں کے تراجم بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو ڈرامے کی پہلی تاریخ "ناٹک ساگر"، بھی محمد عمر نور الٰہی کی تصنیف ہے۔ عموماً لوگ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ہی فرد کا نام ہے لیکن اس ایک نام کے پردے میں دو دوست چھپے ہوئے تھے، ایک کا نام محمد عمر تھا اور دوسرے کا نام نور الٰہی، یہ دونوں اس حد تک یک جان و دو قالب تھے کہ فرداً فرداً جو کچھ لکھتے تھے اسے مشترکہ نام سے چھپواتے تھے۔ عطا اور امجد بھی ایسے ہی دوست ہیں مگر اس حد تک یک جان و دو قالب نہیں ہیں کہ اپنی تحریریں مشترکہ نام سے چھپوائیں۔ دونوں کا ادبی نامۂ اعمال اپنے اپنے نام سے چھپتا ہے اور یہ اچھا ہی ہے، ورنہ دوستی زیادہ دن نہ چلتی۔ اس بات پر جھگڑا ہو جاتا کہ کامیابی

کا سہرا کس کے سر باندھا جائے۔ دو سہرے تو ایک سر پر باندھے جا سکتے ہیں لیکن ایک سہرے میں دو دو سروں کو باندھنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

عطا اور امجد میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔ دونوں ڈراما نگار ہیں، کالم نویس ہیں، سفر کرتے ہیں اور سفرنامے لکھتے ہیں۔ شاعری کرتے ہیں اور مشاعرے پڑھتے ہیں، ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ٹی وی کے پروگراموں میں کبھی کمپیئر اور کبھی مہمان خصوصی بنتے ہیں۔ ایک ہی کالج میں استاد ہیں اور کالج بھی ایسا جس کے بیشتر طالب علم ہر سال پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کی تعلیمی خدمات کتنی وقیع ہیں۔ آخری بات یہ کہ ان دونوں کا تعلق دبستان فنون سے ہے اور اس کے باوجود دونوں ہمارے پسندیدہ ادیب ہیں۔

"اس کے باوجود" کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ہم ان دونوں کو مجبوراً بادل ناخواستہ پسند کرتے ہیں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ دراصل ہم دبستان سرگودھا کے ہوا خواہوں میں سے ہیں، اس لیے اس دبستان سے باہر کے ادیبوں کو ہم تعصب کی عینک سے دیکھتے ہیں لیکن عطا اور امجد کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ اس حد تک ظالم ہیں کہ بہ جبر اپنے آپ کو پڑھواتے ہیں۔ پرانے زمانے کے جابر مفتوحہ علاقوں سے خراج وصول کرتے تھے یہ دونوں غیر مفتوحہ علاقوں سے بھی خراج تحسین وصول کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ہم سے پوچھا، آپ کے تعلقات دونوں دبستانوں سے ہیں، یہ بتائیے کہ آپ کی ہمدردیاں کس دبستان کے ساتھ زیادہ ہیں۔ ہم نے عرض کیا، ہم ۷۵ فیصد دبستان سرگودھا کے ساتھ اور ۲۵ فیصد دبستان فنون کے ساتھ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کیا ان وابستگیوں میں کمی بیشی کا امکان ہے؟ ہم نے کہا، بالکل ہے، اگر آپ اور عطا و امجد دبستان سرگودھا میں شامل ہو جائیں تو ہم صد فیصد اسی دبستان کے ساتھ ہوں گے۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ ممکن نہیں کہ ہم تینوں دبستان سرگودھا میں ضم ہو جائیں کیونکہ اس میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ ہمارا جواب یہ تھا، تو پھر آپ ہماری ۲۵ فیصد ہمدردیوں پر ہی گزارا کیجیے۔

مزاج و عادات اور ادبی طریقہ ہائے واردات کی گہری مماثلت کے باوجود عطا و امجد میں علم اور کلاسیکی ادب سے متعلق رویوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امجد ہر لحظہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب سے تو انھیں عشق ہے، جتنا مطالعہ کلاسیکی ادب کا انھوں نے کیا ہے ان کے نسل کے شاعر، اتنا مطالعہ کم ہی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عطا کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جتنا علم حاصل کر لیا وہی کسی کام نہیں آیا تو مزید کیوں حاصل کیا جائے۔ ایک ایسے دور میں جب ہر شخص "ہل من مزید" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق تک غصب کر لیتا ہے، عطا کی یہ قناعت پسندی قابل تعریف ہے ویسے بھی وہ علم کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ جونہی یہ میل نمودار ہوتا ہے وہ مشاعروں کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو کر پاک صاف ہو جاتے ہیں۔ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں ان کا خیال یہ ہے کہ جو کچھ پرانوں نے لکھا وہ ماضی کا حصہ ہے، ہم آج جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ مستقبل کا کلاسیکی ادب ہے۔ یہ مستقبلیات کا زمانہ ہے ماضی کے ادب کو پڑھنے سے بہتر ہے کہ مستقبل کے کلاسیکی ادب کو پڑھا جائے عطا مستقبل کا کلاسیکی ادب خود تخلیق کرتے ہیں اور پھر اسی کو پڑھتے ہیں۔ مطالعے کا یہ انداز صبر آزما ہی نہیں ہمت طلب بھی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے کہ پیاس لگے تو پہلے کنواں کھودو اور پھر چلو بھر پانی پیو۔

عطا اور امجد دونوں پر مشترک کالم لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان دونوں کی ایک ایک

زہ تصنیف حال ہی میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آدھا کالم تو تمہید میں ضائع ہوگیا، باقی جو رہ گیا ہے اسے بھی ضائع کرنے یا ضائع ہونے سے بچانے کے لیے ہم ان دونوں کتابوں کے بارے میں کچھ رض کریں گے۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے امجد کے کلاسیکی ادب سے شغف کا ذکر کیا ہے۔ اس کا ثبوت یک کتاب کی صورت میں سامنے آیا ہے، اس کا نام ہے "نئے پرانے"، نام کی حد تک کتاب میں یاپن نہیں ہے کیونکہ تقریباً بیس برس پہلے شعرائے قدیم کے انتخاب و حالات پر مشتمل ایک کتاب مرزا ظفر الحسن مرحوم کے رسالہ "غالب" میں "پرانے شاعر نیا کلام" کے نام سے قسط وار شائع ہوچکی ہے لیکن مطالب کے اعتبار سے امجد کی کتاب بے مثال ہے۔ اس کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں صف اوّل کے شعراء میر، درد، سودا، نظیر، مصحفی، آتش، غالب اور اقبال کے کلام کا انتخاب ہے اور دوسرے حصّے میں صف دوم کے اساتذہ ولی، قائم، انشا، جرأت، مومن، ذوق، شیفتہ، حالی اور داغ کا انتخاب ہے۔

ہمارے ہاں کسی شاعر کا انتخاب مرتّب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دوران مطالعہ پسندیدہ اور مشہور شعروں کو نشان زد کردیا جاتا ہے۔ امجد نے یہ آسان طریقہ اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے ایسے شعروں کا انتخاب کیا ہے جو اپنے عہد کے اعتبار سے نئے اور تازہ تھے اور جن کی تازگی عہد بہ عہد سفر کرتی ہوئی آج بھی قائم ہے یا پھر ایسے شعر منتخب کیے ہیں جو نئے ہونے کے باوجود بعض وجوہ سے شعری روایت کا حصّہ نہ بن سکے مگر ان شعروں سے شاعر کی انفرادیت واضح ہوتی ہے۔ گویا امجد نے اس کتاب میں پرانے شاعروں کے "نئے پن" کا سراغ لگایا ہے۔ اسی لیے پرانے شاعروں کی جو تصویریں ہمارے سامنے آئی ہیں وہ ان تصویروں سے بہت مختلف ہیں جنھیں ہم اب تک دیکھتے چلے آرہے ہیں۔

بڑے شاعروں کو ہر عہد میں از سر نو دریافت کیا جاتا ہے اور یہ کام کوئی پیشہ ور نقاد نہیں تخلیقی فن کار ہی انجام دے سکتا ہے۔ سو ہمارے عہد میں یہ فریضہ امجد نے انجام دیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصّے میں جن شاعروں کا انتخاب ہے، ان سب کے بارے میں امجد نے تنقیدی جائزے بھی لکھے ہیں جن سے ان شاعروں کے بہت سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ گو امجد کو نقاد ہونے کا دعوا نہیں ہے مگر ان مضامین میں وہ ایک ایسے نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جس کی تنقیدی بصیرت پر اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

عطا کی نئی کتاب "دلی دور است" ہے۔ کتاب کے فارسی نام کی وجہ سے خیال ہوا کہ اگر کتاب بھی فارسی میں ہوئی تو ہم اس سے استفادہ نہ کرسکیں گے لیکن کتاب کھول کر دیکھی تو معلوم ہوا کہ ہماری طرح عطا کو بھی اتنی ہی فارسی آتی ہے جتنی کتاب کے نام میں آگئی ہے۔ یہ کتاب ہندستان کے دو سفرناموں پر مشتمل ہے۔ پہلا سفر عطا نے ۱۹۷۷ء میں کیا تھا جب وہ زائرین کے ایک گروہ کے ساتھ سرہند شریف گئے تھے۔ دوسری مرتبہ وہ ۱۹۸۵ء میں حیدرآباد دکن گئے تھے، جہاں انھوں نے عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کی تھی، جاتے ہوئے کچھ دیر دہلی میں اور واپسی میں بمبئی میں قیام کیا تھا۔ کتاب کا تین چوتھائی حصّہ حیدرآباد کے بارے میں ہے اور اسی کو اصل سفرنامہ سمجھنا چاہیے۔

عطا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سفر بھی خود کرتے ہیں اور سفرنامہ بھی خود ہی لکھتے

ہیں۔ وہ ان وی آئی پی سفرنگاروں میں سے نہیں ہیں جو سفر سے لوٹتے ہیں تو ان کے دفتری اہل کار سفرنامے کا مسودہ ہاتھ میں لیے ہوئے ائرپورٹ پر ان کا استقبال کرتے ہیں وہ ان سفرنگاروں میں سے بھی نہیں ہیں جو سفر میں تکلیفیں خود اٹھاتے ہیں اور سفرنامے میں ان کے قارئین۔ عطا جس طرح جہاں دیدہ سیّاح ہیں، اسی طرح مشاق سفرنگار بھی ہیں۔ قاری اپنے آپ کو ان کا ہم سفر محسوس کرتا ہے اور سفر کے مناظر اور منازل سے بیگانہ وار نہیں گزرتا۔ یہ کسی بھی سفرنگار کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اس کا قاری، قاری نہ رہے ہم سفر بن جائے۔

حیدرآباد دکن برصغیر میں مسلم ثقافت کا ایک اہم مرکز ہے۔ وہ پاکستان کی جغرافیائی حدود سے بہت دور ہے لیکن پاکستان کی ثقافتی حدود کے اندر واقع ہے۔ عطا نے اس شہر بے مثال کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی منظرکشی بڑی خوبصورتی سے کی ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر عطا ہندستان کے ان تمام شہروں کا سفر کریں جو برصغیر میں اسلامی تہذیب کے مراکز رہے ہیں اور پھر ان کے سفرنامے لکھیں۔ رام پور، لکھنؤ، اجمیر، بھوپال، مرادآباد اور ایسے کتنے ہی دوسرے شہروں سے ہمارا وہی تعلق رہا ہے جو کبھی قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ سے تھا، جب ہم کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی ان شہروں کو نہیں بھول سکے تو صرف پچاس برسوں میں رام پور اور لکھنؤ وغیرہ کو کیسے بھلا سکتے ہیں۔

عطا حیدرآباد اکیلے نہیں گئے ان کے ساتھ بزرگ ادیب سید ضمیر جعفری بھی تھے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ضمیر جعفری کے ساتھ گئے تھے۔ جعفری صاحب کی شخصیت ایسی قدآور ہے کہ ان کے ساتھ جو کوئی بھی ہو، ان کا تابع مہمل بن جاتا ہے لیکن عطا سفر کے دوران جعفری صاحب کے تابعدار تو رہے تابع مہمل نہیں بنے۔ ہر محفل میں وہ جعفری صاحب کے پہلو بہ پہلو جلوہ فگن رہے اور اپنی حاضر جوابی اور حاضر دماغی کے مظاہرے کرتے رہے یہاں تک کہ حیدرآباد میں ایک پنجابی مشاعرے میں بھی غزل سنا ڈالی یہ پنجابی غزل انھوں نے سفرنامے میں بھی درج کی ہے، اسے پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اس میں حروف جار، اسما اور افعال سب اردو کے ہیں صرف خوش فعلیاں پنجابی کی ہیں۔ جتنی پنجابی عطا کی اس غزل میں ملتی ہے اس سے کہیں زیادہ پنجابی تو ان کی اردو غزلوں میں مل جاتی ہے۔

امجد اسلام امجد کے ایک سفرنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا ہے کہ اس میں لطیفے اس کثرت سے بیان کیے گئے ہیں کہ اگر انھیں سفرنامے سے خارج کردیا جائے تو باقی جو کچھ بچے گا وہ بھی ایک لطیفہ ہی ہوگا لیکن حیرت کی بات ہے کہ عطا کے سابقہ سفرناموں کے برعکس زیرنظر سفرنامے میں لطیفے بالکل نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اب اتنے پختہ کار ہوگئے ہیں کہ انھیں اپنی تحریر کو لطیفوں کی بجائے اسلوبِ بیان کے جادو سے پُرکشش بنانے کا فن آگیا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ سفرنامہ اسلوب بیان کے اعتبار سے بھی اس لائق ہے کہ اسے عہد حاضر کی خوبصورت تحریروں میں شمار کیا جائے۔

اکٹر ظہیر علی صدیقی
س محمد سعید خان لشکر خانہ،
رام پور۔ یوپی

تاریخ کتب خانہ واحد مخطوطہ

رام پور رضا لائبریری اپنی نادر و نایاب قلمی تصاویر اور مخطوطات کی وجہ سے عالمی شہرت کی مالک ہے ۔ کتب خانہ عالیہ دار الریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور (موجودہ رضا لائبریری) کے خزانے میں اردو فارسی، عربی، سنسکرت، ترکی اور خط کوفی میں تحریر کیے ہوئے قلمی نسخے موجود ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس مسلم ریاست میں ہندو مذاہب کی تمام اہم کتب کے مخطوطے موجود ہیں۔ جنھیں حکم دے کر مختلف نوابین رام پور نے لکھوایا تھا ۔ تاکہ خود بھی فیض یاب ہو سکیں اور دیگر اردو داں حضرات بھی ان کتب کا مطالعہ کر سکیں ان میں اخوان زادہ احمد خاں غفلت کی رامائن کے علاوہ پنچ تنتر، بھگوت گیتا مہابھارت اور ہتواپدیش کے فارسی رسم الخط کے قدیم نسخے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی زبان و ادب اور ہندستانی تہذیب و تمدن سے متعلق اہم قلمی کتب ہیں۔ ان مخطوطات میں قابلِ ذکر پدماوت کا وہ نسخہ بھی ہے جو اصل نسخے سے قریب ہے پدماوت کے مختلف نسخوں میں املا کے فرق کی وجہ سے تلفظ کا فرق پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا اثر معنی پر پڑتا ہے اس لیے علمی دائرے میں بعض اشعار کے معنی میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن رام پور رضا لائبریری کے پدماوت کے نسخے کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں اعراب کا استعمال کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری صحیح تلفظ ادا کر سکے۔ اور شعر کے معنی صحیح اخذ کیے جا سکیں۔ اس کے علاوہ جائسی کی اکھر اوٹ کا ایک قدیم نسخہ بھی موجود ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں حافظ احمد علی شوق کے مخطوطے تاریخ کتب خانہ عالیہ دار الریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ جس میں رام پور رضا لائبریری کی تاریخ بھی ہے۔ حافظ احمد علی شوق علی برادران (مولانا محمد علی و شوکت علی) کے چچازاد بھائی تھے ۔ ان کا خاندان پشاور کے اطراف سے ہندستان میں داخل ہوا، پنجاب، دہلی اور مراد آباد کے ضلع افغان پور میں مسکن گزیں ہوئے[1] ۔اس خاندان کے افراد ابتدا میں نجیب آباد

میں نجیب الدولہ کے دربار سے منسلک رہے۔ نجیب آباد کی تباہی کے بعد یہ خاندان لکھنؤ چلا گیا۔ اور لکھنؤ سے نوابین رام پور نے انھیں بلالیا۔

حافظ احمد علی شوق کی ولادت ۳۱ر جنوری ۱۸۶۳ کو رام پور میں ہوئی۔ حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی اور مولوی شجاعت علی صاحب، مولوی فضل الرحمٰن، اور مولوی حسن علی خاں سے دوسرے علوم پڑھے (یہ اپنے زمانے کے قابل ذکر علما ہیں۔)

شوق ۱۸۸۲ میں رام پور رسالہ میں جمعدار ہوئے اس کے بعد مہاراجہ سیواجی ہلکر کے یہاں آرمی میں کپتان رہے۔ ۱۹۸۹ میں ترکِ ملازمت کے بعد رام پور چلے آئے[۲]۔ اور رام پور میں منصرم نزول مقرر ہوئے چنانچہ رام پور کے اسٹیٹ گزٹ میں ان کا تقرری کا پروانہ ملتا ہے:

روبکار اجلاس صاحب ریوینیو ممبر بہادر ۴ راپریل ۱۸۹۱ احمد علی خاں مشاہرہ بیس روپیہ ماہوار قائم مقام منصرم نزول مقرر ہوں۔۔۔۔ احکام ضابطہ جاری ہوں۔ یہ خلاصہ درج گزٹ ہو۔

شرح دستخط

سید علی حسن"[۳]

۱۸۹۷ کو حافظ احمد علی شوق کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی ایما پر منصرم کتب خانہ (موجودہ رامپور رضا لائبریری) مقرر کیا گیا۔ اور بعد میں یہ انچارج بھی رہے۔ اس سلسلے میں رام پور اسٹیٹ گزٹ کا ایک روبکار ملاحظہ ہو:

"حکم اجلاس ہمایوں بندگان حضور پرنور دام اقبالہم و ملکہم

واقع ۱۳ افروری ۱۹۹۷

مشہ ناصیہ حکیم محمد اجمل خاں صاحب افسر اعلیٰ بمقدمہ منظوری تقرر حافظ احمد علی خاں شوق بعہدہ منصرمی کتب خانہ بمشاہرہ تیس روپیہ ماہوار پیش گاہ اعلیٰ حضرت بندگان حضور پرنور دام اقبالہم و ملکہم سے حکم ہوا ہے کہ تقرر حافظ احمد علی خاں شوق کا بمشاہرہ تیس روپیہ ماہوار حسب رای حکیم محمد اجمل خاں صاحب منظور ہے۔ احکام ضابطہ جاری ہوں[۴]"

شوق ۲۳ جولائی ۱۹۰۴ کو سیکریٹری بندوبست[۵] اور ۱۹۰۶ میں انھیں افسر کارخانہ جات بھی مقرر کیا گیا۔ کتب خانہ کی خدمات بھی ان کے سپرد رہیں اس کے علاوہ وقف کے انچارج اور مدرسے عالیہ کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ شوق تذکرہ کاملان رام پور کے علاوہ متعدد مقالات

بھی لکھے۔ جن میں اکثر مخطوطات پر ہیں۔

مخطوطہ : تاریخ کتب خانہ دار الریاست مصطفیٰ آباد عرف رام پور، رام پور رضا لائبریری کے قلمی مخطوطات کے رجسٹر میں تاریخ روہیل کھنڈ کال نمبر ۱۴۰ پر مندرج ہے۔ سیاہ روشنائی سے خط نستعلیق میں تحریر ہے۔ خط کسی اچھے کاتب کا ہے۔ کاغذ سفید بادامی ہے۔ رجسٹر سائز پر ہے اور اس کی کوئی نقل مخطوطے کی شکل میں کہیں اور نہیں ہے۔

مذکورہ مخطوطے میں شوق نے عربی فن تحریر کی ایجاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سب سے پہلے جن لوگوں نے فن تحریر ایجاد کیا وہ طے قبیلے کے تھے۔ ان لوگوں نے حروف کی ترتیب کی شکل وضع کی اور حروف تہجی کی ترتیب سریانی زبان کے موافق رکھی۔"

شوق عام کتب خانوں کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"غالباً سب سے پہلے جس نے کتب خانہ عام کی بنیاد ڈالی وہ ساپورین اردشیر ایک امیر تھا۔ اس نے ۳۸۲ھ میں ایک دار العلم بنایا اور بہت سی کتابیں عام مطالعہ کے لیے وقف کر دیں۔ ۳۹۵ھ میں مصر کے فاطمی بادشاہ حاکم بامر اللہ نے ایک بہت بڑا کتب خانہ عام لوگوں کے لیے کھولا۔ اس کتب خانے کی ابتدا بہت دھوم سے ہوئی۔ کتابوں کو پڑھنے اور نقل کرنے کی اجازت تھی۔ بلکہ کاغذ، قلم، دوات، کتب خانہ سے ملتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کل اسلامی دنیا میں کتب خانہ کھل گئے۔ مسجدوں کے ساتھ بھی کتب خانہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اس رسم کا بقیہ نمونہ قسطنطنیہ میں موجود ہے۔" (ص ۱۴)

نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے شوق نے لکھا ہے:

"معلوم ہوتا ہے ان کے زمانے میں بہت بڑا کتب خانہ تھا لیکن اسباب کے ساتھ تباہ ہوگیا۔ البتہ اس عظیم الشان کتب خانے کی دو جلدیں کتب خانہ میں موجود ہیں۔"

ایک نسخہ جواہر تفسیر کا ہے۔"

حافظ احمد علی شوق کے اس مخطوطے تاریخ کتب خانہ عالیہ سے رام پور رضا لائبریری کے نظام اور شخصی دور حکومت میں بھی عوام کے استفادہ کرنے کا علم ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کتب خانہ صبح سے رات دس بجے تک کھلتا تھا۔ ۳۱ مارچ ۱۸۹۲ سے کتب خانہ یعنی موجودہ رام پور رضا لائبریری میں ہر شخص کو آنے کی اجازت تھی لائبریری کی مہروں کا تذکرہ کرتے ہوئے شوق لکھتے ہیں:-

"۱۸۹۱ میں منشی بانکے بہاری لال پاٹھک نے ایک ربڑ کی مہر کھدوائی تھی۔ اس کی پیشانی میں انگریزی میں اسٹیٹ لائبریری اور نیچے رام پور کھدا ہوا ہے۔ بیچ میں بخط نستعلیق کتب

خانہ ریاست رامپور درج ہے۔ یہ مہر کتابوں پر لگانا شروع کی گئی لیکن قرآن شریفوں پر لگانے سے پرہیز کیا، دوسری مہر ربڑ کی کھدوائی گئی جس میں بہ خط عربی کتب خانہ ریاست رامپور درج ہے۔"

اس کتب خانہ میں ہمایوں نامہ اور دیگر اہم کتب موجود تھیں شوق لکھتے ہیں :

"۲۰ ر رمضان المبارک ۱۲۶۲ھ کو نواب جنت آرام گاہ نے ہمایوں نامہ، اکبر نامہ، جہانگیر نامہ، تاریخ خزانتہ العالم، تاریخ نادر خلاصتہ التواریخ خان جہانی رام پور میں موجود تھیں ریلپسن صاحب صدر بورڈ اکبر آباد کو بھیج دیں۔"

نواب محمد یوسف علی خان کے زمانے میں کتب خانہ عالیہ نے بہت ترقی کی ان کے عہد کی کتب میں :

"آمد نامہ خلیفہ غیاث الدین، محتہ خلیفہ الرحمٰن، ملا نورالدین۔ قصہ چہار درویش : سید احمد علی رسا، یوسفیہ مفتی محمد سعداللہ صاحب مرحوم رسالہ تشبیہ : مفتی محمد سعد اللہ صاحب عروض با قافیہ : مفتی محمد اللہ صاحب وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔"

تاریخ کتب خانہ دارالریاست مصطفیٰ آباد عرف رامپور کے مخلوطے سے کتب خانوں کی تاریخ کے علاوہ رام پور رضا لائبریری کی تاریخ سامنے آتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر کون کون سی اہم قلمی کتب تھیں اگر کچھ کتب کہیں تحفتاً بھیجی گئی ہیں تو ان کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ لائبریری کے نظام اور عوام کے لیے اس کے دروازے کھلے رہنے کا تذکرہ موجود ہے۔ اس مخلوطے سے روہیل کھنڈ کے علمی ذوق، فنون لطیفہ اور زبان و ادب میں ان کی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور : حافظ احمد علی شوق ۴۵۹ ---- افغان بندے اللہ بخشی یوسفی ۴۳۴
(۲) ایضاً ۵۵۹ نمبر (۳) رام پور اسٹیٹ گزٹ : نمبر ۷ اجلد ۳، ۲۰ ر اپریل ۱۸۹۱ ص ۵
(۴) ایضاً ۱۵ فروری ۱۸۹۷ نمبر ۷ جلد ۹ (۵) تذکرہ کاملان رامپور : شوق ص ۵۵۹
(۶) آئینہ بخت : شوق معارف ۱۹۳۲ء ص ۲۷۶
(۷) فیض اللہ خاں : ۱۷۷۴ تا ۱۷۹۴ء

رفاقت علی شاہد
معرفت حضرت شیخ مبارک علی اینڈ سنز۔ لاہور،

ایک نایاب "رسالہ پیامِ یار" ، لاہور

انیسویں صدی کا آخری اور بیسویں صدی کا پہلا ربع اردو کی ادبی صحافت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں اس دوران رسائل کی منفرد صورت "گلدستے" عام ہوئے، وہاں یہ زمانہ اُردو کے نثری رسائل کے ارتقا میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس عرصے میں کئی قابلِ ذکر اور نا قابلِ فراموش ادبی رسائل جاری ہوئے جو سالہا سال تک اردو ادب کی آبیاری کرتے رہے اور قدیم ادب کے نخلستان میں جدید ادب کے پودے کو اپنے خون سے سینچتے رہے۔ ان میں ادیب، معارف، مخزن، صلائے عام، زبان، زمانہ وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ اس کے علاوہ اس دوران سیکڑوں ایسے رسائل بھی شائع ہوئے جو ایک یا چند شماروں کی بہار دکھا کر گلستانِ ادب میں اپنا نام محفوظ کرا گئے۔ ان میں سے بعض کے بارے میں تو تواریخ ادب و صحافت میں معلومات مل جاتی ہیں لیکن بعض بلکہ اکثر رسائل گوشہ گمنامی میں پڑے کسی محقق کی نظروں میں آنے کے منتظر ہیں ایسے ہی رسائل میں ایک "پیام یار" (لاہور) بھی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اسی نام سے لکھنؤ سے شعری گلدستہ نکلتا رہا ہے جس کو اردو کا معروف ترین گلدستہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور جو ایک ربع صدی سے زائد عرصے تک تشنگانِ سخن کے ذوق کی آبیاری کرتا ہے۔

اس وقت "پیام یار" (لاہور) کا جلد اول کا تیسرا شمارہ بابت دسمبر 1916 پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ محترم مشفق خواجہ (کراچی) کی ملکیت ہے۔ نایابی کے پیش نظر ذیل میں اس کی ضروری تفصیلات درج کی جاتی ہیں :-

سب سے اوپر درمیان میں "دسمبر 1916" اور اس کے دائیں بائیں بالترتیب "رجسٹرڈ نمبر" اور ایل 1014 درج ہے اور اس کے نیچے یہ شعر ہے :-

خودی کو دور کرکے تو ہو میرے فضل کا جویا
میں بے شک سب گناہوں سے تجھے آزاد کردوں گا

نیچے جلی حروف میں "پیام یار" اور اس کے دائیں بائیں بالترتیب "جلد (۱) اور نمبر (۳) درج ہے۔ پیام یار کے نیچے "لاہور" اور اس کے نیچے "ایڈیٹر و پروپرائٹر :- صوفی شو شنکر" درج ہے۔ سب سے آخر میں دائیں طرف "سالانہ چندہ ۸/عہ" تحریر ہے جب کہ بائیں طرف سرورق پھٹ جانے کے باعث صرف "فی" باقی رہ گیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہاں "فی شمارہ" درج ہوگا۔

اندرونی سرورق کے صفحہ پر دو کالم ہیں۔ پہلے کالم میں فہرست مضامین ہے جو یہاں نقل کی جاتی ہے :-

بعض مضامین اور منظومات کے شروع میں مدیر نے تعارفی نوٹ بھی لکھے ہیں جن میں

سے کچھ یہاں درج کیے جاتے ہیں :-

باسط بسوانی کی نظم اور خود باسط بسوانی کے بارے میں نوٹ درج ہے :-

"منشی محمد باسط علی صاحب باسط بسوانی کا نام ادبی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس لئے (لیے؟) کسی تمہید کا محتاج نہیں۔ آپ نے "موت" پر ایک پُر معنی نظم لکھ کر برائے اندراج رسالہ ہذا ارسال کی ہے۔ جسے ہم شکریہ (شکریے ؟) کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ امید ہے قدر دانِ سخن اس کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جس کی یہ مستحق ہے"۔ ایڈیٹر۔

"مضمون استغراق و یکسوئی" کے شروع میں یہ تعارفی سطور درج ہیں :۔

"ناظرین اس مضمون کو کمالات مسمریزم نامی کتاب کی تمہید سمجھیں۔ آئندہ (آیندہ؟) پرچہ (پرچے) میں اس کے پہلے تین ابواب کا ترجمہ چھاپا جائے گا۔ ایڈیٹر"

"دنیا کے مشہور لوگ" کے مضمون کے تعارف میں یہ سطور ملتی ہیں :۔

"اس زمرے میں آج ہم زمانہ حال کے مشہور کروڑ پتی مسٹر کارنیگی کے سوانحی حالات درج کرتے ہیں۔ اگر ناظرین نے اس سلسلہ (سلسلے) کو پسند کیا تو آئندہ (آیندہ) بھی جاری رکھا جائے گا۔ ——— ایڈیٹر"

دوسرے کالم میں فہرست قوانین ہے جو درج ذیل ہے۔

(۱) پیام یار ہر ماہ کے آخری ہفتہ (ہفتے) میں شہر لاہور سے شائع ہوتا ہے۔

(۲) پیام یار کا مقصد روحانیت کا پرچار کرنا ہے۔

(۳) ایسے مضامین جن سے اخلاق پر بُرا اثر پڑے یا ذاتیات سے بحث ہو یا سیاسی پہلو لیے ہوئے ہو، درج پیام یار نہیں ہو سکتے۔

(۴) لائق اور قابل مضمون نگاروں کو معقول معاوضے دئے (دیے) جاویں گے۔

(۵) مضامین نظم و نثر ہر ماہ کی تاریخ (؟) تک آجانے چاہئیں۔

(۶) پیام یار کے مضامین ماسوائے ان اخبارات کے جن کے ساتھ ہمارا تبادلہ ہے، کسی اخبار یا رسالہ (رسالے) میں نقل کرنے کی قطعی ممانعت ہے۔ تبادلہ کرنے والے اصحاب بھی نوٹ کرلیں کہ بلا "پیام یار لاہور" کا حوالہ اور مصنف کا نام دیئے، اس میں کوئی مضمون نقل نہیں کر سکیں گے۔

(۷) اگر کسی صاحب کے پاس ڈاک خانہ کی غفلت سے کوئی نمبر نہ پہنچے تو ایک ہفتے تک اطلاع دینی چاہئے ورنہ پھر ۰۲/ کے ٹکٹ آنے پر پرچہ روانہ ہوگا۔

(۸) پیام یار کے متعلق جملہ خط و کتابت (مخط کتابت) و ترسیل (زر) بنام صوفی پربھی سنگھ صاحب اڈیٹر و پروپرائٹر پیام یار لاہور کے نام (آنی چاہئیں)

"پیام یار" کا یہ شمارہ صفحات کے شمار نمبر ۱۲۱ سے شروع ہوتا ہے۔ غالباً سال کے بارہ شماروں کے صفحات نمبر مسلسل ہوں گے چنانچہ یہ شمارہ صفحات نمبر ۱۲۱ سے ۱۷۰ تک کا ہے، اور یہ تیسرا شمارہ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس سے قبل کے دو شمارے ۱۲۰ صفحات کے ہیں۔ اس کے بعد "پیام یار" کب تک شائع ہوتا رہا، ہمارے پاس اس سلسلے میں کوئی معلومات نہیں۔

رفیعہ شبنم عابدی
صدر شعبۂ اردو
مہاراشٹر کالج ممبئی ۔ ۸

اقبال۔ شاعر اور سیاست داں

(ایک مختصر جائزہ)

ملک کے دامن میں ایسی شخصیتیں کم ہی آتی ہیں جو مختلف پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہوں۔ اقبال شاعر اور سیاست داں کے مصنف ڈاکٹر رفیق زکریا بھی اُن گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جن کا نام فرزندانِ قوم کی فہرست میں ہمیشہ رقم کیا جاتا رہے گا۔ وہ نہ صرف ایک دانشور ہیں، قانون داں ہیں، کئی تعلیمی اداروں کے سربراہ و سرپرست ہیں بلکہ تاریخ ادب، سماجیات، سیاسیات، اور اسلامیات پر ایک گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں پر دسترس حاصل ہے، لہٰذا خوب صورت زبان بولنا ہی نہیں، لکھنا بھی جانتے ہیں۔ ورنہ پنگوین جیسا عالمی ادارہ ان کی کتابوں کی اشاعت کو اپنی کارگزاریوں کی تاریخ کا حصّہ نہ بناتا۔ مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔ تخلیق، تحقیق، تحریر اور تصنیف کا کام مسلسل کرتے رہتے ہیں ان کی مشہور کتاب "رضیہ سلطان" اگر ان کے تاریخی شعور اور افسانوی ادب کی مثال ہے تو "حضرت محمدؐ اور قرآن" اسلامیات سے ان کے شغف اور، جواب دنداں شکن کا ثبوت ہے۔ زیر نظر کتاب "اقبال۔ شاعر اور سیاست داں" ان کے سیاسی، سماجی اور علمی وادبی شعور و بصیرت کی مظہر ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کی تحریروں (اور تقریروں سے بھی) اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ "غالب اور اقبال" دونوں کے قتیل ہیں۔ میرؔ کو وہ غالباً الگ ہی خانہ میں رکھتے ہیں کہ میرؔ کی رہ گزر تو دل خانہ خراب کی رہ گزر ہے۔ ہر چند اس میں اس اجڑے دیار کے (جس کے وہ رہنے والے تھے) اوراقِ مصور کوچوں کے کچھ مدھم اور کچھ واضح نقوش ضرور ملتے ہیں مگر مذکور تو دل کے نگر کا ہے جو سو مرتبہ لوٹا گیا البتہ غالب اور اقبال کی فکر دل کی رہ گزر سے ہوتے ہوئے ذہن و دماغ کی وادیوں کی سیر کراتی اور کر آتی ہے جہاں اوبڑ کھابڑ پہاڑیاں بھی ہیں اور بلند و بام ٹیلے بھی، جہاں تک غالب کا سوال ہے، ان کے سیاسی شعور اور عصری آگہی کا اندازہ ان کی غزلوں، خطوں اور تحریروں (جن میں دستنبو سب سے اہم ہے) سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر بھی سیاسی اعتبار سے غالب کا معاملہ ذرا دوسرا معاملہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے عہد کے سیاسی

انتشار کو جتنا دیکھا، اتنا ہی محسوس بھی کیا، مگر وہ اس قلزم خوں میں سر تاپا ڈوبے نہیں بلکہ بہت حد تک ساحل کے تماشائی ہیں۔ اس کی تلاطم خیز موجیں ان کے مضطرب اور نا آسودہ وجود سے ٹکرائی ضرور ہیں مگر غرقابی صرف پایابی کی حد تک ہے، کیوں کہ مزاجاً وہ سیاست داں نہیں تھے۔ من موجی آدمی تھے۔ دل والے تھے اور محبت ہی کو زندگی سمجھتے تھے، چاہے وہ فرد کی ہو یا پورے معاشرے کی۔ البتہ اقبال نے اپنے عہد کی سیاست کو نہ صرف محسوس کیا، نہ صرف اس کا مشاہدہ، مطالعہ کیا بلکہ اس کا محاسبہ بھی کیا اور اس میں حصہ بھی لیا۔ حالانکہ اس سمندر کے غواص یا ماہر شناور وہ بھی نہ بننے پائے، صرف کمر کمر ہی ڈوبے ہیں، مگر جتنا وہ ڈوبے ہیں اس سے کہیں زیادہ سیاست نے اُن کا نام ڈبویا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان پر الزامات کی بوچھار نہ ہوتی۔ فتوے صادر نہ ہوتے۔ اور انھیں مختلف خطابات سے نوازا نہ جاتا۔ کوئی انھیں دو قومی نظریہ کا جنم داتا، کوئی بانیٔ پاکستان، کوئی مسلم علاحدگی پسندی کا فلاسفر اور کوئی ہندستان و ہندو مخالف قرار نہ دیتا۔ یہاں تک کہ فرقہ ورانہ ہم آہنگی کے موضوع پر ہونے والے ایک قومی سیمینار میں (جو نہرو سینٹر بمبئی کی جانب سے ۱۹ نومبر ۱۹۹۰ء کو منعقد کیا گیا تھا) بھارتیہ جنتا پارٹی کے جنرل سکریٹری پرمود مہاجن یہ بیان نہ دیتے کہ۔

"ہمارے لیے سب سے زیادہ پریشان کُن اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ایک عظیم ترین ہندستانی مسلمان جنھوں نے 'سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا' جیسا ترانہ تخلیق کیا اور ہم جن کی پرستش کرتے تھے، بعد میں مادر وطن کی تقسیم کے آلۂ کار بن گئے۔ ایسے لوگوں پر کس طرح اعتبار کیا جائے۔" (ص۔۱۹)

اور اس موقع پر ڈاکٹر رفیق زکریا جو اس جلسے کی صدارت فرما رہے تھے یہ محسوس نہ کرتے کہ۔

"گویا اس طرح مہاجن نہ صرف اقبال کی بلکہ مجموعی طور پر سارے مسلمانوں کی ہندستان کے ساتھ وفاداری پر شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک بہترین ہندستانی مسلمان پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔" (ص۔۱۹)

یہی وہ زخم خوردہ احساس تھا جس نے ڈاکٹر رفیق زکریا جیسے روادار اور قومی یکجہتی کے علم بردار دانش ور کی فکر کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ اور انھیں مذکورہ کتاب لکھنے کی تحریک ملی۔ یہ صحیح ہے کہ اگر پرمود مہاجن یہ بیان نہ دیتے تب بھی ڈاکٹر رفیق زکریا اقبال پر کتاب ضرور لکھتے مگر اس کتاب کی نوعیت شاید وہ نہ ہوتی جو اس وقت ہے۔ خود وہ اپنے پیش لفظ میں اس کتاب کی وجہ تصنیف کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

"میں نے سیمینار ہی میں اس الزام کی تردید کی۔ لیکن یہ محسوس کیا کہ اس الزام نے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر اس قدر مضر اور منفی اثرات مرتب کیے ہیں کہ اس مسئلے پر تفصیلی بحث و مباحثہ اور اس کو صحیح تناظر میں پیش کیے جانے کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے بارے میں حقیقت کا انکشاف کیا جاسکے۔"

گویا اس کتاب کی اصل وجہ تصنیف اقبال کے تعلق سے پھیلائی ہوئی ان غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے جن کی وجہ سے سیکولر ذہن رکھنے والے سچے محب وطن اقبال کو، وہ اقبال جن کو خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آتا تھا، جنھیں اپنا وطن سارے جہاں سے اچھا لگتا تھا، جو ہمالیہ کے شیدائی اور نانک و گوتم اور رام کے قصیدہ خواں تھے، جنھیں عالم بالا میں سب سے پہلے "درویش ہندی" جلوہ گر نظر آیا تھا، جو سوامی رام تیر تھ کے فلسفے سے روحانی کشف کرتے تھے، وہاں اسی اقبال کی حب الوطنی پر شک کرنے والے' تعصب کے اس غبار کو دور کرنا تھا جسے سیاست کی آندھی عام ذہنوں پر جما گئی تھی۔

اقبال کے خلاف عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ میں الہ آباد میں کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شمال مغربی ہندستان میں ایک مسلم مملکت کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی وہ مسموم اور زہر آلود پروپیگنڈہ تھا جس کی وجہ سے اقبال ایک عرصے تک ہندوؤں میں مطعون و معتوب رہے۔ بقول ڈاکٹر رفیق زکریا، ممنوعہ شخصیت، سمجھے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ آل انڈیا ریڈیو پر اقبال کا کلام پیش کیے جانے پر پابندی لگادی گئی۔ اس طرح سیاست داں اقبال کے ساتھ ساتھ شاعر اقبال بھی اس تعصب کا شکار ہو گیا اور اسے بھی تنگ نظری کا یہ عذاب جھیلنا پڑا۔

ڈاکٹر رفیق زکریا نے اس کتاب کے ذریعہ اقبال کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اقبال بہ حیثیت شاعر اور اقبال بہ حیثیت سیاست داں۔ اس ضمن میں انھوں نے اقبال کی زندگی کے مختلف واقعات و نظریات اور خیالات کا جائزہ لیا ہے ہندستان اور ہندوؤں کے بارے میں ان کے جذبات' ان کے سیاسی نظریات اور سیاسی سرگرمیاں، اسلام سے ان کی گہری وابستگی، ہندستان سے ان کی شدید محبت، ان کی شاعری اور ان کا فلسفہ غرض یہ کہ ان سب کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور پھر اس کی روشنی میں اقبال کے دامن پر لگائے جانے والے داغوں کی شست و شو کا فریضہ انجام دیا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اقبال کا دامن واقعی داغ دار تھا؟ کیا وہ سچ مچ فرقہ پرست تھے؟ پاکستان کے خالق تھے؟ اور برصغیر کے طالب؟۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر زکریا نے یوں تو پوری کتاب

میں جا بجا بحث کی ہے لیکن ایک پورا باب (ہفتم) اس تفصیل سے بھرا پڑا ہے جس میں ڈاکٹر زکریا اقبال کی سیاست دانی کے احتساب کی متوازن منزل سے کامراں گزرے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے بھی حرف آغاز، کے نام سے اپنے مضمون میں اس کی مزید وضاحت کر دی ہے جس کی وجہ سے آغاز ہی میں کتاب کے متن کو سمجھنے کا اشاریہ مل جاتا ہے۔ مزید ثبوت کے طور پر انھوں نے راغب حسین کے نام اقبال کے اس مکتوب کا حوالہ بھی دیا ہے جو ۶ مارچ ۱۹۳۴ کو تحریر کیا گیا تھا۔ جس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

"برائے مہربانی اس بات پر غور کیا جائے کہ اس تبصرے کے مصنف نے میری اسکیم کو پاکستان کے نظریے کے ساتھ گڈمڈ کر دیا ہے۔ میرا مطالبہ ایک ایسی مملکت کا ہے جو ہندستانی وفاق کے اندر شامل ہو۔ نظریہ پاکستان کا مطالبہ ایک ایسی علاحدہ مسلم مملکت کا ہے جو شمال مغربی ہندوستان میں، ہندوستانی وفاق سے الگ ہو اور براہ راست انگلستان سے وابستہ ہو"۔
(صفحہ ۴۷)

قانون داں ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر رفیق زکریا نے اس مقدمے میں اقبال کی مدلل پیروی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"عدالتی یا قانونی اصطلاح میں غیر تسلیم شدہ طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ اقبال نے واقعی برِ صغیر کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس پاداش میں انھیں خود ان کے وطن میں اس لیے برادری سے باہر یا اچھوت سمجھ لیا جائے کہ ہندستان ان کا ملک تھا؟"
(صفحہ ۲۲)

آگے چل کر ہندستان کی سیاسی تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے متعصب ذہنوں کو یوں دنداں شکن جواب دیتے ہیں۔

"انھوں نے ہندوؤں کو گالیاں نہیں دیں۔ کسی بھی انداز میں ہندوؤں کے خلاف معاندانہ طرزِ عمل کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ درواڑ منترا کزہاکام کے بانی سی۔ این انّادرائی (ڈی۔ ایم۔ کے) نے ہندو تہذیب پر شدید حملہ کیا تھا اور تامل ناڈو کی ہندستان سے علاحدگی کا کھل کر مطالبہ کیا تھا۔ ان کے سچے جانشین ایم جی۔ رام چندرن نے ان کی زبردست حمایت کی تھی۔ اور قومی ہیرو ونیز پسماندہ طبقات کے رہنما ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ جنھوں نے ہندو تہذیب کی مذمت میں کوئی دشنام باقی نہیں چھوڑی تھی۔ امبیڈکر اور ایم۔ جی۔ آر کو بھارت رتن کے اعزازات سے نوازا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال مسلمان تھے اور یہ دونوں ہندو تھے؟۔" (صفحہ ۲۲، ۲۳)

یہ اور اس قسم کے متعدد سوالات ہیں جو ڈاکٹر رفیق زکریا نے اس موضوع کے ضمن میں اٹھائے ہیں جن کا جواب ارباب سیاست و اقتدار کے پاس نہیں ہے۔ البتہ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے والوں کے ذہن سے یقیناً تعصب کی وہ گرد صاف ہو سکتی ہے جو برسوں سے جمی ہوئی ہے۔ نیز اس طرح اقبال کی شخصیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی آئی ہے اس کا ازالہ بھی کسی حد تک ہوتا نظر آتا ہے۔ یہی مصنف کی کامیابی ہے۔

کتاب کا اصل متن تقریباً گیارہ ابواب میں تقسیم ہے جن میں بعض باتوں کا تذکرہ ضمناً ملتا ہے۔ بعض پہلوؤں پر دانستا روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض موضوعات کا خاص طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔ اس طرح وہ باتیں جو کل متن کے مطالعے سے کھل کر سامنے آتی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال کے حالات زندگی : پیدائش، بچپن، تعلیم و تربیت، اعلا تعلیم، وفات وغیرہ کا بیان۔

۲۔ اقبال کے سفر : لندن، ہائیڈل برگ، جرمنی، فلسطین، مصر، افغانستان وغیرہ وغیرہ۔

۳۔ اقبال کے شوق اور مشاغل : مثلاً موسیقی جو ان کی رگوں میں رچی بسی تھی، وہ ستار بھی بجاتے تھے۔ رقص سے بھی ان کی دلچسپی تھی اور لندن میں انگریز عورتوں کے ساتھ رقص کر کے وہ لطف لیتے تھے۔ لاہور کی ہیرامنڈی میں بھی ان کی آمد و رفت تھی۔

۴۔ ان کی شادیوں اور اولادوں کا احوال : پہلی شادی خلاف مرضی کریم بی بی کے ساتھ اور آفتاب کی پیدائش۔ دوسری شادی کشمیری خاتون سردار بیگم کے ساتھ مگر شکوک و شبہات کی بنا پر ناچاقی۔ آخری عمر میں ملاپ اور جاوید اور منیرہ کی پیدائش۔ تیسری شادی لدھیانہ کی مختار بیگم کے ساتھ جو لاولد انتقال کر گئیں

۵۔ ان کے معاشقے : پہلا عشق لاہور میں ایک رقاصہ امیر کے ساتھ (۱۹۰۳ میں) جس سے دور ہونے پر اقبال اپنے ایک دوست سید تقی شاہ کو لکھتے ہیں "امیر کہاں ہے خدا کے واسطے اس کے پاس جاؤ اور اسے دیکھو میں بہت پریشان ہوں۔۔۔ میں جتنا اس سے دور ہوتا ہوں اتنا ہی اس سے قریب ہو جاتا ہوں۔" (صفحہ ۴۵)

دوسرا عشق لندن میں عطیہ فیضی کے ساتھ جس کو ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "میں چاہتا ہوں کہ اپنا دل کھول کر سامنے رکھ دوں تا کہ تم میری روح میں جھانک سکو" (صفحہ ۶۰)

عطیہ سے وہ شادی کے خواہش مند تھے لیکن خاندانی روایات سے مجبور تھے۔

ایک موقع پر درد بھرے انداز میں لکھتے ہیں۔ "میرے لیے اس کا واحد حل یہ ہے کہ میں اس نامراد ملک کو چھوڑ دوں اور شراب میں پناہ لوں جو خودکشی کو آسان بنادی گی۔" (صفحہ ۸۸)

تیسرا عشق ہائیڈل برگ میں ایک جرمن خاتون ایما (Emma) کے ساتھ۔ ایسا لگتا ہے ایما کے معاملے میں وہ بہت زیادہ سنجیدہ تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔
"تم بخوبی تصور کر سکتی ہو کہ میرے دل میں کیا ہے۔ دراصل میری زبردست خواہش ہے کہ میں تمھیں دیکھ سکوں تم سے گفتگو کر سکوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ جو شخص بھی تمھیں جانتا ہے تمھارے بغیر جی نہیں سکتا۔" (صفحہ ۴۷)
۶۔ ان کی کمزوریاں اور خامیاں: جیسے انھیں عملی کام سے نفرت تھی (صفحہ ۴) کریم بی بی سے ان کا ناروا سلوک جس کے لیے ان کے بیٹے آفتاب نے انھیں کبھی معاف نہیں کیا (صفحہ ۴۶)
انھیں خواتین کی صحبت میں لطف آتا تھا (صفحہ ۶۱) کبھی کبھی ہیرا منڈی بھی جایا کرتے تھے جو لاہور میں طوائفوں کی بستی تھی۔ انھوں نے سردار بیگم کو ایک گم نام مراسلے کی تحقیق کیے بغیر ذہنی ایذا پہنچائی (صفحہ ۸۹۔۸۸) ان کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں تھا کہ وہ بچوں کی خاطر خواہ پرورش کر سکتے۔ ان کی فطرت میں بے حد تضاد تھے مثلاً وہ خودی کی تعلیم بھی دیتے ہیں اور دوسروں کے احسان مند بھی ہوتے ہیں وغیرہ۔
۷۔ دیگر اکابرین سے اقبال کا موازنہ: مثلاً اقبال اور ٹیگور (صفحہ ۴۲۔۴۱) اقبال اور گاندھی (صفحہ ۲۲۲)۔ اقبال اور جناح (صفحہ ۲۱۶) وغیرہ۔
۸۔ ان کی شاعری: ان کے تمام شعری مجموعوں اور ان کی شاعری کے سفر کی منزل بہ منزل داستان۔
۹۔ ان کی سیاسی نظریات اور سرگرمیاں۔
۱۰۔ ان کی وطن دوستی اور انسان دوستی۔
۱۱۔ اسلام پسندی اور اسلام سے متعلق ان کے نظریات۔
اس پورے متن میں ڈاکٹر صاحب ایک ایماندار مؤرخ کی حیثیت سے اقبال کی زندگی کے ان پہلوؤں کو بڑے جرات مندانہ انداز میں بے نقاب کرتے ہیں جن پر اقبال کے چاہنے والوں نے مقدس پردے ڈال رکھے ہیں۔ مثلاً۔
۱۔ اقبال نے محمد علی کے باغیانہ جذبے اور اسلام کی راہ میں پیش کردہ ان کی قربانیوں کی تعریف کی لیکن ان کے طریقہ ہائے احتجاج اور برطانیہ مخالف پالیسیوں کو پسند نہیں کیا۔ (صفحہ ۱۰۴)
۲۔ انھوں نے مغرب کی زبردست مخالفت کی لیکن برطانوی راج کی مخالفت میں کچھ نہیں کہا۔

۳۔ وہ سیاست اور قانون دونوں سے دلچسپی بھی رکھتے تھے مگر عملاً دونوں میں ناکام رہے کیونکہ ایمانداری سے اسے اپنا نہ سکے (صفحہ ۱۰۶)

۴۔ اقبال خاموش زندگی کے عادی تھے اور اس کے باوجود الیکشن کے ہنگاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور محلے محلے جا کر ووٹ مانگے (صفحہ ۱۰۵)

۵۔ ایک طرف وہ عوام کی برہمی کے باوجود اپنے لیٹر پیڈ پر سر شیخ محمد اقبال، کے الفاظ لکھتے رہے دوسری طرف تحریروں اور تقریروں میں حکومت برطانیہ پر تنقید کرنا نہ چھوڑا۔ (صفحہ ۱۰۷)

خوش قسمتی سے اس کتاب کو ڈاکٹر عبدالستار دلوی جیسا مترجم مل گیا، ترجمہ جن کا خاص میدان ہے۔ انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ مثلاً مراٹھی سے لولوکیتا، "ساوتری" اور "رن آنگن" وغیرہ کے ترجمے پھر سنسکرت شاعر بھرتری ہری کی نظموں کا اردو ترجمہ جو زیر طبع ہے انگریزی کے شاعر نسیم ایزا کیل کی نظموں کا ترجمہ، انیل کی مشہور نظم "تہان" کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر دلوی مشہور ماہر لسانیات، محقق اور ادیب ہیں لہٰذا زبانوں، لفظوں اور لہجوں کے مزاج داں ہیں اسی لیے بعض تراکیب کا بڑا خوب صورت ترجمہ ملتا ہے۔ مثلاً ریشمی رشتے، شہابی ارتقا، ذہنی بے رحمی وغیرہ۔ کہیں کہیں تو پورے پیراگراف پڑھ جایئے ایسا لگتا ہی نہیں کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب اردو ہی میں تخلیق کی گئی ہے اور پھر اس میں ڈاکٹر رفیق زکریا کا مزاج اور لہجہ برقرار رکھنا۔ مترجم کی کامیاب کاہش اور کاوش کی دلیل ہے۔ ایک اور اہم بات۔ اصل تخلیق سے ترجمہ کی طرف آنا آسان ہے مگر ترجمہ سے اصل تخلیق کی تلاش وقت طلب امر ہے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے اپنی کتاب میں اقبال کے متعدد فارسی اور اردو اشعار کے حوالے انگریزی ترجمے کی صورت پیش کیے ہیں جن میں بعض جگہ تو لفظی ترجمہ ہے اور بعض جگہ بقول پروفیسر جگن ناتھ آزاد فٹز جیرالٹ جیسے ترجمے ہیں۔ مگر اردو میں ان کا ترجمہ کرتے وقت حوالے کے طور پر اقبال کے اصل اشعار پیش کرنا ضروری تھے۔ اور یہ بہت مشکل مرحلہ تھا جس سے ڈاکٹر دلوی کامیاب گزرے ہیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی کے ایسے تمام اشعار ڈاکٹر زکریا کے انگریزی ترجمے کے پیش نظر تلاش کیے کچھ کام باقی رہ گیا تھا وہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے پورا کیا۔

البتہ کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ترجمے پر نظر ثانی نہیں کی جا سکی یا پھر مسودہ صاف ہونے سے پہلے ہی کتابت کے لیے دے دیا گیا۔ ممکن ہے پروف ریڈنگ بھی بغور

نہ ہو پائی ہو۔ یا پھر اس کی تصحیح میں حسبِ معمول کاتب نے غفلت برتی ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان دنوں ڈاکٹر دلوی قاہرہ تشریف لے جا چکے تھے بہر حال کچھ غلطیاں اس کتاب میں رہ گئیں ہیں۔ مثلاً

۱۔ قارئین اس کتاب کا بطور خود، اندازہ لگائیں صفحہ نمبر ۱۲۔ یہ لفظ کتاب میں دو تین جگہوں پر آیا ہے۔ یہاں بطور خود کی بجائے، بذات خود ہونا چاہیے تھا۔

۲۔ عوامی وزرا اور نامزد کردہ کانسلروں کے درمیان۔ (صفحہ ۱۰۸) یہاں منتخب وزرا اور نامزد کانسلروں کے درمیان ہوتا تو بہتر تھا۔

۳۔ محفوظ شدہ موضوعات مثلاً داخلہ اور اقتصادیات کو حکومت برطانیہ کے تقرر کردہ افسران کے پاس رکھا گیا۔ (صفحہ ۱۰۸) محفوظ شعبہ جات مثلاً داخلہ اور اقتصادیات ــــ بہتر تھا۔ بہر حال اس قسم کی غلطیاں خال خال ہیں ورنہ پورا ترجمہ بڑی محنت سے کیا گیا ہے۔

حرف آغاز، میں ڈاکٹر دلوی نے ڈاکٹر زکریا سے ممنونیت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ ڈاکٹر زکریا نے اپنے پیش لفظ میں خشونت سنگھ، بیگم فاطمہ زکریا، اور اپنے ذاتی معاون ایم۔ وی۔ راگھون کا شکریہ تو ادا کیا ہے مگر کہیں بھی جگن ناتھ آزاد اور پروفیسر ڈاکٹر عبد الستار دلوی کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے اس کتاب کو اردو کی روح عطا کی۔ مانا کہ یہ پیش لفظ اصل کتاب کا ہے جو انگریزی میں لکھی گئی تھی مگر جب اس کا ترجمہ اردو میں کیا گیا تو پس نوشت کے طور پر الگ سے دو اضافی جملے شکریے کے اس میں شامل کیے جا سکتے تھے۔

کتاب کے آخر میں حیات اقبال کے مہ و سال، کے عنوان سے ایک پورا باب ہے جس سے اقبال کی بدلتی ہوئی زندگی کے لمحہ بہ لمحہ حالات کا ایک مختصر سا خاکہ مل جاتا ہے۔ پھر حواشی منتخب کتابیات اور اقبال کی تصانیف، نیز اقبالیات سے متعلق انگریزی اور اردو کتابوں اور رسائل و جرائد کی فہرست دی گئی ہے۔ اور اشاریہ بھی شامل ہے۔ یہ سب قاری کو کتاب کے مطالعہ و حوالے میں کافی مدد دیتے ہیں۔

تفہیم اقبال کی خاطر اس کتاب کا مطالعہ اردو کے قاری پر فرض ہے اور خرید کر مطالعہ کرنا اس سے بھی بڑا فریضہ۔

عبدالقوی دسنوی
۲۔ پرنس کالونی۔ عیدگاہ ہلز۔ بھوپال۔۱

''اردو کے چند نامور ادیب اور مشہور شاعر'' پر ایک نظر

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی یاد نہیں لیکن کہاں ہوئی اور کیسے ہوئی یہ اچھی طرح یاد ہے۔ آج سے چالیس / بیالیس سال قبل انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کسی غرض سے جانا ہوا تھا تو پہلے عم محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے ملاقات کی تھی پھر کتب خانے میں داخل ہوا تو وہاں ایک مسکین صورت ، سفید بشرٹ اور پینٹ میں ملبوس درمیانہ قد کے ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی تھی جس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حامد اللہ ندوی رفیق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہیں کتب خانہ کی دیکھ ریکھ اور سہ ماہی '' نوائے ادب '' کی اشاعت میں معاونت کرتے ہیں ۔ نوائے ادب کا ایک اہم حصّہ ''مقالہ نما'' ہوا کرتا تھا جس کی بہت کچھ ذمے داری بھی حامد اللہ ندوی کے کاندھوں پر تھی جسے وہ نہایت دلچسپی اور خوش سلیقگی سے انجام دے رہے تھے ۔ چند سال پہلے نوائے ادب کے ابتدائی شماروں میں ان کے مضامین ''کریمی لائبریری''، ''بادشاہ مدراسی'' ''شاہ عبدالحق احقر''، ''اردو مخطوطات'' اور چند کتابوں پر تبصرے میری نظر سے گزر چکے تھے، دیکھنے میں خاموش طبیعت معلوم ہوئے، گفتگو میں نہ تیزی تھی نہ گرمی تھی بلکہ نرمی تھی، گفتگو کے بعد ان کی طبیعت کی نیکی اور مزاج کی سادگی کا احساس ہوا اور محسوس ہوا کہ حامد اللہ ندوی اپنوں میں سے ہیں، پھر تو ملاقاتیں ہوتی رہیں تعلقات بڑھتے گئے اور رشتہ مضبوط ہوتا گیا۔

عام طور سے حامد اللہ ندوی سے گفتگو کتابوں، رسائل، ادیبوں یا اردو کے اساتذہ سے متعلق ہوا کرتی تھیں ۔ کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ بھی ہو جایا کرتی تھی، لطیفے بھی سنائے جاتے تھے، حالات اور واقعات پر تبصرے بھی ہوتے تھے اور پھر مسکراہٹیں چمکتیں تھیں، قہقہہ گونج اٹھتے تھے۔ ان کے ملنے والوں کا حلقہ مختصر تھا، ان کا زیادہ وقت کتب خانے میں گزرتا تھا، انھیں تحقیق سے دلچسپی رہی ہے اس سے متعلق موضوعات پر ان کا قلم ہمیشہ رواں رہا ہے، ہمیشہ کتب خانوں کو کھنگالتے رہے اہم اور قیمتی مخطوطات کی تلاش میں رہتے، نادرات کی جستجو رہتی، اسی میں

مگن تھے۔ اور یہی ان کی مختصر دنیا بنی رہی۔ یعنی چند ملنے والے، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شعبہ کے کتب خانے گھر سے انسٹی ٹیوٹ تک کا راستہ، اور کبھی کبھار کچھ اور راستے اور بس۔

اسی محدود دنیا میں رہ کر حامد اللہ ندوی ذخار سمندر سے اپنے مطلب کی چیزیں ڈھونڈ نکالتے اور پھر اہل علم کے سامنے پیش کرتے عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جہاں تک مجھے علم ہے حامد اللہ ندوی کی تحقیق سے تعلق رکھنے والی یہ تین کتابیں "لکھنؤ کی لسانی خدمات" (۱۹۷۵ء) "کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات" (۱۹۹۰ء) "اردو کی چند نایاب مثنویاں" (۱۹۹۳ء) پچھلے اٹھارہ سال میں منظر عام پر آئیں اور پسند کی گئیں۔

ان کے علاوہ گذشتہ ۱۹۹۵ء میں ان کی ایک اور کتاب "اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر" شائع ہوئی جو سولہ ۱۶ تاثراتی، تعارفی اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے ان میں زندہ اور مرحوم ادیبوں سے ملاقات کی تصویریں بھی کھینچی گئی ہیں ان کی شخصیتوں پر روشنی بھی ڈالی گئی ہے، خدمات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اور کہیں کہیں اپنا ذکر بھی چھیڑ دیا گیا ہے جس میں کہیں تلخیاں آگئی ہیں، کہیں محرومیاں جھلکتی ہیں، کہیں کامیابیاں مسکراتی ہوئی رقصاں نظر آتی ہیں۔ کہیں تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں کہیں تاثرات میں بزرگوں کی شفقتیں جھلکتی ہیں، کہیں اخلاص کی دھیمی آنچ ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں کبھی بھی طبیعت نے گرانی محسوس نہیں کی نہ فکری اور ذہنی الجھنیں ہوئیں۔ ان کی زبان سادہ اور منجھی ہوئی ہے، خیالات پاکیزہ اور فکر انگیز ہے اور مختلف فکر و خیال کے ادبا اور شعرا سے ملاقاتوں کا سلسلہ، عجب لطف پیدا کرتا ہے۔

چونکہ ان نامور ادیبوں اور شاعروں میں تقریباً سب سے میری بھی ملاقاتیں رہی ہیں س لیے مطالعہ کے دوران گذشتہ دنوں کی یادیں تازہ ہوتی چلی گئیں۔ کبھی آنکھیں چمک اٹھیں، ھی نم ہو گئیں کبھی ملاقاتیں جاگ اٹھیں اور بے چین کرنے لگیں، پڑھتا چلا گیا، آگے بڑھتا پلا گیا۔ بمبئی کی بیتی زندگی کے شب و روز مچلنے لگے اور رنگارنگ تصویریں نگاہوں کے سامنے ونے لگیں اور بہت کچھ کہنے لگیں۔ کتاب ختم ہوئی تو دیر تک اسی ماحول میں اپنے آپ کو کھویا وا محسوس کرتا رہا۔

اس کتاب کا پہلا مضمون "سید سلیمان ندوی کی سیاسی و علمی خدمات" جس میں ڈاکٹر امد اللہ ندوی اپنے دار العلوم ندوہ میں داخلہ سے پہلے اور بعد میں سیدؔ صاحب سے ملاقاتوں کا ر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اور مولانا ابو الکلام آزاد کے ساتھ اس زمانے

ے سید صاحب کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور ان کی سیاسی دلچسپیوں، مصروفیتوں سے
ی آگاہ کیا ہے اور آخر میں کل اور آج کی سیاست سے متعلق حامد اللہ ندوی کے یہ تاثرات ان
ے قلم سے چھلک کر صفحۂ قرطاس پر آگئے ہیں۔

"آج ہم سیاست کا نام لیتے ہیں تو جھوٹ، مکاری، بے ایمانی، خود غرضی اور ضمیر فروشی کی ایک ایسی گھناؤنی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کوچہ میں قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، مگر سید صاحب کے عہد کی سیاست موقع پرستوں اور ضمیر فروشیوں کی سیاست نہ تھی بلکہ اس کا دارومدار تمام تر سچائی، ایمان داری اور حق پرستی پر تھا، وہ ہر قسم کی گندگی سے پاک تھی۔ اس میں وہی لوگ حصّہ لے سکتے تھے جو مخلص تھے جن میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے دکھ جھیلنے اور مصائب برداشت کرنے کی طاقت تھی اور اپنی جان اور مال کی قربانی کے لیے تیار رہتے تھے۔ جن کی جدوجہد میں ذاتی اغراض کا شائبہ تک نہ تھا۔" (ص ۲۹)

ر یہ سچ ہے کہ آج ہمارے وطن عزیز میں قربانی اور ایثار جیسے مقدس الفاظ نے اپنے معنی
ہو دیے ہیں۔ مفاد پرستی، خود غرضی، دھوکا دھڑی اور نہ جانے کیسی کیسی بھیانک قسم کی
ائیاں آج ہمارے ملک کے سفید پوشوں کے ذہن میں پروان چڑھتی رہتی ہیں جو ملک کو تباہی
طرف لے جا رہی ہیں۔

اس مضمون میں علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی، ادبی اور مذہبی خدمات پر بھی تفصیلی
وشنی ڈالی گئی ہے۔ اختتام پر پہنچتے ہوئے سر سید، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی کوششوں
ے متعلق اپنے اس تعلق کا اظہار کرتے ہیں:

"ہم سید، شبلی یا سید صاحب کی کوششوں کو لاکر علی گڑھ تحریک، ندوہ تحریک اور دارالمصنفین تحریک کے نام سے یاد کرلیں لیکن سچ یہ ہے کہ یہ صحیح معنوں میں تحریکیں نہ تھیں بلکہ چند عظیم شخصیتوں کی مخلصانہ مگر انفرادی کوششیں تھیں جو ان شخصیتوں کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد رسالوں، کتابوں اور اداروں میں بند ہو کر رہ گئیں، ان کا فائدہ اتنا عام نہ ہوا جتنا ہونا چاہیے تھا۔" (ص ۴۱)

ہ بات درست ہے کہ ہم ان تحریکوں کے ذریعہ قوم و ملک کو صحیح فائدہ نہیں پہنچا سکے۔ دوسرا
مضمون "آثار قاضی عبدالغفار۔ نفسیاتی مطالعہ" ہے جس میں جہاں قاضی صاحب سے

ملاقاتوں کاذکر ہے وہاں ان کی علمی، ادبی صحافتی خدمات اور مطبوعات کا بھی ذکر ہے۔ پورے مقالے کے مطالعہ کے بعد قاضی صاحب کی بھرپور شخصیت اپنی رنگارنگ خوبیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ حیات اجمل کا تعارف کراتے ہوئے، قاضی صاحب کی قومی تحریک سے وابستگی پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

قاضی صاحب روزِ اول ہی سے ہندستان کی قومی تحریک کے ایک سرگرم رکن رہے ہیں حالات کی وقتاً فوقتاً تبدیلی کے باوجود ان کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آئی، گاندھی جی کی لیڈر شپ کے وہ بے حد مداح تھی''(ص ۶۸)

اور اس کے ساتھ ہی اس تلخ حقیقت کا بھی نہایت سچائی، جرات مندی اور تاسف کے ساتھ اظہار ملتا ہے:

''مگر کوئی مانے یانہ مانے یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ گاندھی جی کی شہادت کے بعد اس قومی تحریک نے اپنادھارا ہی بدل دیا اور اکثریت کے کم مایہ لیڈروں نے سب کچھ اپنا سمجھ کر اقلیتوں کی حق تلفی شروع کردی یہاں تک کہ جن مسلم عالموں، ادیبوں اور شاعروں نے دل وجان کے ساتھ اس تحریک کا ساتھ دیا تھاوہ بھی مایوسیوں کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آج ہندستان کی تاریخ آزادی میں ان کانام تک نہیں۔''(ص ۶۹)

اپنے مضمون ''احتشام صاحب'' میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے ان سے ملاقاتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کو بحیثیت شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار، مترجم، ماہر لسانیات متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ان کی تمام تصنیفات، تالیفات، انتخابات اور تراجم سے آگاہی دی ہے۔ بلاشبہ مطالعہ احتشام حسین میں یہ مقالہ مفید ثابت ہوگا۔

''سروری: ادب سے زبان تک'' میں عبدالقادر سروری مرحوم سے ملاقاتوں کو یاد کرتے ہوئے ان کی علمی وادبی خدمات کا احاطہ اس طرح کرتے ہیں:

''سروری کی علمی وادبی دلچسپیاں گوں ناگوں تھیں انھوں نے مخطوطات کی تفصیلی فہرست بھی مرتب کی، جدید اردو شاعری کی وسعتوں کو بھی ناپا، دنیائے افسانہ کی سیر بھی کرائی، حیدر آباد کی تعلیمی ترقی کا حال بھی سنایا، پھولبن، قصۂ بے نظیر اور بعض دوسری اہم دکنی مثنویاں بھی مرتب کیں، اردو مثنوی کے ارتقا پر بھی روشنی ڈالی، کلیات سراج اس کا انتخاب اور اس کے

حالات بھی شائع کیے ، زبان اور علم زبان کی رفتارِ ترقی کا جائزہ بھی لیا، غرض
کہ اردو ادب اور اردو زبان کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کی نظر نہ گئی ہو اور
جس پر ان کا قلم نہ اٹھا ہو ان کی پوری علمی اور ادبی زندگی سعی پیہم کی ایک زندہ
مثال تھی''(ص ۸۹)

''ندوی صاحب : ایک عکس جمیل '' دراصل پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب کے متعلق ان کے تجربات اور تاثرات ہیں جس میں ان کے شب و روز کی بعض اہم پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ ندوی صاحب نے حامد اللہ کی بروقت مدد کی تھی جس کا ذکر بھی نہایت اچھے ڈھنگ سے کیا گیا ہے اور ان کی ان خوبیوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں جن کی آج کے معاشرہ میں روز بروز کمی ہوتی جارہی ہے ملاحظہ فرمائیں :

''ندوی صاحب انسان دوست اور غریب نواز تھے ہمدردی کا جذبہ ان میں
کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ علانیہ اور پوشیدہ مدد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے
جانے نہیں دیتے تھے اور اس سلسلے میں ان کے ہاں چھوٹے بڑے اپنے، غیر
اور دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہ تھا''(ص ۹۷)

''ایک تارہ ٹوٹا '' میں مولانا شہاب مالیر کوٹلوی سے ملاقات اور تعلقات کی داستان ہے جس میں ایک صاحبِ علم، منکسر المزاج، خوددار، مشفق محترم کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے اور اچھی اور بامقصد زندگی گزارنے کا احساس جگاتی ہے۔

''محمد اکبر الدین صدیقی ۔ ایک نئی کتاب کچھ پرانی یادیں '' میں اکبر الدین صدیقی سے ملاقاتوں کا تذکرہ نہایت دلچسپ انداز سے ملتا ہے اسی کے ساتھ ان کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی پڑتی ہے اور اکبر الدین صدیقی کے متعلق ان کے اس خیال سے آگاہی ہوتی ہے :

''صدیقی صاحب ایک وجیہہ ، خوش پوش، خوش خلق، خوش وضع اور سیر چشم
انسان ہیں۔ ان کی طبیعت میں تحمل، ان کے مزاج میں ایک رکھ رکھاو اور ان
کی شخصیت میں ایک وقار ایک کشش ہے۔ خدا نے انھیں ہر قسم کی آسودگی
سے نوازا ہے علمی بھی ، ذہنی بھی اور مالی بھی ۔ وہ سب کے ساتھ نرمی سے
پیش آتے ہیں ، کسی کی دل شکنی نہیں کرتے ، وہ کم بولتے ہیں ۔ غیر ضروری
بحثوں میں نہیں پڑتے۔ تصنع، تکلف، خود نمائی اور سستی شہرت سے انھیں
عار ہے ، وہ ہمیشہ سچ بات کرتے ہیں ، جھوٹ کبھی نہیں بولتے ، ان کا سینہ حسد
بغض اور کینہ سے پاک ہے ۔ دوسروں سے ناجائز فائدہ کبھی نہیں اٹھاتے مگر

دوسروں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔‘‘(ص ۱۲۶)

اسے مطالعہ کے بعد جہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ حامد اللہ ندوی نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے وہاں یہ احساس بھی ہوتا ہے کاش یہ خوبیاں عام ہو جائیں تاکہ جینے کا حوصلہ بھی ملے لطف بھی آئے اور یہ دنیا آنسوؤں اور سسکیوں کی جگہ مسکراہٹوں سے لبریز ہو جائے۔

’’ڈاکٹر یونس اگاسکر کا ادبی سفر ‘‘ اردو کے ایک ایسے استاد کا تعارف ہے جو مشکلات اور تکالیف میں اپنے لیے کامیابیوں کی راہیں نکالتا ہے اور پھر ادبی سفر کی اس منزل کو جالیتا ہے جہاں لوگ اسے نہ صرف اس کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے جانتے ہیں بلکہ اس کی ان خصوصیات کی وجہ سے بھی اسے پہچانتے ہیں جن کی وجہ سے انسان قابل قدر بن جاتا ہے۔ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ان کی خوبیاں اس طرح گناتے ہیں :

> ’’ اگاسکر کو اپنی زندگی میں بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں مگر ان تکلیفوں کے اثر کو انھوں نے اپنی شخصیت پر حاوی ہونے نہ دیا بلکہ الٹا اس کو اپنے لیے ایک خوشگوار اور مثبت طاقت میں بدل دیا ، وہ نرم مزاج ہیں ، رحم دل ہیں اور دوسروں کے جذبات کا بڑا خیال رکھتے ہیں ، ساتھ ہی وقت پر صحیح بات کہنے سے کبھی نہیں ڈرتے ‘‘(ص ۱۳۵)

’’ آج کے مزاح نگار ‘‘ میں طنز و مزاح اور ہجو کے نازک فرق کو بتاتے ہوئے اور اردو میں مزاح کے تین مختلف ادوار پر روشنی ڈالتے ہوئے ، کرشن چندر ، فرقت کاکوری ، ملا ابن عرب مکی ، فکر تونسوی ، بھارت چند کھنہ ، خواجہ عبد الغفور ، یوسف ناظم ، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین ، ، وجاہت علی سندیلوی ، عبد المجید سہالوی ، پرویز یداللہ مہدی ، مسیح انجم ، نریندر لوتھر ، رشید قریشی ، برق آشیانوی ، ایم۔اے۔خان ، جلال ملیح آبادی ، اظہر افسر ، مخلص بھوپالی اور شفیقہ فرحت کے فن اور خصوصیات کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

’’گوپال متل ایک ادیب ایک شاعر ‘‘ میں متل کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی خدمات خاص طور سے ان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ ہے۔متل کی تحریروں کے اقتباسات کے مطالعہ سے ان کی اردو سے گہری وابستگی کا پتا چلتا ہے۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

> ’’ریاکاری ہمارا ایک عام شیوہ ہے لیکن جو لوگ ان دنوں اردو کے مجاہد بنے ہوئے ہیں وہ کچھ زیادہ ہی ریاکار ہیں وہ اردو کی حمایت میں پر جوش تقریریں کرتے ہیں اور مضامین لکھتے ہیں لیکن ان تقریروں اور مضامین کے آخر میں

چٹکے سے ایک ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو ان کی ابتدائی باتوں کی نفی کر دیتی ہے۔ (ص ۱۹۰)

بے شک اردو کے ساتھ اس طرح کا سلوک اکثر اہل اردو کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اردو کی وجہ سے ملازمتیں حاصل کرتے ہیں، استاد بن جاتے ہیں نام کے آگے پروفیسر لکھتے ہیں، کبھی کبھی دوسری بڑی جگہوں کو بھی حاصل کر لیتے ہیں، اتفاقاً وزارت تک بھی رسائی ہو جاتی ہے پھر اپنی خدمت کرتے ہیں اپنے بے صلاحیت عزیزوں اور دوستوں کی خدمت کرتے ہیں اور اردو سے بے توجہی برتتے ہیں بد سلوکی کرتے ہیں اور اردو سے محبت کرنے والوں سے دشمنی کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

متل کی ایک اور تحریر پیش کرتا ہوں، سچائی بول اٹھی ہے:

"یہ بھی ایک واہمہ ہے کہ معدودے چند بد طینت فرقہ پرستوں کو چھوڑ کر اکثریتی طبقہ مجموعی طور پر اردو کو اپنی زبان ماننے کے لیے تیار ہے یہ کہنا غالباً صحیح نہ ہوگا کہ ہندوؤں کی اکثریت اردو زبان سے عناد رکھتی ہے لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو کے تحفظ سے انھیں کوئی خصوصی دلچسپی نہیں، کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک کہ اسے پُر خلوص اور سرگرم لوگوں کی تائید حاصل نہ ہو یہ خلوص اور دلولہ اردو تحریک کو مسلمان ہی مہیا کر سکتے ہیں، کیوں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ان کے ذہن و دل کی ترجمانی دوسری زبان کے مقابلے میں بہتر طور پر کر سکتی ہے اور یہ ان کی ثقافت کی علامت بھی ہے۔ میں یہ مشورہ نہیں دے رہا کہ مسلمان اردو کے بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھیں، روشن خیال غیر مسلم افراد کی تائید حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو تحریک کے بنیادی سرگرم معاون مسلمان ہی ہوں گے"(ص ۱۹۲)

کاش مخلصین اردو متل صاحب کی اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اردو کو واقعی اپنی مادری زبان دل سے جانیں اور اسے محبت سے اپنے سینوں میں بسائیں، اپنے دلوں میں جگہ دیں اور اپنے عمل سے اس کا اظہار کریں تو اردو ہر گھر میں نغمہ سرا نظر آئے گی۔ اور کوئی طاقت اسے مٹانے کی ہمت نہیں کر سکے گی۔

اس کتاب میں تین مضامین فیض سے متعلق ہیں، فیض بمبئی میں، فیض سعدی اور قطعاتِ فیض، جن کے مطالعہ سے فیض کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

''جاں نثار اختر کا ایک پاکیزہ گوشہ '' جاں نثار اختر کی شاعری سے متعلق دلچسپ معلومات افزا مضمون ہے۔ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے ایک جگہ جاں نثار اختر کی خوبیاں بتاتے ہوئے ایک خاص انداز سے لکھا ہے :

رسول اللہ نے کہا :

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ محفوظ ہوں ''

جاں نثار اختر صحیح معنوں میں مسلمان تھے۔انھیں نہ زبان درازی آتی تھی نہ دست درازی بلکہ وہ اچھی زندگی گزارنے کی تمنا میں دوسروں کی زبان درازیوں اور دست درازیوں کو سہتے رہے دکھ پر دکھ جھیلے ، چوٹ پر چوٹ کھائی مگر کسی کو برا نہ کہا ، کبھی اف نہ کیا ، اگر ہم جاں نثار اختر کی شخصیت کو ناپنے کے لیے اچھائی و برائی کے وہ پیمانے استعمال نہ کریں جو ہمیں اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھیں کہ انھوں نے اپنی زندگی اپنی محنت سے بنائی ہے یا پڑوسی کے کندھے پر بیٹھ کر جنت میں پہنچے ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک باہمت اور سچے انسان تھے نہ ان کے ہاتھ کسی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور نہ انھوں نے کسی کا خون شراب سمجھ کر پیا ''(ص۔۲۸۱)

''زیرِ لب '' کی اشاعت کے بعد جاں نثار اختر کے خلاف کیا کیا نہ کہا گیا، کس کس انداز سے الزام تراشی نہ کی گئی اور کس کس طرح سے ان کی رسوائی کے سامان بہم نہ پہنچائے گئے لیکن جاں نثار اختر نے اُف تک نہیں کی اور سب کچھ خاموشی کے ساتھ جھیلتے رہے۔ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے اپنے مضمون میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے اور حقائق سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں :

''۔۔۔جب پہلی بار ''زیرِ لب '' چھپ کر منظر عام پر آئی تو پوری اردو دنیا اس کی ادبی قدروں کی تحسین کے بجائے صفیہ کی مظلومیت کی داستان سے گونج اٹھی اور ظالم بمبئی کی گلیوں میں منہ چھپائے پھر رہا تھا۔کسی نے یہ نہ سوچا کہ ہم جس شخص کو ظالم قرار دے رہے ہیں وہ کتنا مظلوم ہے کتنا بے کس بے سہارا ہے ''(ص۔۲۸۲)

''کیفی صاحب '' میں کیفی اعظمی کی شخصیت، ملاقاتوں کی روشنی میں پیش کی گئی ہے اور جگہ جگہ ان کی نظموں کے اہم اقتباسات کے ذریعہ ان کی شخصیت کو اُبھارنے میں مدد لی گئی ہے

بلا شبہ کیفی اچھے مقبول شاعر بھی ہیں اور اچھے اور درد مند انسان بھی ۔ عام طور سے ان کی موجودگی سے ادبی محفلوں میں جان پڑتی رہی ہے وہ صرف شاعر ہی نہیں رہے ہیں بلکہ ان میں رہنمائی کی صلاحیت بھی موجود ہے جس سے وہ ہمیشہ کام لیتے رہے ہیں اور کامیاب رہے ہیں۔

اس کتاب کا آخری مضمون "کالی داس گپتا رضا اور ان کی شعاعِ امید " ہے کالی داس گپتا رضا شاعر بھی ہیں اور محقق بھی ۔ عام طور سے یہ دونوں باتیں یکجا نہیں ہو پاتیں لیکن رضا صاحب نے دونوں کو ایک ساتھ برتنے میں کامیابی حاصل کی ہے ان کی کئی نثری اور شعری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں جنھوں نے نہ صرف اردو دنیا میں انھیں روشناس کرایا ہے بلکہ محترم جگہ پر لا بٹھایا ہے۔ خاص طور سے غالبیات سے متعلق ان کی تحقیقات نے انھیں ماہرین غالب کی صف میں جگہ دلائی ہے۔ ڈاکٹر حامد اللہ کا یہ خیال درست ہے کہ :

> "بمبئی آنے کے بعد ان کا علمی ادبی فیضان اور عام ہو گیا، یہاں آکر ایک مختصر سے عرصے میں علم وادب کی انھوں نے جو خدمت انجام دی ہے غالب اور چکبست کے علاوہ وہ دوسری ادبی تحقیقات کی صورت میں انھوں نے جو کثیر ادب پیدا کیا ہے اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے" (ص۔ ۳۰۰)

علمی ادبی کاموں سے گہری دلچسپی کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے انسان بھی ہیں، نہایت خاموشی کے ساتھ ضرورت مندوں کی مدد کرنا ان کا شعار رہا ہے ۔ جمیل الدین بغدادی کی وفات کے بعد ان کی بیوہ کی جس طرح انھوں نے مدد کی وہ عام حالات میں دیکھنے میں نہیں ملتی۔ ڈاکٹر حامد اللہ اس کی تفصیل اس طرح بتاتے ہیں :

> "۔۔۔ پھر وہ خود (جمیل الدین بغدادی) بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ صرف ان کی بیوی رہ گئیں۔ ایک پردہ نشین خاتون، بے یار و بے سہارا، وہ کرے تو کیا اور جائے تو کہاں ۔ جمیل الدین سے رضا صاحب کا بھی دوستانہ تھا اور لوگ تو اظہار ہمدردی سے زیادہ کچھ نہ کر سکے ۔ مگر جب رضا صاحب کو معلوم ہوا تو وہ فوراً ان کے پاس پہنچے ، انھیں دلاسہ دیا، روپوں پیسوں سے ان کی مدد کی ، چار چھے ماہ کے رسد کا انتظام کر دیا اور پانچ سو روپے ان کی پنشن باندھ دی، ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بلا ناغہ ان کا نوکر جاتا اور انھیں پانچ سو روپے دے آتا جو آج پچیس تیس سال گزر جانے کے بعد بھی برقرار ہے۔ اگر میری معلومات صحیح ہیں تو رضا صاحب نے اپنے خرچ سے انھیں فریضۂ حج کی سعادت حاصل کرنے کا سامان بھی کیا تھا" (ص۔ ۳۰۲)۔

اس کے ساتھ رضا صاحب کی یہ رباعی پڑھتے چلیں :

باتیں ایک دوسرے کی سہنا سیکھو
دریا میں بہ رنگ موج بہنا سیکھو
بے سود ہیں یہ دیر و حرم کے جھگڑے
مل جل کے پڑوسیوں سے رہنا سیکھو

مضمون کے آخری حصے میں اردو کے رباعی گو شعرا پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے رضا صاحب کی رباعیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے متعلق یہ فیصلہ سنایا گیا ہے :

"رضا کی رباعیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں قوس و قزح کی طرح ساتوں بنیادی رنگ آ کر مل گئے ہیں ان کی رباعیوں میں ایک طرف کلاسیکی شعرا کی سی بلندیِ فکر، رفعت خیال اور حسن بیان موجود ہے تو دوسری طرف اردو کے اکثر بلند پایا رباعی گو شعرا کا رنگ و آہنگ بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ ان کی رباعیوں میں امجد کی سی حکیمانہ شان بھی موجود ہے اور یگانہ 'فانی کا اُداس اُداس حسن بھی، جوش ورواں کے سے فلسفیانہ افکار بھی ہیں اور فراق و محروم کی سی جمال پرستی، حسن نوازی اور دلکشی بھی لیکن ان سب رنگوں کے علاوہ ان کا اپنا بھی ایک رنگ ہے۔

۔۔۔ وہ زندگی کی ہر حقیقت کو اس کے سارے پوشیدہ رازوں کے ساتھ رباعی کے سانچے میں ڈھال کر اسے واقعی "شعاع امید" بنا دینا چاہتے ہیں "

(ص۔ ۳۰۷)

پوری کتاب کے مطالعہ کے بعد جہاں چند ادیب اور شعرا کی شخصیت اور خدمات سے آگاہی ہوتی ہے وہاں آج کی گندی سیاست، خود غرضانہ رویوں، اردو کے ساتھ ناانصافیوں اور اقلیتوں کے ساتھ حق تلفیوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور بڑی مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ آج سیاست اور صداقت دو متضاد چیزیں بن کر رہ گئی ہیں آج نیک دل آدمی کے بس میں نہیں رہا ہے کہ وہ اس میدان میں اتر کر ملک کی خدمت کرے اور وطن عزیز کا نام بلند کرے۔

یقین ہے کہ حامد اللہ ندوی کی یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور قارئین حق پسندی، اردو پروری اور انسان دوستی کے جذبات سے سرشار ہو کر اس دنیا کو پُرسکون اور خوب صورت بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یہی اچھی تحریر کا مقصد بھی ہے اور حاصل بھی۔ ●

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
صدر شعبۂ اردو،
بی۔این۔کالج پٹنہ۔۴

کچھ ریسرچ کے بارے میں

چند برس قبل کی بات ہے، کمیشن نے لکچرر کی تقرری کے لیے ریسرچ کو لازمی قرار دیا تھا۔ ایک دن میں اس موضوع پر کچھ لکھنے کی کوشش میں تھا کہ میرے دوست مرزا وعلیکم السلام کا لغرہ لگاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے میں نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا: "یار مرزا، ڈکشنری کے مطابق ریسرچ کا مطلب قابل اعتبار تحقیق ہے مگر آج کل ریسرچ سے ثابت ہونے والی اکثر باتیں اعتبار کے قابل نہیں ہوتیں، ایسا کیوں؟''

مرزا بغیر کسی غور و فکر کے شروع ہوگئے :

"بات یہ ہے بھائی صاحب کہ ملک ترقی کر رہا ہے اب ہر شخص کو ریسرچ کرنے کی آزادی ہے۔ ظاہر ہے جب ہر طرح کے لوگ ریسرچ کریں گے تو طرح طرح کی باتیں بھی سامنے آئیں گی۔۔۔''

"لیکن اس طرح تو عام لوگوں کی زندگی عذاب میں پڑ جائے گی۔ مان لیجیے کہ آج کی تحقیق سے متاثر ہو کر ہم نے دل کی بیماریوں سے بچنے کے لیے ٹماٹر کھانا شروع کیا اور کل کسی دوسری ریسرچ سے ثابت ہوا کہ اس کے مستقل استعمال سے دماغ خراب ہو جاتا ہے، تب۔۔۔۔۔۔ ؟''

مرزا بولے :۔"بات یہ ہے بھائی صاحب کہ آپ اس مہنگائی کے دور میں ٹماٹر کھا سکتے ہیں، یہی آپ کی پریشانی کا سبب ہے۔جب تک آپ میری طرح جلسوں میں ٹماٹر کے استعمال سے واقف نہیں ہونگے اور۔۔''

میں نے پھر ان کی بات کاٹی :۔

"آپ تو اصل بات ہی گول کر گئے۔ مسئلہ ٹماٹر کا نہیں، ریسرچ کا تھا۔ آج جو تحقیق ہوتی ہے اسے کل کوئی دوسری تحقیق غلط ثابت کر دیتی ہے۔ ایسے میں ہم جیسے لوگ کیا کریں۔۔۔۔؟"

مرزا کہنے لگے :۔

بات یہ ہے بھائی صاحب کہ آپ تحقیق پر بھروسا ہی کیوں کرتے ہیں۔ ریسرچ کرنے والوں کو اپنی راہ پر چلنے دیجیے اور آپ اپنے راستے پہ چلیے۔''
مجھے یہ مشورہ معقول لگا۔ میں نے خوش ہو کر مرزا کو سگریٹ کا وہ پیکٹ نذر کیا جو آج ہی صبح میرا ریسرچ اسکالر مجھے دے گیا تھا۔ پھر وہ اپنی راہ پہ لگے اور میں ملا کی دوڑ مسجد تک کے قاعدے پر یونی ورسٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسے حسن اتفاق کہیے یا قسمت کی خرابی کہ کالج میں بھی اس موضوع پر زوردار بحث ہو رہی تھی اور شعبہ میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ پہلی جماعت کا خیال تھا کہ ریسرچ کرنے والے کے علم و دانش میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسروں کی رائے تھی کہ جو بے وقوف ہے وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے بھی بے وقوف ہی رہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ گفتار کے غازی عملی تنقید کا مظاہرہ کرنے لگتے، میں نے ماحول بدلنے کے لیے ایک لطیفہ سنایا:
''یورپ کے کسی غیر شہری علاقے سے ایک گھوڑ سوار گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بورڈ پر نظر پڑی۔ لکھا تھا: یہاں مناسب قیمت پر ڈگریاں فراہم کی جاتی ہیں۔'' وہ شخص فوراً گھوڑے سے اترا، پی۔ ایچ۔ ڈی کی ایک ڈگری اپنے لیے خریدی قیمت ادا کی اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے خیال آیا کہ کیوں نہ ایک ڈگری اپنے گھوڑے کے لیے بھی خرید لی جائے۔ واپس لوٹ کر اس دکان پر پہنچا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ دکاندار نے بڑے تاسف بھرے لہجہ میں جواب دیا، ''جی، ہم گھوڑوں کو پی۔ ایچ۔ ڈی نہیں کراتے۔''
اکثر لوگ بے ساختہ ہنسنے لگے اور بحث کی تلخی لوگوں کی ہنسی میں تحلیل ہونے لگی۔ لیکن وہیں موجود میرے ایک پی۔ ایچ۔ ڈی دوست نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟'' ظاہر ہے اس کے بعد پہلی جماعت کے پاس ہار مان لینے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا اور میرے لیے گھر واپسی کا راستہ صاف تھا۔

گھر آیا اور کاغذ قلم لے کر بیٹھا تو خیال آیا کہ واقعی ہمارے ملک میں ریسرچ کا حال بُرا ہے۔ چند سیریس قسم کے سائنس دانوں کو الگ رکھیے تو ریسرچ عام طور پر دو طرح کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک وہ طالب علم جنھیں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد نوکری نہیں مل پاتی دوسرے وہ لوگ جنھیں اخباروں میں نام چھپوانے کی خواہش تڑپاتی ہے۔ پہلی قسم کی تحقیق سے بڑے معصوم لوگ وابستہ ہیں۔ ایم۔ اے کا رزلٹ شائع ہوتے ہی پہلے تو وہ مارک شیٹ حاصل کر کے اس کا Lamination کرواتے ہیں، پھر یکے بعد دیگرے کئی پروفیسروں کے گھر کا چکر لگاتے ہیں کسی نے انھیں شرف نگرانی بخش دیا تو ان کی عید ہو جاتی ہے درخواست کا فارم

بھرنے سے لے کر رجسٹریشن تک کے مرحلے نہایت خشوع و خضوع سے طے کرتے ہیں۔اب ڈگری حاصل ہونے تک اپنے نگراں کی دیکھ بھال کی ذمے داری ان کی ہے اور انھیں پی۔ایچ۔ڈی بنانے کی ذمے داری نگراں کی۔ بس حساب برابر۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں کچھ لوگ اس طرح کی تحقیق کو Supervisor`s Gift کہتے ہیں۔

اس طرح کی تحقیق کے بارے میں بد خواہوں نے اور بھی کئی باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح کے اکثر مقالوں میں تحقیق کے سوا اور سب کچھ ہوتا ہے ۔ مگر کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ان مقالوں میں کم از کم دو حصّے بے حد اہم، مفید اور صداقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ایک تو کتابیات یا ببلوگرافی کا حصّہ جو دوسرے ریسرچ اسکالروں کے یہاں برابر نقل ہوتا رہتا ہے۔ دوسرے تمہید کا حصّہ جس میں ریسرچ اسکالر اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے دوست احباب اور نگراں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ تجربے کار لوگوں کا کہنا ہے کہ اپنی کم علمی کے اعتراف اور نگراں کے شکریے میں جس قدر سخاوت سے کام لیا جاتا ہے۔ ریسرچ اسکالر کی آیندہ ترقی کے امکانات اتنے ہی روشن ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے جب ایک دوست نے مرزا کو یہ اطلاع دی کہ وہ اپنی یونی ورسٹی کے پہلے پی۔ایچ۔ڈی ہیں تو مرزا نے چھوٹتے ہی کہا :

"گویا آپ کی یونی ورسٹی میں جہالت کی ابتدا آپ ہی سے ہوئی ہے میرا خیال ہے کہ یونی ورسٹیوں میں جو تحقیق ہو رہی ہے اس کا سب سے عبرت ناک منظر زبانی امتحان کے موقع پر سامنے آتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقع یاد آرہا ہے۔ ایک صاحبہ کا وایوا شروع ہوا تو ایگزامنر نے سوال پوچھا۔انھوں نے کچھ جواب تو ضرور دیا مگر اس انداز میں کہ اپنا کہا یا خود سنا یا مالک حقیقی کو سنایا۔ بہر حال ان کے نگراں نے حاضر دماغی اور حاضر جوابی دونوں سے کام لیتے ہوئے کہا "She means to say" اور اس کے بعد سوال کا جواب دے دیا۔ایگزامنر شاید نئے نئے تھے یا دوبارہ اس شعبے میں آنا نہیں چاہتے تھے انھوں نے دوسرا سوال پوچھ دیا۔اس بار محترمہ کے لب بھی نہیں ہلے ۔ شاید وہ دل ہی دل میں فریاد کر رہی ہوں یا پھر گالی دے رہی ہوں۔ (کس کو! یہ بھی ایک تحقیق کا مسئلہ ہے)۔ مگر نگراں کہاں چوکنے والے تھے۔انھوں نے پھر وہی جملہ دہرانا شروع کیا "she means to say"۔اس بار وایوا لینے والے نے برجستہ کہا :!

"ظاہر ہے، ان کی زبان تو آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

اور وایوا ختم ہو گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایگزامنر کو واپسی کا ٹکٹ اپنے کسی رشتے دار سے قرض لے کر بنوانا پڑا۔ اس نوعیت کا ایک پُر لطف واقعہ میرے ایک دوست نے سُنایا۔وہ وایوا لینے بہار

تشریف لے گئے تھے ۔ ایک صاحبہ انٹرویو دینے حاضر ہوئیں جنھوں نے "اردو کے ادبی دبستان" پر تحقیق کی تھی۔ میرے دوست نے ان کے نیم لکھنوی انداز سے مرعوب ہو کر پوچھا۔ "یہ بتایئے محترمہ کہ آپ کس اسکول سے تعلق رکھتی ہیں۔"
انھوں نے فوراً جواب دیا۔ "جی صغرا گرلز اسکول سے۔" ممکن ہے آپ ان واقعات پر افسوس کا اظہار کریں لیکن میرا سوال یہ ہے کہ جن لڑکیوں کو نکاح کے وقت بند کمرے میں ہاں کہتے ہوئے دشواری محسوس ہوتی ہے انھیں open viva میں جواب دینے پر مجبور کرنا کہاں کی دانائی ہے ؟
ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اکثر تحقیقی مقالے شائع نہیں ہوتے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ان مقالوں کو شائع کرا کے آخر دوسروں کے لیے تحقیق کا دروازہ کیوں بند کیا جائے۔
سچی بات یہ ہے کہ زمانہ بدلا ہے تو ریسرچ کا مزاج بھی بدل گیا ہے۔ پہلے تحقیق کے اصول ہوتے تھے، اب تحقیق میں ہر طرح کی بے اصولی ہوتی ہے۔ پہلے ریسرچ کر کے ڈگری حاصل کرنا ایک ہنر تھا اب، اب بغیر ریسرچ کیے اس منزل تک پہنچنا ایک آرٹ ہے ۔ پہلے تحقیق کا مقصد علم وادب کی ترقی تھا اب اپنا پروموشن ہے پہلے تحقیق کا ایک معیار ہوتا تھا، اب اکثر نئی تحقیق گراوٹ کا ایک نیا معیار قائم کرتی ہے۔ ہم آزاد ہیں تو نظم بھی آزاد ہے، غزل بھی آزاد ہے اور تحقیق بھی۔ یہ کچھ کم ہے کہ سماجی انصاف اور ترقی کی دھن میں لگی ہوئی قوم تحقیق پر بھی دھیان دے رہی ہے۔ آخر پہلے بھی تو بقول واہی کچھ ادھر اور کچھ ادھر سے لے کر لوگ تحقیقی مقالہ گھسیٹ دیتے تھے ۔ اب شاید لوگ زیادہ عقلمند ہو گئے ہیں، اس لیے اتنی محنت بھی برباد نہیں کرنا چاہتے اور کریں بھی کیوں ؟ ابھی پرسوں کا ہی قصہ ہے، میں نے اپنے ایک کلاس فیلو کو جواب خیر سے وزیر ہیں، اپنی دانست میں یہ زریں مشورہ دیا کہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کیوں نہیں کر لیتے۔
وہ فوراً کہنے لگے :
"حضرت اگر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیتا تو آپ کی طرح لیکچرر ہوتا۔"
بہر حال یہ تو اس تحقیق کی بات ہوئی جو یونی ورسٹیوں میں ہو رہی ہے مگر یونی ورسٹیوں سے باہر بھی کچھ کم گل نہیں کھل رہے ہیں ۔ اناپ شناپ باتیں کہہ کر لوگوں کو چونکانے اور اپنا نام چمکانے کا سلسلہ بہت پرانا ہے مگر اب تو کچھ اخبارات شاید اس طرح کے بیانات کے لیے ہی شائع ہوتے ہیں۔ کسی نے چھپوادیا کہ تاج محل فلاں چندر روشنی راجا نے بنوایا تھا، کسی نے اپنی تحقیق کے نتائج شائع کر دیے کہ ہوائی جہاز کی ایجاد ایک مہاراشٹرین پنڈت نے کی تھی اور

لوگوں کو مہینوں بحث کے لیے ایک موضوع ہاتھ آگیا۔ کچھ لوگوں کاالزام ہے کہ اس طرح کی تحقیق عام طور پر بے نتیجہ رہتی ہے۔ کوئی صاحب برسوں رسوا پر کام کرتے ہیں اور انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ امراو جان کا پہلا گاہک کون تھا؟ میں ایسے لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ اکثر لایعنی قسم کی تحقیق بھی پر لطف نتائج پر ختم ہوتی ہے۔ ایک قصہ ابھی یاد آرہا ہے۔ ایک صاحب کو تحقیق کا شوق ہوا۔ انھوں نے ایک مکھی پکڑی اور اسے ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا کہ "اڑ جا" مکھی اڑ گئی پھر انھوں نے دوسری مکھی پکڑی اس کے پر توڑ ڈالے اور ہتھیلی پر رکھ کر کہا"اڑ جا" مگر مکھی نہیں اڑی۔ انھوں نے کئی بار "اڑ جا" کہا مگر مکھی نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ یہ تجربہ کئی ماہ تک کرنے کے بعد انھوں نے نتیجہ نکالا کہ اگر مکھی کے پر توڑ دیے جائیں تو اس کی قوت سماعت ختم ہو جاتی ہے۔

انھوں نے ایک دوسرا تجربہ بھی کیا۔ ایک کپ میں چاے اور دودھ ڈالا۔ پھر دو چچی شکر ڈال کر چچی ہلائی اور چاے کی چسکی لی۔ چاے میٹھی لگی۔ انھوں نے دوسرے کپ میں چاے انڈیلی۔ اس میں دودھ ڈالا۔ پھر بغیر چینی ڈالے صرف چچی ڈال کر ہلاتے ہوئے کچھ دیر بعد چاے کا گھونٹ لیا تو بے مزہ تھا۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر بغیر چینی ڈالے چاے کی پیالی میں چچی گھمائی جائے تو چاے میٹھی نہیں ہو سکتی۔ تیسری تحقیق وہ اپنی ریاست کے وزیر حیوانات سے متعلق کر رہے تھے دروغ گویوں سے انھیں یہ معلوم ہوا کہ موصوف کو بچپن میں تین بار بھینس نے دھکا مارا تھا۔ پس انھوں نے یہ قاعدہ کلیہ پیش کرنا چاہا کہ جس شخص کو لڑکپن میں بھینس تین بار دھکا مارے وہ وزیر ہو جاتا ہے۔ مزید تحقیق وہ اس بات پر کرنا چاہتے تھے کہ اس کے لیے ایک ہی بھینس کا دھکا مارنا کافی ہے یا تین الگ الگ بھینسوں کی ضرورت ہوگی مگر اس سے قبل کہ وہ یہ تیسری تحقیق کے نتائج پیش کرتے احباب نے انھیں مینٹل اسپتال پہنچادیا۔ ایسے ذہین شخص کا یہ نتیجہ افسوس ناک ہے۔

میں اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ مرزا پھر نازل ہو گئے۔ ایک جھٹکے سے میرا مضمون پڑھا اور کہنے لگے :

"بات یہ ہے بھائی صاحب کہ آپ کی تحریر انگور کھٹے ہیں، کی مثال ہے۔ آپ خود پی۔ ایچ۔ ڈی نہ کر سکے اس لیے یہ مضمون لکھ کر جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔"

میں نے کہا :۔ نہیں یار، میں نے تو دوسری ہی وجہ سے ریسرچ نہیں کی۔"

مرزا بولے :۔ وہ کیا"

میں نے کہا :۔ جب سب چیخ رہے ہوں تو خاموش رہنا ہی بہادری ہے۔" ●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

حضرت محمدؐ اور قرآن (مذہب) ڈاکٹر رفیق زکریا (زیر طبع)
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات (تاریخ) ڈاکٹر سید جمال الدین ۵۱/:
سیرت طیبہؐ میں سماجی انصاف کی تعلیم (خطبہ) پروفیسر اختر الواسع ۱۰/:
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبہ) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/:
اردو صحافت، صداقت اور آزادیِ رائے ″ عشرت علی صدیقی ۱۰/:
تفہیم (مضامین) رشید حسن خاں ۵۱/:
شناس و شناخت (تنقید) پروفیسر انور صدیقی ۶۰/:
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے (مضامین) ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری ۵۱/:
چہرہ در چہرہ (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین ۵۱/:
فی البدیہہ (″) یوسف ناظم ۴۵/:
تعلیم و تعلّم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷۵/:
سرسیّد اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر مونس رضا ۱۰/:
سرسیّد اور اردو یونیورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسن خاں (خطبہ) مرتبہ خواجہ محمد شاہد
شعریات سے سیاسیات تک غلام ربانی تاباں ۵۱/:
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں (تنقید) عبدالقوی دسنوی ۷۵/:
انشا اور تلفّظ (طلبہ کے لیے) (قواعد) رشید حسن خاں ۹/:
عبارت کیسے لکھیں ″ ″ ″ ۱۵/:
آدم خور چیتا (شکاریات) ریاض احمد خاں ۴۵/:
انداز گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/:
دستک اس دروازے پر وزیر آغا ۵۱/:
آزمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۵۴/:
جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدل بسم اللہ ۷۵/:
صحرانورد کے خطوط (افسانے) میرزا ادیب ۷۵/:
میں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/:
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/:
مسلمانوں کا تعلیمی نظام (مضامین) ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/:
جامِ جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا (صحافت) گربچن چندن ۷۵/:
عموربی اور بابلی تہذیب و تمدن (تاریخ) مالک رام ۷۵/:

اپنے دل کی حفاظت کیجیے (ایلوپیتھی) ترجمہ نذیر الدین مینائی ۲۵/:
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان (سوانح) تالیف مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ۵/:
تذکرہ ماہ و سال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/:
افکار اقبال (تنقید) محمد عبدالسلام خاں ۱۲۵/:
تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۵۱/:
تاثر نہ کہ تنقید (تنقید) صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۱/:
بہ صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز) طاہر مسعود ۶۶/:
گوشے میں قفس کے (طنز و مزاح) دلیپ سنگھ ۴۵/:
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۴۰/:
سحر کے پہلے اور بعد (جگ بیتی) سعید الظفر چغتائی ۵۱/:
تحریریں (مضامین) اسلم پرویز ۵۱/:
سفر (ناول) رابعہ تبسم ۲۷/:
خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۶۶/:
بانگ درا مکمل علامہ اقبال ۹/:
بال جبریل مکمل ″ ۶/:
ضرب کلیم (اردو نظمیں) ″ ۶/:
غبار منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں ۴۵/:
پیامی قواعد اردو (قواعد) (ادارہ) ۶/:
″ ″ (خورد) (″) ۳/:
فریدؒ و فرد فریدؒ (سوانح) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۷/:
پہچان اور پرکھ (تنقید) پروفیسر آل احمد سرور ۵۱/:
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۵۱/:
اقبال کا نظریہ خودی (تنقید) ڈاکٹر عبدالمغنی ۵۰/:
پت جھڑ کی آواز (افسانے) قرۃ العین حیدر ۵۰/:
جدید افسانے اور اس کے مسائل (تنقید) وارث علوی ۳۶/:
قلندر بخش جرأت (خطبہ) جمیل جالبی ۱۰/:
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری (ادارہ) ۱۲/:
پیامی ہوم ڈکشنری اردو انگلش ″ ۱۶/:

ڈاکٹر محمد اکرام خان
جامعہ نگر نئی دہلی ۶۵

ڈسپلن کا مفہوم

"میں اپنے بیٹے کو ڈسپلن سکھانا پسند نہیں کرتا بچپن تو ہوتا ہی ہے کھیلنے کودنے اور تفریح کرنے کے لیے، بڑے ابا اس عمر میں بچوں کو ڈسپلن سکھانے کے کیا معنی!"

"ٹھیک ہے بیٹا بچوں کو کھیلنے کودنے اور تفریح کے مواقع فراہم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن انہیں ایسے کاموں سے تو روکنا ہے جو خود ان کے اور ان کے ساتھیوں کے لیے تکلیف دہ ہوں"

یہ ہے وہ گفتگو جو نو عمر اور آزاد خیال عتیق صاحب اور ان کے دادا کریم صاحب کے درمیان اس وقت ہو رہی تھی جب عتیق صاحب کا چار برس کا بیٹا ٹلو کھانے کے کمرے کی دیواروں پر کوئلے سے الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا اس گفتگو سے ڈسپلن کے جدید نظریے اور قدیم نظریے کو سمجھنے میں تھوڑی بہت مدد ضرور ملتی ہے۔ جدید نظریے کے حامی بچے کو بالکل آزاد ماحول میں پیار محبت کے ساتھ پروان چڑھانے کے قائل ہیں اور قدیم نظریے کو ماننے والے ایسی آزادی جس پر کوئی پابندی نہ ہو سخت خلاف ہیں ان کا خیال ہے کہ بچہ فطرتاً شر پسند ہوتا ہے اس لیے اس کی نگرانی کرنا اور اس پر چند پابندیاں لگانا ضروری ہیں۔ وہ اس قول کے قائل ہیں کہ "بچے کو کھلاؤ سونے کا نوالہ لیکن دیکھو شیر کی آنکھ سے" یعنی کھلانے پلانے میں کوئی کمی نہ کی جائے لیکن رکھ رکھاؤ کے عمل کی سختی سے نگرانی کی جائے۔ بچے کو بالکل آزاد چھوڑنے کے معنی ہیں کہ اسے خراب کرنا، بچہ کو شروع ہی سے جیسے بھی ہو سکے سختی سے یا نرمی سے غصہ سے یا پیار سے یہ سمجھانے اور سکھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ بالکل آزاد ورہ کر یا من موجی بن کر زندگی گزارنا اچھا نہیں سمجھا جاتا ایسے کاموں سے سدا دور رہنا چاہیے جو دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہوں۔

تعلیمی حلقوں میں ڈسپلن کے قدیم اور جدید دونوں نظریوں پر خوب خوب بحثیں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اس کا مفہوم یا تو اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس کی صحیح تعریف کرنا ممکن نہیں ہوتا یا اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے ہمیں تو اس وقت پریشانی ہوتی ہے جب ہم اپنے خیال میں بچے کو کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یا کوئی ایسا کام کیا جاتا ہے جو خود بچہ کے لیے اور دوسروں کے لیے باعث تکلیف ہوتا ہے۔

ہم اپنی زندگی کے تجربوں اور مشاہدات کی بنا پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ باضابطہ اور پر سکون زندگی بسر کرنے کے لیے ڈسپلن کا ہونا ضروری ہے اور اسے شروع سے سکھانا چاہئے مثلاً اگر چار پانچ برس کا یوسف گیند بلا کھیلتے ہوئے اپنی گیند اٹھانے کے لیے آنکھ بند کر کے سڑک پر دوڑا جاتا ہے تو اسے ڈسپلن سکھانا ضروری ہے یا بارہ برس کا اختر اپنے گھر کے صحن یا مدرسے کے کھیل کے میدان میں اس طرح کھیلتا ہے کہ اس کے کھیل کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے تو اسے ڈسپلن سکھانا

ضروری ہے یا چودہ برس کا عاطف بغیر کسی اجازت کے کسی کی سائیکل لے کر گھومنے نکل جاتا ہے تو اسے ڈسپلن سکھانا ضروری ہے۔

یوسف کو پیار اور محبت کے ساتھ یہ سمجھانا چاہیے کہ سڑک کے قریب کھیلنے اور آنکھ بند کر کے گیند کے پیچھے دوڑنے سے جسم کے زخمی ہونے یا جان کے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اختر کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کھیلتے وقت دوسروں کے آرام اور خوشی کا کیوں خیال رکھنا چاہیے۔ اسی طرح عاطف کو یہ بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کسی کی چیز کو بغیر اجازت کھانے یا استعمال کرنے سے نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح کی تعلیم وتربیت سے بچوں کو اپنے جذبات پر قابو پانے اور باضابطہ زندگی بسر کرنے میں مدد ملتی ہے اور وہ ہر کام کو کرنے میں اپنی خوشی اور دوسروں کے آرام کا خیال کرنا سیکھتے ہیں۔

قدیم نظریے کے مطابق تو یہ کہا جاتا ہے کہ لکڑی کے آگے لکڑی ناچتی ہے اور سزا نہ دینے کے معنی بچہ کو خراب کرنا ہے۔ اس خیال کے حامی تو ڈسپلن کا مطلب سمجھتے ہیں کہ بچہ کو تعمیل حکم کی تعلیم دی جائے۔ اسے بزرگوں کے اشارے پر چلنا سکھایا جائے۔ بزرگوں کے زمانے سے جو قواعد و ضوابط چلے آرہے ہیں ان پر بے چون وچرا عمل کرنا بتلایا جائے اس لیے قدیم نظریے کے مطابق یوسف اختر اور عاطف شریر بچے کہلائیں گے اور انھیں جیسے تیسے قابو رکھنا بہتر ہوگا۔

جدید نظریے کے حامی اس قسم کے نظریے کو بالکل از کار رفتہ سمجھتے ہیں وہ اندرونی ڈسپلن (Internal Diciplin) یا خود ساختہ (self Diciplin) کے قائل ہیں۔ وہ اختر، یوسف اور عاطف کو پیار اور محبت کے ساتھ ان کی حرکتوں کے اسباب کو جان کر ان کے نتائج اور اثرات کو سمجھانا چاہیں گے۔ ان کے یہاں بچہ کو بالکل آزاد چھوڑ کر اس کی دلچسپی اور ضرورت کے مطابق ڈسپلن سکھایا جاتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے یہاں ابھی تک جدید نظریے کو پوری طور سے اور کھلے دل سے نہیں اپنایا گیا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بچے کے دل ودماغ پر محبت اور شفقت کا جو اثر ہوتا ہے وہ سختی اور سزا سے نہیں ہوتا۔ محبت اور شفقت کے بغیر بچہ کی شخصیت کی صحیح نشوونما ناممکن ہے۔ اس کے بغیر بچہ وہ کام نہیں کر سکتا جس کے لیے وہ پیدا کیا جاتا ہے۔ محبت اور شفقت کے بغیر بچہ کے دل کی کلی نہیں کھل سکتی اور اس کی پوشیدہ صلاحیتیں اور قوتیں پورے طور پر نہیں ابھر سکتیں قدیم نظریے کے مطابق ڈسپلن میں رہنے والا بچہ عام طور سے غیر سماجی انسان بنتا ہے اور جدید نظریے کے مطابق اسے سماجی انسان بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ڈسپلن کے جدید نظریے کو صحیح طور پر سمجھنے اور ماننے والے بچے کو عتیق صاحب کی طرح بالکل آزاد نہیں چھوڑتے وہ سوچ سمجھ کر اس پر پابندیاں لگاتے ہیں اور ان پابندیوں کو اپنانے اور ان پر عمل کرنے کی مشق کراتے ہیں پہلے وہ بچے کی شرارت کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے بعد نہایت محبت اور صبر کے ساتھ شرارت کے اثرات کو سمجھا کر کردار کی اصلاح کرتے ہیں۔ ان کی

کوشش ہوتی ہے بچہ کو اندرونی ڈسپلن سکھانے کی۔ اندرونی ڈسپلن (Internal Dicipline) یا خود ساختہ ڈسپلن (Self Dicipline) کے ذریعے بچہ خود کو پہچانتا ہے۔ خود اپنا احترام کرنا سیکھتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی مفید اور مددگار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی وہ اچھا سماجی انسان بنتا ہے۔ والدین اور استادوں کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ بچہ کی کوئی حرکت یا سرگرمی بے مقصد نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر صورت حال میں اس پوشیدہ مقصد کو سمجھ کر اس کے ساتھ محبت، عزت اور ہمدردی کا برتاو کیا جائے، کوشش کی جائے کہ کسی بھی صورت حال میں بچے کی ہمت شکنی نہ ہو۔ ایسا کرنے سے بچہ کی زندگی میں وہ انضباط (ڈسپلن) پیدا ہوتا ہے جو خارجی دباو کے ذریعہ کبھی بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔

جن والدین اور استادوں کو اپنے جذبات پر قابو نہیں ہوتا۔ جن میں درگزر کا مادہ نہیں ہوتا۔ جو صبر سے کام نہیں لے سکتے۔ جو بچوں کی فطرت سے ناواقف ہوتے ہیں اور جو خود احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں بس وہی بچے کی ناپسندیدہ حرکتوں یا شرارتوں کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ وہ فوری طور پر خفا ہو کر یا تھوڑی بہت جسمانی سزا دے کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بچے کے کردار کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کی ناراضگی اور سختی سے بچے کی شخصیت میں دہراپن پیدا ہوتا ہے اور وہ چھپ چھپ کر ناپسندیدہ یا غیر سماجی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔

دراصل لفظ ڈسپلن اطالوی زبان سے لیا گیا ہے اس کے لغوی معنی ہیں تربیت و تعلیم، یوں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جیسے معلمی، ڈاکٹری یا وکالت کی تعلیم کے دوران ہر ایک طالب علم کو اپنے مضمون یا ڈسپلن کے ضابطوں کی پوری پوری پابندی کرنا ہوتی ہے۔ ہر ایک طالب علم کو باقاعدہ متعلقہ نصاب تعلیم کو پورا کرنا ہوتا ہے گویا کہ طالب علم کو اپنی دلچسپی، صلاحیتوں اور قابلیت کے مطابق ڈسپلن (مضامین) کا انتخاب کرنے کی آزادی ہوتی ہے لیکن نصاب کو پورا کرنے سے متعلق جو پابندیاں اور شرائط ہوتی ہیں ان کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ انھیں اچھی طرح پورا کرنے کے بعد ہی استاد ڈاکٹر یا وکیل اس قابل بنتا ہے کہ وہ اپنے پیشہ میں کامیابی اور خوش اسلوبی سے کام کر سکے اور خوش گوار زندگی گزار سکے۔

جدید نظریے کے مطابق ڈسپلن کا مفہوم ہے :۔

۱۔ ڈسپلن نام ہے ان مضامین کا جو کسی پیشے کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں اور جن کا مطالعہ مقررہ پابندیوں کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔

۲۔ ڈسپلن نام ہے اس تربیت کا جو محبت کے ساتھ کرائی جاتی ہے اور جس کا مقصد خود بچہ کی اور دوسروں کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

۳۔ ڈسپلن نام ہے اس رہنمائی اور مدد کا جس کا دارومدار بچہ کی اندرونی صلاحیتوں اور دلچسپیوں پر ہوتا ہے نہ کہ خارجی دباو اور خوف پر۔

۴۔ ڈسپلن نام ہے اس عمل کا جس کے ذریعے بچہ کو نہ صرف اپنے جذبات اور امنگوں پر قابو پانا سکھایا جاتا ہے بلکہ اسے اپنے گردوپیش کے اصول سے مطابقت پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔

انور ظہیر خاں
ممبئی

آباد خرابے سے اخترالایمان کا سفر

مارچ 1996 کے ماہ نامہ "آج کل" (دہلی) میں اخترالایمان صاحب کی نظم "ذکر مغفور" دیکھی تو یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ وہ گذشتہ دوڈھائی برسوں سے ڈائی لسس پر چل رہے ہیں۔ کہیں خدا نخواستہ انھوں نے موت کے خاموش قدموں کی آہٹ سن تو نہیں لی——— ابھی اس نظم کو پڑھے تین ہی روز ہوئے تھے کہ اتوار کی صبح اخبار والے نے جب اخبار لاکے دیا تو روز نامہ "انقلاب" (ممبئی) کے پہلے صفحے پر اس "آباد خرابے" سے انتقال کی خبر پڑھ کے جی دھک سے رہ گیا۔ ویسے تو نظم پڑھ کے ہی میں یہ منحوس خبر سننے کو تیار بیٹھا تھا۔ لیکن وہ جو ایک چیز ہوتی ہے مایوسی کے اندھیرے میں آس کی ایک ٹمٹماتی سی کرن' آدمی کو بڑے دلاسے اور دھوکے میں رکھتی ہے۔ لہٰذا "انقلاب" پرے رکھ کے روز نامہ "اردو ٹائمز" (ممبئی) کے صفحہ اول پر وہی خبر نگاہیں تلاشنے لگیں۔ اس صفحے پر خبر نہ پاکر نگاہوں کی ناکامی پر جی خوش ہوگیا۔ پھر بھی دگدھا باقی رہی کہ یہ خبر کچھ یوں ہی تو نہیں چھپ گئی۔ میری ایک عادت یہ ہے کہ کسی بھی اخبار کا پہلا صفحہ دیکھنے کے بعد فوراً آخری صفحہ دیکھتا ہوں۔ چنانچہ معمول کے مطابق آخری صفحے پر نظر ڈالی تو اس اندوہ ناک خبر کی توثیق ہوگئی اور آنکھوں میں اندھیرے بس گئے' اور ان کی نظم "موت" کے یہ مصرعے حافظے نے زبان پر اچھال دیئے:

آہ احساس کی زنجیر گراں ٹوٹ گئی
اور سرمایہ انفاس پریشاں نہ رہا
— — — — — — — — —
تھک گیا آج' شکاری کی کماں ٹوٹ گئی

مگر اس رویے پر تعجب ہو اور افسوس بھی کہ اردو کے اس صف اول کے شاعر کے بارے میں "ٹائمز آف انڈیا" میں کچھ بھی نہیں شائع ہوا۔ ممکن ہے ٹائمز آف انڈیا گروپ کو اس کی اطلاع نہ ہو' اور کیا عجب کہ انھوں نے اس خبر کو کوئی اہمیت ہی نہ دی ہو کہ آج تو اچھے خاصے

سلجھے ہوئے ذہنوں نے بھی اردو کو ننگوں کی 'تلواروں کی' مسلمانوں کی زبان سمجھ لیا ہے۔ کسی زبان کو کسی مخصوص فرقے 'قوم' ملک اور مذہب سے وابستہ کردینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ یقیناً زبان کا سماج ہوتا ہے لیکن مذہب نہیں ہوتا۔ یہ لامذہب ہوتی ہے اپنے نیچر کے اعتبار سے سیکولر ہوتی ہے۔ اس کے فیض کا دریا سب کے لیے رواں رہتا ہے۔

آج سورج میں گرمی تو تھی لیکن وہ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ شاید ہمارے غم کی سیاہیاں سورج میں گھل گئی تھیں۔ کسی جوان بدن کی طرح انگڑایا ہوا کارٹر روڈ خاموش تھا۔ سمندر اپنے کناروں کو چھوڑ کر دور گہرائی میں جاچکا تھا۔ سلام بن رزاق' رام پنڈت' الیاس شوقی اور راقم السطور جب اخترالایمان کے مکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ موسیقار نوشاد علی صاحب آہستہ روی سے روی درشن کی طرف مرحوم اخترالایمان کے آخری درشن کے لیے جارہے ہیں۔ ہم لوگ پہنچے تو لگا کہ ماحول پر موت کی سی خموشی کا آسیب چھایا ہوا ہے۔ جانے پہچانے چہروں میں ادیب دوست محمود چھابرا' ذکیا شریف' ڈاکٹر یونس اگاسکر' انور قمر' علی امام نقوی' یعقوب راہی' اطہر عزیز اور مختار سیدیوں بیٹھے تھے جیسے چند تصویریں دیوار کے ساتھ لگادی گئی ہوں۔ ہم ابھی کرسی پر براجے ہی تھے کہ فلم ایکٹر مقری کار میں لدے پھندے مع اپنی فیملی کے وارد ہوئے تھوڑی ہی دیر میں حسن کمال اپنی نصف بہتر کے ساتھ آتے دکھائی دیئے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی بھی مسز میمونہ دلوی کے ساتھ تشریف لے آئے۔ وہ دونوں خواتین اور پرچلی گئیں اور یہ دونوں حضرات ہم میں شامل ہوگئے۔ ہندی کے شاعر اور کہانی کار کمل شکلا بھی اپنی ماروتی میں سوار آن موجود ہوئے۔ کرتے پائجامے اور ٹوپی میں سمائے' جینز اور جرسی' پینٹ شرٹ پہنے ہوئے مرد آتے گئے' شلوار جمپر یا ساڑی میں ملبوس عورتیں بھی آتی رہی۔ دھیرے دھیرے دیدار کرنے 'کندھا دینے' مٹھی بھر مٹی ڈالنے' پسماندگان کو پُرسہ دینے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور گرم سورج کا ستم بھی بڑھتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ غم کے ان لمحوں میں کچھ لوگ غم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے کچھ دیر کے لیے غم کا ملمع چڑھالیا ہے اور عورتوں کے سر سے دوپٹہ نہیں ڈھلک رہا ہے۔

جب سورج سوانیزے پر تھا تو جنازہ اٹھا۔ ساتھ ہی لوگوں کے رونے کی چیخیں بھی سنائی دیں۔ میں نے اپنے رنج رسیدہ دل کی تسلی دی۔

لائی حیات آئے' قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے/ نہ اپنی خوشی چلے

کاندھا دینے والوں میں انور قمر پیش پیش تھے اور وہ زور زور سے کلمۂ شہادت پڑھتے جاتے تھے۔

میں سوچنے لگا دُنیا میں انسان کی آمد اور رخصت کے منظر بھی عجیب ہیں۔ آمد پر خوشیاں منائی جاتی ہیں' مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہیں' شہنائی کی سریلی صدا گونج اٹھتی ہے۔ اور رخصت پر جی بھر آتا ہے' آنکھیں آبشار ہوجاتی ہیں اور انسانی وقوعہ بخوشی یا بادل ناخواستہ لوگوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر موت کے بلاوے پر اندھیرے اور اندھیرے سفر پر روانہ ہوجاتا ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا لیکن ہندو عقیدے کی رو سے جون بدل بدل کر سات جنم تک آتا رہتا ہے کہ اسے موکش مل جائے۔ جانے والا چلا جاتا ہے لیکن اس کی یاد ایک کسک' ایک جلن' ایک ٹیس بن جاتی ہے۔ زندگی کے سارے فلسفے' زن' زر' زمین کے سارے قصیے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ خون کے رشتے بھی بے معنی ٹھہرتے ہیں۔ سارے عہدوپیاں ٹوٹ جاتے ہیں' زندگی بھر کے ساتھی سنگی بچھڑجاتے ہیں۔ محبت ونفرت دوستی اور عداوت' کرم اور ستم' انصاف اور حق تلف' سچ اور جھوٹ' اکھاڑ پچھاڑ کے تمام جذبے' تمام فعل ختم ہوجاتے ہیں۔

میں وہاں موجود چہروں میں اختر الایمان کے پرانے یار دوستوں' معاصرانہ چشمک رکھنے والوں اور مداحوں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ان میں بہت سے کسی نہ کسی کام سے شہر باہر تھے۔ جو شہر میں تھے ان کی اپنی مصروفیات نے انھیں تعلقات کی سلامی دینے کی مہلت نہیں دی اور بعضوں نے اپنے SUNDAY ROUTINE میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ ممبئی نگری ہے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ دل کی دُکھ دُکھی لگ بھگ بیاسی برس کے بعد 9 رمارچ کی شام ان کی جسمانی موت کا اعلان کرگئی تھی۔ ممبئی میں ہفتہ سات دن کا نہیں باقاعدہ پانچ دن کا ہوتا ہے۔ ممبئی کے باسی ہر سنیچر کی صبح اگتے سورج کے ساتھ ہی ہفتے بھر کی مصروفیات کے فشار سے فرار حاصل کرنے کی پلاننگ کرنے لگتے ہیں۔ اور شام ہوتے ہوتے ان کی فکر اور کام کے انداز بدل جاتے ہیں۔ اب یہ لوگ اچھا کھانے' لائف انجوائے کرنے اور RELAX ہونے کے موڈ میں ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اتوار کا دن گزر کر بھی کافی رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ اور سوموار کے صبح سے پھر وہی کولھو کے بیل کا سا چکر شروع ہوجاتا ہے۔ یہاں کے فاصلے بھی تو کچھ کم ظالم نہیں۔ ممبئی کے اس علاقے سے اس علاقے تک' اس سرے سے اس سرے تک جانے کے لیے پیسا' انرجی اور وقت سب بہت کچھ ضائع ہوجاتے ہیں۔ سنیچر اور اتوار کے روز یہاں کے لوگ جہاں تک بس چلتا ہے ان چیزوں کی اکونومی کرتے ہیں۔ یا بے دریغ خرچ کرتے ہیں کہ سکون چاہیے سکون' وہ چاہے جس طرح ملے ڈھیروں لٹا کے یا بہت سا بچا کے —— یہاں کے لوگ کسی کی موت کو بھی تعلق سے زیادہ تجارت کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔

مرنے دو مرنے والوں کو، غم کا شوق فراواں کیوں ہو
کس نے اپنا حال سُنا ہے ہم ہی کس کا درد نباہیں
یہ دنیا یہ دنیا والے اپنی اپنی فکروں میں ہیں
اپنا اپنا توشہ سب کا اپنی اپنی سب کی راہیں
وہ بھی مردہ ہم بھی مردہ وہ آگے ہم پیچھے پیچھے
اپنے پاس دھرا ہی کیا ہے نکلے آنسو بھو کی آہیں

کچھ دور میت کو کندھا دینے اور اسے ایمبولینس میں رکھوانے کے بعد ڈاکٹر عبدالستار دلوی، الیاس شوقی اور میں، حسن کمال صاحب کی گاڑی ہی سوار ہو کر قبرستان پہنچے تو ہم میں سے بہتوں نے سب سے پہلے مسجد کا رخ کیا کہ ظہر کی نماز کا وقت قریب تھا۔ ایسے موقعوں پر میرے اندر کا مسلمان بھی کچھ دیر کے لیے انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ہے کہ

کوئی چارہ نہیں دعا کے سوا
کوئی سنتا نہیں خدا کے سوا

نماز جنازہ کے وقت رام محمد ڈسوزا والے علی رضا، کمرشیل اناؤنسر امین سایانی، معین الدین جینا بڑے، عبدالاحد ساز، کے علاوہ اور بہت سے لوگ آچکے تھے۔ جن میں کچھ لوگوں کے چہرے سے تو میں آشنا تھا لیکن نام سے بیگانہ۔ قبر کے اطراف مٹی کے ڈھیر پر انسانی سر کا خول رکھا ہوا تھا اور اب میرؔ میرے اندر بولنے لگے۔

کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

آس پاس کی قبروں پر دھیان گیا تو غالب کی وہ سوال نما خواہش ذہن میں گونجنے لگی

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

جب میّت کو قبر میں اتارا جارہا تھا تو مرحوم کے صاحبزادے رامش کو ضبط کا یارا نہیں رہا۔ آنسوؤں کا ریلا پلکوں کے باندھ توڑ کر بہہ نکلا۔ بہنا بھی چاہیے تھا کہ ان کے سر پر رکھا دستِ شفقت اٹھ چکا تھا۔ اب ذمہ داریوں کا جُوا ان کے نوجوان مگر بے کڑھے شانوں پر آگیا ہے۔ گویا زمین سخت ہے اور آسماں دور۔

اس آباد خرابے میں اختر الایمان نے کس طرح زندگی بسر کی، ہمیں ان کی آپ بیتی سے جو سلسلہ وار "سوغات" (بنگلور) میں چھپ رہی تھی اور اب ادھوری رہ گئی ہے اور بیشتر نظموں کے وسیلے سے بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ یتیم خانے کی زندگی سے تعلیمی، ادبی اور فلمی زندگی تک کانٹے کوسوں کا ایک سفر ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت
دشت ودر میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت

بے شک موت ہر جگہ اور ہر چیز میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ اتنی سستی اور آسان ہے جتنی کہ اقبال نے بتایا ہے؟ موت کے مسئلے پر یہ سوال بھی ذہن میں اُبھرا کہ بعد از مرگ آدمی واقعی مر جاتا یا زندہ رہتا ہے تو اس کا جواب بھی اقبال کے یہاں ملا

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

اس مقام پر پنڈت جواہر لال کی وصیت کس قدر با معنی اور بامقصد معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے کہا تھا۔ ان کے وجود کی راکھ ہندستان کے دریاؤں، پہاڑوں، جنگلوں، میدانی علاقوں میں بہا اور بکھیر دی جائے کہ وہ مرکز بھی ہندستان کی دھرتی اور ہندستانیوں کے وجود میں زندہ رہیں گے۔ وہ اس طرح کہ انسان خاکی ہے اور خاک میں ہل مل جاتا ہے۔ اسی خاک میں بیج بویا جاتا ہے۔ بیج سے انکھوا پھوٹتا ہے۔ وہی انکھوا ہرا بھرا پودا یا تناور درخت بن جاتا ہے۔ درخت میں پتے، پھول پھل آتے ہیں۔ انسان انھیں اپنی غذا کا حصہ بناتا ہے۔ گویا ایک غیر مرئی وجود ایک مرئی وجود میں غیر محسوس طریقے پر سرایت کر جاتا ہے۔ پھر وہی وجود مٹی میں مل کر چیزوں کی پیدائش اور افزائش کا سبب بنتا ہے۔ غرض زندگی اور موت، موت اور زندگی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو نہ جانے کب سے جاری ہے اور کب تک جاری رہے گا۔

میں موت اور زندگی کے ان الجھاؤں میں الجھا ہوا تھا کہ دیکھا لوگ مٹھیوں میں بھر بھر کے مٹی ڈال رہے ہیں

مٹھیوں میں خاک لے احباب آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

گورکن نے آس پاس ڈھیر مٹی کو یکجا کر کے تھاپ تھوپ کر قبر کی شکل دے دی تو انور قمر نہ جانے کہاں سے گلاب کی ٹہنی لے آئے اور اسے قبر پر لگا دیا۔ کتنا بے لوث، کتنا پر خلوص، کتنا عقیدت بھرا، کس قدر پاکیزہ اور نیک عمل تھا وہ ع

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ہم سب سر جھکائے، خیالوں میں گم، چپ چاپ قبرستان سے باہر نکلنے لگے تو ایک بوسیدہ سی قبر کے قریب پھولوں سے لدے ایک پودے پر نظر پڑی جس کے پاس ایک چھوٹا اور خوب صورت سا لڑکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کتنا زبردست کنٹراسٹ تھا موت اور زندگی کا۔ قبر جو کہ موت کی علامت ہے اور پھولوں کا کھلنا، لڑکے کا مسکرانا زندگی کی نشانی ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور اس شعر کے پس منظر میں مجھے سردار جعفری کے یہ جملے یاد آ گئے:

"پھول چہروں میں بدل جاتے ہیں، چہرے پھولوں میں، خاک سے آدمی بنتا ہے اور آدمی خاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح موت اور زندگی ایک سلسلے کی کڑیاں بن جاتی ہیں اور ساری کائنات ایک وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

23 مارچ 1996 کو شام چھ بجے، خلافت ہاؤس، بائیکلہ (ممبئی) میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، شعبہ اردو ممبئی یونی ورسٹی، انجمن ترقی اردو (مہاراشٹر) اور ادارہ "ہم سب" کا ایک ملا جلا جلسہ جناب علی رضا کی صدارت اور ڈاکٹر یونس اگاسکر کی نظامت میں منعقد ہوا تاکہ مرحوم اخترالایمان کو خراج عقیدت اور ان کے پسماندگان کو پرسہ دیا جا سکے۔ اظہار خیال کرنے والوں میں جناب صدر کے علاوہ باقر مہدی، مدھو سودن، پروفیسر عبدالستار دلوی، یوسف ناظم، حسن کمال، ہارون رشید (علیگ) یعقوب راہی، اور راقم الحروف تھے۔

یعقوب راہی اور انور خاں نے اخترالایمان کو ان کی شاعری کے اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ خود نوشت کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ علی رضا اور ہارون رشید (علیگ) نے انھیں ان کے تحریر کردہ منظر ناموں اور مکالموں میں تلاش کیا۔

حسن کمال نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہی:

"ان کے صاف شفاف کرتے پر فلم کا گلیمر چھچھورے پن کا کوئی داغ نہ لگا سکا۔ انھوں نے اسی انداز اور معیار کے مکالمے لکھے ہیں کہ مکالموں نگاروں نے ان کی مکالمہ نویسی کو پیمانہ بنا لیا تھا۔ انھوں نے شاعری کو ایک نئی جہت دی۔ ہم انھیں یادوں اور شاعری میں مس

کرتے رہیں گے۔"

یوسف ناظم نے گلوگیر آواز میں مضمون پڑھا اور جب وہ اس مقام پر پہنچے تو سامعین کی بھی ہچکیاں سی بندھ گئیں۔

"آج کل" کے تازہ شمارے میں اخترالایمان کی نظم "ذکر مغفور" کے نیچے پتا غلط چھپ گیا ہے۔ اب ان کا پتا باندرہ اور کھار اسٹیشن کے بیچ کا قبرستان ہے۔ جہاں وہ منوں مٹی تلے دفن ہیں۔"

مدھوسودن جو کہ اخترالایمان کے دیرینہ ساتھی تھے۔ انھوں نے رندھے ہوئے لہجے میں فرمایا:

"نوجوانی کے دنوں میں دہلی میں ہم دونوں نے مل کر یہ عہد کیا تھا کہ ہر سال ایک بالغ شخص کی پڑھنا لکھنا سکھائیں گے۔ وہ زندگی کے کسی بھی مسئلے کو اپنے سے بڑا نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی کے سرد و گرم جھیلنے کی ان میں بے پناہ طاقت تھی۔ میں تقریباً ہر اتوار کو ان سے ملا کرتا تھا اور ہم دونوں دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ انتقال سے مہینہ ڈیڑھ مہینہ پہلے وہ کہنے لگے۔ مدھو! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے' جو مجھ پر واچ رکھتا ہے کہ میں فرار نہ ہو جاؤں' میں نے پوچھا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ بولے ملک الموت' میں نے کہا Guardian Angel ہو سکتا ہے بولے "نہیں وہ موت کا فرشتہ ہے۔"

انھوں نے روہانسی آواز میں نظم "ایک لڑکا" کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:

"وہ نگرانی کرنے والا ان کا ہمزاد تھا اور میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اخترالایمان مرگئے ہیں۔ وہ تو زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔"

اور میں نے اپنے تاثرات میں عرض کیا تھا:

"وہ ترقی پسندوں میں ایک نئے آہنگ' ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ اور ترقی پسند تحریک کے متوازی بہنے والے دھارے میں ترقی پسندی کی ایک موج بے قرار تھے۔ ان کا شمار بھی غزل کے زبردست مخالفین میں ہوتا ہے لیکن بعض نظموں مصرعے کے مصرعے غزل کے مصرعوں کی طرح نک سک سے درست اور ڈھلے ڈھلائے نظر آتے ہیں۔ یہ شاید غزل کلچر کے پروردہ مزاج کی دین تھی۔ حالانکہ ان کی شاعری کا بنیادی وصف یہ ہے کہ وہ نثر سے قریب ہے۔ غالی قسم کے ترقی پسندوں سے یارانے کے باوجود ان کی شاعری خطابت' صحافت یا کسی مخصوص نظریے کے پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہوئی۔ دراصل ان کی شاعری آج کے منافق اور بے ضمیر معاشرے میں ایک باضمیر انسان کی آواز ہے' محترم اور مقدس آواز کو موت سے لڑتے لڑتے ان کا جسم ہار گیا مگر ان کی شاعری نے رہتی دنیا تک موت پر فتح حاصل کرلی ہے۔"

وشنو پربھاکر
مترجم :۔ قاسم ندیم
لوٹس کالونی ۹ / ۵۰۵
گونڈی، بمبئی، ۴۰۰۰۴۳

کرفیو اور آدمی

ابھی سردی کے موسم میں شدت نہیں آئی تھی۔ شام کے سایے لمبے ہو کر آہستہ آہستہ اندھیرے کی آغوش میں سماتے جا رہے تھے۔ سڑک پر جگمگاتی روشنی میں وہ بہت بونے ہو کر پھر وارد ہوئے اور لوگوں کی بھیڑ میں کھو گئے۔

میں اب نئی اور پرانی دہلی کی سرحد تک پہنچ گیا تھا۔ میرے پیچھے بھیڑ اور مختلف ٹرکوں، گاڑیوں اور بسوں سے اٹھنے والا شور تھا اور سامنے سرحد کے اس پار ایک دم بھائیں بھائیں کرتا سناٹا۔ افسران نے سائکل رکشائیں کھڑی کر کے پرانی دہلی کی جانب جانے والی دونوں سڑکوں کو آمد و رفت کے لیے بند کر دیا تھا اور اس جانب جانے والوں کو روکنے کے لیے تعینات تھے وردی پوش ہتھیار بند پولس کے سپاہی، قد آور، بونے، موٹے اور پتلے مگر ایک بات سبھی میں مشترک تھی سب کے چہروں پر بے رحمی کا میک اپ ایک جیسا تھا۔ یہاں تک کہ نگاہوں کی زبان میں بھی ہنسا کی بو تھی۔ ذرا سی آہٹ ہوتے ہی ان کے ہاتھ خودکار مشین کی طرح ہتھیاروں پر چلے جاتے تھے۔

پیچھے کے کچھ لوگ تماش بین کی طرح مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ اچانک فضا میں ایک کرخت آواز میں حکم گونجا، "تم ادھر نہیں جا سکتے۔''

میں جانتا تھا وہ کیا جواب دے گا' پھر بھی پوچھا کیوں نہیں جا سکتا۔''

کیوں کہ ادھر کرفیو لگا ہوا ہے۔

میں جب سویرے یہاں سے گیا تھا تب تو کرفیو نہیں تھا۔

نہیں ہوگا پر اب ہے۔

لیکن میں تمھیں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔'' اس نے "ایک" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے تھوڑے نرم لہجہ میں کہا۔"مگر یہ بھی تو سوچو کہ گھر کے علاوہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔"

تم کہاں جا سکتے ہو ؟ کہاں نہیں جا سکتے۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں تمھیں کسی بھی حالت میں آگے بڑھنے نہیں دوں گا۔

وہ اب اپنی سخت زبان کا استعمال کرنے لگا تھا۔ ظاہر تھا کہ اسے غصہ آگیا تھا۔ لیکن اس کا ساتھی جو دو گز کی دوری پر کھڑا تھا اور بڑے دھیان سے ہماری باتیں سن رہا تھا پاس آکر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم کون ہو ؟"

"دیکھ نہیں رہے ہو میں آدمی کا ڈھانچہ ہوں۔"

آدمی کا ڈھانچہ۔۔۔۔۔۔!اس پُر تجسس لفظ نے اسے چونکا دیا تھا۔ تم آدمی کا ڈھانچہ ہو!

"جی ہاں جیسے آپ وردی ہیں"

وردی۔۔!وہ اور بھی حیرت زدہ ہو گیا۔

"جی ہاں میں آدمی کا ڈھانچہ اور آپ وردی اور کرسی ہیں۔"

"پھر آدمی کون ہے ؟"

وہ تو شاید میں بھی نہیں جانتا۔" جانتا تو یہاں نہیں ہوتا۔ مگر میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ جب جب آدمی زمین پر آتا ہے، لوگ اس کے اندر کی آدمیت کو آپریشن کرکے نکال لیتے ہیں اور جلا دیتے ہیں۔ پھر وہ صرف ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔ جیسے ابھی ابھی ہوا۔ ہزاروں لاکھوں بار ایسا ہوا جگہ جگہ لیکن کبھی کبھی کسی ڈھانچے میں آدمیت کی کھرچن چپکی رہ جاتی ہے۔"

سپاہی نے ہمہ تن گوش ہو کر پوچھا، "ان ڈھانچوں کا کیا کرتے ہیں لوگ ؟"

کچھ کو تمھاری جیسی وردی پہنا دیتے ہیں تب اس ڈھانچے میں وردی بولتی ہے۔ کچھ کو کرسی پر بیٹھا دیتے ہیں ان میں کرسی بولتی ہے اور جو کہیں نہیں بیٹھ پاتے وہ ڈھانچے بنے گھومتے ہیں اور جیسا کہ میں نے کہا کسی ڈھانچے میں کھرچن لگی رہ جاتی ہے وہ سوال پوچھنے لگتا ہے ؟ جیسے آپ۔"

سپاہی اپنی تعریف سن کر خوش ہوا۔ اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے پوچھا، "یہ سب کون کرتا ہے ؟"

"نہ بابا! یہ نہیں بتاؤں گا۔"

کیوں ؟

کیوں کہ میں سچ نہیں بول سکتا۔ ڈھانچے کبھی سچ نہیں بول سکتے بزدل ہو جاتے ہیں وہ۔ اگر کوئی کھر چن والا، بہت ہمت کر کے سچ بولنے کی جرأت کر بھی دے تو آسے لوگ رشوت خوری کی دَل دَل میں جھونک دیتے ہیں یا انجکشن لگا کر مفاد پرست بنا دیتے ہیں اور تب وہ بھی لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہے۔ میں وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔

تبھی پہلے سپاہی نے جس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اونچی آواز سے کہا، "کس پاگل سے مغز پچی کر رہے ہو۔ ادھر دیکھو کوئی آرہا ہے۔ روکو اسے اور تم ہمیں بے وقوف مت بناؤ چلتے بنو نہیں تو میں حوالات میں بند کروادوں گا۔"

ضرور ضرور میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ دوبار برٹش سرکار آزادی کی لڑائی میں پکڑ کر بھی جیل نہیں بھیج سکی۔ اپنی سرکار نے بھی کئی بار کوشش کی مگر مجھے جیل جانے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

یکایک وہ سپاہی ہنس پڑا، "تب تو تم ضرور مخبر ہو پہلے ہی کیوں نہیں بتادیا۔ جاؤ جاؤ گھر جاؤ اب نہیں روکوں گا۔"

مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی مگر اطمینان سے کہا، مخبر نہیں ہوں سمجھے۔ میں بس آدمی کا ڈھانچہ ہوں۔

"تو پھر مرو"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے" میں نے کہا، میں اس کھمبے کے سہارے کمر ٹکا کر بیٹھ جاتا ہوں مجھے نیند آجائے اور کرفیو ہٹ جائے تو مجھے بتادینا۔ یہاں تو کرفیو نہیں ہے نا۔

سپاہی نے حقارت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنی جگہ پر چلا گیا۔ میں نے تھیلے سے تولیہ نکالا اور پٹری پر بچھادیا۔ پھر تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ رات دھیرے دھیرے گہری ہو رہی تھی۔ شوروغل بھی کم ہونے لگا تھا۔ دوسری جانب کبھی کبھی کچھ لوگ آتے اور ان کے پیروں کی آہٹ کانوں میں بج اٹھتی، ٹوٹے ہوئے ستار کی طرح۔ آسمان میں چاند نہیں تھا، تارے جھلملا رہے تھے اور ہوا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔

تبھی دوسرا سپاہی پھر وہاں آگیا۔ مجھے اس طرح لیٹے ہوئے دیکھ کر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے آنکھ بچا کر اسے ایک بار دیکھا تھا۔

پہلے نے اسے دیکھ کر کہا، "چلو یار کچھ کھا پی لیں۔ اب شاید ہی کوئی ادھر آئے" مگر دوسرے سپاہی کے دل و دماغ سے ابھی تک وہ آدمی کا ڈھانچہ نہیں نکلا تھا۔ وہ اس کے گٹھری بنے ہوئے بدن کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ بول اٹھا۔ "ہمیں اس کی تلاشی لینی چاہیے۔"

"یہ ہمارا کام نہیں ہے"

ہے! کیونکہ اس آدمی کی باتیں بڑی عجیب ہیں۔

"پاگل ہے یا پھر مخبر"

"مخبر! تب تو اور بھی ضروری ہے کہ اس کی تلاشی لیں"

کئی لمحے وہاں خاموشی چھائی رہی۔ ہوا کچھ تیز ہو چلی تھی ان دونوں کے پھسپھسانے کی آوازیں میرے کانوں کے پردوں پر دستک دے رہی تھیں۔ پھر ان کے قدموں کی آہٹ میری جانب بڑھ رہی تھی مگر میں سونے کا ناٹک کرتا رہا۔ انھوں نے دھیرے سے میرا سر اٹھایا اور تھیلا نکال لیا۔ پھر تھیلے میں جو کتاب، کاغذ اور دوائیں تھیں انھیں نکالا۔ وہ انھیں پڑھنے، پرکھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے کہ دور سے جیپ کی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی ان کے کانوں میں گونج اٹھی۔

دونوں سپاہی فوراً الرٹ ہونے کی حالت میں کھڑے ہو گئے۔ تبھی جیپ ان کے بالکل قریب آکر رکی اور اس میں سے ایک پولیس آفیسر افسرانہ انداز سے نیچے اترا اور کڑک کر پوچھا، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ پہلے سپاہی نے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا، سر۔ یہ آدمی کرفیو والے علاقے میں جانا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ وہاں میرا گھر ہے۔ اس کے پاس کرفیو پاس نہیں تھا اس لیے میں نے اسے جانے نہیں دیا۔ تب وہ یہاں بیٹھ گیا۔ بولا یہاں تو کرفیو نہیں ہے۔ میں یہیں سو جاتا ہوں اور سر وہ سچ مچ سو گیا۔"

دوسرا سپاہی جو اب تک خاموش تھا بول اٹھا، اور سر یہ آدمی بڑی عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔ ہم نے پوچھا تم کون ہو؟ وہ بولا، میں ـــ میں ـــ دیکھ نہیں رہے ہو، میں آدمی کا ڈھانچہ ہوں۔ جیسے تم وردی ہو تمھارے افسر لوگ کرسیاں ہیں۔

پولیس آفیسر بھی یہ سن کر چکرگئے۔ دھیرے سے پوچھا، اور کیا کہا اس نے۔ آدمی کے ڈھانچے سے اس کا کیا مطلب تھا۔

جی سر یہی ہم نے پوچھا تھا۔ وہ بولا تھا، ہر زمانے میں کچھ آدمی آتے ہیں، لیکن لوگ ان کی آدمیت کو باہر کھینچ کر جلا دیتے ہیں یا سولی پر چڑھا دیتے ہیں یا زہر گھول دیتے۔ باقی رہ جاتا ہے ڈھانچہ جو آدمی ہو کر بھی آدمی نہیں ہوتا۔ ایسا ہر یُگ میں ہوتا ہے۔ تمھاری آدمیت کو وردی نے خشک کر دیا ہے۔ افسروں، وزیروں کی آدمیت کرسیوں کے بدلے میں بک جاتی ہے۔

پولیس آفیسر سن بھی رہے تھے اور نہیں بھی۔ ان کا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا انھوں نے اچانک افسرانہ لہجے میں پوچھا۔ اس کے تھیلے میں کیا ملا؟

سر! اس میں ایک موٹی کتاب ہے کچھ کاغذ ہیں ان پر کچھ شعر لکھے ہوئے ہیں، چند ایک پر شاید منتر لکھے ہوئے ہیں۔

منتر! دیکھیں۔

جی سر، یہ ہے ایک کاغذ اس پر لکھا ہوا ہے کہ جو کچھ تم نہیں ہو اسے دکھانے کی کوشش مت کرو، اور یہ دیکھیے، جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ بہت ہی تھوڑا ہے، جو نہیں جانتے وہ بہت زیادہ ہے۔ سر، کچھ تصاویر بھی ہیں، اس کے اپنے اور ایک خوبصورت عورت کے اور سر بائیوڈاٹا بھی ہے۔ گلوکوز ہے، الائچی اور لونگ ہیں۔

اس بار پولیس آفیسر مسکرائے اور پھر بولے، یہ کتاب یہ کاغذ اور یہ بائیوڈاٹا مجھے دو اس کی جیبوں کی تلاشی لو۔۔۔۔

تبھی ان سب کو حیرت زدہ کرتا ہوا میں اٹھ بیٹھا، "بولا تو وردی کے ساتھ کرسی بھی آگئی۔ جناب میں سو نہیں رہا تھا۔ ہوا میں کتنی نمی بڑھ گئی ہے، زمین ٹھنڈی اور اوبڑ کھابڑ ہے۔ ایسے میں آدمی تو سو سکتا ہے اس کا ڈھانچہ نہیں۔

کسی نے بھی لب کشائی نہیں کی۔ وہ سکتے میں آگئے تھے۔ تب میں مسکرایا اور بولا۔ میں بھی جیبوں کی سبھی چیزیں نکالتا ہوں۔ یہ دیکھیے دائیں جیب میں رومال ہے۔ بائیں میں چھوٹی ٹارچ ہے، دوا ہے میری آنکھوں میں بہت درد ہے نا، اس لیے ٹھیک سے پڑھ لکھ نہیں سکتا ؟ ایک آنکھ کی روشنی چوٹ لگنے کی وجہ سے کم ہو گئی ہے۔ اوپر کی جیب میں پین ہے، اور جناب ندر کی جیب میں پاسپورٹ اور نوٹس کچھ شعر و پتوں کی ڈائری ایک پین، جب تک پولس آفیسر کتاب کا پوری طرح معائنہ کر چکے تھے۔ پاسپورٹ اور نوٹس بھی دیکھ لیے اور تب بولے مسکرا کر تو آپ ہیں مشہور ادیب انجے ماتھر۔ یہ کتاب۔۔۔۔۔۔۔

میں نے انھیں ایک دم ٹوک دیا، جناب کیا کہتے ہیں میں اور ادیب! میں تو ادب کا عرضی نویس ہوں۔

پولیس آفیسر نے جیسے کچھ نہیں سنا انھوں نے سپاہیوں کی جانب دیکھا اور بولے، بے وقوفوں یہ تو بہت بڑے آدمی ہیں۔

میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے ان کی آواز میں ایمانداری کی بو آرہی تھی میں نے فوراً ٹوک دیا، جناب وردی کسی کو آدمی نہیں بنا سکتی۔ آدمی تو کبھی کا مر چکا معصوم بچیوں کو، طرح طرح کے حیوانی طریقے ایجاد کر کے جیسے ان کے ماں باپ انھیں مار ڈالتے ہیں، ویسے ہی ہم پاک پروردگار کی قسم کھا کر، آدمی کی آدمیت کو باہر کھینچ کر اسے ڈھانچوں میں بدل دیتے ہیں اور۔۔۔۔۔ ●

اور یکایک نہ جانے کیا ہوا۔ اس کی چھاتی میں زور کا درد اٹھا۔ اندر ہی اندر کچھ اینٹھنے لگا۔
اور وہ اینٹھن ایک پاگل کر دینے والی کراہ بن کر باہر نکل گئی ۔ کئی لمحے لگے اسے سنبھلنے میں۔ پھر بولا، وہی ڈھانچے کچھ وردیوں میں بدل گئے ہیں، کچھ کرسیوں میں، کچھ مفاد پرست بڑے بننے کے بھرم میں وزارتوں کے گلیاروں میں بھٹک جاتے ہیں۔ تبھی تو کسی شاعر نے کہا ہے۔

خدا تو ملتا ہے آدمی نہیں ملتا۔

تب تک پولیس آفیسر کے دل میں بھی زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگیں تھیں ان کا مطلب نہ سمجھ کر وہ بے چین ہو رہے تھے مگر وہ عہدے کی بندشیں اس بے چینی کو باہر آنے نہیں دے رہی تھیں۔ اسی لیے انھوں نے پھر سے افسری کی مسکان اپنے چہرے کے نقاب کی طرح اوڑھ لی تھی اور پوری قوت کو سمیٹ کر انھوں نے کہا تھا، دیکھو اس وقت یہ ہوش میں نہیں ہے اس لیے یہ جو چاہے کرنے دو۔

میں پھر چونک پڑا۔ وہاں اچانک آدمیت کی بو مہک اٹھی تھی جو میری قوت سامہ کے ذریعہ داخل ہو کر سارے بدن میں دوڑ رہی تھی۔ پولیس آفیسر جا چکے تھے۔ دور جاتی ہوئی جیپ کی آواز بند ہوتے ہی وہاں پھر بھائیں بھائیں کر تا سناٹا چھا گیا۔ تبھی دوسرے سپاہی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، چلیے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔

میں نے حیرت زدہ ہو کر فوراً سر ہلاتے ہوئے کہا، ہاں ہاں میں گھر ضرور چلوں گا مجھے یہ خواب فوراً قلم بند کرنا ہو گا۔ نہیں تو بھول جاؤں گا۔ خواب بھی کیا کیا عجیب ہوتے ہیں۔ آدھے سیکنڈ میں پوری عجیب و غریب زندگی جی لیتے ہیں پھر یادداشت کے دائروں سے ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

جولائی ۱۹۹۶ جلد ۳۶ شمارہ ۷

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ٹیلی فون:- ۶۹۱۰۱۹۱

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین وبیانات نقد وتبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

صراط مستقیم (بچوں کے لیے) حکیم محمد سعید ۵۰/-

اقبال۔ ایک مسلم سیاسی مفکر۔ ڈاکٹر مشیر الحق، مرتبہ ماہ طلعت علوی ۱۰۰/-

بیرونی ملکوں میں مقیم ہندوستانی۔ شاہ بندری جعفر صادق ۳۰۰/-

روشنی ہی روشنی (کہانیاں، بچوں کے لیے) میرزا ادیب ۱۰/-

شعور رجحانات (ادب) خلیق الزماں نصرت ۹۰/-

اگلا ورق (شعری مجموعہ) بلراج کومل ۱۵۰/-

جدید و جاوداں (شعری مجموعہ) رشید کوثر فاروقی ۱۰۰/-

دو ھادرین (دوہے) شمس فرخ آبادی ۳۰/-

تفہیم و تعبیر (مجموعہ مضامین) سرور کریم ۸۰/-

گاندھیائی فکر: تجزیہ اور تعبیر (خصوصی شمارہ رسالہ جامعہ)
مدیر: شمیم حنفی / سہیل احمد فاروقی ۵۰/-

مسلم معاشرے کی تشکیل نو (مجموعہ مضامین) مظہر مہدی ۱۵۰/-

تلخیص حجۃ اللہ البالغہ (مذہب) سید رضی الدین احمد فخری ۸۰/-

آئینہ سلوک // مفتی نثار احمد خاں ۱۰۰/-

تسکین الصدور // محمد سرفراز خاں ۱۴۰/-

عقیدہ علم غیب کا تحقیقی جائزہ // // ۱۶۰/-

روضۃ الاولیا // مترجم پروفیسر نثار احمد فاروقی ۵۱/-

نقوش رسالہ رسول نمبر جلد اول (سیرت) طفیل احمد مرحوم ۱۵۰/-

نقوش بھوپال (بھوپال کی ادبی ثقافتی تاریخ) مرتبہ ڈاکٹر رضیہ حامد ۵۰۰/-

کچھ خطبے کچھ مقالے (ادبی مقالات) پروفیسر آل احمد سرور ۱۵۰/-

مبادیات عروض (فن عروض) ڈاکٹر صاحب علی ۵۲/-

مضامین گجرال (مضامین) جناب اندر کمار گجرال ۲۲/-

تحریک اہل حدیث تاریخ کے آئینے میں (مذہب) مولانا قاضی محمد اسلم ۱۵۰/-

لہریں (مضامین) عزیز اندوری ۲۸/-

پرواز (نیا ایڈیشن) (طنزیات) شفیق الرحمن ۶۰/-

لہریں // // // ۵۰/-

آدھا مرد آدھی عورت ۱ (ناول) ایم اے راحت ۴۰/-

سرورق ـــــ نند کشور وکرم

آدھا مرد آدھی عورت ۲ (ناول) ایم اے راحت ۴۰/-

چٹانوں کا راز // ابن صفی ۴۰/-

خطرناک بوڑھا // // ۴۰/-

پیاسا صحرا ۱ // اسلم راہی ۷۰/-

// ۲ // // ۷۰/-

پرچھائیاں // اقبال گھوش ۱۷۰/-

ہندی کہانیاں (افسانے) بھیشم ساہنی ۲۰/-

مکمل تاریخ کشمیر (تاریخ کشمیر) محی الدین فوق ۱۷۵/-

راج ترنگنی اول، دوم // ٹھاکر چند ساہوریہ ۴۰۰/-

قصص الانبیا مجلد ایڈیشن (نبیوں کے حالات) ادارہ ۴۰/-

قرابادین اعظم نیا ایڈیشن (طب) حکیم اعظم خاں ۲۵۰/-

نیا سفر نمبر ۶ (مجلہ) ڈاکٹر قمر رئیس ۳۰/-

مطب عملی (طب) حکیم محمد احمد خاں ۶۰/-

گھریلو دواخانہ (طب) تسنیم فاطمہ فاروقی ۳۰/-

مجربات فزالاطباء (طب) حکیم محمد جلال الدین ۴۰/-

سرسید احمد خاں کا نیا مذہبی طرز فکر (سیاست/مذہب)
پروفیسر عمران الدین ۵۰/-

داستان تاریخ اردو (نیا ایڈیشن) حامد حسن قادری مرحوم ۳۶۰/-

شاہین (ناول) شہر امام ۱۵۰/-

اردو زبان کا آغاز و ارتقا (ادب) خورشید احمد صدیقی ۲۲۵/-

اقبال

ایک مسلم سیاسی مفکر

ڈاکٹر مشیر الحق

مرتبہ ـــــ ماہ طلعت علوی

اس کتاب میں پروفیسر مشیر الحق مرحوم (سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کے چھے اہم مضامین شامل ہیں جن سے علامہ اقبال کے سیاسی فکر پر گہری روشنی پڑتی ہے اور کئی تاریک گوشے روشن ہوجاتے ہیں۔ اقبال کے سیاسی فکر کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت اہمیت رکھتی ہے۔

قیمت: ۱۰۰/- روپے

مہمان مدیر
نند کشور وکرم
کرشن نگر، نئی دہلی

کچھ تلخ ---- کچھ شیریں

برّ صغیر کی تقسیم غالباً اس صدی کا سب سے بڑا المیہ تھا اور دنیا کی تاریخ میں یہ سب سے بڑی ہجرت تھی۔ جس کے کارن تقریباً ایک کروڑ خوف و دہشت سے سہمے ہوئے معصوم اور بے قصور افراد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک خطے سے دوسرے خطے میں ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یوں تو اس کے اثرات ہمارے ملک کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات پر غیر معمولی طور پر پڑے مگر ہندستانی مسلمانوں اور اردو کو بالخصوص اس سے نقصان پہنچا۔ اردو جو اپنی ہر دلعزیزی اور ملک گیر مقبولیت کی بنا پر قومی زبان بننے کی دعویدار تھی، تقسیم کے بعد ہندی کے مقابلے میں اس کا دعوا کمزور پڑ گیا۔ ایک تو تقسیم کی وجہ سے بہت سا اردو خواں علاقہ پاکستان کے حصے میں چلا گیا دوسرے اردو بولنے والوں کی ایک بہت بڑی آبادی بھی ہجرت کر کے پاکستان چلی گئی اور جو باقی بچے انھوں نے ناامیدی مایوسی یا کسی مصلحت کی بنا پر خاموشی اختیار کر لی۔ مزید بر آں حالات سے فائدہ اٹھا کر ہندی کے کٹر حامیوں نے اردو کو تقسیم کا ذمے دار ٹھہرا کر اس کے خلاف نفرت و تعصب پھیلانے کے لیے ایک زبردست مہم کا آغاز کر دیا اور ماحول اردو کے اتنا خلاف ہو گیا کہ جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسے اردو کے پرستار و حامی شخصیتیں بھی اس کے لیے کچھ نہ کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدلتے ہوئے حالات میں ہندی کے قومی زبان بننے کا راستہ بالکل صاف ہو گیا اور اردو کا مستقبل تاریک ہونے کے آثار دکھائی دینے لگے۔

اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندستان میں اردو پندرہ بیس برس میں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ مگر ہمارے اندازے اور قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں اور حالات دھیرے دھیرے سازگار ہونے لگے۔ جب آئین ہند کی تشکیل کی گئی تو اس کے آٹھویں شیڈول میں ملک کی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی ایک قومی زبان کی حیثیت دی گئی اور آئین کی کئی دفعات میں

اسے ترقی ترویج اور تحفظ کی گارنٹی دی گئی۔ بعد ازاں علاقائی زبانوں اور اردو کی تعلیم وترقی کے لیے ملک میں سہ لسانی فارمولہ لاگو کیا گیا جس کے تحت ہر اسکول میں جہاں کسی بھی زبان کے کم از کم دس طلبہ ہوں، ایک استاد کا تقرر لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن جہاں تک اردو کا معاملہ ہے اس پر پوری طرح عمل نہیں کیا جاسکا۔

تاہم اس میں شک نہیں کہ سورگیہ اندرا گاندھی کے عہد حکومت میں سرکار کی جانب سے اردو کی ترقی وفروغ کے لیے کئی اقدام کیے گئے۔ اسی دور میں وزارت تعلیم کے تحت ترقی اردو بیورو قائم کیا گیا جس کا مقصد اعلا معیار و متن کی درسی کتب اور سائنس ٹکنالوجی فلسفہ و تاریخ، شعر وادب' لسانیات اور سماجیات وغیرہ سے متعلق کتابیں شائع کرنا تھا۔ اسی طرح شریمتی اندرا گاندھی کی ایما پر ہی ریاستوں میں اردو اکادمیاں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سب سے پہلے اتر پردیش اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ اور بعد میں مغربی بنگال، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان' دہلی اور ہریانہ وغیرہ میں بھی اردو اکادمیاں قائم کی گئیں۔ اس کے علاوہ جن ریاستوں میں بوجوہ اردو اکادمی قائم نہ کی جاسکی وہاں شعبے اور ادارے قائم کر کے اس کی ترقی وبقا کے اقدام کیے گئے۔ ان اکادمیوں اور اداروں کے علاوہ سرکاری اداروں پبلی کیشنز ڈویژن' نیشنل بک ٹرسٹ ساہتیہ اکادمی اور این سی آر ٹی وغیرہ نے بھی اردو کی ترقی وترویج کے لیے متعدد موضوعات پر اشاعتی پروگرام شروع کیے۔ اس طرح وزارت اطلاعات ونشریات کے ادارے پریس انفارمیشن بیورو نے کم وسائل کے اخبارات ورسائل کو صرف خبریں مضامین اور چربے ہی فراہم نہیں کیے بلکہ ان کی امداد وسہولت کے لیے نئی دہلی کے علاوہ لکھنو، پٹنہ، سری نگر، حیدر آباد، جالندھر، بنگلور، جموں، کلکتہ اور ممبئی وغیرہ میں ذیلی دفاتر قائم کیے۔ نیز ریڈیو اور دور درشن میں بھی اردو کی نشریات ٹیلی کاسٹ پر خصوصی توجہ دی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ سرکار نے اردو کی ترقی وفروغ کے لیے کئی اقدام کیے ہیں لیکن دستیاب اعداد وشمار کے مطابق ان سے اردو کو کچھ حد تک ہی فائدہ پہنچا ہے اور کئی کارنوں سے صورت حال زیادہ تسلی بخش نہیں۔ اور اس کی ذمے داری خود ہم پر بھی عائد ہوتی ہیں کیونکہ ہم اس کی ترقی وترویج کے سلسلے میں بہت کم کوشاں رہتے ہیں اور زیادہ تر سرکاری امداد وسرمایہ پر بھروسا کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم ہمیشہ اردو کے بارے میں خوش فہمی اور غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اخبارات ورسائل میں یہ خبر پڑھ کر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں کہ اردو دنیا کی زبانوں میں تیسرے نمبر پر ہے اگر یہ حقیقت ہوتی تو بلاشبہ ہمارے لیے باعث فخر

بات تھی مگر اس میں کوئی سچائی نہیں اور ہم اردو والے جان بوجھ کر خوش فہمی یا غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں اور بغیر تحقیق و تصدیق کوئی بھی اپنے مطلب کی خبر یا مضمون اپنے رسالے اخبار میں نقل در نقل کرتے رہتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اردو والے آج بھی استاد داغ دہلوی کے اس شعر میں کورانہ عقیدت و یقین رکھتے ہیں کہ "سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے" حالانکہ اصلیت یہ نہیں۔ اردو دنیا کی زبانوں میں تیسرے نہیں تیرھویں نمبر پر ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

منورما ائر بک ۱۹۹۶ میں درج اعداد و شمار

(۱) چینی ۱۱۶۷۰۰۰۰۰۰-ایک ارب ستاسٹھ لاکھ

(۲) انگریزی ۴۷۰۰۰۰۰۰۰-۴۷ کروڑ

(۳) ہندی ۴۱۸۰۰۰۰۰۰-۴۱ کروڑ ۸۰ لاکھ

(۴) اسپینی ۳۸۱۰۰۰۰۰۰-۳۸ کروڑ ۱۰ لاکھ

(۵) روسی ۲۸۸۰۰۰۰۰۰-۲۸ کروڑ ۸۰ لاکھ

(۶) عربی ۲۱۱۰۰۰۰۰۰-۲۱ کروڑ ۸۰ لاکھ

(۷) بنگلہ ۱۹۶۰۰۰۰۰۰-۱۹ کروڑ ۶۰ لاکھ

(۸) پرتگیزی ۱۸۲۰۰۰۰۰۰-۱۸ کروڑ ۲۰ لاکھ

(۹) ملائی انڈونیشین ۱۵۵۰۰۰۰۰۰-۱۵ کروڑ ۵۰ لاکھ

(۱۰) جاپانی ۱۲۶۰۰۰۰۰۰-۱۲ کروڑ ۶۰ لاکھ

(۱۱) فرانسیسی ۱۲۴۰۰۰۰۰۰-۱۲ کروڑ ۴۰ لاکھ

(۲۱) جرمن ۱۲۱۰۰۰۰۰۰-۱۲ کروڑ ۱۰ لاکھ

(۱۳) اردو ۱۰۰۰۰۰۰۰۰-دس کروڑ

(۱۴) پنجابی ۹۴۰۰۰۰۰۰-۹ کروڑ ۴۰ لاکھ

مذکورہ بالا اعداد و شمار کے مطابق تو اردو نہیں بلکہ ہندی تیسرے نمبر پر ہے کیونکہ دنیا بھر میں ۴۱ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد ہندی بولتے ہیں اور صرف دس کروڑ اردو۔ میرا خیال یہ ہے کہ مذکورہ اعداد و شمار اردو کے نہیں بلکہ بر صغیر میں بولی جانے والی زبان ہندستانی (اردو' ہندی) کے ہیں کیونکہ سوائے رسم الخط کے ان دونوں زبانوں میں زیادہ فرق نہیں۔ اور ہندستانی زبان تیسرے نمبر پر نہیں بلکہ دوسرے نمبر پر ہے۔ اور صرف اردو کے اعداد و شمار کو دیکھیں تو اس کا

نمبر تیرہواں ہے۔

اسی طرح آزادی کے بعد ہم نے بے محابا اردو کے ساتھ لفظ سیکولرازم کا استعمال شروع کر دیا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ دل میں ہم اس کے سیکولر ہونے میں شک وشبہ رکھتے ہوں۔ ورنہ زبانیں تو سبھی سیکولر ہوتی ہیں۔ پنجابی، تمل، بنگلہ، انگریزی، ہندی، عربی غرضیکہ کوئی بھی زبان کسی مخصوص فرقہ طبقے گروہ یا مذہب سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہندی کے فروغ میں ہندوؤں نے ہی نہیں مسلمانوں نے بھی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کیا جائسی' رسخان 'کبیر اور عبدالرحیم خان خاناں کو ہندی ادب میں نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ پنجابی میں بابا فرید' سید وارث شاہ، بلھے شاہ حسین اور ہاشم ایسے عظیم المرتبت شاعروں کے ساتھ ساتھ گورونانک ، گورو رام داس، گورو ارجن دیو اور گورو گوبند سنگھ کی صوفیانہ اور بھگتی شاعری کو بھی احترام وعقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور بھائی ویر سنگھ ' دھنی رام چاترک' پروفیسر پورن سنگھ' موہن سنگھ ماہر اور امرتا پریتم بھی اسی زبان کے ممتاز و نامور شاعر و ادیب ہیں۔ عربی کو عام طور پر مسلمانوں کی زبان خیال کیا جاتا ہے مگر یہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی بھی زبان ہے جب ہر زبان کے بولنے والے مختلف فرقوں، طبقوں اور مذہبوں سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر اردو کے ساتھ ہی سیکولرازم کا استعمال کیوں کیا جاتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے کو Guilty Conscious محسوس کرتے ہوں یا ہم میں کمتری کا احساس نہاں ہو؟

ہم اردو کو زیادہ سے زیادہ سرکاری مراعات دلانے کے لیے مطالبات کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں مگر ہمارے اعمال و کردار سے پوری طرح عیاں ہے کہ ہم گفتار کے غازی ہیں اور عملی میدان میں ہم بہت سست رو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار کی جانب سے سہ لسانی فارمولہ نافذ کرنے کے باوجود اسکولوں میں اردو پڑھنے والے بچوں میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو پایا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اسکولوں کے متعصب سربراہ اس اسکیم کو لاگو کرنے کی راہ میں مختلف طرح کی اڑچنیں کھڑی کرتے رہتے ہیں اور کچھ آزادی کے بعد لوگ ہندی سرکاری زبان بن جانے کی وجہ سے اپنے بچوں کو اردو کی بجائے ہندی پڑھانے لگے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو کے اکثر حمایتی اس معاملے میں زیادہ قصوروار ہیں کیونکہ وہ اردو کی وکالت تو کرتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو اردو اسکولوں میں داخل نہیں کراتے۔ ان میں سے زیادہ تر کے بچے پبلک اسکولوں میں انگریزی اور ہندی پڑھتے ہیں اور سرکاری اسکولوں میں صرف معاشی طور پر کمزور افراد ہی اپنے بچے داخل کراتے ہیں (کیونکہ پبلک اسکولوں میں بچے داخل کرانا ان کے بس کی

بات نہیں مجبوری ہے)اور یہ لوگ روزی روٹی کے حصول کے پیش نظر ہندی کو اردو پر ترجیح دیتے ہیں افسوسناک بات تو یہ ہے کہ اردو کے اکثر پروفیسروں' استادوں' شاعروں' ادیبوں اور اس زبان سے روزی روٹی حاصل کرنے والوں کے بچے بھی اردو سے نابلد ہیں۔ انھیں اردو میں تعلیم نہیں دلوائی جارہی ہے۔

گو بنیادی اور پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھنے والوں میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہورہا تاہم کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں اردو طلبہ کی تعداد میں دھڑادھڑ اضافہ ہورہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سو سے زائد کالجوں اور یونی ورسٹی کے شعبوں میں اردو کی تعلیم کا اہتمام ہے اور یہاں سے ہزارہا طلبہ ایم، اے، کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں چالیس کے قریب یونیورسٹی شعبوں میں پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ کی سہولیات فراہم ہیں جہاں سے زاید از ایک ہزار حضرات ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں جبکہ آزادی کے ابتدائی چند برسوں میں گنتی کے ہی پی ایچ ڈی موجود تھے اس کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں میں اڑھائی سو کے قریب ریسرچ اسکالر ڈاکٹریٹ کے لے تحقیقی مقالے مکمل کرنے کے پراسس میں ہیں

اگرچہ پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد بڑی، ہمت افزا، اور دل کو خوش کرنے والی ہے لیکن اس کا دوسرا پہلو بڑا مایوس کن ہے کیوں کہ اس میدان میں عموماً ایمانداری اور سنجیدگی سے کام نہیں ہورہا۔ اکثر تحقیقی مقالے معیار کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ بعض ریسرچ اسکالر روپیہ دے کر دوسروں سے تحقیقی مقالے لکھوا لیتے ہیں اور ڈاکٹر بن جاتے ہیں[اور بعد میں یہی ریسرچ اسکالروں کے نگراں بھی بنتے ہوں گے]اور کبھی کبھی کسی دیگر یونیورسٹی میں پہلے سے کی گئی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں ذرا سی ردوبدل کے بعد اسے submit کرکے ڈگری حاصل کرلی جاتی ہے - علاوہ ازیں مختلف یونیورسٹیوں میں ایک ہی موضوع پر یا ملتے جلتے موضوع پر کئی اصحاب کی جانب سے ریسرچ کرنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں - کیا یونیورسٹیوں میں اس طرح کی جاری ریسرچ ہمارے لیے فخریہ کارنامہ ہے ؟ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی پروفیسر / ممتحن کسی تھیسس کو غیر معیاری یا نامکمل قرار دے کر نامنظور کر دیتا ہے تو بھی ریسرچ اسکالر کو ڈگری عطا کر دی جاتی ہے ایسی صورت میں معیار و افادیت کی بات کرنا بالکل بے معنی ہے کیونکہ اکثر مقالے غیر معیاری ہیں اور ان میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ اگر پی ایچ ڈی کرنے والوں کا یہ لامتناہی سلسلے جاری رہا تو تحقیق و جستجو کا خدا ہی حافظ ہے کیونکہ کل ان ہی ڈگریوں کی بدولت انھیں یونیورسٹیوں میں لکچرر، ریڈر اور

پروفیسر بنادیا جائے گا۔

اب ذرا اردو اکادمیوں اور اداروں کا حال بھی دیکھیے سرکار اردو کی ترقی و ترویج کے لیے کروڑوں روپے کی گرانٹ دے رہی ہے مگر ان روپوں کا شاید زیادہ تسلی بخش ڈھنگ سے استعمال نہیں ہو رہا۔ گو ان اداروں نے اچھے اشاعتی سلسلوں کا آغاز بھی کیا ہے اور کئی نایاب اور کلاسیکل کتابوں کے علاوہ کئی اہم موضوعات پر قابل قدر کتابیں بھی شایع کی ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کو انعامات و اعزازات سے نوازا ہے اور انھیں وظیفوں اور کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد سے سرفراز کیا ہے لیکن ضرورت سے زیادہ سرکاری رقوم کی فراوانی، دوست نوازی اور گروہ بندی وغیرہ کی وجہ سے سرکاری امداد کے غلط اور نامناسب استعمال کی بھی مثالیں موجود ہیں۔

سرکاری گرانٹ کی ضرورت سے زیادہ موصول رقوم کو جن میں ارد کی ترقی کے لیے نہیں بلکہ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر بتدریج اضافہ کیا جارہا ہے - خرچ کرنے کے نقطہ نظر سے اکادمیوں نے انعامات دینے میں بڑی فیاضی دکھائی ہے اور ان گنت ادیبوں کی کتابوں کو انعام سے نوازا ہے اور یہ بھی نہیں دیکھا کہ کتاب کا موضوع کیا ہے یا اس کا معیار اور افادیت کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اکادمیوں کی جانب سے کچھ منتخب معیاری علمی اور ادبی کتابوں پر میں انعام دیا جاتا اور اگر بالفرض رقم فاضل بچنے کا امکان تھا تو انعامات رقم بڑھادی جاتی اور ساتھ ہی موصول ہوئی کچھ کتابوں کی معقول جلدیں خرید کر مصنفین کی مالی امداد کردی جاتی تاکہ انعامات کی قدر و اہمیت میں کمی واقع نہ ہوتی مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ کوئی اکادمی یا ادارہ بے شمار کتابوں کو انعام سے نوازے گا تو ان انعامات کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گا؟ اسی طرح بہت سے ادارے مالی امداد کی غرض سے موصول مسودوں کا بغور مطالعہ و جائزہ کیے بغیر یا احباب نوازی کے پیش نظر اشاعت کے لیے امداد دے دیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان اداروں کی "کرم فرمائی" سے اردو کی کتابوں کی اشاعت میں تو بتدریج اضافہ ہورہا ہے مگر ان میں سے بعض کا معیار ایسا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ انھیں کس بنا پر اور کیوں مالی امداد دی گئی؟ اسی طرح ان اکادمیوں اور اداروں میں سے بعض مستحق اور اہل ادبا و شعرا کو نظر انداز کر کے ایسے حضرات کو ایوارڈ سے نوازتے ہیں جو اثر و رسوخ رکھتے ہیں یا جن پر ادارے کی نظر کرم ہوتی ہے مثال کے طور پر آج سے چند برس پیشتر ایک اکادمی نے ان ہی دنوں وفات پانے والے ایک معروف و نامور شاعر کو اعلا ترین ایوارڈ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا جنھیں ہندستان میں ہی نہیں پاکستان میں بھی عزت و احترام کی نگاہ سے

دیکھا جاتا ہے اور اردو کے محقق' نقاد' ادیب ان کی جبّہ برداری ہیں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں پیش پیش رہتے تھے اور انھیں عالی جاہ بندہ پرور اور نہ جانے کس کس القاب سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر ایوارڈ دینے والی کمیٹی کی میٹنگ میں چند بارسوخ اراکین نے کمیٹی کا فیصلہ بدلواکر ایک محقق کو یہ ایوارڈ دلوادیا اور دلیل یہ دی مرحوم شاعر کو تیس بتیس ہزار روپے کی رقم سے کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ مذکورہ محقق بہت ضرورت مند ہے سوال یہ ہے ایوارڈ ایک عزت افزائی ہوتی ہے نہ کہ مالی امداد اگر انھیں ضرورت مند محقق کی مالی امداد ہی کرنی تھی تو وہ مالی طور پر مدد کردیتے اور یہ ایک قابل تحسین قدم ہوتا کہ ادارے نے ایک ضرورت مند ادیب کی مدد کی۔ ایوارڈ دے کر ایک مستحق مرحوم شاعر کی حق تلفی تو نہیں کرنی چاہیے تھی مگر کیا کیا جائے موت کے بعد اکثر لوگ اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اعداد و شمار کے مطابق ہم نے صحافت کے میدان بھی غیر معمولی ترقی کی ہے۔ آزادی سے بیشتر پورے برصغیر سے ۵۷ کے قریب روزنامے شائع ہوتے تھے جن کی تعداد بمطابق رجسٹرار نیوز پیپرز کی رپورٹ بابئے ۱۹۹۵ء ۴۱۹ تک پہنچ گئی ہے اور وہ مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات میں دوسرے نمبر پر ہے۔ پہلے نمبر پر ہندی کے روزنامے ہیں جن کی تعداد ۹۸۷ اہے اسی طرح اردو اخبارات ورسائل کی مجموعی تعداد بھی بڑھ کر ۲۳۵۳ ہوگئی ہے اور یہ تیسرے نمبر پر ہے۔ سب سے زیادہ اخبارات ورسائل ہندی میں (۱۳۶۵۰) ہیں تشویشناک پہلو یہ ہے کہ ان اخبارات کی سرکولیشن انگریزی ہندی' بنگلہ' ملیالم وغیرہ کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے اتنی کم کہ ہمیں اس کا ذکر کرتے ہوئے شرم و ندامت محسوس ہوتی ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہی ہو کہ بنگلہ روزنامہ آنند بازار پتر کا کلکتہ کے ایک اڈیشن کی سرکولیشن ۴۸۲۵۵۸ ہے اور روزنامہ ملیالم منورما کے مجموعی اڈیشنوں کی تعداد اشاعت ۷۷ ۴۳۱۴ ہے ۔ کیا ملیالم کے اس واحد روزنامے کی سرکولیشن کے مقابلے میں ہمارے تمام روزناموں کی تعداد اشاعت پھیکی معلوم نہیں ہوتی؟ ہمارے یہاں سے شائع ہونے والے ۴۱۹ روزناموں میں سے غالباً پچاس فی صد صرف رجسٹرار نیوز پیپرز کے ریکارڈ کی ہی زینت ہیں ان کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں پچیس فی صد کبھی کبھار سرکاری مراعات واخباری کاغذ، اشتہارات، پریس کارڈ وغیرہ) حاصل کرنے کے لیے شائع کیے جاتے ہیں بقیہ پچیس فی صد میں سے ایک لاکھ تو کیا پچاس ہزار بھی شاید کوئی شائع نہیں ہوتا۔ ہاں پہلے روزانہ ہند سماچار جالندھر کی سرکولیشن ایک لاکھ کے قریب تھی مگر اب اس کی سرکولیشن بتدریج کم ہوتی جارہی ہے۔ دس ہزار سے زائد چھپنے والے

روز ناموں کی تعداد بھی پندرہ بیس کے قریب ہے اور ان میں سے بھی کتنے اخبارات کی سرکولیشن حقیقی ہے یہ متنازعہ فیہ ہے۔

اسی طرح کتابوں کی بکری کا معاملہ بھی تشویشناک ہے۔ گو ہم اردو کو تیسری بڑی زبان قرر دینے کا بانگ دہل اعلان کرتے رہے ہیں (جو سچائی نہیں) مگر اس کی کتابوں کی بکری محدود سے محدود تر ہوتی جارہی ہے اور اگر سرکاری ادارے اور لائبریریاں خریدنا بند کردیں تو شائد آج ہماری کتابوں کے جو عام طور پر پانچ سو اور تین سو کے اڈیشن چھپتے ہیں ان میں بھی مزید کمی واقع ہو جائے۔ کتنی باعث ندامت بات ہے کہ پانچ چھ کروڑ افراد کی زبان اردو کی کتابوں کے تین تین سو اور پانچ پانچ سو کے اڈیشن اشاعت پذیر ہوں اور ان کا بیچنا بھی کار دشوار ہو جبکہ دوسری کئی علاقائی زبانوں کی کتابوں کے اڈیشن کئی کئی ہزار کے شائع ہوتے ہوں۔

دراصل اردو میں کتابوں کی فروخت کی تشویشناک صورت حال کی کئی وجوہ ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اردو والوں کو مفت کتابیں حاصل کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو والوں کی اکثریت قوت خرید نہیں رکھتی مگر یونی ورسٹیوں اور علمی اداروں کے اردو اساتذہ جو ہزاروں روپے تنخواہ لیتے ہیں کیا ان میں بھی قوت خرید نہیں؟ اس وقت ہندستان میں اردو کے سو سوا سو شعبے ہیں لیکن یہاں کے اساتذہ اپنی ضرورت کی کتابیں بہت کم خریدتے ہیں (شاید مطالعہ بھی بہت کم کرتے ہیں) اس کے علاوہ اردو کے شعبے اور کالج بھی اپنی لائبریریوں کے لیے بہت کم کتابیں خریدتے ہیں اور فنڈ کو استعمال کرنے کے لیے جو کتابیں خریدی بھی جاتی ہیں تو وہ ان کی افادیت کو مد نظر رکھ کر نہیں بلکہ ان ناشروں اور کتب فروشوں کی افادیت کو پیش نظر رکھ کر خریدی جاتی ہیں جن سے وہ مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے تحریر کیا گیا ہے اردو کے اکثر اساتذہ کتابیں خریدتے تو نہیں مگر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہر شائع ہونے والی کتاب انھیں مفت پیش کی جائے تاکہ وہ اسے اپنی الماری یا شلف میں سجا کر اپنی نام نہاد علمیت کا رعب گانٹھ سکیں کیونکہ وہ ان میں سے اکثر کتابوں کو پڑھنا تو کجا پوری طرح ورق الٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ اسی طرح اردو کے شاعر اور ادیب بھی مفت کتابوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ جب کبھی ان کے کسی شناسا کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو وہ اسے مفت حاصل کرنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں اور ان کی یہ امید و توقع غلط بھی نہیں کیونکہ کتاب شائع ہوتے ہی ہمارے ادباء و شعراء گھر گھر جا کر اپنی کتاب نقادوں شاعروں ادیبوں عزیزوں رشتہ داروں اور نہ جانے کس کس کو پہنچاتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ معرکتہ الآرا کتاب ہے اور اسے

محققین اور ناقدین وغیرہ کو پیش کر کے وہ ناموری اور شہرت کی بلندیوں کو چھولیں گے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس طرح وہ اپنی متعدد کتابیں ضائع کر دیتے ہیں لیکن وہ بیچارے بھی کیا کریں کتاب کوئی خریدتا نہیں۔ گھر میں پڑی رہیں تو دیمک کی نذر ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جو کتابیں بکری کے لیے مارکیٹ میں جاتی ہیں ان کا حشر بھی افسوسناک ہوتا ہے کیونکہ اردو کے اکثر کتب فروشوں کے یہاں کتابیں بیچنے کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں اور انھوں نے مارکیٹ بھی خراب کر رکھی ہے۔ نتیجتاً ناشرین کو جن میں سے زیادہ تر شاعر اور ادیب خود ہوتے ہیں۔ کتابوں کی قیمت وصول کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ مزید بر آں یہ کہ اردو کے لائبریرین اور سربراہ عموماً ان ہی ناشروں اور کتب فروشوں سے کتابیں خریدتے ہیں جو مقررہ کمیشن کے علاوہ انھیں نجی کمیشن (رشوت نہیں؟) دے کر ان کی جیب گرم کرتے ہیں۔ سرکاری اداروں اور اکادمیوں نے بھی کتابوں کی اشاعت کے لیے مالی امداد فراہم کر کے اس کاز کو نقصان پہنچایا ہے کیونکہ اپنے پلے سے رقم نہ خرچ کرنے کی وجہ سے مصنف کو کتابیں فروخت کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی۔

میرے خیال میں اردو کی کتابوں کی بکری میں اضافہ کرنے کے لیے اداروں اور اکادمیوں کو چاہیے کہ وہ اشاعت کے لیے مالی امداد دینا بند کر دیں اور اس کی بجائے مذکورہ کتابوں کی معقول جلدیں خرید کر اپنے علاقے ریاست کی لائبریریوں کو فراہم کریں اور ساتھ ہی ان لائبریریوں کو گرانٹ دینا بند کر دیں اور رقوم کی بجائے خریدی گئی کتابیں ہی انھیں دیں۔ اس طرح لائبریریوں کے سربراہوں اور منتظمین کے ذریعہ گرانٹ کا روپے غلط ڈھنگ سے استعمال کرنے کا سسٹم ختم ہو جائے گا نیز مصنفین کی کتابیں بھی لائبریریوں میں پہنچ جائیں گی اور ان کی بلاواسطہ مالی امداد بھی ہو جائے گی۔

کتابوں کی اشاعت بڑھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مفت کتابیں بانٹنے کا سلسلہ یکسر ختم کر دیا جائے اور صرف تبصرہ نگار' نقاد اور مدیر رسالہ کو ہی کتاب پیش کی جائے تاکہ قارئین کو نئی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں جانکاری مل سکے کیونکہ بعض اوقات کتاب کی مناسب نہ ہونے کی وجہ سے قارئین کو اہم کتابوں کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہوپاتا۔ اس کے علاوہ اردو اداروں اور اکادمیوں کو بڑے بڑے شہروں میں ہی نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی اردو میلے منعقد کر کے کتابوں کی نمایش اور فروخت کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اردو کی کتابوں کی اشاعت کے بارے میں جانکاری حاصل ہو سکے اور وہ اپنی پسندیدہ کتابیں خرید سکیں۔

یہاں یہ کہتے ہوئے بھی شرم وندامت کا احساس ہوتا ہے کہ ہم اردو کے سلسلے میں ریاستی علاقائی مذہبی اور فرقہ وارانہ گروہ بندی اور عصبیت کے دلدل میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں یہاں تک کہ اسے ہندستانی اور پاکستانی اردو بنانے کے مذموم کوشش بھی کی جاتی ہے۔ پاکستان میں تو اردو کے بعض خیر خواہ اردو کا نام بدل کر پاکستانی کرنے کی تجویز بھی پیش کرتے رہتے ہیں گو ابھی تک پاکستان میں اس تجویز پر کسی نے سنجیدگی کا اظہار نہیں کیا اور اکثریت نے اس کی جانب بالکل توجہ نہیں دی لیکن مستقبل میں کیا ہوتا ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ ماضی میں ہم نے بہت سی تحریکوں اور تجویزوں کا مذاق اڑایا اور انھیں دیوانے کے خواب سے زیادہ اہمیت نہ دی لیکن ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے حقیقت کی شکل اختیار کر لی۔ اس لیے دل میں کبھی کبھی ایک سوال اٹھتا ہے کہ اگر خدانخواستہ مستقبل میں کبھی پاکستان میں اردو کا نام بدل کر پاکستانی رکھ دیا گیا تو کیا ہم پاکستانی زبان کے ادیب و شاعر بن جائیں گے یا ہم اِسے اردو ہی کہتے رہیں گے اور سرحد پار کے ہمارے ہم زبان ،،پاکستانی،،۔

اسی طرح اردو کے کاز کو نقصان پہنچانے کے لیے ہندوپاک کے بعض دانشور ادیب اور شاعر صرف اپنے ملک کے ہی ادبا و شعرا کی تخلیقات شائع کرنے کی وکالت کرتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں بعض ادیب اور دانشور پاکستان میں سیمیناروں اور جلسوں میں شرکت اور پذیرائی کی ہوس کے تحت اپنے یہاں منعقد ہونے والی تقریبوں اور سیمیناروں میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرتے رہتے ہیں (پاکستانی شعرا ادبا بھی اس سے مستثنیٰ ہیں) ان مدعو کیے جانے والے بعض حضرات یہاں آکر ہندوپاک دوستی اور ہم آہنگی کی باتیں کرتے ہیں اور اردو کو دونوں ملکوں میں اتحاد واشتراک کا رشتہ جوڑنے والی زبان قرار دیتے ہیں اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہتے ہیں مگر اپنے ملک میں وہ اردو کو پاکستان اور مسلمانوں کی زبان قرار دیتے ہیں۔ ان کو تو چھوڑیے خود ہمارے ملک کے بعض کرم فرما جلسوں میں تو اسے ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان قرار دیتے ہیں مگر ان میں سے بعض حضرات اپنی مخصوص محفلوں اور نجی مجلسوں میں اسے مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں۔ یہی نہیں بعض مسلم عالم اور محققین اپنے مضامین اور مقالوں میں دبی دبی زبان میں اور بلاواسطہ دلائل پیش کرتے رہتے ہیں کہ یہ ان کی زبان ہے۔ مگر لاکھ کوشش کے باوجود یہ ممکن نہیں کہ وہ اسے صرف مسلمانوں سے منسلک کر سکیں کیونکہ اردو ہی نہیں ہر زبان مختلف فرقوں گروہوں طبقوں اور مذہبوں سے تعلق رکھتی ہے البتہ اس میں شک نہیں کہ اردو جاننے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے جیسے ہندی میں ہندوؤں کی۔

اور ہاں اردو کے نام نہاد خیر خواہ اور ٹھیکیدار لاکھ شور مچاتے رہیں۔ اردو کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اس کا مستقبل تاریک نہیں اور نہ ہی اسے کوئی ختم کر سکتا ہے۔ البتہ اسے اپنے مذکورہ بالا ہمدردوں اور پرستاروں کے دوغلے اور غلط رویے سے ضرور خطرہ ہے جو دانستہ یا نادانستہ طور پر اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ورنہ اردو تو برصغیر کے کروڑوں افراد کی مقبول ہر دلعزیز زبان ہے جو ہندستان اور پاکستان کے درمیان دوستی بھائی چارے اور رابطے کی زبان ہے۔ خدارا اس عالمی زبان کو ملکی، ریاستی، مذہبی، علاقائی اور فرقہ وارانہ گروہ بندی کی زنجیروں میں جکڑنے کی کوشش نہ کیجیے اور اپنے دوغلے پن کو چھوڑ کر اس کی ترقی و ترویج کی جانب توجہ دیجیے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی

جینے کا سلیقہ

دو نادر یادگار تحریریں

آزادی سے قبل دہلی سے ایک ادبی جریدہ "کہکشاں" نکلا کرتا تھا۔ اس کے فروری ۴۵ء کے شمارے میں جو سالنامہ بھی تھا۔ رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ – ۱۹۷۷ء) کا ایک نایاب مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "جینے کا سلیقہ"

اس عنوان سے رشید احمد صاحب نے دو مضامین تحریر کیے تھے۔ ان میں سے ایک مذکورہ بالا ہے۔ جبکہ "جینے کا سلیقہ" کے عنوان سے رشید احمد صاحب کا ایک بالکل مختلف مضمون "علی گڑھ میگزین" کے "طنز و ظرافت" نمبر (۱۹۵۳ء) میں شامل تھا۔ اتفاق ہے کہ یہ دونوں مضامین رشید احمد صدیقی کے کسی مجموعے میں شامل نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ نظیر صدیقی صاحب (پ ۱۹۳۰ء) کی رسائی بھی ان مضامین تک نہ ہو سکی۔ حالانکہ انھوں نے رشید احمد صاحب کی دو تصانیف یعنی "نقش ہائے رنگ رنگ" اور "شیرازۂ خیال" مرتب کرنے میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔

"کہکشاں" کے شمارے نایاب ہونے کی وجہ سے اب قارئین کا اس مضمون سے متمتع ہونا خاصا مشکل ہے۔ لہٰذا قارئین اور بالخصوص رشید احمد صاحب کے مدّاحوں کی دلچسپی کے پیش نظر یہ نادر و یادگار مضمون نذر کتاب نما ہے۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

جینے کی عادت سب کو ہوتی ہے سلیقہ کسی کو نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سلیقے سے زندگی بسر کرتے ہیں دراصل وہ سلیقے سے جیتے نہیں۔ سلیقے سے کسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ زندگی میں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر شخص سلیقے کے کسی مرض میں مبتلا ہے اور یہ شاید ایسا مرض ہے جس میں مبتلا ہوئے بغیر زندگی کا پورا لطف حاصل نہیں ہوتا۔ ایک صاحب ہیں جو کھانا کھا ہی نہیں سکتے۔ جب تک وہ اور ان کا بیرا وقت اور کھانے کے مقررہ کپڑے نہ پہن لے۔ چاہے ان کو کھانے پر دیکھنے والا کوئی نہ ہو اور چاہے وہ ایسے مقام پر کیوں نہ ہوں جہاں بھولے سے بھی کسی شریف آدمی کا گزر نہ ہو سکتا ہو۔ میرے ایک دوست ٹینس ٹورنامنٹ میں فائنل تک پہنچ گئے۔ اتفاق سے فائنل ایسے شخص کے ساتھ کھیلنا پڑا جس کی پتلون چست اور صرف شرعی حدود تک لمبی تھی۔ پتلون جتنی صاف تھی قمیص اتنی ہی میلی۔ دوست نے فائنل کھیلنے سے انکار کر دیا اور محض اس بنا پر کہ جس شخص کو ٹینس کے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں ہے اس کے ساتھ ٹینس کھیلنا شرفاء

کا کام نہیں چنانچہ نہایت سلیقے او رشرافت سے واپس تشریف لائے اور حریف نے کپ جیت لیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہم زندگی کے بعض بڑے اہم مسائل میں بھی اکثر بے تکلف کوئی نہ کوئی ترمیم کر ڈالتے ہیں لیکن فروعی مسائل میں بڑے اصرار سے لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کی بڑی سے بڑی قدروں کو منقلب کر دینے میں ہم کو تامل نہیں ہوتا لیکن ہم لوٹے اور لٹیا میں خفیف سی ترمیم یا مصلحت گوارا نہیں کرتے۔ اسے ہم زندگی کا سلیقہ بتاتے ہیں۔ سلیقے میں جینے کے شاید یہ معنی ہیں کہ جس کام کے جو آداب مقرر ہوں ان کو زندگی میں اسی طرح سے برتا جائے کسی اور طرح سے نہیں۔ یہ بات ٹھیک ہو یا نہیں۔ میرے نزدیک اس سے آدمی بھلے مانسوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہ جاتا۔ سلیقے سے جینے والے اکثر ازکار رفتہ پائے گئے ہیں۔ ان کی زندگی ضرور طویل ہوتی ہے لیکن وہ خوش مذاقوں کی اچانک موت کا اکثر باعث ہوتے ہیں۔ سلیقہ ہی برتتے برتتے زندگی مشن سے مشین بن گئی ہے۔

ہمارے مورث اعلا جب تک جنت میں اپنے سلیقے کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ایک دفعہ چوک ہو گئی اور یہ دنیا وجود میں آ گئی۔ یہ اچھا ہوا یا برا اس پر بحث کرنے کا مجھے سلیقہ نہیں اور موقع تو یقیناً نہیں ہے۔ البتہ اگر ہمارے جد اعلا اوّل سلیقے سے جنت ہی میں رہتے ہوتے تو آج ہم کو کسی پر مرنے کی سعادت کیوں کر میسّر آتی۔ ایسی سعادت شہادت پر بھی فائز کر دیتی ہے۔ بعض ایسے لوگ جن کو سلیقے سے سروکار نہیں، بتلاتے ہیں کہ جینے کا ایسا بھی کیا سلیقہ کہ جس جنت سے جیتے جاگتے نکل گئے یا نکالے گئے وہاں کے لیے مر مر کے جئیں۔ یہاں پہنچ کر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں خود مرنے لگا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ مجھے مرنے نہ دیا گیا تو مار بیٹھوں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا ذہن جنت کے خیال میں کچھ ایسا ڈانواڈول ہوا کہ تحریر و تقریر کا سلیقہ ہی جاتا رہا۔ ناچار میں نے سلیقے کا کوئی شعر یاد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں ایسا شعر یاد کرنے کی فکر میں مبتلا ہو گیا جس میں سلیقے کا لفظ بجنسہ آیا ہو۔ چنانچہ میر کا یہ شعر سنیے ؎

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر اور اس قبیل کے دوسرے بڑے شعراء کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ ذہن میں جو خیال آئے اس کے لیے ان کے برمحل اشعار مل جائیں گے میرا خیال ہے کہ میر تمام عمر سلیقے کے مرض میں مبتلا رہے جیسا کہ اس شعر میں انھوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے ناکامیوں کو محبت کرنے کا فن بنا لیا۔ میر نے عاشقی میں اپنا سلیقہ نہ برتا ہوتا تو وہ محبت میں کبھی ناکام نہ رہتے۔ وہ سلیقے کو نبھانے کے لیے طرح طرح کے سلیقے ایجاد کرتے تھے۔ محبت کا کام بھی تو آخر کام کاج ہی ہوتا ہے۔ میر نے محبت کے کام کاج کو سلیقے کی شامت سے فن ہی نہیں فلسفہ بنا دیا اور آپ تو جانتے ہیں فلسفہ نام ہی ہے سلیقے کی ناکامی کا یا ناکامیابی کے سلیقے کا! وہ محبوب کو اپنانا چاہتے تھے لیکن اپنانے کے بجائے صرف سلیقہ برتتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلیقہ ان کے حصے میں آیا اور محبوب کسی دوسرے کے حصے میں۔ وہ محبوب کی بے وفائی اور محبوب کی ہوسناکی کے گلہ مند رہے۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ محبوب کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہوئی کہ وہ میر کے سلیقے کا شکار ہو جاتا۔ رقیب کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ میر کے سلیقے کی کمزوری سے خوب

واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شعرا یا میر جیسے عشاق مقدمہ جیتنے کے نہ اہل ہوتے ہیں اور نہ اس کے مستحق۔ وہ تو صرف اس کے درپے ہوتے ہیں کہ مقدمہ بازی بہ نمبر سابق قائم ہوتا ہے۔ میر کو محبت سے محبت نہ تھی۔ ناکامی سے الفت تھی جس کو انھوں نے سلیقے کا نام دے رکھا تھا وہ فوجی نقل و حرکت کے دلدادہ تھے۔ لڑائی جیتنے سے سروکار نہ رکھتے تھے۔

بعض لیڈر بھی ایسے ہوتے ہیں جو تمام عمر لیڈر رہتے ہیں لیکن کارنامہ کوئی نہیں۔ ان کی مثال ایسے لوگوں کی ہے جن کو کام کوئی نہیں مصروفیت بہت زیادہ۔ وہ قوم کو قواعد پریڈ سے تو خوب آشنا کرا دیتے ہیں لیکن اس کو جنگ کے قابل نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں ہمارے ملک میں ایک قوم کپرچرا کی تھی۔ کپرچرا غالباً مرکب لفظ ہے۔ کپار اور چرکا، پورب میں کپار سر کو کہتے ہیں اور چرنے سے ہم اور آپ واقف ہیں۔ ان کا مشغلہ یہ تھا کہ اپنا خون بہا کر بھیک مانگتے تھے، آپ سے کچھ مانگا اور آپ نے دینے میں تامّل کیا تو انھوں نے چھری اپنے سر یا جسم کے کسی حصّے پر مار لی۔ خون کا فوّارہ چھوٹنے لگا تو آپ نے کچھ دے دلا کر ان سے جان چھڑا لی۔ ایک دن بادشاہ کی سواری جا رہی تھی وہ اس کارنامے کو دیکھ کر کپرچروں سے بہت مرعوب ہوا اور سوچنے لگا کہ اگر یہ جاں باز فوج میں بھرتی کر لیے جائیں تو غنیم پر فتح پانا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے حکم دے دیا اور کپرچروں کی ایک پلٹن قائم ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد کسی غنیم کا حملہ ہوا۔ مشورہ یہ ہونے لگا کہ دشمن کی روک تھام کیوں کر کی جائے۔ بادشاہ کو دفعتاً کپرچروں کا خیال آیا کہ اسی دن کے لیے یہ بھرتی کیے گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے یہ دشمن کے مقابلے پر بھیجے گئے۔ معجزۂ فن کی نمود میں خون جگر کی نوبت آئی۔ دو چار کپرچروں کو ایسے زخم لگے کہ سب بھاگ کھڑے ہوئے اور سیدھے دارالخلافت آپہنچے۔ بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا۔ ان سے جواب طلب کیا تو انھوں نے دست بستہ التماس کیا کہ جہاں پناہ! ہم رنگ پٹھا دیکھ کر خون بہاتے تھے۔ ان کمبختوں کو خون بہانے کا سلیقہ نہیں۔ آؤ تاؤ کچھ نہیں دیکھتے مارے بیٹھتے ہیں۔ بادشاہ جی میں تو بہت برہم ہوا لیکن چونکہ ان کے انتخاب میں "جہاں پناہ" کے سلیقے کو دخل تھا اس لیے ان کو خاص قسم کے خلعت سے سرفراز فرما کر ملک کے ایک گوشے میں بسا دیا۔

بے موقع نہ ہوگا اگر سلیقے کے فن شریف پر آپ کو ایک چشم دید واقعہ بھی سنا دوں۔ مدّت ہوئی میرے وطن میں ایک خان صاحب تھے جن کا کوئی فرضی نام بھی میں وضع کرنا نہیں چاہتا اس لیے ممکن ہے کہ یہی نام کسی کا اصلی نام ہو اور لاسے امر ار ہو کر میرا روئے سخن اس کی طرف ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ جہاں بڑی آسانی سے تعزیرات ہند کی کوئی سیلقے کی دفعہ مجھ پر عائد کر دی جائے اور میں کسی سلیقے سے بھی اپنی جان نہ بچا سکوں۔ خاں صاحب سے زیادہ جفاکش، خاموش اور طاقتور آدمی اس بستی میں کوئی نہ تھا۔ یہ قصبے کے خادم ہاؤس تھے۔ چھپر اٹھانا، درخت گرانا، سانڈ پکڑنا ہوتا تو خاں صاحب سے رجوع کیا جاتا۔ چلم تمباکو پر خاں صاحب یہ سارے کام کر دیتے۔ قصبے کی لوا کا عورتیں ان کو دیکھ پائیں تو گالیاں دینے لگتیں اور بچے پا جاتے تو سر سے پاتک ان پر لد جاتے۔ اور یہ اپنا ناریل پیتے ہوئے لڑکوں کا چھتا بنے گھومتے پھرتے۔ جیسے آپ نے جمعۃ الوداع کے موقع پر دہلی کی ٹراموں کا نظارہ کیا ہوگا۔

برسات کا زمانہ تھا۔ جنم اشٹمی کی تقریب تھی۔ بستی کے اکھاڑے میں باہر کا کوئی نامور پہلوان آیا ہوا

تھا جس نے بڑی بڑی کشتیاں ماری تھیں۔ آس پاس اس کی شہرت پھیل چکی تھی۔ خاں صاحب بھی ہجوم دیکھ کر پہنچ گئے۔ بچوّں اور بے فکروں کی بن آئی۔ سب نے خاں صاحب کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ نو وارد پہلوان سے کشتی لڑ جائیں۔ خاں صاحب اپنی مضبوط بجیب الطرفین گھریلو گاڑھے کی مرزئی اور گھٹنوں سے اوپر دھوتی سمیت اکھاڑے میں اتر پڑے اور ناریل سے کش لیتے ہوئے گرد و پیش نظر ڈالی اور بولے، کون سالا لڑتا ہے۔ بستی کے ثقات نے خاں صاحب کو زیادہ پارلیمنٹری الفاظ استعمال کرنے کی تلقین کی اور درخواست کی کہ مرزئی اور دھوتی اُتار کر صاف لنگوٹ پر اکتفا کی جائے۔ بچوّں نے ایک نعرہ لگا کر خاں صاحب پر دھاوا بول دیا اور چشم زدن میں سبھوں نے کھینچ تان کر مرزئی اُتار دی۔ لنگوٹ باندھنے پر خاں صاحب تیار نہ ہوئے۔ البتہ دھوتی زیادہ کس لینے پر آمادہ ہو گئے۔ درجنوں لڑکوں نے دھوتی کا ایک سرا پکڑ کر اس طور سے کھینچنا شروع کر دیا جیسے اسکول میں رسّہ کشی کی جاتی ہے اور خاں صاحب کو کس کر تیار کر دیا گیا اور خاں صاحب کی جے بولی۔ خاں صاحب اکھاڑے میں تھوڑی دیر تک کھڑے رہے۔ پھر بولے "کون کون سالا لڑ ھیئی سب ایک دم سے آجائیں" لوگوں نے کہا۔ نہیں نہیں خاں صاحب صرف ایک سے کشتی ہوگی۔ چنانچہ حریف سامنے آیا۔ ادھر ادھر پینترا بدل کر سلامی دی لیکن خاں صاحب ٹس سے مَس نہ ہوئے۔ حریف نے بڑھ کر ہاتھ ملانا چاہا۔ خاں صاحب نے سمجھا لڑائی شروع ہو گئی۔ انھوں نے ہاتھ ملانے کے بجائے اس کی گردن پکڑ لی اور چاہتے تھے کہ چرخ دے کر اس طرح سے دے ماریں جیسے اپنے گاڑھے کی دھوتی کوئیں کی جگت پر پچھاڑتے تھے کہ مجمع سے ایک "شور طوفان خیز" اٹھا۔ ہاں ہاں، خاں صاحب کہہ کر لوگ ٹوٹ پڑے اور بیچ بچاؤ کرا دیا۔ ریفریز کی میٹنگ ہوئی۔ خاں صاحب کو بتایا گیا کہ یہ حرکت بُری تھی۔ حریف سے سب نے ہمدردی کی اور اس کو اطمینان دلایا کہ دوسری بار خاں صاحب سارے آئینی و تمدّنی آداب ملحوظ رکھیں گے کشتی پھر سے شروع ہوگی۔ حریف کے منہ سے آواز تو نکلتی نہ تھی۔ آنکھیں البتہ حلقے سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ بہ دشواری اس نے کہا کہ اس جانگلو کو کشتی کا سلیقہ نہیں ہے۔ یہ پہلوان نہیں ہے مردم خوار ہے۔ میں اس سے نہ لڑوں گا۔ اس میں فن کا احترام نہیں ہے۔ یہ جان کا لاگو ہے۔ لوگوں نے خاں صاحب کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا تو خاں صاحب نے مرزئی کندھے پر اور ناریل کو منہ سے لگاتے ہوئے فرمایا "سار شیخیا ہے اکھاڑا لڑے بدے ہے کہ نلچے بدے" اور وہاں سے چل دیے۔

یادش بخیر! ایک بار ہم سب اسٹرائک کرنے کے صلے میں کالج سے نکال دیے گئے۔ کالج کے ایک ٹرسٹی تھے جو سلیقہ، ضابطہ اور پابندیٔ اوقات کے لیے بڑے مشہور تھے کالج میں ان کی بڑی مان دان تھی ہم سب نے سوچا کہ ان کو گھیرا جائے۔ چنانچہ طویل سفر طے کر کے ان کے آستانے پر حاضر ہوئے۔ عرض حال کیا۔ بڑی شفقت فرمائی۔ پھر کہنے لگے کہ اسٹرائک کا تو پورا حال مجھے معلوم ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ نتیجہ کیا رہا۔ ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم نکال دیے گئے۔ فرمایا۔ ہرگز نہیں۔ تم نکالے نہیں گئے۔ ہم سب بہت خوش ہوئے کہ اب کام چل جائے گا۔ ان کا فرمانا کہ ہم نہیں نکالے گئے۔ نہایت امید افزا ہے پھر عرض کیا کہ جناب والا پرنسپل نے نوٹس نکال دیا ہے کہ فلاں فلاں طالب علم نکال دیے گئے۔ بولے۔ دیکھوں وہ نوٹس کہاں ہے۔ ہم نے کہا کہ نوٹس تو موجود نہیں لیکن ہم لا سکتے ہیں۔ فرمایا "لاؤ"، چنانچہ ہم میں سے ایک شخص پہلی گاڑی سے روانہ ہو کر کالج پہنچا اور نوٹس کی دستخطی نقل لے کر ممدوح کی خدمت میں حاضر

ہوا۔ اس درمیان ہم میں سے بقیہ کی پوری خاطر تواضع کی گئی اور اس طور پر مہمان رکھے گئے جیسے ہم جیسا بہتر اور برگزیدہ مہمان کبھی نہ آیا تھا۔ میزبان نے نوٹس دیکھ کر فرمایا ٹھیک ہے۔ تم سب نکال دیے گئے۔ پرنسپل کے دستخط میں پہچانتا ہوں۔ اب تم لوگ فوراً ہمارے یہاں سے چلے جاؤ لیکن یہ بات یاد رکھو کہ جو بات کہو اس کا ثبوت بھی ساتھ رکھو۔ محض تمھارے کہنے سے میں یہ کیسے مان لیتا کہ تم نکال دیے گئے۔ اب تم نے باضابطہ نوٹس دکھادیا تو میں نے مان لیا کہ بیشک تم نکال دیے گئے۔ تم کو اپنی بات منوانے کا سلیقہ نہیں ہے۔ زندگی میں سلیقہ ہی سب کچھ ہے۔ بس اب چلے جاؤ۔ آیندہ سلیقے کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ ہم سب وہاں سے بڑے سلیقے سے رخصت ہو گئے۔

آج ہماری زندگی میں اس سلیقے نے عجیب ابتری پھیلا رکھی ہے۔ آپ نے امراض کے علاج کے بہتیرے طریقے سنے ہوں گے انگریزی، یونانی، ویدک، ہومیوپیتھی، پانی سے علاج، غذا سے علاج، ورزش سے علاج، آب و ہوا سے علاج، فاقے سے علاج، نعروں سے علاج، ایکیٹی کونسلوں سے علاج، شادی بیاہ سے علاج، مقدمے سے علاج، مارپیٹ پکڑ دھکڑ سے علاج، شعر و ادب سے علاج، گورو کفن سے، صلح ناموں سے علاج، سٹرپٹر سے علاج، غرض علاج ہی علاج لیکن ان سب سے بڑھا ہوا علاج سلیقے کا علاج ہے یہ علاج بالعموم بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ جہاں سلیقے اور صرفے کا بازار گرم ہوتا ہے۔ فرض کیجیے آپ کی ایک آنکھ پھوٹ گئی، آپ نے سلیقے کا علاج شروع کر دیا اور سلیقے کے ماہرین کے پاس پہنچ گئے، ان کے جینے جس کو میں جینے کہنے جا رہا تھا، کے سلیقے میں سب سے بڑا سلیقہ یہ ہے کہ آپ ہاتھ سے نہ جانے پائیں۔ چاہے جان سے چلے جائیں۔

آپ آنکھ کے ماہر کے پاس پہنچے اس نے آپ کی آنکھ پر پٹی باندھ کر دانت کے ماہر کے پاس بھیج دیا۔ جس نے آپ کے سارے دانت اکھیڑ دیے اور آپ کو حلق کے ماہر کے یہاں پہنچا دیا۔ وہاں آپ کے حلق کے کوّے کاٹ دیے گئے اور کان کے ماہر کا راستہ بتا دیا گیا۔ وہاں کان کا ڈھول ٹھونک بجا کر ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا اور ایک بھونپو معاوضے میں دیا گیا اور ناک کے امام سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔ ناک والے نے ناک کے اندر کے سارے غدود اور ریادی بلغم کو نون غنہ میں منتقل کر کے امراض سینہ کے ماہر کے گھر کا راستہ بتا دیا۔ اس نے آپ کے ایک آدھ پھیپھڑے کو مسّن کر دیا اور دل کے ماہر تک رسائی کرادی۔ اس نے دل کو اپنی جگہ سے کھسکا ہوا اور تھوڑا بہت پھولا پھیلا بتا کر پتّے کے ماہر کی طرف روانہ کر دیا۔ انھوں نے پتّے کی جگہ اپنڈکس نکال دی اور گردہ و مثانہ کے امام وقت تک پہنچنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے گردہ کا تعاقب مثانے تک کیا۔ ایک کو سرے سے غائب اور دوسرے کو مختصر کر دیا اور آپ کو گردہ و مثانہ کے بعض ناگفتہ بہ پڑوسیوں کے ماہر کے پاس بھیجا۔ جہاں سے نورٌ علیٰ نور ہو کر آپ گھر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ گھر بک چکا ہے اور بیوی بچّے محتاج خانے میں آباد ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد آپ مر گئے۔ تو آپ کے گھر سے چند تصویر بتاں اور چند حسینوں کے خطوط کے بجائے یا ان کے علاوہ ایکسرے کی طرح طرح کی پلیٹیں، مصنوعی دانت، آنتیں اُتارنے چڑھانے کی کمانیاں، انجکشن اور عمل لینے کی از کار رفتہ پچکاریاں اور تامچینی کا تاملوٹ، گرمائی، ٹھنڈائی پہنچانے والی بوتلیں، کانوں کے بھونپو اور دو چار لنگڑی بیساکھیاں برآمد ہوئیں، اس سارے افسانے کا مرکزی یا بنیادی نقطہ سلیقہ ہے جس نے سارے گھر میں ماہرین فن کا

ہل چلوادیا۔

سلیقے نے ہماری معاشرت میں سائنس اور عبادت کا درجہ حاصل کر لیا ہے کوئی چیز اس وقت تک شروع نہ کی جائے گی جب تک سلیقے کارندا اور ربسولا موجود نہ ہو۔ ایک صاحب کو کتوں کا شوق ہے۔ انھوں نے کتوں کے شعروادب کا مطالعہ کرنے کے بعد کتوں کی طب و سرجری پاس کیا۔ پھر کتوں کے وٹامن بہم پہنچائے۔ ان کی ٹوائلٹ کا سامان فراہم کیا۔ کتوں کو سیر و تفریح کرانے کے لیے سفید پوش بھنگی ملازم رکھے۔ کتوں کا فرنیچر اکٹھا کیا۔ کتوں کی دل آسائی اور دردمندی کے لحاظ سے بیوی کا انتخاب کیا۔ کتوں کے عزت نفس کی خاطر عزیزوں، دوستوں اور ہمسایوں سے ترک تعلق کیا اور اس طور پر میونسپلٹی میں منتخب ہوئے اور قوم کے کام آگئے۔

دنیا کا ہر کاروبار اسی سلیقے سے انجام پاتا ہے۔ تہذیب و تمدن پھیلانے کا سب سے مؤثر سلیقہ یہ ہے کہ ضرورتوں کو گھٹانے کے بجائے بڑھایا جائے۔ بتایا جاتا ہے کہ جس قوم کی جتنی زیادہ ضرورتیں ہوتی ہیں اتنا ہی زیادہ قوم متمدن ہوتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو قومیں زیادہ ضرورتوں کی محتاج ہیں اتنا ہی زیادہ زوال آمادہ ہیں۔ موجودہ عہد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ کوشش پست اقوام کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی کی جاتی ہے اور زندگی کا معیار اونچا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ قوم زندگی کے تعیشات کو زندگی کی ضروریات میں منتقل کر دے۔ تعیشات میں اضافہ اور ان کا ناگزیر ہونا قومی عظمت کا معیار سمجھ لیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ باتیں قوم کی عظمت کا اتنا نہیں جتنا اس کی اشاعت کی دلیل ہے۔ زندگی کے اس گھن کو سلیقے کے سامری نے کیا درجہ دے رکھا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں۔

رشید صاحب کی ایک اور نادر تحریر

جینے کا سلیقہ

(یہ مضمون بالکل مختلف ہے لیکن نام ایک ہے)

ایک صاحب پٹتے بھی جا رہے تھے اور ہنستے بھی جا رہے تھے اور جس قدر بے تحاشا پٹتے تھے اسی قدر بے تحاشا ہنستے تھے۔ دریافت حال کرنے پر موصوف نے بڑی مشکل سے بتایا کہ پیٹنے والا غلط آدمی کو پیٹ رہا تھا اس لیے وہ اس کی حماقت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تو حضرت یہ تو رہا پٹنے کا سلیقہ۔ ایک دوسرے سلیقے کا حال سنیے، سننے کو تو شاید آپ نے سنا ہو لیکن ریڈیو پر سن کر ممکن ہے آپ اسے جھوٹ سمجھیں اس لیے زیادہ لطف اٹھائیں۔ تو وہ قصہ یہ ہے۔ آپ نے وہ مثل تو سنی ہوگی۔ اندھیر نگری چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا۔ ایک گرو اپنے چیلوں کو ہمراہ لے کر کسی تعلیمی یا تبلیغی اکسکرشن پر جا رہے تھے۔ اثنائے سفر میں ایک آبادی سے گزر ہوا جہاں یہ طرفہ تماشا دیکھا کہ معمولی ساگ پات اور لڈو پیڑا ایک ہی بھاؤ بکتے تھے۔

گرو نے چیلوں سے کہا کہ یہاں سے فوراً بھاگو ورنہ عنقریب کوئی آفت آنے والی ہے۔ سب نے اس پر عمل کیا سوائے ایک چیلے کے، جس نے کہا، میں تو فکر و عمل کی آزادی کا قائل ہوں۔ خدا نے عقل

نہیں دی ہے تو لڈو پیڑے دیے ہیں، میں ان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ قافلہ چل دیا اور یہ مزے اُڑانے لگے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مجرم کو پھانسی دینے کے لیے میدان میں لائے۔ خلقت کا ہجوم تھا۔ بادشاہ سلامت بھی موجود تھے۔ مجرم کو پھانسی کے تختے پر لے جانے لگے تو ایک مصاحب نے عرض کیا۔ جہاں پناہ! مجرم بڑا کمزور ہے اور حقیر فقیر سا لگتا ہے۔ لطف تو جب تھا کہ کسی موٹے تازے ہٹے کٹے کو پھانسی دی جاتی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ مجرم کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے بدلے کسی موٹے تازے شخص کو پھانسی دی جائے۔ تلاش کی گئی تو سب سے فربہ وہی چیلے صاحب ملے جنھوں نے عقل اور لڈو کے درمیان انتخاب کرنے میں اپنے فکر و عمل کو آزاد رکھا تھا۔ چنانچہ ان کو کشاں کشاں پھانسی دینے کے لیے چلے۔

اتفاق سے گرو بھی اس وقت سفر سے آئے تھے اور ہجوم میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے چیلے کی نظر پڑی تو گڑگڑا کر گرو سے نجات دلانے کی اپیل کی۔ گرو پھانسی کے تختے کے قریب پہنچ کر مراقبے میں مشغول ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد چونکے تو خوشی میں آکر ناچنے لگے۔ یہ ماجرا دیکھ کر لوگ ان کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لائے دریافت حال کرنے پر فرمایا، دھرما اوتار میں نے اپنے گیان دھیان سے وچار کیا تو معلوم ہوا کہ جس کو اس شبھ لگن میں پھانسی دی جائے گی وہ سیدھا بیکنٹھ پہنچے گا۔ جہاں اس کے سواگت کے لیے بڑا انتظام کیا جا رہا ہے" بادشاہ نے جھرجھری لے کر فرمایا۔ اگر ایسا ہے تو ہٹے کٹے آدمی کی بجائے میں پھانسی میں لٹکوں گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بادشاہ سلامت بیکنٹھ کو سدھارے اور گرو اپنے چیلے کو ساتھ لائے۔ مرنے کا یہ سلیقہ بھی بُرا نہیں۔

مار کھانے اور مر جانے کے سلیقے تو آپ نے دیکھ لیے۔ اب رہا جینے کا سلیقہ۔ اس کا لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ دو شخص قید خانے کی ایک ہی کوٹھری میں بند تھے۔ رات بڑی اندھیری اور بھیانک تھی اور طوفان شدت پر۔ طوفان تھما تو دونوں کوٹھری کے دروازے پر آئے اور سلاخوں سے جھانکنے لگے۔ ایک یہ کہتا ہوا واپس گیا۔ "اُف کس بلا کی تاریکی ہے"۔ دوسرا وہیں کھڑا رہا اور اپنے ساتھی سے بولا: "دیکھنا ایک تارا بھی چمک رہا ہے" لطیفہ تو ختم ہو گیا لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ بات ختم نہیں ہوئی، بلکہ اس میں جینے کا ایک سلیقہ چھپا ہوا ہے۔ اگر اس لطیفے کو آپ پا نہ سکیں یا اس کے قائل نہ ہوں تو ماریے گولی اس سارے قصّے کو۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی حرکت ہی کیوں کی جائے کہ قید بھگتنی پڑے۔ طوفان آئے اور آپ کے دشمن ستاروں سے آگے (یا پیچھے) جہاں اور بھی ہیں کے پھیر میں پڑیں۔

کسی کام کو خوبی و خوبصورتی سے کرنا سلیقہ ہے۔ یوں بھی کہہ لیجیے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ کسی بات کو اس طرح کہنا یا کرنا کہ اس کا حق ادا ہو جائے سلیقہ ہے۔ اس بنا پر میں کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ مذہب، اخلاق، آرٹ اور علوم سب کا بہت کچھ مدار سلیقہ اور شائستگی پر ہے۔ آپ کی اسی دلّی کے ایک خاندانی طبیب کا لطیفہ مشہور ہے جن سے ایک صاحب نے دریافت کیا کہ حکیم صاحب آپ کے علاج سے بھی لوگ مرتے ہیں اور فلاں عطائی کے علاج سے بھی مرتے ہیں پھر آپ دونوں میں فرق کیا رہا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ کوئی فرق نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ کھڑاوے قاعدہ جان لیتا ہے، میں قاعدے سے جان لیتا ہوں، یہ قاعدہ بھی سلیقے ہی کا دوسرا نام ہے۔

آپ کو سلیقے کے بارے میں میری ان باتوں سے اتفاق ہو یا نہیں۔ اتنا تو میں اور آپ دونوں مانیں گے

کچھ اور نہیں تو کتابوں میں یہ باتیں اسی طرح لکھی ہوئی ہیں ؎

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر جس محبت کے قائل تھے۔ وہاں سلیقہ سب کچھ نہیں تو بہت کچھ تھا۔ میر ہی کی زبان سے سلیقے کے بارے میں آپ ایک اور بات سننے پر آمادہ ہوں تو ان کا ایک دوسرا شعر سناؤں۔ دیکھنا یہ چاہتا ہوں کہ جدید تنقید اور جدید اسلحاتِ جنگ کے زمانے میں آپ پر میر کی گرفت کیسی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

دور بیٹھا غبارِ میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یہ ادب بھی سلیقے ہی کا بھائی بند ہے۔

آپ منتظر ہوں گے کہ میں یہ بتاؤں کہ میں نے کس سلیقے سے زندگی بسر کی ہے یا جینے کا میرے کیا سلیقہ ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں نے سلیقے سے پہلے جینا شروع کر دیا تھا۔ اب میرا شمار بوڑھوں میں ہوتا ہے۔ یہ رتبہ مجھے بہ اعتبار ریاض بھی حاصل ہے اور بہ اعتبار ریاضی بھی۔

مجھے جینے کا سلیقہ ہے یا نہیں یہ خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ مرنے کا بھی کچھ ایسا حوصلہ نہیں۔ جینے کا سلیقہ نہیں۔ مرنے کا حوصلہ نہیں۔ بظاہر نہایت نامعقول سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن میں نے دیکھا یہی ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی اور موت کا پروگرام بنا کر جینا شروع کرتے ہیں، عموماً غبی ہوتے ہیں یا اپنی بیویوں پر فخر کرتے ہیں۔ ذہین بیویاں ہمیشہ غبی شوہروں پر فخر کرتی ہیں۔ یہ تحقیقات آپ کے سپرد کرتا ہوں کہ شوہر غبی ہوتے ہیں اس لیے بیوی پر فخر کرتے ہیں یا بیوی پر فخر کرنے سے غبی ہو جاتے ہیں۔ البتہ میرے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ کوئی بیوی آج تک غبی نہیں دیکھی گئی۔

خود میں نے کوئی جینے کا سلیقہ نہیں برتا لیکن زندگی نے میرا ساتھ بڑے سلیقے سے دیا ہے۔ زندگی کو جس شخص پر اعتماد ہو جاتا ہے تو وہ اس شخص سے کبھی دخل فصل نہیں کرتی۔ یہی بات شخص کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگر شخص زندگی کا احترام کرے اور اسے ایک قیمتی امانت اور آزمائش سمجھے تو وہ ایسا سلیقہ وضع کرے گا جو زندگی اور خود اس کے شایانِ شان ہوگا۔ زندگی کا یہ پھیر ہمیشہ یاد رکھیے کہ وہ ہر شخص سے ایک ہی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتی۔ اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب بھی کہ امریکا سے کوئی جینے کے بنے بنائے بے شمار ڈھانچے تیار کرا کے اپنے ووٹروں میں تقسیم کر دے۔

ہر شخص کے جینے کا سلیقہ بھلا ہو یا بُرا اس کا اپنا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو زندگی بسر کرنا محال ہو جائے۔ ایک رِندِ خراباتِ سے ملّائے مسجد کی زندگی بسر کرنے کو کہیے یا ملّا سے کہیے کہ وہ رِندِ خراباتی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا انجام دردناک ہوگا اور یقیناً اس کا انجام بھی قابلِ رشک نہ ہوگا جو اس طرح کے اصول کی وکالت کرے یا اس قسم کا کوئی قانون نافذ کرے۔ جینے کے سلیقے کا تمام تر دار و مدار شخص کے حوصلے یا ہوسناکی پر منحصر ہے۔ گڑبڑی وہاں ہوتی ہے جہاں حوصلہ اور ہوسناکی کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے میں بے ایمانی راہ پا جاتی ہے۔ میں بے ایمانی کی جگہ بے وقوفی کہنا چاہتا تھا، لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی شخص اپنا نفع سوچنے میں بیوقوفی نہیں کرتا اور بے ایمانی سے نہیں چوکتا۔

مجھے تمام عمر نہ اس کی فرصت ملی نہ اس کا حوصلہ ہوا کہ اپنی ذمے داریوں اور اپنی دلچسپیوں کے علاوہ کسی اور کی ذمّے داری یا دلچسپی میں حصّہ لیتا۔ اگر اپنی ذمّے داریوں میں دلچسپی لی جائے اور اپنی دلچسپیوں کی ذمے داری کا احساس ہو تو دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کی عادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن اگر کسی نے دوسرے کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے ہی کو اپنے لیے جینے کا سلیقہ بنالیا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس طرح کے لوگ اکثر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس حرکت سے وہ خود اپنے بہت سے نفسیاتی امراض کو بڑے مضحک طور پر بے نقاب کرتے رہتے ہیں۔

میں سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ایک محدود حلقے میں ایک محدود زمانے تک ایک محدود خدمت کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس لیے اللہ نے مجھے اتنی ہی عقل، اتنا ہی حوصلہ اور اسی قسم کی شکل و صورت دی ہے کہ میں اپنا کام چلاتا رہوں اور کسی ایسے چکر میں نہ پڑوں جو میرے بوتے کا نہ ہو۔ اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے دونوں کان پکڑ کے صبح و شام جھنجھوڑ دیتی ہو تو میرے کان پر جوں نہ رینگے گی بشرطیکہ وہ شوہر میں ہی نہ ہوں اور خدا نہ کردہ ایسا ہو بھی تو میں زیادہ سے زیادہ یہ کروں گا کہ کسی اچھے سرجن سے اپنے دونوں کان ترشوا کر ان نیک بخت کے حوالے کر دوں گا۔ اس طرح کی زندگی بسر کرنے سے مجھے بڑا نفع ہوا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو میری جیسی محدود اور معمولی استعداد رکھتے ہوں اور ان کو اتنی زیادہ نعمتیں میسّر ہوئی ہوں جتنی کہ مجھے۔ اس لیے کبھی کبھی اس سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ دنیا اب بھی کتنی معصوم اور سادہ ہے کہ میں اور مولوی دونوں ولادت اطفال اور سعادت دارین میں حصّہ لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی بسر کرنے سے سب سے بڑی نعمت جو مجھے نصیب ہوئی، وہ یہ تھی کہ میں اس موذی مرض میں کبھی مبتلا نہ ہوا جسے جلنا کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مجھے تمام عمر یونی ورسٹی کی فضا، علم و ادب کا مطالعہ، شریف نوجوانوں کا ساتھ، سیکھنے سکھانے، سلجھنے سنورنے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کے مواقع میسّر رہے۔

مجھ میں کمزوریاں بھی ہیں جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ خوبیاں جو مجھ میں ہیں کبھی ابھاگر نہ ہوتیں۔ مجھے اکثر یہ محسوس ہوا کہ بڑے اور اچھے کام کے لیے حوصلہ اور شوق کی ضرورت ہوتی ہے وہ پلتے اور پنپتے ہی ہیں۔ بعض کمزوریوں کے سایے میں غالب کا مطلب رہا ہو یا نہیں مجھے اپنے اتنے سیدھے عقیدے کو اپنائے رکھنے کے لیے اس مصرعے سے بڑا سہارا ملتا ہے: ؎

بے مے کسے طاقتِ آشوب آگہی!

جینے کا میرا دوسرا سلیقہ یا تصور یہ ہے کہ زندگی نادر، ناقابلِ فہم، مقدس، اعلا ارضی یا غیر ارضی کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہے نہایت مزے کی چیز۔ جسمانی، ذہنی، روحانی اور اخلاقی سبھی اعتبار سے زندگی کا اس سے بہتر کوئی اور تصور ہو نہیں سکتا۔ مزے کی چیز سے میری مراد شراب و شاہد و شعر وغیرہ قسم کی چیز سے نہیں ہے بلکہ دوسری اور بہت سی چیزیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ہم اپنی خوبیوں سے دوسروں کی خامیوں کی اصلاح اور تلافی کر سکتے ہیں۔ کسی شے یا حالت کو بہتر بنا دینے کی قابلیت اور حوصلے سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا نعمت ہو سکتی ہے۔

خدمت کرنے کا میرا تصور بہت ہی معمولی اور مختصر ہے وہ اس لیے کہ میری بھی اور اتنی ہی بساط

ہے، چنانچہ جتنا بڑا اپنے نزدیک میں ہوں اس سے بڑا بننے کے لیے مارا مارا پھرنے، جیل خانے جانے، لوگوں پر عافیت حرام کردینے یا شہادت پا جانے کے پھیر میں کبھی نہیں پڑا۔ میں خدمت کرنے کو ایک ایسا فرض اتارنے کا مترادف سمجھتا ہوں جو بغیر لیے بھی عاید رہتا ہے، چنانچہ مرنے کے بعد اس دنیا میں کوئی میموریل بنوانے یا بہشت میں قصر زمردیں حاصل کرنے کی تمنا میں نے کبھی نہ کی۔ بہشت کی تمنا میں نے اکثر ایسے ہی لوگوں کو کرتے پایا جو دنیا میں دوسروں کی زندگی جہنم بنا چکے ہوتے ہیں۔

جینے کا ایک سلیقہ یہ بھی ہے کہ خط بڑھا ہو، چپل ٹوٹی ہو، ہاضمہ ٹھیک اور شاعری کا ذوق ہو اور ادب برائے نفیست اور نفیست برائے زندگی کے قائل ہوں۔

میں نے چاہے جس سلیقے سے زندگی بسر کی ہو یا اب کرنی پڑے۔ ایک چکر میں اکثر مبتلا رہتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب اولاد ناتواں اور ناسمجھ تھی تو میرا اہتمام وقت آرام، قابلیت، توجہ اور ذرائع اور وسائل اس پر صرف ہوتے کہ وہ اچھی تعلیم، تہذیب اور تندرستی سے بہرہ مند ہوں۔ اس سلسلے میں ان کی جیسی نگرانی کرنی پڑتی تھی وہ ان کی ناسمجھی کی بنا پر ان پر کتنی گراں گزرتی تھی وہ مجھے خوب معلوم ہے اس لیے میں خود اس مرحلے سے گزرا ہوں لیکن اب جب کہ میں بوڑھا اور وہ جوان ہوئے تو ان کی توجہ اس پر صرف ہونے لگی کہ میں اپنے آپ کو ان کی پسند کی ہوئی تربیت و تہذیب میں دے دوں۔ مثلاً یہ کہ بش شرٹ نیکر اور چپل پہن کر جدید تنقید، جدید شاعری اور فلم اسٹار کے کارناموں کا وظیفہ پڑھوں اور نوجوان عورتوں کو خواہ وہ میری یا میرے اعزا اور احباب ہی کی لڑکیاں کیوں نہ ہوں اور میرے سامنے پیدا ہوئی اور بڑھی ہوں سلام کروں اور تعظیم دیتا پھروں اور ایسا نہ کروں تو وہ میری کم توفیقی اور اپنی رسوائی پر کڑھیں۔ بعض اوقات مجھے اس پر بڑی ہنسی آتی ہے کہ یہ نوجوان اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی اصلاح و انجام کی فکر کرنے کی بجائے اپنے باپ دادا کی اصلاح و انجام کی فکر میں کیوں پڑتے ہیں۔ بچپن کے بعد جوانی آتی ہے۔ جب الکشن آرٹ۔ اغوا وغیرہ کا سامنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر والدین اپنے بچوں کو نیچ اونچ دکھاتے سمجھاتے رہیں تو کوئی ایسی برائی نہیں لیکن بڑھاپے کے بعد کیا آنے والا ہے جس کے لیے یہ اولاد والدین کو تبلیغ و تنبیہہ کرتی ہے۔

پھر بھی میری رائے ہے کہ جب والدین بوڑھے اور اولاد جوان ہو جائے تو والدین کو میدان چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ میدان چاہے خاندان کا ہو چاہے علم و ادب کا، چاہے حکمت و فن کا، چاہے اخلاق و مذہب کا۔ بوڑھوں کا نئی نسل سے اپنی منوانے کی ہوس میں مبتلا رہنا میرے نزدیک ٹھیک نہیں ہے اور بوڑھوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ نوجوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ میری اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے ہندوؤں کی اس قدیم روایت سے کہ گرہست آشرم کا زمانہ ختم کرکے دنیوی کاروبار سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ البتہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں کہ ایک گرہست آشرم کو ختم کرنے کی بجائے کوئی شخص دوسرا تیسرا گرہست آشرم شروع کر دے۔ بہرحال یہ شعر اپنی جگہ مسلم ہے ؎

رہرو راہِ محبت (یا ضعیفی) کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جینے کا سلیقہ ہماری اپنی زندگی خود فراہم کرتی رہتی ہے اس کے لیے بالکل ضروری نہیں ہے کہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ کسی پیر فقیر سے مشورہ کیا جائے یا جلسوں اور

اخباروں میں زہر اگلا جائے۔ ایک صبح سے دوسری صبح تک کائنات اپنی تمام نیرنگیوں کو جس جس انداز سے پیش کرتی رہتی ہے، ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں اس میں جتنے معمولی یا غیر معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے ذہن و دماغ میں جتنی چھوٹی بڑی لہریں ہر آن اُبھرتی مٹتی رہتی ہیں ان سے نپٹتے رہنا کبھی ان کے قابو میں چلے جانا، کبھی ان کو قابو میں رکھنا بے شمار ایسے اشارے ہیں جن سے ہم جینے کا سلیقہ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ ساری کائنات جو ہم دریافت کر سکے ہیں یا جو ہماری دریافت سے باہر ہو یا جو ہمارے لیے ہو یا ہم اس کے لیے یا دونوں کسی اور کے لیے یا کوئی کسی کے لیے نہ ہو۔ معلوم نہیں کس کے سلیقے کے ترجمان ہیں۔ ممکن ہے یہ سب صرف ایک عظیم الشان اور ناقابل بیان سلیقہ ہی ہو جس کو ہم نے طرح طرح کے نام دے رکھے ہیں۔

لیکن خدا کے لیے اس موقع پر مسکرا کر یا آہ سرد بھر کے یہ شعر نہ پڑھنے لگیے گا ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اس لیے کہ ایسے مواقع پر پٹے ہوئے اشعار بالخصوص اس شعر کے پڑھنے سے میں اپنے آپے میں نہیں رہتا اور ڈر کے مارے شعر پڑھنے والے سے تعرض نہیں کرتا لیکن غیر شعوری طور پر بعض ایسی حرکتیں ضرور سرزد ہو جاتی ہیں جو میرے نامۂ اعمال میں خود بخود درج ہو کر اس کی سیاہی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔

بلراج کومل
ای۔ ۱۳۹۔ کالکاجی
نئی دہلی ۱۹

سپاہی

میں ہر جنگ کو
سیلِ گریہ میں
جیتا یا ہارا ہوا
وہ سپاہی ہوں
جس کے لیے کوئی ایوانِ تسخیر
یا پھر پنہ گاہ کوئی
یہاں آج باقی نہیں ہے

میں انسان ہوں
انتخابِ مسافت
سفر کی صعوبت
یا آسانیِ رہ گزر
سمت
یہ سب مرا حق ہے
لیکن میں محروم تھا اس سے
میں اب

اسی حق سے کرتا ہوں طے
اپنا حرفِ ارادت
جزا اور سزا
اِذنِ رخصت

میں لوٹ آؤں شاید
کسی قالبِ نو میں امکانِ موجِ شگفتہ کے ہم رہ
اس خاکِ رسوا پہ اک روز
وقفہ
حیاتِ رواں کا
تمھیں جو ملا ہے
اسے تیرگی سے جہاں تک یہ ممکن ہو محفوظ رکھنا
جو حصے میں آئی تھی میرے
وہ سب تیرگی کے ساتھ لے جاؤں گا میں
مقامِ فنا تک

وجاہت علی سندیلوی
نصرت منزل، سندیلہ
یو پی۔

نذرِ اختر

محبِّ دلنواز برادرم اختر سعید خاں صاحب کی غزل کتاب نما کے اپریل ۱۹۹۶ء کے شمارے میں دیکھی۔ غزل بہت پسند آئی اور کیوں نہ آتی جب ہر شعر اپنی جگہ لاجواب ہے اور پھر میرے لیے تو ہر کجا نامت بود قربانت شوم کا مضمون ہے۔ میں تو خود برادرم اختر سعید صاحب کو ایک مرصع غزل سے کم نہیں سمجھتا۔ وہی حُسن، لطافت، موزونیت اور وہی پُرخلوص سوز و گداز۔ غزل اگر انسان کے پیکر میں ڈھل سکتی تو اس کا نام اختر سعید خاں ہی ہوتا۔

"کتاب نما" میں ان کی غزل پڑھ کر ان کی یاد نے بُری طرح ستایا۔ ان کی محبت، شائستگی، حُسنِ مجلس اور مہمان نوازی کی تصویریں بھیگی آنکھوں میں تیرنے لگیں۔ خدا معلوم اب ان سے کب نیاز حاصل ہو سکے؟ انھیں کی غزل پر غزل کہہ کر انھیں ایک حقیر نذرانۂ عقیدت پیش کر رہا ہوں اس دعا کے ساتھ۔ ؎ تم سلامت رہو ہزار برس۔ کسی فن کار کی عظمت کا سب سے بڑا اعتراف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے فن کی تقلید کی جائے۔

۹ر اپریل ۹۶ء — وجاہت علی سندیلوی

نہ منزل، نہ رہبر، نئی رہ گزر ہے — چلا جا رہا ہوں کہ شوقِ سفر ہے
گلوں کا تبسم، دلوں کی جراحت — یہ تیری نظر ہے، وہ میری نظر ہے
جنوں ہے نہ اب چاک دامانیاں ہیں — محبت کی غماز بس چشمِ تر ہے
جو شہکارِ تخلیق کا ہے خدایا — بتا مجھ کو تیرا وہ انساں کدھر ہے
انھیں کی خوشی پر ہوا خاک میں ہوں — مگر آج بھی اُن کی ترچھی نظر ہے
جو بھٹکا ہے راہی سمجھتا سرِ شام — جہاں روشنی ہے وہی میرا گھر ہے
تجھے خواب نوشیں، سفر مجھ کو درپیش! — یہ تیری سحر ہے وہ میری سحر ہے
زمانہ مٹا دے یہ آساں نہیں ہے — مرے نفس میں میرا خونِ جگر ہے

حوادث سے بڑھ کر ہوں آنکھیں ملاتا
نگہ اُن کی اب میری سینہ سپر ہے

ظفر گورکھپوری
اے۔ ۳۰۲، فلوریڈا۔ شاستری نگر۔
اندھیری ویسٹ۔
ممبئی ۵۳

دوہے

جیون نے ہم کو دیے، آگ اور راکھ کے ڈھیر
آگ سے انگارے بنے انگاروں سے شعر

بنسواری کی اوٹ سے، جھانک رہی ہے چھاؤں
ریل بجائے سیٹیاں اور اٹھیں نہ پاؤں

آنگن چنچل نندرسا، گھر ہے سسر سمان
بھیت اندر دو کھڑکیاں جیوں دیوران جٹھان

رات پرائے دیس کی، ہر سپنا برباد
جگنو سا چمکا کرے ماں کی آشیرواد

ٹھٹھر گئی تالاب پر، دو آنسو ہاتھ آئے
سکھی نہایا جائے کچھ، نہ ہی نچوڑا جائے

تن کی ماٹی میں کبھی، دکھ کے بیج ملائیں
کھائیں تو کم ہو نہیں کچھ اتنا اپجائیں

لکشمی کس کی ہو سکی، سدا بدلتی رنگ
اسی لیے ہم ہو گئے سرسوتی کے سنگ

گارا، چونا ریت کیا، چھوڑو یہ پاکھنڈ
اینٹیں جوڑ کے کیا ملے من جب نہیں اکھنڈ

جیون اندھیاری گلی، ہر جانب سے وار
پیچھے خونی بھیڑیے آگے چوکیدار

سمے کے تلوے چاٹیے، چاہے مانگیے بھیک
لاگا کوڑھ ضمیر کو جو سمجھے سب ٹھیک

رات ذرا آندھی تھی، کیا کیا آیا دھیان
روئے مل کر دیر تک میں اور ہندوستان

سب نے چادر اوڑھ لی، لاگ رہا نہ لگاؤ
چلو ظفر اب سو رہیں ٹھنڈا ہوا الاؤ

عاصی کاشمیری
788-WOOD BOROUGH Road
NOTTINGHAM
(ENGLAND)

ملک زادہ جاوید
۱/۲۵، سیکٹر XI - نوئیڈا نمبر ۲۰۱۳۰۱



لالہ و گل کو چھوڑ کر، سرو سمن کو چھوڑ کر
آ بسا ہوں کس جگہ اپنے وطن کو چھوڑ کر

بانٹ دی ہے جب سے میں نے اپنی ساری جائداد
اب میسر ہے سکوں کچھ مال و دھن کو چھوڑ کر

ہجرتوں میں کٹ گئے ہیں جانے کتنے ماہ و سال
آج تک لیکن پریشاں ہوں وطن کو چھوڑ کر

منتقل ہوتی رہی ہے مجھ میں سب خوشبو تیری
لمحہ لمحہ رات بھر تیرے بدن کو چھوڑ کر

کوتوالِ شہر تو خود بھی شریکِ جرم تھا
بچ گیا ہے صاف لیکن راہزن کو چھوڑ کر

ہر گھڑی عاصی تمھیں اندیشۂ سود و زیاں
بن گئے ہو کاروباری فکر و فن کو چھوڑ کر

موسموں کے اَنگنت چہرے ملے
خشک ٹہنی پر ہرے پتے ملے

اپنے بارے میں اگر سوچا کبھی
اُجلے دامن پر کئی دھبے ملے

ایک گھر کی دودھیا دیوار پر
گالیاں لکھتے ہوئے بچے ملے

مصلحت نے بڑھ کے روکے ہیں قدم
زندگی سے جب نئے رستے ملے

فاصلے جن کے پروں کی حد میں تھے
وہ پرندے شاخ پر بیٹھے ملے

آشنا لوگوں سے ناواقف ہوا
اس قدر جاوید کو دھوکے ملے

رہبر جونپوری
۴۲۴-این تھری اے سیکٹر
گوند پورہ-بھیل
بھوپال-۲۲ ایم پی

حوالہ

طوفان میں گھرا ہے سفینہ عوام کا — دم ٹوٹنے لگا ہے رفاہی نظام کا
اُترا ہوا ہے چہرہ ہر اک خاص و عام کا — چرچا جگہ جگہ ہے حوالہ کے نام کا

دولت تمام چند گھروں میں سمٹ گئی
بے چارگی شکستہ دلوں سے لپٹ گئی

ہیں اک سے بڑھ کے ایک مقابل میں ہستیاں — رائج ہوئی ہیں جن سے یہاں زر پرستیاں
عہدوں کا یہ عروج، ضمیروں کی پستیاں — یہ عیش یہ نشاط یہ راحت یہ مستیاں

لعل و گہر کہیں پہ برستے ہیں رات دن
کچھ لوگ روٹیوں کو ترستے ہیں رات دن

مجرم بنے کھڑے ہیں سب عزت مآب لوگ — چہروں سے ان کے نوچ رہے ہیں نقاب لوگ
پل پل کا مانگتے ہیں اب ان سے حساب لوگ — اچھا انھیں کہیں کہ کہیں ہم خراب لوگ

جو نازشِ وطن تھے گنہگار ہو گئے
رُسوا بڑے بڑے سرِ بازار ہو گئے

بھارت کی سمت انگلی اٹھی ہے جہان کی — تصویر داغدار ہے جنت نشان کی
قیمت کوئی نہیں ہے یہاں جسم و جان کی — سر پر کھڑی ہوئی ہے گھڑی امتحان کی

میراثِ ہند قبضۂ اہلِ ہوس میں ہے
کہتے تھے جس کو سونے کی چڑیا قفس میں ہے

ہندوستاں کا غم سے ہوا ہے عجیب حال — ہر ایک سمت مکر و ریا کا بچھا ہے جال
قول و زباں کا پاس نہ وعدوں کا کچھ خیال — گمراہئ خرد سے ہے انسانیت نڈھال

اصحابِ فن گھروں میں نظر بند ہو گئے
جو لوگ بے ہنر تھے ہنر مند ہو گئے

سہمے ہوئے ہیں ڈر سے گلستاں کے برگ و بار — مالی کا گل فروشوں میں ہونے لگا شمار
قابو ہے رہزنوں پہ نہ قاتل پہ اختیار — ہے سازشوں سے دامنِ امید تار تار

ارباب اقتدار میں مسند کی جنگ ہے
اس شانِ خسروانہ پہ تہذیب دنگ ہے

چارہ گرانِ قوم و وطن ہیں دوا سے دور   عدل و خلوص، رحم و کرم، ارتقا سے دور
لے کر خطابِ اہلِ وفا ہیں وفا سے دور   خورشیدِ رہ گزر ہیں مگر ہیں ضیا سے دور
ہیں مطمئن یہ ہند کا چہرہ بگاڑ کے
خوش ہو رہے ہیں اپنا گلستاں بگاڑ کے

چھائی ہوئی ہے سر پہ گھٹا بن کے بیکسی   آزاد ظلمتیں ہیں مقید ہے روشنی
بن کر کنیز اونچے مکانوں میں ہے خوشی   ہر دن ہے عام قتل و فسادات و رہزنی
فاقہ کشوں پہ جبر و ستم ٹوٹنے لگے
سردار خود قبیلوں کو اب لوٹنے لگے

با اختیار اپنے نصیبوں پہ ہیں مگن !   حصے میں ہے انھیں کے بہارِ رخِ چمن
محتاج سوئے دشتِ فلاکت ہیں گامزن !   پھرتی ہے سر پہ باندھے ہوئے زندگی کفن
محلوں میں رقص و میکشی و ناؤ نوش ہے
غربت زدہ گھروں کا دیا تک خموش ہے

کہتے ہیں جس کو گوتم و گاندھی کی سرزمیں   شیوہ تھا جس کا امن، اہنسا پہ تھا یقیں
دنیا میں تھی مثال نہ جس کی کوئی کہیں   کرتے تھے رشک جس پہ یمن، شام و مصر و چیں
دستار اس کی بوالہوسوں نے اچھال دی
خاک اس کے منہ پہ اس کے سپوتوں نے ڈال دی

یارب مرے وطن کا مقدر سنوار دے   تو اس خزاں رسیدہ چمن کو بہار دے
بھارت کے سر سے بوجھ غموں کا اتار دے   دہشت زدہ دلوں کو سکون و قرار دے
تفریق و انتشار کی راہوں کو بند کر
اس دیش کے وقار کو پھر سے بلند کر

شوکت عظیم
۲۲۔ کے، بی، ایم روڈ
چمپڈنی ۔ ہگلی ۲۲

محاسبہ

مرا منّا
بہت اچھا ہے پڑھنے میں
شرارت میں بھی اپنی
اک الگ پہچان رکھتا ہے
شکایت آتی ہے اسکول سے اس کے
وہ اکثر
چھٹیاں ہونے سے پہلے
بھاگ آتا ہے
میں کب سے منتظر ہوں
اپنے منّے کا
وہ گھر آئے تو اس کے کان کھینچوں گا
بتاؤں گا اسے
منّے!
بڑی مکروہ عادت ہے۔
یہ عادت ترک کر ڈالو
مگر پھر سوچتا ہوں یہ
بھلا کس منہ سے
میں منّے کو ڈانٹوں گا
کہ میں خود بھی تو دفتر سے
قبل از وقت
ہمیشہ بھاگ آتا ہوں

ظہیر غازی پوری
ہاشمیہ کالونی۔
ہزاری باغ۔ بہار

حرفِ معتوب

اختلاف
ایسی اک آگ ہے
جس میں
جلتی ہیں
انسان کی ایسی قدریں بھی
جن تک
پہنچنے میں لگتی ہیں صدیاں
اور جل کر بھی جو
چاند تاروں کی مانند
روشن رہا کرتی ہیں
اس جہاں میں

اس لیے
اختلاف آج بھی
حرفِ معتوب ہے
لفظِ مردود ہے۔

سید فیاض الرحمٰن شارق
نزد بار ایسوسی ایشن
سٹی کورٹ، پٹنہ ۷



اِس سے پہلے اُس کے غم کا کوئی اندازہ نہ تھا
آنسوؤں سے اس نے کوئی خط مجھے لکھا نہ تھا

پھول سے بچوں کے چہرے بھی تھے مرجھائے ہوئے
گھر کے گاگر خشک تھے پینے کو اک قطرہ نہ تھا

بے حجابی موسم گرما کی اب کے یوں بڑھی
کھل گیا وہ بھی دریچہ جو کبھی کھلتا نہ تھا

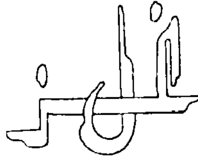
کون دیتا ریت پر اُترے پرندوں کو پناہ
موج دریا خشک تھی سبزہ کوئی اُبھرا نہ تھا

رُت جگے کا لطف لے کر لوگ اپنے گھر گئے
صبح کو دیکھا تو بس خاکستر پروانہ تھا

دوسروں کی آنکھ کی شہتیر گن لیتے تھے جو
ان کو اپنی آنکھ کا تنکا نظر آتا نہ تھا

پوچھتے تم کس سے شارق اپنے جینے کی سبیل
سب کے چہرے زرد تھے کوئی بھلا چنگا نہ تھا

اظہر غوری
۱۷۔ ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵



اس امتیاز کے بعد اعتبار کس کا ہے
تمہارے پھول ہیں سارے تو خار کس کا ہے

ہیں میرے شہر کے سب لوگ خیر خواہ مرے
تو پھر یہ پشت میں خنجر کا وار کس کا ہے

یہ ادّعا تھا، نہیں رہ گیا حریف کوئی
یہ اک جلوس سا پھر سوئے دار کس کا ہے

بزعم خود ہیں سبھی پارسا زمانے میں
تو پھر یہ دامنِ صد داغدار کس کا ہے

وہ خود غرض جو وفاؤں سے آشنا ہی نہیں
نکل چکا ہے جو مطلب، تو یار کس کا ہے

عمل ہی دے گا حقیقت کا روپ خوابوں کو
چلو اٹھاؤ قدم، انتظار کس کا ہے

وہ جس نے دفن کیا ہے ہمیں یہاں اظہر
یہ پوچھتا ہے ہر اک سے، مزار کس کا ہے

عبدالاحد ساز
زکریا مینور، چوتھا منزلہ
۱۴۹، یوسف میر علی روڈ
ممبئی ۳

اقبال مدعو
۲۹/۳ سوداگر محلہ۔ بھیونڈی
ضلع تھانہ، مہاراشٹر

غزلیں

مری آنکھوں سے گزرنا، دل و جاں میں آنا
جسم میں ڈھل کے مری روحِ رواں میں آنا

کھو نہ جانا مری جاں! سرحدِ جاں تک آکر
قرب کا پاس لیے بُعدِ کراں میں آنا

یاد کر وہ دمِ ایجاد، وہ کیفِ ایجاد
مرا ہونا، ترا میری رگِ جاں میں آنا

ساتھ چلنے کو رفیقِ رہِ دنیا ہیں بہت
تو، مرے ساتھ مرے اپنے جہاں میں آنا

لامکاں! شعر کی بندش میں سمٹنا اک پل
"آسماں! آئینۂ آبِ رواں میں آنا"

زینتِ دستِ حنائی ہے یہی "دزدِ حنا"
غیب کا معرضِ وقت و مکاں میں آنا

تشنۂ نور، مری ذات کے مہتاب و نجوم
مرے خورشید! مری کاہکشاں میں آنا

حسینی شہر میں لشکر یزیدوں کے اُترتے ہیں
سمندر تشنگی کا لے کے راہوں سے گزرتے ہیں

وہ تھے اجداد اپنے ہی نشاں تھے عظمتوں کے جو
مگر اب ذکر ان کا ہم حوالوں میں ہی کرتے ہیں

بہانا خون کا دریا تو فرعونوں کی عادت ہے
عصا والے مگر اپنے عصا لے کر گزرتے ہیں

کہاں گم ہو گئے وہ سب خلوص و مہر کے پیکر
ہوس کے شہر میں اب لوگ سایوں سے بھی ڈرتے ہیں

اُفق پر زندگی کی چھانے لگتے ہیں اندھیرے جب
ستارے تیری یادوں کے مرے دل میں اترتے ہیں

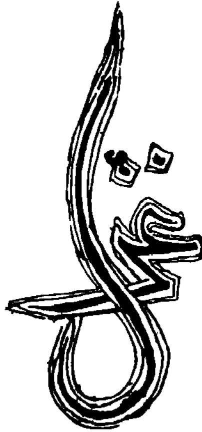
لیے پھرتے ہیں اے اقبال وہ مکر و دغا دل میں
بظاہر جو خوش اخلاقی سے ہنس کر بات کرتے ہیں

ڈاکٹر محمود شیخ
۵۹۲، نیا محلہ، مرزا غالب مارگ، جبل پور

شبد

دوستو
میرے پاس کیول شبد ہیں
شبد جو نہ جانے کتنے ہونٹوں سے گزر کر مجھ تک پہنچے
شبد جو یگوں یگوں سے سمے کے رتھ پر سوار
منش کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں
شبد جو اجر ہیں، امر ہیں
وہ شبد، میں آج تمھیں دیتا ہوں
اپاسنا، تیاگ اور بلیدان تمھیں دیتا ہوں
پریم تمھیں دیتا ہوں
شبد جو وچاروں کی جیوتی
کرم کی جوالا
اور پریم کی خوشبو ہیں
یہ جیوتی / یہ جوالا / یہ خوشبو
میں آج تمھیں دیتا ہوں
اپاسنا، تیاگ اور بلیدان تمھیں دیتا ہوں۔
پریم تمھیں دیتا ہوں
جس طرح کروچھیتر میں شری کرشن نے اپنے شبد ارجن کو دیے۔
(اور وہ انوپم شبد آج بھی پشپ کمل کی طرح کھلے ہوئے ہیں)
ٹھیک ویسے ہی
وہ شبد میں آج تمھیں دیتا ہوں
پرنتو، میں کوئی کرشن نہیں / تم کوئی ارجن نہیں
کروچھیتر نہیں / پھر بھی
وہ شبد میں آج تمھیں دیتا ہوں
اپاسنا، تیاگ اور بلیدان تمھیں دیتا ہوں۔
پریم تمھیں دیتا ہوں۔

انجم بارہ بنکوی
برکت اللہ یونی ورسٹی
بھوپال۔



میرے خلوص کی تابندگی ہے سب سے الگ
کہ اس چراغ کو رکھیے چراغ شب سے الگ

تجھے میں اپنی غریبی میں کیا کروں شامل
یہ مسئلہ ہے مرے یار چشم و لب سے الگ

وہ درس دینے لگے آج فرض و واجب کا
جو ساری عمر رہے خود ہی مستحب سے الگ

مرا نسب تو ضمانت ہے نسل انساں کی
مجھے شمار نہ کرنا مرے نسب سے الگ

میں آرزوؤں سے خود کو بچاؤں بھی کیسے
کہ دل ہوا ہی نہیں خواہش و طلب سے الگ

غزلیں

اقبال خلش
اکوٹ

قریبِ فتح مبین بنا سربراہ آیا
میں اپنے حصّے کی ذمّے داری نبھاہ آیا

ہم اپنی دنیا چراغِ دل سے رکھیں گے روشن
ہمارے حصّے میں مہر آیا نہ ماہ آیا

یہی تصنّع دراڑ بنتا ہے دوستی میں
وہ مجھ سے ملنے بشانِ عالم پناہ آیا

مرے لیے اب نئی سیاست رچی گئی ہے
حریف اب کے بصورتِ خیرخواہ آیا

یہ حق و باطل کا معرکہ کچھ نیا نہیں ہے
اِدھر نہتّے اُدھر وہ لے کے سپاہ آیا

تھا باعثِ فخر بزمِ اہلِ نظر میں پڑھنا
خلش وہیں سے سمیٹ کر واہ واہ آیا

ڈاکٹر سیّد محمود دیوان
نمبر ۲۵ بریلزفورڈ روڈ
لندن

غمِ زندگانی کہیں کیا کسی سے
جیے جا رہے ہیں مگر بے دلی سے

کہو حال ہرگز نہ اپنا کسی سے
ہو مقصود بچنا اگر خودکشی سے

عجب کاوشیں ہیں عجب مشکلیں ہیں
کہاں بھاگ جائیں ہم اس زندگی سے

بسر ہو گئی شب مگر اس طرح سے
کہ تا صبح دو چار تھے جانکنی سے

عجب کیا کہیں کوئی طوفان اٹھے
ہمیں خوف ہے تیری دریا دلی سے

خلوص اپنے احباب کے ہائے دیوانؔ
ہم اپنے وطن میں بھی ہیں اجنبی سے

عبداللہ کمال

دُعا

اے خدا، میری سیہ رات سحر کب ہوگی
روشنی چاروں طرف ہے، مرے گھر کب ہوگی

آزمایش کی کڑی دھوپ ہے، لمبا ہے سفر
تری رحمت مرے سر سایہ شجر کب ہوگی

مرے حصّے کی مسرت تری جانب ہے ابھی
مری جانب بھی وہ مائل بہ سفر کب ہوگی

کھلکھلائیں گے مگر کب مرے سبزانِ چمن
بارشِ لطف سرِ شاخ و ثمر کب ہوگی

تو نے بخشے مری آنکھوں کو سدا خواب کے رزق
صرف خوابوں سے مری زیست بسر کب ہوگی

دشت و دریا میں مجھے تو نے نوازا تھا کبھی
اس نوازش کی نظر بارِ دگر کب ہوگی

کب ترے نوریاں اتریں گے اعانت کو مری
تری تائید مری سینہ سپر کب ہوگی

میں نے مانا کہ یہ شب گزرے گی، کب گزرے گی
میں نے مانا کہ سحر ہوگی، مگر کب ہوگی

دل زدہ ہے ترا عاشق، ترا عبداللہ کمال
اس کی یہ عرضِ طلب حرفِ اثر کب ہوگی

محمد رفیع انصاری
۵۳ - درگاہ روڈ۔ بھیونڈی
ضلع تھانہ - مہاراشٹر

دُعا

اے مرے مالک، مرے پروردگار
میں بہت مجبور، تو با اختیار

ہیں مرے افکار بے سمت و جہت
جادۂ صدق و صفا کر آشکار

ہے تہ و بالا نظامِ زندگی
آگہی کی روشنی دے کردگار

بے محل ٹھہری ہے میری ہر روش
معتبر کر دے مرے قول و قرار

بے ضمیری پر ذہن آمادہ ہے
تیغِ خود داری کو کرے آبدار

ہے بجا بے مصرف و بے مایہ ہوں
کر مرے طرزِ عمل کو مشک بار

پاسبانی کر مری ہر گام پر
ایک جاں، دشمن قطار اندر قطار

عبداللہ ندیم
مجید منزل، مکان نمبر ۴-۲-۴۵
لطیف بازار، نظام آباد۔ اے پی



دل چھین لیا تھا تو جگر ڈھونڈ رہی تھی
چپ چاپ کھڑی تھی وہ مگر ڈھونڈ رہی تھی

خود میری خبر، میری خبر ڈھونڈ رہی تھی
میں کیا اُسے ملتا وہ اگر ڈھونڈ رہی تھی

چلنے کی جو سوچا تو یہ محسوس ہوا ہے
ہم کو ہی ہر اک راہ گزر ڈھونڈ رہی تھی

جس شخص کی خوشبو سے معطر تھی فضا بھی
اس شخص کو بیتاب نظر ڈھونڈ رہی تھی

کوچے کا ترے ہم نے پتا دے دیا اس کو
گلشن میں صبا سمتِ سفر ڈھونڈ رہی تھی

مجھ کو تو ٹھکانے کا کوئی شوق نہیں تھا
آوارگی ہر شہر میں گھر ڈھونڈ رہی تھی

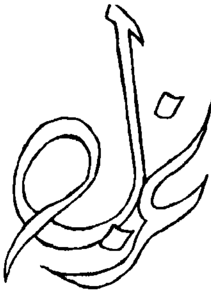
گو ہر طرح بھرپور تھی وہ شام ملن کی
پر میری نظر اس میں بھی ڈر ڈھونڈ رہی تھی

تھی پیاس پریشاں کہ نہ تھے اشک میسر
صحرا میں تھکن میری شجر ڈھونڈ رہی تھی

وحشت کا تقاضا تھا کہ صحرا کی خموشی
تنہائی صداؤں کا نگر ڈھونڈ رہی تھی

یا قیس یا فرہاد یا عبداللہ ندیم آپ
رسوائی تو بس ایک بشر ڈھونڈ رہی تھی

نسیم شاہجہانپوری
تارین جلال نگر
شاہ جہاں پور، یو پی۔



کسی لغزش کی سزا ہو جیسے
زندگی قہر خدا ہو جیسے

مطمئن یوں وہ ستم ڈھا کر ہیں
مجھ پہ احسان کیا ہو جیسے

لبِ نازک پہ تبسم کی نمود
شاخ پر پھول کھلا ہو جیسے

ہوں کچھ اس طرح میں سرگرم سفر
مجھ کو منزل کا پتا ہو جیسے

دعوے اس طرح کیا کرتا ہے
آدمی خود ہی خدا ہو جیسے

غنچہ چٹکا تو یہ محسوس ہوا
تم نے پیغام دیا ہو جیسے

ان کے بدلے ہوئے تیور توبہ
سامنے میرے قضا ہو جیسے

ان کا انداز تغافل بھی نسیم
اک توجہ کی ادا ہو جیسے

وصی احمد وصی
۲۱۔ ایکس۔ گلی پھاٹک والی
خوریجی، نئی دہلی ۵۱



اب تک حصار ذات سے نکلا نہیں ہے تو
دنیا کا فرد ہے دنیا نہیں ہے تو

پگھلا اگر تو چار قدم بہہ نہ پائے گا
ٹکڑا ہے ایک برف کا دریا نہیں ہے تو

کہتا ہے سکّہ مجھ کو اٹھا لو زمین سے
لیکن ضمیر کہتا ہے میرا نہیں ہے تو

یہ جھوٹ بولنے کی ادا میرے سامنے
شاید میرے مزاج کو سمجھا نہیں ہے تو

تیرے خلاف ڈھونڈ کے لاؤں ثبوت کیوں
یہ دل کا فیصلہ ہے کہ اچھا نہیں ہے تو

تیرے امیر ہونے کی کافی ہے یہ سند
عہد و عمل زبان کا پکّا نہیں ہے تو

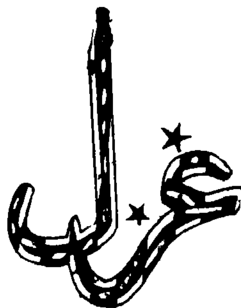
دن رات ہو رہے ہیں ستم تجھ پہ اے وصیؔ
پھر بھی کبھی زبان سے کہتا نہیں ہے تو

صغریٰ عالم
عالم بلڈنگ، شاہ بازار
گلبرگہ۔ کرناٹک

تو ہی رب ہے میرا

تو کہیں ذائقہ تو نہیں۔ ذائقہ ہے اگر
لذّت شیر خواری میں آ
ماں کی الفت میں آ
لوریوں میں سما
ماں کے آنچل میں آ
لذّت بوسۂ بیخودی میں کبھی آ
آ اور دیکھ لے
لامکاں تک میری جو رسائی نہیں
گم شدہ، بے نوا ہی مقدر میرا
اک یقین ہے مگر
تو ہمیشہ ہی ملتا رہا ہے مجھے
گم شدہ ہوں مگر
تجھ سے ملتی رہی
تجھ کو سجدے کیے
تو ہی رَب ہے میرا
تو ہی رَب ہے میرا

رضیہ پروین ابر
سرائے۔ بھاگلپور
(بہار)



حقیقتوں کا مجھے اعتراف ہے اب بھی
کہوں میں کیسے زمانہ خلاف ہے اب بھی

لگے ہے زیست مری کھنڈروں میں گزری ہے
مری نظر میں بسا کوہِ قاف ہے اب بھی

نئے تھے زخم دلوں کے تو سب ہی بھر آئے
کسی کے درد کا دل میں شگاف ہے اب بھی

لکھا تھا ہاتھوں سے تقدیر پتھروں کا یہاں
مرے نصیب کا سادہ لفاف ہے اب بھی

مٹا کے رکھے گا اس کو زمانہ شاہد ہے
اصول حق سے جسے انحراف ہے اب بھی

بھٹک رہا ہے کوئی ابر اپنی راہوں میں
مجھے لگے کوئی محو طواف ہے اب بھی

رام سن پرساد یادو
مقصود پور، متوہا
پٹنہ ۸۰۳۲۰۱

غلطی

لوگوں نے اسے
سڑک پر لا گھسیٹا
لات جوتوں سے
جی بھر کر پیٹا
غلطی صرف اتنی تھی
کہ اس نے
مندر میں جل رہے
گھی کے دیئے کو
راہ گیروں کے لیے
سڑک پر لا کر
رکھ دیا تھا

زندگی

زندگی کچھ بھی نہیں
ایک سفر ہے
سورج کی طرح
آکاش کو پار کرتا ہوا
ایک سفر
جو
شروع ہوتا ہے اُجالے سے
اور ختم ہوتا ہے
اندھیرے میں

مانگے کا اُجالا

خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے



ادیبوں کی جنگ زرگری

کوئی کچھ بھی کہے لیکن یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ آج دنیائے ادب میں انیس ناگی جیسا سچا اور کھرا کوئی دوسرا ادیب نہیں ہے۔ جو ان کے دل میں ہوتا ہے، وہ زبان پر اور جو دماغ میں ہوتا ہے زبانِ قلم پر آجاتا ہے اور وہ اس خوبصورتی کے ساتھ کہ دل کے معاملات میں دماغ کو اور دماغ کے معاملات میں دل کو دخل دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انیس ناگی سچے اور کھرے ہونے کے ساتھ ساتھ کھردرے بھی ہیں۔ دوسروں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے وہ کسی مصلحت کو اور اپنے ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے کسی احتیاط کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ مصلحتیں اور احتیاطیں خیالات کے فطری بہاؤ کی راہ میں غیر فطری رکاوٹیں بن جاتی ہیں۔

انیس ناگی ادب کے جس بلند مقام پر فائز ہیں اس کا اندازہ اس کی کتابوں سے نہیں باتوں سے ہوتا ہے۔ اپنی کتابیں وہ خود چھاپتے ہیں، اس لیے وہ انھیں کے پاس رہتی ہیں لیکن باتیں خوشبو کی طرح عام ہوجاتی ہیں کیونکہ یہ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ لاہور کے اخبارات میں انیس ناگی کے انٹرویو اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جن سے موصوف کی ادبی کارکردگی کا اور معاصر ادیبوں کی کارناکردگی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ گذشتہ مہینے کے آخری ہفتے میں لاہور کے روزنامہ "نوائے وقت" میں ان کا جو انٹرویو شائع ہوا ہے، اس وقت ہمارے سامنے ہے اور اسی کو پڑھ کر ہم لکھنے کی مشق کر رہے ہیں۔

اس انٹرویو کا آغاز انیس ناگی کے اس بیان سے ہوتا ہے "میں نے لکھنے کی ابتدا شاعری سے کی ہے۔ انسان جب بچہ یا نابالغ ہوتا ہے تو اس پر وفورِ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ شاعری اسی جذبے کی پیداوار ہے"۔ کیا حکیمانہ بات ہے جسے سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نہ سمجھنے والے اس بیان سے کوئی غلط نتیجہ نکال سکتے ہیں اور یہ سوال کر سکتے ہیں کہ شاعری اگر صرف بچوں اور نابالغوں کا کھیل ہے تو بچے بڑے اور بالغ ہوجانے کے بعد بھی بچپن ہی کی فضا میں رہنا پسند کرتے ہیں، اس لیے شعر کہنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اسی لیے شاعر کو معصوم ترین مخلوق کہا جاتا ہے۔ اردو کے ننانوے فیصد شعرا، اپنی شاعری کے اعتبار سے خاصے معصوم ہوتے ہیں۔ انھیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ شاعری ہے یا شاعری کی معذرت۔

انیس ناگی جس قسم کی شاعری کرتے ہیں، اس کو تو انھوں نے کوئی نام نہیں دیا لیکن جس قسم کی شاعری وہ نہیں کرتے، اسے وہ "پابند شاعری" سے موسوم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "میرے نزدیک پابند شاعری تک بندی کی مشق ہے جس میں قافیے سے قافیہ ملانے پر زور دیا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کے شاعر پابند شاعری کیسے کر لیتے ہیں۔ غزل ایک متروک صنف سخن ہے۔ اس میں لکھنا جھک مارنے کے مترادف ہے۔"

یہ باتیں ہمارے دل کو تو لگتی ہیں کیوں کہ میر، غالب اور اقبال وغیرہ نے پابند شاعری ہی میں قافیے سے قافیہ ملا کر تک بندی کی مشق کی ہے یعنی جھک ماری ہے لیکن استاد لاغر مرادآبادی کو انیس ناگی سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں "جہاں تک جھک مارنے کا تعلق ہے، نثری نظم اس کام کے لیے زیادہ موزوں ہے کیونکہ غزل میں جھک مارنے کے لیے بھی تھوڑی بہت محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ نثری نظم میں محنت فاری کرتا ہے اور محنت کے رائگاں جانے کا غم بھی وہی سہتا ہے۔"

انیس ناگی نے اپنے انٹرویو میں صرف احمد ندیم قاسمی کا ذکر اچھے لفظوں میں کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل قاسمی صاحب کا ستارہ عروج پر ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی، بادلِ ناخواستہ سہی، کبھی کبھی کسی کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ورنہ زیرِ نظر انٹرویو میں ان کے ناوکِ ناز نے زمانے میں کوئی صید نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ احمد فراز کو بھی مرغِ قبلہ نما سمجھ کر یہ رائے دی ہے "فراز کی شاعری فیض کی نقالی پر مشتمل ہے۔ ان کی غزل پندرہ سولہ سال کے نوجوان کی جذباتی کیفیت کی عکاس ہے۔ مقبول اور اچھا شاعر ہونا دو الگ باتیں ہیں۔ اردو کی شعری روایت میں ان کا نام اس ٹوٹے پھوٹے حوالے کے ساتھ کبھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔"

اس رائے سے فراز پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا، خود انیس ناگی کی ناقص معلومات پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ وہ زمانہ گیا جب فراز کی غزل پندرہ سولہ سال کے نوجوان گاتے پھرتے تھے۔ اب تو فراز اس سے بھی کم عمر کے نوجوانوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ بلکہ بعض بچے تو پیدا ہوتے ہی فراز کے زیرِ اثر آجاتے ہیں۔ اس کی طرف فراز نے خود بھی اپنی ایک غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے:

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کے نام رکھ دیے

پرانے زمانے میں زیادہ رونے والے شیرخوار بچوں کو افیون دی جاتی تھی۔ اسی سے استاد ذوق نے ایک لطیف شاعرانہ نکتہ پیدا کیا تھا:

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

سنا ہے اب شیرخواروں کے لیے فراز کا نام ہی "کار تریاکی" کرتا ہے۔

فراز کو فیض کا نقال کہنا بھی سخت ناانصافی ہے۔ فراز و فیض ہم عصر ہیں اور ہم عصروں کے درمیان ادبی لین دین ہوتا ہی رہتا ہے۔ اگر فراز نے فیض کا رنگ اڑایا ہے تو فیض نے بھی آخری عمر میں کچی عمر کی جو شاعری کی ہے، وہ فراز ہی کا فیضان ہے۔ ایسا ہی ادبی لین دین غالب کا بھی اپنے ہم عصروں سے تھا۔

غالب کے زمانے کے ایک مقبول شاعر حکیم آغا جان عیش تھے۔ ان کی زمینوں میں غالب نے کئی غزلیں لکھی ہیں۔ عیش نے بھی غالب کے بہت سے مضامین غزل کو اپنے رنگ میں منظوم کیا ہے لیکن آج تک کسی نے غالب و عیش پر ایک دوسرے کا نقال ہونے کا الزام عائد نہیں کیا۔ فراز کو ہم فیض کا نقال نہیں کہہ سکتے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں میں وہی تعلق ہے جو غالب و عیش میں تھا۔ یہ فیصلہ کرنا نقادوں کا کام ہے کہ فیض و فراز میں غالب کون ہے اور عیش کون۔

انیس ناگی نے یہ کہہ کر میر تقی میر کی عزت افزائی کی ہے کہ ان کے ہاں اچھے شعر کم ہیں اور بھرتی کے زیادہ۔ مولانا حالی اور فیض کو اوسط درجے کے شاعر قرار دیا ہے۔ قتیل شفائی کو فلمی شاعر کہہ کر ان کے ادبی مقام کی نفی کی گئی ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں کہا ہے کہ وہ چالیس برس سے ایک ہی نقطے پر جمے ہوئے ہیں افتخار جالب اور انور سجاد کے متعلق یہ اطلاع دی ہے کہ دونوں زر کی تلاش میں ادب کو چھوڑ گئے ہیں۔ مجید امجد کے مجموعہ کلام "شب رفتہ" کو بہت کمزور مجموعہ بتایا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی پر الزام لگایا ہے کہ وہ لغت پر انحصار کرتے ہیں۔ انیس ناگی یہی الزام انتظار حسین بھی لگا چکے ہیں۔ ہمیں تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، اگر کوئی لکھنے والا ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے معنی پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہیں تو اسے بھی لغت پر انحصار کرنا چاہیے۔ جس لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں لغت دیکھ لینے چاہئیں۔ ویسے مشتاق احمد یوسفی اور انتظار حسین کو مشورہ دیں گے کہ وہ آیندہ جب کوئی کتاب لکھیں تو اس کے ساتھ فرہنگ بھی لگا دیا کریں تاکہ انیس ناگی کی شکایت رفع ہو جائے۔ شاید مشکل الفاظ ہی کی وجہ سے انیس ناگی کو میر کے ہاں بھرتی کے اشعار زیادہ نظر آتے ہیں۔ فرہنگ میر کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے، شاید موصوف کی نظر سے نہیں گزری ورنہ بھرتی کے شعروں کی تعداد میں معقول حد تک کمی ہو سکتی تھی۔

انیس ناگی نے تنقید نگاروں کے بھی خوب لتے لیے ہیں۔ اس پر انٹرویو لینے والے نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ سوائے انیس ناگی کے کوئی تنقید نہیں لکھ رہا۔" موصوف نے اس کا جواب یہ دیا "میں نے بھی تنقید لکھنی چھوڑ دی ہے، اس لیے کہ جب میں اپنی غیر جانبدارانہ آرا کا اظہار کرتا ہوں تو لوگ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ تنقید لکھنے پر کشور ناہید نے میرا تبادلہ لاہور سے ملتان کروا دیا تھا۔ آپ خود ہی بتائیں میں تنقید کیسے لکھوں، اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور دھمکیوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی۔"

ہمیں یہ تکلیف دہ صورت حال معلوم نہیں تھی۔ ہم انیس ناگی کو مشورہ دیں گے کہ وہ تنقید سے ہمیشہ کے لیے تائب نہ ہوں، بس ذرا اتنی احتیاط کریں کہ پیپلز پارٹی کے دور اقتدار میں تنقید لکھنے سے پرہیز کریں تاکہ کشور ناہید ان کو پریشان نہ کر سکیں، مسلم لیگ کا یا مارشل لا کا دور اس کام کے لیے بہت موزوں ہوتا ہے کیونکہ ان ادوار میں خود کشور ناہید کو پے در پے تبادلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ویسے سننے میں آیا ہے کہ اب کشور ناہید کسی سے ناخوش ہوتی ہیں تو اس کا تبادلہ نہیں کرواتیں، بلکہ یہ دھمکی دیتی ہیں کہ اگر تم راہ راست پر نہ آئے تو اپنی آپ بیتی کے اگلے اڈیشن میں تمھارا ذکر بھی کر دوں گی۔

انیس ناگی اکادمی ادبیات سے بھی ناخوش ہیں، انھیں شکایت ہے کہ "اکادمی کی اہل قلم کانفرنس عجیب ہڑبونگ کا شکار تھی، شرکا کی آدھی تعداد سرے سے ادیب ہی نہ تھی، اس کانفرنس کا مقصد محض اپنے دوستوں کو انعاموں سے نوازنا تھا اور یہ انعامات جی بھر کے غیر مستحقین کو دیے گئے اور اس پر جو احتجاج کیا گیا

اسے بھی نظر انداز کر دیا گیا۔"

انیس ناگی نے اگرچہ یہ نہیں بتایا کہ وہ اہل قلم کانفرنس کے شرکا کی کس آدھی تعداد میں شامل تھے، مگر ان کے اعتراضات بالکل درست ہیں۔ اکادمی کو ان شکایات کا ازالہ کرنا چاہیے اور دوستوں سے انعامات واپس لے کر دشمنوں میں تقسیم کر دینے چاہئیں تاکہ دشمنوں کا شمار بھی دوستوں میں ہونے لگے۔ اب دوستی اور دشمنی کا انحصار ایسی ہی باتوں پر رہ گیا ہے۔

اکادمی کے انعامات کے علاوہ سرکار کا اعزاز پرائڈ آف پرفامنس کے سلسلے میں بھی انیس ناگی خاصے جذباتی نظر آتے ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں اپنی موجودہ مصروفیات کے بارے میں وہ بتاتے ہیں: "آج کل میں پرائڈ آف پرفامنس لینے کی کوشش کر رہا ہوں، افتخار عارف سے رابطہ کر رکھا ہے، اپنے علاوہ جاوید شاہین، اور شہزاد احمد کے لیے بھی کوشش کر رہا ہوں، انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔"

یہ انیس ناگی کی عظمت ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ اس نفانفسی کے زمانے میں کون کسی دوسرے کے فائدے کے لیے کوشش کرتا ہے البتہ افتخار عارف سے معاملہ کرنے میں ذرا احتیاط کی ضرورت ہے وہ جب اکادمی ادبیات کے ڈائرکٹر جنرل تھے تو انھوں نے ایک سازندے کو ادب کا اور ایک ادیب کو سازندوں والا پرائڈ آف پرفامنس دلا دیا تھا۔

انیس ناگی نے اس پر اظہار افسوس کیا ہے کہ اس سال ایک ایسے ادیب کو پرائڈ آف پرفامنس ملا ہے جس نے گذشتہ تیس برسوں سے کچھ نہیں لکھا۔ معلوم نہیں اس میں افسوس کی کیا بات ہے، کیونکہ یہ اعزاز تو ملا ہی نہ لکھنے کی وجہ سے ہے۔ اگر کوئی ادیب انیس ناگی کی طرح لکھ لکھ کر ڈھیر لگاتا رہے تو اسے کون اعزاز کے لائق سمجھے گا۔

آخر میں انیس ناگی کا ایک بیان، بلا تبصرہ — "بہت سے ناول نگار مجھے ناول نگار نہیں مانتے، اسی طرح شاعر مجھے ناشاعر کہتے ہیں، آپ سے کس نے کہا کہ میں اہم ادیب ہوں۔ مجھے ابھی تک سرکار کی طرف سے کوئی انعام نہیں ملا، اکادمی ادبیات نے کبھی باہر کی سیر نہیں کرائی، حکومت نے کوئی اچھا عہدہ نہیں دیا، ہر قسم کی ادبی اور ثقافتی تنظیموں سے مجھے باہر رکھا گیا، ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہے کہ میں اہم ادیب نہیں ہوں۔ البتہ ناپسندیدہ ضرور ہوں، صرف اس لیے کہ ایک خوشامد پرست عہد میں ایک نئے ضمیر کی داستان مرتب کر رہا ہوں۔ ... میں اپنے آپ کو ضلعی سطح کا ادیب سمجھتا ہوں۔"

معذرت

بجلی کی نظر عنایت امسال کچھ زیادہ ہی ہے۔ سال گذشتہ بجلی گھنٹہ، دو گھنٹہ یا زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے کے لیے جاتی تھی امسال گھنٹے دنوں میں بدل گئے۔ خوش نویس لکھ نہیں سکتے، آپریٹر کمپوزنگ نہیں کر سکتے اور پروف ریڈر پڑھ نہیں سکتے۔ لہٰذا غلطیاں رہ جانے کی معذرت قبول فرمائیں۔

(ادارہ)

یوسف ناظم

ذکر گوپی چند نارنگ کا

گوپی چند نارنگ کی شخصیت کے "پہلو دار" ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھیں ہندوستان میں کسی پہلو قرار نہیں آتا۔ دلی میں ان کا ایک گھر بھی ہے۔ (اور کیا گھر ہے دیکھنے والوں کے دل میں گھر کرلیتا ہے) لیکن یہ دلی میں ہی نہیں رہتے تو گھر میں کہاں سے رہیں گے اس سے ان کی فطری صفائی پسندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ دل میں اگر کسی وجہ سے ذراسا بھی غبار ہو تو وہ اسے گھر کے باہر ہی نکالتے ہیں۔ ویسے دل کے غبار آلودہ ہونے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پہلو دار شخصیتیں عام طور پر نزاعی ہوتی ہیں جو ایک اچھی اور خوش آئند بات ہے۔ نزاعی ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس میں اتنے پہلو کیوں ہیں۔ گوپی چند نارنگ سے لوگ خوش بھی رہتے ہیں اور خفا بھی۔ لوگوں کی خوشی تو شاید برملا ہوتی ہے لیکن ان کی خفگی خفی ہوتی ہے اور صرف اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے اس کا موقعہ بھی نہیں آتا کیونکہ گوپی چند نارنگ میں اور بہت سی صلاحیتوں کے ساتھ یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ خوش رہنے اور خفا رہنے والے احباب اور ارباب دونوں کو موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ اپنا موقف بدلیں۔ ان دونوں اقسام کے افراد کے درمیان بھی کچھ لوگ پائے جاتے ہیں جو بین بین ہوتے ہیں۔ یہ آزاد امیدواروں کی طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی آواز یا تو طوطی کی طرح ہوتی ہے یا اس توتے کی طرح جسے سکھا پڑھا کر بولنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔

گوپی چند نارنگ کھلی فضا کے آدمی ہیں انھیں جب بھی دیکھا گیا ہے پَر تولتے دیکھا گیا ہے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہونا ایک محاورہ تھا اور یہ اس وقت وجود میں آیا تھا جب ہوا کے گھوڑے تھے نہیں۔ گوپی چند نارنگ نے اس محاورے کو عملی جامہ پہنایا بلکہ شال اوڑھائی۔ انھیں طیران گاہ پر اتنا دیکھا گیا اتنا دیکھا گیا کہ لوگ یعنی کچھ دیدہ ور قسم کے لوگ انھیں کسی ہوائی سروس کا ایسا نمائندہ سمجھنے لگے جو فقی لباس میں ہو۔ لغات شحنوی میں فقی اس سرکاری شخص کو کہا جاتا ہے جو کوتوالی کے فرائض انجام دیتا ہو اور وردی میں ملبوس نہ ہو اور شکار خود شیر کی کچھار میں چلا آئے۔ گوپی چند نارنگ اردو کے خدمت گار ہیں اور اردو کی باقی بقا کے لیے سال کے ۱۲ مہینے سفر کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ

ایسے مسافر ہیں جن کا تعلق سفر سے کم اور سفارت سے زیادہ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کو ملک سے باہر اپنی بقاء کے لیے ان سے بہتر سفیر میسر نہیں آیا۔ اگرچہ یاروں نے بہت زور "سفر" پر مارا۔ میں اس خیال سے متفق ہوں بلکہ یوں سمجھیے کہ یہ خیال ہے ہی میرا۔ گوپی چند نارنگ اس سلسلے میں ساری دنیا کا سفر کر چکے ہیں۔ کرۂ زمین پر قطب شمالی اور قطب جنوبی پر نہیں گئے اس لیے نہیں گئے کہ اردو ابھی وہاں پہنچی نہیں ہے۔ اور خلا میں چاند پر نہیں گئے۔ چاند پر جانے میں کوتاہی ان کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ نظام شمسی ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ فی الحال ہر شخص چاند پر نہیں جا سکتا۔ (ہنی مون پر جانے کی بات اور ہے کیونکہ اس میں چاند خود ہم سفر ہوتا ہے) گوپی چند نارنگ اکثر و بیشتر ہندوستان بھی آتے جاتے رہتے ہیں کیونکہ اردو اب بھی یہاں پائی جاتی ہے۔ بے حد ملنسار اور خلیق آدمی ہیں اس لیے انھیں مجھ سے بھی ملنے میں عار نہیں ہے دو تین ملاقاتیں تو حیرت ناک طور پر دلی میں ہوئی ہیں۔ (ورنہ ملک کے اور شہروں میں تو ہوتی رہی ہیں) اب ایک ملاقات کا ذکر سن ہی لیجیے۔ بہت پہلے کی بات ہے یعنی اس وقت کی جب مرحوم عمیق حنفی آل انڈیا ریڈیو دہلی میں برسر (پے) کار تھے اور انھوں نے ریڈیو اور طنز و مزاح کی ایک محفل ترتیب دی تھی (اسٹوڈیو میں) اس محفل میں فکر تونسوی اور احمد جمال پاشا بھی شامل تھے یہ کوئی بیس سال پرانی بات ہوگی ہم سب نے اپنے اپنے مضامین سنائے تھے۔ اور یہ سمجھ کر سنائے تھے کہ یہ مزاحیہ ہیں گوپی چند نارنگ نے بھی یہ پروگرام دیکھا تھا۔ بظاہر کافی متاثر تھے اس زمانے میں ان کی حِس مزاح بہت سرگرم تھی اتنی سرگرم کہ انھوں نے سارے مزاح نگاروں کو اپنے گھر چائے (وغیرہ) نوشی کے لیے اپنے گھر بلایا اور سب کو ان کی پسند کی مشروب سے مسرور و مخمور کیا اور مجھ پر کرم یہ کیا کہ "کسٹم فری" بوتل کا منہ مجھ سے کھلوایا (کسی بوتل کی رسم اجرا کے انعقاد کا یہ پہلا واقعہ تھا) جس طرح کتابوں کی رسم اجرا کوئی ناخواندہ مہمان انجام دیتا ہے میں نے بھی اپنا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ گوپی چند نارنگ بہت خوش تھے کہ مزاحیہ مضمون سننے کا کیسا انتقام لیا۔ کئی سال بعد وہ حیدر آباد کی "ورلڈ ہیومر کانفرنس" میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور ایک سنجیدہ اجلاس کی شاید صدارت بھی کی۔ (مزاح سے ایک تنقید نگار کا اتنا تعلق مزاح کے لیے بہت کافی ہے) دلی میں ان سے ایک مرتبہ کسی سیمینار کم عشائیہ میں بھی ملاقات ہوگئی۔ کھانے کی میز تک رسائی آسان نہیں تھی میں قطار میں ان کے پیچھے تھا۔ اتفاق ہے، ورنہ ان کا پیچھا کون کر سکتا ہے۔ انھوں نے مجھے

'بیرونی مہمان' جان کر مجھے اپنی صف میں میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ سے آگے کر دیا (ان کے آگے بھلا کون جاسکتا ہے) میں نے عرض کیا آپ نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا ہے اب مجھے کسی نہ کسی ایوارڈ کے ملنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ذکی الحس بھی ہیں اور بے حد ذو فہم بھی۔ بولے دور سے پتھر پھینکتے ہو، مسکرائے بھی اتنے کہ پیشانی تک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اردو میں خندہ جبیں لوگ ہیں ہی کتنے (صرف چند) مجھ میں اور ان میں یہی ''خندیدگی'' شاید وجہ اتصال ہو ورنہ وہ ٹھہرے 'ساختیات' کے موجد و مبلغ اور میں شکست وریخت کا مقلد و نقیب۔ یہ اور بات ہے کہ میری آواز طوطی کی آواز ہے۔

گوپی چند نارنگ اپنی علمی اور ادبی کے علاوہ ثقافتی بلند و بالا فتوحات کے باوجود بڑے رکھ رکھاو کے آدمی ہیں۔ (جسے جہاں رکھنا ہے رکھ دیتے ہیں) مہذب اور بردبار (بار تو دوسروں پر پڑتا ہے) میں ان سے بہت زیادہ نہیں ملا ہوں لیکن میں نے دیکھا بھی ہے اور سنا بھی ہے کہ وہ کسر نفسی پر کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ کسی سخت بات کا جواب بھی دیتے ہوں تو اس انداز سے جیسے دہی کو لسی میں منتقل کر رہے ہوں یا دودھ کو ملک شیک میں (سب کو ہلا دیتے ہیں) معترض یا مخاطب کے اشتعال کو انفعال میں اس کی تعزیز کو تقطیر میں اور خود پر لگائی گئی فرد جرم کو مدعی کے فرد حساب میں بدل دینا وہ بھی اس طرح کہ مشرقی آداب پر خراش تک نہ آئے گوپی چند نارنگ کا فن یا گر نہیں ان کا مزاج ہے۔ ان کے مصالح انتظامی بہت ہیں لیکن ان کی صلح جوئی مقدار میں مصالح کی تعداد سے زیادہ ہے

گوپی چند نارنگ نے ایک محفل میں نارنگ کے معنی یہ بتائے کہ نارنگ وہ جس پر کوئی رنگ نہ چڑھ سکے چونکہ یہ ان کے قول کے مطابق لغوی معنی ہے اس لیے میں مان لیتا ہوں لیکن ان پر اردو کا جو رنگ چڑھا ہے (اور دن بدن گہرا ہوتا جارہا ہے) اس سے وہ کیسے انکار کریں گے۔ وہ ہر جگہ خواہ وہ مقام دنیا کے نقشے میں ہو یا نہ ہو۔ اسی رنگ میں رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب اتفاق نہیں ہے ایک (خوش گوار) حادثہ ہے کہ میری ان سے شکاگو میں بھی ملاقات ہو گئی اور مجھے وہاں ان کے 'اعزاز' میں منعقدہ ایک جلسے میں شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ موضوع تھا امیر خسرو کی پہیلیاں۔ حیدر آباد دکن کے حبیب صاحب نے جو امیر خسرو سوسائٹی کے سربراہ ہیں اس جلسہ کا انعقاد کیا تھا (جلسہ کم لنچ) اور اس موقع پر گوپی چند نارنگ کی تصنیف کی رونمائی کی رسم انجام دی گئی تھی۔ گوپی چند نارنگ (حسب معمول) بہت خوش تھے اور مجھ سے مل کر تو اچنبھے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اتنی گرم جوشی سے ملے کہ مجھے اکبر الہ آبادی کا وہ شعر یاد آگیا جو انھوں

نے مئی اور جون میں پڑنے والی گرمی کے بارے میں کہا تھا (ظاہر ہے جل بھن کر کہا ہوگا) میں نے محسوس کیا (اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے) کہ گوپی چند نارنگ کو امیر خسرو کی ذات اور خاص طور پر ان کی پہیلیوں سے قلبی لگاؤ ہے باوجود اس کے کہ وہ "جدیدیت" کے قلم بردار رہے ہیں۔ (علم بردار میں نے نہیں کہا اس لیے کہ وہ کوئی اور ہیں علم بردار ہونے کے لیے صرف علم درکار ہوتا ہے علم نہیں) گوپی چند نارنگ کے اس 'رنگ ڈھنگ' سے کون انکار کرے گا کہ کسی بھی نظر سے ان کا اختلاف خواہ کتنا ہی شدید اور کہنہ ہو اتنا ڈھکا چھپا رہتا ہے کہ غالب یاد آجاتے ہیں۔

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے ایک شکن پڑی ہوئی اندر نقاب کے

ایک بات میں نے اور بھی محسوس کی کہ گوپی چند نارنگ دہی صلاحیتوں کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ اکتسابیات' کے قائل ہیں۔ میں حتی الامکان خود کو (اپنی استعداد کی بنا پر) علمی مسائل سے الگ تھلگ رکھتا ہوں لیکن نادانستہ طور پر ابھی حال ہی میں میں نے کہیں ان کا ایک بیان پڑھ لیا جس سے مجھے یہ شبہ ہوا کہ وہ فطری ذوق وغیرہ کی بات کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنی کہ [illegible] عقیدے والے لوگ دیتے ہیں اور اس عام رسم کے بر خلاف وہ یعنی گوپی چند نارنگ ہر سعادت کو "زور بازو" کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اب تک اپنے اس خیال پر بدستور قائم ہیں تو یہ ان کی ثابت قلمی ہے (آپ اسے کرافٹنگ کہیے میں اسے گرافٹنگ کا نام دینا چاہتا ہوں کا) یوں دیکھا جائے تو ان کے اس خیال کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سابق میں جو ہونا تھا وہ ہو چکا لیکن اب آئندہ کوئی "پیدائشی شاعر" نمودار نہیں ہو سکے گا۔ ایک لحاظ سے یہ خوش آئند بات ہے اور ساختیات کے حق میں جاتی ہے۔ میں نے کسی زمانے میں فارسی پڑھی تھی اور "تانہ بخشد خدائے بخشندہ" کے الفاظ مجھے اب بھی یاد ہیں اس لیے یاد ہیں کہ یہ الفاظ غالب کے اس شعر کے اردو شعر کے مقابلے میں بدرجہا آسان ہیں جس میں وہ فرماتے ہیں۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

تیسری بات جو میں نے محسوس کی ہے یہ ہے کہ گوپی چند نارنگ کو بھی تسبیح ہاتھ میں لیے بغیر 'بیک کف بردن صد دل' کا گر آتا ہے (گو کہ غالب نے اسے تماشا کہا ہے) میں کس گنتی میں ہوں لیکن اگر کسی شمار میں ہوں تو وہ یہی سو دلوں والی گنتی ہے کہ میرا دل بھی

اس میں شامل ہے۔ اب وہ خود سو(۱۰۰) تک نہ گن پائیں تو بات اور ہے۔ درمیان میں تو میں آنے سے رہا۔

گوپی چند نارنگ کو جب حال مال میں ساہتہ اکادمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تو میرے ذہن میں ایک ناشائستہ خیال یہ بھی آیا کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ لیکن میں نے فوراً اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ اردو تہذیب اس قسم کے ناقص خیالات کی اجازت نہیں دیتی۔ البتہ یہ بات سمجھنے سے میں قاصر ہوں کہ اس معاملے میں "باعث تاخیر" کیا مسئلہ تھا۔

گوپی چند نارنگ کو میں اس وقت یعنی بروقت مبارک باد نہیں دے سکا اب دے رہا ہوں۔ اتنی دیر سے جو یقیناً نادرست ہے۔

کتاب نما کے خصوصی شمارے

شمس الرحمٰن فاروقی نمبر	مرتبہ احمد محفوظ	۸۰/
اردو افسانہ بمبئی میں	مرتبہ الیاس شوقی	۵۱/
معیث الدین فریدی نمبر	مرتبہ ظہیر احمد صدیقی	۴۵/
خواجہ حسن نظامی نمبر	مرتبہ نثار احمد فاروقی، ریحان احمد عباسی	۷۵/
عبدالوحید صدیقی نمبر	مرتبہ پروانہ ردولوی	۵۱/
غلام ربانی تاباں نمبر	مرتبہ اجمل اجملی	۷۵/
اختر سعید خاں نمبر	مرتبہ ڈاکٹر سید حامد حسین	۵۱/
نثار احمد فاروقی نمبر	مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	۵۱/
پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر	مرتبہ شہریار / ابوالکلام قاسمی	۶۰/
ڈاکٹر خلیق انجم نمبر	مرتبہ ایم حبیب خاں	۹۰/
خواجہ احمد فاروقی	مرتبہ خلیق انجم	۴۵/
حامد علی خاں	مجتبیٰ حسین	۴۵/
پروفیسر مسعود حسین خاں	مرتبہ ایم حبیب خاں	۴۵/
ڈاکٹر اجمل اجملی	مرتبہ علی احمد فاطمی / عذرا حبیب	۴۵/
فرمان فتح پوری نمبر	مرتبہ مجتبیٰ حسین	۲۵/
سردار جعفری نمبر	مرتبہ ڈاکٹر رلیعہ شبنم عابدی	۴۵/
صالحہ عابد حسین نمبر	مرتبہ عزیز قریشی	۴۵/
نئی نظم کا سفر	مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی	۴۵/
مشرقی علوم و دانش پر تحقیق	حامد حسین	۳/۰
پریم چند نمبر	عبدالقوی دسنوی	۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر	کرنل بشیر حسین زیدی	۱۶/

مولانا صبر محمد خاں شباب نمبر	ادارہ	۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر	مرتبہ عبدالقوی دسنوی	۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر	ساحر ہوشیارپوری	۵/۵۰
جگن ناتھ آزاد نمبر	مرتبہ ایم حبیب خاں	۵۱/
عرش ملسیانی نمبر	مالک رام	۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر	یوسف ناظم	۲۵/
قدسیہ زیدی نمبر	کرنل بشیر حسین زیدی	۲۵/
لغت نویسی کے مسائل نمبر	پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/
عبداللطیف اعظمی نمبر	ادارہ	۱۸/
مشفق خواجہ نمبر	مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم	۳۰/
جائزے	مرتبہ مظفر حنفی	۲۵/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

عبارت کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۵/-
انشا اور تلفظ	رشید حسن خاں	۱۲/-
بیامی قواعد اردو	طلبہ ایڈیشن	۳/-
بیامی قواعد اردو	کلاں	۶/-
بیامی اردو انگریزی ڈکشنری		۱۶/-
ہمارے محاورے	سیلی پریمی	۱۲/۵۰
کہاوت اور کہانی	سیلی پریمی	۸/-
مختصر اردو لغت		۲۵/-
فرہنگ عامرہ		۶۰/-
فیروز اللغات	درمیانی	۲۵/-

حکیم محمد حسین خان "شفا"
جیل روڈ ر۔ رام پور۔ یوپی

رام پور کا ادبی پس منظر

"رام پور کو یہ فخر حاصل ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعد وہ زبان اردو کا تیسرا مرکز بنا رہا۔ اس نے ادبیات کو اپنے گہوارہ تربیت میں پرورش کیا۔ ہندوستان کو جن شعرا و ادباء پر فخر و ناز ہے ان میں سے اکثر کا تعلق رام پور سے رہا"

یہ نواب رام پور رضا علی خاں کے ایک فرمان کا اقتباس ہے لیکن اس کی صداقت کو اکثر اہل قلم تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ رام پور کیا ہے؟ گہوارہ علوم و فنون کیوں بنا؟ ادبا و شعرا سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا رہی؟

رام پور روہیلہ پٹھانوں کی یادگار ہے جنھوں نے ایک زمانے تک ہمالہ کی طرح ہندوستان کی پاسبانی کی اور افغانستان سے بیرونی حملہ آوروں کو سرحد ہند میں آنے سے روکا اور جب بھی ضرورت پڑی سر زمین ہند کو اپنے خون سے سینچا۔ یونانیوں، مغلوں اور انگریزوں سے بارہا لوہا لیا، ایک زمانے میں ان کا آبائی وطن افغانستان دشمن کے قبضہ میں پہنچ گیا تو یہ اطراف ہند میں پھیل گئے۔ چونکہ کٹھیر میں ان کی جمعیت زیادہ تھی اس وجہ سے یہ علاقہ روہیل کھنڈ کہلانے لگا۔ جہاں ۱۷۱۹ء سے ۱۷۷۴ء تک روہیلے بلا شرکت غیر حکمراں رہے۔ ان کا پایۂ تخت "آملہ"۔ "فیض گنج" اور تجارے ہند" مشہور تھا۔ جبکہ اس زمانے میں بدامنی' بد حالی اور بحرانی کیفیت پورے ملک میں عام تھی۔ خاندان مغلیہ دم توڑ چکا تھا۔ جانشینی کے لیے مختلف طاقتیں دست و گریباں تھیں۔

دہلی پر انگریزوں کا عملی تسلط ہو چکا تھا۔ جس کا نقشہ اس عہد کے شعرا کے شہر آشوبوں میں بڑی سچائی کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً شاہ کمال الدین کمال کہتے ہیں :

وہ ہی یہ شہر ہے اور وہ ہی ہے یہ ہندوستان
کہ جس کو رشک جناں جانتے ہیں سب انسان
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہونگے سب ویران
نظر پڑے ہے بس اب صورت فرنگستان
نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

[redacted]

معاشی بدحالی اور دہلی سے اہل کمال کی ہجرت کا بیان مصحفی کے یہاں بڑے دردناک طریقہ سے ملتا ہے وہ کہتا ہے :

کہتی ہے اسے خلق جہاں سب شہ عالم | شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے
احوال سلاطین کی لکھوں کیا میں خرابی | جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہ رمضاں ہے
گل جاتے زباں میری کروں ہجو گراں کی | یہ تنگ معاشی کا سلاطین کی بیاں ہے

باشندہ جووان کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے
ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

دہلی اجڑ رہی تھی اہل کمال کے قافلے تلاش معاش میں اودھ، روہیل کھنڈ اور دکن کو رواں دواں تھے اس وقت روہیلہ پایۂ تخت آملہ کے قریب ایک چھوٹی سی ٹانڈہ نامی بستی میں اہل کمال کی سرپرستی صاحبزادہ محمد یار خان امیر فرما رہے تھے امیر نے سودا کو ٹانڈہ بلایا اور ملازمت کی پیش کش کی جب وہ نہیں آئے تو شاگرد سودا و میر درد قائم چاند پوری کو سو روپیہ ماہوار کا اپنے پاس ملازم رکھا۔ مصحفی کو مہمان بلایا اور وظیفہ مقرر کیا۔ سیکڑوں فنکاروں کی پرورش کی۔

دہلی اور اودھ کے درمیان روہیلہ خود مختار حکومت کہ جس کی عسکری حیثیت بھی تھی اور علمی بھی۔ انگریزوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ انھوں نے ایرانی النسل شاہان اودھ کو ساتھ لے کر ۱۷۷۴ء اور ۱۷۹۴ء میں زبردست حملہ کر کے روہیلہ فوجی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ یہ جنگیں تاریخ اردو ادب میں یادگار ہیں۔ سودا، میر تقی میر، غلام جیلانی رفعت، مقامی کھڑی بولی کے شاعر بروہی وغیرہ کی ان معرکوں سے متعلق منظومات ہیں۔ لوک گیتوں اور چہار بیتوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ جن میں روہیل کھنڈ کی قومی لڑائیوں کا تفصیلی بیان ہے۔

روہیلوں کی امن پسند اور غیر فوجی طبقہ سے انگریزوں نے ۷ / اکتوبر ۱۷۷۴ء کو ایک معاہدہ کر لیا جس کے تحت اندرونی خود مختار ریاست رام پور وجود میں آئی۔ انگریزوں نے ان کے لیے سارے اسباب تعیش فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ نوابین نے "فرزند دل پذیر دولت انگلشیہ" بننا قبول کر لیا اور بقول جرات م ۱۲۲۵ھ روہیلے بھی ان نام نہاد امیروں میں شامل ہو گئے۔

سمجھیں نہ امیر ان کو اہل توقیر | انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں | بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

اس معاہدہ کے ساتھ روہیلہ تاریخ کا عہد ہندوستان ختم ہو گیا اور عہد "چنگ رباب" شروع ہو گیا۔ جس کی ابتدا صاحبزادگان علی محمد خان سے ہوئی۔ سعد اللہ خان م ۱۷۶۱ء کے بارے میں تاریخ میں مذکور ہے۔

وہ بے مثل گانے بجانے میں تھے۔ عدیم النظر اس زمانے میں تھے اس عہد کے مشہور موسیقار اور شاعر ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ جنکا مختلف تذکروں میں ذکر ہے۔

صاحبزدگان علی محمد خاں عبداللہ م ۱۷۶۷ء صاحب دیوان شاعر تھے۔ آزاد مبتلا' عاصی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دربار میں میر حسن کے چھوٹے بیٹے میر فیض علی اشعار نویسی کی خدمت پر مامور تھے۔ افسوس لکھنوی نے مصلحتاً' تذکرہ میر حسن' میں ان کا نام نہیں لکھا ہے۔ صرف یہ تحریر کر دیا ہے۔

چار بیٹے فضل الٰہی سے اس کے اب تک موجود ہیں۔ تین شاعر ہوئے مسعود حسن رضوی ادیب نے عدم علم کی بنا پر چوتھے بیٹے کا انکار کیا ہے۔ جبکہ رضا لائبریری میں عبداللہ خان کا دیوان مرتبہ میر فیض علی بن میر حسن دہلوی موجود ہے۔

رام پور کی باضابطہ علمی تاریخ و ادب نوازی کا دور صاحبزادے محمد یار خان امیر م ۱۷۷۴ء کے ٹانڈہ محمد نگر سے رام پور میں قیام پذیر ہونے سے شروع ہوا ہے۔ امیر کی زندگی مختلف نشیب و فراز سے گزری تھی۔ وہ اہل کمال کے دکھ درد اور ضروریات' مزاج کو خوب جانتے تھے۔ انھوں نے اپنا کل سرمایہ شعراء و ادباء کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ امیر کو اپنی قومی شکست کا احساس بہت شدید تھا جو ان کے کلام سے ظاہر ہے

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن | مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے | ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا

امیر کی دیکھا دیکھی دیگر روہیلہ سرداروں نے بھی اجداد کے ٹوٹے ہوئے نیزوں سے قلم اور شکستہ خنجروں کے قلم تراش اور ڈھالوں کی دف بنا کر نغمہ نشاط اور خدمت علم

وفن میں وقت گزاری شروع کر دی۔ اور چند سالوں میں رام پور گہوارہ علم و فن کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ رام پور کی ادبی تاریخ کو کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دور اول روہیلوں کی کٹھیر میں آمد سے نواب احمد علی خاں دازم ۱۸۴۰ء تک تقریباً ایک صدی کو محیط ہے۔

اس عہد میں ہمیں خالص پشتو کے فنکاروں کی کافی بڑی جماعت ملتی ہے جن کے یہاں نظم و نثر کے شاہ کار ہیں۔ ان میں ایسے بھی فنکار اور ان کی نگارشات ہیں جو یک لسانی ہیں۔ اور ایسے بھی جو پانچ' چھ زبانوں کے ماہر ہیں۔ حسن اتفاق سے کچھ چہار بیتیں محفوظ ہیں جن کا ایک بند یا مصرع پشتو ہے۔ ایک فارسی ایک عربی اور ایک ہندی یا اردو میں ہے۔ مشترکہ زبان کے بھی موجود ہیں۔ اس عہد کی سب سے بڑی خصوصیت "اردو پر پشتو کے اثرات" ہے روہیل کھنڈ کی زبان کا دیگر علاقوں کی زبان سے امتیاز اور اردو شاعری کا افغان لہجہ و مزاج ہے۔ اس علاقے کی اردو شاعری نے عام رنگ فارسی سے غیر شعوری طور پر اپنے واسطے راستہ بنایا جس میں انکساری' فرو تنی' خوشامد' منت' سماجت' پست ہمتی' اضمحلال انتقال اور پیر اندازی ——— افغانوں کے اثر سے ——— پختو ہمت و حوصلہ جرات و شجاعت بیباکی بے رحمی مقابلہ و محاربہ کی سکت جیسے اطوار پیدا ہو گئے یہ خصوصیات عام اصناف سخن سے زیادہ چہار بیتوں میں نمایاں تھیں۔ یہ صنف سخن عموماً کم پڑھے لکھے لوگوں کی دل بستگی کا ذریعہ رہی ہے۔ پشتو چہار بیت پر مسٹر ڈار فرانس نے ۱۸۸۸ء میں کام کیا اور پہلا مجموعہ "بارو بہار" کے نام سے شائع کیا اردو میں صبر استاد کا قابل قدر کام ہے۔ آپ نے چہار بیت "نوازش رضا" کے نام سے اور قدیم و جدید چہار بیتوں کے مجموعہ پانچ شاہانہ کے عنوان سے جمع کر دیے ہیں جو سب کے سب قلمی ہیں۔ تاریخ تمدن و لسانیات میں ان عوامی لوک گیتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ رام پور اسکول کے نمائندہ شاعر اور جملہ رام پوری خصوصیات کے حامل دور اول میں عنبر شاہ خاں آشفتہ اور دور آخر میں شاد عارفی ہیں۔

براہ کرم اپنے مضامین کی فوٹو کاپی ہرگز نہ بھجوائیں اس کا پڑھنا پریس کے لیے دردِ سر بن جاتا ہے۔ (ادارہ)

جناب نورالحسن جعفری (سابق صدر انجمن ترقی اردو پاکستان) کے انتقال پر

جناب سیّد ضمیر جعفری کا خط ادا جعفری کے نام

ادا بہن! السلام علیکم

میں نے ایک خط لکھا تھا۔ ملا ہوگا۔ ایک روز رات کے وقت فون پر بھی رابطے کی کوشش کی مگر فون پر کوئی جواب نہ ملا۔ فون نمبر جو نور بھائی میری کاپی پر خود لکھ گئے تھے یہ تھا۔ ۵۲۳۳۰۲ ۴۔ طارق امراؤ صاحب کا خط آیا ہوا ہے کہ میں نور مرحوم کے بارے میں اردو زبان کے خصوصی شمارے کے لیے کچھ لکھوں۔ اور میری حالت یہ ہے کہ ٹریفک کے حادثے کے باعث جو نومبر میں پیش آیا ابھی تک بستر پر معذور پڑا ہوں۔ ٹانگ پلستر سے بندھی ہے اور ہم ٹانگ سے بندھے ہیں۔ ہاتھ بیشک کام کرتے ہیں مگر اب اندازہ ہوا کہ ٹانگ بھی لکھنے کے معاملے میں ٹانگ اڑا دیتی ہے۔ ادھر مہلت بے حد کم۔ میں تو بوکھلا گیا ہوں۔ جذبات کے ایک سیل سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ آپ دونوں پوٹھوار کے واسطے سے چالیس برس تک ہماری زندگیوں میں شامل رہے۔ نور مرحوم اپنی ذات میں قومی یکجہتی کے ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے پوٹھوار کے ٹیلوں اور پتھروں کو جس محبت سے قبول کیا۔ ہمارے معاشرے میں اس کی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ آپ اتنے کراچی کے نہیں تھے جتنے راولپنڈی کے تھے۔ تسلسل کے خیال سے وہ پیچھے دیکھتے ضرور تھے مگر پیچھے دیکھنے کے عادی نہ تھے۔ طبیعت میں مزاح کا ایک قدرتی چشمہ چھلکتا تھا۔ ان کی گفتگو بے حد دلچسپ ہوتی۔ چند مضامین جو اُن کے قلم سے نکلے ہلکے پھلکے روپ کی آبرو سمجھے جائیں گے۔ بالخصوص ان کے خاکے۔ خط بھی دل کو جذب کرنے والا ہوتا۔ ان کے مضامین اور خطوط کو یکجا کر کے محفوظ کرنا۔ اس دور کا ایک تہذیبی قرض ہے۔ وہ اختلاف کرتے تھے مگر پیرایہ ہمیشہ ہمدردانہ اور شائستہ ہوتا تھا۔ ہاں ارباب اقتدار سے کرخت بھی ہو جاتے۔ جن دنوں حکومت کے "اسٹیبلشمنٹ ڈویژن" کے سکریٹری کے اہم منصب پر فائز تھے مجھ سے بریگیڈیر صدیق سالک نے جو صدر ضیاءالحق کے پریس سکریٹری تھے اور ان کے مزاج میں خاصے دخیل بھی، ایک روز بتایا کہ تمہارا دوست نورالحسن جعفری تو خاصا کھردرا آدمی ہے۔ وہ صدر مملکت کے احکام میں بھی مین میخ نکالنے سے باز نہیں آتا۔ مثال کے طور پر سالک نے بتایا کہ صدر ضیاءالحق، مسٹر منظور الٰہی کو "کھڈے" ندی سے نکالنے کے حق میں نہ تھے۔ مگر نورالحسن جعفری ان کو پبلک سروس کمیشن کا ممبر بنوانے پر اتنے بضد ہیں کہ صدر کے قطعی انکار کے باوجود ان کے حق میں "سمریاں" پر "سمریاں" بھیجتے رہتے ہیں۔ جناب نورالحسن جعفری اقتدار و اختیار کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہے مگر طبعاً وہ گھوڑے ہاتھی کے آدمی کبھی نہ رہے۔ سب سے زیادہ راحت وہ حلقۂ یاراں کے غیر رسمی ماحول میں محسوس کرتے۔ میں نے جب "سلسلہ" کے اجلاس کو اپنے گاؤں میں مدعو کیا تو آپ نے بس ایک ہی تاکید کی تھی کہ کھانے میں

سرسوں کے ساگ اور گھر کے مکھن کے سوا کچھ نہ ہو۔ اردو کے صاحب طرز اور منفرد مزاح نگار جنرل شفیق الرحمن کے بارے میں یہ بات عام مشہور ہے کہ ان کا جتنا وزن اس وقت تھا جب وہ "سکنڈ لفٹننٹ" تھے اتنا ہی وزن اس وقت تھا جب وہ میجر جنرل کے رینک سے ریٹائر ہوئے۔ نورالحسن جعفری مرحوم کے بارے میں ہم یہ بات ذاتی مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ جتنے منکسر ملازمت کے پہلے افسری زینے پر تھے اس سے کہیں زیادہ منکسر اُس کی آخری چوٹی پر تھے۔ ان کا ذہن تبدیل ہوتا رہا۔ طرز زندگی کبھی تبدیل نہ ہوا۔ اپنی ذاتی رائے کو انھوں نے اصول کے تقاضوں پر کبھی حاوی نہ ہونے دیا۔

ان سے آخری ملاقات یاد آرہی ہے۔ وہ نومبر ۱۹۹۵ء کے آخری ہفتے میں ادیبوں اور دانشوروں کی بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے اسلام آباد آئے تو ۳ر دسمبر کو گیارہ بجے میری عیادت کے لیے تشریف لے آئے اور تقریباً دو گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہے۔ میں نے اس روز ڈائری میں اس ملاقات کا جو حال لکھا ہے وہ ذیل میں ان اوراق سے نقل کرتا ہوں۔

"آج کا دن کس قدر سیاہ ہے۔ رات کے خبرنامے میں ٹیلی وژن نے یہ المناک خبر نشر کی کہ جناب نورالحسن جعفری کا انتقال ہوگیا۔ دل کا دورہ جو اچانک پڑا جان لیوا ثابت ہوا۔ میں تو سکتے میں آگیا۔ مجھے اس خبر پر یقین نہیں آرہا تھا۔ آج ہی صبح گیارہ بجے سے پونے دو بجے تک تو وہ میرے پاس موجود رہے اور کتنے ہشاش بشاش تھے۔ ماکولات جو میز پر چنی تھیں آپ چنے کی کھیلیں اور آخروٹ کے مغز رغبت سے کھاتے رہے۔ میں نے اسی وقت افتخار عارف سے رابطہ کیا۔ انھوں نے کہا "خبر درست ہے کاش یہ غلط ہوتی"۔ انھوں نے بتایا کہ میت کراچی بھجوائی جاچکی ہے۔ میں نے پوچھا "تو کانفرنس میں تشریف آوری ہوئی ہے"۔ بولے "بلوایا تو آگئے"۔ ہم نے جمیل الدین عالی کے بارے میں پوچھا کہ سنا ہے وہ نہیں آئے" فرمایا۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ نہ انھوں نے مجھ سے کہا مگر میرا اندازہ ہے کہ ان کو ایک عام مندوب کی حیثیت سے شرکت پسند نہ تھی"۔ آپ نے جمیل الدین عالی کے مقام و منزلت کے دفاع میں ان کے جشن کے حوالے سے جو اٹھارہ نومبر ہی کو منایا گیا تھا، کہا "ملک کی کون سی ایسی اہم شخصیت تھی جس نے عالی جس کی ادب میں تخلیقی اور ادب اور ادیبوں کی بہبود کے لیے ان کی طویل اور بے لوث خدمات کو خراج تحسین پیش نہ کیا"۔ اتفاقاً میں اس وقت آپ ہی کی خود نوشت (جو رہی تو (سو) بے خبری رہی) پڑھ رہا تھا۔ میں نے کتاب کی تعریف کی اور آپ کی نثر نے تو مجھے واقعی مسحور کر رکھا تھا۔ میں نے جب ان سے کہا کہ ادا جعفری تک میرے تاثرات پہنچا دیجیے گا تو ہنس کر بولے "آپ ان کو خود ہی لکھیے۔ وہ بہت خوش ہوں گی"۔ کراچی کے حالات پر بہت آزردہ تھے۔ کہہ رہے تھے کہ پنجاب اور سرحد اور بلوچستان کے ادیبوں کی تقریباً کا کراچی میں اور کراچی کے ادیبوں کی تقریبات کا اہتمام پنجاب میں ہونا چاہیے۔ اسی سے دل درشن کی فضا نکھرے گی"۔ منشا یاد اور مجھے وہیں دعوت دی کہ ہم عنقریب آپ دونوں کو کراچی بلا رہے ہیں۔ آپ سے مقالے کی فرمایش بھی نہیں ہوگی۔ آپ بیشک کوئی بات بھی نہ کریں۔ ہم آپ کا درشن کریں گے۔

اگلے روز اسلام آباد میں کرنل اعتزاز عظیم کا اچانک کرکٹ کھیلتے کھیلتے انتقال ہوگیا تھا۔ ان کے خاندان سے نور کے خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ جب ان کے والد سردار عظیم اللہ آباد میں چھاؤنی کے ایگزیکیٹو افسر تھے۔ کرنل اعتزاز کے انتقال کی خبر بھی یہیں جعفری صاحب نے دی۔ بتایا کہ ان کا آج رات کا کھانا اعتزاز مرحوم کے

بڑے بھائی جنرل اعجاز سلیم کے ہاں تھا۔ باتوں باتوں میں جب خاصا وقت گزر گیا تو اچانک گھڑی دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ارے مجھے تو اعتزاز کے جنازے پر جانا ہے" اور جذبات کے ایک بھرپور لمس والے گرم گرم ہاتھ سے معانقہ کر کے ہولے ہولے قدم اٹھاتے دروازے سے نکل گئے۔ وہ لیمنے گرم سوٹ میں بہت پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ وہ میرے گھر کے دروازے سے اب کبھی نہیں نکلیں گے۔ مگر میں تو انھیں ہر روز دن کے پونے دو بجے اپنے گھر کے اس دروازے سے نکلتا دیکھتا ہوں۔ انھوں نے گلہ بھی کیا تھا کہ تم کراچی آتے ہو تو ملتے نہیں ہو۔ کراچی میں ان کے ہاں حاضری کو ہم "محبت کی یاترا" سمجھتے ہیں۔ البتہ گذشتہ دو ایک مرتبہ واقعی کوتاہی ہو گئی۔ معذرت کے ساتھ وجہ بھی بتائی کہ ہماری ٹیلی فون کاپی کھو گئی تھی۔ آپ نے اس پر ہماری نئی کاپی پر جو سامنے ہی رکھی تھی اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر لکھ دیے۔ یہ میرے پاس ان کی آخری تحریر ہے۔ کچھ پہلے خط پوٹھوار کے لیے ان کی شیفتگی کا ذکر ہوا۔ اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسوں کی پتوار ہی ہمارے پوٹھوار کی ہواؤں کے سپرد کر گئے۔

ادا بہن!

میں تو معذرت کا مختصر سا خط لکھنا چاہتا تھا اور لکھنا یہ چاہتا تھا کہ تفصیلی اور باقاعدہ مضمون بعد میں لکھوں گا۔ بہرحال اگر "اردو زبان" میں یہ سطور شامل ہو جائیں تو میں اپنی ارادت کی کچھ تشفی کا وسیلہ سمجھوں گا۔ ہماری ٹانگ تو خیر ساکت تھی ہی ہاتھ میں بھی لغزش ہے۔ اسی لیے جناب طارق امراؤ سے گزارش ہے کہ میری بے ربطی اور نظم شکستگی کے شگافوں کو اپنے قلم سے ڈھانپ دیں۔

مجتبیٰ حسین

حیدرآباد "سیاست" اور مشفق خواجہ

برصغیر کے ممتاز محقق، دانشور، ناقد اور سب سے بڑے ادبی کالم نگار مشفق خواجہ ہمارے کرم فرما ہیں ان کے اندازِ کرم کے بارے میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یہ کرم فرماتے ہیں تو لگتا ہے ستم فرما رہے ہیں۔ ان کے مزاج میں سنجیدگی کا پہلو تو ہوتا ہی ہے بسا اوقات ان کی سنجیدگی میں بھی مزاح کا پہلو نکل آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے بیشتر ادیب اور شاعر ان سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ ہمیں کراچی سے ان کا ایک تفصیلی خط ملا ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد اور "سیاست" کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس خط میں ذکر تو ہمارا بھی ہے لیکن اپنے ذکر کو چھوڑ کر ہم ان کے خط کے وہ اقتباسات پیش کر رہے ہیں جن میں حیدرآباد اور "سیاست" کا ذکر ہے۔ ہم نے پچھلے سال ان کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا اس کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

"آپ اپنے نیازمندوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اس میں آپ کا اتنا دخل نہیں جتنا حیدرآبادی وضع داری کا ہے۔ حیدرآبادی وضع داری کا میں بڑا ناقبیل ہوں۔ ابراہیم جلیس، مرزا ظفر الحسن، خواجہ حمید الدین شاہد، خواجہ معین الدین، صمدانی نقوی، حبیب اللہ رشدی اور نہ جانے کون کون تھے اور رہے کہ جن سے تعلقات کی بنا پر میرے دل میں حیدرآباد کی محبت پیدا ہوئی۔ بہت جی چاہتا ہے کہ اس دیارِ رنگ و بو کو دیکھوں۔ آپ نے تو دس سال پہلے اس کا انتظام کر دیا تھا مگر میں مہمان بن کر نہیں جانا چاہتا۔ گدائے کوچہ گرد کی حیثیت سے ان گلیوں میں گھومنا چاہتا ہوں جہاں کی خاک کبھی میری محبوب ترین ہستیوں کے قدموں سے لپٹی ہے۔ دیکھیے حیدرآباد دیکھنے کی خواہش کب پوری ہوتی ہے۔

"سیاست"، کبھی کبھی غالب لائبریری کے نام آتا ہے۔ میں نے ان لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ سب سے پہلے یہ اخبار میں پڑھوں گا۔ بند پیکٹ میرے پاس آجاتا ہے۔ آپ کا کالم تو میں سب سے پہلے پڑھتا ہوں اور پھر ان صفحات کو جن میں حیدرآباد سے متعلق مضامین اور خبریں ہوتی ہیں۔ وہ خبریں بھی پڑھ ڈالتا ہوں جو خالص مقامی ہوتی ہیں اور وہ اشتہار بھی جو ساریوں اور جوتوں کی دکانوں کے ہوتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ نیشنل ایگ کوارڈی نیشن کمیٹی کا وہ اشتہار بھی جس میں انڈوں کے نرخ ہوتے ہیں، بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں اور اہلِ حیدرآباد پر رشک کرتا ہوں کہ اس گرانی کے زمانہ میں بھی انھیں اتنے سستے انڈے کھانے کو ملتے ہیں۔"

پرانے قصوں میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ قصّہ گو پہلے تو قصّہ بیان کر دیتا تھا اور اس کے بعد قصّہ

سننے والے پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ پہلے یا تو وہ رو دیتا تھا اور بعد میں ہنسنے لگتا تھا یا پھر پہلے ہنس دیتا تھا اور بعد میں رونے لگتا تھا۔ اس پر قصہ بیان کرنے والا سامع سے بیک وقت ہنسنے اور رونے کے اسباب دریافت کرتا تھا اور سامع حسب توفیق اس کی توضیح و تشریح کر دیتا تھا۔ مشفق خواجہ کے خط کو پڑھ کر ہم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ پہلے تو ہم اس خط کو پڑھ کر خوش ہوئے کہ مشفق خواجہ کو حیدرآباد سے بے پناہ محبت ہے اور وہ حیدرآبادی وضع داری کے قائل اور قتیل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے دل میں ان کے اس جملہ کو پڑھ کر دکھ کی ایک لہر بھی اٹھی کہ "اس میں آپ کا اتنا دخل نہیں جتنا حیدرآبادی وضع داری کا ہے"، گویا انھیں ہم میں جتنی خوبیاں نظر آتی ہیں (بشرطیکہ نظر آتی ہوں) وہ ہماری اپنی نہیں بلکہ حیدرآباد کی ہیں۔ ہم تو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ خوبیاں ہم میں اپنے طور پر موجود ہیں لیکن اب مشفق خواجہ نے ہماری ان خوبیوں کو بھی "حیدرآباد" کے خانہ میں ڈال دیا ہے یعنی اگر ہمارے اندر سے حیدرآبادی وضع داری کو نکال دیا جائے تو ہم کچھ بھی نہیں ہیں اور ہم دنیا کے کسی بھی شہر کے باشندے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ خیر مشفق خواجہ ہمارے کرم فرما ہیں اور ہم ان کی تحریر کے حسن کرشمہ ساز کے قائل ہیں۔ اسی لیے تو ہم ان کی کسی بھی بات کا بُرا نہیں مانتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی بات کا بُرا مانتے ہیں ان کا حشر ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہر کس و ناکس کو پکڑ پکڑ کر مشفق خواجہ کے جملوں کا مطلب پوچھتے پھرتے ہیں۔ مشفق خواجہ جہاں دیدہ آدمی ہیں اور کراچی جیسے ظالم شہر میں رہتے ہیں۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اچھا شہر وہی ہوتا ہے جو باہر آباد نہ ہو بلکہ اس میں بسنے والوں کے دلوں میں بھی آباد ہو۔ مگر اب شہر دلوں میں کم بسنے لگے ہیں۔ مشفق خواجہ نے جس حیدرآباد سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہ حیدرآباد اب بھی کچھ لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہو تو ہو، ہمیں تو یہ اب کم ہی نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم اپنی حیدرآبادی وضع داری کو برقرار رکھنے کے لیے ہی تو پچھلے پچیس برسوں سے دہلی میں مقیم ہیں۔ حیدرآباد میں رہ رہے ہوتے تو شاید اپنی "حیدرآبادی وضع داری" کو برقرار نہ رکھ پاتے۔

مشفق خواجہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک گدائے کوچہ گرد کی حیثیت سے حیدرآباد کی ان گلیوں میں گھومنا چاہتے ہیں جہاں کی خاک کبھی ان کی محبوب ترین ہستیوں کے قدموں سے لپٹی تھی۔ مشفق خواجہ کی اس معصوم سی خواہش کے بارے میں بھلا ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ وہ تو ان گلیوں کی زیارت کرنا چاہتے ہیں جہاں ماضی بعید میں ان کی محبوب ترین ہستیاں گھوما کرتی تھیں۔ ان کی محبوب ترین ہستیوں کی گلیوں کی بات تو چھوڑیے ہمیں تو خود وہ گلیاں نہیں دکھائی دیتیں جن میں ہم ابھی بیس پچیس برس تک گھوما کرتے تھے۔ رہی ان ہستیوں کے قدموں سے لپٹی ہوئی خاک کا معاملہ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ہم اکثر حیدرآباد جاتے رہتے ہیں۔ ہمیں تو وہ خاک بھی دکھائی نہیں دیتی جو ابھی مہینہ بھر پہلے ہمارے قدموں سے لپٹی تھی۔ مبادا آپ یہ نہ سمجھیں کہ اس شہر میں صفائی کا انتظام بہت اچھا ہے بلکہ اس کی وجہ دراصل صفائی کا ناقص انتظام ہے۔ اس شہر میں اب گرد و غبار اتنا پھیلتا جا رہا ہے اور اتنی خاک اڑتی رہتی ہے کہ پچھلے ہفتہ جو خاک آپ کے قدموں سے لپٹی تھی وہ نئے گرد و غبار کے بہت نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ اب اس خاک کو کون کہاں تک ڈھونڈتا پھرے۔ ہمیں افسوس تو اس بات کا ہے کہ دس برس پہلے جب مشفق خواجہ ہندوستان آئے تھے تو تبھی ہمیں

حیدرآباد سے ان کی محبت کا اندازہ ہو گیا تھا اور ہم نے انھیں حیدرآباد چلنے کی دعوت دے دی تھی۔ ہم نے تو ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ تیاریوں کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ ہم نے حیدرآباد میں اپنے طور پر ان کی میزبانی کے انتظامات مکمل کر لیے تھے یہاں ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اپنی خالص حیدرآبادی وضع داری کے مطابق ہم نے حیدرآباد میں ایک ایسی ہستی کو ڈھونڈھ لیا تھا جو ان کی میزبانی کے فرائض انجام دینے کی خواہشمند تھی لیکن مشفق خواجہ اس وقت نہیں گئے اور اب انھیں حیدرآباد کی یاد ستا رہی ہے۔

جہاں تک روزنامہ "سیاست" کے بارے میں مشفق خواجہ کی رائے کا تعلق ہے ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ وہ اتنے گہرے انہماک کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں یعنی ہمارے کالم کے مطالعہ سے اخبار شروع کرتے ہیں اور انڈوں کے بھاؤ جاننے کے بعد ہی مطالعہ ختم کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہاں بھی انھوں نے طنز کا پہلو تلاش کر لیا ہے ورنہ وہ ہمارے کالم کو پڑھنے کے فوراً بعد انڈوں کا بھاؤ جاننے کی کوشش نہ کرتے کیوں کہ دنیا جانتی ہے کہ انڈے نہ صرف کھائے جاتے ہیں بلکہ ناپسندیدہ اشخاص پر پھینکے بھی جا سکتے ہیں۔ ان کے خط کے بعد ہم نے بھی پہلی بار اخبار "سیاست" کے ذریعہ حیدرآباد میں انڈوں کا بھاؤ معلوم کیا اور اس کا تقابل دہلی میں ملنے والے انڈوں سے کیا تو پتا چلا کہ واقعی دہلی میں انڈے بہت مہنگے ہیں اور اس کی مہنگائی کا ایک سبب ہمیں تو یہی نظر آیا کہ دہلی سیاسی راجدھانی ہے اور یہاں آئے دن جلسے وغیرہ ہوتے رہتے ہیں۔ امن و امان کی برقراری کے لیے انڈوں کی گرانی نہایت ضروری ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ حیدرآباد میں انڈوں کی ارزانی کا تعلق حیدرآبادی مرغیوں کی "حیدرآبادی وضع داری" سے ہے۔ وضع داری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

مشفق خواجہ کی طنز نگاری کو ہم شروع ہی سے رشک کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ آئے دن ساقی فاروقی، انیس ناگی، عبدالعزیز خالد، نظیر صدیقی، بشیر بدر، مظہر امام اور عالم امام وغیرہ کی تحریریں پڑھتے رہتے ہیں۔ نتیجہ میں ان کی طنز نگاری سے متاثر ہو کر ہم نے بھی ان کی تقلید میں محولہ بالا ادیبوں کی تحریریں پڑھی ہیں لیکن مولوی مدن والی بات ہم میں پیدا نہیں ہوئی۔ اب جا کر کہیں یہ راز کھلا ہے کہ ان کے طنز میں جو کاٹ ہے اور جو نشتریت وغیرہ ہے وہ اس سبب سے ہے کہ وہ روزنامہ "سیاست" میں نہ صرف جوتوں اور ساریوں کے اشتہارات تک پڑھتے ہیں بلکہ انڈوں کے بھاؤ بھی معلوم کرتے رہتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا کچھ پڑھنے کے بعد بھی وہ مندرجہ بالا ادیبوں کی تحریریں پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات ہمیں پہلے سے معلوم ہوتی تو ہم بھی "سیاست" میں چھپنے والے اشتہارات کا بنظر غائر مطالعہ کرتے حالانکہ اس اخبار سے ہمارا ذہنی اور جذباتی رشتہ چالیس برس پرانا ہے۔

بہرحال مشفق خواجہ نے حیدرآباد اور "سیاست" کے تعلق سے جس تعلق خاطر کا اظہار کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں ہماری تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ "حساب دوستاں در دل" والا معاملہ ہے۔ یوں بھی مشفق خواجہ کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کچھ اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ لوگوں کی نظریں اس شخص کے محاسن پر کم اور عیوب پر زیادہ جاتی ہیں جس کی کہ تعریف کی جا رہی ہو۔ ●●

ڈاکٹر شاہ عبدالسلام
شعبۂ عربی
لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ

مرزا محروم اور دعوتِ آم

مرزا محروم یوں تو تھے ایک زمین دار، بہت ہی خود دار اور وضع دار مگر اب بچارے ستم ہائے روزگار کے مارے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی نوجوانی میں خوب خوب مزے اڑا چکے ہیں مگر اب حالات کے تھپیڑوں، قویٰ کے اضمحلال اور نئی قدروں کے رواج نے مرزا کو عرصہ دراز سے مزے اڑانا تو درکنار کھانے پینے سے ہی محروم کر رکھا ہے اور اب وہ روکھی سوکھی پر ہی گزارہ کر کے کسی طرح عزت و آبرو بچائے پڑے ہیں۔ ماضی کی خوش خوراکیوں کی یاد مرزا کو ہمہ وقت ذہنی کرب و بے چینی میں مبتلا رکھتی ہے اور مرزا محروم کبھی بھولے بھٹکے اگر باری تعالیٰ کے روبرو حاضر ہوتے ہیں تو بس یہی دعا مانگتے ہیں کہ "یا اللہ میرے دن پھر سے پھیر دے اور پہلے کی طرح احباب و اعزّا کے یہاں سے پھر دعوتِ عام کا بلاوا آئے اور میں پھر مع اہل و عیال کے دعوتی لباس میں ملبوس ٹھسّے کے ساتھ محفلوں میں شرکت کروں اور کام و دہن کے ساتھ انصاف کروں"۔

کہتے ہیں کہ آہِ سحر گاہی اثر ضرور دکھاتی ہے مرزا کی دعا بھی ایک دن بادل ناخواستہ عرش سے ٹکرا ہی گئی اور پھر مرزا محروم کی مراد بر آئی کہ صبح صبح محلہ کے حجام نے مرزا محروم کو ایک دعوت نامہ لا کر دیا اور کہا کہ "چودھری صاحب کے یہاں سے یہ پرچہ آپ کے لیے لایا ہوں شام کو پانچ بجے آپ مدعو ہیں"۔ مرزا پڑھے لکھے نہ تھے کہ پہلے زمینداروں اور جاگیرداروں کے بچّوں کو پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ خیر جلدی سے پرچہ لیا اور پڑوس میں چچا جمّن کے پاس اُسے پڑھوانے پہنچے۔ چچا جمن نے ان کو پڑھ کر بتایا کہ اس پرچہ میں یہ شعر لکھا ہے ؎

چودھری کے یہاں آج طفیلِ غالبؔ
"دعوت آم" پر مدعو ہیں جناب عالی!

مرزا کو کسی دعوت میں شرکت کیے برسوں گزر گئے تھے۔ جلدی میں صرف "دوسرے" مصرع پر ہی توجہ گئی۔ بھاگ کر گھر آئے اور مثلِ ابلق گرا نبار بتیسی بسار کر بیوی سے بولے "برسوں کی مراد بر آئی، میں نہ کہتا تھا کہ اللہ ایک دن ضرور سنے گا اور میرے دن بھی پھریں گے۔ بس تم اب بچوں کے گھر میں بلاؤ سب کی گنتی کرو اور نہلا دھلا کر دعوتی کپڑے پہنا کر تیار کرو آج دعوتِ عام پر چلنا ہے اور دیکھو جلدی کرو یہ موقع بہت دنوں بعد ہاتھ آیا ہے رائیگاں نہ جائے"۔ یہ سن بیگم محروم اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں .... پھر کیا تھا، شام ہونے کو ہی نہ آتی تھی خدا خدا کر کے سہ پہر ہوئی اور

مرزا محروم مع اپنی پلٹن کے چودھری کے گھر پر پہنچ گئے۔
وہاں پہنچ کر مرزا نے گردو پیش کا جائزہ لیا تو وہاں منظر ہی کچھ اور تھا مہمانوں کی تعداد کچھ ایسی نہ تھی کہ اسے دعوتِ عام کہا جاتا۔ مرزا نے سوچا کہ غالباً چودھری صاحب نے اپنے مخصوص دوستوں کو ہی مدعو کیا ہے اور اپنے دیرینہ تعلقات کا لحاظ رکھتے ہوئے مجھے خصوصی اہمیت دے کر دعوتِ عام کا پرچہ بھیجا ہے۔ یہ سوچ کر ذرا ہمت بندھی۔
پھر ذرا غور سے اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک طرف کسی کو "حسن آرا" پر نثار ہوتے ہوئے، کسی کو "حسن افروز" سے بوس و کنار ہوتے ہوئے، کسی کو "مرگ نیبنی" سے دستِ درازی کرتے ہوئے، کسی کو "مکفنی" پر دانت پیوست کرتے ہوئے تو کسی کو "ثریا" کی شیریں دہنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پایا۔ دوسری طرف نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ "نیلم پری"، "بے نظیر" اور "بچھراج" بھی لوگوں کی دست درازی سے بے جان ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر مرزا حیران و پریشان ابھی کھڑے ہی تھے کہ چودھری صاحب نے پیچھے سے پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر مرزا کو چونکا دیا اور بولے "مرزا صاحب آپ نے یہ اچھا کیا کہ اپنے ساتھ اہل و عیال کو بھی لے آئے۔ اہلیہ اور بچوں کو تو زنان خانہ میں آپ بھیج دیں اور آپ ادھر محفل میں تشریف لے چلیں اور آپ بھی دست درازی کے پینترے دکھائیں۔
مرزا بوجھل قدم اُس طرف بڑھے جدھر دوسرے مدعوئین فرش پر پالتی مارے بیٹھے تھے اور دست و دہن کے کرتب دکھا رہے تھے۔ ابھی مرزا ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ ایک خادم نے مرزا کے سامنے ایک لگن لاکر رکھ دی جس میں ہمہ اقسام کے آم پانی میں غوطے لگا رہے تھے۔ خادم نے کہا "میاں بسم اللہ"
مرزا بے بس غصّہ کی نگاہوں سے خادم کی طرف دیکھ کر بولے "ٹھیک ہے بس دفع ہو"
اور پھر دھیرے دھیرے مرزا بڑبڑائے کہ
"عین و الف کے فرق نے محروم کر دیا"
"آج پتا چلا کہ ش ق تو درست ہونا ہی چاہیے ساتھ میں تلفظ میں ع اور الف کا فرق بھی واضح اور صحیح ہونا چاہیے ورنہ انجام وہی ہوگا جو آج میرے ساتھ ہوا کہ میں نے اللہ پاک سے "دعوتِ عام" کی طلب کی تھی اس نے "دعوتِ آم" سمجھ کر عطا کی۔ اور بھائی نکتہ سنج مرحوم کے اس شعر کی حقیقت بھی آج ہی مجھ پر کھلی ؎

ایک نقطے نے مجھے محرم سے مجرم کر دیا
میں دعا لکھتا رہا اور وہ دغا سمجھا کیے

م۔ناگ
معرفت مختار سید
روزنامہ "اردو ٹائمز۔ بمبئی ۸

باجی

بلو کب بچپن سے لڑکپن کی طرف بڑھا' اس کا احساس نہ باجی کو ہوا نہ ماں کو۔
"باجی دوستوں کے سامنے تم مجھے بلو کیوں کہتی ہو ؟"
"ایا تو کیا ظفر احمد کہوں ؟"
"ظفر کہو سیدھا"
"بے بی! اب ظفر بڑے ہو گئے ہیں ان کو بھائی صاحب کہو"
"ہاں ہاں بہت بڑا ہو گیا، ابھی کچھ کہو تو بس ای کر کے سُر نکالنے لگے گا"
"چل بھاگ"!
لیکن بلو کسی کے کہنے سننے سے نہیں رکا' وہ بڑا ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ دوستوں کی بات چیت سے، چھپ چھپا کر کتابیں پڑھنے سے ایک نئی دنیا اس پر آشکار ہونے لگی تھی اور وہ حواس باختہ رہ گیا تھا۔ کیا یہ سب سچ ہے ؟ پھر کیا باجی کو سب کچھ پتہ ہے ؟ وہ اب باجی پر نظر رکھنے لگا تھا۔ اس کے طور طریقے بدلنے لگے تھے۔ وہ اب بستر پر پڑا اینڈ تا نہ تھا نہانے کے بعد سلیقے سے کپڑے پہنتا جب باہر جاتا تو آئینہ کے سامنے کافی وقت گزارتا اور کتنا سجیلا لگتا!
"باجی! کل کریم کے ساتھ کیا باتیں چل رہیں تھیں ؟"
"کس کے ساتھ ؟"
"کریم خان کے ساتھ"
"کب ؟"
"جیسے کچھ پتہ ہی نہیں! کل پارک کے پاس!"
"اوہ! لوہ ہمارے کالج میگزین کا ایڈیٹر ہے' میری نظم سے متعلق بات چیت کر رہا تھا وہ نظمیں کتنی اچھی لکھتا ہے"
"گدھا کہیں کا"!
"ظفر گالی کیوں دیتا ہے اسے' ماں سے کہوں گی میں"

''بالکل گالی دوں گا میں، بڑا آیا نظمیں لکھنے والا''
''سمجھ گئی تو باہر جا، مجھے کپڑے بدلنے دے''

''باجی! اوشا کے ساتھ مت گھوما کر''
''کیوں تیرا کیا جاتا ہے؟''
''بے کار لڑکی ہے اوشا۔ لوگ کیا کیا باتیں کرتے ہیں اس کے بارے میں''
''ظفر، آج کل تو بہت حکم چلانے لگا ہے''
''کچھ بُرا کیا کیا؟
''مگر تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ خراب ہے''
''ماننا ہے تو مانو، ورنہ چھوڑو بس تم اس کے ساتھ مت گھوما کرو''

''ایا ہبلو کی مونچھیں نکلیں!''
''اش کہاں! چل کچھ نہیں''
''ارے یہ دیکھ''
''باجی! چپ!''
''ارے ظفر ایک چپاتی کھالے۔ کیوں تو اس کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ دیکھ چلا گیا نا''

''آج کالج سے تم نالے کے راستے کیوں لوٹ رہی تھیں؟''
''کب؟''
''آج دوپہر کو''
''تو کیا ہوا؟''
''کچھ ہونا چاہیے کیا؟ وہاں بنگلے میں بیٹھ کر لڑکے فقرے چست کرتے رہتے ہیں''
''کرنے دو لڑکوں سے کون ڈرتا ہے''
''امی! تم کہو نا اس سے''
''زمانہ خراب ہے بے بی۔ نظریں گندی ہوتی ہیں لوگوں کی۔ اوشا سے بھی کہو''
''مگر امی یہ کون ہوتا ہے میری نگرانی کرنے والا؟ تو کیوں بنگلے میں گیا؟ بول اب بول؟
''کیوں جھگڑتے ہو؟ ارے تو بڑی ہے نا اس سے۔ ذرا سمجھ داری سے رہو۔ کب یہ بچپنا

جائے گا؟ جملوں کے مطلب، اندرون مطلب، ذو معنی لفظوں میں چھپے مفہوم۔ وہ سب کچھ جان رہا تھا۔ باجی کو بھی کوئی ایسی نظروں سے دیکھتا ہوگا جیسے دوسری لڑکیوں کو دیکھا جاتا ہے۔ اس وسوسہ سے وہ پریشان ہو گیا۔ باجی کے دل میں کیا اثر ہوگا وہ یہ بھانپنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ باجی کی کتابیں، اس کے بیگ میں تلاش کرتا رہتا، کچھ ڈھونڈنے لگتا۔

"ظفر! اوشا بھاگ گئی؟"

"کیا۔۔۔"

"ارے اوشا بھاگ گئی اور اس نے شادی کر لی"

"کس کے ساتھ؟"

"معلوم نہیں۔۔۔"

"اسی روی کے ساتھ کی ہوگی شادی"

"ہاں۔۔۔ ایا تیرے کو کیسے معلوم؟"

"سب کو معلوم ہے! پاگل ہے اوشا"

"پاگل کیوں؟ وہ پیار کرتی تھی روی سے اور چاچا چاچی مانتے نہ تھے"

"پیار۔۔۔ یعنی کیا؟"

"وہ تجھے نہیں سمجھے گا ابھی"

لیکن ببلو سوچتا رہا کہ وہ کیوں کر باجی کو دنیا کی نظروں سے چھپا کر رکھے۔ رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ بہت خوش ہے اور اس کے پاس ایک بہت بڑی ٹوکری ہے بانس کی ایک بہت بڑی ٹوکری! اور اس ٹوکری میں ببلو نے باجی کو بند کر دیا ہے!!

عبدالعزیز خان
امین بلڈنگ۔ چوتھا منزلہ۔ فلیٹ نمبر ۲۱
ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی۔ ۳

کٹا ہوا رشتہ

دیوار پر ماں کی تصویر آویزاں تھی۔

پاگل ماں کو سنبھالتے سنبھالتے وہ تھک جاتا۔ اس دوران بیوی نے اس کا بہت ساتھ دیا۔ ماں کے لیے اس نے کئی مرتبہ دعا مانگی تھی کہ اگر پاگل پن میں کچھ افاقہ نہیں کرنا ہے تو اسے اٹھالے۔

ماں کی پرانی تصویر دیکھ کر وہ دل گرفتہ ہو جاتا اور جب ماں کے پاگل پن کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھرتی ہے تو وہ خود بھی پاگل ہونے لگتا۔

بیوی نے دوبارہ چائے بنا کر دی۔ اس دفعہ دودھ نہیں ڈالا بلکہ لیموں نچوڑا۔

''ذرا سر ہلکا ہو جائے گا'' بیوی بولی۔

سچ مچ بیوی اس کا کتنا خیال رکھتی ہے اور پھر ماں کے بارے میں بھی پوچھتی رہتی ہے۔

''آخر کب لائیں گے ماں جی کو؟''

مگر وہ جانتا ہے۔ ماں سے پڑوسیوں اور گلی والوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے؟

''تمھیں اتنی نہیں پینی چاہیے رات رات بھر بڑبڑاتے رہتے ہو؟'' بیوی کہتی ہے

اس نے دیکھا۔ بیوی کی پھٹی ہوئی ساڑی کے اندر سے میلا پیٹی کوٹ جھانک رہا تھا۔

آج تنخواہ ملنے والی ہے۔ اس نے سوچا۔ آج بیوی کے لیے وہ اچھی سی ساڑی لائے گا۔

دونوں چھوٹے بچے سوئے ہوئے تھے وہ بالٹی لے کر نل پر پہنچا۔

''کیسے بابو صاحب! چاچی کی حالت کیسی ہے؟ کچھ سدھار ہوا؟ پڑوسی گپتا، ماں کے بارے میں پوچھتا ہے اور ایک ہاتھ میں داتون لے کر پچ کی آواز کے ساتھ تھوکتا ہے۔

اب ایسے سوالوں کے جواب دیتے دیتے وہ چڑچڑا ہو گیا تھا کس کس کو جواب دے؟ حرام زادے اوپر سے کتنی ہمدردی بتاتے ہیں۔ مگر دل ہی دل میں خوش ہوں گے

وہ پہلے فیکٹری میں ملازم تھا۔ وہاں سے نوکری چھوڑ کر اس نے کسی، نئے آفس میں ملازمت حاصل کرلی تھی۔ پرانی فیکٹری کا پتہ سب جانتے ہیں نئی آفس کا پتہ اس نے پرانی فیکٹری والوں کو نہیں دیا اور نہ کسی دوست کو بتایا۔ اب بس ایک ہی پتہ ہے جو

سب جانتے ہیں اور وہ ہے اُس گلی میں اُس کا گھر، جس پر کل کی ڈاک سے نوٹس والا لفافہ آیا ہے۔ آج کل میں مکان مل جائے تو وہ فوراً مکان بدل لے گا۔ پھر کوئی ڈر نہیں۔ وہ سب کے لیے اجنبی بن جائے گا!

''بھگوان جانے ماں جی کا کیا حال ہو گا! کئی مہینوں سے آپ دیکھنے نہیں گئے ؟

بیوی نے پوچھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح سوچنے لگا کہ کیا جواب دے ؟

بیوی نے کھانے کا ڈبہ اس کی تھیلی میں رکھ دیا۔ ضرورت کی چیزوں کی ایک فہرست اسے دے دی۔

اس نے سوچا اگر آج بھی تنخواہ نہیں ملی تو ادھار لانا پڑے گا ؟ کل تو سالا خزانچی ہی غائب تھا۔ اس لیے تنخواہ نہیں ملی۔ ویسے پے سلپ تو تیار تھی۔

آفس کے لیے نکلا۔ شہر میں بھیڑ تھی تمام سڑکوں پر ٹرافک کچھا کھچ بھرا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کچھ برس پہلے وہ اس شہر کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ یہ شہر کبھی اسے اجنبی لگتا۔ کبھی اپنا۔ یہاں وہ سب کی نظروں سے چھپ سکتا ہے۔ بس گھر بدل لیا کہ کام ہو گیا! کوئی بھی اسے کھوج نہیں پائے گا!

وہ ماں کی یاد کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا۔ مگر اسے ماں کی یاد اس کی شفقت کے ساتھ اس کے ذہن سے چمٹی ہوئی تھی۔

وہ بس میں سوار ہو گیا۔

دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں ماں کی تصویر ابھرنے لگی۔ بکھرے بال، خوفناک چہرہ، بال نوچتے ہاتھ، بے چین پاؤں، کہیں بھاگنے کی کوشش کرتی۔ برتن پٹکتی، گالیاں بکتی، چلاتی ''مجھے مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو''

شوہر کی بےوقت موت۔ جیٹھ جٹھانی کے ظلم و ستم اور طعنوں کی وجہ سے اور پھر پڑوس کے پچھڑی ذات کے ایک لڑکے کے ساتھ بیٹی کا بھاگ جانا۔ اسے پاگل بنانے کے لیے کافی تھا۔ پریشانی جب زیادہ بڑھی تو اس نے ماں کو گاوں سے لاکر اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی کو بھی دیکھ ریکھ کے لیے بلا لیا۔ جب گلی کے لوگ پریشان ہو کر شکایتیں کرنے لگے تو ماں کو پاگل خانے میں ڈال دیا۔

پاگل خانے میں فارم پر پتہ لکھتے ہوئے آفیسر کو اس پر شک ہو گیا۔ آفیسر نے کہا'' صحیح اور پورا پتہ لکھوائیے۔ ورنہ قانونی کاروائی کی جائے گی''

اس نے پرانی فیکٹری کا پتہ لکھوایا۔ صحیح صحیح اور گھر کا بھی!
آفیسر نے دوبارہ کہا،
"لوگ یہاں کتنے مریضوں کی بھرتی کرا کے چلے جاتے ہیں اور پھر واپس نہیں آتے۔ ان کے لکھائے ہوئے پتے بھی غلط ہوتے ہیں۔ ہم مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ اگر مریض کے بارے میں کچھ پوچھنا ہو تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ ایسے کئی لاوارث مریض یہاں پڑے رہتے ہیں۔ ہم ضابطے کی کاروائی بھی اس وقت کر سکتے ہیں جب پتہ صحیح ہو۔
وارڈ میں ماں کو چھوڑ کر جاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
بیچ بیچ میں جا کر وہ ماں کو دیکھتا رہا۔ علاج شروع تھا۔ مگر افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔
یہی دیکھ کر اب دو مہینوں سے وہ ماں کے پاس نہیں گیا تھا۔ کیونکہ آخری بار جب وہ گیا تھا تو اسے پتہ چلا تھا کہ جو علاج ہونا تھا وہ ہو چکا مگر ماں ابھی تک اچھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہوگی۔ اسی وقت اسے اسپتال سے نوٹس ملا تھا کہ اپنی ماں کو لے جاؤ۔
ڈاکٹروں نے صاف جواب دے دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا" صدمہ انتاز بردست ہے کہ ہمارے سارے ٹریٹمنٹ ناکام ہو چکے ہیں۔ کسی بھی ٹریٹمنٹ کا اثر وقتی طور پر ہوتا ہے۔" اس نے ایک ہفتے کے لیے ماں کا اخراج رکوانے کی درخواست دی تھی۔
اسپتال میں چاروں طرف ننگے اور ادھ کھلے کولہوں سے گھسٹتے مریض چہرے بناتے۔ پیسے مانگتے۔ سگریٹ مانگتے ہوئے۔ وہاں کئی عورتوں کو دیکھا۔ ہنستی ہوئیں بال نوچتی ہوئیں۔ مگر ماں کا حال ہی نرالا تھا۔
ماں کو آخری بار اس نے بیڑیاں پہنے ہوئے پھٹے حال روتے ہوئے دیکھا۔ تو وہ خود بھی رو پڑا۔ اس نے ماں کو پکارا۔ مگر ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے پہچانتی نہ ہو۔ وہ اکیلا تھا بیوی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ گھر آکر اس نے بیوی کو صحیح حال نہیں بتایا۔ بوجھل من سے بستر پر گر پڑا تھا۔
آج دو مہینے ہو گئے تھے اسپتال کا دوسرا نوٹس اس کی جیب میں پڑا تھا۔
ایک ہفتے بعد ماں کو لے جانے کا کہہ کر وہ گیا ہی نہیں۔ نوکری ہی بدل لی۔ اب گھر بدلنا تھا کہ ان نوٹسوں سے چھٹکارا ملے۔
بس سے اتر کر آفس پہنچا۔
مالک کسی خاص کام سے باہر تھا۔ اس لیے سارا اسٹاف خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ خزانچی کو بیٹھا دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ چلو آج تنخواہ ملے گی!

کچھ دیر بعد وہ دوست آ گیا جس نے اسے گھر دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ "مٹھائی کھلاؤ کمرہ مل گیا ہے!" دوست نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا
فوراً اس نے دوست کو گلے سے لگا لیا۔ اسے یاد نہیں آتا کہ اتنا خوش وہ اس سے پہلے کب ہوا تھا۔
"جلد ہی شفٹ ہو جاؤ" دوست بولا۔
"آج دیکھنے چلیں گے؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں آج ہی چلو"
جیب میں پڑا نوٹس والا لفافہ بے اثر لگا۔ وہ ہشاش بشاش اپنا کام کرتا رہا۔ تنخواہ ملی۔ جیب میں رکھی۔

آفس چھوٹنے پر وہ دوست کے ساتھ نکلا۔ دونوں بس میں سوار ہوئے۔ کمرہ کافی دور تھا۔ اچھا ہی تھا! جب وہ کمرہ دیکھنے گئے۔ شام گہری ہونے لگی تھی۔ صاف ستھری جگہ تھی۔ روشنی اور پانی کا انتظام تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی لگا ہوا باتھ روم بھی تھا۔ حالاں کہ کمرہ چھوٹا تھا اور کرایہ بھی زیادہ تھا مگر اس نے ہامی بھر لی۔ کرائے کی بات بھی پکی کر لی ایک ماہ کا کرایہ بھی پیشگی دے دیا۔

لوٹتے وقت اس کے ذہن میں ایک سوال ابھر کہ اگر اسپتال والے راشن آفس سے اس کے نئے گھر کا پتہ چلا لیں تو، وہ کیا کرے گا؟ اس نے سوچا کہ وہ راشن کارڈ بنائے گا ہی نہیں۔ بعد میں دیکھا جائے گا اس نے خوشی کے عجیب احساس سے سیٹی بجائی۔

بازار سے اس نے بیوی کے لیے ایک اچھی سی ساڑی بلاؤز پیٹی کوٹ خریدا۔ بچوں کے لیے بھی کپڑے خریدے گھر، کے قریب کرانہ دکان سے ضروری اشیاء خریدیں۔

گلی کے نکڑ پر چند پڑوسی تاش کھیل رہے تھے "کیوں بھیا چاچی کو کب لا رہے ہو"؟ پیچھے سے آواز آئی اس نے آواز سنی اَن سنی کر دی اور اپنے گھر میں داخل ہوا۔

بیوی اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔
وہ اسے دیکھ کر چائے بنانے چلی گئی۔ آج اس نے شراب نہیں پی تھی۔ بیوی یہ دیکھ کر خوش ہوئی۔ اس نے بچوں کو گود میں اٹھا لیا۔ مٹھائیاں دیں۔ کپڑے دیے۔ بیوی کو کپڑے دکھائے۔

بیوی سو گئی تھی اور بچے بھی۔
وہ اٹھا۔ دیوار پر ٹنگی ماں کی تصویر پلٹ دی اور اطمینان سے سو گیا۔ ●●

بی بی سرِیواستو رَند
R-16 سیکٹر 11 نوئیڈا

قسط ۲

گرد میں اَٹا ہُوا آئینہ

قیسؔ رامپوری

چشم بدور ـــــ دوستوں کا کہنا ہے کہ جب انگریز بہت زیادہ میلا نظر آئے تو رنگت کے اعتبار سے قیسؔ رامپوری ہو جاتا ہے۔ سرخ و سپید، و جیہہ قامت، پروقار شخصیت، متبسم چہرہ اور پُر خلوص انداز تکلم، یہ ہیں میرے دوست قیسؔ رام پوری، جدید وضع قطع، سلیقے کا لباس، منہ میں پان کی گلوری، لبوں پر ہلکی سی سرخی ان کے باذوق ہونے کی غمازی کرتی ہے۔ جب بھی ملتے ہیں انکساری انگلیاں تھامے ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہے، پان کھانا ان کی کمزوری ہے۔ مگر اپنے پاس کبھی گلوری دان نہیں رکھتے اور اگر کچھ رکھتے ہیں تو تقریباً ایک درجن پانوں کا پلندہ اور وہ بھی کاغذ میں لپٹا ہوا۔ کمزوری اس قدر کہ چاہے کام میں مشغول ہوں یا بات کر رہے ہوں، غیر شعوری طور پر اپنے گردو پیش کے ماحول سے بے نیاز کاغذ کے پلندے سے ایک ٹکڑا نکال کر نہایت سلیقے سے داخل از دہن کر لیں گے حالانکہ مجھے پان کھانے کا شوق نہیں مگر قیسؔ کے پان کھانے کے انداز کو دیکھ کر کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس فن کی تربیت حاصل کروں اور دن بھر کھانا کھانے کے بجائے صرف پان ہی کھایا کروں۔

کافی عرصہ ہوا دہلی آنے کے بعد ایک شعری نشست میں اتفاقاً ہی ان سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات صرف رسمی سی ہی تھی مگر رفتہ رفتہ نزدیکیوں میں تبدیل ہو گئی۔ قیسؔ صاحب جب ذرا کھلے تو اندازہ ہوا کہ ہماری طبیعتوں میں نہ صرف یگانگت ہے بلکہ مزاجاً بھی ہم مشرب ہیں۔ پھر ان نزدیکیوں نے ساری پردہ داریاں ختم کر دیں اور ہم لوگ ایک اچھے دوست بن گئے۔

صنعتی بستی نوئیڈا جو کبھی فیکٹریوں اور مشینوں کی بستی تھی۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ اب ادبی بستی کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ ہندی اور اردو کے نامور شاعر افسانہ نگار، ادیب اور کوی حضرات رفتہ رفتہ اسے آباد کرتے جارہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، رفعت سروش، گلزار دہلوی، ڈاکٹر خورشید عالم، ڈاکٹر رضیہ حامد، ضمیر حسن دہلوی، ملک زادہ جاوید، شیخ سلیم اور نہ جانے کتنے ہی محبان اردو اس کی ترویج و تدریج میں کوشاں ہیں۔ سڑک کے اس پار جھانکیے تو میور وہار جہاں، مظہر امام، ڈاکٹر بھگوتی پرشاد عاجز، قمرالدین اور کلدیپ گوہر موجود ہیں اردو کی اس نئی بستی نوئیڈا سے قیس کا تعلق یہ ہے کہ وہ آج کل اردو ہفت روزہ راشٹریہ سہارا میں بحیثیت چیف آرٹسٹ ملازم ہیں اور اردو کے فروغ میں اپنا بھرپور تعاون دے رہے ہیں۔ نوئیڈا کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ ہندی اور اردو کا گنگا جمنی ادبی اجتماع ملک کے کسی بھی حصے میں اتنا کامیاب نہیں ہوتا جتنا کہ نوئیڈا میں، اس کامیابی کے مستحق ہیں راجندر سنگھل جنہوں نے یہاں کے باذوق حضرات کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور زبان کی حدوں سے پرے ادب اور صرف ادب کو نوازا چاہے وہ کسی بھی زبان کا ہو۔

1995 میں ہولی کے دوسرے روز گلزار دہلوی کی رہائش گاہ سیکٹر 26، نوئیڈا میں ایک گنگا جمنی نشست کا اہتمام تھا۔ قرۃ العین حیدر، رفعت سروش، ابوالفیض سحر، مظہر امام، واجد سحری، مخدوم زادہ مختار عثمانی، ملک زادہ جاوید، قیس رام پوری اور راقم الحروف کے علاوہ ایک درجن ہندی اور اردو کے شاعر اور کوی حضرات نے شرکت کی۔ نشست نہایت کامیاب رہی۔ قیس کا جب نمبر آیا تو ان کی غزل نے داد و تحسین سے ڈائنگ روم کی چھتیں اڑا دیں ایک شعر مجھے اب بھی یاد ہے۔

ہمارے بچوں کے سر مانگتی ہیں بنیادیں
یہ کیسے شہر کی تعمیر کر رہے ہم

قیس بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کے یہاں کلاسکی رچاؤ کے ساتھ جدیدیت کی چاشنی بدرجہ اتم موجود ہے۔ انہوں نے جدیدیت کے دہکتے انگاروں کو کسی بچے کی طرح لپک کر نہیں پکڑا جو ہتھیلیاں جلا دے، انہوں نے شعلے کی تپش کا اندازہ کیا اور اس کی تمازت سے اپنے احساسات کو گرمایا اور شعر کے پیکر میں اتار دیا۔

عہد حاضر کے مورخ کبھی یہ بھی لکھدیں
خون سے خون کے دھبے نہیں دھوئے جاتے

یہ بڑے حوصلے کا کام ہے اس خاص انداز کو اپنانے کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے منفرد انداز سے جذبات اور احساسات کی رنگینی، خوشبو اور نشے کو ایک خاص رچاؤ دیتے ہیں جس کا اثر ابدی نہ سہی مگر دیرپا ضرور ہے۔ قیسؔ رامپوری اور ان کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال میرے لیے ایک مشکل کام ہے۔ دوستی رواداری اور قربت کی نہ جانے کتنی خاردار جھاڑیاں درمیان میں حائل ہیں۔ میں ویسے بھی تکلّف اور تصنع کا قائل نہیں، مگر جب بات غیر جانب دارانہ طور پر ہو رہی ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ قیسؔ نے جس قسم کی شاعری کی ہے آج کے دور نے اس کی اتنی پذیرائی نہیں کی جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں مجھے جو بات سب سے زیادہ پسند ہے وہ ہے سادگی کے ساتھ پُرکاری اور الفاظ کی برجستگی، وہ جو بھی کہنا چاہتے ہیں نہایت پُرخلوص انداز میں آسانی سے کہہ دیتے ہیں۔ یہ ان کا منفرد اسلوب ہے اور ریجھ پیارا ہے۔ وہ چونکہ خوش پوش بھی ہیں اس لیے اپنے اشعار میں جاذبیت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

دیئے جلانے کی رسمیں بھلا چکے شاید
ہمارے شہر میں انساں جلائے جاتے ہیں

سروں کی فصل اگاتا ہے کاٹ دیتا ہے
نجانے کونسے انداز کا کسان ہے وہ

کچھ دنوں سے یہ مشغلہ ہے مرا
گھر کے آئینے توڑ دیتا ہوں

دعا یہ مانگ فلک بوسیوں کے شیدائی
ترے لیے یہ زمینیں نہ تنگ ہوجائیں

قیسؔ رام پوری کے کلام میں احساس اور ادراک کی بلندیاں اپنی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ انقلاب زمانہ، سرگزشت حیات اور واردات کے دلکش بیان ان کے یہاں اچھوتے انداز میں نظر آتے ہیں۔ بیان کی یہ خوبصورتی ہمیشہ سے ہی رامپور اسکول کو انفرادی حیثیت عطا کرتی رہی ہے۔ وہ رامپور کی ادبی فضا میں پلے۔ بڑھے اور جوان ہوئے اور جب اپنے شعور کی آبیاری کرتے کرتے غزل کے میدان میں اترے تو ملک کے مشہور اور ہردلعزیز شاعر جناب شادؔ عارفی کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔ اس کے علاوہ جناب رشیدؔ رامپوری سے بھی فیض سخن حاصل کیا۔ دونوں استاد فن حضرات کی رہنمائی اور اپنی

خداداد صلاحیت کی مشعل جلائے انہوں نے اپنا راستہ خود اختیار کیا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی نے قیسؔ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اردو شاعری میں ایک رنگ رامپور کا بھی ہے اور یہ رنگ خاصا شوخ و شنگ ہے۔ یہ بات کہ رامپور ایک علیحدہ دبستان شاعری ہے خواہ ہم جیسوں کے لیے قابل قبول نہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ناظمؔ سے لیکر نظامؔ رامپوری تک اور شادؔ عارفی سے لیکر قیسؔ رامپوری تک تازہ اور حقیقت نگار شاعروں کا ایک سلسلہ چلا آتا ہے جو ہر دور میں تاریخ ادب میں رامپور کی اہمیت کا اعتراف کراتا ہے۔

چمپئی رت کے انتظار میں ہوں
کوئی خوشبو لئے کھڑا ہوگا

خرید و تیرہ دل والوں خریدو
میں خوابوں کے اجالے بیچتا ہوں

ایسا نہ ہو شعور کا آئینہ ٹوٹ جائے
اتنی بھی بوئے گل کی تمنا نہ کیجئے

سب لوگ جانتے ہیں کہ ساحرؔ لدھیانوی عام طور پر شاعروں کے کلام پر تبصرہ کرنے سے بچتے تھے مگر انہوں نے قیسؔ کے مجموعہ کلام "سمندر در سمندر" پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا۔

"قیسؔ کے کلام کو پڑھنے کے بعد میں پختہ یقین کے ساتھ لکھ سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ اردو شاعری کا دامن فن کی سچائیوں سے مالا مال ہے۔ قیسؔ نے اپنی غزلوں اور خصوصاً نظموں میں موجودہ زندگی کے تمام چہروں کو جس سلیقے سے آشکار کیا ہے وہ فنی ہنرمندی اور گہرے مشاہدے کی ٹھوس علامت ہے۔ نہ جانے کیوں یہ بھی لکھنا ضروری سمجھ رہا ہوں کہ وقت کے گذرنے کے ساتھ قیسؔ کا کلام صاحبان نظر کے لیے قیمتی اور مزید قیمتی بن جائے گا"۔

یہ بھوکی لاش اگر بول دے تو راز کھلے
کہ دوستوں نے اسے کیا کھلا کے قتل کیا

اب اس بہار کو کس نام سے پکاریں ہم
کہ شاخ شاخ پہ خنجر سجائے جاتے ہیں

یہ تجربہ بھی ہمیں ایک بار کرنا ہے

کہ مڑ کے دیکھیں اسے اور سنگ ہوجائیں
ہمیں اس شرط پر یہ زندگی کچھ راس آئی ہے
کہ ہم سانسیں بھی لیں تو دوسروں کے پھیپھڑوں سے
لیں

ڈاکٹر مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ غزل میں دوسروں کے پھیپھڑوں سے سانس لینے کی بات کرنا اور بھوکی لاش کو لب کشائی کے لئے آمادہ کرنا بڑے حوصلہ کا کام ہے اور جرات کی شہادت ہے۔ اس انوکھے انداز میں کہے گئے اشعار قیس کی غزلوں میں کافی نظر آتے ہیں۔

قیسؔ رام پوری پیشے کے لحاظ سے خوشنویس، آرٹسٹ اور جدید آرٹسٹک خطاطی کی کامیاب مثال ہیں۔ ہندوستان میں آرٹسٹک خطاطی میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ہندوستان میں چھپنے والے اردو کے کئی اخباروں اور رسائل سے ان کا تعلق رہا ہے۔ یہ بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ ان کی تیزین کاری نے ہی کئی ہفت روزہ اخباروں کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ہفت روزہ اخباروں اور رسائل کی شہرت اس کے مواد پر مبنی ہوتی ہے مگر اس مواد کو دیدہ زیب ڈھنگ سے سجانا سنوارنا اس کی تزین کاری کرنا اور خطاطی کے خوشنما زیور سے آراستہ کرنا بھی ایک بہت بڑا فن ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اس فن کے ماہر قیسؔ رامپوری ایک واحد مثال ہیں وہ جہاں بھی کام کرتے ہیں خلوص دل سے کرتے ہیں اور ہر شمارہ کو ایک نیا انداز عطا کرتے ہیں۔

قیسؔ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ساحرؔ لدھیانوی نے مزید لکھا ہے کہ انسان اپنے محسوسات کے اظہار کے لئے جو الفاظ اور انداز اپناتا ہے وہ بذات خود شاعری ہے اور اس اظہار کو نظم و ضبط دیدیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ یہ بات بڑی فنکاری ہے اکثر اسی فن کو کسوٹی بنا کر فن کے معیار اور اس کے دل و دماغ کی بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

صرف چہرہ دیکھ کر دیوانہ کہہ دیتے ہیں لوگ
کوئی دیکھے تو مرے زخم تمنا کا لہو

تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔



(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

انوار قرآن

یعنی اسلامی تصوف اور صوفیہ کے حوالے سے
قرآن فہمی کے چند پہلو

مصنف : پروفیسر نثار احمد فاروقی
قیمت : ۱۵ روپے
تبصرہ نگار : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

قرآن پاک آخری کتاب ہدایت ہے جس سے انسانیت کو قیامت تک رہنمائی حاصل ہوتی رہے گی قرآن کریم اگر ایک طرف انتہائی آسان کر دیا گیا ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کرنے اور ایمان واخلاق کی اصلاح کرنے کے لیے بڑا عالم وفاضل یا فلسفی ہونا ضروری نہیں ہے، تو دوسری طرف وہ گہرا خاموش سمندر ہے جس سے قیامت تک اہل علم وعرفان آبدار موتیاں نکالتے رہیں گے۔ قرآن کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں۔

امت اسلامیہ نے قرآن کریم کی جس قدر خدمت کی ہے اس کی کوئی دوسری نظیر ادیان وملل کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ امت مسلمہ بیشتر علمی اور فکری صلاحیتیں قرآن کی خدمت میں صرف ہوئیں۔ تفسیر قرآن اور علوم قرآن کا ناپیدا کنار سمندر تو براہ راست قرآن کی خدمت اور قرآن فہمی کے لیے وجود میں آیا لیکن دوسرے اسلامی علوم اور علوم لغت (نحو وصرف، بلاغت وغیرہ) میں مسلم علماء اور محققین کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کا اصل محرک بھی دراصل خدمت قرآن کا جذبہ تھا۔

تفسیر اور علوم قرآن کی کتابوں کے علاوہ قرآنیات کا بہت بڑا ذخیرہ مختلف علوم کی کتابوں میں بکھرا ہوا ہے۔ دوسرے علوم کی کتابوں میں جا بجا روشن تفسیری اور قرآنی افادات کو اگر یکجا کیا جائے تو تفسیر قرآن کے بہت سے انوکھے اور نادر پہلو سامنے آتے ہیں۔

مختلف اسلامی علوم کی طرح علم تصوف کی کتابوں میں بھی بہت سے تفسیری افادات ونکات بکھرے ہوئے ہیں جو قرآن فہمی میں بڑے معاون ہو سکتے ہیں۔ تصوف کی بعض کتابوں میں بعض غیر اسلامی افکار کے راہ پا جانے کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ تصوف کا اصل خمیر کتاب وسنت سے اٹھا ہے اور امت اسلامیہ جن صوفیہ کو عظمت واحترام کی نگاہ سے دیکھتی ہے انھیں قرآن وحدیث کا گہرا علم تھا اور وہ سر مو

جادۂ شریعت سے انحراف کو گوارا نہیں کرتے تھے اس لیے ان کی اصل تصنیفات، مکتوبات اور ملفوظات میں مختلف آیات قرآنی، احادیث نبویہ کی تفسیر و شرح سے متعلق بڑا بیش قیمت مواد ملتا ہے۔

ہندستان کے ممتاز صوفیائے عظام اس بارے میں خصوصی امتیاز رکھتے ہیں۔ کتاب و سنّت سے ان کا رشتہ بڑا مستحکم اور استوار تھا۔

جناب پروفیسر نثار احمد فاروقی کا ہندستان کے صوفیائے عظام اور ان کے افکار و خیالات پر خصوصی مطالعہ ہے۔ صوفیائے ہند کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے بیش قیمت مقالات لکھے ہیں۔ اس وقت ہمارے پیش نظر ان کی کتاب "انوار قرآن" ہے۔ جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ستاسی (۸۷) صفحات اور چھ مقالات پر مشتمل ہے۔ اکثر مقالات جلسے میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے ہیں اس لیے ان میں حتی الامکان اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

پہلے دو مقالے "قرآن کریم: ایک اجمالی تعارف" میں قرآن کریم کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں قرآن کریم سے متعلق بہت سی معلومات جمع کردی گئی ہیں۔ دوسرا مضمون "اعمال و اشغال صوفیہ اور قرآن کریم" کے موضوع پر ہے۔ اس کے بعد تین مقالات کے عنوانات یہ ہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور تفہیم قرآن کریم
حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی اور تفہیم قرآن کریم
حضرت خواجہ گیسو درازؒ اور تفہیم قرآن کریم

ان تینوں مقالات میں مذکورہ بالا تینوں بزرگوں کے ملفوظات سے قرآنی افادات جمع کیے گئے ہیں۔ ان مقالات کے ذریعے پروفیسر فاروقی صاحب نے قرآنیات کے ایک نئے موضوع پر تحقیق و تلاش کی راہ ہموار کی ہے۔

کتاب کا آخری مضمون "نباتات قرآن — ایک جائزہ"، ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی کی کتاب "نباتات قرآن" پر تبصرہ ہے۔ کسی مصنف یا کتاب کے تمام نتائج بحث سے اتفاق تو مشکل سے ہوتا ہے لیکن پروفیسر نثار احمد فاروقی کی زیر نظر کتاب انوار قرآن مجموعی طور پر فکر انگیز اور معلومات افزا ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کی اس تحقیق و کاوش کو قبول فرمائے اور امت مسلمہ کے لیے نافع بنائے۔

دیوان یقین دہلوی

مرتبہ: ڈاکٹر فرحت فاطمہ
قیمت: ۱۱۰ روپے صفحات: ۳۴۸
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

انعام اللہ خاں یقین اٹھارھویں صدی عیسوی کے ممتاز اور باکمال شاعر تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں سے تلمذ رکھتے تھے اور ان کی ایہام گوئی مخالف تحریک کے علم بردار بھی۔ یقین نے تازہ گوئی کی بنیاد ڈالی، باوجود تیس سال سے بھی کم مدت حیات پانے کے ان کی شہرت دور دور تک پھیلی۔ بہت سے معاصر اور مابعد شعرا نے اتباع کیا حتیٰ کہ شاہ ظہور الدین حاتم نے بھی ان کے طرز میں غزلیں کہیں۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے انعام اللہ خاں یقین کے دیوان کا تنقیدی اڈیشن بڑی جانفشانی سے تیار کیا ہے۔ اس کا حرف آغاز ڈاکٹر خلیق انجم نے تحریر کیا ہے۔ دیوان یقین کے اس اڈیشن کی تیاری میں ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے درجنوں قلمی اور مطبوعہ

نسخوں کے ایک ایک لفظ کو جانچا پرکھا اور کھنگالا ہے اور باہم موازنہ کر کے اصل متن تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے وقت کے تمام دستیاب نسخوں کی مدد سے اختلاف نسخ کو ظاہر کرنے کے لیے ایک سو سے زائد صفحے حواشی کے لیے وقف کیے ہیں تاکہ یقین کے اشعار کے مختلف نسخوں میں متنی فرق کو واضح کیا جا سکے۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے میر و مصحفی کے تذکروں کے علاوہ اور بہت سی قلمی بیاضوں سے بھی استفادہ کیا ہے اس طرح دیوان یقین کو صحت متن کے ساتھ پیش کرنے کے لیے تدوین متن کے تمام جدید ترین اصولوں کو اپنایا ہے۔ کتاب کے ساتھ دیوان یقین کی فرہنگ بھی تیار کی گئی ہے تاکہ یقین اور عہد یقین کی زبان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے میں مدد لی جا سکے۔

کتاب کے شروع میں ایک مبسوط، جامع، مدلل اور تحقیقی مقدمہ بھی ہے جس میں یقین کے تاریخی ماحول حیات، نام، خاندان، وفات، اسباب ہلاکت، تلمذ، یقین اور مظہر، یقین اور میر، سرقہ اور توارد کی بحث، اصلاحی تحریک، یقین کی شاعرانہ خصوصیات، ان کے مرتبے کا تعین اور ان کی خدمات وغیرہ موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور تاریخ کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اس مقدمے سے یقین کی شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان کی حیات کے بہت سے مخفی گوشے منور ہو گئے ہیں۔ یہ کتاب مخطوطہ شناسی کے طلبہ کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کے لیے بھی ایک مثالی نمونہ ہے۔

ڈاکٹر فرحت فاطمہ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی دہلی میں ریڈر ہیں تحریر کی نفاست شستگی، کتابت وطباعت کا دلپذیر اہتمام شاید ان کو اپنے والد مرحوم پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم سے ورثہ میں ملا ہے۔ کتاب کا عنوان خط دیوانی میں اتنا دلکش اور خوبصورت ہے کہ مانو کتابت کا تمام زور قلم صرف کر دیا گیا ہے۔ جلد مضبوط اور کاغذ سفید استعمال ہوا ہے۔ قیمت نہایت مناسب بلکہ کم معلوم ہوتی ہے۔

اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ

مصنف : ڈاکٹر خالد محمود
قیمت : ۲۵۰ روپے۔
مبصر : پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر خالد محمود نے اپنی کتاب کے آخر میں اردو میں لکھے گئے سفرناموں کی جو فہرست فراہم کی ہے ان کی تعداد تقریباً ۱۵۰ تک جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جس طرح سفر کا سلسلہ ازمنۂ قدیم سے جاری ہے۔ سفرنامہ لکھنے کا بھی سلسلہ پرانا ہے۔ اردو زبان میں بھی سفرنامے مسلسل لکھے جا رہے ہیں۔ البتہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جس تیز رفتاری کے ساتھ سفرنامے ترتیب دیے گئے ان کی تنقید و تحسین بہت تاخیر سے شروع ہوئی اور چند ایک کاوشوں کے ماسوا کوئی مبسوط علمی کام اس ضمن میں اردو میں دستیاب نہیں ہے۔ ادبی نقادوں کی اس عدم دلچسپی کی ایک وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ ادبی سفرنامے تمام کے تمام اکثر اردو ادیبوں نے تحریر نہیں کیے (وجہ ظاہر ہے کہ بیرون ملک کا سفر بالعموم تاجروں اور اہل ثروت کا مشغلہ رہا ہے) ڈاکٹر خالد محمود نے موجودہ کتاب میں جو ان کی پی، ایچ، ڈی کا مقالہ ہے ہندستان میں پہلی بار معیر میں تحریر کیے گئے تقریباً تمام اہم سفرناموں کا تعارف پیش کیا ہے۔ سفر کی ضرورت اور اہمیت پر تو روشنی

ڈالی ہی ہے لیکن انھوں نے اپنی توجہ سے ادب میں سفرنامے کی صنفی اہمیت کے پیش نظر اس کی معنویت کا جائزہ لیا ہے اور اس مقصد کے لیے انھوں نے جو فنی اور تکنیکی پیمانے وضع کیے ہیں۔ ان کی زد میں آکر ادب غیر ادب اور کھرے کھوٹے کی پہچان ہو جاتی ہے اور سفرناموں کی طویل فہرست میں صرف چند ہی ایسے بچتے ہیں جو اپنے ادبی و لسانی اعتبار امتیاز اور پیش کش کے سبب اہم اور دلچسپ قرار پاتے ہیں۔ سفرنامے چونکہ تاریخ کا نعم البدل نہیں ہوتے اس لیے ان کی جو بھی قدر و قیمت ہے وہ فکشن اور نان فکشن کے درمیان ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر خالد محمود نے اس مقصد کے حصول کے لیے نہ صرف یہ کہ سیکڑوں سفرناموں کا باضابطہ مطالعہ کیا ہے بلکہ ان پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے اس کے بعد ہی وہ اس کثیر انبار میں سے واقعی اہمیت اور وقعت کے حامل سفرناموں کی نشاندہی کر سکے ہیں۔

موصوف کی پیش کش میں بلا کی جاذبیت ہے وہ خود شاعر ہوتے ہوئے بھی غیر شاعرانہ موثر نثر لکھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے اس ٹھوس علمی کارنامے کا ادبی دنیا میں خیر مقدم کیا جائے گا۔

سمتِ سفر

مصنف : سلمان ماہی

قیمت : ۷۰/- روپے صفحات : ۱۷۶

مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں

ملنے کا پتا : دفتر فوزان، ڈاکٹر انصاری روڈ، دوسرکار ابوڑی تھانہ مہاراشٹر۔

"سمتِ سفر" سلمان ماہی کے ان اداریوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہفت روزہ فوزان کے لیے تحریر فرمائے۔ یہ اخبار مہاراشٹر کے تھانہ نامی مقام سے نکلتا ہے "سمتِ سفر" میں ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۴ء تک کے ۷۶ اداریے شامل ہیں جیسا کہ ظاہر ہے اداریے وقت اور حالات کے پیش نظر لکھے جاتے ہیں اور حالات حاضرہ کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہ اداریے بھی مختلف مسائل، عنوانات اور مسائل پر لکھے گئے ہیں جو ملک کے 'برننگ ایشوز' ہیں۔ ان میں اردو، سیکولرازم، اقلیتوں کے مسائل، مظالم اور برسر اقتدار طبقہ کی غفلت، نااتفاقی اور استبداد وغیرہ خاص طور پر پیش نظر رکھے گئے ہیں۔ جن کے لکھنے میں جیرت انگیز جرأت اور ہمت کا ثبوت دیا گیا ہے اس طرح سلمان ماہی ایک نہایت جری، بے باک اور اولوالعزم صحافی نظر آتے ہیں ان کے یہ اداریے حقائق پر مبنی ہیں اور واقعات ہندستان کی ایک مستند تاریخ تیار کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے نہ صرف دلچسپی کا باعث بنیں گے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کریں گے اس بے خوف اور غیر جانبدارانہ اداریہ نگاری پر سلمان ماہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے یہ کتاب عوام و خواص میں قبولیتِ عام کا شرف حاصل کرے گی۔

پاکستان میں اردو ادب
محرکات اور رجحانات کا تشکیلی دور

مصنف : ڈاکٹر معین الدین عقیل

قیمت : ندارد صفحات : ۸۰

مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں

ملنے کا پتا : مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰

[illegible]

میں آیا تھا اور اب مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان سے شائع ہوا۔ اس مختصر مقالہ میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے پاکستان کے قیام کے بعد ادب کے رجحانات و محرکات کا مختصر جائزہ لیا ہے اور ہر ایک صنف ادب غزل، افسانہ، ناول، تنقید، انشائیہ، خود نوشت، تحقیق و تنقید اور خاکہ نگاری وغیرہ از اوّل تا حال کا عمومی تذکرہ کیا ہے جو ایک خوبصورت رپورٹ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس مقالہ میں ہند و پاک کے تمام اہم نام شامل ہیں اس لیے یہ نہ صرف پاکستان میں اردو ادب بلکہ برصغیر میں اردو ادب کی فہرست نما جامع رپورٹ تیار ہو گئی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسا جائزہ ہے جس کو وسعت دے کر کئی ضخیم مقالے تیار کیے جا سکتے ہیں۔ کتابت کمپیوٹر پر، کاغذ سفید چمک دار ہے۔ سرورق دو رنگوں میں خوبصورت اور دبیز پیپر کا ہے۔

دکھ کے موسم

مصنف: خورشید کرمانی
قیمت: ۱۰۰؍ روپے صفحات: ۱۳۶
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ناشر: تحریر نہیں کیا گیا

"دکھ کے موسم" خورشید کرمانی کا پہلا شعری مجموعہ ہے اس کے حصہ اوّل میں غزلیں اور دوسرے حصہ میں آزاد نظمیں شامل ہیں نظمیں چھوٹی اور بعض عنوانات کے تحت لکھی گئی ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں جن کو وادیٔ کشمیر کے خطہ پونچھ کا نمایاں اور ممتاز شاعر سمجھا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں احساس کی شدت اور تازگی کے علاوہ سادگی اور اثر بھی ہے۔ ایک غزل پڑھیے تو آخر تک پڑھنے کو جی چاہے بلکہ پڑھ کر ہی دم لیجیے بعض اشعار بغیر انتخاب کے ملاحظہ ہوں۔

تیرے نین کیوں برسے جاناں سو سو بار میں صدقے جاناں
میں نے چھیڑا ذکر جب اس رات کا اس کا چہرہ زعفرانی ہو گیا

پاگل مجھ کو سب سمجھیں گے لوگوں کے گر کام میں لکھوں
یہ افسانہ آدھا ہی ہے اس کا کیا انجام میں لکھوں
ہر اک گھر میں برپا ہے جو آج کا یہ کہرام میں لکھوں

میرے ہاتھوں سے اُجاڑا مجھ کو یہ بھی کوئی اصول تھا یارو
لوگ یوں داستاں بنا بیٹھے قصہ اتنا نہ طول تھا یارو

ہر اک گھر کا یہ کہرام ختم خدایا کیسے ہوگا!
تیرا میرا تو اک بام آجا ہم سے جھگڑا کیسا

خورشید کرمانی کی غزلوں کی بحریں چھوٹی اور رواں ہیں۔ ان کے اشعار میں مقامی رنگ اور مقامی تہذیب نمایاں ہے۔ انھیں پڑھ کر خطہ جنت نظیر کی نئی پرانی تصویریں چمکنے لگتی ہیں۔ نوجوان شاعر سے توقع ہے کہ

وہ اپنا شعری سفر جاری رکھیں گے اور بہتری کی طرف قدم بڑھائیں گے ۔

عربی زبان کے منتخب اور نمایندہ افسانے

مصنف: رفعت حجازی
قیمت: ایک سو روپے۔ صفحات: ۱۶۰
مبصر: ڈاکٹر محسن عثمانی

اردو زبان کا دامن دنیا کی دوسری زبانوں کے جواہر پاروں سے مالا مال ہے۔ حیرت و تعجب کی بات یہ ہے کہ عربی زبان کے افسانے ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہو پائے تھے۔ اگر کسی کو توفیق ہوئی بھی تو اس نے کسی ایک افسانہ نگار کے چند افسانے اردو میں منتقل کر دیے لیکن اس طرح کے عربی افسانوں کا پورا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔ یہ کام محترمہ رفعت حجازی سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا اس اعتبار سے عربی زبان کے "منتخب اور نمایندہ افسانے" ایک گراں قدر پیش کش ہے اور ترجمے کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ ہے۔

رفعت حجازی صاحبہ نے صرف ترجمے نہیں کیے ہیں بلکہ عربی زبان کے افسانوی ادب کی پوری تاریخ اپنے مقدمے میں دہرا دی ہے مزید یہ کہ کتاب کے آخر میں انھوں نے افسانہ نگاروں کا اپنے قلم سے تعارف بھی کرایا ہے۔ ان دو خصوصیات کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ بہت اہم اور مطالعے کے لائق ہے۔ انھوں نے افسانے کے فن کے سلسلے میں مقدمہ کتاب میں اپنی پسند اور ناپسند کا بھی اظہار کیا ہے لیکن اس میں بھی انھوں نے احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "میں یہ سمجھتی ہوں کہ ادب میں صرف فن اور ہیئت کو معتبر سمجھنا کافی نہیں ہے" اس سے یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ رفعت حجازی کے نزدیک صرف اسلوب اور ہیئت کا مکمل ہونا ادب کو زرِ کامل عیار نہیں بناتا۔ اسلوب اور ہیئت کے سوا اور کیا چیزیں رفعت حجازی کو عزیز ہوں گی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ مقدمے کی مجموعی فضا سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ اخلاقی اور انسانی قدریں انھیں عزیز ہوں گی لیکن افسانوں کے انتخاب میں انھوں نے اپنے ذاتی معیار کو زیادہ دخل انداز نہیں کیا ہے بلکہ وہ افسانے جو عرب دنیا کے ادبی حلقوں میں مقبول رہے ہیں انھیں بے کم و کاست پیش کر دیا ہے تاکہ عربی افسانہ جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے وہ اردو زبان کے قاری کے سامنے آجائے۔

کتاب کا تعارف معروف افسانہ نگار اور ناول نگار جیلانی بانو کے قلم سے ہے۔

رفعت حجازی صاحبہ نے اپنا مقدمہ ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔

"عربی زبان کے منتخب اور نمایندہ افسانوں کا مجموعہ اردو زبان میں ارباب ذوق کی خدمت میں اب پیش ہے ۔۔ ادب کے بازار میں لطف داستان کی یہ جنس گراں مایہ رکھ دی گئی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہجوم شوق کا کتنا سرمایہ جیب و دامن میں موجود ہے"

یہ فکر کون سہے گا کہ اپنی محفل میں ہجوم شوق نہ ہو لطف داستاں نہ رہے
دلوں میں ساغر سرشار کا فسانہ نہ ہو لبوں پہ غالب و اقبال کی زباں نہ رہے

اردو زبان کی "ریڈرشپ" کو علمی ادبی اور اخلاقی چیلنج مذکورہ بالا الفاظ میں دیا گیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگ اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔

فصلِ آگہی

شاعر: سلیم انصاری
مرتب: عطا عابدی : مبصر: ڈاکٹر خالد محمود
قیمت: ۷۵/- روپے
ناشر: سلیم انصاری ۵۵۹ موتی نالہ، جبل پور (ایم پی)

سلیم انصاری کی غزلیں اور نظمیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نئے ادبی منظر نامے سے منسلک ہونے کے باوجود اپنی قدرے الگ پہچان بھی بناتی ہے۔ ماسوا اس فطری یکسانیت کے جو ہم عصر شعراء میں باہم دیگر منعکس ہوتی اور اپنی چھب دکھلاتی رہتی ہے۔ انھیں پڑھ کر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ کلام کہیں پڑھا ہوا یا سنا ہوا ہے۔

عہدِ حاضر مابعد الاستعجاب کا عہد ہے۔ نت نئے سائنسی تجربات کے تسلسل اور علم و آگہی کی افراط نے کمپیوٹر کے آتے آتے مسرت بخش حیرتوں کے تمام دروازے بند کر لیے ہیں۔ اب ایک عجیب سی بے حسی اور بے بسی کا عالم ہے۔ سیاسی اور سماجی سطح پر نگاہ کیجیے تو ناانصافی، نابرابری، یقین و بے یقینی کی کشمکش، لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال، اعتبار و اختلاط کی فریب دہی اور اقدار و روایات کی شکست و ریخت جیسے اَن گنت معاملات و مسائل ہیں جن کا ردِ عمل ایک شاعر کے درون میں اضطراب پیدا کرتا ہے۔ یہی اضطراب تخلیقِ شعر کا سرچشمہ ہے۔

سلیم انصاری کا کلام اسی اضطراب کا فنی اظہار ہے۔ ان کی نظمیں مختصر اور بہت مختصر ہیں مگر معنوی لحاظ سے غزل کے اشعار کی سی کاٹ اور تہہ داری رکھتی ہیں۔ غزل کے اشعار میں روانی، برجستگی اور موضوعات کے تنوع کے ساتھ عصری حسیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ جدید غزل نے نام نہاد جدیدیت کے نام پر خود اختیاری ابہام کا جو کہرا اپنے گرد لپیٹ لیا تھا اب وہ اس سے باہر آ چکی ہے غزل کی نئی روش میں اب نہ ترسیل و ابلاغ کوئی مسئلہ ہے اور نہ شش و پنج والی پہلی جیسی کیفیت باقی ہے۔ سلیم انصاری کی غزل اسی فنی رویے کا اعتراف نامہ ہے۔

جنگل جنگل شہر

مصنف: ہیرانند سوز
قیمت: ۱۲۵/- روپے، ضخامت: ۱۶۰ صفحات
تبصرہ نگار: سیفی سرونجی
ناشر: سیمانت پرکاشن ۹۲۲ کوچہ روہیلا خاں ترایا بہرام، دریا گنج نئی دہلی ۲

مولانا اسمٰعیل میرٹھی نے کہا ہے ؎

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل — تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل

مختصر افسانہ نگاری میں نصف صدی کے ریاض نے ہیرانند سوز کی شناخت قائم کر دی ہے۔ کتاب میں شامل ۱۹ کہانیوں کے نقش کو "جنگل جنگل شہر"، کا نام دیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں دو شخصیات ابھرتی ہیں۔ ایک افسانہ نگار اور دوسرے دیگر اہم کردار اور کرداروں کے بھی دو گروپ نظر آتے ہیں۔

جن کے اپنے مختلف حالات، ماحول اور عادتیں ہیں۔ ایک گروپ کے کردار انسان کو 'مجبور محض' سمجھتے ہیں وہ زندگی کے تاریک پہلو پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ یہ ان کا مزاج بن گیا ہے ـــ انجام؟ ٹریجڈی۔ دوسرے گروپ کے لوگ انسان کو مختارِ کل مانتے ہیں۔ کائنات کا روشن پہلو ان کے سامنے رہتا ہے یہ ان کا مزاج ہے اور عاقبت؟ کامیڈی۔ افسانہ نگار نے ان دونوں متضاد دائروں سے ایک اہم نقطہ تلاش کرلیا ہے۔ یعنی انسانی سائیکی۔

دو کہانیاں "بھوک" اور "قربتیں اور فاصلے" منطق سے زیادہ تقدیر اور حالات کی بنیاد پر استوار ہیں۔ اس لیے واقعہ نگاری تک محدود ہیں' ہاں اس کتاب میں 'درد آشنا'، 'دلّی جو ایک شہر تھا'، 'ٹوٹی کہاں کمند'، 'آخری وقت'، 'فرشتے'، 'بازی گر'، اور 'مکافات' بلاشبہہ عمدہ کہانیاں ہیں۔ 'بیتے لمحوں کا عذاب' کہانی اس لیے پڑھنی چاہیے کہ اس میں جاگیردارانہ نظام کا جاہ و حشم' دن عید، رات شب برات، دلداری دلبری، جنبشِ ابرو، حکمراں کا حکم، حسینوں سے چلمن سجانا، اور محل میں ان کا قتل جاگیرداری امارت کی علامت تھا اب زوال پذیر ہونے کے بعد بھی آمادہ پیکار ہے "مکافات" بہتر کہانی ہے۔ "کالج کا ماحول" قاری کو دھوکا ہوتا ہے وہ نیرجا کو ہیروئن اور سامنت کو ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔ پھر کہانی خطرناک موڑ اختیار کرلیتی ہے سامنت کی ماں لکشمی اور نیرجا کا باپ راجندر تلوار ہیروئن اور ہیرو کے روپ میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ کالج کا پرانا معاشقہ سبق آموز ثابت ہوتا ہے اور ٹریجڈی کو کامیڈی میں بدل دیتا ہے۔ دو خاندان تباہی سے بچ جاتے ہیں کیوں اور کیسے؟ یہ کہانی پڑھ کر معلوم ہوگا۔ مختصر افسانہ نویسی میں کرداروں کا یہ رنگ پیدا کرنا ہیرانند سوز کا فن ہے میں سمجھتا ہوں اس افسانہ نگار کے یہاں پریم چندازم کی جھلک ہے ہیرانند سوز نے تمام موضوعات ہندستانی زندگی اور سماج سے لیے ہیں۔ عنوانات کا انتخاب افسانہ نگار کے مشاہدے، علم اور ذہانت کا ثبوت ہے۔ عنوان اور کہانی آخر تک ایک دوسرے سے منسوب رہتے ہیں۔ کتاب میں شامل کہانیاں قاری کو کیا دیتی ہیں؟ دلچسپی، وقت کا بہتر استعمال، زندگی سے آگہی۔ خود کفالتی کا نسخہ اور خوش حال۔ شاداب حاضر و مستقبل کی تخلیق کا آسان میگنا کارٹا یعنی خود اعتمادی کا اپنی ہی صلاحیتوں سے مطالبہ اور کامراں، مزاج میں نرمی مگر استقلال اور موقع شناسی۔ پوری انسانیت کو بہار زندگی کی سوغات۔

"جنگل جنگل شہر" اردو افسانوی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ یہ کتاب دیدہ زیب، گٹ اپ عمدہ کاغذ اور اعلا درجے کی کتابت اور طباعت کے ساتھ نہایت خوبصورت چھپی ہے۔

بے نام شجر
(مجموعہ کلام)

شاعرہ : نور جہاں ثروت

قیمت : ۱۷۵/- روپے صفحات: ۱۶۰

مبصر : ڈاکٹر خالد محمود

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"بے نام شجر" نور جہاں ثروت کا تازہ شعری مجموعہ ہے جسے شجر پبلی کیشنز نے عزیز پرنٹنگ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی سے شائع کیا ہے۔ کتاب ایسی خوبصورت ہے کہ آپ دیکھیں تو دیکھتے ہی رہ جائیں۔ سرورق سے لے کر کاغذ، کتابت، طباعت اور کتاب کی پشت پر صاحب کتاب کی تصویر تک ہر پہلو جاذب نظر ہے۔ غزلوں کے آس پاس ضرورت سے زیادہ موٹے اور چوڑے سیاہ حاشیوں کے ماسوا طباعت و اشاعت میں

بہرزاویہ حسن ترتیب اور خوش سلیقگی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب نزاکت اور صلابت کی متوازن پیش کش کے طور پر بھی یاد رکھی جائے گی۔ اوپر شاعرہ کی جس تصویر کا ذکر آیا ہے اس تصویر کے تیور اور شاعری کے تیوروں میں بڑی یکسانیت ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ تصویری تمکنت تجربات و احساسات کی پہنائیوں سے گزر کر شاعری تک آتے آتے اس "نیم رومانی ملال" کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کی جانب کتاب کے فلیپ کی عبارت میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں "گزرے ہوئے جذبات و احساسات ایک نیم رومانی ملال کی سطح پر نور جہاں ثروت کے ادراک سے رشتہ قائم کرتے ہیں اور نغمہ بن جاتے ہیں، نثر اس لیے کہ ان نظموں اور غزلوں میں غنائیت کا پہلو بہت نمایاں ہے"

نور جہاں ثروت اردو ادب کی معروف خواتین میں اپنی بے باکی اور جرأت اظہار کے لیے مشہور رہیں یہ شہرت انھیں صحافت کے حوالے سے حاصل ہے۔ شاعری خصوصاً غزل کی شاعری میں غیر شاعرانہ اور غیر ضروری قسم کی بے باکی برائے بے باکی ایک خاص انداز کی شہرت تو ضرور دلا سکتی ہے مگر جہاں تک معیار و اعتبار کا تعلق ہے اس کی ضمانت نہیں دے سکتی، ایک خاص نوع کی سماجی یا جنسی بے باکی کسی نفسیاتی ردعمل کے طور پر ذہنی انتشار اور جذباتی ناآسودگی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، پاکستان کی بعض شاعرات کے کلام میں اس بے باکی کے دلچسپ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ نور جہاں ثروت اپنی شاعری میں نہ صحافی ہیں نہ مذکورہ بے باک، وہ شاعر ہیں اور غزل کی اس ادا سے واقف ہیں کہ یہ صنف سخن واقعات و حادثات کو املا کی شکل میں لکھنا پسند نہیں کرتی بلکہ شاعر کے جذبات و احساسات کو اپنے فن کے وسیلے سے قبول کرتی ہے، تو وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اس کا فن جذبے اور احساس کی آنچ میں پگھل کر یوں تحلیل ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ نظر نہ آئیں۔ نور جہاں ثروت نے جگہ جگہ غزل کی ان شرائط کو پورا کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

یہ بات جا کے کسی شیشہ گر سے پوچھوں گی
شکست دل کی صدا کیوں مہیب ہوتی ہے

مجھی پر ختم ہوئیں دوست داریاں ساری
کہ میرے درد کا دامن بہت کشادہ ہے

ہمارے پاس تو لے دے ہے اک درد کی دولت
بڑے آرام سے اپنی گزر اوقات ہوتی ہے

ہم نے وفا نبھائی بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنے ہی بل پہ زندہ رہے عمر کٹ گئی

شہر ناپرساں میں اے ثروت سبھی قاضی بنے
یعنی ہر نافہم اپنا فیصلہ دینے لگا

صفحات کی تعداد ایک سو ساٹھ اور قیمت ایک سو بہتر روپے ہے۔

تحقیقی گوشے

مصنّف : ڈاکٹر رئیس انور۔
قیمت : ۶۰/- روپے
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

"تحقیقی گوشے" ڈاکٹر رئیس انور کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ان کی دقت نظری اور ادق کاوشوں کا عکس نظر آتا ہے۔ تحقیق کی صبر آزمائی اور سخت کوشی سے فرار کے اس زمانے میں ڈاکٹر رئیس انور کی ذات غنیمت ہے جنھوں نے تحقیق کی اصولی نظر کو اپنایا اور اس کے بعض جامع اصولوں کو ملحوظ رکھ کر مستند مآخذ کی مدد سے نئے اور کارگر نتائج اخذ کیے ہیں۔ مثلاً اردو یونی ورسٹی کا تصور ۱۸۶۸ء میں سرسید احمد خاں نے ورناکولر یونی ورسٹی کے نام سے پیش کیا۔ اس طرح کے کئی قدیم اور معتبر حوالوں سے بہت سے اچھوتے گوشے تاریخ کے دھندلکوں سے نکال کر منظر عام پر لائے ہیں۔ عبدالغفور نساخ کی مرتب کردہ "منتخبات" سے ڈاکٹر رئیس انور نے فورٹ ولیم کالج کے زمانۂ قیام کی توسیع ثابت کی ہے اسی کے ساتھ اگر وہ کالج کی مدت حیات کو متعین کر کے صاف صاف (اتنے سال اتنے مہینے اور اتنے دن وغیرہ) لکھ دیتے تو مسئلہ اور زیادہ واضح اور توجہ طلب بن جاتا۔ بہر نوع "تحقیقی گوشے" شمال مشرقی ہندستان کی بہت سی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے میں معاون ہوگی اور توقع ہے تحقیق کے طلبہ اور یونی ورسٹیوں کے دائرے میں مشعل راہ بنے گی اور اعلا ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرے گی۔

پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل کی عکاسی

مصنفہ : ڈاکٹر سیما فاروقی
قیمت : ۱۰۰/- روپے صفحات ۲۱۸
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
تقسیم کار : نصرت پبلشرز حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ

پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل کی عکاسی، ڈاکٹر سیما فاروقی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس کے بعض حصوں کو حذف کر کے موجودہ شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر اختر بستوی کی نگرانی میں لکھا گیا جس پر گورکھپور یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر سیما فاروقی نے پریم چند کے کم و بیش ایک درجن اردو، ہندی ناولوں میں مسائل خواتین کا جائزہ لیا ہے اور پریم چند کی ناول نگاری کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تحقیق و جستجو کا کام انجام دیا ہے۔ اس چھان پھٹک کے لیے انھوں نے اہم نقادوں کے معتبر حوالوں سے استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر سیما فاروقی کی اس کتاب کا تمام تر مطالعہ اس بات پر منتج ہوتا ہے کہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں خواتین کرداروں کو جس کشمکش اور الجھن میں گرفتار دکھایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند مظالم نسواں سے رنجیدہ تھے اور ان کی یہ حقیقی عکاسی جو خواتین کرداروں کے بیچ در بیچ قابل رحم کرداروں کی شکل میں ابھرتی ہے آزادی نسواں کی تحریک کا ایک حصہ ہے۔ ظاہر ہے پریم چند اپنے عہد کے حقیقت نگار تھے۔ ڈاکٹر سیما فاروقی نے ان کی اس حقیقت نگاری میں پریم چند کے مظلوم نسوانی کرداروں کا جائزہ لے کر حق نسوانیت ادا کیا ہے آخری اور چوتھے باب میں پورے مقالے کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ پریم چند کے

یہاں خواتین کرداروں کی تصویریں انسانی ہمدردی کے طور پر ابھرتی ہیں جس سے ان کی انسان دوستی کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ فکشن کی تنقید کی بھرمار کے اس زمانے میں ڈاکٹر سیما فاروقی کا مقالہ قابل قدر ہے جس سے ان کی محنت شاقہ اور خلوص کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس مقالے کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ اس میں بھرتی کا مواد شامل نہیں کیا گیا ہے۔ راقم کی ناقص رائے میں کتاب کے عنوان کے لیے "پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل،، ہی کافی تھا۔

ڈاکٹر سیما فاروقی کی زبان صاف ستھری سادہ اور پُرکشش ہے اس میں پریم چند کے پُراثر اسلوب کا شائبہ نظر آتا ہے۔ کتابت نہایت شستہ نستعلیق ہے اور طباعت بھی بے داغ ہے۔ اگر کاغذ بھی ذرا اور اچھے قسم کا استعمال کیا جاتا تو اور بھی اچھا تھا۔ سرورق رنگین اور خوشنما ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ امید ہے یہ کتاب مطالعہ پریم چند میں ایک اضافہ سمجھی جائے گی۔ ڈاکٹر سیما فاروقی اس کی اشاعت پر مبارکباد کی مستحق ہیں۔

شہکارِ عروض و بلاغت

مصنف: انور مینائی
صفحات: ۱۶۰
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ملنے کا پتا: الامین ایجوکیشنل کامپلکس درگاہ محلہ ضلع کولار۔ کرناٹک ۵۶۳۱۰۱

"شہکارِ عروض و بلاغت،، انور مینائی کی تازہ ترین کتاب ہے جس میں عروض اور بلاغت کے مشکل مسائل کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انور مینائی ماہر عروض بھی ہیں شاعر بھی اور ایک درس گاہ میں تدریس کے پیشے سے وابستہ بھی۔ انھوں نے عروض و بلاغت کے خشک اور دماغ سوز موضوع کو طلبہ میں مقبول بنانے کی غرض سے یہ کتاب تیار کی ہے۔ آج عروض و بلاغت سے فرار کے سبب بہت سی نئی اور غیر موزوں تصانیف کا تجربہ کیا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم عروض اور علم بلاغت سے آگاہی کے بغیر شعری حسن برقرار نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں کم سے کم شعر و شاعری کے حسن و قبح کو جان لینا گویا جملہ مقام سے پاک رکھنے کے لیے ضروری ہے جس کے لیے شہکار عروض و بلاغت یقیناً معاون ثابت ہوگی۔ انور مینائی نے بحر و اوزان، تقطیع، افاعیل و تفاعیل، عروض کی ابتدا اور مختلف لوازم شعری کو سمجھایا اور مثالوں سے واضح کیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں صنائع بدائع اور عیوب شعر پر نوٹ لکھے گئے ہیں جو اردو کے طالب علموں کے لیے خصوصاً کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ کتاب کے اس حصے میں انور مینائی نے علامت نگاری اور پیکر تراشی پر بھی مختصر نوٹ لکھا ہے جو موجودہ دور میں علم کلام کے اجزائے کبیر میں شامل ہیں۔ بہرنوع انور مینائی کی یہ کتاب ایک مستحسن کوشش ہے لیکن اسی قسم کی کتابوں کو شائع کرتے وقت اتنا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو اصول بنے بنائے ہوتے ہیں یا جو باتیں دوسروں سے مستعار لی جاتی ہیں اور اپنے لفظوں میں بیان کی جاتی ہیں ان کو تصنیف یا ترتیب نہیں کہا جاتا بلکہ تالیف کہا جاتا ہے اور تالیف کرنے والے کو مؤلف لکھا جاتا ہے نہ کہ مصنف یا مؤلف۔

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی راے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما سے متعلق آپ کی دو ٹوک، بے لاگ اور فوری راے کی ہمیں انتہائی ضرورت ہے مگر کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مختصر بھی ہو۔ (ادارہ)

● شمس الرحمٰن فاروقی، رانی منڈی، پوسٹ بکس نمبر ۱۳، الہ آباد ۳

مئی کے کتاب نما میں آپ نے میرا مضمون "تقطیع اس کی اب میاں صبح سے تا بہ شام ہو" شائع کیا ہے ممنون ہوں۔ جناب کمال احمد صدیقی نے مجھے متوجہ کیا ہے کہ سودا کے مصرعے

تقطیع اس کی جس کے صبح سے تا بہ شام ہو

کے پہلے رکن میں الف موصولہ فرض کریں تو تقطی عس بروزن مفعولن حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا "تقطیع اس" کا وزن لامحالہ طور پر مستفعلن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جناب کمال احمد صدیقی کی بات بالکل درست ہے۔ میرا دھیان الف موصولہ کے امکان کی طرف گیا ہی نہیں، غالباً اس باعث کہ لفظ کے آخر میں نچے رہنے والا ع تقطیع میں تو شمار ہوتا ہے لیکن بول چال کے تلفظ میں نہیں آتا، اس لیے شاید ہی کسی اردو شاعر نے ایسے ع پر الف موصولہ کا عمل کیا ہو۔ بہرحال اصولی طور پر یہ بات بالکل درست ہے کہ "تقطیع اس" کا وزن مفعولن ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ بات کہ سودا نے رجز کا سالم رکن مطوی کی جگہ رکھا ہے۔ غلط قرار پاتی ہے۔ اب صرف اقبال کی مثالیں رہ جاتی ہیں جن میں انھوں نے رجز سالم کے رکن کو مطوی رکن کی جگہ استعمال کیا ہے از راہ کرم اس مراسلے کو شائع کر دیں۔ میں جناب کمال احمد صدیقی کی توجہ دہانی کا ممنون ہوں۔

● ریاض الرحمٰن شروانی، حبیب منزل، علی گڑھ یوپی۔

ایک عجیب اور دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ سرسید اور ڈاکٹر اقبال کے سلسلے میں ہندستان اور پاکستان کے مصنفین کا رویہ بالعموم ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ ہندستان کے اہل قلم ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرسید ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دیتے تھے، نہ کہ مذہب کو اور پاکستان کے قلم کاروں کا سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ دو قومی نظریے کے اصلی بانی سرسید ہی تھے۔

اسی طرح ہندستان کے مصنفین ڈاکٹر اقبال کے حب وطن کو اجاگر کرنا اپنا اولین فرض قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال ہندستان کے اندر شمال مشرقی ریاستوں کے وفاق کے حامی تھے، تصور پاکستان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے برعکس پاکستان میں ان کی عظمت کی بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ وہ تصور پاکستان کے خالق تھے۔ وہاں جس طرح مسٹر جناح کو عملی طور پر بانی پاکستان مانا جاتا ہے اسی طرح ڈاکٹر اقبال کو نظریاتی طور پر خالق پاکستان (خالق اپنے لغوی معنی میں) سمجھا جاتا ہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے، جب تک ان کا وہ خط عام نہیں ہوا تھا جو انھوں نے اپنے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت کے کئی برس کے بعد مسٹر جناح کو لکھا تھا اور جس میں واضح طور پر مسلمانوں کے لیے ہندستان کے شمال مشرقی صوبوں پر مشتمل علاحدہ مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا اس وقت تک تو یہ مسئلہ بحث طلب ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کا اصلی منشا کیا تھا لیکن اب بالکل نہیں رہا ہے۔ اس خط کی روشنی میں وہ بلا شبہ ایک جداگانہ مسلم ریاست کے حامی نظر آتے ہیں بلکہ وہ تو اس معاملے میں اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ انھوں نے مسٹر جناح کو مشورہ دیا تھا کہ اقلیتی

صوبوں کے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے ساری توجہ اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں پر مبذول کرنی چاہیے۔ یہ امر بھی بہت دلچسپ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی اسکیم میں شمال مشرق کی مسلم اکثریت والی ریاست (بنگال) کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔

ڈاکٹر اقبال یقیناً بہت بڑے شاعر تھے لیکن کسی بڑے شاعر کے لیے بڑا سیاست داں ہونا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے ڈاکٹر اقبال پنجابی مسلم لیگ کے ایک دھڑے کے لیڈر تھے اور بس! لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی فرق بالکل نہیں آتا ہے۔ اقبال کے عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ایک بڑے یا اہم سیاسی لیڈر ہونے پر اصرار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ممتاز سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ایک بڑے شاعر بھی تھے جو وہ یقیناً نہیں تھے۔

● زیڈ۔ ایم۔ خاں، ۵/۱۷ ہاتھی خانہ، فتح گڑھ، یو۔پی۔

کتاب نما بابت ماہ فروری میں ایک انشائیہ بعنوان "مشترکہ تہذیبی ورثہ اور اقبال" نظر سے گزرا جس میں علامہ اقبالؒ پر غیر حقیقت مندانہ اور خلاف تاریخ تنقید کر کے ان کو فرقہ پرور گردانا گیا ہے اور سیاسی نقطۂ نظر سے ہی نہیں بلکہ ان کی فکر اسلامی اور فلسفۂ "خودی" پر اپنی لاعلمی کی بنا پر بہت بھونڈے اعتراض کر کے طعن کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال نے لفظ "خودی" کا استعمال اپنے اشعار میں امتیازی و نمایاں طور پر کیا ہے جس کو قارئین بالعموم سرسری طور پر پڑھ کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق مطلب اخذ کرتے ہیں۔ بہت ہی کم اصحاب نے اس "خودی" کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہوگا کہ اس کے رموز درحقیقت ان پر وا ہوئی "خودی" کیا ہے اور اس کا حیات انسانی سے کیا تعلق ہے؟ اس کی تشریح میں مختصراً پیش کر رہا ہوں۔

ہمارے وجود کا مرکز و جوہر روح ہے اور خودی اس بحرِ وجود کا گوہر۔ اور اقبالؒ کی فہم و نظر میں وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کا نمود "کہ اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا"۔ یہ "خودی" ہی انسان کو نیابت الٰہی کا اہل بناتی ہے اور اس مقام ولایت پر فائز کرتی ہے جس کے لیے مخبر صادق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنّ اللّٰہ رجالاً یرضی برضاٴھم و یغضب بغضبھم کما انّھم یرضوا برضائہ و یغضبوا لغضبہٖ" (رواہ ترمذی) یعنی جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دے دیتے ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضب ناک ہوتے ہیں اور اس کی ترجمانی علامہ اقبالؒ نے یوں کی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

"خودی" لغوی اعتبار سے فارسی سے تعلق رکھتا ہے اور یہ عربی لفظ "انا" کا بدل ہے۔ "انا" ایک فطری / نفسی جذبہ ہے جو ہر ذی روح کا حصّہ ہے لیکن وہ عرفانِ حق کے بغیر بے لگام ہو کر حق پرستی سے منہ موڑ لیتا ہے اور خود پرستی و خود ستائش میں مبتلا ہو کر نیز دنیاوی کامرانی کبر و نخوت، گھمنڈ و غرور کی نحوست کا شکار ہو کر حیوانیت و شیطنت پر اتر آتا ہے جس کا نتیجہ شر پسندی، بد نظمی و شہوت پرستی ہوتا ہے لیکن عارف کی نظر میں "خودی" انسان کا وہ النفسی و ملکوتی جوہر ہے (ESSENCE) جو صالح کردار، یقین و عمل اور راہِ مستقیم کے تصورات کی شمع روشن کرتا ہے اسی طرح اقبال کی "خودی" ملکوتی جذبات کا آئینہ ہے وہ تمکنت غرور اور خود پرستی کا مفہوم ادا نہیں کرتی بلکہ خود شناسی اور عرفان نفس کا (دینی شعور نفس کو بیدار کر کے اور ایفائے عہد الست کا احساس جگا کر اس فرض سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کا جذبہ پیدا کرتی ہے جیسا کہ خود علامہ اقبال نے فرمایا: خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں۔

جو نازبھی ہے تو بے لذت نیاز نہیں۔)۔ اقبال کی "خودی" نظام فکر کی تنظیم کرتی ہے اور ترتیب ۔ ان کے اشعار میں اس کا استعمال مقصدیت کا حامل ہے نہ کہ محض تفنن طبع تھا اور یہ اپنی حیثیت میں مہمل تخیل نہیں ہے ۔ یہ فلسفہ مسلمان کی فکر اور احساس بندگی کو جلا دینے والا ہے ۔ یہ وہ مضراب ہے جو مسلمان کی حیثیت "اشرفیت" کو بیدار کر کے تطہیر و تزکیۂ قلب کرتی ہے ۔ اقبال کا یہ تفکر نتیجہ ہے اسلامی تاریخ، قرآن وسنت اور صحابہ کرامؓ و صلحاء امت کی زندگی کے مطالعہ سے سبق حاصل کرنے کا (محض ورق گردانی نہیں اور نہ سیاسی سرپرستوں کی گفتار اور ریاکاری سے بھرپور صحبت اور انداز فکر و مطلب براری کا) انھوں نے مسلمانوں کی ہزیمت کے اسباب کا تجزیہ کر کے (جواب شکوہ) ملت کو عزیمت کی راہ دکھائی اور ان کے درخشاں و تابناک دور کا آئینہ پیش کیا ۔ انھوں نے اپنے نظریات کو فلسفۂ "خودی" میں سمو کر حسین شعری پیراہن سے مزین کیا تاکہ وہ ذہنوں کی راہ سے دلوں میں جگہ پا سکے ۔ ان کا مقصد تھا کہ مسلمان آخر ہی میں نہیں دنیا میں بھی سرخروہی حاصل کرے ۔ انھوں نے روز ازل "میثاق عام" میں کہا گیا "بلی۔ شہدنا" کا عہد یاد دلا کر کلمۂ شہادت سے اس کی تصدیق کرنے کا احساس اور "انسان" کا "نقش" اجاگر کرکے "خودی" کے ترنم اور اس کی عطر بیزی سے معطر "امانت"، "خلافت" اور "ولایت" کے درجات و منزل کی نشاندہی کی ۔ ان کے اشعار نے مہمیز بن کر ملت کی خوابیدہ فہم (دنیا پرستی) اور فرائض دین میں ہلچل مچادی (لیکن آنکھوں والا تیرے جوبن کا تماشا دیکھے) کیونکہ انیسویں صدی کے آخری دہے میں اسلامی سماج کی امتیازی شخصیت، حسائیت کے نظریہ زندگی سے متاثر ہونے لگی تھی اور مسلمانوں نے اپنی زندگی دین و دنیا کے خانوں میں پورے طور پر تقسیم کر دی تھی حتیٰ کہ وہ منقسم زندگیاں طبقاتی شکل اختیار کر کے ایک دوسرے سے بُعد اختیار کرنے لگی تھیں جس نے وحدت ملت کو پارہ پارہ کر دیا تھا نتیجتاً پورا اسلامی سماج اخلاقی طور پر روبہ زوال ہونے لگا تھا ۔ اقبال کا مطالعہ تھا کہ آج مسلمان نے اپنے اعمال و کردار اور مقصد حیات کو پرکھنے کے لیے، قرآن وسنت کو کسوٹی نہ بنا کر اپنی عقل کو (مغربی اور دوسری تہذیبوں کی پیروی میں) نفسانی جذبات کا مطیع بنا کر اسی چولے میں خود کو ڈھالنا شروع کر دیا تھا اور ان کے تحت الشعور میں اسلام صرف چند رسموں تک محدود نظر آنے لگا تھا ۔ ان مشاہدات نے علامہ کی فطری فکر کو جھنجھوڑا اور یہ توفیق باری تعالیٰ وہ عقل (اسلام) کو دل کے پاس رکھنے کی تلقین کرنے لگے (بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل)۔ انھوں نے "خودی"، (عرفان نفس و خودشناسی) کو اپنی فکر کا مرکز بنا کر اس وقت کا مقبول عام اسلوب شاعری اختیار کیا (جس پر ہمارے مقالہ نگار نے طعن کیا ہے) تاکہ عزیمت کی راہ دل نشیں ہو جائے ۔ یہ ان کا شاعرانہ تخیل نہیں تھا ۔ بلکہ رموز اسلام کی کلید تھی اور "الست بربکم" کے جواب پر عمل پیرا کرنے کا حسین پیرائے تلقین جس میں انھوں "مجذوب فرنگی" کو مقام رب العلمین اور انسان کو خود اس کی حیثیت سے روشناس کرایا ۔

تصور "خودی"، تصور حیات کا رہنما ہے اور باہم لازم و ملزوم ۔ مسلمان کی تہذیب اسی کے سایہ میں آراستہ و مزین ہوتی ہے جو اجتماعی اور سماجی میدان میں معاشرت کا روپ دھارن کر لیتی ہے "یہ زندگی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی ۔ وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے"، مقالہ نگار کا یہ تخیل کہ اقبال "نئے انسان اور نئے انسانی معاشرے کا کوئی واضح خاکہ پیش کرنے سے قاصر رہے"، انتہائی افسوسناک ہے اور علمی بحران کا ثبوت "خودی" کی تصویر سے زیادہ بہتر انسان کا نمونۂ زندگی، جامعیت نیز وضاحت

اور کیا ہو سکتی ہے "خودی" حقیقت انسان ہے لیکن اس کے عرفان سے ناواقف انسان کے لیے "الف نہیں لٹھ"، کے مصداق۔ کیا علامہ کے اشعار میں پیروی قرآن و سنت کے اشارے انسان کو صالح عمل و کردار کی راہ نہیں دکھاتے؟ کیا اسلامی اقدار جو لفظ شریعت سے واضح کی گئی ہیں ان کا حامل شخص "انسان" کا اثر نمونہ نہیں۔ کیا تہذیب اسلام کے مثل آج تک دنیا کوئی تہذیب پیش کر سکی ہے؟ کیا نئے معاشرے سے مقالہ نگار کی مراد اس نئے معاشرے سے ہے جس کو مجذوب فرنگی انڈوانسڈ کلچر کہتے ہیں اور وہ اسی تہذیب کے فطری، آفاقی اور صالح ہونے کی تصدیق علامہ اقبال کی زبان سے سننا چاہتے ہیں اور اس معاشرے کی بے حیائی، فحاشی، آزاد جنسی اختلاط (جانوریت)، خود پرستی و نفس پرستی ریاکارانہ سیاست اور اخلاق مطلب پرستانہ کی تائید نہ پاکر یہ فرماتے ہیں کہ، "وہ کوئی واضح خاکہ پیش کرنے سے قاصر رہے" آخر اس جملہ سے کیا مقصد ہے محترم مقالہ نگار کا۔

آخر میں۔ میں مقالہ نگار سے عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ اسلام کا عقیدہ "عہد الست"، اور رابطہ خالق و مخلوق کی روشنی میں "خودی"، کے رموز حقیقت عظمت، اہمیت اور لزومیت بالنفس کا مطالعہ کریں اور فرمائیں کہ علامہ اقبال پر آپ کی لگائی گئی تہمت حق ہے؟

● ڈاکٹر ایس، اخلاق اثر، کوٹھی نمبر ۲، سیکٹر A-۱۹، چندی گڑھ

کتاب نما کا اپریل کا شمارہ ہریانہ اردو اکادمی میں اور مئی کا شمارہ پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں دیکھا۔ جناب اختر سعید خاں کی غزل کلاسکی شان رکھتی ہے اور اس کی مقام اشاعت سے آپ کے ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کا "رشید حسن خاں دہلی سے چلے گئے"، بہت خوب ہے۔ خاص طور سے جہاں جہاں انھوں نے رشید حسن خاں کے املا کی اصلاحات کا ذکر کیا ہے وہاں وہاں ان کے مزاج کا رنگ گہرا اور احتجاج کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ یوسف ناظم نے رشید حسن خاں کے بارے میں لکھا تھا، "جو جتنا سر جھکا کر کام کرتا ہے اتنا ہی سر اٹھا کر چلتا ہے"۔ یہ حقیقت بھی ہے اور دوسروں کے لیے ایک اچھا مشورہ بھی۔

● کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی، این ۳۴۷، گریٹر کیلاش، نئی دہلی

مجھے خوشی ہے کہ کتاب نما کے قارئین نے "فائر ایریا"، پر میرے تبصرے کو غور سے پڑھا اور اس پر اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کیا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے اعتراضات میں دلائل کم اور الیاس احمد گدی سے محبت زیادہ نظر آتی ہے۔

کوثر مظہری صاحب کا کہنا ہے کہ ناول میں فن پارہ ہونے کے تمام عناصر موجود ہیں۔ کہانی پن بھی ہے کردار نگاری کا پختہ شعور بھی۔ یہی بات میں نے کہی تھی۔ میں کوثر مظہری صاحب کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ کولیری ناول کا ضروری حصہ ہے میرا اعتراض صرف اتنا ہے یہ حصہ ناول پر اتنا زیادہ حاوی ہو گیا ہے کہ ناول کی دوسری خوبیاں دب کر رہ گئی ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ اگر قاری اس طرح کے صفحات (کولیری کا تفصیلی خاکہ) سے بچ کر آگے نکلنا چاہتا ہے تو اس سے گدی صاحب کا کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر قاری ایسا کرتا ہے تو ناول نگار کا بہت کچھ چلا جاتا ہے۔ کوثر صاحب بے شک اس سے متفق نہ ہوں لیکن مجھے یقین ہے گدی صاحب کو یہ ضرور برا لگے گا۔

توصیف احمد صاحب کا کہنا ہے کہ جناب شمس الرحمن فاروقی "شب خون"، میں اپنے تبصرے میں اس خیال کا برملا اظہار کر چکے ہیں کہ یہ ناول بڑے ناولوں میں سے ایک ہے۔ فاروقی صاحب

بلاشک بڑے قدآور ناقد ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات کا بُرا نہیں مانیں گے کہ دوسرے تبصرہ نگاروں کی رائے ان سے مختلف کیوں ہے۔

رونق شہری صاحب نے میرے تبصرے پر تو کوئی رائے زنی نہیں کی ہے البتہ ان کا کہنا ہے کہ اس ناول کے دلچسپ ہونے کی بنا پر ہی اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی ہے اگر مقبولیت کی بنا پر ہی ایک ناول کی ساکھ کا فیصلہ ٹھہرا تو پھر گلشن نندہ صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے ناول نگار سمجھے جائیں گے۔

● منظور ہاشمی، خواب آشیاں، ۱۷- بی- بدر باغ، علی گڑھ

ادھر مارچ ۹۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر شہپر رسول کا مہمان اداریہ پڑھ کر جی خوش ہو گیا کہ انھوں نے پیکر تراشی جیسے پیچیدہ عمل کو بڑی آسان اور رواں زبان میں سمجھنے، پہچاننے اور محسوس کرنے پر روشنی ڈالی ہے اس کو پڑھنے کے بعد شعری حسن، تخلیق فن کار کا اور اندرونی خوبصورتی تک رسائی آسان بھی ہو جاتی ہے اور پُر لطف بھی۔

● م- ق- سلیم، ایم اے، ریسرچ اسکالر (عثمانیہ یونیورسٹی)

اپریل ۹۶ء کا کتاب نما نظر سے گزرا، مہمان مدیر مسعود احمد برکاتی کا اشاریہ "تشویش معلومات" مختصر مگر بہت کچھ احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ بات یہی ہے کہ تعلیم یافتہ جاہل، یہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس علم کا سمندر ہے اور تعلیم یافتہ عالم کو علم کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کسی بھی چیز کو پرکھنے کے لیے سب سے پہلے یقین کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ یقین تین مدارج کے بعد کامل کہلاتا یعنی (۱) علم الیقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین، اور ایک یقین بھی ہے جو ڈلمل یقین کہلاتا ہے۔ اور یہ یقین تشویش معلومات کا سب سے بڑا عنصر کہلا سکتا ہے۔ برکاتی صاحب کے یہ الفاظ "مدیروں کے لیے تو ایک اور مسئلہ بھی ہے۔ بے شمار مسودات پڑھے بغیر اشاعت کے لیے انتخاب ممکن نہیں اور مثلاً دس اچھے مسودات چننے کے لیے سو بُرے مسودات بھی پڑھنے ضروری ہیں۔ یقیناً ان کا کہنا صحیح ہے اور یہ صرف سچے اور صادق اڈیٹروں پر صادق ہے جو ادب نظم و نثر کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر ان مدیروں کا کیا کریں جن کے پاس یا تو صرف نام ہوتے ہیں یا سفارشی اور باقی کے مسودات اڈیٹر کی ردی کی ٹوکری کے حوالے ہو جاتے ہیں چاہے وہ اچھے ہی کیوں نہ ہوں۔

● رفیع الدین بلساری، ۱۲۰/اے ڈاکٹر انصاری روڈ، دوسری راہوڑی، تھانہ، مہاراشٹر۔

اشاریہ "بہار میں اردو- مسائل اور امکانات"۔ بہت ہی قابل غور اور توجہ طلب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو داں اردو کی ترقی کے خواہشمند ہونے کے باوجود اس کی ترقی کے لیے کچھ نہیں کر پاتے جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان ہی سمجھا جاتا ہے جو کہ سراسر غلط ہے اور یہی خیال اس کی ترقی کے لیے بڑی رکاوٹ ہے۔

● سلیم انصاری، ۵۵۹ موتی نالہ، جبل پور، ایم پی

مشتاق احمد نوری نے اردو کے مسائل کا جائزہ غیر جانبداری سے لیا ہے۔ سچائی یہ ہے کہ ہم اردو والے ہی اردو کے کاز کو نقصان پہنچانے میں پیش پیش ہیں ہم حکومت وقت سے اس لیے نالاں ہیں کہ وہ اردو کی ترقی اور بقا کے لیے کچھ نہیں کرتی لیکن جہاں اردو کو مراعات حاصل ہیں، وہاں ہمارا رول اردو دشمنی پر مبنی ہے۔ مشتاق نوری نے اس سلسلے میں پٹنہ کے پاسپورٹ آفس کی مثال دی ہے۔ پٹنہ کے پاسپورٹ آفس میں حکومت نے پاسپورٹ کے فارم اردو میں مہیا کرائے لیکن ایک بھی اردو فارم نہیں بکا۔ اردو کو تخلیق کار سے زیادہ قاری کی تلاش ہے اگر صورت حال یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب تخلیق کار اور قاری کی تعداد برابر ہو جائے گی۔ لہذا ضرورت اس

بات کی ہے کہ ہم اردو کا قاری پیدا کریں۔

● تارا چرن رستوگی، اقبال اسٹڈیز سینٹر، گوہاٹی۔

پروفیسر قاضی عبدالرحمن ہاشمی کی تحریر بہ عنوان "مشترکہ تہذیبی وراثت اور اقبال"، گذشتہ دو ہفتے سینٹر کی نشستوں میں موضوع بحث رہی۔ فی الواقع بہ حیثیت مہمان مدیر پروفیسر ہاشمی نے اقبالیات کی تنظیم میں قابل تعریف اضافہ کیا ہے اساسی طور پر اقبال شاعر تھے، درد و سوز و آرزو مندی سے بھرپور رومانی شاعر مگر سیاسی سطح پر ان کی سوچ رومانیت کا شکار ہو کر رہ گئی۔ تصور پاکستان دراصل اسی سوچ پر پروان چڑھا، جس کو سیاست کاروں نے ملک کی تقسیم پر منتج کر دیا، جو آگ کا دریا بنی ہوئی ہے۔

ہمارا سینٹر تو ہنوز اس نتیجے پر بھی نہیں پہنچ سکا ہے کہ شاعر اعظم کو علامہ سب سے پہلے کس نے کہا اور کب کہا۔ اب اس لقب کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

● سید احتشام الدین، محلہ ملا حلیم خاں، دربھنگہ بہار

اس شمارے میں آپ نے پٹنہ کے مشتاق احمد نوری سے اشاریہ لکھوایا ہے۔ شاید انھیں بہار کا موضوع قائم کر کے لکھنے کی پابندی تھی۔ مشتاق صاحب نے جن مسائل کو چھیڑا ہے وہ ملک گیر ہیں۔

محترم میرے خیال میں مشتاق نوری صاحب نے "بہار میں اردو ادب ـ مسائل اور امکانات" کو وسیع تناظر میں پیش کیا ہے۔ اگر بہار، لالو، جابر کے حوالے سے بات نہیں کرتے تو اس کی کاٹ اور بڑھ جاتی۔ جس قسم کی باتیں انھوں نے "اشاریہ" میں کی ہیں۔ یہ پورے اردو داں طبقہ کے لیے دعوت فکر ہے۔ اردو سے متعلق نوری صاحب کے یہاں جو جذبہ کارفرما ہے، وہ قابل ستایش ہے۔ اردو کے مزاج میں انسان دوستی، رواداری اور سیکولرزم کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

● صابر رومانی۔ تھانے

کتاب نما کا تازہ شمارہ (ماہ مئی) موصول ہوا بہ حسب سابق نہایت معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ مشتاق احمد نوری صاحب کا اشاریہ "بہار میں اردو۔ مسائل اور امکانات"، کافی فکر انگیز ہے۔ انفرادی طور پر سوچنے اور کچھ کرنے کے بجائے اجتماعی صلاح و مشورہ اور کارگزاری زیادہ وقیع اور مفید ثابت ہوگی۔ پٹنہ میں کئی فعال ادارے ہیں جو فروغ اردو کے لیے پہلے ہی سے کوشاں ہیں۔ انھیں مزید فعال بانا اور ان کے واسطے سے مختلف سرگرم کارکنان کو جمع کر کے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنا زیادہ مفید ہوگا عبدالمعروف خاں کا انشائیہ "کنفیوژن" کافی دلچسپ ہے۔

● عادل حیات، نبی کریم، نئی دہلی ۵۵

مئی ۹۶ء کا "کتاب نما"، باصرہ نواز ہوا۔ غزلیں افسانے اور مضامین اپنی جواب آپ ہیں۔ مشتاق احمد نوری کا اشاریہ "بہار میں اردو۔ مسائل اور امکانات"، ایک بلیغ اور بصیرت افروز اشاریہ ہے۔

● عابد دربھنگوی، الفا کمپیوٹر سینٹر، دریاپور، پٹنہ۔

ڈاکٹر نجیب اختر کا مضمون "معیاری اردو نثر"، بہت دلچسپ اور معلوماتی بھی ہے۔ اشاریہ میں مہمان مدیر مشتاق احمد نوری صاحب نے جو مسئلہ اٹھایا۔ وہ واقعی قابل غور ہے مگر عملی سطح پر جیسا کہ انھوں نے کہا، سعی فی الحال بہت نازک ادوار سے گزر رہی ہے۔ اس سلسلے میں دیگر حضرات کو تو خیر چھوڑ دیجیے، اس معاملے میں اردو اکیڈمیوں کا رول بھی تشویشناک ہے جو مشورے انھوں نے دیے اس پر اردو اکادمی حتیٰ کہ وہ اردو اکادمی بھی عمل نہیں کر پاتی جس کے وہ سکریٹری ہیں ایسی صورت میں واقعی اردو کے مستقبل سے امید وابستہ نہیں کی جا سکتی۔

ادبی و تہذیبی خبریں

اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے انعامات کا اعلان

پروفیسر نثار احمد فاروقی، عثمان غنی انعام پانے والوں میں شامل

لکھنؤ۔ (۱۲ مئی) اتر پردیش اردو اکادمی کے سال ۱۹۹۵ء کے انعامات کا اعلان آج اکادمی کے چیرمین پروفیسر محمد یونس نگرامی اور وائس چیرمین مسٹر اطہر نبی نے ایک پریس اعلانیہ میں کیا ہے۔

اکادمی نے سال گزشتہ کی موصولہ کتابوں پر ایک لاکھ تیس ہزار پانچ سو روپے کے انعامات کا بھی اعلان کیا جن میں ناشرین اور کاتب کے انعامات بھی شامل ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد انعام۔ ایک لاکھ گیارہ ہزار روپے، پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی) مجموعی ادبی خدمات کے انعامات۔ ڈاکٹر عرفان عباسی (لکھنؤ) اکیاون ہزار روپے۔ کرشن بہاری نور (لکھنؤ) اکیاون ہزار روپے۔ مولانا عبدالوحید صدیقی انعام برائے صحافت، جناب عثمان غنی (لکھنؤ) دس ہزار روپے۔

پانچ ہزار روپے کے انعامات

کوکب قدر سجاد علی مرزا (علی گڑھ) واجد علی شاہ کی ادبی و ثقافتی خدمات (تحقیق)۔ مجتبیٰ حسین (دہلی) سفر لخت لخت (سفرنامے طنز و مزاح)۔ عمر انصاری (لکھنؤ) مصحف عمر (شاعری)

تین ہزار روپے کے انعامات

امیلا ماتھر (بمبئی) ایسی تھی برسات کی رات (افسانے)۔ شمیم نکہت (دہلی) تاثرات (تنقید)، ذاکرہ غوث (مدراس) مولانا الوری۔ شخصیت اور فن (تنقید)۔ سید محمد ہاشم (علی گڑھ) سید سلیمان ندوی۔ حیات اور کارنامے (تنقید)۔ پیام فتح پوری (کانپور) شبنم و گل (شاعری)۔ خورشید افسر بسوانی (بسواں) سرشام (شاعری)۔ مصور لکھنوی (لکھنؤ) عکس کائنات (شاعری)۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں (دہلی) مفکرین تعلیم (تعلیم)۔ سیدہ جعفر (حیدرآباد) مہک اور محک (تنقید)۔

دو ہزار روپے کے انعامات

ظل ہما (دہلی) دہلی میں اردو افسانہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک (تحقیق)۔ شمس بدایونی (بریلی) نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات۔ صغیر ابراہیم (اناؤ) نثری داستانوں کا سفر (تحقیق)۔ ضیا فاطمہ (الہ آباد) جدید اردو غزل (تنقید)۔ محمد یونس (بنارس) ماہنامہ الناظر لکھنؤ۔ ایک مطالعہ (تحقیق)، شاہد ماہلی (دہلی) سنہری اداسیاں (شاعری) شبیر سنگھ شبیر (دہلی) خم خانہ (شاعری)۔ شمس فرخ آبادی (لکھنؤ) دوہا درپن (شاعری)۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی (بریلی) نوابین اودھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی (تاریخ)۔ ولایت جعفری (لکھنؤ) گستاخیاں (افسانے)۔ ہیرانند سوز (فرید آباد) جنگل جنگل شہر (افسانے)۔ زینیہ منظور الامین (حیدرآباد) یہ راستے (ناول)۔ تسکین زیدی (کانپور) خواب کی پرچھائیاں (افسانے)۔ نورالعین علی (بمبئی) کینسر (ڈراما) سیدہ نسیم چشتی (دہلی) تعاقب (ناول)۔ نور اندوری (بھوپال) غزل کہہ رہا ہوں (شاعری)۔

ڈیڑھ ہزار روپے کے انعامات

ڈاکٹر سیما فاروقی (گورکھپور) پریم چند کے ناولوں میں خواتین کے مسائل کی عکاسی (تنقید) سید امجد حسین (لکھنؤ) غیر مسلم مرثیہ نگار۔ نصرین ممتاز بصیر (علی گڑھ) اردو خطوط نگاری کا ایک مطالعہ (تنقید)۔ ڈاکٹر جہاں آرا سلیم (لکھنؤ) فیاض علی۔ حیات اور ادبی خدمات (تحقیق)۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی (مرادآباد)

میر تقی میر۔ شخصیت اور فن (تنقید)۔ خالد محمود (مدھیہ پردیش) اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں (دہلی) شعریات بال جبریل (تنقید)۔ سبطین فاطمہ رضوی (لکھنؤ) میر خورشید علی نفیس۔ حیات و شاعری (تحقیق)، ماہر بلگرامی (لکھنؤ) خدنگ ناز (شاعری)۔ محرم عابدی (مئو) یادداشں (شاعری)۔ ڈاکٹر طاہر حسین طاہر (لکھنؤ) آبشار (شاعری)۔ صابر ابوہری (جگادھری) افکار اقبال (شاعری)۔ کرشن کمار طور (دھرم شالہ) مشک منور (شاعری)۔ ڈاکٹر ملک اسمٰعیل خاں (شاہجہاں پور) سوز حیات (شاعری)۔ ایونڈر لارنس (مراد آباد) گاہے گاہے (شاعری)۔ قمر زہرا رضوی (دہلی) جدید ہندوستانی (تذکرہ)۔ رئیس نجمی امروہوی (امروہہ) روتا ہوا آدمی (افسانے)۔ ایم۔ ایمرا احمد (بنگلور) سائنس کے کرشمے (سائنس)۔ شمس الاسلام فاروقی (دہلی) کیڑے قدرت کے شاہکار (سائنس)۔

ایک ہزار روپے کے انعامات

حبیب وقار (حیدرآباد) دکن کے مخصوص شعری اصناف (تحقیق)۔ مسعود انور علی (علی گڑھ) اودھ کے چند عربی علما (تحقیق) انیس چشتی (پونہ) دلت مراٹھی ادب شناسی (تنقید) محمد اشفاق عارف (جبل پور) جگت موہن لال رواں اور ان کی شاعری (تنقید)۔ اسعد بدایونی (علی گڑھ) بیخود بدایونی۔ حیات اور ادبی خدمات (تنقید)۔ محمد فیروز ظفر بدایونی (بدایوں) پھول نہال خار نہال (شاعری)۔ گوپال کرشن شفق (انبالہ) موج شفق (شاعری)۔ نوز پرکار (بمبئی) شفق کا ایک اور رنگ (شاعری)۔ ثاقب عباسی (الہ آباد) منزلیں ستاروں کی (شاعری)۔ گوہر خیرآبادی (سیتاپور) آب گہر (شاعری)۔ ڈاکٹر آصف زمانی (لکھنؤ) بات چیت (انٹرویو)۔ پریم گوپال متل (دہلی) مہاتما گاندھی اہنسا کے پیامبر (سوانح)۔ عشرت مرتضیٰ صدیقی (فیض آباد) پتھر اور مشعل (افسانے)۔ بیگم افتخار صدیقی (علی گڑھ) بچوں کے غالب۔ شفیقہ فرحت (بھوپال) نظیر اکبرآبادی (بچوں کا ادب)۔ مسعود الحق (دہلی) استادوں کی تعلیم و تربیت (تعلیم)۔ محمد حبیب خاں (علی گڑھ) تدریس سماجی علوم (تعلیم)۔ سعید احمد قادری (گیا) دھوپ کی چادر (افسانے) شیلیندر ربجن (پس از مرگ۔ بارہ بنکی) دریا (شاعری)۔ نغمہ ملوی: پھول مہکتے ہیں (افسانہ)۔

پبلشرز ایوارڈ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ایک ہزار روپے
مکتبہ پیام تعلیم " " "

کاتب انعامات

محمد الیاس (لکھنؤ) دو ہزار روپے
حافظ ابرار احمد۔ ایک ہزار روپے
(قومی آواز)

عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام
اردو امتحان

حیدرآباد۔ عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام پانچواں اردو امتحان جون ۱۹۹۶ء میں منعقد ہو رہا ہے۔ اردو تعلیم کی یہ تحریک اپریل ۱۹۹۴ء سے شروع ہوئی تھی۔ ٹرسٹ کے تعلیمی مراکز میں تعلیم پانے والوں کا سال میں دو مرتبہ یعنی جنوری اور جون میں امتحان لیا جاتا ہے۔ انگلش اور تیلگو میڈیم کے ایسے طلبہ جن کی مادری زبان اردو ہے لیکن وہ اردو لکھنے پڑھنے سے واقف نہیں ہیں ان کے لیے اس مرتبہ بھی گرمائی اردو کلاس کا انتظام کیا گیا۔ یہ اردو کلاس شہر حیدرآباد و سکندرآباد کے مختلف محلوں کے علاوہ تلنگانہ و آندھرا کے اضلاع اور کرناٹک وغیرہ کے علاقوں میں قائم ہیں۔ ٹرسٹ نے اردو تعلیم کا ایسا نصاب مرتب کیا ہے جس کے ذریعے کم سے کم مدت میں اردو لکھنے پڑھنے کی ابتدائی صلاحیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مدارس کے طلبہ کے علاوہ مختلف مرد و خواتین جو لکھنا پڑھنا

نہیں جانتے وہ بھی ٹرسٹ کی مرتبہ کتابوں سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اردو تعلیم حاصل کرنے کے لیے عمر، جنس فرقہ اور علاقہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ اردو سیکھنے والوں کو کتابیں، نوٹ بکس، پنسل اور ربر بلا قیمت دیے جاتے ہیں۔ ٹرسٹ کے مراکز میں اردو تعلیم کے تین مدارج ہیں۔ پہلا اردو دانی (حروف شناسی)، دوسرا زبان دانی، اور تیسرا اردو انشا، جو جواہر اردو اور پنج تنتر کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔

سرکاری مدارس میں اردو کے ناقص انتظام اور عام طور پر اردو کی زبوں حالی کے پیش نظر عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ نے صورت حال کی اصلاح کے لیے حکومت پر تکیہ کرنے کے بجائے اپنے طور پر اردو تعلیم اور اردو کی ترقی و ترویج کے لیے یہ عملی اقدام کیا ہے۔ اردو تعلیم کی تحریک کی ابتدا ۱۹۹۴ء میں ہوئی تھی۔ اُس وقت جون ۱۹۹۴ء میں صرف اردو دانی کا امتحان ہوا تھا جس میں ۳۹۸۲ طلبہ و طالبات شریک امتحان رہے۔ جنوری ۱۹۹۵ء میں اردو دانی کے ساتھ ساتھ اردو زبان دانی کے امتحانات بھی منعقد ہوئے جس میں ۱۹۹۴ء کے مقابلہ میں امتحان میں شرکت کرنے والوں کی تعداد دوگنی ہوگئی تھی یعنی ۷۰۸۲ طلبہ و طالبات شریک امتحان رہے جون ۱۹۹۵ء میں اضلاع و شہر کے ۱۴۶ مراکز پر ۵۴۵۵ امیدواروں نے امتحان دیا۔ جنوری ۱۹۹۶ء میں اردو دانی، زبان دانی کے بعد اردو انشا کا اضافہ عمل میں آیا۔ اس امتحان میں شہر اور اضلاع کے جملہ ۲۳۰ مراکز کے ۱۶۵۰۰ امیدواروں نے شرکت کے فارم داخل کیے۔

عوام میں اردو تعلیم کا یہ سلسلہ مقبولیت حاصل کرکے روز بہ روز ترقی کر رہا ہے۔ مراکز میں تعلیم حاصل کرنے والوں کے علاوہ انفرادی طور پر ٹرسٹ کی کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ۴ ہزار سے زائد ہے۔ اردو تعلیم حاصل کرنے والوں کو ادارہ ادبیات اردو کے مسلمہ امتحانات میں شریک کر دیا جاتا ہے۔ کامیاب ہونے والوں کو سرٹیفکٹس بھی دیے جاتے ہیں۔

(اس اہم اور نیک کام کے لیے مکتبہ جامعہ جناب زاہد علی خاں کو مبارک باد پیش کرتا ہے)

جامعہ اردو علی گڑھ، پروانہ ردولوی، گلزار دہلوی اور ایم حبیب خاں کو انعامات

ہاپوڑ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ۱۲۵ ویں یوم پیدائش کے موقع پر ۲۱ اپریل ۱۹۹۶ء کو ایک سیمنار بعنوان "قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کا کردار"، منعقد ہوا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر جناب محمود الرحمن نے سیمنار کا افتتاح کیا اور ایوارڈ تقسیم کیے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کو ایوارڈ برائے اردو تعلیم اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے اسسٹنٹ سکریٹری جناب ایم حبیب خاں کو اردو تحقیق میں اور جناب حفیظ میرٹھی کو شاعری میں نمایاں خدمات کے لیے ایوارڈ دیے گئے۔ اعلان کے مطابق جناب پروانہ ردولوی اور ڈاکٹر گلزار زتشی دہلوی کو بھی ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔ بعض سماجی کارکنوں اور اردو اساتذہ کو بھی ایوارڈ دیے گئے۔

اس موقع پر ہاپوڑ کے ایک محب اردو نے سوسائٹی کے لیے پانچ سو گز قطعہ آراضی دینے کا وعدہ کیا۔ جناب محمود الرحمن نے بھی مبلغ ۲۵ ہزار روپے بطور عطیہ دینے کا اعلان کیا۔

مسلم یونی ورسٹی شعبہ اردو کے ابوالکلام قاسمی نئے صدر مقرر

علی گڑھ۔ ۱۰ جون۔ اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر ابوالکلام قاسمی کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کا تین برس کے لیے نیا سربراہ مقرر کیا گیا ہے۔ اردو کے ممتاز شاعر پروفیسر شہریار کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر قاسمی نے شعبہ کی ذمے داری سنبھالی ہے۔ یہ اطلاع یونی ورسٹی کے او ایس ڈی شافع قدوائی نے

اعلانیہ میں دی ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا شمار ملک کے ممتاز ناقدوں میں ہوتا ہے اور ان کی متعدد تنقیدی و تحقیقی کتابیں اور تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر قاسمی کے مضامین برصغیر کے ادبی جرائد میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں اور وہ ملک اور بیرون ملک میں ہونے والے متعدد سیمناروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ پروفیسر قاسمی مشہور ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" کے مدیر بھی ہیں۔

کیرالا میں اردو بی۔ اے ڈگری کورس کا افتتاح

ملک کے تمام محبانِ اردو کے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہوگی کہ گورنمنٹ کالج ملاپرم (کیرالا) میں حکومت کیرالا کی منظور کردہ اردو بی۔ اے ڈگری کورس کا افتتاح ۲۱ نومبر ۹۵ء کی صبح ٹھیک دس بجے ریاست کیرالا کے وزیر صنعت عزت مآب عالی جناب پی کے کنھالی کٹی صاحب نے کیا۔ وزیر موصوف نے اپنی تقریر پہلے اردو سے شروع کیا۔ اس کے بعد ملیالم میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہماری سب کی دیرینہ خواہش تھی کہ ملاپرم گورنمنٹ کالج میں اردو بی۔ اے ڈگری کورس لایا جائے۔ اس موقع پر انھوں نے وعدہ کیا کہ اردو کے تعلق سے جو بھی مسائل ہیں انھیں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کالج کے پرنسپل شری پدمانابھا شرما جی نے جلسہ کے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب ہمزہ تاملِ نہرو یوک کیندر مقامی کوارڈی نیٹر جناب عبداللہ کٹی کالی کٹ یونی ورسٹی کے سنڈیکیٹ ممبر جناب ولی محی الدین کٹی صدر کیرالا اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن، پروفیسر اسمٰعیل اسٹاف اڈوائزر وغیرہ نے جلسہ کو خطاب کیا۔ اس کے پہلے صدر شعبۂ اردو جناب پی عبدالغفار نے حاضرین کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا اور شعبۂ اردو کے پی ابوبکر کے شکریہ کے ساتھ ہی جلسہ اختتام کو پہنچا۔

بی ایڈ اردو کے لیے سیٹیں دہلی یونی ورسٹی میں محفوظ

نئی دہلی۔ شعبۂ اردو کی مسلسل جدوجہد کے نتیجہ میں دہلی یونی ورسٹی نے بی ایڈ میں اردو کے لیے سات نشستیں محفوظ کی ہیں جن میں چار نشستیں سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن میں اور تین نشستیں والمیکی کالج آف ایجوکیشن میں امسال محفوظ کی ہیں۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر عبدالحق نے ایک پریس اعلانیہ میں کہا ہے کہ بی ایڈ میں داخلہ چاہنے والے طلبہ جلد سے جلد فارم پُر کر کے جمع کریں۔

شاد بریلوی کے اعزاز میں شعری نشست

اردو کے بزرگ شاعر چندر بہادر سکسینہ شاد بریلوی کی کتاب "خواہشِ درماں" کا اجرا ۳۰ مارچ ۱۹۹۶ء کو بیلی بھیت میں ہوا۔ دہلی میں ان کی آمد پر انجمن شاخِ ادب نے ان کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ عظمت خاں نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ خویجی کی معتبر شخصیت غفار خاں کے دستِ مبارک سے بزم کی شمع روشن ہوئی۔ گارمنٹ ایکسپورٹر الحاج سلیم احمد نے صدارت فرمائی۔ اس نشست میں تقریباً بیس شعرا کرام نے شرکت کی جن شعرا کو زیادہ پسند کیا گیا ان میں شہباز ندیم ضیائی ظہیر دہلوی، انداز دہلوی، خمار چاندپوری، محسن بدر، محبوب امین، شاہد نگینوی، نشتر بچھرایونی، بلد یو کپور امبر، اکرام الدین خمار۔ نظامت کے فرائض وصی احمد وصی نے انجام دیے۔ نشست کے اختتام پر الحاج سلیم احمد نے اپنے صدارتی خطبہ سے نوازا اور شاد بریلوی کا یہ شعر پڑھا۔۔

زندگی کا رخ بدلنے کو بدل ڈالا مگر
میں سمجھتا ہوں مجھے کتنے زر ر ش [illegible]

ہونہار طلبہ وطالبات کے لیے شیخ الہند اور مدنی ایوارڈ

سہارنپور۔ ضلع کے ہونہار طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ انٹرمیڈیٹ امتحانات کے لیے شیخ الہند ایوارڈ اور ہائی اسکول امتحانات کے لیے مدنی ایوارڈ، ایک پُروقار تقریب میں دیے جائیں گے۔

اردو کسی ایک فرقے یا خطے تک محدود نہیں

نئی دہلی۔ اردو کسی ایک فرقے یا خطے کی زبان نہیں یہ ان تمام لوگوں کی زبان ہے جو اسے بولتے اور لکھتے ہیں" یہ بات آج مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے ایک استقبالیہ جلسے میں کہی جو دہلی اردو اکادمی کی طرف سے ڈنمارک سے آئے ہوئے مہمان شاعر جناب شمشیر سنگھ شیر کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ہم نے کسی بے جا تعصب کی بنا پر ہندستان کی اس بڑی زبان کو خیرباد کہہ دیا تو یہ ایک عظیم قومی نقصان ہوگا اور ہم اپنے آپ کو از خود گونگوں میں شامل کرلیں گے۔ انھوں نے جناب شمشیر سنگھ شیر کو مبارک باد دی کہ وہ سات سمندر پار جا بسے لیکن انھوں نے وہاں بھی اردو کو دل سے لگائے رکھا جو ہمارا قیمتی تہذیبی ورثہ ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ اور جناب نوین سوری نے بھی اپنی تقریروں میں اردو کی ادبی، ثقافتی اور تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ یہ زبان اب عالمی زبانوں میں شامل ہوگئی ہے جس کے لیے وہ تمام اردو والے مبارک باد کے حقدار ہیں جو جہاں بھی گئے اپنی زبان اور اس سے وابستہ روایات و اقدار کو اپنے ساتھ لے گئے۔

جلسے کی صدارت حکومت دہلی کے وزیر صنعت جناب ہرشرن سنگھ بلی نے کی۔ انھوں نے اردو اکادمی کی طرف سے مہمان شاعر کو شال اور اکادمی کی مطبوعات کا ایک سیٹ پیش کیا۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر صادق نے مہمانوں کا استقبال کیا اور اکادمی کی سرگرمیوں پر مختصراً روشنی ڈالی۔ اکادمی کے اسسٹنٹ سکریٹری مخمور سعیدی نے جلسے کی نظامت کی۔ جلسہ اکادمی کے اردو آڈیٹوریم میں ہوا جو باذوق سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جناب شمشیر سنگھ شیر نے اپنی کئی نظمیں، غزلیں اور قطعات سُنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں

"اقبال کی شعری وفکری جہات" پر دو روزہ سیمینار

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں ۱۵، ۱۶ مئی ۱۹۹۶ء کو "اقبال کی شعری وفکری جہات" کے موضوع پر دو روزہ مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جناب شاہد صدیقی نے افتتاح کیا۔ پروفیسر محمد حسن نے افتتاحی اجلاس کی صدارت فرمائی اور اقبال کے مطالعے کو ناگزیر بتایا۔ صدر شعبہ عبدالحق نے تمام شرکاء کا استقبال اور ان کی آمد کو اقبال شناسی میں خوش آیند عمل سے تعبیر کیا۔ ۱۵ مئی، پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر فہمیدہ بیگم نے فرمائی اور پروفیسر امیر عارفی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس اجلاس میں جناب الطاف اعظمی، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر صادق اور امتیاز احمد نے اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر منظر اعظمی اور پروفیسر رضی الدین احمد نے فرمائی۔ پروفیسر محمد حسن، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر امیر عارفی، ڈاکٹر نصیر احمد خاں اور ڈاکٹر توقیر احمد نے اپنے مقالے پیش کیے۔

۱۶ مئی تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے فرمائی اور ڈاکٹر شریف احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سعید الظفر چغتائی،

پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر منظر اعظمی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر حنیف کیفی اور ڈاکٹر فیروز احمد نے مقالات پیش کیے۔

چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر عظیم الشان صدیقی اور پروفیسر حنیف کیفی نے فرمائی اور نظامت ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے۔ اس آخری اجلاس میں ڈاکٹر محمد نفیس حسن، ڈاکٹر علی جاوید، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر رضی الدین اور پروفیسر ہر بھجن سنگھ نے اپنے مقالے پیش کیے۔

۱۹۷۷ء کے جشن اقبال صدی تقریبات کے بعد یہ پہلا مذاکرہ تھا جس میں بیس سے زائد مقالے پیش کیے گئے اور ۱۷ پروفیسر حضرات نے شرکت کی۔ ان مقالوں میں اقبال کی فکری و شعری جہات کے بالکل نئے اور اچھوتے پہلوؤں پر عملی گفتگو کی گئی۔ اساتذہ و طلبہ کے فکر انگیز مباحث نے اس مذاکرے کی توقیر بڑھادی۔ پروفیسر عبدالحق نے شعبہ کی علمی خدمات کے اعتراف میں اقبال پر کیے گئے تحقیقی اور تنقیدی کاموں کا جائزہ پیش کرتے ہوئے سامعین حضرات اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔

علامہ اقبال نظریۂ پاکستان کے خالق نہیں

اسلام آباد۔ ۲۱ مئی (یو این آئی) ولی خاں نے تبصروں کی ایک تقریب کے موقع پر ایک دستاویز دکھائی جو علامہ اقبال کا لکھا ہوا ایک خط بتایا جاتا ہے۔ جس کے مطابق شاعر مشرق نے نظریۂ پاکستان پیش کرنے سے انکار کیا ہے۔ ولی خاں کے بقول اسی خط میں مسٹر ظفر اللہ خاں کو نظریہ پاکستان کا خالق بتایا گیا ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن چاہتے تھے لیکن انھوں نے قادیانی ہونے کی وجہ سے اپنا نام چھپائے رکھا۔

مبینہ خط کے بارے میں اے این پی کی صدر ولی خاں کی اہلیہ بیگم نسیم نے دعوا کیا ہے کہ ان کے شوہر نے یہ خط انڈیا آفس لائبریری سے حاصل کیا تھا لیکن ان کے بقول ولی خاں نے اس کے سلسلے میں کبھی محمد علی جناح کا نام نہیں لیا۔ تاہم پاکستان پیپلز پارٹی اور جونیجو مسلم لیگ کی مخلوط حکومت نے پنجاب اسمبلی میں ایک قرارداد منظور کرائی۔ جس میں ولی خاں پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلانے اور عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کو خلاف قانون قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ قرارداد کے محرک نے کہا ہے ولی خاں نے بانی پاکستان کو برطانیہ کا کاسہ لیس بتایا اور یہ کہا ہے کہ پاکستان انگریز نے بنایا تھا۔

اردو کے مخلص سپاہی رام پرکاش کپور کے اعزاز میں خصوصی نشست

نئی دہلی ۔ ۱۳ جون۔ اردو ایک خوبصورت زبان ہے۔ یہ مشترکہ قومی ورثہ ہے، اسے فروغ دینا قومی فریضہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی تعلیم اور فروغ کے لیے عملی جدوجہد سیاسی و سماجی دونوں سطحوں پر کی جائے۔ یہ بات حلقہ فکر وفن دہلی کے زیر اہتمام "دبستان" اور "شہر ادب" کے تعاون سے منعقد ایک مذاکرہ میں مدھیہ پردیش سے تشریف لائے ہمارے مہمان خصوصی رام پرکاش کپور نے کہی۔ یہ مذاکرہ ۱۳ جون کو اکیڈمک اسٹاف کالج (جامعہ ملیہ اسلامیہ) میں پروفیسر عنوان چشتی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نظامت کے فرائض کوثر مظہری نے انجام دیے۔

اس موقع پر پروفیسر ظفر احمد نظامی نے واضح طور پر کہا کہ حکومت ہو یا تنظیمیں اردو کے بارے میں کسی کی نیت صاف نہیں ہے۔ ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ اردو گھر دہلی کے افتتاحیہ جلسہ میں آنجہانی وزیراعظم ہند مرارجی دیسائی نے کہا تھا کہ ملک میں فساد کرانے کے لیے اردو ذمے دار ہے اس کے باوجود ناظم جلسہ نے ان کا شکریہ

ادا کیا اور کہیں سے صدائے احتجاج بلند نہ ہو سکی۔ صدارتی کلمات میں پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ اردو کی تباہی کے لیے اردو والے خود ذمے دار نہیں ہیں بلکہ وہ بلادِ وطن ہیں جو اردو سے نفرت کرتے ہیں اردو زبان جب تک سیاسی سطح پر دوسری زبانوں سے آنکھ ملانے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی، اردو کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اس مذاکرہ اور شعری نشست میں جن حضرات نے حصہ لیا ان میں ڈاکٹر تنویر چشتی، وسیم مینائی، عطا عابدی، راشد احمد راشد، ظہیر گنگولی، عادل حیات، سرجیت سنگھ بخشی، اسرار جامعی، مینا سنگھ، سکندر عاقل، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، محمد علیم، شاہد علی خاں، شاہانہ ارم اور فرزانہ خلیل وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ادیبوں کے لطیفے "نیا اڈیشن کی رسم اجراء

حلقۂ ارباب ذوق نئی دہلی نے انڈین کلچر سوسائٹی اور کنور مہیندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے تعاون سے کنور مہیندر سنگھ بیدی کے ۱۰۶ ویں یوم ولادت پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے وسیع ہال میں آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا۔ جس میں ہندستان کے گوشہ گوشہ سے تشریف لائے ہوئے معتبر شعرا نے شرکت اور حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

اس موقع پر نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب "ادیبوں کے لطیفے" کے نیا اڈیشن کا اجرا پروفیسر گوپی چند نارنگ و شری ایچ۔ کے۔ ایل بھگت سابق یونین منسٹر کے دست مبارک سے ہوا۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فرمایا کہ زیر نظر کتاب "ادیبوں کے لطیفے" میں شعرا و ادیب اپنی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، ذہانت، فطانت اور طباعی کے سبب جیتے جاگتے اور زندگی سے چھلکتے نظر آتے ہیں۔ خوشی کا مقام ہے کہ اس کتاب کا پیش لفظ پاکستان کے مشہور محقق اور مزاح نگار مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین اور دلیپ سنگھ نے اپنے خصوصی انداز میں نارنگ ساقی اور کنور مہیندر سنگھ بیدی پر تاثراتی مضمون پڑھے جنھیں حاضرین نے بے حد پسند کیا۔

بیدی صاحب کے دوست اور نامور انڈسٹریلسٹ جی ساگر سوری نے اس موقع پر شائع کیے گئے خصوصی سوونیر کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ بیدی صاحب کی باغ و بہار شخصیت کے نقوش برسوں بھلائے نہ جا سکیں گے۔

حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نارنگ ساقی نے کہا کہ کنور مہیندر سنگھ بیدی کی محبت کا ہی فیض ہے کہ ہم اردو ادب کی خدمت کے مبارک فریضے کو مقدور کے مطابق نبھائے جا رہے ہیں۔

پروفیسر ابوذر عثمانی کا ونوبا بھاوے یونیورسٹی میں تقرر

اردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر ابوذر عثمانی رانچی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے استاد تھے۔ کچھ عرصے قبل ان کا ونوبا بھاوے یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ انھوں نے اپنے نئے عہدے کا چارج لے لیا ہے۔

اردو کے سب سے بڑے ایوارڈ کا اجرا

پہلا ایوارڈ آل احمد سرور اور احمد ندیم قاسمی کو

خلیجی ریاستوں کی سب سے فعال ادبی تنظیم مجلس فروغِ اردو ادب دوحہ قطر نے برصغیر میں اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت کے اعتراف اور قدر شناسی کے لیے ہر سال دو لاکھ روپے کی مجموعی مالیت کے "عالمی فروغِ اردو ادب ایوارڈ" اور گولڈ میڈل دینے کا اعلان کیا ہے ہندستان میں اس ایوارڈ کے پہلے حقدار پروفیسر آل احمد سرور قرار پائے ہیں اور پاکستان میں احمد ندیم قاسمی اس ایوارڈ کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ (ادارہ کتاب نما اپنے ان دونوں بزرگوں کو مبارکباد دیتا ہے)

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی روس کے دورے پر

پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی دعوت پر سابق سوویت یونین کی یونی ورسٹیوں کے اردو شعبوں میں لیکچر دینے کے لیے ایک ماہ ماسکو میں قیام کریں گے پروفیسر ہاشمی پہلے بھی اسٹیٹ یونی ورسٹی، تاشقند سے کئی سال تک وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں متعدد ملکوں کا علمی سفر کر چکے ہیں۔

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں

پروفیسر رشید الدین خاں کا انتقال

نئی دہلی۔ ۲۵ اپریل، پروفیسر رشید الدین خان، سابق راجیہ سبھا ممبر اور مشہور سوشل سائنٹسٹ آج صبح انتقال کر گئے۔ ۷۲ سالہ پروفیسر خان چند دنوں سے علیل تھے انھیں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اس کے ورثا میں ان کی بیوی، ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہیں۔ پروفیسر رشید الدین خاں ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک مشہور ماہر تعلیم تھے۔ وہ ۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک عثمانیہ یونی ورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر تھے وہ جواہر لال یونی ورسٹی میں سینٹر برائے پولیٹیکل اسٹڈیز کے بانی چیرمین اور پروفیسر رہے (۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۸۹ء تک) ۱۹۹۰ء سے وہ ہمدرد یونی ورسٹی میں فیڈرل اسٹڈیز کے بانی اور ڈائرکٹر رہے۔ پروفیسر رشید الدین خاں دو مدت تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ انھوں نے اقوام متحدہ اور کئی بین اقوامی اداروں میں ہندستان کی نمایندگی کی تھی۔ پروفیسر خان طلبہ میں بہت مقبول اور قابل احترام ٹیچر تھے۔ وہ طلبہ میں مطالعہ کا ذوق و شوق پیدا کرتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

حنیف ترین کو صدمہ

بزم احبابِ سخن عرعر کے صدر معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی (مقیم سعودی عربیہ) کی والدہ ماجدہ محترمہ شفیق بیگم کا انتقال پُرملال یوم عاشورہ کی دوپہر مطابق ۲۹ مئی ۱۹۹۶ء کو ان کے گھر سرائے ترین سنبھل ضلع مرادآباد میں ہوگیا۔ مرحومہ کی عمر ۸۶ سال تھی۔ ان کے سوگواروں میں ۶ بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ مرحومہ اپنے حسنِ اخلاق اور غریب پروری کی وجہ سے علاقے کی عورتوں میں بے مقبول تھیں۔

ارکان بزم احباب سخن عرعر، سعودی عربیہ

ساحر لدھیانوی کی چھوٹی بہن کا انتقال

۷ مئی ۱۹۹۶ء کو مرحوم شاعر ساحر لدھیانوی کی چھوٹی بہن انور سلطانہ مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ مرحومہ پچھلے چار ماہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔ ۸ مئی کو سانتا کروز قبرستان میں مرحومہ کی تدفین عمل میں آئی۔ اس موقع پر ممبئی فلم انڈسٹری اور اردو دنیا کی معزز شخصیتیں خاصی تعداد میں موجود تھیں۔

احمد جلیس نہیں رہے

اردو کے مشہور ادیب اور دوردرشن بنگلور کے ڈپٹی ڈائرکٹر جناب احمد جلیس کا ۹ مئی ۱۹۹۶ء کو کام کے دوران قلب پر حملہ کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ ان کے قلب پر یہ تیسرا اور آخری حملہ تھا۔ ان کی میت بنگلور سے حیدرآباد لائی گئی۔ تدفین درگاہ یوسفین میں ۱۰ مئی ۱۹۹۶ء کو بعد نماز عصر عمل میں آئی۔ یہی وہ بارگاہ ہے جہاں امیر مینائی اور حضرت داغ کے علاوہ بے شمار مشاہیر علما اور شعرا دفن ہیں ــ ادارہ کتاب نما، تمام مرحومین کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ ●

دیگر اداروں کے شعری مجموعے

بکھ	مظفر ایرج	30/-
حسا س کی صلیب	فرید پاشا آزاد	20/-
ضواں سر	نوشاد	200/-
منہ در آئینہ	عزیز قیسی	4/-
یلے چٹنی آگ	قوی سیف	80/-
مان میں کمیں گاہیں	شیو کے کمار	80/-
آتش دابیدہ	فدا خالدی دہلوی	75/-
ہیں اور پرچم	سروش تیر دانی	22/-
مرہ من	ڈاکٹر محمد منشا	30/-
ا،	معین ادیبی	10/-
مدی	قادر صدیقی	20/-
نئے احساس کے	اسد رضا	50/-
آتش سیال	ساجد وزیدی	8/-
نوائے شیدا	مرزا کمال الدین شیدا	35/-
ساعت مست	دینا ناتھ مست کشمیری	35/-
نیرنگیں	سیدہ نسیم چشتی	125/-
سے رنگ	جگدیش سہائے سکسینہ	7/-
کرن پرچھائیاں	کرشن ادیب	15/-
تن	قیصر زیدی	20/-
کاس	راجندر بہادر موج	30/-
شب ۱	ظہیر غازی پوری	12/-
آٹا سودائر	عبدالقادر سوداگر	20/-
یہ احاق	خواجہ دل محمد	10/-
معان آلام	سید محمود	20/-
تخاب ظم (برائے بی۔اے)		1/50
تخاب قصائد و مراثی	محمد مجاہد اللہ سید حیدر عباس	6/50
یک سو غزلیں	عتیق اللہ	8/-
حاسے	کالیداس گپتا رضا	10/-
ارمغان حرم	عبدالرحمان محسن	4/-
آتش خاموش	مطرب نظامی	5/-

آہنگ خیال	حیات وارثی	5/-
آتش پارے	سرفراز افسر	-/50
آئینہ حیرت	حیرت شملوی	2/-
اردو کے مسیحی شعرا	ڈی اے ہیریسن قربان	15/-
ارج	ذکی ڈواکر	3/50
انمول	دیپک قمر	40/-
ادراک	قیصر رتنا گیروی	50/-
ارمغان کندن	کندن لال کندن	30/-
اک چراغ اور	دھرم پال عاقل	35/-
اعراض	رئیس مالیگانوی	10/-
اثاثہ	سید مہدی حسین وانی	20/-
اوتار	دیپک قمر	40/-
آسمان کا پیرہن	یوسف اعظمی	20/-
احساس کی فصل	رئیس بلوی	35/-
ایک ہی رنگ لہو کا	شرر فتح پوری	15/-
احساس کی صلیب	مشتاق احمد	10/-
انتخاب کلام شیفتہ	خواجہ ذکی احمد بی۔اے	1/-
افسانۂ لکھنؤ	آغا جو شرف	40/-
اثاثۂ منصور	سید نذر الحسن قادری	10/-
انتخاب منصور	سید نذر الحسن قادری	5/-
انتخاب نو	سید نذر الحسن قادری	2/50
اشعار میر	عبدالمنان صاحب بیدل	12/-
اردو ہے جس کا نام	ضیاباقی	6/-
اردو میں ہندوستانی شاعری	ڈاکٹر جعفر حسن اسیم	4/-
اجنبی پرندے	اسلم عمادی	10/-
برگ زرد	طالب چکوالی	15/-
فطرت	ڈاکٹر سید عبدالمجید	12/-
برگ سر سبز	نامی انصاری	10/-
برف، شعر، آواز	حمید الماس	30/-
باقیات شہباز	ڈاکٹر سید صابر حسن	25/-
بارہ ماسہ طیبہ	مولوی حفظ اللہ قادری	2/25

بحر بیکراں	اختر بستوی	5/-
برق تبسم	تبسم علیپوری	10/-
پیوند خستہ بادباں	خمار قریشی	30/-
پرندوں بھرا آسماں	بلراج کومل	30/-
پیراہن جاں	مظفر شباب	50/-
پرچھائیوں کا جلوس	جگن ناتھ پرساد داس	10/-
پس دیوار شب	سکندر محسن	20/-
پیش خیمہ	وقار ناصری	30/-
پنچھی رخصت ہوئے	جاوید ندیم	40/-
پتھروں کا شہر	علی عباس امید	5/-
پرچھائیاں	آصف علی	4/-
پس غبار	رئیس امروہوی	22/50
پنکھڑی گلاب کی	تبسم	2/50
پنکھڑیاں	سعید سہروردی	5/-
پرواز غبار	غبار بھٹی	10/-
پہلی بارش	ناصر کاظمی	40/-
پہلا پتھر	طاہر طہری	10/-
پیمانہ امروز	نعیم صدیقی	20/-
تعارف	طلعت عرفانی	40/-
تیشے کا سفر	رضا اشک	15/-
تیسرا سفر	سلمان خمار	15/-
تجلیات قمر	جمال احمد صدیقی	15/-
ترکش بشر	افتخار احمد بشر	22/-
پیکر خیال	اختر بستوی	2/-
تکون کا کرب	آزاد گلاٹی	5/-
تصویر وفا	حکیم احمد علی خان وفا	5/-
ترنگیں	رانا پرتاپ سنگھ رانا	2/-
تابوت	صفدر حسین	5/-
ٹوٹا ہوا آئینہ	عارف خورشید	10/-
ثبات	محبوب راہی	10/-
جھنجھنیات	جھنجھٹ لکھنوی	6/-
جسارت	عزیز وارثی	10/-
جلوۂ نمو	حرمت الاکرام	15/-
جنگل	صلاح الدین پرویز	25/-
جوش جنوں	شورش کاشمیری	15/-
جوابی خط	شاکر انصاری سکندر	20/-
جنبش لب	لیاز بلگرامی	4/-
جام فروزاں	سید بشیر حسین	35/-
جادۂ ملا	آنند نرائن ملا	25/-
جسموں کا بن باس	آزاد گلاٹی	8/-
جب جی اور سکھ منی صاحب	خواجہ دل محمد	12/50
جذبات و نغمات	تاج النساء تاج	15/-
جام جلاول	ڈاکٹر ذکی کاکوروی	18/-
چراغ دیر	اختر حسین	5/50
چراغ سے چراغ	شاہد باوری	35/-
چاند ستارے	اسحاق خضر	15/-
چمنستان	رام رتن منظر	15/-
چپ کی داد چپ کی فریاد	رفیق مارہروی	/50
چمن چمن	جگدیش متاوردو	15/-
چمن جاگے	نقوی مصطفیٰ آبادی	10/-
چنار کے پھول	جگدیش مہتہ درد دہلوی	5/-
چکبست اور ان کی منتخب نظمیں	ڈاکٹر محمد شفیع	6/-
چاک سحر	اثر قادری متھراگری	3/-
احرام حرف	مرحوم دلکش ساگری	48/-
حیرت زار	عطا کاکوی	12/-
حرف راز	مندر پرتاپ چاند	10/-
حرف زیر لب	عفت بانو زیبا کاکوری	6/-
حرف فکر	یعقوب راہی	3/-
حکایت نے	رئیس امروہی	15/-
حرف و صدا	میر الاول فلک دہلوی	20/-
حرف خودی	ادیب حسین ادیب	10/-
حرف حرف	شرر فتحپوری	24/-

حرف ناتمام	عمر انصاری	20/-	رقص گرداب	نشاط سعید	10/-
خوابوں کے ہمسائے	شاہد جمیل	85/-	ریزہ ریزہ	ظفر حمیدی	10/-
خون جگر	دھرمپال عاقل	30/-	روشنی کے پھول	انور مینائی	15/-
خلش	خاد دہلوی	25/-	رنگ ترنگ	کرشن مراری	50/-
خط غبار	قیصر حیدری دہلوی	30/-	رنگین پرواز	جی این رنگی	80/-
خوش بو	بدیع الزماں خاور	4/-	ریزہ ریزہ اکائیاں	مشتاق علی شاہد	15/-
خیمہ خواب	اسعد بدایونی	20/-	رنگ تماشہ	حمید الماس	40/-
دلکش نظمیں	ابرار کرت پوری	6/-	رنگا رنگ	محبوب راہی	7/-
دیوان ثنائی	ڈاکٹر سید علی حیدر	60/-	رباعیات	زیڈ۔ ایچ خان	20/-
دست زلیخا	سلمیٰ جاوید	12/-	رشتہ کلام	محسن زیدی	10/-
دھوپ لہو سفر	حفیظ آتش	25/-	رت جگے	رحمت امروہوی	40/-
دھول کی شال	عارف خورشید	25/-	رحل نظر	مہدی نظمی	2/50
دیوان غزل	حسین علی تاسف	12/-	رد تبلیغ نو	اثر بن یحیٰ	10/-
درد تہہ جام	نازش پرتاپ گڑھی	20/-	رستے سنگسار	عرفان صدیقی	15/-
دواوین غزلیات	محمد جعفر خان راغب	25/-	رباعیات اختر	بخشی اختر امرتسری	40/-
دیوان سیماب امروہوی	سید فیضان حسن	100/-	روشن جزیروں کا سفر	انور مینائی	15/-
دشت آرزو	غنی اعجاز	20/-	زخموں کے کئی نام	سندیپ بینرجی	90/-
دھنک احساس کی	راج نرائن راز	45/-	زخم کے پھول	ڈاکٹر محمد محسن	25/-
داستان داستان	مست احسنی گنوری	30/-	زر فشاں	نشاط امروہوی	10/-
دشت نوا	وقار روحانی	25/-	زنجیر کا نغمہ	محمد حسین	30/-
دھنک رنگ	نوبہار صابر	22/-	زنجیر و زنار	محمد شمس الدین تابع	12/-
دھوپ کا دریچہ	خلیل اعظم امروہوی	75/-	زخموں کے پھول	فیضی نظام پوری	10/-
دو قدم ایک غزل	شایاں قدوائی	6/-	زنداں میں اذان	جمال احمد امین آبادی	4/-
دل و نظر	ناظم میواتی	12/-	زندگی سے زندگی کی طرف	نازش پرتاپ گڑھی	5/-
دستخط	صادق	10/-	زم زم ساقی	ماسٹر نیپ راج بھاٹیہ	3/50
دست جرسا	ڈاکٹر یعقوب عامر	25/-	زخموں کے سلسلے	عبد الصمد تپش	28/-
دشت آرزو	غنی اعجاز	20/-	سنگ جاں	زاہدہ زیدی	45/-
دشت گل	زبیدہ تحسین	18/-	سبب	مناظر عاشق ہرگانوی	25/-
دھڑکنیں	شیدا انبالوی	15/-	سبزہ شرر	نعمان امام	35/-
دیوان آغا محمد کاظم	ڈاکٹر عبد الغفار	15/-	سورج کی آنکھ	کیف احمد صدیقی	10/-
ذوق نظر	سید نظر برنی	10/-	سب رنگ	الفت امین آبادی	50/-

شرابوں کی فصل	جمنا پرشاد راہی	40/-	ضرب احساس	ذاکر عثمانی رلویری	7/-
سفینہ چاہئے	شاد عارفی	10/-	عکس در عکس	شاہد ساگری	40/-
سفینۂ نجات	ابو نجم صولت علوی	15/-	عمر خیام کی رباعیات	دز مطبع منشی تیج کمار "	7/50
سچے بول	گوپال متل	30/-	کلیات ایمان	سیدہ ہاشمی مجید	50/-
سوگوار یاد	رحم علی الہاشمی	2/25	کلیات بیخود	(مرتبہ ڈاکٹر سید سکندر)	50/-
سوز اقبال	منور لکھنوی	3/-	کلیات جگر مراد آبادی	جگر مراد آبادی	45/-
سخن	وقار خلیل	30/-	کائنات روشن	روشن بنارسی	35/-
سخن نامی	(ترتیب) وقار خلیل	10/-	کارواں	روشن صدیقی	5/-
سانجھ بھئی چودیس	ساحر لکھنوی	5/-	کنور	ابو بکر جیلانی	20/-
سیال	اختر مالی گانوی	6/-	کلام نصیر الدین حیدر	ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	15/-
سنگ دشمن	خالد شفائی	3/-	گیان گنگا	کویراج رگھو نند	4/-
سطح آئینہ	سہیل واسطی	12/-	گلدستہ دانش	مولوی مشتاق احمد	3/-
سلک لالی	"گنجینہ معرفت "	35/-	لمحوں کی خوشبو	ڈاکٹر تنویر علوی	45/-
سنہری ادا سیاں	شاہد ماہلی	100/-	منزلیں ستاروں کی	ثاقب عباس	80/-
سیاہ سیاہ	باقر مہدی	180/-	منظر پس منظر	شاہد ماہلی	10/-
سوچ سمندر	جمال قریشی	30/-	مضراب	فیضی نظام پوری	4/-
سوز حیات	ڈاکٹر ملک اسماعیل خان	100/-	مگدھ	شری کانت ورما	30/-
شہ پارے	(جی۔اے)	10/-	متاع ہنر	محمود سروش	120/-
شاھنامہ ہند (اول)	سریر کابری	25/-	میدان	انور ندیم	80/-
شاعر کالو	ڈاکٹر کامل قریشی	18/-	شہ رگ	تبسم طارق	12/-
شعاع اول	مہر ورولی	15/-	موسموں کا وطن	نسیم فاروقی	5/-
شہر میں ایک تحریر	بلراج کومل	40/-	مہاتما گاندھی	قمر جلال آبادی	3/-
شعلہ گل	سردار الںام	40/-	میری کائنات	انجم نجمی	5/-
شکست قیمت دل	وجد چغتائی	25/-	مثنوی محفل اعجاز	اعجاز	7/-
شب گزیدہ شہر	رفعت شمیم	40/-	میں اور تو	مظفر احمد لاری	2/50
شعلہ آواز	جوالہ پرساد شاہی	15/-	موج شفق موج غبار	نور پرکار	15/-
شفق	سعید شہیدی	10/-	موجیں	قیصر حیدر دہلوی	5/50
شعاع جاوید	کالیداس گپتا رضا	20/-	میلاد اکبر وارثی	"اسلامی تبلیغی مشن "	15/-
شہ سراب	انیس انصاری	15/-	مثنوی خسرو شیریں نظامی	نول کشور پریس "	15/-
شرار جستہ	شرف الدین ساحل	10/-	میٹھی میٹھی بولیاں (دوہے)	نادم بلخی	35/-
شام گراں	عبدالرحیم نشتر	5/-	مختلف	اسلم آزاد	30/-

نقش دوام	عمر انصاری	20/-	نگار سحر	جوہر ہاشمی	12/-
نوائی راز	خلیل الرحمٰن راز	60/-	نیلم کے پنکھ	شیشندر شرما	7/50
نصاب دل	رشید علی اسیح جلیل	12/-	وقت کی بانہوں میں	اختر انصاری	3/50
نوائے اردو	معروف شریفی	5/-	وقت کی صدیاں	داؤد غازی	4/-
نکہتِ خلش	محمد صدر الدین فضا	7/-	یادوں کی مہک	نسیم بیگم نسیم	40/-
نفس نفس	ناصر کرنولی	15/-	یادوں کے گلاب	سلمان عباسی	10/-
نغمہ ناقوس	جوہر دیوبندی	30/-	شرار نغمہ	گوپال متل	25/-
نقش نوا	مبارک شمیم	10/-	شاخ نہال غم	خورشید السلام	15/-
نسیم بہار	اے سی بہار	7/50	شرار جستہ	شرف الدین ساحل	10/-
نشاط غم کلام	زار عظیم آبادی	15/-	شمع محفل	مظہر عظیم آبادی	30/-
نوائے بلبل	سردار علی احمد خان	8/-	صحرا صحرا اجنبی	رؤف خلش	25/-
نشاط نظر	ہدایت محسنی	2/25	صحرا	توقیر زیدی	50/-
نگار حکمت	محمد فضل الرحمان	6/-	صدف سمندر	شہپر رسول	40/-
نذر نانک	مہدی نظمی	5/-	صہبائے ہند	نشور واحدی	80/-
نئی دنیا نیا آدم	شرر فتحپوری	24/-	صبوحی	مہر چند کوثر	3/50
نام بدن اور میں	بمل کرشن اشک	15/-	خواب آگاہی	محمد آفاق صدیقی	48/-
نئی پاکستانی نظم نئے دستخط	غلام حسین ماجد	25/-	طلسم سفر	شام رضوی	20/-
نغمہ حیات	جنون سرمست	60/-	عکس بادہ	ساغر جیلانی	10/-
نرم رو	سلیم زاہد	75/-	عکس عاشقی	تلک راج بے نام	10/50
نژاد سنگ	بلراج کومل	16/-	عکس دوراں	منشا الرحمٰن خان منشا	5/-
نخل جنوں	علیم اللہ حالی	40/-	عظمت وطن	عظمت عبدالقیوم خان	3/50
نور الہدی	پیرزادہ احسان فاروقی	20/-	عکس تمنا	کمال جعفری	15/-
نیلا آکاش	احتشام اختر	25/-	غائب متکلم	راجہ غضنفر علی	50/-
نئی روشنی	نور جہاں نور	20/-	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	5/50
نوائے حیات	سیدہ فرحت	20/-	غبار صحرا	وقار ناصری	25/-
ندی کے پار کا منظر	حیات لکھنوی	30/-	غزل گلاب	کالیداس گپتا رضا	80/-
ناتمام	حکیم منظور	15/-	غریب شہر	راہی معصوم رضا	60/-
نامہ گل	مختار شمیم	5/-	فانوس حرم	حسامی کروری	50/-
نئی مراٹھی شاعری	صادق	10/-	فرمودات	شری بسوا ایشور / حمید الماس	50/-
نیا سویرا	ریاضت علی شاعر	5/-	فردوس تخیل	محترمہ ز۔خ۔ خلد آشیانی	100/-
نوشتے	سلمان عباسی	50/-	قصائد ذوق	ڈاکٹر سر شاہ سلیمان	5/-

قندیل	رضا امروہوی	30/-	لولس چنار	حکیم منظور	30/-
کرب تنہائی	رفعت سروش	50/-	لا انتہا	مظہر مہدی	10/-
کاغذ کا شہر	ڈاکٹر ساغر اعظمی	30/-	لو پکارے گا	اندر سروپ دت نادان	40/-
کجلی بن	سعادت سعید	40/-	لمحہ لمحہ جاگی رات	یعقوب راہی	25/-
کالے کاغذ کی نظمیں	باقر مہدی	4/50	لہو کا درد	ظفر غزالی	20/-
کرن	افتخار اعظمی	10/-	لا شریک	ف۔س۔اعجاز	40/-
کاروان خیال	عطا کاکوی	15/-	مشاعرہ زنداں	اتر پردیش اردو اکادمی	4/50
لمحہ لمحہ پیاس	کیلاش ماہر	50/-	موج تسنیم	علامہ تسنیم فاروقی	15/-
لالہ زار صبح	ناشر نقوی	40/-	متاع فکر	عروج زیدی	20/-
لازوال	مائل ملیح آبادی	30/-	ماضیانہ	بمل کرشن اشک	15/-
لہریں	راجندر بہادر موج	30/-	مافی الضمیر	ضمیر کاظمی	40/-
کمار سمبھو	منور لکھنوی	5/-	مجموعہ کلام حفیظ	مرشد پرویز	10/-
کارواں خیالوں کا	نوبہار صابر	6/-	مینارہ فلک بوس	ساقی توابلوی	100/-
کلام ابی طالب	مولانا علی حسین شیفتہ	20/-	معلومات سخن	علامہ سریر کابری چینائی	35/-
کاویم	کاوش بدری	33/-	ماسوا	ظہیر صدیقی	10/-
کاغذی حکم	علیم جہانگیر	20/-	مدعا	ظہیر صدیقی	20/-
کھنڈر میں چراغ	ملک زادہ جاوید	60/-	مثنوی جینز کی لعنت	الحاج حافظ محمد ایوب	30/-
گلہائے ادب	ڈاکٹر عبدالاحد خاں	3/50	منتخب قومی شاعری	سردار جعفری	9/25
گردش رنگ	مختار ہاشمی	10/-	میراجی کی نظمیں	مرغوب علی	60/-
گلفشاں	جیالعل دت رفیق	30/-	مصحف عصر	عمر انصاری	180/-
گیتان جلی	سید ظہیر عباس	30/-	مطلع حیات	احسن رضوی	45/-
لہو کے چراغ	انجم عباس	20/-	موج گنگ	جوہر دیوبندی	35/-

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، جے۔جے ہسپتال، بمبئی ۳

نظریاتی تنازعوں کے درمیان ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ
کتاب نما
نئی دہلی ۲۵

اگست ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۸

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/-

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 6910191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں/غزلیں

طنز و مزاح

جائزے

نئی مطبوعات

امیر خسرو کی جمالیات (ادب) شکیل الرحمٰن ۱۵۰/-
منور لکھنوی ایک مطالعہ (ادبی سوانح) شباب للت ۳۵۰/-
ڈاکٹر رشید جہاں حیات و خدمات 〃 ادریس احمد خاں ۱۰۰/-
اظہار (تنقیدی مضامین) آزاد گلاٹی ۱۰۰/-
اجنبی ہوا (شعری مجموعہ) شباب للت ۷۵/-
عکس بے خیال (افسانے) رشید احمد ۷۵/-
شعلوں کا کفن (ناول) خان آصف ۲۵۰/-
دیوی 〃 عبدالقیوم شاد ۹۰/-
سیپیاں (افسانے) فصیح اللہ نقیب ۵۰/-
بہار و خزاں (ناول) حمیدہ سلطان ۱۰۰/-
عالم اسلام اخلاقی صورت حال (اخلاقیات) اسرار عالم ۱۲۰/-
چیزیں اور لوگ (افسانے) آصف فرخی ۱۰۰/-
لمحات بصیرت (شعری مجموعہ) رگھوناتھ گھمی ۴۰/-
قدیم اردو نظم اوّل (انتخاب) ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ۴۰/-
اسرار غالب (غالبیات) سید قدرت اللہ نقوی ۶۰/-
دھوپ کی چادر (افسانے) سید احمد قادری ۷۵/-
بے زبانی کا ہنر (شعری مجموعہ) ڈاکٹر سجاد سیّد ۸۰/-
شہر چپ ہے (ناول) مشرف عالم ذوقی ۸۰/-
شبلی کی علمی ادبی خدمات (ادب) ڈاکٹر خلیق انجم ۱۵۰/-
دبستان مومن (ادب) ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۶۰/-
مثنوی اسرار محبت ڈاکٹر تسیم احمد ۵۰/-
کمپیوٹر کوئز سوالاً جواباً (معلومات کمپیوٹر) ایم۔ایس انور ۳۰/-
کمپیوٹر ایج مع کمپیوٹر ڈکشنری 〃 پروفیسر محمد ایاز جشوانی ۶۵/-
صراط مستقیم (بچوں کے لیے قرآنی آیات کا ترجمہ و تشریح) حکیم محمد سعید ۷/۵۰
حق تو یہ ہے کہ (افسانے) شبیب احمد کاف ۴۴/-
لفظوں کا سفر (شعری مجموعہ) کامل بہزادی ۱۸/-
تلوک چند محروم ایک مطالعہ 〃 ۶۰/-

سرورق ـــ زبیر رضوی

تنہا تنہا (افسانے) فرزانہ اعجاز ۶۰/-
دستاویز (اردو املا و رسم خط سے متعلق) جابر حسین ۱۰۰/-
ٹوٹے سکوت (مراثی) مرتضیٰ اظہر رضوی ۵۰/-
ندوۃ العلما، محرک و بانی۔ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد / مولوی نجیب اصغر ۴۰/-
بنام علیم صبا نویدی (خطوط) مرتبہ ڈاکٹر محمد علی اثر ۸۰/-
سوندھی مٹی کے بت (خاکے) اقبال متین ۹۷/-
جنرل سائنس (فزکس، کیمسٹری، دسویں درجے کے لیے)
پروفیسر زاہد حسین رضوی ۵۰/-
رام لعل کے شب و روز (سوانح) ہما جمال رضوی ۲۰۰/-
شعوری رجحانات (ادبی تحقیقی مقالے) خلیق الزماں نصرت ۶۰/-
بیرونی ملکوں میں مقیم ہندستانی۔ شاہ بندری جعفر صادق ۳۰۰/-
دھوپ دریا (شعری مجموعہ) شکیل اعظمی ۵۰/-

آسماں محراب

۱۹۷۶ء سے لے کر ۱۹۹۶ء تک کے کلام کا انتخاب

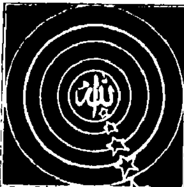
شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری میں بنیادی تجربہ محض بصری، جسمانی یا نغیری نوعیت کا نہیں ہے۔ اکثر و بیشتر یہ تجربہ زیر زمیں آگ کے سفر کا تجربہ ہے۔ (بلراج کومل)

فاروقی کی غزلیں ان کے معاصرین کی غزلوں سے بے حد مختلف نظر آتی ہیں اور یہ امتیاز ان کی غزلوں اور نظموں میں خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر نمایاں ہیں۔ (احمد محفوظ)

قیمت: ۲۱۰/ روپے

(بچوں کے لیے)
منتخب قرآنی آیات
کا
ترجمہ و
تشریح
قیمت
۷/۵۰



صراط مستقیم

مہمان مدیر
زبیر رضوی
ایڈیٹر "ذہن جدید"
۷۔ کاسموپالیٹن اپارٹمنٹس۔ لین ۱۲۔ ذاکر نگر۔ نئی دہلی

اشاریہ

خواندگی اور ادیب کا رول

اپنے اردگرد کی سماجی زندگی میں ادیب کے رول اور اس پر عائد ذمے داری کی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ادیب سماجی زندگی میں اپنی حیثیت کے تعین کے بغیر یہ ساری باتیں خاموشی سے سنتا رہتا ہے۔ اس سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی سماجی ذمے داریوں کا احساس کرتے ہوئے ملک و قوم کی رہنمائی کا فرض ادا کرے ہر برائی کے سامنے وہ سینہ تان کھڑا ہو جائے اور جہاں تک ممکن ہو سکے وہ ان سماجی عناصر پر وار کرتا رہے جو معاشرے میں ابتری، انتشار یا برائیوں کو راہ دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ایسا سب کچھ کہتے ہوئے ہم ادیب کو کسی مورچے یا محاذ پر کھڑے اس بندوق بردار سپاہی جیسا ہی سمجھتے ہیں جس کو ہدایت ہی یہ دی گئی ہے کہ وہ دشمن پر کڑی نظر رکھے اور جب بھی وہ سر اٹھائے اس پر گولی داغ دے۔ اس طرح کی باتیں کرنے والے ادیب کے تخلیقی مزاج اور رویے سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی دور میں ادیب نے اپنی اردگرد کی زندگی سے آنکھ ملائے بغیر لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے وہ یا تو اس پر بیتا ہوا ہوتا ہے یا پھر وہ ہوتا ہے جو اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا: ضرورت اور مطالبے کے تحت ادیب نے کم ہی قلم اٹھایا ہے۔ یہ صورت حال کسی سیاسی صورت حال کے حوالے سے تو اور بھی زیادہ اختلافی ہو جاتی ہے۔ اکثر جب ادیب کے رول کی بات ہوتی ہے تو یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ ادیب ہمیشہ زندگی اور اس کے مظاہر کو اپنی آنکھ سے دیکھنے، اپنے ذہن سے سوچنے اور انھیں اپنی حسیت کے حوالے سے محسوس کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ ایسے

سیاسی نظام میں ادیب کی دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے جس میں اس کا کوئی باعزت مقام متعین نہیں ہوتا، ایسے نظام میں ادیب اپنے مقام کے تعین سے زیادہ اپنے لکھنے کے محرکات سے زیادہ سروکار رکھتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ ایک جینوئن اور انا پسند ادیب مصلحتوں یا مطالبوں کے گھیروں میں آنے سے بچتا رہتا ہے، ادیب کے ایسے جانے پہچانے رویوں کے پیش نظر یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ادیب کے نزدیک ہر سماجی ضرورت یا تقاضا بے معنی ہے، یہاں ہم اگر خواندگی کے سوال پر ادیب کے رول اور اس نوعیت کے منصوبوں میں اس کی شرکت اور دلچسپی کی بات کریں تو یہ ادیب سے کیے جانے والے سیاسی نوعیت کے تقاضوں سے قطعی مختلف ہے۔ یہاں انسان کو حرف آشنا بنانے اور وہ جسے حرف سے نا آشنا ہونے کے نتیجے میں سماجی زندگی میں جس نوعیت کے نقصانات کا سامنا کرنا ہوتا ہے اس سے جتنا ایک سماجیات کا ماہر واقف ہے اتنا ہی ایک ادیب بھی اس سے باخبر ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے ساتھ اس کی ہمدردی بڑھ جاتی ہے جو ہمارے نظام تعلیم اور اس کی فراہم کردہ سہولتوں سے باہر بے خبری کے روز و شب گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ کیوں مکتب یا مدرسے کی حدود میں قدم نہیں رکھ سکے۔ تعلیم کیوں ان کے لیے ایک دور کا خواب بن کے رہ گئی۔ یہاں یہ ساری راکھ کریدنا مقصود نہیں۔ بات جس پر ہمیں اظہار خیال کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں جو لوگ کاغذ، پنسل اور سلیٹ لے کر اسکول جانے کے بجائے، کھیتوں، کارخانوں، روزگار کی تپتی ہوئی بھٹیوں اور گھریلو کام کاج کی سلوں کے پاٹوں میں پستے رہے ہیں انھیں پڑھا لکھا بنایا جائے یا نہیں۔ اگر ہم ان کے پڑھے لکھے بنائے جانے سے اتفاق کرتے ہیں تو پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ ان کے لیے کتاب کون لکھے اور کیسی کتاب لکھی جائے۔ ہمارے یہاں اب تک یہ فیصلہ ماہر تعلیم کرتے آئے ہیں کہ کسی ناخواندہ کو اسکول، کالج یا پھر خواندگی کے مرکزوں کے حوالے سے کیا پڑھایا اور کیسے پڑھایا جائے اس پورے عمل میں ادیب کی براہ راست شرکت کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا رشتہ بس بالواسطہ رہا ہے کہ جو کچھ اس نے پہلے سے لکھا ہوا ہے اس میں کیا کچھ نصاب میں رکھنے یا پھر خواندگی کی مختلف سطحوں پر پڑھا لیا جائے۔ ادھر کچھ دنوں سے یہ اہم رویہ سامنے آرہا ہے کہ خواندگی کی اس اصلاحی مہم سے ادیب کو بھی باخبر رکھا جائے اور اسے ان لوگوں سے قریب لایا جائے جو ناخواندگی کا نقصان بھگت رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پریم چند اور اقبال کی طرح ہمارے بہت سے ادیب ایسے ہیں جنھوں نے اس طرح کا کافی کچھ لکھا ہے جسے خواندگی کے لیے تیار ہونے والی کتابوں میں شامل کیا جائے لیکن ایسا ہی

بہت کچھ دوسرے ادیبوں کے پاس لکھا ہوا زیادہ نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر ادیبوں کو سنجیدگی کے ساتھ خواندگی کے منصوبوں اور مرکزوں سے وابستہ رکھا جائے تو کچھ تو وہ ایسا ضرور لکھ سکیں گے جو خواندگی کے مرکزوں میں آنے والوں کے لیے پُرکشش ثابت ہو، یہ صحیح ہے اسکول اور خواندگی کے مرکزوں میں علم کی روشنی پانے والوں کے درمیان چیزوں کو قبول کرنے کا مزاج اور رویہ مختلف ہوتا ہے۔ اسکول میں ایک لمبے عرصے کے لیے پڑھنے اور پڑھانے کی فضابنی ہوتی ہے جبکہ خواندگی کے مرکز میں آنے والا پورے دن اندھیرے میں سفر کرنے کے بعد ہلکی اور زرد روشنی میں شبد کے گیان کی ریاضت کرتا ہے ۔ یہ شخص اسکول جانے والے بچے سے بے حد مختلف ہے اور اس اعتبار سے ادیب کے لیے خاص طور پر فکشن لکھنے والے کے لیے یہ ایک دلچسپ کردار بھی بن جاتا ہے۔

میرے خیال میں ایک بڑی دشواری جو ادیب اور خواندگی کے مرکز میں پڑھنے والے کے درمیان دوری کو پاٹنے میں حائل ہے وہ یہ ہے کہ دونوں ہی زندگی کی مصروفیتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک دوبار اگر خواندگی کی مہم سے دلچسپی رکھنے والے ادیبوں کو ایسے مراکز سے قریب لایا جائے تو پھر ادیب کے لیے ان لوگوں کی ضرورتوں، عادتوں اور سماجی رویوں اور کہانی، قصوں میں ان کی دلچسپی کی نوعیت کا پتا چل جائے گا۔ یہ بھی علم ہو سکے گا کہ ایسے لوگوں کے لیے لکھتے ہوئے زبان کیا ہو، موضوعات کیا ہوں، متن کو کس طرح دلچسپ اور پڑھنے کے قابل بنایا جائے کہ پڑھنے والے کے ہاتھ سے کتاب نہ چھوٹے: خواندگی کے مرکزوں میں پڑھنے والے کی قاری کی حیثیت سے اگر ہم اسے قاری مانتے ہیں تو اس کی نفسیات اور سماجی معاملات میں اس کے عمومی رد عمل اور زاویوں کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

یہ سوال بھی اہم ہے کہ ہم خواندگی کی مہم میں اچھے اور ممتاز ادیبوں کی وابستگی کو یقینی بنانے میں کامیاب نہیں رہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ بار بار کی کوششوں کے باوجود ادیب پوری طرح اس مہم کا حصہ نہیں بن پاتے اور پھر انھی لوگوں کی تحریروں کو کتابوں کی شکل میں چھاپ دیتے ہیں جو "ادیب" ہونے کے زمرے میں نہیں آتے اس سلسلے میں کسی قدر توجہ کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا ہوگا، دراصل ہم جس نظام میں سانس لے رہے ہیں اس میں خلوص، اٹوٹ وابستگی کا خاصا فقدان ہوتا جارہا ہے یوں بھی دفتری نظام اور اس کی کھڑی کی ہوئی رکاوٹوں کو دور کرنا اس ادیب کے لیے تو اور بھی دشوار ہے جو خواندگی کے تصور کا ساتھ دینے کے خیال سے اپنی تخلیقی سرگرمیوں سے کچھ دیر کے لیے باہر آنے

کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر خواندگی کی مہم میں ہم ادیب سے کسی تخلیقی کردار کے ادا کرنے کے آرزو مند ہیں تو پھر ہمیں اس کی وابستگی کو یقینی بنانے کے لیے بھی وہ پیش قدمیاں کرنی ہوں گی جن کو اپناتے ہوئے کبھی کبھی ہمارے دل میں بلکہ اکثر یہ خیال آتا ہے ماہر تو ہم ہیں، یہ ادیب بیچ میں کہاں سے آگیا۔

اگر خواندگی کی مہم میں ادیب کو سچ مچ بیچ میں لانا ہے تو پھر ادیب کے ساتھ ایک بار نہیں کئی بار مل بیٹھنا ہوگا: اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ایک اچھے ادیب کو شبد کا جو گیان ہوتا ہے اس کی اثر آفرینی اور اس میں چھپے تیر و نشتر، شعلہ و شبنم سے وہ جتنا واقف اور ان کا مزاج داں ہوتا ہے اتنا کوئی دوسرا نہیں ہوتا لیکن اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس میدان میں حقیقی ادیب کی جگہ محض زیبائش اور آرائش کی ہے تو پھر خواندگی کی کتابوں کو وہ لوگ بھی مرتب کر سکتے ہیں جو اس مہم میں سرگرمی سے شریک ہیں۔ دوسرے معنی میں جانے پہچانے ادیب کے بجائے ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنے والوں کی ایک ایسی جماعت بنالیں جو بھلے ادیب نہ ہوں مگر خواندگی کے مرکزوں کے لیے قابل بھروسا کتاب لکھ سکیں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی
پروفیسرس کوارٹر، سائنس کالج کمپاؤنڈ
پٹنہ ۵

کلام اقبال کی آفاقیت

کلام اقبال کی وسعت و تنوع کے سبب مختلف وقتوں میں مختلف افراد نے اس کی مختلف تعبیریں کی ہیں، کبھی وطنیت، کبھی اسلامیت، کبھی اشتراکیت، کبھی جمہوریت، کبھی آمریت وغیرہ کا سراغ اقبال کے اشعار میں لگانے کی کوششیں مسلسل ہوتی رہی ہیں۔ مطالعۂ اقبال کی یہ رنگا رنگی کلام شاعر کی کثیر جہتوں یا اس کے موضوعات کی کثرت کی نشان دہی کرتی ہے۔ بجائے خود یہ حقیقت حال عظمت اور آفاقیت کی دلیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کی اپیل کسی ایک حلقے یا طبقے تک محدود نہیں بلکہ مختلف الخیال ذہنوں کے لیے عام ہے اور اس کے دائرے میں زندگی کے متعدد زاویے اور گوشے موجود ہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگ اقبال کو صرف شاعر مشرق کہنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم اگر یہ ہے کہ وہ مشرق سے نمودار ہوئے اور وہی ان کا مرکز و محور رہا تو شاید یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے لیکن شاعر کے پورے اردو و فارسی کلام کا مربوط و منظم مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کا اصل موضوع انسان تھا اور ان کی شاعری انسانی زندگی کے تمام جلووں پر محیط تھی، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا کائنات سے، قدیم روایات کی عکاسی کرتے ہوں یا جدید ترقیات کی۔ کلام اقبال نے تاریخ اور فطرت دونوں کی روشنی میں انسانیت کو ہر رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہ بین اقوامی سائنسی، صنعتی اور تکنیکی دور کے شاعر تھے، ان کی عصری حسیات اور معلومات بہت گہری اور وسیع تھیں۔ ان کی بصیرت ماضی و حال کے ساتھ مستقبل کے واقعات و اشارات پر محیط تھی۔ رائج الوقت علوم و فنون پر دسترس اور رجحان زمانہ سے آگاہی کی جامعیت کے ساتھ ساتھ ان کے ذہن میں ایک توازن اور اعتدال تھا۔ ان کے احساسات و تجربات بہت مرکب اور پیچیدہ و بالیدہ تھے۔ ان کی طبیعت کے وفور کا سبب ان کے ادراک کی یہی زرخیزی تھی۔ اس وفور کا اظہار ان کے اشعار کی فراوانی میں ہوا ہے، جو ایک بحر ذخار کی طرح موجزن ہے۔ یہ سارے نکات آفاقیت کے نشانات ہیں۔ اقبال کا وجد آفریں نغمہ ایک نقشۂ کائنات

ہے۔ ایک زمزمۂ انسانیت ہے۔ وہ ازلی وابدی اقدارِ حیات کے شاعر ہیں، ان کے کلام میں ایک ایسی تہذیب کا رنگ و آہنگ ہے جس کو علاقوں اور زمانوں میں تقسیم یا محدود نہیں کیا جا سکتا۔
ان بیانات کی تائید میں بے شمار اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں۔ بروقت صرف مشتے نمونہ از خروارے اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کلامِ اقبال کے آخری دور کی ایک اردو نظم "شعاعِ امید" جو شاعر کی زندگی میں شائع ہونے والے آخری اردو مجموعے میں درج ہے۔ نہایت فکر انگیز ہے۔ اس کے تین بند ہیں۔ پہلے بند میں سورج اپنی شعاعوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام

لہٰذا پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ

یہ عصرِ حاضر کی تصویر کشی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا ایک بحران میں مبتلا ہے چنانچہ

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

یہ دوسرے بند کی ابتدا ہے، جس کے بعد مشرق و مغرب دونوں کی صورتِ حال کا یہ نقشہ پیش کیا گیا ہے :

اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش

یہ مغرب کے انتشار اور مشرق کے جمودگی کی عکاسی ہے، ایک طرف مادّی ترقی کا شور و غل ہے اور دوسری طرف تنزلی کا سکون و سکوت۔ انسانی نقطۂ نظر سے دونوں ہی ظلمت کے آئینے ہیں۔ اس دبیز تاریکی کو آفتاب کی شعاعیں دور نہیں کرسکتیں۔ بالِ جبریل کی مشہور نظم "ذوق و شوق" کے آخری سے پہلے بند کے خاتمے پر شاعر نے کہا تھا :

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

پورے جہان کی اس محیط تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک شعاع اٹھتی ہے، جس کی شان یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے مشرق کو، جو اس کا منبع ہے، اور اس کے ساتھ ہندستان کو، جو اس کا موطن ہے، اپنا مرکز بنانے کا عزم ظاہر کرتی ہے :

بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب

مشرق کے ہر ایک ذرّے کو جہاں تاب بنانے کا مطلب وہی ہے جو مشرق سے طلوع ہونے کے باوجود آفتاب کو عالم تاب کہنے کا ہوتا ہے۔ یہ تیس بند کی شروعات ہے۔ آگے چل کر عصر حاضر کے مشرق کے لیے ہندستان کی اہمیت پر زور اس طرح دیا جاتا ہے:

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

یہ بیسویں صدی کی دوسری چوتھائی میں، جب تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی، اس غیر منقسم ہندستان کا موقع ہے جس کے ایک اہم ترین شہر لاہور سے شاعر نہ صرف پورے ملک اور برصغیر بلکہ پوری دنیا سے انسانیت کو خطاب کر رہا تھا:

بنتے ہیں مری کارگہ فکر میں انجم
لے اپنے مقدّر کے ستارے کو تو پہچان

(مرد مسلمان — ضرب کلیم)

اس خطاب کی آفاقیت کا ایک اندازہ اس حقیقت سے بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر مسلم و غیر مسلم دونوں کے حال زار کی صورت گری کرتا ہے:

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

یہ وطن دوستی ضرور ہے مگر قوم پرستی ہرگز نہیں۔ اقبال اپنے پہلے اردو مجموعۂ کلام "بانگ درا" ہی میں "تصویر درد" کے ساتھ "شمع اور شاعر" اور "ترانۂ ہندی" کے ساتھ "ترانۂ ملّی" ان کے علاوہ "طلوع اسلام" کے ساتھ "خضر راہ" لکھ کر بیک وقت وطن دوستی، ملّت دوستی، اور انسان دوستی کا ثبوت دے چکے تھے، پھر بال جبریل میں "مسجد قرطبہ"، "ساقی نامہ" اور "ذوق و شوق"، جیسی اہم ترین اردو نظمیں شاعر کی اسلام پسندی میں نظریاتی آفاقیت اور اس کی زبر دست انسان دوستی کی کائناتی جہت پر تاکیدی نشان لگا چکی تھیں یہی وجہ ہے کہ "شعاع امید" کا خاتمہ اس آفاقی تلقین پر ہوتا ہے:

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر　　فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

فطرت کے اشارے سے شعر کی کائناتی جہت کی توثیق ہوتی ہے۔ یہ آفاقی شعاع امید، عالمی تاریکی کے موجودہ ماحول میں خود اقبال اور ان کا کلام ہے۔

اقبال کے اس عالمی نقطۂ نظر کا ایک معرکہ آرا اظہار جنگ عظیم اول کے بعد قائم ہونے والی لیگ آف نیشنز کے نام نہاد بین اقوامی کردار پران کے تنقیدی تبصرے سے ہوتا ہے، جو جنگ عظیم دوم کے بعد تشکیل پانے والی موجودہ یونائیٹڈ نیشنز پر بھی صادق آتا ہے۔ اس تبصرے میں سب سے نمایاں اور فکر انگیز نکتہ اسلامی توحید کی بنا پر وحدت آدم کا ہے، جس کی نشان دہی بعد میں آرنلڈ ٹوائن بی جیسے عصر حاضر کے سب سے بڑے مؤرخ نے بھی اپنی کتاب Civilization on Trial میں کی:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمت افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

(مکّہ اور جنیوا۔ ضرب کلیم)

اسلام کے حوالے سے اقبال نے وحدت آدم، ملت آدم اور جمعیت آدم کے جو پیغامات دیے ہیں وہ مشرق کے حوالے سے "طلوع اسلام" میں بھی ایک آفاقی صداقت و وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں:

یہ نکتہ سرگزشت ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

ابھی تک آدمی صید زبون شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہ اطلس قبایان تتاری ہے

ان اشعار میں ملت اسلامیہ، ایشیا، آدمیت، محبت انسانی، اخوت وحریت اور جوہری حکمت Nuclar Science کے مطابق تمام مخلوقات کی کائناتی وحدت کے اشارات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ سیاست وقوت کے اعتبار سے اقبال کی ملت دوستی کی پہنائی کا ایک منظر "خضر راہ"، کے اس شعر سے نمایاں ہے:

ربط وضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

اقبال مغربی سامراج کا خاتمہ اپنی ہمہ گیر انسان دوستی کے سبب ہی چاہتے تھے اور اسی مقصد کے لیے انھوں نے وقتی طور پر "خضر راہ"، میں "سرمایہ ومحنت"، کے عنوان سے اشتراکیت کے ظہور کا خیر مقدم بھی کیا اور محنت کشوں کو یہ ولولہ انگیز پیام دیا تھا:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس واقعے کی پیش گوئی مغربی سامراج کی متوقع شکست کے بعد ملت اسلامیہ اور عالم انسانیت دونوں کے بہتر مستقبل کے متعلق اقبال نے بانگ درا کی نظم "شمع اور شاعر" ہی میں پورے یقین کے ساتھ کردی تھی:

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

اور سب سے بڑھ کر یہ مژدۂ جاں فزا:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

کلام اقبال میں توحید کی آفاقی ہمہ گیری کی بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال "پیام مشرق"

کی نظم "الملک للہ" ہے جس کا خاتمہ اس فکر انگیز شعر پر ہوا ہے:

خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

(طارق نے اندلس کے ساحل پر اپنی شمشیر کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا کہ ہر ملک ہمارا ہے، اس لیے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے)

اس نظم کے فوراً بعد "جوئے آب" کے عنوان سے بہترین نعتیہ نظم کا خاتمہ اس آفاق گیر بند پر ہوتا ہے:

دریائے پُرخروش ز بند و شکن گزشت		از تنگ نائے وادی و کوہ و دمن گزشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را		از کاخ شاہ و بادہ و کشت و چمن گزشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار		در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گزشت

زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شریعت ایک پرشور دریا کی طرح ہر بند و شکن سے گزر گئی، وادی و کوہ و دمن سے آگے بڑھ گئی۔ ایک سیلاب کی طرح تمام نشیب و فراز کو طے کرتی ہوئی شاہی محل اور بادہ و کشت و چمن سب سے گزرتی چلی گئی۔ وہ ایک ایسا بیتاب و تند و تیز اور جگر سوز و بے قرار دریا ہے جو ہر زمانے میں تازہ دم رہا اور کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ یہ بحر بیکراں کیسی مستی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور اپنے آپ میں یگانہ ہوتے ہوئے سب سے بیگانہ ہے)

پیغمبر اسلام کی اس آفاقیت کا اظہار بال جبریل کی غزل کے ایک شعر میں اس طرح ہوا ہے:

نہ چینی و عربی وہ، نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاقی

رحمۃ للعالمین کی یہی شان حسب ذیل شعر سے بھی عیاں ہے:

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی

("امرائے عرب سے" ضرب کلیم)

ایمان و اسلام، عشق، خودی اور انسانیت کی آفاقی جہتوں کی طرف اشارہ کرنے والے متعدد منتخب اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک   دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
("علم اور دین" ۔ ضرب کلیم)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم   مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق
("کافر و مومن" ۔ ضرب کلیم)

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا   مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
("شاہین" ۔ بال جبریل)

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے   نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
(ساقی نامہ ۔ بال جبریل)

اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور   اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
(مسجد قرطبہ ۔ بال جبریل)

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ   حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ
(مسجد قرطبہ ۔ بال جبریل)

کلام اقبال کی آفاقیت کا سب سے نمایاں عنصر کائنات میں انسان کی حیثیت اور اس کا ارتقا ہے۔ عروج آدم خاکی کا یہ تصور آفاقی بنیاد پر ہی استوار ہے:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

(غزل ۔ بال جبریل)

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

(غزل ۔ بال جبریل)

جس طرح "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے"، اس سے بڑھ کر انسانی ترقی کا وجد آور نغمہ جہان شاعری میں موجود نہیں۔ مثال کے طور پر نظم کا صرف ایک بند نقل کرنا کافی ہوگا:

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ   (بال جبریل)

اس سلسلے میں ایک معرکہ آرا نظم پیام مشرق کی "تسخیر فطرت" ہے جس کا پہلا حصہ "میلاد آدم"
اس ولولہ انگیز شعر سے شروع ہوتا ہے :

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

(عشق نے نعرہ لگایا کہ انسان کی شکل میں ایک خونیں جگر پیدا ہوا اور حسن کانپ اٹھا کہ ایک صاحب نظر نمودار ہوا) ۔

اس کے بعد چوتھے حصے "آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید" کے پہلے دو اشعار ہی دنیا میں انسان کے بلند حوصلوں کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں :

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن

(پوری زندگی سوز و ساز میں گزارنا کتنا خوش گوار ہے)
(کوہ و دشت و صحرا کے دلوں کو ایک پھونک سے پگھلا دینا بڑا ہی خوش آیند ہے)

ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے
رہ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن

(قفس کا دروازہ کھول کر ایک گلستاں کی فضا میں آجانا بہت خوب ہے)
(آسمان کی راہیں طے کرنا اور ستاروں سے سرگوشی بھی اچھی لگتی ہے)

پیام مشرق ہی کی ایک نظم "محاورہ مابین خدا و انسان" میں فروغ ہستی کے لیے انسان کا یہ دعوا ایک آفاقی زمزمہ سنجی ہے :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم

(اے خدا تو نے رات بنائی اور میں نے چراغ، تو نے مٹی بنائی اور میں نے جام)
(تو نے بیابان و کہسار و سبزہ زار پیدا کیے اور میں نے خیابان و گلزار و باغ)

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(میں وہ ہوں جو پتھر سے آئینہ بناتا ہے)
(میں وہ ہوں جو زہر کو شہد میں تبدیل کر دیتا ہے)

زیر نظر مجموعے کی ایک اور نظم "حور و شاعر" انسان کی پیہم ترقی پسندی اور اولوالعزمی

کا نغمہ سناتی ہے:

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبرو ے تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

(جب میری نگاہ ایک خوبصورت محبوب پر پڑتی ہے تو ساتھ ہی میرا دل اس سے زیادہ حسین معشوق کے لیے تڑپنے لگتا ہے۔ میں ایک شرر سے آگے بڑھ کر ایک ستارے سے بھی بڑھ کر آفتاب کی جستجو کرتا ہوں۔ میں کسی ایک منزل پر ٹھہر جانے کا خیال بھی نہیں کرتا اس لیے کہ قرار میرے لیے موت ہے۔)

یہ موضوع بال جبریل کی نظم "ساقی نامہ" میں اس انداز سے پیش کیا گیا ہے:

فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوق پرواز ہے زندگی

کائنات کی یہ مسلسل حرکت اور پیش قدمی وقت کے اس آفاقی تناظر میں ہے جو ال جبریل کی نظم "مسجد قرطبہ" کے پہلے بند کا مفہوم ہے:

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

انسانیت کی معراج کا سب سے بڑا مرقع اور پوری دنیائے شاعری کے عظیم ترین شاہکار جاوید نامہ" میں پیش کیا گیا ہے، جس کے آغاز میں یہ روح پرور "نغمۂ ملائک" فردوس گوش ہے:

فروغ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر او گردوں شود روزے
خیال او کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنیٔ آدم نگر از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

مشت خاک کو ترقی کسی روز نوریوں سے بڑھ جائے گی۔ زمین آدمی کی تقدیر سے آسمان

جائے گی۔ انسان کا تخیل جو ابھی حوادث کے سیلاب میں پل رہا ہے ایک روز نیلگوں آسمان کے گرداب سے نکل جائے گا۔ ذرا آدمی کے باطن میں جھانک کر دیکھو۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ یہ ابھی ایک مضمون کی طرح ذہن میں پک رہا ہے۔ کسی روز موزوں ہو جائے گا۔ یہ پیش پاافتادہ مضمون ایسا موزوں ہوگا کہ اس کی تاثیر سے یزداں کا دل خون ہو جائے گا)۔

اس تمہید کے ساتھ افلاک کی جو سیر ہوتی ہے اس میں بلا امتیاز دنیا کے مختلف خطوں میں ابھرنے والے تاریخ عالم کے اہم ترین موضوعات اور اشخاص اس بصیرت کے ساتھ زیر بحث آتے ہیں کہ انفس و آفاق سب روشن ہو جاتے ہیں اور شاعری کی کائنات میں فطرت وصداقت کی لاتعداد نشانیاں رونما ہوتی ہیں۔ فلک قمر پر ایک قدیم عارف ہندی معرفت کا درس دیتا ہے۔ اسی فلک پر طاسین گوتم، طاسین زرتشت، طاسین مسیح مع رویائے حکیم طالسطائی اور طاسین محمد صلعم بھی ہیں۔ فلک عطارد پر جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی زیارت ہوتی ہے۔ دین و وطن اشتراکیت و ملوکیت، شرق و غرب، محکمات عالم قرآنی، خلافت آدم، حکومت الٰہی وغیرہ کے مباحث ہوتے ہیں۔ فلک زہرہ پر مہدی سوڈانی کا ظہور ایک بہترین نعتیہ نغمے کے ساتھ ہوتا ہے۔ فلک مریخ پر ایک مدعیہ نبوت کو غلط قسم کی آزادی نسواں کا ترجمان بنا کر اس کا پول کھولا گیا ہے۔ فلک مشتری پر حلاج، غالب، قرۃ العین طاہرہ کے علاوہ ابلیس بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ فلک زحل پر وطن دشمن عناصر کی شدید ترین مذمت کے ساتھ روح ہندستان کو فریاد کناں دکھایا گیا ہے "آں سوے افلاک" میں نیتشے، شرف النسا، سید علی ہمدانی، غنی کشمیری، برتری ہری، نادر، ابدالی، سلطان ٹیپو اور ناصر خسرو علوی نمودار ہوتے ہیں۔ بالآخر حضور باری تعالیٰ میں ندائے جمال بھی آتی ہے اور تجلی جلال بھی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دانتے کی ڈیوائن کومیڈی سے بہتر اور گیٹے کے فاؤسٹ سے برتر اقبال کے جاوید نامہ کی عظیم الشان شاعرانہ سیاحت علوی نئی نسل کے نام ایک بصیرت افروز خطاب پر ختم ہو جاتی ہے۔

جاوید نامہ کا ایک خاص شعر اقبال کی آفاقی انسان دوستی کی دستاویز کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

(انسانیت انسان کے احترام کا نام ہے لہٰذا آدمی کے مقام کا لحاظ کرنا چاہیے)

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے اردو و فارسی کلام میں ہر مذہب و ملت، نظریہ و خیال اور خطہ و دور کے قابل ذکر اشخاص کو ان کے کارناموں کی داد دی ہے۔ گرچہ ان کی بعض باتوں

پر تنقید بھی کی ہے۔ رام۔ گوتم، نانک، مارکس، ہیگل، لینن، نپولین، مسولینی وغیرہ سبھی اقبال کے حلقۂ سخن میں داخل ہیں۔ کسی کے خلاف اقبال کو کوئی تعصب نہیں ہے۔ سب کے سلسلے میں ان کا انداز نظر معروضی اور مثبت ہے۔ گرچہ وہ خود اپنا محورِ فکر رکھتے ہیں اور ان کا ایک معیار ردّ و قبول ہے، ایک نظریہ اور موقف ہے، جس کے مطابق انھوں نے کائنات کا مشاہدہ اور حیات کا مطالعہ کیا ہے۔ اقبال کا عقیدہ اسلام ہے جس پر محکم ایمان نے ہی انھیں ایک آفاقی شعور، لطیف ذوق اور مضبوط کردار عطا کیا ہے۔ اسی ایمان کی بنیاد پر اقبال وسیع ترین تہذیبی قدروں کے علم بردار ہیں۔

اقبال کے ایمان کا پیمانہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی　　　گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں، نہ سمرقند
(غزل ــ بال جبریل)

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث　　　مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے
(غزل ــ بال جبریل)

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی　　　میرے کلام پہ حجّت ہے نکتۂ لولاک
(غزل ــ بال جبریل)

ضرب کلیم کی نظمیں "مدنیت اسلام"، اور "مرد مسلمان" اس سلسلے میں حد درجہ فکر انگیز ہیں۔ آخر الذکر نظم میں مسلمان کے تصور کی تشکیل کے لیے چار عناصر کی ترکیب اور "طلوع اسلام" میں شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی اور نطق اعرابی کے درگاہ حق سے مومن کو عطا ہونے کا مژدہ واضح طور سے ایک آفاقی وجود پر دلالت کرتا ہے۔

اپنے کلام کی آفاقی تاثیر کا احساس خود اقبال کو بھی تھا، جس کا اظہار انھوں نے متعدد اشعار میں مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ اس احساس و اظہار کی صرف معدودے چند مثالیں درج ذیل ہیں:

عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا
(غزل ــ پیام مشرق)

(عرب میرے خون کے آنسو سے لالہ زار بن چکا ہے۔ میرے سانس نے اس عجم کو بہار سے ہم کنار کیا ہے جس کے گلستاں کی خوشبو اڑ چکی تھی)

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند
جہاں را دگرگوں کرد یک مرد خود آگا ہے

(غزل ــ زبورِ عجم)

(میرے بعد لوگ میرا شعر پڑھتے، سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ایک مرد خود آگاہ نے ایک جہان کو بدل کر رکھ دیا)۔

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انھیں ذوق آتش آشامی

(غزل ــ بال جبریل)

زیارت گاہ اہل عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاک راہ کو میں نے بتایا راز الوندی

(غزل ــ بال جبریل)

مستقبل کے اشارے کلام اقبال کی اس دیدہ وری اور دور بینی پر دلالت کرتے ہیں جو آفاقی نقطۂ نظر کی ایک واضح علامت ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل یعنی ۱۹۱۲ء ہی میں بانگ درا کی مشہور نظم "شمع اور شاعر" کے خاتمے سے پہلے پیش بینی یا مستقبلیت پر مبنی یہ شعر ملتا ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

نظم کا پورا آخری بند برطانوی سامراج کے عروج پر اس کے زوال کی پیش گوئی اور مشرق یا ملت اسلامیہ کے دور زوال میں اس کے عروج کی آیندہ خوش خبری سے بھرا ہوا ہے۔ یہ عصر حاضر کی انسانیت کے افق پر چھائی ہوئی تاریکی اور ناامیدی میں روشنی اور امید کی کرن کی نشان دہی ہے۔ بند کا آغاز ہی اس رجائی شعر سے ہوتا ہے:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

چنانچہ بال جبریل کی مشہور نظم "مسجد قرطبہ" کے آخری بند میں یہ اشعار اس مستقبل کی خبر دیتے ہیں جو موجودہ صدی کے خاتمے پر ایک واقعہ بن چکا ہے:

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں　　میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے　　لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

خضرِ راہ میں اقبال نے کہا تھا:

کھول کر آنکھیں میرے آئینۂ گفتار میں   آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

(بانگ درا)

اقبال اپنی پیش بینی کی اس صلاحیت سے واقف تھے:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

(غزل — بالِ جبریل)

یہی وجہ ہے کہ مستقبل کے انقلاب کا نعرہ سب سے پہلے انھوں نے لگایا اور وہ ان کا نالہ بن کر آفاق گیر ہوا:

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

(زبورِ عجم، حصّہ دوم)

انقلاب کا یہ نعرہ کتنا ہمہ گیر تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے اقبال کا یہ تصورِ جہاں کافی ہوگا

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست

کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بودہ است

(زبورِ عجم، حصّہ دوم)

(یہ نہ سمجھو کہ یہی خاکداں ہمارا نشیمن ہے۔ اس لیے کہ ہر ستارہ جہان ہے یا جہان رہ چکا ہے)

کلامِ اقبال کی اس آفاقیت کے مقابلے میں دانتے، گیٹے اور شیکسپیر کا پیمانۂ شاعری بہت چھوٹا ہے۔ اقبال بلاشبہ دنیا کے سب سے بڑے آفاقی شاعر ہیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
۷۔ سلور لائن اپارٹمنٹس۔ اے سیکٹر (بی۔ڈی۔اے)
کوہ فضا۔ بھوپال ۴۶۲۰۰۱

پیمانوں کی کہانی

انسان، حیوان سے مختلف ہے۔ یہ سب ہی جانتے ہیں اور انسان کی بات کرنے، سوچنے اور سوس کرنے کی ان صلاحیتوں کی اکثر بات کرتے ہیں جو انسانوں کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہیں لیکن یک اور خصوصیت بھی ہے جو قدرت نے انسان میں پیدا کی ہے اور حیوان میں نہیں۔ یہ وہ شعور ہے جس کی بنیاد پر انسان ناپ تول کا فرق کر سکتا ہے۔ بچے کو جیسے ہی سمجھ آتی ہے وہ کم اور یادہ کے فرق کو سمجھنے لگتا ہے اور جیسے جیسے اس کے شعور میں پختگی اور وسعت آتی جاتی ہے۔ یسے ہی ویسے وہ ناپ تول کا باریک سے باریک فرق کرنے لگتا ہے۔

یہ شعور اندازے سے شروع ہوتا ہے۔ لفظ "پیمانے" میں بھی اندازہ کرنے کے معنی وجود ہیں اور ناپ تول کا یہ سارا کاروبار بھی دراصل اندازے سے ہی شروع ہوا تھا جیسے ٹھی بھر چاول، کٹوری بھر دال، چٹکی بھر نمک سے یہ بات چلی تھی۔ ابتدا میں انسان نے اپنے س پاس موجود، بنے بنائے سانچوں کو اپنے ناپ تول کی بنیاد بنایا، جیسے اس نے لمبائی اور وڑائی کا ناپ کرنے کے لیے اپنی انگلیوں کی چوڑائی، پنجے کے پھیلاؤ، ہاتھ کی لمبائی اور دم کے فاصلے کو اپنا معیار بنایا۔ پھر اُن کی مدد سے کم از کم ناپ سے زیادہ سے زیادہ وری کے ناپ کے لیے مختلف درجے مقرر کیے۔

ہندستان میں چوڑائی کا سب سے چھوٹا پیمانہ انگل یعنی انگلی کی چوڑائی مقرر کیا گیا۔ بارہ نگل کا ایک بالشت مانا گیا۔ بالشت سے وہ چوڑائی مراد لی گئی جو ہاتھ کا پنجہ پھیلانے سے چھوٹی انگلی کے سرے سے انگوٹھے کے سرے کے درمیان ہوتی ہے۔" ہندی شبد ساگر" نے بالشت کو فارسی لفظ مانا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں بالشت یا الشں سے تکیہ مراد لیا جاتا ہے۔ پنجے کی چوڑائی کے لیے سنسکرت میں वितस्ति (وِتس تی) کا لفظ آتا ہے۔ غالباً اسی نے بعد میں بالشت کی شکل اختیار کی۔ دو بالشت

ایک ہاتھ مانا جاتا تھا اور دو ہاتھ کا ایک گز۔ گز لکڑی کی چھڑی یا لوہے کی چھڑ کو کہتے ہیں۔ جس زمانے میں کارتوسوں کا رواج نہیں تھا اور بندوق کی نال میں بارود کی گولی وغیرہ بھر کر ڈاٹ لگائی جاتی تھی، اس گولی بارود وغیرہ کو ایک لوہے کی چھڑ سے کوٹ کوٹ کر اندر بٹھایا جاتا تھا۔ یہ چھڑ گز کہلاتی تھی۔ اسی طرح سارنگی وغیرہ سازوں کو بجانے والی کمان کو بھی گز کہتے ہیں۔ تیر کی وہ سیدھی لکڑی جس میں نوک اور پر لگا کر تیر بنایا جاتا ہے گز کہلاتی ہے۔ کپڑا وغیرہ ناپنے کے لیے عام طور پر لوہے کا گز استعمال کیا جاتا ہے جس پر نشان بنے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر نشان ایک گرہ کہلاتا تھا۔ گرہ رسّی۔ دھاگے وغیرہ میں لگائی جانے والی گٹھان کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گز کی غیر موجودگی میں، گز بھر لمبائی کی رسّی کو بھی ناپنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اسے سولہ برابر حصّوں میں بانٹنے کے لیے بیچ بیچ میں گرہیں لگا دی جاتی تھیں۔ بعد میں لوہے کے گز میں بھی سولھویں حصّوں کو گرہ ہی کہا گیا۔

زیادہ لمبے فاصلے کے لیے کوس کا پیمانہ استعمال کیا جاتا تھا۔ مرتب "فرہنگ آصفیہ" کا خیال ہے کہ یہ لفظ "گوش" تھا اور "گوشید" یعنی گائے کی آواز کو ظاہر کرتا تھا لیکن دراصل کوس سنسکرت لفظ "کروش" کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چیخ یا پکار کے ہوتے ہیں (فارسی لفظ "خروش" سے مقابلہ کیجیے) اور یہ لفظ "کروش" سنسکرت میں فاصلے کے پیمانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا اور غالباً "کروش" کی ہی بنا پر فارسی میں کوس کے لیے لفظ "کروہ" اختیار کیا گیا۔ ظاہر ہے "کروش" سے ابتداءً وہ فاصلہ مراد تھا جہاں تک کسی انسان کی پکار سنی جا سکے۔ ایک انگریز کو جسے سری لنکا میں کام کرنے کا موقع ملا تھا یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اس علاقے میں جنگلوں وغیرہ میں فاصلے کو دیکھ کر نہیں بلکہ سن کر متعین کیا جاتا تھا۔ سری لنکا میں چوتھائی میل کے لگ بھگ فاصلے کو کتّے کی آواز کا فاصلہ بتایا جاتا۔ اس سے زیادہ فاصلے کو مرغ کی بانگ اور اس سے بھی زیادہ فاصلے کو "ہو" کی آواز جو کہ انسانی آواز کی نقل تھی کے ذریعے بتایا جاتا تھا۔ سڑکوں پر فاصلے کے نشان لگانے کا کام اکبر کے زمانے میں کیا گیا اور "آئین اکبری" میں ایک کوس کو پانچ ہزار گز کے برابر بتایا گیا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں دہلی کے قریب قائم کوس میناروں کے درمیان اوسطاً فاصلہ دو میل سے زیادہ ناپا گیا اور اس طرح موٹے طور پر ایک کوس کو دو میل کے برابر قرار دیا گیا۔

انگریزوں کے عہد میں ہمارے یہاں برطانوی پیمائش کے نظام کو اختیار کیا گیا۔ اس نظام کی بنیاد فٹ یعنی پیر تھا۔ اس کو بارہ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصّے کو انچ کہا گیا۔ لفظ "انچ" کا مطلب ہی بارھواں حصّہ ہوتا تھا۔ تین فٹ کو ایک "یارڈ" یعنی چھڑی کہا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ

نگلستان میں یارڈ کا ناپ بادشاہ ہنری اول کے ہاتھ کے ناپ کے برابر رکھا گیا تھا۔ ہندستان میں گز کی پیمائش ہی تین فٹ مقرر کر دی گئی۔ زیادہ لمبے فاصلے کو فرلانگ اور میل کے ذریعے ظاہر کیا جانے لگا۔ فرلانگ سے وہ لمبائی مراد تھی جو دس ایکڑ رقبے کے مربع کھیت میں ایک سیدھ میں ایک بار میں کی گئی ہو۔ فرلانگ کو میل کا آٹھواں حصہ مانا گیا جس سے ایک فرلانگ میں ۲۲۰ گز ہوئے۔ جہاں تک میل کا سوال ہے یہ ایک ایسے لاطینی لفظ سے مطلب ہے جس کا مطلب ہزار ہوتا ہے۔ قدیم روم میں ایک میل سے ایک ہزار میل دُہرے قدم کا فاصلہ مراد لیا جاتا تھا جو کہ موجودہ پیمائش کے اعتبار سے ۱۴۸۰ میٹر کے برابر تھا اور دُہرا قدم پانچ فٹ سے کچھ زائد ہوتا تھا۔ رومن شہنشاہ آگسٹس سیزر نے روم کے چوک میں پہلا میل کا پتھر نصب کروایا تھا جس سے دوسرے مقامات کے فاصلے ناپے جاتے تھے۔ بعد میں مختلف مقامات پر میلوں کی پیمائش مختلف ہو گئی۔ انگلستان میں ملکہ الزبتھ اول کے عہد میں میل کی معیاری لمبائی ۱۷۶۰ گز طے کی گئی جو تقریباً ۱۶۰۹ میٹر کے برابر ہوتی ہے۔ آج پیمائش کا اعشاری نظام دنیا کے بیشتر ملکوں کی طرح ہمارے یہاں بھی رائج ہے۔ یہ نظام فرانس کی رائل اکیڈمی آف سائنسیز نے ۱۸ ویں صدی کے آخر میں تیار کیا تھا۔ اس نظام کے تحت لمبائی کی اکائی کی حیثیت سے میٹر کو اختیار کیا گیا۔ میٹر کے لفظی معنی تو ناپنا ہیں۔ لیکن اعشاری نظام کے تحت ایک میٹر کو اس لمبائی کے برابر سمجھا گیا جو پیرس کے قطب شمالی سے جوڑنے والے کرۂ ارض کے دائرے کے اُس حصّے کے ایک کروڑویں حصّے کے برابر ہو جو خط استوا اور قطب شمالی کے درمیان ہے۔

رقبہ ناپنے کے لیے ہندستان میں بیگھا استعمال کیا جاتا تھا۔ اکبری بیگھے میں ۳۶۰۰ مربع الٰہی گز کا رقبہ ہوتا تھا جب کہ ایک الٰہی گز تقریباً ۳۳ انچ کا ہوتا تھا۔ بیگھے کا بیسواں حصّہ بسوہ کہلاتا تھا۔ انگریزوں نے بعد میں تین بیگھوں کو ایک ایکڑ کے برابر مانا۔ ایکڑ ایک انگریزی لفظ کی شکل ہے جس کے معنی پہلے کھلی زمین کے ہوتے تھے لیکن بعد میں اس لفظ کو ایسی زمین کے لیے بولا جانے لگا جیسے مینڈھ وغیرہ بنا کر گھیرا گیا ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ جب بادشاہ ایڈورڈ اول کے زمین کے رقبے کو ناپنے کے لیے کسی مستقل پیمانے کی ضرورت ہوئی تو بادشاہ نے ایک جوڑی بیل سے دن بھر ایک کھیت جتوایا اور اس کی پیمائش کروائی اور اپنے فرمان کے ذریعے ایک ایکڑ کی پیمائش چالیس بانس لمبائی اور چار بانس چوڑائی مقرر کی گئی جو کہ بعد میں ۴۸۴۰ مربع گز طے ہوئی۔

انسان کو ناپ کے ساتھ ساتھ تول کی بھی ضرورت پڑی۔ چنانچہ اُسے سامنے جو اشیا نظر آئیں ان ہی کی مدد سے اپنے پیمانے تیار کیے۔ چاول عام استعمال کی چیز تھی۔ اُسے بہت

کم مقدار میں تولی جانے والی کمیاب اور قیمتی اشیا کو تولنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ بعض دواؤں کشتوں وغیرہ کی خوراک کی مقدار چاول کے حساب سے مقرر کی جاتی ہے۔ آٹھ چاول کی ایک رتی ہوتی ہے۔ رتی ایک لال رنگ کا خوبصورت بیج ہوتا ہے جس کے سر پر کالے رنگ کا ایک دھبّہ ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر گھونگچی یا گومچی بھی کہا کرتے ہیں۔ وزن کے لیے آٹھ چاول کے برابر ایک رتی مانی جاتی ہے۔ رتی سے اوپر ماشے کا وزن ہوا کرتا تھا۔ ماش یعنی اُڑد کے دانے کو آٹھ رتی کے برابر سمجھتے تھے۔ اس کے بعد تولہ ہوتا تھا جو ظاہر ہے تولنے کے لفظ سے گڑھا گیا تھا۔ ایک تولے میں بارہ ماشے ہوا کرتے تھے اور اکثر ایک کلدار روپیا یعنی سرکار کا ٹکسال میں گڑھا ہوا روپیے کا سکّہ ایک تولہ وزن تولنے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندستان کے الگ الگ علاقوں میں الگ الگ وزن کے سیر چلا کرتے تھے۔ انگریزوں کی عمل داری میں اسّی (۸۰) تولے کا سیر چلتا تھا۔ اور پھر چالیس سیر کا من ہوتا تھا۔ زبان کے ماہرین نے تحقیق کی ہے کہ "من" کا لفظ ہندستان کے مغرب میں دور دور تک مختلف شکلوں میں بولا جاتا تھا۔ اس کی ابتدا غالباً عکّادی زبان میں ہوئی تھی اور بابل میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ لفظ عربوں کے ہندستان کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھنے کے دوران آٹھویں یا نویں صدی میں اس ملک میں پہنچا لیکن سنسکرت میں وزن کے لیے ایک لفظ "منا" ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "من" پہلے سے ہندستان میں موجود تھا۔ پرتگالیوں نے ہندستان پہنچ کر اس لفظ کو "ماؤں" کی شکل میں اختیار کیا جس سے انگریزوں نے MAUND بنالیا۔ بعض علاقوں میں دو من کی ایک مانی بھی رائج تھی۔

انگریز اپنے ساتھ اپنا نظام پیمائش لائے جس میں چھوٹے پیمانوں میں "گرین" یعنی دانہ تھا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ابتداً اس سے مراد جو کا دانہ ہوتا تھا۔ بڑا وزن پونڈ تھا۔ "پاؤنڈ" کے لفظی معنی "وزن" کے تھے۔ ۲۲۴۰ پونڈ کا ایک ٹن ہوتا تھا۔ ٹن دراصل شراب وغیرہ کے ایک بڑے ڈرم کو کہتے تھے۔ اب یہ لفظ انگریزی زبان میں تھوڑے املا کے فرق کے ساتھ TONNE اعشاری نظام کے تحت ایک ہزار کلو گرام وزن کے لیے بولا جاتا ہے۔ جہاں تک خود لفظ گرام کا تعلق ہے یونانی زبان میں گرام حروف تہجی میں سے کسی حرف کو کہتے ہیں۔ بعد میں اس سے کسی بھی قسم کی چھوٹی اکائی مراد لی جانے لگی اور اٹھارھویں صدی میں فرانس میں اسے وزن کی سب سے چھوٹی اکائی کی شکل میں اختیار کیا گیا۔ "کلو" یونانی میں ہزار کے لیے آتا ہے اور جدید پیمانوں میں کلو گرام یا کلو میٹر سے ایک ہزار گرام یا ایک ہزار میٹر مراد لیا جاتا ہے۔

پٹرول وغیرہ سیّال چیزوں کی پیمائش کے لیے گیلن کا پیمانہ رائج تھا جس کے اصل معنی

شراب کے جگ کے تھے لیکن یہ پیمانہ دھیرے دھیرے بڑھ کر ۲۷۷ء۴ مکعب انچ کے برابر ہو گیا۔ آج کل لیٹر کا پیمانہ رائج ہے۔ لیٹر دراصل بحر روم میں واقع جزیرے سسلی کے ایک سکّے کا نام تھا لیکن جب یہ لفظ یونانی سے لاطینی میں پہنچا تو ایک پیمانہ بن گیا اور ۱۷۹۳ء میں فرانس میں اسے نئے اعشاری نظام میں برتن میں سیال چیز کو بھر کر ناپنے کے پیمانے کی اکائی کی شکل میں ایک بنیادی حیثیت دی گئی۔

وقت کو ناپنے کی بھی انسان کو ضرورت پڑی۔ ہندستان میں دن رات کو ساٹھ گھڑی میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم جیوتش کے حساب پر مبنی تھی۔ پھر دن رات کے آٹھ پہر ہوا کرتے تھے اور ہر پہر تین گھنٹے کا ہوتا تھا۔ پہر کے دوران پہرے دار چوکسی پر رہتے اور ہر گھنٹہ پورا ہونے پر دھات کے بنے گھنٹے پر چوٹ دے کر یہ اعلان کرتے کہ وہ پہرے پر ہیں اور دوسرے وقت کیا ہوا ہے۔ ہر چوتھے گھنٹے پر گجر بجائی جاتی یعنی چار گھنٹوں کے ساتھ چار چوٹیں مزید لگائی جاتیں۔ اسی طرح آٹھ بجے آٹھ گھنٹوں کے ساتھ آٹھ مزید چوٹیں اور بارہ بجے بارہ گھنٹوں کے ساتھ بارہ چوٹیں مزید لگائی جاتیں اور اس سے یہ اندازہ ہوتا رہتا کہ کب پہرہ بدلا جاتا ہے۔

بابل کے لوگوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ ایک دائرے کو چھے برابر حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ساٹھ ساٹھ کے چھوٹے حصوں میں اکائی کو تقسیم کرنے کا رواج ڈالا تھا۔ اسی بنا پر ایک گھنٹے کو پہلی بار ساٹھ حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصّے کو لاطینی میں PARS MINUTA PRIMA یعنی پہلا چھوٹا حصّہ کہا گیا۔ مختصراً اس حصّے کا نام "منٹ" پڑ گیا۔ جس کا مطلب صرف "چھوٹا" ہوتا ہے اور اسی وجہ سے عربی میں منٹ کا ترجمہ دقیقہ کیا جاتا ہے۔ ہر منٹ کو مزید ساٹھ حصّوں میں تقسیم کرنے کے لیے لاطینی میں اسے PARS MINUTA SECUNDA یعنی دوسری بار چھوٹا حصّہ کہا گیا۔ اس سے مختصراً سیکنڈ کا نام پڑ گیا جس کی بنیاد پر عربی میں سیکنڈ کا ترجمہ ثانیہ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں دن کا وقت انسان کی ضرورتوں کو زیادہ پورا کرتا ہے اس سے اس نے پورے چوبیس گھنٹوں کا نام ہی دن رکھ دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیوتش کا مطالعہ اکثر جڑا رہا ہے۔ اس علم میں سات اجرام فلکی کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اسی بنا پر اکثر دنوں کے نام ان سات سیاروں وغیرہ کے نام پر رکھ کر سات دنوں کا ایک ہفتہ مقرر کیا گیا۔ جیسے ہندستان میں اتوار یا روی وار سورج سے، سوم وار سوم یعنی چاند سے، منگل وار، منگل یعنی مریخ سے، بدھ وار بدھ یعنی عطارد سے، برہسپت وار، برہسپتی وار یعنی مشتری سے۔ شکر وار، شکر یعنی زہرہ سے اور شنی وار شنی یعنی زحل سے منسوب ہیں۔ مہینے کا تصور ماہ یعنی چاند سے ہے۔ چاند کی گھٹتی بڑھتی شکلوں کا ایک دور

جس عرصے میں ختم ہوتا تھا اُسے ایک ماہ کہا گیا لیکن بعض حالات زیادہ طویل عرصے میں دوبارہ نمودار ہوتے ہیں جیسے موسم۔ مثلاً ایک برسات کے بعد دوسری برسات آنے میں بارہ ماہ کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ اس کو برس کہا گیا۔ "برس" کا لفظ سنسکرت لفظ "ورش" سے متعلق ہے اور "ورش" "ورشاہ" سے نکلا ہے۔

کبھی کبھی بعض چیزوں کو ایک خاص تعداد یا مقدار میں اکٹھا رکھ کر ان کے بارے میں بات کرنے کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ قدیم انسان کے پاس گنتی کرنے کا سب سے آسان ذریعہ انگلیاں تھیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں "بیسا" اکثر استعمال ہوتا تھا جس کا مطلب تھا ہاتھوں اور پیروں کی کل بیسوں انگلیاں۔ جب ایک سے زیادہ بیس بیس چیزوں کے مجموعے کی بات کرنا ہوتی تو اس کے لیے ایک کوڑی یا کنکر، یا کوئی اور چیز یادداشت کے لیے الگ کرکے رکھ دی جاتی۔ اس لیے بعض اوقات بیس چیزوں کی ایک کوڑی بھی کہی جاتی۔ یورپ وغیرہ میں بیس کے لیے کہیں ایک نشان بنادیا جاتا جیسے لکڑی میں چاقو سے ایک نشان بنادیتے۔ اس نشان کو اسکور کہا جاتا تھا اور اسکور سے کبھی بیس چیزوں کا مطلب بھی لیتے تھے۔ اب یورپ سے لایا گیا درجن کا لفظ بھی بہت استعمال ہوتا ہے۔ درجن، بارہ کے لفظ سے نکلا ہے۔ یورپ میں بارہ کو جہاں حساب کتاب میں تین اور چار دونوں سے تقسیم ہوجانے کی وجہ سے اہمیت حاصل رہی ہے، وہیں حضرت عیسیٰؑ کے بارہ خاص شاگردوں یا حواریوں کے سبب بارہ کو ایک متبرک عدد بھی سمجھا جاتا رہا ہے۔ بارہ درجن کا ایک گُرس ہوتا ہے۔ گُرس کا لفظ فرانسیسی لفظ گراس سے نکلا ہے جس کا مطلب بہت سا یا ڈھیر سا ہوتا ہے۔ بارہ گرس کا ایک بڑا گرس یا گریٹ گراس سمجھا جاتا ہے۔

کاغذ کے شمار کے لیے چوبیس تختوں کا ایک دستہ اور بیس دستوں کا ایک رم مانا جاتا تھا۔ کاغذ کی ایک شیٹ کو تختے کا نام دیا جاتا تھا۔ کاغذ کی لُگدی کو کپڑا لگے فریموں پہ پھیلا کر یہ تختے بنائے جاتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ فریموں پر الگ الگ شیٹوں کی شکل میں بنائے جانے کی وجہ سے انھیں تختہ کہا جاتا بلکہ لکھنے کی مشق کرنے کے لیے جو بورڈ استعمال کیے جاتے تھے ان کے لیے پہلے سے تختی کا لفظ بولا جاتا تھا۔ کاغذ کے تختوں میں موڑنے کی وجہ سے شکنیں نہ پڑیں اس لیے انھیں لپیٹ کر رول بنالیا جاتا تھا جس سے کاغذ کو مٹھی میں پکڑنے میں بھی آسانی ہوتی تھی۔ اس ایک مٹھا کاغذ کو دستے کا نام دیا گیا۔ رم کا لفظ REAM انگریزی سے آیا تھا۔ یہ انگریزی لفظ عربی لفظ رِزم سے بنا تھا جس کا مطلب ڈھیر یا انبار ہوتا ہے۔

قیصر شمیم
۲۸ ۔ ۱۷ اسٹاف کوارٹرز
این سی ای آر ٹی کیمپس
نئی دہلی ۱۶

مسودہ کیسے تیار کریں

(دستور العمل)

صاف ستھرے اچھے مسودے کے بنا، اغلاط سے پاک خوبصورت کتاب کا چھپنا محال ہے ۔ مناسب حاشیہ چھوڑے بغیر ورق کے دونوں جانب لکھی ہوئی گنجلک تحریر نہ صرف اغلاط کا سبب بنتی ہے بلکہ صفحات کی تزئین کے مسئلہ کو دشوار تر بنا دیتی ہے ۔ کمپیوٹر اور لیزر کے استعمال سے ٹائپ مارکنگ کا مسئلہ بھی پیدا ہو رہا ہے ۔ پھر بھی مسودہ تیار کرنے کے اصول سے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ ڈاکٹر شمیم قیصر کو کتابوں کی اڈیٹنگ کا وسیع تجربہ ہے ۔ مصنفین کی سہولت کے لیے انھوں نے مسودہ سازی کے ضوابط کو ترتیب دے کر شائع کرایا تھا ۔ اس کی افادیت کے پیش نظر ہم اسے "کتاب نما" میں شائع کر رہے ہیں ۔ (ادارہ)

۱ ۔ کسی بھی ایک مسودے میں شروع سے آخر تک ایک سائز کا کاغذ استعمال کیا جانا چاہیے ۔ جہاں تک ممکن ہو بغیر لکیر والے، سادہ فولس کیپ کاغذ (۲۷×۱۷) استعمال کرنا چاہیے ۔ چھوٹی چھوٹی پرچیاں اور آدھے چوتھائی صفحے کا استعمال جوڑ پیوند کی شکل میں نہیں کرنا چاہیے، خواہ کسی صفحے پر دو تین سطریں ہی کیوں نہ لکھنی ہوں ۔

۲ ۔ مسودے کے لیے عمدہ کاغذ استعمال کیا جانا چاہیے ۔ ایسے کاغذ کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیے جس پر سے حروف کے مٹ جانے کا خدشہ ہو ۔ مثلاً ERASABLE PAPER پر بار بار ہاتھ لگنے سے حروف دھندلے ہو سکتے ہیں یا مٹ جا سکتے ہیں ۔ اس سے کتاب میں اغلاط کے راہ پا جانے کا خدشہ ہوتا ہے ۔

۳ ۔ پورے مسودے کو کالی یا نیلی ایک ہی روشنائی سے لکھنا چاہیے ۔ پنسل کا استعمال ہرگز نہیں کرنا چاہیے ۔

۴۔ مسودہ، کاغذ کے ایک طرف، درمیان میں ایک سطر یا دو سطر کی جگہ چھوڑ کر خوش خط لکھا یا ٹائپ کیا جانا چاہیے۔ صفحے کے اوپر نیچے اور دائیں بائیں جانب ایک ایک انچ کا حاشیہ چھوڑنا چاہیے۔ اس کے برعکس کوئی اور صورت مسودہ کی تدوین یا پریس کاپی تیار کرنے میں رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے۔

۵۔ ہر باب کو علاحدہ صفحے سے شروع کیا جانا چاہیے۔

۶۔ حسب ضرورت باب کا عنوان اور نمبر ضرور لکھنا چاہیے۔ اسے پورے مسودے میں ایک طرح سے لکھنا چاہیے۔

۷۔ پورے مسودے میں صفحات کے نمبر، ہر صفحے کے اوپر وسط میں سلسلے وار لکھنا چاہیے اور اسے ایک گولے سے گھیر دینا چاہیے۔

۸۔ جدول، تصاویر، اشکال، نقشاجات وغیرہ پر مسودے کے ساتھ نمبر نہیں ڈالنا چاہیے۔

۹۔ اعداد ہمیشہ بین اقوامی (یعنی 1، 2، 3، 4) استعمال کرنا چاہیے؛ سوائے ان مقامات کے جہاں کسی خاص نظامِ اعداد و شمار کا دکھایا جانا مقصود ہو۔

۱۰۔ اصطلاحات، ناموں وغیرہ کو اوّل تا آخر ایک ہی طرح سے لکھا جانا چاہیے۔

۱۱۔ ابواب کے عنوانات، دیگر عنوانات اور ذیلی عنوانات کو جگہ چھوڑ کر، کنارے یا بیچ میں، اس طرح لکھا جانا چاہیے کہ ان میں فرق کیا جاسکے اور پڑھنے والے کو دھوکا نہ ہو۔

۱۱-۱۔ سب سے اہم عنوان کو مرکز میں اور پھر اس کے ذیلی عنوانات کو دائیں طرف بغلی سرخی کے طور پر لکھنا چاہیے۔

۱۱-۲۔ جو ذیلی عنوان، پیرا کی سطر میں ہی ہو، اسے لکھنے کے بعد تفصیلیہ (:-) دینا چاہیے، پھر متن کی عبارت کو لکھنا چاہیے۔

۱۱-۳۔ ذیلی عنوانات اور پھر ان کے ذیلی عنوانات کسی نہ کسی نظام کے تحت ہوں۔ بلا وجہ عنوانات قائم نہیں کیے جانے چاہییں۔

۱۲۔ مسودے کی تین کاپیاں تیار کرنی چاہئیں۔ دو کاپیاں اشاعتی ادارے کو بھیجا جانا چاہیے اور ایک کاپی مصنف کے پاس رہنی چاہیے۔

۱۳۔ مسودے کے ساتھ ہی اس کا پیش لفظ / دیباچہ، انتساب، فہرستِ مضامین، حسبِ ضرورت تصاویر، نقشوں وغیرہ کی فہرست، مصنف کا مختصر تعارف، کتاب کا مختصر تعارف وغیرہ اشاعتی ادارے کو بھیجا جانا چاہیے۔

۱۴۔ مسودہ کی جلد بندی نہیں کرانی چاہیے۔ اسے کھلے اوراق کی شکل میں ہی دھاگہ سے

نقل کرکے بھیجنا چاہیے۔

۱۴-۱۔ مسودے کی نقل ہمیشہ دائیں طرف، اوپر کونے میں، دونوں کناروں سے آدھ انچ ہٹ کر کرنی چاہیے اور اس کے اوپر نیچے کاغذ کا ایک دبیز ٹکڑا لگا دینا چاہیے۔

۱۴-۲۔ ہر باب کی نقل الگ کی جانی چاہیے۔

۱۵۔ ترمیم و تنسیخ :

۱۵-۱۔ اگر تیار مسودے میں ترمیم کی جانی ضروری ہو تو اسے صرف ایک خط تنسیخ کے ذریعے کاٹ کر اس کے اوپر خالی جگہ میں قلم سے لکھا جانا چاہیے۔ پنسل کا استعمال اس کام کے لیے ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ مصنف کے ذریعہ ترمیم یا اضافہ کو اسی روشنائی سے لکھا ہونا چاہیے جس سے پورا مسودہ لکھا گیا ہے۔

۱۵-۲۔ اگر مسودے میں سے کوئی صفحہ کاٹ دیا جائے یا نکال دیا جائے تو اس صفحے کا نمبر اس سے پہلے والے صفحے پر اوپر وسط میں لکھے نمبر کے ساتھ ہی ڈیش دے کر لکھ دینا چاہیے۔ مثلاً اگر صفحہ دس نکال دیا گیا ہے تو صفحہ نو پر اس طرح لکھنا چاہیے: ۱۰-۹۔ اس کے بعد صفحات کے نمبر جوں کے توں رہیں گے۔

۱۵-۳۔ اگر کلمہ، جملہ یا سطر کاٹنا ہو تو افقی لکیر کے ذریعے اور پورا پیراگراف یا صفحہ کاٹنا ہو تو ترچھی لکیر کے ذریعے تنسیخ کی نشان دہی کرنا چاہیے۔

۱۵-۴۔ مصنف کے ذریعے مسودے میں ترمیم یا اضافے کے لیے مندرجہ ذیل طریقہ نہایت نامناسب ہے :

۱۵-۴-۱۔ صفحے کی پشت پر لکھنا۔

۱۵-۴-۲۔ نیچے۔ اوپر یا دائیں۔ بائیں طرف چھوڑے گئے حاشیے میں لکھنا۔

۱۵-۴-۳۔ صفحے سے، چھوٹی چھوٹی پرچیاں منسلک کرنا۔

۱۵-۴-۴۔ کاغذ کے نیچے مزید کوئی کاغذ چسپاں کر کے اس پر لکھنا۔

۱۵-۴-۵۔ کاتب یا پریس کو ہدایت کرنا کہ کسی صفحے کا کوئی حصہ کسی اور صفحے پر لے جائے۔

۱۵-۴-۶۔ پنسل سے لکھنا یا غیر واضح طور پر لکھنا۔

۱۶۔ اقتباسات :۔ اقتباسات درج کرتے وقت مندرجہ ذیل احتیاط لازم ہے :

۱۶-۱۔ بنیادی متن میں تین سطر تک کے نثری اقتباس کو اکہرے واوین (' ') میں درج کرنا چاہیے۔ دوسرے واوین (" ") کا استعمال اقتباس کے اندر اقتباس کے لیے یا کسی کا قول نقل کرنے کے لیے کرنا چاہیے۔ اسی طرح کسی خاص کلمہ یا الفاظ کو بقیہ متن سے میز

کرنے کے لیے بھی دوہرے واوین کا استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۶-۲۔ تین سطر سے زیادہ کا اقتباس الگ سے، دو پائیکا ایم کی پوٹ، دونوں طرف چھوڑ کر بغیر واوین کے اس طرح لکھنا چاہیے کہ وہ اصل متن سے الگ معلوم ہو۔ یعنی نیچے اوپر بھی تھوڑی جگہ بھی چھوڑنی چاہیے۔

۱۶-۳۔ حسب ضرورت اقتباس شروع کرنے یا قول درج کرنے سے قبل رابطہ کا نشان (:) بنانا چاہیے۔ مثلاً سارتر کا قول ہے: میں محسوس کرتا ہوں، اس لیے میرا وجود ہے۔

۱۶-۴۔ اقتباس کا حوالہ مناسب طور پر دیا جانا چاہیے۔

۱۶-۵۔ اقتباس جوں کا توں درج کیا جانا چاہیے۔ البتہ بچوں کی کتابوں یا اسکول کی درسی کتابوں میں ممکن حد تک اسے جدید املا کے مطابق لکھنا چاہیے۔ اگر دوسری زبان کا اقتباس ہو تو جہاں تک ممکن ہو اس کا اردو میں ترجمہ کر دینا چاہیے۔

۱۶-۶۔ ابتدا، درمیان یا آخر کہیں سے بھی اگر اقتباس کا کوئی حصہ ترک کیا جا رہا ہو تو وہاں صرف تین نقطے (...) دیے جانے چاہئیں۔ انگریزی میں اسے Elepsis Point یا Suspension Point کہا جاتا ہے۔ ان نقطوں کو سطر کی کمر پر لکھنا چاہیے۔ اوپر یا نیچے نہیں۔

۱۶-۷۔ اگر درمیان سے پورا پیراگراف ترک کیا جا رہا ہو، کوئی شعر یا نظم کا کوئی ٹکڑا ترک کیا جا رہا ہو تو ایک سطر میں نقطوں کے ذریعے اسے ظاہر کرنا چاہیے۔ مثلاً: ....

۱۶-۸۔ اگر کسی اقتباس کو جملے کا حصہ بنایا جا رہا ہو تو اس قسم کے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ محض مطلوبہ مقامات پر دوہرے واوین دیے جا سکتے ہیں۔

۱۶-۹۔ اگر کسی پرانے مخطوطے کا کوئی حصہ پڑھا نہیں جا رہا ہو تو وہاں تین نقطے ڈالنے کے بجائے ایک پائیکا ایم جگہ چھوڑنا چاہیے اور پھر قوسین میں قیاس کے مطابق اس حصے کو لکھنا چاہیے۔

۱۷۔ حوالے، حواشی :

۱۷-۱۔ تمام حوالے اور حواشی باب کے آخر میں الگ کاغذ پر لکھے ہونے چاہئیں۔ کتاب کی نوعیت اور تکنیکی سہولتوں کے مطابق، کاپی اڈیٹر یہ طے کرے گا کہ ان کو ہر صفحے کے نیچے آنا چاہیے یا ابواب کے آخر میں یا کتاب کے آخر میں ایک جگہ۔

۱۷-۲۔ ہر باب کے حوالے کے نمبر الگ الگ مسلسل ترتیب میں دیے جانے چاہئیں۔ ہر صفحے پر حوالے کا الگ الگ نمبر الجھن پیدا کر سکتا ہے۔

۱۷-۳۔ اگر حوالے اور حواشی اکا دکا ہوں تو انھیں یا ورق پر، ستارہ جیسا کوئی نشان (★) بنا کر

یا نمبر ڈال کر، لکھ دینا چاہیے۔
۱۷۔۴۔ اگر اشعار، نظم یا اس کا کوئی ٹکڑا متن میں درج کیا گیا ہو تو اس کی معمولی تفصیل متن ہی میں لکھ دینی چاہیے۔ مثلاً: شاعر کا نام اور/ یا نظم کا عنوان وغیرہ کو متن میں اس کے نیچے ہی قوسین کے اندر درج کر دینا چاہیے۔
۱۷۔۵۔ کسی کتاب کا حوالہ اس طرح لکھنا مناسب ہے:
مصنف/ مرتّب کا نام: کتاب کا نام، ناشر، مقامِ اشاعت، اڈیشن یا سالِ اشاعت، صفحہ نمبر۔ مثلاً:

محمد عتیق صدیقی: ہندستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، بار اوّل، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ نمبر ۲۴

۱۷۔۵۔۱۔ اگر کتاب کئی جلدوں میں ہو تو کتاب کے نام کے بعد سکتہ (کاما) کا نشان بنا کر ج ۱، ج ۲ وغیرہ درج کرنا چاہیے۔ مثلاً:

سیّد شہاب الدین دسنوی: ہمارا دین، ج ۲ حصہ ۲، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔ ۱۹۹۵ء، صفحہ ۸۸

۱۷۔۵۔۲۔ اگر کسی مصنف کی کسی کتاب کا حوالہ ایک سے زائد مرتبہ آ رہا ہو تو تفصیل دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے حوالوں کی دو صورتیں ہوں گی:
۔ اگر کسی مصنف کی ایک ہی کتاب کا حوالہ مسلسل آ رہا ہو تو محض "ایضاً" اور صفحہ نمبر لکھ کر کام چلایا جا سکتا ہے۔
۔ اگر کسی مصنف کی کسی کتاب کا حوالہ، وقفہ۔ وقفہ سے آ رہا ہو تو مصنّف کا نام لکھ کر "ایضاً" اور صفحہ نمبر لکھنا چاہیے۔
۱۷۔۶۔ اخبارات یا رسائل سے دیے گئے حوالے کو اس طرح درج کرنا چاہیے:
مصنف کا نام: مضمون کا عنوان، اخبار یا رسالے کا نام (اس تفصیل کے ساتھ کہ وہ ماہنامہ، ہفتہ وار یا روزنامہ ہے)، مقامِ اشاعت، شمارہ، سال (روزنامہ یا ہفتہ وار کی صورت میں تاریخِ اشاعت بھی)، صفحہ نمبر۔ مثلاً:
شمیم حنفی: 'بلراج کومل'، اوراق (لاہور) جدید نظم نمبر، جولائی۔ اگست ۱۹۷۷ء، صفحہ ۱۳۳
۱۷۔۷۔ جدول سے متعلق نوٹ یا تصاویر کے عنوانات یا سروے سے منظور شدہ نقشے کی تفصیلات کو اس کے نیچے ہی درج کر دینا چاہیے۔

۱۷-۸- فرہنگ کو لفظ کے چوتھے حرف تک الفبائی ترتیب میں لکھا جانا چاہیے۔

۱۸- جدول، تصاویر، اشکال، نقشے وغیرہ:

۱۸-۱- ان سب کو اصل مسودے سے الگ یکجا کیا جانا چاہیے۔

۱۸-۲- مسودے کی نشان دہی کے مطابق ان کی پشت پر لکھا جانا چاہیے کہ ان کی جگہ مسودے میں کہاں ہے۔ اس کام کے لیے پنسل کا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر قلم کا استعمال کرنا پڑے تو بہت ہلکے ہاتھ سے لکھنا چاہیے۔

۱۸-۳- نام، مقام وغیرہ کا بیان، جس طرح مسودے میں ہوا ہے، اسی طرح نقشے، تصاویر وغیرہ میں ہونا چاہیے۔

۱۸-۴- اگر کوئی خاص تصویر دی جارہی ہو تو اس کی مناسب تفصیل دی جانی چاہیے۔

۱۸-۵- تصاویر یا نقشے کے کونوں پر پن یا کلپ کا استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی تصاویر کو کسی بھی شکل میں موڑنا نہیں چاہیے۔

۱۹- اصطلاحات:

۱۹-۱- ترقی اردو بورڈ کی اصطلاحات کو معیار بنایا جانا چاہیے۔ اگر کوئی اصطلاح پہلے سے ہی مروج ہو اور اس کی جگہ ترقی اردو بورڈ کی اصطلاح رواج نہ پا سکی ہو تو مروج و مانوس اصطلاح کا استعمال بہتر ہے۔

۱۹-۲- کسی اصطلاح کو پہلی بار استعمال کرتے وقت، قوسین میں، انگریزی متبادل کا لکھ دینا قاری کے لیے سہولت بخش ہوگا۔

۱۹-۳- نئی اصطلاح تیار کرتے وقت وحید الدین سلیم کی کتاب وضع اصطلاحات کے اصولوں اور ترقی اردو بورڈ کی سفارشات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۱۹-۴- نئی اصطلاح کے لیے ہندستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں خصوصاً ہندی اور ہندی۔ اردو کے مشترک علاقے کی بولیوں سے قریب رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۱۹-۵ حسب ضرورت مختلف پیشوں میں یا طبقات میں مروج اصطلاحات کو تصرف میں لانا چاہیے۔

۱۹-۶- پورے مسودے میں کسی ایک تصور یا خیال کے لیے ایک ہی اصطلاح کا استعمال کرنا چاہیے بلا وجہ کہیں "جوہر" اور کہیں "ایٹم" لکھنا یا کہیں "عمرانیات" اور کہیں "سماجیات" لکھنا نہایت غیر مناسب بات ہے۔

۲۰- املا:

۲-۱- پورے مسودے میں کسی بھی لفظ کا املا، شروع سے آخر تک ایک ہی ہونا چاہیے۔

۲-۲- عام طور سے ترقی اردو بورڈ کی املا کمیٹی کی سفارشات کو مان لیا جانا چاہیے۔ اس سے پورے ملک میں املا کے سلسلے میں یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے۔

۳- اعداد اور تاریخ۔

۳-۱- متن میں عام طور سے ۱۰۰ تک کی گنتی کا استعمال عدد میں کرنا چاہیے۔ بڑی گنتیوں (سیکڑہ، ہزار وغیرہ) کو لفظوں میں لکھا جائے تو اچھا ہے۔ سائنس، ریاضی یا اس قسم کے دیگر علوم کی کتابوں پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہونا چاہیے۔

۳-۲- ۱۷-۳-۱۹۹۱ کو لکھا جائے گا: ۱۷ مارچ، ۱۹۹۱ یا ۱۷، مارچ ۱۹۹۱۔ اردو املا اور رسم خط کی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر تاریخ اور ماہ کے درمیان سکتہ یا آبلک کا استعمال ضروری ہے۔

۳-۲-۱- تاریخ کے ساتھ حسبِ ضرورت سال دیا جا سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اگر صرف "ماہ" لکھنا ہو تو "مارچ" لکھنے سے کام چل سکتا ہے؛ ہفتہ اور مہینہ دونوں دینا ہو تو سکتہ کا استعمال کرنا چاہیے۔

۳-۳- B.C. کے لیے اردو میں "قبلِ مسیح" یا "ق م" لکھنے کا رواج ہے۔ A.D. کے لیے عیسوی یا محض "ء" لکھنا چاہیے۔ قدیم طریقے سے "سنہ" لکھنا ضروری نہیں ہے۔

ادا جعفری
۲/۴/۸/ بی بلاک نمبر ۶
پی۔ای۔سی۔ایچ، سوسائٹی
کراچی (پاکستان)

سویرا ہو تو کیسے ہو

تم اب میرے سرہانے
موتیا کے پھول رکھنا بھول جاتے ہو
سویرا ہو تو کیسے ہو
اُجالا اب میرے دل تک نہیں آتا
دھنک کے رنگ آنچل سے پھسل کر گر چکے ہیں
مسافر خواب کو رستہ مرے گھر کا نہیں ملتا
کوئی شیریں نوا طائر
کسی رُت کا سندیسہ اب نہیں لاتا
فقط اک درد کا موسم
فقط اک غم کی پُروائی
کسی خوشبو کا لہجہ اب
سخن مجھ سے نہیں کرتا
جو روز و شب سے رشتے تھے
وہ پہچانے نہیں جاتے
نہ جانے کتنے دن گزرے
نہ جانے کون یگ بیتا
کہ اب موج ہوا مجھ سے مخاطب ہی نہیں ہوتی
تو کیا سب آئینے ٹوٹے
تو کیا اب یہ زمین و آسمان بدلے
یہ سناٹا، اندھیرا اور تنہائی
یہ ویرانی
تمھارے بس میں تھا کارِ مسیحائی
نہ جانے تم کہاں ہو
میں کہاں ہوں
تمھیں یادوں کے گجرے اب کہاں بھیجوں!

احمد ہاتف
ترجمہ۔ سید بشارت علی
سری وینکٹیشورملوگری کالج
سوریہ پیٹ ضلع نلگنڈہ اے پی

فارسی کی ترجیع بند کا منظوم اردو ترجمہ

(احمد ہاتف، اٹھارھویں صدی کا شاعر تھا۔ اس ترجیع بند نے اسے فارسی شاعری میں لافانی مقام عطا کیا)

ہیں فدا تجھ پہ میرے دل اور جاں — تیری رہ پر نثار این و آں
دل فدا ہے کہ تو ہی دلبر ہے — جاں تیری کہ تو ہی ہے جاناں
دل کا آزاد ہونا مشکل ہے — دل دے دینا تجھ پہ ہے آساں
پُر خطر راہ تجھ سے ملنے کی — عشق کا درد، درد ہے درماں
سر ہتھیلی پہ ہوں اٹھائے ہوئے — چشم اور گوش تابع فرماں
صلح چاہے تو دل یہ حاضر ہے — جنگ چاہے تو یہ دھری ہے جاں
رات کو شوق و شورِ عشق لیے — میں بھٹکتا تھا ہر طرف حیراں
آخر کار میرا جذبۂ شوق — لے گیا مجھ کو سوئے دیر مغاں
چشم بد دور ایسی خلوت تھی — ہر طرف نور حق تھا ضو افشاں
ہاں وہی نور میں نے بھی دیکھا — جس کو دیکھے تھے موسیٰؑ عمراں
مغبچے گرد با ادب بیٹھے — درمیاں میں تھا ان کے پیر مغاں
سبھی سیمیں عذار، گل رخسار — سبھی شیریں زباں، تنگ دہاں
عود و چنگ و نے وداف و بربط — شمع و نقل و گل و مے و ریحاں
ساقی تھا ماہ رو و مشکیں مُو — بذلہ گو، مطرب اور خوش الحاں
مغبچے اپنے اپنے منصب پر — اس کی خدمت میں باندھے اپنی میاں
چونکہ میں ہی وہاں مسلماں تھا — ہو گیا ایک گوشے میں پنہاں
پیر نے پوچھا "کون ہے؟" سب نے کہا — "عاشق بے قرار و سرگرداں"
کہا "دو اس کو ایک مے کا جام — بن بلایا ہے گرچہ یہ مہماں"
اور آتش پرست ساقی نے — ڈالی ساغر میں آتش سوزاں
جوں ہی پی عقل اور ہوش گئے — کفر بھی جل گیا، جلا ایماں
مست ہو کر پڑا تو مستی میں — جس کی تشریح بھی نہیں آساں
اک صدا اٹھ رہی تھی اعضا سے — گویا کہتے تھے سب مرے شریاں

کہ یکی ہست و ہیچ نیست جز او
وحدہٗ لا اِلٰہ الّا ہو،

(۲)

یہ کہا دلبرِ فرنگی سے — دل ترے دام میں اسیر ہوا
تیرے زنار نے تو گویا کہ! — ایک اک بال میرا باندھ لیا
کب تو پائے گا راہ وحدت کی — قید تثلیث سے رہا ہوگا
جو کہ یکتا ہے اور یگانہ ہے — اب کہا، ابن و روحِ قدس کہا
اس نے شیریں لبوں کو جنبش دی — شکریں لہجے میں ہوئی گویا
جانتا تو جو سرِّ وحدت کو — تہمتِ کفر مجھ پہ کیوں دھرتا
یہ ہیں وہ تین آئینے جن میں — وہ نگارِ ازل ہے عکس نما
پرنیاں یا حریر یا ریشم — جو کہو ایک پارچہ ہوگا
محو اس گفتگو میں جب ہم تھے — شورِ ناقوس اک طرف سے اٹھا

کہ یکی ہست و ہیچ نیست جز او
وحدہٗ لا اِلٰہ الّا ہو،

(۳)

چشمِ دل سے تو اپنی جاں دیکھے — جو ہے نادیدنی سماں دیکھے
تو جو اقلیمِ عشق میں آوے — ہمہ آفاق گلستاں دیکھے
اس جہاں والوں کے اشارے پر — گردشِ دورِ آسماں دیکھے
جو بھی دیکھے اسی کو تو چاہے — تو جو چاہے وہی سماں دیکھے
بے سر و پا گدا کو بھی اس جا — جہاں بانی میں سرگراں دیکھے
پا برہنہ ہجوم کے پانوں — سرِ انجم پہ تو رواں دیکھے
بے سروں کے گروہ کی خاطر — عرش سے اونچا آسماں دیکھے
ہوں سماع میں تو دونوں عالم پر — وجد میں آستیں فشاں دیکھے
کسی ذرّے کا دل اگر چیرے — آفتاب اس کے درمیاں دیکھے
جاں اگر عشق میں جلا ڈالے — عشق کو کیمیائے جاں دیکھے
ماورائے شش جہات سے ہو کر — وسعتِ ملکِ لامکاں دیکھے
کان جس کو نہ سن سکے وہ سنے — جو نہ دیکھا اسے عیاں دیکھے
اور جو اس مقام پر پہنچے — سبھی انسان ایک جاں دیکھے
جب دل و جاں پہ عشق حاوی ہو — تو بہ چشمِ یقیں عیاں دیکھے

که یکی ہست و ہیچ نیست جز او
وحدہٗ لا الٰہ اِلّا ہو

احمد ہاتف

ترجیع بند

(اصل متن)

(۱)

ای فدای تو ہم دل و ہم جان — وی نثار رہت ہم این و ہم آن
دل فدای تو چون توئی دلبر — جان نثار تو چون توئی جانان
دل رہاندن ز دست تو مشکل — جان نشاندن بپای تو آسان
راہِ وصلِ تو راہِ پرآسیب — درد عشق تو درد بے درمان
بندگانیم- جان و دل در کف — چشم بر حکم و گوش بر فرمان
گر سر صلح داری، اینک دل — ور سر جنگ داری، اینک جان
دوش از شور عشق و جذبۂ شوق — ہر طرف می شتافتم حیران
آخر کار شوق دیدارم! — سوی دیر مغان کشید عنان
چشم بد دور، خلوتی دیدم — روشن از نور حق نہ از نیران
ہر طرف دیدم آتشی کآن شب — دید در طور موسیٰؑ عمران!
پیری آنجا بآتش افروزی — بادب گرد پیر مغبچگان
ہمہ سیمین عذار و گل رخسار — ہمہ شیرین زبان و تنگ دہان
عود و چنگ و نی و دف و بربط — شمع و نقل و گل و می و ریحان
ساقی ماہ روی و مشکین موی — مطرب بذلہ گوی خوش الحان
مغ و مغ زادہ موبد و دستور — خدمتش را تمام بستہ میان
منِ شرمندہ از مسلمانی — شدم آنجا بگوشۂ پنہان
پیر پرسید کیست، این گفتند — عاشقی بی قرار و سرگردان
گفت جامی دہیدش از می ناب — گرچہ ناخواندہ باشد این مہمان
ساقی آتش پرست و آتش دست — ریخت در ساغر آتشِ سوزان
چون کشیدم نہ عقل ماند نہ ہوش — سوخت ہم کفر از آن و ہم ایمان
مست افتادم و در آن مستی — بزبانی کہ شرح آن نتوان
این سخن می شنیدم از اعضا — ہمہ حتی الورید والشریان

کہ یکی ہست و ہیچ نیست جز او

(۲)

در کلیسا بدلبر ترسا / گفتم ای دل بدام تو در بند
ای کہ دارد بتار زنارت / ھر سر موی من جدا پیوند
رہ بوحدت نیافتن تا کی / ننگ تثلیث بریکی تا چند
نام حق یگانہ چون شاید / کہ اب و ابن و روح قدس نہند
لب شیرین کشود و بامن گفت / وز شکر خند ریخت از لب قند
کہ گر از سرِ وحدت آگاھی / تہمت کافری بما مپسند
در سہ آئینہ شاہد ازلی / پر تو از روی تابناک افگند
سر نگردد بریشم از اُو را / پرنیان خوانی وحریر و پرند
مادرین گفت گو کہ از یک سو / شد زنا قوس این ترانہ بلند

کہ یکی ھست و ھیچ نیست جز او
وحدہٗ لا الہ الّا ھوٗ،

(۳)

چشم دل باز کن کہ جان بینی / آنچہ نادیدنی ست آن بینی
گر باقلیم عشق رو آری / ھمہ آفاق گلستان بینی
بر ھمہ اہل آن زمین بمراد / گردش دور آسمان بینی
آنچہ بینی دلت ھمان خواہد / و آنچہ خواہد دلت ھمان بینی
بی سروپا گدای آنجا را / سر زملکِ جہان گران بینی
ھم در آن پا برھنہ قومی را / پای بر فرقِ فرقدان بینی
ھم در آن سرِ برہنہ جمعی را / بر سر از عرش سایبان بینی
گاہِ وجد و سماع ہریکی را / بر دو کون آستین فشان بینی
دلِ ہر ذرہٗ کہ، شگافی / آفتابیش درمیان بینی
ہرچہ داری اگر بعشق دہی / کافرم گر جوی زیان بینی
جان گدازی اگر بآتشِ عشق / عشق را کیمیای جان بینی
از مضیقِ جہات در گذری / وسعت ملک لامکان بینی
آنچہ نشنیدہ گوش آن شنوی / و آنچہ نادیدہ چشم آن بینی
تا بجائی رساندت کہ یکی / از جہان و جہانیان بینی
بایکی عشق ورزی از دل وجان / تا بعین الیقین عیان بینی

کہ یکی ھست و ھیچ نیست جزاو
وحدہٗ لا الہ الّا ھوٗ،

مظفر حنفی
پروفیسر شعبہ اقبال چیر
کلکتہ یونی ورسٹی۔ کلکتہ

غزل

نقش میں شوخیِ تحریر کہاں سے آئی
آج بن کر مری تقدیر کہاں سے آئی

چاندنی رات نہیں، آپ مرے ساتھ نہیں
جھیل میں چاند کی تصویر کہاں سے آئی

تیر اس نے بھی کبھی کھائے ہیں دل پر ورنہ
اس کی باتوں میں یہ تاثیر کہاں سے آئی

ہم تو گہوارے میں بھی کھیل چکے ہیں اس سے
کیا بتائیں کہ یہ زنجیر کہاں سے آئی

لوگ تو پھول بچھاتے تھے تری راہوں میں
پھر ترے ہاتھ میں شمشیر کہاں سے آئی

اے مظفر تری افتاد جدا گانہ ہے
شعر میں خستگیِ میر کہاں سے آئی

اقبال متین
مقیم کہانی، کتاب نگر
نظام آباد۔ اے پی

غزل

وہ میرے پاس ہی رہتا ہوا سا
میں اس کے ساتھ ہی چلتا ہوا سا

وہ ہر نغمے کی جاں ہے اور میں بھی
لبوں پہ اس کے لیے ہنستا ہوا سا

کسی آنگن میں اس کی چاندنی سی
مرے گھر کا دیا بجھتا ہوا سا

وہ آندھی کی طرح مجھ کو اڑائے
میں پتّے کی طرح ڈرتا ہوا سا

شجر کی شاخ تھی سوکھی ہوئی سی
ہرا پتّا بھی تھا گرتا ہوا سا

در و دیوار سب سہمے ہوئے سے
میں مٹی کی طرح جھڑتا ہوا سا

متین اقبال رو کر کیا کروگے
مژہ پر کچھ نہیں ملتا ہوا سا

ڈاکٹر شہپر رسول
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

غزل

کوئی سایا نہ کوئی ہمسایا
آب و دانہ یہ کس جگہ لایا

دوست بھی میرے اچھے ہیں
اک مخالف بہت پسند آیا

اک ادا تھی کہ راہ روکتی تھی
اک انا تھی کہ جس نے اکسایا

ہم بھی صاحب دلاں میں آتے ہیں
یہ ترے روپ کی ہے سب مایا

چل پڑے ہیں تو چل پڑے سائیں
کوئی سودا نہ کوئی سرمایا

سب نے تعریف کی مری شہپر
اور میں احمق بہت ہی شرمایا

انور شفیق اعظمی
موٹیویٹر "سہارا انڈیا"
براہ نخ، سرائے میر۔ اعظم گڑھ

غزل

ذکر ہمارا گھر گھر ہے
سب کی نظر کیوں ہم پر ہے
پھل تو پیڑ پہ ایک ہی ہے
ہاتھ میں سب کے پتھر ہے
سمجھنے والے اک دو ہیں
قرآں جب کہ گھر گھر ہے
کبھی بھی اپنے دشمن کو
یہ نہ سمجھنا کہ کم تر ہے
یار نظر میں میری تو
تو ہی سب سے سندر ہے
رنج و الم ہی دیتا ہے
کیسا میرا دلبر ہے
تجھ کو بس میں کر لوں گا
پاس مرے وہ منتر ہے
شہپر یہ سارا جانے ہے
انور بھی اک "شاعر" ہے

مجید مرزا تاباں
فیض گنج۔ مرادآباد

غزل

جانِ من! درد کا رشتہ بھی غضب رشتہ ہے
اب مرا ذہن، ترے ذہن کا آئینہ ہے

خود سے بھی اپنے کئی روپ چھپانا چاہوں
اور سمجھوں کہ بہت خوب مرا چہرہ ہے

روشنی زہر سے ٹپکے تو نظر زخمی ہو
گفتگو حسنِ چمن، جیبِ دروں کاسہ ہے

وہ جو چلاتا ہے جنوں گا میں جنوں گا مزدر
ذہن میں اس کے ہزیمت کا بہت خدشہ ہے

شام کے ٹھہرے ہوئے، سرمئی ہونے بادل
آپ کے بعد تو غم پر بھی یہاں سکتہ ہے

بہتے دریا سا بدلتے ہوئے منظر کا سراب
بس مرے سامنے جو کچھ ہے یہی لمحہ ہے

نرمئی بادِ سحر، لمس کا احساس لطیف
پیارا اے یار غزل جیسا حسیں جذبہ ہے

ڈاکٹر شاہد میر

دوہے

آنسو اُمنڈے بے طرح بھرنے لگے ایاغ
پلکوں پلکوں جل اُٹھے سارے سرد چراغ

اک تو ہی تنہا نہیں دل آوارہ دیکھ
دھرتی پر گرتا ہوا ایک ستارہ دیکھ

ہریالی پر رکھ دیے جانے کس نے پاؤں
ایک آن میں بکھر گیا اوس کا ٹھنڈا گاؤں

وقت انوکھی چڑیا ہے جس کے پنکھ ہزار
روک نہیں پایا جسے کوئی پہرے دار

سب کو جانا ہے میاں اک ساجن کے گاؤں
صبح شام چلتے رہو دھوپ ملے یا چھاؤں

سب اپنے رخصت ہوئے دل کو دے کر داغ
داغ ہی داغ اب ہر طرف پھول پات نا باغ

عبدالحمید
گورنمنٹ پی۔ جی کالج
محمود آباد۔ سیتاپور
یوپی۔

غزل

کوہ و قریہ دشت و دریا دیکھنے کے واسطے
اس نے پھیلایا اُجالا دیکھنے کے واسطے

نام پر چھپنے کے وہ بھی گھر سے باہر آگیا
میں بھی اندھا ہوگیا تھا دیکھنے کے واسطے

شوخ وہ گھبرا گیا کیوں آج مجھ کو دیکھ کر
دیکھتا تھا روز کیا دیکھنے کے واسطے

اک نظر ہی دیکھ لے شاید کبھی روٹھی زمیں
آسماں ہے کیوں سنورتا دیکھنے کے واسطے

ہوش ہی ہوگا کہاں کچھ دیکھنے کا اس گھڑی
جب لگا ہوگا تماشا دیکھنے کے واسطے

گھر سے بے گھر کردیا اس نے تو سب ہے دیکھنا
اب تلک بس تھا ارادہ دیکھنے کے واسطے

ہم بھی سامان سفر کے ساتھ ہی کچھ ڈھ پڑے
دے دیا جب اس نے نقشا دیکھنے کے واسطے

علی آذر
۵۱۔اے اسٹریٹ فیز ۵
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔کراچی

غزل

عجیب صورتِ حالات کا شکار ہوئے
جو بے کنار تھا ہم اس سے ہم کنار ہوئے

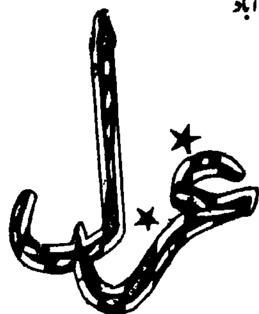
اُفق پہ ذہن کے مانندِ ماہتاب ابھرے
وہ چہرہ مدتیں گزری ہیں جس سے پیار ہوئے

سرشت ایک تھی سب کی مگر نصیب جُدا
یہ شہریار ہوئے اور وہ سنگسار ہوئے

حقیقت اپنی تو دل کے سوا کسے معلوم
نظر میں گو کہ زمانے کی ہوشیار ہوئے

نصیب جن کا تھا ردّی کی ٹوکری آذر
ستم کے دور میں مضمون وہ شاہکار ہوئے

پروفیسر فضل امام رضوی
۱/۹-۱۰ بینک روڈ
الٰہ آباد



وہ ایک شخص کہ قاتل ہے یا مسیحا ہے
ہمارے قلب و نظر کا اسی سے رشتہ ہے

مرے وجود میں چپکے سے بس گیا ہے وہی
وہ جو کہ میرے لیے اب بھی ناشناسا ہے

کہاں سے آئے گی اب روشنی کی کوئی کرن
چہار سمت تو چھایا ہوا اندھیرا ہے

روش پہ اپنی جو قائم ہے اک زمانے سے
وہ اژدحام بشر میں بھی کچھ اکیلا ہے

امیر مملکت کائنات سے لوگو!
جو زیب جسم کیے اک پھٹا سا کرتا ہے

لہو سے اپنے جو دنیا کو کر گیا سیراب
حقیقتاً وہی کردار اب بھی پیاسا ہے

غزل کہی ہے جو فضل امام رضوی نے
ہمارے عہد پریشاں کا اک حوالہ ہے

سہیل احمد زیدی
۷۔ شوکت علی روڈ
اٹالہ۔ الٰہ آباد



سب راج پاٹ سونپ کے دنیا کو بھول جائیں
تم سے غزل سنیں تمھیں اپنی غزل سنائیں

صحرا کو اب تو گھر مرا کہنے لگے ہیں لوگ
جو ریت مٹھیوں میں بچی ہے کہاں اڑائیں

دیوار دل سے جھڑتی ہے مٹی ہوا کے ساتھ
دیوانے ہم نہیں ہیں کہ بستر یہاں لگائیں

پھرتے ہیں کس امید پہ لے کر بجھے چراغ
تم کو بتا دیا ہے ہواؤں سے کیوں بتائیں

سرسوں سا ایک حرف ہنر دسترس میں ہے
دھرتی سے کیا اگائیں ہتھیلی پہ کیا جمائیں

یوں تو معاملات میں آئینہ ہیں سہیل
ایسے بھی اب نہیں ہیں کہ پتھر سے ٹوٹ جائیں

طوت رسول

رئیس الدین فریدی
معرفت روزنامہ ہند
کلکتہ ۷۳



رے خدائے بزرگ برتر

واقف ہیں مشک سائی زلف بتاں سے ہم
بہلائیں دل کو کیسے گل و بوستاں سے ہم

سمجھو نہ حد ہمارے جنوں کی بہار تک
پیدا کریں گے اپنی بہاریں خزاں سے ہم

بجلی کا جو نشانہ ہو صرصر کا ہو ہدف
اے ہم صفیر خوش ہیں اسی آشیاں سے ہم

مسجد میں جا کے بھی نہ ملا شیخ کو سکون
فریاد اس کی سنتے ہیں بانگ اذاں سے ہم

بھاری ہے کیوں زمین کو بھی اب مرا وجود
ٹھکرا چکے ہیں سیکڑوں بار آسماں کو ہم

سہہ کر ہزار غم فریدی کا عزم ہے
منہ موڑیں گے نہ خدمت ہندوستاں سے ہم

ئے کُن، کس غضب سے آئے
ے خدائے بزرگ برتر
ہم تو ہے
یر ہیں ہوں
ہم تو ہے
بر میں ہوں
رگ دانا
رترے گنبد جہاں میں
سیر میں ہوں
ی صدا اس طرف سے آئے
دشتِ پُر ہَول کانپ جائے
حرفِ اظہار بے نوا ہے
ہم کے ہاتھ میں عصا ہے
ہم پا پوش خستہ جاں ہے

اسرار جامعی
مدیر پوسٹ مارٹم
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

اردو

گھر پہ آکر بیٹے نے اک ماہر تحقیق کے
سیکڑوں اردو کتابوں کا دیا تحفہ مجھے

وہ یہ بولے یہ کتابیں ہیں "پتا" کی یادگار
جن کو پڑھتے تھے سناتے تھے وہ سب کو بار بار

میرے گھر میں بعد ان کے قدر داں کوئی نہیں
اس زباں کا جاننے والا وہاں کوئی نہیں

اس لیے تحفے میں اس کو دے رہا ہوں آپ کو
شانتی مل جائے اس سے تاکہ میرے باپ کو

جب ملا یہ نادر و نایاب تحفہ خوش ہوا
کہ ادب کا اک خزانہ مفت مجھ کو مل گیا

اس خوشی سے جس قدر مسرور تھا مغرور تھا
ساتھ ہی اک غم تھا جس سے دل بھی میرا چور تھا

قدر اردو کی تھی پہلے جس کے گھر میں اس قدر
ہوگئی اردو بچاری اب وہیں سے "گھر بدر"

عطا عابدی
۲۲/۱۵۳ ای، ذاکر نگر
نئی دہلی ۲۵

غزل

نہیں چمن میں گلاب ایک بھی گلاب نما
جسے بھی دیکھیے اب ہے وہی سراب نما

اندھیرا دور اگرچہ ہے اس کے دم سے یہاں
نہ آفتاب ہی وہ ہے نہ آفتاب نما

ہم اپنی جیت کا اعلان کر نہیں سکتے
دیا ہے وقت نے انعام بھی عذاب نما

کرشمہ سازیٔ سُرخی کے ہوگئے قائل
ڈراما ہم نے جو کل دیکھا انقلاب نما

لکھی ہے ایک نے پڑھتے ہیں سیکڑوں اس کو
ہے زندگی بھی عطا غالباً کتاب نما

درشن لعل کپور فلک
۲/۲۰، تیغ بہادر روڈ
دہرہ دون، یو پی

کیسے ہو تم

میں نے کسی مندر میں کبھی پھول نہیں چڑھائے
کبھی کسی مسجد میں جاکر نماز نہیں پڑھی
کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر مالا نہیں جپی
اور کبھی کسی درگاہ پر چادر نہیں چڑھائی

میں نے تمھیں کبھی پکارا بھی نہیں
تمھیں کبھی ہاتھ بھی نہیں جوڑے
اور
اپنی منڈیر پر کبھی کوئی دیا بھی نہیں جلایا
پھر بھی
تم میرے آنگن میں روشنی بن کر کھڑے ہو
کیسے ہو تم
ہم تو انسان ہو کر انسان نہیں بننا چاہتے
تم بھگوان ہو کر بھی بھگوان ہی رہنا چاہتے ہو۔

ڈاکٹر نریش
پروفیسر و صدر، شعبۂ جدید ادب،
پنجاب یونی ورسٹی۔ چنڈی گڑھ

غزل

بچھڑ رہا ہے تو یہ بد دعا نہ دے مجھ کو
ترے بغیر جیوں یہ سزا نہ دے مجھ کو

تم آئے ہو مرے محسن مگر یہ ڈر ہے مجھے
یہ انبساطِ فراواں رُلا نہ دے مجھ کو

دِیا ہوں گھر کا نہ دہلیز پر رکھو کہ کہیں
ہوا کا ایک ہی جھونکا بجھا نہ دے مجھ کو

قبا بدن کو نہ دے سر کو چھت نہ دے لیکن
جبین رکھنے کو اک آستانہ دے مجھ کو

وہ آئیں گے شب وعدہ یقیں تو ہے لیکن
یہ انتظارِ مسلسل سُلا نہ دے مجھ کو

قلم زبان جو کی ہے تو کاٹ لے سر بھی
مری زبان کا کوئی خوں بہا نہ دے مجھ کو

نریش جیسی گزاری ہے آج تک میں نے
یہ زندگی ہے تو اس کی دعا نہ دے مجھ کو

مکتبہ جامعہ کی نئی مطبوعات

مولانا ابوالکلام آزاد
(فکر ونظر کی چند جہتیں)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے مضامین کا مجموعہ جن میں مولانا آزاد کے افکار وخیالات اور ان کی علمی وعملی سرگرمیوں کے قومی وملی محرکات کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، یقیناً ان مضامین میں قارئین کو مولانا سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ملیں گی۔ =/60

جدید ادبی تحریکات وتعبیرات
ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں شامل ۲۲ مضامین ہیں جو ۱۹۶۴ء سے ۱۹۹۴ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظرنامے میں جن تحریکات وتعبیرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت =/51

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ
ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالرز میں ہوتا ہے موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ قیمت =/45

ٹیلی ویژن نشریات
انجم عثمانی
(تاریخ، تحریر، تکنیک)

اردو میں ٹیلی ویژن نشریات پر پہلی کتاب جو ایسے حضرات کے لیے نہایت اہم کتاب ہے جو ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا یا کوئی اہم کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ قیمت 90 روپے

صحرا میں لفظ
فضیل جعفری

فضیل جعفری کا شمار آج کے عہد کے سنجیدہ اور ذمے دار نقادوں میں ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کے شاعروں پر لکھے ہوئے موصوف کے ۱۴ نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت =/90

سیر کر دنیا کی غافل ....
(سفرنامے) ڈاکٹر صغرا مہدی

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اردو دنیا میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب آپ کے پانچ سفرناموں کا مجموعہ ہے اس کتاب میں ڈاکٹر خالد محمود کا ان سفرناموں پر تبصرہ اور یوسف ناظم کا ایک دلچسپ خاکہ بھی شامل ہے
قیمت :- 51/-

کاسۂ خیال
عبدالمعروف خاں چودھری

معروف صاحب حقیقی شاعر ہیں جو خیال کو جذبے میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں ان کے یہاں فکر اپنی تجریدی شکل میں نہیں ملتی۔ ان کا تشبیہی تخیل علامتوں، استعاروں اور حسّی پیکروں میں اپنی کارفرمائی دکھاتا ہے جس کا آپ بخوبی اندازہ اس شعری مجموعے کے مطالعے سے لگا سکتے ہیں۔ قیمت 51/-

طرازِ دوام
اختر سعید خاں

غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے بھڑکتے شعلوں سے نہیں۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشک کی نمی ہوتی ہے تو کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔ یہ ساری خوبیاں اس شعری مجموعے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ قیمت 51/-

مانگے کا اجالا



خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے

ساقی فاروقی کا معاصرین کے خلاف اعلان جنگ

اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ ساقی فاروقی موجودہ دور کے اہم ترین شاعروں میں سے ہیں۔ ہاں دو سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں کہ ساقی کو اہم شاعر نہ ماننے والے بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ساقی کو اہم شاعر ماننے والوں میں سر فہرست تین عدد ہیں۔ ہم، شمس الرحمان فاروقی اور خود ساقی فاروقی۔ ہم ساقی فاروقی کے اس لیے مداح ہیں کہ ہمارا شاعری کا مطالعہ بے حد محدود ہے۔ شمس الرحمان فاروقی اس لیے کہ ان کا مطالعہ بیحد وسیع ہے۔ ایک کے محدود اور دوسرے کے وسیع مطالعے کا یکساں نتیجہ اس لیے بر آمد ہوا کہ ہم دونوں سخن فہم ہونے کے باوجود طرف دار ہیں، اور ساقی کی شاعری کے بارے میں ایسی رائے نہیں رکھ سکتے جو خود ساقی کی رائے سے مختلف ہو۔ خود ساقی اپنے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اس کا اندازہ ان کی شاعری سے نہیں نثر سے ہوتا ہے۔ ساقی اپنے مضامین نثر میں اپنے ہم عصر شاعروں کے کمالات کی نفی ایسی عمدگی سے کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں صرف ایک ہی باکمال شاعر ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہ خود ساقی فاروقی ہے۔

ساقی کا نثری مجموعہ چند سال پہلے "بازگشت و بازیافت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اب یہی مجموعہ چند مضامین کے اضافے کے ساتھ "ہدایت نامہ شاعر" کے نام سے چھپا ہے۔ نام کی تبدیلی سے ہمیں کویراج ہرنام داس بی اے کی دو مشہور کتابیں "ہدایت نامہ خاوند" اور "ہدایت نامہ بیوی" یاد آگئیں جو ساٹھ ستر سال پہلے بار بار شائع ہوتی اور خوب بکتی تھیں۔ کویراج ہرنام داس کا مقصد عام معاشرے کو صحت مند بنانا تھا۔ ساقی ادبی معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں، اس اعتبار سے اگر ساقی کو ادب کا کویراج ہرنام داس کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

ساقی کے نثری مجموعے میں تنقیدی مضامین، شخصی خاکے، کتابوں پر تبصرے اور

ادبی خطوط وغیرہ شامل ہیں جو سب کے سب شاعری اور شاعروں کے بارے میں ہیں۔ یہ سب تحریریں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں۔ بعض مضامین میں ساقی نے تنقید کا اعلا معیار پیش کیا ہے اور بعض میں تنقیص کا۔ یوں تو ساقی کے تمام مضامین ایسے ہیں کہ انھیں بار بار پڑھا جائے لیکن تین مضمون ایسے ہیں جنھیں اردو ادب کا کوئی قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ایک "نظم کا سفر" ہے جس میں فیض، راشد، اور میراجی کی شاعری پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور باقی دو شخصی خاکے ہیں جن میں فیض اور راشد کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگر ساقی کی تمام ادبی کاوشیں خدانخواستہ ضائع ہو جائیں اور صرف یہ تین مضمون بچ جائیں تو تب بھی اردو ادب کی تاریخ میں ساقی کا نام زندہ رہے گا۔ ممکن ہے یہاں بعض لوگ یہ پوچھیں کہ جب صرف تین مضامین کی وجہ سے ساقی کا نام زندہ رہ سکتا ہے تو انھوں نے باقی مضامین کیوں لکھے اور اتنی ڈھیر ساری شاعری کیوں کی۔ اس دخل در معقولات کے جواب میں عرض ہے کہ ساقی نے اتنا بہت سا اس لیے لکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ مذکورہ تینوں مضامین ضائع ہو جائیں تو باقی ماندہ اثاثے کی وجہ سے ساقی کے ادبی مقام کا تعین کیا جا سکے۔ یہ کام اگرچہ بہت مشکل ہے مگر ہماری دعاؤں اور نیک تمناؤں کے سائے میں شمس الرحمان فاروقی جس طرح ڈاکٹر انور سجاد کو اردو افسانے کا معمار اعظم ثابت کر چکے ہیں، اسی طرح وہ ساقی کو بھی کسی نہ کسی ادبی صنف کا معمار اعظم ثابت کر دکھائیں گے۔

مذکورہ تین مضامین سے قطع نظر، باقی مضامین پڑھ کر ہمیں علامہ اقبال یاد آگئے جنھوں نے "ضرب کلیم" کے سرورق پر جلی حروف میں یہ لکھا ہے: "اعلان جنگ، دور حاضر کے خلاف" ساقی نے بھی اپنے متعدد شعرا کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ ساقی اپنے کسی ہم عصر کے بارے میں کلمہ خیر کہنا جانتے ہی نہیں، اور اگر کبھی بادل ناخواستہ کسی کے بارے میں کلمہ خیر کہہ بھی دیتے ہیں تو اس کے اثر کو جلد ہی دو چار کلمات شر سے زائل کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساقی نے اپنے معاصرین سے نبرد آزمائی کا فن یگانہ سے سیکھا ہے۔ وہی یگانہ جو اپنا تعارف یوں کراتے ہیں۔

یگانہ کون؟ وہ بزم ادب سے بیگانہ
لڑائی چھیڑ کے پگڑی اتارنے والے

دوسرا مصرع ساقی کے بھی حسب حال ہے۔ یگانہ اور ساقی میں فرق یہ ہے کہ یگانہ دوسروں کی پگڑیاں اتار کر اپنے سر پر باندھ لیتے تھے ساقی ان پگڑیوں کو مضامین کی صورت

نہیں ہیں۔ زیر نظر کتاب کے پہلے ہی مضمون کے دوسرے پیراگراف میں اکٹھے پانچ معاصرین کا حساب کتاب برابر کر دیا ہے۔ اس پیراگراف کا کچھ حصہ یہ ہے "۔ میں نے لندن کے ایک گمنام شاعر مسٹر بخش لائلپوری کے بے حد اصرار پر......... ان کا فلیپ لکھ دیا۔ وہ بھی اس لیے کہ میں نے اس قدر انکار کیا تھا کہ انکار سے بھی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس عزیز نے کمال حوصلہ مندی سے اپنی کتاب میں میری تحریر شامل کر دی۔ اس کے بعد وہ گمنام رہے نہ میں۔ اس عبارت کے ایک دو فقرے.......۱۹۳۶ء والوں نے اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے مسائل کے اظہار کے لیے جو عوامی پیرایہ اختیار کیا تھا اس کی یکسانیت اور بے تہی مجھے سخت ناپسند ہے۔ مگر میری ناپسند سے ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی پاپولیرٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بلکہ انھیں لوگوں کا لحظہ اور الفاظ مستعار لے کر ۳۵ سال بعد بھی حبیب جالب اور احمد فراز جیسے لوگ اپنی ایک پرت کی شاعری کے بل بوتے پر مشاعرے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اگر آپ مندرجہ بالا شاعروں کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں تو پھر مسٹر بخش لائلپوری کا کلام بھی پڑھیے۔ ....بظاہر یہ فقرہ بے ضرر تھا میں نے دانستہ اسے ضرر رساں کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دونوں جہاں دیدہ عندلیب (جن پر ساٹھواں برس یا تو لگ چکا ہے یا لگ رہا ہے) سرمہ اور خضاب لگا کر آہ و زاریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تیس تیس، چالیس چالیس سال جہالت کے زور پر شعر لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو مہرباں چھوڑ آئے، داستاں چھوڑ آئے یا شرابوں میں ملیں، پھول کتابوں میں ملیں جیسے فرسودہ رومانی جذبات پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔"

یگانہ نے جگر کی آبنوسی رنگت کو سامنے رکھ کر شعر کہے تھے، ساقی نے اپنے معاصرین کے رنگ سخن کو موضوع بنا کر داد سخن دی ہے لیکن یہ داد اس وقت بیداد بن جاتی ہے جب ساقی بزرگ معاصرین کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں کئی جگہ سردار جعفری اور وامق جونپوری جیسے بزرگوں کو انھیں لفظوں میں یاد کیا گیا ہے جن لفظوں میں وہ اپنے ہم عمروں کو عموماً یاد کرتے ہیں۔ دیدہ دلیری اور بے مروتی کی انتہا ہے کہ سردار جعفری کے اعزاز میں منعقد ہونے والے ایک جلسے میں ساقی نے جو مضمون پڑھا، اس میں سردار جعفری کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میں کھردرا ضرور ہوں مگر منصفی میرے مزاج میں ہے، اور آج صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ کی شخصیت کا ہمیشہ سے قدردان رہا ہوں اور میرا مسلک بھی آپ سے جدا نہیں ہے کہ کیڈر

میں شائع کردیتے ہیں۔

یگانہ اور ساقی میں ایک فرق اور بھی ہے۔ ساقی اپنی تعریف اپنی زبان سے نہیں کرتے بلکہ ایسے حالات پیدا کردیتے ہیں کہ لوگ خوف زدہ ہو کر ان کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس یگانہ میں اتنی اخلاقی جرأت تھی کہ وہ اپنی شاعری کی تعریف میں اس قسم کا لہجہ اختیار کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ چھت میں ڈھونڈتے کیا ہو میرے بانکے شعر کی بات شیر کا پنجہ، کتے کا دھکا، مینڈھے کی چوٹ، گدھے کی لات۔

شیر تو خیر شیر ہے اور مینڈھا بھی ٹھیک ہے لیکن اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کتے اور گدھے سے ان کی خصوصیات مستعار لینا حوصلے کی بات ہے۔

جانوروں سے ساقی کو بھی خاصی دلچسپی ہے۔ ان پر کئی معرکے کی نظمیں لکھی ہیں، ساقی کے پاس اخفش کی بکری جیسا ایک سخن فہم کتا ہے جسے وہ اپنی ہر نظم اور غزل سب سے پہلے سناتے ہیں اور داد حاصل کرتے ہیں۔ ساقی نے کچھوے کا ایک بچہ بھی پال رکھا ہے اس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے: "جب اس سے گفتگو کرتا ہوں تو اس کی زندہ اور دور رس آنکھوں میں ایک عجب تحریر ابھرتی ہے۔: "یہ کائنات کیا خوب صورت جگہ ہے مگر افسوس کہ یہاں انسان بہت ہیں۔" کچھوے کے بچے نے آنکھیں کھولنے کے بعد ساقی ہی کو دیکھا۔ اس کا انسانوں سے مایوس ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خاصا مردم شناس ہے۔

یگانہ نے اپنے معاصرین۔ جگر مراد آبادی، فانی بدایونی، اصغر گونڈوی، عزیز لکھنوی، صفی لکھنوی، یہاں تک کہ علامہ اقبال کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا ہے، مثلاً جگر مرادآبادی کو وہ ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

شعر کہنے لگا ہے کالا بھوت
رنگ لایا ہے کیا نرالا بھوت
گھی کے جلنے لگے خبیثوں میں
کس اندھیرے کا ہے اجالا بھوت
انھیں باتوں کی ہے یہ بلہاری
پھاند سکتا تھا کیا ہمارا بھوت
صورت و سیرت ایک سی واللہ
کس نے سانچے میں ایسا ڈھالا بھوت

یگانہ کی طرح ساقی بھی معاصرین کے ساتھ کسی قسم کی رعایت برتنے کے قائل

سوشلسٹ ہوں بلکہ یہاں بسنے کے بعد اور بائیں طرف سرک گیا ہوں مگر شاعری میں صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے کو متنے کا قائل نہیں کہ میری کمٹ منٹ صحافت سے نہیں شاعری سے ہے جو پوری ذات کا مکمل اظہار مانگتی ہے۔ یہی نہیں احمد فراز ٹائپ کے شاعروں کو یہ تنبیہ بھی کرتا آرہا ہوں کہ فیض کے الفاظ، سردار کے انداز، ساحر کے لہجے اور مخدوم کے نغمے کی چوری نہ کرو۔"

ایسے ہی موقعوں پر کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مقصود تھی اصلاح سردار جعفری کی اور تنبیہ کردی احمد فراز کو۔ ایک طرف تو ساقی اپنی منصف مزاجی کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں اور دوسری طرف ناانصافی کا یہ عالم ہے کہ کامے اور فل اسٹاپ کی جگہ بھی وہ احمد فراز ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ احمد فراز کے صبر کی داد دینی چاہیے کہ اس نے ساقی کی کسی بات کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ سننے میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے فراز سے کہا کہ آپ ساقی کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ فراز نے کہا، جتنا وقت ساقی کی باتوں کا جواب دینے میں صرف ہوگا، اتنے وقت میں میں دس غزلیں کہہ لوں گا۔ یہ بات ساقی تک پہنچی تو اس نے کہا، فراز غزل تو ایک ہی کہتا ہے، باقی نوکاربن کاپیاں ہوتی ہیں۔

ساقی کی کتاب لاہور سے چھپی ہے لیکن ہمارے پاس براہ لندن آئی ہے۔ یہ نسخہ نوادر میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس میں ساقی نے خود اپنے قلم سے تقریباً ڈیڑھ تین سو اغلاط طباعت کی تصحیح کی ہے اور اتنے ہی مقامات پر سفیدہ استعمال کرکے بعض الفاظ کو مٹایا ہے۔ ساقی نے بہت اچھا کیا کہ معنوی اغلاط کو درست نہیں کیا، ورنہ تصحیح کا کام بہت بڑھ جاتا۔ سفیدے کا استعمال بھی ساقی نے ہاتھ روک کر کیا ہے اگر یہ خدمت ہم سے لی جاتی تو کتاب کا کم از کم ایک چوتھائی حصہ سفید پوشوں میں شمار ہونے کے لائق ہو جاتا۔ (جاری)

مجتبیٰ حسین
۲۰۰/ ۲ انگور اپارٹمنٹس، پٹ پڑ گنج
نئی دہلی ۹۲

نثار احمد فاروقی کو انعام ملنے پر

پروفیسر نثار احمد فاروقی کو اتر پردیش اردو اکیڈمی کے ایک لاکھ گیارہ ہزار روپے کی مالیت کے مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ کے ملنے کی اُڑتی اُڑتی اطلاع ہمیں مدینہ کے لو برائے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں اُس وقت ملی جب ہم ہوٹل کے مینو کارڈ کے تفصیلی مطالعے کے ذریعے کسی ایسے کھانے کی تلاش میں تھے جو سیدھا سادہ اور زود ہضم ہو۔ ایسا کھانا چونکہ ہمیں مل نہیں پا رہا تھا تو ڈائننگ ہال کے انچارج عباسی صاحب ہمارے پاس آئے۔

عباسی صاحب امروہہ کے رہنے والے ہیں اور ان میں جتنا "اپنا پن،، ہمیں نظر آیا اتنا "امروہہ پن،، نظر نہیں آیا پہلے ہی دن سے وہ ہم پر اس لیے بھی مہربان ہو گئے تھے کہ ہم پروفیسر نثار احمد فاروقی کے دوست ہیں۔ کہنے لگے "کیا میں کھانے کے انتخاب میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔ آپ چونکہ نثار احمد فاروقی کے دوست ہیں اس لیے مرغن غذاؤں کی تلاش میں ہوں گے۔،،

ہم نے پوچھا "آپ کو کیسے پتا کہ فاروقی صاحب مرغن غذائیں کھاتے ہیں،،

بولے "اس لیے کہ میں ان کا پڑوسی رہ چکا ہوں،،

ہم نے کہا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ فاروقی صاحب کے گھر کی دعوتوں میں ضرور شریک ہوتے ہوں گے،، بولے "دعوت میں تو خیر شریک نہیں ہوا البتہ ان کے گھر سے پکوان کی جو خوشبو آتی ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ یوں بھی ایک اچھا اور سچا پڑوسی دوسرے پڑوسی کے حالات کا اسی طرح اندازہ لگاتا ہے۔،،

ہم نے کہا "خدا ہر ایک کو آپ جیسا شائستہ اور مہذب پڑوسی عطا کرے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں مرغن غذاؤں سے پرہیز کرتا ہوں۔ چونکہ ہلکی پھلکی تحریریں لکھتا ہوں اس لیے غذائیں بھی ہلکی پھلکی لیتا ہوں۔ فاروقی صاحب کی بات دوسری ہے۔ ان کی تحقیق اور تنقید اتنی ثقیل اور مرغن ہوتی ہے کہ اس مناسبت سے ان کے لیے مرغن غذاؤں کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔،،

ہماری بات پر مسکرا کر بولے "ویسے آپ کی طلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے کل

رات ہی پتا چلا ہے کہ ہندستان میں فاروقی صاحب کو کچھ ملا ہے۔،،

ہم نے کہا "ضرور کوئی مخطوطہ ملا ہو گا انھیں اس کے سوائے اور مل بھی کیا سکتا ہے،،

بولے مخطوطہ نہیں کچھ اور ملا ہے،،

ہم نے کہا "انھیں کوئی انعام تو نہیں مل سکتا کیونکہ ان دنوں جس طرح کے انعامات رائج ہیں اُنھیں کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اس گر سے وہ بالکل ناواقف ہیں۔ مخطوطہ البتہ انھیں ضرور مل سکتا ہے کیونکہ وہ انعام کی تلاش میں کم اور مخطوطہ کی تلاش میں زیادہ رہتے ہیں۔ ایک بار انھیں پینتیس برس پرانا مخطوطہ ملا تھا۔ بے حد خوش تھے کہنے لگے "اس مخطوطہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کچھ ایسے خیالات پیش کیے گئے ہیں جو میرے اپنے لگتے ہیں مجھے بہت کم مخطوطے ایسے ملے ہیں جن سے میں خود بھی متفق نظر آؤں۔،، ہم نے اس نادر مخطوطے کا مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ اس مخطوطے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن سے کم از کم ہمارا کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اس لیے یقین سا ہو گیا کہ یہ مخطوطہ خود نثار احمد فاروقی کا لکھا ہوا ہے جس پر انھوں نے مخطوطہ کے لکھے جانے کی تاریخ تو لکھ دی تھی لیکن اپنا نام لکھنا بھول گئے تھے۔ بعد میں جب ہم نے دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ امتداد زمانہ کے باعث ان کے سابقہ ہینڈ رائٹنگ اور مروجہ ہینڈ رائٹنگ میں فرق پیدا ہو گیا ہے تو اس مخطوطہ کی دریافت پر نہ صرف بے پناہ خوش ہوئے بلکہ اس کی دریافت کا سہرا بھی ہمارے سر باندھنے پر مصر نظر آئے۔ بڑی مشکل سے ہم اپنے سر کو اُن کے سہرے سے بچا کر بھاگ آئے۔ اس پر عباسی صاحب نے بتایا "آپ اطمینان رکھیں فاروقی صاحب کو اس بار کوئی مخطوطہ نہیں ملا ہے بلکہ انعام ہی ملا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ انعام کی رقم بھی اچھی خاصی ہے۔،،

ہم نے کہا "ہو گا کوئی پندرہ بیس ہزار روپے کا انعام،،

بولے "جہاں تک مجھے یاد ہے کل رات تک تو اس انعام کی رقم ایک لاکھ روپے سے اوپر تھی۔ اب کم ہو گئی ہو تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یوں بھی ہندستان کے حالات آج کل کچھ ایسے ویسے ہی ہیں،، اِس اطلاع کو سن کر ہم اتنے خوش ہوئے کہ عباسی صاحب نے اس دن جتنی مرغن غذائیں کھلائیں سب کی سب کھا گئے۔ آدمی خوش ہو تو اسی طرح کھانا کھاتا ہے۔ اس دن یقین آیا کہ کبھی کبھی ہماری اردو اکیڈمیاں غلطی سے صحیح فیصلے بھی کر لیتی ہیں۔ ورنہ اکثر یہ ہوتا آیا ہے کہ جب بھی کسی اردو اکیڈمی کی طرف سے کسی ادیب کو انعام ملتا ہے تو وہ انعام یافتہ کم اور سزا یافتہ زیادہ نظر آنے لگتا ہے۔ جی تو چاہ رہا ہے کہ خود اتر پردیش اردو اکیڈمی کو اس بات پہ کوئی موزوں ایوارڈ دیا جائے کہ اس نے نثار احمد فاروقی کو

اپنا سب سے بڑا ایوارڈ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس سے اتر پردیش اردو اکیڈمی کے اعزاز میں ضرور اضافہ ہوگا۔

ایک سال پہلے جب مکتبہ جامعہ نے نثار احمد فاروقی کے بارے میں "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ شائع کیا تھا تو ہم نے ایک تاثراتی مضمون لکھا تھا۔ آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ ہمارے لکھنے کے باوجود اس خصوصی شمارہ کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکا ہے۔ اب دوسرا اڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ خدارا یہ نہ سمجھیے کہ اس خصوصی شمارہ کے سارے نسخے خود نثار احمد فاروقی نے خریدے ہیں جیسا کہ خصوصی شماروں کے سلسلہ میں عموماً ہوتا آیا ہے۔ ہمارے استفسار پر بتایا کہ اس خصوصی شمارہ کے صرف چھے نسخے انھوں نے خریدے تھے، باقی کے سارے نسخے اہل علم و ادب نے قیمت دے کر خریدے ہیں ان کے خصوصی شمارے کا پہلا اڈیشن جس تیز رفتاری سے فروخت ہوا ہے اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یہ پینتیس برس پہلے کی بات ہے۔ ہم حیدر آباد کے ایک پرنٹنگ پریس کے منیجر ہوا کرتے تھے۔ اردو کے ایک شاعر نے (جو ان دنوں جوان تھے اور خدا کے فضل سے اب بھی بقید حیات ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ درازیٔ عمر کے باعث پھر سے بچے بن گئے ہیں) ہمارے پریس میں اپنا پہلا مجموعۂ کلام طبع کروایا تھا۔ اگر چہ اس مجموعۂ کلام کے کل پندرہ سو نسخے چھپے تھے لیکن ابتدائی چار صفحات کی طباعت کے معاملہ میں اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ انھیں دو مرتبہ چھاپا گیا تھا۔ ابتدائی ایک ہزار کاپیوں میں پہلے اڈیشن کی تعداد اشاعت ایک ہزار دکھائی گئی تھی اور دوسرے اڈیشن کے فرمے میں جو ساتھ ہی چھپا تھا یہ بتایا گیا تھا کہ دوسرے اڈیشن کی تعداد اشاعت پانچ سو نسخے ہے اگر چہ ہم اندر کا حال اچھی طرح جانتے تھے لیکن شاعر موصوف نے اپنی مقبولیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے پندرہ دنوں کے اندر ہی یہ اعلان کر دیا کہ اس مجموعۂ کلام کا دوسرا اڈیشن شائع ہو رہا ہے ہمیں بھی رسم اجرا کے موقعے پر دو جملے بولنے کے لیے کہا گیا اور ہم نے اس جلسہ میں سچ مچ دو جملے ہی بولے اور ایسے جملے بولے کہ شاعر موصوف سے اب تک ہمارے تعلقات بحال نہ ہو سکے۔ ہم نے کہا تھا "حضرات! اس مجموعۂ کلام کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت کی مسرت میں، میں ایک خصوصی رعایت کا اعلان بھی کرنا چاہتا ہوں کہ جو حضرات دوسرے اڈیشن کا ایک نسخہ خریدیں گے انھیں پہلے اڈیشن کے دو نسخے مفت دیے جائیں گے۔"

بہر حال یہ تو ایک لطیفۂ معترضہ تھا۔ اگر چہ نثار احمد فاروقی کو ہم پچھلے پینتیس

برسوں سے جانتے ہیں لیکن ان کے بارے میں "کتاب نما،، کے خصوصی شمارہ کے مطالعہ کے بعد ہی ہمیں پتا چلا کہ یہ اتنے بڑے عالم، اتنے بڑے محقق، اور اتنے بڑے نقاد ہیں۔ بلا شبہہ ہم ان سے قدم بر قدم اکتساب علم کرتے آئے ہیں لیکن ان سے اتنا ہی ضروری علم حاصل کیا جتنی کہ ہماری خوش دلی اور خوش ذوقی کو ضرورت تھی۔ اب جو خصوصی شمارہ میں ان کی علمی فتوحات اور ادبی کارناموں کا تفصیل سے ذکر پڑھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں (نیند میں بھی بڑی مشکل سے بند ہو رہی ہیں)۔ ہماری حالت اس غیر تعلیم یافتہ عمر رسیدہ شخص کی سی ہو گئی ہے جس نے پچاس برس کی عمر کے بعد رسمی تعلیم حاصل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک دن اس نے گرامر کی کتاب پڑھی اور جب اسے اچانک یہ احساس ہوا کہ گرامر کے باضابطہ مطالعہ کے بغیر بھی وہ پچھلے کم و بیش پچاس برسوں سے صحیح زبان بولتا رہا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ چنانچہ اب ہم اس احساس کے باعث خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہے ہیں کہ پچھلے پینتیس برسوں سے ہم ایک بڑے عالم کی صحبت میں وقت گزار رہے ہیں اور ہمیں اس کا پتا ہی نہ چل سکا۔ بات دراصل یہ ہے کہ نثار احمد فاروقی علم کا ایک سمندر ہیں جس کو جتنا پانی چاہیے لے لے۔ ہمارے لیے تو چلو بھر پانی ہی کافی ہے۔

نثار احمد فاروقی خود ہماری مزاح نگاری کے بارے میں بڑی انوکھی اور دلچسپ رائے رکھتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے "تمھارے اکثر مزاحیہ مضامین پڑھتا ہوں تو آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ چنانچہ تمھارے مضمون "اردو کا آخری قاری،، کو جب بھی پڑھتا ہوں تو آنکھوں سے آنسو ہی پونچھتا رہ جاتا ہوں۔ تمھارے مزاح میں جو غم انگیزی ہے وہ غیر معمولی چیز ہے اور میں اسے مزاح کی معراج سمجھتا ہوں۔،،

ہم نے کہا "یہ بات آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ میرے غم سے واقف نہیں ہیں وہ نہایت مضحکہ خیز ہے۔،،

بولے "آج کے دور کی سچائی، غم کی مضحکہ خیزی اور مزاح کی غم انگیزی کے بیچ میں کہیں پوشیدہ ہے۔" نثار احمد فاروقی کی اس بلیغ رائے کے بعد ہی ہمیں پتا چلا کہ ہماری تحریروں پر لوگ پھوٹ پھوٹ کر کیوں ہنستے ہیں، بلک بلک کر کیوں مسکراتے ہیں، سسک سسک کر کیوں خندہ زن ہوتے ہیں اور دھاڑیں مار مار کر کیوں قہقہے لگاتے ہیں۔

بجلی کی نظر عنایت امسال کچھ زیادہ ہی ہے۔ سال گذشتہ بجلی گھنٹہ، دو گھنٹہ یا زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے کے لیے جاتی تھی امسال گھنٹے دنوں میں بدل گئے۔ خوش نویس لکھ نہیں سکتے، آپریٹر کمپوزنگ نہیں کر سکتے اور پروف ریڈر پڑھ نہیں سکتے۔ لہذا غلطیاں رہ جانے کی معذرت قبول فرمائیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد شاہد حسین
جے' این 'یو' نئی دہلی

عوامی ذرائع ترسیل کی تاریخ

عوامی ذرائع ترسیل نے آج مختلف افراد پر مختلف سماج بلکہ پوری عالمی برادری کو ایک دھاگے میں باندھ دیا ہے اور مختلف ممالک میں مختلف سطحوں پر فکر' اقدار تہذیب اور ثقافت کو شدت سے متاثر کررہے ہیں۔ یہاں تک کہ معیشت ' سیاست اور اقتصادیات تک اس کی زد سے محفوظ نہیں۔ شاید اسی لیے "ولور شرم" نے اپنی کتاب "ماس میڈیا اینڈ نیشنل ڈیولپ منٹ" میں لکھا ہے کہ عوامی ذرائع ترسیل " دنیا کا نقشا بدل سکتے ہیں۔ بلکہ بدل سکتے ہیں کی جگہ بدل رہے ہیں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

لہٰذا انسان کے دل میں ایسی اہم چیز کی تفصیلات جاننے کی خواہش پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے اور اسی خواہش کے تحت ہم عوامی ذرائع ترسیل کی تاریخ کی جانب رجوع کرتے ہیں۔
(اس کے اجزاء عناصر اور سماجی معنویت پر پہلے ہی ہرزہ سرائی کرچکا ہوں)

دراصل ترسیل کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس کی ابتداء کا سلسلہ انسانی وجود کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قدیم ترین انسان اپنی ضرورتوں اور ابلاغ کی فطری خواہش کے تحت مختلف قسم کی آوازوں' چہرے کے تاثرات اشارات اور حرکات و سکنات کے ذریعے ترسیل کرتا تھا۔

جوں جوں انسان مہذب ہوتا گیا ترسیل کے طریقوں میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ لہٰذا ایک ایسا زمانہ آیا جب انسان نے مٹی کی پلیٹوں پر نشانات بنانا شروع کیا پھر یہ نشانات لائن تصویروں کی شکل اختیار کرنے لگے۔ چنانچہ غاروں اور گپھاؤں میں بنی تصویریں اس کی مثال ہیں اور جو ہمارا تہذیبی رشتہ ماضی سے جوڑتی ہیں۔

آدمی نے جنگلوں پہاڑوں اور غاروں سے نکل کر قبیلوں کی شکل میں زندگی گزارنی شروع کی اور شکار کے گوشت پر گزر اوقات کرنے کے بجائے زراعت اور گلہ بانی وغیرہ کے ذرائع اپنائے تو یہ موسیقی' رقص اور تصویروں کے ذریعے پیغامات کا تبادلہ کرنے لگا۔

انسانی ذہن نے تھوڑی اور ترقی کی تو آوازوں کا ایک ایسا سلسلہ اختراع کیا جس کے جوڑنے اور ملانے سے زبان بنی، جس نے ترسیل کی دنیا ہی بدل دی۔ لیکن شروع میں جو زبان بنی وہ صرف بولے جانے والے الفاظ تھے۔ لہٰذا ایک لمبے عرصے تک زبانی ترسیل ہوتی رہی۔ گشتی درویش، خانہ بدوش، شاعر، گویئے، سامان فروخت کرنے والے۔ اور خبر رساں کے ذریعے زبانی ترسیل کی جاتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے انسانوں کا چلا کر پیغام کو آگے بڑھانے کا طریقہ مغلوں کے عہد تک قائم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہزادہ سلیم کی پیدائش کے وقت اکبرالہ آباد میں مقیم تھا۔ لہٰذا سلیم کی پیدائش کی اطلاع اسے اسی طریقے سے پہنچائی گئی تھی۔ زبانی ترسیل کا سلسلہ آج بھی قائم ہے اور ایک موثر ذریعہ ترسیل تسلیم کیا جاتا ہے۔

بعدہ تحریر کی ایجاد ہوئی لہٰذا سات ہزار قبل مسیح تک ایسی PICTROGRAPHICS وجود میں آگئی تھیں جن میں SIMBAL کے علاوہ کچھ ایسے نشانات بھی تھے جنہیں ہم ALPHABET کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔ قدیم مخطوطات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہاتھ سے لکھی کتابوں کی تاریخ قریب تیس صدی پرانی ہے۔ چینیوں نے سب سے پہلے دستیاب علم کو کتابوں کی شکل میں محفوظ کیا۔

تحریر کی ایجاد نے بولے جانے والے الفاظ کو ایک نظر آنے والی شکل میں منجمد کردیا۔ جس سے زبان کا بنیادی مزاج متاثر ہوا۔ اب زبان کے دو رخ ہوگئے۔ ایک بولے جانے والی زبان اور دوسری لکھی جانے والی زبان، اس سے سماج بھی دو طبقوں میں بٹ گیا۔ ایک خواندہ طبقہ اور دوسرا ناخواندہ طبقہ۔ اب علم سینہ بہ سینہ چلنے کے بجائے تحریر کے ذریعے محفوظ کیا جانے لگا۔

تحریر کی ایجاد نے ترسیل کو جو ترقی دی اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا لیکن کاغذ کی ایجاد سے پہلے تک اس کا دائرہ عمل کافی محدود تھا۔ اس کے لیے پتھروں کی سلیں، دھاتوں کے پتر، درختوں کی چھال، پتے اور چمڑے کا استعمال کیا جاتا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں چین نے سب سے پہلے کاغذ تیار کیا۔ جس سے کسی عبارت کو محفوظ کرنے میں کافی آسانی پیدا ہوگئی۔ پھر بھی ہاتھ سے تحریریں محدود پیانے پر ہی لکھی جاسکتی تھیں۔ اور ان کی زیادہ کاپیاں تیار کرنا کافی وقت طلب تھا۔ لہٰذا چھاپے خانے کی ایجاد نے تحریر کی ایجاد کو ایک وسیع پس منظر عطا کردیا۔

یوں تو چین میں نویں صدی عیسوی میں چھپائی کا کام شروع ہوگیا تھا لیکن بڑے پیانے پر یوروپ میں پندرھویں صدی میں ہی شروع ہوسکا۔ پہلے پہل لکڑی کی ٹائپ سے چھپائی ہوئی پھر ہاتھ کی مشین پر کام ہوا پھر بجلی سے چلنے والے پریس کی ایجاد ہوئی پھر ٹیلر پریس، آفسیٹ

پلیٹیں اور روٹری مشینوں کو استعمال کیا جانے لگا۔ جدید ترین طریقوں میں فوٹو آفسیٹ مشینوں کا استعمال کیا جارہا ہے۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے تقریباً پانچ سو سال کا لمبا سفر طے کرنا پڑا ہے۔ اب بہت کم وقت میں کسی تحریر کی بہت زیادہ کاپیاں تیار کی جاسکتی ہیں۔ اس سے یہ آسانی ہوئی ہے کہ اب عوام کے لیے جانکاری اطلاعات اور تفریحی مواد دور دراز قصبوں اور گاؤں میں بروقت پہنچنے لگا ہے۔ خصوصاً اخبارات نے اس سلسلے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ جس میں سہ روزہ' ہفت روزہ' پندرہ روزہ' ماہ نامے' پوسٹر' پمفلٹ اور فولڈر بھی شامل ہیں۔ لیکن اس ذریعہ ترسیل میں یہ کمی تھی کہ اس سے صرف خواندہ طبقہ ہی استفادہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مطبوعہ مواد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں نسبتاً خرچ بھی زیادہ آتا تھا اور وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔

چنانچہ سائنسدانوں نے بے وزن(WEIGHT LESS) اور تیز رفتار چیز یعنی آواز کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کی طرف توجہ دی اور اس کی ابتدا ہوئی ٹیلی گراف سے۔

دراصل ٹیلی گراف1840ء کے قریب تار کی لائن کے ذریعے آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا ذریعہ بنا۔ لیکن اس کا دائرہ عمل اس وقت بہت وسیع ہوگیا جب1858ء میں بحر اٹلانٹک کے آرپار کیبل ڈالا گیا۔ اب اس کے ذریعے یوروپ اور امریکہ کے کسی بھی حصے میں خبروں کا تبادلہ کیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں مزید ترقی اس وقت ہوئی جب مارکونی نے1896ء میں وائرلیس ٹیلی گراف ایجاد کیا اور چار سال کی مختصر مدت میں نہ صرف یہ کہ اس کے اشارے واضح اور زور دار ہوگئے بلکہ اس کا دائرہ عمل بھی کافی بڑھ گیا اور اسے پریس نیوز سروس کے لیے استعمال کیا جانے لگا لیکن ابھی تک کچھ نقطے اور نشانات ہی تھے جن کے ذریعے کسی پیغام کی ترسیل کی جاتی۔ آواز یا موسیقی کی ہو بہو ترسیل بعد کا مرحلہ ہے اور یہ مرحلہ اس وقت طے ہوا جب امبروز فلیمنگ (AMBROSE FLAMING) نے TWOELECTRODEVALVE کی ایجاد کی THIRDELECTRODE یعنی GIRD کا اضافہ لی۔ڈی فارسٹ LE DE FOREST نے کیا جس کا نتیجہ TRIODEVALVE کی شکل میں سامنے آیا اور جو کسی بھی آلہ ترسیل میں بنیادی رول ادا کرتا ہے۔ پھر VALVES کو جلد ہی اتنا بااثر اور مکمل بنالیا گیا کہ کسی بھی اشارے' آواز موسیقی یا ذرائع کو دنیا کے کسی کونے میں بھیجا جانے لگا۔

ابھی اس ایجاد کو مشکل سے چالیس سال گزرے ہوں گے کہ اس کا زیادہ جامع مختصر

اور سستا متبادل تلاش کرلیا گیا، جسے دنیا UBIQUITOUS TRANSISTOR کے نام سے جانتی ہے۔ یعنی اب ریڈیو نے دنیا کو دنیا کے سامنے پیش کردیا اور پیش کش بھی اس انداز سے کہ تاریخ عالم میں جس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ ترسیل کی دنیا میں اب آواز کی برتری مسلم ہوگئی۔ یہ ایک ایسا ذریعہ ترسیل تھا جس سے پڑھے لکھے، کم پڑھے، بغیر پڑھے شہری، دیہاتی یہاں تک کہ نابینا بھی استفادہ کرسکتا تھا۔ مزید یہ کہ یہ بہت کم خرچ میں، بہت کم وقت میں بہت زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتا تھا۔ آپ سفر میں ہوں حضر میں ہوں۔ سائکل سے سفر کررہے ہوں، بس، ریل یا ہوائی جہاز سے، یہ کسی ہم دم و ہمدرد کی طرح ہر وقت آپ کے ساتھ ہے۔ لہٰذا اس ذریعے کے سستے پن، کثیر الاستعمال اور آسان دستیابی نے عوامی ذریعہ ترسیل کا دائرہ وسیع تر کردیا۔

عوامی ذریعہ ترسیل میں ایک انقلابی ترقی اس وقت ہوئی جب آواز کے ساتھ ساتھ تصویر کی بھی ترسیل کی جانے لگی اور سنیما و ٹی وی وجود میں آیا۔ ابتداء میں سنیما صرف چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات سے ہی ترسیل کا کام انجام دیتا رہا۔ پھر تصویر کے ساتھ ساتھ آواز کو بھی شامل کیا گیا۔ اب ہم جو بات صرف سنتے تھے، اسے دیکھنے بھی لگے لیکن یہ ایک مخصوص جگہ پر بڑے پردے پر ہی دکھایا جاسکتا تھا اور اس کی پیش کش کا طریقہ کار بھی محدود تھا یعنی اسے ٹیلی کاسٹ نہیں کیا جاتا تھا۔ ٹی وی نے اس محدودیت کو توڑا۔ لہٰذا آواز و تصویر دونوں کو ایک ساتھ آپ تک پہنچانے والے اس ڈبے (جسے بعد میں ایڈیٹ باکس بھی کہا گیا) کی پہنچ اب آپ کے ڈرائنگ روم سے گزر کر بیڈ روم تک ہوگئی ہے اور ریڈیو کی طرح یہ بھی آپ کے سفر و حضر کا ساتھی بن گیا ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ یہ ابھی سائکل میں فٹ نہیں ہوپایا ہے۔ (لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ سائکل میں بھی فٹ ہوجائے گا)۔ ورنہ بس، کار، ریل اور ہوائی جہاز میں یکساں طور پر موثر ہے۔

لہٰذا ٹی وی آج اپنی پہنچ، رنگا رنگی، آواز و تصویر کی یکجائیت اور منظر و پس منظر کی وجہ سے موثر ترین اور مقبول ترین ذریعہ ترسیل بن گیا ہے۔

ذریعہ ترسیل کے ارتقا کا ایک پہلو ذرائع حمل و نقل سے بھی منسلک ہے۔ ابھی ایک سو پچاس سال پہلے تک ہمارے پاس حمل و نقل کے ذرائع میں گھوڑا اور کشتی ہی تھے۔ یوں تو کچھ اور جانوروں کو بھی اس کام کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن ان میں گھوڑے کا زیادہ استعمال اس لیے تھا کہ اس کی رفتار سب سے زیادہ تھی یعنی تیس میل فی گھنٹہ لیکن اس کی قوت محدود تھی۔ کشتی منحصر ہوتی ہوا کے رخ، پانی کے بہاؤ اور انسانی قوت پر باوجودیکہ پہیے کی ایجاد

نے ذرائع حمل و نقل کا پس منظر بدلا یہ بھی کسی نہ کسی قوت کی محتاج ہوتی۔

حمل و نقل کے ذرائع مدتوں اسی ڈھرے پر چلتے رہے۔ تبدیلی آئی تو اس وقت جب اپ کے انجن کی ایجاد ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اس کی رفتار زیادہ تھی بلکہ یہ بلا رکے 'بلا تھکے' بے لمبے فاصلے طے کر سکتا تھا۔ لہٰذا جلد ہی تیس میل فی گھنٹہ والی رفتار اسی میل میں بدل گئی۔ ں کی وجہ سے ریل وجود بھی آئی اور صنعتی ترقی ممکن ہو سکی جس نے پورے معاشرے کا اج اس کی فکر اور اقدار بدل ڈالی۔ اب سفر کی آسانی کی وجہ سے آرٹ' کلچر' تہذیب بلکہ ہر زنے ایک جگہ سے دوسری جگہ تیز رفتاری سے پہنچنا شروع کیا۔ جس سے کہیں تہذیبی ترقی ئی کہیں سماجی سدھار ہوا کہیں تخلیقیت متاثر ہوئی۔

اس سلسلے کی اگلی کڑی کمبشن انجن کی ایجاد ہے جسے آٹو موبائیل میں استعمال کیا گیا۔ انٹرنل کمبشن انجن کی ایجاد ہوئی جس سے ہوائی پرواز ممکن ہو سکی۔ شروع شروع میں اس استعمال محدود طریقے پر ہوا۔ لیکن جلد ہی اسے بڑے بڑے ہوائی جہازوں میں لمبے لمبے سفر ے لیے استعمال کیا جانے لگا اور اس کی رفتار تین سو میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی۔ پھر اس کے ادل کے طور پر جلد ہی جٹ انجن سامنے آیا۔ جس کی رفتار انٹرنل کمبشن کے مقابلے میں لنا تھی اور وزن لے جانے کی قوت تین گنا۔ لیکن اس پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ مزید رفتار ھانے کی کوشش برابر جاری رہی۔ لہٰذا ایک سو پچاس سال کے اندر اندر گھوڑے کی تیس ں فی گھنٹے والی رفتار بڑھ کر اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی۔ کیوں کہ یہی وہ رفتار ہے ں سے مسٹر آرم اسٹرانگ کو خلا میں بھیجا گیا تھا۔

اب تو یہ بات بھی پرانی ہو چکی اس وقت سے اب تک نہ جانے کتنی ترقی ہو چکی ہے ترقی کی رفتار یہ ہے کہ ہر صبح ایک نئی تبدیلی کے ساتھ ہوتی ہے۔

بلقیس ظفیر الحسن
ایم - بی - جے بلاک، ایم - آئی - جی - فلیٹس
فیز ۱ - اشوک وہار، نئی دہلی ۵۲

اک شہسوارِ گرد پوش

سیّد ظفیر الحسن

بہت پرانی بات ہے مگر میرے لیے ایسی جیسے کل ہوئی ہو۔ میرے ابّا اور چچا مشاعرے سے لوٹے تھے، اور اپنی گفتگو کے دوران بار بار کہہ رہے تھے "بھئی۔ ہے تو لڑکا ہی مگر غضب کے شعر کہتا ہے"۔ اور میں جل بھن کر خاک ہوئی جا رہی تھی۔ میرے گھر والے تو جیسے ظفیر پر عاشق ہوئے پڑے تھے۔ سب کے سب! ابّا ان کی علمی صلاحیت اور شعر گوئی کے معترف تھے، تو بجیا اور دولہا بھائی ان کی سادہ دلی کے، اور چھوٹی بہن ناہید کا ظفیر بھائی، ظفیر بھائی کہتے منہ نہیں سوکھتا تھا۔ میری عمر اس وقت مشکل سے بارہ تیرہ برس کی رہی ہوگی۔ گھر میں شدید قسم کا ادبی ماحول تھا۔ میں نے بھی ایک غزل لکھی تھی اور ابّا کے حضور اصلاح کے لیے لے گئی تو وہ ہنسنے لگے۔ اور پیار سے سمجھانے لگے کہ اچھی بچیاں شعر و شاعری کی خرافات میں اپنا وقت برباد نہیں کرتیں۔ تمھیں ان فضولیات سے دور رہنا چاہیے۔ اور انھیں کے منہ سے اس "لڑکے" ظفیر کی تعریفیں سن کر جل جل کباب نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ مارے رشک اور حسد کے آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ اپنے لڑکی ہونے پر اتنا غصہ آتا کہ بس! اور کئی برسوں بعد جب مجھے اسی لڑکے کی بیوی بننے کا شرف حاصل ہوا تو اپنی خوش نصیبی پر اتنا رشک آرہا تھا کہ مارے خوشی کے آنسو ٹپکے پڑ رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ جو ظفیر اوائل عمر میں اپنے غضب کے شعروں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا اور جس کی ساری عمر قلم چلاتے گزری لیکن بعد میں شعر گوئی سے اپنا رشتہ پوری طرح استوار نہیں رکھ سکا۔

میری سمجھ میں یہ بات نہ کبھی پہلے آئی نہ اب آتی ہے کہ اتنی ذہانت اور بے پناہ صلاحیت رکھنے والے ظفیر الحسن اپنے آپ کو اس قدر چھپائے کیوں رکھتے ہیں۔ اردو، فارسی، فرنچ، سنسکرت اور بنگلہ زبانوں پر تو خیر انھیں عبور حاصل تھا ہی، مراٹھی، پنجابی اور کشمیری بھی بول، سمجھ لیتے تھے۔ بنگلہ تو اتنی اچھی بولتے تھے کہ ان پر غیر بنگالی ہونے کا گمان

تک نہیں گزرتا تھا۔ ”ماں۔ ماں۔ حسن کا کو ہندی بھی بہت اچھی بولتے ہیں“ بمل دا (جانے مانے بنگالی رائٹر اور فلم ساز بمل دت) کا چھوٹا بیٹا کابو اپنی ماں کے کان میں کہ رہا تھا ایک دن ۔ جب اس نے ظفر الحسن کو منوہر شیام جوشی سے بمل دا کے گھر میں جہاں وہ صرف بنگلہ میں گفتگو کیا کرتے تھے، ہندی میں ” وارتالاپ “ کرتے ہوئے سُنا معصوم بچہ انھیں اپنی طرح بنگالی سمجھتا تھا۔ اور انھیں ہندی بولتا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا) یادداشت اتنی اچھی کہ ایک دو بار سُنی ہوئی کوئی بھی چیز ازبر ہو جاتی تھی انھیں منٹوں میں۔ فانی کے قصیدے ہوں یا وید منتر، موڈ میں آکر جب سنانے لگتے تو سماں بندھ جاتا تھا لگتا کہ ایک دریا ہے جو اُمڈا چلا آرہا ہے۔

میں لڑ پڑتی تھی ان سے ” جتنا علم آپ کے پاس ہے، مجھے حاصل ہوتا تو آسمان میں تھگلی لگاتی “ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا“ جب آئے سنتوش دھن سب دھن دھول سمان “ بآوازِ بلند اعلان فرماتے اور ہنسنے لگتے۔ ان کا یہ ”سنتوش دھن“ دیکھ دیکھ کر میری ” آتر پت آتما“ نرک کے انگاروں کی طرح دہک اٹھتی تھی“ بیٹھی مٹی رہو دھول سے رسی تم! “ (بمبیا زبان کا یہ عام سا محاورہ انھیں بہت پسند تھا)“ بہت لکھ چکا ہوں میں۔ فلم۔ ڈویژن کی الماریاں پٹی پڑی ہیں میرے لکھے سے......“

بمبئی میں برسوں فلم۔ ڈویژن کے لیے کمنٹری لکھتے رہے۔ ان کی لکھی ہوئی کمنٹریز میں ” گلیٹی “ اور ” اکبر تھرو دی پینٹنگز “ قابل ذکر ہیں ۔ پھر آرمی میں بھیج دیے گئے پبلک ریلشن افسر بنا کر۔ کھادی کے کرتا پاجامہ اور نہرو جیکٹ کی جگہ یونیفارم نے لے لی۔ مونچھیں رکھ لیں اور میجر حسن بن گئے۔ دس سال آرمی کے جھمیلوں میں پڑے رہے اور اپنے آپ سے دور ہوتے گئے جس کا احساس انھیں اکثر دکھ دیا کرتا تھا۔ دہلی کی پوسٹنگ نے انھیں پھر سے متاعِ لوح و قلم عطا کر دی، اور وہ پلاننگ کمیشن کے ماہنامے ” یوجنا “ کے جو گورنمنٹ آف انڈیا کی منظور شدہ ساری زبانوں میں شائع ہوتا ہے، چیف اڈیٹر مامور ہوئے۔ ان کے قلم کا سفر جو ” عصرِ جدید “ کلکتہ سے شروع ہوا تھا یہاں آکر ٹھہر گیا۔ اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن شعر گوئی سے ان کا رشتہ پھر بھی پوری طرح استوار نہیں ہو سکا۔ یوں لکھتے رہتے تھے ” یوجنا “ کے اداریے کے علاوہ ریڈیو کے لیے بھی ان کا قلم چل پڑتا تھا۔ ” جرم سازی “ تک کے موضوع پر ایسا لکھ جاتے تھے کہ میں حیران رہ جاتی تھی۔ اس معاملے میں ان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ کوئی بھی موضوع مل جائے، قلم لے کر بیٹھ جاتے اور کھٹا کھٹ سب تیار! کبھی کبھی ایک آدھ غزل بھی لکھ لیتے مگر سنجیدگی سے اس طرف

ان کی توجہ باقی نہیں رہی تھی۔ بہت خوش ہوتے تو میرے پکائے ہوئے کھانے کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے:

کھانے میں کیا لذیذ ہے کدّو چنے کی دال مجھ کو بہت عزیز ہے کدّو چنے کی دال

مہمانوں کی بھیڑ سے پریشان ہوتے تو ارشاد ہوتا:

گھر کا وہ حال ہے مہمانوں کی یلغار کے بعد جو ہوا کرتا تھا یورپ کا کبھی وار کے بعد

اور اپنے مخصوص بلند بانگ قہقہے لگا لگا کر مہمانوں کو ہی سناتے۔ ہم سب خوب مزے لیتے اور میں حسبِ عادت مشورہ دینے لگتی "آپ مزاحیہ ہی کیوں نہیں لکھتے سنجیدگی سے۔ ہمارے یہاں مزاحیہ کی بڑی قلت ہے۔" اور وہ بدک جاتے "تم ہی بٹو اپنی رسّی، دھول سے"، ان کا محبوب محاورہ موجود ہو جاتا۔ اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاتی۔

ان کی قابلِ رشک بے نیازی مجھے حیران کر جاتی تھی۔ خود نمائی کے ہر موقعے سے دور بھاگتے تھے مگر کہیں رونما ہو جاتے تو جگمگا اٹھتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کے قہقہے، ان کے فقرے بھلائے نہیں بھولیں گے ان کے جاننے والوں سے "یوجنا" سے ریٹائر ہونے کے فوراً بعد کشمیر گورنمنٹ نے انھیں ڈائرکٹر انفارمیشن کے طور پر تین سال کے لیے اپنے یہاں بلا لیا تھا۔ جہاں سے وہ خرابیٔ صحت کی بنا پر ڈھائی سال میں ہی دلّی لوٹ آئے۔ مگر کشمیر سے انھیں اور ان سے کشمیر والوں کو جو لگاؤ ہو گیا تھا، وہ اٹوٹ رہا۔ ان کے چاہنے والوں کے فون اب تک آتے رہتے ہیں۔ اہالیانِ کشمیر سے ان کی وابستگی اتنی زیادہ ہوئی کہ وہاں رشتہ داری بھی کرلی۔ میرے بڑے بیٹے احمد ظفر کا عقد حبیب اللہ بھٹ صاحب کی صاحبزادی ریحانہ کے ساتھ ہو جانے کے بعد وہ اعلان کرتے ہوئے سنے گئے "کشمیر سے ہندستان کے الحاق کے مسئلے کا جو ہونا ہے، سو ہو، ہمارا الحاق تو باضابطہ اور قانونی ہو گیا ہے کشمیر کے ساتھ۔"

کشمیر سے آنے کے بعد ان کی حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ مگر غیرت کا یہ حال تھا کہ اپنی شدید تکلیف کا اظہار اپنے قریب ترین شخص سے کرتے ہوئے بھی شرماتے تھے۔ آخری لمحوں سے کچھ پہلے ان کے ملنے والے آئے۔ حال پوچھا۔ تو ہمیشہ کی طرح مسکرا کر بولے۔

"ہنڈرڈ ٹوئنٹی (۱۲۰) پرسنٹ!"

کہیں بھی ہوں گے، بڑے مزے میں ہوں گے۔ شعر سنا رہے ہوں گے، فقرے چست کر رہے ہوں گے، قہقہے لگا رہے ہوں گے۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔

۲۸ جولائی ۹۶ء کو ان کو گئے ہوئے پورا سال ہو گا مگر کیا وہ سچ مچ چلے گئے ہیں؟ نہیں ہیں؟ نہیں نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تک ہم زندہ ہیں وہ کیسے ختم ہو سکتے ہیں؟

ہاں نظر سے دور ہو گئے ہیں مگر ہیں تو ہمارے ہی درمیان ـــ اور رہیں گے۔

وشوکرما

یوں ہی وقت کا چاک چلتا رہے گا۔
سبب اور نتیجے کا اک سلسلہ ہے۔
ازل سے ابد تک
اور انسان اس سلسلے کی کڑی ہے
تلاش اور تحقیق کے کارواں کا مسافر
یہ مخلوق خالق نما جس کی صنعت گری
دستِ قدرت کی صنّاعیوں کا فقط عکس ہے۔
جو مٹی سے، لکڑی سے، پتھر سے، پتلے بناتا ہے
اک دن عناصر کی آغوش میں جا چھپے گا
مگر اس کے پیدا کیے نقش باقی رہیں گے
انھیں اپنے دل کا لہو، اپنی آنکھوں کی تابندگی
اس نے بخشی ہے
بے جان چیزوں میں اک روح سی پھونک دی ہے۔
رہِ جستجو کا یہ راہی مسلسل
تگ و دو میں سرگرم، تخلیق میں منہمک ہے
آج نوگم ہے، خود اپنی صنعت کے گرداب میں
کل نہ جانے وہ کس روپ میں جلوہ گر ہو!

غزل

مرا اس سے عجب رشتہ رہا ہے
ہے بیگانہ، مگر اپنا رہا ہے

بھلا بیٹھا ہوں مدت سے میں سب کچھ
نہ جانے کون پھر یاد آ رہا ہے

بہت مشکل ہے اب منزل کا ملنا
کہ رہبر خود ہمیں بہکا رہا ہے

جہانِ عشق کے بندوں کا مسجود
کسی کافر کا نقشِ پا رہا ہے

حقیقت پست دنیا کی نظر میں
اور افسانے کا قد بالا رہا ہے

سید ظفر الحسن



مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

ڈاکٹر عقیل احمد
دہلی یونی ورسٹی شعبہ اردو، دہلی 110009

تضمین نگاری کی روایت

تضمین کے لغوی معنی ہیں ضم کرنا یا ملانا۔ شاعری کی اصطلاح میں تضمین وہ صنف سخن ہے جس میں تضمین نگار کسی دوسرے شاعر کے شعر پر اپنے مصرعے اس حسن و خوبی سے لگاتا ہے کہ تضمین کے مصرعے تضمین شدہ شعر کے ساتھ مل کر ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ تضمین کا فن بڑا نازک اور لطیف ہے۔ غزل کے شعرا کے لیے شعر کہنا تو آسان کام ہے لیکن کسی دوسرے شاعر کے شعر پر تضمین کرنا مشکل، کیوں کہ غزل کے ہر شعر میں شاعر کی داخلی کیفیات، لطیف و نازک احساسات اور اس کی عملی صلاحیتوں کے ارتعاشات موجود ہوتے ہیں۔ اصل شعر یا مصرعے پر لگائے جانے والے مصرعوں کو پیوست اور ہم آہنگ کرنے کے لیے شاعر کو اپنے مصرعوں کی تخلیق کرتے وقت اپنی داخلی کیفیات، لطیف و نازک احساسات، لب و لہجہ اور اپنی علمی صلاحیتوں کی سطح کو تھوڑی دیر کے لیے اس شعر یا مصرعے میں موجود شاعر کی داخلی کیفیات، لطیف و نازک احساسات، لب و لہجہ اور علمی صلاحیتوں کی سطح کے برابر لانا پڑتا ہے جو خلاف فطرت اور مشکل ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں اسے اور بھی کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور کئی نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً وہ سب سے پہلے تفہیم شعر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کے کچھ نامکمل پہلوؤں کی تلاش کرتا ہے جبکہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے اور اس میں کسی نامکمل پہلو کو تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ان سب دشوار مرحلوں سے گزرنے کے بعد تضمین کے جو مصرعے وجود میں آتے ہیں وہ اصل شعر یا مصرعے کے ساتھ شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ جن میں کوئی فرق نہیں محسوس کیا جا سکتا اور اس طرح جو تضمین ہوتی ہے وہ حاصل کلام ہے۔

تضمین کے لیے کسی مخصوص ہیت کی قید نہیں ہے۔ مخمس، مثلث، مسدس اور ترکیب بند وغیرہ میں تضمین کے فن کی نادر مثالیں مل جاتی ہیں لیکن مخمس کی شکل میں تضمین کا فن زیادہ مقبول ہوا۔

تضمین کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب زیر تضمین شعر معنوی اعتبار سے مکمل ہو

اور تضمین نگار اس مکمل شعری رمزیت سے فائدہ اٹھاکر اس طرح سے تضمین کرے کہ تضمین کے مصرعے سن کر یہ محسوس ہو کہ ان مصرعوں کے بغیر شعر ناتمام تھا مثلاً غالب کا شعر ہے۔

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیراہن کی آزمایش ہے

اس شعر پر صبا اکبر آبادی نے بڑے دلکش اسلوب اور پر لطف تخیل کے ساتھ تضمین کا حق ادا کیا ہے۔ تیسرے مصرعے کی ندرت اور برجستگی نے غالب کے شعر کی معنویت کو ایک نئی جہت دے دی ہے۔

مداوائے دل رنجور کا سامان کیا معنی
زمانے کو نہیں ہے فکر عشق نالہ فرسا کی
ہوائے حسن بہر راحت الفت نہیں چلتی
نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیراہن کی آزمایش ہے

تضمین کے فن کی ایک خوبی یہ ہے کہ تیسرا مصرع اس طرح سے لگایا جائے کہ اصل شعر کا مفہوم بدل جائے۔ حالی کی مشہور غزل کا مقطع ہے۔

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کے صورت

اس وقت علی گڑھ میں ایک طالب علم داؤد' بلا کے ذہین اور شگفتہ مزاج تھے۔ انھوں نے حالی کے اس شعر پر اس طرح تضمین کی۔

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں
پہلے یہ دیکھے کہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

مولانا محمد علی مرحوم نے اس تضمین کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے "مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کردیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں اور صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش اور میرا خدا خوش۔"

میرؔ و سوداؔ کا عہد شمالی ہند میں اردو شاعری کا اہم ترین دور مانا گیا ہے۔ اس دور میں غزل، قصیدہ اور مثنوی کا معیار متعین ہوا۔ میرؔ نے غزل کو اور سوداؔ نے قصیدہ کو نوک پلک سے سنوارا کہ اردو غزل فارسی غزل سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگئی اور قصیدہ فارسی کا حریف بننے لگا۔ فارسی اشعار کے ترجمے اور فارسی اشعار کی تضمین کا رجحان بڑھنے لگا۔ یہ رجحان اس بات کا غماز ہے کہ اردو کے شعرا فارسی اشعار کی سی لطافت، بلندی اور نزاکت، ریختہ کے اشعار میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ریختہ ابھی اپنی ارتقائی منزل طے کررہا تھا۔ ترجمہ کے ساتھ ساتھ پس پردہ یہی رجحان کام کررہا تھا کہ ریختہ بھی فارسی کے اشعار کی سی بلاغت اور اثر آفرینی کا حامل ہوجائے۔ میرؔ اور سوداؔ کی بیشتر تضمین اس رجحان کی آئینہ دار ہیں۔ میرؔ نے فارسی کے اشعار پر تضمین کرکے تضمین نگاری کے نت نئے پہلوؤں سے اردو شاعری کو آب و رنگ بخشا۔ فارسی اشعار کی کیفیات کی باز آفرینی اور غزل کی رمزیت اور تہہ داری سے شعر کے مفہوم کی نئی توجیہہ کرکے تضمین کے فن کو تخلیق کا بلند درجہ عطا کیا۔ انھوں نے تضمین کی روایتی ہیئت (تخمیس یا مخمس) کے علاوہ اس فن کے امکانات کو بروئے کار لانے کے لیے مثلث کی ہیت کو بھی بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر میرؔ نے فارسی کے مطلع پر اردو کے مطلع کی تضمین کرکے اس فن کی نادرہ کاری کا بہت دلچسپ ثبوت دیا ہے۔ اس قسم کی تضمین کے میرؔ ہی موجد ہیں اور وہی خاتم بھی ہیں۔ اب مثلث کی ہیت میں میرؔ کی ایک تضمین پیش کی جاتی ہے۔

نالہ بلبل غنچہ غم شمشاد آہ دلفگار
باغباں جاروب گل خمیازہ و من انتظار
ہر کسے چیزے بیادت درگلستاں می کشد

میرؔ نے اپنے تخیل کی جدت سے فارسی کے شعر کے مفہوم کی بہت پر لطف توسیع کی ہے۔ فارسی کے شعر میں باغباں کے جھاڑو دینے، پھول کے انگڑائی لینے اور شاعر کے انتظار کے لیے "می کشد" کا فعل استعمال ہوا ہے۔ میرؔ نے فارسی محاورے کے مطابق اس فعل "می کشد" سے بلبل کے نالے، غنچہ کے غم اور شمشاد کی آہ کو وابستہ کرکے شعر کے مفہوم کو ایسی وسعت دی ہے کہ تینوں مصرعے ایک ہی شاعر کی تخلیق معلوم ہوتے ہیں۔

سوداؔ نے تضمین کے فن میں جو خلاقی کے جوہر دکھائے ہیں وہ اردو شاعری کے لیے مبارک فال ثابت ہوئے۔ تضمین کی راہ میں سوداؔ کے جلائے ہوئے چراغوں کا اجالا انیسویں

اور بیسویں صدی کے شعرا کے لیے مشعل راہ بنا۔ اٹھارویں صدی کے تضمین نگاروں میں سودا کا نام اس لیے بہت اہم ہے کہ سودا نے ہیت کے اعتبار سے تضمین کے تمام امکانات کو بروئے کار لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہیت کا جیسا تنوع سودا کی تضمین نگاری میں ملتا ہے اس کی مثال کسی دور کے تضمین نگار کے کلام میں نہیں ملتی۔ مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند اور قطعے کے علاوہ ایک مصرع کی تضمین کے قابل قدر نمونے سودا نے پیش کر کے اس فن کو بڑا وزن و وقار بخش دیا۔ شعری ہیت کے تنوع کے ساتھ سودا نے میر کے مقابلے میں فارسی کے شاعروں کی غزلیں زیادہ تضمین کی ہیں۔ خسرو، حافظ، کلیم، عصمت بخاری، ناصر علی، فاخر مکیں، وغیرہ کی مقبول غزلیں سودا کی تضمین سے اور زیادہ مقبول ہو گئیں۔ اردو غزلوں میں سودا نے اپنی غزلوں کے ساتھ میر تقی میر کی غزلوں کو بھی تضمین کیا ہے۔ سودا ہجو اور طنز کے ماہر تھے ان کے بیشتر ہجو یہ قصیدے اور قطعے ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ ان کی ہجو اور طنز کی صلاحیت نے ندرت کاشمیری کے ہجو یہ اشعار کی تضمین میں یہ کمال دکھایا ہے کہ ندرت نے سودا کی ہجو میں جو اشعار کہے تھے۔ سودا نے ان پر اپنی جدت طبع سے اس انداز کی تضمین کی ہے کہ وہ تمام اشعار جو سودا کی ہجو میں کہے گئے تھے ان کی ہجو کا وار پلٹ گیا اور ندرت کاشمیری اپنے اشعار کا خود ہدف بن گئے۔ اس طرح تضمین کے پیروڈی کی صورت اختیار کر لی اور سودا کی اس پیروڈی نے بیسویں صدی کے پیروڈی نگاروں کے لیے تضمین کے فن سے کام لینے کا مکمل نمونہ پیش کر دیا۔ اب حافظ کے ایک شعر پر سودا کی تضمین پیش کی جاتی ہے۔ حافظ کا یہ شعر ایسا ہے جسے سودا کی تضمین کے مصرعوں کے ساتھ پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ شعر ناتمام تھا اور تکمیل مفہوم کے لیے سودا کے مصرعوں کا محتاج تھا۔

ترا سا حسن نہیں جگ میں یہ تو ہے لاریب
ولے نہیں ہمیں معلوم سرّ عالم غیب
جو فکر فتح میں اب سر کو لائے سوئے جیب
جز ایں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب
کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبا را

حافظ کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ سوائے اس کے کہ تیرے حسن میں اور کوئی عیب نہیں نکالا جا سکتا کہ تیرے حسین چہرے پر مہر و وفا کا تل نہیں ہے۔ سودا نے اس پر اضافہ یہ کیا ہے کہ محبوب کے جمال کو بے مثال کہا اور پھر یہ کہا کہ کوئی اگر عیب نکالنے پر آئے اور بہت غور و فکر کے بعد کوئی نکتہ اسے مل جائے تو یہی کہہ سکے گا کہ تو بے مہر ہے اور بے وفا ہے یعنی محبوب کی

بے مہری اور بے وفائی کا تل اگر چہرے پر نہیں ہے تو بھی اسکی زیبائی اپنی جگہ مکمل ہے۔ اس
ت کو اردو کے ایک اور شاعر نے اس طرح کہا ہے۔

رخ پر نور پر جگہ تھی کہاں
رکھنے والے کو دیکھئے تل کے

ی تل نے رعنائی میں اضافہ ضرور کیا لیکن جمال محبوب تل کا محتاج نہیں تھا۔

نظیر اکبر آبادی نے تضمین کی روایت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اپنی شاعرانہ صلاحیت کو بروئے کار لاکر تضمین کے فن کے مستقبل کو درخشاں کردیا۔ نظیر نے حافظ، سعدی ور خسرو کی غزلوں کی تضمین کی۔ اردو کے شاعروں میں اصغر، فغا، قدرت اور سراج کے علاوہ پنی غزلوں کی بھی تضمین کی ہے۔ میر اور سودا کی طرح نظیر کی تضمین میں بھی یہ بات بڑی مایاں ہے کہ فارسی اشعار کی تضمین رواں، چست اور مربوط ہے۔ اردو اشعار کی تضمین اس کے مقابلے میں ہلکی ہے اور کہیں کہیں بے لطف بھی ہوگئی ہے مگر مجموعی طور پر تضمین کے فن یں نظیر اپنے عہد میں سب سے ممتاز اور مقبول ہیں۔ اب سعدی کے ایک شعر پر نظیر کی تضمین پیش کی جاتی ہے۔

گیا اک دن میں گورستاں میں دل سرد
پڑی اڈی تھی واں ہر قبہ پر گرد
جو دیکھا ہے تو باچشم ورخ زرد
یکے بر تربتے فریاد می کرد
کہ ایلنہا پادشاہان جہانند

اس تضمین میں ایک ڈرامائی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ تیسرا مصرع خوب بہم پہنچایا ہے۔ سعدی کے شعر میں "فریادی کرد" سے جو تاثر ابھرتا ہے اسے نظیر نے "باچشم ورخ زرد" کہہ کر عبرتناک بنادیا ہے۔

انیسویں صدی میں اردو شاعری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ غالب نے روایتی غزل میں فکر اور تنوع پیدا کیا اور غزل میں وسعت پیدا کی۔ غالب نے غزل گوئی کے علاوہ دوسرے صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن غالب کو تضمین نگاری کا شوق نہیں تھا۔ ان کی غزلوں میں ایک مرزا بیدل کا مصرع آمد سخن میں تضمین ہوگیا ہے۔ اور ایک ناسخ کا مصرع اپنے عقیدے کی تائید میں تضمین کیا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

البتہ دیوان غالب نسخہ عرشی میں بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل پر تضمین ملتی ہے جو مخمس کے عنوان سے چھپی ہے۔ ظفر کی یہ غزل جس پر غالب نے تضمین کی ہے ظفر کی نمائندہ غزل نہیں ہے مگر غالب نے اپنی قادر الکلامی سے اس غزل کے بعض اشعار کی تضمین میں ردیف کی بے لطفی کو دور کردیا ہے اور مضمون آفرینی کے لیے کوئی نیا پہلو نکال لیا ہے۔ مثلاً

تو نے دیکھا مجھ پہ کیسی بن گئی اے راز دار
خواب وبیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار
مثل زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار
کھینچتا تھا رات کو میں خواب میں تصویر یار
جاگ اٹھا جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی

تیسرا مصرع کتنا دلچسپ ہے اور خواب میں تصویر کے نامکمل رہ جانے کی کیسی نادر توجیہ پیش کی ہے کہ اگر میں آنکھوں کو بند رکھنے پر قادر ہوتا تو تصویر مکمل ہوجاتی۔ تخیل کے اس انداز نے ظفر کے شعر کے مفہوم کو وسعت دینے کی گنجائش نکال لی۔

مومن نے اپنے پسندیدہ فارسی شعراء کے کلام پر تضمین کی ہے۔ انھوں نے مخمس مثلث اور مسدس کی شکلوں میں فارسی اشعار کو تضمین کرکے میر، سودا، اور نظیر کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ غزلوں کی تضمین کے علاوہ انھوں نے کہیں ایک شعر اور کہیں ایک مصرعے پر کئی بند تضمین کے لکھ کر اپنی جدت ادا کا جوہر دکھایا ہے۔ عرفی شیرازی کی ایک غزل کے ایک شعر پر مثلث کی طرز میں تضمین کی ہے جو پیش کی جاتی ہے۔

حیراں ہوں دیکھ ربط گل وشبنم اے ہزار
بے درد رابہ صحبت ارباب دل چہ کار
خندیدہ آشنا نا بود باگریستن

مومن نے اپنے اردو کے مصرعے کی مدد سے فارسی شعر کو نئی معنویت دے دی۔ عرفی کے شعر کا تو مفہوم یہ ہے کہ ہنسنے والا رونے والے کا ساتھ نہیں دیتا۔ مومن مگر گل وشبنم کا ربط دیکھ کر حیران ہیں۔

بہادر شاہ ظفر نے ہر مقبول عام رائج الوقت صنف سخن میں اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ ظفر کی تضمین نگاری ان کے رنگ سخن کی آئینہ دار ہے۔ ظفر کے کلام میں تضمینوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ میر کی دو غزلیں، اور سودا کی ایک غزل ظفر کی تضمین سے

آراستہ ہوتی ہے۔ میر کی دونوں غزلیں میر کی نمائندہ غزلیں ہیں اور چھوٹی بحر میں ہیں۔ ظفر کی زبان کی سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ تضمین کا حق ادا کیا ہے۔

جرم ثابت ہوا ہے کیا ہم پر
نہیں کھلتا یہ ماجرا ہم پر
روز ایک ظلم ہے نیا ہم پر
اے بتو اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندہ خدا ہیں ہم

اس شعر کی تضمین میں ظفر کے تیسرے مصرعے نے میر کے شعر کی تاثیر میں اضافہ کردیا ہے۔ بڑی مربوط اور برجستہ تضمین ہوئی ہے۔

امیر مینائی دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام میں ان کی تضمین کا فن پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ محسن کاکوروی کے قصیدہ کو امیر مینائی نے اپنی تضمین کی مدد سے مخمس کردیا۔ مضمون آفرینی اور زور بیان میں محسن کاکوروی کی لے سے لے ملادی ہے۔

مخمس تیری پانچوں انگلیوں کا ایک خاکا ہے
رباعی چار ابرو کا مقرر سادہ نقشا ہے
جو رنگیں قطعہ ہے یاقوت لب کا ایک ٹکڑا ہے
تری زلف رسا کا شعر اک ادنیٰ سا لٹکا ہے
کرشمہ ہے غزل تیری غزال چشم اسود کا

داغ کے کلام میں بھی تین تضمینیں ملتی ہیں۔ داغ نے والی رامپور ناظم، سعدی، اور اپنی غزل پر تضمین کی ہے۔ شیخ سعدی کی بہت مشہور غزل پر داغ نے بہترین تضمین کی ہے۔

ثانی نظارہ روئے تو کو
جلوہ دیدار محشر ہو تو ہو
کب ملا یہ دن کلیم وطور کو
اے تماشہ گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

داغ نے تضمین کے لیے بڑی پر لطف گنجائش نکالی۔ تینوں مصرعوں میں زور تخیل اور طرز ادا کی کار فرمائی قابل داد ہے۔

بیسویں صدی میں ہندستان کے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، معاشی اور ادبی صورت حال کے ساتھ تضمین کی روایت میں تبدیلی آئی۔ اس عہد کے شعراء نے تضمین کے فن کو بالکل نئے انداز سے برتا ہے۔

شبلی نے اپنی قومی اور اصلاحی نظموں میں فارسی کے مشہور اشعار تضمین کر کے نہ صرف نظموں کی تاثیر کو بڑھایا بلکہ تضمین کے قدیم فن کو وسعت دی اور یہ ثابت کردیا کہ تضمین کا فن اثر آفرینی اور ایجاد معانی کے کیسے کیسے امکانات کا حامل ہے۔ اب تضمین کا فن خمسہ کے روایتی طلسم سے آزاد ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لانے کے نئے نئے اسالیب تلاش کرنے لگا۔ شبلی کی نظم "سر آغا خان کا خطاب ترکوں سے" اس نئی طرز کا سنگ میل ہے۔ یہ نظم جنگ بلقان کے زمانے میں لکھی گئی۔ یہ نظم سر آغا خان کے اس مضمون کا طنزیہ جواب ہے جس میں انھوں نے ترکوں کو یہ صلاح دی تھی کہ وہ سرزمین یورپ کو چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تاکہ وہ یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ اس مضمون پر مسلمان بہت برہم تھے اور ان کے وقار کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔

شبلی نے اس نظم میں بڑی فنکاری سے آغا کے مضمون کے تمام مشوروں کو نظم کرنے کے بعد حافظ کا یہ شعر

پدرم روضہ رضواں بدوگندم بفروخت
نا خلف باشم اگر من بہ جوئے نفروشم

پر اپنی نظم ختم کر کے طنز کے وار کو بھرپور بنا دیا ہے۔

اقبال نے فارسی کے برگزیدہ شعرا کے اعلا ترین اشعار پر تضمین کی ہے۔ اقبال کے اس شاعرانہ عمل سے تضمین کے فن کی اہمیت پر مہر تصدیق ہوگئی ہے اور یہ بھی ثابت ہوگیا ہے کہ اقبال کسی مشہور اور بلند پایہ شاعر کی شہرت کے سہارے اپنی ناموری نہیں چاہتے۔ اقبال روایت پرست شاعروں کی طرح قافیہ پیمائی کے قائل نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری کا تصور بھی اردو شاعری کی روایت سے مختلف ہے۔ وہ شاعر کو دیدہ بینائے قوم سمجھتے ہیں اور قوم کے درد میں آنسو بہانے کو شاعری کا مقدس فریضہ قرار دیتے ہیں۔ شعری روایت کو توسیع دے کر قدیم اصناف کو جدید تر خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنا دینا اقبال کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے جس طرح پرانی علامتوں کو نئے معانی دیے اسی طرح بعض قدیم اسالیب کو بھی نئی معنویت کے ابلاغ کا ذریعہ بنایا۔ تضمین میں کسی رمزیت کو نئی توجیہہ اور نئی تعبیر کا حامل بنا دینا کمال فن سمجھا گیا۔ اقبال نے اپنی نظموں میں اس فن کا ایسا جادو جگایا ہے کہ اس کی نظیر اردو شاعری کی تاریخ

میں نہیں ملتی۔ فارسی اساتذہ کے اشعار کو اپنی نظم کے اشعار سے اس طرح پیوست کیا ہے کہ اگر اس نظم سے وہ شعر ہٹا دیا جائے تو نظم ناتمام معلوم ہوتی ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں اقبال کی نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" پیش کی جاتی ہے۔

یہ نظم غنی کاشمیری کی مشہور غزل کے مقطع پر تضمین ہے

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

یہ نظم بھی قطعہ کی صورت میں ہے اور اس کے اشعار غنی کے شعر کے دوسرے مصرعے کے ہم قافیہ ہیں۔ غنی کے شعر کی رمزیت کی اثر آفرینی کے امکانات کو بروئے کار لاکر پیر کنعاں اور زلیخا کی علامتوں کو نیا مفہوم دے دیا ہے۔ یہ نظم صرف ایک تضمین ہی نہیں ہے فکری اور فنی اعتبار سے ایک تخلیقی کارنامہ بھی ہے۔ اقبال نے اس نظم میں مسلم نوجوانوں کو ان کے شاندار ماضی کی یاد دلائی ہے۔ معنی خیز ترکیبوں کی مدد سے نظم کی ابتدا میں اسلامی شعار اور کردار کی تصویر پیش کی ہے۔ چوتھے شعر میں حافظ کی مشہور غزل کے بہت مشہور مصرعے کی اس کاریگری سے تضمین کی ہے کہ غزل کی معروف علامتوں کا مفہوم یکسر بدل کر رہ گیا۔ الفقر فخری کی دلنشیں تفسیر غزل کی زبان میں پیش کردی۔ اصلاحی نظم میں ایسی شعریت پیدا کردینا اقبال کا کمال ہے۔ بحر کی نغمگی سے اشعار گنگناتے ہیں۔

یورپ میں اقبال کو اپنے اسلاف کی وہ کتابیں جب نظر آئیں جن سے ظلمت یورپ نے نور دانش حاصل کیا تو ان کا دل تڑپ اٹھا۔ اس درد و کرب کی ترجمانی غنی کے شعر کی مدد سے جیسی بھرپور ہوئی ہے کہ کسی اور پیرایہ اظہار سے ممکن ہی نہ تھی۔

شبلی اور اقبال سے متاثر ہو کر جوش نے بھی اپنی نظموں میں سعدی، حافظ، صائب اور غالب کے فارسی اشعار اور مومن کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے۔ جوش کی نظموں میں تضمین کا انداز شبلی اور اقبال سے مختلف ہے۔ جوش نے تضمین میں فارسی شعر کی شرح تفسیر کے پہلو پر زیادہ توجہ دی ہے۔ نئی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کم سے کم ہے جوش کی نظموں کا موضوع بھی رومانی ہے اور فارسی کا شعر بھی غزل کا ہے۔ جوش نے اپنی قادر الکلامی سے تضمین شدہ شعر کو اپنی نظم میں اس طرح کھپا دیا ہے کہ کہیں سے پیوند کاری نہیں معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً "تسلی" جوش کی ایک مختصر سیاسی طنزیہ نظم ہے۔ اس میں ارباب وطن کی بزدلی پر طنز کیا ہے اور حافظ کے اس مشہور شعر کو تضمین کرکے شعر کو سیاسی معنویت دے دی ہے۔ یہ مختصر نظم جوش کے حسن تضمین کی بڑی کامیاب مثال ہے۔ حافظ کا شعر ہے

شہپر زاغ وزغن، شایان قید وبند نیست
ایں کرامت ہمو شہباز وشاہیں کردہ اند

(چیل کوؤں کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ ان کے پیر باندھ کر انھیں قید کیا جائے۔ یہ شرف تو شہباز و شاہین کے حصہ میں آیا ہے)۔

جوش نے اپنی نظم میں ہندستان کی غیریت قومی کو ابھارنے کے لیے طنز کا وار کیا ہے اور اہل وطن کو یہ بتایا ہے کہ تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے حکومت تمھیں گرفتار نہیں کرے گی۔ گرفتار وہ لوگ کیے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خطرہ ہو۔ اس نظم میں حافظ کے شعر کی برجستہ تضمین پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا تھا۔

بزدلو! تم کیوں سیاسی کشمکش سے ہو اداس
ہاں تمھارے بال وپر کو چھو نہیں سکتی کمند
گلستاں میں رخصت پرواز حاصل ہے تمھیں
ہمت صیاد کرسکتی نہیں تجھ کو پسند
"شہپر زاغ وزغن، شایان قید وبند نیست
ایں کرامت ہمو شہباز وشاہیں کردہ اند"

اکبر الہ آبادی نے اپنے طنز کے وار کو بھرپور بنانے کے لیے اکثر تضمین کا سہارا لیا ہے۔ ان کی ظریفانہ شاعری میں تضمین کی بڑی پر لطف مثالیں ملتی ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی تضمین کا کمال ان قطعات میں نظر آتا ہے جن میں اکبر نے اپنی نظم کو فارسی کے کسی مشہور شعر پر تمام کیا ہے۔

سرسید تحریک اور اس کی مخالفت کے زمانے میں قدیم اور جدید کی کش کش نے مسلمانوں کو جس دوراہے پر لاکر کھڑا کردیا تھا اس صورت حال کی تصویر ایک قطعہ میں پیش کرتے ہوئے اس کش کمش کی شدت کو نمایاں کرنے کے لیے اکبر نے فارسی غزل کے ایک مشہور شعر کو اپنے اشعار میں اس خوبی سے ضم کیا ہے کہ گویا غزل کا یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ فارسی کا شعر ہے

غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ وفرقت لیلیٰ

(مجنوں کی جان کے لیے دو طرح کے عذاب ہیں۔ لیلیٰ سے ملنا بھی مصیبت ہے اور نہ ملنا بھی تکلیف دہ)۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر

تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں
خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلیٰ وفرقت لیلیٰ

ڈی کے ابتدائی نقوش اودھ پنچ میں ملتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے تضمین کے فن سے کام
لے کر سنجیدہ کلام کو مزاحیہ بنادیا ہے مثلاً

پہن لے سایہ مری جاں اتار کر پشواز
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز

دو کے کامیاب پیروڈی نگاروں کے جو کارنامے ہمارے سامنے ہیں ان میں تضمین کے فن کی
یگری صرف چند ممتاز پیروڈی نگاروں کے کلام میں ملتی ہے۔

دلاور فگار نے اقبال کی نظم شکوہ کی پیروڈی لکھی ہے۔ دلاور فگار کی پیروڈی میں تحریف
تضمین دونوں کا امتزاج ملتا ہے۔ اس نظم کے پہلے بند کا پانچواں مصرع اقبال کا ہے۔ دلاور
ر کی پیروڈی کا عنوان ہے "ٹیچر کا شکوہ"۔

کیوں غلط کاربنوں فرض فراموش رہوں
طعنے بیگم کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
کیوں نہ تنخواہ طلب کرکے سبکدوش رہوں
ہم نوا میں کوئی بدھو ہوں کہ خاموش رہوں
جرات آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ تنخواہ کا خاکم بدہن ہے مجھ کو

ر فگار نے اس پیروڈی میں اقبال کے اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے بہت معمولی سی تحریف
ے پیروڈی کا جادو جگادیا ہے۔ اقبال کے مصرعے میں گل کی جگہ بدھو رکھ کر پورے بند کو اقبال
ے مصرعے سے ہم آہنگ کردیا۔

رسالہ ہندستانی الہ آباد (۱۹۳۱ - ۱۹۴۸) سے انتخاب

...و ادب

مجموعے میں ظفر الاحسن لاری، عبد السلام ندوی
...اب اکبر آبادی، گنپت سہائے سریواستو، رفیق حسین
...ت دیال ورما، سید مبارز الدین احمد رفعت،
...ں پرشاد وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت /۵۰ روپے

محمد اجمل خاں، کرشن پرشاد کول، تارا چند وغیرہ کے
اہم ترین مضامین کا۔ قیمت /۴۰ روپے

...دو لغت

...س مجموعے میں سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر
...یب اشرف ندوی، عبد الباری آسی، محمد اجمل
...ں، سلیم جعفر، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اور نعیم الرحمن
...ہ اہم مضامین شامل ہیں۔ قیمت /۴۰ روپے

...ادبی مشاہیر کی تحریریں

...ر، سرشار، جلال، اقبال، اصغر گونڈوی، محمود
شیرانی، ٹیگور، سروجنی نائیڈو پر لکھے ہوئے مضامین
...ز ان ادیبوں میں سے اکثر کے لکھے ہوئے مضامین
...س گلدستے میں شامل ہیں۔ قیمت /۷۰ روپے

...ردو ہندی ہندستانی

یہ مجموعہ ہے اطہر علی، سید ابو القاسم، سعید انصاری

ہندی ادبیات

اس مجموعے میں نور الحسن نیر کاکوری، طاہر حسن
علوی، اقبال ورما، سید رشید الحسن، کشتہ قادری
اور محمد ضیاء الدین کے مضامین شامل ہیں۔
قیمت /۶۰ روپے

تاریخ

اس مجموعے میں آغا مہدی حسین، بینی پرشاد،
بنارسی پرشاد سکسینہ، سید مقبول احمد صمدنی
محمد تقی احمد، پریاگ دیال، شوکت تھانوی، پروفیسر
عبد الباسط، حکیم شمس اللہ قادری، اور ایچ، اے
آر، گب کے مضامین شامل ہیں۔ قیمت /۶۰ روپے

سائنس

اس مجموعے میں شبیر احمد غوری، رفعت حسین
صدیقی، صدر الدین عظیم، امداد حسین خاں، مقبول الرحمن
محمد امین عباسی، راغب بدایونی، جعفر حسن، محمد
ذکی الدین اور پروفیسر منہاج الدین کے اہم ترین
مضامین شامل ہیں۔ قیمت /۶۰ روپے

ہندستان میں قومی یکجہتی کی روایات

بی۔ این۔ پانڈے

آزاد ہندستان کا مورخ، غلام مورخوں کے بوجھ کب تک اٹھائے گا۔ یہ سوال کئی ذہنوں میں اٹھا مگر جس دردمندی اور دلسوزی سے بشمبھر ناتھ پانڈے نے اسے اپنا مشن بنایا اس کی کوئی مثال ملنا مشکل ہے۔

قیمت: -/۵

ایک غیر معمولی لیکچر

جائزے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مضامین گجرال

مصنف: اندر کمار گجرال
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۲۲ روپے صفحات: ۱۳۶
ناشر: ادارہ روزنامہ سیاست، حیدرآباد

"مضامین گجرال" میں جناب اندر کمار گجرال صاحب کے مختلف مضامین اور خطبات ہیں۔ روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد نے انھیں یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ سیاست داں اور وزیر کی حیثیت سے تو گجرال صاحب کو ساری دنیا جانتی ہے لیکن اردو والے انھیں اپنا ہمدرد، سرپرست اور محسن بھی سمجھتے ہیں۔ اور ان کا نام نہایت عزت اور احترام سے مزید اس لیے بھی لیتے ہیں کہ گجرال صاحب نے اردو کے فروغ میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ گجرال کمیٹی میں اردو والوں کے جائز مطالبات کی ترجمانی بھی کی۔ کتاب کے مضامین کو پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ گجرال صاحب کے یہاں نئی روش اور نئے تقاضوں سے مقابلے کی خواہش ہے اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کی تگ و دو ہے۔ یہ کتاب گجرال صاحب کے اسی انواع کے مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بہت سی سیاسی، ادبی اور سماجی محفلوں کے لیے لکھے تھے۔ اس میں شامل مضامین کی تعداد سولہ ہے جن میں اردو، ادب، سیاست اور سیاحت بطور خاص نظر آتے ہیں لیکن ان مختلف مضامین میں جو ایک شے مشترک ہے وہ گجرال صاحب کا مخصوص نظریہ ہے جس میں وہ نہ صرف ہندستان بلکہ پورے ایشیا کے لیے فکرمند نظر آتے ہیں۔ ان مضامین میں "ہند پاک مفاہمت..." "افغانستان اور ہمارے مفادات" "کابل میں چند دن" "ہندستان کی سالمیت" "ہندستان میں اردو کا مسئلہ" "بہ یاد فیض" "سوویت یونین کا زوال" اور "فسادی جا چکے اپنے گھروں کو" وغیرہ مضامین شامل ہیں جن سے گجرال صاحب کے نظریاتی لگاؤ کا علم ہوتا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امن و سکون اور خیرسگالی سے مایوس نہیں جس کا اظہار اقبال کے اس مصرعے سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے کتاب کے ٹائٹل کی پیشانی پر رقم کیا ہے یعنی "ذرا نم ہو تو یہ مٹی....." ان مضامین سے ایک تاثر یہ ابھرتا ہے کہ گجرال صاحب

کسی ایک ملک میں بھی سیاسی بحران کو باقی تمام ملکوں کے لیے نقصان دہ تصوّر کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ پورے مشرقی خطہ میں سیاسی استحکام کی ضرورت ہے۔ اس نظر سے "افغانستان اور ہمارے مفادات" گجرال صاحب کا نادر مضمون ہے جو ۱۹۹۱ء کے آس پاس تحریر ہوا اس میں ایک اہم خیال یہ بھی ہے کہ تمام خطہ میں امن قائم رہنے کے لیے افغانستان میں سیاسی استحکام کی ضرورت ہے۔

کتاب کے شروع میں زاہد علی خاں کا لکھا ہوا مختصر دیباچہ اور پھر اردو کے معروف طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب کا دلچسپ اور شگفتہ خاکہ بھی شامل ہے جو گجرال صاحب کی بڑی دلکش تصویر پیش کرتا ہے۔ گویا یہ خاکہ اردو والوں کی نظر سے گجرال صاحب کا بھرپور تعارف ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

"گجرال صاحب کی یہ ادا مجھے بہت پسند ہے کہ سیاست داں ہونے کے باوجود ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کی صحبت میں اپنے آپ کو زیادہ مطمئن اور مسرور پاتے ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی ہے۔" ص ۱۳

"بیاد فیض" گجرال صاحب کا خالص ادبی مضمون ہے جس میں انھوں نے فیض احمد فیض کی صحبتوں اور قرابتوں کا ذکر بڑے پُر لطف انداز میں کیا ہے اور فیض سے اپنے مراسم کی یادوں کو محفوظ کیا ہے۔ یہ مضمون اردو والوں کے لیے خاص طور پر کشش کا باعث بنے گا۔ کتاب میں کاغذ نہایت سفید اور چیک دار استعمال ہوا ہے۔ کتابت کمپیوٹر پر ہے طباعت بہت صاف ستھری ہے۔

تلاشِ میر

مبصر : حکیم محمد حسین خاں شفا
مصنف : پروفیسر نثار احمد فاروقی۔
قیمت : 65 روپیہ
ناشر : انجمن ترقی اردو دہلی

اس کتاب میں پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کے میر تقی میر پر لکھے ہوئے ۹ مضامین ہیں۔ جن میں نثار احمد صاحب نے میر کی زندگی اور فن کے مختلف گوشوں کو عالمانہ و محققانہ انداز سے متعارف کرایا ہے۔ میر اردو زبان کی آبرو اور اردو شاعری کے خاص طور پر اردو غزل میں خدائے سخن ہیں۔ انکی زبان و لہجہ دل کو چھو لینے والا ہے۔ میر کی "انا" اور "شدت احساس" نے ان کو عظیم فنکار بنادیا ہے وہ کہتے ہیں:

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے | ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

اس کتاب میں حرف آغاز کے عنوان سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب اور حرف ابتدا کے عنوان سے نثار صاحب نے بڑی فکر انگیز باتیں تحریر کیں ہیں۔ اس مجموعہ کا پہلا مضمون میر کا آرٹ ہے جس میں نثار صاحب نے میر کی شاعری کا جمالیاتی پہلو اور رس پیش لیا ہے۔ اس کے ہر ہر جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استاد طلبہ کو علم گھول کر پلا رہا ہے۔
اس مقالہ میں وہ سب داخلی و خارجی عناصر یکجا کر دیے گئے ہیں جن پر شعر کے اثر و عظمت کا دارومدار ہوتا ہے۔
اس مقالہ میں میر کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اصلی مقصد طلبہ میں تفہیم شعر کا شعور پیدا کرنا ہے۔ اور دراصل یہی مقالہ حاصل کتاب ہے۔
دوسرا مقالہ مطالعہ میر کے امکانات ہے۔ چونکہ میر کی عظمت کے اعتراف کے باوجود اہل قلم نے میر پر بہت کم توجہ دی۔ اس مقالہ میں نثار صاحب نے وہ اکثر پہلو اجاگر کیے ہیں جن پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا کتنا حق اردو زبان پر باقی ہے اور اس موضوع پر نثار صاحب کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔
کسی بھی فنکار کی تفہیم میں اس کے عہد و احباب کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے خاص طور پر میر کی ۹۰ سالہ زندگی بہت ہی پر آشوب رہی جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

میر صاحب زمانہ نازک ہے | دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

چونکہ میر کی اپنے معاصرین کے بارے میں اچھی رائے نہیں تھی۔ ادھر احسان مندی کا جذبہ بھی ان میں نہیں تھا جس کی مثالیں ان کی شاعری و تصانیف میں کثرت سے ہیں۔ ان حالات میں میر صاحب کے احباب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اس سلسلہ میں بطور نمونہ نثار صاحب نے سید سعادت علی امروہوی اور انعام اللہ خاں یقین پر مقالات تجویز کیے ہیں جو تحقیقی سوانح نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ ان دونوں حضرات کے سلسلے میں کوئی ماخذ نثار صاحب کی نظر سے اوجھل معلوم نہیں ہوتا۔ میر تقی میر کو میر مجلس شعراء ان کی غزل گوئی نے بنایا ہے جس کے بارے میں میر کا خیال ہے۔

زمین غزل ملک سی ہوگی | یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
جانا نہیں کچھ جز غزل اکبر کے جہاں میں | کل میرے تصرف میں یہی قطعہ زمین تھا

اس کے ساتھ ساتھ میر کی مثنویات بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں نثار صاحب

نے اس کتاب میں تین مضامین مثنویات پر تحریر کیے ہیں (۱) میر کی مثنوی شعلہ شوق کا ماخذ (۲) مثنوی دریائے عشق (۳) میر کی مثنویاں۔ میر کی ۷ ۳ مثنویات کا پتہ چلتا ہے ان مضامین میں میر کی مثنوی نگاری کے فن اور ماخذ سے بہت فاضلانہ بحث کی ہے اور اس فن میں بھی میر کا مقام متعین کیا ہے۔ میر کی نگارشات کا نثری حصہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے اور نثار صاحب کو اس عہد کے نمایاں میر شناسوں میں معزز مقام اسی کی وجہ سے ملا ہے۔ نثار صاحب نے ذکر میر کا اردو ترجمہ میر کی آپ بیتی کے عنوان سے کیا اور میر کے تذکرہ نکات الشعراء کا تحقیقی جائزہ لیا۔ اس مجموعے میں آٹھواں مضمون 'نکات الشعراء کی ایک اور روایت' اس سلسلہ کی کڑی ہے۔ نثار صاحب نے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ایک نادر مخطوطہ دریافت کیا اور اس کا عصری انداز میں تذکرہ نکات الشعراء سے مقابلہ کر کے اختلافات کو تحریر کیا ہے یہ مضمون مخطوطہ شناسی کا اچھا نمونہ ہے۔

اس کتاب کا آخری مضمون تذکرہ معشوق چہل سالہ ہے جو نثار صاحب کی میر کی مزاج شناسی کا اچھا نمونہ ہے میر تقی میر کے بارے میں قاضی عبدالودود صاحب نے تحریر کیا تھا میر صاحب نہ تو مصنف ہیں نہ راست گفتار ان کا حافظہ بھی قوی نہیں ہے میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء کو اردو شعراء کا پہلا تذکرہ قرار دیا ہے جبکہ ان کے پیش نظر تاریخ کا تذکرہ مخزن نکات تھا اور اس پر انھوں نے تذکرہ معشوق چہل سالہ مرتبہ خاکسار لکھ کر پھبتی کسی ہے۔

مجموعی طور پر نثار صاحب ایک ممتاز میر شناس اور ان کی یہ کتاب میریات میں شاہکار ہے۔ اگرچہ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۷۶ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا تھا جس کی قیمت ۱۱ روپیہ تھی اب یہ بغیر نظر ثانی کے شائع ہوا ہے جبکہ اس پر نظر ثانی کی ضرورت تھی اور میر کی زندگی پر ایک مضمون کا اضافہ بہت ضروری تھا

کھلے خطوط

پرکاش کپور، ۸/۷- ایم- آئی- جی پدم نابھ پور
ـ ـ ۱۰۰۱ ۹۱ (مدھیہ پردیش)
جون ۹۶ء کے کتاب نما میں ڈاکٹر عبدالمغنی
ب نے استدلالی نقطۂ نظر سے علامہ اقبال
فکروفن کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے علامہ
ل کے آخری مجموعہ کلام "ضرب کلیم" کی نظم
"متاعِ امید" اور ان کی کتاب "جاوید نامہ"
، حوالہ سے علامہ کے فکروفن پر روشنی ڈالی
ہے۔ المیہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں
صرف عام قارئین کے ذہن میں بلکہ کئی دانشورو
کے ذہن میں بھی غلط فہمیاں ہیں۔ کئی نقادوں
دانشوروں نے ان کی فنی اور فکری تخلیقات کا
گہرائی سے مطالعہ کیے بغیر ان کے بارے میں اظہار
خیال کیا ہے بلکہ کئی بار تو ایسا محسوس ہوتا ہے
کہ وہ اقبال کے بارے میں متعصب ہیں۔ علامہ
اقبال محض ایک شاعر و سیاست داں ہی نہیں
تھے بلکہ عالمی مفکر تھے۔ جناب ڈاکٹر عبدالمغنی
نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "اقبال کے فکروفن
پر بے جا تنقید کرنے والے کم علمی اور کم ظرفی
دونوں کے شکار ہیں۔ وہ ایک قسم کی نفسیاتی
الجھن میں مبتلا ہیں۔ اقبال کے کلام میں جس
رفعت و شوکت، قوت و طاقت، عزم و حوصلہ
باہمت و جرأت کا پیغام ہے۔ وہ مریضانہ

ذہنیت کے حامل لوگوں کو پسند نہیں...."

مئی ۱۹۹۶ء میں مجھے دہلی یونیورسٹی میں علامہ اقبال پر ایک سمینار میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ جس میں کئی جانے مانے ادیبوں و دانشوروں نے حصہ لیا اور علامہ اقبال کے فکروفن اور شخصیت پر کئی نہایت اچھے اور معلوماتی مقالے پڑھے گئے۔ جن میں علامہ اقبال کے فکروفن پر مختلف پہلوؤں سے و نقاطِ نظر سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ بعد میں بحث کے دوران جناب گوپی چند نارنگ صاحب نے ایک نہایت ہی اہم بات کی طرف توجہ دلائی۔ انھوں نے کہا کہ "ہندستان میں علامہ اقبال کے بارے میں اور پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں Re-evaluation اور نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور دونوں ملکوں کے ادیبوں و دانشوروں کا فرض ہے کہ اس تجویز پر دھیان دیں"، میرے خیال میں دونوں ملکوں کے ادیبوں و دانشوروں کو ڈاکٹر نارنگ کی اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے بعض ادبی حلقوں میں ابتدا کی جا چکی ہے اور یہ باعث اطمینان ہے۔

میں جناب عبدالمغنی کی اس توقع کا بھی حامی ہوں کہ "جیسے جیسے مغرب کی ذہنی غلامی کا طلسم ٹوٹتا جائے گا اور فکر و نظر کی آزادی و وسعت۔ حقیقت پسندی و حق پسندی کا زیادہ مطالبہ کرے گی۔ مطالعۂ اقبال کی جہت بہتر سے بہتر ہوتی جائے گی۔ اور مفکر شاعر کی قدر شناسی

عالم گیر پیمانے پر بڑھتی جائے گی۔"

اب میں اسی شمارہ میں شامل محترمہ رفیعہ شبنم عابدی کے جناب رفیق زکریا کی کتاب کے "جائزہ" کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں اس جائزہ میں علامہ اقبال کے بارے میں کچھ نہایت ہی اہم باتیں خاص کر ان کی شخصیت اور نجی زندگی کے بارے میں لکھی گئی ہیں جن کا ہم کو پہلے علم نہیں تھا۔ دوسرے رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ نے چند نہایت اہم حوالے دیے ہیں جو نہایت اہم معلوماتی اور مدلل ہیں لیکن ایک دو جگہوں پر انھوں نے جو حوالے دیے ہیں۔ ان سے کچھ تضاد اور کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے"۔ اس پورے متن میں ڈاکٹر صاحب ایک ایماندار مورخ کی حیثیت سے اقبال کی زندگی کے ان پہلوؤں کو بڑے جرأت مندانہ انداز میں بے نقاب کرتے ہیں۔ جن پر اقبال کے چاہنے والوں نے پردے ڈال رکھے ہیں مثلاً

۱۔ . . . .

۲۔ انھوں نے مغرب کی زبردست مخالفت کی لیکن برطانوی راج کی مخالفت میں کچھ نہیں کہا۔

۳۔ . . . . ۴ . . . .

۵۔ ایک طرف وہ عوام کی برہمی کے باوجود لیٹر پیڈ پر "سر شیخ محمد اقبال"، کے الفاظ لکھتے ہے۔ دوسری طرف تحریروں اور تقریروں میں حکومت برطانیہ پر تنقید کرنا نہ چھوڑا۔

اب جو نمبر ۲ میں لکھا ہے نمبر پانچ میں اس کے بالکل الٹ ہے۔ اس تضاد کے بارے میں رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ وضاحت کریں گی؟

ہماری نظر میں علامہ اقبال کی نجی ازدواجی زندگی کی انسانی کمزوریاں بطور شاعر و مفکر ان کی عظمت کو کسی طرح بھی کم نہیں کرتیں بلکہ عام انسانی پیکر میں اپنی کمزوریوں کے ساتھ وہ ہمیں اور بھی زیادہ عظیم انسان اور بڑے مفکر اور شاعر نیز عوام سے نزدیک اور ہر دلعزیز دکھائی دیتے ہیں۔

اب کچھ ڈاکٹر ناشر نقوی کے اشاریہ کے متعلق۔

ڈاکٹر ناشر نقوی صاحب کا اشاریہ "کچھ اردو اور پنجاب کے تعلق سے"، میں نے نہایت غور اور دلچسپی سے پڑھا۔ اشاریہ نہایت ہی معلوماتی ہے لیکن پورا پڑھنے کے بعد کچھ تشنگی کا احساس ہوتا ہے وہ کچھ اور پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتے تھے اور دوسرے سکھ گوروؤں اور پنجابی صوفی فقیروں کی شاعری کا بھی ذکر کر سکتے تھے۔

جناب ناشر نقوی نے گورو نانک دیو جی کے بارے میں لکھا ہے .... "گورو گرنتھ صاحب میں ان کا جو کلام شامل ہے اس میں اس وقت کی مروجہ اردو کے نمونے جگہ جگہ نظر آئیں گے۔"

یہ بالکل درست ہے لیکن حیرانی کی بات ہے کہ اردو زبان کے نقادوں نے پہلے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اردو زبان کی تاریخ کے مورخوں نے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے لیکن لگتا ہے کہ اب اردو والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ ناشر نقوی صاحب کا ہی ایک جامع مضمون "بابا گورو نانک دیو کی شاعری"، ماہنامہ

نیا دور لکھنؤ" کے دسمبر ۹۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے جس میں گورونانک دیو جی کی شاعری کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے"..... بابا نانک کو ان کی تصنیفات "جپ جی" "سدھ گوشٹی" اونکار، آسادی وار، ملار، بیمں، ماجھ دی وار، اور سودن آرتی، کے علاوہ گورو گرنتھ صاحب میں شامل ۹۴۴ شبد نیز "سہ حرفی" اور "حاضر نامہ" جیسی تاریخ ساز نظموں کی بنیاد پر اردو کا عظیم شاعر ماننا ضروری ہے....."

امید ہے ناشر نقوی صاحب اس ریسرچ کو آگے بڑھاتے ہوئے گورونانک دیو جی کے علاوہ گورو ارجن دیو جی۔ گورو تیغ بہادر جی، گورو گوبند سنگھ اور دوسرے گورو صاحبان کی بانی اور پنجابی صوفی فقیروں بابا شیخ فرید۔ بلھے شاہ وغیرہ وغیرہ کی شاعری کا بھی جائزہ لیں گے۔ بابا شیخ فرید کا کلام گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔

پنجابیوں کا اردو سے کچھ عجیب سا رشتہ ہے۔ بقول آنجہانی پروفیسر کنہیا لال کپور" اردو پنجابیوں کی مادری زبان نہیں ہے۔ محبوبہ ضرور ہے جس سے انھوں نے ڈٹ کر محبت کی ہے جنون کی حد تک عشق کیا ہے.....، سعادت حسن منٹو کہا کرتے تھے۔ میں پنجابی بولتا ہوں لیکن لکھتا اردو میں ہوں۔ تقسیم ملک سے پہلے دہلی سے لے کر کشمیر کی سرحد تک ادب اور میڈیا کی زبان اردو تھی۔ لاہور سے ایک درجن سے زیادہ اردو روزنامے شائع ہوتے تھے (جن میں صرف ایک اخبار "زمیندار" کے مالک و مدیر مسلمان تھے۔ باقی سب اخباروں کے مالک و اڈیٹر ہندو۔ سکھ تھے۔ دو اخبار آریہ سماج والوں کے تھے۔ ایک سناتن دھرم پرتی ندھی سبھا کا۔ ایک اکالی سکھوں کا، ایک نیشنلسٹ سکھوں کا) دو درجن سے زیادہ ہفتہ وار و ماہنامے شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالے و اخبار سارے شمالی ہندستان میں پڑھے جاتے تھے اور کئی اخبار کا سرکولیشن ملک میں شائع ہونے والے علاقائی زبانوں کے اخباروں میں سب سے زیادہ تھا۔ یہاں یہ بھی ذکر کرتا چلوں کہ اس وقت لاہور سے صرف دو انگریزی اخبار شائع ہوتے تھے۔ آزادی کے بعد پچاس کی دہائی میں جب ہندی پنجابی کا جھگڑا چل رہا تھا۔ تو پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ یہ پنجابی۔ ہندی کا جھگڑا عجیب ہے۔ اردو اخبار کے ذریعے چل رہا ہے۔

ایک ہی یونی ورسٹی پنجاب یونی ورسٹی تھی۔ جس میں میٹرک تک ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔ زیادہ تر مڈل اسکولوں میں صرف اردو پڑھائی جاتی تھی چونکہ مڈل پاس کو نوکری مل جاتی تھی۔ اس لیے مڈل سے آگے کم ہی لوگ پڑھتے تھے۔ انگریزی صرف بڑے شہروں کے مڈل و ہائی اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ جو لوگ دیہاتوں یا قصبوں کے ورنیکلر مڈل اسکولوں سے پاس کرکے آگے پڑھنا چاہتے تھے۔ ان کو اور دو سال صرف انگریزی پڑھنے کے بعد نویں میں داخلہ ملتا تھا۔ میں خود بھی اسی طرح پڑھا ہوں۔ نچلی کچہریوں، تحصیل

ومیونسپل دفتروں۔ پٹوار خانوں اور تھانوں وغیرہ میں صرف اردو چلتی تھی۔ پرائمری و مڈل اسکولوں کے استاد صرف اردو پڑھے ہوتے تھے۔ انگریزی پڑھے ہونا ضروری نہیں تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے پنجابی زبان کے امتحانات بھی اردو اور گورمکھی دونوں سکرپٹ میں ہوتے تھے لیکن اردو رسم خط کا رواج زیادہ تھا۔ جو ہندو سکھ گورمکھی سکرپٹ جانتے بھی تھے وہ بھی عام طور پر اردو سکرپٹ ہی استعمال کرتے تھے یہ ان کو آسان لگتا تھا۔ کیونکہ ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ آزادی سے پہلے کی جو تعلیم یافتہ نسل پاکستان سے آئی ہے وہ اب بھی اردو کے اخبار ہی پڑھتے ہیں۔ جالندھر کے ایک اردو اخبار کا سرکولیشن ہندستان کے علاقائی زبانوں کے اخباروں میں سب سے زیادہ ہے۔ پنجابیوں کی آزادی کے بعد تعلیم پانے والی نسل اردو سکرپٹ نہیں جانتی لیکن تمام پنجابی اردو شاعری کے دلدادہ ہیں اور غزل گائیکی پنجاب میں بہت ہی ہر دلعزیز ہے۔ غزل گائیکی کو ملک میں پاپولر کرنے میں غزل گائیک جگجیت سنگھ کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ پنجابی زبان کا کم ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جو ساتھ میں تھوڑی بہت اردو شاعری نہ کرتا ہو۔ بھلے ہی وہ اردو سکرپٹ سے ناواقف ہو۔

میں نے اپنی تمام مذہبی کتابیں رامائن، مہابھارت، شریمد بھاگوت پران، بھگوت گیتا گورو گرنتھ صاحب کی بانی کے کچھ حصے جو چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں شائع ہوتے تھے اور دیگر بہت سی دھارمک کتابیں اردو زبان اور رسم خط میں پڑھی ہیں۔ پنجاب اور ہریانہ میں آج بھی کئی شہروں میں اردو کی کوچنگ کلاسز چل رہی ہیں جن سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

ناشر نقوی صاحب کے ہی الفاظ میں اس مکتوب کو ختم کرتا ہوں "باوجود اس کے کہ موجودہ ہندستانی پنجاب میں سیاست کی آندھیاں بہت کچھ اڑا دینے کے درپے ہیں۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ اردو کے تئیں پنجابیوں کے دلوں میں ایک جوت جل رہی ہے" مجھے امید ہے کہ یہ جوت ہمیشہ جلتی رہے گی۔

● ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، صدر شعبۂ اردو بی۔ این کالج پٹنہ یونی ورسٹی۔ پٹنہ

پچھلے کئی مہینوں سے آپ نے اقبال سے متعلق مضامین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ خاصا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ جولائی کے شمارے میں اقبال کے تصور خودی سے متعلق زیڈ۔ ایم۔ خان کا مراسلہ بھی کسی مقالے سے کم نہیں۔ برادرم م۔ ق۔ سلیم نے اپریل ۹۶ء کے شمارے میں شائع شدہ مسعود احمد برکاتی کے مہمان اداریے کی تعریف میں چند جملے لکھے ہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس اداریے کی جس طرح پذیرائی ہونی چاہیے تھی، کسی وجہ سے نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ جون ۹۶ء کے کتاب نما میں 'کھلے خطوط' شائع ہی نہیں ہوئے؟ مسعود صاحب نے دور حاضر کے ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ گرچہ یہ مسئلہ بہت نیا بھی نہیں۔ بر صور

پہلے اقبال نے کتاب خواں، اور صاحب کتاب، کے فرق کی طرف اشارہ کیا تھا اور کلیم الدین احمد نے اپنے ایک مضمون میں اس بات پہ زور دیا تھا کہ کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت Selection ہونا ضروری ہے مگر پچھلی دہائیوں میں ٹی۔ وی اور دیگر الیکٹرونک میڈیا کے سبب یہ معاملہ نئے انداز سے سامنے آیا ہے۔ مسعود صاحب نے اس سلسلے میں درست لکھا ہے کہ آج کل زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرکے "باخبر" کہلانے کے لیے لوگ بے تکان پڑھتے ہیں مگر کچھ حاصل نہیں کرپاتے۔ مطالعے کا شوق اچھی چیز ہے مگر اس نتیجے میں فرسٹریشن کا شکار ہونا یا پھر ہمہ دانی کے خبط میں مبتلا ہوجانا، یہ دونوں ہی صورتیں بُری ہیں۔ پڑھنا سوچ سمجھ کر گہرائی سے پڑھنا اور مطالعے کی روشنی میں درست نتائج تک پہنچنا ہی اچھے قاری کی پہچان ہے۔ ورنہ سطح بینوں کو لعل و گہر کیسے حاصل ہوسکتے ہیں؟

یہ خواہش تو دل میں ضرور پیدا ہوئی کہ کاش مسعود احمد برکاتی صاحب اس موضوع پر کچھ اور تفصیل سے لکھتے مگر ان کی مشغولیات (بحیثیت مدیر و منتظم) بھی مجھے معلوم ہیں، اس لیے ان سے کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ البتہ دوسرے ادیبوں اور دانشوروں کو اس موضوع کے دیگر پہلوؤں پر ضرور لکھنا چاہیے۔

● وصی احمد وصی، کھوریجی کلاں، نئی دہلی ۵۱

کر خاکسار پر کرم فرمائی کی لیکن مطلع میں کتابت کی ایک غلطی ہوگئی ہے اگلے شمارے میں اسے درست کرکے ایک پھر شکریہ کا موقع دیں۔

اب تک حصار ذات سے نکلا نہیں ہے تو
دنیا کا ایک فرد ہے دنیا نہیں ہے تو

● ضیا جبل پوری، اکا ماریڈی۔ اے پی

جون کا شمارہ دیکھا۔ "کچھ اردو اور پنجاب کے تعلق سے"، بنارس میں فارسی ادب کے دو قیمتی آثار، مطالعہ اقبال، اقبال شاعر اور سیاست داں، پسند آئے۔ حصہ نظم میں وسیم مینائی، خورشید اکبر اختر ضیائی، شرون کمار ورما، کرامت بخاری، اور قتیل شفائی مزہ دے گئے۔ کرفیو اور آدمی، اچھا افسانہ ہے۔

● سید فیاض الرحمٰن شارق۔ پٹنہ

کتاب نما ماہ جولائی ۹۶ء موصول ہوا۔ مزید یہ کہ پابندی سے مل رہا ہے۔ موجودہ شمارے میں کتابت اور پروف ریڈنگ کے نقص کے سبب چند جملے اور چند اشعار اپنی موزونیت کھو بیٹھے ہیں۔

مہمان مدیر، خامہ بگوش اور دیگر مشمولات اہمیت کے حامل ہیں۔ رہبر جونپوری کی نظم "جوالا" اور عبدالاحد ساز کی غزل اچھی ہے نظم و نثر کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

عبداللہ کمال صاحب کی "دعا" کے مطلع کا پہلا مصرع ان کی مزید توجہ کا طالب ہے۔ عبداللہ ندیم صاحب کی غزل کے مقطع

اس کا اعلان ہونا چاہیے۔ رضیہ پروین کا چوتھا شعر واضح نہیں ہے اور کچھ یہی حال آخری شعر کا ہے۔

رفیع انصاری صاحب کی "دعا" کے پانچویں شعر کے مصرع اولا کے "ذہن" میں "ہ" متحرک ہو جاتی ہے۔ اسے ساکن ہونا چاہیے۔ دوسرا کتابت کی زد میں آ گیا۔

● رام یتن پرساد یادو۔ مقصود پور، فتوہا، پٹنہ۔

"کتاب نما" کا شمارہ ۷ جولائی ۱۹۹۶ء موصول ہوا۔ شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ بہت ہی اچھا لگا۔ نظموں، غزلوں کے علاوہ دوسرے مضامین نے بھی متاثر کیا۔ افسانوں میں باجی اور کٹا ہوا رشتہ پسند آیا۔ ان افسانوں میں تیزی سے بدل رہی زندگی کا بھیانک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ بے اثر ہو رہے رشتوں کی تصویر کو بہت سنجیدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے افسانے ہندی میں خوب لکھے، پڑھے جا رہے ہیں۔ آپ بھی ایسے چھوٹے چھوٹے افسانوں کو ہر شمارے میں جگہ دیں۔

میرا نام رام یتن پرساد یادو ہے جبکہ نظم کے ساتھ رام سن چھپ گیا ہے۔ امید ہے آیندہ سے اس پر دھیان دیں گے۔ آپ نے میری نظموں کو "کتاب نما" میں چھاپ کر حوصلہ بڑھایا۔ اس کے لیے دل سے شکریہ! "کتاب نما" میری ادبی زندگی کی پہلی پسند ہے۔

ادبی و تہذیبی خبریں

جامعہ اردو (علی گڑھ) کا انتخاب

ڈاکٹر رفیق زکریا چانسلر، اور خلیق انجم وائس چانسلر منتخب

علی گڑھ ۔ ۲۲ جولائی ۱۹۹۶، جامعہ اردو (علی گڑھ) کی مجلس عام کی میٹنگ ۲۰ جولائی ۹۶ کو "اردو گھر" نئی دہلی میں منعقد ہوئی ۔ اس میٹنگ میں جامعہ اردو کے عہدے داروں اور مختلف کمیٹیوں کے انتخابات عمل میں آئے۔ ہندستان کے مشہور، ممتاز دانشور، مفکر، انگریزی اور اردو کے ادیب اور سیاست داں ڈاکٹر رفیق زکریا چانسلر اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری، اردو کے صف اوّل کے نقاد اور محقق ڈاکٹر خلیق انجم وائس چانسلر منتخب ہوئے ۔ انگریزی کے نامور صحافی کلدیپ نیئر پرو چانسلر، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی پرو وائس چانسلر اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ خازن منتخب ہوئے ۔

مجلس عام کے اراکین میں ماہر اقبالیات اور اردو کے ممتاز ترین نقاد اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اور "عوام" کے اڈیٹر شاہد صدیقی، "انقلاب" کے اڈیٹر ہارون رشید، پروفیسر عبد المغنی، رشید حسن خاں، پروفیسر آفاق احمد، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر طیب ابدالی، ایم۔ حبیب خاں، مغیث الدین فریدی، ہارون ایوب، پروفیسر محمد ذاکر، ڈاکٹر عبد العزیز (مبئی) سید عبد العزیز (آگرہ) اسرار اکبر آبادی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، سید ثاقب رضوی۔

اس جلسے میں جامعہ اردو کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے کچھ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ دستور کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر رفیق زکریا، مالی کمیشن کے چیرمین شاہد صدیقی اور پبلیکیشن کمیٹی کے چیرمین پروفیسر جگن ناتھ آزاد وغیرہ منتخب ہوئے ۔

جامعہ اردو ایک امتحانی ادارہ ہے۔ اس سال ایک لاکھ سے زائد طلبہ اس ادارے سے ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل اور معلم اردو کے امتحانات دے رہے ہیں۔

اردو اکادمی دہلی کے سالانہ ایوارڈ کا اعلان

نئی دہلی ۔ ۲۶ جون، اردو اکادمی، دہلی کی گورننگ کونسل کا خصوصی اجلاس آج دہلی سرکار کے وزیر اعلا جناب صاحب سنگھ ورما کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دہلی کے وزیر اعلا دہلی کی تمام اکادمیوں کے بہ لحاظ عہدہ چیرمین بھی ہیں۔ میٹنگ میں علاوہ دیگر امور کے ذیل کے ادبی و علمی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۹۵ء کے کل ہند نوعیت کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لیے جو ۵۱ ہزار روپے مالیت کا ہے اردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کے نام کا اعلان کیا گیا۔ علمی و ثقافتی تحقیق کا ایوارڈ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی کو، اردو صحافت کا ایوارڈ مولانا وحید الدین خاں کو، تخلیقی نثر کا ایوارڈ جناب ضمیر حسن دہلوی کو، اور اردو شاعری کا ایوارڈ جناب امیر آغا قزلباش کو دیا جائے گا۔ اور بہترین استاد (اردو میڈیم) کا ایوارڈ محترمہ شاہین اختر خاں کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمام ایوارڈ ۲۱ ہزار روپے مالیت کے ہیں۔ اردو خطاطی ایوارڈ جو گیارہ ہزار روپے مالیت کا ہے محمد سالم کو دیا جائے گا اسی موقع پر ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی اردو کتابوں پر بھی انعامات کا اعلان کیا گیا۔ چار چار ہزار روپے کے ۱۵ اور دو دو ہزار روپے کے ۷ انعام کل ۲۲ کتابوں پر دیے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے ۔

چار ہزار روپے مالیت کے انعامات

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (مولانا ابوالکلام آزاد) پروفیسر صغرا مہدی (سیر کر دنیا کی غافل) آمنہ ابوالحسن (یادش بخیر) ڈاکٹر محمد شاہد حسین (ڈراما فن اور روایت) ڈاکٹر سید جمال الدین (برطانوی راج میں مذہب اور سیاست) انجم عثمانی (ٹیلی ویژن نشریات)

پروفیسر امیر عارفی (دیپلی کے خطوط اور مضمون کی ڈائری) قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی (سید عابد حسین) پروفیسر شارب ردولوی (تنقیدی مباحث) پروفیسر عتیق اللہ (ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ) سیدہ نسیم چشتی (تعاقب) نور جہاں ثروت (بے نام شجر) عطاالرحمٰن قاسمی (دہلی کی تاریخی مساجد) ڈاکٹر خالد محمود (اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ) عادل اسیر (بچوں کی رباعیاں)

دو ہزار روپے مالیت کے انعامات

ڈاکٹر اسد رضا زیدی (ماہیت الامراض) کرشن پوری (میری راہیں میری منزل) عبدالمعروف خاں (کاسۂ خیال) ابرار کرتپوری (خالق ذوالجلال) شہباز ندیم ضیائی (شہباز) ڈاکٹر توقیر احمد خاں (شعریات بالِ جبریل) مسعود الحق (استاد کی تعلیم و تربیت)

اردو ناشرین ایوارڈ برائے ۹۴ اور ۱۹۹۵ء

معیار پبلی کیشنز (چار ہزار روپے) عاکف بک ڈپو (چار ہزار روپے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (چار ہزار روپے) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی (چار ہزار روپے)

پروفیسر اختر الواسع شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے صدر مقرر

مشہور نوجوان اسکالر، خطیب، مصنف، مترجم اور مختلف سماجی و سیاسی تنظیموں کے روح رواں پروفیسر اختر الواسع کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر بشیر الدین احمد صاحب نے بتاریخ ۲۳ جولائی ۹۶ء تین سال کی مدت کے لیے ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا صدر مقرر کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کے زمانۂ صدارت میں شعبۂ مذکور قابل لحاظ ترقی کرے گا۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اس نئی ذمے داری پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الحسن ندوی شعبۂ عربی کے صدر مقرر

عربی زبان و ادب کے عالم پروفیسر ضیاء الحسن ندوی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب بشیر الدین احمد نے تین سال کی مدت کے لیے شعبۂ عربی کا صدر مقرر کیا ہے۔ ضیاء الحسن ندوی صاحب کی شخصیت، ذہانت و فطانت کی آئینہ دار ہے۔ عربی ادب پر ان کے کئی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف پہلے بھی شعبۂ عربی کے صدر رہ چکے ہیں۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اس نئی ذمے داری پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ موصوف کے زمانۂ صدارت میں شعبۂ عربی مزید ترقی کرے گا۔

ڈاکٹر محمد نعمان شعبۂ اردو کے صدر ہو گئے

ڈاکٹر محمد نعمان سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو کے صدر اور نائب پرنسپل ہو گئے۔ ڈاکٹر نعمان کا نام اب اردو داں حلقے کے لیے نیا نہیں ہے۔ بھوپال سے متعلق آپ کے تحقیقی مقالوں کا مجموعہ "بھوپال ادب کے آئینے میں" ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے تحقیقی مضامین کا ایک اور مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

اساتذہ اردو کی پہلی ڈائرکٹری

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی جانب سے کالج و یونیورسٹی کی تدریس سے وابستہ اساتذہ کی ایک ڈائرکٹری عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ تمام اساتذہ اردو سے التماس ہے کہ اپنا مکمل بائیوڈاٹا مع تصویر، نام، تاریخ و جائے پیدائش، کالج/یونیورسٹی کا نام، رہائشی پتا، تعلیم، تصانیف اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کی مختصر روداد جلد از جلد ارسال فرمائیں تاکہ اردو اساتذہ جامعات ہند کی زیر ترتیب ڈائرکٹری میں شمولیت یقینی ہو سکے۔ صدر شعبۂ اردو۔ دہلی یونیورسٹی دہلی

ایم حبیب خاں کے اعزاز میں ادبی نشست

بدایوں: نامور محقق و نقاد اور انجمن ترقی اردو کے اسسٹنٹ سکریٹری ایم حبیب خاں کی بدایوں آمد پر دفتر سماجی ابر"

گیا۔ جس کی صدارت بزرگ ادیب ضیا علی خاں اشرفی نے کی۔ بطور مہمان خصوصی حبیب خاں صاحب کے علاوہ نشاط پیلی بھیتی نے بھی شرکت کی۔ اس نشست کی نظامت کے فرائض خان فہیم نے ادا کیے۔

اس موقع پر چودھری صغیر حسن صدیقی نے ایم حبیب خاں کی ادبی خدمات پر ایک مضمون پڑھا۔ مہمان خصوصی حبیب خاں نے سلطان حیدر جوش بدایونی، پر اپنا مقالہ پیش کیا اور صدر محفل نے اپنا خاکہ (مزاحیہ انداز میں) پیش کیا۔ اس نشست میں مندرجہ ذیل شعرائے کرام نے کلام سے نوازا۔

رونق بدایونی، ذکی تانگانوی، نشاط پیلی بھیتی، معراج بدایونی، جمیل بدایونی، خان فہیم، شاداب ذکی، طبیب بدایونی۔

محفل کے اختتام پر مدیر "ابر" ذکی تانگانوی نے شعرا، ادبا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ شعرا کے علاوہ مونس نظامی، ڈاکٹر صداقت اللہ خاں، فرید احمد، کامیاب ذکی اور محمد عقیل نے بھی شرکت کی۔

دوماہی "گلبن" احمد آباد کا گجرات نمبر

احمد آباد گجرات سے نکلنے والا رسالہ دوماہی "گلبن" جو پچھلے اٹھارہ سال سے نہایت ہی پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس مرتبہ اس کا گجرات نمبر سالنامے کی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا تمام اہل قلم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ گجرات سے متعلق مضامین ذیل کے پتے پر ارسال فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔

رحمت امروہوی، مرزاپور موٹر کس واڑ، احمد آباد نمبر ا گجرات

پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض

راجستھان یونی ورسٹی جے پور کی جانب سے معین الدین شاہین اجمیری، کو ان کے تحقیقی مقالے "رام بابو سکسینہ، حیات و خدمات" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر فیروز احمد، ریڈر شعبۂ اردو راجستھان یونی ورسٹی جے پور کی نگرانی میں لکھا گیا۔

حافظ رئیس احمد خاں کو ڈاکٹریٹ

راجستھان یونی ورسٹی جے پور کی جانب سے شعبۂ اردو و فارسی کے ریسرچ اسکالر حافظ رئیس احمد خاں کو ان کے تحقیقی مقالے "شعرائے اردو کے تذکرے ۱۸۳۵ء کے بعد" پر ڈاکٹریٹ (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی سند عطا کی گئی۔ حافظ رئیس احمد خاں نے اپنا تحقیقی مقالہ ڈاکٹر فیروز احمد صاحب (ریڈر) کی نگرانی میں مکمل کیا۔

ہم غم میں برابر کے شریک ہیں

ممبئی کا علمی، ادبی حلقہ سوگوار

ممبئی: اردو کے ممتاز ادیب، دانشور، نقاد، شاعر اور صحافی محمود سروش، جنھیں ممبئی کے ادبی حلقے میں اردو کی چلتی پھرتی لغت کہا جاتا تھا، ۲ جولائی ۹۶ء کو اس دار فانی سے رخصت ہو کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ ابھی چند ماہ پہلے ہی موصوف کا شعری مجموعہ "متاع ہنر" ان کے شاگردوں نے شائع کر کے ایک باوقار تقریب میں انھیں پیش کیا تھا۔ آپ کے باقاعدہ شاگردوں کی تعداد کم سہی لیکن آپ سے فیض حاصل کرنے والوں کی تعداد بلا شبہہ ہزاروں طلبہ تک پہنچتی ہے مکتبہ جامعہ اور کارکنان مکتبہ جامعہ سے موصوف کو گہرا لگاؤ تھا۔ آپ کے انتقال سے اردو ادب کا ایک انتہائی تابناک ستارہ ٹوٹ گیا۔

مکتبہ جامعہ اپنے مخلص ساتھی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے، نیز آپ کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر

پروفیسر علی اشرف کا انتقال

نئی دہلی۔ ۴ جولائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر علی اشرف کا آج صبح دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ ۷۸ برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، ۲ بیٹے اور ۳ بیٹیاں شامل ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ سبکدوش ہونے کے بعد پروفیسر اشرف نے وارانسی کے گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں اور ۱۹۹۴ء میں عہدہ چھوڑ دیا۔ بہار میں دربھنگہ کے راجندر کالج میں بطور لیکچرار اپنا کیریر شروع کیا۔ بعد میں وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے امریکا کے کورنیل یونی ورسٹی چلے گئے۔ پروفیسر اشرف نے واپسی پر کانپور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر کام کیا۔ اس کے بعد وہ پٹنہ کے اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہوگئے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر بنے اور ۱۹۸۴ء میں اس ادارے کے وائس چانسلر بن گئے۔ پروفیسر علی اشرف ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ متعدد کتابوں کے بھی مصنف تھے۔ مرحوم کے جسد خاکی کو آج عصر بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

پروفیسر علی اشرف کے انتقال سے علمی دنیا کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ مکتبہ جامعہ پروفیسر علی اشرف کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعاگو ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری اپنے مالک حقیقی سے جا ملے

اعظم گڑھ۔ ۲۸ صفر ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء بروز یکشنبہ تقریباً پونے دس بجے شب میں مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اس دار فانی سے رحلت فرما کر اپنے رفیق اعلا سے جا ملے۔ انا للہ.... دوسرے روز دوشنبہ تین بجے دوپہر میں تدفین عمل میں آئی، نماز جنازہ میں اعظم گڑھ سے ملحق اضلاع بنارس، جونپور، مئو، غازی پور وغیرہ کے بے شمار علما و فضلا اور صلحا و اتقیا نے شرکت کی۔ ہر خاص و عام کا یہ تاثر ہے کہ علما و فضلا اور صلحا و اتقیا کی اتنی کثیر تعداد یکجا طور پر شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

کارکنان مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دست بہ دعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت فرما کر جنت الفردوس میں اعلا مقام سے سرفراز فرمائیں اور سوگواروں کو صبر جمیل اور جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین

چھپتے چھپتے

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نہیں رہے

اہل جامعہ سوگوار

نئی دہلی۔ ۳۱ جولائی ۱۹۹۶ء، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، سابق پرنسپل جامعہ کالج، بانی ڈائرکٹر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، سابق مدیر مدینہ بجنور، رسالہ جامعہ، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید اور اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج (انگریزی) ۳۰-۳۱ جولائی کی درمیانی شب میں ½ ۱۱ بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ آپ کے جسد خاکی کو جامعہ کے قبرستان میں ۳۱ جولائی بعد نماز ظہر سیکڑوں سوگواروں جن میں امیر جامعہ، شیخ الجامعہ سمیت جامعہ کے اساتذہ، طلبہ اور جامعہ برادری کے حضرات بہت بڑی تعداد میں موجود تھے، سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ ۲ مئی ۱۹۲۵ء میں ٹانڈہ، فیض آباد میں پیدا ہوئے الہ آباد، علی گڑھ، اور مک گل یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں جامعہ برادری میں شامل ہوئے، ۱۹۶۵ء سے تاحیات مکتبہ جامعہ کے ڈائرکٹر رہے۔ آپ کی تصانیف میں دیوبند اسکول اور مطالبہ پاکستان، جدید

ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ، شہید جستجو، حضرت جنید بغدادی مسلمانوں کا تعلیمی نظام، اسلام میں راسخ الاعتقادی، ریخ کی راہ (خطبہ)، اشخاص وافکار، اور مولانا ابوالکلام آزاد، فکر کی چند جہتیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کی ترتیب دی ہوئی کتابوں میں عجیب صاحب احوال و افکار، فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں، اور نگار معنی قابل ذکر ہیں۔ کارکنان مکتبہ جامعہ اپنے عزیز ترین ڈاکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائیں، اور آپ کے صاحبزادوں، صاحبزادیوں کو صبر کی تلقین عطا فرمائے۔

مطبوعات
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں
ادب، تنقید، انشاء

قلم اور قدم — سید حامد — ۷۵/-
مستقبل کی طرف (خطبات جلسہ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ: خواجہ محمد شاہد / خالد کمال فاروقی — ۱۵۰/-
مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و نظر کی چند جہتیں۔
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۴۰/-
جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین — ۶۰/-
صحرا میں لفظ — فضیل جعفری — ۹۰/-
فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر مومن محی الدین — ۵۱/-
ٹیلی ویژن نشریات۔ تاریخ۔ تحریر۔ تکنیک۔ انجم عثمانی — ۹۰/-
انشائے غالب — مرتبہ: رشید حسن خاں — ۴۰/-
اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف — ۵۱/-
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید جلال الدین — ۵۱/-
انداز گفتگو کیا ہے — شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-
دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا — ۹۵/-
سرسید یادگاری خطبات۔ مونس رضا / مسعود حسین خاں — ۱۰/-
تفہیم — رشید حسن خاں — ۷۵/-
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی — ۷۵/-
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — نقی حسین جعفری — ۵۱/-
شناس و شناخت — انور صدیقی — ۶۰/-
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم — ۱۰/-
سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم۔ اختر الواسع — ۱۰/-
آزمائش کی گھڑی — سید حامد (زیر طبع)

تموربی اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام — ۷۵/-
جام جہاں نما — گربچن چندن — ۷۵/-
اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر — ۴۵/-
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ کبیر — ۷۵/-
تاثر نہ کہ تنقید — صدیق الرحمٰن قدوائی — ۵۱/-
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود — ۹۹/-
تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — ۵۱/-
انشائیہ کے خدوخال — وزیر آغا — ۳۵/-
افکار اقبال — عبدالسلام خاں — ۱۲۵/-
تذکرہ ماہ و سال — مالک رام — ۱۲۵/-
تحقیق نامہ — مشفق خواجہ — ۱۲۵/-
سحر کے پہلے اور بعد — سعید الظفر چغتائی — ۵۱/-
پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — ۵۱/-
اقبال کا نظریہ خودی — عبدالمغنی — ۱۵۰/-
قلندر بخش جرأت — جمیل جالبی — ۱۰/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی — ۳۶/-
تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری — ۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر — ظ انصاری — ۳۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید — ڈاکٹر وزیر آغا — ۹۰/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں — مالک رام — ۵۱/۰۰
لسان الصدق — مولانا ابوالکلام آزاد — ۷۵/۰۰
اردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی — ۴۸/-
تفہیم و تنقید — پروفیسر حامدی کاشمیری — ۴۸/-
نذر مختار — مرتبہ: مالک رام — ۱۰۱/-
تحقیقی مضامین — مالک رام — ۹۰/-
خسرو نامہ — مجیب رضوی — ۲۱/-
تحفۃ السرور — مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-
جائزے — مرتبہ: مظفر حنفی — ۴۵/-
نقد بجنوری — صدیقہ بیگم — ۲۵/-
ادبی سماجیات — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/-
الفاظ کا مزاج — غلام ربانی — ۲۳/-

تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	زیر طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمن فاروقی	۱۷/۵۰
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۴/-
" سوم	"	۲۲/-
" چہارم	"	۴۰/-
نعت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۵/
اثبات و نفی	شمس الرحمن فاروقی	۴۰/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۶/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۷/۵۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۲۴/-
تنقید کیا ہے	"	۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی	داؤد رہبر	۳۶/-
اردو اسیز	مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی	۳۶/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	۴/۵۰
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۵/-
دبستان آتش	شاہ عبدالسلام	۱۶/-

تعلیم

مفکرین تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۱۲/-
قلم اور قدم	سید حامد	۷/۵۰
تعلیم و تعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۷/۵۰
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/-
ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۰/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴/۵۰
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	۲۱/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۱/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	۴/۵۰
ہم کیسے پڑھائیں	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۳/-
تعلیمی خطبات	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک	اختر الواسع	۲۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۹/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	۱۲/-
تعلیم نظریہ اور عمل	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۷/-
بنیادی استاد کے لیے	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۲/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۲/-
بچوں کا آرٹ	عبید الحق	۲۴/-

تذکرے، سوانح، شخصیتیں

مستقبل کی طرف (خطبات جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ: خواجہ محمد شاہد / خالد کمال فاروقی ۱۵۰/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو — کشمیری لال ذاکر ۳۰/-
دلّی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی ۵۱/-
چند تصویر بتاں — مولانا عبدالسلام قدوائی ۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب — پروفیسر آل احمد سرور ۸/-
صاحب جی، سلطان جی — ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-
ہندستانی مسلمان آئینۂ ایام میں — ڈاکٹر عابد حسین ۷۵/-
شہید جستجو — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷۵/-
مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۸/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاء) — ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۵/-
حیات جامی — مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
نقش ذاکر — مرتبہ عبدالحق خاں ۵۱/-
مالک رام ایک مطالعہ — مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ — مرتبہ خلیق انجم ۳۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات — مرتبہ انور صدیقی ۱۸/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ — مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹۰/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) — ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) — صالحہ عابد حسین ۶۵/-
وجد شاعر اور شخص — مرتبہ یوسف ناظم ۲۵/-
غبار کارواں — بیگم انیس قدوائی ۲۷/-
فراق شخص و شاعر — مرتبہ: شمیم حنفی (زیر طبع)
حیات حافظ — اسلم جیراجپوری ۱۵/-
افکار رومی — مولانا عبدالسلام خاں ۴۰/-
بزم رفتگاں — صباح الدین عبدالرحمٰن (زیر طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری — پروفیسر ممتاز حسین (زیر طبع)

مکالمات افلاطون — مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۸/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری — شفیق النساء بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو — بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند — ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن — ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیات اسماعیل، حیات و خدمات — ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدرالدین آزردہ — عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف — صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب — رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار — پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵۰/-
میر انیس — سفارش حسین رضوی ۲/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت — مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰
حسرت کی شاعری — ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۵/۵۰
گنجہائے گرانمایہ — پروفیسر رشید احمد صدیقی ۴۲/-
کیا خوب آدمی تھا — مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/-
قدسیہ زیدی — کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انشار — مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظوں اور معنی میں — مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۵/-
روسی ادب اوّل، دوم — پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

طنزیات، مزاحیات

خامہ بگوش کے قلم سے — مرتبہ: مظفر علی سید مجلد ۱۵۰/- غیر مجلد ۸۰/-
فی البدیہہ — یوسف ناظم ۴۵/-
چہرہ در چہرہ — مجتبیٰ حسین ۵۱/-
طنزیات و مضحکات — رشید احمد صدیقی ۴۰/-
گوشے میں قفس کے — دلیپ سنگھ ۴۷/-
فی الحقیقت — یوسف ناظم ۴۵/-

نی الفور۔	یوسف ناظم	-/۳۰
نول مال۔	شفیقہ فرحت	-/۱۸
نی الحال۔	یوسف ناظم	-/۱۸
رانگ نمبر۔	شفیقہ فرحت	-/۱۶
بالکلیات۔	یوسف ناظم	-/۱۸
برکت ایک چھینک کی۔	وجاہت علی سندیلوی	-/۱۵
ذکر خیر۔	یوسف ناظم	-/۲۱
بے پَرکی۔	حضرت آوارہ	-/۱۰
خنداں۔	رشید احمد صدیقی	-/۲۶
شگوفہ زار۔	خواجہ عبد الغفور	-/۱۲
دیوارِ قہقہہ۔ (مزاحیہ شاعری)	محمد یوسف پاپا	-/۱۵
آشفتہ بیانی میری۔	رشید احمد صدیقی	-/۱۵

طب - ایلوپیتھی

اشاراتِ قلب	پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم	-/۶
مرضیات	حکیم نعیم الدین زبیری	-/۵۱
اپنے دل کی حفاظت کیجیے۔	ترجمہ۔ نذیر الدین مینائی	-/۲۵
ذیابیطس۔	ڈاکٹر محمد شعیب اختر	(زیرِ طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل	صغرا مہدی	-/۵۱
وسط ایشیا	آصف جیلانی	-/۵۱
کولمبس کے دیس میں۔	جگن ناتھ آزاد	-/۴۵
پشکن کے دیس میں۔	جگن ناتھ آزاد	-/۲۵
سفرِ زندگی کے لیے سوز و ساز۔	بیگم صالحہ عابد حسین	-/۱۸
باتیں لاہور کی۔	سوم آنند	-/۱۶
رہِ نوردِ شوق۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۱۴/۵۰
یادوں کے سائے	عتیق صدیقی	-/۱۲

شعری مجموعے

گاہے گاہے	رولینڈ لارنس	-/۳۰
رنگ، خوشبو، روشنی	قتیل شفائی	-/۸۰
طرازِ دوام	اختر سعید خاں	-/۵۱
کاسۂ خیال	عبد المعروف خاں	-/۵۱
میں سمندر ہوں	فرحان سالم	-/۲۰
اسرارِ خودی (فراموش شدہ اڈیشن)	شائستہ خاں	-/۷۵
بانگِ درا	اقبال	-/۱۲
بالِ جبریل	اقبال	-/۸
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز	〃	-/۸
خواب اور خلش	آلِ احمد سرور	-/۴۹
غبارِ منزل	غلام ربانی تاباں	-/۲۵
انیس	۳۳ غیر مطبوعہ مرثیے	-/۹۰
پُرانی بات ہے۔	زبیر رضوی	-/۳۰
سازِ سخن۔	ادا جعفری	-/۴۵
غزل نما (غزلیات کا انتخاب)	مرتبہ ادا جعفری	-/۷۵
دائروں میں پھیلی لکیر۔	کشور ناہید	-/۲۰
آنکھ میں سمندر۔	زاہد ڈار	-/۲۰
آنکھ اور خواب کے درمیان۔	ندا فاضلی	-/۳۰
رات کے مسافر۔	مرتبہ انور سجاد	-/۲۸
گدازِ شب۔	معین احسن جذبی	-/۴۰
ایک خواب اور۔	علی سردار جعفری	-/۴۰
حرف حرف روشنی۔	حمایت علی شاعر	-/۳۵
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں)	مترجم کرامت علی کرامت	-/۲۰
دوہے۔	جمیل الدین عالی	-/۱۲
کلیاتِ عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	-/۷۵
راوار۔	ساقی فاروقی	-/۲۰
پتھر کی زبان۔	فہمیدہ ریاض	-/۱۵

شام کا پہلا تارا ۔ زہرا نگاہ ۲۱/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۲۸/-
لہو پکارتا ہے ۔ علی سردار جعفری ۱۵/-
شام شہر یاراں ۔ فیض احمد فیض مجلد ۱/۶
جستہ جستہ ۔ خورشید الاسلام ۱۸/-
گل افشانی گفتار ۔ نشور واحدی ۵/-
کرب آگہی ۔ آنند نرائن ملا ۱۰/۵۰
نوائے آوارہ ۔ غلام ربانی تاباں ۸/۵۰
اردو گیت ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیر طبع)
پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۱۵/-
انتخاب حالی (نیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۱۵/-
شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۸/۵۰
ذوق سفر ۔ غلام ربانی تاباں ۵/-
کو بہ کو ۔ سلطان جاں نثار اختر ۷/-
آتش گل جگر مرادآبادی ۲۵/-
دیوار قہقہہ ۔ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

انوار قرآن پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۵/-
حضرت محمد اور قرآن ڈاکٹر رفیق زکریا ۔ زیر طبع
مسلمانوں کا تعلیمی نظام ضیاء الحسن فاروقی ۴/۵۰
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ۔ محمود احمد برکاتی ۔ ۴۵/-
فرید و فرد فریدؒ اسلم فرخی ۲۷/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ ضیاء الحسن فاروقی ۸/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سر سید احمد کا مرتبہ سید مقبول احمد ۸/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل ۔ مولانا مجیب اللہ ندوی ۔ ۱۴/-
نقد ملفوظات نثار احمد فاروقی ۶۵/-
خطبات عیدین مولانا تقی امینی ۲۱/-

تاریخ اودھ قاسم علی نیشاپوری ۲۷/-
قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت ۔ ڈاکٹر نجیب اشرف ۱۲/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۸/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
ترجمۂ قرآن ۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش پروفیسر مشیر الحق ۸/-
مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات ۔ پروفیسر ریاض الرحمن شیروانی ۸/-
دنیا کے بڑے مذہب ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۸۵/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ۔ شمس الرحمن محسنی ۵۰/-
رسول اکرم اور یہود حجاز ۔ سید برکات احمد ۴۰/-
محجوب الارث ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
اسلام دور حاضر میں ۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۳۶/-
اسلامیات ۔ مالک رام ۲۷/-
عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۶/-
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵/۷۵
روح القرآن ۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ۳۰/-
عشق اور بھگتی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۶/-
عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳۰/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ عبدالسلام قدوائی ۸/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء ۔ محمود الحسن ۱۵/-
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبید الرحمن ۲/-
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۶/-
دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ۱۲/-
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰
خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-
مسلمان اور سیکولر ہندوستان ۔ پروفیسر مشیر الحق ۷/-
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۶/۵۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-

تاریخ الامت سیرت رسولؐ حصہ اوّل ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-

〃 خلافت راشدہ 〃 دوم 〃 ۲۱/-

〃 خلافت بنی امیہ 〃 سوم 〃 ۱۵/-

〃 عباسیہ 〃 چہارم 〃 ۱۵/-

〃 عباسیہ بغداد 〃 پنجم 〃 ۲۷/-

〃 عباسیہ مصر 〃 ششم 〃 ۲۷/-

〃 آل عثمانؓ ۔ ہفتم ۔ 〃 ۱۸/-

〃 ہشتم 〃 ۳۶/-

فکر اسلامی کی تشکیل جدید ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-

قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) ۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-

〃 〃 کلاں سائز 〃 ۴/-

بکھرے ورق سینتی کمار چیٹرجی ۴/-

تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-



آگے سمندر ہے انتظار حسین ۱۵/-

جھینی جھینی بینی چدریا عبدل بسم اللہ ۷۵/-

صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۷۵/-

نوٹوں کی تلاش ایاز سید ہاروی ۶۰/-

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-

سفر رابعہ تبسم ۲۷/-

سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-

مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-

تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-

ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-

بنجر بادل ۔ کشمیری لال ذاکر ۳۴/-

فرار ۔ ظفر پیامی ۴۰/-

ڈوبتے سورج کی کتھا ۔ کشمیری لال ذاکر ۳۶/-

لمحوں میں بکھری سی زندگی ۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-

مہکتی بہاریں ۔ کوثر چاندپوری ۱۸/-

راگ بھوپالی ۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-

دھرتی سدا سہاگن ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰

کھجوراہو کی ایک رات ۔ کشمیری لال ذاکر (زیر طبع)

میں واپس آؤں گا ۔ ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس ۲۵/-

پُروائی ۔ صغریٰ مہدی ۹/۵۰

گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیر طبع)

انگوٹھے کا نشان ۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-

ایک ہم دو دل ۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-

اشک خوں ۔ حبیبہ بانو ۱۰/-

اپنی اپنی صلیب ۔ صالحہ عابد حسین ۶۰/-

پرائی دھرتی اپنے لوگ ۔ جتندر بلّو ۱۲/-

ایک مٹھی ہندستان ۔ سید شمیم اشرف ۔ ۶/-

ایک چادر میلی سی ۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-

آلپس کے گیت ۔ مترجم قرۃ العین حیدر ۳/-

پیار کا موسم ۔ مہندر ناتھ ۴/۵۰

چنار کا پتا ۔ سلطان آصف فیضی ۳/-

پابہ جولاں ۔ صغریٰ مہدی (زیر طبع)

زندگی کی لہر ۔ (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق ۴/-

کالا شہر گورے لوگ ۔ احسان الحق (زیر طبع)

بیوہ ۔ منشی پریم چند ۲۴/-

گئودان (نیا اڈیشن) 〃 ۷۵/-

میدانِ عمل ۔ (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۷۵/-

یودوکیہ ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/-

شکستِ ناتمام ۔ زہرہ سیدین ۳/-

الجھی ڈور ۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع

پراسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۱۲/۵۰

ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۴/۵۰

افسانے

صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۷۵/-

پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	۷۵/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	۲۵/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	۳۰/-
دل دریا	شرون کمار	۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	۱۸/-
دردِ دل	ستارہ جعفری	۱۸/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	۱۲/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۳۰/-
کوکھ جلی	" "	۱۸/-
کھڑکی	پرکاش پنڈت	۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	۱۲/۷۵
تیوری	امر سنگھ	۱۴/۷۵
قلی نمبر ۴۹۹	وجاہت علی سندیلوی	۱۴/۷۵
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۲۷/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش بجاج	۹/-
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	۱۲/-
درد و درماں	صالحہ عابد حسین	زیرِ طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	۲۶/-
واردات	پریم چند	۲۱/-
ردو اسپیئر مرتبہ	ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۳۶/-
دس افسانے	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	۹/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں	صغریٰ مہدی	۱۶/-
اپنے دکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	۲۱/-

ڈرامے

لجھاوے	ابراہیم یوسف	۵/-
زندگی کی طرف	پروفیسر شمیم حنفی	۲۶/-
زوال کا عروج	مترجم: انور عظیم	۳۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے	پروفیسر شمیم حنفی	۲۱/-
انتی گونی ـ سوفوکلیز	مترجم قیصر زیدی	۹/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
حبہ خاتون	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
تاریخ کے آنچل میں	رفعت سروش	۱۸/-
اداس موڑ	ابراہیم یوسف	۱۲/-
اینٹنی اور کلیوپیٹرا	ولیم شیکسپیر	۱۶/۵۰
مٹی کا بلاوا	شمیم حنفی	۵/-
سات کھیل	راجندر سنگھ بیدی	۱۶/۵۰
غالب کون	سید محمد مہدی	۸/۵۰
خیال کی دستک	ساگر سرحدی	۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	۶/-
پہلے آپ (مزاحیہ ڈراما)	افتخار عالم	۲/۵۰
آذر کا خواب	قدسیہ زیدی	۸/۵۰
آزمائش	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
انجام	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
کھیتی	"	۴/۵۰
ہیروئن کی تلاش	"	۵/۵۰
پردۂ غفلت	ڈاکٹر سید عابد حسین	۹/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
آئینۂ ایام ـ جے بی پریسٹلے	مترجم خلیق احمد	۴/۵۰
نقشِ آخر	اشتیاق حسین قریشی	۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	
ریڈیو ڈرامے کی اصناف	"	
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	"	۱۰/-
فاؤسٹ (گوئٹے)	مترجم: ڈاکٹر عابد حسین	۲۵/۵۰

اقبالیات

افکارِ اقبال	محمد عبدالسلام خاں	۱۲۵/-

نظریۂ خودی	عبدالمغنی	۱۵/-
فکر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	۱۴/-
تلاش	عبدالقوی دسنوی	۲۵/-
(خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	۲۶/-
لی	عبدالقوی دسنوی	۹/۵۰
	میکش اکبرآبادی	۲۵/۵۰
	اسلوب احمد انصاری	۲/-

غالبیات

ب	مالک رام	(زیر طبع)
لب	مالک رام	۴۸/-
صغیر بلگرامی	مشفق خواجہ	۳۶/-
غالب	مالک رام	۷۵/-
لب	مالک رام	۱۴/۵۰
رشاہان تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰

معیاری سیریز

س و دبیر	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۴/-
خیال	مالک رام	۱۵/-
غالب اردو	"	۳۰/-
فارسی	"	۹/-
مضامین سرسید	انور صدیقی	۱۹/-
سعدی	مرتبہ رشید حسن خاں	۳۶/-
آزاد (تلخیص)	" ڈاکٹر قمر رئیس	۷۵/-

انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	۷۵/-
انتخاب ناسخ	مرتبہ " "	۱۵/-
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی	۸/-
شریف زادہ	" ڈاکٹر قمر رئیس	۲۶/-
امراؤ جان ادا	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۲۸/-
فسانۂ مبتلا	" صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۵/-
توبۃ النصوح	" مالک رام	۳۶/-
باغ و بہار	" رشید حسن خاں	۲۷/-
ابن الوقت	" ڈاکٹر خلیق انجم	۴۵/-
مجالس النساء	" صالحہ عابد حسین	۲۴/-
گذشتہ لکھنؤ	" رشید حسن خاں	۷۵/-
قصہ حاتم طائی	" اطہر پرویز	۱۵/-
انتخاب ولی	مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی	۲۰/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی	مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
" مراثی انیس و دبیر	رشید حسن خاں	۳۶/-
" نظیر اکبرآبادی	"	۳۰/-
" اکبر الٰہ آبادی	صدیق الرحمٰن قدوائی	۲۱/-
" کلام میر	ڈاکٹر محمد حسن	(زیر طبع)
دیوان درد	رشید حسن خاں	۲۴/-
انتخاب سودا	"	۱۵/-
" قلی قطب شاہ	محمد اکبر الدین صدیقی	۲۷/-
" ذوق	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۲۴/-
مثنوی سحر البیان	رشید حسن خاں	۲۱/-
مثنوی گلزار نسیم	"	۱۶/-
افادات سلیم	ڈاکٹر خلیق انجم	۳۰/-
مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۷/-

جیبی کتابیں

بیاض مریم	سکندر علی وجد	۱۵/-

پتھر کی دیوار — // — 15/-
ایک خواب اور — علی سردار جعفری — 10/-
آتشِ گل — جگر مرادآبادی — 10/-
پچھلے پہر — جاں نثار اختر — 7/50
رومانی غزلیں — ثمینہ حجاب — 10/-
انتخاب اکبر الہ آبادی — صدیق الرحمٰن قدوائی — 12/-
ساتواں آنگن — صالحہ عابد حسین — 8/-
دھوپ — رابعہ تبسم — 5/-
گھر — ماریہ رحمٰن — 8/-
واپسی کا سفر — عبداللہ حسین — 5/-
راگ بھوپالی — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — 4/-
نشیب — عبداللہ حسین — 5/-
موت کا بازار — آفتاب ہلالی — 8/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

شمس الرحمٰن فاروقی نمبر — مرتبہ: احمد محفوظ — 80/-
اردو افسانہ بمبئی میں — // الیاس شوقی — 51/-
مغیث الدین فریدی نمبر — // ظہیر احمد صدیقی — 45/-
خواجہ حسن نظامی نمبر — // نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی — 75/-
عبدالوحید صدیقی نمبر — // پروانہ ردولوی — 51/-
غلام ربانی تاباں نمبر — // اجمل اجملی — 75/-
اختر سعید خاں نمبر — // ڈاکٹر سید حامد حسین — 51/-
نثار احمد فاروقی نمبر — // ڈاکٹر خلیق انجم — 51/-
پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر — مرتبہ شہریار / ابوالکلام قاسمی — 60/-
ڈاکٹر خلیق انجم نمبر — مرتبہ: ایم حبیب خاں — 90/-

خواجہ احمد فاروقی — مرتبہ: خلیق انجم — 15/-
عابد علی خاں — // مجتبیٰ حسین — 15/-
پروفیسر مسعود حسین خاں — // ایم حبیب خاں — 45/-
ڈاکٹر اجمل اجملی — مرتبہ علی احمد فاطمی / عذرا مجیب — 45/-
فرمان فتح پوری نمبر — مرتبہ خلیق انجم — 9/-
سردار جعفری نمبر — مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی — 5/-
صالحہ عابد حسین نمبر — مرتبہ: عزیز قریشی — 45/0
نئی نظم کا سفر — مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی — 45/0

مشرقی علوم وابستہ پر تحقیق۔ حامد حسین — 4/-
پریم چند نمبر — عبدالقوی دسنوی — 1/50
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر۔ کرنل بشیر حسین زیدی — 6/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر۔ ادارہ — 50
مرزا سلامت علی دبیر نمبر۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی — 7/50
جوش ملسیانی نمبر — ساحر ہوشیار پوری — 5/50
جگن ناتھ آزاد نمبر — مرتبہ: ایم حبیب خاں — 51/-
خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی — 4/50
عرش ملسیانی نمبر — مالک رام — 12/50
سکندر علی وجد نمبر — یوسف ناظم — 25/-
قدسیہ زیدی نمبر — کرنل بشیر حسین زیدی — 25/-
فراق نمبر — شمیم حنفی — زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ — 25/-
عبداللطیف اعظمی نمبر — ادارہ — 18/-
مشفق خواجہ نمبر — مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم — 40/-
جائزے — مرتبہ مظفر حنفی — 45/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکیر و تانیث (۷ ہزار الفاظ) فصاحت بہادر جنگ — 75/-
معیار اردو — // — 21/-
محاوراتِ ہند۔ تصحیح و ترتیب: محبوب الرحمٰن فاروقی — 51/-

بچوں کے لیے

مکتبہ پیام تعلیم کی مذہبی کتابیں

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں	۹/:
نماز پڑھیے	۴/۵۰
السلام علیکم	۷/۵۰
حضرت یوسف علیہ السلام	۴/۵۰
حدیث کیا ہے	۴/:
حضرت عمر فاروق رض	۶/:
نقوش سیرت ﷺ اوّل	۵/:
نقوش سیرت ﷺ حصہ دوم	۵/:
نقوش سیرت ﷺ حصہ سوم	۵/:
نقوش سیرت ﷺ حصہ چہارم	۵/:
نقوش سیرت حصہ پنجم	۵/:
رسالہ دینیات اوّل	۳/:
〃 دوم	۴/:
〃 سوم	۵/:
〃 چہارم	۵/:
〃 پنجم	۶/:
〃 ششم	۶/=
〃 ہفتم	۶/=
〃 ہشتم	۶/=
…ضرت آدم علیہ السلام	۴/:
…ضرت یحییٰ علیہ السلام	۳/:
…رگان دین	۴/:
…ت کی مائیں	۴/۵۰
…ی باتیں	۴/۵۰
…ب سیرت ﷺ اول	۶/:
…ب سیرت ﷺ دوم	۶/:
…ل اللہ ﷺ کی صاحبزادیاں	۴/۵۰
…طان جی رح	۴/۵۰

سیرت پاک مختصر مختصر	۳/:
کمسن صحابی	۶/:
رحمان کا مہمان	۶/:
اسلام کے جان نثار	۵/:
نور کے پھول	۹/:
سب سے بڑے انسان } رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیق رض	۶/:
حضرت عبداللہ بن عمر رض	۳/:
حضرت طلحہ رض	۳/:
حضرت ابو ذر غفاری رض	۳/:
حضرت سلمان فارسی رض	۳/۵۰
حضرت عبداللہ بن عباس رض	۳/:
حضرت محبوب الٰہی رح	۲/:
حضرت معین الدین چشتی رح	۳/:
حضرت فرید گنج شکر رح	۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح	۳/:
نیک بیٹیاں	۳/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاء رح	۳/:
حضرت حمزہ رض	۳/:
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض	۳/:
حضرت ابوہریرہ رض	۴/:
اللہ کے صفی	۲/۵۰
اللہ کا گھر	۴/۵۰
اللہ کے خلیل	۳/۵۰
رسول پاک ﷺ کے اخلاق	۴/:
قرآن پاک کیا ہے؟	۵/:
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل	۶/:
〃 دوم	۶/:
اسلام کے مشہور امیر البحر	۹/:
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل	۷/۵۰

〃 حصہ دوم	۶/:
اسلام کیسے شروع ہوا	۷/۵۰
رسول پاک ﷺ	۶/:
دس جنتی	۷/۵۰
سرکار کا دربار	۶/۵۰
چار یار	۷/۵۰
آں حضرت ﷺ (اردو)	۳/۵۰
حضرت محمد ﷺ (ہندی)	/۴۰
ہمارا دین حصہ اوّل	۸/۵۰
ہمارا دین حصہ دوم	۸/۵۰
ہمارا دین حصہ سوم	۸/۵۰
تحسین القرآن	(زیر طبع)
منہاج القرآن	۴/۵۰
ائمہ اربع	(زیر طبع)
ارکان اسلام	۴/:
عقائد اسلام	۴/۵۰
خلفائے اربعہ	۱۰/۵۰
نبیوں کے قصے	۷/۵۰
ہمارے رسول ﷺ	۶/:
مسلمان بیبیاں	۶/:
ہمارے نبی ﷺ (اردو)	۴/:
ہمارے نبی ﷺ (ہندی)	زیر طبع
سرکار دوعالم ﷺ	۹/:
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد)	۲/:
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں)	۴/۵۰

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی	۶/:
بچوں کے نظیر اکبرآبادی	۶/:
بچوں کے "ظ" انصاری	۶/:
بچوں کی آپا جان (گیرڈ انلپس)	۶/:

بچوں کی شفیقہ فرحت ۴/۵۰
بچوں کے عابد علی خاں ۴/-
بچوں کے علی سردار جعفری ۴/-
بچوں کے یوسف ناظم ۴/-
چارلی چیپلن اور کینتھ اینڈرسن ۹/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی ۴/-
بچوں کے میر امّن دلی والے ۴/۵۰
بچوں کے محمد حسین آزاد ۴/-
بچوں کے مرزا غالب ۴/-
بچوں کے رنگا رنگ خسروؒ ۴/-
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد ۴/-
بچوں کے سلطان جی رح ۴/۵۰
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی ۴/۵۰
بچوں کی صالحہ عابد حسین ۴/-
بچوں کے ڈاکٹر سید عابد حسین ۴/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق ۴/۵۰
بچوں کے میرزا ادیب ۴/۵۰
بچوں کے غلام السیّدین ۵/-
بچوں کے مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲۱/-
بچوں کے ذاکر صاحب ۷/-
دادا نہرو ۶/-
اندرا گاندھی کی کہانی ۶/-
محمد شفیع الدین زبیری ۷/۵۰
ہمارے عظیم سائنس داں ۹/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں ۶/-
مولانا آزاد کی کہانی ۱۸/-
جوہر قابل ۴/۵۰
بچوں کے چار بزرگ دوست ۳/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی ۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں ۲/-
میرا انیس ۲/-

امیر خسروؒ ۲/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات ۱۰/-
کہانی بھی، معلومات بھی ۶/-
چیزوں کی کہانی ۷/۵۰
یہ کیسا بخار ہے ۶/-
آپ کا جسم ۶/-
گندا پانی ۴/-
کیوں اور کیسے؟ ۶/-
سائنس کی دنیا ۸/-
کمپیوٹر کیا ہے ۸/-
عجائب گھر ۶/-
ذرّے کی کہانی ۲۱/-
علاج میرا دشمن ۶/-
پرواز کی کہانی ۴/۵۰
غذا کی کہانی ۳/۵۰
رنگوں کی بستی ۵/-
غذائیں دوائیں ۸/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں ۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے ۳/-
صحت کی الف بے ۵/-
سنہرے اصول ۵/-
پرندوں سے جانوروں تک ۴/۵۰
دہلی ۲/-
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) ۱/۵۰
سماجی زندگی حصہ سوم ۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم) ۷/۷۵
ان تھک جان (زیر طبع)
بھن بھن بانو ″
جاں باز سپاہی ″

ا. ہمت کے پھل ″
موم کا محل ″
بڑے دادا کی کہانی ″
چٹانوں کی کہانیاں ″

نظمیں

پھلجھڑیاں ۶/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲۱/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) ۷/۵۰
چٹکتی کلیاں (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے ۶/۵۰
سہانے ترانے ۴/۵۰
بچوں کے افسر ۶/-
بچوں کے اقبال ۶/۵۰

ننھے منّے بچوں کے لیے

بتاشے (باتصویر) ۷/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) ۶/-
شیر اور بکری ″ ۷/۵۰
چاند کی بیٹی ″ ۶/-
بھیڑیے کا گانا ″ ۷/۵۰
جادو کی ہنڈیا ″ ۶/-
چالاک بلی ″ ۷/۵۰
دم کٹی لومڑی ″ ۷/۵۰
کوّے کا خواب ″ ۷/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری ۷/۵۰

بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

خطرناک سگنل پہلا حصہ ۱۰/-
لاش چل پڑی دوسرا حصہ ۱۰/-
کالا جنگل نیلی موت تیسرا حصہ ۱۰/-

خلائی سرنگ چوتھا حصّہ	۱۰/:	سمندر کا بادشاہ ہار گیا	۴/۵۰	جادو کی سارنگی	۱/:
وہ خلا میں بھٹک گئے پانچواں حصّہ	۱۰/:	چوں چوں بیگم	۴/:	بدر شہزادی	۱/:
خلائی مخلوق بمبئی میں چھٹا حصّہ	۱۰/:	ماسٹر شامت	۶/:	سمندری طوفان اور تین لڑکے	۱/:
موت کی شعاعیں ساتواں حصّہ	۱۰/:	ٹھوڑی تارا ماتھے چاند	۴/:	ننھا سیّاح	/:
خطرناک فارمولا آٹھواں حصّہ	۱۰/:	پکڑے گئے	۷/۵۰	زیور	۱/:
تابوت سمندر میں نواں حصّہ	۱۰/:	درویش کا تحفہ	۶/:	شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	۱/:
خلائی مخلوق کا حملہ دسواں حصّہ	۱۰/:	موراسے فرار	۷/۵۰	سام پر کیا گزری	۷/۵۰
عمران کی زندہ لاش گیارھواں حصّہ	۱۰/:	بکرے کی تعریف	۶/:	جنگو کی بلّی	۳/:
شہر پتھر بن گیا بارھواں حصّہ	۱۰/:	جھیل کا راز	۶/:	چالاک خرگوش کے کارنامے	۹/:
روشنی ہی روشنی	۱۰/:	قصر صحرا اوّل	۷/:	چور پکڑو	۲/۵۰
ایلس کی دنیا	۱۰/۵۰	قصر صحرا دوم	۱۰/:	بہادر علی	۷/۵۰
پتھر کا خرگوش	۱۰/:	قصر صحرا سوم	۸/:	خالی ہاتھ	۹/:
سرخ موت	۴/۵۰	عموں کی تباہی	۷/۵۰	کھلونا نگر	۱/۵۰
دنیا کی عجیب وغریب کہانیاں	۷/۵۰	بیمار کا پنچھی	۴/:	حاجی بابا کی ڈائری	/۵۰
انمول کہانیاں	۴/۵۰	ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	۷/۵۰	قصہ اژدہا پکڑنے کا	۹/:
پتھر کی گڑیا	۷/۵۰	پادری کی روح	۴/:	ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۹/:
ریل کے بچّے	۴/:	ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	۴/۵۰	ابوعلی کا جوتا	۶/:
افریقہ کی کہانیاں	۷/۵۰	گدھا کہانی	۹/:	ننھا سراغ رساں	۵/:
۸۰ دن میں دنیا کا چکّر	۳/:	خفیہ سرنگ	۶/:	پُراسرار غار	۶/:
ہزاروں خواہشیں	۹/:	بڑھیا کی بھینس	۴/۵۰	ظالم ڈاکو	۹/:
مونٹی کرسٹو کا نواب	۹/:	تیس مار خاں	۴/۵۰	عرب دیسیوں کی عوامی کہانیاں	۷/۵۰
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر	۶/:	چالاک خرگوش کی واپسی	۱۵/:	دلّی کی شادی	۴/:
جادوئی چقماق کی ڈبیہ	۴/۵۰	غریب لکڑہارے کی کہانی	۶/:	رحمت شہزادہ	۴/۵۰
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	۴/:	نردوبی کا آدم خور	۶/:	اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
دادی اماں کی کہانیاں	۶/:	ہمت کے کرشمے	۶/:	پانچ جاسوس	۱۰/:
سفر کے قصے	۵/:	خلائی مسافر	۶/:	جنگل کی ایک رات	۷/۵۰
پہاڑی مہم	۴/۵۰	ابو خاں کی بکری	۱۵/:	اچھی کہانیاں	۳/:
تین بندوقچی	۱۰/:	ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/:	ہرن کا دل	۲/:
ہم بنے کمانڈو	۵/:	نرالے گویے	۴/۵۰	دریا کی رانی	۳/:
ایک تھا مرغا ککڑوں کوں	۶/:	باتونی بکھرا	۴/۵۰	گوہر شہزادی	۴/:
پریوں کی کہانیاں	۶/:	جادو کا چھلّا	۳/:	شریر شیرا	۳/۵۰

پری رانی	۳/-	جادو کا گھر	۳/۵۰	تین اناڑی	۶/-
خطرناک سفر	۳/۵۰	بی مینڈکی اور کوا	۳/۵۰	خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا	(زیر طبع)
ننھا جھبرو	۳/۵۰	تاک دنا دن تاک کے سے	۳/۵۰	چمپاوت کا آدم خور شیر	۱/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں	۴/۵۰	روٹی کس نے پکائی	۳/۵۰	ننھا ٹٹو	۳/-
بابا ناصح	۳/-	پھر میں چکھوں کیا خاک	۳/۵۰	چنبیلی	۱/۲۰
سالا مہ دمصامہ	۴/۵۰	پانچ بونے	۳/۵۰	شہزادہ اور ٹھگ	(زیر طبع)
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/-	چیونٹی رانی	۳/۵۰	**ہماری درسی کتابیں**	
شرارت	۶/-	بچوں کی کہانیاں	۳/۵۰	اردو قاعدہ	۵/-
ننھا فرشتہ	۶/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	۳/۵۰	اردو کی پہلی کتاب	۷/۵۰
آپ کھلا راز	۳/۵۰	پکڑا دُم کٹے کو	۳/۵۰	اردو کی دوسری کتاب	۱۰/۵۰
نھیرا اور اس کی بیوی	۳/۵۰	سدو راہا پردیس چلے	۳/۵۰	اردو کی تیسری کتاب	۱۲/-
بھوتوں کا جہاز	۷/۵۰	ہیچو میچو	۳/۵۰	اردو کی چوتھی کتاب	۱۲/-
ہار کی تلاش	۶/-	سرخ جوتے	۴/۵۰	اردو کی پانچویں کتاب	۱۴/-
خرگوش کی چال	۴/-	ریڈیو فیچر	(زیر طبع)	اردو کی چھٹی کتاب	۱۶/-
آؤ ڈراما کریں	۴/-	پلک نہ مارو	۶/-	اردو کی ساتویں کتاب	۱۷/-
خرگوش کا سپنا	۹/-	ایک دیس ایک خون	۳/۵۰	اردو کی آٹھویں کتاب	۱۸/-
میلا ہیرا	۶/۵۰	جادو کے کھیل	(زیر طبع)	اردو خوش خطی حصہ اوّل	۳/۵۰
ایک کٹوری تیل میں	(زیر طبع)	انعامی مقابلہ	۲/۲۵	اردو خوش خطی حصہ دوم	۳/۵۰
شیر خاں	۴/-	دعوت ملّاجی	(زیر طبع)	// حصہ سوم	۳/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۳/-	جیت کس کی؟	۴/-	// حصہ چہارم	۳/۵۰
لومڑی کے بچے	۳/-	چینی کی گڑیا	(زیر طبع)	ہمارا ملک بھارت	۱۷/-
میاں ٹڈھینچو کے بچے	۴/-	بہادر سیاح	۴/-	بھارت اور سنسار	۱۷/-
بہادر	۴/۵۰	چچا غالب	(زیر طبع)		
ہرن کے بچے	۳/-	تانیل خاں	۳/-		
اس نے کیا کرنا جانا	۳/۵۰	جن حسن عبدالرحمٰن	۵/-		
کٹا ہوا ہاتھ	۷/۵۰	چوری کی عادت	۳/۵۰		
میگھ نگر کا راجا	(زیر طبع)	غیر ذمہ دار لڑکا	(زیر طبع)		
جی دار اور ننھا فرشتہ	//	جب اور اب	//		
سرکس	۱/۵۰	سندر چنار	۱/۵۰		
بندر اور رنائی	۴/۵۰	گلابو چوہیا اور غبارے	۱/۵۰		
لومڑی کا گھر					

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

قصائد و قطعاتِ تاریخ — مرتبہ: ڈاکٹر علی احمد خلیلی — ۲۰/-
مآثرِ غالب — " قاضی عبدالودود — ۵۰/-
مولانا آزاد اور رفاقت قرآنی " مولانا آزاد سیمینار کے مقالے ۵۰/-
اردو غزل (۱۹۴۰ء کے شعراء کے تناظر میں) ۴۰/-
شاد عظیم آبادی — قیس رضوی عظیم آبادی — ۴۰/-
ہمدرد میں اردو رسائل اور اخبارات
مرتبین: شکیل احمد شمسی / محمد ذاکر حسین — ۵۰/-
شہر میں کرفیو (ناول) — وبھوتی نارائن رائے — ۲۵/-
قاضی سید رضا حسین — مولوی سید عبدالمغنی — ۵۰/-
اردو زبان (مسائل اور حل) — خطبہ سید ہاشم علی — ۵/-
محمود ایاز کے سوغات کا اشاریہ — ڈاکٹر سلمان عابد — ۲۰/-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو رسائل کا اشاریہ
مرتبہ: ڈاکٹر عطا خورشید — ۵/-
شاہ کمال علی کمال اور ان کی تصانیف — قاضی عبدالودود — ۲۰/-
روہیل کھنڈ اور لغت — رئیس رام پوری — ۲۰/-
اردو جرائد - خدا بخش میں (ایک صدی کا ذخیرہ) — ۵۰/-
دیوان ابوالکلام آزاد — ڈاکٹر عبدالغفار شکیل — ۲۵/-
عقائد ہندواں (دبستان مذاہب: متعلقہ ابواب) ذوالفقار نوید ۵/-
"نگار" وضاحتی اشاریہ — مرتبہ: عطا خورشید — ۲۰۰/-
آثار آزاد (مولانا آزاد کے اوائل عمر کی خود نوشت تحریریں)
سید قدرت اللہ فاطمی — ۲۰/-
رسالہ "جامعہ" عہد اول (۱۹۲۳ء - ۱۹۴۷ء) کا اشاریہ — ۵۰/-
جہان غالب — قاضی عبدالودود — ۱۰۰/-
تذکرہ کاملانِ بہار — ۱۰۰/-
اردو رسائل کا ذخیرہ (خدا بخش لائبریری میں) — ۱۰۰/-
عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ۔
پروفیسر سید حسن عسکری — ۷۵/-
عبدالحق بحیثیت محقق — قاضی عبدالودود — ۱۲۵/-
قواعد اردو — پروفیسر فدا علی خاں — ۱۰۰/-

کلامِ شاد (انتخاب) — قاضی عبدالودود — ۲۵/-
کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اول) قاضی عبدالودود
" حصہ دوم "
اردو رسائل ۱۹۹۳ (نصف اول) نمبر ۲ — ۲۰/-
" " (جولائی تا دسمبر) — ۲۰/-
بہار اردو لغت — احمد یوسف — ۱۰۰/-
مرآۃ الاحوال جہاں نما (سفرنامہ ہند) احمد بہبہانی — ۲۰/-
مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری (احوال و افکار)
سید ضمیر الدین احمد — ۷۵/-
قرآن مجید کی تفسیریں (چودہ برس میں) — ۱۰۰/-
چار بیت (تعارف و انتخاب) شبیر علی خاں شکیب — ۲۵/-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو مخطوطات۔ ترتیب ڈاکٹر عطا خورشید
تفسیر القرآن اول — سرسید احمد خاں
تفسیر القرآن دوم — " — مکمل سیٹ ۲۵۰/-
تحریر فی اصول التفسیر — "
سکوں پر اشعار — ۱۲۵/-
جدید غزل گو (ادارہ) — ۵
دیوان نوازش — نوازش لکھنوی — ۵۰/-
دیوان راسخ عظیم آبادی — غلام علی راسخ عظیم آبادی — ۱۰۰/-
ہندومت حصہ اول (۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب — ۵۰/-
ہندومت حصہ دوم (۲) " " " — ۶۰/-
ہندومت حصہ سوم (۳) " " " — ۸۰/-
بدھ / جین / سکھ اور رادھا سوامی (۴) " " — ۴۰/-
ہندو مسلم مسئلہ (۵) " " — ۴۰/-
اسلامیانِ ہند (۶) " " — ۴۰/-
تاریخ ہند (۷) " " — ۶۰/-
پریم چند افسانے (۸) " " — ۵۰/-
پریم چند: مزید افسانے (۹) " " — ۶۰/-
پریم چند: ادبیات (۱۰) " " — ۴۰/-
پریم چند متفرقات (۱۱) " — ۴۰/-
مشاہیر ادب اردو حصہ اول (۱۲) " — ۱۵۰/-

" " " دوم	(۱۳)	۱۵۰/-
" " " سوم	(۱۴) "	۲۰۰/-
" " " چہارم	(۱۵)	۱۲۵/-
نیا ہندستان مشاہیر کے آئینے میں حصہ اول	(۱۶) "	۱۵۰/-
" حصہ دوم	(۱۷) "	/-
سیاست ہند حصہ اوّل	(۱۸) "	۱۰۰/-
سیاست ہند حصہ دوم	(۱۹) "	۱۲۵/-
ممالک اسلامیہ جاپان اور دوسرے ممالک	(۲۰) "	۱۰۰/-
ادبیات ہندی	(۲۱) "	۵۰/-

چند اہم اخبارات و رسائل — قاضی عبدالودود — ۳۰/-
جین دھرم کے مقدس مقامات — بابو چھی داس — ۴۰/-
تہذیب، زبان، ادبیات (خطبات جلد دوم) — ۷۵/-
ہندو مذہب۔ پنڈت منوہر لال زتشی — ۱۰/-
شری کرشن، گوتم بدھ اور دوسرے رہنما — نارائن پرشاد — ۵۰/-
پیر علی (ناول) — شاد عظیم آبادی — ۲۵/-
کچھ ہندومت کے بارے میں — (ادارہ) — ۴۰/-
کبیر صاحب — پنڈت منوہر لال زتشی — ۲۵/-
اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں — (ادارہ) — ۱۰۰/-
ہندوؤں کے تیوہار — لالہ بالکشن بترہ ابر — ۴۰/-
ہندوؤں کے اوتار — // — ۲۰/-
کرنل محبوب احمد — ۲۵/-
پٹنہ کے کتبے — فصیح الدین بلخی — ۵۰/-
جامع الشواہد — مولانا ابوالکلام آزاد — ۴۰/-
اردو ادب — رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱ء۔۴۸ء سے انتخاب — ۵۰/-
اردو لغت — // — // — ۴۰/-
چند ادبی شاہکار کی تحریریں — // — // — ۷۰/-
اردو ہندی ہندستانی — // — // — ۴۰/-
ہندی ادبیات — // — // — ۶۰/-
تاریخ — // — // — ۶۰/-
سائنس — // — // — ۶۰/-
یادگار روزگار — سید بدرالحسن — ۲۰۰/-

گیتا اور قرآن — پنڈت سندر لال — ۲۵/-
جواہر لال نہرو کا سفر روس — جواہر لال نہرو — ۲۰/-
شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا — جنید احمد — ۴۵/-
تحفۃ السعداء — خواجہ کمال — ۲۰/-
خطبۂ صدارت موتی لال نہرو — ۱۰/-
شریمد بھگوت گیتا — مہاتما گاندھی — ۲۰/-
محبوب الالباب — خدا بخش خاں — ۲۰۰/-
قطعات دلدار — مرتبہ: قاضی عبدالودود — ۳۰/-
میرا مذہب — محمد علی ردولوی — ۳۰/-
لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری — قاضی عبدالغفار — ۴۰/-
صراط مستقیم — مرتبہ: قمر آستاں خاں — ۴۰/-
حکایت لقمان — ایسس فیبلس — ۴۵/-
ہندو دھرم اکبر کے عہد میں — ابوالفضل — ۱۰۰/-
مجمع النفائس — سراج الدین علی خاں — ۱۵۰/-
تصوف برصغیر میں — خدا بخش سمینار — ۱۵۰/-
اعمال نامہ — سر رضا علی — ۱۰۰/-
گاندھی جی اور ہندو مسلم ایکتا — نقش علی — ۱۵/-
باغ معانی — مؤلفہ نقش علی تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار — ۱۵۰/-
بھگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی — محمد اجمل خاں — ۲۰/-
جوگ بسشٹ منہاج السالکین — دارا شکوہ — ۴۰/-
ہندو دھرم ہزار برس پہلے — البیرونی — ۱۰۰/-
گفتنی ناگفتنی — وامق جونپوری — ۷۵/-
جرنل ۵۷ ـ ۶۲ — ۱۵۰/-
خدا بخش جرنل ۶۳ ـ ۶۸ — ۱۵۰/-
خدا بخش جرنل ۶۹ ـ ۷۴ — ۱۵۰/-
جنید احمد کی آٹوگراف بک — جنید احمد — ۲۰/-
ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ
ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین — ۱۰۰/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت۔ منشی رام پرشاد ماتھر — ۳۰/-
داستان میر' — ڈاکٹر اقبال حسین — ۳۰/-
دیوان مصحفی — مرتبہ: امیر لکھنوی / امیر مینائی — ۵۰/-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

ستمبر ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۹

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/=
" (بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/=

اڈیٹر
شاھد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
ٹیلی فون: 6910191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ ممبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹوڈی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵..۱۱ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

ادب، خواتین اور سماج (مجموعہ مضامین) ڈاکٹر صادقہ ذکی ۱۲۵/-
بند آنکھوں کا سفر (افسانے) مشتاق احمد نوری ۱۰۰/-
قطرہ قطرہ (مقالات/اداریے) ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل ۵۰/-
ساحل سے دور (شعری مجموعہ) شمشاد سحر ۵۰/-
رمز " آشا پربھات ۶۰/-
اردو مدارس کے معیار تعلیم کا مسئلہ ڈاکٹر اکبر رحمانی ۱۵/-
انتخاب کلام حزیں مرتبہ رزاق انسر ۱۷/-
دربار عام (افسانے) سمن پھلانوی ۶۰/-
تنقیدی بصیرت (تنقید) مشتاق احمد ۳۵/-
غزل کا عبوری دور (ادب) ڈاکٹر شیخ عقیل احمد ۱۵۰/-
ادبیات جدید ایران (ادب) ڈاکٹر منظر امام ۱۲۵/-
خبیث حصہ ۱ مجلد (کہانی) انوار صدیقی ۵۰/-

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

جمنا داس اختر

شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات

مرتبہ: گربچن چندن

جمنا داس اختر کا نام اردو کی سنجیدہ صحافت کی آبرو ہے اس خصوصی شمارے میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں نے اختر صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس شمارے کی حیثیت تاریخ ہند کے اہم باب کی ہے

قیمت: ۹۰ روپے

آسماں محراب

۷۶ تا ۹۶ ۱۹ء کے کلام کا انتخاب

شمس الرحمٰن فاروقی

اردو کے ممتاز نقاد اور شاعر فاروقی کے کلام کا انتخاب۔ یہ انتخاب اردو شاعری کی ایک نئی سمت کی نشان دہی کرتا ہے۔ ۱۹۹۶ء کے شعری مجموعوں میں ایک اہم اضافہ۔ قیمت: ۲۱۰/- روپے

سرورق ——— شرون کمار ورما

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی اہم مطبوعات

اقبال کے آئینہ خانے میں (مقالات کا مجموعہ) مرتبہ آفاق احمد ۴۰/-
پریم چند شناسی (مقالات کا مجموعہ) مرتبہ: پروفیسر آفاق احمد ۵۰/-
شخصیات (خاکے) سید محمود الحسینی ۱۹/-
مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال (ادبی)
ادارہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی ۶۰/-
فکر و شعور (مضامین) کوثر چاند پوری ۱۲.۵۰
تحقیق اور حاصل تحقیق (تنقید) ڈاکٹر سید حامد حسین ۱۴/-
خاموش آواز (خطوط) جاں نثار اختر ۲۵/-
نگارشات (ادبی مضامین) حکیم سید قمر الحسن ۱۵/-
دیوان غالب جدید (شعری مجموعہ) مرتب: مفتی محمد انوار الحق ۲۲/-
لمعات سہا (شعری مجموعہ) مولانا سہا مجددی ۱۶/-
کلام حامد (شعری مجموعہ) حامد سعید خاں ۱۲/-
شب ریزے " ڈاکٹر اختر نظمی ۱۳/-
ستاع فکر " وکیل بھوپالی ۱۳/-
روشنی کس جگہ سے خالی ہے (شعری مجموعہ) فضل تابش ۶۰/-
روشنی، دھوپ، چاندنی " اسد بھوپالی ۵۰/-
نقوش ذکی (شعری مجموعہ) ذکی وارثی ۱۰/-
حرف حرف آئینہ " مختار شمیم ۱۴/-
کاغذ " وحید پرواز ۱۵/-
نگاہ " اختر سعید خاں ۲۰/-
ترنم (ناول) وسیم بانو قدوائی ۲۵/-
اب میں کیا کروں (افسانے) مصطفےٰ تاج ۱۷/-
پرشور خاموشی " آفاق احمد ۲۲/-
جادونگری " کوثر جہاں کوثر ۱۴/-
بازیافت " فرحت جہاں ۱۵/-
یادوں کے چراغ " اقبال جعفری ۱۵/-
لو آج ہم بھی (مزاح) شفیقہ فرحت ۱۲/-
لمحوں کا سفر (افسانے) ڈاکٹر رضیہ حامد ۱۵/-
انوکھا مقابلہ " قانتی انصار ۹/-

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵ - علی گڑھ ۲ - ممبئی ۳

مہمان مدیر
شرون کمار ورما
۲۵۲/۱۔ گلی اونٹھاں والی
چوک پراگ ۔ امرتسر

اشاریہ

کہانی کیوں اور کیسے

میں نے ایک کہانی سنی تھی۔ جو ادھوری رہ گئی، اب یاد نہیں سنانے والا سو گیا تھا یا مجھے نیند آ گئی تھی۔ یہ کہانی نانی یا دادی نے سنانا شروع کی تھی۔ انھوں نے اُسے اپنی نانی، دادی سے سنا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے یہ کہانی میرے باپ نے میری ماں کو سنائی ہو اور میں نے ابھیمنیو کی طرح آدھی سنی ہو، یوں یہ سلسلہ بہت پیچھے تک جاتا ہے۔ اس کہانی میں ایک شہزادی تھی۔ ایک نیک دل پری تھی، ظالم جادوگر اور خطرناک دیو تھا اور ایک بہادر راج کمار۔ پھر اس میں چڑیا داخل ہو گئی، لوتا، مینا گھس آئے۔ خرگوش، کچھوا، شیر، گیدڑ، اونٹ، ہاتھی، آدمی میرے اور آپ جیسا آدمی، امیر اور غریب آدمی تو بہت بعد میں شامل ہوا، لیکن کہانی بظاہر مکمل ہو کر بھی ادھوری ہی رہی۔ سننے والے کو پیاسا چھوڑ جاتی۔ میرا باپ زندگی کے جھمیلوں میں الجھ کر کہانی بھول گیا، ماں گھر کی چار دیواری میں مصروف ہو گئی۔ نانی، دادی کی یادداشت دھوکا دینے لگی تو میں نے اس کہانی کے سرے جوڑنا شروع کیے۔ راج کمار شہزادی کو جادوگری سے نجات دلا لایا۔ پھر کیا ہوا ـــ؟ اس چھوٹے سے سوال کا جواب آسان نہیں تھا۔

تب میں نے جانا کہ جو کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ اپنے پیچھے ایک اہم سوال چھوڑ جاتی ہے اور یہ سوال نئی کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔ جو پھر کچھ سوال کھڑے کر دیتی ہیں۔ شہزادے سے ہوری تک ادر ہوری سے 'دہ' تک کہانیاں اور سوال بکھرے ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ داستان کے بطن سے پیدا ہونے والی کہانی تک پھیلا ہوا ہے اور ختم ہونے والا بھی نہیں۔ ایک نسل، دوسری کو اس کا سرا تھما کر خاموش ہو جاتی ہے لیکن کہانی کا سفر جاری رہتا ہے کیوں کہ زندگی کی رو کبھی رکتی، تھمتی نہیں۔ بھولے شنکر نے آکاش سے اترنے والی بھاگیرتی کو اپنی جٹاؤں میں سنبھالا تھا کہ سرزنا ش نہ کر دے اور پھر اسے شانت کر کے منشیہ جاتی کی

شیوا اور بھلائی اور اپکار کے لیے اگلے سفر پر روانہ کر دیا تھا۔ بھاگیرتی راستہ بدل لیا کرتی ہے۔ رکتی نہیں کہ اُسے سب کا کلیان کرنا ہے۔ بھگوان شیو نے کلیانی (پاروتی) کو کہانی سنائی تھی جو اوپر شاخ پر بیٹھے لوتا مینا نے بھی سنی اور ان پکشیوں نے اسے ہوا کے حوالے کر دیا اور یہ پرم پرا چل نکلی۔ آج بھی امرت منتھن کے بعد جو لیش پان کرتا ہے وہی امر ہو جانے والی کہانیاں سناتا ہے۔ وہی سمجھ سکتا ہے کہ ستیم، شوم، سندرم کے کیا معنی ہیں۔

جنت سے نکالا ہوا آدم آج بھی شرمندہ نہیں ہے۔ وہ حوّا کے ساتھ مل کر اپنے لیے دوسری جنت آباد کرنے کی مسلسل کوشش میں ہے۔ نہ تو گیہوں کی بالیاں سنہری ہونا بند ہوئیں اور نہ سانپوں نے عورت کی ایڑی پر ڈسنا چھوڑا۔ سانپ زندگی کے لیے ضروری ہیں اور کینچوے بھی۔ مٹی اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں۔ علم اور ابدیت دینے والے درخت بھی پھلے ہوتے ہیں۔ ان کی آبیاری کے سنگین جرم کی پاداش میں کسی کو پھانسی پہ لٹکا دیا گیا۔ کسی کو زہر پینے پر مجبور کیا گیا۔ آسمانوں میں سرزد ہوا جرم (؟) ایک خوبصورت اور دلچسپ کہانی بن گیا اور آگے کہانیوں کو جنم دیتا چلا گیا۔ جب آدمی جنت آباد کر لیتا ہے تو دو طرح کے ردعمل سامنے آتے ہیں۔ اول تو کچھ گندی اور تخریبی ذہنیت رکھنے والی طاقتیں سر اٹھاتی ہیں۔ دوئم آدمی خود اپنی جنت سے اکتانے لگتا ہے، اس میں خامیاں اور کمیاں محسوس کرنے لگتا ہے۔ تخریب کار کبھی تجارتی کمپنیاں اور کبھی ایٹمی ہتھیار بنا کر اس جنت کو تباہ کرتا ہے، کبھی کسی نئے ازم کا خوبصورت جال پھیلا کر اپنی سازشوں پر خوش ہوتا ہے۔ یہ جنگ، یہ اپنی تعمیر کردہ جنت سے اکتاہٹ نئی کہانیوں کی بنیاد رکھتی ہے۔

اس کہانی میں چونکہ عورت، مرد کے شانہ بہ شانہ رہتی ہے۔ اسی لیے کہانی میں خوشبو، رنگ، روپ، روشنی، محبت، ممتا، ناز، نخرہ، نزاکت، ایثار، خلوص، قربانی گھل مل گئے۔ عورت محض جسم نہیں، جنسی جذبہ کی تسکین کا نام یا ذریعہ نہیں ایک لافانی، لطیف احساس کبھی پھیکے پڑنے والے رنگ اور سورج سے آنکھ ملانے والے قطرۂ شبنم کی علامت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی لطافت، نرمی اور ہلکے رنگ مانگتی ہے اور اس لیے زندگی کے ہر موڑ پہ اپنا لہجہ، انداز، اسلوب اور رفتار بدلتی رہتی ہے لیکن اپنے مشن، جاذبیت اور اور چاشنی کا سودا نہیں کرتی۔ آج نہ تو جنت سے نکالی ہوئی بی حوّا ہیں اور نہ حضرت آدم لیکن ہجرت کی کہانی جاری ہے۔ آج دنیا میں جنت سے نکالے ہوئے اس جوڑے کا چیلنج گونج رہا ہے۔ کار جہاں دراز ہے۔ او رچراغ آفریدم، یہ ولولہ، یہ حوصلہ، یہ جوش زندہ ہے۔ اس کی جھلک اور گونج ان کہانیوں میں دیکھی اور سنی جا سکتی ہے جو آج نئے دور کا

شیو، پاروتی کو سنا رہا ہے۔

حوّا اور آدم کی داستان ہجرت اور اس دھرتی پر آکر پیدا ہونے والی حیرت نے کہانی کو نیا روپ، رنگ دیا تھا۔ یہ انسانی زندگی کا المیہ ہے کہ وہ اپنی آباد کی ہوئی جنت سے اکتانے بھی لگتا ہے۔ خود کو اس میں غیر اور اجنبی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ غیریت اور بوریت کا احساس اسے کچھ نیا کرنے، نیا حاصل کرنے کی دوڑ میں شامل کر دیتا ہے اور اس کے یہ نئے تجربات و مشاہدات نئی کہانیوں کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش نئے افق روشن کرتی رہتی ہے۔ جنگل سے مہانگر کا طویل سفر اسی کی اسی تگ و دو کا نتیجہ ہے۔ ابھی تو چاند اور دوسرے سیاروں کی زمین اس کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہے۔ جب آدمی چاند یا منگل ستارے پر آباد ہوا تو نئی کہانیاں جنم لیں گی۔

نئی بستیاں بسانے والے ان سے کچھ امیدیں بھی وابستہ کرلیتے ہیں۔ امیدیں اور انڈے ٹوٹ بھی جاتے ہیں، کبھی ان سے نئی زندگی جلا پاتی ہے۔ اور کبھی صرف دکھ اور تکلیف۔ یہ دکھ جب آدمی کے اندر برگد کی طرح پھیلتا ہے تو کوئی گوتم نروان کی تلاش میں آنکلتا ہے اور کبھی اے۔ کے ۴۷ رائفل بردار دہشت گرد جنم لیتا ہے۔ اس کی شاخوں پر توتا مینا بھی بسیرا کرتے ہیں۔ اس کی چھاؤں میں بیٹھنے والے اپنے دکھ درد بیان کرتے ہیں۔ گوتم انھیں زندگی کے راز سمجھاتا ہے اور جاتک کتھاؤں کی شکل میں زندگی کی پرتیں ان پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ توتا مینا ان کہانیوں کو لے اڑتے ہیں۔ پھر شہر پاؤں پسارتا ہے تو یہ برگد کاٹ دیا جاتا ہے۔ توتا مینا، گوتم اور بھکشو سب ہجرت کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور ان کے ساتھ کہانیاں بھی۔

دکھ تنہائی کا بھی ہوتا ہے اور بھیڑ میں رہتے ہوئے اپنی شناخت کا بھی، زندگی کے بے معنی ہوجانے کا بھی اور رشتوں کی شکست و ریخت کا بھی لیکن جب یہ دکھ احساس کی آگ میں تپ کر کہانی کا روپ لیتا ہے تو مکانی ہونے کے باوجود لامکانی ہوجاتا ہے۔ آفاق کی کارگہہِ شیشہ گری، نازک ہوتی ہے، اس میں بال آتے ہیں تو ہم سب متاثر ہوتے ہیں، تب اس دکھ اس المیہ کی کوکھ سے جنم لینے والی کہانی آفاقی اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے۔

کہانی کی زبان کہانی سے الگ نہیں ہوتی۔ جس کہانی پر زبان دانی کا بوجھ ڈال دیا جائے اسے سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اکثر دم گھٹ کر مر بھی جاتی ہے۔ سپر اسٹرکچر کا تام جھام کہانی کار کا ہوتا ہے۔ بڑھا بھی لیتے ہیں کچھ زیب داستان کے لیے۔ یہاں کچھ کا لفظ توجہ چاہتا ہے۔ زیادہ بڑھا چڑھا لینے سے آنکھیں تو خیرہ کی جاسکتی ہیں لیکن کہانی اس چکاچوند میں گم ہوجاتی ہے۔ جس گھونسلے کو پرندہ چھوڑ جائے وہاں صرف تنکے

رہ جاتے ہیں۔ چاہے وہ گھونسلہ فن کار بیا کا کیوں نہ ہو۔ محض الفاظ کی جادوگری، جملوں کی چکاچوند اور فلسفہ بگھارنے سے بات نہیں بنتی۔ مداری کا تماشہ ہو کر رہ جاتی ہے جہاں ڈگڈگی کی آواز اور بندروں کے کرتب نمایاں ہوتے ہیں۔ اچھا کہانی کار قاری کو الفاظ کے بوجھل چکر میں ڈال کر اس کی جیب نہیں کاٹتا۔ اسے پہلے سے کچھ زیادہ امیر زیادہ تجربہ کار اور زیادہ ہوش مند ہونے کا لطیف احساس دلاتا ہے۔

کچھ نئے، کچھ خوبصورت اور سچ کا احساس دلانے والی کہانی نہ تو مذہبی واعظ ہوتی ہے اور نہ کسی ریفارمر یا سیاست داں کی لچھے دار تقریر۔ کسی حساس، بیدار ذہین فن کار سے ایسی امید رکھنا بھی بیکار ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ جگر خون کر کے کہانی میں رنگ بھرنے والا فن کار صلہ اور ستائش کی پرواکیے بغیر ایک ایسے سفر پر چلتا رہتا ہے جس میں سائے نہیں ہوئے۔ اس کی تیسری آنکھ کچھ نیا ڈھونڈتی رہتی ہے۔

زندہ رہنے کی ضرورت اس صارفی سماج میں شعوری یا غیر شعوری طور پر تجارتی رشتوں اور پیسوں کی مرہون منت بنادی گئی ہے پیسہ اور اس سے حاصل کی جانے والی سہولت STATUS SYMBOL بن گئی ہے۔ آدمی ان کے حصول کے لیے اپنی الگ پہچان بنانے کے لیے اپنا گھر اپنے لوگ، اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی اور غیر مانوس جگہوں اور ماحول میں آباد ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔ آج وہ فاتح بن کر نہیں، ضرورت مند بن کر سمندر پار جا رہا ہے۔ جہاں ابھی ہر کام مشین، روبوٹ اور کمپیوٹر نہیں کر رہے وہاں سستی لیبر درکار ہے۔ باغوں میں، ہوٹلوں میں، پبز (PUBS) اور پٹرول پمپس پر ڈالر اور پاؤنڈ کے لالچ میں یہ پردیسی پرندے ہر دم شکار کیے جانے یا اڑائے جانے کے تکلیف دہ خوف اور حقارت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور پاؤنڈ اور ڈالر کو روپیوں میں تبدیل کر کے خوش ہو لیتے ہیں لیکن جب بے وطنی اور بے خبری کا احساس بچھو کے ڈنک کی طرح لگتا ہے تو پریشان ہو اٹھتے ہیں۔ جب اپنی ہی اولاد مغربی سانچوں میں ڈھل کر جوان ہوتی ہے تو ایک اور ڈر انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تب یہ خود سے پوچھتے ہیں "اب کیا ہوگا۔؟" یہ نیا سوال نئی کہانیوں کو جنم دیتا ہے۔ ڈالر اور پاؤنڈ کا لالچ وہاں سے آنے نہیں دیتا، غیریت اجنبیت اور ذلالت کا احساس وہاں رہنے نہیں دیتا۔ زندہ رہنے کے لیے خود کو پل پل مارتے رہنے والے یہ پردیسی پرندے دھندلکوں میں اڑتے رہتے ہیں۔

آج زندگی اتنی سیدھی، سپاٹ اور صاف نہیں رہ گئی جتنی پتھر اور جنگل کے یگ میں ہوا کرتی تھی۔ تکنیکی ترقی کے ساتھ پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئی ہیں۔ سمجھ آتی ہے اور نہیں آتی۔

تے ٹوٹ رہے ہیں، بدل رہے ہیں، جھوٹ زندگی کا سچ بنتا جا رہا ہے۔ کوئی مقدس ب، کوئی واعظ، کوئی تنبیہ اسے روک نہیں پا رہی۔ اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل رہا ہے۔ وی پر سُر ودھا اور کے رنگین اشتہارات اسکوٹر کے اشتہار میں جنسی اشارے، گھر ر بیں دیکھے اور سنے جا رہے ہیں۔ تو باپ بیٹے سے کیا چھپائے اور ماں بیٹی کو کیا سمجھائے۔ ، کہانی اسی ماحول میں سانس لے رہی ہے۔ لینے پر مجبور ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے کیچڑ ے کنول کے پھول کی طرح رہنا ہے۔ زندگی کے اس نئے اور اہم موڑ پر کہانی کو اپنا رنگ، پ، لب و لہجہ بدلنا ہی ہوگا۔ بہت سے پردے اٹھ رہے ہیں۔ بہت سی دیواریں گر رہی ں اور کہانی یہ سب بیان کرنے پر مجبور ہے۔

سماجی رشتے جب ٹوٹتے ہیں تو آواز نہیں ہوتی۔ ایک دکھی کر دینے والا کھردرا سا ساس ہوتا ہے۔ آدمی گھبرا کر ڈر کر اپنے اندر سمٹنے لگتا ہے۔ خود کی تلاش اور شناخت اور فاظت اسے الگ تھلگ کر دیتی ہے۔ گوشۂ عافیت سمجھ کر وہ اپنے اندر چھپا تو رہتا ہے لیکن ندر کی گھٹن زیادہ دیر برداشت نہیں ہوتی۔ وہ گھبرا کر پھر باہر آتا ہے۔ یہ اندر باہر کا سفر نئی ہانیوں میں ڈھلتا ہے۔ زندگی کے چوراہے پر کھڑا یہ آدمی اُس آدم سے مختلف ہے جو ہشت سے نکالے جانے پر حوّا کے ساتھ اس دھرتی پر وارد ہوا تھا اس کے مسائل بہت م تھے۔ یہ آدمی بھیڑ کے باوجود خود کو تنہا اور ہر طرف سے کٹا ہوا، کسی وسیع و عمیق سمندر میں یک چھوٹا سا جزیرہ محسوس کر رہا ہے۔ اپنے ارد گرد اُٹھنے والے شور، افراتفری اور بیگانگت و سمجھنے، اسے معنی دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ رہبرانِ قوم کی طرف مایوسی اور امید کے ملے جلے احساس سے دیکھ رہا ہے۔ جن کا ایک ہاتھ کرسی کو مضبوطی سے تھامے ہے اور دوسرا ٹوپی کو۔ ٹوپیاں اچھل رہی ہیں۔ کرسیاں کھسک رہی ہیں۔ کرسی کے فتنے جنم لے رہے ہیں۔ اس جھمیلے سے نکلنے کے لیے وہ کبھی مذہب، کبھی سیاست، کبھی دہشت گردی کا سہارا لے رہا ہے۔ حاصل کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ لاحاصلی کا غم نئی کہانیوں میں ابھر رہا ہے۔ کچھ اسے کھردرے پن کا نام دے کر اس سب کے بیان کو معتوب کر رہے ہیں۔ کچھ زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر رہے ہیں۔ آج کا آدم خود کو ایسے ہی جالوں اور چالوں میں گھرا پا رہا ہے۔ وہ ان سے کیسے نجات پائے۔ بے بسی اور خوف کا احساس، بے معنی اور بیکار ہو جانے کا احساس، فن کار کا حصہ ہے۔ پھر وہ کیا کرے۔ پریوں اور شہزادوں اور جادوگروں کی کہانیاں کہاں سے لائے۔ ڈرے، سہمے، پریشان اس آدمی کی کہانی ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے۔ پوچھ رہی ہے۔ کیا کہوں؟ جواب وقت کے پاس ے۔ بڑی کہانی آنے والے وقت کی غماز ہوا کرتی ہے۔ محض حالات حاضرہ کا آئینہ یا عکس نہیں۔

دونسلوں کے بیچ کا فاصلہ کب نہیں تھا، کب نہیں ہوگا۔ اسے کم کیا جا ہی نہیں سکتا، پھر قبول کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ جہاں سماجی رشتے ہوتے ہیں وہاں جنسی رشتوں میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ عورت اور مرد کا باہمی رشتہ سماجی بندھنوں کے علاوہ کچھ جسمانی ضرورتوں کا پابند بھی ہوتا ہے تبھی تو استحصال کی نوبت آتی ہے۔ مرد، عورت کے بطن سے پیدا ہوا، اس لیے ممتا محبت اور قرب کے لیے ترستا رہتا ہے۔ عورت، مرد کی پسلی کاٹ کر پیدا کی گئی اس لیے بار بار ادھر کو ہی پلٹتی ہے۔ پھر مرد ہی گناہ گار کیوں۔ سماج دونوں کی برابری قبول کیوں نہیں کر لیتا لیکن یہ برابری فیشن شوز، بیوٹی کمپ ٹی ٹشنز جسم کی بے ہودہ نمائش میں ناپ تول کے پیمانوں پر پورا اترنا۔ باپ، بھائی اور خاوند کی سرپرستی سے نکل کر غیر مردوں کی اقتصادی اور سماجی غلامی میں نہیں ہے۔ یہ سب تو خوبصورت طریقہ استحصال ہیں۔ نئی کہانی عورت کی آزادی کے ساتھ ساتھ یہ اہم سوالات بھی اٹھا رہی ہے۔

قلم اور لفظ کی حُرمت اسی میں ہے کہ کہانی کا رسچ اور انصاف کا ساتھ دے۔ بے باک اور بے لاگ ہو کر زندگی کے حسن، جاذبیت کے ساتھ ساتھ اس کے گھناؤتے رخ کا احاطہ بھی کرے۔ بکنے سے گریز کرے۔ نئے چیلنج قبول کرے۔ میڈیسن کی دنیا میں کینسر اور ایڈز جیسے موذی امراض کا علاج ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اگر ایک طرح کا سیاسی نظام ناکام ہو رہا ہے تو دوسرا اور بہتر نظام لانے میں کیا قباحت ہے لیکن کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے، کسی پر صرف کیچڑ اچھالنے یا کسی خاص رنگ کی عینک سے دیکھنے سے اچھا اور زندہ ادب پیدا نہیں ہوتا۔ لالچ، ریاستی جبر، جھوٹ، فریب انسان کے دشمن رہے ہیں۔ ان کا پردہ فاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کہانی کو سانس لینے کے لیے تازہ ہوا، آزاد فضا اور پر امن معاشرہ چاہیے۔ تیسری آنکھ، دش پان اور جٹاؤں میں بھاگیرتی کو سنبھالنے کی شکتی اور حوصلہ ہی ستیم، شوم، سندرم کی پہلی سیڑھی ہے۔

[redacted]

اختر سعید خاں
اندرون اتوارہ
بھوپال۔ ایم۔ پی

غزل

مانے وہ کس طرح کہ انا درمیان ہے
خود اس کو اپنے جھوٹ پہ سچ کا گمان ہے

یوں چل رہے ہیں ناز سے وہ میری خاک پر
گویا کہ ان کے زیرِ قدم آسمان ہے

اس زندگی کو ہنس کے گلے سے لگائے ہوں
جس کے نفس نفس کی اجل ترجمان ہے

تصویرِ غم بنے ہوئے پرسانِ دل ہیں وہ
اے دردِ ہجر آج ترا امتحان ہے

اٹھیے جو اس کے در سے تو پھر جائیے کہاں
لے دے کے سر پہ ایک یہی سائبان ہے

اٹھتا ہے کون دیکھیے عرفانِ غم لیے
میں ہی ستم رسیدہ نہیں اک جہان ہے

اختر مری زباں پہ ہے جو حرفِ آرزو
صدیوں کے اضطراب کی ایک داستان ہے

قیوم خضر
خلاصی ٹولہ
پٹنہ ۷



خلوصِ دل اگر ہوگا تو تاثیرِ نظر ہوگی
اگر ٹپکے لہو دل سے تو تحسینِ ہنر ہوگی

غموں سے چور ہیں پھر بھی کڑے لمحوں کو سہہ لیں گے
بلکتے بھوک سے بچوں کی شب کیسے بسر ہوگی؟

وہ سناٹا، وہ تنہائی، وہ گم صم سی فضائے شب
دعا مانگی مریضِ غم نے مولا! کب سحر ہوگی؟

کنوارے پن کی آنکھوں سے لہو ٹپکے گا آنگن میں
کبھی سوچا نہ تھا ایسی بھی تذلیلِ بشر ہوگی

وہ بنجارے، وہ بیچارے، وہ بدقسمت کہاں جائیں
اگر غم خوار ہوگی تو فقط گردِ سفر ہوگی

دھنک کا رنگ بکھرا، آنچلوں کے سائے لہرائے
بہارِ حسن سے اب دعوتِ ذوقِ نظر ہوگی

عروسِ شب کے ماتھے سے ردائے کہکشاں ڈھلکی
فضا جاگی، ندی چونکی، کہ ان دیکھی سحر ہوگی

کسی کو ساغرِ آبِ بقا یونہی نہیں ملتا
فنا میں ڈوب کر آوے تو مولا کی نظر ہوگی

ڈاکٹر ظفر حمیدی

غزل

شاعر ہوں شاعری کی نوا چھوڑ جاؤں گا
میں حرف حرف نقش وفا چھوڑ جاؤں گا

آفاق میں نرالی صدا چھوڑ جاؤں گا
ہر کہکشاں میں اپنی ضیا چھوڑ جاؤں گا

گونجے گی عرش پاک کے چاروں طرف مدام
سب کے لیے میں ایسی دُعا چھوڑ جاؤں گا

تحلیل ہو کے خاک کے ذرّوں میں ایک دن
ذرّوں کو آفتاب نما چھوڑ جاؤں گا

اس کے چراغ فکر کو روشن کریں گے لوگ
اپنے لہو کا جلتا دیا چھوڑ جاؤں گا

مظلوم قافلے یہاں ٹھہریں گے باربار
گھر کا ہر ایک کمرہ کھلا چھوڑ جاؤں گا

جو بھی مرے کفن پہ کچھ آنسو بہائے گا
میں اس کے دل میں یاد خدا چھوڑ جاؤں گا

اگلی صدی قریب ہے اس کے لیے ظفر
انسانیت کی تازہ فضا چھوڑ جاؤں گا

انجم بارہ بنکوی
۷۸ منصب منزل، کربلا روڈ، بھوپال

غزل

میں جانتا ہوں مجھ کو کدھر جانا چاہیے
موسم کی سرحدوں سے گزر جانا چاہیے

خوشبو کا احترام ہوائیں نہ کر سکیں
پھولوں کو اپنی شاخ پہ مرجانا چاہیے

میں تو سمجھ رہا تھا محبّت گلاب ہے
یہ بوجھ ہے تو دل سے اتر جانا چاہیے

اللہ میرے دل میں محبّت نہیں رہی
اس آئینے کو اب تو بکھر جانا چاہیے

پانی سے دشمنی ہے تو کشتی میں کیوں رہیں
دریا کی تہہ میں ہم کو اتر جانا چاہیے

کس کو پکارتے ہو ستارے تو سو گئے
شب کے مسافروں کو بھی گھر جانا چاہیے

انجم مرا خیال ہے چاہت کے واسطے
یہ راستہ کٹھن ہے مگر جانا چاہیے

مظہر امام
۱۷۶- بی' پاکٹ 1
میور وہار- ا' دہلی 91

آج کا ادیب' کتنا ادیب !

زندگی' نظریۂ زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ ادیب کے لیے کسی مخصوص نظریۂ حیات یا فلسفہ یا عقیدہ یا مسلک سے کلی طور پر وابستہ ہونا ضروری نہیں۔ ادب کا تعلق انسان اور حیات انسانی سے ہے' اور کوئی ادب' غیر انسانی اور رجعت پسند نہیں ہوتا۔ انسان دوستی' مساوات' عالم گیری برادری' حسن' خیر اور صداقت کے تصورات تخلیقی سرگرمیوں کے خاص محرک ہیں۔

ادیب یا شاعر سے توقع رکھنا کہ وہ زندگی میں پیدا ہونے والے ہر مسئلے پر کوئی فن پارہ تخلیق کرے' درست نہیں۔ عالمی' ملکی یا کسی خاص خطے کی سطح پر بہت سے واقعات و حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان سب پر ادیب یا شاعر کا فوری طور پر ردعمل ظاہر کرنا' عموماً اچھے ادب کی تخلیق کا ضامن نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ادیب اپنے وقت کے مسائل سے بے تعلق ہو کے بیٹھا رہے' اپنی آنکھیں عصری منظر نامے پر ٹکنے نہ دے' اپنے گھر کے نیم روشن نیم تاریک کمرے میں فکر سخن کرتا رہے اور اپنے آپ کو احساس دلاتا رہے کہ وقتی مسائل پر لکھنے والے "ملحدوں" پر کس طرح عذاب الٰہی نازل ہوا !

مثال کے طور پر تقسیم ہند اور اس کے سب سے بڑے المیے فسادات کو لیں۔ یہ المیہ اتنا ہمہ گیر تھا اور اس کے اثرات اتنے دور رس تھے کہ اس نے تقریباً سارے ادیبوں اور شاعروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا' اور کم و بیش سب ہی چھوٹے بڑے ادیب اس انسانی المیے اور اس سے پیدا شدہ نفسیاتی' عمرانی اور اخلاقی مسائل کی بنیاد پر اپنی تخلیقات پیش کرنے لگے۔ بلاشبہ ان میں بیشتر تحریروں کا فنی معیار پست تھا۔ اس طرح کی بہت سی تحریروں کو صحافتی ادب کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ بعض تخلیقات اپنی شدید جذباتیت کی بنا پر ناقابل اعتبار ٹھہریں۔ لیکن انھیں میں بہت سی بلند درجے کی تحریریں بھی تھیں۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں "کھول دو" "ٹھنڈا گوشت" "موذیل" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو اعلا ادب تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانے "لاجونتی" میں ایک مغویہ عورت کی نفسیات کو ایسی انسانی ہمدردی اور فنی نزاکت کے ساتھ پیش کیا کہ اسے اردو کے لازوال افسانوں کی صف میں جگہ ملی۔ اس موضوع پر کچھ اور بھی

اہم تخلیقات سامنے آئیں۔ مثلاً شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ "دہلی کی بپتا" اور قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ "یا خدا"۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، فیض کی نظم "سحر" کی مثال کافی ہوگی۔

اس ذکر سے مقصود یہ ہے کہ ایسے مسائل جو عصری زندگی پر گہرے اثرات مرتسم کررہے ہوں، ان پر اپنے فنکارانہ ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے ادیب کو شرمانا نہیں چاہیے۔

میری نسل کے لوگ گذشتہ چالیس سال سے دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تہذیب کی حسین قدروں کا حسن مشتبہ ہوگیا ہے۔ انسان اپنی عظمت کھوتا جارہا ہے اور تباہی و بربادی کی طاقتیں سر افراز ہو رہی ہیں۔ نیکی، حق پسندی اور انسان دوستی کے نعروں میں پہلی سی حرارت نہیں رہی۔ قومی اور بین اقوامی انتشار نے ایقان و اعتماد کی دیواروں کو متزلزل کردیا ہے۔ زندگی کی عزیز قدریں فنا ہوچکی ہیں۔ تنگ نظری، جانب داری اور خود غرضی کی بڑی کریہہ صورتیں سامنے ہیں۔ نئی نسل نے تو اسی ماحول اور اسی فضا میں آنکھیں کھولی ہیں۔

شاید ہم تاریخ کے پیچیدہ ترین دور سے گزر رہے ہیں۔ تہذیبی، سماجی اور معاشی بحران کا ایسا تجربہ غالباً پہلے کسی نسل کو نہیں ہوا ہوگا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں بنیاد پرستی ایک باقاعدہ رجحان کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ ہمارے یہاں بھی بنیاد پرستی اور فرقہ پرستی کی لہر جس تیزی سے اٹھی ہے، اس کا تجربہ ہم سب کو ہے اور اس میں کسی طرح کی کمی کے آثار نہیں ہیں۔ یہ فرقہ پرستی درندگی، وحشیانہ پن اور حیوانیت پر منتج ہوئی ہے۔

صارفیت نے ہمارے معاشرے کو کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کہ اب اس سے مفر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ صارفیت کے زیر اثر ہمارے اندر اپنے آرام و آسائش کے زیادہ سے زیادہ سامان مہیا کرنے، تعیش اور تفریح کی صورتیں پیدا کرنے اور جا و بیجا طریقے پر اپنے مال و دولت کا مظاہرہ کرنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے اس نوع کے وسائل فراہم کرنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اپنے پاس پڑوس والوں کی نظر میں ہیٹا بھی نہیں ہونا چاہتا۔ اس لیے وہ دولت کمانے کے ایسے طریقے استعمال کرتا ہے جن کی اجازت اخلاق اور قانون نہیں دیتا۔ ایک عمدہ، وسیع، سازو سامان سے آراستہ مکان، اعلا درجے کی گاڑی بلکہ گاڑیاں، جدید ترین فیشن کے قیمتی لباس، اشتہاروں کے ذریعے للچانے والی مصنوعات کی فراہمی کی خواہش، پانچ ستارہ ہوٹلوں میں قیام و طعام اور رقص و سرود سے حظ اندوز ہونے کی آرزو اسے حصول زر کے غلط راستوں پر لگا دیتی ہے، کیونکہ ظاہر ہے، صرف علمی لیاقت، محنت اور ایمانداری سے تعیش، نمائش، آرائش اور آسائش کے اتنے سامان مہیا نہیں ہوسکتے۔ کہا جاتا ہے کہ سویت یونین کے زوال کا ایک بڑا سبب صارفیت کی جانب عوام کا بڑھتا ہوا رجحان بھی تھا !

ادیب اپنے معاشرے کا ضمیر ہو یا نہ ہو' سماج کا حصہ ضرور ہے اور اس کا فن اپنے زمانے کی بربریت' ظلم و جبر' تعصب' منافرت' غربت' غیر انسانی رویوں' حصول زر کے لیے اندھا دھند دوڑ' تیسری دنیا کو اقتصادی شکنجے میں کس کر زیادہ سے زیادہ مفلس بنانے کا عمل اور اس طرح کے دوسرے رویوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ اس نے روس میں ایک نئے نظام حیات کا عظیم تجربہ بھی دیکھا اور اس کے ناکام ہونے کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ جو ادیب براہ راست اس تصور حیات سے وابستہ رہے ہیں' ان کی بات جانے دیجیے' لیکن جو ادیب اس نقطہ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں' وہ بھی اس تجربے کی ناکامی پر مسرور ہونے کا کوئی جواز نہیں رکھتے' کیونکہ اس ناکامی کے جو اثرات عالمی سطح پر ظاہر ہونے لگے ہیں' ان سے آج کا ادیب چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ سویت یونین کے انہدام پر مغرب کے مشہور جریدے "اکانومسٹ" نے اپنے اداریے میں یہ معنی خیز بات لکھی تھی : "خوشی منانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آرہی ہے۔ بات یہ ہے کہ درحقیقت جیتا تو کوئی بھی نہیں !"

یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا آج کے مسائل کو پیش کرکے ہی بڑے یا کم از کم اچھے ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ ادبی تقاضے کچھ اور ہیں۔ صرف موضوعات سے اچھا ادب معرض وجود میں نہیں آتا۔ کیا ادیب کو اپنی زبان پر گرفت ہے؟ اظہار کے مختلف اسالیب پر اس کی نظر ہے؟ کیا اس کا مطالعہ وسیع ہے؟ زندگی کے مختلف مظاہر کا اس نے کتنا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے؟ اس کا تاریخی' عمرانی اور سماجی شعور کس حد تک بالیدہ ہے؟ وغیرہ

پھر ایک سوال جو مجھے اکثر پریشان کرتا رہتا ہے۔ اگر ادیب معاشرے کے لیے ذمے دار ہے تو کیا معاشرہ بھی ادیب کے لیے ذمے دار ہے؟ کیا ادیب کو ہمارے معاشرے میں کوئی مقام حاصل ہے؟ کیا اس کی کوئی سماجی حیثیت ہے؟ اور چونکہ نہیں ہے' اس لیے کیا اس کی تحریریں کوئی اثر بھی رکھتی ہیں؟ کیا اس کے احتجاج کی بھی کوئی وقعت ہے؟

چونکہ گفتگو یہاں اردو کے حوالے سے ہو رہی ہے' اس لیے اردو ادب کو اردو زبان سے الگ کرکے کوئی بات نہیں کی جاسکتی۔ اردو پر جو سخت وقت پڑا ہے اور اس زبان کے جولالے پڑے ہوئے ہیں' اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ اردو کا ادیب یہ سوچنے میں حق بجانب ہے کہ اس کا خون جگر صرف کرنا محض کار زیاں تو نہیں ہے؟ اگر زبان ہی نہیں رہی تو اس کا ادب پڑھے گا کون؟ اس سے جڑا ہوا مسئلہ قاری کا بھی ہے' کیونکہ اردو ادب کا قاری معدوم ہوتا جارہا ہے۔ اسباب و علل پر گفتگو بے کار ہے۔ آج کے ادیب کو بہر حال قاری کی بازیافت بھی کرنی ہے۔ وہ قاری جو اس سے جدا ہو گیا ہے !

پروفیسر شارب ردولوی
اے۔ ۱۱/۷
موریس نگر۔ نئی دہلی ۷

ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ

اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ

پروفیسر عتیق اللہ اردو کے ادبی حلقے میں ایک شاعر، ادیب، ناقد اور شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے استاد کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں لیکن ان کے موجودہ کارنامے نے ان کے ایک بالکل نئے پہلو سے متعارف کرایا یعنی الفاظ شناسی اور اصطلاح سازی۔

اردو میں لغت نویسی یا فرہنگ نگاری کا کام نیا نہیں ہے، ہر عہد میں اس طرح کا کوئی نہ کوئی کام ہوتا رہا ہے۔ دراصل یہ کام انسان کی بنیادی ضرورتوں میں ہے۔ ہندستان میں زبانوں کی کثرت، علاقائی اختلاف اور روزمرّہ و محاورہ کے فرق کے بارے میں ایک پرانی کہاوت اب بھی رائج ہے کہ یہاں ہر دو کوس پر زبان بدل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ وقت، ضرورت اور حالات کے مطابق بھی زبان تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ پرانے محاورے متروک ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے محاورے لے لیتے ہیں۔ زبان میں یہ عمل شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر چلتا رہتا ہے۔ سماجی، معاشی، تہذیبی تبدیلیوں، سائنسی تجربوں اور علم میں روز افزوں اضافوں کے تحت نئے الفاظ جنم لیتے ہیں یا نیا محاورۂ زبان پیدا ہوتا ہے۔ یہ نیا محاورۂ زبان نئے علوم اور نئی واقفیت سے بھی وجود میں آتا ہے۔ نئی اصطلاحات سامنے آتی ہیں اور اپنی زبان میں اظہار کے لیے ان اصطلاحات کے مترادفات کی ضرورت پڑتی ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں ہماری زبان میں جس تیزی سے تبدیلیاں ہوئیں انھوں نے زبان کی شکل کو بہت کچھ بدل دیا۔ یہ ہر بڑی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلی کے ساتھ ہوتا ہے اس لیے کہ ان تبدیلیوں سے علم میں جو وسعت آتی ہے، اس کے لیے مروّجہ الفاظ ناکافی ہوتے ہیں اور پھر نئے الفاظ گڑھنے اور بنانے اور نئی اصطلاحات سازی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس ضرورت کا شدید احساس پہلی بار سرمایہ دارانہ نظام کی آمد اور انگریز حکومت کے قیام کے ساتھ ہوا۔ انگریزی سے ترجمے کے وقت بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر یہاں پر معاملہ صرف ادب کا نہیں بلکہ تمام علوم کا تھا اور ایک نئے

تعلیمی نظام اور علوم کی نئی جہتوں سے استفادہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا جب تک نئی لفظیات نئی اصطلاحات اور علامتوں کے مترادفات متعین نہ کیے جائیں۔ اس وقت بھی لغات کی تدوین ہوئی فرہنگیں تیار کی گئیں، اصطلاحات کے مترادف بنائے گئے۔ بہت بڑے پیمانے پر یہ کام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہوا جہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تھا۔ علمی کتابوں کے انگریزی سے ترجمے کے وقت ایسی بے شمار اصطلاحوں سے سابقہ پڑا جن کا کوئی مترادف اردو میں نہیں تھا، اس لیے پہلی بار باقاعدہ طور پر "مجلس وضع اصطلاحات" قائم کی گئی تاکہ اصطلاحات کے ترجمے میں یکسانیت رہے اور ترجمہ ابہام کا شکار نہ ہو۔ ایسی کوششیں اور بھی ہوئیں لیکن بہت بڑے پیمانے پر، اس کی ضرورت ایک بار پھر اس وقت پیش آئی جب حکومت ہند نے فیصلہ کیا کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے اس کے لیے کتابوں کے ترجمے کی ضرورت پیش آئی جس کے لیے ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا جہاں مختلف علوم کی اصطلاحات وضع کرنے کا کام وسیع پیمانے پر ہوا اور اردو کے مشہور ناقد کلیم الدین احمد کو ادبی تنقید کی اصطلاحات کا کام سپرد کیا گیا لیکن گذشتہ ربع صدی میں اردو ادب و تنقید میں خاص طور پر نفسیات، اسلوبیات، ساختیات اور مابعد ساختیاتی نظریوں کے تحت نئی اصطلاحات کا ایک سیلاب آگیا اور ہر شخص الفاظ و اصطلاحات کی تشریح و تعبیر اپنے نظریے، ضرورت اور سہولت کے مطابق کرنے لگا۔ اردو، بے علاقہ ہونے کے باوجود ہندستان سے پاکستان اور پاکستان سے یورپ، امریکا اور کنیڈا تک ایک بہت بڑے علاقے کو محیط ہے جس میں بہت سے ناقد اور ادیب نئی اصطلاحات کے ذریعے اپنے نقطۂ نظر پر اصرار کرتے رہے ہیں لیکن اکثر یہ دیکھا گیا کہ ایک ہی اصطلاح کے لیے مختلف حضرات مختلف مترادف استعمال کرتے ہیں جس سے ترجمے میں بھی دشواری ہوتی ہے اور لفظ کے مفہوم سمجھنے میں بھی۔ مثلاً صرف ایک اصطلاح کو لے لیں، آج کل ادبی تنقید میں DECONSTRUCTION کا ذکر بار بار آتا ہے اس کے لیے ردتعمیر، لاتشکیل، ساخت شکنی ردتشکیل، انہدام وغیرہ مترادف کے طور پر مستعمل ہیں۔ ایسی صورت میں قاری کو جس دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔ اس لیے اس کی شدید ضرورت تھی کہ مغربی ادبی اصطلاحات کے مترادفات کی معیار بندی کی جائے۔ یہ کام بڑے جوکھم، محنت، لگن اور سوجھ بوجھ کا تھا۔ کسی اصطلاح کا مترادف طے کرنے میں بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے، لفظ، اس کا ادبی سیاق، اس کی سماجی و تہذیبی نہج، اس کا منطقی پہلو پھر مشتقات کی صورت میں سابقوں اور لاحقوں کے ساتھ اس کے معنیاتی نظام کا درست رہنا، اس کے علاوہ اس پر نگاہ رکھنا کہ اصطلاح کا بدل اصطلاح کی صورت میں بن سکا یا صرف تعبیر و تشریح

ہو پاتی۔

زیر نظر کتاب 'ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، جدید ادبی اصطلاحات کے سلسلہ میں اردو کی اہم ترین فرہنگ ہے۔ جسے ڈاکٹر عتیق اللہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بڑی معروضیت کے ساتھ لفظ کے معنی اور مفہوم کے تعین کی کوشش کی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس مکتبہ فکر کے لوگوں کا اس کے بارے میں کیا ردّ عمل ہوگا جو لفظ کے کسی متعینہ معنی کو ہی نہیں مانتے بہر حال ڈاکٹر عتیق اللہ نے کسی لفظ یا اصطلاح کو اس کے پورے سیاق میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، پھر اس کے استعمال کے مطابق اس کے معنی کے اور کتنے پہلو ہو سکتے ہیں، ان تمام معنی، مطالب اور مفاہیم کی روشنی میں اس کے کیا معنی یا مترادف ہو سکتے ہیں اس سے بحث کی ہے اور یورپی ناقدین کے حوالوں کے ساتھ معنی متعین کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے انگریزی کے مشہور فرہنگ نویسوں کارل بکیس، سلوان بارنیٹ، ایم ایچ ابرام، راجر فاؤلر اور جے۔ اے کڈن سے استفادہ کیا ہے اور ان کے حوالے سے معنی کی سند فراہم کی ہے۔

ڈاکٹر عتیق اللہ نے اصطلاحات کا تعین کرنے سے پہلے مخصوص اصطلاح کی تشریح و تفہیم کی ہے یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ جب تک معنی واضح نہ ہو اس وقت تک اصطلاح کا تعین ممکن نہیں ہے اردو میں اصطلاحات کے سلسلہ میں جو افراتفری نظر آتی ہے اس کا سبب یہی ہے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے اس صورت حال کو دور کرنے کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ لفظ کے معنی اور اس کے تہذیبی، سماجی اور تاریخی رشتوں کی وضاحت کی ہے اور پھر اردو شعر و ادب سے اس کی مثالیں دی ہیں تاکہ آسانی سے سمجھ میں آسکیں مثلاً ایک یونانی اصطلاح ADYNATION ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ناممکن کے ہیں...... مبالغہ کی ایک قسم.... علم معنی کی اصطلاح میں غلو..... یعنی عقل و عادت سے محال یا خلاف فطرت مبالغہ آرائی..... شعرا نے قصائد اور مراثی میں جہاں جہاں ممدوح یا ممدوح کی تلوار، نیزے، گھوڑے، ہاتھی، یا صورت و سیرت کی تعریف کی ہے وہاں اکثر حد سے زیادہ استبعاد سے کام لیا ہے..... سودا، انیس اور دبیر کے کلام میں مبالغہ کی بہترین اور نفیس مثالوں کے پہلو بہ پہلو ان کی اجزار کی بھی کمی نہیں جہاں مبالغہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر کے غلو کی حدود میں داخل ہو گیا ہے..... مشرقی و مغربی ادب میں غلو کا تصور یکساں ہے۔"

یہ اس تفصیل کی تلخیص ہے جو انھوں نے ADYNATION یا غلو کے سلسلہ میں درج کی ہے اس کے بعد اردو سے مرزا دبیر اور انگریزی سے ڈرائڈن کے یہاں سے غلو کی مثال دی ہے۔ مرزا دبیر کا بند رعایت لفظی اور غلو کی بڑی خوبصورت مثال ہے۔

کاٹا پلک میں آنکھ کو، پتلی میں نور کو پاؤں میں کج روی کو، سروں میں غرور کو
سینہ میں بغض وکینہ کو دل میں فتور کو نیت میں معصیت کو، طبیعت میں زور کو
ذات اک طرف، مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں، زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

ظاہر ہے کہ اتنی تفصیل کے بعد کسی کے ذہن میں معنیٰ، مفہوم یا اصطلاح کے بارے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا بعض اصطلاحات کی وضاحت اور معنیٰ کی تفصیل ۲۰، ۲۰ صفحات تک چلی گئی ہے۔ انھوں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کے بارے میں کوئی گوشہ تشنہ نہ رہ جائے۔ ایسی اصطلاحات جن کے مترادفات اردو میں موجود ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس کے سلسلہ میں بھی لفظ کے قدیم ماخذ سے لے کر اس کے جدید معنیٰ و مفاہیم تک ایک ایک پہلو اور ایک ایک گوشے کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے مثلاً AESTHETICS کے لیے اردو میں رائج اصطلاح 'جمالیات' ہے۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے جمالیات کی تشریح تقریباً ۱۸ صفحات میں کی ہے جس میں یونانی لفظ AISTHETIKOS سے لے کر افلاطون، ڈیموکریٹس، ارسطو، ایپی کیورس، لکریشس، ہیگل، اسپینوزا، لیسنگ، بام گارٹن، چرنو شیوسکی، شلر، ہارٹ مان، کروچے تک تمام جمالیاتی مفکرین کے نظریات سے بحث کی ہے اور حسن، خیر، صداقت، نیکی، تحسین، انبساط اور اظہار کا جمالیات سے کیا رشتہ ہے اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح Aesth سے مل کر بننے والی تمام اصطلاحات کی تفصیل سے تشریح کی ہے اور ان کے مترادف تحریر کیے ہیں۔

اس بڑے کام میں ڈاکٹر عتیق اللہ کو جہاں بہت سی اصطلاحیں بنی ہوئی مل گئیں وہیں بہت سی اصطلاحات کے لیے انھیں نئے لفظ وضع کرنے پڑے، یہ کام تشریح و تعبیر سے زیادہ مشکل تھا جو بڑی فکر، توجہ اور مسلسل مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ اردو میں خاص طور پر ان ادبی اور تنقیدی اصطلاحوں کے سلسلہ میں جو گذشتہ چند برسوں میں رائج ہوئیں کئی کئی مترادفات لکھے جاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے بڑی محنت اور کاوش سے ان کے مترادف طے کیے اور اصطلاحات وضع کیں۔ ممکن ہے کہ بعض اصطلاحات کسی کو پسند نہ

آئین لیکن عام طور پر ان میں ایسی غرابت نہیں ہے جو ان کے رواج پانے میں حارج ہو انھوں نے بعض بہت اچھی اصطلاحیں وضع کی ہیں مثلاً Reader Oriented Criticism کے لیے 'قاریانہ تنقید' Faminism کے لیے تانیث Harmeneutics کے لیے ہرمینیات وغیرہ بہت اچھے مترادفات ہیں لیکن بعض جگہ اس طرح کی اصطلاح بھی انھوں نے لکھ دی ہے مثلاً Defamiliarization کے لیے اجنبیانے کا عمل، جو اصطلاح نہیں صرف مفہوم کی تشریح ہے "اجنبیانہ" معنی کے اعتبار سے بھی درست نہیں ہے اور محاورہ زبان کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے اسے بہ آسانی نامانوسیت، رد یگانگت یا بیگانگیت کہا جاسکتا ہے Defamiliarization مصنف کی حقیقت پیش کشی یا نمایندگی سے بیگانگیت یا ردیگانگت ہے اس کا تعلق روسی ہیئت پرستوں سے ہے جو خارجی حقیقت کے تئیں مختلف رویہ رکھتے ہیں یعنی ان سے بیگانگت برت کر غیر ادبی مواد کو فنی ہیئت میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ دلکش بن جائے یہاں اگر یہ کہا جائے کہ "اجنبیانے کے عمل" سے وہ دلکش بن جاتے ہیں تو اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن یہ میرا خیال ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے دلائل جن کے تحت انھوں نے اسے ترجیح دی زیادہ قابل قبول ہوں یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس میں کسی لفظ کا رہ جانا یا کسی اصطلاح سے کسی کا متفق نہ ہونا بہت معمولی بات ہے اور اس سے کام کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے تنہا وہ کام انجام دیا ہے جو اداروں کا کام ہے۔ ادبی اصطلاحات کی یہ وضاحتی فرہنگ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ڈاکٹر عتیق اللہ ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسی تندہی اور لگن کے ساتھ اس کی دوسری جلدیں بھی مکمل کرلیں گے۔

خالد عبادی، بہار اردو اکیڈمی،
اشوک راج پت، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴۔

ادب، آؤ اور آؤ

آج ادب کی نامقبولیت کا رونا رونے والے تو بہت ملیں گے۔ لیکن ایسا کیوں ہے یہ بتانے والا کوئی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے، یہ رُدیے جانتے ہی نہیں کہ آج کا ادب نامقبول ہو کر کیوں رہ گیا ہے۔ انہیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بہتر اور بڑے شاعر یا ادیب ہیں، باوجود اس کے نہ کوئی اُن کی کتابیں پڑھنے اور خریدنے والا ہے نہ اُن پر تعریفی و توصیفی مضامین لکھ کر انہیں میر غالب اور بیدی و منٹو سے بڑا ثابت کرنے والا۔ ادب کے رُویوں میں ایسے ناقدین بھی شامل ہیں جن کی درجن، نصف درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن کوئی انہیں گھاس تک ڈالنے کو تیار نہیں۔ جب کہ بے چارے اس امید میں کرسی صُدارت اور سند صدارت کے پیچھے بھاگتے نظر آتے ہیں کہ کوئی اُنھیں بابائے تنقید یا [illegible] ئے تنقید کہہ دے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ ادب کی نامقبو[illegible] اور اردو کی بدحالی کا رونا رو، رو کر شہر کو غرقاب کرنے پر آمادہ ہیں اور ہم ہیں کہ انہیں روتا دیکھ کر نہ صرف یہ کہ خود بھی بابائے یوسف بنتے جارہے ہیں بلکہ انہیں رومالِ زلیخا سے لے کر دامانِ زلیخا تک برائے اشک شوئی فراہم کر رہے ہیں جبکہ ادب کی نامقبولیت کی بنیادی وجوہات کچھ اور ہی ہیں جیسے ادب کے Concept کا واضح نہ ہونا۔ جیسے روایتی اندازِ فکر و نظر سے سرمو آگے نہ بڑھنا جیسے ہر کس و ناکس کا خود کو ترم خاں ترم اور بیتاب بر سر سمجھنا وغیرہ۔

ادب کیا ہے؟ ادیب کون ہے؟ ہمارے بیشتر لکھنے والے ان باتوں سے بے بہرہ ہیں۔ کسی کو لکھتے ہوا دیکھا اور لکھنا شروع کر دیا۔ کسی کو انا الادیب، انا الادیب کے عالم میں دیکھا اور خود بھی جاری ہو گئے۔ ——————— ایسے ماحول میں ادب اور ادیب کے بارے میں کچی بات کہنا بے تکلف ہونے اور بے لطف کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ لیکن چونکہ یہ بے لطفی بھی ذائقہ نو کی حامل ہوگی اس لیے پیرانی شعرا کے امکانِ متصورہ سے مایوس کن ہوگا۔

ادب اور ادیب کا آج بالکل وہی حال ہے جو امت مرحومہ کے مدارس اسلامیہ اور ان کے اساتذہ کا۔ اب آپ چاہیں تو طلبہ کو قارئین ادب پر محمول کر سکتے ہیں کہ نہ صرف یہ تمثیل سچی ہے بلکہ اس کے ادب کی کس مپرسی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ بھی حقیقی ہے۔

ادب ...... تاریخ نہیں، نفسیات نہیں، عمرانیات نہیں، معاشیات نہیں، طبعیات نہیں، حیاتیات نہیں، ...... کہ ان کی حدیں مقرر ہیں۔ ان کی تگ و تاز محدود ہے۔ ادب کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس کا عرصۂ تگ و تاز لامحدود ہوتا ہے۔ ایک مقام ایسا آتا ہے جب تاریخ رُکتی اور جھجکتی ہے۔ ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب عمرانیات اٹکتی اور ٹھٹکتی ہے۔ دوسرے علوم کا بھی یہی معاملہ ہے جبکہ ادب کی زندگی میں ایسا کوئی مقام کوئی لمحہ نہیں آتا جہاں اسے جھجکنا اور ٹھٹکنا پڑے۔ ایک علم کے ساتھ دوسرے علوم کے رابطے کی جو نوعیت ہوتی ہے، اس پر بھی غور کریں تو ادب کی ماہیت بے اشکال ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً جہاں پر نفسیات کی حدیں ختم ہوتی ہیں اس کے فوراً بعد معاشیات کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔ (دھیان رہے فوراً بعد نہ کہ جہاں سے حدیں ختم ہوتی ہیں وہیں سے) یعنی علم اور علم کے درمیانہ فاصلہ کا رہ جانا ناگزیر ہے۔ ادب کی سب سے بڑی Discovery یہی ہے کہ وہ اس فاصلہ اور اس جیسے "متعدد فاصلوں" کو اپنی قلم رو میں شامل کر کے "فاصلہ" اور نہ فاصلہ، یا نہ فاصلہ اور "فاصلوں" کی دوئی مٹا دیتا ہے۔ اس طرح ادب دنیا کی سب سے بڑی خود مختاری ہے۔ یہاں آپ چاہیں تو یزداں اور اہرمن کو یکساں تو بٹھا سکتے ہیں لیکن یہیں سے ادیب کا تفاعل شروع ہوتا ہے اور اس بنیاد پر ہم کسی ادیب کی "ادبیت" کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ادب دونوں (یزداں اور اہرمن) کو ایک ساتھ بٹھا سکتا ہے اور بٹھاتا بھی ہے۔ باوجود اس کے دونوں کے درمیان جو ایک "دیکھا، ان دیکھا یا ان دیکھا دیکھا فاصلہ رہ جاتا ہے ادیب اسی فاصلہ میں دنیا کی سب سے بڑی خود مختاری کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ پھر دوسروں سے کہتا ہے آؤ......

فی الوقت ادب میں آؤ کہنے والا کوئی نہیں۔ (کبھی کسی نے کہا ہو تو مجھے اس سے بحث نہیں۔ شاید میر نے کہا ہو، فانی نے یا منٹو نے یا میراجی نے، ۔۔۔) اور آئندہ بھی کسی "آؤ گوئندہ" کی امید نظر نہیں آتی۔

خدا کو مانتے ہیں، مذہب کو مانتے ہیں اس کے اوامر و نواہی کو مانتے ہیں۔ حلال و حرام، جزا و سزا، جنت و جہنم، حور و فرشتہ، شیطان و جن، ملت، سماج، قومیت جمہوریت، تاریخ، تقویم ...... علماء، زعماء، حکماء، عیسیٰ، موسیٰ، بدھ، مہابیر، اقبال، ٹیگور، گاندھی، نہرو، کانگریس، بھاجپا، جنتادل، مسلم لیگ سی پی آئی یا سی پی آئی (ایم) کو مانتے ہیں تو میں کہنا چاہتا ہوں ایسا کوئی آدمی ادیب (شاعر) نہیں ہو سکتا کہ جن چیزوں کو وہ جان اور مان رہا ہے باقی دنیا بھی انہیں چیزوں کو جان اور مان رہی ہے۔ پھر ادیب لوگوں کو کس چیز کی طرف بلائے گا اور کہے گا آؤ۔ کہ وہ لوگوں کو جس چیز کی طرف بلائے گا لوگ پہلے ہی سے اس طرف ہوں گے۔ یہیں پر ادیب کی

معنویت اور ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ پھر بھی ادب زندہ ہے.......... حیرت ہے۔

گو کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ ادیب اور ادبی دنیا دونوں روایتی انداز فکر و نظر کے حامی و دلدادہ ہیں۔ ایسے میں آؤ کی طرف آؤ کہنے والے کی پذیرائی اجتماعی لاشعوری عمل بن جاتا ہے۔ للٰذا جو جتنی شدت سے آؤ کی طرف آؤ، آؤ کہے گا وہ اپنے عہد، اپنے ملک اور اپنے سماج کا اتنا ہی بڑا Recognised ادیب ہوگا۔ (ٹیگور اور اقبال کی مثال اس کے لیے کافی ہوگی) اور جہاں کسی بڑا اور چھوٹا اس روایتی انداز میں تسلیم کیا جاتا ہے وہاں ہر کس و ناکس کا خود کو ترم خاں ترم اور بیتاب بر سر سمجھنا بر حق ہے اور جس ادب میں ہر کس و ناکس خود کو ترم خاں ترم اور بیتاب بر سر سمجھنے میں حق بہ جانب ہو، اس کو یہ ترہ تو حاصل ہو گا ہی کہ آپ جب چاہیں اس کی نامقبولیت کا رونا رونے لگیں اور جب چاہیں اس کی مقبولیت کا ہنسا ہنسنے لگیں گو کہ میری نیت ایسی نہیں۔

آج سیاست کو جو مرکزیت حاصل ہے وہ شاید کبھی کعبۂ دل کو حاصل رہی ہو کہ جس کی طرف شاہ بھی جھکتے تھے اور فقیر بھی۔ یہی وہ وصف ہے جس کی بناء پر سیاست آج دنیا کا سب سے طاقتور ادارہ ہے۔ اس کے بعد اس سے کم طاقتور ادارہ ہے، اس کے بعد اس سے کم اور اس کے بعد اس سے .... لیکن ادب کا اس سلسلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک طرف تو صورت حال یہ ہے دوسری طرف آج کا ادیب ان سلسلوں سے اپنا سلسلہ جوڑے بغیر خود کو ادیب تصور کرنے کی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ سو اس کارِ ادب میں اب اسے مہارتِ تامہ حاصل ہو چکی ہے۔

یہ سب چونکہ روایتی انداز فکر سے بندھے رہنے کے سبب ہو رہا ہے اس لیے پہلا کام روایتی انداز فکر و نظر سے نجات حاصل کرنے کا ہے۔ یعنی ادب کا سماج، مذہب، اخلاقیات، انصاف، صداقت، غیر جانبداری یا معروضیت سے کوئی تعلق ہے، اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس سچائی کو بے دریغانہ عام کر کے ہی ادب کی بحالی معنویت کی تحریک کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ (یوں بھی ادب صرف ادب کو جواب دہ ہوتا ہے۔ دنیا یا اہل دنیا کو نہیں)



یوسف ناظم

دلیپ سنگھ کی یاد میں

اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو جی چاہا کہ یہ خبر بھی اخباری خبروں کی طرح کی ہو اور دوسرے دن اس کی تردید چھپ جائے۔ ہمارے کتنے ہی ادیب اور شاعر ایسی افواہوں کا شکار ہوئے ہیں۔ جگر مراد آبادی کا نام سرفہرست ہے پھر چند سال پہلے مجنوں گورکھپوری کے انتقال سے پہلے ان کی وفات کی خبر ہندستان کے اخباروں میں چھپ گئی۔ کاش دلیپ سنگھ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا۔

دلیپ سنگھ میرے بہت ہی عزیز دوست تھے۔ کھلے دل سے دوستی کے قائل تھے۔ اردو کے ادیب تو تھے ہی لیکن اس سے زیادہ اردو تہذیب کے دلدادہ اور پاسدار تھے۔ مجھے (مخواہ) اپنا بزرگ مانتے اور برملا اس کا ہر ملاقات میں ذکر بھی کرتے تھے یعنی زہر ان پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں وہ خلوص اور محبت کے معاملے میں بے حد رکنار رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ خود ہی اپنے آپ پر شک کرتے کہ کہیں ان کی طرف سے خلوص میں کوئی کوتاہی تو نہیں ہو رہی ہے۔ ملاقات ہوتی تو تقریباً بچھ جاتے خط لکھتے اس طرح لکھتے موتیا اور بیلے کے پھولوں کا ہار مرتب کر رہے ہوں۔ اب میں ان کے خط ڈھونڈ رہا ہوں جو پچھلے دس سال کے عرصے میں وقفے وقفے سے مجھ پر عطر چھڑکتے رہے۔

ان کے چند ہی دن پہلے تو انھیں خط لکھا تھا۔ یہاں اخبار میں خبر چھپی تھی کہ سی بی آئی کے ڈائریکٹر جوگیندر سنگھ ہوگئے ہیں جو مزاح نگار ہیں اور ان کی دو تین کتابیں چھپ چکی ہیں۔ میں نے فوراً دلیپ سنگھ سے رجوع کیا اور انھیں خط لکھا کہ یہ ہیں کون صاحب کیا آپ کی ان سے دوستی ہے اور اگر ہے تو کیوں اور کتنی پرانی۔ میں سمجھتا ہوں یہ خط ان کی میز پر ہی

کھلا پڑا رہ گیا۔ انتقال سے دو یا تین دن پہلے انھیں ملا ہوگا اور وہ جواب نہیں لکھ سکے۔ ان کے ساتھ خط و کتابت کا معاملہ کچھ اس نوعیت کا تھا کہ میں اسے دوبدو گفتگو سمجھتا تھا۔ میں نے آج کچھ پوچھا اور کل اس کا جواب مل گیا۔ ان کے انتقال کو اتنے دن ہو گئے ہیں لیکن اب بھی مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ ان کا خط جو انھوں نے میرے خط کے جواب میں لکھ دیا ہوگا ضرور مجھے ملے گا۔ دلیپ سنگھ اور مقروض یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک خط میں تو انھوں نے یہ تک لکھا کہ "یہ کیا ہے جب چاہا ڈانٹ دیتے ہیں۔" دلی اور حیدرآباد میں ان سے جو ملاقاتیں اور مکالمات ہوئے وہ دل پر نقش رہیں گے۔ نفیس آدمی تھے اپنے آپ کو ملک ٹک سے درست اور صحیح رکھنے میں طاق، دلچسپ باتیں کرنے کے مشاق۔ اپنے ہر سفر کی روداد بیان کرنے کے شوقین جس سے ان کی معصومیت جھلکتی تھی۔ پچھلے سال ایک محفل طنز و مزاح میں ان کے ساتھ چار دن مسقط میں گزرے۔ میری ہی طرح وہ بھی خوش تھے خوشی کا جہاں تک تعلق ہے دلیپ سنگھ نہ صرف اسے سمیٹتے تھے بلکہ دوسروں میں بانٹتے بھی تھے ورنہ بہتوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ دوسروں کے سکھ میں شریک ہوتے ہیں تو ان کے حصے کی خوشیاں بھی لپک لیتے ہیں۔ مسقط سے واپس ہونے پر ایک پوسٹ کارڈ لکھا (پوسٹ کارڈ لکھنے کے فن سے میں نے ہی انھیں آشنا کیا تھا ورنہ وہ ہمیشہ خوبصورت اسٹیشنری پر خط لکھتے اور لفافے میں رکھ کر بھیجتے تھے) اصل خط یوں ہے۔

"برادر محترم یوسف ناظم صاحب! میرا خط مل گیا ہوگا۔ یہ خط دو خبریں دینے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ شاہد علی خاں صاحب نے مسقط کے جشن کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ جشن اتنا کامیاب تھا کہ یوسف ناظم صاحب نے بھی چھتیں اڑادیں۔ میرے فون بند کرنے تک وہ ہنس رہے تھے۔"

(خط میں جو دوسری خبر درج تھی اس کا تعلق عوام سے نہیں ہے) دلیپ سنگھ کو پابندی سے خط لکھنے کی عادت ہو گئی تھی اور میرا خیال ہے ان کا کافی وقت اسی مشغلے میں ہوا کی طرح نکل جاتا تھا۔ ایک خط میں مجھے لکھا میں جون کی بیس تاریخ کو امریکہ چلا گیا تھا اور کل رات کو لوٹا ہوں۔ واپسی پر آپ کا ۲ اگست کا خط دیکھا اور دیکھ لیجیے فوراً جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ امریکہ میں ذاتی نوعیت کا ایک کام تھا لیکن سفر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ایک امریکی پبلشر کو ایک ناول کا خاکہ بھیجا تھا۔ اُسے پسند آیا اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے ذاتی بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ بات چیت ہو گئی۔ اب صرف ناول لکھنا باقی ہے۔ ایک معمولی کام..." آپ کا لکھا ہوا تبصرہ مجھے نہیں ملا مجھے تو شک ہے آپ نے لکھا ہی نہیں ورنہ ضرور ملتا۔ آپ کا خط ملا

ہے اس سے ظاہر ہے کہ محکمۂ ڈاک کو مجھ سے کوئی بیر نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ
کہ آپ سچ بولنا عمر کی کس منزل میں شروع کریں گے۔ ویسے تبصرہ آپ نے مجھے کیوں؟
کتاب نما کو بھیجیے، انقلاب کو بھیجیے تاکہ مجھے کچھ شہرت ملے۔"

ایک دوسرے خط میں دلیپ سنگھ نے میری "حوصلہ افزائی"، ان الفاظ میں کی
کی کتاب میں نے جہاز کے سفر میں پڑھ لی۔ بہت سے مضمون پہلے ہی پڑھے ہوئے تھے
خاکے تمام پہلی بار پڑھے اور بے حد لطف لیا یہ کہنا کہ آپ خوب لکھتے ہیں تو بالکل
ہوگا جیسے ایک شاگرد، استاد کو شاباشی دے لیکن سچی بات یہ ہے کہ آپ خوب لکھتے
ہیں نے اسی لیے تو عرض کیا کہ دلیپ سنگھ اردو کے ادیب ہی نہیں تھے اردو تہذیب
دلدادہ اور پاسدار تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے دلیپ سنگھ کے بیان کو
یا لیکن ان کی فراخ دلی کا تو قائل ہونا ہی پڑا۔ یہ فراخ دلی جب خود میں نہیں ہے تو دلیپ
کے علاوہ اس کی توقع دوسروں سے کرنا ایسا ہی ہے۔ اب جانے دیجیے لیکن دلیپ سنگھ
مجھ سے یہ محبت وقتی یا عارضی نہیں تھی۔ ایک خط میں جو حال حال کا ہے انھوں نے لکھا

"مجھے خیال تھا کہ آپ سے حیدرآباد میں ملاقات ہوگی اور آپ سے خوب باتیں
گی لیکن وہاں جاکر معلوم ہوا کہ آپ ناسازی طبیعت کی وجہ سے نہیں آئیں گے۔ بہت
ہوئی۔ آپ جانتے ہیں کہ حیدرآباد میں ہماری سرگرمیاں تو بس دو تین گھنٹوں کے لیے
ہیں۔ باقی وقت تو دوستوں کے لیے ہوتا ہے۔ آپ آئے نہیں۔ نریندر لوتھر زندہ دلان
ناراض تھے۔ باقی کا تمام وقت ہوٹل کے کمرے میں لیٹ کر گزارا کرکٹ دیکھتا رہا۔
کرکٹ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ دیکھ کر یہ حالت ہوگئی کہ اتنے رن تو میں
بنا سکتا ہوں جتنے ہمارا اظہرالدین بناتا ہے۔ حیدرآباد کے جلسے آپ کی غیر حاضری
باوجود کامیاب رہے۔ ادبی اجلاس میں پہلے تو سامعین کچھ کم نظر آئے لیکن پھر ہال
گیا۔ میری باری کے آنے تک کوئی کرسی خالی نہیں تھی۔ اس بار خصوصی طور پر مجھے احساس
کہ اہل حیدرآباد میری ہر حرکت کو پسند کرتے ہیں۔ میں کوئی مضمون پڑھوں وہ داد دینے
تیار رہتے ہیں۔ خدا کرے یہ سلسلہ بنا رہے کہ داد ہی کے سہارے تو ہم لوگ زندہ ہیں۔"

اچھا ہوا کہ دلیپ سنگھ کے سارے خط تلاش کرنے پر بھی مجھے نہیں ملے ورنہ میں
خط نقل ہی کرتا رہتا۔ دلیپ سنگھ باضابطہ مزاح نگار تھے۔ انھوں نے ہنسی کا کارو
کیا تھا اور یوں سمجھیے اس گھاٹے کے سودے کے بڑے تاجر تھے۔ محفلوں میں تو وہ شاخ
کی طرح لہکتے اور مہکتے تھے۔ ان کے ساتھ میں کئی جلسوں میں شریک رہا اور ہر جلسے

میں نے دیکھا کہ دلیپ سنگھ ہی دلیپ سنگھ ہوتے تھے۔ (طرفداری کی بات اور تھی)۔ ایک توان کا رکھ رکھاؤ، سلیقہ، مضمون پڑھنے کا انداز اور پھر بے ساختہ مزاح اپنے آپ پر جملے کس کر، بے حد خوش ہوتے۔ مسقط کے جلسے میں میں نے انہی کا خاکہ پڑھا تھا۔ بعد میں ایک خاتون مجھے مبارکباد دینے آئیں (شاید رسمی ہوگی) میں نے ان کا رخ دلیپ سنگھ کی طرف موڑ دیا۔

دلیپ سنگھ کے تو ہزاروں دوست ہوں گے۔ کچھ سے توان کی ابھی ابھی شناسائی تھی جو جلد ہی آشنائی میں تبدیل ہوگئی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ حیدر آباد میں پیدا ہوئے ہیں یا میں دلی میں۔ پچھلی مرتبہ (کوئی دو سال پہلے) جب میں دلی گیا تھا تو وہ اپنی "ٹویٹا" میں، جس کا ذکر وہ اکثر اپنے کالموں میں کرتے رہے ہیں مجھے لیے لیے گھومے اور ڈرتے ڈرتے پاکستانی ایمبیسی کے دفتر بھی لے گئے۔ کہتے رہے کہ ان کی کار کا نمبر نوٹ کرلیا جائے گا۔ ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ اور دوسرے گیٹ سے پھر پہلے گیٹ۔ میں نے کہا بھی کہ ہر گیٹ پر اپنی کار کا نمبر کیوں درج کروا رہے ہیں۔ ہنسے اور بولے۔ شہرت شہرت!!

دلیپ سنگھ نے لوگوں میں بہت مسکراہٹیں اور قہقہے بانٹے۔ میں نے تو حساب نہیں رکھا لیکن وہ جہاں جہاں بھی گئے ہوں گے وہاں کی ہواؤں میں ان کے شگوفوں کی مہک بس گئی ہوگی۔ کلکتہ میں ان کی ایک کتاب کی رسم اجرا کا جلسہ تھا۔ دعوت نامہ مجھے بھی ملا لیکن بدقسمتی سے میں جا نہیں سکا۔ جس کا دلیپ سنگھ نے مجھ سے محبت آمیز شکوہ بھی کیا تھا لیکن صرف یہ کہ آپ آجاتے تو اچھا ہوتا۔ دلیپ سنگھ نے شاید خود بھی حساب نہیں کیا ہوگا کہ انھوں نے کتنے قلعے فتح کر لیے تھے۔ حیدر آباد میں تو وہ اتنے مقبول تھے کہ رویندر بھارتی اور نمائش کلب کی چھتوں کی مرمت کروانی پڑتی تھی۔ دیواروں میں الگ دراڑیں پڑ جاتی تھیں۔ رواں دواں تحریر۔ آب مقطر کی طرح صاف۔ میونسپلٹی کے پانی کا شائبہ تک نہیں، شستہ اور شایستہ مزاح۔ پیش پا افتادہ موضوع پر ہی ان کے مخصوص انداز کی چھاپ۔ فوری طور پر گرفت میں آجانے والی نکتہ سنجی۔ دوکان آتش بازی کے سامان کی لیکن خطرہ کوئی نہیں۔ یہ سب دلیپ سنگھ کی مزاح نگاری کی خصوصیات تھیں۔ وہ جب بھی مضمون سناتے فرحت وانبساط کا ماحول پیدا کردیتے۔ میری رائے ہے کہ جب کوئی مزاح نگار اسٹیج پر مضمون سنانے کھڑا ہو تو تصویر اس کی نہیں سامعین کی کھینچنی چاہیے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ مجمع پر اس کا اثر کیا ہوا۔ مقالہ نگاروں کی تصویریں کھینچنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ ایسے موقعوں پر کیمرے کا رخ سامعین کی طرف ہونا ہی نہیں چاہیے۔

دلیپ سنگھ نے اچھی زندگی گزاری، خود کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ دلی کی محفلوں میں بھی وہ پابندی سے شریک ہونے لگے تھے۔ جب رشید حسن خاں دلی سے رخصت ہونے لگے تو ان

کے داعی جلسے میں دلیپ سنگھ نے بھی مضمون پڑھا۔ میں تو وہاں موجود نہیں تھا لیکن لوگوں سے میں نے سنا کہ ان کے جملوں نے سب کو خوش کر دیا۔ "دل ماشاد کردی" کا جملہ ہر کسی کی زبان پر تھا۔ اگر کوئی یہ خبر مجھ تک نہ بھی پہنچاتا تو میرا کوئی نقصان نہ ہوتا کیوں کہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ جس جلسے میں دلیپ سنگھ شریک ہوتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ مسقط میں ان کی جو پذیرائی ہوئی اس کا اندازہ کم لوگوں کو ہو گا۔ وہاں کی ہندستانی ایمبیسی کے عہدہ داراُن سے اس طرح ملے جیسے دلیپ سنگھ اب بھی بر سرکار ہوں۔ دلیپ سنگھ نے مجھے وہاں بھی اپنے ہر سردار دوست سے ملایا اور مجھے اتنی اہمیت دی کہ ان کے دوست اور شناساان کی مردم شناسی پر شک کرنے لگے۔

دلیپ سنگھ یوں اچانک چل بسیں گے اس کا گمان تک نہیں تھا۔ وہ دل کے مریض ضرور تھے لیکن یہ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ زندگی اور زندہ دلی سے معمور یہ دل کچھ کہے سنے بغیر یوں خاموش ہو جائے گا۔ حادثہ شاید اسے ہی کہتے ہیں۔ بعض موقعوں پر زبان اور قلم ساتھ دینے سے انکار کر دیتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اپنے آپ کی کیفیت کو کیسے ظاہر کرے۔

میں زندہ دلان حیدر آباد کے حالیہ اجلاسوں میں شریک نہیں ہو سکا اس کی کوئی معقول وجہ تھی یا نہیں پتا نہیں لیکن اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کسی بہانے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ دلیپ سنگھ کی "عدم موجودگی" ریڈ سگنل بن گئی ہے۔ حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد۔

مانگے کا اُجالا

خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے



کچھ لوگ بنک لوٹتے ہیں اور کچھ مشاعرے

پاکستانی افواج کے میجر جنرل فاروقی کی "بڑھاپے کی شادی" نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ راولپنڈی چھاؤنی کے تالاب کے گرد واقع سبزہ زار میں محفل آراستہ کی گئی، ابوالاثر حفیظ جالندھری کو سہرا پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ حفیظ صاحب نے "دولھا" کی عمر کے حوالے سے طنز و مزاح کا پیرایہ اختیار کیا۔ محفل میں شریک فوجی افسروں کو یہ بات ناگوار گزری کہ ایک شاعر ایک میجر جنرل سے تفریح لے۔ انھوں نے حفیظ صاحب کو اٹھا کر تالاب میں پھینک دیا۔ حفیظ صاحب ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ پانی کی سطح پر صرف ان کی ٹوپی تیر رہی تھی۔ ایک رحم دل فوجی افسر کرنل مسعود احمد کے دل میں نیکی آ گئی اور وہ غرقاب شاعر کو کھینچ کر کنارے پر لائے۔ حفیظ صاحب بھیگے ہوئے کپڑوں میں بپھرے ہوئے مائیکروفون کے قریب گئے اور "تم پر لعنت ہو" کہہ کر محفل سے رخصت ہو گئے۔ حفیظ ہوشیارپوری نے حفیظ جالندھری کے اس شعر سے ان کی غرقابی کی تاریخ نکالی۔

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں
وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

یہ ۱۹۵۲ء کا واقعہ ہے اگر چھے سال بعد مارشل لا کے نفاذ کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آتا تو کرنل مسعود احمد تالاب سے صرف حفیظ صاحب کی ٹوپی نکال کر باہر لاتے اور اسے فردوسیٔ اسلام کی یادگار کے طور پر قومی عجائب گھر میں محفوظ کر دیا جاتا۔

یہ ایسا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ اگر اس کے راوی بزرگ ادیب سید ضمیر جعفری نہ ہوتے تو ہمیں ہرگز اس پر یقین نہ آتا۔ جس کتاب میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس کا نام "حفیظ نامچہ" ہے۔

سید ضمیر جعفری ہمارے ان سدابہار ادیبوں میں سے ہیں جو گذشتہ نصف صدی سے تسلسل

کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ غزل میں ان کا خاص رنگ ہے اور ان کی مزاحیہ شاعری تو سراپا رنگ ہی رنگ ہے۔ وہ ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام کاغذ اور مائیک دونوں پر یکساں مزا دیتا ہے گو انھوں نے اعلا درجے کی سنجیدہ شاعری کی ہے لیکن مزاحیہ شاعری کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ نوبت یہ این جا رسید کہ جب کبھی وہ کسی مشاعرے میں سنجیدہ غزل سناتے ہیں تو سامعین اسے مزاحیہ کلام سمجھ کر ہنستے اور تالیاں بجاتے ہیں۔ سید صاحب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کے بغیر کسی مشاعرے کی کامیابی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی زندگی میں سید صاحب نے جتنے مشاعرے لوٹے ہیں، اتنے تو ملک بھر کے ڈاکوؤں نے بنک بھی نہ لوٹے ہوں گے۔

نثر میں بھی سید ضمیر جعفری نے ایک اسلوب خاص ایجاد کیا ہے۔ انھوں نے شخصیات و واقعات کے حوالے سے اپنی یادوں کو جس انداز سے قلم بند کیا ہے، اس سے اردو خاکہ نگاری کے قد اور وزن دونوں میں اضافہ ہوا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ایسے انبار لگائے ہیں کہ موجودہ دور کے تقریباً سبھی طنز و مزاح نگاران کے خرمن کے خوشہ چیں ہیں۔ ترجمے کے میدان میں بھی سید صاحب کسی سے پیچھے نہیں بلکہ کبھی کبھی تو اُن غیر ملکی مصنفین سے بھی آگے نکل جاتے ہیں جن کی تخلیقات کو وہ اردو میں منتقل کرتے ہیں۔

سید صاحب کے دو روزنامچے مرتب ہوئے ہیں۔ ایک
سید صاحب کے دو روزنامچے مرتب ہو رہے ہیں۔ ایک وہ جو کراماً کاتبین لکھتے ہیں اور دوسرا وہ جسے وہ خود قلم بند کر رہے ہیں
تو وہ ہے جو کراماً کاتبین لکھتے
ہیں اور دوسرا وہ خود
قلم بند کرتے ہیں۔ کراماً کاتبین والا روزنامچہ تو
قیامت کے روز دیکھنے کو ملے گا لیکن سید صاحب کا خود نوشتہ روزنامچہ ان کے بہت سے دوستوں کی نظر سے گزر چکا ہے۔ "حفیظ نامچہ" اسی روزنامچے کا خلاصہ ہے۔ اصل روزنامچے کے ایسے حصے الگ کر کے کتابی صورت میں شائع کیے گئے ہیں جن میں حفیظ جالندھری کا ذکر ہے۔ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اردو میں اس نوعیت کی صرف ایک کتاب اور ملتی ہے اور وہ ہے سید نذیر نیازی کی "اقبال کے حضور"، لیکن اس میں "حضور" زیادہ ہے اور "اقبال" کم۔ اس کے برعکس حفیظ نامچہ میں سوائے حفیظ جالندھری کے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا اور اگر نظر آتا بھی ہے تو حفیظ کی شخصیت کا تابع مہمل بن کر۔ فردوسیٔ اسلام ابوالاثر حفیظ جالندھری کو تو ہم اُن کی تصانیف میں دیکھ لیتے ہیں لیکن حفیظ عام زندگی میں کیسے تھے، اس کا اندازہ صرف "حفیظ نامچہ" ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

سیّد ضمیر جعفری خوش قسمت ہیں کہ انھیں حفیظ سے قریب رہنے کا موقع ملا لیکن حفیظ زیادہ خوش قسمت ہیں کہ انھیں ضمیر جعفری جیسا روزنامچہ نویس ملا جس نے ان کی زندگی کو روز و شب کے آئینے میں اس طرح دکھایا ہے کہ دیکھنے والوں کے سامنے حفیظ کی صرف ٹوپی نہیں پوری شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

حفیظ بہت بڑے شاعر تھے لیکن وہ آدمی ویسے ہی تھے جیسے عام لوگ ہوتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی خفا ہو جاتے تھے اور کبھی خوش۔ تعریف سن کر چہرہ گلستان ہو جاتا تھا۔ تنقید یا تنقیص سے طبیعت افسردہ ہو جاتی تھی۔ صاحبانِ اقتدار کی قربت سے خوش ہوتے تھے۔ ہم عصر شاعروں کو طنز کا نشانہ بنا کر انھیں بڑا سکون ملتا تھا۔ اپنی شاعری پر ہی نہیں، اپنے پکائے ہوئے سالن پر بھی داد طلب کرتے تھے۔ ۲۶ فروری ۱۹۷۶ء کا اندراج ملاحظہ کیجیے "دن حفیظ صاحب کے ساتھ گزرا۔ بلکہ اُن کے چولھے چوکے کے ساتھ گزرا۔ بود و باش کا وہی انداز جیسے حالی کی دکان۔ سب سے الگ۔ گھر میں اُن کا کمرہ الگ۔ خواب گاہ بھی وہی، دارالمطالعہ بھی وہی۔ دیوان خانہ، باورچی خانہ سب کچھ وہیں۔ کوزے میں سمندر۔ نغمہ زار میں ٹماٹر زار۔ آج انھوں نے میرے اعزاز میں دو تین ترکاریاں (بشمول دال مونگ) اپنے ہاتھ سے پکائیں۔ جس طرح ان کا شعر سن کر داد دینا فرض ہے اسی طرح اُن کا سالن کھا کر انگلیاں چاٹنی پڑتی ہیں۔ سچ ہے کہ ان کا سالن ہوتا بھی لذیذ ہے۔ مقدار ہمیشہ کم رکھتے ہیں۔ شاعری کی طرح سالن بھی چھوٹی بحر میں پکاتے ہیں"

حفیظ نامچہ سے حفیظ کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے بعض معاصرین کو سخت ناپسند کرتے ہیں جن میں فیض سرِ فہرست تھے۔ فیض کے خلاف وہ ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے جس کے بارے میں ان کا یہ کہنا تھا کہ "فیض سے مجھے کوئی ذاتی عناد نہیں، اصولی اختلافات ہیں" معلوم نہیں اصولی اختلافات پر مبنی اس کتاب کا مسودہ اب کہاں ہے؟

حفیظ صاحب کے بعض دوست بھی انھیں ناپسند کرتے تھے۔ ۱۸ جولائی ۱۹۵۲ء کے روزنامچے میں سیّد ضمیر جعفری لکھتے ہیں "حفیظ اور ن۔ م راشد کی نہیں بنتی۔ راشد چھیڑ چھاڑ لگا رکھتا ہے۔ محض لطیفہ بازی۔۔۔ راشد نے حفیظ کے انتقال کی تاریخیں نکال رکھی ہیں۔ مثلاً اگر انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا تو "ور اف حفیظ جالندھری"، اور اگر انتقال ۱۹۵۴ء میں ہوا تو "زندہ باد حفیظ جالندھری"

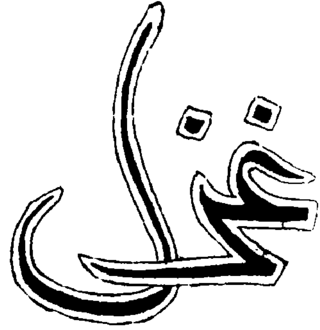
چراغ حسن حسرت کا واقعہ مشہور بھی ہے اور مزے کا بھی لیکن سید ضمیر جعفری کی زبانی

سننے کا مزہ اور ہے۔ ۱۴؍ اپریل ۱۹۵۲ء کے روزنامچے میں لکھتے ہیں ـــ" آج رات کراچی کے ایک ممتاز سوداگر ملک باغ علی نے اپنے ہاں ایک پُر تکلف صحبت طعام و کلام آراستہ کی... مولانا عبدالمجید سالک کی صدارت میں شعر و سخن کا دور چلا--- چراغ حسن حسرت اور مجید لاہوری آخری صفوں میں بیٹھے تھے۔ مجید تو چھیڑ خانی کر ہی رہا تھا، ایک لطیفہ حسرت صاحب نے بھی جڑ دیا۔ حفیظ صاحب تاڑ گئے کہ مجید اور حسرت گڑبڑ کر رہے ہیں۔ انھوں نے حسرت صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ حسرت صاحب آپ جیسا سخن فہم اتنی دور جا بیٹھا۔ حضرت آگے آئیے اور مصرع اٹھائیے۔ اس پر حسرت صاحب نے اپنی نشست سے اٹھ کر کہا "حاضر ہوتا ہوں۔ میں نے عمر بھر مُردوں کو کندھا دیا ہے یا آپ کے مصرعے اٹھائے ہیں"!

اس واقعے سے حفیظ اتنے افسردہ ہوئے کہ انھوں نے ایک غزل لکھی جس میں مجید لاہوری اور چراغ حسن حسرت کی طرف اشارے تھے۔ مثلاً

شعر کو حرف و حکایات سمجھنے والا
بات یہ ہے کہ نہیں بات سمجھتے والا
آج کل تو بھی نشے میں ہے تو مجھ سے نہ اُلجھ
میں ہوں کم ظرف کی اوقات سمجھتے والا　　(۱۹۸۶ - ۸۸ء)

نفیس تقی (ڈاکٹر)
تلیا، سرونج
ایم پی



اب آنکھ کھلی اپنی تو کچھ بھی نہ بچا ہے
شیشے کا پتا ہے نہ صُراحی کا پتا ہے

یہ جھوٹ ہے دنیا میں ہر اک شخص بِکا ہے
منصور تو ہر دور میں سولی پہ چڑھا ہے

شب خون بھی مارے گا بگولوں سے لڑے گا
بے سمت اُڑانوں پہ پرندہ جو اُڑا ہے

قد اس کا نکلتا ہوا لگتا ہے مجھ ہی سے
صدیوں جو مرے پاؤں کی ٹھوکر میں رہا ہے

پھر خاک اُڑاتا ہوا گلیوں میں پھرے گا
پھر دستِ جنوں بندِ قبا کھول رہا ہے

شاغل ادیب ایم، اے
۱-۴-۳۰۴/۹/۳، مشیرآباد
حیدرآباد۔ اے پی

ایک نظم

صبح میرے جواں بیٹے نے
صحن میں میرے گھر کے
اگاتے ہوئے
میرے اجداد کے پیڑ کو
کاٹ ڈالا
پرندے سبھی اس کٹے پیڑ سے
بوکھلا کر کہیں اُڑ گئے
شام لیکن
مجھے دیکھ کر یہ تعجّب ہوا
بوکھلائے ہوئے بے سہارا پرندے
مرے گھر کے باہر
سڑک کے کنارے اُگے پیڑ پر
اک نیا آشیانہ بنا کر
سکھی تھے بہت
تھے بہت مطمئن

پروین صدیقی
۹۲، اقبال باغ، نزد عبداللہ کالج
ڈگی روڈ۔ علی گڑھ ۲

غزل

ہزار غم لیے ہمراہ اک خوشی آئی
ہمیشہ موت کے سایے میں زندگی آئی

نئے سرے سے دیے زخم پھر زمانے نے
پُرانے زخموں میں جب بھی مرے کمی آئی

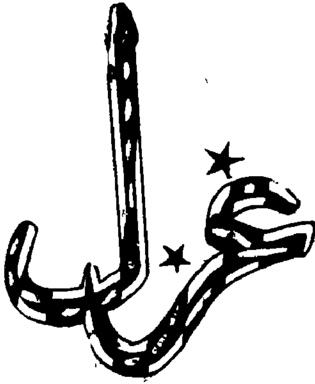
مجھے تو چاند بھی اپنی طرح اُداس لگا
کھُلا دریچہ تو پھیکی سی چاندنی آئی

خزاں ہنسی تو ہنسے جا رہی بہاروں پر
"سوال یہ ہے کہ پھولوں کو کیوں ہنسی آئی"

یہ کیسے شیخ کی ساقی نے کی پذیرائی
شکستہ جام تو مینا تہی تہی آئی

ستم ہے ترکِ تعلق کے بعد بھی پروین
کسی کی یاد دبے پاؤں پھر چلی آئی

افشاں علوی
۴۳/۳، اگاڑی خانہ، فتح گڑھ
فرخ آباد۔ یوپی



خزاں کو موسمِ گُل سے حسین کر نہ سکی
جگر کے خون سے تر آستین کر نہ سکی

زمیں پہ چاند ستارے اُتار لائی مگر
وہ آسماں تھا، اُسے میں زمیں کر نہ سکی

دیارِ جاں کی طرف قافلے تو آئے بہت
مکانِ دل میں کسی کو مکین کر نہ سکی

وہ دیوتا کی طرح تھا اسی لیے افشاں
خم اس کے سامنے اپنی جبیں کر نہ سکی

راجیندر بہادر موج
موج مارگ۔ فتح گڑھ
یو۔پی

غزل

اُن کے انتظار میں عمر مختصر گئی
اک حسیں فریب میں راہ پہ گزر گئی

عشق کے بغیر زیست جیسے پھول بے مہک
عشق ہی کا تھا کرم کہ زندگی سنور گئی

ان کے روبرو ہوئے ختم ہوئے شکوہ ہائے جور
اک ندی چڑھی ہوئی دفعتاً اُتر گئی

زندگی نے مقصدِ زندگی بُھلا دیا
کیا حسین رات تھی نیند میں گزر گئی

اک نظر سے کھل گیا گلستانِ آرزو
صبح کی کرن کے ساتھ ہر کلی نکھر گئی

ورنہ میرا ظرف کیا اور کہاں وہ بزمِ ناز
کچھ نگاہِ حسن ہی کام اپنا کر گئی

موج راس آ گیا اب تموّجِ حیات
فکر ناخدا گئی فکر راہبر گئی

محسن زیدی
۱۸/۵۳، اندرا نگر
لکھنؤ ۲۲۶۰۱۶

غزل

سرِ موجِ آب کہیں کہیں
ملے کچھ حباب کہیں کہیں

وہ نظر گئی جو اِدھر اُدھر
کھُلا دل کا باب کہیں کہیں

تھے جو نقش، کتبۂ خاک پر
ملے زیرِ آب کہیں کہیں

گیا رائگاں تو نہ خونِ دل
کھِلے کچھ گلاب کہیں کہیں

یہ زمیں کہیں پہ جو خشک ہے
تو ہے آب آب کہیں کہیں

کہاں محسنؔ اس کو میں ڈھونڈتا
وہ تھا خواب خواب کہیں کہیں

عبدالمعروف خاں
۹۲۔ذاکر باغ، نئی دہلی ۲۵

نظم

دیوانوں کا رنگ ہو کیسے بیاں؟ شعلہ نفساں صحرا داماں
کبھی بھول کے ان کو بھی پوچھو ذرا، گل پیرہناں گلشن بدناں

دل ٹوٹ گیا، مایوس ہوئے، آنکھیں پھیریں اور چل نکلے
خوابوں میں کبھی ممکن ہے ملیں، غنچہ دہناں آہو چشماں

ہے سونی پڑی دھونی ان کی، جو جان چھڑکتے تھے اپنی
اب ڈھونڈو انھیں ملکوں ملکوں، شمشاد قداں سیمیں بدناں

ہے تم کو غرورِ حسن بجا، فرصت جو ملے تو سوچو ذرا
کیا ہوگا اگر چلے نہ گئے، بادہ چشماں اور قند لباں

جب مثلِ سراب ہی جینا ہے خود کے لیے کھلنا مہکنا ہے
بے کار ہے رنگ و نکہت سب جنت بدناں عنبر نفساں

مسرور حسین سرور
ہاتھی خانہ، فتح گڑھ
یوپی

غزل

وہ گلی اچھی لگی، وہ راستہ اچھا لگا
زندگی سے زندگی کا رابطہ اچھا لگا

بھیڑ تھی چہروں کی یوں تو شہر میں چاروں طرف
ایک ہی چہرے کے حق میں فیصلہ اچھا لگا

زندگی بھر وہ مجھے اپنا نظر آتا رہا
زندگی میں بس یہی اک واہمہ اچھا لگا

سر سے ٹکرا کر قدم بوسی کو پتھر آ گیا
میں بہت خوش ہوں مجھے یہ حادثہ اچھا لگا

پیاس ہی منزل ہے، منزل کی تمنا ہے فضول
ریگزاروں میں بھٹکتا قافلہ اچھا لگا

جب کہیں بھی گرد اٹھتی تھی تو ڈر جاتے تھے ہم
رفتہ رفتہ آندھیوں کا سلسلہ اچھا لگا

مختلف رستوں سے منزل پر پہنچتے ہیں سرور
ہر جداگانہ روش ہر فاصلہ اچھا لگا

شرر غازی پوری
ایم۔ ایس۔ پراتراپور
پوسٹ آفس۔ برج گنج
پورٹ بلیر

ضمیر ساجد
اڈیٹر "دیار ادب"
مومن پورہ۔ اکولہ

غزلیں

دوپہر دھوپ میں اک شمع جلائی جائے
آبروِ دن کے اُجالے کی بچائی جائے

رہ نہ جائے کسی طوفان کا ارماں کوئی
ناؤ کاغذ کی سمندر میں چلائی جائے

زندگانی میں بڑی چیز ہے مستی لیکن
بات تو جب ہے کہ آنکھوں سے چُرائی جائے

آج آکاش نے برسائی نہیں چنگاری
آج کی تازہ خبر سب کو سنائی جائے

دھوپ کے ماتھے پر برسات کا موسم لکھ کر
اے شرر پیاس کی بنیاد ہلائی جائے

خلافِ حق نہ ہمارا بیان جائے گا
یہ ایسی بات ہے دشمن بھی مان جائے گا

کرایے دار کی فطرت اُسے نہیں معلوم
اب اس کے ہاتھ سے اپنا مکان جائے گا

میں اپنے چہرے پہ چہرہ لگا نہیں سکتا
وہ میرے دل میں چھپا راز جان جائے گا

وہ سارے شہر کے حالات جانتا ہے مگر
کب اپنے گھر کی طرف اس کا دھیان جائے گا

ابھی وہ مجھ سے خفا ہے بہت مگر ساجد
اُسے مناؤں گا ایسے کہ مان جائے گا

غزلیں

شمس فرخ آبادی
سحر منزل، گولا گنج
لکھنؤ

اب اتنی رحمت فرماؤ، اک وقت پڑا ہے آجاؤ
ہم کچھ بھی بُرا نہیں مانیں گے، ہمیں باتوں سے بہلا جاؤ

ہے کل کی بات یا برسوں کی، مل کے بچھڑنا یاد ابھی
تم بھول کے یہ مت کرنا کبھی، کشتی اس پار جلا جاؤ

شب گزری سونا کمرہ ہے، دو آنکھیں کھلا دروازہ ہے
چوکھٹ پہ اک دیا جلتا ہے، خود آکے اسے بجھا جاؤ

جینے سے زیادہ جی بھی چکے، دن رات جتن سے اک ہوئے
ہم جاگے ہیں کتنی ہی راتوں سے، ہمیں گہری نیند سُلا جاؤ

ہیں ٹھوکریں کئی زمانوں کی، اپنوں کی اور بیگانوں کی
عادت ہے ہم دیوانوں کی، دل دے کے ہوش گنوا جاؤ

شاید وہ حادثہ پھر گزرا، کوئی اندھے کنوئیں میں پھر چیخا
اک کرتے پر اک رشتے کا، پھر داغ لگا ہے مٹا جاؤ

وجے میرٹھی
گورنمنٹ انٹر کالج
ہستناپور ضلع میرٹھ، یوپی

سخن کیا گفتگو کیا
مذاقِ آرزو کیا
گلی کوچے تمھارے
ہماری جستجو کیا
اب اس نیلام گھر میں
ادب کیا آبرو کیا
رکھیں دھونی رمائیں
پھریں یوں کو بہ کو کیا
اُسے تھا آگ ہونا
ہے پانی تو لہو کیا
جو ہے تیری رضا ہے
ہماری آرزو کیا
وہی اک ذات ہر سو
کہ میں کیا اور تو کیا
جو ہے تشنہ لبی ہے
وجے جام و سبو کیا

اثر بدایونی
۲۴ پرل اپارٹمنٹ سیکنڈ رابوڑی
ڈاکٹر انصاری روڈ۔ تھانہ

غزل

کھول کر پانو سے زنجیر سفر آئے ہیں
دل ہے مسرور کہ پردیس سے گھر آئے ہیں

آج خوشبو سے معطر ہیں ہوا کے جھونکے
کیا تری زلف کو چھو کر یہ ادھر آئے ہیں

بے زمینی کا تصور تو ہے اسلاف کی دین
سارے الزام مری نسل کے سر آئے ہیں

راستہ بھولے ہوئے چند مسافر تو نہیں
تیری پلکوں پہ ستارے جو نظر آئے ہیں

ق

دست تخیل نے کھولی ہے کتاب ماضی
بیتے لمحات باندازِ دگر آئے ہیں

وقت کی گرد سے دھندلائے ہوئے سارے نقوش
آج پھر ذہن کے پردے پہ ابھر آئے ہیں

حال سے بڑھ کے درخشاں ہو رخ مستقبل
ہم بھی ہاتھوں میں لیے شمعِ ہنر آئے ہیں

راشد جمال فاروقی
۱۴۸/۹۸-اے۔ ٹاؤن شپ۔ ویر بھدرا
(رشی کیش)۔ دہرہ دون ۲



نہ دیکھ پاؤں گا اپنا زوال ہوتے ہوئے
وقارِ کوہ صفت پائمال ہوتے ہوئے

ہر ایک بات کو نسیاں کی طاق میں رکھیے
ہر ایک بات کا ہر دم خیال ہوتے ہوئے

یہ ایک رات کہ صدیوں پہ ہے محیط مگر
ہمیں فراق کا دھڑکا وصال ہوتے ہوئے

بچا ہی کون ہے یلغار سے مصائب کی
کسے مدد کو پکاروں نڈھال ہوتے ہوئے

میں رو رہا ہوں کہ ماحول کا تقاضا ہے
میں ہنس بھی لیتا ہوں اکثر ملال ہوتے ہوئے

ڈاکٹر قیصر شمیم
۸۔IV۳، این، سی، آئی، آر، ٹی کیمپس
نئی دہلی ۱۶

آگ بجھی نہیں ہے

انسان کا دل جب تک درد سے معمور رہے گا اور اس کی زندگی ظلم کا شکار رہے گی، ادب کسی نہ کسی شکل میں اس کا اظہار کرتا رہے گا۔ ۱۹۹۴ء میں چھپے الیاس احمد گدی کے ناول ''فائر ایریا،، کا خاتمہ، شوکت صدیقی کے افسانہ ''غم دل اگر نہ ہوتا،، سے گہری مماثلت رکھتا ہے، جو انجمن ترقی پسند مصنفین، لکھنؤ کے جلسہ میں پڑھا گیا تھا اور ''شاہراہ'' کے ۱۹۵۰ء۔ کے سالنامے میں شائع ہوا تھا۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ یا یہ اس ذہنی رجحان کا غماز ہے جس کی فصل حقائق کی سنگلاخ سرزمین سے خود بخود اگتی ہے اور گذشتہ کئی دہائیوں میں ہونے والے لایعنی اور لاطائل ادبی مباحث کے مقبرے کو گھاس کی طرح ڈھک لیتی ہے۔ ان دونوں کے آخری حصہ کا موازنہ خاصا دلچسپ ہے

''غم دل اگر نہ ہوتا'' کا مرکزی کردار، رندھیر جو مزدور تحریک سے کٹ چکا ہے، اپنے پرانے ساتھی مرلی کی ارتھی کا جلوس دیکھنے کے لیے فٹ پاتھ پر کھڑا ہے: ''اس کی ارتھی توپ کے دہانے پر نہیں، انقلاب زندہ باد کے نعروں پر جارہی تھی۔ اس کی ارتھی کے ساتھ فوجی دستے نہیں مارچ کر رہے تھے، مزدور تھے، صرف مزدور... جلوس آہستہ آہستہ گزر گیا، اور رندھیر کھڑا دیکھتا رہا، پھر اس کی گردن جھک گئی... رندھیر واپس جاکر کموڈنی پر چیختا ہے کہ وہ اس کی وجہ سے کمزور اور بزدل ہو گیا ہے

''فائر ایریا'' کا مرکزی کردار سہدیو بھی جو اپنی ڈگر سے ہٹ کر مافیا گروہ کا آلہ کار بن گیا ہے، اپنے پرانے ساتھی محمد ار کی ارتھی کے جلوس کو دیکھتا رہتا ہے، جو تین میل لمبا ہے۔ تمام جانے پہچانے چہرے، اس کی نگاہ کے سامنے سے گزر رہے ہیں، مگر وہ خود ان میں شامل نہیں ہے۔ ''غم دل اگر نہ ہوتا'' کے رندھیر کی طرح، سہدیو محض پچھتانے پر اکتفا

نہیں کرتا ہے بلکہ : ''جلوس گزر گیا۔وہ قدم بڑھاتا ہے ، ایک قدم دو قدم ، چار قدم اور جلوس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔''

''غم دل اگر نہ ہوتا'' کے آخری پیراگراف میں رندھیر کی چیخ پکار اور اس سے قبل خود جلوس کے گزرنے کے بیان میں خاصی نعرے بازی ہے جو اس زمانے میں ترقی پسند مصنفین کی عام کمزوری تھی :

''...رندھیر سوچنے لگا کہ یہ کیسا جلوس ہے کہ مرنے والے کی چھاتیاں اوپر کو اٹھی ہوئی ہیں اور ظلم کرنے والوں کے چہرے بدحواس ہیں لیکن آج پھر فائرنگ ہو گی، آج پھر کتنے ہی مرلی گولیوں کے سامنے دم توڑیں گے۔ ایک خاندان نہیں کتنے ہی خاندان برباد ہوں گے لیکن ظلم کو کچلنے کے لیے ، انقلاب کو لانے کے لیے ، ایک نہیں کتنے ہی خاندان تباہ ہو جائیں ، ان کو تباہ ہو جانے دو۔ وہ موت ، وہ تباہی جو کروڑوں خاندانوں کی بہتری کے لیے ہو ، جو ظلم کو کچلنے کے لیے ہو ، جو انقلاب کے لیے ہو ، ایسی موتیں ، ایسی تباہیاں مقدس ہیں ، قابل پرستش ہیں ، کامریڈ مرلی تم کبھی نہیں مر سکتے۔ تم ہمیشہ زندہ رہو گے ...''

''فائر ایریا'' میں جلوس کے بیان میں ، مزدوروں کے نعرے ہیں مگر بیان ، نعرہ بازی اور متوسط طبقہ کی جذباتیت سے پاک ہے :

''دھم دھما دھم دھم۔۔۔
دھم دھما دھم دھم۔۔۔۔
ڈھول کی آواز صاف سنائی دینے لگی ہے۔ لوگوں کے قدموں سے اڑتی ہوئی دھول کا غبار بھی دکھلائی دے رہا ہے۔
بہت بڑا جلوس ہے
تین میل لمبا جلوس آج تک کولفیڈ میں نہیں نکلا
سنہا صاحب مرے تھے تب بھی نہیں
۱۹۸۱ء میں اندرا گاندھی گولف گراؤنڈ میں آئی تھیں ، تب بھی نہیں۔
سہدیو سر اٹھا کر اوپر دیکھتا ہے۔ نیلا آسمان دھوپ میں تپ کر خاکستری ہو گیا ہے۔ سورج آگ اگل رہا ہے اور زمین انگنت قدموں کی دھمک سے کانپ رہی ہے۔ سہدیو ذرا سا جھک کر ادھر دیکھتا ہے جدھر سے جلوس آرہا ہے۔ آدمیوں کا ایک انبوہ... انگنت آدمیوں کا ایک سیلاب...''

سر سا کولیری میں مجدار کی لال جھنڈا یونین میں سہدیو سمیت محض تین لوگ تھے
اور موہنا کولیری محض گیارہ لوگ۔ اب وہ :

"پانی کی وہ تین بوند جسے گرم توے پر چھن سے جل جانے کا ڈر تھا، ایک منہ زور سرکش دریا بن چکا ہے۔

"گیارہ آدمیوں کی سرگوشیاں آج ہزار ہا گلے سے چنگھار کر ایک گونجنے والے نعرے میں تبدیل ہو چکی ہے۔

...

یہ کون لوگ ہیں ؟ وہ کل تک تو اسی کے ساتھی تھے مگر آج ؟

ایک گھنٹہ گزر گیا ہے اور ابھی تک جلوس گزر ہی رہا ہے ... وہ پھر جھک کر دیکھتا ہے۔ اب جلوس کا آخری سرا آرہا ہے۔ اس آخری سرے میں عورتیں ہیں۔ میلی کچیلی کامنیں۔ کچھ نے پی بھی رکھی ہے۔ کچھ جھوم جھوم کر چل رہی ہیں۔

... واقعی وہ ختونیا ہے۔ اپنا ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ برابر نعرہ لگاتی جا رہی تھی :

پھانسی دو۔ پھانسی دو

... اور جب ختونیا اُس کے ایک دم نزدیک آجاتی ہے تو وہ اچانک اس کو دیکھ لیتی ہے۔ دیکھ لیتی ہے تو دیکھتی رہتی ہے اور تب اچانک سہدیو دیکھتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں ایک شعلہ لپک رہا ہے

آگ !

اس کو تعجب ہوا کہ جس آگ کو وہ ساری زندگی تلاش کرتا رہا وہ کہیں اور نہیں ختونیا کی آنکھوں میں ہے ..."

شوکت صدیقی نے "غم دل اگر نہ ہوتا" اس زمانہ میں لکھا تھا جب اس قسم کی باتیں لکھنا فیشن میں داخل تھا اور الیاس احمد گدی نے اپنے ناول کے لیے اس قسم کا خاتمہ اس وقت پسند کیا ہے جب پوری دنیا میں پسپائی کا عمل جاری ہے اور بہت سے سکہ بند ترقی پسند اپنی ٹوپی جیب میں چھپا کر رکھتے ہیں کہ جب حالات اچھے ہوں تو پہن لیا جائے۔ الیاس احمد گدی کی تحریر اس بات کی علامت ہے کہ آگ بجھی نہیں ہے، فائر ایریا کی طرح اندر ہی اندر دھدھک رہی ہے۔

ناول کی ابتداء ان جملوں سے ہوتی ہے :

"اگر آپ کبھی کوئلوں کی اس کالی دنیا میں آئیں جسے کولفیلڈ کہا جاتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ کہیں کہیں کسی کسی سڑک کے کنارے ایک بہت چھوٹا سا بورڈ لگا ہو گا : "فائر ایریا"

آگ؟

آپ حیرت سے چاروں طرف دیکھیں گے، مگر آپ کو آگ کہیں دکھلائی نہیں دے گی، نہ آگ، نہ دھواں، نہ شعلہ، نہ چنگاری، کچھ بھی نہیں۔... آگ ہے، اوپر نہیں ہے اندر ہے۔ زمین کے اندر۔ کبھی کبھی پانی گھس جانے سے یا زمین کی پرت کمزور پڑ جانے سے یا شاید اپنی شدت کی وجہ سے زمین کا ایک بہت چھوٹا ٹکڑا اندر دھنس جاتا ہے اور گیس، دھوئیں اور بھاپ کی شکل میں، آگ پھوٹ پڑتی ہے۔ تب مائننگ ڈپارٹمنٹ، ایکشن میں آ جاتا ہے۔ اس بڑے سوراخ میں، جس سے بھاپ خارج ہو رہی ہوتی ہے، پانی اور ریت بھری جاتی ہے۔ اس عمل کو اسٹوئنگ کہتے ہیں۔

"... مائننگ ڈپارٹمنٹ، جلد ہی اس آگ پر قابو پالیتا ہے اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے... کیونکہ اس بات کا مطلق امکان نہیں ہے کہ ایک ہی ساتھ سارے کول فیلڈ کی زمین دھنس جائے اور اندر سلگتی ہوئی آگ باہر نکل پڑے۔ اس بات کو مائننگ ڈپارٹمنٹ بھی اچھی طرح جانتا ہے اور مینجمنٹ بھی۔ اس لیے سب مطمئن ہیں۔"

ناول کے یہ ابتدائی جملے پورے ناول کی کلید کی حیثیت رکھتے ہیں اور خاتمہ سے اس طرح مربوط ہیں کہ دائرے کی تکمیل کا احساس ہوتا ہے جیسے سنگیت میں "سم" ----- یہ آغاز، اسی موضوع پر ۱۹۹۰ میں شائع ہونے والے سنجیو کے ہندی ناول : "ساودھان نیچے آگ ہے" سے بہت مختلف ہے، جو نہایت روایتی انداز میں شروع ہوتا ہے اور جس میں "اسٹوئنگ، فائر ایریا، پٹ، اوپن کاسٹ، ٹرامر، ہالج، کوک پلانٹ وغیرہ" جیسی اصطلاحات کی تشریح متن میں کرنے کے بجائے کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ شامل کی گئی ہے، جیسا کہ علمی کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

سنجیو کا ناول "ساودھان نیچے آگ ہے"، الیاس احمد گدی کے ناول "فائر ایریا" سے محض چار سال قبل شائع ہوا تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ الیاس احمد گدی نے اپنا ناول کب مکمل کیا

تھااور اس کے شائع ہونے سے قبل وہ سنجیو کے ناول سے واقف تھے یا نہیں ؟ لیکن موضوع کے اتحاد اور نقطہ نظر کے اشتراک کے باوجود، دونوں ناولوں میں ماجرہ اور برتاؤ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ کرداروں کا ہجوم دونوں ناولوں میں ہے جو انہیں تکنیک کی سطح پر اجتماعی ناول سے قریب کر دیتا ہے مگر الیاس احمد گدی نے نسبتاً زیادہ بڑے کینوس کا استعمال کیا ہے اور ایک پورے عہد کی تصویر بنائی ہے۔ آزادی کے بعد بھی انگریز کمپنیوں کا وجود، دیسی کمپنیوں کا نسبتاً زیادہ مزدور کش رویّہ، مافیا گروہوں کی پیدائش اور ان کا ارتقاء، مل مالک اور مزدوروں کے درمیان ٹریڈ یونین کا بدلتا کردار اور پس منظر میں سیاسی جماعتیں، کوئلہ کانوں کو قومیائے جانے کے اثرات، قومی ایمرجنسی کا نفاذ اور بعد کا زمانہ۔۔۔ غرض ایک پورا عہد ہے جو اس ناول کے پس منظر میں ابھرتا ڈوبتا ہے۔

شوکت صدیقی کے "غم دل اگر نہ ہوتا" جیسی متعدد تحریروں کا زمانہ سیاسی عینیت پسندی کا زمانہ تھا جب ترقی پسندوں کی بیشتر تحریروں میں تحریک کے گرد رومان کا دھندلکا نظر آتا ہے، مگر الیاس احمد گدی کے موجودہ ناول کے لکھے جانے کا زمانہ وہ ہے جب ہر سیاسی عمل بے نقاب اور واضح ہے۔۔۔ مزدور تحریک میں پیدا ہونے والا بگاڑ (Vulgarisation) بھی جس کی وجہ سے پوری ٹریڈ یونین تحریک کی توقیر جاتی رہی ہے۔ مالک، ٹھیکیدار اور ان کے غنڈے جس طرح اس کالی نگری میں، ٹریڈ یونین تحریک کا استعمال کرتے ہیں اور ظلم کی چکی میں پسنے والے مزدور خود جس طرح ان کے آلہ کار بنتے ہیں اس کی نہایت عمدہ تصویر اس ناول میں نظر آتی ہے۔ یہاں پرانے لکھنے والوں کی عینیت پسندی کی کارفرمائی نہیں ہے جب پوری تحریک مقدس گردانی جاتی تھی اور ہر مزدور ہیرو۔ اس ناول میں محنت کش طبقہ کی کمزوریوں اور لغزشوں کے ساتھ، ان کے زندہ رہنے کی جدوجہد کی ایک بے لاگ داستان پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس ناول پر گفتگو کرتے وقت بہت سے لوگ قرۃالعین حیدر کے ناول "آخر شب کے ہمسفر" کا حوالہ دے رہے ہیں، مگر "آخر شب کے ہمسفر" کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ مصنفہ کی، کمیونسٹ تحریک اور خصوصاً انڈر گراؤنڈ طور پر کام کرنے والوں کے بارے میں کوئی براہ راست واقفیت نہیں ہے۔ اس کے بر خلاف "فائر ایریا" میں بیان کی پختگی اس بات کی غماز ہے کہ مصنف نے یا تو خود اس عمل میں حصّہ لیا ہے یا بہت قریب سے اس پورے عمل کا مشاہدہ کیا ہے۔

سرسا کولیری اور موہنا کولیری سے کانوں کے قومیائے جانے اور اس کے بعد تک یعنی گزشتہ پچاس برس میں ٹریڈ یونین کے بدلتے ہوئے کردار کو جس طرح اس ناول میں پیش

کیا گیا ہے، اس کی مثال اس سے قبل اردو فکشن میں مشکل سے ملے گی۔ دولت، سیاست، اقتدار، سیکس، محنت، استحصال اور ظلم سے ترکیب پانے والے عمل کی جو تصویر الیاس احمد گدی نے پیش کی ہے اس کے لیے وہ یقیناً تعریف کے مستحق ہیں۔

الیاس احمد گدی نے اپنے کرداروں کی مناسبت سے ان کی فطری زبان استعمال کی ہے جس سے ان کی شناخت آسان ہو گئی ہے۔۔ یہی کام جگہ جگہ سنجیو نے بھی کیا ہے۔ کول نیلڈ میں صرف "اے۔بی۔سی۔ یعنی آرہ، بلیا اور چھپرہ" کے ہی لوگ نہیں ہیں بلکہ پورے بہار، مشرقی اتر پردیش، بنگال، اڑیسہ کے ساتھ ساتھ پنجاب تک کے لوگ نظر آتے ہیں۔ سب کی اپنی اپنی بولی ہے اور اس پنچ رنگی بولی کے ملنے سے ایک ملی جلی بولی کے بننے کا خاموش عمل جاری ہے جیسے وہاں کے لوگ دوسرے ڈھورے والوں سے بولنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نہ سنجیو کے ناول میں پنجاب سے آئے اودھم سنگھ کو کسی قسم کی دقت محسوس ہوتی ہے اور نہ الیاس احمد گدی کے جونا تھن اور دلجیت سنگھ کو۔ البتہ بڑے تہذیبی مراکز میں مقید، سکہ بند زبان دانوں کو یہ بولیاں یقیناً اجنبی معلوم ہوں گی اور وہ اس کی قراءت میں دشواری محسوس کریں گے۔ لیکن جن لوگوں کا کبھی اُس خطہ سے واسطہ پڑا ہے وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختلف النوع بولیوں کے استعمال سے الیاس احمد گدی نے حقیقی ماحول کو کس خوبی سے اجاگر کیا ہے:

"باپ کا نام سن کر گھوشال بابو بمک گیا
دیکھو باپ دادا کیا تو بہت برا ہو جائے گا۔
... یہ سالا ہماری پوری گشٹی کو گالی دیا۔" (صفحات ۵۴۔۱۵۳)

"بمکنا" بمعنی غصہ میں تلملانا، بنگالیوں کے روز مرہ کا حصہ ہے جس کا استعمال وہ ہندوستانی بولتے وقت بھی کرتے ہیں۔ جھگڑنے کا یہ انداز بھی بنگالیوں کا مخصوص انداز ہے۔ اس کے بر خلاف جب الیاس احمد گدی، باوڑیوں کو جھگڑتے ہوئے دکھاتے ہیں تو پورا انداز بدل جاتا ہے اور ایک نئی فضا کی تخلیق ہوتی ہے اور اس کی تفصیلات سے مصنف کے زبردست قوت مشاہدہ کا پتا چلتا ہے۔ ان سب کے بر خلاف یوپی کے جعفری صاحب کی زبان اور ان کا برتاؤ ان کے جاگیر دارانہ اقتدار کی وضاحت کرتا ہے۔ کبھی کبھی کئی طرح کے کردار یکجا ہو جاتے ہیں، تب مصنف کی چابکدستی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے:

"گوہا کا معاملہ فٹ ہو گیا!"

کسی نے اس کو بغل سے اطلاع دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ کھونٹا

مستری دلجیت سنگھ تھا۔

"تم کو کا ہے کھجلی ہو رہی ہے ؟"

"ہلے ہلے! وہ بنگالی بچہ شکار سامنے سے لے گیا اور میں دیکھتا رہ گیا۔"

... اس نے بغل میں دیکھا دلجیت سنگھ بھی غائب تھا۔ پتا نہیں کون سی کڑی کے ساتھ۔

ہر کردار کی زبان واضح طور پر علاحدہ ہے۔ ان کے رویے بھی اس قدر علاحدہ ہیں کہ ہجوم میں بھی یہ کردار اپنی انفرادیت نہیں کھوتے ؛ یہاں تک کہ بہار کے گانو اور شہر کے کرداروں کی زبان اور ان کے رویے کا باریک سا فرق بھی بہت واضح نظر آتا ہے۔ اتنے کرداروں کو اس طرح سنبھال کر پیش کرنا واقعی قابل تعریف بات ہے۔

جس طرح تحسین کی "نو طرز مرصع" جیسی بہت سی کلاسیکی تحریروں کی قرأت کے لیے مشق کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح الیاس احمد گدی جیسے عوامی بولیوں کو استعمال کرنے والوں کی تحریروں کی قرأت میں وہ لوگ دقت محسوس کریں گے جن کا عوامی بولیوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ گیان سنگھ شاطر اور الیاس احمد گدی کی زبان پر اعتراض کی بڑی وجہ شاید یہی ہے۔ لیکن اگر فکشن کا مطالعہ محض ذہنی عیاشی نہیں ہے تو قاری کو اس مشق کی زحمت گوارہ کرنی چاہیے۔ عام تصوّر کے برعکس نہ تو یہ بولیاں تہہ داری سے محروم ہیں اور نہ ہی ان کے بولنے والے کنائے سے ناواقف۔ مثلاً : جب اعلا ذات کے جوالا مصر، کمتر ذات کی ایک غریب باوڑی عورت کے گھر سے برآمد ہوتے ہیں اور لوگوں کو ٹوہ میں پاکر بہانہ بناتے ہیں کہ پانو کی موچ ٹھیک کرانے گئے تھے تو سری واستو ہنس کر کہتا ہے :

"پیر اختم ہو گئیل بابا؟"

لیکن باوڑی عورتیں اس پر اور پہلودار تبصرہ کرتی ہیں :

"سنا ہو دُلری کے مائی! اب تو املی کے پیڑ میں آم لاگی۔"

دوسری عورت جواب دیتی ہے :

"ہاں بہن نالی میں گنگا بہے لاگل ای کلجگ ما۔"

کتابت اور پروف خوانی کی خرابی اور رموز و اوقاف کے بے سروپا استعمال کی وجہ سے پڑھتے وقت بار بار اکتاہٹ ہوتی ہے، مگر ایک ایسی زبان کے مصنف سے ان باتوں کا کیا شکوہ کیا جائے جہاں ناول کے پبلشر بمشکل ہاتھ آتے ہیں اور لکھنے والا آخر تک ایک غیر

یقینی کیفیت کا شکار رہتا ہے کہ آیا اس کی تحریر کبھی زیور طبع سے آراستہ ہو بھی پائے گی یا نہیں۔ اگر لکھنے والا صاحب حیثیت نہیں ہے تو صورتحال اور بھی دگرگوں ہوتی ہے۔ اس غیر یقینی صورت حال کا اثر یقینی طور پر تخلیق کے عمل پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس ناول میں زبان کے استعمال میں لاپرواہی کی بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جنہیں کسی بھی طرح گوارہ کرنا مشکل ہے:

"ان سارے اسٹافوں میں بس ایک آدمی نہیں تھا۔" (صفحہ ۱۵۵)

"رفتہ رفتہ یہ کچھا جزوے بدن ہو گیا۔" (صفحہ ۳۴۶)

ایسی مثالیں ناول میں کئی جگہ ملتی ہیں مگر ان اغلاط پر نظر ڈالتے وقت یہ امتیاز لازم ہے کہ بعض کردار کی زبان سے قصداً ایسے جملے اور محاورے کہلوائے گئے ہیں جو قواعد کی رو سے غلط ہیں۔ مثلاً صفحہ ۲۸۶ پر نیپال یادو کا یہ کہنا:

"سالا عورت اور طوطا کا کوئی بسواس نہیں کب اڑ جائے۔"

یا بہت سے جملے جو پہلے درج کیے گئے ہیں۔ شمالی ہندستان کی بولیوں میں جنس کے اعتبار سے افعال نہیں بدلتے۔ ان بولیوں کے بولنے والوں کے لیے ہوا بہتا ہے یا بہتی ہے، سورج نکلتا ہے یا نکلتی ہے بے معنی سی چیز ہے۔ اس لیے کہ ان کی اپنی بولیوں میں اس کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے۔ لہٰذا کھڑی بولی پر مبنی اردو یا ہندی بولتے وقت بھی وہ لوگ تذکیر و تانیث کے استعمال پر بمشکل قادر ہوتے ہیں۔ ان کی زبان سے اسی قسم کے جملے اور فقرے فطری معلوم ہوتے ہیں جن کا استعمال الیاس احمد گدی نے کیا ہے۔ اس سے فضابندی میں مدد ملی ہے۔

الیاس احمد گدی کا "فائر ایریا"، ایسا ناول نہیں ہے جسے محض زبان کی خوبیوں اور تکنیک کے استعمال پر بات کر کے ٹالا جا سکے۔ فکشن محض زبان اور تکنیک کا استعمال نہیں ہے۔ انسانی زندگی کا نت نیا تجربہ اسے آب بخشتا ہے۔ الیاس احمد گدی نے جن تجربات کا بیان کیا ہے وہ اردو میں کمیاب ہیں۔ بعض تصویریں تو ایسی دردناک ہیں کہ ان کو پڑھنے کے لیے گز بھر کا کلیجہ چاہیے۔ جگہ جگہ وہ ایسی جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں گویا سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ الیاس احمد گدی نے ان تجربات کو بیان کرنے کی ہمّت اس وقت کی ہے جب صارف سماج بڑی تیزی سے تشکیل پذیر ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا بھی اس عمل میں معاونت کر رہا ہے۔ قومی سطح کے اخبارات میں فیشن ڈیزائن پر ہزاروں ٹن کاغذ صرف کیا جا رہا ہے، کار کے نئے ماڈلوں اور گھر کی داخلی تزئین پر

نمایاں طور پر سرخیاں لگائی جارہی ہیں مگر دال کے مہنگے ہونے یا دیگر اجناس کی گرانی کا ذکر معدوم ہوتا جارہا ہے، بڑے شہروں سے باہر کی دنیا پر توجہ کم ہورہی ہے اور تحصیل کی خبریں شائع کرنے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں الیاس احمد گدی جیسے لوگوں کی تحریریں اس تشکیل پذیر صارف سماج کے خلاف مزاحمت کا فریضہ انجام دیتی ہیں اور ہمارے اس یقین کو مستحکم کرتی ہیں کہ ادب کسی بھی سیاسی و معاشی نظام کا ماتحت نہیں ہے بلکہ اس سے پرے ہے اور اسے نئی راہ دکھانے والا ہے۔

ڈاکٹر توقیر احمد خان
لیکچرر شعبۂ اردو
دہلی یونی ورسٹی۔ دہلی

واقعاتِ اقبال

(حکیم کلب علی کی زبان سے)

فکر اقبال کے بہترین مفسر اُن کے ہم نشیں ہیں یعنی وہ لوگ جنھوں نے اقبال کی محفلوں سے براہِ راست فیض اٹھایا لیکن افسوس کہ جن لوگوں نے اقبال کو دیکھا، اُن کی باتوں کو سنا اور اُن کے علم و فضل سے استفادہ کیا اس دنیا میں اب بہت کم ہیں زہے نصیب راقم الحروف کو ایک ایسے ہی بزرگ حکیم کلب علی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جنھوں نے چار سال کا عرصہ لاہور میں گزارا۔ انھیں گاہے بگاہے اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی محفل سے لطف اندوز ہونے کا فخر حاصل ہے۔ حکیم کلب علی صاحب کافی معمر اور ضعیف ہو چکے ہیں وہ اپنے آبائی وطن امروہہ کے محلہ بیگم سرائے میں قیام پذیر ہیں اور طبابت کا پیشہ کرتے ہیں۔ حکیم کلب علی صاحب نے حیات اقبال کے کچھ ایسے واقعات بیان کیے جو اُس عہد کی اہم یادگار ہیں۔ ان واقعات و حالات سے اقبال کی فکر اور اقبال کی شاعری پر مزید روشنی پڑتی ہے اور شعر اقبال کے مخفی گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں۔

حکیم صاحب قبلہ نفیس ادبی ذوق رکھتے ہیں ادیبوں اور عالموں کی پذیرائی فرماتے ہیں اور علمی و ادبی محفلیں بھی منعقد کرتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں انھوں نے امروہہ میں اورینٹل سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک سمینار منعقد کرایا تھا جس کا عنوان تھا ''اردو زبان و ادب کی ترقی میں روہیلکھنڈ کا حصہ''، راقم کو اس سیمنار میں شرکت کا موقع ملا اور پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کی وساطت سے قبلہ حکیم صاحب سے نیاز کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دو سال بعد یکم اکتوبر ۱۹۹۵ء کو حکیم صاحب سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس وقت احباب نے حکیم صاحب کی عالمانہ خدمات کے اعتراف میں ایک کتاب بھی شائع کی تھی جس کا نام ''حکیم کلب علی شاہد۔۔۔ شخصیت اور فن''، ہے۔ آپ نے ازراہ عنایت کتاب کا نسخہ عنایت کیا اور سیمنار کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ راقم کا ذوق ادب اور اشتیاق ملاقات دیکھ کر حکیم صاحب نے روک لیا اور ادبی گفتگو فرمانے لگے۔ مریض آجاتے تو انھیں دیکھنے لگتے پھر فارغ ہوتے تو اور خطاب فرماتے اقبال کی باتوں میں بتایا کہ ایک صاحب رسول تشریف

لائے تھے کہنے لگے ''میں نے فارسی میں ایم اے کیا ہے۔،،میں نے (حکیم صاحب نے) ان سے پوچھا ''عصمتِ بی بی از چادر یست،، کا کیا مطلب ہے ؟ نہیں بتا سکے، پھر میں نے ہی انھیں بتایا۔ اُس وقت ایران میں طرح طرح کی خرابیاں تھیں جس کی وجہ سے ایران بہت بدنام ہو گیا تھا کسی خاتون کا گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے نیک بیبیوں کو یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ گھر سے باہر نکلیں گی تو چادر اوڑھیں گی اور اپنی عزت و عصمت کو خطرے میں ڈالیں گی اور اپنے گھر وہ بے چادر کے گھر کی چار دیواری میں رہیں گی تو محفوظ رہیں گی۔ پھر فرمایا کیا یہ بات کہیں کتابوں میں مل سکتی ہے ؟ میں نے کہا مگر اقبال نے تو اسی بات کو یوں کہا تھا

بطولے باش و پنہاں شواز یں عصر

مصرع سنتے ہی انھوں نے پوری رباعی پڑھ دی

اگر پندے درویشے پذیری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہزار امت بمیرد تو نہ میری
بطولے باش و پنہاں شواز یں عصر۔۔۔۔۔۔از اں پس در آغوش شبیرے بگیری

ایسا لگا جیسے حکیم صاحب کمال رغبت کے ساتھ کچھ جذباتی ہو گئے ہیں پھر انھوں نے بتایا کہ (۱۹۳۵ سے ۱۹۴۰ء تک) چار سال لائل پور رہا ہوں اس دوران اقبال کی خدمت میں جاتا رہتا تھا۔ میں اقبال کے کچھ واقعات ایسے سناؤں گا جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں پھر مریضوں کو دیکھتے رہے اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ عجیب و غریب واقعات سنائے

حکیم صاحب نے فرمایا اقبال کا ایک شعر ہے

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی نا خوش اندیشی

(بال جبریل غزل نمبر ۶)

میں نے اقبال سے پوچھا کہ صاحب اس کا کیا مطلب ہے یہ آپ نے کیا کہا ہے ؟ اقبال نے بتایا کہ میاں اسمٰعیل نانوتوی نے اور پھر مولوی عبد العزیز نے بھی یہ فتوادیا کہ ہندستان دار الحرب ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب کے ہزاروں گھرانے اپنے مکان اور جائدادو نے پونے بیچ کر نکل پڑے لیکن وہاں جاکر انھیں ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں ہوا چنانچہ وہ تمام گھرانے پریشان حال الٹے پانو واپس آئے اور پھر ہندستان ہی میں ایک ایک لقمہ کو ترس گئے اور بڑی مصیبت کی زندگی گزارنے لگے۔ اس طرح نہ معلوم کتنے مسلمان گھرانے برباد ہوئے۔ یہ شعر اس موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ پھر حکیم صاحب نے فرمایا کہ

اقبال کا دل کس قدر نرم تھا۔ یہاں انھوں نے "ناخوش اندیشی"، کہا ہے اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ معلوم کیا الفاظ استعمال کرتا۔ اس شعر کی طرح حکیم کلب علی صاحب نے اقبال کا ایک اور شعر پڑھا

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

(بال جبریل۔ باغی مرید)

حکیم صاحب نے بتایا کہ اقبال ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کرتے تھے ایک بار وہ کہیں سے لاہور واپس آرہے تھے کہ ان کے ڈبے میں ایک شاہ جی سوار ہوئے اور اقبال کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے بیس پچیس مرید بھی تھے۔ اقبال حقہ پی رہے تھے۔ انھوں نے حقہ کی نلی شاہ جی کی طرف موڑ دی۔ شاہ جی نے حقہ پیا اور پوچھا کہ تم کون ہو تو اقبال نے کہا میرا نام اقبال ہے۔ راستے میں شاہ جی کہیں اتر گئے اور اسٹیشن پر ہی یہ بات مشہور کر دی کہ مجھے کل کو اقبال نے لاہور بلایا ہے۔ یہ بات شاہ جی نے لوگوں کو یہ جتانے کے لیے کہی کہ دیکھو میں اتنا بڑا بزرگ ہوں کہ اقبال جیسا جیّد عالم بھی میرا مرید ہے۔ اگلے دن صبح کو میں اقبال کے پاس بیٹھا تھا کہ علی بخش نے بتایا کہ کوئی درویش نما شخص دروازے پر ہے اقبال نے کہا کہ انھیں اندر بلا لاؤ۔ شاہ جی لاہور سے بھی بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ علی بخش بولا کہ صاحب ان کے ساتھ تو سو ڈیڑھ سو آدمی اور ہیں۔ تو مہمان خانہ کھول دو۔ اقبال نے کہا۔ علی بخش نے مہمان خانہ کھول کر ان سب کو بٹھادیا۔ جب اقبال مہمان خانہ میں داخل ہوئے تو شاہ جی ایک ایک مرید کی فریاد سن رہے تھے۔ ایک مرید نے بیس روپے کا نوٹ دیا۔ پیر صاحب نے اسے تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ مرید دست بستہ کھڑے ہو کر کہنے لگا۔ حضور میں سات سو روپے کا قرض دار ہوں۔ بیٹی کی شادی میں یہ رقم اُدھار لے لی تھی۔ دعا کریں میرا یہ قرض ادا ہو جائے۔ اقبال نے آتے ہی یہ منظر دیکھا کہ مرید گڑگڑا رہا ہے اور رو رو کر فریاد کر رہا ہے۔ تو انھوں نے شاہ جی سے کہا حضرت یہ دس روپے تو غریب کے واپس کر دیں ۶۹۰ روپے کا ہی قرض دار رہ جائے گا۔ انھوں نے واپس نہ کیے۔ اقبال نے علی بخش سے کہا کہ تکیہ کے نیچے سے نوٹ نکال لو تو اس کے نیچے اور بھی نوٹ نکلے۔ اقبال نے کہا گنو۔ علی بخش نے گن کر بتایا کہ ۳۵۰ روپے ہیں۔ اقبال نے کہا علی بخش جاؤ اس مقروض کو سیٹھ بلاقی رام کے پاس لے جاؤ اور کہنا کہ اقبال نے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس شخص کا سود معاف کر کے اصل رقم لے لی جائے۔ ساڑھے تین سو روپے یہ ہیں جو کم پڑیں

میری طرف سے شامل کرلو۔ علی بخش اس شخص کو لے گیا اور پھر ایسا ہی کیا۔ ساری محفل اور تمام مرید مع پیر صاحب کے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ اسی موقع کے لیے اقبال نے کہا تھا

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

حکیم صاحب نے اقبال کا ایک اور شعر ارشاد فرمایا۔

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

خارا تو کانٹے دار پتھر کو کہتے ہیں لیکن یہ "پوشیدہ ہنر،، کیا ہے؟ پھر خود ہی بتایا کہ اقبال گردے کے مریض تھے پتھری کے علاج کے لیے آپریشن کی تیاری ہو گئی۔ اقبال کا پاسپورٹ اور ویزا بھی آگیا ایک دن جانے میں تھا کہ ان کے بھائی عطا محمد آئے اور بولے کہ جانے سے پہلے ایک بزرگ حاذق کو دکھالیں۔ حاذق صاحب کے یہاں جانے کے لیے گھوڑے کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ اقبال گھوڑے پر سوار ہو کر گئے۔ حاذق صاحب نے اقبال کو دیکھا تو اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور باصرار اقبال کو اس جگہ پر بٹھایا جہاں خود بیٹھتے تھے۔ باتیں کرتے رہے حاذق صاحب نے اپنے ملازم کو آواز دی اور ایک تعویذ زعفران سے لکھ کر اس کو دیا کہ ایک کورے گھڑے میں پانی بھر کر یہ تعویذ اس میں ڈال دو۔ اور ایک پرانے گھڑے میں بھی پانی بھر کر رکھ دو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ حاذق صاحب اقبال سے بولے بیٹے گرمی بہت ہے تم سفر کے تھکے ہوئے ہو جاؤ پہلے نہالو۔ اقبال نے کہا مناسب ہے میں بھی یہی چاہتا تھا ذرا تکان دور ہو جائے گی۔ حاذق صاحب نے کہا پہلے کورے گھڑے کا پانی استعمال کرنا۔ اقبال غسل خانے میں گئے اور جیسے ہی پانی ڈالنا شروع کیا ان کو بہت زور کا پیشاب آیا اور اقبال نے تمام جسم کو اور جگہ کو پاک کیا اور پتھری کاغذ میں لے کر باہر آئے۔ حاذق صاحب نے پوچھا بیٹے کیا حال ہے؟ اقبال نے کاغذ میں لپٹی ہوئی پتھری دکھائی اور سارا واقعہ بتایا۔ اس طرح انھیں آپریشن کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ اسی کے لیے اقبال نے "پوشیدہ ہنر،، کی اصطلاح بنائی تھی۔ اور کہا تھا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
سنتا ہوں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

(ارمغان حجاز۔۔ بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)

حکیم صاحب نے ایک بار پھر کہا کہ وہی باتیں بتاؤں گا جن کا میں گواہ ہوں اور جو واقعات

میرے سامنے پیش آئے ہیں۔ پھر فرمایا ایک جرمن لیڈی اقبال کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں نے قرآن شریف کو جرمن زبان میں پڑھا ہے اور بڑے احترام سے اسے تولیہ میں لپیٹ کر رکھتی تھی لیکن جب میں نے پڑھا کہ خدا کے "کن فیکون"، کہتے ہی کائنات وجود میں آگئی تو میں نے قرآن کو میز پر پٹخ دیا۔ (حکیم صاحب نے ہاتھ سے دھکیلنے کا اشارہ کرکے بتایا اس لیڈی نے یوں کہا جیسے قرآن کو دھکیل دیا) یہ سنتے ہی اقبال کا چہرہ تمتما گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا جواب میں تمھارے فلسفہ کی رو سے ہی دوں گا۔ پھر اقبال نے اس لیڈی سے پوچھا کہ تمھاری قمیص کا رنگ کیسا ہے؟ اس نے کہا۔ نیلا۔ اقبال نے بتایا کہ جرمنی فلسفہ کے مطابق کسی رنگ کو جاننے کے لیے ڈھائی کھرب تعاملات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یعنی ڈھائی سو کلرک اگر بٹھائے جائیں تو اس کو جاننے میں بارہ سال لگ جائیں گے کہ یہ رنگ نیلا ہے۔ اور آپ نے پلک جھپکتے ہی یہ بتادیا کہ یہ رنگ نیلا ہے جب آپ اتنے لمبے عمل کی بات کو ایک لمحہ میں بتاسکتی ہیں۔ تو آپ کی اس آنکھ کو بنانے والا "کن فیکون"، کہہ کر کائنات کو پیدا کیوں نہیں کر سکتا۔ لیڈی کے پاس جواب نہ تھا۔ پھر حکیم صاحب نے فرمایا کہ توقیر میاں بتایئے اگر وہ لیڈی ابوالکلام آزاد کے پاس آتی تو کیا وہ اس کو ایسا تشفی جواب دے سکتے تھے۔؟

ورنہ بیٹا بھی کبوتر باز ہوگا۔ حکیم صاحب نے بتایا اقبال کبوتر شوقیہ نہیں پالتے تھے بلکہ رسول اللہ کے عشق میں احتراماً کبوتر پالا کرتے تھے کیونکہ ان کبوتروں میں روضہ مبارک کا ایک کبوتر تھا اس کے احترام میں اقبال اتنے کبوتر پالا کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے کے ساتھ حکیم صاحب نے ایک اور بات بتائی کہ حج بیت اللہ کے موقع پر میں نے خود دیکھا ہے کہ وہاں جب کبوتروں کا جھنڈ اڑتا ہے تو روضہ رسولؐ کے اوپر سے نہیں گزرتا بلکہ کبوتروں کا جھنڈ کا جھنڈ ادھر ادھر پھٹ جاتا ہے اور کبوتر گنبد خضری سے بچ کر اڑتے ہیں اور ان حدود میں بیٹ بھی نہیں کرتے ہیں۔ پرندوں کے اس حیرت انگیز عمل پر حکیم صاحب نے ایک شعر بھی مسجد نبوی میں کہا تھا اور راقم کو سنایا جو اس طرح ہے۔

نہ جفت ہوں نہ کریں بیٹ صحن مسجد میں
طیور بھی تو تمھارے یہاں مہذب ہیں

اس موقعہ پر حکیم صاحب نے اقبال کے معاملات کے دو عجیب و غریب واقعات اور سنائے پہلا یہ تھا کہ جب جاوید منزل بن گئی تو اقبال بیٹے کے مکان میں رہنے کا کرایہ ادا کرتے تھے جو ستر روپے ماہانہ تھا۔ ایک بار ملازم سے کہا کہ اب ڈیڑھ مہینے کا کرایہ دے دو۔ ملازم کرایہ

لے کر پہنچا تو جاوید رو دیئے اور سمجھ گئے۔ حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اقبال کے انتقال کا قریب قریب وہی دن تھا کہ ڈیڑھ مہینہ پورا ہو رہا تھا۔ اقبال کا انتقال ہوا مگر وہ مکان کا کرایہ مار کر نہیں گئے۔ اس وقت حکیم صاحب کے حاضرین میں سے کسی نے اقبال کا مصرعہ پڑھا۔ "نشانِ مرد مومن با تو گویم"، اس پر حکیم صاحب نے شعر پورا کیا "چو مرگ آید تبسم بر لب اوست"، اور گواہی دے کر بتایا کہ میں نے خود دیکھا ہے کہ مرنے کے بعد اقبال کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پھر ایک شعر پڑھا۔

از مرگ نادان تا چند ترسی
مرگ است صیدے تو در کمینی

اور کہا کہ سید سلیمان ندوی نے بتایا کہ یہ ایک حدیث ہے۔

دوسرا واقعہ بھی معاملات سے متعلق سنایا وہ تھا کہ جب اقبال نے دوسری شادی کر لی تو لدھیانہ والی بیوی خود ہی گھر آ گئیں۔ دوسری بیوی نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ایک جوڑ جڑواں کنڈل بنوا دو۔ اقبال نے سیٹھ بلاقی رام کو فون کیا کہ دو جوڑ کنڈل ایک وزن کے بنادو۔ ایک چاول کا فرق نہ ہو۔ جب کنڈل بن کر آ گئے تو انھیں ترازو میں رکھ کر تولا گیا۔ ان میں سے ایک جوڑ آدھی رتی کم تھا۔ اس پر بڑی بیوی نے کہا کہ کم والے میں لے لوں گی مگر اقبال نے ان کنڈلوں کو واپس کر دیا اور اس روایت کے راوی شفاء الملک نے بتایا کہ سیٹھ بلاقی رام نے کم والے کنڈلوں میں آدھی رتی کا ٹانکا لگادیا اور اس طرح دونوں دھڑوں کو برابر کے کنڈل دیے گئے۔ اسے کہتے ہیں العدل فی الحقیقت۔

آخر میں ایک بات کا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حکیم صاحب قبلہ اقبال کے عقیدت مند ہیں اور ان کے گرویدہ ہیں۔ ان واقعات کو گزرے نصف صدی کا عرصہ ہو چکا ہے اس لیے ان کو ایک ایک دن، گھڑی یا ریخ میں تولنا مناسب نہ ہوگا چنانچہ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر استعمال ہونے والے اعداد و شمار قیاسی ہیں لیکن امر واقعہ کو بیان کرتے ہیں یا پھر حقیقی اعداد و شمار کے بے حد قریب ہیں۔ ویسے بحمد اللہ حکیم کلب علی تادمِ ایں تحریر بقیدِ حیات ہیں اور اس سلسلہ میں کسی بھی تفصیل، ترمیم، تردید، توثیق یا تصحیح کے لیے حکیم صاحب قبلہ سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ف س اعجاز
مدیر ماہنامہ انشاء
بی۔۲۵ زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۷۳

(پہلی قسط)

ادب میں خواب کے اجزاء

نوٹ مصنف نے یہ طبعزاد مضمون اپنی زیر طبع نفسیاتی کتاب "خوابوں کے اسرار"، کے لیے تحریر کیا ہے۔ "خوابوں کے اسرار"، انگریزی سے ترجمہ کردہ نفسیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ (ادارہ)

اپنے یہاں شیخ چلی کے خواب مشہور ہیں۔ اور وہ ادب کے ذریعے ہی مشہور ہوئے ہیں۔ اصلاً یہ خواب نہیں لطیفے ہیں ہر خیالی پلاؤ کو شیخ چلی کا خواب کہہ دیا جاتا ہے۔ خواب سے متعلق بہت محاورے زبان زد خاص و عام ہیں کھلی آنکھوں خواب دیکھنا، جاگتی آنکھوں کے خواب، ٹٹ پونجیے کے خواب محلوں کے خواب وغیرہ وغیرہ۔ خوابوں سے ادب کا گہرا لگاؤ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تخلیقی عمل خواب دیکھنے کے عمل سے شدید طور پر متاثر نظر آتا ہے خواب کے بارے میں آدمی جس قدر لاعلمی میں رہے گا اسی قدر سرّیت اس کے خوابوں کے اظہار میں پائی جائے گی۔ خواب بینی کا عمل نیند کے طبعی نظام سے جڑا ہے شاعری افسانے سے زیادہ پرانی صنف ادب ہے اور شعرا کے وسیلے سے شاعری کے محو خواب یا محو نیند دماغ کی حالت کا پتا چلتا رہا ہے۔ شعرا کی بے خوابی اور راتوں میں اختر شماری یوں بھی مشہور ہے۔ یہ سارا معاملہ تخلیقی سطح پر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ فانی بدایونی کا شعر ہے ؎

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب دیوانے کا

تخلیق میں ایسی کسی صورت حال کو خواب کی تشریح کرنے والے بہ عجلت شاعر کے ذہنی خلل، مالیخولیا یا فنا آمادگی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ خوابوں سے شعرا بھی اتنے ہی پریشان ہو سکتے ہیں جتنا ایک عام آدمی ہوتا ہے۔ پسندیدہ خواب سے آدمی خوش ہو سکتا ہے تو محرومی کا خواب یا خواب کی ناکامی اسے تھوڑی دیر کے لیے عذاب اور کشش و پنچ میں چھوڑ

جاتی ہے۔ شعرا کو محرومی اور کامیابی دونوں سے یکساں دلچسپی ہوتی ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی ایک شاعر سلمان اختر نے اپنے ایک مطلع میں اس طرح کی ہے ؎

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

شاعری میں شبیہات (Images) ہو بہو خواب کی شبیہات کی نقل ہوں اس کا امکان کم ہے۔ چونکہ شاعری یا ادب بہر حال خوابوں کا بیان نہیں ہے۔ شاعری خود ایک تخلیقی عمل ہے اور تخلیقی ذہن کا عمل ہے جس میں واردات سے زیادہ واردات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت کا سراغ ملتا ہے۔ ممکن ہے کسی شعر یا کہانی کا محرک کوئی خواب ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شعر یا افسانے کا جنم داتا کوئی خواب نہ ہو البتہ تخلیقی عمل کے دوران تخلیق کار کے ذہن میں ایسی فضا تیار ہو جائے جس کے بطن سے وہ خواب جنم لے لے جسے شاعر کا الہام قرار دیا جاتا ہے۔ صحیح علم اور تجسس کی مدد سے پس تخلیق بہت کچھ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے اس شعر کو لیجیے ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ایسے نہ جانے کتنے کلاسیکی اشعار ہوں گے جنھیں تکیوں کے غلافوں پر بیل بوٹوں کے ساتھ کاڑھا جا سکتا ہے اور سہاگ رات میں سیج کی زینت بڑھائی جا سکتی ہے لیکن غور فرمائیں تو یہ اشعار ہمیں کسی اور جہاں کی سیر کراتے ہیں۔ غالب کے منقولہ شعر میں لفظ "نیند،، کے ساتھ دماغ۔ راتیں۔ زلفیں۔ بازو اور پریشاں۔ ان الفاظ کی آمد نے جسم کے حسی و اعصابی نظام کو وہ فطری ترتیب دے دی ہے کہ رومانی ذہن اس کا خوشگوار اثر لیتا ہے اور آدمی کو تسکین حاصل ہوتی ہے جس کے بعد وہ رات کو سکون کی نیند سو سکتا ہے۔

آرٹ کو اس طرح سمجھنے کا اپروچ ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجہ خواب کے بارے میں آگہی کی کمی ہے۔ خواب کے بیان کو ہم ایک رسمی سطح پر قبول کرتے ہیں چاہے وہ سطح توہم کی ہو، خوف کی ہو، دلچسپی یا عدم دلچسپی کی ہو۔ الیوژن یا فریب نظر سے خوابوں کی دلکشی البتہ قائم ہے جس سے شعرا کا بیان خواب متاثر ہوتا ہے۔ یہ دو شعر دیکھیں ؎

میری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نور جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا یا خیال تھا

(بہادر شاہ ظفر)

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

(مومن)

خواب اور نیند سے متعلق غزلیہ اشعار کلاسیکی، ترقی پسند، جمال پرست اور سبھی جدید شعرا کے یہاں ملتے ہیں جنھیں محض خیال آفرینی یا لطف بیان کی خاطر پڑھا یا نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

۱۔ شب وہ جو سو رہے مرے پاس آ کے خواب میں
جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں
۲۔ آنکھوں کو بند کر کے وہیں کھول دے گر آئے
یوسف کسی کے محو تماشا کے خواب میں
۳۔ کابوس ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے
کاش اور کوئی آئے اطباؔ کے خواب میں
۴۔ رہتا ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں
کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

(مومن)

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں
تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

(جاں نثار اختر)

یہ آج رات راہ بھول کے آئے کدھر سے آپ
یہ خواب میں نے رات کو دیکھا تھا خواب میں

(ناصر کاظمی)

میں اپنے خواب کے سب رنگ جس سے مانگتی ہوں
وہ آئینہ ہے مگر عکس میں اترتا ہے
اندھے، گونگے، بہرے خواب
آنکھ میں کیسے کیسے خواب
ایک کرن کمرے میں نہ آئے
اور کھلے صحنوں کے خواب

ہر انجانے چہرے پر
کیسے جانے بوجھے خواب
(حمیرا رحمان)

(ق) دل مرے تن کا پھول سا بچہ
پتھروں کے نگر میں پلتا رہا
نیند ہی نیند میں کھلونے لیے
خواب ہی خواب میں بہلتا رہا

(پروین شاکر)

مومن، جاں نثار اختر، ناصر کاظمی، حمیرا رحمان، اور پروین شاکر کے محولہ بالا اشعار میں خوابوں کی بعض الجھنیں یا کیفیتیں بیان ہوئی ہیں۔

مومن کے اشعار میں سے پہلا شعر تمنا کے خواب کا مذکور ہے کہ محبوب جو رات کو شاعر کے پہلو میں سو گیا تو اس کا نصیبہ جاگ اٹھا۔ یہاں فرائڈ کے مسلمہ نظریے کا اطلاق ہوتا ہے کہ بعض خوابوں کے پیچھے آدمی کی جنسی خواہش کی تکمیل کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔

مومن کے دوسرے شعر میں یہ خیال کارفرما ہے کہ محوِ خواب شخص کے دماغ کے سوئے ہوئے حصے میں کسی بھی قسم کی شبیہ نمودار ہو سکتی ہے لیکن جس کی آرزوئے دید آدمی کے لاشعور میں دبی ہوئی ہو وہ اسی کو دیکھنا پسند کرتا ہے۔ کسی دوسری شے کا نظارہ اسے گوارا نہیں خواہ وہ شے کتنی ہی حسین و جمیل کیوں نہ ہو۔ چنانچہ خواب کے عالم میں دماغ اپنے پسندیدہ منظر کو ڈھونڈ رہا ہے اس وقت خواب دیکھنے والے کی ذہنی آنکھ حضرت یوسفؑ کے رخِ جمال کو بھی خاطر میں نہیں لائے گی۔

تیسرے شعر کی جو تشریح ,,کلیات مومن،، کے مرتب ڈاکٹر ضیاء احمد نے کی ہے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

,,کابوس ایک مرض ہے جس میں کثرتِ رطوبتِ دماغ کی وجہ سے آدمی خواب میں حرکات کرتا ہے اور ڈر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب میرے خواب میں آتا ہے تو مجھ پر عجب کیفیت گزرتی ہے۔ اس کیفیت کو اطبا کابوس تجویز کرتے ہیں [یعنی میرے تاثرِ عشق کو مرضِ دماغ قرار دیتے ہیں] کاش یہ لوگ بھی کسی حسین پر عاشق ہوں اور کوئی ان کے خواب میں آئے تو ان کو میری حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ اپنے محبوب کے معاملے میں تو

رشک [مانع] ہے ہاں اور کوئی حسین ہو تو اچھا۔ اس کے سوا ان [اطبا] کا مزاج درست ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ عشق ان کی بلا جانے عاشق ہو تو پہچانے۔ الخ۔،،

چوتھے شعر کا مطلب صاف ہے کہ مجھے نہ دیکھنے سے میرا خیال تم پر اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ تمھاری نیند میں خلل پڑتا ہے کیوں کہ میں رہ رہ کر تمھارے خواب میں آنے لگتا ہوں۔

جاں نثار اختر کا شعر مومن کے اس آخری شعر سے کیفیت میں جدا ہے۔ شاعر قصداً سو بھی جائے تو محبوب کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا جو خواب میں اس کی پلکوں کے دریچوں سے جھانکتا رہتا ہے۔ اور اس کی توجہ اس میں مرکوز ہو جاتی ہے۔ اسے نوم توجہ کا خواب (Hyprogaeic Dream) قرار دیا جا سکتا ہے۔ ناصر کاظمی کے خواب کے بعد اس خواب کا اصلیت میں تبدیل ہونا ایک قسم کی ٹیلی پیتھی کی علامت ہے۔ اسے ،، پیش مدرکہ ،، خواب بھی کہا جا سکتا ہے۔

حمیرا رحمان کے شعر میں خواب الٹی [Reverse] چال چلتا نظر آتا ہے جو ثانی مصرع سے ظاہر ہے۔ ،، وہ آئینہ ہے مگر عکس میں اترتا ہے ،،۔ عکس کے آئینے میں اترتا تو چال سیدھی ہوتی۔ ذہنی کیفیت یہ ہے کہ جو کبھی آئینہ تھا وہ اب دھندلی شبیہ یا سایے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ لہذا خواب دیکھنے والی کے من پسند رنگ او جھل ہو گئے ہیں۔ ایک تضاد کی صورت ہے۔ حمیرا کے دیگر تین اشعار کا پس منظر توجہ چاہتا ہے۔ مطلع میں جن خوابوں کا ذکر ہے وہ اپنی شخصیت نہیں پا رہے ہیں۔ وہ بینائی، گویائی اور سماعت تینوں سے محروم ہیں۔ دوسرے شعر میں، کمرہ، شاعرہ کی زندگی کے رقبے کی علامت ہے۔ ایک منہ بند مکان ہے۔ جس میں ایک کرن کا در آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ گھٹن کا خواب ہے اور شاعرہ کے اپنے ہی ایک حصے کی عکاسی کر رہا ہے۔ تیسرے شعر میں جن چہروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ اجنبی ہیں لیکن اپنے سے لگتے ہیں۔ یعنی جو ہیولے یا شبیہات خواب میں نظر آ رہے ہیں وہ انجانے ہیں لیکن کچھ شناسا چہروں کی مماثلت رکھتے ہیں ماہرین خواب کی اصطلاح میں اسے کسی منظر کا ،، جگہ سے بے جگہ ہونا ،، کہتے ہیں۔

پروین شاکر کے قطعہ بند اشعار محل نظر ہیں۔ ایک نازک اور کومل دل کی لڑکی سنگدل معاشرے میں جینے کے لیے خوابوں کا سہارا ڈھونڈتی آئی ہے۔ اور خواب اسے آسودہ کرتے رہے ہیں۔ پروین شاکر کے دو اشعار اور دیکھیے -

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

رنگ خوشبو میں اگر حل ہو جائے
وصل کا خواب مکمل ہو جائے

دونوں شعروں سے ظاہر ہے کہ خواب دیکھنے والی اپنے خواب کے ذریعے اصل زندگی کی کوئی تلافی چاہتی ہے۔ دوسرے شعر میں ایک ایمائیت ہے کہ کیا ہونے سے وصل کا خواب مکمل ہو سکتا ہے۔ جبکہ پہلے شعر میں اس یقین کا اظہار ہے کہ کسی کا مخصوص لمس اسے ڈھیر ہونے پر مجبور کر دے گا۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ شاعرہ کے خواب میں اس کے محبوب کی تصویر متحرک رہی ہو۔ یہ اس بات کی رمز بھی ہو سکتی ہے کہ مرد کے بارے میں اس کا اپنا رجحان کیا ہے۔ وہ اگر مرد ہوتی تو عورت کی تسکین کے لیے اس کے ساتھ کیسا رویہ اختیار کرتی جو عورت کو پسند آتا۔ کسی نا آسودہ خواہش کی تلافی کا یہ ایک طریقہ ہے۔

یہ چند نمونے غزلوں سے لیے گئے تھے۔ نظم میں چونکہ ایک موضوع کی صراحت کی گنجایش ہوتی ہے اس لیے غزلیہ اشعار کی بہ نسبت نظموں میں "خواب مناظر" کا امکان زیادہ پایا جاتا ہے۔ مزید کچھ تحریر کرنے سے پہلے یہ جتادینا ضروری ہے کہ خواب یا خواب کے دہرائے جانے سے کسی نظم کا اعلانیہ رشتہ ہو یہ ضروری نہیں ہے۔ جب کوئی شعر ہونے لگتا ہے یا نظم وجود میں آنے لگتی ہے تو شاعر کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اس کے ذریعے اپنا کوئی خواب بیان کرنے جا رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک تخلیق ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ لاشعوری طور پر اس میں وہ اپنے کسی خواب کا تجربہ بیان کر جائے۔ چنانچہ شعری عمل میں یہ بھی ضروری نہیں کہ جس نظم یا نظم کے کسی خاص ٹکڑے کو زیر بحث لایا جائے اس کے عنوان یا متن میں "خواب" یا "نیند" جیسے الفاظ کنایہ کے طور پر موجود ہوں۔ شاعر یہ اعلان نہیں کرتا کہ اس نے کوئی خواب منظوم کیا ہے۔ الفاظ کا مجموعی برتاؤ اور تاثر اور نظم کی پیدا کردہ کیفیت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ متعلقہ تخلیق کے لمحوں میں شاعر کی ذہنی فضا کیا تھی۔ یا اس نے کون سی خوابناک فضا کو نظم میں داخل کرنا چاہا ہے۔

ہمارے ماضی اور مستقبل کے ساتھ خواب جڑے ہوتے ہیں۔ جب فن کار اپنے فنی وسیلے سے ان کا اظہار کرتا ہے تو اس کے سپاٹ بیان کی تہہ میں ایک اور لہر بھی پائی جا سکتی ہے جو اس کے بیان کو فکر یا مقصد عطا کرتی ہے۔ فلسفی و مفکر شعراء جن کی شاعری ایک مشن یا پیغام ہوتی ہے اونچی ذہنی سطح کے مالک ہوتے ہیں، اپنی دماغی ساخت کی بنا پر وہ عوام الناس کے نزدیک جتنے بڑے شاعر ہوتے ہیں اس سے زیادہ بڑے ہدایت کار ثابت

ہوتے ہیں لیکن اقبال جیسا بیدار مغز شاعر بھی کہیں کہیں خواب کے محرکات کے زیر اثر آجاتا ہے۔ یہ کمالات میں سے ہے کہ اقبال نے خواب کے بجائے اصلیت پر زور دیا اور جہاں کہیں ان کی شاعری میں کسی خواب کی طرف اشارہ ملتا ہے وہ بیداری کی سطح پر ہے اور لوگوں کو بیدار ہونے کا پیغام دیتا ہے۔ اقبال نے "والدہ مرحومہ کی یاد میں" لکھی تو دیکھیے خواب سے کون سی دولت بیدار حاصل کی۔ کہتے ہیں ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!

اقبال کی زیادہ تر شاعری بیداری کا پیغام ہے لیکن یہ بیداری کی منزل اقبال کا خواب ہی تو تھی۔ (اور ہنوز اہل مشرق کے لیے ایک خواب بنی ہوئی ہے۔) جس کی تڑپ میں انھوں نے فرمایا ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کی تمنا، حقیقت کو خواب کے بھیس میں دیکھنے ہی کی خواہش کا دوسرا نام ہے۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد اگر کوئی اقبال کی نظموں "ماں کا خواب"، "سیر فلک"، "تاتاری کا خواب"، "ایک آرزو"، "حقیقتِ حسن"، "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کا مطالعہ کرے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اقبال نے خواب کو ایک زبردست طاقت سمجھا ہے، اظہار بیان کے لیے۔ "ایک آرزو" اور "محبت" جیسی نظموں میں ان کی فطرت نگاری میں اجزائے خواب اچھی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ "والدہ مرحومہ کی یاد میں" نظم کے کئی اشعار واضح فلیش بیک ہیں اور خواب کا رنگ اختیار کر گئے ہیں۔ اقبال کی کئی نظموں مثلاً "جواب شکوہ"، "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں جو مکالماتی فضا پائی جاتی ہے اس میں بعض آوازوں کا خطیبانہ یا نرم لہجہ متوجہ کرتا ہے۔ کہیں کہیں "آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا" جیسے مصرعوں سے محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر خواب میں غیب کی آواز سننے کے لیے بے تاب ہے بلکہ ہمہ تن گوش ہے۔ یہ کیفیت تخیل سے زیادہ خواب سے بر آمد ہوتی ہے۔

اقبال کا یہ شعر اس ضمن میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ؎

ہے دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

اقبال کی شاعری میں خواب کے جو اجزاء نمایاں ہیں وہ دنیا کو آئینہ عقل دکھا کر

عظمت انسان کے ماضی کو دہرانا چاہتے ہیں۔ اقبال کے حوالے سے یہ مکرر ثابت ہوتا ہے کہ شاعر نہ تو صرف خواب لکھتا ہے اور نہ اس کے شہ پارے میں صرف خوابوں کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔ البتہ جہاں خواب سے کوئی تخلیق ہم رشتہ ہو وہاں سائنسی تشریح کے ذریعے تخلیق کار کے ذہن اور اس کی تخلیق کے کردار میں ایسی کسی بات کو دریافت کیا جاسکتا ہے جو اس کے ظاہر سے جدا ہو۔

یہاں چند نظم گو شعراء کا ذکر نامناسب ہوگا۔ ایک تو میراجی ہیں جن کی شاعری سے ایک منفی کردار برآمد ہوتا ہے۔ میراجی کی شاعری ان کے کیریکٹر سے میل کھاتی ہے۔ میرا سین نامی ایک بنگالن سے ناکام عشق ان کے شعری عمل اور طرز تصور کو متاثر کر گیا۔ میراجی جنسی خلل اور بدفعلیوں کے شکار تھے اور ان کا خواب تخلیق اکثر ایک چمکیلے غبار یا مکڑی کے جال میں پھنسا نظر آتا ہے اور اپنی ہی کشش رکھتا ہے۔ یہ کشش اس فیصلے پر پہنچاتی ہے کہ آپ کسی بڑے آدمی کے برے خواب کو بھی اسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے جس طرح ایک ڈاکٹر ایڈز کے مریض سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ سائنسی اپروچ یہی ہے۔ اس کے برعکس اختر شیرانی کا خواب تخلیق ایک نکتے پر مرکوز نظر آتا ہے۔ اور وہ ہے سلمٰی۔ یہاں تک کہ اس کے مزاج میں ایک بچے کی سی ضد شامل ہے جسے دل بہلانے کے لیے بس ایک ہی کھلونا چاہیے۔ ایک ہی روپ کو بار بار متصور کرنا شاعر کے خواب تخلیق کو خواب اعادہ Recurring Dream میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس کے یہاں بات سطحی خواب سے آگے نہیں جاتی۔

نظموں میں خواب کے اجزاء سے متعلق اس مضمون میں مزید تین شعراء کا ذکر کرنا ہے جن کے نام ہیں ساحر لدھیانوی، اختر الایمان اور گلزار۔ ان تینوں کا تعلق فلمی دنیا سے رہا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے شعبے میں کامیاب رہا ہے۔ لہٰذا ان کی نظموں میں عمل خواب کے بیان میں تصویریت کا در آنا فطری ہے۔

ساحر لدھیانوی نے کئی خوبصورت خواب پاروں کو اپنی بعض نظموں میں ٹانک دیا ہے۔ ان کی نظم "متاعِ غیر" کا اولین بند دیکھیے۔

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

ساحر کی نظم "پرچھائیاں" منظوم خواب کی بہترین مثال ہے۔ ایک رومانی فضا

دسری جنگ عظیم کے ہولناک سایوں اور اندیشوں میں بکھر کر رہ گئی۔ شاعر کو ایک تخیل
رست کی سی قدرت بیان حاصل ہے اور وہ خواب کے بدلتے ہوئے مناظر کی شناخت
ر سکتا ہے، انھیں بیان کر سکتا ہے۔ یہی نہیں وہ خواب کی واردات کو حسب منشاء رخ
ختیار کرنے کی ہدایت بھی دے سکتا ہے کہ کہاں اسے کون سا موڑ مڑنا ہے۔ اس کی یہ
سلاحیت اسے نقش گر حادثات ثابت کرتی ہے۔ نظم کے کچھ حصے اِدھر اُدھر سے نقل کیے
ارہے ہیں۔

جوان رات کے سینے پہ دودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خواب مرمریں کی طرح

رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رخ پر
ندی کے ساز پہ ملاح گیت گاتا ہے
تمھارا جسم ہر اک لہر کے جھکولے سے
مری کھلی ہوئی بانہوں میں جھول جاتا ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
میں پھول ٹانک رہا ہوں تمھارے جوڑے میں
تمھاری آنکھ مسرت سے جھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہوں
زبان خشک ہے آواز رکتی جاتی ہے
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

ں نظم کا مصرعہ تکرار "تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں" عام لوگوں کی آسانی کی خاطر
حر نے کئی جگہ "خیال و خواب کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں" سے تبدیل کر دیا تھا۔)

ساحر کے یہاں،، خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر،، قبیل کے کئی مصرعے
ئے جاتے ہیں۔

اختر الایمان اور گلزار کی نظموں میں خواب کے عناصر فلیش بیک کی صورت میں
ل شناخت معلوم ہوتے ہیں۔ اختر الایمان کے یہاں باز آفرینی کا عمل واضح ہے۔ ان کی
یں کہیں کہیں ان کے ماضی کو اگل دیتی ہیں اور اس ماضی سے ان کے کسی خواب کا کوئی
ابر آمد ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم،، ایک لڑکا،، کا وہ مشہور زمانہ مصرع،، یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر

الایمان تم ہی ہو،، شکست خواب کیفیت اور ضمیر کے چبھتے ہوئے سوال کو نرم اور طنزیہ انداز میں اٹھاتا ہے۔ اخترالایمان حافظے کو راست دہرانے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا خواب ان کے اپنے جبر کا شکار معلوم ہوتا ہے جس سے ان کے بیان میں خستگی اور ضبط کے عناصر شامل ہو گئے ہیں، اپنے مجموعہ ,,یادیں،، کے پیش لفظ میں اپنی تخلیق سے ذہنی خلل کا رشتہ اخترالایمان نے کس طرح ظاہر کیا ہے، ملاحظہ کیجیے مجھے اپنے ,, بچپن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے اور یہ واقعہ ہی اس نظم کا محرک ہے۔ ہم ایک گانو سے منتقل ہو کر دوسرے گانو جارہے تھے۔ اس وقت میری عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ہمارا سامان ایک بیل گاڑی میں لادا جارہا تھا اور میں اس گاڑی کے پاس کھڑا اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی۔ اس لیے کہ میں اس گانو کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں ؟ یہ بات میں اس وقت نہیں سمجھتا تھا اب سمجھتا ہوں۔ وہاں بڑے بڑے باغ تھے، باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔ کوئلیں کوکتی تھیں پپیہے بولتے تھے، وہاں جوہڑ تھے، جوہڑ میں نیلوفر اور کنول کھلتے تھے۔ وہاں کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی نظر آتی تھیں۔ وہاں وہ سب تھا جو ذہنی طور پر مجھے پسند ہے۔ مگر وہ معصوم لڑکا اس گاڑی کو روک نہیں سکا میں اس گاڑی میں بیٹھ کر آگے چلا گیا مگر وہ لڑکا وہیں کھڑا رہ گیا۔

وقت کے ساتھ اس لڑکے کی تصویر میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ میں دنیا کی کشاکش میں کھو گیا اور شاعر ہو گیا۔ پھر ایک بار میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں ایک نظم کہوں جس میں اپنے نام کا استعمال کروں بظاہر یہ لڑکا اور اپنے نام والا احساس دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں مگر دراصل ایک ہیں۔ وہ لڑکا جس کی تصویر کبھی میرے ذہن میں تھی اس کا نام اخترالایمان ہے۔ احساس کی اس دوسری منزل کے بعد مجھے اس لڑکے کا جگہ جگہ سفر یاد آیا یہ لڑکا خانہ بدوش تھا۔ کوئی اس کا مستقل گھر نہیں تھا۔ اس کے پاس مناسب اسباب معیشت نہیں تھے۔ اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا۔ مجھے اس لڑکے سے ہمدردی ہو گئی۔ یہ ہمدردی دراصل مجھے اپنے سے تھی۔ مگر چونکہ میں نے اپنے کو اس لڑکے سے الگ کر لیا تھا اس لیے میری شخصیت دب گئی، اس لڑکے کی شخصیت ابھر آئی۔ تخلیقی عمل کی چوتھی منزل یہ تھی میں نے غیر شعوری طور پر اس لڑکے کو اپنا ہیرو بنالیا۔ مجھے اس لڑکے کے دکھوں اور پریشانیوں سے محبت ہو گئی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا وہ میرا موضوع ہے۔ میں نے اس لڑکے کی شخصیت کو روشن کرنا چاہا اور ,,ایک لڑکا،، ضمیر انسانیت کا علامیہ بن گیا۔ یہ سب خیالات اور احساسات ایک ہی ساتھ ذہن میں نہیں آئے، ایک ایک کر کے آئے۔ اور پھر میں انھیں بھول گیا۔ ایک سال گزر گیا۔ دو سال۔ تین سال۔ چار سال۔ قوس قزح کے سب رنگ

غائب ہو گئے۔ پھر ایک دن۔ رات کے ایک بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ ذہن میں ایک مصرع گونج رہا تھا۔

"یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟"

مجھے معلوم تھا یہ لڑکا کون ہے؟ مگر یہ مجھ سے اس قسم کی باز پرس کیوں کر رہا ہے؟ مجھ سے میرے اعمال کا حساب کیوں مانگ رہا ہے؟ اب ذہن کا شعوری فعل شروع ہوا۔ اخترالایمان کی شخصیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک یہ لڑکا جو معصوم تھا اور دوسرا وہ جس نے دنیا کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ میں نے نظم کا پہلا بند لکھا اور سو گیا۔

خواب میں کس طرح ماضی داخل ہوا اور کس طرح خواب سے نظم بر آمد ہوئی یہ خواب اپنی فکر کا پروردہ اور اپنے لیے دیکھا گیا خواب ہے۔ (باقی آئندہ)

رفعت صدیقی
دلشاد نگر کالونی، نئی باؤلی
حیدر آباد-۵۰۸۰۲۸

یہ کیسی مسیحائی؟

ناشتے کے بعد، جب میں نے اخبار کی مقامی خبروں پر سرسری نظر ڈالی تو میں اچانک چونک گیا۔ جلدی جلدی میں نے وہ پوری خبر شروع سے آخر تک غور سے پڑھ ڈالی۔ مشہور گاسٹرو انٹرالوجسٹ (Gastro Entrologist) ڈاکٹر طہورا کے دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ اسپیشلیٹی ہاسپٹل، رائل ہاسپٹل میں داخل تھے۔

ایک عجیب سے سنسنی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے برقی کی ایک تیز رو دوڑتے خون کے ساتھ میرے رگ وپے میں سے گزر گئی ساتھ ہی ساتھ ایک انجانی خوشی میرے سارے وجود کو سرشار کر گئی۔ شاید ایسی ہی خوشی، صدیوں پہلے حضرت موسیٰؑ نے، فرعون کے غرق نیل ہونے کے بعد محسوس کی ہوگی!

آج سے ایک برس پہلے کی وہ رات میری آنکھوں میں بجلی کی طرح کوند گئی جب دھواں دھار بارش میں، میں اور میری بیوی اپنے نو عمر لڑکے کو لیے ہوئے، ڈاکٹر طہورا کے کلینک گئے تھے۔ وہ بڑی قیامت کی رات تھی! پانی تھا کہ چھاجوں، برس رہا تھا۔ میرے بیٹے کو جگر کا عارضہ تھا اور چلنا تو درکنار، اس کے لیے بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ کھانسی، مسلسل اس کے کمزور وجود کو تہ وبالا کیے دے رہی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے، کسی طرح تابڑتوڑ بارش کے چھینٹوں سے اسے بچاتے ہوئے جب ہم کلینک کے بڑے سے ہال میں پہنچے تو وہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بیٹھنے تک کی جگہ نہیں تھی۔ کسی طرح سے مریض کو ایک جگہ ہم نے بٹھا دیا۔ میں ریسپشنسٹ (Receptionist) کی طرف لپکا۔

"معاف کیجیے، بیمار کی حالت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر کا اسے فوراً دیکھنا بہت ضروری ہے۔ پلیز! ہم کو اندر جانے دیں۔"

"آپ کا پہلے سے اپائنٹمنٹ ہے؟"

"نہیں! ہمیں موقع ہی مل نہیں سکا۔ اچانک بچے کی حالت بگڑ گئی!"

"Sorry! پھر تو آپ کو مریض کا نام لکھوانا پڑے گا۔ باری آنے پر ہی مریض کو آپ

اندر لے جاسکیں گے۔" اس لڑکی نے کورے لہجے میں جواب دیا۔
"میڈم ! آپ سمجھتی نہیں ہیں ! بچے کی حالت خراب ہے۔"
"Sorry !" اس نے پھر کہا۔ "میں کچھ نہیں کر سکتی۔ کلینک کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں !"

میں اسے گھورتا ہی رہ گیا۔ مجبوراً بچے کی طرف لوٹ آیا۔ وہ اب بھی مسلسل کھانس رہا تھا۔ اس کا کمزور جسم، طوفان کی زد میں آئے ہوئے کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ہم دونوں اپنے آپ کو بہلانے کے لیے اس کا سر سہلاتے رہے۔ باہر تابڑتوڑ بارش ہو رہی تھی۔ مریض اور ان کے رشتے دار کیبن میں جاتے اور واپس، ایک کے بعد ایک آتے رہے لیکن ایسا معلم ہوتا تھا کہ بھیڑ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہی ہے۔

اس دن سے دو مہینے پہلے بھی ہم بچے کو ڈاکٹر طہورا کلینک میں دکھلانے کے لیے آئے تھے۔ تب اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ جلد ہی اندر داخلہ مل گیا تھا۔ ڈاکٹر طہورا نے معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ آپ بچے کو گورنمنٹ ہاسپٹل میں داخل کردیجیے۔ میں وہاں گاسٹروا یشٹرولوجی ڈپارٹمنٹ کا ہیڈ ہوں۔ میری نگرانی میں علاج ہوگا۔ بچہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

ہمیں بڑی ڈھارس بندھی تھی۔ دوسرے ہی دن ہم نے بچے کو گورنمنٹ ہاسپٹل میں داخل کرویا۔ لیکن اسی دن ہمیں پتہ چلا کہ ڈاکٹر طہورہ، اسی صبح، کسی انٹرنیشنل سمینار میں شرکت کرنے کے لیے فلپائین جاچکے ہیں۔ وہاں سے جاپان اور ہونولولو کا دورہ کر کے شاید ایک مہینے کے بعد ہندستان واپس لوٹیں گے۔ ہماری مایوسی کی انتہا نہ رہی لیکن کیا کرتے ! مجبوراً بچے کو ہاسپٹل میں ہی رکھا۔ تب اس کی حالت اتنی خراب نہیں تھی۔ چل پھر سکتا تھا لیکن روز بروز کمزور ہوتا جارہا تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد ہم نے محسوس کرلیا تھا کہ ہاسپٹل کے دوسرے ڈاکٹر، محض ضابطوں کی تکمیل کر رہے ہیں۔ کئی قسم کے (Test) وہ لیتے رہے اور اسی طرح ایک مہینہ گزار دیا۔ نہ تو صحیح تشخیص ہوئی نہ کوئی معقول علاج۔ کچھ دن اور ہم نے ڈاکٹر طہورا کی واپسی کے انتظار میں گزار دیے لیکن، ان کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ کوئی بھی ان کی واپسی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ مجبوراً ہمیں مریض کو ڈسچارج کرواکر گھر لے آنا پڑا۔ پھر کسی کے کہنے پر ہومیو پیتھی علاج شروع کیا۔ وقتی طور پر کچھ حالت سنبھلی مگر کمزوری بڑھتی گئی۔ مسلسل بخار رہنے لگا۔ غذا کم ہوتی گئی اور اب پچھلے دو دنوں سے تو اس کی صحت میں ایک دم بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔ آخر کار، ہال میں دو تین ہی لوگ باقی رہ

گئے۔ ہم نے بچے کو ایک بنچ پر لٹا دیا تھا۔ وہ بڑی تکلیف سے سانس لے رہا تھا۔ تبھی کاؤنٹر کلرک نے مجھے بلایا۔ مریض کا نام پوچھا۔ پھر فیس کی چٹھی پھاڑتے ہوئے بولی سو روپے دے دیجیے۔ "ابھی آپ کی باری آئے گی۔"

دس منٹ کے بعد ہم بچے کو سہارا دیے ہوئے کیبن میں لے گئے۔ ڈاکٹر طہورا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا ہمیں غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بچے کو قریبی بیڈ پر لٹا دینے کے لیے کہا۔ پھر اٹھا اور خاموشی سے بچے کا معائنہ کرنے لگا۔ معائنہ ختم کرکے بولا۔ "آپ لوگ اب تک کیا کر رہے تھے؟ سو رہے تھے؟ IT IS A HOPELESS CASE جائیے! اس کو رایل ہاسپٹل لے جائیے۔ وہاں میں آتا رہوں گا۔ حالت بہت ہی SERIOUS ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب......" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے بھی آپ نے اسے ہاسپٹل میں داخل کرنے کے لیے کہا تھا لیکن آپ ایک بار بھی اسے ATTEND نہ کرسکے اور اب پھر۔۔۔"

"میں پہلے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔" اس نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ "آپ اس کو فوراً رایل ہاسپٹل لے جائیے۔"

"ڈاکٹر صاحب! کم از کم اس بار آپ سے امید ہے کہ آپ کی نگرانی میں بچے کا معقول علاج ہوگا۔ پچھلی بار تو آپ کے کہنے پر ہی ہم نے بچے کو ہاسپٹل میں داخل کروایا تھا لیکن اس تمام عرصے میں آپ ملک کے باہر رہے اسی لیے بچے کا اب تک کوئی معقول علاج نہ ہوسکا۔ اسی لیے......"

"کیا مطلب؟" وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔ "معقول علاج؟ ہم لوگ ہمیشہ ہی معقول علاج کرتے ہیں۔ یہ آپ جیسے لاپروا لوگ ہیں جو اپنی جہالت سے مرض کو بگاڑ دیتے ہیں۔ جائیے! اسے رایل ہاسپٹل لے جائیے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! ابھی تو بچے کی حالت بہت خراب ہے۔ بہتری کے لیے کچھ تو کیجیے! کوئی انجکشن یا دوا تاکہ اسے کچھ آرام ہوجائے۔"

"نہیں! نہیں!" وہ چڑ کر بولا۔ "کچھ نہیں کرسکتا میں۔ کل اسے ہاسپٹل لے آؤ۔"

بوجھل قدموں سے ہم مجبوراً بچے کو لیے آٹو میں گھر واپس ہوئے، رات بڑے ہی عذاب میں کٹی۔ صبح بچے کو لیے رایل ہاسپٹل گئے۔ داخلے کے لیے کاؤنٹر پر جب میں پہنچا تو فارم بھرنے سے پہلے میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے ڈاکٹر طہورا کی ویزٹ کے بارے میں پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر طہورا پندرہ دن تک ہاسپٹل نہیں آئیں گے کیونکہ

وہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے سوئزر لینڈ جارہے ہیں۔

اس واقعے کے تیسرے دن میرے ہونہار اور نوعمر بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ زمین اور آسمان ہم پر تنگ ہو گئے۔ ہوش و حواس جواب دے گئے۔ وقت جیسے رُک سا گیا۔ یقین ہی نہ آتا تھا کہ ہمارے وجود کا ایک حصہ کیسے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ وہ جسے پیدائش سے اس کی جوانی کی دہلیز تک پہنچانے میں ہمارے شب و روز وقف تھے' کیسے ہمارے شب و روز سے غائب ہو گیا۔ کیسے؟

ایک عرصے کے بعد ہوش آیا تو میرے جی میں آیا کہ جا کر شہر کے تمام ہسپتالوں کو آگ لگادوں اور وہ انسان نما حیوان جو بیمار انسانیت کے علاج اور راحت کا دعوا کرتے ہیں انھیں صفحۂ ہستی سے مٹادوں۔ لیکن مجھ جیسا ساری عمر قانون اور اخلاق کے دائروں میں مقید رہنے والا کمزور انسان کیا کر سکتا تھا! میں کسی ہندستانی فلم کا ہیرو تو نہ تھا جو انتقام کی آگ میں جھلس کر' ہاتھ میں پستول لیے' اپنے تمام برا چاہنے والوں کا دیکھتے ہی دیکھتے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے خاتمہ کر دیتا ہے۔ ایک حساس' لیکن قانون و اخلاق کا پاس و لحاظ رکھنے والا شخص صرف کڑھتا رہ جاتا ہے' میں بھی کچھ نہ کر سکا! بس سوچتا اور کڑھتا رہ گیا کہ یہ سفید پوش مخلوق جسے عام آدمی مسیحا سمجھتے ہیں انسان سے کتنی دور ہے! ان کا مقصد حیات صرف روپیہ کمانا ہے اور یہ روپیہ وہ اپنے مریضوں کو نت نئے ڈیاگناسٹک سنٹرس (DIAGNOSTIC CENTERS) میں جہاں سے انھیں معقول کمیشن ملتا ہے' طرح طرح کے TESTS کروا کر اور قیمتی دوائیں دے کر پیدا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو میڈیکل سائنس کی حیرت انگیز ترقی سے مریضوں کو صحت یابی بخشنے کے بجائے انھیں زیر بار کرتے رہتے اور انھیں آہستہ آہستہ موت کے دہانے کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ یہ آج کل کے ان مسیحاؤں کا اصلی روپ ہے! آج ہر وہ شخص جو میڈیکل پیشے میں داخل ہونے سے پہلے' اس کی تقدیس برقرار رکھنے کی ہپوکراٹس (HIPPO CRATES) قسم کھاتا ہے اور انسانیت کی تمام عمر خدمت کرنے کا عہد کرتا ہے۔ عملی دنیا میں قدم رکھتے ہی سب کچھ بھول جاتا ہے اور ایک ایسی مشین میں تبدیل ہو جاتا ہے جو سکّے ڈھالنے کا کام کرتی ہے۔

مجھے پتہ ہے کہ تمام ڈاکٹر' ڈاکٹر ملہوترا جیسے نہیں ہیں۔ ان میں یقیناً مریضوں کا خیال رکھنے والے اور امراض کو پہچان کر علاج کرنے اور صحت واپس لے آنے والے لوگ بھی ہیں لیکن میرے ہوش ربا تجربے نے مجھے ڈاکٹر ملہوترا کو ایک ایسی شخصیت کے روپ میں لا کر کھڑا کیا جسے مریضوں کے علاج سے زیادہ روپیہ کمانے اور نام و شہرت کے پیچھے بھاگنے کا جنون

رہا ہے۔ نہ جانے اپنے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لیے اس نے کتنے مریضوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کیا ہوگا۔ اپنی ہرلاپرواہی اور غلطی کو میڈیکل وجوہات کا لبادہ پہنادیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دلائل سے مریضوں کے رشتے دار وقتی طور پر مطمئن ہوگئے ہوں گے لیکن اس کا ضمیر (اگر اب بھی وہ ہے) یقیناً ہر وقت اس پر لعنت بھیجتا رہا ہوگا! یقیناً... کیوں کہ ڈاکٹر ملہوترا بھی ایک انسان ہے۔ اس کے ہزاروں مریضوں کی طرح ایک فانی جسم کا مالک۔ اس کے جسم میں بھی وہی خون دوڑتا ہے جو دوسروں کی رگوں میں موجزن ہے اور وہ بھی اسی طرح کسی بھی مرض کا شکار ہو سکتا ہے جس طرح دوسرے بے شمار آدمی۔

اچانک میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں ڈاکٹر ملہوترا کو دیکھنے جاؤں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کس طرح وہ ایک خطرناک مرض کے آہنی پنجوں میں جکڑا ہوا، کسی باز کی شکار چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہا ہوگا۔ کیسے اس کے اعصاب، اس کے دماغ کا حکم ماننے سے انکار کر چکے ہوں گے۔ کیسے اس کی حسرت ناک آنکھوں میں، موت کا بھیانک سایہ ناچ رہا ہوگا! یہ سب کچھ میں دیکھنا چاہتا تھا اور میں ضرور دیکھوں گا۔

جب میں رایل ہاسپٹل پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ملہوترا انٹنسیو کیریونٹ (INTENSIVE CARE UNIT) میں ہے۔ تو کمبخت واقعی SERIOUS ہے! میرے روم روم میں ایک چہل سی پیدا ہوگئی۔

بہت سے لوگ کمرے کے باہر کھڑے تھے اور باری باری انھیں اندر جانے کے لیے کہا جارہا تھا، تو گویا کیو یہاں بھی اس کے کلینک کی طرح موجود تھا! میں بھی اپنی باری کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں مجھے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

میں کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا۔ ڈاکٹر ملہوترا چت لیٹا ہوا، کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ ڈیکس ٹروز (DEXTROSE) کی باٹل چڑھائی جارہی تھی۔ عینک کے بغیر اس کا چہرہ پہچاننا مشکل تھا۔ میں بستر کے پائنتی جاکر کھڑا ہوگیا۔ چھت کو گھورتے گھورتے ایک لمحے کے لیے اس کی نظر اچٹ کر مجھ پر پڑی اور الجھ کر رہ گئی۔ آنکھیں پہلے تو شیشے کی طرح شفاف رہیں پھر ان میں پہچان لینے کی ایک رمق پیدا ہوئی اور پھر یہ دونوں آنکھوں میں پھیل گئی۔ میں اس لمحے ٹھٹھا مار کر زور زور سے ہنسنا چاہتا تھا۔ قہقہے لگانا چاہتا تھا۔ یہاں بات کرنے کی ممانعت تھی لیکن میں چلا کر کہنا چاہتا تھا۔ "ڈاکٹر ملہوترا! یہی وہ منزل ہے جس سے ہر فانی انسان کو گزرنا ہے۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے جسے ہر انسان جھٹلانے کی تمام عمر کوشش کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی! کل تک ہزاروں مریضوں کی

تقدیریں تمہارے دماغ سے جڑی ہوئی تھیں لیکن آج یہ تمہارا غیر معمولی دماغ گوشت کے بے جان لوتھڑے سے زیادہ نہیں! اسی پر تو ناز تھا نا تمہیں؟

ڈاکٹر ملہوترا کی آنکھیں یک بیک سکڑ گئیں اور ان میں بے بسی کی ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ پھر بے کسی کے ازحد احساس سے اس کی آنکھیں شرابور ہو گئیں۔ میں نے قہقہے لگانے کے جذبے کو کچل دیا... پھر اچانک میرے دل و دماغ میں یک بیک پل نہ سکون و راحت کا احساس در آیا۔ ایسا لگا جیسے میرے وجود کو جو پہلے تپتی ہوئی ریت پر گرا ہوا تڑپ رہا تھا کسی غیر مرئی طاقت نے اٹھا کر کسی ٹھنڈے پانی کی جھیل میں ڈبو دیا ہو! اس ازحد سکون کے بطن سے ایک آواز ابھری جو شاید میری ہی آواز تھی لیکن کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی "... تمام حقیقتوں کا مبداء ہماری نظروں سے کہیں دور... اوپر ہماری قسمتوں کا امین ہے! وہی سب کا انصاف کرنے والا ہے۔ مکمل انصاف... اس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا! کوئی بھی نہیں!"

---میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

ڈاکٹر محمد نعمان
صدر شعبہ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال

بھوپال میں اردو ترجمے کی روایت

ترجمہ محض لسانیاتی عمل ہی نہیں نثرپاتی عمل بھی ہے۔ ہر زبان ایک مخصوص لسانی اور تہذیبی پس منظر اور علاحدہ صرفی و نحوی خصوصیت کی حامل ہوتی ہے لہٰذا ایک زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور ادبی شان برقرار رہے، آسان کام نہیں ہے اس سلسلہ میں مترجم کا محض تخلیقی ذہن کا حامل ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے دونوں زبانوں پر کامل عبور بھی لازمی ہے۔

اردو زبان کی عمر کیوں کہ زیادہ نہیں ہے لہٰذا اس کے ادبی ذخیرے میں اضافہ نیز ترجمہ کی افادیت و اہمیت کے پیش نظر ہر عہد میں مختلف زبانوں کے ادبی سرمایہ کو اردو کے قالب میں منتقل کیا جاتا رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

بھوپال میں دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری پر بھی توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا اہم نام نواب سکندر جہاں بیگم کا ہے جنھوں نے ۱۸۵۹ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کر کے ریاست کے قوانین کو اردو میں منتقل کرایا۔ ان کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے خواتین اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے متعلق انگریزی ادب کے فن پاروں کا خود بھی ترجمہ کیا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ سلطان جہاں بیگم نے اصلاحی اور اخلاقی موضوعات سے متعلق اکتالیس کتابوں کے تراجم کتابی صورت میں شایع کیے۔ والدہ نواب شاہجہاں بیگم کی سوانح "حیات شاہجہانی" اور اپنی خود نوشت کو AN ACCOUNT OF MY LIEE کے نام سے انگریزی میں شایع کیا۔ سلطان جہاں بیگم کی فرمائش پر ہی منشی حسین خاں نے "بے تال پچیسی" کا اردو اور انگریزی میں ترجمہ کیا۔

دوران قیام بھوپال، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ٹیگور کی کئی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا اور انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات بھی وضع کیے۔

بھوپال میں ترجمہ نگاری کو فروغ دینے میں یہاں کے دفتر تاریخ کی خدمات نہایت اہم ہیں، جس کے تحت مولوی عبدالرزاق البرامکہ، نیاز فتح پوری، مولوی محمد مہدی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، محمد امین زبیری، علامہ محوی صدیقی اور سید محمد یوسف قیصر وغیرہ نے مختلف زبانوں کے فن پاروں کو اردو نثر و نظم کا جامہ پہنایا۔

بھوپال میں ترجمہ کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر کے جن حضرات نے شہرت حاصل کی، ان میں مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ مفتی محمد انوار الحق، ارجمند محمد خاں سلیم، قدوس صہبائی، سید عابد علی وجدی الحسنی، کیف بھوپالی، کبیر کوثر، ارشد صدیقی، ابراہیم یوسف، آفاق احمد، سید حامد حسین، مظفر حنفی، فضل تابش، اقبال مسعود، رشید انجم اور یعقوب یاور کے نام قابل ذکر ہیں۔

محمد یوسف قیصر کا اہم کارنامہ انگریزی کے معروف شعراء کے کلام کا منظوم ترجمہ ہے جو خیابانِ ادب، اوراق گل" اور "بیاض گل" کے نام سے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

"خیابان ادب" میں بچوں کے لیے انگریزی کہانیوں اور نظموں کا ترجمہ شامل ہے۔"اوراق گل" میں انگریزی کی ۳۲ نظموں کو اردو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں کے متعلق یوسف قیصر نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"مجھے اس کا اعتراف ضرور ہے کہ انگریزی کی ان پاکیزہ اور دلچسپ نظموں کو اردو نظموں کا لباس پہنانے میں باوجود سعئ بلیغ کے بھی میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ تاہم میری کوشش رائگاں نہیں گئی کہ عبارت میں سلاست اور مضامین میں فصاحت قائم رہے تاکہ ان کو پڑھنے میں کوئی الجھن نہ ہو اور وہ آسانی کے ساتھ شاعر کے اصلی خیالات اور جذبات کی تہہ تک پہنچ سکیں۔"

قیصر صاحب نے ان نظموں میں انگریزی ناموں کے بجائے ہندستانی نام لکھے ہیں اور ان نظموں کے ترجموں میں گنگا جمنی خیالات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

"بیاض گل" میں انگریزی کی ۲۸ نظموں کو اردو نظم کا پیکر عطا کیا گیا ہے "اوراق گل" کی طرح "بیاض گل" کی نظمیں بھی سلیس اور فصیح ہیں۔

نسخۂ حمیدیہ کے مرتب، مفتی محمد انوار الحق کے ذریعہ ترجمہ شدہ کتابوں میں، آرم اسٹرانگ کی GOD AND SOUL کا ترجمہ "اثبات واجب الوجود" رالف والڈو ٹرائن کی تصنیف CHARACTER BUILDING کا ترجمہ "تہذیب الخصال" پروفیسر رڈپاتھ کی کتاب THE UNIVERSAL HISTORY OF THE W کے حصہ اول کا ترجمہ "تاریخ البشر" اور ٹیگور کا ڈراما

THE KING OF THE DARK CHAMBER کا ترجمہ "چیستان عالم" کے نام شامل ہیں۔
بیگم بھوپال، میمونہ سلطان نے شبلی نعمانی کے فارسی رسالہ "بدر الاسلام" کا ترجمہ اردو
ں کیا۔ عبدالمتین متین نے ترکی زبان کی تین کتابوں کا ترجمہ "تاریخ یمن" "علم الادب"
رز مختلف فلاسفر" کے نام سے کیا۔ مولوی محمد مہدی نائب مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کی ترجمہ
دہ کئی کہانیاں رسالہ ظل السلطان میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے اسپرنٹو اسکرپٹ کے مترادفات
بھی اردو میں منتقل کیا۔ رشید احمد ارشد تھانوی نے انگریزی کے ایک ناول کا ترجمہ
طواف زمین" کے نام سے اردو میں کیا۔ محمود اعظم فہمی کے دو ترجمے "سیاحت زمین"
ر"سیاحت ہوا" شائع ہوئے۔ گوبند پرشاد آفتاب نے بوعلی سینا کی کتاب "شفا" کا
جمہ "آفتاب فلسفہ" کے نام سے کیا۔ محمد اسمٰعیل ہاتف نے فرنچ ناول نگار پیری لوئی
ے ناول "ویتران شانتے" کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ۱۹۲۲ء میں منشی لکشمی نرائن افسر نے
خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ کرکے معاصرین میں امتیاز حاصل کیا۔ ان کے متعلق مولوی
رالرزاق البرامکہ کا خیال ہے کہ:

"... بھوپال کے ایک رئیس منشی لچھمی نرائن افسر نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ
ا ہے جو اب تک کے جتنے ترجمے میری نظر سے گزرے ہیں، سب سے بہتر ہے۔"

بھوپال کے ماسٹر جادو رائے شریواستو ناظم نے ہندستانی قومی ترانہ کا منظوم ترجمہ اس
ح کیا ہے۔"

مالک قلب وانس وجاں — عزّ و جلّ شانہ
خالق نظم دو جہاں — عزّ و جلّ شانہ
ہے تو ہی کارساز ہند — خم ہے سر نیاز ہند
ملک بہار و ملک سندھ — کوہ ہمالہ، کوہ وندھ
ملک دکن کلنگ و بنگ — رود چین و یاس و گنگ
جلوہ گہ جلال تو — آئینۂ جمال تو
سب کی زباں پہ تیرا نام — لب پہ دعا یہ صبح و شام
قاسم لطف بے کراں — عزّ و جلّ شانہ
مالک قلب وانس وجاں — عزّ و جلّ شانہ
مادر ہند زندہ باد — مادر ہند زندہ باد!

قدوس صہبائی نے میر سید عالم جان سابق شاہ بخارا کی فارسی خود نوشت کا ترجمہ "بخارا کا جمہوری انقلاب" کے نام سے کیا اور کئی روسی کہانیوں کو اردو قالب میں منتقل کیا۔ محمود علی خاں جامعی نے پنڈت نہرو کی تصنیف "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" کا اردو ترجمہ "جگ بیتی" کے نام سے کیا جو مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ ہاورڈ فاسٹ کا ناول CAN SAVE THE LIBERTY کو احسن علی خاں نے "آزادی کے بعد" کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔

بھوپال کے تین شاعروں کیف بھوپالی، کبیر کوثر اور سید عابد علی وجدی الحسینی (مرحوم) نے قرآن کریم اور احادیث نبویؐ کے بعض حصّوں کو منظوم شکل عطا کی ہے۔ کیفؔ بھوپالی نے تقریباً ۳۵ سال قبل مفہوم القرآن کو منظوم کرنے کا کام شروع کر کے ۱۱ پارے مکمل کر لیے تھے۔ ۲۵ برس قبل بنارس سے چند پاروں کی اشاعت عمل میں آئی اس کے بعد ولا اکادمی (حسن الدین احمد حیدر آباد) کے زیر اہتمام دس منظوم پارے کتابی صورت میں شائع ہوئے اور مئی ۱۹۹۳ء میں، یونیسکیپز (متحدہ عرب امارات) کے ذریعے ۱۶ منظوم پارے مفہوم القرآن کے نام سے خوبصورت طباعت کے ساتھ منظر عام پر آچکے ہیں۔ جناب کبیر کوثر نے ۳۰ ویں پارے کا منظوم ترجمہ بعنوان نظام حیات جون ۱۹۷۷ء میں شائع کیا اور اسی نام سے سورۂ رحمٰن کا منظوم ترجمہ مکتبہ رحمانیہ دہلی ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا جس میں متنِ قرآن کو اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی منظوم کیا گیا ہے۔

قاضی سید عابد علی وجدی الحسینی مرحوم نے چالیس احادیث نبویؐ کو اردو نظم کا پیکر عطا کر کے بعنوان "چہل حدیث منظوم" ۱۹۸۰ء میں شائع کیا۔ ان احادیث کو عربی میں نقل کر کے سلیس اردو نثر و نظم میں پیش کیا گیا ہے۔

اردو میں انگریزی نظموں کے منظوم تراجم کی تعداد بہت کم ہے۔ بھوپال میں اس سلسلہ میں محمد یوسف قیصر کے بعد دوسرا نام ارشد صدیقی کا ہے۔ انھوں نے انگریزی کی پندرہ نظموں کو منظوم کر کے "عکس خیال" کے نام سے شائع کیا۔ ان نظموں سے متعلق نیاز فتح پوری کی یہ رائے درست ہے کہ:

"غیر زبان کی نظموں کا ترجمہ کرنا اور وہ بھی نظم میں آسان کام نہیں، لیکن جناب صدیقی نے اس مشکل منزل کو جس آسانی سے طے کیا ہے اس کو دیکھ کر ان کی سخنورانہ اہلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔"

بھوپال میں کیے گئے دیگر تراجم میں ابراہیم یوسف کے ذریعہ کیا گیا رومانیہ کے ڈرامانویس

کریچل کا ڈراما THE LOST LETTER کا اردو ترجمہ "گمشدہ خط" پروفیسر آفاق احمد کے ذریعہ کیا گیا راج گوپال آچاریہ کی کہانیوں کا ترجمہ "ایک کرن اجالے کی"، ڈاکٹر سید حامد حسین کے ذریعہ علامہ اقبال کی "اسرار خودی" کے اردو ترجمہ کے علاوہ ڈاکٹر مظفر حنفی کے ذریعہ کیے گئے مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والی ۱۲ کتابوں کے تراجم شامل ہیں۔

فضل تابش نے جن آٹھ افریقی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے، اُن میں نیگرو شاعر لانگسٹن ہیوز کی دو نظمیں، ڈیوڈ ڈیوپ کی چار نظمیں اور کاؤنٹ کلین کی دو نظمیں شامل ہیں۔ احمد علی جاوید کے ذریعہ کیا گیا کشمیری لوک کتھاؤں کا اردو ترجمہ ماہنامہ کردار (بھوپال) جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

اگرچہ جاسوسی ادب کا شمار اعلا ادب میں نہیں کیا جاتا ہے لیکن اس کی تحیر خیزی اور دلچسپی کے باعث جاسوسی یا جہاتی ناول پڑھنے والوں کی تعداد ہر عہد میں زیادہ رہی ہے۔ چنانچہ ان کی مقبولیت کے پیش نظر بھوپال کے نوجوان مترجمین میں رشید انجم اور یعقوب یاور نے کئی ترجمے کیے۔

مذکورہ دونوں مترجمین، اس میدان میں نووارد ضرور ہیں لیکن نومشق نہیں! رشید انجم کے ترجمہ شدہ پانچ ناول اور ایک ڈراما کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے، ان کی زبان رواں دواں اور اظہار بیان دلچسپ ہے۔

سیفیہ کالج کے سابق طالب علم یعقوب یاور، کو زمانۂ طالب علمی سے ہی ترجمہ سے دلچسپی رہی ہے۔ اپنے طبعی میلان کے سبب انھوں نے ۱۹۸۲ء میں ہرمن ہیس کا ناول "سدھارتھا" کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ جب سے آج تک ان کے ذریعہ ترجمہ شدہ نو ناول نسیم بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

کوثر صدیقی اچھے شاعر اور مترجم ہیں۔ وہ میرانیس کا مرثیہ "نجد افارس میدان تہور تھا حُر" کو نہایت کامیابی کے ساتھ فارسی اشعار میں منتقل کر چکے ہیں۔ اُس کے علاوہ علامہ اقبال کی نظموں "مسجد قرطبہ" اور "صبح" کو بھی فارسی اشعار میں پیش کر چکے ہیں اور علامہ اقبال کی دیگر اردو نظموں کو فارسی اشعار میں منتقل کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کی اس کوشش کو اہل نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور سراہا ہے ان کے ذریعہ ترجمہ شدہ اقبال کی بعض نظمیں اقبال اکادمی لاہور نے اپنے موقر ادبی جریدہ "اقبالیات" میں شائع کرنے کے لیے منتخب کرلی ہیں۔

اقبال مسعود نے انا میری شمائل کے انگریزی مضمون کا ترجمہ "اقبال اور جرمنی اجز
اور اقبال" کے عنوان سے کیا اور بنگلہ دیش کے پانچ شعرا کی تخلیقات کو بھی اردو
کا پیکر عطا کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ معروف سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام کے مضمون کا ترجمہ
"مسلمانوں کی سائنسی میدان میں فتوحات" کے نام سے کر چکے ہیں۔

بھوپال میں ترجمہ نگاری کے اس مختصر جائزے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں
ترجمہ نگاری کی روایت وقیع ہے، ہر زمانہ میں یہاں کے شعرا و ادبا نے اپنی بہترین صلاحیت
کا اظہار کر کے مختلف زبانوں کے ادب پاروں کو اردو زبان کا قالب عطا کیا ہے اور یہ سلسلہ
ہنوز جاری ہے۔

جائزے

(تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

مفکرین تعلیم

مصنف : ڈاکٹر محمد اکرام خاں
مبصر : شوکت اللہ
قیمت : 150/-
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تعلیم کے موضوع پر ڈاکٹر اکرام خاں صاحب کی تازہ ترین تصنیف پیش نظر ہے۔ پچھلی تصانیف کی طرح موجودہ کتاب میں بھی موصوف نے افکار، تجربے اور احساسات کا اظہار انفرادیت کے ساتھ کیا ہے کیونکہ وہ رہے عام سے ہٹ کر چلنے کے عادی ہیں اور رسمی خیالات کا اظہار روایتی انداز سے پسند نہیں کرتے۔ مشاہدے، تجربے اور لمحے تحریری شکل حاصل کر لینے پر منتشر ہونے سے بچ جاتے ہیں اور تہذیب کے سفر میں وسیلۂ تسلسل بن کر تمدنی ورثہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے وسیع تعلیمی تجربوں اور مشاہدوں کو محفوظ کرنے کے تعمیری عمل میں مسلسل مصروف ہیں اور اپنی ان قابل تحسین کوششوں کی داد اہلِ علم و دانش سے وصول کر رہے ہیں اس لیے کہ موجودہ کتاب ان کی پہلی کوشش نہیں بلکہ اس عمل مسلسل کی کڑی ہے جس کے نتیجہ میں متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اردو زبان میں تعلیم کے موضوع پر معیاری کتابوں کی قلت اور طلبہ کی پریشانیوں کو انھوں نے براہِ راست محسوس کیا اور ایک خادم اور مبلغ علم کی حیثیت سے اس کمی کو دور کرنے کے لیے خود کو وقف کر دیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے تعلیمی فکر کے سفر کی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے اور ایسے نمایندہ مفکرین کو زیر بحث لائے ہیں جنھیں نظریاتی انفرادیت کے پیش نظر تاریخ ساز حیثیت حاصل ہے۔ ایک طرف انھوں نے مغربی فکر کے باوا آدم افلاطون سے، تعلیم میں جمہوری اقدار مبلغ جان ڈیوی تک ابھرتے اور بدلتے ہوئے فکر مطمح نظر کا جائزہ لیا ہے تو دوسری طرف رابندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو شامل بحث کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا اپنا سوچا سمجھا ہوا نقطہ نظر ہے اور جس کے اظہار پر انھوں نے خاص توجہ بھی مرکوز کی ہے۔ وہ فرائیڈ کی مانند نہ تو انسان کو محض ایک "ترقی یافتہ حیوان" تصور کرتے ہیں اور نہ ہی مشرق کی تقدیر پرستی کے قائل ہیں۔ وہ مشرق و مغرب کے تعلیمی فلسفوں کے حسین

امتزاج سے ایسی شخصیت کی تشکیل کے خواہاں ہیں جو ہم آہنگ ہو، مربوط ہو، جن کی سیرت صالح ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی باصلاحیت ہو کہ ممکن اور مطلوب کے درمیان مثبت جدوجہد کا پُل تعمیر کرسکیں۔

تعلیمی افکار کی تشکیل کے تاریخی سفر میں تسلسل اور تبدیلی کے عناصر پر مصنّف کی گہری نظر ہے۔ مفکرین کے نظریات پر بحث کے دوران انھوں نے ادوار خطوں کی مصنوعی حد بندی کو حائل نہیں ہونے دیا اور اس حقیقت کو نمایاں کیا کہ افکار بنی نوع انسان کی بین اقوامی جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہونے والی مشترک میراث ہیں۔

مصنف نے مفکرین تعلیم کے افکار کا تجزیہ ان کے حالاتِ زندگی اور اس دور میں مروجہ فلسفہ کی روشنی یعنی حقیقی پس منظر میں کیا ہے۔ ساتھ ہی اپنے ذاتی احساس اور بصری حیت کو شامل بحث کرکے کہنے اور سوچنے کا ایک انداز پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں جان ڈیوی کے تعلیم برائے جمہوریت کے نظریہ کی تمہید غور طلب ہے "ابھی ہمارے یہاں جمہوریت محض قانون کی شکل میں ہے۔ اس کے بنیادی اصول اور تصورات ہماری سیرت کا جزو نہیں بن سکے۔ بحث مباحثہ کے وقت جمہوریت کی تعریف کی جاتی ہے لیکن عمل کے وقت اسے دور رکھا جاتا ہے" (صفحہ ۱۳۴)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے افکار بالعموم سلیقے اور سلاست سے پیش کیے ہیں۔ انھیں تعلیمی نظریات اور روایات کا نہ صرف ادراک ہے بلکہ علمی روپ دینے کی بھی انھیں قدرت حاصل ہے۔ یہ پختہ مشقی اور سلاست روی کی دلیل ہے۔

زیرِتبصرہ تصنیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں زبان کا اسلوب بہت سلیس، رواں اور شائستہ ہے جس کی وجہ سے عام پڑھنے والے آسانی سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً ہربارٹ اسپنسر کے تعلیمی نظریات کو متعارف کرانے کے لیے مصنف نے چند الفاظ اور سیدھے سوال کا سہارا لیتے ہوئے کہا ہے کہ "زندگی بسر کرنے کے لیے کون سا علم سب سے زیادہ مفید ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب ہربارٹ اسپنسر نے ..... سوچا اور سمجھا ہے" (صفحہ ۱۱۰)

عام طور پر مصنف نے اپنے خیالات کو نمایاں انداز میں شامل بحث کیا ہے مگر چند جگہوں پر زیر بحث مفکر، دوسرے رہنماؤں اور موجودہ مصنف کے خیالات کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل محسوس ہوتا ہے (صفحہ ۸۱ - ۱۷۷ - ۱۳۵)۔ چند ایک جگہوں پر دلائل کی تکرار ملتی ہے (صفحہ ۱۳۱ - ۱۲۸) کتابت کی چند غلطیاں آئندہ اڈیشن میں دور

ا جاسکتی ہیں (۱۲۸، ۱۲۰) کل ملاکر کتابت، طباعت، کاغذ، جلد عمدہ نفیس اور دیدہ
ب ہیں۔

اردو میں خصوصاً تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر کتابوں کے فقدان کے نتیجہ میں جو نقصان
دو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کو ہوتا رہا ہے اس کی تلافی کے لیے ڈاکٹر صاحب کی یہ منصفانہ کوشش
ل صد مبارک باد ہے۔ مغربی مفکرین کی اہم تصنیفات کے تراجم سے جو مغربی مطمح نظر اور
از فکر نئی نسلوں میں سرایت کرتا ہے، اس خدشہ سے بھی یہ کوشش مبرا ہے۔ مکتبہ جامعہ
ی تصانیف کو قدر دان اردو کو فراہم کرنے کے لیے بلاشک وشبہہ مبارکباد کا مستحق
ے۔

برگِ حنا

شاعر: مہدی علی
مبصر: ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

"برگ حنا" پروفیسر مہدی علی کی چھے درجن منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے جسے اردو مرکز
لیم آباد (پٹنہ) نے شائع کیا ہے۔ مرکز کے سرپرست پروفیسر جابر حسین نے جو سخنور بھی ہیں
سخن پرور بھی۔ کتاب کی ابتدا میں "اپنی بات" کے عنوان سے ایک اہم بات یہ کہی ہے کہ پروفیسر
وف کی غزلیں کلاسیکی انداز میں دورِ جدید کے کرب کا خوبصورت اظہار ہیں۔ میں اس بات کی
احت کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "برگ حنا" کے شاعر نے غزل کی روایتی پیکر میں
، کرب کو پیش کیا ہے وہ ایک پوری نسل اور قوم کا کرب ہے جس نے آزادیٔ وطن کے خواب
یھے تھے اور اب ان خوابوں کی تعبیر دیکھ کر حیران ہے۔ یہ وہ نسل ہے جس نے کچھ خاص قدروں
، محبّت کی ہے اور اب ان قدروں کے انہدام کی خاموش تماشائی ہے اور یہ وہ قوم ہے جس
، دل میں اپنی بے لبی کے غم کے ساتھ ساتھ اپنی عزّت و ناموس کا احساس بھی زندہ ہے
نے آپ کو گزری ہوئی راتوں کا خواب، دیمک زدہ کتاب، وقت سے قبل غروب ہونے والا
اب، زندگی کے لیے عذاب، سطحِ دریا پہ نمودار ہونے والا حباب کہنے کے بعد اس
ح کے اشعار کہنا ــ

ایسے بیمار کہ چاہیں تو مسیحائی کریں — ہو گئے خاک مگر خاکِ شفا ہیں ہم لوگ
دستِ قدرت کا شاہکار کہو — ابھی بھی دنیا میں انتخاب ہیں ہم

ہ خیا میں ذہنی کیفیت کا اظہار اور بظاہر شکست کے باوجود حوصلوں کے پست نہ ہونے

کا ثبوت ہے۔ درج ذیل اشعار بھی کم و بیش انھیں کیفیات کی غمازی کرتے ہیں ؎

زبان خلق ہیں ہم وقت کی زبان ہم ہیں — نہیں ہے کوئی تو خود اپنے نوحہ خواں ہم ہیں
(پوری غزل)

میں کیا بتاؤں کہ میں کیا تھا اور کیا ہوں میں — میں ایک دور تھا اب صرف تذکرہ ہوں میں
(پوری غزل)

لہلہاتا ہوا سرسبز چمن میرا تھا — وہ بھی کیا وقت تھا جب میرا وطن میرا تھا
(پوری غزل)

وہ جفا کر کے بھی نازاں ہیں جفا پر اپنی — ہم کو پابندیٔ آئین وفا نے لوٹا
(غزل کے ابتدائی چار اشعار)

رہنا ہے جب یہاں تو ذرا سرخ رو رہیں — چہرے پہ آج اپنا لہو مل رہے ہیں ہم

بات آنکلی ہے مہدی عزّت سادات کی — ہم بھی قبروں سے پُرانی ہڈیاں لے آئے ہیں

دراصل یہ کیفیت صرف مہدی علی کا حصّہ نہیں ہے۔ اس میں ان کی قوم کے ایسے بیشتر لوگ شریک ہیں جنھوں نے چالیس پچاس برس پہلے تزئین گلستاں کے نقشے میں خون جگر سے رنگ بھرا تھا مگر آج ان کی نگاہوں کے سامنے باغ کا سارا منظر دھواں دھواں ہے اور وہ خود اپنی حیثیت کے بارے میں بے یقینی کی ایک عجیب وغریب کیفیت سے دوچار ہیں۔ اسی لیے برق و نشیمن کے استعارے میں پروفیسر مہدی علی نے اس پوری قوم کے احساسات پیش کیے ہیں جو ۱۹۴۷ء کے بعد تیزی سے روبہ زوال ہو رہی ہے گرچہ انھوں نے صرف ایک غزل کے بارے میں دعوا کیا ہے کہ یہ فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے مگر ان کی اکثر غزلوں کے ایک سے زیادہ شعروں پہ آزادیٔ ہند سے اب تک کی سماجی اور فرقہ وارانہ صورت حال کا اثر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کے لاشعور میں کہیں نہ کہیں یہ احساس ضرور موجود ہے کہ ایک پوری قوم حالات کی چکّی میں پس کر برگ حنا کی طرح اپنا فرض انجام دیتی رہی ہے۔ شاید اسی لیے ان کے اشعار میں جو لطیف احتجاج ملتا ہے وہ غزل کے روایتی لب ولہجے سے ہم آمیز ہے۔

"برگ حنا" کا مطالعہ کرتے ہوئے دو اور باتوں کا خاص طور پہ احساس ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے بعض اشعار FLAT STATEMENT پر مبنی ہونے کے باوجود تادیر متاثر کرتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ان میں دور حاضر کی ایسی صداقتوں کا اظہار ہوا ہے جو بہت Common ہیں۔ یہاں ایک ہی غزل کے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

اب کسی چیز کا معیار نہیں ملتا ہے — دوست مل جاتے ہیں غمخوار نہیں ملتا ہے
لوگ اکثر سر منبر تو نظر آتے ہیں — اب کوئی ہم کو سر دار نہیں ملتا ہے

دوسرے یہ کہ پروفیسر مہدی علی نے غزل کے روایتی موضوعات پہ بھی بعض ایسے اشعار کہے ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کا دل چاہتا ہے۔ یہ تین اشعار دیکھیے سے

کون جانے کوئی بے ساختہ یاد آیا ہو — اتنا گل رنگ نہ رخسار حیا تھا پہلے

آپ کو آپ کی بھیگی ہوئی پلکوں کی قسم — ہم بھی بیٹھے ہیں ان آنکھوں میں سمندر لے کر

یہ نہ جانا تھا کہ برسات پلٹ آئے گی — ذکر چھیڑا تھا تری زلف کے لہرانے کا

مجموعی طور پر بہترین روایات اور صلاحیتوں کا مالک ہونے کے باوجود اپنی ناقدری کا احساس پروفیسر مہدی علی کی غزل گوئی کی اساس ہے۔ میرے خیال سے یہ انفرادی احساس ایک اجتماعی کرب سے ہم آمیز ہو کر ان کی شناخت بن گیا ہے۔

اردو زبان اور سماجی سیاق

مصنف : پروفیسر عبدالستار دلوی
تبصرہ نگار : پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی
مہمان پروفیسر رشین اکیڈمی آف سائنسز
ماسکو۔ (روس)
ناشر: قلم پبلی کیشن ممبئی ۔ قیمت : ۱۰۰/- روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ ممبئی ۲

"اردو زبان اور سماجی سیاق" پروفیسر عبدالستار دلوی کے ان گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے زبان اور اس کے متعلقات پر وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ اس مجموعے میں سماجی لسانیات کے نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کے حامل مضامین ہیں "دکنی اردو ۔ سماجی لسانیات کی روشنی میں"، "بچوں کی اردو ۔ تحصیل زبان کا ایک مطالعہ"، "ممبئی کی اردو ۔ ایک لسانی مطالعہ"، "اردو میں لسانی آداب"، "اردو اور انگریزی کے دو لسانی پہلو"، اور "اردو کا ہندوستانی رجحان"، ان موضوعات کے حوالے سے پروفیسر دلوی نے مجموعہ ہائے افراد، گروہوں اور معاشرتوں کے درمیان لسانی تفاعل کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے نتائج سے بھی بحث کی ہے۔

اس صدی کے نصف آخر میں مطالعہ زبان کے جس سائنسی رویئے کو فروغ حاصل ہوا ہے اس کی روشنی میں وضع کردہ اصولوں پر اردو زبان کے مطالعہ کے میدان میں ابھی خامی نظر آتی ہے اور اس لحاظ سے پروفیسر دلوی کی یہ کوشش اس سمت میں ایک مبارک پیش رفت ہے۔

اس کوشش کی ایک اہم کڑی ہے اردو کے سیاق میں بچوں کے لیے تحصیل زبان کے عمل کا مشاہدہ اور اس کی بنیاد پر بعض نتائج اور اصولوں کا استخراج۔ اس ضمن میں تحصیل زبان کے مرحلے کی مختلف عمروں کے بچوں کے بولے ہوئے فقروں اور جملوں کے تجزیے اور نسبتاً بڑی عمر کے افراد یا بالغ ناطقین کے مساوی لسانی عمل ہے اس کے موازنے میں دینی طرز عمل اختیار کیا ہے جو جدید سائنسی معیاروں کے شایانِ شان ہے۔ ممبئی کی اردو سے لسانی مطالعہ میں ممبئی اور اس کے نواح کی زندگی کی اجتماعی، مذہبی اور جغرافیائی زندگی کے ہر پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور اسی کے اعتبار سے مراٹھی، گجراتی، اردو، ہندی اور انگریزی بولنے والے طبقوں سے خاص طور پر بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کی ایک مزید توجیہہ پروفیسر دلوی کا یہ انکشاف بھی ہے کہ ق / خ اور غ ممبئی کی اردو کے صوتی نظام میں شامل نہیں ہیں۔ واضح رہے کہ یہ اصوات جنوبی ہند کی بیشتر علاقائی زبانوں سے غائب ہیں۔ ممبئی اور جنوبی ہند کی علاقائی زبانوں میں لفظ کے پہلے اور آخری مصمتی خوشوں کو توڑنے کا بھی رجحان مشترک ہے۔ ممبئی کے سیاق میں پروفیسر دلوی کی یہ نشاندہی تقابلی اور سماجی لسانیات کے میدان میں مزید تحقیق کی اساس فراہم کرتی ہے۔

اپنے مضمون "اردو میں لسانی آداب" میں مصنف نے آداب معاشرت اور زبان کے استعمال میں ہم آہنگی کے عناصر کی وضاحت مدلل انداز میں کی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سنسکرت عہد کا حوالہ بجا طور پر دیا ہے تاکہ معاشرت اور زبان کا ارتباط ذہن نشین ہو جائے یہ ارتباط جتنا اور جس قدر مضبوط ہوگا معاشرہ اسی قدر مہذب ہوگا۔ یہ اصول تحقیق مصنف کو اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ زبان اردو کی لسانیاتی ثقافت میں ہر انسان بلا لحاظ قوم و نسل، عمر، جنس یا دولت قابلِ احترام ہے"۔

مجھے یقین ہے کہ پروفیسر دلوی کی یہ کتاب علمی حلقوں میں خاص طور پر مقبول ہوگی اور سنجیدہ بحث و تمحیث کا موضوع بنے گی۔

کھلے خطوط

● ڈاکٹر ابن فرید، بیت الصالحہ، زینہ عنایت خان
رام پور۔ یوپی

جناب نند کشور وکرم صاحب کا اشاریہ "کچھ تلخ.... کچھ شیریں"، پڑھ کر میں سمجھ نہ سکا کہ وہ اردو کی حمایت میں لکھ رہے ہیں یا مخالفت میں۔ اردو کے لیے جواہر لال نہرو نے کچھ نہیں کیا تھا کیونکہ داخلی امور سردار پٹیل کے اختیار میں تھے اور ان سے پنجہ آزمائی بڑی خطرناک ہو سکتی تھی۔ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اردو کے لیے جو کچھ کیا اس کے نتیجے میں آج بھی اردو زندہ ہے۔ جی ہاں! کیا تو سب کچھ یہی سوچ کر کہ اردو دس پندرہ سال میں ختم ہو جائے گی لیکن فطری زبان اور مصنوعی زبان کے عمل میں جو فرق ہوتا ہے اسے ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا۔ اسی لیے فطری عمل نے تمام اندازوں کو غلط ثابت کر دیا۔ اب سیاسی عمل کچھ ایسا شروع ہو گیا ہے کہ ہر سیاسی جماعت اردو کی مظلومیت اور فروغ کے لیے پُر تصنع فکر مندی کا اظہار کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا؟ اہل نظر کے لیے غور و فکر کا مرحلہ ہے۔

بھائی وکرم صاحب، تھوڑی سی دنیا ہم نے بھی دیکھی ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ دبئی کی دوسری سرکاری زبان اردو ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقی ممالک میں اردو مقبول ہے، یہاں تک کہ سعودی عرب نے اردو کو اپنی مملکت کی دوسری سب سے بڑی زبان قرار دے دیا ہے۔ وسطی ایشیا میں ترک ممالک کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہاں ہندی رائج ہے۔ وہ "ہندی" وہی ہے جو غالب کی "عود ہندی" میں ہے۔ اب جب غالب نے خود اپنے قلم سے لکھ دیا ہے تو ان کے سارے خطوط اور شاعری کو "ہندی" قرار دیا جائے۔

اگر اکبر اعظم، شاہجہاں، انارکلی، پاکیزہ امراؤ جان ادا وغیرہ فلموں کی زبان ہندی ہے اور جاں نثار اختر، اختر شیرانی، راجا مہدی علی خاں، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی وغیرہ کی "فلمی شاعری" ہندی میں ہے تو ہم سنسر بورڈ اور آپ کے پیش کردہ اعداد و شمار کی تردید کیسے کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے آپ سے یہ دریافت کرنا ہے کہ آخر یہ کوی سمیلن و مجلس' کے بغیر کیوں پورے نہیں ہوتے؟ کیوں ہندی کویتاؤں، کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں عربی و فارسی الفاظ کی بہتات ہونے لگی ہے؟

ایک بات اہم جیسے زندگی کی آخری منزل میں پہنچنے والے بوڑھوں کی یاد رکھیے کہ زندہ زبانیں مرا نہیں کرتیں، مردہ لاشے مصنوعی سانس سے زندہ نہیں ہو جاتے۔

اگست ۹۶ء کے شمارے کا جہاں اداریہ زبیر رضوی صاحب نے خاصا شاعرانہ لکھا ہے لیکن آخری جملہ غیر شاعرانہ لکھا ہے "قابل بھروسا"،

...اعدیوں کی نظر میں غلط ہے۔ میرے خیال
...ں اس کو ضرورت سے زیادہ "گاڑھا" کرنے
...سے جملے میں کوئی حسن پیدا نہیں ہوا ہے۔ سیدھے
...سادے انداز میں "بھروسے کے قابل"
...لکھنے میں کیا حرج تھا؟
ہر کام کے لیے اس کے ٹیکنیکل ماہرین
...موزوں و مناسب ہوتے ہیں۔ نصابی
...ابیں لکھنا خالص فنی اور تکنیکی کام ہے۔ اس
...عمر، استعداد، فہم اور متعلقہ افراد کے سرمایہ
...ت (VOCABULARY) کا خیال رکھنا پڑتا
...۔ بیچارے شاعر و ادیب والے ہرن کی
...پر گھاس لادنے کی آپ سفارش کیوں
...رہے ہیں؟ شاعر و ادیب کا اشتراک ان
...وں میں یقیناً ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیقات
...تقاضوں کے مطابق قلم بند کریں جو مطلوبہ
...اس کے لیے ضروری ہیں۔ یہ خدمات وہ ایک
...ں ضرورت کے تحت فلموں وغیرہ کے لیے
...ام دیتے رہے ہیں۔ اگر نصابی کتابوں
...تدوین کے لیے بھی وہ ایسا کریں تو اچھی
...ی کتابیں تیار ہو جائیں گی۔
اب جہاں تک غیر معیاری نصابی کتابوں کی
...ی کی بات ہے تو وہ عصبیت، فرقہ بندی
...ب و اقربا پروری اور سب سے بڑھ کر
...سے پر گھوڑے کی جھول باندھنے "سے
...ہے۔ اس معاملے میں ہم آپ کسی کا
...ہیں بگاڑ سکتے۔ ••

● محسن بھوپالی، محسن منزل، ناظم آباد، کراچی، پاکستان
ممنون ہوں کہ کتاب نما سے نوازتے رہتے
ہیں۔ جولائی کا شمارہ آج ۱۰ اگست کو موصول ہوا
ہے۔ شاعروں، ادیبوں اور ناشروں کو پاک و
ہند کے محکمہ ڈاک کے مابین کوئی معاہدہ نہ ہونے
کی صورت میں جہاں کتابوں، اور رسائل کی
آزادانہ اور بروقت ترسیل میں مشکلات کا
سامنا ہے وہیں یہ صورت حال لاعلمی اور عدم
واقفیت کو بھی راہ دیتی ہے اور اکثر اوقات تحقیقی
کام کرنے والے اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔
میرے مندرجہ بالا تجزیے کی تازہ مثال
پچھلے تین ماہ میں موصول ہونے والی دو کتابیں
ہیں۔ "جدید اردو غزل"، (خدا بخش لائبریری، مطبوعہ
۱۹۹۵ء) اور "بنام علیم صبا نویدی"، مرتبہ ڈاکٹر محمد علی
اثر، جو ۱۹۹۶ء کے اوائل میں شائع ہوئی تھی۔ اول
الذکر کتاب میں میرا وہ مکتوب شامل کیا گیا ہے
(ص ۵) جو میں نے آپ کو تحریر کیا تھا اور جس
میں میں نے مرتب کی بعض کوتاہیوں کی جانب
اشارہ کیا تھا لیکن اسی کتاب میں عدم معلومات
کی بنا پر عرشی بھوپالی کے عنوان کے نیچے ان
کی تین غزلوں کے فوراً بعد صفحہ ۲۱۰ پر درج کیے
ہوئے آخری دس اشعار میری مختلف مطبوعہ
غزلوں سے لیے گئے ہیں اور اس تسلسل کے
ساتھ مرتب کیے گئے ہیں کہ یہ اشعار بھی
عرشی بھوپالی مرحوم کے "کھاتے" میں چلے
گئے ہیں۔ میں نے کوئی دو ماہ پہلے مرتب کو
خط سے آگاہ کیا تھا لیکن جواب سے محروم

...ہوں۔ ممکن ہے خط ہی نہ ملا ہو۔

دوسری کتاب "بنام علیم صبا نویدی" پچھلے ...ماہ موصول ہوئی تھی۔ اس میں بھی تحقیق کی رو سے چند باتیں تصحیح طلب ہیں جنھیں اردو ادب ...بالخصوص تحقیق کے شعبے سے وابستہ افراد کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ محقق ڈاکٹر محمد علی اثر نے مذکورہ کتاب کے ایک باب "مکتوب نگاروں کے سوانحی اشارے" میں لکھا ہے "گرد مسافت۔ محسن بھوپالی کا پہلا شعری مجموعہ ہے"، جو سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس "انکشاف" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مجموعہ پڑھنا تو کجا دیباچے کا پہلا صفحہ حتیٰ کہ کتاب کو پلٹ کر بیک ٹائٹل بھی نہیں پڑھا جس کے نیچے مطبوعہ مجموعوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

ڈاکٹر اثر نے اسی سوانحی اشارے میں مزید انکشاف کیا ہے کہ "علیم صبا نویدی کی ہائیکو نظموں کے مجموعے تشدید کی اشاعت کے بعد موصوف (محسن بھوپالی) نے "تشدید" کی نظموں کا اتباع کرتے ہوئے ہائیکو نظمیں (بروزن فعلن فعلن فعلن فع یا فاع) کی پابندی کے ساتھ لکھیں جو مذکورہ بالا مجموعے (گرد مسافت) میں موجود ہیں"، اب ذرا حقیقت ملاحظہ کیجیے "تشدید" کا سال اشاعت ۱۹۸۹ء ہے جو کتاب میں درج ہے اور یہی سال اشاعت زیر حوالہ کتاب: بنام علیم صبا نویدی کے بیک ٹائٹل پر دی گئی فہرست کتب میں بھی دیا گیا ہے۔ عقل حیران ہے کہ ۸۸ء میں شائع ہونے والے مجموعے میں ۸۹ء کی کتاب کا تتبع کیسے کیا جا سکتا ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ گرد مسافت میں شامل ہائیکو دسمبر ۱۹۸۳ء میں کہے گئے تھے اور جاپان قونصل خانہ کراچی کے سالانہ مشاعرے منعقدہ ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء میں پڑھے گئے تھے جو قونصل خانہ کے شائع کردہ مجموعے "اردو ہائیکو" مطبوعہ اپریل ۱۹۸۴ء میں شامل ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں نے عزیزم علیم صبا نویدی کو ۲۸ مارچ ۱۹۹۶ء کے اپنے مکتوب میں ان کی تالیف "تامل ناڈو کے صاحب تصنیف علما" کی رسید سے مطلع کرتے ہوئے انھیں "تشدید" (ہائیکو) کی ایک جلد ارسال کرنے کی فرمایش بھی کی تھی جس کا میں آج بھی منتظر ہوں۔

معاف کیجیے گا یہ خط "کتاب نما" سے کم اردو تحقیقی مسائل سے کچھ زیادہ متعلق ہے لیکن اس کی مندرجات متقاضی ہیں کہ یہ اہل علم اور بالخصوص اہل تحقیق تک پہنچیں اور تحقیقی لغزشوں کی اصلاح ہو سکے۔

● اظہر نیّر، سکریٹری نوری اردو اکیڈمی، بریولیا، وایا کنسی سیمری ضلع دربھنگہ، بہار

خواندگی کے حوالے سے ادیب کے رول پر زبیر رضوی کا خیال اچھا ہے لیکن وہ اپنی بات کی تائید میں وافر افادی دلائل فراہم نہیں کر سکے ہیں۔ ادیب کے مختلف رول پر گفتگو ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی کا مضمون عمدہ

اور معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین، قیصر شمیم شاہد حسین اور ڈاکٹر عقیل احمد کے مضامین بہت مفید ہیں۔ غزلوں میں مظفر حنفی، عبدالمجید سہیل احمد زیدی، عطا عابدی اور ڈاکٹر نریش کے کئی اشعار بہت اثر انگیز ہیں۔ اسرار جامعی کی نظم "اردو" بھی اچھی کوشش ہے۔ کھلے خطوط میں حسب سابق اکثر خطوط بہت اہم ہیں۔ خصوصاً رام پرکاش کپور اور ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے خیالات اردو دنیا کی توجہ کے مستحق ہیں۔

● شکیل جہانگیری۔ ۲۴۳ کاویری، جے این یو نئی دہلی

کچھ دنوں پہلے کتاب نما میں حکیم حسین خاں شفا رام پوری کا ایک مضمون نظر سے گزرا۔ حکیم صاحب میرے کرم فرما ہیں۔ اچھے اسکالر ہیں لیکن چاربیت کے تعلق سے انھوں نے جو اطلاعات اس مضمون میں دی ہیں وہ ناقص ہیں اور ثانوی ذرائع یا محض سنی ہوئی باتوں پر مشتمل ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ چاربیت ہندستان کی ایک عوامی روایت "خیال" سے ماخوذ ہے۔ پختونوں نے اسے فروغ دیا اور ہیئتی اضافے کیے۔ دوسری بات یہ کہ افغانی لوک گیتوں پر سب سے پہلا تحقیقی کام جس میں چاربیت بھی شامل ہے۔ جیمز ڈار مسٹر نے کیا ہے۔ اس کی فرنچ کتاب ۱۸۹۰ء "لے شاں پوپولیر دیس افغان" پیرس سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا پشتو متن جو افغان لوک گیتوں پر مشتمل ہے دس پندرہ سال قبل کابل سے "د پختو نخوا د شعر ہار و بہار" کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ جبکہ مضمون نگار کے بقول "ڈار کی کتاب" بارو بہار" ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ غلط ہے۔

ادبی و تہذیبی خبریں

۲۲ ممتاز اسکالرز کو اعزازی سند او رصدر جمہوریہ ایوارڈ

جامعہ ملیہ کے ڈاکٹر بدرالدین الحافظ اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ڈاکٹر سمیع الدین احمد شامل کو اعلیور۔ ۲۰ اگست۔ سنسکرت، عربی فارسی اور پالی زبانوں میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں بائیس ممتاز اسکالروں کو اعزازی سند اور ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ سنسکرت کے پندرہ، عربی کے تین، فارسی کے تین اور پالی کے ایک اسکالر کو ایک خصوصی تقریب میں صدر جمہوریہ شنکر دیال شرما ایوارڈ سے سرفراز کریں گے۔ یہ ایوارڈ سند، عبائے اعزاز اور عمر بھر کے لیے ہر سال بیس ہزار روپے کی مالی امداد پر مشتمل ہے۔ ایوارڈ یافتگان کے نام حسب ذیل ہیں۔

سنسکرت: آر این سی وی نرسمچاریہ، ڈاکٹر بیدناتھ جھا، پنڈت جوالا پرساد دگوار، مسٹر وشنو دیو سنکلیشور پنڈت، پنڈت جانکی ناتھ کول دکمل، ڈاکٹر شری کانت گن پتی، مسٹر آر کرونا کرن، مسٹر ایس شری رام بھیکاجی والنکر آچاریہ دگمبر مہاپترا، اچاریہ ڈاکٹر نارائن شاستری کنکر، مسٹر تیاگ راج رام چندر شاستری، مسٹر چندریکا پرساد شکلا، ڈاکٹر شری موہن بھٹاچاریہ۔

عربی: ڈاکٹر بدرالدین الحافظ، مسٹر وی عبدالرحیم اور ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔

فارسی: ڈاکٹر متین احمد، ڈاکٹر سمیع الدین احمد، مسٹر محمد عبداللہ۔

پالی: ڈاکٹر مہیش تیواری شاستری۔

پروفیسر انیس سلطان کو پی ایچ ڈی تفویض

پروفیسر انیس سلطان صدر شعبۂ اردو ایم ایل بی گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج بھوپال کو ان کے تحقیقی مقالہ "بھوپال میں اردو تحقیق و تنقید کا ارتقا" پر برکت اللہ یونی ورسٹی بھوپال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ آپ نے یہ مقالہ پروفیسر آفاق احمد میر ایکزیکیٹیو برکت اللہ یونی ورسٹی کی نگرانی میں تحریر کیا تھا۔

برکت اللہ بھوپالی کے یوم پیدائش پر کتب کی پیش کش

جہاں گشت انقلابی مولانا برکت اللہ بھوپالی پر تحریر کی گئی کتابوں کا سیٹ انھیں کے نام سے موسوم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر وائی ایس چوہان کو پیش کیا گیا۔ برکت اللہ بھوپالی کی شخصیت اور انقلابی کارناموں کا احاطہ کرنے والی یہ کتاب قاضی وجدی الحسینی مرحوم نے تحریر کی تھی۔ ایک کتاب اردو میں ہے۔ دوسری دیوناگری میں جس کا پروفیسر فضل تابش مرحوم نے ترجمہ کیا ہے ان کتابوں کو مدھیہ پردیش

اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ برکت اللہ بھوپالی کے یوم وفات پر اکادمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے یونیورسٹی لائبریری کے لیے یہ کتب پیش کیں۔

تسنیم کوثر کو لائنس کلب فیمینا پٹنہ کی جانب سے ایوارڈ

پٹنہ۔ گذشتہ ۲۹ جون ۹۶ء کو لائنس کلب فیمینا پٹنہ کی جانب سے اپنے شعبوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے جن چار خواتین کو ۹۷-۱۹۹۶ء کے اپری سی ایشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان میں نئی نسل کی ممتاز افسانہ نگار، دوردرشن کیندر اور آکاش وانی پٹنہ کی نیوز کاسٹر محترمہ تسنیم کوثر بھی شامل ہیں۔ یہ ایوارڈ جو ایک توصیفی سند، تحفہ اور مبلغ پانچ سو روپے کی رقم پر مشتمل ہے، ہوٹل چانکیہ کے شاندار ہال میں منعقد ایک رنگا رنگ تقریب میں گورنر بہار، عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے عطا کیا۔
لائنس کلب فیمینا کی سکریٹری مسز منجو شنکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ٹیلی وژن اور ریڈیو نیوز کاسٹنگ میں تسنیم کوثر نے الفاظ اور آواز کی ہم آہنگی سے جو بلند معیار قائم کیا ہے ہم پٹنہ واسی اس سے بھلی بھانتی واقف ہیں۔ ادب اور صحافت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔ قومی یک جہتی پر مبنی ان کی ہندی کی "ایک پودا تلسی کا" پردیپا پُرستن انعام پا چکی ہے۔ ان کے اردو افسانوی مجموعے "بونسائی" کا ادبی حلقوں میں زبردست طریقے سے خیر مقدم کیا گیا۔

ایوارڈ حاصل کرنے والی دوسری تین خواتین مسز گریس کجور (اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ) مس پرتیبھا سنہا (سب انسپکٹر پولیس آف پولیس) اور مس گیتا بوس (بیوٹیشن) ہیں۔
اس موقع پر مہمان خصوصی ڈاکٹر قدوائی کے علاوہ لائنس کلب کی صدر مسز سندھیا شرما نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ظفر گورکھپوری کو فراق سمان

گذشتہ دنوں گورکھپور کی ایک ادبی تنظیم "یوواچیتنا" نے اردو کے معروف شاعر ظفر گورکھپوری کو ان کی ۴۵ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں اپنے اعزاز فراق سمان سے سرفراز کیا۔ ۲۳ جون ۹۶ء کی اس تقریب میں اردو کے بین اقوامی شہرت یافتہ ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے خصوصی طور پر شرکت کی۔ شمس الرحمٰن فاروقی جو تقریب کے مہمان خصوصی تھے ان کے ہاتھوں ظفر گورکھپوری کو فراق سمان پیش کیا گیا۔ فراق سمان ایک یادگاری نشان، ایک توصیفی سند، ایک شال اور مبلغ پانچ ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ اس موقع پر گورکھپور کمشنری کا وسیع ہال اردو اور ہندی کے ادیبوں، دانشوروں اور باذوق سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی

نے نظامت کی۔ اوّلین صفوں میں جو شخصیتیں تشریف فرما تھیں ان میں پروفیسر احمر لاری، ڈاکٹر غلام رسول مکرانی، ڈاکٹر عزیز احمد، پروفیسر پرمانند سری واستو اور ڈاکٹر شعیب ندیم کے علاوہ گورکھپور یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں کے پروفیسر صاحبان شریک تھے۔ اس تقریب میں ظفر کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ جس میں اردو اور ہندی کے دانشوروں نے حصّہ لیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ ظفر کی شاعری عصری حسیّت کی شاعری ہے آج کا انسان جن مسائل سے دوچار ہے اس کی بھرپور ترجمانی ظفر کی شاعری میں ملتی ہے۔ فراق نے جب یہ کہا تھا کہ "میں منصب لوح و قلم پا رہا ہوں" تو ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں ظفر تیز نکلے۔ کسی شاعر کو جیتے جی اس کے اہل شہر نوازیں، یہ اپنے آپ میں ایک بڑا انعام ہے۔ ہندی کے بلند پایہ نقاد ڈاکٹر پرمانند سری واستو صدر شعبۂ ہندی گورکھپور یونی ورسٹی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ظفر کی شاعری سچی اور کھری شاعری ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی ممبئی جیسے بڑے اور معروف شہر میں گزار دی بڑے شہر کی جو بدعتیں اور لعنتیں ہوتی ہیں اس کا اندازہ ہم ظفر کی شاعری کے حوالے سے کرتے رہے ہیں۔ ظفر گورکھپوری کو فراق سمان دیا جانا ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ گورکھپور شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر عزیز احمد (ایم۔ ڈی) نے ظفر گورکھپوری کی شاعری کی مختلف جہتوں پر ان کے اشعار کے حوالے سے روشنی ڈالی، اس سلسلے میں انھوں نے ظفر کے اتنے اشعار سنائے کہ سامعین حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک معالج اور اتنا رچا ہوا ادبی ذوق۔

مہمان خصوصی جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ظفر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے گورکھپور کی ادبی روایت پر بھرپور روشنی ڈالی اور کہا کہ ظفر گورکھپوری فراق کے شعری سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے ترقی پسند ہیں۔ ان کی شاعری میں عصری مسائل کی بھرپور عکاسی ہے۔ سماج میں بکھری ہوئی تلخ سچائیوں کو انھوں نے نہایت ایمانداری کے ساتھ شاعری کے توسّط سے عوام تک پہنچایا۔ ظفر نے کبھی سطحی شاعری نہیں کی۔ انھوں نے ہمیشہ ادب کو ادب کی طرح پیش کیا۔ ان کی شاعری میں فکر بھی ہے، شعور بھی ہے اور فن بھی۔ فاروقی صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ ظفر کا پہلا مجموعہ "تیشہ" تھا "تیشہ" کے بعد "وادیِ سنگ" کے نام سے جب ان کا دوسرا مجموعہ آیا تبھی یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ نام اپنے لیے ایک معزز مقام بنائے گا اور اب "گوکھرو کے پھول" کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جدید غزل کی نئی آوازوں میں ظفر کی ایک منفرد پہچان ہے۔ ظفر اس لیے یاد رکھے جائیں گے کہ ان کی شاعری جاندار ہے اس لیے نہیں کہ انھیں فراق سمان ملا ہے۔ فاروقی صاحب کے بعد صدر جلسہ بزرگ شخصیت

پروفیسر محمود الٰہی نے کہا کہ ظفر کی شاعری میں گانو کی مٹی کی خوشبو ہے۔ ان کا اسلوب منفرد ہے اُن کا لہجہ نیکھا ہے اور وہ اپنی زمین سے جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ ظفر گورکھپوری نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ اگر یہ اعزاز مجھے کسی سیاسی ادارے نے دیا ہوتا تو مجھے وہ خوشی نہیں ہوتی جو مجھے اپنے شہر کے لوگوں کے ذریعے اس اعزاز کے ملنے سے ہوئی ہے۔ میرے لیے یہ ایوارڈ اس لیے بھی قابلِ احترام ہے کہ اس سے فراق جیسے عظیم شاعر کا نام جڑا ہوا ہے۔ سامعین کے اصرار پر ظفر نے اپنی غزلوں کے کچھ متفرق اشعار اور ایک مکمل غزل سُنائی۔

ظفر گورکھپوری کی گورکھپور آمد پر اُن کے اعزاز میں جگہ جگہ نشستیں ہوئیں۔ جناب حبیب اللہ ایڈوکیٹ اور پروفیسر احمر لاری کے دولت کدوں پر منعقد کی گئیں نشستیں قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی متھلا یونی ورسٹی کے وائس چانسلر

پروفیسر عبدالمغنی کو متھلا یونی ورسٹی دربھنگہ کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔ ۲۶ جولائی کو انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لے لیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی انگریزی کے پروفیسر ہیں اور کچھ ہی دن پہلے ریٹائر ہوئے تھے۔

مغنی صاحب انگریزی اور اردو کے اسکالر اور نقاد ہیں۔ ان کی کتابوں میں اقبال کا ذہنی و فنی ارتقا، عظمتِ غالب، مولانا ابوالکلام آزاد ذہن و کردار، تنقید مشرق، تنقیدی زاویے، ابوالکلام آزاد کا اسلوبِ نگارش، اسلوبِ تنقید، تصورات، اقبال کا نظریۂ خودی وغیرہ بہت اہم ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی انجمن ترقی اردو بہار کے تقریباً ۲۰ سال سے صدر ہیں۔ انھی کی لگاتار کوششوں کی وجہ سے اردو کو بہار میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ وہ اردو تحریک کے ایک انتہائی فعال اور سرگرم رہنما ہیں۔ مغنی صاحب پچھلے ۲۰ سال سے مرکزی انجمن ترقی اردو کے بھی مجلسِ عاملہ اور مختلف کمیٹیوں کے رکن ہیں۔

ادارہ "کتاب نما" اس اعزاز پر عبدالمغنی صاحب کو تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہے۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

پنجاب یونی ورسٹی چنڈی گڑھ نے ڈاکٹر مظفر حسین غزالی کو ان کے پی ایچ ڈی مقالے "اردو زبان کی تشکیل میں اردو صحافت کا حصہ" پر ڈگری تفویض کی ہے۔ اس مقالے میں ڈاکٹر غزالی نے ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان زبان میں ہونے والی تبدیلیوں کا صحافت کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ مقالے کے نگراں ڈاکٹر محمد شکیل خاں تھے جو پنجاب یونی ورسٹی چنڈی گڑھ کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔

شعیب رضا وارثی کو پی ایچ ڈی تفویض

شعیب رضا وارثی کو "دہلی میں ادبی رسائل کا تنقیدی جائزہ آزادی کے بعد" کے موضوع پر جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ان کے نگراں ڈاکٹر نصیر احمد خاں تھے۔

ہم بہت دکھی ہیں

نئی دہلی ۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے زیر اہتمام ۹ اگست کو یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد نئی دہلی کے تدریسی اور غیر تدریسی کارکنوں اور دیگر بزرگوں نے علوم اسلامیہ کے ممتاز دانشور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے سانحۂ ارتحال کو علمی و فکری دنیا کا ایک بڑا سانحہ قرار دیا۔ سچی مذہبیت اسی کو کہتے ہیں کہ آدمی فصل کے بجائے وصل کی باتیں کرے، بیچ کی راہ، توازن اور اعتدال کے رویے سے ہی باہمی اتحاد، محبت اور ہم آہنگی کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ ان قدروں کا ایک بڑا علمبردار اس دنیا سے رخصت ہو گیا وہ اقلیتوں کے بنیادی مذہبی، تہذیبی، تعلیمی سیاسی و معاشی حقوق کا تحفظ ہر قیمت پر چاہتے تھے۔ ان باتوں کا ذکر ضیاء صاحب کی یاد میں منعقد تعزیتی جلسہ میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے استاد جناب محمد اسحاق صاحب نے کیا۔ پروفیسر مجیب رضوی سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اسلام کو عصری تناظر میں سمجھتے تھے۔ وہ ایک ایسے استاد تھے جنھوں نے اعلا قدروں کی تعلیم دینے کے ساتھ انھیں برتنے کی بھی بھرپور کوشش کی، مرحوم کے حوالے سے انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ مذاہب کے مطالعہ و تدریس میں سمجھ میں آنے والی زبان استعمال کرنی چاہیے۔ ٹیچرس ٹریننگ کالج کے سابق استاد جناب عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے مرحوم کی دلآویز شخصیت، جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والے افراد سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے ان سے اپنے قریبی مراسم و روابط کا ذکر کیا۔ شعبۂ ہندی کے صدر ڈاکٹر اشوک چکردھر نے مرحوم سے اپنی ذاتی قربت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ضیاء صاحب کا نہ رہنا میرے لیے ذاتی دکھ کا کارن ہے۔ آج میں جس مقام پر ہوں اس میں ضیاء صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بنارس ہندو یونی ورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابق صدر اور پروفیسر ڈاکٹر بدرالدین الحافظ نے مرحوم سے جامعہ ملیہ میں اپنی طالب علمی کے عہد کی بہت سی باتوں کا ذکر کیا اور انھیں مدارس اور یونی ورسٹی کے طلبہ کے بیچ خلیج کو پر کرنے والا قرار دیا۔ جناب عبداللطیف اعظمی صاحب نے مرحوم سے اپنے طویل اور گہرے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے ان کی صحافتی اور علمی و اصلاحی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا

اس موقع پر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ہمدرد کے ریسرچ آفیسر جناب شیث محمد اسمٰعیل نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ نظامت کے فرائض شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے انجام دیے اور پروفیسر ماجد علی خاں نے تعزیتی قرارداد پڑھ کر سنائی جامعہ ہمدرد کے ریڈر ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم کی فاتحہ خوانی اور ایصال ثواب پر جلسہ کی کاروائی ختم ہوئی۔

اس موقع پر جامعہ کے قدیم ترین حیاتی رکن جناب سید مجتبیٰ حسین زیدی، سابق رجسٹرار پروفیسر ایم۔ این۔ مینائی، فیکلٹی آف ہیومنیٹز اینڈ لینگویجز کے ڈین پروفیسر شمیم حنفی، شعبۂ فارسی کے سابق صدر پروفیسر شعیب اعظمی، مشہور مفکر تعلیم ڈاکٹر محمد اکرام خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل مینجر جناب شاہد علی خاں، مشہور افسانہ نگار پروفیسر صغرا مہدی، شعبۂ فارسی کی صدر ڈاکٹر قمر غفار، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ہمدرد کے صدر ڈاکٹر عبدالحی فاروقی اور ان کے رفقاء کار موجود تھے۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی وفات پر

ایک تعزیتی قرارداد

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کا یہ جلسہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے سانحۂ ارتحال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جو ۲ مئی ۱۹۲۵ء کو اودھ کے مردم خیز خطّہ کے ایک قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے اور جن کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، الٰہ آباد یونی ورسٹی اور مک گل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (کناڈا) میں ہوئی۔ ہمارے عہد کے ان ممتاز دانشوروں میں سے تھے جن کی شخصیت نہایت وقیع اور پہلودار تھی۔ ان کی نظر قدیم وجدید افکار ونظریات پر ایسی گہری تھی کہ جس سے ان کے عصری خیالات میں عصری معنویت کے ساتھ روایات کا بھی خوبصورت عناصر شامل ہو گیا تھا۔

مرحوم جامعہ ملیہ کے پرنسپل فیکلٹی آف ہیومنیٹز اینڈ لینگویجز کے ڈین، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر اور قائم مقام شیخ الجامعہ رہے۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا جامعہ کی سرگرمیوں میں نہایت اہم حصّہ رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے دہے میں اپنی عین جوانی کے زمانہ میں جب وہ جامعہ تشریف لائے تو جامعہ کی برادری میں ایسے جذب ہو گئے کہ انھوں نے اپنی جوانی اور بڑھاپا جامعہ کی نذر کر دیا۔

مرحوم مدینہ (بجنور) اور Message سے اپنی صحافت کا آغاز کرنے کے بعد اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج (سہ ماہی) اسلام اور عصر جدید (سہ ماہی) اور ماہنامہ جامعہ کے عرصہ تک مدیر رہے۔ ان میں لکھتے رہے، ان کے علاوہ دوسرے علمی جرائد میں بھی اُن کے

مضامین شائع ہوتے رہے۔ انھوں نے قومی اور بین اقوامی سطح کے سیمناروں میں متعدد مقالے بھی پیش کیے۔ اردو اور انگریزی میں لکھی ہوئی ان کی کتابیں اور مقالات کو اہل علم خراج تحسین پیش کر چکے ہیں۔

مرحوم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، کشمیر یونی ورسٹی ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی اور متعدد دیگر علمی اداروں کی مجلس علمی کے رکن رہے۔ انھوں نے ایک عالم کی حیثیت سے امریکا اور کناڈا کے علاوہ کئی یورپی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دورے پر گئے۔ انھیں جامعہ ملّیہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین چیر کا اعزاز بھی حاصل رہا۔

مرحوم کو جامعہ کی لائبریری سے خاص دلچسپی تھی۔ وہاں وہ اپنے اوقات کا بڑا حصّہ گزارا کرتے تھے۔ وہ لائبریری کی ترقی اور اس کی بہتر کارکردگی کے ہمیشہ خواہاں اور کوشاں رہے ان کے چلے جانے سے لائبریری اپنے ایک اہم چاہنے والے سے خالی ہوگئی۔

آخر میں یہ جلسہ بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہے کہ وہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کے پسماندگان اور ان کے عقیدت مندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

یہ جلسہ اللہ ربّ العزت سے یہ بھی دعا کرتا ہے کہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے ہمارے بیچ اُٹھ جانے سے جو علمی و فکری خلا پیدا ہو گیا ہے اسے اپنے فضل و کرم سے پُر کر دے۔ آمین

سیّد محمّد زیدی نہیں رہے

سید محمد زیدی ایک مخلص، حوصلہ مند محب اردو تھے۔ ۶ جولائی ۱۹۹۶ء کو رحلت فرما گئے۔ آج سے ۲۷-۲۸ سال قبل ۱۹۶۹ء میں سید محمد زیدی کانے علی سردار جعفری صاحب کی رہنمائی میں ایک اردو کمیٹی تشکیل دی تھی، اس اردو کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور روح رواں خود زیدی صاحب تھے۔ اس کمیٹی کے زیر اہتمام آل انڈیا اردو کنونشن ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۶۹ء کو منعقد ہوا تھا جس میں اردو والوں کے ساتھ ۱۵ غیر اردو زبانوں کے ادیب بھی شامل ہوئے تھے۔ اردو کے مطالبات پر بڑی تعداد میں تمام دوسری زبانوں کے ادیبوں نے دستخط کیے۔

اس طرح گویا یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور پہلا کنونشن تھا جس میں غیر اردو والوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور دستخط کیے۔ آنند نرائن ملّا نے مطالبات پیش کیے تھے۔ اتنے بڑے جلسے کے انعقاد کی پوری ذمّے داری زیدی صاحب کے اوپر تھی، حسن و خوبی کے ساتھ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

سیّد محمد زیدی مہاراشٹر انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری تھے اور شہر ممبئی کی انجمن ترقی اردو کے ایک اہم اور فعال رکن تھے۔ شہر ممبئی کی اردو خدمات کے سلسلے میں زیدی صاحب کا نام ہمیشہ بڑے احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

ان کی موت سے اردو دنیا میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

مولانا عبدالشہید نہیں رہے

کانپور۔ مولانا عبدالشہید صاحب (رشیدیہ کتب خانہ) بروز ہفتہ ۲۷ جولائی ۱۹۹۶ء بوقت صبح طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ [پسما]ندگان میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ مرحوم [ب]ہت ہی ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے، [دہ]لی مکتبہ جامعہ سے مرحوم کو گہرا لگاؤ تھا۔ مکتبہ [ج]امعہ مرحوم کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و [غ]م کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

[ار]دو مزاح نگار دلیپ سنگھ کا انتقال

نئی دہلی۔ ۸ اگست، اردو کے مشہور و معروف [مز]اح نگار دلیپ سنگھ کا آج صبح ۹ بجے اچانک حرکت [قل]ب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر [تق]ریباً ۷۴ سال تھی۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ کے [علا]وہ دو بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک شادی [شد]ہ ہے۔ آج سہ پہر ان کے قریبی عزیزوں، [رشتہ د]اروں، دوستوں اور اردو کے ممتاز ادیبوں [کی] موجودگی میں ان کی آخری رسوم ادا کر دی گئیں۔ [اس] موقع پر ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین، افسانہ [نگا]ر جوگندر پال، بزرگ شاعر مظہر امام، نند کشور [وکر]م، مخمور سعیدی، پروانہ ردولوی، بلراج کومل، نارنگ ساقی، رحمان فاروقی، اوتار سنگھ جج، امیر عارفی وغیرہ موجود تھے۔ اردو اکیڈمی کی طرف سے ڈاکٹر صادق نے مرحوم کے جسدِ خاکی پر پھول چڑھائے۔ وہ اکیڈمی کے دو بار ممبر رہ چکے تھے۔ غالب ایوارڈ اور اردو اکادمی دہلی کے مختلف ایوارڈز کے علاوہ حال ہی میں دلیپ سنگھ کو پنجاب حکومت کی طرف سے ان کی ہندی ناول "دل دریا"، پر بھی ایوارڈ دیا گیا۔ اس ناول پر بنایا گیا ٹی وی سیریل دور درشن پر کافی مقبول ہوا تھا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے "گوشہ میں قفس کے"، اور "سارے جہاں کا درد" کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک ڈراما "موم کی گڑیا"، ایک سفر نامہ "آوارگی کا آشنا" اور ایک ناول "دوسرا کیول"، ان کی دیگر تصانیف میں شامل ہیں۔ دلیپ سنگھ ۱۹۲۲ء میں ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے اور ملک کی تقسیم کے بعد سے دہلی میں بس گئے تھے۔ دلیپ سنگھ نے زندگی کا طویل عرصہ وزارت خارجہ میں ملازمت کی بدولت بیرونِ ملک یورپ میں گزارا تھا اور وہ وزارت خارجہ کے جریدہ انڈیا پرسپکٹو کے مدیر تھے جو اردو میں بھی شائع ہوتا تھا۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ مرحوم کی آتما کی شانتی کے لیے دعا گو ہے۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانبدارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

اکتوبر ۱۹۹۶ء جلد ۳۶ شمارہ ۱۰

فی پرچہ	6 / 50
سالانہ	60 / =
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80 / =
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170 /=
〃 (بذریعہ ہوائی ڈاک)	350 /=

اڈیٹر

شاھد علی خاں

صدر دفتر :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۲۵

ٹیلی فون : 6910191

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، اردو بازار ، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ پرنسس بلڈنگ ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس ، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ۔۔ ۱۱ سے شائع کیا ۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

"زمانہ" کی غالبیات — خدا بخش لائبریری پٹنہ — ۱۰۰/-
انشائے صفی اورنگ آبادی — مرتبہ: محبوب علی اخگر — ۴۰/-
اطہر ہاپوڑی حیات و فن شاعری — شاہدہ افضال — ۱۰۰/-
مطالعہ مثنویات مصحفی (تحقیق) — ڈاکٹر سعیدہ وارثی — ۱۰۰/-
ہندستان کی دینی درسگاہیں (کل ہند سروے) ڈاکٹر قمر الدین — ۲۰۰/-
محمد حسین آزاد۔ ایک تحقیقی فنکار — ساحل احمد — ۶/-
گاندھیائی تحریک اور نہرو — ″ — ۶/-
خضر راہ۔ ایک تنقیدی جائزہ — ″ — ۶/-
غالب کی ہندوستانیت — ″ — ۶/-
تاریخ یورپ عہد جدید (۱۵۰۰ تا ۱۸۱۷) سید علی محسن — ۱۷۵/-
مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے علمی و ادبی کارنامے۔
راہی فدائی — ۱۰۰/-
اینقہ (افسانے) ڈاکٹر سید حسن احمد — ۲۰/-
الشفا (طبی ڈائجسٹ) مدیر: سید اعجاز حسین فی شمارہ — ۱۰/-
جدید و جاوداں (شعری مجموعہ) رشید کوثر فاروقی — ۱۰۰/-
ہندوستان کے اردو مصنفین اور شعراء (ڈائریکٹری)
ترتیب: گوپی چند نارنگ، عبداللطیف اعظمی — ۲۰۰/-
ہندوستان اسلام اور مغربی ایشیا (مضامین) پروفیسر محمد شفیع اگوانی — ۱۵۰/-
منصور سبزواری شخصیت اور فن (ادب) ڈاکٹر نسیم الظفر — ۱۵۰/-
حیدرآباد۔ جو کبھی تھا (تاریخ) رئیس احمد جعفری — ۸۰/-
پس انداز موسم (شعری مجموعہ) احمد فراز — ۴۵/-
خواب گل پریشان ہے ″ ″ — ۴۵/-
خود شناسی کی طرف (افسانے) بیدل سرحدی — ۱۲۵/-
سنگ اٹھانے کا حوصلہ ″ رضا الجبار — ۸۰/-
تحقیقی تصورات (تنقیدی ادبی مضامین) ترتیب: پروفیسر عبدالحق — ۳۰۰/-
ترکی کا مرد مجاہد (تاریخ) ثروت صولت — ۷/-
اسلام اور مغرب کی کشمکش (مذہب) سید قطب شہید — ۶۰/-

سرورق —— رشید الدین

ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار (شخصیت) مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم — ۰/-
بالمشافہ (مزاحیہ مضامین) معصوم مراد آبادی — ۶۰/-
جاگتے رہو (افسانے) شردن کمار ورما — ۱۶۰/-
پروفیسر مسعود حسین خاں ایک جامع شخصیت۔ ڈاکٹر خلیق انجم — ۵۰/-
قاضی عبدالغفار ایک ممتاز نثر نگار ″ ″ — ۱۰۰/-
اردو بول چال یعنی لغت الخواتین (لغت) مولانا اشہری — ۲۵۰/-
بڑا دائرہ (مجموعہ خیالی) سمن مچھانوی — ۳۰/-
بہار میں اردو افسانہ نگاری (موازنہ) ڈاکٹر قیام نیّر — ۳۰۰/-
چاچی کا ڈھابہ (ناول) رام لعل — ۱۲۵/-
عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار (تنقید) ڈاکٹر فرزانہ سلیم — ۲۰۰/-
اقبال پر ایک نظر (اقبالیات) سید محمد شاہ — ۵۰/-
منتخب افسانے ۱۹۹۵ء (افسانے) ترتیب: نند کشور وکرم — ۸۰/-
شاہنامہ اسلام مکمل مجلد (عکسی اڈیشن) منظوم اسلامی تاریخ
حفیظ جالندھری — ۱۲۵/-
افعال الاعضاء (حصہ اول) (طب) حکیم خالد زماں خاں — ۲۵۰/-
علم الادویہ حصہ اول، دوم ″ حکیم محمد طاہر محمود بٹ — ۸۰/-
کاشف رموز کیمیا (طب) حکیم عبدالعزیز — ۱۰۰/-
بیاض مسیحا حکیم حافظ اجمل خاں (طب)
مرتبہ: شفاء الملک حکیم محمد قریشی — ۶۰/-
یونانی میڈیکل پریکٹشنر (طب) حکیم محمد رفیق حجازی — ۵۰/-
تشریح المفاصل ″ محمد احمد لاری — ۷۵/-
ذیابیطس قابل علاج ہے ″ حکیم ڈاکٹر مرزا امام الدین — ۱۵/-
یاکمی شاعری (شعری مجموعہ) مظفر حنفی — ۲۰۰/-

مہمان مدیر

رشید الدین
رشید گلشن، سنتوش نگر کالونی
مہدی پٹنم حیدر آباد۔ ۲۸

زبان یا ادب ؟

اردو داں افراد کے لئے ایک لمحۂ فکر

ادب اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ بظاہر زبان و ادب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں بلکہ ہیں مگر ان دونوں میں فوقیت پھر بھی زبان کو حاصل ہے۔ ادب زبان کا رہین منت ہے مگر زبان ادب کی محتاج نہیں، ادب کے بغیر تو زبان قائم رہ سکتی ہے لیکن زبان کے بغیر ادب کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زبان پہلے وجود میں آتی ہے پھر اس کی قواعد اور اس کے بعد ادب پیدا ہوتا ہے۔ ہندستان میں آج بھی آدی باسی علاقوں میں ایسی زبانیں و بولیاں رائج ہیں اور صدیوں سے بولی جاتی ہیں لیکن ان کا کوئی رسم الخط نہیں ہے، ادب تو دور کی بات ہے ان زبانوں میں ان کے گیت ہیں 'کہاوتیں ہیں' ضرب الامثال ہیں۔ یہ جاندار زبانیں ہیں کیونکہ انکے بولنے والے موجود ہیں۔ یہ عوامی زبانیں ہیں کیونکہ انھیں عوام کا تعاون حاصل ہے۔

اس پس منظر میں میں اردو زبان و ادب کی بات کروں گا۔ اردو ایک جاندار شیریں اور میٹھی زبان ہے۔ رسم الخط سے قطع نظر آسان بھی ہے۔ اس کا ادب بھی کافی مالا مال ہے لیکن اب اس زبان کی وہ پوزیشن نہیں رہی جو پہلے کبھی تھی لیکن اردو داں آج بھی اپنے ادبی ورثہ اور زبان پر فخر کرتے ہیں اور بڑی شان سے داغ دہلوی کا یہ شعر دہراتے ہیں :

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ویسے سارے جہان میں اردو کی دھوم تو کبھی نہیں رہی (اور خصوصاً داغ کے دور میں) یہ داغ کی غزل کا ایک مقطع ہے اور غزل کے مقطع میں تعلّی جائز ہے۔ بس اسی کو اردو والوں نے سچ مان لیا اور لگے اسے دہرانے۔ ان ہی شاعر کا اردو کے تعلق سے ایک اور شعر ہے اور خاصا مشہور ہے :

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ا سے شاعر کی کون لوگ مراد ہیں ؟وہ جنھیں اردو نہیں آتی یا وہ جو شاعری میں ان کے
۔ گمان غالب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے ہم عصر شاعروں پر چوٹ کی تھی لیکن آج اس
دوالے بڑے فخر سے دہراتے ہیں گویا جنھیں اردو نہیں آتی یا جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں ان
نکنی کی جائے۔ اگر ایسا ہے تو یہ اردو کے لئے کوئی اچھی بات نہیں۔

دووالوں کو یہ اپنی پدرم سلطان بود (یعنی ہمارے باپ بادشاہ تھے) کے رویہ کو بدلنا ہوگا
سے خود ان کی زبان یعنی اردو کو نقصان ہوگا کیونکہ آج اردو کے وہ حالات نہیں۔ تقسیم ہند
مدی ہونے کو آرہی ہے مگر اردو کے حالات (ہر دو ممالک ہندستان اور پاکستان میں) بد
وتے جارہے ہیں۔ ہندستان میں تقسیم ہند ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد رہی سہی کسر
ں لسانی بنیادوں پر تقسیم (یکم نومبر ۱۹۵۶ء) نے پوری کر دی اور اردو کو ایک ریاست بھی
ویسے بہت سی ریاستوں میں چیدہ چیدہ طور پر اردو والے بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔
۔ کشمیر کے کھاتہ میں اردو کو ڈال دیا گیا جب کہ جموں و کشمیر میں پہلے سے دو زبانیں موجود
ں میں کشمیری اور جموں میں ڈوگری۔ حکومت ہند تو جموں و کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان
فرض سے سبکدوش ہو گئی مگر نہ کشمیری اردو زبان کو پسند کرتے ہیں اور نہ جموں کے لوگ
ندستان میں تقسیم ہند کے بعد اردو ذریعہ تعلیم کا کوئی مدرسہ کسی علاقہ میں نہیں کھلا جب
سے اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس بند ہو گئے کیونکہ اردو پڑھنے والے طلبہ کم ہوتے گئے۔
ں کی بات تو میں نہیں کرتا مگر آندھرا پردیش جو لسانی بنیادوں پر تقسیم کے بعد (مہارا
ناٹک کے علاقوں کو الگ کر کے اور مدراس کے کچھ علاقوں کو ملا کر بنی ہے) اردو کے بہت
ں ختم ہو گئے ہیں جب کہ سابق ریاست حیدر آباد میں نہ صرف بڑے پیمانے پر اردو ذریعہ
مدارس تھے۔ چار انٹرمیڈیٹ کالج اور ایک اردو کی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ بھی تھی جس کا
م انگریزی کر دیا گیا۔

تقسیم ہند سے پہلے ریاست حیدر آباد سب سے بڑی دیسی ریاست تھی۔ اس کے علاوہ
رام پور ' جونا گڑھ اور اودھ کی ریاستیں اردو ذریعہ تعلیم کی ریاست تھیں مگر اب ان
کے علاقوں میں کہیں بھی اردو ذریعہ تعلیم نہیں۔ مجبوراً اردو داں طالب علم علاقائی
ں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح اردو دانوں کی نئی نسل اردو سے نابلد ہوتی جارہی
لک آباد میرا وطن ہونے کی وجہ سے میں مہاراشٹر کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ
والوں کے بچے مراٹھی میڈیم کے مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن اس کے
دوالوں کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ وہ بقول نند کشور وکرم "خوش فہمی یا غلط فہمی"

میں مبتلا ہیں۔

پچھلے کئی سال سے ہندستان میں اردو یونیورسٹی کا غلغلہ سنائی دے رہا تھا حتیٰ کہ گزشتہ سال نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک ابوالکلام آزاد اوپن یونیورسٹی کے قیام کا حکومت سے فیصلہ بھی کرالیا اور اس فیصلہ میں ایک بل بھی پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا لیکن شومئی قسمت سے وہ بل پاس نہ ہو سکا اور حکومت بدل گئی۔ اب موجودہ حالات میں تو اس بل کی پیش کش اور منظوری کے آثار بھی نظر نہیں آتے، ویسے اردو یونیورسٹی کے لیے ہم طلبہ کہاں سے لائیں گے۔ سابق ریاست حیدر آباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا جو تجربہ کامیاب ہوا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ صغیر جماعت سے لے کر انٹر میڈیٹ تک ذریعہ تعلیم اردو تھا اسی لیے طلبہ کے حصول میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

ہندستان میں اردو اخبارات اور رسائل اور کتابوں کا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تجارتی اداروں کو چھوڑ کر لے دے کر ایک مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ہی ہے جو ایک بڑا ادبی پبلشنگ ادارہ ہے اور بس۔ ادارہ ''شمع'' کسی زمانے میں ایک بڑا پبلشنگ ادارہ تھا جہاں سے کتابوں کے علاوہ بچوں کا رسالہ کھلونا خواتین کا رسالہ بانو ایک جاسوسی رسالہ ''مجرم'' اور ایک ماہانہ ڈائجسٹ ''شبستاں'' شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے ایک ادبی پرچے ''افق'' کی اشاعت کا بھی اعلان کیا تھا جو صرف اعلان تک محدود رہا اور اس کے بعد جو اردو کے حالات خراب ہونے شروع ہوئے تو ایک ایک کر کے اس ادارہ سے شائع ہونے والے تمام رسائل بند ہو گئے اور اب کسی بھی وقت اردو والے ''شمع'' کے بند ہونے کا اعلان بھی سن سکتے ہیں کیونکہ انھوں نے اس کا ہندی ایڈیشن ''سشما'' کے نام سے نکالنا شروع کر دیا ہے۔

ایک طرف ٹیکنالوجی میں زبردست ترقی ہوئی اور آفسیٹ کے دور میں داخل ہو کر کمپیوٹر کے دور تک پہنچ گئی لیکن اردو قارئین کی تعداد دن بدن گھٹ رہی ہے جس کے ذمہ دار خود اردو والے بھی ہیں جو کتابیں اور رسالے خرید کر پڑھنا نہیں چاہتے۔ ایسا بھی نہیں کہ ان کی قیمت خرید اس کی اجازت نہیں دیتی بلکہ زندگی کے دوسرے مدات پر تو اردو والے بہت پیسہ خرچ کر دیتے ہیں لیکن کفایت صرف اردو اخبارات ' رسائل اور کتابوں کے معاملے میں ہوتی جا رہی ہے۔ اردو والوں کا یہ وطیرہ بھی ہندستان میں اردو کو بہت نقصان پہنچا رہا ہے۔

ہندستان میں اردو والوں کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز حکومت کرے۔ یہ لوگ اپنے طور پر کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ تقریباً ریاستی حکومتوں نے اردو اکیڈیمیاں قائم کر رکھی ہیں اور مرکزی حکومت کا اردو بورڈ ہے مگر اس کے باوجود وُہی ڈھاک کے تین پات۔ مرکزی اور

ریاستی ان اداروں سے اردو والوں کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا تھا یا انھوں نے اٹھایا نہیں، سوائے اس کے کہ ان اداروں سے اردو کے چند افراد کو روزگار مل گئے۔ ایک اور بات اردو والوں میں پھیلا دی گئی کہ اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے جب کہ دنیا کی بڑی زبانوں میں اس کا نمبر تیرھواں ہے۔ تیسرے نمبر پر تو ہندی ہے جو ظاہر ہے کہ اردو سے ایک الگ زبان ہے۔

ہندی کے ذکر پر یہ یاد آیا کہ ہندستان میں بعض نام نہاد دانشوروں نے یہ مشورہ اردو والوں کو دیا تھا کہ اردو کا رسم الخط بدل کر اسے ہندی یا دیوناگری کر دیا جائے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ دانشوران اردو ہی کے تھے۔ اردو کا رسم الخط اگر دیوناگری کر دیا جائے تو اردو ہندی میں ضم ہو جائے گی اور اس کا الگ وجود ہی برقرار نہیں رہے گا، جب کہ اردو زبان کی سب سے بڑی شناخت اس کا رسم الخط ہی ہے، اس طرح اردو کے ایسے نادان دوستوں سے بھی ہندستان میں اردو کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

اردو والوں کے مسلسل اصرار اور مطالبہ پر اتر پردیش اور بہار میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کا اعلان کیا گیا۔ ایسا ہی اعلان آندھرا پردیش کے اضلاع کے لیے بھی کیا گیا جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن یہ اعلان صرف اعلان تک ہی محدود رہا اور یہ عملی شکل اختیار نہیں کر سکا۔ ویسے انتظامی نقطہ نظر سے یہ ممکن نہیں ہے اسی وجہ سے سابق وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش ڈاکٹر چنا ریڈی نے کہا تھا اور بہت صحیح کہا تھا کہ ''اردو والے درجہ یا نمبر کی بات چھوڑ کر یہ کہیں کہ انھیں کیا مراعات چاہئیں'' اب اتر پردیش میں جن اردو مترجمیں کا دفاتر میں تقرر کیا گیا ہے انھیں کوئی کام نہیں اور ان سے دوسرا سرکاری کام لیا جا رہا ہے۔

یہ تو تھا ہندستان کا حال اب ذرا پاکستان کی طرف آیئے۔ وہاں تو سارے ملک کی سرکاری زبان اردو کو قرار دیا گیا ہے مگر وہاں بھی ابھی تک عملاً کچھ نہیں ہوا ہے اور ہنوز دفاتر میں انگریزی کا رواج یا تسلط ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے جن علاقوں پر مشتمل پاکستان بنایا گیا ہے وہ سرے سے اردو کے علاقے تھے ہی نہیں اور نہ ان علاقوں میں پاکستان کے قیام سے کوئی دلچسپی ظاہر کی گئی۔ یہ تو دلی 'یوپی اور مدھیہ پردیش یعنی وسطی ہندستان کے علاقے تھے جہاں قیام پاکستان کی تحریک چلائی گئی اور پاکستان بننے کے بعد زیادہ تر وہیں کے لوگ پاکستان منتقل ہوئے۔ ریاست حیدر آباد کے انڈین یونین میں انضمام ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کے بعد کچھ حیدر آبادی بھی پاکستان چلے گئے۔

لیکن ان دنوں پاکستان خصوصاً کراچی میں ان کے ساتھ مقامی باشندوں کا کیا سلوک ہے آپ اور ہم اخبارات میں آئے دن پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ اب تو نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ نقل مقام کر کے ہندستان سے پاکستان ہجرت کر کے جانے والوں کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ پہلے

پہل یہ صرف اندرونی حصہ تک محدود رہی لیکن اب تو پاکستانی کھلم کھلا ہندستانیوں کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور محمد علی جناح (بانی پاکستان) کے مزار تک کو کھود کر پھینک دینے کے درپے ہیں اس لیے حکومت کو ان کے مزار پر پہرہ بٹھا دینا پڑا ہے۔ یہی حال کشمیر میں شیخ عبداللہ کے مزار کا ہے۔

اس کی وجہ خود ہجرت کرنے والے ہندستانی بھی ہیں جو وہاں کے قومی دھارے میں شامل نہیں ہوئے اور اپنی الگ شناخت برقرار رکھی بلکہ اپنے اہل زبان ہونے کی دھونس بھی دلائی اور مقامی باشندوں سے ازدواجی رشتے بھی قائم نہیں کیے بلکہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے رکھی۔ یہ بات ایک بار مجھ سے خود حیدر آباد میں جناب سہام مرزا ایڈیٹر ماہنامہ "دوشیزہ" نے کہی اور اس پر اظہار رائے بھی کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کراچی کے حالات اتنے خراب نہیں ہوئے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کا پاکستان میں ایک اردو یونیورسٹی کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور پاکستانی جامعات میں بدستور انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے۔ یوں تو پاکستان سے اردو کے کئی اخبار اور رسالے نکلتے ہیں مگر سوائے ماہنامہ "رابطہ" کے کوئی ایسا نہیں جو بین الاقوامی معیار کا حامل ہو یا اس پر پورا اترتا ہو۔

پاکستان کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے ممالک (خصوصاً) ان کے بڑے شہروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جہاں بڑے پیمانے پر ہندستان اور پاکستان کے باشندے روزگار کے سلسلہ میں وہاں مقیم ہیں۔ ظاہر ہے یہ لوگ اپنی پطھس کے لیے وہاں ادبی جلسے اور مشاعرے وغیرہ کر لیتے ہیں۔ یہ ہندستان اور پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کو بھی بلاتے ہیں۔ اب اس پر ہندستان اور پاکستان کے اردو داں خوش ہوتے رہتے ہیں کہ اردو مشرق وسطیٰ تک پہنچنے لگی ہے حالانکہ ان لوگوں کا قیام وہاں عارضی ہے اور انہیں ایک نہ ایک دن اپنے وطنوں کو واپس آنا ہے۔

ہندستان اور پاکستان میں روزگار کے ناکافی مواقع ہونے اور زیادہ معاشی خوشحالی نہ ہونے کی بناء پر بہت سے ہندستانی اور پاکستانی اردو داں افراد امریکہ، کنیڈا اور برطانیہ کے بڑے شہروں میں مستقلاً آباد ہوئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی طرح یہ لوگ بھی اپنے یہاں جلسہ اور مشاعرے منعقد کرتے ہیں اور کچھ ہندستانی اور پاکستانی شعراء اور ادبا کو وہاں مدعو کرتے ہیں لیکن یہ صورت حال بھی صرف اسی نسل تک محدود ہے۔ ان کے بچے نہ اردو جانیں گے اور نہ اردو کے ایسے جلسے منعقد کریں گے بلکہ رفتہ رفتہ اپنی زبان اور کلچر کو بھول کر ان میں ضم ہو جائیں گے البتہ مذہب پر کاربند رہیں گے وہ بھی برائے نام۔

تو یہ ہے ایک خاکہ ہماری اردو کی عالمی زبان بن جانے کا، اس وقت اردو کے چار بڑے خطے ہیں۔ ہندستان، پاکستان، مشرق وسطیٰ، امریکہ، کنیڈا اور برطانیہ۔ ان چاروں خطوں میں اردو کا

حال آپ پڑھ بھی چکے ہیں۔ اب اس کے بعد بھی کوئی اردو کو عالمی زبان کہہ کر فخر محسوس کرے تو میں کہوں گا کہ وہ رحمتوں کی جنت میں رہتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں اردو کا کوئی دشمن نہیں بلکہ ایک بہی خواہ ہوں۔ اردو کا ادیب ہوں، صحافی اور معلم بھی رہ چکا ہوں اور ۳۵ سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت آندھرا پردیش کے ایک سرکاری دفتر محکمہ ترجمہ میں اردو کا مترجم رہ کر حال ہی میں ملازمت سے سبکدوش ہوا ہوں اور آج جو کچھ ہوں اسے اردو کی دین ہی سمجھتا ہوں۔

لیکن میں حقیقت پسند انسان ہوں، حالات کا دماغ میں تجزیہ کرتا رہتا ہوں اور خدا نے مجھے تعلیم کی وجہ سے شعور کی تھوڑی سی دولت بھی عطا کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اردو کے ایک ہندو شاعر ببانگ دہل کہتے ہیں کہ اردو ان کی اور ان کے خاندان کی زبان ہے۔ کیا وہ مردم شماری کے خانہ میں بھی اپنے خاندان کی مادری زبان اردو ہی لکھواتے ہیں؟ میں یہاں شخصی طور پر کسی کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن ایک بات ذہن میں آ گئی تو لکھ گیا۔ بہتر ہو گا کہ وہ صاحب خود اس کی توثیق کر دیں۔

حاصل مطلب یہ کہ آج اردو پر برا وقت آ پڑا ہے اور ہندستان اور پاکستان دونوں اس کی لپیٹ میں ہیں، ایسی صورت میں ہمیں اردو ادب کا اور اس کے ذخیرہ کا ڈھنڈھورہ پیٹنے کی بجائے اردو کی بقاء اور ترقی کے لیے کچھ کرنا چاہیے ورنہ اگر اردو زبان ہی نہیں رہے گی تو اس کے ادب کو کیا آپ اور ہم گھول کر پئیں گے؟ ایسا بھی نہیں کہ زبانیں مرتی نہیں۔ کیا لاطینی، عبرانی، پالی اور سنسکرت کا کہیں وجود ہے؟ اب یہ الگ بات ہے کہ اس کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے لیکن اگر بروقت اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی تو حالات مزید خراب ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں عابد علی خاں ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد اچھی خدمات انجام دے رہا ہے اور اردو پڑھانے اور سکھانے کی ان کی تحریک حیدر آباد اور اس کے گرد و نواح سے نکل کر اب شمالی ہند میں بھی پہنچ گئی ہے اور غیر اردو داں افراد اور اردو والوں کی نئی نسل ان کے مرتب کردہ نصاب سے استفادہ کر رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسی تحریک حیدر آباد کے علاوہ دوسرے علاقوں اور شہروں میں بھی شروع کی جائے اور اردو کو نئی نسل تک پہنچانے کا کام انجام دیا جائے ورنہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ اردو میں صرف ادیب اور شاعر رہ جائیں گے اور قاری غائب ہو جائیں گے۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ زبان ادب سے مقدم ہے اور زبان ہے تو ادب ہے۔ ہمیں نہ صرف اپنی زبان کا تحفظ کرنا ہو گا بلکہ اس کی توسیع و ترویج بھی کرنی ہو گی۔ اس وقت ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم اردو کے بہی خواہ ہیں اور اردو ایک عظیم ادبی سرمایہ کی مالک ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد
شعبۂ اردو
راجستھان یونیورسٹی
جے پور

باغ و بہار کا ایک قدیم مخطوطہ

اردو کی جن کتابوں کو غیر معمولی شہرت ملی، ان میں باغ و بہار کا نام سر فہرست ہے۔ کتاب پہلی بار ۱۸۰۴ء میں طبع ہوئی، تب سے آج تک اس کی "سر سبزی" قائم ہے۔ اس وجہ مقبولیت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کے خطی نسخے تعداد میں زیادہ نہیں اور جن دو چار نسخوں حوالہ ملتا بھی ہے ان تک رسائی آسان نہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ نامور محقق جناب رشید حسن خان نے ۱۹۹۲ء میں برسوں کی محنت شاقہ کے بعد جب باغ و بہار کو از سر مرتب اور شائع کیا تو انھیں اس کے چار سے زیادہ خطی نسخوں کا علم نہیں ہو سکا۔ ان میں بھی تین نسخے ایسے ہیں جن کا ذکر صرف کتابوں تک محدود ہے۔ البتہ وہ خطی نسخہ جو لندن میں محفوظ ہے ا جس کا تفصیلی تعارف رشید حسن خان نے اپنے مرتبہ باغ و بہار کے مقدمہ میں کرلیا ہے، بعض اعتبار سے اہم ضرور ہے، مگر اس میں ان کے بقول "ترقیمہ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ "یہ مخطو کس نسخے کی نقل ہے"۔

رشید حسن خان نے اپنے پیش نظر خطی نسخے کی قدامت ثابت کرنے کے لیے اول تو اس تقابل باغ و بہار کے ان ۱۰۲ صفحات سے کیا جو کلکتہ سے ۱۸۰۲ء میں طبع ہوا اور جسے عرف عام میں ہندی مینول، یا باغ و بہار کی پہلی روایت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس تقابلی مطالعے میں وہ اس نتیجہ پہنچے کہ زیر تعارف خطی نسخہ کا متن کسی ایسے نسخے پر مبنی ہے جو نظر ثانی (طبع اول ۱۸۰۴ء)۔ پہلے کا نسخہ تھا اور یہ وہی نسخہ تھا (یا اس نسخہ کی نقل تھا) جس پر ہندی مینول کا متن بنی تھا(۱) ا چونکہ انھیں تقابلی مطالعہ کے دوران ہندی مینول اور اس خطی نسخے کے متن میں بھی جا بہ اختلافات نظر آئے اس لیے ان کا خیال ہے کہ :

"..... خطی نسخے (یعنی مخطوطۂ لندن) کے کاتب کے سامنے اس کتاب کی دو روایتیں تھیں۔ ایک وہ جسے پہلی روایت کہنا چاہیے اور نسخہ "م" (ہندی مینول) جس پر مبنی ہے اور دوسری روایت جو نظ ثانی (طبع اول) کے بعد مرتب ہوئی۔ "ن" (یعنی مخطوطۂ لندن) کے کاتب نے بنیادی طور پر تو پہ

ا۔ باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں ص ۴۷

بت کو سامنے رکھا ہے اور بعض مقامات پر نظر ثانی شدہ روایت سے بھی کام لیا ہے اور عبارت
ہ کو نظر ثانی شدہ روایت سے نقل کیا ہے۔(۱)

اس طرح ترقیمہ کی عدم موجودگی میں بھی رشید حسن خان نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کے
نظر جو خطی نسخہ ہے وہ طبع اول کے بہت بعد کا نہیں اور یہ کہ ان کا متن پہلے درویش کی سیر کے
یا اختتام تک تو روایت اول سے مطابقت رکھتا ہے اور چند اختلافات کے باوجود باقی حصہ باغ و
کی اس روایت پر مبنی ہے جو ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج سے طبع ہوا۔ یوں رشید حسن خان کے
یک اس نظر ثانی شدہ طبع اول کی اہمیت دیگر نسخوں سے زیادہ ہے۔ انھوں نے اسی نسخے کے متن
پنے مرتبہ باغ و بہار کی بنیاد رکھی ہے اور اسے اساسی نسخہ متصور کرتے ہوئے نسخہ "ک" کا نام دیا
۔ اس نسخہ "ک" کی بڑی خصوصیت رشید حسن خان نے یہ ظاہر کی ہے کہ جان گل کرسٹ کی زیر
نی مرتب اور شائع ہوا اور اس میں فہرست مضامین کے علاوہ ایک غلط نامہ بھی شامل تھا، یہی
اس نسخہ "ک" میں اس 'نظام املا' کی پوری پابندی نظر آتی ہے جسے گل کرسٹ نے رائج کرنے
عی کی مگر چونکہ غلط نامے کے باوجود بھی اغلاط کتابت در آئی تھیں' اس لیے ان کی تصحیح کے لیے
ں نے ذیل کے چار نسخوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے:

نسخہ "ن" (خطی نسخہ لندن)

نسخہ "م" (ہندی مینول مطبوعہ ۱۸۰۲ء)

نسخہ "ف" (باغ و بہار مرتبہ ڈنکن فاربس ۱۸۴۶ء)

نسخہ "ع" (باغ و بہار مرتبہ عبدالحق ۱۹۴۴ء

مذکورہ بالا چار مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے جناب رشید حسن خان نے تدوین
کا جو مثالی کارنامہ انجام دیا ہے اس کا اندازہ اس طویل اور بے حد وقیع مقدمے کے علاوہ ان ضمیمہ
سے بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جو اس کتاب میں شامل ہیں۔ انھوں نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا ہے کہ
کا مرتب کردہ باغ و بہار کا متن منشائے مصنف کے عین مطابق ہے' مگر ان کی تمام تر کوشش یہی
ہے کہ اردو کے اس کلاسیکی متن کو اس طور مرتب کر دیا جائے کہ اس میں کوئی نقص باقی نہ
ے، آیندہ رشید حسن خان کے مرتبہ باغ و بہار کو نسخہ جدید یا صرف 'ذ' سے تعبیر کیا جائے گا۔

فسانہ عجائب کے بعد باغ و بہار کی تدوین نو کا کام رشید حسن خان نے جس دقت نظر اور
قی انداز میں انجام دیا ہے' اس کی جتنی ستایش کی جائے کم ہے مگر حواشی اور مختلف ضمیموں سے
نظر باغ و بہار کا موجودہ متن اب بھی بعض مقامات پر تصحیح طلب معلوم ہوتا ہے' یہی نہیں اس

و بہار مرتبہ رشید حسن خان ص ۷۳، مطبوعہ ۱۹۹۲ء

نسخۂ جدید کا متن اس خطی نسخے سے نہایت مطابقت رکھتا ہے جس کی تقریب کے سلسلے میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اور جسے آیندہ نسخۂ جے پور کہا جائے گا۔ یہ نسخۂ جے پور بنیادی طور پر تو طبع اول سے مطابقت رکھتا ہے، مگر طبع اول کی وہ اغلاط کتابت جس کی نشاندہی رشید حسن خاں نے کی ہے، ان سے یہ نسخہ مبرا ہے۔ یہی نہیں ان دونوں کے تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'ک' کے برخلاف نسخۂ جے پور کا متن نہ صرف حسن بیان بلکہ بعض لفظوں کے استعمال کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نسخۂ جدید (جو چار مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے) کے متن سے تقابل کے بعد جس نتیجہ پر بہ آسانی پہنچا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ "د" کا متن بھی تمام تر خوبیوں کے باوصف نسخۂ جے پور کے متن سے (چند مستثنیات سے قطع نظر جن کی نشاندہی (ذرا آگے چل کر کی جائے گی) لفظ بہ لفظ مطابقت رکھتا ہے اور جن مقامات پر اختلاف نظر آتے ہیں ان کا سبب "د" کے مرتب کا نسخہ 'ک' یا پھر 'ف' اور 'ع' جیسے نسخوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر لینا ہے۔ ان سب کی تفصیلات بعد میں پیش کی جائیں گی۔ یہاں نسخۂ جے پور سے متعلق چند بنیادی باتیں۔

باغ و بہار کا نسخۂ جے پور ۱۲۴۲ء کا مکتوبہ ہے، اس کا متن ہر اعتبار سے مکمل اور خط نستعلیق ہے۔ کاغذ نسبتاً باریک ہے مگر اس میں اب خستگی کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔ پورا متن ۱۳۰ اوراق (یعنی دو سو ساٹھ صفحے) پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں "فہرست باغ و بہار" درج ہے اور آخر میں ذیل کا ترقیمہ۔

"تحت الکتاب بعون الملک الوہاب بتاریخ دہم (۱۰) شہر شوال ۱۲۴۲ ہجری بنوی صلی اللہ علیہ وسلم در چھاونی ہانسی وقت ملازمی کمپنی بہادر وقت شب بپاس خاطر قرۃ العین احسان علی طال عمرہ و زاد علمہ سمت اتمام و صورت اختتام یافت۔ کاتب عاصی پر معاصی خاکسار امام علی اسدی غفر اللہ لہ و الدیہہ و احسن الیہما والیہ ۔

این نوشتم بر کتاب دلفروز مالکش اللہ تحویلم دو روز

مخطوطے کا ہر ورق ترک سے شروع ہوتا ہے۔ کاتب کا خط اتنا صاف اور واضح ہے کہ پورے متن میں کسی لفظ کے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، مزید برآں غلط نویسی سے احتراز کی حتی الامکان سعی کاتب کی احتیاط پسندی کا مزید ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لکھنے میں ذا اور زے کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھنے کے علاوہ کوئی لفظ یا فقرے کا کوئی ٹکڑا سہواً درج ہونے سے رہ گیا تو کاتب نے '۲' یا 'ٹ' کا نشان بنا کر از سر نو اسی سطر میں یا پھر حاشیے میں انھیں لکھا ہے۔ یہی صورت بعض ان الفاظ کی ہے جن کی کتابت میں کوئی نقص واقع ہو گیا۔

مخطوطے میں ایسے تمام الفاظ کو حاشیے میں پہلے سے زیادہ واضح طور پر لکھا گیا ہے۔ ذیل کی مثالوں سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ یہ واضح رہے کہ ایسی تمام مثالوں میں نسخۂ جے پور کے اصل املا کو پیش نظر رکھا گیا ہے :

(الف) ا۔ "پادشاہ ظل اللہ کی بہی ملازمت حاصل ہوئی۔۔"

۲۔ "اور بولی پہلی ہمکو شہزادی غایب"

۳۔ "دل کی بہلانی کی لیٔ خاطر"

۴۔ "جو عرض کیا"

۵۔ "اپنی ساری پادشاہت مجہی دی تو اس پر بہی نہ تہوکوں اور نہ دہارن ماروں" (حاشیے میں 'دہار' پرن کا نشان بنا کر دَہر لکھا گیا ہے) اسی طرح ایک جگہ 'ازدحام' کو ذ سے لکھنے پر غلطی کا احساس ہوا تو اسے کاٹ کر اس کے اوپر ز لکھ دیا ہے۔ غلط نویسی سے بچنے کا غالباً یہی میلان تھا جس کے سبب مخطوطے میں اعراب بھی لگائے گئے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ کہیں لفظ کے تمام حرفوں پر حرکات ملتی ہیں تو کہیں صرف ایک یا دو حرفوں پر مثلاً

(ب) چو جگی۔ مہر۔ بہر وَر۔ اکابر۔ پہر۔ فرخ۔ مصمم موذّب۔ جو کچہہ ہوا سو ہوا۔ نول۔ دِہری۔ حدِ نہایت۔ ہکا بکا۔ تتر بتر۔ اِلماس۔ مبارک کو مناوَنا کر۔ جز بز۔ آپ ہوا ہوا۔ تزک۔ قوال۔ مسلط۔ امنا۔ تصدّق۔ بت کہاوء۔ اِصفہان۔ منّت۔ تنفس۔ معین۔ گن گنا کر۔ اِنعام واِکرام۔ خوشگوئی۔ متکلم۔ وغیرہ

(س) مخطوطے میں یائے معروف و مجہول کے امتیاز کو عام طور پر برقرار نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی ایسی کوئی علامت پائی جاتی ہے جس سے پڑھنے والے کو صورت حال کا اندازہ ہو سکے :

" خدانی تمہیں یہ کمال دیا ہی کہ اِس مسافر پر مہربانی کرو غریب خانی تشریف لیچلو اُس کو دیکہو اگر زندگی ہوئی تو تمہیں بڑا جس ہو گا اور میں ساری عمر غلامی کرونگا۔۔۔"

(ج) اِس 'اُس یا اِن اور اُن کے الف پر عموماً زیر یا پیش موجود ہے 'البتہ وہ جملۂ معترضہ جنھیں ک کی مطابقت میں رشید حسن خان نے بھی قوسین میں لکھا ہے 'اس خطی نسخے میں موجود نہیں۔ یہاں مختلف اوراق میں ایسے الفاظ ضرور موجود ہیں جنپر سرخ روشنائی سے ڈوئی کا نشان بنایا گیا ہے 'اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ کاتب یہاں سے نیا پیراگراف شروع کرتا ہے۔ یہ پیراگرافنگ ک سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔

(د) ک کی طرح زیرِ نظر خطی نسخہ میں ایک "فہرست عنوانات" بھی ہے 'مگر غلط نامہ نہیں۔ یہ غلط نامہ فاربس کے مرتبہ باغ و بہار میں بھی نہیں ہے 'یہاں اس کے برعکس ایک مبسوط فرہنگ ہے۔

نسخۂ ج پور میں ایسی کوئی فرہنگ تو نہیں البتہ بعض الفاظ کے معنی حاشیے میں درج ہیں مثلاً بجھری (دمیں بجھرے) بمعنی ظرف آب گرم اور دبھکا (دمیں بکھنا) بہ معنی تماشا و تقلید و نقلہائے بازیگراں وغیرہ۔

اس کے علاوہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ک کی طرح نسخۂ ج پور میں بھی مضامین کی فہرست ہے مگر ک کے بر خلاف یہ آغاز متن میں ہے۔ یہی نہیں ان دونوں کے تقابل سے پتہ چلتا ہے کہ نسخۂ ج پور کے عنوانات نہ صرف تعداد بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی مختلف ہیں۔ ذیل میں یہ عنوانات درج کیے جاتے ہیں:

"فہرست کتاب باغ و بہار

مندرجہ بالا فہرست کے مطابق عنوانات یا مضامین کی مجموعی تعداد ۲۲ ہے، جبکہ ک میں یہ صرف آٹھ ہے۔ ان میں سے تین عنادین یعنی سبب ترجمہ میں، احوال مترجم میں اور اردو کی حقیقت میں اصلاً متن میں شامل ہیں، جبکہ حمد اور نعت کے عنوانات جو فہرست میں ہیں مگر متن میں انھیں لگ سے درج نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح آغاز قصہ کا جو عنوان نسخۂ ج پور میں ہے، اصل متن میں اس کا عنوان یہ ہے: "شروع قصی کی، ک میں یہ عنوان اس طرح ہے: شروع قصے میں، یہی فاربس کے نسخے میں بھی ہے۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پہلے درویش کی سیر کا جو عنوان نسخۂ ج پور میں ہے (یعنی "پہلے درویش کی سیر میں") وہ ن، ک، ف، اور ع جیسے نسخوں سے مختلف ہے، ان چاروں میں یہ عنوان اس طرح ہے: سیر پہلے درویش کی۔ ک میں دوسرے درویش کا

عنوان یہ ہے : سیر دوسرے درویش کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی نسخۂ جے پور سے مختلف ہے۔ دوسرے اور تیسرے درویش کی داستان کے درمیان بصرہ کی شہزادی، شاہ نیمروز، آزاد بخت اور خواجہ سگ پرست کے علاوہ بارہ لعلوں کی حقیقت کا جو قصہ ہے اسے نسخہ ء جے پور کی فہرست میں باقاعدہ عنوانات سے ظاہر کیا گیا ہے لیکن اصل متن میں بہ تغیر الفاظ صرف ایک عنوان کو جگہ دی گئی ہے' اور وہ عنوان یہ ہے :

حقیقت بارہ لعل کی' ظاہر ہے یہ اصل عنوانِ فہرست سے مختلف ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ چاروں عناوین میں سے ایک عنوان یعنی 'آزاد بخت کے احوال میں' ایسا ہے جو اختلافِ نسخ کے ساتھ ف اور ع کے متن میں تو نظر آتا ہے 'مگر ک میں نہیں۔ رشید حسن خان کی صراحت کے مطابق ک کی فہرستِ مضامین میں اسے یوں درج کیا گیا ہے : بادشاہ آزاد بخت کی حکایت میں 'ن میں یہ عنوان اس طرح ہے : قصہ آزاد بخت بادشاہ کا، اس مقام پر رشید حسن خان نے ف کی مطابقت اختیار کی ہے کہ وہاں یہی عنوان موجود ہے۔ نسخۂ جے پور کی فہرست میں تیسرے درویش کی سیر کے تحت نعمان سیاح اور بہزاد خاں کے قصہ کو علاحدہ عنوان دیا گیا ہے 'مگر متن میں یہ عنوانات موجود نہیں۔ ک کی فہرست میں بھی یہ عنوانات نہیں اور نہ ہی کسی دوسرے نسخے کے متن میں یہ عنوانات پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جے پور کے نسخے میں جہاں جہاں کبت آئے ہیں' وہ مذکورہ بالا عنوانات کی طرح سرخ روشنائی سے درج کیے گئے ہیں۔ مزید بر آں متن میں فارسی اور اردو کی تمام کہاوتوں اور محاوروں پر سرخ روشنائی سے ہی واضح خط کشید کیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ یہ کوئی کہاوت (یا محاورہ) ہے۔

ابتداً ذکر کیا گیا ہے کہ نسخۂ جدید (باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خاں) اور جے پور کے مخطوطے میں اختلاف نسخ بھی پائے جاتے ہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ک (جس کے متن پر نسخۂ جدید بنی ہے) اور نسخۂ جے پور کے درمیان بھی یہ اختلافات موجود ہونا چاہیں۔ دونوں کے تقابل سے اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ یہاں اس کی بعض نمایاں مثالیں ملاحظہ ہوں۔ 'د' (یعنی نسخۂ جدید) کے ص ۲۴۳ پر ایک جملہ اس طرح درج ہے :

"اور شولا اور غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نوالہ کھلاتا۔۔۔۔۔۔"

یہاں شولا (بہ معنی کھچڑی جو اسقدر پکائی جائے کہ حریرہ کے مانند ہو جائے) کے ساتھ غذا محل نظر بلکہ یکسر غلط بھی ہے۔

رشید حسن خاں نے ضمیمے میں صراحت کی ہے کہ ک میں 'غذا' کی جگہ پر "اوغزا" ہے جو طباعت کی غلطی ہے۔ 'اوغزا' کو غلطی طباعت مان کر تھوڑی دیر کے لیے شولا کو نظر انداز کر دیجیے

اور محولہ بالا فقرہ پھر پڑھیے یعنی : غذا اپنے ہاتھ سے پکا کر کوئی نوالہ کھلاتا۔ کیا غذا پکانا خلاف محاورہ اور یکسر غلط انداز بیان نہیں ہے ؟ آصفیہ میں لفظ 'اوگرا' موجود ہے اور لغات کبیرہ (حصہ دوئم) معروف بہ لغات الادویہ میں اسے 'اگرا' اور "اوگرہ" دونوں صورت میں درج کرتے ہوئے اسے ہندی الاصل قرار دیا گیا ہے، اور جو معنی لکھے گئے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ 'اگرا یا اوگرہ مریضوں کے لیے ایک غذائے رقیق کا نام ہے جو چاول، مونگ اور گرم مسالوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اس معنی میں شولا اور اوگرا کا تعلق ظاہر ہے۔ باغ و بہار میں جہاں یہ دونوں الفاظ آئے ہیں، وہاں حکیم اور اُس کے نسخے کا بھی ذکر ہے۔ ک کے بر خلاف نسخۂ جے پور میں اس مقام پر 'اوغرا' ہے اور یہ اصل سے قریب تر ہے، ممکن ہے کہ بول چال کی سطح پر اوغرا بھی مستعمل ہو، یوں بھی گ کا غ میں بدل جانا (بول چال میں) قرین قیاس ہے۔

لفظ نیک 'د' میں دو جگہوں پر اس طرح آیا ہے :

"اتنی محنت کچھ نیک نہ لگی' (ص ۲۲۲)۔ ہماری محنت نیک لگی' (ص ۲۳۶) آصفیہ اور نور دونوں میں نیگ لگنا کی موجودگی کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رشید حسن خان نے اسے میر امن کے مختارات میں شمار کیا ہے۔ نسخۂ جے پور میں بھی مذکورہ دونوں فقروں میں 'نیگ' واضح تر انداز میں لکھا ہے۔

'د' میں ہی ص ۲۲۶ پر ایک فقرہ ہے :

"......ایک کاغذ دستی سے نکال کر'

رشید حسن خان کی صراحت کے مطابق ن میں دستی کی جگہ پر "دستگی' ہے یعنی ک 'ف اور ع جیسے نسخوں میں اس مقام پر 'دستی' ہی ہے۔ نسخۂ جے پور میں یہ لفظ ن سے مطابقت رکھتا ہے یعنی : "ایک کاغذ دستگی سی نکال کر"

'د' میں ہی ایک جملہ اس طرح لکھا ہے :

"......وُہی بادل پھر آیا اور ایک پنگھولا جڑاؤ 'موتیوں کی توڑ پڑی ہوئی لایا......' (ص ۲۴۱)

نسخۂ جے پور میں پنگھولا کی جگہ پنگھوڑا ہے۔ پنگھوڑا ن 'ف 'م اور ع میں موجود نہیں۔ آصفیہ کے مطابق یہ لفظ پنگوڑا (ہائے ہوز کے بغیر) ہے 'ممکن ہے کہ بول چال میں اسی کی ایک صورت پنگھوڑا بھی ہو۔ یوں بھی صوتی اعتبار سے پنگوڑا اور پنگھوڑا میں زیادہ فرق نہیں۔

تقریباً یہی صورت لفظ 'ڈھاڑس' کی ہے۔ 'د' میں اسے ڈھارس لکھا گیا ہے۔ رشید حسن خان کی صراحت کے مطابق ف کے متن میں اسے ڈھاڑس (مع رائے ثقیلہ) لکھا گیا ہے 'نسخۂ جے پور میں ان سب نسخوں سے مختلف اس لفظ کی صورت یہ ہے :

...باری خرد مندوزیر کی ایسی ایسی عرض معروض کرنی سی آزاد بخت کی دلکو ڈہاڑہس بندہی..."

مزید مثالوں سے قطع نظر کی جاتی ہے لیکن یہ لکھدینا ضروری ہے کہ ایسی مثالیں بڑی تعداد ں موجود ہیں' یہاں باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خان اور نسخۂ جے پور کے چند مزید اختلافات نسخ کی ثاندہی کی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہو سکے گا کہ نسخۂ جے پور متنی اعتبار سے ک اور ف سے کتنا تلف ہے:

غ و بہار مرتبہ رشید حسن خان		نسخۂ جے پور مکتوبہ ۱۲۲۴ھ
۔..... موت ملک کی ہو گی	ص ۹	"..... ہو گی' ندارد
۔..... زار بہ زار رونے اور دبلا پے سے	ص ۱۳	"..... ڈبلانی (دبلانے)
ا۔.... شاید ان مردوں کے وسیلے سے	ص ۱۸	"..... مرُوں.....
ا۔.. گماشتے خرید و فروخت کے واسطے	ص ۲۰	"..... 'فروخت' ندارد
۔..... ضیافت قبول کرنی سنت رسول کی ہے	ص ۳۲	"..... سنت رسول اللہ.....
۔..... سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے	ص ۴۸	"..... خدا کے' ندارد
۔..... صراحی شربت کی تکلف سے بنا کر' برف میں لگا کر لڑکے ہاتھ لوا کر آیا	ص ۴۹	"..... تکلف سے بنا برف میں لگا لڑکے.....
۔..... تب اچھی اچھی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ بلکہ آہ اوہی بھی کرنے لگا	ص ۴۹	"..... 'تب' ندارد..... بلکہ آہ اوہ بہی کرنی لگا
۔..... جیسے شام کو شفق پھولے ہے	ص ۵۵	"..... 'شام کو' ندارد
ا۔ ..... سر سے پانو تک جو گذرا تھا راست کہہ سنایا	ص ۷۲	"..... 'راست' ندارد
۔..... پان سو اشرفی کے بدلے پان پان سے	ص ۷۲	"..... کی بدلی پان سی
ا۔ ..... آدمی ہزاری اور بزاری نظر پڑے	ص ۹۷	"... 'اور' ندارد
ا۔..... کیا جانے پیر پیرائی	ص ۱۰۱	"..... پیڑ پرائی
ا۔ ..... وہ اونچا ہوتا جاتا تھا	ص ۱۰۳	"..... ہو جاتا تھا
ا۔ ..... چڑھواں جوتا اڑایا	ص ۱۰۷	"..... جوتا اڑیایا
۔ ..... پری کو جان کی طرح بغل میں لے آیا	ص ۱۱۱	"..... بغل میں لیا
ا۔..... جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے اور ہے سنا، سنو	ص ۱۱۶	"..... میں بنا، سنو
ا۔..... آزاد بخت نے اپنا احوال شروع کیا	ص ۱۱۲	"..... احوال کہنا شروع کیا

۱۹۔....ہاتھ کے تھوڑا ہوا	ص ۱۴۱	"......تھوڑا......
۲۰۔....اوپر سے کتے نے ہمیشہ یہ احوال	ص ۱۴۶	"..... ہمیشہ' ندارد
۲۱۔..... آخر اُس کو پہاڑ ہی پر لے آیا	ص ۱۴۷	"....پہاڑی......
۲۲۔ .... میں نے کہا تم جو کھاتے ہو کیا ہو جو مجھے بھی تھوڑا سا دو	ص ۱۴۶	"میں نی کہا تم جو کہاتی ہو کیا ہی جو ہو سو مجھی بہی.....
۲۳۔.... سونے کے وقت گھر میں جاتا۔ تین برس تک اُن کی خاطر داری میں گذری اور اُن سے بھی کوئی حرکتِ بدواقع نہ ہوئی کہ باعث رنجیدگی کا ہووے جو میں سوار ہو کر کہیں جاتا تو یہ گھر میں رہتے۔ اِتفاقاً وہ بی بی۔۔۔	ص ۱۵۳	"سونی کی وقت گہر مین جاتا تو بہی گہر مین رہتی اتفاقاً وہ بی بی.....
۲۴۔..... کوتا کھترا دیکھنے لگی	ص ۱۵۹	"....کوتا کتہرا ...
۲۵۔.....جو جہاز عجم کی طرف چلے' مجھے خبر کیجیو	ص ۱۶۳	"....'مجھی' ندارد
۲۶۔....اور سب پنڈوں کے تقسیم کرنے کی خاطر	ص ۱۷۵	"....'پنڈوں' ندارد
۲۷۔.... خلقت مبارکباد کہتی ہوئی	ص ۱۸۷	"....مبارکبادی ....
۲۸۔.... عطر پان دے کر خواجہ کو رخصت کیا	ص ۲۰۰	"....خواجہ سرا....
۲۹۔..... چھاتی پر سانپ پھر گیا	ص ۲۲۰	"....پہرنی (پھرنے) لگا
۳۰۔.... میرے ذبح کرنے اور گاڑ دینے کو	ص ۲۲۱	"......گاڑنی کو
۳۱۔.....نزدیک جا کر سلام کیا۔ مہربانگی سے	ص ۲۲۴	"....مہربانی.....
۳۲۔....وہ اندر بیٹھا' میں باہر کا باہر کھڑا	ص ۹۷	"....میں باہر کہڑا رہ گیا
۳۳۔.....وہ نازنین۔ سفید رومالی اوڑھے ہوئے سادی خوزادی بن گہنے پاتے بنی ہوئی	ص ۳۶ ص ۶	"....وہ نازنین.... سادی خوزادی کہ زیور شکل سادی.....
۳۴....یہ سلطنت اور تم نے پیدا کی' ایک ذرا میں ہاتھ سے نکل جائے گی	ص ۱۴	"....یہ سلطنت.... ایک ذری میں....

۳۵۔۔۔۔ پھٹی اور توبزہ ہے	ص ۱۸۱	"..... توبرہ .....
۳۶۔۔۔۔ اسے توبزے میں بھر کر	ص ۱۸۱	"....توبری .....
۳۷۔۔۔۔ اُس نازنین کا حسن و جمال دیکھ کر مرجھا گیا	ص ۱۹۷	"..... مرچھا .....
۳۸۔۔۔۔ اُس کی جانگ سے یہ تیر	ص ۱۹۲	"..... جانگھ .....
۳۹۔۔۔۔ مند جائے چشم عاشق تو بھی وہ منہ نہ کھولے	ص ۱۹۷	"....تو بھی تو منہ .....
۴۰۔۔۔۔ ایکبارگی کھڑکی نمود ہوئی	ص ۲۲۱	"....گھرکی ..... (گھرکی نمود ہوئی)
۴۱۔۔۔۔ اُس نے ڈھیر سی تسلی دی	ص ۲۳۷	"..... 'بہت' .....
۴۲۔۔۔۔ جو میرے حق میں بھلا ہو سو کر، میری تسلی کر کے		"...... میری تسلی کر کہا
۴۳۔۔۔۔ کنچیاں روپے سونے کی کمر میں لٹکتیں ہوئیں	ص ۸۳	".... لٹکتی ہوئیں
۴۴۔۔۔۔ روزہ کھولنے کے وقت ایک چھہارا کھاتے اور تین گھونٹ پانی پیتے	ص ۱۱	".... 'کھاتے' ندارد
۴۵۔۔۔۔ اسی طرح سے یے چاروں نقش دیوار ہو رہے	ص ۱۸	"....'سے' ندارد
۴۶۔۔۔۔ شہر کے آیا، تھوڑی سی دور رہا تھا۔	ص ۲۷	"....'سی' ندارد
۴۹۔۔۔۔ سارا احوال مول تول کا اور مہمان کے بجد ہونے کا کہہ سنایا	ص ۳۲	"..... 'تول' ندارد
۵۰۔۔۔۔ مندیں لگیں ہیں	ص ۳۶	"....لگی نہیں
۵۱۔۔۔۔ یہ کیا تھا اور کیا ہوا	ص ۳۹	"....کیا ہو گیا

میرا خیال ہے کہ اثبات مدعا کے لیے یہ مثالیں کافی ہیں، ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نسخہء جے پور کا متن پوری طرح طبع اول سے مطابقت نہیں رکھتا، یہی بات ہندی مینول اور نسخۂ جے پور یا ان اور نسخۂ جے پور کے تقابل کے بعد کہی جا سکتی ہے۔ اوپر جو مثالیں درج ہیں ان سے

بعض م لورن کے اختلافات کو بھی ظاہر کرتی ہیں لیکن اس کی مزید تفہیم کے لیے صرف ہندی مینول اور نسخۂ لندن سے چند نمایاں فرق پر غور کرنا مناسب ہوگا۔ یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ نسخۂ جے پور میں "میرامن کی عرضی" نہیں ہے :

نسخۂ جے پور

۱۔... کہ جس بات میں نہ دم مار سکی چپکا ہو رہی ~

۲۔.... ~ جس کا ثانی اور مقابل ہی نہ ہو دیگا کبھو

۳۔.... ایسی یکتا کو

۴۔.... لیکن اتنا جانتا ہوں خالق ورزاق ہی وہ

۵۔.... درجہ رسالت کا دیا ~

۶۔.... ہندوستانیوں سی گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو بہ آگاہی تمام انجام دیں اس واسطے کتنی کتابیں اسی سال بموجب فرمایش کی تالیف ہوئیں جو صاحب دانا

۷۔.... یہ قصہ ہمیشہ کہتی اور بیماریوں میں حاضر رہتی

۸۔.... یہ قصہ فارسی میں مروّج ہوا

۹۔.... نجیبوں کی قدر دان جان گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہی

نسخۂ م لورن

"....کہ جو بات عقل میں نہ آوے.....GHUZUL(م)

"....جس کا ثانی اور مقابل آج تک پیدا نہیں (م)

(اور یہی ن میں بھی ہے)

"....ایسے واحد کو (م لورن)

".....اس زمانے میں بھی بعضے مرد ہیں جوہر شناس (م۔ن)

"....م میں اس کے فوراً بعد UBYAT ہے لورن میں بیت 'نسخۂ جے پور میں صرف ~ کا نشان ہے

"....باہم گفت و شنود کریں اور ملکی کام کو انجام دیں' چنانچہ یہ کتاب اسی سال بموجب فرمایش کے تالیف ہوئی جو صاحب دانا (م۔ن)

"....بیمارداری کی خدمت۔ (م۔ن)

"....مروّج تھا

"....مجبوں کے قدر دان غریبوں کے فیض رساں عاجزوں کے ہاتھ پکڑنے والے بیچاروں کی پرورش کرنے والے زمانے کے۔ BYT سرکار سے دے کے آب ودانا نادان کو بنایا جس نے دانا یعنی

جان گلکرسٹ صاحب۔"

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ (۱) نسخۂ جے پور اور ہندی مینول (یعنی نسخۂ م) کے متن میں یکسانیت نہیں ہے اور ایسے تمام مقامات پر نسخۂ جے پور طبع اول سے مطابقت رکھتا ہے۔ (۲) رشید حسن خان کے متعارفہ خطی نسخے (یعنی ن) سے بھی نسخۂ جے پور کا متن مختلف صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے اور یہاں بھی طبع اول (ک) سے گہری مماثلت نظر آتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا طبع اول اور نسخۂ جے پور کا متن یکساں ہے؟ اس کا جواب اُن بہت سی مثالوں کے تناظر میں (جو اس سے پہلے درج کی گئیں) یقیناً نفی میں ہوگا اور باوجود اسکے کہ دونوں میں مطابقت بھی بہت ہے "لیکن اختلافاتِ نسخ کی جو مثالیں پیش کی گئیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں قابل لحاظ حد تک فرق بھی ہے۔ یہ عجیب صورت حال ہے اور اس کی توجیہ بھی بظاہر آسان نہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیا جائے کہ جے پوری نسخے کے کاتب نے ک کے غلط نامے کو بھی سامنے رکھ کر صحیح تر متن پیش کیا ہے مثلاً "نسخۂ جدید" کے ص ۵۲ پر ایک جملہ ہے:

"جب سمی سانجھ ہوتی' چھپکے ہی وہ خواجہ سرا اس جوان کو......"ک کے متن میں "سمی سانجھ" کی جگہ "سی سانجھ" ہے۔ ن اور م دونوں میں سمی سانجھ ہے۔ یہی نسخۂ جے پور میں بھی ہے۔ اب اگر نسخۂ جے پور کے کاتب نے ک کے غلط نامے کو بھی پیش نظر رکھا ہوتا تو اول تو رشید حسن خان کی صراحت کی مطابق وہاں یہ موجود ہی نہیں' دوئم یہ کہ نسخۂ جے پور میں اسے لازماً "سی سانجھ" ہونا چاہیے۔ مگر چونکہ صورت حال مختلف ہے اس لیے ایک بات تو واضح ہے کہ جے پوری نسخے کے کاتب نے ک کے علاوہ بعض مقامات پر م اور ن جیسے نسخوں سے بھی مدد لی ہے یا پھر اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے پیش نظر جو خطی نسخہ ہوگا اس میں اِس قبیل کی اغلاط نہ ہوں۔ اس صورت میں یہ بھی قرین قیاس ہوگا کہ اس خطی نسخہ کا متن م اور ن کے بر خلاف ک پر مبنی ہوگا اور چونکہ ک کے متن میں بھی اغلاط کتابت یا حسن بیان کے اعتبار سے بعض نقائص موجود ہیں اس لیے ان کی تصحیح کے بعد جو متن ترتیب دیا ہوگا 'نسخۂ جے پور' اسی متن پر مبنی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے چند مثالوں پر غور کرنا مناسب ہوگا۔ پہلے حسن بیان کو لیجیے:

نسخۂ جدید کے ص ۲۰۶ پر ایک جملہ اس طرح ہے:

".....اشتیاق میں فرنگ کے ملک کے دیکھنے کو روانہ ہوا"

یہی جملہ نسخۂ جے پور میں اس طرح ہے: "اشتیاق میں ملک فرنگ کی دیکھنی کو روانہ ہوا" اسی نسخہ کے ص ۲۲۰ پر ایک جملہ ہے:

"...مبارک نے سلام کیا اور مجھے ساتھ لیا، محل میں پہنچا دیا"

جے پور کے نسخے میں اس کی کیفیت یہ ہے: "مبارک سلامت کی اور مجھی ساتھ لے محل میں پہنچا دیا"

نسخۂ جدید (ص ۴۹) پر ایک جملہ یوں درج ہے:

"... ایک صراحی اُسی شربت کی تکلف سے بنا کر 'برف میں لگا کر' لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا"

نسخۂ جے پور میں اسے یوں لکھا گیا ہے: "ایک صراحی اُسی شربت کی تکلف میں بنا برف میں لگا لڑکے ہاتھہ لوا کر آیا"

اس سلسلے میں یہ آخری مثال بھی غور طلب ہے:

"..... بولا کہ میں اُس روز تمھیں اُس ظالم کے پاس لے گیا کاشکے اگر یہ جانتا تو نہ لے جاتا۔ میں نے گھبرا کر کہا: میرے جانے میں کیا ایسی قباحت ہوئی 'کہو تو صحیح (ایضاً ۲۲۰) نسخۂ جے پور میں ان جملوں کی کیفیت یہ ہے:

"... بولا کہ میں اُس روز تمھیں اُس ظالم کی پاس لگیا کاشکے اگر یہ جانتا تو نہ لیجاتا گھبرا کر کہا میری جانی مین کیا ایسی قباحت ہوئی کہو تو سہی"

یہ اور اس طرح کے متعدد جملے ساخت اور حسن بیان کے اعتبار سے نسخۂ جدید سے بہتر ہیں۔ یہاں اس طرف بھی اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ آخری جملے میں جو لفظ "صحیح آیا ہے" وہ دیگر تمام نسخوں کے بر خلاف "سہی" کی صورت میں صرف نسخۂ جے پور میں پایا جاتا ہے۔

اب ایک دوسرا، پہلو نسخۂ جے پور ۱۲۴۲ھ کا مکتوبہ ہے۔ فاربس کا مرتبہ متن اس کے سولہ برس بعد وجود میں آیا۔ اس سے قبل معلومات کی حد تک 'باغ و بہار' کی تین روایتیں ملتی ہیں۔ یعنی ہندی مینول (نامکمل ہی سہی) طبع اول ۱۸۰۴ء اور وہ خطی نسخہ جسے رشید حسن خان نے متعارف کرایا ہے۔ اگرچہ آخری الذکر میں ترقیمہ نہیں ہے مگر رشید حسن خان کے دلائل پر اعتماد کر کے اسے طبع اول اور مخطوطۂ جے پور کے درمیانی زمانے کا نسخہ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جے پور کا نسخہ اس سلسلے کی چوتھی روایت کے طور پر سامنے آتا ہے اور چونکہ یہ روایت "باغ و بہار" (۱۲۱۷ھ) کے تقریباً ۳۰ سال بعد ۱۲۴۲ھ میں مکمل ہوئی اور یہ م اور ن جیسے نسخوں سے مختلف ہے اور اختلاف کی یہ صورت ک سے تقابل کے بعد بھی واضح معلوم ہوتی ہے یہی نہیں باغ و بہار مرتبہ رشید حسن خان (یعنی نسخۂ جدید یا 'د') اور نسخۂ جے پور کا احوال بھی بعض مقامات پر یکساں نہیں ہے' اس لیے چوتھی روایت کے طور پر اس نسخۂ جے پور کی اہمیت مسلم ہے اور اسے اگر شائع کر دیا جائے تو یہ باغ و بہار کے متداول نسخوں کے بر خلاف ایک معتبر نسخہ ہوگا۔

ف۔ س اعجاز
مدیر ماہنامہ انشاء
B-25 زکریا اسٹریٹ، کلکتہ۔ ۷۳

(دوسری قسط)

ادب میں خواب کے اجزاء

گلزار نے اپنے مجموعۂ منظومات ,,چاند پکھراج کا،، (ہندستانی اڈیشن) کے پیش لفظ میں سب سے پہلے جو بات لکھی ہے وہ یہ ہے :

,,فلیش بیک سنانے کی بہت عادت ہے مجھے،،

یہ فلیش بیک ظاہر ہے کچھ ماضی ہے اور کچھ خواب۔ گلزار کی کئی خوب صورت نظموں میں جو تفصیل پائی جاتی ہے وہ تقریباً خوابوں سے اخذ کی گئی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی یا خواب کے بیان پر گلزار کو قدرت حاصل ہے، تحلیل نفسی کے ماہر اس بات پر ضرور دھیان دیتے ہیں کہ ماضی اور خواب کو بیان کرنے والا اپنا مسئلہ یا واردات کس طرح بیان کرتا ہے۔ شاعر کے فلیش بیک کی گونج خواب کے گنبد میں محدود ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ آگے نکل کر کائنات میں پھیل جاتی ہے۔ کالی داس جیسا خوب صورت اور ارفع تصور گلزار کے خواب کے کینوس کو زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔ اس اضافی شے کو شاعری کا جادو اور شاعر کا کمال کہنا چاہیے۔ ان کی نظموں ,,ایک دور،، ,,بھمیری،، ,,دستک،، ,,اجل،، ,,بانجھ،، ,,گل مہر،، ,,لمس،، ,,تخلیق،، کا پس منظر خواب جیسا ہے۔ اختصار مانع نہ ہوتا تو یہ نظمیں یہاں نقل کی جاسکتی تھیں۔ پھر بھی ایک چھوٹی نظم اور ایک نظم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

کوئی چنگاری نہیں جلتی کہیں ٹھنڈے بدن میں میرے
سانس کے ٹوٹے ہوئے تاگے لٹکتے ہیں گلے سے
بلبلے پانی کے اٹکے ہوئے برفاب لہو میں
نیند پتھرائی ہوئی آنکھوں پہ بس رکھی ہوئی ہے
رات بے حس ہے، مرے پہلو میں لکڑی سی پڑی ہے
کوئی چنگاری نہیں جلتی کہیں ٹھنڈے بدن میں میرے
بانجھ ہوگی وہ کوئی جس نے مجھے جنم دیا ــ بانجھ
چاند کیوں ابر کی اس میلی سی گٹھری میں چھپا تھا
خون سے لتھڑی ہوئی رات کے رہ گیروں نے ذوزانو ہو گر کر،

"روشنی، روشنی،، چلایا تھا، دیکھا تھا فلک کی جانب،
چاند نے گٹھری سے ایک ہاتھ نکالا تھا، دکھایا تھا چمکتا ہوا خنجر
ایک دور (تیسرا اور آخری بند)

اپنی نظموں سے گلزار ایک surrealist ثابت ہوتے ہیں اور بالاتر حقیقت کو قبول کرتے ہیں۔

لطف کی بات ہے کہ گلزار ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں لیکن ان کی کہانیوں میں خوابوں کا پس منظر کم اور فلیش بیک زیادہ ملتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خوابوں سے جو لگاؤ شاعری کو ہے وہ کہانی یا دوسری صنف ادب کو نہیں ہے۔ شاعر بھی خواب کے موجد تو نہیں ہوتے لیکن وہ الہامی کیفیت سے گزرتے ہیں اور الہام کا درجہ وحی کے فوراً بعد آتا ہے۔ اس لیے شعرا کے خواب وصول کرنے اور انھیں لاکھوں لوگوں تک پہنچانے کا منفرد انداز ہوتا ہے۔ شاعر کی ذہنی کیفیت براہ راست دو مصرعوں یا کئی مصرعوں میں منعکس ہوتی ہے۔ ڈراما نگار یا افسانہ نگار کا عمل تخلیق اس سے سوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ڈرامے یا کہانی کی ضرورت کے مطابق اپنی فکر کو ڈھالتا ہے۔ کہانی اگرچہ کسی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے لیکن وہ مبالغہ پر چلتی ہے۔ چنانچہ اس کا کینوس شاعری کے کینوس سے بڑا ہوتا ہے۔ کہانی یا ڈراما کی واقعیت اور کردار تخلیق کار کے اپنے متصورہ خاکوں اور تخلیقی اپج کا نتیجہ ہوتے ہیں جس میں اسے مثبت و منفی پہلوؤں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ کسی خواب کے پس منظر کو بلاوجہ اپنی تخلیق میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ ہاں کلاسیکی کہانیوں مثلاً الف لیلیٰ کی داستان، الہ دین کے قصے اور اس طرح کی دیگر طلسمی کہانیوں کے سرچشمے خواب اور تمثیلیں ہی ہیں جو myths سے جڑی ہوئی ہیں اور ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان دیو پریوں کی کہانیوں کو ہم عادتاً قبول کر لیتے ہیں، ان میں کوئی منطق نہیں تلاش کرتے۔ آج جو سائنسی فکشن لکھے جا رہے ہیں وہ کل سائنسی انکشاف یا دریافت کے کسی خواب کی کارفرمائی کا نتیجہ معلوم ہو سکتے ہیں۔

شعرا کے برعکس کہانی کار اپنے خواب کا خلاصہ براہ راست بیان نہیں کرتے بلکہ اسے کہانی میں بکھیر دیتے اور پھیلا دیتے ہیں یا کسی خواب کی آگہی کو تحلیل کر دیتے ہیں تاکہ خواب عناصر کی پہچان گم ہو جائے اور مبالغہ یا اصلیت ظاہر ہو جائے۔ شعری عمل کو داخلیت سے اور ڈرامائی و افسانوی عمل کو خارجیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس لیے خواب سے شاعری اور افسانے کا رشتہ الگ الگ بنانے کا ہوتا ہے۔ اس بات کی صداقت کسی ایسے فنکار کے ذریعے

آزمائی جائے جو بیک وقت شاعر بھی ہو اور کہانی کار بھی۔ او پر ایک ایسے فن کار گلزار کا حوالہ دیا گیا جو یقیناً مناسب تھا۔ ہم تمام عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں تا کہ فلیش بیک، خواب اور تصور کی الگ الگ شناخت قائم کر پائیں۔

ڈراما سے متعلق یہاں شیکسپیر کا ذکر زیادہ مناسب ہو گا کہ اس کے ڈراموں میں خواب عناصر خصوصی توجہ سے پڑھے جاتے ہیں یہاں صرف ڈراما "جولیس سیزر،، کے باب ۲ منظر ۲ کے حوالے سے بات کی جائے گی۔ کالی طوفانی رات میں سیزر کی بیوی کیلفورنیا تین بار نیند میں چلاتی ہے "بچاؤ۔ وہ سیزر کو قتل کر رہے ہیں،، اس کے بعد وہ اپنے خاوند سیزر کو محل سے نکلنے سے روکتی ہے جب کہ سیزر کو سنیت جانا ہے جہاں ممبران سنیت اس کی تاج پوشی کریں گے۔ سیزر جانا چاہتا ہے لیکن اس کی بیوی اپنا خوف بیان کرتی ہے منظر کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

کیلفورنیا۔ سیزر میں کبھی رسومات کے آڑے نہیں آئی لیکن اب مجھے ان سے خوف آتا ہے جو کچھ سنا اور دیکھا ہے اس کے سوا بھی میرے اندر کوئی ہے جو وہ بھیانک واردات بیان کر رہا ہے جو کبھی وقت نے نہیں دیکھی۔ ایک شیرنی شاہراہوں میں گھس آئی ہے اور قبروں نے منہ پھاڑ کر اپنے مردے اگل دیے ہیں۔ خطرناک جنگجو اپنے اپنے منصب اور لشکر کے ساتھ بادلوں پر بیٹھے ہوئے لڑ رہے ہیں جس سے راجدھانی پر خون کی بارش ہو رہی ہے جنگ کا شور ہواؤں میں گونج رہا ہے، گھوڑے ہنہنا رہے ہیں او ٹوٹتے ہوئے آدمی چلا رہے ہیں اور بھوت سڑکوں پر چنگھاڑتے دندناتے پھر رہے ہیں۔ سیزر، یہ ساری باتیں خلاف معمول ہیں اور میں یقیناً ان سے ڈرتی ہوں۔

سیزر۔۔ جس کا خاتمہ طاقتور خداؤں کا منشاء ہو کیا وہ اپنے انجام سے بچ سکتا ہے؟ لیکن سیزر جائے گا کیونکہ یہ سب پیشن گوئیاں جیسی سیزر کے لیے ہیں ویسی ہی بالعموم دنیا کے لیے ہیں۔

کیلفورنیا۔۔ جب فقیروں کی موت آتی ہے تو دم دار ستارے نظر نہیں آتے۔ شاہ زادوں کی موت کا ڈھنڈورا آسمان خود پیٹتے ہیں۔

سیزر۔۔ بزدل اپنی موت سے کئی بار مرتے ہیں۔ بہادر موت کا ذائقہ صرف ایک بار چکھتا ہے۔ اب تک جتنے عجوبوں کا میں نے سنا ان میں سے انسان کا

ڈرنا مجھے سب سے عجیب لگتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ موت لازمی انجام
ہے اور معینہ وقت پر اسے آنا ہے۔

سیزر ایک خادم کو بھیج کر پجاریوں سے فال معلوم کرواتا ہے۔ پجاریوں کی رائے آتی ہے کہ ایک جانور کی بھینٹ دی گئی۔ اس کے بعد اس کا پیٹ چیر کر اس کی اوجھڑی وغیرہ نکالی گئی تو اس میں سے دل برآمد نہیں ہوا۔ لہذا سیزر کو اس منحوس نشانی کے بعد محل سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ سیزر جانے کا ارادہ ملتوی کرنے لگتا ہے۔ اسی عرصے میں سازشی ڈیشیئس بروٹس آتا ہے اور معاملہ کو تاڑ لیتا ہے۔ وہ کیلفورنیا کے خواب کی انوکھی تاویل بیان کر کے سیزر کو گمراہ کر دیتا ہے وہ کہتا ہے۔

"اس خواب کی بالکل غلط تفسیر کی گئی ہے۔ یہ تو اچھی اور خوش آیند بات ہے۔ آپ کے مجسمہ سے خون بہ کر نلوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچا جس میں شادماں رومیوں نے غسل فرمایا۔ یہ اس بات کا مظہر ہے کہ آپ سے عظیم روم حیات نو کا جام پیے گا اور عظیم لوگ بہ اصرار آپ سے روح شراب، نیا رنگ، یادگار تبرک اور اختیار حاصل کریں گے۔ کیلفورنیا کے خواب کا اصل مفہوم یہی ہے۔"

ڈیشیئس بروٹس سیزر کو اپنی باتوں سے قائل کر لیتا ہے جس کے بعد سیزر چلا جاتا ہے اور سازشیوں بشمول ڈیشیئس بروٹس کے ہاتھوں ہلاک ہوتا ہے۔

ایک ڈرامانگار خواب کو اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ سیزر کی بیوی کا یہ خواب خواب تھا کہ نہیں اس پر بحث چھڑتی ہے۔ بعض اسکالر اسے (hallucenation) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال ایک ہی خواب یا فریب نظر بیوی (کیلفورنیا) اور شوہر (سیزر) کی الگ الگ ذہنی کیفیتوں کو ظاہر کر رہا ہے جبکہ ڈیشیئس کی توجیہ خواب انسانی عقل کی عیاری کا بے مثال نمونہ ہے، اس خواب کے ذریعے مختلف ذہنوں کی اصلیت تک پہنچا جا سکتا ہے۔

جاگتی آنکھوں کے خواب ادب میں جا بجا مطالعہ سے گزرتے ہیں ۔ فیسوڈور دوستو وسکی کے مشہور ناول جرم و سزا (Crime and Punishment)، کا ہیرو راسکولنکاف مخصوص حالات کے زیر اثر ایک خاص قسم کی ذہنی حالت میں اپنی ظالم بوڑھی مکان مالکہ کا قتل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مستقل ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ انوکھے مفروضوں اور اندیشوں میں گھر جاتا ہے اور سوتے جاگتے اس کی آنکھوں میں انوکھے ہیولے گردش کرنے لگتے ہیں جن کے وسیلے سے اس کی ہذیانی کیفیت کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے باطن تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ناول کے اس اقتباس کو پڑھیے اور غور فرمائیے کہ کس طرح حالات

ے تحت انسان کی فکر مجروح ہو سکتی ہے اور وہ ان چوٹوں کے بعد کس قسم کے خواب بیداری
ے عالم میں دیکھ لیتا ہے۔

"تقریباً بے جان اور لرزتی ٹانگوں سے راسکولنکاف واپس اپنے کمرے میں پہنچا، وہ ٹھنڈے پسینے میں نہا رہا تھا۔ اس نے سر سے ٹوپی اتار کر میز پر رکھی اور دس منٹ تک بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا اور پھر بے جانی سے صوفے پر ڈھے گیا۔ درد کی ایک ہلکی سی سسکی کے ساتھ اس نے اپنے ہاتھ اور پیر پھیلا دیے اور آدھے گھنٹے تک اسی طرح پڑا رہا۔

وہ کچھ سوچ نہ رہا تھا البتہ خیالات کی چند دھجیاں اس کے دماغ میں بے ترتیبی سے منڈلا رہی تھیں اور کچھ ہیولے سے اس کی نظر کے سامنے بے ربطی سے ناچ رہے تھے۔ یہ ان لوگوں کے چہرے تھے جنھیں اس نے بچپن میں کہیں دیکھا تھا لیکن جن کی صورت اسے یاد نہ تھی اور پھر------ وار نے سکی کا کلیسا، ریستوراں کا بلیرڈ ٹیبل جس پر چند افسر کھیل رہے تھے، کوئی شراب خانہ اور شراب اور تمباکو کی بو، ایک ہوٹل، کسی عمارت کا تنگ و تاریک عقبی زینہ جس پر انڈوں اور آلوؤں کے چھلکے پڑے ہوئے تھے اور سیڑھیاں گندے پانی سے پھسلوان ہو رہی تھیں اور یہ ہیولے اس کی نظر کے سامنے سے گزر رہے تھے، ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے ان میں چند اسے دلچسپ معلوم ہوئے اور راسکولنکاف نے انھیں روک رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ دھندلے ہو کر غائب ہو گئے۔ کوئی بدروح اس کے دل میں بیٹھی اس کی دیواروں کو اپنے ناخنوں سے کھرچ رہی تھی، اسے اپنی ہتھیلیوں میں مسل رہی تھی لیکن یہ تکلیف اور یہ دباؤ ناقابل برداشت نہ تھا بلکہ بعض دفعہ تو اسے یہ درد میٹھا میٹھا محسوس ہوا۔

زینے پر سے راز و موہن کے پیروں کی چاپ سنائی دی تو وہ آنکھیں بند کر کے سوتا بن گیا۔" (مترجم۔ منظر الحق علوی)

یہ کیس ایک ناول سے لیا گیا تھا۔ افسانے میں بھی خواب نگاری کا عمل کرداروں کی
ہنی کیفیت سے برآمد کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ کہانی میں خواب کی جزئیات کو تلاش کرنا عموماً
آسان نہیں ہوتا پھر بھی تلاش شرط ہے۔ بعض جدید افسانہ نگاروں کے یہاں اجزائے خواب
لگ الگ ڈھنگ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ سریندر پرکاش اور انتظار حسین کے بعض افسانوں

پر خواب جیسی شبیہات اپنا پر تو مکمل پھیلاتی نظر آتی ہیں جس پر غور کرنے سے افسانوں کی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔ کچھ لغو و مہمل خواب بھی افسانوں کی تہ سے نکل آتے ہیں۔ غور نہ کرنے سے تشکیک اور ابہام کی صورت پیدا ہوتی ہے ،جوگندر پال کے کئی افسانوں اور افسانچوں میں خوابوں کو پرت در پرت دریافت کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ناول ,نادید، کا مرکزی کردار ایک اندھا ہے۔ وہ دنیا کا اوراک دو طرح ہی کر سکتا ہے۔ تصور کے ذریعے یا خواب کے ذریعہ۔ ایک اندھے کے تصور اور خواب میں جو فرق ممکن ہے اسے طنز اور فلسفہ کے رنگوں میں جوگندر پال نے نمایاں کیا ہے۔

ہرچرن چاولہ کی ایک کہانی "سچ جیسے سپنے،، خواب کے متعلق فرائڈ کے نظریہ پر مبنی ہے جس میں مصنف نے عریانیت کا سہارا لیے بغیر جنس مخالف کے تصور کو اپنی شخصیت اور آرزو کی عدم تکمیل سے مربوط کرتے ہوئے خود کو ایک خواب کا قیدی دکھایا ہے۔ یہ پوری کہانی ایک نفسیاتی کہانی ہے اور حیرت انگیز طور پر یہ ایک تجزیاتی مطالعہ ہے۔ جس سے یہ حقیقت بر آمد ہوتی ہے کہ نو عمری سے چلی آرہی ناکام جنسی خواہش ۶۲ سال کی عمر میں بھی آدمی کو مضطرب اور بے چین رکھ سکتی ہے اور وہ تلافی کے خوابوں (Compensatory Dreams) میں سکون پانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کی سٹنگ پس منظر لفظ بہ لفظ کسی تحلیل نفسی کے ماہر کے روبرو دہرایا ہوا خواب معلوم ہوتا ہے۔ افسانہ میں خواب اپنی متوازی حقیقتوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ جمالیات سے جادو کا کام لیا گیا ہے۔

پاکستان کے افسانہ نگار ناصر بغدادی کے افسانوں میں (جو ان کے مجموعے ,,بے شناخت،، میں شامل ہیں) جا بجا خوابوں کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں کی تہ میں وہ خواب دبے ہوئے ہیں جنھیں آدمی لاشعور میں زندہ رکھتا ہے، کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن ان کی شناخت بھی کروانا چاہتا ہے۔ کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں اتنی مقدار میں اجزائے خواب نظر نہیں آتے۔ ناصر بغدادی کے دو مختلف افسانوں سے یہ اقتباسات دیکھیں:

> "وہ تھکے ہوئے قدموں سے راہداری طے کر رہا تھا کہ حجاب کے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ ایزل کے سامنے کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ کا برش سبک رفتاری سے آشفتہ حال نوجوان کی پورٹریٹ پر ادھر ادھر دوڑ رہا تھا۔ اور پھر چہرے کے سارے خطوط، سارے نقوش ناقابل شناخت ہو گئے۔ رنگوں کا بھدا سا ایک ہیولہ کینوس پر نمودار ہو گیا۔ مگر اس

کے باوجود اس کی دو ویران آنکھیں باقی رہ گئی تھیں جو اس وقت گہرے رنگوں کے ہیولے میں گھری ہوئی یوں گھور رہی تھیں جیسے خلا میں اپنے نامکمل خوابوں کو تلاش کر رہی ہوں۔ شاید ان دو آنکھوں میں دو ہستیوں کا مشترک غم اپنے سنہرے خوابوں کے لٹنے پر چپ چاپ آنسو بہا رہا تھا۔

"تصویر کے زخم"، (کلائمکس)

اچانک پیاس بجھانے کی منہ زور خواہش نے پھر ایک بار جوش مارا تو سوچ کا تسلسل کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ گیا۔ وہ یوں اپنی دنیا میں واپس آگیا جیسے ٹراؤٹ مچھلی چند لمحوں کی اڑان کے بعد پھر پانی میں گر جاتی ہے۔ اسے محسوس ہوا جیسے پانی نہ ملا تو اس کا جسم پھٹ کر چیتھڑوں کی شکل میں فضا میں بکھر جائے گا۔ پیاس اب اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ نہ جانے یہ خواہش، یہ طلب کس نوع کی تھی؟ زندگی میں کسی بھی طلب نے اتنے شدید اور جارحانہ انداز میں اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ کی تھی۔

حوصلوں اور جرأت کو جمع کر کے اس نے پہلی سیڑھی پر یوں قدم رکھا جیسے کسی کم ہمت تیشہ بردار کو کوہ کنی پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ پھر اس کے بعد اسے کچھ پتا نہ چلا کہ اس نے بقیہ سیڑھیاں کس طرح طے کیں۔ اس کے خوابیدہ حواس اس وقت بیدار ہوئے جب اس نے آخری سیڑھی عبور کر لی تھی۔ اس کے بائیں جانب ڈائننگ روم تھا جہاں پیاس بجھانے کا وافر سامان تھا۔ ایک کونے میں قد آدم سفید ریفریجریٹر یوں کھڑا تھا جیسے سفید پوش آسمانی فرشتہ خیر و برکت کا خزانہ لٹانے آگیا ہو۔

"تتلی کے رنگ"،

"تصویر کے زخم"، کے اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شکست خواب بھی کسی خواب کا منظر ہے۔ "تتلی کے رنگ"، سے لیا گیا اقتباس میں اڑ کر تیرنے والی ٹراؤٹ مچھلی، تیشہ بردار، کوہ کنی کا عمل، شدید پیاس۔۔ یہ علامات و افعال توجہ چاہتے ہیں، دھیرے دھیرے ایک خواب تکمیل پا رہا ہے آخری جملہ "کونے میں قد آدم سفید ریفریجریٹر یوں کھڑا تھا جیسے کوئی سفید پوش آسمانی فرشتہ خیر و برکت کا خزانہ لٹانے آگیا ہو"، انتہائی قابل غور ہے۔ تمام شبیہوں کی گردش خوابیدہ حواس میں ہو رہی ہے۔ سفید پوش آسمانی فرشتہ سفید ریفریجریٹر کی علامت

اختیار کر گیا ہے۔ ٹیلی وژن پر ریفریجریٹر کے اشتہارات اسی طرح کے دکھائے جارہے ہیں۔ ناصر بغدادی کے یہاں بھی سر رئلزم حاوی ہے۔ بیشتر افسانوں میں وہ ایک متبادل حقیقت کے متلاشی نظر آتے ہیں۔

ادب میں خواب عناصر کی مثالیں پیش کی گئیں۔ انھیں پڑھ کر کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ کیا سارا ادب نیم خوابی کے فسوں میں مبتلا ہے۔ جواب اثبات و نفی دونوں میں ہو سکتا ہے۔ نثر نگاروں کے یہاں خواب کے ملل تو پائے جاتے ہیں لیکن وہ عموماً نیند اور خواب کے اعلان کے تحت ادب پاروں میں نہیں لائے جاتے۔ جبکہ شعرا کے یہاں نیند اور خواب کی فضا اکثر پائی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ نثر نگاروں کے بارے میں آپ بہ عجلت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نیم خوابی کے فسوں میں مبتلا ہیں البتہ شاعروں کے یہاں خواب نیند کی جھیل میں تیرتے نظر آتے ہیں۔ فراق گورکھپوری کے یہ دو اشعار دیکھیں :

؎ دکھاتے ہیں ستارے ایک بہتر زندگی کا خواب
نہ دیکھ ان کی طرف وہ چھین لیں گے سب خوشی تیری

؎ ستارے جاگتے ہیں رات لٹ جھٹکائے سوتی ہے
دبے پانو کسی نے آ کے خواب زندگی بدلا

خواب دیکھنے یا منظوم کرنے والے کی اپنی فکر اور ندرت خیال کہیں نہ کہیں سے اصل جھلک ضرور دکھاتی ہے۔ جیسے مظفر وارثی کے اس شعر میں ایک اور بات معلوم ہوتی ہے ؎

تمام عمر کی نیندیں اجاڑ لیں میں نے
کوئی نہ دیکھا ہوا خواب دیکھنے کے لیے

خواب کا ایک مریض جس طرح اپنے آپ سے اپنے خواب کو بیان کرتا ہے یا ماہر نفسیات کے آگے اپنا خواب دہراتا ہے کیا ادیب و شاعر کو بھی اسی طرح ادب میں کسی خواب کو دہرانا چاہیے ؟۔ اگر کوئی یہ سوال کرے تو اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر ادیب یا شاعر خواب کی کیفیت کو سیدھے سپاٹ انداز میں بیان کرتے تو خواب سے متعلق دنیا کا سارا ادب مریضوں کے بیانات یا کیس ہسٹریز کے مجموعے کے سوا کیا ہوتا؟۔ ادب میں خوابوں کی اہمیت ادب کے تخلیقی عناصر کی وجہ سے ہے جن سے شعرا و ادبا کی تخلیقی اپج، معانی کیفیت، ذہانت اور خلاقی کا ثبوت ملتا ہے۔ یوں تو سب کچھ قاری کے ذہن پر منحصر ہے کہ وہ ادب کے ذریعے موہوم کتنے خوابوں کی شناخت کر پاتا ہے اور کتنوں کو رد کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵۔ سلور لائن اپارٹمنٹس ' اے سیکٹر (بی ڈی اے)
کوہ فضا۔ بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۱

چائے کی ترنگ

آج چائے ہندستانیوں کے لیے کبھی مجبوری بن کر آتی ہے اور کبھی ضرورت کا روپ لے کر۔ ہم دودھ کی نہریں تو نہ بہا سکے لیکن چائے ہمارے عوامی کلچر کی ایک متوازی دھارا ضرور بن گئی۔ ہم میں سے بہت سے چائے نہیں پیتے بلکہ چائے پینے کا بہانہ ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔

چائے کے اَن گنت روپ ہیں اور چائے پینے کے لا تعداد طریقے۔ میز پر بیٹھ کر پی جانے والی چائے سڑک پر کھڑے کھڑے جلدی جلدی حلق سے اتاری جانے والی چائے۔ پیالی والی چائے۔ ٹرے والی چائے۔ تھرماس والی چائے۔ پھر وہ چھینکے والی چائے جس کے گلاس چھینکے میں رکھ کر لائے جاتے ہیں۔ چائے کی چائے اور قومی ایکتا گھول مفت۔ قومی ایکتا گھول؟ جی ہاں' اس بالٹی کا مقدس گھول جس میں یہ گلاس صبح سے شام تک ڈبو ڈبو کر نکالے جاتے رہتے ہیں اور بنگالی اور گجراتی' سکھ اور عیسائی اونچی مونچھ والے اور بلا مونچھ والے چائے کے سارے متوالوں کے ہونٹوں کا مزہ' سانسوں کی مہک اور ان میں لپٹے جراثیم اور وائرس قوم میں برابر برابر تقسیم کرنے کا کام مفت میں ہوتا رہتا ہے۔

مانا جاتا ہے کہ چائے کی جنگلی جھاڑی کا پتا چار ہزار سال پہلے چلا تھا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ۲۷۳۷ قبل مسیح کے قریب چین میں شہنشاہ شین نانگ کی حکومت تھی۔ ایک دن شہنشاہ کے لیے جو گرم پانی لایا گیا اس میں کسی جھاڑی کی پتیاں گر گئیں۔ شہنشاہ نے غلطی سے تھوڑا سا پانی پی لیا۔ وہ اسے بہت اچھا لگا۔ شہنشاہ نے جب ان پتیوں کو ابال کر پینا شروع کیا تو رعایا بھی انھیں پینے لگی۔ ایسے بھی لوگ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ ہر بڑے کام کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور چائے کی دریافت میں بھی عورت کا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک چینی کسان نے اپنی بیوی سے یہ کہہ رکھا تھا کہ جب وہ شام کو کھیت سے لوٹے تو اسے دھول سے اٹے ہاتھ پاتو دھونے کے لیے گرم پانی تیار ملنا چاہیے۔ ایک دن کسان کی بیوی پڑوسن کے پاس بیٹھ کر گاؤں کے اسکینڈل سننے میں ایسی محو ہوئی کہ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کتنا وقت

نکل گیا۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ جلدی جلدی پانی رکھ کر اس کے نیچے آگ سلگا ہی رہی تھی کہ کسان آگیا۔ پانی ٹھنڈا دیکھ کر کسان کا پارا چڑھ گیا اور پاس لگی جھاڑی کی ایک ٹہنی توڑ کر بیوی کی پٹائی کرنے لگا۔ جھاڑی کی کچھ پتیاں پانی میں بھی گر گئیں۔ جب پانی گرم ہو گیا اور کسان نے اس سے اپنے ہاتھ پانو دھوئے تو اسے روز سے زیادہ آرام ملا۔ پھر تو وہ ہر روز یہ پتیاں ابلوانے لگا۔ پی کر دیکھا تو بڑا سرور آیا اور وہ اسے پینے لگا۔ پھر دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی پینے لگے اور چائے مقبول ہو گئی۔

ابتدا کیسے بھی ہوئی ہو۔ چینی لوگ طویل عرصے تک چائے کو دوا کی شکل میں پیتے رہے۔ یہ بات ان تاجروں اور سیاحوں نے دیکھی جو چین گئے۔ یورپ میں یہ بات ۱۵۴۵ء میں پہنچی جب اٹلی کے راموزیو نے ایک ایرانی تاجر حاجی محمد کے حوالے سے بتایا کہ اگر چائے کے دو پیالے خالی پیٹ پی لیے جائیں تو بخار، درد سر، پیٹ اور جوڑوں کے درد، گٹھیا اور دمے کے مریضوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یورپ میں صبح اٹھ کر چائے پینے یا "بیڈ ٹی" کا رواج اسی طرح ہوا ہو۔ چائے کو دوا کی شکل میں استعمال کرنے کی ایسی روایت ہوئی کہ پولینڈ میں چائے کے لیے جو لفظ بولا جاتا ہے اس کا اصل مفہوم ہی جڑی بوٹی ہوتا ہے۔ ہندستان میں بھی پہلے لوگ چائے عادتاً نہیں بلکہ بیمار پڑنے پر پیا کرتے تھے۔ آج بھی ادرک وغیرہ کی چائے، نزلہ زکام، حلق کی تکلیف، بلغم کی وجہ سے سینے میں جکڑن دور کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔

چینی لوگ تو زیادہ تر سادہ چائے ہی پیتے ہیں۔ کبھی کبھی لیمو کے چند قطرے بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ دودھ اور شکر کا اضافہ کرنے کی روایت انگریزوں نے ڈالی۔ چائے کے مزے کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے لوگ نئے نئے طریقے نکالتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ چائے میں الائچی، دار چینی وغیرہ شامل کرتے ہیں۔ سکم میں بڑی الائچی ڈالنے کا رواج ہے۔ کشمیر میں زعفران کی چائے بھی پی جاتی ہے۔ چاکلیٹ ٹی شامل کرنا تو عام بات ہو گئی ہے۔ نشہ چاہیے تو ابلتی چائے میں افیم کے کچھ ڈوڈے ڈال کر بندوبست ہو جاتا ہے۔ جو لوگ مہک سے مزہ لیتے ہیں ان کے لیے گلاب کی پنکھڑیوں میں بسی روز ٹی اور زیادہ نفیس مہک چاہیے تو وہائٹ جیسمن کا انتظام ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ سنترے کے چھلکے کے دو چار ٹکڑوں کو ابلتی چائے میں ڈال کر آرنج کا مزہ لیتے ہیں۔

بہار وغیرہ بعض علاقوں میں شیر چائے کا رواج ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر دودھ کے کھول میں چائے کی پتی کپڑے میں باندھ کر ڈال دی جاتی ہے اور ساتھ میں بادام، غلہ، منے

بھی۔ چائے رات بھر چڑھی رہتی ہے اور جیسے جیسے چائے پکتی جاتی ہے دودھ کا مزہ کھلتا جاتا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں کہیں تو چائے حلوہ بنتی جاتی ہے۔

کبھی کبھی خاص مذاق رکھنے والے لوگ اپنی پسند کے چائے خانے اپنی شامیں گزارنے کے لیے چن لیتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں انگلینڈ میں چائے خانوں کی پڑھی لکھی سوسائٹی میں بڑی اہمیت تھی۔ ایک زمانے میں جب گھر گھر ریڈیو نہیں ہوا کرتے تھے، لوگ ریڈیو پر خبریں اور کھیلوں کی کمنٹری سننے کے لیے چائے ہوٹلوں میں یکجا ہوا کرتے تھے، کہیں کہیں چائے کی دوکانوں پر شطرنج اور کیرم وغیرہ کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔

جاپان میں تو چائے نوشی ایک اچھی خاصی پر تکلف رسم ہے۔ شروع میں بارھویں اور تیرھویں صدی میں زین بدھ بھکشو رات کو جاگ جاگ کر عبادت کرتے یا مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے، وہ نیند کو دور رکھنے کے لیے چائے پیتے رہتے تھے۔ تیرھویں صدی میں جاپان کی اعلا سوسائٹی میں "چا-نا-یو" یعنی چائے پینے کی پُر تکلف رسم شروع ہوئی۔ پندرھویں صدی تک اس قسم کی چائے نوشی کے بڑے سخت قاعدے بن گئے۔ چائے تیار کرنے، چائے کے برتنوں کو سجانے، کمرے کی سجاوٹ، ناشتے کے سامان کا انتخاب کس طرح کیا جائے اس پر بڑی باریکی سے خیال رکھا جاتا۔ چائے پینے کا ایک خاص کمرہ جسے "چاشت-سو" کہتے ہیں تیار کیا جاتا ہے جس کا دروازہ بھی اتنا نیچا ہوتا کہ لوگ اس میں گھٹنوں کے بل چل کر داخل ہوتے۔ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ پانچ لوگ اس چائے میں شریک ہوتے جو زمین پر پالتی موڑ کر بیٹھتے اور چائے پیتے وقت کمرے کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے آرٹ اور فن میں آلی حسن و خوبصورتی کے بارے میں گفتگو کرتے۔

انگلینڈ میں شام کی چائے کا رواج بیڈ فورڈ کی ڈچس نے ۱۸۴۰ء میں ڈالا اور اس کے لیے خاص آداب مقرر کیے کہ پیالی میں سب سے پہلے چائے انڈیلی جائے اور دودھ اور شکر مہمان اپنی پسند سے ملائے۔ ہندوستان میں ۱۹۴۰ء کے قریب عام چائے خانوں میں تین خصلتیں ضروری سمجھی جاتیں۔ چائے لب سوز ہو، لب دوز ہو اور لبریز ہو۔ یعنی اتنی گرم کہ ہونٹ جل جائیں، اتنی میٹھی کہ ہونٹ چپک کر سل جائیں اور اتنی بھری ہوئی کہ پیالی میں سے چھلک جائے۔ اس زمانے میں لوگ یہ پسند کرتے تھے کہ چائے میں موٹی بالائی پڑی ہو۔ آج بھی کہیں صرف دودھ میں پتی ڈال کر پکائی گئی اصل چائے کی فرمائش کی جاتی ہے۔

انگلینڈ میں تو چائے کے ساتھ لوگوں نے کچھ توہمات بھی جوڑ لیے ہیں جیسے اگر کیتلی میں چائے کو دائیں سے بائیں گھما کر ملایا جائے تو جھگڑا ہوتا ہے۔ اگر ایک ہی کیتلی سے دو

عورتیں چائے انڈیل لیں تو سال بھر کے اندر اندر ان میں سے ایک کو بچہ ہوگا۔ اگر شکر سے پہلے دودھ ڈالو گے تو آپس میں پھوٹ پڑے گی۔ کیتلی کا ڈھکن چھوٹ کر گر جائے تو کوئی مہمان آئے گا۔ دروازے کے سامنے تھوڑی سی پتیاں بکھیر دینے سے خبیث ارواح دور رہتی ہیں۔ اسی طرح پیالی میں پتیوں کو دیکھ کر قسمت کا حال بتانے کا رواج ہوا۔

چائے لوگوں کی قسمت سدھارے یا نہ سدھارے، لیکن اس نے تاریخ کو بنانے میں ضرور حصہ لیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے توا تار چڑھاؤ میں چائے شامل ہے۔ ۱۶۶۴ء میں کمپنی شہنشاہ انگلستان کو چین سے جو عجیب و غریب چیزیں بطور تحفہ بھیجی تھیں ان میں چائے بھی تھی۔ ۱۶۶۹ء سے کمپنی پابندی سے انگلستان چائے بھیجنے لگی اور اسے چائے کی تجارت میں اجارہ داری حاصل ہو گئی جو کہ ۱۸۳۴ء تک جاری رہی۔ اس دوران چائے نے انگریزوں کی اپنی نو آبادیات میں پنجے گاڑنے میں بھرپور مدد کی۔

یہی نہیں امریکہ کی جنگ آزادی میں بھی چائے کا کردار رہا۔ ۱۷۷۳ء میں انگلستان میں جو چائے قانون بنایا گیا اس کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کو امریکا چائے فروخت کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ کمپنی کے پاس اس وقت چائے کا بڑا اسٹاک اکٹھا ہو گیا تھا۔ جب کمپنی نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے یہ چائے امریکا میں سستے داموں بیچنے کے لیے بھیجی تو امریکا کے تاجروں اور اسمگلروں کا کاروبار چوپٹ ہونے لگا۔ بوسٹن شہر کے لوگوں نے کمپنی کے جہازوں سے چائے اتارنے کی مخالفت کی۔ جب انگریز گورنر نے کمپنی کے جہازوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی تو بوسٹن کے مجاہدین آزادی کے ایک گروہ نے ریڈ انڈین لوگوں کے بھیس میں جہاز پر دھاوا بولا اور ۱۶ دسمبر ۱۷۷۳ء کو کوئی ساڑھے تین سو چائے کے بکس سمندر میں پھینک دیے۔ یہ واقعہ جسے "بوسٹن ٹی پارٹی" کا نام دیا جاتا ہے، امریکا کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ انگریز حاکموں نے بوسٹن کے شہریوں کو سزا دینے کے لیے سخت پابندیاں لگائیں۔ اس کے نتیجے میں امریکا کے دوسرے حصے بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر میں امریکا نے انگریز حکومت سے آزادی حاصل کر کے چھوڑی۔

ہندستان میں انگریزوں نے چائے کی مدد سے اپنی جیبیں خوب بھریں۔ ہندستان میں چائے کے باغات لگانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے اور وہ سب کا سب انگریزوں کے پاس ہی رہے۔ ۱۸۲۰ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی چائے کی تجارت کے لیے سارا مال چین سے لیتی تھی۔ چین کے ساتھ تعلقات بگڑنے پر وہ چاہتی تھی کہ چائے کے لیے اس کا چین پر انحصار نہ رہے۔ پھر ہندستان میں کمپنی کی حکومت تھی اور وہ ہندوستانی مزدوروں سے

باغات میں من مانے ڈھنگ سے کام لے کر تھوڑی سی مزدوری میں بڑی کفایت سے اپنا کام نکال سکتی تھی۔

یوں تو کمپنی نے ۱۷۷۴ء میں آسام کے ڈبرو گڑھ ضلع میں چائے کا پہلا باغ لگایا تھا، لیکن وہ کمپنی کو کوئی منافع نہیں دے سکا۔ ۱۸۲۰ء میں آسام کے کمشنر ڈیوڈ اسکاٹ نے کوچ بہار اور رنپور سے پتیوں کے نمونے اس نوٹ کے ساتھ کلکتہ بھیجے کہ وہ چائے ہے۔ ۱۸۲۳ء میں سی، اے، بروس نے یہ دعوا کیا کہ اس نے شمالی آسام میں چائے کے جنگلی پودے کا پتا چلایا ہے۔ ایسی ہی اطلاعات نیپال اور منی پور سے ملیں۔ ۱۸۳۴ء میں گورنر جنرل نے چائے اگانے کے معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی اور چین سے حاصل کیے گئے بیجوں کو اگانے کے لیے کلکتہ کے بوٹے نیکل گارڈن میں تجربہ کیا۔ ۱۸۴۱ء میں ڈاکٹر کیمپ بیل چینی چائے کے بیج لائے اور دار جلنگ کے پاس انھیں بویا۔ اس کے بعد تو ایک کے بعد ایک باغ لگانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۸۷۴ء تک ۱۱۳ باغات لگائے جا چکے تھے اور ۱۸۸۸ء تک چائے کے بیوپار میں ہندستان چین سے آگے نکل چکا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء تک ہندستان ساری دنیا کو چائے پلانے لگا تھا، لیکن خود ہندستان میں چائے کا کوئی خاص رواج نہ تھا۔ انگریزوں کو بھی چائے دوسرے ملکوں میں بھیج کر نفع کمانے میں دلچسپی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے بعد امریکا اور یورپ میں مندی کا دور آیا اور دور دراز ملکوں میں لے جا کر چائے بیچنا فائدے کا سودا نہیں رہا۔ ادھر چائے کمپنیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلے میں زیادہ سے زیادہ چائے کی پیداوار لینے کی کوشش کی۔ جب مندی کے سبب بڑھتے ہوئے اسٹاک سے نئے مسائل کھڑے ہونے لگے تو ۱۹۳۴ء میں انگریز سرکار کو چائے کی زیادہ پیداوار پر پابندی لگانے کے لیے قانون بنانا پڑا۔ دوسری عالمی جنگ کے چھڑ جانے کے بعد سمندر کے راستے تجارت خطروں سے خالی نہیں رہی۔ اس لیے چائے کمپنیوں نے یہ حل نکالا کہ اپنے اسٹاک کی کھپت کے لیے ہندستان کے اندر ہی مانگ بڑھانے کی کوشش کی جائے۔

لوگ بتاتے ہیں کہ ۱۹۴۰ء کے قریب چائے کمپنیوں نے ہندستانیوں کو رجھانے کے لیے طرح طرح کے طریقے اپنائے۔ سرکس اور دوسرے تماشے والوں کی طرح بینڈ باجے کے ساتھ رنگ برنگے کپڑے پہنے مسخروں کی شکل میں اچھلتے کودتے لوگوں کے جلوس نکالے جاتے۔ کبھی جلوس کے ساتھ لمبے لمبے پائنچوں کے لباس پہنے گڑیوں پر چلتے ہوئے نٹ بھی ہوتے۔ کہیں کہیں دیواروں پر تام چینی کی پٹیوں پر چھپے اشتہار لگے نظر آتے۔ یہ اشتہار

برسات کے پانی سے بھی نہیں بگڑتے' ایسے ہی ایک اشتہار میں دو نوجوان' ایک ہندو اور ایک مسلمان اس طرح دکھائے جاتے کہ ایک گرم چائے کی پیالی کو پکڑے ہوئے ہیں۔ تصویر کے اوپر رومن رسم الخط میں لکھا ہوتا "یہ اور اس کا بھائے" (YEH AUR USKA BHAI) اور نیچے کی سطر میں ہوتا "پیتا ہے چائے" (PEETA HAI CHAI) یعنی "بھائے" (BHAI) اور "چائے" (CHHAI) کا قافیہ ملایا جاتا ہے۔ پھر بازاروں' میلوں' ہاٹھوں اور تیوہاروں کے موقعوں پر لوگوں کو مفت چائے پلائی جاتی۔

آج ہندستان کا مشکل سے کوئی ایسا شہر یا گانو ہوگا جہاں لوگ چائے کے مزے سے واقف نہ ہوں۔ جس سے پوچھو وہ کہتا ہے کہ چائے سے تھکن دور ہوتی ہے' چائے چستی دیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ چائے میں کے فین جیسا ایک ہلکا سا کڑوا مادہ' جسے ٹے نن کہتے ہیں' ہوتا ہے۔ اس سے TISSUES میں سکڑن پیدا ہوتی ہے اور پینے والے کو سکون کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چائے میں کچھ مقدار میں بی کمپلکس کے قسم کے وٹامن بھی ہوتے ہیں۔ چائے کی ایک پیالی سے پینے والے کو تقریباً چار کیلوریز طاقت ملتی ہے۔

خود چائے کا پودا کوئی بہت بڑا نہیں ہوتا۔ چائے کی جھاڑی کو اپنے آپ بڑھنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو یہ ۱۵ سے ۳۰ فٹ تک اونچی ہو سکتی ہے' لیکن باغوں میں ان کی برابر چھنٹائی ہوتی رہتی ہے اور انھیں دو سے چار فٹ اونچائی کا رکھا جاتا ہے تاکہ کونپلوں کو آسانی سے چنا جاسکے۔ چائے کی پتی کٹاؤ دار دو سے پانچ انچ تک لمبی ہوتی ہے۔ لیکن پینے کے لیے عام طور پر نئی کونپل اور اوپر کی دو پتیوں کو ہی چنتے ہیں۔ نئی کونپل اور اوپر کی پتی والی چائے "آرینج پی کو" کہلاتی ہے۔ دوسری پتی والی چائی کو "پی کو" کہتے ہیں۔ ایک پودے سے ۳۵ سے ۵۰ سال تک پتی چنی جاسکتی ہے۔ چائے کے پودے میں خوشبودار گلابی رنگت کے پھول آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے خول دار پھل لگتے ہیں۔

چائے کی تین قسمیں ہوتی ہیں : چین میں ہری چائے پی جاتی ہے جس میں تلخی بہت کم ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ کالی چائے پی جاتی ہے۔ اس میں سکھا کر فرمین ٹے شن (FERMENTATION) کے ذریعے خاص مہک اور تلخی پیدا کی جاتی ہے۔ اُولانگ قسم کی چائے میں ہلکا فرمین ٹے شن اور ہلکی تلخی ہوتی ہے۔ کشمیر میں تازہ پتیوں سے تیار کی گئی گلابی چائے بہت پسند کی جاتی ہے۔ سکم میں بھی لوگ چائے کے پودے گھر میں لگاتے ہیں اور تازہ پتی کی چائے پی جاتی ہے۔ تیار کی ہوئی چائے تین قسم کی ملتی ہے : پتی والی چائے' دانے دار چائے اور چورا چائے۔ دانے دار چائے کی کھپت زیادہ ہے۔ لیکن چورا چائے ہوٹلوں وغیرہ

میں زیادہ چلتی ہے۔

چائے کو لوگ الگ الگ طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں ایک انگریز رچرڈ بلے کنڈن امریکا کے شہر سینٹ لوئی میں منعقدہ عالمی میلے میں چائے لے کر پہنچا تھا۔ لیکن اس سال وہاں اتنی گرمی پڑی کہ کوئی گرم چائے پینے کو تیار نہ تھا۔ رچرڈ نے سوچا کہ کیوں نہ چائے کو برف سے ٹھنڈا کرکے ٹھنڈی چائے کا تجربہ کیا جائے۔ تجربہ کامیاب رہا اور ٹھنڈی چائے چل پڑی۔ ادھر تبت' میانمار' (برما) تھائی لینڈ وغیرہ میں لوگ چائے کو پیتے نہیں' کھاتے یا چباتے ہیں۔ اس کے لیے چائے کی ہری پتیوں کو ایک کے اوپر ایک تہ جماکر' وزن سے دبا جاتا ہے اور اس طرح چھوٹی چھوٹی گڈیاں بنالی جاتی ہیں اور انھیں سکھالیا جاتا ہے۔ یہ چائے کے اچار جیسا مزہ دیتی ہیں۔ تبت میں تو انھیں سبزی ترکاری کی طرح استعمال کرتے ہیں' کچھ لوگ ان پتیوں کو تمباکو' کی طرح چبا چبا کر چوستے بھی ہیں۔ میانمار (برما) میں یہ چوسنے والی چائے "لے پیٹ" اور تھائی لینڈ میں "میانگ" کہلاتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی کچھ لوگ پیالی میں بچی ہوئی پتیوں کو چبا چبا کر چوسنے میں مزہ لیتے ہیں۔

اب "انس ٹینٹ ٹی" (INSTANT TEA) بھی بنائی جانے لگی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اس کے تجربے کیے گئے۔ لیکن ۱۹۶۰ء کے بعد ہی اسے تجارتی بنیادوں پر تیار کیا جاسکا۔ "انس ٹینٹ ٹی" پاؤڈر کی شکل میں چائے کا تیز کن سین ٹریٹ (CONCENTRATE) ہوتا ہے جسے گرم پانی میں حل کرکے چائے تیار ہو جاتی ہے۔ یہ کن سین ٹریٹ ہندستان کی دو کمپنیاں حل کرتی ہیں لیکن ابھی اسے غیر ملکی منڈیوں' خاص کر امریکا میں فروخت کرنے کے لیے بنایا جارہا ہے۔

اس وقت دنیا کے سولہ ملکوں میں چائے اگائی جارہی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ ہندستان میں اور پھر سری لنکا میں ہوتی ہے۔ ان کے بعد انڈونیشیا اور روس کا نمبر آتا ہے۔ چائے کی سب سے زیادہ کھپت بھی ہندستان میں ہی ہوتی ہے' اس کے بعد انگلستان میں۔ آزادی کے بعد سے ہندستان میں چائے کی پیداوار اور کھپت دونوں میں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔

ہندستان میں چائے اب عام لوگوں کی پسند کی چیز بن گئی ہے۔ ملک میں اس لیے معمولی قسم کی ہی چائے کی زیادہ کھپت ہے۔ اعلا کوالٹی کی چائے ابھی بھی غیر ملکی بازار کے لیے ہے جہاں اونچے دام ملتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ۱۹۹۳ء میں دار جلنگ کی "کاسل ٹن" چائے سوا چودہ ہزار روپیہ فی کلو گرام کے بھاؤ سے فروخت ہوئی تھی۔

مخمور سعیدی

غزل

(نذرِ غالب)

آجائے لبوں تک اگر اِک جام بہت ہے
تھوڑا سا اُجالا ابھی سرِ شام بہت ہے
تسکیں کے لیے اذنِ ملاقات سے پہلے
یہ رابطۂ نامہ و پیغام بہت ہے
آجائے اچانک وہ کسی روز تو کیا ہو
اب اس کے نہ آنے کی خبر عام بہت ہے
ملتی ہے بھلا کس کو یہاں عیش کی مہلت
یہ فرصتِ غم بھی دلِ خود کام بہت ہے
سنتے ہیں کہ سنسان ہیں سب کوچہ و بازار
کہتے ہیں مگر شہر میں کہرام بہت ہے
کیا عکس ہو روشن ابھی تقدیرِ بشر کا
دُھندلا ابھی آئینۂ ایّام بہت ہے
کم کم ہی فروزاں ہے کہیں مشعلِ ادراک
دنیا ابھی سرگشتۂ اوہام بہت ہے
پل بھر میں بکھر جائے نہ یہ سارا تماشا
کمزور، طلسمِ سحر و شام بہت ہے
زندہ ہیں بس ترکِ تعلق بھی ابھی ہم
تکلیف ہے تھوڑی مگر آرام بہت ہے
تہمت کوئی اب اور تو ہم پر نہ رکھیں لوگ
رسوائی کو اک عشق کا الزام بہت ہے
مخمور! بس اب بادۂ عشرت کی ہوس چھوڑ

عارف شفیق
۳۵/۱- B گراؤنڈ فلور بلاک آ
اکرم اسکول۔ کراچی

غزل

رازِ ہستی کے جو مجھ پہ کھولتا ہے کون ہے
مجھ میں یہ میرے سوا جو دوسرا ہے کون ہے

اپنے دروازے پہ خود ہی دستکیں دیتا ہے وہ
اجنبی لہجے میں پھر وہ پوچھتا ہے کون ہے

بھیڑ میں دنیا کی جو کھونے نہیں دیتا مجھے
یہ جو میری ذات کے اندر چھپا ہے کون ہے

مجھ کو تو بیدار رکھتا ہے صداؤں کا ہجوم
شام کی دہلیز پہ جو سو گیا ہے کون ہے

لکھ رہا ہے جو مری تقدیر میں بربادیاں
وہ امیرِ شہر ہے میرا خدا ہے کون ہے

گرمیٔ آغوشِ مادر کے لیے عارف شفیق

تخلیق : شرد کوکاس
ترجمہ : کمار جعفری

خواندگی پر دو نظمیں ہندی سے

ایک اکیلا حرف

آنکھیں پہچانتی ہیں
کچھ آڑی ترچھی لکیریں
کچھ دائرے جیسی شکلیں
کچھ نیم دائرہ نما
جیسے باچشمے کی ڈنڈی جیسی
مڑی ہوئی لکیریں
لکیریں جو بولتی ہیں / بناتی ہیں حرف
حرفوں سے لفظ / لفظوں سے جملے
جملوں میں خیال پیدا ہوتے ہیں
جو طے کرتے ہیں معنی و مطالب
سچ ہونے والے سپنوں کی عمارت ہیں
بنیاد کا کام کرتا ہے / ایک اکیلا حرف

چاند کا متبادل

ناخواندگی کی اماوس میں
ہاتھ مل کر بنائیں گے
لفظوں کے دیئے
جگمگائے گی جن میں خواندگی کی لو
عقل کے ستاروں کے ساتھ
چمکیں گی ہزارہا آنکھیں
[illegible]

اکبر علی نظر بریلوی

غزل

کب تک خیال و خواب کے موتی پروئیں گے
بستر پہ گرم دھوپ کے کب تک یہ سوئیں گے

یہ سوچ کر نہ رو سکے کھل کر کبھی کہ ہم
برفیلی وادیوں میں کہاں اشک بوئیں گے

رکھ دیں گے ایک آئینہ ہم ان کے روبرو
ہم آج چاندنی میں یوں سورج ڈبوئیں گے

پہلو کا شور کم ہو اگر اُترے اے نظر
[illegible]

تاباں ضیائی
۱/۲- آزاد روڈ، سناود
(ایم پی)

غزل

گہرائیوں میں رہ کے گہر ڈھونڈتے نہ تھے
کرتے تھے ہم دعائیں اثر ڈھونڈتے نہ تھے

منزل کی دھن تھی دھوپ سے بچنے کے واسطے
ہم سایہ دار کوئی شجر ڈھونڈتے نہ تھے

ذلت ہمارے عہد کی جاگیر بھی نہ تھی
ہم عزت و وقار مگر ڈھونڈتے نہ تھے

بانٹی تھیں آفتاب نے کچھ ایسی تلخیاں
خوش ذائقہ مزاج شکر ڈھونڈتے نہ تھے

کافی سمجھ لیا تھا بس اک تار عنکبوت
شاکر تھے ہم اسی پہ جو گھر ڈھونڈتے نہ تھے

تاباں یہ بے نیازی کہ وہ راہی عدم
[redacted]

انیس انور
فلیٹ نمبر ۲۰۲، گل مہر اپارٹمنٹ، بالمقابل
الفلاح مسجد، کوسہ ممبرا
تھانے۔ مہاراشٹر

تنہائی

ہم سے ہے ہم کلام تنہائی
کس کا لائی پیام تنہائی
بے خیالی، خیال کی دیوی
ہم ہیں تیرے غلام تنہائی
کام کی بات سب نے کی لیکن
کوئی آیا نہ کام تنہائی
نام محفل میں کیوں کمائیں ہم
بس رہے تیرا نام تنہائی
اک خلا، اک اتھاہ سناٹا
ہے یہ کیسا مقام تنہائی
بات کس سے کریں اکیلے ہم
راہ میں ہے قیام تنہا
پل میں صدیوں کا رت جگا بیتا
کتنی ہے تیز گام تنہائی
خواب کی سرزمیں سے کیا لوٹے
نیند ہے اب حرام تنہائی
رب کی یکتائی نے بنایا ہے

ستیہ پال ملہوترہ عارف
۱۷۰۷/۱۱ کوچہ بوہڑ والا، کٹڑہ باگھ سنگھ
امرتسر۔ پنجاب

غزل

دل، جگر کھو گئے، جسم، جاں کھو گئے
شوق یہ کیا کیا، ہم کہاں کھو گئے

زندگی! کیوں ترا ساز ہے بے نوا
کس جہاں میں ترے نغمہ خواں کھو گئے

سب صحیفے ہیں رکھے ہوئے طاق پر
اہلِ دانش نہ جانے کہاں کھو گئے

حالِ دل ان سے کہنا نہ ممکن ہوا
لب جو کھولے تو حرف و بیاں کھو گئے

منزلِ ہوش ہم سے گریزاں رہی
خوابِ غفلت میں دونوں جہاں کھو گئے

ہے اُدھر آسماں آج زیرِ قدم
اور اِدھر جلسے کون و مکاں کھو گئے

دل کے آنگن میں پھیلا ہے نورِ کرم
نور میں عارفِ خوش بیاں کھو گئے

قاسم امام
قریش نگر (E)۔ کرلا
ممبئی۔ ۷۰

غزل

مسلسل سوچ میں گزرے ہوئے لمحے بھی آتے ہیں
ہمارے پیچھے پیچھے یاد کے سایے بھی آتے ہیں

یہی وہ خواب ہیں جن پر میں اکثر چونک جاتا ہوں
یہی وہ خواب ہیں جو نیند سے پہلے بھی آتے ہیں

ہرے موسم میں برگ و بار کو آنکھیں ترستی ہیں
شجر کی زندگی میں مرحلے ایسے بھی آتے ہیں

ہم اپنی زندہ لاشوں کی بجھائیں تشنگی کیسے
یہاں پانی پہ ابھری لاش کے ٹکڑے بھی آتے ہیں

ابھی کچھ دیر ٹھہرو آزمانے دو ہنر اپنا
محبت کی تجارت میں کھرے سکّے بھی آتے ہیں

میں اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں لیکن کئی سورج
مرے آگے تو چلتے ہیں مرے پیچھے بھی آتے ہیں

شاغل ادیب
زیب منزل، ۱-۴-۳۰۴-۴/۹/۳
مشیرآباد، حیدرآباد اے پی

کوئی

ہیں!
ہاں میں تو
ہوں دوست
سارے اپنوں کا اور
کوئی بیگانہ بھی میرا دشمن نہیں
جانے پھر بھی مجھے
ہو رہا ہے یہ احساس کیوں
صدیوں صدیوں سے جیسے "کوئی"
ہر جگہ ہر قدم
ہر ڈگر ہر نگر
ہاتھ میں خنجر اک تھام کر
کر رہا ہے تعاقب میرا
ہاں!
مگر یہ "کوئی"
واقعی ہے "کوئی"
یا یہ "کوئی"
وجود اپنا میرا ہے خود

جعفر ساہنی
ڈی/۴۵ توپسیا روڈ
ہندوستان مینڈیکوز۔ کلکتہ ۳۹

کھلونا

وہ گڈو ہے یا پپّو ہے
بڑا معصوم بچہ ہے۔
کھلونوں کے جہاں میں وہ
بہت مسرور لگتا ہے
یہ کرکٹ، گیند اور ہاکی
یہ گاڑی، ٹیکسی، بگھی
ہرن، خرگوش اور ہاتھی
یہ کتا، شیر اور بلی
سب بکھرے پڑے ہیں
وہ درمیاں اُن کے کھڑا
بندوق لیے ہاتھوں میں
بہت مسرور لگتا ہے
ذرا مغرور لگتا ہے

غزلیں

ڈاکٹر خاور خان سرحدی
سرائے میاں دہلی گیٹ
علی گڑھ - یوپی

وہ شخص اجنبی ہے مگر آشنا سا ہے
لکھا ہوا لفافے پہ اپنا پتا سا ہے

جلتا ہوا چراغ ہے لیکن بجھا سا ہے
وہ آدمی ہے یا کوئی بہروپیا سا ہے

حاصل ہیں تم کو چاند ستارے گہر سبھی
خالی مگر فقیر کا اب تک یہ کاسا ہے

محروم تاج و تخت سے ہم اپنے ہو گئے
ان واقعات میں کوئی قصہ چھپا سا ہے

رکھتی ہے پاؤں جب بھی زمیں پر کبھی صبا
بھولی ہوئی سی یاد کا غنچہ کھلا سا ہے

خاورؔ یقیں نہیں کہ کنارہ نصیب ہو

خواجہ فراز (فراز بندہ نواز)
انڈیکر کیوز روڈ،
نزد جامع مسجد بدامی کرناٹک

اس کے پاس دولت پڑی اس کا کون اپنا نہیں
کس سے پیار تو مانگتا، تیرے پاس پیسا نہیں

بدلا حسن کا طور بھی بدلا عشق کا طرز بھی
اس کو ذوقِ پردہ نہیں اِس کو شوقِ جلوہ نہیں

اب لطف بہاراں کہاں اب شوقِ نظارا کسے
کوئی داغ کہنہ نہیں، کوئی زخم تازہ نہیں

میری بزم کا رنگ اور تیری بزم کا رنگ اور
اِس میں شمع جلتی نہیں اور دل اس میں جلتا نہیں

چوراہے، گلی، راستے، سڑکیں اور اونچے مکان
اِک انسان کو چھوڑ کر، میرے شہر میں کیا نہیں

سن کر یہ غزل میری کیا کوئی فرازؔ اب کہے

غزلیں

ڈاکٹر محبوب راہی
لام نبی آزاد کالج
ارسی ٹاکلی، آکولہ

یے بار پریشانی وہ جب گھر سے نکلتا ہے
لگتا ہے مسائل کے سمندر سے نکلتا ہے

مجھ لیجیے کہ بس آتش فشاں پھٹنے ہی والا ہے
شرارہ سا اگر کچھ سرد پتھر سے نکلتا ہے

ڑا محتاط ہے ناخن بھی تر ہونے نہیں دیتا
کا کر جب بھی وہ غوطہ سمندر سے نکلتا ہے

بس سیلاب کس غالب کے گھر کی بات کرتے ہو
ہر سیل بلا تو اب مرے گھر سے نکلتا ہے

یاں! جو شعر ہوتا ہے وہ یونہی تو نہیں ہوتا
کہ دل کو چیر کر ہر لفظ اندر سے نکلتا ہے

ں عاجز آچکا ہوں اپنی مسیحائی سے اے راہی
[illegible]

م۔ ر۔ ح۔ امام
ریڈر شعبۂ اردو
مرزا غالب کالج گیا۔ بہار

مرا ہی قصّہ ہے یہ ٹوٹنے بکھرنے کا
مجھی کو حکم ہے اقبالِ جرم کرنے کا

کھنڈر میں ماضی کے جاتے ہیں دشمنِ ایماں
سراغِ زیست وہیں دفن ہے بکھرنے کا

کہو تو ساکت و صامت کھڑا میں ہو جاؤں
ارادہ ہو جو مجھے سنگسار کرنے کا

ہر ایک سانس سے تلقل کی آ رہی ہے صدا
غمِ حیات نے بدلا ہے روپ جھرنے کا

فقیہِ شہر نے بے بس بنا دیا ورنہ
سنوارنے کا ہنر بھی ہے اور سنورنے کا

مُحسن نے خونِ جگر سے شعور بخشا ہے
[illegible]

ظہیر علی
۶-۱۲/۱۹۲ گورنمنٹ کالونی
باندرہ (ایسٹ) ممبئی ۵۱

پوت راج

آج کا دن بھگت کے لوٹا ہوں
شام مجھ سے حساب مانگتی ہے
کتنے کوڑے تیرے بدن پہ پڑے
گھاؤ کتنے دل و ذہن پہ لگے
میں تھکا ہارا کیا بتاؤں اسے
دل میرے پاس، نہ ذہن میرا
میں نے تو یہ ساری قیمتی چیزیں
کاروبارِ جہاں کی خاطر
روزی، روٹی، مکان کی خاطر
سیکڑوں سال پہلے بیچی تھیں

پاس جب دل نہیں تو زخم کہاں؟
ذہن جب بک چکا تو غم کیسا؟
اب یہ سرتاپا بدن اچھا ہے
زندگی جھیلنے میں سچا ہے
یہ بدن، بے حس و بے روح بدن
تازیانے ہزار سہتا ہے
پھر بھی تکلیف سے مبرا ہے
میں تو اس پوت راج جیسا ہوں
جو گلی کوچے بھیک مانگتا ہے
گھنگھروؤں کی صدا پہ ناچتا ہے
ڈھول کی تھاپ پہ تھرکتا ہے
وہ اذیت پسند ایسا ہے
دوسروں کے دلوں میں گھر کرنے
اپنے کوڑے کو آزماتا ہے
اور ادھ ننگے بدن پر اپنے
ان گنت وار کیے جاتا ہے
تب کہیں روزی روٹی پاتا ہے

وہ بھی انساں ہے، میں بھی انساں ہوں
وہ بھی زندہ ہے، میں بھی زندہ ہوں

صدف جعفری
شاہ فیملی، لکھمنیا، بیگوسرائے بہار

غزل

شبِ غم میں کرن جب پھوٹ نکلی
پرانی بات گویا جھوٹ نکلی
صدائے وصل بھی ایک سانحہ تھی
کسی ارماں کا سینہ کوٹ نکلی
شجر کے جسم کا عنوان بدلہ
کہ شاخِ گل بھی اکثر لوٹ نکلی
جھکائے سر وہ شرمندہ کھڑا ہے
سچائی کیوں زباں سے چھوٹ نکلی
ہوائے تیز کے تیور عیاں تھے
بھرے باغوں کو آخر لوٹ نکلی
سڑک تھی نرم ساری سختیوں میں
پہن کر کل صدف جب بوٹ نکلی

مانگے کا اُجالا



خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے

کتابت کی طبع زاد غلطیاں

کچھ لوگوں کو اس پر اعتراض ہے کہ ہم اپنے کالموں میں انیس ناگی کا تذکرہ کچھ زیادہ ہی کرنے لگے ہیں۔ استاد لاغر مراد آبادی نے اپنی ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا' ایک ہی مصرع طرح پر ہر تیسرے چوتھے ہفتے غزل لکھنا اگر کسی حکیم کے نسخے پر عمل کرنے کی وجہ سے ہے تو غزل لکھ کر براہ راست اپنے ممدوح کو بھیج دیا کیجیے۔ اگر ان کو اصلاح مقصود ہے تو وہ غیر مطبوعہ کالم سے بھی ہو سکتی ہے۔ بصورت دیگر یہی سمجھا جائے گا کہ آپ کے پاس لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں رہا۔

استاد محترم نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہیں۔ ہم تو خود محتاج دعا ہیں' کسی دوسرے کی اصلاح کیا کریں گے۔ انیس ناگی بھی خدا کے فضل سے اصلاح کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں اور اس بلند مقام پر فائز ہیں جہاں انسان دوسروں کے لیے اصلاح و عبرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ہم موصوف کے بارے میں بار بار اس لیے لکھتے ہیں کہ اس وقت پاکستان میں وہ واحد ادیب ہیں جو انفرادی فکر رکھتے ہیں اور تخلیقی سطح پر بے حد فعال ہیں۔ وہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ اتنا اور ایسا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ وہ بیک وقت شاعر' افسانہ نگار' نقاد' ناول نویس اور مترجم ہیں۔ "دانشور" جیسے منفرد ادبی رسالے کے مدیر ہیں جس میں بیشتر تحریریں خود انھیں کی ہوتی ہیں اگر حسنِ اتفاق سے کچھ جگہ بچ جائے تو اسے ان ادیبوں کی تحریروں سے پُر کیا جاتا ہے جنھیں کسی دوسرے رسالے میں جگہ نہیں ملتی۔

انیس ناگی اپنی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں خود کفیل ہیں۔ نہ صرف یہ کہ کتابیں وہ خود لکھتے ہیں بلکہ ان کی کمپوزنگ اور کاپی پیسٹنگ بھی خود کرتے ہیں۔ خود کمپوز کرنے کا ایک

فائدہ یہ ہے کہ کتابت کی غلطیاں بھی طبع زاد ہوتی ہیں اور انھیں کسی دوسرے کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ قاری (بشرطیکہ دستیاب ہو) ان غلطیوں سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔

انیس ناگی کی ایک خوبی جو اردو کے کسی ادیب میں نہیں پائی جاتی' یہ ہے کہ وہ انتہائی بے باک اور صاف گو انسان ہیں۔ بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں۔ ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا سچ صرف خود انھیں کے لیے قابل قبول ہوتا ہے' دوسرے اس لیے قبول نہیں کرتے کہ ان کے سچ کا معیار الگ ہے۔ دوسروں کے بارے میں منفی اور اپنے بارے میں مثبت رائیں قائم کرنے میں بھی ان کا جواب نہیں ہے۔ کبھی کسی کی تعریف کرتے بھی ہیں تو یوں جیسے خیرات دے رہے ہوں۔ فیض کی زیادہ سے زیادہ تعریف کریں گے تو یہ نہیں کہیں گے کہ وہ بڑے شاعر ہیں بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ سب سے زیادہ مشہور شاعر ہیں۔ اپنی کم سے کم تعریف کریں گے تو یہ نہیں کہیں گے کہ میں انیس ناگی ہوں' بلکہ یہ کہیں گے کہ میں نئی شاعری کا بانی ہوں۔

انیس ناگی کی تازہ ترین کتاب "میری ادبی بیاض" ہے جو پچھلے ہفتے شائع ہوئی ہے اور اسی سے استفادے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی عجیب و غریب کتاب ہے۔ عجیب اس لیے کہ اس میں مختلف طرح کی تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے اور غریب اس لیے کہ پڑھنے والے کو غربت بلکہ ذہنی طور پر غربت کا احساس ہوتا ہے۔ افسوس صد افسوس! مفاد پرست سیاست دانوں نے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت اس حد تک خراب کر دی ہے کہ ادبی دنیا میں بھی غربت و ناداری بڑھتی جا رہی ہے۔

لاہور کی بلدیاتی حدود میں اگرچہ ہارن بجانا منع ہے لیکن شاعری کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اس وجہ سے لاہور میں شعر کہنے والوں کی تعداد شعر سننے والوں سے بڑھ گئی ہے۔ اس صورت حال کے تدارک کے لیے انیس ناگی نے بعض شاعروں کو نثر لکھنے کے کام پر لگا دیا ہے۔ اس کام کا پہلا نمونہ انیس ناگی کی زیر نظر کتاب کا دیباچہ ہے جو شاعر زاہد مسعود نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ پوری انیس سطروں پر مشتمل ہے اور ان میں بھی کام کی سطر ایک ہی ہے جو یہ ہے : "انیس ناگی تنازعوں سے نہیں ڈرتے کیونکہ وہ خود ایک ادبی تنازع ہیں۔" یہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک نادر واقعہ ہے کہ کوئی ادیب دوسروں سے جھگڑتے جھگڑتے خود ہی ایک جھگڑا بن کر رہ جائے۔

"میری ادبی بیاض" میں افسانے' نظمیں' تنقیدی مضامین' شخصی خاکے اور یادداشتوں پر مبنی مضامین شامل ہیں۔ افسانے' نظمیں اور تنقیدی مضامین تو ویسے ہی ہیں جیسے

نیس ناگی عمر بھر لکھتے رہے ہیں لیکن دوسری تحریریں بہت دلچسپ ہیں ... اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر موصوف چاہیں تو "اوراق ناخواندہ" کے علاوہ بھی بہت کچھ تصنیف کر سکتے ہیں۔ ن۔ م۔ راشد اور فیض کے شخصی خاکوں میں بعض سنسنی خیز واقعات ملتے ہیں جن سے ان دونوں کی شخصیتوں کے نئے رُخ سامنے آتے ہیں۔

انیس ناگی نے بتایا ہے کہ انھوں نے جب پاکستان کی جدید اردو شاعری کے انگریزی تراجم پر مشتمل کتاب مرتب کی تو راشد نے ان سے پوچھا : "تم اپنی کتاب کس شاعر کی نظموں سے شروع کر رہے ہو !" ناگی نے بتایا کہ سب سے پہلے فیض کی نظمیں ہوں گی۔ اس کے جواب میں راشد نے کہا : "تو پھر میری نظموں کے تراجم اپنی کتاب سے خارج کر دو۔" انیس ناگی کو غصہ آگیا۔ انھوں نے کہا : "میں کتاب کے دیباچہ میں آپ کی نظموں کی غیر حاضری کی وجہ یہی بیان کروں گا کہ آپ فیض سے پہلے چھپنا چاہتے تھے۔" راشد نے قہر بھری نظروں سے ناگی کی طرف دیکھا اور کہا "جیسے تمہاری مرضی۔"

جب ناگی کی کتاب "نیا شعری افق" شائع ہوئی' راشد اس زمانے میں نیویارک میں تھے۔ ناگی نے انھیں کتاب بھیجی تو راشد نے خط کے ذریعہ یہ رائے ظاہر کی : "عزیزی آپ بر خود غلط قسم کے نقاد ہیں۔ آپ نے جس تیقن سے اپنے غلط نظریات کا اظہار کیا ہے' مجھے اس پر حیرت ہے۔"

جن دنوں ناگی شجاع آباد میں سب ڈویژنل مجسٹریٹ تھے' اس زمانے میں راشد پاکستان آئے اور ملتان میں اپنے بھائی کے ہاں مقیم ہوئے۔ انھوں نے فون کر کے ناگی کو شجاع آباد سے تیس میل دور ملتان بلایا اور اپنا ایک مسئلہ پیش کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مشہور شاعر منیر نیازی نے "المثال" کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کر رکھا تھا' اور اس کی طرف سے راشد کی کتابیں شائع کی تھیں۔ راشد کا خیال تھا کہ منیر نیازی نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے' لہٰذا وہ اس کے خلاف غبن اور دھوکا دہی کا مقدمہ درج کرانا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ناگی کی مدد چاہتے ہیں۔ ناگی نے مروت میں مدد کا وعدہ تو کر لیا مگر اس کے بعد راشد سے ملاقات نہ کی۔ ناگی کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ انھوں نے ادبی معاملات میں اپنے سرکاری اختیارات کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنے تمام ادبی حریفوں کو بد چلنی اور نقص امن کے الزامات کے تحت تھانے کچہری کے چکر لگانے پر مجبور کر دیتا۔ ہم انیس ناگی کی طرح کے ایک سرکاری افسر سے واقف ہیں جنہیں عدالتی اختیارات بھی حاصل تھے اور شاعری کا بھی شوق تھا۔ ایک محفل میں وہ کلام سنا رہے تھے' حاضرین ادب کی وجہ سے خاموشی سے سن

۔ تھے۔ جناب شاعر کو داد نہ ملی تو ان کے اندر کا سرکاری افسر چراغ پا ہو گیا۔ انھوں نے
رین کو ڈانٹ کر کہا۔ "اس خاموشی کی وجہ سے آپ کو توہین عدالت کے جرم میں سزا
تی ہے۔"

فیض کے شخصی خاکے میں ناگی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ انھوں نے فیض کی کچھ
ں کے انگریزی میں ترجمے کیے اور فیض کو سنانے کے لیے لاہور کے ایک ہوٹل میں گئے
وہ مقیم تھے۔ ان ترجموں سے فیض اتنے خوش ہوئے کہ انیس ناگی کو ماسکو کے ادبی میلے
اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ آگے کا قصہ انیس ناگی کے الفاظ میں یہ ہے : "معقب
ٹک ٹک کی آواز آئی، مڑ کر دیکھا تو کشور ناہید اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی مصنوعی مسکراہٹ
ساتھ بلند آوازیں بولی' آہا آج دونوں میں کیا راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کشور کو دیکھ
یرا دل بیٹھ گیا اور میں سوچنے لگا' اب میں کبھی ماسکو نہیں جاسکوں گا۔ وہی ہوا جس کا
نہ تھا۔ اس نے اپنے سینڈل اتارے اور پلنگ پر چڑھ کر فیض صاحب کے سرہانے بیٹھ
۔ اس نے ایک دو مرتبہ فیض کی پیشانی نہایت کاروباری طریقے سے تھپتھپائی پھر اس کو
دیا... وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھی کہ میں وہاں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ فیض صاحب' یہ
ٹ یہاں کیا کر رہا ہے' میں تو آپ کو مشاعرے میں لے جانے کے لیے آئی ہوں... فیض
ب نے کہا' کشور اس مرتبہ انیس ہمارے ساتھ ماسکو جائے گا اور وہاں اپنی نظمیں سنائے
کشور پٹاخ سے بولی' واہ فیض صاحب ہم آپ کے جاں نثار ہیں اور یہ سیریہ کرے۔ یہ تو آپ
شاعری کے خلاف تقریر بھی کرتا ہے... 'فیض صاحب نے سگریٹ کے ایک دو گہرے کش
اور کہنے لگے' انیس تمھارا ماسکو جانا درست نہیں۔ خفیہ پولیس تمھیں تنگ کرے گی اور
ست میں مشکل پیش آئے گی... میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پندرہ دنوں کے بعد معلوم ہوا
کشور ناہید اور فیض صاحب ماسکو کے ادبی میلے کے لیے پرواز کر چکے ہیں۔"

انیس ناگی کی خود شناسی کی طرح غالب شناسی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس سلسلے میں وہ
ابیں لکھ کر غالب خستہ کو مزید خستہ کر چکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں بھی ان کا ایک مضمون
ہے جس کا عنوان ہے : "غالب اور میرا تبادلہ" اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ جس
نے میں وہ پنجاب آرکائیوز کے ڈائریکٹر تھے' انھیں حکومت پنجاب کے ریکارڈ میں غالب کی
سے متعلق بہت سی غیر مطبوعہ دستاویزات مل گئیں اور انھوں نے ان کے ترجمے کا کام
ع کر دیا۔ انیس ناگی کے پیشرو نے حکومت پنجاب سے شکایت کی کہ وہ پہلے ہی اس
وع پر کام کر چکے ہیں لہٰذا ناگی کو دخل در معقولات سے روکا جائے۔ اس پر ناگی لکھتے

ہیں : "میں نے سوچا کہ غالب سے دوستی مہنگی پڑی ہے۔ ان سے دوری رہنا بہتر ہے لیکن یہ ممکن نہیں۔ میرے پاس غالب پر کام کرنے کے ایک دو منصوبے ہیں۔ اس تذبذب میں ہوں کہ ان پر کام کروں یا انہیں ابھی التوا میں رکھوں۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور مزید آزمایشوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

ہماری رائے میں یہ دوستی غالب اور ناگی دونوں ہی کو مہنگی پڑی ہے۔ ناگی کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے، اپنے منصوبوں پر کام جاری رکھنا چاہیے۔ ہم انہیں اطمینان دلاتے ہیں کہ غالب میں ابھی مزید آزمایشوں سے گزرنے کی سکت ہے۔

ناگی کو اپنی شاعری پر اتنا فخر نہیں جتنا اس بات پر ہے کہ ۱۹۶۰ء میں نئی شاعری کی جو تحریک چلی تھی، وہ اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ یہ نئی شاعری جو لاہور کے مشہور ٹی ہاؤس کی چائے کی پیالی میں طوفان کی حیثیت رکھتی ہے، کب کی نقش و نگار طاقِ نسیاں بن چکی مگر انیس ناگی اسے اردو ادب کی ایک عہد آفریں تحریک سمجھتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ وہ نئے افسانے کو بھی اپنی نئی شاعری کی ضمنی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں : "انتظار حسین کی ادبی ریشہ دوانیوں اور نئی شاعری کی مخالفت کا یہ حل سوچا گیا کہ ان کے مقابلے میں انور سجاد کو تیار کیا جائے... میں نے اس سے کہا، منٹو کی وفات کے بعد اردو افسانے کا میدان خالی ہے۔ اس نے اپنا منحنی سا سینہ پھلا کر کہا "میں کس لیے ہوں۔" ان مکالموں کے بعد نیا افسانہ وجود میں آگیا۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن آگے چل کر ناگی اپنے بیان کو ایک ایسے جملے پر ختم کرتے ہیں جس سے یہ واقعہ ایک لطیفے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ جملہ یہ ہے "انتظار حسین بہت چیں بجبیں ہوئے اور انور سجاد کی دیکھا دیکھی اپنے افسانے کا رنگ بدلا۔"

اسی قسم کی باتیں پڑھ کر ناگی کو داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ انھوں نے اس کتاب میں بڑی محنت سے ادبی لطیفے جمع کیے ہیں۔ لیکن اس میں صرف لطیفے ہی نہیں ہیں، بعض دردناک واقعات بھی ہیں۔ "ایک بھولی ہوئی سرگزشت" کے عنوان کے تحت ناگی نے اپنے حالات زندگی بیان کیے جنھیں پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ اس مضمون کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے : "مجھے پوری طرح احساس ہے کہ میں ایک ناکام ادیب ہوں۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح احساس ہے کہ میں نے ادب کے آدرش کے لیے اپنی ساری عملی زندگی وقف کی تھی، وہ بھی رائیگاں گئی۔ عملی سطح پر بھی میں ایک ناکام اور بودا شخص ثابت ہوا ہوں جو ترقی اور عروج کی منزل طے نہیں کر سکا۔ میں بین الاقوامی سطح پر ادب کا ایک ستارہ بننا چاہتا تھا

لیکن میں جغرافیائی اور تہذیبی سطح پر ایک ایسے بد قسمت خطے سے تعلق رکھتا ہوں جو ہمیشہ محکوم رہا ہے' جو ہمیشہ انتشار میں رہا ہے اور دنیا کے نقشے پر کسی امتیاز کا حامل نہیں۔"

ناگی نے بڑی صفائی کے ساتھ اپنے مزاج اور شخصیت کی بعض ایسی خصوصیات کا ذکر کیا ہے جنھیں کوئی دوسرا بیان کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لکھتے ہیں : "میں اس وقت جو کچھ ہوں اور مجھ میں جو کج رویاں ہیں' ان کا ذمہ دار میرے والد کا پیدا کردہ ماحول تھا۔ میں نفسیات کے علم سے زیادہ آگاہ نہیں ہوں۔ لیکن جینیٹکس کی تھیوری کو مانتا ہوں' مثال کے طور پر یہ خود سری' ضد' اپنی راستی پر بے پایاں یقین' خود پسندی' طبیعت میں بے پناہ غصہ اور ایک طرح کی جذباتی سنگ دلی' منہ پھٹ ہونا اور گستاخی میری وراثت میں آئی ہے۔ میرے خاندان میں بہتر تعلیم کے باوجود تمام کی شخصیت پر ایک طرح کی ناتراشیدگی اور احساس برتری بے حد غالب ہے۔"

اس مضمون کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے : "جو شخص کسی کو کچھ نہیں دے سکتا' کسی کا نفع نقصان نہیں کر سکتا' اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں اسی لیے اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں۔ اس تنہائی میں میری سوگواری میری ملازمت کی وجہ سے ہے۔ ملازمت میں جتنی میری تحقیر کی گئی ہے' اگر میں شاعر نہ ہوتا تو شاید خود کشی کر لیتا۔ میری ملازمت میرے لیے' میری آزادی کے لیے ہر طرح کی ایک رکاوٹ رہی ہے۔ اگر میں نے اس طرح کی ملازمت کرنا تھی تو پھر ایک کل وقتی ادیب ہونا زیادہ باعث فخر تھا۔ میں اس فخر سے اپنے آپ کو محروم پاتا ہوں۔ میں اس غلطی کا کفارہ ادا نہیں کر سکتا۔ میں ایک کل وقتی ادیب کے طور پر زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن حالات نے مجھے اور طرف دھکیل دیا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے مزاج کے اندر تلخی اور میری تحریروں میں سفاکی یا ناخوشگواری موجودہ حقیقت کے ادراک سے پیدا ہوئی ہو جس میں مجھے ہر شخص ایک مکار درندہ نظر آتا ہے۔"

ہم یہ کالم انیس ناگی کے لیے درازیِ عمر اور شادمانی کی دعا پر ختم کرتے ہیں تاکہ وہ آیندہ زندگی اپنی مرضی کے مطابق بسر کر سکیں۔

یوسف ناظم
۱۹- الہلال' باندرہ
ممبئی- ۵۰

تماشائے اہل قدم

قدرت کی طرف سے دنیا کے سارے آدمیوں کو فی کس دو پانو کے حساب سے پانو دیے گئے ہیں انھیں دو پانو سے آدمی کو اپنی زندگی کا سارا سفر زیادہ تر پیدل ہی طے کرنا پڑتا ہے- کسی بھی آدمی کو دو سے زیادہ پانو نہیں دیے گئے ہیں- جانوروں کو البتہ (وہ بھی سارے جانوروں کو نہیں) دو سے زیادہ پانو کا مستحق سمجھا گیا ہے کیونکہ ان کی ضروریات آدمیوں کی ضروریات سے ذرا زیادہ ہوتی ہیں- ویسے چند آدمیوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ چوپایوں کے سے مشاغل اور حرکتیں اختیار کرسکتے اور ان حرکتوں سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوسکتے ہیں- لیکن چونکہ ان کے پانو عام آدمیوں کی طرح صرف دو ہوتے ہیں اس لیے جانوروں کی طرح کے اعمال نامہ رکھنے والے اصحاب فکر و دانش انسانی معاشرے ہی میں زندگی گزارتے ہیں بلکہ انھیں اپنی غیر معمولی خصوصیات کی بنا پر معاشرے میں زیادہ عزت دی جاتی ہے- دی کیا جاتی ہے وہ خود ہی اسے سمیٹ لیتے ہیں- یہ لوگ اپنا نام خود روشن کرتے ہیں- یہ لوگ اپنے والدین کا نام اس لیے روشن نہیں کرتے کہ وہ انھیں پوشیدہ رکھنا ہی مناسب سمجھتے ہیں-

آدمی کا بچہ جو درحقیقت صرف آدمی ہی کا نہیں بلکہ پورے گھر کا باپ ہوتا ہے' جب تک اس قابل نہیں ہوجاتا کہ از خود اپنے پانو پر کھڑا ہوسکے اور گرے بغیر دو قدم چل سکے' وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہے اس لیے آدمی کے اعضائے جسمانی میں گھٹنوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے- یہ گھٹنے نہ ہوتے تو ہماری نومولود نسلیں کبھی چلنا نہ سیکھ پاتیں- ہر آدمی خواہ وہ اپنی عملی زندگی میں کتنی ہی اونچی حیثیت کا کیوں نہ ہو اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں جسے زندگی نامے کا دیباچہ کہنا چاہیے' گھٹنوں ہی کے بل چلا ہے اور کچھ صورتوں میں یہ بھی ہوا ہے کہ زیادہ دنوں تک گھٹنوں کے بل چلنے کی وجہ سے چند خوش قسمت لوگوں کی عقل گھٹنوں ہی میں رہ گئی- ان کی بھی ترقی کی راہیں کھلی ہی رہیں' کیونکہ نقصان تو اس وقت ہوتا ہے جب عقل ضرورت سے زیادہ ہوجائے-

جب آدمی نے چلنا سیکھ لیا تو چلنے کے مختلف انداز خود بخود اس کے ذہن میں آگئے- ان

میں سب سے اچھا انداز دبے پانو چلنے کا ہے۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا قیامت اس کے قریب سے گزر گئی۔ زندگی میں کئی موقعے ایسے آئے ہیں جب آدمی کو بلی کی طرح دبے پانو چلنا پڑتا ہے (کچھ لوگ اپنے گھر میں بلی اسی لیے پالتے ہیں یہ ان کی کوچ ہوتی ہے)۔ خفیہ کاموں میں چلنے کا یہ انداز ایک لازمی شرط ہے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی کو سانپ کہہ کر ڈرانا ہو تو دبے پانو چل کر ہی اس کے قریب جانا چاہیے۔ یہ دبے پانو چلنے کی بہت رومانی صورت ہوتی ہے۔ یہ عادت محرمانہ رہے تو ٹھیک ہے لیکن یہ مجرمانہ شکل اختیار کرلے تو یہ پانو قانون کے ہاتھوں پڑجاتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان ہاتھوں کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے ـــــ لیکن ہمیشہ نہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ بعض صورتوں میں قانون بھی صورت دیکھ کر پسیج جاتا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب آدمی کا زبان کا کھرا ہونا ضروری تھا۔ اب اسے پانو کا کھرا ہونا چاہیے۔ اس کا صرف ثابت قدم ہونا کافی نہیں ہے گو کہ آدمی میں ثابت قدم ہونے کی بھی صفت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں کافی وقت لگتا ہے کیونکہ اب زمانہ ہی لڑکھڑانے اور ڈگمگانے کا ہے لیکن آدمی پانو کا کھرا ہوجائے تو لوگ اس کے نقش قدم کو غور سے دیکھنے اور اور اسی پر چلنے کی مشق کرتے ہیں۔ کس کے نقش قدم پر چلنا چاہیے اس کا فیصلہ آدمی کو خود کرنا پڑتا ہے اور یہ فیصلہ اکثر غلط ہوتا ہے۔ فیصلوں کا کیا ہے، فیصلے تو اکثر عدالتوں میں بھی ہوتے ہیں جن کا قطعی فیصلہ سپریم کورٹ میں ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب درخواست گزار اس فیصلے سے "استفادہ حاصل کرنے" کے موقف میں نہیں ہوتا اور اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ اس وقت دنیا میں ہوتا ہی نہیں ہے۔ (استفادہ حاصل کرنے کے بارے میں ہمیں حال ہی میں یہ اطلاع ملی ہے کہ یہ ترکیب یا اصطلاح صحیح ہے اس لیے وہ لوگ جو اب تک صرف استفادہ کرنے پر اکتفا کیے ہوئے تھے اب استفادہ حاصل کررہے ہیں۔ ان کا معدہ مضبوط ہوگیا ہے)۔ بات نقش قدم کی ہورہی تھی، اس سلسلے میں لوگ احتیاط یہ کرتے ہیں کہ کسی شیخ کے نقش قدم کا انتخاب نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہوتا ہے اور یوں بھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان میں سے کس یوں پر قدم رکھ کر چلیں۔ اگر باپ سے اس انتخاب میں غلطی ہوجاتی ہے تو سمجھ دار بیٹا آگے چل کر اس کی تصحیح کردیتا ہے۔ ایسا بعض صورتوں میں ہوا ہے اور اس لیے دانشوروں نے کہا ہے کہ پدر اگر نتواند پسر تمام کند۔

جو لوگ پانو کے کھرے ہوتے ہیں ان کا ہر قدم سیدھا پڑتا ہے خواہ وہ دایاں پانو ہو یا

یاں۔ جن لوگوں کا ذہن از خود کام نہیں کرتا وہ اپنے پانو پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ کرنا بھی
ہیے کیونکہ پانو تعداد میں دو ہوتے ہیں جب کہ ذہن صرف ایک۔ یہ لوگ ہر قدم پر اس
ت کا خیال رکھتے ہیں کہ دایاں قدم پہلے اٹھائیں یا بایاں۔ سکہ اچھالنے کا وقت ان کے پاس
تا نہیں ہے ورنہ وہ ہر قدم پر سکہ ہی اچھالتے رہتے۔ (یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس
ت تو وافر مقدار میں ہو لیکن اچھالنے کے لیے سکہ نہ ہو)۔ پانو کی اہمیت اسی وقت تسلیم
لی گئی تھی جب آدمی پتھروں کے عہد میں رہتا تھا اور اسی لیے جب بھی کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا
ں کے پانو ہی دیکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بنتے اور اگر کسی بچے کے پانو بہت زیادہ چکنے ہوتے تو
گ اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں کرتے کہ یہ بچہ بہت ہونہار ہوگا۔ بچوں کے پانو اب بھی
یکھے جاتے اور انھیں ہی پیش نظر رکھ کر ان کے مستقبل کے فیصلے کیے جاتے ہیں لیکن اب
یکھا یہ جاتا ہے کہ بچے کے پانو 'بچہ مزدوری' کے قابل ہیں یا نہیں۔ چکنے پانو والے بچے 'بچہ
زدوری' کے لیے غیر موزوں مانے جاتے ہیں۔ ماہرین معاشیات کا خیال ہے کہ فی کس یعنی
کیپٹا (PER CAPITA) آمدنی کے لیے ہر گھر میں زیادہ بچے ہونے ضروری ہیں اسی لیے
ض ملکوں میں جنھیں ترقی پذیر ملک کا نام دیا گیا ہے بیشتر گھر' بچے ہی چلاتے ہیں یہ اور بات
ہے کہ ان گھروں کا نام بال مندر نہیں ہوتا۔ 'چلڈرنس ہوم' کا مطلب ہمارے ذہن میں کچھ
رہی ہے۔ اسے ادبی زبان میں تسامح کہا جاتا ہے—— زنگی کو کافور کا نام دینے کی اس سے
یادہ ناقص مثال دوسری نہیں ملتی۔

چلنے کے انداز میں ایک انداز تیز تیز قدم چلنے کا بھی ہے' جب کوئی نوجوان کسی انٹرویو
کے لیے جاتا ہے تو وہ تیز تیز قدم ہی چلتا ہے اور جب انٹرویو سے فارغ ہو کر واپس ہوتا ہے تو
بھاری قدموں سے چلتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس جتنی بھی
گریاں ہوتی ہیں وہ اصلی ہوتی ہیں۔ اصلی سندوں کا بوجھ ہی اسے بھاری قدموں سے چلنے پر
مجبور کرتا ہے۔ چھلانگیں مار کر چلنے والے لوگ ڈگریوں کے لیے تعلیمی اداروں کی طرف نہیں
اتے' دکان داروں سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔

آدمی کو بہت دن بعد پتہ چلا کہ یہ پانو تو بہت کام کی چیز ہیں۔ ان سے صرف چلا اور بھاگا
ہیں جا سکتا' لمبی اور اونچی جست بھی لگائی جا سکتی ہے۔ یہ لانگ جمپ اور ہائی جمپ صرف
کھیل کے میدان ہی میں استعمال کی چیزیں نہیں ہیں عملی زندگی میں بھی زیر استعمال لائی
جا سکتی ہیں اور جو شخص بھی جست لگانے میں مہارت حاصل کر لیتا ہے دنیا اس کے لیے
'بازیچۂ اطفال' بن جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کو اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے اور بعض لوگ جو

اپنے ذاتی والد کے علاوہ ایک گاڈ فادر تلاش کرلیتے ہیں' گھر بیٹھے جست لگاتے رہتے ہیں' اسے پول جمپ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی پیروں کا کمال۔(پیروں کا بھی اور پیروں کا بھی)۔

ہمارے بزرگوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ پانو اتنے ہی پھیلاؤ جتنی کہ چادر ہو۔ سچ پوچھیے تو ہمیں یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ مشوروں کو ممنوع قرار دینے کا رواج ہمارے یہاں ہے نہیں' ہوتا تو ہم مشورہ دیتے کہ اس مشورے کو ممنوع قرار دیا جائے۔ اس مشورے نے ہمارے یہاں بونے پیدا کردیے۔ ہمیں یقین ہے کہ جس کسی نے بھی یہ مقولہ گڑھا خود اس نے اپنے روز مرہ استعمال کے کپڑے کبھی تنگ یا چھوٹے نہیں سلوائے۔ کبھی اٹنگے پیجامے نہیں پہنے۔ ایسے کرتے نہیں پہنے جن میں وہ خود کو پھنسا پھنسا محسوس کرتے۔ کشادہ کپڑے پہننے والے شخص کا کاش ذہن بھی کشادہ ہوتا۔ اس مقولے کا ایک اور پہلو بھی ہے' جو ذرا دردناک ہے اس لیے ہم اس پہلو سے سرسری گزر جانا پسند کریں گے۔ مقولوں کی بات چل پڑی ہے تو ہمیں وہ مقولہ بہت پسند ہے جو سر سے کفن باندھ کر گھر سے نکلنے کے بارے میں ہے۔ کفن سے متعلق ہماری معلومات یہ ہیں کہ یہ آدمی کے پورے قد کے برابر ہوتا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اور اگر کسی سنگدل شخص کو کسی کی 'بے زبانی' دیکھنی ہوتی ہے تو کفن کو منہ سے سرکانا پڑتا ہے۔ یہ کتنی مسرت کی بات ہے کہ آدمی کو زندگی میں چادر کے ناپ کے مطابق پانو پھیلانے کا پابند رہنا پڑا ہو لیکن یہ کیا کم ہے کہ اسے اپنی طویل زندگی کا سفر ختم کرنے پر سر اور پانو دونوں پوری طرح ڈھانپنے کی آسایش مہیا کردی جاتی ہے ـــــ ممکن ہے ہمارا یہ خیال بھی ہماری خوش فہمی کی بدولت ہو' تاہم کفن والا یہ مقولہ ہمارے جی کو لگا۔

چلنے کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ آدمی اُلٹے پانو چلے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کسی کے دروازے پر پہنچنے کے بعد اپنی شامت کو آواز دیں اور جب وہ آجائے تو آپ وفور جوش میں یا فتور ہوش میں "پاسباں کے قدم" لے لیں۔ اب یہ آپ کی شامت پر منحصر ہے کہ آپ واپسی میں اُلٹے پانو چل کر گھر آتے ہیں یا یا بدست دیگرے کی حالت میں پہنچائے جاتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وانہ ہوا۔

پانو کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہم بعض وقت بربنائے شرافت یا بربنائے ضعف برکت جیسی نعمت کو بھی کسی نہ کسی کے قدموں سے منسوب کردینے میں تامل نہیں کرتے۔ اس موقع پر ہمیں آدمی کے دوسرے اعضائے جسمانی' جن میں چند اعضائے رئیسہ بھی شامل ہیں' مطلق یاد نہیں آتے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ دنیا میں چند پانو

ایسے گزرے ہیں جو صرف قدم بوسی کے لائق نہیں تھے بلکہ انھیں دھوکر بھی پیا گیا ہے۔ اصل میں یہ اس زمانے کی بات ہے جب جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر نہیں ہوا کرتے تھے اور جس کسی کے ذمے راستوں پر سے کچرا ہٹانے کا کام سپرد کیا جاتا تھا اس کی نااہلی پر اس کی ٹانگ شارع عام پر کھینچی جاتی تھی اور لوگوں کو اس وقت پتہ چلتا تھا کہ یہ ٹانگ تو زخمی ہے اور اس شخص نے خود ہی اپنے پانو پر کلہاڑی مار لی ہے۔ اب صورت حال مختلف ہے۔ اگر راستوں پر کچرے کے ڈھیر نظر نہیں آتے ہیں تو متعلقہ لوگوں کی تنخواہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

جس طرح ایک شعر کے معائب و محاسن ہوتے ہیں اسی طرح آدمی کے پانو میں ان دونوں چیزوں کی تلاش کی جاتی ہے۔ پانو کے معائب میں سرفہرست "عذر لنگ" ہے جو عام حالات میں دونوں پانو میں ہو سکتا ہے لیکن چند مخصوص صورتوں میں یہ عیب، ضرورت کے موقع پر کسی ایک پانو ہی میں نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست کو جب بھی یہ عذر ہوا بائیں پانو ہی میں ہوا حالانکہ ہیں وہ بائیں بازو کے ادیب، ہمارے کلچر میں یہ روایت زمانے سے چلی آرہی ہے کہ "عذر لنگ" کو خود لنگ کے مقابلے میں زیادہ بُرا مانا گیا ہے اور اتنا بُرا گویا یہ کوئی عارضہ ہو۔ اگر کوئی شاعر، درد سر کی وجہ سے آپ کی فرمائش پر کلام سنانے سے انکار کرتا ہے تو آپ اسے "عذر لنگ" کا نام دیتے ہیں۔ کمال ہے درد سر اور عذر لنگ۔ شاید یہ پانو کا جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ "عذر لنگ" سے حذر کرنا بہتر ہے۔ جو شخص عذر لنگ کا بہانہ نہیں کرتا یہ زمین کبھی اس پر تنگ نہیں ہوتی۔ یہ شکایت اس لیے بھی مناسب نہیں ہے کہ پانو تو قدرت کی دستکاری کا بہترین نمونہ بھی ہیں اور تحفہ بھی۔ ان میں سے کچھ پانو جو فنون لطیفہ کی کسی شاخ میں استعمال ہوتے ہیں واقعی جادوئی پانو ہوتے ہیں۔ یہ جب رقص میں آتے ہیں تو دیکھنے والے سر دھننے لگتے ہیں ـــــ لیکن وہ لوگ جن کا سارا ذوق، زبان کے ذائقے کی حد تک محدود ہوتا ہے اگر پسند کرتے ہیں تو صرف بکروں کے پانو پسند کرتے ہیں جنھیں وہ از راہ محبت پانو نہیں پائے کہتے ہیں۔

پانو کو زیر استعمال لانے کا ایک ڈھب یہ بھی ہے کہ آدمی سر پر پانو رکھ کر بھاگے۔ ایسے مواقع اس وقت آتے ہیں جب کوئی سبز قدم، سرخ بانات پر قدم رکھتا ہے۔

نی حسین
۲۰- انکور اپارٹمنٹس
ٹ پڑ گنج- نئی دہلی

ایک خط اٹلانٹا سے

ہمارے دوست ڈاکٹر اسد پچھلے کئی برسوں سے اٹلانٹا میں مقیم ہیں- کل ہمیں ان کا یک خط ملا جسے ہم ذیل میں پیش کررہے ہیں-

"برادر محترم، تسلیم! آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۸۴ء کے موسم بہار میں آپ واشنگٹن سے وریڈا جاتے ہوئے اٹلانٹا بھی آئے تھے اور ایک دن میرے غریب خانہ پر قیام بھی فرمایا تھا- ں کی یادیں اب تک تازہ ہیں- آپ نے جاتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ آپ پھر اٹلانٹا آئیں گے- آپ نے جہاں قیام فرمایا تھا وہاں سے تین چار کلو میٹر کی دوری پر ان دنوں اولمپک ھیلوں کے بین الاقوامی مقابلے جاری ہیں- بڑی رونق لگی ہوئی ہے- میرا خیال تھا کہ آپ م از کم ان اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے ضرور آئیں گے اور دوبارہ اٹلانٹا آنے کا اپنا عدہ پورا کریں گے- آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان مقابلوں میں آپ کو بحیثیت تماشائی یہاں یکھنا چاہتا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آپ بطور کھلاڑی بھی یہاں بڑی آسانی سے آسکتے تھے کیونکہ ندستان سے جو کھلاڑی یہاں آئے ہیں اور جس طرح کی کارکردگی انھوں نے اب تک دکھائی ہے اس کے مطابق اگر یہ سچ مچ کھلاڑی ہیں تو بخدا آپ ان سے بدرجہا بہتر کھلاڑی ثابت وسکتے تھے- ماشاء اللہ آپ تو خاصے بااثر اور بارسوخ آدمی ہیں- ذرا سی کوشش کرتے تو آپ ھی نیکر اور ٹی شرٹ پہن کر بطور کھلاڑی یہاں آسکتے تھے اور اپنے ملک کے نام سے کہیں یادہ اپنا نام روشن کرسکتے تھے- آپ نے ایک بار کہیں لکھا تھا کہ آپ ہمیشہ مارتوں کے پیچھے ور بھاگتوں کے آگے رہتے ہیں- اگر ایسی کوئی ریس اولمپک مقابلوں میں رکھی جاتی تو یقیناً ولڈ میڈل آپ ہی کو ملتا- بھلے ہی آپ کسی کھیل کے کوئی مسلمہ کھلاڑی نہ ہوں لیکن آپ ہر ایک سے کھلواڑ کرتے ہی رہتے ہیں- کھیل اور کھلواڑ میں مجھے تو بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آتا- اولمپک کھیلوں کی افتتاحی تقریب میں مجھے جانے کی سعادت نصیب ہوئی تھی- یوں بھی ندستانیوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ صرف افتتاحی تقریب میں ہی جایا کریں بلکہ ہندستانی ھلاڑیوں کو بھی صرف افتتاحی تقریب میں ہی حصہ لینا چاہیے- باقی وقت میں شاپنگ کریں،

تفریح کریں، سیر کریں اور موج منا سکیں۔ ہندستان کے کھلاڑیوں کا جتھا جس میں سو سے زیادہ کھلاڑی شامل تھے، افتتاحی تقریب میں جب تماشائیوں کے آگے سے گزرا تو یقین مانئے تماشائی دم بخود رہ گئے۔ کیا آن بان تھی ان کی، کیا کروفر تھا، کیا اٹھان تھی، کیا چال تھی۔ لگتا تھا ان میں کا ہر کھلاڑی فی کس ایک دو گولڈ میڈل لیے بغیر یہاں سے نہیں ٹلے گا۔ مگر بعد میں کھیل کے اصل میدان میں یوں بھیگی بلی بن گئے جیسے کھیلوں سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ ایک ہندستانی کھلاڑی کسی مخصوص کھیل کا قومی چمپین رہا ہے لیکن اولمپک مقابلہ میں وہ پچاسویں نمبر پر رہا (پیچھے رہنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔) ار جنٹینا اور ہندستان کے بیچ ہاکی کا جو پہلا مقابلہ ہوا تھا اسے میں نے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا۔ ٹیلی ویژن پر میچ دیکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب آپ کی ٹیم ہارنے لگے تو آپ ٹیلی ویژن کا سوئچ آف کرسکتے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد ہی میں نے ٹیلی ویژن بند کردیا تھا تاکہ میری چشم گنہگار وہ سب کچھ نہ دیکھ سکے جسے آپ لوگوں نے ہندستان میں بڑے اشتیاق سے دیکھا ہوگا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں نے عرصہ سے امریکی شہریت اختیار کرلی ہے لیکن پھر بھی وطن سے محبت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے کھلاڑی اپنے ملک کا نام روشن کریں۔ بہرحال مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ آپ اولمپک مقابلوں میں بطور کھلاڑی اٹلانٹا نہ آسکے ورنہ آپ سے جی بھر کے باتیں ہوتیں، گپ شپ ہوتی۔ اب جو کھلاڑی ہندستان سے آئے ہیں ان سے تو گپ شپ بھی نہیں کی جاسکتی۔ عرصہ بعد آپ کو اس طرح کا خط لکھنے کا سبب یہ ہے کہ آپ اکثر قوم کی غیرت کو للکارتے اور قوم کو اکثر جگانے کی کوشش وغیرہ کرتے رہتے ہیں (یہ جانے بغیر کہ قوم سو رہی ہے یا مرگئی ہے۔) اگر واقعی سو رہی ہوتی تو اب تک جاگ بھی جاتی۔ میرے زیادہ لکھے کو کم نہ جانیے گا۔ احباب کو سلام کہیے۔ خدا حافظ

ڈاکٹر اسد کے مندرجہ بالا خط کا ہم نے جو جواب دیا ہے اس کی نقل بھی ہم اپنے قارئین کی سہولت کی خاطر ذیل میں پیش کررہے ہیں۔

"برادرم اسد! آپ کا خط ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ امریکی شہریت اختیار کرلینے کے باوجود آپ میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ آپ میں جو "ہندستانیت" ہوا کرتی تھی وہ اب مفقود ہو چکی ہے۔ ہم ہندستانی ابتدا ہی سے ایک مطمئن زندگی گزارنے کے عادی رہے ہیں جس کی بنیاد، صبر و شکر اور توکل کے فلسفہ پر رکھی ہوتی ہے۔ اگر کہیں سے کچھ مل جائے تو اچھا ہے، نہ ملے تو ہمیں اس کا دکھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا آنی جانی ہے۔ مایا کے موہ میں آدمی کا ملوث ہونا اچھا نہیں

ہوتا۔ بخدا ہمیں یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ ایک معمولی سے گولڈ میڈل کی خاطر آدمی یوں اپنے آپ کو ہلکان کرتا پھرے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کئی کمسن لڑکیاں اولمپک مقابلوں میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کی خاطر اپنے جسم کو یوں لپٹ لیتی ہیں جیسے جسم نہ ہوا' ململ کا تھان ہو گیا۔ جسم کو ململ کا تھان بنالینا کیا اسی کو اولمپک مقابلہ کہتے ہیں۔ پھر زندگی میں جیت ہی سب کچھ نہیں ہوتی' ہار کے بھی ہزاروں فائدے ہیں۔ اس سے آدمی میں عجز' انکسار اور حلم وغیرہ جیسے بیش بہا جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے جیت سے آدمی میں غرور' نک چڑھے پن اور تکبر وغیرہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے ہاں ہارنے کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے جیسے ہار ہی ہماری زندگی کا واحد نصب العین ہو۔ آپ کھیلوں کی بات کرتے ہیں' بھیا! ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے جنگیں ہارنے کے لیے پانی پت میں ایک الگ سے اسٹیڈیم بنا رکھا تھا جسے آج بھی لوگ پانی پت کا میدان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس میدان کو دیکھ کر ہی تو بعد میں اولمپک کھیلوں کے اسٹیڈیم بنائے جانے لگے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ کھیلوں کا بنیادی مقصد کھلاڑی میں ''اسپورٹس مین اسپرٹ'' پیدا کرنا ہوتا ہے اور ماشاء اللہ ہندستانیوں میں اتنی ''اسپورٹس مین اسپرٹ'' ہوتی ہے کہ لاکھ جگہ ہار جائیں لیکن اپنے چہرہ پر کبھی ندامت' خفت' پشیمانی اور شرمندگی وغیرہ کے آثار پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اسے ہم ظرف بھی کہتے ہیں۔ آپ اسے بھلے ہی بے شرمی اور ڈھٹائی وغیرہ سمجھیں لیکن مغرب میں اسے ''اسپورٹس مین اسپرٹ'' کہا جاتا ہے۔ ہمیں تو اعتراض ہے کہ ''اسپورٹس مین اسپرٹ'' کو خود ''اسپورٹس'' میں کیوں شامل نہیں کیا جاتا اگر ''اسپورٹ'' کے طور پر اس کے بھی مقابلے منعقد کیے جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ اس کا گولڈ میڈل ہمارے سوائے کسی کو نہیں ملے گا۔

پھر اولمپک مقابلوں میں ''گولڈ میڈل'' کے نہ ملنے پر اتنا افسوس کا اظہار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ایک زمانہ میں ہمارا ملک ساری دنیا میں ''سونے کی چڑیا'' کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا۔ لوگ دور دور سے یہاں آیا کرتے تھے۔ بھیا! ہمارا ملک تو بذات خود ایک ''گولڈ میڈل'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ چار پانچ ہزار روپے کی مالیت کے ایک گولڈ میڈل کی خاطر اپنے آپ کو ہلکان کرتے پھریں۔ یوں بھی ان دنوں ہمارے اکثر نوجوان خلیجی ممالک سے آئے دن سونے کی اتنے سارے تو ''بسکٹ'' لاتے رہتے ہیں۔ سونے کی اسمگلنگ کا کاروبار بھی خدا کے فضل و کرم سے عروج پر ہے۔ ایسے میں اولمپک مقابلوں کے گولڈ میڈلوں کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا اچھا نہیں ہے۔ پھر اولمپک

مقابلوں کی کمیٹی سے ہمیں یہ شکایت ہے کہ وہ صرف اپنی پسند کے کھیلوں کے ہی مقابلے منعقد کرتی ہے۔ جو کھیل ہمارے اپنے ہیں ان کا کوئی مقابلہ منعقد نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر "گھپلوں" ہی لیجیے۔ انواع و اقسام کے گھپلے کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا قومی کھیل ہے لیکن بین الاقوامی سطح پر اس کا کوئی مقابلہ نہیں منعقد کیا جاتا۔ اگر ایسا کوئی مقابلہ منعقد کیا جائے تو کس کی مجال ہے کہ ہم سے "گولڈ میڈل" چھین لے۔ یہ سب سامراجی طاقتوں کی سازش ہے کہ ایسے مسلمہ اور مقبول کھیلوں کو مقابلوں میں شامل نہیں کیا جاتا۔

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ اگرچہ آپ نے امریکی شہریت اختیار کرلی ہے لیکن پھر بھی اپنے پرانے وطن سے آپ کی محبت برقرار ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندستانی کھلاڑیوں کو گولڈ میڈل نہیں ملتے تو آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ امریکی شہریت اختیار کرنے کے یہی تو نقصانات ہیں۔ اگر آپ بھی ہندستان میں ہوتے تو آپ کو ایسی فضول باتوں پر دکھ کا اظہار کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ پوچھیے تو ہمیں آپ کے خط سے ہی پتہ چلا کہ ان دنوں اٹلانٹا میں اولمپک مقابلہ چل رہے ہیں اور کہ ان میں ہندستانی کھلاڑیوں کو کوئی گولڈ میڈل نہیں ملا ہے۔ ہم تو ایسی باتوں سے بے تعلق رہتے ہیں۔ بے نیازی 'لاتعلقی' قلندری اور استغنا کو ہندستانی معاشرہ میں جو اہمیت حاصل ہے اسے آپ بھی اپنالیں تو ایسی باتوں پر دکھ کرنا چھوڑ دیں گے۔

آپ نے لکھا ہے کہ ہم نے اٹلانٹا میں آپ کے غریب خانہ پر قیام فرمایا تھا۔ اگر ایک ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے مکان کو "غریب خانہ" کہتے ہیں تو پھر "دولت خانہ" کس چڑیا کا نام ہے۔ مانا کہ ہم نے رسمی طور پر وعدہ کیا تھا کہ ہم پھر اٹلانٹا آئیں گے۔ اصل میں ہمارے وہاں نہ آنے کی کئی وجوہات بھی ہیں۔ امریکہ میں ڈیڑھ مہینہ تک قیام کرنے کے بعد ہمیں یہاں واپس آکر اپنی زندگی پھر سے معمول پر لانے میں کئی دن لگ گئے تھے۔ دو چار مہینے تو اسی تذبذب میں گزر گئے کہ پان کی پیک کو کہاں تھوکا جائے۔ حالانکہ اس کام کے لیے حکومت نے جگہ جگہ سڑکیں اور عالیشان عمارتوں کے کونے بنا رکھے ہیں۔ پان کی پیک کو اپنے ہی حلق سے نیچے اتارنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری صحت کئی دنوں تک خراب رہی۔ ہم اپنی غربت میں مگن ہیں۔ جگہ جگہ گندگی پھیلانے کے جمہوری حق کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم پھر سے امریکہ آئیں اور آپ کو آزمایش سے گزاریں۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اگر آپ گولڈ میڈلوں کے چکر میں نہ پڑیں تو آپ اور بھی زیادہ خیریت سے رہ سکتے ہیں۔ ہندستانی کھلاڑیوں کو ہمارا سلام اور یہ بھی کہیے کہ اگر انھوں نے غلطی سے کوئی میڈل حاصل کرلیا تو ہم سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ا... کو سلام کہیے۔ خدا حافظ"

...یل احمد فاروقی
...ب مدیر رسالہ جامعہ
...معہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مر گئے ہم تو.......

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر بشیر الدین احمد ۷ ستمبر ۱۹۹۶ کو مالک حقیقی ...ے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اب وہ جامعہ میں ہی آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے عہدے ...ی مدت ابھی فروری ۱۹۹۷ تک باقی تھی کہ پیغام اجل آپہنچا۔ بعض افراد کا خیال تھا کہ ملیریا ...ر تیز بخار کی وجہ سے انتقال ہوا، کسی نے کہا کہ ہارٹ فیل کی بناء پر لیکن مسلمہ حقیقیت ...رف ایک ہی تھی، یعنی موت۔

حیدر آباد کی عدالت عالیہ کے چیف جسٹس نواب اکبر یار جنگ جو قائم گنج ضلع فرخ آباد ...ے حیدر آباد منتقل ہو گئے تھی بشیر صاحب ان کے بیٹے اور پروفیسر وحید الدین خان اور پروفیسر ...شید الدین خان کے بھائی تھے۔ وہ ۷ر مئی ۱۹۳۲ کو پیدا ہوئے اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے ...۱۹۵ میں تعلیم مکمل کر کے تقریباً سات سال تک وہیں تدریس کے فرائض انجام دیتے ...ہے۔ ان کی روشن ذہنی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں مرکزی حکومت کے ادارے سنٹر فار ...ی اسٹڈی آف ڈولپنگ سوسائیٹیز (سی ایس ڈی ایس) میں ممتاز منصب پر فائز کیا گیا جہاں ...ھوں نے جوائنٹ ڈائرکٹر اور ڈائرکٹر کے عہدوں پر بھی خدمات انجام دیں۔ یہاں کے قیام ...نے ان کی صلاحیتوں کو اور جلا بخشی اور داد ہنر کے طور پر انھیں سنٹر فار پالیسی ریسرچ میں ...وفیسر کے عہدے کی پیش کش ہوئی۔ اس مرکز سے وابستگی کے دوران بشیر صاحب مشی گن ...ر ایوا یونیورسٹی (یو۔ایس۔اے) میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ وہ شکاگو یونیورسٹی کے فیلو ...ی مقرر ہوئے۔

جامعہ سے اپنی وابستگی کے ساڑھے چار برسوں میں بشیر صاحب خرابیِ صحت، عارضۂ ...لب اور دیانت داری کے باوجود بددیانتی کے الزامات ان سب کا بوجھ اٹھائے آبلہ پائی سے ...بے پروا دھوپ کا سفر طے کرتے رہے۔ انتظامی طریق کار کی باریکیوں سے قطع نظر یہ بات ...ورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ بشیر صاحب نے جامعہ کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے ...قصد پر ہمیشہ نظر رکھی اور اس اصول سے کبھی ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ طلباء اور اساتذہ سے وہ اتنا

رشتہ اسی عنوان سے قائم رکھنے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ طلباء کی علمی سرگرمی اور امتیازی کارگزاری پر تحسین و آفریں کہنے میں انھوں نے کبھی بخل نہیں برتا۔ کانفرنس ہال میں ایک سمینار میں جس میں سابق سوویت یونین سے آیا ہوا ایک بڑا وفد بھی شامل تھا' ایک ریسرچ اسکالر نے کسی مقرر سے بعض استفسارات کئے۔ سوال اگرچہ اس طالب علم کی سطح سے ہلکے تھے لیکن بشیر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس کی جرأت مندی کا خاص طور پر اعتراف کیا۔ وہ جانتے تھے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ان ذہنوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہونی چاہئے مبادا کہ ان کا جذبۂ جستجو سرد پڑجاتے۔ جلسہ گاہ سے نکلتے ہوئے وہ عزیز بڑے پُر جوش لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا "اپنے وائس چانسلر صاحب پر امپریشن پڑگیا۔ اب اور کیا چاہئے !" اہل جامعہ کی تصنیفی کارگزاریوں کو مرحوم یہاں آنے والے مہمانوں کے سامنے بڑے فخر سے پیش کرتے تھے۔ حالیہ چند برسوں میں مختلف موضوعات پر جو کتابیں منظر عام پر آئیں وہ بشیر صاحب ہی کی حوصلہ افزائی کا ہی نتیجہ ہیں۔

قومی منظرنامے پر پروفیسر بشیرالدین احمد کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ان دانشوروں کے اس مختصر حلقے کے ایک نمایاں فرد تھے جس نے ہندوستان میں سیاسی مطالعات کی صورت حال کو ایک خوش آئند و خوش گوار تبدیلی سے ہمکنار کیا۔ اس بیان کی صداقت اور بھی واضح ہوجاتی ہے جب ہمیں یہ علم ہوتا ہے آج سے تقریباً تیس برس پہلے تک سیاسی سائنس دانوں کی اصل جولانگاہ سیاسی اداروں' دستور و قانون' سیاسی تاریخ اور سیاسی سوانح نگاری تک محدود تھی۔ دوسری جانب سیاسی مبصرین کا انداز گفتار پر نخوت کا غلبہ تھا جس میں خود رایانہ قیاس اور سطحی نصیحت گوئی کے سوا کسی اور شے کا گزر نہ تھا۔ یہ بشیر صاحب ہی تھے جنھوں نے ایک نئے طرز کی تجربیت پسندی سے اس شعبۂ علم میں تازہ روح پھونکی' جس کے لئے اصل ضرورت تھی عوام سے رابطہ قائم کرنے اور ان کے احساس' عمل اور خیال تک رسائی حاصل کرنے کی۔ بشیر صاحب نے رجنی کوٹھاری' ڈی ایل سیٹھ اور بین الاقوامی شہرت کے حامل دانشوروں کے اشتراک سے تین اہم کام کئے تھے پہلا تھا۔ ۱۹۶۰ کی دہائی کے اواخر میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا ملک گیر مطالعہ اور دیگر دو مطالعات کا موضوع تھا ۱۹۶۷ اور ۱۹۷۱ کے عام انتخابات۔ ان مطالعات کا مقصد ہندوستانی جمہوریت کے خدوخال کا جائزہ لینا اور دیگر ممالک کے تجربے سے اس کا موازنہ کرنا تھا۔

مذکورہ تین مطالعے ہندوستانی سیاسی تجزیہ کاروں کے لیے بڑی حد تک مشعل راہ ثابت ہوئے کیونکہ ان کے سہارے وہ جمہوری عمل میں عوام کی شرکت' ان کی ترجیحات اور

جذبات سے روشناس ہوئے اور ملک کے جمہوری تجربے میں تقابلی اور بین معاشرتی پہلو کا اضافہ ہوا۔ ملک اور بیرون ملک کے اہم جریدوں میں سماجی وسیاسی تبدیلی کے موضوع پر شائع ہونے والی ان کی تحریریں دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہندستان میں دلتوں اور امریکہ کی سیاہ فام قوم کی حیثیت کے موضوع پر ان کا تقابلی مطالعہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ "سٹیزن اینڈ پالیٹکس" اور کاسٹ' "ریس اینڈ پالیٹکس" کے عنوانات دو اہم کتابیں انھوں نے اپنے معروف معاصرین کے اشتراک سے شکاگو یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع کیں۔ بشیر صاحب اور ان کے ہمکاروں کے ان کارناموں کی علم دوست حلقوں کی طرف سے پزیرائی ہوئی تو دوسری جانب ایوان حکومت میں بااقتدار حلقوں اور تعلیمی اداروں میں ادبی صلاحیت کے حامل اور نعرے بازی کو دانشورانہ دیدہ ریزی کا نعم البدل سمجھ بیٹھنے والے عناصر کی طرف سے مذمت بھی ہوئی۔ کبھی ان پر امریکہ نوازی کا الزام لگا تو کبھی ان مطالعات کے ذریعہ دشمن ممالک کو ضروری معلومات فراہم کرنے کا۔ ستم یہ کہ بشیر صاحب اور رجنی کوٹھاری متشدد قوم پرستوں اور قدامت پسند لیفٹسٹوں دونوں کے عتاب کا شکار ہوئے۔

بشیر صاحب ہندوستانی جمہوریت کے مستقبل کی طرف سے ہمیشہ پر امید رہتے تھے اور اس کی بنیاد کسی بڑی تہذیبی تبدیلی کا خواب نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ عوام کے قریب جا کر وہ ان کی ترجیحات سے آگاہ ہوئے تھے۔ ادارہ جاتی سطح پر ہندوستانی سیاست کے تعلق سے ان کا نمایاں ترین کارنامہ سینٹر فار دی اسٹڈی آف ڈولپنگ سوسائٹیز ہے جسے انھوں نے ابھرتے ہوئے محقق کی حیثیت سے مستحکم کیا تھا۔ شاید دنیا میں یہ اپنی نوعیت کا واحد علمی ذخیرہ گاہ ہے جس سے سیاست کے مختلف شعبوں میں مصروف ماہرین و محققین کی کئی نسلیں استفادہ کریں گی۔ بشیر صاحب جامعہ کی اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز کو انہی خطوط پر ترقی دینے کے آرزو مند تھے اور اس سمت میں خاصی پیش رفت بھی ہو چکی تھی۔ ان کی علمی دلچسپی کا دائرہ سیاسی مطالعات تک ہی محدود نہ تھا۔ یہ تو ان کا منصبی سروکار تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ عالمی ادب 'فلسفہ' عمرانیات 'اور الہیات جیسے کئی دھاروں نے مل کر ان کے علمی مزاج کی مشاطگی کی تھی۔

بشیر صاحب اپنی ذاتی زندگی میں اور منصبی زندگی میں بھی ایک طرح کی فطری سادگی اور خوش ترتیبی کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جامعہ کے وائس چانسلر لاج میں آرام سے رہنے کے خیال پر کبھی ان کا ذہن آمادہ نہ تھا اور انھوں نے یہاں سے کچھ دور اپنے مختصر سے مکان میں معمولی ضروریات زندگی کے ساتھ وقت گزارنے پر قناعت کی۔ سادہ مزاجی اور دیانت داری کا تال میل تو ہے ہی۔ بعض امور پر گفتگو کے دوران ان کے لہجے میں کہیں کہیں آجانے والی درشتگی اسی دیانت داری کی غمازی کرتی تھی۔

ڈاکٹر محمد اکرام خاں
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی۔۔۔ایک مثالی استاد
(۱۹۲۵ء - ۱۹۹۶ء)

یہ بات ہے ۱۳/ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی جب کہ میں صبح ۱۱ بجے حسب معمول بی۔ ایڈ کے طلبہ کو پڑھانے کے بعد اسٹاف روم میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب کے ڈرائیور محمد سلیم صاحب میرے پاس آئے اور نہایت متانت اور سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "چلیے آپ کو شیخ الجامعہ صاحب نے یاد فرمایا ہے۔" میں فوراً سلیم صاحب کے ہمراہ شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر پہنچا اور مجیب صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے بعد ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجیب صاحب نے اپنے پاس بیٹھے دو حضرات سے مجھے ملایا۔ ایک صاحب تھے کولمبیا یونی ورسٹی' نیویارک کے پروفیسر میکنزی اور دوسرے تھے جامعہ کالج کے استاد ضیاء الحسن فاروقی صاحب۔ پروفیسر میکنزی جامعہ ملیہ اسلامیہ دیکھنے آئے تھے اور مجھے اور ضیاء صاحب کو جامعہ دکھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔

چائے پی کر ہم پروفیسر میکنزی کو لے کر شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر سے باہر آئے۔ پروفیسر میکنزی نے مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کی عمارتوں کی طرف دیکھنا شروع کیا اور میں نے ضیاء صاحب کی طرف۔ تھوڑی دیر بعد ضیاء صاحب نے معزز مہمان کو جامعہ کے قیام کی غرض وغایت سمجھائی اور کہا کہ جامعہ دراصل تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک تعلیمی تحریک ہے اور تحریک آزادی کی دین ہے۔ اس تحریک کے روح رواں شیخ الہند مولانا محمود حسن' جواہرلال نہرو' حکیم اجمل خاں' ڈاکٹر انصاری' مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی سب ایک ایک کرکے اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ ان سب کی روایات کے علم بردار ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں جو آج کل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور جامعہ کے چانسلر ہیں۔ جامعہ اور جامعہ نگر دونوں کی رونق ان ہی کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی مرہون منت ہے۔ وہی جامعہ کے استادوں اور طلبہ کو اپنے فکر و عمل سے یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ جامعہ کی تعلیم کا بنیادی اور اصل مقصد ایسے نونہال اور نوجوان پیدا کرنا ہے جو صحیح معنوں میں خدا پرست ہوں اور وطن پرست یعنی اچھے مسلمان ہوں اور سچے ہندستانی تاکہ اچھا مسلم معاشرہ بن سکے اور اچھا ہندستان۔

اس مختصر سی گفتگو کے بعد معزز مہمان کو مدرسہ ثانوی دکھایا گیا۔ مدرسہ ابتدائی گئے تو معلوم

ہوا کہ آج مدرسہ کا کام "بچوں کی حکومت" کے زیر نگرانی چل رہا ہے۔ تمام انتظامی اور تدریسی ذمہ داریاں طلباء کے نمائندے پوری کر رہے ہیں۔ چنانچہ مدرسہ دکھانے کی ذمہ داری بھی "بچوں کی حکومت" کے وزیر اعظم نے قبول کی۔ مہمان نگراں مدرسہ کے دفتر میں گئے اور ہم دونوں اس پختہ دائرہ پر آکر بیٹھ گئے جہاں ہر سال ۲۹ر اکتوبر کو پرچم کشائی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ ہماری یہ نشست تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی رہی لیکن رہی بڑی دلچسپ اور کار آمد۔ ہماری گفتگو کبھی اسیر مالٹا مولانا محمود حسن اور مولانا حسین مدنی پر ہوئی۔ کبھی دار العلوم دیوبند' جامعہ اور مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ پر اور کبھی دیوبندی اور بریلوی مسلک پر۔ اس ملاقات کا میرے دل پر جو نقش ہوا وہ جیتے جی نہیں مٹ سکے گا۔ یہ تھی ہماری پہلی ملاقات جس نے مجھے ضیاء صاحب سے دور رہتے ہوئے بھی قریب رکھا۔

ضیاء الحسن صاحب فاروقی نہایت سمجھ دار اور سلجھے ہوئے نیشلسٹ تھے۔ انھیں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابو الکلام آزاد سے والہانہ عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد مدینہ اخبار (بجنور) میں بحیثیت مددگار مدیر کام کیا۔ اس کے بعد جمعیتہ العلماء ہند کے ہفتہ واری انگریزی اخبار MESSAGE کے مدیر ہو کر دہلی آگئے۔ صحافت کے ذریعہ کئی برس قومی خدمت کرنے کے بعد اسے چھوڑ کر تعلیمی میدان میں آئے اور آئے بھی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں۔ مادی منفعت کے خیال سے نہیں بلکہ فکر و نظر کی جو دولت اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ حاصل کی تھی اسے قوم کے نونہالوں اور نوجوانوں تک منتقل کرنے کے شوق میں۔ ضیاء صاحب جامعہ آئے تھے لیکچرر کی حیثیت سے لیکن سبکدوش ہوئے بحیثیت پروفیسر۔ انھوں نے جامعہ میں رہ کر یوں تو رسالہ جامعہ' عصر جدید اور اسلام اینڈ دی موڈرن ایج کی ادارت بھی کی اور جامعہ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر بھی رہے اور کئی دفعہ قائم مقام شیخ الجامعہ بھی' لیکن سدا جانے پہچانے گئے استاد کی حیثیت سے۔ ان کے علم کی گہرائی اور دانشمندی' ان کی رواداری اور انکساری' ان کی وضع داری اور پاسداری' ان کی دینی بصیرت اور روشن خالی' ان کی انسان دوستی اور انسانیت نے طلباء' رفقاء کار اور ارباب اقتدار میں انھیں مقبول بنایا۔

ضیاء صاحب فطری طور پر جماعتی اور سماجی آدمی تھے۔ ان کی ذہنی تشکیل میں محبت ہمدردی اور دوسروں سے میل ملاپ کی خواہش روز ازل ودیعت کردی گئی تھی۔ وہ تعلیم کے کام کو خالص سماجی کام سمجھتے تھے۔ وہ مانتے تھے کہ جیسا استاد ہوتا ہے ویسے ہی اس کے شاگرد ہوتے ہیں۔ استاد ہو یا سماج سیوک' اسے اپنے اندر وہی خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں جو وہ دوسروں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ استاد کے لیئے ضروری سمجھتے تھے کہ وہ طلباء سے بے لوث محبت کرے اور ان کا اعتماد حاصل کرے۔ وہ جانتے تھے کہ طلباء اس استاد سے زیادہ سیکھتے ہیں جس پر انھیں بھروسہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ایسے

استاد کہاں ہیں جنھیں بچوں اور نوجوانوں سے قدرتی لگاؤ اور انس ہو، جو تعلیم کے کام کو سماجی کام سمجھیں اور اس کا احساس رکھتے ہوں کہ انھیں اپنے سماج کو کچھ دینا ہے۔ بنی نوع انسانی کی خدمت کرنا ہے۔ اچھے افراد پیدا کرنے ہیں کہ ان کی شخصیت کے نور سے دنیا کے کاموں میں حسن، خیر اور صداقت کی کچھ جلوہ گری دیکھنے میں آئے۔" (۱)

ضیاء صاحب کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ یوں تو وہ مدبر بھی تھے اور مفکر بھی۔ ادیب بھی تھے اور صحافی بھی۔ منتظم بھی تھے اور معلم بھی لیکن درس و تدریس کی خوبی ان سب خوبیوں سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس خوبی کی بدولت وہ دوسروں پر اثر انداز ہوئے اور تعلیمی دنیا میں امتیاز حاصل کیا۔ ان کے یہاں تعلیم کا مقصد محض معلومات کا ذخیرہ جمع کرنا، ڈگریاں حاصل کرنا یا واقعات کو رٹ لینا نہ تھا بلکہ تعلیم کو عقل و دانش کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ ان تعلیم یافتہ لوگوں میں نہ تھے جو ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد اپنے علم سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے علم سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے اور عقل و دانش میں اضافہ کرتے رہنے کے خیال سے زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور دانشور کہلاتے ہیں۔ کہتے ہیں "دانشور وہ ہے جو تہذیب، مذہب، علم اور فلسفے سے جو کچھ اسے بطور میراث ملتا ہے اسے تفہیم، توضیح اور توسیع کے عمل سے اپنے ہم عصروں کے ذہن تک پہنچائے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک روایت بن کر کچھ علمی اور تہذیبی روایات چھوڑ جائے۔" (۲)

ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا طریقۂ تدریس نہایت دلچسپ اور کامیاب تھا۔ ایک روز میں نے ضیاء صاحب کی اجازت سے ان کا ایم۔ اے کلاس میں ایک لیکچر سنا۔ اتفاق سے اس روز اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ اور ہندی کے شعبہ کے چند طلباء میں صبح سویرے کچھ بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ ضیاء صاحب نے حافظ ابن قیم کے حوالہ سے "شرع اور شریعت" سے متعلق یہ بتانا شروع ہی کیا تھا کہ شرع کُل کی کُل انصاف ہے، حکمت ہے اور رحمت ہے۔ اس کی بنیاد عوام کی دنیاوی اور اخروی فلاح و بہبود پر ہے کہ اچانک دو تین لڑکے آپے سے باہر جماعت کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ ضیاء صاحب نے خندہ پیشانی اور عزت سے ان کا خیر مقدم کیا۔ انھیں اپنے قریب بٹھایا اور دھیمی دھیمی آواز میں نہ جانے کیا سمجھایا کہ وہ خاموش اور خوش ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد وہ اپنے طلباء کی طرف متوجہ ہوئے۔ شرع اور شریعت کے بجائے کہنے لگے۔ "بھیا اجتماعی زندگی کو خوش گوار اور پُرامن بنانے میں جو مدد قوت برداشت سے مل سکتی ہے وہ قوت آزمائی سے نہیں مل سکتی۔" یہ سنتا تھا

(۱) ضیاء الحسن فاروقی، تعارف ص ۸ "تعلیم اور رہنمائی ۱۹۸۶ء از محمد اکرام خاں

(۲) ضیاء الحسن فاروقی، مولانا ابوالکلام آزاد، فکر و نظر کی چند جہتیں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۹۵ء ص ۳۵

کہ ایک طالب علم نے خفا ہو کر کہا۔ "اس کا مطلب تو جناب یہ ہوا کہ بس پٹتے رہا کریں۔" ضیاء صاحب ہنسے اور کہنے لگے "قوت برداشت سے مراد ہے صبر سے کام لینا' صبر کا مطلب پٹتے رہنا نہیں بلکہ نفس کی لگام کو قابو میں رکھنا ہے۔ کڑوی بات سن لینا یا اپنی مونچھیں نیچی کر لینا ہی صبر ہے۔ صبر کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہے اور حقوق اللہ سے بھی۔ اپنے مزاج اور عادت کے خلاف کام کرنا بھی صبر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص خود یہ فیصلہ کرے کہ کس موقع پر کس قسم کے صبر سے کام لینا چاہئے۔ حسن سلوک' باہمی تعاون اور صبر و تحمل سے کام لینا اچھا ہوتا ہے۔ ہمیں علم کو محض معلومات حاصل کرنے کے لیئے نہیں سیکھنا چاہئے بلکہ اس کی روشنی میں زندگی گزارنے کی کوشش کرنا چاہئے اس کے بعد سورہ قصص کہ یہ آیت پڑھی۔ **ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک** جس طرح خدا نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی دوسروں پر اسی طرح احسان کرو۔ ضیاء صاحب کی ان باتوں کو طلبا نے ہمہ تن گوش بن کر اور سرنگوں کر کے سنا اور سمجھا۔ جب پیریڈ ختم ہوا تو دو طلبا نے سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے معافی مانگ لیں گے۔

ضیاء صاحب اپنے طلباء یا ساتھیوں نے کسی بھی موضوع پر گفتگو کرتے وقت جذبات سے بالکل دور رہتے تھے۔ جو بات کہتے شگفتگی' نرمی' سادگی اور اطمینان سے کہتے تھے۔ جو کچھ کہتے بالکل غیر جانب دار ہو کر کہتے۔ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے وقت خواہ طلباء ہوں یا رفقاء کار دوسروں کے نقطہ نظر کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے۔ ان کے ہر خیال میں استحکام کے باوجود لچک ہوتی تھی۔ اچھائی خواہ کسی کی ہوتی اس کا اعتراف کرتے اور برائی کی پردہ داری کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ چھوٹوں کا اور بڑوں کا' ہم چشموں کا اور رفقا کار کا اور خود اپنا احترام کس طرح کیا جاتا ہے۔ ان کی عادت تھی نیکی اور شرافت کا ساتھ دینے کی اور برائی اور بے انصافی سے دور رہنے کی۔ یہی سب وہ صفات اور خوبیاں تھیں جن کی بدولت وہ اپنے شاگردوں میں ایک شفیق رہنما بن کر رہے اور رفقاء کار میں ذہین' شگفتہ اور مخلص دوست بنے۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ارباب اقتدار میں وہ مقام حاصل کیا جو ہم سب کے لئے سرمایہ مسرت تھا۔

ضیاء صاحب یاد آتے ہیں تو ان کی پاکیزہ اور دل ربا شخصیت کے تمام پہلو جگمگانے لگتے ہیں۔ اب جامعہ کو ضیاء صاحب جیسا استاد نہیں ملے گا اور ہمیں ان جیسا مخلص' مشکل کشا اور ہمدرد دوست نہیں ملے گا۔ ان سے ہر ملاقات اور گفتگو بڑی مفید اور کار آمد ثابت ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت کی تعمیر میں اسلامی تعلیمات کا رنگ نمایاں تھا۔

تجھے بھول جانا تو ہے غیر ممکن   مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

ڈاکٹر مہتاب منظر
لیکچرار، شعبہ پالیٹکل سائنس،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

چہل پہل

فوزیہ خالہ کی بیٹی کی شادی کا کارڈ ملتے ہی ہمارے گھر میں بھونچال آگیا۔ ہم نے یوں تیاریاں شروع کردیں کہ جیسے بارات ہمارے ہی گھر آنے والی ہو۔ ہماری ہر بات میں گھبراہٹ، ہر کام میں جلدی اور ہر قدم میں پھرتی آگئی۔ خوشی کے مارے قدم ڈگمگانے لگے۔ مانو پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ چلتے کہیں، پہنچتے کہیں۔ گھر کے کسی دوسرے کونے میں اماں چپکے چپکے، اپنے چشمہ کی آڑ سے ہماری ساری حرکتوں کا جائزہ لے رہی تھیں اور من ہی من مسکرا رہی تھیں۔ ہم لوگ ان کی غیر معمولی خاموشی پر محوِ حیرت تو ضرور تھے مگر اس موضوع پر زیادہ غور و فکر کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ ان پر طاری سکوت کبھی کبھی ہمیں چونکا دیتا مگر پھر اپنی مصروفیات میں یہ بات ذہن سے نکل جاتی تھی۔ تیاریاں جس قدر زور شور سے جاری تھیں اتنا ہی ہم، سفر کی Formalities سے بے خبر تھے۔ ریزرویشن کا تو کسی کو خیال ہی نہ آسکا۔ وہ تو بھلا ہو بڑے بھیا کا کہ انھوں نے چپ چاپ اتنی بڑی ذمہ داری ادا کردی ورنہ ہماری ساری خوشی دھری کی دھری رہ جاتی۔

لیجیے صاحب! سفر کی کیا کیا صعوبتیں برداشت کرتے ہم دہلی پہنچے تو ٹیکسی والوں نے یوں گھیر لیا کہ خوف آنے لگا۔ اپنے اغوا کا فوری اندیشہ پیدا ہوگیا اور ان کی آن میں اپنا برا اور عبرت ناک انجام سامنے کھڑا نظر آنے لگا۔ ان کے لب و لہجہ میں چھپی دھونس و زبردستی محسوس کرتے ہوئے ہمارے پسینے چھوٹ گئے۔ اس افرا تفری میں نہ آیۃ الکرسی یاد آرہی تھی اور نہ ہی کوئی دنیاوی نسخہ۔ خدا خدا کرکے ایک ٹیکسی میں بیٹھے یا یوں سمجھیے کہ کودے اور سامان ٹھونسا گویا اسٹیشن کے خوفناک ماحول سے نجات کا اب یہی راستہ ہے۔ کالونی میں پہنچے تو لکھنؤ کی بھول بھلیاں یاد آئیں۔ یا اللہ یہ دنیا کا کون سا عجیب کونہ ہے جہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے یوں بے خبر ہے کہ جیسے وہ تنہا زندہ رہنے کو ممکن بنا رہا ہو۔ ہمیں ارسطو کی ساری Theory فیل ہوتی نظر آئی کہ انسان ایک سماجی جانور ہے وہ سماج کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس سے پتہ پوچھتے وہی Sorry کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہماری مسکین صورتوں اور

پریشان حالی پر کسی کم بخت کی نظر ہی نہ پڑتی تھی۔ ہر کوئی جلدی میں کیوں ہے؟ یہ ہماری سمجھ میں ہی نہ آسکا۔ ایسے میں ایک شخص فرشتہ بن کر نمودار ہوا اس سے قبل کہ ہم اس سے کچھ پوچھتے، ہم سے ہی دریافت کرلیا گیا کہ آپ کو کس کی تلاش ہے۔ ایک ضعیف، تنہا، ناتواں جسم میں ایک دل مہرباں جس نے ہمیں اس دوسری مصیبت سے بر آور کیا۔

منزل مقصود تو مل گئی مگر یہ کیا؟ اس گھر میں شادی ہو رہی ہے؟ اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ گھر کے در و دیوار خاموش، سادگی کا لبادہ اوڑھے۔ نہ کوئی سجاوٹ نہ شور غل اور ظاہر ہے بے رونق۔ ہم ہی متحیر نہ تھے بلکہ اماں بھی۔ جو اپنی فطری فقرہ بازی سے بے ساختہ مجبور ہو گئیں۔ "اوئی نوج، شادی کا گھر تو دور سے ہی نظر آتا ہے۔ یہ تو مرغیہ خانہ لگ رہا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو گھر تو گھر، پوری گلی ہفتہ بھر پہلے رنگین کاغذ سے بنی جھنڈیوں سے سجادی جاتی تھی۔ اور بغیر دعوت نامہ کے ہی بہت سے لوگ خود بخود اس گھر کی طرف کھنچے چلے آتے تھے خاص طور سے بچے اور لڑکیاں۔۔۔" ہم سب نے مسکرا کر، ایک معنی خیز انداز میں پہلے اماں کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور ماں کا سکوت ٹوٹنے کا جھٹکا ایک قہقہہ کے ساتھ محسوس کیا۔

دوسرا جھٹکا لگا فوزیہ آپی کو دیکھ کر۔ جنھوں نے دروازہ یوں کھولا جیسے یہاں کچھ بات ہی نہیں ہے۔ ان کا سپاٹ سا چہرہ نارمل سا انداز، کیا نام دیں اس کو، نہ شادی کا حجاب نہ کوئی انداز تبسم، ہونے والی دلہن کو گلے لگانے کا ہمارا سارا جذبہ ٹھنڈا ہو گیا۔ بلکہ یوں کہیے کہ ان کا چہرہ دیکھ کر ہم اپنے دل میں کوئی ایسا طوفانی جذبہ پیدا ہی نہ کر سکے۔ ہم آنکھیں جھپک ہی رہے تھے کہ انھوں نے ہم کو اندر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ چونک کر، بادل ناخواستہ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور گردن جھکا کر، چپ چاپ اندر داخل ہو گئے۔ ایک نظر اماں کو مڑ کر ضرور دیکھا، بلکہ دیکھے بنا رہ نہ سکے تو وہ بھی حیرت و استعجاب میں ڈوبی نظر آئیں۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر، سب اہل خانہ اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے اپنی سمجھ میں، فوزیہ آپی کو گھیرنے کی کوشش کی تاکہ چھیڑ خوانی سے ماحول کچھ تبدیل کیا جاسکے۔ تو انھوں نے اعلان کرڈالا "Excuse me---- 'میرا کل آخری پیپر ہے اور مجھے پڑھنا ہے۔" ایں۔۔۔ پڑھنا ہے۔ گویا ابھی تک یعنی پیا کے گھر جانے کے وقت بھی پڑھنے کا بھوت ان کے دماغ پر سوار ہے۔ تو شادی کا رنگ ہی کیسے نظر آئے گا، کہاں نظر آئے گا۔ اماں نے فوراً احتجاج کرڈالا "اے بوا، بس بھی کرو۔ بہت پڑھ لیا۔ اے بہن تم بچی کو اس وقت بھی گھر میں نہیں بیٹھاؤگی تو کب بیٹھاؤگی؟ ابٹن لگ جاتا تو اس بہانہ دو چار دن گھر میں رہتی۔ چہرہ

پر کچھ دلہن جیسی رونق آئی۔ باہر نامحرموں کی نظر پڑے گی تو کیا خاک رونق آئے گی۔ ہمارے زمانے میں تو شادی کی تاریخ طے ہو جاتے ہی، لڑکیاں باپ بھائیوں کے سامنے بھی نہیں پڑتی تھیں۔ آٹھ دن پہلے، پورے آٹھ دن پہلے ابٹن کی رسم ہو جاتی تھی اور روزانہ وہ رگڑائی ہوتی کہ چہرہ نکھر نکھر اٹھتا اور لڑکی دلہن بن کر یوں سجتی کہ لوگ ایک ٹک دیکھتے رہ جاتے۔"

ہمیں ایک دم ماحول کی کشیدگی کا احساس سا ہونے لگا۔ ہم اماں کی ہاں میں ہاں بھی نہ ملا سکے۔ البتہ انھوں نے ہمارے دل کی بات کہہ دی اور بلا جھجک کہہ دی جو ہمارے بس کا کام نہ تھا۔ شاید اسی لیے ہم ان کی ہر بات پر سرہلاتے رہے گویا وہ ہم سے ہی مخاطب ہوں اور ہم ہی خطا کار بھی۔ "اب بھلا فوزیا آپی کا اس میں کیا قصور؟" ہم نے تھوڑا Practical بننے کی کوشش کی۔ "ایک پیپر چھوڑ کر تین سال کی محنت ضائع کرنا، کہاں کی عقلمندی ہے۔ اچھا کیا۔ بی۔ اے۔ کی ڈگری تو مل جائے گی۔ شادی کے بعد کون پورا کرتا ہے۔ جو وہ کر لیتیں۔" ہم جو شادی کے ہنگاموں سے بھرپور لطف اندوز ہونے، اپنی خالہ کے یہاں وارد ہوئے تھے، اس طرح ایک اور دن صبر کرنے پر خود بخود سمجھوتا کر بیٹھے اور ایک ایک پل اس ایک دن کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

لو بھئی، اگلے روز فوزیہ آپی (جن کی راہوں میں ہم پلکیں بچھائے انتظار کر رہے تھے) کالج سے تشریف لائیں تو اس قدر تھکی ہوئی تھیں کہ انھوں نے نظر اٹھا کر ہماری پرشوق نگاہوں کو بھی نہ پہچانا اور سر جھکائے اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ ہم پر اس بے اعتنائی کا کیا اثر ہوا۔ محترمہ تھک کر ایسا سوئیں کہ رات دس بجے آنکھ کھل سکی۔ کھانا کھایا اور پھر غائب یہاں بوریت سے برا حال، کیا کیا خواب لے کر آئے تھے، یوں گیت گائیں گے، ڈھولک بجائیں گے، آپی کو چھیڑ چھیڑ کر برا حال کر دیں گے، مہندی لگائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ مگر دل کے ارمان دل میں ہی رہ گئے۔ بہت سے شادی کے گیت لکھ کر لائے تھے اور اس گانے کی تو خوب پریکٹس کی تھی :

پودینہ ہرا لے جائے او پودینہ والے
اس پودینہ والے کی اماں نہیں ہے
دولہا کی اماں لے جائے، او پودینہ والے
اس پودینہ والے کی بہنا نہیں ہے
دولہا کی بہنا لے جائے، او پودینہ والے

ایک اور گیت جس کو خوب رٹا تھا وہ کچھ یوں تھا۔

آلو کا محل بنایا' محل جانے کیسا ہے
بہنا پوچھے بھابھی' بھیا میرا کیسا ہے

اس پر ہی اکتفا نہیں ہو سکا تھا بلکہ خاص طور پر شادی کے لطیفے' فقرے' اور نہ جانے کون کون سے پلان سوچ کر آئے تھے اپنی خالہ زاد کی شادی کے لیے' جو خاک میں مل گئے پھر بھی ہم نے صبر کیا۔

اب شادی میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ صبح ناشتے سے فراغت کے بعد' خالہ جان نے ہم لوگوں کو تیار ہونے کا آرڈر دے ڈالا۔ ایک موہوم سی آشا دل میں جاگی۔ الوکھی سی خوشی کی لہر تن من میں دوڑ گئی۔ پتہ نہیں ہمیں تیار ہو کر کہاں جانا تھا' کیوں جانا تھا مگر ہم نے زیادہ دماغ ریزی نہیں کی اور جلدی جلدی تیار ہونے لگے۔ پتہ چلا کہ فوزیہ آپی کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ مگر کہاں؟ یہ بھی پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کیوں کہ ماحول ہی اس قدر سرد اور بے کیف تھا۔ بہر حال ان کے ساتھ مجرموں کی طرح چپ چاپ چل پڑے۔ منزل مقصود پر پہنچے تو یہ عقدہ کھلا کہ یہ بیوٹی پارلر ہے ایک بار پھر ہم پر دورہ پڑا' حیرت و استعجاب کا لیکن ہمارے ہونق چہرے پر بھلا کس کی نظر پڑتی وہاں پر موجود کئی لڑکیوں نے فوراً ہی ہماری آپی کو اپنے گھیرے میں لے کر' اپنی اپنی ہنرمندی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ جب ان کی لمبی سی چوٹی کو تراش کر' بلکہ یوں کہیے کہ قتل کر کے' پیچ و خم دیا جانے لگا تو میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چوٹی کے بغیر دلہن کا تصور' شاید برداشت نہ کر سکی اور دیکھنے والوں نے سمجھا کہ بہن کے وداع ہونے کا غم ہو رہا ہے۔

اماں نے واپسی پر فوزیہ آپی کو دیکھا تو بے دھڑک فقرہ چست کر دیا۔ اف ! خدا کا غضب یہ تم اپنی شکل بگڑوانے گئی تھیں اور وہ بھی پیسے خرچ کر کے۔ اے بہن ! میں پوچھتی ہوں اس گھر میں کوئی بڑا چھوٹا بھی ہے کہ نہیں۔ پڑھائی لکھائی تو سب ہی کرتے ہیں مگر یہ کیسا گھور اندھیرا دیکھ رہی ہوں رسم و رواج کو تو چھوڑو' وہ تو بھاڑ میں چلے گئے۔ مہندی اور ابٹن کی رسمیں بھی ان کے نزدیک فرسودہ ہو گئیں۔ اے لو' اتنی خوبصورت' ریشم ریشم چوٹی کس کو دان کر آئیں؟"

وہ اپنے غصہ پر شاید قابو نہ پا سکیں اور بولتی ہی چلی گئیں "ہمارے زمانے میں تو دلہن کے بالوں کی یوں حفاظت ہوتی تھی جیسے ہیرے جواہرات کو چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ دلہن کے بالوں میں اول تو کنگھا ہی نہیں کیا جاتا تھا اور جب کیا جاتا تو ایک ایک بال ٹوٹا ہوا چنا جاتا اور کپڑے میں باندھ کر حفاظت سے ایک طرف رکھ دیتے کہیں کسی کی نظر بد نہ لگ جائے' کہیں

کوئی ٹونا ٹوٹکا نہ کردے۔ دلہن کی کمر پر لہراتی بل کھاتی چوٹی کتنی پیاری لگتی تھی۔ رنگ برنگے چوٹیلے ڈال کر کیا بہار آئی تھی۔ دیکھنے والے نہارتے ہی رہ جاتے۔"

اب تو خالہ امی، فوزیہ آپی اور سب گھر والے دم بخود رہ گئے۔ ہم بھی سر جھکائے اماں کی شعلہ بیانی دیکھتے اور سنتے رہے (گو کہ ہمارا کوئی قصور نہ تھا) نہ جانے کب خالو جان بھی آن پہنچے تھے اور سب کے پیچھے شرمندہ شرمندہ سے کھڑے تھے۔ انھیں لگا کہ واقعی ان سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے، بہت سنگین جرم سرزد ہو گیا ہے۔ تعلیم و تہذیب کی دولت اپنی اولاد کو مہیا کرانا کس کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ اس خواہش کی تکمیل میں حد سے آگے بڑھ گئے۔ اس شوق میں خود اپنی تہذیب کو روند ڈالا۔ ان کا چہرہ پچھتاوے کا غمازی تھا۔ ان کی حالت زار دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ "ارے آپ کب آئے خالو جان؟ ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔" مگر خالو جان نے ہماری بات ہی سنی ان سنی کردی۔ آگے بڑھ کر وہ ایک دم اماں سے لپٹ گئے۔ آنکھوں کی نمی بہت چھپانے پر بھی نہ چھپ سکی۔ ماحول اچانک سوگوار سا ہو گیا۔

یکایک خالو جان جوش میں کھڑے ہو گئے۔ "اب شادی ویسے ہی ہو گی جیسے ہماری آپا جان چاہیں گی۔ وہی سب رسمیں دوہرائی جائیں گی جو میری اپنی شادی میں منائی گئی تھی۔" اس اعلان کے ساتھ ہی فضا انوکھی مگر سچی خوشیوں سے مہک اٹھی۔ ہر طرف گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ آنکھوں میں تبسم، چہرہ پر گلاب سجائے فوزیہ آپی جھک گئیں۔ سب ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

پھر کیا تھا۔ ڈھولک بجی اور خوب بجی۔ ہمارے تو جیسے بھاگ کھل گئے۔ رٹو توتوں کی طرح ہم نے ایک ایک شادی کا گانا چیخ چیخ کر گایا۔ Once More Once More کی آوازیں بچوں کی طرف سے آئیں تو بہت حیرت ہوئی۔ یہ سوچ کر دل خوشیوں سے بھر گیا کہ لوک گیتوں کی مٹھاس ان معصوم دلوں کو کیوں کر چھو گئی۔ پڑوس میں ڈھولک کی تھاپ نے ہلچل مچادی۔ ایک نیا سرور جاگ اٹھا۔ بزرگ عورتیں اپنے اپنے علاقائی گیتوں کی یاد تازہ کرنے لگیں۔ مجھے تو اس قدر جوش آیا کہ ہوش کھو بیٹھی۔ فوزیہ آپی کو زبردستی گھسیٹ لائی اور سب کے درمیان بٹھا کر لمبا سا گھونگھٹ کھینچ ڈالا۔ جھک کر ان کا چہرہ دیکھا تو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ شرم و حیا کا یہ سیلاب کہاں سے امڈ پڑا۔ اماں نے آگے بڑھ کر دلہن کا صدقہ اتارا۔ پھر کیا تھا سب عورتیں باری باری اٹھ کر دلہن پر واری نیاری ہونے لگیں۔ بچوں کو بھی شرارت سوجھی وہ بھی اپنی اپنی ماؤں کے پرس سے کچھ نقدی لے آئے اور وہی عمل دوہرانے لگے۔

گلا پھاڑ پھاڑ کر۔" آخر کب تک گیت گاتے' رات بہت ہو گئی تھی مگر سب کی نیند غائب!
اماں کے یاد دلانے پر مہندی کھولی گئی۔ دلہن کے ساتھ ' دوسری لڑکیاں بھی ہاتھ پھیلا پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ خالہ چلائیں "ارے کل صبح وہ بیوٹی پارلر والی آئے گی' اس سے کون مہندی لگوائے گا۔ ان کو ایڈوانس دے رکھا ہے" مگر کسی نے ان کی پکار پر دھیان نہ دیا۔

شادی کا دن تو وہ ہنگامہ خیز ثابت ہوا کہ کچھ مت پوچھیے۔ ہم نے اپنے سارے ارمان یوں نکالے کہ اب ایسا موقع دوبارہ ہاتھ نہ آئے گا۔ چند خوبصورت رسموں کی دلکشی نے سب کا دل موہ لیا۔ خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ خالہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر اماں کو گلے سے لگا لیا اور بہت دیر تک ان کی آغوش میں سر چھپائے رکھا۔ آپی نے چپکے سے ہمارے کان میں اقرار کیا "شادی کی چہل پہل ایسی ہوتی ہے' مجھے معلوم نہ تھا" ان کا وہ سپاٹ سا چہرہ اب شرم و حجاب کا آئینہ بن گیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ دنیا ابھی بدلی نہیں ہے۔ اپنی تہذیب ابھی زندہ ہے۔ چہل پہل ابھی باقی ہے۔

مسرت بانو ابراہیم شیخ
میرا روڈ (مہاراشٹر)

جنم جلی

سائیں سائیں کرتی بارش کی طوفانی رات..... ہوا اور پانی کا زور پورے شباب پر تھا۔ رہ رہ کر بادلوں کی گود سے بجلی کڑکتی...... جسے پکڑنے کی کوشش میں دو بادل لپکتے اور اتنی زور سے آپس میں ٹکراتے کہ دھرتی کا سینہ دہل جاتا۔ چاروں طرف جل تھل تھا۔ لگاتار دو روز سے بارش ہو رہی تھی اور تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے کمین گاہ میں کھڑکی دروازے بند کیے لحافوں اور کمبلوں میں دبکے پڑے تھے 'انجانا سا خوف طاری تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

خستہ حال جھونپڑی کا پھڑپھڑاتا ہوا چھپّر ان طوفانی ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے وقفہ وقفہ سے پھڑپھڑا کر جھونپڑی کے اندر سہمے ہوئے پانچ نفوس کا کمزور سہارا بنا ہوا تھا جب کہ دوسرے کونے کا چھپر ہوا کے تھپیڑوں سے اڑ کر دور میدان میں جا گرا تھا۔

آٹھ سال کا بچہ جو پلیا کا شکار ہوا تھا چارپائی پہ بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ بارہ سال کا دوسرا بیٹا یوسف جو ساتویں جماعت میں زیر تعلیم تھا سردی سے کانپ رہا تھا اور خود کو ٹاٹ کے ٹکڑے میں چھپائے ہوئے تھا..... تیسری مفلس کی جوان بیٹی ساڑی کے چیتھڑے سے خود کو بارش کی سرد بوچھار سے بچانے کی ناکام کوشش کیے جا رہی تھی۔

جھونپڑی کے دروازے پر ایک بوڑھا جوڑا پانی میں بھیگی مرغیوں کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔ دونوں گویا اس اندھیری طوفانی رات میں اپنی جوان آبرو کی چوکیداری کر رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر قیامت کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ چھت پر لٹکی لالٹین بھنور میں ہچکولے کھاتی کشتی کی طرح جھولتی ہوئی اپنی مدھم روشنی پھیلا رہی تھی..... بڑھیا نے لمبی سانس کھینچی اور اداسی و ناامیدی سے بولی۔

"آج کا دن بھی انتظار میں بیت گیا۔ آس لگائے تیرہ دن گزر گئے۔ وعدے کے مطابق صرف دو دن باقی ہیں۔

"دو دن کہیں؟..... صرف کل کا دن۔ پرسوں وہ لوگ آنے والے ہیں یعنی صرف ایک دن بیچ میں ہے۔ اگر کل بھی کوئی میت نہیں آئی تو میری بچی یونہی بن بیاہی رہ جائے گی۔" بڑھیا سہمی سہمی سی بولی۔

"کتنی مشکل سے ایک لڑکا ہاتھ آیا تھا۔" بڑے میاں لاچاری سے بولے۔ "ڈرتا ہوں کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" پھر اپنی بیٹی پہ نظر ڈال کر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ دونوں ہاتھ پھیلائے اور بولے۔

"یا اللہ! ایسا ظلم مت کرنا۔ بڑے دنوں بعد یہ امید بندھی ہے۔ مجھے ناامید مت کرنا..... رحم کر کسی کو بھیج دے میرے مولا۔"

"یوسف کے ابا.....! نون مرچ کی طرح کیا آج کل انسانی جندگی بھی مہنگی ہو گئی ہے کہ کوئی مرنے کا نام نہیں لیتا۔ یا پھر موت کا فرشتہ چھٹی منا رہا ہے۔ یا پھر اللہ میاں کی رحمت ناجل ہوئی ہے جو لوگوں کی عمریں دراج ہو گئی ہیں جو کوئی قبرستان کا رخ نہیں کرتا۔"

"میں کیا جانوں۔"

"اگر یہی حال رہا تو چند روج میں ہم بھوکے مر جائیں گے۔"

"کیوں اماں؟" یوسف نے پوچھا۔

"لوگوں کی جندگی پر ہماری جندگی کا دارومدار جو ہے۔"

"یعنی کوئی مرے گا تو ہم کو جندگی ملے گی۔ کسی کے گھر کا چراغ گُل ہو گا تو ہمیں روشنی ملے گی۔ کسی کے آنسو بہیں گے تو ہمیں مسکراہٹ نصیب ہو گی۔ کتنی عجیب ہے ہماری زندگی۔"

"چپ کر..... چار کتاب کیا پڑھ لی۔ بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے۔ تو کیا جانے ہماری جندگی کیا ہے..... تکلیفوں کا جہنم ہے' بڑا ہو گا تو سب سمجھے گا۔" بڑھیا نے ڈانٹ پلائی۔

اندھیرے میں بلی کی چمکتی پتلیوں کی طرح بڑے میاں کی پتلیوں کی چمک تیز ہو گئی۔ ویسے بھی ان کے پچکے گالوں پر ننھی ننھی دو آنکھیں' سفید قدرے باہر نکلے ہوئے دانت ان کے لاغر چہرے کو ہنس مکھ بنائے ہوئے تھے..... دبلا پتلا ہڈیوں کا بدن' سفید ململ کے کرتے سے ڈھکا رہتا۔ ٹخنوں سے اوپر پرانی لال لنگی' سر پر سفید ٹوپی اور ہنس مکھ چہرہ دیکھنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیتا تھا۔ سفید موتی جیسے دانت اندھیرے میں چمکتے۔ مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔ آنکھوں کی پتلیوں کی چمک بڑھ گئی بولے..... "نہیں......! ایسا نہیں ہو گا..... پروردگار ایسا ظلم نہیں کرے گا' وہ رب العالمین ہے۔ ہم بھی اس کی مخلوق ہیں۔ باہر دو روز سے طوفان چل رہا ہے۔ کہیں نہ کہیں..... کوئی نہ کوئی ضرور مرا ہو گا..... کوئی آتا ہی ہو گا مجھے بلانے کے لیے' قبر کھودنے کے واسطے..... ہاں.....! ضرور آئے گا اور پھر ہمارے سارے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ میری بچی بن بیاہی نہیں رہے گی۔ یوسف کی ماں! ہماری بیٹی کا نکاح ضرور ہو گا۔ اس اندھیری رات کی روشن صبح ضرور نمودار ہو گی۔"

رات اسی امید و بیم کے جھکولے کھاتے گزر گئی۔ صبح بڑھیا نے ڈانٹ پلائی۔ "یوسف کے ابا....! اب بس کرو تمہارا انتظار اور جلدی جاکر کسی مرید و رید یا حکیم سے بچے کے لیے پیلیا کی خوراک لے آؤ۔"

"لیکن.....!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر تم نے دیر کردی تو تمھیں خود اپنے بچے کی قبر کھودنی پڑے گی اور وہ بھی پھوکٹ میں 'بن پیسے کے۔"

بڑے میاں چپ چاپ دستی کندھے پہ ڈال جھٹکے سے اٹھے اور ایک طرف چل پڑے۔

"کیوں.....؟ تو آج اسکول نہیں جائے گا؟" بڑھیا نے بیٹے سے پوچھا۔

"نہیں ماں۔ میرے پاس کاپی نہیں ہے..... میرا کام ادھورا ہے..... مجھے مار پڑتی ہے۔ جب تک کاپیاں نہیں ملیں گی۔ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔"

"جاکر اپنی آپا جان سے کہہ دے 'جب تک کسی کا جنازہ نہیں اٹھتا' ہماری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ ہمارے گھر چولہا نہیں جلتا۔ جب کوئی مرے گا تب کاپیاں بھی آجائیں گی۔ بڑھیا جل کر بولے جارہی تھی۔

"پانچ سو روپے میں کیا کیا ہوگا ماں۔ میری کاپیاں آئیں گی۔ چھوٹو کا علاج ہوگا۔ گھر کا خرچ چلے گا یا آپا کا نکاح؟"

"کہہ دیا نا سب کچھ ہوجائے گا۔"

"اماں تو ایسے کہہ رہی ہے۔ جیسے ابا کو لاٹری لگنے والی ہے۔ شٹ! ہماری بھی کیا زندگی ہے۔ اوروں کی بربادی پر ہماری آبادی منحصر ہے۔ گھن آتی ہے مجھے ایسی زندگی سے۔"

اسی لیے تو کہتی ہوں میرے چھوٹے بھیا۔ تم اسکول جاؤ۔ پڑھ لکھ لوگے تو ایسے کاموں سے بچ جاؤ گے۔ لڑکی نے اپنے چھوٹے بھائی یوسف کو پچکارا۔

بڑھیا چڑھ کر بولی۔۔ "میں بھی تنگ آچکی ہوں۔ اس طرح کے روج روج مر کر جینے سے اچھا ہوتا جو اس بستی میں ہیضہ یا کالرا پھیلتا۔ چار روج سوکھ سے تو گزرتے۔۔۔۔ یا پھر۔۔۔! تیرا باپ ہم سبھوں کی قبر ایک ساتھ کھود آتا۔ اس روج روج کے مرنے سے چھٹکارا تو مل جاتا۔"

"مت کوسا کرو دوسروں کو اماں! ہر کوئی اپنی تقدیر خود لکھا کرلاتا ہے۔"

"کیوں نہ کوسوں...؟ پھوٹی تقدیر لکھنے کے لیے کیا ہم ہی لوگ رہ گئے تھے؟ اور پھر میرے کوسنے سے کوئی کیوں مرنے لگا۔ کوے کے شراپ سے ڈھور مرا نہیں کرتے..... اب تو اپنا منہ بند کر۔ ایسے بھی جندگی میں تکلیفیں کیا کم دھریں تھیں جو تجھے اوپر والے نے اس جھونپڑے میں پیدا

کیا۔ جوان ہو کر ہمارے سینوں پہ سانپ کی طرح بل کھانے کے لیے.....!"

چار کوس کا پیدل سفر طے کر کے فضلو چاچا جب حکیم صاحب کے گھر پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ تھکے ماندے، ہانپتے کانپتے اس نے حکیم صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور اپنے آنے کا منشا بیان کیا۔ حکیم صاحب نے پپلیا کی خوراک اسے تھمادی اور احتیاط و پرہیز کے بارے میں تاکید کی۔ اتنے میں ایک اجنبی نے آکر حکیم صاحب کو اطلاع دی کہ گاؤں میں سکینہ آپا کے گھر آئے ہوئے کسی رشتہ دار کی حرکت قلب بند ہونے سے موت واقع ہوئی ہے۔

سکینہ آپا کے سوا اس کا دوسرا کوئی رشتے دار نہیں ہے، اب اسے یہیں اپنے گاؤں کے قبرستان میں دفنانا پڑے گا۔

حکیم صاحب نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "بیچارہ بڑا بد نصیب ہے۔" آنے والے نے حکیم صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے سچ کہا حکیم صاحب واقعی وہ بڑا بد نصیب ہے، دیکھیے نا قبر کھودنے کے لیے گاؤں کا گورکن بھی موجود نہیں ہے۔"

حکیم صاحب نے پوچھا۔ "کہاں گیا ہے وہ؟"

آنے والے نے بتایا۔ "شہر گیا ہوا ہے۔"

فضلو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ من ہی من میں بولا۔ "آخر خدا نے میری سن لی۔ اب میری بچی کا نکاح ضرور ہو گا۔"

فضلو بے ساختہ بیچ میں بول پڑا۔ "حکیم صاحب میں ہوں نا! میں یہ کام کروں گا، میں کھود وں گا قبر۔"

حکیم صاحب نے بھی ہامی بھری اور بولے۔ "ارے ہاں بھائی! میں تو بھول ہی گیا تھا تم بھی تو گورکن ہو۔" پھر آنے والے سے بولے۔

"یہ پڑوس کے گاؤں کا گورکن ہے۔ یہ آپ کا کام کردے گا، تم طے کرلو۔"

آنے والے نے چار سو روپے میں معاملہ طے کرلیا۔ فضلو پھاوڑا، کدال لے کر قبرستان پہنچ گیا اور بتائی ہوئی جگہ پر قبر کھودنی شروع کردی۔ فضلو سوچ رہا تھا۔ گھر واپس جانے میں دیر تو ہو جائے گی مگر جب یوسف کی ماں کو پتہ چلے گا کہ میں چار سو روپے کما کر لایا ہوں تو بہت خوش ہو گی۔ ذرا شادی کی تیاری شروع کرنا پڑے گی۔ خدا کتنا مہربان ہے۔ حاجت مندوں کی حاجت کسی نہ کسی بہانے پوری کردیتا ہے۔

قبر کھودتے کھودتے فضلو نڈھال ہو گیا۔ قبر میں ایک بڑا سا پتھر نکل آیا تھا۔ مگر فضلو نے ہمت نہ ہاری۔ رات کے بارہ بجتے بجتے فضلو نے قبر کھود کر تیار کرلی۔ قبر کھود چکنے کے بعد، تھکن سے چور

ہو کر قبرستان کے پاس ہی ایک پیڑ کے نیچے سستانے لگا۔ میت آئی اسے قبر میں اتار گیا۔ فضلو نے مٹی ڈال کر قبر برابر کر دی۔ نیند اور تھکن سے اس کا برا حال تھا مگر چار سو روپے کی آس میں اس کے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔ میت دفن کرتے کرتے صبح کے چار بج گئے۔ میت کو سپرد خاک کر کے خوشی خوشی چار سو روپے کے نوٹ کلیجے سے چمٹائے تیز تیز قدموں سے وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ روپیوں کی قربت نے گویا اس کے مردہ جسم میں روح پھونک دی تھی۔ ساری تھکن پل بھر میں کافور ہو گئی۔

صبح صادق کے وقت وہ اپنی بستی میں پہنچا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کا جھونپڑا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کاش پنکھ لگ جائیں اور وہ اڑتے ہوئے اپنی بیوی بچوں کے پاس پہنچ کر ان کی جھولی خوشیوں سے بھر دے۔

ادھر مسجد سے موذن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اللہ اکبر۔۔۔۔ اللہ اکبر۔ ادھر فضلو گھر کے آنگن میں پہنچا۔۔۔۔ لیکن یہ کیا۔۔۔۔ اس کے جھونپڑے سے آہ و بکا سنائی دے رہی تھی۔ لوگ دروازے کو گھیرے ہوئے تھے۔ فضلو لرز گیا۔ "یا خدا میرا بیمار بچہ۔۔۔۔!"

لپک کر وہ جھونپڑے میں داخل ہوا۔ آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بیمار بچہ، بڑا بیٹا یوسف اور بیٹی سبھی سلامت تھے اور بڑھیا کو گھیرے بیٹھے تھے اور بڑھیا سینہ کوبی کرتے ہوئے بین کر رہی تھی۔ فضلو کو بے حد غصہ آیا وہ چیخ کر بولا

"نامراد! کیوں گلا پھاڑ رہی ہو۔ میں ابھی زندہ ہوں، پھر کس کے نام کا ماتم کر رہی ہو؟"

"تمہاری جنم جلی بیٹی کی پھوٹی قسمت کا۔" بڑھیا بین کرتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا اسے؟ اچھی بھلی تو ہے۔"

"خاک اچھی بھلی ہے، ارے اس کا سہاگ تو بننے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔ کل تمہارا ہونے والا داماد آنے والا تھا نا۔۔۔۔ نکاح پڑھانے۔۔۔۔! لیکن قضا لے گئی اسے۔۔۔۔ لقمۂ اجل بن گیا۔"

"کیسے۔۔۔۔؟" فضلو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"پرسوں اپنی خالہ کو بلانے وہ پڑوس کے گاؤں گیا تھا۔ اسے تو نہ لا سکا۔ خود ہی موت کے منہ میں چلا گیا بدنصیب۔۔۔۔ اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"ہائے۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔" کہتے ہوئے فضلو اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگا۔ جب جی ہلکا ہوا تو بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے اپنے گلے سے لگاتا ہوا بولا۔

"یوسف کی ماں مت رو۔ خدا کا شکر ادا کر۔ جس نے تیری بچی کو بیوہ بننے سے بچا لیا۔ اری یہ جنم جلی نہیں بلکہ نصیبوں والی ہے، نصیبوں والی۔"

جائزے

زمانہ کی غالبیات

ناشر : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ
تقسیم : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ایک سو روپے۔

"زمانہ"، کانپور یگانہ روزگار رسالوں میں سے ایک ہے جس میں اقبال حسرت جیسے عہد ساز ادیبوں اور شاعروں کا کلام شائع ہوتا رہا ہے۔ اس رسالہ کے اڈیٹر دیا نرائن نگم ادارتی صلاحیتوں کے علاوہ خود بھی ممتاز ادیب تھے۔ اس رسالہ کی پچاس سالہ مدت حیات میں اردو ادب کا وافر سرمایہ جمع ہو گیا آج تک محققین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ نے اس رسالہ سے مختلف موضوعات کا انتخاب کرکے ہر موضوع پر الگ الگ ایک کتاب شائع کی ہے۔ اب تک ۳۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ شائع کرنے کا عزم کیا ہے "زمانہ کی غالبیات"، اسی سلسلہ کی ۲۲ ویں کڑی ہے۔ اس کتاب میں دو درجن سے زائد نظمیں اور مضامین شامل ہیں جو رسالہ زمانہ میں ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہوئے۔ ان مضامین میں ۹ مضمون خود مدیر زمانہ دیا نرائن نگم کے لکھے ہوئے ہیں باقی لکھنے والوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید علی عباس حسینی نظامی بدایونی اور پروفیسر مہیش پرشاد جیسے صاحب قلم شامل ہیں۔ اگرچہ اس کتاب کو یوں بھی اردو کے عظیم شاعر کا ایک نادر اور خصوصی نمبر کہلانے کا حق مل سکتا تھا لیکن اس عہد کے معروف ادیبوں اور صحافیوں کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین نے اس کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

"زمانہ کی غالبیات" کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مرزا کی سرتاپا ایک نایاب تصویر شائع کی گئی ہے جو کتاب کے شروع میں صفحہ ۲ پر چھپی ہے۔ غالب کی یہ تصویر شاید ان اوّلین تصاویر میں سے ہے جسے زمانہ کانپور نے پہلی بار شائع کیا۔

غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے علاوہ اس کتاب کے مضامین سے غالب کے فلسفہ، شعر، مذہب اور رہن سہن وغیرہ بہت سی باتوں پر نئے سرے سے روشنی پڑتی ہے۔ امید ہے بڑے شاعر پر ترتیب دی گئی یہ کتاب بڑے اشتیاق سے پڑھی جائے گی اور علم و ادب کے حلقوں میں غیر معمولی کشش کا سبب بنے گی۔

مرتب : ڈاکٹر امام اعظم
مبصر : ڈاکٹر رئیس انور
قیمت : ۱۲۰؍ روپے

نصف ملاقات

شخصیاتی مطالعے میں مکتوباتی ادب کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف دو شخصیتوں کے ذاتی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ قلبی کیفیت، پوشیدہ حالات، بے تکلفانہ خیالات، بے محابا تاثرات، مہر و محبت، عنایت و عطا، غیظ و غضب، نفرت و عداوت، خلش حسرت، طعن و تشنیع، شکوہ و شکایت غرض ہر طرح کے جذبات کا کھل کر اظہار ہوتا ہے۔ شخصیت کی تمام ظاہری پابندیوں اور مصلحتوں پر پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے اور انسانی جبلت کا اصل روپ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اسی بنا پر دانشوروں اور فنکاروں کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ان کے مکتوبات سے گزرنا از بس کہ ضروری ہے۔ غالباً مشاہیر ادب کے مکتوبات کے مجموعے "نصف ملاقات"، کے مرتب ڈاکٹر امام اعظم کا مقصد و مدعا بھی یہی ہے۔ اس کتاب میں اردو کے نامور شاعر اور ادیب مظہر امام کے نام لکھے جانے والے ان نابغۂ عصر کے مکتوبات اکٹھا کیے گئے ہیں جو ۱۹۹۲ء تک اس دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ کتاب میں ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے دوران لکھے ہوئے دو سو چودہ مکتوبات شامل ہیں۔ مکتوب الیہ کی ہوشمندی اور شخصی عظمت ہے کہ اس نے مکتوب نگاروں کی زندگی میں ان کی اشاعت سے گریز کیا کیونکہ بعض مکتوبات سے کبھی کبھی مکتوب نگار کی شخصیت دھندلا جاتی ہے۔

نوجوان مرتب نے شروع میں چار صفحوں کا ایک مفید دیباچہ لکھا ہے پھر ترتیب و تدوین کے اصول کی حتی المقدور پابندی کرتے ہوئے مکتوبات شامل کیے ہیں۔ مکتوبات کے وضاحت طلب امور پر بھی خاصی توجہ دی ہے اور جگہ جگہ مکتوب الیہ کی وضاحتوں کو حاشیے میں درج کیا ہے۔ آخر میں چھ صفحوں پر مشتمل ان ناموں کا اشاریہ بھی تیار کیا ہے جن کا ذکر مختلف مکتوبات میں آیا ہے۔

مکتوبات کی اشاعت کا اصل مقصد مکتوب نگار کی شخصیت کے مخفی گوشوں پر روشنی ڈالنا ہے۔ اس لیے مجموعوں میں رسمی اور رسیدی مکتوبات کی شمولیت سے احتراز لازمی ہے۔ "نصف ملاقات" کے مشمولات پر بھی تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت تھی۔ مثلاً اثر لکھنوی کے آخری تین مکتوبات محض رسمی ہیں۔ اسی طرح احمد جمال پاشا کے تیسرے، کلیم الدین احمد کے پہلے، ل احمد اکبرآبادی کے ساتویں، محمد طفیل کے پہلے اور مخمور جالندھری کے پہلے مکتوب کی شمولیت کا کوئی خاص
[illegible] اور اہمیت

مکتوبات عموماً قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات وقتی جذبے کے تحت کسی کی ناطر شکنی اور دل آزاری بھی ہو جاتی ہے۔ مرتب کو ایسے موقعوں پر جو کسی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور اپنے اختیارات سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کے دیباچے کے مطابق کسی مکتوب میں انھوں نے دانائی کے ساتھ متنازعہ فیہ عبارت حذف کر دی ہے۔ لیکن دوسری جگہوں پر ان سے چوک ہو گئی ہے جس کی وجہ سے دو ایک زندہ شخصیتوں کی دل شکنی ہوتی ہے جو نادانستہ ہونے کی بنا پر قابل درگزر ہے۔

بہرحال "نصف ملاقات"، ڈاکٹر امام اعظم کی ترتیبی و تدوینی صلاحیت کا پہلا نمونہ ہے جس میں کتابت، طباعت، گٹ اپ اور سرورق کی نفاست اور ستھرے پن سے ان کا سلجھا ہوا ادبی مزاج بھی منعکس ہوا ہے۔ دو سو چالیس صفحات پر محیط اس مجلد کتاب کی قیمت فی زمانہ مناسب ہے۔ امید ہے ادبی و علمی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

فکرِ رسا

مرتب : جابر حسین
قیمت : دس روپے
صفحات : ۲۵
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
ناشر : بہار فاؤنڈیشن لوہیا نگر، پٹنہ

"فکرِ رسا" "تھنو لال وحشی" کا لکھا ہوا مرثیہ ہے جو بہتر بندوں پر مشتمل ہے اور شہید کربلا کی شان میں لکھا گیا۔ خیال اور فارم کے لحاظ سے بھی روایتی ہے مگر ایک غیر مسلم شاعر کا لکھا ہونے کی وجہ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعر کو مرثیہ اور قصیدہ لکھنے پر عبور حاصل ہے اور ان ہی اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی بھی کی ہے۔ مرثیہ مذکور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

آنکھوں میں پھر رہا ہے سماں اس دیار کا
ہندو جواب دیتے ہیں آج اس پکار کا

مت گونجے مسجدوں میں فسانہ حسین کا
مندر بنیں گے تعزیہ خانہ حسین کا

ہم بت پرست آپ کی تربت بنائیں گے
ہر چوک پر دیوں کی جگہ دل جلائیں گے

بادۂ تغزل

ترتیب و تدوین : صابر آروی
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : .. روپے
صفحات : ۹۶
تقسیم کار : سید فیاض حسین ایل ۲ - ۱۵ ایس کے پو
بورڈنگ روڈ، پٹنہ ۱

"بادۂ تغزل" سید خادم حسن خادم آروی کے کلام کا مجموعہ ہے جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند صابر آروی نے ترتیب دے کر شائع کر دیا ہے۔ اس مجموعہ میں خادم آروی کا جو کلام شامل ہے اس میں ان کی طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے علاوہ کچھ نظمیں اور رباعیاں بھی شامل ہیں۔ اپنی شاعری کے آئینہ میں خادم آروی بڑے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر کی شکل میں نظر آتے ہیں جو شعر گوئی کی دنیا میں اپنی فصاحت اور بلاغت کا نمونہ دکھا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری نہایت پُر لطف پُر مغز اور جملہ عیوب سے اس طرح پاک ہے شعری اور فنی اعتبار سے آج کی شاعری کی طرح اس میں کہیں جھول نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے اتنا ریاض اور اکتساب گذشتہ زمانے کے شاعر کر سکتے تھے۔ کتاب کی ابتدا میں شاعر کے حالات اور ان کی خدمات پر مضامین ہیں جن سے ان کے علمی و ادبی سفر پر روشنی پڑتی ہے۔ "بادۂ تغزل" کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

بکھرائے بال بام پہ آیا کرے کوئی
کب تک بتاؤ دل کو بچایا کرے کو

تیرے دیوانے کا حلقہ بڑھ گیا جوشِ جنوں
ہتھکڑی بھی ہاتھ میں ہے پاؤں میں زنجیر

اشکوں نے میرے عشق میں رسوا کیا مجھے
افسوس رازِ عشق کبھی پنہاں نہیں ر

کالی گھٹا ہو، سرد ہوا ہو، بہار ہو
ساغر میں ہو شراب تو پہلو میں یار

بھلا تھا اس سے نہ ملنے کی آرزو کرتے
ہماری عمر کٹی مفت جستجو کرتے

ٹل گئی موت جو وہ آ کے سرہانے بیٹھے
معجزہ عشق کا میں نے یہ خدایا دیکھ

رات دن آنکھ میں پھرتی رہی صورت تیری
وہی جلوہ وہی چہرہ وہ نقشا دیکھ

تیرے درد مند جو ہیں انھیں درد کے مزے ہیں
نہ انھیں دعا سے مطلب نہ غرض انھیں دوا

قبر میں چھوڑ کے تنہا مجھے احباب گئے
اب زمانے میں رکھے کس کا بھروسا کوئی

شعوری رجحانات

مصنف : خلیق الزماں نصرت
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۶۰ روپے
پتا : پہلا منزلہ بلڈنگ نمبر ۴ فلیٹ نمبر ۱ امانی نگر
۲ اونی، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲

خلیق الزماں نصرت اردو کے بے لوث خدمت گزاروں میں ہیں انھیں نہ صلہ کی پروا ہے اور نہ ستائش کی تمنا اردو ان کی اپنی زبان ہے اس لیے اس سے قلبی ہمدردی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہونی زیادتیوں اور ناانصافیوں کو بے خوف اور بے باک ہو کر نمایاں کرتے ہیں انھیں ایسے راز فاش کرنے اور حقائق کو بیان کرنے میں کوئی ڈر نہیں لگتا کیوں کہ ان کی روزی روٹی کا ذریعہ اردو نہیں ہے۔ جس سے ناراض ہو کر کوئی افسر یا حاکم ان کو نقصان پہنچا سکے۔ پیش نظر مجموعہ مضامین "شعوری رجحانات" خلیق الزماں نصرت کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں "مشرقی غزل میں حالات حاضرہ" "علامہ اقبال کے کلام کی پیش گوئیاں" "فیضی نظام پوری فن اور شخصیت" "امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری اور اردو" وادی خار میں مضامین شامل ہیں۔ اردو وادی خار میں ان کا معرکۃ الآرا مضمون ہے جس میں اردو کے ساتھ سوتیلے برتاؤ اور اردو کی بے دل عزیزی کے متعدد ثبوت فراہم کیے گئے ہیں۔ ان کا قلم رواں دواں ہے۔ اظہار بیان نمایاں اور صاف ہے۔ سچ پوچھو تو ایسے ہی اصحاب کی بدولت اردو زندہ ہے۔ اردو سے لگاؤ رکھنے والے ہر شخص کو یہ کتاب ایک بار ضرور پڑھنی چاہیے۔

نرمان

تصنیف : افتخار نسیم
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۱۵۰ روپے
مقام اشاعت : ہم خیال پبلشرز ۸ ایوب پلازہ
کچہری بازار فیصل آباد (پاکستان)

"نرمان" افتخار نسیم کی عجیب و غریب تصنیف ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی تسلیم کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے اس کا اندازہ قارئین کو کتاب پڑھنے سے از خود ہو جائے گا لیکن کائنات عالم کی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان پیدائشی طور پر مذکر ہے یا پھر مونث۔ اردو شعر و ادب میں جن جذبات اور احساسات کا اظہار ملتا ہے وہ اکثر انھیں دونوں کے

ترجمان ہیں لیکن کیسی حیرانی کی بات ہے کہ مخلوق خداوندی میں ان دونوں کے علاوہ ایک اور جنس بھی ہے جو تذکیر و تانیث کے جھگڑوں سے پاک ہے۔ اس دنیا کے محسوسات مذکورہ دونیاؤں سے یقیناً جدا ہوں گے جو دونوں کی لذتوں سے ناآشنا ہوں گے مگر لذت گناہ کے لیے تڑپتے بھی ہوں گے۔ جو شخص مرد پیدا ہو کر مردانہ خواہشوں اور تقاضوں سے محروم ہے اس کا رد عمل کیا ہوگا اور وہ اپنے اور اپنی دنیا کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔ اس راز کو جاننا ہو تو افتخار نسیم کی کتاب "نرمان" پڑھی جائے۔ "نرمان" میں ایک ایسے ہی انسان کے احساسات ہیں۔ "نرمان" جدید فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ایک یونانی دیوتا "ہرمافروڈائٹ" کے ہیں جو آدھا مرد اور آدھی عورت تھا۔ افتخار نسیم نے اپنے مجموعہ کا یہی نام تجویز کیا اور اس میں اسی انواع کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اردو زبان و ادب میں ایک نئی تحریک کا آغاز کیا ہے اور انسان کی اس تیسری قسم کو زبان دی ہے۔ ان کی ہمت کی داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے اپنے ذاتی کرب اور قلبی تمنن کی ناگفتنی باتوں کو بڑی دلیری کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

کتاب میں ۵٦ موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے دو نمونے ملاحظہ ہوں۔

"---مرے سارے ہم عمر مجھ کو
بلوغت کے ہی موڑ پر
چھوڑ کر جا چکے ہیں
اکیلا میں اس شخص کا منتظر ہوں
جو میرے قبیلے کا ہوگا
جو اسرار جانے گا میرے بدن کا---"

(A.GAY PERSON)

میں صبح اٹھ کر یہ سوچتا ہوں
نہ میرا بستر صلیب ہوتا
نہ زندہ در گور اپنے بستر میں
لیٹتا میں
نہ یوں اندھیرے بھی اتنا ڈرتا
نہ میں کوئی خواب گروی رکھتا
جو رات کو اٹھ کے اپنے جیسوں کو
ڈھونڈتا ہے۔

(خاموش اقلیت)

اواز داخلی الوہی اور نرالی ہے مگر شاعرانہ فن کاری سے عاری ہے۔ جنھیں کتاب میں چند جملوں کے نثری اقتباسات ہیں مگر مصنف نے انھیں ایک سچائی سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ بھی ایک سچ ہے کہ اس کتاب سے ایک منفی تاثر بھی ابھرتا ہے کہ یہ شخص شاعر تو ہے نہیں اور شاعر بننا چاہتا ہے۔ مگر شعری ریاض سے کتراتا ہے اگر انھوں نے انھیں خیالات کو شعری رواداری کے ساتھ نظم کیا ہوتا تو تحقیر و ملامت کے بجائے ایک ان چاہا لگاؤ بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر پھر انھیں "اخلاقی مجرم" کیسے کہا جاتا؟ کتابت طباعت اور کاغذ بے حد عمدہ ہے۔ کتاب کے شروع میں افتخار نسیم کے علاوہ پروفیسر نعیم چودھری، ڈاکٹر سلمان اختر اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی گراں قدر آراء ہیں۔ پشت پر انجم سلیمی کی رائے شامل ہے۔

بہار میں اردو افسانہ نگاری

مصنف : ڈاکٹر قیام نیرؔ
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : ڈاکٹر قیام الدین نیر مقام و پوسٹ بردابا، وایا کمتول، دربھنگہ (بہار)

"بہار میں اردو افسانہ نگاری" ڈاکٹر قیام نیر کا مقالہ ہے جس پر ایل این متھلا یونی ورسٹی دربھنگہ نے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی۔ اس ضخیم تحقیقی مقالے کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) افسانہ کیا ہے (۲) ہندستان میں اردو افسانہ (۳) بہار کے نمائندہ افسانہ نگار (۴) بہار کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار (۵) بہار میں اردو افسانہ (۶) ماحصل۔ باب اول میں عنوان کے تقاضے کو خیال میں رکھ کر اردو افسانہ کی تعریف اور اس کے فن کو موضوع بنا کر اس کے لوازم اور اجزا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں افسانہ کے انواع اقسام کی نشاندہی کر کے دیگر اصناف یعنی ناول، ڈرامہ اور قصہ وغیرہ سے اس کے فرق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ پہلا باب اس وقیع مقالے کی تمہید ہے۔ دوسرے باب میں مختصر افسانہ کی مختصر تاریخ اور اس کے مقام کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس باب میں ہندستان کے نامور افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری پر مختصراً تبصرہ کیا گیا ہے۔ تیسرا اور چوتھا باب اصل موضوع کو محیط ہیں۔ ان دونوں ابواب میں خالصتاً بہار میں لکھنے والے تقریباً دو سو افسانہ نگاروں کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ہر ایک کی مختصر سوانحی تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے اس کتاب میں اپنے موضوع کا پوری طرح احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور عصری ادبی تقاضوں کو سامنے رکھ کر جامعیت سے کام لیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب افسانوی ادب کی عصری ضرورت کو پورا کرتی ہے اور بہار میں اردو افسانہ کی ایک جامع تاریخ بھی ظاہر کرتا ہے۔

ب میں بہار کی افسانہ نگاری پر کام کرنے والوں کے لیے اچھا مواد جمع ہو گیا ہے۔ جو آئندہ محققین
ناقدین کے لیے مدد گار ثابت ہوگا۔ ہر ریاست کے اصناف ادب پر اس طرح کام کرنے کی
رت ہے۔ اس مختصر تبصرے میں زیرِ نظر کتاب کا مختصر تعارف تو ممکن نہیں تاہم یہ کتاب نہ صرف
بلکہ ہندوپاک کے افسانوی ادب کے سرمایہ میں ایک ضروری کڑی کی حیثیت اختیار کرے گی۔
قیام نیر بہار میں اردو افسانہ کی اس مبسوط تاریخ کی اشاعت پر قابل مبارک باد ہیں۔

شاعر : قاضی حسن رضا

غبار احساس

قیمت : ۵۰ روپے

مبصر : ڈاکٹر توفیق احمد خاں

تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لیمٹڈ نئی دہلی ۲۵

راحساس" کھنڈوہ کے ایک کہنہ مشق شاعر قاضی حسن رضا کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں
سو سے زائد غزلیں شامل ہیں جن میں مصنف کی مہارت فن کا کمال نمایاں ہے۔ صاف ستھری
دھلی زبان میں اردو شاعری کا تازہ نمونہ سامنے آتا ہے۔ قاضی حسن رضا کی غزلوں میں ایک قومی
ور تڑپ ہے۔ شعر و ادب سے قدیم لگاؤ کی بنا پر ان کی شاعری میں جھول نظر نہیں آتا۔ اظہار پر بے
قدرت رکھتے ہیں ان کے اشعار الم ناک جذبات کے اظہار کا آئینہ ہیں۔ جن میں ہمت اور حوصلہ
ی نہیں۔ کتاب کے شروع میں مصنف کے حالات مصنف کے قلم سے دیباچہ کی شکل میں ملتے
۔ اس کتاب میں مصنف کے ہم جماعت پروفیسر مظفر حنفی کی رائے بھی شامل ہے۔ چند اشعار
ظہ ہوں۔

شخص اپنے زعم میں نامہرباں رہا | پھر بھی ہمارا شہر میں اونچا مکاں رہا
شیشہ زنی کی مہارت نہ ہوتی | تو تعمیر اس کی عمارت نہ ہوتی
پرواز فن میں نہ اس کو سکھاتا | اسے خود سری کی جسارت نہ ہوتی
تک لڑے آدمی آخر ضمیر سے | زخمی وہ ہوگا ایک دن اپنے ہی تیر سے
سے فلسفہ لیا اقبال سے خودی | سوز غم حیات لیا ہم نے میر سے
بھی کیوں محال ہے دور جدید میں | میرا سوال ایک جوابات کس قدر
، مکان، کپڑا، ہوا آب کی کسک | چھوٹی سی زندگی میں حسابات کس قدر

کوزے میں اپنے غم کا دریا سمٹ نہ جائے — جذبے کی شدتوں سے دل میرا پھٹ نہ جائے
غزل کہنا کوئی آسان نہیں لیکن رضا تم بھی — روایت اور جدت کو ملا کے ساتھ چلتے ہو
لوگوں کو جھوٹ سے کبھی فرصت نہیں ملی — سچ بولنے کی ہم کو اجازت نہیں ملی

شیشوں کے درمیاں

مرتب : خلیق صدیقی
مبصر : توقیر احمد خاں
قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

"شیشوں کے درمیاں" شفق تنویر کے شعری مجموعہ "سورج کاندھے پر لیے" پر مختلف تاثرات اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں شاعر کے حوالے سے بڑی دلچسپ ادبی اور شعری مباحث ملتے ہیں۔ شفق تنویر کی بیٹی حنا نکہت کا ایک فقرہ "اب اہل نظر تبصرے کریں یا نہ کریں دونوں سے بے نیاز ہیں میرے ابو" خصوصاً موضوع بحث رہا ہے۔ اس مجموعہ میں ۴۵ اشخاص کی آراء و تاثرات شامل ہیں۔ کتاب کا سنہ اشاعت ۱۹۹۶ ہے

اردو انشائیہ کے ارتقاء میں
پروفیسر رشید احمد صدیقی کا حصہ

مصنف : ڈاکٹر ریاض احمد انصاری
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۶۰ روپے
تقسیم کار : کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ

اردو انشائیہ کے ارتقاء میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا حصہ ڈاکٹر محمد ریاض احمد انصاری لکچرار شعبہ اردو و فارسی ایس کے آر کالج برہیگہ (مونگیر) کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ ہے جو ڈاکٹر سید مظفر اقبال بھاگلپور یونی ورسٹی بھاگلپور کی نگرانی میں لکھا گیا اور اس مقالہ پر مصنف کو ٹی ایم بھاگلپور یونی ورسٹی نے ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ مقالہ کو پانچ ابواب میں منقسم کر کے رشید احمد صدیقی کی انشائیہ نگاری کا جامع اور معروضی جائزہ لیا گیا ہے اور مستند انگریزی اردو کتب کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ رشید احمد صدیقی مرحوم نے اردو انشائیہ نگاری کے فن کو بام عروج پر پہنچایا جس کو کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اردو انشائیہ کے باب میں انھوں نے جو طرح ڈالی بعد کے انشائیہ نگاروں نے اس کی اتباع کی ہے۔ اس طرح وہ ایک نادر رجحان ساز انشائیہ نگار ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر

محمد ریاض احمد انصاری کا یہ مقالہ قابل قدر ہے جو اپنے مشمولات اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی عمدہ ہے۔ کاغذ اور طباعت کی خامی مقالہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی توقع ہے رشید احمد صدیقی کے ادب کے مطالعہ میں یہ کتاب ایک اضافہ کی حیثیت اختیار کرے گی اور ارباب علم و ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

بیتی کہانی

مصنفہ : شہربانو بیگم
مرتب : معین الدین عقیل
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۱۷۵ روپے
ناشر : ادارہ علمی حیدر آباد پاکستان

ڈاکٹر معین الدین عقیل اردو اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتاب محققین کے لیے اس لیے اور بھی قابل توجہ ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کی دریافت کے مطابق "اردو کی اولین نسوانی خود نوشت ہے" جو پاٹوری کے نواب اکبر علی خاں کی دختر شہربانو بیگم مرحوم کی تصنیف ہے۔ یہ خود نوشت مصنفہ نے ایک انگریز خاتون کے ایماء پر لکھی تھی اور ۱۸۸۷ سے قبل تصنیف کی گئی تھی۔ عام مشرقی خواتین کی طرح یہ خود نوشت بھی ایک مشرقی خاتون کی کہانی ہے جو عام فہم سادہ اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ انداز تحریر نہایت دلکش ہے جسے مصنفہ کے نوابی ٹھاٹ باٹ اور ریاست کے نوابی ماحول نے اور زیادہ پر وقار بنا دیا ہے۔ جس میں ریاست کے نواب خاندان، اس عہد معاشرہ، تہذیب اور کلچر کی شفاف تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اردو خود نوشت کی دنیا میں ایک اہم سنگ میل ہے جو دنیائے ادب میں ایک انوکھی اور نادر صنف سخن ہے۔ کتابت کمپیوٹر پر ہے۔ کاغذ بہت ہی عمدہ سفید دبیز اور چکدار استعمال ہوا ہے جو پاکستانی کتابوں کا خاصہ ہے۔ سرورق کریم رنگ میں ہے جس پر طلائی حروف میں کتاب کا نام وغیرہ چھپا ہے۔ جو دیکھنے میں جاذب نظر ہے۔ من حیث المجموع کتاب کی قیمت بھی مناسب ہے۔ توقع ہے اہل علم و ادب کی توجہ کا خاص مرکز بنے گی۔

کھلے خطوط

مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

☆جوگندرپال۔ ۲۰۴ منڈاکنی نئی دہلی ۱۹

پروفیسر شارب ردولوی نے "کتاب نما" کے ستمبر ۹۶ء کے شمارے میں اپنے مختصر مگر جامع مضمون میں عتیق اللہ کی "ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ" کو بجا طور پر اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا ہے۔ انگریزی میں قارئین کی ہمہ وقت بدلتی ضروریات کے پیش نظر آئے دن اس نوع کی کوئی نہ کوئی کتاب منظر عام پر آجاتی ہے۔ مگر ہمارے یہاں نئی علمی وارداتوں میں روز افزوں اضافوں اور نتیجتاً ہم عصر زندگی میں نئے محاوروں اور اصطلاحوں کے راہ پاچکنے کے باوصف ہماری بیشتر فرہنگیں کرم خوردہ الفاظ، محاوروں اور اصطلاحوں پر ہی تکیہ کیے جاتی ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنی اس وضاحتی فرہنگ کی پہلی جلد شائع کرکے واقعتاً اردو ادب کی اعلا تعلیم کی بہتر تکمیل میں سہارے کا اقدام کیا ہے۔ مجھے امید ہے اردو کے ذمے دار سرکاری اور غیر سرکاری ادارے انھیں ہر ممکن سہولت اور موقع فراہم کریں گے، تاکہ وہ اپنے علمی اور تحقیقی انہماک کو برابر بنائے رکھیں اور بقیہ جلدوں کا کام بھی بے روک ٹوک انجام دے پائیں۔

پروفیسر عتیق اللہ کی وضاحتی فرہنگ کی یہ خوبی خاص طور پر متوجہ کرتی ہے کہ مغربی اصطلاحوں کے دیسی مترادفات پر ہی قانع ہو جانے کی بجائے وہ ہمیں ان سے مستند دیسی تحریروں کے سیاق میں روشناس کرواتے ہیں۔ کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ فاضل مصنف نے ہر اصطلاح کے تین چار مترادفات دیے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ لوائل میں مترادفات کی معیار بندی کے بغیر ادب کے قاری کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تاہم یہ بھی ہے کہ ناموں کی صحیح معیار بندی جیساکہ ہر مغربی زبان میں بھی ہوتا آیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ از خود طے پاجاتی ہے، بلکہ بعض حالات میں طے پاجانے پر بھی اس میں بہ ضرورت ترمیم کی گنجائش روا رکھی جاتی ہے۔ آخری محاسبے میں حروف کو بھی زندوں کے مانند کوئی مستقل معیار بندی راس نہیں آتی۔

ایک اور بات: پروفیسر عتیق اللہ شاید میری اس تجویز پر غور کرنا چاہیں: حالیہ علوم کے بیشتر دائروں میں اگرچہ ہم مغربی اصطلاحوں کے محتاج ہیں، پھر بھی اردو ادب میں کیا بعض ایسی نئی اصطلاحیں وضع کیے جانا بھی ناگزیر نہیں جو خالصتاً مقامی ہوں اور جن

کے واضح تعین کی غیر موجودگی میں طلبہ کا
اپنے تلازموں میں ویسے ہی بھٹکنے کا امکان ہو
جیسے مغربی اصطلاحوں کی غیر موجودگی میں؟
یہ عمل بھی شروع کیا جا سکے تو ہماری زبان
میں وہ دور بعید از قیاس نہ رہے گا جب علمی
برادریوں میں دو رویہ ٹریفک شروع ہو جاتی
ہے جو بہر صورت بہتر اور برتر امکانات کی
حامل ہوتی ہے۔

اور آخر میں اصطلاحی ترغیبوں کے
تعلق سے شاید یہ وارننگ بے محل نہیں: اگر
چہ اصطلاحوں کی سہولتی افادیت میسر نہ آنے
پر علم کی معراج تک راستہ ہموار کرنا نہایت
کٹھن ہے، تاہم اصطلاحوں کو بذات خود اہم
قرار دے کر بھی آدمی اپنا علم گویا لاعلمی میں
ہی ڈھوتا چلا جاتا ہے۔ اسی تناظر میں صاحب
کمال اصطلاحوں کی روز مرہ افادیت تسلیم
کرنے کے باوجود اصطلاحی تدبر کو ٹس کر ٹال
جاتے ہیں۔ تدبر بہر حال وارداتی ہوتا ہے،
اصطلاحی نہیں، اور اسی باعث اصطلاحوں کی
پاسداری کے باوجود یورپ کو اصرار ہے کہ ان
کی پادشاہی کو پارلیمنٹ کا پابند بنائے رکھے۔

☆ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی۔ اردو بازار دہلی

مئی ۹۶ء کے شمارے میں "دلی کی
تاریخی مساجد،، جلد اول پر تبصرہ شائع ہوا
ہے۔ یہ کتاب واقعی اہم ہے اور اہم موضوع
پر لکھی گئی ہے۔ اس کے مرتب عطاء الرحمٰن
قاسمی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں، بڑا
اچھا کام کیا ہے۔ لیکن ذرا سی احتیاط
تحقیق کا اہتمام کیا جاتا تو کیا ہی...

تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ مؤلف نے "کتاب
کی ترتیب میں بڑی بالغ نظری اور ژرف
نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔۔۔ بڑی تحقیق و جستجو
کے ساتھ۔،،

زیر تبصرہ کتاب سرسری طور پر
راقم نے بھی دیکھی ہے۔ مرتب محترم کی
ژرف نگاہی اور تحقیق پر مبنی کتاب سے دو تین
اقتباس پیش کرتا ہوں۔ کیا اس طرح کی
کتاب کا تحقیقی معیار ایسا ہونا چاہیے۔ مسجد اکبر
آبادی کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"دلی کے مشہور بزرگ مولانا حفیظ
الرحمٰن واصف" صاحب کی تحقیق نقل کی جاتی
ہے۔ جنھوں نے بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد
کے بات ثابت کی ہے کہ مسجد اکبر آبادی
ایڈورڈ پارک موجودہ سبھاش پارک ہی میں
تھی۔،،

اور اپنی بات کی تائید میں مولانا واصف" کی
کتاب " اردو مصدر نامہ ،، کے مقدمہ سے
اقتباس دیا ہے۔

"ایام طفولیت میں راقم الحروف نے
سنا تھا کہ ٹھنڈی سڑک کے کنارے پر ایڈورڈ
پارک میں وہ مسجد تھی جس میں شاہ عبد القادر"
نے علوم اسلامیہ کا درس دیا تھا۔ سقوط دہلی
کے بعد انگریزوں نے اس شہر یعنی جہان آباد
پر ایسا غصہ اتارا کہ قلعہ کے اطراف کی آبادی

اور محلات دور دور تک ملیامیٹ کر دیے گئے۔
یہ مسجد بھی ڈھادی گئی۔ امام جامع مسجد شمس العلماء مولانا سید احمدؒ نے چیف کمشنر سے درخواست کی کہ کم از کم اس جگہ کا احاطہ کر دیا جائے تاکہ جانوروں کی آمد و رفت سے بے حرمتی نہ ہو۔ چنانچہ احاطہ کر دیا گیا۔،،
(دلی کی تاریخی مساجد صفحہ ۲۲۹)

اس اقتباس سے اس طرف کہاں اشارہ ہوتا ہے۔ کہ یہ مولانا کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ یہ تو بچپن کا سنا ہوا ایک واقعہ رقم ہوا ہے مولانا کی تحقیق کی اس تمہیدی تحریر کو مولانا کی تحقیق و تفتیش قرار دے دینا کہاں تک مناسب ہے، اس کا فیصلہ قارئین کرام ...
مصدرنامہ کے مقدمہ کی مکمل عبارت صفحہ ۱۵۔۱۶ پڑھ کر خود کر لیں جو درج ذیل کی جاتی ہے۔

"سقوط دہلی کے بعد انگریزوں نے اس شہر مینو سواد یعنی شاہجہاں آباد پر ایسا غصہ اتارا کہ قلعہ کے اطراف کی آبادی اور محلات دور دور تک ملیامیٹ کر دیے گیے یہ مسجد بھی ڈھادی گئی ـــــ چنانچہ احاطہ کر دیا گیا جو ٹھنڈی سڑک کی طرف ایڈورڈپاک کے جنگلے کے اندر ہے مہندھی کی باڑ ہے اور مغربی جانب دونوں کونوں پر فیلپایہ اور بیچ میں محراب کی پشت کا پیچھے کو نکلا ہوا حصہ ہے۔ یہ احاطہ اب بھی موجود ہے۔ احاطہ کے اندر پہاڑی ہے جو جنگلے کے باہر پٹڑی تک ابھری ہوئی تھی۔ مگر اب پٹڑی کو ہموار کر دیا گیا ہے واقعات دارالحکومت میں ہے۔ (فیض بازار میں ہی یہ مسجد تھی جو غدر کے بعد ڈھایا ڈھوئی کی نذر ہو گئی۔ محل و قوع اسکا موجودہ ایڈورڈ پارک ہے جس وقت اس کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی تو مسجد کا چبوترہ اور بنیادیں جوں کی توں مثل گنج نہاں کے زمین میں مدفون تھیں۔ ویسے ہی ڈھک دی گئیں اور ہمیشہ کے لیے یہ بے نظیر عمارت نظروں سے پوشیدہ ہو گئی۔)

راقم الحروف (مولانا واصف دہلوی) عرض کرتا ہے کہ مجھے اس احاطہ کے بارے میں یقین نہیں ہے کہ یہ صحیح جگہ پر بنایا گیا ہے کیونکہ مسجد فیض بازار میں تھی اور پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ سڑک فیض بازار کی ہے ہی نہیں۔ فیض بازار کی سڑک تو موجودہ زمانہ پردہ باغ کے دروازہ کے پاس سے گزر رہی ہے اور نقشہ میں دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اکبر آبادی فیض بازار میں لب سڑک ہے۔ آیئے اب ہم جو اس کی جائے وقوع سمجھ سکے ہیں آپ کو بھی بتائیں فیض بازار میں مسجد روشن الدولہ والی لائن میں شمال کی طرف چلیے کوچہ چیلان سے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کی طرف کوچہ دکھنی رائے آئے گا پھر اور آگے بڑھ کر آپ دکانوں کی لائن کے ختم پر چوراہے کے قریب شمال رخ کھڑے ہو جایئے آپ کے دائیں ہاتھ پر دکانوں کی لائن ختم ہو گئی اور سرے پر ایک چھوٹی سی

مسجد ہے جسکو بیلوں والی مسجد کہتے ہیں اس
کے برابر سے دریا گنج کو سڑک چلی گئی ہے۔
اب پھر بائیں ہاتھ کی طرف دیکھیے۔ آپ کے
سامنے ایک کشادہ سا چوک ہے۔ اسی کے
کونے پر آدمیوں کے چلنے کے لیے سڑک
کے اوپر ایک پل شرقاً غرباً حال ہی میں بنایا گیا
ہے اس چوک کے جانب غرب ڈاکٹر
بھنڈاری کی بلڈنگ ہے اور جنوب مغربی
گوشے میں ایک سیدھی گلی ہے جو بیلوں والی
مسجد کی پشت کے بالکل محاذ میں ہے۔ اس گلی کا
نام گلی ڈیوڑھ ہے۔ یہ پہلے سیدھی پٹودی ہاؤس
والی سڑک پر نکلتی تھی جسکو نقار خانہ کی سڑک
کہتے تھے اب جو زنانہ وکٹوریہ ہسپتال کے پیچھے
سے ادھر سڑک گئی ہے یہ غدر سے پہلے نہیں
تھی۔ ایڈورڈ پارک اور ہسپتال کے بیچ والی
سڑک بھی انگریزوں نے غدر کے بعد نکالی
ہے۔ نقشہ میں مسجد اکبر آبادی عین اسی جگہ
دکھائی گئی ہے جہاں یہ چوک کشادہ واقع ہے
اس چوک کا شمالی ضلع سڑک کی وجہ سے کٹ
بھی گیا ہے اس مسجد کا مغربی ضلع مسجد نواب
پٹودی سے بخط مستقیم تقریباً پانچ سو فٹ کے
فاصلہ پر ہے۔ مسجد اکبر آبادی بیگم کے پاس
کشمیری کٹرہ تھا۔ مرزا غالب نے اسی مناسبت
سے اس کو کشمیری کٹرہ کی مسجد لکھا ہے۔
(مقدمہ اردو مصدر نامہ ص ۱۶)
"شہر مینو سواد یعنی شاہجہاں آباد" کو بدل کر
مولف کے شہر یعنی جہاں آباد کرنے کی وجہ
میں نہیں سمجھ سکا۔ جامع مسجد دہلی کے ذکر
میں کئی باتیں محل نظر ہیں لیکن یہاں چند کی
نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے، لکھتے ہیں
حوض کے مغرب میں ایک نہایت
خوبصورت و حسین مکبّر ہے۔ یہ مکبّر شاہزادہ
سلیم بن معین الدین محمد اکبر شاہ نے
۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء میں تعمیر کرایا تھا۔
یہ مکبر سنگ باسی کا بنا ہوا ہے اور نہایت ہی
خوبصورت ہے آج بھی اس مکبّر سے تکبیر کہی
جاتی ہے۔ (صف ۲۰۸)
متذکرہ بالا سنگ باسی کا مکبّر اس وقت حوض
کے مشرقی ضلع سے ملحق نصب ہے۔
مکبّر سے اب تکبیر کہی جاتی ہے وہ مسجد کی
درمیانی عظیم الشان محراب کے
سنگ مرمر کا بنا ہے اس پر درج ذیل
کندہ ہے مکبر ہذا پیش کردہ چودہری ش
خاں عفی عنہ رئیس گوہانہ ضلع
(پنجاب) م ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۸ء"
چونکہ یہ ۱۹۲۸ء میں نصب کیا گیا ہے اس
لیے تاریخ کی کسی کتاب میں اسکا ذکر نہیں
ہے سب کتابیں اس سے پہلے کی تصنیف شدہ
ہیں۔ آج کے مورخ کا فرض ہے کہ اس وقت
کی کیفیت بیان کی جائے اگر زیر بحث کتاب
کے فاضل مرتب ایک مرتبہ خود جامع مسجد
ہو آئے اور پھر موجودہ کیفیت مسجد کی لکھتے۔
کتاب کی تاریخی حیثیت اور وقیع اور کارآمد
ہو جاتی اور گذشتہ مصنفوں کی کتابوں میں جو

غیر صحیح باتیں راہ پاگئی ہیں وہ دور ہو جائیں۔
یوں تحقیق اور تاریخ نویسی کا کچھ حق بھی ادا
ہوتا۔ اسی طرح جامع مسجد کے تین بڑے
گنبدوں کے بارے میں واقعات دار الحکومت
،، کی عبارت نقل کردی گئی ہے کہ "جن پر
ایک ایک پٹی سنگ موسیٰ کی اور ایک ایک
سنگ سرخ کی پڑی ہوئی ہے۔ (صفحہ ۲۸)
ہمیں تو ہمیشہ سے یہ گنبد سنگ مرمر کے منظر
آتے ہیں جن پر سنگ موسیٰ کی پٹیاں پڑی
ہوئی ہیں اور سر سید نے بھی لکھا ہے کہ گنبد
اور برجیاں سب سنگ مرمر کی ہیں۔ صحن
سے خاص مسجد میں داخل ہونے کے لیے
سامنے کی طرف تین جگہ سیڑھیاں بنی ہوئی
ہیں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ تینوں
سیڑھیاں سنگ مرمر کی بنی ہوئی (ص ۲۱۳
جبکہ یہ تینوں بھی اور دائیں بائیں جانب بھی
چار جگہ سیڑھیاں سنگ سرخ کی ہیں۔
مدرسہ امینیہ دہلی کی مسجد لطف اللہ خان
صادق کی روکار کی محراب پر مولانا حفیظ
الرحمان واصفؒ کے فارسی میں کچھ اشعار کندہ
ہیں۔

این مسجد مقدس این بیت رب اکبر
تعمیرش از سر نوشد دل پسند و خوشتر
دار العلوم یعنی گردش مثال ہالہ
وین سجدہ گہ درونش مثل مہ منور
در عہد اہتمام آں صاحب معالی
کز نکہت علومش ہندوستاں معطر
علامۂ یگانہ مفتی کفایت اللہ
عزمش ہمہ مبارک سعیش ہمہ مظفر
جمعے ز اہل ایماں کردہ مساعیتہا
صد گونہ احتسابا در بذل ہمت و زر
گر بعد سیزدہ صد پنجاہ و سہ ز ہجرت
گیری رسی بسال این معبد مطہر
(زرگال ۱۸ے) اس تاریخی قطعہ کو دلی کی
تاریخی مساجد میں ۲۱۰ پر جس بالغ نظری
سے نقل کیا گیا ہے دیکھ کر حیرت ہوتی
ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

این مسجد مقدس این بیت رب اکبر
وین سجدہ گہ درونش مثل مہ منور
علامۂ یگانہ مفتی کفایت اللہ
صد گونہ احتسابا در بذل ہمت و زر
تعمیرش از سر نوشد دل پسند و خوشتر
در عہد اہتمام آں صاحب معالی
عزمش ہمہ مبارک سعیش ہمہ مظفر
گر بعد سیزدہ صد پنجاہ و سہ ز ہجرت
دار العلوم یعنی گردش مثال ہالہ
کز نکہت علومش ہندوستاں معطر
جمعے از اہل ایماں کردہ مساعیتہا
گیری رسی بسال این معبد مطہر

کتاب کی سرسری ورق گردانی کرنے پر یہ غیر
محتاط اور غیر ذمہ دارانہ مقامات سامنے آئے
ہیں اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اور بھی کچھ
سامنے آجائے۔
بقول تبصرہ نگار فاضل مرتب کی سادہ و شگفتہ

بڑی اچھی اور ادبی حیثیت سے اہم زبان کے
بارہ میں صرف اتنا کہوں گا کہ مولانا محمد ولی
رحمانی صاحب کی تعارفی تحریر اس کتاب میں
نقش سنگ" کے عنوان سے شامل ہے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار صاحب نے اس
کی فصیح و مرصع زبان سے لطف اندوز ہو کر
اسکی خصوصیات کا اطلاق پوری کتاب کی زبان
پر کر دیا ہے۔ کتاب کی کتابت اچھی ہے لیکن
تصحیح کا اہتمام کیا جاتا تو " رضائی "
کا "رضائی" شاید نہ بنتا اور مندرجہ بالا قطعہ کا
بھی خون ناحق نہ ہوتا۔

☆ م۔ ق۔ سلیم (ایم اے۔ پی، ایڈ لکچرار
اردو ۔ سائبان ۴۶۹-۲-۱۶ بیرون فتح
دروازہ، حیدر آباد)

کتاب نما اگست ۹۶ء باصرہ نواز ہوا۔ جناب
قیصر شمیم کا مضمون مسودہ کیسے تیار کریں
معلوماتی ہے۔ بڑی محنت کے ساتھ انھوں
نے ان تمام امور پر روشنی ڈالی ہے جو اکثر
ادیبوں اور شاعروں کے اپنے مسودوں میں
ہوتی ہے خاص طور پر اس انداز میں مسودہ تیار
کیا جائے تو تو غلطیوں کا احتمال کم ہوگا اور
ناشر وغیرہ اس کو صحیح طریقے پر ترتیب دے
سکے گا۔ یہ ان ریسرچ اسکالروں کے لیے بھی
مشعل راہ ہے جو ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے
اپنے مقالے تیار کر رہے ہیں۔ اقبال پر ایک
سلسلہ چل نکلا ہے اور یقیناً اقبال دیر سے آتا
ہے مگر آتا ضرور ہے آپ اقبال پر جو نظریاتی
تنقیدیں ہو رہی ہیں اس کو یکجا کر کے شائع
کریں تاکہ اقبالیات میں پہلے سے زیادہ ان
تحریروں کی اہمیت ہوگی۔ اس لیے کسی شاعر
نے کہا ہے۔

وقت کو جو بدل دے وہ ہے انسان عظیم
وقت کے ساتھ بدلنا کوئی کردار نہیں

آج کا ادیب اور شاعر وقت کو بدلنے کی سعی
کر رہا ہے اور جو اس سعی مسلسل میں ناکام ہے
وہ وقت کے ساتھ بدل رہا ہے ہماری جامعات
اس بات کی مظہر ہیں کام کسی نوعیت کا ہی
کیوں نہ ہو اس میں تحقیق کے ساتھ تنقیدی
پہلو بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ماہر
اقبالیات خاموش ہیں۔ آخر کیوں؟ احمد ہاتف
کی "فارسی کی ترجیع بند کا منظوم اردو ترجمہ"
سید بشارت علی نے بڑی خوبصورتی سے کیا
ہے عنوان "فارسی کی ترجیع بند کا منظوم اردو
ترجمہ' میں کی اضافت لگتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل
احمد کا مضمون تضمین نگاری کی روایت پڑھنے
لائق ہے۔

☆ بھگوان داس اعجاز۔ ٹی ۴۵۱ بلجیت نگر نئی
دہلی ۸

کتاب نما کا اگست شمارہ موصول ہوا جس کے
چند صفحات میں نے سنجیدگی سے پڑھے ڈاک
عبد المغنی کا کلام اقبال کی آفاقیت" معلوماتی
دل چسپ لگا۔ کئی شعروں نے تو من موہ
خصوصاً اگست ماہ میں ان کا ہندی ترانہ سار
جہاں سے اچھا ۔۔۔ بھارت کے گو۔

لوشے میں گنگنایا جاتا ہے۔ آپ بھی اگست شمارہ کو اگر آزادی نمبر کا نام دیتے تو میری ناقص رائے ہیں اور بہتر ہوتا۔ مضامین تو اور بھی لائق مطالعہ ہیں جیسے قیصر شمیم کا مسودہ کیسے تیار کریں اور ڈاکٹر عقیل احمد کا تضمین نگاری کی روایت وغیرہ غزلیات میں سہیل احمد زیدی کی غزل کا رنگ الگ نظر آیا، باقی غزلوں کے چند شعر پسند آئے۔ نظمیں بھی اچھی لگیں اور جناب زبیر رضوی صاحب کا اشاریہ بھی شاہد میر کے دوھے پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ چھے میں سے چار دوھے خارج، از بحر ہیں اور ان کے مصرعے بھی کوئی معنوی تعلق نہیں رکھتے۔ شاہد میر صاحب چاہیں تو میں اس موضوع پر ان سے بات کرنے کو تیار ہوں۔

☆صبوحی سہیل الہی باغ۔ نیو کالونی گورکھپور

اگست کا شمارہ ملا آپ نے مختلف موضوعات پہ بہت اچھے مضامیں کا انتخاب کیا ہے۔ شعری تخلیقات کا معیار بھی بلند ہے لیکن سب سے زیادہ خامہ بگوش پسند آئے ان کی تحریروں میں غضب کا تیکھا پن ہوتا ہے۔ ساقی فاروقی پہ تبصرے میں ان کے قلم کی جولانیاں اپنے پورے شباب پہ نظر آتی ہیں۔ انداز بیان بڑا ہی پیارا مگر طنز سے بھرپور ہے۔

☆سید فیاض الرحمٰن شارق۔ پٹنہ

کتاب نما ماہ ستمبر ۹۶ موصول ہوا گذشتہ شمارے ملتے رہتے ہیں۔ کتاب نما ستمبر میں نظم و نثر کے دونوں حصے خوب ہیں۔ مہمان مدیر شرون کمار ورما کا اداریہ کہانی کیوں اور کیسے "خاصے کی چیز ہے ان کے افسانوی لب و لہجہ نے اداریہ کو بہت دلکش بنا دیا۔ مانگے کا اجالا " تو قاری کا پسندیدہ صفحہ رہا ہے او آیندہ بھی رہے گا۔

ڈاکٹر قیصر شمیم کی تحریر آگ بجھی نہیں " غور و فکر کے دروازے کھولی رہی ہے ڈاکٹر محمد نعمان کی بھوپال میں اردو ترجمے کی روایت حقائق کی اچھی ترجمانی ہے رفعت صدیقی کی یہ کیسی مسیحائی " حقیقیت پر مبنی ہے لیکن قدرے تلخ ہے۔

غزلوں میں اختر سعید خاں، قیوم خفر، ظفر حمیدی زیادہ پسند آئے ڈاکٹر نفیس تقی کی غزل کے تیسرے شعر کے مصرع اولایں شب خوں کے نون کا اعلان ہے اس اعلان سے شعر میں صوتی قباحت پیدا ہوگئی ہے پھر بھی غزل پیاری ہے۔

"کھلے خطوط میں ڈاکٹر ابن فرید صاحب کا خط مختصر ہوتا تو بھی سوانیزے پہ آیا ہوا آفتاب ہوتا۔

محسن زیدی صاحب کی تین اشعار والی غزل چھے اشعار میں پھیل کر پیاری سی لگتی ہے۔

☆ڈاکٹر محمد علی اثر (ایم، اے، پی ایچ، ڈی)
۲۰۔۴۔۶۲۲،۹ چوک حیدر آباد)

ستمبر کے کتاب نما میں محترم محسن بھوپالی کا خط شائع ہوا ہے (ص ۸۶) چوں کہ اس خط میں

بنام علیم صبانویدی کے مرتب کی حیثیت سے راقم الحروف کا نام لیا گیا ہے۔ اور مذکورہ کتاب میں راہ پانے والی فروگذاشتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اس لیے میں چند سطور وضاحت کے طور پر تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عرض یہ ہے کہ "بنام علیم صبانویدی میں نے حیدر آباد میں بیٹھ کر مرتب کی ہے اور جناب علیم صبانویدی صاحب نے اس کتاب کو ازراہ نوازش تمل ناڈو اردو پبلیکیشنز مدراس سے شائع کیا ہے اس لیے چھپنے سے پہلے مجھے اس کی پروف آخری شکل دیکھنے یا ریڈنگ کرنے کا موقع نہیں مل سکا مقدمہ کے علاوہ مکتوب نگاروں کے سوانحی اشارے بھی میں نے تحریر کیے ہیں لیکن چند مرحوم اور بیرون ہند سے متعلق مکتوب نگاروں کے سوانحی کوائف سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے ان کے نام کے آگے تفصیلی حالات دستیاب نہ ہو سکے تحریر کر دیا تھا" انھیں مکتوب نگاروں میں محسن بھوپالی صاحب کے علاوہ قیوم راہی، احمد ہمیش، کرامت بخاری، کمال مدراسی، ایس ایم حیات، دانش فرازی، راحی صدیقی کے نام شامل ہیں۔ ان مکتوب نگاروں کے تعلق سے جو کچھ سوانحی کوائف شائع ہوئے ہیں وہ خود مکتوب الیہ (جناب علیم صبانویدی صاحب) کے تحریر کردہ ہیں۔ میں جناب محسن بھوپالی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کتاب نما کی ستمبر ۹۶ء کی اشاعت میں اپنے خطوط کے ذریعے میری مرتبہ کتاب میں پائی جانے والی لغزشوں کی اصلاح فرمائی۔

☆شاغل ادیب۔ مشیر آباد حیدر آباد ۴۸

اشاریہ میں مہمان مدیر شردن کمار ورمانے کہانی کار اور ان کے موضوعات پر کہانی کی ابتدا سے عصر حاضر تک اچھا جائزہ لیا ہے مضامین میں مظہر امام اور خالد عبادی کے مضامین ادب سماج ادیب اور اس کی ذمہ داریوں سے متعلقہ خوب بحث لیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں کا مضمون واقعات اقبال میں علامہ اقبال کی فکر اور شاعری کے مخفی گوشے واقعی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر قیصر شمیم نے آگ بجھتی نہیں ہے میں الیاس احمد گدی کے ناول فائر ایریا اور شوکت صدیقی کے افسانے غم دل اگر نہ ہوتا میں مرکزی کردار اور دیگر عناصر کی مماثلت کو اچھے انداز میں واضح کیا ہے۔

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات

ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں ۲۲ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۶۴ سے ۱۹۹۴ کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظرنامے میں جن تحریکات و تعبیرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے ان کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت : ۔/51 روپے

ادبی و تہذیبی خبریں

ڈاکٹر صادق کو ماروتی اعزاز

نئی دہلی۔ ۳ ستمبر۔ دہلی کے سماجی، ثقافتی اور ادبی آرگنائزیشن ماروتی کی طرف سے دلی ہاٹ کے اوپن ایر جلسہ گھر میں منعقدہ ایک شاندار تقریب میں معروف و ممتاز شاعر، ادیب اور مصور ڈاکٹر صادق کو ان کی ادبی اور ثقافتی خدمات کے لیے ماروتی اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز حاصل کرنے والی دوسری شخصیتوں میں محترمہ ملا دتوانی، محترمہ کانتا کتھوریا، محترمہ سشما سوراج، ڈاکٹر موتی لال جوتوانی، محترمہ سمن دیوگن اور کلدیپ من سکھانی شامل ہیں۔

سندھی اکادمی اور ماروتی کی ست رنگی تقریب میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر صادق نے ہندستانی ادبیات سے اپنی گہری دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے سندھی زبان و ادب سے اردو کی لسانی اور ثقافتی رشتے پر روشنی ڈالی اور ماروتی کی روح رواں محترمہ وینا شرنگی کی خدمات کو سراہا۔

قاضی حسن رضا کو مثالی مدرس کا نیشنل ایوارڈ

کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) کے معروف ترین شاعر و ادیب اور جواہر ہائی اسکول کے پرنسپل قاضی حسن رضا کو ان کی علمی، ادبی، تعلیمی، سماجی اور ملی خدمات کے پیش نظر راشٹرپتی شنکر دیال شرما کے ہاتھوں ۵ ستمبر ۹۶ کو نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مدھیہ پردیش سے قاضی حسن رضا تاحال پہلے مسلم ٹیچر ہیں جنھیں قومی پیمانے کے اس اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ اس پروقار اعزاز کی حصولیابی پر رضا صاحب کو ہر طرف داد و تحسین سے نوازنے کے ساتھ ساتھ "حق بہ حقدار رسید" کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

۔شیخ موسیٰ ایم۔اے، بی۔ایڈ کھنڈوہ

زہرہ خاتون کو فارسی میں پی ایچ ڈی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شعبۂ فارسی کی ریسرچ اسکالر زہرہ خاتون کو ان کے تحقیقی مقالے پر فارسی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ ڈاکٹر زہرہ کے مقالے کا عنوان ہے "اودھ کے فارسی شعرا۔ ۱۷۲۱ تا ۱۸۵۷ء" انھوں نے ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی کے زیر نگرانی اپنی تحقیق مکمل کی۔

حلقۂ فکر و فن دہلی کا ایک اہم مذاکرہ

پروفیسر ظفر احمد نظامی کی صدارت اور عطا عابدی کی نظامت میں مورخہ ۶ جون ۹۶ء کو اکیڈمک اسٹاف کالج میں حلقۂ فکر و فن دہلی کے زیر اہتمام اردو تعلیم کے مسائل پر ایک اہم

مذاکرہ اور شعری نشست ڈاکٹر محبوب راہی (آکولہ، مہاراشٹر) اور قاضی حسن رضا (کھنڈوہ ایم.پی) کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ واضح ہو کہ قاضی حسن رضا کو "مثالی معلم" ہونے کا صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے "یوم اساتذہ" کے موقع پر ۵ ستمبر کو ایوارڈ ملا ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی بھی چند سال قبل یہ ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ لہٰذا حاضرین کی جانب سے سب سے پہلے اس ایوارڈ کے لیے انھیں مبارک باد پیش کی گئی۔ بعد ازیں مذاکرہ میں حصّہ لیتے ہوئے قاضی حسن رضا نے بتایا کہ اردو تعلیم کے تعلق سے اردو اساتذہ اور ادبا خود ایک مسئلہ ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو اردو سے نابلد رکھ رہے ہیں۔ جہاں یہ حالت ہو وہاں اردو کی کتابیں کل کون پڑھے گا؟ ڈاکٹر محبوب راہی کا خیال تھا کہ بنیادی مسئلہ معیار کا ہے۔ اردو اسکولوں کے پست معیار کی وجہ سے اپنے بچوں کا داخلہ لوگ وہاں پسند نہیں کرتے۔ ایک اہم اور بڑا مسئلہ ان کی نظر میں ٹیچر بھی ہیں جو اپنے سبجیکٹ میں محنت نہیں کرتے۔ اردو کے ٹیچر رسالہ نہیں خریدتے وہی لوگ رسالہ خریدتے ہیں جو چھپتے بھی ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی طویل تقریر میں اردو تعلیم کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان کی زندگی اور اس کے قتل کیے جانے کے عوامل پر روشنی ڈالی۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو والے اردو کے دشمن نہیں ہیں۔

پروفیسر اختر الواسع نے پروفیسر عنوان چشتی کی اس بات کو اگرچہ تسلیم کیا کہ اردو والے اردو کے دشمن نہیں ہیں لیکن ان کا رویہ اردو کے ساتھ بہت زیادہ دوستانہ بھی نہیں ہے۔ ہم عملی سطح پر اردو دوستی والا رویہ اختیار نہیں کر رہے ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے اپنی تقریر میں یہ سوال کیا کہ اردو کے مسئلے پر ہم حکومت ہی کی طرف کیوں دیکھتے ہیں؟ خود اپنے گھر سے کام شروع کیوں نہیں کرتے؟ اس سے ہمیں کس نے روکا ہے؟ ہم اگر ایک آدمی کو بھی ایک ماہ میں یا ایک سال میں اردو سکھلانے یا اس کی سہولت پیدا کرنے کی ذمّے داری لیں تو مسئلہ کا بہت حد تک تدارک ہو سکتا ہے۔ حفیظ محمود بلند شہری نے مقررین کی باتوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہر کام میں نیت کا معاملہ بہت ضروری ہے۔ بغیر خلوص کے کچھ نہیں ہوگا۔

شعری نشست میں مختلف شعرا نے اپنے اپنے کلام سے نوازا۔ ان شعرا میں مہمان شعرا قاضی حسن رضا، اور ڈاکٹر محبوب راہی کے علاوہ پروفیسر عنوان چشتی، یوسف پاپا، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شبیر رسول، عزیز بگھروی، سطوت رسول، شہباز ندیم ضیائی، عطا عابدی، پروفیسر تنویر چشتی، اسرار جامعی، حفیظ محمود، راشد انور راشد، عادل حیات، سرور الہدیٰ سکندر عاقل کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس مذاکرہ و نشست میں ڈراما نگار

[illegible] عالم
اسپورٹس راشٹر انجینیر فیروز احمد، شفیق الاسلام
[illegible]ی و دیگر کئی اہل ذوق حضرات اس
مذاکرہ و نشست میں شریک رہے۔ حفیظ
محمود بلند شہری نے سبھی شرکاء کا شکریہ ادا
کیا اور صدر کی اجازت سے یہ تقریب اپنے
اختتام کو پہنچی۔

عروج زیدی حیات اور کارنامے

رام پور (بذریعہ ڈاک) عروج الکلام حضرت عروج زیدی بدایونی (مرحوم) پر تحقیق کام ہریش چندر پوسٹ گریجویٹ کالج کی لیکچرار محترمہ صفیہ حمید کر رہی ہیں۔ یہ مقالہ شعبہ کے صدر ڈاکٹر صابر سنبھلی کی نگرانی میں تیار ہو رہا ہے۔ علی عرفان زیدی بدایونی کی مرحوم کے مداحوں سے گزارش ہے کہ ان کے پاس جو بھی مواد ہو اس کی زیراکس کاپیاں رجسٹرڈ ڈاک سے ان کے پتے پر ارسال کر دیں۔ رجسٹری ملنے پر رجسٹری اور زیراکس کے اخراجات فوراً منی آرڈر سے ارسال کر دیے جائیں گے۔ اصل مواد کی نقل کر کے اس کو شکریہ کے ساتھ رجسٹرڈ ڈاک سے واپس کر دیا جائے گا۔ اخراجات کا تخمینہ ارسال کرنے پر پیشگی منی آرڈر کر دیا جائے گا۔

پتا: علی عرفان زیدی بدایونی، ممبر آل انڈیا ریڈیو، صدر عروج زیدی، لائبریری، حضرت عروج زیدی روڈ، رام پور (یوپی) ۲۴۴۹۰۱

اردو مزاح نگار دلیپ سنگھ کے انتقال پر

ہریانہ اردو اکادمی میں تعزیتی جلسہ

اردو حلقوں کے لیے یہ خبر بہت افسوس ناک ہے کہ اردو کے مقبول مزاح نگار اور ادیب دلیپ سنگھ ۸ راگست ۹۶ء کو ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کی عمر تقریباً ۴۲ برس تھی۔

دلیپ سنگھ کے سانحہ ارتحال پر ہریانہ اردو اکادمی میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں ان کے انتقال پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اکادمی کے جنرل جناب کشمیری لال ذاکر نے دلیپ سنگھ سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان جیسی باغ و بہار شخصیت کے لوگ دنیا میں مدتوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے صرف اپنے قلم سے ہی مزاح کے گل بوٹے نہیں کھلائے بلکہ مزاح ان کے مزاج میں رچا بسا ہوا تھا۔ اکادمی کے اڈیٹر شمس تبریزی نے دلیپ سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب ایوارڈ اور اردو اکاڈمی دہلی کے مختلف ایوارڈوں کے علاوہ حال ہی میں دلیپ سنگھ کو پنجاب حکومت کی طرف سے ان کے ناول "دل دریا" پر بھی ایوارڈ دیا گیا۔ دلیپ سنگھ کے انتقالِ پرملال پر ان کی روح کی تسکین کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔

ناہیدہ نسرین کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

ناہیدہ نسرین صاحبہ، بیجیلی چک نیا ٹولہ حبیب پور بھاگلپور، تلکا مانجھی بھاگلپور یونیورسٹی نے ان کے مقالے "ہندستان کی تحریک آزادی میں جوش ملیح آبادی کی شاعری کا حصہ"، ۱۴ اگست ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا کی ہے۔

یہ مقالہ ڈاکٹر قمر جہاں پروفیسر شعبۂ اردو سندر وتی مہیلا کالج کی نگرانی میں لکھا گیا ہے اس کے ممتحن ڈاکٹر اختر بستوی پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی اور ڈاکٹر علیم اللہ حالی پروفیسر اور پروکٹر مگدھ یونیورسٹی تھے۔

انجمن کے وفد کی آئی کے گجرال سے ملاقات

انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی قیادت میں انجمن کا ایک وفد مرکزی وزیر خارجہ جناب آئی کے گجرال سے ملا اور انھیں گجرال کمیٹی کے سلسلے میں ایک میمورنڈم پیش کیا۔

میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ اگر گجرال کمیٹی کی تمام سفارشات کو ایک ساتھ نافذ کرنا مشکل ہے تو انھیں تین مدارج میں نافذ کرنا چاہیے۔ اس میمورنڈم میں ان سفارشات کی نشاندہی کی گئی ہے جنھیں پہلے مرحلے میں نافذ کرنا ضروری ہے۔ یہ تمام سفارشیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بارے میں ہیں۔ اس وفد میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم کے علاوہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، شہباز حسین، ڈاکٹر اسلم پرویز اور ایم حبیب خاں صاحبان شامل تھے۔

گجرال صاحب نے میمورنڈم پڑھ کر وفد سے کہا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) مختلف ریاستوں میں اردو کی حالت کا سروے کرائے اور مجھے دو دو، تین تین ریاستوں کی رپورٹ بھیجے تاکہ میں ان ریاستوں میں گجرال کمیشن کی سفارشات کو نافذ کرانے کی کوشش کروں۔ انھوں نے وفد کو یقین دلایا کہ حکومت چاہتی ہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات کو نافذ کرے لیکن اس کے لیے ہمیں انجمن ترقی اردو (ہند) جیسے اداروں کے تعاون کی ضرورت ہے۔

وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ

پروفیسر بشیر الدین احمد کا انتقال

نئی دہلی۔ ۷ ستمبر، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر بشیر الدین احمد کا آج صبح دہلی میں قلب پر حملہ کے باعث انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ خاندان کے ذرائع نے بتایا کہ پروفیسر بشیر الدین احمد کے سینہ میں تکلیف کی شکایت کے بعد قریبی ہاسپٹل لے جایا جا رہا تھا کہ ان کی روح راستہ میں ہی قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ پروفیسر احمد سابق رکن پارلیمنٹ

جناب رشید الدین خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے ان کے پسماندگان میں شریک حیات شامل ہے جو اس وقت امریکا میں ہیں۔ پروفیسر احمد نے وائس چانسلر جامعہ ملیہ کا عہدہ فروری ۱۹۹۲ء میں سنبھالا تھا اور ان کی پانچ سالہ میعاد آئندہ سال ختم ہونے والی تھی۔ وزیر فروغ انسانی وسائل مسٹر ایس آر بومئی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ ان کے انتقال سے ملک ایک ٹیچر اور فلسفی سے محروم ہو گیا جنھوں نے تعلیم کے شعبہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ سیاست نیوز کے مطابق خاندان کے ذرائع نے بتایا کہ ان کی تدفین آج شام نئی دہلی میں عمل میں آئے گی۔

پروفیسر بشیر الدین احمد اکبر یار جنگ کے تیسرے فرزند تھے۔ گرامر اسکول میں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نظام کالج سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ وہ نظام کالج کے ذہین طلبہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ورنگل کالج میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات کا آغاز کیا۔ اس کے بعد سیف آباد کالج اور پھر نظام کالج میں خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد دہلی روانہ ہو گئے۔ ۱۹۹۲ء سے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز تھے۔

اردو کتابوں کے نیک نام تاجر

عبدالاحد عثمانی کا انتقال

عثمانیہ بک ڈپو کلکتے کے بانی، اردو کتابوں کے پورے ہندستان کے تاجرانِ کتب میں اپنی ایمانداری کے لیے مشہور جناب عبدالاحد عثمانی ۲۴ جولائی ۹۶ء کو اپنے محبوبِ حقیقی سے جا ملے۔ ادارہ مکتبہ جامعہ، ماہنامہ کتاب نما ماہنامہ پیام تعلیم عثمانی صاحب کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور موصوف کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

خلیق انجم اور بشیر بدر کل ہند اعزازات سے سرفراز

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ۹۶-۱۹۹۵ء کے اعزازات کا اعلان

مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے ۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے اپنے کل ہند اور صوبائی اعزازات کا اعلان کر دیا ہے۔ ان میں تخلیقی ادب، تحقیق و تنقید، درس و تدریس اور صحافت کے اعزازات شامل ہیں۔

۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے صحافت کا کل ہند حکیم سید قمر الحسن اعزاز ہفت روزہ "ہماری زبان" کے مدیر ڈاکٹر خلیق انجم کو اور تخلیقی ادب کا کل ہند میر تقی میر اعزاز ڈاکٹر بشیر بدر کو پیش کیا جائے گا۔

دیگر اعزاز یافتگان میں ڈاکٹر شفیقہ فرحت بھوپال (محمد یوسف قیصر اعزاز) جناب رفعت الحسینی بھوپال۔ (سراج میر خاں سحر اعزاز) ڈاکٹر ممتاز شمیم

اندور (نواب صدیق حسن خاں اعزاز) ڈاکٹر عزیز اندوری (مہاجدردی اعزاز) شامل ہیں۔ ان اعزازات کا اعلان کرتے ہوئے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے بتایا کہ کل ہند اعزازات میں گیارہ ہزار روپے نذرانہ کے ساتھ سند توصیف اور پلیک دیا جاتا ہے جبکہ صوبائی اعزازات میں سند توصیف اور پلیک کے ساتھ سات ہزار روپے نذر کیے جاتے ہیں۔

تین صوبائی اعزازات بالترتیب ڈاکٹر قدسیہ اختر (بھوپال)، قاری ہادی حسن (سرونج) جناب دیوی سرن (بھوپال) کو دیے گئے ہیں۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کی وزیراعظم سے ملاقات

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس گلڈ کے ایک نمایندہ وفد نے آج ملک کے وزیراعظم جناب ایچ ڈی دیوگوڑا سے ملاقات کرکے اردو زبان صحافت اور اقلیتوں کے سلگتے مسائل کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ اس موقع پر وزیراعظم نے تسلیم کیا کہ ملک میں اب تک اقلیتوں کو وہ کچھ نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ اس کا ازالہ کیا جائے۔ اقلیتوں کو ہم ووٹ بنک کی نظر سے نہیں دیکھتے جیسا کہ اب تک سیاسی جماعتوں کا نقطۂ نظر رہا ہے۔ انھوں نے عندیہ دیا کہ یوپی الیکشن کے نتائج ملک کے مستقبل پر بہت اثر انداز ہوں گے۔

وزیراعظم نے اردو صحافت کے وسیلے سے اقلیتوں کو جذباتی امور سے پرہیز کرکے اپنی تعمیر و ترقی پر توجہ دینے کا مشورہ دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ اردو اخبارات مل بیٹھ کر مستقبل کی حکمت عملی طے کریں گے اور ملک کی تعمیر میں اپنا رول ادا کریں گے۔ اقلیتوں کے مسائل خاص کر سرکاری ملازمتوں کے بارے میں وزیراعظم نے کہا کہ حکومت اس سلسلے میں کافی کچھ کرنے کی خواہاں ہے۔ انھوں نے کرناٹک میں اقلیتی مالی کارپوریشن کے ذریعے ۱۰ کروڑ کے سرمایے سے ۲۰ ہزار مسلمانوں کو مستفید کرنے کی بھی بات کہی اور کرناٹک میں ہی جس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل جل کر ہبلی کی عیدگاہ کا مسئلہ باہمی طور پر حل کیا وہ ایک روشن مثال ہے اور اسی طرح کی آپسی رواداری کا جذبہ ہر جگہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

وفد نے جو وزیراعظم سے گلڈ کے جنرل سکریٹری اسرار سلطانپوری کی قیادت میں ملا۔ اس موقع پر ایک ۸ نکاتی میمورنڈم بھی پیش کیا جن میں سے بیشتر باتوں کو وزیراعظم نے اپنی منظوری دے دی۔ انھوں نے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو جلد از جلد لاگو کرنے قومی یک جہتی کونسل میں اردو اخبارات کو نمایندگی اور دوسری وزارتوں جیسے شہری ہوا بازی۔ اطلاعات و نشریات۔ ریلوے وغیرہ سے

تجزیے اردو صحافت کے مسائل پر غور و خوض کرنے کا یقین دلایا۔ اس نمایندہ وفد میں گلڈ کی صدر نشین محترمہ ریحانہ فاروقی صاحبہ کے علاوہ مندرجہ ذیل معزز ممبران بھی شامل تھے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی (منادی دہلی) جناب محمد وسیم الحق (اخبار مشرق کلکتہ) ارشد علی فہمی (دین دنیا دہلی) رئیس مرزا (عکاس کلکتہ) عارف عزیز (ندیم بھوپال) اقبال مسعود (آفتاب جدید بھوپال) عارف جمال (قطب میل دہلی) اور فدا علی فوٹو گرافر جرنلسٹ۔ وزیر اعظم نے ملک کے اردو صحافیوں کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔

مطبوعات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشا

قلم اور قدم — سید حامد — ۷۵/-

مستقبل کی طرف (خطبات جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ: خواجہ محمد شاہد / خالد کمال فاروقی — ۱۵۰/-

مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و نظر کی چند جہتیں۔
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۶۰/-

جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین — ۶۰/-

صحرا میں لفظ — فضیل جعفری — ۹۰/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر مومن محی الدین — ۱۵۰/-

ٹیلی ویژن نشریات۔ تاریخ۔ تحریر۔ تکنیک۔ انجم عثمانی — ۹۰/-

انشائے غالب — مرتبہ: رشید حسن خاں — ۶۰/-

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف — ۴۵/-

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید جلال الدین — ۱۵۰/-

انداز گفتگو کیا ہے — شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-

دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا — ۶۵/-

سرسید یادگاری خطبات۔ مونس رضا / مسعود حسین خاں — ۲۰/-

تفہیم — رشید حسن خاں — ۷۵/-

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی — ۷۵/-

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — نقی حسین جعفری — ۱۵۰/-

شناس و شناخت — انور صدیقی — ۶۰/-

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم — ۱۰/-

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم۔ اختر الواسع — ۱۰/-

آزمائش کی گھڑی — سید حامد (زیر طبع)

گوری اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام — ۷۹/-

جام جہاں نما — گربچن چندن — ۷۹/-

اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر — ۴۹/-

اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ کبیر — ۷۹/-

تاثر نہ کہ تنقید — صدیق الرحمٰن قدوائی — ۵۱/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود — ۶۶/-

تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — ۵۱/-

انشائیہ کے خدوخال — وزیر آغا — ۳۵/-

افکار اقبال — عبدالسلام خاں — ۱۲۵/-

تذکرۂ ماہ و سال — مالک رام — ۱۲۵/-

تحقیق نامہ — مشفق خواجہ — ۱۲۵/-

سحر کے پہلے اور بعد — سعید الظفر چغتائی — ۵۱/-

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی — ۱۵۰/-

قلندر بخش جرأت — جمیل جالبی — ۱۰/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی — ۳۶/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری — ۲۷/-

مولانا آزاد کا ذہنی سفر — ظ انصاری — ۳۳/-

تنقید اور جدید اردو تنقید — ڈاکٹر وزیر آغا — ۶۰/-

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں — مالک رام — ۵۱/-

لسان الصدق — مولانا ابوالکلام آزاد — ۷۵/-

اردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی — ۴۸/-

تفہیم و تنقید — پروفیسر حامدی کاشمیری — ۴۸/-

نذر مختار — مرتبہ: مالک رام — ۱۰۱/-

تحقیقی مضامین — مالک رام — ۶۰/-

خسرو نامہ — مجیب رضوی — ۲۱/-

تحفۃ السرور — مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-

جائزے — مرتبہ: مظفر حنفی — ۴۵/-

نقد بجنوری — صدیقہ بیگم — ۲۵/-

ادبی سماجیات — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/-

الفاظ کا مزاج — غلام ربانی — ۲۴/-

اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	زیر طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۸/۵۰
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۴/-
" سوم	"	۲۲/-
" چہارم	"	۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیل نفسی کے پیچ وخم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۵/-
اثبات ونفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظارے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۴۲/-
فکر وریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۹/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۶/۵۰
مسالک ومنازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۹/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۲/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۲۲/-
تنقید کیا ہے	"	۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی	داور رہبر	۳۶/-
اردو اسیز	مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی	۲۷/-
[illegible]	[illegible]	۴/۵۰
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۵/-
دبستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	۴۲/-

تعلیم

مفکرینِ تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۱۲/-
قلم اور قدم	سید حامد	۷/۵۰
تعلیم وتعلم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۷/۵۰
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	۳/۵۰
ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵/-
مشقِ تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴/۵۰
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	۲۴/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-
تعلیم وتربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۵۸/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	۵/۷۵
ہم کیسے پڑھائیں۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۲/-
تعلیمی خطبات۔	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔	اختر الواسع	۴۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)۔	شکیل اختر فاروقی	۱۲/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۷/-
بنیادی استاد کے لیے۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۲/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۲/
بچوں کا آرٹ	عبید الحق	۲۴/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

مستقبل کی طرف (خطبات جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ: خواجہ محمود شاہد / خالد کمال فاروقی ۱۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو کشمیری لال ذاکر ۳۰/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی ۵۱/-
چند تصویر بتاں مولانا عبدالسلام قدوائی ۲۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب پروفیسر آل احمد سرور ۸/-
صاحب جی، سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں ڈاکٹر عابد حسین ۷۵/-
شہید جستجو۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷۵/-
مولانا آزاد کی کہانی۔ ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۸/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۵/-
حیات جامیؒ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
نقش ذاکر۔ مرتبہ عبدالحق خاں ۵۱/-
مانک رام ایک مطالعہ۔ مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ مرتبہ خلیق انجم ۳۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ مرتبہ انور صدیقی ۱۸/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹۰/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) صالحہ عابد حسین ۶۵/-
وحید شاعر اور شخص۔ مرتبہ یوسف ناظم ۲۵/-
غبار کارواں۔ بیگم انیس قدوائی ۲۶/-
فراق شخص و شاعر۔ مرتبہ: شمیم حنفی (زیر طبع)
حیات حافظ۔ اسلم جیراجپوری ۱۵/-
افکار رومی۔ مولانا عبدالسلام خاں ۴۰/-
بزم رفتگاں صباح الدین عبدالرحمٰن (زیر طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ پروفیسر ممتاز حسین (زیر طبع)

مکالمات افلاطون۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۳۶/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری شفیق افسانہ بیگم ۱۶/-
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند۔ ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیات اسماعیل، حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیس۔ سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۴/۵۰
حسرت کی شاعری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷/۵۰
گنجہائے گرانمایہ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۳۲/-
کیا خوب آدمی تھا۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/-
قدسیہ زیدی۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انشار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظوں میں۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
روسی ادب اول، دوم پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

طنزیات، مزاحیات

خامہ بگوش کے قلم سے مرتبہ: مظفر علی سید مجلد ۱۵۰/- غیر مجلد ۸۰/-
فی البدیہہ یوسف ناظم ۴۵/-
چہرہ در چہرہ مجتبیٰ حسین ۵۱/-
طنزیات و مضحکات، رشید احمد صدیقی ۶۰/-
گوشے میں قفس کے دلیپ سنگھ ۴۵/-
فی الحقیقت یوسف ناظم ۴۵/-

سور۔ یوسف ناظم ۳۰/-
گول مال۔ شفیقہ فرحت ۱۸/-
فی المال۔ یوسف ناظم ۱۸/-
رانگ نمبر۔ شفیقہ فرحت ۱۶/-
بالکلیات۔ یوسف ناظم ۱۸/-
برکت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۵/-
ذکرِ خیر۔ یوسف ناظم ۲۱/-
بے پر کی۔ حضرت آوارہ ۱۰/-
خنداں۔ رشید احمد صدیقی ۳۶/-
شگوفہ زار۔ خواجہ عبد الغفور ۱۴/-
دیوارِ قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-
آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی ۱۵/-

طب۔ ایلوپیتھی

اشارات قلب پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم ۶/:
مرضیات حکیم نعیم الدین زبیری ۵۱/:
اپنے دل کی حفاظت کیجیے۔ ترجمہ، نذیر الدین مینائی ۲۵/-
ذیابیطس۔ ڈاکٹر محمد شعیب اختر (زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل صغرا مہدی ۵۱/:
وسط ایشیا آصف جیلانی ۵۱/:
کولمبس کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۴۵/-
پشکن کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۲۵/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۱۸/-
باتیں لاہور کی۔ سوم آنند ۱۶/-
رہ نوردِ شوق۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۴/۵۰
یادوں کے سائے عتیق صدیقی ۱۲/-

شعری مجموعے

گاہے گاہے رولینڈ لارنس ۳۰/:
رنگ، خوشبو، روشنی قتیل شفائی ۸۰/:
طرازِ دوام اختر سعید خان ۵۱/:
کاسۂ خیال عبد المعروف خاں ۵۱/:
میں سمندر ہوں فرحان سالم ۲۰/:
اسرارِ خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
بانگِ درا اقبال ۱۳/-
بالِ جبریل اقبال ۸/-
ضربِ کلیم مع ارمغانِ حجاز 〃 ۸/-
خواب اور خلش آل احمد سرور ۴۹/-
غبارِ منزل غلام ربانی تاباں ۲۵/-
انیس ۳۴ غیر مطبوعہ مرثیے ۹۰/-
پرانی بات ہے۔ زبیر رضوی ۳۰/-
سازِ سخن۔ ادا جعفری ۴۵/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ، ادا جعفری ۷۵/-
دائروں میں پھیلی لکیر۔ کشور ناہید ۲۶/-
آنکھ میں سمندر۔ زاہد ڈار ۲۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ ندا فاضلی ۳۰/-
رات کے مسافر۔ مرتبہ انور سجاد ۲۸/-
گدازِ شب۔ معین احسن جذبی ۴۰/-
ایک خواب اور۔ علی سردار جعفری ۴۰/-
حرف حرف روشنی۔ حمایت علی شاعر ۲۵/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت ۲۶/-
دوہے۔ جمیل الدین عالی ۱۲/-
کلیاتِ عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام ۷۵/-
رادار۔ ساقی فاروقی ۲۶/-
پتھر کی زبان۔ فہمیدہ ریاض ۱۵/-

شام کا پہلا تارا۔ زہرا نگاہ ۲۶/-

مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۲۸/-

لہو پکارتا ہے۔ علی سردار جعفری ۱۵/-

شام شہر یاراں۔ فیض احمد فیض مجلد ۱۰/ ۶/-

جستہ جستہ۔ خورشید الاسلام ۱۸/-

گل افشانی گفتار۔ نشور واحدی ۵/-

کرب آگہی۔ آنند نرائن ملا ۱۰/۵۰

نوائے آوارہ۔ غلام ربانی تاباں ۸/۵۰

اردو گیت۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیر طبع)

پچھلے پہر۔ جاں نثار اختر ۱۵/-

انتخاب حالی (دنیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۱۵/-

شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۸/۵۰

ذوق سفر۔ غلام ربانی تاباں ۵/-

کو بہ کو۔ سلمان جاں نثار اختر ۷/-

آتش گل جگر مرادآبادی ۲۵/-

دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

انوار قرآن پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۵/-

حضرت محمدؐ اور قرآن ڈاکٹر رفیق زکریا ۲۰۰/-

مسلمانوں کا تعلیمی نظام ضیاء الحسن فاروقی ۹/-

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان۔ محمود احمد برکاتی۔ ۲۵/-

فرید و فرود فریدؒ اسلم فرخی ۲۷/-

اسلام میں راسخ الاعتقادی بیچ کی راہ ضیاء الحسن فاروقی ۸/-

اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا مرتبہ سید مقبول احمد ۸/-

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل۔ مولانا مجیب اللہ ندوی۔ ۱۴/-

تقدیر ملفوظات نثار احمد فاروقی ۴۵/-

خطبات عیدین مولانا تقی امینی ۲۱/-

تاریخ اردو ...

قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت۔ ڈاکٹر مجیب اشرف ۔ ۱۲/-

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۸/-

ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-

ترجمۂ قرآن۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش پروفیسر مشیر الحق ۸/-

مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی

دنیا کے بڑے مذہب۔ عماد الحسن آزاد فاروقی

ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک۔ شمس الرحمٰن محسنی ۵۰/-

رسول اکرمؐ اور یہود حجاز۔ سید برکات احمد ۴۰/-

محجوب الارث۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-

ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-

اسلام دور حاضر میں۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۳۶/-

اسلامیات۔ مالک رام ۲۴/-

عمرو بن عاصؓ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۹/-

حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵/-

روح القرآن۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ۳/-

عشق اور بھگتی۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۹/-

عورت اور اسلامی تعلیم۔ مالک رام ۳/-

مسلمان اور وقت کے تقاضے۔ عبدالسلام قدوائی ۸/-

عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء۔ محمود الحسن ۱۵/-

سماجی تبدیلیاں۔ مترجم قاضی عبید الرحمٰن ۲/-

مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)

ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۲/-

دین الٰہی اور اس کا پس منظر۔ مولانا محمد اسلم خاں شہابی ۴/-

کتاب و سنت کے جواہر پارے۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۔ ۴/۵۰

خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-

مسلمان اور سیکولر ہندوستان۔ پروفیسر مشیر الحق ۶/-

اسلامی عقائد و مسائل مذہب۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۔ ۴/۵۰

اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-

تاریخ الامت سیرت رسول حصہ اول۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۴/-
" خلافت راشدہ " دوم " ۲۱/-
" خلافت بنی امیہ " سوم " ۱۵/-
" عباسیہ " چہارم " ۱۵/-
" عباسیہ بغداد " پنجم " ۲۷/-
" عباسیہ مصر " ششم " ۲۷/-
" آل عثمان ہفتم " ۱۸/-
" ہشتم " ۳۶/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز)۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-
" " کلاں سائز " ۴/-
بکھرے ورق سینتی کمار چیٹرجی ۴/-
تاریخ انگلینڈ ۱۴۸۵/۱۹۰۱ء سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-

ناول

آگے سمندر ہے انتظار حسین ۱۵۰/-
جھینی جھینی بینی چدریا عبد البسم اللہ ۵۰/-
صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۵۰/-
نوٹوں کی تلاش ایاز سیوہاروی ۶۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-
سفر رابعہ تبسم ۲۷/-
سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-
ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-
بنجر بادل۔ کشمیری لال ذاکر ۲۴/-
فرار۔ ظفر پیامی ۴۰/-
ڈوبتے سورج کی کتھا۔ کشمیری لال ذاکر ۳۶/-
لمحوں میں بکھری زندگی۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-

سلگتی بہاریں۔ کوثر چاند پوری ۱۸/-
راگ بھوپالی۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات۔ کشمیری لال ذاکر (زیر طبع)
میں واپس آؤں گا۔ ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس ۲۵/-
پروائی۔ صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-
ایک ہم دو دل۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-
اشک خوں۔ حبیبہ بانو ۱۰/-
اپنی اپنی صلیب۔ صالحہ عابد حسین ۶/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ۔ جتندر بلو ۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان۔ سید ضمیم اشرف۔ ۶/-
ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
آلپس کے گیت۔ مترجم قرۃ العین حیدر ۲/-
پیار کا موسم۔ مہندر ناتھ ۴/۵۰
چنار کا پتا۔ سلطان آصف فیضی ۲/-
پا بہ جولاں۔ صغریٰ مہدی (زیر طبع)
زندگی کی لہر۔ (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق ۴/-
کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق (زیر طبع)
بیوہ۔ منشی پریم چند ۲۴/-
گئودان (نیا اڈیشن) " ۴۵/-
میدان عمل۔ (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۴۵/-
یو دو کیہ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/-
شکست ناتمام۔ زہرہ سیدین ۲/-
ابھی دور۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پر اسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/۵۰

افسانے

صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر — ٧٥/-
آوازوں کا میوزیم — ساگر سرحدی — ٢٥/-
سدابہار چاندنی — رام لعل — ٣٦/-
دل دریا — شرون کمار — ٢٥/-
تین چہرے تین آوازیں — صالحہ عابد حسین — ١٨/-
دردِ دل — ستارہ جعفری — ١٨/-
مکتی بودھ — راجندر سنگھ بیدی — ٢٥/٥٠
نیلی ساری — خواجہ احمد عباس — ١٣/-
گرہن — راجندر سنگھ بیدی — ٣٠/-
کوکھ جلی — " " — ١٨/-
کھڑکی — پرکاش پنڈت — ١٢/-
ریت سمندر اور جھاگ — ہرچرن چاولہ — ١٢/٧٥
تیوری — امر سنگھ — ١٤/٧٥
قلی نمبر ٣٩٩ — وجاہت علی سندیلوی — ١٢/٧٥
دانہ و دام — راجندر سنگھ بیدی — ٢٧/-
اپنے پرائے — اوم پرکاش بجاج — ٩/-
نئی دھرتی نئے انسان — خواجہ احمد عباس — ١٢/-
درد و درماں — صالحہ عابد حسین — زیرِ طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے — راجندر سنگھ بیدی — ٢٦/-
طارلت — پریم چند — ٢١/-
اردو ایسیز — مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی — ٣٦/-
دس افسانے — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — ٤/٥٠
راستے اور کھڑکیاں — انور خاں — ٦/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں — صغریٰ مہدی — ١٦/-
اپنے دکھ مجھے دے دو — راجندر سنگھ بیدی — ٢١/-

ڈرامے

الجھاوے — ابراہیم یوسف — ٥١/-
زندگی کی طرف — پروفیسر شمیم حنفی — ٣٦/-

زوال کا عروج — مترجمہ انور عظیم — ٣٦/-
مجھے گھر یاد آتا ہے — پروفیسر شمیم حنفی — ٣٦/-
انٹی گونی — سوفوکلیز — مترجم قیصر زیدی — ٩/-
خانہ جنگی — پروفیسر محمد مجیب — ٦/-
حبہ خاتون — پروفیسر محمد مجیب — ٦/-
تاریخ کے آنچل میں — رفعت سروش — ١٨/-
اداس موڑ — ابراہیم یوسف — ١٣/-
اینٹنی اور کلیوپٹرا — ولیم شیکسپیئر — ١٦/٥٠
مٹی کا بلاوا — شمیم حنفی — ٥/-
سات کھیل — راجندر سنگھ بیدی — ١٧/٥٠
غالب کون — سید محمد مہدی — ٨/٥٠
خیال کی دستک — ساگر سرحدی — ١٢/٧٥
دیا بجھ گیا — کرتار سنگھ دگل — ٦/-
پہلے آپ (مزاحیہ ڈراما) — افتخار عالم — ٢/٥٠
آذر کا خواب — قدسیہ زیدی — ٨/٥٠
آزمائش — پروفیسر محمد مجیب — ٦/-
انجام — پروفیسر محمد مجیب — ٦/-
کھیتی — " — ٤/٥٠
ہیروئن کی تلاش — " — ٥/٥٠
پردۂ غفلت — ڈاکٹر سید عابد حسین — ٩/-
دروازے کھول دو — کرشن چندر — ٦/٥٠
آئینۂ ایام — جے بریشلے — مترجم خلیق احمد — ٤/٥٠
نقشِ آخر — اشتیاق حسین قریشی — ٢/٢٥
ریڈیو ڈرامے کا فن — ڈاکٹر اخلاق اثر
ریڈیو ڈرامے کی اصناف — "
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو — " — ١٠/-
فاؤسٹ (گوئٹے) مترجم: ڈاکٹر عابد حسین — ٢٥/٥٠

اقبالیات

افکارِ اقبال — محمد عبدالسلام خان — ١٢٥/-

اقبال جادوگر ہندی نژاد — عتیق صدیقی — ۱۰/-
اقبالیات کی تلاش — عبدالقوی دسنوی — ۲۵/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) سید وحیدالدین — ۳۶/-
اقبال اور دہلی — عبدالقوی دسنوی — ۹/۵۰
نقدِ اقبال — میکش اکبرآبادی — ۲۵/۵۰
نقش اقبال — اسلوب احمد انصاری — ۲/-

غالبیات

ذکرِ غالب — مالک رام — (زیرِ طبع)
گفتارِ غالب — مالک رام — ۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی — مشفق خواجہ — ۳۶/-
تلامذۂ غالب — مالک رام — ۷۵/-
فسانۂ غالب — مالک رام — ۱۶/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ — ڈاکٹر خلیق انجم — ۹/۵۰

ہماری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۴/-
نیرنگِ خیال — مالک رام — ۱۵/-
یادگارِ غالب اردو — " — ۳۰/-
" فارسی — " — ۹/-
انتخاب مضامین سرسید — انور صدیقی — ۱۶/-
حیاتِ سعدی — مرتبہ رشید حسن خاں — ۳۶/-
فسانۂ آزاد (تلخیص) — " ڈاکٹر قمر رئیس — ۷۵/-
فردوسِ بریں — " عبدالحلیم شرر — ۱۶/-

انتخاب ناسخ — مرتبہ — ۵۱/-
مثنوی بحرالمحبت — مرتبہ عبدالماجد دریابادی — ۵/-
شریف زادہ — " ڈاکٹر قمر رئیس — ۲۰/-
امراؤ جان ادا — مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن — ۲۸/-
فسانۂ مبتلا — " صدیق الرحمٰن قدوائی — ۱۵/-
توبۃ النصوح — " مالک رام — ۳۶/-
باغ و بہار — " رشید حسن خاں — ۲۷/-
ابن الوقت — " ڈاکٹر خلیق انجم — ۴۵/-
مجالس النساء — " صالحہ عابد حسین — ۲۴/-
گذشتہ لکھنؤ — " رشید حسن خاں — ۷۵/-
قصۂ حاتم طائی — " اطہر پرویز — ۱۵/-
انتخاب ولی — مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی — ۲۰/-
انتخاب سراج اورنگ آبادی — مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/-
" مراثی انیس و دبیر — رشید حسن خاں — ۳۶/-
" نظیر اکبرآبادی — " — ۳۰/-
" اکبر الٰہ آبادی — صدیق الرحمٰن قدوائی — ۲۱/-
" کلامِ میر — ڈاکٹر محمد حسن — (زیرِ طبع)
دیوانِ درد — رشید حسن خاں — ۲۴/-
انتخاب سودا — " — ۱۵/-
" قلی قطب شاہ — محمد اکبر الدین صدیقی — ۲۷/-
" ذوق — ڈاکٹر تنویر احمد علوی — ۲۴/-
مثنوی سحرالبیان — رشید حسن خاں — ۲۱/-
مثنوی گلزارِ نسیم — " — ۱۶/-
افاداتِ سلیم — ڈاکٹر خلیق انجم — ۳۰/-
مقدمۂ شعر و شاعری — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۷/-

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی ۲۵

نومبر ۱۹۹۶ء	جلد ۳۶	شمارہ ۱۱

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/-
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	80/-
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/-
″ (بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/-

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

Tel Cum Fax No. (011)-6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ٦

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین وبیانات نقد وتبصرہ کے ذمے دار خود مصنفین ہیں۔ ادارۂ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلیشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵..۱۱ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

اشاریہ

مضامین

نظمیں / غزلیں

ملنگ کا اجالا

طنز ومزاح

افسانہ

نئی مطبوعات

اخلاقیات طبیب	حکیم محمد سعید	۴۰/
...ے کی چوری	بچوں کے لیے کہانیاں	۴/
خلائی طبیب	//	۸/
سنہری جھیل	//	۹/
ہلتا ہوا مکان	//	۵/
بونوں کا جزیرہ	//	۸/
جادونگری	//	۹/
بچوں کی شفیقہ فرحت	انیس سلطانہ	۴/
بچوں کے حالی	سیدہ سیدین	۷/
فوائد بدریہ (سیرت)	مولانا محمد صبغۃ اللہ	۷۵/
اسلام اور منشیات (تحقیق)	ڈاکٹر عبدالمجید	۷۵/
رسالہ جامعہ نمبر ۷۔۸۔۹	مدیر: شمیم حنفی / سہیل فاروقی	۲۵/
غالب نامہ (سلور جبلی نمبر ۲)	مدیر اعلیٰ: پروفیسر نذیر احمد	۵۰/
اصولِ زندگی (صحت)	ڈاکٹر سید واجد علی	۷۵/
عالمی اردو ادب ۱۹۹۶ء مجلہ	ترتیب نند کشور وکرم	۱۵۰/
فن اسماء الرجال (مذہب)	ڈاکٹر تقی الدین ندوی	۵۰/
ادب کی آبرو (مضامین)	دیویندر اسر	۷۰/
میگھ دوت (شاعری)	مترجم: رتن بہاری لال سکسینہ	۷۰/
بیتی رتوں کا منظر نامہ (نظمیں)	فیاض رفعت	۱۰۰/
کل ہند تعلیمی کارواں (سروے)	یوپی رابطہ کمیٹی	۱۰۰/
شہنشۂ کونین (شاعری)	واجد سحری	۱۵۰/
نیا اردو افسانہ ایک انتخاب	رام لال / اظہار عثمانی	۵۷/
ہندوستان میں ملی مسائل	پروفیسر عمر حیات خان	۵۵/
وضاحتی کتابیات (جلد سوم)	گوپی چند نارنگ / مظفر حنفی	۱۳۵/
ترکی کا مرد مجاہد	ثروت صولت	۷۰/
ہندوستان میں مدارس عربیہ کے مسائل	سلطان احمد اصلاحی	۵۰/
مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی شخصیت کے چند نمایاں پہلو	سلطان احمد اصلاحی	۱۵/
مولانا عبدالمجید ندوی شخصیت کے پہلو...	سلطان احمد اصلاحی	۱۵/
اسلام اور مغرب کی کش مکش	سید قطب شہیدؒ	۶۰/
فتاویٰ اہل حدیث (خورد)	مولانا ابوالبرکات احمد	۶۵/
اسلام میں نذر و نیاز کا اسلامی تصور	کلیم کاشمیری	۱۵/

اخلاقیات طبیب — حکیم محمد سعید

حقیقت یہ ہے کہ طبیب کے لیے علم میں مہارت جتنی ضروری ہے اتنی ہی ضروری اخلاقی رفعت بھی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں طب کے ہر عامل اور ہر طالب علم کے لیے ایک اخلاقی معلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر طریق علاج کے عاملین کے لیے مفید اور معتبر۔ قیمت: 20/ روپے

ہندوستان کی دینی درسگاہیں — ڈاکٹر قمرالدین

اس کتاب میں دینی مدارس کے قدیم و عظیم نظام تعلیم کا جائزہ لے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ موجودہ ترقی پذیر دور میں ان مدارس کو کس طرح مزید موثر اور مفید بنایا جا سکتا ہے تاکہ آج جو غلط خبریں اور افواہیں اور شبہات سر ابھار رہے ہیں ان کا سلسلہ بند ہو سکے۔ ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ قیمت 200/ روپے

ادب، خواتین اور سماج — ڈاکٹر صادقہ ذکی

صنف نازک کے دکھ درد، ان کی الجھنوں، کمزوریوں محرومیوں پر لکھے ہوئے ۱۴ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت 125 روپے

جمنا داس اختر — مرتبہ: گربچن چندن

(شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات)

بزرگ صحافی جمنا داس اختر، جن کا سن ۸۰ کو تجاوز کر چکا ہے اور جو ۶۵ سال سے صحافت کی آبیاری کر رہے ہیں، کتاب نما نے ان پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے۔ ۱۵۲ صفحات کی اس بسیط دستاویز میں ہندوستان اور پاکستان کے تمیں ممتاز صحافیوں اور دانشوروں نے ان کی خدمات پر تبصرہ کیا ہے۔ شمارے کی ترتیب و تدوین بزرگ صحافی گربچن چندن نے کی ہے جنھوں نے ان کی ہشت پہلو شخصیت کی عکاسی کرنے کے علاوہ ان سے ۲۶ صفحات کا ایک انٹرویو بھی شامل کیا ہے جو حیرت افزا اور سنسنی خیز انکشافات سے لبریز ہے۔ یہ شمارہ صرف ایک فرد کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک پورے دور کا جائزہ ہے۔ ایک ایسا دور جس میں ہمارے برصغیر کی نہ صرف کایا ہی بدلی بلکہ اس کا کردار بھی بدل گیا۔ اس شمارے میں اردو زبان کی وسعت اور صحافت کی قدرت، قوت اور شوکت کا ایک ایسا نادر مرقع مرتب ہوا ہے جسے اس زبان کا کوئی بھی غلو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ قیمت: 60/ روپے

سرورق — ظہور الاسلام

مہمان مدیر (اشاریہ)
ظہور الاسلام
۱۸/۱، نارتھ ٹی ٹی نگر، بھوپال

مادری زبان اردو کی تعلیمی اہمیت

انسان کی زندگی میں مادری زبان کی اہمیت بھی تقریباً اتنی ہی ہے، جتنی خود ماں کی۔ اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کا تعلق ماں سے ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مادری زبان کی اصطلاح ہی رائج نہ ہوتی۔

مادری زبان، اس زبان کو کہا جاتا ہے جس کو بچہ اپنی ماں سے سنتا ہے حالانکہ یہی بچہ اپنے باپ سے بھی وہی زبان سنتا ہے لیکن پھر بھی اس کے لیے "پدری زبان" کی اصطلاح کہیں رائج نہیں ہے۔ زندگی کے دیگر شعبوں میں عام طور پر باپ کو ہی اولیت کا درجہ حاصل ہے لیکن زبان کے معاملے میں ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ کی بہ نسبت ماں کے اثرات بچے پر زیادہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے آغوش مادر کو بچے کی پہلی درس گاہ کہا جاتا ہے۔ باپ کاروبار دنیا کی خاطر زیادہ تر گھر سے باہر رہتا ہے اور بچہ ماں کی نگرانی میں رہ کر اس کی حرکات و افعال کے اثرات کو قبول کرتا رہتا ہے۔ ماں کی زبان سے نکلنے والے بیشتر الفاظ بچے کے ذہن میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں اور جب اس کو قوت گویائی مل جاتی ہے تو وہ انھیں الفاظ کے ذریعے اظہار مطلب کرتا ہے۔

بچے کی زبان سے غوں، غاں، کے بعد عموماً جو لفظ ادا ہوتا ہے وہ ما، ہوتا ہے۔ یہی لفظ ماحول کے اثرات سے کہیں ماں، کہیں ماتا، کہیں مادر، اور مدر، کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ جو بالکل فطری انداز میں ہوتا ہے۔ بچے کو اس میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس کے ماحول میں جو لفظ مروج ہوتا ہے، اس کو وہ بہ آسانی اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے برعکس عمل کے لیے اگر بچے کو مجبور کیا جائے تو اس میں اسے دقت محسوس ہوگی۔ بفرض محال اگر اس کوشش میں کامیابی حاصل بھی ہوجاتی ہے، تب بھی یہ ایک خلاف فطرت عمل ہوگا، جس کا بچے کی نفسیات پر اچھا اثر مرتب نہ ہوگا۔۔۔ اگر آغوش مادر بچے کے لیے پہلی درس گاہ ہے، تو اس میں تعلیم کا ذریعہ صرف مادری زبان ہی ہونا چاہیے۔ دوسری کسی بھی زبان کا استعمال دشواریاں پیدا کردے، اس لیے تمام ماہرین تعلیم نے ابتدائی درجات میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی ضرورت

اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بچہ جب پہلے پہل اسکول میں داخل کیا جاتا ہے' تو اس وقت تک وہ اپنی مادری زبان کے الفاظ بولنا اور سمجھنا سیکھ چکا ہوتا ہے۔ اگر اسکول میں بھی بچے کو انھیں الفاظ سے واسطہ پڑا تو وہ اپنائیت محسوس کرے گا اور تعلیم میں دلچسپی لینے لگے گا ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ اگر اسکول کی زبان بچے کی مادری زبان نہیں ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسکول اور تعلیم دونوں میں کوئی کشش محسوس نہ کرے گا اور پہلے ہی قدم پر تعلیم کو ایک بوجھ سمجھنے لگے گا۔

مادری زبان میں تعلیم دینا بچوں کے لیے اسی طرح ضروری ہے' جس طرح پودوں کے لیے سورج کی روشنی ـــــ اگر مادری زبان میں تعلیم نہ ملے تو بچوں کی شخصیت مجروح ہو جاتی ہے اور وہ پوری طرح ابھر نہیں پاتی۔ ان کی انفرادی صلاحیتوں کو نشوونما کا پورا موقع نہیں مل پاتا۔ ان کے ذہنی ارتقا کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ اس کمزوری سے بچوں کی تخلیقی صلاحیتیں بھی بے جان رہ جاتی ہیں۔ غرض کہ اس کمی سے بچوں کی نفسیات پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں' وہ ہمیشہ کے لیے ان کو پست ہمت' غیر حوصلہ مند' اور ایک سہمی ہوئی شخصیت کا مالک بنا دیتے ہیں۔ ایسے بچوں اور یتیم خانہ میں پرورش پائے ہوئے بچوں کی مزاجی کیفیت میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہر بچے کو کم از کم اسکولی سطح تک کی تعلیم' اس کی مادری زبان ہی میں دی جائے' جس سے وہ سماج کے لیے کار آمد اور ذمے دار شہری ثابت ہو سکے۔

کالج کے سطح پر میڈیم میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ چونکہ طلبہ اب ابتدا ہی سے ہندی اور انگریزی پڑھتے ہیں' اس لیے کالج کی سطح تک ان میں ان زبانوں کی اتنی استعداد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ذریعہ تعلیم کی تبدیلی بہ آسانی قبول کر سکیں۔ تین زبانوں کی تعلیم کے سہارے اردو طلبہ دیگر مضامین میں بھی نسبتاً بہتر صلاحیت حاصل کر سکتے ہیں اور ان کا تعلیمی معیار بھی بلند ہو سکتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی اس تبدیلی کا کوئی برا اثر طلبہ پر نہیں پڑے گا کیونکہ اس سطح پر طلبہ کے ذہن میں وسعت اور شعور میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آزادی سے قبل اکثر طلبہ اسکولی تعلیم مادری زبان میں حاصل کرنے کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم انگریزی میڈیم میں ہی حاصل کرتے تھے۔ اس تبدیلی میں انھیں کوئی دشواری بھی نہیں ہوتی تھی۔ فی الحال جہاں مادری زبان اردو میں تعلیمی سہولتیں فراہم نہیں ہو سکی ہیں' وہاں کم از کم ایک مضمون کی حیثیت سے اردو زبان کی تعلیم میں کوتاہی نہیں ہونا چاہیے۔

ہندستان میں تعلیم کا مسئلہ سیاست میں الجھا ہوا ہے' اور مادری زبان میں تعلیم کی

ہیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس پر نیک نیتی کے ساتھ پوری طرح عمل نہیں کیا جارہا ہے۔ نتیجہ میں ایک غیر فطری نظام تعلیم وجود میں آگیا ہے جس کے سبب معیار تعلیم بھی گرتا جارہا ہے۔ ایسے طلبہ جن کو اپنی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا' ان کا تعلیمی معیار نسبتاً پست ہوتا ہے۔ وہ تعلیم میں زیادہ غیر سنجیدہ اور لاپروا ہوتے ہیں۔ درس گاہوں میں وہ صرف اسناد حاصل کرنے جاتے ہیں' تعلیم کی کشش انھیں کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ دیکھا جائے تو اس میں طلبہ کا زیادہ قصور نہیں بلکہ قصور والدین کا ہے یا تعلیمی پالیسی وضع کرنے والوں اور اس پر عمل کرانے والے انتظامیہ کا ہے۔

موجودہ دور میں اردو زبان والے طلبہ مذکورہ خامی کا زیادہ شکار ہوئے ہیں۔ ان کی حالت بڑی افسوسناک اور قابل رحم ہے۔ ان کا تعلیمی معیار حیرت انگیز طور پر پست ہوا ہے۔ ہزاروں ایسے گریجویٹ مل جائیں گے جنھوں نے اردو' ہندی اور انگریزی تینوں زبانیں پڑھی ہیں' لیکن وہ کسی ایک زبان کو اچھی طرح نہ بول سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اگر ان کو ایک گونگی بہری نسل سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اردو زبان نے ہندستان کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن آزادی وطن کے بعد سب سے زیادہ نقصان اسی زبان کو پہنچا۔ غلامی کی زنجیریں کیا ٹوٹیں گویا اردو پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس کو جہاں غیروں نے آنکھیں دکھائیں' وہیں اپنوں نے بھی اس سے آنکھیں چرائیں اور اسے یتیمی کی حالت میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس زبان کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل کی گئیں۔ آزادی سے قبل اس کو جو سہولتیں حاصل تھیں' ان سب سے اس کو محروم کردیا گیا۔ آزادی کے بعد جتنی مخالفت اردو زبان کی ہوئی ہے' اگر کسی اور ہندستانی زبان کی ہوئی ہوتی تو شاید وہ اب تک دم توڑ چکی ہوتی۔ اتنی طویل مدت تک ناانصافیوں اور نامہربانیوں کے شکار رہنے کے باوجود اردو زبان مری نہیں' زندہ ہے۔ البتہ اس کے پڑھنے لکھنے والوں کا دائرہ کم ضرور ہوتا جارہا ہے۔ یہ صورت حال انتہائی تشویشناک ہے اور محبان اردو کے لیے ایک انتباہ بھی۔

اگر اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ آزادی کے بعد اردو والوں نے اپنی مادری زبان کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں تو نظر آئے گا کہ اس سلسلے میں عام طور پر بے عملی اور بے حسی کا مظاہرہ ہوا ہے۔ کھوکھلی نعرے بازی' حکومتوں کو یادداشتیں پیش کرنے اور مراسلاتی احتجاج کے علاوہ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کسی تعمیری پروگرام پر عمل نہیں کیا گیا۔ حکومتوں سے رعایتوں کی امید لگائے بیٹھے رہے اور خود اپنی زبان سے عموماً بے پروائی برتی۔

حکومت کی جانب سے ادیبوں کے لیے انعامات، کتابوں کی اشاعت اور سیمینار وغیرہ کے انعقاد کو اردو زبان کا تحفظ سمجھنا، ہماری سادہ لوحی ہے۔ اردو کے تحفظ اور اس کی ترویج کے لیے محبان اردو کو آگے بڑھ کر خود محنت کرنی ہوگی۔ اردو کے متعلق اپنے سابقہ طرز فکر میں تبدیلی کرکے از سر نو حالات کا جائزہ لے کر، عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں ایک مکمل لائحہ عمل ترتیب دے کر، اس پر نیک نیتی سے عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ صرف حکومت سے مطالبات کرنے، کوری بیان بازی اور اردو کی مرثیہ خوانی سے کامیابی حاصل ہونے والی نہیں۔ اردو زبان کے تحفظ اور استحکام کے لیے میدان عمل ہمارا منتظر ہے۔

اس سلسلے کی سب سے اہم اور بنیادی کڑی ابتدائی درجات سے اردو زبان کی تعلیم ہے۔ اس معاملے میں حکومت سے زیادہ خود اردو والے غفلت برت رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں اردو طلبہ کی تعداد سال بہ سال کم ہوتی جارہی ہے۔ ایک طرف تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اردو تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور دوسری طرف ہمارا رویہ یہ ہے کہ جن اداروں میں یہ سہولتیں موجود ہیں، وہاں بھی اکثر طلبہ اردو پڑھنے سے کتراتے ہیں۔ وہ نہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور نہ بحیثیت ایک مضمون کے اسے پڑھنا قبول کرتے ہیں۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ خود والدین نے اندیشہ ہائے دور دراز کی بنیاد پر اپنے بچوں کو اردو پڑھنے سے روک دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو تعلیم سے ان کے بچوں کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ ان حضرات کو سمجھنا چاہئے کہ یہ صرف مخالفین اردو کا پروپیگنڈہ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مدھیہ پردیش کے کئی شہروں میں عرصہ سے ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ کیا وہاں کے طلبہ بھوکے مر رہے ہیں؟ دوسری ریاستوں میں بھی جہاں اردو والے مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا اردو کو بحیثیت ایک مضمون کے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کیا وہ سارے طلبہ بے روزگار رہتے ہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اردو دشمنی کے اس طویل عرصے میں اردو میڈیم کے اسکولوں کا برقرار رہنا، اندیشہ ہائے دور دراز کی بے وقعتی کا ثبوت ہے۔ مذکورہ اندیشے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دور غلامی سے نہ صرف اردوداں طبقہ بلکہ مجموعی طور پر ملک میں تعلیم کو ملازمت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جارہا ہے۔ تعلیم کا یہ غلط تصور آزادی کے بعد بھی باقی ہے۔ بلاشبہ کسب معاش میں تعلیم معاون ثابت ہوسکتی ہے لیکن اس کو تعلیم کا مقصد بنالینا درست نہیں۔ اردو والوں میں یہ احساس کچھ زیادہ ہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے ملازمت ملنے میں دشواری ہوتی ہے حالانکہ اب اردو کے ساتھ ہر طالب علم کو ہندی اور انگریزی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں اردو کے علاوہ اور بھی ایسی اقلیتی زبانیں ہیں جن سے ملازمت پانے میں کوئی مدد نہیں ملتی لیکن ان حلقوں میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ مدھیہ پردیش میں مراٹھی اور سندھی زبان سے ملازمت پانے کا کوئی امکان نہیں پھر بھی ان زبانوں کی تعلیم یہاں برابر جاری ہے اور ان زبانوں میں یہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔

اردو زبان کی بقا کے لیے اس کی تعلیم ایک بنیادی ضرورت ہے جب کہ اس سلسلے میں عوام اور حکام دونوں کی طرف سے لاپرواہی برتی جارہی ہے۔ جب تک سارے اردو علاقوں میں اس زبان کی عام اور غیر مشروط تعلیمی سہولتیں فراہم نہیں کرائی جاتیں' اردو کی بقا ممکن نہیں۔ ترقی اردو بورڈ کے قیام' اردو اکادمیوں کی تشکیل' اردو کتابوں کی اشاعت اور اردو شاعروں' ادیبوں کو انعامات کی تقسیم سے اردو زبان کو ہندستان میں ختم ہونے سے نہیں بچایا جاسکتا۔ حکومت کے یہ اقدامات عام حالات میں یقیناً قابل ستائش ہیں لیکن موجودہ حالات میں جبکہ اردو زبان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے' ان تمام باتوں کی حیثیت ریگستان میں سراب جیسی ہے۔ اس زبان کا اصل اور بنیادی مسئلہ اس کی تعلیم سے متعلق ہے اس لیے کہ جب اردو پڑھنے والے ہی نہ ہوں گے تو ان کتابوں کو جو آج لاکھوں روپیوں کے صرف سے شائع ہو رہی ہیں یا ادیبوں کی ان تصانیف کو جنھیں انعامات سے نوازا جارہا ہے' انھیں کل کون پوچھے گا؟ موجودہ حالات میں دانشوران اردو' معلوم نہیں کس دل سے یہ انعامات قبول کر رہے ہیں۔ انھیں چاہئے کہ وہ ان انعامات کو اس وقت تک احتجاجاً قبول نہ کریں جب تک کہ حسب ضرورت تمام سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کے خاطر خواہ انتظامات نہ ہو جائیں۔

سیاسی مصلحت کے تحت اردو کے حق میں اب تک جو فیصلے یا اعلانات حکومت کی جانب سے ہوئے ہیں وہ اطمینان بخش ہرگز نہیں کہے جاسکتے۔ ایک بھی ایسا مثبت قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے زبان کے تحفظ اور بقا کی یقین دہانی ہوتی ہو۔ اس لیے اردو دوستوں کو چاہیے کہ وہ مراعات کی طرف سے توجہ ہٹا کر اپنی ساری توانائی اور عملی قوت اردو زبان کی درس و تدریس کی سہولتیں حاصل کرنے میں صرف کریں۔ اسی کے ساتھ جن اسکولوں میں یہ سہولت ملی ہوئی ہے' وہاں طلبہ کو داخل کرانا اور ان میں اردو تعلیم کی رغبت پیدا کرنا محبان اردو اپنی ذمے داری سمجھیں۔

زبان کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب کے مٹنے کا بھی خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ کسی دانشور نے کہا ہے کہ اگر کسی قوم کی تہذیب کو مٹانا ہو تو پہلے اس کی زبان کو ختم کرو۔ ہمارے لیے اس

کے آثار اب نظر آنے لگے ہیں۔ کیا اردو والے اب بھی اپنی مادری زبان سے غفلت برتیں گے؟

پچھلے تقریباً ۳۰۔۔۔۳۵ برسوں کے درمیان اردو والوں کی ایک پوری نسل سامنے آچکی ہے، جس کی تعلیم میں اردو زبان شامل نہیں رہی۔ یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس نسل کی موجودہ حیثیت کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔۔۔ مذکورہ نسل کسی اعتبار سے فائدہ میں نہیں ہے۔۔۔ زندگی کی دوڑ میں وہ خود بخود دوسرے تیسرے درجے پر پہنچ گئی ہے۔۔۔ کیونکہ چاہے جتنی کوشش کی جائے معیار تعلیم میں ان لوگوں کی برابری ممکن نہیں جنھوں نے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کی ہے۔۔۔ تعلیم کو جب ملازمت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے تو ظاہر ہے اولا وہی لوگ موقع پائیں گے جن کا تعلیمی معیار بہتر ہوگا۔ یہ نسل ہر اعتبار سے خسارہ میں ہے اور "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم" کی مصداق بنی ہوئی ہے۔ مادری زبان اس کے ہاتھ سے گئی اور دوسری زبانوں کا علم سطحی رہ گیا۔۔۔ غیر مادری زبان ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے دیگر مضامین کی صلاحیت بھی پایہ اعتبار کو نہ پہنچ سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نسل احساس کمتری میں مبتلا ہو کر بے عملی اور بے حسی کا شکار ہو گئی ہے۔۔۔

جو لوگ اردو تعلیم کی مخالفت اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ اس سے ملازمت ملنے میں دشواری پیش آتی ہے، کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ دہائیوں میں ابھرنے والی نسل جو اردو سے نابلد ہے یا جس نے غیر مادری زبان سے تعلیم پائی ہے، اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہے؟ کیا اسے ملازمت حاصل کرنے میں دقتیں پیش نہیں آتی ہیں؟۔ اس لیے ع "دیکھو انھیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"۔ لہٰذا ضروری ہے کہ موجودہ صورتِ حال کا اب انتہائی سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے اور اردو زبان کی تعلیم سے متعلق تمام مسائل کا از سر نو غور و فکر کے ساتھ جائزہ لیا جائے تاکہ درج ذیل سوالوں کے جوابات پانے میں آسانی ہو سکے۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی تہذیب آپ کا کلچر مٹ جائے؟

کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کی زبان اور اس کا ادب ختم ہو جائے؟

کیا آپ اپنے بچوں کے تعلیمی معیار کو پست رکھنا چاہتے ہیں؟

کیا آپ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا نہیں چاہتے؟

کیا آپ اپنے مذہبی سرمایے اور تہذیبی روایات سے بے بہرہ رہنا چاہتے ہیں؟

کیا آپ کو منظور ہے کہ آپ کے بچے یتیم اللسان بنیں رہیں؟

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔

عتیق اللہ
شعبہ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

آسماں محراب، نقشِ ہزار رنگ

آسماں محراب شمس الرحمٰن فاروقی کا تازہ مجموعہ کلام ہے جس میں غزلیں، نظمیں (بشمول نامکمل سوانح حیات اور قصیدہ شہر آشوب) بعض غیر زبانوں کی نظموں کے ترجمے، چند رباعیات و قطعات اور چار نظمیں بچوں کے لیے بھی شامل ہیں۔ پہلی ہی نظر میں ہمارا سابقہ آسماں محراب کی اس خطاطی سے پڑتا ہے، جو موجودہ وقتوں میں عام ڈھرے سے قطعی مختلف ہے، یعنی وقفہ، نیم وقفہ، استفہامیہ اور خطابیہ علامات و اعراب وغیرہ سے یکسر بری، شاید اسی لیے کہ فاروقی شاعری کو بلند آواز میں پڑھنے اور سنانے کی چیز سمجھتے ہیں اور علامات، اوقاف و اعراب کی پیش بند تعیین، معنی افزائی اور معنی آزمائی کے آزاد کھیل کی راہ میں مانع آسکتی ہے۔ ایسے قاری کو آزمانے اور چھیڑنے سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

آسماں محراب اگر ایک دم ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے تو اس کا ایک سبب خود فاروقی کا نام ہے۔ فاروقی جیسی سطح کے نقاد کی شاعری اور وہ بھی ایک ایسے نقاد کی شاعری جسے معمولات کو رد کرنے نئی تعبیریں وضع کرنے اور بھولی ہوئی شعریات کو از سر نو مرتب کرنے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی ہے، ایک خاص نوعیت کی قرأت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہم میں سے اکثر فاروقی کے تنقیدی تصورات اور کلیوں کی روشنی میں اسے جانچنے کی سعی بھی کرسکتے ہیں۔ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس صورت میں بھی فاروقی اپنے قول و عمل میں لخت لخت نظر نہیں آئیں گے۔ فاروقی کی بیش تر شاعری ان کے دعاوی پر پورا اترتی ہے۔ البتہ میں ان کے اس خیال سے کم ہی متفق ہوں کہ ان کی شاعری کا رنگ اب بھی وہی ہے جو گنج سوختہ اور سبز اندر سبز سے عبارت ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "بعض لوگ کہتے ہیں میری شاعری کا رنگ ادھر کچھ بدلا ہے۔ گذشتہ تقریباً دو دہائیوں کے اس خرمن خاکستری کو یک جا دیکھتا ہوں تو مجھے کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔" دراصل گزشتہ شاعری میں فاروقی کے ذہنی سلسلے غالب، اقبال اور راشد تک پہنچتے تھے۔ مشرقیات سے انھیں ان دنوں بھی رغبت تھی مگر انھوں نے مغربیات کو ادھر ایک دوسری منطق کے تحت کھنگالنے، قبول کرنے یا رد کرنے کا بیڑہ

ملایا ہے۔اب مشرقیات کی طرف ان کی توجہ میں خاصی شدت پائی جاتی ہے۔ خصوصی میر تقی میر کا کلام
گزشتہ دس بارہ برسوں سے ان پر جادو کی طرح سرچڑھ کر بول رہا ہے۔وہ ہمارے دور کے غالباً سب سے
بڑے میر پرست بلکہ میر فہم ہیں۔فاروقی کی طرح اتنی مشقت، دماغ سوزی اور یکسوئی کے ساتھ میر کو کسی
نے نہیں دریافت کیا تھا۔میر سے معاملات کے اس طور کا نتیجہ ہے کہ فاروقی نے خود بھی اپنے آپ کو از
سر نو دریافت کیا ہے بلکہ مجتمع کرنے کی کوشش کی ہے' جہاں ایک طرف فاروقی نے میر کو بڑی حد تک
پا لیا ہے وہیں یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ میر نے فاروقی کو میرایا ہے۔میرائی صورت نہ صرف
کہ ان کی تنقیدوں میں دیکھی جاسکتی ہے بلکہ آسماں محراب میں بھی وہ جہاں تہاں مستولی ہے۔
میرانے سے میرا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ فاروقی رنگ میر کے شاعر ہو گئے ہیں بلکہ میر کے
توسط اور تحریک سے انھوں نے ہماری اس فراموش کردہ شعری قواعد کو نہ صرف پھر سے دریافت کیا ہے
بلکہ اس کے ان مضمرات تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے زمانے تک پہنچتے پہنچتے کافی حد تک مسخ
ہو چکے ہیں۔انھوں نے محض تصورات کی بازخوانی ہی نہیں کی ہے' نئی تعبیریں بھی وضع کی ہیں۔فاروقی
کے کلام میں ہمارے استاد شعرا کے لفظی قرینوں، میر و سودا کے یہاں مستعمل لفظی خوشوں اور موجودہ
عہد میں تقریباً ترک کردہ ضمائر کی اصواتی شکلوں اور لفظوں کی بازگشتی نے نقش ہزار رنگ کا سماں پیدا
کر دیا ہے۔یہ صورت غزلوں اور رباعیوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ نظموں کا کرافٹ اس سے مختلف ہے۔
یہ تاثر ان غزلوں میں زیادہ واضح ہے جن کی ردیفیں اسماء یا اسماء کے ساتھ کسی اور صیغے سے مل کر بنی ہیں
جیسے : بدل گئی ہے بہار و خزان دل زدگاں ہر صفحہ خاک تھا میں سات سمندر روہ مخمس ر ہے یوں تو
لمعہ دیروز کا نشاں محراب ہر شعلہ بہار رنگ ہے بھڑکی ہوئی ہے آگ وغیرہ والی غزلیں۔
فاروقی کو رنگوں اور روشنیوں سے خصوصی شغف ہے' انھیں کے متعلقات سے احساسیت
(SENSUOUSNESS) کا رنگ گہرا ہوا ہے۔گنج سوختہ اور سبز اندر سبز میں بھی وہ اکثر کورے لفظوں
کے بجائے رنگوں اور روشنیوں میں کلام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بعض رباعیوں میں یہ رنگ کچھ
زیادہ ہی گہرا ہے' جیسے رنگوں کی پھواریں چھوٹتی ہوئی' خوشبوؤں کے چشمے پھوٹتے ہوئے اور روشنیوں
کے سیلاب امڈتے ہوئے ایک دوسرے کے تال میل سے عجیب اور نادر مشابہتیں قائم کر رہے ہوں۔
لوائح اربعہ ر رباعی سب رنگ ہر رنگ کے چار رنگ)

نقش پا دھندلی چمک دیکھ لوں آنکھیں رکھ دوں
برگ یک خندہ نچوڑوں تو جگر تر کرلوں
سینہ چو رنگ اور اک گوشہ میں مہتاب کی لو
صبح کاذب میں یہ دیکھا یہ بیاں کس سے کروں

۳۔ وہ برق گر کے مری خاک میں ہوئی پیوند
سواد جاں کو مرے آب زر اسی سے ملی

۴۔ اب کے دھویں میں خون کی سرخی کا رنگ ہے
یوں ان گھروں میں پہلے بھی لگتی رہی ہے آگ

۵۔ شیشہ مہتاب اثر ہاتھ کی گرمی کا کھیل
دل بھی تو مجھ سے ملا اے گہر شام رنگ

فاروقی کا ذہن سادے اور اکہرے پیکروں کے بجائے مخلوط پیکروں میں سوچنے کا عادی ہے اور وہ بھی محض وہ پیکر جو رنگوں اور روشنیوں سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح ٹھوس اشیا اور مجرد کیفیات کا خلط ملط جیسے : شہر شگوفہ شرار سے روشن ہر ربط کا زہر گل زرد ہر شجر شاخ کا شعلوں کھلنا خوش بوئے صد لب نغمہ نما ہر برگ آواز میں لپٹا غنچہ عریاں بدن ہر بدن میں دھوپ سی اظہار کی چمک وغیرہ۔ منور تیرگی CHIAROS CURO کی اس کیفیت کو جو دھند اور چمک یا روشنی اور تاریکی کے تال میل سے پیدا ہوتی ہے بڑے سبک ڈھنگ اور مناسب رعایتوں کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے' جیسے محولہ بالا اشعار میں مثال ۱۔ نقش پا دھندلی چمک مثال ۲۔ گوشہ میں مہتاب کی لو اور صبح کاذب کا سماں مثال ۳۔ خاک (جو کہ خیالے رنگ کی ہوتی ہے) میں برق کا گر کے پیوند ہو جانا اور پھر سواد جاں (سواد میں بھی مٹی کا تصور پنہاں ہے) کو آب زر ملنا مثال ۴۔ آگ اور دھویں کا ملا جلا رنگ اور پھر اس میں خون کی سرخی کا رنگ شامل ہونا جو چمکیلا بھی ہوتا ہے۔ مثال ۵۔ شیشہ مہتاب کی چمک اور گہر شام رنگ وغیرہ۔

فاروقی نے جابجا جو تراکیب استعمال کی ہیں اور جو مضامین نیز اخلاقی مضامین باندھے ہیں اور مجموعاً جو لہجہ (جس کی تعریف تقریباً ناممکن ہے) متشکل ہوا ہے (بالخصوص غزل میں) ایک استوانہ شان رکھتا ہے۔ اس طرح کا کلام لفظی دروبست میں بڑا کاٹھ دار ہوتا ہے اور استعارہ اور تشبیہ کی مشابہتوں میں تناسب سے متجاوز نہیں ہوتا۔ آپ بمشکل ہی کہیں انگشت رکھ سکتے ہیں۔ کتابی حوالے سے یہ ہنر وری ہمارے لیے اب بھی مانوس ہے مگر عملاً ہم نے ان سے صرف نظر کر رکھا ہے یا ان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہے یا ادب اور فن کے دیگر تقاضے ذہنوں پر حاوی ہوتے چلے گئے اور انھیں بغیر کسی تعصب کے بھلا دیا گیا۔ اسی لیے یہ لہجہ موجودہ وقتوں میں نامانوس ہی کہلائے گا۔

اسی نسبت سے فاروقی نے نامانوس کاری کا ایک خلاقانہ اور صناعانہ تجربہ کیا ہے۔ فاروقی کا اسلوب شعر ہمارے دور کے ایک عمومی اسلوب سے نہ صرف یہ کہ مختلف ہے بلکہ تازہ کار بھی ہے۔ فاروقی شعر کے ہونے والے تصور کے مقابلے پر اب شعر بنانے (تعمیر : CONSTRUCT) کے تصور کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ اپنی شاعری کے صناعانہ کردار کی طرف توجہ دلا کر قاری کی ادراک کی عادتوں

کی تربیت بھی ان کا مقصود ہے۔ شعر اگر قاری کے احساس جمال کی تشکیل نو کا سبب بنتا ہے تو اصلاً اس کی وجوہ کیا ہوتی ہے؟ دراصل اس کی وجوہ بھی اسی فن پارے کی ساخت میں مضمر ہوتی ہیں۔ فن پارے کے مشتملات میں فنی لوازم کی بڑی قیمت ہوتی ہے جو دیگر حوالوں کو پیچھے دھکیل کر فن کے عمل کو زیادہ نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی صورت نے فاروقی کے کلام کو بڑا گھنا اور معنی گیر بنادیا ہے۔

گل امید کے دامن پہ چشم تر نے لکھا ہے
ہمیں تو کب سکوت آب سے آزاد کردے گا
اس دل کے دشتِ شورہ پہ نکلا نہیں ہے کچھ
حیراں ہوں تیرے قصر یہاں کس طرح بنے
تھہ ربطِ بے کنار کا اٹھتا نہیں ہے بوجھ
آنکھیں دھواں ہیں قوت بازو گریز پا
قدم ٹھہرتے نہیں قصر پست و بالا میں
زمیں ہے فرش تو ہے قوسِ آسماں محراب
سینہ صد چاک کیا قلب کو چو رنگ کیا
حیلے کیا کیا ہوس سیر عدم نے نہ کیے
مٹی ہے جب سیاہ تو اترے گا کیسے نور
زنگی ہوس کے دل کو سودا کیا میاں

آسماں محراب میں اس قسم کے اشعار کی جابجا دھنک سی کھنچی ہوئی ہے۔ یہ اشعار میں نے بغیر کسی کوشش اور خاص توجہ کے ادھر اُدھر سے چُن لیے ہیں۔ ان سے فاروقی کا کلاسیکی شعور اور خاص طور پر ہماری لسانی تہذیب سے جڑی ہوئی بیش قیمت روایات کا شعور بخوبی جھلک رہا ہے۔ میں نے شروع ہی میں یہ بات کہی ہے کہ فاروقی کی شاعری ایک خاص قرأت کا مطالبہ کرتی ہے یعنی قاری سے اس کے کچھ خاص مطالبے ہیں۔ فاروقی کی شاعری کے قاری کو ہمارے وقتوں کی شاعری کے علاوہ اردو شاعری کے کلاسیکی ورثہ کا بھی علم ہونا چاہیے یعنی وہ ذہن جو ماضی کے تجربے سے گزر کر حال کی دہلیز تک پہنچا ہو، اسے ہمارے نظام بدیعیات کے قائم کردہ ان دقیق حیلوں سے بھی واقفیت ہونی چاہیے جنھوں نے صدیوں تک ہمارے ذوق شعری کی تشکیل و تربیت میں زبردست حصہ لیا ہے۔ ایک سطح پر کسی بھی زبان کی اپنی جو لسانیات شعری ہوتی ہے اس کا صدور بھی ایک وسیع تر معاشرت کی لسانی تہذیب ہی سے ہوتا ہے۔ اسی کے حوالے سے ہم اس لسانی گروہ کے ETHOS یا مخصوص مزاج اور اخلاق و افعال کو نشان زد کرتے یا کر سکتے ہیں۔ درج بالا اشعار میں گل امید کا مضمون اور ترکیب دل کے دشت شورہ اور اس

پر تصرف کی قدرت، ضدین کا تصادم اور خرابیٔ دہر کا تذکرہ آنکھوں کا حیراں ہو جانا، قوتِ بازو اور گریز پائی میں ضد کی رعایت کا پہلو، انسانی زندگی یا مکان پر زماں کی یلغار جو بے معنیٔ دہر کو ثابت ہے۔ سینہ صد چاک یا ہوسِ سیرِ عدم اور اس مضمون میں مضمر اخلاقی نکتہ میں ETHOS کی وہ صورت جو ہمارے قدیم شعری نظام فکر کا آموختہ رہی ہے وغیرہ تمام امور اور صورتیں ہمیں اپنی شعریات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ فاروقی ہی نہیں راشد اور فیض سے لے کر ظفر اقبال، افتخار عارف اور عرفان صدیقی تک کی شاعری کی بہتر تفہیم کا حق بھی ہم اس وقت تک ادا نہیں کر سکتے جب تک کہ ماضی کو ہم اپنے ذہنی تجربے کا حصہ نہ بنالیں۔ فاروقی کا یہ اپنا ایک طرز حاصل ہے جس سے ہمارے عہد کے اور دوسرے بہت سے شعرا بھی متاثر ہوئے ہیں۔

یوں تو آسماں محراب کے کئی پہلو ہیں جن پر کافی وضاحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جائے گا۔ یہاں صرف ان کے قصیدۂ شہر آشوب کی طرف اشارے کرنا چاہوں گا۔ اس نظم میں ہمیں ایک نئے فاروقی سے تعارف ہوتا ہے۔ فاروقی کا اکثر اپنی غزلوں میں ایک چلبلا کردار بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں ہجا کی تھوڑی سے چھوٹ اور طنز کی تھوڑی سی رمق بھی شامل ہوتی ہے۔ فاروقی نے پہلی بار کسی ہجائیہ صنف کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے جو اپنے اسلوب میں بڑی نکتہ رَس، دقیق اور اُستادانہ مشاقی کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اس ہجو بلکہ ہجو قبیح کا اصل محرک کون ہے؟ کسے ہدف ملامت و مذمت بنایا گیا ہے یہ تو فاروقی جانیں لیکن اس ذات کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے جس نے فاروقی سے اتنی شاندار نظم لکھوالی جو ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے۔

ہمارے عہد کے تقریباً ہر صیغۂ حیات میں اتنی دو رخی پائی جاتی ہے اور ہر طرف مکر، ریاکاری، فریب، منافقت اور زمانہ سازی نے ایسا جال سا بن رکھا ہے کہ اصل صورتیں مسخ ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ صورتیں ایک خاص معنی میں زٹلی اور جرأت کے عہد کو ہمارے عہدوں سے جوڑ دیتی ہیں۔ جوش کی رشوت اور کراچی نامہ، وحید اختر کی کرسی نامہ اور خلیل الرحمن اعظمی کی شہر آشوب کا معنوی سلسلہ سودا اور نظیر سے جا کر ملتا ہے، جب کہ فاروقی اپنی نظم کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "یہ نظم اپنے زمانے کا شکوہ تو ہے ہی، لیکن یہ جرأت کی شہر آشوب کو اور ہجو کی صنف کو خراج عقیدت بھی ہے۔ جرأت کا تتبع کرتے ہوئے میں نے اس شہر آشوب کے ہر شعر میں کم سے کم ایک جانور کا نام لیا ہے۔" آسماں محراب ص ۴۹

جرأت کی نظم ۱۱۵ مصرعوں پر مشتمل تھی، جس میں بقول فاروقی ۳۳ چڑیوں، گیارہ جانوروں، ۲۴ پیشوں اور ۲ طرح کے لوگوں کا ذکر ہے۔ فاروقی کی نظم ۱۳۴ مصرعوں پر مشتمل ہے، جسے گیارہ چھوٹے بڑے قطعہ نما بندوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فاروقی نے ۵۱ پرندوں، ۴۳ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا ذکر

کیا ہے۔ بچھو، کوے، گدھے، سانپ اور شیر وغیرہ کی مختلف قسموں یا ناموں کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد نوے سے اوپر نکل جاتی ہے۔

مصر قدیم سے لے کر ہندستان تک ایسے قصے کہانیوں کی ایک طویل روایت ہے جن میں جانوروں کی مخصوص صفات یا ان کے معروف عام کردار و خصائل کے حوالے سے انسانی فطرت کے متعدد پہلوؤں کی پردہ دری کی گئی ہے۔ ہماری ہجو نگاری کا پیرایۂ اظہار تو تمثیلی نہیں ہے لیکن سماج، معاشرت، فرد یا انسان فہمی میں تمثیلی بصیرت کا اطلاق ضرور کیا گیا ہے۔ فاروقی نے بھی بعض افراد میں ان حیوانی خاصتوں کا مشاہدہ کیا ہے جو گھن کی طرح ہمارے پورے نظام تعلیم بلکہ نظام معاشرت کو اندر اور باہر سے کھوکھلا کرتے جا رہے ہیں۔ اس نظم میں ہمارے عہد کے علمی اور سیاسی اداروں سے لے کر ان ارباب حل و عقد اور جہلائے عصر رواں تک کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، جو ایک سطح پر خود خوشامد اور کاسہ لیسی میں یگانۂ روزگار ہیں تو دوسری سطح پر نو واردان علم و ادب اور ہم نوایان ہم مشرب کو بلند و بالا عہدوں، مسندوں اور انعام و اکرام کا لالچ دیتے ہیں اور اپنی مدح سرائی کا سامان ہمیشہ تازہ دم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادبی سیاست ایسے ہی لوگوں کا اجارہ ہے اور جو ہر قیمت پر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

ہمارے ہجو نگاروں نے ارباب علم و فضل نیز معلموں کی خستہ حالی کا بڑا دردناک منظر کھینچا ہے۔ یہ دور وہ تھا جب معلمی پیشہ کم اور خدمت زیادہ تھی۔ سودا نے معلموں کو جس ذلت و خواری سے گزرنے پڑ رہا تھا اس کی ایک عبرتناک تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

ملائی اگر کیجے، ملا کی ہے یہ قدر ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
اور ماحضر اخوند کا اب کیا میں بتاؤں یک کاسہ دال عدس و جو کی دو نان ہے
دن کو تو بیچارا، وہ پڑھایا کرے لڑکے شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ خواں ہے

دوسری تصویر فاروقی نے کھینچی ہے جو مقام عبرت کم، حقارت آمیز زیادہ ہے۔ اساتذہ نے طلبہ کی ذہنی تربیت اور علمی خدمت کے بجائے درس گاہوں کو جہالت کی کارگاہوں میں بدل دیا ہے۔ جہاں چاپلوسی، کینہ توزی، دھڑے بازی اور سازشانہ سیاست کے داؤ پیچ سکھائے جاتے ہیں۔ مصاحبت کی تعلیم دی جاتی ہے اور حاشیہ نشینی کا فن سکھایا جاتا ہے۔ ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کی غرض سے طلبہ کو بہتر ملازمتوں کے خواب دکھائے جاتے ہیں اور انھیں اپنا آلہ کار بنایا جاتا ہے۔ فاروقی نے طنز کے ہر اس حربے کا استعمال کیا ہے جو صورت حال کی آمنی کو اس کی پوری شدت اور تناقض کے ساتھ نمایاں کر سکے۔ اس طرح فاروقی اپنے نفرت آمیز جذبے کو دوسروں کے اندر پیدا کرنے میں یقیناً کامیاب ہوئے ہیں۔

ہیں درس گاہیں وہ اصطبل کہنہ جن میں اب
الاغ و اسپ بھی سرگین کے سوا نہ کریں
وہ چغد بوم مسلط ہیں درس گاہوں پر
ہے کون سی حرکت جو اساتذہ نہ کریں
ہے پوچ بافی سوا کام کیا جولاہوں کو
کریں بھی کیا جو عمل عنکبوت سا نہ کریں
تمام اداروں میں قایم شکار گہ ان کی
غراب و کرگس و کنجشک کا نشانہ کریں
کوئی شکار ہو بلا نہیں ہے ان کے لیے
ہو زاغ یا کہ زغن فرق بے حیا نہ کریں
جو آگے پیچھے نہ پھرتا ہو ان کے چل سکیں
ملازمت اسے شعبے میں یہ عطا نہ کریں

ہمارے شعرا نے سیاسی و سماجی بحران، معاشی اختلال[۱] مختلف پیشہ وران کی خستہ حالی[۲] اور ناقدری ارباب علم و فضل کا حال اکثر اپنی ہجویہ نظموں میں بڑے موثر طریقے سے بیان کیا ہے[۳] اس طرح خواص کے ساتھ عوام کی زبوں حالی بھی ان کے موضوع میں شامل رہی ہے۔ زٹلی، میر، سودا اور قایم نے تو بادشاہوں کی ناکارکردگی، سرکاری عمالوں اور حکمرانوں کی اخلاقی بے راہ روی کے علاوہ امرائے سلطنت کی نااہلی پر بھی تیکھے وار کیے ہیں۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے فاروقی نے بھی ارباب سیاست کی جاہ طلبی[۴] ارباب علم و فن کی ناقدری اور مصنوعی ادیبوں اور نقادوں بلکہ نقادچیوں کی درباراداری کی روش پر سخت گرفت کی ہے۔ فاروقی کا لہجہ شروع سے آخر تک ترش رو ہے۔ طعن، تعریض، پھبتی اور دشنام سے لیس، تحقیر ہی تحقیر، تنفیر ہی تنفیر، کہیں ملامت کہیں مذمت فاروقی نے شکوہ ہی نہیں احتجاج بھی کیا ہے اور دل سوختہ کے انداز میں خوب جلی کٹی بھی سنائی ہے۔

فاروقی کا قصیدہ شہر آشوب ہمارے عہد کی ان بہترین نظموں میں سے ایک ہے جو ہمارے عہد کا سراغ ہیں اور جو اپنی معنویت کے اعتبار سے ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ فاروقی کی نظم کا تاثر اتنا قوی اور گہرا ہے کہ اگر اسی نشست میں ان کی دوسری نظمیں بھی پڑھنے کی کوشش کی جائے تو شاید ان کے ساتھ انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ اس لیے میں انھیں اس مایہ ناز نظم کی تخلیق پر مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی دوسری نظموں پر اپنی رائے کو کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔

رضا نقوی واہی
۱۹/۱ پڑہ گردنی باغ
پٹنہ ا

حوالا سے گھٹالا تک

ہم اپنے کرسی نشینوں کے دل سے قائل ہیں
کہ حق میں قوم کے وہ مادرِ مسائل ہیں
قدم قدم پہ نئے گُل کھلاتے رہتے ہیں
طرح طرح کے مسائل اُگاتے رہتے ہیں

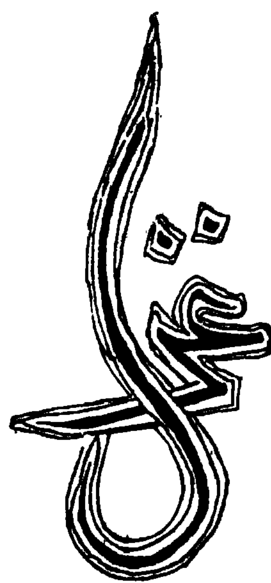
وہ جب بھی خدمت قومی کا بار لیتے ہیں
تو مفلسوں کی لنگوٹی اُتار لیتے ہیں
برائے بحث کھڑا ہے کبھی یہ ہنگامہ
لباس قوم کا دھوتی ہو یا کہ پاجامہ

برائے شغل کبھی تو "حوالا بازی" کی
بڑھی جو مشق تو جی بھر "گھٹالا" سازی کی
مویشیوں کی غذا اور دوا کا تھا جو بجٹ
ستم ظریفوں کا چرگہ اُسے بھی کر گیا چٹ

مویشی سوچتے ہوں گے بڑی حقارت سے
کہ آدمی جو نکالا گیا تھا جنّت سے
ذرا بھی اس کی نہ فطرت میں آئی تبدیلی
ہوا و حرص نے کی رگ دماغ کی ڈھیلی

بڑے بڑوں نے بڑا ہی کمال کر ڈالا
کہ "بے زبانوں" کا جینا محال کر ڈالا
بتا دیں آپ کو اب اس کے بعد کیا ہوگا
"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا"

شمیم جے پوری
۱۰-ایچ، مکان نمبر ۴۸، ۴
مہرولی روڈ بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵



جو عشق ہے تو صدا کو یہ کو ضروری ہے
کوئی ملے نہ ملے جستجو ضروری ہے

مرے لیے بھی اسی طرح تو ضروری ہے
کہ جیسے ساغر کو سبو ضروری ہے

کسی پہ اپنی پریشانیاں نہ کر ظاہر
کہ آدمی کے لیے آبرو ضروری ہے

جو چاہتے ہیں کہ قائم رہے نظام چمن
تو پھر چمن کو انھیں کا لہو ضروری ہے

نہ مال و زر کی تمنّا نہ شہرتوں کی ہوس
ہم اہل دل کے لیے صرف تو ضروری ہے

مری انا نے اجازت نہ دی کبھی اس کی
جو ایک بات ترے رو برو ضروری ہے

وہ دور بیٹھے ہیں پھر بھی مجھ ہی کو دیکھتے ہیں
اب آنکھوں آنکھوں میں کچھ گفتگو ضروری ہے

خوشی میں دیدۂ تر جتنا بہہ سکے بہہ لے
کہ ان کی دید سے پہلے وضو ضروری ہے

خدا مجھے شرفِ سرخروئی بخش کہ اب
کسی کے عشق میں دل کا لہو ضروری ہے

وقار دل کے لیے لازمی ہے غم بھی یونہی
کہ جیسے گل کے لیے رنگ و بو ضروری ہے

کسی کی چشم توجّہ کا شکر کر ورنہ
نہ میں ضروری ہوں اے دل نہ تو ضروری ہے

وہ آرزو کہ جو پوری نہ ہو شمیم کبھی
حیات دل کو وہی آرزو ضروری ہے

محسن احسان
شعبۂ انگریزی
اسلامیہ کالج پشاور

غزل

یہ عروج رُت ہے زوال کی، یہ زوال دن ہیں کمال کے
تبھی پر کسی نے کتر دیے مرے طائرانِ خیال کے

کوئی آفتاب بدست ہے مگر آنسوؤں کے جلو میں ہے
کوئی تیرگی میں اتر گیا کئی سورجوں کو اچھال کے

مرے ہمنشیں، مرے سامنے مری بزدلی نے اُجاڑ دیں
وہ جو بستیاں تھیں جمال کی، وہ جو راستے تھے وصال کے

مری ہر شکن میں چھپی ہوئی ہیں کہانیاں کئی کرب کی
مری جھرّیوں میں سجے ہوئے ہیں سب آئینے مہ و سال کے

مرے ذوقِ حسن و جمال نے تری خوشبوؤں کو چلن دیا
ترے خد و خال میں کھل اُٹھے کئی پھول شوقِ وصال کے

کوئی مرثیہ غمِ ہجر کا کوئی نوحہ دردِ فراق کا
سرِ برگِ گل ہیں لکھے ہوئے کسی پیش لفظ ملال کے

احمد صغیر صدیقی
کرسٹل بنگلہ
موڈل کالونی۔ کراچی (پاکستان)



تماشا ذات کا مستور ہونے کے لیے تھا
میں اتنا خوش، بہت رنجور ہونے کے لیے تھا

کہاں میں اور کہاں گوشہ نشینی کا یہ اعلان
یہ سارا سلسلہ مشہور ہونے کے لیے تھا

ہمیں اس عشق میں دل ٹوٹنے کا غم نہیں ہے
یہ شیشہ یوں بھی چکنا چور ہونے کے لیے تھا

اک اکتاہٹ ضروری تھی اقامت کے بہانے
سفر کا شوق، گھر سے دور ہونے کے لیے تھا

میں جو کچھ کہہ رہا تھا بس وہی کہنا تھا مجھ کو
یہاں میں دوسرا منصور ہونے کے لیے تھا

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج۔ ممبئی

غزل

پیرایۂ اظہار کی زینت نہیں بنتیں
وہ باتیں جو گفتار کی زینت نہیں بنتیں

جو سب سے ضروری بھی ہیں، سچ بھی ہیں، اہم بھی
خبریں وہی اخبار کی زینت نہیں بنتیں

مٹ جاتی ہیں ذہنوں سے فقط چند دنوں میں
تصویریں، جو دیوار کی زینت نہیں بنتیں

لازم ہے شہادت کے لیے جرأتِ انکار
یہ بیعتیں تلوار کی زینت نہیں بنتیں

جب تک کہ نہ شامل ہو عبادت کا تقدس
راتیں یونہی کردار کی زینت نہیں بنتیں

بے کار ہیں یہ ساری عبائیں یہ قبائیں
گر عفتِ افکار کی زینت نہیں بنتیں

شبنم مرے سورج کی نوازش ہے وگرنہ
یہ ندیاں کہسار کی زینت نہیں بنتیں

سیما فریدی
انیس منزل، شیخی پور۔ بدایوں

غزل

خوشبو کا ذکر رات کی رانی کے تذکرے
دریائے زندگی کی روانی کے تذکرے

کرتی ہیں وہ حسین نگاہیں تمام رات
جھرنوں کی بات جھیل کے پانی کے تذکرے

اس ماہ رُخ کا ذکر ہر ایک انجمن میں ہے
جیسے بیاں ہوں یوسفِ ثانی کے تذکرے

پت جھڑ کے باوجود شجر لہلہا اٹھے
جب شوخیوں پہ آئے جوانی کے تذکرے

ممکن نہیں ہے شعلہ و شبنم کی دوستی
مت کیجیے گا آگ سے پانی کے تذکرے

سیما زبانِ خلق پر آنے لگے ہیں پھر
بیتے ہوئے دنوں کی کہانی کے تذکرے

ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی
۷۰/۱۳۔ اردو بازار، دہلی ۶

میں اور میرا وطن

سنگِ مرمر سے تراشیدہ محبت کا مزار
ساری دنیا میں ہے مشہور حسین تاج محل
یہ مرے ملک کی مٹی کے تقدس کی امیں
کیسی پاکیزہ ہے دہلی تری شاہی مسجد
پرچم ہند سنبھالے ہوئے صد ناز کے ساتھ
شانِ اسلاف کی عظمت کا نشاں لال قلعہ
سربلندی کی طرف جیسے ہو یہ راہ نما
ایک مینار ہے گزری ہوئی رفعت کا نشاں
میں بھی قائل ہوں زمانہ بھی یہی کہتا ہے
میرے اجداد کی باقی ہیں انھیں سے یادیں
لیکن اک اور حقیقت کہ بھلا دی ہم نے
میرے اسلاف نے اقدار بھی تو بخشی تھیں
میرے اسلاف کو تھی خاکِ وطن جاں سے عزیز
ہے مرے خون میں بھی حبِ وطن کی گرمی
جھوم کر اس کی فضاؤں میں بھی لہراتا ہوں
ذرے ذرے میں تپش بن کے سما جاتا ہوں

نذیر فتح پوری
دفتر اسباق ۲/۲۱ نیتا پارک
ایروڈا، پونہ ۶ ۔ ۴۱۱۰۰۶

غزل

تنہائیوں نے خوب مرا گھر سجا دیا
دیوار و در پہ موت کا منظر سجا دیا

بے خوابیوں نے چھین کے ساری شگفتگی
کانٹوں سے میری نیند کا بستر سجا دیا

پیاسی رتوں کے بعد کی بھیگی فضاؤں نے
ہونٹوں کی خشکیوں پہ سمندر سجا دیا

ظاہر پرست مجھ سے خفا ہیں کریں نہ کیوں
باطن کے سارے راز کو باہر سجا دیا

سچ پوچھیے تو نام کی تشہیر نے نذیر
کانٹوں کا ایک تاج مرے سر سجا دیا

...ذکی طارق
...۵۶۰۔کیلا روڈ
...تھک۔غازی آباد

غزل

...نے بغیر کٹیں دن نہ شب گزرتی ہے
...یات کس سے کہوں کیسے اب گزرتی ہے

...لان ہوتا ہے مجھ کو تمہارے آنے کا
...وا اِدھر سے دبے پانو جب گزرتی ہے

...مارا کیا ہے کسی طور کٹ ہی جائے گی
...نکوں سے اُن کی تو شامِ طرب گزرتی ہے

...مجھے وہ لمحہ قیامت سے کم نہیں ہوتا
...وئی کراہ سماعت سے جب گزرتی ہے

...ر ایک لمحہ ہوا نذر بے یقینی کی
...لموں سے دن تہی آنکھوں میں شب گزرتی ہے

...زر رہا ہوں جس احساس کے عذاب میں
...امت ایسی کسی دل پہ کب گزرتی ہے

... راہِ شوق ہے کچھ احتیاط لازم ہے
...کی اصالتی یہاں بے ادب گزرتی ہے

راحت حسن
پریم نشان دودھ پور
علی گڑھ (یو پی)

غزل

ہر کوئی اپنے سفر کی داستاں کہنے لگا
پانو، دریا و زمیں، سر، آسماں کہنے لگا

ہر گھڑی جذبات سے رشتہ بدلتا ہی رہا
وہ دلِ ناآشنا کو مہرباں کہنے لگا

پھر کسی پہچان کا نام و نشاں مٹنے کو ہے
جو ہوا کہنے لگی وہ بادباں کہنے لگا

جانے کب سے تھیں مخاطب لفظ کی خاموشیاں
اور پھر اک شخص مجھ کو ہم زباں کہنے لگا

آ گئی پھر جان واپس حوصلوں کے جسم میں
کوئی دشمن ایک لاغر کو جواں کہنے لگا

راکھ تو راحت ہوائیں ساتھ لے کر اڑ گئیں
س... [illegible]

غزلیں

ضیا جبل پوری
کاماریڈی - 503111

ہم نہ شمس و قمر کی بات کریں
آج دیوار و در کی بات کریں

جس کے ہاتھوں ہوئے ہیں رسوا ہم
اُس دلِ بے خبر کی بات کریں

اہلِ دنیا کا تذکرہ ہی سہی
اس بہانے ہی گھر کی بات کریں

گو صعوبت قدم قدم پہ ہے
گُل بدن ہم سفر کی بات کریں

حُسنِ رُخسارِ یار دہکائیں
تابِ برق و شرر کی بات کریں

چاند تاروں میں اب ضیا کم ہے
اہتمامِ سحر کی بات کریں

شمیم انجم وارثی
مڈلاون گارو ڈا گرولیا
۲۴ پرگنہ، مغربی بنگال

شعور اوجِ نشینی کو طمطراق سمجھ
میں جس یقین کو پہنچوں اسے مذاق سمجھ

شریکِ حال یہاں کون کس کا ہوتا ہے
جو مل گیا کوئی ایسا تو اتفاق سمجھ

قرابتوں سے اُڑے گردِ اجتناب اگر
تو اُس وصال کو تو حاملِ فراق سمجھ

پتنگے کھیل رہے ہیں جو آگ کی لَو سے
اسے جنونِ محبت کا اشتیاق سمجھ

نہیں ہے ترکِ تعلق کی کوئی وجہ شمیم
اُسے رقیب کی نیرنگیٔ نفاق سمجھ

بدر واسطی
مکان نمبر ۹، مقابل مسجد ملنگ شاہ
چوکی امام باڑہ روڈ۔ بھوپال

زاہد نظر
جی، ۲۳، بنگلہ بستی، گارڈن ریچ
مٹیا برج۔ کلکتہ ۲۴

غزلیں

کچھ راستے کی مٹی ہی کاغذ میں باندھ لے
ممکن ہے واپس آئے تو پکی سڑک ملے

مٹی کا اک دیا بھی تو چاندی کے گھر میں رکھ
اجداد سے نہ ٹوٹیں کبھی تیرے سلسلے

کب تک رہیں گے سر پہ پرانی چھتوں کے بانس
جھڑتی ہیں پتیاں بھی اگر شاخِ گل ہلے

دل میں بہار کے جو ہو جذبہ نکھار کا
پھولوں کو رنگ و بو کے ہوں شکوے نہ کچھ گلے

کتنے مسافر آنکھیں بچھائے ہیں راہ میں
اب کے جو آئے بس تو ہمیں بھی جگہ ملے

تتلی کے پر مسل کے جو نتھا ہے دل میں خوش
یہ کون اس سے پوچھے تجھے رنگ بھی ملے؟

شہر میں کیا ہوگیا ہے
دل نظر کیوں کر بلا ہے

آسماں سے چاند لانے
خاک سے سورج گیا ہے

رات کے ماتھے پہ چل کر
روشنی کو رکھ دیا ہے

خامشی عادت ہے میری
آپ کو کیا ہوگیا ہے

میں دعا کا منتظر ہوں
اب دعا بھی اک سزا ہے

دن میں جگنو کھیلتے ہیں
رات میں اب کیا دھرا ہے

پھول سب مرجھا گئے ہیں
خار گملوں میں اگا ہے

اے نظر تم لکھتے جاؤ
حادثہ جو بھی ہوا ہے

غزلیں

نسیم شاہجہاں پوری
ترین جلال نگر
شاہ جہاں پور (یوپی)

آج اس چشمِ حسین کے غیظ کی حد ہوگئی
میری ہر منت، گزارش، التجا رد ہوگئی

سوچتا ہوں گردشِ دوراں سے کہہ دوں صاف صاف
ظلم کی حد ہو نہ ہو اب صبر کی حد ہوگئی

اس نے جو کچھ بھی کہا اس کا کہیں چرچا نہیں
بات جو میں نے کہی تھی وہ زبان زد ہوگئی

میں بھی جا سکتا نہیں اور وہ بھی آ سکتے نہیں
بیچ کی دیوار ہند و پاک سرحد ہوگئی

مل گیا گنجینۂ معنیٰ لبوں کو اے نسیم
جب زباں میری کلیدِ قفلِ ابجد ہوگئی

شریف قریشی
پڑا بھوسہ منڈی فتح گڑھ
ضلع فرخ آباد، یوپی

ان چراغوں کے اجالوں کی ادا زندہ ہے
جن چراغوں کے وسیلے سے ہوا زندہ ہے

تو سلامت ہے دعا مانگنے والا نہ رہا
رات کے آخری لمحے کی دُعا زندہ ہے

گیت مر جاتے ہیں آوازیں پلٹ جاتی ہیں
اس خرابے میں فقط دل کی صدا زندہ ہے

بے ثباتی تو ہر ایک شے کا مقدر ہے یہاں
یا خدا زندہ ہے یا حرفِ فنا زندہ ہے

تو جو مجبورِ محبت ہے تو اے جانِ جہاں
تیری فطرت میں ابھی میری وفا زندہ ہے

ملک زادہ جاوید
ی/۲۵ سیکٹر XI
نوئیڈا۔یوپی

غزل

کوئی جواب آیا نہیں خط لکھے بہت
لگتا ہے اس نگر میں غلط ہیں پتے بہت

یہ بات سوچ کر مجھے گھر چھوڑنا پڑا
بوڑھے شجر کے سایے میں اب تک رہے بہت

پہنچا ہوا کے سامنے لو کانپنے لگی
ویسے تو اس چراغ میں تھے حوصلے بہت

ان میں سے ایک کی بھی تو خوشبو نہیں اڑی
شاخوں پہ پھول پیار کے یوں تو کھلے بہت

اخبار میں کبھی نہیں چھپتی کوئی خبر
ہوتے ہیں میرے گاؤں میں بھی حادثے بہت

رہتا ہے نیند کا مجھے غلبہ ہر اک جگہ
قربت میں اس کی ہونے لگے رت جگے بہت

جاوید اس کی بزم میں اک قہقہہ اٹھا
پھر رو گئے ، یاد کر کے کسی کو ہنسے بہت

رام یتن پرساد یادو
مقصود پور، متوہا
پٹنہ

بچپن

مجھے یاد ہے
اپنا بچپن
جو مست ہواؤں جیسا تھا
پیڑوں کے نیچے
تتلیوں کے پیچھے
دن بھر دوڑا کرتا تھا میں
ذرا بھی نہیں
فکر و غم تھا من میں اور
بجلی سی
بھرتی تھی تن بدن میں
اب نہیں رہا
میرے اندر بچپن کا وہ شور
دھیرے دھیرے
اترنے لگا ہے
زندگی کے بھنور میں
ظالم بڑھاپا
تو ایسا سوچتا ہوں کہ
کیا پھر میں منا سکوں گا
اپنے اس روٹھے
مست اور البڑ بچپن کو

کیلاش چندر ناز
مکان نمبر ۸۴-یو راجا پارک
رام گلی نمبر ۲ جے پور

غزل

زندگی کا موت کے نزدیک جانا یاد ہے
لمحہ لمحہ مر کے جینے کا زمانا یاد ہے

رفتہ رفتہ وہ نظر سے دور ہو جانا ترا
میرا اِک تصویرِ حیرت بنتے جانا یاد ہے

بھول بیٹھا ہوں خوشی کے موسموں کی داستاں
اور غم کی خلوتوں کا ہر زمانا یاد ہے

محفلوں میں میں نے بخشیں قہقہوں کو عظمتیں
بند کمروں میں گھٹاؤں کو سجانا یاد ہے

یاد ہے دل کی لگی سے دل لگی کرنا ترا
شوخ ادا سے یہ شرارت کرتے جانا یاد ہے

زندگی جب نا امیدی کے گھنے جنگل میں تھی
اِس درندے یا اجل کا سر اٹھانا یاد ہے

کیا خوشی کیا غم نہ تھا دل کا کوئی بھی آسرا
[illegible]

فرحان حنیف
تھرد رمضان بانگی چال، روم نمبر ۵
فرسٹ فلور، کماٹی پورہ، تھرڈ لین، ممبئی ۸

غزل

عمومی سوچ سے بڑھ کر بھی کچھ فنکار رکھتا ہے
وسیلہ کوئی بھی ہو قوتِ اظہار رکھتا ہے

مرا یہ دل بظاہر مصلحت اندیش ہے لیکن
انا حاوی اگر ہو جرأتِ انکار رکھتا ہے

رعایا خود کو کتنی بے اماں محسوس کرتی ہے
عداوت شاہ سے جب بھی سپہ سالار رکھتا ہے

تعجب ہے وفا کے باب میں بھی حد مقرر ہے
وہ سب سمتوں میں جیسے کانچ کی دیوار رکھتا ہے

ہماری چاہتیں سچ ہیں مگر حالات کا دریا
مجھے اِس پار رکھتا ہے تجھے اُس پار رکھتا ہے

نہیں اپنی خبر فرحان کو لیکن بعدِ حیرت
[illegible]

راج احلی
ریسرچ اسکالر
شعبہء اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

بابو جی

دنیا سرائے فانی ہے۔ جو یہاں آیا ہے اسے واپس جانا ہے۔ انتظار حسین کے لفظوں میں 'ہم شہر افسوس کے باسی ہیں' ہمارے پاس اگر کوئی دولت ہے تو وہ یادوں کی دولت ہے۔ کوئی سرمایہ ہے تو وہ زخموں کا سرمایہ ہے اور کوئی متاع ہے تو وہ صرف متاع درد ہے۔ وقت اپنے جلو میں ان یادوں زخموں اور درد کو لیے ہوئے جاچکا ہوتا ہے لیکن باقی رہ جانے والوں پر مختلف اوقات میں طرح طرح سے اس کے اثرات ہوتے ہیں اور کبھی مزاج کو فرحت، کبھی آنکھوں کی نمی اور کبھی طبیعت کو بے سکونی عطا کرتے ہیں۔ ایک ذرا سے زمانی فاصلے سے دیکھیں تو روشنی کی ایک لکیر نظر آتی ہے جو کبھی پھیل کر آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے اور کبھی سمٹ کر ایک نقطہء نور بن جاتی ہے۔ یہ لکیر اپنی ہر حیثیت میں اتنی شفاف ہوتی ہے کہ اس کے آرپار ہم بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ ماضی اصلاً میوزیم کی چیز ہوتا ہے لیکن ماضی کی بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن پر حال بھی فدا یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس ماضی سے ہمارا شدت تعلق کا رشتہ ہے جو گذشتگان کی یاد کو اسی صورت میں قائم رکھتا ہے جس صورت میں کہ وہ خود ہمارے بیچ موجود تھے۔ اس میں ہمارا اپنا کوئی رول نہیں ہوتا بلکہ ان کی شخصیت، مزاج، فطرت اور وجود کی ہمہ جہتی کو بہت دخل ہوتا ہے۔

آج ایک ایسے ہی ہمہ جہت وجود اور ہمہ جہت موصوف کی یاد نے دردل پر دستک دی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس وجود کو ماضی کا حصہ بنے صرف چند ہفتے گزرے ہیں اور جو اوپر ذکر کی گئی باتوں کے باوصف شاید کبھی ماضی بن کر فکر و خیال کے میوزیم کی زینت نہ بن سکے۔ اس وجود نے آج سے لگ بھگ ۷ دھائیاں قبل مشرقی اتر پردش کے ایک معزز خانوادے میں آنکھیں کھولیں اور شرافت، انسان دوستی، ہمدردی، دل پر سوز و درد مند، فکر پاکیزہ اور سینہ بے کینہ وراثت میں پایا۔ یہ ایسی دولت ہے جس کے آگے تاج شاہی بھی ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ اس وجود کا سلسلہ نسب اس علاقے کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ رکن الدین رکن عالم زاہدی سے ملتا

ہے جو اس خطے میں مخدوم صاحب کے نام سے مشہور ہیں اور ان کا آستانہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔ بلیا ضلع کے شیخ پور نامی گانو میں آنکھیں کھول کر اس وجود نے سرد و گرم زمانے سے نبرد آزمائی کا سلسلہ بہت جلد شروع کر دیا اور جوانی کی راتیں مرادوں کے دن، کی عمر میں ہی سفر دہلی اختیار کیا۔ دہلی بڑا ظالم شہر ہے ان معنوں میں کہ جس کو اپنا اسیر کرتا ہے وہ پھر کہیں کا نہیں رہتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس شہر میں کہاں، کہاں سے کیسے کیسے متمول پس منظر والے افراد آئے اور پھر ہمیشہ کے لئے اسی شہر کے ہو کر رہ گئے اس بات کو اگر یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا کہ یہ شہر شہروں میں انتخاب کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے وہ اشخاص جو زندگی کے میدان میں منتخب روزگار ہونے کی صلاحیت لے کر اس دنیا میں آتے ہیں وہ اکثر کشاں کشاں اس شہر میں آجاتے ہیں۔ اس شہر کی یہ خصوصیت اسے کل بھی اہمیت بخش رہی تھی اور آج بھی اس کی عظمت کی ضمانت ہے۔ سو اس وجود نے کہ منتخبات میں سے تھا اس شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ جب وہ اس شہر میں داخل ہوا تو اس کا نام روض الرحمٰن واحدی تھا لیکن جملہ خصوصیات اور گوناگوں صفات کے سبب داخل اسے شہر نے ایک عجیب و غریب عرفیت عطا کی۔ یہ عرفیت ہی اس کے مزاج، اس کی فطرت اس کے میلان طبع اور ان تمام خصوصیت کی نشاندہی کرتی ہے جو اسے وراثت میں ملی تھیں۔ یہ عرفیت تھی "بابو جی' روض الرحمٰن واحدی اس طرح بابو جی بنے کہ ان کا اصل نام ان کو بہت قریب سے دیکھنے والوں اور بہت اچھی طرح جاننے والوں کے حافظے سے بھی محو گیا۔ دہلی میں بابو جی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مردم خیز ماحول میسر آیا، اس ادارے سے انھوں نے کلرک کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ان محسنین و مخلصین جامعہ بالفاظ دگر محسنین قوم کی آنکھیں دیکھیں جنہیں دنیا ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کے ناموں سے جانتی ہے۔ جامعہ کے قیام کے پیچھے جو مقصد تھا وہ تھا شخصیت کی تعمیر۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہی بنے تھے سو انھوں نے جامعہ کو اور دو جامعہ نے انھیں بہ تمام و کمال اپنا لیا۔

خوش قسمتی سے ہمارا تعلق بھی بابو جی کے خطے سے ہے۔ جب ہم نے اس شہر میں قدم رکھا تو دانستہ یا نادانستہ طور پر ہم بھی بابو جی کے سایہ عاطفت میں آگئے قربت بڑھی تو بابو جی کی کتاب زندگی کے مطالعے کا موقع ملا اور ان کے جوہر کھلنے شروع ہوئے۔ آج بابو جی کو پیوند زمین ہوئے ایک ہفتہ گذر چکا ہے۔ یہ پورا ہفتہ ہم نے بابو جی کی یادوں کے ساتھ گزارا ہے اور تقریباً ہر پل یہ سوچا ہے کہ انہیں سمیٹ کر آپ تک پہنچائیں لیکن یادیں ہیں کہ سمٹنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ آپ خود محسوس کر رہے ہوں گے کہ ہم کتنے جتن کرتے ہیں لیکن سلسلہ کسی اور جانب چلا جاتا ہے۔ ہم نے اس کی وجہ پر غور کرنا چاہا تو اندازہ ہوا کہ جو لوگ اس طرح زندگی گزارتے

ہیں کہ "بی اے کیا، نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے" ان کے تعلق سے کچھ کہنا نسبتاً آسان ہوتا ہے برخلاف اس کے وہ لوگ جنہوں نے اس جولانگاہ ہستی میں قدم قدم پر اپنے وجود کا اثبات ایک دو اشخاص سے نہیں ایک ایک انبوہ سے کرلیا ہو اور کتاب زندگی کے ہر صفحے پر اپنے بے حد درخشاں نقوش چھوڑے ہوں ان کی یادوں کو سمیٹنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

ہم بابو جی کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عموماً یہ دیکھتے کہ کوئی نہ کوئی شخص اپنا مسئلہ لیے موجود ہے اور بابو جی اس کے حل کے لئے عملی طور پر سرگرم۔ ہم سوچتے، بابو جی کا تعلق پورب سے وہاں کے لوگوں میں اپنے علاقے کے لوگوں سے ہمدردی کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ بابو جی کے اس انداز کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن اس خیال کا بطلان بہت جلد ہمارے مشاہد نے کردیا کیونکہ صرف مشرقی یوپی یا بہار کے احبار ہی نہیں بابو جی کی عنایتوں اور ان کے اخلاص نے تو سارے ہندوستان کو اپنے سائے میں لے رکھا تھا۔ سب پر یکساں توجہ، سب کے لئے یکساں طور پر کوشاں۔ ان کے یہاں اپنے پرائے علاقے والے وغیرہ کا شاید کوئی خانہ ہی نہیں تھا۔ پھر سوچا بابو جی بہت اچھے مسلمان ہیں نماز کے پابند، روزوں کے عادی، دن ورات کا بیشتر حصہ ذکر میں گزارنے والے اللہ ورسول، کو بہت سلیقے سے ماننے والے، اس لیے ان کی توجہ مسلمان پر بہت ہوتی ہے خواہ وہ کہیں کا ہو۔ اسے کلمہ گو ہونا چاہئے بابو جی اس کی استعانت کے لیے تیار رہتے ہیں۔ لیکن ایک بار پھر مشاہدے نے پختگی دی اور ہمارا یہ خیال بھی باطل قرار پایا کیونکہ جس قدر توجہ، محبت اور ہمدردی بابو جی کے سامنے بیٹھے ملسمان کو ان کی جانب سے حاصل تھی اسی قدر ایک غیر مسلم کو بھی خواہ وہ ہندو ہو، سکھ ہو یا عیسائی۔ ہم بے انتہا دقت نظر سے بابو جی کی شخصیت کے مطالعے کے بعد بھی ان کے یہاں تعصب کا کوئی خانہ دریافت نہ کرپائے۔

ہمارے ذہن میں یہ سوال بھی اکثر آیا کہ بابو جی، بابو جی کیوں ہیں؟ روء ضالرحمٰن واحدی کیوں نہیں؟ ہم دیکھتے کہ ان کے شناساوءں میں ہر شخص خواہ وہ بزرگ ہو یا خورد، عورت ہو یا مرد، ہندو ہو یا مسلمان، اپنا ہو یا پرایا انہیں "بابو جی" ہی کہتا ہے۔ انکے اپنے بچے ان کے قریبی اعزہ اور ہم سب، غرض کہ جو بھی ان کے قریب ہے (اور قریب تو سبھی یکساں طور پر ہیں) انہیں بابو جی کہہ رہا ہے۔ (بابو جی مشرقی ہند میں بالعموم باپ کو کہتے ہیں) اگر انہیں ان کے بچے بابو جی کہہ رہے ہیں تو بالکل ٹھیک، اگر قریبی اعزہ کہہ رہے ہیں تو ہو سکتا ہے ازروئے احترام کہہ رہے ہوں، اگر ہم کہہ رہے ہیں تو وہ ہمارے باپ کی طرح ہیں۔ اگر ہماری عمر کے لوگ کہہ رہے ہیں؟ تو وہ ان سب کی باپوں کی عمر کے ہیں لیکن یہ ان کی عمر کے لوگ آخر کس لیے انہیں بابو جی کہہ رہے ہیں؟ ہمارے اس سوال کا جواب بھی مشاہدے نے ہی فراہم کیا۔ بہت سے لوگ اپنی

خصوصیات اور اپنے تجربات کی بنا پر عمر کی قید سے بھی نکل جاتے ہیں پھر وہ سب کے مربی ہوتے ہیں سب کے سرپرست اور سب پر شفیق۔ بابو جی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سب انہیں "بابو جی" کہتے۔

بابو جی اکہرے بدن، سانولی رنگت، کتابی چہرے اور ہر طرح کے تصنع سے بے نیاز شخصیت کو سفید براق کرتے پاجامے اور گاندھی ٹوپی میں سجائے ہاتھ میں چھڑی یا چھتری لیے جدھر سے گزرتے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ان کے لیے احترام اور احسان مندی کے جذبات ہوتے اور بابو جی کی آنکھوں میں ان سب کے لیے شفقت اور انسیت۔

دلی کی اس بے حد معروف زندگی میں کسی کے لئے فرصت نہیں لیکن بابو جی اس میٹرو کلچر میں اپنی الگ شناخت رکھتے تھے آج ان کی شخصیت کے معترفین کی ایک خاصی معقول تعداد اس شہر میں موجود ہے اور ان کی ذات سے فائدہ حاصل کر کے بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے والے بھی سارے شہر بلکہ سارے ملک اور دنیا کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں، خوش و خرم اور شادماں، ان کی اس خوشی، خرمی اور شادمانی میں بہت سی چیزیں شامل ہوں گی لیکن بابو جی کی شخصیت کا حصہ بھی اچھا خاصہ ضرور ہے۔

ہو سکتا ہے بابو جی کو ان کے اہل خاندان ولی اللہ سمجھتے ہوں لیکن ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندی کے سلسلہ ارادت سے وابستگی، کثرت ذکر و فکر، ادائیگی فرائض اور ادائیگی حقوق العباد کے باوصف بابو جی انسان تھے صرف انسان، جسے اقبال نے انگارہ خاکی کہا ہے کہ جب یہ یقین کی دولت سے مالامال ہوتا ہے تو بال و پر روح الامیں پیدا کر لیتا ہے۔

ہم آپ کے سامنے بابو جی کے اوصاف بیان کرنا چاہتے تھے ان کی یادوں کو سمیٹ کر آپ کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے لیکن وہ یادیں ہیں کہ سمٹنے کو تیار نہیں۔ اس لئے ہم سوچتے ہیں کہ ان یادوں کو ویسے ہی رہنے دیں یا بابو جی تو اس طرح کی چیزوں سے بھی ماورا لگتے ہیں۔ ہم بابو جی کا قطعہ تاریخ وفات بھی کہنا چاہتے تھے لیکن بات بنی نہیں۔ یادوں کا اتنا ہجوم ہو تو سفر بہت بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ سو ہم آپ کو صرف تاریخ کا شعر سناتے ہیں اور بابو جی کی یادوں کو سمیٹ پانے میں اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں ؎

کوئی کیسے تمہارے وصف 176 بھولے
ثمر ہے یہ تمہاری نیکیوں کا

کتاب نما

مانگے کا اُجالا

علامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا مزہ لیجیے

کمزور شاعری مضبوط پی آر



لیث قریشی پچھلے پچاس برسوں سے کلام موزوں یعنی شاعری کے انبار لگا رہے ہیں۔ اس کہنہ مشقی کے باوجود ٹی وی کے کسی مشاعرے میں ان کی صورت اور کسی ادبی رسالے کے تنقیدی جائزے میں ان کا نام نظر نہیں آتا۔ سبب یہ ہے کہ ان کی پی آر بہت کمزور ہے۔ اگر شاعری کمزور ہوتی تو شاید صورت حال اتنی خراب نہ ہوتی کہ کمزور شاعری والوں کی پی آر بہت مضبوط ہوتی ہے۔ مضبوط پی آر کی وجہ سے ٹی وی والوں کی سخن فہمی اور نقادوں کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ لیث قریشی نے ان پردوں کو اٹھانے کی طرف توجہ نہیں کی کرتے بھی کیسے کہ انھیں تو شاعری نے حیات و کائنات کے رازوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھانے ہی میں مصروف رکھا ہے۔ اسی مصروفیت میں ان کے چار ضخیم مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے ناموں کو اگر تاریخ ہائے اشاعت کی ترتیب سے دو سطروں میں تقسیم کر کے لکھا جائے تو یہ خوبصورت شعر وجود میں آجاتا ہے :

لمس گریزاں، عکس لرزاں　　　تاباں تاباں، شعلۂ رقصاں

پہلے تین مجموعے ۱۹۷۶ء سے ۱۹۹۱ء تک شائع ہو کر حیات و کائنات کے ان رازوں میں شامل ہو چکے ہیں جن تک اہل نظر کی رسائی نہیں ہے۔ چوتھا مجموعہ "شعلۂ رقصاں" ابھی پچھلے مہینے شائع ہوا ہے۔ ہم جناب لیث قریشی کے بے حد ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنا تازہ مجموعہ کلام عنایت فرمایا تاکہ اس شعلۂ رقصاں سے ہم اپنے خرمن ذوق سخن کو روشن کر سکیں۔ سو یہ کالم اسی روشنی میں لکھ رہے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم قریشی صاحب کو مجموعوں کے اتنے خوبصورت نام رکھنے پر مبارکباد دیں گے۔ وہ اگر چاہتے تو پہلے مجموعے "لمس گریزاں" کی اشاعت کے بعد باقی مجموعوں کو "ایضاً" کے نام سے شائع کر سکتے تھے کہ سب مجموعوں میں شاعری ایک ہی جیسی ہے لیکن ان کی تنوع پسند طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ مجموعوں کے نام ایک ہی جیسے ہوں۔ کسی نے کہا تھا کہ نام میں کیا رکھا

ہے۔ مگر یہاں سب کچھ ناموں ہی میں رکھا ہے جو معنی خیز بھی ہیں اور مقفّیٰ بھی۔ شاعری میں قافیہ پیمائی تو خیر سبھی کر لیتے ہیں لیکن مجموعوں کے ناموں میں قافیہ پیدا ہونا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اوروں کا تو کیا ذکر اقبال جیسے بڑے شاعر نے بھی اپنے مجموعوں کے ناموں میں قافیے کا خیال نہیں رکھا۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم ایک معاملے میں لیث قریشی کو اقبال پر سبقت حاصل ہے۔ باقی معاملات کا فیصلہ کرنا ماہرین اقبالیات کا کام ہے جو ہم انہیں پر چھوڑتے ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ادھر ہم نے "شعلۂ رقصاں" سے اپنے دامن کو جلایا اور ادھر روزنامہ "جنگ" کے ادبی صفحے پر لیث قریشی کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں انھوں نے اپنے شعری کمالات و نظریات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس انٹرویو کے مطالعے سے ہمارے لیے "شعلۂ رقصاں" پر گفتگو کرنے میں آسانی ہو گئی ہے ورنہ ایسے ثقیل موضوع پر کچھ عرض کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔

موصوف فرماتے ہیں : "میرا بچپن انتہائی غیر شاعرانہ ماحول میں گزرا۔ میں ایک عالم دین کا بیٹا ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ بینکاری بھی کی اور شاعری بھی جب کہ یہ دونوں فعل غیر شرعی ہیں۔" زیر نظر مجموعہ کلام سے غیر شاعرانہ ماحول میں پرورش پانے کے شواہد تو بے شمار ملتے ہیں مگر بینکار ہونے کا صرف ایک ہی ثبوت ملتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مجموعہ اس عمدہ کاغذ پر چھاپا گیا ہے جس پر اسٹیٹ بینک نوٹ چھاپتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جس پر نوٹ چھپتے ہیں اس کاغذ کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور جب اسی کاغذ پر شاعری چھاپ دی جائے تو لوگ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں جیسے جعلی نوٹ چھاپ دیے گئے ہوں۔

لیث قریشی شاعری کر کے ایک غیر شرعی فعل کے مرتکب تو ہوئے ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کی شاعری حد شریعت سے باہر نہیں ہے۔ یعنی انہوں نے کوئی ایسا شعر نہیں کہا جو غیر شرعی ہو۔ یہاں تک کہ محبوب کا ذکر بھی کیا ہے تو نہایت احتیاط سے۔ شاعروں نے اپنے محبوبوں کے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کی ہیں اور انہیں نہایت فاسقانہ قسم کے القاب سے یاد کیا ہے۔ کوئی جاناں کہتا ہے اور کوئی جان جہاں۔ کوئی شاہ خوباں کہتا ہے اور کوئی درددل کا درماں لیکن لیث قریشی ان تکلفات میں نہیں پڑتے، سیدھی بات کہتے ہیں اور اسے "شریک حیات" کا مہذب، شائستہ اور شرعی نام دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں :

جو شریک حیات بن جائے　　　اس کو کیسے جُدا کرے کوئی

عام شاعروں کی طرح وہ اپنے آپ کو مظلوم اور محبوب کو ظالم نہیں کہتے بلکہ معاملات دل و نظر کی خرابی کا دونوں کو مساوی طور پر ذمہ دار ٹھہراتے ہیں :

دل کے جو واقعات تھے مانا کہ بے ثبات تھے
تم بھی تو ساتھ ساتھ تھے ہم پر ہی حرف آئے کیوں

اگر تعلق خاطر فاسقانہ ہو تو بڑھاپے میں فریقین ایک دوسرے سے اجتناب کرتے ہیں۔ تعریف کرنا تو کیا آپس میں ڈھنگ سے بات بھی نہیں کرتے۔ لیکن لیث قریشی محبوب کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں :

مجھے دادِ حسنِ نظر تو دے تو وہی ہے اب بھی مرے لیے
بھلا تجھ سے میں نے یہ کب کہا ترا وہ شباب نہیں رہا

اس پاکیزہ خیالی کی وجہ بھی موصوف نے اپنے انٹرویو میں بتادی ہے۔ فرماتے ہیں : "وہ عشق جسے عموماً لوگ معاشقہ کہتے ہیں، میں نے کیا ہی نہیں۔ میں ہجر و وصال کی کیفیت سے بھی نہیں گزرا، نہ کسی کی جدائی یا فراق میں ذہنی کرب میں مبتلا ہوا ہوں۔" یہ بیان استاد لاغر مراد آبادی کی نظر سے گزرا تو انہوں نے فرمایا : "ایسے شخص کو شاعری کا مردہ خراب نہیں کرنا چاہیے۔ کوئی اور کام کرنا چاہیے۔ مثلاً مولانا عبد الستار ایدھی کے ساتھ مل کر لاوارث مُردوں کو نہلانا چاہیے یا جماعت اسلامی میں شامل ہو کر اگلا الیکشن ہارنے کی تیاری کرنی چاہیے۔"

یہ صحیح ہے کہ لیث قریشی عشق اور معاشقے کے خلاف ہیں مگر ضرورت شعری کے تحت تصوراتی عشق کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں :

چپک اٹھیں نگاہیں کیوں یکایک تصور میں کوئی پھر آگیا کیا

ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ جناب شاعر جب اصلی اور واقعاتی عشق کے قائل نہیں ہیں تو پھر یہ تصوراتی ہیرا پھیری کیوں؟ معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ تصوراتی عشق گناہ صغیرہ ہے جو صدق دل سے توبہ کرنے سے معاف ہو سکتا ہے۔

لیث قریشی نے اپنے انٹرویو میں یہ بھی کہا ہے کہ "بڑی شاعری زندگی کے تجربوں سے وجود میں آتی ہے۔" اس قول کی تصدیق ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ان کا ایک شعر ہے۔

وہ بھی اب پوچھ رہے ہیں ہم سے آپ کا اسمِ گرامی کیا ہے

اس شعر میں زندگی کا ایک بہت بڑا تجربہ تمام شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ذرا تصور کیجیے شاعر کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جس سے برسوں کی شناسائی ہے مگر اس کا حافظہ اتنا خراب ہو چکا ہے کہ وہ شاعر کا نام بھول جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی اس کا نام یاد نہیں۔ اس لیے وہ پہلے مصرعے میں نام کے بجائے ضمیر غائب "وہ" استعمال کرتا

ہے۔ کیا طرفین شعر کے حافظوں کی بیک وقت گمشدگی زندگی کا ایک بہت بڑا تجربہ نہیں ہے؟

اسی طرح ایک اور شعر یہ ہے :

آپ کہتے ہیں تو تسلیم کیے لیتا ہوں ویسے دیکھی تو نہیں آبِ بقا کی صورت

قطع نظر اس سے کہ شعر میں معانی آبِ بقا ہی کی طرح نایاب ہیں' کیا یہ شاعر کی زندگی کا ایک نادر اور بڑا تجربہ نہیں ہے کہ اس نے آبِ بقا کی صورت بھی نہیں دیکھی اور تسلیم کر لیا۔ کیا تسلیم کر لیا؟ معانی کا یہ جزو شاعر نے اس لیے محذوف رکھا ہے کہ قاری بھی اپنی عقل سے کام لے اور کسی نتیجے تک پہنچے۔ بڑی شاعری کا دارومدار عموماً قاری ہی کی عقل پر ہوتا ہے اور یوں معاملہ بے نتیجہ رہتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ بڑی شاعری اگر سمجھ میں آجائے تو وہ بڑی نہیں رہتی چھوٹی پڑ جاتی ہے۔

لیث قریشی نے انٹرویو میں یہ بھی کہا ہے کہ "غزل کہہ کر میں اپنے اندر طمانیت محسوس کرتا ہوں۔" مگر ہمیں یہ طمانیت ان کی غزل کے اندر نظر نہیں آئی۔ جو کچھ نظر آیا ہے' وہ یہ ہے کہ جناب شاعر غزل گوئی پر اس حد تک نادم ہیں کہ اپنے شعروں کو اپنی خطاؤں میں شمار کرتے ہیں۔

لیث شاید مری فطرت کا تقاضا ہے یہی شعر ہو جاتے ہیں سرزد جو خطا کی صورت

یہاں تک تو معاملہ غنیمت ہے کہ ہر نیک دل انسان اپنی خطاؤں پر نادم ہوتا ہے لیکن ایک مقطع میں تو انہوں نے "حسنِ تغزل" سے بھی بے تعلقی کا اعلان کر دیا ہے :

لیث تیری فکر میں حسنِ تغزل ہے کہاں یہ غزل تو شیخ سعدی کی حکایت ہو گئی

کوئی سخن ناشناس یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اپنی غزل کی مذمت کرتے ہوئے اسے شیخ سعدی کی حکایت سے تشبیہ دینا' شیخ کے ساتھ گستاخی کے مترادف ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ یہ گستاخی نہیں شاعرانہ نازک خیالی ہے۔ ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کے ساتھ ہر طرح کی بے تکلفی برت سکتا ہے' یہاں تک کہ اس کی زمینوں میں غزلیں بھی کہہ سکتا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

قریشی صاحب نے اپنے انٹرویو میں یہ انکشاف کیا ہے کہ وہ غالب اسکول کے شاعر ہیں۔ معلوم نہیں یہ اسکول غالب نے کھولا تھا یا غالب کے نام پر کسی اور نے کھول رکھا ہے' صورت حال جو کچھ بھی ہو' ہمارے ملک کے عام تعلیمی معیار کے برخلاف اس اسکول کا معیار نہایت اطمینان بخش ہے۔ معلوم ہوتا ہے قریشی صاحب نے ایثار کی تعلیم اسی اسکول سے حاصل کی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے چالیس سے زیادہ غزلیں غالب کی زمینوں میں کہی ہیں جن سے غالب ہی کو فائدہ پہنچا ہے۔ یعنی موصوف کی غزلوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ غالب کی

زمینوں میں کسی دوسرے کے لیے ڈھنگ کا شعر نکالنا ممکن نہیں۔ نفسا نفسی کے اس زمانے میں خود نقصان اٹھا کر کسی دوسرے کو فائدہ پہنچانا ایثار کی ایک روشن مثال ہے۔

غالب کی زمینوں کو جس طرح پامال کیا گیا ہے اگر اس کی ایک دو مثالیں بھی پیش کر دی جائیں تو دونوں شاعروں کا موازنہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ غالب کی ایک مشہور زمین ہے 'دشوار بھی نہیں' دیوار بھی نہیں'۔ اس میں لیث قریشی نے یہ شعر کہا ہے :

اب سایۂ شجر تو بہت دور کی ہے بات — یاں سنگ و خشت کی کوئی دیوار بھی نہیں

اسی قافیہ کو غالب نے یوں استعمال کیا ہے :

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

غالب کے اس شعر کے سامنے لیث قریشی کا شعر ریت کی دیوار معلوم ہوتا ہے اگر یہ شعر غالب کی زندگی میں کہا جاتا تو غالب اسی ریت کی دیوار سے اپنی شوریدگی سر کا مداوا کر لیتے۔

غالب کا مشہور شعر ہے :

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اس شعر پر ہمارے ممدوح نے یوں بجلی گرائی ہے :

جلا کر خاک کردے برق' آندھی لے اُڑے جس کو
وہ ننگِ گلستاں میری ہی شاخِ آشیاں کیوں ہو

انصاف کی بات یہ ہے کہ لیث قریشی کا شعر غالب کے شعر سے آگے نکل گیا ہے۔ غالب نے صرف بجلی اور آشیاں کے حوالے سے بات کی ہے' لیث قریشی نے آشیاں کو پہلے برق کے ذریعے جلایا اور پھر آندھی کے ذریعے اس کی خاک بھی اڑادی۔ شاعری میں اس طرح خاک اڑانا غالب کے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک مرتبہ مشہور شاعر ناصر زیدی سے غالب کا موازنہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ دونوں ایک ہی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں' بس ذرا لفظوں کی ترتیب مختلف ہوتی ہے۔ لیث قریشی کو ناصر زیدی پر اس وجہ سے برتری حاصل ہے کہ وہ غالب کا مقابلہ معنوی سطح پر کرتے ہیں۔ غالب کے بیشتر شعروں کو سمجھنے کے لیے خاص ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے' لیث قریشی کے شعر ذہن تک پہنچنے سے پہلے ہی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ گویا انہوں نے سہل ممتنع کی طرح سہل انگاری کو بھی شعری صنعت کا درجہ دے دیا ہے۔ یہ کام غالب کے بس کا نہیں تھا۔

ڈاکٹر وہاب قیصر
وائس پرنسپل، ممتاز کالج
ملک پیٹ، حیدر آباد-۵۰۰۰۳۶

شمع اور پروانہ
سائنس کے نقطۂ نظر سے

فطرت میں کئی ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں سے اکثر کی وجوہات سے نہ تو ہم واقف رہتے ہیں اور نہ ہم ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ پروانے کا شمع کی طرف راغب ہونا بھی ایسے ہی واقعات میں یہ ایک ہے۔ پروانہ کب سے اپنی جان شمع پر قربان کرتا آرہا ہے لیکن کسی نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ آخر وہ کونسی قوت ہے جو پروانہ شمع پر جان نچھاور کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔ البتہ اردو کے شعراء نے پروانے کو شمع پر نچھاور ہوتے دیکھ کر عاشق سمجھا اور اسی مناسبت سے اشعار موزوں کیے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

طواف شمع کیے جارہے ہیں پروانے
ابھی تو ہوش کی سرحد میں ہیں یہ دیوانے
گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے
مت کرو شمع کو بدنام جلاتی وہ نہیں
آپ سے شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا
شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگار حسن وعشق اک داغ دل پہ رہ گیا
شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو
بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

اسی طرح کے اور بھی بہت سے اشعار ملیں گے۔ جن میں پروانے کو عاشق کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ شمع پر منڈلانے والے پروانے صرف نر

پتنگوں پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ اور روشنی کے مختلف مبادی SOURCES کے لیے پتنگوں کی کشش مختلف ہوتی ہے۔ محققین کے لیے یہ مسائل کئی سال تک حل طلب رہے کہ آخر نر پتنگے ہی کیوں شمع کی طرف کشش رکھتے ہیں ؟اور روشنی کے مختلف مبادی کے لیے پتنگوں کی کشش مختلف کیوں ہوتی ہے ؟

پتنگوں پر کی جانے والی تحقیق کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ سب سے پہلے S.W.Frost نامی ایک امریکی شخص نے انیسویں صدی میں اس بات کا پتا لگایا تھا کہ Cotton Moths پتنگوں کے لیے موم بتی اور مٹی کے تیل کی روشنی یکساں طور پر کشش نہیں رکھتی۔ اس کے بعد J.H.Fabre نامی ایک فرانسیسی ماہر حشریات نے شمع پر پروانے کے نچھاور ہونے کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس کے مطالعہ کی ابتداء ایک اتفاقی واقعے سے ہوتی ہے۔ ایک وقت کی بات ہے کہ Faber جنگل میں واقع اپنے کاٹیج میں مقیم تھا۔ اس نے ایک بڑے مادہ پتنگے کو اپنے مطالعہ کے کمرہ میں شیشہ کے فانوس میں بند کر رکھا تھا۔ رات کے تقریباً نو بجے جبکہ وہ اپنے بیڈ روم میں تھا' اس نے دیکھا کہ پورا کاٹیج نر پتنگوں سے بھرا ہوا ہے۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہو سکتا ہے یہ سارے نر پتنگے اس مادہ کے لیے جمع ہوئے ہوں جس کو اس نے قید کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس خیال کی تصدیق کے لیے جب اس نے جلتی ہوئی موم بتی لے کر اپنے مطالعہ کے کمرے کا رخ کیا تو اس نے دیکھا کہ سارے پتنگے اس فانوس کے اطراف منڈلا رہے ہیں جس میں مادہ قید تھی۔ لیکن چند ہی لمحات میں اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ پتنگوں کی ایک بڑی تعداد فانوس کے اطراف منڈلانا چھوڑ کر موم بتی کے اطراف چکر لگاتے ہوئے اپنے پروں سے اس کو بجھانے کی کوشش کرنے لگی ہے۔ اس واقعے نے Fabre کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایک تو اس کا کاٹیج جنگل میں بڑے بڑے درختوں اور جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا' دوسرے رات بہت اندھیری تھی۔ ایسے میں نر پتنگے کس طرح وہاں پر مادہ کے وجود کا پتہ لگا سکے ؟ اور پھر وہ مادہ کو چھوڑ کر جلتی ہوئی موم بتی کے اطراف کیوں منڈلانے لگے۔ ان سوالات کا اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کے لیے Fabre نے اس تجربے کو کئی مرتبہ دہرایا اور ہر مرتبہ اس نے یہی مشاہدہ کیا۔ آخر کار انیسویں صدی کے ختم پر اس کی موت واقع ہوئی۔ اور مرتے دم تک وہ ان سوالات کا صحیح جواب حاصل نہ کر سکا۔

پتنگوں پر کی گئی حالیہ تحقیق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر مادہ پتنگے کے پیٹ کے نیچے ایک غدود ہوتا ہے۔ جس سے خاص موقعوں پر Pheromones کے سالمات جنسی خوشبو کا

شکل میں آزاد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مادہ پتنگا اپنے پروں کے ارتعاش کے ذریعہ مخصوص پیام نشر کرتا رہتا ہے۔ رات میں آسمان سے آنے والی نیلی اور بالا بنفشی شعاعیں Uttra Voilet Radiations جب ان سالمات سے ملتی ہیں تو وہ زیادہ طول رکھنے والی زیر سرخ شعاعیں Infra red Radiations خارج ہوتی ہیں۔ تب پتنگے سے نشر شدہ پیام کا ان زیر سرخ شعاعوں کے ساتھ Modulation عمل میں آتا ہے۔ Modulation دراصل ایک ایسا عمل ہے جس میں کم توانائی رکھنے والی لہریں' طاقتور لہروں پر سوار ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مادہ پتنگے کا پیام بھی زیر سرخ شعاعوں پر سوار ہو جاتا ہے۔ جس کی بدولت اس پیام کی توانائی بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ فضا میں ریڈیائی لہروں کی طرح سفر کرتا ہے۔ دور دراز مقامات پر اڑنے والے نر پتنگے جب اپنے Antenna نظام کے ذریعہ اس پیام کو حاصل کرتے ہیں تو وہ مادہ کی سمت اڑنے لگتے ہیں۔ پتنگوں میں مواصلات کا یہ نظام بالکل اسی طرح کا ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ریڈیو اسٹیشن سے آواز کی لہریں' ریڈیائی لہروں کے ذریعہ Modulate ہو کر فضا میں پھیل جاتی ہیں اور جب یہ لہریں ریڈیو تک پہنچتی ہیں تو ریڈیو' آوارز کی لہروں کو ریڈیائی لہروں سے الگ کرتا ہے' تب کہیں جاکر آواز ہمیں سنائی دیتی ہے۔

مختلف اقسام کے پتنگوں سے نکلنے والے Pheromones کے سالمات کا کیمیائی تجزیہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان سالمات میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے نکلنے والی زیر سرخ شعاعوں کی فریکونسی مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے مختلف قسم کے پتنگوں میں مواصلات کی فریکونسی مختلف ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہونے والے پروگرام کی فریکونسی مختلف ہوتی ہے۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ چند اقسام کے مادہ پتنگے ۴ کلو میٹر دور پائے جانے والے نر پتنگوں تک سے اپنا مواصلاتی ربط قائم کرسکتے ہیں۔ اور تو اور پتنگوں کی چند قسمیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی ایک مادہ وقت واحد میں ۱۱ ہزار سے بھی زیادہ نر پتنگوں کو اپنی طرف راغب کرسکتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مادہ پتنگے سے Pheromones کے سالمات ہمیشہ آزاد نہیں ہوتے۔ یہ عمل اسی وقت ہوتا ہے جب مادہ' نر پتنگے کو اپنی طرف راغب کرنا چاہتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم کو ہر رات' روشن بلب اور روشن لیمپ کے آس پاس پتنگے نظر نہیں آتے البتہ کبھی کبھی ہمارے مشاہدہ میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ روشن بلب یا روشن لیمپ کے قریب پتنگوں کے جھنڈ کے جھنڈ لگ جاتے ہیں اور یہ پتنگے اس وقت تک برقرار رہتے ہیں جب تک کہ وہ جل کر اپنی جان نہ دے دیں۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ قرب وجوار

میں کہیں نہ کہیں مادہ پتنگے ضرور موجود ہیں اور ان کے جسم سے نکلنے والی جنسی خوشبو فضا میں پھیل چکی ہوتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ گھروں اور سڑکوں پر روشن کیے گئے الکٹرک بلب یا لیمپ کی روشنی میں موجود نیلی اور بالا بنفشی شعاعیں جب اس جنسی خوشبو سے ملتی ہیں تو طاقتور زیر سرخ شعاعوں کو پیدا کرتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان بلب اور لیمپس میں بہنے والی غیر سمتی برقی رو A.C. کی بدولت ان شعاعوں کا Modulation واقع ہوتا ہے۔ چونکہ روشن بلب اور لیمپ کے ذریعہ کیا گیا Modulation، آسمان سے آنے والی شعاعوں سے کیے گئے Modulation کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہوتا ہے اسی لیے نر پتنگے بجائے مادہ کی طرف راغب ہونے کے بلب اور لیمپ کا رخ کرتے ہیں۔

جہاں تک شمع کا تعلق ہے۔ اس کے موم میں پائے جانے والے ہائڈرو کاربن جب جلتے ہیں تو روشنی میں مختلف فریکونسی رکھنے والی زیر سرخ شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں مختلف مادہ پتنگوں کی جنسی خوشبو سے نکلنے والی شعاعوں کے مماثل ہوتی ہیں اور پھر شمع کی لو کی تھرتھراہٹ ان شعاعوں کے Modulation کا باعث بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اقسام کے نر پتنگوں کے لیے شمع کی روشنی ایک خاص کشش رکھتی ہے۔

روشنی چاہے شمع کی ہو کہ تیل کے چراغ کی، فلامنٹ بلب کی ہو کہ Fluorescent Tube کی یا مرکیوری لیمپ کی ایک ہی فریکونسی رکھنے والی زیر سرخ شعاعوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ لیکن ان میں Depth of Modulation مختلف ہوتی ہے جس کی وجہ سے پتنگوں کے لیے ہر روشنی یکساں طور پر کشش کا ذریعہ نہیں رکھتی۔

ڈاکٹر مختار شمیم
ایف ۲- گورنمنٹ گرلز پوسٹ گریجویٹ کالج کیمپس
(موتی طویلہ) اندور ۴۵۲۰۰۴

ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی تنقید نگاری

ڈاکٹر سیّدہ جعفر اردو کی معتبر محقق اور نامور نقاد ہیں۔ اب تک ان کی تقریباً بیس کتابیں شائع ہو کر ارباب ادب اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ دو کتابیں ابھی زیر طبع ہیں۔ ان کے قلم کی رفتار کو دیکھ کر ڈاکٹر گیان چند جین کو اعتراف کرنا پڑا کہ "حیدر آباد کے معاصر محققین میں سیدہ جعفر بالیقین سب سے زیادہ فعّال ہیں[1]" اور وہ "انجمن سہل نگاراں کی رکن نہیں، وہ ہمیشہ ڈٹ کر لکھتی ہیں[2]" ڈاکٹر سیدہ جعفر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اکثر کتابیں مستقل موضوعات پر تصنیف کی ہیں۔ غائر مطالعہ، ندرت فکر، محنت و جستجو اور اعلیٰ ادبی معیار ان کی تصانیف کی پہچان ہے۔

تحقیق و تنقید یوں بھی ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ تنقید کو زندگی کی تہذیب اور فن کی آبرو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ تنقید کے جلو میں ہزار ہا جلوہ سامانیاں موجود ہیں جو ادب اور فن کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے آئینے کا کام دیتی ہیں اور اس کا اعتبار بھی بنتی ہیں۔ تنقید سے آگہی نہ صرف زندگی کا مزاج داں بناتی ہے بلکہ ادب کو بھی ایک نئے شعور کی روشنی بخشتی ہے اور عرفان وادراک کے لیے گوشوں کو ذہن میں منور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھا ناقد، ادب اور زندگی میں پائیدار اور مستحکم قدروں کی بحالی کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ کائنات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے تناظر میں زندگی اور ادب پر ان کے اثرات اور اس کے نتیجہ میں اس کے رد و قبول کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر کا مطالعہ وسیع ہے۔ وہ نہ صرف کلاسیکی ادب پر گہری نظر رکھتی ہیں بلکہ جدید ادب کے رویوں سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ چنانچہ ادب میں جدید رجحانات کو اس کے ارتقا کے لیے لازمی سمجھتی ہیں۔ (بقول خود ان کے) وہ قصہ جدید و قدیم کو دلیل کم نظری تصور کرتی ہیں اور ادب کے اس حرکی کردار کی قائل ہیں کہ نت نئے سانچوں میں ڈھل کر زندگی کے جلوۂ صد رنگ کا مظہر ہو جاتا ہے۔[3]

ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تصانیف کی طویل فہرست میں ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل تین

مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں تیسری اور تنقید کے موضوع پر پہلی کتاب "فن کی جانچ" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ "تنقید اور انداز نظر" کے نام سے ایک اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ۱۹۷۹ء میں لکھنؤ کے نسیم بکڈپو کے ذریعے سے اشاعت پذیر ہوا اور حال ہی میں ان کی تیسری تنقیدی کتاب "مہک اور محک" (اگست ۱۹۹۵ء) ادارہ پیکر حیدر آباد نے نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپی ہے۔

"فن کی جانچ" راقم السطور کی دسترس میں نہیں ہے البتہ "تنقید اور انداز نظر" کی مشمولات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ "تنقید اور انداز نظر" میں گیارہ مضامین شامل ہیں۔ موضوعات کی رنگا رنگی سیّدہ جعفر صاحبہ کے ہمہ جہت مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کے پہلے مضمون میں ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے کچھ مروّجہ تنقیدی اصولوں اور ناقدین کے روّیوں سے بحث کی ہے۔ مثلاً ادبی تنقید کے بارے میں وہ لکھتی ہیں :-

> "تنقید تخلیقی ادب کی ایک شاخ ہے اور یہ ادب کے دوسرے شعبوں مثلاً شاعری' افسانہ نگاری اور ڈراما نویسی سے کم درجے کی چیز نہیں ہے۔" [۴]
>
> "تنقید جانچ پڑتال' افہام و تفہیم' تشکیل ذوق اور ادبی صداقت کے شعور کا نام ہے۔" [۵]
>
> "ادب کو سماجی زندگی سے علاحدہ کر کے پرکھنا اور اس کے محاسن و معائب کے متعلق فیصلہ صادر کرنے سے احتراز کرنا تنقید کو گمراہ کر سکتا ہے۔" [۶]
>
> "تنقید میں انداز نظر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔" [۷]

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ادبی صداقت کا شعور رکھتی ہیں' شاید اسی لیے ان کے بعض مضامین میں افہام و تفہیم کی صورتیں تخلیقیت کا احساس دلاتی ہیں۔ "تنقید اور انداز نظر" میں جہاں "حسرت کا تغزل" اور نذیر احمد کے "تصورات" سے بحث کی گئی ہے وہیں "سمرسٹ ماہم۔ کہانیوں کا ساحر" کے عنوان سے ایک مضمون ان کے مطالعے کی دیگر جہات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا تازہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ "مہک اور محک" کتابت و طباعت کی پرانی ڈگر سے ہٹ کر اشاعتی مراحل کی نئی صورتوں کے ساتھ یعنی آفسٹ پر کمپیوٹر کمپوزنگ کے ذریعے سے جلوہ افروز ہوا ہے۔ تبدل و تغیر سے آشنا اس کائنات میں ظاہر ہے کہ ۱۹۶۵ء کے اوائل سے اگست ۱۹۹۵ء کا ادبی تنقید کا سفر' ڈاکٹر سیدہ جعفر کو اس حقیقت حال سے آشنا کر گیا کہ گزشتہ تین چار دہائیوں سے اردو تنقید' افکار و اظہار کے گوناگوں پیکروں اور نئے ادبی

رویّوں کے زیر اثر مسلسل تغیرات کی زد میں ہے۔" چنانچہ اس دوران جہاں ان کے ذہن میں پختگی اور خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے وہیں ان کی گہری سوجھ بوجھ کے سبب اعلیٰ ادبی معیار کو ایک اعتبار ملا ہے اور ان کے شعور نے ادب کی پرکھ اور پہچان کے لیے ایک متوازن طریق کار اپنایا ہے۔ ان کی منفرد فکر اور مطالعہ کی وسعت نے "مہک اور محک" کی محض ادبی قدر و قیمت میں اضافہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اسے دانشوری کی لے سے بھی آشنا کیا ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو "یک رخے" مطالعے کو اپنی کائنات سمجھ لیتے ہیں۔ وہ ان ناقدوں میں سے بھی نہیں ہیں جو مغربی افکار سے مرعوب دکھائی دیتے ہیں اور اپنے ادبی سرمایہ پر گفتگو کرتے وقت کسی قدر احساس کمتری میں مبتلا ہو جایا کرتے ہیں ـــ اور محض "خوشہ چینی" کو ہی "حاصل مطالعہ" سمجھتے ہیں۔ ذہین ناقد اپنے ہمہ جہت اور ہمہ گیر مطالعہ کی بدولت تقابلی تنقید کے ذریعے سے اپنے ادب کی اہمیت کو دوبالا کرتا ہے اور نت نئے خیالات سے اپنی زبان و ادب کو مالامال کرتا ہے۔ ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی تنقید کو اس اعتبار سے اگر کاروانشوراں سے منسوب کیا جاتا ہے تو غلط کیا ہے! تحقیقی و تنقیدی بصیرت، مطالعہ کی وسعت، ذہنی جودت اور تخلیق و تعبیر کی معنویت نے ان کو ایک متوازن نظریہ عطا کیا ہے، چنانچہ ان کا ہر ایک تنقیدی مضمون غیر جانبداری اور انصاف پسندی کی دلیل ہے۔ وہ ذاتی نظریات و تعصبات سے درگزر کرتے ہوئے ادب کی متحرک قوتوں کی پہچان کراتی ہیں نیز صحت مند تنقید اور اعلیٰ ادبی قدروں کو ان کا صحیح منصب دلانے میں انھیں یقیناً مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا تازہ تنقیدی مجموعہ "مہک اور محک" میں سترہ مضامین شامل ہیں۔ مصنفہ کے بقول "یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور مختلف سیمیناروں میں پیش ہوئے ہیں۔[۱۱]" یہ سیمیناروں میں پیش کیے جانے والے مضامین عام طور پر ایک دوسرے کی بازگشت، تکرار، اعادہ ـــ اور کسی حد تک سرسری پن سے بچ نہیں پاتے لیکن سیدہ جعفر صاحبہ کے یہ مضامین ان کے ذوق وجدان، مطالعہ کی سنجیدگی اور سلیم الطبعی کا مظہر ہیں۔ اپنی سوچ اور تازہ کاری کے سبب ایک نہایت خوشگوار فضا کی تعمیر کرتے ہیں۔ ان کے زیر نظر مجموعہ میں ایک طرف ان کے شعور کی محک، نے ادب کی مختلف جہات کو پرکھنے میں اعلیٰ معیار کو قائم کیا ہے تو دوسری طرف ندرت افکار کی مہک، نے انھیں شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلائی۔

"مہک اور محک" کا پہلا مضمون "اردو افسانے کی نئی جہت" کے عنوان سے ہے

اس مضمون میں ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اردو افسانے کے ارتقاء کا نہایت جامع انداز میں جائزہ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں بدلتی ہوئی قدروں کے نتیجہ میں مختلف رجحانات کی شمولیت اور عصری تقاضوں کے تناظر میں اردو کے افسانہ نگاروں کی تخلیقی رو کو بھی انھوں نے اپنے مضمون کی اساس بنایا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ :-

"نئے میلانات اور حیات و کائنات کے متعلق عصری آگہی نے ہمارے افسانے کو نئی بصیرت عطا کی ہے، لیکن یہ جدید میلانات پوری طرح ہمارے ادراک کا جزو، ہماری حسیت اور ادبی مزاج کا حصہ نہیں بن سکے ہیں۔ اس لیے ان سے ذہنی موانست کی کمی ان کی تفہیم و تحسین کی راہ میں حائل ہے۔" [۱۱]

تاہم سیدہ جعفر صاحبہ نے علامتی و تجریدی افسانے کا مطالعہ بھی پر خلوص انداز میں پیش کیا ہے اور جدیدیت کو معاصر حقیقت کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

داغ کے سلسلہ میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کا ایک عمدہ مضمون "تنقید اور انداز نظر" میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے داغ کی شاعری کے فنی نقوش کو تلاش کیا ہے۔ "مہک اور محک" میں شامل ان کا مضمون "داغ حیدر آباد میں" اپنے مواد اور پیش کش کے لحاظ سے تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ داغ کے حیدر آباد میں ورود اور وہاں ان کے قیام کی تفصیلات، تلاش و بصیرت اور شواہد و دلائل کے ساتھ موجود ہیں۔ سرکار آصفی میں داغ کے خطابات جیسی نئی معلومات و ریسرچ اسکالرز کے لیے نہایت کار آمد ہے۔

"مہک اور محک" میں اقبال کے وسیلے سے دو نئے مضمون "اقبال کا تصور فن" اور اقبال کی پیروڈی" ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نئی سوچ کا پتہ دیتے ہیں۔ اقبال کی فکر کے سینکڑوں مضامین اور کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان کے فن پر بھی بہت گفتگو ہوتی رہی ہے اور ہر بار یہ محسوس کیا جاتا رہا کہ شاید اب کچھ کہنے کو باقی نہیں ہے لیکن ہر بار جب بھی اقبال کے فکر و فن پر بات چھیڑی جاتی ہے تو نئے خیالات اور نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ اسے اقبال کی شاعری کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اقبال کے سلسلہ میں بیشتر مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت حال بھی کھلی کہ اقبال کے فن پر بات کرتے کرتے ہمارے ادبا اقبال کی فکر کے ساتھ اونچے اڑنے لگتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ اپنے موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کرپاتے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اپنے مضمون "اقبال کا تصور فن" میں اقبال کے ذہنی افق کے ان زاویوں کو تلاش کیا ہے جہاں فنون لطیفہ کے اجالے آب و گل کو نئی آب و تاب بخشنے کے لیے بیتاب نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر فرماتی ہیں کہ :-

"اقبال کی دانست میں فنون لطیفہ سستی تفریح، عارضی کیف و سرور اور وقتی ہیجان یا سطحی جذبات کی تسکین اور حظ آفرینی سے بالاتر ہیں۔"

"... انسانی خودی اور شخصیت کی تعمیر میں یہ ایک اہم رول ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ فنون لطیفہ مناظر و مظاہر میں الجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ انسانی دلوں تک اپنی رہ گزر بنا سکیں۔ [۱۲]

اقبال کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر سیدہ جعفر کا یہ قول نہایت بر محل اور معنی خیز ہے کہ :-

اقبال نے خود اپنے کلام میں لفظ پرستی سے گریز کیا ہے اور لفظ وبیان کے خوبصورت مرقعوں پر خیال کی تازگی اور ندرت فکر کو ترجیح دی ہے۔ [۱۳]

اس قول کی روشنی میں اقبال کی زبان پر اعتراض کرنے والوں کو شاید خود اپنی رائے پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی، اسی ذیل میں ان کا یہ دعوا بھی مناسب ہے کہ :-

اقبال کی بے مثل امیجری اور پیکر تراشی کا جواب اردو کے ان شاعروں کے یہاں بھی نہیں ملتا جنھوں نے شعر کے صوری حسن کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا تھا۔" [۱۴]

ثانی الذکر مضمون براہ راست اقبال کے فکر و فن سے رابطہ تو نہیں رکھتا لیکن یہ مضمون بھی ایک طرح سے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہی ہے کہ ان کے کلام پر مختلف شعرا نے مختلف انداز سے پیروڈی کی ہے اور اقبال کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر کا یہ مضمون کسی قدر سرسری اور تشنہ ہے لیکن بہرحال فکر و خیال کی ایک راہ کو بھی متعین کرتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داغ اور اقبال کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر طرازی نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کو اپنے دام میں گرفتار کر رکھا ہے۔بات یہ ہے کہ خود سیدہ جعفر صاحبہ تخلیقی اسلوب کی قائل ہیں، اس لیے وہ داغ، اقبال اور ابوالکلام آزاد پر مجبوری میں قلم نہیں اٹھاتی ہیں بلکہ ان کے فنی تصورات کے آئینے میں ان کے زور بیان اور ان کے اسلوب کی شگفتگی کو دیکھ کر مسحور ہو جاتی ہیں۔وہ داغ ہوں کہ اقبال کہ آزاد ــــ انھوں نے ادب کی جمالیات کو لفظی پیکر تراشی کی بدولت جو ہنر عطا کیا ہے، اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو!

"تنقید اور انداز نظر" میں ابوالکلام آزاد کے مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے ان کی انشا پردازی کے ان خوبصورت نقوش کو دریافت کیا تھا جن سے ابوالکلام، ابوالکلام کہلائے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بقول :-

"ابوالکلام آزاد نے اردو مضمون نگاری کو ایک خاص لب ولہجہ اور ایک منفرد آہنگ عطا کیا اور اپنے اسلوب کی ذاتی اور انفرادی لے سے اس صنف میں انشاپردازی کا ایک نیا پندار اور وقار پیدا کردیا۔

"مہک اور محک" میں "ابوالکلام آزاد کا اسلوب بیان" کے زیر عنوان پروفیسر سیّدہ جعفر کا ایک گرانقدر مضمون آزاد کی نثرنگاری اور ان کے انداز نگارش کو سمجھنے میں ممد ومعاون ثابت ہوا ہے۔ اس مضمون میں مصنف کے بقول "ان کے طرز تحریر کے مخصوص آہنگ اور منفرد خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے[13]۔" لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہیں کہ--- "ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان کا بنیادی وصف رنگا رنگی وبو قلمونی میں ہے[14]۔" ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس رنگا رنگی وبو قلمونی کو پرت در پرت الٹتی چلی جاتی ہیں' یہاں تک کہ مولانا آزاد کے اسلوب کی رنگینیوں اور جلوہ سامانیوں کے آئینہ خانے تک ہماری رسائی آسان ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی ذہانت اور عملی تنقید کا یہ ایک بیّن ثبوت ہے۔ انھوں نے خود مولانا کے نقطہ نظر کو بھی سامنے رکھا ہے اور اس کی "اصل تصویر اور رعنائی" کو بھی پالیا ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر کا خیال ہے کہ کسی فنکار کے اسلوب اور انداز نگارش کو سمجھنے کے لیے محض لفظی صنّاعی میں بھٹکنے یا عبارت آرائی میں الجھنے کی بجائے اس کی ذہنی ساخت' فنکارانہ شعور اجتماعی قدروں اور انفرادی شخصیت کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ آزاد کے اسلوب کی اصل تصویر اور رعنائی انھیں "غبار خاطر" میں جابجا نظر آتی ہے لیکن مضمون کے آخری حصہ میں جب وہ خطوط نگاری کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں تو اس حقیقت کو نظر انداز کرجاتی ہیں کہ "غبار خاطر" کو خطوط نگاری" کی صف میں نہیں رکھا جاسکتا۔

ابتدا میں اس جانب اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر تنقید کو تخلیقی ادب کی ایک شاخ متصور کرتی ہیں۔ چنانچہ "مہک اور محک" کے مطالعے سے قاری پر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی تنقید تخلیقیت کا لطف بھی لیے ہوئے ہے۔ چونکہ ان کی تنقید اپنے اندر ایک معنوی حسن رکھتی ہے' اس لیے اسے لفظی صناعی یا عبارت آرائی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اقبال کے فنی تصورات کی بات ہو کہ سراج' فیض' مخدوم اور وجد کے شاعرانہ مرثیے پر گفتگو ہو--- ڈاکٹر سیّدہ جعفر کا لہجہ پرخلوص اور اسلوب عالمانہ شان لیے ہوئے ہے۔ جہاں تک ان کی نظر انتخاب کا معاملہ ہے تو اقبال' فیض' مخدوم' اور احتشام حسین اور کرشن چندر جیسے شاعروں اور ادیبوں کو اپنی تنقید کا موضوع بنانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ادب میں

ابت کی قائل ہیں اور کسی حد تک "وابستگی" کو بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ سید احتشام حسین
ر آل احمد سرور غالباً ان کے پسندیدہ نقاد ہیں۔ انھوں نے ان دونوں ناقدین کے انداز نظر کو
ی خوش اسلوبی سے واضح کیا ہے اور ادبی تنقید میں ان کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ احتشام
سین کے تنقیدی مسلک پر ایک ناقد کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ :-

"تنقید کو ہمارے یہاں ابھی تک انشاپردازی اور عبارت آرائی کا تابع سمجھا جاتا ہے۔ ایسے تصورات کے حامل افراد تنقید میں نقاد کی شخصیت کا عکس تلاش کرتے اور بعض دوسری اصناف ادب کی طرح اس کو بھی ایک داخلی چیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اردو کی ایک نادر شخصیت نے احتشام حسین پر یہ اعتراض کیا تھا کہ احتشام حسین صاحب کی شخصیت اور ان کی نگارشات میں ہمیشہ ایک فاصلہ حائل ہوتا ہے۔' اس قسم کے لوگ نقاد سے یہ توقع کرتے ہیں کہ تنقید کے آئینے میں وہ صرف اپنا عکس دکھائے اور زیر بحث شاعر یا ادیب کو پس منظر میں جگہ دے لیکن حقیقی تنقید خود نمائی، جذباتیت اور نری داخلیت سے بلند ہوتی ہے۔" [۱۸]

مندرجہ بالا اقتباس سے خود ڈاکٹر سیّدہ جعفر کے تنقیدی اصولوں کی وضاحت ہوتی
ہے۔ احتشام صاحب کی تنقید نگاری کے سلسلہ میں وہ ایک موقع پر یہ بھی بیان دیتی ہیں کہ
تنقید میں نقطہ نظر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔" ادب اور تنقید میں چونکہ احتشام حسین ایک
ص نقطہ نظر رکھتے تھے اس لیے ڈاکٹر سیدہ جعفر اس نقطۂ نظر کو منور کرنے کے ساتھ ساتھ
سے ہمہ گیر معنویت کا آئینہ بھی دے دیتی ہیں۔ احتشام حسین کی تنقید نگاری کے جائزے
ں انھوں نے ان پہلوؤں کو مزید روشن کیا ہے جن سے احتشام حسین کی وقعت اور عظمت
ں اضافہ ہوا ہے۔

آل احمد سرور کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ انھوں نے "گزشتہ پانچ
ائیوں میں نہ کسی مخصوص نظریے کی حلقہ بگوشی کی اور نہ کسی ازم کو اپنے پاؤں کی زنجیر بننے
ا۔" اور "انھوں نے ادبی رویّوں کی کثرت میں وحدت کا جلوہ دیکھنے اور دکھانے کی کوشش
ں اور یہی انداز فکر تنقید میں ان کی پہچان اور شناخت بن گیا۔" سچ تو یہ ہے کہ اس مضمون
ں ڈاکٹر سیّدہ جعفر نے آل احمد سرور کی تنقید نگاری کا نہایت متوازن انداز میں محاکمہ کیا
ہے۔ جہاں ڈاکٹر سیّدہ جعفر، تنقید میں کسی مخصوص نظریے اور کسی حد تک وابستگی کو درست
سمجھتی ہیں وہیں وہ آل احمد سرور کی غیر وابستگی ان کے تنقیدی تصورات اور افکار کو ایک
صف مزاج ناقد کی طرح سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک طرف وہ آل احمد

سرور کی تنقید میں مغربی افکار کا اُجالا دیکھتی ہیں تو دوسری طرف وہ سرور صاحب کی تنقیدی بصیرت میں صالح اور مثبت روایات نیز توانا ادبی اقدار کا عکس بھی تلاش کرلیتی ہیں۔

ڈاکٹر سیّدہ جعفر کے نزدیک تقابلی تنقید اتنی آسان نہیں جتنا کہ لوگ اسے آسان سمجھ لیتے ہیں۔ اس میں "جانب داری" "کم نظری" اور "ذہنی تعصب" کا اندیشہ رہتا ہے۔ تنقید اور انداز نظر" میں انھوں نے اسی جانب اشارہ کیا ہے کہ :۔

"بعض نقاد تقابلی مطالعے کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ موازنے اور مقابلے کے ذریعے سے اپنی ادبی حقیقتوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ تقابلی مطالعے میں بعض دشواریاں ہوتی ہیں۔ تقابل کے تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا' ایمانداری اور خلوص کے ساتھ انہیں جانچنا اور پرکھنا اور پھر صحیح نتائج اخذ کرنا آسان نہیں ہے۔" [۲۱]

کم وبیش انھیں خیالات کا اظہار انھوں نے "مہک اور محک" میں بھی کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

"ہر ادب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے۔ اس کے انفرادی مسائل اور تصور فن ہوتا ہے اسی لیے تقابلی تنقید کے منصب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ اس میں جانبداری' کم نظری اور ذہنی تعصب سے بلند ہو کر احتساب کرنا پڑتا ہے۔" [۲۲]

ڈاکٹر سیّدہ جعفر آل احمد سرور کی قدرداں اس لیے بھی ہیں کہ انھوں نے تقابلی تنقید کو ایک معیار عطا کیا ہے۔ سرور صاحب کی تنقید' مغربی مفکرین کے حوالہ سے ہمارے ادب کو نہ صرف تابناک بناتی ہے بلکہ اسے فکر کی گیرائی اور گہرائی بھی بخشتی ہے۔

باعث طمانیت ہے کہ خود ڈاکٹر سیّدہ جعفر کے مضامین تقابلی تنقید کی اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ سرور صاحب کی طرح سیّدہ صاحبہ بھی مغربی مفکرین کے حوالوں کو بڑی خوبی سے اپنی تحریر میں استعمال کرتی ہیں تاہم وہ انھیں مغربی افکار کو اپنے خیالات کا زینہ بناتی ہیں جو ہمارے ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ان حوالوں کے تقابل سے خود ہمارے ادب کا وقار بلند ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے جہاں ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کی متوازن فکر اور صالح ادبی نظریے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی ذہنی تعصب میں مبتلا ہوئے بغیر ادب کی نمو پذیری اور اس کے نامیاتی کردار کی حمایت کرتی ہیں۔ لہٰذا یہ برملا کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر سیّدہ جعفر کی تنقید توانا ادبی اقدار اور مثبت نظریات کے باعث اپنے ہم عصر ناقدوں کے مابین ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ ندرت فکر اور تنوع کے اعتبار سے بھی ان کے تنقیدی مضامین اپنی جداگانہ شان رکھتے ہیں۔ دیانتدارانہ عمل'

غیر متعصبانہ احتساب اور پرخلوص انداز نے ان کے وقار میں اضافہ کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا نہ تھکنے والا قلم ذہن و فکر کے ہفت خواں ایک ہی جست میں طے کرلینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر اتنی رواں دواں اور خیالات کا بہاؤ اتنا صاف اور شستہ ہے کہ جیسے تیز رو کشتی سطح سمندر کو چیرتی ہوئی اپنی منزلوں کی طرف بڑھی چلی جارہی ہے اور وسعتیں اور بلندیاں اس کے احترام میں سربسجدہ ہوئی جاتی ہیں۔

اردو کے ہم عصر ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے ایوان میں ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کے نام کی شمعیں روشن ہیں کہ جن کی تابانی اور روشنی نے اردو تنقید کو تعصب کے اندھیروں سے بچائے رکھا ہے اور عالمی تناظر میں اردو کے وقار کو بحال کیا ہے۔

حوالہ :-

۱-۲ پرکھ اور پہچان از ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۳۵۵

۳- دیکھیے پیش لفظ مہک اور محک از ڈاکٹر سیدہ جعفر، ص ۷ اور ۸

۴-۵-۶- تنقید اور انداز نظر از ڈاکٹر سیدہ جعفر، ص ۶

۹- مہک اور محک ص ۷

۱۰- ایضاً ص ۸

۱۱-۱۲-۱۳-۱۴- ایضاً صفحات حسب ترتیب ۱۴، ۵۳، ۲۰

۱۵- تنقید اور انداز نظر، ص ۲۳۰

۱۶-۱۷ مہک اور محک ص ۲۱۸

۱۸- ایضاً، ۳۱-۳۲

۱۹-۲۰ ایضاً ص ۱۹۰

۲۱- تنقید اور انداز نظر ص ۲۹

۲۲- مہک اور محک ص ۱۴۳-۱۴۴

مجتبیٰ حسین
۲۰۰-انگور اپارٹمنٹس
پٹ پڑ گنج۔ نئی دہلی ۹۲

کچھ استاد محمود مرزا کے بارے

دھرپد دھمار، ٹھمری خیال، دادرا اور بھیرویں نہ جانے یہ سب کیا ہیں۔ اگر راگ ہیں تو کیسے راگ ہیں؟ کیوں ہیں؟ کیسے گائے جاتے ہیں اور کب گائے جاتے ہیں؟ یہی نہیں ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تان پورہ، طنبورہ، ستار، وینا، سنتور، اور سرود میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ہمیں تو یہ سب ایک ہی طرح کے ساز لگتے ہیں۔ غرض موسیقی کے بارے میں ہمارے سامنے کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجانا۔ بھینس کا معاملہ تو پھر بھی دوسرا ہے کہ اگر کوئی راگ اس کی سمجھ میں نہ آئے تو وہ جگالی ہی کرتی رہ جائے گی۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ان سازوں کو سن کر جگالی تک نہیں کر سکتے۔ ویسے ہندستانی موسیقی کے کلاکاروں کے ریاض اور بھینس کی جگالی میں بھی ہمیں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہی کام کو ایک لمبے عرصے تک بلاوجہ اور متواتر انجام دینا ہوتا ہے۔ بھینس کی جگالی تو خیر پھر بھی قابل قبول ہے کہ اس سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی جبکہ موسیقار کا ریاض الامان والحفیظ۔ سوچنا پڑتا ہے کہ خدا نے کسی کو اچھی آواز عطا کی، سریلا گلا دیا بہت اچھا کیا لیکن ہم جیسوں کو کان عطا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مبادا یہ نہیں سمجھے کہ ہم موسیقی کے مخالف ہیں۔ بلکہ آج جو ہم یہ مثالی صحت رکھتے ہیں تو اس کا سبب موسیقی ہی ہے۔ یہ بھی نہ سمجھے کہ موسیقی سننے سے آدمی کی صحت بہتر ہو جاتی ہے۔ ہماری صحت کا اصل راز یہ ہے کہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں ہم ایک ایسے گھر میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں کلاسیکی موسیقی کے ایک نامی گرامی استاد رہا کرتے تھے۔ علی الصباح جونہی وہ ریاض کی خاطر راگ الاپنا شروع کرتے تھے تو ہم بے ساختہ گھر سے باہر نکل جاتے تھے اور اس وقت تک چہل قدمی کرتے رہتے تھے جب تک کہ ان کا ریاض ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ ہماری یہ علی الصباح جاگنے کی عادت اور لگاتار چہل قدمی کرنے کی یہ لت ان ہی دنوں کی یادگار ہے۔ موسیقی تو خیر ہماری سمجھ میں نہیں آئی البتہ دیکھتے ہی دیکھتے صحت بہتر ہوتی چلی گئی۔ گویا کلاسیکی موسیقی سے ہماری صحت کا تعلق نہایت گہرا ہے۔ یوں بھی ہم ہمیشہ سے بُری صحبت اور اچھی صحت کے قائل رہے ہیں۔

یاد ش بخیر بہت عرصہ پہلے ایک دوست کے اصرار پر کلاسیکی موسیقی کے ایک پروگرام میں ہمیں شرکت کرنے کا موقع ملا تھا۔ ہمارے سامنے ایک نوجوان جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا۔ گلوکار

دئی پکا گانا گا رہا تھا اور اپنے فن کی اس معراج پر پہنچ چکا تھا جہاں راگ الاپنے اور پانی کے غرارے
رنے میں بہت کم فرق باقی رہ جاتا ہے۔ ماہرین موسیقی کہتے ہیں کہ راگ کا یہ نہایت تخلیقی لمحہ
وتا ہے۔ نوجوان غالباً اپنی کم علمی اور کوتاہی کی وجہ سے ان لگاتار غراروں سے تنگ آچکا تھا۔ لہٰذا
س نے لڑکی کی توجہ ان غراروں سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کرانے کی خاطر اس کے حسن کی
عریف شروع کردی مگر راگ کے طوفانی شور میں لڑکی کو کچھ نہ سنائی دیا۔ اس پر لڑکی نے کہا۔ "
س گلوکار کے بیہودہ شور کی وجہ سے میں تمھاری اچھی باتیں سن نہیں سکتی۔ چلو باہر چلتے ہیں۔"

اب یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ موسیقی سے اس قدر نابلد ہونے کے باوجود ہماری
وستی استاد محمود مرزا سے ہے جو ستار نوازی کے معاملہ میں عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ ستار کی
نیا میں وہ نہایت اونچے درجے کے ستار نواز سمجھے جاتے ہیں۔ استاد محمود مرزا سے ہماری ملاقات
س برس پہلے اس وقت ہوئی تھی جب وہ لندن سے دہلی آئے ہوئے تھے۔ (جو وہ ہر سال آتے
ہتے ہیں) محمود مرزا پچھلے ۲۷ برسوں سے لندن میں مقیم ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ بارہ
رس پہلے جب ہمیں لندن میں ڈیڑھ مہینہ قیام کرنے کا موقع ملا تھا تو یہ اپنا ستار اٹھا کر روم میں
ئی پروگرام پیش کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ اس پر ہم نے بعد کی ایک ملاقات میں ان سے
ما تھا کہ جب لندن ہماری آمد کی وجہ سے جل رہا تھا تو آپ روم میں ستار بجا رہے تھے۔ ظاہر ہے
ہ ہم نے اس شہرۂ آفاق کہاوت کی تحریف کی تھی جس کے مطابق جب روم جل رہا تھا تو نیرو
سری بجا رہا تھا۔ یوں بھی موسیقی اور آگ لگانے کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ میاں تان سین کے
رے میں تو یہاں تک مشہور ہے کہ وہ ماچس کا سہارا لیے بغیر اپنے دیپک راگ کی مدد سے
راغوں کو جلا دیا کرتے تھے کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اکثر لوگ نظریں بچا کر میاں
ان سین کے دیپک راگ سے اپنی بیڑیاں تک جلا لیتے تھے۔

موسیقی کے فن سے ہماری اس گہری عدم واقفیت کے باوجود محمود مرزا سے ہماری
دستی کا یہ عالم ہے کہ جب بھی وہ سال میں ایک مرتبہ ہندستان آتے ہیں تو ان کا زیادہ تر وقت
مارے ساتھ اور ہمارا زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گزرتا ہے۔ محمود مرزا خالصتاً دہلی والے ہیں۔
ہلی کے مخصوص رکھ رکھاؤ اور اس کی تہذیب کے پروردہ پچھلے پچیس برسوں میں ہمیں خود دہلی
یں کوئی خالص دہلی والا نہیں ملا۔ ایک محمود مرزا ملے تو وہ بھی لندن میں رہتے ہیں۔ یورپ میں
ن کی بڑی دھاک ہے۔ جگہ جگہ ان کے کنسرٹ ہوتے رہتے ہیں اور خوش جمالوں کا ایک جم
غفیر ہمیشہ ان کی شاگردی میں رہتا ہے۔ برطانیہ کی دو ایک یونی ورسٹیوں میں بھی وہ ہندستانی
موسیقی کے استاد رہ چکے ہیں۔ محمود مرزا کے لیے موسیقی نہ صرف ایک شوق ہے بلکہ مقصد
حیات بھی ہے۔ محمود مرزا نے (جن کی عمر اب ساٹھ برس کی ہو چکی ہے) چھے سال کی عمر میں

انھوں نے عوام کے سامنے اپنے پروگرام پیش کرنا شروع کر دیے تھے اور آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ محمود مرزا ابھی تیرہ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ آل انڈیا ریڈیو کے مسلّمہ فن کار بن چکے تھے۔ اتنی کمسنی میں آل انڈیا ریڈیو کا مسلّمہ فن کار بن جانا قیامت ہے۔ وہ جب تک ہندستان میں رہے اپنے فن کے ذریعہ عوام میں دھوم مچاتے رہے۔ حکومت کی جانب سے بیرونی ممالک کو بھیجے جانے والے موسیقاروں کے وفود میں بھی وہ شامل رہے لیکن ایسے ہی ایک بیرونی دورے میں ان کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ خوش جمالوں اور خوش خصالوں کے شہر لندن میں آباد ہو گئے۔ پچھلے ۲۷ برسوں سے وہ لندن میں رہتے ہیں اور سال میں ایک دو مہینوں کے لیے ہندستان ضرور آجاتے ہیں۔ تاکہ اپنے ملک کی جڑوں کے علاوہ اس کی جڑی بوٹیوں سے بھی ان کا تعلق بنا رہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم ستار نواز محمود مرزا کو بالکل نہیں جانتے۔ ہم تو اس محمود مرزا کو جانتے ہیں جو ایک شخص ہے ہم اکثر مذاق میں ان سے کہتے رہتے ہیں کہ مرزا صاحب آپ ستار نواز نہیں ہیں بلکہ خود ایک ستار ہیں۔ ایک ایسا ستار جس کی ذات میں انسانیت، محبت، اخوت، خلوص دوستی، شائستگی اور اعلا ظرفی کے ساتوں تار کچھ اس طرح ٹھنا ٹھن تنے ہوئے ہیں کہ کبھی کسی تار کو وقت بے وقت اور بلاوجہ کسنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ (آپ نے دیکھا ہوگا کہ ستار نواز جب کوئی راگ بھول جاتا ہے یا ٹھیک سے بجا نہیں پاتا تو ایک انجان سی خود اعتمادی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک پشیمانی کے جذبہ کے تحت ستار کے کسی نہ کسی تار کو خواہ مخواہ ہی کسنا شروع کر دیتا ہے) محمود مرزا ہمیں اس لیے پسند ہیں کہ ان میں روایتی موسیقاروں کا سا کوئی بھی تصنع نہیں ہے۔ نہ بیجا فخر ہے نہ بیجا غرور۔ حد تو یہ ہے کہ وہ لباس میں بھی موسیقاروں کا سا نہیں پہنتے۔ ہمیشہ سوٹ بوٹ یا عصری لباس میں ملبوس ہوں گے۔ ہمارے بعض موسیقار کچھ ایسا حلیہ بنائے رکھتے ہیں اور کچھ اس طرح کے کپڑے زیب تن کرتے ہیں کہ بسا اوقات تو ان کی جنس تک مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ نہایت باذوق اور پڑھے لکھے آدمی ہیں انگریزی اور اردو زبان و ادب پر انھیں گہرا عبور حاصل ہے۔ لندن سے جب بھی ہمیں یہ کبھی اردو اور کبھی انگریزی میں خط لکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑنے کے لیے نہیں بلکہ قلم کو پکڑنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ (مگر کیا کریں ان کے ماموں استاد حیدر حسین خاں جو بیچ میں آگئے تھے) ادب، آرٹ، موسیقی اور کلچر کے جدید ترین رجحانات سے وہ جتنا واقف ہیں اتنا تو ہم بھی واقف نہیں ہیں اور ہم بھی کیا ہیں۔

محمود مرزا نے یورپ کے خوش جمالوں کے بیچ رہنے کے باوجود شادی نہیں کی۔ ایک اعتبار سے یہ اچھا ہی کیا۔ کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر موسیقار خود اپنی ہی اولاد کے ساتھ تیموں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ ابھی اولاد چار پانچ برس کی بھی نہیں ہو پاتی کہ اسے زبردستی

موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بٹھا دیتے ہیں۔ یہ اولاد موسیقی کی تعلیم تو حاصل کر لیتی ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ گلی ڈنڈا کیسے کھیلا جاتا ہے اور آنکھ مچولی کھیلنے اور وہ بھی لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے میں کتنا لطف آتا ہے۔ ہمیں تو خود محمود مرزا پر ترس آتا ہے کہ چھے برس کی عمر میں ہی وہ پانچ فٹ لمبے ستار کو گود میں لے کر بیٹھ گئے تھے۔ ہاتھ کی انگلیاں بھی اتنی چھوٹی تھیں کہ ساتوں تاروں تک نہیں پہنچ پاتی تھیں لہٰذا ستار کے تاروں کو کسنے کی بجائے ان کی انگلیوں کو کسنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ غرض اولاد کو پیدا نہ کر کے محمود مرزا نے اپنی اولاد کے لیے جس پیار اور محبت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ایسے سعادت مند والدین اب کہاں پیدا ہوتے ہیں جو اولاد ہی کو نہ پیدا کریں۔

محمود مرزا بات بھی بڑے پتے کی کرتے ہیں۔ ایک دن ہم نے پوچھا کہ ایک زمانہ میں مغرب میں ہندستانی کلاسیکی موسیقی کا بڑا شہرہ تھا۔ ہر کوئی اسے سیکھنے کو دوڑتا تھا۔ اب کیا حال ہے؟ بولے "یہ شوق تو صرف شکار کو پھانسنے کی خاطر ڈالے جانے والے دانہ کی تعریف میں آتا تھا۔ اس شوق کے زیر اثر ہندستانی ماہرین موسیقی جوق در جوق مغرب میں جا آباد ہوئے۔ کچھ عرصے تک مغرب اور مشرق کے درمیان موسیقی کا یہ دو طرفہ ٹریفک جاری رہا لیکن رفتہ رفتہ اس آمد و رفت کی وجہ سے خود ہندستانی موسیقی مغربی موسیقی کے زیر اثر آتی چلی گئی۔ چنانچہ آپ ہندستانی فلموں کی موسیقی کو دیکھیے کہ اب اس میں کتنی مشرقیت باقی رہ گئی ہے سیاسی سامراجیت بھلے ہی ختم ہو گئی ہو لیکن مغرب کے کلچر کی سامراجیت تو اب شروع ہوئی ہے۔"

محمود مرزا کی دوستی ہمارے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے اور ان کے بارے میں اگر ہم کچھ لکھنے پر آئیں تو دفتر کے دفتر لکھ دیں۔ لہٰذا ہمارے تھوڑے لکھے کو بہت جانیے اور ہو سکے تو اُسے ذہن میں اندارج کر لیجیے۔ چلتے چلتے ایک بات اور سن لیں۔ ایک دن ہم نے محمود مرزا سے کہا کہ قبلہ مغرب میں موسیقی کو لکھنے کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن ہمارے ہاں اب تک موسیقی سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے۔ اسے لکھنے کی صورت کیوں نہیں نکالی جاتی۔ بڑی بے ساختگی کے ساتھ معصوم سی صورت بنا کر بولے "لکھی تو جا سکتی ہے لیکن کس رسم خط میں۔ فارسی یا دیوناگری میں؟ پھر لکھنے کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس میں کتابت کی غلطی کا اندیشہ بھی تو لگا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں تو آپ جیسے ادیب بھی اپنی ذاتی غلطیوں کو کاتب کی غلطی کے کھاتہ میں ڈال کر باعزت بری ہو جاتے ہیں۔"

محمود مرزا کی بذلہ سنجی، خوش مذاقی اور حاضر جوابی کے بارے میں پھر کبھی لکھیں گے پہلے وہ ہندستان سے جائیں تو سہی۔

طاہر حسین صدیقی
1808 J STREET
SACRAME NTO
CA95814_3010

انا

کہتے ہیں کہ ایک وحشی نے جنگل میں کہیں ایک آئینہ پڑا پایا' گرد آلود تھا' رگڑ کر اس کو صاف کیا' چمکدار نکل آیا بہت خوش ہوا' لیکن جب اس کو شکل نظر آئی تو غصہ میں آکر اس کو زمین پر پٹک دیا اور کہنے لگا" اُفوہ! کس قدر بری تصویر ہے جب ہی تو کوئی اسے یہاں پھینک گیا ہے۔ اگر کسی صاحب کو اس مضمون میں کوئی ایسی ہی تصویر نظر آجائے تو آئینہ کی طرح اس میں مصنف کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بس بقول غالب یہی سمجھ لیجیے گا۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

....

انا ایک عربی لفظ ہے جو واحد متکلم کے لیے استعمال ہو تا ہے' انگریزی میں اس کو I لاطینی میں ego اور بہ زبان اردو "میں" کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا سہ حرفی لفظ ہے' جس کی ابتداء بھی الف ہے اور انتہا بھی الف' اول بھی الف اور آخر بھی الف' ازل اس کے پیچھے ابد سامنے۔ مگر الف تو ایک سیدھا سادا حروف تہجی کا پہلا حرف ہے۔ نہایت ملنسار' مرنجان مرنج' ہر ایک سے مل جاتا ہے لیکن معلوم نہیں نون کے ساتھ مل کر اس کی ہیئت میں کیا تبدیلی آجاتی ہے۔ درد کے بارے میں ایک شاعر نے کہا تھا اس کو جس پہلو سے اٹھو درد ہے۔ درد کے لیے لفظ پہلو کے استعمال سے تو ایک قسم کی صنعت پیدا ہو گئی کیوں کہ اگر درد ہو تو کسی پہلو چین نہیں پڑتا۔ انا بھی الٹنے سے حالاں کہ انا ہی رہتی ہے لیکن اس کے لیے پہلو کا لفظ مناسب نہیں ہے کیوں کہ انا پہلو میں نہیں ہوتی، انا تو سامنے ہوتی ہے۔

بے دھڑک علی الاعلان خم ٹھونک کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور للکار کر کہتی ہے۔
ہم سا ہو تو سامنے آئے!

پھر انا میں یہ تبدیلی کہاں سے آگئی۔ الف کے ساتھ ایک حرف نون ہی تو ملایا گیا ہے کہ نئی تیزی آگئی، اور نون بھی صرف ایک نقطہ والا مگر واہ رے تیزی کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ معلوم ہوتا ہے یہ ساری خرابی نون ہی کی ہے اور نون بھی ناک والا، مکھی کاہے کو بیٹھنے دے گا!

ناک والوں کی انا بھی بڑی ہوتی ہے، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، ناک میں دم کرتے ہیں اور ناک چنے چبواتے ہیں بلکہ ناک تک رگڑواتے ہیں۔ انا بڑی ہونے کے لیے نہ تو انسانی ناک کا بڑا ہونا ضروری ہے اور نہ انسانی جسم کا۔ وہ ناک جس سے انا بڑی ہوتی ہے وہ دوسرے قسم کی ناک ہے، بلکہ حقیقتاً انا ہی کا دوسرا نام ناک ہے اور یہ ناک کبھی کبھی کٹ بھی جاتی ہے اور اگر کٹ جائے تو ناک کٹنے والے کو نکٹا نہیں کہتے، بلکہ اس کی ناک اور بڑی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ کبھی کبھی ناک کا بال بننے کی کوشش بھی کرتے ہیں!

نون سے ایک اور لفظ نفس بھی ہوتا ہے اور نفس کو سانس بھی کہتے ہیں۔ نوری یا ناری کا ذکر نہیں، اس خاکی انسان کی زندگی سانس ہی سے قائم ہے۔ جب وہ سانس لیتا ہے تو بقول شیخ سعدی ہر اندر جانے والا سانس اس کے لیے مدِ حیات یعنی زندگی بڑھانے والا اور ہر باہر آنے والا سانس مفرّح ذات یعنی فرحت دینے والا ہو جاتا ہے۔ صوفیائے کرام نے نفس کو مارنے کی بہت تلقین کی ہے۔ بقول ذوق ؎

نہ مارا آپ کو جو خاک سے اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

یہاں آپ سے مراد آپ (واحد مخاطب) بلکہ اپنا نفس مراد ہے۔ اپنے آپ یا اپنے تئیں مارنے سے اپنے نفس کو مارنا مقصود ہے، خودکشی کی تلقین نہیں۔ آپ، میں، انا، نفس سب ایک ہی جذبہ کے مظاہر ہیں۔ خواجہ میر درد نے بھی ,آپ، کا استعمال انہی معنوں میں اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

پہونچا جو آپ کو تو میں پہونچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

یہ شعر تقریباً اس حدیث شریف کا ترجمہ ہے من عرف نفسہ، فقد عرف ربہٗ اگر اپنے آپ کو پہچان لیا تو خدا تک پہنچ گئے۔

ہمارے یہاں لوگ دوسروں کو پہچاننے کا دعوا کرتے ہیں لیکن چکر ساری عمر اپنے ہی چاروں طرف لگاتے رہتے ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو نہیں پہچانتے۔ کولھو کے بیل کی طرح جو ہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ تیل خواہ دوسروں کا نکالیں یا اپنا!

نون سے ایک اور لفظ "نام" بھی ہے جس کی خاطر ہم سب پاپڑ بیلتے ہیں حالاں کہ پاپڑ بھی ایک نام ہی ہے لیکن ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ ایک صفت مشترک ہو سکتی ہے اگر نام کرارا ہو۔ پاپڑ (Hapur) کے بہت مشہور تھے اور کرارے بھی ہوتے تھے۔ اتنے کرارے کہ مرحوم شوکت تھانوی نے اسی قدر مشترک کے حوالے سے ہاپڑ کی وجہ شہرت بھی بتائی تھی کہ ہاپڑ کی دو ہی چیزیں مشہور ہیں' ایک تو پاپڑ اور دوسرے مولوی عبدالحق اور دونوں ابھی تک کرارے ہیں۔ پاپڑ کے بارے میں تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا' لیکن مولانا مرحوم آخر وقت تک کرارے ہی رہے گفتار میں بھی اور کردار میں بھی!

نام میں اگر نمود کی بھی آمیزش ہو تو کیا کہنا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نام اور نمود کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایسے نام سے کیا فائدہ جس میں نمود' ناز' نخرہ نمایاں نہ ہو اور اس کی نمایش نہ کی جائے' ایسا نام زندگی بھر کا ناسور بن جاتا ہے اس لیے ایسے نام کو نمدہ میں لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے' کیوں کہ یہ سب نون ہی سے شروع ہوتے ہیں!

نام کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو پیدایش کے وقت ماں باپ رکھ دیتے ہیں۔ ایک وہ نام ہے جو پیدا ہونے کے بعد انسان خود پیدا کرتا ہے۔ ایک نام اور بھی ہے جو دوسرے لوگ دھرتے ہیں یا رکھ دیتے ہیں۔ کچھ لوگ نام پا جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا نام پڑ جاتا ہے' کچھ لوگ نام ڈبو دیتے ہیں اور کچھ روشن کرتے ہیں اور نام پر حرف نہیں آنے دیتے۔ کچھ لوگوں کا نام تو بڑا ہوتا ہے لیکن درشن چھوٹے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کا قد بڑا اور نام چھوٹا ہوتا ہے، کچھ لوگ نام کے پیچھے اس قدر پڑتے ہیں کہ بدنام ہو جاتے ہیں بقول شاعر ۔

نام کے پیچھے پڑے تھے کس قدر
ہو گئے بدنام پیچھے نام کے

ویسے نام سب اچھے ہوتے ہیں۔ آخر نام میں دھرا ہی کیا ہے۔ گلاب تو گلاب ہی رہے گا خواہ آپ اسے کسی نام سے پکاریں، اس کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ خواہ اس کا آپ

....

۱؎ ہاپڑ Hapur میرٹھ کے قریب ایک شہر ہے وہی میرٹھ جہاں سے ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ابتداء ہوئی تھی۔

عرق گلاب بنائیں یا گلقند!

اصل میں ساری خرابی لوگوں کی ہے۔ وہ خراب ہوتے ہیں تو نام بھی خراب ہو جاتا ہے بلکہ کسی ایک شخص یا چند اشخاص کی وجہ سے بعض ناموں کے ساتھ کچھ صفات ہو جاتی ہیں کہ صفت سے موصوف اور موصوف سے صفت خود بہ خود ذہن میں آجاتی ہے، مثلاً اگر چند دوست بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف ہوں تو لطیفوں کے ساتھ ایک مخصوص علاقہ کے کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ حالاں کہ یہ سراسر ان پر تہمت ہے!

ایک نام وہ بھی ہے جو بے ننگ و نام ہوتا ہے' مثلاً غالب نے کہا تھا۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

معلوم نہیں غالب کو کس نے بے ننگ و نامی کا طعنہ دیا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے' ورنہ ان کو اور ان کی شرافت اور نجابت کو کون نہیں جانتا تھا۔ اگر آپ ان کو بہ حیثیت شاعر نہیں بھی جاننا چاہتے تو نہ جانیں' وہ تو خود شاعری کو اپنے لیے ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے۔ سو پشت سے آبا کا پیشہ سپہ گری ہوتے ہوئے انھیں اور کسی واسطے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر شخص ان کو جانتا تھا، حد تو یہ ہے کہ ان کو خط بھیجنے کے لیے پتے تک کی ضرورت نہیں تھی۔ خود فرماتے ہیں کہ بس غالب اور دہلی لکھ دو خط مجھ کو مل جائے گا۔ پھر بھی لوگ ان سے ان کے بارے میں پوچھتے ہی رہتے تھے لیکن وہ ٹھہرے فلسفی، جواب کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے ؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اب بولیے ؟ احمقانہ سوال کرو گے تو ایسا ہی جواب ملے گا!

علامہ اقبال سے بھی ایک بزرگ نے کچھ ایسا ہی سوال کیا تھا۔ انھوں نے فلسفہ اور تصوف میں ڈوبا ہوا جواب دے کر ان سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے!

آپ ہی بتایئے کون ہے جو اپنے آپ سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اور جو آگاہ ہو جاتا ہے وہ خدا کے تئیں پہنچ جاتا ہے۔

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

نام کے ساتھ ننگ بھی نون ہی سے ہوتا ہے لیکن یہ عجیب لفظ ہے کہ ننگ ونام اور ننگ وناموس میں تو عزت و آبرو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن ننگِ خاندان، ننگِ خلائق، ننگِ اسلاف میں باعث شرم کے لیے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر کون نہیں جانتا ~

ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
جعفر از بنگال و صادق از دکن

اسی کو کہتے ہیں اگر ~ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!

فانی بدایونی، اپنا وطن عزیز چھوڑ کر حیدر آباد دکن چلے گئے تھے۔ لیکن رہے تمام عمر غیر ملکی ہی، تنگ آکر یہی کہنا پڑا ~

فانی ہم تو جیتے جی اک میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

بقول غالب گھر کو آگ بھی لگائی اور بے ننگ ونامی کا طعنہ بھی سہنا پڑا تو پھر اگر کوئی تنگ نظر آپ پر بھی، بھارتی بھیا، کی پھبتی کسے تو پھر آپ کیا کہہ سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ علامہ اقبال کا اعتراف خود ان ہی کی زبان میں معترض کو سنا دیں ~

کافر ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میری رگ و پے میں ہے

اور جب اللہ ہو کا نغمہ رگ و پے میں سمایا ہو تو کون اپنے ہوش میں رہ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ایسے معترضین کو یہ خیالات و جذبات سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اگر یہ توفیق ان کی قسمت میں نہ ہو تو ان کو دو چلو پانی ہی میسر فرمادے۔ ہمارے ایک دوست ایسے موقعوں پر کہا کرتے تھے کہ اگر آپ لوگوں کا جی چاہے تو آمین کہہ دیں۔ میری بھی آپ سے یہی درخواست ہے!

نون سے نسل بھی ہوتی ہے اور نسل سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ دنیا کے سارے جھگڑے اسی نسل کی بدولت ہیں۔ نسل پرستی ممنوع ہے لیکن سب نسل پرست ہیں اور ممنوع کا اعلان کرنے کے بعد بھی نسل پرستی کرتے ہیں۔ عدم تشدد کے ایک دیوتا کہا کرتے تھے کہ جنگ میں حصہ لو، جنگ ختم کرنے کے لیے۔ ہوئی نا یہ بات، لوہے سے لوہا کاٹنے والی۔ زمانہ قدیم میں علاج کے دو طریقے بتائے گئے تھے۔ ایک علاج بالمثل اور دوسرا

علاج بالضد۔ یعنی گرمی کا علاج گرمی سے یا گرمی کا علاج سردی سے۔ اس کے بعد زمانہ آیا علاج بالعضو کا لیکن آج کل تو علاج بالغذا کا طریقہ رائج ہے، جو عضو خراب ہو اس کی جگہ دوسرا عضو لگا دو۔

لو بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اور اگر بازار سے نہ ملے تو کسی آدمی کو مار کر (یا شاید ایکسیڈنٹ کر کے) اس کے عضو یا اعضاء مریض کے فٹ کر دو کیوں کہ اگر چہ سب انسان برابر ہیں لیکن ان میں سے کچھ انسان زیادہ برابر ہوتے ہیں اور کچھ نسلیں ان سے بھی زیادہ برابر۔ بات چوں کہ ذات اور نسل کی چل نکلی ہے تو پھر یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ کچھ کم ذاتیں بھی ہوتی ہیں اور کچھ شریف ذاتیں۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ذات شریف بھی ہوتے ہیں۔ اصل میں ایسے لوگ بدذات ہوتے ہیں اور دوسروں کو کم ذات بنا کر ذات شریف بن جاتے ہیں اور موقع محل کے لحاظ سے ذات بدلتے رہتے ہیں ۔

اولا ندّاف بودم دو ئمش گشتیم شیخ

غلہ چوں ارزاں شود امسال سیدمی شوم

رہا مسئلہ حقوق انسانی یا human rights کا تو وہ صرف humans یا انسانوں کا مسئلہ ہے۔ جو لوگ انسان ہی نہیں ہیں ان پر اس کا اطلاق کرنا بالکل غیر انسانی اور نادانی فعل ہے۔ ایسے لوگوں کے صرف حیوانی اعضاء ہی لگائے جا سکتے ہیں!

اگر آپ انا کی ہیئت ترکیبی پر غور کریں تو یہ "انا=ا+نا،، کی مساوات نظر آتی ہے۔ الف جو اکیلا اور یکہ و تنہا ہے وہ تو مخصوص ہے اپنی ذات یا اپنے نفس کے لیے۔ باقی رہی ,,نا" تو وہ ہے کلمۂ نفی۔ مجید لاہوری مرحوم نے یو این او کے بارے میں کہا تھا

یو این او میں "یو" ہے "یو ایس اے" کا باقی نو ہی نو

یہی حال انا کا بھی ہے۔ اس میں الف تو اپنی ذات کے لیے ہے۔ باقی نا ہے نفی' ہر چیز کی نفی سوائے اپنی ذات کے 'کسی کی کتنی ہی قابلیت یا اہلیت ہو' صاحب انا کو وہ سب نا قابلیت اور نا اہلیت ہی نظر آتی ہے۔ اپنے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں 'اپنی خوبی کے سامنے ساری خوبیاں ہیچ ہیں۔ تو بہ کیجیے جو اپنی کوئی برائی نظر آئے ۔

آج مجھ سا نہیں زمانے میں

شاعر نغز گوئے خوش گفتار

اس کو تو آپ شاید شاعرانہ تعلّی کہہ کر معاف کر دیں لیکن جولیس سیزر صاحب تو شاعر

نہیں تھے۔ انھوں نے جو فرمایا تھا کہ I am the monarch of all I surve ا تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے کہیں اس کو شاہانہ تعلّی کے زمرہ میں نہ ڈال دیجیے گا!

انا کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ وہ نئے نئے ہدف اور ان کو حاصل کرنے کے لیے نئے نئے راستے تلاش کرتی رہتی ہے۔ کبھی کسی کے رنگ و نسل کو نشانہ بناتی ہے کبھی وطن اور پیشوں کو، محفوظ اگر کوئی ہے تو صاحب انا کی خود اپنی ذات اپنا رنگ 'اپنا پیشہ اور اپنا کردار' لیکن یہ انا خود صاحب انا کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنے کی طرف راغب نہیں کرتی البتہ دوسروں کے تہہ خانوں سے گڑے مردے اکھاڑ کر لاتی ہے۔ تہمتوں کی تھالی میں مکر کے سینڈوچوں پر افترا کی چٹنی ڈال کر دوسروں کو پیش کرتی ہے اور اس کے عوض دوستوں اور قوم سے داد وصول کرتی ہے۔ اس سے صاحب انا کا ضمیر مردہ اور نفس پھول کر کپا ہو جاتا ہے!

انا کبھی صاحب انا کو غلطی تسلیم کرنے نہیں دیتی بلکہ اس کو اپنی غلطی کی عجیب توجیہیں کرنے پر اکساتی ہے۔ اگر کبھی کسی محفل میں کسی صاحب انا کے غلط خیالات کے اظہار پر ان سے اختلاف کیا جائے تو خالص انگریزی زبان میں فرمائیں گے Iwas thinking a loud یعنی میں تو صرف سوچ رہا تھا۔ سہواً زبان سے نکل گیا۔ یا سوچ صحیح تھی بات غلط تھی یا بغیر سوچے سمجھے کہہ گیا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی مطلب ہو۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی:

یہ کبھی نہیں فرمائیں گے۔ "آپ کا خیال درست ہے، میری نگاہ سے یہ نکتہ پوشیدہ تھا جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی شکریہ۔"

بڑے لیڈروں کا قول اگر ان کو جتایا جائے تو جواباً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ out of contact ہے یعنی یہ بات سیاق و سباق سے علاحدہ کر کے پیش کی گئی ہے۔ یعنی یہ بات انھوں نے کہی تو ضرور تھی (کیوں کہ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ بھی نہیں) لیکن کسی اور سلسلہ میں یا یہ کہ ان کا یہ مطلب نہیں تھا یا یہ کہ اس سلسلہ کی فلاں بات رہ گئی وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے اقتباس میں کوئی نہ کوئی بات تو رہ گئی ہوگی تو کیا ان کو یاد دلانے کے لیے پورے تین گھنٹہ کی تقریر دہرانی پڑے گی۔ بعض حضرات تو سیاق و سباق کے اتنے مریض ہو جاتے ہیں کہ وہ پورے کے پورے بذات خود اور بہ نفس نفیس out of contact ہی نظر آتے ہیں!

خط غلط 'املا غلط 'انشا غلط!

یعنی سب کچھ غلط' بلکہ بر خود غلط!
سوال تو انا کا ہے وہ بھلا کیوں صاحب انا کی انانیت کو مجروح ہونے دے!
انا میں نون کی اتنی خرابیوں کے باوجود ایک بات قابل توجہ ہے۔ یہی نون جب مشدد ہو جاتا ہے تو ایک معصوم سا لفظ بن جاتا ہے۔ "انّا" جس سے ہماری بڑی پیاری بھولی بھالی بچپن کی باتیں اور باتوں کی یادیں وابستہ ہیں۔ گود لاں کی ہو یا انّا کی' یہی بچہ کی پہلی درسگاہ ہے۔ یہیں وہ آغوں' آغوں اور اپنی توتلی زبان میں ٹوٹی پھوٹی رسیلی اور معصوم باتیں کرنا سیکھتا ہے۔ پالنے میں لوریوں کی موسیقی سے ماں کے دل ودماغ میں آنے والے دنوں کی امیدیں اور مستقبل کے سنہرے سپنے بس جاتے ہیں اور وہ سب ماں کی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔

کیا آپ اپنی انا کو انّا بنانے کے لیے تیار ہیں؟
ایک بے ضرر' معصوم' سادہ سی' خیالی انا؟

بچوں کی انا بہت معصوم ہوتی ہے۔ وہ تو کھلونوں سے بھی بہل جاتی ہے، کیوں نہ ہم آپ بھی اسی بچپن کی طرف لوٹ چلیں جہاں سے ہم نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ زندگی زیادہ سہل زیادہ رنگین اور زیادہ مطمئن ہو جائے گی! اور جب ہم اس بچپن سے آگے بڑھیں گے تو اپنی انا کے ساتھ دوسروں کے جذبات اور احساسات بھی اتنے ہی نازک اتنے ہی معصوم اور اتنے ہی پیارے نظر آئیں گے جتنے ہمارے اپنے۔ دوسروں کے دلوں کو رکھنا ہم اپنا فرض سمجھیں گے کیوں کہ ۔

دل بہ دست آور کہ حج اکبر است

اور پھر یہ بھی کہ ۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس کے بعد پھر نہ تو ہمارے سامنے' نہ سامنے کے آئینہ میں اور نہ دل کے آئینہ میں کوئی ایسی تصویر نظر آئے گی جسے دیکھ کر آئینہ زمین پر پٹکنا پڑے!

رضوان اللہ
۱۷۸-ابوالفضل انکلیو
نئی دہلی-۲۵

ش مظفرپوری

اردو ادب و صحافت کے خار زاروں میں کم و بیش نصف صدی کی آبلہ پائی اور قسمت آزمائی کے بعد ش مظفرپوری آسودۂ خاک ہو گئے- پانچ دہائیوں سے زیادہ کی اس مدت کے دوران کبھی تیز گام رہے کبھی ست خرام' لیکن جس راستے پر وہ چل پڑے تھے اس میں کوئی مقام ایسا نہیں آیا جہاں انھوں نے اپنے قیام کو غیر ضروری طول دیا ہو- انھوں نے ادبی یا صحافتی دنیا میں کوئی ہلچل نہیں پیدا کی یا ہماری یہ دنیا ان کے متعلق بے اعتنائی کا وہی وطیرہ اختیار کیے رہی جو اس کا خاصہ ہے یا ان کی خودداری اور بے نیازی نے ان سطحی طریقوں کو اختیار کرنا اپنے مرتبے سے کم تر سمجھا جو عام طور سے ہماری دنیا میں سکۂ رائج الوقت ہے- چنانچہ انھوں نے نہ گروہ بندی کی' نہ تشہیر کی تدبیریں کیں' نہ ہم عصروں کے خلاف سازشیں- اپنا کام خاموشی سے کرتے رہے اور کرتے چلے گئے- ان کی جولا نگاہ کلکتے سے پٹنہ تک تھی لیکن ماہنامہ "شمع" دہلی میں ان کے وجود سے آشنائی کا گواہ ہے' یوں کراچی تک ان کے قدموں کی آہٹ سنی گئی-

ش صاحب سے میری شناسائی کی ابتداء کلکتے میں ۱۹۵۱ء میں ہوئی اور وقفے وقفے سے جاری رہی' لیکن ہاں کچھ فاصلوں کے ساتھ- اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ کلکتے کی صحافت میں ش صاحب مجھ سے بہت سینئر تھے- میں مبتدی تھا تو ش صاحب میدان صحافت کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے- روز نامہ "عصر جدید" میں میرے داخل ہونے سے پہلے وہ وہاں سے رخصت ہو چکے تھے اور "روزانہ ہند" کے نیوز ایڈیٹر ہو گئے تھے- ہمارے درمیان یہ جو ذرا سی دوری تھی وہ ایک عمر کی قربت کے باوجود برقرار رہی اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان کے ابتدائی دور کے بارے میں خود ان سے کبھی نہیں پوچھا- مزے کی بات یہ ہے کہ ش صاحب کا وہ صحافتی دور جو کلکتے میں ۵۰ء کے عشرے میں گزرا' بڑی آزادہ روی کا تھا- بسنت کمار چٹرجی اور ابراہیم ہوش ان کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے لیکن اس کے باوجود ش صاحب نے سنجیدگی کو حد فاصل بنائے رکھا- ہو سکتا ہے اس میں میری سنجیدگی اور کم آمیزی'

...ی کچھ قصور رہا ہو اس لیے کہ ابتدائی دور میں انھوں نے مجھے جو مشورہ دیا تھا وہ مجھے اب
...ک یاد ہے۔ انھوں نے کہا تھا میاں ابھی تمھاری سب سے ملنے ملانے کی عمر ہے۔ سب سے
...ا جلا کرو' ہاں ایک وقت ایسا آئے گا جب تم کنارہ کشی اختیار کر لینا اور لوگ تمھیں تلاش
...کرتے پھریں گے۔ بظاہر یہ بات انھوں نے روا روی میں کہی تھی لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ
...ہ بات زندگی کے تئیں ان کے فلسفے کا حصہ تھی کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی کی آخری دو
...دہائیوں کے دوران ایک طرح کی گوشہ نشینی ہی کو راہ دی۔ میں سال میں ایک بار دہلی سے
کلکتہ جاتے ہوئے پٹنہ میں ٹھہرتا اور گاندھی میدان سے سبزی باغ کی طرف جانے والی سڑک
...پر اسی گلی کو تلاش کرتا جسے دکانوں اور آدمیوں کی بھیڑ میں ہمیشہ بھول جایا کرتا تھا اور اس گلی
...سے گزرتا ہوا اس حجرے تک پہنچ جاتا جہاں ش صاحب نے گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی اور
اپنی ابتدائی زندگی کے بالکل برعکس باتسبیح و مصلّی ہو چکے تھے۔

بساط ادب پر ش صاحب کے مقام کا شاید اسی وجہ سے تعین نہیں ہو سکا کہ وہ خود اپنی
وسعتوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ کئی روز ناموں' ہفتہ وار اخباروں اور ماہناموں سے وابستہ
رہے۔ افسانے اور ناولیں لکھتے رہے۔ ان کے کام کی فہرست سازی' معیار بندی' ناپ تول'
قدر و قیمت کا اندازہ یہ سب پٹنہ کی ادبی دنیا پر فرض ہے اور ش صاحب کا قرض ہے۔

کلکتے کی صحافت میں ش صاحب کے دو چہرے تھے ایک دیکھا گیا دوسرا نقاب کے پیچھے
تھا یعنی ایک طرف تو وہ "روزانہ ہند" میں نیوز ایڈیٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے تو
دوسری طرف اسی اخبار میں "کہنے کی باتیں" کے زیر عنوان فکاہیہ کالم بھی لکھ رہے تھے۔
طیب بھائی ظریف "روزانہ ہند" کے مالک تھے اور ان کے مقابلے میں خان بہادر شیخ محمد جان
کی ملکیت میں روز نامہ "عصر جدید" شائع ہو رہا تھا۔ یہ دونوں حضرات سیاسی طور پر مغربی
بنگال کانگریس سے وابستہ تھے۔ ان کی وابستگیاں بالترتیب بوہرہ جماعت اور جمعیت العلماء
سے بھی تھیں لیکن سیاسی اور تجارتی رقابتوں اور مسابقتوں میں اُلجھ کر گراوٹ کی ہر انتہا
تک جانے پر اتر آئے تھے۔ چنانچہ ان دونوں اخباروں کے فکاہیہ کالم ایک دوسرے کا بخیہ
ادھیڑنے کے لیے وقف ہو گئے تھے۔ یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ "روزانہ ہند" میں ش مظفر
پوری تھے اور "عصر جدید" میں اس اخبار کے ایڈیٹر سید محمد مصطفیٰ صابری تھے جو فکاہیہ کالم
بھی لکھا کرتے تھے۔ اس یاوہ گوئی کا نقطۂ عروج وہ سلسلہ مضامین تھا جو ش صاحب "حرام
زادے کی سرگزشت" کے عنوان سے لکھ رہے تھے۔ ان تحریروں کی وجہ سے کلکتے کے
سنجیدہ حلقوں میں بڑی بدمزگی محسوس کی جا رہی تھی چنانچہ چند بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر اس

سلسلے کو بند کروایا۔

بری چیز تو بری ہی ہوتی ہے۔ ان تحریروں نے ش صاحب کے منہ کا مزہ بھی خراب کر رکھا تھا۔ اسی بد مزگی کے عالم میں انھوں نے ایک مضمون "اخبار نویسی یا عصمت فروشی" کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ کلکتہ کو خیرباد کہہ کر پٹنہ چلے گئے اور وہاں مختلف اخباروں میں کام کرتے رہے۔ ماہنامہ "صنم" نکالا۔ اور بھی پرچوں کی تخلیق اور تدفین کرتے رہے جن کی تفصیلات کا مجھے علم نہیں ہے لیکن ۱۹۷۰ء کے قریب جب غلام سرور صاحب نے اپنے پٹنہ کے اخبار "سنگم" کا کلکتہ ایڈیشن نکالا تو پھر ش صاحب کو کلکتہ لائے لیکن اب ان کا دل پٹنہ ہی میں اٹک کر رہ گیا تھا اس لیے زیادہ دنوں تک کلکتہ میں قیام نہ کیا اور پٹنہ واپس چلے گئے۔ اب وہاں ان کی پذیرائی بھی ہوئی۔ بہار اردو اکادمی نے ان کی خدمات حاصل کرلیں اور اکادمی کے جریدہ "زبان و ادب" کی ادارت انھیں تفویض کی۔ ریاستی حکومت نے ایک سینئر صحافی کی حیثیت سے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ماہانہ پنشن مقرر کردی۔ اس طرح قیاس تو یہی ہے کہ ان کی سادہ اور محدود زندگی کے آخری ایام طمانیت کے ساتھ گزرے ہوں گے۔ یوں شکوے شکایت ان کے مزاج کا حصہ نہ تھے' نہ کبھی اپنے حال کا شکوہ نہ زمانے کی شکایت ان کی زبان سے سنی گئی نہ احباب و معاصرین کی وہ مکروہ تنقیدیں ان سے سنی گئیں جو شاعروں اور ادیبوں کی محفلوں میں باہمی گفتگو کا خاص موضوع ہوا کرتی ہیں۔ جب عالم شباب کا تھا تو لطیفے اور بذلہ سنجیاں اور جب عالم شیب آیا تو خاموشی اور گوشہ نشینی کو راہ دی۔ شاید وہ حافظ کے اس فلسفے کے قائل تھے۔ "رندی و خراباتی در عہد شباب اولی۔"

ش صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۹۹۰ء میں پٹنہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد پٹنہ جانے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا لیکن اس سے کئی برس پہلے کی بات ہے میں نے ش صاحب کو مصلی پر دیکھا اور اس طرح کا میرا پہلا مشاہدہ تھا۔ اس کے بعد کلکتے گیا تو ابراہیم ہوش سے بھی حسب روایت ملاقات کے لیے گیا۔ ش صاحب کا بھی ذکر آیا میں نے کہا کہ اب تو وہ بالکل صوفی باتسبیح و مصلی ہو گئے ہیں۔ ہوش صاحب نے آنکھیں پھاڑ کر اور سنجیدگی اوڑھ کر پوچھا۔ "کیا اس نے داڑھی بھی رکھ لی ہے؟" میں نے کہا نہیں۔ بس ہوش صاحب نے ایک زوردار فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا کہ "جبھی وہ بال بال بچا ہے۔" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

...نما
...اعظم شاہ خاں
...ر، گورنمنٹ کالج۔
...(راجستھان)

صحت اور زندگی کے لیے معدنیات کی اہمیت

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ زندگی کی ابتدا سمندر میں ہوئی شاید اسی وجہ سے سمندر کے ...ر انسان کے جسم کے مختلف سیالوں کی کیمیائی ترکیب میں کافی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ علم کیمیا ...ماہرین کے مطابق اب تک تقریباً ۱۰۱ عناصر کی تصدیق شدہ دریافت کی جاچکی ہے جو مختلف ...ئی اتحاد کی بدولت ہزاروں قسم کے مرکبات بناتے ہیں۔ ان مرکبات کو ان میں موجود عناصر ...ن کے درمیان رابطوں (BONDS) کی بنا پر دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نامیاتی ...بات (ORGANIC COMPOUNDS) اور غیر نامیاتی مرکبات (INORGANIC COMPOUNI...) ان دونوں ہی مرکبات کے خاص طریقے اور تناسب میں ملنے کی وجہ سے ...ص حالات میں کسی وقت زندگی کا آغاز ہوا۔ شروع شروع میں زندگی اپنی بہت ہی آسان ...ہل شکل میں تھی۔ اس کے بعد ابتدائی حیوانات نمودار ہوئے، اور پھر وقت گزرنے کے ...ھ ساتھ، ضرورت کے مطابق، قدرت انھیں پیچیدہ سے پیچیدہ تر بناتی چلی گئی۔ جس کے ...میں قدرت کی بہترین کاریگری کے نمونے کی شکل میں ہم آج انسان جیسے ذی روح کو دیکھتے

انسان اور دوسری مخلوقات کی غذائی ضروریات کا اگر ہم کیمیائی تجزیہ کریں تو پائیں گے ...ہاں ان کو اپنی صحت اور زندگی کی دوسری ضروریات کے لیے مختلف قسم کے نامیاتی مرکبات ...ضرورت رہتی ہے وہیں کئی معاملات میں ان کے جسم کے لیے غیر نامیاتی مرکبات کی بھی ...ت ہے۔ یہ غیر نامیاتی مرکبات ان کو دھاتی (METALIC) اور غیر دھاتی (NON-META-L...) آینوں (IONS) کی شکل میں اپنی غذا کے ایک اہم جزو معدنیات سے حاصل ہوتے ہیں۔ ...نکہ نامیاتی مرکبات کے مقابلے میں جسم کو ان کی بہت کم مقدار ہی درکار ہوتی ہے اس وجہ ...جسم میں ان کا تناسب صرف چار فیصد ہوتا ہے مگر اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا

لمتا ہے کہ انسان کے جسم میں اگر دوسرے غذائی اجزاء مثلاً کاربوہائڈریٹس، پروٹینس، چربی، نس وغیرہ کی کمی ہو جائے تو انسان اس کو کافی وقت تک برداشت کر سکتا ہے لیکن جسم میں .نیات کی کمی ہو جائے تو کچھ وقت ہی میں انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

انسانی جسم میں کم و بیش ۳۴ عناصر پائے جاتے ہیں۔ جن میں سے ۲۹ صحت اور زندگی ، لئے ضروری ہیں۔ ان میں ۱۳ عناصر غیر دھاتی ہیں۔ جو اس طرح ہیں: کاربن(C)، ڈروجن(H)، آکسیجن (O)، نائیٹروجن (N)، سلفر (S)، فاسفورس (P)، کلورین (CL)، رین(F))، برومین(Br) آیوڈین(I)، بورون(B)، سلیکا(Si) اور آرسینک(As)۔ باقی عناصر ات ہیں جو اس طرح ہیں: کیلشیم (Ca)، میگنیشم(Mg)، پوٹیشم(K)، سوڈیم(Na)، رن(Fe)، کاپر (Cu)، زنک (Zn)، نکل(Ni) کوبالٹ (Co)، میگنیز (Mn)، ایلومینیم(Al)، لیڈ P)، ٹن(Sn)، مولبڈینم(Mo)، وینےڈیم(V) اور ٹائیٹینیم(Ti)۔ ان عناصر میں سے کچھ کی جسم زیادہ ضرورت رہتی ہے جب ان کی یومیہ ضرورت ایک ملی گرام سے زیادہ ہوتی ہے تب انہیں لاں عناصر" (MACRO ELEMENTS) کہتے ہیں جو اس طرح ہیں: کیلشیم (Ca) سفورس(P) میگنیشم(Mg) پوٹیشم(K) سوڈیم(Na) سلفر(S)، کلورین (Cl) اور آئرن (Fe)۔ ں کے برعکس بہت سے دوسرے عناصر جن کی جسم کو ضرورت بہت خفیف مقدار میں ہی ہوتی ہے ان کو "ٹریس عناصر" (TRACE ELEMENTS) کہتے ہیں۔

معدنیات یا دھاتی و غیر دھاتی عناصر حالانکہ جسم کو کسی بھی قسم کی توانائی نہیں دیتے ن جسم کی بہت سی دوسری ضروریات کے لئے اہم ہیں جیسے جسم میں موجود مختلف قسم کے الوں کی ترشی یا اساسی خصوصیات کو بنائے رکھے کر پی۔ ایچ کو قائم رکھنے میں مدد کرنا تاکہ خصوص قسم کے خامرے اپنے اپنے کاموں کو بخوبی انجام دے سکیں، درون خلوی و برون خلوی وجی دباؤ (OSMOTIC PRESSURE) کو بنائے رکھ کر خلیوں کے اندر و باہر عناصر کے نے جانے پر کنٹرول، خلیوں کے اندر و باہر ترشی۔ اساسی توازن (ACID-BASE BAL-ANCE) کو بنائے رکھنا، جسم میں مختلف قسم کی تحریکات کو چلانا وغیرہ وغیرہ۔

آیئے کچھ اہم عناصر کا مختصر جائزہ لیں۔

کیلشیم۔ (Calcium=ca)

۷۰ کلوگرام کے وزن کے انسان میں کیلشیم کی مقدار تقریباً ۱۲۰۰ گرام ہوتی ہے۔ تندرست آدمی کے لئے اس کی یومیہ ضرورت ۰٫۸ گرام ہے۔ کیلشیم کا بہترین ذریعہ دودھ ہے۔ بھینس کے دودھ کا اگر ایک کپ روز پی لیا جائے تو جسم کی کیلشیم کی یومیہ ضرورت کے لئے

انی ہیہ۔ دودھ کے علاوہ انڈے کی زردی، پھلیوں، مسور کی دال، گری دار میوے، انجیر، لوبھی، چقندر، پتہ گوبھی میں بھی کیلشیم پایا جاتا ہے۔ جسم کے کل کیلشیم کا ۹۹ فیصد ہڈیوں کا ڈھانچہ اور دانت بنانے کے کے کام آتا ہے۔ اس کے علاوہ خون کا تھکا جمانے، دل کی دھڑکن کو معمول کے مطابق بنائے رکھنے، عضلات کے سکڑنے، پھیلنے، اعصاب کی کارکردگی اور جھلیوں کی نفوذ پزیری (PEMEABILITY) کے لئے کیلشیم کی ضرورت رہتی ہے۔ اس کی کمی سے ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔ بچوں میں سوکھا اور تیڑھی میڑھی ہڈیاں یعنی ریکیٹ(RICKET) نام کی بیماری ہو جاتی ہے اور بوڑھے لوگوں میں ہڈیاں کمزور و بے لوچ (osteomalacia) ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پٹھوں میں اینٹھن اور بلاپنے آنے لگتے ہیں۔ جسم کے نشو نما پر بھی مضر اثرات پڑتے ہیں۔ وٹامن ڈی آنتوں کے ذریعہ کیلشیم کے جذب کرنے میں مدد کرتا ہے۔

فاسفورس۔ (Phosphorus=P)

جسم میں اس کی کل مقدار ۷۰۰ گرام کے آس پاس پائی جاتی ہے۔ جس میں سے ۶۰۰ گرام ہڈیوں اور دانتوں میں، ۷۵ گرام عضلات میں، ۵ گرام دماغ میں اور دو گرام خون میں پایا جاتا ہے۔ جسم میں توانائی مہیا کرانے کے لئے ذمہ دار مرکب یعنی اے۔ ٹی۔ پی (ATP)، نیوکلی ترشے، خلیوں کی جھلیوں اور بہت سے خامروں کی کارکردگی کے لئے فاسفورس ضروری ہے۔ اکثر یہ کیلشیم کے ساتھ مرکبات بناتا ہے۔ اسلئے اس کی کمی سے رونما ہونے والی علامات بالکل ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی کیلشیم کی کمی سے ہونے والی علامات۔ اکثر جسم میں اس کی کمی نہیں ہوتی ہے کیونکہ تقریباً ہر غذائی شے میں یہ پایا جاتا ہے۔ اس کے لئے بھی دودھ ایک بہترین ذریعہ ہے جسم کو یومیہ ۵ء۱ گرام فاسفورس کی ضرورت رہتی ہے۔

میگنیشیم۔ (Magnesium-Mg)

جسم میں اس کی کل مقدار ۲۰ سے ۲۵ گرام پائی جاتی ہے اور جسم کو اس کی یومیہ ضرورت ۰ء۷ گرام رہتی ہے۔ کوکو، سوکھے میووں کی گری، اناج، پھلیوں، مٹر، سویابین اور سمندری غذائی اشیاء اسکے اچھے ذرائع ہیں۔ روزانہ اگر ۳ یا ۴ کیلے کھا لئے جائیں تو میگنیشم کی یومیہ ضرورت کو با آسانی پورا کیا جاسکتا ہے۔ جسم کے کل میگنیشم کا تقریباً ۷۰ فیصد، کیلشیم اور فاسفورس کے ساتھ مل کر جسم کا ڈھانچہ بنانے میں مدد کرتا ہے۔ جسم کے نرم و نازک بافتوں کو بنانے، عضلات کے سکڑنے و پھیلنے، تحولی نظام اور بہت سے خامروں کی کارکردگی کے لئے یہ ضروری عنصر ہے۔ میگنیشم کی کمی سے عصبی۔ عضلی ضبط (NEYRO-MUSCULAR CON-TROL) بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے لرزہ اور پٹھوں میں اینٹھن ہونا شروع

ہو جاتی ہے۔

سوڈیم، پوٹیشم اور کلورائڈ۔ (Na, K,Cl)

جسم میں اپنے اپنے مخصوص کاموں کے علاوہ یہ تینوں عناصر ملکر جسم کے اندر پائے جانے والے مختلف سیالوں کا ترشی، اساسی توازن (ACID-BASE BALANCE) درون و برون خلوی ولوجی دباؤ(OSMOTIC PRESSURE)اور سیالوں کی پی۔ ایچ بنائے رکھنے میں مدد کرتے ہیں تاکہ جسم کی تحولی حرکات (METABOLIC ACTIVITIES) اور خامرے ٹھیک سے کام کرتے رہیں۔

سوڈیم۔ (Sodium=Na)

سوڈیم کی جسم میں کل مقدار ۱۰۰ گرام کے آس پاس ہوتی ہے۔ اس کی یومیہ ضرورت ۸ سے ۱۸ گرام تک ہوتی ہے جو روز مرہ کے کھانے کے ساتھ نمک سے پوری ہو جاتی ہے۔ عام غذائی اشیاء جیسے روٹی، پنیر، سوکھے میوے، پالک، چقندر، آلو بخارا اور مولی میں بھی اس کی خاص مقدار پائی جاتی ہے۔ سڈیم برون خلوی سیال EXTRACALLULAR FLUID0) کا اہم مثبت آئن CATION_) ہے۔ پوٹیشم اور کلورائڈ کے ساتھ ملکر جسم میں موجود مختلف قسم کے سیالوں کی پی۔ ایچ کو برقرار رکھنے، ترشی۔ اساسی توازن کو بنائے رکھنے اور درون و برون خلوی ولوجی دباؤ کے بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عضلات کی حیثیت، خلیوں کی نفوذ پزیری اور عصبی نظام کی کارکردگی کے لئے ضروری ہے اونچے درجہ ء حرارت کی وجہ سے بہت زیادہ پسینہ آنے کی صورت میں جب جسم سے کافی مقدار میں سوڈیم خارج ہو جاتا ہے تو جسم میں نا بیدگی(DEHYDRATION) کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے بہت زیادہ پیاس لگتی ہے، ہاتھ پیروں میں اینٹھن، شکمی درد، سر درد، متلی اور دست آنے لگتے ہیں ایسی حالت میں اگر وقت رہتے تدارک نہ کیے جائیں تو جان جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں جسم میں سوڈیم کی کمی کی وجہ سے بھوک نہ لگنا، تولیدی نظام پر گڑبڑی اور جسم کے نشوونما میں خرابی آجاتی ہے۔

پوٹیشم۔(Potassium=K)

پوٹیشم کی جسم میں کل مقدار تقریباً ۱۴۰ گرام ہوتی ہے۔ جسم کو اس کی یومیہ ضرورت ۵ گرام ہوتی ہے۔ مرغ اور بچھڑے کے گوشت و کلیجی، خوبانی، شفتالو، کیلا، نارنگی، اناناس، رتالو اور آلو میں اس کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ عام طور پر جسم میں اس کی کمی نہیں ہوتی کیونکہ روز کھائی جانے والی سبھی چیزوں میں یہ پایا جاتا ہے۔ پوٹیشم درون خلوی۔(INTRA-CELLULAR)

یال کا اہم مثبت آئن ہے۔ برون خلوی سیال میں اس کی مقدار سوڈیم سے کم ہوتی ہے۔ یہ عضلاتی حرکات کو ٹھیک طریقے سے چلانے اور دل کے عضلات کو تروتازہ رکھنے میں مدد کرتا ہے۔ سوڈیم اور کلورائڈ کے ساتھ مل کر درون خلوی ترشی۔ اساسی توازن ولوجی دباؤ اور پی ایچ کو قائم رکھنے میں مدد کرتا ہے۔ اسکے علاوہ پروٹین کی حیاتی ترکیب (PROTEIN BIOSYN-THESIS) میں بھی پوٹیشم اہم کردار نبھاتا ہے۔ خوناب میں (SERUM) پوٹیشم کی مقدار بڑھ جانے کی صورت میں قلبی حرکات اور مرکزی عصبی نظام کی کارکردگی کی سست پڑ جاتی ہے۔ جبکہ اس کی کمی ہو جانے کی صورت میں جسم میں ناقص غذائیت کے حالات اور تحولی حرکات میں بد نظمی پیدا ہو جاتی ہے اور عضلات کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے فالج کے اثرات رونما ہونے لگتے ہیں۔

کلورین (Chlorine=Cl)

کلورین کا استعمال جسم میں کلورائڈ آئن کی شکل میں ہوتا ہے۔ سیرم (SERUM) میں اس کی مقدار ۳۴۰ سے ۳۷۰ ملی گرام فی سو ملی لیٹر ہوتی ہے۔ اگر جسم میں سوڈیم کی کمی نہیں ہو تو کلورین کی کمی بھی نہیں ہوتی کیونکہ یہ اکثر سوڈیم کلورائڈ (SODIUM CHLORIDE) کی شکل میں کھانے پینے کی اشیاء یا نمک میں پائی جاتی ہے۔ سوڈیم اور پوٹیشم کے ساتھ ملکر یہ سیالوں کی پی۔ ایچ۔، درون و برون خلوی ترشی۔ اساسی توازن اور ولوجی دباوء کو بنائے رکھنے میں مدد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ معدے میں تیزابیت پیدا کرنے اور پروٹین کے ہاضمے کے لئے ضروری ہے۔

سلفر۔ (Sulphur=S)

جسم میں موجود کل عناصر کا ۰٫۲۵ فیصد حصہ سلفر ہوتا ہے۔ وہ پروٹین جن میں سسٹین (CYSTEIN)، میتھایونین (MERHIONINE) موجود ہوں، کے ذریعے جسم کو سلفر مہیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کرکری ہڈی (CARTILAGE) وتر (TENDONS) اور ہڈیوں کے قالب (MATRIX) میں بھی سلفر پائی جاتی ہے۔ جسم میں انسولن (INSULIN) ہارمون کو بنانے میں اہم کردار نبھاتی ہے جس کی وجہ سے خون میں شکر کی خاص مقدار بنی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ جسم کے کچھ اعضا کے بنانے اور کچھ اہم خامروں کی کارکردگی میں تعاون کر کے تحولی نظام کو ٹھیک طرح چلانے میں مدد کرتی ہے۔

آئرن۔ (Iron=fe)

آئرن یا فولادی عنصر کو جسم میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جسم میں اس کی مقدار ۴ سے

گرام تک پائی جاتی ہے۔ اس میں سے ۶۵ سے ۷۰ فی صد حصہ لال خلیات میں آکسیجن کو جذب کرنے کے لئے ذمہ دار سرخ مادّے یعنی، ہیمو گلوبن" (HAEMOGLOBIN) کے بنانے میں کام آتا ہے۔ باقی جگر، تلی، ہڈیوں کے گودے (BONE MARROW) اور گردوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کچھ مقدار "سائیٹو کروم آکسی ڈیز" -CYTOCHROME OXI) (DASE اور اسی قسم کے کچھ دوسرے خامروں کے بنانے میں کام آتی ہے۔ آئرن کے اچھے ذرائع گوشت، جگر، دل، گردے اور تلی ہیں ان کے علاوہ انڈا، گیہوں، مچھلی، سوکھے میوے، کھجور، انجیر پھلیوں اور پالک میں بھی آئرن پایا جاتا ہے۔ لوہے کی کمی سے انیمیا (ANAEMIA) یا خون کی کمی کی بیماری ہو جاتی ہے۔ خون کے خلیات کا سائز چھوٹا اور تعداد کم ہو جانے کی وجہ سے انسان کا جسم پیلا پڑ جاتا ہے، بھوک نہیں لگتی، کمزوری ہو جاتی ہے، انسان جلد تھک جاتا ہے اور دل کی دھڑکن کی رفتار میں تیزی آجاتی ہے۔ خون کی کمی کی صورت میں کچھ حاملہ عورتیں چھپ چھپ کر مٹی، اسٹارچ، چاک اور راکھ اور کبھی کبھی اخباری کاغذ تک کھانا شروع کر دیتی ہیں۔ ان کے اس رویے کو "پائیکا" (PICA) کہتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں جہاں اکثر آکسیجن کی کمی ہوتی ہے، وہاں کے لوگوں میں خون کے لال خلیوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خلیوں میں ہیمو گلوبین کی مقدار بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس مظہر کو "پولی سائیتھیمیا" (POLYCY THEMIA) کہتے ہیں۔

اوپر ذکر کیے گئے عناصر کو "کلاں عناصر" کہتے ہیں۔ لیکن بہت سے عناصر کی جسم کو بہت معمولی سی مقدار ہی درکار ہوتی ہے اس لیے ان کو "ٹریس عناصر" -TRACE ELE) (MENTS کی اصطلاح دی گئی ہے۔ ان میں سے کچھ اہم عناصر کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے :

کوپر۔ (Copper=cu)

جسم میں اس کی مقدار ا۰ء۰ فیصد ہوتی ہے۔ اس کی جسم کو یومیہ ضرورت ۲۔۰ سے ۳۔۰ ملی گرام ہوتی ہے۔ سوکھے میووں، کھپڑے دار مچھلی، جگر، گردے اور پھلیاں اس کے اچھے ذرائع ہیں۔ اس کی کچھ مقدار گائے کے دودھ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کا اہم کام جسم میں خون کی کمی کو دور کرنا ہے، کیونکہ یہ ہیمو گلوبن کو بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جسم کے لئے کچھ ضروری پروٹینس، ہڈیاں اور کچھ خامرے بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اکثر اس کی جسم میں کمی نہیں ہوتی۔ لیکن کچھ بچوں میں اس کی کمی دیکھی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے جسم پر ورم آجاتا ہے۔ اور خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن جسم میں اس کی زیادہ مقدار بھی نقصان دہ ہے۔

ڈین۔(Iodine=I)
اوسط وزن کے انسان میں اس کی کل مقدار ۲۵ ملی گرام ہوتی ہے۔ جسم کو اس کی یومیہ رورت ۱۰۰ سے ۱۵۰ مائیکرو گرام ہوتی ہے۔ پانی، کھانے کے نمک، پھل، اناج، گھانس زیاں اور سمندری غذائی اشیاء اس کے اچھے ذرائع ہیں۔ تھائرائڈ غدودوں (THYROID GLANDS میں اس کی تقریباً دو تہائی مقدار جمع رہتی ہے جہاں یہ تھائیرائڈ ہارمون (THYR-OID HORMON بنانے میں مدد کرتی ہے۔ تھائرائڈ ہارمون جسم کو کام کرنے کیلئے ضروری ؛انائی مہیا کرانے، جسم کی تحولی حرکات کو ٹھیک سے چلانے اور جسم و دماغ کے نشوونما کے لئے یک ضروری ہارمون ہے۔ اسکی کمی سے گھینگا(GOITRE) ہو جاتا ہے روز مرہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے "آیوڈائزڈ نمک" (IODIZED SALT) کا استعمال کافی ہے۔ آیوڈائزڈ نمک میں ایک حصہ آیوڈین اور ایک لاکھ حصہ نمک ہوتا ہے۔

میگنیز۔(Maganaze=mg)
گردوں اور جگر میں یہ کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ہری سبزیاں اس کا اچھا ذریعہ ہیں۔ حالانکہ میگنیز کی انسانی جسم میں اہمیت پر ابھی تحقیقی کام جاری ہے لیکن اتنا طے ہے کہ جسم کے ہر کلو گرام وزن کے لئے اس کی ۰٫۲ سے ۰٫۳ گرام مقدار ہونا ضروری ہے۔ گوشت، مرغ، سمندری غذائی اشیاء اور مچھلی بھی مانگنیز کے اچھے ذرائع ہیں۔ ہڈیوں کے بنانے، تولید، مرکزی عصبی نظام کی کارکردگی، کچھ خامروں کو بنانے اور جسم میں گلوکوز اور گلائی کوجن (GLY-COGEN) بنانے میں مدد کرتا ہے۔

کوبالٹ۔(Cobalt=co)
اس کی جسم میں پوشیدہ ضرورت ۰٫۵ سے ۰٫۸ مائیکرو گرام ہوتی ہے۔ جگر، گردہ اور ہڈیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ وٹامن بی۔۱۲ یعنی "سائینو کوبال ایمن" (CYANOCOBAL AMINE) بنانے میں مدد کرتا ہے، جو ہیمو گلوبن بنانے کے لئے ذمہ دار ہے۔ اس کی کمی سے "پرنی شیس اینمیا" (PRNICIOUS ANAEMIA) ہو جاتا ہے جس میں خون کی شدید کمی ہو جاتی ہے۔

زنک(Zinc=zn)
جسم کو اس کی یومیہ ضرورت ۶ سے ۴ مائیکرو گرام رہتی ہے۔ حالانکہ روز مرہ کی عام خوراک میں یہ ۱۲ سے ۲۰ ملی گرام پایا جاتا ہے لیکن اس کا بیشتر حصہ جسم سے فضلات کی شکل میں خارج کر دیا جاتا ہے۔ کئی خامروں اور ہارمونس کا اہم حصہ ہونے کے باوجود زنک کے بارے میں ابھی یہ

معلوم نہیں ہے کہ دراصل یہ جسم کے لیے کس طرح ضروری ہے۔ویسے یہ تحفظ خامرے "کاربونک این ہائڈریز" (CARBOINC ANHY DRASE) جو لال خلیوں میں پایا جاتا ہے "ڈی ہائڈروجینز" (DEHYDROGENASE) جو جگر میں پایا جاتا ہے، "ٹرپسن" (-TRYP SIN) جو لبلبے (PANCDREAS) میں پایا جاتا ہے، ساتھ ہی لبلبے میں تیار ہونے والے ہارمون "انسولن" (INSULIN) کا بھی یہ اہم حصہ ہوتا ہے۔زنک کی کمی سے چوہوں کے نشوونما پر مضر اثرات پڑتے دیکھے گئے ہیں۔ مرغا مرغیوں کے قد چھوٹے رہ جاتے ہیں ایک رائے کے مطابق مردوں میں جنسی خرابیوں اور عورتوں میں دودھ کی کمی، دماغی کمزوری کو زنک دور کرنے میں مدد کرتا ہے جسم میں زنک کی کمی ہو جانے پر نشو نما پر مضر اثرات پڑتے ہیں اور خون کی کمی ہو جاتی ہے۔ویسے اکثر جسم میں زنک کی کمی نہیں ہوتی کیونکہ اکثر غذائی اشیاء میں اس کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ گیہوں، کستورا مچھلی (OYESTER)، بھیجے، پھل اور سبزیاوں میں اس کی خاص مقدار پائی جاتی ہے۔

فلورین۔(Flourine=f)

فلورین کی تھوڑی بہت مقدار پانی میں گھلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ فلورین کی پانی میں اگر ایک پی پی ایم مقدار ہو تو وہ صحت کے لئے فائدے مند ہے کیونکہ یہ ہڈیوں اور دانتوں کو بنانے میں مدد کرتی ہے۔ لیکن جن علاقوں میں فلورین کی پانی میں مقدار زیادہ پائی جاتی ہے ان میں کئی قسم کی جسمانی خرابیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً وہاں کبڑے پن کا مرض عام ہوتا ہے۔دانت کمزوریاں آڑے ترچھے، گڈھے دار ہوتے ہیں ان میں چھید ہو جاتے ہیں اور یا تو وہ چونے جیسے سفید اور کچے ہو جاتے ہیں یا ان پر پیلے رنگ کی دھاریاں بن جاتی ہیں۔اس طرح ہڈیوں کی ساخت میں تبدیلی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ان سب علامات کی وجہ سے "فلوروسس" نام کی بیماری ہو جاتی ہے۔

مولبڈ نیم (Molybdenum=Mb)

جسم کو اس کی بہت معمولی سی مقدار میں ضرورت ہوتی ہے اس کی ابھی انسانی جسم میں اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ جگر اور گردوں میں اس کی سب سے زیادہ مقدار پائی جاتی ہے۔ کچھ خامروں جیسے "زین تھین آکسی ڈیز" (xanthine ox idase) کی کارکردگی کے لئے مولبڈ نیم ضروری ہے۔ پھلیاں، اناج، گہرے ہرے رنگ کی سبزیاں، جگر اور گردے اس کے اچھے ذرائع ہیں۔

اوپر ذکر کئے گئے "ٹریس عناصر" کے علاوہ باقی ماندہ عناصر جیسے "سیلے نیم" (-SELE

NIUM، "کرومیم" (CHROMIUM) لیڈ (LEAD)، "مرکری" (MURCURY) اور
سری ٹریس عنصر جن کا اس مضمون کے شروع میں ذکر کیا گیا ہے، اس کی بھی معمولی سی
ندار جسم میں پائی جاتی ہے۔ لیکن ایسا مانا جاتا ہے کہ جسم میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غذائی
شیاء میں یہ تھوڑی بہت مقدار میں موجود ہوتے ہیں اس لئے جسم کے مختلف حصوں میں جاکر
ع ہو جاتے ہیں لیکن تحولی نظام میں کوئی حصہ نہیں لیتے مگر جسم میں زیادہ مقدار میں جمع
و جانے کی صورت میں صحت اور زندگی کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

صحت مند انسان کا دماغ بھی صحت مند اور جسم پر رونق ہوتا ہوتا ہے۔ اچھی صحت کے لئے متوازن غذا ضروری ہے، جس کا ایک اہم حصہ معدنیات ہیں جو بھلے ہی جسم کو کسی سیدھے طریقے سے توانائی مہیا نہیں کراتے ہیں مگر جسم کی نشوونما، تحولی حرکات، خامروں کی کارکردگی، سیالوں کی پی۔ ایچ اور دوسرے بہت سے اہم کام انجام دیتے ہیں۔ جسم میں ان کی کمی مہلک ثابت ہوتی ہے اور جان تک جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اچھی صحت اور لمبی زندگی کے لئے، کھاتے پینے کی اشیاء کا انتخاب کرتے وقت معدنیات کی اہمیت کا بھی دھیان رکھنا بہت ضروری ہے۔

مظہر سلیم
سی/۱۵/۱۱ کنتی دیوی چال
ونوبا بھاوے نگر، کرلا بمبئی ۷۰

کھولی

اُسے اس بات کا قطعی علم نہ تھا کہ آخر وہ اس فٹ پاتھ پر کہاں سے آگیا تھا اس سے قبل وہ کہاں رہتا تھا۔ آسمان نے اسے نیچے پھینکا تھا یا زمین کے کس حصّے میں اس کا جنم ہوا تھا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتا تھا آنکھ کھلی شعور کی اور سنبھالا اُسے ہوش نے تو فٹ پاتھ ہی اس کا گھر تھا۔ بغیر کھڑکی دروازے والا گھر۔ نیلا آسمان اس کی چھت اور زمین اس کا بستر۔ جب سارا شہر تاریکی میں ڈوب جاتا تو وہ نیلے آسمان کو جی بھر کر دیکھتا اور دور بہت دور آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو جاتا جیسے کوئی حسین خواب بن رہا ہو۔

اس کی دیرینہ خواہش تو یہی ہوتی تھی کہ وہ فٹ پاتھ سے اٹھ کر کسی پوش علاقے میں رہائش پذیر ہو جائے اور ایک ایسی زندگی کا خاتمہ کر دے جو وہ گزار ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے آج اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب سورج مشرق کی کوکھ سے جنم لے گا اور ساری بستی کو اپنی آتشیں شعاعوں سے نہلا دے گا تو وہ فٹ پاتھ کے بستر کو لپیٹ کر سب سے پہلے کریم بھائی ہوٹل والے سے ملاقات کر کے کھولی (کمرے) کا انتظام کرے گا۔ سر چھپانے کے لیے ایک کھولی کا ہونا ضروری ہے۔ شہر میں کسی اچھے علاقے میں چھوٹا سا کمرہ لے کر وہ اپنی بے قاعدہ زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرے گا۔ ویسے تو فٹ پاتھ پر رہنے میں کوئی تکلیف نہ تھی لیکن بارش کے دنوں میں تکلیف کا احساس دوگنا ہو جاتا اور سردیوں میں کوئی خاص پریشانی نہیں صرف پانڈو حولدار کی ٹنکڑی جیبوں میں گرم سا ایک نوٹ ڈال دینا پڑتا تھا۔ پھر ساری رات فٹ پاتھ ہماری۔ اس کے بعد داؤد بھائی باٹلی والا کو فٹ پاتھ پر رہنے کا کرایہ یا ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ جیسے یہ سارا فٹ پاتھ اس کی جاگیر ہو۔ اور ادھر کچھ دنوں سے میونسپل ملازمین نے

ٹ پاتھ سے جھونپڑوں کو ہٹانے کا بھی کام شروع کر دیا ہے۔ تب سے تو اور زیادہ پریشانی ہونے لگی اور مہنگائی کے غیر متوقع اضافے نے بھی اُسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ سوچتا تھا جب کرایہ ہی دینا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ کسی کھولی کا انتظام کیا جائے اور بڑی شان سے رہا جائے۔ جب سے گاؤں اور دوسرے علاقوں یا ریاستوں کے لوگوں کی آمد کا سلسلہ روکنے کے لیے ممبئی کی ایک سیاسی جماعت پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کر رہی ہے اور آنے والے لوگوں میں خوف و دہشت پھیلا رہی ہے۔ تب سے اُسے کمرے کا انتظام آسان محسوس ہونے لگا تھا۔

اس کی جب آنکھ کھلی تو دھوپ کی چادر اس کے پورے جسم پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور زندگیوں کو دوڑتا، بھاگتا دیکھنے لگا۔ موٹر گاڑیاں، ٹیکسیاں، لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، بس اسٹاپ پر کھڑے بے چین مسافر، دور تک پھیلی ہوئی سیاہ سڑک اور ہوٹلیں، فٹ پاتھ کا جنگل۔ پر سارا منظر دیکھ کر اس میں جینے کی تمنا جاگ جاتی اور وہ بسم اللہ ہوٹل میں داخل ہوتا۔ چائے ناشتے کے بعد عادتاً اخبار پر سرسری نظر دوڑاتا اور ڈیوٹی کے لیے نکل پڑتا۔

شام جب رات کی کوکھ میں اُتر جاتی تو وہ تاریکی اوڑھ کر فٹ پاتھ کے بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگتا کہ کل تک وہ ضرور کھولی تلاش کرے گا۔ آخر کب تک وہ اس فٹ پاتھ پر جانوروں کی طرح زندگی گزارے گا۔ پولیس کا ڈر، داؤ دیا ٹی والے کا خوف، فٹ پاتھ پر بسنے والے لوگوں سے گھبراہٹ اور میونسپل ملازمین کی توڑ پھوڑ، ان سب سے اُکتا گیا تھا وہ۔

ان دنوں وہ اچھا خاصا کما لیتا تھا اور ساری تنخواہ کریم بھائی کے پاس جمع کر دیتا تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا اسے کسی کی فکر بھی نہ تھی مگر کچھ دنوں سے فٹ پاتھ ہی پر رہنے والی ایک لڑکی رانی نے اس کے دل کے دروازے پر ہلکے سے دستک دی تھی تب سے وہ اپنے آگے پیچھے کسی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ رانی اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ دن بھر فٹ پاتھ پر بنے ٹاٹ کے جھونپڑے میں بیٹھی بیڑی بناتی۔ اس کا باپ کسی بار میں کام کرتا تھا اور ماں لوگوں کے گھر جا کر کام کرتی تھی۔

رانی نے جب سے اس کے اندر پیار اور گھر کا تصور اُبھارا تھا تب سے وہ رانی اور گھر کو یکساں طور پر چاہنے لگا تھا۔ اس کے ذہن کے اسکرین پر رانی کی تصویر چسپاں ہو گئی تھی رانی سے اس کے خواب جڑے ہوئے تھے۔ بیوی، بچے، تعلیم، ان کی پرورش سبھی کچھ۔ رانی دھیرے دھیرے اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی تھی۔

پھر کریم بھائی ہوٹل والا کا مخلص اور معصوم چہرہ ابھرتا تو وہ ان کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کتنے بے غرض اور ہمدرد آدمی ہیں ۔ اس کے کمرے کی ذمّے داری لے رکھی ہے۔ آج نہیں تو کل ضرور وہ کھولی کا انتظام کریں گے ۔ وہ تو کلپنا ٹاکیز کے سامنے جھونپڑ پٹّی میں کھولی کرایے پر لینے کا ارادہ رکھتا تھا، مگر اسے تو کریم بھائی نے ہی منع کیا تھا اور سمجھایا تھا کہ یہ جگہ تمھارے لائق نہیں ۔ دوسرے ہی دن اس جھونپڑ پٹّی میں بلڈوزر چلادیا گیا تھا ۔ کریم بھائی بڑے ہی دیانت دار اور ایماندار آدمی واقع ہوئے تھے ۔ ان کی دور اندیشی بھی کسی سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ ان کے تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس نے کریم بھائی کے پاس ڈپازٹ کے روپے بھی جمع کردیے تھے۔ اسے ان پر پورا بھروسا تھا۔ ان کی ایمانداری اور سنجیدگی سارے محلّے میں مشہور تھی۔ فٹ پاتھ پر بسنے والے لوگ تو انھیں اپنا ضامن سمجھتے تھے۔ وہ لوگ ان کے پاس ہی اپنی ساری پونجی جمع کرتے تھے اور وہ بھی حساب میں ایک پیسے کا فرق نہیں آنے دیتے ۔

رات کی تاریکی میں وہ نیلے آسمان کو دیکھنے لگتا۔ جہاں ستارے آنکھ مچولی کھیلتے اور چاند بادلوں میں کہیں چھپ جاتا۔ کریم بھائی، پولیس، چور، داؤد باٹلی والا، رانی، چھت، آسمان، زمین، بستر سب کچھ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوجاتے۔ کبھی وہ کھولی کے بارے میں سوچتا یا پھر ان لوگوں کے بارے میں جو فٹ پاتھ پر بغیر کسی سرحد کے مل جل کر رہتے تھے اور آپس میں کبھی نہیں ٹکراتے تھے۔ اس کی نظریں پھر رانی پر جاکر رک جاتیں۔ رانی جس نے اس کے دل ودماغ پر قبضہ کرلیا تھا، اسے گھر کا تصور دیا تھا۔ وہ اسی سے شادی کرے گا۔ اس کے بچّے بھی ہوں گے لیکن وہ زیادہ بچّے پیدا نہیں کرے گا کیونکہ یہ فعل ہماری حکومت کو پسند نہیں ہے۔ مہنگائی کے زمانے میں کم بچّے پیدا کرکے سکھی پریوار کی بنیاد رکھنا ہی عقل مندی ہے۔ شادی کے بعد وہ رانی کا پورا پورا خیال رکھے گا۔ نہ پولیس کی دھمکی ہوگی اور نہ دھاندلی، بس ایک ہی مقصد کے تحت زندگی گزارے گا۔ بے مقصد اور بے سبب زندگی کو اس نے رانی کی خاطر اس فٹ پاتھ پر ہی کہیں دفن کردیا تھا۔ کل سے وہ کھولی میں ضرور رہے گا۔ اس کی زندگی میں ڈسپلن آجائے گا۔ وہ شادی رچاکر رانی کی زندگی کو سنوارے گا۔ نکھارے گا۔ ایک باعزّت شہری کی طرح ...... یہ سوچتے سوچتے وہ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا کچھ پتا نہ چلا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو فٹ پاتھ جاگ گیا تھا، راستے کا سنّاٹا شور میں تبدیل ہوگیا تھا کیونکہ سورج نے رات کا سارا منظر جلاکر راکھ کردیا تھا اور اب اسے منہ چڑا رہا تھا۔

اس کے قدم خود بخود بسم اللہ ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ کریم بھائی اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جہانگیر کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر خوشی رقص کرنے لگی۔ وہ فرطِ جذبات سے کہنے لگے۔ جہانگیر تمھاری کھولی کا انتظام ہو گیا ہے۔

کیا... جہانگیر نے متعجب ہو کر دریافت کیا.....

ہاں... سچ مچ کھولی کا انتظام ہو گیا ہے....

جہانگیر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکن رک جائے گی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا واقعی.... میں کھولی میں رہوں گا۔ فٹ پاتھ میرے لیے ایک بیتا ہوا کل ہو گا۔

ہاں.... جہانگیر.... چلو کھولی دیکھ لو..... اندرا نگر میں ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جسے کبھی سنجے گاندھی نے برسوں پہلے برباد کیا تھا۔ بلڈوزر چلا کر۔ غریبوں کے سروں سے چھت چھین لی تھی مگر سنجے گاندھی کی موت کے بعد سے اندرا گاندھی نے بسایا تھا تب سے یہ علاقہ اندرا گاندھی کے نام سے منسوب ہے۔ چلو... دونوں تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اندرا نگر کی طرف چل پڑے۔

کریم بھائی نے دوڑتے ہوئے روڈ کراس کر لیا تھا۔ یہ نیشنل ہائی وے تھا جو بہت زیادہ مصروف رہتا تھا اور گاڑیوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سگنل بھی بہت دور تھا۔ جہانگیر روڈ کراس نہیں کر پایا تھا وہ رانی اور کھولی کے متعلق سوچتے ہوئے کہیں دور نکل گیا تھا منصوبوں کی دنیا میں۔ ابھی وہ روڈ کراس کرنے کے لیے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک تیز رفتار وین نے اسے بڑی بے دردی سے کچل دیا جبکہ وہ سڑک کی سائڈ میں چل رہا تھا..... فضا میں ایک چیخ ابھری اور غائب ہو گئی۔ لوگوں کا شور بلند ہوا.... پکڑو...... دوڑو..... اس گاڑی کا نمبر نوٹ کرو...... دوڑو...

پھر سرگوشیاں..... ارے جانے دو۔ پولیس کی وین ہے.... پولیس.... ہاں۔ شاید ڈرائیور شراب پی کر گاڑی چلا رہا تھا..... لوگ جہانگیر کی لاش کے قریب چیونٹیوں کی طرح اکٹھا ہوئے اور بکھر گئے۔

جہانگیر وہیں تڑپتا رہ گیا۔ کریم بھائی دوڑے مگر وہ تو اس جہان سے کہیں دور چلا گیا تھا۔ اس کے سارے سپنے پولیس وین نے چکنا چور کر دیے تھے۔ کریم بھائی کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے وہ چلا کر رونے لگے جیسے ان کا اپنا کوئی عزیز مر گیا ہو۔ وہ جانتے تھے کہ اس فٹ پاتھ پر بسنے والے غلیظ قسم کے لوگوں سے ان کا کوئی

رشتہ نہیں تھا بس ایک گاہک اور دکاندار کا رشتہ تھا۔ یہ لوگ بسم اللہ ہوٹل میں چائے پیتے، کھانا کھاتے اور فرصت کے اوقات اسی ہوٹل میں گپ شپ کرتے رہتے مگر کریم بھائی ہوٹل مالک کے ساتھ ایک درد مند دل رکھنے والے آدمی بھی تھے جو ان غریبوں کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔ ایک بار تو میونسپل ملازمین ان جھونپڑوں پر ٹوٹ پڑے تھے مگر کریم بھائی نے بیچ بچاؤ کر کے اس توڑ پھوڑ کو رکوا دیا تھا۔ کریم بھائی سیاسی اثر رسوخ بھی رکھتے تھے اسی لیے وہ فٹ پاتھ کے لوگوں کے لیے مسیحا بن گئے تھے۔

کریم بھائی جہانگیر کی طرف دوڑے، جہانگیر کا تڑپتا جسم ایک ٹھنڈی لاش بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی لاش کو اٹھا کر وہ بسم اللہ ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ لوگ جمع ہو گئے اور زار و قطار رونے لگے مگر رانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کے چشمے خشک ہو گئے تھے وہ صرف جہانگیر کی لاش کو مسلسل گھور رہی تھی۔ کریم بھائی سوچنے لگے۔ جہانگیر پہلا شخص تھا جس نے فٹ پاتھ پر رہ کر بہتر زندگی کا خواب دیکھا تھا اس خواب کی تعبیر بھی پا چکا تھا مگر تقدیر نے اسے ایسا گرایا کہ پھر وہ اٹھ نہ سکا۔

جہانگیر کے جمع کیے ہوئے ڈپازٹ کے روپیوں سے کریم بھائی نے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ جب اسے قبر میں اتارا گیا تو کریم بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ روتے روتے کہنے لگے "جہانگیر کی دیرینہ خواہش تو آج پوری ہو گئی۔۔۔۔"

جائزے

ہندوستان کی دینی درسگاہیں

مصنف: ڈاکٹر قمرالدین
مبصر: ڈاکٹر سلامت اللہ — قیمت ۲۰۰/-
ناشر: ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

"ہندوستان کی دینی درسگاہیں" نامی سروے رپورٹ ملی، شکریہ۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور ڈاکٹر قمرالدین مع مددگار ٹیم کے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اس موضوع پر اتنی جامع رپورٹ اتنے کم وقت میں پیش کردی جو ملک کی پندرہ ریاستوں کے ۵۷۶ مدارس کے کثیر الجہتی سروے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر قمرالدین کی یہ کوشش اس لیے اور زیادہ قابل تحسین ہے کہ یہ مدارس عموماً اپنے طریقۂ کار کو صیغۂ راز میں رکھنے کے عادی ہیں اور اگر کوئی ان کے حقائق معلوم کرنا چاہے تو اسے اپنے اندرونی معاملات میں بے جا مداخلت اور اپنی خودمختاری پر چوٹ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قمرالدین اور ان کے ساتھیوں نے ان کے ذہنی اور جذباتی حصار میں داخل ہونے کی کامیابی حاصل کی یہ بہت بڑی بات ہے اور آپ لوگوں کے صبر و تحمل، دوراندیشی اور موزوں نفسیاتی اپروچ کا ثبوت ہے۔

میں نے اس رپورٹ کو غور سے پڑھا۔ دوران مطالعہ یہ تاثر پختہ تر ہوتا گیا کہ قمرالدین صاحب کی یہ کاوش محض ایک تعلیمی سروے نہیں ہے یہ ایسا کارنامہ نہیں ہے جو علمی تحقیق کے طور پر فقط معلوماتی تجسس کی تشفی کے انجام دیا گیا ہے بلکہ ان مدارس کے طریقۂ کار کی اصلاح مقصود ہے تاکہ وہ اپنے تعلیمی عمل کو زیادہ مؤثر اور کارآمد بنا سکیں۔ ایسا اسلوب بیان اختیار کیا ہے کہ ان اداروں کے کارکنان جب اس رپورٹ کو پڑھیں گے تو امید ہے کہ وہ مندرجہ سفارشات سے بدکیں گے نہیں بلکہ ان پر عمل کرنے کی طرف مائل ہوں گے۔ لب و لہجہ ایسا اختیار کیا گیا کسی روٹھے ہوئے آشنا کو منایا جا رہا ہے۔ زبان سلیس و شستہ ہے اور اظہار خیال صاف اور واضح کہ تفہیم مطلب میں دشواری نہیں ہوگی۔ غرض جس مقصد کے پیش نظر یہ سروے کیا گیا ہے رپورٹ اسے بخوبی پورا کرتی ہے۔ ریسرچ کے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بھی یہ خاصا قابلِ قدر کام ہے البتہ کہیں کہیں چھوٹی موٹی خامیاں نظر آتی ہیں مثال کے طور پر چند ایک حسب ذیل ہے۔

بعض تاریخی واقعات کا Documentation حذف ہو گیا ہے مثلاً صفحہ ۳۶
"لڑکیوں کے تعلیم کے معقول انتظام کا ذکر"

صفحہ ا پر کالموں کے اندراج کی ترتیب (اردو تحریر کے طریقہ کے لحاظ سے) الٹی ہے۔
صفحہ ۱۶۱ پر جدید طریقہ ہائے تدریس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ محض اصطلاحات کے اندراج پر اکتفا کیا گیا ہے۔
صفحہ ۲۶۹ پر درج ہے کہ Random Sampling کے ذریعے سے سروے مدارس کا انتخاب کیا گیا اور صفحہ ۲۹۸ پر بتایا گیا کہ "وہ بڑے اور خوش حال" ہیں۔ ان دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔
۔ مختلف مقامات پر دیے گئے اعداد کا نظام یکساں نہیں ہے۔ کہیں اردو کا طریقہ اپنایا گیا ہے اور کہیں بین اقوامی (انگریزی یا رومن) ہر جگہ رومن طریقہ اختیار کیا گیا ہوتا تو بہتر تھا۔
بہرکیف یہ سروے مفید ہے اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اسے بنچ مارک سمجھنا چاہیے خدا کرے کہ مندرجہ سفارشات کی روشنی میں عملی اقدامات اور پھر ۵ یا دس سال بعد اسی قسم کا سروے کیا جائے تاکہ معلوم ہوسکے کہ اِس وقت کی صورت حال کے مقابلہ میں کتنی ترقی ہوئی ہے۔
آخر میں، طباعت کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ واقعی بہت دیدہ زیب ہے اور املا یا صرف و نحو کی غلطیاں بھی معمولاً دوسری اردو کتابوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں دعا ہے کہ آپ کی یہ کاوش مقبول ہو۔

شکستہ پر

مصنف: خلیل جبران ۔ ترجمہ: کوثر مظہری

مبصر: عطا عابدی

قیمت: پچاس روپے ۔ سال اشاعت ۱۹۹۶ء

خلیل جبران کا نام عربی کے علاوہ بالواسطہ طور پر انگریزی اور اردو ادب میں بھی جانا پہچانا ہے۔ ان کا منفرد اسلوب اور ان کے رومانی تخیلات ہر صاحب نظر کے لیے توجہ کا باعث رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب "شکستہ پر" خلیل جبران کی کتاب الاجنحۃ المنکسرہ کے انگریزی ترجمے The Broken Wing کا اردو روپ ہے۔ کتاب کے آغاز میں کوثر مظہری نے جبران کی زندگی اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں مختصر مگر جامع تحریر پیش کی ہے۔ ترجمہ رواں اور فارسی آمیز فقروں کی مدد سے کیا گیا ہے مگر مفرس فقرے سماعت پر گرانی کا باعث نہیں بنتے بلکہ رس گھولتے ہیں ایک جملہ ملاحظہ فرمائیں :

"روح کی پیاس مادی اشیاء کے نشے سے زیادہ شیریں ہوتی ہے اور اس کی وحشت حفظِ جان سے عزیز تر" کتاب کی پشت پر پروفیسر شمیم حنفی اور یوسف عامر (شعبۂ اردو، جامعہ ازہر مصر) کی آراء شامل ہیں۔ شمیم صاحب کے یہ کہنے کے بعد کہ : وہ (کوثر مظہری) بڑی حد تک اس طلسمی اور رومان پرور ماحول کو منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس سے جبران کی پہچان قائم ہوتی ہے۔ رواں دواں شعریت آمیز میں یہ کتاب آج بھی پڑھنے والوں کو متاثر اور متوجہ رکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔" اور کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں رہتی۔ فکشن میں مختلف مزاج کے متلاشی حضرات سے خصوصاً اور اردو ادب کے باذوق قارئین سے عموماً یہ ناول اپنے آپ کو پڑھوانے کا تقاضا کرتا ہے۔ کتابت اور طباعت صاف اور دلکش "شکستہ پر" کی مناسبت سے اس کتاب کا سرورق ناظرین و قارئین کو دیر تک دیکھتے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

بچوں کی رباعیاں

مصنف : عادل اسیر دہلوی
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۶/روپے صفحات ۳۲
ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی ۶

زیر نظر مجموعہ میں عادل اسیر دہلوی کی نصف سے زائد رباعیاں بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں اور ان میں اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اخلاقی قدروں کے اس بحران کے زمانے میں عادل صاحب کا قدم مستحسن ہے۔ اب یوں بھی رباعیات کہنے ان کو یاد رکھنے اور ان سے نصیحت پکڑنے کا رواج کم ہو گیا ہے۔ عادل صاحب نے اس روایت کو برقرار رکھا ہے اور اچھے معاشرے کی تعمیر کے لیے اچھے اخلاق و اطوار کو یاد دلایا ہے اور وہ بھی خاص طور پر بچوں کے لیے جن کے اخلاق و عادات اگر بچپن ہی سے سدھار دیے جائیں تو آگے چل کر خرابی پیدا ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ رباعیات کی زبان سادہ اور سلیس ہے مگر کہیں کہیں بچوں کے معیار سے بالا زبان استعمال ہوئی ہے جس سے رباعیوں میں ثقل پیدا ہو گیا ہے۔ کتابت اور طباعت نہایت شستہ ہے۔ کتابچہ کے شروع میں جناب مخمور سعیدی صاحب کا مختصر جامع دیباچہ بھی شامل ہے۔ امید ہے یہ رباعیات بچوں کی دنیا میں پسند کی جائیں گی۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

استاد کی عزت جو کرے گا بچو　　احباب سے الفت جو کرے گا بچو
دنیا میں سدا نام رہے گا اس کا　　ماں باپ کی عزت جو کرے گا بچو

دشت بام و در

مصنف : اکبر حمیدی
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خان
قیمت : ۱۰۰/روپے صفحات : ۱۲۸
ناشر : "القلم" دارالاشاعت، اسلام آباد

"دشت بام و در" اکبر حمیدی صاحب کی (۱۹۹۰ سے ۱۹۹۵ء تک کی) غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے کتاب کے شروع میں ساٹھ غزلیں اور آخری حصہ میں سولہ آزاد نظمیں شامل ہیں۔ اکبر حمیدی صاحب کی غزلیں بہت دلکش اور خوبصورت ہیں۔ ان میں فطری کشش پائی جاتی ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے پاکستان میں ان کی شاعری خاصی شہرت حاصل کر کے داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ان کی تمام غزلوں میں ایک دردمند اور غیر جانب دار دل کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنی آواز کو ہر قسم کی تحریک سے آزاد رکھنے کی کوشش کی

لفظ خود شاعر کا لکھا ہوا ہے جو ان کی شاعری سے زیادہ دلچسپ اور عالمانہ ہے۔ ظاہر ہے ان ہی افکار کا پرتو ان کی شاعری میں نظر آئے گا۔ اکبر حمیدی ایک اچھے قادر الکلام شاعر ہیں ان کی اصل شاعری کا رنگ ان کی غزلیں ہیں۔ اگر نظموں کو بھی یہی فن کارانہ جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو شاید ان کی نظم بھی اعلا پایہ کا فن پارہ بن سکے۔ اکبر حمیدی صاحب کے اس مجموعہ سے چند اشعار بغیر کسی انتخاب کے ملاحظہ ہوں۔

وہ دشت تم نے جسے شہر بے مکاں پایا
یہ شہر ہم نے جسے دشتِ بام و در جانا

سوچوں تو میرا تیرا تعلق عجیب ہے
جتنا ہے دور اس سے زیادہ قریب ہے

ہوائے شوق ایسی تیز ہے ٹھہرا نہیں جاتا
اُدھر کو جا رہا ہوں جس طرف رستہ نہیں جاتا

میں ایسی پاک زمیں کے عتاب میں ہوں جہاں
بجز گناہ محبت گناہ کوئی نہیں

بہت دلچسپ ہوتا جا رہا ہے
چلے گا یہ ڈرامہ اور بھی کچھ

وہ عہد نہیں اچھا حسینوں کے لیے بھی
جس عہد میں الزام ہو آئینہ گروں پر

اس کی یادوں میں کھو کے لکھتا ہوں
خاک اور خون ہو کے لکھتا ہوں

کسی بھی روز سہی فیصلہ تو ہونا ہے
ہمارا اُس کا کبھی سامنا تو ہونا ہے

حکیم کلب علی شاہد شخصیت اور فن

مرتب : خورشید مصطفیٰ رضوی
مبصر : ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت : ۶۰ روپے صفحات : ۱۸۴
پیش کش : حکیم پرویز اختر و واصف اختر، محلہ بیگم سرائے خورد، امروہہ ۲۴۴۲۲۱

حکیم کلب علی شاہد شخصیت اور فن۔ حکیم کلب علی صاحب امروہوی کی حیات اور خدمات کا اعتراف ہے جس میں ایک درجن سے زائد مضامین شامل ہیں۔ حکیم صاحب قبلہ اس عہد میں نابغہ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں جو مشرقی تہذیب کا زندہ نمونہ ہیں۔ علم، حلم طبابت اور عنایت ان کا وطیرہ خاص ہیں۔ اس مجموعہ کے تمام مضامین میں حکیم صاحب قبلہ کی علمی، ادبی، شعری اور حکیمانہ صلاحیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے جو حکیم صاحب کے خاص عقیدت مندوں میں ہیں حکیم صاحب کی کرم فرمائیوں نوازشوں اور ان کی شخصیت کے کریمانہ و مربیانہ پہلو کا جائزہ بڑے ہی لطیف انداز میں لیا ہے یہ مضمون "شاہد و مشہود" کے عنوان سے شامل کتاب ہے۔ ایک تو حکیم صاحب کی بابرکت شخصیت اور پھر فاروقی صاحب کے شگفتہ انداز بیان نے اسے اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے۔

تمام مضامین کے ماحصل کے طور پر حکیم صاحب کی شخصیت ایک حکیم اور صاحب فہم کے علاوہ ایک ایسے شخص کی طرح بھی نمودار ہوتی ہے جس نے علم و ادب کی انجمن کو پروان چڑھایا ہے۔ اس کتاب کا سب سے ادق اور پر مغز مضمون "علم الصیدلہ اور رموز مطب حکیم کلب علی" ہے جس کے لکھنے والے ڈاکٹر مرزا احمد حسین سیفی ہیں۔ انھوں نے نہایت بلیغ اور معیاری زبان میں حکیم صاحب کی طبی تحقیقات و اختراعات کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو بربادی کے اس زمانے میں سیفی صاحب کا مضمون پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصحفی کی سرزمین آج بھی اُردو کے قافلہ کی قیادت کے لیے کافی ہے۔ کتاب کا ایک حصّہ نظم کے لیے وقف کیا گیا ہے جس میں حکیم صاحب کی خدمت میں منظوم خراج عقیدت ہے۔ غرض یہ کتاب عجیب و غریب مجموعہ ہے جس میں علم و شعر کے علاوہ میٹھے میٹھے خمیروں کی خوشبو فرحت بخش مشکی و زعفرانی عرقیات کے بخارات اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں جن کے بارے میں پڑھ کر اچھے بھلے آدمی کا بیمار پڑنے کو جی چاہے اور حکیم صاحب سے شرف ملاقات کا اشتیاق بلکہ تڑپ پیدا ہو۔ سچ مچ یہ کتاب ایک انوکھی کتاب ہے جو ادیبوں اور شاعروں اور حکیموں کے علاوہ عام لوگوں میں بہت سی دلچسپیوں اور جسمانی و روحانی غذاؤں کا باعث بنے گی۔

نبضِ دوراں

مصنف کا نام : عارف عزیز

مرتب : مرضیہ عارف

ناشر : عزیز پبلیکیشنز ۲۰ گھاٹی بھوجلہ روڈ تلیا بھوپال

مبصر : ابراہیم یوسف۔ قیمت : ۵۰ روپے

اخبارات میں کالم نویسی فی البدیہہ ادب تخلیق کرنا ہے فی البدیہہ ادب کی اصطلاح ممکن ہے کچھ عجیب، غیر مانوس اور اٹپٹی معلوم ہو اور یہ بھی ممکن ہے کچھ حضرات اخبارات کے کالموں کو ادب کے زمرہ شامل کرنے سے اختلاف کریں لیکن جس طرح وہ ناول، وہ افسانے، وہ منظومات اور وہ ڈرامے جو اپنے دور کے سماجی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں تخلیق کیے جاتے ہیں نہ صرف ادب کا حصہ ہوتے ہیں بلکہ اس دور کی تاریخ بھی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اخبار کے کالم آنے والے مورخ کے مواد فراہم کرتے ہیں اور وہ ان سے روشنی حاصل کر کے اس دور کے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ اس طرح یہ اخباری کالم اپنے دور کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ اخبار کے کالم نویسی کا کام مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ کالم نویس کے لیے وسیع

معلومات اور وسیع مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کا بے باک اور نڈر ہونا ضروری ہے۔ اور سب سے بڑی بات اس کی قوت فیصلہ ہے۔ اگر کالم نویس مصلحت پسندی کا شکار ہے تو اس سے صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی توقع رکھنا فضول ہے۔ میں نے اخباری کالم نویسی کو فی البدیہہ ادب اس لیے کہا ہے کہ کالم نویس کو کسی ایسے موضوع پر قلم برداشتہ لکھنا ہوتا ہے۔ جو اس وقت کا برننگ پرابلم ہوتا ہے یوں تو مسائل سیکڑوں ہوتے ہیں۔ اب یہ کالم نویس کی ذہانت اور وقت کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ ان میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے۔

جناب عارف عزیز عرصہ سے اخبارات میں کالم نویسی کر رہے ہیں۔ اور ان کے منتخب کالم کا مجموعہ "نبض دوراں" کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آگیا ہے کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں تقریباً ۷۵ کالم شامل ہیں۔ ہر باب میں ایک ہی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے کالم شامل کیے گئے ہیں مثلاً جذب دائر کے زیر عنوان۔ اردو اور اس کا رسم خط' اردو تدریس کے مسائل' ہندستانی زبان کے فروغ کی ضرورت' اردو کے لیے ہماری ذمہ داری وغیرہ یا پھر رفتار رفتار عالم کے زیر عنوان۔ اقوام متحدہ کے پچاس سال 'ناوابستہ تحریک کی معنویت' دولت مشترکہ کا کردار' سارک علاقائی تعاون وغیرہ۔ جناب عارف عزیز کے کالموں کا مطالعہ کرنے کے بعد پہلی بات تو یہ سامنے آتی ہے کہ ایسے مسائل جن کو مصلحت پسند صحافی اور کالم نویس چھیڑتے ہوئے گھبراتے ہیں مثلاً فرقہ وارانہ فسادات یا ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کی حق تلفیاں وغیرہ۔ بلا کسی مصلحت پسندی کا شکار ہوئے بغیر اپنی رائے کا بے باکی سے اظہار کر دیتے ہیں اس کے علاوہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ اگر کسی مسئلہ پر اداریہ لکھا گیا ہے جسے اخبار کی پالیسی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر اسی مسئلہ پر جناب عارف عزیز نے اپنا کالم لکھا ہے۔ تو انھوں نے نڈر ہو کر اور فیصلہ سنایا ہے۔ نہ کسی فیصلہ سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی فیصلہ کی تقلید کی ہے۔ جس سے ان کی آزادی رائے اور قوت فیصلہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

نبض دوراں میں جن کالموں کو شامل کیا گیا ہے ان میں مقامی نوعیت کے مسائل کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہے ورنہ تمام کالم قومی اور بین اقوامی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں جن میں تاریخی' معاشی' معاشرتی' سیاسی' ادبی' اور ثقافتی مسائل شامل ہیں۔ جن کے مطالعہ سے کالم نویس کے وسیع مطالعہ اور معلومات' بے باکی اور قوت فیصلہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ان کالموں میں جناب عارف عزیز نے اپنے بے باک' نڈر اور غیر مصلحت پسند فیصلوں کو رواں زبان میں مدلل طور پر پیش کیا ہے۔ ضرورت تو یہ تھی نبض دوراں کے کالموں کے اقتباسات پیش کیے جاتے کہ جناب عارف عزیز کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی

ہوتی مگر لوبی طوالت کا خوف مانع ہے دوسرے چھوٹے چھوٹے اقتباسات سے کالم کی پوری روح کو سمجھنا ممکن نہیں ہے اس کے لیے پورے کالم کا مطالعہ ضروری ہے پھر بھی ان کے کالم "شک و شبہ کی دیواروں کا انہدام" سے ایک مختصر اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس سے ان کی بے باکی اور دوراندیشی کا ثبوت ملتا ہے۔

"مسلم اقلیت بدقسمتی سے آج اس ملک میں جس صورت حال سے دوچار ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی تعداد شمار کے لیے ہندستان میں ۱۵۔ ۱۶ کروڑ ہے لیکن ملک کی مجموعی آبادی میں اس کا تناسب صرف ۱۳۔ ۱۴ فیصد ہے ایسی حالت میں مسلمان اگر چاہیں کہ اسلحہ کی مدد سے اپنا دفاع کرسکیں تو یہ ممکن نہیں کیوں کہ ملک کا نظم و نسق ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اکثریت میں ہیں فوج اور پولیس بھی ان ہی پر مشتمل ہے جو کسی ناخوش گوار موقع پر اکثریت کا ہی ساتھ دیتی ہے اور اگر مسلمان ہتھیاروں سے اپنا دفاع کرنا چاہیں تو بھی فوج اور پولیس سے ان کا مقابلہ ہوگا۔ ایک اور ہتھیار محبت اور خدمت ہے جس کے لیے لائسنس یا کسی سے اجازت لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور اس ہتھیار سے عوام ہی نہیں پولیس اور فوج کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔"

ایک کمی جو مجھے نبض دوراں میں محسوس ہوئی وہ یہ کہ کالم کے ساتھ اس کے لکھے جانے کی تاریخ اور سن درج نہیں کیا گیا ہے اگر درج کردیا جاتا تو اس سے آیندہ ان کالموں کا مطالعہ کرنے والے کو اس دور کے تعلق سے مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ بہر حال صورت سے مولانا نظر آنے والے عارف عزیز نے نبض دوراں پیش کرکے اردو کالم نویسی میں اضافہ کیا ہے جس کے لیے وہ بجا طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

تحقیقی تصورات

مرتب: پروفیسر عبدالحق
مبصر: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
صفحات: ۲۷۸ قیمت: ۳۰۰ روپے
ناشر: شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی ۷
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی دہلی کے صدر پروفیسر عبدالحق نے اپنی مدت صدارت میں مؤقر جریدے اردوئے معلی کی اشاعت کو بھی از سر نو بحال کیا جو عرصۂ دراز سے مسدود تھی۔ اردوئے معلی سیریز کے کئی نمبر شائع کیے جن میں "تنقیدی تصورات" بالخصوص شہرت پاکر

قبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔ اسی سلسلے کا ایک اور جامع اور نادر نمبر "تحقیقی تصورات" منظر عام پر آیا ہے جس کے بعض مضامین نے تو نہ صرف تاریخ ادب اردو کی صحیح تعین میں مدد کی بلکہ اردو زبان کی پوری تاریخ کو متاثر کیا ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے۔ اس طرح اب تک دریافت شدہ حقائق کی بنا پر اردوئے معلی کا "تحقیقی تصورات" نمبر اردو زبان و ادب کی صحت و سلامتی کا ضامن ہے۔ جس سے باخبر ہونا ہر اردو والے کا فرضِ اولین ہے۔

"تحقیقی تصورات" کے مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) تحقیق (۲) تنقید (۳) تبصرہ۔ حصہ اول کتاب کا وہی وقیع اور لازوال حصہ ہے جس نے ادب اردو کی تاریخ ازسر نو ترتیب دی ہے۔ اس والا قدر حصہ میں جو مضامین شامل ہیں ان میں (۱) شاعر رنگین نوا (پروفیسر محمد حسن) (۲) امیر خسرو کا ہندوی کلام اور نسخۂ برلن (پروفیسر گوپی چند نارنگ) (۳) پنج آہنگ کا قدیم ترین قلمی نسخہ (ڈاکٹر محمد حنیف نقوی) (۴) مولانا حالی کی عربی نگارشات (پروفیسر محمد سلیمان اشرف) (۵) مفاتیح الریاست، ہندوستانی تاریخ و تہذیب کا ایک اہم ماخذ (پروفیسر شریف حسین قاسمی) نہایت اہم اور قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین میں سے ہر ایک مضمون ایک نئے نظریے اور نئی حقیقت کا انکشاف کرتا ہے جو اپنی جگہ مسلم ہے لیکن پروفیسر محمد حسن کا مضمون "شاعر رنگین نوا" ایسا انقلاب آفریں مضمون ہے جس نے آب حیات کے مصنف محمد حسین آزاد کی ساری فرضی عمارت منہدم کردی ہے یعنی شبلی، حالی اور بعض دوسرے محققین کی طرح پروفیسر محمد حسن نے بھی 'آب حیات' کو ایک بار پھر غیر تحقیقی اور محض خیالی ثابت کردیا ہے۔ "شاعر رنگیں نوا" نامی اس مضمون کی رو سے سعادت یار خاں رنگین اپنے زمانے کے معروف صاحب طرز شاعر تھے جنھوں نے ۲۷ اصناف میں طبع آزمائی کی جو پچھلے دو ہزار سال میں کسی دوسرے شاعر و ادیب نے نہیں کی۔ آزاد نے رنگین کو صرف ریختی کا موجد کہہ کر اس لیے ٹال دیا تھا کیونکہ رنگین انگریزوں کے مخالف اور ٹیپو سلطان کے مداح تھے ان کا ایک بے مثال قصیدہ ٹیپو سلطان کی مدح میں بھی ملتا ہے جو شامل مضمون ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے انڈیا آفس لائبریری میں رنگین کی چھوٹی بڑی اٹھائیس تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں ریختی کا نام و نشان بھی نہیں ہے اور آزاد کے برخلاف خود رنگین نے ریختی کا موجد اپنے آپ کو نہیں انشاء کو بتایا ہے۔ "تجربۂ رنگین" عسکری نظام پر لکھا گیا ایک اہم رسالہ ہے جو ایک طرح سے رنگین کی آپ بیتی بھی ہے جو غالباً خود نوشت کے طرز پر پہلی نثر بھی۔ اس کی سلاست اور روانی کے پیش نظر پروفیسر محمد حسن نے حیرت ظاہر کی ہے کہ ایسے رواں دواں نثرپارہ کو اردو تاریخ میں کوئی جگہ کیوں نہیں مل پاتی؟ اس طرح سعادت یار خاں رنگین کے بارے میں اور بہت سی نئی اور حقیقی معلومات اس مضمون میں فراہم کی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ رنگین اصل میں تعصب کا شکار ہوئے۔ اس طرح حسن صاحب کا یہ مضمون رنگین کے بارے میں بالکل نئی اور

تازہ معلومات فراہم کرتا ہے جو تاریخ ادب میں ان کے مرتبے کے تعین میں ممد و معاون ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون میں امیر خسرو کے کلام کی بازیافت کی ہے اور یہ بھی اردو کی تاریخ کا نیا اور لائیفنگ مجز ہے۔ یعنی اسپرنگر کے نسخے مخزونہ برلن کی دریافت کے بعد اب امیر خسرو کے ہندی کلام کی تردید آسان نہیں۔ مولانا حالی کو اب تک ہم صرف اردو کے شاعر اور نقاد کی حیثیت سے دیکھتے اور سمجھتے رہے ہیں لیکن پروفیسر محمد سلیمان اشرف کے مضمون "مولانا حالی کی عربی نگارشات" نے ثابت کر دیا ہے کہ حالی اردو اور فارسی کے علاوہ عربی زبان کے بھی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ اور یہ نظریہ بھی "تحقیقی تصورات" میں پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ اس طرح "تنقید" والے حصہ میں نہایت اہم اور وقیع مضامین شامل ہیں۔ "تبصرہ" میں بعض کتابوں کے اوپر بے لاگ تبصرے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض کتابیں کس طرح علم و ادب کی دنیا میں گمراہی کا سبب بنتی ہیں۔ اس بارے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا تبصرہ "اردو شاعری میں مستعمل تلمیحات و مصطلحات" نام کی ایک کتاب پر ہے جس نے پوری کتاب پر یکسر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے۔

تحقیق و تنقید کے موضوع اور مباحث پر لکھا گیا پروفیسر عبد الحق کا مقدمہ تحقیقی معنویت اور الفاظ و اسلوب نگارش کی ایک عمدہ مثال ہے اور کتاب میں شامل دیگر باز آفریں مضامین سے کسی طرح کم نہیں جو تحقیق کے اسکالروں کے لیے بھی یکساں مفید ہے۔

کتاب کے اعلا معیار اور اقدار کے بقدر کتابت، طباعت اور جلد وغیرہ بھی شایان شان ہے جس خوش اسلوبی کے اور صفائی و ستھرائی سے اس کتاب کو جاذب نظر سرورق کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اس کے لیے اس کتاب کا اشاعتی ادارہ بھی قابلِ مبارکباد ہے۔ بلاشبہ یہ ایسی کتابوں میں سے ایک ہے جو بہت لمبے عرصے کے بعد ایک آدھ منظر عام پر آتی ہے اور اپنی وقعت اور اپنی ضرورت خود بخود منوالیتی ہے۔ یقین ہے کہ اردو ادب کی دنیا میں اس انقلاب آفریں کتاب کا غیر معمولی خیر مقدم کیا جائے گا۔

کھلے خطوط

★عبداللطیف اعظمی۔ ۴۹۔۳ ذاکر نگر نئی دہلی
ماہنامہ کتاب نما بابت ماہ اکتوبر ۱۹۹۶ میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم پر برادرم ڈاکٹر محمد اکرام خاں صاحب کا ایک مختصر مضمون شائع ہوا ہے (صفحات ۶۳۔۶۶) جس میں ان کے قلم سے سہواً ایک بات نکل گئی۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ مدینہ اخبار (بجنور) میں انھوں نے بحیثیت مددگار مدیر کام کیا۔ جس وقت مرحوم نے سہ روزہ مدینہ میں ۲۱ مئی ۱۹۵۰ء کو کام شروع کیا تو مددگار مدیر کا کوئی عہدہ نہیں تھا۔ ادارۂ تحریر میں تین نام تھے۔ تیسرا نام ضیاء صاحب مرحوم کا تھا۔ ان تینوں ناموں کی تفصیل یوں تھی۔
حمید حسن فکر، محمد وارث کامل بی اے۔ ضیاء الحسن فاروقی ایم اے۔ کچھ عرصے کے بعد ۵ جنوری ۱۹۵۳ کے شمارے میں ضیاء صاحب کا نام بیچ میں آگیا یعنی: حمید حسن فکر۔ ضیاء الحسن فاروقی ایم اے اور محمد وارث کامل بی اے۔

★ سیما فریدی۔ انیس منزل شیخو پور۔ بدایوں۔ یوپی
کتاب نما کے حالیہ شمارے میں جناب رفعت صدیقی صاحب کا افسانہ ”یہ کیسی مسیحائی؟“ بار بار پڑھنے کو دل چاہا۔ یہ دور حاضر کا المیہ ہے۔ حقیقت ہے۔ جسے رفعت صاحب نے چابکدستی کے ساتھ افسانے کا پیرہن پہنا دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کہانی کا انگلش اور ہندی میں ترجمہ ہو اور جو لوگ اس کہانی کے جیتے جاگتے کردار ہیں وہ اسے پڑھیں اور عبرت حاصل کریں۔ رفعت صاحب کو کتاب نما کے توسط سے اس شاہ کار کہانی کے لیے ہماری جانب سے مبارکباد۔
قیوم صاحب کی غزل کا یہ شعر حاصل غزل ٹھہرا۔

کنوارے پن کی آنکھوں سے لہو ٹپکے گا آنگن میں
کبھی سوچا نہ تھا ایسی بھی تذلیل بشر ہوگی

علاوہ ازیں پروین صدیقی۔ محسن زیدی۔ عبدالمعروف خاں۔ ضمیر ساجد صاحب۔ اختر سعید خاں اور دیگر شعرا اکرام اپنی اپنی جگہ کامیاب ہیں۔ ڈاکٹر تو قیر صاحب نے نے واقعات اقبال کے تحت حیات اقبال کی انوکھی تحقیق کی ہے۔ یہ مضمون بھی بار بار پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب تو مبارکباد کے مستحق ہیں ہی تاہم کتاب نما کا یہ کارنامہ بھی قابل ستائش ہے کہ اس نے حیات اقبال کی اس نئی تحقیق سے قارئین کو روشناس کرایا۔ مصروفیات کے باعث ابھی تازہ شمارے کا پوری طرح مطالعہ بھی نہیں کیا بس جتنا دیکھا تھا اتنا لکھ دیا۔

★ڈاکٹر اسلام عشرت۔ پٹنہ
ماہنامہ کتاب نما کا مطالعہ بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ سے خرید کر ہمیشہ کرتا ہوں۔ ستمبر ۱۹۹۶ کا شمارہ مضامین کے لحاظ سے اچھا خاصا وقیع ہے۔ زیر نظر شمارے میں آٹھ مضامین شامل ہیں جن میں مظہر امام، ڈاکٹر قیصر شمیم، ف، س اعجاز، شارب ردولوی، اور ڈاکٹر محمد نعمان کے مضامین۔ مواد و موضوع اور معنیٰ و مفاہیم کے اعتبار سے محض قابلِ اعتنا ہی نہیں بلکہ قابل غور و فکر اور معلومات افزا بھی ہیں۔ مہمان مدیر کی حیثیت سے شرون کمار ورما (جو خود ایک مشہور و ممتاز کہانی کار ہیں) نے جو کہانی کے متعلق اپنے خیالات و تاثرات بیان کیے ہیں وہ مثبت اور قابل تحسین ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی عمدہ و معیاری ہے۔ تبصرے پُر مغز، بے لاگ اور متوازن ہیں۔

★خالد عبادی، ۲ نیتاجی مارگ پٹنہ ۱
ستمبر کے کتاب نما میں اپنے مضمون "ادب، آؤ اور آؤ" کی اشاعت کے لیے از حد ممنون ہوں۔ مجھے گمان تک نہ تھا کہ آپ اس مضمون کو شائع کریں گے اور وہ بھی اتنی جلدی۔
مضمون ایک دو جگہ خبط کمپوزنگ کا شکار ہو گیا ہے۔ مثلاً

(۱) "۔۔۔ سچی بات کہنا بے لطف ہونے اور بے لطف کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں۔" یہاں "بے لطف ہونے" کی جگہ "بے تکلف ہونے" اور اس کے فوراً بعد "اس لیے پیدائی شعرا کے امکان متصورہ سے مایوسی کفر ہوگا" کی جگہ "ہیرائی شعرا کے امکان متصورہ سے مایوس کن ہو جانا" کمپوز ہو گیا ہے (مضمون کا دوسرا پیرا ملاحظہ فرمائیں)
(۲) مضمون کے تیسرے پیرا میں "۔۔۔ اپنی قلم رو میں شامل کر کے فاصلہ اور فاصلہ با فاصلہ اور فاصلوں کی روٹی مٹا دیتا ہے۔" ہونا چاہیے یہاں فاصا اور فاصا یا فاصا اور فاصلوں" کمپوز ہو گیا ہے جو بظاہر میرا مقصود نہیں۔ اس تصحیح کے لیے ممنون ہوں گا۔

★سید فیاض الرحمٰن شارق۔ پٹنہ ۷
کتاب نما اکتوبر موصول ہوا۔ مجموعی طور پر اچھا ہے اور نثری حصے کا پلہ گراں ہے۔ مہمان مدیر کا اداریہ مایوس کن ہے اور جو لوگ اردو کی ترویج و بقا کے لیے متحرک ہیں ان کے حوصلے پست کرتا ہے۔ مضمون میں "رویہ" تانیث استعمال ہوا ہے۔ جس ریاست نے آزادی کے بعد اردو تحریک کی بدولت جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان کا فاضل مدیر نے مطالعہ کیا ہی نہیں۔

"ہندستان میں تقسیم ہند کے بعد اردو درجہ تعلیم کا کوئی مدرسہ کسی علاقے میں نہیں کھلا" یہ جملہ فاضل مدیر کی بے خبری کا معلن ہے۔

غزلوں میں مخمور سعیدی، عارف شفیق، ستیہ پال ملہوترہ، اور قاسم امام کی غزلیں پیاری ہیں۔ مسرت بانو شیخ ابراہیم کا افسانہ "جنم جلی" اچھا ہے۔ افسانہ میں "زور" تانیث اور "کمین گاہ" تذکیر استعمال ہوا ہے۔ "قیامت کی اداسی" اور "تکلیفوں کا جنم" جیسے ٹکڑے افسانہ کی دہلیز پر زیادہ کاربن اگلنے والے چراغ ہیں۔

★رشید الدین۔ حیدر آباد

اکتوبر ۹۶ء کا کتاب نما ملا.. شکریہ۔ میرے کلیدی مضمون جو آپ نے اشاریہ کے طور پر شائع کیا ہے کمپیوٹر کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں ہیں۔ سب سے پہلے تو میرے پتے میں پن کوڈ نمبر ہی غلط شائع ہو گیا ہے۔ یہ ۲۸ تھا جو ۳۸ ہو گیا ہے۔ اندر بھی کمپیوٹر کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ پہلے اردو میں کتابت کی غلطیوں کا رونا تھا اب کمپیوٹر کی غلطیاں عام ہیں۔ پروف ریڈر کا کام ہے کہ متن کو دھیان سے پڑھے۔ آدھرا پردیش میں آٹھ اضلاع ہیں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ کمپوزنگ میں ۸ کا ہندسہ چھوٹ گیا ہے اور آندھرا پردیش کے اضلاع چھپ گیا ہے۔ اس سے قاری کو الجھن ہو سکتی ہے کہ جب آندھرا پردیش کے اضلاع میں لکھا گیا ہے تو آندھرا پردیش ہی کیوں نہیں لکھا گیا ہے اگر اضلاع ہے تو یہ کون کون سے اضلاع ہیں۔ ایک غلطی البتہ میری ہے جو مسودہ میں درست کرنے سے رہ گئی۔ ساری دنیا میں اردو کا مقام سترھواں ہے جبکہ میں نے تیرھواں لکھا ہے یعنی گراف اور نیچے آ گیا ہے پن کوڈ نمبر غلط ہونے اور مکان نمبر نہ ہونے (مکان نمبر تو میں نے ہی نہیں لکھا تھا) کے باوجود مجھے بہت سے توصیفی خطوط مل رہے ہیں اور دوست احباب نے بھی یہاں اس مضمون اور اس میں ظاہر کردہ خیالات پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ بہت سے لوگوں کو میرے نقطۂ نظر سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے اس لیے میں چاہوں گا کہ آپ اس پر ردّ عمل کے خطوط شائع کریں اور جو نہ شائع کر سکتے ہوں یا بہت طویل ہوں تو مجھے ایک لفافے میں روانہ کر دیجیے آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن یہ ایک اہم موضوع ہے اس لیے آپ سے یہ درخواست کر رہا ہوں۔

★نامی انصاری ۲۹۵/۹۹ نالا روڈ چمن گنج۔ کانپور

کتاب نما کے اکتوبر کے شمارے میں جناب رشید الدین صاحب کا اشاریہ

'زبان و ادب" ان کی فکر مندی تو ظاہر کرتا ہے لیکن اس میں غلط مفروضات قائم کر کے غلط نتائج بھی نکالے گئے ہیں جن سے لوگوں کو خواہ مخواہ کے شکوک پیدا ہو سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ صفحہ سات پر داغ کا جو شعر درج ہے وہ غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ صحیح شعر یوں ہے اور بہت مشہور ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

رشید الدین نے ہندستان کو "سارے جہاں" سے بدل دیا ہے نتیجتاً اس شعر کے بعد انھوں نے جو عبارت لکھی ہے وہ از خود ساقط ٹھہرتی ہے۔

زبان کی اہمیت تسلیم لیکن زبان کو وقار اور اعتبار اس کے ادب سے ہی ملتا ہے۔ رشید الدین نے لکھا ہے:

"ہندستان میں آج بھی آدی باسی علاقوں میں ایسی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں اور صدیوں سے بولی جاتی ہیں لیکن ان کا کوئی رسم خط نہیں ہے۔۔۔ یہ جاندار زبانیں ہیں کیونکہ ان کے بولنے والے موجود ہیں۔"

تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے اردو زبان کو بھی آدی باسی زبانوں کی مانند ہو جانا چاہیے کہ اس کے بولنے والے تو موجود ہوں لیکن اس کے ادب کو نظر انداز کر دیا جائے؟ یقیناً مضمون نگار کا یہ مطلب نہیں ہوگا لیکن ان کی تحریر سے یہی مترشح ہوتا ہے۔

کشمیر میں اردو زبان کی حیثیت کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "نہ کشمیری اردو زبان کو پسند کرتے ہیں اور نہ جموں کے لوگ"

کشمیر کے بارے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کے لوگ اردو کو پسند بھی کرتے ہیں اور اپنی تقریر و تحریر میں اردو کا وافر استعمال بھی کرتے ہیں۔ البتہ وہ اپنے گھروں میں اپنی مادری زبان کشمیری بولتے ہیں۔ ساری وادیٔ کشمیر میں ہر جگہ بازاروں میں، سرکاری تختیوں پر، سڑکوں پر لگے بورڈوں میں، سرکاری و غیر سرکاری دفتروں میں ہر جگہ اردو ہی نظر آتی ہے، کہیں کہیں انگریزی بھی دکھائی پڑتی ہے۔ ٹی وی پر کشمیری لیڈروں کو سبھی نے بولتے سنا ہوگا۔ یہ لوگ ہمیشہ اردو ہی بولتے ہیں، البتہ مشرق وسطیٰ اور یورپ و امریکا میں اردو کی حیثیت کے بارے میں رشید الدین نے جو لکھا ہے وہ درست ہے۔۔۔ اردو کے بعض حضرات "اردو کی نئی بستیاں" کا پہاڑہ بڑے زور و شور سے پڑھتے رہتے ہیں جس کا واحد مقصد ان نئی بستیوں سے مالی منفعت حاصل کرنا، وہاں کے مشاعروں کے دعوت نامے حاصل کرنا، اور نئی بستیوں میں اپنی کتابوں اور رسالوں کی فروخت بڑھانا ہے۔ ہمارے "صارف سماج" کا یہ بھی ایک منظر ہے، چاہے ہمیں پسند ہو یا نہ ہو۔●

ادبی و تہذیبی خبریں

شمس الرحمٰن فاروقی کا اسرائیل یونیورسٹی میں توسیعی خطبہ دینے سے انکار

معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کو اسرائیل کی JEWISH UNIVERSITY "ہندستانی شعریات" پر پہلا توسیعی خطبہ دینے کے لیے پیہم اصرار کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں یونی ورسٹی نے طعام و قیام کے علاوہ انھیں کئی لاکھ کی رقم دینے کی پیش کش کی ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اسرائیل کے فلسطینیوں پر مظالم کو دیکھتے ہوئے ان کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور وہاں جانے سے انکار کر دیا۔

کویت میں "اپکار" کا یادگار مشاعرہ

گذشتہ روز ہندستانی سفارت خانے کے آڈیٹوریم میں مقامی بھارتی ثقافتی تنظیم "اپکار" کے زیر اہتمام بھارت کے پچاسویں یوم آزادی کے سلسلہ میں ایک شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس میں مقامی تمام ہندستانی شعرا نے سامعین کو محظوظ کیا۔ "اپکار" کے صدر یو۔ سی۔ شرما نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اس مشاعرے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ سفیر ہند جناب بی، ایم، سی نائر جو اس مشاعرہ کے مہمان خصوصی تھے انھوں نے شاعروں اور ادیبوں کو یکجہتی کے موضوع پر اپنی تخلیقات پیش کرنے کی درخواست کی، وہیں گیسٹ آف آنر، مقامی اسکالر محترمہ صالحہ جواد موسیٰ نے آزادی کے مفہوم کو اجاگر کرتے ہوئے قومی یکجہتی کی افادیت پر گفتگو کی۔ مشاعرہ کے مدیر جی کے سکسینہ نے اپکار کی ثقافتی اور ادبی خدمات کو سراہا۔ اس یادگار اور کامیاب مشاعرہ کی نظامت اردو کے معروف شاعر و ادیب اور مراٹھی کے معتبر مترجم جناب نور پرکار نے کی۔ نور پرکار کی نظامت نے مشاعرہ میں چار چاند لگائے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً ادبی واقعات کا ذکر اس خوبصورت انداز سے کیا کہ آخر تک حاضرین کی دلچسپی کو برقرار رکھا۔ نیز خوبصورت شعری حوالوں سے سامعین کی بھرپور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا ان میں نور پرکار، عبداللہ ساجد جی کے سکسینہ، یو، سی شرما، جسبیر سنگھ دھیمان ایوب قاسم کرجیکر، اسلم عمادی، افتخار شہزاد اعظمی مسرور عابدی، احمد علی عرفان، غزالہ بانو، ڈاکٹر اروند رینا، منظر عالم، اکبر نظر بریلوی، تسکین انصاری، سعید نظر کرپوی، اور عبداللہ اطہر کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو کی چار ممتاز شخصیتوں کو عوامی ایوارڈ

پونے۔ یکم اکتوبر، پونے گنیش اتسو سلسلہ کے ایک عوامی جلسہ میں ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ء کو مہاراشٹر کی مندرجہ ذیل ممتاز شخصیتوں کی خدمت میں

ان کی دیرینہ ادبی، تعلیمی اور صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر توصیف نامے شیشوں کی خوبصورت فریم کی شکل میں پیش کیے گئے۔

جناب قاضی سلیم : برائے شعری خدمات
ڈاکٹر عصمت جاوید۔ برائے ادبی و لسانی خدمات
ڈاکٹر رفیق زکریا : برائے تعلیمی خدمات
جناب ہارون الرشید : برائے صحافتی خدمات

یہ توصیف نامے جناب علی سردار جعفری کے ہاتھوں تفویض کیے گئے۔ جناب سریش کلماڈی ایم پی و سابق وزیر ریلوے نے انعام یافتگان کو مبارک باد دی اور مشہور و معروف صحافی ایم جے اکبر نے گلدستوں سے نوازا۔ چونکہ اردو کی ممتاز شخصیتوں کو عوامی ایوارڈ دینے کی روایت پونے فیسٹول کمیٹی نے پہلی بار قائم کی ہے اس پر پونے کے ادب نواز اردو حلقوں اور عوام میں مسرت کا اظہار کیا گیا۔

منجانب: عثمان ہیرولی پونے فیسٹی ول کمیٹی

کامل بہزادی کی نئی کتاب کی رونمائی

ناگپور (بذریعہ ڈاک) صدر مسلم لائبریری ناگپور میں گذشتہ شب بھوپال کے مشہور شاعر و ادیب کامل بہزادی کے اعزاز میں ایک شعری نشست زیر صدارت جناب جلیل ساز انعقاد پذیر ہوئی۔

جناب حسین العلاف صاحب نے تلاوت کلام پاک سے نشست کا آغاز کیا۔ جناب عبدالمقیت نے مہمانوں کی گل پوشی کی اور لائبریری کے صدر پروفیسر سید یونس صاحب نے خصوصی مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔

اس موقع پر جناب کامل بہزادی کی نئی تصنیف "تلوک چند محروم۔ ایک مطالعہ" کی رسم اجرا ادا کی گئی۔ کتاب کی رونمائی جناب ایڈوکیٹ حبیب الدین صاحب نے فرمائی۔ موصوف نے فرمایا کہ حسن اتفاق سے کامل صاحب کی سابقہ تصنیف "لفظوں کا سفر" کی رونمائی کی رسم بھی میرے ہی ہاتھوں انجام پائی تھی۔

جناب کامل بہزادی نے استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تلوک چند محروم کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جملہ اصناف سخن جیسے غزل، نظم اور رباعیات میں طبع آزمائی کی ہے۔

جناب جلیل ساز صاحب نے سامعین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ و ترقی کے لیے ایسی نشستوں کی بہت ضرورت ہے۔

اس خوشگوار تقریب کے بعد محفل شعر و سخن کا آغاز ہوا جس میں جناب جلیل ساز، پروفیسر منشاءالرحمن خاں منشاء، پروفیسر سید یونس، ظفر کلیم، ڈاکٹر بدر جمیل اور ظہیر عالم نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ڈاکٹر بدر جمیل نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور آخر میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

تحقیق تصورات' اردو ادب میں ایک اہم اضافہ

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی دہلی کی تازہ ترین اشاعت "تحقیق تصورات"، کی رسم اجرا کا جلسہ ۱۶ر ستمبر کو سیمینار روم آرٹس فیکلٹی دہلی یونی ورسٹی میں منعقد ہوا۔ جلسے کا آغاز کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ "تحقیق تصورات"، کی اشاعت نہ صرف شعبے کے لیے بلکہ اردو دنیا کے لیے ایک مفید اور اہم دستاویزی کتاب ثابت ہوگی۔ اس میں شامل "شاعر رنگین نوا"، کے عنوان سے پروفیسر محمد حسن کا مضمون اردو شاعری کے چند نئے حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مضامین بھی مختلف ادبی حقائق پر مبنی ہیں۔ پروفیسر عبدالحق نے اس کی اشاعت میں شعبے کے احباب اور مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر علاء الدین احمد وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نے اسے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ بتایا۔ پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ "تحقیق تصورات"، بلاشبہ اردو میں زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس جلسے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سراج الدین قریشی صاحب موجود تھے۔ ان کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف ایجوکیشن پروفیسر جلیل، پروفیسر بابل (شعبۂ ہندی) ڈاکٹر الطاف حسین، مولانا عبدالحمید نعمانی، پروفیسر عظیم الشان صدیقی، پروفیسر شمیم نکہت، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر عشرت فاطمہ، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان کے علاوہ جامعہ ملیہ، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی اور دہلی یونی ورسٹی کے اساتذہ و اسکالر جلسہ میں شریک تھے۔

نشست بیادِ ضیا فتح آبادی

آنجہانی ضیاء فتح آبادی کی یاد میں حلقہ تشنگانِ ادب نئی دہلی نے ایک شعری نشست مرحوم کی دسویں برسی کے موقع پر ۲۵ر اگست ۹۶ء کو مسز ضیا راج سونی کے دولت کدہ پر منعقد کی۔

۲۸۴ ویں اس نشست میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب تاباں ضیائی۔ سنادو (ایم پی) نے شرکت فرمائی۔ ان کے علاوہ چالیس شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اور سامعین کو محظوظ کیا۔ جن شعراء کرام کو داد سے خوب خوب نوازا گیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مہمان خصوصی تاباں ضیائی، مظہر امام، جگدیش جین (صدر بزم)، رادھا کرشن سہگل، اندر سروپ ناداں، سیماب سلطانپوری (سکریٹری بزم)، تقوی دہلوی اختر دہلوی، رعنا مظہری، رام پرکاش راہی، بسمل ساہنی، رویندر کمار روی (ضیا فتح آبادی کے بڑے بیٹے)، منور دہلوی (طنز و مزاح)، گروبندر سنگھ عازم۔ نشست کے آغاز میں آنجہانی ضیاء فتح آبادی کی شخصیت اور شاعری پر جناب منور دہلوی اور جناب تاباں ضیائی نے اپنا اپنا مقالہ پڑھا۔ جناب مظہر امام نے اپنا کلام پیش کرنے سے قبل ضیا فتح آبادی کی فنی خدمات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

فرزند ضیا فتح آبادی نے (جو انگلش میں بھی بہت اچھا لکھتے ہیں)، مختصر انگریزی نظم پیش کی۔ یہ نشست دوپہر تین بجے اپنے وقار کے ساتھ شروع ہو کر رات کے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوئی۔ اس نشست کی صدارت جناب جگدیش جین اور نظامت جناب سیماب سلطانپوری نے فرمائی۔

تاباں ضیائی

صدر بزم سخن سناد و۔ ایم۔ پی

خلیج میں "جشن پیرزادہ" کے عالمی مشاعرے

(بذریعہ ڈاک) دوحہ قطر کی مجلس فروغ اردو ادب نے اس سال عالمی اردو ادب ایوارڈ کی داغ بیل ڈال دی ہے جس کے تحت ہر سال پاک و ہند کے مقتدر ادیب و نقاد کو ایک ایک لاکھ روپے نقد اور طلائی تمغے پیش کیا کرے گی۔

۱۸ ستمبر کو دوحہ قطر میں مجلس کے چیرمین بورڈ آف ٹرسٹیز جناب محمد عتیق کی جانب سے عالمی اردو ادب ایوارڈ کی اختتامی تقریب منعقد کی گئی جس میں ۱۹۹۶ء کے ایوارڈ یافتگان کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ پاکستان کے لیے ممتاز ادیب و شاعر جناب احمد ندیم قاسمی اور ہندستان کے معروف نقاد و ادیب جناب آل احمد سرور کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

دوحہ کلب کی تقریب میں مشتاق احمد یوسفی نے احمد ندیم قاسمی پر شگفتہ خاکہ سنایا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے آل احمد سرور کی خدمات و شخصیات پر اپنا مضمون پیش کیا۔

دوسرے دن ۱۹ ستمبر کی جگمگاتی رات میں دوحہ قطر کے ہوٹل شیراٹن میں جشن پیرزادہ قاسم کا عالمی مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب علی سردار جعفری نے فرمائی اور نظامت حسب روایت سلیم جعفری نے ادا کی۔

تقریب کے مہمان اعزازی دوحہ قطر کے وزیر اطلاعات و ثقافت ڈاکٹر محمد عبدالعزیز الکواری تھے جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے احمد ندیم قاسمی کو ایک لاکھ روپے کا نقد ایوارڈ، طلائی تمغہ اور شال سے نوازا۔ ہندستان کے ایوارڈ یافتہ آل احمد سرور اپنی علالت کی وجہ سے دوحہ تشریف نہ لا سکے۔ لہٰذا ایوارڈ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سپرد کر دیا گیا۔

اس موقع پر وزیر موصوف نے صاحب جشن ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کی نئی شعری کتاب "شعلوں پہ زباں"، مجلس کا مجلۂ ایوارڈ، اور مجلۂ پیرزادہ کی رسم رونمائی فرمائی۔ دوران تقریب وزیر محترم کے علاوہ چیرمین محمد عتیق، بانی مجلس معیب الرحمن ابن الحبیب احقر اور علی سردار جعفری نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

ابتدا میں وزیر موصوف کے علاوہ قطر میں سفیر پاکستان عزت مآب جناب لیاقت محمود، علی سردار جعفری، پیرزادہ قاسم، ادریس دہلوی اور مہمان خصوصی مہبا لکھنوی مدیر افکار کراچی کا دوحہ کے بچوں نے خوشنما پھولوں کے ساتھ استقبال کیا۔

جشن پیرزادہ کا افتتاحی پروگرام ۱۴ ستمبر کو ممبئی میں عالمی مشاعروں کے بانی سلیم جعفری

کی سرپرستی و نگرانی اور نظامت میں شروع ہوا مشاعرے کے مہمان اعزازی جناب عبدالرزاق سومرو سفیر پاکستان تھے ۱۳ ستمبر کو العین کی "بزم شعر و ادب" کی جانب سے مشاعرہ ہوا جس کی نظامت ظہورالاسلام جاوید نے کی۔ ۱۴ ستمبر کو انڈین اسپورٹس کلب دبئی کے صدر محترم کے۔ ایم بھاٹیہ نے محفل مشاعرہ اور ضیافت کا اہتمام کیا اور ۱۵ ستمبر کو دبئی کی ممتاز اردو دوست محترمہ اختر جہاں ملک نے ایک جدید ہوٹل میں شعری نشست اور عشائیہ کا انعقاد کیا جس میں پیرزادہ کو ان کے ۴۵ اشعار سے کاڑھی گئی رنگ برنگی چادر پیش کی۔

تقریبات میں انٹرنیشنل سامع، کراچی کے جہانگیر خاں، رابطہ آفیسر ان حفیظ باحلیم حاجی انیس دہلوی اور معاون خصوصی کفایت دہلوی نے بھی شرکت فرما کر تقریبات کا وقار بلند کیا۔

مشاعرے میں پاکستان کی جانب سے صاحب جشن ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، افتخار عارف، جون ایلیاء، خالد غزنوی، اطہر شاہ جیدی، اقبال مجیدی، لیاقت علی عاصم دانش، فرحت عباس شاہ اور ڈاکٹر نکہت افتخار نے شرکت کی۔

ہندوستان کی نمائندگی وسیم بریلوی، معراج فیض آبادی، شین کاف نظام، احمد نثار جونپوری، ہما پروین رضوی اور تاجور سلطانہ نے کی جبکہ صدارت کے فرائض علی سردار جعفری نے فرمائے۔ ان کا جشن اکتوبر ۱۹۹۷ء میں منایا جائے گا۔

ظفر علی انجم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

۲۹ جون ۱۹۹۶ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ظفر علی انجم کی پی ایچ ڈی ڈگری کے لیے زبانی امتحان VIVA ہوا جس کے بعد ان کے عربی مقالہ پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دے دی گئی۔ انجم صاحب کا مقالہ جدید مصری عربی ادب سے متعلق ہے جس کا موضوع ہے "مصر کی ادبی تحریکات۔ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں"

علامہ انجم فوقی بدایونی پر تحقیقی مقالہ

"آئینہ در آئینہ" کی اشاعت

مشہور شاعر و ادیب علامہ حکیم انجم فوقی بدایونی (مرحوم) کے فکر و فن اور شخصیت پر پی ایچ ڈی کرنے والی ڈاکٹر فرزانہ خان کا تھیسس اب کتابی شکل میں "آئینہ در آئینہ" کے عنوان سے ادارہ فوق الادب کراچی نے شائع کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ مقالہ ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشاء کے زیر نگرانی تکمیل کو پہنچا تھا اور ناگ پور یونیورسٹی نے فرزانہ خان کو اسی تحقیقی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی تھی۔

محمد حسین کو پی ایچ ڈی ڈگری تفویض

بیکانیر۔ راجستھان یونیورسٹی جے پور کی جانب سے محمد حسین اسسٹنٹ پروفیسر صدر شعبۂ اردو ڈونگر کالج بیکانیر کو ان کے تحقیقی مقالہ

"اردو تحقیق ۱۹۴۷ء سے قبل" پر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر فیروز احمد ایسوسیٹ پروفیسر شعبۂ اردو راجستھان یونی ورسٹی جے پور کی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ زبانی امتحان پروفیسر سید محمود الحسن سابق صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ نے لیا۔ مقالہ چھے ابواب پر مشتمل ہے جن میں ۱۹۴۷ء تک اردو میں تحقیقی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ممتاز افسانہ نگار اور دانشور رام لعل کا انتقال

۱۶ر اکتوبر، اردو کے سینیر اور ممتاز افسانہ نگار رام لعل کا آج صبح اچانک یہاں اپنے مکان اندرانگر میں انتقال ہوگیا اور اس طرح لکھنؤ میں افسانہ نگاری اور اردو کے لیے جدوجہد کا ایک عہد ختم ہوگیا۔

رام لعل جی کی آخری رسوم آج شام بھینسا کنڈ کے شمشان گھاٹ پر ادا کی گئیں اور جب ان کے بیٹے نے چتا میں آگ دی تو وہاں موجود ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دوستوں کے ایک بڑے مجمع کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں۔

رام لعل جی کی عمر ۷۵ برس کے لگ بھگ تھی اور تقریباً تین چار برسوں سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اس لیے ان کی سنادنی آنے کے لیے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا لیکن جو اطلاعات ملتی تھیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے ان کے جسم نے یا ان کی قوت ارادی نے ان کے مرض پر قابو پالیا ہو۔ وہ ہنستے بولتے تھے، چلتے پھرتے تھے اور آج صبح بھی یہی ہوا۔ بیدار ہونے کے بعد حسب معمول انھوں نے اپنے کمرے کو صاف کیا اور پودوں میں پانی دیا اور پھر اچانک وقت آگیا اور وہ خود ہنستے کھیلتے دنیا سے چلے گئے لیکن دوسروں کو رُلا گئے۔

رام لعل جی کی شخصیت میں ادبی خلاقی کے ساتھ قوت عمل بھی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ اگر وہ ایک طرف ممتاز افسانہ نگار، ناول نگار، انشا نویس اور سفرناموں کے خالق تھے تو دوسری طرف انھوں نے غیر مسلم اردو مصنفین کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کرکے اردو کے چہرے پر لیے ا[ن] داغ دھونے کی عملی کوشش کی جو اس پر لوگ یہ کہہ کر لگاتے تھے کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے
انھوں نے کل ہند اردو رابطہ کمیٹی کے ذریعہ جس کے وہ صدر تھے پورے اترپردیش میں ا[ردو] کے لیے ایک بھرپور مہم چلائی۔

رام لعل جی کا ایک بڑا وصف ان کی انسان دوستی اور ان کا سیکولرازم تھا لکھنؤ میں ہر کشیدگی کے وقت وہ کسی نہ کسی تنظیم سے وابستہ ہوکر ان قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جاتے تھے جو اس ملک میں اشتعال اور کشیدگی پیدا کرنے کے درپے رہی ہیں۔ چنانچہ دفتر قومی آواز میں ان کی جو آخری تحریر موصول ہوئی وہ مصور مقبول فدا حسین پر ہونے والی یلغار کے خلاف صدائے احتجاج ہے، اس اپیل پر جو ان کی فعالیت کی وجہ سے تحریر ہوئی ان کے ساتھ بہت سے دوسرے ادیبوں کے بھی دستخط ہیں۔

رام لعل جی لکھنؤ میں اس وقت حیات اللہ

انصاری صاحب کے بعد غالباً سب سے سینیر افسانہ نگار تھے، ان کا ادبی سفر اس وقت شروع ہوگیا تھا جب تقسیم سے قبل وہ لاہور میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے بیوی، ایک بیٹا اور دو بیٹیوں کے علاوہ سیکڑوں افسانوں، متعدد ناولوں اور سفر ناموں کو یادگار چھوڑا ہے۔

ان کے ادبی مرتبے کو متعین کرنے کے لیے ان کے بارے میں کئی یونی ورسٹیوں میں تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔ "زرد پتوں کی بہار"، اردو کے سفر ناموں میں ایک اہم سفرنامہ ہے۔

آج جن لوگوں نے رام لعل جی کی وفات پر اظہار رنج والم کیا ہے ان میں اردو کے سب سے سینیر افسانہ نگار حیات اللہ انصاری صاحب سرفہرست ہیں جنھوں نے رام لعل جی کی وفات کو اردو کا ایک بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ کل ہند اردو رابطہ کمیٹی میں رام لعل جی کے ساتھی ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے ان کی وفات پر اظہارِ غم کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اردو کے ایسے ادیب و دانشور تھے جن پر مجاہد اردو کا لقب سجتا ہو۔ رام لعل جی فخر الدین علی احمد کمیٹی کے چیرمین اور اردو اکادمی کے نائب چیرمین بھی رہ چکے تھے۔

رام لعل جی پنجاب کے شہر میاں والی کے رہنے والے تھے جو اب پاکستان میں ہے۔ لیکن آزادی سے قبل وہ تعلیم اور پھر ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے جہاں سے تقسیم ہند کے بعد کے فسادات کے زمانے میں ہندستان آگئے تھے اور انھوں نے ریلوے میں ملازمت کر لی تھی۔ کچھ دنوں دہلی میں رہنے کے بعد وہ لکھنؤ منتقل ہوگئے تھے اور ایک عمر کی جدوجہد، تخلیقی سرگرمیوں اور شوریدہ سری کے بعد اسی شہر میں ان کو بالیں آسایش نصیب ہوگئی۔ (قومی آواز دہلی)

پروفیسر سیّد حامد جعفری نہیں رہے

بھوپال کے معروف شاعر و ادیب اور سابق صدر شعبۂ تاریخ سیفیہ کالج، پروفیسر سید حامد جعفری کا ۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو انتقال ہوگیا۔ اِنا للّٰہ۔۔۔ مرحوم انتہائی خلیق اور نیک انسان تھے۔ تاریخ اگرچہ ان کا اصل میدان تھا لیکن اردو شعر و ادب کے ساتھ انگریزی ادب سے بھی انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کا شمار بھوپال کے دانشوروں اور باکمال شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھے مقرّر اور استاد بھی تھے۔ ان کے اچانک انتقال سے شہر کے ادبی حلقوں میں سوگ چھا گیا۔ مرکز ادب، کاروانِ سیفیہ، وجدی اکادمی، سیفیہ کالج اقبال لائبریری، ایم پی اردو رائٹرس گلڈ، حلقۂ تحریک ادب، بزم تاج اور دیگر کئی ادبی انجمنوں نے تعزیتی جلسے منعقد کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

مرحوم کا مکتبہ جامعہ سے بھی گہرا تعلق تھا ادارہ ان کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتا ہے۔

پروفیسر ماجد علی خاں کی وفات

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر ماجد علی خاں کا بروز منگل بتاریخ ۲۲ اکتوبر کی شام کو تقریباً پانچ بجے جامعہ نگر کے قریب میمون نرسنگ ہوم میں انتقال ہوگیا۔ وہاں ان کی اہلیہ پہلے سے زیر علاج تھیں۔ مرحوم کے سینے میں اچانک درد اٹھا اور وہ بھی داخل اسپتال ہوگئے۔ بعد میں ان کو دل کی تکلیف ہوئی چنانچہ انٹنسیو کیر میں داخل کردیا گیا۔ وہاں دل کا دورہ اٹھا اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اناللہ ....

مرحوم ریاست رام پور (یوپی) کے رہنے والے تھے جہاں ۱۸ نومبر ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے موصوف ایک طویل عرصے سے جامعہ ملیہ میں تعلیمی فرائض انجام دے رہے تھے۔ مرحوم اردو اور انگریزی کی متعدد کتابوں کے مؤلف اور مصنف تھے۔ انھیں رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ سے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ۱۹۷۹ء میں ایک انگریزی کتاب پر ایک لاکھ کا انعام ملا تھا۔ مرحوم جدید علوم پر پوری دستگاہ رکھتے تھے اور درس نظامی کے بھی فاضل تھے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں اونچا مقام مرحمت فرمائے۔ آمین

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر فرمائیں

مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی اہم مطبوعات

اقبال کے آئینہ خانے میں (مقالات کا مجموعہ) مرتبہ آفاق احمد	۲۴/-
پریم چند شناسی (مقالات کا مجموعہ) مرتبہ: پروفیسر آفاق احمد	۵۰/-
شخصیات (خاکے) سید محمود الحسینی	۱۹/-
مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال (ادبی) ادارہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی	۶۰/-
فکر و شعور (مضامین) کوثر چاندپوری	۱۳/۵۰
تحقیق اور ماحصل تحقیق (تنقید) ڈاکٹر سید حامد حسین	۱۴/-
خاموش آواز (خطوط) جاں نثار اختر	۲۵/-
نگارشات (ادبی مضامین) حکیم سید قمرالحسن	۱۵/-
دیوان غالب جدید (شعری مجموعہ) مرتب: مفتی محمد انوار الحق	۳۴/-
لمعات سہا (شعری مجموعہ) مولانا سہا مجددی	۱۸/-
کلام حامد (شعری مجموعہ) حامد سعید خاں	۱۲/-
شب ریزے 〃 ڈاکٹر اختر نظمی	۱۳/-
شاعر فکر 〃 وکیل بھوپالی	۱۳/-
روشنی کس جگہ سے خالی ہے (شعری مجموعہ) فضل تابش	۶/-
روشنی، دھوپ، چاندنی 〃 اسد بھوپالی	۵/-
نقوش ذکی (شعری مجموعہ) ذکی وارثی	۱۴/-
حرف حرف آئینہ 〃 مختار شمیم	۱۴/-
کاغذ 〃 وحید پرواز	۱۵/-
نگاہ 〃 اختر سعید خاں	۳۲/-
خرّم (ناول) وسیم بانو قدوائی	۲۵/-
اب میں کیا کروں (افسانے) مصطفی تاج	۱۴/-
پرشور خاموشی 〃 آفاق احمد	۲۲/-
جادو نگری 〃 کوثر جہاں کوثر	۱۶/-
بازیافت 〃 فرحت جہاں	۱۵/-
یادوں کے چراغ 〃 اقبال جعفری	۱۵/-
لو آج ہم بھی (مزاح) شفیقہ فرحت	۱۲/-
لمحوں کا سفر (افسانے) ڈاکٹر رضیہ حامد	۱۵/-
انوکھا مقابلہ 〃 قاضی انصار	۹/-

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵۔ علی گڑھ ۲۔ ممبئی ۳

سوغات

مدیر ـــ محمود ایاز

گیارھواں شمارہ
شائع ہوگیا

مضامین: شمس الرحمٰن فاروقی ـ نیّر مسعود ـ وارث علوی ـ کلیم الدین احمد ـ مغنی تبسم
ڈاکٹر خورشید رضوی ـ انور خان ـ شفیق فاطمہ شعریٰ

خاکہ: نور علی نور ـــــــ اسلم فرخی

گمشدہ تحریریں:

مثلث [طویل کہانی] ـــ عزیز احمد ـــ تفہیم کی تلاش میں [تبصرہ] ـــ سید محمد اشرف

افسانے چادر ـــ سلام بن رزاق ـ ناگ پھنی ـــ آشا بگّے ۔ ترجمہ: معین الدین جینابڑے

نظمیں واسکوپوپا کی نظمیں ـــ تعارف و ترجمہ: انور خان ـ گریش دمینیا
وزیر آغا ـ شفیق فاطمہ شعریٰ ـ خالد جاوید ـ فیاض رفعت ـ جبّار جمیل ـ جینت پرمار ـ جمال اویسی ـ راشد جمال

غزلیں:
احمد جاوید ـ مظہر علوی ـ رزاق ارشد ـ خالد عبادی ـ مرغوب علی ـ روشن لال روشن

خصوصی مطالعہ

عظیم بیگ چغتائی ـــــــ حسن عسکری

دوزخی ـــ عصمت چغتائی ـ عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں ـــ شاہد احمد دہلوی

چند باتیں، چند یادیں ـــ مرزا انجم بیگ چغتائی ـ میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں ـ عظیم بیگ چغتائی

دو ناول: جمکی ـ کمزوری

چار افسانے: غلیل ـ وفادار احمد ـ یکّہ ـ مچھلی کا شکار

بازگشت [خطوط] : آل احمد سرور ـ شان الحق حقی ـ نیّر مسعود ـ حمید نسیم ـ شفیق فاطمہ شعریٰ
شمس الرحمٰن فاروقی ـ فضیل جعفری ـ اردو ادب کا ایک قاری ـ اردو کے ایک تاجر کتب ـ خالد سعید ـ قیصر اقبال ـ محمد نور الدین خان
جمال اویسی۔

صفحات: ۵۶۰ قیمت: ۱۰۰ روپے

امریکا، کناڈا، انگلینڈ اور سعودی خلیجی ممالک سے | ہوائی ڈاک | بارہ امریکی ڈالر سولہ کینیڈین ڈالر دس پاؤنڈ | (صرف وی پی پی کے ذریعہ) (۳ سے کم کاپیوں پر کمیشن نہیں دیا جائیگا)

پتہ: ۸۳، تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور ۳۸-۵۶۰۰ (ہند)

...تاب نما کے ...وصی شمارے		جلداس اختر نمبر مرتبہ گربچن چندن قیمت	شمس الرحمٰن فاروقی نمبر مرتبہ: احمد محفوظ قیمت ۸۰/-	اردو افسانہ بمبئی میں مرتبہ: الیاس شوقی قیمت ۵۱/-
...د حسن خاں ...اطہر فاروقی ...زیر طبع)	مغیث الدین فریدی نمبر مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی قیمت ۴۵/-	خواجہ حسن نظامی نمبر مرتبین: نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی قیمت ۷۵/-	مولانا عبدالوحید صدیقی نمبر مرتبہ: پروانہ ردولوی قیمت ۵۱/-	غلام ربانی تاباں نمبر مرتبہ: اجمل اجملی قیمت ۷۵/-
...سعید خاں نمبر مرتبہ ...سید حامد حسین ...ت ۵۱/-	نثار احمد فاروقی نمبر مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم قیمت ۵۱/-	پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر مرتبہ: شہریار / ابوالکلام قاسمی قیمت ۶۰/-	ڈاکٹر خلیق انجم نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں قیمت ۹۰/-	خواجہ احمد فاروقی مرتبہ: خلیق انجم قیمت ۴۵/-
...بد علی خاں ...تبہ: مجتبیٰ حسین ...مت ۴۵/-	پروفیسر مسعود حسین خاں مرتبہ: ایم حبیب خاں قیمت ۴۵/-	ڈاکٹر اجمل اجملی مرتبہ علی احمد فاطمی / عذرا حبیب قیمت ۴۵/-	فرمان فتح پوری نمبر مرتبہ: خلیق انجم قیمت ۲۵/-	سردار جعفری نمبر مرتبہ ڈاکٹر رقیہ شبنم عابدی قیمت ۴۵/-
...الحہ عابد حسین نمبر ...رتبہ: عزیز قریشی ...مت ۴۵/-	نئی نظم کا سفر مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی قیمت ۴۵/-	مشرقی علوم والسنہ پر تحقیق حامد حسین قیمت ۳/-	پریم چند نمبر عبدالقوی دسنوی قیمت ۸/۵۰	ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر کرنل بشیر حسین زیدی قیمت ۱۶/-
...ولانا طاہر محمد خاں شہاب نمبر (ادارہ) قیمت ۱/۵۰	مرزا سلامت علی دبیر نمبر مرتبہ عبدالقوی دسنوی قیمت ۷/۵۰	جگن ناتھ آزاد نمبر مرتبہ: ایم حبیب خاں قیمت ۵۱/-	جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری قیمت ۵/۵۰	خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغرا مہدی قیمت ۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر مالک رام قیمت ۲/۵۰	سکندر علی وجد نمبر یوسف ناظم قیمت ۲۵/-	قدسیہ زیدی نمبر کرنل بشیر حسین زیدی قیمت ۲۵/-	عبداللطیف اعظمی نمبر (ادارہ) قیمت ۱۸/-	مشفق خواجہ نمبر مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم قیمت ۳۰/-

مطبوعات مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ادب، تنقید، انشاء		افکار اقبال عبدالسلام خاں قیمت ۱۲۵/-	تذکرہ ماہ و سال مالک رام قیمت ۱۲۵/-	تحقیق نامہ مشفق خواجہ قیمت ۱۲۵/-
سحر کے پہلے اور بعد سعید الظفر چغتائی قیمت ۱۵/-	پہچان اور پرکھ پروفیسر آل احمد سرور قیمت ۵۱/-	اقبال کا نظریہ خودی عبدالمغنی قیمت ۱۵۰/-	قلندر بخش جرأت جمیل جالبی قیمت ۱۰/-	جدید افسانہ اور اس کے مسائل وارث علوی قیمت ۳۶/-
تاریخ اودھ قاسم علی نیشاپوری قیمت ۲۷/-	مولانا آزاد کا ذہنی سفر ظ۔ انصاری قیمت ۳۳/-	تنقید اور جدید اردو تنقید ڈاکٹر وزیر آغا قیمت ۶۰/-	کچھ مولانا آزاد کے بارے میں مالک رام قیمت ۵۱/-	لسان الصدق مولانا ابوالکلام آزاد قیمت ۷۵/-
تفہیم و تنقید پروفیسر حامد کاشمیری قیمت ۴۸/-	نذر مختار مرتبہ مالک رام قیمت ۱۰۱/-	تحقیقی مضامین مالک رام قیمت ۶۰/-	خسرو نامہ مجیب رضوی قیمت ۲۱/-	تحفۃ السرور مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی قیمت ۷۵/-
جائزے مرتبہ: مظفر حنفی قیمت ۴۵/-	نقد بجنور صدیقہ بیگم قیمت ۲۵/-	ادبی سماجیات ڈاکٹر محمد حسن قیمت ۱۵/-	الفاظ کا مزاج غلام ربانی قیمت ۲۴/-	تقریر و تعبیر محمد ہدایت اللہ قیمت ۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار ڈاکٹر فرمان فتح پوری (زیر طبع)	افسانہ کی حمایت میں شمس الرحمٰن فاروقی قیمت ۱۷/۵۰	علامتوں کا زوال انتظار حسین قیمت ۳۶/-	لغت نویسی کے مسائل مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ قیمت ۳۵/-	معاصر ادب کے پیش رو ڈاکٹر محمد حسن قیمت ۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت پروفیسر علی محمد خسرو قیمت ۶/-	تحلیل نفسی کے پیچ و خم ڈاکٹر سلامت اللہ قیمت ۳۵/-	اثبات و نفی شمس الرحمٰن فاروقی قیمت ۴۰/-	نقد حرف پروفیسر ممتاز حسین قیمت ۴۸/-	اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ پروفیسر صغرا مہدی قیمت ۳۵/-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

ماہنامہ

کتاب نما

نئی دہلی

دسمبر ۱۹۹۶ء۔ جلد ۳۶۔ شمارہ ۱۲

فی پرچہ	6/50
سالانہ	60/:
سرکاری تعلیمی اداروں سے	80/:
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	170/:
غیر ممالک سے (بذریعہ ہوائی ڈاک)	350/:

اڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Tel Cum Fax No (011)- 6910191

ٹیلی فون نمبر 6910191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ۔ ممبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں چھپواکر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

جو رہی سو بے خبری رہی (خود نوشت) ادا جعفری ۲۰۰/-
وضاحتی کتابیات جلد سوم (ادب) پروفیسر گوپی چند نارنگ، اظفر حقی ۱۲۵/-
بیسواں افسانہ ایک انتخاب (تنقید) رام لال، اظہار عثمانی ۵۲/-
ہندستان میں ملی مسائل (مذہب) پروفیسر عمر حیات خان غوری ۵۵/-
انفاس انفاس (شاعری) بسمل نقشبندی ۱۲۵/-
آئینہ دل " دل ایوبی ۶۰/-
تازہ روٹی کی مہک (افسانے) مہدی ٹونکی ۱۰۰/-
تاریخ ریاست ٹونک (تاریخ) ہنومان سنگھل ۱۵۰/-
مولانا حسرت موہانی اور تحریک آزادی (تحقیقی مقالہ)
(اردوئے معلی اور اخبار مستقل کی روشنی میں) مرتب: محمد طیب ۲۰۰/-
سوغات ۱۱ مجلہ مدیر: محمود ایاز ۱۰۰/-
قاضی عبدالغفار شخصیت اور فن (تحقیقی مقالہ) پروفیسر امیر عارفی ۱۷۵/-
رشید احمد صدیقی کے خطوط پروفیسر آل احمد سرور ۱۸۰/-
اقبال بحیثیت شاعر (نیا اڈیشن)، اقبالیات پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ۷۵/-
آنگن (نیا اڈیشن) (ناول) خدیجہ مستور ۵۰/-
ہندی اردو لغت " (ترجمہ نگاری کی ڈکشنری) ابو محمد رام نگری ۲۵/-
اردو ہندی لغت " " " ۳۵/-
ازواج مطہرات (مذہب) فروغ احسن ۱۱۰/-
سنگ اٹھانے کا حوصلہ (افسانے) رضا الجبار ۸۰/-
مظہر امام کی تنقید نگاری (تحقیق) محمد رضا کاظمی ۵۰/-
شاخیں (مضامین) پروفیسر علیم اللہ حالی ۹۰/-
پوسٹر (افسانے) قاسم خورشید ۶۰/-
جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب (افسانے) جوگندر پال ۸۰/-
بے نام رشتے (ناول) کے، ایل، گاندھی ۷۵/-
پتھروں کے شہر میں (تذکرہ) شکیل گوالیاری ۷۵/-
نکہت رقصاں (شعری مجموعہ) ساجد حمید ۵۰/-
خزاں کے بعد (ناولٹ) رفیق ہارون ۲۵/-

گرد سب کی شاعری (خود نوشت) اقبال داؤدی ۱۲۰/-
دھوپ کی چادر (افسانے) سید احمد قادری ۷۵/-
پہلے دسمبر (شعری مجموعہ) احمد صغیر ۴۰/-
خنجر پر بیٹھا پرند (افسانے) " ۵۰/-
مولانا محمد علی جوہر ایک عہد ساز شخصیت محمد فضل حق ۵۰/-
دانت ہمارے ہونٹ تمہارے (مزاحیہ) مترجم محمد اسد اللہ ۴۰/-
طنز ظرافت (مزاحیہ شعری مجموعہ) شمشاد حسین صدیقی ۲۵/-
نالہ شبگیر (مثنوی) مرتب: جابر حسین ۱۰۰/-
قربتوں کی دھوپ (شعری مجموعہ) ڈاکٹر امام اعظم ۱۰۰/-
سفر سانسوں کا " فاروق شکیل ۴۰/-
پھول تمہارے خار ہمارے " فیروز مظفر بدایونی ۵۰/-
تحقیق سے تحریف تک (ادب) مولانا انیس احمد فلاحی ۷۰/-
نوائے لعوز (رباعیاں) ناوک حمزہ پوری ۱۵/-
جو کچھ لکھتا ہوں سچ لکھتا ہوں (آزاد نظم) ساحل احمد ۱۰/-
غالب اور اس کی شاعری احمد الدین احمد ۱۰/-
مرزا داغ دہلوی کی شاعری سید محمد فاروق ۱۵/-

ادب اطفال سیمینار

زیر اہتمام حاجی غلام محمد ایجوکیشن ٹرسٹ۔ ۲۳۹۰ خان بہادر ہدایت اللہ روڈ۔ نیو مودی خانہ پونے ۴۱۱۰۰۱۔

۴، ۵ جنوری ۹۷ء کو پونے میں اپنی نوعیت کا پہلا اور نہایت اہم سیمینار منعقد کیا جائے گا۔ تفصیلات کے لیے مہتمم جناب حفیظ صدیقی سے رابطہ قائم کریں۔

سرورق شکیل اختر فاروقی

مہمان مدیر
پروفیسر شکیل اختر فاروقی
فیکلٹی آف ایجوکیشن
جامعہ ملیہ اسلامیہ 'نئی دہلی-۲۵

آسان اردو کی تدریس اور اس کے مسائل

ملک میں آزادی سے پہلے اردو کا جو مقام تھا اس سے ہم سب واقف ہیں' عدلیہ' انتظامیہ اور درس گاہوں میں اردو کے بغیر کام نہیں چلتا تھا۔ لہٰذا اردو کی تعلیم لازمی نہ ہوتے ہوئے بھی ضروری تھی۔ جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی وہ بھی اردو یعنی دوسری زبان کی تعلیم پہلی زبان یعنی مادری زبان کی طرح حاصل کرتے تھے۔ اردو جاننے والی رعایا پر حکومت کرنے کے لیے انگریزوں کو بھی اردو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ اردو سے غیر معمولی دلچسپی لینے لگے۔ اس دلچسپی کی اصل وجہ ضرورتیں' تھیں' اور یہ ضرورتیں تجارتی' سیاسی' علمی ہر طرح کی تھیں۔ غرض انگریز بہادر اردو سیکھنے کی طرف راغب ہوا' فورٹ ولیم کالج میں اردو زبان کے بھی اصول و ضوابط مرتب ہوئے۔ صرف و نحو اور قواعد پر کتابیں لکھی گئیں تاکہ ان کی روشنی میں اردو سیکھنے سکھانے کا کام کیا جاسکے۔ قواعد یا صرف و نحو غیر ملکی زبان سیکھنے میں ضرور معاون ہوتے ہوں گے لیکن اہل زبان کو قواعد کے ذریعے زبان سیکھنا پڑے تو مادری زبان کا سیکھنا ان کے لیے غیر ملکی زبان سے زیادہ مشکل ہو جائے۔

ملک میں آج جو صورت حال ہے وہ بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ہماری نئی نسل اردو سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ غیر مسلموں نے تو ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد اردو سے ناتا توڑلیا تھا' مسلمان کو بھی اردو پڑھنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ اردو کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اردو بے توجہی کا شکار ہو گئی۔ اب جو اردو پڑھ رہے ہیں' وہ کسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ شاید اس لیے کہ وہ بے چارے کچھ اور کرنے سے قاصر ہیں۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے دلوں میں رکھتے ہیں اور کبھی کبھی بڑی مایوسی ہونے لگتی ہے' لیکن مایوس اور ناامید ہو کر بیٹھ رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اردو دوبارہ ہر خاص و عام کی زبان بن جائے۔ اردو بولنے اور پڑھنے والوں کا تعلق ہر طبقے سے پیدا کیا جائے۔ تعصب اپنی جگہ پر' مگر خوشی کی بات ہے کہ اردو زبان سے دلچسپی اور سیکھنے کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔ اعداد و شمار پیش کرنا مشکل ہیں لیکن جو مصدقہ اور غیر مصدقہ خبریں ملتی ہیں

ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دہلی میں دہلی یونیورسٹی، دہلی اردو اکادمی اور جامعہ خط کتابت اردو کورس میں داخلہ لینے والوں کی تعداد بڑھی ہے۔

جامعہ میں ۱۹۷۰ سے قبل غیر اردو داں طلبہ کو اردو پڑھانے کا کام عبد الغفار مدھولی صاحب مرحوم کیا کرتے تھے۔ وہ یہ کام جس لگن اور تندہی سے سرانجام دیتے تھے اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ اردو کے مستقبل سے نہ ہراساں تھے اور نہ مایوس۔ بس اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ ان کی اس لگن اور دلچسپی کے سبب اردو بہت مقبول ہوئی۔ جامعہ میں آج بھی مختلف سطحوں پر ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے طلبہ اردو سیکھتے ہیں۔ اکثر طلبہ اردو اس لیے سیکھتے ہیں کیوں کہ ان کے گھروں میں پنجابی زبان کی چند کتابیں اردو رسم خط میں موجود ہیں۔ کچھ اس لیے دلچسپی لیتے ہیں کہ اردو کا رسم خط ان کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ سندھی زبان اور اردو کے رسم خط میں انھیں بڑی مماثلت نظر آئی۔ بیشتر کو اردو شعر و شاعری پسند ہے اور اردو کی شیرینی و شائستگی کے تو سبھی قائل ہیں۔

فی زمانہ ہندی کے ذریعے اردو سکھانے کی بات بڑی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ کیوں کہ اب ہندی کے ذریعے ان لوگوں کو بھی اردو سکھانی ہے جن کی مادری زبان تو اردو ہے مگر وہ اردو پڑھنا نہیں جانتے۔ دوسری اور تیسری زبان کی حیثیت سے اردو کی تدریس کا مطلب ہے ان لوگوں کو اردو سکھانا جو یا تو اردو سے بالکل نابلد ہیں یا اردو رسم خط سے ناواقف ہیں۔

ابتدائی تعلیم اگر مادری زبان کے ذریعے ہو تو زبان کی حیثیت ایک مضمون کی بھی ہوتی ہے اور ذریعہ تعلیم کی بھی۔ اس طرح زبان سیکھنے کا عمل شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں سے ہوتا ہے۔ مدرسے کی پوری فضا اور پورے ماحول میں زبان کی حکمرانی نظر آتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مدرسے کی تقریباً تمام تعلیم زبان ہی کی تعلیم ہے۔ ایسا ماحول میسر ہو تو زبان سیکھنے کی بہت سی دشواریاں خود بخود دور ہوتی جاتی ہیں، اس کے برخلاف دوسری یا تیسری زبان سیکھنے کے لیے شعوری کوشش کی ضرورت ہوتی ہے شعوری طور سے کوئی شخص زبان میں کتنی ہی استعداد بہم پہنچائے اہل زبان کی سی مہارت پیدا نہیں کر سکتا۔ اپنی مادری زبان کی بعض عادتوں کو ترک یا فراموش کر کے نئی لسانی عادتیں پیدا کرنا آسان کام نہیں ہے۔

خوش قسمتی سے اردو اور ہندی بول چال کی زبانیں کم و بیش ایک ہیں اس لیے عموماً ہندی والے ایک نئی زبان نہیں، ایک نیا رسم خط سیکھتے ہیں۔ رسم خط سیکھنے میں وہ اکثر بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں تاکہ جلد از جلد اردو کے اس ادب خصوصاً شاعری سے شد بد حاصل کر لیں جس کی انھوں نے صرف تعریفیں سنی ہیں۔ وہ اردو کی اس تہذیب سے بھی جلد

روشناس ہونا چاہتے ہیں جو تقریباً پچاس سال قبل ان کے بزرگوں کی تہذیب تھی۔

اس پس منظر میں سوچیے تو اردو سکھانے کا روایتی طریقہ زیادہ کار آمد نہیں ثابت ہوگا۔ یہ طریقہ ہندی والوں کے لیے الجھن اور پریشانی کا سبب بنتا ہے۔ روایتی طریقہ فرسودہ ہے یا نہیں لیکن غالباً یہ طریقہ ان بچوں کے لیے زیادہ مفید ہے جن کی مادری زبان اردو ہے اور جو ابتدا سے اردو سیکھ رہے ہیں، ہندی جاننے والا دراصل عمر اور تعلیمی استعداد کے لحاظ سے ان بچوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی لیے اس ذخیرۂ الفاظ سے بھی کام نہیں چلے گا جو عام طور سے بے معنی الفاظ کی شکل میں بچوں کو ازبر کرادیے جاتے ہیں۔ حروف شناسی کا کام بھی اس طرح کرادیا جائے کہ حرف، لفظ کا اکائی کی حیثیت سے سامنے آئے۔ غرض ایسے لوگوں کے لیے اردو زبان کی تعلیم کا کوئی منطقی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے پاس وقت کی کمی ہے اور سیکھنا زیادہ۔ لہٰذا حروف کی روایتی ترتیب سے بھی گریز کرکے حروف کا انتخاب ضرورت کے تحت کرنا موثر ثابت ہوگا۔ بس یہ خیال رہے کہ جو حروف بتائے جائیں وہ مانوس اور بامعنی الفاظ کا حصہ ہوں۔ اور اس کام کے لیے ہمیں حروف سے الفاظ بنانے کا کوئی سائنٹفک طریقہ تلاش کرنا چاہیے۔

ہندی والوں کی آسانی کے پیش نظر اردو سکھانے کے لیے صوتی طریقہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا ہے۔ ابتدا میں اگر حروف کے نام نہ بتائے جائیں صرف ان کی آوازوں سے واقف کرایا جائے تو زیادہ بہتر نتائج بر آمد ہوں گے۔ حروف کے ناموں سے واقف کرانے کا کام آخر میں کرایا جاسکتا ہے۔ اردو کے مخصوص ہم آواز اور ہم شکل حروف سکھانے میں بھی جلد بازی نہ کی جائے تو بہتر ہوگا۔ اردو سکھانے کے روائتی طریقہ میں عموماً ابتدا سے حروف تہجی کی مشق مع اعراب کے کرائی جاتی ہے۔ یہ طریقہ تعلیمی اور نفسیاتی اعتبار سے کتنا معتبر ہے اس کا فیصلہ پھر کبھی کیا جائے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس طرح وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ مفرد حرف اس وقت بامعنی بنتا ہے جب وہ لفظ کی اکائی کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ اردو سکھانے کے لیے اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ تمام علامتیں اور اعراب ایک ساتھ نہ بتائی جائیں بلکہ مبتدیوں کو ابتدا میں بغیر اعراب کے لفظ بنانا سکھائے جائیں اور پھر ایک ایک کر کے اعراب اور علامتوں کے ساتھ مشق کرائی جائے۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ اردو میں کسی مصوتے (Vowel) سے کوئی لفظ شروع ہوتا ہے تو ابتدا میں "الف" کا استعمال لازماً ہوتا ہے، مثلاً اب، آپ، اِس، اکھ، اُس، اوْن، اوس، اوْر، ایک اور ایسا۔ مصوتے کی شکل میں الف، اگر ایسے حروف کے بعد آئے جو ہمیشہ پورے

لکھے جاتے ہیں تو اس کی شکل میں تبدیلی نہیں ہوتا کیوں کہ وہ کسی ماقبل حرف سے ملتا نہیں ہے لیکن اگر کسی حرف کی چھوٹی شکل کے بعد آئے تو اس کی شکل بدل جاتی ہے اور وہ نیچے سے اوپر ہلکے سے گھماؤ کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ جیسے 'نا' اس کے علاوہ 'ای' 'اے' اور 'او' والے مرکب مصوتے لفظ کے آخر میں ہوں تو 'الف' کے بجائے ہمزہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے بھائی، بھئی، آئے، گئے اور آؤ وغیرہ۔ سکھانے والے کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ایک علامت ایک ہی مصوتی آواز کے لیے مخصوص ہو۔ اردو کے بعض حروف بذات خود مصوتے بھی ہیں اور ان کے لیے علامات کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر 'و' 'ی' اور 'ے' مصوتوں کی حیثیت میں ہوں تو ان کے ساتھ اعراب کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ جیسے 'دو' 'دی' 'دے' یا بول' بولی اور بولے وغیرہ۔ لفظ 'دو' یا بول میں 'د' اور 'ب' پر پیش لگانے کا طریقہ غلط ہے۔ دو یا جو' پر پیش (ـُ) لگانے کا کوئی صوتیاتی جواز نہیں۔ لفظ 'دو' میں صرف دو آوازیں ہیں۔ پہلی آواز 'د' کی ہے جو ایک مصمتہ (Consonant) ہے۔ دوسری آواز 'و' کی ہے جو ایک مصوتہ (Vowel) ہے۔ پیش کا استعمال صرف مختصر مصوتے (Short Vowel) کے طور پر کرنا صحیح ہوگا جیسے 'اُس' 'رُک' وغیرہ زیر' کے لیے بھی یہی اصول برتنا چاہیے۔ مثلاً اِن' دِن وغیرہ۔ ان علامات سے مذکورہ آوازوں کو ظاہر کرنے کے علاوہ کسی دوسری آواز کے ظاہر کرنے کا کام لینا درست نہیں۔ ایک ہی وقت میں مصوتے اور مختصر مصوتے کا استعمال مضحکہ خیز سا لگتا ہے۔ اردو میں زبر' مختصر مصوتے کی نمائندگی کرنے کے علاوہ واو ماقبل مفتوح اور یائے ماقبل مفتوح کے لیے بھی استعمال کرنے کا چلن ہے۔ لیکن زبر کو صرف مختصر مصوتہ ہی تصور کرنا چاہیے۔ مذکورہ دونوں آوازوں کے لیے ایک دوسری علامت (ـٚ) کا استعمال کرنا صحیح ہوگا۔ اَیسا' یا اَوْر' کو اَیسا' یا اَور' لکھنا بے تکا سا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں 'ی' اور 'ے' کے فرق کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے' ہندی کے [illegible] ' کے لیے اردو کے متبادل ی' ے' ۓ' اور ئی' ہوں گے جن کی بالترتیب چھوٹی شکلیں ﮯ' یـ' ئـ' اور ئـ ہیں۔

ہندی جاننے والوں کو اردو کے' ہم آواز' حروف کی تفہیم میں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔ ان کو سمجھانے کے لیے کسی گُر کا بتانا تو ممکن نہیں لیکن اگر انھیں یاد دلایا جائے کہ اس قسم کی دشواریاں غالباً دنیا کی ہر زبان میں پیش آتی ہیں اور ہندی بھی اس سے مبرّا نہیں ہے' ہندی جیسی صوتی زبان میں' شین' کی آواز کے لیے ایک سے زیادہ حروف موجود ہیں "ر" کی آواز کے لیے بھی ہندی میں تقریباً چھے طریقے ہیں۔ انگریزی زبان کا معاملہ تو کچھ زیادہ ہی اُلجھا

ہوا ہے۔ اس بین الاقوامی زبان میں حروف تو کیا مصوتے بھی بیک وقت متعدد طرح سے بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ اردو اور ہندی اس لحاظ سے غنیمت زبانیں ہیں کہ یہاں ایک آواز کے لیے کئی حروف ضرور ہیں مگر ایک حرف کئی آوازیں نہیں دیتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر زبان میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں مشق کر کے ہی بات سمجھی جا سکتی ہے۔ ہم آواز حروف کا استعمال سیکھنے کے لیے بھی اصول بتانے سے زیادہ تحریر اور زبانی مشقیں ضروری ہیں۔

اردو سیکھنے میں سب سے زیادہ پریشانی حروف ملا کر لفظ بنانے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس دشواری کو بھی تحریری کام کی زیادہ سے زیادہ مشق سے دور کیا جا سکتا ہے۔ حروف شناسی کے ساتھ الفاظ اور جملے لکھنے کی خاطر خواہ مشق ہو سکے اس کے لیے تحلیلی اور ترکیبی دونوں طریقوں کا استعمال کیا جائے۔ زبان کے اصولوں کو مرتب کرنا مشکل کام ضرور ہے لیکن جب دوسری زبان سیکھنے سکھانے کی بات ہو تو ہمیں اس طرف بھی توجہ کرنی پڑے گی۔ اردو سکھانے کے لیے بے شمار کتابیں بازاروں میں آنے لگی ہیں' ان میں سے بیشتر کتابیں پڑھنے والوں سے زیادہ پڑھانے والوں کے مطلب کی ہیں' اکثر کتابوں میں کوئی منطقی اصول بھی نظر نہیں آتا' نہ انھیں سائنٹفک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں مبتدیوں کی دلچسپی کا بھی فقدان ہے۔ کتاب مرتب کرتے وقت حروف شناسی اور حروف کو جوڑ کر لفظ بنانے کی مشق کے زیادہ مواقع فراہم ہوں اور شروع سے چھوٹے چھوٹے جملے پڑھنے اور لکھنے کا کام بھی ہوتا رہے۔ یہ جملے بچکانہ نہ ہوں بلکہ عمر اور تعلیمی استعداد کے مطابق ہوں۔ نظم و نثر کا ہر سبق' آسان' دلچسپ اور معیاری ہو۔ مقصد یہ ہو کہ مبتدی رسم خط کے ساتھ ساتھ اردو ادب خصوصاً شعر و شاعری اور تہذیب سے روشناس ہو سکے اور لطف اٹھا سکے۔

عموماً اردو جاننے والوں کو بھی ایک شکایت ہوتی ہے کہ اردو حروف کی چھوٹی بڑی اتنی شکلوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ اس شکایت میں خاصا وزن بھی ہے لیکن بہ نظر غور دیکھیے تو یہ شکایت سطحی سی لگے گی۔ جس طرح کسی انسان کی شناخت اس کے چہرے یا مکھڑے کے بغیر ممکن نہیں بالکل اسی طرح اردو کے وہ تمام حروف بھی اپنے چہرے سے پہچانے جاتے ہیں جن کی چھوٹی شکلیں الفاظ سازی میں کام آتی ہیں' حروف کے یہ چہرے کچھ اور نہیں' ان حروف کی ابتدائی شکلیں ہیں' اس کے برخلاف انگریزی کے بیشتر SMALL LETTERS ایسے ہیں جو اپنی CAPITAL شکلوں سے کسی طرح کی مماثلت نہیں رکھتے۔

ایک اور شکایت اردو حروف کی آوازوں سے متعلق ہے کہ ہر حرف کے نام میں ایک ساتھ

کئی آوازیں شامل ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کس آواز کا استعمال کیا جائے۔ یہاں بھی یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ان ناموں کی ابتدائی آواز ہی اس حرف کی اصل آواز ہے' جب کہ انگریزی حروف کے ناموں میں بسا اوقات کوئی آواز بھی اس حرف کی آواز نہیں ہے اس کی زندہ مثال ہے۔

اردو کی تدریس میں ان امور کی طرف توجہ دی جائے تو خیال ہے کہ سیکھنے سکھانے کا عمل آسان بھی ہو جائے گا اور زیادہ سائنٹفک بھی۔ لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اردو زبان سیکھی کیسے جائے بلکہ یہ ہے کہ سیکھی ہوئی زبان کو کیوں کر کام میں لایا جائے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے FOLLOW UP PROGRAMME تیار کرنا چاہییں جو سیکھنے سکھانے کا سلسلہ تادیر قائم رکھ سکیں۔ اردو میں اس قسم کے پروگراموں کا فقدان نظر آتا ہے۔ وقتی شوق اور دلچسپی کے تحت زبان سیکھی تو جاسکتی ہے لیکن جتنی تیزی سے سیکھی جاتی ہے اتنی جلدی بھلادی جاتی ہے۔

اپنی زبان کے رسم خط سے ناواقفیت کے سبب اردو پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہوتا جارہا ہے۔ اکثر اس کا علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ اردو کا رسم خط بدل کر دیوناگری کردیا جائے تاکہ اردو جاننے والوں کا حلقہ وسیع تر ہو جائے۔ لیکن اس قسم کا علاج تجویز کرنے والے نہیں جانتے کہ ان کا اس طرح سے سوچنا اردو دوستی نہیں اردو دشمنی کے مترادف ہے۔ اردو دوستی یہ نہیں کہ رسم خط بدل دیا جائے بلکہ صحیح معنوں میں اردو دوستی یہ ہے کہ اردو رسم خط کو محفوظ رکھا جائے۔ ورنہ اردو کو ہندی کی ایک شیلی قرار دینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

رسم خط کوئی لباس نہیں کہ جب چاہا اتار پھینکا۔ جب رسم خط زبان کی شناخت بن جائے تو اس میں کسی قسم کی تبدیلی زبان کو فنا کرسکتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو نے رسم خط فارسی اور عربی سے مستعار لیا تھا لیکن اب خود یہ رسم خط سنسکرت اور ہندی آوازوں کو شامل کرکے عربی اور فارسی کے رسم خط سے زیادہ جامع بن گیا ہے۔

شوق' دلچسپی یا کسی ضرورت کے تحت جن لوگوں نے اردو پڑھ لی ہے ان کے لیے سب سے اہم اور مفید کام یہ ہوگا کہ ہم اپنے اکثر بیشتر کاموں میں اردو رسم خط کا استعمال کریں۔ اردو میں خط لکھیں' اردو میں پتے لکھیں اردو میں درخواستیں لکھیں اور اردو میں دعوت نامے شائع کرائیں۔ غرض یہ کہ اردو رسم خط کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیں اور کوشش کریں کہ اردو رسم خط اور تحریریں اردو سیکھنے والوں کی نظر سے گزرتی رہیں۔

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵ سلور لائن اپارٹمنٹس گ ے سیکٹر (بی ڈی اے)
کوہ فضا بھوپال ۴۶۲۰۰۱

پوشاکوں کے نام

پوشاکوں کے نام کس طرح پڑے' یہ بجائے خود مطالعہ کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف لباس کے فیشن بدلے بلکہ لباسوں کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں۔

مردانہ لباس میں قمیض کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ حرف صاد کے ساتھ لفظ "قمیص" قرآن حکیم میں آیا ہے۔ سورہ یوسف میں ملاحظہ فرمایئے۔ وجاؤ علیٰ قمیصہ بدم کذب (سورہ ۱۲ آیت ۱۸) لیکن یہ لفظ بہت پرانا ہے اور قدیم یونانی ریکارڈ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ باز نطینی حکمراں بھاری بھرکم خلعت پہنا کرتے تھے جو سونے چاندی کے تاروں اور ریشم وغیرہ کے بنے ہوئے ہوتے تھے اور ان پر طرح طرح کے جواہرات کا کام ہوتا تھا۔ اس بھاری اور قیمتی خلعت کو پسینے وغیرہ سے اور اس کی رگڑ سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک سادہ کپڑے کا لباس اندر پہنا جاتا تھا۔ اس لباس کو کامیسا کا نام دیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے شب خوابی کے لباس کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ ہندستان میں اوپری جسم کے لیے مردانہ لباس کو بالعموم کرتا' نیمہ وغیرہ کہا جاتا تھا۔ پرتگالیوں کے ساتھ یوروپی انداز کی شرٹ نے ہندستان میں رواج پایا اور اس کے لیے پرتگالی لفظ CAMISA "ضاد" کے تلفظ کے ساتھ رائج ہوا اور اب عام طور پر قمیض (ضاد کے ساتھ) بولا جاتا ہے۔

یوروپی لباس کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ ہندستان میں پتلون کا رواج بڑھا۔ یہ نام اٹلی سے ہم تک پہنچا۔ سولہویں صدی عیسوی میں اٹلی کے شہر وینس کے قرب و جوار میں چکر لگا کر ناٹک دکھانے والی منڈیوں میں ایک مسخرہ کردار ہوتا تھا۔ اس کے لیے کسی دبلے پتلے بوڑھے شخص کو ایک ڈھیلے ڈھالے پاجامے جیسا لباس اور ڈھیلی ڈھالی چپلیں پہنائی جاتی تھیں۔ یہ شخص اپنی اچھل کود اور احمقانہ حرکتوں سے لوگوں کو ہنسایا کرتا تھا۔ اس کردار کو "پینٹالون" کہتے تھے۔ یہ نام سینٹ پینٹالیونی کے نام پر تھا جسے وینس کے معالج اپنا روحانی سرپرست سمجھتے تھے لیکن عام لوگ معالجوں کی لوٹ کھسوٹ' سخت دلی اور بد کلامی کے شاکی تھے چنانچہ جب ناٹک منڈی کے مسخرے سینٹ پینٹالیونی کا سوانگ بھر کر ان معالجوں کا مذاق اڑاتے تو تماشائی بہت لطف لیتے۔ ان مسخروں کے ساتھ ساتھ ان کا مخصوص

لباس بھی مقبول ہوا اور دھیرے دھیرے اس پاجامے کا نام ہی دستاویزوں سے غائب ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وضع قطع اور پہناوے کا انداز بھی بدل گیا۔ یہی نہیں یورپ والوں کے ساتھ اس لباس کے ہمارے ملک میں پہنچنے کے بعد اس کا نام بھی بدل کر پتلون ہو گیا۔

آج کل نوجوانوں میں نیلے، موٹے سخت کپڑے کے پتلون بڑے مقبول ہیں جنھیں جینس کہا جاتا ہے۔ یہ نام دراصل اٹلی کے شہر جنوا کی یاد دلاتا ہے جہاں شروع میں اس قسم کا مضبوط، موٹا، سوتی کپڑا بنایا جاتا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں اس کپڑے کو عام طور پر مشقت کا کام کرنے والے مزدوروں یا کھلاڑیوں کے لباس کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ کپڑا گہرے رنگوں میں یا دھاری دار بھی ہوتا تھا لیکن نیلے رنگ کا کپڑا زیادہ مقبول تھا۔ ۱۸۵۰ میں جب لیوی اسٹراس امریکا کے علاقے کیلی فورنیا میں سونے کی تلاش میں گیا تو اس نے اس کپڑے کا نیلے رنگ کا پتلون استعمال کیا۔ اسے خاص خاص جگہوں پر مضبوط بنانے کے لیے تانبے کے ریٹ لگائے گئے تھے۔ تب سے اس قسم کے جینس رواج میں آ گئے۔

نیکر کا لفظ بھی ہندستان میں مغرب سے ہی آیا جہاں شروع میں نیکر عورتوں کا پہناوا تھا۔ عورتوں کے یہ نیکر اونی یا ریشمی ہوتے تھے اور انھیں عام طور پر جاڑے کے موسم میں پہنا جاتا تھا۔ یہ کولھوں پر تو ڈھیلے ہوتے تھے مگر انھیں گھٹنوں پر اتنا تنگ رکھا جاتا تھا کہ وہ پنڈلی کے اوپری حصے پر بالکل کس جائیں اور سرد ہوا کا گھٹنوں کے اوپر گزر نہ ہو۔ امریکا میں نیکر مردوں کا لباس بن گیا اور لوگ گولف وغیرہ کھیلتے وقت اسے استعمال کرنے لگے۔ امریکا میں یہ لباس ڈچ لوگوں کے ساتھ پہنچا۔ ان کا یہ ڈھیلا ڈھالا لباس کافی عرصے تک لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنا رہا۔ نیکر کا نام بھی اسی مذاق کا نتیجہ ہے۔ امریکا کے مصنف واشنگٹن ارونگ نے مسخرے پن سے بھرا ہوا ایک ڈراما لکھا۔ اس میں اس نے نیکر جوکر نام کا ایک کردار پیش کیا تھا۔ اس کردار کی تصویروں میں اسے یہی لباس پہنے دکھایا گیا تھا۔ پھر یہ نام چل پڑا۔ ہندستان میں یہ لباس اب اپنی اصل شکل میں نہیں ہے اور ہم اکثر ہاف پینٹس کو ہی نیکر کا نام دیتے ہیں۔

نسوانی لباس میں ہندستان میں فراک کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ فراک شروع میں مردانہ پہناوا تھا اور اسے خاص طور پر راہب اور پادری پہنا کرتے تھے۔ جب کبھی پایا جاتا کہ کسی نے پادری کے شایان شان کام نہیں کیا ہے تو سزا کے طور پر اسے پادریوں کی برادری سے نکال دیا جاتا اور اسے فراک پہننے کی ممانعت کر دی جاتی۔ فراک سے یہ محرومی ایک بڑی بے عزتی بھی جاتی تھی۔ اسی طرح کھیتوں میں کام کرنے والے بھی ایک قسم کا فراک پہنا کرتے تھے۔ شہر میں کام کرنے والوں کے رسمی لباس کا حصہ ان کا فراک کوٹ ہوتا تھا جس کے لمبے اور نوک دار دامن پیچھے کی طرف لٹکتے رہتے تھے۔ انیسویں صدی میں فراک چھوٹی لڑکیوں کے لباس کا حصہ بنا اور زیادہ عمر کی لڑکیوں اور خواتین

کے لیے اسے بیسویں صدی کی ابتدا میں اپنایا گیا۔

اسکرٹ آج کل نسوانی لباس کا حصہ ہے لیکن قدیم انگریزی زبان میں یہ لفظ جسم کے بالائی حصے میں پہنے جانے والے قمیص جیسے لباس کے لیے استعمال ہوتا تھا بلکہ قمیص کے لیے انگریزی لفظ "شرٹ" کو اسی لفظ کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں اسکرٹ سے دامن مراد لیا جانے لگا اور پھر اس سے لباس کا وہ حصہ جو جسم میں نیچے تک آئے۔ اس لحاظ سے جب کہ جسم کے اوپری حصے کے پہناوے کے لیے شرٹ کا لفظ اختیار کیا گیا' جسم کے نچلے حصے کے لباس کے لیے اسکرٹ کو لے لیا گیا لیکن کیونکہ اسکرٹ کے لفظ میں ابھی بھی دامن کا مفہوم کہیں باقی رہ گیا تھا اس لیے یہ بجائے مردانہ لباس کے صرف ایسے زنانہ لباس کے لیے مخصوص ہو گیا جس میں لمبا گھیر اور دامن ہو۔

لفظ پیٹی کوٹ نے بھی اسی طرح معنوی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ آج کل پیٹی کوٹ خاص عورتوں کا پہناوا ہے جو کہ ہمارے ملک میں ساڑی کے نیچے پہنا جاتا ہے لیکن اس کا سیدھا سادہ مطلب "چھوٹا کوٹ" ہے اور چودھویں صدی عیسوی میں انگلستان میں مرد اور عورت دونوں اسے اپنے کوٹ کے اندر جیکٹ کی طرح پہنا کرتے تھے۔ بعد میں عورتوں نے سامنے سے کھلے ہوئے گاؤن کے نیچے پہننے کے لیے جو چھوٹے کوٹ بنوانا شروع کیے ان کے دامن لمبے اور کڑھے ہوئے ہونے لگے۔ پھر جب سامنے سے کھلے گاؤن کا فیشن ختم ہو گیا تو اس چھوٹے کوٹ کے اوپری حصے کی ضرورت باقی نہ رہی اور صرف نیچے کا حصہ رہ گیا اور اسی نے آج کے پیٹی کوٹ کی شکل اختیار کر لی۔

کپڑوں کے نیچے پہنے جانے والے کپڑوں میں سے ایک بنیان ہے۔ اب اس کی پرانی شکل بہت بدل گئی ہے۔ دراصل اس لباس کا نام بنیوں کی قوم سے اس کی نسبت کی بنا پر پڑا۔ شروع میں خاص طور پر گجرات کے بنیے ایک قسم کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا کرتے تھے جو اکثر کولھوں سے اوپر رہتا تھا۔ جب کہیں باہر جانا ہوتا یا سفر پر جاتے تو ایک اور لباس پہن لیا کرتے جو رانوں تک آتا۔ جب یوروپ کے باشندے اس حصے میں تجارت کی غرض سے آئے اور یہاں رہائش اختیار کی تو انھیں بھی ہندستان کے گرم موسم میں اندر پہنے جانے والا یہ لباس آرام دہ معلوم ہوا اور انھوں نے گھر کے اندر اسے استعمال کرنا شروع کیا۔ بعد میں انھوں نے اس کی وضع میں تبدیلیاں کیں اور جب مشینوں کا استعمال بڑھا تو موزوں کی طرح بنیان بھی مشین سے بنوا کر استعمال کرنے لگے۔ بنیان کی ایک قسم آج کل سینڈو کہلاتی ہے۔ دراصل یہ سینڈو نامی ایک پہلوان کے نام پر ہے۔ جس نے اپنے زمانے میں عالم گیر شہرت حاصل کی۔ یہ پہلوان اس مصلحت سے کہ کشتی کے دوران آستینیں اس کے داؤ پیچ میں رکاوٹ نہ بنیں بغیر آستین کی بنیان پہنا کرتا تھا۔ اسی نسبت سے بعد میں بغیر آستین والی بنیانیں سینڈو کہلانے لگیں۔

سردی سے بچاؤ کے لیے سوئٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔ سوئٹر کے لفظی معنی پسینہ لانے

والے کے ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں بعض لوگ مریض کو پسینہ دلانے کی غرض سے ایک موٹا کاٹن جیسا لباس استعمال کیا جاتا تھا اسے سوئٹر کہتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں کھلاڑیوں اور کشتی چلانے والوں کے لیے ایسی اونی جرسیاں رواج میں آئیں جو پسینے کو جذب کر سکیں۔ دھیرے دھیرے سوئٹر سردی سے محفوظ رہنے کا ایک عام لباس بن گیا۔

جسم کے اوپری حصے کو سردی وغیرہ سے بچانے کے لیے جرسیاں بھی پہنی جاتی ہیں۔ دراصل جرسی اس پہناوے کا نہیں بلکہ اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ پہناوا سب سے پہلے شروع ہوا۔ جرسی انگلستان کے قریب رودبار انگلستان (انگلش چینل) میں واقع سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ وہاں کے لوگوں کا خاص پیشہ مویشی پالنا ہے اور جرسی نسل کی مویشی دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں اون کا بھی بہت زمانے سے کام ہوتا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یہاں وہ اونی جاکٹیں بننا شروع ہوئیں جنھیں اب سب جرسی کہتے ہیں۔ پہلے جرسیاں مچھیرے اور ملاح پہنا کرتے تھے کیوں کہ جرسیاں سمندر کے پانی کے چھینٹوں اور بوچھار کو جذب کر لیتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں کھیلوں کی مقبولیت بڑھنے کے بعد جرسیاں کھلاڑیوں میں بھی مقبول ہوئیں اور یہ لباس ساری دنیا میں عام ہو گیا۔

ہندستان میں سردی کے موسم میں مرزئی پہننے کا رواج تھا۔ یہ پوشاک مرزاؤں سے منسوب کی گئی تھی۔ لفظ مرزا اکثر بطور لقب استعمال ہوتا تھا اور مغل شہزادوں کے نام کے ساتھ بھی لگایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر "مرزا مزاج" کہہ کر مزاج کی نفاست کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔ سردی سے بچنے کے لیے عام لوگ تو صدری یا شلوکا پہنتے تھے لیکن امرا اپنے لیے خوبصورت' آستینوں دار پوشاک تیار کراتے جس میں دو کپڑوں کے بیچ روئی رکھ کر سی جاتی تھی۔ روئی کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے لگائے گئے ٹانکوں سے خوبصورت ڈزائن بنائے جاتے تھے۔ اس زمانے کے لحاظ سے اس فیشن ایبل شہزادوں جیسے پہناوے کو مرزائی شلوکا کہا جانے لگا جو عام زبان میں مرزئی ہو گیا۔

ہندستان میں ایک زمانے میں پشواز پہننے کا بھی رواج تھا۔ دراصل پشواز فارسی لفظ "پیش باز" (یعنی سامنے سے کھلنے والا) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ قبائے پیش باز ایک ایسی ٹخنوں تک پہنچنے والی ڈھیلی ڈھالی پوشاک ہوتی تھی جو سامنے سے کھلی ہوتی تھی اور اسے عام طور پر درویش پہنتے تھے۔ ہندستان میں عورتیں اکثر چولی اور لہنگے پہنتی تھیں جس سے عورتوں کی پوری طرح سترپوشی نہیں ہوتی تھی۔ چناں چہ مسلمانوں نے چولی اور لہنگے کو جوڑ کر پشواز کی شکل دی جسے عام طور پر پیشہ ور عورتیں جیسے نائنیں' چوڑیاں یا سبزی بیچنے والیاں' رنڈیاں' ڈومنیاں وغیرہ پہنتیں۔ یہاں تک کہ نٹ اور بھانڈ وغیرہ مرد بھی تماشا دکھاتے وقت پشواز پہن لیا کرتے تھے۔ دلہنوں کو بھی رسماً پشواز پہنائی جاتی تھی۔

اس طرح تقریباً ہر پوشاک اپنے دامن میں ایک داستان چھپائے ہوئے ہے جو دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔

خامہ بگوش کے قلم سے

جلد 36
شمارہ ۱۲

جو رہی سو بے خبری رہی

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آپ بیتی، جس کی حیثیت آج اردو شاعری میں خاتونِ اول کی ہے۔

ادا جعفری کی کتاب "جو رہی سو بے خبری رہی" دیکھ کر ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ یہ محترمہ کا تازہ مجموعہ کلام ہوگا۔ ان کا آخری مجموعہ "سازِ سخن بہانہ ہے" بارہ تیرہ برس پہلے چھپا تھا، اس عرصے میں انھوں نے بہت سی شاہ کار نظمیں غزلیں لکھی ہیں، اس لیے تازہ مجموعے کی اشاعت غیر متوقع نہیں تھی، کتاب کی ورق گردانی سے پہلے اس کے نام نے مسحور کر دیا کہ کسی شعری مجموعے کے لیے ایسا موزوں اور خوب صورت نام کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ بڑے شوق سے کتاب کھولی لیکن افسوس کہ اس میں سے نظم کی بجائے نثر برآمد ہوئی۔ مزید مایوسی اس وقت ہوئی جب اندرونی سرورق پر کتاب کے نام کے نیچے قوسین میں "خود نوشت" لکھا دیکھا۔ ایک تو شاعروں کی نثر پڑھنا ہمارے لیے مشکل کام ہے، اور اس سے زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ کسی ایسی شخصیت کی آپ بیتی پڑھی جائے جس کی زندگی میں کسی چٹخارے دار واقعے کے رونما ہونے کا امکان ہی نہ ہو۔ جس نے امرتا پریتم، اجیت کور اور کشور ناہید کی آپ بیتیاں پڑھی ہوں وہ ادا جعفری کی آپ بیتی اسی وقت پڑھے گا جب اسے ثواب حاصل کرنا ہوگا۔ سو ہم نے اس کتاب کو ان کتابوں کے ساتھ رکھ دیا جن کو آئندہ زندگی میں حصولِ ثواب کے لیے پڑھنے کا ارادہ ہے۔

گذشتہ ہفتے سورج گرہن والے دن پورے شہر کی طرح ہم بھی خوف زدہ تھے، گھر سے باہر قدم نکالنے کی ہمت نہ ہوئی تو سوچا کوئی نیکی کا کام ہی کر لیا جائے۔ اس لمحے ادا جعفری کی کتاب یاد آئی کہ اس کے مطالعے سے زیادہ نیکی کا کوئی کام اور کیا ہو سکتا ہے۔ کانپتے ہاتھوں میں ہم نے کتاب سنبھالی اور آئندہ زندگی میں نیک راہ پر چلنے کی دعا مانگ کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ پہلے صفحے کی پہلی سطر ہی ایسی دامن کشِ دل ہوئی کہ ہم دنیا و مافیہا سے

بے خبر ہو کر اسے پڑھتے رہے اور جب تک کتاب ختم نہ ہو گئی، ہم نے اسے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ کتاب پڑھنے کے بعد ہمیں اپنی اس رائے پر ندامت ہوئی، جو ہم نے کتاب پڑھنے سے پہلے قائم کی تھی۔ حالانکہ ہماری روایت یہ رہی ہے کہ کتابیں پڑھے بغیر ہی ان کے بارے میں کالم لکھے ہیں اور الحمدللہ کہ کبھی کوئی غلط بات نہیں لکھی۔ ادا جعفری کی کتاب پڑھنے کے بعد اب ہماری یہ رائے ہے کہ اسے سورج گرہن کے دن ہی میں نہیں، عام دنوں میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اردو میں ایسی دلچسپ اور اعلا ادبی معیار کی کتابیں کم لکھی گئی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادا جعفری کی زندگی میں کوئی چٹخارے دار واقعہ، کوئی سنسنی خیز قصہ اور کوئی دل گرما دینے والا رومان رونما نہیں ہوا، اس کے باوجود یہ کتاب قاری کے دل کو گرماتی ہے اور ذہن کو روشنی بھی عطا کرتی ہے۔

ادا جعفری نے ہر حساس انسان کی طرح دو سطحوں پر زندگی بسر کی ہے، وہ بیک وقت دو دنیاؤں کی شہری ہیں۔ ایک دنیا تو وہ ہے جو گرد و پیش کے ماحول نے تعمیر کی ہے اور دوسری دنیا وہ ہے جو ان کی ذات کے اندر واقع ہے۔ وہ اپنی زندگی کی روداد بیان کرتے ہوئے کبھی ظاہری دنیا کی تصویریں دکھاتی ہیں اور کبھی باطنی دنیا کے مناظر پیش کرتی ہیں۔ کہیں وہ بھولے بسرے واقعات سناتی ہیں اور کہیں اپنی ان سوچوں اور خیالوں کی نقش گری کرتی ہیں جو زندگی کے مختلف ادوار میں ان کے دل و دماغ پر مسلط رہے۔ اس اعتبار سے یہ آپ بیتی منفرد ہے کہ اس میں عام واقعات کے ساتھ دل و دماغ پر گزرنے والی کیفیات کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی نے آج کے عہد کی ایک بڑی شاعرہ بننے تک کے مراحل کس طرح طے کیے، ان کی تفصیل تو اس کتاب میں ملتی ہی ہے، لیکن جو چیز اس کتاب کو عام کتابوں سے الگ کرتی ہے، وہ مصنفہ کا انداز بیان ہے۔ یہ بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی اچھا شاعر، اچھی نثر لکھنے پر بھی قادر ہو۔ اسی طرح اگر کوئی اچھا نثر نگار شاعر بھی ہو تو اس سے اچھی شاعری کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ غالب کا شمار تو مستثنیات میں ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت بڑا شاعر بھی ہے اور بڑا نثر نگار بھی لیکن دوسرا کوئی شاعر یا نثر نگار ایسا نہیں ملتا جو نثر و نظم دونوں میں باکمال ہو۔ شاعروں میں علامہ اقبال کی مثال ہمارے سامنے ہے، وہ بڑے شاعر ہیں مگر ان کی نثر بے مزہ ہوتی ہے یہی حال فیض کا ہے کہ ان کی شاعری کے سامنے ان کی نثر خانہ بے چراغ ہے۔ ہمارے صاحب طرز نثر نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور

نیاز فتح پوری شاعری سے بھی شوق رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کا خاصا کلام منظر عام پر آچکا ہے اور نیاز فتح پوری کا شمار تو زود گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا وہ کلام جو ستر اسی سال پہلے کے رسالوں میں دفن ہے اجمع کیا جائے تو ہزار صفحوں سے کم کا مجموعہ مرتب نہیں ہوگا لیکن آزاد اور نیاز کی نثر کے سامنے ان کی شاعری کا وہی حال ہے جو کمال کے بالمقابل عجز کا۔ موجودہ دور میں ایک بھی نثر نگار ایسا نہیں ہے جس نے ڈھنگ کے دو مصرعے لکھے ہوں لیکن شاعروں میں چند ایسے ضرور مل جاتے ہیں، جنھیں نثر لکھنی آتی ہے۔ اس مختصر گروہ میں ادا جعفری اس اعتبار سے منفرد نظر آتی ہیں کہ ان کی نثر صحیح معنوں میں تخلیقی نثر ہے، وہ اب تک ہمارے عہد کی ایک بڑی شاعرہ تھیں، زیر کتاب کی اشاعت کے بعد اب وہ بڑی نثر نگار بھی ہیں۔

اگر یہاں تخلیقی نثر اور غیر تخلیقی نثر کا فرق واضح کر دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ہر لکھنے والے کی پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا مدعا بیان کرے اور یہ کام ہر وہ شخص بآسانی انجام دے لیتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں قلم اور قلم کے سامنے کاغذ ہو۔ کوئی لفظوں کو بے جان اشیاء کی طرح استعمال کرتا ہے اور کوئی ان کو جاندار سمجھ کر اپنا مدعا اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا پڑھ کر بھول جاتا ہے کہ اس نے کیا پڑھا تھا اور کوئی اپنی بات اس طرح کہتا ہے کہ بات ذہن میں نقش ہو جاتی ہے اور بات کہنے کا انداز دل میں گھر کر لیتا ہے۔

ادا جعفری کی نثر اس لیے تخلیقی ہے کہ انھوں نے لفظوں کو انسانوں کی طرح جاندار سمجھا ہے اور ان کی ماورائے لغت معنویت سے بھی کام لیا ہے۔ ان کی باتیں اچھے شعر کی طرح نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ یاد بھی رہ جاتی ہے۔ کتاب کا آغاز ہی اس خوبصورت انداز سے ہوتا ہے "وہ جو بے چین اور بے خبر اداس ہجوم میں تنہا لڑکی تھی، یہ اس کی اور میری کہانی ہے۔ میرے اور اس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا صبح و شام کے بیچ آجاتا ہے۔ میرا اور اس کا وہی رشتہ ہے جو سوچ کا آواز سے ہوتا ہے۔ سوچ کی سرحدیں نہیں ہوتیں، آواز حدود میں گرفتار رہتی ہے، آواز سوچ کے ساتھ چلے کبھی ایسا ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ کبھی وہ میرے پاس ہوتی ہے کبھی صدیوں کے فاصلے پر میں تو اسے بہت پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھی تھی مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مڑ کر دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ بدلتے موسموں کی دل داری اور دل آزاری دونوں پر یقین کرنے کے لیے کبھی کبھی بھولی بسری یادوں کو چھو لینا بھی اچھا ہے۔

اگر اس اقتباس کے جملے، مصرعوں کی طرح لکھ دیئے جائیں تو یہ عبارت ایک خوبصورت نثری نظم میں تبدیل ہو جائے گی۔ ایسے ہی دل کو چھو لینے والے "شعر" اس کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر ملتے ہیں۔ ان میں کچھ "شعر" سنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

"وہ بی بیاں واقعی چراغِ خانہ تھیں، طاق میں رکھے ہوئے دیے کو اپنے ہی اجالے کے لیے کسی اور ہاتھ کا منتظر رہنا پڑتا ہے کہ جب چاہا جلا لیا، جس کو چاہا بجھا دیا اور پھر بجھے ہوئے چراغ کی بساط ہی کیا ہوتی ہے، وہ آنسو جو آنکھ سے دل میں ٹپکا کس نے دیکھا ہے"۔

"کتابِ ذات کو کھول کر پڑھا جائے، کہاں ممکن ہے، اس کے اوراق تو تند شوریدہ سر ہواؤں میں اتنی تیزی سے پلٹ رہے ہیں کہ کہیں کسی صفحے کا ایک لفظ، کسی ورق کی ایک سطر ہی پلّے پڑ جائے تو بہت ہے"۔

"عورت ایک ہی مہلتِ حیات میں کئی جیون جھیلتی ہے قلم ہاتھ میں تھام لے تو جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے آداب کچھ کہتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملنے کے راستے کہیں اور نکلتے ہیں"۔

اس آپ بیتی کا مطالعہ کئی زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مصنفہ نے اپنے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ اپنے مشاہدات بھی بیان کیے ہیں، خصوصاً غیر ملکی اسفار کا تذکرہ خاصی تفصیل سے ملتا ہے، لیکن ان میں روایتی سفرناموں والی کوئی بات نہیں ہے۔ سفر کے انھیں پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے جو مصنفہ کے لیے حیرت واستعجاب کا باعث تھے، اس حیرت واستعجاب میں قاری بھی برابر کا شریک ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کو شخصیات کا نگارخانہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بلامبالغہ سو ڈیڑھ سو افراد کا ذکر ہے، لیکن کسی کے بارے میں بھی چند سطروں سے زیادہ نہیں لکھا۔ اس کے باوجود کوئی اہم بات لکھنے سے نہیں رہ گئی۔ چند سطروں ہی میں موضوع کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ شخصیت نگاری کے حوالے سے اختصار اور جامعیت کا ایسا امتزاج شاید ہی کسی دوسری جگہ نظر آئے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے وہ چند سطریں نقل کی جاتی ہیں، جو ممتاز مفتی کے کے بارے میں ہیں۔ "مفتی جی ادب کا اتھاہ ساگر ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ وقت کی حدود سے آزاد ہیں۔ مختصر افسانے کے ابتدائی دور میں بھی ادیبوں کی پہلی صف میں موجود تھے اور آج جدید ترین افسانہ نگاروں کے گروہ کے سرخیل بھی وہی ہیں۔ وقت اپنا سایہ ان پر نہیں ڈال سکا۔ ہم سب انھیں سن رسیدہ بیٹے کا نوجوان باپ کہتے تھے... مجھے تو ایسا لگتا ہے وقت کے علاوہ مقام کی قید سے بھی وہ آزاد ہیں کہ آپ انھیں اپنے سامنے بیٹھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ان سے باتیں کر رہے ہیں، ان کی باتیں سن رہے ہیں اور عین اسی لمحے وہ کہیں دور کسی برگد کی چھاؤں میں آنکھیں بند کیے کسی اندر ہی سے محوِ تکلم ہیں۔ پہاڑوں پتھروں کے بیچ کھلے ہوئے کسی اکیلے پھول کی اجنبی خوشبو کی آواز بھی سن رہے ہیں اور رم جھم برکھا میں کسی دیوداسی کی ترنگ کے راگ

ملہار پر جھوم بھی رہے ہیں، اس بھید کو کون بوجھے"!

اس مختصر کالم میں کتاب کے جملہ محاسن کا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم یہ عجیب و غریب بات لکھے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ پوری کتاب میں کوئی جملہ تو کیا، کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ حالانکہ آج کل کے بعض مصنفین تو پوری پوری کتابیں ایسی لکھ دیتے ہیں جن میں قارئین کی آزاری کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ آج دنیائے ادب میں قاری سے زیادہ مظلوم اگر کوئی ہے تو صرف وہ کاغذ ہے جس پر کتابیں چھپتی ہیں۔

اور آخر میں صہبا لکھنوی کا بے حد شکریہ کہ انھیں کے پیہم تقاضوں کی وجہ سے یہ کتاب لکھی گئی۔ صہبا لکھنوی نے یوں تو بڑے بڑے ادبی کام انجام دیے ہیں جن کی وجہ سے ادب کی تاریخ میں ان کی جگہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکی ہے، لیکن ادا جعفری سے یہ کتاب لکھوا کر انھوں نے ہم جیسے بندگانِ بے دام کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی ہے

قیوم خضر
غلامی ٹولہ، پٹنہ،

جرمِ حسن

(ایک واقعاتی نظم)

ہم قصیدہ حُسنِ یوسفؑ کا لکھیں تو کیوں لکھیں؟
عظمتِ آدمؑ کا قصہ سُن کے ہم اب کیا کریں؟؟

۲

کل گلی میں شور اٹھا لاش ہے اک برہنہ!
بنتِ حواؑ کی سرِ بازار عصمت لُٹ گئی!
کون تھی وہ؟ کس کی بیٹی تھی؟ نہیں کچھ بھی پتہ!
صرف اتنا تو سنا مہندی لگی تھی ہات میں!
کان میں جھمکوں کے بدلے موتیا کے پھول تھے!

۳

اب ہوا معلوم سب جو، تھا حقیقی واقعہ!
وہ سہاگن تھی کُنک جیسا دمکتا رنگ تھا!
وہ کسی گھر کی بہو تھی، آبرو تھی، لاج تھی!
کنچنی کومل سی دیوی تھی شباب و حسن کی!
حُسن کی شہرت ہی اس کی دشمنِ جاں بن گئی!

۴

گر یہی تھا جُرم اُس کا تو ہمارا ہے سوال؛
ہیں کہاں تہذیبِ نو کے وہ پرستارِ جدید؟
ہیں کہاں گرویدگانِ خصلت؟ کیوں نظر آتے نہیں
یہ تماشا آکے دیکھیں کوچہ و بازار میں!

۵

چشمِ نرگس، دہنِ[1] سوسن، زلفِ سُنبل بھی فضول
اس زمیں کا موری حسنِ تسلسل بھی فضول
بُت کدوں کی کل صنمیانی ادائیں بھی فضول
گھنگھروؤں کی چھم چھما چھم سی صدائیں بھی فضول
عشقِ لیلیٰ، قیس کا غمگیں فسانہ بھی فضول
کوہِ کن کا عشقیہ سب کارنامہ بھی فضول

۶

آدمی کو خوش نگاہی جب وَدِیعت کی گئی!
تب خدا نے اک جہانِ حسن پیدا کر دیا!
حُسن کے دشمن نے غارت کر دیا اس کو مگر
اب رہا کیا؟ جب نگاہ و دل کی دنیا لُٹ گئی!

۷

مسئلہ ہے زندگی کیسے گزارے آدمی؟
دامنِ دل اب کہاں جا کے پسارے آدمی؟
ہم قصیدہ حسنِ یوسفؑ کا لکھیں تو کیوں لکھیں؟
عظمتِ آدمؑ کا قصہ سن کے ہم اب کیا کریں؟

---

[1] لفظ دَہَن ہے مگر ضرورتِ شعری کے تحت "ہ" کو ساکن کر دیا گیا ہے (خضر)

میر ہاشم
۴۳ مغربی کالونی، عقب۔ آر۔ٹی۔او آفس
ریلوے اسٹیشن روڈ۔ اورنگ آباد ۵

عاصی کاشمیری
DANISH KADAH
788-WOOD BROUGH ROAD.
NOTTINGHAM NG3 5 QJ
ENGLAND
TEL: 9523732

غزلیں

سب یہ سمجھ رہے تھے کہ خوبی حنا کی تھی
وہ روکشِ گلاب تھا سرخی حیا کی تھی

وہ ہر قدم پہ خود میں سمٹتا چلا گیا
کہتا کسی سے کیا کہ شرارت ہوا کی تھی

اس بزم میں سبھی تھے مگر مرکزِ نگہ
تصویر اک مجسم شرم و حیا کی تھی

وعدہ وفا نہ کر سکا یہ اور بات ہے
ہر ہر قدم پہ اس کی تو نیت وفا کی تھی

الزام ہر طرف سے اسی ایک ذات پر
تدبیر کا قصور تھا، مرضی خدا کی تھی

اپنی کلاہ کج لیے دنیا سے کٹ گئے
وہ وضع داری تھی کہ خرابی انا کی تھی

دیکھتے ہیں اُسے نظر بھر کے
لوگ سب ہو گئے ہیں پتھر کے

خواب آنکھوں سے گر گئے شاید
رنگ مدھم ہوئے ہیں منظر کے

میں ہی کچھ فائدہ اُٹھا نہ سکا
در کھلے تھے مرے مقدر کے

مل گیا ہے گلے وہ دریا سے
حوصلے دیکھیے سمندر کے

میرے چہرے سے صاف ظاہر ہے
گھاؤ جتنے ہیں میرے اندر کے

اپنے قد کو بڑھا لیا عاصی
یار لوگوں پہ تبصرے کر کے

ستیہ پال آنند
606 Adams St.
Herndon, VA 22070-4613

چل چلاؤ

کھلا، ہموار میداں — ایک ویرانہ
مگر لوگوں کا جمگھٹ ہے
مرے چاروں طرف اک شور برپا ہے
ہوا کا زور بھی ہے، لوگ بھی باتوں میں الجھے ہیں
کئی خیموں کو کس کر باندھتے
مضبوط کھونٹوں سے جکڑتے ہیں
کئی خیمے لپیٹے، ڈھیلی ڈھالی سی طنابیں
تمام کر بے تاب ہیں آگے نکلنے کو
انھیں اگلے پڑاؤ تک پہنچنا ہے
ہوا بھی تیز ہے — سب کو مگر اپنی پڑی ہے
چل چلاؤ کی!

میں خیمہ گاڑ کر اک گہرا ٹھنڈا سانس لیتا ہوں
ذرا پاؤں پساروں، خود سے کہتا ہوں
معاً نظریں اٹھاتا ہوں
کوئی میری طرف اک ٹک نظر گاڑے

کھڑا ہے — جیسے میرا دوسرا "میں" ہو
مرا ہی عکس ہو
لیکن ضعیف العمر، مرجھایا سا
روکھے بال، آنکھوں میں نمی سی
کچھ اداسی سی
ہوا میں اڑتی، ڈھیلی سی طنابیں ہاتھ میں تھامے
وہ خیمے کو اکھاڑے
اپنے کندھے پر اٹھائے
اک قدم آگے بڑھاتا ہے
ذرا رک کر مجھے پھر دیکھتا ہے
مسکراتا ہے
"مرے بیٹے، خدا حافظ"
وہ کہتا ہے
"مرا دن ختم ہوتا ہے
تمھیں میری طرح ہی اس جگہ اک دن ٹھہرنا ہے!"

(معروف پاکستانی شاعر علی محمد فرشی کے ابو کی وفات پر ستیہ پال آنند کا تعزیت نامہ)

سہیل احمد فاروقی
۱۲/۱۷۷ ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵

غزل

انساں کے ہاتھوں سے ایسا دبسا ہو جائے گا کیا
کل تک باغ کا پتا پتا پیلا ہو جائے گا کیا

اُس تک میری بات ابھی پہنچانے کی مت فکر کرو
میرے نام سے رنگِ حنا کچھ گہرا ہو جائے گا کیا

اپنے ہاتھ سے تیری ریکھائیں نے مٹتے دیکھی ہے
تجھ کو خبر ہے خواب کسی دن اُلٹا ہو جائے گا کیا

میرے نام رفاقت اپنی کر دی اس نے یہ کہہ کر
دل میں تو کچھ سوچ رہا ہے تنہا ہو جائے گا کیا

تیرے بھیجے سب پنچھی میں نے آنگن میں اتار لیے
سائیں میری چھت کا رنگ سنہرا ہو جائے گا کیا

روئے سخن فاروقی کا اس کی جانب بھی رہتا ہے
سوچو ان سیدھی باتوں سے پردا ہو جائے گا کیا

مولانا زبیر احمد راہی قاسمی
"بیت الفرید" سرونج

مناجات راہی

(فارسی)

بندہ گناہگارم فریادرس الٰہی
بسیار شرمسارم فریادرس الٰہی

از سوزِ غم نہفتہ جگرم کباب گشتہ
شکوہ ولے ندارم فریادرس الٰہی

جُز جانِ ناتوانم چیزے نہ ہیچ دارم
ایں ہم بتو سپارم فریادرس الٰہی

از قبر تا بہ محشر سفر طویل و مشکل
ہمراہیے نہ دارم فریادرس الٰہی

از خوفِ حشر لرزم آمرزگار لیکن
اُمّیدِ عفو دارم فریادرس الٰہی

عشقِ رسولؐ جانم عشقِ تو جانِ جانم
جُز ایں نہ ہیچ دارم فریادرس الٰہی

در رہگذارِ ہستی نادیدہ رہنما ام
بے یار و غمگسارم فریادرس الٰہی

محبوبِ کبریا را سلطانِ انبیا را
یارب! شفیع آرم فریادرس الٰہی

دانی تو دردِ دل را آزارِ مستقل را
چوں روز و شب گذارم فریادرس الٰہی

راہی سرِ نیازش سرِ آستاں نہادہ
گوید قصور دارم فریادرس الٰہی

سرور علی خاں
مسیح خوش نفس۔ سرونج

سید علی ہاشمی بے پوری
مدرس دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، سورت۔ گجرات

غزلیں

بحر پیمبری کا گہر کس کے پاس ہے
سلطان انبیاء کی نظر کس کے پاس ہے

مبنی ہے اختلاف پہ ہنگامۂ وجود
یک رنگیٔ خیال و نظر کس کے پاس ہے

لاحق کبھی نہ ہو جسے اندیشہ شام کا
عالم میں آج ایسی سحر کس کے پاس ہے

عزت چھپی ہے خلقت محمود میں ایاز
اس بات کا یقین مگر کس کے پاس ہے

ہم نے تو اختیار کیا عفو و درگزر
تم ہی کہو یہ دل یہ نظر کس کے پاس ہے

جس نے سنا مسیح وہ گرویدہ ہوگیا
ایسا کلام زود اثر کس کے پاس ہے

یہ جو تیری زلف دراز ہے جو نہ ڈھل سکے یہ وہ شام ہے
جو نہ کھل سکے یہ وہ راز ہے جو نہ چھٹ سکے یہ وہ دام ہے

لب ناز ہے کہ ہے برگ گل کہ یہ غازۂ سر شام ہے
یہ فروغِ صبح ازل ہے یا کہ چمن میں تیرا خرام ہے

کبھی بام پر کبھی فرش پر کبھی طور پر کبھی عرش پر
ہیں تجلیاں تری جا بجا، ترا جلوہ جلوۂ عام ہے

ابھی چند روز خموش رہ ابھی اپنا غم نہ کسی سے کہہ
ترا لہجہ قدرے درشت ہے ترا نالہ نالۂ خام ہے

کوئی مستقر ہو تو دوں پتا، نہ مکاں رہا نہ وطن رہا
ہیں ازل سے خانہ بدوش ہم کہیں صبح ہے کہیں شام ہے

نہ فلاحی ہے نہ وہ قاسمی ہے بہت غریب سا آدمی
جسے لوگ کہتے ہیں ہاشمی کسی زلف و رخ کا غلام ہے

ڈاکٹر سخاوت شمیم
سرجن۔ بی۔ ڈی ایم اسپتال
کوٹ پتلی (جے پور)

منیر ساجد
مدیر۔ دیار ادب
مومن پورہ۔ آکولہ

غزلیں

پرندوں کو شجر اپنا لگے ہے
مجھے جیسے یہ گھر اپنا لگے ہے

نہیں ہے غم کہ مٹ جائے گی دنیا
قیامت ہو تو ڈر اپنا لگے ہے

خلاؤں میں چھپا بیٹھا تھا کوئی
مگر اب ہم سفر اپنا لگے ہے

اندھیری رات سناٹوں کا جنگل
بہت بھاری سفر اپنا لگے ہے

شمیم اس شہر میں ہشیار رہنا
یہاں تو ہر بشر اپنا لگے ہے

خلاف حق نہ ہمارا بیان جائے گا
یہ ایسی بات ہے دشمن بھی مان جائے گا

کرائے دار کی فطرت اسے نہیں معلوم
اب اس کے ہاتھ سے اپنا مکان جائے گا

میں اپنے چہرے پہ چہرہ لگا نہیں سکتا
وہ میرے دل میں چھپا راز جان جائے گا

وہ سارے شہر کے حالات جانتا ہے مگر
کب اپنے گھر کی طرف اس کا دھیان جائے گا

ابھی وہ مجھ سے خفا ہے بہت مگر ساجد
اسے مناؤں گا ایسے کہ مان جائے گا

امتیاز دانش ندوی
آگرہ فوٹ ویر، شیو مندر روڈ
جھریا۔ دھنباد (بہار)

دوھے

چھاتی سے اس کوہ کی رستا ہے جو گھاؤ
دھارے پر اس کے بہے ہر کشتی ہر ناؤ!

مکھی، مچھر بے خبر، کب آئے گا کال
بیٹھی ہے چپ چاپ اک مکڑی تانے جال

ٹھونٹھ شجر کی ڈال پر گدھ ہے لگائے آس
مریل سا اک بیل ہے تن پر تھوڑا ماس

طاقتور ہو سامنے کرے نہ کوئی وار
خالی ہو میدان تو سب بھانجیں تلوار

اس کا ہی اس عہد میں جینا ہے آسان
گٹھری جس کی پیٹھ ہے بہرے جس کے کان

بانس اور بلّی کی طرح بکھرے سارے خواب
سب تھے گہری نیند میں جب آیا سیلاب

دانش دل سے جب کوئی لب تک آئے آہ
سننے والا سر دھنے منہ سے نکلے واہ

سید فیاض الرحمٰن شارق
نزد بار ایسوسی ایشن
سٹی کورٹ۔ پٹنہ

غزل

جان دے منّت رذیل نہ کر
اپنے جینے کی یہ سبیل نہ کر
سارے بندوں پہ ہے نظر اس کی
اس عقیدے میں قال و قیل نہ کر
اس کی رحمت کا آسرا ہے مگر
توشۂ آخرت قلیل نہ کر
دن بدلتے ہیں موسموں کی طرح
بحث کر دعویٰ بے دلیل نہ کر
بد خصالوں کو ذی شرف مت لکھ
آبروئے قلم ذلیل نہ کر
تشنہ کاموں کو قطرۂ شبنم
اتنی زحمت مرے خلیل نہ کر
بانٹ، جتنا بھی بانٹ سکتا ہے
علم کو دولت بخیل نہ کر
یہ تو خود مدّعی ہیں اے شارق
اپنے ہمسایہ کو وکیل نہ کر

پروف کا نمونہ

مطبوعہ صفحہ کے اثرات

پریس کے ساتھ ساتھ شعر محض کہنے اور سنانے کی چیز نہیں رہ گیا مطبوعہ
صفحہ نے نثر کی طرح شاعری کو بھی رفتہ رفتہ پڑھنے کی چیز بنا دیا۔

شعراء کا کلام اخبارات و رسائل اور مطبوعہ کتابوں کے ذریعے
دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے قاری تک جو ایک دوسرے سے
ہی نہیں تخلیق کار
سے بھی بیگانہ تھے سرعت سے پہنچنے لگا۔ چنانچہ شاعری کے
معاشرے کے قیام وہ تمام اصول و ضوابط جو سے قبل سامع کو ذہن
میں رکھ کر تیار کیے گئے تھے غیر موثر ثابت ہونے لگے۔
اس لیے اس کی ضرورت پیش آئی کہ شعری اظہار کے طریقہ
کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کی جائے شعر کے ان قدیم تصورات پر زور
صرف نہ کیا جائے جو شعر کہنے سنانے میں اگر لکھنے اور پڑھنے میں
نہیں۔ اس نئی ضرورت نے شعری ہیئت میں نئے تجربے پر مجبور کیا۔
یہ محض اتفاق نہیں ہے
کہ جو شعراء پریس سے زیادہ وابستہ تھے ان کے یہاں ہیئتی تجربہ اور
تبدیلی کی کوشش زیادہ ملتی ہے کیا اسے نظر انداز کر کے ان تجربوں کو
محض انگریزی شاعری کے اثرات قرار دینا مناسب ہے

قیصر شمیم
38/IV، این سی ای آر ٹی کیمپس، نئی دہلی

پروف کی جانچ یا پروف پڑھنا

کمپیوٹر کی مشینی کتابت نے طباعت واشاعت کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ طباعت واشاعت کے ہر مرحلہ کی معیار بندی کی جائے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اڈیٹنگ کے ساتھ ساتھ پروف خوانی میں بھی علامتوں کا استعمال عام ہو۔ اس سلسلے میں ہم قیصر شمیم کا مضمون اور ان کی مجوزہ علامتیں شائع کررہے ہیں۔ ہمیں قارئین کی آرا کا انتظار رہے گا تاکہ ان علامتوں کو مزید کارآمد بنایا جاسکے۔

(ادارہ)

پروف پڑھنا ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے پروف (کتابت شدہ مواد یا کمپوز کیے ہوئے مواد کے چربہ) کا تقابل، اصل مسودے سے کیا جاتا ہے اور اس طرح ترک، زبان وبیان اور املا کی غلطیوں، ٹائپ کی شکستگی اور دیگر اغلاط کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ طباعت واشاعت کے سلسلے میں یہ بیحد مشکل اور ذمے داری کا کام ہے، جس کے بنا، کسی بھی مواد کا صحت کے ساتھ چھپنا مشکل ہے۔

کسی بھی طباعتی واشاعتی ادارے (پریس، کمپوزنگ سینٹر، اشاعت گھر، اخبار کے دفاتر) وغیرہ میں جو شخص پروف پڑھتا ہے اسے پروف ریڈر کہتے ہیں۔ پروف ریڈر کے ساتھ، عموماً ایک اور شخص ہوتا ہے جو پروف کی جانچ کے وقت مسودہ پڑھتا جاتا ہے اور اس طرح اصل مسودے سے پروف کے تقابل میں مدد کرتا ہے۔ اس مسودہ پڑھنے والے کو کاپی ہولڈر یا قاری کہا جاتا ہے۔

پروف ریڈر کی خوبیاں :

۱۔ ایک اچھے پروف ریڈر کی نگاہ کتابت یا کمپوز کیے ہوئے مواد کی غلطیوں پر ہی اٹکتی ہے۔ اسے اس بات کی مشق ہونی چاہیے کہ کسی بھی قسم کی غلطی اس کی نگاہ سے بچ

نہیں پائے۔

۲۔ اسے اس بات کی مشق ہونی چاہیے کہ بیک وقت اس کے کان کاپی ہولڈر کی طرف ہوں اور نگاہ پروف پڑھنے میں مصروف ہو۔

۳۔ اسے زبان، اس کے روز مرہ اور محاوروں سے واقف ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی اسے اس بات پر پوری قدرت ہونی چاہیے کہ لغت دیکھے بغیر وہ کسی بھی لفظ کے صحیح اور غلط ہجے میں تمیز کر سکے (پھر بھی، ذرا سے شبہ کی حالت میں بھی اسے فوراً لغت سے رجوع کرنے کی عادت ہونی چاہیے)۔

۴۔ اسے زبان اور املا میں آنے والی تمام تبدیلیوں سے واقف ہونا چاہیے۔

۵۔ اس کی عام معلومات بہت اچھی ہونی چاہیے۔

۶۔ اسے کتابت یا ٹائپ کی تمام صورتوں سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔

۷۔ اس میں ہر قسم کی بد خط یا گنجلک تحریر پڑھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

کاپی ہولڈر یا قاری کی خوبیاں :

۱۔ اس میں مسودے کو یکساں رفتار سے اس طرح پڑھنے کی صلاحیت ہونی چاہئے کہ ہر لفظ واضح طور پر سنائی دے۔

۲۔ اس کا تلفظ درست ہونا چاہیے۔

۳۔ اسے زبان و املا میں آنے والی تبدیلیوں سے واقف ہونا چاہیے تاکہ مسودے میں عام روش سے مختلف زبان یا املا نظر آئے یا اس کی قدیم و متروک صورت نظر آئے تو پروف ریڈر کو اس سے آگاہ کر سکے۔

۴۔ اسے کتابت یا ٹائپ کی تمام صورتوں سے واقف ہونا چاہیے۔

۵۔ اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ اڈیٹنگ میں مستعمل علامات کو سمجھ سکے اور پروف ریڈر کو اس سے آگاہ کر سکے۔

۶۔ اس میں ہر طرح کی بد خط یا گنجلک تحریر پڑھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

پروف ریڈر کی ذمہ داریاں :

پروف ریڈر کا کام پروف میں ہر طرح کی غلطیوں کی نشاندہی کرنا ہے اور اسی لحاظ سے، اس کی ذمے داریاں ہیں :

۱۔ اس کی ذمے داری ہے کہ وہ قاری کے ذریعے پڑھے جانے والے مسودے سے پروف کا مقابلہ کرے۔ اس طرح اسے پروف میں ہونے والے ترک اور دیگر اغلاط کی نشاندہی میں سہولت ہوگی۔

۲۔ اسے ان تمام غلطیوں کی نشاندہی کرنی چاہیے جو اس کی نگاہ میں آئی ہیں۔

۳۔ دوسری مرتبہ موصول ہونے والے پروف کی جانچ کے وقت اسے غور کرنا چاہیے کہ اس کے بتائے ہوئے سارے اغلاط ہٹا دیے گئے ہیں یا نہیں۔ اس کے لیے یہ بھی دیکھنا لازم ہے کہ کوئی نئی غلطی تو راہ نہیں پا گئی۔

۴۔ اسے سرخیوں، ابواب کے عنوانات، نوٹس، تصویروں، خاکوں، شکلوں، نقشوں، ان سب کے عنوانات اور ان کی اندرونی تحریروں، صفحات کے سلسلہ وار نمبروں اور صفحات کی پیشانی کی تحریر (فولیو ہیڈنگ) وغیرہ کی جانچ اچھی طرح کرلینی چاہیے۔

۵۔ اسے اس کی جانچ کرنی چاہیے کہ تمام صفحات کا حوض برابر ہے یا نہیں اور چھپنے والا مواد کہیں حوض سے باہر تو نہیں جارہا ہے۔

۶۔ بین السطور اور لفظوں کے مابین فاصلہ کی یکسانیت کی جانچ اور ساتھ ساتھ سیدھ (ALIGNMENT) اور رجسٹریشن وغیرہ کی جانچ بھی پروف ریڈر کی ذمے داری ہے۔

۷۔ اسے تحریری خطوط (نسخ، نستعلیق، رقع، ریحانی، کوفی وغیرہ) اور ٹائپ کی تمام صورتوں کی شکستگی اور شکستگی کی جانچ کرنا چاہیے۔ اسے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کہیں ایک ہی لفظ کا کوئی حرف یا ایک سے زائد حروف ایک دوسرے سے دور تو نہیں ہوگئے ہیں یا کسی دوسرے لفظ کا حصہ تو نہیں معلوم ہو رہے ہیں۔

۸۔ اسے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کہیں ایک ہی لفظ دو سطروں میں منقسم تو نہیں ہوگیا ہے مثلاً: "راہبر" میں "را" ایک سطر میں اور "ہبر" دوسری سطر میں نہ ہو۔ البتہ زنجیرو (HYPHEN) کی صورت میں دو لفظوں کو دو سطروں میں قبول کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً "اردو زبان کا تعلق ہند۔ ایرانی خاندان سے ہے۔" اس میں "ہند" کو ایک سطر میں اور "ایرانی" کو دوسرے سطر میں قبول کیا جاسکتا ہے، مگر اضافت کی حالت میں اسے ایک ہی سطر میں ہونا چاہیے۔ مثلاً "نئی تعلیمی پالیسی حکومت ہند نے ۱۹۸۶ء میں تیار کی۔" اس میں "حکومت ہند" کو ایک ہی سطر میں ہونا چاہیے۔

۹۔ اگر پروف ریڈر کو مسودہ میں کسی بھی قسم کی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو اسے پروف میں اس کی جگہ پر سوالیہ نشان بنا دینا چاہیے تاکہ اڈیٹر اسے چیک کرلے۔

۱۰۔ اسے دیکھنا چاہیے کہ پیراگراف کی ابتدا میں مناسب جگہ (INDENTION) چھوڑی گئی ہے یا نہیں۔
۱۱۔ اسے اس کی بھی جانچ کرلینی چاہیے کہ پہلے پروف میں اڈیٹر مصنف کے ذریعے کی جانے والی ترمیمات دوسرے پروف میں شامل کرلی گئی ہیں یا نہیں۔

قاری کی ذمہ داریاں :

۱۔ قاری ہر طرح سے پروف ریڈر کے تابع ہے اور اس کا کام پروف ریڈر کی مدد کرنا ہے تاکہ وہ پروف کو اصل مسودے کے مطابق بنا سکے۔ لہٰذا اسے مسودہ اس طرح پڑھنا چاہیے کہ اس کے پروف کی جانچ مناسب طور پر ہو سکے۔
۲۔ اس کے لیے لازم ہے کہ مسودہ پڑھتے ہوئے وہ پیراگراف کی ابتدا' اقتباسات اور رموز ِ اوقاف کا اعلان بھی کرے۔ جہاں خط بدلے وہاں اس کا بھی اعلان کرے۔ مسودے میں جہاں تصاویر' اشکال' جدول' سائنس وریاضی وغیرہ کے فارمولے ہوں' وہاں اعلان میں خاص احتیاط برتنی چاہیے۔

پروف کی جانچ :

۱۔ کتابت کیے ہوئے مواد کی جانچ ہمیشہ باریک نوک والی نرم پنسل سے کی جانی چاہیے۔ کمپوز کیے ہوئے مواد کے چربے یا فوٹو کاپی کی جانچ قلم یا بال پن سے کی جا سکتی ہے' پھر بھی پنسل سے جانچ کرنے میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ اگر غلطی ہو جائے تو اسے مٹا کر دوبارہ لکھا جا سکتا ہے۔
۲۔ مسودے کی اڈیٹنگ کے وقت اصلاح طلب باتوں کو سطروں کے درمیان درج کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پروف کی جانچ میں یہ باتیں حاشیے میں درج کی جاتی ہیں۔
۳۔ اصلاح طلب حرف یا نشان (علامات وغیرہ) کو سیدھے خط سے اور اصلاح طلب لفظ کو ترچھے خط سے کاٹا جاتا ہے اور پھر ایک ترچھی لکیر(/) بنا کر حاشیے میں صحیح صورت لکھ دی جاتی ہے۔
۴۔ پروف صفحہ کے بیچ سے داہنی طرف کی تصحیح' دائیں طرف حاشیے میں اور بائیں طرف کی تصحیح بائیں طرف حاشیے میں اسی ترتیب میں درج کرنا چاہیے جس ترتیب میں کہ وہ کتابت یا پروف میں ہوں۔

پروف کی اصلاح کے لیے علامات :

اب تک ہمارے یہاں کتابت کا رواج رہا ہے جس میں نہ ٹائپ مارک کی ضرورت ہوتی ہے نہ پروف کے علامات کی۔ مسودہ کاتب کے حوالے کردیا' کتاب کا سائز بتادیا' زیادہ سے زیادہ سطروں کی تعداد بتادی۔ بقیہ سب کچھ کاتب کی صوابدید پر ہے کہ وہ مسطر بنائے' نب کا سائز طے کرے' مابین حروف ومابین الفاظ فصل اپنی استطاعت کے مطابق رکھے یا نہ رکھے' میم کا دنبالہ اگر کاف کے مرکز سے گلے مل رہا ہے اور بین السکور غائب ہو رہا ہے تو ہو جائے۔ ایک سطر میں جتنے الفاظ چاہے لکھے اور کتابت شدہ صفحہ مصنف/ناشر کے سامنے پروف ریڈنگ کے لیے پیش کردے۔ ظاہر ہے ایسی غیر سائنسی صورت حال میں' نہ تو سائنسی اعتبار سے معیار بند کاپی اڈیٹنگ کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ہی اس قسم کے پروف ریڈنگ کی۔ حروف کے سائز سے مطمئن نہیں ہیں تو جلی یا خفی کرنے کو کہہ دیا (سائز بتانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں)۔ اگر غلطی نظر آئی تو غلطی کو پنسل سے گھیر کر ایک لکیر حاشیے تک لائے اور وہاں صحیح صورت لکھ دی یا کاتب کے لیے کچھ ہدایت درج کردی۔ کاتب اپنی فہم سے خود ہی اندازہ لگالیتا ہے کہ کون سی عبارت کتابت کے لیے ہے اور کون سی اس کی ہدایت کے لیے۔۔۔ مگر اب صورت حال مختلف ہونے جارہی ہے۔

فوٹوٹائپ سیٹنگ (PHOTOTYPE SETTING) اور لیزر نے طباعت واشاعت کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا ہے۔ ایک کاتب دن بھر میں تین/چار صفحات لکھ پاتا ہے۔ اس طرح ایک ماہ میں (اگر مسلسل لکھے تو) تین/چار سو صفحے کی کتاب لکھ سکتا ہے۔ فوٹو کمپوزنگ کے ذریعے اس ضخامت کی کتاب تین چار دن میں کمپوز ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اخبار ورسائل ہی نہیں اب تو کتابوں کی اشاعت میں بھی یہ طریقہ مقبول ہونے والا ہے۔

جیسے جیسے مشین کا عمل دخل بڑھتا جائے گا' کاتب اور مصنف/ناشر کا وہ براہ راست رشتہ معدوم ہوتا جائے گا جس میں ان کی باتیں سمجھ لی جاتی ہیں۔ اب ضرورت ہوگی ایک ایسے معیاری نظام علامات کی جسے تمام متعلقہ افراد سمجھ سکیں اور حسب دستور استعمال کرسکیں۔

آج سے تقریباً نصف صدی قبل چودھری رحم علی ہاشمی نے ۳۳ علامات پر مبنی ایک نظام تیار کیا تھا جو مروج نہ ہوسکا۔ ان کی تیار کردہ علامات درج ذیل ہیں۔

⊢⊣ = وقفہ	؟ = سوال
، = کاما	! = تعجب یا تعریف

ءٗ ءٗ = نقل قول	⊔⊔ = نیا پیرا
ع = خارج	⊔⊔ ں = نیا پیرا نہ ہو
؟ = الٹا	⊓ = اوپر اٹھاؤ
ں = خفی کرو	⊔ = نیچے کرو
ی = جلی کرو	∟ = داہنی طرف
6 = فاصلہ یا زیادہ فاصلہ	⅃ = بائیں طرف
و = وصل	سـ = سطح برابر کرو
^ = یہاں اضافہ کرو	‖ = حاشیہ برابر کرو
⊸ = حلقے کی عبارت کو تیر کی جگہ منتقل کرو	V = فاصلہ کم کرو
⊥ = فاصلہ نیچا کرو	Λ = فاصلہ زیادہ کرو
مخ = مقدم موخر	(؟) = کاپی دیکھو
X = صحیح ٹائپ لگاؤ	( ) = قوسین
صہ = بدستور رہے	۲⁄ = فوقانی عدد
صف = صاف کرو	اسـ = فوقانی حرف
	٭ = فوقانی نشان حاشیہ

آج اسے دیکھ کر خوش ہوا جا سکتا ہے کہ نصف صدی قبل ہمارے یہاں یہ کام بھی ہوا تھا۔ زمانہ بدل گیا، ضرورتیں بدل گئیں۔ طباعت واشاعت کی دنیا میں اتنا بڑا انقلاب آگیا ہے کہ نصف صدی قبل جس کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ انگریزی کے وہ بہت سے مینول آف اسٹائل جو معیار بندی کی ضمانت سمجھے جاتے ہیں اور ہمارے لیے نشان راہ کا کام کرتے ہیں، اس وقت تک وجود میں نہیں آئے تھے۔ ظاہر ہے ایسے میں چودھری رحم علی ہاشمی کی تیار کردہ علامات نہ صرف ہماری بہت سی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہیں بلکہ بین الاقوامی علامات سے مطابقت بھی نہیں رکھتی ہیں۔ اس 'سمٹتی' سکڑتی دنیا میں 'ذولسانی کمپوزنگ مشین اور سائنس ٹکنالوجی میں ذولسانی و سہ لسانی کمپوزنگ کی ضرورت کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، بین الاقوامی علامات سے قریب رہا جائے اور اس کی معیار بندی کا خیال رکھا جائے۔ مزید یہ کہ چودھری صاحب نے ساری علامات اخباری ضرورتوں کے پیش نظر رکھی تھیں کتابوں کی طباعت واشاعت ان کے پیش نظر نہیں تھی۔

مندرجہ بالا باتوں کو ذہن میں رکھ کر جو علامات تیار کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ ان میں

ترمیم واضافہ کی گنجائش موجود ہے اور یہ کام تبھی ہو سکتا ہے جب مسودے کی ایڈیٹنگ اور پروف پڑھنے میں علامات کا استعمال شروع ہو :

ح یا D = خارج کرنا، مٹانا، نکالنا

◡ = قریب کرنا، فاصلہ کم کرنا

ح̂ یا D̂ = خارج کرکے فاصلہ ختم کرنا

خ # = غیر ضروری فاصلہ ختم کرنا ہے

= فاصلہ بڑھانا

لف # = الفاظ کے درمیان مساوی فاصلہ

سط # = سطروں کے درمیان مساوی فاصلہ

حف # = حروف کے درمیان مناسب فاصلہ

خف # = خفیف فاصلہ پیدا کرنا

ک یا ¶ = نیا پیراگراف بنانا

ع ¶ = پیراگراف ختم کرکے سطر پورا کرنا

□ = دائیں یا بائیں طرف ایک ایم (Em) کھسکانا

⊏ = دائیں جانب کھسکانا

⊐ = بائیں جانب کھسکانا

⊐⊏ = مرکز میں لانا

⊓ = اوپر لے جانا ہے

⊔ = نیچے لانا ہے

= = افقی سیدھ درست کرنا ہے (ALIGN HORIZONTALLY)

|| = عمودی سیدھ درست کرنا ہے (AELIGN VERTICALLY)

\\// = مرکز میں لانا (CENTRALLY ALIGNED)

∽ = مقدم و مؤخر کرنا ہے

مخف = مخفف دیا جانا چاہیے

مکمل = تخفیف کی جگہ پورا لفظ لکھا جانا چاہیے

صح = صحیح شکل بنائیے

کسخ = کشش ختم کرنا یا کم کرنا ہے

کشش = کشش بنانا ر بڑھاتا ہے
= نقطہ صحیح جگہ پر لاتا ہے
= شوشہ کم کرتا ہے
= شوشہ بڑھاتا ہے
= اضافہ کرتا ہے
(ترک) = ترک
= حلقے کی عبارت کو تیر کی جگہ منتقل کرتا ہے
= بدستور رہے
= فوقانی نمبر
= فوقانی الف
= فوقانی نشان حاشیہ
خفی = خفی کرتا ہے
جلی = جلی کرتا ہے
نسخ = جس خط کا نام لکھا ہے زیر خط الفاظ ر حروف کو اس میں لکھتا ہے
= سکتہ بناتا ہے
= ختمہ بناتا ہے
؟ = سوالیہ نشان بناتا ہے
( ) = بریکٹ بناتا ہے
= بریکٹ ختم کرتا ہے
! = ندائیہ نشان بناتا ہے
: = کولن کا نشان بناتا ہے
؛ = سیمی کولن (SEMI COLON) کا نشان بناتا ہے
= اقتباس کی واحد علامت بناتی ہے
= اقتباس کی دوہری علامت بناتی ہے
= ڈیش بناتا ہے
= M پائیکا ڈیش بناتا ہے
= N پائیکا ڈیش بناتا ہے

ا=ا	=	ہائفن بنانا ہے
(…	=	کچھ حصہ حذف کیا جارہا ہے
—	=	تخلص یا ہندوستانی ناموں کے اوپر نشان
ر د / نو	=	نقطے مل گئے ہیں ان کو علاحدہ / واضح کرنا ہے
⑨	=	غلط ٹائپ لگا ہے / خط بدل گیا ہے۔ صحیح ٹائپ لگانا ہے
صف	=	صاف کرنا ہے
ٹ غ	=	ٹوٹے حروف (حروف) کو پھر سے کمپوز کرنا ہے / فلم یا پلیٹ کو چیک کرنا ہے
ﺍ	=	کی جگہ لکھنا ہے
v	=	حرف یا لفظ کے بالائی حصے میں نقطے / علامات کے لیے
∧	=	حرف یا لفظ کے زیریں حصے میں نقطے / علامات کے لیے
(مسودہ)	=	مسودہ دیکھیے
(مطبع)	=	مطبع / پریس کے لیے ہدایت
✓	=	ہٹا کا نشان (OBLIQUE) بنانا ہے
◯	=	دونوں الفاظ کو الگ الگ لکھنا ہے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

حضرت محمدؐ اور قرآن (مذہب) ڈاکٔٹر رفیق زکریا (زیر طبع)
تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات (تاریخ) ڈاکٹر سید جمال الدین ۵۰/۰
سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم (خطبہ) پروفیسر اختر الواسع ۱۰/-
سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبہ) ڈاکٹر سید ظہور قاسم ۱۰/:
اردو صحافت صداقت اور آزادی رائے ″ عشرت علی صدیقی ۱۰/:
تفہیم (مضامین) رشید حسن خاں ۷۵/:
شناسا و شناخت (تنقید) پروفیسر انور صدیقی ۹۰/:
کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے (مضامین) ڈاکٹر سید تقی حسین جعفری ۷۵/۰
چہرہ در چہرہ (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین ۵۰/:
فی البدیہہ (″) یوسف ناظم ۴۵/:
تعلیم و تعلم (تعلیم) ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۷۵/:
سرسید اور روایت کی تجدید۔ پروفیسر مونس رضا } (خطبہ) ۱۰/:
سرسید اور ماڈرن یونیورسٹی۔ پروفیسر مسعود حسین خاں } مرتبہ خواجہ محمد شاہد
شعریات سے سیاسیات تک غلام ربانی تاباں ۵۰/:
اردو شاعری کی گیارہ آوازیں (تنقید) عبدالقوی دسنوی ۷۵/:
انشا اور تلفظ (طلبہ کے لیے) (قواعد) رشید حسن خاں ۹/:
عبارت کیسے لکھیں ″ ″ ۱۵/:
آدم خور چیتا (شکاریات) ریاض احمد خاں ۴۵/:
انداز گفتگو کیا ہے (تنقید) شمس الرحمٰن فاروقی ۷۵/:
دستک اس دروازے پر وزیر آغا ۵۰/:
آزمائش کی گھڑی (مضامین) سید حامد ۵۰/:
جھینی جھینی بینی چدریا (ناول) عبدالبسم اللہ ۷۵/:
صحرانورد کے خطوط (افسانے) میرزا ادیب ۶۵/:
میں سمندر ہوں (شعری مجموعہ) فرحان سالم ۳۰/:
اسرار خودی (فراموش شدہ اڈیشن) شائستہ خاں ۶۵/:
مسلمانوں کا تعلیمی نظام (مضامین) ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/:
بام جہاں نما اردو صحافت کی ابتدا (صحافت) گربچن چندن ۶۵/:
لوتھل اور بابلی تہذیب و تمدن (تاریخ) مالک رام ۶۵/:

اپنے دل کی حفاظت کیجیے (ہیلتھ بک) ترجمہ نذیر الدین مینائی ۲۵/:
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان (سوانح) تالیف مولانا حکیم محمود احمد برکاتی ۹۰/:
تذکرۂ ماہ و سال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/:
افکار اقبال (تنقید) محمد عبدالسلام خاں ۱۲۵/:
تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۵۰/:
تاثر کی تنقید (تنقید) صدیق الرحمٰن قدوائی ۵۰/:
یہ صورت گر کچھ خوابوں کے (انٹرویوز) طاہر مسعود ۶۶/:
گوشے میں قفس کے (طنز و مزاح) دلیپ سنگھ ۴۵/:
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول) کشمیری لال ذاکر ۴۰/:
سحر کے پہلے اور بعد (جگ بیتی) سید الظفر چغتائی ۵۰/:
تحریریں (مضامین) اسلم پرویز ۵۷/:
سفر (ناول) رابعہ تبسم ۲۷/:
خواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۶۶/:
بانگ درا مکمل علامہ اقبال ۹/:
بال جبریل مکمل ″ ۹/:
ضرب کلیم (اردو نظمیں) ″ ۶/:
غبار منزل (شعری مجموعہ) غلام ربانی تاباں ۴۵/:
پیامی قواعد اردو (قواعد) (ادارہ) ۶/:
″ ″ (خورد) (″) ۳/:
فریدؒ و فرد فریدؒ (سوانح) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۷/:
پہچان اور پرکھ (تنقید) پروفیسر آل احمد سرور ۵۰/:
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم (مضامین) ڈاکٹر سلامت اللہ ۵۰/:
اقبال کا نظریۂ خودی (تنقید) ڈاکٹر عبدالمغنی ۱۰/:
پت جھڑ کی آواز (افسانے) قرۃ العین حیدر ۴۵/:
جدید افسانہ اور اس کے مسائل (تنقید) وارث علوی ۳۶/:
قلندر بخش جرأت (خطبہ) جمیل جالبی ۱۰/:
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری (ادارہ) ۱۲/:
پیامی ہوم ڈکشنری اردو انگلش ″ ۱۴/:

مانگے کا اُجالا



خامہ بگوش کی ہفت پر لکھی گئی ...

حجرۂ ہفت بلا یا بلائے ہفت حجرہ

آج کل کتاب لکھنا اتنا آسان ہوگیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کتاب کی جلد سازی ایک مشکل کام نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد سازی کے پیشے میں ناکام ہونے والے بھی کامیاب مصنف بن جاتے ہیں۔ مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ کتاب کا پڑھنا ہے۔ اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے ہم نے ایک عرصے سے مطالعہ کتب کا شغل ترک کر رکھا ہے۔ پرانے زمانے کے قیافہ شناسوں کی طرح ہم کتاب کا سرورق دیکھ کر اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے اندر کیا ہوگا۔ گویا لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیا جاتا ہے۔ مگر کبھی کبھی کوئی کتاب ایسی بھی ہاتھ لگ جاتی ہے جس کے ظاہر سے اس کے باطن کا اندازہ نہیں ہوتا۔ آدمیوں کی طرح کتابوں میں بھی ظاہر و باطن کا فرق نظر آجائے تو مجبوراً مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ آگے ہماری قسمت کہ حاصل مطالعہ مسرت ہو یا عبرت۔

اب کے ایک ایسی کتاب ہماری نظر سے گزری ہے جس سے ہم نے بیک وقت مسرت بھی حاصل کی اور عبرت بھی۔ کتاب کا نام ہے جو "ملے تھے راستے میں" اور مصنف کا نام نامی احمد بشیر ہے۔ سرورق پر دو باتیں ایسی لکھی ہیں جنھوں نے کتاب کے مطالعے پر ہمیں مجبور کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ کتاب کے نام کی وضاحت یوں کی گئی ہے "احمد بشیر کے حقیقت پسندانہ خاکے" یہ وضاحت دیکھ کر پہلا خیال ذہن میں یہ آیا کہ "مبنی بر حقیقت" کی بجائے خاکوں کو "حقیقت پسندانہ" کہنا شاید حقیقت شناسی کا کوئی بہت اونچا درجہ ہے' لہٰذا یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ کتاب کے سرورق پر دوسری بات یہ درج ہے "تحقیق و ترتیب: یونس جاوید" ترتیب کی بات تو سمجھ میں آگئی کہ جناب مرتب نے نہایت غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا ہوگا کہ کتاب میں کون سا خاکہ پہلے آئے گا اور کون سا بعد میں۔ مگر تحقیق والی بات پلے نہیں پڑی۔ تحقیق کی ضرورت تو اس وقت پیش آتی ہے جب مصنف اور اس کے کارنامے ماضی بعید کے دھندلکوں میں گم ہو چکے ہوں اور انھیں از سر تو دریافت کرنا ہو گویا محقق اندھیرے سے اجالے کی طرف سفر کرتا ہے۔ لیکن جب مصنف خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہو' اور اس کے وجود کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہو تو اندھیرا کہاں سے دستیاب ہوگا جسے اہل تحقیق اپنے سفر کا نقطہ آغاز قرار دیتے ہیں۔ بہرحال جناب مرتب کے دیباچے سے ان

کی تحقیق کی جو تفصیل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ احمد بشیر نے جو منفی خاکے لکھے تھے' وہ اخباروں اور رسالوں میں دفن تھے' انھیں بڑی مشکل سے تلاش کیا گیا ہے۔ واقعی یہ بہت بڑا تحقیقی کام ہے کہ جن تحریروں کو خود مصنف نے سنبھال کر رکھنے کے لیے لائق نہیں سمجھا' انھیں مرتب نے تلاش کرلیا۔ کتاب پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہو گا کہ مصنف کے بارے میں کچھ بنیادی معلومات حاصل کرلی جائیں۔

مرتب کے دیباچے' کتاب میں شامل ممتاز مفتی کے مضمون اور کتاب میں بکھرے ہوئے خود مصنف کے بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تربیت گرداسپور میں اپنے "طرح دار" ماموں کی بیٹھک میں ہوئی جہاں انھوں نے راگوں میں شدبد حاصل کی۔ اس تربیت کے مثبت نتائج کتاب میں جابجا نظر آتے ہیں۔ جہاں کہیں راگ راگنیوں کا ذکر آیا ہے' احمد بشیر نے معلومات کے دریا بہادیے ہیں۔ یہی نہیں اکثر جگہ موسیقی کی اصطلاحوں کے ذریعے زندگی کے عام معاملات کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ موصوف اسی میدان میں اپنا نام روشن کرتے لیکن مولانا چراغ حسن حسرت کی توجہ سے وہ صحافی بن گئے۔ خیر یہ بھی کوئی مختلف کام نہیں کہ آج کل صحافیوں کا سرکار کے دربار میں بھرتی ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔

صحافی کی حیثیت سے احمد بشیر نے خاصی شہرت حاصل کی لیکن ایوب خاں کے دور میں قدرت اللہ شہاب کی عنایت سے وہ سرکاری ملازم ہو گئے۔ بھٹو کے زمانے میں دوبارہ صحافت کی طرف آئے مگر ضیاء الحق کی فرماں روائی کے گیارہ سال لاہور کے ٹی ہاؤس میں فوجی آمریت کے خلاف زبانی جہاد کرنے میں گزار دیے۔ اسی زمانے میں زمین کا ایک پلاٹ بھی حاصل کیا لیکن فوجی آمریت کی اس یادگار کو اپنے پاس رکھنا مناسب نہ سمجھا اور بقول مرتب کتاب' اسے فروخت کر کے بیٹے کی شادی کردی۔ گویا جس آسانی سے یہ پلاٹ ہاتھ آیا تھا' اسی آسانی سے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نقصان کی تلافی بھٹو کی بیٹی نے یوں کردی کہ دوسری مرتبہ اقتدار میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ احمد بشیر کو پرائڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ اس اعزاز کے ساتھ اتنی رقم مل جاتی ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا پلاٹ خریدا جاسکے۔

ممتاز مفتی اور احمد بشیر میں برسوں کا یارانہ تھا۔ مفتی صاحب کا جو مضمون کتاب میں شامل ہے' اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک زمانے میں کراچی میں احمد بشیر گدھا گاڑی چلایا کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ پھر وہ شاعر بن گئے اور سخن آرائیاں کرنے لگے۔ کچھ عرصے بعد شاعری سے طبیعت اچاٹ ہو گئی اور نثر نگاری کی طرف توجہ کی۔ جس مضمون میں یہ باتیں لکھی ہیں' اس کا عنوان ہے "غنڈہ۔" اس اجمال کی تفصیل مضمون ہی میں دیکھی جاسکتی ہے' تاہم نمونہ کلام کے طور پر کچھ اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ احمد بشیر کو مفتی صاحب مرحوم کس قدر قریب سے جانتے تھے۔

"اشتیاق کے عالم میں ننگی اور فحش گالیاں دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔"

"احمد بشیر...... خود پسند' منتقم' متشدد غنڈہ ہے۔"

"احمد بشیر کی شخصیت کے شالامار کے کسی پوشیدہ حجرے میں ایک سور رہتا ہے اگرچہ وہ کبھی کبھار باہر نکلتا ہے، لیکن جب بھی نکلتا ہے، سارے باغ کو مسخ کر دیتا ہے۔"

پرانی داستانوں میں "حجرۂ ہفت بلا" کا ذکر تو پڑھا تھا، اب معلوم ہوا کہ "بلائے ہفت حجرہ" بھی کوئی چیز ہے۔ ممتاز مفتی کے مذکورہ اشارے کی تصدیق مولانا چراغ حسن حسرت کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے جو خود احمد بشیر نے کتاب میں ایک جگہ نقل کیا ہے: "بزرگوں کی عزت بھی آپ کے دل میں نہیں اور منہ پھٹ بھی آپ بہت ہیں۔"

خود احمد بشیر نے کتاب میں جگہ جگہ یہ دعوا کیا ہے کہ وہ بہت سچے آدمی ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں: (۱) "میں نے ہمیشہ تلوار کے سایے میں سچ بولا ہے۔" (۲) "میں اپنے سچ کی خاطر بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہوں۔" (۳) "جو لوگ مجھے جانتے ہیں، انھیں پتا ہے کہ جھوٹ میں نہیں بولتا۔" ...... اس دعوے کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ دعوا کرنے والے نے بھی اسی عالم میں یہ دعوا کیا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

احمد بشیر کا اتنا تعارف کافی نہیں ہے۔ جو لوگ اس سے زیادہ جاننے کے خواہش مند ہوں، انھیں اصل کتاب پڑھنی چاہیے۔ کتاب میں جتنی معلومات احمد بشیر کے بارے میں ملتی ہیں، اتنی ان لوگوں کے متعلق دستیاب نہیں ہوئیں جن کے خاکے لکھے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک ہی خاکے پر مشتمل ہے جو ایک درجن شخصیات کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ یہ سب شخصیات احمد بشیر کی شخصیت کو سمجھنے کا وسیلہ ہیں۔

جن لوگوں کے خاکے اس کتاب میں شامل ہیں، ان کے نام یہ ہیں: مولانا حسرت موہانی، مولانا چراغ حسن حسرت، احسان دانش، ظہیر کاشمیری، ممتاز مفتی، خواجہ خورشید انور، قدرت اللہ شہاب، وارث میر، میجر اسحاق، کشور ناہید، عبدالمجید بھٹی اور بریگیڈیئر عاطف۔ ان میں سے بیشتر شخصیات پر جو مضامین لکھے گئے ہیں، وہ فنی طور پر شخصی خاکے کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ مثلاً مولانا حسرت موہانی پر جو مضمون ہے وہ دراصل ایک انٹرویو ہے۔ ظاہر ہے انٹرویو شخصی خاکہ نہیں ہوتا۔ مولانا چراغ حسن حسرت سے متعلق مضمون میں صرف پہلی ملاقات کی تفصیل ہے۔ ظاہر ہے ایک ملاقات کی روداد بیان کرنا اور شخصی خاکہ لکھنا دو بالکل مختلف باتیں ہیں۔ خواجہ خورشید انور، وارث میر اور میجر اسحاق کے بارے میں جو مضامین ہیں، ان کی نوعیت تعزیتی شذرات کی ہے۔ ان تینوں کی موت کے بعد صحافیانہ ضرورت کے تحت لکھے گئے ان مضامین میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جن کی بنا پر انھیں شخصی خاکوں میں شمار کیا جائے۔ قدرت اللہ شہاب سے متعلق مضمون میں مصنف نے خود اعتراف کیا ہے کہ شہاب کی شخصیت پر لکھنا مقصود نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں تو شہاب نامہ پر مضمون لکھنے چلا تھا، یہ قدرت اللہ شہاب بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا۔"

شخصی خاکہ لکھنے والے کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو خاکہ،

خاکہ نہیں رہتا' جواب مضمون بن جاتا ہے۔ احمد بشیر کے بعض خاکے پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتیں لکھی ہیں یا دوسروں کے مضامین پڑھ کر ان کے بعض مطالب کو اپنی طرف سے لکھ دیا ہے۔ مثلاً احسان دانش اور ظمیر کاشمیری کی ابتدائی زندگی کی بہت سی باتیں ان سے پوچھ کر لکھی گئی ہیں۔ یہ طریق کار سوانحی خاکے کے لیے تو مناسب ہے مگر شخصی خاکے کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے۔ ان دونوں خاکوں سے اگر "شنید" کو خارج کر دیا جائے تو "دید" کا عنصر برائے نام رہ جاتا ہے۔ خورشید انور کے بارے میں بھی زیادہ تر سنی سنائی باتیں دہرائی گئی ہیں۔ احمد بشیر اس کے سوا اور کچھ لکھ سکتے بھی نہیں تھے کیونکہ خورشید انور سے ان کی دور کی شناسائی تھی اور اس کا انھوں نے اعتراف کیا ہے: "میری تو ان سے بے تکلفی بھی نہیں تھی۔ میں ان کی خاص مجلسوں میں کبھی نہیں بیٹھا۔"

مولانا چراغ حسن حسرت سے احمد بشیر کے گہرے مراسم تھے۔ برسوں تک ان سے روزانہ ملاقات کا موقع ملتا رہا۔ احمد بشیر چاہتے تو مولانا کا بہترین شخصی خاکہ لکھ سکتے تھے' لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے' انھوں نے پہلی ملاقات کی روداد لکھنے پر قناعت کی۔ وہ خاکہ تو نہ لکھ سکے البتہ ایک ایسا مضمون ضرور لکھ دیا جس میں ڈرامائی عنصر کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جن دنوں روزنامہ "امروز" جاری ہونے والا تھا' احمد بشیر بغیر کسی سابقہ تعارف کے مولانا سے ملے اور اپنی چرب زبانی اور شگفتہ بیانی سے انھیں اتنا متاثر کیا کہ دفتر امروز میں بطور کلرک ملازمت حاصل کر لی۔ یہی نہیں' مولانا اتنے مہربان ہوئے کہ اسی روز دفتری اوقات کے بعد احمد بشیر کے ساتھ نہ صرف شراب خانے جا کر شغل کیا بلکہ ہیرا منڈی میں گانا بھی سنا۔ جب طوائف گانا سنا رہی تھی تو مولانا نے ایک فنی اعتراض کیا۔ یہاں "طرح دار" ماموں کی بیٹھک کی تربیت کام آئی اور احمد بشیر نے مولانا کے اعتراض کو رد کر دیا۔ گانے والی کے استاد جی محفل میں موجود تھے' انھوں نے احمد بشیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چھوٹے صاحب بہت گنی معلوم ہوتے ہیں۔"

اس پہلی ملاقات کا حال ممتاز مفتی نے بھی احمد بشیر کے خاکے میں لکھا ہے۔ یہ خاکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس کتاب میں شامل ہے۔ مفتی صاحب اور احمد بشیر کے بیانات میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک ہی کتاب میں ایک ہی واقعہ حیرت ناک حد تک اس طرح مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دونوں راویوں میں سے کس کے بیان کو صحیح سمجھا جائے۔ احمد بشیر کا دعوا ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے ممتاز مفتی نے اس قسم کا کوئی دعوا نہیں کیا' لہذا غلط بیانی کا سہرا انھیں کے سر بندھنا چاہیے۔

احمد بشیر کا خیال ہے کہ انھوں نے مولانا حسرت موہانی کا جو انٹرویو لیا تھا' اس سے اردو میں انٹرویو لینے کی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔ حیرت ہے کہ جناب مرتب نے دوران تحقیق احمد بشیر کو یہ نہیں بتایا کہ اس کام کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اردو میں پہلا انٹرویو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کا تھا جو جولائی ۱۹۳۸ء میں پروفیسر حمید احمد خاں نے لیا تھا اور اسی زمانے میں شائع بھی ہوا تھا۔ بگا بیگم' غالب کے دوست نواب ضیاء

الدین نیر درخشاں کی صاحبزادی تھیں اور غالب ہی ان کو عارف کے بیٹے مرزا باقر علی خان کامل سے بیاہ کر اپنے گھر لائے تھے۔ بگا بیگم نے غالب کا آخری زمانہ دیکھا تھا۔ ان کا انٹرویو غالب ہی کے حوالے سے تھا۔

احمد بشیر اپنے آپ کو اردو میں محض خاکہ نگاری کا "موجد" بھی سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "خاکہ نگاری کی تاریخ پر ایک کتاب میری نظر سے گزری۔ اس کی ابتداء میں نے کی تھی مگر میرا ذکر نہیں آیا اس کتاب میں۔" اس قول برحق کو علم کی انتہا سمجھنا چاہیے کہ علم کی انتہا یہی ہے کہ آدمی کو اپنے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ احمد بشیر نے بقول خود پہلا خاکہ ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا جب کہ اردو کے درجنوں بہترین خاکے ۱۹۴۶ء سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مشہور خاکہ "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی" ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا اور تقریباً یہی زمانہ احمد بشیر کی پیدائش کا ہے۔"

جناب مرتب نے کتاب کے دیباچے میں احمد بشیر کے بارے میں معلومات کے جو دریا بہائے ہیں، لگے ہاتھوں ان کا بھی ایک نمونہ دیکھ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ضیاء الحق کے زمانے میں حاصل کردہ پلاٹ بیٹے کی شادی کے لیے بیچنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "حیرت تو یہ ہے کہ شادی کے لیے بیچنے کی ضرورت کیا تھی جب کہ اس کے بیٹے کی شادی کا کل خرچہ صرف چار سو پچاس روپے تھا، جس میں سے دو سو مولوی صاحب نے لیے تھے۔ اسی طرح بشریٰ انصاری (مشہور ٹی وی اسٹار) کی شادی پر چھ ہزار خرچ آیا تھا۔ نیلم احمد بشیر (مشہور افسانہ نگار) کے لیے انھوں نے دفتر سے کچھ رقم اڈوانس لی تھی البتہ قلزم کی شادی میں بیس ہزار روپے میں اور سنبل کی پچاس ہزار روپے میں ہوئی تھی۔ مگر یہ پچاس ہزار بھی یوں ہوئے کہ احمد بشیر نے اپنے محکمے کے لیے کوئی فلم بنائی تھی۔ یہ محکمہ چونکہ قدرت اللہ شہاب کے ماتحت تھا، انھوں نے بشیر صاحب کو پچاس ہزار بونس دلوا دیا۔" (جاری ہے)

ابراہیم یوسف

اردو ڈرامے کی روایت کمزور کیوں ہے

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے انل ٹھکر کے ڈراموں کے مجموعہ "خالی خانے" کا مقدمہ لکھتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اردو میں ڈراما کیوں نہیں ہے یا اتنا کم کیوں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ ہمارے یہاں ڈراما اس وجہ سے نہیں کہ ڈرامے کی بنیاد کشمکش ہے اور مشرقی تہذیب میں کشمکش کا کوئی مقام نہیں ہے اس معنی میں کہ انسان خود کو تقدیر یا خدا کے حوالے کر دینا ہی زندگی کا بہترین مصرف سمجھتا ہے۔" لیکن اس تشریح سے نہ تو فاروقی صاحب اتفاق کرتے ہیں اور نہ اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ اردو ہندستانی زبان ہے اور ہندستان کی زبان میں ڈرامے کی روایت موجود ہے۔ فاروقی صاحب مزید فرماتے ہیں کہ "اردو دنیا کی ان چھ زبانوں میں سے ہے جنھیں اسلامی زبانیں کہا جاتا ہے مگر اردو کا مزاج یکسر اسلامی نہیں ہے بلکہ ہند اسلامی ہے۔" اردو کا مزاج ہند اسلامی ضرور ہے اور ہر مذہب اور ملت کے افراد نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ مگر اس پر غالب اثرات اسلامی کلچر اور اسلامی عقائد کے ہیں جنھوں نے اردو ادب پر اثرات ڈالے ہیں۔" ڈرامے کی ترقی میں یہ اثرات کچھ زیادہ ہی واضح نظر آتے ہیں جن پر آگے چل کر ہم گفتگو کریں گے۔

اردو میں ڈرامے کی کمی کے وجوہ تلاش کرنے میں ہمیں تاریخ کے اوراق پلٹنا ہوں گے۔ جب مسلمان ہندستان میں وارد ہوئے تو ان کو اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے کافی عرصہ تک جنگی مہمات میں مصروف رہنا پڑا اور ہندستان کے علوم و فنون کی طرف دھیان دینے کا بہت کم موقع ملا اور ایک عرصے تک نو وارد مسلمانوں اور ہندستانی باشندوں کے درمیان ایک مغائرت سی قائم رہی لیکن جب مسلمانوں کو قدرے سکون ہوا اور انھوں نے ہندستان کو اپنا وطن قرار دے کر یہاں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا تو آہستہ آہستہ مغائرت کا پردہ درمیان سے ہٹنے لگا دوری قربت میں تبدیل ہونے لگی۔ میل جول

بڑھا تو ایک طرف تو اردو زبان وجود میں آئی دوسری طرف ایک دوسرے کے علوم و فنون کو سمجھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سنسکرت ڈراما اپنی بساط سمیٹ چکا تھا اور اس کی کوئی روایت موجود نہیں رہی تھی اس کی جگہ لوک ناٹکوں جیسے راس لیلا بھگت اور سوانگ وغیرہ نے لے لی تھی جو شہروں سے دور بالعموم دیہاتوں میں کھیلی جاتی تھیں جبکہ مسلمانوں کی آبادی شہروں میں تھی۔ اس لیے مسلمان سنسکرت ڈراما تو کیا ان لوک ناٹکوں سے بھی واقف نہ ہو سکے۔ چوں کہ عربی اور فارسی میں ڈرامے کی کوئی روایت موجود نہیں تھیں اس لیے مسلمان کسی ایسی صنف شاعری سے واقف نہ تھے جو کہ اسٹیج پر دیکھائی جاتی ہو اور وہ عرصے تک ڈرامے کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

جب مسلمانوں کی آبادی دیہاتوں کی طرف منتقل ہونا شروع ہوئی تو وہ کسی حد تک ان لوک ناٹکوں سے واقف ہوئے لیکن ایک دقت جو پیدا ہوئی وہ یہ کہ راس لیلائیں جن کا کردار کلاسیکل تھا خالص ہندو عقائد پر مبنی تھیں اور بالعموم مندر اور ان آشرموں میں کھیلی جاتی تھیں جہاں گرو اپنے چیلوں کو ان کی تعلیم دیتے تھے اور یہ دونوں جگہیں مسلمانوں کی پہنچ سے باہر تھیں اس لیے مسلمانوں کو ان کلاسیکل ڈراموں کا علم نہ ہو سکا۔ بھگت اور سوانگ وغیرہ کی نوعیت اگرچہ زیادہ مذہبی نہیں تھی مگر ان کا معیار اس قدر پست تھا کہ وہ مسلمانوں کے ذوق کی تسکین نہ کر سکیں اور مسلمانوں نے ان میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ڈرامے کی ترقی ان اقوام میں زیادہ ہوئی جن میں دیو مالائی قومی روایت موجود رہی ہے خواہ وہ یونان ہو یا ہندستان مگر اسلام میں نہ تو اصنام پرستی ہے اور نہ دیو مالا کی کوئی روایت۔ بزرگان دین کی نہ تو تصویر بنائی جا سکتی ہے اور نہ کوئی ان کا روپ دھار کر اسٹیج پر آسکتا ہے۔ جب مسلمانوں نے راس لیلا بھگت اور سوانگ وغیرہ میں دیوی دیوتاؤں کا روپ دھار کر فانی انسان کو اسٹیج پر آتے دیکھا تو یہ ان کے عقائد کے بالکل منافی تھا اس لیے بھی وہ اس طرف متوجہ نہ ہو سکے اور وہ پیش کشوں کو ہندو مذہب کا ایک جزو سمجھتے رہے کیوں کہ یہ پیش کشیں کسی نہ کسی دیوتا سے منسوب ہوتی تھیں

جب ہندستان میں پراکرتوں بالخصوص پالی میں بدھوں نے بدھ مت کی تبلیغ کا ذریعہ ناٹکوں کو بنایا تو برہمنوں کو بھی اس کا خیال آیا اور انھوں نے سنسکرت میں ڈرامے کو رواج دے کر ایک طرف تو اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی دوسری طرف بدھ مذہب کے بڑھتے اثرات پر روک لگانے کی سعی کی۔ ان ناٹکوں کی پیش کش بالعموم

مناد رکے صحنوں میں کی جاتی تھی لیکن مسلمانوں کا عبادت گاہوں کا اپنا تصور تھا مسلمان ڈرامے کو یا تو ہندوؤں کا مذہبی عمل سمجھتے تھے یا پھر لہو ولعب کا ذریعہ اس لیے وہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں بار نہیں پاسکتا تھا اس طرح دونوں ہندو مذہب اور اسلام اردو میں ڈرامے کی ترقی میں حائل ہو گئے۔

اردو اپنے بچپن کے دور میں خانقاہوں میں داخل ہو چکی تھی اور وہاں رُشد وہدایت کا ذریعہ بن چکی تھی مگر خانقاہوں کے مذہبی، سنجیدہ اور ثقہ ماحول میں ڈرامے کا جو لہو لعب کی سند حاصل کر چکا تھا گزر ممکن نہیں تھا۔ خانقاہوں نے جس طرح اردو کی دیگر اصناف کی سرپرستی کی ڈراما اس سرپرستی سے محروم رہا اور اسے کبھی مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ نہیں بنایا گیا جس طرح ہندو سادھو سنتوں اور کلیسا کے راہبوں نے ڈرامے کو اپنے مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔

اردو جب بازاروں اور خانقاہوں سے نکل کر درباروں میں پہنچی اور طبقۂ اشرافیہ نے اسے اظہار کا ذریعہ بنایا تو اس پر اشرافیت کا لیبل چسپاں ہو گیا۔ اس طبقۂ اشرافیہ کا ذہن کلاسیکل تھا وہ ایسی کسی صنف کو معتبر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا جس کی جڑیں عوامی بنیادوں میں ہوں اس کے علاوہ یہ طبقۂ اشرافیہ ادبی محاذ پر تنگ نظری کا شکار تھا وہ صرف انھیں اصناف کو معتبر سمجھتا تھا جو اسے عربی اور فارسی سے وراثت میں ملی تھیں اور جنھیں ان کا کلاسیکل ذہن معیاری سمجھتا تھا۔ بے چارے نظیر اکبرآبادی کو اس طبقۂ اشرافیہ نے اس لیے شاعر تسلیم نہیں کیا کہ ان کی شاعری عوام سے تعلق رکھتی تھی۔ جب نظیر اکبرآبادی اس تعصب کا شکار رہے تو ڈراما جیسی عوامی صنف کب قابل اعتنا ہو سکتی تھی۔ امانت نے اندر سبھا لکھی تو وہ خود کو شرمندہ شرمندہ سا محسوس کرتے رہے اس طبقۂ اشرافیہ نے اردو زبان پر ایک سامراجی طرز کا تسلط قائم کر لیا تھا جس کے دائرہ میں کسی عوامی چیز کا گزر ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ڈراما اس طبقۂ اشرافیہ کی توجہ کا مرکز بننا تو دور کی بات ہے ان کی نفرت اور تعصب کا شکار رہا اور جب اردو ڈرامے نے بال و پر نکالے تب بھی کسی معتبر شاعر یا ادیب کو اسے اپنانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود یہ بھی تاریخ کا ایک مذاق ہے کہ ڈرامے کی اردو میں ابتدا ایک نواب واجد علی شاہ اور طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد امانت کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ دوسرا مذاق یہ کہ ان دونوں نے اپنے ڈراموں کی بنیاد ہندو دیومالا کے کرداروں پر رکھی تھی۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ گانے ناچنے والوں کو تو

فنکار تسلیم کر کے پذیرائی کی گئی مگر ڈرامے کے فنکاروں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا جس سے یہ فنکار ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہے اور اپنے فن کی ہمت افزائی کے لیے ترستے رہے۔ اشرافیہ کے اس آمرانہ رویہ اور بے جا تعصب نے ڈرامے کو عرصہ تک فن شریف ہونے سے محروم رکھا اور یہ معتبر شاعروں اور ادیبوں کی خدمات سے محروم رہا۔

اس طرح ڈرامے کی ترقی کی راہ میں مذہبی عقائد، اردو کا شہری مزاج اور اشرافیہ کا اس کی جانب بے جا تعصب بڑی رکاوٹیں رہی ہیں اور ڈرامے کی اس تیزی سے ترقی نہ ہو سکی جیسی کہ ہونا چاہیے تھی۔ اس کے باوجود یہ خیال کہ اردو میں ڈرامے کی کمی ہے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالہ "اردو کیپابی ڈراما" میں تقریباً دو ڈھائی ہزار کیپابی ڈراموں پر فرداً فرداً تبصرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم نامی نے "ببلوگرافیا اردو ڈراما" میں جو نامکمل ہے اور صرف حرف ج تک کے ڈراموں تک محدود ہے سیکڑوں ڈراموں کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے علاوہ اور ہزاروں ڈرامے اردو کی جھولی میں موجود ہیں۔ اس طرح اردو میں اچھے برے ڈراموں کی کمی نہیں ہے کیوں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر سے بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک اردو ڈراما اسٹیج پر دھوم مچاتا رہا اور لاتعداد ڈرامے لکھے گئے اس لیے اب ہمیں اردو میں ڈرامے کی کمی کے وجوہ تلاش نہیں کرنا بلکہ اردو ڈرامے کی کسمپرسی کے وجوہ تلاش کرنا ہے اس کسمپرسی کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ ہم نے ڈرامے کو کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا نہ ہم نے ڈرامے کی کوئی معتبر تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی اور نہ ڈراما نگاروں کے حالات زندگی معلوم کرنے پر زور دیا۔ ہمارے پاس قدیم ڈراموں کے صحیح متن تک موجود نہیں ہیں اور غلط سلط مشغلا کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھانے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ امانت کی اندر سبھا کی ہر جلد مولوی نذیر احمد کے نزدیک سوختنی اور دریدنی تھی تو ناصر لکھنوی نے اس کو پڑھنے اور دیکھنے والے کو مغلم اور لوطی کے خطاب سے نوازا تھا اب اگرچہ ڈرامے کی طرف تعصب کی یہ شدت تو نہیں رہی ہے مگر ابھی تک ڈرامے کی طرف سے ذہن مکمل طور پر صاف نہیں ہوئے ہیں اور اسے اعلا تخلیقی ادب قبول کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں ایک مرتبہ میرے قریبی اور بے تکلف دوست نے مجھ سے ازراہ مذاق کہا تھا کہ آپ ڈراما نگار کہاں کے ادیب و دیب آپ تو گلتے ناچنے

والے لوگ ہیں۔ شیران کی بات تو ازراہ مذاق تھی مگر اہل اردو میں ابھی کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جو اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں۔ ہندستان کی اور زبانوں میں بھی ڈرامے کی کمی ہوگی مگر وہ ہماری طرح مایوسی کی باتیں نہیں کرتے جس طرح ہم مفروضہ کو حقیقت سمجھ کر سینہ کوبی کرتے رہتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ اردو کی کوئی اکیڈمی پروجیکٹ کے طور پر اردو ڈرامے کی ایک معتبر تاریخ مرتب کرے اور قدیم ڈراموں کو صحیح متن کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام کرے تاکہ ہر نظر انداز کی جانے والی صنف اعتبار حاصل کر سکے۔

دبستان آتش شاہ عبدالسلام

مجموعی طور پر یہ مقالہ مستند تحقیق کا اچھا نمونہ ہے اور اپنے اندر ایسی زرخیزی رکھتا ہے جس سے یقیناً تحقیق کی مزید راہیں کھلیں گی۔ 16/-

حیات اسماعیل۔ حیات اور خدمات
ڈاکٹر سیفی پریمی

اس تحقیقی مقالے میں اسماعیل میرٹھی کی غزل گوئی قصیدہ نگاری اور نثر نویسی کے بارے میں متعدد نئی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس مقالے پر موصوف کو دلی یونی ورسٹی سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ 18/-

مرزا سلامت علی دبیر مرتبہ: عبدالقوی دسنوی

مرزا دبیر اردو کے عظیم، مستند اور مسلم الثبوت شاعر تھے۔ جناب عبدالقوی دسنوی نے بڑی محنت سے "کتاب نما" کے اس نمبر کو ترتیب دیا اور اردو کے ممتاز نقادوں سے مضامین لکھوائے۔ 7/50

یادوں کے سائے عتیق صدیقی

اس خود نوشت سوانح اور سفرنامہ کا تانا بانا تو ہندستان کی چار دہائی پہلے کی سیاسی تاریخ نے فراہم کیا ہے لیکن اس کا اسٹیج بنت النیل کا قلب قاہرہ ہے جہاں اس ڈرامے کے پردے اٹھتے اور گرتے ہیں۔ 14/-

قطرے خوش گندرے بیگم انیس قدوائی

دلچسپ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اس میں شاعروں پر بھی مضامین ہیں اور ادیبوں پر بھی۔ تاریخی حقائق اور نئی تہذیب کا ملکسچر جو کڑوا کسیلا ہے مگر ہے فرحت بخش۔ 12/-

شکست ناتمام (ناول) مصنف: اسٹین بیک مترجم: زہرہ حیدر بیگ

اسٹین بیک امریکہ کے صاحب طرز ادیب اور مشہور ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول اپنے اچھوتے پلاٹ اور اعلا کردار نگاری کے لحاظ سے نمایاں انفرادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ "دی مون از ڈاؤن" ان کا وہ شاہکار ناول ہے۔ جس میں مذکورہ بالا دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ 2/-

پروفیسر گوپی چند نارنگ

مضامینِ گجرال

جناب اندر کمار گجرال ہر چند کہ حکومت ہند میں وزارتوں اور سفارتوں کے سلسلے میں اونچے اونچے عہدوں پر رہے ہیں، لیکن اردو والوں کے دل میں ان کی حیثیت ایک "اردو والے" کی ہے اور یہ رشتہ اتنا سچا اور بے لوث ہے کہ اونچی سے اونچی وزارت یا سفارت سے کسی کو عزت و احترام کا وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو اردو والوں کی نظر میں گجرال صاحب کا اردو کی محبت کے رشتے سے ہے۔ اردو والوں کے لیے یہ کل کی بات ہے کہ برسوں کی محنت اور تگ و دو اور سیکڑوں ہزاروں یادداشتوں کی جمع آوری کے بعد گجرال کمیٹی کی جو رپورٹ تیار ہوئی تھی، اس کی حیثیت زبان کی ترقی و بقا کے لیے ایک مستقل دستاویز کی سی ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست جس نشیب و فراز سے گزر رہی ہے اور جس طرح قدروں کے زوال کا منظر نامہ روز بروز مزید گہرا ہوتا جاتا ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کچھ باضمیر لوگوں نے اپنے وجود کو داؤں پر لگانا گوارا کیا لیکن ظلم و بے انصافی سے کسی قیمت پر سمجھوتا کرنا پسند نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بڑے سے بڑے فولادی کرداروں کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھا گیا، لیکن گجرال صاحب کی ذات تھی کہ آفات و حوادث کی موجِ خوں کو انھوں نے سر سے گزر نے دیا اور ان کے پایۂ استقلال ذرا سی لغزش نہ آئی۔ گجرال صاحب کا تعلق پنجاب کے ایک ایسے خاندان سے رہا ہے جس کا نام قومی سیاست میں ہمیشہ ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کچھ خاندانی اثرات، کچھ اردو کی روایت جو سود و زیاں کو خاطر میں نہیں لاتی اور دیوانگی کے سودے کی ترغیب دیتی ہے، کچھ فیض احمد فیض کی رفاقت و محبت جن سے گجرال صاحب کو والہانہ عقیدت رہی ہے، غالباً ان سب عوامل نے مل کر گجرال صاحب کی سیرت میں کچھ ایسی صلابت اور بلند ہمتی کا جوہر بھر دیا ہے کہ پچھلے تیس چالیس برسوں میں وہ سیاست دانوں کی بھیڑ میں ہر قدم پر دوسروں سے مختلف اور دوسروں سے کچھ الگ اور کچھ آگے رہے ہیں۔ سیاست میں تو ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں، کیسے کیسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ایسے ویسے ہو گئے اور ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے۔ لوگ آئے دن

وزیر و سفیر بنتے ہیں اور جب کرسی سے اتر جاتے ہیں تو کوئی نام لینا کیسے گوارا نہیں کرتا ہے آئے دن یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ گجرال صاحب نرے نہ تو سیاست داں ہیں 'نہ نرے وزیر 'نہ نرے سفیر 'ان کے دل میں انسانیت اور درد مندی کی جوت ہمیشہ روشن رہی ہے۔ نگاہ کی بلندی 'سخن کی دلنوازی 'اور جاں کی پرسوزی ہمیشہ ان کا سرمایۂ حیات رہی ہے۔ وہ اردو والوں کے دل میں رہتے ہیں اور اردو والے ان سے بھی ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ آج جو ملک بھر میں اردو اکادمیوں کی ریل پیل دکھائی دیتی ہے یہ سب گجرال صاحب ہی کی کوششوں کا فقط ایک پہلو ہے۔ ان بارہ تیرہ اکادمیوں کا کل بجٹ ملا کر چھ سات کروڑ روپے سالانہ سے کم نہ ہوگا۔ اگر ان کی کارکردگی توقعات کے مطابق نہیں 'یا روپے کا صرف ٹھیک سے نہیں ہوتا 'یا ترقی اردو بیورو کو خود مختاری دی گئی ہے اور ہم اس خود مختاری کا فائدہ نہیں اٹھا پائے تو قصور ہمارا ہے 'قصور مراعات دینے یا مراعات دلانے والوں کا نہیں۔ گجرال صاحب کی حیثیت ایک باضمیر دانشور اور صاحب نظر صحافی کی بھی ہے۔ وہ حکومت کے اندر رہے ہوں یا باہر 'اردو کے مسائل پر اور دوسرے قومی 'سماجی اور گجرال مسائل پر ہندستان اور پاکستان کے اخباروں میں وہ برابر لکھتے رہے ہیں۔ انگریزی کے علاوہ اردو کو بھی انھوں نے ہمیشہ وسیلۂ اظہار بنایا ہے خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے مرحوم عابد علی خاں مدیر سیاست حیدر آباد کو جن کی رفاقت نے گجرال صاحب کو ہمیشہ مجبور کیا کہ وہ سیاست اخبار کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہے ہیں۔ ان برسوں میں گجرال صاحب کے بہت سے مضامین جو اصلاً انگریزی یا ہندستانی میں لکھے گئے وہ روزنامہ "سیاست" میں ترجمہ ہو کر یا رسم الخط بدل کر اردو کے قالب میں شائع ہوئے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ادارۂ سیاست نے ان تحریروں کو یکجا کر کے "مضامین گجرال" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ ہر چند کہ اخباروں میں شائع ہونے والے مضامین ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں اور صبح کو چھپتے ہیں تو شام کو کوئی پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا 'لیکن گجرال صاحب کے مضامین اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے مستقل نوعیت رکھتے ہیں۔ ہندپاک دوستی گجرال صاحب کا خاص موضوع ہے اسی طرح افغانستان اور ہمارے مفادات اور کشمیر کی سیاست کے بدلتے تیور 'یا سوویت یونین کا زوال آج بھی پڑھے جانے اور غور کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایک مضمون ہندستان میں اردو کے مسئلے پر ہے جس میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر روشنی ڈالی ہے جن پر عمل در آمد ہنوز باقی ہے۔ ایک مضمون فیض احمد فیض کی یاد میں ہے اور گاندھی جی کی راج

[redacted]

نتی اور پنڈت نہرو اور صحافت بنیادی نوعیت کے مضامین ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ مضمون ہے "میں اخبار کیوں پڑھتا ہوں" گجرال صاحب کی زبان رواں دواں، صاف سادہ سلیس اور شفاف ہے، خود گجرال صاحب کی شخصیت کی طرح۔ ادارۂ سیاست ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ دستاویزی اہمیت کی حامل اس کتاب کو شائقین اردو کے لیے فراہم کردیا۔ جہاں اردو والوں پر یہ فرض ہے کہ اس کتاب کے مندرجات پر آج کے حالات کی روشنی میں غور و خوض کریں، وہاں گجرال صاحب پر بھی یہ واجب ہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات پر جو علی سردار جعفری کمیٹی بنی تھی اور جس پر وقت کی گرد چڑھ چکی ہے، دفتر خارجہ کے کاموں سے تھوڑا سا وقت نکال کر وزارت تعلیم اور کابینہ کو توجہ دلائیں کہ اگر ان سفارشات پر عمل در آمد اب بھی نہ ہوا تو پھر کب ہوگا؟

ساقی ہے اک تبسم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

جمنا داس اختر
مرتبہ: گربچن چندن

(شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات)

بزرگ صحافی جمنا داس اختر، جن کا سن ۸۰ کو تجاوز کر چکا ہے اور جو ۶۵ سال سے صحافت کی آبیاری کر رہے ہیں، کتاب نما نے ان پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا ہے۔ ۱۵۲ صفحات کی اس بسیط دستاویز میں ہندستان اور پاکستان کے تیس ممتاز صحافیوں اور دانشوروں نے ان کی خدمات پر تبصرہ کیا ہے۔ شمارے کی ترتیب و تدوین بزرگ صحافی گربچن چندن نے کی ہے جنھوں نے ان کو ہشت پہلو شخصیت کی عکاسی کرنے کے علاوہ ان سے ۲۶ صفحات کا ایک انٹرویو بھی شامل کیا ہے جو حیرت افزا اور سنسنی خیز انکشافات سے لبریز ہے۔ یہ شمارہ صرف ایک فرد کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک پورے دور کا جائزہ ہے، ایک ایسا دور جس میں ہمارے برصغیر کی نہ صرف کایا ہی بدلی بلکہ اس کا کردار بھی بدل گیا۔ اس شمارے میں اردو زبان کی وسعت اور صحافت کی قدرت، قوت اور شوکت کا ایک ایسا نادر مرقع مرتب ہوا ہے جسے اس زبان کا کوئی بھی خواہ نظر انداز نہیں کر سکتا۔ قیمت: /90 روپے

کوبہ کو
سلمان جمال نثار اختر

غزلوں کا یہ مجموعہ نہ صرف عصری حسیت سے معمور ہے بلکہ فن کی وہ نزاکتیں جو بغیر کلاسیکی ادب کے مطالعے کے ہاتھ نہیں آئیں اس میں موجود ہیں۔ /7

شہر آشوب
ڈاکٹر نعیم احمد

اردو میں "شہر آشوب" کے تحت جو نظمیں کہی گئی ہیں وہ اپنے دور کے حالات کی سچی اور کچی تصویر پیش کرتی ہیں۔ /8

بازگشت
کبیر احمد جائسی

ہندستان اور ایران کے ان چند قدیم و جدید ادیبوں اور شاعروں کا مفصل جائزہ جن کی ادبی کاوش فارسی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ /13

یوسف ناظم
۱۹-الہلال، باندرہ ریکلیمیشن
ممبئی

جمالیات در جمالیات

مجھے اپنے مبلغ علم کے بارے میں غلط فہمی ضرور ہے لیکن زیادہ نہیں۔ اپنے متعلق تھوڑی سی یعنی قدرے گوارا غلط فہمی ہر شریف آدمی کے لیے ضروری مانی گئی ہے کیونکہ بقائے حیات کے لوازمات میں یہ شامل ہے بس اس کی مقدار کو اسی طرح قابو میں رکھنا پڑتا ہے جس طرح اطباء کے غیر ضروری مشورے پر شکر اور خون کے دباؤ پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ غلط فہمی بھی اگر حد سے زیادہ ہو جائے تو عارضہ بن جاتی ہے اور پھر اس کا علاج ممکن نہیں ہوتا کیونکہ لقمان تو بہت مل جاتے ہیں حکیم کوئی نہیں ملتا۔

اب آپ سے کیا چھپانا ہے میں حال حال تک سمجھتا رہا کہ "جمالیات" ایک مجرد بلکہ لاولد چیز ہے۔ میں نے اس موضوع پر کبھی دھیان نہیں دیا یعنی اس کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اور اپنی حد تک مطمئن رہا کہ جمالیات صرف شعری جمالیات ہوگی جسے ادبی جمالیات کہنا اس لیے مناسب ہوگا کہ بعض نثر نگار بھی نہایت شاعرانہ قسم کی نثر لکھتے ہیں لیکن یہ راز چند دن پہلے ہی مجھ پر کھلا کہ جمالیات کوئی بانس کا پیڑ نہیں جس میں صرف بانس ہی بانس ہوں اور بانس کے سوا کچھ نہ ہو بلکہ یہ ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں ہی شاخیں ہیں جو کسی مثالی محبوب کی زلفوں کی طرح لمبی اور گھنی ہیں۔ ہاں مجھے ایک شعر یاد آگیا۔ آپ بھی دیکھیے۔

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

یہ شعر میں نے یہاں اس لیے پیش کیا کہ میں اس شعر کی اندرونی جمالیات پر ہمیشہ لوٹ پوٹ ہوتا رہا اور مجھے بڑی مشکل سے منایا جاسکا کہ بس بہت ہوچکا۔ لفظ "جھٹکا" ہمارے یہاں کتنا غیر شاعرانہ بلکہ غیر شریفانہ لفظ ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ شاعر کے جمالیاتی ادراک نے اس لفظ میں کیا غضب کی رعنائی اور دلربائی پیدا کردی ہے۔ مانا کہ اس شعر میں غلو کی مقدار زیادہ ہے لیکن شاعری اور ریاضی میں

[redacted]

یہی فرق ہے۔ جس زمانے کا یہ شعر ہے اس وقت مبالغے کے اشعار ہی زیادہ کہے اور پسند کیے جاتے تھے۔ اس شعر کی جمالیات میں بہر حال کی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہاں مجھے ایک بات اور یاد آئی کہ مندرجہ بالا شعر کے برسوں بعد میں نے لفظ "جھٹکا" کو اس کی اس صورت میں تو نہیں لیکن اس سے زیادہ خوبصورت انداز میں مندرجہ ذیل شعر میں پایا۔ شعر دعائیہ ہے۔

جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

یہ اشعار میں نے یہاں کیوں نقل کیے اس کی وجہ ابھی کچھ ہی دیر میں بیان کرتا ہوں۔ (کچھ ہی دیر میں' کے الفاظ میں نے آل انڈیا ریڈیو کے اناؤنسر کی تقلید میں پیش کیے ہیں۔ (آل انڈیا ریڈیو سے جب بھی خبروں کے نشر ہونے کا اعلان ہوتا ہے اناؤنسر یہی کہتا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر میں۔ حالانکہ کہنا چاہیے۔ اب خبریں پیش ہیں لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کو آپ زبان نہیں سکھا سکتے۔)

میں یہ عرض کر رہا تھا جمالیات سے متعلق حال ہی میں ایک ادبی محفل میں یہ پتا چلا کہ جمالیات میں ایک سائنسی جمالیات بھی ہوتی ہے۔ یہ سن کر میں پہلے تو دنگ رہ گیا اور تقریباً حواس خمسہ باختہ۔ لیکن اس مذاکرے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے ٹھنڈے دل سے اس مسئلے پر غور کیا اور چند نثر پاروں اور نظموں کا از سر نو مطالعہ کیا تو میں ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار بلکہ سرشار ہوا اور جیسے جیسے میں نثری اور شعری تخلیقات کی گہرائیوں میں اترتا اور ڈوبتا چلا گیا نئے نئے گوہر آب دار میرے ہاتھ آتے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے مبلغ علم میں کثیر اضافہ ہوا۔ سائنسی جمالیات کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد میں نے ہر شعر کو شعر کے موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے اسے مخصوص جمالیات کا حامل ٹھہرایا مثلاً ؎

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

اس شعر میں میں نے کیمیاوی اور طبیعاتی دونوں قسم کی جمالیات محسوس کی۔ اقبال کی نظم "ہمالہ" میں میں نے کہستانی اور جلوا تیہ جمالیات کے عناصر رقصاں پائے۔ آپ بھی غور کیجیے۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

چونکہ نظم ایک پہاڑ سے متعلق ہے اس لیے اس پر جملواتی جمالیات کا غلبہ ہے۔ غالب کے قصیدہ در صفت انبہ میں مجھے علانیہ طور پر نباتاتی جمالیات کی سرکاری عروج پر دکھائی دی۔ اسے فواکہاتی جمالیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ غالب کی تو بات ہی اور ہے ان کے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی جمالیات بولتی نظر آتی ہے۔ علوم و فنون کی جتنی بھی اقسام رواج میں ہیں اتنی ہی قسموں کی جمالیات غالب کے اشعار

میں ایک لازمی مضمون کی طرح پائی جاتی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ آپ سے اجازت لے کر غالب کے چند اشعار آپ کے گوش گزار کروں جن سے موصوف کی جمالیات شناسی کا ثبوت ملتا ہے مثلاً

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

اس میں ریاضیاتی جمالیات کی رنگ آمیزی ہے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

اس شعر میں جیالو جیکل (ارضیاتی) جمالیات کار فرما ہے اور مندرذیل میں فلکیاتی۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کے پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

تنبیہہ : جب بھی کسی کو یہ شعر پڑھنا ہو اس پر لازم ہے کہ پورا شعر ایک سانس میں پڑھے۔ دوسرا مصرع ہرگز ہرگز تنہا نہ پڑھے۔

نکتہ : غالب کے کلام میں آپ کو "ہائے" کا لفظ 'صفحے پر مل جائے گا بلکہ ہائے ہائے کی ردیف میں ایک پوری غزل بھی دستیاب ہو جائے گی۔ ایک اور نکتہ 'رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب "گنج ہائے گرانمایہ" کا نام غالب کے ایسے شعر سے اخذ کیا جس میں ارضیاتی جمالیات بلو از بلند سنائی دیتی ہے۔

جمالیات کے عناصر اردو نثر میں بھی پائے جاتے ہیں۔ نثر کے تعلق سے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اظہار کا موثر فارم نثر ہی ہے۔ میں نے اس نقطہ نظر سے بھی چند نثر پارے از سر نو پڑھے تو معلوم ہوا کہ رشید احمد صدیقی کے مشہور و معروف مضمون "ارہر کا کھیت" زرعی جمالیات سے لدا پھندا ہے اور پریم چند کے افسانے "کفن" میں معاشی جمالیات موجود ہے۔

جمالیات کی اور بھی کئی قسمیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ آدمی جاتا تو کہیں اور چاہتا ہے لیکن جوش سیاحت میں کسی اور طرف نکل جاتا ہے اور جمالیات کے مضمون میں تو موڑ ہی موڑ ہیں۔ اجمیری گیٹ جانے والا راہرو کشمیری گیٹ کی طرف چل پڑتا ہے۔

جمالیات کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ جو بہت اہم ہے یہ سامنے آیا کہ اردو شاعری میں جہاں تک غزلیہ شاعری کا تعلق ہے اختر شیرانی کے منصہ شہود پر آنے تک محبوب "محبوب" ہی رہا "محبوبہ" بعد میں بنا۔ محبوب کو مردانہ لب و لہجے میں پیش کرنے کی وجہ سے شعر میں جمالیات کا کوئی خاص نقصان تو نہیں ہوا کیونکہ اردو شاعری میں خود تضاد کو محاسن شاعری میں جگہ دی گئی ہے لیکن اختر شیرانی کے دلیرانہ اور جرات مندانہ اقدام کی وجہ سے اردو شاعری میں خواتین 'پہلی مرتبہ خواتین کے روپ میں

[redacted]

نمودار ہوئیں ورنہ صورت حال یہ تھی کہ محبوب عالم ہر اسانی میں "دوپٹہ اوڑھ کر اٹھا" چلا آتا تھا۔ مو اور دوپٹہ "تضاد اور وہ بھی غضب کا تضاد۔ ہماری جمالیات کو نسوانی جمالیات میں منتقل ہونے میں کافی دیر لگی اور ہمیں ایک عرصے تک مردانہ جمالیات ہی پر گزارا کرنا پڑا۔ قدما نے خواتین کو پیش ضرور کیا لیکن صیغہ تانیث میں "صیغہ تذکیر میں نہیں۔ جیسے چلمن سے لگے بیٹھے ہیں کہا گیا۔ بیٹھی ہیں کہنے میں تکلف ہوا۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں "کہا گیا۔ یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ چھپتی بھی نہیں سامنے آتیں بھی نہیں۔ یہ صیغہ "صیغہ راز تھا اور اس میں بھی ایک جمالیات پوشیدہ تھی۔ اختر شیرانی نے اس صیغے کی نقاب کشائی کی۔ یہ پہلا قدم تھا۔ دوسرا قدم مجاز نے اٹھایا اور "خاتون" کو بالراست مخاطب کر کے صاف الفاظ میں کہا کہ محترمہ آپ کی پیشانی پر ساری کا یہ آنچل خوبصورت تو معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ (ازراہ عنایت اور برائے بغاوت) اس آنچل سے ایک پرچم بنا لیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ مجاز کا یہ کہنا تھا کہ ایک انقلاب آگیا۔ شاعری میں بھی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی (اس میں شعبہ اردو سب سے نمایاں تھا)۔ اردو کے شاعروں نے (جنھیں اپنا بیان ہمیشہ حسن طبیعت رہا ہے) اپنی قادر الکلامی کے بل پر نسوانی جمالیات کو مردانہ طرز بیان کے باوجود مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس میں قاری کے ذوق شعری کا بھی بڑا دخل تھا ورنہ اپنی عقل سے شعر سمجھنے والے قاری "کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی" کو بھی کسی ایسے شخص کے ذکر سے منسوب کر دیتے جو پیدائشی مرد ہو اور جٹائیں رکھتا ہو کیونکہ اس شعر میں شاعر نے کمال ہوشیاری سے یہ بات مخفی ہی رکھی کہ یہ بال کس کے ہیں۔ یہ تو قاری کا "حسن ظن" ہے جس کی وجہ سے فوراً سمجھ میں آجاتا ہے کہ شعر کس کے بارے میں ہے حالانکہ شعر کی جمالیات غیر سائنسی ہے۔

سائنسی جمالیات کا رواج ابھی ابھی شروع ہوا ہے بلکہ یوں سمجھیے یہ سکہ ابھی ابھی ڈھالا گیا ہے۔ پوری طرح چلن میں نہیں آیا ہے۔ لوگ جان توڑ (دوسروں کی جان) کوشش کر رہے ہیں کہ سائنسی جمالیات کی ترکیب اس کا مفہوم سمجھے بغیر مقبول ہو جائے۔ کم سے کم میں نے تو اسے قبول کر لیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جماداتی "نباتاتی" حیواناتی (زوو الوجیکل) وغیرہ اقسام کی جمالیات کو بھی اس طرح قبول کیا جائے جس طرح پارلیمان میں سیاسی جماعتوں کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ہر جماعت کو علاحدہ نشستیں دی جاتی ہیں۔ انگلستان میں بھی یہ طریقہ رائج ہے اور وہاں تو قبرستانوں میں بھی مرحومین کے ان کے پیشوں کے اعتبار سے گوشے مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ برطانیہ میں جب بھی کسی شاعر کا انتقال ہوتا ہے ویسٹ منسٹرایبے کے ایک مخصوص گوشے میں اس کی دائمی رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ تدفین کا جمالیاتی پہلو یہ ہے کہ مرنے کے بعد کم سے کم شاعروں اور عوام میں ایک فاصلہ رہے۔ اسے قبرستانی جمالیات "کا نام دیا جا سکتا ہے۔

جی سین
۴۰۰۔ انگور اپارٹمنٹس
بہٹ پڑ گنج، نئی دلی

عینی آپا سے ملاقات

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض بیمار ادیبوں نے نہایت صحت مند ادب کی تخلیق کی اور بعض صحت مند ادیبوں نے بیمار اور علیل ادب کو پیدا کیا۔ مثالیں خود آپ کے سامنے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض نہایت اچھے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے اچھے بھلے ادب کے علاوہ اپنی بیماریوں کے ذریعہ بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ ہمارے ایک بزرگ کرم فرما نہایت اعلا پایہ کے شاعر اور صحافی تھے۔ ادب میں بھی اونچا مقام اور رتبہ رکھتے تھے لیکن کسی کو خط لکھتے تو اسے ادب کی موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنے کے علاوہ اپنی رائج الوقت بیماریوں کی تفصیل سے بھی واقف کرا دیتے تھے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

مختلف بیماریوں اور ان کے تیر بہدف علاج کے سلسلہ میں آج ہمارے پاس جتنی بھی ضروری اور اہم معلومات ہیں وہ سب ان کے خطوط کی بدولت ہیں۔ بخدا آج بھی کبھی ہماری صحت خراب ہوجاتی ہے تو ہم ان کے پچھلے خطوط کے ذخیرہ کو کھنگال کر اس میں سے اپنے مطلب کی بیماری کا علاج ڈھونڈ لیتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کے بارے میں مشہور ہے کہ اگرچہ وہ اتنے بیمار نہیں رہتے تھے لیکن پھر بھی متوقع بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں ہر دم مصروف رہتے تھے اور ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور یونانی طریقہ ہائے علاج سے وابستہ دواؤں کو اپنے جسم میں پہنچاتے رہتے تھے۔ اپنا علاج نہ صرف خود کرتے تھے بلکہ دوسروں کا علاج کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ادیب اور شاعر حضرات چونکہ خود کو "قومی ورثہ" تصور کرتے ہیں اس لیے اپنی نجی زندگی کے حالات اور کوائف سے قوم کو بھی وقتاً وقتاً سے واقف کراتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی ادیب یا شاعر علیل ہوجاتا ہے تو اخباروں میں اس کی علالت کی خبریں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔

یادش بخیر! ہمارے ایک بزرگ شاعر دوست ہوا کرتے تھے جو کسی نہ کسی بیماری کی آڑ میں وقتاً وقتاً سے اسپتال میں شریک ہوجایا کرتے تھے اور نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے چاہنے والوں سے اپنی "مزاج پرسی" کروایا کرتے تھے۔ کہتے تھے لوگ جب جوق در جوق آکر ان کی مزاج پرسی کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کا کوئی معصوم اور بے گناہ مداح ان کی مزاج پرسی کو پہنچا ہو اور انھوں نے اسے

اپنا تازہ کلام نہ سنایا ہو۔ ایک بار ہم نے ان کی صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے کلام نہ سنانے کی فرمائش کی تو انھوں نے ہمیں سختی سے پابند کیا کہ ہم مستقبل میں ان کی مزاج پرسی کرنے کو نہ آئیں۔ ان کے معالجین کی رائے بھی اس معاملہ میں بڑی مشکوک تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے مرض کو دواؤں سے اتنا افاقہ نہیں ہوتا جتنا کہ ان کو شعر خوانی سے ہوتا ہے۔ جب تک اپنا سارا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام اپنے تیمارداروں کو سنا نہیں دیتے تھے تب تک اسپتال سے ڈسچارج نہیں ہوتے تھے۔ حد ہوگئی کہ ان کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کردہ نازک اندام نرسیں بھی "سبحان اللہ" "مرحبا" اور "مکرر ارشاد" کی گردان کرتی ہوئی پائی جاتی تھیں بلکہ مرحوم "جوش علالت" میں اپنے بعض شعر بھی ان نرسوں کی نذر کردیتے تھے جنھیں وہ از راہ علاج شرما شرما کر قبول بھی کرلیتی تھیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض ادیب اور شاعر اپنے فن کے بل بوتے پر شہرت کے معاملہ میں "خود کفیل" تو ہوتے ہی ہیں لیکن پھر بھی بر اوقت آن پڑے تو اپنی علالت کے ذریعہ بھی شہرت کمانے سے نہیں چوکتے۔

مندرجہ بالا باتیں ہم نے اس لیے لکھی ہیں کہ پچھلے دنوں ہماری عینی آپا بھی بیمار ہوگئی تھیں۔ قرۃ العین حیدر بلاشبہ اس وقت پوری اردو دنیا کا سب سے اہم اور معتبر نام ہیں۔ مانا کہ اردو میں آج تک کوئی چھوٹا ادیب اور شاعر پیدا ہی نہیں ہوا لیکن پھر بھی ہمارا خیال ہے کہ برصغیر کے موجودہ سارے بڑے اردو ادیبوں اور فنکاروں کے درمیان قرۃ العین حیدر کا قد سب سے اونچا ہے اور یہ ان کی بڑائی نہیں تو اور کیا ہے کہ ادب میں اتنا اونچا قد رکھنے کے باوجود وہ ہم جیسے کوتاہ قامت ادیبوں کو بھی عزیز رکھتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے وہ لندن میں بیمار ہوگئیں تھیں۔ واپس آئیں تو پچھلے دنوں پھر بیمار ہوگئیں۔ اخباروں میں ان کی علالت کی خبریں چھپیں اور اردو والوں میں تشویش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ بعض جگہ تو ان کی صحت یابی کے لیے دعائیہ جلسے بھی منعقد کیے گئے۔ ہم مشرقی دہلی میں رہتے ہیں اور عینی آپا بھی کم و بیش مشرقی دہلی میں ہی رہتی ہیں۔ عینی آپا سے واقفیت کی بنا پر ہمیں اس کا اندازہ تو تھا کہ ان کی صحت کی خرابی کی خبروں کے بارے میں ان کا کیا رد عمل ہوگا۔ وہ ہمارے ادب کی ان ہستیوں میں سے ہیں جو جائز طور پر ملنے والی شہرت سے بھی حتی الامکان دور رہتی ہیں۔ انھیں ٹیلی ویژن پر بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ کسی جلسہ میں ٹیلی ویژن والوں کے کیمرے کا رخ جب ان کی طرف ہوتا ہے تو وہ کسی رسالہ کی اوٹ میں اپنا چہرہ چھپالیتی ہیں یا منہ پھیر لیتی ہیں۔ بہرحال جب ان کی علالت کی خبر ملی تو ہم نے پہلے فون پر ان کی خیریت جاننے کی کوشش کی۔ دو ایک بار خود عینی آپا سے بھی بات ہوئیں۔ نہ ہم نے ان کے مزاج کے بارے میں کچھ پوچھا اور نہ ہی انھوں نے اپنے مزاج کے بارے میں کہنا مناسب سمجھا۔ وہی ادب اور ادیبوں کی سرگرمیوں کے بارے میں باتیں ہوئی۔ غرض پچھلے ہفتہ ہم اور مشہور شاعر مظہر امام دونوں ان کے گھر چلے گئے۔ عینی آپا کے اس نئے گھر میں ہمیں پہلی بار جانے کا موقع ملا۔ ان کے دیوان خانہ میں جابجا الماریوں میں نادر و نایاب کتابیں سجی ہوئی ہیں۔ بعض کتابیں تو ایسی بھی نظر آئیں جنھیں دیکھ کر ہم پر ہیبت سی طاری ہوگئی کیونکہ ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے نہ صرف استطاعت کی بلکہ

بڑے حوصلے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ عینی آپا اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی تھیں' بہت ہشاش بشاش نظر آئیں۔ اتنی ہشاش بشاش کہ ان کے مزاج کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی' پھر خود ہی کہنے لگیں۔ یہ اخبار والوں کو کیا ہو گیا ہے کہ آئے دن میری صحت کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر چھاپ دیتے ہیں۔ پتا نہیں لوگوں کو اس طرح کی خبریں چھاپنے میں کیا مزا آتا ہے۔

مظہر امام نے کہا۔ "آپ اردو ادب کی سب سے اہم ہستی ہیں۔ اگر لوگ آپ کی صحت کی خرابی کی اطلاع سے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو یہ ایک فطری بات ہے۔"

عینی آپا بولیں۔ "لیکن میری علالت کا ادب سے کیا تعلق ہے۔ میری بیماری میرا نجی معاملہ ہے۔ اس میں کسی کو دلچسپی لینے کی کیا ضرورت ہے۔" اس بحث میں ہم نے جان بوجھ کر کوئی حصہ نہیں لیا کیونکہ اس وقت تک عینی آپا کی نظر سے وہ خبریں نہیں گزری تھیں جن میں ان کی صحت یابی کے لیے دعائیہ جلسوں کے انعقاد کی تفصیلات درج تھیں۔ ایک دعائیہ جلسہ کی صدارت فلاں صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض فلاں صاحب نے انجام دیے۔ ایک صاحب اس دعائیہ جلسہ کے مہمان خصوصی بھی تھے۔ پہلی بار ہمیں پتا چلا کہ ان دنوں دعا مانگنے کے لیے بھی "صدارت" یا "نظامت" کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بہر حال عینی آپا سے اس دن خوب باتیں ہوئیں۔ ہم سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو وہ حیدر آباد کے حوالے سے فاطمہ آپا (فاطمہ عالم علی خان) کے بارے میں ضرور پوچھتی ہیں اور انھیں یاد کرتی ہیں۔ پھر انھوں نے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا "ان دنوں ہندی میں تاناشاہی کا لفظ ڈکٹیٹر شپ کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا ہے۔ بھئی! تمھارا تاناشاہ تو نہایت صوفی مسلک' پاکباز اور بے نیاز بادشاہ تھا اس کا سلسلہ آمریت' سے جوڑنا بالکل غلط بات ہے۔ تم حیدر آبادی اس پر احتجاج کیوں نہیں کرتے۔ لوگوں کو بتاتے کیوں نہیں کہ تاناشاہ' اور نادر شاہ' میں فرق تھا۔" اب ہم عینی آپا کو کیا بتاتے کہ ان دنوں ہندی میں "مخالفت" کے لیے "خلافت" کا لفظ بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ پھر ان سے دنیا جہاں کی باتیں ہوئیں۔ بیرونی ممالک میں مقیم حیدر آبادیوں کی خوشحالی کا بھی تذکرہ رہا۔

بہر حال ہمیں تو عینی آپا نہایت ہشاش بشاش نظر آئیں۔ زندگی اور توانائی سے بھرپور۔ عینی آپا کی تلون مزاجی اور سیماب صفتی کے بارے میں کوئی کچھ بھی کہے ہم جب بھی عینی آپا سے ملے انھیں خوش باش اور خوش مذاق ہی پایا۔ اڑیا فلموں کی مشہور اداکارہ وجویا جینا (جنھیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے) ہمارے ایک عزیز دوست کی بہو ہیں۔ جب بھی دہلی آتی ہیں تو ہم سے ضرور ملتی ہیں۔ نہایت ذہین اور پڑھی لکھی اداکارہ ہیں۔ ایک بار کہنے لگیں کہ وہ عینی آپا کی کہانی "اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو" پر اڑیا میں ایک فلم بنانا چاہتی ہیں' ان سے ملاقات کرا دیجیے۔ پھر ڈرتے ڈرتے یہ بھی کہا کہ عینی آپا اتنی بڑی ادیبہ ہیں پتا نہیں ملاقات بھی کرنا پسند کریں یا نہ کریں۔ ہم وجویا کو لے کر عینی آپا کے ہاں گئے۔ بہت گرم جوشی سے ملیں۔ عینی آپا کو وجویا کی باتیں اور اس کا رکھ رکھاؤ اتنا پسند آیا کہ انھوں نے اس پر اپنی شفقتوں کی بارش کر دی۔ وجویا

عینی آپا کی زبردست مداح ہے اور ان کی شفقتوں کا بڑی احسان مندی کے ساتھ ذکر کرتی ہے۔

غرض عینی آپا سے ملاقات کے بعد ہم جانے لگے تو کہنے لگیں۔ "بھئی! میری صحت کے بارے میں یہ جو آئے دن تشویشناک خبریں شائع ہو رہی ہیں ان کا کچھ مداوا کیجیے۔ اس سے میرے رشتہ داروں کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ پاکستان میں میرے کئی رشتہ دار ہیں جنھوں نے ان اطلاعات کی اشاعت کے بعد پریشان ہو کر مجھ سے ربط پیدا کیا۔ انھیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔

بہر حال عینی آپا ان دنوں آرام کر رہی ہیں۔ گھر پر ہی فزیو تھراپی ہو جاتی ہے۔ ہمیں تو وہ نہایت چاق و چوبند اور چست نظر آئیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔ ان کی ذات نہ صرف اردو ادب کے لیے بلکہ عالمی ادب کے لیے بھی ایک "قیمتی اثاثہ" ہے۔

ڈاکٹر محمد انور الدین
صدر شعبہ لسانیات، حیدر آباد یونیورسٹی

اُردو زبان اور سماجی سیاق

اردو لسانیات میں ایک نئی جہت

پروفیسر عبدالستار دلوی اردو کے بلند مرتبت محقق و نقاد ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قد آور ماہر لسانیات بھی ہیں۔ انھوں نے لسانیات میں نہ صرف اعلاترین ڈگری حاصل کی ہے بلکہ اس فن میں مجتہدانہ مہارت اور بصیرت بھی پیدا کی ہے اس شعبہ میں ان کے علمی تبحر مطالعہ کی وسعت اور نظر کے تعمق کا نیا مظہر ان کی تازہ تصنیف "اردو زبان اور سماجی سیاق" ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ علم لسانیات کی شروعات تاریخی لسانیات PHILOLOGY سے ہوئی۔ اس میں انیسویں صدی کے آغاز میں توضیحی لسانیات کی شاخ کا نشو و نما ہوا لیکن عصر حاضر کے دوران علم لسانیات میں متعدد جدید شعبوں کا ارتقاء ہوا ہے مثلاً نفسیاتی لسانیات اور ریاضیاتی لسانیات وغیرہ۔ انھیں نئے شعبوں میں سے ایک سماجی لسانیات ہے جس میں زبان کی سماجی اہمیت اس کے سماجی کردار، سماجی تبدیلیوں سے اس کی اثر پذیری اور سماج سے متعلق اس کے دیگر ابعاد سے بحث کی جاتی ہے۔ اردو میں لسانیات پر بہت کم کام ہوا ہے اور خاص کر سماجی لسانیات پر اس سے بھی کم، جب کہ مطالعہ زبان میں اس کے سماجی سیاق کی اہمیت محتاج دلیل نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کی زیر نظر کتاب اردو میں سماجی لسانیات پر اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔ اس میں زبان اور سماج کے رشتے سے متعلق گیارہ مضامین شامل ہیں۔ جنھیں فاضل مصنف کے ایک عمر کی تحقیق و تلاش، تجربات و مشاہدے اور غور و تفحص کا نچوڑ سمجھا جا سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب کا پہلا مضمون "امیر خسرو کے عہد کا لسانی اور سماجی پس منظر اور ان کی

ہندی شاعری" ہے۔ اردو زبان کی لسانیاتی تاریخ میں امیر خسرو اور ان کی ہندوی شاعری کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر دلوی نے امیر خسرو کے عہد کے لسانی اور سماجی پس منظر کا نہایت تعمق اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور شرح و بسط کے ساتھ ان سماجی عوامل اور تہذیبی عناصر پر روشنی ڈالی ہے جن کے پس منظر میں خسرو کی ہندوی شاعری ایک تاریخی ضرورت بن کر معرض وجود میں آئی۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی آمد سے قبل برصغیر کی لسانیاتی صورت حال کا نقشا کھینچ کر یہ دکھایا گیا ہے کہ جدید ہند آریائی زبان کس طرح وجود پذیر ہوئی امیر خسرو سے قبل جن شعراء کے ہندوی اشعار کا ذکر ملتا ہے ان کے حوالے دیئے گئے ہیں جن میں مسعود سعد سلمان، شاہ معین الدین چشتی، شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ برہان الدین، شیخ حمیدالدین ناگوری شامل ہیں۔ اسی تسلسل میں کھڑی بولی کی وسعت اور مقبولیت کے اثبات کے لیے دلوی صاحب نے نہایت دقت نظری اور دقیقہ سنجی کے ساتھ مراٹھی کے کلاسیکی شعراء سنت گیا نیشور، مکتا بائی اور نام دیو کے پدوں میں کھڑی بولی کے الفاظ کھوج نکالے ہیں۔ اس تاریخی، تہذیبی، سماجی اور لسانی تناظر میں خسرو کی ولادت اور ابتدائی احوال پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد ان کے ہندوی شاعری کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔ امیر خسرو کی ہندوی زبان سے موانست اور فارسی شاعری اور نثری تصنیف میں ہندوی الفاظ کی شناخت کی ہے۔ امیر خسرو کی ہندی دلنی کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے دلوی صاحب نے خسرو سے منسوب مشہور ہندوی نظم خالق باری کا بھی ذکر کیا ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی نے جو دلائل دیئے ہیں وہ تشنہ اور ناقص ہیں اور ان پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اس مضمون میں دلوی صاحب نے خسرو سے منسوب پہیلیوں دوہوں اور کہ مکرنیوں پر بھی مفصل گفتگو کی ہے۔ خسرو کی ہندوی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اس دور کا آئینہ ہے جب مختلف زبانوں بولیوں، تہذیبی اکائیوں اور دیگر تاریخی عوامل کے امتزاج و اختلاط سے اردو زبان کا قوام تیار ہوا تھا اسی مناسبت سے پیش نظر مضمون کی اہمیت کھلی ہی ہے کہ اس میں فاضل مقالہ نگار نے نہایت شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ عہد خسرو کے سماجی پس منظر کا احاطہ کیا ہے۔

دوسرے مقالہ کا عنوان "اردو اور ہندی۔ تاریخی اور لسانی تناظر میں" ہے اس میں دلوی صاحب نے مشہور ماہر لسانیات گریرسن کے اس نظریے کی روشنی میں کہ "اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں" ان زبانوں کے تاریخی اور لسانی سیاق کا عالمانہ جائزہ

لیا ہے۔ یوروپی اور ہندستانی ماہرینِ زبان کے حوالے سے انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ "اودھی، برج، میتھلی، راجستھانی اور بہاری وغیرہ جنھیں اب ہندی کہا جانے لگا ہے ہندی سے الگ آزاد زبانیں ہیں۔ ان زبانوں کے آزادانہ وجود کی تشخیص بالواسطہ طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ قدامت اور عمر کے اعتبار سے اردو ہندی کے مقابلے میں زیادہ پرانی زبان ہے۔ اس بات کو توثیق کے لیے دلوی صاحب نے گریرسن شری رام چندر شکل اور ڈاکٹر دھریندر ورما کے اقوال بھی پیش کیے ہیں۔

اردو اور ہندی میں مشابہت اور مشاکلت کے سبب بیشتر ہندی علماء اور بعض اردو علماء نے ان دونوں کو ایک ہی زبان کہا ہے اس کے بخلاف پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر مسعود حسین خاں نے لسانیات کے نقطۂ نظر سے انھیں جداگانہ زبانیں ماننے پر زور دیا ہے۔ دلوی صاحب نے نہایت متانت اور شائستگی کے ساتھ معروضی انداز میں یہ بتایا ہے کہ توضیحی لسانیات کی سطح پر اردو اور ہندی میں کافی گہری مناسبت یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں صوتی اور لفظی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ایک ہی (کھڑی) کی دو فروعات ہیں۔ لیکن سماجی لسانیات اور اسلوبیات کے اعتبار سے دونوں میں واضح فرق ہے۔ اردو اور ہندی کے سیاق میں اس فرق کو جاننا ہی دراصل لسانی صحت مند رویے کی علامت ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا تیسرا مضمون "دکنی اردو ـــ سماجی لسانیات کی روشنی میں" ہے۔ اس میں دلوی صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کھڑی بولی اردو نے جب شمالی سے جنوب کا سفر کیا تو دکن کے لسانی ماحول میں مقامی زبانوں کے اشتراک سے اس نے ابتدا میں ایک تکن (ترسیل و ابلاغ کے لیے ثانوی زبان) کی حیثیت اختیار کی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ کریول (مادری زبان) کی حیثیت حاصل کرلی۔ تکنی کی حیثیت جس دکنی اردو نے گجراتی اور مراہٹی کے ساتھ تلگو اور کنڑ نیز پرتگیزی۔ فرنچ۔ ڈچ اور انگریزی زبانوں کے بعض اثرات لفظی سطح پر قبول کیے۔ کریول کی حیثیت میں دکنی اردو نے دیگر علاقائی زبان کو متاثر کیا۔ چنانچہ علاقائی زبانوں میں دخیل عربی و فارسی کے الفاظ دکنی ہی کے وسیلے سے ان تک پہنچے۔ دکن کی جغرافیائی وحدت کی زبان ہونے کے ناطے دکنی اردو میں اس علاقے کی تہذیب و ثقافت رچ بس گئی ہے۔ اس پہلو سے یہ زبان اپنی ایک خاص سماجیات رکھتی ہے جس کی جڑیں دکن کے علاقائی رسم و رواج طرزِ معاشرت اور تہذیب و تمدن کی مٹی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مقالے کے اختتام میں دلوی صاحب نے نہایت

باریک بینی اور دقت نظر سے یہ نکتہ بھی واضح کیا ہے کہ طبقاتی درجہ بندی کے اعتبار سے معیاری اردو کے دہلوی اور لکھنوی دبستانوں کی طرح دکنی اردو کے بھی کئی علاقائی مراکز ہیں۔ شہری اور دیہاتی ماحول سے قطع نظر بدلے ہوئے لسانی اور تہذیبی پس منظر میں دکنی اردو کہیں مراٹھی، کہیں کنٹر کہیں تلگو اور کہیں تامل اثرات کے تحت بولی جاتی ہے۔ اس مقالے میں دلوی صاحب نے نہایت جامع و مانع انداز میں دکنی اردو کی سماجی لسانیات پر روشنی ڈالی ہے۔

اگلے مقالے کا موضوع "اردو میں دخیل آوازیں" ہے۔ اس میں دلوی صاحب نے لسانیات کے ماہر علم کی حیثیت سے اردو زبان میں دخیل آوازوں کا مطالعہ پیش کیا ہے اردو ایک مخلوط زبان ہے اس کی تشکیل میں فارسی، عربی اور بر عظیم کی مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کی اصوات بھی اردو کے صوتی نظام میں شامل ہو گئیں۔ دلوی صاحب نے اردو میں دخیل آوازوں مصوتوں اور مصمتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔ عام طور پر ماہرین اردو زبان کے درج ذیل دس مصوتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ا ا - ؛ - e - ɔ - ɔ̃ - ɑ̃ - ɑ̃ - ə - ɑ - ɪ - ɪ̃ - U۔ دلوی صاحب نے بتایا ہے کہ انگریزی کے ذیل تین مصوتے بھی انگریزی الفاظ کے ساتھ اردو کے مصوتوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ e - æ - ɔ مصوتوں کے علاوہ اردو زبان نے دراوڑی زبانوں سے مصمتہ ڑ - ا بھی اپنا لیا ہے۔ اس رگڑالو Flap کی وجہ سے اردو میں رگڑالو ہائیہ A spirated Flap ڑھ وجود میں آتا ہے دلوی صاحب نے علم لسانیات کی روشنی میں حرف و صوت کے درمیان پائے جانے والے فرق و امتیاز کی وضاحت کرتے ہوئے اردو میں دخیل عربی و فارسی کی خاص آوازوں یعنی ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق وغیرہ کی ادائی کی بحث اٹھائی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ عام طور پر بول چال کی زبان میں عام اردو والا قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ مذکورہ آوازوں کو عربی اور فارسی صوتیات کے مطابق ادا نہیں کرتا اور طبعاً اس کے اعضائے نطق بھی اس پر قادر نہیں ہیں۔ اس بنا پر بعض لوگ ان آوازوں اور ان کی علامتوں (حروف) کو اردو رسم خط سے شہر بدر کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقدمے میں دلوی صاحب کا قول فیصل یہ ہے کہ چونکہ ہر اردو داں ان سب علامتوں کو استعمال کرتا ہے اس لیے ماہرین کو چاہیے کہ آوازوں کو صرف بول چال کی زبان کی اکائی مانیں اور حروف کو تحریری زبان کا جزو سمجھ کر آگے بڑھیں۔

پانچواں مضمون "اردو میں تلفظ کا مسئلہ" ہے۔ اس میں دلوی صاحب نے تلفظ اور

معیار کے تعلق سے مغربی ماہرین لسانیات ایڈرسی وارڈ، پال گارون اور بلوم فیلڈ کی آرا پیش کر کے اردو میں تلفظ کے مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اردو میں تلفظ کا مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے لیکن اس مسئلہ میں تنہا اردو ہی گرفتار نہیں ہے بلکہ انگریزی، جرمنی، فرنچ اور عربی وغیرہ زبانیں بھی اس کی اسیر ہیں۔ ہندستان جیسے وسیع و عریض ملک میں مقامی بولیاں اپنے اپنے علاقے کے اردو بولنے والوں کے لہجے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ زبانوں کی مقامی بولیوں کے علاوہ سماجی بولیاں بھی ہوتی ہیں جیسے پنجابی، پٹھان، کشمیری، قریش، کھتری، نداف وغیرہ ان کے تلفظ میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ دلوی صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں تلفظ کے سلسلے میں قدما مثلاً انشا، ناسخ، خان آرزو، رجب علی بیگ، داغ اور میر امن کی سخت گیری معرب اور مفرس اردو کی طرف میلان اور علاقائی اثرات کی نفی اور تضحیک کا رویہ نہایت درجہ غیر حقیقت پسندانہ، غیر صحت مندانہ اور اردو کے حق میں از حد خطرناک ہے۔ دلوی صاحب نے تلفظ اور زبان کے اختلاف کی دو وجوہات بتائی ہیں۔ پہلی وجہ اردو رسم خط میں اعراب کی غیر موجودگی ہے اور اس کا حل اعراب کی پابندی ہے جو تمام الفاظ کے لیے نہیں بلکہ ایسے الفاظ کے لیے ناگزیر ہے جن میں اعراب کی غلطی سے معنی بدل جاتے ہیں۔ تلفظ میں اختلاف کی دوسری وجہ عربی و فارسی کا ذخیرہ الفاظ ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ ان الفاظ کو عربی و فارسی صوتیات کے مطابق بولنے کی قید ختم کر دی جائے۔ اور نہ صرف عربی اور فارسی بلکہ سنسکرت اور انگریزی الفاظ کے تلفظ کو بھی "اردوانا" چاہیے لیکن اگر دخیل الفاظ کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کی صوتی خصوصیات بھی چلی آرہی ہوں تب بھی بلا پس و پیش دونوں طریقوں کے تلفظ کو صحیح قرار دینا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں تلفظ کے مسائل پر دلوی صاحب کا یہ مضمون پر مغز اور بصیرت افروز ہے اور اس موضوع پر لکھے گئے نمائندہ مضامین میں شامل ہے۔

پیش نظر کتاب کا اگلا مضمون "بچوں کی اردو ــ تحصیل زبان کا ایک مطالعہ" بھی نہایت معلوماتی اہم اور وقیع ہے۔ اس میں تمہیداً بچوں کی زبان جو انگریزی کی اصطلاحوں Baby Talk اور Child Language دونوں کو محیط ہے کی تعریف کی گئی ہے علم لسانیات میں شیر خوار اور بالغ معروف معنیٰ سے جداگانہ تصورات ہیں۔ ان کی وضاحت کرتے ہوئے بحیثیت زبان۔ اردو کی تحصیل کی مختلف منزلوں کا جائزہ لیا گیا

ہے۔ بچوں میں صوتی ترقی Phonetic Development کے چار مدارج ہیں (۱) رونا (۲) غوں غاں کرنا (۳) اللانا (تتلانا) (۴) گفتگو۔ فاضل مقالہ نگار نے ہر مرحلے کے دوران بچہ اکتساب زبان کے جس عمل سے گزرتا ہے اس کی تفصیلی صراحت کی ہے جو نہایت دلچسپ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں بچوں کی تحصیل زبان کو موضوع بنا کر نہ تحقیق کی گئی ہے اور نہ اس سلسلے میں کوئی سائنٹیفک کام ہی ہوا ہے۔ دلوی صاحب نے تین بچوں کو تحقیق اور مشاہدے کا موضوع بنا کر ان میں عمر کے مختلف مرحلوں کے دوران تحصیل زبان کی کیفیت اور ان کی صوتی خصوصیات کا مشاہدہ کیا ہے اور ان مشاہدات کی توثیق دیگر ذرایعوں سے کی ہے۔ اس طرح حاصل شدہ مواد کا بچوں کی اردو کے مصوتے۔ بچوں کی اردو کے مصمتے۔ نیم مصوتے۔ بچوں کی اردو میں مصمتی خوشے کی ذیلی سرخیوں کے تحت لسانیاتی اصولوں کے مطابق تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔ اسی ضمن میں صوتیاتی نقطۂ نظر سے بچوں کی اردو کی مصمتی آوازوں کا گوشوارہ بھی بنایا گیا ہے۔ یہ مضمون نہایت متجرانہ سائنٹیفک اور تکنیکی ہے اور اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون ہے جسے فاضل مصنف نے نہایت عرق فشانی۔ دیدہ ریزی اور منطقی تسلسل اور سلیقہ مندی کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور اس مطالعہ میں مغرب کے جید ماہرین لسانیات کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔

اگلا مضمون "بمبئی کی اردو ــــ ایک لسانی مطالعہ" بھی نہایت فنی اور عالمانہ ہے۔ اس میں مصنف نے شہر بمبئی کی کاسمو پولیٹن شناخت کے حوالے سے بتایا ہے کہ بمبئی کی اردو جو "بمبیانہ زبان" یا "بمبیانہ زبان" کے نام سے مشہور ہے۔ مراٹھی، گجراتی، پرتگیزی اور انگریزی کے اثرات کے تحت تشکیل پائی۔ بمبئی کی اردو یہاں کے مخصوص ہمہ رنگی معاشرت، مذہبی، تہذیبی اور سماجی زندگی کا آئینہ ہے۔ دلوی صاحب نے منشی محمد ابراہیم مقبہ، ملا طیب، علی بن بھائی میاں اور عبد الفتاح گلشن آبادی کی تصانیف کی روشنی میں جو بمبیانہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اس زبان کا سماجی ولسانی مطالعہ نقد قلم کیا ہے۔ اس سلسلے میں بمبئی کی اردو کی صوتی خصوصیات کی جدول تیار کر کے دکھایا ہے کہ اس میں ادبی اردو کی کون کون سی آوازیں شامل نہیں ہیں۔ اس کے بعد بمبیانہ زبان کی چند مزید صوتی خصوصیات کی صراحت کی گئی ہے۔ جن میں پھ کے بجائے ف کا استعمال، لفظوں کو مشدد کرنے کا رجحان، ہکاریت کا عدم استعمال۔ مصمتی خوشوں کی تسہیل۔ صرفی خصوصیات میں "لوگ" کے لاحقے سے جمع بنانے کا طریقہ،

تذکیر و تانیث کی بے قاعدگی، ضمائر میں اتُ وغیرہ کا استعمال دلچسپ بھی ہے اور امتیازی بھی۔ لغوی اعتبار سے بمبیانہ زبان نے مراٹھی، کوکنی، گجراتی اور بالواسطہ طور پر انگریزی زبان سے بے دریغ خوشہ چینی کی ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے یہ ایک آزادانہ شکل کی حامل ہے۔ دلوی صاحب نے بمبئی کی اردو اور عام اردو کے ذخیرہ الفاظ کی تقابلی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بمبئی کی اردو میں تحریر شدہ کتابوں سے انیسویں صدی کے دوران مروج بمبیانہ زبان کے نمونے اور ان کے عام اردو متبادل کی بھی طویل فہرست دی ہے۔ یہ مضمون لسانی تحقیق کا بلند پایہ نمونہ پیش کرتا ہے۔

پیش نظر کتاب کا آٹھواں مضمون "اردو میں لسانی آداب" ایک اچھوتے اور نئے موضوع پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک مغربی ماہر لسانیات کے بموجب ہر معاشرے میں اظہار خیال کے تین مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ (۱) رسمی یا شائستہ (۲) روزمرہ (۳) بازاری۔ اس مضمون میں دلوی صاحب نے اردو زبان میں اظہار کے رسمی یا شائستہ اسالیب کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اردو زبان میں رسمی انداز گفتگو یا شائستہ طرز اظہار کی نشوونما اور ارتقا، امرا و روسا اور بادشاہ کے درباروں، شرفا و معززین کے دیوان خانوں اور علما و صوفیا کی بارگاہوں میں ہوا۔ ہندستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا دامن خطابات، صفات پُراحترام الفاظ، شائستہ کلمات نستعلیق فقرات اور اعزاز و اکرام۔ مہر و مروت اور خلوص و محبت کے خوبصورت اور دلنشیں اظہارات سے مالامال ہے۔ شہنشاہ وقت، اساتذہ، رہنما، پیر طریقت، والدین اعزہ و اقربا، دوست احباب، متعلقین خورد و سال حتیٰ کہ نوکر چاکر، بھنگی، حجام اور نابینا وغیرہ تک ایک کے لیے اردو میں مخاطبت کے الگ الگ القاب و آداب مقرر ہیں جن کے استعمال سے ایک خاص تہذیب، سماجی روایت، شائستگی و متانت کا اظہار ہوتا ہے۔ شائستہ کلامی، شیریں سخنی، حسن گفتار، اظہار خلوص اور اعزاز و اکرام لسانی آداب کے مختلف ابعاد ہیں۔ ان سب میں ضمائر اور ان کے ساتھ افعال اور اسما کا موزوں استعمال قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔

"تو جا" - "آپ تشریف لے جائیں" ان دو جملوں کے درمیان درحقیقت لسانی ادب کی ایک طویل داستان مخفی ہے۔ دلوی صاحب نے بڑی ذہانت اور فطانت کے ساتھ اس بکھری ہوئی داستان کو فنی اصولوں اور قواعد کی گرفت میں لیا ہے۔ اردو لسانیات

کی دنیا میں یہ گوشہ بالکل نیا اور اچھوتا ہے۔

اگلے صفحوں کا عنوان "اردو انگریزی کے دو لسانی پہلو" ہے یہ بھی نہایت ہی عالمانہ اور علم لسانیات کی مخصوص مصطلحات و تصورات سے مملو مقالہ ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے سب سے پہلے لسانیات میں دو لسانیت Bilingualism کی تعریف نیز اس کی اقسام۔ دو لسانیت کے اسباب و محرکات نیز تداخل اور دو لسانیت کے فرق کی تشریح اور تفہیم کی ہے۔ دو لسانیت Borrowing بیک وقت دو یا کئی زبانیں جاننے اور ان میں اظہار خیال کرنے کی ضرورت کو کہتے ہیں۔ اس کے ضمنی مسائل و مباحث کافی طویل اور علم افزا ہیں۔ جنھیں ولوی صاحب نے نہایت دلچسپ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اردو اور انگریزی کی دو لسانیت کا نقطۂ آغاز اوائل انیسویں صدی کا وہ عہد ہے جب ہندستان میں انتظام حکومت، عدلیہ، تعلیم اور مختلف شعبوں میں انگریزی زبان کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ اس کے جواب میں اردو نے بھی انگریزی کو متاثر کیا۔ اور کئی الفاظ اسے مستعار دیئے۔ ولوی صاحب نے اردو اور انگریزی کی دو لسانیت کے ضمن میں اردو میں دخیل انگریزی الفاظ کا صوتی مطالعہ بھی کیا ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ اردو میں داخل ہونے کے بعد ان الفاظ میں کس قسم کی صوتی تبدیلیاں (مصوتوں میں ترمیم یا تخفیف کا عمل) واقع ہوئی ہیں۔ اسی طرح ان الفاظ کے معنیٰ خوشوں میں اہل اردو نے اپنے لسانی مزاج کے مطابق تبدیلی کی ہے۔ ایک زبان کے الفاظ جب دوسری زبان میں استعمال ہوتے ہیں تو صوتی، حرفی، لفظی اور معنیاتی ہر سطح پر اپنی عادتیں اور طور و طریق بدل دیتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل گو نہایت خشک اور علمی ہے لیکن ولوی صاحب نے اسے آسان اور دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے جو لسانیات سے ان کی طبعی مناسبت اور اس میں ان کی دست گاہ کامل پر دال ہے۔

زیر نظر کتاب کا دسواں مقالہ "اردو اور لسانی منصوبہ بندی" ہے۔ ہندستان کے کثیر لسانی پس منظر اور متنوع سماجی و تعلیمی مسائل کے پیش نظر اردو زبان کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنا بے حد ضروری ہے۔ یہی عمل دراصل لسانی منصوبہ بندی ہے۔ ظاہر ہے جہاں مسائل ہوں گے وہیں ان کے حل کی تلاش کا سلسلہ بھی ہوگا۔ اس ضمن میں ولوی صاحب کا پختہ کارانہ مشورہ یہ ہے کہ اردو کے مسائل جذباتیت کے بجائے ملک کے وسیع تر لسانی، تہذیبی، تعلیمی اور سیاسی حالات کے علاوہ بین الاقوامی

تہذیب و ثقافت، علوم و فنون کے عصری اکتسابات اور سماجی و لسانی صورت حال کے سیاق میں حل کرنا چاہیے۔ فاضل مصنف کی یہ شکایت بجا ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے تعلق سے ہماری گفتگو صرف اس کے ادبی پہلوؤں تک ہی محدود ہوتی ہے۔ حالانکہ شاعری یا افسانے ہی زبان اور ادب کی اساس نہیں ہے بلکہ سماجی و سائنسی علوم بھی ایک طرح سے اس کا حصہ ہیں کوئی بھی زبان محض ادبی زبان ہونے کی حیثیت سے بڑی زبان نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اسے علمی زبان بھی ہونا پڑتا ہے۔ اردو کی لسانی منصوبہ بندی کا موضوع نہایت وسیع اور ہمہ رخی ہے۔ زیر نظر مضمون میں فاضل مصنف نے جن مسائل سے تعرض کیا ہے ان میں سماجی، سائنسی، تعلیمی اور علمی موضوعات پر تصنیف کتب اصطلاح سازی رسم خط اور معیار املا کا تعین، قواعد لغت، انسائیکلو پیڈیا اور حوالے کی کتابوں کی تیاری وغیرہ شامل ہیں۔ اردو کی لسانی منصوبہ بندی وقت کا اہم تقاضہ اور اہل اردو کی خرد اور بصیرت کا امتحان ہے۔ دلوی صاحب نے نہایت خوبی اور باریک بینی سے اس مسئلے کے ما لہ و ما علیہ سے بحث کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا آخری مضمون "اردو کا ہندستانی رجحان" ہے۔ زمانی و مکانی پس منظر کی رنگا رنگی، تہذیبی عناصر کی کثرت اور سیاسی و تاریخی عوامل کے اختلاف و تنوع کے سبب اردو ادب میں تین قسم کے اسالیب یا رجحانات واضح اور ممیز ہیں۔

(۱) مفرس و معرب رجحان (۲) ہندستانی رجحان (۳) انگریزی رجحان۔ دلوی صاحب نے ثانی الذکر رجحان کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اردو میں ہندستانی رجحان کو موضوعِ آب و رنگ کی آمیزش دکنی اور گجری کے دور سے ہوتی ہے۔ دلوی صاحب نے کسی اقتدار کے بغیر ان اسباب و علل کی بھی صراحت کی ہے جن کی وجہ سے اردو ادب میں مفرس اور معرب رجحان نے بار پایا۔ محمد حسین آزاد پہلے ادیب ہیں جنھوں نے ہندستانی عناصر کی شمولیت کی قدر و قیمت محسوس کی قدیم دور میں ہندستانی رجحانات کے حامل دکنی اور شمالی ہند کے شاعروں اور ادیبوں کی شناخت اور نشاندہی کے بعد دلوی صاحب نے جدید اردو کے شاعروں کے کلام میں ہندستانی عناصر کی تشخیص کی ہے جن میں حفیظ، الطاف، مشہدی، میرا جی، اختر شیرانی، جوش اور جمیل الدین عالی وغیرہ شامل ہیں۔ نظم کی طرح انھوں نے اردو نثر میں بھی ہندستانی نقوش اور اقسامات روشن کیے ہیں جس کے نقطۂ آغاز پر میر امن اور انشا کھڑے ہیں۔ تو نقطۂ انتہا پر سدرشن، کرشن چندر بیدی اور اشک اور ہنوز یہ سفر جاری ہے۔

اس مضمون میں دلوی صاحب نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اردو زبان اور ادب میں ہندستانی عناصر کی کارفرمائی اور ہندستانی رجحانات خود تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے۔

عبارت مختصر پروفیسر عبدالستار دلوی کی زیر نظر کتاب اردو میں سماجی لسانیات کے موضوع پر ایک گراں مایہ اور وقیع تصنیف ہے اس میں اردو کی سماجی لسانیات کے نئے گوشوں اور اچھوتے زاویوں کو فکر و نظر کی روشنی میں لایا گیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین نہایت معلوماتی، دلچسپ، مفید، ٹھوس اور علمی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ دلوی صاحب کی تحقیق سائنٹفک اور معروضی اور طرز استدلال عقلی و منطقی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ جن نتائج کا استخراج کرتے ہیں اس سے انکار یا اختلاف کی شاذ ہی کہیں گنجائش ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب تحریر نہایت شگفتہ اور دلآویز ہے۔ جس کی وجہ سے قاری پر مسائل و مباحث کی خشکی بار خاطر نہیں ہوتی۔ اس کے ذریعہ طلبہ ریسرچ اسکالرس اور باذوق قاری اردو زبان پر علاقائی، تہذیبی، جغرافیائی، تاریخی اور سماجی اثرات کی آگہی حاصل کرسکتے ہیں۔

ڈاکٹر شبیر رسول
شعبہ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی — ۲۵

مخمور سعیدی کی غزل

مخمور سعیدی ایک ایسے تراہے پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں جہاں روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت تینوں رویے ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ وہ اس تہذیبی تسلسل سے انکار نہیں کرتے جو صدیوں کی ادبی روایات کا حصہ ہے۔ اس لیے پرانی کھتیلی مٹی میں اپنی جڑیں تلاش کرنے کے عمل کی نشاندہی ان کے یہاں کی جا سکتی ہے۔ ہیئت و اسلوب کے نقطہ نظر سے جو مثبت تجربات ترقی پسندی کے پرچم تلے وجود میں آئے ان کی چھاپ بھی مخمور سعیدی کے شعری تجربات میں اپنی جھلک دکھاتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جدیدیت ان کے لیے تخلیقی سچائی کا دوسرا نام ہے۔ وہ جب ذات کی تخلیقی وسعتوں میں کائناتی تحرک کا احساس کرتے ہیں تو ان کی شعری انفرادیت افراد کے مابین ایک ایسا آئینہ آویزاں کر دیتی ہے جو ان کی شاعری بطور خاص "غزل" کی سطح پر پیدا ہونے والے تازہ کار تنوع سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔

مخمور سعیدی کے شعری مجموعوں مثلاً گفتنی، آواز کا جسم، واحد متکلم اور آتے جاتے لمحوں کی صدا، کے ناموں پر غور کیجیے تو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ موصوف کو حس سامع سے خصوصی ربط ہے، کیوں کہ یہ چاروں نام سماعت کو متحرک کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزل میں سماعی پیکروں کی بہ نسبت بصری اور حرکی پیکر کثرت سے تخلیق ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ "سفر" کو زندگی کا بہترین استعارہ تصور کرتے ہیں۔ یہی سفر روایت سے ترقی پسندی اور ترقی پسندی سے جدیدیت کے شعری رجحان تک ان کی رسائی کا ذریعہ ہے اور یہی سفر ایک ایسا سرچشمہ بھی بن جاتا ہے جو حرکی قوت، بصری صلاحیت، ذوقی تجسس اور تخلیقی آزادی کے تصور کو ان کی شعری وسعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔

جب شاعر آزادانہ مزاج اور طبعی تجسس کے پر پرواز پر سفر کرتا ہے تو وہ خوشی بلکہ سرخوشی نیز نئی نئی حیرتوں سے دوچار ہوتا ہے اور راہ میں آنے والی رکاوٹوں، خطروں اور مشکلات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کرب کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ مخمور سعیدی جب اپنے سفر پسند الفاظ و تراکیب مثلاً رہگزر، ہمسفر، شناور، غبار راہ، موج بلا خیز، سفینہ رواں، بادباں اور کشتی موج

رواں وغیرہ کو اپنے بنیادی استعارے "سفر" کے ساتھ تلازماتی رنگ میں استعمال کرتے ہیں تو سفر کی دلنوازی، خوف ناکی، دوڑتے بھاگتے لمحوں کی رفاقت، خودشناس تنہائی، لمحوں کا تعاقب اور راہ کے اپنے آغاز کی طرف مڑجانے کا حرکی تاثر حیرت و مسرت کی کیفیت اور خطروں سے پیدا شدہ کرب کی تجسیم اس طرح کرتا ہے۔

بادباں تیرا بنے تیز ہوا کی چادر
کشتی موجِ رواں پر ہو سفر پانی میں
تو شناور ہی سہی وقت کے طوفانوں کا
تندیٔ موجِ بلا خیز سے ڈر پانی میں
نہ رستہ نہ کوئی ڈگر ہے یہاں
مگر سب کی قسمت سفر ہے یہاں
محور کیسی راہ تھی ہم جس پہ چل پڑے
آئی تھی جس طرف سے اسی سمت پھر گئی
دل نہ ٹھہرا کسی عالم میں کہ ہم نے تا عمر
دوڑتے بھاگتے لمحوں کی رفاقت کی ہے
راہِ خود شناسی میں ہم سفر کہاں کوئی
کر رہا ہوں طے کب سے یہ کٹھن سفر تنہا
زندگی کے ساتھ چلنا اس قدر آساں نہیں
اڑتے لمحوں کا تعاقب اس میں شامل ہے میاں
میں اکیلا تو نہیں اپنے سفر میں محور
ہم سفر دل ہے، نظر راہ نما ہے میری
کس لپکتے ہوئے سائے کے تعاقب میں ہوں، میں
مڑ کے دیکھے نہ کسی موڑ پہ پل بھر ٹھہرے

ان تمام اشعار میں ظاہر ہونے والے حرکی پیکر، حرکت اور تغیر سے بھی شاعر کے ذہنی ربط کا سراغ دیتے ہیں اور نئی زندگی کی پیچیدگیوں، بے سمتی، تیز رفتاری اور تنہائی کے ساتھ ساتھ ان تمام چیزوں کے زیرِ اثر نمودار ہونے والے خوف کو بھی مجسم کرتے ہیں۔ محور سعیدی نے اپنے تخلیقی سفر کی وساطت سے زندگی کے سفر کے شعری اظہار میں قوتِ باصرہ سے بطورِ خاص کام لیا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ سفر کرنے والا دوسرے حواس کو نسبتاً کم اور باصرہ کو کثرت کے ساتھ بروئے کار

لاتا ہے۔ مخمور سعیدی کے یہاں بصری پیکروں کا ایک ایسا سلسلہ نظر آتا ہے جو عصری زندگی کی سفاکی، محرومی اور ناآسودگی کو مرتسم کرتا ہے اور زندگی کے جمالیاتی مناظر سے بھی شاعر کے جذباتی لگاؤ کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ آگ اور روشنی کے استعاراتی اور علامتی استعمال نے ان کی بصری پیکر تراشی میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔

مرے جلتے ہوئے گھر کی نشانی بس یہی ہوگی
جہاں اس شہر میں تم روشنی دیکھو چلے آنا
جگ مگ کرتی ساری بستی آج دھوئیں کی دلدل ہے
شعلہ بکف اندھی آندھی نے چاروں طرف پھیلائی آگ
خوابوں کی بستیوں میں جو جگمگا رہا تھا
ڈوبے سیاہیوں میں اس گھر کے بام و در بھی
پلک بھی جھپکتے ہو مخمور کیوں
تماشا بہت مختصر ہے یہاں
گو دن چڑھا، فصیل شب تار گر گئی
اب زندگی کچھ اور اندھیروں میں گھر گئی
خیالوں پر سر شام اس کے سائے پھیل جاتے ہیں
نگاہوں میں چمک اٹھتا ہے پرتو صبح دم اس کا
اس کے آنے کی خبر ہن کے دیار جاں میں
خون دل سے در و دیوار کی زینت کی ہے

مخمور سعیدی کے بصری پیکروں میں اداسی، محرومی اور طنز میں ڈوبا ہوا جو کرب نظر آتا ہے اس کا سلسلہ ان کی ذات سے ہوتا ہوا عہد حاضر کے آشوب و ابتلا تک پہنچتا ہے۔ آگ کا لفظ ان کے یہاں ایک زبردست استعارے کی شکل میں ابھرتا ہے۔ روشنی، تاریکی اور دھوئیں سے بھی ان کی ذاتی محرومی اور درد سے گہرے رشتے کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہی پر آشوب زندگی، جلتے ہوئے گھر، دھوئیں کی دلدل اور سیاہیوں میں ڈوبے ہوئے بام و در سے دور کچھ ایسے لمحات بھی فراہم کرتی ہے جو ہر شام خیالوں کی وسیع و عریض فضاؤں پر محبوب کی یادوں کے سایوں کو پھیلا دیتے ہیں، ہر صبح نگاہ میں اس کے پرتو کی چمک بھر دیتے ہیں اور اس کی آمد کی خبر پر دیار جاں کے در و دیوار کی رونق اور رنگ آمیزی کے لیے خون دل بھی صرف کرتے ہیں۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر غزل کے حوالے سے اپنی منفرد سوچ کے نقوش ثبت کرتا ہے اگر مخمور سعیدی کے پیکروں میں زندگی کی تمام تر

کرب ناکی، پیچیدگی، سیماب صفتی اور ازلی تنہائی کے خاکے کثرت کے ساتھ ابھرتے ہیں تو کم کم ہی سہی لیکن زندگی کی حزنیہ رومان انگیزی اور سرشاری و شادابی کی تصویریں بھی اپنے گہرے نقوش چھوڑتی ہیں۔ حقیقتاً ان کا یہی طرزِ فکر ان کو زمانے کی سفاکیوں اور چیرہ دستیوں میں گھرے ہونے کے باوجود بھی زندگی کرنے کی قوت سے سرفراز کرتا ہے۔

مخمور سعیدی کے شعری مجموعوں کے ناموں کے حوالے سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ موصوف کا حسِ سامع سے خاص تعلق ہے اسی لیے شعری پیکر تراشی میں سماعت کے عمل و اثر سے مرتب ہونے والے تاثرات کو بھی وہ خصوصی اہمیت تفویض کرتے ہیں۔ خامشی سے ہم کلامی، لمحوں کی گفتگو، صدیوں کی داستاں، دیارِ خامشی سے آتی ہوئی آواز اور صنم خانوں میں اذان کا بلند ہونا وغیرہ زبان کا ایسا مجازی استعمال ہے جو ان کے سامعی پیکروں کی تخلیق کی بنیاد بنتا ہے۔

صنم خانوں سے آوازِ اذاں آنے لگی مجھ کو   سنا ہے میں نے جب چرچا سرِ صحنِ چمن اس کا
دیارِ خامشی سے کوئی رہ رہ کر بلاتا ہے   ہمیں مخمور اک دن ہے اسی آواز پر جانا

پتھروں نے صدا سنی میری   خامشی مجھ سے ہم کلام ہوئی

مخمور غور سے سن لمحوں کی گفتگو کو
صدیوں کی داستاں ہے اک حرفِ مختصر میں

ان اشعار میں صورت پذیر ہونے والے پیکروں میں گنتی کیفیات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے، آواز کے جسم کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ واحد متکلم سے ہم کلام بھی ہوا جاسکتا ہے اور آتے جاتے لمحوں کی صدا بھی بخوبی سنی جاسکتی ہے۔ یعنی سماعت کی وہ تمام تر نیرنگیاں جو شاعر کی شخصیت، زندگی سے متعلق اس کے شعور اور معاشرے کے مخفی گوشوں کی عکاسی کرتی ہیں، وہ سبھی مذکورہ سامعی پیکروں میں موجود ہیں۔ مخمور سعیدی کی غزل میں حرکی، بصری اور سامعی پیکروں کی طرح ہی بعض مرکب پیکر بھی خاص اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ آئیے ان کے ایسے اشعار پر بھی ایک نظر ڈالیں جن میں مختلف حسی پیکر ایک دوسرے میں پیوست اور مدغم ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کہیں شعلوں میں اس کا عکس رنگیں پھول سا مہکے   کبھی آئینہ بن جاتے ہیں پتھر کے صنم اس کا
سہانے موسموں کی یاد سکھلا یا تجھے کس نے   افق پر دیدہ و دل کے دھنک بن کر بکھر جانا

کہیں ستاروں کی زرفشانی، کہیں شگوفے مہک رہے ہیں
رگوں میں تیری لہو ہے جب تک یہ سارے منظر چمک رہے ہیں

جانے کن بیتے دنوں کی یاد کا جھونکا ہے جو   آکے راتوں میں مری تنہائیاں مہکائے ہے

مخمور سعیدی نے بصری، سامعی اور حرکی وسامعی احساس کی بنیاد پر منقسم اور منفرد انداز کی پیکر تراشی بھی کی ہے اور مذکورہ تمام حسوں کے یکجا استعمال کے ذریعے مخلوط پیکر بھی تراشے ہیں۔ انھوں نے جہاں کہیں ایک سے زیادہ حواس کو بیک وقت متحرک کرنے کا جادو جگایا ہے وہاں شعری تہہ داری اور ہمہ جہتی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ مندرجہ بالا شعری سلسلے کے پہلے شعر میں شعلوں میں محبوب کے عکس رنگیں کا پھولوں کی طرح مہکنا اور پتھر کے صنم کا آئینہ بن جانا قوت باصرہ اور قوت شامہ کو متحرک کرتا ہے۔ دوسرے شعر میں سہانے موسموں کی یاد' یادداشتی پیکر کی تشکیل کرتی ہے اور دھنک بن کر بکھر جانا حس بصارت کی نمائندگی کرتا ہے۔ تیسرے شعر میں ستاروں کی زر فشانی اور لہو سے منظروں کا چمکنا بصری پیکر کو ابھارنے کے لیے اور شگوفوں کا مہکنا شامی پیکر کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور آخری شعر میں بیتے دنوں کی یاد کے جھونکوں سے تنہائیوں کا مہکنا یادداشتی اور شامی تصویریں خلق کرتا ہے۔ ان پیکروں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مختلف حسی پیکر انفرادی اور مخلوط دونوں سطحوں پر جلوہ سامانی کرتے ہیں۔ جب یہ ایک دوسرے میں پیوست ہوجاتے ہیں تو مختلف حواس انسانی میں ایک ربط پیدا کرتے ہیں اور شعر میں کثیر العناصری کا تاثر بھی پیدا کرتے ہیں۔

مخمور سعیدی کے تجربات و مشاہدات' ان کی شاعرانہ زبان کے بنیادی الفاظ اور ان لفظوں کے تلازمات کے ساتھ سیال ہوکر پورے شعری تجربے پر پھیل جاتے ہیں اسی لیے ان کی غزل میں رنگا رنگ اور متحرک تصویریں نظر آتی ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے پیکروں میں استعاراتی اور علامتی پراسراریت کی جگہ تشبیہی شفافیت نے بھی لے لی ہے۔ ایسے مقام پر شعر سپاٹ ہوگیا ہے اور تہہ داری نیز معنوی ہمہ جہتی مفقود ہوگئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مخمور سعیدی کی غزل میں شامی' ذوقی اور لمسی قوتوں کا تخلیقی استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ وہ حواس خمسہ میں سے صرف بصری اور سامعی حواس کو کثرت کے ساتھ متحرک کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے شعری تخلیقی منظرنامے میں اہم اور کلیدی حیثیت صرف ان کے حرکی پیکروں کو حاصل ہے جو زندگی کے تحرک و تغیر سے ان کے فکری ربط و تعلق کے آئینہ دار ہیں۔ یہی پیکر ان کی غزل کے مزاج اور انفرادیت کی بھی کسی حد تک نشاندہی کرتے ہیں اور اس کے وزن و وقار میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مسز خان شائستہ اختر
شعبۂ فارسی اسمٰعیل یوسف کالج ممبئی

غالب کی فارسی شاعری

جاندار اور قابل اعتبار و اعتنا اور اچھا شعر وہی ہوتا ہے جس کا اثر، جوش اور نیاپن ہر زمانے میں قائم رہے، جس کی تازگی اور لذت کبھی کم نہ ہو۔ اسے پڑھ کر یا سن کر قاری یا سامع یہ محسوس کرے کہ یہ شعر یقیناً میرے ہی لیے کہا گیا ہے۔ تقریباً دو صدی گزرنے کے باوجود غالب کے اشعار میں آج ہم اپنی زندگی کے نشیب و فراز بخوبی محسوس کرسکتے ہیں۔

جہاں تک غالب کی فارسی شاعری کا تعلق ہے، فارسی اشعار کا بغور مطالعہ کرنے سے غالب کا وہ دعوا بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے، جو وہ اپنے فارسی کلام کی برتری کے متعلق کیا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں سرزمین ہند نے فارسی جیسی مقبول عام، وسیع، نفیس و شیریں زبان میں غالب دہلوی سے بڑا اور عظیم شاعر پیدا نہیں کیا۔

غالب فارسی زبان میں اردو سے زیادہ مہارت رکھتے تھے، ان کا ذہن فارسی الفاظ معانی کا ایک بہت بڑا خزانہ تھا۔ تازہ بہ تازہ اور معنی خیز تراکیب کی ایجاد میں ایسی قدرت رکھتے تھے کہ ان کے برجستہ فقرے نہ صرف پرکشش، جاذب النظر اور بلیغ ہوتے بلکہ اپنے اندر مطالب و مفاہیم کے اظہار کی وسیع گنجائش بھی رکھتے تھے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ نت نئی تراکیب کے استعمال سے زور بیان میں کس قدر طاقت و قدرت عطا ہوتی ہے۔

نطق تنہا نہ بود مشق سخن را کافی
سخن این است کہ ایں تیر کمانی دارد

غالب نے اپنی عمر کے گیارہویں برس میں زبان فارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔ علم دوستی، شاعرانہ عظمت، تخیلات کی پرواز اور ذوق و شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کی کئی تصنیفات فارسی ادب میں مخصوص ترین حیثیت کی حامل ہو گئیں۔ فارسی تصنیفات پر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو نظم میں ایک ضخیم

کلیات موجود ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور قطعات پر بلکہ تمام اصناف سخن پر بھی جان سے طبع آزمائی کی ہے۔ نثری تصنیفات میں "پنج گنج، پنج آہنگ، دستنبو، مہر نیم روز" اور "قاطع برہان" شامل ہیں۔ جو موضوع، مواد اور چاشنی کے اعتبار سے اپنا اعلا مقام رکھتی ہیں۔

ادبی اعتبار سے غالب اپنے زمانے کے بہت زیادہ باذوق اور باسلیقہ شاعر تھے۔ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں اور متحرک و فعال شخصیت کی بنا پر فارسی نظم و نثر کی تمام اصناف پر برتری حاصل کرلی تھی لیکن ان کا خاص میدان "غزل" تھا جس میں ان کی رنگا رنگ اور قد آور شخصیت کلی طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں میں فکر رسا، احساسات کی گہرائی، خیالات کا تموّج، بلاغت، ذہنی پختگی حقیقت کا صحیح اور سیدھا مفہوم، زندگی کے مسائل سے آگہی، ذہنی عرفان، معاشی اور معاشرتی بحران کا تدارک اور انسانیت اور حریت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کی غزلیں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور عظمتوں کی بہترین غماز ہیں۔

غالب کی قابل قدر خصوصیات کو ان کے پورے شاعرانہ وجود میں انتہائی واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کا فن قدیم و جدید اوب کا امتزاج ہے۔ ادب العالیہ کی اعلا ترین روایات سے غالب نے اپنے آپ کو کبھی لاتعلق نہیں رکھا بلکہ ان کا نچوڑ اپنی زبان میں جذب کرکے اس پر نئے ذہن، فکر اور فن کے لب و لہجہ اور نئی جہات کا اضافہ کیا۔ جدت مضامین، تازگی بیان، تشبیہات و استعارات میں انوکھاپن اور شوخی و ظرافت میں انفرادی و امتیازی سمت اختیار کی، سطحی خیالات کو اچھوتے انداز میں برتا۔ اس تعلق سے مجموعہ کا درج ذیل شعر مختلف معانی و مطالب کے ساتھ غالب کی شخصیت سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔

براوجِ خرد ماہِ نو تافتہ
ریاضِ سخن سروِ نو یافتہ

(عقل کی بلندی پر نیا چاند چمکا اور شاعری کے باغ میں نیا سرو اگ آیا ہے)

ان کی شخصیت کی عظمت کا راز غیر معمولی فکری صلاحیتیں ہیں۔ عزت نفس، غیرت، خودی ر خودداری ان کے کلام کے جواہر پارے ہیں۔ مستقبل پر نظر رکھنے اور فرسودہ، بے ہودہ اور مُبتذل ولیات سے اکتا جانے کی بدولت غالب کے فن میں نئے عہد کا نیا شاعر پیدا ہوا۔ وہ صرف خوشی اور غم ں ڈوب کر ہی نہیں رہ گئے بلکہ انھوں نے دونوں کے حقائق کو نئے زاویے سے پہچاننے کی کوشش ہ۔ اسی وصف نے غالب کے فن کو جلا بخشی جس سے ان کے فن میں شگفتگی و تازگی پیدا ہوئی۔ غزل ں شوخی و طراری کی مثال ملاحظہ فرمایئے۔

۷۵

وداع و وصل جدا گانہ لذتی دارد
ہزار بار بروصد ہزار بار بیا

"اے محبوب ملنے اور بچھڑنے کی لذتیں مختلف ہیں۔ اس لیے تو ایک ہزار اور سو ہزار بار واپس
"

بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند
بمرگ من کہ بہ سامان روزگار بیا

تیری ایک دو اداؤں سے کیا جانے والا ستم مجھے خوش نہیں کر سکتا بلکہ تو زمانے سے میری
ت کا سامان لے آ۔
ب کی زبان دانی انھیں ایران سے مربوط کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے فن کے ذریعے اہل ہند کو اہل
ران کی نظر میں سرخرو کیا۔ کسی نے خوب ہی کہا ہے کہ
"ہندستان میں فارسی شاعری ایک "ترک لاچین" یعنی امیر خسرو نے شروع کی اور ایک
ترک ایبک "یعنی مرزا غالب پر ختم ہوئی۔"
انھیں خود بھی اپنی فارسی زبان دانی اور شاعری پر بڑا ہی ناز تھا۔ کہتے ہیں۔
فارسی بیں تابہ بینی نقش ہای رنگ رنگ
بگذراز مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است
میری فارسی شاعری کو دیکھ کہ اس میں قسم ہاقسم کے رنگ موجود ہیں
اردو شاعری کے مجموعے کو چھوڑ دے کہ وہ بالکل ہی بے رنگ ہے
الب نے اپنی فارسی زبان دانی پر جس قدر ناز کیا ہے وہ یقیناً بجا طور پر کیا ہے اور اس میں مبالغے کی ذرہ
رابر بھی گنجائش نہیں ہے۔

جائزے

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

مصنف۔ حکیم محمد سعید

اخلاقیات طبیب

مبصر۔ خلیق انجم

قیمت۔ ۲۰ روپے۔ ضخامت ۶۴ صفحات
پبلیشر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

حکیم محمد سعید کا شمار بر صغیر کی اہم ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ حکیم محمد سعید کے بڑے بھائی حکیم عبد الحمید کا بھی یہی مرتبہ ہے۔ دونوں اعلا درجے کے حکیم ہیں۔ اپنی اپنی قوم کی تعلیم کے سلسلے میں ہر ممکن جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ "اخلاقیات طبیب" جیسی کتاب صرف ایک شخص لکھ سکتا تھا جو بنیادی طور پر انسان دوست ہو۔ یہ مختصر سی کتاب صرف حکیموں ہی کے لیے نہیں بلکہ ان تمام معالجوں کے لیے ہے جو یونانی، آیورویدک، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک، یا کوئی اور طریقۂ علاج استعمال کرتے ہوں۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ بتانا ہے کہ معالجے کا پیشہ دنیا کا مقدس ترین پیشہ ہے چونکہ معالج انسانوں کو دکھ درد اور کبھی کبھی موت کے منہ سے بچاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ایلوپیتھی کی وجہ سے معالج کا پیشہ صرف پیسا کمانے کا ذریعہ ہو گیا ہے۔ مادّی آسایش حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ڈاکٹر اور طبیب کے پیشے کے خلاف ہے۔ اب اخباروں میں اکثر یہ خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ سرکاری اسپتالوں میں ڈاکٹر مریض سے رشوت لیتے ہوئے پکڑے گئے یا اسپتالوں کی دواؤں کی خرید فروخت کے غبن کے معاملے میں ملوث پائے گئے۔ حکیم محمد سعید نے اس کتاب میں ایک معالج، دواخانے، دواخانے میں کام کرنے والے ملازمین اور مریضوں سے متعلق اخلاقیات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال کر یہ ثابت کیا ہے کہ طب ایک فن شریف ہے، اس لیے اس شریف فن کا تقاضا ہے کہ طبیب مظہرِ شرافت ہو اور صداقت، دیانت، ہمدردی اور قربانی و ایثار کا اعلا ترین نمونہ ہو۔ اُسے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے سے نہیں

بلکہ مریضوں کو مرض سے نجات دلانے سے خوشی حاصل ہو۔ یہ کتاب اس اہمیت کی حامل ہے کہ اسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہیے اور علاج کے تمام طریقوں کے نصاب میں اسے شامل کیا جانا چاہیے۔

روضۃ الاولیاء

مترجم۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی
مبصر۔ مسرت حسین آزاد
قیمت : /۵۲ روپے۔ صفحات ۱۱۶
ناشر: مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج رام پور یوپی

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ایک مستند صاحب قلم عالم ہیں۔ ان کا یہ مختصر تذکرہ جو خلد آباد کے ۹ بزرگان دین کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ تذکرہ فارسی میں ہونے کی وجہ سے اردو داں طبقہ میں متعارف نہ تھا اب پروفیسر نثار احمد فاروقی کی کاوش سے اردو والوں تک پہنچ گیا ہے۔۔ مترجم فاروقی صاحب نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۸۹۲ء میں ایک مرتبہ اورنگ آباد سے شائع ہوا تھا اس کا اردو ترجمہ ان کے ذریعے پہلی مرتبہ سامنے لایا جارہا ہے۔

اس تذکرہ کی ضخامت ۱۱۶ صفحات ہوگئی ہے کیونکہ اس میں اردو ترجمہ کے ساتھ فہرست، حواشی اور فارسی متن بھی شامل ہے۔۔۔ اس تذکرہ کی تالیف کے سلسلے میں آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ جب وہ حج سے واپسی میں خلد آباد میں قیام پذیر ہوئے تھے وہیں انھوں نے یہ تذکرہ لکھا۔ جس میں وہاں کے ۹ مستند صاحبِ مزار صوفیاء کرام کا ذکر کیا ہے۔

اس مختصر سی کتاب کی تیاری میں آزاد نے بزرگوں کے ملفوظات، عوام میں پھیلے ہوئے قصوں اور دوسری کتب کو سامنے رکھا ہے۔ نثار صاحب خود بھی اسی سلسلے کے آدمی ہیں۔ اولیاء اللہ کے حالات میں وہ کون سا مآخذ ہوگا جس پر اس کی نظر نہ ہو، کتاب میں شامل تشریحات دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یوں تو اس کتاب میں شامل بزرگوں کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں اور بعض کے حالات میں تو ضخیم سے ضخیم کتب موجود ہیں لیکن روضۃ الاولیا میں مؤلف نے تحقیقی انداز اختیار کرتے ہوئے کئی اہم گوشوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس مجموعہ میں شیخ برہان الدین غریب ہانسویؒ، شیخ منتجب الدین زرزری بخشؒ، حضرت امیر حسن علاء سنجریؒ، سید راجو قتال، حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ، مولانا فرید الدین ادیبؒ، خواجہ حسین شیرازیؒ، شیخ داؤد حسین شیرازیؒ، حضرت شیخ جلالؒ حضرت شیخ خاکسار اور خود مؤلف کے حالات شامل ہیں۔ مؤلف نے ان بزرگوں کے حالات میں مروّجہ واقعات کو چھان بین کے بعد ہی اس کتاب میں شامل کیا ہے جو کہ مختصر

کر جامع ہیں۔ ان بزرگوں میں کم از کم دو بزرگ شیخ برہان الدینؒ اور شیخ زین الدینؒ ایسے ہیں جن کے نام پر برہان پور اور زین آباد نامی دو شہر بسائے گئے۔ زین الدینؒ، شیخ برہان الدینؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔

روضۃ الاولیا کے مؤلف کے پیش نظر اس دور کے بہت سے ملفوظات رہے ہیں ان بزرگوں کے زیادہ تر حالات انھیں کتابوں سے ماخوذ ہیں بہت سی نصیحتیں اور دلچسپ واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں یہاں چند پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

مثلاً شیخ برہان الدین غریبؒ نے اپنے خلیفہ مولانا فخر الدینؒ کے سلسلے میں فرمایا کہ قیامت کے دن اگر اللہ نے معلوم کیا کہ ہمارے لیے کیا لائے ہو تو کہہ دوں گا فخر الدینؒ کو لایا ہوں۔ اس طرح کی روایات کئی بزرگوں سے منسوب ہیں سر سید نے مولانا حالی کی نظم مسدس حالی کو اس مقصد کے واسطے منتخب کر لیا تھا۔ دوسری اہم بات جو صوفیانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے یہ ہے کہ گوشہ نشینی کا بنیادی راز یہ ہے کہ اس طرح دوسروں کے شر سے بچا جا سکتا ہے اور دوسروں کو اپنے شر سے بچایا جا سکتا ہے۔ یہ مفید بات شیخ زین الدینؒ کے خلیفہ امیر حسینؒ کی کتاب ہدایۃ القلوب میں ہے جس میں انھوں نے اپنے شیخ زین الدینؒ کے ملفوظات جمع کیے ہیں اس میں مقبول بندوں کی صفات، نصیحت اور فضیحت کا فرق اور دولت کی پوجا کرنے والے شیوخ کا ذکر بھی موجود ہے۔

ان دسوں بزرگوں میں دیوگیر میں بسنے والے اور وہیں رحلت اختیار کرنے والے سب سے پہلے بزرگ شیخ برہان الدینؒ ہی ہیں۔ شاہ خاکسار جو اس کتاب کے آخری بزرگ ہیں ان کی قبر شیخ زین الدینؒ کے مزار کے احاطے میں ہے اسی مزار کے ایک حظیرے میں شہنشاہ ہند اورنگ زیبؒ عالمگیرؒ بھی آرام فرما ہیں۔ انھیں بزرگوں کے تذکرہ میں مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کہ جس کے حالات بہت کم ملتے ہیں کے والد مولانا غلام علی کا بھی ذکر ہے جو شاعر تھے۔ اس طرح یہ مختصر سی کتاب تاریخی لحاظ سے کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب روضۃ الاولیاء کے ترجمہ سے پہلے فارسی کتاب قوام العقائد مؤلفہ جمال قوام (سوانح حضرت نظام الدین اولیا) کا بھی اردو ترجمہ کر چکے ہیں دونوں کتابوں کی اشاعت کا سہرا مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ رامپور کے ادارہ نشر و اشاعت پر ہے جس کے محرک اور منتظم ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی جیسے فعّال منتظم اور قابل مضمون نگار ہیں امید ہے کہ شعائر اللہ خاں کی کوششوں سے اور بہت سی کتب بھی شائع ہو سکیں گی۔

کتاب روضۃ الاولیا طباعت اور کتابت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی اس میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ۱۱۶ صفحات کی اس کتاب کے پیپر بیک اڈیشن کی قیمت ۵۲ روپے ہے جسے ادارہ نشر واشاعت مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ مستن گنج رام پور یوپی کے علاوہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شفق کا ایک اور رنگ

شاعر: نور پر کار

(نثری نظموں کا مجموعہ)

دوسرا بھورو خاں

افسانہ نگار: نور پر کار

(افسانوں کا مجموعہ)

مبصر: اسلم عمادی

ناشر: قلم پبلی کیشنز ۷/۱/۱۷ ایل آئی جی کالونی کرلا (مغربی) ممبئی ۰۷

نور پر کار کا نام ہندستان جدید اردو ادب کے اہم ناموں میں سے ایک ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے میں غالباً ۱۹۷۰-۱۹۷۱ کے زمانہ میں ان کے نام سے روشناس ہوا، ان دنوں ہندستان میں اہم رسائل جو ادب کے فن پر جگمگا رہے تھے ان میں آج کل، کتاب، لکھنؤ، تحریک، دہلی، شب خون، الہ آباد، صبا، حیدر آباد، پیکر، حیدر آباد، مریخ، پٹنہ، صبح امید، شاعر اور نقش کوکن ممبئی کا نام یاد آرہا ہے۔ نور پر کار کا نام بھی شاید کتاب لکھنؤ اور شاعر ممبئی کے ذریعے میرے حیطۂ علم میں آیا۔ یہ نام بذاتِ خود نادر اور پُر کشش لگا، پرکار سے واقفیت ریاضی پڑھنے اور پھر ناسخ کا وہ شعر جس میں دائرہ شاہ اجمل کی مدح میں انھوں نے کہا تھا کہ ؎

> ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
> آئی کہاں سے گردش پرکار پانوں میں

تک محدود تھی۔ نئے ادیبوں نے عموماً تخلص سے سادگی کی طرف سفر کیا ہے، بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے تو (جن میں میں بھی شریک ہوں) صرف اپنے نام پر اکتفا کرلیا ہے۔ نور پرکار کے نام سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک روشنی کا خط تصورات پر مستوی ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ نور صاحب سے ملاقات (بلکہ ۵ یا ۶، ملاقاتیں جو اب تک ہوئی ہیں) وہ بھی ۱۹۸۹ میں (میرے کویت آنے کے بعد) پر یہ ضرور لگا ہے کہ وہ ادب جی رہے ہیں اور ادب تحریر کر رہے ہیں۔ ان کی متذکرہ بالا کتابوں کا تنقیدی تجزیہ پیش ہے۔

ا۔ شفق کا یک اور رنگ : نور پرکار کا شعری اسلوب نثر کی بے ربطی، استعاراتی فکر سے بے نیازی، شعری آہنگ سے مبرا، لیکن کبھی کبھی صیغہ واحد متکلم میں صوت و صدا زیر و بم، کبھی مکالمے کے یک رخی کردار کی زبان اور کبھی حرف حق کہہ جانے کی جسارت پر مشتمل ہے اردو کی نثری شاعری میں اس طرح کا تجربہ کم ہی ہوا ہے احمد ہمیش نے نثری آہنگ تو منتخب کیا لیکن استعارات، علامات اور الفاظ کے تحرک سے ایک تحیر کن شعری فضا بھی پیدا کی۔ قمر جمیل کی نثری شاعری کی زیریں سطح میں آہنگ بیتر تا نظر آتا ہے۔ بلراج کومل، عزیز قیسی اور شہریار نے نثری آہنگ میں امیجری اور شعری اظہار کی فضا کے تار و پود پر خاص توجہ دی ہے۔ نور پرکار نے شاعری کو سراسر اظہارِ ذات کا واسطہ بنادیا ہے، ان کی استعمال کی ہوئی تشبیہ اور علامات جزوی طول رکھتی ہیں ۔ پوری نظم پر حاوی ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔ یہ ان کا ممیتز اسلوب بیان ہے۔ اور حساس عناصر کے سبب انتہائی مرتکز ہے۔ ان کی نظموں میں کئی کردار ابھرتے اور ڈوبتے رہتے ہیں جو اپنے عمل کو مکمل کرکے منظر سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کی فکری فضا میں طلسم خانہ و جسم و جاں، نا آسودگی اور نامکمل تمناؤں کی پیش رفت ملتی ہے۔ نور پرکار نے اپنی شعری قوت اظہار کو زمانہ حال کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کی زبان عمومی ہے انھوں نے خصوصی لفظیات اور اصطلاحات کا کم تر استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں کے چند منتخب حصے پیش ہیں۔

ابھی تو جسم مرور ایام کے درد سے بے خبر ہے۔ اور من سے تن تلک۔ پھیلا ہوا راستہ کتنا لمبا ہے۔ کسی دن آنسو بہائے چپکے سے بستر کی خواہشوں سے پرے۔ میری طرح۔۔۔ (شاعری کرے تو۔۔)
کٹھن سفر کی اذیتوں سے۔ کسی دن جو تھک جاؤں گا۔ گہرے پانی میں چپ چاپ اتر جاؤں گا۔۔ (۲۶ فروری۔۔)۔ جو کبھی آنکھ سے آنکھ ملے۔ تو گفتگو نہ کروں۔ جو لب ہلیں۔ اور سوالوں کی دھند چھٹے۔ تو جوابوں کی جستجو نہ کروں۔۔ (بین السطور)

نور صاحب کی نظموں میں کئی الفاظ اور مناظر متواتر آئے ہیں، سفر، دن، رات، شب و روز، سمندر، یاد، اور ایسے ہی الفاظ روپ بدل بدل کر نظموں میں تکرار کے ساتھ آتے ہیں۔ ان سب نظموں میں دوست داری، دنیا سے بے پروائی، یاسیت اور ہلکی ہلکی لذت پرستی زبان بیان یا پس منظر میں اپنی سی جھلک دکھا کر چھپ جاتی ہیں۔

نور پرکار نے جس ڈکشن کو استعمال کیا ہے وہ اردو نقاد کو نثری نظموں کے مکالماتی

اسلوب کی طرف ضرور راغب کرے گا۔ اب مکالماتی اسلوب میں شعریت کے تلازمہ کا تعین اب مرحلہ دشوار ہے کہ گذشتہ بیس برسوں سے ان پر بحث کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ میں نور پرکار کو اس خوبصورت کتاب کی صوری اور معنوی خوبیوں پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

۲۔ دوسرا بھوروخاں۔ یہ چونکہ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ارباب ادب کی نظر سے گزری ہوگی اور اس پر تبصرے بھی ہوئے ہوں گے۔ اس کتاب میں ۱۷ افسانے ہیں اور ہر افسانہ مختصر طوالت کا ہے۔ نور پرکار نے ان افسانوں کے لیے جو اسلوب منتخب کیا ہے وہ سہل زبان و بیان پر مبنی ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا بیدی اور جوگندر پال کے درمیان اور منٹو اور سریندر پرکاش کے خلط ملط سے ایک علاحدہ وجودی اکائی بن کر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں شدت کا احساس بھی ملتا ہے۔ دوسرا بھوروں خاں، نورن، لہو لہو گلاب، میری ٹری زا، اسی شدید لب و لہجے کے نرم زبان میں عکس ہیں۔ ان کے افسانوں میں عموماً ایک مرکزی کردار کو پورے موضوع پر محیط بنا کر پیش کیا جاتا ہے

نور پرکار نے جس اسلوب بیان کو استعمال کیا ہے وہ بے ربط سے ربط، سیناریو کی اچانک تبدیلی، زبان کا متوازن برتاؤ، کہانی پن میں شکست و ریخت، تخیل کی درونی دھوپ چھاؤں، بین تشلابہہ کا نیم علاماتی استعمال اور کچھ کہہ دینے اور کسی خبر عام کرنے کی جستجو پر منحصر ہے نور کے افسانوی کردار اپنے اندر منجمد کرداری احساسیوں کے ربط و ضبط سے بلا واسطہ اپنے ماحول کی صورت حال کو منکشف کرتے ہیں۔ نور نے جدید افسانہ کی زبان سے عملاً احتراز کیا ہے نہ اس میں پراسراریت ہے نہ عجبت ہے۔ سلیس اور بیانیہ قصہ گوئی جیسی زبان ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ وہ کئی مناظر کو ایک مقام سے دیکھ کر ان کو مختصر فصل کے ساتھ کہانی کی زمین پر منتشر کردیتے ہیں لیکن مربوط طور پر۔ اس طرح بیش قلمونی مناظر (یا واقعات) گڈ مڈ ہو کر ایک کہانی کی شکل میں افسانہ نگار کے مقصود کو پیش کرتے ہیں۔ نور پرکار کی کہانی کاری میں دانائی کا کرب، انسانی رشتوں کی شدت اور خود غرضی کی بے رحمی اہم موضوعات ہیں۔ وہ اپنے طرز ترسیل میں خاصے کامیاب نظر آتے ہیں اور ان کے افسانوں کو نئے اردو ادب میں نمایندگی ضرور ملے گی۔ نور پرکار کے افسانوں کا یہ مجموعہ ان کی ادبی دیانت داری کا اہم دستاویز کہا جاسکتا ہے۔

کھلے خطوط

• رام پرکاش کپور، ۱۸/۷ ایم-آئی-جی پدم نابھ پور
دُرگ ۴۹۱۰۰۱ (مدھیہ پردیش)

جولائی کے کتاب نما کے اشاریہ میں جناب نند کشور وکرم کے اردو اور ہندی کے بارے میں دیے ہوئے اعداد و شمار صحیح نہیں ہیں یہ نہایت ہی misleading (گمراہ کن) اور غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ انھوں نے خود بھی یہ اعداد و شمار دینے کے فوراً بعد اردو کے دنیا کی تیسری زبان ہونے کے دعوا کو رد کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے "میرا خیال ہے کہ مذکورہ اعداد و شمار اردو کے نہیں بلکہ برصغیر میں بولی جانے والی ہندستانی (اردو- ہندی) کے ہیں۔ کیونکہ سوائے رسم خط کے اِن دونوں زبانوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اور ہندستانی زبان تیسرے نمبر پر نہیں دوسرے نمبر پر ہے ....." یہ لکھ کر انھوں نے خود ہی اپنے دیے ہوئے ہندی کے اعداد و شمار اور ان کی بنا پر اس کے دنیا میں تیسرے نمبر پر ہونے کی نفی کر دی ہے۔

لیکن یہ لکھنے کے باوجود انھوں نے پہلے اردو اور ہندی کے علاحدہ علاحدہ اعداد و شمار دے کر ہندی کو تیسرے نمبر پر اور اردو کو تیرھویں نمبر پر رکھا ہے۔ اس طرح ہندستانی کو ہندی بنا دیا ہے حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ ہندستانی۔ بول چال کی آسان ہندی اور آسان اردو کا حسین امتزاج ہے اور میرے خیال میں ملک کے بہت بڑے حصّے میں سمجھی اور بولی جانے والی ہندستانی جس میں ہندی فلموں کی زبان بھی شامل ہے، ہندی کی نسبت اردو کے زیادہ قریب ہے۔ نیز ہندی اور اردو کو بندھے ہوئے سخت قوانین کے تحت دو مختلف زبانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ اردو اور ہندی Water Tight Compartments میں تقسیم کسی بھی طرح صحیح اور روا نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خالص (شُدھ) ہندی اور خاص کردہ ہندی جو گورنمنٹ کے دفتروں یا محکموں میں گڑھی جا رہی ہے یا آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن پر استعمال کی جاتی ہے۔ وہ ہندستان کے کسی بھی حصّے کے لوگوں کی مادری یا بول چال کی زبان نہیں ہے۔ سرکاری ہندی کی سنسکرت زدگی کے اثرات پر آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ چُبھتا ہوا فقرہ یادگار رہے گا جو انھوں نے ایک پریس کانفرنس (جنوری ۱۹۶۱ء) میں آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبروں پر کیا تھا۔ کسی سوال کے جواب میں کہنے لگے "بعض مرتبہ یہ لوگ (آل انڈیا ریڈیو والے) میری ہندی تقریروں کو ایسی ہندی میں ترجمہ کر کے سناتے ہیں کہ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ بھئی عام ہندی میں مجھے بتاؤ کہ میں نے کیا کہا ہے۔"

خالص اور سلیس اردو بولنے والے تو آج بھی آپ کو دہلی کے چاندنی چوک کے کٹروں۔ جامع مسجد کے اِرد گرد کی گلیوں۔ دریا گنج، ترکمان گیٹ، اجمیری گیٹ، حوض رانی اور بلّی ماران کے اندرونی گلی کوچوں میں اور اوکھلا و مہرولی اور حضرت نظام الدین

کے اس پاس کی بستیوں میں مل جائیں گے اور دہلی کے علاوہ بھی آپ کو یہ سلیس زبان بولنے والے ملک کے کئی حصوں مثلاً پرانے بھوپال، رام پور، مرادآباد، آگرہ، لکھنؤ، مرشد آباد، پٹنہ، حیدرآباد دکن کے کچھ حصوں میں ضرور مل جائیں گے لیکن عوام میں آپ کو سلیس ہندی بولنے والے کہیں نہیں ملیں گے۔ شدھ ہندی تو زعفران برگیڈ کے پرچارک اور دھارمک سنسکرت گرنتھوں کی کتھا کرنے والے پنڈت اور کتھا واچک ہی بولتے ہیں۔

ہندی کے اعداد و شمار میں سارے شمالی ہندستان کو شامل کیا گیا ہے لیکن بڑے شہروں کو چھوڑ کر جہاں ان شہروں کی خصوصی ہندستانی (ہندی- اردو) زبان بولی جاتی ہے۔ (ممبئی میں بولی جانے والی زبان کو بمبیّا ہندی یا بمبیّا اردو کہا جاتا ہے) شمالی ہندستان کے دیہات اور چھوٹے شہروں و قصبوں میں ہندی تو کیا ہندستانی بھی نہیں بولی جاتی۔ وہاں مقامی بولیاں برج بھاشا، اودھی، کھڑی بولی، ہریانوی، راجستھانی، گڑھوالی، بندھیل کھنڈ، بہاری، چھتیس گڑھی، میتھلی وغیرہ بولی جاتی ہیں جو ہندی اردو سے ملتی جلتی تو ہیں لیکن انھیں ہندی یا اردو نہیں کہا جا سکتا۔ جناب نند کشور وکرم نے ان سب زبانوں کے بولنے والوں کو اپنے اعداد و شمار میں شامل کیا ہے۔ مرکزی حکومت کے جہاں جہاں پبلک سیکٹر میں کارخانے قائم ہوئے ہیں اُن نئے بسے شہروں میں بھی آپس کی بول چال کی زبان ہندستانی ہے جو ہندی کی نسبت اردو سے زیادہ قریب ہے میں خود بھی ایک ایسے ہی ٹاؤن شپ "بھلائی"

میں رہا ہوں۔ شمالی ہندستان کے تمام بڑے شہروں میں تھوڑے بہت اختلافات کے ساتھ جو زبان بولی جاتی ہے وہ ہندستانی ہے ہندی نہیں ہے اور وہ ہندستانی اردو کے زیادہ قریب ہے۔

اسی طرح گو پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان اُردو ہے لیکن کراچی اور حیدرآباد سندھ کی چند مہاجر بستیوں کو چھوڑ کر پاکستان کے کسی بھی حصّے کے لوگوں کی مادری اور بول چال کی زبان اردو نہیں ہے۔ اِس لیے اردو کے اعداد و شمار میں پاکستان کی آبادی کا بہت ہی کم حصّہ شامل کیا جا سکتا ہے۔

ممبئی میں بنی تمام فلموں کی زبان جو ہندستانی ہوتی ہے وہ اردو کے بہت زیادہ قریب ہوتی ہے اور وہ ہندستان کے بہت بڑے حصے میں سمجھی جاتی ہے گو سنسر سرٹیفکٹ میں انھیں ہندی فلمیں ہی کہا جاتا ہے اور ہندی فلموں کے زیادہ تر گانے تو سلیس اردو میں ہی ہوتے ہیں اور یہ گانے سارے ملک میں پاپولر ہیں لیکن ریڈیو اور ٹی۔وی والے انھیں ہندی گانے ہی کہتے ہیں حالانکہ کچھ گیتوں کو چھوڑ کر جن میں شدھ ہندی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں زیادہ تر ہندی فلموں کے گانے اور غزلیں اردو میں ہی ہوتے ہیں لیکن انھیں بھی ہندی سرٹیفکٹ ہی ملتا ہے اور کئی تاریخی فلموں کے مکالمے بھی سلیس اردو میں ہوتے ہیں لیکن انھیں بھی ہندی سرٹیفکٹ ہی دیا جاتا ہے اس سلسلے میں جناب ڈاکٹر ابن فرید کے مکتوب میں (کتاب نما۔ ستمبر ۱۹۶) کے الفاظ ہی دُہرا لیجا

ہوں، اگر اکبر اعظم، شاہجہاں، انارکلی، پاکیزہ، امراؤجان وغیرہ فلموں کی زبان ہندی ہے اور جان نثار اختر، اختر شیرانی، راجا مہدی علی خاں، ساحر لدھیانوی، شکیل بدایونی وغیرہ کی فلمی شاعری ہندی ہے۔ تو ہم سنسر بورڈ کے اور آپ کے اعداد و شمار کی تردید کیسے کرسکتے ہیں....."

کئی اور فلمیں مثلاً مرزا غالب، صنم بے وفا، ہمایوں، انگور، سلسلہ، کبھی کبھی، بازار، سویرا وغیرہ بھی مذکورہ بالا فلموں کی لسٹ میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح مجروح سلطان پوری، ندا فاضلی، کیفی اعظمی، گلزار، جاوید اختر، شمیم، آنند بخشی، اختر الایمان ساگر سرحدی، وغیرہ اردو شاعری و مکالمہ نگاروں کو فلمی ہندی ادیبوں کی لسٹ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے کئی پرانے شاعروں میر، غالب، مومن، ذوق، آرزو، بہادر شاہ ظفر وغیرہ کی غزلوں کا بھی فلموں میں کثرت سے استعمال ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ یہی نہیں جگجیت سنگھ، غلام علی پیناز مسانی، پنکج اداس وغیرہ کی خالص اردو غزلوں کو بھی ٹی وی والے ہندی گانوں کی لسٹ میں شامل کرتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ آزادی کے بعد کے حالات اور گورنمنٹ کی سرکاری اسکولوں میں اردو میڈیم کو ختم کرنے کی پالیسی کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے بعد اردو رسم خط جاننے والوں کی تعداد میں کافی کمی آئی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔

میں اردو کے مستقبل کے بارے میں مایوس نہیں ہوں لیکن اعداد و شمار کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

● ڈاکٹر ناشر نقوی، شعبۂ اردو فارسی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ۔ پنجاب۔

کتاب نما (نومبر ۹۶ء) کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ اپنے منفرد اور مخلص طرز میں کتاب نما کا کوئی ثانی نہیں۔ ظہور الاسلام صاحب کا اشاریہ جو مادری زبان اور اردو کی تعلیمی اہمیت پر ہے، اردو والوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ خامہ بگوش کے قلم کی تو جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس بار کمزور شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے اس نے عجیب سا لطف دیا۔ مجتبیٰ حسین نے محمود مرزا کی موسیقی اور ان کی شخصیت کا جو قلمی احاطہ کیا ہے وہ مجتبیٰ حسین کے فن کی مثال ہے۔ کلاسیکی موسیقی کی اصطلاحیں مزاحیہ انداز میں معلوماتی طور پر بہترین ڈھنگ سے پیش کی گئی ہیں۔ شعری حصے میں شمیم جے پوری، رفیعہ شبنم عابدی، ذکی طارق، ملک زادہ جاوید نے متاثر کیا۔

● محمد رشید الدین ۱۲۲/A/۸۲۳-۲-۱۲ سنتوش نگر کالونی، مہدی پٹنم، حیدرآباد ۲۸۔

"حسب ذیل خط ایک غیر اردو داں کا ہے جن کی مادری زبان تلگو ہے اور رشید الدین صاحب کا موسومہ ہے جنھوں نے اکتوبر کے اشاریہ کے حوالے سے تلگو کا جو حال بیان کیا ہے وہ دلچسپی اور تعجب سے خالی نہیں۔ اس لیے اسے

ہم رشید الدین صاحب کے شکریہ کے ساتھ من وعن شائع کر رہے ہیں۔"

محترم رشید الدین صاحب

آداب عرض ہے۔ آپ کا مضمون "زبان یا ادب" اکتوبر کے کتاب نما میں پڑھا جس میں آپ اردو کی موجودہ حالت پر کامل نقشہ کھینچا آپ کے خیالات سے میں بالکل متفق ہوں۔ کم و بیش تلگو بولنے والوں کا بھی یہی حال ہے تیلگو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہونے سے بظاہر بیمار کا حال اچھا معلوم ہوتا ہے۔ حیدرآباد کے تلگو جامعہ کو دیکھیے۔ وہاں پر پڑھنے والوں کی تعداد برائے نام ہے۔ چاہے اردو بولنے والے ہوں یا تلگو بولنے والے، ان کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ گئی ہے کہ مادری زبان میں پڑھنے سے ہمارا مستقبل مضر رہے گا۔ لہذا ہمیں انگریزی کا ماہر بننا چاہیے حالانکہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ انگریزی پڑھنے سے ان کا مستقبل روشن ہوگا۔ ماہر نفسیات لاکھ کہیں کہ مادری زبان میں پڑھنے سے جس قدر آسانی سے ترقی کر سکتا ہے۔ دیگر زبانوں کے ذریعہ نہیں ہو سکتا پر بھی کوئی ماننے کو تیار نہیں مختصر یہ کہ ان لوگوں کو کس طرح اپنے مادری زبان کے طرف ترغیب دی جائے۔ مجھے تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ البتہ اس چیز کا یقین دلوایا جا سکتا ہے کہ زبان اور ذریعہ معاش دونوں بالکل الگ الگ ہیں۔ حیدرآباد جیسے شہر میں اردو رسائل نہیں ملتے۔ پورے شہر کی گشت لگانا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ ہمارے ملک میں زیادہ ہے چونکہ ہمارے ہاں کئی زبانیں ہیں ہر ایک ریاست ایک ملک ہے اور زبانوں کے بنیاد پر بٹا ہوا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بلیوں کے جھگڑے میں بندر کا فائدہ۔ انگریزی بندر کی جگہ لے لیا ہے۔

نوٹ۔ اردو کے غلطیوں کو نظر انداز کیجیے۔ چونکہ آپ حیدرآباد میں ہیں اس لیے راست آپ کو ہی لکھ رہا ہوں۔

مخلص

کے، راما راؤ

سی ۹۱۔ وربے رام نگر، حیدرآباد ۴۴

● قمر الہدیٰ فریدی، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کتاب نما (نومبر ۱۹۹۶ء) نظر نواز ہوا۔ رسالہ حسب معمول بھرپور ہے۔ مضامین، نظمیں، غزلیں خطوط، جائزے اور ادبی و تہذیبی خبریں وغیرہ وغیرہ۔ پروفیسر عتیق اللہ کا مضمون حاصل شمارہ ہے۔ انھوں نے فاروقی کے قصیدۂ شہر آشوب کا بجا طور پر خصوصی ذکر کیا ہے۔ رضا نقوی واہی کی نظم اور خامہ بگوش کی سدا بہار تحریر بھی مزا دے گئی۔ "شمع اور پروانہ" میں ہر چند کہ سائنسی معلومات فراہم کی گئی ہیں لیکن موضوع کچھ ایسا ہے کہ ادب کے قارئین اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن "صحت اور زندگی" ... جیسے مضامین دلکش انداز بیان، اعلا معیار اور اہمیت کے باوجود غالباً کتاب نما کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے۔

ادبی و تہذیبی خبریں

ڈاکٹر ظہور قاسم نے علی گڑھ میں کمپیوٹر پر کنونشن کا افتتاح کیا

علی گڑھ ۔ ۲۸ ستمبر ۔ ممتاز سائنس داں اور پلاننگ کمیشن کے سابق رکن پروفیسر سید ظہور قاسم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کمپیوٹر تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے سے متعلق دو روزہ نیشنل کنونشن کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ آج کا دور انفارمیشن ٹکنالوجی کا دور ہے اور ایک منٹ میں تیس ہزار الفاظ کو دنیا کے کسی بھی علاقے میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور سائنس کی تحقیق کا بنیادی مقصد بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے اور جیسے جیسے سائنس ترقی کے منازل طے کرے گی اسی طرح عوام میں خوش حالی آئے گی۔ انھوں نے کہا کہ این سی ای آر ٹی نے اب چھٹی جماعت سے ہی طلبہ کو کمپیوٹر کی تعلیم مہیا کرانے کے لیے نصاب تیار کیا ہے تاکہ اسکول سطح سے ہی بچوں کو کمپیوٹر کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ کمپیوٹر کی تعلیم سے نوجوانوں کو روزگار کے بہتر مواقع فراہم ہو رہے ہیں۔

انھوں نے مسلم یونی ورسٹی میں انڈسٹریل انفارمیشن کے چار سالہ کورس کو شروع کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس کورس سے کمپیوٹر کی تعلیم میں ایک انقلاب برپا ہوگا اور طلبہ کو اپنے مستقبل کو سنوارنے کے بہتر مواقع فراہم ہوں گے۔ مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر جناب محمود الرحمٰن نے افتتاحیہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ طلبہ کو روزگار کے مواقع فراہم کرانے کے لیے قلیل المدت اور طویل المدت پیشہ ورانہ کورس شروع کیے جا رہے ہیں اور یونی ورسٹی میں انٹرنیٹ کی سروس بہت جلد شروع ہو جائے گی تاکہ کمپیوٹر کے ذریعے اس ادارے کا رشتہ پوری دنیا سے قائم ہو سکے۔ مورچہ کے ترجمان مسٹر نیپال ریڈی نے کہا کہ روزگار پر مبنی تعلیم کی سفارش کوٹھاری کمیشن نے کی تھی۔ کمپیوٹر کی تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانا وقت کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس موقع پر سائنس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر سعید الظفر چغتائی کمپیوٹر سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر اکرام حسین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مسلم سائنسدانوں کو انجمن برائے فروغ سائنس کے اعزازات

شمیم جے راجپوری، ابرار مصطفٰے اور مہدی حسن فیلو منتخب

نئی دہلی ۔ ۲۴ اکتوبر ۔ جامعہ ہمدرد کے کنونشن ہال میں آج مسلم انجمن برائے فروغ سائنس کی جانب سے ملک کے نامور سائنس دانوں کو اعزازی فیلوشپ دی گئی اور نوجوان سائنس دانوں کو اعزازات پیش کیے گئے۔ اس موقع پر ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈا منٹل ریسرچ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ویریندر سنگھ نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی، دوسرے معزز مہمانوں میں کوویمپو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر جینندر گوڈ اور جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر پروفیسر علاء الدین احمد

شامل تھے۔ انجمن کے صدر، نائب صدر اور معتمد اعزازی نے انجمن کا تعارف کراتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔

اس موقع پر پروفیسر ویریندر سنگھ (ڈائرکٹر ٹی آئی ایف آر) اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر مہدی حسن، پروفیسر ابرار مصطفیٰ خاں اور پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری کو انجمن کا اعزازی فیلو منتخب کیا گیا اور ڈاکٹر شاہد جمیل (انٹرنیشنل سنٹر فار جینٹک انجینیرنگ اور بایو ٹکنالوجی، نئی دہلی)، ڈاکٹر انور لقمان بلگرامی (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی)، اور ڈاکٹر شیر علی (نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف امیونالوجی، نئی دہلی) کو نوجوان مسلم سائنس داں کے اعزازات پیش کیے گئے۔

عربی، فارسی اور اردو کے اسکالروں کی عزت افزائی

حیدر آباد۔ ۳ر نومبر، صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کل شام یہاں آندھرا پردیش کی وزارت برائے مائنارٹی ویلفیر (بہبودیٔ اقلیت) کی جانب سے راشٹرپتی نیلایم میں منعقدہ ایک تقریب میں عربی، فارسی اور اردو کے اسکالروں کی عزت افزائی کی۔

جن اسکالروں کی عزت افزائی کی گئی وہ ہیں۔ جناب مولانا سید طاہر رضوی، مفتی محمد عظیم الدین، پروفیسر محترمہ سعیدہ مہرالنساء (عربی) ڈاکٹر رحمت علی خاں، پروفیسر رفیق فاطمہ، رضیہ اکبر، پروفیسر پی ایم یعقوب عمر (فارسی) پروفیسر محترمہ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر محترمہ زینت ساجدہ اور پروفیسر غلام عمر خاں (اردو)

ڈاکٹر اسلم پرویز کی انگریزی کتاب کی تقریب رونمائی

اردو زبان ہند ایرانی مشترکہ تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ زبان کو کسی فرقے، ملک، اور مذہب سے جوڑنا ایک خطرناک رجحان ہے اور یہ زبان کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار عزت مآب علی رضا شیخ عطار (سفیر جمہوریہ اسلامیہ ایران) نے انجمن ترقی اردو (ہند) اور محمد عبدالسلام فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ڈاکٹر اسلم پرویز کی انگریزی کتاب

"THE ADAPTATION OF THE PERSO-ARABIC SCRIPT FOR URDU, PUNJABI AND SINDHI"

(اردو، پنجابی اور سندھی کے لیے عربی، فارسی رسم خط کا استعمال) کی رسم اجرا کی تقریب میں کیا جو اردو گھر، نئی دہلی میں ۹ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو شام ۶ بجے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ کتاب کی رسم اجرا سفیر موصوف کے ہاتھوں انجام پائی۔

عزت مآب علی رضا شیخ عطار نے کہا کہ ڈاکٹر اسلم پرویز کی یہ کتاب اپنے موضوع پر اہم ترین کتاب ہے اور اگر میری اطلاع غلط نہیں ہے تو اس موضوع پر اس سے پہلے کسی اور نے نہیں لکھا۔ یہ کتاب ایک شاندار علمی کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے تعارفی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر اسلم پرویز کی یہ کتاب علمی اور تحقیقی کتاب ہے اور لسانیات کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے

یکساں مفید ہے۔

متین امروہوی صاحب نے اس موقع پر ایک قطعہ پیش کیا جس میں انھوں نے ڈاکٹر اسلم پرویز کو خراج تحسین پیش کیا۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ ڈاکٹر اسلم پرویز کی یہ کتاب اردو رسم خط کے سلسلے میں ایک بنیادی کام ہے۔ اردو رسم خط سے ہمارا صرف جذباتی رشتہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ تہذیبی و ثقافتی شناخت کی علامت بھی ہے۔

مشہور ماہر معاشیات اور محمد عبدالسلام فاؤنڈیشن کے چیرمین جناب علی محمد خسرو نے کہا کہ مجھے اس بات پر بہت خوشی ہے کہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے بہت خلوص، لگن اور دیدہ ریزی سے یہ کام کیا ہے۔ اس کے لیے میں ڈاکٹر اسلم پرویز کو مبارک باد دیتا ہوں۔ خسرو صاحب نے محمد عبدالسلام فاؤنڈیشن کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر مختصر روشنی ڈالی۔

پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ ڈاکٹر اسلم پرویز نے بہت اہم موضوع پر کام کیا ہے اور اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر اسلم اصلاحی نے کہا کہ اس کتاب کو پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں اردو، عربی اور دوسری زبانوں کے درمیان دوری کو ختم کرنے میں اس کتاب سے بہت مدد ملے گی۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے تمام مقررین اور شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے ادبی سفر اور اس کتاب کے سلسلے میں کچھ وضاحتیں کیں اور یقین دلایا کہ میں اس کام کو مزید آگے بڑھاؤں گا۔

ماہر اقبالیات اور صدر جلسہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ہند اور ایران کی تہذیب و ثقافت ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ان کے درمیان ایک روحانی رشتہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ اچھی اردو جاننے کے لیے اچھی فارسی کا بھی جاننا ضروری ہے۔

ناظم اجلاس جناب احمد سعید نے کہا کہ ڈاکٹر اسلم پرویز خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے عادی ہیں۔ شہرت اور ناموری سے بے نیاز ہیں۔

آخر میں جناب اطہر فاروقی نے تمام مقررین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور اسی کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

شفیقہ فرحت کی نظم کو اعزاز

مریم لنڈبرگ میموریل فاؤنڈیشن اسرائیل کے شعر برائے امن ۱۹۹۶ء کے مقابلے میں ڈاکٹر شفیقہ فرحت کی بلاعنوان نظم (جس کی پہلی لائن تھی "میرا بچپن چھپا تھا") کو جیوری نے اعزازی تحسین کا مستحق قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں فاؤنڈیشن کے چیرمین پروفیسر اسینڈگ نے ڈاکٹر شفیقہ فرحت کو مبارک باد کا خط لکھا ہے۔ یہ نظم "وائس آف اسرائیل" کے خصوصی شمارہ میں بھی شائع ہوگی۔ جیوری نے اپنے فیصلہ میں لکھا ہے کہ نظم گی

کی حامل یہ نظم اس کی نشاندہی کرتی ہے کہ جب تک دنیا کی نصف آبادی آزاد نہیں ہوگی پائیدار امن والی سوسائٹی قائم نہیں ہو سکے گی۔

ایم پی اردو اکادمی کی ملا رموزی صدی تقریبات

مدھیہ پردیش اردو اکادمی گلابی اردو کے موجد ملا رموزی کی صدی تقریبات ان کے شایانِ شان منائے گی۔ صوبے کے دوسرے ادبی ادارے بھی اس سلسلے میں پروگرام بنا رہے ہیں۔

پچھلے دنوں اردو اکادمی نے تقریبات کے انعقاد کے سلسلے میں ایک نشست کا اہتمام کیا تھا جس میں راجدھانی کے مختلف ادبی و تہذیبی اداروں نے شرکت کی تھی جن میں جن وادی لیکھک سنگھ کے جنرل سکریٹری رام پرکاش تریپاٹھی، پرگتی شیل لیکھک سنگھ کے صدر بھگوت راوت، انجمن ترقی اردو بھوپال کے صدر دیوی سرن، مرکز ادب کے روح رواں عشرت قادری اور دوسری انجمنوں کے نمائندے شریک تھے۔ اکادمی کے سکریٹری پروفیسر آفاق احمد نے بتایا کہ صدی کے دوران اردو اکادمی ایک سمینار ملا رموزی اور ان کے عہد پر منعقد کرے گی۔ ایک مزاح نگاروں کی کانفرنس اور مشاعرہ، اور ملا رموزی کے فن اور ان کی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل دو کتابیں شائع کی جائیں گی۔

اس سلسلے کا پہلا جلسہ جن وادی لیکھک سنگھ نے کیا اور ملا رموزی کی شخصیت و خدمات پر ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر پروفیسر اکشے کمار جین اور جن وادی لیکھک سنگھ کے صدر پروفیسر آفاق احمد نے روشنی ڈالی۔ منتخب شعرا کا ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔

رشید انجم کے اعزاز میں نشست

"انجمن تحسین باہمی"، جامعہ نگر کی ایک نشست ۱۶ر نومبر ۱۹۹۶ء بروز سینچر ڈاکٹر دہاج الدین علوی کے دولت کدے پر بھوپال سے تشریف لائے مہمان جناب رشید انجم کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت جناب تصدّق حسین (استاد جامعہ سینیر سکنڈری اسکول) نے فرمائی۔

جناب رشید انجم کا شمار اس صدی کے ربع آخر کے ابھرتے ہوئے ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ بائیس ڈراموں کے خالق ہیں جن میں "فرعون"، "صلیب زندہ ہے"، اور "قطرہ قطرہ زندگی"، کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ ڈرامے ریڈیو سے نشر اور اسٹیج ہو چکے ہیں۔ ان کے دو ڈرامے "فاصلوں میں بٹی زندگی"، اور "شجاع الدولہ"، کتابی شکل میں جلد ہی منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ رشید صاحب "سمجھوتہ" اور "گل مہر"، جیسے اخبارات کی ادارت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اداکاری اور رقص کے فن رموز پر رشید صاحب کی گہری نظر ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی ادبی خدمات پر گفتگو نشر ہو چکی ہے۔ تقریباً چھے کتابوں کے ترجمے بھی وہ کر چکے ہیں۔ اور فلموں کے اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت

سے بھی مشہور ہیں۔

اس نشست میں رشید صاحب نے اپنے زیر طبع ڈرامے شجاع الدولہ کا ایک منظر پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے ڈرامے کے اس منظر کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے "عتاب" کے عنوان سے ایک کہانی پیش کی۔ اس پر بھی گفتگو ہوئی۔ شعری دور میں سہیل احمد فاروقی، اور ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر شبیر رسول نے کلام سنایا۔

آخر میں صدر محترم نے بھی اپنے مخصوص ترنم میں چند اشعار سنائے۔

انجمن تحسین باہمی کی اگلی نشست میں جامعہ اور قرب وجوار کے کئی شاعروں اور ادیبوں کی شرکت متوقع ہے جس کی روداد قارئین کی نذر کی جائے گی۔

رپورٹ: احسن نظامی، ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵

شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی میں مخطوطہ شناسی و تدوین متن پر نظام اردو خطبات

۶ر نومبر ۱۹۹۶ء، جلسہ کا آغاز کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر عبدالحق نے اپنے تعارفی کلمات میں پروفیسر نذیر احمد کے وقیع علمی و تحقیقی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کی شخصیت علم و ادب کا ایک روشن باب ہے۔ آپ نے تحقیق و تدوین کے معیار کو بلند کرنے میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ ہمیشہ استفادہ کا موجب ہوگا۔

پروفیسر نذیر احمد نے اپنے خطبہ میں مشرق و مغرب کے حوالے سے تحقیق و تدوین کی اہمیت کو واضح کیا اور یہ فرمایا کہ مغرب میں تحقیق کو جو معیار و اہمیت حاصل ہے وہ بدقسمتی سے مشرق میں نظر نہیں آتی۔ یہاں بیشتر صاحب علم تحقیق و تدوین متن کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتے جبکہ صحیح متن تک رسائی حاصل کرنا اور اسے منظر عام پر لانا از حد ضروری ہے۔ آپ نے مزید فرمایا کہ یہاں تدوین متن کے تعلق سے عام طور پر مصنف کے آخری زمانے کی تحریر یا کلام کو معیار بنایا جاتا ہے جبکہ کسی انسان کی تحریر اس کے بدلتے ہوئے مزاج اور بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اکثر بدلتی رہتی ہے۔ لہٰذا تدوین متن کے سلسلہ میں مصنف کی عمر کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور اگر اس کے یہاں کوئی خامی یا کمزوری ہے تو محض اس لیے کہ وہ نام بڑا ہے لہٰذا ایسی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس کے علاوہ انھوں نے کتابت کی غلطیوں کے ساتھ ساتھ تحریر کے فرق اور اس کی صحیح خواندگی پر زور دیتے ہوئے تحشیے اور تالیفات کی اہمیت و افادیت کو بھی اجاگر کیا۔

پروفیسر ایس ایس رانا ڈین آف کالجز، دہلی یونی ورسٹی نے اپنے صدارتی کلمات میں نذیر احمد کے خطبہ کی افادیت و اہمیت کو تسلیم کیا اور مشرق میں تحقیق کی کم مائیگی کا اعتراف کیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے پروفیسر نذیر احمد اور دیگر شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ کی وقیع علمی شخصیت کا اعتراف کیا اور مزید فرمایا کہ پروفیسر نذیر احمد نے تحقیق و تدوین کے بنیادی مسائل اور اہم

مسائل کو جس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے اس خطبہ کے نقوش ہمارے دلوں میں تادیر جاگزیں رہیں گے۔ اس جلسہ میں شعبۂ اردو کے علاوہ فارسی، عربی، سنسکرت، ہندی پنجابی اور دیگر جامعات و کالجز کے اساتذہ و اسکالرز شریک ہوئے۔

صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر امیر عارفی کے اعزاز میں جلسہ

۱۴ نومبر ۱۹۹۶ کو شعبۂ اردو کے نئے صدر پروفیسر امیر عارفی کے اعزاز میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا اس اعزازیہ جلسہ میں پروفیسر عبدالحق کو سبکدوش ہونے پر خراج تحسین بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ابن کنول نے اپنے الوداعیہ کلمات میں پروفیسر عبدالحق کے کاموں کو سراہا اور پروفیسر امیر عارفی کا استقبال کرتے ہوئے آئندہ ان کے کاموں کو جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے بھی پروفیسر عبدالحق کے کاموں کو سراہا اور شعبہ کی ترقی اور اسے ہمہ جہت بنانے کے لیے انھوں نے جو نمایاں کام کیے اسے مستحسن قرار دیا۔ پروفیسر شمیم نکہت نے اپنے الوداعیہ کلمات میں فرمایا کہ عبدالحق صاحب نے شعبہ میں اشتراک و اتفاق کا جو ماحول قائم کیا تھا وہ آگے بھی جاری رہے گا انھوں نے نئے صدر کو نئے منصب پر فائز ہونے پر مبارکباد پیش کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے عبدالحق صاحب کے کاموں کو یاد کیا اور یہ کہا کہ انھوں نے سمیناروں اور نظام خطبات کی سابقہ روایات کو جس طرح برقرار رکھا امید ہے موجودہ صدر اسے اور آگے بڑھائیں گے۔ ڈاکٹر شریف احمد نے شعبہ کے اساتذہ کی محبتوں اور کارناموں کا ذکر کیا۔ فاروقی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ پروفیسر عبدالحق نے یقیناً سابقہ روایات کو آگے بڑھایا ہے اور موجودہ صدر اسے اور آگے بڑھائیں گے تاکہ شعبہ کا نام اور روشن ہوسکے۔ پروفیسر عبدالحق نے نئے صدر کا استقبال کرتے ہوئے اپنے ماضی کو یاد کیا اور شعبہ کے اساتذہ اور دیگر اراکین کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ صدر شعبہ پروفیسر امیر عارفی نے فرمایا کہ وہ کاروان فاروقی کے آخری فرد ہیں کیونکہ ان کی تقرری فاروقی صاحب کے ہاتھوں ہوئی تھی انھوں نے مزید فرمایا کہ فاروقی صاحب کے کارناموں اور شخصیت کو یاد کرکے جی لرز اٹھتا ہے کیونکہ انھوں نے جو معیار قائم کیا تھا وہ خاصا بلند ہے لیکن باوجود اس کے میں اس معیار کو قائم رکھنے کی کوشش کروں گا تاکہ شعبہ کا وقار بلند ہوسکے۔ انھوں نے تمام شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا۔ طلبہ کی طرف سے سابق صدر پروفیسر عبدالحق اور موجودہ صدر پروفیسر امیر عارفی کی خدمت میں گلدستے پیش کیے گئے۔ اس جلسہ میں اساتذۂ کرام کے علاوہ شعبہ کے طلبہ و اسکالرز نے شرکت کی۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام یاور عباس اور حمیدہ یاور عباس کو استقبالیہ

ممبئی ۵ نومبر، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے زیر اہتمام لندن سے آئے ہوئے مہمان جناب

یاور عباس اور محترمہ حمیدہ یاور عباس کو استقبالیہ، خلافت ہاؤس بائیکلہ میں دیا گیا۔

اکادمی کے کارگزار چیرمین ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے مہمانوں کا خیر مقدم اور تعارف پیش کیا، انھوں نے بتایا کہ یاور عباس ایک عرصے تک بی بی سی سے وابستہ رہے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے اردو سے متعلق کئی ڈاکیومینٹری فلمیں بنائی ہیں جو بے حد مقبول ہوئی ہیں، حمیدہ یاور عباس ہائیڈل برگ یونی ورسٹی میں اردو کی لکچرار رہی ہیں۔ اس موقع پر اکادمی کے جریدے امکان کے خصوصی شمارے دلت سواگت کی رسم رونمائی ممتاز شاعر نرائن سروے کے ہاتھوں انجام پائی۔ نرائن سروے نے اکادمی کو مبارکباد پیش کی اور فرمایا کہ آج کے حالات میں ادب کا آدان پردان بہت ضروری ہے اور اکادمی کا یہ کام قابل قدر ہے۔

مہمان یاور عباس نے فرمایا کہ پہلے بی بی سی ادبی، ثقافتی اور تہذیبی ادارہ تھا مگر اب اس کا کلچر بدل چکا ہے۔ انھوں نے اپنا مقالہ جوش کے دو عشق بھی پیش کیا۔ سردار جعفری نے اپنے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ آج تہذیب کا مزاج بدل چکا ہے۔ اقدار میں تیزی سے تبدیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم جوش اور مجاز جیسے شاعروں کو فراموش کر چکے ہیں جوش کو سمجھنے کے لیے ہمیں چالیس سال پیچھے لوٹنا پڑے گا۔ جوش نے ہماری کلاسیکی زبان کی بلند ترین سطح سے شعر کہے ہیں ان کی بازیافت کی ضرورت ہے۔ رومانی شاعری کے زیر اثر ہم اپنے کلاسیکی ادب کا صحیح ادراک نہ پیدا کر سکے، انھوں نے تجویز پیش کی کہ ۲۰۰۰ء میں بڑے پیمانے پر جوش صدی منائی جائے۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر نے مہمانوں کا شکریہ ادا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر انور جمال قدوائی کو خدا بخش ایوارڈ، راشٹرپتی بھون میں مرحوم کے بیٹے نے ایوارڈ لیا۔

نئی دہلی۔ ۲۴ ستمبر، صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے آج اہل وطن سے ان قوم دشمن طاقتوں کا متحد ہو کر مقابلہ کرنے کی اپیل کی ہے جو اپنے مفادات کے لیے ملک میں علاحدگی پسندی کو ہوا دیتی ہیں۔

ڈاکٹر شرما آج راشٹرپتی بھون میں منعقد ایک تقریب میں سال ۹۴-۱۹۹۳ء اور ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے خدا بخش انعامات پیش کر رہے تھے۔ ہندستان مشترک تہذیب کو فروغ دینے کے لیے خدا بخش انعامات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر مسٹر انور جمال قدوائی کو بعد از مرگ دیا گیا جبکہ قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے سمیدرا جوشی کو انعام دیا گیا ہے۔ صدر محترم نے پٹنہ میں واقع خدا بخش لائبریری کی تعریف کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ سرکار اسے پوری مدد دے گی۔ اس موقع پر انسانی وسائل کے فروغ کے وزیر ایس آر بومئی، وزیر زراعت چترانن مشرا، خدا بخش لائبریری بورڈ کے چیرمین بہار کے گورنر اخلاق الرحمان قدوائی اور خدا بخش لائبریری کے نئے ڈائرکٹر حبیب الرحمٰن چگانی بھی موجود تھے۔ تقریب میں مدھیہ پردیش کے گورنر محمد شفیع قریشی پانڈیچری کی گورنر راجندر کماری باجپئی اور بڑی تعداد میں [illegible]

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵ میں

رام لعل راہی کی رحلت پر تعزیتی جلسہ

نئی دہلی۔ ۳۰ اکتوبر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے معروف افسانہ نگار رام لعل راہی کی رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں شعبۂ اردو کے علاوہ جامعہ کے دیگر شعبوں کے اساتذہ و طلبہ نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) نے کی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے رام لعل کی مجموعی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ادیب اور فنکار ہی نہیں تھے بلکہ اردو تحریک کے پر زور قائد اور کئی اداروں کے سربراہ بھی رہے وہ اگرچہ طویل العمری کے باعث ترقی پسند اور جدید ادوار سے گزرے ہیں لیکن انھوں نے کسی پارٹی یا جھنڈے یا خیمے میں پناہ گزیں ہونا پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ آزادانہ طور پر حقائق کا تخلیقی سطح پر انکشاف کرتے رہے۔ آفاق صاحب نے جناب رام لعل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ان کی افسانوی تخلیقات کا طویل سلسلہ ہے لیکن وہ اپنی ۲۰ یا ۲۲ شاہکار کہانیوں کی بنا پر ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ وہ متواتر کام کرتے رہے لیکن ان کے تمام کام صلہ و ستایش کی تمنا سے بے نیاز رہے۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی (ڈائرکٹر اکیڈمک اسٹاف کالج) نے کہا کہ رام لعل کی ادبی شناخت تہذیبی قدروں سے قائم ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع ہی انسان دوستی رہا۔ ان کی تخلیقات پر ریلوے کے ماحول اور سفر کی گہری چھاپ ہے۔ ڈاکٹر شمس الحق عثمانی صاحب نے ان کے بعض افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ طول کلامی ان کی ناکامی رہی لیکن ان کے افسانوں کا بیانیہ ان کی کامیابی کا ضامن رہا۔ اسلم جمشید پوری نے ان کی شخصیت اور افسانہ کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے رام لعل کی حیات اور فن پر مضمون پڑھتے ہوئے شعبۂ اردو کی جانب سے تعزیتی قرارداد پیش کی۔ جس میں ان کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار، ان کی روح کے لیے سکون اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی گئی تھی۔ بعد میں دو منٹ کی خاموشی پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

ہر زمیں پر گویا آسمان میں بھی ہوں

نئی دہلی۔ آج مورخہ ۳ نومبر ۹۶ء کو خانقاہ شاہ ولایت جامعہ نگر نئی دہلی میں ایک عظیم الشان جلسہ اور مشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت وجدی برہان جبل پوری صاحب نے اور نظامت جناب دمی احمد دمی نے کی۔ اس مشاعرے کے اہتمام میں سکندر علی اور ڈاکٹر شبیر رسول نے خاص حصہ لیا۔ مشاعرے کے سرپرست اور خانقاہ کے بانی پروفیسر عنوان چشتی سجادہ نشیں حضرت شاہ ولایت منگلوری نے مشاعرے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ خانقاہ میں دو تہذیبوں اور دو قوموں کا خاص طور پر ملن ہوتا ہے۔ یہ

ایسا سنگم ہے جہاں ہندو اور مسلمان دل کھول کر ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں اس مشاعرے کے مہمان خصوصی علامہ سلطان نظامی اور مخلص قومی کارکن شریمتی سادتری شرماجی رہیں۔ اس مشاعرے میں پروفیسر عنوان چشتی، سلطان نظامی، بدر نظیری، حامل سنبھلی، وحدی برہان، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر خالد محمود، استاد ظہیر دہلوی، اعجاز انصاری، وصی احمد وصی، شہباز ندیم ضیائی، جاوید نشتر، سکندر عاقل، ریاض حنفی، دانش ایوبی، شعیب مرزا، شاداب امروہوی وغیرہ نے اپنے تازہ اور نو بہ نو کلام سے سامعین کا دل موہ لیا۔ خانقاہ شاہ ولایت کی طرف سے ماحضر پیش کر کے تواضع کی گئی۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہر شاعر کو خوب داد ملی اور وہ کامیاب و شادماں ہوا۔

کالی داس گپتا رضا کے ساتھ ایک شام

ممبئی کے ہم عصر ادیبوں کے فعال ادارے "ہم سب" نے اردو کے مستند و معتبر محقق اور نامور شاعر جناب کالی داس گپتا رضا کے ساتھ ایک ادبی شام کا انعقاد ۵ اکتوبر ۹۶ء کو انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہال ممبئی میں کیا۔ اس موقر نشست کی صدارت بلند پایہ محقق و ماہر لسانیات رشید حسن خاں صاحب نے فرمائی۔ نئی نسل کے معروف شاعر عبدالاحد ساز نے رضا صاحب کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری پر ایک تفصیلی مضمون پڑھا جسے انہماک کے ساتھ سنا گیا۔ جناب یوسف ناظم نے اپنے مخصوص انداز میں رضا صاحب پر ایک دلچسپ اور پر لطف خاکہ سنا کر محفل میں شگفتگی پیدا کر دی۔ جناب کالی داس گپتا رضا نے مختصراً اپنی تخلیقی و ادبی ترجیحات اور تحقیقی موضوعات کے انتخاب کے بارے میں بلکہ جامع باتیں گوش گزار کیں۔ اس کے بعد رضا صاحب سے حاضرین کے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں خصوصاً طلبہ نے غالب پر ان کے تحقیقی کاموں سے متعلق اہم سوالات کیے۔ روایت پسندی کے باوجود رضا صاحب کی غزلوں اور نظموں میں جدت کے عناصر کو بھی موضوع بحث بنایا گیا۔ غالب اور میر کی شاعری کے تقابل کے ضمن میں رضا صاحب کے موقف سے بیشتر حاضرین مطمئن نہیں تھے۔ صدر نشست نے اس تنازعے کے بارے میں کچھ مدلل باتیں کیں۔ بحث کے بعد رضا صاحب نے اپنی تازہ غزلوں سے شرکاء محفل کو نوازا۔ اس نشست میں اتفاقاً گیاہ سے آئے ہوئے معروف ادیب ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے بھی شرکت کی اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض پروفیسر انور ظہیر خاں نے انجام دیے۔

معروف ترقی پسند شاعر قمر زاہدی کا انتقال

معروف ترقی پسند شاعر جناب قمر زاہدی کا انتقال طویل علالت کے بعد ۱۰ ستمبر ۹۶ء کو صبح صادق ۳ بجکر ۱۵ منٹ پر ہو گیا۔ ان کی عمر ۷۲ سال تھی

اردو شاعری کی دنیا میں مرحوم قمر زاہدی اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے ایک خاص پہچان رکھتے تھے۔ ان کی شاعری اور ان کے مضامین نے ان کے بعد کی ادبی نسل کو بھی متاثر کیا۔ ان کی آخری رسومات عظیم آباد (پٹنہ) کی قبرستان میں ادا کر دی گئیں۔

مرحوم قمر زاہدی کو ان کے شعری مجموعہ "چشم نم" پر بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔

اک دیا اور بجھا

اردو کے مزاح نگار وجاہت علی سندیلوی کا انتقال ۹ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو سندیلہ میں ہوا۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے حامل تھے بڑے خوش مزاج اور ایسی شگفتہ گفتگو کرتے کہ سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے۔ وہ انجمن ترقی اردو اتر پردیش سے بھی وابستہ رہے۔ بچوں کے تخلیقی ادب سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ وجاہت علی سندیلوی صاحب یکم مارچ ۱۹۱۶ء کو سندیلہ میں پیدا ہوئے۔ زمیندار گھرانے سے تعلق تھا۔ ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے پاس کیا اس کے بعد ایل ایل بی کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ مونسپلٹی بورڈ کے ممبر رہے۔ اپنے قصبے کی ٹاؤن ایریا کے صدر منتخب ہوئے۔ اردو زبان سے بچپن سے شغف رہا۔ اردو میں آٹھ، نو کتابیں لکھیں جن میں "چھینک ایک برکت کی"، "دھوپ کی عینک" اور "رقص تماشائی" بہت مشہور ہوئیں۔ چالیس سال تک وکالت کا پیشہ جاری رکھا۔ اس کے بعد مستقل طور پر اپنے آپ کو اردو زبان میں پڑھنے لکھنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے انتقال سے اردو والوں کو جو صدمہ پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ ادارہ "کتاب نما"، مرحوم کے لیے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

چھپتے چھپتے

انقلاب کے سابق اڈیٹر ریاض احمد خاں کا انتقال

ممبئی۔ ۲۴ر نومبر، روزنامہ "انقلاب" کے سابق اڈیٹر ریاض احمد خاں کا آج یہاں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر ۶۲ برس کی تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کا انتقال وسطی ممبئی کے مجگاؤں علاقہ میں اسلامیہ اسپتال میں صبح تین بجے ہوا۔ ان کی تدفین کل صبح آٹھ بجے مجگاؤں کے ناریل واڑی قبرستان میں ہو گئی۔ انھوں نے ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۰ء تک انقلاب کی ادارت کی اس سے پہلے وہ ریاستی سرکار کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں اور ایک کتاب شکاریات پر لکھی۔ ان تمام کتابوں کو مختلف اکیڈمیوں نے انعامات سے نوازا۔ ریاض احمد خاں انتہائی ایماندار مخلص اور دوست نواز انسان تھے۔ مکتبہ جامعہ ممبئی برانچ اور اہل مکتبہ جامعہ سے موصوف کو گہرا لگاؤ تھا۔ اہل مکتبہ جامعہ انھیں اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے۔

بیانی احمد خاں کا اس طرح اچانک اٹھ جانا اہل مکتبہ جامعہ کا ذاتی غم بھی ہے۔ ادارہ مکتبہ جامعہ موصوف کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل خاندان کو اس صدمہ عظیم کو برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین

مکتبہ جامعہ کے ایک اور کارکن کا انتقال

۲۵ نومبر ۹۶ء، مکتبہ جامعہ علی گڑھ برانچ کے سابق منیجر جناب صابر علی بزمی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اناللہ..... موصوف نے طویل عرصے تک مکتبہ جامعہ کی خدمت کی۔ چند سال قبل علالت کے باعث ریٹائر ہو گئے تھے۔ بزمی صاحب بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کے مجموعے پر مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے انعام سے بھی نوازا تھا۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ادارہ مکتبہ جامعہ بزمی صاحب کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور موصوف کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ اہل خاندان کو اس غم کو برداشت کرنے کی توفیق فرمائے۔ آمین۔

اردو یونیورسٹی کے قیام کا بل منظور

نئی دہلی — ۲۷ نومبر، راجیہ سبھا نے آج کسی اختلاف کے بغیر حیدر آباد میں مولانا آزاد یونیورسٹی کے قیام کے بل کو منظوری دے دی۔ اس یونیورسٹی کے قیام کا مقصد زبان و ثقافت کا فروغ ہے۔ انسانی وسائل کے وزیر ایس آر بومئی نے ایوان کو یقین دلایا کہ یہ یونیورسٹی کسی تاخیر کے بغیر قائم ہو جائے گی۔ بل پر بحث کا جواب دیتے ہوئے مسٹر بومئی نے کہا کہ یونیورسٹی کے لیے چھ کروڑ روپے کی رقم پہلے ہی منظور کی جا چکی ہے۔ مسٹر بومئی نے کہا کہ اردو یونیورسٹی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے خطوط پر کام کرے گی اور اس میں خط و کتابت کے ذریعہ تعلیم کی بھی سہولت ہوگی۔ مباحثہ کے دوران نیشنل کانفرنس کے ممبر پروفیسر سیف الدین سوز نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ یونیورسٹی آندھرا پردیش میں قائم ہو رہی ہے جہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔

مغربی بنگال سے سی پی آئی ایم کے مسٹر محمد سلیم نے کہا کہ چونکہ اردو بولنے والوں کی اکثریت دستکاروں کی ہے لہٰذا یونیورسٹی کو ان کی ہنرمندی بڑھانے میں مدد کرنی چاہیے۔ مہاراشٹر سے آزاد ممبر سریش کیشوانی نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کے قیام سے مختلف فرقوں کے مابین پھوٹ نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ مسٹر بومئی نے واضح کیا کہ اردو یونیورسٹی کرناٹک، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر میں رہنے والے بہت سے ہندوؤں سمیت اردو بولنے والوں کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے قائم کی جا رہی ہے۔ مسٹر بومئی نے کہا کہ ان ریاستوں میں اردو میں تعلیم دینے والے پرائمری اسکولوں کی تعداد اتر پردیش جیسی شمالی ریاستوں سے زیادہ ہے۔ وہ واضح کر رہے تھے کہ یونیورسٹی کے قیام کے لیے حیدر آباد کا انتخاب کیوں کیا گیا۔

آج سے ۷۲ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۷۲ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعلِ راہ بھی بنایا۔ اردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ قلمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں۔ اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے

دسمبر ۱۹۹۶ء

یادداشت

* براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمایئے۔
* ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔
* اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوایئے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کر دی جائے گی۔
* اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔
* مصارف ڈاک و ریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔
* کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجیے۔
* کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اس وقت مقرر ہوگی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے دفاتر

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی 110025

ٹیلی فون 6910191

Tel Cum Fax No. (011)-6910191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی 110006

ٹیلی فون 3260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400002

ٹیلی فون 3762867

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

فون نمبر 406182

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نزد ڈاک خانہ جامعہ نگر نئی دہلی 110025

مطبع

لبرٹی آرٹ پریس ۲۸۰۱۵ پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی 110002

ٹیلی فون نمبر 3276018

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج نئی دہلی 110002 میں چھپوا کر شائع کیا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

جو رہی سو بے خبری رہی
(خود نوشت) ادا جعفری

بدایوں کی ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی کی اونچی دیواروں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ذہین اور حساس لڑکی کی آپ بیتی، جس کی حیثیت آج اردو شاعری میں خاتونِ اول کی ہے۔ قیمت 200/- روپے

اخلاقیات طبیب
حکیم محمد سعید

حقیقت یہ ہے کہ طبیب کے لیے علم میں مہارت جتنی ضروری ہے اتنی ہی ضروری اخلاقی رفعت بھی ہے۔ یہ کتاب اس دور میں طب کے ہر عامل اور ہر طالب علم کے لیے ایک اخلاقی معلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ہر طریقِ علاج کے عاملین کے لیے مفید اور معتبر
قیمت 20/- روپے

تصوف: رسم اور حقیقت
خواجہ حسن ثانی نظامی

تصوف کی تاریخ، صوفیہ کے نظامِ حیات، تعلیمات، ہندستانی سماج پر صوفیہ کے اثرات، اور ان سے بہت سے دوسرے سوالات پر روشنی ڈالنے والی اپنی نوعیت کی پہلی کتاب جس میں برصغیر ہند و پاک میں رائج جملہ صوفی سلسلوں کے مکمل شجرے بھی دیے گئے ہیں۔ قیمت 90/-

مستقبل کی طرف
مرتبین • خواجہ محمد شاہد • خالد کمال فاروقی

مولانا محمود حسن کے خطبۂ جلسۂ تقسیم اسناد (جامعہ ملیہ اسلامیہ) سے لے کر آج تک کے ایسے تمام تمام خطبات کا مجموعہ:

ایک اہم تاریخی دستاویز۔ قیمت 150/- روپے

قلم اور قدم
سید حامد

ہمارے تہذیبی، تعلیمی، لسانی، معاشرتی مسائل کا بے لاگ اور ہمدردانہ تجزیہ۔ ہمارے عہد کے ایک ممتاز دانشور اور سماجی مبصر کے قلم سے۔ ان مضامین کا اہم ترین پہلو جیتی جاگتی زندگی کے مسائل اور معاملات سے ان کا گہرا تعلق ہے۔
قیمت 75/- روپے

مفکرینِ تعلیم
ڈاکٹر محمد اکرام خاں

تعلیم کا کام درحقیقت پیغمبرانہ کام ہے اس اہم اور نیک کام کے لیے جن اہم ملکی و غیر ملکی ماہرانِ تعلیم نے اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کیا ہے اس کتاب میں ان کے خیالات ان کا فلسفہ، ان کی سوانح مختصر مگر جامع انداز میں پیش کی گئی۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔ قیمت 120/-

استادوں کی تعلیم اور تربیت (ایک زاویہ نگاہ)
مسعود الحق

مسعود الحق ایک صاحبِ مفکر معلّم ہیں۔ موصوف نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا ہے کہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر بیچز ایجوکیشن کے نظریے اور عمل میں کس قسم کی تبدیلیاں درکار ہیں اور کیوں؟ زیر تربیت اساتذہ کے لیے ایک نہایت اہم کتاب۔
قیمت 60/- ر

سرسید سے اکبر تک
مرتبین • شمیم حنفی • سہیل احمد فاروقی

سرسید اور ان کے عہد کا مطالعہ ہمارے اجتماعی حا

مستقبل کا مطالعہ ہے۔

قیمت -/90

سیاہ فام ادب

مرتبین : • شمیم حنفی • سہیل احمد فاروقی

ایک نئی، زندہ اور متحرک حسیت کا منظر نامہ۔ سیاہ فام جمالیات اور سیاہ فام ادب پر اردو میں اولین کاوش۔ آج کے ادبی مزاج کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

قیمت -/40 روپے

خامہ بگوش کے قلم سے

۱۹۸۴ تا ۱۹۹۰ کے طنزیہ مزاحیہ کالموں کا انتخاب جلد اول،

مرتبہ: مظفر علی سید

عہد حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالموں کا مجموعہ جس کا اردو والوں کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ صفحات تک بھگ ۳۵۰۔ قیمت مجلد -/150 عام اڈیشن -/80

انوار قرآن

(یعنی اسلامی تصوف کے حوالے سے قرآن فہمی کے چند پہلو)

پروفیسر نثار احمد فاروقی

یہ مضامین اگرچہ مختصر ہیں اس کے باوجود ان کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ ہمارے بزرگ صوفیا کو قرآن کریم سے کتنا گہرا شغف تھا اور اس کے لطیف نکات کو کیسے سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

قیمت -/15 روپے

رنگ، خوشبو، روشنی   قتیل شفائی

قتیل شفائی کی آواز شاعری کی اسی جادو اثری کی آواز ہے جس نے اندھیرے میں بھی ایک جوت جلا رکھی ہے قتیل شفائی کے چودہ شعری مجموعوں کا انتخاب۔ قیمت -/80

گاہے گاہے   رولینڈ لارنس

میری نظمیں، میری غزلیں

اردو کسی خاص مذہب یا کسی خاص طبقے کی زبان نہیں۔ یہ ان کی زبان ہے جو حساس دل رکھتے ہیں۔ لارنس ریاضی داں ہیں عیسائی مذہب کے پیرو ہیں۔ اردو میں تک بھگ ۴۰-۳۵ سال سے شاعری کر رہے ہیں۔ اشعار پڑھیں گے تو جھوم جھوم جائیں گے۔ اس شعری مجموعے کا مقدمہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے سپرد قلم کیا ہے۔ قیمت -/30 روپے

اشارات قلب   پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم

اشارات قلب میں ڈاکٹر سید اسلم صاحب نے سادہ و سلیس زبان میں دل کی صحت، تکالیف، اسباب متعلقہ مسائل نہایت اختصار کے ساتھ مع ضروری ہدایات کے پیش کیے ہیں۔ قیمت -/6

مولانا ابوالکلام آزاد   پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

(فکر و نظر کی چند جہتیں)

اس کتاب میں مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کے قومی و ملی محرکات کو نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً ان مضامین میں قارئین کو مولانا سے متعلق بعض نئی معلومات بھی ملیں گی۔ قیمت -/60 روپے

صحرا میں لفظ   فضیل جعفری

فضیل جعفری کا شمار آج کے عہد کے سنجیدہ اور ذمہ دار نقادوں میں ہوتا ہے۔ دور حاضر کے شاعروں پر لکھے ہوئے موصوف کے ۱۴ نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ -/90

جدید ادبی تحریکات و تعبیرات

ڈاکٹر سید حامد حسین

اس مجموعے میں ۲۲ مضامین شامل ہیں جو ۱۹۶۰ء سے

۱۹۹۲ء کے عرصے میں لکھے گئے ہیں اور اس دوران اردو کے ادبی منظر نامے میں جن تحریکات و تعبیرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے اُن کے بعض اہم پہلوؤں کو بحث کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔ قیمت 51/- روپے

طرازِ دوام
اختر سعید خاں

غزل کا فن نرم آنچ سے چلا پاتا ہے بھڑکتے شعلوں سے نہیں۔ وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا۔ ایک تبسم ہے ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشک کی نمی ہوتی ہے تو کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔ یہ ساری خوبیاں اس شعری مجموعے میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ قیمت 51/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ
ڈاکٹر مومن محی الدین

ڈاکٹر مومن محی الدین کا شمار جدید فارسی ادب کے اسکالرز میں ہوتا ہے موصوف نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ فارسی داستان نویسی کی تاریخ مرتب کی ہے جو مختصر بھی ہے اور جامع بھی۔ قیمت 45/-

سیر کر دنیا کی غافل .....
(سفرنامے) ڈاکٹر صغرا مہدی

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اردو دنیا میں اب کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مندرجہ بالا کتاب آپ کے پانچ سفرناموں کا مجموعہ ہے اس کتاب میں ڈاکٹر خالد محمود کا ان سفرناموں پر تبصرہ اور یوسف ناظم کا ایک دلچسپ خاکہ بھی شامل ہے
قیمت 51/-

ٹیلی ویژن نشریات
(تاریخ، تحریر، تکنیک) انجم عثمانی

اردو میں ٹیلی ویژن نشریات پر پہلی کتاب جو ایسے حضرات کے لیے نہایت اہم کتاب ہے جو ٹیلی ویژن کے لیے لکھنا یا کوئی اہم کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ 90/- روپے

کاسۂ خیال
(شعری مجموعہ)
عبدالمعروف خاں چودھری

معروف صاحب حقیقی شاعر ہیں جو خیال کو جذبے میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتے ہیں ان کے یہاں فکر اپنی تجریدی شکل میں نہیں ملتی۔ ان کا تسبیہی تخیل علامتوں استعاروں اور حسی پیکروں میں اپنی کارفرمائی دکھاتا ہے جس کا آپ بخوبی اندازہ اس شعری مجموعے کے مطالعے سے لگا سکتے ہیں۔ قیمت 51/-

انشائے غالب
مرتبہ: رشید حسن خاں

غالبیات کے ذخیرے میں بیش قیمت اضافہ

مرزا غالب نے ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر اپنی نثر و نظم کا انتخاب تیار کیا تھا۔ اس کا اصل خطی نسخہ جس کے بعض صفحات پر مرزا غالب کے قلم کی تصحیحات ہیں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) کے پاس محفوظ تھی انھوں نے اس کے حواشی لکھ لیے تھے لیکن مقدمہ نہیں لکھ پائے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد مالک رام صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا اور مزید حواشی لکھے۔ اب رشید حسن خاں نے اپنے مختصر پیش لفظ کے ساتھ اس انتخاب کو سارے متعلقات کے ساتھ مرتب کیا۔ آخر میں اصل خطی نسخے کا عکس بھی شامل ہے۔ قیمت 60/-

حضرت محمدؐ اور قرآن
ڈاکٹر رفیق زکریا

مترجم: ڈاکٹر مظفر محی الدین

ڈاکٹر رفیق زکریا کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ اس کتاب میں سلمان رشدی کے ناول "شیطانی آیات" کا مدلل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔ ۴۳۲ صفحات (زیرِ طبع)

پتھر کی دیوار
سردار جعفری

"پتھر کی دیوار" سردار جعفری کی جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ اس فصلِ بہار کا ثمر ہے جو اقبال اور جوش کے بعد اردو شاعری کا مزاج بدل رہی تھی۔ (پاکٹ اڈیشن) 15/- روپے

وسط ایشیا۔ نئی آزادی، نئے چیلنج

آصف جیلانی

سابق سوویت یونین کی نو آزاد مسلم جمہوریاؤں کے سفر کے تجربات و مشاہدات پر مبنی بی بی سی لندن کی اردو نشریات سے نشر ہونے والے سلسلہ وار پروگراموں پر مشتمل ایک دستاویز۔ قیمت ؍ 51

معیارِ اردو مرتبہ: نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

یہ کتاب زبان اردو کے محاورات کا مجموعہ ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ اور ریسرچ اسکالر محاورات کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ قیمت ؍21 روپے

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ ابراہیم یوسف

اس مجموعے میں اردو ڈرامے کی تنقید کے محرکات اور رجحانات جو ابتدا سے تاحال کارفرما رہے ہیں۔ پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت ؍ 45 روپے

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج (خطبات)

ڈاکٹر سید ظہور قاسم

ڈاکٹر سید ظہور قاسم کی تحقیق کا میدان بحریات ہے آپ بحر منجمد کی علمی مہم کے پہلے میر کارواں ہیں ان خطبات میں اس پر اسرار ارضی حصے کی دلچسپ داستاں بھی ہے اور سائنس کے مختلف شعبوں میں بتدریج ترقیوں کا تجزیہ بھی۔

قیمت ؍ 10

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم

پروفیسر اختر الواسع

پروفیسر اختر الواسع نے ۱۸ جون ۱۹۹۱ء کو انجمن اسلام بمبئی کی دعوت پر معین الدین حارث یادگاری سیرت لیکچر کے سلسلے میں مندرجہ بالا عنوان کے تحت جو خطبہ پیش

کیا تھا اسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

قیمت ؍10 روپے

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات

ڈاکٹر سید جمال الدین

زیر نظر کتاب میں اردو کے قاری کو ۹ بلند پایہ مورخین اور ان کے فن تاریخ نگاری سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ان میں یونان، عرب، جرمنی، برطانیہ اور ہندستان کے مورخین شامل ہیں۔ قیمت ؍51 روپے

محاوراتِ ہند سبحان بخش

بہ تصحیح و ترتیب: محبوب الرحمٰن فاروقی

محاورات کے اس مجموعے کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا اس میں دہلی کے گرد و نواح کے محاورے اکٹھا کر کے بہ حروف تہجی جمع کر دیے گئے ہیں۔

-/51

تذکیر و تانیث نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

جانشین امیر مینائی حافظ جلیل نے اس قیمتی کتاب کے ذریعے زبان اردو میں تذکیر و تانیث کا ایک فتاوی مدون کیا ہے۔ اس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث بتائی گئی ہے اہل اردو کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ قیمت -/75 روپے

عبارت کیسے لکھیں رشید حسن خاں

یہ کتاب اس لیے مرتب کروائی گئی ہے کہ ہمارے طالب علموں کو املا کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو سکے اور اُن کی تحریر اُن خرابیوں سے محفوظ رہ سکے جس سے عبارت میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

قیمت -/15 روپے

لہو پکارتا ہے سردار جعفری

سردار جعفری کی انقلابی نظموں اور نغموں کا تازہ ترین

مجموعہ جن سے وطن اور انسانیت سے محبت کے
ساتھ ساتھ برائیوں سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی ملتا ہے
(پاکٹ اڈیشن) قیمت 15/ روپے

آگے سمندر ہے (ناول)

انتظار حسین

انتظار حسین کا شمار اردو کے صف اوّل کے ناول نگاروں
میں ہوتا ہے "آگے سمندر ہے" آپ کا تازہ ترین
ناول ہے۔
قیمت 150/ روپے

تفہیم

رشید حسن خاں

اردو کے بلند پایہ محقق، دانشور اور زبان کے پارکھ جناب
رشید حسن خاں کے اہم ترین مضامین کا نیا مجموعہ قیمت 75/

چہرہ در چہرہ

مجتبیٰ حسین

مجتبیٰ حسین نے بلاشبہ شخصی خاکہ نگاری کو ایک نیا
اسلوب اور نیا آہنگ عطا کیا ہے۔ اردو کی بیس اہم
شخصیتوں کے باغ و بہار خاکے۔ قیمت 51/ روپے

فی البدیہہ

یوسف ناظم

اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار یوسف ناظم کے ۱۴ دلچسپ
اور قہقہوں سے بھرپور مضامین کا نیا مجموعہ: قیمت 45/

تعلیم و تعلّم

ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں کا تعلق درس و تدریس سے رہا ہے
"تعلیم" کے موضوع پر موصوف کی کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی
ہیں۔ زیر نظر کتاب آپ کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔
قیمت 75/ روپے

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں

عبدالقوی دسنوی

اس کتاب میں اردو کے گیارہ شاعر (اکبر، حالی، چکبست
سید سلیمان ندوی، پرویز شاہدی، فراق، ساحر، جاں نثار اختر
فیض اور مجروح) کی شاعری اور فن پر سیر حاصل بحث
کی گئی ہے۔ قیمت 75/ روپے

آپ خوبصورت اردو کیسے لکھ سکتے ہیں؟

انشا اور تلفظ

رشید حسن خاں — طلبہ کے لیے

آپ کی رہنمائی کر سکتی ہے یہ کتاب آپ کے لیے۔
اردو کے ممتاز محقق اردو زبان کے پارکھ جناب رشید حسن
خاں نے لکھی ہے اس کے مطالعے سے آپ کو معلوم
ہوگا کہ جملہ یا عبارت کس طرح لکھی جائے اور اس کی
خوبیاں اور خرابیاں کیا ہیں۔ قیمت 12/ روپے

شعریات سے سیاسیات تک

غلام ربانی تاباں۔ مترجم: اجمل اجملی

فرقہ واریت کے خلاف تاباں صاحب کے انگریزی
مضامین کا اردو ترجمہ۔ قیمت 51/ روپے

دوسرا اور پانچواں سرسید یادگاری خطبہ

سرسید اور روایت کی تجدید

پروفیسر مونس رضا

سرسید اور اردو یونیورسٹی

پروفیسر مسعود حسین خاں

مرتبہ: خواجہ محمد شاہد

سرسید یادگاری خطبات کا سلسلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شروع کیا تھا
اب تک چار ممتاز دانشوروں کے خطبات شائع کیے جا چکے
ہیں۔ زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔
قیمت 10/ روپے

آدم خور چیتا

ریاض احمد خاں

اس کتاب میں شکاری کی جتنی کہانیاں ہیں سب سچی اور
آنکھوں دیکھی ہیں۔ حیرت انگیز اور دل دہلا دینے والی
کہانیاں۔ قیمت 45/ روپے

جھینی جھینی بینی چدریا
عبدل بسم اللہ
مترجم۔ وسیم حیدر ہاشمی

سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ اور کیڈیا ایوارڈ یافتہ یہ ناول بنارس کے انصار بھائیوں کی تہذیب و تمدن کی ایک روشن تصویر ہے۔ جس کو ناول نگار نے دس سال بنکروں کے بیچ رہ کر انھی کی زبان اور کلچر پر قلم بند کیا ہے۔ قیمت/75

انداز گفتگو کیا ہے
شمس الرحمٰن فاروقی

اس کتاب میں شامل اکثر مضامین گفتگو کا موضوع رہے ہیں اور اس بنا پر ان کے ذریعے کچھ پرانے مسائل پر نئی گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس کے تمام مضامین میں شاعروں اور شاعری کو ہی معرض بحث میں لایا گیا ہے۔
ایک نہایت اہم مضامین کا مجموعہ۔ قیمت /75 روپے

دستک اس دروازے پر
وزیر آغا

اس کتاب میں موجودیت کا فلسفہ ہے اور اس سلسلے میں مغرب کے فلسفے، تصوف، اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا بیان ہے۔ عارفانہ تجربے اور تخلیقی تجربے کا یہ فرق ہی اس کتاب کا موضوع ہے۔ قیمت /51 روپے

مٹی کا بلاوا (ڈرامے)
شمیم حنفی

سب سے بڑا ڈراما خود انسانی زندگی ہے۔ شمیم حنفی کے یہ ڈرامے زندگی کے ڈرامے کا ایک منظریہ ترتیب دیتے ہیں۔ ایک نئے تہذیبی اور سماجی زاویۂ نظر کا عکس ان میں بیشتر ڈرامے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات کے ذریعے مقبول ہو چکے ہیں۔
(دوسرا اڈیشن) قیمت /45 روپے

شناس و شناخت
انور صدیقی

پروفیسر انور صدیقی کے بارہ اہم تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ قیمت /60 روپے

کچھ مشرق سے، کچھ مغرب سے
ڈاکٹر سید نقی حسین جعفری

انگریزی عشقیہ شاعری کے فروغ میں اندلسی اور عرب تہذیب و ادب کے بعض مصادر کی نشاندہی اور فراق اور شہریار کی شعری حسیات میں مغربی رجحانات کے بارے میں علمی مضامین، گلستان سعدی کے منظوم اردو تراجم، دانشوری اور تصور مذہب، میر، سودا اور ناصر کاظمی کی غزلوں کے تجزیے اور بعض اہم کتابوں پر تفصیلی تبصرے۔ قیمت /۱۵ روپے

صحرانورد کے خطوط
میرزا ادیب

صحرانورد کے خطوط، آج سے کم و بیش تیس برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک اس کے بارہ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں یہ حقیقت ہے کہ اردو کے کسی افسانوی مجموعے کو اس قدر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی صحرانورد کے خطوط کو۔ قیمت /75 روپے

اسرار خودی
(فراموش شدہ اڈیشن)

ترتیب: شائستہ خاں

علامہ اقبال کی "اسرار خودی" کے پہلے اڈیشن میں چند اشعار بطریق انتساب درج تھے جو دوسرے اڈیشن میں حذف کر دیے گئے۔ دوسرے اڈیشن میں گیارہ اشعار پیش کش سے نکال کر تمہید میں منتقل کر دیے گئے۔ کون سے اشعار حذف کیے اور وہ کہاں گئے؟ اور وہ اشعار کون سے تھے؟ یہ آپ کو اس کتاب کے عکسی اڈیشن سے معلوم ہوگا۔ قیمت /75 روپے

مسلمانوں کا تعلیمی نظام
ضیاء الحسن فاروقی

اس کتاب میں مسلمانوں کے تعلیمی نظام سے متعلق چار اہم مضامین ہیں جن میں قیام مدارس کی تحریک، بغداد کا

مدارس نظامیہ اور مسلمانوں کا نظام تعلیمی عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں خاص معلومات فراہم کرتے ہیں قیمت 45/-

جامِ جہاں نما — گربچن چندن

اردو صحافت کی ابتداء

ہندستان میں اردو صحافت کے آغاز کے بارے میں نئی دریافتوں کی حامل یہ کتاب پہلی بار ان حقائق کو پیش کرتی ہے جو اب تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور برٹش لائبریری کے ظلمت کدوں میں مستور تھے۔ مصنف نے اوریجنل ریکارڈ کے مشاہدے کے بعد مسلّمہ نظریات کا بیباک جائزہ لیا ہے اور اردو کے اس اوّلین مطبوعہ اخبار کے حقیقی موقف، کردار اور مرتبے کی صراحت کی ہے۔ مزید اس حصّے کی نشاندہی کی ہے جو ۱۹ ویں صدی میں ہندستان اردو صحافت کی پیش رفت میں جام جہاں نما نے ڈالا۔ قیمت 75/- روپے

حموربی اور بابلی تہذیب و تمدّن — مالک رام

دنیا کے علم و فن، آئین و قوانین، حکومت کے نظم و نسق، مذہب، معاشرت غرض زندگی کے ہر شعبے کی تشکیل و ترقی اور ترویج میں بابل کا جو مقام رہا ہے اس کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں ملے گی۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی اہم ترین دستاویز۔ قیمت 75/- روپے

اپنے دل کی حفاظت کیجیے

ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کے۔ ایل۔ چوپڑا۔ ایف آر سی۔ پی

ترجمہ: نذیر الدین مینائی

خدانہ کرے کسی کو دل کا دورہ پڑے۔ اور کچھ نہیں احتیاطی تدابیر تو کر ہی سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کے۔ ایل چوپڑا نے دل کا فعل۔ دل کا دورہ۔ قلبی انجو گرافی۔ بائی پاس سرجری سبھی کچھ بیان کر دیا ہے۔ کتاب با تصویر ہے ضرور مطالعہ کیجیے۔ قیمت 25/- روپے

تذکرۂ ماہ و سال — مالک رام

اس مجموعے میں اردو کے بیشتر ادیب، شاعر، نقاد، کالم نگار صحافی اور دوسرے اہم عمائد (جنھوں نے اردو ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے) کی تاریخ ولادت اور جو ہماری بدقسمتی سے انتقال کر چکے ہیں ان میں سے اکثر کی تاریخ وفات بھی درج ہے۔ کسی بھی اہم ادیب پر مضمون لکھتے وقت اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے 125/-

شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان

تالیف:۔ مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

اس کتاب میں برکاتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ نیز ان کی تصانیف، تلامذہ، مریدین شاہ ولی اللہؒ کا تعارف بھی ہے۔ قیمت 45/- روپے

افکارِ اقبال — محمد عبد السلام خاں

اس اہم کتاب میں علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی، ان کے اردو اور فارسی کلام پر سیر حاصل بحث، ان کے مذہبی اور سیاسی افکار، اور کچھ ایسے اہم واقعات کی نشان دہی کی گئی ہے جو اب تک اندھیرے میں تھے۔ قیمت 125/- روپے

تحقیق نامہ — مشفق خواجہ

مشفق خواجہ اردو کے وہ واحد محقق ہیں جو ہمیشہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی اہمیت کی بنا پر ہماری ادبی تاریخ کے کسی نہ کسی خلا کو پُر کرتے ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں ایسے ہی اہم ترین مضامین شامل ہیں۔ 125/-

مرضیات — حکیم نعیم الدین زبیری

بیماریوں کے اصولی اسباب اور ان کی وجہ سے افعال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے مطالعے یعنی ماہیت

الامراض (پیتھالوجی) پر جامع اور آسان بحث طلبہ کے علاوہ اطباء کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ قیمت /75

تاثر نہ کہ تنقید

صدیق الرحمٰن قدوائی

تنقید ادب کی ایک اہم شاخ ہے مگر اس کا ضرورت سے زیادہ چرچا بھی اچھا نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص "نقاد" ہو جائے۔ ادب کو تنقید کے سوا بھی مختلف زاویوں سے دیکھا جا سکتا ہے جن کا انحصار پڑھنے والوں کے انفرادی مزاجوں پر ہے۔ یہ تصنیف ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ قیمت /51 روپے

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے

(عہد حاضر کے ۱۹ اہم ادیبوں کے انٹرویو)

طاہر مسعود   قیمت /66 روپے

گوشے میں قفس کے

دلیپ سنگھ

(طنزیہ و مزاحیہ مضامین)

دلیپ سنگھ کا نام اب طنزیہ مزاحیہ ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ "گوشے میں قفس کے" آپ کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ دلچسپ انسان کے نہایت دلچسپ مضامین کا مجموعہ۔ قیمت /45 روپے

سحر کے پہلے اور بعد

میرزا سعید الظفر چغتائی

یہ ایک قصبے کی سماجی اور سیاسی تناظر میں لکھی ہوئی کہانی ہے جس میں مصنف کے بچپن کی گلیاں سعدیؒ کے گلستاں کی طرح حسین و نوجوان نظر آ رہی ہیں۔ دلچسپ جگ بیتی۔ قیمت /51 روپے

تحریریں

اسلم پرویز

اردو کے جانے مانے ادیب اور نقاد ڈاکٹر اسلم پرویز کے اہم مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت /51 روپے

ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی (ناول)

کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا بھوپال گیس ٹریجڈی کے موضوع پر نیا ناول۔ انسانی رشتوں کے بننے، استوار ہونے اور ٹوٹنے کی درد انگیز داستان، جو ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ قیمت -/40 روپے

سفر (ناول)

رابعہ تبسم

رابعہ تبسم کا ایک اچھوتا رومانی ناول۔ روزانہ زندگی میں پیش آنے والی خوشیوں اور غموں کا سنگم۔ یہ انتہائی رنگین ہے اور سنگین بھی۔ قیمت /27 روپے

خواب اور خلش (شعری مجموعہ)

آل احمد سرور

شاعری ذات سے کائنات تک کا سفر ہے یہ خوابوں کے ذریعے حقائق کی توسیع کا نام ہے۔ بڑی شاعری تجربے سے مدد لیتی ہے مگر وہ روایت اور تجربے میں ایک توازن رکھتی ہے۔ آل احمد سرور کی شاعری صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں بلکہ اس میں معانی کا ایک سمندر ہے جس کی تہہ میں پہنچ کر ہی موتی نکالے جا سکتے ہیں۔

قیمت /66 روپے

غبار منزل (شعری مجموعہ)

غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں نظموں اور قطعات کا تازہ ترین مجموعہ جس میں "ساز لرزاں"، "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت /45 روپے

فریدؒ و فرد فریدؒ

ڈاکٹر اسلم فرخی

شیخ کبیر فرید الدین مسعودؒ اور شیخ نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی کے روحانی سفر کی روداد۔ قیمت /27

کتاب نما کے چند خصوصی شمارے

جگن ناتھ آزاد؟

جمنا داس اختر

مرتبہ: گریش بجاج؟ (مرتبہ : گرنجن بجاج)

(شخصیت اور ادبی و صحافتی خدمات)

جمنا داس اختر کا نام اردو کی سنجیدہ صحافت کی آبرو ہے اس خصوصی شمارے میں ملک اور بیرون ملک کے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں نے اختر صاحب کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اس شمارے کی حیثیت تاریخ ہند کے اہم باب کی ہے۔ قیمت 90/ روپے

شمس الرحمٰن فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— احمد محفوظ

اردو کے معتبر ادیب، نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی کی اعلا ادبی خدمات کے اعتراف میں اردو کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ قیمت 80/ روپے

اردو افسانہ بمبئی میں ۱۹۷۰ء کے بعد

مرتبہ ——— الیاس شوقی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں نئی نسل کے ۹ نمائندہ افسانہ نگاروں کا ایک ایک افسانہ شائع کیا گیا ہے۔ مرتب نے اپنے پیش لفظ کے آخر میں افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے "۱۹۷۰ء کے بعد بمبئی کا افسانہ زندگی کی سچائیوں کی عمدہ مثال ہے" قیمت 51/

مغیث الدین فریدی

شخصیت اور ادبی خدمات

مرتبہ ——— ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

یہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ہے اس میں فریدی صاحب کی شخصیت، شاعری، تاریخ گوئی اور تضمین نگاری پر اردو کے نامور ادیبوں نے اپنے بہترین خیالات کا اظہار کیا ہے۔ قیمت 45/ روپے

خواجہ حسن نظامی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین پروفیسر نثار احمد فاروقی / ریحان احمد عباسی

اردو کے صاحب طرز ادیب، صحافی، خاکہ نگار، مترجم و مفسر قرآن خواجہ حسن نظامی کے فن اور شخصیت پر اردو کے ممتاز ترین ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔

قیمت 75/: روپے

مولانا عبدالوحید صدیقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ——— پروانہ ردولوی

اردو کے بیباک اور حق شناس صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی کی ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں ملک کے بزرگ صحافیوں اور اہل علم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت 51/: روپے

غلام ربانی تاباں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین۔ اجمل اجملی، ڈاکٹر صغرا مہدی، عذرا رضوی

اردو کے ممتاز غزل گو شاعر غلام ربانی تاباں مرحوم کی شاعری اور فن پر اردو کے ممتاز اہل قلم کی نگارشات کا مجموعہ۔ قیمت 75/: روپے

پروفیسر نثار احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین ——— خلیق انجم۔ ایم حبیب خاں

عربی، فارسی کے اسکالر اور اردو کے معتبر ترین ادیب، نقاد اور محقق پروفیسر نثار احمد فاروقی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ملک و بیرون ملک کے بلند پایہ مصنفین کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت 51/ روپے

اختر سعید خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــــ ڈاکٹر سید حامد حسین

اختر سعید خاں نے جہاں غزل کی روایت کا احترام کیا وہیں شعر کے تخلیقی منصب کی پاسداری بھی کی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں زندگی کا ایک واضح شعور بخشا۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر کی شخصیت اور فن پر ایک اہم شمارہ۔ قیمت /51

پروفیسر آل احمد سرور

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتب ـــــــ ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر آل احمد سرور، اردو کے ایک مشفق اور مقتدر استاد بھی ہیں اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ادب کے اعلا نقاد بھی ہیں اور زبان کے نباض بھی۔ قیمت /45 روپے

خواجہ احمد فاروقی

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــــ ڈاکٹر خلیق انجم

اردو کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، انتظامی امور کے ماہر، سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی (جن کے عہد میں شعبۂ اردو، اپنے کارہائے نمایاں کے لیے پورے ہندستان میں مشہور تھا) کی علمی، ادبی خدمات کا اعتراف نہ صرف ان کے شاگردوں نے بلکہ ممتاز ادیبوں نے بھی کیا ہے۔ قیمت /45 روپے

عابد علی خاں

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ ـــــــ مجتبیٰ حسین

عابد علی خاں مرحوم ایک انجمن کا نام ہی نہیں ایک تحریک کا نام بھی تھا۔ اس خصوصی شمارے میں ملک کے ممتاز ادیبوں نے مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ قیمت /45 روپے

ڈاکٹر اجمل اجملی

(حیات اور ادبی خدمات)

مرتبین ـــــــ ڈاکٹر علی احمد فاطمی / عذرا رضوی

اردو، ہندی کے ممتاز ادیبوں کی اہم نگارشات کا مجموعہ جس میں ڈاکٹر اجمل اجملی کی ادبی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا ہے۔ قیمت /45 روپے

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبین:- پروفیسر شہریار / پروفیسر ابوالکلام قاسمی

کتاب نما کے اس خصوصی شمارے میں پروفیسر نارنگ کی علمی، ادبی سرگرمیوں کے نمایندہ پہلوؤں سے متعلق مضامین، تاثرات، تنقیدی آرا اور ادبی مسائل پر مکالمہ، سے ان کی دلچسپیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت /60 روپے

علی سردار جعفری

(شخصیت اور ادبی خدمات)

ترتیب ـــــــ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

سردار جعفری کی شخصیت میں بیک وقت کئی شخصیتیں سانس لے رہی ہیں۔ وہ کون سا میدان ہے جہاں سردار جعفری اپنے فکر و نظر کی جولانیاں دکھاتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ صحافت ہو یا ادب، فلم ہو یا ٹی وی، ریڈیو ہو یا اسٹیج، خطابت ہو یا شاعری! ان کی مکمل شخصیت کا بھرپور جائزہ۔ قیمت /45 روپے

مطبوعات
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

قلم اور قدم — ستید حامد — ۷۵/-

مستقبل کی طرف (خطبات جلسۂ تقسیم اسناد جامعہ ملیہ اسلامیہ)
مرتبہ: خواجہ محمود شاہد، خالد کمال فاروقی — ۱۵۰/-

مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر و نظر کی چند جہتیں۔
پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی — ۴۰/-

جدید ادبی تحریکات — ڈاکٹر سید حامد حسین — ۶۰/-

صحرا میں لفظ — فضیل جعفری — ۹۰/-

فارسی داستان نویسی کی مختصر تاریخ۔ ڈاکٹر مومن محی الدین — ۷۵/-

ٹیلی ویژن نشریات۔ تاریخ۔ تحریر۔ تکنیک۔ انجم عثمانی — ۹۰/-

انشائے غالب — مرتبہ: رشید حسن خاں — ۴۰/-

اردو ڈرامے کی تنقید کا جائزہ — ابراہیم یوسف — ۷۵/-

تاریخ نگاری۔ قدیم و جدید رجحانات — ڈاکٹر سید جلال الدین — ۵۱/-

انداز گفتگو کیا ہے — شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-

دستک اس دروازے پر — ڈاکٹر وزیر آغا — ۶۵/-

سرسید یادگاری خطبات۔ مونس رضا، مسعود حسین خاں — ۱۰/-

تفہیم — رشید حسن خاں — ۷۵/-

اردو شاعری کی گیارہ آوازیں — عبدالقوی دسنوی — ۷۵/-

کچھ مشرق سے کچھ مغرب سے — نقی حسین جعفری — ۵۱/-

شناس و شناخت — انور صدیقی — ۶۰/-

سائنس کی ترقی اور آج کا سماج — ڈاکٹر سید ظہور قاسم — ۱۰/-

سیرت طیبہ میں سماجی انصاف کی تعلیم۔ اختر الواسع — ۱۰/-

آزمائش کی گھڑی — سید حامد (زیر طبع)

مصوری اور بابلی تہذیب و تمدن — مالک رام — ۷۵/-

جام جہاں نما — گربچن چندن — ۷۵/-

اردو ناول میں عورت کا تصور — فہمیدہ کبیر — ۴۵/-

اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) شائستہ کبیر — ۷۵/-

تاثر نہ کہ تنقید — صدیق الرحمٰن قدوائی — ۵۱/-

یہ صورت گر کچھ خوابوں کے — طاہر مسعود — ۴۶/-

تحریریں — ڈاکٹر اسلم پرویز — ۵۱/-

انشائیہ کے خدوخال — وزیر آغا — ۳۵/-

افکار اقبال — عبدالسلام خاں — ۱۲۵/-

تذکرہ ماہ و سال — مالک رام — ۱۲۵/-

تحقیق نامہ — مشفق خواجہ — ۱۲۵/-

سحر کے پہلے اور بعد — سعید الظفر چغتائی — ۵۱/-

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور — ۵۱/-

اقبال کا نظریہ خودی — عبدالمغنی — ۱۵۰/-

قلندر بخش جرأت — جمیل جالبی — ۱۰/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی — ۳۶/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری — ۲۷/-

مولانا آزاد کا ذہنی سفر — ظ انصاری — ۳۳/-

تنقید اور جدید اردو تنقید — ڈاکٹر وزیر آغا — ۶۰/-

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں — مالک رام — ۵۱/-

لسان الصدق — مولانا ابوالکلام آزاد — ۷۵/-

اردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی — ۴۸/-

تفہیم و تنقید — پروفیسر حامدی کاشمیری — ۴۸/-

نذر مختار — مرتبہ: مالک رام — ۱۰۱/-

تحقیقی مضامین — مالک رام — ۶۰/-

خسرو نامہ — مجیب رضوی — ۲۱/-

تحفۃ السرور — مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی — ۷۵/-

جائزے — مرتبہ: مظفر حنفی — ۴۵/-

نقد بجنوری — صدیقہ بیگم — ۲۵/-

ادبی سماجیات — ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/-

الفاظ کا مزاج — غلام ربانی — ۲۴/-

تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	زیر طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	(زیر طبع)
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۴/-
" سوم	"	۲۲/-
" چہارم	"	۲۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیلِ نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۳۵/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقدِ حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	(زیر طبع)
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۶/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
حسرت کی شاعری	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	۶/۵۰
مسالک و منازل	ضیا احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلّی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۴۹/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	(زیر طبع)
تنقید کیا ہے	"	۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی	داؤد رہبر	۳۶/-
اردو اسپیز	مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی	۳۶/-

روحِ تہذیب	خواجہ غلام السیدین	۲/۵۰
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۵/-
دبستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	۱۴/-

تعلیم

مفکرینِ تعلیم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۱۲/-
استادوں کی تعلیم و تربیت	مسعود الحق	۶/-
تعلیم و تعلّم	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۵/-
مسلمانوں کا تعلیمی نظام	ضیاء الحسن فاروقی	۵/-
ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵/-
مشقِ تدریس کیوں اور کیسے	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۵/-
معاشیات کے اصول	عزیز احمد قاسمی	۲۱/-
آسان اردو ورک بک	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۵۱/-
تعلیم اور رہنمائی	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں	معین الدین	۵۴/-
ہم کیسے پڑھائیں۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۳/-
تعلیمی خطبات۔	ڈاکٹر ذاکر حسین	۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔	اختر الواسع	۲۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے)	شکیل اختر فاروقی	۱۲/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۶۰/-
بنیادی استاد کے لیے۔	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۲/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۴/-
عبارت کیسے لکھیں	//	۱۵/-
انشا اور تلفظ	//	۱۲/-
بچوں کا آرٹ	عبید الحق	۲۴/-

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

دلی جو ایک شہر تھا؟ ... ادا جعفری ۲۰۰/-
دلی کی بیگماتی زبان ... محی الدین حسن ۷/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو ... کشمیری لال ذاکر ۳۰/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں ... اشرف صبوحی ۵/-
چند تصویر بتاں ... مولانا عبدالسلام قدوائی ۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب ... پروفیسر آل احمد سرور ۸/-
صاحب جی، سلطان جی ... ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں ... ڈاکٹر عابد حسین ۷۵/-
شہید جستجو ... پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵۰/-
مولانا آزاد کی کہانی ... ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۸۰/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۱۵۰/-
حیات جامیؒ ... مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
نقش ذاکر ... مرتبہ عبدالحق خاں ۵۱/-
مالک رام ایک مطالعہ ... مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ ... مرتبہ خلیق انجم ۳۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات ... مرتبہ انور صدیقی ۱۸۰/-
یادوں کا اجالا ... بھگوان سنگھ ... مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار ... پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹۰/-
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴۵/-
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) صالحہ عابد حسین ۶۵/-
وجد شاعر اور شخص ... مرتبہ یوسف ناظم ۲۵/-
غبار کارواں ... بیگم انیس قدوائی ۲۷/-
فراق شخص و شاعر ... مرتبہ: شمیم حنفی (زیر طبع)
حیات حافظ ... اسلم جیراجپوری ۱۵/-
افکار رومی ... مولانا عبدالسلام خاں ۴۰/-
بزم رفتگاں ... صباح الدین عبدالرحمن (زیر طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری ... پروفیسر ممتاز حسین (زیر طبع)

مکالمات افلاطون ... مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۴۶/-
غلام ربانی تاباں حیات اور شاعری ... شفیق النسا بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو ... بیگم انیس قدوائی ۱۲/۵۰
پریم چند ... ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن ... ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیات اسماعیل، حیات و خدمات ... ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ ... عبدالرحمن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف ... صالحہ عابد حسین ۶/-
ہمارے ذاکر صاحب ... رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار ... پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۸/۵۰
میر انیس ... سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت ... مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰
حسرت کی شاعری ... ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۷/۵۰
گنجہائے گرانمایہ ... پروفیسر رشید احمد صدیقی ۴۲/-
کیا خوب آدمی تھا ... مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۵/-
قدسیہ زیدی ... کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
انتخاب ... مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں ... مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
روسی ادب اوّل، دوم ... پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-
مرحوم دلی کی ایک جھلک ... نسیم انصاری ۲/۵۰

طنزیات، مزاحیات

خامہ بگوش کے قلم سے ... مرتبہ مظفر علی سید ... مجلد ۱۵۰/- غیر مجلد ۸۰/-
فی البدیہہ ... یوسف ناظم ۴۵/-
چہرہ در چہرہ ... مجتبیٰ حسین ۵۱/-
طنزیات و مضحکات ... رشید احمد صدیقی ۶۰/-
گوشے میں قفس کے ... دلیپ سنگھ ۴۵/-
فی الحقیقت ... یوسف ناظم ۴۵/-

انور۔ یوسف ناظم ۳۰/-
...مال۔ شفیقہ فرحت ۱۸/-
...مال۔ یوسف ناظم ۱۸/-
...گ نمبر۔ شفیقہ فرحت ۱۶/-
...لیات۔ یوسف ناظم ۱۸/-
...ت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۵/-
...رخیر۔ یوسف ناظم ۲۱/-
...پڑکی۔ حضرت آوارہ (زیر طبع)
...نداں۔ رشید احمد صدیقی ۳۶/-
...لنجانے گرانمایہ ” ۴۵/-
...یوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-
آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی ۱۵/-

طب۔ ایلوپیتھی

اخلاقیات طبیب حکیم محمد سعید ۲۰/-
امراض قلب پروفیسر ڈاکٹر سید اسلم ۶/-
مرضیات حکیم نعیم الدین زبیری ۴۵/-
اپنے دل کی حفاظت کیجیے۔ ترجمہ۔ نذیر الدین مینائی ۲۵/-
ذیابیطس۔ ڈاکٹر محمد شعیب اختر (زیر طبع)

سفرنامے، رپورتاژ

سیر کر دنیا کی غافل صغرا مہدی ۵۱/-
وسط ایشیا آصف جیلانی ۵۱/-
کولمبس کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۴۵/-
پشکن کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ۲۵/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۱۸/-
سخن دلنواز (خطوط کا مجموعہ) خواجہ غلام السیدین ۳۰/-
رہ نورد شوق۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/۵۰
یادوں کے سائے عتیق صدیقی ۱۲/-

شعری مجموعے

گلاب گا ہے رولینڈ لارنس ۲۰/-
رنگ، خوشبو، روشنی قتیل شفائی ۸۰/-
طراز دوام افسر سعید خاں ۵۰/-
کاسۂ خیال عبدالمعروف خاں ۵۰/-
میں سمندر رہوں زرحان سالم ۲۰/-
اسرار خودی (فراموش شدہ ایڈیشن) شائستہ خاں ۷۵/-
بانگ درا اقبال ۱۲/-
بال جبریل اقبال ۸/-
ضرب کلیم مع ارمغان حجاز ” ۸/-
خواب اور خلش آل احمد سرور ۴۲/-
غبار منزل غلام ربانی تاباں ۴۵/-
انیس ۲۳ غیر مطبوعہ مرثیے ۹۰/-
پرانی بات ہے۔ زبیر رضوی ۳۰/-
ساز سخن۔ ادا جعفری ۴۵/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری ۷۵/-
دائروں میں پھیلی لکیر۔ کشور ناہید ۲۰/-
آنکھ میں سمندر۔ زاہد ڈار ۲۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ ندا فاضلی ۳۰/-
رات کے مسافر۔ مرتبہ انور سجاد ۲۸/-
گداز شب۔ معین احسن جذبی ۳۰/-
ایک خواب اور۔ علی سردار جعفری ۴۰/-
حرف حرف روشنی۔ حمایت علی شاعر ۲۵/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت ۲۶/-
دو ہے۔ جمیل الدین عالی ۱۲/-
کلیات عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام ۷۵/-
رادار۔ ساقی فاروقی ۲۶/-
پتھر کی زبان۔ فہمیدہ ریاض ۱۵/-

شام کا پہلا تارا ۔ زہرا نگاہ ۳۶/-
مثنوی نُہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۲۴/-
لہو پکارتا ہے ۔ علی سردار جعفری ۱۵/-
شام شہریاراں فیض احمد فیض مجلد ۱۰/- ۶/-
جستہ جستہ ۔ خورشید الاسلام ۱۸/-
گل افشانی گفتار ۔ نشور واحدی ۵/-
کرب آگہی ۔ آنند نرائن مُلا ۱۰/۵۰
نوائے آوارہ ۔ غلام ربانی تاباں (زیر طبع)
اردو گیت ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیر طبع)
پچھلا پہر ۔ جاں نثار اختر ۱۵/-
انتخاب حالی (نیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۱۵/-
شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۔ ۸/۵۰
ذوق سفر ۔ غلام ربانی تاباں ۵/-
کو بہ کو ۔ سلام جاں نثار اختر ۷/-
آتش گل جگر مرادآبادی ۲۵/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

تصوف ۔ رسم اور حقیقت خواجہ حسن ثانی نظامی ۹/-
انوار قرآن پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۵/-
حضرت محمدؐ اور قرآن ڈاکٹر رفیق زکریا (زیر طبع)
مسلمانوں کا تعلیمی نظام ضیاء الحسن فاروقی ۴/۵۰
شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ۔ محمود احمد برکاتی ۲۵/-
فرید و فرد فرید اسلم فرخی ۲۷/-
اسلام میں راسخ الاعتقادی نیچر کی راہ } ضیاء الحسن فاروقی ۸/-
اسلام کی اصلاحی تحریکوں میں سرسید احمد کا مرتبہ } سید مقبول احمد ۸/-
فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل ۔ مولانا مجیب اللہ ندوی ۱۴/-
تعبیر ملفوظات نثار احمد فاروقی ۶۵/-
خطبات عیدین مولانا تقی امینی ۲۱/-

تاریخ یہود ۔ قاسم علی نیشاپوری ۲۴/-
قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت ۔ ڈاکٹر مجیب اشرف ۱۲/-
مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۸/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۶/-
ترجمۂ قرآن ۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش } پروفیسر مشیر الحق ۸/-
مسلمانان ہند سے وقت کے مطالبات ۔ پروفیسر ریاض الرحمن شیروانی ۹/-
دنیا کے بڑے مذہب عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ۔ شمس الرحمن محسنی ۵۰/-
رسول اکرمؐ اور یہود حجاز ۔ سید برکات احمد ۴۰/-
محجوب الارث ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
اسلام دور حاضر میں ۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۳۶/-
اسلامیات ۔ مالک رام ۴۴/-
عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری (زیر طبع)
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹/-
روح القرآن ۔ مولانا عبد السلام قدوائی (زیر طبع)
عشق اور بھگتی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی (زیر طبع)
عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳/-
مسلمان اور روح وقت کے تقاضے ۔ عبد السلام قدوائی ۸/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا ۔ محمود الحسن ۱۵/-
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبید الرحمن ۲/-
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی (زیر طبع)
دین الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی "
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جلال الدین اعظمی (زیر طبع)
خواتین کربلا کلام انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین "
مسلمان اور سیکولر ہندوستان ۔ پروفیسر مشیر الحق "
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جلال الدین اعظمی "
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-

تاریخ الامت سیرت رسولؐ حصہ اول۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
" خلافت راشدہ " دوم " ۲۱/-
" خلافت بنی امیہ " سوم " ۱۵/-
" عباسیہ " چہارم " ۱۸/-
" عباسیہ بغداد " پنجم " ۲۴/-
" عباسیہ مصر " ششم " ۲۱/-
" آل عثمانؒ ہفتم " ۱۸/-
ہشتم " ۳۶/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز)۔ قاری محمد اسماعیل ۲/-
" " کلاں سائز " ۴/-
بکھرے ورق سینتی کمار چٹرجی ۴/-
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵ء) سید محمد عزیز الدین حسین ۹/-

ناول

تنگ سمندر ہے انتظار حسین ۱۵/-
جھینی جھینی بینی چدریا عبدالبسم اللہ ۴۵/-
صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۴۵/-
لوتھوں کی تلاش ایاز سیوہاروی ۴۰/-
ہارے ہوئے لشکر کا آخری سپاہی کشمیری لال ذاکر ۴۸/-
سفر رابعہ تبسم ۲۴/-
سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۴/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-
ریت کی دیواریں رفعت سروش ۲۱/-
نجر بادل۔ کشمیری لال ذاکر ۴۲/-
راز۔ ظفر پیامی ۴۰/-
جیتے سورج کی کتھا۔ کشمیری لال ذاکر ۳۶/-
لوں میں بکھری زندگی۔ کشمیری لال ذاکر ۱۸/-

مہکتی بہاریں۔ کوثر چاند پوری ۱۸/-
راگ بھوپالی۔ صغریٰ مہدی ۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن۔ کشمیری لال ذاکر ۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات۔ کشمیری لال ذاکر (زیر طبع)
میں واپس آؤں گا۔ ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس (زیر طبع)
پروائی۔ صغریٰ مہدی ۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان۔ کشمیری لال ذاکر ۷/-
ایک ہم دو دل۔ خالدہ رحمٰن ۱۰/-
اشک خوں۔ حبیبہ بانو (زیر طبع)
اپنی اپنی صلیب۔ صالحہ عابد حسین ۱۰/-
پرائی دھرتی اپنے لوگ۔ جتندر بلو ۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان۔ سید ضمیم اشرف۔ ۶/-
ایک چادر میلی سی۔ راجندر سنگھ بیدی ۱۸/-
آلپس کے گیت۔ مترجم قرۃ العین حیدر ۳/-
پیار کا موسم۔ مہندر ناتھ (زیر طبع)
چنار کا پتا۔ سلطان آصف فیضی ۳/-
پا بہ جولاں۔ صغریٰ مہدی (زیر طبع)
زندگی کی لہر (ساؤمنگ) مترجم محمد خلیق (زیر طبع)
کالا شہر گورے لوگ۔ احسان الحق (زیر طبع)
بیوہ۔ منشی پریم چند ۲۴/-
گئودان (نیا اڈیشن) " ۴۵/-
میدانِ عمل (نیا اڈیشن) منشی پریم چند ۴۵/-
پو دو کیہ۔ ترجمہ قرۃ العین حیدر ۲/-
شکست ناتمام۔ زہرہ سیدین ۲/-
ابھی دور۔ صالحہ عابد حسین زیر طبع
پر اسرار مقدمہ کافکا مترجم رحم علی الہاشمی ۱۲/۵۰
ماں کی کھیتی ترجمہ قرۃ العین حیدر (زیر طبع)

افسانے

صحرانورد کے خطوط مرزا ادیب ۴۵/-

پت جھڑ کی آواز	قرۃالعین حیدر	۴۵/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	۲۵/-
سدابہار چاندنی۔	رام لعل	۳۰/-
دل دریا۔	شرون کمار	۳۵/-
تین چہرے تین آوازیں۔	صالحہ عابد حسین	۱۸/-
دردِ دل	ستارہ جعفری	۱۸/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
گرہن۔	راجندر سنگھ بیدی	۳۰/-
کوکھ جلی۔	〃	۱۸/-
کھڑکی۔	پرکاش پنڈت	(زیر طبع)
ریت سمندر اور جھاگ۔	ہرچرن چاولہ	۱۲/۷۵
نوری۔	امر سنگھ	۱۴/۷۵
قلی نمبر ۲۹۹۔	وجاہت علی سندیلوی	۱۴/۷۵
دانہ ودام۔	راجندر سنگھ بیدی	۲۷/-
اپنے پرائے۔	اوم پرکاش بجاج	۹/-
نئی دھرتی نئے انسان۔	خواجہ احمد عباس	(زیر طبع)
دردودرماں	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔	راجندر سنگھ بیدی	۲۷/-
واردات۔	پریم چند	۲۱/-
اردو اسینز	مرتبہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی	۲۶/-
دس افسانے۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	(زیر طبع)
راستے اور کھڑکیاں۔	انور خاں	۹/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں۔	صغریٰ مہدی	۱۶/-
اپنے دکھ مجھے دیدو۔	راجندر سنگھ بیدی	۲۱/-

ڈرامے

الجھاوے	ابراہیم یوسف	۵۱/-
زندگی کی طرف۔	پروفیسر شمیم حنفی	۳۶/-

زوال کا عروج	مترجم: انور عظیم	۳۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے۔	پروفیسر شمیم حنفی	۲۱/-
انٹی گونی۔ سوفوکلیز	مترجم قیصر زیدی	۹/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
حبہ خاتون۔	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
تاریخ کے آنچل میں۔	رفعت سروش	۱۸/-
اداس موڑ۔	ابراہیم یوسف	۱۲/-
اینٹنی اور کلیوپٹرا	ولیم شیکسپیر	۱۶/۵۰
مٹی کا بلاوا۔	شمیم حنفی	۵/-
سات کھیل۔	راجندر سنگھ بیدی	(زیر طبع)
غالب کون۔	سید محمد مہدی	۸/۵۰
خیال کی دستک۔	ساگر سرحدی	۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا۔	کرتار سنگھ دگل	(زیر طبع)
پہلے آپ۔ (مزاحیہ ڈراما)	افتخار عالم	(〃)
آذر کا خواب۔	قدسیہ زیدی	(〃)
آزمائش۔	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
انجام۔	پروفیسر محمد مجیب	۶/-
کھیتی	〃	۹/-
ہیروئن کی تلاش۔	〃	۵/۵۰
پردۂ غفلت۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۹/-
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۹/۵۰
آئینۂ ایام۔ جے بریسٹلے	مترجم: خلیق احمد	۴/۵۰
نقشِ آخر۔	اشتیاق حسین قریشی	۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	(زیر طبع)
ریڈیو ڈرامے کی اصناف	〃	(〃)
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	〃	۱۰/-
فاؤسٹ (گوئٹے)	مترجم: ڈاکٹر عابد حسین	۲۵/۵۰

اقبالیات

افکارِ اقبال	محمد عبدالسلام خان	۱۲۵/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی — ۱۵/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد — عتیق صدیقی — (زیرطبع)
اقبالیات کی تلاش — عبدالقوی دسنوی — ۲۵/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں) — سید وحیدالدین — ۲۶/-
اقبال اور دہلی — عبدالقوی دسنوی — (زیرطبع)
نقدِ اقبال۔ — میکش اکبرآبادی — ۱۵/۵۰
نقشِ اقبال۔ — اسلوب احمد انصاری — (زیرطبع)

غالبیات

ذکرِ غالب — مالک رام — (زیرطبع)
گفتارِ غالب — مالک رام — ۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی۔ — مشفق خواجہ — ۳۶/-
تلامذۂ غالب۔ — مالک رام — ۷۵/-
فسانۂ غالب۔ — مالک رام — ۱۹/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ۔ — ڈاکٹر خلیق انجم — ۹/۵۰

ہماری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر۔ — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۴/-
نیرنگِ خیال۔ — مالک رام — ۱۵/-
یادگارِ غالب اردو۔ — " — ۳۰/-
" فارسی۔ — " — ۹/-
انتخابِ مضامینِ سرسید — انور صدیقی — ۱۹/-
حیاتِ سعدی۔ — مرتبہ رشید حسن خاں — ۳۹/-
فسانۂ آزاد (تلخیص) — " ڈاکٹر قمر رئیس — ۷۵/-
فردوسِ بریں۔ — " عبدالحلیم شرر — ۱۴/-

انتخابِ مضامینِ شبلی — مرتبہ رشید حسن خاں — ۷۵/-
انتخابِ ناسخ — مرتبہ " — ۵۱/-
مثنوی بحرالمحبت — مرتبہ عبدالماجد دریابادی — ۵/-
شریف زادہ۔ — " ڈاکٹر قمر رئیس — ۲۰/-
امراؤ جان ادا — مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن — ۲۸/-
فسانۂ مبتلا۔ — " صدیق الرحمٰن قدوائی — ۱۵/-
توبۃ النصوح۔ — " مالک رام — ۳۶/-
باغ و بہار۔ — " رشید حسن خاں — ۲۰/-
ابن الوقت۔ — " ڈاکٹر خلیق انجم — ۵۱/-
مجالس النساء۔ — " صالحہ عابد حسین — ۲۴/-
گذشتہ لکھنؤ — " رشید حسن خاں — ۷۵/-
قصہ حاتم طائی۔ — " اطہر پرویز — ۱۵/-
انتخابِ ولی — مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی — ۲۰/-
انتخابِ سراج اورنگ آبادی — مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/-
" مراثی انیس و دبیر۔ — رشید حسن خاں — ۳۶/-
" نظیر اکبرآبادی۔ — " — ۳۰/-
" اکبر الہ آبادی۔ — صدیق الرحمٰن قدوائی — ۲۱/-
" کلامِ میر۔ — ڈاکٹر محمد حسن — (زیرطبع)
دیوانِ درد — رشید حسن خاں — ۲۴/-
انتخاب سودا — ۱۵/-
" قلی قطب شاہ — محمد اکبرالدین صدیقی — ۲۷/-
" ذوق۔ — ڈاکٹر تنویر احمد علوی — ۲۴/-
مثنوی سحرالبیان۔ — رشید حسن خاں — ۲۱/-
مثنوی گلزارِ نسیم۔ — — ۱۹/-
افاداتِ سلیم۔ — ڈاکٹر خلیق انجم — ۳۶/-
مقدمہ شعر و شاعری۔ — مرتبہ رشید حسن خاں — ۲۷/-

جیبی کتابیں

بیاضِ مریم — سکندر علی وجد — [illegible]
لہو پکارتا ہے — سردار جعفری — [illegible]

پتھر کی دیوار — ″ — ۱۵/-
ایک خواب اور۔ — علی سردار جعفری — ۱۰/-
آتش گل۔ — جگر مرادآبادی — ۱۲/-
پچھلے پہر۔ — جاں نثار اختر — ۷/۵۰
رومانی غزلیں۔ — ثمینہ حجاب — ۱۰/-
انتخاب اکبر الہ آبادی۔ — صدیق الرحمن قدوائی — ۱۵/-
ساتواں آنگن۔ — صالحہ عابد حسین — ۸/-
دھوپ — رابعہ تبسم — ۵/-
گھر۔ — حامدہ رحمن — ۸/-
واپسی کا سفر۔ — عبداللہ حسین — ۵/-
راگ بھوپالی۔ — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — ۴/-
نشیب۔ — عبداللہ حسین — ۵/-
موت کا بازار۔ — آفتاب ہلالی — ۸/-



جمنا داس اختر نمبر — مرتبہ: گربچن چندن — ۹۰/-

شمس الرحمن فاروقی نمبر — مرتبہ: احمد محفوظ — ۸۰/-
اردو افسانہ بمبئی میں — ″ الیاس شوقی — ۵۱/-
مغیث الدین فریدی نمبر — ″ ظہیر احمد صدیقی — ۵۰/-
خواجہ حسن نظامی نمبر — ″ نثار احمد فاروقی، ریحان احمد عباسی — ۷۵/-

عبدالوحید صدیقی نمبر — ″ پروانہ ردولوی — ۵۱/-
غلام ربانی تاباں نمبر — ″ اجمل اجملی — ۷۵/-
اختر سعید خاں نمبر — ″ ڈاکٹر سید حامد حسین — ۵۱/-
نثار احمد فاروقی نمبر — ″ ڈاکٹر خلیق انجم — ۵۱/-
پروفیسر گوپی چند نارنگ نمبر — مرتبہ شہریار/ابوالکلام قاسمی — ۶۰/-
ڈاکٹر خلیق انجم نمبر — مرتبہ: ایم حبیب خاں — ۹۰/-

خواجہ احمد فاروقی — مرتبہ: خلیق انجم — ۴۵/-
عابد علی خاں — ″ مجتبیٰ حسین — ۴۵/-
پروفیسر مسعود حسین خاں — ″ ایم حبیب خاں — ۴۵/-
ڈاکٹر اجمل اجملی — مرتبہ علی احمد فاطمی/عذرا حبیب — ۴۵/-
فرمان فتح پوری نمبر — مرتبہ خلیق انجم — ۲۵/-
سردار جعفری نمبر — مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی — ۴۰/-
صالحہ عابد حسین نمبر — مرتبہ: عزیز قریشی — ۴۵/-
نئی نظم کا سفر — مرتبہ: خلیل الرحمن اعظمی — ۴۵/-

مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق۔ حامد حسین — ۲/-
پریم چند نمبر۔ — عبدالقوی دسنوی — (زیر طبع)
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر۔ کرنل بشیر حسین زیدی — ۱۶/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر۔ — ادارہ — ۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی — ۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر — ساحر ہوشیارپوری — (زیر طبع)
جگن ناتھ آزاد نمبر — مرتبہ: ایم حبیب خاں — ۵۱/-
خواتین افسانہ نگار نمبر — ڈاکٹر صغریٰ مہدی — (زیر طبع)
عرش ملسیانی نمبر۔ — مالک رام — ۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر۔ — یوسف ناظم — ۲۵/-
قدسیہ زیدی نمبر۔ — کرنل بشیر حسین زیدی — (زیر طبع)
فراق نمبر۔ — شمیم حنفی — زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۳۵/-
عبداللطیف اعظمی نمبر۔ — ادارہ — ۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر۔ — مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم — ۳۰/-
جائزے۔ — مرتبہ مظفر حنفی — ۴۵/-

قواعد، محاورے، کہاوتیں اور لغات

تذکیر و تانیث (۷ ہزار الفاظ) فصاحت بہادر جنگ — ۵۰/-
معیار اردو — ″ — ۲۱/-
محاورات ہند۔ تصحیح و ترتیب: محبوب الرحمن فاروقی — ۵۰/-

ت کیسے لکھیں			۱۵/-
اور تلفظ			۱۲/-
ی قواعد اردو	طلبہ اڈیشن		۳/-
//	// کلاں		۶/-
ی اردو انگریزی ڈکشنری			۱۲/-
می بیسک انگلش اردو ڈکشنری			۱۵/-
رے محاورے	سینی پرکی		۱۲/۵۰
اوت اور کہانی	//		۸/-
تصر اردو لغت			۶۵/-
رہنگ عامرہ			۶۰/-
وز اللغات	درمیانی		۱۵/-

کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب		(ادارہ)	۲۴/-
نیا اردو نصاب	اوّل	قیصر زیدی/محمود ذاکر	۱۰/-
آئینہ ادب		ڈاکٹر محی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ	۲۱/-
انوار ادب		پروفیسر نصیح الدین/ڈاکٹر عابد حسین حسینی	۸/۵۰

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

کفن دفن		۱/-
حیات اللہ انصاری		۱/-
چیچک	مشتاق احمد	۱/-
آستین کا سانپ	محمد حسین حسان	۱/-
چاند	//	۱/-
دیمک	//	۱/-
کتنی زمین	//	۱/-

ہسٹری کی دوسری کتابیں

موسموں کا کھیل	۱/-
پرم پیا	۱/-
اپنا گھر	۱/-
امریکہ	۱/-
دہلی	۱/-
موہنجوڈرو اور ہڑپا	۱/-
چاندی کا چمچہ	۱/-

بچوں کے لیے

مکتبہ پیامِ تعلیم کی مذہبی کتابیں

صراطِ مستقیم ۷/۵۰
سورۂ رحمٰن (ترجمہ مع تشریح) ۶/
حضرت شیخ مخدوم علی فقیہہ مہائمی ۴/۵۰
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں ۹/
نماز پڑھیے ۴/۵۰
السلام علیکم ۷/۵۰
حضرت یوسف علیہ السلام ۴/۵۰
حدیث کیا ہے ۴/
حضرت عمر فاروقؓ ۶/
نقوشِ سیرتؐ اوّل ۵/
نقوشِ سیرتؐ حصہ دوم ۵/
نقوشِ سیرتؐ حصہ سوم ۵/
نقوشِ سیرتؐ حصہ چہارم ۵/
نقوشِ سیرت حصہ پنجم ۵/
رسالہ دینیات اوّل ۳/
" دوم ۴/
" سوم ۵/
" چہارم ۵/
" پنجم ۶/
" ششم ۶/=
" ہفتم ۶/=
" ہشتم ۶/=
حضرت آدم علیہ السلام ۴/
حضرت یحییٰ علیہ السلام ۳/
بزرگانِ دین ۴/
امت کی مائیں ۴/۵۰
خوب سیرتؐ (اول ۶/
خوب سیرت دوم ۶/

اچھی باتیں ۴/۵۰
رسول اللہؐ کی صاحبزادیاں ۴/۵۰
سلطان جیؒ ۴/۵۰
سیرتِ پاک مختصر مختصر ۳/
کمسن صحابی ۶/
رحمان کا مہمان ۶/
اسلام کے جاں نثار ۵/
نور کے پھول ۹/
سب سے بڑے انسان / رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۳/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ ۶/
حضرت عبداللہ بن عمرؓ ۳/
حضرت طلحہؓ ۳/
حضرت ابو ذر غفاریؓ ۳/
حضرت سلمان فارسیؓ ۳/۵۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ ۳/
حضرت محبوب الٰہیؒ ۳/۵۰
حضرت معین الدین چشتیؒ ۳/
حضرت فرید گنج شکرؒ ۳/
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ۳/
نیک بیٹیاں ۳/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاءؒ ۳/
حضرت حمزہؓ ۱/
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۳/
حضرت ابوہریرہؓ ۴/
اللہ کے صفی ۲/۵۰
اللہ کا گھر ۴/۵۰
اللہ کے خلیلؑ ۳/۵۰
رسول پاکؐ کے اخلاق ۴/
قرآن پاک کیا ہے؟ ۵/
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل ۶/
" دوم ۶/

اسلام کے مشہور امیر البحر ۹/
اسلام کیسے پھیلا حصہ اوّل ۷/۵۰
" حصہ دوم ۶/
اسلام کیسے شروع ہوا ۷/۵۰
رسول پاکؐ ۶/
دس جنتی ۷/۵۰
سرکار کا دربار ۶/۵۰
چار یار ۷/۵۰
آں حضرتؐ (اردو) ۳/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی) /۴۰
ہمارا دین حصہ اوّل ۸/۵۰
ہمارا دین حصہ دوم ۸/۵۰
ہمارا دین حصہ سوم ۸/۵۰
تحسین القرآن (زیر طبع)
منہاج القرآن ۴/۵۰
ائمہ اربعہ (زیر طبع)
ارکانِ اسلام ۴/
عقائدِ اسلام ۴/۵۰
خلفائے اربعہ ۱۲/
نبیوں کے قصے ۷/۵۰
ہمارے رسولؐ ۷/
مسلمان بیبیاں ۶/
ہمارے نبیؐ (اردو) ۴/
ہمارے نبیؐ (ہندی) زیر طبع
سرکارِ دو عالمؐ ۹/
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد) ۲/
قاعدہ یسرنا القرآن (کلاں) ۴/۵۰

سوانح

بچوں کے خواجہ الطاف حسین حالی ۶/=
بچوں کے نظیر اکبر آبادی ۶/

بچوں کے حیات اللہ انصاری ۶/-
بچوں کی آپا جان (گیرڈا فلپس) ۶/-
بچوں کی شفیقہ فرحت ۴/۵۰
بچوں کے عابد علی خاں ۴/-
بچوں کے علی سردار جعفری ۴/-
بچوں کے یوسف ناظم ۴/-
چارلی چیپلن اور کینتھ اینڈرسن ۹/-
بچوں کے مولانا حسرت موہانی ۴/-
بچوں کے میر امن دلی والے ۴/۵۰
بچوں کے محمد حسین آزاد ۴/-
بچوں کے مرزا غالب ۴/-
بچوں کے رنگا رنگ خسروؒ ۴/-
بچوں کے ڈپٹی نذیر احمد ۴/-
بچوں کے سلطان جی رح ۴/۵۰
بچوں کے مولانا شبلی نعمانی ۴/۵۰
بچوں کے حالی، عابد حسین ۴/-
بچوں کے ذاکر، سیدہ عابد حسین ۴/-
بچوں کے بابائے اردو مولوی عبدالحق ۴/۵۰
بچوں کے میرزا ادیب ۴/۵۰
بچوں کے غلام السیدین ۵/-
بچوں کے مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲/-
بچوں کے ذاکر صاحب ۷/-
دادا نہرو ۶/-
اندرا گاندھی کی کہانی ۶/-
محمد شفیع الدین نیر ۷/۵۰
ہمارے عظیم سائنس داں ۹/-
چند مشہور طبیب اور سائنس داں ۹/-
مولانا آزاد کی کہانی ۸/-
جوہر قابل ۴/۵۰
بچوں کے چار رنگ رنگ دوست ۳/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی ۱۰/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں ۲/-

میر انیس ۲/-
امیر خسروؒ ۲/۵۰

سائنس، طب اور عام معلومات

باتوں باتوں میں معلومات ۱۰/-
کہانی بھی، معلومات بھی ۶/-
چیزوں کی کہانی ۷/۵۰
یہ کیسا بخار ہے ۶/-
آپ کا جسم ۶/-
گندا پانی ۴/-
کیوں اور کیسے؟ ۶/-
سائنس کی دنیا ۸/-
کمپیوٹر کیا ہے ۸/-
عجائب گھر ۱۰/-
ذرے کی کہانی ۲۱/-
علاج میرا دشمن ۶/-
پرواز کی کہانی ۴/۵۰
غذا کی کہانی ۳/-
رنگوں کی بستی ۵/-
غذائیں دوائیں ۸/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں ۴/۵۰
صحت کے ۹۹ نکتے ۲/-
صحت کی الف بے ۵/-
سنہرے اصول ۵/-
پرندوں سے جانوروں تک ۴/۵۰
دہلی ۲/-
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) ۱/۵۰
سماجی زندگی حصہ سوم ۴/۹۰
تاریخ ہند کی کہانیاں (دوم، چہارم) ۷/۵۰
ان تھک جان (زیر طبع)
بھن بھن باز ″
جان باز سپاہی ″

محنت کے پھل ″
موم کا محل ″
پہلا اقوام متحدہ طلبہ کے لیے ۳/-
″ ″ (بڑا سائز) ۶/-

نظمیں

پھلجھڑیاں ۶/-
مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۲۱/-
بتاشے (نرسری گیت باتصویر) ۷/۵۰
ننھی کلیاں (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے ۶/۵۰
سہانے ترانے ۴/۵۰
بچوں کے افسر ۶/-
بچوں کے اقبال ۶/۵۰

ننھے منے بچوں کے لیے

بتاشے (باتصویر) ۷/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) ۶/-
شیر اور بکری ″ ۹/-
چاند کی بیٹی ″ ۸/-
بھیڑیے کا گانا ″ ۷/۵۰
جادو کی ہنڈیا ″ ۶/-
چالاک بلی ″ ۷/۵۰
دم کٹی لومڑی ″ ۷/۵۰
کوے کا خواب ″ ۷/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری ۷/۵۰

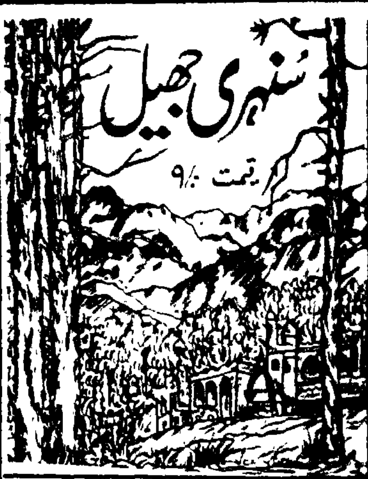
بڑے بچوں کی دلچسپ کہانیاں

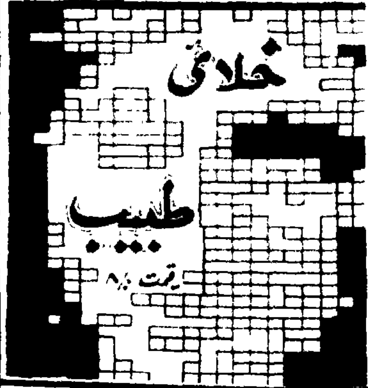
روشنی ہی روشنی ۱۰/-
خطرناک سگنل پہلا حصہ ۱۰/-
لاش چل پڑی دوسرا حصہ ۱۰/-
کالا جنگل نیلی موت تیسرا حصہ ۱۰/-

خلائی سرنگ چوتھا حصہ	۱۰/۵۰
وہ خلا میں بھٹک گئے پانچواں حصہ	۱۰/۵۰
خلائی مخلوق بستی میں چھٹا حصہ	۱۰/۵۰
موت کی شعاعیں ساتواں حصہ	۱۰/۵۰
خطرناک فارمولا آٹھواں حصہ	۱۰/۵۰
تابوت سمندر میں نواں حصہ	۱۰/۵۰
خلائی مخلوق کا حملہ دسواں حصہ	۱۰/۵۰
عمران کی زندہ لاش گیارھواں حصہ	۱۰/۵۰
شہر پتھر بن گیا بارھواں حصہ	۱۰/۵۰
روشنی ہی روشنی	۱۰/-
ایلس کی دنیا	۱۰/۵۰
پتھر کا خرگوش	۱۰/-
سرخ موت	۴/۵۰
دنیا کی عجیب و غریب کہانیاں	۷/۵۰
انمول کہانیاں	۴/۵۰
پتھر کی گڑیا	۷/۵۰
ریل کے بچے	۴/-
افریشیا کی کہانیاں	۹/-
۸۰ دن میں دنیا کا چکر	۳/-
ہزاروں خواہشیں	۹/-
مونٹی کرسٹو کا نواب	۹/-
گلی ور کے تین حیرت انگیز سفر	۶/-
جادوئی چقماق کی ڈبیہ	۴/۵۰
گیارہ ہنس اور ایک شہزادی	۴/-
دادی اماں کی کہانیاں	۶/-
سفر کے قصے	۵/-
پہاڑی مہم	۴/۵۰
تین بندوقچی	۱۰/-
ہم بنے کانڈو	۵/-
ایک تھا مرغا ککڑوکوں	۶/-
پریوں کی کہانیاں	۶/-
سمندر کا بادشاہ ہار گیا	۴/۵۰
چوں چوں بیگم	۴/-
ماسٹر شامت	۶/-
تھوڑی تارا ماتھے چاند	۴/-
پکڑے گئے	۷/۵۰
درویش کا تحفہ	۶/-
موراسے فرار	۷/۵۰
بکرے کی تعریف میں	۶/-
جھیل کا راز	۶/-
قصر صحرا اوّل	۷/-
قصر صحرا دوم	۱۰/-
قصر صحرا سوم	۶/-
عموں کی تباہی	۷/۵۰
پیار کا پنچھی	۴/-
ہیروں کے چور اور سونے کی تلاش	۷/۵۰
پادری کی روح	۴/-
ٹھگ نے ٹھگا ٹھگ کو	۴/۵۰
گدھا کہانی	۹/-
خفیہ سرنگ	۶/-
بڑھیا کی بھینس	۴/۵۰
تیس مار خاں	۴/۵۰
چالاک خرگوش کی واپسی	۱۵/-
غریب لکڑہارے کی کہانی	۶/-
نردولی کا آدم خور	۶/-
ہمت کے کرشمے	۶/-
خلائی مسافر	۶/-
ابو خاں کی بکری	۱۵/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/-
نرالے گویے	۴/۵۰
باتونی کچھوا	۴/۵۰
جادو کا چھلا	۳/-
جادو کی سارنگی	۳/-
بدر شہزادی	۶/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	۶/-
ننھا سیاح	۸/۵۰
زیور	۶/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	۶/-
سام پر کیا گزری	۳/۵۰
جنگو کی بلی	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۹/-
چور پکڑو	۲/۵۰
بہادر علی	۶/۵۰
خالی ہاتھ	۹/-
کھلونا نگر	۷/۵۰
حاجی بابا کی ڈائری	۷/۵۰
قصہ اژدھا پکڑنے کا	۶/-
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/-
ابو علی کا جوتا	۶/-
ننھا سراغ رساں	۶/-
پُراسرار غار	۶/-
ظالم ڈاکو	۶/-
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	۷/۵۰
دلّی کی شادی	۴/-
رحمت شہزادہ	۴/۵۰
اندھے کا بیٹا	۳/۵۰
پانچ جاسوس	۱۰/-
جنگل کی ایک رات	۷/۵۰
اچھی کہانیاں	۳/-
ہرن کا دل	۳/-
دریا کی رانی	۳/-
گوہر شہزادی	۴/۵۰
شریر شیرا	۳/۵۰

پری رانی	۳/-	جادو کا گھر	۳/۵۰	ٹمن اناڑی	۴/-
خطرناک سفر	۳/۵۰	بی مینڈکی اور کوّا	۳/۵۰	خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا	(زیر طبع)
ننھا جمرو	۳/۵۰	تاک دنا دن تاک کے سے	۳/۵۰	چمپاوت کا آدم خور شیر	۱۵/-
مرغی کی چار ٹانگیں	۴/۵۰	روٹی کس نے پکائی	۳/۵۰	ننھا ٹٹو	۳/-
بابا تاسح	۲/-	پھر میں تنکوں کیا خاک	۳/۵۰	چنبیلی	۱۲/-
سلامہ و صمصامہ	۵/-	پانچ بونے	۳/۵۰	شہزادہ اور ٹھگ	(زیر طبع)
پہاڑ کی چوٹی پر	۶/-	چیونٹی رانی	۳/۵۰	**ہماری درسی کتابیں**	
شرارت	۴/-	بچوں کی کہانیاں	۳/۵۰	اردو قاعدہ	۵۰
ننھا فرشتہ	۶/-	پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا	۳/۵۰	اردو کی پہلی کتاب	۱/-
ایک کھلا راز	۳/۵۰	پکڑو دُم کٹے کو	۳/۵۰	اردو کی دوسری کتاب	۱/-
بھیڑا اور اس کی بیوی	۳/۵۰	مدو راتا پردیس چلے	۳/۵۰	اردو کی تیسری کتاب	[illegible]
بھوتوں کا جہاز	۲/۵۰	بچو جیتو	۳/۵۰	اردو کی چوتھی کتاب	[illegible]
ہار کی تلاش	۶/-	سرخ جوتے	۴/۵۰	اردو کی پانچویں کتاب	-
خرگوش کی چال	۴/-	ریڈیو فیچر	(زیر طبع)	اردو کی چھٹی کتاب	۱/-
آؤ ڈراما کریں	۴/-	پلک نہ مارو	۶/-	اردو کی ساتویں کتاب	۲/-
خرگوش کا سپنا	۹/-	ایک دیس ایک خون	۳/۵۰	اردو کی آٹھویں کتاب	۳۲
نیلا ہیرا	۲/۵۰	جادو کے کھیل	(زیر طبع)	اردو خوش خطی حصہ اول	۳/۵۰
ایک کوری تیلی میں	(زیر طبع)	انعامی مقابلہ	۳/۷۵	اردو خوش خطی حصہ دوم	۲/۵۰
شیر خاں	۴/-	دعوت ملاقی	(زیر طبع)	// حصہ سوم	۳/۵۰
بھیڑیے کے بچے	۲/-	جیت کس کی؟	۴/-	// حصہ چہارم	۴/-
لومڑی کے بچے	۳/-	چینی کی گڑیا	(زیر طبع)	ہمارا ملک بھارت	۹/-
میاں ٹو جینو کے بچے	۴/-	بہادر سپاہی	۴/-	بھارت اور سنسار	۱۹/-
بہادر	۴/۵۰	چچا غالب	(زیر طبع)		
ہرن کے بچے	۳/۵۰	تانیل خاں	۳/-		
اس نے کیا کرنا چاہا	۳/۵۰	بن حسن عبدالرحمٰن	۵/-		
کٹا ہوا ہاتھ	۲/۵۰	چوری کی عادت	۳/۵۰		
میگھ نگر کا راجا	(زیر طبع)	غیر ذمہ دار لڑکا	(زیر طبع)		
جی دار اور ننھا فرشتہ	//	جیب اور اب	//		
سرکس	۱/۵۰	سندر چنار	۱/۵۰		
بندر اور بنائی	۴/۵۰	گلاو چوہیا اور غبارے	۱/۵۰		
لومڑی کا گھر	۲/۵۰	لال مرغی	۴/-		
گلاو چوہیا اور پری زاد	۵/-	چڑیاں	۳/-		


جادونگری
قیمت
۹/-

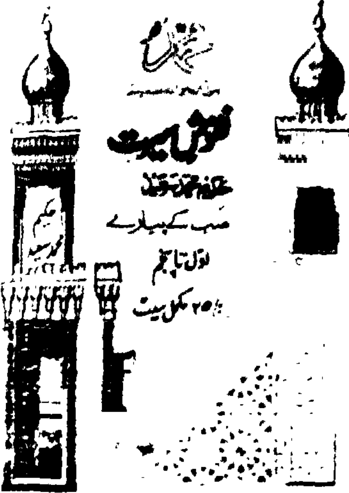

سنہری جھیل
قیمت ۹/-

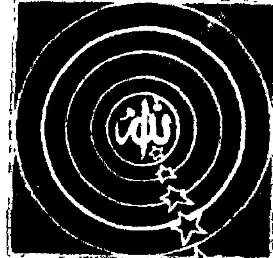

خلائی
طبیب
قیمت ۸/-


سونے کی
چوری
قیمت ۴/-


بونوں کا
جزیرہ
قیمت
۸/-


ہلتا ہوا مکان
قیمت ۵/-





صراطِ مستقیم

قیمت ۵۰/-

قصرِ صحرا

حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم

(مکمل سیٹ ۲۵/-)



خوب سیرت

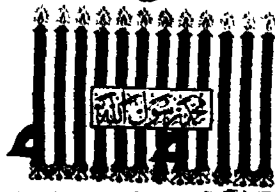
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنیاں

حکیم محمد سعید نے خوب سیرت
کے نام سے ایک بہت خوب صورت کتاب
لکھی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس
احادیث متن کا ترجمہ اور آسان و دل نشیں
زبان میں ان کی تشریح لکھی ہے

حصہ اول ۶/-

حصہ دوم ۶/-





ایک ایسی کتاب جس کو ہر گھر میں ہونا چاہیے

روشنی ہی روشنی





عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں
قیمت
۷/۵۰



بچوں کے
چار بزرگ دوست
قیمت
۳/۵۰



پادری کی روح
قیمت
۴/-



پکڑے گئے
قیمت
۷/۵۰



تھوڑی تارا ماتھے چاند
قیمت ۴/-



غریب لکڑہارے کی کہانی
قیمت ۶/-


خلائی مسافر
قیمت
۶/


ننھا جھبرو
قیمت
۳.۵۰


قیمت ۶/

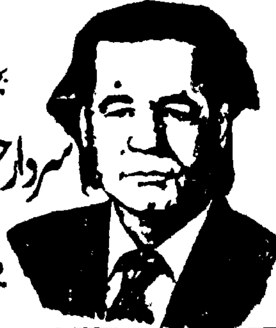

کھلونا نگر
قیمت
۵.۰

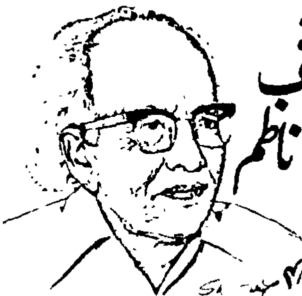

پُراسرار غار
قیمت : ۶.

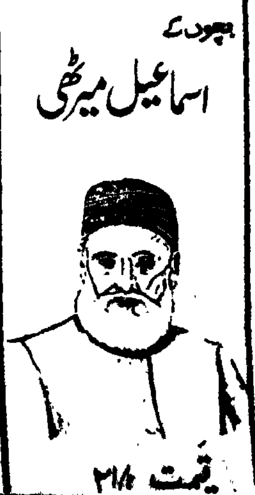

قیمت


جوہر قابل
قیمت
۴/۵۰


بچوں کے
ڈاکٹر سید
عابد حسین
قیمت ۴/-


بچوں کے
سردار جعفری
قیمت ۴/-


بچوں کے
یوسف
ناظم
قیمت ۴/-


بچوں کے
اسماعیل میرٹھی
قیمت ۲۱/-


بچوں کے
نظیر اکبرآبادی
قیمت ۶/-


قیمت
بچوں کے
مولانا شبلی نعمانی
ڈاکٹر اسلم فرخی

بچوں کے
مرزا غالب
۴/-

بچوں کے
الطاف حسین حالی
قیمت 6/=

بچوں کے غلام السیدین
قیمت ۵/-

بچوں کی
شفیقہ فرحت
قیمت ۴/-

بچوں کی
صالحہ عابد حسین
قیمت ۴/-

بچوں کے عابد علی خاں

بچوں کی
آپا جان
(اگر ڈ ابلس بورن)
قیمت ۶/-

علاج میرا دشمن



غذا کی کہانی



صحت کی الف بے

مسعود احمد برکاتی



باتوں باتوں میں معلومات



کہانی بھی معلومات بھی



قیمت ۶/-

رنگوں کی بستی

سہیل انور



مکتبہ پیام تعلیم کی دلچسپ اور سائنسی کتابیں

انمول کہانیاں

(انوار سہیلی سے ماخوذ)

مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

قیمت



۸۰ دن میں دنیا کا چکر



قیمت ۳/۵۰

پرندوں سے جانوروں تک



قیمت

افریشیا کی کہانیاں



تین بندوقچی

مسعود احمد برکاتی

(ناول)



قیمت ۱۰/- روپے

دنیا کی عجیب کہانیاں



آصف فرخی

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

- اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم - حصہ اول (سمینار کی روداد) ۱۰٪
- " " حصہ دوم ۱۰٪
- " " حصہ سوم ۵٪
- " " حصہ چہارم ۴۰٪
- ...صاحب: ذاتی یادیں (مرتبہ ...) نمبر ۲ ۱۰۰٪
- ...زمانہ قاضی عبدالودود ۵٪
- اردو سودا " ۵٪
- ابن امین اللہ طوفان کا تذکرہ شعرا " ۵٪
- غالب بہ حیثیت محقق " ۱۵٪
- شاد عظیم آبادی کے بارے میں " ۷۵٪
- اردو میں ادبی تحقیق " ۵٪
- زبان شناسی - اردو/فارسی " ۱۰۰٪
- والعصر مولانا آزاد ۱۰٪
- حجۃ ابراہیمی " ۴٪
- رباعیات باخرزی سیف الدین باخرزی ۳۰٪
- سکھ مت میجر بلبیر سنگھ ۲۵٪
- ہندستان کے عہد وسطیٰ پر مقالات - پروفیسر سید حسن عسکری ۲۰٪
- تاریخ بنگال و بہار (سدہ میٹرڈیم) کرم علی ۳۰٪
- مکتوبات صدی مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ ۳۰٪
- دیوان مصحفی (دیوان ہشتم) ۲۰٪
- اردو رسائل ۱۹۹۳ء میں نمبر ۴ (ادارہ) ۲۰٪
- " " نمبر ۵ " ۲۵٪
- خدا بخش جرنل ۹۶ " ۷۵٪
- پاکستان نیشنل میوزیم کراچی کے اردو مخطوطات، مرتبہ: ڈاکٹر ظفر اقبال ۷۵٪
- خدا بخش لائبریری کے اردو مخطوطات کی فہرست (ادارہ) ۱۰۰٪
- فہرست المخطوطات العربیہ (المسمی بہ) مفتاح الکنوز (المجلد الرابع) ۵۰٪

- فہرست مخطوطات فارسی - رام پور رضا لائبریری تقدیم شائستہ خاں ۳۰٪
- غزلیات شبلی شبلی نعمانی ۵٪
- قاضی سدید الدین عوفی کی جوامع الحکایات کے بارے میں (انگریزی) سید حسن عسکری ۲۵٪
- علی گڑھ ہندو مخطوطات - ڈاکٹر جعفر رضا شلیش زیدی ۵۰٪
- علامہ سلیمان ندوی کی تحقیقات الفاظ اردو - مرتبہ: ڈاکٹر سید حامد حسین ۴۰٪
- مسدس حالی (خدا بخش اڈیشن) ۲٪
- اردو رسائل کا ذخیرہ - رام پور رضا لائبریری میں ۲۰٪
- پٹنہ یونیورسٹی کے اردو تھیسس کا جائزہ احمد یوسف ۱۰٪
- سوانح حیدر علی (فارسی) علی ابراہیم خاں ۵۰٪
- سوانح چیت سنگھ مہاراجا بنارس (فارسی) علی ابراہیم خاں ۲٪
- اسلامیان ہند کے مسائل (روداد علی گڑھ سمینار) ۳٪
- احوال منازل بہار (فارسی) حافظ محمد فاضل خاں ۱۰٪
- مولانا آزاد اور مدارس اسلامیہ: مرتبہ قمر آستان خاں ۵۰٪
- ہندومت حصہ اول (۱) رسالہ زمانہ کانپور سے انتخاب ۵۰٪
- ہندومت حصہ دوم (۲) " ۶۰٪
- ہندومت حصہ سوم (۳) " ۸۰٪
- بدھ/جین/سکھ اور رادھا سوامی (۴) " ۴۰٪
- ہندو مسلم مسئلہ (۵) " ۴۰٪
- اسلامیان ہند (۶) " ۴۰٪
- تاریخ ہند (۷) " ۶۰٪
- پریم چند افسانے (۸) " ۵۰٪
- پریم چند: مزید افسانے (۹) " ۶۰٪
- پریم چند: ادبیات (۱۰) " ۴۰٪
- پریم چند: متفرقات (۱۱) " ۴۰٪
- مشاہیر ادب اردو حصہ اول (۱۲) " ۱۵۰٪
- " " دوم (۱۳) " ۱۵۰٪
- " " سوم (۱۴) " ۲۰۰٪

(۱۵) مشاہیر ادب اردو چہارم // [illegible]
(۱۶) ہندوستانی شاہیر کے آئینے میں حصہ اوّل // [illegible]
(۱۷) // // حصہ دوم // [illegible]
(۱۸) سیاست ہند حصہ اوّل // ۱۰/-
(۱۹) // حصہ دوم // ۱۵/-
(۲۰) ممالک اسلامیہ جاپان اور دوسرے ممالک // ۱۰/-
(۲۱) ادبیات ہندی // ۵/-
(۲۲) // ۵/-
(۲۳) ادبیات فارسی۔ رسالہ زمانہ نمبر // ۵/-
(۲۴) ادب، زبان، قواعد //
(۲۵) ہندستانی زبان کا مسئلہ //
(۲۶) اخبارات و رسائل //
(۲۷) ہندو مسلم یونیورسٹیاں / کتب خانے / علمی خبریں // [illegible]
(۲۸) فنون لطیفہ نمبر // ۵/-
(۲۹) مذہب نمبر // ۵/-
(۳۰) ۱۹۴۲ء - ۱۹۴۹ء کا ایک انتخاب نمبر // ۱۰/-
قصائد و قطعات تاریخ مرتبہ: ڈاکٹر علی احمد جلیلی ۲/-
مآثر // قاضی عبدالودود ۵/-
مولانا آزاد اور رفاقت قرآنی // مولانا آزاد سیمینار کے مقالے [illegible]
اردو غزل (۱۹۴۰ء کے شعرا کے تناظر میں) ۴/-
شاد عظیم آبادی قیس رضوی عظیم آبادی ۴/-
ہمدرد میں اردو رسائل اور اخبارات
مرتبین: شکیل احمد تمی / محمد ذاکر حسین ۵/-
شہر میں کرفیو (ناول) وبھوتی نارائن رائے ۲۵/-
قاضی سید رضا حسین مولوی سید عبدالغنی ۵/-
اردو زبان (مسائل اور حل) خطبہ سید ہاشم علی ۵/-
محمود ایاز کے سوغات کا اشاریہ ڈاکٹر سلمان عابد ۲۰/-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو رسائل کا اشاریہ
مرتبہ: ڈاکٹر عطا خورشید ۵/-
شاہ کمال علی کمال اور ان کی تصانیف۔ قاضی عبدالودود ۲۰/-
روہیل کھنڈ اور لغت رئیس رام پوری ۲۰/-

اردو مخطوطہ۔ خدا بخش میں (ایک صدی کا ذخیرہ)
دیوان ابوالکلام آزاد ڈاکٹر عبدالغفار شکیل
عقائد ہندواں (دبستان مذاہب سے متعلقہ ابواب) ذوالفقار
نگار و فاحشی اشاریہ مرتبہ: عطا خورشید
آثار آزاد (مولانا آزاد کے اوائل عمر کی خود نوشت تحریریں)
سید قدرت اللہ فاطمی
رسالہ جامعہ عہد اوّل (۱۹۲۳ء - ۱۹۴۰ء) کا اشاریہ
جہان غالب قاضی عبدالودود
اردو رسائل کا ذخیرہ (خدا بخش لائبریری میں) /-
عہد وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ
پروفیسر سید حسن عسکری /-
عبدالحق بحیثیت محقق قاضی عبدالودود /-
قواعد اردو پروفیسر فدا علی خاں /-
کلام شاد (انتخاب) قاضی عبدالودود /-
کچھ غالب کے بارے میں (حصہ اوّل) قاضی عبدالودود
// حصہ دوم //
اردو رسائل ۱۹۹۳ء (نصف اول) نمبر ۲ /-
// // (جولائی تا دسمبر) /-
بہار اردو لغت احمد یوسف /-
مرآۃ الاحوال جہاں نما (سفر نامہ ہند) احمد بہبہانی /-
مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری (احوال و افکار) /-
سید منیر الدین احمد ۵/-
قرآن مجید کی تفسیریں (چودہ سو برس میں) /-
چاربیت (تعارف و انتخاب) شبیر علی خاں شکیب ۵/-
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو مخطوطات۔ ترتیب ڈاکٹر عطا خورشید
تفسیر القرآن اوّل سر سید احمد خاں
تفسیر القرآن دوم // مکمل سیٹ ۱۰۰/-
تحریر فی اصول التفسیر //
سکوں پر اشعار ۵/-
جدید غزل گو (ادارہ) /-
دیوان نوازش نوازش لکھنوی /-

...راسخ عظیم آبادی	غلام علی راسخ عظیم آبادی	۱۰۰/-
...زیب ایک نیا تنقیدی نظر	جگر دیو پرکاش پرساد	۱۵/-
...نادر روزنامچہ	مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۳۰/-
...تان میں قومی یکجہتی کی روایت	بی این پانڈے	۵/-
...خ نادرالعصر	مؤلفہ منشی نول کشور	۲۵/-
...موہن کی باتیں	شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی	۱۵/-
... (ہفتہ وار)	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۰۰/-
...ت عظیم الدین احمد	ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ	۱۵/-
...الہ «زبان»	مدیر خوشتر منگرولی	۵۰/-
...ان رضا عظیم آبادی	قاضی عبدالودود	۱۰/-
...ر اردو لغت (جلد اوّل)	سید سیف الدین احمد بلخی	۱۵/-
...یار تحقیق ۱ (مجلہ)	ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ	۱۰۰/-
...یار تحقیق ۲	〃 〃	۲۵۰/-
...نے (کشمیری انشائیے)	ڈاکٹر محمد زماں آزردہ	۱۵/-
...رہنگ زبان گویا جلد اوّل	تالیف بدر ابراہیم	۵۰/-
...عربی تعلیم کا تصور	رشید احمد صدیقی	۲۰/-
طلسم ہوشربا	اوّل	۱۰۰/-
طلسم ہوشربا	دوم	۱۰۰/-
طلسم ہوشربا	سوم	۱۰۰/-
طلسم ہوشربا	چہارم	۱۰۰/-
طلسم ہوشربا	پنجم (اوّل و دوم)	۲۰۰/-
طلسم ہوشربا	ششم	۱۰۰/-
طلسم ہوشربا	ہفتم	۱۰۰/-
باقیات طلسم ہوشربا	(اوّل و دوم)	۲۰۰/-
مقدمہ طلسم ہوشربا		۲۰/-
مکمل سیٹ (Rs.1020)		۱۰۲۰/-
چند اہم اخبارات و رسائل	قاضی عبدالودود	۳۰/-
جین دھرم کے مقدس مقامات	بابو نیمی داس	۴۰/-
تہذیب، زبان، ادبیات (خطبات جلد دوم)		۷۵/-
ہندو مذہب	پنڈت منوہر لال زتشی	۱۰/-
شری کرشن گوتم بدھ اور دوسرے رہنما	نارائن پرشاد	۵۰/-

پیر علی (ناول)	شاد عظیم آبادی	۲۵/-
کچھ ہندومت کے بارے میں	(ادارہ)	۴۰/-
کبیر صاحب	پنڈت منوہر لال زتشی	۲۵/-
اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں	(ادارہ)	۱۰۰/-
ہندوؤں کے تیوہار	لالہ بالکشن بترہ ابر	۴۰/-
ہندوؤں کے اوتار	〃	۲۰/-
کرنل محبوب احمد		۲۵/-
پٹنہ کے کتبے	فصیح الدین بلخی	۵۰/-
جامع الشواہد	مولانا ابوالکلام آزاد	۴۰/-
اردو ادب رسالہ ہندستانی ۱۹۳۱ء–۱۹۴۰ء سے انتخاب		۵۰/-
اردو لغت	〃	۴۰/-
چند ادبی مشاہیر کی تحریریں 〃	〃	۷۰/-
اردو ہندی ہندستانی 〃	〃	۴۰/-
ہندی ادبیات 〃	〃	۶۰/-
تاریخ 〃	〃	۶۰/-
سائنس 〃	〃	۶۰/-
یادگار روزگار	سید بدرالحسن	۲۰۰/-
گیتا اور قرآن	پنڈت سندر لال	۲۵/-
جواہر لال نہرو کا سفر روس	جواہر لال نہرو	۲۰/-
شخصیات و واقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا	جنید احمد	۴۵/-
تحفۃ السعداد	خواجہ کمال	۲۰/-
خطبۂ صدارت موتی لال نہرو		۱۰/-
شریمد بھگوت گیتا	مہاتما گاندھی	۲۰/-
محبوب الالباب	خدا بخش خاں	۲۰۰/-
قطعات دلدار	مرتبہ: قاضی عبدالودود	۲۰/-
میرا مذہب	محمد علی ردولوی	۳۰/-
لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری	قاضی عبدالغفار	۴۰/-
صراط مستقیم	مرتبہ: قمر آستاں خاں	۴۰/-
حکایات لقمان	ایس سی قیبلس	۴۵/-
ہندو دھرم اکبر کے عہد میں	ابوالفضل	۱۰۰/-
مجمع النفایس	سراج الدین علی خاں	۱۵/-

...ف جیفریز	خدا بخش سیمینار	۱۰۰/-
...ال نامہ	سید رضا علی	۱۰۰/-
...ذہبی اور ہندو مسلم یکتا	تفضل علی	۱۵/-
...ع مصحفی	مولف تفضل علی، تصحیح و ترتیب عابد رضا بیدار	۱۵/-
...مت کیمیا یا تعزز خداوندی	محمد اجمل خاں	۲۰/-
...ل بہشت مترجمہ و مساکین ملا شکوہ		۴۰/-
...ند ہرمز ہزار برس پہلے	البیرونی	۱۰۰/-
...تقی تا کفتی	وامق جونپوری	۷۵/-
...رنل	۵۷–۶۲	۱۵۰/-
...ا بخش جرنل	۶۳–۶۸	۱۵۰/-
...دا بخش جرنل	۶۹–۷۴	۱۵۰/-
...مید احمد کی آٹوگراف بک	جنید احمد	۲۰/-
...ندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ	ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین	۱۰۰/-
...ندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت	منشی رام پرشاد ماتھر	۳۰/-
...بستان میری	ڈاکٹر اقبال حسین	۳۰/-
...یوان مصحفی	مرتبہ: امیر لکھنوی / امیر مینائی	۵۰/-

دلی کی بیگماتی زبان

محی الدین حسن

دلی کی بیگماتی زبان کو پڑھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کیا کرتی تھیں اور کس قدر وسعت اور مٹھاس اردو زبان میں پائی جاتی ہے۔

قیمت صرف سات روپے۔

ہندوستان کی دینی درسگاہیں

ڈاکٹر قمر الدین

اس کتاب میں دینی مدارس کے قدیم و عظیم نظام تعلیم کا جائزہ لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ ترقی پذیر دور میں ان مدارس کو کس طرح مزید موثر اور مفید بنایا جا سکتا ہے تاکہ آج جو غلط خبریں اور افواہیں اور شبہات سر ابھار رہے ہیں ان کا سلسلہ بند ہو سکے۔ ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ قیمت: /200 روپے

دیگر اداروں کی مطبوعات

ترکش

(شعری مجموعہ)

جاوید اختر

اردو شاعری کے نیا گرا آبشار پر ان گنت پھواروں سے جو قوس قزح بنتی ہے اس کے رنگوں کے بہت سے پرتو ہیں اور ان پر جاوید اختر کا پرتو بھی شامل ہو چکا ہے (قرۃ العین حیدر)

جاوید اختر اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر جاں نثار کے لڑکے ہیں فلمی دنیا میں بھی ایک کامیاب اسکرپٹ رائٹر اور گیت کار کی حیثیت سے اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔

ترکش جدید اردو شاعری کی اہم دستاویز ہے۔ قیمت: /100

اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ

خالد محمود

سفرنامے اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک پرکشش صنف ادب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ خالد محمود صاحب نے اس تحقیقی مقالے میں سفرناموں کے ارتقا اور اوصاف پر نہ صرف سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ قابل ذکر سفرناموں کا تہذیبی پس منظر بھی پیش کیا ہے۔ اس تحقیقی مقالے پر موصوف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ /250

۱۹۴۷ء کے بعد ہندستان میں اسلامی تحریکیں

ڈاکٹر اقتدار محمد خاں

اس تحقیقی مقالے کے چھے باب ہیں۔ مقالہ نگار نے ان ابواب میں دینی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب اور ہندستانی مسلمانوں کے درمیان پائے جانے والے اسلام کے پس منظر میں ہندستان کی تمام اسلامی تحریکوں کے حوالے سے اصل اور زندہ جاوید اسلام پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ جس پر مصنف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ قیمت: /250

معروضات

مصنف: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی

اردو کے جواں سال ادیب اور نقاد ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت: /100

…الصدق — مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں شائع
…الے نا چوار رسالے کا مکمل فائل۔ اس کا مقدمہ
…بدالقوی دسنوی نے تحریر کیا ہے۔ … ۴۵/=

…ام رنگ — ڈاکٹر اسلم فرخی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ
…خاکہ۔ یہ اُس نامور بزرگ کا خاکہ ہے جس نے
…عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا
…انسانیت کو وقار بخشا۔ ۱۵/=

…سبتو (سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین) — پروفیسر ضیاالحسن فاروقی

ذاکر صاحب وہ مرد درویش تھے جن کا انداز
…والہ ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب اقبال کے مرد مومن
…ذاکر صاحب وہ شبنم تھے جس سے جگر لالہ میں
…ٹھنڈک پڑتی ہے۔ وہ طوفان تھے جس سے دریاؤں
…کے دل دہل جاتے تھے۔ اس کتاب میں ذاکر صاحب
…کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۵/=

… (سلسلہ وار نظمیں) — زبیر رضوی

…زبیر رضوی نے ان نظموں میں واقعات و
… ۴۰ …

…قدیم شعرا اردو قلی قطب شاہ سے …
خاں سیماب تک کے کلام کا جامع انتخاب …
ادا جعفری نے برسوں کی محنت اور …
بعد ترتیب دیا۔ بلاشبہہ اسے ادا جعفری کا …
قرار دیا جائے گا۔ صفحات ۴۸۰

سازِ سخن — ادا جعفری

جدید شاعری کی خاتونِ اوّل …
کے کلام کا جامع انتخاب۔ ادا جعفری کے …
سے ایک ایسی قوتِ ارادی منتشرح ہے جس کے …
ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔

ترجمۂ قرآن — پروفیسر …

(منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش …
پہلا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ جو ۳۰ …
کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خصوصی تقریب …
میں پیش کیا گیا۔

نذرِ مختار — …

مجموعۂ مضامین جو ممتاز محقق اور دانشور …
مختارالدین احمد کو عالیجناب شنکر دیال شرما …
جمہوریۂ ہند کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا …
کے ممتاز محققین اور ادیبوں کی نگارشات …

Regd. with R.N.I. at No [illegible]7/60 December 199[illegible]
Regd. No. DL 16016/96
Licence No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postage

KITAB NUMA

JAMIA NAGAR NEW DELHI - 110025